

लाल बहादुर शास्त्री राष्ट्रीय प्रशासन अकादमी

L B.S. National Academy of Administration

मसूरी

MUSSOORIE

पुस्तकालय

LIBRARY

अवाप्ति संख्या

Accession No. 18226

वर्ग संख्या

Class No. 291.43205

पुस्तक संख्या

Book No. 1129 No. 72-Sc

زندگی امیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

ادبِ عالیہ

(نقوش کی دس سالہ تحریروں کا انتخاب)

۸۰، ۷۹

اپریل ۱۹۶۰ء

میر
محمد طفیل

مجموعہ شمارہ
۱۲ روپے

سالانہ قیمت
۲۰ روپے

ادارۂ فروغِ اردو ۱ لاہور

ترتیب

محمد طفیل

طلوع

- ۱ - نقوش کے بارے میں میرے تاثرات
- ۲ - نقاش و نقوش
- ۳ - نقوش کے خاص نمبر

غلام رسول مہر ، ۱۱
ڈاکٹر اختر اورینٹی
نثار احمد فاروقی ،

نوائے

- ۱ - تذکرہ رجحانہ
- ۲ - اصول غازی
- ۳ - تقریظ

مولانا حالی ، ۳۳
مولانا حالی ، ۴۰
مولانا محمد علی ، ۴۵

شعرو شاعر

- ۲ - شعور زندگی
- ۵ - قتیل و طہری قنایا فرید آبادی
- ۶ - مثنوی بہار عشق
- ۷ - تنقید شعرا و رجال
- ۸ - بیچ اکبر
- ۹ - آوارہ گرد اشعار
- ۱۰ - داراشکوہ کا دیوان
- ۱۱ - غالب کی مقبولیت کے اسباب
- ۱۲ - آتش کی صوفیانہ شاعری
- ۱۳ - فرسے دارشاعر
- ۱۴ - اختر شیرانی
- ۱۵ - فیضی کا نظریہ شعر

ڈاکٹر یوسف حسین خان ، ۵۳
ڈاکٹر مختار الدین آرزو ، ۶۴
ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ، ۷۹
پروفیسر عبدالقادر سروری ، ۱۰۶
پروفیسر حامد حسن قادری ، ۱۱۶
قاضی عبدالودود ، ۱۲۴
پروفیسر علم الدین ربانک ، ۱۴۱
شیخ محمد اکرام ، ۱۵۰
سید احسان حسین ، ۱۵۴
محمد حسن عسکری ، ۱۶۱
آل احمد سرور ، ۱۸۳
ڈاکٹر وحید قریشی

ادب و تنقید

- ۱۶ - برج بھاشا کی پہلی گرامر
- ۱۷ - اردو اور پنجابی

سید محمد حسن رضوی ، ۱۹۹
ڈاکٹر محمدی الدین زور ، ۲۱۴

- ڈاکٹر شوکت سبزواری، ۲۲۳۰
 نیاز فقہوری، ۲۲۳۰
 ڈاکٹر ابوالایت صدیقی، ۲۲۰
 سید وقار عظیم، ۲۶۴
 ڈاکٹر محمد حسن، ۲۷۴
 آغا محمد اشرف، ۲۸۸
 ڈاکٹر سید عبداللہ، ۳۰۵
 محمد عبد اللہ قریشی، ۳۱۶
 ڈاکٹر اعجاز حسین، ۳۲۹
 ممتاز حسین، ۳۴۰
 فراق گورکھپوری، ۳۵۱

- دریں نقطہ نظر کی اہمیت
 - جملہ معتزلات
 ۲۰ - جلی شاہ کی ایک اور تصنیف
 ۲۱ -
 ۲۲ - مرزا رسوا کی سید مظاری
 ۲۳ - آزاد کی سیاحت
 ۲۴ - نذیر احمد کی انفرادیت
 گل بکولی
 نذیر احمد کا ذہنی تجربہ
 ۲۵ - ماضی کے ادب عالیہ کے متعلق
 ۲۸ - میر فقوش کے نام (مخطوط)

شہادت نمبر

- ڈاکٹر مولوی عبدالحق، ۳۶۷
 مولوی عیادت اللہ دہلوی، ۳۹۰
 ملک رام، ۳۹۴
 غلام رسول، ۴۰۹
 مولانا عبدالمجید دریابادی، ۴۱۷
 ابراہیم مودودی، ۴۲۹
 شورش کاشمیری، ۴۴۴
 رشید احمد صدیقی، ۴۵۴
 ڈاکٹر سید عابد حسین، ۴۶۲
 شاہد احمد دہلوی، ۴۷۲

- ۱ - فواب حماد الملک
 ۲ - سر سید احمد خان
 ۳ - فواب صدیق ریاض
 ۴ - ابوالکلام
 ۵ - محمدی حسن
 ۶ - علامہ محمد امجدی
 ۷ - نغمہ علی خاں
 ۸ - بکر صاحب
 ۹ - ڈاکٹر صاحب
 ۱۰ - مرزا عظیم بیگ چغتائی

منٹو نمبر

- حامد جیلانی، ۴۸۳
 عصمت چغتائی، ۴۸۷
 اویندر ناتھ اشک، ۵۰۳
 محمد طفیل، ۵۲۸
 سید وقار عظیم، ۵۴۵

- ۱ - منٹو ماموں کی موت
 ۲ - میرا دوست، میرا دشمن
 ۳ - منٹو میرا دشمن
 ۴ - منٹو صاحب
 ۵ - منٹو کا فن

مکاتیب نمبر

- ۱ - غالب، ۵۷۷
 ۲ - سر سید، ۵۸۴
 ۳ - محمد حسین آزاد، ۵۸۸
 ۴ - امیر مینائی، ۵۸۹

- ۵۔ داغ ، ۵۹۱
۶۔ فطی مذہر احمد ، ۵۹۲
۷۔ مولانا حالی ، ۵۹۳
۸۔ نواب محسن الملک ، ۵۹۶
۹۔ نواب دتار الملک ، ۵۹۸
۱۰۔ شبلی نعمانی ، ۶۰۱
۱۱۔ اکبر الہ آبادی ، ۶۰۳
۱۲۔ عبدالمجید مرشد ، ۶۰۴
۱۳۔ ریاض خیر آبادی
۱۴۔ حبیب الرحمن شروانی ، ۶۱۰
۱۵۔ علامہ اقبال ، ۶۱۳
۱۶۔ مولانا محمد علی جوہر ، ۶۱۴
۱۷۔ راشد الفیزی ، ۶۱۸
۱۸۔ منشی دیارائیں نعم ، ۶۱۹
۱۹۔ نصیر حسین خیالی ، ۶۲۰
۲۰۔ سید سلیمان ندوی ، ۶۲۳
۲۱۔ خواجہ حسن نظامی ، ۶۲۷
۲۲۔ منشی پروچند ، ۶۳۰

نظیں، غزلیں

- ۱۔ قطعات
۲۔ جھوٹی برسات
۳۔ اگر زہر و جبینوں کے درمیان کڑے
۴۔ یہ دن ہمارے اب کے بھی راس آں
۵۔ مطرب سے کہو آج اس انداز سے کہنے
۶۔ جگنو
۷۔ بات سمجھنے والا
۸۔ زندگی مجبور یوں کا راز ہو کر رہ گئی
۹۔ یادِ عزرائیل چشمان ، ذکرِ سخن ہزاراں
۱۰۔ آگ میں پھول
۱۱۔ جو وہ در پردہ انھیں جلوہ نمائی کی نہ تجوہوتی
۱۲۔ مر سے جی میں ہے کہ پوچھوں کبھی مرشدِ معان سے
۱۳۔ حضورِ یاد آئندہ کل ہی آئے ہیں
۱۴۔ دل بلا سے نثار ہو جائے
۱۵۔ اٹھنا سا غم کہ دنیا ورہ پئے ازار ہے ساقی
۱۶۔ کسی طرح دن توڑتے ہیں فریبِ امید کھارہا ہوں
۱۷۔ حملہ جہان بازیوں کا پار ہے ہیں
۱۸۔ کیا بھروسہ جو کسی مہم کا
۱۹۔ عینِ خیر کا کھٹلنے !
۲۰۔ خود دل میں رہ کے آنکھ سے پردہ کرے کوئی
۲۱۔ ایک گیت
۲۲۔ غم کے ہرے کی کچھ تھوڑا آیا اب تم سے بیان کریں
۲۳۔ وفا کی آخری منزل بھی آ رہی ہے قریب
۲۴۔ چین پلانا ہے دل کو آج نہ کل
جوش ملیح آبادی ، ۶۳۱
جوش ملیح آبادی ، ۶۳۲
برہم اد آبادی ، ۶۳۶
جلالہ اد آبادی ، ۶۳۷
فراق گورکھپوری ، ۶۳۸
فراق گورکھپوری ، ۶۳۹
حفیظ جالندھری ، ۶۴۶
آرزو الحسنوی ، ۶۴۷
فیض احمد فیض ، ۶۴۸
فیض احمد فیض ، ۶۴۹
سیاب اکبر آبادی ، ۶۵۱
عبدالمجید سالک ، ۶۵۲
ناشر ، ۶۵۳
چراغِ حسنِ برت ، ۶۵۴
انتہر شیانی ، ۶۵۵
وہشت گلگتوی ، ۶۵۶
اشرفی ، ۶۵۷
احمد ندیم قاسمی ، ۶۵۸
احمد ندیم قاسمی ، ۶۵۹
اسرار الحق مجاز ، ۶۶۱
میراجی ، ۶۶۲
میراجی ، ۶۶۳
صوفی بھٹو ، ۶۶۴
مادری علی خاں ، ۶۶۵

- ۲۵ - ترے کرم سے خدا فی میں یوں تو کیا نہ ملا
۲۶ - افضالی
۲۷ - کچھ اس طرح سے نظر سے گزر گیا کوئی
۲۸ - برنم میں جب وہ وہاں آٹھابی آئے گا
۲۹ - تقابل
۳۰ - قطعات
۳۱ - خزاں میں آگ لگاؤ بہار کے دن ہیں
۳۲ - سنبھالی ساقی مغل اب اپنے پیمانے
۳۳ - کچھ تو مجھے محبوب ترا غم بھی بہت ہے
۳۴ - وضع کا پاس کہاں تک کرتے تم تو پھر دیوانے تھے
۳۵ - کوئی اداس تاشیں محبت میں تپنے
۳۶ - ہماری محفلوں میں بے حجاب آنے سے کیا ہوگا
۳۷ - اک دن وہ ہل گئے تھے ہر رگڑ رگیں
۳۸ - پس منظر
۳۹ - زباں پر آپ کا نام آ رہا ہے
۴۰ - افسانہ آن شبے
۴۱ - زلف کے نام جنوں کا پیام لے کے چلے
۴۲ - جب کبھی تذکرہ شعلہ رخاں ہوتا ہے
۴۳ - ایک کوستانی سفر کے دوران میں
۴۴ - کسی کے دم سے راحت بھی ہوئی ہے
۴۵ - غضب ہے جس تجھے دل کا یہ انجام ہو جائے
۴۶ - دولت کی خدائی
۴۷ - کیا منزل غم سمٹ گئی ہے
۴۸ - چمن میں کس نے کسی بے نوا کا ساتھ دیا
۴۹ - یہ باتیں بھولی باتیں ہیں
۵۰ - کرن نگاہ کی ہلاکتی تو کیا ہوگا
۵۱ - کھری باتیں بہ اندازہ سخن گمدوں تو کیا ہوگا
۵۲ - میراث
۵۳ - دن ہو کہ رات کچھ نفس ہو کہ معنی باغ
۵۴ - یہ پھول
۵۵ - وا ہوا پھر درمیانہ گل
- ۶۶۶ - ن - م - راشد
۶۶۷ - ن - م - راشد
۶۶۸ - حفظہ ہوشیار پوری
۶۶۹ - احسان دانش
۶۷۰ - معین حسن جہی
۶۷۱ - جان نثار اختر
۶۷۲ - اختر انصاری
۶۷۳ - یندت آند نرائن ملا
۶۷۴ - فضل احمد کرم فضلی
۶۷۵ - میکش اکبر آبادی
۶۷۶ - عندلیب شادانی
۶۷۷ - عربی رام پوری
۶۷۸ - اشک راج پوری
۶۷۹ - اختر الیام
۶۸۰ - عدم
۶۸۱ - جگن ناتھ آزاد
۶۸۲ - قلیق شفا
۶۸۳ - غلیہ کا شیری
۶۸۴ - مجید احمد
۶۸۵ - عبد المجید حیرت
۶۸۶ - شعری بھوپالی
۶۸۷ - پروین شکر
۶۸۸ - سیف الدین سیف
۶۸۹ - علامہ بابا ناناں
۶۹۰ - ابن اثنا
۶۹۱ - ادو حفصی بدایونی
۶۹۲ - شاد عارفی
۶۹۳ - یوسف ظفر
۶۹۴ - انجمن رومانی
۶۹۵ - قیوم نظر
۶۹۶ - ناصر کاکھی

افسانے

- ۱ - دور کا نشانہ
۲ - اپنے دکھ مجھے دے دو
- چودھری محمد علی ردوہوی، ۵-۷
راجندر سنگھ بیدی، ۷-۹

- ۳ - پرتو
۴ - بٹھی کی مانی
۵ - المجدد
۶ - موزیل
۷ - سایہ
۸ - سہارے کی تلاش
۹ - ڈیڈ لیٹر
۱۰ - منشا
۱۱ - جل پری
۱۲ - صحر تراش کا خواب
۱۳ - ادلی اللہ
۱۴ - یہ حادثے
۱۵ - لندن لیٹر
۱۶ - بھاگ بھری
۱۷ - آندھی میں پوراغ
۱۸ - وادا
۱۹ - کالی ترتری
۲۰ - ریلوے جنکشن
۲۱ - چارہ گر
۲۲ - بھتیجا دیوچ
۲۳ - پرواز کے زخم
۲۴ - مانی پھانسیاں
۲۵ - گنگاری کے اندھے
۲۶ - زینو
۲۷ - جونکیں
۲۸ - آخری سہارا
۲۹ - زرد و گلاب
۳۰ - گڈ ریا
- کرشن چندر ، ۷۲۸
عصمت چغتائی ، ۷۳۶
احمد ندیم قاسمی ، ۷۴۳
منشو ، ۷۵۹
فلام عباس ، ۷۷۵
حیات افترا نھاری ، ۷۸۵
خواجہ احمد عباس ، ۷۹۷
انتر اور نیوی ، ۸۰۴
علی عباس سیفی ، ۸۰۹
ل۔ احمد ، ۸۳۱
ممتاز مفتی ، ۸۸۰
حجاب امتیاز علی ، ۸۵۳
قرۃ العین جیدر ، ۸۶۰
لاجرہ مسرور ، ۸۷۹
ممتاز شبیر ، ۸۸۸
خدیجہ مستور ، ۸۹۵
بلونت سنگھ ، ۹۰۷
قدرت اللہ شہاب ، ۹۳۱
نصیر سلیم جھٹاری ، ۹۳۵
ابوالفضل صدیقی ، ۹۴۷
کشمیری لال ذاکر ، ۹۷۹
میرزا ادیب ، ۹۹۱
دوبندر ستیا رتی ، ۹۹۹
ابو سعید قریشی ، ۱۰۰۹
مندرناتھ ، ۱۰۲۰
شکینہ اختر ، ۱۰۲۹
اسے مجید ، ۱۰۳۸
اشفاق احمد ، ۱۰۷۴

دورے

- ۳۱ - آبا
۳۲ - اصفہان کے گلگند
۳۳ - ہیلو
- اوپندر ناتھ انک ، ۱۱۰۱
نیدامیتا علی تاج ، ۱۱۱۱
جاوید اقبال ، ۱۱۲۷

طنز و مزاح

- | | |
|----------------------|-----------------------------|
| شوکت تھانوی، ۱۱۵۴ | ۳۴ - تعبیر طلب |
| بطرس، ۱۱۶۲ | ۳۵ - دوست کے ہم |
| کنہیا لال کپور، ۱۱۶۷ | ۳۶ - برج بانو |
| شفیق الرحمن، ۱۱۷۱ | ۳۷ - سفر نامہ جہاز باد سندی |
| غلام پیم، ۱۱۹۳ | ۳۸ - شہر اور گاؤں |
| نظر تونسوی، ۱۱۹۵ | ۳۹ - ایک انسان کی موت |

آرٹ

- ۱ - چند یادیں عبد الرحمن چغتائی، ۱۲۰۳

نقوش کی دس سالہ تحریروں کی مکمل فہرست، ۱۲۰۹

محمد طفیل، ۱۲۴۹ مدیر نقوش (خاکہ)

طلوع

ادب کی باتیں اس سے پہلے بھی چڑھی ہیں اور بڑے دھوم دھڑکوں کے ساتھ چڑھی ہیں۔ ماضی کی یادوں میں اُٹھ جائیے گا تو شہنائیوں کی آوازیں، آج بھی سنائی دیں گی۔

اور لاڈلوں کی طرح، نقوش بھی اس دنیا میں آیا۔ پہلے اس کی پرورش کے فرائض میرے بڑے بھائی احمد نعیم تاحی اور چھوٹی بہن ہاجرہ مسرور کے سپرد ہوئے۔ یہاں کہتے ہیں۔ چھین کی تربیت ہم پر، مستقبل کی نشان دہی ہوا کرتی ہے۔ پھر نقوش میرے سب سے بڑے بھائی سید وقار نعیم کی آغوش میں پلکارا کسر کسی نے بھی نہ اٹھا رکھی۔ بسھی نے لاڈ بپا رکھا۔ ابھی نقوش تین ہی ماہ کا ہوا تھا کہ سخت بیمار ہو گیا۔ اصل میں بات یہ تھی کہ شرارتی بچوں کو اس کی چھین بھاتی نہ تھی۔ انھوں نے

ایسی چال چلی کہ یہ بے چارہ چھ ماہ تک بے مددہ چڑھا رہا۔ جب نقوش چھٹنے اور ٹوٹنے لگ گیا تو اس کی پرورش میرے سپرد ہوئی۔ بیاری سمیت اُس وقت اس کی عمر کوئی ڈھائی برس ہوگی۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری تھی۔ میری راتوں کی نیند اچھٹ گئی۔ میں سوچتا تھا اتنا خوب صورت ماہ اور ہونا ہر بچہ، اگر میری نگرانی میں نہ ہو سکا تو کتنی جگ ہنسائی ہوگی۔ میں نوجوان مڑا رہا۔

میرے مالی حالات بھی زیادہ اچھے نہ تھے۔ گریں چاہتا تھا اسے ولایت تک بھیجوں۔ حوصلے اتنے، وسائل محدود، اللہ کی بارگاہ میں دن رات دعائیں مانگیں۔

پھر ٹوکڑ ناخدا کا یہ ہوا۔ نقوش نے اپنے پائے کا من موہ لیا۔ وہاں سے یہاں تک پہنچنے کے لیے اتنی محنت کی اور اتنے غلوں سے کہ اس نے ایک ایک سال میں دو دو تین تین امتحان دینے شروع کر دیے اور خدا کی مہربانی سے اچھے نمبروں سے پاس ہوتا رہا۔ اس کے کئے ہوئے پرچے آج پاکستان اور ہندوستان کی کسی بھی یونیورسٹی میں رکھ کے دیکھ لیں۔ اس شان سے کوئی بھی پاس نہ ہوا ہوگا۔ اس کی قابلیت نے اس کے بہت سے حامد بھی پیدا کر دیے ہیں۔ جو اس سے تلی غنا د رکھتے ہیں۔ گو یہ کوئی نئی بات نہیں۔ مگر اس سے دل دکھتا ہے۔ حالانکہ یہ اپنی ہی دھن میں دیوانہ وار چلا جا رہا ہے کسی کے کچھ غرض نہیں۔ مگر لوگ ہیں کہ اسے فکر یاں مارنے سے باز نہیں آتے۔ اس کا باوجود اس کے دل میں انتقام کا جذبہ نہیں۔ یہ ریشہوں کی بازی کو بھی جھٹکتوں سے جیتنا چاہتا ہے۔ ماشاء اللہ نقوش اب جوانی میں قدم رکھ رہا ہے۔ کوئی اس کا بائپن تو دیکھے۔ ڈٹنا ہوں کہیں اسے میری ہی نظر نہ لگ جائے۔ لائے آپ میری باتوں پر یقین نہ کریں۔ اسے میری نظروں سے نہ دیکھیں۔ میں تو دیوانہ نہ ہوں۔ دیوانہ نہ ہوتا تو آج نقوش کو یہ مرتبہ فیصیب نہ ہوتا۔

مگر مجھے اتنا ہوش ہے — آج میرے بھی لاڈلے کی رات چڑھی ہے۔

محمد طفیل



نیاز فتح پوری



بابائے اردو



مالک رام



ڈاکٹر محی الدین زور



ڈاکٹر عابد حسین



قاضی عبد الودود



سید مسعود حسن رضوی



ڈاکٹر تائیر



ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی



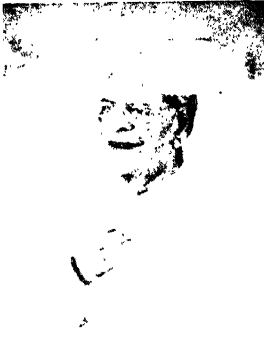
سید احتشام حسین



سید وقار عظیم



ڈاکٹر شوکت سبزواری



مهد علی ردولوی



ڈاکٹر ابولمہدی صدیقی



راجندر سنگھ بیدی



مہد حسن عسکری



حمات اللہ انصاری



ڈاکٹر مہد حسن



قرۃ العین



عصمت چغتائی



خلد بیہ مستور



ہاجرہ مسرور



سمتاز شیدیں



حجاب امتیاز علی



منشو



درشن چندر



احمد ندیم قاسمی



غلام عباس



ممتاز مفتی



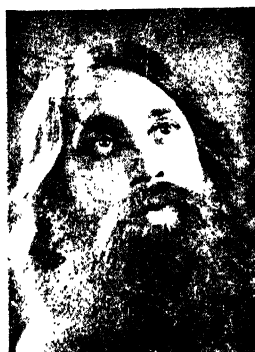
علی عباس حسینی



قدرت الله نسحاب



بلونت سنگو



ديوندر ستيا رتھي



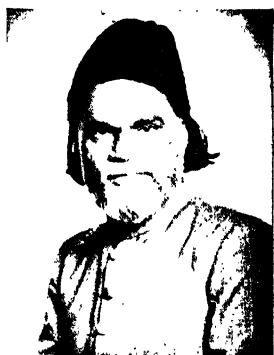
اويندر ناگھ اشک



مھندر ناگھ



کشميري لال ذاکر



جگر مرادآبادی



جوش ملیح آبادی



حفیظ چالندھری



فراق گورکھ پوری



اختر شیرانی



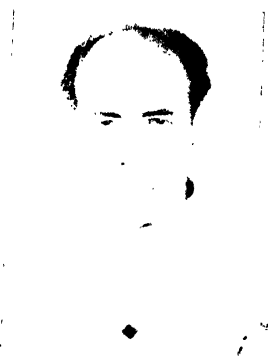
اثر لکھنوی



عابد علی عابد



فیض



جدی



حفیظ ہوشیارپوری



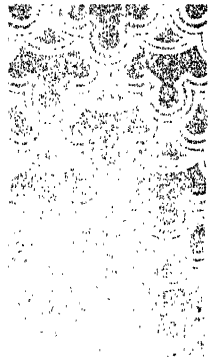
اختر انصاری



علم



حیرت شماوی



چکن ناتھ آزاد



میکش اکبر آبادی



غلام ربانی نابان



شاهد احمد دهلوی



قتیل شفائی



سولت تھانوی



نثارس



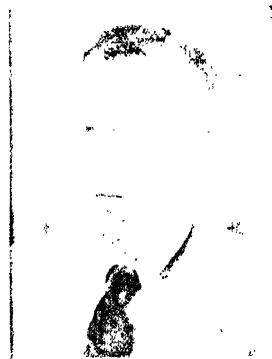
نشیہا لال دور



جراح حسن حسرت



شفیق الرحمن



امتیاز علی ناز

ترتیب

نفقوش کی اشاعت کو آج بارہ برس ہو گئے ہیں۔ چند لفظوں میں اس کے دس سالہ کارناموں کے بارے میں کچھ کہنا آسان نہ ہو گا۔ پھر کہ اس تو ان چیزوں کے بارے میں مانتا ہے جسے صرف لکھنے والا ہی جانتا ہو۔ پڑھنے اور سننے والا نہ جانتا ہو۔ اس لیے میں کچھ زیادہ کہنا نہیں چاہتا۔ ہاں موجودہ نمبر کی ترتیب کے سلسلے میں چند باتیں سن ہیں۔

کوئی دوسرا، میرے نفقوش کا یہ انتخاب کرتا تو میں سٹ پٹا کے رہ جاتا۔ اس لیے کہ نفقوش میں جو کچھ بھی چھپا ہے۔ اس کی ادبی آبرو پر کوئی بھی حرف نہیں رکھ سکتا (ویسے برائے اعتراض، جو جس کا جی چاہے کہے) یہی وجہ ہے کہ مجھے نفقوش کی ہر ہر سطریں حسرت ہی حسرت نظر آتا ہے۔ ایسے محبت کے بارے کو نفقوش کی دس سالہ تحریروں کا انتخاب اپنے ذمہ نہیں لینا چاہیے تھا۔ مگر سوال یہ ہے اگر میں یہ کام کسی اور کو سونپتا تو میریں خود کیسے زندہ رہتا۔ دونوں طرح اپنی موت!

مجھے نفقوش کی نسبت سے ہر اچھا جتنی بھی منظور ہے اور ہر برائی بھی ایسی وجہ ہے کہ اس سراسر جھجکے والے کام کو میں، مگر انجام دے کر بری بھی باتیں سننے کے لیے آمادہ ہو گیا ہوں اب یہ سے سلسلے نفقوش کا ایک ایک لفظ ہے اور یہ جاننا تو ان!

میری مشغلوں کی نوعیت مختلف ہے۔ ایک طرف اہل قلم ہیں۔ دوسری طرف قارئین، ایک سے ایک سمنہ زور، دہل رہا ہوں نہ جانے میری اس عاجزانہ کوشش کو پسند بھی کیا جائے گا یا نہیں۔ ڈھارس کی صرف ایک بات ہے۔ وہ یہ کہ اگر کسی کام کوئی دوسرا انجام دیتا (اللہ میاں کے سوا) تو کیا ادیب اور قاری مطمئن ہو جاتے؟ میرا خیال ہے۔ ہرگز مطمئن نہ ہوتے۔ اطمینان تو اپنی موت کی نشانی ہوا کرتا ہے۔ جو نہ مجھے منظور ہے۔ اور نہ ہی نفقوش کی قاری اور نقاش کا منظور ہو گا۔

آئیے میں آپ کو بتاؤں کہ میں نے تقریباً نظر تجربوں کے چناؤ میں، کن کن امور کا خیال رکھا ہے۔ مقالات کے سلسلے میں میں نے یہ چاہا ہے کہ مضمون نگار کی بہتر تحقیق کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی خیال رکھوں کہ موضوع بے حد اہم ہو اور اس موضوع پر بات لکھا نہ گیا ہو یا سب سے کم لکھا گیا ہو میں نے ایک جلتے پھٹے موضوع پر ایک اچھا مضمون اس لیے چھوڑ دیا ہے کہ اس موضوع پر ادیب کی چیزیں مل جاتی تھیں (جیسے نظم، غزل یا افسانے پر مضمون) برخلاف اس کے اس مضمون کو کیا ہے جس میں ہمارے لیے مواد کی ندوت اور موضوع کی اہمیت تھی۔ یعنی میں نے اس حصے کو مصنف کے جذبات سے زیادہ علمی اعتبار سے وقیع بنانے کی کوشش کی ہے۔ کہیں کہیں جیسے جیسے ہوا ہوں تو آگاہی کا ایسے مضمون بھی راہ لگائے ہیں۔ وہ نہ میری ہیئت نہ تھی۔

افسانوں اور نظموں کے سلسلے میں میں نے اس امر کی کوشش کی ہے کہ اس میں لکھنے والے کا اپنا اسٹائل ضرور ہو۔ میں نے ان چیزوں کو نہیں چننا، جن میں مصنف کا اپنا رنگ نہ تھا۔ ان چیزوں کو بھی نظر انداز کیا ہے۔ جو صرف زور بازو سے لکھی یا کئی ہوئی تھیں۔ میں نے خیال اور انداز بیان کے ساتھ افسانہ میں افسانویت، نظم میں نغزیت اور غزل میں غزلیت کو دوسری ”فلکا دانہ غمبھوں“ پر ترجیح دی ہے یعنی میں نے نہیں چاہا کہ ایک خالص رومانی افسانہ نگار کا افسانہ میز یا کسی پر آئے۔ اسی طرح میں نے شاعروں کی تخلیقات کے بارے میں سوچا ہے۔

نفقش کے خاص نبروں کا انتخاب اور بھی کٹھن تھا۔ اس لیے کہ اپنے اپنے موضوع پر ان میں بہت کچھ ہے۔ دفتروں کے دفتر، اب میں کمان ملک ابھی چیزوں سے اپنی نظریں چراتا۔ بہر حال خاص نبروں کی تھوڑی بہت جھلک اس انتخاب میں مل جائے گی۔ غزلی نبر اور افسانہ نبر کو میں نے اس میں اس لیے شامل نہیں کیا کہ وہ پہلے ہی انتخاب تھا۔ البتہ ان دونوں افسانہ نبروں میں سے انتخاب کیا ہے۔ جو نئے افسانوں پر مشتمل تھے) میں تو اس نبر میں ان چیزوں کو لایا ہوں جو غیر مطلوبہ تھیں اور پہلے پہل نفقش میں بھی تھیں۔

دیکھ لیجئے اس نبر کی ضخامت کتنی زیادہ ہو گئی ہے۔ میں ایک نثر (مضمون) سے زیادہ کا انتخاب نہیں چاہتا تھا (ابھی تین چار سو کتابت شدہ صفحات روک لیے ہیں) اس لیے میرے وہ دوست جن کی تخلیقات اس نبر میں نہیں آسکیں۔ وہ مجھے میری مجبوری کی بنا پر رخصت کر دیں۔ اس لیے کہ میں تو چاہتا تھا کہ اس انتخاب میں وہ سب کچھ آجائے جو نفقش میں چھپ چکا ہے۔ گمیری اس خواہش کی تکمیل ناممکن تھی۔

اس نبر میں صرف چار مضمون غیر مطلوبہ ہیں۔ تین ابتدائی مضمون جو نفقش کے بارے میں میرے مضمون اور دوستوں نے لکھے ہیں اسے ان کی محبت جاننے اور اس سے زیادہ کچھ نہ سوچتے۔ البتہ ایک مضمون میرا ہے اور مجھی پر ہے۔ اسے میں نے سب سے آخر میں ٹانگ دیا ہے (یہ وہی مضمون ہے جس کے بارے میں میں نے اب بار خود معرکہ اکا را مضمون کی پھبتی کسی تھی) اگر کوئی اس نبر میں فالتو اور فضول چیز ہے تو وہ میرا ہی مضمون ہے جس کے لیے میں آپ سے درگزر کی درخواست کروں گا۔

نقوش کے بارے میں میرے تاثرات

مولانا غلام رسول مہر

مجھے پیش نظر کاموں سے اتنی ذمہ دت نہیں ملتی کہ اطمینان سے ہر رسالہ بالاسٹیج پڑھ سکوں، بلکہ ابھی ہوتا ہے کہ مختلف رسالوں کے متفرق مضامین ذمہ دت کے اوقات میں جستہ جستہ دیکھ لیتا ہوں۔ ان میں ایک رسالہ ”نقوش“ بھی ہے جس کے خاص نمبر اکثر میرے لئے جہت دستغلاب کا موجب بنے رہے۔

مجھے معلوم نہیں کہ آردو رسالے میں خاص نمبروں کی ابتدا کب سے ہوئی اور کس رسالے کو اس میدان میں سبقت کا شرف حاصل ہے۔ خود میری نظر سے جو پڑانے والے گزرے، ان میں سب سے پہلے خاص نمبر ”عزن“ کا دیکھا، جو دسمبر ۱۹۷۷ء میں ایڈورڈ ہفمن کی تاج پوشی پر نکلا تھا اور اس کا نام ”دربار نمبر“ تھا۔ ”عزن“ کا سائز چھوٹا تھا اور اس خاص نمبر کی ضخامت ”عزن“ کے دو ماہر و فیروں کے برابر بھی نہ تھی۔ ہمارے مہذبین جو خاص نمبر لکھتے رہے، ان میں سے بھی اکثر دیکھے۔ تاہم اگر میں کہوں کہ ”نقوش“ نے خاص نمبروں میں بیگانگی کا ایسا معیار قائم کر دیا ہے، جس کی کوئی نظیر کم از کم آردو زبان کے رسالوں میں نہیں مل سکتی، تو غالباً اسے مبالغہ نہیں سمجھا جائیگا۔ میں نے کم از کم محض احتیاط کی رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے کہا، حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی زبان کے رسالے میں ایسے خاص نمبر کبھی نہیں دیکھے۔ ایک زمانے میں افسانہ نگار کا مشہور جملہ ”کا بل“ اس سے ملنے جلتے ”سالنامے“ کا لاکر تھا، لیکن یہ دوسری عالمی جنگ سے پیشتر کے دور کا ذکر ہے اور اس وقت جملہ ”کا بل“ کی زبان پشتو نہیں فارسی تھی۔

”نقوش“ کے خاص نمبر

”نقوش“ کے خاص نمبروں کی بیگانگی محض ضخامت کی خفامت یا ظاہری حسین و تزین نگ کی کبھی محدود نہ رہی۔ یعنی یہ نہ بھنا چاہیے کہ دوران زیادہ سے زیادہ مقدار میں فراہم کر دے گئے اور سرورق کو دل آویز نقش و نگار کے ذریعے سے ہر طور خاص جذب کشش افزا بنا دیا گیا۔ اس سلسلے میں جو امر خصوصی توجہ کا مستحق ہے، یہ ہے کہ خاص نمبر کے معمولی لوازم کو ہر لحاظ سے پورا کرنے میں زیادہ سے زیادہ اہتمام پیش نظر رہا۔ گویا خاص نمبر کا جو موضوع تجویز کر لیا، اس کے ہر پہلو کے متعلق جتنی معلومات ضروری سمجھی جاسکتی تھیں، وہ سب فراہم کر دیں اور جو بھی خاص نمبر نکالا اسے مجوزہ موضوع کے باب میں جامع الحقائق بنا دیا گیا اگر کوئی

صاحبِ ذوق کسی موضوع کے مختلف پہلوؤں پر کتنا بول کا بہت بڑا ذخیرہ بھی فراہم کر لے اور انھیں تفصیلاً دیکھ جاتے تو کیا جا سکتا کہ اس کے ذہن کا دامن اتنی معلومات شاہد ہی اٹھی کر سکے گا جو "نقوش" کے ایک خاص نمبر میں مل سکتی ہیں۔

عام مشہور یہ دیکھا گیا کہ جب خاص نمبر نکالا جاتا ہے تو اس کا ایک حصہ مخصوص مضامین کے لئے وقف کیا جاتا ہے، باقی اوراق میں دوسرے تعلق مضامین و مقالات چھاپے جاتے ہیں۔ خواہ یہ سب ہو کہ ایک ہی موضوع کے تمام مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل مضامین فراہم کر لینا سہل نہیں اور سعی و اہتمام کو آخری منزل پر پہنچانے کے لئے جس قدر صبر و دل سوزی درکار ہے، اس سے ہر ادارہ تحریر مسلسل کام نہیں لے سکتا، خواہ یہ سب ہو کہ تخصیص کے باوجود تنوع اور پلوتونی کو نظر انداز نہیں کیا جاتا اور خواجہ حالی مرحوم مغفور کا یہ اثر و متعلیٰ راہ رہتا ہے کہ :

ہر دم میں اہل سخن بھی ہیں، فاسق فانی بھی

معنوی محاسن

"نقوش" نے اس لحاظ سے بھی مشہور عام کی بیرونی کبھی نہ کی اور اپنے اختیار کردہ مسلک ہی پر قائم رہا۔ یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ "نقوش" کا ادارہ تحریر تنوع کی جاہزیت سے ناواقف ہے یا اسے علم نہیں کہ مضامین میں پلوتونی کی رعایت پیش نظر رہے تو مختلف اذواق اور مختلف درجہ علم کی نگاہوں کے دامن کھینچ آئیں گے۔ تاہنا نکالا۔ تاہم اس نے خاص نمبروں کو سمیت تحریر کردہ موضوع سے وابستہ رکھا، البتہ اس دائرے کے اندر رہتے ہوئے تنوع کے اہتمام میں کبھی کوتاہی نہ کی۔ مثلاً اگر کسی شخصیت کے متعلق تھا تو اس کے سوانح حیات ہی شامل کئے، ان خاص کارناموں کی تفصیل بھی بتائی، جن کی بدولت اس شخصیت نے ایک خاص نمبر کا استحقاق پیدا کیا۔ اس کی سیرت کے گونا گوں پہلو بھی اُبھارے۔ مختلف اصحاب علم و نظر کے تاثرات بھی فراہم کئے اور اس کی زیادہ سے زیادہ تحریرات و نگارشات کوئی یکجا کر دیا۔ گویا جو کچھ اس نمبر میں چھپا وہ برابر اصل شخصیت کے متعلق تھا۔ یہ اس ہمہ نام مضامین میں زیادہ سے زیادہ تنوع موجود تھا۔ دس ستر خانہ پر طرح طرح کے کھانے چڑھتے، ہر شخص جن کھانوں کو پسند کر دیتا اور اپنے ذوق کے مطابق پائے، اٹھالے۔ باغ میں رنگ رنگ کے پھولوں کی کیا دیاں سبحان جس کی خوشبو میں حد و رجب ولی آویز و عطر بیز خیل۔ جسے جس رنگ اور جس خوشبو کا پھول پسند ہو، اس سے اپنے باصرہ و مذاق کی تراضی فرماتے۔ مثال کے طور پر "پیرس نمبر" کو لے لیجئے، مجھے معلوم نہیں بخاری مرحوم کے سوانح حیات کبھی نہ زیب پائیں گے یا نہیں پائیں گے لیکن "نقوش" کے جامع نمبر نے یہ فرض کھایا، ادا کر دیا اور وہ سب کچھ فراہم ہو گیا جو مرحوم کی سیرت و سوانح، اخلاق و عادات، علم و فضل، خدمت ملک و ملت کے سلسلے میں ضروری اوراق قابل ذکر تھا، یہاں تک کہ ان کی بیشتر تحریریں اور تقریریں بھی شامل کر دیں۔

یگانگی کے مختلف پہلو

"نقوش" کے دوسرے خاص شماروں مثلاً "شخصیات نمبر"، "مکاتیب نمبر"، "افسانہ نمبر"، "مغز نمبر"، "مراج نمبر"، "مغز نمبر" وغیرہ پر تفصیل بحث کروں تو ایک ضخیم جلد تیار ہو جائے گا۔ بہر حال میں نے "نقوش" کے خاص نمبروں کو مختلف وجوہ

سے نیکانہ قرار دیا :

۱۔ اتنی خدمت کے خاص نمبر شاید ہی کسی دوسرے دسائے نے مسلسل شائع کیے ہوں۔ کم از کم میرے علم میں کوئی مثال نہیں۔

۲۔ معوی اعتبار سے جی ایس نمبر کہیں نہ دیکھے یعنی ہر مجوزہ موضوع کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کی گئیں۔ کوشش یہ رہی کہ اس موضوع کا کوئی بھی پہلو اصحاب ذوق کی نظروں سے اوجھل نہ رہ جائے۔ بے این ہمد تنوع و بطنی اور وسعت مشرب کے تقاضے ہمیشہ پیش نظر رکھے۔

۳۔ یہ خاص نمبر اس انداز میں مرتب نہیں ہوئے کہ وقتی طور پر ارباب ذوق کی دلچسپی کا سرو سامان بن سکیں بلکہ اپنے خاص عنوانوں کے متعلق گراں قدر معلومات کا یہ ایسا ذخیرہ ہیں، جسے کتب خانوں کا بچوڑ قرار دیا جاسکتا ہے۔

۴۔ ان کی اہمیت کا ایک ہیٹوفا لیا اب تک بڑی طرح ابھر نہیں سکا، اور وہ یہ ہے کہ ان نمبروں کی ایک مخصوص تاریخی حیثیت ہے۔ دس بیس سال گزر جانے کے بعد یہ موجودہ جمہور کے علم و فضل اور ذوق و مشرب کا نادر و جامع مرقع رہ جائیگا اور جنہیں سے ہمارے عہد کی بیسیوں خصوصیات کے متعلق زیادہ سے زیادہ روشنی مہیا کی جاسکے گی۔

۵۔ ”منٹو نمبر“ یا ”پطرس نمبر“ وغیرہ جیسے شماروں کو اس لحاظ سے بے حد پیش قیمت سمجھا جائے گا کہ بلند منزلت شخصیتوں کے متعلق معاصرین و احباب کے تاثرات کو کوئی بھی مرقع ان کے سوا باقی نہ ہوگا۔

۶۔ مکانیز نمبر، تفصیلات نمبر وغیرہ بھی اس لحاظ سے حد درجہ قابل قدر منظور ہوں گے کہ جو کچھ ان کے ذریعے سے یکجا ہو چکا ہے وہ دوسری جگہ ہرگز نہ مل سکے گا۔

دعا

آفریں انا اور عرض کردہ بنایا ہوا ہوں کہ یہ تحریر نہ تو ”دعا نمبر“ کا مقدمہ و تعارف ہے اور نہ اس میں ان مضامین و مقالات کی کیفیت پیش کی گئی ہے جو دس سال کے شماروں سے تعجب رکھے۔ یہ گراں قدر مجموعہ نیا دیکھا گیا ہے۔ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ ”فقہ ش“ کے خاص نمبروں کے باب میں اپنے تاثرات پیش کر دوں جنہوں نے نہیں کہ ادارہ ”فقہ ش“ یا اصحاب علم و فضل ان سے حرفِ نافرمانی متوقع ہوں۔ ان خاص نمبروں کی افادہ حیثیت کے مختلف پہلوؤں کا سامنے آجانا اس لئے بھی ضروری نظر آیا کہ اگر پہلے بلا ارادہ یہ خدمات انجام پائی نہ اب ان کے لئے بالا ارادہ اور بالہ ہنگام سرگرم کوششیں جاری رہنی چاہئیں۔

آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ادارہ ”فقہ ش“ کو بدرجہا زیادہ قابل قدر اور بہ اعتبار نتائج و اثرات وسیع تر خدمات کا سرچشمہ بنائے :

ابن کمال ازمن و از جملہ حبیبان امین باد

نقاش و نقوش

ڈاکٹر اختر اور بیوی

بیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو صبا رفتار و برق بر کنار زندگی کے نقوش رنگ رنگ زمانہ کی راہوں اور منزلوں میں بکھرے ہوئے پاتا ہوں۔ ماضی کو خواب و خیال کیسے کہہ دوں؟ ماضی سے بڑی حقیقت تو میرے لئے اور کئی نہیں بحال کا زہرِ غم ابھی رگ و پے میں اس طرح سرایت نہیں کر سکا کہ وہ جانِ حزن کا ایک حصہ بن جائے۔ زندگی کا اہم ترین حصہ جات ہے ماضی سے۔

کتنی پیاری ہنسٹیاں، کتنے چاہنے والے لوگ، کیسے ہنستے ہوئے چہرے، کتنے تاناک و اوقات، کیسی جاندار جھٹتیں، کتنی گرم مجلسیں، کیسی ادبی مجلسیں اور کتنے محبوب جہیدے میری حیاتِ مستعار کا جز بن چکے ہیں! ماضی کبھی نہیں مٹتا۔ حالِ ماضی کا پردہ وہ ہے، ماضی کے لوگ اسرار ہے۔ حیاتِ گذشتہ پنہاں ہونے کے باوجود کسی نہ کسی رنگ و آہنگ سے حالِ مستقبل کے لالہ و گل میں نمایاں ہوتی رہتی ہے۔

میرے دل میں اس وقت آرو و جہیدوں کی یادیں بیدار رہتی ہیں۔ اور ان یادوں کے ساتھ نہ جانے اور کتنی حسین اور پیاری یادیں وابستہ ہیں۔ ماضی سے دوری کا احساس دل میں ایسا گداز پیدا کر دیتا ہے کہ اُس کے پھول تو پھول کاٹنے بھی عزیز تر ہو جاتے ہیں۔

میرے شباب نے دامنِ نگار میں آنکھیں کھولیں اور پھر نیرنگ خیال نے اُسے پر کار بنایا۔ شباب جب اور سا ہوا تو بستی اور رومان کو ایمان و انگیزی سے دوستی اور ٹیکن و جوش کی رہبری کے لئے بڑھنے ہوئے دکھیا۔ حسن اور حسن کا روی کے عالم رنگ و لب میں میرے ذوق و شوق پل رہے تھے۔ ادب میرا مذہب تھا اور میں ادب لطیف کی فضا سے مغموم رہتا تھا۔ جہیدے کی طرح کہہ رہے ہیں۔ سب سے اہم ذریعہ رسالوں کی وہ ہے جو ایک منفرد شخصیت ایک مخصوص فضا اور ایک استوار رعایت رکھتی ہے۔ میں جہیدوں کو جیتے جاگتے انسانوں کی طرح بچانا اور ادب انھیں یاد رکھتا ہوں۔ پرچہ میرے مخصوص محبوب و دوستوں کی طرح ہوتے ہیں۔ میں دونوں کو بہت چاہتا ہوں۔ مگر اظہار و فاعاد میں ہی استوار نہیں ہوں۔

شخصیت میں مسلسل روایت کا پرتو فرم چکا ہے اور ارتقا کی تندرلیوں کا عکس بھی۔ آدمی اور جہیدے دونوں اس قانون کے دائرے میں آتے ہیں۔ آدمی فزیت ہوتے ہیں۔ پرچہ بھی مر جاتے ہیں۔ کتنے پرایسے لوگ اور کتنے اچھے پرچے فنا پا گئے۔ لیکن میرے دل کی دھڑکنوں میں وہ آواز بھی زندہ ہیں۔ دومانِ دلاہور، کتنا محبوب رسالہ تھا! کوئی میری روح میں جھانک کر اس کی بہادری کو دیکھے!

فلک کی نقیب کے بعد کوئی رسالے ہجرت کر گئے۔ اور میں ہجرتِ فانی میں اپنی تشنہ لہی کو دعا میں ملے رہا ہوں۔ دلی دھڑکی مگر کراچی بہت دور ہے، بہت دور! — اور لاہور؟ نہ پای پیر بار خدا یا بیس کا نام آجی؟

وہ منہ نکال دلاہور میرے لئے دلاہور کا حاکم ہے۔ دلاہور میرے لئے دلاہور ہے۔ دلاہور میرے لئے دلاہور ہے۔

ہے۔ میں ادبی دنیا سے دور و مجبور ہوں۔ نہ جانے نیرنگِ حمال و ادبی دنیا تو ہونگے یا زندہ ہیں۔
سناسے لاجو میں نئی بہاریں آئی ہیں۔ وہ سنہرے دلبران اور رنگ چمن بن گیا ہے۔ بچھڑ گئی وہ باسمن اور چند
نقوش جبین اس صحنِ خاتمہ ہند میں بھی آجاتے ہیں۔ اور کعبہ کے بتان دیر بے رنگ و جن کے کدے آج سے ہیں۔ اہلِ حرم
اور اہلِ صنم کدہ مینا بڑا آردو میں آکر ہم آغوش ہر جلتے ہیں۔

آردو جریبوں کی ادبی اہمیت تو ہے ہی۔ لیکن موجودہ حالات میں اُن کی جذبی، تہذیبی، سیاسی اور لسانی
جستجوب بھی کم اہم نہیں۔ آردو وہ مہم ہے جو تقسیم کے زخم کے اندمال کا باعث ہے۔ یہ ڈٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے والی
حلقہ ہے۔ آردو تو اسے محبت ہے۔ اس صفتِ ایشیا کا پریم ہی سنگا رہے۔ آردو پرپے سفر لئے آگفت ہیں۔
نی الحال میں گلستانِ آردو کے ایک نئی نویدہ کے متعلق اپنے تاثرات پیش کر رہا ہوں۔ یہ پھول تقسیم کے
بعد راوی کے کنارے کھلا۔ اس کے آیتام عجمیِ نویم کی صحبت میں مسرور گزرے۔ انھوں نے اپنے خونِ جگر سے اس کی بہاریں
کو برداشت چڑھایا اور اس کے نقوش آج ہمارے۔ دوسرا آردو آردو کا تو بڑا راز آیا۔ شباب کا لہڑا اور انقلاب کی سیاست
دور ہو چکی تھی۔ فضا آئی۔ شورشِ بگینی اور شعلگی نے چٹکی کی طرف قدم بڑھایا۔ نقوش بہار تباہ و رنج گئے، زیادہ سوز
گئے، زیادہ دل نہیں ہوئے اور زیادہ فکر انگیز۔ پھولی کھلتا رہا، ورکھتا رہا۔ یہ نکھار گلستان کے فیض سے بھی نکھار
ہمارے طفیل سے بھی۔ م

قیاس کی زگلستانِ من بہم رہا !

نیکل ہمارے قری ہے نقوش ہمارے نقاشی کی اور نقوش گلستان پر کارو یا بندہ ہو گئے۔ آردو کے گل کو
دمیدہ کے قیسرے دور کو اہلِ تاشہ ہمارے چٹکی و قری کھتے ہیں۔ نقوش ہمارے بچے، بایہ ہرے، ان کی شخصیتیں بھری
اور یہ گلستان میں نکمت ادری ہی گئے۔ نقاشی نے محض اپنی صلاحیتوں کے طفیل صرف اپنے جوشِ اظہار کے بل بوتے
پر نقوش ہمارے کو سنوارا، نکھارا اور تارِ رخ گلستان بنائی۔ نقوش چمن کے قیسرے دور کے نقاش نے دامانِ بہاراں
کو بہت وسیع بنا دیا۔ یہ عمارتِ وسیع و شمس ہے۔ اور آردو ادب کی تارِ رخ میں ایسے ایسے نقوش، بھرے جنہیں ہم نقوشِ مانی
و ہزار کہہ سکتے ہیں۔

قیسے دور کا نقاشِ ساحر ہے۔ یہ اپنے پیرایوں کی طرف گل و تر پھینکتا ہے مگر خانہ براندازِ جن نہیں
بلکہ خانہ سازِ بہار ہے۔ یہ ماضی کے رنگ و نکمت کو سمیٹ کر لاتا ہے اور میرا نے نقوش ہمارے کو حیاتِ تازہ عطا
کرتا ہے۔ یہ فزلی مرا بھی ہے اور داستانِ گرہی۔ اس نے شاہانِ بہاراں کا ایک صنم کدہ بھی تعمیر کیا ہے۔
وہ خادہ شگنی کی کرے جوئے شیر بھی لاتا ہے۔ اس نے ایک دیوارِ قہر بھی بنوائی ہے۔ وہ تصویرِ بتان اور حسینانِ
ادب کے خطوطِ جگ کرنا دہتا ہے۔ وہ بہرہ و بیا ہے۔ ویکھو گل ہائے نقیب کی ڈگری سر پہ رکے مالِ کعبہ میں بے چلا
آ رہا ہے۔

لے خوشا روزِ کہ آئی و بہ صد ناز آئی !

نقوش کے خاص نمبر

نثار احمد رفقی

آرہو میں اخبارات کو لکھتے ہوئے مدت تو ایک صدی سے بھی زیادہ ہی ہو گئی لیکن رسالوں کا رواج، آرہو میں ایسے رسالے جرائد مضامین، افسانے، نوائے نغمین اور غزلیں سجا کر نکلتے ہیں، ان کا آغاز بیسویں صدی کے ساتھ ہی ہوا ہے۔ آرہو میں علمی اور ادبی رسالوں کا جو معیار آج ہے وہ رفتہ رفتہ بنا ہے۔ ایک زمانے میں تہذیب الاخلاق، معارف، مصنف، عالمگیر، ہمالیہ، ادبی دنیا، صلائے عام، نیرنگ خیال، الناظر، نگار اور ساقی ایسے ادبی رسالے تھے کہ ان میں کسی مضمون کا شائع ہونا ہی ادیب کے ذی شعور اور پختہ کار ہونے کی علامت تھی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ان رسالوں نے اس صدی کے بہت سے لکھنے والوں کو بنایا ہے اور شناس کر لیا ہے یا ان کا اکتشاف کیا ہے۔

لیکن بہار دی زبان میں بہت سی باتوں کے ساتھ ایک بدیہی یہ بھی ہے کہ اس کے لکھنے والے جہاں دی فکر سے محروم ہیں اور دیکھ کر فقیر بننے میں ماہرانہ دسترس رکھتے ہیں چنانچہ اسی کی بدولت اب وہ دوش جو کبھی بعض رسالوں کا طرہٴ افتخار تھی اتنی عامیانہ ہو چکی ہے کہ عام قاری اس سے متاثر نہیں ہوتا۔ یورپ اور امریکہ میں جو قلم ایک باضابطہ فن کی حیثیت اختیار کر چکا ہے، وہاں باقاعدہ صحافت کی تعلیم اور تربیت دی جاتی ہے اس میں نئی نئی راہیں پیدا کی جاتی ہیں۔ اخبار رسالے، میگزین اور صحافت ترتیب دینے کے سلسلے میں غور و فکر کے بعد کتا بھی لکھی جاتی ہیں لیکن آرہو میں ایسا کوئی فن یا کھلا کتاب موجود نہیں نطفہ یہ کہ رسالہ کو ایڈٹ کرنا سب سے زیادہ آسان کام سمجھا جاتا ہے، دو چار مقالے، چار سات افسانے، اس پندرہ نغمین غزلیں اور خطوط۔۔۔۔۔۔ یہ سب جمع ہوئے تو ایک رسالہ سمجھ لیا، چنانچہ ہمارے ملک میں یہ ایک روایت بن چکی ہے کہ شاعر، ایڈیٹر اور مولوی "خدا ساز" ہوتا ہے اسے سخت اور مطالعے کی ضرورت نہیں، وہ یہ سمجھتا ہے کہ اگلے وقت کے لوگ سب کچھ کہہ گئے ہوں اور علم و ادب کا کوئی گوشہ نامہ موجود نہیں ہے اب کسی جہتا یا تجدید کی کیا ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسالے اتنی کثرت سے نکلتے ہیں کہ ان میں انفرادیت یا نمایاں فرق بالکل نہیں ہوتا۔ سوال یہ ہے کہ ایک خواندہ جسے ادب سے لگاؤ ہے وہ "غلطی" رسالہ کیوں خریدے اور غلطی کیوں نہ خریدے؟ یعنی کوئی توجہ اعتبار اور ترجیح دینا ہی چاہیے۔ مگر آپ آرہو کے دو چار رسالوں کا تقابلی مطالعہ کر دیکھئے کوئی حالت تخلیق یا اجتہادی نہیں ملے گی۔ ادب کے نام پر وہ کچھ پیش کرتے ہیں وہ ادب کی پھر وڈی معلوم تو رہتا ہے۔

اب پڑھئے، الہ کا مذاق بھی بدل چکا ہے۔ اگر کسی کام میں جی جان سے محنت کی جائے تو اس میں کامیابی بھی یقینی ہے اور اس کا کامیاب ہونا بھی مسلم ہے۔ الملک کی مثال دیکھئے مولانا آزاد نے اسے ایسی شان سے نکالا تھا کہ نصف صدی کا عرصہ گزرجانے پہلے کوئی اخبار اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکا۔ مولانا کبھی دوسرے درجے کی چیز پر راضی نہ ہوئے، خیار بھی نکالا تو پہلے پرسی لگا یا وہ بھی ٹاٹب کا، جو اس وقت اگرچہ مقبول نہیں تھا لیکن اسے سائنٹفک ہونے کی وجہ سے گوارا کیا۔ معیار کے اعتبار سے انگریزی اور عربی کے بہترین محققین اخباروں کو نمونہ بنایا ان کی بھی اندھی تقلید نہیں کی بلکہ ’خدا صفا دے ماکہ رے‘ کے اصول پر عمل کیا۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ آج اردو کے اخبارات الملک کی مقبولیت اور انفرادیت پر رشک کرتے ہیں۔

علمی رسالوں میں معارف، زبان اور نگار آج بھی اپنی اپنی وضع پر نکل رہے ہیں اور انھوں نے سینٹیوں ہزاروں کی تعداد میں اعلیٰ درجے کے علمی مضامین و مقالات سے اردو کو سرمایہ وار کر دیا ہے۔ اردو میں غالباً ’نیرنگ خیال‘ نے خاص نمبروں اور سالناموں کی رقم کو آگے بڑھایا اور اب تیز رقم سے زیادہ ’وبا‘ ہو گئی ہے۔ بہت سے رسالے تو خاص نمبر لے کر بچے بیٹھے جاتے ہیں، مگر کچھ رسالے باز نہیں آتے۔ ان میں عام شاعری سے صحت مضامین زیادہ ہوتی ہے اور کچھ نہیں۔ گویا اس اچھی بھلی روش کو بھی اتنا دوسودہ اور غیر دلکش بنا دیا کہ اب کسی رسالے کے خاص نمبر کی کوئی اہمیت یا غیر معمولی حیثیت باقی نہیں رہ گئی ہے۔

’فقوش‘ اردو کا اعلیٰ ترین ادبی مجلہ ہے۔ اردو کے معنوی علمی اور ادبی رسالوں میں اس کا نام سب سے پہلے لیا جاتا ہے۔ یہ ۱۹۲۸ء سے نکلتا شروع ہوا اور اب تک جب کہ یہ اپنی زندگی کے بارہ برس طے کر چکا ہے اس نے بہت سے قابلِ قدر اور عظیم نشان نمبر پیش کئے ہیں۔ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۷ء تک دس سال کی مدت میں ’فقوش‘ نے جو کچھ پیش کیا ہے اس کا مکمل جائزہ اس کے دس سالہ نمبر میں شائع ہو چکا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ۷۱۵ مضامین، ۴۹۰ اشعار، ۲۱۳ خطوط، ۱۲ ڈرامے، ۶ ناول، ۶۱ مہم نظمیں، ۳۳۷ غزلیں چھاپی ہیں جن کے صفحات کی مجموعی تعداد ۲۷۷۷ صفحات ہوتی ہے۔ اس کے بعد طنز و مزاح نمبر، لطیف نمبر، خاص نمبر اور دو عام شمارے بھی چھپ چکے ہیں ان کے صفحات اور شمولات بھی شمار میں لائیے تو یہ تعداد کہیں زیادہ بڑھ جائے گی۔

محنت میں برکت ہوتی ہے۔

محمد طفیل نے اپنے زمانہ ادارت میں ’فقوش‘ کو زندہ جاری کر دیا ہے اور ان کی محنت نے انہیں بھی امر بنا دیا ہے جس طرح نگار کے ساتھ نیاز فتح پوری کا نام، انجنی ترقی اردو کے ساتھ مولوی عبدالحی کا نام یا عدلانے عام کے ساتھ میرزا ناصر علی کا نام ہمیشہ کے لئے دالستہ ہو گیا ہے اسی طرح اب ’فقوش‘ اور محمد طفیل بھی ایک ہی چیز کے دو نام ہیں یہ ان سے زندہ ہے وہ اس سے ————— عام طور پر یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ خاص نمبروں کے میدان میں ’فقوش‘ کا کوئی حریف ہندوستان یا پاکستان میں موجود نہیں۔

’فقوش‘ نے اب تک مجموعی طور پر اکیس نمبر شائع کئے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے۔

۱۷) آزادوی نمبر	۱۶) امن نمبر	۳) آزادی نمبر	۴) خاص نمبر
۵) سالنامہ	۶) ناولٹ نمبر	۷) افسانہ نمبر ۱	۸) پچ سالہ نمبر
۹) افسانہ نمبر ۲	۱۰) غزلی نمبر	۱۱) شخصیات نمبر ۱	۱۲) مفتوحہ نمبر
۱۳) افسانہ نمبر ۳	۱۴) شخصیات نمبر ۲	۱۵) سالنامہ	۱۶) مکاتیب نمبر ۱
۱۷) مکاتیب نمبر ۲	۱۸) وہ سال نمبر	۱۹) طنز و مزاح نمبر	۲۰) پطرس نمبر
۲۱) خاص نمبر			

ان خاص اشاعتوں کے صفحات کی مجموعی تعداد کئی ہزار ہوتی ہے اور ان کی افادیت دو گونہ ہے یعنی ان میں کچھ اشاعتیں تو بعض موضوعات سے متعلق ہیں مثلاً افسانہ نمبر، غزلی نمبر، شخصیات نمبر، طنز و مزاح نمبر۔ کچھ عمومی افادیت کی حامل ہیں مثلاً سالنامہ، خاص نمبر، پچ سالہ نمبر، وہ سال نمبر وغیرہ۔ اور دو اشاعتیں ایک ہی موضوع سے متعلق ہیں: مفتوحہ اور پطرس نمبر۔ ان نمبروں کا سرسری جائزہ لینے کے لئے بھی کئی ہزار صفحات کو پڑھنا اور ان کے محاسن یا معائب سے بحث کرنا آسان نہیں، ان پر آجپٹنا جو تبصرہ کرنے کے لئے بھی ایک پورا دفتر درکار ہے۔ میں یہاں ان خاص اشاعتوں کے تعارف کی رسم ادا کرتا ہوں، مطالعات کے حوالے ایجاز و اختصار کی بناہ گاہ سے قصداً باہر نہیں نکلا ہوں۔ پھر بھی ہزاروں صفحات کو پڑھنے اور ان کے بارے میں غور و فکر کرنے میں اچھا خاصا وقت صرف ہوتا ہے۔

تقریر نے سب سے پہلے اپنا چوتھا شمارہ آزادی نمبر کی شکل میں پیش کیا تھا جو اس وقت پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا گیا۔ اور سناؤں شمارہ "مکتبہ امن نمبر" نکلا جسے باجوہ سرور اور احمد ندیم شامی نے ترتیب دیا تھا۔ اس میں تمام چیزیں امن کے موضوع پر شامل تھیں۔ ان دنوں امن کانٹیس کا سالانہ اجلاس بھی ہوا تھا وہ ہنگامی طور پر یہ موضوع اچھا خاصا "چلتا چڑا" تھا۔ اس وقت تقریر ترقی پسند تحریک کا ترجمان تھا اور محافی سیاست کا قیاب ہی کر رہ گیا تھا۔ مجھے کسی تحریک یا ازم، یا سیاسی عقیدے سے انکار نہیں لیکن ادب کو کسی ایک نظریہ کا پابند کرنا بھی سودمند نہیں سمجھتا۔ اچھا اور بڑا ادب مختلف شمارہ جو ہے آزادی ہوتا ہے اسے وقتی جذبات میں اسیر نہیں کیا جاسکتا۔ اس نمبر میں محنتی تخلیقات شامل ہیں وہ سب ادب سے زیادہ سیاست کی مانند تھیں۔ انہیں کسی اخبار کے اداریہ کالم میں جگہ دی جاتی تو اچھا ہوتا۔ اس اعتبار سے تحریک نے ہمارے ادب کو بہت نقصان پہنچایا۔ سیاست کو ممکن ہے کچھ فائدہ پہنچ گیا جو۔ اس نمبر کی منظومات میں سے ایک نمونہ آپ بھی دیکھتے چلیں:

”چین، برما، ملائیا، میں اک عہد تو آج انگریزیاں لے رہے ہیں۔“

ایشیا اپنی کمندہ عکاز بند یوں کو۔۔۔

بحر کابل کے گہرے سید پانیوں میں دھکیے چلا جا رہا ہے

آج جا بان میں انقلابی جزم لے رہے ہیں

کو رہا بھی طلسم زد و بیم کو توڑنے کے لئے مضطرب ہے۔۔۔

ہند میں ایک طوفان مٹا ہوا ہے
ہندو کشن کی بلندی پر یہ رونا بک اُگ کی جھلکیاں مٹے رہے ہیں ۔۔۔

خدا را بابتے کہ بیظم ہے یا نہ مصورینِ سعاد کی داستانِ نظم کے اس ہند میں اور کسی اخبار کے نمبر اکرم اداسیہ میں آپ کی فرق و امتیاز کریں گے، کیا اسی روش پر ادب کی تخلیق ہوتی رہتی تو ”بڑا ادب“ پیدا ہو جاتا۔ اور کیا ہیں باقی اتنے ہی بلکہ اس سے زیادہ جوش و خروش اور طغیانی کے ساتھ نثر میں نہیں لکھی جاسکتیں ۱۹ بی باؤں پر غور کیجئے تو فیصلہ آپ خود ہی کریں گے۔۔۔ وہ زمانہ، فرافری کا تھا۔ پر، یگنڈے کا زور شور تھا۔ اب جذبات میں وہ ابالی نہیں ہے اب تو یہ سب باہنیں آسانی سے سرچی جاسکتی ہیں مثلاً ”نقدیں“ بہت جلد سیاست کے پکڑے نکل گیا اور اب وہ بھڑکی لیل کے شائع ہوئے، ہر کتب خیال کی نمائندگی کر رہے، ہندوستان اور پاکستان میں آدھ کے بہترین لکھنے والوں کی بہترین تحریریں پیش کر رہے۔ اور کسی سیاسی مسلک کا نمائندہ نہ ہونے کی وجہ سے تمام حلقوں میں یکساں طور پر مقبول و معروف ہے۔

اس کے بعد پچھلے نمبر کا آٹھواں شمارہ، آزادی نمبر تھا۔ اس میں اچھے لکھنے والوں کی اچھی چیزیں سلیقے سے جمع کی گئی تھیں۔ جلالیسا کیوں نہ جوتا۔ احمد نیر غامی اور باجرہ سرور جیسے قابل اور سوجھ بوجھ والے مدیر تھے۔ وہ ذوقی کرتا ہی نہیں جس کی زد میں یہ لوگ آگئے تھے۔ ورنہ یہ بات نہیں کہ اعلیٰ ادبی تحریروں اور سیاسی تحریروں میں بغیر نہ تھی۔ کیا رصواں اور ربا رصواں شمارہ خاص نمبر کی شکل میں نمودار ہوا۔ یہی ۹۲۹ نمبر کی بات ہے۔ اس وقت سید ذوالعظیم اس کے مدیر تھے جو دو کے اچھے لکھنے والے، مبصر، صحافی اور دانشور، پرواز ہیں۔ ان دنوں یہ رسالہ ایک آزمائش سے گزر رہا تھا یعنی حکومت پاکستان نے جولائی ۱۹۳۸ء میں اس پر پابندی لگا دی تھی جو فوری ۱۹۳۹ء تک رہی اس کے بعد پچھلے زمانہ ناسازگار حالات ہے جن کی وجہ سے سالہ وقت پرستان نہ ہو سکا۔ مگر دیوارِ زمانہ شکر کے حوصلے بلند تھے۔ انہوں نے بڑی آبی بان سے یہ خاص نمبر پیش کیا۔ قدیم اور جدید لکھنے والوں کی بہترین نمائندہ تحریریں اس میں موجود تھیں جن میں میرزا صری مرحوم (رسالے عالم، کابائیں، انشائیہ ”خط و مکہ لے دل“ خلسے کی چیز تھا۔ اس کے علاوہ عبدالرحمن جغتائی، مولانا صالح الدین احمد، نیاز فقیدی، ممتاز شیریں وغیرہ کے مضامین موضوع کے اعتبار سے وقیع اور انداز کے لحاظ سے رفیع تھے لیکن سب سے زیادہ محنت اور وسیع زہری کے ساتھ قدیم نظر نے اندر سمجھا کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ کیا تھا۔

سید ذوالعظیم کے زمانہ ادارت میں دو نمبر اور بھی نکلے ایک سالانہ شمارہ ۱۵-۱۶ دوسرا ناوٹ نمبر شمارہ ۱۵-۱۸ یہ دونوں بہت ہی مقبول ہونے خصوصاً ناوٹ نمبر، کیونکہ فقیر ہند کے بعد پہلی بار نانا اچھا ناوٹ نمبر نکالا گیا تھا۔ شمارہ ۱۹-۲۰ سے محمد طفیل کی ادارت کا آغاز ہوا۔ اور سب سے پہلے اپنے ”سجدہ و عدالت ہند“ میں انھوں نے اُردو لکھنے کے ساتھ انصاف کیا۔ یہ افسانہ نمبر شمارہ ۲۵-۲۶ موضوع کی نمائندگی کرتا تھا۔ قیسویں ٹائٹل پر نقدیں کی عمر ۵ سال پہنچی تھی اس کی سالگرہ منائی گئی اور پانچ سالہ نمبر شمارہ ۲۹-۳۰ شائع کیا گیا۔

’پنج سالہ نمبر کے بعد پچھلے افسانہ نمبر شمارہ ۳۷-۳۸ پیش کیا گیا۔ یہ بھی پچھلے خاص نمبروں کی طرح امتیازی علامت رکھتا تھا۔

لیکن نقوش کی کامیابی اور خاص نمبروں کے میدان میں بیکہ تازی کا آغاز غزل نمبر شمارہ ۴۲-۴۱ سے ہونے لگا۔
 ترقی پسند تحریک کے زمانہ عروج میں غزل کی مخالفت بھی بڑے ہی جوش و خروش سے ہوتی تھی۔ لیکن اس کا شہتہ جاری تہذیب
 اور ثقافت سے ہزاروں برس پرانا ہے۔ یہ رشتہ ایسا ’ذوق سکست‘ نہیں کہ بیکہ پیش اسے ختم کر دیا جائے۔ پروفیسر شید احمد
 مدظلہ نے ایک جگہ لکھا ہے ’غزل غنی بزم نام ہے اتنی ہی مجھے عزت ہے۔ شاعری کا نام آتے ہی میرا ذہن غزل کی طرف مائل ہوتا
 ہے۔ غزل کو میرے ذہن میں اپنی شاعری کی تکرار دیکھتا ہوں۔ ہماری تہذیب غزل میں اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلے ہے ورنہ
 کو محنت و زحمت کا ایک دوسرے سے حاصل ہوئی ہے اس پر نہ ہنسنا چاہیے نہ رونہ۔ اس کا احترام کرنا چاہیے۔ چنانچہ یہ غزل کی
 قوت ہی ہے جو اب تک وہ نہ صرف بیکہ مقبول رہی بلکہ کسی مخالفت و اڑکا ہلکا سا اثر بھی اس نے قبول نہیں کیا۔ جنہوں نے
 غزل کی مخالفت کی، ۱۰۱۱ء میں شاعری کو کھینچنا ہی غزل کا کچھ نہ لگاؤ کے۔ نقوش نے غزل نمبر پیش کر کے اس کی مقبولیت پر
 مہر تصدیق ثبت کر دی۔ سارے چھ سو صفحات میں بہترین غزلیات کا یہ انتخاب اتنی محنت اور سلیقے سے کیا گیا ہے کہ ہر دور
 کے نامزد شاعر اور ان شاعروں کا نامزدہ کلام اس میں لگایا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ موضوع اور معیار کے اعتبار سے
 تیز وں اور خیالات کے لحاظ سے غزل کا عہد بہ عہد ارتقا کس طرح ہوا ہے۔ یہ غزل نمبر اتنا مقبول ہوا کہ اب تک اس کے تین
 ایڈیشن فروخت ہو چکے ہیں اور چوتھا زیر طبع ہے۔ میں یہ تجویز کرنا چاہتا تھا کہ بعض شعر اخصروں، اساتذہ، منتقدین و مترسٹین
 کے کلام کا اچھا اور نامزدہ انتخاب نہیں ہو سکا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان کے دواوین یا تو چھپے نہیں یا عام طور سے دستیاب
 نہیں ہونے، مثلاً قائم چاند پوری، مہتمی، بکیر، بیان وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ ان کے کلام کا انتخاب مختلف تذکرہ نگاروں اور بیاضوں
 سے کیا گیا ہوگا۔ اگر ایسے شاعروں کے دواوین سے براہ راست انتخاب کیا جاتا تو وہ اور زیادہ اچھا ہو سکتا تھا۔
 ”نقوش کا شمارہ ۴۴-۴۵ء ایک ایسا محکم بالنتان کا رہا کہ نہ صرف اردو زبان میں پہلی بار کسی رسالے نے انجام دیا۔
 پہلی کوشش عموماً ناقص اور خامیوں سے پرہیز کرتی ہے لیکن یہ اس کے برعکس بڑی ہی جامع، منفرد، ادیبانہ و غریب فہمی جس نے
 اچانک اردو دواوین کو اپنی طرف متوجہ کر لیا میری مراد شخصیات نمبر سے ہے۔ اس نمبر کے دو حصے ہیں۔ دوسرا حصہ (شمارہ ۵۹-۶۰)
 منظر نمبر اور افسانہ نمبر کے بعد چھپا تھا۔ شخصیات نمبر کے بارے میں اپنی رائے کسی حد تک ظاہر کر چکا ہوں (نقوش، شمارہ ۴۲، ۴۳، ۴۴)
 یہاں ان کے تعارف کے طور پر کچھ عرض کرتا ہوں۔

پہلا حصہ (شمارہ ۴۴-۴۵ء) چھ سو سات (۶۰۸) صفحوں کو محیط ہے اور اس میں کل چھ چھپائی تھی شخصیتوں پر نکلے
 اور مضامین شامل ہیں۔ جن پر خاکے ہیں ان کے چند نام یہ ہیں: محمد حسین آزاد، مشعل، مرزا سرتا، میرزا نصر علی، مرزا رفعت الدین،
 حسرت مرثانی، ڈاکٹر عبدالحی، ابو الکلام، رشید احمد صدیقی، آثر کھنوی، جگر مراد آبادی، چودھری محمد علی وغیرہ۔ ان پر
 کھنڈے والے بھی اتنے ہی بڑے بڑے لوگ ہیں۔ ایک حصہ اس میں اور بھی ہے جس میں لاہور کی چند ادبی شخصیتیں، اس طرح دلی،
 کھنڈے اور حیدر آباد کی شخصیات کا مختصر اور جامع تذکرہ دیا گیا ہے۔ یہ براہ اعتبار سے دلچسپ اور ان میں بعض نئی باتیں بھی
 معلوم ہوتی ہیں۔

دوسرا حصہ (شمارہ ۵۹-۶۰ء) آٹھ سو سات (۸۰۷) صفحوں کا ہے۔ اس میں بھی ۸۸ مضامین ہیں۔ ان شخصیات میں

میں یہ بھی بہت سے مفید مضامین کے ساتھ بیکہ زندگی ستارہ کو شاف کر گیا ہے۔

بڑے لوگ، ادیب، سیاست دان، سماجی رہنما، شاعر، طنز نگار، صحافی، لیڈر سبھی آگے ہیں۔ ان پر لکھنے والے بھی بیشتر وہ ہیں جن کو سے بہت فریب رہے ہیں۔ یا ہم عصر ہیں۔ اس نمبر کی قدر و قیمت آج بھی بہت ہے مگر سو سو برس کے بعد تو ایک عجیب گراں بہا ماحذ کا کام دے گا۔ اگر بالفرض اس نمبر میں کوئی کام کی بات نہ ہوتی تب بھی سارے سولہ سو عصفوں کا، بیگانہ دنیا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ بڑے دن گروے کا کام ہے۔

یہ نمبر بے حد مقبول ہوا، اس نے نقوش کو زندہ جاوید کر دیا اور اس کے مرتب محمد طفیل کو بھی۔

نقوش کا شمار ۴۹-۵۰ء کے مکتو کے لئے وقف تھا۔ شمس الدین اردو کا بڑا بڑا فن افسانہ نگار تھا۔ ہمارے مردہ پرست ملک نے اپنی روایت کے مطابق جیسے بھی اس کی قدر نہیں کی۔ لیکن اب اس کا نظم ہمیشہ کے لئے رنگ گیا ہے تو دوسروں کے نظم اس پر چیلنے شروع ہوئے ہیں۔ مکتو کے انتقال کے بعد بہت سے رسالوں نے "مکتو غیر" لکھے لیکن یہاں بھی، انفرادیت نقوش ہی کی بانی رہی۔ اس میں مکتو کی میں غیر مکتو نہ لکھایاں چھپائی گئیں جو ایک ایسے فن کے نقص سے لکھی گئی تھیں اور مطبوعہ لکھنؤ میں سے بہترین و سلا انتخاب۔ پھر مکتو کے فن پر سات تصانیف جن کے لکھنے والے فرقۃ العین حیدر، وفادار عظیم، حسن عسکری اور ممتاز حسین جیسے سنجیدہ اور دیدہ و حضرات ہیں۔ جو سچے سچے میں مکتو کی شخصیت پر بہت ہی دلچسپ تصانیف ہیں جو صحت چھپائی، اوپنڈرنا محمد اشک، احمد ندیم قاسمی، ماجدہ مسرور، ابرار سعید قریشی، حیدر جلال، غلام عباس اور محمد طفیل نے لکھے ہیں۔ ان سے مکتو کی شخصیت کے بہت سے نقوش ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ مکتو کے فن پر اب دیر چھ بھی شروع ہو چکی ہے چنانچہ ماسکومیں اب روسی خاتون جو اردو کی طالبہ ہیں، مکتو کے فن پر تحقیقی مقالہ لکھ رہی ہیں۔ وہ اس سلسلے میں مدد ستان بھی آتی تھیں۔ آئندہ میں ہمارے ناقد اور محقق مکتو کی شخصیت اور فن پر نو بہرہ کریں گے۔ اس وقت ان سب کے لئے مکتو نمبر بہترین اور سزاوارتہ ماحذ ہو گا۔

۱۹۵۵ء میں نقوش نے ایک شاندار افسانہ نمبر پیش کیا۔ شمارہ ۵۳-۵۴ء۔ یہ ایک ہزار چوبیس صفحوں کا ایک ضخیم اور سبب سائیکلو پیڈیا ہے جس میں ۱۹۵۵ء تک ڈیڑھ سو سال کے افسانوی ادب کا انتخاب آبلے۔ ان ڈیڑھ سو برسوں میں اردو افسانہ نگاروں سے کہاں پہنچ گیا اس کا اندازہ یہ انتخاب دیکھ کر ہی ہو جاتا ہے اور ادا دے میں محمد طفیل نے بہت ہی لطیف استعارے میں یوں بیان کر دیا ہے :

"کھاتے چمٹے کھڑے ہیں ایک بچہ پیدا ہوا کہ جسے حد و بین، موٹا تازہ، اور ساتھ ہی بڑا باقوی تھا۔ وہ اپنی تو قلی زبان میں جب باتیں کرنے پر آمادہ ہو جاتا تو چپ ہو کر نام ہی نہ لیتا تھا۔ اس کی وہ تمام اکھڑی اکھڑی اور سلسلہ و سلسلہ باتیں آج بھی سب کو یاد آتی ہیں۔

مگر ٹہنچا ہی یہ کہ شروع ہی سے اس بچے کو اپنی ماں کا دودھ نصیب نہ ہوا۔ جب یہ بچہ کچھ بڑا ہوا اور اس کا مشغول بھی کچھ کچھ بچہ ہونے لگا تو اسے اپنے قوتوں اور اپنی صاف ترستی سے بے حد آنکشت "بیدا ہوئی شاید یہی وجہ تھی کہ اس نے قدر کے سببوں کے اپنے مسائل کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ اب اس کی باتوں میں وہ پہلی

یادہ گئی نہ رہی، قدرے اختصار کے ساتھ ایک خطرناک تھا، ایک تسلسل تھا اور ایک نقطہ نظر تھا، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ مطمئن نہ تھا۔

اسی بے منزلی میں اس نے اپنے ملک سے دور مغرب کے بچوں سے بار بار گفتگو کی کہ وہ اس سے زندگی میں کئی قدم آگے تھے۔ وہاں میٹھے ہی میٹھے اس نے انھیں اپنا مذہبی امام تصور کر لیا اور اس کی باتوں کو اپنے الفاظ میں دہرا کر بہت کچھ لکھا۔ مغربی بچوں کی دیکھا دیکھی جب اس نے اسی انداز میں وہاں زندہ رہنا چاہا تو اپنی چال بھی بھول گیا۔ نہ انی بچوں والی کوڑا بات پیدا ہو سکی اور نہ اپنی ہی افلاوت باقی رہی۔ یہی وجہ ہوئی کہ وہ کچھ افسانہ جانتا تھا کہ نہ سکا۔ کچھ لکھنا سا گیا بعضوں کو اس کی بھی ہر کھلا ہٹ بڑی عیب ہے۔

تقدیب کی یہ کیفیت اس پر زیادہ عرصہ جاری نہ رہی۔ وہ نیچے جن سے دوست زیادہ مرعوب تھا اور جن سے واقعی اس سے بہت کچھ سیکھا تھا ان سے بھی اسے انھیں چار کرنے کی ہمت پیدا ہوئی۔ اور اس کا یہ نمونہ کچھ زیادہ غلط بھی نہ تھا۔ آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ وہ کچھ جو بعد کو بالکل ہو کر جوان بھی ہوا، آج مثلاً چڑا زندگی کے دن گزار رہا ہے =

(دھڑلے افسانہ نمبر)

یہ کہانی اردو افسانے کی قسمی “

انے نگہ سے پرے ہیں، اتنے مختصر لفظوں میں، ایسے دل نشیں انداز سے، اردو افسانے کے متعلق اتنی بہت سی باتیں کہہ کر اردو افسانے کی ابتدا اتنی عروج اور موجودہ “تغیر” کا ایسا سماں بنا دیا ہے کہ شاید ہی اس پر کچھ اضافہ کیا جاسکے۔ اسی لئے باوجود اقتباس کی لطوات کے یہاں میں نے تمام وہی لفظیں کر دیا۔

اس میں شخصیت سے آخری فقرہ بہت ہی عجیبنا ہوا ہے۔ کیا واقعی ہمارا افسانہ رویہ وال ہے؟ یہ ایک بڑا سوالیہ نشان ہے جو مسلسل غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ ادب میں زوال کا فرقہ دکانا تو کچھ مشکل نہیں لیکن اس کے سبب و علل پر غور کرنا اور اس کا صحیح حل پیش کرنا بہت مشکل ہے۔

ہمارے افسانے میں بالخصوص اردو ادب میں بالعموم اگر زوال آیا ہے تو یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ باغیہا موضوع ہے یا لحاظوں۔ یعنی بات ڈھنگ کی نہیں کی جا رہی ہے یا ڈھنگ سے کی نہیں جا رہی ہے۔ اس موضوع پر بعد میں ہم طیفیل نے ایک مہموزیم بھی کیا تھا، فقوش خاص نمبر ۱۹۵۴م جس میں ملک کے بہت کچھ والوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور ان خیالات پر ہم اپنا اظہار کسی دوسری جگہ کریں گے۔

بہرحال افسانہ نمبر میں سے پہلے تو اردو کی پہلی کہانی “دانی کیسی اور کنور اودے بھان کی” “منہر انشا اللہ خدا انشاء شامل ہے۔ یہ انشاء کا ایک ہم تحریر تھا جس سے نہ صرف اردو افسانے کا آغاز ہوتا ہے بلکہ ہندی والے بھی اسے

آدی کال کے ہندی کتا سانبہ میں پہلی جگہ دیتے ہیں۔
اس کے بعد طول مختصر داستانوں کا دور آئے جس میں طوطا کمانی، آرائش محفل، بانج وہار، تیبال پھپی، نگہ نشہ

انشائے نورق، فساد عجاب اور الف لیلہ شامل ہیں۔ پھر ناولوں کا دور ہے۔ یہاں نام ڈیٹی نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار، شرر، رسوا، اور راشد الغیری کے نظر آتے ہیں۔ ایک دور ہمارے ادب میں تراجم کا بھی گزرا ہے اور اس کے بہت سے دور رس فائدے ہوئے ہیں۔ یعنی اردو افسانے کو کچھ نئے تجربے ملے پھر ان میں دریافت ہوئیں، طرزِ ادب میں تنوع اور سادگی پیدا ہوئی، موضوعات میں بھی اسی اعتبار سے وسعت آئی۔ ظفر علی خاں، عنایت اللہ دہلوی، عبدالرزاق طبع آبادی، خواجہ منظور حسین، صادق خاں، تیرتھ رام فیروز پوری اور اسی صنف کے خوش فرائض تراجم کے دور کی نمائندگی، اس فہر میں کر رہے ہیں لیکن یہ دور بینیم نہیں ہوا، اب تک جاری ہے۔ اور بعض ادیبوں نے جن میں شاہد احمد دہلوی کا نام سرفہرست ہے، غیر زبانوں کے بہتر تراجم پیش کئے ہیں۔ اس فہرست میں سجاد حیدر، ملہم، نیاز فتح پوری، ل. احمد اکبر آبادی اور حسن عسکری کے نام بھی شامل ہونا ضروری تھے۔

”افسانوی مضامین“ کا دور خراج حسن نظامی سے شروع کیا گیا ہے۔ اس میں ناصر نذیر زرقانی، آغا حید جبین، چرخ حسرت، اور انشرف صبر علی شامل ہیں۔ پھر اردو افسانے کے پانچ دور کر دیتے ہیں۔ ان میں اتنی افسانہ نگاروں کے نمائندہ افسانے انتخاب کئے گئے ہیں۔

آخر میں مقالات کا حصہ ہے اور اس میں چار مقالے ہیں۔ ایک مذاکرہ ہے اس میں افسانے کے فن اور موضوعات متعلق بہت سے پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔

اردو افسانے پر اب تک کیا کچھ لکھا گیا ہے اسے دیکھتے تو متفرق چھوٹے چھوٹے مضامین سے قطع نظر دو تین کتابیں ہی سامنے آتی ہیں۔ عبدالغفار سردری کی دنیا کے افسانہ، وفار عظیم کی ”ہمارے افسانے“ اور ”ہماری داستانیں“ کلیم الدین احمد کی فن داستان گوئی۔ ڈاکٹر احسن فاروقی کی ”ناول کیا ہے“ اور علی عباس حسینی کی ”ناول کی تاریخ و تنقید“ بھی اسی میں شامل کر لیجئے۔ اللہ اللہ خبر صلا۔ ان میں بھی افسانے پر دو ہی کتابیں ہیں۔ باقی داستانوں اور ناولوں سے متعلق ہیں۔ گذشتہ ڈیڑھ سو برس میں اردو کا افسانوی ادب اچھا خاصہ قد آور اور جاندار ہو گیا ہے۔ یہ ایسا معمولی ادب جس پر مایہ نہیں کہ اسے باسانی نظر انداز کیا جاسکے۔ صرف داستانوں ہی کو لیا جائے تو وہ بھی تنقیدی داستانیں لکھی گئی ہیں انھیں پڑھنے کے لئے موزع چاہیے۔ صرف ایک داستان امیر حمزہ اپنی ضخامت میں ایسا سیکڑہ بیباک برٹانک کے برابر ہے۔ ان داستانوں پر ضحافت تنقیدی نظر ڈالنے کے لئے تو اور بھی محنت و کار ہوگی۔ اس کے بعد افسانوں کی طرف آئیے تو ہر دور میں اس پانچ بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ اچھے افسانہ نگار ملیں گے اور موجودہ زمانے کو تو ایک طرح سے وہ افسانوں کا عہد ہی کہا جاسکتا ہے۔ مگر ہماری بے حس بھی قابلِ واہ ہے کہ ہم نے اب تک مغربی نقادوں کے حوالے ہوئے خیالات اور جاتے ہوئے ناولوں سے زیادہ اپنے ادب کے ان بے شمار کچھ نہیں لکھا مگر بڑی ادب میں جا کر سے پہلے کوئی معقول چیز نہیں ملتی لیکن جو کچھ ”نامعقول“ تحریریں بھی ملتی ہیں ان پر بھی تاریخی و تنقیدی نظر

سے اتنا لکھا گیا ہے کہ اسے برسوں میں بھی نہیں پڑھا جاسکتا۔ مگر ادعوں میں ابتدائی نثر پر زور کیا گیا ہوئی، اہم کتابوں کے صحیح متن تک ایڈٹ کر کے نہیں چھاپے گئے اور افسانے جیسی اہم صنف سے بے اعتنائی برتی جا رہی ہے۔ یہ ایک نازیبا تدبیر ہے جو ہمارے مردہ احساس پر گھٹے کے بجائے کاش "سمندرِ ناز" پر لگتا !

ہمارے ناقدوں میں سید ذوالفہم نے اردو افسانے پر کام کیا ہے۔ اور ابتدائی داستانوں سے دور حاضر تک تمام سرمائے کو کھنگالا ہے۔ اسی سبب سے ان کی دو کتابیں "ہمارے افسانے" اور "ہماری داستانیں" شائع ہو چکی ہیں لیکن اتنے بڑے سرمائے کا تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی جائزہ ایک فرد کا نہیں ایک ادارے کا کام ہے۔ نقوش نے اس میدان میں قدم اٹھا کر ایک بڑی ضرورت کی طرف اشارہ کر دیا ہے کاش اس موضوع کو "بیابانِ خطرناک" سمجھ کر نقوش قدم بہ قدم حسرت نہ جھجھڑا دیا جائے۔

افسانہ نمبر کے بعد نقوش کے "شخصیاتِ نمبر" کا حصہ ۲ شائع ہوا تھا (شمارہ ۵۹، ۶۰) اس پر محض پچھلے سطور میں لکھ چکا ہوں۔ (شمارہ ۶۱، ۶۲) سالانہ کی شکل میں نمودار ہوا اور ایک عام اشاعت کے بعد نقوش نے دوسرا لافانی کارنامہ مکتب نمبر (شمارہ ۶۵، ۶۶) پیش کیا۔ اس کے دیکھتے ہیں۔ پہلا حصہ ۶۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے جس کی ابتدا میں خطوط نگاری کی ابتداء سے متعلق چار پرمغز مقالے غلام رسول، محمد سید عبدالقد، ماک دام اور محمد عبدالقد فرشتی کے لکھے ہوئے شامل ہیں۔ دیکھا جائے تو یہ چار مقالے ہی لکھا گیا اردو میں مکتوب نگاری پر ایک اچھی تنقیدی کتاب بن سکتے ہیں اس میں ۷۷ مکتوب نگاروں کے خطوط ہیں جن میں سے پہلے غالب کے آٹھ غیر مطبوعہ خطوط آئے ہیں۔ دوسرے اہم مکتوب نگاروں میں میر سید علی محمد حسین آزاد، امیر معانی، فارغ، حالی، شبلی، اکبر، شاد، اقبال، محمد علی جوہر، سلیمان ندوی، حسن نظامی، منشی پریم چند، فانی، محمود شیرانی وغیرہ شامل ہیں۔

مکتب نمبر کے دوسرے حصے میں ۸۸ صفحات ہیں اس میں بھی ۷۷ مکتوب نگار ہیں اور ان میں میر شکر آبادی، جوش امیر علی، سید علی ٹکڑا، محمد علی رودلوی، میر ناصر علی، اور سید حسین بکرامی جیسے اہم لوگ ہیں۔ اس طرح مکتب نمبر کے دونوں حصوں کی مجموعی ضخامت ایک ہزار اترتالیس صفحات اور مکتوبات کی کل تعداد تیرہ سو تیرہ (۱۳۱۳) ہوئی ہے۔ اردو میں آج تک اتنے اہم لکھنے والوں کے خطوط کا اتنا بڑا ذخیرہ نہیں چھاپا گیا تھا۔ ایک شخصیت یہ بھی ہے کہ جاباں مکتوب نگاروں کے نوٹ اور ۸۷ صفحات پر خطوط کے عکس بھی دیئے گئے ہیں۔ بعض لوگ ایسے ہیں جن کے مکتوب ہیں ماسوائے ان کے ہیں اور جنہیں مکتوب نگاروں کا رد جرتین کرنے میں مدد دیتے ہیں تقریباً تمام خطوط غیر مطبوعہ، اہم اور معلومات افزا ہیں۔

خطوط طبعی کی شخصیت کو برکھے کا عجیب آلہ ہوتے ہیں۔ ان کی اہمیت کی پہلوؤں سے ہوتی ہے، ایک تو یہ کہ مکتوب نگار نے تلفظ، مرکب، لکھنا ہے اور اس کے سوچنے کا زاویہ، ذہن کی افلاؤ، فطرت کی پیروی، وحم، طبیعت کی سادگی یا چرکاری اور معلوم ہو جاتی ہے۔ دوسرے خطوط سے نچے حالات اور بہت سی وہ باتیں جو انسان عام حالات میں لکھنا یا بیان کرنا پسند نہیں کرتا معلوم ہو جاتی ہیں۔ تیسرے ان کے بے تکلفی کے باعث استدلال کا انداز، اسلوب کی بے ساختگی اور زبان پر قدرت کا حال لکھنا ہے۔ اس کے ساتھ ہی خطوط کی سوانحی اہمیت بھی ہوتی ہے۔ مرزا غالب نے اگر اپنے خطوط نہ چھوڑے ہوتے تو آج شاید

ان کی سوانح عمری اتنی تفصیل اور مونثاتی کے ساتھ نہ لکھی جاسکتی۔ چنانچہ مکاتیب نمبر میں بھی ایسے خطوں کی تعداد بیکٹریوں تک پہنچی ہے جن سے مکتوب نگاروں کے بارے میں یا ان کے تعلق سے دوسری ادبی، سیاسی، سماجی یا تاریخی شخصیتوں کے باب میں بہت سی نئی اور اہم معلومات ہمیں مل جاتی ہیں۔ مثلاً منشی پریم چند کے ۲۸ خطوط اس میں شامل ہیں جن سے ان کی بعض کتابوں کے زمانہ تصنیف و طباعت کی تعیین کی جاسکتی ہے بعض افسانے انھوں نے کب لکھے یہ ٹھیک ٹھیک معلوم ہو جاتا ہے۔ اس معلوماتی اہمیت یوں زیادہ ہو گئی ہے کہ پریم چند کے بہتے افسانوں کا محرک کوئی سیاسی یا سماجی حادثہ ہے۔ اور اس ہمد کی سیاسی کشمکش ان کی تحریروں میں اہم محرک کی حیثیت رکھتی ہے۔

۲۸ جولائی ۱۹۲۲ء کے خط سے (مکاتیب نمبر ۲: ۵۸۹) ان کے چھوٹے بچے کی تاریخ وفات کا علم ہوتا ہے۔ ابتدائی تصانیف کے بارے میں بھی ان خطوں سے معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

”ہاں۔ ہم تو ماہر قراب، کشنا، وغیرہ میری ابتدائی تصانیف میں پہلی کتاب نوکھنور کے ناول پر پس نے شائع کی تھی دوسری کتاب بنارس کے میڈیکل ہل پر پس نے۔ یہ غالباً سنہ ۱۹۲۱ء کی تصانیف ہیں۔“ (۲: ۵۹۲)

پریم چند کی بری شیورانی پریم چند نے ایک کتاب بہت سیدھی اور سہل زبان میں لکھی ہے جو ہندی میں شائع ہو چکی ہے اس کا نام ہے۔ ”پریم چند گھر میں۔“ اس میں انھوں نے پریم چند کی عاقبتیں، ان کے شغل، گھر، موصاعطوں میں ان کا رویہ ان کی زندگی کے بہت سے اہم واقعات، عمدہ پیرائے، بیان کئے ہیں۔ انھوں نے ہی بھی بتایا ہے کہ گاندھی جی کا گوکھیوڑ میں آنا پریم چند کی زندگی میں ایک انقلاب کا آغاز تھا۔ اسی کے بعد انھوں نے ملازمت سے استعفا دے کر ترک موالات کرنے والوں کی صف میں شمولیت کی۔ وہ ملک کی آزادی کے لئے جی جان سے لڑنا چاہتے تھے اور ہندوستان کو آزاد دیکھنے کی تڑپ رکھتے تھے۔ لیکن بہت سی جھوڑوں کی وجہ سے وہ بھی کوئی عملی حیرتہ تحریک میں نہ رہ سکے۔ ۸ فروری ۱۹۲۲ء کے ایک خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسی تاریخ کو گاندھی جی گوکھیوڑ گئے تھے (۲: ۵۹۲)۔ اس تاریخ کا معلوم ہر جانا کوئی بڑی دریافت تو نہیں ہے لیکن یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ بعض اتنی جزدی اور بظاہر معرونی باتیں بھی سوانح نگار کو بہت مدد دیتی ہیں اور ان سے سوانح عمری کی قدرو قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک خط میں پریم چند لکھتے ہیں :

”میں بھی ترک موالاتی ہوں۔ میرے دل و دماغ میں بھی اتنی کل دہی مسائل گونجا کر تھے ہیں۔ ذہنوں میں بھی وہی خیالات جھلکتے ہیں۔ اور ادبی رسالے میں ان کی گنجائش

نہیں“ (۲: ۵۹۴)

اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کیا مصالحوں اور موالات پریم چند کے سامنے تھے اور وہ کس انداز سے سوچتے تھے اور کی افکار و حوادث کا اس ان کی تحریروں میں کس کس طرح ملتا ہے۔

پریم چند پر ہندی میں متعدد کتابیں چھپ چکی ہیں سوانحی حیثیت کی بھی اور تنقیدی بھی۔ لیکن اردو میں بڑے کرایک رسالہ زمانہ کا بنور کا ”پریم چند نمبر“ ہے۔ دوسری ایک مختصر سی کتاب ”پریم سوگ“ یا چھر جس راج دہر کی کتاب ”پریم چند“

جس کا ہندی اور انگریزی میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ زمانہ کا پورا نہ فرود واقعی اہم ہے کیونکہ یہ ایک معاصر ستارہ کی حیثیت رکھتا ہے پریم چند کے تعلقات و بازنائیں مگر سے جتنے گزے اور پرانے تھے وہ سب جاننے میں لیکن اس کے بعد کسی نے ان دونوں پر پریم چند پر کھنے کا حق ادا نہیں کیا۔ دہلی کی کتاب چونکہ بلا غلط ہے اس لئے اسے غنیمت ہی کہا جا سکتا ہے۔ اب ڈاکٹر فرید جس کا تحقیقی مقالہ ”پریم چند کا تنقیدی مطالعہ“ شائع ہونے والا ہے یہ شاید اس موضوع پر پہلی کامیاب کوشش ہوگی۔

پریم چند کے بعض خطوط رسالہ نمائندہ میں چھپے تھے اور متفرق طور سے بھی شائع ہوئے تھے لیکن اتنے اہم اور واقعی تعداد میں کسی ایک مجلہ نہیں ملے گے۔ جتنے انورس نیویشن کر دیئے ہیں۔

اور یہ تو صرف ایک پریم چند کی بات ہوئی جسے میں نے بطور مثال پیش کر دیا تھا اس طرح کتنے ہی شاعر، ادیب، افسانہ نگار اور اہم صحافی حیثیت کے بزرگ ایسے ہیں جن کے خطوط نہایت مستند، ماضی کا روبرو رکھتے ہیں اور تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے ان سے استفادہ ناگزیر ہوگا۔

ان خطوں میں چوتھی مباحث، ملی، لسانی یا ادبی نکات آئے ہیں وہ بھی کچھ کم احیاء نہیں رکھتے۔ مثلاً ایک جلد فقط ”شروعات“ کی بحث (۲، ۷۷، ۵) کا بعد ازین ہندوی کے خط میں اصطلاحات علمیہ کے ترجمے کا مسئلہ (۲، ۵۸۳) ان سے بعض غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ہوتا ہے۔ مجید سے ایک شہر عالم اور اپنے پیرمیل تذکرہ یہ فرمایا تھا کہ حسرت موہانی مرحوم نے ”انتخاب سخن“ کے عنوان سے جو سلسلہ تعلیم شعراء کے اردو کے انتخاب کلام کا چھاپا تھا وہ انتخاب دراصل براہ راست دو اویں سے نہیں کیا گیا تھا بلکہ حسرت کو غالباً پٹنہ سے ایک ایسی ہی کتاب مل گئی تھی جس میں بہت سے شاعروں کا منتخب کلام کسی یا دونوں جامعے کے ترتیب دیا تھا اور اس کو انھوں نے باسقاط شائع کیا۔ یہ بات کچھ ایسی مستبعد نہیں معلوم ہوتی۔ مگر حسرت موہانی جیسے فقہ انسان سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ حوالہ دینے سے گریز کریں اور کتنا ہی تحقیق کے مرتکب ہوں حسرت کے جو خطوط کا ترتیب فراہم کر دیئے گئے ہیں ان سے حسرت کے مزاج کی جھلک، و ناکی، سادگی، استقلال اور حصے کا انتخابی اندازہ ہوتا ہے جو کسی دوسرے ذریعے سے ممکن نہ تھا۔ ان میں بعض خطوط سے ان دو اویں کے نام بھی مل جاتے ہیں جن سے حسرت نے یہ انتخاب کر کے چھاپا ہوگا۔ (مثلاً ۲، ۹۰۹)۔

مولانا حسرت کی زندگی متضاوت عناصر کا آمیزہ تھی اور ان کے خطوط ان کی کئی زندگی کے کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔

ان خطوں سے بعض اہم باتوں کی نشان دہی بھی ہو جاتی ہے مثلاً بیگانہ چنگیزی نے اپنی زندگی میں تحفہ ”نئی ترتیب ادب“ اضافے کے ساتھ مرتب کر کے لاہور کا دارالکتاب دس شعلہ کے حوالے کر دیا تھا (۲، ۷۱۵)۔ بایں کہ سر آسمان جاہ کی درخواست پر سید محبوب علی خاں آصف جاہ سلاطین نے مولوی فضل حق خیر آبادی مرحوم کے فرزند مولوی عبدالغنی خیر آبادی کو دوسروں پر وظیفہ میں تباہ کیا تھا۔ (۲، ۷۹۴)

ایک خط اس میں مزید شکوہ آبادی کا بھی شامل ہے (۲، ۷۹۸) اس سے پہلے غالباً متبرک کو کوئی اور خط شائع نہیں ہوا اس خط سے بعض اور امر کے علاوہ متبرک کے طرز نگارش کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

مکتب تبرک کے انور میں مشاہیر ادب کے عنوان سے ان مکتوب نگاروں کے مختصر سوانح بھی ہیں جن کو محمد عبداللہ قدوسی صاحب نے لکھا ہے۔ جیسے ہی بہت اہم ہے اور محنت سے لکھا گیا ہے۔ لیکن بعض فروگزاشتیں بھی رہ گئی ہیں مثلاً محمد حسین آزاد کے

والد کا نام باقر علی، لکھا ہے (۲: ۹۲۲) مہینے نام محمد باقر ہے اور پینٹل کالج میگزین، ذوری ۱۹۳۹ء یا ذوالحجہ ۱۳۵۸ء کے نام ہے جس کے ہر: "۱۰" اور ہر میں کچھ سرکاری خدمات انجام دیں جس کی وجہ سے سرشتہ دار اور پھر پھر عمر سعدرا الصدور ہو گئے " (۲: ۹۲۵)۔ ان خدمات کا تعین امر ہو رہے ہیں۔

تھوڑا سی معمولی ذوقِ شاعری قابلِ گرفت نہیں ہوگا، ان سے بچنے کی سہل ترکیب یہ تھی کہ فاضل مرتبہ ہر گیدہ انہیں اپنا مانند غلام کر دیتے۔

جہاں اس نمبر میں بہت سے تاریخی لحاظ سے اہم اور معلومات افزا خطوط ہیں، ان میں بعض مکتوبات بہت نگین، دلچسپ اور پُر بہا بھی ہیں مثلاً عبدالحق کا مکتوب (۲: ۹۱۱)، یا پطرس کا خط عبدالحمد ملک کے نام (۲: ۵۴۵)۔

آخر میں فاضل مرتبہ نے یہ راحت کر دی ہے کہ اس نمبر میں "زیرِ ادبیوں" کے مکتوبات شامل نہیں ہیں (دیکھ کر بعض غزلیات شامل ہیں) ہمیں امید ہے کہ وہ اسی طعنان اور ساز و براق کے ساتھ زندہ ادبیوں کے صاحبزادے، اب نمبروں کی طرف توجہ دے کر دیں گے۔

۱۹۵۸ء میں لغزش نے اپنی زندگی کے دس سال پورے کرنے کو "سببِ زہر" نکالا جو ۵۲ مضمون کا تھا اس میں ۱۷ انسانے ۲ ڈرامے، ۱۰ پورٹریٹس، ۱۰ ادبی مضامین اور دس مضمون شامل تھے۔ ان میں سب سے اچھا تنقیدی مضمون "غالب کی شاعری" پر جو عطا شعلہ کا ہے۔ انھوں نے غالب کی شاعری کے بعض پہلوؤں پر بڑی مہارت سے گفتگو کی ہے اور اب وہ انہیں تواریخ قرار دے لکھا ہے۔

وارد اشکر کے دیوان فارسی پر ایک تعارفی مضمون جناب علامہ بن سالک کا بھی اسی نمبر میں شامل ہے اور بہت قابلِ قدر ہے۔ حضرت سید احمد دہلوی کی داستانِ جہاد پر غلام جیلانی برفی اور گل بگاولی پر محمد عبداللہ قریشی کے مضامین بھی علمی افادے کے اعتبار سے اہم ہیں۔

اس نمبر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ لغزش نے "فارسی میں ادبِ جاوید پیش کیا ہے جس سے بیک نظر معلوم ہو جاتا ہے کہ دس برس کے اندر لغزش نے کیا کیا کیا ہے۔ چنانچہ میزان یہ ہے:

۵۱۷ مضامین، ۲۴۹۰ افسانے، ۱۲۱۳ خطوط، ۶ ناولٹ، ۶۰ مضمون، ۱۴۷۷ غزلیں اور یہ سب چیزیں بارہ ہزار دو سو چھیتر (۱۲۲۷۶) مضمون میں سمائی ہوئی ہیں۔ جتنا کچھ لغزش نے دس برس میں پیش کر دیا ہے وہ شاید بہت سے رسالوں کے پچاس برس کے فائلوں میں بھی نہ مل سکے۔ دس سالہ فیر کے بعد طنز و مزاح نمبر، پطرس نمبر، خاص نمبر اور دو عام نمبر بھی نکل چکے ہیں انہیں بھی شامل کر لیں تو یہ تعداد اور بھی بڑھ جائے گی۔

۱۹۵۹ء میں لغزش نے تین نمبر بہت قیمتی اور نیاوی اہمیت رکھنے والے پیش کئے ہیں۔ ان میں ایک طنز و مزاح نمبر ہے (شمارہ ۷۲۰) جس کی مضامین ۹۲۸ صفحات سے ہیں۔ تفصیلی تبصرے کے لئے بجائے خود اس پر ایک نمبر نکالا جاسکتا ہے۔ سرسری تعارف کے لئے کہا جائے تو اس کی ترتیب پر ایک نظر ڈالئے۔ پہلے حصے میں آٹھ مقالے ہیں۔ لکھنے والوں میں نام ڈاکٹر امجد حسین، ڈاکٹر خورشید الاسلام، ڈاکٹر ذریعہ، پروفیسر حکیم الدین احمد، ڈاکٹر شوکت مہزادی، قاضی طور الحسن، ظفر احمد صدیقی

اور علم الدین سادگت کے عین گئے اور موضوعات کی ترتیب یہ ہے :

(۱) بخنے کی ابتدا اور اس کی اجبت (۲) طنز و مزاح (۳) مزاح اور مزاح نگاری (۴) اردو ادب میں طنز و مزاح۔
(۵) اردو شعری میں طنز (۶) جوگوئی کی تاریخ (۷) پیرڈی اردو ادب میں (۸) فارسی ادب میں طنز و مزاح۔

یہ نوگز باطن و مزاح انارنجی، تنقیدی اور تحقیقی جائزہ ہوا، اب دوسرے باب میں دنیا کی بڑی زبانوں کا طنز و مزاح پر ملاحظہ کیا گیا ہے اور ان زبانوں میں انگریزی، فرانسیسی، فارسی، روسی، سپانی، عربی، اطالوی، ہندی، ترکی، بنگالی اور ہندی شامل ہیں۔ سب مل کر گیارہ نمونے ہیں جو ان زبانوں کے ادب کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض نام تو نامندہ نہیں ہیں، ان سے بہتر انتخاب ہو سکتا تھا لیکن بہت سال ان سے ایک اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اردو میں ترجمہ ہو کر بھی بعض چیزیں کچھ لکچھ ہو جاتی ہیں۔ ایسی مثالیں تو بہت ہی کم ہوں گی کہ اصلی کی روح ترجمے میں بھی ایسی طرح آجائے۔

قریب باب کا عنوان ہے ”طنز و مزاح ادب کے ابتدائی نمونے“ ان میں مختلف اخباروں اور جہدوں کی نمائندگی کی گئی ہے خصوصاً ”پنچن“ ”دور“ جس میں رفیق ہند، پنجاب پنچ، دوہلی پنچ، لاہور پنچ، بنارس پنچ، آگرہ پنچ، دکن پنچ وغیرہ شامل ہیں۔

پھر ادھر پنچ کا دور آتا ہے اور اس میں وہ تمام مزاح نگار آگئے ہیں جنہوں نے ادھر پنچ سے کھنا شروع کیا، البتہ آبادی غنی سپاہیوں، ترجمان ناظر، مجبور بگ تم ظریف، جوالا پشاور، برق، رون ناظر، شاعر، فریب محمد زاد، عبدالغفور شہزاد اور دیگر ممتاز حسین شامی وغیرہ۔

ادھر پنچ کے بعد ”فطن“ ”فطن اور فطن کا دور“ ہے۔ اس میں پہلے فطن اور فطن سے متعلق متعلق، محفل، امجدی، ایک اچھا مضمون ہے۔ پھر ان کے انتخابات دیکھے گئے ہیں۔ جن میں ریاضی خیر آبادی کا باغ و بہار، اسلوب اپنے شباب پر ہے۔ اس کے بعد شیرازہ کا دور ہے جس میں سند باد چھازی، جدید جزا، قیہ پنجاب، ”عبدالحیدر سالک کا“ ”ملکہ ایک منبر نائی“ بھی شامل ہیں۔

اس کے بعد موضوع کے تاریخی ارتقاء کے مطابق طنز و مزاح ادب کے شہ پاروں کا انتخاب ہے جو بڑی محنت اور جدوجہد پر بڑی سے کیا گیا ہے۔ غالب، مرثیہ، نذیر احمد، محمد علی جوہر، حمادی، محفوظ علی بدایونی، ابراہیم، بولوی، عبدالحق، عبدالحامد، بدایونی، قاضی عبدالغفار، خواجہ حسن نظامی، غلام پیم اور دیگر ماضی میں لیکن کاظمی تک بہت سے نام اور ان کی نمائندہ تحریریں لگی ہیں۔

اس کے دوسرے حصے میں جو طنز و مزاح ادب کے دریں دور سے منسوب کیا گیا ہے پطرس، رشید احمد صدیقی، حضرت بیگ بیگم چغتائی، شریک تھانی، ملازمی، کنہیا لال کپور، شفیق الرحمن، احمد ندیم قاسمی، ابراہیم جلیس، فرقت کا کوری، اور احمد جمال پاشا تک سب شامل ہیں۔

یہ حصہ مترقا۔ اب اردو کے طنز و مزاح ”شاعر“ آتے ہیں اس میں پہلے نو شعری میں طنز و مزاح کی

"تاریخ و تنقید پر ایک پرمغز مقالہ محمد عبدالقدوس کی قلم سے ہے جس میں سب سے پہلے جعفر زٹلی ہیں ان کے بعد مسعود، امیر، انشا، مصطفیٰ، یحییٰ، ضاحک، کتر، ہدایت، انظیر، اکبر، اودی، ناز، بیگم، وغیرہ ہیں۔ مگر حیرت ہے کہ یوم میرٹھی نہیں ہیں شاعروں میں اور بھی دو چار اچھے نام چھوٹ گئے ہیں۔ پھر دودرجد ہیں اکبر، جسکی، عالی سے لے کر انجم، پھیمو ندی، شاد، عارفی، مجید، لاہوری، سید محمد بختری، راجہ ہمدی علی خاں وغیرہ بہت سے مزاحیہ شاعروں کا نام آ گیا ہے۔ پھر ایک ممتازان ہے "مزاحیہ کردار" اردو میں بعض کیریکچر اچھی خصوصیات کی وجہ سے زندہ جاوید ہو گئے ہیں مثلاً سوتی، حاجی غول، چچا چھکین وغیرہ ان کرداروں کی نمائندگی بھی موجود ہے۔

انباروں میں بھی مزاحیہ کا نام کارہ اچ ہے۔ "مزاحیہ کالم" کے تحت ہمدرد، زمیں سدا، انقلاب، صدق، امروز، نوائے وقت، بستان، فکدان، کے مزاحیہ کالموں سے نوے پیش کئے گئے ہیں۔

آخر میں کچھ محاسن بانی بقی کے کچھ کئے ہوئے لطافت میں جن کا نعتیہ اردو کے ادیبوں اور شاعروں سے ہے۔ یہ کوہا میں نے سرسری طور پر صرف طنز و مزاح نمونہ کی نرس کا تعارف کر لیا ہے جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ اس میں کیا کچھ موجود ہے۔ ایک ہزار صفحات کے اس نمونہ پر "تنقیدی" نظر ڈالنا آسان نہیں۔ اردو میں طنز و مزاح پر اعلیٰ بہت کم لکھا گیا ہے، رشید احمد صدیقی کی کتاب طنز و مزاحات، اس سلسلے میں سب سے پہلی کوشش تھی جسے انھوں نے ہندوستانی اکیڈمی کی فرمائش پر لکھا تھا اور وہیں سے کتاب چھپی تھی۔ اس کا مقصد تحقیق یا تنقید سے زیادہ یہ تھا کہ اردو میں طنز و مزاح کی وضاحت کر دیا جائے کہ اس کا ایک بھر پور تعارف ہو جائے۔ اس وقت تو یہ مقصد پورا ہو گیا تھا۔ لیکن اب ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ رشید صاحب اس پر نظر ثانی کریں۔ اور اضافوں کے ساتھ اس کا نیا، ایڈیشن چھاپا جائے۔

رشید احمد صدیقی کے بعد کلام الدین احمد نے طنز و مزاح پر ایک طویل مقالہ لکھا اور اس میں تنک نہیں کہ انھوں نے بعض اہم مسائل کی طرف توجہ کی نئے انداز سے اردو کے تمام نمونے پر ایک نظر ڈالی اور اہم پہلوؤں کی طرف اشارہ کر دیا غلام احمد فطرت نے بھی بی ایچ ڈی کے لئے اپنا مقالہ اسی موضوع پر لکھ لیا ہے جو کھنڈیو نیو ریٹ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ طنز و مزاح کے نام سے ان کی مرتب کی ہوئی ایک کتاب اوارہ فروغ اردو کمیٹی نے چھاپی ہے جس میں اردو ادب کے طنز و مزاح کا انتخاب کئی سو گھنٹات پر پھیلایا ہوا ہے۔ شروع میں ایک طویل مقدمہ ہے۔ اس میں فرقت صاحب نے طنز و مزاح کی تعریف اور تاریخ بیان کی ہے اور اس کے عہد پر حمد اور نقاد کا جائزہ لیا ہے۔

اچھی پاکستان سے ایک کتاب "اردو ادب میں طنز و مزاح" ڈاکٹر وزیر آغا کی شائع ہوئی ہے۔ یہ ان کا پہلی ایچ ڈی کا تیسریں ہے اس میں وزیر آغا نے اردو نظم و نثر میں طنز و مزاح کی رفتار متعین کر کے اس کا تجزیہ کیا ہے۔ لیکن حیثیت مجموعی یہ کتاب ہماری توقعات کے مطابق نہیں ہے اس میں بعض خامیاں ایسی رہ گئی ہیں جن کی وجہ سے یہ کتاب تنقید کے معیار سے گر جاتی ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ نظم و نثر کے جائزے میں تناسب نہیں رکھا جن اشعار یا نثر کے ٹکڑوں کا انتخاب کیا ہے وہ غیر مربوط ہیں اور جس عنوان کے تحت یا جس مثال کی تصدیق کے لئے پیش کئے گئے ہیں ان کی نمائندگی نہیں کرتے۔ نتائج کے متنباط میں بھی وزیر آغا نے غور و فکر سے کام نہیں لیا۔ جگہ و جگہ زیادہ جذباتی ہو گئے ہیں مثلاً اکبر کے معاملے میں ان کی رائے معروضی

ADJECTIVE نہیں ہے۔ اگر تیزی زبان سے تھالیں، اقتباس اور حوالے ضرورت سے زیادہ جمع کر بیٹے ہیں جن سے اردو طنز و مزاح کو سمجھنے میں کوئی مدد نہیں ملتی صرف مصنف کی وسعت مطالعہ کا علم ہوتا ہے۔

بعض باتیں دلیل کی محتاج رہ گئی ہیں کچھ نہیں لکھتے ہیں بڑے فطیم، انصاف اور مکان پر ٹھہری مہذب اور بہرہ و بوجہی غریبیں (۸۲) نفع نظر اس بات سے کہ ان نظموں کے لکھنویوں کے جانے کی کوئی خاص شہادت موجود نہیں، مگر جن کی یہ جو بیات خصوصاً انصاف والا لطیفہ اتنا غیر مہذب اور ناشائستہ ہیں کہ حیرت جاتی ہے۔ وزیر کا خانے قائم جاندہ پری کی جو بیات پر بھی تو صرف نہیں کی، قائم کی جو بیات سوسا سے پہلے مانی ہیں۔

اُدو کی ابتداءنی شاعری میں جو بیات کا اتنا ذخیرہ باسانی مل سکتا ہے کہ اس پر ایک علمبردار مقالہ یا کتاب لکھی جاسکے۔ وزیر آخانے ان جو بیات کو تالوی درجے میں لائق اعتنا سمجھا ہے۔ انتخاب اشعار کا معاملہ ذاتی ذوق اور پسند کا ہر تہلہ لیکن جہاں شہل کی ضرورت ہو وہاں یہ شرط اتنی گڑبی نہیں رہتی۔ دعوے کی دلیل ذاتی پسند یا ذوق سے نہیں جھٹکتی تھے اور انرا ترسے دی جاتی ہے۔ مبرا لڑے ہے کہ جو اشعار وزیر آخانے مثالوں میں نقل کئے ہیں ان میں بیشتر ایسے ہیں جن سے دعوے کا اثبات نہیں ہوتا اور جو مرغل میں ای سے بہتر اشعار کا انتخاب کیا جاسکتا تھا۔

بہر حال اس کتاب پر متصل تبصرہ نویں پھر لکھوں گا مگر دست پر کتنا چاہتا تھا کہ اردو میں اب تک طنز و مزاح پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بہت نا کافی ہے۔ نقوش کے طنز و مزاح نمونے اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لئے اتنا کچھ مراد ایک جگہ فراہم کر دیا ہے کہ اس کے سہارے سے طنز و مزاح کی ایک بھر پور تاریخ لکھی جاسکتی ہے اور نہ ہی لکھی جائے تو یہ غیر خود اپنی جگہ ایک تاریخ ہے جو طنز و مزاح کے تدبیری ارتقا کو مینہ کر دیتی ہے۔

مگر نقوش نے ایک بات اچھی نہیں کی وہ یہ کہ انھوں نے "نقوش" اور "غیر نقوش" میں انبیاء ذکر کرنے سے بڑبڑ شاعری کے بہت سے حصے حذف کر دیے۔ اس معاملے پر کئی پہلوؤں سے سوچنا چاہیے ایک تو یہ کہ طنز و مزاح غیر کا مقصد عاقبت کجشہ آنا نہیں ہے دوسرے یہ کہ جو میں لکھ اور پھر مضامین کا استعمال رواج زمانہ کے مطابق تھا ان سے آج برأت کا نفرت کا اظہار کرنا ایسا بیجا ہے جیسے تیریا سوسا سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ مارکی کیوں نہ ہوئے؟ یا مرسید کی عجائبات نے یونیورسٹی قائم کیوں نہ کی۔ تیسرے یہ کہ ان ریکی، متبذل، اور سوتیلیہ مضامین سے اس عہد کی معاشرت اور تعلیمات کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ چوتھے یہ کہ وہ اشعار جن کا مقصد صرف گالی گلوچ یا گندہ دہنی تھا جیسے میر حسن کا "لطیفہ" انصاف، یا قائم کی شہو جو کسی لاولد لعل کی جو میں ہے، انھیں نظر انداز کر دینا مناسب بلکہ واجب لیکن اسانڈہ متقدمین کی جو بیات کے ساتھ یہ رد یہ اچھا نہ ہو گا۔ طنز و مزاح کی تاریخ مرتب کرنے وقت جب ہم ریختی کی نمائندگی بھی کر رہے ہیں تو حیرت زلی کے ساتھ جو کچھ، یوسم، زآخ وغیرہ خالص پھکڑ کے شاعروں کی نمائندگی بھی ہوتی چاہیے طنز و مزاح کی بہت سی شاخیں ہیں، ذہانت و گنگنہ آفرینی، مزاح، مضطرب، ضلع جگت، پھکڑ، پھنکی، بھو، وغیرہ ان سب بہترین نمونے جمع کرنے کے لئے ہمیں کہیں اخلاق سے معذرت بھی کرنی پڑے گی اور موضوع سے انصاف کرنا ہے تو بہت معذرت بھی کرنی چاہیے۔

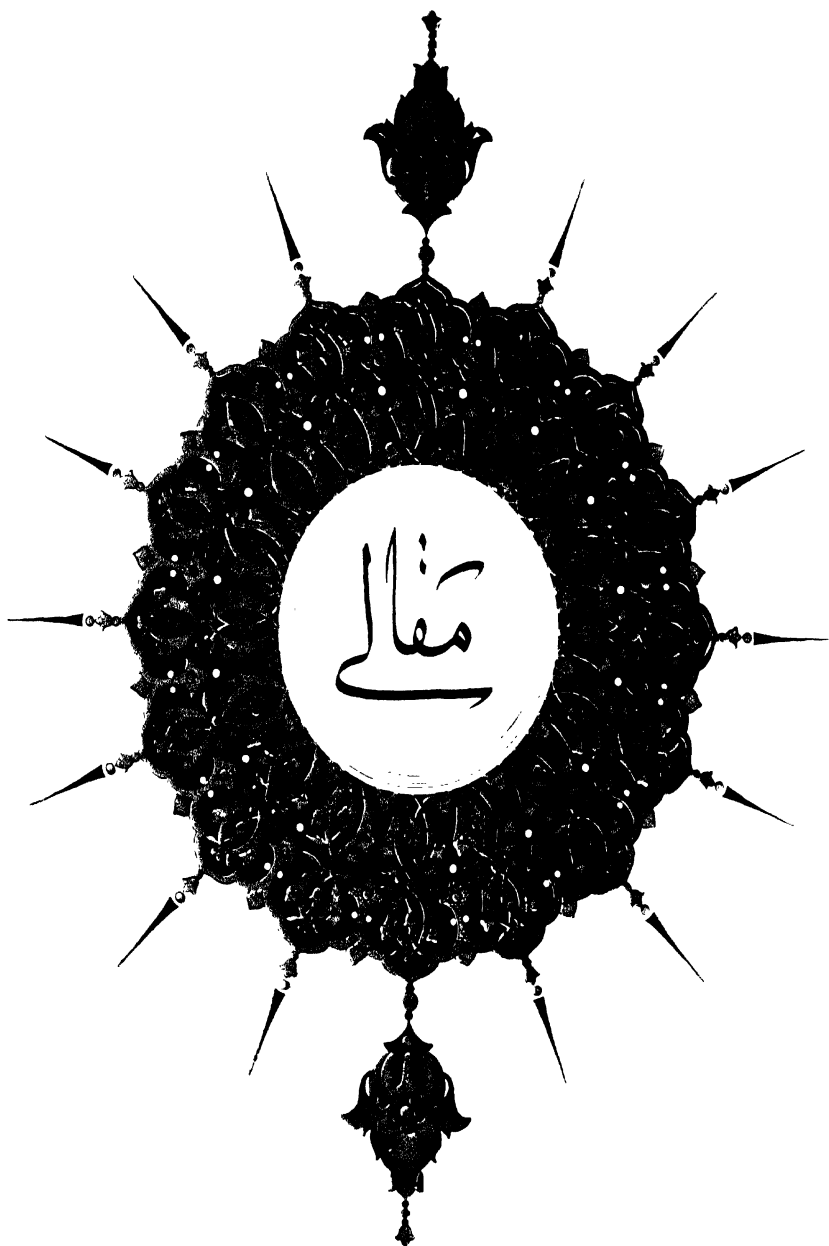
ہیں ۲۵ ذی ہوش ادیبوں اور ناقدوں نے اظہار رائے کیا ہے۔ افسانہ، شاعری، تنقید اور طنز و مزاح پر ان مضامین کے مستند لکھنے والوں کے خیالات ایک جگہ جمع کر دینا معمولی کام نہیں۔ اور آج تک کسی رسالے نے اس نوعیت کا کوئی سمپوزیم پیش بھی نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ حصہ لینے والوں میں منفی اور مثبت، مخالف اور موافق دونوں نظریوں کے لوگ شامل ہیں لیکن کوئی کہتا ہے ادب رو بہ زوال ہے، کوئی کہتا ہے نہیں۔ ایسی صورت میں ایک عام قاری کو یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ صحیح صورت حال کیا ہے۔ کیا یہ صرف نقطہ نظر کا ایریچر ہے یعنی یہ

تفاوت است میان شنیدنی من و تو تو بسنن در و من فتح باب فی ششرم
یا ادب کی سمت و رفتار کا تعین اور اس کی ترقی یا زوال کا تعین کسی خاص معیار سے کیا جاسکتا ہے؟ ایسی صورت میں یہ ضروری تھا کہ اس بحث میں ایک حکم بھی مقرر کیا جانا جو ان سب حضرات کے دلائل و شواہد کو سامنے رکھ کر استنتاج کر سکتا۔

جہاں تک افسانے کا تعلق ہے اس کے فن میں نئے تجربے نہیں ہوئے ہیں اور موضوعات میں تنوع نہیں انشتا پیدا ہو چکا ہے۔ شاعری میں بھی پرانی روش کی طرف رجعت فتنہری کر رہی ہے۔ تنقید میں نگار نگیز باتوں کا فقدان ہے اور اس کے اصول و ضوابط آج تک نہیں مدون ہو سکے ہیں۔ تنقیدی نظریات اور عقائد ہم آہنگ غیر محالک سے درآمد کرنے ہیں اس کے بہت سے اسباب ہیں۔ فقدان وسائل، تیزی سے بدلنے ہوئے حالات، نئی اور پرانی قدروں کی کشمکش، نظریات کی فراوانی، کثرتِ تعبیر سے خواہوں کی پریشانی، نئے علوم سے ہادی بیزاری، اور زبان و ادب پر سیاست کا رد عمل، یہ سب مجموعی طور پر ہمارے ادب کی ترقی میں مانع ہیں۔ میں نے اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار علیحدہ کیا ہے۔

برہمپوزیم کوئی ناظرین فیصلہ نہیں۔ ادب کے موجودہ موقف کی ایک رپورٹ ہے جس پر ہمارے نئے لکھنے والوں کو، ذہین اور ذی شعور ادیبوں کو تنقید کی کے ساتھ غور و فکر کرنا چاہیئے۔

محمد طفیل نے اپنے زمانہ ادارت میں نقوش کو زندہ جاوید کر دیا ہے اور ان کی محنت نے انھیں بھی امر بنا دیا ہے جس طرح نگار کے ساتھ نیاز فتح پوری کا نام، انجمن ترقی اردو کے ساتھ مولوی عبدالحی کا نام یا صدائے عام کے ساتھ میر ناصر علی کا نام ہمیشہ کے لئے وابستہ ہو گیا ہے اسی طرح اب نقوش اور محمد طفیل بھی ایک ہی چیز کے دو نام ہیں یہ ان سے زندہ ہے وہ اس سے عام طور پر یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ خاص نمبروں کے میدان میں نقوش کا کوئی حریف ہندوستان یا پاکستان میں موجود نہیں۔



تذکرہ رسائی

مولانا الطاف حسین حالی کا ایک غیر مطبوعہ مضمون

مضمون جس کو شیخ محمد اسماعیل صاحب چھوڑ کر شائع کر رہے ہیں والد مرحوم (مولوی الطاف حسین صاحب حالی) نے اپنے اُستاد اور اپنے وطن کے قابلِ فخر بزرگ حضرت مولانا قاری عبدالرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے چند روز کے بعد قلمبند میں لکھا تھا۔ شیخ محمد اسماعیل صاحب نے اس مضمون کی ایک نقل کو شش اور کچھ روز پہر فریق کے مولانا مرحوم کے ایک دوست سے حاصل کی ہے اور اس کو شائع کرنے سے آج کامیاب ہوئے ہیں۔ مضمون کے ساتھ اسلامی دنیا کے ایک مشہور بزرگ کے حالات بھی محفوظ ہو چکے ہیں جو پڑھنے والوں کے لئے سبق آموز اور ان کے دلوں میں اسلامی نفع کی وقعت پیدا کرنے والے ہیں۔

یہ بات کہ حضرت مولانا قاری عبدالرحمن صاحب کس پایہ کے عالم اور بزرگ تھے اور یہ کہ مضمون نگار کے دل میں ایسے بزرگ، استاد و کس قدر عزت اور محبت تھی وہی کے مضمون سے ظاہر ہے۔ عزیزِ مہرم ہو۔

ہیں شیخ محمد اسماعیل صاحب کا خاص کہ اس وجہ سے شکر گزار ہوں کہ مطبوعہ نعتیہ عالمی میں یہ مضمون پہلے نہیں چھپا اور اس نے اس کا خیال نہ اُٹا تو ممکن تھا کہ وہ کچھ عرصے کے بعد تلف ہو جاتا اور مسلمانوں کی آنکھ میں ایک ایسے بزرگ کے حالات بے خبر رہتے جو اس اخیر زمانہ میں سلف صالحین کا سچا نمونہ تھے۔ خدا تعالیٰ شیخ صاحب معصوم کو جزائے خیر دے اور سب قانونی کو حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی سے بہت دور سبقت حاصل کرنے کی توفیق دے۔ آمین۔

خاکسار

سجاد حسین عینی اللہ عنہ

از پانی پت

خلف خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم مؤخر

محمد افغاناں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَمَا مِنْ زَكَاةٍ أَكْبَرَ عَلَى الْإِسْلَامِ مِنْ هَذِهِ أَهْلِ اللَّهِ وَعُلَمَاءُ الدِّينِ
یعنی، اسلام پر کوئی مصیبت اہل اللہ اور علمائے دین کی موت زیادہ بڑی نہیں۔

افسوس اہلِ افسوس!! افسوس ہزار افسوس!! کہ تدوینِ اعلیٰ و بقیۃ السلف الصالحین جناب حاجی تاجی مولوی عبدالرحمن صاحب

انصاری پُرس پانی پت نے تاریخ ۶ ربیع الثانی ۱۰۸۱ ہجری یوم و شنبہ شام کے تین بجے بجا روضہ زیب و جیش اٹھ سات دن بیمار کرکے کچھ کم فٹے برس کی عمر میں دنیا سے رحلت فرمائی اور رات کے دس بجے امیر مودود دلائی قدس برہ کے مزار کے قریب بڑے دلچسپیت میں دفن کئے گئے۔ یاد جو دیگر رات کا وقت تھا اور تجہیز و تکفین میں نہایت عجلت کی گئی تھی جس کی وجہ سے وہاں میں خبر نہ پہنچ سکی پھر بھی قریب پانچ ہزار آدمی کے جنازہ کی نماز میں موجود تھا اور سینکڑوں مرد اور عورتیں ڈھاڑیں مار مار کر روتے تھے۔ چاروں طرفوں کے رئیس۔ اہل حرفہ۔ کاشتکار اور سوداگر جنازہ کی مشابہت میں شریک تھے۔

مولانا معصوم ناری محمدی صاحب کے خلف القدین اور ناری نادر بخش صاحب اور ناری احمدی صاحب کے زوجہ فلعہ دہلی ہیں اکثر سلاطین اور خاص حکمرانوں کی اولاد کے استاد تھے حقیقی جھنجھے تھے۔ ان کے والد اور دونوں چچاؤں نے جناب پتلی مصلح الدین صاحب پانی پتی سے جن کے صاحبزادے قاری لاری صاحب تمام ہندوستان میں مشہور تھے۔ تجویذ اور قرأت کیسی تھی اور انھیں کے خاندان کی بدولت پانی پت۔ دہلی اور مضافات دہلی میں فن تجوید شائع ہوا احتیاط و قرا کی تعداد و ہزاروں سے گزر کر لاکھوں تک پہنچ گئی خصوصاً مولانا مرحوم جن سے قدر قرآن مجید کی خدمت دس برس کی عمر سے انجیر عمر تک کی وہ شاہد کسی کی کو نصیب ہوئی ہوگی۔ مولانا نے قرآن اور کسی قدر صرف و نحو اور قرأت دہلی میں اپنے والد ماجد سے دیکھ کر خود بخود دہلی کے ہاں سے متعلق تھے پڑھی تھی اور وہ اپنے والد کے ساتھ شاہ عبدالعزیز صاحب کے خط میں جایا کرتے تھے جب والد کا انتقال دہلی میں ہو گیا۔ تو مولانا سید محمد صاحب۔ حاجی قاسم صاحب۔ مولوی رشید الدین خان صاحب کے کسی قدر کتب و رسد اور زیادہ زمرہ نامہ ملک علی صاحب کے پڑھیں اور صحاح سنہ کی سند جناب مولانا شاہ محمد اسماعیل صاحب مین آؤ لہا الی آخر یہ حاصل لی اور ان کے ہاتھ پر رعیت طریقت کی۔ اور اوروں میں جا کر مولوی ناری امام الدین صاحب علم قرأت اور منطق و تصوف کا اکتساب کیا۔

عالمی کے زمانہ میں جو انماک اور استغرائی ان کو تخصیص کلم میں رہنا تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ان کے عزیز اور ہم عمر دوست جو اس زمانہ میں آئی ان سے ملنے جاتے تھے۔ وہ ان سے سلام علیکم یا سرسری مزاج پرسی کے بعد رخصت کہہ دیتے تھے کہ اس سے زیادہ فرصت ملنے یا بات چیت کرنے کی نہیں ہے جب خدا بامر ادا ملے گا اس وقت ملیں گے۔ عالمی کے زمانہ میں جو سختیاں اور محن و مشاق اٹھوں نے اٹھائی ہیں ان پر اس زمانہ میں یقین آنا مشکل ہے۔

۱۲۵۳ھ میں جب حضرت شاہ محمد اسماعیل صاحب ہجرت کے ارادہ سے عرب میں شریفین کو جانے لگے اس وقت مولانا مرحوم بھی ان کے ہمراہ تھے۔ چونکہ مرحوم ذوالفقار بہادر نواب باندہ نے شاہ صاحب سے درخواست کی تھی کہ عرب میں کس طرح تشریف لے جائیں۔ اس نے شاہ صاحب اول باندہ تشریف لے گئے اور مولانا مرحوم کو نواب ذوالفقار رہا رکے پاس باندہ میں چھوڑ گئے تھے۔ تقریباً سولہ برس مولانا صاحب باندہ میں رہے اور اس عرصہ میں تمام علوم عقلیہ و نقلیہ کی درس و تدریس کرتے رہے۔ شاہ صاحب کے تشریف لے جانے کے دو سال بعد کو جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں جا کر بعد کے کچھ کم ایک سال رہے پھر شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر رہے اور صحاح کی سند دوبارہ مرحوم محترم خاتم طہ میں پیش کر کے حاصل کی۔

جب شاہ صاحب عرب میں کروانہ ہوئے تو قرآن مجید کا درس جو وہ چھوڑ کر فرمایا کرتے تھے اس میں تقریباً نصف قرآن شریف کا درس باقی رہ گیا تھا۔ مولانا مرحوم نے باہارت شاہ صاحب باندہ میں باقی سیریا روں کا درس ختم کیا۔ اور اس کے بعد

ابتداء سے قرآن کا درس دینا شروع کیا اور تقریباً پچاس برس برابر پھر جمعہ کو ان کا درس مہتراں کا خاص خاص حالتوں کے سوا کبھی کوئی جمعہ ناغہ نہیں ہوا۔ یہ قرآن بھی مغرب ختم ہونے والا تھا صرف کسی قدر تیسواں بارہ باقی رہ گیا تھا کہ مولانا کے کونچ کا وقت آن پہنچا۔

چند سال سے مولانا مرحوم کی دونوں آنکھوں میں پانی اتر آیا تھا۔ انھوں نے زیادہ تر اسی خیال سے کہ قرآن مجید کا درس ختم ہو جائے غھر ٹھوکر جا کر ایک آنکھ نہ ہوائی مگر اس سے اچھی طرح کارروائی نہ ہوئی۔ اس لئے الادوہ تھا کہ دوسری آنکھ بھی بغاوت مگر چونکہ اہل شمس کا وقت ٹھنڈا نہ تھا۔ یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔

مولانا مدد و ح کے فضائل و کمالات اور اعلیٰ اخلاق اور پختہ خصائل بہان کرنے کے لئے ایک جہاں کتاب درکار ہے۔ مختصر یہ کہ جو خصوصیات علمی و عملی مولانا مرحوم میں پائی جاتی تھیں ان کے لحاظ سے ان کا نظیر اب دور دورہ نظر نہیں آتا۔ ان کی تمام کتب و رسر کی تدوین میں گذری تھی۔ ایک ایک کتاب کو میں میں تیس تیس دفعہ اول سے آخر تک پڑھا یا تھا۔ اس سبب تمام کتابیں ایسی میچو گی تھیں کہ شکل سے شکل کتاب بلا تردد اور بغیر مطالعہ کے نہایت عمدگی سے پڑھانے تھے صحاح ستہ کو جس عمدتاً نہ احتیاط اور ادب و تعظیم کے ساتھ وہ پڑھاتے تھے اس کی نظیر کہیں نہیں دیکھی گئی۔

علم قرأت جس میں قرآن سہ اور ان کے راویوں کے اختلافات اور نیز قرأت پر متواترہ و شاذہ کا بیان ہے اس میں مولانا مرحوم تمام ہندوستان میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے راوی چونکہ اس فن کو ان سے بہت ہی کم لوگوں نے حاصل کیا تھا اس لئے اخیر عمر میں ان کی دلی خواہش یہ تھی کہ لوگ ان سے اس فن کو حاصل کریں۔ اور لوگوں کی اس طرف سے بے زہمی و یکجہ کو خوف کیا کرتے تھے کہ مبادا یہ علم اس ملک سے ناپید ہو جائے۔

ان کی تمام عمر کتب و رسرہ اور صحاح ستہ کے درس و تدریس میں گذری تھی مگر اب ان کو کوئی کام اور کوئی مشغلہ قرآن مجید کی تلاوت اور قرآنی علم قرأت اور علم تجوید کی تعلیم سے زیادہ عزیز اور مغرب نہ تھا۔ باوجودیکہ کئی برس سے قوی میں نہایت محال پیدا ہو گیا تھا۔ سماعت بہت کم ہو گئی تھی اور میانی بالکل نہ رہی تھی مگر ہمیشہ میں پچیس سنی قرآن مجید کے مردوں اور قوم کی عورتوں کو پڑھانے تھے سخت سے سخت مرض اور تکلیف میں بھی رمضان شریف کے روزے اور ایک قرآن تلاوت میں ستائیسویں ترک نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ گذشتہ رمضان شریف میں باوجود کمال ضعف و ناتوانی کے سارا قرآن شریف تلاوت میں سٹایا اور تمام رمضان شریف کے روزے رکھے۔

مازا سے جس کی نسبت رسول خدا صلعم نے فتنۃ عینی فی الصلوات فرمایا ہے انھوں نے عجیب طرح کا خلق پیدا کیا تھا کہ نماز کا وقت ہوتے ہی وہ بسے چین ہو جاتے تھے اور جب تک نماز ادا نہ کر لیتے تھے دنیا و مافیہا سے کچھ سروکار نہ رکھتے تھے۔

قرآن مجید جس کی تلاوت اور خدمت اور تعلیم میں تقریباً اسی برس گذرے تھے مگر با ان کی رگڑے میں سربازت کر گیا تھا۔ اس میں سرمدانہ نہیں کہ اگر بالفرض وہ تمام قرآن سمجھتے سمجھتے ختم کر دیتے تو ان کو ایک مجید بھی منشا بہ نہ ملتا اور ایک حرف بھی قواعد تجوید و نزہل کے خلاف ان کے منہ سے نہ نکلتا۔

وہ قرآن کے الفاظ و حروف کو بضم و رویت خارج سے نہیں نکالتے تھے بلکہ تمام حروف کو اپنے خارج سے ادا کرنا اُن کا سلیقہ اور طبعیت بن گیا تھا۔ وہ فرماتے تھے کہ مکہ معظمہ کی اقامت کے زمانہ میں جب اور ضروری کاموں سے صحت ہوتی تھی تو میں جہاں کہیں عربوں کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو کھیلتے دیکھتا وہاں جا بھکھڑا ہوتا اور اُن کے لب و لہجہ پر غور کرنا اور جہاں تک ہو سکتا تھا اُسی طرح حروف و الفاظ کے ادا کرنے میں کوشش کرتا۔

رسول خدا صلعم کی نماز کی نسبت جو حدیث میں آجّت و ائمہ کا لفظ وارد ہوا ہے۔ اُس کے معنی مولانا مرحوم کی نماز اور تلاوت قرآن کا ڈھنگ دیکھ کر بالکل زمین نشین ہو جاتے تھے۔ وہ قرآن مجید بہت جلد پڑھتے تھے مگر کیا امکان ہے کہ تجوید و ترتیل کے خلاف ایک حرف زبان سے نکلے۔

انھوں نے تمام قرآن میں سے امام نافع کی وہ روایت جو اُن کے شاگرد امام ناولن کے توسط سے پہنچی ہے اختیار کر لی تھی۔ آخر ذہب اسی روایت کے موافق قرآن مجید پڑھا یا۔ چونکہ اس روایت میں تروشد بہت کم ہے اور مولانا مرحوم کی مشق و جماد متنتہا کمال کو پہنچ گئی تھی اس لئے باوجود نہایت جلد پڑھنے کے تجوید و ترتیل میں مرزوق نہ آتا تھا۔

اُن کے وعظ کہنے کا طریقہ تمام واعظین کے طریقہ کے بالکل برخلاف تھا۔ اُن کا وعظ و خطبہت درس ہوتا تھا جس میں لغو و استغناء اور فضول قصے کہانیاں بالکل نہ ہوتی تھیں اور کوئی بات خارج از آہنگ محض بیان میں نہ آتی تھی۔ اول قرآن کی آیت کے صاف اور سیدھے معنی بیان کرتے تھے۔ پھر اُس کی ترکیب کا حال اور نہایت عز وری تفسیر اور مسائل فقہیہ پر ائمہ مجتہدین نے اُس سے استنباط کئے ہیں، یا کوئی ضروری اور مفید بحث جو فی الواقع قرآن کے معانی و الفاظ سے تعلق رکھتی ہو بیان کرنے تھے۔ اس لئے اُن کے وعظ سے سامعین کو بے انتہا فائدہ ہوتا تھا اور نہایت مفید کام کی باتیں اور مسائل کو گوں کو معلوم ہوتے تھے۔

مذکورہ بالا اوصاف کے علاوہ مولانا مرحوم میں وہ اعلیٰ درجہ کی صفات بھی تھیں جو طے بڑے مقدس علماء و مشائخ میں بھی نہیں دیکھی جاتیں۔ وہ اُن لوگوں میں سے تھے جن کی نسبت ارشاد ہوا ہے کہ یُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ۔ جو کچھ اُن کے دل میں تھا وہی زبان پر تھا جس بات میں خدا اور رسول کی مرضی دیکھی گوسا زمانہ اُس کے برخلاف ہو اُن کو اُس بات کے کرنے میں کچھ بالک نہ تھا اور جس امر کو حکم الہی کے خلاف سمجھا۔ گو کہ ساری برادری او کہنے اُس کو اچھا جانے وہ ہمیشہ اس کے مخالف ہے اور جہاں تک ممکن ہو اُس کے ٹٹلنے میں کوشش کی۔

انھوں نے شادی و عی کی تمام بہبود و رسمیں یک قلم اپنے ہاں سے موقوف کر دیں بلکہ بعض نفلیات مقام برادری اور کتبے سے موقوف کر دیں۔ مگر جیسا کہ حدیث میں آیا ہے سَلَا اِسْلَامًا عَزَّوَجَلَّ وَ عَزَّوَجَلَّ فِي بَلَدٍ بَارٍ۔ اُن کی ہدایتوں اور نصیحتوں پر زیادہ تر عمل کرنے والے اور اُن کا حکم بحالانے والے غریب، اہل حرفہ، ماشتکا را اور دکاندار لوگ تھے جو ہمیشہ اُن کی خدمت میں حاضر رہتے۔ انھوں روز اُن کی مجلس و وعظ میں شریک ہوتے۔ اور برسوں تک تراویح میں اُن کی تلاوت سنتے تھے۔ اُن لوگوں نے حد و رسوم و بدعات صرف مولانا مرحوم کی ہدایت سے ہمیشہ کے لئے ترک کر دیں۔

وہ صرف زبانی نصیحتوں پر ہی اکتفا نہ کرتے تھے بلکہ ہمیشہ ترک رسوم و بدعات اور احیائے سنن میں خود فونہ بن کر

لوگوں کو اُس کی طرف مائل کرتے تھے۔

مولانا مرحوم شخص، نقلی اور نوکی باقوں سے نہایت نفرت کرتے تھے معاملات میں ایسے صاف اور کھلے آدمی دُنیا میں بہت کم جہتے ہیں اسیدت و دلالت و لعل اُن کے مزاج میں ملتی نہ تھی۔ نہ اپنا حق کسی کے پاس چھوڑتے تھے اور نہ دوسروں کے حق میں دست اندازی کرنا چاہتے تھے۔ آج کا حساب کل پرادول کا حساب پرسوں پر کسی نہ رکھتے تھے۔ انتظام، تدبیر، منزل، اذونات کی باندی، کاموں کی ترتیب، مستعدی و استقلال اُن کی خاص صفیں تھیں۔ اُن کی جزر رسی اور کفایت شناسی بالکل شعری معنوی کے اس شعر کی مصداق تھی۔

لے بسا امسال کز انفاق بہ مال حق راجز براہ حق مدہ

اگرچہ وہ فرائض و واجبات و سکن کے سوا نوافل و اُرداد و وظائف کے زیادہ پابند نہ تھے مگر جس قدر نوافل یا اذکار کا انھوں نے التزام کر لیا تھا اُن میں لُحْمائے اَحَبِّ الْاَحْبَالِ اُذْ وُجِّعَ کبھی فرق نہ آتا تھا۔

قصبہ باقی پت میں جواد لا حضرت ابو ارباب النصارى صاحب الرحمن اور ثانی شیخ الاسلام خواجہ عبدالعزیز بہرل کی چھ سو برس سے آباد ہے۔ مولانا بھی اسی قوم کے ایک رنگن تھے۔ اُس قوم میں سنی اور شیعہ دونوں مذہب کے آدمی شامل ہیں مولانا مرحوم کا اپنی قوم کے بچوں، جوانوں اور بوڑھوں سے ایسی محبت تھی کہ اُن کو دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے تھے۔ باوجودیکہ اُن کی قوم کے آدمی یہ نسبت اور قوموں کے اُن کے فیض صحبت سے بہت کم مستفیض ہوتے تھے اور اُن کی خدمت میں کم حاضر ہوتے تھے۔ باہر ہجرت کر کے اپنی قوم کا دل جاتا تھا تو اُس سے نہایت مہربانی اور رعایت اور محبت کے ساتھ ساتھ رہتے تھے اور ہمیشہ دل سے اپنی قوم کی خیر خواہی کا خیال رکھتے تھے۔

عہد کی مسجد جس میں مولانا مرحوم نماز پڑھا کرتے تھے۔ اُس کی مرمت کے لئے روپیہ کی ضرورت تھی تو انصار یوں کے سوا کسی سے انھوں نے طلب نہیں کیا۔ البتہ اگر کسی نے غیر قوم کے لوگوں میں سے اپنی خوشی سے کچھ دیا تو اُس سے انکار بھی نہیں کیا اور جو کچھ کمی رہی وہ اپنے پاس سے پوری کی۔ غیر قوم کے لوگوں سے انھوں نے صرف اس خیال سے نہیں طلب کیا کہ عہد کی مسجد کو خود نہ بنانے اور غیر قوموں سے مدد لینے میں اُن کی اپنی قوم کو وجہ لگے گا۔ مسجد کے برابر ایک مکان نوابان اللہ خان مرحوم انصاری کا تھا اُس کو اُن سے مالک کے مسجد میں شامل کر لیا اور اس طرح مسجد کو خالص انصاریوں کی امداد سے تیار کر لیا۔ یہ بظاہر ایک اعلیٰ بات معلوم ہوتی ہے مگر یہی وجہ چیز ہے جس کے نہ ہونے سے روز بروز مسلمانوں کی نام جماعتیں پرالگ ہو رہی ہیں جو جاتی ہیں۔

مولانا مرحوم کی سیدھی سادی او بے تکلف وضع کو دیکھ کر ایک انجلی آدمی اُن کو اَحَدٌ مِّنَ النَّاسِ سَجَّحَ تَخَاطَرُ ہندوستان کے تمام اطراف و جانب میں اُن کے متقدمین و مسترشدین لگتی اور شہار سے خارج تھے۔ ملک کے ہر حصے سے صد ہا استفہام اُن کے پاس آتا تھا اور سینکڑوں آدمی بیعت کے لئے اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ وہ بظاہر ولایت کے لباس میں تھے

مگر حقیقت بہت بڑے شیخ تھے اور وہ جو کسی بزرگ کا قول ہے کہ ”قطبِ وقت کو پہاڑوں جیگھوں اور پراڈوں کی تنہائی اور عزت میں نہ ٹھہرے بلکہ بازاروں میں، بالائیں میں، خرید و فروخت میں اور تمام دنیا واری کے تعلقات میں تلاش کرو“ سو یہ قول مولانا مرحوم کی شان میں پورا پورا صاف و آفا تھا۔ اُن کے نزدیک ترک و تجرید کا نام لغزو و رویش نہ تھا بلکہ دنیا کو مرکز نہ سمجھنا اور تمام دنیا کے معاملات حکم خدا اور رسول کے موافق طے کرنا اور بے ہمد و باہم رہنا اسی کو رویشی سمجھتے تھے۔ اُن کا حال اس شعر کا مصداق تھا۔

پاک ہیں آلائشوں میں بندشوں میں بے لگاؤ
رہتے ہیں دنیا میں رب کے درمیان سے الگ

اگرچہ اخیر عمر میں بسبب ضعف و ناتوانی کے اوقات نماز کے سوا اور وقتوں میں بہت کم باہر نکلتے تھے اور گھر میں ایک علیحدہ بالا خانہ میں رہتے تھے مگر اپنی طاقت اور وقت کے موافق اپنے تمام کام خود ہی سرانجام دیتے تھے۔ مولانا مرحوم دین کے معاملات میں اپنی رائے اور قیاس کو کبھی دخل نہ دیتے تھے بلکہ جو کچھ شیخِ عروج اور اساتذہ سے سنا تھا یا جس پر تصریح برآں کو چلتے دیکھا تھا یا جس طرح کتابوں میں پڑھا تھا۔ اُس سے سر موخا زندگی نہ کرتے تھے تنہائی میں یا مجمع عام میں اگر کوئی اُن سے کچھ مسئلہ چھیٹا تھا اور اُن کو اس کا جواب سرِ درست معلوم نہ ہوتا تھا تو باوجود جو مرجعِ خلافت ہونے کے وہ صاف کہہ دیتے تھے کہ اس وقت مجھے معلوم نہیں جب تک اُن کو اپنے جواب پر نہایت اطمینان اور ثقیقہ نہ ہوتا تھا کبھی زبان سے نہ نکالتے تھے۔

۱۸۵۷ء کے غدر میں وہ باندہ میں تھے جہاں کے لوگ اُن کے نہایت معتقد اور اُن کے حکم پر وار تھے تیس چالیس لگیز اور اُن کے بچے اور عیس باغیوں کے خوف سے اُن کی پناہ میں آ گئیں۔ انھوں نے سب کو پناہ دی اور اپنے معتقدین کو حکم دے دیا کہ جہاں تک ہو سکے اُن کی حفاظت کرو اور برادران کے کھانے پینے کی خبر لی۔ اور جنہوں نے جان کے خوف سے مسلمان ہونے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اُن کو قاعدہ کے موافق مسلمان کر لیا چنانچہ وہ سب پناہ گیر مولانا مرحوم کے مدرسہ میں امن کے زمانہ تک رہے اور جب غدر رُفع ہو گیا تو وہ ہجرتِ تمام اپنے اپنے وطن گئے۔ ایک روز اُن میں سے ایک شخص جو بہت بڑا افسر تھا اپنے اہلی لباس میں مولوی صاحب ملے آیا۔ انھوں نے اُسے مطلق نہ پہچانا چو کہ وہ شخص بھی مولانا مرحوم کے دفتر پر کمان چڑھا تھا اور انھوں نے اُس کا نام بھی مسلمانوں کا سا ہی رکھ دیا تھا اُس نے اپنا نام لیا کہ میں وہ شخص ہوں۔ اُس وقت مولانا نے پہچانا۔ اس یورپین افسر نے کہا کہ آپ اپنے تعلقین کے طرف سے ایک نواست گھر اور کچھ کرو بچھے۔ کہ اتنے یورپین مردوں اور عورتوں اور بچوں نے ہمارے ہاں بیٹھی اور آج تک مولوی صاحب نے اُن کو ہر ایک آفت اور جلد سے پہچا۔ اُس کے صلیب میں ہم کو سر کا سے جاگیر یا انعام ملتا چاہیے بلانا میرٹھ کے مسکرا اور فرمایا کہ میں نے اپنے مذہب کے موافق اس وقت تمہاری حفاظت اور حمایت کرنی ضروری تھی سو اُس کے موافق عہدہ کرنا میرا فرض تھا میں یا میری اولاد ہرگز اس کا عوض تم سے یا میرا سے نہیں چاہتی۔ تم اس کا خیال نہ کرو۔ یہ سنکر وہ افسر نہایت ادب اور تعظیم سے مولوی صاحب کو سلام کے کہے نہایت اور مولوی صاحب چند روکے بعد پالی پت چلے آئے۔ مولانا مرحوم کے شاگردوں اور مستفیدوں اور مترشدوں کی تعداد دائرہِ حصر و اھل سے باہر ہے۔ یہاں تک کہ اُن

کے بعض جلیل القدر شاعر و عرب میں بھی موجود ہیں۔ اذان جملہ مولوی حبیب الرحمن سندھی بنگالی نزہیل مدینہ جو ایک مدت سے مدینہ طیبہ میں رہتے ہیں اور جن کا تمام مدینہ کے علم و مشائخ اوس کرتے ہیں مولانا مرحوم کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں اور ان کا شیخ ہونے کی وجہ سے وہ ان کے علم و ادب و عدم ملاقات کے مولانا مرحوم کا نہایت اوس اور تعلیم کرتے ہیں۔

منابت افسوس ہے کہ پانی پت ایک ایسے بزرگ سے خالی ہو گیا جو نہ صرف اہل بانی پت کے لئے بلکہ تمام مسلمانوں کے لئے باعث فخر تھا اور جس کا مثل آئندہ زمانہ میں پیدا ہونا محالاتِ عادیہ میں سے معلوم ہوتا ہے۔

فَمَا كَانَ كَأَنَّكَ هَلَكْتَ وَاجِدٌ
وَالْحَيَّةُ بَنِيَانٌ قَوْمٌ تَهْدَى مَا

یعنی تیس کامرنا ایک آدمی کامرنا نہ سمجھو بلکہ وہ قوم کی بنیاد بنی ہو گئی۔

یہ ایک بات عجیب ہے کہ مولانا مرحوم نے انتقال سے تین چار ہفتے پہلے جامع مسجد میں جو درس فرمایا تھا اس میں زیادہ تر موت کے مسائل یعنی تجہیز و تکفین اور غسل میت وغیرہ تشریح کے ساتھ بیان فرمائے تھے۔ یہ گویا آخری وعظ تھا۔ اس کے بعد پھر نوبت وعظ کی نہیں آئی۔

مولانا مرحوم کی ایک سترہ عادت یہ بھی تھی کہ اپنا درس ہمیشہ اس کلمہ پر ختم کرتے تھے "باقی بیان انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ ہوگا" لہذا اس آخری وعظ میں بھائے اس کے یہ فرمایا کہ "باقی بشرط زندگی آئندہ"۔

عزیزی حافظ اخلاقی حسین سلمہ اللہ تعالیٰ بلور زاوہ فرماتے ہیں کہ مولانا مرحوم کے شاگردوں اور متفردوں میں سے ہیں مولانا مرحوم کی تاریخ وفات قرآن مجید کے اس جملہ سے کہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ عَظِيمٌ نکالی ہے جس کو الہام کہنا چاہیے۔ ہمارے نزدیک یہ جملہ تبرک ضرور بالضرور مولانا مرحوم کی قبر پر کندہ کرنا چاہیے۔

(عطیہ: محمد اسماعیل بانی پتی)

مولانا حاتمی کی ایک بے نظیر غیر مطبوعہ کتاب

اصول فارسی

(پیش کردہ شیخ محمد اسماعیل یانی پتی)

حضرت شمس العلماء مولانا الطاف حسین حاتمی یانی پتی کے بہت سے نادر و نایاب تبرکات میں سے صرف صدر اذکی تلاش و جستجو کے بعد فراہم اور متیا کئے گئے، جن میں سے بہت کافى حصہ تو حکومت کی قیامت خیز آندھی اور ہلاکت آفریں طوفان کی نذر ہو گیا۔ جو بہت ہی غنڈا سا حصہ میرے ہٹ کے محمد احمد اور مبارک محمود یانی پتی سے مشکل بچا کر لے آئے تھے۔ اُس میں سے ایک نہایت دلچسپ مضمون ”تذکرہ رکنائے“ کے عنوان سے ”نقوش“ کے پنج سالہ نمبر میں بریڈ ناظرین کو چپکا ہوں۔ مگر یہ مضمون صاحب مدیر نقوش کے اصرار پر راجح حضرت مولانا مرحوم کا ایک اور علمی تبرک فارغ بنی نقوش کی خدمت عالی میں پیش کر رہا ہوں۔ مولانا نے آج سے ۸۵ برس پہلے ۱۲۹۶ھ میں اصول فارسی کے نام سے فارسی حرمت و نحو کے متعلق ایک بسیط اور مفصل کتاب اُردو میں لکھی تھی۔ جو نہ مولانا کی زندگی میں زیورِ مطبع سے آراستہ ہو سکی اور نہ مولانا کی وفات کے بعد مولانا کے گرامی نذرِ فرزند حضرت خواجہ سجاد حسین صاحب نے اُس کی طباعت کا خیال فرمایا۔ اور وہ اُن کے خانی کتب خانہ میں اُن کے محترم والد کی دوسری نایاب کتابوں کے ساتھ محفوظ رہی۔ ۱۹۴۲ھ میں اُن کا بھی انتقال ہو گیا چونکہ حضرت خواجہ صاحب مرحوم کے کوئی لڑکا نہ تھا۔ اس لیے مکان بند پڑا اور یہ علمی تبرکات الماروں میں مقفل رہے۔ مسئلہ اُن کے منگام میں یہ نہیں کہ مکان نہ کورٹ لٹ گیا یا محفوظ نہ رہا۔ اور ان تبرکات کا کیا حشر ہوا؟ اور یہ نایاب کتاب اس وقت کہاں ہے اور کس کے پاس ہے؟

میں نے ۱۹۹۱ھ میں حضرت خواجہ سجاد حسین صاحب کی لاٹری بری سے لے کر اس علمی کتاب کا دیباچہ اور عنوانات و مسند تاج کتاب کی نہرست نقل کی تھی جو آج پہلی مرتبہ ناظرین نقوش کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے کمری و محبتی محمد طفیل صاحب کے حوالے کر رہا ہوں۔ تمام کتاب حضرت مولانا حاتمی کے اپنے تلمیذ لکھی ہوئی ہے۔ تحریر بہت خوشخط اور صحت ہے۔ بہن اسلور رکھا رکھا ہے۔ فی صغیر ۱۵۰ سطریں ہیں اور فی سطر چار و پنج یا پندرہ لفظ ہیں۔ کتاب کا سائز فل سکیپ ہے۔ اور کتاب میں کہیں داغ و جھرنہ نہیں۔ البتہ کاغذ میلا ہو گیا ہے اور کتاب کو مع حملہ کے کڑے سے بگڑا ہوا ہے۔ جلد بہت بوسیدہ ہے۔ کتاب کی تہید و صفحات میں آئی ہے۔ اُس کے بعد علمِ حرمت کا حصہ ۲۲ صفحات میں مولانا نے لکھا ہے۔ بعد ازاں علمِ نحو کا بیان ۲۶ صفحات میں ہے یعنی کل کتاب کے (۹ + ۲۲ + ۱۱۶) = ۱۴۷ صفحات ہیں۔ تمام کتاب کالی سیاہی اور نیزے کے قلم سے لکھی ہوئی ہے۔

اس کتاب کا قاعدہ ناظرین کرام سے کراتے ہوئے یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ چونکہ کتاب مذکور آج سے قریباً ستر برس پہلے کی لکھی ہوئی ہے۔ لہذا آج کل کے رسم الخط میں اوس وقت کی طرز کتابت میں کچھ فرق ہے۔ مثلاً کتاب مذکور کے مسودہ میں :-

۱۔ ہر جگہ بجائے ”چونکہ“ کے ”جو کہ“ لکھا ہے۔
۲۔ ساری کتاب میں کہیں ڈیش نہیں۔ اور نہ الگ الگ پرے ہیں بلکہ معنوں مسلسل چلا گیا ہے جہاں مولانا کو نیا فقرہ شروع کرنا ہو۔ وہاں علامت (—) بنا دیتے ہیں۔ مگر یہ علامت کتاب مذکور میں اکثر جگہ بغیر نئے فقرہ کے بھی بعض الفاظ پر لکھی ہوئی ہے۔

۳۔ ”اُنکی۔ اُسکی۔ اُس۔ اُن“ وغیرہ الفاظ کو بالعموم اس طرح لکھا ہے ”اونکی۔ اوسکی۔ اوس۔ اون“ وغیرہ۔
۴۔ تمام کتاب میں ”وْن“ غلط کا استعمال کہیں نہیں کیا گیا۔ ہر جگہ ”وَران“ لکھا ہے مثلاً ”ہیں۔ زبانیں۔ نہیں“ وغیرہ کو ہمیشہ ”ہیں۔ زبانیں۔ نہیں“ لکھا ہے۔ یعنی لفظ ”وْن“ میں نقطہ ضرور دیا ہے۔

۵۔ جہاں جہاں کتاب میں ”ٹ“ آئی ہے اس کو ہمیشہ اس طرح لکھا ہے ”ٹ“
۶۔ ”یائے مجہول کو بالعموم یائے معروف لکھا ہے۔ مثلاً ”نے۔ جتنے۔ ہے“ کو ”نی۔ جتنی۔ ہی“ تحریر کیا ہے۔

۷۔ حرفت گ کو ساری کتاب میں ک کی طرح لکھا ہے۔ مثلاً اگر کو اگر۔ گورنمنٹ کو گورنمنٹ لکھا ہے۔

۸۔ ”پیچھے لکھی“ وغیرہ الفاظ کو ہمیشہ ”پیچھے لکھی“ وغیرہ لکھا ہے۔ صرف ایک جگہ ”پاری کھلانے لگی“ کی بجائے ”پاری کھلانے لگی“ لکھا ہے۔

۹۔ ساری کتاب میں جے کہیں اضافہ کی علامت یعنی زیرِ نظر نہیں آئی ہیں زیرِ نظر پیشکش میں مولانا کی اس تحریر کو ہمیشہ ”س“ شکل میں ہدیہ ناظرین کر رہا ہوں جس رسم الخط کے ساتھ مولانا نے اسے اپنے قلم سے تحریر فرمایا تھا تاکہ آج سے قریباً سو برس پہلے کی طرز کتابت سے بھی قارئین کرام روشناس ہو سکیں۔ وہ ہو ہذا :-

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تمہید مطالب کتاب

خدا تعالیٰ جس طرح ہر ملک اور ہر ولایت میں نئی صورت اور نئی وضع اور نئے ڈھنگ کے آدمی بنائے اس طرح ہر ملک کے آدمیوں کو نئی بولی اور نئی زبان حمایت کی دیکھو عرب کی زبان اور ہے علم کی زبان اور ہندوستان کی زبان ان دونوں سے جدا ہے انکستان کی زبان تینوں زبانوں سے نہیں ملتی اسی طرح جتنی ملک ہیں اتنی ہی بولیاں ہیں اور ظاہری کہ آدمی مدنی اطمینانی ہر کام میں آدمیوں سے پہلی بولی اور دین دین کرنے کا محتاج ہے اور یہ سبھی ظاہر ہے کہ دنیا کے معاملات کا مدار زبان کے سمجھنے اور سمجھانے پر

ہی پس آدمی جس قدر زیادہ زبانیں جانتا ہوگا اسی قدر اس کے معاملات آسانی سے سرانجام ہونگے اور زبان کا جاننا ایک قیصر ہے کہ انسان جو ملک میں پیدا ہوا اس ملک کی بولی اپنے ماں باپ اور ناتے رشتے والوں سے اور پھر ہر ایک کی زبان سے سنتے سنتے سمجھ گیا اور ضرورت کے وقت اپنے دل کے مطلب اس بولی میں ادا کرنے لگا اور دوسرے یہ کہ اس زبان میں جو خواص کا محاورہ اور لہجہ چال ہے اس کے موافق تقریر اور تحریر کے سوبہ بات بدول اس کے حاصل نہیں ہو سکتی کہ اہل زبان نے جو اصول اور قواعد اس زبان کے تہذیب اور اصلاح کے لیے مقرر کیے ہیں اسے واقف ہو اور اگر بالعرض اپنی زبان کی تقریر اور تحریر میں ان اصول اور قواعد کے جاننے کا محتاج نہیں تو اس میں کچھ شک نہیں کہ دوسرے ملک کی زبان بدول واقفیت اصول کے ہرگز نہیں آسکتی جو کہ ہماری کورنٹ کی بہت عالی اس بات میں بہت معروف ہے کہ جو زبانیں ہندوستان میں رائج ہیں یا جن زبانوں کی کتابیں ہندوستانیوں کی درس و تدریس میں متعمل ہیں ان کی اصلاح بخوبی کی جائے اور ان کے اصول اور قواعد ایسے طور پر لکھے جائیں کہ ہر مبتدی بہ ادنیٰ توہر ادنیٰ قاعدوں کے ذریعے سے -

اول زبانوں میں تقریر اور تحریر کا سلیقہ پیدا کر سکے اور ایک اشتہار جو کورنٹ پنجاب دام انبالہ نے شائع عیسوی میں بولچہ انعام جاری فرمایا ہے اس کا مقدمہ مطلب یہ ہے کہ زبان فارسی کے اصول اور زبان میں عبارت روش و واضح بیان کئے جائیں اس لیے خاکسار پیچیدگان الطاف حسین انصاری پانی پتی خدا تعالیٰ کے بہرہ سے پر اس امر کا مقصدی ہوا ہر چند محکوم پانی پتی نے اور پیچیدگی سے توفیق نہیں کہ میری تالیف حضور کو رنٹ دام انبالہ میں پسندیدہ اور مقبول ٹھہرے لیکن اس رسالہ میں چند خصوصیات ایسی ہیں کہ اصول فارسی کے اہل کتابوں میں سے کسی کی خاص کتاب میں شاید نہ پائے جائیں ایک یہ کہ اہل کتابوں میں لوگوں نے جو زبان فارسی کے قواعد لکھے ہیں ان میں صرف و نحو کے اصول کو باجم ایسا غلو کیا ہے کہ صرف کے مسائل بخو کے مسائل سے ہرگز ممتاز نہیں ہو سکتے بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ صرف و نحو ایک فن ہے نہ کہ نام ہی حالانکہ صرف ایک جدا فن نہ ہو جہاں صرف میں مثلاً ایک حرف کا دوسرے حرف سے بدلا جانا اور مصدر کے تغیر اور مصدروں کے وزن اور فعلوں کی ضمیں اور اشتقاق کی کیفیت اور ابدال و اسکان و تحریک و قلب و وحدت و اشباع و ادغام و تخفیف و اشباع و امانہ کی بحث اور اسوں کے تغیرات لفظی کا بیان کیا جاتا ہے اور نحو میں مثلاً کلموں کی ترکیب دینے کا دستور اور اجزای کلمہ کے حالات اور اسناد اور اضافت و صفت و مطلق و تاکید و بدل و مبتدا و خبر و فعل و فاعل و نائب فاعل و مفعول و متشی و تاکید و ترکیب ناقص و ترکیب تام اور حرفوں کے استعمالات معنوی کا بیان کیا جاتا ہے -

ظاہر ہے کہ یہ دونوں بحثیں جدا جدا بیان کرنی منفعیت سے خالی نہیں سوا اس کتاب میں صرف کی بحث بخو کے فن سے بالکل جدا ہے -

دوسرے اہل کتابوں کی ترتیب مفید نہیں یعنی جو باتیں پہلے لکھنے کی ہیں وہ ان میں پیچھے لکھی گئیں اور جو پیچھے لکھنے کی ہیں وہ پہلے لکھی گئیں اور ظاہر ہے کہ حسن ترتیب کو مطالب کے و لفظی کر کے میں بڑا دخل ہے سوا اس رسالے میں رعایت ترتیب کی بہت ملحوظ رہی ہے -

تیسرے اصول فارسی کی اہل کتابیں جو رائج ہیں ان میں نحو کے اکثر مطالب نہیں بیان کئے گئے اور خاکسار نے حتیٰ الوسع مطالب نحو کو جو کہ میں قصور نہیں کیا -

چوتھے اصول کا لفظ کئی قرون کو شامل ہے صرف و نحو معانی بدیع سوچ تک کتاب میں یہ سب فنون بیان نہ کئے جائیں

کتاب ناقص ہے حالانکہ اس کتاب میں کوئی رسالہ ایسا نہیں دیکھا گیا جو ان پانچوں فنون کو شامل ہو اور اسرار عبدالواسع بانسوی اور شجرۃ الامانی اور نہر الفصاحت وغیرہ میں جو ان فنون کا کچھ کچھ ذکر ہے وہ کافی نہیں اس رسالہ میں پانچوں فن اپنے نزدیک اچھی طرح بیان کئے گئے ہیں ان کو جو باتیں ضروری نہیں سمجھیں یا جن کا بیان کرنا دلچسپاؤ سے خالی نہ تھا اور مبتدیوں کا فہم اُن کے سمجھنے سے قاصر سمجھا گیا وہ باتیں البتہ چھوڑ دی گئیں۔

پانچویں اکثر استادوں کے شعر جو بطور رسد کے لائے جاتے ہیں بعضے ادب میں سے و بعضے ہوتے ہیں اور اُن کے سمجھنے بغیر قاعدہ طالب علم کے سمجھ میں نہیں آتا سو خاکسار نے ایسے شعر و نکات جو کر کے اور سکا مطلب روشن اور واضح کر دیا ہے چھٹے ہر فن کے آخر میں تھوڑے تھوڑے سوال اُسی فن کے لکھ دیئے ہیں اور اُن کا جواب نہیں لکھا تا کہ پڑھنے والوں کو اُن کے دیکھنے سے بصیرت حاصل ہو اُن کے امتحان میں بیسے کام آئیں۔

اگرچہ میں خوش چین انہیں ہر کوں کا چوں اور اُنکے تالیفین اور تصنیفین ہوتیں تو بیشک جھک کتاب لکھی بہت دشوار ہوتے بلکہ شاید نہ لکھ سکتا لیکن دستور یہ ہے کہ جس کام کی طرف سلطان وقت کی توجہ ہوتی ہے وہ کام حد کمال کو پہنچتا ہے اور جو بات کوئی اہل علم اپنے دل کی آواز سے کرتا ہے اس میں کچھ کچھ نقصان رہ جاتا ہے ظاہر ہے کہ کورنٹ کے انتقال امر کے لیے جس امر سے ان میں کوکبھی و کوشش کی گئی اور کرتے ہیں وہ اکلون نے کامیابی کی ہو کیونکہ سلطان مافیہ نے اصول فارسی کی تہذیب کی طرف توجہ نہیں کی۔

تتبعیہ پارس جو ملک ولایت کا نام ہی سو وہ پارس بن پہلو بن سام بن نوح کی آباد کی ہوئی ہے اس سبب سے اس کو پارس کہتے ہیں جو زبان کہ اس ملک میں رائج ہوئی وہ فارسی کہلاتے لگی اور اوسیکو فارسی کہتے ہیں فارسی زبان کی کئی قسمیں ہیں درہی پہلی پاری ہر وہی سکر ہی نام کی تھی۔ درہی کو بعضے کہتے ہیں کہ کہیں اسفند باد کے درباریوں کی زبان ہے اور بعضے کہتے ہیں کہ کیا کہیں کے درباریوں بول جاتی تھے اور بعضوں کے نزدیک درہی وہ زبان ہے جو وہ کہہ کے رہنے والے بولتے تھے اوسمیں کسی غیر زبان کا ملاؤ نہ تھا بہر حال یہ زبان بہت فصیح گئے جاتی تھی پاری اس زبان کو کہتے ہیں جو خاص بلاد پارس میں رائج تھے پہلی کو بعضے کہتے ہیں کہ ولایت رُسیہ اور اصفہان اور ہمدان اور دیور اور اُنکے مضافات کی زبان تھی اور جو کہ اس ملک کو پہلو کہتے ہیں اس لیے وہ ان کی زبان کو پہلی کہنے لگے اور بعضی کہتے ہیں کہ پہلو پارس بن سام بن نوح کے باپ کا نام تھا یہ زبان اوسکی طرف منسوب ہے بہر حال یہ تینوں زبانیں رائج اور متعل رہیں اور باقی چار زبانیں ترک کہ کہیں جب سے مجھ میں اہل اسلام کی عملداری آئی عربی زبان کے لغت فارسی میں مخلوط ہو کر ایک نئی زبان بن گئی جیسے ہندوستان کی قدیم زبان فارسی اور عربی کے ملنے سے بالکل بدل گئی۔

اب جاننا چاہئے کہ فارسی زبان کی ایسی معرفت جس سے آدمی فصحا اہل زبان کے طور پر تقریر اور تحریر کر سکے اور حکومت کے استعمال کرنے میں اور کلام کے ترکیب دینے میں غلبیوں سے محفوظ رہ سکے کئی باتوں کے جاننے پر موقوف ہے اول لغت اور اصطلاح اور محاورے و دوسرے اشتقاق اور تصرف کے اصول تیسرے نظم کلام کا دستور چوتھے محسب مقتضای حال گفتگو کرنے کا طریقہ پانچویں ایک مطلب کو نئے نئے اسلوب سے ادا کرنے کے ناموسے چھٹے یہ بات کہ بعد رعایت فصاحت و بلاغت کے کلام میں کئی باتوں سے حسن و خوبی زیادہ ہو جاتی ہے۔

انہی سے پہلے بات بہر فن قاطع اور فرہنگ جہانگیری اور فرہنگ رشیدی اور فرہنگ سرودی اور مدارالافاضل اور مژدہ الفضلا

ادب ہمارے علم اور اصطلاحات و ارستہ اور سراج اللغۃ اور سوا اسکے اور لغت کی کتابوں سے طلب کرنے کی چاہی اور باقی پانچ مقدمے اس رسالے میں انشاء اللہ تعالیٰ بہت بسط اور شرح کے ساتھ بیان کئے جائیں گے اور سید اسطہاس کتاب کے پانچ حصے کئے گئے۔

پہلا حصہ علم صرف کے بیان میں

مقدمہ صرف کی اصطلاح کے بیان میں

پہلا باب حرفوں کے بیان میں

دوسرا باب مصدر اور مشتق کے بیان میں

تیسرا باب جامد کے بیان میں

خاتمہ سوالات علم صرف میں

دوسرا حصہ علم نحو کے بیان میں

مقدمہ نحو کے اصطلاح کے بیان میں

پہلا باب اسموں کے بیان میں

دوسرا باب فعلوں کے بیان میں

تیسرا باب حرفوں کے بیان میں

چوتھا باب مرکب ناقص کے بیان میں

پانچواں باب مرکب تام کے بیان میں

خاتمہ سوالات علم نحو میں

تیسرا حصہ علم معانی کے بیان میں

مقدمہ علم معانی کی اصطلاح کے بیان میں

پہلا باب اسناد خبری کے بیان میں

دوسرا باب مسند الیہ کے بیان میں

تیسرا باب مسند کے بیان میں

چوتھا باب فعل کے متعلقات کے بیان میں

پانچواں باب فقر کے بیان میں

چھٹا باب انشاء کے بیان میں

سب تو اں باب فصل و وصل کے بیان میں

آٹھواں باب ایجاز و احاطہ و مساوات کے بیان میں

خاتمہ علم معانی کے سوالات میں

چوتھا حصہ علم بیان میں

مقدمہ علم بیان کے اصطلاحوں کے بیان میں

پہلا باب تشبیہ کے بیان میں

دوسرا باب استعارہ کے بیان میں

تیسرا باب محاورہ و مرسل کے بیان میں

چوتھا باب کنایہ کے بیان میں

خاتمہ علم بیان کے سوالات میں

پانچواں حصہ علم بدیع کے بیان میں

مقدمہ علم بدیع کے اصطلاحوں کے بیان میں

پہلا باب صنائع معنوی کے بیان میں

دوسرا باب صنائع لفظی کے بیان میں

خاتمہ علم بدیع کے سوالات میں

تقریب

مولانا محمد علی جوہر

۱۸۹۱ء کی گرمیوں میں میکسیری عمر سائے سے گیارہ برس کی تھی میں اپنے بھائی مولانا شوکت علی کے ساتھ جنھوں نے اسی سال انٹرنس (ریا آج کل کی اصطلاح میں میٹرکولیشن) کا امتحان پاس کیا تھا، برقی کیمول سے علی گڑھ کے مدرسۃ العلوم میں پڑھنے کے لیے آیا میرے مجھے بھائی ذوالفقار علی خاں صاحب گوہر غالباً ہم سے پہلے ہی علی گڑھ آچکے تھے۔ اس ”نیچر گڑھ“ میں تقریباً سبھی طلباء کی ایک ہی سی وضع قطع تھی۔ شیعروانی، اچکن، تڑکی ٹوپی، سیدھا ڈھلا پا جامہ، قمیص، جراب، انگریزی جوتائی سب کا لباس تھا۔ کوئی شیعروانی کی جگہ تڑکی کرٹ پہنا کرتا تھا، تڑکی ٹوپی کی جگہ کوئی سیاہ ایرانی ٹوپی اوڑھا کرتا تھا، کوئی کبھی کبھار کڑا بھی پہن لیا کرتا تھا مگر داڑھیاں سوائے ایک آدمی کے سب کی منڈی ہوتی رہتی تھیں گروہیوں کے بھی صفایا کرانے کا فیشن اس وقت تک رائج نہیں ہوا تھا۔ ہاں سب کے آگے سے بڑھے ہوئے، پیچھے سے بندہ بچ زیادہ کترے ہوئے تھے جو آج سارے ہندوستان میں رائج ہیں اور جنھیں ولایت تک کی عورتوں نے اسی طرح کتر و نا قبول کر لیا ہے اور ”چٹا“ میں ”کراپ“ کے نام سے موسوم ہیں لیکن جس کچی بارک میں ہم تینوں بھائی رہتے تھے اسی کے پاس والی کچی بارک میں اور اس بیچ والے کمرے میں جہاں ایک عرصہ اُسے ”ٹول ہاؤس“ میں گیا ہے ایک وزارت امت مگر خالصہ و بے پینے صاحب رہتے تھے جو خالص ہندوستان کی چرائی وضع کی اچکن پہنا کرتے تھے، جن کی ٹوپی ان کے وطن امرتسر کی ساخت کی کشتی نما ہوتی تھی جس کو اب ”گانڈھی کیپ“ کہا جاتا ہے، جن کا داڑھی کا سلیم شاہی وضع کا مگر سادہ ہوتا تھا اور جن کے بال رسولی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح لانے تھے اور اگرچہ ”بردوش“ نہ سہی لیکن ”تابنا گوش“ ضرور آتے تھے، مگر ان لمبے بالوں کے باعث اچکن پہن کر دھیرہ نہ پڑ جاتے، وہ گردن میں ایک سفید خالصہ کا رومال اسی طرح ضرور باندھ لیتے تھے جس طرح سر سید رحمۃ اللہ علیہ اپنے گلے کی رسولی چھپانے کے لیے استعمال فرمایا کرتے تھے۔ یہ وضع قطع اس زمانہ کے بزرگوں کی اس وقت تک باقی تھی لیکن علی گڑھ جیسے ”نیچر گڑھ“ کے کسی طالب علم کا اس وضع قطع کو برقرار رکھنا اس زمانہ میں اس سے بھی زیادہ ناہیاں تھا جتنا کہ کسی یورپین لڑکی کا آج بڑے ہال رکھنا، نیچا سایہ پہننا اور گروہن، ہانڈوش اور ہاں سب کو کپڑے سے ڈھانپنا یا بلرنگ

لے امر وہر (لیوہی)، کی کشتی نما ساخت کی ٹوپی اور گانڈھی کیپ میں نمایاں فرق یہ تھا کہ گانڈھی کیپ تو عموماً سپید کھدی ہوتی تھی اور امر وہر ساخت کی ٹوپی ریشم اور کلاتون کی کٹڑی ہوتی تھی۔

اس لیے میری نظر بھی آئے ہی ان بزرگ پر پڑی اور اگر انھیں کسی اور طرح کا امتیاز نہ ملے حاصل ہوتا تب بھی میں ضرور اپنے بھائیوں سے پوچھتا کہ یہ اس عجیب و غریب وضع قطع کے بزرگ کون ہیں لیکن محمد واؤد صاحب کو کون نہیں جانتا تھا۔ علی گڑھ کا کالج میں اس وقت سب سے زیادہ ممتاز اور ہر دل پر بوجھ جاتا تھا اور جس میں محمد حبیب علیہ السلام صاحب، احمد حسین علیہ السلام صاحب، تقیم بیگ علیہ السلام صاحب چنتائی جیسے طلبہ شامل تھے اس کے سردار بھی پرانی وضع کے بزرگ تھے۔ ان کے کمرے پر بیسیوں ممتاز ترین طلبہ کا مجمع رہا کرتا تھا جن میں میرے بھائی ذوالفقار علی خان کو بہر بھی ہوتے تھے، حیدر آباد کے ممتاز افسر صاحب قطب الدین صاحب دہلوی (مٹو) بھی ہوتے تھے جو دھری ممتاز رہتے صاحب بھی ہوتے تھے اور چریاکوٹ کے ایک صاحب جن کا نام غالب احمد علیہ السلام صاحب تھا اور بوردنگ کے باہر اپنے والد بزرگوار خان بہادر سید زین العابدین صاحب کی کھٹی پر سنبھلے سید زین الدین بھی ہر روز میں آجاتے تھے جہاں ممتاز طلبہ کی جماعت کے پاس ہی رہتے تھے خوش بھی تھا مگر ساتھ ہی ساتھ تنگ بھی آگیا تھا کیونکہ ان حضرات کو کسی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ مجھے گدگی بھیگتی ہے اور مجھے بچکر یہ بھیگ گدگی لگتی ہے۔ مولانا طفیل احمد صاحب اور

۱۔ یعنی خان بہادر محمد حبیب علیہ السلام صاحب بی۔ اے (ملیگ)، ساہن کلکریو۔ بی۔ بی۔ جنھوں نے دت العمر اپنے دادا علی کی پیش ہا خدمات انجام دی ہیں اور آج بھی اس پر پانچ سالہ میں انجام دے رہے ہیں اور علی گڑھ ہی میں مقیم ہیں۔

۲۔ احمد حسین بی۔ اے مرحوم ۱۸۸۶ء میں کالج میں داخل ہوئے اور ۱۸۹۸ء میں بی۔ اے پاس کر کے ریاست رام پور کے اسٹیٹ لائی سکول میں پریکٹس ماسٹر رہے بعد میں انتقال ہو گیا۔

۳۔ مرزا تقیم بیگ چنتائی بی۔ اے (ملیگ)، اگر ہر کے رہنے والے ۱۸۸۵ء میں کالج میں فرسٹ ایئر میں داخل ہوئے ۱۸۸۹ء میں بی۔ اے پاس کر کے اول علی گڑھ کے ایک کلکٹر کی بیٹی کے جس کی آنکھیں خراب تھیں، پرنس اسسٹنٹ ہوئے پھر کالج میں ترمیم ہو گئے اس کے بعد اگر وہ کالج میں داخل ہوئے اور پھر اتفاق سے ٹیچر کلکریوئے۔ خان بہادر کا خطاب حاصل کیا۔ آخر میں جو دھری میں بھی رہے۔ بڑے لطیف گو تھے۔ ان کے کئی بیٹے تھے جن میں مرزا عظیم بیگ چنتائی نے ادبیات و افسانہ نویس میں بڑی شہرت حاصل کی۔

۴۔ یہ قادیانی فرقہ میں شامل ہو کر قادیان میں مقیم رہے۔ ان کے ہم معروں کا قول ان کے پاس ہے کہ بڑے لٹوگو تھے۔

۵۔ یہ دہلی کے نہیں بارہ بنگلے کے رہنے والے تھے ۱۸۸۰ء میں کالج میں آئے اور ۱۸۹۹ء میں بی۔ اے کیا۔ ابتداً فرج میں ملازمت کی پھر ریاست حیدر آباد میں تعلقداری کا عہدہ ملا اور افسر رہے۔

۶۔ جو دھری ممتاز حسین علیہ السلام صاحب غلامی بخش خاں ساکن پانی پت۔ ۱۰ جون ۱۸۸۹ء کو داخل ہوئے اور ۱۸۹۹ء میں انٹرمیڈیٹ کر کے نائب تحصیلدار پھر تحصیلدار ہوئے۔ کچھ عرصہ ریاست دو جہان میں مقیم بھی رہے۔

۷۔ مولوی احمد عظیم عباسی ساکن چریاکوٹ، علی گڑھ سے جا کر حیدر آباد میں کسی منصب پر فائز ہوئے۔

۸۔ خان بہادر سید زین العابدین مرحوم سر سید کے اصحاب خاص ہیں تھے۔ علی گڑھ میں عرصہ تک سب جج رہے۔

۹۔ مولانا طفیل احمد مرحوم ۱۸۹۶ء میں داخل ہوئے اور ۱۸۹۹ء میں فوٹو تھاپے آنکھوں کی خرابی کی وجہ سے تعلیم بزرگ کرنے پر مجبور ہوئے طبیعت کی یکسانیت کی وجہ سے ماؤد صاحب سے ان کے بڑے گہرے تعلقات دت العمر تک رہے کالج دہلی نور پور میں وکانفرس کی

گران قدر خدمات انجام دیتے رہے۔ (عباسی)

داؤد صاحب تو اس قدر متعجب اور سنجیدہ بزرگ تھے کہ وہ کسی کو کیا دینی کرنے مگر حبیب اللہ خاں صاحب، قیس بیگ صاحب اور زین الدین صاحب مجھے بے حد پریشان کیا کرتے تھے۔ ایک میر سے دو نوں کا تھکڑا لیتا اور سارا دونوں ٹانگیں، جب میں اس طرح "پا پست کرنے سے دست بردار کرتے" ان رندان باصفا کی صحبت میں گرفتار رہتا تو تیسرا ہیٹ میں گدگدی کرتا اور میں بیتاب ہو جاتا کرتا۔ اس کے بعد تو میری پریشانی نے اس قدر ترقی کی کہ حبیب اللہ خاں صاحب مجھے دور ہی سے دیکھتے تو اس طرح اپنے ہاتھوں کو حرکت دیتے کہ گویا مجھے گدگداتا رہے ہیں اور میں دور ہی سے بیتاب ہونے لگتا۔

اس زمانہ میں یونین کے افسروں کا انتخاب ہوا اور چونکہ اس وقت تک اسکول کے طلبہ بھی یونین کے ممبر ہو سکتے تھے تو ہم انتخاب میں راستے دینسکی خوض سے گھر نہ آنے گئے اور مجھے خوب یاد ہے کہ میں نے بھی داؤد صاحب کی پوری پارٹی کے جیسے باطل اہل اکثریت کے مطابق رائے دی جو ہم سب کو پہلے سے اسے دی گئی تھی تاکہ ہم اس کے نام یاد کر لیں۔ بیسوں نے شہر دونوں طرف سے نہ آنے گئے تھے اور بیکٹ صاحب خوش خوش پھر رہے تھے کہ یونین کی آمدنی بھی طبعی اور نجی راہی وجہ سے کسی نے غم نہ تو داخل ہو گئے اس سال غالباً منظم کنی صاحب "بھائی بھوشو" جن کے اس عہد کے لیے کالج کے کورس کا یہ شعر لکھا گیا تھا۔

محب ہے بھنگ کا پیالہ ادا ادا ادا ادا ادا ادا ادا
ہوا بھوشو کا منہ کالا ادا ادا ادا ادا ادا ادا ادا

دانش پرینٹنگ اور منچر داؤد صاحب کی شریٰ فتح ہوئے۔ دوسرے سال احمد حسین صاحب مرحوم اور حبیب اللہ خاں صاحب ان عہدوں کے لیے منتخب ہوئے اور غالباً تیسرے سال سید زین الدین صاحب اور مولانا شرکت علی۔ یونین نے ایک نظم کے لیے انعام کا بھی اعلان کیا تھا اور جن دو نظموں کے لکھنے والوں میں غالب تھا ان میں سے ایک کو کھپور کے کچھ افسر صاحب عوف "بخار" مرحوم نے بھی لکھی تھی اور ایک اس خاکسار نے اور غالب کسی کو یہ پیش کرتا تھا کہ انعام "بخار" صاحب ہی کے تصدیق کیا اور ہم یوں ہی رہ گئے اور مولانا شبلی مرحوم کی تختانی پر ایک موصفتک بے حد شک کرتے رہے کہ یہ کونسا انعام کا فیصلہ ان کے ہاتھ میں تھا۔

شہر میں جس شخص کے لیے اتنی کم عمری میں بقول غالب خود خواہش کی ہرگز گرد و دفن او "وہ بھلا داؤد صاحب پر کس طرح عاشق ہوتا جبکہ اسے اسی زمانہ میں معلوم ہو گیا ہو کہ داؤد صاحب کا بھی یہی فیصلہ میں نے سنا تھا کہ چودھری قمار حسین صاحب کو آج کے کلکٹر

لے سید زین الدین ایم۔ اے (علیگ)، ابتدا تو ٹیپ کلکٹر ہوئے پھر کلکٹر ریٹائر ہو کر ریاست رام پور میں یونیورسٹر ہے۔ شروع شروع میں چلے فیشن اہل تھے آخر میں اعلیٰ مذہبی کے محدود رجحانہ صوفی مش ہو گئے تھے۔

۱۷۔ مسٹر بیگ سارے سے ۱۸۷۵ء تک کالج کے پرنسپل رہے۔

۱۸۔ علی کو کچھ کالج کی شہزادین کا نام "سندس دین" ہے جو مسٹر ٹنٹس (ایڈیٹر) ۱۸۷۸ء تا ۱۸۸۳ء کے ریٹائر ہونے کے بعد شریک تھے ان کے نام سے قائم کی گئی۔

۱۹۔ جنوری ۱۸۷۸ء کو کالج میں داخل ہوئے تھے ان میں بی۔ اے کے پہلے نائب تحصیلدار اور کسٹمر پیکر اور میں ٹیپ کلکٹر ہوئے۔

۲۰۔ محمد انبیل مرحوم وہ لوہر افغان ساکن بھی ۳۳ جون ۱۸۹۰ء کو فرسٹ ایبلیں داخل ہوئے تھے۔ (عباسی)

سید زین الدین صاحب کے ساتھ خاص الفت تھی مگر زین الدین صاحب جس طرح ۱۹۲۱ء میں نان کو پریشوں پر ظلم کرنے پر مشغور تھے اسی طرح اس زمانہ میں چودھری صاحب پر یہاں تک ظلم فرمایا کرتے تھے کہ بچا رسے چودھری صاحب نے خود کشی کی ٹھان لی تھی اس قصہ کو داؤد صاحب نے ایک شنی کی شکل میں نظم کیا تھا اور ۸۹۱ء سے مجھے اس کا ایک شریاد تھا جس میں زین الدین صاحب کا اپنی کوٹھی پر بستے ہی گھبرا کر باہر نکل آنا بیان کیا گیا ہے۔

نہ ہوا سر دھجی نہ سر پہ چھاؤں اس پر طرہ یہ تھا کہ ننگے پاؤں

اس شنی کو کہیں بھلا کر نکھانے کی کسی کی زبانی میں نے یہ شعر سن لیا تھا اور گویا بیٹس کے باعث اب حافظہ بالکل بر باد ہو گیا ہے لیکن اچھٹا بندہ بچپن کے سنے سنائے شریاب تک یاد ہیں جب میرے عزیز دوست محمود احمد عباسی نے یہ ارادہ ظاہر کیا کہ اپنے مرحوم بڑے بھائی کی اس شنی کو وہ پھر شائع کرائیں گے اور تقریباً لکھنے کی مجھ سے فرمائش کر کے مجھے وہ شنی دکھائی تو میں نے سب سے پہلے اسی شنی تلاش کی اور عجیب مسرت ہوئی جب اس کو اسی طرح شنی میں اسی موقع پر جس کام میں نے اپنے حافظہ سے اوپر کو کیا ہے پایا۔ افسوس کہ دھت مفریاد سننے اور ہمدردی سے نصحت ہونے اور ٹکی کی شادی کرنے میں اتنا وقت بھی نہ مل سکا کہ اس شنی کو پڑھ سکتا البتہ ”مخبر خاں جاوید“ میں چند غزلیں اور متفرق اشعار اور یوسف خاں مرحوم کا مرثیہ شائع ہوا ہے ان کو پڑھ کر داؤد صاحب مرحوم کی بے تکلف شاعری اور ان کے کمال مفتح کا لطف اٹھایا۔ ان اشعار میں سے بھی بچپن کے حافظہ نے ایک شعر کا تذکرہ مجھے عطا کیا تھا چنانچہ اس کو بھی اسی مسرت سے پڑھا ہے

پچھوٹ اور ہم سے بس اب رہنے دیجئے

ہم بھی تو رات بھانک رہے تھے دراز سے!

البتہ اب جبکہ میری حوالہ داؤد صاحب مرحوم کی حوصلہ بازی زیادہ ہو گئی ہے اس شعر کے معاملہ پر نظر پڑی تو تعجب ہوا کہ ان جیسے بڑے اور مقطع بزرگ بھی کم از کم شعر میں دراز سے بھانک سکتا تھا! اعلان کرے کہ یہ شعر بھی شنی کی طرح صوبجات متحدہ کے نان کو پریشوں کا ایک قہرمان مسلمان کلٹر کی نشان دہی کا گایا ہوا مگر داؤد پوری سنجیدگی کے داؤد صاحب مرحوم کی طبیعت نہایت تکلفی تھی اور مولانا حالیؒ کی ایک مشہور غزل کے مقطع پر چھپین انھوں نے لکھی تھی اس نے تو مولانا حالیؒ تک کہ یہ کہنے پر مجبور کر دیا تھا کہ داؤد میری ساری غزل سے لمبی صحت میرا غلط مقطع سے نکال ڈالیں تو میں خوش ہوا خدا خوش ہوئے غرضیں بھی ملائی تھی۔ ایک ہی مصرعہ نے مولانا مرحوم کے شعر کا سنیا ناس کر دیا، چھٹنے سے

گر کرے قصہ کسی کام کا دل میں انساں پہلے یہ دیکھے وہ اس کام کے پہلی نمایاں

مسن کے ڈگوں سے کہو آئے تھے آؤں کے ماں ان کو حالی بھی جلاتے ہیں گھر اپنے مہماں

دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

۱۔ یمنی تحریک عدم مراعات و تعاون کو کانگرس نے حکومت کے خلاف چلائی تھی۔

۲۔ داؤد صاحب مرحوم کے کمال مجاہدہ کا کام کو شائع کرنا مقصود تھا۔ (عباسی)

بزرگوں کی شان میں داؤد صاحب نے صرف یہی ایک گستاخی نہیں کی تھی کالج میں ایک عرصہ تک ”نسل“ میں ایڈیٹر عظیم کوہ بوم کا لقب ملتا تھا۔ اس نسل کے بوم کو مولانا شبلی رحمت اللہ علیہ کی صحبت میں رہنے کا حشمت تھا جب کالج کا گروپ ڈیوٹ لکھنے لگا تو ”بوم“ صاحب فوراً مولانا شبلی کی کرسی کے پیچھے آکر کھڑے ہو گئے جس پر داؤد صاحب نے اسی وقت کہہ دیا ہے

آج کالج میں مج رہی ہے دھوم طلبہ کا ہے ہر طرف سے ہجوم
بول اٹھی روح سعدی جوم ”کس نہ آید بزرگ یہ بوم“
الامولانا شبلی عظیم دوم

چودھری خوشی محمد خان صاحب کالج کے ”پریٹ لاریٹ“ اور اپنے قد کے لحاظ سے ”لانگ فیلو“ تھے اور آرنلڈ صاحب اور مولانا شبلی خاص طور سے ان کے مداح تھے چودھری صاحب کو زبان پر پردی قدرت نہ تھی اس لیے کبھی نظم میں داؤد صاحب اور کبھی نثر میں عبدالحی صاحب (جو آج کل اودنگ آباد سے اردو کی خدمت کر رہے اور اس زمانہ میں کالج میں مینٹ پال کے عرف سے معروف تھے) چودھری صاحب کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ چودھری صاحب نے ناموس کی نظم ”سینرٹس“ پڑھ کر جو ان کے کورس میں داخل تھے ایک نظم لکھ بھیجی جس پر مولانا شبلی کے مشورے آرنلڈ صاحب نے انھیں ایک انعام مرحمت فرمایا تھا۔ اس میں ایک بیت پر چودھری صاحب کھٹکے لکھے کہ

”ناظر اب سیر سبزہ کر ڈالو

ناظر آپ کا تخلص تھا اور قد میں ناظر صاحب کے متعلق کیا جا سکتا تھا کہ ”انظر الی الامل کیفت خلقت“ اس لیے ناموس پر کیا کہ اس مصرع کی داد نہ دی جائے جو داؤد صاحب نے اس پر لکھا تھا۔

ناظر صاحب فرماتے ہیں — ناظر اب سیر سبزہ کر ڈالو

داؤد صاحب اسی پر فرماتے ہیں — اپنے آنکے کی گھاس چر ڈالو

نواب محسن الملک مرحوم جب حیدرآباد چھوڑ کر علی گڑھ چلے آئے اور وہ طلبہ جو سرسید کے ڈیوٹ سے ڈرتے تھے اب نواب صاحب کے پاس جانے لگے اور علی گڑھ کے سدابہار کھانے کی حسب دستور شکایت کرنے لگے تو نواب صاحب نے بھی

ملے چودھری صاحب نے ۱۸۹۳ء میں علی گڑھ سے فرسٹ ڈویژن میں انگریزی و فارسی میں آنرز کے ساتھ بی۔ اے کیا عرصہ تک ریاست شیر میں اعلیٰ منصب پر فائز رہے تو قیظیں بہت لکھی ہیں۔ انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسوں میں خاص طور سے حصّے تھے۔

ملے ڈاکٹر مروتی عبدالحی صاحب (بابائے اردو) ولد مشتعلی حسین مرحوم ساکن لاہر موضع میر ۱۳، اپریل ۱۸۹۰ء کو درجہ نہم میں داخل ہوئے

اور ۱۸۹۱ء میں فرسٹ ڈویژن لی۔ اسے کیا عرصہ دراز تک ریاست حیدرآباد میں سلسلہ ملازمت رہے اور اورنگ آباد کالج کی پرنسپل کے زمانہ میں انجمن ترقی اردو کے ذریعہ اردو زبان کی ترویج پر اہم خدمات انجام دیتے رہے۔ پھر دہلی سے دہلی چلے آئے اور کچھ عرصہ اردو کادفر، کتب خانہ اور پریس بھی وہیں منتقل کیا جو خدمات کے زمانہ میں سبٹ لٹریچر۔ اس بنا ہی کے بعد کراچی آئے اور یہاں از سر نو انجمن کادفر، کتب خانہ پریس قائم کیا اور اردو کالج کی بنیاد ڈالی جو اب ایک اعلیٰ پایہ دست گاہ ہے۔ (عجاسی)

”حسب وقود“ اصلاح کے بہت سے وعدے کیے، ان وعدوں سے خوش ہو کر چودھری صاحب نے فارسی میں ایک نظم لکھی جس کا قافیہ ”جان“ اور ”نان“ تھا اور مولانا شمس کی شاگرد رشید اور محبوب خاص نے اسے مولانا ہی کے انداز سے یونین میں پڑھا۔ ان کے بہت سے شاگرد آج نقل اتار سکتے ہیں گے، اسی بجز اور قافیہ میں داؤد صاحب نے بھی فوراً ایک شعر لکھ دیا اور اسی انداز سے اپنے خاص حلقہ میں پڑھ کر سنا بھی دیا، وہ یہ تھا۔

”خوب تر محمد انوری ہی کند

اشتر پنجاب در ہندوستان“

اب قافیہ میں کرام داؤد صاحب کے لکھے ہوئے مصرعہ کا لطف پوری طرح اٹھائیں گے۔

ناتوا! اب سیر سبز و کر ٹوا

اپنے آگے کی گھاس چرٹوا

مگر جہاں تک مجھے یاد تھا اسی قسم کی ایک اور گستاخی کا یہ صلیح لکھ کر شہر و خاندان کی شان میں داؤد صاحب نے نہیں کی تھی بلکہ وہ میرے بڑے بھائی ذوالفقار علی خاں صاحب کو بہر کی شرارت تھی، محمد سلیمان صاحب اس زمانہ میں بورڈنگ ہاؤس کے ”پرائکٹر“ تھے گو اس وقت ان کا لقب ”مجتہد“ تھا جسے وہ اس طرح لکھا کرتے تھے کہ عام طور پر طلبہ اسے ”مجتہد“ پڑھا کرتے تھے۔ مولوی سعید احمد صاحب غالباً محاسب تھے، مولوی بدر الحسن صاحب مرحوم (بھائی بدو) میرے درجہ کے استاد تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی علاء الحسن صاحب اس وقت تک طالب علم ہی تھے۔ اس خاندان کو کالج کے ساتھ مشفق تھا اور متعدد غنظین اور طلبہ اس نے کالج کو جسے تھے

لے۔ یہ گو بہر کی شرارت نہ تھی، داؤد صاحب مرحوم ہی کی بدقسمتی تھی۔ گو بہر کے کالج میں آئے اور ۱۹۸۹ء میں داخلہ لینے سے بقول خان بہادر مولوی محمد حبیب اللہ خاں صاحب برسوں پہلے سے داؤد صاحب کا یہ لطیفہ کالج میں مشہور اور زبان زد خاص و عام تھا۔ مولانا لکھن علی خان صاحب نے جو گو بہر صاحب سے سالہا سال پہلے سے کالج کے طالب علم تھے، اپنے اخبار ”زمیندار“ کی ایک اشاعت میں ایک موقع پر لکھا تھا۔۔

”محمد داؤد مرحوم کو جو راقم الحروف کے زمانہ طالب علمی میں، رشتہ معلوم کے ایک تمیز رشید تھے، مبداء فیاض سے سخن سرائی کا ایک خاص ذوق مرحمت ہوا تھا، شعر و ادب میں سیر کرتے تھے اور ظرافت و ہجو کا خاص حصہ تھی۔ اتفاقاً ایسا ہوا کہ کاندھلہ سے جتنے لوگ علی گڑھ آئے تھے، ان میں شرفائی کی خدمت واقع ہوئے تھے اور قدرت نے ان کے سیم کو ڈھنپیں لیکن سروں کو غور و جھڑپا کھنڈ، خاندان الہاں کر رکھا تھا، اس پر مرحوم کو ذیل کی بھتیجی شرمیلی جو اسی وقت کالج کے سرپرست تھے کی زبان پر تھی۔

آتا ہے کاغذ سے سے جولا ہے سر پہ گنج

تاروں نے راستہ میں لٹایا خزانہ کیا“

خود مولانا شمس کی مرحوم نے اپنے مضمون میں جو داؤد صاحب مرحوم کے حالات پر لکھا تھا، اس لطیفہ کو مرحوم ہی سے منسوب کیا ہے۔ (جمالی)

مولا کا جے کے ساتھ اس عشق کے ساتھ ہی ساتھ ایک خاصہ اس خاندان کا اور بھی تھا جس کو گو کہ ہر نے اس طرح باندھا تھا ہے
 آتا ہے جو وہاں سے وہ لانا ہے سر پہ لٹچ
 قاروں نے کا نہ چلے میں ٹٹ یا خزانہ کیا
 تار میں کرام کو یقیناً آتش کا مشورہ شر یا د ہو گا ہے

یہ اسی مشہور شعر کی خرابی کی گئی ہے اور علاء الحسن صاحب مرحوم کی شان میں یہ تصرف کیا گیا تھا۔ محمد احمد صاحب جامی کا خیال تھا کہ یہ ان کے
 مرحوم بھائی کا تصرف تھا کیونکہ انھوں نے داؤد صاحب کو ضرور اسے پڑھتے سنا ہو گا مگر مجھے یاد تھا کہ یہ تصرف میرے بڑے بھائی نے کیا
 تھا چنانچہ میری لڑکی کی شادی میں جب وہ تشریف لائے تو خود ان سے پوچھا گیا اور میرا حافظہ صحیح نکلا۔

مولانا ظفر علی خان و خان بہادر محمد حبیب اللہ خاں و مولانا طفیل احمد صاحب مرحوم و خیر خواہ نسبت مولانا محمد علی مرحوم کے اس زمانہ کے حالات
 سے زیادہ واقف تھے اور ان سے دس بارہ سال پہلے سے کالج میں جو رہتے اس لطیفہ کو دو مرحوم کی کشفِ ظہری سے منسوب کرتے
 رہے ہیں۔ علاوہ بریل گوہر صاحب کے کالج میں داخل ہونے سے بارہ برس پہلے سے کاڈھ کا یہ خاندان وہاں موجود تھا۔ مولوی محمد اکبر
 مرحوم ۱۸۷۵ء سے عربی کے استاد تھے اور ان کے چچے بڑے بھائی محمد سلیمان مرحوم بورنگ کے میسر تھے۔ یہ دونوں بھائی مرستیہ کے استاد
 مولوی نور الحسن کے فرزند تھے اور مولوی نور الحسن مفتی انبی غنی مرحوم ساکن کاڈھ کے پوتے تھے۔ مفتی صاحب نے فتویٰ مولانا روم کا ساڑا
 دفتر لکھا تھا جو راز داہیں مولانا رومی کے کلام کے ہم پاری تھا۔ مفتی صاحب اپنے زمانہ کے جید عالم ہونے کے باوجود بڑے سادہ مزاج
 اور سید احمد شہید کے دستِ گرفتہ تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ ساری عمر میں نے مذہبی علوم کو پسایا، وہ دلیا تھا ریت احمد شہید سے صحبت
 کرنے کے بعد وہ میدہ ہوا۔ مرستیہ کو چو کہ اس خاندان سے شاگردی کا تعلق تھا انھوں نے کالج کی ابتدا ڈھلنے کے وقت سے
 ہی مولوی محمد اکبر اور مولوی محمد سعید کو کالج میں لا کر رکھا۔ مولوی محمد اکبر کے بڑے بیٹے بدر الحسن (بھائی بدو) ۲۶ جون ۱۸۷۵ء کو کالج میں داخل
 ہوئے اور سب جج تک ترقی کی۔ علاء الحسن ۱۸۷۷ء میں جب داؤد صاحب مرحوم نے داخلہ لیا ہے انھوں میں داخل ہوئے اور
 ۱۸۹۳ء میں بی۔ اے پاس کیا۔ یہ محمد محمود مرحوم کی سفارش پر بی۔ اے میں داخل ہوئے ان کے فرزند ظہیر الحسن بی۔ اے میں تیس کاڈھ چلے ہیں۔ مولانا
 محمد علی نے یہ شعر لکھی غلط نقل کیا ہے بعض الفاظ کا رد و بدل ہو گیا ہے مولانا ظفر علی خاں نے صحیح لکھا ہے، دونوں کے فرق کا اندازہ
 اہل ذوق بخوبی کر سکتے ہیں۔ آتش کے مشورہ شر کا پہلا مصرعہ ملی مولانا ظفر لکھ گئے ہیں۔ اصل مصرعہ ہے:

ظ۔ زبیر میں سے آتا ہے جو گلِ سوز و بکث

اس میں تصرف کر کے داؤد صاحب نے فرمایا تھا ہے

آتا ہے کاڈھ سے جو لانا ہے سر پہ لٹچ

(مبایں)

قاروں نے رستہ میں لٹی یا خزانہ کیا

یہ سب اس لئے ہوئے پر لطیف زمانہ کی یا قلعی جگہ کی اور علی گڑھ کی موجودہ تباہی پر ایک بار اور انسوگر و انگلی بھلا اس کو کس طرح تقریباً کہا جاسکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تادمین کرام داؤد صاحب مرحوم کے اشعار کو خود ہی پڑھیں گے اور ان کا خطا تھا نہیں میں صاحب اور دربان بن کر ان کو زیادہ دیر تک روکنا نہیں چاہتا۔ پردہ اٹھا دیا گیا اور روازہ کھلا ہے آگے بڑھئے اور داؤد صاحب کی شکستہ ترین طبیعت سے ملاقات کیجئے اور ان کی روح پر نفاخہ پڑھ جائیے۔ میں بھی دست بدعا ہوں اور اشک ریز، لیکن اس دیدہ نظر کے ساتھ ہی ساتھ اس وقت جو مٹوں پر سیم آئے بغیر بھی نہیں رہتا صاحب اس کا خیال آتا ہے جو لڑکا آج سہ ماہ میں پشیر داؤد صاحب کی دست قطع پر تعجب کرتا تھا کہ علی گڑھ جیسے مقام پر رہ کر وہ لائے بال رکھتے ہیں اور امر و سرکشی ناشاپنی اڑھتے ہیں یا گئے ہیں رومال باندھتے ہیں اور دسی بکین پہنتے ہیں اور دہلی کا سلیم شاہی جوتا، آج اس کے بال بھی ان ہی کی طرح لائے ہیں، وہ بھی گاڑے کا کرنا اور پاہا پہنے بیٹھا ہے، ایک نئی خوش کا جوتا پیروں میں ہے، دھڑی لائی ہے، ایک نئی بھی نہیں بلکہ عیا پہنے ہوئے ہے اور علی گڑھ ہی نہیں آکسفورڈ ہی پڑھ چکا ہے اور اس وقت بی اینڈ او کمپنی کے جہاز پر صاحب لوگوں اور میروں اور فیشن ایبل ہندوستانیوں کے درمیان "ٹریک" پڑھنا چاہا یہ "تقریباً" لکھ رہا ہے اور مرتے مرتے پورپ کے بہت شفا کو بھی آزاد کیجئے کی غرض سے عازم انگلستان ہے۔

ک رہے نزل میں ہوس آویں گی کر دیجیں

(غیر مطبوعہ)

(اعلیٰ محمد احمد عباسی)

شعر اور زندگی

ڈاکٹر یوسف حسین

آرٹ یا شاعری کی جب اجتماعی توجہ کی جاتی ہے تو ذہنی اور فکری تصور اتنا بے چھا جاتا ہے کہ انفرادیت میں تحیل اور جذبے کی جو کارفرمائی ہوتی ہے وہ نظر انداز ہو جاتی ہے۔ غالب کے کلام کو اگر صرف اس نفعہ نظر سے سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ وہ مغلیہ سلطنت کے زوال کا گہری نغمہ سے وابستہ تھے تو یہ بات بک طرف ہوگی۔ غالب کی انانیت ان کی شانِ امارت اور طبقاتی زندگی کا عکس سہی لیکن میر صاحب کی انانیت کی کیا توجیہ کیجئے گا جو ایک متوسط طبقے کے فروغ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی انانیت غالب کی انانیت سے بڑھی ہوئی تھی۔ اس قسم کی سائنٹیفک توجیہ اکثر میکا کی بے جان اور بے لطف ہو جاتی ہے۔ جس میں بن مانے طور پر نرسے ٹکے اصول تو نظر ہوتے ہیں جو زندگی کی پیچیدگی پر پوری طرح سے حاوی نہیں ہو سکتے۔ ان سے کسی صحیح نتیجے پر پہنچنا ممکن نہیں۔ ممکن ہے یہ کہنا جائے کہ انفرادیت میں تحیل اور جذبے کے نقش و نگار بھی خارجی احوال کا عکس ہوتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ جذبہ و تحیل پر خارجی حالات کا اثر ہوتا ہے اور اگر کسی شاعر کے گرد و پیش کے حالات کا علم ہو تو اس کے کلام کو سمجھنے میں ایک حریف مدد ملے گی۔ اگر یہ حالات بدل جائیں گے تو شاعر کے قلوب میں بھی یقینی طور پر تبدیلی پیدا ہوگی۔ غلط سالی کے زمانے میں عشق و عاشقی کے مشغلے میں اگر کسی امہائے نو اس پر غلبہ نہ ہونا چاہیے۔ شیخ سعدی نے اسی لغیباتی حکمت کی طرف نہایت بلیغ اشارہ کیا ہے۔

جہاں خط سالے شد اندر

کہ یاراں فراموش کردند عشق

اس شعر میں حقیقت پسندی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ اور عام طور پر انسانوں کی نفسی کیفیات کو دیکھتے ہوئے اس کی صداقت غیر مشتبہ ہے۔ انسان کی یہ فطرت ہے کہ اس کی فوری جلی ضرورت اس نفعہ سے پر حاوی آجاتی ہے جو فوری نہیں ہے آخر الذکر کے نفوس و حسد بڑھ جاتے ہیں اور اسی مناسبت سے ان کا احساس مبہم ہو جاتا ہے۔ مثلاً غلط کے زمانے میں جنت کی ساری قوتیں روٹی کے حصول پر صرف ہوں گی۔ یا اگر کسی کو دشمن سے ہڈیاں ہو جو جان کا لاگڑے تو ایسی حالت میں جنسی حیات عارضی طور پر دب جائے گی۔ ایسا ہونا قدرتی ہے اور زندگی کی حکمت کا یہی تقاضا ہے۔ ایسا ہونے کی ضرورت اس واسطے ہے تاکہ ارادے اور بھجان کی سب توانا نمایاں فوری مقصد کے حاصل کرنے میں ٹوڑن سکیں اور ایسا نتیجہ برآمد ہو

جو مجموعی طور پر زندگی کو ترقی اور فروغ دینے والا ہو خارجی عالم میں زندگی کا یہ عمل لازمی طور پر اخلاوی پہلوئے ہونے ہے جو ہمارے شعور کی سطح پر چھا جاتا ہے۔

ممكن ہے فقط سالوں کے زمانے میں یا در لوگ عشق کو فراموش کر دیں لیکن قسط کے کم ہوتے ہی دہی ہوئی خواہشوں کے چہنئے ابل پڑیں گے اور ان کی شدت معمول سے زیادہ ہوگی۔ اور غالب کا تو یہ خیال تھا کہ جذبات خارجی احوال کے آگے چاہے وہ کیسے ہی نامساعد اور سخت تشنگن کیوں نہ ہوں اپنا مزہ نہیں جھکاتا۔ اس کے اسباب خود اس کے اندر پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اس شعر میں اسی جانب اشارہ ہے۔

کو کین گر سمنہ مزدور طرب گاہ قریب

بے ستموں آئینہ خواب گراں شیریں

فارسی اور اردو شاعری میں فرماؤ ایک علامتی ہستی ہے۔ وہ الوکھا مزدور ہے۔ وہ پیٹ کے لئے نہیں بلکہ عشق کے لئے مزدور کی کرنا ہے۔ اس کے عمل نے زندگی کی معاشی تعبیر کو باطل ثابت کر دیا ہے۔ غالب نے ان سب باتوں کو جاننے ہوئے بھی ایک جگہ فرماؤ کی مزدوری پر چوٹ کی ہے جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ان کا عشق فرماؤ کے عشق سے زیادہ بے لوث ہے۔ شعر ہے۔

عشق و مزدوری محشر ت گنہگار کیا خوب

ہم کو کسیم کچھ نامی مند باد نہیں

در اصل غالب اور شیخ سعدی کے خیال میں نفاق و نہیں ہے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں اور دونوں میں اہمیت اور صداقت موجود ہے۔ بڑا مفکر یا احساس فن کار اپنے بچے میں ایک صداقت محسوس کرتا ہے جس سے زندگی کے کسی خاص رجحان پر روشنی پڑتی ہے۔ لیکن یہ صداقت اضافی حیثیت رکھتی ہے۔ جب کسی سطحی علم والے کے کان میں اس کی جھجک پہنچتی ہے تو وہ اسے ایک متعل نظر بنادیتا ہے جو اس کے نزدیک تا فون فطرت کی طرح اعلیٰ ہوتا ہے۔

پچھلے کچھ دنوں سے ہماری شاعری میں سببائی اثرات کے تحت ایک خاص قسم کی خفیت نگاری نے راہ پائی ہے اس میں شبہ نہیں کہ عشق بنان کے ساتھ دیگر معاش کا مسئلہ زندگی کے لئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے غم عشق اور غم روزگار دونوں اپنی اپنی جگہ اہم ہیں۔ شعر زندگی کی آئینہ داری اسی وقت رکسکتا ہے جب کہ اس میں قدرتی زندگی کے ہر پہلو کو اپنے میں سمونے کی صلاحیت ہو۔ انسانی زندگی کے پیچیدہ نظام میں معاشی عمل کی اہمیت واضح ہے۔ اس مضمون میں بھی احساس کی حدیث اور صداقت اسی طرح پیا کی جا سکتی ہے جس طرح عشق و عاشقی کے مضمون میں۔ اب تک ہمارے شاعر و نئے نئے نخل حسین خاں کے عیش کا ذکر کیا لیکن اب زمانہ بدل چکا ہے۔ اب نخل حسین خاں کے عیش میں کھو او رکھ لیاں بھی برابر کی شرکت کے معمول ہار چکے ہیں۔

لہ غالب کے مدح نواب نخل حسین خاں الیٰ فرخ آباد کی طرف اشارہ ہے جن کی مدح میں غالب ایک قطعہ لکھا تھا جو کہ پہلا شعر یہ ہے۔

و یا ہے خلق کو بھی ناسے فطر نہ لگے ہنایے عین نخل حسین خاں کے لئے

گلو غالب کا خاص ذکر تھا۔ کلبان بھی ان کے لازم کا نام ہے جو کہا نہ تھا۔

حقیقت کو کوئی ادب نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے غزل کے مقابلے میں نظم میں معاشی نوعیت کے مضمون زیادہ رودانی اور خوبی سے ادا ہو سکیں لیکن غزل میں بھی ان کی نسبت اشارے آجائیں تو کوئی قیامت نہیں۔ لیکن ذرا اس کا خیال رکھیں کہ شعریت مجرد نہ ہو۔ موضوع چاہے کچھ بھی ہو اگر شاعر نے اپنے حسن اور اسے شعریت کو برقرار رکھا تو اس کے کلام کا پایہ بلند رہے گا۔ جس طرح کوئی لفظ غیر نہیں جسے شعر میں نہ استعمال کیا جاسکے اسی طرح کوئی موضوع ایسا نہیں جسے شاعر نہ برت سکے۔ ممکن ہے ”تنگ نالے غزل“ کی نسبت نظم میں سماجی اور اخلاقی مضمون زیادہ اچھی طرح کھپ سکیں۔ اسی لئے آئندہ ہماری زبان کی توسیع اور ترقی میں نظم جو کام کرے گی وہ شاید غزل نہ کر سکے۔

سائنس و طب کے تغیر کی اصطلاح پہ جمل بہت کچھ سننے میں آ رہی ہے۔ اس سے فالیا مراد چھوٹا کہ خارجی احوال سے شعر و سخن کو پرکھا جائے۔ گویا اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا خارجی احوال کے مقابلے میں اسی قسم کا رد عمل برتاوے جیسے امیبیا کا۔ یہ مفروضہ غلط ہے۔ بعض لوگوں کو اس میں شبہ ہے کہ کیا ادبی تغیر واقعی سائنس و طب کا رد عمل ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اجتماعی علوم نے بھی بزم خود کو خود دعوے کیا تھا کہ ہر سائنس و طب میں۔ ان کے اس دعوے کا بول کھل چکا ہے۔ آج سماجیات، معاشیات اور سیاسیات یہ دعویٰ کرنے ہوئے چلی گئی ہیں۔ ان علوم کو اپنی نارائیوں کا روز بروز احساس برحقا جا رہا ہے کہ کیا معاشی اور معاشی قانون طبیعیات کے قانونوں کی طرح اہل ہیں۔ اس سوال کا یہ جواب ہے کہ انسانی اعمال کے محرک اور ان کی نوعیتیں اس قدر پیچیدہ اور الجھی ہوئی ہیں کہ سائنس کی طرح انہیں سادہ اجزاء میں تحلیل نہیں کیا جاسکتا۔ ان میں ربط و ترتیب اسی وقت قائم ہوتا ہے جب کہ ان کے احوال و اسباب کے سلسلے کا نفسیاتی جائزہ لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس نفسیاتی جائزہ میں بھی سائنس کی سی بے لوثی کبھی نہیں آسکتی۔ لیکن پھر بھی اس کے بغیر چارہ نہیں۔ ادب کی طرح اجتماعی علوم میں طبیعی علوم کی طرح بے جان اور بے حس اور بے ارادے مادہ سے بحث نہیں ہوتی بلکہ انسان سے بحث ہوتی ہے جو شعور اور ارادہ اور خواہش رکھتا ہے اور جس کو اپنے احوال میں ایک حد تک تصرف کرنے کی قدرت حاصل ہے۔ وہ مجبور محض نہیں ہے اور یہی عقیدہ اس کی اخلاقی بصیرت کا ضامن ہے۔ اسی لئے زندگی کے تمام ظاہر کی تحقیق علمی بھی ہے اور فنی بھی۔ بعض اوقات زندگی کو سمجھنے کے لئے ان غیر عقلی اور جبلی رجحانوں کا کھوج لگانا ضروری ہوتا ہے جو کسی خاص زمانے میں اجتماعی یا انفرادی زندگی میں محرک ہوتے ہیں۔

خارجی احوال کے علاوہ فن کاری روحانی آزادی کو بھی ماننا چاہئے۔ اعلیٰ درجے کے آرٹ کی تخلیق کسی بندھے لگے اجتماعی پروگرام کے تحت عمل میں نہیں آتی۔ جس میں انفرادیت کا وجود موجود نہ ہو۔ جو قوموں میں عام لوگوں کی تعلیم کا معیار اچھا خاصا ہے ان میں بھی فن کار اپنے آرٹ کو عوام کی ذہنی اور جذباتی سطح پر نہیں لانا بلکہ عوام کو اپنے بلند معیار تک لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ دنیا کے جتنے بھی بڑے فن کار یا شاعر ہوئے ہیں انہوں نے عوام سے اپنا رشتہ رکھتے ہوئے بھی اپنے معیار کو ان کی ذہنی سطح سے بلند رکھا ہے۔ دانتے، شکسپیئر، گوٹے اور غالب اپنے اپنے ماحول سے تعلق رکھتے ہوئے بھی اس سے کس قدر بلند ہیں۔ گوہر و پیش کے اثر کے باوجود ان کے کلام میں کس قدر عالمگیریت ہے۔ جس طرح سیاست و معیشت میں بنیادی سوال یہ ہے کہ فرد کا سوسائٹی سے کیا تعلق ہے اسی طرح آرٹ کا بھی

ہی بنیادی مسئلہ ہے۔ جدید ہندو کا بڑا عجیب یہ ہے کہ وہ ذہن کو میکا کی مپنی کی طرف لے جاتی ہے۔ فن کار سے تو خلق کی جاتی ہے کہ وہ بنے بنائے سچوں کے مطابق اپنی تخلیق کرنے تاکہ پیسے سے ضرورت کی ساجی ضروریات کی تکمیل ہو۔ یہ سماجی ایسی معاشرتی قدروں پر مبنی ہوتے ہیں جن سے فنکار چھٹکارا نہیں پاسکتا۔ وہ معاشیات کے رسد و طلب کے قانون کی پابندی اپنے فکرو فن میں بھی کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ سرمایہ داری کے تمدن میں کام کی نوعیت ایسی ہے کہ وہ انسان کی روح سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ انسان اپنے کام میں کوئی تخلیقی لطف اور جوش نہیں محسوس کرتا۔ آج کسی کا خانے میں مہینے کا کام کرنے والے کی حیثیت ازمنہ و مسئلے کے کارگر سے بنیادی طور پر مختلف ہے جو اپنی کارگیری میں اپنی شخصیت کا ایک جزو رکھ دیتا تھا۔ آج مہینے پر کام کرنے والا صرف ایک چہرہ یا مہینے کے ایک حصہ کی نسبت واقفیت رکھتا ہے اور اسی حد تک اپنے کام کو محدود رکھتا ہے۔ اس کے کام کی تخصیص پوری مہینے سے بھی اس کا کوئی حلقہ یا جذباتی تعلق نہیں قائم ہونے دیتی۔ اسی لئے اس زمانے کا مزدور یا کارگر اپنے کام میں کوئی لطف یا شوق نہیں محسوس کرتا۔ اس کا کام بھی میکا کی ہو کر رہ گیا ہے جس میں جس نام کو نہیں۔ اسی لئے جدید تمدن کی مشقت انسانی صلاحیتوں پر بڑا ظلم ہے اس تخصیص میں کتنی ہی افادیت کیوں نہ ہو لیکن انسانی تخلیق سے اس کو کوئی واسطہ نہیں۔ اس سے انسانی روح کی پیاس نہیں بجھتی یہی وجہ ہے کہ انسان اس سے فراق کی شکلیں تلاش کرتا ہے جو ت نئے انقلابوں کا روپ دھارتی ہیں۔ اشتراکی سماج بھی اس مسئلہ کا کوئی ایسا حل نہیں پیش کر سکا جسے تنفیجی بخش کہا جاسکے۔ انسانی تخلیق آزاد پر اس لئے بھی طرح طرح کی روکیں لگادی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہی تخلیق یہاں بھی سماجی پابندیوں سے دب کر رہ گئی ہے۔ ادب کو لغتاً سماج سے لئے تعلق نہیں ہونا چاہیئے لیکن اگر کسی سماج میں فن کار کو پوری آزادی میسر نہیں تو وہ جمالیاتی قدروں کی تخلیق نہیں کر سکتا۔ فن کاری کا ایک انتہائی نظریہ یہ تھا کہ وہ موسیقی ہو جائے اور اب دوسرا نظریہ یہ ہے کہ وہ صحت بن جائے جدید فن کاری کو ان دونوں انتہاؤں کے درمیان اپنی راہ نکالنی پڑے گی اگر وہ انسانی قدروں کو فروغ دینا چاہتی ہے۔

شعر کی تخلیق علمی دنیا میں ہوئی۔ مذہب کے دامن میں اس نے ابتدائی نشوونما پائی بمثل اور شائستگی نے اس کے جہر کو نکھارا اور مشق و محنت نے اس سے مٹی اور بہرہ دگی کا موافراہم کیا۔ اب پروپیگنڈہ سے اس کی جان پر بنائی ہے جس سے اس کو بچنا ضروری ہے۔ جدید تمدن کا ادھما ہیں شاعر اور ادیب کو بھی متاثر کر رہا ہے۔ اس کے حاجی ہیں ناٹ میں انیون کی سی خاصیت ہے جس کے سبب ذہن اور شعور ماؤت ہو رہے ہیں۔ شاعر اور فن کار ان حالات میں کیا کریں؟ اگر وہ اپنے ماحول سے متاثر ہو کر اس کی رو میں بہہ جائیں تو وہ اپنی اندرونی پکار پر لبیک نہیں کہتے بلکہ خارجی حالات کا کہیں بن جاتے ہیں۔ جدید انسان تمدن کے خالق کی حیثیت سے خود اپنی مخلوق کی پیچیدگیوں اور گتھیلوں سے گھبرا اٹھا ہے۔ وہ خود اپنے آپ سے فراق چاہتا ہے۔ لیکن یہ ممکن نہیں جس طرح انسان کے جسم کی بیماریاں اس کے سامنے رہنے دہم تک ہیں اسی طرح اس کے روح کی بیماریاں بھی اس سے الگ نہیں ہو سکتیں۔ وہ اپنی روح سے گناہی بچنا اور چھپنا چاہے وہ نہیں چھپ سکتا۔ ادب کا کام ہے کہ اس کو نہ چھپنے دے۔

ہر اعلیٰ درجے کے فن کاری نظر میں حقیقت کی بدلتی ہوئی شان ہوتی ہے اسی لئے وہ کسی ایسے بندے کے اصول

کا پائہ نہیں کیا جاسکتا جو کسی عارضی سیاسی یا سماجی مصنف کا نتیجہ ہو۔ وہ اپنے گرو و پیش کی آمینداری کرتے ہوئے بھی اس کی پرورش اپنے خیال میں اس طور پر کرتا ہے کہ مستقبل کے امکان آج اگر ہو سکیں۔ وہ انسانیت کی پیچیدہ اور اچھی ہوئی زندگی کا ولدا وہ ہوتا ہے جس میں حقیقت کے مختلف رُخوں کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ اگر فن کار کی روح آزاد نہیں تو وہ انسانی کام کو ترک کر سکتا ہے لیکن عقید کا فرض کب نہیں دے سکتا۔ جب وہ سماجی انقلابوں میں سے گزرتے گا تو ان کے پیچ و تم کو اپنی روح سے وابستہ کر لے گا تاکہ وہ تخلیق کے محرک نہیں ہو کہ زندگی کی دائمی حرکت اور اس کی بے کمانی اور ناقصی پر اس کی نظر پڑتی ہے اس لئے وہ اس کو خارجی حقیقت سے کہیں زیادہ بلند اور بڑھتو کر کرتا ہے۔ وہ خارجی حقیقت کو غور سے دیکھتا ہے لیکن اس کو اپنا وجود زیادہ کم نظر آتا ہے۔ وہ اپنی ذات کے ذریعہ کائنات کی خواہشوں اور مسرتوں اور غموں میں شرکت کرتا ہے۔ اگر فن کار کو کوئی دوسرا وجود کی اہمیت کا گہرا احساس ہے تو یہ اسی وقت ممکن ہے کہ اس کو کائنات کی صداقت کا بھی گہرا احساس ہو۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تخلیق اور جذبے کے اندرونی تجربے میں خارجی حس کے تجربے سے زیادہ صداقت اور شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ تخلیق کا بالذات بن جانا ہے اور اپنے اوپر اس کو اتنا اعتماد حاصل ہو جانا ہے کہ اپنی دہشت میں بھی خارجی حقیقت کو محسوس نہیں کیا جاتا ہے کہ اس کے دل کی واقعی حقیقت باہر کی ناقص اور غیر مکمل حقیقت کی جگہ لے لیتی ہے۔ یہ جذبہ اور تخیل کی ہم آہنگی کی گارنٹی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ درجے کا فن کار جب کسی معمولی اور عادی موضوع پر بھی بات کو بیان کرتا ہے تو اس کی قلب ماہریت ہر جاتی ہے اور اس میں عجیب انوکھا پن اور ایچ پیدا ہو جاتی ہے۔

جدید زمانے کا انسان آج اپنی نفس دردی اور جمالی زندگی کی جس منزل میں ہے وہاں وہ یہ سوچ رہا ہے کہ آیا زندگی اس قابل ہے کہ زندگی کو زندہ رہا جائے۔ اس میں ایک عجیب جھجھکا ہوا آہٹ ہے۔ آج کل کی کیفیت یہ ہے۔ فرد اپنی شخصیت کو جیسے جیسے اس کا فعلی سرمایہ داری کے نظام سے ہر یا اشتراک نظام سے۔ قدروں کا احترام آج کل کی برتری اور بے اعتباری کا ہر طرف دور دورہ ہے جس کا اظہار خاص طور پر سیاست کے میدان میں ہو رہا ہے۔ دل عقیدت اور محبت سے خالی ہیں۔ بغیر عقیدے کے محبت کا نرم اور نازک پودا کیسے پن سکتا ہے۔ آرٹ اور ادب کا یہ کام ہے کہ وہ زندگی کے کھوئے ہوئے توازن کو پھر سے قائم کرنے میں مدد کریں۔ زندگی کی بے وفائی کو دور کریں۔ انسانیت کی محبت کو عقیدت کی بنیادوں پر استوار کر دیں۔ یعنی دور کے بعد صرف انسانی زندگی بلکہ تو فطرت اپنے اہل حق سے محروم ہو گئی ہے۔ آرٹ دونوں کے لئے ہوئے حسن کو بھر جاتا کہ سکتا ہے۔ سوائے اس کے یہ کام اور کوئی نہیں کر سکتا۔ علم اگر اس کی کوشش کرے گا تو اس کو کچھ بھی کامیابی نہیں ہو سکتی۔ وہ اور اچھا و پیدا کرے گا۔

اب تک مغربی ادب میں کلاسیک ہیروئن کے ان اثرات کام کر رہے تھے لیکن کچھ عرصے سے نئے عموک کا رفاہی جن کے اثر سے زندگی بچ سکی ہے اور نہ ادب۔ جدید زمانے کا فن کار پُرانی قدروں کی جگہ نئی قدریں بنانا چاہتا ہے اس واسطے کہ پُرانی دنیا کی جگہ نئی دنیا بنائے گا اسے حوصلہ دے وہ صرف جمالیاتی فلسفی کیفیت سے متاثر نہیں بلکہ وہ زندگی کے مختلف اداسیہ مسائل کی نسبت اپنے حل پیش کرنا چاہتا ہے۔ لیکن وہ اپنے دعوے میں کامیاب نہیں معلوم ہوتا۔ اجمیٹ ہو سوتا اور پوریل فن کار اب تک کوئی ممکن فلسفہ حیات نہیں پیش کر سکے۔ وہ پُرانی قدروں کی جگہ نئی قدریں بنائیں تاکہ جو زندگی کے عیب

خلا کو چکر سکیں۔ یہ علاؤ روز بروز حبیب سے نہ ہوتا جا رہا ہے۔ زندگی کے حقائق میں جو تعلق پائے جاتے ہیں ان کو ذہنی طور پر دھم و برہم کرنا کافی نہیں جب تک کہ ان کی جگہ دوسرے حقائق نہ لائے جائیں جو زندگی پر عوامی مومن سوبریل اسٹ فن کار تخت شعوری تلازموں کو شعوری تلازموں پر ترجیح دیتے ہیں۔ اچھا ترجیح وہی، انھیں اختیار ہے۔ لیکن نتیجہ کیا ہے۔ بجائے اس کے کہ کسی جن کے ایک تختے میں وہ جسین مجھے کو کچھیں انھیں وہ مجھ سے کسی غلاطت سے بھرے ہوئے گوشے میں پڑا نظر آتا ہے۔ لیکن ہے کبھی ایسا اتفاق ہو جائے کہ جسین مجھ غلاطت کی آلودگیوں میں نظر اُٹھائے لیکن ہمیشہ تو ایسا نہیں ہو سکتا۔ زندگی کا یہ معمول تو نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بھی مانا کہ سوبریل اسٹ فن کار کو ایسی تخت شعوری کیفیت محسوس کرنے کا حق ہے جس میں خواب کی سسی بے ترتیبی اور آتشیں با یا جانا ہو۔

ہم آٹے بات آلتی یار آلتا

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس قسم کی تخت شعوری کیفیت محسوس کرنے سے زندگی کے مسائل حل ہو جائیں گے۔ سوبریل اسٹ شاعر وں کی انفرادیت پسندی کے ڈانڈے راج سے جا کر مل جاتے ہیں۔ ان کے ہاں تخت شعور میں اس قدر غلو رہنا گیا ہے کہ گویا عقل و فکر کو زندگی میں کچھ دخل ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس اسکول کے فن کاروں کے ہاں نہ صرف اخلاقی بلکہ جمالیاتی قدریں بھی باقی نہیں رہیں۔ ان کے بیان کی بے ترتیبی اور ایک ہی مضمون کو اتنا تنگے نامیک بنا دیتا ہے کہ پڑھنے والے کے پتے کچھ نہیں پڑتا۔ وہ لفظوں کی بھول بھلیوں میں ایسا گم ہو جاتا ہے کہ ان سے باہر نکلنے کا راستہ بھی اسے نہیں ملتا۔ ہیں حال سوسوسٹوں کا ہے۔ بلو لبر، ورمور، ولبرین، ومارے اور اس طرز کے دوسرے شاعر وں نے جو جیستانی ابہام کی بنیاد لی اس کا ثواب تک باقی ہے۔ پال ویر نے اپنی سنجیدگی سے ہر چیز سمجھ سوسٹوں کی بے راہ روی کو دودھ کرنے کی کوشش کی لیکن اس کو کامیابی نہیں ہوئی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس طرز کے پیر لفظوں کے گورکھ و خندے میں پھنس کر رہ گئے ہیں اور زندگی کی حقیقت سے ان کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ کم و بیش یہی کیفیت انجیٹ کی ہے۔ ان کے خیالی تلازموں تک رسائی حاصل کرنا کہ کندھ کاہ برآوردن کا مصداق ہے۔ بیان کی بے تکلفی تو انھیں چھو کر بھی نہیں گئی۔ لیکن ان کے عالم تصور میں بعض ایسی صداقتیں ہیں جن کی طرف سے ادب و شعر انھیں نہیں بند کر سکتے۔ موصوف کہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مغربی ادب ان مختلف طریقوں اور دستاویزوں میں بعض باتیں ایسی ہیں جن سے ہمارا ادب نامہ اُٹھا سکتا ہے بشرطیکہ ذوق کی رہنمائی شامل حال رہے۔ اور محض نقاتی کا شیوہ نہ اختیار کیا جائے۔ مغربی ادب کی ان مختلف تحریکوں سے ہم انتخاب تو کر سکتے ہیں لیکن پیروی کسی کی بھی نہیں کرنی چاہیے۔

مغربی ادب کے جدید رجحانوں میں سینما، ریڈیو اور اخباروں سے اور زیادہ بھیجیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ سینما کی تکنیک یہ ہے کہ کسی جذباتی کیفیت کو ظاہر کرنے کے لئے مختلف واقعات کے الگ الگ ٹکڑے جوڑ دیئے جاتے ہیں بعض اوقات ان ٹکڑوں میں ہمہ سائنس ہونڈے جو پوری داستان کے ساتھ ہم آہنگ ہونڈے۔ ریڈیو اور اخبار بھی زندگی کی تصویر کے الگ الگ ٹکڑے پیش کرتے ہیں۔ سمجھ سوسٹ شاعر کی غلامتوں اور ایجیٹ شاعر کی لفظی تصویروں میں کچھ ایسی قسم کی کیفیت ملتی ہے ان کی باتیں ان آلے جو ذہنی معلوم ہوتی ہیں لیکن حقیقت میں ان میں تعلق ہونڈے۔ اسی طرح کا تعلق جیسے تخت شعوری تلازموں میں

پایا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میسورین صدی میں محفل و شعور بھی تخت شعور کی نقالی پر اتر آئے ہیں۔ لیکن کیا واقعی شعور اور تخت شعور کے بیچ میں ایسی علیحدگی ہے جو پر نہیں ہو سکتی کہ جس طرح وجدان اور عقلی عمل کے ڈانڈے مل جاتے ہیں اسی طرح شعور اور تخت شعور بھی ایک دوسرے سے اتنے دور نہ ہوں جتنا کہ تحلیل نفسی کے ماہر ظاہر کرتے ہیں۔ جدید تمدن و تہذیب کا یہ سب سے بڑا المیہ ہے کہ جس طرح اس نے وجدان اور عقل کے الگ الگ خانے بنائے اسی طرح اب شعور اور تخت شعور کو ایک دوسرے سے بالکل بے تعلق خیال کیا جا رہا ہے۔ جدید تہذیب کی بنیاد ہی بے آہنگی ہی ہے۔ آرٹ اور ادب میں ایک طرف تخت شعور کے علم برداروں کی جماعت ہے جس میں سمبولسٹ، امپریسٹ اور سوریل آرٹ شامل ہیں جن کے نزدیک انفرادیت یا ترکیبیت ہی ادب کی جان اور ایمان ہے۔ اور دوسری طرف اشتراکی نقادوں جو شعور و عقل کے اجتماعی معیار کے علاوہ ادب اور آرٹ کو کسی اور کسوٹی پر پرکھنا نہیں چاہتے اور ان کو سائنس کا جزو بنا دینے پھر رہے ہیں۔ جدید تمدن کی اندرونی کشاکش انہی رجحانوں کے تقصادم کا نتیجہ ہے۔ آج یہ دونوں رجحان ہمارے ادب میں بھی آچکے ہیں جن کی وجہ سے ہمارے فن کاروں کی ذہنی انجمنیں بڑھ گئی ہیں۔ یہ کوئی انفسوس کی بات نہیں۔ مجھے تو یقین ہے کہ یہ انجمنیں ہمارے ادب کو مالا مال کریں گی اور ان کی بدولت ہمارے فن کاروں کی تخلیقی صلاحیتیں آ جا کر ہوں گی جس طرح میسورین صدی کے انگریزی زبان کے سب سے بڑے شاعر ایش کے یہاں ان سب رجحانوں کے امتزاج سے ایک خاص نزاکت اور لطافت اور گہرائی پیدا ہوئی ہے اسی طرح ہمارا ذوق بھی ان مختلف رجحانوں میں توازن قائم کرنے میں کامیاب ہو گا۔

تحلیل نفسی کے ماہروں نے شعرا اور زندگی کی جو توجہ پیش کی ہے اس کی دوسرے ذہن کو شعور اور تخت شعور رلا شعور کے الگ الگ ٹکڑوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ لیکن ذہنی زندگی تو ایک کل ہے جو دونوں پر حاوی ہے۔ شاعر اس کل کو اس کے ٹکڑوں کی خاطر نظر انداز نہیں کر سکتا۔ انسان کا امن شعوری اور اسے سے ہونا ہے۔ لیکن یہ معلوم کرنے کے لئے کہ اس ارادے کی تہ میں کیا ہے تخت شعوری قوتوں کو جاننا ضروری ہے جب تک کسی انسان کی وہی ہوئی خواہشوں اور باؤں کو نہ معلوم کیا جائے اس کے عمل کی صحیح توجہ ممکن نہیں۔ جدید شاعری میں چونکہ شعوری اور تخت شعوری ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے بالکل بے تعلق کر دیا گیا ہے اس لئے وہ ایسے مبہم اشاروں کا مجموعہ ہو گئی ہے کہ اچھا خاصہ بڑھا چکا شخص ان کو نہیں سمجھ سکتا ظاہر ہے کہ جب تک اس شاعری کے تشننے والوں یا پڑھنے والوں کے ذہن میں وہی تلازمات (ایسوسی ایشن) موجود نہ ہوں شاعر کے ذہن میں شعر کتنے وقت تھے اس وقت تک وہ اس شاعری کو نہیں سمجھ سکتا۔ اس وجہ سے ہمیں جدید مغربی شاعری میں عجیب بنے نکلے سائنسوس ہوتا ہے جو محض ادب کی بڑے مشابہت رکھتا ہے۔ لیکن آپ اس فہم کا بے تکلف حافطہ، ٹوٹے اور غائب کے یہاں نہیں پاتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان استادوں نے وجدان اور عقل اور شعور اور تخت شعور کو ایک دوسرے سے بے تعلق نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے انسانی فطرت اور ذہن کی سالمیت کو برقرار رکھا۔ ہماری ادبی روایت بھی اسی جانب اشارہ کر رہی ہیں۔ یہ روایات جدید نفسیات کی بنیادیں صدیوں کی جدوجہد کرتے ہوئے ہمارے ادب کو بے راہ روی سے بچا سکتی ہیں۔

انسان کا تجربہ پورے انسان کا ہونا چاہیئے نہ کہ اس کی زندگی کے کسی ایک دُرح کا۔ اس میں داخلیت اور خارجیت

دو دنوں کا پناہ نامعام ملنا چاہیئے۔ بغیر اس کے جذباتی اور ذہنی انتشار سے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ بازار آگ نے اپنے مادی مرنے سے دوران کٹھن“ (LE CHEFD OAMR INCONNU) میں اس نظم کی ایک دینی زندگی کا بڑا اچھا نقشہ کھینچا ہے۔ اس کا ہیرو مصوری سے دلچسپی رکھتا ہے۔ وہ ایک تصویر کھینچنے کے جس میں رنگوں کی افراطی اور ابتری اپنی انتہائی صورت میں نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ سے تصویر میں بے نگاہی پیدا ہو گیا ہے۔ اسی تصویر کے ایک کونے میں عورت کی ٹانگ ایک طرف کو نکلی ہوئی ہے۔ یہ ٹانگ کسی انسان کی نہیں بلکہ کسی کھوپڑی کی ٹانگ معلوم ہوتی ہے اس کا انداز بہت کچھ امپرسیونزم سے مصوری کے طرز سے ملتا جلتا ہے جس کے جذباتی انتشار کو ابھل سکتی بجائے ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ بازار آگ نے جس کا آرٹ سماجی اہمیت میں دیکھا ہو اسے۔ اس تصویر کے ذریعہ دونوں یعنی کا مذاق اڑایا ہے اس کا خیال بالکل درست ہے۔ ادیب اور فن کار کا فرض ہے کہ وہ ایسا فنی نمونہ پیش کرے جو صلیت پر مبنی ہو۔ اندر دینی زندگی بالکل خود مختار تو نہیں کہی جا سکتی اور نہ وہ ایسے آزاد قوانین کے تحت نشوونما پاتی ہے جو گر دوپیش کی دنیا سے کوئی تعلق نہ رکھتے ہوں۔ انسانوں کے جذبات اور خیالات بڑی حد تک اس کشش سے وابستہ ہوتے ہیں جو انھیں اجتماعی زندگی میں پیش آتی ہے۔ فن کار کا فرض ہے کہ وہ اوپر، اندر، باہر سب طرف دیکھے اور تعلیم اور صداقت کا جہاں کہیں بھی وہ ملے خیر مقدم کرے۔ یہ صداقت ذہنی تجزیہ نہ ہو بلکہ جذبے سے بھر پور ہونے کے باعث مجازی اور انسانی ہوئی چاہئے۔ زندگی کی صلیت اور صداقت کا یہ بھی اقصاء ہے کہ تذبذب و ادب کو حیوانی عناصر سے جہاں تک ممکن ہو انک کر کے انسانی بلندی تک پہنچائے۔ اس لئے شاعر باطن کار کا موضوع چاہے کچھ ہی ہو وہ اپنے آپ کو اخلاق سے بے نیاز نہیں کر سکتا اور اگر وہ ایسا کر لگا تو یقیناً اپنے فن میں ایک عجیب و گراہ وے کا جس سے اس کے کمال کی شانک جلتے گا۔ شاعر کا یہ کام ہے کہ اس کا موضوع چاہے خارجی حقیقت سے تعلق رکھے یا داخلی سے وہ ہمیں اس کا براہ راست جلوہ دکھائے اور ہمیں ایسا محسوس ہو جیسے وہ پروہ جو فطرت اور ہماری خودی کے درمیان اور خود ہمارے شعور اور ہمارے درمیان بڑا ہوا تھا اچانک طور پر مٹ گیا معلوم ہوتا ہے غالب کو اس بات کا احساس تھا کہ اعلیٰ درجے کے آرٹ میں غارتگری اور دو خلیت شعور اور سخت شعور اور بیداری اور خواب میں فرق و تغیر زبانی نہیں رہتا چاہیئے جس کی نسبت اس کے اس غیر طبعی شعور میں اشارہ ہے۔

ہزار حریف کہ اتنا نہیں کوئی غائب

جو جاننے کو ملا دلوے آگے خواب کے سامنے

(اسی شعر غائب ص ۱۵۷)

یوں کہ جب ادیب میں بعض دنیاوی صداقتیں ہیں جن کے ضمنی جز ہونے میں کام نہیں۔ ان کو ہمارا ادیب نظر انداز نہیں کر سکتا۔ لیکن انھیں جس ایک طرف انداز میں برتنا کیسے اس سے احتراز کرنا چاہیئے۔ اگر آپ غور سے انھیں نواں صداقتوں کے اسی عناصر غزل میں صدیوں سے موجود رہے ہیں مجسٹک کی رمز و علامت، مجسٹک کی نقلی تصویر کشی اور سو دہلی اسٹ کی تحت شعور کی انھیں پیرسکمی نہ کسی شکل میں غزل میں آپ کو ملیں گے۔ ہمارے غزل نگاروں نے شعر کے سب عناصر کو اس خوبی سے برتنا ہے کہ ان میں سے کسی کیفیت نہیں پیدا ہونے پائی۔ اگر تحقیق ابہام کی حد سے آگے بڑھ گئی تو وہ شعر کا عجیب

سمجھا گیا ہے۔ اس کو بھی فطر سے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ ہستعارہ، کنایہ اور رمز میں اس بات کا پورا اہتمام کیا گیا ہے کہ معانی فربشی کے باوجود فربشی تلازم ایک دوسرے سے بہت دور نہ جا پڑیں اور تخیل کا دار امن ادبی ضبط و توازن سے بندھا رہے اس طرح اجتماعی نظم و تنقید فن کا رکوہینے سے روکتی ہے۔ جننا بلند تخیل ہو گا اتنا ہی بیکنے کا احتمال زیادہ ہوتا ہے۔ غالب تو اپنی مشکل پسندی بہت کچھ اسی اجتماعی تنقید کی وجہ سے چھوڑنی پڑی تھی۔ ان کے دوستوں نے جن میں خاص طور پر میرزا خاں اور مولوی فضل حق خیر آبادی کا نام لیا جاتا ہے انھیں مشورہ دیا کہ سنسنے والوں کی خاطر رمز و ہستعارہ کی پیروی کو ذرا کم کر لیں۔ بعض طنز نگاروں نے یہ بھی بتائی تھی کہ وی۔

مزا کہنے کا جب ہے اک کلمہ اور دوسرا سمجھے
مگر ان کا کہنا یہ آپ سمجھیں یا حسد سمجھے
اگر ایسا کہتا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
کلام میر سمجھے اور زبان میر نہ سمجھے

انھیں باتوں کو سن کر غالب کو کہنا پڑا۔

مشکل ہے نہ کلام میر لعل
آسان کہنے کی کہنے میں فرماؤں
سن سن کے لئے سنو دارانِ کامل
گویم مشکل و گز نہ گویم مشکل

مہمیں معلوم ہے کہ شروع شروع میں غالب اس قسم کی تنقید پر بہت جھنجھلائے لیکن پھر بھی انھوں نے اس کا اثر قبول کیا اور پرانی روش کو بڑی حد تک ترک کر دیا۔ اگرچہ ان کے سہل متبع میں بھی خیال کی نزاکت اور رمز و ہستعارہ کا انحصار موجود ہے لیکن زبان کی سادگی کی وجہ سے عام لوگ بھی ان کے بعد کے کلام سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اس رنگ میں بھی ان کی انفرادیت اور رنگ باقی رہی۔ حقیقت کا انحصار علامتی طور پر ہی تصور بہت گرفت میں آتا ہے اس لئے اعلیٰ فن کار کے یہاں چاہے وہ کتنی ہی سادگی کیوں نہ برتنے کی کوشش کرے مطالب کا تصور بہت اشکالی پیدا ہو ہی جاتا۔ حقیقت پسندی کے جوں میں بعض نقاد یہ غلطی کرتے ہیں کہ وہ شعر کی حیثیت کو اسی حد تک ماننا چاہتے ہیں جس حد تک کہ وہ خارجی سماجی احوال کی ترجمانی کرے۔ لیکن وہ بھول جاتے ہیں کہ خارجی حقیقت جب شعر کا جزو بنتی ہے تو اس کی خاصیت بہت کچھ بدل جاتی ہے۔ جب شاعر کسی منظر کو بیان کرتا ہے تو وہ صرف اس منظر کی بات نہیں کرتا بلکہ خود اپنے منظر بھی کچھ نہ کچھ ضرور کہہ دیتا ہے۔ اس کا اسلوب اور اس کا لفظوں کا انتخاب اس کی اندرونی حالت کی چینی کھاتے ہیں۔ شعر کی تعریف اس کی ظاہری صورت و فارم، اور موضوع سے مکمل نہیں ہوتی اس کی صورت و فارم، ضروری ہے۔ اور یہ ضروری ہے کہ وہ ایک خاص قاعدے کے مطابق ہو لیکن یہ اس لئے ضروری نہیں کہ اس سے شاعر خارجی حقیقت کا فنی تعین کرتا ہے بلکہ اس واسطے ضروری ہے کہ وہ خود ایک روحانی اصول کی حیثیت رکھتی ہے جسے شعر سے کسی حالت میں بھی الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے ذریعے حقیقت کی پراسرار کا دفر مابوں کو ظاہر کرنے میں مدد ملتی ہے۔

سائنٹسٹ کے لئے اس کی ذات سے باہر جو کائنات ہے وہ زیادہ اہم اور معنی خیز ہے یعنی شاعر کے نزدیک اس کی ذات خارجی حقیقت سے زیادہ اہم ہے جو اس کے احساس کو انفرادیت بخشی ہے۔ یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ آیا خارجی حقیقت زیادہ اہمیت رکھتی ہے یا اس کو اوداک و احساس کرنے والی صلاحیت بالکل اسی طرح جیسے ان سوالوں

کا جواب دینا دشوار ہے کہ بھوک زیادہ اہم ہے یا روٹی۔ محبوب کی خواہش زیادہ اہم ہے یا خود محبوب۔ جگر نے اس شواہد کی طرف اشارہ کیا ہے۔۔۔

سب کچھ ہڑا مگر نہ کھلا آج تک یہ راز

تم حب ان آرزو ہو کہ ہم حب ان آرزو

شاعر چاہے کتنا بھی حقیقت پسندی کے دعوے کرے وہ اپنے شعر کے لئے جو اسلوب اور موضوع منتخب کرے گا اس میں اس کا ذاتی رجحان لازمی طور پر نمودار ہے گا۔ اس کی اندرونی زندگی کا رنگ خارجی تصویر کشی میں اجاگر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور اس کے جذبہ و خواہش کے الجھاؤ اور پیچ و خم پہلے پے پی پی ظاہر ہو جائیں گے۔ ہر شاعر اور خاص طور پر غزل گو شاعر اپنے موضوع سے جذباتی تعلق رکھتا ہے اور اگر نہ رکھے تو وہ شعر کا حق نہیں ادا کر سکتا۔ ضروری ہے کہ وہ اپنی روح کی گمراہیوں میں اندرونی زندگی کے لئے پھنسے ہوئے نہ رہے۔ اس کے بعد ہی اس کو یہ طاقت حاصل ہوگی کہ اپنے مضمون والوں کے شعور اور دل میں جو پردہ حال ہے اسے اُٹھا دے تاکہ وہ اپنی اندرونی زندگی کو بہ نسبت پسے کے بہتر سمجھنے لگیں جب شاعر اپنے موضوع کو زبان و بیان کا جامہ زیب تن کرنا ہے تو غیر شعوری طور پر وہ اس کو اپنے جذباتی اور ذہنی نظام کا جز بنا لیتا ہے۔ یہ جذباتی اور ذہنی نظام شعور اور تحت شعور دونوں پر جاری ہوتا ہے۔ لیکن ہمیں یہ ماننا چاہیگا کہ اس زمانے کے ادب اور آرٹ کا عام رجحان یہ ہے کہ زندگی کے خارجی احوال کو زیادہ اہمیت دی جائے اور ان کا انہار کیا جائے۔ چنانچہ ہمارے ادب کے لئے بھی وقت کا رعب بڑا سوال یہی ہے کہ اس میں خارجی مسائل کو کس طرح سے سمجھا جائے تاکہ ان کی نسبت ہماری بصیرت میں اتنا اضافہ ہو۔ یہ مضمون جب شعریں ادا کئے جائیں گے تو لازمی طور پر ان میں فکری عنصر داخل کرنا پڑے گا۔ لیکن پسے کے تخلیقی فکر ہوگی جو جذبے سے ہم آمیز ہوگی۔ اس طرح جب علامہ نجفی جی نے نصرت و نور پر بیست ہو جائیں گے تو وہ تجزیہ کی حالت میں نہیں رہ سکتے۔ تخلیقی فکر کی قوت اس کی گمراہی میں پل شدہ ہے۔ یہ قوت صورت پذیری اور نظم آفرینی کے سارے انداز اپنے اندر پنہاں رکھتی ہے۔ وہ جب خارجی حقائق کو اپنے اندر جذب کرتی ہے تو موضوع و معروض کی دوئی باقی نہیں رہتی۔ اس طرح میں اور حقیقت، فطرت اور آزادی، شعور اور لاشعور، انفرادیت اور اجتماعیت کے تضاد و تہمتوں پہنچ جاتے ہیں اور شعر زندگی کے ہر کیفیت و رنگ کا مظہر بن جاتا ہے۔

اگرچہ سماجی اور اخلاقی مسائل کا بیان نظم میں بہتر طور پر ہو سکے گا لیکن غزل میں بھی انہیں چھپا کر نکالتے انداز میں داخل کیا جا سکتا ہے تاکہ جذبہ و جذبہ کے انسان کی ذہنی کیفیت ظاہر ہو سکے۔ لیکن اس اخبار کے بہت سے طریقے ہیں۔ ایک اس طور پر خیالوں کو ظاہر کرنا ہے کہ وہ محاشی ملل یا تخت شعور کی ڈائری یا کھٹنی معلوم ہوں اور ایک اس طرح کہ مضمون والا اپنی زندگی میں مسرت اور فراوانی محسوس کرے۔ اس کی بصیرت کو چھلے ہو اور اس کی قدروں اور خواہشوں میں ہم آہستگی اور ہم رنگی پیدا ہو۔ قدر ہی وہ کبھی ہے جس سے زندگی کے سارے طے مٹھتے ہیں۔ شعر کو قدر کا خادم ہونا چاہیئے نہ کہ اس کو شائے والا۔ غزل گو شاعر عجب زندگی کا ذکر کرے گا تو لازمی طور پر اس کے لامع و امکا فوں کی طرف اس کی نظر جائے گی۔ وہ کبھی اپنی خواہشوں کا رنگ ان پر چڑھائے گا اور کبھی ان کے اثر سے اپنی آرزوؤں کی صورت لے گی

کرے گا۔ وہ سخن آفرینی بھی کرے گا اور مست را فرینی بھی۔ لیکن یہ کام وہ تجرباً و منطقاً معدمات سے نہیں انجام دے سکتا جن کا لازمی نتیجہ کلام میں بے لطف یکسانیت اور پلاٹ پر ہو گا۔ شاعری فکر تخلیقی اور وجدانی ہونی چاہیے جس میں اندرونی جذبے کا ریس و چا ہوا ہو۔ بغیر اس کے کلام میں تاثیر اور دلکشی نہیں پیدا ہو سکتی۔ شعر کی خوبی کا معیار نہ اسلوب میں نہماں ہے اور نہ موضوع میں بلکہ شعریت میں جو دونوں سے بالاتر ہے۔ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے کہ شعریت تخلیقی فکر اور جذبے کی ہم آمیزی کے بغیر نہیں پیدا ہو سکتی اور یہی دونوں جزو تفضل کی جان ہیں۔ انھیں سے سخن ادا کی جلوہ گری ہوتی ہے جو ادب کی بنیادی قدر ہے۔

قتیل دہلوی تھا یا فیہ آبادی

مختار الدین احمد

بارہوی صدی ہجری کے آثار اور تیرہویں صدی کی ابتدا میں مرزا قلیل کی ذات بھی عجیب و غریب گزری ہے۔ فارسی زبان کا مشہور مصنف و شاعر، متعدد اردو شعرا کا استاد، لیکن آج تک اس کے نام کے متعلق جھگڑا ہے، اس کی طبیعت مشتبہ ہے، اس کی عمر کا پتہ نہیں، کہاں کہاں رہا نہیں معلوم، کیا کیا کرتا رہا؟ نہیں کہا جاسکتا، کب وفات پائی؟ اس میں اختلاف کب پیدا ہوا؟ اس کی تحقیق نہیں۔

اٹھارہ سال کی عمر تک اس کا کیا نام رہا؟ یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے، ایک تذکرہ نگار نے اس کا نام دیوالی سنگھ ایک مورخ نے دیوالی سنگھ، ایک مضمون نگار نے دیوالی سنگھ، ایک متشرق نے دیوالی سنگھ اور ایک مشہور اردو شاعر نے دیوالی سنگھ بتایا ہے۔

مسلمان ہونے کے بعد اس کا نام تبدیل ہوا، نام کیا رکھا گیا؟ مختلف اصحاب مختلف نام بتاتے ہیں۔ ابوعلی نے اس کا نام محمد قلیل، نواب صدیق حسن، حکیم عبدالغنی، صاحب ریاض الفروس، مصحفی اور عیسیٰ نے محمد حسن، ڈاکٹر عبدالحق اور پرنسٹن کینی نے محمد حسن، بعض تذکرہ نگاروں نے (عربی کا بھی ایک جگہ یہی بیان ہے) محمد حسن، اور صاحب قاموس لسانا میر نے احمد حسن لکھا ہے۔

لے تقریباً تمام تذکرے جو میری نظر سے گزرے ہیں قلیل کی اردو شاعری کے بارے میں خاموش ہیں، اس کے دیوان و کتابت کے متعدد نسخے دیکھنے میں آئے لیکن کسی میں اس کے اردو اشعار نہیں ملے۔ صرف سعادت خان ناصر کے ناباب تذکرہ "نوش معرکہ زیبا" میں اس کا ایک اردو شعر درج ہے، اصل عبارت یہ ہے:-

جو کہ مولدا اس کا ہندوستان تھا، بگم کل شی برجن الی اصلہ، کبھی کوئی مصرع یا سبب زبان درختہ میں بھی کہتا چنانچہ یہ شعر:-

زنجی پیچے کا حسن عظیم امثال ہے ثانی جو اس کا ہے تو کوئی خال خال ہے

اگرچہ یہ شعر اس کا دونوں مرتبہ سے ملے یہ ہندی گزوں کا تذکرہ ہے اور اکثر ہندی گز اس کے شاگرد ہیں، لکھا گیا "وہیئے لطافت میں بہتے اردو شعر چینی کے متعلق یہ معلوم نہیں کہ کس کے گلے مجھے ہیں، مندرجہ ذیل شعر تعجب نہیں کرتے ہیں کہ ہوا:-

جہاں میں مجلسِ محبت کا جاہر ہے قوط میں جانا نہ ہوں کہ دشمن مرا ہے یار مرا

سال ولادت، فرقہ و طوطی، عظیم آبادی، دہلی، امیر المیٹھوی، ۱۲۲۶ھ، عہد قیامت، اور حسین خان عاصمی، عظیم آبادی، ۱۲۲۶ھ، بناتے ہیں۔ صاحب نتائج الافکار کے بیان کے بموجب اس کی وفات تیرہویں صدی ہجری کے عشرہ چہارم میں ہوئی۔ صاحب مشعرجن کے نزدیک سال وفات ۱۲۳۲ھ ہے۔ عہد قیامت، ۱۲۳۲ھ، لکھتے ہیں۔ اور بیل ۱۲۳۲ھ، عاشق شقائق، ناموس، المشاہیر اور تاریخ ادوہ میں ۱۲۳۲ھ درج ہے۔

میرزا علی غفرانی، اس کی عمر ساٹھ سال حسین قلی خان، اکٹھ سال اور فرقہ و طوطی، دہلی، ۱۲۳۲ھ، امیر المیٹھوی، ۱۲۳۲ھ، سال بناتے ہیں۔

عربی کا بیان ہے کہ اسلام لانے وقت اس کی عمر ستر سال تھی یعنی اوڑھتا تھا۔ اٹھارہ سال بتاتے ہیں عاشق کا بیان ہے کہ چودہ سال ہی کی عمر میں اس کے دل میں اسلام کی محبت موجیں مار رہی تھی۔ تذکرہ سفینہ ہندی، "ہیں کہ" اور صاحب مسلمان، جوا، عاشق شقائق میں درج ہے کہ غفران، شباب میں اسلام لایا۔

سفینہ ہندی اور نتائج الافکار کے خلاف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سلطان ہونے کے بعد وارد شاہ جہان آباد ہوا۔ اور وہیں عربی و فارسی کی تحصیل کی لیکن معنی لکھنے کے اس کی تعلیم شاہ جہان آباد میں نہیں بلکہ فیض آباد میں ہوئی۔

ان معاملات کے علاوہ عقل کی ولایت میں بیانی اختلاف رہا ہے اور انہی نکاس کا کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا۔ میرزا بیگد میں اور نتائج و دلوں کے اقوال اس معاملہ میں مختلف ہیں۔ تیرہویں صدی کے مورخ اور تذکرہ نگار کسی نہیں ہمارے زمانہ کے محققین اور مضمون کا حضرت ابی اس معاملہ میں مختلف الافعال نظر آتے ہیں کہ اس کا وطن کہاں ہے۔

موصوفی نے اس کے بزرگوں کا وطن بٹالی، بنگو، ان واس نے بٹالہ، بٹالی نے پٹالہ، صاحب "بہر بیضا" (۱۹) نے بٹالہ، فواب صدیقی حسن نے لاہور، محمد حسین آزاد نے لکھنؤ، ابو طالب دہلی، بنا بٹالہ ہے۔ ناصر نے مولداس کا ہندوستان تھا، کہنے پر قناعت کی ہے۔ اور یوں وہ اس جگہ سے صحافت نقل کیا ہے۔

آزاد نے اس کا وطن لکھنؤ اس لحاظ سے بنایا ہوگا کہ اس کی نصرت زندگی سے زائد لکھنؤ میں تمام ہوئی۔ وہیں اس نے وفات پائی اور وہیں کی خاک میں ہمیشہ کے لئے سو گیا۔ جن تذکرہ نگاروں نے اس کا وطن لاہور بنایا، وہ شاید اس طرح کہ ریاست پٹالہ، مضافات لاہور میں ہے۔ پٹالہ اور بٹالہ اس لئے اس کا وطن کہا جاتا ہے کہ اس کے آباء اجداد بٹالہ کے رہنے والے تھے اور ان کا بھرن کی غلط فہمی کی وجہ سے اس نام کی مختلف شکلیں پیدا ہو گئی تھیں۔ ابو طالب اور عربی نے اگر اس کا وطن دہلی بنایا تو غلام تعجب

اسے نکاح مصطفیٰ فہر میں ایک مضمون شائع ہوا تھا "مصطفیٰ کی دو بیاضیں" جس میں دعوے کیا گیا تھا کہ "یدر بیضا" مصطفیٰ کی تالیف ہے اور ثبوت میں کچھ شعر کے ترجمے بھی پیش کئے گئے تھے۔ میں جملہ ان کے تسلیم کا ترجمہ بھی تھا جس میں اسے بٹالہ کا بنایا تھا۔ پھر اس میں جملہ و تحریف سے بچا ہوا تھا۔ میں نے فوراً ہی ایک طویل مکتوب حضرت نیا زنجیری کو لکھا جس میں اس فہر پر ایک تنقیدی نظر ڈالی گئی تھی اور "یدر بیضا" دوسرے مضمون کے حملہ و تحریف کا پورہ چاک کر دیا گیا تھا۔ نیا ز صاحب نے وہ خط "مصطفیٰ فہر کی بعض اعتراضات" کے عنوان سے شائع کر دیا تھا۔ ملاحظہ ہو نگار اہل سلسلہ ۱۹۳۰ء۔

نہیں جب کہ قتلِ خود، مولدِ من خاک و ہلِ اے قتلِ "نکستہ" ————— لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ قتلِ کے وطن کی نسبت ذیہ آباد و کی طرف کس طرح جاتی ہے ؟

زمانہ حال میں قنبل کو فریڈ باؤی سمجھنے والوں میں زیادہ پیش پیش سید اسد علی انوری صاحب ہیں جو نوجو فریڈ باؤ کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے اپنے مقالہ ”قنبل کا دلچسپ“ میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس کا وطن فریڈ آباد تھا۔ انھوں نے قدیم تذکروں کے متعدد واقعات بھی درج کئے ہیں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ کسی میں اس کے فریڈ آباد ہونے کا ذکر نہیں۔ ریاض الفردوس میں اسے کھنوی کے تاج الاذکار و اشعاع الحسن میں لاہوری، خلاصۃ الافکار میں دہلوی، عقدۃ رباعی میں بتاوی لکھا ہے محمد انوار گلشن شائق خوش معرکہ زیرباب میں اس کی وطنیت کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ملتی۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کے فریڈ آبادی ہونے کا ثبوت قدیم تذکروں میں نہیں ملتا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ مرثیہ پہلے کس نے اسے فرید آبادی لکھا جو مان گیس میں تختیں کر رکھا ہوں، اس کی اولیت کا سہرا مرزا غالب کے سر ہے۔ اور ان کے بعد اگر کسی نے اسے فرید آبادی لکھا ہے مثلاً عالی اور کرم خان تو یہ غالب کے تقلید میں ہے اور اس لحاظ میں یہ اصحاب غالب کے عقیدہ محض ہیں۔ اور لیکن یہ ہے کہ انھوں نے تقلید کی وطنیت سے متعلق ذاتی تحقیقات نہیں کی۔

غالب نے اپنے خطوط میں اسے مفرد و جگہ فریاد کا تکرار کیا ہے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ مرزا نے تاریک و مخفی کے آدمی تھے اور نہ وہ اس عالم کے لئے موزوں تھے۔ یہ سچی نہیں کہ انھیں قلیل سے کوئی خاص تعلق رہا جو کہ حالات جاننے کے لئے کوشش کی ہو۔ انھیں تو قلیل کا نام تک صحیح نہیں معلوم۔

انہی عرصے میں فریق کے مذکرہ شیعہ انجمن کا بنی حوالہ دیتے ہیں جو اردو زبان و ادب کی تعلیم کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ وہ کافی حد تک عملی عبادت جو فی جا ہیجے تھی۔ اس مذکر کے کا وجود نام بھی کیا گیا ہے تو جو شخص ایک جھوٹ سے جھلکے ہیں وہ غلطیاں کر سکتا ہے اس کی تیسری بات کا کس طرح یقین کیا جاسکتا ہے نہ یہ بھی صحیح ہے کہ نقیض ۱۶۱۶ میں پیدا ہوا اور نہ یہ درست ہے کہ وفات کے وقت اس کی عمر پانچ کی تھی۔ مزید یہ کہ یہ فریق کا کوئی بھائی تو اس بنا پر کہ نظر یہ ظاہر اسے قبیل کے حالات معلوم کرنے کے خاص ذرائع حاصل تھے چند ماہوں میں نہیں لکھتا۔ پھر فرقی بہت بعد کے آدمی ہیں۔ ان کا بیان چنداں قابلِ اعتماد نہیں خصوصاً اس صورت میں جب کہ مصنفین قبیل کچھ اور کہتے ہوں۔ پھر ان نام لوگوں کے باغات غالب ہی سے ماخوذ ہیں۔

اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ قبیل کی وطنیت فریڈ آباد کی قدیم ترین شاہدات مرزا غاٹکے وہ رقصات ہیں جن میں قبیل کا کھنسی جگہ ذکر آیا ہے۔ ایک نوید کہ مرزا کو تارینج سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور وہ ان لوگوں میں تھے جن کو ماضی کی نسبت حال سے زیادہ دلچسپی

۱۰ مطبوعہ نکار۔

کچھ فرقہ فکری کا ذکر تذکرہ میں ملتا ہے لیکن اس بات کا سراغ کہیں نہیں ملتا کہ اس نے کوئی تذکرہ بھی مرتب کیا تھا۔ امید ایشوری صاحب کو یہ بتانا تھا کہ انھوں نے یہ تذکرہ کہاں دیکھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ امید ایشوری کے حاضر پرچہ اقتصاد و ذریعہ آبادی صاحب کہے، اس میں دوسرے شریک نہ ہوں تو قابل الزام نہیں۔

ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ایک طویل اردو مکتوب میں جو اردو کے معنی یا عود ہندی میں شامل نہیں ہے، وہ اسے لکھنوی بتاتے ہیں۔ غالب مولوی خلیفہ الدین خاں کو لکھتے ہیں :-

”..... مستند یا مستند میں ہر نام کو فارسی کے نزدیک لکھنے پر متوجہ ہوئے۔ نہ ایک دو کلمہ ہزار و ہزار فرہنگیں فراہم کر لیں یہاں تک کہ قلیل نو مسلم لکھنوی اور غلام الدین ملائے مکتب دار رام پور اور کہاں تک کہوں کون کون، جس کے جی میں آئی وہ مقصدی تحریر تو اعدا نشا ہو گیا.....“

اس عبارت سے میرے خیال کی تصدیق ہو سکتی ہے کہ مرزا نے قلیل کے مدلول کے بارے میں کوئی خاص تحقیق نہیں کی۔ جب جی میں آیا فرید آباد کا لکھدو واجب دل جا یا لکھنوی بنا دیا، مرزا نے ایک جگہ اسے دہلی بھی لکھدو دیا ہے۔ مرزا کا بیان اگر مستند ہے تو ان کے سامنے یہ بات پیش نظر رکھنے چاہئیں۔

یہ مکتوب ۱۲۶۲ھ کے بعد لکھا ہوا ہے اس لئے یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے وہ واقعی قلیل کو فرید آبادی سمجھتے ہوں پھر بعد کو جب اس کا اطلاق ثابت ہو گیا ہو تو اس لحاظ سے کہ اس کی زیادہ تر زندگی لکھنوی میں گزری (اب روایت عاشقی عظیم آبادی) اسے لکھنوی لکھنا زیادہ مناسب سمجھا ہو۔ فرقہ دہلی ضرور میں لیکن یہ بھی تو دیکھئے کہ وہ بارہ سال کی عمر میں دہلی پروردگار عظیم آبادی پر چکے تھے۔ پندت کبھی نے بھی اسے فرید آبادی لکھا ہے۔ لیکن ان کے پاس یہ ظاہر مرزا غالب کی تحریکے سوا اور کوئی ثبوت نہیں۔

۲

فرید آباد قلیل کا مدلول کس طرح ہے؟ وہ وہاں پیدا ہوا، نہ وہاں وفات پائی، نہ وہاں قیام کیا اور نہ وہاں سکونت اختیار کی۔ فرید آباد میں نہ اس کا وطن ثابت ہے اور نہ اس کے آبادی اجداد کا۔

اس کا باب ۱۸ میں رہا یا شاہ جہاں آباد میں، وہ خود ۱۷۴۲ء میں دہلی میں پیدا ہوا۔ ۱۷۷۱ء سال کی عمر تقریباً ۲۹ سال تک تحصیل علم کے سلسلے میں یا تو دہلی رہا یا فیض آباد۔ ۱۷۹۱ء میں فیض آباد میں شہید کے ہاتھ پر مسلمان ہوا۔ اب تک وہ دہلوی لکھدو تھا اب وہ محمد حسن ہو گیا مسلمان ہونے کے بعد گھر بار چھوڑ کر ان کا ہو گیا اور ایک زمانہ تک لطافت شاہ جہاں آباد میں نجف خاں

اسے اس طویل مکتوب کا تین بہترین محذومی ڈاکٹر عبد الستار صدیقی والد آبادی نے رسالہ ”ہندوستانی“ میں چھاپا اور پھر انہیں کی عنایت سے رقم نے پورے خط کا عکس علی گڑھ میگزین میں غالب نمبر میں شائع کیا۔ مکمل خط چار صفحوں میں آیا ہے۔ ملاحظہ فرما کر غالب نمبر ۱۷۷۱ء ص ۸۴۔

۱۷۷۱ء غالب کا قول یہ ہے کہ ان دیکھا ہے قیمتی سے میرے کائنات میں اس کا حوالہ درج نہیں۔ یہ قول جن ممکن مصادر میں مل سکتا تھا، دیکھ لیکن کچھ تیز نہ مل سکا، انیسویں، کہ اس امر میں اس وقت زیادہ توجہ نہ مل سکا۔

۱۷۷۱ء صفحہ کا بیان ہے ”درایت کے متعلق فاش جسے اب خود فیض آبادی و رفتہ استقامت گرفتہ بروست شہید ہمزہ رسالہ بود کہ مشرت اسلام پرستہ“ عقد ثریا ص ۶۰۔

کے لشکریوں کے ساتھ گھومتا رہا۔ یہ ظاہر ہے کہ ۱۱۹۹ھ یا ۱۲۰۰ھ یعنی اسلام لانے سے پہلے تک وہ کافی سیاحت کر چکا ہوگا۔ مصطفیٰ عظیمؐ نے یہاں پہنچنے کے بعد جس زمانہ میں قبیلہ کا تعلق لشکرِ نواب نجف خاں سے تھا وہ وہاں آنا اور بعضی کے مشعلوں میں شریک ہونا۔ یہ مشاعرے ہمارے زمانے کے مطابق ۱۱۹۶ھ سے ۱۱۹۸ھ تک کی مدت میں ہوتے رہے ہیں۔ تذکرہ عقیدہ شریاکی ترتیب کا خیال خود سخیل ہی نے اسے دلایا تھا۔ چونکہ زمانے میں مزبور خیلہ سیاحت کردہ دو مجلس و شریف و سیدہ نظم شرازا شعرا و احوال معاصرین جہتہ بریاض خاطر خود خوش دلشے، روز سے فسون تالیف تذکرہ معاصرین کو شتم ویدہ ص ۲۔

برسرِ جب لکھی جا رہی تھیں، اس وقت نجف فوت نہ ہوا تھا، اس کا سال وفات ۱۲۰۲ھ میں اٹھایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ۱۱۹۵ھ یا ۱۱۹۶ھ سے پہلے ہی وہ کافی سیاحت کر چکا تھا اور متعدد مجلس و شریف و سیدہ کا تھا۔ قیاس یہ چاہتا ہے کہ اس کی سیاحت اس کے اسلام لانے سے پہلے یعنی ۱۱۹۹ھ کی ہے۔ اس لئے کہ اسلام لانے کے بعد اس کا شوق نجف خاں کے لشکریوں سے ہوا اور وہ ان کے ساتھ وہابی و اطرافِ دہلی کا شت کرنا رہا۔ اتنا ظاہر ہے کہ قبیلہ ۱۱۹۶ھ میں ختم ہو گیا۔ اب عاشق کا بیان پیش نظر کیجئے۔ وہ لکھتا ہے:-

”تا مدت و اطرافِ شاہ جہاں آبادیہ لشکرِ نجف خاں می گشت“ تا مدت کا لحاظ کرتے ہوئے ماننا چاہئے کہ انکم ۱۱۹۹ھ تک اس کا تعلق ضرور یہاں ہو گیا تھا۔ اس لحاظ سے سخیل کی سیر و سیاحت کا زمانہ یقیناً اس سے پہلے ماننا چاہئے۔ دوسرے لغظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ۱۱۸۲ھ سے ۱۱۹۶ھ تک وہ وہابی فیض آباد وغیرہ میں گھومتا رہا۔ ۱۱۹۶ھ تک وہ نجف خاں کے لشکر کے ساتھ پھر مانچھرا رہا۔ ۱۱۹۶ھ سے ۱۲۰۳ھ یعنی اپنی موت تک وہ گھومتا رہا۔

اوپر کی سطروں میں ہم نے یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ تاریخ و تذکرہ کا کوئی بیان ہمیں ایسا نہیں ملتا ہے جس سے قبیلہ کی وطنیت فرید آباد متعین کیا جاسکے، اس پر ہم کی سی روشنی پڑ سکے۔ وطنیت تو بہت بڑی چیز ہے، قدامت کی تحریروں میں قبیلہ کا ایک لمحہ کے لئے بھی فرید آباد میں قیام کرنا ثابت نہیں۔ ایسی صورت میں اسے فرید آبادی کہنا اور فرید آباد اس کا وطن بتانا قریب انصاف و تحقیق نہیں۔

اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ اس کی ولادت وہابی ہوئی، ابتدائی تعلیم وہابی حاصل کی، نتائج افکار کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی و فارسی کی تکمیل بھی اس نے وہابی ہی میں کی۔ اسلام لانے کے بعد وہ فیض آباد، وہابی و اطرافِ دہلی کی گھومتا رہا اور آخر کار لکھنؤ میں جا بسا۔ اور وہابی کی خاک میں ہمیشہ کے لئے سو گیا۔ اس کے مکانیب کے مطالعہ سے کچھ اور مقامات کی

۱۔ ابی بیت خود را بنیر با گشتہ کنار بست و ازادانہ قدم بہ راہ تجرید نہادہ تا مدت و اطرافِ شاہ جہاں آبادیہ لشکرِ خود انصاف الدولہ مرحوم می گشت“ فخر عشق، ص: ۱۴۵۔

۲۔ ۱۱۸۲ھ میں اس کے ۱۱۹۶ھ تک قبیلہ کا سال ولادت ہے۔ کم از کم دس سال طفلی کے اس سے نکال دینے چاہئیں۔

۳۔ قیام نہ ہونے اور قیام ثابت نہ ہونے میں بڑا فرق ہے، میں چاہتا ہوں کہ ناظرین اس فرق کو ہمیشہ ملحوظ رکھیں۔

سیاحت کا پتہ چلتا ہے لیکن منہ پر آباؤ کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔

ہلک رام صاحب قنیل کے ایک بیان سے اس کے وطن کا کھجور لگانا چاہتے ہیں، انھیں قنیل کے خاندان کے ایک فرد سے ایک شجرہ ملا ہے جس سے وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اس کا خاندان بٹالہ مارہٹہ والا تھا اور قنیل کی پیدائش بھی بٹالہ میں ہوئی۔ یہ صحیح ہے کہ اصل قنیل کا خاندان بٹالہ مارہٹہ والا تھا، لیکن ان کا یہ خیال کہ اس کی پیدائش بٹالہ میں ہوئی محض نظر ہے۔ اس کے بزرگوں کی وطنیت کے بارے میں محقق کا بیان کسی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ قنیل سے جو تعلقات مصحفی کے تھے وہ اہل نظر پر پیشہ وہ نہیں۔ تذکرہ عقد تریا، قنیل ہی کی حرکت اس نے لکھنا شروع کیا تھا بلکہ بہت سامواؤں قنیل ہی کا جمع کر وہ تھا مصحفی نے خود قنیل کا مولد نہیں بتایا لیکن اس کے اس قول سے ”در اصل بزرگانش قوم کھتری مجنہاری بٹالی بودہ اند“ سے اس کے بزرگوں کی وطنیت بٹالہ ثابت ہوتی ہے۔

یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ قنیل کے آباؤ اجداد کی وطنیت بٹالہ کی دلیل اس بات پر نہیں۔ ابھی میرے پاس ایک معتبر عارف تذکرہ نگار کا بیان موجود ہے جس سے خود قنیل کے تعلقات تھے اور یہ سب کہ اس نے خود بیان کیا ہے اس سے سلسلہ مواصلت بھی جاری تھا۔ میری مراد آغا حسین نقی خان شافعی عظیم آبادی سے ہے جس نے فارسی شاعر کے حالات میں ایک سوسھات کا بڑا ضخیم تذکرہ لکھ لیا ہے۔ اس میں قنیل کا تذکرہ چھ صفحات میں آیا ہے اس کا خلاصہ یہاں اردو میں پیش کیا جاتا ہے۔

قنیل کے آباؤ اجداد ایک چھوٹے سے قصبہ بٹالہ کے رہنے والے تھے، اپنی پائالہ کے قریب چولا پور کے قریب واقع ہے کچھ زمانہ کے بعد قصبہ سوم (غالباً سورت سنگھ احمد) ایک شخص کے ساتھ جو کھتری تھا اور جس سے مواصلت و برادری تھی، بٹالہ سے ہجرت کر کے باغپت چلا آیا۔ قنیل کے باپ اور دادا اور گاہی مل اور رائے لال جی مل کی ولادت یہیں باغپت میں ہوئی۔ ۱۳۱۱ھ میں رائے لال جی مر گیا۔ اس کے بعد درگاہی مل نے باغپت کو چھوڑ کر ڈاسنہ میں جو ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور وہی سے اس کے اکر س پر واقع ہے، بروہاش اختیار کی، ۳۳ سال تک وہاں قیام کیا تھا کہ ۱۳۱۸ھ میں احمد نواب ہدایت علی خان نے بد نظر استھانی و ابط و تعلقات جو سب بی بیض لٹا دیا اور رائے لال جی مل کو قتل کر دیا۔

۱۔ مرزا قنیل کے رفقات و ملائیک متعدد و مجموعہ میں۔ صرت رفقات قنیل میں اس کے مختلف سفروں کا پتہ چلتا ہے۔ دفعہ ۵۹ سے سفر الد آباد و سلطان پورہ، پرناب گڑھ کا پتہ چلتا ہے۔ دفعہ ۳۷ سے سفر کان پور کا ارادہ معلوم ہوتا ہے۔ دفعہ ۸۲ سے قیام سلطان پور پر روشنی پڑتی ہے اور دفعہ ۳۳ سے ہمیں اس کے دوبار سفر ہراج کا علم ہوتا ہے۔

۲۔ ملاحظہ ہو رسالہ نگار۔

۳۔ قنیل کی پیدائش بٹالہ تذکرہ بعد کی چیز ہے، نشر عشق کا بیان مان لیا جائے اور نہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں تو اس کے باپ اور دادا، درگاہی مل اور رائے لال جی مل کی بھی پیدائش بٹالہ میں نہیں بلکہ باغپت میں ہوئی ہے۔ قنیل کی پیدائش بٹالہ میں ہوئی خود اس کی پیدائش سے بہت پہلے اس کے دادا، ایک کھتری کے ساتھ ترک وطن کر کے باغپت آچکے تھے۔

قتیل کے باپ درگاہی مل کو اپنے پاس بلالیا۔ بہت دلجوئی کی اور ہزار روپیہ روات کا مقرّر کر کے اجازت دی کہ اپنے گھراں و عیال کے ساتھ رہیں۔ درگاہی مل، مدت اسیر کبھی داسنہ دلا کر کبھی نواب ہدایت علی خاں کے یہاں۔ انھیں دونوں مسئلہ میں شاہ جہان آباد قتبیل کی ولادت ہوئی۔“

۳

مرزا قتبیل کی ولادت شاہ جہان آباد میں ہوئی۔ اور وہ بلاشبہ دلجوئی تھے۔ ان کی ولایت کے بارے میں یہ رائے قائم کر لینے سے پہلے تذکرہ نگاروں اور مورخین کے بیانات کے ساتھ ساتھ قتبیل کی بیشتر تشریف نظم پر بھی ایک نگاہ ڈال لی گئی ہے اور ان کی بعض تصانیف کے زیر مباحثہ تھے بھی پیش نظر ہیں۔

(۱) ”زافیل، والدش از قوم کھتری متوطن پالہ (کذا) ہضافات لامور از قراٹان (رائے لال جی) بروہ خودش در شاہ جہان آباد نمودہ در سحر سن شرف اسلام پذیرفتہ“

(تذکرہ سفینہ ہندی۔ ص ۳۱ ب۔ مرزا بیگوان داس)

(۲) ”مرزا محمد حسن :- در شاہ تہ تولد آں افعی البلفا در شاہ جہان آباد اتفاق افتاد و تا عمر مغت دوسالگی از طبع خدا داد عربی و فارسی تحصیل ساختہ طبیعت عالی پیدا کرد“

دشتر عشق عاشقی عظیم آبادی۔ ص ۱۴۵۰

(۳) ”قتیل، دہلی کے کھتری تھے، انھوں نے اسلام قبول کیا ہے، اب کھتری کہتے ہیں اور فارسی کے بہترین ماموں ہیں۔“

(عیار الشعر۔ خوب چند و کار)

(۴) ”اسم نامی آں مرزا محمد حسین است، مولد گرامش شاہ جہان آباد و اجدادش ساکن قصبہ پالہ قوم کھتری بروہ اندر نیلے آزادانہ سیری بر و تا آن کہ از شاہ جہان آباد برآمدہ بہ لکھنؤ پورست، در ۲۳ صحر بہر شہت سالگی و ولایت حیات سپرد“

(۵) ”امش مرزا محمد حسن است از خوش معاشان قصبہ پالہ بروہ اندر، مولد او پدر بزرگوارش از خاک شاہ جہان آباد بزرگداشتہ اند بہ عمر شہت و چند سالگی در ۲۳ صحر و ولایت حیات سپرد۔“

(ریاض انوار، عربی عظیم آبادی)

۱۔ رائے لال جی، ”قبائلی تصویح ہے، سفینہ کا جو غلطہ میرے زیر مطالعہ رہا ہے وہ کہم خوردہ ہے۔ ناظرین میں اگر کسی صاحب کی اس کتاب کے کسی عمدہ نسخہ تک رسائی ہو تو براہ کرم مطلع فرمائیں۔“

۲۔ اس تذکرے کا ایک نسخہ انڈیا آفس لندن میں ہے اور ایک ناقص نسخہ پٹنہ کے ایک ذاتی کتب خانہ میں لیکن ہمارا بیان اسپرنگ سے ماخوذ ہے۔ رائے لال جی، ”اس مذکرے کے ایک ہم ترین نسخہ کا پتہ چلا ہے جو تمام و مال خود خوب چند و کار کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔ یہ نسخہ معصفت کا اصل ابتدائی مسودہ ہے۔“

- ۹، محمد قنیل... جنس از کھتریان ساکن شاہ جهان آباد است -
(خلاعتہ المادک: ۲۴۴ ب - ابرطال صفہانی)
- ۷، بیل نے قنیل کا نام محمد حسن - وطن دہلی اور سال وفات ۱۲۳۲ھ لکھا ہے -
(اورینٹل بائیو گرافیکل ڈکشنری)
- ۸، نظامی دہلوی نے اس کا نام مرزا احمد حسن اور وطن دہلی لکھا ہے -
(قاموس المشابیر ۱۴۶)
- ۹، خواجہ محمد علی نانا عظیم آبادی نے ایک ضخیم بیاض فارسی شعر کی مرتب کی جس پر خوشنویس نے اپنے ہاتھ سے ایک بیاض تحریر کیا ہے - اس بیاض میں تینے جو اس کا خاص دوست تھا، اسے دہلوی لکھا ہے -
(بیاض قنیل)
- ۱۰، صاحب مجموعہ سخن نے بھی اسے دہلوی لکھا ہے -

۱۔ اس بیاض کا نام "قمان المعانی" ہے۔ مرتب خواجہ محمد علی قنیل خاں خواجہ عبداللہ بن تائب ہیں۔ جو ۱۲۳۳ھ تک زندہ تھے دیوان کی مرتبہ بعد ایک مجموعہ غالباً "ریاض النشأت" اور ایک ضخیم بیاض جس میں اساتذہ کی تقریرات نشر جمع کی ہیں نظر سے گذری۔ ایک مجموعہ کا نام "شعرات" بھی ہے اور کتب خانہ خدابخش میں ۳۵۱ نمبر پر موجود ہے ان کا یہ اور شعر بھی نہیں چھوٹا ہے

کب تک سدا سے نوحہ دل ہم سنا کریں
تنگ آگاہ ہیں درہست سے اللہ کیا کریں

اس بیاض میں امامی ہروی، نظیر خاں احسن، غنایت خاں آشتی، خاں آشتی، خاں احسن، میرزا محمد رضا قزلباش خاں امید، امیر خاں آقام، آرزو، آرزو، اشتیاق، دہلوی، میرزا، جہونہ سنگھ پروانہ، عظمت اللہ بے خبر، پیام اکبر آبادی، برہنہ لادہروی، بیدل، برکت اللہ گلجامی، افضل ثابت، عظیم ثابت، خلیف ثابت، نواب سید حسین علی خاں، بہرام جنگ، مرشد آبادی، علامہ حسین خاں (سلطہ اللہ)، ذوقی رام سرت کے علاوہ بہت سے شعرائے فارسی کے اشعار کا انتخاب ہے۔ امید، آرزو، بیدل کے سوسو شعرا وہ افضل ثابت کے ۷۸ شعرا نقل کیے ہیں جبکہ میرزا کا صرف ایک اور آرزو کے صرف دو شعرا نقل کیے ہیں۔

شعر نے ہمارے خواجہ امین الدین امین علم آبادی کے ۲۴۳۔ میر محمد عظیم خٹک کے ۳، نواب علی ابراہیم قنیل صاحب گلزار ابراہیم کے ۹۸۔ پلاس رائے، نگین خلیف راجہ مان رائے کے ۳۔ جہرم عظیم آبادی کے ۲، علی بخش مفتون عظیم آبادی کے ۲، جاگیر خلیفہ کے ۴، راجہ رام نرائن موزوں عظیم آبادی کے ۵۔ مرتبے خود اپنے دو شعرا و اپنے والد خواجہ عبداللہ تائب متوفی ۱۲۳۲ھ کے ۷۷ اشعار نقل کیے ہیں۔ جو بیاض کے ص ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰ تک چھپ چکے ہیں۔ بیاض کے ابتدا میں مرزا قنیل کا یہ بیاض ہے۔ جو یہ قیاس غالب خود انہیں کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ چونکہ مرزا قنیل کی کسی تحریر کا اب تک پتہ نہیں چلا ہے اس لئے، اس تحریر کا عکس ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ راقم کی نظر سے "کلیات قنیل" کا ایک ایسا نسخہ بھی گذرا ہے جو قنیل کے پاس رہ چکا تھا اور موقوف پارس کے دستخط موجود ہیں۔ قنیل کی تحریر کے علاوہ بیاض کے مرتب خواجہ محمد علی قنیل کی تحریر کا عکس بھی شامل کیا جاتا ہے۔ ان دونوں تحریروں کے لئے میں قاضی عبدالودود صاحب برسر طرہائی پور ٹیڈ کا ممنون ہوں۔

اوپر کے بیانات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مرزا قنیل کا وطن فرید آباد نہیں، بلکہ دہلی تھا۔ اور یہ دلائل ثبوت کے لئے کافی ہیں، لیکن ہم ایک قدم اور اگے بڑھاتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ خود مرزا قنیل نے اپنے بارے میں کیا لکھا ہے۔

(۱۱) مرزا قنیل کا ایک فارسی شعر ہے

گرچہ باشد مولد من خاک دہلی لے قنیل کم کسے چوں من زبرد و ابرو ان رخاست

جب خود وہ اپنا مولدِ خاک دہلی بتاتا ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم اسے صحیح زمانہ میں لیکن ممکن ہے کوئی صاحبِ فرمائیں صاحب یہ تو شعر و شاعری کی باتیں ہیں شعر میں آدمی کیا کچھ نہیں کہہ جاتا ہے۔ ان کے لئے ایک دوسری صاف اور واضح سند بھی پیش کرنا ہوں جس کے بعد شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

۱۲۔ قنیل نے مولوی سلامت کے نام ایک طویل دفعہ لکھا ہے اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو دہلی سے کیسی محبت تھی۔ کیا یہ سببِ حب وطن کے سوا کچھ اور ہے؟ اس دفعہ کے چند جملے یہ ہیں:-

..... داخل شہر شدہ بہ پاس خاطر داعی آثم روزے رونق افروز مسجد فتہ پوری شدہ دکانیں بازار قریب مسجد

مذکورہ اذ طرف من سلاط و دروڈا پر شہر را اشتبا تھے رسانیدن ضرورہ و از عنایات ولی بعد نہ خواہد بود بہ خدا کہ من بہر کویت

وہر خاتمہ آں شہر عاشقہم: ۲۰۹

(۱۳) اسی دفعہ کی ابتدا میں ایک جملہ ہے:-

”شاہ جہاں آباد مولد وطن فقیر است“

میرزا خیال ہے کہ قنیل کی وطنیت دہلی پر اب اس سے زیادہ روشن اور واضح دلیل نہیں لائی جاسکتی۔ اور نہ اس بہتر حجت قائم ہو سکتی ہے۔

۴

ہم سمجھنا ہوں کہ یہ بات اسی طرح سے ثابت ہو چکی ہے کہ قنیل کا وطن دہلی تھا۔ ہر صاحب اس بات کے مدعی ہوں کہ وہ فرید آبادی تھا۔ انھیں اس کا ثبوت معتبر معاصرین کے بیانات سے دینا چاہئے۔ مجھے تو مذکورہ تاریخ کا کوئی بیان ایسا نہیں مل سکا جس سے اسکی وطنیت فرید آباد ثابت ہو سکے۔ وطنیت تو بعد کی چیز ہے، قنیل کا تو قیام فرید آباد ہی متعین نہیں۔ تاریخ، تذکرہ، روزنامہ، مکتوبات اور بیاضوں کے مطالعہ سے ہمیں قنیل کے مختلف شہروں میں رہنے اور آنے جانے کی سیسیوں مثالیں ملتی ہیں لیکن کسی ایک جگہ بھی ایسا نہ ملتا کہ وہ اس ایک جگہ کے لئے بھی فرید آباد میں قیام ثابت نہیں ہوتا۔

قنیل، عاشق کے بیان کے مطابق ۱۱۶۲ھ میں پیدا ہوا۔ اور محمود کے قول کے مطابق ۱۲۳۳ھ میں اس نے وفات پائی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ اس مدت میں کہ جہڑا اور کہاں کہاں کی خاک چھانٹا رہا۔

۱۱۶۲ھ

۱۔ عاشق کا بیان ہے کہ قنیل کی پیدائش ۱۱۶۲ھ دہلی میں ہوئی۔ در ۱۱۶۴ھ در شاہ جہاں آباد اتفاق افتادہ

۲۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر تک یعنی تقریباً ۱۱۹۰ھ تک وہ تحصیل علم کرتا رہا۔ یا تو دہلی رہا یا فیض آباد۔ گو کونائج

اٹایا آفس کی نہرست کتب خانہ فارسی جلہ دوم میں مشہور واقعات اور شعرا و اکابرین کے سبب ولادت و وفات وغیرہ دیئے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۱۲ھ میں عبدالقادر خان کا کرکن الیٹ انڈیا کا قیام جان سٹڈن کی معیت میں لکھنؤ میں تھا۔ بہر حال ۱۲۱۲ھ میں عبدالقادر خان لکھنؤ میں موجود تھا۔ اب رہا اس کے اورتھیل کے تعلقات کا حال، سواس کا بھی ثبوت ملا خطہ جو ۱۔

نہرالذ صاحت کے دفعہ ۲۶۹ میں قتل اپنے کسی عزیز کو لکھ رہا ہے کہ تھا را سفر حکمتہ اور خان صاحب مولوی عبدالقادر کی وساطت سے مسٹر جان سٹڈن سے ملاقات کا حال معلیم ہوا۔ چون این۔ بے سرو با یا جان صاحب مددج نیانے داخلا سے است۔۔۔۔۔ معلوم ہوا کہ قتل ۱۲۱۲ھ میں لکھنؤ میں موجود تھا اور وہیں مولوی عبدالقادر خان کے مکان پر اس کی ملاقات متا سے ہوئی۔ (۱۲۱۲ھ)

۱۔ چار شربت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۱۵ھ میں وہ کالپی گیا اور دھانی سال تک ان مقیم رہا۔ صاحب تذکرہ شمع الحق کے قول کے مطابق وہ عماد الملک کا صاحب بن گیا تھا۔ تذکرہ سراج الادکار میں بھی یہی ہے کہ کچھ دنوں کالپی رہے اور پھر ونوئی بسر کی۔ (۱۲۱۵ھ)

۱۱۔ چار شربت میں وہ خود لکھتا ہے کہ ۱۲۱۶ھ میں کالپی سے لکھنؤ واپس لوٹا۔ (۱۲۱۶ھ)

۱۲۔ حسین علی خان عاشقی تلمیذ وجہ الدین شافعی عظیم آبادی کا بیان ہے :-

”... الحال از موصی شش سال لکھنؤ شریف میں دوازہ روزہ بازو سال

بیبب خلعت و اتحاد مرزا شجاعت علی خاں مشہور بہ آغا صاحب کہ مختارہ سرکار

دولت مارہ شذراۃ آفاق مرزا سکندر شکوہ بہاور... بہ دولت شاہ زاوۃ

مدون متقاوت پذیرفت۔“ بعد نخر بر احوال ناگمان خبر جان گدار ز سبب کہ

آن فصاحت کیش بہ مرض استسقاء بنا بر رخ بست و سوم بیع الاول و

لکھنؤ و ولایت حیات سپرد۔“

عاشقی یہ سطر قتل کی بالکل آغزی عربی لکھ رہا ہے۔ اس کا سال وفات ۱۲۳۳ھ ہے اگر اس سے ۵ سال نکال لے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قتل تقریباً ۱۲۱۵ھ میں سکندر شکوہ کے مصاحبوں میں داخل ہو چکا تھا۔ (۱۲۱۵ھ)

۱۳۔ دہلے لطافت کی ترتیب میں قتل کا بڑا ہاتھ تھا اور نصف ثانی جو منتظن و قرائی اور بیان و بدیع پر متعل ہے طلیہ اس کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب سماعت علی خاں مسند پر رونق افروز تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ۱۲۳۱ھ

۱۔ عبدالقادر اور قتل کے تعلقات پر روشنی ڈالنے عبدالقادر خانی سے بھی پڑتی ہے جس کا ایک نام نسو کنیا ہے حبیب گنج میں موجود ہے۔ ایک نسخہ جامعہ علی گڑھ میں بھی تھا ایک اب موجود نہیں۔ ناظم نے اپنے کام کے لئے کچھ اجزا کی نقل کتب خانہ حبیب گنج کے فخر سے کرائی ہے۔ اور اس وقت وہی پیش نظر ہے۔

قیس میل لکھنؤ میں موجود تھا۔ (۲۲-۲۱ھ)

۱۲۔ آواز آنے دیجی کے حوالے سے لکھا ہے کہ مرزا حاجی کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا، انتشار، قیل، مصحفی اور دوسرے شعراء جمع ہوتے، ناسخ جلتے، سب کو سنتے مگر وہاں خود کچھ نہ پڑھتے۔ (آب حیات: ۳۴۵)

مرزا حاجی کے مکان پر مشاعرے کب ہوتے تھے اس کی ہمیں خبر نہیں، لیکن ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ انشا ایک روایت کی بنا پر ۱۲۲۵ھ میں خاندنشین ہو گیا تھا۔ اس مجمع میں مرآت بھی نظر آتا ہے۔ اس کا سال وفات ہی یقین کی بنا پر ۱۲۲۲ھ ہے۔ یہ مشاعرے ظاہر ہے کہ ۱۲۲۲ھ یا اس کے لگ بھگ منعقد ہو کر نہ گئے جب کہ تیسرے آخری ایام تھے۔ اور ناسخ کا ابتدائی دور۔

۱۵۔ محل انصاف مرزا قلیل کے ان رفعات کا مجموعہ ہے جو حاجی امام الدین آٹا می نے اس کی زندگی ہی میں مرتب کیا ہے۔ اس کے ایک کتبہ میں تسکلی رقمطراز ہے: "اتقا صاحبان محمود و محترمہ بنیریت اندو ماہرہ مگر یہ کوئی مستند من بہ نحاس درخا و شہما" نحاس لکھنؤ کا ایک محلہ ہے۔ اور یکنوب ۲۰ ربیع الثانی ۱۲۲۵ھ کا لکھا ہوا ہے۔ (۱۲۲۶ھ)

۱۶۔ ایک دوسرے کتبہ کے چند جملے یہ ہیں: "ہیز روز کشیدہ عرہ تربت لثانی ۱۲۲۵ھ بود" عرضہ شام و خطے کہ اسی من بود و روزی نحاس بمیکہ از حضور بر این تقدیر کہ فردا روزہ مشاعرہ است رسیدم بہ مطالعہ در آمد" اس سے معلوم ہوا کہ ۱۲۲۵ھ میں وہ لکھنؤ میں موجود تھا۔ (۱۲۲۶ھ)

۱۷۔ مولوی عبدالنفا خان نگین رام پوری اپنے روزنامہ "ذوق عبدلفاروقانی" میں سید سفر لکھنؤ ۱۲۲۹ھ کے ذیل میں لکھتے ہیں: "روزے و محفل مشاعرہ کہ در ایام بدعا میرجعفری بود" فقہ مرزا محمد حسن قلیل، مصحفی، میر نصیر دہلوی در ایام زمرہ مرگروہ ہشاری آمدند" شیخ امام بخش ناسخ در ایام روزہ افزونی، نامرودی در ایام ہار بود" نسخہ راقم: ۵۵ معلوم ہوا کہ قلیل ۱۲۲۹ھ میں لکھنؤ میں موجود تھا۔ (۱۲۲۹ھ)

۱۸۔ ۱۲۳۱ھ میں ہم اسے پھر دہلی میں موجود پاتے ہیں منظر العجب کے دریا پے سے معلوم ہوتا ہے کہ دورانِ ایلیم کتاب میں وہ کاپی میں ہے۔ یہ کتاب ۱۲۳۱ھ میں لکھی گئی۔ عارف ظاہر ہے کہ ۱۲۳۱ھ میں وہ کاپی میں موجود تھا۔ (۱۲۳۱ھ)

۱۹۔ راج امرت لال اپنے لڑکے کھن لال کی شادی کے موقع پر پینٹل کو جو وہیں لکھنؤ میں موجود ہے دعوت نامہ بھیجنا ہے۔ "موضوع اقدس فی رسامہ کہ شرب شنبہ برات بندہ زادہ کھن لال بودہ و کالے کہ برچہ میلا فروکش کردہ ام امیدوارم کہ امروز یا فردا برائے یک دوساعت اگر غلام نواری فرمان بہ موجب افتخار است"

کتبہ برات امرت لال کے اس قلمی نسخے کی ابتداء میں کچھ اور سادہ اوراق ہیں جن پر کچھ ریختہ کے اشعار و کچھ نسخے اور کچھ قطعات تاریخ و راج ہیں۔ ایک قطعہ تاریخ کھن لال کی شادی کا بھی ہے جس سے صنعتِ تعبیر میں ۱۲۳۲ھ کے اعداد نکلتے ہیں۔ تقریب شادی لکھنؤ میں انجام پائی معلوم ہوا کہ قلیل ۱۲۳۲ھ میں لکھنؤ میں موجود تھا۔ (۱۲۳۲ھ)

۲۰۔ اس کا سال وفات ۱۲۳۳ھ ہے اور اس امر پر تمام مورخوں اور تذکرہ نویسوں کا اتفاق ہے کہ اس کی وفات لکھنؤ میں ہوئی۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ ۱۲۳۲ھ میں لکھنؤ میں موجود تھا۔ (۱۲۳۳ھ)

ذیل کی سطر دوں سے معلوم ہوا کہ قلیل کس سنہ میں کمان رکھا۔

” ۱۱۹۰ھ تک دہلی باغیض آباد۔ ۱۱۹۶ھ میں دہلی ۱۱۹۰ھ تک دہلی سے باغیض آباد
 لکھنؤ ۱۲۰۶ھ تک لکھنؤ۔ ۱۲۰۲ھ تا ۱۲۰۹ھ کے درمیان کسی ایک وقت لکھنؤ ۱۲۰۶ھ کے دو جاہل برس پہلے سے لکھنؤ۔
 ۱۲۱۲ھ لکھنؤ ۱۲۱۵ھ کاہلی۔ ۱۲۱۶ھ لکھنؤ۔ ۱۲۱۸ھ لکھنؤ۔ ۱۲۲۱ھ لکھنؤ۔ ۱۲۲۲ھ لکھنؤ۔ ۱۲۲۳ھ لکھنؤ۔
 ۱۲۳۱ھ دہلی ۱۲۳۲ھ لکھنؤ۔ ۱۲۳۳ھ لکھنؤ۔ اب مجھے بتایا جائے کہ آخر اس کا فہم فرید آباد میں کب تھا۔ نہ اس کا قیام وہاں
 ثابت۔ نہ اس کے باپ کا قیام متحقق۔ نہ وہ وہاں پیدا ہوا نہ اس کے باپ کی پیدائش وہاں ہوئی نہ وہ وہاں مرا۔ نہ اس کے
 باپ کی وفات وہاں ہوئی۔ آخر یہ فرید آباد اس کا وطن کیسے ہو گیا ؟

۵

میں نے ۱۹۴۲ء میں دہلی اسکول کے نمٹان کی فراغت کے بعد پروفیسر کیا گیا تھا، اور ۱۹۴۳ء کی ابتدا میں جب علی گڑھ
 میں فرسٹ ایئر میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اشاعت کے لئے نگار کو بھیجا گیا تھا، جہاں وہ جون ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا۔ اب دس سال
 کے بعد نظر ثانی، ترمیم اور اضافہ کے ساتھ اسے پھر شائع کیا جا رہا ہے۔ اس اثنا میں کچھ نئے مواد تک بھی رسائی ہوئی اور بعض
 پڑانے بیانات کی مزید تحقیق کا بھی موقع ملا تحقیق کی دینیامی دس ماہ کی مدت میں بہت سے اوجھڑیں تھیں ایک آدھ بات ایسی
 نظر آجاتی ہے جس کی بنا پر پڑانے نظریے باطل کر دیتے ہوتے ہیں مبالغہ مست ہے کہ دس سال گزر جانے پر بھی جو ابتدائی مفروضہ
 میں نے قائم کیا تھا اور جو دعویٰ اس مضمون میں کیا گیا تھا، اس سے بال برابر پٹنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی بلکہ اپنے دعوے پر
 اور محکم ہونے کا موقع ملا۔ اس اثنا میں بزرگوں اور دوستوں کی رائیں بھی معلوم ہوئیں۔ اپنے مفروضہ فاضل عبدالرؤف صاحب پیر
 کامنوں ہوں کہ انھوں نے مضمون کا بڑے غور سے مطالعہ فرمایا اور بڑے مفید مشورے دیئے ہیں ان کا تہہ ولی سے شکریہ ادا
 کرتا ہوں۔ ایک مضمون بھی اس سلسلے میں لکھے گئے جن میں خود وہی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی مضمون قابل ذکر ہے۔
 انھوں نے اپنے گرانقدر مضمون میں بعض نئی باتیں دی ہیں۔ ان کی وضاحت ضروری ہے۔

فرید آبادی صاحب نے ”مرزا قلیل کا وطن“ کے عنوان سے ایک مضمون رسالہ اردو اجنری ۱۹۴۵ء میں شائع
 کیلئے تہہ دیک کے بعد آپ فقط ازہیں :-

” رسالہ نگار میں مختار الدین صاحب آرزو نے بڑی محنت اور قابلیت سے تفصیل کے حالات مختلف
 تذکرہ دہلی سے جمع کیے ہیں اور زیادہ و توفیق سے عاصمی تعلیم آبادی کی شہادت پیش کی ہے جو قلیل کا
 ہم عصر اور اس کے ساتھ خط و کتابت لکھنا تھا اور بڑی تفصیل سے اس کے حالات تحریر کرتا ہے۔
 اس نے قلیل کی ولادت شاہ جہاں آباد دہلی، بتائی ہے۔ بعض اور معتبر تذکرے بھی اس کی
 بطیت اور ابتدائی نشو و نما دہلی تحریر کرتے ہیں۔ مختار الدین صاحب کا بھی یہی خیال معلوم ہوتا
 ہے اور ہمیں ان کی تائید میں غدر نہیں۔ لیکن مضمون کے آخر میں بوہ سوالی کرتے ہیں کہ آخر فرید آباد
 اس کا وطن کیسے ہو گیا ؟ جواب میں عرض ہے کہ اس کے دہلوی کہلانے اور فرید آبادی ہونے میں

کوئی تناقض نہیں ہے کیونکہ فرید آبادی دہلی کے مضامین میں داخل اور ”در بابِ لطافت“ میں اس کا نام دہلی کے محلوں اور بازاروں کے ضمن میں تحریر کیا گیا ہے اور یہ وہ کتاب ہے جس کے تحریر دو باب خود مرزا قنبل نے لکھے تھے۔“

عرض یہ ہے کہ جب دہلی کو مٹانے اور فرید آبادی ہونے میں کوئی تناقض نہیں ہے تو اختلاف ختم ہو جاتا ہے۔ اب ایسے بیان پر بھروسہ کرنا زیادہ بہتر ہے جس میں اکثریت کا اتفاق ہو۔ سارے قدیم تذکرہ نویس اسے دہلی کہتے ہیں فرید آبادی کوئی نہیں بتاتا۔ اس لئے اسے دہلی ہی کہیں نہ تسلیم کر لیا جائے خصوصاً ایسی شکل میں کہ:-

”تاہم چونکہ تذکرہ نویس نے قطع نظر خود فرید آبادی کا محلوں و نواح اور دہلی سے تعلقات ایسے ہے کہ اگر کوئی تذکرہ نویس قنبل کو ایک نواحی بستی کی تفصیل لکھنے کے بجائے اجمالا دہلی لکھتا ہے تو اسے ملحوظ نہیں کر سکتے۔“

آخر میں فریاد مانتے ہیں:-

”بہر حال انتہائی یقینی ہے کہ غالب نے جو قنبل کے قریب العصر اور دہلی کے مٹنے والے تھے، اس کے فرید آبادی ہونے کا حال کسی سے سنا ہوگا۔ ورنہ خود خود اس کا وطن تصنیف نہ کرتے، یہ بہت بعید از قیاس بات ہے۔ پس جب تک ان کے کسی معاصر کی ترویج و تفسیر آئے ہم عالمیہ رد و قدح کو ان کے بیان کی نگاہ سے لے کر فی نہیں سمجھتے۔“

غالب کی تحقیق اور عاصمہ مارچھی کے متعلق عرض کیا جا چکا ہے۔ پھر غالب نے اسے لکھنؤ ہی اور ایک مجدد دہلی بھی تو لکھا ہے۔ غالب کے ایک قول کو تسلیم کیا جائے اور دوسرے اقوال کو کہیں ٹھکرا یا جائے خصوصاً ایسی صورت میں کہ وہ اقوال صحت سے قریب تر ہونے کا امکان زیادہ رکھتے ہوں۔ آخری اقوال، ان کی عمر کے آخری دور کے اقوال ہیں اور ہو سکتا ہے کہ انھیں بعد میں صحیح اطلاع ملی ہو اور وہ اپنے پہلے قول سے پھر گئے ہوں۔ اور جہاں تک وطن تصنیف کرنے کا تعلق ہے تو انھیں تو آدمی تصنیف کرتے و پر نہیں لگتی۔ بعد اصرار مرزا کی تصنیف نہیں تو اور کیا ہے؟ رہا سوال معاصر کی ترویج کا، تو پہلے یہ تو معلوم ہو کہ غالب کے علاوہ قنبل کی وفات کے وقت غالب کی عمر میں کیس سال کی تھی جو زمانہ ان کی جوانی کی رنگینیوں کا تھا، مرزا اس زمانہ میں دہلی میں تھے کبھی کبھار زمانہ مال اگر سے چلے جاتے ہوں گے۔ ان کا اس زمانہ میں لکھنؤ جانا اور قنبل کا دہلی آنا ثابت نہیں۔ اس لئے ملاقات کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ان وجوہ سے ان دونوں کی معاشر بھی کچھ دبی ہی ہے، اور کون ایسے معاصر میں جو قنبل کو فرید آبادی بتا سکتے ہیں۔ اور فاضل ضمون کا عاشقی عظیم آبادی اور خواجہ قننا عظیم آبادی کو قنبل کے معاصر کہیں نہیں سمجھتے جن سے تعلقات و خط و کتابت اور ملاقات سب کچھ ثابت ہے؟

مصادر:-

مرزا قنبل کی مطبوعہ تصانیف، تاریخ و تذکرے کے کتابوں اور رسائل کے علاوہ ذیل کے مطبوعات خاص طور پر قابل ذکر ہیں:-

۱۔ تذکرہ خوش معرکہ زیبا مرتبہ سعادت خان ناصر، نسخہ خدائش باکی پورہ جامعہ علی گڑھ۔

- ۲۔ تذکرہ سیفہ ہندی
 - ۳۔ تذکرہ شتر عشق
 - ۴۔ تذکرہ معراج الجنال
 - ۵۔ تذکرہ ریاض الادکار
 - ۶۔ تذکرہ خلاصہ الافکار
 - ۷۔ عثمان المعانی
 - ۸۔ کلیات قیل
 - ۹۔ رفعت امرت لال
 - ۱۰۔ وقائع عبدالقادر رسانی
- مرتبہ جگوان واس نسخہ خدا بخش بانکی پور۔
 مرتبہ آغا حسین علی خان عاشق عظیم آبادی نسخہ خدا بخش بانکی پور۔
 مرتبہ میر و زبیر علی خیرتی عظیم آبادی نسخہ الیشیا ملک سوسائٹی بنگال۔
 مرتبہ میر و زبیر علی خیرتی عظیم آبادی نسخہ راقم۔
 مرتبہ ابوطالب تبریزی اصلہانی نسخہ خدا بخش بانکی پور۔
 مرتبہ خواجہ محمد علی گنا عظیم آبادی نسخہ قاضی عبدالودود و صاحب بانکی پور۔
 ارتقین۔ نسخہ خدا بخش، جامعہ علی گڑھ، جامعہ بنارس، حبیب گنج۔
 مرتبہ امرت لال نسخہ راقم۔
 مرتبہ عبدالقادر رسانی نمکین رامپوری۔ نسخہ راسم۔

۱۔ یہ مضمون کچھ دنوں سے گم تھا اور میں اس سے دایوس ہو چکا تھا کہ کہیں سے اس کے آفتاب زہیری صاحب نے اس کا مسودہ ڈھونڈ نکالا، انھیں نے اس کی نقل بھی تیار کی، میں اس کے لئے ان کا ممنون ہوں۔ (غفار الدین احمد)

ثنوی بہارِ عشق

خواجہ احمد فاروقی

ہمارے تئیں ایک عرصہ تک واقعہ و محنت کا کام انجام دیتی رہی ہے۔ اسی لیے مرزا شوق کی ثنوی بہارِ عشق کو کبھی دروغ و افتنا نہیں سمجھا گیا۔ ہم نے پہلا کو مرتق کی آئین میں پوشیدہ رکھا۔ لیکن اس میں مکیس یا ردیجے کی کوشش نہیں کی۔ ہم زاہر و خوں میں سے یکجہ میں مصروف رہے اور یہ کبھی نہیں سمجھے کہ مذہب قدح خوار سے بھی بہت سی باتیں مکیس جاسکتی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ بہارِ عشق کسی کے دے ہوئے لیکن پُر غروش مکیس و جہانات کی نشاۃِ امجد داستان ہے۔ یہ سہ کلامی اور پیش کوشی کی کہانی ہے۔ جس کو شاعر نے پوری بے باکی اور بے جہالی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ لیکن اس نے رنگین پردہ قوال کو پردہ کے نقش و نگار کو حقیقت باور نہیں کرایا۔ ۱۱۔ مذہب و ملت ہیں تو کسے اپنے گناہ کو بدتر از گناہ بنا یا ہے۔

ثنوی پڑھنے کے بعد ہمارے دل میں مختلف سوالات پیدا ہوتے ہیں؛ کیا مرزا شوق نے بعض زندگی کی نریمان ہی کی ہے اسے بند نہیں کیا؟ کیا ان کی پستی میں عزت ہی عزت ہے، کسی قسم کی لطافت نہیں ہے؟ کیا ان کی فتاوٰی بندی کی منادان قطع کرنے میں کوئی بھی دو نہیں دے سکتی؟

ایک شخص جو اپنے سر پر بھاری بوجھ اٹھائے ہوئے اندھیری رات میں دشوار گزار سفر طے کرنا رہا ہے۔ وہ اگر راستہ کے پہنچ و غم اور نشیب و فراز سے، دوسرے راہ گروں کو ملین کر دیتا ہے تو وہ جس کے الفاظ میں اپنا ہی بوجھ دھکا نہیں کرتا بلکہ دوسروں کا بھی بوجھ دھکا کر دیتا ہے۔

خیاتم نے ایک شیخ اور زن فاحشہ کا مکالمہ کیا ہے۔ زاہر نے بدکار عورت کو بھڑکا کر تو ہر وقت مست و غراب رہتی ہے۔ تو نے خیر سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا ہے۔ اور شر سے وابستہ ہو گئی ہے۔ کچھ عاقبت کی بھی خبر ہے تجھے؟ اس نے کہا عنود میں تو میری ہوں اپنے آپ کو بنا ہر کرتی ہوں کیا آپ بھی ایسے ہیں جیسے اپنے آپ کو بھڑا کر رہے ہیں؟

مرزا شوق نے اپنے انداز میں اسی سوال کو دہرایا ہے اللہ اس سوال کی حسین اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

یہ فقہ جان عالم و جامع شاعر کے اس کھٹو سے متعلق ہے جہاں فیضِ نبیم اور عبودہ گل کی کمی نہیں تھی۔ ہر مغفرت نگاہ اور ہر گوشہ بساط و دایان با فنان بنا ہوا تھا۔ نگاہ جہاں بھی تھا۔ اور شوق وصال بھی، دہس کے سوا گل، اندر سبکی پر بوں کے غیجے، و دگاہ حضرت عباس اور قیصر بدخ کے میلے اور شعر و سخن کی عام مضمون نے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ محکم قضا کو جام شراب کی گردش سے پھیر دیا ہے

اور شام و سحر کی یہ نینکیاں قائم ہو کر رہ گئی ہیں۔
 سے و راسخ و دنگ و بو کی یہ فینیں، پٹیلیاں صرف آفتاب سہ پہر چاہ و حشم ہی کے لیے مخصوص نہیں تھیں جن کے
 اختیارات کم ہوتے ہوئے محدود ہو گئے تھے۔ بلکہ ہر عجب و امیر اسی دنگ میں رنگا ہوا تھا۔ ہر خاص و عام کے آگے اسی طرح ایک
 نہ ایک جام سرشار ہی رکھا ہوا تھا۔ ذہر و صبح بھی تھا، اور جام بلور بھی، صراحی مے ناب بھی تھی اور فیضِ غزل بھی، لوگ، ماضی و مستقبل کو ماضی
 کی مہتیوں اور نگینیوں میں جھلکے تھے اور دست افشانی اور پا کوئی کا مفہوم صرف یہ رہ گیا تھا کہ:-

بیانا یک مشب تماشا نسیم
 چو فزا شود فکر فزا نسیم

، بہا، عشق کے فتنے کی ابتداء اور انتہا اسی صں بیزاد عشق خیز سرزمین میں ہوتی ہے۔
 میرا فسانہ لفظ کا ایک خوب صورت نوجوان ہے۔ جس کا وقت آبی مسموم مہنبوں اور چھبوں میں گزرتا ہے۔ وہ عشق و عاشقی
 سے قطعی ناواقف ہے اور دوامِ ازلت سے نا آشنا۔

نامِ ازلت سے ہم نہ جنتہ آکا و کسی یوسف کی تھی نہ ہرگز ماہ
 حبش و عشرت میں تھی تھی اوقات چھبوں میں گذرتی تھی اوقات
 عشق کا سنتے تھے نہ ادا نہ شوق و دیون پہ تھے نہ پادانہ
 جان دیتے نہ تھے کسی گل پر بنیتے تھے ناہائے مہل پر
 آہ و زاری جو کوئی کرتا تھا اک دہلنا ہمیں گزرتا تھا

لیکن ایک دن جب کہ وہ کائنات کے شرفائے دستور کے مطابق چوک میں سیر کرنے جا رہا تھا۔ آٹھنا ایک کامزا اس سے
 آنچیں چا رہی ہو گئیں۔ اور اس کے ہوش و حواس کا سارا سرا یہ چھن گیا۔ وہ دل بہان اب تک مسرت و اطمینان کی طرانی تھی، وہاں انتظار و
 التہاب کا پرچم چمک اٹھا۔ یہ داستان خود شاعر کی زبان سے سننے کے قابل ہے۔

ایک دن جو برائے سیر انخا دیکھی کوٹھے پہ ایک ماہ لقا
 ہم روشن تھا ہوا کی صورت سر سے ہانک تھی نور کی صورت

”ماہ لقا“ کی یہ مضمر یہ تھی مکمل اور دلکش ہے۔

خسں یوسف بھی اس کے آگے ماند پہرہ دھنوں میں جیسے ابر میں چاند
 محی سے رخسار، گول گول بدن نکات جس طرح چمکتے روشن
 رخ پہ وہ بکھرے بکھرے لطف کے مال بگ بگ سے وہ موت پان سے لال
 بے مہی کے وہ دانت و شب قدر بان عاشق شاد ہو جس پر
 ناک میں نیم کا فتنہ تو نکا ! شوخی چالاک متھنسا سن کا !
 آستینوں کی وہ پھنسی کرتی جسم میں وہ مشاب کی پھرتی

قدیم آئنا سب قیامت کے گوری گردن میں طوق منت کے
مُخ پر لکھی سے وہ عرفی لم کم جس طرح گل پہ نقشہ شبنم
حس مُخ ہوتیوں کے انڈی میں بھیاں چھوٹی چھوٹی کاؤں میں
دل گل سی کر چسکتی ہوئی چوٹی ایڑی ٹلک ٹھٹی ہوئی
مرو سا قد تو گل سے رخصتے شانے بازو بھرے بھرے سائے

گنتا مکمل اور صحیح نقشہ ہے یہ۔ مہ تقا کی ابھی شادی نہیں ہوئی۔ اس کی جوانی ابھی کاٹنے میں تھی رہی ہے۔ اس کی خوبصورتی آرائش اور تحفہ سے بھر پور بنا ہے، مرزا شوق نے تجربے ہوئے ہاؤں اے سنی کے دانوں، آتینوں کی پھنسی کوئی جسم کی بھرتی ناک میں نیم کے تنگے، لاؤں کی بھینوں، بھرے بھرے بازوؤں، پیسینے کے چھوٹے چھوٹے قندوں، اور چوٹی کے ٹھٹھے کا ذکر کر کے مہ تقا کی تصویر اپنے ہاؤں ایک موقع سے پوری خوبی و صفائی کے ساتھ کھینچی ہے۔ اس سراپا میں اور نہ ہر عشق کے سراپا میں بڑا فرق ہے۔ اس سے مقصود نہ دُخ و دوش کے آگے شمع رکنا ہے اور نہ کسی مقابلہ کرنا۔ بلکہ صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ آب و رنگ اور جزئیات کے اعتبار سے بہاؤ عشق کی تصویر زیادہ دل پذیر ہے۔ نہ ہر عشق کے اس قسم کے الفاظ، جڑتِ حور، کمالِ عینیت، رشکِ چشمِ غزال، بے مدہل و فیض ہمارے سامنے چہرین کا پورا نقشہ پیش نہیں کرتے۔ بہاؤ عشق میں تقسیم نہیں ہے۔ مہ تقا کی اوڑھیں الگ ہیں، مخصوص ہیں، اسی کے لیے ہیں۔ سراپا میں جس جگہ بھی نفرت کیجئے یہ جی چاہتا ہے کہ عزیز میں بسر کر دی جائے۔ ایک ایک کرشمہ دامن دل کو کھینچتا ہے اور کہتا ہے اے مارا میں اور دو آں نیزم !
فیہر شہنوشی اس جہن اور حوران منظر کی تاب نہ لاسکا۔ اور ایک ہی نگاہ میں دل ہی کا سودا نہیں ہوا بلکہ اس کا زمین و آسمان بھی چھین گیا۔

جب نفرت سے نظر دو چار ہوئی ایک ہر جی جگہ کے پاؤں ہوئی
رنگ نہ نہ کیجئے ہی زور دہڑا دل میں ہے اختیار و دروہڑا
دل جو دم بڑا اٹھاتا تھا ایک رنگ آتا ایک جاتا تھا
حمن نے کی دل سے کج ادائیگی منہ پہ چھٹنے لگی ہوائی سی
سوزش و داغ دل دو چند ہوئی آتش عشق سب بند ہوئی
سوزِ دل سے یہ آگ بھڑکائی جان گہر لکے لب تلخ آئی
منہ کو تباہ تو آں نے پھیر لیا اہر گیسو نے دل کو گھیر لیا
واں جسے بٹن ٹلک ہوئی و شوار تیر کھائے ہر جس طرح سے شکار
جان دول مبتلا سے دو دھجے یک ایک ادا تہ پاؤں سرو دھجے
بس کلیجہ سا کوئی ملنے لگا غم سے دل دو دو اٹھا پھٹنے لگا

بیاتری شہر بھی ملاحظہ ہو۔

شہر سارا اہاڑ تھا گویا آتنا رستہ پہاڑ تھا گویا

یہ کیفیات اصیت سے اتنی قریب ہیں کہ پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پہلی نگاہ کی جمت اکثر غلط چمنوں کی نظر میں قابل اعتراض رہی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ محبت کو کسی ترازو میں نہیں تو لاھا سکتا اس کا کوئی وقت، کوئی لمحہ مقرر نہیں ہے۔ اس کا کوئی تاقون ہے، نہ کوئی تاریخ۔ پھر اس قسم کا فیصلہ کسے وقت ہمہ اُس زمانے کے، اور اپنے ملک کے مخصوص حالات کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ یہاں بہت سی عورتیں ہی نہیں، مرد بھی قفس میں بند رہتے ہیں اور کسی فتنہ طراز کو دلچسپ کران کے تاثرات بھی اتنے ہی شدید ہوتے ہیں۔

یہ زخم اتنا عاری تھا کہ میر فتویٰ کی تمام شب بے چینی اور اضطراب کے ساتھ گوری — عشق کا رات بھر تو جوش رہا؛ صبح جلتے ہی پھر نہ ہوئی رہا۔ دوست آتشا نہایت پریشان ہوئے، صدقے کیلئے اُڑنے لگے۔ گلاب چھڑا جانے لگا۔ اقرار کو بھی تشویش ہوئی۔ اور بعض کو تو یقین ہو گیا کہ یہ شخص اب جاں بر نہیں ہو سکتا۔ یہ بات مبالغہ آمیز ہو سکتی ہے۔ لیکن ناممکن نہیں۔

دو کے کہنا تھا کوئی غم ہے بڑا یک بیک آسمان ٹوٹ پڑا
کچھ دوا کرتے دل کو صبر آتا لاش پیار پڑ کے مرجھاتا
زنی اور نہ کی نہ اپنی کہی دل کی حسرت تمام دل میں ہی
اللہ آج سے اس کو پا رہے سارے گھر کا یہ بنی اچالا رہے

سارا گھر ماتم کر رہا جو اتھا کہ خدا خدا کر کے اس مریض غم نے آنکھیں کھولیں اور اس بے ہوشی سے نجات پائی —
تن ہے جاں میں سب کے جان آئی

ریخ اور غم دونوں سے ہو گئے دُور اپنے بیگانے سب ہوئے سرور
اب لوگوں نے اس زخم بے نشان اور تیرے کہاں کا پتہ ٹھکانا شروع کیا۔ ایک آدمی قسبیں دے دے کر پوچھنے لگا۔ ناچا رہا ہادی داستان سنا تا پڑی۔

ماہر اسب بہت دیا ان کو ان کے گھر کا پتہ دیا ان کو
دوستوں نے غم گساری اور چارہ سازی کا پورا یقین دلایا۔
آتشا بوسے شہر چھپائیں گے لائیں گے ہم جہاں سے ہمائیں گے
ہیں جو اس شہر ہیں تو آئیں گی ہم سے چھپ کر کہاں پہ جائیں گی
کچھ عرصہ اسی پریشانی اور اضطراب میں گزارا۔ عاشق کا کسی چیز میں دل نہ لگتا تھا۔ دریا کی سیر کی۔ باغ کی بہاد چوسر۔ شطرنج کوئی چیز اسے سرور نہ کر سکتی تھی۔

بالآخر ایک دوست نے اس کے گھر کا پتہ بتا دیا۔ اور آکر یہ خوش خبری سنائی۔ لیکن دیکھئے کتنے صیبت اذنان سنائی ہے۔

جس پہ عالم فریفتہ ہے آج حُسنِ خود جس کا شیفہ ہے آج
جس کو ہے ادعائے بحیثیتِ آفتِ جاں ہے جس کی دعائی
تبیخِ ابرو سے جس کی بسلِ ہمو تیر شڑ گان سے جس کے گھاٹی ہو

جس کی خاطر جوا ہے مال تباہ
کھاتے پیٹتے ہوا درد سوتے ہو
جس کی فرقت میں ہر کہاں تباہ
جس کی اُلفت میں جان کھستے ہو
جہاں دیتے ہو جس پر مرتے ہو
جس سے تم گر پر دم نکلتا ہے
جس کا رہ کہے دھیمان آئے ہے
گھر بڑی محنتوں سے پایا ہے
اس کے جواب میں عاشق کا تاثر صرف یہ ہے

ہنس دیا، رنج دل سے دور ہوا

پھر گلہ برا کے پوچھتا ہے وہ کب آئیں گی؟

یا مجھے اپنے گھر بلائیں گی؟

دوست ہنستا ہے اور کہتا ہے: ہوش کی دوا کرو۔ یہ کچھ ایسا سہل اور آسان مغز ہی ہے۔

ہنس کے اس نے کہا جوں میں آؤ
ایسا آسان ان کا آنا ہے
ان مری باتوں پر نہ اتراؤ
سہل کچھ آپ کا بلانا ہے
کس نے یہ مشورہ بتایا ہے
دل کہیں اور بھی ملجا ہے
عشق آفت آسمانی ہے
برسوں لوگوں نے خاک چھانی ہے

اس کے بعد عشق کے فلسفہ پر تقریر ہے۔ یہ طولانی ضرور ہے۔ لیکن اردو ادب و شاعری میں اس کا یہاں تجزیہ کی مثالیں ایک ہی دو

جگر مل سکیں گی۔

عشق آفت آسمانی ہے
شعاع ہو کے کہیں بجھتا ہے
کہیں سر مرد ہے، چشم تڑپے کہیں
کہیں بے کفر اور کہیں اسلام
کہیں فرقت کا درد مند ہے یہ
کہیں زخم ملگرا چھا تا ہے
کہیں عارض کا خال بنتا ہے
کہیں انہی زلفِ یاد ہے یہ
برسوں لوگوں نے خاک چھانی ہے
کہیں پردہ بانہ بن کے بنتا ہے
کہیں صندل ہے، درد دیر کے کہیں
کہیں دو فوں کو کرتے ہیں یہ سلام
کہیں مغز دردِ غم دہند ہے یہ
دردِ دین کہ کہیں کرا تا ہے
کہیں چشم غزال بنتا ہے
کہیں تریاق زہر مادہ ہے یہ
خندہ زخم عاشقان ہے کہیں

کہیں خود بینی اس کو نامرغوب
کہیں غمخیزے دستِ قاتل کا
ہے کہیں تاجِ بادشاہی کا
گلِ رخسارِ آتشیں ہے کہیں
سینکڑوں جی سے کھو دیئے اس نے
بھولا دیا دوسری کوہ کنی
وصلِ تم بھیجے آج ہی کل میں
قیس برسوں پھر ایسے بھگل میں

اس کے بعد دوست طریقہ کا دہلتا ہے۔ کہ پہلے ان سے دہل چڑھایا جائے پھر داتوں باتوں میں تہا راحال تہلایا جائے۔
بکہا جب ہے کہ وہ ترس کھائیں اور دیکھنے بھی چلی آئیں۔

پہلے بھگانا نہ وارہائیں گے
دہل جو نہ سے کاجب کمال ان سے
کہیں گے ہجر میں وہ مرتے ہیں
مقامِ فرقت سے ہے لبوں پر جان
خون کا الزام سہ پہ کیوں لاؤ
اگر اس کا تمہیں خدا دے گا
دہل ان سے بہت بھجائیں گے
کچھ کہیں گے تہا راحال ان سے
دات دن آہ و نالہ کرتے ہیں
کوئی دو چار دن کے ہیں مہمان
ایک دن تم بھی جگے دیکھ آؤ
جو سنے گا بہت دعا دے گا

دوست کی ہوشیاری میں شبہ نہیں، وہ پہلے سے سوچ لیتا ہے کہ اس اقدام کے اثرات کیا مرتب ہوں گے۔

پہلے یہ سن کے ہو گئے ہمیں ہمیں
نیچے والے کی شامت آئے گی
بول ہی ملے ہوں گے مرحلے دوچلا
ہے اثر کب یہ چاہ ہوتی ہے
ایک کرویں گے آسمان و زمین
پہلے ہم پر قیامت آئے گی
عقرب کم ہوتا جائے گا ہر بار
دل سے اک دل کو راہ ہوتی ہے

جب عہت اپنی تاثیر دکھائے گی تو وہ کوئی نیا فقرہ بنائیں گے اور دوسرے آئیں گے۔

”عاشق“ دوست کی یہ تقریر، تصویر بنایا، چپ اور خاموش سنتا رہا۔ اتفاقاً کی ہے تاہم اور دل کی بے قراریاں کبھی تدبیر ہی کی آرزو مند نہیں۔ وہ بے چین ہو کر کہتا ہے۔

اس کی تدبیر اب شباب کو
میری مٹی نہ یوں خراب کر دے

آخر میں کہتا ہے۔

میرے مرے پان کو لاؤ گے
جب میں مر جاؤں گا تو جاؤ گے

دوست دودھ کر کے دھت کر جاتا ہے۔ لیکن سر اسیر، مشہور اور پریشان ہے کہ یہ کام کس طرح انجام دے اور کس کو بھراؤ
بنائے۔ اتفاق سے ایک ماما مل جاتی ہے، جس کی تصویر مرزا نے ایسی معامی اور چابک دستی سے لکھنی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ گوشت
و پوست کی صورت میں چھلین کرتی ہوئی ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس کی دہری اور ادا دوسے ابتدائی دقیقوں دور ہو جاتی ہیں۔

اتنے میں نکلے گھر سے ایک صورت	سالا لا ڈنگ، چلبلی صورت
لال بنڈ، ازار بند بڑا	گٹھا اک کنیوں کا اس میں پڑا
کھیتی ہنستی کھلکھلاتی ہوئی!	آنکھ ایک ایک سے طاتی ہوئی
چاقی چومند سینہ زوری میں	پیشول دنگے جوئے کٹوری میں
آنکھ ایک ایک پر لگاؤٹ کی	ہات ایک ایک سے گھلاؤٹ کی
حسن کے دن جوانی زوروں پر	دانت کی باسی مہندی پوروں پر
دھیان ایک اک سے چرگانی کا	ستیاناںس ہو جوانی کا
یہاں مٹھری کبھی دواں مٹھری	دو منہ ہنس ہل لی جہاں مٹھری

یہ ایک متوسط گھر لے کر ماما کا ملید ہے اور اس تاریخی ماحول میں باطل کھپ گیا ہے۔ غائب نے بھی ایک خط میں ماما کا نقشہ
کھینچا ہے اور اس میں ان ہی شوخ رنگوں سے کام لیا ہے۔

دوست نے اپنی ضرورت اس سے بیان کی اور کہا کہ اپنی بیگم کو کھڑے کھڑے دو دانے تک ملا دو۔ ان سے ایک دوسری
بائیں کھنی ہیں۔ میں کسی کو بیچ میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ ہاتھ ان ہی سے کھینے کی ہے۔ اس میں ان کو زحمت تو ہوگی۔ لیکن فیر کے سننے کا پیمانہ
— وہ ہی سن میں تو بہتر ہے۔

ماما اقرار کر لیتی ہے وہ اس کو کوئی بڑا کام نہیں سمجھتی۔ وہ جانتی ہے کہ بات سننے میں ایسی قیامت نہیں ہے
وہ جھکتی چلی گئی گھر میں
یہ اکیلے کھڑے رہے وہ میں

بیگم بہت خفا ہوئیں۔ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ بے پوچھے گچھے کیوں لے آئی اُسے قطارہ کہیں کی؟

بات کرنے کا بے یار کون طریق	کر دیا ہوتا خوب سا تحقیق!
آئے کس جگہ سے ہیں پیام بے کیا	کس نے بیجا ہے ان کا نام بے کیا
پوچھا تو ہوتا ما جسدا کیا ہے	تو بھی لے۔ بڑی کتنی خیلا ہے۔
بات کا کچھ سلیقہ خاک نہ حول	فوج اتنا ہو کوئی ادل جہول
بھڑک چا پانچے طاتی آئی	جو چلے کرتی کھل کھلاتی آئی

ادب جو کچھ بولوں تو بڑھتی ہے تو تو ماما ہراسے لڑتی ہے
منہ لگے کون تیرے شہکارا شہر بھر کی ٹھوڑی آوارا
مجھ سے چھکواتے خوف کھاتی ہیں خیر کہہ رہے ہیں آپ آتی ہوں
مہلقا دفعہ بڑھ کے بیٹے خود ہی چلی آئی۔ نہ معلوم ماما کیا نے اور کیا کہے۔

کیا اس دوست نے وہ سب سنا لیا کہا کچھ چپکے کچھ پکار پکار
عاشقی کا سبب بیان کیا میرا احوال سب بیان کیا
کہا پہلے تو ہو گیا تھا جوں آج تنگ آکے کھائے اینوں
تر و بالا ہے گھر قیامت ہے دشمنوں کی عجیب حالت ہے
نیل آنکھوں سے آبِ موعنا ہے بنج ساقط ہے دم نکلتا ہے

دوست نے سراسر غلط بیانی سے کام لیا اور اس پر جتنا بھی اعتراض کیا جائے کم ہے۔ لیکن اس نے پوری داستان کو اس غریب اور دل نشینی سے بیان کیا کہ مہلقا جیون ہو گئی۔

نام اینوں کا سن وہ لالہ زاد بولی اچھے نہیں ہیں یہ کرداد
دہریوں کھائیں اور گنواؤں جان کوئی ہنام جو نہیں کچھ دھیان

مہلقا پر اس تقریر کو سن کر جو اثر ہوتا ہے۔ اس میں دوست کاظم، عدو کا خوف، جان اور آبرو کا محو سب ہی کچھ شامل ہے۔ لیکن اس سے اس دوست کی ہر اک اور ہر جملہ جاتی ہے اور وہ اس سے چھٹے اور دیکھنے کے چلے کہتا ہے۔

عوض کی دہری کے ہے شایاں چل کے ان کی اگر بچا لو جاں
ہے بشر کے لیے مروت شرط آدمی کو ہے آدمیت شرط
قسمیں دے کر دوا چلاؤ نہیں چل کے فائدہ دیکھ آؤ انہیں
اور کسی کا کہا نہیں کہتے سب بھند ہیں، دوا نہیں کہتے
اور کہے کوئی جھوٹ نہیں گے بے تہا ہے چلے نہ نہیں گے
گو کہ بچنے کا کوئی طوع نہیں دیکھ ہی ہیں گئے خیر اور انہیں

بعض نقادوں نے مہلقا کے اس فعل کو ناقابلِ اعتراض سمجھا ہے۔ لیکن مسترین اس کے ان الفاظ کو بھول جاتے ہیں۔

نام چھٹے کا سن وہ عاشق کش بولی وہ تیرے چڑھا کے خیر خوش
ہوئے سوتوں کو اپنے وہ بولائے خوب گئی کی کہا رہے ہیں آئے
دل ہیں یہ کیا خیال آیا ہے خانگی کسی کچھ بنایا ہے
کتنی باتیں ٹھوڑی آتی ہیں شامیں کہہ کے تھوڑی آتی ہیں
کوئی مڑا ہے کیرن بلا جانے ہم ہو بیٹھاں یہ کیا جائیں

اس کے بعد فعد سے کہتی ہے۔

پھر یہ جفتہ سے بولی اور خود کام کوئی کرتا ہے اس طرح کے کام
دور ہو بس کہ جسے قصور و عات پاس کرتی ہوں جان کر اشرف
ورنہ اس کا مزہ چکھا دیتی ! کیا کہوں جو نہیں سننا دیتی
اب خبر دایاں نہ آئیے گا پھر نہ یہ بات مند پہ لایے گا
میری جوتی سے زہر کھایا ہے؟ مجھ کو کس بات پر مودرایا ہے
جان جائے گی ان کی جائے گی میری پاؤں بھی نہ آئے گی
مرقا کے ذہن میں ایک کشمکش ہے۔ اسے آبرو کا بھی پاس ہے اور خونِ ناسق کا ڈر بھی ہے۔

دیکھئے یہ الفاظ ایک عام عورت کے کتنے آئینہ دار ہیں۔

اسے لوانیوں کھائی تیر کیا اور بھی اپنے حق میں بصر کیا
اب جو آتی بھی نہیں آؤں گی جیسے کہ اوہ بھی جہلاؤں گی
ان کی قسمت میں یوں ہی مرتقا مجھ کو رسوائے شہر کرنا تھا
لیکن پھر سوچتی ہے کہ اس نے خود کشتی کا اقدام کیا ہے۔ اگر وہ اس کی جان بچا سکتی ہے تو اسے بچانا چاہیے۔ انسانیت
اور انسانیت دونوں کا تقاضا یہ ہے رسوائی و زور و فطرت ہو رہی ہے یوں خونِ ناسق بھی گردن پر رہ جائے گا۔

ہو مراد دل بھی حق تعالیٰ کا ہے جس کے لرزہ خدا کا آتا ہے
درگزر کس طرح کو دل حق سے ہوں آتا ہے خونِ ناسق سے
جب اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تو وہ جھجھکا کر اپنے ذہن میں یہ ہی طے کرتی ہے۔

کیسی جلتی ہے جان رہ رہ کر یہ ہی آتا ہے وھیان رہ رہ کر
گلاباں مند پہ دیکھئے چل کر جھوٹ سج دیکھئے بجھے چل کر

اس کے بعد کہتی ہے۔

خیر اب جلد تم یہاں سے جاؤ جس طرح ہو سکے دوا بلواؤ
پہلے اپنی طرف سے دم دینا پھر مری جان کی قسم دینا
گھر کے اندر بیٹھنے والی۔ دنیا کے گرم و سرد سے ناواقف، فوجان، نادان، اندکثر بہ کار لڑکی اگر اس ہم رنگ نہیں دام
میں گرفتار ہو گئی۔ تو ایسی حیرت کی یا دنیا سے لڑائی بات نہیں ہے اس کا یہ پیام دیکھئے کیا اس میں شرافت نفس کا کوئی جذبہ نہیں ہے
اوہ یہ کہنا او خدا کی مزاب یوں بھی کھوتا ہے کوئی اپنا شتاب
یوں گھوٹا ہے کوئی اپنی جان سب سمجھتے ہیں جان ہے تو جان
دو جینے میں تم کو ضبط ہوڑا سال دو سال بھی نہ ضبط ہوڑا

ایک ساغر میں ہروش اُڑ گئے وہاں
کتنے کم ظرف ہو معاذ اللہ
آفریں کہتی ہے ۔

پھر یہ بولی وہیں نہ رہ جانا
اک ذرا آکے حال کہہ جانا
ہم بھی درگاہ آج جا میں گئے
جوگی فرصت تو داں بھی آئیں گے
دوست نے اگر یہ سادہ رویہ کو سنائی اور زہرہ اسے فخر سے پر زور دیا ۔

عزت اللہ نے بکبائی آج
ہم تو سمجھے تھے منہ کی کھائی آج
آپ کے لیے بھی منہ نہ ہوتا
گر یہ فقر نہ کا دگر ہوتا
پہلے غصہ تھا مگر بعد میں بے طور
بجھتے تھے توئی فعلی اور ہی اور
جب کہا میں نے نہ رکھا پاسے
سن کے لڑنے انہیں تب آئے پاسے
مہ لقا کے آنے کی خوش خبری سن کر میرا نشانہ کے قالب بے جاں میں جان سی چڑھی ۔
سن ۔ کہے یہ ہاتھ پاؤں چھو ل گئے
دعج فرقت تمام قبول گئے

یہ دیوانی لڑکی ایک شریف و معاشق کی باتوں پر اقبال کر کے اور درگاہ حضرت عباس کے جانے کا بہانہ کر کے بیٹھوئی
کہیں پہنچی گئی ۔ ماما اس کے ساتھ تھی ۔ اس کی خوشی اور طراری کا وہی عالم تھا ۔ جو ہم اس سے پہلے دیکھ چکے ہیں ۔

پوچھتی آئی ہے یہاں تک گھر
اپنے سایہ سے بھی بھڑکتی ہے
ہنسی مٹھتی بھکت منفع میں طاق
کھڑی ایک اک لامعہ چراتی ہے
جوئی پوٹی ہے ہاسی ہاؤں سے
لڑ رہی ہے جگت کہاؤں سے

مہ لقا کو پردہ کر کے باغ میں اڑوا دیا گیا ۔ اس کا آنا بھی قیامت کا آنا تھا ۔

سب حیا سے ہن پرانے ہوئے
شرم سے گورن قناسب تن ہیں
ڈک جوک اک جمال سے پیدا
شوخ و طرار چلی لم سیریں
کچھ گندے کچھ کھلے وہ سر کے بال
ادامشوق پن کی گھاٹوں میں
چال اٹھکیوں سے جیتی آئی
جان عشاق ہوتی تھی پا مال
پانچنے ناز سے اٹھائے ہوئے
پر شرارت بھری تھی چتون میں
بالکین چال و حال سے پیدا
حسن اُبلد ہوا بہار کے دن
سائے معشوقوں سے ترالی چال
شرم آنکھوں میں تہرباؤں میں
دل کو پاؤں کے نیچے مٹی آئی
دیتے تھے فعل کی صدا غلغلا

گھنگر و جرتی کے جگلاتے تھے ہاں میں ہاں اود یہ لاتے تھے
 منتوب حسن اس کا لاکھوں میں لال ڈورے نشیلی آنکھوں میں
 گوری زرخٹ پری سی صورت میں چمکلا پن بھرا بیعت میں
 آنکھوں پر سر بونٹوں پر اجماد بات کرنے کا اک نسیب اذنا
 متعجب پیچ و تاب کا کل کا پیمنا پڑتا تھا جو بن اس گل کا
 غرض جان پہ بقی آفت تھی قہر تھی، نقد تھی، قیامت تھی

مرثقا انہی جگر آتی تھی۔ سارا جسم پیمینہ میں ڈوبا ہوا تھا۔ باد بار اسے یہ ہی دور تھا کہ کوئی آکر نہیں رہا۔ کوئی آواز نہ تو نہیں رہے
 رہا جبر شہزی کی چٹن و ستیروں نے اسے یہ سمجھنے پر مجبور کیا کہ اسے دھوکا دیا گیا ہے۔ اور نہ ہر کھانے کا انا نہ بعض اس کو یہاں بلانے کے
 لیے کھڑا کیا تھا۔

لاش یہ دھوکا کبھی نہ دیا جاتا۔ میں بڑا چکر کھا گئی انوسس
 جو ترسے جمل میں لگتی انوسس

اس کے بعد اختلاط اور وصل کی داستان ہے۔ چاروں طرف بے حیائی اور بے شرمی کے پردے پڑ جاتے ہیں اور خوب
 دل کھول کر رادعیش دی جاتی ہے۔ قیامت یہ ہے کہ جتنی یہ داستان عریاں اور غیر مذہب ہے اتنی ہی اس کی زبان شکستہ و زلفہ سادہ
 اور بے تکلف ہے۔ روانی اور سفاکی کا یہ عالم ہے۔ جیسے شفات پانی کا چشمہ پہاڑ کے دامن سے دھسک رہا ہو۔ جو بندش ہے۔ وہ
 چست، جو محاورہ ہے وہ درست، جو لفظ ہے وہ برص۔

ہمارے پسند آموز نقادوں نے ساری بحث اخلاق ہی پر آکر ختم کر دی۔ انہوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ شاعری اچھی بُری
 نہیں ہوتی۔ شاعر اچھے بُرے ہوتے ہیں۔ اور شاعری کی اخلاقیات (Moralities) اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوتی کہ وہ اظہار
 و اسلوب میں مکمل ہو۔ انہوں نے اخلاقی نکات کو دھوڑے لیکن جذبات نگاری کی قوت، بیان کی سلاست، زبان کی صحت اور دوزخہ
 کی قدرت پر غور نہیں کیا۔ یہ عریانی، تو اس زمانہ کے فیشن میں داخل تھی۔ خود صاحب عالم اور سلطان عالم اقراری مجرم تھے۔ اور ان
 داستانوں کو مزے لے لے کر نظم کرتے اور حوام کے سامنے بے حجابانہ پیش کرتے تھے۔ جب اس بارگاہِ سلطانی سے فوٹے لے
 حاصل ہو جائے اور چشم باد بھی بندھ دینے کے لیے موجود ہو، پھر ایک عام آدمی، معمولی گوشت و پوست کا آدمی، اپنی نظریہ، اپنے
 دل پر، اود اپنے فکر پر کسی طرح قابو نہ کر سکتا ہے۔

ہمارے تنقید نگار حور پر کے اس جواب کو بھول جاتے ہیں۔ جو اس نے اپنی برائت میں داخل مل شاہ کو دیا تھا۔

کہا کل ثبات علی خاں کا ہے خفا کی، ظنا نام انسان کا ہے
 نہیں میں فقط ایک تقصیر واد کہ اس دامن میں اور بھی ہیں نکار

حقیقت یہ ہے کہ اس تمام میں سب ہی نکلے تھے۔ صاحبِ عالم ہوں۔ یا بہا و عشق کا ہیرو، حور پر ہی ہوں یا غنوی کی

پھر اس زمانہ کا مذاقی سخن بھی ایک خاص سا پتہ میں وصل گیا تھا۔ یہ سا پتہ ٹوٹ سکتا تھا بدل نہیں سکتا تھا۔ دودھ کیوں جائیے ابھی کل کی بات ہے مگر خضر جاس باشتی بیان کرتے تھے کہ ان کے ایک عزیز داغ کے دیوان سے مہلا و شریف پڑھتے تھے اور زاد و قطار دوتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ میں مذہبی و زہدین اتنا سخت لغوا و نہیں تھا، جتنا آج ہے۔ پروفیسر جاس کا مدسین قادری بیان کرتے ہیں کہ مولوی نصیر عالم صاحب نے ایک مرتبہ علامہ شبلی کے سامنے یہ شعر پڑھا۔

کارخانے میں خدا کے ہے کسے دخل ہوا

بچہ تم پہلے جنیں بیاہ ہوا میرے بعد

مولانا آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے، اٹھ کے بیٹھ گئے۔ پہلے ممبر کو بار بار پڑھتے تھے اور اس کے حوالہ سے سے لطف اٹھاتے تھے۔

پروفیسر نسیم الرحمن صاحب ناقل ہیں کہ ایک مرتبہ لاہور کے ادبی اڈل کالج کے اہل ریش عربی کے مٹھانے علامہ اقبال سے شکایت کی کہ حسان کا دیوان نصاب سے خارج کر دیکھئے اس لیے کہ اس میں فحشیات ہی فحشیات ہیں۔ علامہ مرحوم نے نہایت مصدقیت اور استعجاب سے سوال کیا: کیا آپ کے دہچے میں بیکیاں بھی ہیں؟ کہا: نہیں، فرمایا: تو پھر کیا عروج ہے؟ آپ سب ماشاء اللہ مرد ہیں اور ڈاڑھی داڑھی سے ہیں۔ آپ کو یہ بھی تو معلوم ہونا چاہیئے کہ عربی شریا گائیاں کیسے دیتے تھے۔ آخر کیا باں ہیں تو زبان اور اولٹے نہالی کا ایک طرز ہیں۔ اس سے بھی تو واقفیت ضروری ہے؟

بات کہاں سے کہاں بچی گئی۔ اس سخن گزشتہ بحث سے مفرد صرف یہ ہے کہ اس اختلاط اور وصل کی داستان کو اس دور کے مذاقی، اور حالات سے الگ کر کے دیکھنا چاہیئے۔ ورنہ ہم اپنے اُدب پر بھی علم کر لیں گے اور مصنف پر بھی۔ یہاں ایک عربی اصرا دلوں الجھا ہے دوسری طرف انکار اور غصہ۔

اچھے آتے ہی اختلاط پڑھائے	خوب نام خدا مرے ہیں آئے
بل بے فقرہ بڑا مصداق اللہ	میرے تو بوش آؤ گئے واللہ
لوگ کہتے تھے ہے ہوں پہچان	مگر کے صدقے جھوٹ کے قربان
تو بیکس وجہ ہے سیاہی ہے	واہ کیا دیدہ کی صفائی ہے
میں ہوا چکر کھ گئی انوس	جو تیرے قبل میں آگئی انوس
جھوٹا، بد ذات فعلیہا مکاتر	ان گنوں پر تیرے خدا کی سنوار
گو یہ پہلے سے جان جاتی ہیں	مر بھی جانا جو تو نہ آتی ہیں
ایسے فغروں کو کوئی کہا سمجھے	اور تو کیا کہوں۔ خدا سمجھے

گہر ڈوبا کہ کوئی آتا ہے	کبھی بولی کوئی ملتا ہے
شرم سے سب بدن چرٹے بجے	آپ ہی آپ کو چھپائے ہدے

ہاتھ پائی میں مہ نپتے جانا
 بال مرغ کے سزا تے جانا
 زور کرنا کہی کہ چھو میں ہاتھ
 کہی باتوں میں ہوش کھو دینا
 آنکھیں پھو میں جو بحر منظر دیکھے
 کہی کہتی کہاں میں آن پڑی
 گھر گئی آگے کیسی آفت میں
 کئی دن سے بچ رہا تھا ہے
 کچھ عجب حال میرے جی کا ہے
 دم بھر پر نہیں کچھ آتا ہے
 کہی جھنجھلا کے سر بٹا دینا
 گہ کاٹی مروڑنے لگت
 کہی تیوری چڑھا کے یہ کہنا
 کوئی اس طرح بھی پہنرتا ہے
 اشتیاق ایسا کیا زیادہ ہے
 نقد کھواؤ تم کو سودا ہے
 بچے بیٹو تمہیں خدا کی قسم
 لوح اس طرح بھی کوئی بولے
 کہی کہنا ہماری بھتی کھائے
 ہم کو پیٹے اگر مروڑے ہاتھ
 گاہ مانتے پہ ہاتھ کو دھونا
 کہی کہنا سدا ہی منگو اؤں
 کہی کہنا کہ تم کو سودا ہے
 کچھ بہت خوش مزاج عالی ہے
 بے حیائی کا جام پہننا ہے
 چربی آنکھوں پہ تیزی چھائی ہے
 جان بھان ہو گئی بھدا
 چھوٹے کپڑے کوڑھانپتے جانا
 اونچی لڑتی اتار تے جانا
 کہی کہنا ابھی تو میں ہاتھ
 کہی کھیانی ہو کے رو دینا
 ہم کو پیٹے اگر ادھر دیکھے
 کیا کروں کس غضب میں بن پڑی
 پڑ گئی جان کس مصیبت میں
 تن بدن سن سنایا جاتا ہے
 دیکھو پنڈا ابھی سے پھیلا ہے
 کوئی مہاں کو یوں ستاتا ہے
 ہاتھ سے کہ کہی جھٹک دینا
 اور کہی ہاتھ جوڑنے لگت
 گہ زبان کو دبا کے یہ کہنا
 مان۔ کوئی ایسی بات کرتا ہے
 خیر ہے کہنے کیا ارادہ ہے
 سنبھلو صاحب ذرا ہڑا کیا ہے
 بس زیادہ کرو مذاک میں دم
 لوح کوئی اتنی بول بول چائے
 گرہیں بے طریق ہاتھ لگائے
 ہم کو کھائے گرد چھوڑے ہاتھ
 کہی انہا۔ دوسر کرنا
 ہے یہی شرط گھر چلی جاؤں
 جان کی خیر ہے ہڑا کیا ہے
 تو نے یہ چڑمری نکالی ہے
 خیر ہے کھنڈ میں رہنا ہے
 کچھ گھوڑے کی شامت آئی ہے
 چھوڑ غارت گئے مرا بیچ

کبھی آفت نہ یہ امثال تھی چھائیں پھوئیں میں نوح آئی تھی
ہٹ کے بیٹھو بہت ستیا ہے تم نے خیا مجھے بسنا ہے
کیا دھما چڑھ کر ڈی بھائی ہے تیری بھناوڑی کچھ آئی ہے
تم نقدق لگے نشا ہوئے خوب میرے لکے کا ادا ہوئے
مجھ کو یہ بات ہے نہیں مرغب اچھے کھل کیلئے واہ داکا خوب
بس زیادہ نہ آپ اترا ہیں دیکھو کچھ شامیں نہ آجائیں
مرتقا غصہ میں آکر کہتی ہے۔

کچھ تو ہی نہ مجھ کو جانے کا دیکھے پھر برا نہ مانئے گا
موسے جیتے اکھاڑ ڈالوں گی کڑوی کی طرح چھاڑ ڈالوں گی
میں اگر بولنے پہ آؤں گی لاکھوں دھڑے تیسے اتاؤں گی
ابھی سب کہہ کے سن کے کھڑکی سات پڑی کوڑی کئے بکھڑکی
دیکھنا کیسی دھوم ڈالوں گی مودی کی طرح تو مڈالوں گی

تھے اسی دن کو سب اٹھا رکھے کیا کیا ارمان ہیں خدا رکھے
اب میں سمجھی جو قصد تیرا ہے اے لوگ بھیتوں نے گھیرا ہے
ادودہ ہوتا ہوں اب سیلی میں نہیں بچی گولیاں کھیلی
نوح ایسے کا اقتدار کروں ایڑی چوٹی پہ میں شاہ کروں
لاکھ منت کرو بلایں و وہ نہیں ہوگا تم جو سمجھے ہو
کوئی دل کا مزہ بھی کھتا ہے یہ نہ بدوستیوں سے ہوتا ہے
میں تو منست خدا ہوئی بدنام اس محبت کو آپ کی ہے سلام
کچھ عجب ڈھنگ ہیں طبیعت کے بہت آدا سنہ ہو صحبت کے
ہم کو بھانے نہیں ہیں ایسے طو یہ چہ بھگولیاں دین کہیں اور
بات کچھ کو نہیں یہ خوش آتی ایسی بندی نہیں ہے اُدھماتی

اب تک تیرفتویٰ کی منت و سماجت کی آدائیں ہم تک نہیں پہنچیں، اور ان کو پہنچا بھی نہیں چاہیئے تھا۔ صرف یہ تھا
کی عقلی اور عفتہ کی آدائیں ملانی دیتی ہیں۔ لیکن اس مرتبہ عاشق کے بند بانگ دھوے اتنے جوش اور ملیں کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں
کہ ان کی آواز ہم تک بھی پہنچ جاتی ہے۔
وہ قدموں پہ لڑکھاتا ہے۔

ہر گھڑی دم تہمارا بھرتے ہیں بخدا جہنم پہ مرتے حسین
جھوٹے کی جان پر ستم ڈھٹے شاہ عباس کا علم ٹوٹے
ستیا ناس جانے غارت ہو اود پر جس کی کچھ طبیعت ہو
بخدا کوئی خوش جو آتا ہو آنکھیں پھونپھون جو کوئی بھاتا ہو
اسی اللہ کے ولی کی قسم دومرے مرتضیٰ علیؑ کی قسم

مرثقا جواب دیتی ہے۔

بولی بائیں بنا نہ میرے ساتھ اب تو میں لگ ٹٹی ہوں تیرے ساتھ
مجھ پہ مرتے جہنم قرآن کسوں سچ کہو تم کو میری جان کسوں
مجھ کو بھی سوچیں گے مرنا ہے تو یا فقط اپنے منہ میں مٹھو
اپنے مطلب کی یہ محبت ہے تیری تو ذات ہے مروت ہے
اس کے بعد بدستی کا اندیزہ اچھا جاتا ہے۔ جاؤ شرم کا لباس اتر جاتا ہے اور تہذیب کی آنکھیں بھی ہو جاتی ہیں۔
چمکے چمکے پھارتی مٹی کبھی ڈھیلے ہاتھوں سے مارتی تھی کبھی

لو کائی اتر گئی ہے ہے کیا غضب ہے میں مر گئی ہے ہے

قبر ہے نعم ہے قیامت ہے مجھ پہ ہے ہے یہ کبھی آفت ہے

میری ماما کو مر گئی لوگو بسے اللہ میں مر گئی لوگو

بس مرا ہو گیا ہے ناک میں دم ہٹ کے بیٹھو تہیں خدا کی قسم
اب جو تو بولے گا قرآن کسوں اپنی اود تیری جان ایک کردوں
لاہاں کیسی کو سنے دوں گی میں بھی ایک پلٹنے نام کی ہوں گی
بس بہت میں نے آدیت کی جو نہ کرنا تھی وہ مروت کی
دیکھو پھر اب اگر سناؤ گے میری ہچکچاہٹیں بھی نہ پاؤ گے

میر تقی کو اس غم، اس جوایت، حسن و عشق کی اس تڑپ کے لیے کبھی بھی معاف نہیں کیا جاسکتا۔ مرثقا کو آخر وقت تک اس فریب پر غرق، سچ اود نعمت ہے۔ لیکن ایک بڑی کی لہا طہی کیا؟ ان حلقہ دئے دام سے نکلتا اس کے لیے ناممکن تھا۔
خوب آنے کی دی سزا مجھ کو اب نہ لائے کبھی خدا مجھ کو

یہ بھی اک آبرو کا کھونا تھا نام بدنام سب میں ہونا تھا
لیکن کیا یہ مدخل کافی ہے؟ ایک منزلی امانت گزارنے اسی طرح ایک قصہ لکھا تھا۔ ایک دودھ بیچنے والی لڑکی کو ایک
آدامہ مزاج راہ گیر چھینا ہے۔ اداس کی صفت و نزاکت اس کے جبر و تشدد کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ لیکن وہ لڑکی زمین سے اٹھتی ہی وہ
دودھ کا برتن جو اس وجہ کا شہنشاہ میں یہ سودا ایک ہی بار ہوتا ہے اور ایک ہی شخص سے ہوتا ہے چاہے وہ اچھا ہو یا بُرا۔ دوسرے
محلوں میں اس شاعری کے گم گشتہ کے بعد بھی ہوا ہو سنا نہ پایے بنا زائد نڈنگی بسر کی جاسکتی ہے۔
مدخل کو ایک ایک منٹ پہاڑ ہے۔ وہ بدسواری منگلانے کے لیے نہیں کرتی ہے۔

میری رخصت میں اب نہ کرتا میر
وہ نہ ہم صوفیوں میں ہونگی معتبر
میں تو بیاں پڑ گئی تیرے بس میں
چرچے والے دوسوں گئے آپس میں
گھر میں سب ہونگے دیکھتے مری راہ
دھوڑنے جانے کا کوئی درگاہ
تو ادھر کی نہ ہیں ادھر کی رہی
پھر کہو یہ ملا کہ صر کی رہی
آبرو جانے میری جانے گی
تیری تو اس میں بھی بن آئے گی
اب تو جانے لے کبریا کے بیٹے
نہیں کرتی ہوں خدا کے بیٹے
سواہی آجاتی ہے، میر تقی میر، مدخل سے چلتے وقت کہتا ہے۔

ہاؤ پر توں صارتی جاؤ
ہاؤ پر ہاؤ پر ہاؤ پر ہاؤ
بولو کب آؤ گی دستار کرد
کچھ تو سبکین جان زار کرد
کوئی شے منہ سے نکلی جاتی ہے
تم نہیں جانتیں جان جاتی ہے
یہ تو باد نہیں بلاؤ گی
کہہ دو کھا کر قسم کب آؤ گی

مدخل کہتی ہے کہ اس وقت اس کا جواب کیا دیا جاسکتا ہے۔ آئندہ کی کیا خبر اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ کھرے
نکھے ہوئے اتنی دیر ہو گئی تھی۔ گھر والے پوچھیں گے تو کیا کہا جائے گا۔ اس کا رنگ قی تھا، چہرہ آئرا ہوتا تھا۔ دل کا پدا تھا۔ لیکن پھر بھی
اپنے آپ کو بہت مضحکہ خیز ہونے لگی، اور بتوڑی پر پل ڈال کے سب کے سامنے کے بیٹے کہنے لگی۔

لوچ نوچندی کو میں جاتی آج
آئی ہوں کسی ہو میں کھاتی آج
بھیرنے آج دم تمام کیا
ایسی درگاہ کو سلام کیا
ساتھ ماما نہ آج گر جاتی
کبھی بھنا دے مری آتی
یا خدا جو بھلا بھاری کا
جو ٹھیکہ چستہ سواہی کا
کبھی پھنکتا ہوں میں جا کر آج
پہنچی یاں تک خدا خدا کر آج
گر قسم لے تو کوئی کھاؤ گی
کبھی نوچندی میں نہ جاؤ گی

اس دردِ مصطحت آمیز سے سب وگ ملحق تو ہر گئے لیکن خود اس کے دل کا حال عجیب تھا۔ وہ میران مٹی کر رہ گیا ہوا۔ اور اب کیا ہو گا۔

کچھ مزا دل میں کچھ ندامت تھی اکشش پہنچ میں طبیعت تھی
کبھی کہتی تھی کیا ہوئی یہ ملا کبھی کہتی تھی کیوں ہوئی مٹی خدا
رہی اُلجھن سی تا سحر اس کو نبند آئی نہ مات بھراس کو
جب دل اس کا بہت جاک ہوا تب گریبان صبح چاک ہوا
یہ ہی حال "عاشق" کا تھا۔

ہوئی فرقت سے بہ مری حالت نہ وہ زنجیر ہی نہ وہ صورت
راحت و عیش سب محال ہوا دو ہی دن میں جب حال ہوا
ہو گئی دل کی ایسی حالتِ ناز جیسے برسوں کا ہو کوئی بیمار
نالہ ٹوک کر لبوں پہ آنے لگا ضعف سے جسم مقرر ترانے لگا
موجوں نے دھنکار کا تھا اسیر ناتواں مٹی پاؤں کی زنجیر
رکھ فرقت سے میسر حال ہوا لینا کر دھت تک محال ہوا
چین دن کو نہ رات کو آرام یاد میں اس کی جیسے تا شام

لیکن انیسویں صدی کا مہول عاشق، کوئی اقدام نہیں کرتا۔ تپش جبر سے مجبور ہو کر لڑکی ہی مانا کر بھرتی ہے۔ یہ لاپ کی پہلی موج گزرتی تھی۔ اور اب وہ محسوس کرتی ہے کہ وہ بھی اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ ماما سے کہتی ہے

میری اچھی تو اس کے گھر تک جا
دیکھ کر اس کو اُسے پاؤں آ

"اور جو پوچھیں انہوں نے یہ بھائے۔ تو کہنا ہے

ان کی پاؤں کو عرض مٹی ہاں جو مجھے یہ بھی خبر نہ کہ یہاں
گزری باتوں کی یاد ہے اب کیا آپ کو پوچھنے سے مطلب کیا
اعرض جب کمال ہو ماری اور کہے تجھ سے منت نہ ماری
کہنا کہوں تو بچھے ہنگامے کیا ہے ہاں انہوں نے ہی تم کو پھلا ہے

ماما کہتی ہے۔

چین سے تم تو پڑے سو کر وہاں کئی رات ماری دودھ کر
ہے انہیں فٹش پہ فٹش چلا آتا اُٹھا بیٹھا تلک نہیں جانا
لوٹی ہوئی میں دودھ ہے ان کے دنگ پھرے کا زود ہے ان کے

دل معشوق تو کباب کیا عشق کا نام بھی خراب کیا
اپنا مطلب نکال کر تم نے جھوٹوں پر بھی نہ پھر ضرر تم نے
خوش کو آزدہ ہو جیسے صاحب آپ کے پاؤں پر جیسے صاحب
ماہا مہنی یہ الزام طاقی ہے کہ تم کو اتنی بھی توفیق نہ ہوئی کہ کسی سے مدد لیا کی خیر خبر بھی ملے جیتے۔ اس کے جواب میں وہ صرف یہ کہتا ہے۔

دل و جان سے نثار ان کا ہوں ہر میں تعقیر واران کا ہوں
اس کی غائبیاں جو یہاں لپک رہی تھیں کہ کوئی اندر تک جا کر پیام نہیں دے سکتا تھا، العزیز اس کے بعد سے پیام و سلام ہونے لگے۔ خاصدا ان اس طرف سے آتا تھا اور کھنچے یہاں سے جاتے تھے۔ ایک دن ان کے ہمسائے میں ایک برات تھی۔ میرزا نے بھی حباب اعلیٰ گیا تھا۔ اتفاق سے ماہ اتفاق باہم پر موجود تھی۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ انک بھر آئے۔ میرزا کچھ باتیں بھی ہوئیں۔ جو ہر علی غلط سے نہایت اہم ہیں۔
مدد کا کہتی ہے۔

گدڑی کیا کیا نہ جان پر میری خوب لی آپ نے خبر میری
اب نہ کہنا کبھی کہ مرتے تھے بس اسی منہ پر پیار کرتے تھے
جھوٹ دم عاشقی کا بھڑنا ہے کون صاحب کسی پر مڑنا ہے
میر شہزادیؔ

مسن کے میں نے دیا یہ انکو جواب بس زیادہ کرو نہ دل کو کباب
کس کو تم ایک بست و بھو اتنا کون ایسا تھا جو خبر نہ اتنا
جندی بھتی نہ آپ گھس جاتیں دو گھڑی کو اگر چسلی آتیں

مدد کا جواب ایک شریف لڑکی کی ہے کسی دے سی کا مر ق ہے۔ ایسی لڑکی جس کی رسم و رواج کے مطابق بدشاہی ہونا چاہیے لیکن ابھی ہو نہیں سکی ہے۔ جو درتوں کے سامنے بھی کھل کے بات نہیں کر سکتی اور جس کی نشست و برخاست، رفتار و گفتار، ایک ایک بات کی گشت کی جاتی ہے۔

ہاں شکوہ مرا تو ہے بے جا فوج ہو اور پھر ہو قبر خدا
نہیں واللہ دسترس اپنا قیدی بندی ہے کیا ہے بس اپنا
گو بھی پر نہیں ہے یہ افتاد سب کے ماں باپ بچتے ہیں خدا
سارے عالم میں گویہ آفت ہے ہم پر لیکن سوا قیامت ہے
دن بھر ایک ایک منہ کو کھتا ہے بات کہنے میں عیب لگتا ہے
ناک میں دم ہے آشکارا ہے زندگی ملک سے جان ماری ہے

اس کے بعد کہتی ہے۔

اپنے مطلب کا خوب یا مجھے ڈھنگ ہر جہاں سے کسی پر تیر منہ زبک
کشمکشیت تہا ری کوئی کرے تم کو کیا ہے کوئی جینے کے مرے
دھیان دل میں نہا ہ کا کب تھا اپنے مطلب سے تم کو مطلب تھا
یاد رکھنا تہا رے بن لڑی جان جاسے گی ایک دن اپنی
زیر کھانا ہے جان کھونا ہے ایک دن تم پر طنز ہونا ہے
اسی جگہ نہ لٹا کے کچھ عزیز بھی تھے اور انہوں نے یہ ساری گفتگو سن لی تھی۔

تھے جو اشارت کچھ نہ بن آئی مشورت اس طرح سے بھر پائی
شادی ان دونوں کی جو جو جائے کچھ تو منہ سے سیاہی دھو جائے
جب کس طرح یہ چھپا تیں گے کلا منہ کس کو اب دکھائیں گے

والدین نے سمجھ واری کی اور خاموشی و قناعت کی غلط پاسداری نہ کرتے ہوئے دونوں کی شادی کر دی۔ اس طعن غمزہ کا خاتمہ
وصل کی شادمانی پر ہوتا ہے اور یہ انتقامِ زیرِ مشق کے انجام سے بالکل مختلف ہے۔

میں نے اس غمزہ کا تھمس بالڑ کو جو سینٹ جاس لاگ اگر وہ میں انگریزی کی پیکر ادبیں سنا یا۔ عرض یہ بھی کہ ایک غیر ہندوستانی
پید ہو جود و شادی (Restoration) کے، دیانت سے بھی واقف ہیں۔ اس کے کیا اثبات ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا۔ اسی مرد
سے جس نے لڑکی کو خراب کیا ہے شادی ہو جانا تو کھلی بات ہے۔ منسوب میں شاید ایسا کبھی نہ ہوتا۔

لیکن میرے خیال میں نفس پرستی کے اس طوفان کے بعد وہ نوں فریق اپنے دل کا بازوہ بیٹھتے ہیں جس سے یہ لشکر گزرا تھا۔ اور
دل کے تقاضے اور دنیا کی مصیبت وہ دن سے مجبور ہو کر یہ محسوس کرتے ہیں کہ زندگی کی اس لغزش کو دو دائمی محبت کے سرو میں تبدیل ہو
جانا چاہیے۔ مصنف نے بھی اپنی طرف سے اس گنا و غیہ کی اگر کوئی تلافی کی ہے تو یہ ہی کہ ان دونوں کو رشتہ ازدواج میں شملک کر دینے
مزیدوں اور رشتہ داروں کا بھی یہ فضل قابلِ قدر ہے کہ انہوں نے اپنی عادت کے مطابق اس شادی کی مخالفت نہیں کی۔ وہ جانتے تھے کہ
اگر بات نکل گئی تو سارے عالم میں بدنامی ہوگی اور پھر کوئی لڑکی کو بوجھے گا بھی نہیں۔

اس مسئلہ پر اس طرح سوچئے کہ اگر اس لڑکی کی شادی کسی دوسری جگہ ہو جاتی۔ تو فریقین کی زندگی میں کبھی عجیب بدنامی پیدا ہو
جاتی۔ اس بدنامی کا احساس اس وقت اور قوی ہو گا جب تقدیریت کو چھوڑ کر ملک کے عام حقوقی حالات کو پیش نظر رکھا جائے گا۔

میر غزنوی نے اپنے مہان کے ساتھ جو بیہیمانہ سلوک روا رکھا وہ محبت کی دنیا میں کبھی سمات نہیں کیا جاسکتا اور سخت سے
سخت خدمت اور علامت کا مستحق ہے۔ ممکن ہے اس کی برأت میں یہ کہا جائے کہ وہ ہذا سے متغوب ہو گیا۔ اور یہ غلطی بھائی اور
اتفاقی تھی۔ لیکن دام کا یہ عقد پہلے سے تھا نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن محبت کی نفاست اور نزاکت تو کسی قسم کی آلودگی کو برداشت نہیں کرتی
اسی کے ساتھ یہ بھی واضح رہے کہ میر غزنوی کی یہ زندگی ایک انفرادی واقعہ نہیں ہے۔ پورے مجموعہ کا سادہ ہے۔ وہ
واہد علی شاہ اور قطب الدولہ کے گھنٹہ، سرگزشت پر ہی اور ہاتھن پر ہی کے گھنٹہ، مہاڈول اور ساڈول کے گھنٹہ۔ ذاب آب و سال و بیگ اور

ذواب معنی: بچم کے گھنٹہ اور جھومر والیوں اور گھونگھٹ والیوں کے گھنٹوں کی پیداوار ہے۔ اس کو انیسویں صدی کے اس قبضل ماحول سے جب کہ زندگی کو دونوں ماحولوں سے یکدگر اس کا سارا پس پھر کر لیا گیا تھا، الگ کر کے دیکھنا تا پھر کا اور تنقید کا خون کرنا ہے۔ پھر وہ کوئی غیر معمولی نوجوان نہیں ہے۔ اسی دنیا کے دول کا، اسی گوشہ و پوست کا معمول انسان ہے۔ اس میں لڑکیاں بھی ہیں۔ اور خابیاں بھی۔ مرزا شوق نے اس کی غلیبوں پر پردہ نہیں ڈالا ہے بلکہ اس کی "ادبیت" اور "عمومیت" کو اور نمایاں کیا ہے۔ اس اعتبار سے مصنف کی حقیقت نگاری اور اصیبت پسندی قابلِ داد ہے۔

مرزا شوقی نے مدد کا کہ وہ پیش کرنے میں وہ کہاں نہیں بتا جو نہر عشق کی علامہ افسانہ کے کردار ہیں ہے اسی لیے اس کا مجموعی اثر کچھ بہت اچھا نہیں ہوتا۔ بعض جگہ تصادف ہے اور بعض جگہ رنگ آتنا گہرا ہو گیا ہے۔ کہ سارے میں پھیل گیا ہے۔ ایک ٹوکی جن کی شرافت کا شمار نہ ہو بلکہ ذکر کیا ہے۔ وہ اپنی گھر میں جاتی ہے تو اس امداد سے۔

طرز گفتار بالکل نئے کے ساتھ !
شعر و جملہ ہر سخن کے ساتھ
کچھ رکھائی سی کچھ مہنسی کچھ شرم
تازے فقرے بیٹھے گرما گرم

مانا کہ لطیف گوئی اور شعر گوئی اس زمانہ میں فطرت ثانیہ ہی گئی تھی، لیکن ان حالات میں جن کا ذکر مثنوی میں کیا گیا ہے۔ ایک ٹوکی کی زبان سے بیٹھے اور شعر نہیں نکل سکتے۔ اسی طرح آزاد کے وصل پر جب بحث چھڑ جاتی ہے اور امرامہ و انکار کا ایک دفتر کھل جاتا ہے تو ایک ہندوستانی ٹوکی کا یہ کہنا۔

"دودھرا تیرا یہ حملہ ہے
ایسا سمجھے کہ شہر شملہ ہے"

کسی طرح ہائز نہیں۔

لیکن ٹوکی کا کردار میراثی سے زیادہ ہند ہے۔ اور اس مضمون افسانہ میں اس کے کافی شواہد موجود ہیں کہ وہ مشربیت گھرانے کی ٹوکی ہے جو ایک غریب کا شمار ہو گئی ہے، لیکن اپنی فیت اور عزت باطن چھوڑ نہیں دیتی ہے، بہادر عشق میں نہر عشق کے برخلاف، عشق یک طرفہ ہے۔ مرد پہنچے محبت کرتا ہے اور عورت بعد میں۔ مرد اس راہ میں اپنی عزت اور شرافت سب کچھ کھو بیٹھتا ہے اور عورت یہ سب کھو کر بھی سب کچھ جیت لیتی ہے۔

گناہ کا منہ تو بھی مجرب ہے اور سوسائٹی کے قوانین اس سے بھی غیب تر ہیں۔ ایک بھوکا آدمی قانون سے تنگ آکر جوری کرتا ہے۔ لیکن قانون اسے سزا دیتا ہے۔ ایک تیش رو استاد با ایک عالم باپ ساہا سال تک پکڑن کی ذہنیت منہ کرتا رہتا ہے لیکن قانون اسے کچھ نہیں کہتا۔

ایک جوان پردہ نشین اور نا تجربہ کار ٹوکی پہلی دفعہ یہ سنتی ہے کہ ایک شخص اس کی وجہ سے جلاں بھ ہے۔ عورت اس کی مصلحتی ہی اس کو بچا سکتی ہے۔ وہ کچھ عروت، کچھ آدمیت اور کچھ محبت کی خاطر اس کی جان بچانے کے لیے پہنچتی ہے لیکن وہاں اسے ایک چال

میں پھانس لیا جاتا ہے۔ اور وہ کسی کی چہرہ و دستوں کی تاب نہیں لاسکتی۔ کیا اس کو بھی ہم غفلت یا گناہ ہی کہیں گے۔ اگر یہ غفلت ہے تو ایسی غفلت ہے جس میں سلامت روی کے نشانات موجود ہیں۔ اگر یہ گناہ ہے تو ایسا گناہ ہے جس میں پشیمانی کے آثار پوشیدہ ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس بردباری کے بعد وہ لڑکی اس سے ملنے کا اقرار کیوں کرتی ہے؟ اس کے پیلے بے چین کیوں ہوتی ہے؟ ماما کو کہیں بھیجتی ہے؟ کیا محبت اس نقطہ سے بھی شروع ہو سکتی ہے۔ اس کا جواب اس لڑکی کو نہیں۔ ہماری معاشرت کو دنیا چاہیے۔ اور محبت کو معاشرہ سے جو تعلق ہے اس کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ یہاں یہ اکثر ہوا ہے کہ جس ناپ سنے ڈسا ہے اسی کی پوجا کی گئی ہے۔ یہ محبت یہ پرستش مصطحت یا نفس کی آسودگیوں سے پاک ہے۔ اس لیے کہ جو کچھ نہ دیکھنے کو تھا وہ ٹوٹا ہوا چکا یا زیادہ صیح لفظوں میں ٹٹ چکا۔ اب بجز آئندوں کی روانی اور دل کی تپش کے اور کیا باقی تھا۔ یہ جو سنے کم آب جو اس وحشیانہ نظم و تشدد میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔ اب بڑھ کر تشدد و تیز رویا میں تبدیل ہو گئی۔

مرتقا کے یہ انفراد صفت اس کے ٹکے ہوئے دل کی بچا رہیں۔ بلکہ ہماری عجیب و غریب معاشرت کا مرثیہ بھی ہیں اب تک ہماری نگاہیں وجد و صحت شامی لڑکچہ کی صرف معنی بیخبروں میں اُلجھی رہی ہیں۔ لیکن اس کا یہ ثبوت ہو سکتی ہے بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

نہیں واللہ دست دس اپنا قیدی بندی سے کیا ہے بس اپنا
دن بھر ایک ایک منہ کوٹتا ہے بات کرنے میں عیب لگتا ہے
ناک میں دم ہے شکیباری ہے ننگ لگی تاک سے جان طاری ہے۔

شادی کے بعد نہ تو دامن کی لڑائی باقی رہتی ہے اور نہ خلیک دامن کی سبک دہی کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شادی یا روزگار و خراب کی اس مسئلہ لغزش پر مروج کی اندرونی عدالت نے ان دونوں کو تو ہری کر دیا ہے لیکن کاری سے بیسے ایک خوش پیرا کو دی ہے۔ مرزا شکی کا یہ گمان میں نہیں ہے کہ اگر وہ اپنے مسائل کا حل تلاش نہیں کر سکے تو کم سے کم ان مسائل کو پوری صفائی اور دیانت داری سے پیش کر دے۔

یہاں عشق چلت یا کر دیا نہ کاری کے اعتبار سے کوئی بند پارہ عشقی نہیں ہے۔ اس کی خدمت کا دن نہان کے صفت اور محاوروں کی چاشنی میں پوشیدہ ہے۔ اس زمانہ میں جب غفلت لڑکی کو حسن یعنی سے نزدیک اور محبت حاصل تھی۔ مرزا شکی نے سادگی و سلامت کے پیرا پہا دیئے اور عشق و عاشقی اور حسن و دجوانی کے راگ کو ایسی بیعتی بول چال میں پھیرا کہ دہلی کے شیوا بیان اور شیریں زبان بھی اشتیاق بولناں رہ گئے اس رسول عالم عشق کے کہنے اشتیاق میں آج بھی زبان زو غنائی ہیں۔

ناک میں نیم کا فقط تشکا شوخی چال کی متعنا سن کا

وصل تم سمجھے آج ہی گل ہیں کیس برسوں پہلے ہے جل ہیں

بے اثر کب یہ چاہ ہوتی ہے دل سے اک دل کو راہ ہوتی ہے

اور جو کچھ بولوں تو بڑھتی ہے تو تو ماما ہوا سے بڑھتی ہے

کوئی مڑتا ہے کیوں بلا جلنے ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں

مرزا شوق کی تقریریں سراسر شہیت اور اصیت پر مبنی ہیں۔ انہوں نے اندک ولبہار کا تقریباً ہر جگہ لحاظ رکھا ہے جہاں ہلکے رنگوں کی مزور ہے وہاں ہلکے ہیں۔ جہاں گہرے کی مزور ہے وہاں گہرے۔ مثلاً ان معروض کی احتیاط اور صحت دیکھئے جن میں خط کشیدہ نغموں نے جان پیدا کر دی ہے۔

غم نے کی دل سے کج ادائی سی منہ پہ چھٹنے لگی ہوائی سی

شہر سارا اجاڑت گویا اتنا دستہ پہاڑ مت گویا
 ۛ کچھ گندھے، کچھ کھلے وہ سرے بال
 ۛ کچھ دکھائی تھی، کچھ لگاوت تھی
 ۛ شانے بازو بھرے بھرے سارے
 ۛ قبر تھی، فتنہ تھی، قیامت تھی

مرزا شوق کو شہیت نگاری میں کمال حاصل ہے۔ یہ کمال اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب شاہ جہ و سیج ہو اور نظریات ایک بڑے کو دیکھ سکتی ہو۔

ناک میں بزم کا فقط تنہا شوخی چالاکی متعقبات کا
 آستینوں کی وہ بھنسی گڑتی جسم میں وہ شہاب کی چھرتی
 مرنے پہ گڑی سے وہ عرق کم کم جس طرح گل پہ تفرہ شبنم
 مٹس رنج موتیوں کے دانوں میں بجلیاں چھوٹی چھوٹی لائوں میں

اس غزلی میں مرقع نگاری کی بہت سی کامیاب نمایاں موجود ہیں۔ مرزا شوق کے خطوط نازک اور سبک ہیں لیکن اس صورت گری میں غلاست، اصیت پر غالب نہیں آئی، مگر یہ قصور بلا غلط ہو۔

اتنے میں نگلی گھر سے ایک فوت ساؤ لڑکے چھبلی صورت
 لال نیفہ ازار بند بڑا لکھا ایک کنجوں کا اس میں پڑا
 کھیتی ہنسی کھٹکھٹاتی ہوئی آنکھ ایک ایک سے طاقی ہوئی
 چاقی چرند سیمہ زوری میں پھول رکے ہوئے کٹوری میں
 آنکھ ایک ایک پر لگاوت کی بات ایک ایک سے گلاوت کی

حسن کے دن جوانی زوڑوں پر مات کی ہاسی مہندی پروں پر
 بعض تصویریں چند خطوں سے کچھیں ہیں لیکن محلی ہیں۔
 وہ ششک چلی گئی گھر میں
 یہ اکیلے کھڑے ہے در میں
 مرتقا ایک اجنبی گھر میں اس طرح آتی ہے۔

سب جیا سے ہل چلے ہوئے
 پائے ناز سے اٹھائے ہوئے

تھا عجیب بچہ کتاب کا گل کا پھٹا پڑتا تھا جو میں اس گل کا
 بعض تصویریں اس سے بھی زیادہ چھوٹی ہیں لیکن ادھوری نہیں ہیں۔

چ۔ بوٹی بوٹی پڑی پھرتی ہے

چ۔ شرم آنکھوں میں قہر بانوں میں

چ۔ جسم ڈوبا تھا سب پسینے میں

چ۔ نہیں کرنے لگتا خود در کے

چ۔ بال رُخ کے سنوارتے جانا

مرزا شوق نے کینیا ت و جذبات کی ترجمانی میں بھی اصیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔ روزمرہ ادھار دھار سے
 ان خاکوں میں حقیقت اور فطرت کا رنگ بھر رہا ہے۔

جب نعرے نعرے دو چار ہوئی ایک بچھی جگر کے ہار ہوئی

جان و دل بتلائے دو ہوئے یک بیک اٹھ پاؤں سر دھوئے

بس کیجھر سا کوئی ملنے لگا تم سے دل دو دو اٹھ اچھلنے لگا

ہو گئی دل کی ایسی حالت زار جیسے برسوں کا ہو کوئی بیمار

پہلے دن کو نہ مات کو آرام یاد ہیں اس کی جیسے ناشام

رہی الجھن سی تاسخ اس کو نیند آئی نہ مات بھر اس کو

جب دل اس کا بہت ہلاک ہوا تب گریباں میں چاک ہوا

یہ نقشے کسی سماں اور ہادیہ یکروں سے کھینچے گئے ہیں۔

بوٹی بونی میں دروہ ہے ان کے رنگ پہرے کا زدو ہے ان کے

ناک میں دم ہے اشکباری ہے زندگی تک سے جان ماری ہے
صاحب بہارِ عشق کو اثرِ آفرینی کے تمام کے معلوم ہیں۔ دیکھئے اس تدریجی اور پُر شکوہ بیان نے تاثیر میں کتنا اعنا ذکر دیا ہے
جس پہ عالم فریفتہ ہے آج حسنِ خود جس کا شیفتہ ہے آج
جس کو ہے ادعا سے یکتائی آفتِ جاں ہے جس کی رعنائی
تیرخاں سے جس کی بھل ہو تیرخاں سے جس کے گھاٹ ہو
گھر بڑی محنتوں سے پایا ہے آج اس کا پست لگایا ہے

جو گنگو ہے وہ موقع اور محل کے مطابق۔ درحقیقت سے آتشِ بدامن ہو جاتی ہے۔ لیکن اپنی بندہ سلج کو نہیں چھوڑتی یہ گنگو
دیکھئے کتنی بیش ہے اور انداز کتنا شاندار ہے۔

دور ہو بس کہ ہے قصورِ معاصات پاس کوئی ہوں جان کر اشراف
ورنہ اس کا مزا چکھا دیتی کیا کہوں جو تہیں سزا دیتی
اب ٹہر دیاں نہ آئیے گا پھر نہ یہ بات منہ پہ لائیے گا
میری جوتی سے زہر کھایا ہے مجھ کو کس بات پر ڈوبایا ہے

مرزا شوق نے تبلیغ، تشبیہ اور استعارہ کا بھی اہتمام کیا ہے۔ لیکن اس میں وہی سلیقہ پڑتا ہے جو آنکھ میں سرمہ لگانے
اور چہرہ پر غارہ ہٹانے کے لینے دکا رہے۔ تبہات و تشبیہات معمولی اور زبردست ہیں۔ لیکن بہتہ اور بدھلی ہیں۔

بام روشنِ خاطر کی صورت سر سے پاک تھی لڑکی کی صورت
حسنِ پوست بھی اس کے آگلا نہ چہرہ زلفوں میں جیسے ابویں چاند

دُخ پہ گرمی سے وہ عرق کم کم جس طرح گل پہ قطرہٴ شبنم
رنگ گل سی لہر پسکتی ہوئی چوٹی ایسی نلک سکتی ہوئی
سرو ساند تو گل سے رخصا سے شانے بازو بھرے بھرے ساندے
مز کو تاب و توان لے پھیر لیا ابر گیسو نے دل کو گھیر لیا
واں سے جنبشِ ناک ہوئی وشار تیر کھائے ہو جس طرح سے شکار

نہایت ادا کی یہ شیشہ گرمیِ ملاحظہ ہو۔ عشق کے متعلق کہتا ہے۔

گر یہ چشمِ خونچکان ہیں کہیں خندہ زخمِ عاشقان ہے کہیں
کہیں مجھ پر ہے دستِ قاتل کا کہیں حرمِ مراحتِ دل کا

اس شعر میں دیکھئے۔ دل کی بے چینی اور پوری رات کی بے قراری کا نقشہ کھینچا ہے۔
 جب دل اس کا بہت ہلاک ہوا تب گریبان صبح جاگ ہوا
 مرزا اشرفی بول چال کی زبان خوب کہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ گفتگو ہمارے سامنے ہمہ ہی ہے۔
 ہنس کے اس نے کہا حاس میں ڈر ان میری باتوں پر نہ اتراؤ
 ایسا آسان ان کا آنا ہے سہل کچھ آپ کا بلانا ہے
 کس نے یہ مشورہ بتایا ہے دل کہیں اور بھی ٹھیک ہے

مرزا ذکرائی سے کہتی ہے۔

بات کرنے کا ہے یہ کون طریق کر یا ہوتا خوب ساختی
 آئے کس جا سے ہیں پیام ہے کیا کس نے یہ جابے ان کا نام ہے کیا

جھوٹ سچ پانچھے ہلاتی آئی جو چلے کرتی کھل کھلاتی آئی
 اور جو کچھ بولوں تو جھڑتی ہے تو تو ماما ہمارے بڑتی ہے

ان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عورتوں کی زبان اور لب و لہجہ مردوں سے مختلف ہے۔ اب چند اور چند وجوہ سے یہ مدہنیاں ٹوٹی جاتی ہیں۔ مرزا اشرفی نے یہ زبان جس خوبی اور کامیابی کے ساتھ لکھی ہے۔ اس کی مثالیں اردو نثر میں بہت کم ہیں
 اس کے اشعار بہت سے اذہر گز رہے ہیں۔ ہم مرنے چند قدر کر کے طود پر پیش کرتے ہیں۔

فجہ فوجی کو میں جاتی آج آئی ہوں کیسی بولیں کھاتی آج
 بھر مئے آج دم تک کیا ایسی درگاہ کو سلام کیا
 ساتھ ماما نہ آج گر جاتی کیسی بخت و دی ہری آتی
 یا خدا جو بھلا بچا دی کا جو ٹھیک ہستہ سوا دی کا
 کیسی پچھتاتی ہوں میں جا کر آج پہنچی ہاں تک خدا خدا کر آج

شمیر کی یہ مرانی بھی ملاحظہ ہو۔

کچھ مڑی نہ مجھ کو جانے گا دیکھئے پھر بُرا نہ مانے گا
 مرنے جیتے لکھاڑواؤں کی کڑی کی طرح جھاڑواؤں کی
 میں اگر بولنے پر آؤں گی لاکھوں دھڑے ترے آوازوں کی
 ابھی سب کہہ سکے دکھ دوں گی سات پڑی کو پُرنے کے دکھ دوں گی
 دیکھیں کیسی دھوم ڈواؤں کی دُئی کی طرح قوم ڈواؤں کی

دو ذرہ اور محاورہ کا جو تعلق بہارِ عشق میں ہے۔ وہ اس فراوانی کے ساتھ مرزا کی کسی غنوی میں نہیں ہے۔ ان اشعار کو دیکھئے ساہتے میں دھسے ہوئے ہیں۔

شہر سارا اجاڑ تھا گویا اتنا رستہ پہاڑ تھا گویا

نہ سنی اور کی نہ اپنی کہی دل کی حسرت تھام دل میں ہی

اللہ آمین سے اس کو پالا ہے سارے گھر کا یہی اہلا ہے

آکھ ایک ایک پر ملاوٹ کی بات ایک ایک سے گھلاوٹ کی
یہاں بٹہری کبھی وہاں بٹہری دو منہ ہنس بول لی جہاں بٹہری

ہوتے سوتوں کو اپنے وہ بولے خوب لڑی کی، کیا مزے میں لائے

ایک ساغر میں ہوش اڑ گئے واہ کتنے کم غرت ہو معب ذالہ

اپنے سائے سے ہی بھرتی ہے بونی بونی پڑی پھرکتی ہے

اچھے آتے ہی اختلاط برعائے خوب نام غذا مزے میں آئے
لوگ کہتے تھے ہے لبوں پر جان لڑکے صدتے جھوٹ کے قرآن

اشقیاق ایسا کہنا زیادہ ہے خیر ہے کہنے کیا ادا وہ ہے

کچھ بہت خوش مزاج عالی ہے تو نے یہ چڑھری نکالی ہے

بے حیائی کا جامہ پہنا ہے خیر ہے کھنڈوں میں رہنا ہے

کیا دما چھلڑی چھائی ہے تیری بھتاوری کچھ آئی ہے

تم تقدّر کئے شاہ ہوئے خوب میرے گئے کا مار بھگئے
بس زیادہ نہ آپ اترائیں دیکھو کچھ شائیتیں نہ آجائیں

تھے اسی دن کو سب اٹھا لکے کیا کیا ارمان ہیں خدا رکے
اب میں کبھی جو قصد تیرا ہے اے لوگم بختوں نے گھیرا ہے
ہرمزہ پیکل شوخیاں نہ کرو بس چو عشق زریاں نہ کرو

یہ شعر ملاحظہ ہو۔

کچھ عجب و عجب ہیں جیت کے بہت آراستہ ہو صحبت کے

نہ کہنا زمانہ اور ہے یہ شاہ و امجد علی کا دور ہے یہ

خوش کہ آذر وہ ہو جئے صاحب آپ کے پاؤں پر جئے صاحب

مہندی چھتی نہ آپ گس جاتیں دو گھڑی کو اگر جلی جاتیں

اس قسم کے بیسیوں شعر غزلی میں گئے۔ ہم نے انھما کی وجہ سے طویل اقتباس سے پرہیز کیا ہے۔

بہارِ عشق اور نہرِ عشق کی ہر ایک ہے، انداز ایک، دونوں کا لہجہ معمولی ہے، کچھ مختصر اور بے ترتیب سا۔ جس میں نہ کوئی جدت ہے، نہ فنی مضامین۔ لیکن نہرِ عشق میں جو ہنرِ قنادگی، پریشانی، درد اور کسک ہے وہ بہارِ عشق میں نہیں ہے، اور وفقت اور سنجیدہ سیما کا جو خوبصورت پس منظر نہرِ عشق میں ہے اور جو اس قسم کی تصنیف کے لیے اذہنِ مزدی ہے، وہ بہارِ عشق میں نہ ملتا اور بہت کم ہے۔ زبان کے اعتبار سے بہارِ عشق مرزا عشق کی سب سے مکمل غزل ہے۔ دہمروہ کی چاشنی، الفاظ کی ترتیب، عادات کی جڑبٹکی، یہ تمام خوبیاں اس میں ہر وجہ اتم موجود ہیں۔ اس مثنوی کو پڑھ کر بعض وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ”وہ آرت ناقص ہے جس میں کوئی طرز اور اسلوب نہیں ہے“

تنقید شعر اور حالی

عبدالقادر سرمدی

اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ اردو میں کم سے کم شاعری کی حد تک حالی کے تنقیدی کا نام ہے جدید عہد کے نقیب کہا سکتے ہیں۔ حالی سے پہلے اگر دو تنقید زیادہ تر صوری اور اصولی تنقید تھی۔ جس میں شعر کے صوری محاسن اور زبان اور اسلوب کی نزاکتوں کے بارے میں اشارے مل جاتے ہیں۔ اور بدیع معانی اور عروض پر مکمل کر بحث کی جاتی ہے۔ شرف عام طور پر ہمارے اہل فکر ادیبوں کی چھان بین سے بے نیاز نہ رہی اور شعر کی اہمیت کے دو نظر صاحبان ذوق کی توجہ زیادہ تر شاعری ہر سرگودہ کی۔ جدید عہد سے پہلے اردو نثر کی اصناف بھی گنتی جتنی تھیں۔ اور اگر کسی کسی نے نثر کے بارے میں انکشاف خیال کرنا چاہا ہے تو توجہ صرف دوزمرہ، محاورہ اور صحت الفاظ ہی تک محدود رہی۔ بعض وقت نثری کارناموں پر مستند ادیبوں نے تھریٹین مکی ہیں۔ اور اس طرح کی تحریروں کا اچھا خاصہ ذخیرہ اردو میں مہیا ہے۔ لیکن تقریباً سب متعلق باتیں ہوتی ہیں۔ نثری تنقید سے متعلق کچھ اشارے بعض تحریروں میں ایسے بھی ملتے ہیں جن میں کسی ادبی کارنامہ کی زبان یا محاورہ پر تفریق کی گئی ہے۔ ایسی تحریروں میں جب علی بیگ سرور کے ”سانہ محائب“ کا درجہ قابل ذکر ہے۔ جس میں سرور نے میراں کی ”بارغ و بہار“ کی زبان پر تفریق کی ہے کہ۔

”میراں صاحب نے چار درویش میں بکھیرا کہا ہے کہ ہم دوگوں کے
ذہن دھتے ہیں یہ زبان آئی ہے۔ دلی کے دروے ہیں محاورے کے
ہاتھ منہ توڑے ہیں۔ پتھر پڑیں ایسی بکھر پڑی خیال انسان کا خام ہوتا ہے
مفت میں نیک نام بنام ہوتا ہے۔ بشر کو دھوئے کب مزدا اے۔
کلاون کو یہودہ گوئی سے انکار بکھڑنگ و مارے۔ مثلاً آلت کز جو
بوید نگر عطار گوید۔ یہ وہی مثل سننے میں آئی ہے کہ اپنے منہ سے دھنباائی

ایسی تحریروں بہت بھل ہیں۔ اور اکثر اوقات تفریق اور کسی طنز و استہزاء کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ ایسی تنقیدیں کہ ہم ذوقی تنقید بھی نہیں کر سکتے ان کو گھٹیا جذباتی تنقید کی یہ شایں ہو سکتی ہیں۔
عہد جدید سے پہلے ہمارے یہاں ذوقی تنقید کے کچھ اشارے بعض وقت ہمارے سنجیدہ فکر نگاروں کی طرف سے ملے ہیں۔

دور کے چند شعرا کے کارنامے مل جاتے ہیں۔ لیکن یہ زیادہ تر شعر سے تعلق رکھتے ہیں اور موزوں تنقید کی مثالیں کبھی جاسکتی ہیں اس طرح کی تنقید کی ایک بھی مثال مولفہ کے قدیم شعرا میں دہی کی غزلی "تنب مشری" میں ملتی ہے: "در شرح شعر گوید کے مزان سے اس نے جو چند شعر لکھے ہیں ان میں دہی نے شعر کو بدلنے کے سوا دہی لینے کی کوشش کی ہے وہ کہتا ہے:-

کنا ہوں تجھے ہند کی ایک بات کہ ہے فائدہ اس سے وکالت محال
جوبے بعد بوسے تو بیاں بچیں بجلا ہے جو یک بیت بوسے سیس
نکو کو توں کئی بگنے کا برس اگر خوب بوسے تو یک بیت بس
اسی لفظ کوں شعر میں لکھتے توں کو لیا ہے اُس تا د جس لفظ کوں

اگر خام شے شعر کا تجھ کوں چمند

چنے لفظ یا ہوئے معنی بمنند

گویا دہی شعریں ربط معانی و سلاست کو موزوں سمجھتا ہے۔ اور اس کی نغز میں شعر کی خوبی کیت پر نہیں بلکہ کیفیت پر ہے۔ شعر میں مستند اور منتخب الفاظ اور مہندی معانی کی اہمیت پر بھی وہ زور دیتا ہے۔

مولفہ کا ایک اور شاعر، ابن نشائی بھی اپنی غزلی "جھولین" کے آخری حصے میں شعر کے فن کے بارے میں کچھ اصولی

باتیں بتاتا ہے وہ کہتا ہے:-

اگرچہ شاعری کا فن ہے عالی دے کیا کام آوے بات خالی
کہے ہیں شعر کوں کشید حکمت کہ بگنے شعر کوں چرنا نصیحت
اول بارے نصیحت اس میں اچھا نصیحت نہیں تو صنعت اس میں چھا

یہ شعر کا پرانا اخلاقی نغز ہے۔ ابن نشائی معنوی اعتبار سے شعر کی اخلاقی تدریوں پر زور دیتا ہے اور موزوں اعتبار سے صنعت پر۔ صنعت نگاری کا وہ دل دادہ تھا۔ چنانچہ "جھولین" میں اس نے جرحاً و ثلجاً استعمال کیے ہیں ان کے بارے میں کہتا ہے:-

ہنر کوئی دیکھ دے سو دکھایا صنائع ایک کم چاہیں لایا
ہنر حار و صرف سخن میں یوں قرینہ بوجھے کچھ بھی صنعت کا گیند

غواصی نے کوئی عام مہار سے شعر کے نہیں پیش کیے لیکن خود اپنی شاعری کے بارے میں اس نے جو باتیں کہی ہیں۔ ان سے بھی فن شعر کے کچھ مہار قائم ہوتے ہیں۔ قدیم اردو شاعری میں غواصی مسلم الثبوت اُستادانا جانا تھا اور اپنی اہمیت کا احساس بھی اسے تھا چنانچہ غزلی سیف الملوک و بدیع الجمال میں "در حسب حال خود گوید کے مزان سے وہ لکھتا ہے؟

دکھایا ہنر موشگافی کیسا سلاست کے تیلے سر تھے صافی دیا

کہہ رہے ہیں کہ طرح سے مت سے بہت کہ کوئے لائے سے ہم نہ اور نہ کر کے۔ بیان کرنے کے یہ تیلے دھنا تیلے نہیں۔
گے سے ملے جان پڑے نہ کو از سر نو صغائی بگئی۔

دراکت کون میں اپنے خیال تلخ دکھایا ہوں یا ایک کربال تھے
 دیا تا زلی شر کی دعائے کون سحر کو دکھایا ہر ایک بات کون
 ”طوطی نامہ میں بھی۔ در سبب نظم میں داستان گوید کے عنوان کے تحت قدیم اساتذہ شعر کے محاسن کی حوت اشارہ کرتا ہوا کہتا ہے۔

جو یک بیت اذن کی اگر کوئی پڑھے اخذات کون یک ہی مدح پڑھے
 گئے شعر کون ہیرو تھے کر دیں کئے اپنا ناؤں بر تر نہ دیں !!
 ان اشعار سے شعر کے جو میاں راجہ آتے ہیں وہ یہ ہیں کہ شعر میں سلاست اور صفائی، براکت اور تازگی ضروری ہے۔ اور اگر شعر کا بنیادی وصف ہے۔

بیجا پور کے شعرا میں منشی نے (۱۰۵۵ھ) میں اپنی مثنوی ”بے نظیر“ کے آغاز میں سخن اور شعر کی تعریف میں کئی شعر لکھے ہیں۔ قدیم شعرا سخن، کلام اور شعر دونوں کے لیے استعمال کرتے تھے۔ منشی شعر کی روحانی قدروں کا زیادہ قائل نظر آتا ہے۔ کہتا ہے۔

سخن گنج ہے عالم الغیب کا
 سخن موج زن لعل لاریب کا
 آگے وہ شعر کی صلاحیت اور اس کی جہان بخش خصوصیت کے بارے میں کہتا ہے۔
 سخن ات معنائی میں کوا اچھے سخن سفرۂ من و سوا اچھے
 لیکن بار سر سبز دل کا چمن !! سخن ہے سخن ہے سخن ہے سخن
 وہ یہ بھی کہتا ہے کہ مثنوی اور گند ذہن عمدہ شعر سرانجام نہیں کر سکتا۔
 کہاں ہوئے کو دن تے شعر سلیم
 گیسے کات کال آدہ بر گ نیم
 منشی سخن سخی پر سخن مثنوی کو فوقیت دیتا ہے۔

زیادہ ہے نزدیک اہل قیاس
 سخن پر لئے تھے سخن کا قیاس

شعر کے حسن و قبح کو جانچنے کے یہ میاں قدیم ہیں۔ مشرق میں بھی میاں پر لئے زمانے سے مسلم رہے ہیں مغرب میں یونانیوں کے یہاں بھی کچھ اسی طرح کے میاں ملتے ہیں۔ مولانا یہ ہوا ہے کہ ہر زبان کے علماء اپنی میاں کی اور مسئلہ الہی احسان کی بنا پر الہی اور تنقید شعر کے اصول مرتب کرتے رہے ہیں۔ عربوں میں ابن رشیق اور دوسرے علماء تنقید شعر کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے وہ

ط سے علاہ اصل تلہ ان راجع ہمہ پڑھے وہ پڑھے تلہ جہان کے نام تلہ ہے وہ کہاں تلہ سے

زیادہ تر قیید و کمبند رہا کر رکھا۔ اصناف ادب کے اذکار میں قومی مزاج اور طبیعت کو بہت دخل ہوتا ہے۔ ملاسنے اکثر یہ کہا ہے کہ اپنی ماؤں ادبی اصناف کی بنا پر تنقیدی اصول مرتب ہو سکتے تھے انہیں عموماً تنقید کی شکل دے دی مگر اپنی طمانی طمانی عموماً یہی کہا ہے۔ مثلاً قواعد زبان مرتب کرنے جوئے انہوں نے اپنی زبان کے جو قاعدے ہو سکتے تھے انہیں معیار زبان کر دیا کی دوسری ساری زبانوں پر انہیں کوئی تنقید کرنے کی کوشش کی۔ زبان کی طرح شعری تنقید میں بھی انہوں نے یہی کیا۔ اپنی ادبی اصناف کے مطالعے سے جو اصول استخراج ہوئے تھے انہیں عموماً شکل دے دی۔ پرانی شاعری میں زمیہ، بلکہ (دھانی) اور ٹیپوڈی کو چھری اہمیت حاصل تھی۔ اس اعتبار سے جو اصول تنقید شعری کے ان کسے یہاں مرتب ہوئے۔ ان کی بنا پر بھی اصناف قبض اور جس طرح انہوں نے زبان کے قاعدوں میں تعمیر کر کے انہیں ساری دنیا کی زبانوں پر مطبق کرنے کی کوشش کی۔ اسی طرح اپنے شعری تنقید کے اصولوں کو شعریہ عام طور پر مطبق کرنے کی کوشش کی۔ یمنان کے بہت کم مطالعے سے جو اپنی زبان کے علاوہ دوسری زبانیں بھی جانتے ہوں۔

یونان کی قدیم ترین شعری تنقید کے جو آثار ملتے ہیں۔ ان سے تنقید کے بارے میں دو تصورات واضح ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ شعریہ اثر یا دل کشی ہوتی چاہیے اور دوسرے یہ کہ شعر صداقت کا مظہر ہوتا ہے۔

جہاں تک شعر کے اثر اور دل کشی کے اصول کا تعلق ہے مغرب اور مشرق میں ہم آہنگی ہے۔ صداقت شعری کے سلسلے میں قصومات بہت سے شیب و فراز سے گزرتے ہیں۔ شعری صداقت کا سائیکسٹک اور واضح تصور ابھرتے ابھرتے بہت عرصہ پہلے مالی سے پہلے شعرا کے قلام کے علاوہ تنقید شعری کے کچھ اشارے ہم کو بعض تذکروں میں بھی مل جاتے ہیں۔ یہ اشارے اصول کی ضرورت میں بہت کم ہیں۔ مگر کچھ اصول عملی تنقیدوں سے اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ اس تلاش اور تحقیق سے جو اصول تنقید شعری کے بارے میں ہو سکتے ہیں۔ وہ ایک توجہ ہوں گے دوسری بات یہ ہے کہ زیادہ تر عربی اور فارسی شاعری میں مروج اور مقبول اصناف کی بنا پر مروج اور مرتب ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان اصول کو ساری دنیا کی شاعری پر لاگو نہیں کیا جاسکتا۔ جس طرح کسی اور زبان کے مخصوص اصناف شعریہ کے اصول پر اردو شاعری کی تنقید نہیں کی جاسکتی۔

اصل بات یہ ہے کہ تنقید شعریہ کے مجرد اور عقلی اصولوں کو ترقی کرتے اور نشوونما پاتے پاتے کافی عرصہ لگ گیا۔ یہ اصول وقت رفتہ اور ذہنی نشوونما اور تحقیق اور مہاجان میں کے طریقوں کے ترقی پانے کے ساتھ ساتھ نشوونما پاتے ہیں۔ سائنسی انداز تحقیق کے طریقوں سے مشرق اور مہندوستان عام طور پر انیسویں صدی عیسوی سے پہلے ماؤں نہیں تھے۔ انیسویں صدی کے وسط سے اور خاص طور پر انگریزی ادب ایک برتر اور فاضلین کے ادب کی حیثیت سے آمد کے طار سے روشناس ہوا تو اس سے ہماری طاری کی اثر پذیر ایک طری بات تھی۔ آزاد اور حاکم کی کہ جوہر میں کچھ تو بعض انگریزوں کی ترمیم دلائے پر خاص طور پر مالی کو ترجمے میں لکھے ہیں لام کرتے ہوئے مغربی ادبی کاموں اور ان کے دیباچوں اور مقدمات سے آگاہی کی وجہ سے اپنے ادبی کاموں کو بھی مغربی اصول تنقید پر جانچنے کی خواہش نظر آتا پیدا ہوئی۔ اس میں کچھ ضرورت کو دخل تھا۔ اور کچھ تقاضاے ضرورت۔

حالی جب شعر و شاعری کا جائزہ لینے بیٹھے تو ان کے سامنے شعری تنقید کے کچھ عمومی اور مجرد اصول تھے جن پر انہوں نے اپنے کام کے مقدمہ شعر و شاعری کے ابتدائی حصے میں بحث کی ہے۔ اس کے آخری حصے میں ان اصولوں پر اردو شاعری کی مختلف اصناف کو جانچنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مقدمہ شعر و شاعری ہندوستان کی جدید زبانوں میں شری تنقید کے مغربی اصولوں پر لکھی ہوئی اولین کتاب ہے۔ اردو میں بلاشبہ یہ اولین مستقل کتاب ہے جس میں شعر کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے اور مروجہ شعر کی اصناف اور اسباب پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے شعر کو پرکھنے کے جو معیار ہمارے انشا پردازوں کے سامنے تھے وہ بہت کچھ مختلف تھے۔ عام طور پر منظوم اور مثنوی کلام کو شعر سمجھا جاتا تھا یہ صحیح ہے کہ شعر کا معنوں اور اسلوب بھی پیش نظر ہوتا تھا۔ لیکن پچھلیت مجموعی یہ کم دیکھا جاتا تھا کہ کیا کہا جا رہا ہے۔ بلکہ نوجہ اس بات پر زیادہ مثنوی تھی کہ کس طرح کہا جا رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اہمیت زیادہ تر اس بات کو دی جاتی تھی کہ کوئی شاعر بحر اور قافیہ کے اصول کی کہاں تک پابندی کرتا ہے اور نہ اسے دوزخ اور عمارت سے فیض حاصل کرتا ہے۔

حالی سے پہلے کی تنقید کے نمونے ہمارے شعرا کے تذکروں میں ملتے ہیں۔ تذکروں کا آغاز دہلی شاعر کے کلام کی پسند ہوتا تھا۔ اچھے شعر پر اس میں بادداشت کے لیے کلمہ دیتے تھے اور شاعر کے بارے میں بھی کچھ معلومات جمع کر لی جاتی تھیں۔ دفتر دفتر تذکرہ نگاری کے کچھ اصول بھی نشو و نما پا گئے اور یہ شاعری کی تاریخ کی شکل اختیار کرتے گئے۔ لیکن شعرا کی یہ تاریخ دراصل حوالے کے لیے خام مال اٹھا کر دی گئی تھی۔ کیونکہ شاعر کی زندگی اور حالات کے بارے میں بہت کم جہان بین کی جاتی تھی۔ شعر کی پسند یا پسند کی چار محض انفرادی ذوق ہوتا تھا۔ شعر کی تنقید جیسا کہ مختصر ملاحظہ مایہ جین نے لکھا ہے شعر کو دین کی کسوٹی پر کھنکھاتا تھا۔ اس کے لفظوں اور ترکیبوں پر اساتذہ کی سند لانا اور تذکرہ نگاری کی کج فہمیوں میں الجھنا سمجھا جاتا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ حالی سے پہلے آزاد نے انجمن پنجاب کے نئے شاعروں کی طرح ڈالنے ہوئے جو تنقیدی پھر ۱۸۶۷ء میں دیا تھا۔ اس میں جدید تنقید کے کچھ اشارے ملتے ہیں۔ آزاد نے نظم اور کلام مرزوں کے بارے میں خیالات ظاہر کرتے ہوئے شعر کی حیرت انگیز تاثیر پر بہت زور دیا تھا اور خلافتِ یونان کے کچھ خیالات کی ترجمانی بھی کی تھی۔ آزاد کو نارسا شاعری سے جو شک تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا۔ کہ انہوں نے رومی اور سعدی کی شاعری کو نمونہ بنایا اور شعر کا اجماع مقصد پسند و نصیحت اور ہدایتِ حاضر و باطن قرار دیا تھا۔ آزاد کا یہ نظریہ دراصل شعر کی اخلاقی قدروں والا پرانا نظریہ تھا جو شعر کے موجودہ نقادوں کے پاس تمام و کمال قابل قبول نہیں۔ اخلاقی قدر حقیقت میں جتنا قدروں میں سے صرف ایک قدر ہے۔ شعر کی قدروں اس سے کہیں زیادہ وسیع ہیں۔ اسی تقریب میں آزاد نے اردو شاعری کے مرتبہ آغاز پر بھی بحث چینی کی ہے۔ وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ جہاں تک عبارت کا زور و معنوں کا جوش و خروش اور لطافت و مناسبت کے ساتھ ساتھ اس کا تعلق ہے۔ ہمارے بزرگ اس قدر سے کہتے ہیں کہ اس معاملے میں ہماری زبان کسی سے کم نہیں۔ لیکن انہیں افسوس ہوتا ہے کہ ہمارے شاعر اس زور اور جوش کو بے اصل اور معدوم باتوں میں ضائع کر رہے ہیں۔ وہ چند جزیرہ فردی احاطوں میں گھروں گھوس ہو گئے ہیں وہ کہتے ہیں۔ کیسی حسرت آتی ہے جب میں زبان انگریزی میں دیکھتا ہوں کہ ہر قسم کے مطالب و مضامین نثر سے زیادہ خوبصورتی کے ساتھ نظم کرتے ہیں اور مثنوی یہ ہے کہ کلام میں جان ڈال دیتے ہیں وہ جوش میں آکر اپنا زبان و دل کو اجماع دیتے ہیں کہ۔

”تہا ری شاعری جو چند محدود احاطوں میں بلکہ چند زنجیروں میں مقید ہو رہی ہے۔ اس کے آزاد کرنے میں کوکوش کرو نہیں تو تہا ری اولاد ایسا پائے گی کہ ان کی زبان شاعری کے نام سے بے نشان ہو گئی“

آزادی کی تقریروں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں کچھ تو غائب ہجرند یا یزید یا لاندہ کے ایسا پر اور کچھ انگریزی شاعری کے نمونوں کو دلچسپی کا احساس ہو گیا تھا کہ اردو شاعری کچھ غیر مزدی مدد میں گھر گئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس ادب کا گھاٹ سے باہر نکلنے کی کیا سبیل انہوں نے بتائی تھی؟ اور شاعروں کے لیے کیا معین مقام تجویز کیا تھا؟ اس بارے میں آزاد کی تقریر اور کچھ سے کوئی رہنمائی نہیں ہوتی۔ مرت آنا اندازہ ہوتا ہے کہ منزل کا انہیں کچھ شعور تھا لیکن اس منزل تک پہنچنے کے لیے کوئی معین راہ وہ نہ بتا سکے۔ اس کا سبب شاید یہ ہو کہ آزاد ایک اٹاپہ واندہ تھے۔ تجزیہ اور تحلیل سے ان کی طبیعت کو لگاؤ نہ تھا۔ وہ کچھ بھی ہو یہ واقعہ ہے کہ آزاد مرض کی تشفی تو کر سکے لیکن علاج تجویز نہ کر سکے۔ اس لیے آزاد کی تقریر اور کچھ شعری تنقید کا کوئی نظام مرتب نہیں کرتا۔ ان سے محض شاعر کے معاملے میں نئے معیار کی تلاش کا پتہ چلتا ہے۔ اور موجودہ شعری کے نیچے سے ان کا ہٹ کا اظہار ہوتا ہے۔ اس بات کو آزاد نے اچھی طرح ظاہر کر دیا ہے۔ کہ ہمارے شعر نے اپنی فضا کو غیر مزدی طور پر محدود کر لیا ہے۔ حالانکہ وہ چاہتے تو فضا کی وسعتوں سے کام لے سکتے تھے۔

آزاد کے شاگرد و خدمت دار کے ایک بیان سے جو نظم آزاد کے آخر میں چھاپا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آزاد کی تقریروں نے کافی بل بل برپا کر دی تھی۔ اور آزاد کے نبیرہ آغا محمد باقر بتاتے ہیں کہ آزاد کے ”دو قدم راہ خطا کرتے ہی ہر طرف سے علامت کے تیرا سنے لگے۔“

اس میں تفریبیں جب ہم ”مقدّر شعر و شاعری پر نظر ڈالتے ہیں تو ان اوراق میں پہلی دفعہ ہم کو شعر اور مطالعہ شعر کے سارے پہلوؤں پر ایک نئے انداز سے روشنی پڑتی دکھائی دیتی ہے۔ حالی کی بحث اور تحقیق کا انداز اور ان کے اکثر مباحث وہی ہیں جو جدید تنقید کے موضوع ہیں۔“

حالی کو شعر و شاعری پر غم اٹھاتے ہوئے سب سے پہلے شعری ضرورت کا جواز دریافت کرنا تھا اس کی ضرورت اس وجہ سے بھی تھی کہ زمانہ کے سب سے بڑے مکتب افلاطون نے اپنے جھوکریہ کے خیالی دعوے سے شاعر کو سرے سے خارج کر دیا تھا۔ افلاطون کے ذہن سے صحیح یا غلط وہ پر سوچنے والے اور بھی کئی علماء کے پاس سماجی نظام میں شاعری کی ضرورت سقم ہی نہیں۔ بعض اہل رسلے ایسے بھی ہیں جو شعر کو ماہیت کی یادگار سمجھتے ہیں۔ اس لیے آج کی سائنس دہیا میں انہیں شعر کا کوئی مقام نظر نہیں آتا۔ حالی کے جیسے اس نقطہ خیالی کو رد کرنا آسان کام نہیں تھا۔ لیکن انہوں نے عدم طبیعت اور شہدے دل سے سوچنے کی صلاحیت کی مدد سے اس نقطہ خیالی کی بڑی خوبی سے اصلاح کی ہے۔ حالی نے شعر کے جہان میں یہ تبدیلی پیش کیا ہے کہ حکیم علی الاطلاق نے اس دیرانہ آباد دنیا میں کارخانہ دنیا کی رونق اور اختتام کے لیے انسان کے مختلف گروہوں میں مختلف صلاحیتیں پیدا کی ہیں۔ اگرچہ ان میں بعض جماعتوں کے کام ایسے بھی ہیں جو سوسائٹی کے حق میں چند ان سود مند نہیں معلوم ہوتے مگر چونکہ تمام ازل سے ان کو یہی حق پہنچا ہے اس لیے وہ اپنی قسمت پر قانع اور اپنی کوششوں میں سرگرم ہیں۔ جو شخص اس حلقہ الہی کو مستغنائے قدرت کے موافق کام میں لائے گا۔ ممکن نہیں کہ اس سے سوسائٹی کو کچھ نقص نہ پہنچے۔

حالی کا یہ استدلال اس انداز کا ہے کہ مکتب بھی سوچنے پر مائل ہو جائے گا۔ حالی نے سماج میں شعری ضرورت کے مسئلے کو اور آگے بڑھانے کے لیے شعری کی تاثیر کی بہت سی مثالیں پیش کی ہیں۔ استدلال کا یہ طریقہ جدید علمی طریقہ ہے جو کسی مسئلے کو ثابت کرنے

ہیں بہت وزنی ہوتا ہے۔

حالی نے ان لوگوں کے خیال کی بھی بڑے سلیقے سے اصلاح کی ہے جو شعر کو زائد جہتیت کی یادگار سمجھتے ہیں۔ اور

یہ ثابت کیا ہے کہ شاعری شائستگی میں بھی قائم رہ سکتی ہے۔

شعر کی اخلاقی قدردانی کیا ہے میں بہت کچھ کہا اور لکھا گیا ہے۔ کچھ عطا تو شعر کے ساتھ کسی انفرادی یا تاریخی مقصد کے وابستہ کیئے جانے کے خیال ہی سے جبراً نہ ہوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس پر زور دیتے ہیں کہ شعر کا مقصد محض شعر ہے۔ شعر سے وادار شعر کا کوئی مقصد قراء دینا اُن کے خیال میں بد ذوقی ہے۔ کچھ اور علماء اس خیال کو مدد کیے بغیر شعر کی اخلاقی قدردانی کو سب سے اہم سمجھتے ہیں۔ آزاد کا خیال اس بارے میں اُوپر بہت لیا جا چکا ہے۔ حالی بھی اس مسلک کے حامی ہیں۔ چنانچہ ”مقدمہ“ میں یہ بحث انہوں نے بڑی خوبی سے کی ہے کہ شعر انسان کی دوسری خوشیوں کو گناتا ہے۔ انسان کی دوسری خوشیوں کے ساتھ اخلاقی کاغذ بدست ہے۔ پھر انہوں نے اس نکتے کی وضاحت کی ہے کہ شعر علم اخلاق کی طرح براہِ راست تلقین اور تربیت نہیں کر سکتا بلکہ اذروئے الصفات اس کو عام اخلاق کا نام نہاب کہہ سکتے ہیں۔ اس کی تائید میں ان مونیفک مسلک کو پیش کیا ہے جو سماج کو قریب الہی اور مذہبی نفس کا ذریعہ بناتے ہیں۔ حالی کہتے ہیں کہ سماج کا رکن شعری ہے۔

شعر کی ضرورت اور اہمیت کے مسئلے کو زینہ بزمہ اٹھانے کے بعد حالی نے انہیں شعر کی عظمت کی طرف منتقل کرتے ہیں شعر کی تاثیر کو مسلم اور اس کی اخلاقی قدر کو بدیہی ماننے کے بعد حالی اپنے پیش رو حالی کی ہم قدمی پر قناعت نہیں کر سکتے۔ وہ ایک قدم اور آگے چلا جاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ شاعری سب کچھ بننے کے باوجود سوسائٹی کے تابع ہے۔ اس مسئلے پر حالی نے طویل اور مدلل بحث کی ہے۔ اور شعر کو عام تخیل سے دنیائے آب و گل میں اتار دیا ہے۔ حالی کی بحث سے بظاہر یہ مستفاد ہوتا ہے کہ شاعری میں جب بگاڑ پیدا ہوتا ہے تو اس کی وجوہات کی تلاش ہم کو سماج میں کرنا چاہیئے لیکن اس اصول کو انہیں اپنے کے بعد یہیں پر لکھنا نہیں چاہئے۔ استفادہ کی مدد سے ہم یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ شاعری کا ہر اعلیٰ سماج ہے۔ شاعری سماج سے اُٹھتی ہے سماج ہی جیتی ہے۔ سماج جہات ہی ہے اور جہات ہی میں جہات ہے۔ جو شاعری سماج سے اپنے رشتے کو توڑ لیتی ہے وہ جہات سے اپنا رشتہ توڑ لیتی ہے۔ اور اپنے ہمارے کٹ جاتی ہے۔ حالی نے شاعری کو سوسائٹی کے تابع بنا کر حقیقت میں آدھو شاعروں اور نقادوں کے ذہن کو نہایت ترقی پر توجہ دے دوں گا کہ بڑا تھا۔

شعر کی جہتیت اور شعر کے عناصر کو لازم سے بھی حالی نے بحث کی ہے۔ یہ بحث بھی چند دھماکوں اور غمازوں سے خالی نہیں ہے۔ مثلاً قافیہ اور مدحیت کی جھگڑا اور سہارے پر قدم اٹھانے والے شاعروں سے حالی کا کہنا کہ قافیہ اور مدحیت شعر کے لوازم نہیں بلکہ نظم کے لوازمات سے ہیں۔ ان کی ساری ذہنی جہادوں کو دھما دھم دینے کے مترادف تھا۔

اپنے تجزیہ پسند ذہن کی مدد سے حالی نے شعر اور نظم کو ”پڑھائی“ اور ”درد“ کے درمیان پہلی دفعہ فرق کیا۔ شاعری کی شرطوں میں سب سے اہم شرط انہوں نے مطالعہ کائنات کی مقرر کی ہے۔ یہی دراصل وہ پہلو ہے جہاں ہمارے پرانے شاعر بیٹھے نظر آتے ہیں۔ اپنے اہام کے لیے۔ حیثیت نظر کا مطالعہ کرنے کی بجائے، انہوں نے اساتذہ کے دیوان مٹھولنے کو زیادہ پسند کیا ہے دوسروں کی ذہنی منزل پر تفرق کرنا، ہنسے فخر کی بات بھی جاتی تھی۔ مضمون پر مضمون بانٹنے کی عادت بھی، دراصل اسی کوتاہی کا

نہجہ ہے۔

حالی نے یہ بھی تغیب لکھی ہے کہ شعر میں کیا کیا ضربیں ہونی چاہئیں۔ یہ مواد ان کو انگریزی کے مشہور شاعر مٹسن سے حاصل ہوا تھا۔ اس میں شک نہیں تاریخ تنقید میں، مٹسن کے تنقیدی خیالات کی اہمیت اتنی زیادہ نہیں۔ مٹسن کا سب سے اہم کارنامہ یہ تھا کہ اس نے شعر میں قافیہ کے التزام کی مخالفت اور بے قافیہ نظم کی ولایت کی تھی۔ لیکن چونکہ وہ بڑا شاعر تھا۔ اور حالی کے زمانہ میں وہ مقبول انگریزی شاعر تھا۔ اس لیے حالی نے اس کے مینڈا اصول کو تنقید شعر کے بنیادی اصول سمجھ لیا۔ اور اسی سے انہوں نے جہاں تک شعر کی معنوی تنقید کا تعلق تھا، کام لیا۔ ساوگی، اصیلت، اور جوش، جوش کی نظریں، شعر کے لازمی اجزاء ہیں۔ ان میں دو اجزاء، یعنی ساوگی اور اصیلت سے۔ حالی سے عین پہلے کی شاعری بیچ نہ چوری تھی۔ جوش یا ایک اور نفا کے الفاظ ہیں۔ ہدایت کا از خود چھکاؤ یا تو سرے سے پایا ہی نہیں جاتا تھا، اور شعر ذہنی کاوش کا نمونہ بن گیا تھا یا پھر بے موقع اور حد سے بڑھا ہوا تھا۔

حالی نے مطلق حیثیت سے، ساوگی اور اصیلت کا جس استیصال سے تجزیہ کیا ہے وہ آج بھی پڑھنے کے قابل ہے۔ شاعری میں جوش کے مفہوم کو سمجھاتے ہوئے انہوں نے مروجہ اندوز شاعری پر بھی تبصرہ کیا ہے۔ اور اس میں وہ سارے اصول بیان کیے ہیں جن کی وجہ سے ہماری شاعری، ساوگی، اصیلت اور جوش، سب سے دور رہی ہے۔ یہ تبصرہ حقیقت میں حالی کے مطالعے کی وسعت اور گہرائی کا پتہ دیتا ہے۔ انہوں نے مٹسن کے اصول کی روشنی میں، اردو غزل اور قصیدہ کا بھی جائزہ دیا ہے۔ مٹسن کی صحت پسند جمیعت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ نئے سخن میر کی شاعری میں ساری خوبیاں ہی خوبیاں دیکھے چنانچہ ساوگی بیان کے سلسلے میں وہ لکھتے ہیں۔

اگرچہ ہمارے بعض شعرا اپنے بھی گورے ہیں۔ جنہوں نے ساوگی بیان کو سب چیزوں پر مقدم بھلے جیسے تیرا، دودا، آٹا اور مٹھی وغیرہ۔ لیکن چونکہ انہوں نے قمار کے خیالات و مضامین سے بہت کم تجاوز کیا ہے۔ اس لیے ان کے دیوان زیادہ تو بھرتی اور پُرکھن اشعار سے بھرے ہوئے ہیں۔

مترسیدہ اور حالی کے زمانے میں ایک اصطلاح 'نچرل شاعری' کا چل پڑی تھی جیسے ادبی محققین اسے مطلب کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ نچرل شاعری کو وہ یہ مفہوم پہناتے تھے کہ وہ شاعری ہے جو نچرل چیزوں سے متشبہ ہے اور جس میں نچرل خیالات اور تصورات پیش کیے جاتے ہیں۔ مترسیدہ اور حالی 'نچری' کہلاتے تھے۔ چنانچہ مترسیدہ کی ہمدانی سامعی کے خامضین اور ادیبوں کا وہ گروہ جو اودھ پنج سے وابستہ تھا۔ انہیں 'ہیرنچرل' لقب سے موسوم کرنا تھا۔ اور مترسیدہ اور ان کے رفقاء کے بارے میں خوب ہنسی اڑائی جاتی تھی۔ حالی نے نچرل شاعری کے بارے میں جو غلط فہمیاں بھیجی ہوئی تھیں یا دانستہ پھیلادی گئی تھیں ان کا تذکرہ کیا ہے اور نچرل شاعری کے حقیقی مفہوم کو، جو ان کے ذہن میں تھا، واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

حالی نے شعر میں صوری وازم یعنی زبان اور اس کی دستگی کی اہمیت پر بھی مضل روشنی ڈالی ہے۔ ان کو خاص طور پر نچرل شاعری کے جس کے وہ سراگرم وکیل تھے۔ اغراض و مقاصد کی تکلیف کے لیے، اردو کے مروجہ ذہنیو الفاظ اور اسالیب کی تنگ دامانی کا احساس تھا۔ اسی لیے وہ ہندی بھاشا سے استفادہ اور ہندی کے الفاظ کو اردو میں داخل کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ اس مرقع پر حالی، بسن ایسی ذیلی بحثوں میں الجھ گئے ہیں جن کی یہاں قطعاً ضرورت نہیں تھی یہ زبان کے مستند مراکزوں

کی بحث ہے۔ یہ بحث دراصل عاقی سے پہلے کے جہد کی ایک ذرا سی بحث تھی۔ حالی کی بحث میں ایک کھلا تضاد ہے کہ اردو کو ہندوستان کی سب سے زیادہ وسیع اور عام زبان مانتے ہوئے بھی اسے کھنڈ اور دہلی کے مراکز میں قید کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اصل میں یہاں حالی اپنے آپ کو ان محسوسوں سے وابستہ رکھنا اس لیے ضروری سمجھتے تھے کہ اپنی دہلی اور اہل کھنڈ میں سے کوئی بھی حالی کو اپنی زبان نہیں مانتا تھا۔ اور یہ روایت آج تک برابر ہے۔ حالانکہ خود حالی کو اردو زبان سے ایک ایسی سند کے طور پر مان لیا ہے جس کی زبان نے اردو کو دہلی اور کھنڈ کی شخصی اور جغرافیائی قیدوں سے آزاد کر دیا ہے۔

یہ سمجھ ہے کہ حالی زبان کے سلسلے میں کوئی تغیری اور منظم تجربہ پیش نہ کر سکے۔ ان انہوں نے اردو زبان کو درست دینے اور اس کی سند کے شخصی اور جغرافیائی معیاروں کو معروضی اور عملی بنانے کے لیے اردو کی مستند لغات اور قواعد زبان کی تدوین کی ضرورت پر زور دیا ہے۔

مقدمہ شعر و شاعری کا براہِ راست تنقید شری نغری بھٹوں پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں عملی تنقید کے بھی چند نمونے اس سلسلے میں مل جاتے ہیں۔ جہاں انہوں نے اپنے مہینہ اوروں پر اردو شاعری کو جس جتنے طور پر جانچا ہے۔ ”مقدمہ“ کا آخری حصہ اردو شاعری کی عملی تنقید سے متعلق ہے۔ اس حصے میں انہوں نے اردو کی مختلف اصناف شاعری کا جائزہ لیا ہے۔ اس جائزہ میں غزل، قطبہ، رباعی، غزلی اور دوسری اہم یا فیہر اہم اصناف کو حالی نے تنقید شری کے لیے نئے اصولوں پر جانچنے کی کوشش کی ہے۔ غزل کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ اس کی حالت فی زمانہ اہتر ہے۔ اور وہ محض ایک بے سوکڑ اور دوراد کا مصنف ہو کر رہ گئی ہے۔ قبیہ کی حالت کو بھی وہ ناگفتہ بہ بتاتے ہیں۔ اور غزلی کے ضمن مشقیہ قصوں تک محدود ہو کر رہ جانے کی انہیں شکایت ہے۔ مثنوی قصائد ہی کے زمرے میں آجاتا ہے۔ یہی تین اصناف ایسی ہیں جنہیں حالی، اردو شاعری کا سراپا سمجھتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے بڑی وقت و نظر کے ساتھ ان کا محاسبہ کیا ہے اور ان کی اصلاح اور انہیں متنفسانے زمانہ کے مطابق بنانے کی یہ تجویز بھی پیش کی ہیں۔ حالی کا یہ جائزہ ان لوگوں کے لیے جو اردو شاعری اور اس کی اصناف کو مثالی اور خاصے بالادتر مانتے تھے۔ بڑا ہی ناگوار ثابت ہوا۔ حالی نے خاص طور پر غزل میں جہانگیری بنیادی مانی جا رہی تھیں، ان پر حملہ کر کے، شاعر کے پاؤں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔ اس لیے جیسا کہ قلمبر ماحرہ ماہر حسین نے کہا ہے۔ ”مقدمہ“ حالی کی سب سے زیادہ مشہور۔ سب سے زیادہ مقرب اور سب سے زیادہ مقبول کتاب ثابت ہوئی۔

حالی نے حصے اموں اور مثالی مدق کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ ان اصناف کو اپنے ہیان کیے ہوئے اصولوں کے مطابق برتا بھی۔ حالی کی غفلت کا حقیقت میں بہت بڑا یہ پہلو ہے۔ اصول سازی ہمیشہ آسان کام ہے۔ لیکن عمل ان اصولوں کو اختیار کرنا۔ اتنا آسان نہیں۔

عملی شری تنقید کے کارناموں میں حالی کی تعانیف و حیات سعدی اور شاہ کاغذ و غالب حالی کے جمود کا ناسخ ہیں حیات سعدی میں سعدی کے کام اور تعانیف پر حالی کی تنقید کا ایک حصہ ان کی تعانیف کی مقبولیت سے متعلق ہے۔ جو حصہ کام اور تعانیف کی براہِ راست تنقید سے متعلق ہے۔ اس میں بغاوتِ حالی نے مقدمہ کے مہینہ اموں کی سختی سے پابندی نہیں کی۔ بلکہ بعض جگہ تنقید کے دوامی اغراض سے بھی کام لیا ہے۔ اس حصے میں دو تقابلی تنقید کے طریقے سے بھی کام لیتے ہیں اور اپنے مانی اخیر کی وضاحت کرتے ہیں۔

اردو شاعری کی عملی تنقید میں "بادشاہ غالب" کا وہ حصہ اہمیت رکھتا ہے جس میں حاکمی نے مرزا کے کام پر مہربان کیا ہے یہ حقیقت میں وہ مقام تھا جہاں حاکمی اپنے مندرجہ اموروں سے زیادہ وابستہ رہ سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے بعض اوقات کی طرح اپنے آپ کو اموروں سے سختی کے ساتھ بندھا ہوا رکھنے کی بجائے کسی قدر آزاد دہی سے بھی کام لیا ہے۔ اور خیالات کے بہاؤ کے رخ پر نکل گئے ہیں۔ اصل میں اچھی تنقید بھی تخلیق ہوتی ہے اور تخلیق کے تحت شعور میں اصول کار مبرا ہو سکتے ہیں۔ لیکن مصنف کا ان کے ساتھ محسوس ہونا، اکثر عمدہ تخلیق کا باعث نہیں ہوتا۔ حاکمی کی تنقید کا اصل موضوع تو مرزا غالب کی منزل گوئی ہے۔ لیکن ان کے قطعاً اور رہا جیوں کی جانب بھی عمل اشارے ملے ہیں۔

مرزا کی منزل پر حاکمی کی تنقید کا اسلوب کچھ روایتی سا بن گیا ہے۔ وہ منزل گوئی کا یہ حیثیت جموں کا جزو نہیں ہے سکے میں بلکہ اپنے جزو کو انہوں نے غازیوں میں بانٹ دیا ہے۔ مختلف مضامین قائم کر کے ان کے تحت غالب کے اشعار پیش کرنے اور ان کی شرح کرنے کے طریقے کو حاکمی نے پسند کیا ہے۔ ایک بات ضرور قابلِ توجہ ہے کہ حاکمی نے تنقید کو محض صوری اور اسلوبی تنقید ملکِ عمدہ و نہیں رکھا۔ اس عقیدہ میں یہ بات واضح ہے کہ حاکمی کی معلومات کا دائرہ محدود تھا۔ اس لیے وہ مغرب کے فنی شرط سے غالب کی منزل کا تقابلی مطالعہ نہیں کر سکے۔ انہوں نے عام طور پر فارسی کے منزل کو شرط سے بھی غالب کا مقابلہ نہیں کیا اور یہ ضروری بھی نہیں تھا بلکہ بعض وقت ایسا متبادلاً خراب بن جاتا ہے جہاں تک غالب کے کام کی شرح اور تعبیر کا تعلق ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حاکمی کی تشریحوں نے اس کے محاسن اور مصونیت کی جانب لوگوں کی توجہ منسلک کرانے میں بہاؤ دی خدمت انجام دی۔

"بادشاہ" میں حاکمی نے مرزا کی اردو نثر پر بھی غور فرمائی ہے لیکن حاکمی کی نثری تنقید اس اشارے کے موضوع سے خارج ہے

ہجج اکبر

حامد حسن قادری

حضرت اکبر (الہ آبادی نے بہت لوگوں کے نام رکھے۔ کسی کا بدھو، کسی کا مچن، کسی کا لیڈر، کسی کا پیڈ۔ مولانا محمد علی بیس الاحرار نے اکبر کا نام رکھ دیا۔ ”ہجج اکبر“ بوزن ”ہجج اکبر“۔ حضرت اکبر دیسے بہت مقطع تھے، صرف شاعری میں ”ہنسوڑ تھے“ مولانا محمد علی ظریف شاعر نہ تھے۔ مگر طبیعت سے بڑے چلبے، باتوں میں بڑے مسخرے تھے۔ ایک روز نامہ ہمدرد کو چڑھ چیلان دہلی سے نکالتے تھے۔ اس میں اکبر (الہ آبادی کے تذکرے پر ان کو ہجج اکبر لکھا تھا۔ مجھے بہت پسند آیا تھا۔ اسی لیے اس کو اس مقالے کا عنوان قرار دیتا ہوں۔

شاعری میں رمز بات کے بغیر چارہ کار نہیں۔ نام رکھنا بھی ایک رمز، ایک ایذا، ایک استعارہ ہے۔ جس طرح بادہ و ساغر کے بغیر نہیں مٹی، اسی طرح زندگی و رسالتی، شیخ و زاہد، داعی و مخلص، بے بغیر نہیں مٹی، اور اسی طرح مولوی مدنی، شیخ علی، موسیٰ و عیسیٰ، افلاطون و فرعون کے بغیر کام نہیں چلتا۔

کسی رمز یا نام کے استعمال کا بڑا فائدہ انحصار کے ساتھ ملنا ہے۔ ایک نام اک اصطلاح بن جاتا ہے۔ سیرت یا سورت کا بڑا خاکہ یا نقشہ ایک لفظ میں سما جاتا ہے۔ جو نام سننے ہی آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ کسی تفصیل سے وہ محسوس پیدا نہیں ہوتا اور وہ لطف حاصل نہیں ہوتا جو ایک چھوٹے سے نام سے ہو جاتا ہے۔ مثلاً بدھو کا نام ہے۔ بدھ یا بدھی عقل کہتے ہیں۔ بدھو کے معنی ہونے عقل مند۔ لیکن اذراہ طنز و طعنت بے عقل اور احمق کو بدھو کو کہتے ہیں ساکبر کے ہاں اس کا لطف دیکھئے :-

بدھو میاں بھی حضرت گاندھی کے ساتھ ہیں

لوگوں کو راہ ہیں مکہ گاندھی کے ساتھ ہیں

یہاں مچن ہیں وہ بات نہ نکلتی جو بدھو میں ہے۔ دوسری جگہ کہتے ہیں :-

مرزا غریب چپ ہیں، ان کی کتاب روتی

بدھو اکڑ رہے ہیں، صاحب بے یہ کہا ہے

یعنی صاحب نے جو کچھ کہا ہے وہ اصل میں غلط ہے، بلکہ مرزا کی کتاب میں جو کچھ ہے وہی صحیح ہے۔ لیکن بدھو احمق اس کو

کیا سمجھیں، اہی کے نزدیک تو صاحب کا فرمودہ ہی سب کچھ ہے۔ اب مرزا غریب صاحب کے خلاف کیا کہیں، چپ ہیں، ان کی کتاب روتی۔

مبتہجہ اکبر کی ایجاد نہیں۔ پرانا نام ہے۔ لیکن اکبر نے نئے نام اور اصطلاحات بھی ایجاد کئے ہیں۔ اندر بعض بعض کو اس طرح لکھ گئے ہیں کہ اکبر داسے معنی یاد آجائیں تو اچھے خلمے معقولی لفظ سے سبجہ کی خدمت ہو جاتی ہے۔ مثلاً لیڈر کا لفظ کس قدر عام ہندوئی اور کارآمد ہے، ایسا کہ اس کا کوئی مترادف اس قدر معنی غیر نہیں۔ لیکن اس کو اکبر کے اس شعر میں دیکھئے :-

یوہن کو نہ سمجھے کہ حسین بھی ہے جواں بھی

شاید نرسے لیڈر تھے زلیخا کے میاں بھی

اجن کی جگہ لیڈر کہہ کر کیا لیڈروں کی قلمی کھولی ہے !

حضرت احمق، طبع پوندوی بھی بڑے بڑے کارنظرافت شعرا ہیں۔ لیڈر سے وہ بھی کام لیتے ہیں :-

لیڈر ہے ہر اناس، نلاکت کا ہوں میں جن

مدت سے اپنی قوم کے سر آ جا ہوں میں

دلچسپ بات کہی۔ لیڈروں کے باوجود قوم کی نلاکت دور نہیں ہوتی تو لیڈر کس مرض کی دوا ہیں۔ بلکہ ان کا بار لیڈر ہی اور بھی قوم کی نلاکت کا باعث ہے۔ اکبر کا ایک اور ”لیڈر“ دیکھئے :-

قوم کے علم میں ڈنکھاتے ہیں حکام کے ساتھ

رکچ لیڈر کو بہت ہیں مگر آرام کیساتھ

ایک دیل صاحب نے قومی خدمت اختیار کی تو اکبر نے کہا :-

پہلے بکرا اکے پی کساں

مردوہ پلیڈر سے لیڈر ہونے

جمعۃ الوداع یا عید کی نماز پڑھے کبھی صاحب آجاتے ہیں، وہ صاحب، جن کے لیے اکبر کہتے ہیں :-

رہ گئے نا آشنا۔ احباب غائب ہو گئے

ہم نفس دواک جو بانی تھے وہ صاحب ہو گئے

تو پھر مسجد میں تماشا دیکھئے۔ جتنی، دفاتی جیسے غریب نمازی جو نماز کے اہتمام میں دین گھنٹہ پہلے سے آئے ہوئے بیٹھے ہیں پہلی صف سے اٹھائے جاتے ہیں اور حکام کے لیے جگہ نمائی کرائی جاتی ہے۔ ایسے ہی منظر پر اکبر کہتے ہیں :-

شان نماز اکبر شہانہ ہو چلی ہے

مسجد الگ بنائیں اپنی میاں و فاتی

میاں و فاتی پر کسی کیسی کا عالم طاری ہے۔

فوجی نذیر احمد کی ”مراۃ العروس“ میں مانتا عظمت ایک کیرکڑی گیڑ سے اور ضرب اشل۔ اکبر الدہادی کی بی نصیب بھی ایک کیرکڑی ہیں :-

رہیں ہر چہر کے آیا بی نصیبیں وہ گوا سکولی میں برسوں پٹھاکیں

اکبر نے ناموں سے دلچسپ کام لے ہیں۔ نام جس قوم کے فرد کا ہوتا ہے، اس قوم کی خصوصیات کا رد و ایما ہوتا ہے۔ اس لیے ناموں کو اکبر نے جہاں مناسب سمجھا اسے لیے لکھا ہے، وہاں بھی مکتون میں اس نام اور قوم کے شصا فقیر قوی و شخص کا خیال رکھا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:-

نامی کے آگے تیز کا دلچسپ پاٹ ہے گلو کی جان فرائی کو گنگا کا گھاٹ ہے
ڈوبے ہوئے ہیں یہ بھی گلابی بات میں پیرو بھی ہرے ہیں خیالی فرات میں
اسلام کی رونق کا کیا حال کہیں تم سے کونسل میں بہت سید، مسی میں فقط سہی
رات انوس سے کہتے تھے برہنہ بھائی ہم سے ناسحق ہیں الگ کا فتنہ فی بھائی
دہشت تے میں بھی بس تے ہیں کہتے ہیں مان جاؤ منسا رام
محکم نگارش کا۔ ملک ہندو کا اب خدا ہی ہے بھائی مستو کا

میں نام سے صرف تافیر آرائی مقصود رکھی ہے۔ جیسے:-
تائم بھی بوٹ اور موزا رکھیے دل کو مشتاق مس ڈوسوزا رکھیے
ان باتوں پر معترض نہ ہو گا کوئی پڑھیے جو نماز اور روزہ رکھیے
لیکن دوسری جگہ نام سے کوئی خصوصیت ملحوظ رکھتے ہیں، مثلاً:-

عجب تکنت کو دور کرتا ہے زبیدہ سے
سوا اس کے جو باتیں ہیں نقال پر دہری
”زبیدہ“ کے ہم وزن حمیدہ، حمیرا وغیرہ بھی تھے۔ لیکن ”تکنت“ کے عمل پر ”زبیدہ“ کس تند مزوں ہے۔ زبیدہ خاتون ملک بارون شید
خلفہ عباسی کا نام ضرب الفش ہے۔

اصل ناموں کو بھی علامت بنانے میں اکبر نے لطافت و جدت پیدا کی ہے۔ لکھتے ہیں:-

جھکا سبے سراپا پائے بُتے پر۔ زبان پر ہے گلہ جفا کا

مرے گل میں ہے طرز سید۔ غزل میں اغا زلاجبت ہے

مرسید کی انگریز پرستی اور لالہ لاجپت رستے کی بغاوت پسندی کی طرف کس قدر خوبصورت اشارے ہیں۔

دو اور نام لکھتے ہیں۔ ان میں اگرچہ ”طرز سید“ اور ”اندا زلاجبت“ کی خوبی نہیں مگر دونوں کا فرق خوب ہے۔ لکھتے ہیں:-

ایک، شوکت اور ضیاء الدین وضع دو میں ہیں

فرق اتنا ہی ہے، وہ جھگل میں ہیں۔ یہ تو میں ہیں

مولانا شوکت علی کو تن و توش اور زور و شور کے سبب سے جھگل کا شیر کہا۔ اور ان کے مقابلے میں ڈاکٹر ضیاء الدین کو محاسب خانے کا۔

ڈارون کا نام اکبر نے بڑی کثرت سے استعمال کیا ہے۔ ڈارون کا نظریہ درست ہی سمجھیے، لیکن اس کی گازی کا بندر پر

اکر لکھ جانا اور انسان کا بندر سے رشتہ جوڑنا، ہندوستانیوں کی نظر میں مضحکہ خیز ضرورت تھا جہاں بندر عجیب ذات واقع ہوئے ہیں۔

اکبر کو خلافت کے لیے ایک دلچسپ موضوع ہاتھ آ گیا۔ بڑی اہم افشائیاں کہیں۔ لیکن جہاں اکبر کو صرف محمد بن کے نظریہ ارتقاء پر طنز و استعزاز مقصود ہے اس کوئی دوسرا مفید و دلچسپ پہلو نہیں پیدا ہوتا، مثلاً اس شعر میں :-
 کہا منصور نے خدا ہوں میں ڈاؤن بولے بوز تاجروں میں
 یا اس سے بڑھ کر اس شعر میں :-

نئی تعلیم کو کیا واسطہ ہے آدمیت کے جناب ڈاؤن کو حضرت آدم سے کیا مطلب
 میاں اکبر کا ذہن دگر غلطی کرتا ہے۔ کسی علمی نظریہ و تحقیق سے بغیر دلیل کے اخلاقیات جائز نہیں۔ اور کسی وطن و مملکت کی تازیبا ہے لیکن
 یہی خلافت کا نام ذیل کے شعر میں عجیب کام کر جاتا ہے :-

باغ امید کے پھل ہوتے ہیں روزِ حاشا ہم کو خدا بچائے اولادِ ڈاؤن سے
 اولادِ ڈاؤن یعنی انگریز۔ جس طرح ہندو باغ کے پھل کو حاشا کرتے ہیں اسی طرح انگریز ہماری امیدوں کو تباہ و برباد کرتے ہیں۔ کس قدر
 بیباکی سے انگریز حکومت پر استعزاز کرتے ہیں۔
 یا پھر ذیل کے شعر میں ڈاؤن کا نام پر لطف ہے :-

مغل سپردِ ماسٹر، مالی سپردِ آفتاب جان سپردِ ڈاکٹر، روح سپردِ ڈاؤن
 جب ہر چیز کو کسی نہ کسی کے سپرد کرنا نظر آ تو روح سپردِ ڈاؤن۔
 اسی طرح بعض اور ناموں کو اکبر نے مختلف موضوعوں اور کاموں میں علامت قرار دیا ہے۔ اس میں بھی کہیں بے اعتدالی ہو گئی
 ہے۔ ہر برٹ اسپتھر اور جان استوارٹ مل دو برٹے مشہور مفکر و فلسفی تھے۔ اکبر کے زمانے میں جن یورپین فلاسفوں کی کتابیں کالج
 و یونیورسٹی کی درسیا میں شامل ہوئیں ان میں سب سے مقدم اسپتھر اور مل تھے۔ تعلیم یافتہ لوگوں کی زبانوں پر ان کے نام تھے ساؤڈو
 میں ان کی تصانیف و مقالات کے ترجمے ہوئے۔ اس وجہ سے اکبر کی زبان پر بھی یہی دو نام زیادہ آئے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :-

کتابِ دل فقط کافی ہے اکبر دریں حکمت کو میں اسپتھر سے مستغنی ہوں مجھ سے مل نہیں ملتا
 اس شعر پر کسی افتاد کا یہ اعتراض غلط ہے کہ مگر بحسن تصور پرست ہیں، یا مدح کو مجھے سمجھتے ہیں، یا مدح کو باعنی سمجھنا اور ان سے کام
 لینا اکبر کے قول و عمل دونوں سے ثابت ہے۔ اس شعر میں اسپتھر و مل کے فلسفہ و تفکر و تعلیم اور فلسفہ اخلاق و سیاست سے اکبر کو اٹھل نہیں
 بلکہ اکبر اپنی ایک کیفیت کو بیان کرتے ہیں جس میں فلسفہ کی کتابوں کے علاوہ ایک اور کتاب یعنی کتابِ دل، دس حکمت کے کام آتی ہے۔
 ہندوستان میں اسی بیسویں صدی میں ایسے لوگ باغی گئے ہیں جنھوں نے اسپتھر و مل کی کتابوں کے بعد کتابِ دل کا مطالعہ بھی
 مفید پایا ہے۔ یہ بات سنئے تو لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ لیکن کیا یہ منور ہے کہ سب باغی ہر ایک کی سمجھ میں آتے ہیں۔ بہر حال اوپر
 کے شعر میں اکبر نے اسپتھر و مل کے نام پر مل استعمال کئے ہیں۔ لیکن ذیل کے شعر میں ان کا موقع نہ تھا :-

اسپتھر و مل کے دوق ہیں کس قیامت کے سبب گلِ توپ غلامِ اک طرف۔ بابو کی جرأت اک طرف

مجاہدوں سے مراد جنگی بالو ہے۔ ہندوستان میں تقسیم ہونے کے بعد چھ سال تک جنگالیوں نے سرخ تقسیم کے لیے شورش برپا رکھی۔ اس کی طرف اکبر اشارہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جنگالیوں کی جرأت کا سبب اسپتروہل کی تعلیم تھی۔ لیکن یہ بات غلط ہے۔ ان فلاسفوں کی تعلیم کو بغاوت سے کچھ تعلق نہیں۔ بلکہ کل کا تو دوس ہی یہ ہے کہ سیاست میں زور و شور اور بغاوت کی جگہ نہایت تحمل و قناعت کے ساتھ تفکر و تدبیر کے انقلاب کے لیے راستہ بنانا چاہیے۔ اکبر نے اصل میں اسپتروہل کو مغربی تعلیم کے لیے علامت قرار دیا ہے اور ان کا مفہوم یہ ہے کہ جنگالیوں کی شورش خود گریزوں کی دی ہوئی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ تاہم ان ناموں کا استعمال اس شعر میں بے محل اور نازیبا ہے۔

مشہور تاریخی ناموں سے اکبر نے زیادہ کام نہیں لیا۔ سب سے زیادہ پیلا اور مجنوں سے ان کو دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔ ان کے متعلق بہترین شروع مضمون تو ”مجنوں کا استعفا“ ہے۔ لیکن یہ شعر بھی خوب ہے :-

مجدد میں بھی مغربی تعلیم جاری ہو گئی لیل و مجنون میں آخر فوجداری ہو گئی

مغربی تعلیم کی خرابی کا بیان اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان میں لیل و مجنون جیسے تعلق دارے دوسری۔ پھر بھی مختلف لوگ امن و عافیت سے وہ رہے تھے۔ پیسے مغربی سیاست نے آپس میں فوجداری کرانے کی ضرورت سمجھی اور پھر سیاست بے سیاست خود بخود فوجداری چھنے لگی۔ اس شعر میں اکبر کو مغربی تعلیم کے فوائد سے انکار نہیں، بلکہ اس کے ان عواقب و نتائج کی طرف اشارہ مقصود ہے، جن سے اہل ہند آخر میر کے بھوٹا ہو گئے :-

ہاں سلوک نغانو اٹھائے تھے نرم و گم کا ہے کو تیر کوئی دبلے جب بگول گئی
ناموں کے علاوہ خطا یوں سے بھی اکبر نے ایسا دعلا و علامت کا کام لیا ہے مرزا کی ان بان مشہور بات ہے۔ ”میرزا شناسی“ محاذ ہے۔ اکبر بھی پڑنے کے متعلق کہتے ہیں :-

میرزا باند ادا حق سلطنت کی بات تھی

ذیل کے شعر میں بھی مرزا بطور علامت استعمال ہوا ہے۔

دربار دہلی اک طرف - لوکل مجالس اک طرف

مرزا کا بچم تھم اک طرف - بدھو کی گھس گھس اک طرف

ٹھاکر کے دو معنی ہیں۔ اکبر نے دونوں طرح لکھا ہے۔ کہتے ہیں :-

انہیں کی گھنہیں ہے بھائی گرجن کی لاٹھی ہے انہیں کا گاؤں ہے اکبر جو بن سکیں ٹھاکر

دوسری جگہ کہتے ہیں :-

دیو دیو پر میں نے ڈنڈوت کی بھری تھی مرے دل میں ٹھاکر کی پیٹ

کیا شور چلیوں نے بہر طرف مہاراج کی جے ! گرجی کی جیت

یہ نظر اکبر کی ذہانت و ظرافت اور مہارت کی عجیب و غریب مثال ہے۔ چوتھے مصرعہ میں صنعت ”دھوکیت الصورت“ کا استعمال ہے۔ یعنی چوتھے مصرعہ کے الفاظ (جے - جی - جیت) کو کھینچ کر پڑھنے سے ”دھیل“ کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ اور تیسرے مصرعہ میں بڑی صنعت کے ساتھ اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یعنی جیلوں کا لفظ ”چیلے“ کی جمع اور ”دھیل“ کی جمع دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے۔ گویا چیلے کیا ہیں

چلیں ہیں۔ یہ اکبر کا عجیب سحر اپن ہے۔
 یہاں شاید یہ بات بے عمل نہ سمجھی جائے کہ اکبر جس بے یمنی و گمراہی پرستی کے مخالف تھے اس کی ایک دلچسپ مثال ٹھاکر کی بیوی
 ہوئی صورت ٹیکو رہے۔ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیکو راج محل میں ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹھاکر ہے۔ ٹیکو رابندر ناتھ کی کسی زبان کا لفظ نہیں۔ انگریزی مانا
 لفظ بنایا ہے۔ بنگالی زبان میں ڈاکٹر صاحب کے نام میں ٹھاکر ہی لکھا جاتا ہے۔

ایک اور دلچسپ خطاب دیکھئے:-
 نہ سہی لطف ظم، گمھی ہی سہی شیخ صاحب مہمنت جی ہی سہی

اس مضمون کے لیے لالہ، بیڈنٹ وغیرہ سب سے زیادہ مہنت جی ہی موزوں تھے۔

دو اور خطاب، بڑے مزے سے لکھے ہیں:-

بیکالہ میں کس کو درد و شبان قحط سے بھولانا ہمارا کیا ہے اے بھائی۔ نہ مگر ہیں نہ مولانا
 مسٹر اور مولانا دونوں کو پیسے بیکانے سے عار ہے۔ اس شعر کی تافید آرائی تو اکبر کا خاصہ ہی ہے۔ لیکن تافید آرائی کے شوق کا اعتراف اور
 اس کی ”بے پناہ“ مثال ذیل کے شعر میں دیکھئے:-

موج ہے دل میں مرے تافید پیدائی جا کے لگا پر کہا کرتا ہوں ”بے ماٹی کی!“
 برگڑ کے مولوی کی اکبر نے ایسی ایسی تواریخ کی ہے کہ ان حضرت کا جی ہی جانتا ہو گا۔ معلوم ہوتا ہے اس ”توریم“ کے ساتھ اکبر کو کچھ ”لا“
 ہے۔ بہر حال ایک شعر میں بڑی تلخ بات کہی ہے، یعنی:-

برگڑ کے مولوی کو کیا پوچھتے ہو کیا ہے مغرب کی بالیسی کا مرنی میں ترجمہ ہے
 ”مولوی“ کے لیے لکھا کہ ”مورنی میں ترجمہ ہے“ کس قدر خوبصورت بات ہے۔ اور ظاہر ہے کہ برگڑ کا مولوی مغربی بالیسی کے پروپیگنڈے کا کام دیتا ہے۔
 شیخ تبارک قدیم، عہدہ سال کمنڈ علامت ہے، اس میں لطف پیدا کرنا مشکل ہے جب تک ایسے جاہل مضامین و اسالیب
 نہ ہوں جیسے ان دو تین شعروں میں ہیں:-

باد کرتا ہے گزشتہ با اثر لاجل کو شیخ کو طعنہ دیا کرتا ہے شیطان ان دلوں
 یعنی شیخ میں اگلے لوگوں کا سامان اور تقویٰ نہیں رہا، اس لیے شیخ کے لاجل میں اثر نہیں۔ اب اس سے شیطان نہیں بھاگتا۔
 وہ تو گرجا پر کا اور یہ گیا کسے کو بھانڈ شیخ کا ٹوٹا انجیل سے بھی بڑھ کر نیر ہے
 کہے کہ بھانڈ جانا یعنی کہے سے بے تعلق رہنا یا جسے کی حرمت و خدمت کا خیال نہ رکھنا ثبوت کہ کی ”کعبہ فردنی“ کے واقعات معلوم و مشہور ہیں۔
 شیخ صاحب کی کھلی کئی نہ تعلق کھل جائے لارڈ صاحب کا کہیں سنتر میں اظہار نہ ہو

لارڈ صاحب کی خوشامد میں شیخ صاحب کی ایمان فردنی کا کیا خوب بیان ہے۔

یاد بل کے شعر کی سہی اعلیٰ اور لطیف ظرافت پیدا کی جائے:-

سچ کہتے ہیں شیخ اکبر، ہے طاقت حق لازم ہاں نرک مے دشاہد، یہ ان کی بڑائی ہے
 ”یہ اُن کی بڑائی ہے“، یعنی، یہ ان کا بدترہ ہیں ہے۔ اس شعر کی کا جواب نہیں۔

یا پھر اس طرح کسی واقعہ کی طرہ اشارہ ہو :-
یہ قسمتِ شمعِ نبی کی در نہ کہستہ
کماں وہ بُت کماں اُست بُتِ لاندہ
یہ فرضی شعرِ اُردائی نہیں، اصلی سا شعر ہے۔

سردار خان بہادر کے خطابِ پانڈہ اکبر کی زد سے کیا بچتے۔ ذلتے ہیں :-

ہے زورِ لہو کا اثرِ کیسا جب مغزِ نہیں تو لفظِ سرِ کیا
ایک اور شعر میں اپنی عادت کے مطابق بڑی نغلی رعایتوں سے کام لیا ہے جو بالکل بے لطف ہو جاتی ہیں اگر ان کے ساتھ یہ لطیف نہ ہوتا کہ
اکبر نے کسی کے متعلق سن کر کہ ان کو سر کا خطاب طلب ہے اور اب وہ بالکل درِ انگریز ہو گئے ہیں، بال میں ناچنے بھی لگے ہیں، فی البدیہہ کہنا تھا،
پاکر خطاب ناچ کا بھی ذوق ہو گیا ”سر“ ہو گئے تو ”بال“ ناچا بھی شوق ہو گیا
ایک مجددِ البتہ لطیف انداز سے کہا ہے :-

خدا کے گھر سے اب اکبر کی جو خبر آئے
بیانِ سرِ دوزخِ معنوں میں موزوں ہے۔
خود اکبر کو خانِ بہادر کا خطاب ملا تو کہا :-

شاعرانہ داد اچھی دی یہ مجھ کو جو چرنے
نام رکھنے سے اکبر نے اپنے آپ کو بھی نہیں بخشا۔ کس نے کلفنی سے کہتے ہیں :-
مردِ دلور کو درمنٹ اکبر اگر نہ ہوتا
عورتوں کے خطابات میں بھی اکبر نے بڑی شوخی، جذبت اور معنویت سے کام لیا ہے۔ بیگم، خاتون، بی، بیوی، لیدی، مس،
منائیت موزوں اور بر محلِ استعمال کئے ہیں۔ کہتے ہیں :-

اکبر دے نہیں کسی سلطان کی نوج سے
بیان ”بیگم“ کی جگہ ”بیوی“ بر محلِ نہ تھا۔ ”بیگم“ کی زبان ہے۔ اسی طرح اس شعر کو دیکھئے :-

تعلیمِ دلکین کو ضروری تو ہے مگر خاتونِ خانہ ہوں وہ بھائی کی بی بی نہ ہوں
ایک محاورہ بڑے مزے سے لکھا ہے — ہم تو اسے بی بی؟ میں رسہ، اختیار بی بی ہو گئے۔ اس میں اکبر کی منطقی کاریگری کا رُخ ہے
مگر کس قدر دلچسپ اور دوزخ میں سے مسلمانِ نوجوانوں میں اکثر ایسا ہڈا ہے کہ شادی کے بعد تعلیم ختم ہو گئی ہے۔
اور دیکھئے :-

تعلیم کی غربابی سے ہو گئی بالآخر شوہر پرست بیوی پبلک پرست بیوی
متر کے لفظ کی تو اکبر کے کلام میں گنتی مشکل ہے۔ چونکہ فارسی میں بھی اس ڈانبا کا لفظ ہے اس لیے نغلی رعایتوں کے شوق میں بھی اکبر نے اس
سے کام لیا ہے۔ لیکن ایسے اشارہ میں محض متناہی ہے۔ مثلاً :-

حسرتِ کُشتاقِ بازارِ جہاں میں کچھ نہ پوچھ
زندہ تیا، زردار دمس کی کثرت، سیم گم

سایہ کا ہم کو جنوں، وہ دھوپ میں مصروف کار
 مس پر ہے اپنی نظر اور سیم ان کے ہاتھ میں
 لیکن سجن جگہ ای رعایتوں سے الگ ہو کر بھی خوب لکھا ہے۔ دیکھئے کیا شوخی ہے :-
 شیخ کے دامن کو کلی بوسہ جو اکبر نے دیا
 ہم نے برکت کیلئے اک مس کا سایہ چھو لیا
 اور اس اعلیٰ عظافت کا تو کیا کہنا :-

جو سخن بت کی جگہ حکیم مس ہوا مستانم
 تو عشق چھوڑ کے مہم نے ہی نوکری کر لی

آوارہ گرد اشعار

قاضی عبدالودود

۱) آوارہ گرد اشعار کی ابتدا سال ۱۹۵۱ء سے ہوئی اور اس وقت تک اس کی کئی اور قسطیں مختلف رسائل میں جمع ہو چکی ہیں۔

۲) کچھ نامور کی تخلیق سب دلوا دینے والی، مثالہ کئی شہل میں چھپے گا تو ضروری اٹھانے کے جائیں گے۔

۳) مواد کافی نہ ہو تو اور امور در شمار فیصلہ بھی نہیں کر سکتا کہ کوئی شاعر جس کی طوٹ کوئی خاص شعر منسوب ہوئے

فی الواقع اس کا بھی تھا یا نہیں کہ بیخبر میر ہے۔

۴) ایسے اشعار پر بھی جن میں کیفیت اشعار، ناث ہیں "آوارہ گرد" کا اطلاق ہو رہے لیکن یا تو انہیں کراختلافات کا ذکر کیا جائے۔

۵) اس قسط میں حسب ذیل مختصات مستعمل ہوئے ہیں:

آب = آب حیات ط ۱۹۵۱ء آصفیہ = فرہنگ آصفیہ۔ انجن = انجن ترقی اردو۔ بیاض کو انھد = یہ بیاض

جو نائش ہٹو برکل ریکا روٹس کیش پینڈ فروزی ۱۹۵۲ء میں کو انھد سے آئی نئی ناقص للہرقین ہے اس لئے اس سے اس کے

مؤلف کا حال معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن قرآن اس پر ولایت کرتے ہیں کہ یہ وہی ہے جس کا ذکر صفحہ ۹ میں ہے جس = تذکرہ

شعرا کے اردو از میر حسن ط ۱۔ حجاز = حماد مجاور۔ سوسائٹی = کتب خانہ ایشیاء سوسائٹی بنگال شیفیق = جہنمناں شعرا از میر حسن۔

شورش = کس خطوط آکسفورڈ۔ یہ شورش عظیم آبادی منوئی ۱۹۵۲ء کا تذکرہ شعرا ہے۔ نیت ہے مگر اس میں کی شخص نے شعر کا

کتے ہیں۔ شوق = تذکرہ قدرت اللہ شوقی۔ شیفیقہ = گلشن بے غار از شیفیقہ ط ۱۹۵۱ء۔ صفیر = جلوہ تنہا جلد از صفیر ط ۱۹۵۱ء۔

ط = طبع۔ طبقات = طبقات شعرا کے ہند از مریم الدین۔ طوفان = تذکرہ شعرا از ابن طوفان۔ مزینہ راقم عشقی = تذکرہ

عشقی عظیم آبادی نثر راقم۔ نام = مجموعہ نغز از فاسلم۔ قائم = عزیزی نکات از قائم۔ گرویزی = تذکرہ رچنے گویاں از فخر علی

حبیبی گرویزی۔ گلزار = گلزار ابراہیم نثر م۔ م = کتب خانہ مشرقیہ پینڈ مسرت = تذکرہ مسرت افزا، یہ معاصر پینڈ میں البتہ

میں ہو رہے۔ میر تقی میر حیات اور شاعری = از جناب ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی۔ تسخیر = نثر شعرا از تسخیر۔

نکات = نکات اشعار از میر ط ۲۔ نکت = عزیزی فراد از نکت و لہوی، یہ طبع ہو چکی ہے لیکن اس وقت میں نظر نہیں آتا

کے حوالے سے جو کچھ لکھا گیا ہے وہ غلطہ آردو ۵۰ م سے ماخوذ ہے۔ و = ورق۔ ہندی = تذکرہ ہندی از مصنفی۔
 (۶) لفظ آوارہ گرد، ممکن ہے کہ ایرانیوں کی زبان پر نہ ہو، لیکن محض اس بنا پر اسے غلط قرار دینے سے خارج نہیں کیا جاسکتا۔ بہ ہرزہ گرد کی طرح ہے جو ایران میں مستعمل ہے۔ "آوارہ گرد" ہندوستان میں صوبوں سے رائج ہے۔ اتاریخ آراوٹھان واضح منوفی ص ۱۳۸ م: "آوارہ گرد و نژاد اعظم شاہ آمد" ۶۶ و ۲۔ سفر نامہ اندرام غلص منوفی ص ۱۶۲ م: "آوارہ گردان کوہ" ۸۵۔ ۳۔ بہار بے خزاں، مصنفہ آواسطافہ سیزویم، بقول ارد "میر" از آوارہ گرد و بہار آرمیدہ ص ۵۹۱ م۔ کلیات میر اشاعت آسی، پھر نار باہوں گلیوں میں آوارہ گرد سا "ص ۵۵" آوارہ گردی: ایپی کچھ میر دلوں پر "ص ۲۹" آوارہ گرد بادہہ اتلاہوں میں "ص ۵۵"۔ آپ بقا از خواجہ عشرت کھنوی: "آوارہ گردی" ص ۹ و ۶۔ اندر سجا امانت "از حسرت مولیٰ منقول از نگار و سبیر ۱۹۵۳ م: "سبیر ہی آوارہ گرد ہو جاتی ہے" ص ۴۲۔ ۷۔ حاشیہ کلام انشا از مرزا محمد عسکری کھنوی: "آوارہ گرد و گورت" ص ۳۴۔ ۸۔ خیام مصنفہ سید سلیمان ندوی: "آوارہ گرد و باغیوں" ص ۲۵۔
 (۷) ان اصحاب کا تذکرہ اول سے شکر یہ ادا کیا جاتا ہے جن سے اس مقالے کی تحریر میں مدد ملی ہے۔ ان کے نام اپنی اپنی جگہ پر ملیں گے۔

- (۱) کچھ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے
 خضر کیا جاں غریب لگے زمانے ملے
 صبا، شاگرد آتش کا شمع رہے ردیوان طرۃ ۱۹۶۸ م: "لیکن آصفیہ ۴ ص ۶۳ میں بنام میر۔
- (۲) میں اور بزم سے یوں شہ کلام آؤں
 گر میں نے کی تھی تو بے سانی کو کیا ہوتا تھا
 غالب کا طبع زاد ہے ردیوان مطن نظامی کا پتہ ص ۱۳۱ م: "لیکن آصفیہ ۱ ص ۱۳۱ میں میر کے نام سے ہے۔
- (۳) گرم محمد سوختہ کے پاس سے جانا کیا تھا
 آگ لینے مگر آئے تھے یہ آنا کیا تھا
 تیر کا مطلع ہے کلیات ص ۱۲۵ عشقی، لیکن آصفیہ ۴ ص ۱۲۱ میں ورد سے منسوب ہے۔
- (۴) یہ جو چشم پر آب ہیں دونوں
 ایک خانہ خراب ہیں دونوں
 انتخاب دیوان تیر کو لفظ جناب ڈاکٹر عبدالحی ص ۶۳ میں مطلع شامل ہے اور باوجود اس کے کہ کلیات سے غیر حاضر ہے، مقدور کلیات نوشتہ آسی مرحوم میں تیر کے نام سے ص ۴۲ "میر" میں ان اصحاب کی تقلید لگتی ہے ص ۳۶، اور جناب عطا کیا ہیں ہے کہ "کمتر لوگ" اسے تیر کی ملک سمجھتے ہیں، لنگا جولائی ۱۳۵۸ م: "یہ درست ہو یا نہ ہو، ان کا یہ قول ضرور صحیح ہے کہ یہ مطلع طبقات میں بالکل اندر حضور شاگرد ورد کے نام سے ہے اس پر یہ اضافہ کیا جاسکتا ہے کہ اشاعت طبقات سے کم و بیش ۱۲ سال قبل شیعینہ (ص ۱۳۱) اور ان سے بھی بہت پہلے ناسم (ص ۲۱) اسے حضور کی طرف منسوب کر چکے ہیں کوئی لے جناب شاہ عطا الرحمنی عطا کا گوئی نے بھی ایک مقالہ آوارہ گرد و اشعار کے عنوان سے لکھا ہے۔ اس کی ۶ صفحات نگار ۱۹۵۲ میں (اردو) تا دسمبر شائع ہوئی ہیں۔ سہ طبقات ص ۲۴۲۔ سہ حضور و مجموعہ نغمہ کے اختتام ۱۳۵۲ سے قبل ہی مرچکے تھے مگر مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم کے مشاوعہ کریم الدین میں شریک ہیں۔

قدیم شہادت اس امر کی کہ میر کی تصنیف ہے، یہ علم میں نہیں۔
 (د) ”فغانِ دہلی“ ایک مجموعہ اشعار ہے جو تفضیل حسین کوکت نے ۱۹۳۲ء میں شائع کیا تھا۔ اس میں بہت سارے
 بعض وہ نظمیں ہیں جو شورشِ شہر سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھیں۔ اردو کی مشہور غزل جو بحذف ۵ اشعار درج ذیل ہے جہاں
 ”مک میرا علم ہے پہلے پہل اسی مجموعہ کی وساطت سے منظرِ عام پر آئی تھی۔ ”فغانِ دہلی“ میں یہ ”حسامی“ کی طرف منسوب ہے۔
 کئی ایک ایک جو جو اپنی نہیں لکھ میرے قرار ہے
 ساری دہائیے ہند تباہ ہوئی کون کیا کیا ان چٹا پڑی
 دے شہر دہلی یہ بھٹا چن کہ سب طرح کا بہانہ تھا ان
 شہر دوزخوں میں جو تعلق کوئی نام نہ نہ ہے چھ گھنٹیں
 جو سولہ گز تھے اوسے اب ہیں دیکھو کس طور سے
 یہ بال تین پر سے سزا نہیں جان جانے کا ڈر ورا
 یہاں نگہ مال جو سب کے یہ کر کرتہ قدرت سب کے
 یہ تم کسی نے جتنی سنا کہ دی بھانسی لاکھوں کرے گناہ
 نہ تو دشمنائی ہے بغیر میں نہیں اپنا یاں کوئی دہر میں
 کیا حسامی ڈر تجھے حشر کا جو خدا رکھے تجھے بر ملا
 تجھے ہے وسیلہ رسول کا کہ ترا وہ حامی کا رہے صلہ

یہ اشعار جو مختلف الانواع اس مقام سے ملو ہیں محسن ”فغانِ دہلی“ ۱۳۳۲ھ سے نقل کئے گئے ہیں۔ ۱۳۳۲ھ
 کے بہت بعد بہارِ گلشن نامی ایک مجموعہ اشعار غالب لکھنؤ کے کسی مطبع نے چھاپ کر شائع کیا تھا۔ یہ اس وقت پیش نظر نہیں
 لیکن مجھے اسی طرح یاد ہے کہ اس میں اس غزل کے کچھ اشعار ظفر کے نام سے درج ہوئے تھے اور مطلع میں ”حسامی“ کی
 جگہ ”ظفر“ تھا۔ میرا خیال ہے کہ متن اشعار میں اور بھی اختلافات تھے۔ لیکن یہ یاد نہیں کہ اس میں کوئی ایسا شعر بھی تھا یا
 نہیں جو ”فغانِ دہلی“ میں موجود نہیں تھا۔ ۲ اشعارتہ بذریعہ اس میں برتقلید فغانِ دہلی اس غزل کے اشعار حسامی
 کے نام سے منقول ہوئے ص ۱۱، لیکن ”بہارِ گلشن ظفر“ مصنف امیر احمد علوی مرحوم میں اس زمین کے ۱۱ اشعار شائع ہیں
 جن میں سے ایک ہے

سبھی سادہ قائم سخت ہے کہوں کہی گردشِ بخت ہے
 نہ وہ تاج ہے نہ وہ تخت ہے نہ وہ شاہ ہے نہ وہ دیا ہے

”فغانِ دہلی“ سے بغیر حاضر ہے اور نہ معلوم کہاں سے لیا گیا ہے۔ باقی ۹ اشعار فغانِ دہلی میں ہیں لیکن دونوں کا متن بہت

مختلف ہے۔ کتاب مذکور میں اشعار زیر بحث کے متعلق لکھا ہے: ”اس دور و دنیا بیت (۱۵۷) کی یادگار ایک نظم ہے جس کی اوائل شائستگی تصنیف بناتے ہیں مگر اس تمام کلام پر نظر کے بعض مکتے اس کو عامی شخص ایک غیر معروف شاعر کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اس وار و گریہ میں الفاظ کی نکست پر غور کرنے کا کس کو موقع تھا؟ دل کے جذبات زبان پر بے ساختہ آئے اور اب تک درد مندوں کی زبان پر ہیں“ ص ۱۱۱۔ ”حامی“ غالباً ”حسامی“ کا مصحف ہے اور میں نے کہیں اور یہ اشعار ”حامی“ کے نام سے نہیں دیکھے۔ جہاں تک عظیم آبادی نے ”منزل اور اردو ص ۱۶ میں اس غزل کے ۳ شعر ”فغانِ دہلی“ میں ہیں پیش کئے ہیں اور وہ انھیں فخر کی ملک قرار دیتے ہیں، اس کتاب میں قطع کا مصرع اس طرح ہے۔

”خجے خوف حشر ہے کیا فخر تو خدا کے فضل پر رکھ نظر“

تھانہ ۵ سربراہ کی وفات کے بعد پنڈت کبھی مرحوم نے شائع کیا تھا۔ اس کے ص ۴۴ میں ”فغانِ دہلی“ کے ۳ شعر بحوالہ دیوانِ فخر مند درج ہیں مگر یہ اشعار دیوان میں نہیں اور تھانہ ۵ میں ان کا شمول غالباً پنڈت صاحب کا فعل ہے۔ میری رائے میں کوئی قابل قبول شہادت اس کی موجود نہیں کہ یہ اشعار فخر کے ہیں۔ سبھی جا... ۱۸۔ ”تو نہ معلوم کس کا ہے باقی حسامی کے ہیں۔

(۶) مضامین فحش حصہ ۴۔ ”قدر کے کئی برس بعد دلی میں ایک مشاعرہ ہوا تھا اس میں کوئی طرح نہیں دی گئی تھی۔ میں بھی خاکہ دلی کا مرثیہ کو۔ یہ کل کلام ایک کتاب کی شکل میں چھپا ہے۔ اس مشاعرے میں آرزو بھی شریک تھے۔ انھوں نے دلی کی تباہی پر خدا کا شکر ادا کیا ہے۔

ہوا اچھا جو مشا نام و نشان دہلی

کس کی پاپوش بنے مرثیہ خوانِ دہلی “ ص ۱۵۲

تھانہ ۴۔ ”رحیم حسین علی خان شادواں۔ ”فغانِ دہلی کی تقریر کے وقت بھی ان کی عمر تیرہ و دو برس کی ہوگی کہ مندر شعر کے شدید نقص سے عاجز آکر انھوں نے دلی کا مرثیہ کیا جس کا ایک شعر یہ ہے۔

مٹ گیا خوب ہوا نام و نشان دہلی

میری پاپوش بنے مرثیہ خوانِ دہلی “ ص ۲۸

مرزا فحش لکھنؤ ایک مرحوم نے جس کتاب کی طرف اشارہ کیا ہے وہ ”فغانِ دہلی“ کے ہوا اور کوئی نہیں ہو سکتی مگر اس میں شاعر کے کا ذکر نہیں۔ شعر زیر بحث کی زمیں میں تیس سے زیادہ شعر کے اشعار ملتے ہیں، جو اس پر دلالت کرتا ہے کہ مشاعرہ ہوا ہوا یا نہ ہوا، اس طرح ضرور تھی۔ فغانِ دہلی میں آرزو کا ایک ممدس ہے جس کا آخری بند یہ ہے۔

دور و حشر تجھے صحرای کی طرف لاتی ہے سر ہے اور جوش جنوں سنگم اور بھجائی ہے

لکھوٹے ہوتا ہے جگر بھی پہ بن آتی ہے مصطفیٰ فغان کی ملاقات جو یاد آتی ہے

کیونکر آرزو نہ مل جائے نہ سوداوی جو قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو ص ۱۲

ظہور علی ظہور دہلی (مثنوی سلاسل) شاگردِ ذوق وغیرہ کے دیوانِ طبع (اس وقت تقریر یا یادداشت پیش نظر)

وہاں بیٹھیں ہوئی تھی ان کی کھبینگی

(۱۸) زندگی زندہ ولی کا ہے نام
مردہ ولی خاک جیا کرتے ہیں

ناسخ کا شعر ہے (علیات مطبع مولائی ص ۱۹۸) مگر اس صفحہ ۲ ص ۱۴۴ میں بنام فوق۔

(۱۹) وہ سعی وہ دلیورنی کی محبت محمودہ کی وہ آدمیت

فلزائیم مصنفہ پنڈت دیا شکر نسیم لکھنوی (اشاعت یکمست ۲۹) کا شعر ہے لیکن آصفیہ استدین نامہ نسیم لکھنوی (اصغر علی خاں)

کرتی تھی جو بھوک پیاس بس میں پانی پیتی تھی کھا کے قمیص

گلزارِ نسیم کا شعر ہے ص ۲۹ مگر آصفیہ ص ۱۵۹ میں بنام حسن ۔

(۱۱) تو مجھے بھولی گیا ہو تو پتا بلا دوں
کبھی فتراک میں تیری کوئی نغمہ بھی تھا

غالب کا شعر ہے (دیوان ص ۱۵) لیکن تصنیف ۳ ص ۲۵ میں بنام مصحفی ۔

(۱۲) رونے ہے نقشِ پا کی طرح غلط یاں مجھے
اے عمرِ رفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے

درد کا مطلع ہے ردیوان مطہر محمدی لکھنؤ ۱۳۱۱، حسن متا، قائم متا، مگر اٹھ فیصد صحت میں بنام ارشد

(۱۳) شکوہ تو کیوں کر ہے میرے اشکِ سُرخ کا
تیری کب آستیں مے لوہے سے بھر گئی

فغان کا شعر ہے جو دیوانِ مطہرہ کے علاوہ ان مخطوطات و دیوان میں بھی ہے جو میرے پاس ہیں۔ تذکرے بھی اسی کے مؤید

میں کہ دفائن کا زاریہ مبلغ ہے (۵۵ روکات ۱۳۳۰، سن ۱۲۳۰، مگر ویزی مسئلہ وغیرہ لیکن ذواللغات ہم صاحب میں اسے سودا کا نتیجہ فکر کردیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ کلیات سودا اصل میں بی شعر ہو جاسکے، لیکن صاحب ذواللغات کی نظر اس پر نہیں پڑی کہ سودا کے لئے نظمیں کیجئے۔ وہ قطعہ جس کے آخر میں یہ شعر آتا ہے سودا کی ایک غزل کا جزو ہے اور قطعے کا پہلا شعر یہ ہے۔

سورہ فاعل کو خط یہ لکھا اس کے بارے

جس وقت اس کے حال کی اس کو خبر ہو گئی ص ۱۸۹

اس تضمین کا ذکر نکات و حسن میں بھی ہے۔

۱۴) محبتِ گل ہے فقط بیل سے کیا بگڑی ہوئی
ان دنوں سائے چمن کی ہے ہوا بگڑی ہوئی

ظفر کا مطلع ہے دہلیات ط ۸۸۶ ص ۳۳۲ مگر نور اللغات ۴ ص ۲۱۱ میں بنام جلال۔

۱۵) مرچا شاہ اے رحمت خدا کی آفریں

انشاء کا شرحہ، کلام انشاء، گلشن ہند ص ۱۲، لیکن اسمعیلیہ ص ۱۹ میں بنام نظیر لطف دیکھ کہ ۱۶۴۲ء میں انشاء کے نام سے بھی ہے۔

۱۶) تجھ کو میں لطف ہے سو ملک کو خبر نہیں خورشید کیا ہے اس کے فلک کو خبر نہیں

نخبر کا مطلع سے زکات ۱۵۰، گورنری ص ۲، شنیق ص ۵۴، حسن ص ۶۵، شنیفہ ص ۴۱، لیکن اب ۲۳ میں بنا
سودا صاحب آصفیہ جو آزاد کو خضر راہ تحقیق سمجھتے ہیں، اس اعتراف کے باوجود کہ شمس الیاباں بطیش اور بیگمیر کے لغت
میں خبر کے نام سے ہے، آزاد کے قریب میں سے سودا کا طبع راونا بنا ہے اور لڑتے ہیں کہ شاید کلیات میں نکلے (۳ ص ۲۵۳)
کلیات ہیں اس زمین کا ایک شعر موجود نہیں۔

(۱۴) از زلف سیاہ تو بدول دھوم پڑی ہے آئینے کے گلشن میں گنسا محبوم پڑی ہے
اس زلف سیر نام کی کیا دھوم پڑی ہے آئینے کے گلشن میں گنسا محبوم پڑی ہے

”از زلف... الخ“ اب ص ۶۰ میں حرفِ فطرت کے نام سے ہے اور اس زلف... الخ ص ۲۳ میں آزاد کے
دوسرے اشعار کے ساتھ مندرج ہے لیکن حاشیہ میں مرقوم ہے کہ انشائیہ دریا کے لطافت میں از زلف... الخ اور مقابلاش
آئینہ کے منسوب ہے، اس زلف... الخ کی نسبت حاشیہ میں لکھا ہے کہ تذکرہ سودا میں اس طرح آزاد کے نام سے ہے
لا، آزاد نے تذکرہ سودا کا اس طرح حوالہ دیا ہے کہ گویا ان کی نظر سے گزرا ہے، لیکن اب ۱۵۲ میں اسے
”نایاب“ بتاتے ہیں جو اس موقع پر ناہما ”ناپید“ کے معنی میں متعلیٰ ہوا ہے حقیقت یہ ہے کہ آزاد کا ناخدا اصلی تذکرہ قاسم
جس میں شعر کی دونوں شکلیں درج ہیں اور شکل ۲ کے متعلق لکھا ہے: ”واللہ اعلم بحقیقۃ الحال کہ...“ ہمیں طور بلوہ یا مریزا
(سودا) نصرت فود (۱۵۵) قاسم پہلے کسی نے اس تذکرے کا ذکر نہیں کیا اور اس صورت میں کہ قاسم حسن تلامذہ سودا
کے تذکرہ میں اس کی طرف اشارہ نہیں صرف قاسم کی شہادت پر اس کے وجود خارجی کا قائل ہونا ناممکن نہیں۔ (ب) شعر
کی صحیح شکل وہی ہے جس میں نا نسبت زیادہ ہے (ج) دریائے لطافت راخن ص ۲۵۵ دو دیگر نسخ میں آئینہ نہیں، فطرت کے نام
سے ہے (د) آزاد کی عبارت میں لفظ ”بعض“ گمراہ کن ہے۔ سچ یہ ہے کہ تذکرہ قاسم سے قطع نظر، کوئی تذکرہ ایسا نہیں جس
میں یہ شعر سودا فطرت کے نام سے نہ ہو زکات ص ۱۵۰ قاسم ص ۱۶۱ — (۵) آزاد کا اس شعر کے کچھ متعلیٰ نہیں،
ہر نا تو میر سے فطرت کی طرف منسوب نہ کرتے۔

(۱۵) میں عجب یہ رسم دیکھی مجھے روزِ عید قرباں وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اٹا
یہ عجیب ماجرا ہے کہ بروزِ عید قرباں وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اٹا

شعر اب ۲۳۲ میں نام متعلیٰ اور برتدیل بعض الفاظ صغی کے دیوان ۳ (نغمہ دو دیگر نسخ میں موجود ہے۔
شعر ۲۰۲ اب ۱۵۰ میں انشائیہ کے نام سے ہے اور کلیات انشایہ وہی ہیں یہ ہے مگر محشی کلام انشائیہ کا بیان ہے کہ خطی نسخے اس
سے خالی ہیں ص ۱ کلیات کے مسموعی نسخوں را یک نسخہ ملکہ کہ جناب ڈاکٹر عبدلیہ شادانی ۲۰ میں ہیں) اور دیوان (نغمہ) میں

۱۔ شاعر کا نام ہی نے تذکرہ سودا کا حسین آباد میں چرنا لکھا ہے۔ لیکن دہلی بھی تھا نہ اب ہے۔ وہ اصحابِ بوجیاتِ فریاد و شہسازِ باندہ
وغیرہ کو کچھ بچے ہیں وہ جانتے ہیں کہ شاعر کیسے وادی ہیں۔
۲۔ یہ سزا آزاد کے والد کے مطلع میں چھپا تھا۔

جو اس وقت پیش نظر ہیں، یہ شعرو جو وہ نہیں۔ قریب ہے کہ نسخہ مطبوعہ میں غلطی سے داخل ہو گیا ہے۔

(۱۹) بگولے کا کبھی صد کہی صحر کی رحمت ہے ہماری خاک یوں اڑتی پھرے لئے بر رحمت

شہادت شاگرد فدوی کا مطلع ہے دگر از خوشنوی، لیکن انشاء نورتن، ہضفہ مجور، شاگرد و جرات مطلع جمیدی کا یہ حوالہ میں برسیا کے نام سے ہے۔ آوازوں آتب صلا میں لے سودا کی عرف منسوب کیا ہے۔ لیکن آتب صلا اور دیوان ذوق مسئلہ میں ذوق کی ذیالی اسے تیر کا طبع راؤ کا لکھا ہے۔

(۲۰) کھل کے گل کچھ تو بہا را بتی صبا دکھلا گئے حسرت ان نغموں پہ جوں کھنکھے مرعبائے

ذوق کا مطلع ہے، اس کی اصلی شکل یہی ہے (انشاعت و دیوان و غیرہ ص ۳۹، انشاء آتب آواز ص ۳۸) لیکن جناب کلیم الدین نے یہ تبدیل بعض الفاظ غائب کے نام سے کھلا ہے (معا ص ۳۵)

(۲۱) یا ننگ نہ کرنا صبح ناواں مجھے آنا یا چل کے دکھا دے دین الہیا کر الہیا

آصفیہ ص ۳۳ میں بنام آرزوہ مندرج ہے اور مقدمہ کلیات مسرت و شہدۃ نوشتہ نظامی دہلوی میں حرم میں کسی سند کے بغیر مرقوم ہے کہ آرزوہ کی اس غزل کا شعر ہے برا غموں نے مسئلہ کے ایک شاعر نے پڑھی تھی جسے شیف نے منعقد کیا تھا ص ۳۳۔ جناب نظامی دہلوی کی بعض تذکروں میں آرزوہ کے نام سے ہے لیکن کسی تذکرے کا نام نہیں آتا اور بتا عرش مسلمان کے ایک ریڈیائی فخر کے حوالے پر لکھا کرتے ہیں (نشا واکثر ص ۳۳) کوئی ایسا تذکرہ جناب نظامی کا متذکرہ ہو مگر علم میں نہیں، اور قریب باغیبن ہے کہ جناب مسرت کا مقدمہ دیوان ہے۔ جناب نظامی نے اس پر اٹھا جہرت کیا ہے کہ یہ شعر طبقات میں آتاب رستے تاب کشمیری کی طرف منسوب ہے لیکن یہ صرف طبقات ص ۴۲ ہی میں اس کے نام سے نہیں، کریم الدین سے برسوں پہلے شیف نے اسے تاب کی تصنیف قرار دے چکے ہیں ص ۳۹ مشاعرہ ص ۸۴ میں اس شعر کا پڑھا جانا یاد کرنے کی بات نہیں، شیف نے تذکرہ جس پر آرزوہ کی تقریظ ہے کہ از کم دیوان اس سے پیشتر معرض میں آچکا تھا۔

(۲۲) مخمنا دم ترجمہ سہا، داماد صبا کھنوی، اگست ص ۱۹ کے گلیں میں جو غزل ان کے نام سے ہے اس کے بعض شعرا یوسف علی خاں ناظم کے ہیں مثلاً

خون ہوتے ہوئے دیکھا کبھی جلتے دیکھا ولی کہ ہر بار زب رنگ بدلتے دیکھا

اسی طرح دوسرا شعر بھی یہ تبدیل الفاظ انہی کا ہے۔

زادہ کو شیخ و برہمن مرے ہم مشرب ہیں دیرمیں نہ سے کس کس کو نکلتے دیکھا

ناظم کا مصرع یوں ہے: "زادہ کو شیخ سبھی خوب ہیں کیا بلالوں" اسی طرح ناظم کا یہ مشہور شعر ہے

ہے یہ ساتی کی کرامت کہ نہیں جاکم پاؤں اور پھر نرم ہیں سب نے اسے چلتے دیکھا

بے تکلف اپنی غزل میں داخل کیا ہے۔ شاعری کی کائنات یہ اور استادی کا دعویٰ! ص ۳۹ دیوان ناظم ص ۳۳ صاحب مخمنا کے قول کی تصدیق مرقی ہے۔ سہا صاحب دیوان فتنے مگر اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ خبر نہیں اس کا اصل نسخہ موجود ہے یا نہیں اور ہے تو یہ اشعار اس میں ہیں یا نہیں۔

(۲۳) از کشتن ضعفم نگسلد و آن وقت
 این که من نہ نے میرم نہ زنا تو انہماست
 غالب کا شعر ہے (کلیات فارسی ص ۳۹۹) لیکن مخاندہ ص ۲۶۶ میں ہے کہ بدلتنی رفتہ دہلوی نے یہ شعر اپنی وفات کے
 چند منٹ پیشتر کہا تھا۔

(۲۴) سر منظرہ نظر چھرا ہے چشم یار کو
 نیگوں گند انجھ یا مردم بہار کو
 کلیات انکس مبلوہ مطلع محمدی، صفحہ نصف ص ۱۴۷ میں موجود ہے لیکن شیعہ نے ایک گرام شاعر محمد امین معنی کی طرف
 منسوب کیلئے ص ۱۸۰ اور تحت و ۲۰۷ ص ۱۴۷ میں یہ تبدیلی بعض الفاظ سیماں شکوہ کے نام سے ہے مگر والد کو
 کا دیوان ہے، لیکن مجھے اب تک اس کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

(۲۵) تھوڑی سی نیک و بد کی گردنیر کے
 کا فر ہو پھر حودلی کو اس سے عزیز کے
 محمد رضا شکوہ کا مطلع ہے (دہلوی ص ۱۳۷) تاہم ص ۱۳۷ میں میرضیہ کے نام سے ہے۔

(۲۶) اب اور لگا ہونے ایجا بگلستاں میں
 رازوں کو لگا دھنے صبا بگلستاں میں
 شیعہ ص ۸۵ و سن ۱۴۰ و مخاندہ ص ۳۳ میں نام راسخ عظیم آبادی، لیکن ان کے دیوان کی کسی نسخہ میں
 نہیں اور انتخاب دیوان تھا شاگرد مصطفیٰ (مؤلفہ حسرت مولائی) میں یہ تبدیلی بعض الفاظ موجود ہے بلکہ اس میں اس زمین کے
 اور شمار بھی اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ تھا کائنات فکر ہے۔

(۲۷) دشمن در پردہ کی لے ملے نہ نے کیا کیا
 شیعہ ص ۵۵ و سن ۱۴۰ و مخاندہ ص ۳۳ میں نام راسخ عظیم آبادی، لیکن دیوان راسخ کے کل نمونے سے جو میری نظر سے
 گزرے ہیں غیر حاضر ہے اور یہ تبدیلی بعض الفاظ عشقی نے مراد بخش مراد و شاگرد راسخ کے نام سے کھلے ہے۔ یہی ص ۱۰۰ ہے۔

(۲۸) ہوئے ہم بیک بنے برہن سے وہ کتنے ہیں
 عزم کے ہنسنے والوں سے عشق اللہ کرتے ہیں
 تاہم ص ۱۴۱ میں نام حرات، لیکن محکمہ جین ص ۱۴۱ حقیقت، شاگرد حرات و ط ۲۶ ص ۱۴۱ میں حسرت اسناد حرات
 کے نام سے ہے۔ برکت نے پوری غزل شبنم مطلع کی نقضین کی ہے (کلیات ص ۳۸۹) منقطع حسرت کی نقضین یہ ہے:
 نہ پہنچے براہوس تو عاشقوں کی گرد کوہ گرگز
 نہیں بنے وہ حرات ان کی آہ سر کوہ گرگز
 بھلاؤں گا نہ میں اسناد کی اس خود کوہ گرگز
 سخن آرد و کا حسرت نہ پہنچے درو کوہ گرگز
 کہ اس پر آئے نکلے ہے اور اس پر وہ کہتے ہیں

مجھے یاد تھا کہ یہ غزل دیوان حسرت نسخہ کتب خانہ رضا کیہ دامپور میں موجود ہے، جناب مابد رضا، بیدارنے اس
 کی تصویر کر دی۔

(۲۹) حضرات اپنے عاشق کی نہیں مشق کی بھاتی
 بیاں سنی اپنی رسوائی میں نہ مقرر ورت کچھو
 کہ تھا سارباں کے کان میں پیلے نے ہنسنہ
 کہ مجبوری کی خرابی کا کہیں نہ کوہ دست کچھو
 جہاں سخن ۲ مؤلفہ جناب کینی چر یا کوئی میں شعر ۲ بیاں کے نام سے ہے، لیکن جن ص ۹۷ میں بدرا نسائیکم، دختر

قرادین خاں، وزیر محمد شاہ کی طرف منسوب ہے۔ میں نے جناب ڈاکٹر عبدالستار صدیقی سے اس کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ دیوان بیان کا جو نسخہ ان کے پاس ہے اس میں دولوں شعر آخر غزل میں یکے بعد دیگرے موجود ہیں۔ اس کا امکان ہے کہ بیان نے تصنیف کی ہوا اور شعر غزل اوراق بدراقتا یکجہ کا جو۔ واضح ہے کہ موبغرا الذکر کے مشابہ ہونے کا مدار صرف حسن کے بیان پر ہے اور کہا تھا۔۔۔ الخ ” کے علاوہ کوئی اور شعر ان کے نام سے نظر نہیں آیا۔

(۳۰) ہم کھیں نہ بھیندیں گی تری بے وفا مجھے ان کھڑکیوں سے تھا نہ تہی بی فضل مجھے
ریاض خیر آبادی نے لکھا ہے کہ صحیح جو باطلط ” میں نے شعر شمس و شمس گدا و آواز کے نام سے سنا ہے۔ ریاض خیر
نکاح ۳۲، لیکن دیوان بحر، شاگرد و شاخ حسنی بد ریاض البحر مطبوعہ ۱۳۵۸ء میں موجود ہے ۳۵ اور ریاض کے استاد
امیر مینا نے بھی یہ شعر بحر ہی کی طرف منسوب کیا ہے (انتخاب یا و کار ۵۶)۔

(۳۱) تو زبنت زاد نے کیدیں مسجد پر تنگ نہ کیا تب تو اک صورت بھی تھی ایسا ہی پر کیا
حسن ۵۶، و کلا و مسرت ۳۳ میں بنام میرا علی خاں مہر ولایت اللہ لیکن کلیات سید محمد خاں، رند کے
اس نسخے میں جو مصنف کی زندگی میں ۱۲۶۲ء میں طبع ہوا تھا، نقل میں موجود ہے :
تو زبنت مسیری مسما زبنت خانہ ہوا

جب تو اک صورت بھی تھی ایسا ہی پرانہ تمرا ۱۴۲

رند نے اپنی غزل میں جو دیوان اول کے بعد ہے، اعتراف کیا ہے کہ میں نے اوّل میں میر تقی میر خاں مہر حسن سے
اصلاح لی تھی اور مذکورہ حسن عجب نہیں کہ ان کی نظر سے گزرا ہو یکجہ است کے متغیر ہوا کلا و نسیم میں یہ حکایت درج ہے کہ
ناصح نے ایک مشاعرے میں نسیم لکھنوی کو مخاطب کر کے یہ مصرع پیش کیے ” مسجد بنا مسما زبنت خانہ کیا “ پڑھا اور بولے کہ
وہ میرا مصرع نہیں سوچتا کہ شعر مکمل ہو جائے۔ ناصح کی زبان سے یہ مصرع نکلا ہی تھا کہ نسیم نے یہ مصرع نکال دیا۔ تب تو اک
صورت بھی تھی اب معاف و براند کب، حاضرین پھر ک اسٹھے۔ ناصح نے مذہبی چوٹ کی تھی، نسیم نے غصہ اکر دیا، ۳۵
کلا و نسیم مرتبہ یکجہ است کی اشاعت کے کچھ ہی بعد ریاض خیر آبادی نے لکھا تھا کہ (د) یہ حکایت مصنوعی ہے، کہیں اور نہیں
ملتی، اب ناصح و نسیم کے مرتبے میں بڑا فرق تھا۔ ناصح انھیں قابل خطاب نہ سمجھتے ہوں گے (ج) ناصح ایسے غیر مرتب
نہ تھے کہ ایک ہندو اور پیچڑ محبوب ہندو (۹) کو مخاطب کر کے ایسا دل شکن مصرع پڑھتے۔ (د) نسیم لاکھ حاضر جواب
سہی مگر ناصح کے سامنے ان کی زبان نہ کھتی (ریاض نمبر ۳۵) یکجہ است نے نہ پہلے یہ بتایا تھا کہ یہ حکایت انھیں
کہاں سے ملی اور نہ جہاں تک میرا علی خاں نے انھوں نے ریاض کے اعتراض کے بعد اپنے ناخدا سے منسل کسی قسم کی اطلاع
دینے کی ضرورت محسوس کی۔ ریاض کا خیالی ہے کہ وہ خود مختار ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے کسی سے سنی ہوگی نسیم
سے جو غلو تھا اس نے اس پر غور کرنے کا موقع نہ دیا کہ کتنی دو را ز قیاس ہے۔ اعلیٰ علی نے جس زمانے میں یہ شعر کہا تھا، نسیم
کیا ان کے آستانہ آتش بھی اس وقت پیدا نہ ہوئے ہوں گے۔

(۳۲) حسرت لے تازہ اسیران قفس آتی ہے دھرم سے فصل بہار کب برس آتی ہے

نے اپنی انگریزی کتاب "چار سربز اور وہ شاعرات ایران" میں بحوالہ تذکرۃ الخوائین اسے چند راہ لقا، حیدر آبادی سے منسوب کیا ہے ص ۵۱۔ فیصلہ کی بات ممکن ہے کہ تذکرۃ الخوائین کا ماخذ معلوم ہونے کے بعد کی جاسکے۔

(۳۹) جو کوئی کہ آفت نہانی مانگے اور ملک عدم کی کچھ نشانی مانگے
دکھلائے اسے تو اپنی یہ تیغ نکاہ جس کا مارا کبھی نہ پانی مانگے
ہندی ص ۲۱۲ قاسم ۲۹۹ میں بنام مزعلی لطف، لیکن گلزار عشقی میں بہ تبدیلی بعض الفاظ اولیامرادی کے

نام سے ہے۔
(۴۰) خدا کسی کو گرفت از زلف کا نہ کرے نصیب میں کسی کا فر کے یہ بلانہ کرے
سفر کمر رائے بنیاب کا مطلع ہے (قاسم ص ۶۷، حسن ص ۶۵) لیکن قاسم ص ۱۲۵ میں اسی شخص کے ایک دوسرے

شاعر محمد اسماعیل سے منسوب ہے۔
(۴۱) آہم کا جسم جب کہ عناصر سے مل بنا کچھ رنگ بچ رہی تھی سو عاشق کا دل بنا
سور کا مطلع ہے (کلیات ص ۱۲) اور قاسم نے اپنے تذکرے میں اپنے استاد کو جسے اشعار نے میں ان کا آغاز
اسی سے ہوتا ہے ص ۱۲۱ لیکن شفیق نے خود قاسم کو اس کا مصنف لکھا ہے ص ۱۲۱۔

(۴۲) میں کہاں تو کہاں پہ کھتے ہیں کہ یہ آئیں میں وولول رہتے ہیں
اثرہ مطلع ہے (دیوان ص ۲۵، حسن ص ۲۴، قاسم ص ۱۲۵) لیکن مصنف مسرت نے اسے ان کے حقیقی صاحب میر
الم کے نام سے لکھا ہے ص ۱۲۱ اس کا یہ بیان کہ بیان اشعار میں سے جو مجھے خود الم سے ملے تھے، صحیح ہے تو یہ ستر ہے۔
(۴۳) مغناں مجھ مست بن پھر خندہ فاقل نہ ہوئے گا مے گلگون کا شیشہ پچلیاں سے لے کے دوڑے گا
میر کا مطلع ہے (کلیات ص ۱۲۵، نکات ص ۱۵۱، قاسم ص ۱۲۵، حسن ص ۱۲۵) لیکن اب ص ۱۲۲ میں آرزو کے نام

سے ہے۔
(۴۴) کوئی نہیں کہ یار کی لاوے خبر مجھے لے سب اشک تو ہی بہا لے اوھر مجھے
میر حسن کا مطلع ہے، جو کلیات کے متعدد نسخوں (از انجمنہ نسخہ م ۸۲) میں ملتے ہیں لیکن گلزار عشقی میں حسن غیر حسن
تذکرہ کے نام سے ہے اور قاسم ص ۱۲۵ میں شہرت برادر سبقت سے منسوب ہے۔ بدیدہ گوئی مصنفہ ہوش فکر امی میں مالدک
گلزار امی کی زمانی مرقوم ہے کہ پہلا مصرع نصف الدولہ کا ہے، اس نے اعلان کیا تھا کہ مصرع لگانے والے کو ہزار روپے
میں گے۔ ایک شہدے نے دوسرا مصرع کہہ کے انعام حاصل کیا۔ ص ۱۲۱

(۴۵) نہکت گل نہ جگایا کے زندان کے پنج پھیر زنجیر کی جھنکار پڑی کان کے پنج
مختصر علی خاں شہرت کا مطلع ہے (نکات ص ۱۲۵، قاسم ص ۱۲۵، حسن ص ۱۲۵) مگر قاسم ص ۱۲۱ میں بنام محمد علی خاں
شہرت۔ اسی مرقوم نے دونوں اب زمانہ بیاضیں اودان کا انتخاب "مہ ص ۵۱ میں لکھا ہے کہ مصنفی کے یہاں یہ مرقوم الذکر
شہرت کے نام سے ہے۔ یہ صحیح نہیں، مصنفی بھی اس معاملے میں میر قاسم کے ہمنوا ہیں (ہندی ص ۱۲۵)۔

(۴۶) دے صورتیں الہی کس ملک بستیاں ہیں اب بچنے کو جن کے سبکدوش تبتیاں ہیں
 لئے تھے کہیں دم سے کیا کر پلے جہاں ہیں بزرگ زلیست نمودن آئیں میں ہمتیاں ہیں
 حسن صفا دگھڑا دوسرے صفا میں بنام فتح علی شیدا، شاگرد سوادا، لیکن شعر الگ شدہ تسلیم کو نصف متوال (طو کلمتہ) میں
 ہینگا، شیدا کے نام سے ہے۔ اور اب ص ۱۳۳ میں سودا کو اس کا مصنف لکھا ہے۔ پوری غزل شمول ہر دو شعر کلیات سودا میں
 بھی ہے مگر مغرب نے اس سے غالی ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ غزل شیدا مقدم الذکر کی ہے۔

(۴۷) وہ جب تک کہ بغیر سنوارا کیا کھڑا اس پر میں جان وارا کیا

ابھی دل کو لے کر گیا میرے لہ وہ چلتا رہا میں پکارا کب

قمار محبت میں بازی سدا وہ جیتا کیا اور میں ہارا کیا

کیا قتل اور جان بخشی بھی کی حسن اس نے احساں دیا ہوا کیا

آب ص ۲۵۵ میں بنام میر حسن صاحب بحر البیان، مگر آزاد کو یہ دعوے نہیں کہ ان کا کلیات میری نظر سے گزر رہے۔ بلکہ
 وہ یہ کہتے ہیں کہ "اب نہیں ملتا" ص ۲۵۵ - یہ قریب بریفین ہے کہ آزاد نے یہ اشعار جن بے نظیر سے لئے ہیں جو پہلی بار شویش شہ
 سے چند سال قبل چھپا تھا اور جسے دتاسی برنٹ نے غلط فہمی، اپنی تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی جلد ۲ ص ۳۵۳، جلد ۳ ص ۳۶۱ میں خود
 محمد حسین آزاد کی تالیف بتاتا ہے۔ اشعار زیر بحث کتاب تذکرہ میں زیر عنوان "حسن" (دستہ نو کشور ص ۱۵۱) میں موجود ہیں اور
 اس زیر میں لاکڑی اور شعرا کے ساتھ نہیں۔ ظاہر ہے کہ جب اس شخص کے متعدد اشعار گزرے ہیں تو شخص عنوان اس کے لئے کافی نہیں
 کہ یہ اشعار یہ حسن کی طرف منسوب کئے جائیں، بلکہ یہ بات کہ قطع میں لفظ "بخش" آیا ہے اور یہ شیفہ ص ۹۹ و طبقات ص ۲۱
 دونوں میں خواجہ حسن مودودی کے نام سے ہے، اس کے خلاف پڑتی ہے، مگر آزاد کو میر حسن کے اشعار کی ضرورت تھی اور خواجہ حسن
 کچھ مطلب نہ تھا۔ انہیں مقدم الذکر کے نام سے درج کتاب کرنے میں تامل نہ ہوا۔ مجھے یاد تھا کہ مکمل غزل فیوض الذکر دہلوان (نسخہ
 سوسائٹی) میں موجود ہے۔ جناب شاہ مقبول احمد کے خط سے اس کی تصدیق ہو گئی۔

(۴۸) حسن بے پروا کو خود بین و خود را کردیا کیا کیا میں نے کہ انہما رفت کردیا

مجھے یاد آئے کہ حسرت موبانی نے اردو کے مغل کے کسی شاعر سے (۱۹۱۰ء تا ۱۹۱۳ء) میں کہا تھا کہ مجھ اس مطلق
 میں بخود و بوفی سے تو اردو ہوا ہے۔ انتخاب و دیوان حسرت ط ۱۹۱۹ء ص ۲ میں یہ موجود ہے لیکن جیسا کہ مجھے جناب ظہیر احمد صدیقی
 سے معلوم ہوا ہے، مطبوعہ دیوان بخود اس سے غالی ہے۔ تو اوروے واقف ہو کر اس کی ملکیت سے باز آگئے ہوں گے۔ براہ کرم
 وہ اصحاب جن کی رسائی جلدات اردو کے مطلق تک ہے مطلق فرمائیں کہ میرا بیان صحیح ہے یا غلط۔

(۴۹) کس سوچ میں ہو نسیم بولو کہ نہیں تو ملاؤ دل کہاں ہے

نسیم کھنٹی کی ایک غزل کا قطع ہے جو گلزار نسیم میں شامل ہے ص ۳۸۔ لیکن تصفیہ ص ۳۱ میں اس کی مستند
 نقل میر سے منسوب ہے:

میر کس سوچ میں ہو بولو کہ نہیں تو ملاؤ دل کہاں ہے

(۵۰) غزلان تو واقف ہو کر مینوں کے مرنے کی
دوا نامہ لکھا آخر کو ورنے کی پکب گزرا
غزلان تو حاضر ہو کر مینوں کے تلم میں
دوا نامہ لکھا جس وقت ورنے کی پکب گزرا
”مذکرہ حسن“ میں ہے کہ رام نرائی موزوں نے جو فارسی گوشتے اور اردو بالکل نہیں کھتے تھے، بیشتر اس وقت
فی البدیہہ لکھا تھا جب انھیں قتل سراج الدولہ کی خبر ملی تھی ”میں شہر ”غزالان“ ... لکھتا ہوں اور یادگار ماندا“ رگنڑا مل کے مطابق
”گنڈری“ جو طاب میں ہے صحیح نہیں، ”سرت میں غزالان“ ... لکھتا ہوں ”ورنہ“ قیاس صحیح خطی نسخے میں ”میں“ لکھا ہے، ایک ہی معروف
بنارس میں نامہ میرزا ابراہیم خاں کے نام سے ہے (۲۲۵)

(۵۱) لکھنے کا کٹ کر سر شمشیر
پر ورنے سے شرب حلی کنی کی
طواف حس میں بنام مصطفیٰ، لیکن دوا وین مصطفیٰ (نسخہ فقیر) میں یہ شعر نہیں ہے کسی جگہ عرش و خافت میر کے نام
سے دیکھ کر کتاب عابد رضا، بیدار سے دریافت کیا کہ ولولان عرش ظکھتو میں ہے یا نہیں۔ ان کا جواب اس مضمون کا آیا کہ
ولولان میں ہے۔

(۵۲) حیرت میں ہوں کہ تجھے تیں لے شرب حصال
نظر میں دیکھتا ہوں کہ عالم ہے شراب کا
حواشی طوفان حس میں بحوالہ گلزار باد و رو، لیکن ہدایت کا شعر ہے (نکات مسلط، حسن ۲۱۵)
(۵۳) کیست کہ بغیام من بشہر شہراں برد
یک از سخن زمین ہواں مرغ خندان برد
گو بہ خانقا یا ابی ہمدان شوبہ سیرت
نہ ہر کہ گو بہ دو بیت نسبت بخاناں برد
یہ اشعار رحمان الدین مجد الدراق مصنفی کے ہیں جن میں اس نے اپنے معاصر خانقاہی سے خطاب کیا ہے اور چنانچہ
یاد ہے میں نے اپنے مقالے ”نکات سخن“ میں انھیں اسی کے نام سے لکھا تھا، لیکن اردو ادب کے سیرت نگاروں میں خانقاہی کے
نام سے ہے۔ یہ ادارہ اردو ادب کی جہان ہے، باہر اسہوئم، اس کے متعلق مصنف کے کی طرف رجوع کئے بغیر کچھ نہیں کہہ سکتا
اور مسودہ و فخر اردو ادب میں ہے۔

(۵۴) ایس از مشوق مرنا عشق کو بزم کرنا ہے
خدا عینوں کو بخشے مر گیا اور ہم کو نہ ہے
(۵۵) مرغا فقیس کو پچھوں نے تے شاد و بہ کھا بھیجا ہے
آ جاؤ جرم کو نہاں ہو لیے میں بھی شاد و بہ میں
ہمارے شاعری ”تصفیہ“ میں مصرع حسن شہن اوہب، دلا میں شاد و عظیم آبادی کے صرف یہی دو شعر ہیں اور پہلے کو اٹھ
نے سہو شاد و لکھنوی کی طرف منسوب کیا ہے۔ یہ کلام شاد و، میخانہ الامام (۱۲۵) دونوں میں ہے اور اس میں کچھ شک نہیں
کہ شاد و عظیم آبادی کا ہے۔ دوسرا شعر بھی ان دونوں کتابوں میں (میخانہ ۱۲۵) موجود ہے، مگر جاری شاعری ”صفت“ میں اس
کے پیش کر کے پراکتھا کیا گیا ہے۔ یہ نہیں بتایا کہ کس کا ہے، میں نے معاصر اس میں جو اعتراض کیا تھا کہ اس کتاب میں شاد و لکھنوی
کے نام سے ہے بعض نے جاننا تھا۔ اس کا مجھے بہت افسوس ہے اور میں جناب ایچ بی معذرت خواہ ہوں۔ ہوا یہ کہ یہ بات زمین
میں بھی کہ شاد و عظیم آبادی، یہ کہ وہ شعروں میں سے ایک شاد و لکھنوی کی طرف منسوب ہو گیا ہے، وقت تحریر پہنچے کہ جگہ دوسرا شعر ظلم سے
نقل کیا، تب اس پر ہے کہ نگار ”میرزا“ میں ہی غلط، اعتراض جناب محفل نے بھی کیلے۔

(۵۶) تذکرہ گردیزی کے مرتب جناب ڈاکٹر عبدالحق نے اس تذکرے کے شعرا کی جو فہرست دی ہے وہ اس پر مشعر ہے کہ اس میں پاکبان کے بعد قزلباش خاں کا مرتبہ ہے۔ حالانکہ اس میں تازم کی ترتیب میں حرف تھی کا، انشراحا غایا گیا ہے۔ تذکرے کے صفحہ ۲ میں زیر عنوان ”پاکبان“ عبارت نثر اور شعر ذیل درج ہے :

جلوس تھا جس کے تین پہ ہم کہاں تم تو ہمیں ہمیشہ ہوا نسوس ہم نہیں
اس کے معانی ایک نیا عنوان ”قزلباش خاں“ ہے اور اس کے تحت ذیل کی نثر و نظم مرقوم ہے (صفحہ ۲ و ۳)
”ابن شعر خوشگاہ قزلباش خاں مرحوم است :
نفس کے در کو باز لے بل ای صبا کو تپتے
خدا جانے کسے گا ذی یا آدا کو تپتے
اب بیت نام و گریہ ہم شروع شدہ :

مجھے در و عالم رہتا ہے نہ گھبت میاں حساب خبر لینے نہیں کیسے ہو تم میرے میاں حساب
جواب نہ میرے تو پھر انتظار میں میرے خدا عز نہ کھاتے ہمارے میں میرے
تمام شعر شرمیں پاکبانے سانی ہزار حیف کہ اب انتظار میں میرے

گردیزی نے پانچوں شعر پاکبان کے نام سے لکھے ہیں، لیکن مرتب نے انھیں اس طرح پیش کیا ہے کہ صرف ایک ان میں آیا ہے اور کے تحت باقی قزلباش خاں کو مل گئے ہیں، شقیق نے کل اشعار گردیزی کے نشانک مطابق پاکبان سے منسوب کئے ہیں۔ حالانکہ جناب قزلباش کے ہموار میں اور شعر ہم کے متعلق رقمطراز ہیں کہ منفعہ طور پر پاکبان سمجھا جاتا ہے لیکن گردیزی نے اسے پاکبان کے نام لکھ کر مشکوک بنا دیا ہے۔ نگار و میر صفحہ ۳ پر نکات سے۔ فاقہ صفحہ ۲۵ اور میرت ص ۳۱ میں پاکبان کے نام سے ہے لیکن نگار و میر میں صلاح الدین پاکبان کی جگہ صلاح الدین بنیات سے۔ اس نام کا تخلص کا کوئی شاعر اس زمانے میں نہیں گزرا۔ ”بنیات“ کتابت کی غلطی ہو تو عجیب نہیں۔ عاصی میرت نے شعر ہم کو پاکبان کی طرف منسوب کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ”مترلف ... بنام شخصے، اگر باقی قسم شنیدہ : فراق کیا ہے با او جمل یا میں میرے خدا“۔ شاید شاعر برائے حسن شعر عرض تبدیل نمودہ یا توار، او داوہ ودا المدا علم“۔ صفحہ ۳۲۔ یہ تبدیلی شدہ شعر بیان کو افسردہ و غمناک نہیں، صرف ادا کے نام سے ہے بلکہ اس کا دیوان رسوائی، اس سے خالی ہے۔

(۵۷) کسی نے روم کی قسمت میں کوئی شاعر آیا ہمیں کچھ دے نہ آیا ایک تیرا نام لے آیا
مصحف نے ہندی ص ۳۱ میں یہ بیان خاں تذکرہ جابل“ کہا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ان کا ”خروج زبان“ تنگ و دست
ذخرا۔ فاقہ کا قولی ہے کہ پہلے میر سوز و غمیرہ ان کے ہمای بیٹے، اس کے بعد سوز و غمیرہ کا فرخ آباد جانا ہوا تو رفتہ انھیں اپنے دفعتاً
میں داخل کر لیا حضرت حسن (صفحہ ۱۱) اور صاحب کلزار نے انھیں سوز و وسو کا شاگرد لکھا ہے لیکن حسن کا بیان ہے کہ اکثر

نے میرے نزدیک اس عبارت کا تعلق شخص تم سے ہے مگر اس کا امکان ہے کہ جیسے الخ سے ہو۔
تک یہ عبارت میری دہستہ میں ”مجھے در و عالم الخ“ سے ملتی تھی ہے لیکن یہ ممکن ہے کہ ”نفس الخ“ سے ملتی ہو۔

اشعار سوز و سودا اور دیوانِ مہربانِ خاں یافتہ سے مشورہ، ازین بہت اشعار اور قلمی نگرہ دم آنچہ دوسرے شہسپاں آگنہا کر دم
 ص ۲۱۱ - شوق کہتے ہیں کہ اکثر غزلیات مضبوط و مربوط اور اہم زار فیض سودا، و میر سوز و غیر نسبت یکدن خداوند کو کہ در افق
 اکیسیت "قاسم نے ترجمہ ترجمہ میں ایک غزل کے متعلق لکھا ہے: "ابنِ غزل در کلیات سودا ابنِ عاصی دیدہ و بسیار را پسندیدہ"
 و ص ۲۶۶، ناصر کا قول ہے کہ زندہ کا دیوان مولف کی نظر سے گزرا ہے۔ مگر اکثر وہی غزلیں سوز کے دیوان میں موجود اور نام زندگان
 میں سے نالوہ۔ یہ نہ چاہیے جو چیز مہربانِ عوض ہوا اس کا دوسرے اوصاف سے بعید ہے
 شعر زیر بحث قاسم نے زندہ کے نام سے لکھا ہے اور دیوانِ زندہ اس سوانحی ہیں اس زمین کے اور اشعار کے ساتھ موجود
 ہے۔ لیکن شوق سے زندہ کے ان اشعار میں شمار کرنے پر جنہیں لوگ سودا یا سوز کی ملک سمجھتے ہیں مبطوعہ کلیات سودا ص ۲۱۱ میں
 یہ شعر ملتا ہے جو نہ تھا ہے ۱۰۰ زمین کے او اشعار اس کے ساتھ نہیں۔ حسن ص ۱۱۱ میں سوز سے منسوب اور مکمل غزل دیوانِ سوز
 و شعر گواہ و شعر جناب علی حیدر میں شامل ہے۔

میر خیال ہے کہ زندہ یا شوق نے ہی نہیں یا جنھں نے نام شعر کہتے تھے کسی نے روم ۱۰۰۰ "اور اس زمین
 کے اور اشعار و اس سوز کے ہیں جو زمانہ ملازمت میں انھوں نے زندہ کو دے دیے تھے۔ مگر افعالیہ تعلقات کے بعد خود اپنے
 دیوان میں داخل کر لے۔ سودا کا اس سے کچھ سروکار نہیں، کلیات کے مندرجہ فیصلے اس سے خالی ہیں۔

(۵۸) صحبت و عطف تو تادیر ہے گی و عطف یہ ہے مینا نے ابھی کی ہے چلے آئے ہیں
 نظم طلبائی کی شرت و دیوانِ غالب (الناظر یک عین ص ۱۵۸) میں پیشتر اسی طرح مرقوم ہے لیکن نظم نے اس کے
 مصنف کا نام نہیں بتایا۔ یہ ہے جہاں غالب، معاصر ۲ جنوری ۱۸۵۷ء میں لکھا تھا:

"اس وجہ سے ثبوت میں کہ باقر و جہاں صبح" رکھتے تھے، مقدمہ نگار حلف باقر نے شاہ محمود الحق مرحوم کی زبانی
 یہ واقعہ بیان کیا ہے۔ کسی نے باقر کے سامنے پیشتر پڑھا ہے

محسوس و عطف تو تادیر رہے گی غالب

یا سہی مینا ہے کی ہے چلے آئے ہیں

انھیں بڑی حیرت ہوئی۔ اسی دن خط لکھ کر تحقیق دریافت کی۔ غالب کا جواب جو بقول مقدمہ نگار شاہ.... مرحوم کو لفظ لفظ
 یا و تھا ہے، "اگر پیشتر میرا موزو محمد پر ایک ہزار لعنت اور نہ جن نے اس کو لفظ میری جانب منسوب کیا ہے اس پر اس
 ہزار لعنت" مجھ پر کیا شامت آئی تھی کہ پاس ہی سے خاندہ ہونے ہوئے مجلس و عطف میں جا بیٹھا، عطف عبارت حاشیہ: یہ
 شعر و اس میں ہے: مجلس و عطف... قاسم... یہ ہے... آتے ہیں... اور کچھ لوگ اسے قاسم کی تصنیف سمجھتے ہیں مگر
 نہ "قاسم" لازماً بطور تخلص آیا ہے اور نہ یہ شعر دیوانِ قاسم داغداغ آفس میں ہے جیسا کہ صحیح ہونے کا یہ ضامن نہیں۔ ص ۱۵۸
 جناب حلفانے نگار پر ابلی میں اس شعر کا مصرعہ اول اسی طرح لکھا ہے جس طرح کہ حاشیہ معاصر میں ہے اور جناب
 اعجاز رسول خاں مقدمہ نگار دیوانِ نونشا و اس کے اس قول کی ترویج کرتے ہوئے کہ میر کا طبع زاوہ ہے کسی ثبوت کے بغیر قاسم کو اس

لے شوق کہتے ہیں کہ کلیات زندہ ہزار اشعار پر مشتمل ہے لیکن سوانحی کا نسخہ زیادہ ضخیم نہیں۔

مصنف نژاد وہابیہ ص ۳۴ - انھوں نے نگارا کنویر میں اس سے دوبار بحث کی ہے اور میری غزلیا ذکر کرتے ہوئے فیصلہ کیا ہے کہ جب تک اس کا کوئی دوسرا دعوے دار پیدا نہ ہو قائم کا ہے۔ ص ۳۴ -

مقدمہ دیوان باقر میں ص ۲ کی خوشگلی ہے اس میں ایک سے زیادہ نظم ہیں اور حکایت نمونہ ص ۱۰۱ اسی طرح ہے جس طرح کہ شاعر معاصر میں ہے اور میر کی طرف شعر کے انساب کی کوئی سند اس میں نہیں۔ حکایت نمونہ ص ۱۰۱ اس سے خالی ہے اور جہان مک میرا علم ہے مقدمہ نگارا دیوان نوشا و میر کے منسوب کرنے میں منفر دیں۔ رہا قائم کا معاملہ تو یہ جیسا کہ عاشقہ معاصر میں لکھا گیا تھا دیوان قائم میں نہیں اور شاعر سے قبل کہ اسے ان کے نام سے نہیں لکھا۔ شعر کی اس شکل کے بھی جو عاشقہ معاصر میں ہے وہی دمردار میں شعر انجم ۲ ص ۱۹۱ مقدمہ ۲۵ شعر کی اصلی شکل وہی ہے جو شاعر دیوان انساب میں ہے اور مجھے اس کا علم نہیں کہ دراصل کس کا ہے۔

(۵۹) روشن ہے اس طرح دل ویراں میں داغ ایک اجڑے گزریں جیسے جلے ہے پوراغ ایک
 ص ۳۳ و ۳۴ میں میر صوفیہ شکل میں میر کے نام سے ہے، اور دست ص ۳۳ و ۳۴ میں جرات اس کے مصنف بتائے گئے ہیں۔ حیات میر و حکایت جرات م اس سے خالی ہیں۔ میر کا نوادہ انہیں حکایت جرات کے اونیوں میں جی نہ ملے تو ان کا بھی نہیں جتنی سے لے کر ثابت، شاکر و فدائی سے منسوب کیا ہے۔

(۶۰) چھپا ہے ناکس میں دل جانکے اب میں ڈھونڈوں کہ میر

کہ آدھی رات آدھ ہے اور آدھ رات آدھ

یہ شعر کہ ان کے شاعروں کی طرف منسوب ہے۔ یہ انقباض شاعرین اردو کے کسی دوسرے شعر کو حاصل ہو جس نے اسے بدھت کہ فن رکا طبع اور تباہ ہے ص ۳۴ - شوق کتنے ہیں کہ دیدار شین دیدار کا بغیر نگر ہے۔ کلازا میں حمزہ علی رند کے نام سے ہے، فاسم دامن (۱) اور غالباً ذکا بھی اسے اصغر علی اصغر مارہروی کی تصنیف سمجھتے ہیں، مہجھی کے نزدیک یہ سنہ کی ملک ہے۔ شبنم عظیمیہ م، اور باطن لغزہ غیب ص ۲۵ کی رائے میں عاوا ملک نظام کے ذہن کی پیداوار ہے اور نعت ص ۲۵ و تصفیہ ص ۳۴ کے مطابق فقط کے رشحات قائم سے ہے۔

داراشکوہ کا دیوان

پروفیسر محمد علم الدین سالک

شہزادہ داراشکوہ شاہ جہاں کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ ماں باپ دونوں اسے بہت عزیز رکھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مرنے والی پہلی دوا دوا دیں وہاں تھیں۔ شاہ جہاں کو رشک کی خواہش تھی۔ وہ اس ضمن کے لیے اکثر خواجہ معین الدین چشتی اجیری کے آستانہ مبارک پر حاضر ہوا کرتا تھا۔ آخر اس کی دعا قبول ہوئی اور داراشکوہ ۲۹ صفر ۱۰۲۲ھ مطابق ۲۰ مارچ ۱۶۱۱ء کو آہستہ کے مقام پر پیدا ہوا اور ۱۵ ذی قعدہ ۱۰۶۰ھ کو مقام دہلی قتل کیا گیا۔ ایک شاعر نے اس واقعہ کی عجیب و غریب تاریخ لکھی ہے۔

$$\frac{\text{قتل داراشکوہ شہزادہ}}{۲} = \frac{۱۰۶۰ + ۲}{۲} = ۱۰۲۹ \text{ھ}$$

داراشکوہ کی تعلیم و تربیت عام شہزادوں کی طرح برہمنوں کے شاگردوں کے مشہور استادوں اور علماء اس کی تعلیم و تربیت پر مقرر ہوئے۔ ان میں مولانا محمد اللہ علیہ سلطان پوری، علامہ مرکب اور شیخ ہر دی کا ذکر داراشکوہ کے استادوں کی فہرست میں ملتا ہے۔

خطاطی اس زمانے میں ایک شاندار صفت سمجھا جاتا تھا۔ داراشکوہ کا مشہور عالم استاد، عبدالرشید دہلی جیسے کیا۔ اور اس نے اس فن میں خوب مہارت حاصل کی۔ ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں داراشکوہ کی کئی کتابیں اور دستیاں آج بھی ملتی ہیں جن سے اس کے کمال فن کا پتہ چلتا ہے۔

فنون سپہ گری کے بغیر شہزادوں کی تعلیم مکمل نہ سمجھی جاتی تھی۔ داراشکوہ اس میں بھی کمال حاصل کیا۔ ساموگرمہ کا سرگرم داراشکوہ کا سپاہیانہ جہارت کا آئینہ دار ہے۔

بہر حال داراشکوہ اپنے دادا جہانگیر اور اپنے باپ شاہ جہاں کی سرپرستی میں رہ کر گونا گوں کمالات حاصل کیے۔ اور شاہ جہانگیر نے اس کا خطاب ملا۔ طبیعت میں تعقوت کا مذاق موجود تھا۔ اس پر تلاش حق کا جنوں دماغ میں سما گیا۔ اس لیے اس کی طبیعت میں ایسی باتیں بھی ملتی ہیں جو اسلام کے نقطہ نظر سے قابل اعتراض ہیں۔ گو بعض اہل باطن تعقوت نے انہیں حقیقت سمجھنے پر تیار کر دیا۔ اسلام ثابت کرنے کی کوشش کی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ داراشکوہ کی آزاد روی، تلاش حق کا سہوا اور بیاضت و عبادت سے کٹ کر رہی

کی وجہ سے اس قسم کی باتوں کا پیدا ہوجانا لازمی تھا۔

دارالاجیب جوان ہوا تو تصنیف کا قلم اس کے ہاتھ میں تھا۔ چنانچہ ۱۰۴۹ھ میں جب وہ مرکی پھس بہادریں دیکھ چکا تھا۔ اس نے اپنی پہلی تصنیف دنیا کے سامنے پیش کی۔ یہ سینیئہ الاویا تھی۔ جس میں اس نے چار سو گیارہ بزرگان دین کے حالات لکھے ہیں۔ اس کتاب میں لہ پٹے آپ کو تسنی اور تاداری کہتا ہے۔ یہ کتاب ۱۰۴۹ھ رمضان ۲۷ کو مکمل ہوئی جس کے متنو راہ مصر بعد وہ ملا شاہ بخشاہی کے مریدوں میں شامل ہوا۔

اس کے تین برس بعد ۱۰۵۲ھ میں اس نے اپنی دوسری کتاب سینیئہ الاویا لکھی جس میں دامانے بڑے مزے لے لے کر محنت میں آئی۔ یہ کے حالات بیان کیے ہیں وہ اکثر انہیں حضرت باری تعالیٰ کہتا ہے اور حسنات العارفین میں اس کی وجہ یہ بیان کرتا ہے۔

”پہوں ایشان در کوہ دہائے قصبہ باری عادت گزین بودند بن ایشان۔ ادا می قالی می گفتم“

وآدا کو صوفیہ سے داہا زحمت تھی۔ دو اکثر صوفیہ سے ہمہ دوست اور فنا کے مسائل پر خط و کتابت کیا کرتا تھا۔ یہ خطا و کوتاہی بت ہے حد دل چسپ ہے۔ اس سے وہ انکی ادبی نشان غالب ہوئی ہے۔ فنا کے مسئلے پر وہ سرور گو کہتا ہے

”بیر مرشد من - درود قلم عازمت داد۔ حیرتی شود۔ اگر من نعم ارادہ

من معطل چرا؟ و اگر من نیستم چہ تقصیر؟ قتل امام حسین اگرچہ شہیت است

پس یزید و یحییٰ و یحییٰ؟ و اگر من شہیت است پس من نے فیصل اللہ ماشا

دعایم ہا پر چہیت؟ بنی خاندان بربک کفار می۔ ذلت نیست و اسلام

نی افتاد۔ علمائے کبار می گویند تعلیم صبر است۔ ختمی را تعلیم چہ درکار؟“

سرور نے اس کا جواب ایک نہایت بلیغ شعر میں دیا۔

اسے عزیز ہے

ما آچہ خواندہ ایم فراوانش کردہ ایم !

إلا حدیث دوست کہ تکرار می کنم

غرض آثار نے اپنے اشعار میں بھی اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے وہ شاعر تھا اور تاداری تخلص کرتا تھا۔ بہر حال شہزادے

کی طرح شعرو سخن کا دل داد اور شاعر کا قدر دان و مرئی تھا۔ اچھے شعر کی داد و دل بھول کر وہ بے ادب شاعر کو انعام سے مالا مال کرتا تھا۔ دینی مشہدی نے ایک وفد ایک غزل کہی۔ اس میں یہ شعر آندا کہ بہت پسند آیا۔

”ناک داسر سبز کن اسے ابر نیماں در ہزار

قطرہ تاسے تواند شد چہرا گویہر شود !

وآدا نے اس پر اسے ایک لاکھ دوپہر انعام دیا اور خود اس شعر کے جواب میں یوں کہا۔

معرفت سہل است خود را آشنائے فقر کن

قطرہ تا دریا تواند شد چرا گوهر شود!

یہ موقعہ نہیں کہ وارا کی تمام نقائص بہت ہی مفصل بحث کی جائے۔ مروست ہم اس کے دیوان کے ایک پہلو پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ وارا کا دیوان نہایت مختصر ہے اور بہت کیاب۔ اس وقت تک اس کے بہت کم نسخے دریافت ہوئے ہیں۔ ان میں سے دو نسخے نامکمل اور دو نسخے جو بظاہر مکمل ہیں وہ ایک خوردہ ہیں۔ ایک دفعہ نگار کے فاضل مدینے یہ دعویٰ کیا تھا کہ وارا کا مکمل دیوان ان کے پاس موجود ہے اور وہ اسے شائع کرنا چاہتے ہیں۔ اس پر تقریباً چونتالیس صدی گزر چکی ہے۔ مگر دیوان ابھی تک زیور صبیح سے آراستہ نہیں ہوا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دیوان وارا کا نہیں کسی اور کا ہے۔ گوہر نقوش کلمات اشعار میں اور علامہ فرانسس ریڈا وی اسپن نے ذکر کیا ہے اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ وارا کی صاحب کا دیوان تھا۔ اس کی تائید ضابطیہ ایست دیہات العلماء میں کرتا ہے۔ خود دیوان کے مطالعہ سے معلوم ہے کہ یہ دیوان وارا، شکرہ کا ہے۔ چنانچہ اس کا ایک منقطع ہے کہ

چراں ہوا رائے خویشت دل بہ سپرد
قادیسی زیر میں وارا مشد

اس کے علاوہ دیرین میں بہت سے ایست نام کی شواہد ملتے ہیں۔ اور ایسی تاریخی تصنیفوں کا ذکر بھی پایا جاتا ہے۔ جو وارا سے متعلق تھیں اور حیز پر ہم آگے چل کر روشنی ڈالیں گے۔

دیوان قادیسی اپنے دور کی تاریخی شاعری کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ زبان صاف و سادہ ہے۔ خیالات صوفیانہ ہیں۔ جنہیں وارا بڑی آسانی سے بیان کرتا ہے۔ انداز میں مرتبی پائی جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیالات اس کے دگ وچنے میں سرایت کر چکے ہیں۔ یہی اس کی زندگی ہے اور یہی اس کی زندگی کا بڑا کارنامہ ہے۔ وہ انہیں بڑی بے تعلقی کے ساتھ نظم و نثر میں ادا کرتا ہے۔ یہ خیالات زیادہ تر موقوف کے نہایت اہم ترین مسائل ہر اوست اور فنا کے متعلق ہیں۔ چنانچہ وہ ایک مقام پر دھندہ اوجو دیا ہر اوست کے متعلق کہتا ہے کہ

ہر سو کہ غمزدہ کنی ہم اوست
وجہ اللہ عیان ست۔ ویر و را

پھر اسی معنوں کو یوں ادا کرتا ہے۔

گفت انا الحق و دار خود فوسطے
دار گفت و کشید و خود را خود
وہ پس پردہ گفت گوی کرد
ہر وہ برداشت وید خود را خود

وہ اس معنوں کو بار بار بیان کرتا ہے۔ مگر سیر نہیں ہوتا۔ وہ ہر بار ایک نیا انداز اختیار کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو

خویشتر دایم نامی دایم

ایک خود را خدا فی دامن
ظہر را بختے کر باہر است
بیشتر دہی روانی دامن

فنا کے متعلق اس کی یہ غزل دیکھئے۔ کس سرتی سے وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔

ہمہ موجود در وجود ما گنج مخفی است این نمود ما
گرچہ در پردہ داکشتم آواز شد نئے سخن برای سرو ما
مانہ دیدیم بچہ جنبہ خود عین نہ نمود در شہود ما
وہم نانی نشود نہ مانی ہست باقی ہمہ وجود ما
سراغم کہ مشد بہانہب ما از پسے خویش شد سجود ما
خوشیق را گرفتہ نبشیم اے خوشا ہم چنین نمود ما
فرق در تباری و قادر نیست

میں اخلاق مشد یقود ما

ایک اور غزل میں وہ ہمہ ادست اور فنا کے مقامات پر بحث کرتا، خواہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت میں کہتا ہے۔

ایک وجود ہست لامحدود کہ ہوں بود فارحہ خود
کرد خواہش بد بدن مت خویش چوں کہ بر حسن گنج مخفی بود
پس زہو عاشقی ہویدا شد از ہی خواست جہود وجود
حسن خود بر سہیل تھلے دید نام آں گلی مستم فرمود
از عمدہ ہزار گل بہ شگفت یک و نام احمد و محمود
گفت محشوق خویش دریں نام شد کید در خندان بود
بعد اذان فیرتش فدائی خواست شد خداود رسول گفت و نشود
خاص جاد دست حرف ناگوید گشت قرآن خویش را پرستود
چوں نظر کرد در صفات خویش شد رحیم و کریم و رب و دود
آسمان و زمین بشد پیدا چوں جناب اذیال دیا بود
گفت ز آواز خویش آن دیا از ہاں موج و نقش و سئے نمود
گرمی و شور عشق چوں افتاد نام خود کرد شاہد و مشہود
آفرانہ عشق جہود پیدا شد ایں کہ جہاں مت عشق کشود
نظم ہر چوں مت ہمہ بشد عہد در نام گشتہ شد معبود

قادرى جملہ از تو پيدا شد

آپنہ بو داستان بہت خواہد پڑ

تو کی تنگ نظری سے غلو کی ہمیشہ نالائی رہی ہے۔ داد کے مذہبی اقتادات پر بھی اکثر سے دسے ہوتی رہی ہے اور اس

میں قلا ہمیشہ سب سے آگے جڑنا تھا۔ داد اس کا زخم خوردہ تھا۔ اس واسطے وہ ملا کے متعلق اپنے دلی جذبات کا اظہار یوں کرتا ہے۔

بہشت آجنا کو ملائے نہاںد ز قلابت و عفائے نہاںد

جہاں خالی شود از شدہ قلا ز فتویٰ باش پردائے نہاںد

وہ آں شہرے کو قلا خا زادہ وہ آجنا میچ دانائے نہاںد

میں نے قادرى تو دے قلا

مرد آجنا کو شیدا ئے نہاںد

پیری مریدی اور ہیبت کے جواز عدم جواز پر ہمیشہ بحثیں چلتی آ رہی ہیں۔ داد نے اس کے جواب میں ایک نزل لکھی

ہے جس کے چند شعر یہ ہیں:-

طعن کر دی تو بہادرات من من ز طعن تو کے شود دل گیر

من چلو نہ مرید کس نشوم از اداوت مرا مرشت غیر

من مریم بحضرت میراں بہت شنام پیش من بے پیر

کے اداوت کنی تو باہر سے غلاد و ترا چوں کنی شہر ی

مردم شہر ما چہلے پیراںد

قادرى ماند فاش از تقدیر

دیوان میں اس زمانے کے مشہور روحانی بزرگوں کی منقبت بھی پائی جاتی ہے۔ چونکہ داد کا پیر طریقت کبھی لاہور اور

کبھی کشمیر میں رہتا تھا۔ اس لیے پنجاب۔ لاہور اور کشمیر اس کی اداوت کے خاص مرکز تھے۔ وہ پنجاب کی شریفیوں کی طلب سالان

جو تاسے۔

ہا زہوں جان دہل بیتا ہے بہت ہا زہوں چشماں من بیغلاب بہت

فشن پنجاہم نمودہ ہے ستارہ نانا کہ نقش و دست پنجاہ بہت

کہہ من حضرت لاہور داں سجدہ من سوسے آن مہر بہت

قادرى دا کہہ دادا پد رسد

کا ذراں لہار فتح الہاب بہت

داد لاہور لاہور کا ایک مشہور محدث تھا جہاں حضرت میاں میر تقی میر نے یہ دہی جگہ ہے جہاں آج کل آپ کا مزار اور

دادہ ہاؤسنگ کی تبراق ہے۔ داد نے یہ محلہ اپنے دادا پیر کے نام سے آہلیا کیا تھا۔ ایک اور مزار میں وہ حضرت میاں میر کی منقبت

گناہ بڑا کہتا ہے ۔

دل شدہ فارغ از ہمت دبیر می شود آنچه ہمت در تقدیر
خسرو اندر ولم نمی آید خسروہ دور کرد ہاں بیستہ

دارالخوہ کی عقیدت کا دوسرا مرکز ملا محمد شاہ عرف ملا شاہ بدخشی ہے۔ حسب تک حضرت میاں میر تقی حیات رہے ملا شاہ گرمیاں کشمیر میں اور سرویاں لاہور میں بسر کیا کرتے تھے۔ اگر جب حضرت یہاں میر ۱۰۴۰ھ میں فوت ہو گئے تو انہوں نے مستقل طور پر لاہور میں رہنا شروع کر دیا۔ جہاں آبادی کم نے ان کے لیے ایک نہایت خوب صورت خانقاہ سری گوہ میں تیار کرائی جہاں دارالاکثران کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ یہ خانقاہ کوہ ماراں کے واس میں واقع تھی۔ اب بھی اس کے کنذرات وہاں باسے جاتے ہیں اسی مناسبت سے دارابہ شاعران کی منقبت میں اکثر پڑھا کرتا تھا۔

کوہ ماراں بکر لعل بدخشاں دارو

ابن جنس بخت کیا تخت یلماں دارو

ملا شاہ کی منقبت میں بھی دارابہ کے دیوان میں کئی غزلیں ملتی ہیں۔ ایک غزل ہے ۔

مرا بخشدہ ملک ہدایت کہ اک ملک مرا بنود نہایت
ولم بڑولے صدوشن عذارم مرا چوں شاہ دارو در حمایت
تو کردی بخشش شاہ زلسلے آ مذکور دا زاولیا دگر نہایت
تو کردی مت دہری ماخان آباد

سلامت بر سرش دارو خدا بیت

ایک اور غزل میں آپ کی منقبت کرتے ہوئے دارابہ کہتا ہے ۔

ذات اومت پہنچ اہل اند اہل توحید و اماں باشند
صورت ہامح حقیقت بشر بشریت اور انجہاں باشند

ایک نہایت عمدہ غزل حضرت پیران پیر شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی مدح میں بھی ہے۔ جس کے لفظافذ سے

عقیدت مندی کا اظہار ہوتا ہے۔ بیان نہایت سادہ ، انداز نہایت دلنشین ہے۔ ملاحظہ ہو ۔

حضرت میراں خداوند جہاں خوش جن انس و شاہ عارفان
میں دین شیخ عبدالقادر دست آں کہ اور اعوش باشند آستان
سید سادات فخر اولیاء شیریں شہبازہ اوج لامکان
دہنائے شام راہ احمدی دھگری جہز در ماندگان ؛
ہر کجا پاسے نہادی بر زمین فخر کرے آسمان نہیں آستان

خواجہ بہاؤ الدین نقشبندی سلسلہ نقشبندیہ کے بانی ہیں۔ دارا کو ان سے بھی عقیدت تھی۔ وہاں میں دو غزلیں ان کی مدح میں

جس موجود ہیں۔ ایک کا مطلع ہے ۛ

تغلب دنیا و دین بہاؤ الدین

نقشبند یقین بہاؤ الدین

شاہ جہانی دور کی ایک مشہور شخصیت حضرت ایشاق بھی تھی۔ ان کا نام فقہ اور عرف خواجه خاند محمد متقا۔ کشمیر میں سلسلہ نقشبندیہ کو انہیں کی وجہ سے فروغ ہوا۔ بعض سیاسی حالات کی بنا پر انہیں مجبور کیا گیا کہ وہ اپنا مستقل قیام لاہور میں رکھیں چنانچہ انہوں نے لاہور کے سب سے امیر اور دولت مند محمد غفل پورہ میں اقامت اختیار کی اور یہیں اپنی مسند اور خانقاہ تعمیر کرائی۔ آپ اپنے زمانے کے بہت بڑے محدث اور مفسر تھے۔ ۱۰۵۷ھ میں فوت ہو کر یہیں دفن ہوئے۔ دامائے آپ کا مرقع لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دارا کے تعلقات آپ سے نہایت خلصانہ تھے مریضی کے چند شعر یہ ہیں ۛ

چوں نہا شد آساں با چشم تر	چوں سفر فرمود شیخ بحر و بر
شیخ ہفت اقلیم یوں مرام	چیلوئے او بہار مغتبر
آن حقہ کز منی آمد بدون	اہل شرق و غرب را گردیدہ سر
روز و شب می گرد بر گرد مر	کاں چنان گردش نیا آید از بشر
اولیاء امرگ می باشند حسام	لایقہ کو است چوں اندر شہر
دو بزار و پنج و دو دھن و فت او	دو ذرہ شہد و پنج از صغیر
قادسی گریاں بماند از ہجر او	
گردانہ دایے ہائے چوں سفر	

دیوان سے دارا کے مذہبی اعتقادات خاص کر توحید رسالت، ختم نبوت، حب الہییت اور غفلانے راشدین سے عہدت لاپتہ چلتا ہے۔ توحید کے بارے میں اس کا خیال ہے ۛ

ترک نہاؤ کردہ ام ڈاں رو	تا و وحدت نمود در ذاتہ
قادری نیست یچ جز قادر	وعدہ لا ائذ لا ہو!
موجودہ مشر بنیر خدا	دشمن ہست بسمہ و ذاتار

رسالت کے بارے میں اس کے خیالات ملاحظہ ہوں ۛ

چند ہازی تو بر شریعت خود	احمد مرسل از خداست سوا
نعمت نبوت کے متعلق کہتا ہے ۛ	

تو ہم نشین من شد و گردگار عالم
خلفائے راشدین کے بارے میں کہتا ہے ۛ

نیمت بچارہ یچ لا درست

نیمت چہینے چہ چاہیاد درست
بہر بخت منی نہیں پاید
پایہ چاہ استوار درست

وہنچن ۛ

ذاتِ اوست ہنچ اہل اللہ
اہلِ توحید را اماں ہا مشد

دارا کو جس لاٹھ پیار سے مال باپ نے پالا۔ جس طرح اسے عزیز رکھا۔ اور ہر بات میں اس کی نافرمانی کی۔ اس سے ملے
یہ وہیم ہو گیا تھا کہ وہ اپنے تمام بھائیوں سے ممتاز ہے۔ چنانچہ دہران میں اس کے مشفق مہابھائاں اسے ہاتھ جاتے ہیں۔ ان اشعار سے
بدوا پر ملاحظہ فرمائیے کہ ہم یہ بات زمین نشین کر لیں کہ شاہجہاں اپنی جگہ پر فیصد کر چکا تھا کہ اس کا جانشین واداد ہو گا۔ اس
نے اسے شاہ بلند آقبال کا خطاب بھی عطا کیا۔ اسے چتر شاہی اور دیگر لوازمات شاہی استعمال کرنے کی اجازت بھی دے دی۔ اس واسطے دارا
اپنے آپ کو بادشاہ سمجھتا تھا۔ وہ خود کہتا ہے ۛ

قرنبا ہم ہوت آوری پاید قادر ی صلب قرآن نشد

ہر چند کہ نیست سایہ از نفاذ خدا یک نمود سایہ شہ عزیز نما

داخل چوں گویند مرا سایہ حق تو رسم کہ ازین دومی آید حق را

بعض اشعار سے دارا کے اخلاق و عادات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ وہ شہب زور کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اس واسطے کہتا ہے ۛ

دست زور آلود بد بر می شود

جان زور آلود را احوال چمیت

دارا کے خیال میں بنیادی سچائیوں ہر مذہب میں موجود ہیں۔ اس لیے وہ ہر مذہب کے لوگوں سے دودھ دیکھتا تھا۔ اور
ان سے میل ملاپ بڑھاتا تھا۔ دوسرے نغموں میں وہ دنیا پر ظاہر کرتا تھا کہ اس کا مسلک مصلح کی ہے اور اسے کسی مذہب اور کسی فرقے سے
علاقہ نہیں۔ اس کی وجہ فلسفہ بہر دوست ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے۔

قادر کسی دید تا ترا و دکن

مصلح کل کرد از عا و گذشت

ماتا را ز عاری پر بہت زور دیتا ہے۔ اور یقین کرتا ہے کہ روحانی اور مادی دنیا میں کامیابی کا نام یہی ہے کہ اپنے امرا کو
چھوڑ دے اور اگر کوئی را زدار بنانا چاہتے ہو تو اپنے دل کے سوا کسی کو نافرمان نہ بناؤ ۛ

ماذہ خود را بنیر ولی تو گز
ماذہ داری بنیر ولی نہ بود
بعض بعض اشعار بشریت کے نقطہ نظر سے لکھتے ہیں جن پر فقہاء غزوہ گیری بھی کرتے رہے ہیں اور جو آخر میں اس کی
تہا ہی کا باعث بنے مثلاً

کفر و دین دہ دہ ہن ہن ہواں وعدہ لاشد یک لائیباں

قادی گشت قادر مطلق اذ پئے ہر فنا کمال تہاست

قادی ذو دین قادر شد جوں مدد کرد قادر بند شد

ہم محمد توئی جسم اللہ اہی عنایت تراست

قادی ماذہ قدرت کامل قادر ذو الجلال سا دوسے

یہ دہا کے دیوان کا ایک نہایت سرسری جائزہ ہے افسوس ہے کہ دیوان کا کوئی اچھا نسخہ میسر نہ کرنے کی وجہ سے بعض
اشعار نہ پڑھے جاسکے۔ بہر حال جو کچھ مل سکا اس سے دہا کی انفرادیت، اُس کے ماحول اور اس کے اعتقادات کا کسی حد تک اندازہ
ہوسکتا ہے۔ اس سے دہا کی شخصیت کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ اور وہ اسباب بھی سامنے آجاتے ہیں جن کی بنا پر اسے ناکامیوں سے دوچار
ہونا پڑا۔ اگر دیوان کے ساتھ ساتھ دہا کی دیگر تصانیف کو بھی سامنے لکھا جائے تو دہا اور اس کے دور کی بڑی دلچسپ تاریخ مرتب ہوسکتی
ہے۔ ایسی تاریخ جس کے آئینے میں اس دور کے مشافہوں کی خوبوں اور کمزوریوں کا صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اور ان عوامل کا سراغ بھی مل سکتا
ہے جو مضمون کی تنظیم اثنان سلطنت کے آئنا خانہ ذوال کا باعث بنے۔

غالب کی مقبولیت کے اسباب

شیخ محمد اکرام

کلام غالب کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ اس کا حیرت انگیز تنوع ہے۔ مرزا کی شاعری زیادہ تر عشق و محبت کا بیان ہے لیکن دین، اور پیچیدہ خیالات کے طالب کے لیے یہاں معنی آفرینی اور نازک خیالی کے وہ نمونے ہیں جو دیوان غنی میں بھی مشکل سے ملیں گے۔ شاعر نے لوگوں کے لیے شوق و ظرافت ہے اور انسانی فطرت کی دوستانی مسما ہو تو یہاں وہ کہنے کی باتیں ہیں کہ جو ان میں چشم بصیرت کھلی جائے گی ان کا لطف بڑھتا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ دیوان غالب میں ہر شخص اپنی تصویر دیکھتا ہے اور لطف اٹھاتا ہے۔

اس سبب سے بے شمار نغمے ہیں اور ہر نغمہ دل آویز ہے۔ اس دل آویزی کی وجہ یہ ہے کہ کلام غالب فنی سنانی بالوں کا بیان نہیں بلکہ غالب غائب کے مشاہدات کا اہم نمونہ ہے۔ اس رباع پر دست قدرت نے سارے عمر ایک ایک کر کے بجا رکھے ہیں اور دیوان غالب افنی عسروں کی حد اسے بازگشت ہے۔

زخمہ بر تابد رنگ حسان می زلف
کس چہ داند تا چہ در ستاں می زلف

مرد و اثر رائے نے لٹیکے پتیر کے متعلق لکھا ہے: "وہ کیاب ترین چیز تھائی ایک پورا انسان۔" شیکسپیر کے متعلق تو یہ رائے اس کی کتابوں کے مطالعے پر ہی چلی ہے جن کی ناکوں تجربوں سے مرزا کو واسطہ پڑا تھا اگر ان کا مقابلہ شیکسپیر کے حالات سے کریں تو مرزا کا پلڈ شیکسپیر سے کہا نہیں رہے گا۔ مرزا کی زندگی میں ان کے ایک مخالف نے ان کے متعلق لکھا تھا: "آپ انتخاب زمان میں کیڑوں ہیں جس طرف طبیعت آئی اس کی خاک اڑائی۔ چنانچہ دھڑ دھڑ سے ہوناک لگائی تو وہ ظرافت پیدا کیا کہ مینا کے گروں میں شراب شوقین تھائی بادب پیش کش لایا اور قمار بازی پر چڑھیاں کیا تو وہ چھٹے چوڑی ہوئے کہ میر پٹا او بکھرے داؤں کھانے لگے۔" (گلستان بختراں)

لیکن تصویر کا لفظ ایک پولیس ہے۔ مرزا اگر سے خالص اور فارغ حال کے لیے پوری طرح خاک چھان چکے تھے تو شمع اور نصرت کی منزلوں سے بھی ناواقف نہ تھے۔ وہ بلی کے دوڑے عالم فضل حق تیر آباہی اور مولانا سعد الدین ان کے عزیز دوست تھے اور جس نفاست سے صوفیانہ راز و نیاز کی باتیں ان کے اشتعال میں ادھڑکی ہیں اگر وہ کے ہمت تھوڑے شعرا کے کلام میں ملیں گی۔ در رنگ لیون میں بلی کمر جو ان ہوتے لیکن زمانے نے ایک ایک کر کے اپنے نقش کے سارے تیران پر چلائے اور اگر وہ بزم شاد و موششر میں اجنبی معلوم نہ ہوتے تھے تو در بندوں کے مصائب بھی نوب سمجھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہے کہ میخواریا ہو یا محسب شوخی اور نظرافت کا دلدادہ

یا غرض غلطی پر یا عاشقِ مزاج، اسی سبب کے لیے کلامِ غالب میں کچھ نہ کچھ موجود ہے۔
مرزا کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ نئے نئے طرز کے آدی تھے اور ان کے خیالات کا جو اسلوب تھا آج نہ اس کی تائید
کر رہا ہے۔ ہم یہ ذکر کر چکے ہیں کہ مرزا انقلاب کے قائل نہ تھے، اپنی کچھ پر زیادہ عبور و سرکرتے تھے۔ ان کی جدت پسندی نئے مضامین اور
نئی تشبیہیں تلاش کرنے کے لیے نہ تھی بلکہ لغت، شعر، انشا اور دوسری علمی و ادبی باتوں کے علاوہ وضع قطع اور لباس میں بھی وہ اپنے پیشرو
اور ماحول کی پیروی کرنا ضروری نہ سمجھتے اور اپنی آرزو مانہ لکھتے بھی کرتے تھے جب کلکتہ میں ان کے اشعار پر یہ اعتراض ہوا کہ انھیں نئے عقیدے
کے وضع کردہ اصولوں کا خیال نہیں رکھا تو انھوں نے بڑے جوش سے کہا تھا کہ

وہ کہہ دیکس چرا باشم من نہ ایدم، محکم چرا باشم
یہ آرزو خیالی اور تقلید سے نفرت عمر بھر ان کی انبیازی خصوصیت رہی اور قومی خیالات کے موجودہ عبوری دور میں بھی یہی طریقہ عمل رہا
مقبول ہے۔ اسی طرح مرزا نے اپنے دوستوں کی کتابوں پر جو تبصرے لکھے وہ عام طور پر اگرچہ بلند پایہ نہیں لیکن ان میں اور مغربی طرز کی
تعاریف میں یہ بات مشترک ہے کہ وہ کتاب اور مصنف کی تعریف میں مبالغے سے پاک ہیں۔ اس کے علاوہ زبان اور محاورے کے چمکنا اور
خیال کو مقدم رکھنے کی خصوصیت کلامِ غالب میں موجود ہے مغربی شاعری کے اصولی تعقید بھی اس کے حامی ہیں۔ مرزا نے آرزو محض یہی
میں جو رنگ اختیار کیا وہ غازی خانی ان کی نسبت انگریزی خطوط نویسی سے زیادہ قریب تھا۔ ان سب باتوں کی وجہ سے موجودہ نسل
جس کی تعلیم مغربی اصولوں پر ہوئی ہے مرزا کے کلام اور اپنے خیالات میں دوسرے مشرقی شعراء کی نسبت بہت زیادہ باتیں مشترک
پاتی ہے۔

دورِ حاضر میں غالب کو خاص طور پر مقبولیت حاصل ہوئی ہے لیکن یہ عام خیال کہ غالب کے معاصرین نے اس کی باطل قدر
کی و انصاف کے غلط اندازہ پر مبنی ہے۔ اگر غالب کی شاعری اور شہنشاہی کی تدبیر کی تالیفوں اور ترقیوں کو زبان میں رکھیں تو خیال آتا ہے
کہ اگر غالب کے اردو کلام کو فوری مقبولیت حاصل نہیں ہوتی تو اس کا بڑا سبب کلامِ غالب کے اصلاح طلب، جیسے جیسے۔ ایک مدت
تک مرزا رنگ تبدیل پر فریفتہ رہے۔ پھر چند روز کے لیے سنبھلے تو اُردو و ہندو کو غازی شاعری شروع کی اور ایک ایسے گلستان کی
آبیاری کی جس میں عوام الناس کو بار نہ تھا۔ غازی شہنشاہی میں غالب نے ان اساتذہ کی پیروی کی جن کی جو تصنیف اور با تکلف شہنشاہی کی
مصنوعی شہرت کا جواب تھی۔ اگر معاصرین غالب نے ان چیزوں کو سراہا تو انھیں قبولِ عام کی سند نہ ملی تو وہیں حیران نہ
ہونا چاہئے کیونکہ انھیں تو اب بھی کوئی خاص فروغ حاصل نہیں اور اگر تمام حالات کو غور سے دیکھیں تو یہ چہلن ہے کہ بعض اہم امر میں نہ
غالب کی نہیں بلکہ معاصرین غالب کی تائید کر رہا ہے۔

عوام الناس مرزا کا یہ مصرع

شہرتِ شہر گیتی بعدِ من خواہم بردن

پڑھتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ مرزا کا وہی کلام آج الہامی سمجھا جاتا ہے جس کے متعلق ان کے معاصرین کہتے تھے کہ

مزا کہنے کا جب ہے اک کے اور دوسرا کچھ
اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھو تو کیسا کچھ
مخبران کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھ
کلامِ میر کلامِ میر نہ کچھ

ایک اور خط میں غزل کے لیے عشق و محبت اور مشرق کی ضرورت کے متعلق لکھا ہے:

”شعرا کی کہوں گا، غزل کا ڈھنگ لہولہا گیا مشرق کس کفر اردوں جو غزل کی مدح فرمیں آئے،
 رہا قصیدہ، ممدوح کون ہے۔ ہائے آفریں گویا میری زبان سے کہتا ہے۔
 اسے دروغا نیست ممدوحے سزاوار میرے
 اسے دروغا نیست مشرق سے سزاوار غزل“

قطع نظر اس امر سے کہ زنا قافیہ بیانی سے خود متفرق تھے۔ ان کے کلام سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ ان کی غزل ان کی اپنی دلہریہ شخصیت کا اظہار ہے۔ ایک شاعر کے خیالات میں بھی عام انسانوں کی طرح تغیر و تبدل جوتا رہتا ہے اور اگر آج ایک بات کا ایک پہلو نظر آتا ہے تو کل دوسرا چنانچہ دیوان غالب میں بھی یہ تنوع موجود ہے لیکن اس میں متضاد سے کوئی شعر ایسا ملے گا جسے قافیہ کی اس عظیم اور متنوع شخصیت سے ضرب نہ کیا جاسکے جس سے ہم یادگار غالب اور دوٹے معلیٰ کی بدولت خوب واقف ہیں۔ مرزا کا زاویہ نگاہ عام لوگوں سے کچھ با توں میں مختلف تھا اور ان کے زاویہ نگاہ میں انہی اشعار کی ترجمانی ہوتی تھی۔ مرزا نے بہشت کا ذکر بیشتر استہزا سے کیا اور یہ ان کے شخصی نقطہ نظر کا اظہار معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح فرخ کا ذکر ان کے اشعار میں کبھی جگہ آیا ہے اور سب جگہ استہزا۔ مذہب کے متعلق ان کے پیسوں اشعار ہیں اور ہر شعر ان کی وسعت نظر اور طبعی تشنگان کا اظہار ہے اسی طرح رشک کے مضامین ہوں یا انسان کی فطری مجبوریوں کا ذکر، مرزا کا اظہار کے اختلاف سے قطع نظر وہ مرزا ہی کے اسلوب خیال کو نمایاں کرتے ہیں اور بالعموم یہ خیال نہیں ہوتا کہ مرزا نے کوئی مضامین خاص سے مجبور ہو کر باندھا ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غزل ایک جامعہ موزوں ہے جو مرزا کی شخصیت پر راست آیا اور جس نے اس دلہریہ شخصیت کو اور نمایاں کر دیا۔

چرائی طرز کے نقادوں نے مرزا کے کلام پر جو اعتراض کیے ہیں وہ یا تو زبان کے متعلق ہیں یا فعل اسرار دلہے، ”بہی کھاتہ والوں کی نقاد“ یعنی سر قند اور نواز کی بحث۔ مرزا یا اس اور مولانا آزاد (مولانا عبد الباقی آسی) نے محنت و تحقیق سے اساتذہ قدیم کے کلام سے بعض اشعار ایسے ڈھونڈ نکالے ہیں جن کے مضامین غالب کے اشعار سے ملنے جھلنے ہیں۔ کسی زمانہ میں ٹٹن کے اشعار کے متعلق بھی اسی طرح کا حساب کتاب ہو کر تھا لیکن اس سے اس کی شہرت کو کوئی مضمت نہیں پہنچا کیونکہ ایک ترقی پسند گروہ نے اسے کھینچا تھا۔ میں کوئی چیز یا نکل ہی نہیں“ اور دوسرے کسی شاعر کے چند اشعار میں تو اور دیا سر قند ثابت کرنے سے اس کے باقی اشعار کی خوبیاں منہ منہ نہیں ہوتیں۔

آتش کی صوفیانہ شاعری

احسان حسین

انگریزی، ہندی اور فارسی کی طرزِ اردو ادب میں بھی صوفیانہ شاعری کی ایک اہم روایت ملتی ہے۔ ولی، محمد تجری، میراج اور ملک آبادی، خواجہ میر درد، میر تقی میر، غالب، آتش، آستی غازی پوری اور اقبال اس سلسلہ کی مضبوط گڑیاں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک صوفیانہ اردو روحانی تجربے کے مختلف حوالے سے تعلق رکھتا ہے۔

تصوف حیات و کائنات کے سمجھنے کی صحیح کوشش ہے یا نہیں۔ اس بحث سے قطع نظر تصوف سے زندگی اور ادب میں ایسے دھماکے اور ایسی گہرائیاں ضرور پیدا ہوئیں جنہیں کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ تاریخ ادب کے ایک شخص دو۔ میں تصوف شاعری میں اس طرح دس س لیا کہ حقیقی اور معنوی جذبات اور حال و قات میں تیز کرنا مشکل ہوگی۔ وہ شعرا جو مولانا مونی تھے ان کا تو پوچھنا ہی کیا۔ جن کو تصوف سے کوئی خاص تعلق نہ تھا وہ بھی شیخ علی حربی کے اس مقالہ پر عمل کرتے نظر آتے ہیں کہ تصوف پر اسے شعر گفتن خوب است چنانچہ اردو شعرا میں بھی دو ذوں طرح کے لوگ ملتے ہیں۔ وہ واقعی اس وادی کے دیرو اور اس دہا کے شاعر ہیں اور وہ ہر ساری تصوف کو دہرے مضامین کی طرح ایک معنوی کچھ کو شعر میں جگہ دیتے ہیں۔ دو ذوں جمیعتوں میں معنی وہ فرق نہیں ہے جسے اظہار بیان کے نازک اختلاف سے واضح کیا جاسکے۔ بلکہ اس سے تصوف اور زندگی کے تعلق، روحانی داخلی تجربے اور مادی اندازِ نظر کے اعتقاد پر بھی روشنی پڑتی ہے اور حقیقی صوفیانہ شاعری، ایسی صوفیانہ خیال آرائی سے الگ ہوتی ہے۔

خواجہ جہد علی آتش صوفی شعرا میں گئے جیسے ہیں۔ اور ایسے صوفی شاعر میں جو معنی قابل کے شاعر نہ تھے بلکہ صاحبِ حال بھی تھے۔ وہ باقاعدہ صوفی نہ بنی لیکن ان کی زندگی اور شاعری پر نظر رکھ کر انہیں بڑے صوفی شعرا میں شمار کرنا ہی پڑے گا۔ وہ دہلی کے ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جہاں تصوف اور پیری مریدی کا زور تھا۔ یوں انہوں نے اپنی زندگی میں گھر کی وہ بہار نہیں دیکھی وہ وطن سے دور چھڑھتے ہوئے سڑج کے شہر فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ جہاں زندگی کی جدوجہد میں شریک ہونے کے لیے انہیں آبائی مسلک کو خیر باد کہنا پڑا۔ بقول آقا دادا انہوں نے شاعری اختیار کی اور خاندانی طریقہ کو سلام کر کے ان میں سے فضا آزادی اور بے پروائی کو یافتہ میں سے لیا۔ آزاد کے چہرہ الفاظ آتش کی شخصیت اور مزاج اور ان کے تصوف کی نوعیت پر بہت اچھے تبصرے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تصوف کے اعلیٰ معیار کو پیش نظر رکھتے ہوئے آتش کو روحی، انسانی، عقائد اور دینی بحث میں شمار کرنا صحیح نہ ہوگا۔ چہ جائے کہ ان صوفی شعرا کا ہم تجربہ قرار دینا جن کے اقوال اور مفروضات سے تصوف کی تاریخ مرتب ہوتی ہے لیکن پھر بھی ان کی زندگی اور شاعری دونوں

میں نقوت کی مدوح صوفی کی وسعتِ نفرا و صفائے قلب، قناعت پسندی اور استغناء کے وہ مہوسے نغز آتے ہیں کہ انہیں صوفی شعرا کی بزم میں جگہ دینا غلط نہ ہوگا۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ باقاعدہ کسی صوفیانہ تحریک یا سلسلہ سے وابستہ نہ تھے۔ لیکن اپنی ذات سے مزدور صوفی تھے۔

اُردو شاعری میں ابتدا ہی سے صوفیانہ خیالات ملتے ہیں۔ یہ ترکِ معرفت فارسی شاعری سے نہیں بلکہ اس زندگی سے ملتا تھا جو مذہب کے حدود کے اندر آزاد خیالی کا اور جاگیر دارانہ تمدن کی تقسیم کے اندر عوام کی بہبودی کا تصور رکھتی تھی۔ اس میں ہندی نقوت کی آمیزش بھی نغز آتی ہے۔ دنیا کی تاریخِ نقوت دلچسپی جاسنے تو بہت سے خیالات میں یک۔ ٹی اور یگانہ پائی جائے گی۔ حالانکہ ہر ملک میں اس کے ارتقا کی نوعیت مختلف ہوگی۔ اسی وجہ سے بعض معمار کا خیال ہے کہ نقوت کا تعلق کسی مخصوص مذہب یا قوم سے نہیں بلکہ یہ زندگی کو سمجھنے اور کائنات کی حقیقت کا نامعلوم کرنے کی اس فطری خواہش کا قیہ ہے۔ جس سے کوئی دل خالی نہیں۔ لیکن اس کا نام معلوم کرنا ہر شخص کے امکان میں بھی نہیں ہے۔ بقول آتشؔ :-

یہ کینیت سے مٹی ہے جو جس کے مفرد میں

مئے الفت نہ خرمی ہے نہ شیشے میں نہ سر میں

ہر شخص قوم اور ملک کی باطن کی حقیقتِ تاریکی بڑا کر کرتی ہے اور مختلف ملک میں جاتے ہیں بعض مکارے اسے باطنی آریائی تصور روحانیت اور باطنیت قرار دیا ہے۔ بعض دوسرے مغربین کا خیال ہے کہ اس کی نقوت یہ زوالِ طوفانی فلسفہٴ مشرق کا لہر اڑا ہے اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دوسری صدی ہجری سے اسلام پر یونان اور اسلندہ کے فلسفین کا واضح اثر پڑنے لگا تھا اس لیے اگر مذہبی انتشار کے اس دور میں اثرِ اقلیت نے مسلمانوں کے عقیدہٴ توحید کو تڑپا کر توحید کی بات نہیں۔ مگر مسلمان صوفیوں اور مغربوں میں بہت سے ایسے ہیں جو اسے خاص اسلامی بناتے ہیں۔ یہ مٹی نہیں ہیں۔ اور ان کے پھرنے کا یہ تو قہر نہیں تاہم ان کا کبنا مزدوری ہے کہ ان کو نقطہٴ نظر کا اختلاف نہ ہوگا۔ اگر مختلف اوقات کی کا، قربانی نہ ہوگی اور تلاشِ حقیقت کا خواب کثرتِ تعبیر سے پریشان نہ ہوتا تو خود صوفیوں کے لئے کتبِ خیالی اور سلسلے نہ ہوتے۔ اس لیے ہندوستانی شاعر کے صوفیانہ خیالات میں، اگر اسلامی اثرات کے علاوہ دیدہ نامی اور اثرِ اقلیت مہریدہ کے فہم بھی جھلک اٹھتے ہیں تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں۔ مکتبِ نقوت کی پیدائش میں عوامی تحریکوں کے اثرات کی جستجو میں اس کو بے موقع ہوئی۔ کیونکہ آتشؔ کا تصورِ خرم صوفیانہ تحریکوں کے زوال یا پیرودہ سے ملحق رکھتا ہے۔ آتشؔ کی صوفیانہ شاعری کے کچھ حصے میں تصوف کے کسی مخصوص سلسلہ کو چہن نظر نہ لکھا بھی ممکن نہ ہوگا۔ بلکہ نقوت کی اس عام روح کو دیکھنا ہوگا جو مختلف مکتب میں مشترک ہے۔

آتشؔ کے صوفیانہ خیالات کی موزوں سے زیادہ توان کی آزادگی پسندی تعیناتی اور روحانی نمرتی میں برتی ہے جس سے ان کی شاعری ہمیں چمپی ہے۔ لیکن نقوت کے وہ مقامات بھی ان کے بہان آتے ہیں جن کا تعلق معرفتِ نفس، فناء کے خوری، وحدت و وجود ترک دنیا، حجاز و حقیقت، جبر و اختیار، سہی انسان کی بے باقی اور عظمت، ترک رسوم اور شعری تخیل سے ہے۔ یہ وہ کوسٹیاں ہیں جن پر آتشؔ کا نقوت پلکا جاسکتا ہے۔ اور انہیں ہم مہمان کی کی آتشؔ اور توحید سے نقوت کے حدودِ معین کیے جاسکتے ہیں۔ جہاں ناک آتش کا تعلق ہے ان کا نقوت رسمی یا شاعرانہ نہیں تھا۔ بلکہ ان کی روح اور شخصیت، ان کے عقائد اور طرزِ معاشرت کا آئینہ تھا۔ ان کی قناعت پسند اور سادہ زندگی، مہمان کی اور بے باکی، احساسِ فردیت اور جذبہٴ عظمت سے ان کے اشعار بالا مال ہیں۔ ظاہر ہے کہ اپنے محققانہ منہم میں یہ مسائل نقوت

نہیں ہیں۔ لیکن صوفی جس منہائے قلب اور تزکیہ باطن پر زور دیتا ہے۔ اس کی اخلاقی مظہر بھی خصوصیت ہیں۔ آتش کی شاعرانہ نشوونما کھنڈوں میں ہوئی۔ ابتدائی زمانے کو چھوڑ کر کھنڈوں کی شاعری میں تصوف کی بہت کمی نظر آتی ہے۔ اس کے احباب تھے جن سے بحث یہاں ضروری نہیں۔ لیکن ہے یہ حقیقت کہ آتش سے پہلے یہاں تصوف کا ذکر ضرورت کم تھا بلکہ دسی بھی نہ تھا۔ انہوں نے اپنی آواز دہری، غلوں، اہلنفاستی، مسمیٰ کو دار اور مدنا نہ بانگین سے تصوفات کے خالی شیشوں میں تند و تیز نثراب بھری اور طراوت کی بے پناہ آغزی میں باطنی واردات کے چراغ جلائے۔

تصوف کا سب سے اہم سکر معرفت خداوندی ہے۔ اور اس کے بزرگوں پہلو ہیں۔ مذہب اسلام نے بھی عقائد میں توحید کو پہلی جگہ دی ہے۔ لیکن صوفی کا وہ مذہب جو خدا کو تصوف رُوح کے عام تصوف سے بہت مختلف اور بہت پیچیدہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سادہ صوفیانہ نظام معرفت ہی کے رد گھوڑت ہے۔ الٹا فی تا، ایلات اور شاعرانہ نازک خیالیوں نے اور دشواریاں پیدا کر دی ہیں۔ سادہ الفاظ میں اسے کچھ یوں سمجھ سکتے ہیں، خدا ایک ہے۔ یہی نہیں بلکہ اسے ایک کہنا بھی ٹھیک نہیں۔ خدا کے سوا کچھ اور نہیں ہے تو ہم کیا ہیں؟ کسی نے کہا ہم خدا ہیں۔ کسی نے کہا اس کا صغیر کسی نے کہا اس کا ایک حصہ، روح اکبر کا بدو، بحر حقیقت کا ایک قطرہ — یہی وجہ ہے کہ تصوف کے زیادہ تر مکاتب وجود انسان کی کو خدا سے دوری اور جبر سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور اسی ذات میں ملی جانے کو روحانیت کی معراج قرار دیتے ہیں۔ آتش کے یہاں یہ مضمون مختلف اشاروں، کشیوں اور استعاروں میں دالبا نہ جوش کے ساتھ بیان فرما ہے۔

جواب آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشتی کا نہایت غم ہے اس قدرے کو دریا کی جدائی کا
تعلق روح سے مجھ کو جسد کا ناگوارا ہے زمانے میں میں ہے جاہل دن کی آشتی کا

اداس قالیب خالی ہیں۔ روح جہتی ہے مکان سے تنگ ہے مشتاق نامکان ہرما

آدمی کو موت کے آنے کی لازم ہے خوشی عید ہے جس روز چھٹکارا ہوا جموں کس کا
ان تمام اشعار میں ایک ہی سانچہ رہا ہے۔ خدا اصل ہے۔ اور انسان اس کا جزو۔ اس سے ٹکے کے لیے بے قرار ہونا ہی حصول معرفت کا نیز ہے۔ چنانچہ دوسرے صوفی شعراء کی طرح آتش بھی بعض اوقات مذہب اور شریعت کی ظاہری قیدوں کو توڑ کر اس اصل حقیقت کی تلاش میں مجنوں بن جانا چاہتے ہیں۔ تاکہ کوئی اور چیز، اپنی طرف، مٹی ہی نہ رک سکے۔ اس منزل پر پہنچ کر ظاہری رسم مذہب، کعبہ و بت خانہ کے اختلافات بہت حقیر معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اسے نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ دیوانگی مذہبی دیوانگی سے مختلف ہے۔ یہاں سادہ مذہب کی سماں ہے۔ اولہ و باں اپنے مذہب کے سوا اور کسی کی نہیں۔ آتش کے خیال میں یہ مذہب کی گرفتاری سے چھٹا ایسی دیوانگی ہے جو سب سے بڑی عقل مندی ہے۔

قید مذہب کی گرفتاری سے چھٹ جانا ہے
ہو نہ دیوانہ تو ہے عقل سے انسان خالی
کعبہ و دیار کے اختلاف کی حقیقت یوں بیان کی ہے۔

کعبہ و دیبر میں وہ خانہ برافراں کہاں گردش کافر دین دادیے پھرتی ہے

قول اپنا ہے یہ سجدہ زناہ کے یلے دو چہندے ہیں یہ کافر و بندار کے یلے

کوچہ یاد میں ہر روشنی اپنے دم کی کعبہ و دیبر کریں گہر و مسلمان آباد
کعبہ و دیبر کے باہر اس سرزمین کی تلاش جہاں خدا کی تلاش گہر و مسلمان بن کر نہ کی جائے، صرف آزاد خیالی کی منبر نہیں ہے
بلکہ شریعت کی حدود کے باہر نکل کر حقیقت کا عہد معلوم کرنے کی آرزو ہے۔ کعبہ اور بت خانہ کی حد بندی نے نگاہوں کی وسعت
چھین لی ہے۔ ایسے میں اس روت کائنات کی ہجو جو ہر کافر و دین دار کی جان ہے۔ شریعت کی حدود میں رہ کر نہیں کی جاسکتی۔

تیرے کوپے کا ہے اسے خازن خراب اسنا آج

شیخ کعبہ چھوڑتا ہے برہمن بت خانہ آج

اس مجر تفضیلی بحث کا مرقعہ نہیں۔ در نہ یہ دیکھنا مشکل نہیں کہ آتش کے یہاں شریعت اور طریقت کی وہ جگہ نہیں ہے جو اکثر
صوفی شعرا کے یہاں ملتی ہے۔ اور دونوں میں زبردست علیحدگی محسوس ہوتی نظر آتی ہے۔ آتش کے یہاں مذہبی جذبات اور خیالات میں بڑی تعداد
میں ملتے ہیں۔ جلیوں کو کہہ سکتے ہیں کہ وہ مذہب سے زیادہ درد نہیں جانا چاہتے۔ ان کے یہاں تنگ نظری باقی نہیں رہتی۔
ناقوس میں سے آئی صدائے ہر الغفور ہم تکلے گئے ہر مذہب سے ڈرے ہوئے

کستے ہیں سجدہ اسکی طرف کیا بھوکے لوگ کعبہ ہے نام ایک کشتہ خراب کا
مختصر یہ کہ آتش خدا کی مجسمہ اور عرفان حق کی تلاش میں پہل پڑنا چاہتے ہیں۔ اور جو دھر سے اس کی آواز سنائی دے اس کی
جھلک دکھائی پڑے اور ہری مڑھائے ہیں۔

چلا وہ راہ جو سالک کے پیش پا آئی

مصر گئی جو کہیں برے آشنا آئی

یہی مسلک طریقت کے مقامات ہیں۔ سالک کو بڑی ہر تیار سی سے قدم آگے بڑھنا چاہیئے۔ کیونکہ اس راہ میں ہمسائے اور
جھگڑائے والے بھی ملتے ہیں۔

طریق عشق کا سالک ہے، واعظوں کی ذہن

مٹوں کے کچھ لایا اعتبار راہ میں ہے

اگر کوئی راہ چھٹ گیا تو کسی طرف کا نہ ہوگا۔ آتش سننے اس خیال کو کتنی غریب مانتی۔ کتنے جوش اور ولہاں ہیں سے ادائیگہ ہے۔

پاؤں تراوہ جو عرق ہر اکسیر عشق میں

وہ داغ ہے جو دامن ساحل میں وہ گیا

اس طرح سادگ خاص طرح کی مٹی، وجدانِ ادب بے خودی کے سہاگے اپنی راہ طے کرتا ہے۔

سادگ راہِ محبت کو پس و پیش نہیں

مصکبت میں نہیں میں طاقتِ اندیش نہیں

اس کے سفرِ عرفان کی آخری منزل یہی ہے کہ فقرہ دریا میں ٹل جائے اور دیا ہو جائے۔ چنانچہ آتش بھی اسی جستجو میں ٹلنے کی تلخفیس بھیتے ہیں لیکن حصولِ مقصد کے لیے دیوانوں کی خاک اڑاتے بڑھتے جلتے ہیں، انہیں یقین ہے کہ خدا مہجد اور بت خانے میں نہیں رہا ہی میں ہے۔ لیکن جب تک ریاضت اور صغنائے نفس سے انکلیں روشن نہ ہو جائیں، خودی کا طسم ٹوٹ نہ جائے اس وقت تک وہ غل نہیں سکتا۔ تلخیوں اور استغماؤں میں یہ خیالات اس طرح غل ہر کوئے میں ہے۔

شیریں زبان ہوئی ہے نرگد کے دہن میں لیلے پکارتی ہے محزون کے پیر میں

واہ دی سبے بھری واہ دی نا بیانی صورت آباد سے شائقِ بقا جاتے ہیں

عارف ہے وہ جوشن کا جریا جہاں میں ہے باہر نہیں ہے یوسف اسی کا دواں میں ہے
انہیں یہ بھی یقین ہے کہ وہ باغِ آسے کا گرجا ہر کی ضرورت ہے۔
تھکیں جو پاؤں تو چل کر کے بل نہ ٹھیر آتش لگی مراد تو منزل میں خار واہ میں ہے

نغمے نہ مچر جو واہ میں تیری نکل چلے نل ہو گئے جو پاؤں تو ہم سر کے بل چلے

ہے اتھا دیو سے نرے موجِ اکب کا اسے مکر جس اپنا سمجھ آشنا مجھے

مذہبچا، اب تو نہ شائقوں سے ملے خود شیدو چرخِ گرداں کی طرح برسوں ہی سرگرداں کیا

صدایہ صید گاہِ عشق سے آتی ہے برسوں نشاندہ تیر کا ہو واہ کر فزاک سے پیدا

عرفان کی ان راہوں پر آتشِ ایک واقف کا سادگ کی طرح بے ٹکری سے چلتے ہیں۔ لیکن انہوں نے ملائذِ دنیا سے اپنا دامن پاک رکھا ہے۔ اردو شعرا میں غالب آتش کے یہاں فقرہ استغنا کا جذبہ سب سے زیادہ ملے گا۔ قناعت اور توکل کی دولت ملے کہ وہ ادبِ تمام چیزوں کو مشکور دینا چاہتے ہیں۔ سینکڑوں اشعار میں سے چند شعر دیکھئے۔ وہ آتش کی ترجمانی خود کریں گے۔
منزلِ فقرہ فنا جاکے ادب سے فاضل بادشہ تخت سے یاں پہلے اتر لیتا ہے

کچھ عزت میں قناعت کی جو بان خشک پر نصیب دنیا کی جو کچھ تھیں جیتا ہو گئیں

جو قناعت کے منے سے آشنا ہو جاوے گا بھیک کا کاسہ اسے دست دے دیا ہو جائے گا

نفسانہ رہتی ہے غافلہ ہمیشہ قناعت بھی بہادر ہے خزاں ہے

پھوڑ کی ہم نے امیری کی فقیری اختیار بروئے پریشی میں قائلین کو غموں کا مار کر

طلب دنیا کو کر کے زن مریدی ہو نہیں سکتی خیال آبرو نے بہت مردانہ آنا ہے

اس قسم کے نفرت کے انہار میں شاید ہی آدو کا کوئی شاعر آتش کے قریب پہنچ سکے۔ کیونکہ یہ بعض شاعری نہیں ان کی زندگی
مغنی۔ معمولی لباس میں گھٹیا سے مکان کے اندر، چھوٹی سی آمدنی کے سہارے اپنی چٹائی پر بیٹھے زندگی گزار دی۔ وہ حقیقتاً دنیا کی ان لذتوں کو
تھکرا دینے کی طاقت رکھتے تھے جو ان کی شفقت کو مجروح کرتی تھیں۔ ترک دنیا کا یہ جذبہ بعض خانقاہ میں بیٹھ کر جہدِ جات سے بچکنے کے
پیسے نہیں تھا۔ بلکہ اس میں ان کے مزاج کے استغناء کا کس ہے اور اگر استغناء میں بھی عود پیدا ہو جائے تو آتش کی نگاہ اس کا پردہ بھی
چاک کر دینے پر آمادہ نظر آتی ہے۔ مذاپ بھر دے تو یہ توکل تھا۔

قیمت میں جو کچھ ہے سو اسے گا آپ سے

جیسا بیٹے نہ اُمید نہ دامن پسایئے

اور جب فقیروں کے کبر و نخوت پر منتظر جاتی تھی تو کہتے تھے۔

دعوت کو منیٹے پر ہے ان عزت گوینوں کو

حسیر کہنہ دیکھا، دستِ خشک دہائے شل پایا

جو روافیاء بھی مونیانہ خیالات میں اہم جگہ رکھتے ہیں۔ صوفی عام طور سے نسیم و رضا کا بندہ ہوتا ہے۔ اور سب کچھ خدا

ہی کی عزت سے بھرتا ہے۔ آتش کے یہاں بھی مونیانہ روایت نظر آتی ہے۔

پھرتا ہوں پھیرتا ہے وہ پردہ نشیں جدھر

بہن کی طرح سے نہیں میں اختصار میں

افتخاری حرکت جان نہ مجسودوں کی

یہ جاتی ہے جدھر ہم کو قصا جاتے ہیں

وہ بھی حقیقت تک پہنچنے کے لیے مجاز راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔
 خدا یاد آگیا مجھ کو جنوں کی بے نیازی سے
 ملاہام حقیقت زینت عشقِ عرب زلی سے
 آتش میں بھی فروتنی، خاکساری اور عاجزی ہے لیکن جہاں انسانی غفلت کے انکار کا موقعہ آتا ہے۔ وہاں وہ بھی اس عالم
 اصغر میں عالمِ اکبر دیکھتے ہیں۔

مجھے آتشِ زکوٰۃ کی آگ کو حقیقت
 نہیں اسرار سے یہ خاک کا پتلا خالی

بہر حال آتش اور دھوئی شعراء میں ایک اہم جگہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے تصوف سے جو غارت خانہ رنگ لیا۔ اس میں سپاہیانہ اور
 مردانہ جذبات کی آمیزش کر کے نہ صرف لکھنؤ کے شاعرانہ رنگ میں لگی، ذوق اور چمکھان پید کیا بلکہ خود آدو شاعری کو نئے امکانات اور
 میلانات سے آشنا کر کے اس کا دامن وسیع اور گراں باد کر دیا۔ ان کی شاعری اسی تصوف کے اثر سے زیادہ تر آزادی اور عظمت انسانی کے
 صحت مندی حالات سے بھری ہوئی ہے۔ جسے وہ اپنے دور کے شاعرانہ رنگ میں زیر سمولی قوت اور جوش و روانی اور غلوں کے ساتھ پیش کرتے ہیں
 کو نیا یہ خیالات تاہم کئی جہوں کی وجہ سے اظہار کی گئے ہیں۔ لیکن جدوجہات کی تمنائیں اور انسان کو حقیقت سے ہم آغوش اور ہم آہنگ
 بنا دینے کی خواہش آتش کو ان روایت پسند ہمارا اور اسلوب پرست شاعروں سے بہت بلند کرتی ہے۔ جن کے پاس کھوکھلے الفاظ کے سوا
 اور کچھ نہیں ہوتا 4

مذہب دار شاعر

محمد حسن عسکری

جرات پر معنوں کھٹنے میں اس انداز سے بیٹھا ہوں کہ جیسے امتحان کا پرچہ کرنا ہو۔ بلکہ اپنا امتحان بیٹھنے کے لیے ہی میں نے یہ موضوع چھانٹا ہے۔ میں نقاد نہ ہوں، مگر ایسے معنوں کو لکھتا ہوں جہاں میں مختلف قسم کے کھٹنے والوں پر اپنی رائے یا اپنے نقصانات کا اظہار کرتا ہوں۔ چنانچہ مجھے دیکھنا یہ ہے کہ میں تنقید نگار کس حد تک اس کے آسکر و اٹلٹھنے کہا ہے کہ ہر قسم کا اسلوب تو میں نیام واسے کو پسند آتا ہے۔ یہ فقرہ فن کار کے لیے تو جوی مددگار دست ہے اور تنقید نگار کے لیے بھی ایک مددگار دست ہے۔ لیکن پھر بھی ہم تنقید نگار سے یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ اپنے ذاتی مزاج کے اندر کھٹ کے نہ رہ جائے۔ بلکہ اپنی کائنات میں ایسی چیزوں کے لیے بھی جگہ رکھے۔ جو اس کے مزاج سے عداوت نہیں رکھیں۔ عداوت اور ناموافقت کی کس کسٹ فن کار کے لیے بھی مفید ہے۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ ٹیکسپیرا، ٹامس، جونس، میر جیسے فن کاروں میں عظمت اور آفاقیت اسی کی پھینچا مائی کے ذریعے آئی ہے۔ لیکن جو فن کار اپنے مزاج کے اندر بند ہو کر بیٹھ جائے اور ناموافقت چیزوں سے کراہیت اور عداوت کے سوا اور کچھ محسوس نہ کرے۔ اسے بھی ہم کسی نہ کسی مددگار اور معنوی بہت دیر کے لیے قبول کر لیتے ہیں۔ جیسے شہل اور غالب۔ اس کے برخلاف اگر نقاد اپنے مزاج کو اچھی خاصی کال کوٹھری بنا لے اور جو چیز اس کے اندر نہ سما سکے، اسے کائنات ہی سے خارج کرنا چاہیے۔ اس کے اندر ایک سرن پیدا ہو جاتی ہے اور پڑھنے والے کو سہلی ہونے لگتی ہے۔ یہ حال ایسے آدمی کے ساتھ ہوتا ہے یا آج کل میڈلن مری لا۔ اگر نہیں فتادبھنے کی صلاحیت ہی ہو تو ہی کم سے کم ایسا نقاد نہیں بننا چاہتا جو لوگوں کو پیام زندگی دیتا پھرے۔ لیکن مزاج کی ماد کردہ پابندیوں کے علاوہ بعض مجبوریاں اپنی خوش فہمی سے بھی پیدا ہوتی ہیں۔ میں نے دوتوں سے کوئی اضافہ نہیں کیا۔ لیکن کہتا ہوں کہ مجھے اضافہ نہ لکھنا ہے۔ اس اعتبار سے میں اپنا حق سمجھتا ہوں کہ میرے تجربات کا ایک مرکز اور دیر کی لادوں کا ایک مرکز ہو۔ چنانچہ میں پڑھتا بھی ایسی چیزیں ہوں جن سے مجھے پتہ چل سکے کہ مزاج تجربات ایک مرکز پر کیسے لانے جاسکتے ہیں۔ مجھے نہ توخم جاننا واسے پسند ہیں، نہ خم دوران واسے۔ نہ ایسے لوگ جو باری باری سے دونوں کا مزاج لیتے ہوں۔ میں تو ایسے لوگوں کو لکھتا چاہتا ہوں جن کے یہاں علم جائی اور خم دوران و دونوں مل کر اپنا کم حق بن جائیں۔ اپنے خم سے میرا مطلب یہ نہیں کہ آدمی میرے کے اپنی عروصوں کو دوبار کرے۔ چاہے وہ عروسی دکنار دیکھتا رہا والی ماہری کی طرح فرماؤ ہی ہی کیوں نہ ہو۔ اس اپنے خم سے مراد وہ شخصیت درد ہے جو انسانی ہستی اور انسانی زندگی کی تفتیش کا ذریعہ بننا ہے اور جس میں کائنات کا خم و نشان و ہن جاسکے۔ تو ت اور دیر لائی موجود ہوتی ہے۔ مثلاً ٹامس، چاسٹر۔ ٹیکسپیرا، ادیجر۔ جو کس کے یہاں یہ اپنا علم کس طرح شروع ہوتا ہے۔ اس کا بیان میر

نے بڑی ابھی طرح کر دیا ہے۔

دل نہیں مجھ کو طایہ کوئی جی کا ہے دہال
خود بخود جاتا ہے کہتا آرزو کیا ہے اسے
یادیں بری ہزا ہر کچھ سبب تو ہے بجا
نے کس کو گیسو دکال کا دابستہ ہوں میں
کہا کروں اپنے لئے بے وجہ عرض تجھ سے بیان
سے ہم درد جدائی ہے - اندوہ وصال

یہ ستم عاشق بظاہر لبیک می کاہ و دم

مگر مجھشت و غمی دامن چرمی خواہر دم

اردو شاعری کی تاریخ میں بعض لوگ ایسے ہیں جن کے یہاں یہ غم پیدا ہو کر اپنی نفسیات کی تحقیق کا ذریعہ تو بن جاتا ہے مگر انسانی زندگی یا کائنات کی تفتیش تک نہیں پہنچ جاتا۔ مثلاً مرتضیٰ جبرست سے لوگ ایسے ہیں جو دکھ درد کا ذکر تو کرتے ہیں۔ مگر ان کی کاروائی یا عوامی محض ایک وقت کے ایک محدود ہر کے رہ جاتی ہے۔ اور انہیں اپنی پوری شخصیت پر بھی غور کرنے کی ترغیب نہیں دیتی۔ اس لیے ان کے یہاں وقتاً فوقتاً شش کاظم تو نماز آتا ہے۔ مگر اپنا غم پیدا ہی نہیں ہوتا۔ مثلاً جبرست۔ اسی لیے میں نے اپنا امتحان لینے کے لیے جرات کو چھینا ہے۔ میری طبیعت کو جبرست سے کتنی ناصدقت ہے یہ اسی سے ظاہر ہے کہ معنوں گھسنے کے لیے میں نے ان کا دوبار تین دفعہ پڑھا۔ مگر مجھے ان کا ایک بھی شعر یاد نہیں ہو سکا۔

یونگ نے یہاں میری کے تعلقات پر ایک مضمون لکھتے ہوئے بتلایا ہے کہ ان دونوں میں ایک فریق تو CONTAINER ہوتا ہے۔ دوسرا CONTAINED پہلے فریق کی شخصیت اتنی پیچیدہ، متنوع اور پیلوں ہوتی ہے کہ دوسرا اس کے اندر سما جاتا ہے۔ مگر چونکہ پہلے فریق کے اندر بہت سے خانے خالی رہ جاتے ہیں۔ اس لیے آسروگی دونوں کو نہیں ملتی۔ آسروگی حاصل کرنے کے لیے مجبوری ہے کہ یا تو پہلا فریق سکوت سے یا دوسرا فریق پھیلے۔ چنانچہ مکمل ہم آہنگی حاصل کرنے کے لیے یہاں میری میں ایک کش مکش سی شروعات ہو جاتی ہے۔ میرے خیال میں بالکل یہی نقشہ ایک شاعر اور ایک قاری کے تعلقات کا ہے۔ خیر ایسے شاعروں کا ذکر کرنے کا تو سوال ہی نہیں جن کی شخصیت ایک عام قاری سے بھی محدود ہو۔ انہیں تو ہم ادب کی تاریخ میں شامل ہی نہیں کرتے۔ لیکن ایسے شاعر بہت سے ہیں جو ہماری شخصیت کے بعض پہلوؤں کو پوری طرح مطمئن کرتے ہیں۔ اور ہم ان سے خودی دیر کے لیے جی بھر کے لطف لے سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ وہ ہماری شخصیت کے بہت سے خاصا صفت کو تشہیر کرتے ہیں۔ اس لیے وہ ہمارے حیرن ساقی نہیں بن سکتے۔ مثلاً اگر اس کے برخلاف تیر جیسے شاعر کو پڑھتے ہوئے ہم فوراً CONTAINED بن کے رہ جاتے ہیں۔ اور ہمیں نا آسروگی یہ دہتی ہے کہ شاعر کی طبیعت کے بہت سے خاصہ کا جو اب ہمارے پاس موجود نہیں۔ نیز کہ پڑھنا تو ایک ابھی خامی جنگ ہے جو ہر ہمارا ہی رہتی ہے۔ اس کا احساس اس آرزو کے ہر شاعر کو رہا ہے اور آرزو نے یہ کاکھارت ایک CONTAINER پیدا کیا ہے — فراق — [میں یہ دعوے نہیں کر رہا ہوں کہ فراق صاحب تیر سے بڑے شاعر ہیں۔ مگر اپنی باز مدتوں پہلے کہ فراق کے بعض مطالبات تیر سے بھی پڑے نہیں ہوتے۔] یہ تشکیک فراق نہیں۔ ان کی زندگی میں بھی لوگوں کو تیر سے جتنی عقیدت تھی اس کے باوجود وہ اپنے ہنسنے والوں سے مطمئن نہیں ہو سکے۔

کس کس کو اسے دیکھتے ہیں کچھ ملے سمجھا نہ کوئی میری زبان اس ویا در میں
تاہم کس کو جو حال ہی میر سے حال ہی اود کچھ ہے مجلس کا

ان شعروں میں اس زمانے کے سیاسی، معاشرتی اور سماجی حالات پر جتنی بھی تنقید شامل تھی جاسکے۔ اُس کے باوجود یہ حقیقت برقرار رہتی ہے کہ یہ ایک ایسی شخصیت کی نا آسودگی ہے جسے اپنے حیدر مندوں میں بھی تسکین کے سارے پہلو نہیں ملتے۔ بلکہ یہ بات تیر نے پوری وضاحت سے بھی کہی ہے۔

تو یہ چال میز سی، تڑی باست بروکھی
تجھے تیر سمجھا ہے یاں کم کسٹنے

تیر کے یہاں جو شخصیں پیدا ہوتی ہیں۔ اُن کی وجہ صرف یہی نہیں کہ اُن کی شخصیت اوروں سے زیادہ پیچیدہ اور پیہلو اور مٹی ہو بلکہ وہ اپنی شخصیت پر مسلسل مخلاتی زندگی کے ذریعے متنوع و فاصلہ کو ٹھکا کر ایک نئی چیز پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اُن کے اندر جس قسم کا مہذبانی عمل جاری تھا اُس کا ایک اشارہ اس شعر میں ملتا ہے۔

نہیں جیر مستان صحبت کا باب
معاہدہ کو کوئی ہمیشہ یاد سا

مستانہ میں اود ہشیاری کے ان متضاد تقاضوں کو سہلانا عام آدمی کے بس کی بات نہیں۔ اسی لیے اپنی سہولت کے لیے ہر ممکن دالوں نے یہ مشہور کر دیا کہ تیر کی شاعری واہ نہیں آہ ہے لیکن جن شاعروں نے واقعی تیر سے اُلجھنے کی کوشش کی، اود محیر رہا۔ یہ بڑا پکارا کیلئے ————— سولے فراق کے۔ [دوسرے شاعر تو ہیں، انھوں نے کیا کیلئے کہ نہ بڑا پڑ نہ بڑا تیر کا انداز نصیب۔ لیکن فراق صاحب احترام کے ساتھ ساتھ اپنے اختلاف کا بھی اعلان کر سکتے ہیں۔

جو ہوتا: دنگ جیر و میرزا فراق ہی کیا تھی۔]

غرض یہ کہ تیر کو چھٹا مہر کا جھگڑا مول لینا ہے۔ اس کے بغیر عام آدمی کو حرکت کے معاملے میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی بلکہ نہ کوئی CONTAINER بنتا ہے نہ کوئی CONTAINED۔ جرات جیسے شاعر اور عام پڑھنے والے کا معاملہ بالکل الٹا ملتی جوڑی کا ہے۔ چلی زن چل بیٹھ جاتی ہے۔ نہ تو شاعر کو پڑھنے والے کی گرفت میں آنے کے لیے سلاوا پڑتا ہے، نہ پڑھنے والے کو شاعر کے ساتھ ہم آہنگی حاصل کرنے کے لیے چینا مزدور ہے۔ جرات عام آدمی کے سارے جذباتی تقاضے پورے کر لے۔ اور قادی کو اپنے ذلتی عزائم کو کھٹے ل جاگتے ہیں۔ شاعری کی: میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔ والی تشریف الگو میں صادق آتی ہے جو حرکت کی شاعری پر یہ بات تیر کے شعری نہیں کی جاسکتی۔ تیر کی شاعری جذبات کو بغیر فراق صاحب کچھ اور بنا دینے والی شاعری جذبات کے بیان کی شاعری ہے۔ تیر کی شاعری خدا کا نام ہے، جرات کی شاعری بیانیہ۔

بیانیہ شاعری سے میں سیکھا کر ادلی ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے میں پھر تیر اور جرات کا موازنہ کروں گا۔ تیر کی شاعری محض اُن کی شخصیت کا اظہار نہیں ہے۔ اُن کو اُن کی شخصیت کے اندر ہی مختلف عناصر میں تغنا اور تضاد عام ہے۔ پھر جو فن کار اس تضاد کو سمیٹ کر اس کی قلبیہ اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ وہ شخصیت سے الگ اور اُد بہت ہی دھمکتا ہے۔ جرات کی شاعری اُن کی زندگی کا عکس ہے۔ تیر اپنے

آپ سے ملتی نہیں ہیں، ان کے لیے خالی تجربہ کافی نہیں ہوتا جب تک کہ وہ کچھ اور نہ بن جائے۔

دو سے پہلے سے اپنی ہی محبت میں

تمام عمر میں نکاحیوں سے کام لیا

تیر نفی میں انہماک ڈھونڈتے ہیں، ان کے یہاں شکست تو مل جائے گی۔ مگر شکست خوردگی نہیں۔ ان کی اندر کی ایک نئی تھکنش

کا ہمارا ہمتی ہے۔ حرارت نہ تو نکالی سے کام لیتے ہیں نہ کامزنی سے۔ بلکہ دونوں چیزیں ان کے کام آجاتی ہیں۔ دونوں چیزیں انہیں دلچسپ سے

دلچسپ تر بناتی ہیں۔ اس لیے دونوں پہلے خود اودھ کی نئی تشکیل کے بغیر بھی ان کے لیے کارآمد ہیں۔ یہ چیز ان کے لیے تجربات، بھی نہیں بلکہ

واقعات ہیں۔ اسی لیے حرارت شاعر سے زیادہ واقف نگار ہیں۔ شاعری نہیں کرتے بلکہ اپنی سوانح عمری لکھتے ہیں۔ ان کی شخصیت اودھ کی فن کاری

گری آسانی سے ایک ہوجاتی ہیں۔ یا یوں کہیے کہ ان کی شخصیت کے لیے فن کار ایک ماہر اسٹوڈنٹ کی طرح ہے جو واقعات انہیں پیش آئے

ہیں۔ چاہے وہ خارجی ہوں یا داخلی، حرارت ان کی تفتیش کرنے یا ان کا دستہ دوسری قسم کے واقعات سے ملنے یا ان کی سرمدوں کو توڑ کر

آگے نکلنے یا انہیں گھٹا کر کسے ساکنوں میں ڈھالنے کی کوشش نہیں کرتے۔ یہ تو نہیں کہا سکتا کہ وہ انشائی کی طرح محض خارج ہیں۔ اور ان میں

واقعیت نہیں۔ جتنے واقعات انہوں نے اپنی شاعری میں بیان کیے ہیں۔ ان میں یکساں کی صدی تو مزور داخلی وقتیت کے ہیں۔ مگر وہ ہر قسم

کی وارداتِ قلب سے کٹ لیتے ہیں۔ اس کا مطالعہ نہیں کرتے۔ ان کے لیے ہر واقعہ اور ہر مذہباتی کیفیت بھاسے خود مکمل ہوتی ہے

وہ اسے کسی دوسرے واقعے سے ملنے یا ٹکرائے نہیں دیتے۔ اسی لیے ان کے اندر کسی قسم کی کش مکش یا اقدام یا ٹکراؤ نہیں۔ خوش ہیں تو

خوش، رنجیدہ ہیں تو رنجیدہ، ان کی خوشی آتش کا انسانا ط نہیں بننے پاتی۔ ان کا دلچیز کیرا سا دودھ نہیں بنتا۔ بلکہ دھیدہ گیسے آگے نہیں بڑھتا۔

وہ جیسا مزاج لے کر پیدا ہوئے تھے جیسا مزاج ان کا بن گیا وہ اسی میں خوش رہے اور اسی کے اندر رہے کہ انہوں نے شاعری کی۔ اگر

کسی شاعر کا ظاہر و باطن، زندگی اور فن ایک سارا ہے تو حرارت کا۔ اگر کسی کی شاعری میں ممکن غوص و ادبی طلوس نہیں ملے گا تو حرارت کے

یہاں۔ سنبھلے ہیں کہ وہ خوش باش، خوش طبع، ظریف، لطیف باز اور عاشقِ مزاج قسم کے آدمی تھے۔ اہل دل نہیں تھے، بلکہ دل دالے۔ بلکہ دل

پھینک۔ یہ میں نے اعتراض یا طعن کے طور پر نہیں کہا۔ میں صرف ان کی شاعری کی صحیح تعریف معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ اور میرا احساس یہ ہے

کہ حرارت کی شاعری ان کی خوش باشی ہی کا ایک حصہ تھی۔ تیر کے اندر جو شاعر ہے وہ ان کی شخصیت کو کبھی قبول کرتا ہے۔ کبھی رد کرتا ہے

کبھی دونوں باتیں ایک ساتھ کرتا ہے۔ ہر حال وہ ان کی شخصیت سے باہر نکل جانے کے لیے ناتواں ہاؤں مانتا رہتا ہے۔ حرارت کے اندر جو

شاعر ہے۔ وہ ان کی شخصیت کے اندر رہتے ہوئے تو باہمی بے ہمہی محسوس نہیں کرتا وہ تو صرف اس شخصیت کا ترجمان ہے۔

یہ نہ سمجھئے کہ مجھے حرارت سے کوئی پرہیز ہے اور میں اس کی شاعری کو محض خوش باشی کہہ کر نہ مان چاہتا ہوں۔ اگر مانا جاتا تو پورا

مضمون لکھنے کی کیا ضرورت تھی، ایک فقرے میں ہی کام چل جاتا۔ حرارت کی زندگی میں شاعری کا کیا مقام تھا۔ یہ انہیں کی زبان سے پہلے میر

تو شاعری کے بارگاہ سے گھبرا کر گریج پڑے تھے۔

ہم کو شاعر نہ کہو تیر کہ صاحب ہم نے

درد دل اتنے کیجے جج تو دیوان ہنر

بقولِ قرآن صاحب، میر نے شعر نہیں کہا۔ تعریف کرنے والوں کے منہ پر جوتا مارا ہے۔ اس کے برخلاف حرارت کے لیے

شاعری، سماجی مقبولیت حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔

جرات جواب تیر تو ایسا ہی کہہ کے بس
چاروں طرف سے شور سنے واہ واہ کا

[اس جواب تیر کی ستم خوئی کا بھی جواب نہیں] شعر کہہ کر وہ یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ میں مجلسی کمالات کی پٹ ہوں اور فن شعر
بد مجھے قدرت حاصل ہے۔ اسی لیے انہیں تیر معصی، سودا جیسے استادوں کی زمین میں شریک بنے کا خاص شوق ہے۔ اس سے ان کا ہنر تو مزید
ظاہر ہو جاتا ہے، مگر وہ گھاتے ہیں اس لیے رہتے ہیں کہ دوسرا ہون کا قابل اور نقصا پیدا ہونے ہی ان کے شر کا ہلکا پن ابھر آتا ہے۔
معصی کی منزل کا یہ شہود شعر ہے :-

صبح پر یار کا ہے وعدہ وصل ایک شب اور بھی بیٹے ہی بنے
اس کا جواب جرات یوں دیتے ہیں :-

اُس کے آٹھ تک لے لی بہا جس طرح ہو سکے بیٹے ہی بنے
گولیں کا تقاضا ہے کہ استادوں کے نگ میں یا کم سے کم ان کی زمین میں کہا جائے، جرات اپنی ہر تیری جو حق منزل میں یہ بات
یاد دل دیتے ہیں کہ ان کے گرو دوسرے آدمی نہیں بلکہ شرفیے والے یار دوست ہیں۔ اور انہیں اپنا بھرم دکھانا ہے۔ جیسے دوسرے
اور دوسرے جرات نے لکھے ہیں، شاید ہی کسی شاعر نے لکھے ہوں۔ اور وہ ہر دفعہ بنا دیتے ہیں کہ ابھی کیا دیکھا ہے، اگے دیکھنا۔
ایک ہی چوہہ کہ منزل جرات ہوا تو کیوں غوسٹ
شرابی تو اور بھی ہیں پھر سے پڑھو انے کئی

ہے شگفتہ یہ منزل جرات منزل ہوا وہ بھی
دیکھیں معنون اس سے بہتر اور تو کیا لاکھ ہے

کہ جرات ایک اور منزل وہ کہ سب کہیں
کھنکھنے اُس کے دفتر اشعار گرم ہے

جرات منزل اک اور ملا تو کہ کہیں سب
کب ایسی گرہ اور منزل خواں نے لگائی

جرات سے اپنی شاعرانہ ذہنیت کی بالکل صحیح تعریف کر دی ہے، وہ شاعری نہیں کرتے منزل ملا تے ہیں۔ دراصل جرات
ان لوگوں میں سے نہیں جو اپنی شخصیت اپنے آپ بنا تے ہیں اور بناتے دہتے ہیں، جنہیں یہ پتہ ہی نہیں ہوتا کہ ہم جو نئی شکل اختیار کریں گے

اُس کے متعلق دوسروں کا اور خود بہار دودھ کیا ہوگا۔ جرأت تو ایک گڑا گڑا کر داری ہے، اُنہیں بھی معلوم ہے اور دوسروں کو بھی کہ اُن سے کن کن باتوں کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اُنہیں تو ماحول ہے کہیں دلچسپ آدمی ہوں اور لوگ مجھے پسند کرتے ہیں۔ اور وہ کسی سے ایمانی کے بغیر بڑے خلوص کے ساتھ جانتے ہیں کہ لوگ مجھے اور بھی پسند کریں۔ انہوں نے دنیا بھر کے تماشے دیکھے ہیں، جیسے جگہ آٹھ روٹی ہے دوستوں کی محفل میں بیٹھ کر اُن کا دل خوش کرانے کے لیے اُنہیں سیٹھڑوں تھتے یاد ہیں۔ یہ قصے اُنہوں نے نثر میں نہیں بلکہ شعروں کی شکل میں سنائے ہیں۔ اُن کی شاعری کی بنیادی تحریک یہی ہے کہ اپنے معاشقوں کے بارے میں دوستوں کے ساتھ میٹھ کر گپ کی جائے تاکہ مجلس میں گرمی آئے اور لوگوں کے دل میں اُن کی قدر بڑھے۔ اس مقصد میں وہ کاہن باب ہوئے ہیں اور لوگ ایک قعر سن کر دوسرا قعر سننا چاہتے ہیں۔

حسبِ حال اشعار کیلئے اپنے اب جرأت کچھ اور

یہ غزل تو تھی کئی یادوں کی گہوائی ہوتی

۔ یہاں یہ تنبیہ پھر مزودی ہے کہ دلچسپ آدمی بننے اور لوگوں میں مقبول ہونے کی خواہش کوئی بڑی بات نہیں ہے زندگی میں ایسے مزاج ایسے آدمیوں اور ایسی شاعری کی بھی مزودت ہے۔ میرا مطلب صرف اتنا ہے کہ ایسی شاعری یادوں کی محفل کے بغیر وجود میں نہیں آتی۔ یہ خود لاجی نہیں بلکہ گفتگو ہے۔ جس کے لیے دلچسپ ہونا لازمی ہے۔ یہ شاعری پڑے سنوں میں تھکتی محفل یا داخلی تجربات کی تنظیم یا امتیازِ قلب نہیں، بلکہ نوا واقعات کا بیان ہے جو شاعر کو پیش آئے۔ یہ مزودی نہیں کہ سارے واقعات حربِ ناک ہی ہوں، یہ دلچسپ آدمی جیسے پیسوں تھتے یاد ہیں۔ چونکہ خلوص اور صاف گوئی سے کام لے رہا ہے۔ اس لیے غرضیوں کی داستان بھی سنائے گا۔

سانپا اُس کو یہ قعر کہ بس آئینہ محفل آئے

لیکن ذہنیت ہوگی قعر گوئی کی ہی۔ اسی لیے جرأت کو مسلسل مزل بہت مزید ہے۔ مسلسل مزل کھنکھانے کے معاملے میں بھی جرأت غالباً سب شاعروں سے آگے ہیں۔ چونکہ یہ قصے یادوں کو سنائے جا رہے ہیں۔ اسی لیے اُن کی محفل میں ایسی روانی اور سلاکت آئی ہے اور اسی لیے پڑھنے والے کو بڑی آسانی سے قعر کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اس اعتبار سے اُن کا عشق اُن کی شہر گوئی کے لیے بڑا مفید ثابت ہوا ہے۔ کیونکہ انہیں سننے کے لیے اسنے قعر لے گئے۔ پھر شہر گوئی کی قدرت کے سبب ان کا عشق بھی دلچسپ بن گیا۔ لیکن چونکہ اُن کے عشق کا ایک صرف یہ بھی ہے کہ دوسروں کی تعریفِ طبع کا ذریعہ ہے۔ اس لیے وہ اپنے عشق کو عام طور پر محاشقے کی سطح سے اُچھا نہیں اٹھتے دیتے۔ لیکن تھا کہ وہ حیرت کے زیراثر اپنے عشق کے معاملے کی طرف بھی راغب ہو جاتے۔ مگر یادوں کے زیراثر انہوں نے اپنی ہمتیوں کو واقعات میں جتنے دیا۔ اگر ہم ہر آتے کے ساتھ ذرا سختی کرتا چاہیں تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ یادوں میں مقبول ہونے کے لیے شہر لیتے تھے اور شہر لکھنے کے لیے عشق کرتے تھے۔ ہر حال اُن کی شاعری میں یہ احساس غالب ہے کہ شہر اور عشق دونوں مجلسی کمالات کا ایک حصہ ہیں اور خوش وقتی کا ایک وسیلہ۔

چنانچہ اُن کا فن اصل میں ماحول کا دریا اضافہ نہیں کا فن ہے، شاعر کا نہیں۔ یہاں زندگی کے سارے تجربات کے ایک سلسلہ مشقی میں لینے کی مزودت نہیں ہوتی۔ یہاں واقعات ذرا ذرا دلچسپ ہیں اور سلسلہ وار ایک دوسرے کے بعد آتے ہیں۔ یہاں تفصیلات ہی اہم

ہیں خصوصاً خارجی تفصیلات۔ اس قسم کا مشق مسلسل منزل میں بڑی اچھی طرح دھلتا ہے۔ حرکت کی بہت سی مسلسل غزلیں منظوم افسانے ہیں جن پر منزل کی حیثیت سے نہیں بلکہ مختصر افسانے کی حیثیت سے غور ہونا چاہیے۔ مثلاً وہ منزل جو اس طرح شروع ہوتی ہے۔

دگرچی دگے اُس سے کوئی خدا یا

شرارت سے جی جس نے میرا جھوٹا

چڑھ کر یہ کہا کی مشق کی نہیں بلکہ لڑائی کی ہے، اس جیسے شاعر کو اپنی پوری جتنا ساری تفصیلات سمیت یاد ہے۔ اور ان تفصیلات میں ایک منطقی تسلسل قائم ہے۔ اس کہانی کی ایک ابتدا، ایک انتہا، ایک درمیانی حصہ، ایک اگلی مرحلہ ہے۔ یہاں وہ بیرونی بات نہیں کہ ابتدا اور انتہا سب ایک دوسرے میں مدغم ہو جائے، اسی طرح حرکت کا وہ مشہور دستاورد

جادو ہے لکڑچوب ہے غضب قرہ ہے لکڑا اور قد ہے قیامت

ایک مکمل انسانہ ہے بلکہ اگر ہم چاہیں تو حرکت کے کلام سے اُن کی پوری سوانح خری مرتب کر سکتے ہیں۔ ہم یہ پتہ چلا سکتے ہیں کہ اُن کے محبوب پر وہ نشین بھی تھے۔ اور جے پر وہ بھی۔ معاشقہ کس طرح شروع ہوا، جب کی شکل و صورت کیسی تھی وہ اپنے عاشق کے ساتھ کس طرح چپن کیا، آخر کار کیا کیا۔ دقتیں سننے کیا درازدیاں کیں، عاشق کو کس قسم کی کامیابی یا ناکامی حاصل ہوئی۔ وغیرہ وغیرہ۔ غرض وہ لطیف واقعات بیان کر کے شاعری کرنا چاہتے ہیں۔

یا تو اُس کے گھر سے آتے تھے نہ اپنے گھر کو ہم یا اب اپنے گھر میں بیٹھے دیکھتے ہیں درد کو ہم

فما شاہے کہ جن دزدن ہیں اُس کے تر باخوش تھے توانا حق پھر گناہ تمام سے دل اُس آفتابان کا

اس لطیف واقعات بیان کرنے والی شاعری میں حرکت کے ذاتی مزاج کے علاوہ ایک اور بات کو بھی دخل ہے۔ معاملہ بندی اس کلام میں ملتی ہے جہاں مرد اور عورتیں ایک دوسرے سے باغلی اگے دھتے ہوں۔ ایسے حالات میں لوگوں کو گندی باتیں سننے کا شوق بڑھ جاتا ہے اور جن میں سے ایک جھگڑا دیکھ کر یا آنکھ نظر آجانا بھی گندی بات بن جاتا ہے۔ یہاں ذرا سی تفصیل بھی بذات خود دلف و دلیہ لگتی ہے اور لوگ درد لکھی کلمی منس دیتے ہیں۔ اسی لیے سرکہ کے بیان میں اُس قسم کی دلی پہی پیدا ہوتی ہے جو اکثر لکھنوی شاعروں کے یہاں ملتی ہے۔ یعنی سراپا کا مطلب جسم کی تفصیلات گزرا نے کا ہر جاتا ہے۔ حرکت جیسے شاعروں کی بدولت آدود شاعری میں حقیقت نگاری کا ہوا اضافہ ہوا وہ قابل قدر نو مزور ہے۔ لیکن دلچسپ واقعات یا مزے دار قہقہہ سنانے کے شوق میں حرکت اور معاملہ بندی دلسے شاعروں کو بعض دفعہ یہ بھی خیال نہیں رہتا کہ قہقہہ تو بھر گیا مگر شرمی ہو گیا نہیں۔

میں رو کر جو کہنے لگا دردِ دل

وہ منہ پھیر کر مسکراتے لگا

حرکت کے یہاں کہنے ہی شعریے ہیں گے جو حقیقت نگاری کی وجہ سے ہنس پھٹے بن سکے وہ گئے ہیں۔ چونکہ ایسی شاعری میں یہ خطرہ ہر وقت رہتا ہے۔ اس لیے حرکت کو زبان و بیان پر اُس قدرت اور اُس صنایع کی ضرورت پڑتی ہے جو حیر کے لیے

لازمی نہیں۔ اسی لیے میر نے ہدایت کی ہے کہ ہم کو شاعر نہ کہو، میر کا ذریعہ انہماک ان کا اسلوب، ان کی زبان تجربے کی اندرونی کشاکش سے پیدا ہوتی ہے۔ جرأت اپنی کہانی کو دل چسپ اور مزے دار بنانے کے لیے اپنی زبان دانی سے کام لیتے ہیں۔ میر کو زبان سے ہر وقت کشاکش کرنی پڑتی ہے اس لیے ان کے اچھے شعروں میں بھی بعض دفعہ بیان کا پتہ پن ل جاسکے گا۔ جرأت کو مزوجہ الفاظ میں نئی وسعتیں پیدا کرنے کی ضرورت نہیں پیش آتی، انہیں تو صرف مردوں غلط فہمیوں کا پتہ ہے۔ اس لیے ان کے اچھے شعرا بالکل گٹھے گٹھے ہوں گے۔ جو بے ساختگی آپ کو جرأت کے کہاں ملے گی، وہ میر کے یہاں نظر نہیں آسکے گی۔ جرأت عام طور پر اپنی بات پوری کہہ بیٹھے ہیں میر بعض دفعہ پوری بات نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ وہ مزہ تو دوزخ ہی استعمال کرتے ہیں۔ مگر میر کے یہاں وہ زبان ملے گی جو وسیع ترین انسانی تعلقات کے داخلی پہلو کی مانند لگتی ہے۔ جرأت کے یہاں وہ زبان ہے جو خارجی حرکات کے بیان میں کام آتی ہے۔ پھر میر کے یہاں زبان کی ایک اور معنویت بھی ہے۔ اپنی تیرھی چال اور دلکشی بات کی وجہ سے ان کا رشتہ دوسروں سے منقطع ہو گیا تھا وہ زبان کی حدود سے یہ ٹوٹا ہوا رشتہ پھر جوڑتے ہیں۔ کیونکہ جو زبان میر استعمال کرتے ہیں وہ سارے سماجی تجربے کا پتہ ہے۔ اپنے تجربے کو اس زبان میں سموتے ہوئے وہ اپنے آپ کو دوسروں میں پھر دم کر لیتے ہیں۔

ضعف بہت ہے تیر تیس کھانسی کی گلی میں دست جاؤ
مہر کو کچھ اور بھی صاف طاقت جی میں آئے دو

بڑا حال اس کی گلی میں ہے میر جو اٹھ جائیں دال سے تو اچھا کریں

اس کے برخلاف جرأت کی زبان سماجی تجربے کی زبان نہیں بلکہ سماجی تعلقات کی زبان ہے وہ لوگوں سے کہا جھگڑے، لوگ انہیں خود گریہ دیتے تھے۔ اس لیے انہیں اپنی معنویت دوسروں پر اور دوسروں کی معنویت اپنے اوپر واضح کرنے کی ضرورت نہیں پیش آتی۔ پھر وہ اپنے الفاظ میں متفاد قسم کے تجربے بھرنے کی کوشش کیوں کرتے؟ جن چیزوں کا وہ ذکر کرتے ہیں، ان کی قدمد تہیت خود ان کی نظروں میں اور دوسروں کی نظروں میں بھی معین ہے۔ سماجی تعلقات اسی مناجت کے بل پر چلتے ہیں۔ چونکہ انہیں یہ مناجت حاصل ہے لہذا وہ سماجی تعلقات کی زبان استعمال کر کے اسی مناجت کو اور ترقی دیتے ہیں۔

ان کی شاعری کی جو بنیادی ترکیب بری کچھ ہیں آتی تھی۔ وہ ترقی نے پیش کر دی۔ اب میں ان کے عشق کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ چونکہ میں ایسی باتیں کہوں گا جن میں جرأت کی شخصیت جھلکے گی۔ اس لیے میں پہلے ہی سے بتانے دیتا ہوں کہ میرا مقصد مفردہ نہیں جو مذکر کے بعد سے نیاک اور ثقہ لوگوں کا مانا ہے اگر اورت کی شاعری فاسقانہ ہے تو مجھے اس سے کوئی گہر نہیں ہوتی، اگر ان کا مجرب بازاری ہے تو مجھے کوئی وجہ نہیں۔ جو شاعری باوجود محبت جہانی خواہش کی بائزگی محسوس نہ کر سکے۔ وہ قوت اور عظمت سے بھی پاک ہوگی۔ ڈانٹنے جیسی پاک محبت کس شاعر نے کی ہے۔ مگر پاؤں اور فرائض کا کتنا نفسانی محبت کے سامنے اس کا بھی سراجزم کے ساتھ جھک جاتا ہے۔ لیکن جو نفسانی خواہش انسانی ہستی کے باقی عناصر سے، انسانی زندگی کے دوسرے پہلوؤں سے اور کائنات کی پیچیدگیوں اور وسوسوں سے الگ ہو کر محض اپنے اندر مرکوز ہو جائے وہ بڑی شاعری پیدا نہیں کر سکتی۔ اگر نفسانی خواہش آدمی کو اپنے جواروں و ملت دیکھنے پر آمادہ سکے تو گندی سے گندی بات، بڑی سے بڑی بات بن سکتی ہے۔ مثلاً YEATS نے کہا ہے۔

BUT LOVE PITCHED HIS MANSION IN
THE PLACE OF EXCREMENT;
IT CAN NEVER BE WHOLE OR SOLE;
THAT WHICH IS NOT RENT.

جنسی خواہش کے باوجود، مگر شاید جنسی خواہش ہی کی مدد سے، آدمی محبوب کے حسن میں ساری لائعات کا حسن دیکھ سکتا ہے

مثلاً فراق

مانگے بھی ہیں بیدار ذہن جاگ رہی ہے
بچھلے کو بھی وہ آنکھ کھیں جاگ رہی ہے

لیکن بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو محبوب کو دیکھ کر سسلی بھرتے ہیں۔ اور ان کی شاعری بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔
غیر اب جرات کی طرف آئیے۔ اس میں شک نہیں کہ نثر گوؤں کی رائے کے مطابق ان کے کچھ ہاں بازاری قسم کے فقرے بازی،
سوتیانہ بد مذاقی، گھٹیا اور چھپرے طعنے، اور ہذا ذہن میں جا کر آواز سے کہنے کا انداز موجود ہے۔

کیا کیا وہ خٹا محمد سے ہوا گھر سے نکل کے
جب ہیں نے پکارا اُسے آواز نہ دل کے

بندے کی سن سنارش بولے وہ یوں کسی سے
عاشق یوں ہی وہ صاحب سناے جہاں پر ہیں

دو دو جراب سخن اُس کو تو یہ جھٹھلا کے کہے
جل لے جل مجھ سے نہ ربات میں تار نکال

دام میں ہم کو لاتے ہو تم دل لٹکا ہے اور کہیں
شعر ٹھکانا ہم سے لڑ معنوں گھٹا ہے اور کہیں

گگ جاگلے سے تاب اب اے نازیب نہیں
ہے ہے خدا کے واسطے مت کر نہیں نہیں

ایک طرح سے دیکھتے تو آخری شعر میں جرات نے جو کچھ کہا ہے اس کا دل کا تعلق اور جرقہ دن نے اپنی ECSTASY میں مار ڈال
نے اپنی COY MISTRESS میں اس سے زیادہ اور کیا کہا ہے؟ بھول ناں صاحب، سب وہی بات ہے۔ بہتر کے شعر میں بھی اس
کے سرا اور کیا دکھا ہے؟ —

ہم فیروز سے بے ادائی کیا

آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

یہ مرث بڑے شاعر اور چھوٹے شاعر کا فرق نہیں ہے۔ یہ فرق ایک خواہش کو باقی سب خواہشوں سے پہچاننا

سرگرمی کو باقی سب سرگرمیوں سے الگ کر لینے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ صاف صاف تو کیا کہوں، نقد لوگوں کے درمیان دہنا ہے۔ ہوں سمجھتے کہ مندر بالا شعرا ایسے آدمی کے ہی ہوسکتے ہیں جو موت اپنی ناک سے آگے نہ دیکھ سکتا ہو۔

لیکن اس بازاری پن کے باوجود یہ کہنا غلط ہو گا کہ ان کا عشق "غص" چھیر چھڑایا ہنس و ہنر ہے۔ یا ان کے عشق میں شدت اور خلوص نہیں۔ یہ چیزیں ان کے اندر موجود ہیں۔ بلکہ اس شعر میں بھی موجود ہیں۔

جب یہ سنتے ہیں وہ ہراسے ہیں آگے بڑھے

کیا در وہام پہ ہم چہرے ہیں گہرائے ہوئے

لیکن بڑی شاعری اور بڑی شخصیت کی تو یہ عرض شدت اور خلوص کی بنا دوں پر نہیں ہوتی۔ جذباتی خلوص اور اخلاقی خلوص میں بڑا فرق ہے۔ جذباتی خلوص تو ایک لمحے کی چیز ہوتا ہے۔ اخلاقی خلوص اس وقت پیدا ہوتا ہے کہ جب مختلف قسم کے مخصوص اور شدید جذباتی لحظوں کو ایک دوسرے سے ملے اور ٹکرائے دیا جائے۔ غصہ اتنا کہ دینے سے کام نہیں چلتا کہ حرکت کی محبت دیر پائیں ہوتی یا وہ صرف وقتی تسکین دھونڈتے ہیں۔ ہنگامی عشق بازی تو شاید واسطے نئے محبت سے زیادہ کی ہوگی۔ ایسی محبت جس کے خلوص اور شدت میں ازل سے لے کر اب تک کوئی فرق نہ آئے، انسانوں کا کام نہیں۔ واسطے والی ذہنیت سے پاک وہ کریمی فراق صاحب نے کہا ہے۔

یہ کہہ کہ میں کرتا ہوں عرض قنات

نگاہ محبت کے دھوکے نہ کھانا

حرکت کی محبت جھوٹی نہیں، اگر ان میں خامی یہ ہے کہ ان کا خلوص جذباتی ہے، اخلاقی یا عقائدانہ نہیں۔ انہیں تجربات تو بہت سے حاصل ہوئے ہیں۔ لیکن وہ سب ہی کر ایک تجربہ نہیں بننے پائے۔ انہوں نے ہر تجربہ کو اپنی اپنی جگہ قبول کر لیا ہے۔ سب تجربات پر ایک ساتھ اخلاقی یا تحقیقی عمل نہیں کیا۔ ان کی زندگی محبت کا مجموعہ ہے۔ لیکن اس کے اندر کوئی ایسا عنصر نہیں جس میں ساری زندگی سمٹ آئے ان کے یہاں تضاد تو بہت ملے گا۔ لیکن اس تضاد سے کوئی نئی وحدت وجود میں نہیں آتی۔ ان کا روحانی سفر ایک قص کی شکل کسی اختیار نہیں کرتا بلکہ ایسا ہے جیسے کوئی منہ اٹھائے چلا جا رہا ہو، اور وقتاً فوقتاً راستے کے مختلف نظاروں سے مختلف قسم کا لطف لے لیتا ہے۔ اسی لیے جزات کے مزاج یا شاعری یا عشق کی جامع و مانع نہ ہو، اطمینان بخش تعریف بھی پیش کرنے میں ہتھکڑی ہوتی ہے۔

اگر ہم یہ کہہ دیں کہ حرکت کے عشق کا تعلق خارجی عمل سے ہے۔ داخلیت سے نہیں تو بات آدمی تنہا بیان بزرگی خاص خیالی اور وقتی خواہش میں کسی کچھ نہ کچھ داخلیت تو آج ہی جاتی ہے۔ داخلیت صرف فطریاتی مسنون میں نہیں۔ بلکہ ان مسنون میں بھی کہ آدمی کو اپنی جذباتی اور ذہنی پہل کا تصور بہت شعور پیدا ہو۔ داخلیت تو حرکت کے بہت سے خارجی شعروں میں بھی موجود ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ یہ داخلیت ہے کس قسم کی۔ ایک عشق تو وہ ہوتا ہے کہ چاہے آدمی اس پر دن میں دہشت مرتب کرے۔ لیکن وہ دوسری سرگرمیوں پر بھی اثر انداز ہو، دوسری سرگرمیاں عشق پر اثر انداز ہوں۔ اور عشق کی بدولت آدمی کا خارجی اور داخلی رویہ مکمل طور سے بدلنا شروع ہو جائے۔ دوسرا عشق وہ ہے کہ چاہے آدمی دن بھر اسی فکر میں پڑا رہے۔ لیکن عشق کا دوسری سرگرمیوں سے کوئی داخلی ملاقات پیدا نہ ہونے پائے۔ اور عشق آدمی کی شخصیت کے تحت ایک حصے میں محدود ہر کے رہ جائے۔ حرکت کے عشق میں اسی انداز کی داخلیت ہے مجھے اس سے انکار نہیں کہ حرکت نے جسبانی خواہش کا اظہار بڑی صحت مندی کے ساتھ، بڑی صاف دلی کے ساتھ دیکھ آپ چاہیں

تو مصروفیت کے ساتھ بھی، کیا ہے۔

یاد آتا ہے تو کیا پھر تازہوں گھبرا یا ہوا چھٹی رنگ اور بدن اُس کا وہ گد ریا ہوا

گروہ ہاتھ آئے تو زانو پہ بٹھائے رکھئے لب سے لب سینے سے سینے کو ٹٹے رکھئے

بیٹھیں کیا دُور کہ چاہے ہی کثرتِ شوق آپ کے زانو سے زانو کو بٹھائے رکھئے

بیٹھ آدمی میں تک لطف اُٹھانے دے مجھے اب تمہے پاؤں پڑوں ہاتھ ٹھٹھانے دے مجھے

ایک شب ساتھ اُس کے گروہِ نازِ سر تو ٹٹے شام سے لے تا حرکت کیا چوٹ کر سوتے

تم تو دُور تھے ہی دھبے اور چلی وصل کی رات لوگ نہ بچتے مل جائے اور سو رہتے

مرگ یہی نہیں کہ وہ اپنی لذت یا ذاتی تسکین ہی چاہتے ہوں۔ ایسی معاملات میں ان کی صحت مندی اتنی بڑی ہوتی ہے کہ وہ محبوب سے بھی جسمانی خرابی کی آرزو رکھتے ہیں۔

لب اُس بے حاشا ہوں تو بس یہ دل میں آتا ہے جودلت اُس کو بھی مل جائے کچھ تو کیا مزہ ہوئے

جو دسے کس مزے سے یہاں وہ کرم بوس ہوگا کسب کہ جس اداسے وہ بھرے ہے کسب کی اور جسمانی ہم آہنگی سے جو جذباتی ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور جسمانی خواہش کی تکمیل جس طرح بیاہ بن جاتی ہے۔ اس کا بھی انہیں شعور اس احساس ہے۔

یاد آتا ہے یہ کہنا جب تو اُڑ جاتی ہے نیند

اپنی ہٹ تو رکھ چکے وہاں تو ہٹ کے سوتے

لیکن ان سب چیزوں کے ساتھ ساتھ ایک بات یاد رکھنی چاہیے۔ جب عشق زندگی کی دوسری سرگرمیوں سے بالکل الگ اور شخصیت کے ایک کونے میں بند رہ جائے تو کامیابی اور ناکامی دونوں کی خاص شکلیں بن جاتی ہیں۔ خودی کی صورت میں آدمی تو رونے بھی لگے بیٹھ جاتا ہے یا پھر داسوت پڑا آتا ہے (جس کی ہر بات کی شاعری میں خاصی کثرت ہے)

ظاہر ہے دل ایسے سے کوئی بھی دھک کھا دے

یہ سن لو تم کہ ہے دھب یا دم کو بھی جسد نے کا

یہ تو بڑی عروسی، لایا ہوا کا حال یہ ہے کہ اس قسم کا عشق اپنا اظہار خارجی عمل میں مزبور کرنا چاہتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ جمائی تکیوں کی طلب نہ رکھنا کوئی فریاد ہے۔ اس طرح کے عشق میں تو اود بھی مرثا نہ ہوتی ہے۔ لیکن اگر عشق مصفااتی ترکیب کے علاوہ نفسیاتی ترکیب بھی ہے تو اس میں لایا ہوا کی شکلیں اتنی محدود نہیں ہونی چاہئیں۔ اگر جمائی تکیوں سے بے نیاز ہونا شرم کی بات ہے۔ تو جہت کو ارتقاء دینے کی صلاحیت سے محروم ہونا بھی کچھ ایسی قابلِ تدارک چیز نہیں۔ برکت کے یہاں جمائی تکیوں کو ایسی مرکزیت حاصل ہو گئی ہے۔ اُن کا عشق بڑی جلدی چھاہٹ میں تبدیل ہو جاتا ہے اور مزہ سے بالکل نکلنے لگتی ہے۔

مرد خدا نظر آتا ہے یوں خال سے خوب
کرا دیجئے جوٹ اپنا ترے گال سے خوب

ہلکے پوچھے کے ہے کیا ہی جو ان کی ہلک
اور میرے گالوں پر جیوسے کو کیا چھائے ہے

پھر اس عشق اور شاعری کے لیے سراپا کی بھی ایک خاص اہمیت ہے اگر آدمی کو محبوب کے حسن یا اس کی شخصیت کا احساس ہی نہ ہے اور وہ ہر وقت اپنے عاشقا و جذبات ہی سے اُلجھتا رہے تو میں اسے بھی کوئی برت بڑا عشق نہیں سمجھتا۔ لیکن جرات کو تو عاشق ہونے کے لیے گراؤ جسم اور آمبھری ہونی گات چاہیئے۔ انہیں محبوب کی تلاش میں موتی بلکہ چند مترقہ جمائی خصوصیات کی۔ اُن کے یہاں محبوب کے حسن پر غور و غوض اور تفکر نہیں ملتا جس کی مدد سے اس قسم کے فقرے پیدا ہوتے ہیں۔

HER BEAUTY LIKE A TIGHTENED BOW (YEATS)

اُن کے یہاں اس تفکر کے بجائے ایک چٹا رہ ہے، بلکہ برت چاٹنے کا انداز، جہاں انہیں اپنی مطلوبہ اشارتیں نظر آئیں اور انہیں نے ران پر ہاتھ مار کے داد دی، جیسے محبوب نے آمبھری ہوئی گات میں دکھائی بلکہ کوئی لفظ نہ لیا ہے۔

اور وہیں چڑھے بھرے ہیں بالی آمبھری ہوئی گات
سچ دکھو یہ کیا اُس نے دھواں دار نکالی

اک چاند کی جھلک ہی جو پوچھے کی اوت ہے
کیونکہ اُدھر نہ دیکھوں کہ دل لوٹ پوٹ ہے

اُس کی عمر پر یہ کہتی ہے بُنت زنگس کی
دیکھے کوئی کہ لگی آنکھیں ہیں یاں کس کس کی

قد ہے قیامت اور مغرب گات آپ کی
جہاں ہے سو قریامت ہے آپ کی

سینہ کوئی کے سوا کچھ اور بن آتا نہیں
یاد جب ہم کو وہ کچھ آمبھری ہوئی گات آئے ہے

گھڑا ہی تھا اس کا نہیں نام خدا گرم
کافروہ سراپا ہے مجھ کا سا بلا گرم

ہلے قراری ہیں جوں موج نہ کیوں کر ہو کجیب
لہر ویا کی طرح یاد کا جوہن ماسے
گواں آخری شعرین مجرب کی دل کٹی کا مجھ ہی تاؤ آگاہ ہے۔ لیکن جرأت کی ذہنیت کو سمجھنے کے لیے دوشروں کا مقابلہ کیجئے۔
جرأت کہتے ہیں :-

کیا جانے کیا وہ اس میں ہے ہوئے ہے اس پرچی
یوں اور کیا جہاں میں کوئی حسین نہیں

فرانک صاحب نے کہا ہے :-

کوئی یوں ہی ساتھ جس نے مجھے مٹا ڈالا
نہ کوئی نہ لہو کا پھٹا نہ کوئی نہ زہرہ جبین

”مٹا ڈالنے کا مطلب ہے ساری زندگی پر اثر انداز ہونا، اور جی کو مٹنے سے مراد ہے مرث جنس کشش۔ مٹا ڈالنے میں سراپا کا کوئی دخل نہیں، اور جی کو مٹا ہے مجرب کا سراپا دیکھو کہ کیونکہ دوسرے جبینوں سے اس کا مقابلہ ہو رہا ہے۔
ہاں تو میں کہہ یہ اٹھا کہ جرأت کے مشق میں جسمانی تسکین کو کڑی حیثیت حاصل ہے۔ یہ بھی نہ سہی تو کسی نہ کسی قسم کے خارجی تعلقات اور خارجی تحریکات کے بغیر اس مشق میں آسودگی نہیں ملتی۔ کیونکہ یہ مشق لذت کی پکار سے زیادہ جسم کی پکار ہے۔ پھر چونکہ یہ مشق شخصیت کے باقی حصوں کو متاثر نہیں کرتا، اس لیے منہی مضامبات دوسرے ہو کے بغیر اس تسکین کا کوئی پہلو نہیں مل سکتا۔ یہاں مٹا ڈالنے کے ایک ہی معنی ہیں۔ یعنی لگاؤ کا خارجی اظہار۔

نے خط نہ کتابت ہے نہ معین م نہانی
اس دل کی تسلی کی کوئی بات نہیں اب

ہیں دیکھئے سے وہ جیتا تھا اور ہم اس پر مرتے تھے
یہی مائیں تھیں اور ہائیں تھیں وہ دن کہا کرتے تھے

ہے وقت خوش انہوں کا کیا لطف ہم دو گر ہیں
دل جن کھل کھلے ہے ہیں اور پاس پاس گھر ہیں

یہ کہنا تو جرأت کے ساتھ بے انصافی ہے کہ وہ مشق میں جسمانی تعلقات سے آگے ہٹتے ہی نہیں۔ لیکن مشق کے خارجی اظہار پر اتنا زور دینے کی وجہ سے ان کا لگاؤ، لطافت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جرأت کے تیر کے معنوں میں عاشق نہیں تھے بلکہ عاشق تھ۔ وہ دیکھ کے بعد دو گیسے مختلف محسوسوں سے سچی محبت کرتے چلتے ہیں، اور اپنی ماضیانہ زندگی کے ہر لمحے کو ایک دوسرے سے الگ رکھتے ہیں۔ انہیں مجربوں کی آن گنت ادائیں یاد ہیں، لیکن مجرب ایک بھی یاد نہیں۔ کوئی سچی آن کے دل میں اس طرح گھر نہیں کر سکی کہ من کی کائنات زبردہر ہو جائے۔ وہ مجرب سے جسمانی اور جذباتی ہم آہنگی تو چاہتے ہیں۔ لیکن منہی تعلقات سے باہر نکل کر عام انسانی تعلقات والی ہم آہنگی کے خواہاں نہیں

ہوتے۔ YEATS نے اپنی محبوبہ کی سبہ مہری کا لہر کستے ہوئے کہا تھا کہ محبت تو میر میں اور بھی کروں گا۔ لیکن یہ دوزخہ کی زندگی میں جو ایک دوسرے کے ساتھ چھوٹی چھوٹی مہراناں جوتی ہیں، یہ کہاں اور میں گی؟ جرأت اپنے عشق میں ایسی ہمہ گیر کیسبتی کے طالب نہیں ہوتے۔ انہیں تو عشق کی ایک طلب سی ہے۔ اور وہ ہر حال کیس نکلیں پوری کرنی ہے، انہیں تو خدا نے مرنے وارہ جو تڑا دیا تھا، اور جی کی مرے دادیاں انہیں برصودت دکھائی ہیں، ان کے لیے عشق ایسا تجربہ نہیں جس کے بعد انہیں اپنی ساری زندگی کو اذمر نو ترتیب دینا پڑے۔ انہیں پہلے ہی سے معلوم ہے کہ عشق کیا چیز ہے اور وہ اپنے آپ کو اس سے سٹھنے کے لیے پوری طرح تیار پاتے ہیں۔ چنانچہ عشق ان کے لیے کوئی روحانی یا شیطانی قوت نہیں بلکہ محض من چلا پن ہے۔

لگا جاتا ہے جرأت اُس برب غر خوار سے کچ ہے وہی دم عشق کا مٹے جو ایسا من چلا ہووے
ازل سے گرفت رہ پیدا ہوا ہے یہ دل کیل مرنے وار پیدا ہوا ہے

پڑھتے ہیں کہ ہو کر اب الفت کسی کے ساتھ ہے آہ یہ دل کا مڑا تو اپنے جی کے ساتھ ہے
ان مرنے واروں نے محبوب کے ساتھ جرأت کے دوستے کو بھی خوب رنگ دے دیا ہے۔ محبوب کو بے اعتنائی پر شرم تو اور شاعروں نے بھی دلائی ہے اور کئی پہلوؤں سے۔

کیا کیا آپ نے کہ حسرت سے
نئے، حسن کا عنصر دو کیا
فراق صاحب تو محبوب کے ساتھ ناز بھی کر لیتے ہیں۔

میں پھر عشق نہ دھو سکے گا
آج مٹا دے آج مٹا دے

لیکن یہ وسیع، قوی اور درجی ہرئی شخصیت کا اپنے اذ پر اعتماد ہے جو محبوب سے بھی ٹکڑے جاتا ہے۔ اس کے برخلاف جرأت تو اپنی جیسی خواہش ہی کو اس بڑی طرح حق بجانب سمجھتے ہیں۔ کہ اس کے مقابلے میں زندگی کے اور پہلوؤں کو خاطر میں نہیں لاتے جیفت ہے اس کے جھلنے پوجے یا دگر و تمیز کر جان جرأت میں جو نہیں سوا ایسی بات ہو گیا ہے اور کہیں

مجدید اور اپنا جیسا کر دیا تو نے مجھے میں بھی جرأت ہوں کوں یوں تجھ کو حیران تو ہی

دو دو دو آئے سے جرأت کے کو امت کیا کر اس بھلے کی طبیعت تم پہ ہے آئی ہوئی

جب یہ من چلا پن اپنی خود اعتمادی میں مدد سے گڑنے لگتا ہے تو محبت اچھی خاصی پہلوانی بن جاتی ہے اور اپنی کامرانہوں کا خروہ اوجھا پن اور اہمڈال پیدا کر دیتا ہے۔ ساتھ ساتھ شاعری میں بھی۔

عاشقی کے فن میں جرأت آج خم غمگوں بوں میں
 سامنے ہو جائے اب جو مرد ہر میدان کا
 چنانچہ جب ان کی عزت کو ٹھیس لگتی ہے تو اس وقت بھی انسانی وقار یا خودداری کے سوال سے زیادہ رنگ پر ہوتا ہے
 جیسے ان کی استاد ی بلکہ ان کی جنسی خواہش کی قربان کی گئی ہو۔
 آج اس طرح سے جبر کا کہ بھر اس سے جا کر
 کچھ بھی عزت ہو جو دل کو تو نہ ذنبا ر ملے

مذہب جو آئے ہے سو کہتا ہے محمد کو کیا ہے زبان پایا ہے
 اب ذرا اس عاشقی کے فن کو بھی دیکھ لیجئے جس کے وہ ماہر ہیں۔ اصل میں جرأت عاشقی کے فن سے نہیں بلکہ اپنی طبیعت سے
 واقف ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ عشق کونساں کے وہی نتیجے ہو سکتے ہیں۔ اگر مجبور ہاتھ آگیا۔ تو راوی چین ہی چین لکھتا ہے، اپنی استاد ی سلم
 اور اگر ہاتھ نہ آیا تو جی کی سزے وادیاں سلامت رہیں۔ آگے دیکھیں گے۔ اس کا ردائی کا فائدہ یہ ہے کہ آدمی تانچے سے بے نیاز ہو کر
 عشق کڑا سکتا ہے۔ ناکامی کی صورت میں پہلے سے معلوم ہے کہ رنج و دھار دن سے زیادہ نہیں چلتا۔ چنانچہ انہوں نے پہلے ہی سے انتظام
 کر لیا کہ عشق زندگی کا ایک گراں با در تجربہ نہ بننے پائے۔ جرأت کی اصل پہوانی یہ ہے کہ انہیں درد سے بچنے کے لیے داؤد بیچ معلوم ہیں
 وہ محبت کے میدان میں بڑی آسانی سے خم ٹھوگ سکتے ہیں۔ کیونکہ محبت تو ان کی کا۔ ودائی کے ہاتھوں ختم ہی ہو جاتی ہے اسی انہیں
 کیسے برا بھلا جاسکتا ہے۔

حسن لے جان نہیں رہنے کا پھر یہ احسان نہیں رہنے کا
 ہجر کے خم سے نہ گھبرا جرأت اتنا جیسا ان نہیں رہنے کا
 محبت کا ختم ہو جانا تو الگ۔ یہ لا ودائی تو محبت کو تنہی مذاق اور دل گئی میں بدل دیتی ہے۔
 ہر وہ مت مزے اٹھانا نہ ہمارا محمد ہیں اوسان نہیں رہنے کا
 آن کر اپنی امانت سے جا پھر کچھ دھیان نہیں رہنے کا
 پتہ نہیں جرأت نے ساتھ ساتھ یہ بھی کیوں نہ کہہ دیا کہ
 آن کر بان تو کھا لے جلدی ورنہ پھر بان نہیں رہنے کا
 جو چیز ان کی محبت، ان کی شخصیت، ان کی شاعری کو بڑا بننے سے روکتی ہے وہ کہیں کہاں درد نہیں، میں درد لک
 ہے۔ چرکہ اس زمانے میں نصرت کا رواج تھا۔ پھر وہ جبر کے رنگ میں کہنے کی کوشش وقتاً فوقتاً کرتے رہتے ہیں، اس لیے وہ نظریاتی
 طور پر اپنا مرض سمجھتے ہیں کہ دل میں درد ہو۔

گرم ہر قاب میں جرأت صورتیں دھلتی رہیں
 ہر بنا جو درد کا پتلا دہی انساں ہوتا
 بلکہ اس احساس کے باوجود درد سے گھبرا تے ہیں۔ وقتی دچ تو وہ سہار لیتے ہیں، پیر کی پیروی کرنے کی فکر میں آخر

انہوں نے نامہ نالی کے مضامین ہاند سے ہی ہیں۔ اور دیکھتے ہیں کہ طبیعت کی خاصی اصلاح کی ہے اور کئی جگہ ان کا لہجہ بدلا ہے
دوسرے بات پر مہررات
ہے گرفتار یہ کہیں نہ کہیں

لیکن وقتاً فوقتاً دل گداز ہو جانے کے باوجود ان کے یہاں وہ "ہیٹم" نہیں مٹا جس کا میں نے شروع میں ذکر کیا تھا۔ لیکن ایک وقتی چیز ہے۔ وہ وہیں ایک تسلسل اور ایک استقلال ہو تا ہے۔ پھر یہ بھی مزوری نہیں کہ وہ صرف عروسی اور نا کامی سے ہی پیدا ہو۔ مہررات کے یہاں وہ بعض نا کامی کا احساس ہے، ان کی خوشی یا کج کا انحصار محبوب کے ہٹنے یا نہ ہٹنے پر ہے۔

دل اب ایسا کہیں آیا ہے کہ جی جانے ہے
کہوئے جلتے ہیں ہم ایک کیک کے لئے مہررات
یہ قلم ہم نے اٹھا لیا ہے کہ جی جانے ہے
ہم نے محبوب پیا ہے کہ جی جانے ہے

کسی خاص عروسی کے وقت انہیں وقتی تو ہوتا ہے، لیکن عروسی کو سمجھنے میں جو اذیت پیدا ہوتی ہے اس سے وہ جان ہرتے ہیں وہ وقتی رنج کے سامنے بس جھک جاتے ہیں۔ لیکن اپنے آپ کو تیر کی طرح اپنے دکھوں سے الگ نہیں کر سکتے۔ وہ اپنے دکھ کی کہانی تو سنا سکتے ہیں لیکن اس کا مطالعہ نہیں کر سکتے۔ وہ اپنی حالت بیان کر سکتے ہیں، اس حالت پر مصراۃ میرت کا انہماک بھی کر لیتے ہیں لیکن اس حالت کے اندر ڈوبنے اور اس کی تفتیش کرنے کی خواہش انہیں نہیں ہوتی۔

آدم نہ مردل کو تو اسے یاد کر لی کیا
تماشا ہے کہ پاس پلنے وہ بھٹاتا نہیں ہم کو
پھر پھر کے بیس آتے ہیں ناپاد کر لی کیا
اور اس سے گرجا بیٹھیں تو پھر بیٹھا نہیں جانا
تو سے بدیچہ مہررات کی حالت ہو گئی غم سے
کو اپنے سے تو اس کو بھر نظر دیکھ نہیں جاتا

ان کے اندر محبت کے خلاف ایسی ممانعت نہیں جیسی حالت میں ہے۔ انہیں محبت سونی صدی قبول ہے اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہے کہ اس میں مغرور سے بہت دگر بھی جھیلے پڑیں گے۔ اصل میں سر دیا تو چوٹوں کا لیا ڈر۔ چنانچہ نہ تو ان کے اندر وہ کش مکش پیدا ہوتی ہے جو حالتی کے یہاں ہے۔ نہ وہ تغاؤ اور دگر بچھانا مانی جو تیر میں ہے۔ تیر کے درد کا ایک سبب یہ الجھن ہے کہ آخر عشق ایک وقت رحمت اور عذاب کیوں ہے؟ چونکہ وہ فن عاشقی کے ماہر، لڑکے بارہاں دیدہ ہیں۔ انہیں سب حالات کا پٹلے سے علم ہے وہ جانتے ہیں کہ انہیں کیا کیا کرنا ہے اس لیے وہ درد کو آٹھنے ہی نہیں دیتے۔

جو کہ دگے ظلم تم، ہم سب سہیں گے کیا کہیں
تم ہٹے اس کام کے اور ہم ہٹے اس کام کے

پھر تیرے ہیں دن کو تو بہ کڑے ہے شب کہانتے
اپنی توقع کے مطابق انہیں کسی عروسی اور نا کامی یا محبوب کی بے اعتنائی کے سبب دکھ ہوتا ہے۔ جیسے ہیں ہرک اٹھتی ہے
اور وہ اپنے غلوں، اپنی حق گوئی کے تقاضے سے مجبور ہو کر اپنی پہلوانی کے باوجود دکھ دیتے ہیں۔

کیا عالم آپ کا ہے یہاں مہررات ان دفن
عالم سے جھٹ گئی ہے ملاقات آپ کی

جب مرے پاس سے اٹھ کر وہ کہیں جا بیٹھے ہے
جی میں گزرتے ہیں کہ لاش وہیں مجھ سے ہم

ہم نے ہر چند کہا پر نہ آ یا یاں تک
بعض دفعہ تو وہ اپنی کسک میں بھی ایک طب کا پتو پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ وہ بات نہیں کہ غم و نشاط گھل مل کر ایک ہوجائیں بلکہ
ایسا ہے جیسے کسی کو سب سے الگ ٹھکانے میں ڈھک کر اس کا غم غلط کرنے کے لیے اسے چھوڑتے ہوں۔

داں سے اول دل بے تاب تو کب آتا ہے

اور جو آتا ہے تو سو جا پہ چل کر آتا

اس کے مقابلے میں ذرا کا یہ شعر دیکھئے :-

واقعہ وار فتنہ کو ہم آج ترے کو چہ سے

اس طرح کھینکے لئے ہیں کہ حق جانتا ہے

جرات نے مجھ کو ب کی تم نظریں کا ذکر ایک جگہ یوں کیا ہے :-

کل جو۔ دے پر مرے ٹک دھیان اس کا پڑ گیا

ہنس کے یوں کہنے کا کچھ آنکھ میں کیا پڑ گیا

اُس وقت تو خیر محبوب بھادوں کے ساتھ زیادتی کر رہا تھا۔ لیکن اس میں بھی تاش نہیں کہ جرات نے دو دو کی نوعیت ہی قسم

کی ہے جیسے آنکھ میں کچھ پڑ گیا جو۔ یعنی ایک ایسا واقعہ جو تھوڑی دیر تک دے کو بھر تکلیف دے اور پھر اسے جرات اس تکلیف سے تیار
گھبراتے ہیں کہ ایک جگہ تو انہوں نے بقول نیز کہہ کے سپرد ہم تو مایہ خویش رہا والا معاملہ کر دیا ہے۔

آوارہ و پردہ ہوں میں جرات بقیہ

خاندان خراب ہر جو اس دل کی چاہ

اصل میں جرات کا قصہ یہ ہے کہ وہ دو قسم کی شاعری کے درمیان بٹے ہوئے ہیں۔ ایک تو لکھنوی شاعری۔ دوسرے میر کی

شاعری۔ اپنی غریب طبیعت کے باعث اود کچھ ماحول کے اثر سے انہوں نے اس قدر کی نیال آرائیاں ترکی میں جہاں الفاظ یا لغت۔ ت کو جرات
سے الگ کر کے اُن سے کھیل جاتا ہے۔ مثلاً

ہے یہ عالم چشم ساقی پر کہ دقت سے خودی

چشم مینا حق سے چاہے ہے کہا ب۔ وگسی

لیکن اُن کی طبیعت میں انشا کا سا ہنسور ڈھن نہیں تھا۔ اس لیے وہ اس رنگ میں کاغذ نہیں چسکے کچھ نیری پیر کی

شوق نے انہیں ادھر تک طرح چلنے دیا۔ لیکن دوسری طرف لکھنوی رنگ نے نیز کا رنگ خراب کیا۔ یہ نہیں کہ اگر وہ لکھنوی کے جھنڈے دئی ہیں

ہوئے تو کس قسم کی شاعری کہتے، اُن کے مران میں وسعت اور گہرائی آجاتی یا اُن کا طبع انداز بھی مدبھا کے رہ جاتا۔ فی الحال صورت یہ ہے

کہ وہ دیکھتے ہیں کہ شاعرانہ مضمون کے مضمون کا ہمارا گرم ہے اور اپنی گرمی دکھانا چاہتے ہیں مضمون میں غبار بھی ہوتا یا ان کی انہیں یہاں پہنچ گئی ہے

کہ وہ دقتاً فوقتاً دکھ بھیلنے کے باوجود دکھ سے گہراتے ہیں۔ اور اسے ہی کاجہال سمجھتے ہیں۔ جس عشق میں مصیبت اٹھانی پڑے۔ اس کے بعد انہیں افسوس ہوتا ہے۔ کہ آخر اس مصیبت میں ہی کیوں پڑے۔ باوجود علم کے نہ کچھ تو تیر بھی پس پس گئے ہیں۔ مگر حرات کے لیے کامیابی اور ناکامی کا فرق بہت مٹنے دکھتا ہے۔ پہلوانی کی ڈینگ کے باوجود انہیں اپنے اس کچھ بن کا احساس ہے۔ ہر روز کے جلنے کو کہاں سے ملکر آدے

[اس کے مقابلے میں تیر کا شعر بھی یاد رکھیے۔]

جب نام تو لیجئے تب چشم میرا آدے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے ملکر آدے
میرے لیے عشق ایک "زندگی" ہے حرات کے لیے ایک الجھن۔]
جرات ہند مرتبہ عشق ہے بہت
ہم پست جنتی سے ابھی ہیں دے دے
مادار سے تعلق طبیعت نے نہیں

ہی کے گب جانے کا کچھ پایا دلا تو سنے مرہ ہم نہ کہتے تھے جڑی ہوتی ہے دیوانے لگی

جہاں جا بیٹھے ہر دل نہیں لگتا میاں جرات کہو اب تو اٹھانی کیفیت کچھ دل لگانے کی

لگا یا تم یہ جوانی میں کیوں میاں جرات ابھی تو سیر تماشے کے تھے تہا دے دن

سختیاں درد و محبت کی نہ پوچھو ہے جی ہی جانے ہے جو کچھ دل نے اذیت پائی

غلاؤں آٹھ ٹک اس سے تو رتن سے جدا ہو گئے کہاں لاکھ حسد یا اسے تے دل کا بڑا ہو گئے

جرات سے درد تو واقعی برداشت نہیں ہوتا۔ لیکن جن حدوں کے اندر وہ کوہ عشق کرتے ہیں ان کے اندر رہتے ہوئے بھی اور اپنے کھلاڑیوں کے باوجود اپنے من چلنے کے باوجود بہت سی جگہ حسدانی لگن کی شدت اور غلوں کے باعث ان کی شاعری میں کئی جگہ ہلک اور ہلک ادالہا زہن اور مرثاری جگہ مصومیت تک آگئی ہے۔

کہاں آئے کہاں بیٹھے سمجھتے کچھ نہیں جرات یہ ہو جاتی ہے ہم کو بخودی سی داں سے گھرا کر

مری وحشت سے ہر دل کی دل میں یوں کہتا ہے اپنی لگ گئے کیوں ایسے دیر لے کر پائے ہم

کیونکہ تم پاس سے بھر جائیں بھلا اور کہیں
جی تو لگتا ہی نہیں یاں کے سوا اور کہیں

کو چڑھاناں سے جلتے ہیں پہ جاسکتے نہیں
کو اٹھاتے ہیں قدم پہ دل اٹھا سکتے نہیں

جی میں سو بار آئے ہے حرکت شیطانی سے
یہ سمجھ کر دل میں کچھ سو گند کھا سکتے نہیں

اگر محض جنسی تسکین ہی کا سوال ہو اور معاشرہ اس سے آگے نہ بڑھے تو اور بات ہے۔ لیکن اگر آدمی کے دل میں جسم کا احترام نہ ہو
جسم اور جانی خواہش کی حدود ہی بہت قدر بوجہ رہے وہ گمبھیری ہوتی گات ہی کی قدر نہ ہو، تو یہ کسی نہ کسی مذہب انسانیّت کی قدرین جاتی ہے
اور ہمیشہ پرستی میں بھی معذور اس قدر آجاتا ہے۔ لگاؤ انسانی لگاؤ میں تبدیل ہونے لگتی ہے۔ جرات بھی زغالب میر کے سہا ہے
اس طرح معذور اس قدر ہے۔ گوشت نہ دانی کے برابر بھی نہیں پہنچے۔
مذہب ہو کے دل اس شورش کا بھی دھڑکے ہے آگے پیچھے سے کہیں پاس جو مجھ مضمر کے

یا لاگ دلوں کی تھی ہم دم ہم انسانوں
یا جی کی رکاوٹ ہے اور اور اوصد بھی
برأت کی زندگی میں دو چار لمحے ایسے بھی آئے ہیں جب یہ لگاؤ پھو کر محبوب کی قدر اور محبوب کے احترام کی شکل اختیار کرتا
نظر آتا ہے۔ مگر یہ آنا نہ ہی رہے۔ ان کی نشوونما نہ ہونے پائی۔
ہوئی اور یاں ہم سے جرات تو کیا
مگر تم کو آ کر خف کر چلے

یہ وہ آنکھوں ہیں کہ ہے جب رو دہلے کوئی
پھوٹ پھوٹ اتنا نہ رو دہنام ہوتا ہے کوئی

کہا ہے میں نے تجھے کب کر میرے پاس نہ بیٹھو
خدا کے واسطے تمھارے پاس تو آداس نہ بیٹھو

ایسے وقت اپنی جسمانی خواہش کے حق بھانپ ہونے کا خیال بھی اُن کے دل سے نکل جاتا ہے اور وہ اپنے ماضی تعلقات کو
بھی مام انسانی تعلقات کے دائرے میں لانے کی عتوری بہت کوشش کرتے ہیں۔
جیسے یاد اپنی گھاسیے اُسے صاف سال سے بھٹائیے
بلکہ ادھر تو آگے چلے ہی ہم سے قول و قرار تھا

کسی نے تیری خاطر غنا دیوان کر دیا اپنا
بھلا تو بھی اُسے اے خاں آباد جاسے ہے

بعد دیکھو تو ہم تم ایک ہی بستی میں بستے ہیں سوئس پر یہ غضب ہے دیکھنے کو بھی ترستے ہیں
لیکن اس آخری شعر میں انسانی ہستی کی پیچیدگیوں پر وہ استعجاب آئینہ چاگی کا احساس نہیں آنے پایا جو تبرکے شعر میں ہے۔

دوب جے گا اگلی نہیں معلوم

تم جہاں کے مرداں کے ہم بھی ہیں

جرات کے شعریں تو صرف محبوب کی ستہاگی کا ٹھوسے۔ برصورت اُن کے یہاں بھی محبوب کے جسم نہیں بلکہ اُس کی شخصیت

کی پہنچِ عجب دو ایک عجزِ مافی ہے۔

کہ دریا د پہ پھر پھر کے نہ آنے جرات

در در دوستے پڑے پھر تے ہر جرات

مگر انہیں محبوب سے ایک منفی قسم کا فائدہ پہنچا ہے، یعنی وہ مرگشتہ نہیں ہونے پائے، آتش کو محبوب کی بے رخی میں بھی ایک مثبت

چیز حاصل ہوئی ہے۔ اسی لیے آتش کے شعریں ایک بے پایاں نون ہے جس نے غلاب کو اپنے اندر نیت یا بے ایسی ہی شخصیت ہے
جو جرات کے شعر کو چھو بھی نہیں گئی۔

دھوپ میں سایہ دیوار نے سونے نہ دیا

حاکم پر شاہ دیوار نے سونے نہ دیا

اچھا، اب جرات کی طرف سے محبوب کا وہیہ دیکھنے کو انہیں اپنی محبت کا جواب کیسا ملتا ہے۔ عام طور سے جرات کا محبوب

اُن سے جھیر اور عداوت کی باتیں کرتا ہے جو بے رحمی اور بے اعتنائی سے خالی ہیں۔ جرات تو، دو انسانی ہستیوں کی دریا کی چٹائی کا تجربہ نہ ہونے
کے برابر ہے — یعنی بعض وقت کی خودی کے باوجود۔

دیکھ ہم نہ کشیدنیوں کو وہ بولا کہ کہیں اور جاگ نہیں کیا یہ جو میں بیٹھنے میں

دیکھ منت سے مرا کوئی بھٹانا جرات اور اُس شوق کا کہنا کہ نہیں بیٹھنے میں

میں یہ نفوں میں بہک چوں کہ دم گزیر وہ شوق جنس کے پیر ہے کہ کو میں نہ کر دل بھاری

بہکنا دیکھ صاحب اور نہیں پر جرات یہ وہ چاہے ہے کہ اس کو بھی ملے لکھے

لیکن جب یہ حادثہ ٹکڑا میں ہوتی ہے تو محبوبِ وفاقت کا حق ادا کیا جاتا ہے۔ محبوب کے معاملے میں بھی یہ بدلتا اور وفاقت

کا احساس جراتی آسودگی سے پیدا ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ انسانی تعلقات کی شکل اختیار کرنے لگتا ہے۔ نراق صاحب نے ایک دفعہ اس تعجب

کا اظہار کیا تھا کہ بعض شاعر محبوب کی بے اعتنائی کا ردِ ناقصہ کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر کہیں محبوب خود اُن پر عاشق ہو جائے تو کیا ہو؟ لیکن

جرات کو ان شاعروں کی طرح اس قسم کی پریشانی نہیں اٹھانی پڑتی۔ وہ عشق لڑانا بھی جانتے ہیں اور عشق وصول کرنا بھی۔ کیونکہ اُن کے یہاں

مشرق کا سارا کار و بار جہانی مفاہمت پر منحصر ہے۔ چنانچہ انہیں محبوب کے لگاؤ کا احساس ہے اور اس کی قدر بھی ————— بلکہ انہیں مشق میں سب سے بڑی مزدورت اسی چیز کی ہوتی ہے

یہ جانیں کہ بہت سے کیا ہم پر کیا عسر جو بات نہ مانی ماننے کی مان گئے عسر

حیرت ہے کہ گل اُس نے کبھی مان ہیں اپنے وہ بات نہ مانی جو نہ مانی دھیان میں اپنے

کئی دن بعد جانے پر ذرا جس سے کہ الفت ہم غصہ ہے اُس کا یہ کہنا کہ کتنے بے مروت ہم

دوستے اُس شرح تم کو اُس نے ہم کو ان دھڑکوں سے منایا ہے کہ جی چلنے ہے
کامیاب مشق میں محبوب سے اتنی ہم آہنگی اور ربط حاصل کر لینے کے بعد بھی، مشق محنت کے لیے انسانی زندگی یا کائنات سے ہم آہنگی حاصل کرنے کا ذیل نہیں بنتا۔ یہ بعد صرف ایک آدمی سے حاصل ہوتا ہے اور وہ بھی اپنی اپنی شخصیتوں کے دو جاہل گوشوں میں محبوب اُن کے دُور دور جانے سے تو نہ رہتا ہے اور اُن کے کان میں ایسی بات بھی کہہ دیتا ہے جو اُن کے دھیان میں بھی نہ آتی تھی۔ لیکن یہ محبت لے لے والا محبوب اُن کے لیے کبھی وہ چیز نہیں بنتا جو رفیق صاحب کا محبوب اُن کے لیے بن گیا ہے —

تو دن کی طرح جس رات کی طرح پُر کمیت

جہاں بھی جاسے یہ اندازہ ضرور جائے

جس مشق پر سید انسانی زندگی اور کائنات کا پُر تو نہ پڑے وہ اُس سے زیادہ بڑھی کیا سکتا ہے؟ جو آدمی محبوب کی ادایں کو نگاہ رہ جائے اور دوسری چیزیں چھوڑ کر بسے محبوب کو بھی نہ دیکھ سکے۔ وہ اس سے بڑی شاعری کیا کر سکتا ہے؟ یوں تو محنت نے ہر سے پُر تک محبوب کے سارے دل کش اعضا کا نام لے لیا۔ لیکن وہ ہیں اپنا محبوب تک نہ دیکھ سکے معاشقہ کی تعصبات بیان کرنے کے باوجود وہ مشقیہ تعلقات کی پیچیدگیوں سے دامن بچا کرتے رہے۔ انہیں ان پیچیدگیوں کا احساس تو ضرور ہوا۔ آخر پہلوان مشق تھے چنانچہ اس کا اشارہ انہوں نے کیا ہے۔

دل دیتے دت ہوئی ہے اب تک لیکن مزاج

اُس بہت کا فر کا کس کا فر سے سمجھا جائے

لیکن وہ اس الجھن میں نہیں پڑتا چاہتے۔ جب ایسی بات آتی ہے تو اُسے ہنس ہنسا کر صاف اُڑا جاتے ہیں۔ وہ تو بس یہ دیکھتے ہیں کہ محبوب مل رہا ہے یا نہیں مل رہا، اور کس طرح۔ یہ کس طرح ہی اصل میں اُن کی شاعری ہے لیکن یہ سوالات کہ محبوب کیوں مل رہا ہے کیوں نہیں مل رہا۔ خوش وقتی میں غل جھڑتے ہیں، یہ باتیں یا تو لوگ معلوم نہیں کرنا چاہتے۔ لہذا محنت کئی کاٹ جاتے ہیں۔ محبوب مل گیا تو سبحان اللہ! ظلاً تو خیر سہا۔ اور اگر مشق میں رسنے کی تربت آگئی تو بھی —

دیا اُس کے در پہ جو محنت نے جی تو الحمد للہ محنت ٹھکانے لگی

عرض انجام ہر طرف نقشے کے مطابق ہونا چاہیے۔ کیونکہ انہیں تو ایک کردار بنانا ہے۔ کامیابی میں بھی اور محرومی میں بھی۔ ہر حال خاتمہ اس طرح ہونا چاہیے کہ یاد دوست بھی اس کی بھیج نوعیت پہن کر اطمینان کے ساتھ اطمینان کہہ سکیں۔ چونکہ جرأت کی شکل سوانح قریٰ تو یسر نہیں۔ اس لیے میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کی ذہنی نیپٹیاں عمدہ و عظیم یا وسیع۔ یوں ہر نے کو انہوں نے سب سے پہلے اظہار خیال کیا ہے۔

سمجھے نہ امیر کوئی ان کو نہ دندیر
انگریزوں کے ساتھ انکے نفس میں ہیں امیر

جو کچھ وہ پچھائی سو یہ منہ سے بولیں
بہگلے کی مینا میں یہ پودب کے امیر

پھر انہوں نے رسمی یا غیر رسمی طور پر کارواں، نفس و بیرو کے مفاہیم بھی بانٹے ہیں جن کی سیاسی تفسیر یہ کی جاسکتی ہیں۔ لیکن ان کی عظیم شاعری سے قویٰ پتہ چلتا ہے کہ اگر ان کی ذہنی دلچسپی اور دماغی عمق کے حوالے کر دیا۔ وہ پھر عشق کو اپنی محنت کے ایک الگ متکاف ہونے میں ہند کر دیا۔ چنانچہ ان کا عشق دوسری دلچسپیوں اور زندگی کے دوسرے پہلوؤں سے بالکل الگ پندیر نہیں ہوا۔ وہ پھر ایک حرکت انہوں نے یہ کی کہ اپنے عشق کو الگ الگ محلوں میں بانٹ دیا۔ ان کا عشق اس طرح ٹکڑے ٹکڑے ہوا کہ وہ اسے ایک کلی سمجھ کر کسی نہیں دیکھ سکے۔ اگر وہی سے اچھے رہے۔ انہوں نے اردو شاعری کو یہ فائدہ تو مزید پہنچایا کہ ہماری شاعری چھوٹی چھوٹی ادواؤں اور لحاظی تاثرات کو بیان کرنا سیکھ گئی۔ لیکن ہر بات میں اتنی قوت نہیں ملتی کہ ان کا جملہ ان ادواؤں کو پوری شخصیت کا نمونہ بنائے کہ چن کر سکتا۔ چنانچہ وہ تاثرات کے شاعر ہیں۔ تجربہ کے شاعر نہیں، ان کا فن مقامی ہے، علاقائی نہیں۔ اس لیے ان کا عشق عام تندرست آدمی کا عشق ہے اور ان کی نظیر شاعری کم سے کم عاشق مزاجوں میں ذاب القل بن جانے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے نہ

اختر شیرانی

آل احمد سرور

تقریباً بیس سال ہوئے جب میں کالج میں نیا نیا داخل ہوا تھا۔ میں سائنس کا طالب علم تھا۔ مگر ادب سے دلچسپی زیادہ تھی کلاس میں پروفیسر نکمیا اور طبیبات کے نامور لکچررات بیان کیا کرتے تھے۔ اور ہم کچھ دیکھتے دیکھتے اردو کے شاعروں کا کلام پڑھتے یا ان کے حالات اور تذکرے دیکھتے۔ اس زمانے میں داغ کا کلام ہمارے دارمعلوم ہوتا تھا۔ مگر اس کی شہرت اور شہادت میں کچھ بازاری پن کا احساس ہوتا تھا۔ حسرت کی غریب زیادہ اچھی معلوم نہیں۔ اور جوش اور اختر شیرانی کی نہیں۔ اس زمانے میں جنگل کی شہزادی۔ نامترا، اجانی، دیکھو وہ کوئی جو گل میں گاہی ہے۔ تہیں ستاروں نے بے اختیار دیکھا ہے۔ تری تصویر سینے سے لگاؤں اور مر جاؤں، پڑھنا اور دوسروں کو سنانا میرا ایک محبوب مشغول تھا۔ اختر کی سٹے اس وقت ایک عجیب آسمانی مخلوق معلوم ہوتی اس کی تصویر کو سینے سے ٹکا کر مر جانا زندگی کا سب سے مقدس فرض نظر آتا ہے۔ آتنا اب بھی یا دہے کہ جوش کی نہیں ایک طوفان کی طرح بہاے جاتیں۔ مگر اختر کے اشعار میں ایک نشہ ہوتا تھا۔ ایک لذت ہوتی تھی۔ جو تھوڑی دیر کے لیے کسی اور دنیا میں پسپا دیتی تھی۔

اور آج جب میں نے اختر شیرانی کے مجھے غمزدہ، اختر شان، لاٹھوڑ دیکھے تو مجھے وہ نشہ پھر یاد آ گیا۔ غمزدہ مرم میں اختر کی اچھی نہیں کم ہیں۔ وہاں تڑکی کا گیت۔ دیکھو وہ کوئی جو گل میں گاہی ہے۔ حوریت، گلو پڑا ستاروں کی سنی۔ یہی اس مجھے کی کائنات ہے۔ اختر دراصل ایک رومانی شاعر ہیں۔ ان کی شادی۔ ہماری جدید مشفقہ شاعری میں ایک اتمیازی حیثیت رکھتی ہے۔ مگر حورتوں اور بچوں کے لیے نہیں لکھتے وقت وہ بعض اخلاقی، سماجی اور قلمی معانی کے چکر میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ ان کے ایسے اشعار میں رومانی اور دل کشی ہے۔ مگر حوریت اختر شان کی بیشتر تفصیلات میں ہے وہ نہ غمزدہ مرم میں ہے نہ لاٹھوڑ میں۔

اور دیس سے آنے والے بتا۔ جہاں ریمانہ رہتی تھی۔ ایک حادثہ۔ سر زمین عشق، سلمیٰ، وادی نکا میں ایک رات، انتظار، چوڑھویں ساگر کا کھنڈ، ایک تصویر دیکھ کر۔ ایک فوجانہ بات تراش کی آرزو۔ تاثرات غمزدہ۔ دنیا کی بہادریں اختر کی فائدہ نہیں ہیں۔ ان کے مصلحے سے اختر کی خوبیاں اور خامیاں ظاہر ہو جاتی ہیں۔ ان ہی میں وہ جوان۔ چپقل، مشغ و مضطرب عشق سے حوریت حسن کا شہزادی نہیں پتا رہا ہے۔ اس کی خاطر مر جانا چاہتا ہے۔ اور اس موت کو کیس کی طرح نعمت سمجھتا ہے۔ ان میں وہ شدید رومانی دنیا پر چھا جانے والا جذبہ ہے جو انسان کی حسین ترین کمزوریوں میں سے ہے۔ اس میں خوابوں، جذبات، تماشوں اور آرزوؤں کی وہ

جنت ہے جس سے کائنات کی آمد و قیام ہے۔ اختر کا خلق خدا کی نجات کا وہ نظریہ ہے۔ جب ہر مدت میں عورتوں کا تقدس اور شہزادیوں کا جہان نظر آتا ہے۔ جب عورت سے بھی زیادہ عزیز اس کا تصور ہوتا ہے۔ جس میں دوری مباد ہے اور وحدت کا احساس۔ جس میں حقیقت خوابوں کے تہہ پہ تہہ سے آراستہ ہو کر آتی ہے۔ جس میں ہر چیز سے زندگی نہیں۔ گرمی ہے۔ دشتی نہیں شربت ہے۔ گہرائی اور استواری نہیں جو زندگی کو شراب و شکر بھرتا ہے۔ اور اس لیے اس کی تیزوں کی شکل سے تاب لاسکتا ہے۔ محراب صاف ہے جسے کو عقل کی تیز روشنی اور ذہن کی پختہ کاری بھی اس کا مذاق نہیں آ سکتی۔ اس کی معصیت، فخری، تک، بے ساختگی اور رنگینی اسے زندگی کا ایک روشن لمحہ بنا دیتا ہے۔ اس فضا میں ذہنی چلچلی ہے۔ طرہ زندگی کا ایک اہم دور یہ بھی ہے۔ کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خوابوں، جادو کے جزیروں اور سہرے و صندلوں کی یہ دنیا ہمیشہ زندگی سے گریز اور فرار کھلاتی ہے۔ لیکن ہر جگہ ایسا نہیں ہوتا۔ کچھ لوگ خوابوں سے حقیقت کی طرف آتے ہیں اور دنیا کو جنت بنانے کی یہ آرزو اس میں مدد دے چکے ہیں۔ کچھ زندگی سے ایسے بیزار ہو جاتے ہیں کہ (AXEL) کی طرح میں عالم حسرت میں مرنا بہتر سمجھتے ہیں اور زندگی کرنا اپنے لڑکوں کے لیے چھوڑ جاتے ہیں۔ اختر بھی برسے ہیں۔ چنانچہ لالہ طور کا ماہی و دریا شگفتہ اور زندہ ولی نہیں۔ اسے محبت میں ناکامیاں ہوتی ہیں۔ وہ آسمان سے زمین پر اترا آیا ہے پسے دینا اس کے لیے فردوس تھی۔ اب وہ "فریب" سے آگاہ ہو گیا ہے اور کبھی کبھی یہ بھی کہہ سکتا ہے۔

جن کو کچھ بھی نہیں، عشق جواں کچھ بھی نہیں

ہوش لے دل کہ جہاں گزراں کچھ بھی نہیں

اب اس کے لیے انہی کی سہری یادیں اور زیادہ سہری ہو گئی ہیں۔ یاد رفتہ "کوہ چوڑی نہیں سکتا۔ اس کی داستان جو کبھی تناؤں کی کہانی" تھی اب عشقوں کا بیان بھی ہو گئی ہے۔ اس میں غمی، زہری، کھجوریت دینا سے بے زاری اور فراز کا مذہب پیدا نہیں ہوتا۔ اس کا نغمہ بہار جہاں سننے سے ہر دم پیش بھانے کا عزم ہی ہرگز آتا ہے وہ ہم پیش کا زیادہ قیمتی تصور بھی پیش کرنا ہے۔

ایک سلطان کو لشکروں گدائی دے کر

ہر گدا کو کئی معوروں کا سلطان کر دیں

منفرد عالم نو کا ہے جہاں کہند

شیر تیرہ سے عیاں بیخ و دشتاں کر دیں

اس مجموعے کی اچھی غلوں میں سے داستان حیات، نغمہ بہار، نغمہ قاصد اور میرا موجودہ مشغول ہیں۔ اگرچہ اس میں رنگ نہیں اختر کی شاعری میں یہاں ایک انحطاط محسوس ہوتا ہے۔ اختر کی شاعری میں عشق کا جوش بھی ہے (PASSION) اور وجد و کیف بھی (ECSTASY) لیکن وجد و کیف زیادہ ہے اور طہر ہے عرف اسی کے ہمارے انسان تک پہنچ سکتا ہے۔

اختر کی شروع کی غلوں میں عورت سب کچھ ہے۔ انہوں نے جا بجا کہا ہے کہ جب تک یہ دنیا اور اس کی خوش فانی ہے۔

ہماری زندگی پر عورت کی خدائی ہے۔ یہ عورت سبلی ہو یا عذرا، ریکانڈیئر یا شمشیر یا کوئی اور، اختر نے اس کا سراپا بیان نہیں کیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اختر نے اسے نگاہ ہو کر دیکھا بھی نہیں۔ سبلی بقول راشد کے اختر کا جمال ذہنی ہے اور وہ ڈور و تھو کی لوسی (LUCY)

یا کیس (FANNY BROWN) کی طرح شاعر کے دل کی حکم۔ وہ بھی صاف نظر نہیں آتی۔ ایک مقدس پرچہ میں ایک پیر بختاب

ایک آسانی حور ہے۔ دیکھیے :-

بہارِ صن کا تو غیرِ شاداب ہے سلی

تجھے غلٹ نے اپنے دستِ نیکیں سے ملوایا ہے

بہشتِ رنگ و بو کا تو سراپا اک نظرِ آہ ہے

تو صورتِ سراپا پر شاداب ہے سلی

تو اجسم اک ہجومِ دیشم و گنواہ ہے سلی

یہی حال سلی کی تصویر کا ہے ۛ

یہ حسنِ ناز نہیں یہ جلوہٴ نازِ افسریں تیرا

یہ معصومانہ چہرہ غنچہٴ شاداب کا عالم

یہ مستانہ نگاہیں اک بیشقیِ خواب کا عالم

سراپا کے خیالی حورِ جسمِ ماز میں تیرا

مجسمِ خندہٴ خوابِ پوری رہنے میں تیرا

اختر کی تصویریں حسیں و دلکش ہیں مگر دانشِ نہیں۔ ان کے رنگ نہایت شوخ ہیں مگر نہ وہ حالِ صاف نظر نہیں آتے۔ ہر چیز پر ایک سہرا نقاب ہے تشبیہات و استعارات سننے نہیں۔ احساس کی صداقت اور حقائق نے انہیں بھی ذہن کی دوسری ہے۔

اختر کے کلام کی پہلی خصوصیت جو زور دیتی ہے، اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ یہ ہے کہ ان کا عشق قدیم شہر کی طرح نہ کسی تجلی تو بہم کا عشق ہے، نہ مہرِ طبع کی شاد باندازی کا۔ نہ ایک سرودِ بے رنگ عورت کا۔ بلکہ ایک ایسی عورت کا عشق ہے جو اس دنیا کی ہے۔ پہلو میں دل رکھتی ہے اور دل میں لطیف جذبات جو شعاعِ عشق سے متاثر بھی ہوتی ہے، اور اپنے جذبات کا انہماک بھی کرتی ہے۔ لیکن بعض اوقات سماجی بندشیں اسے اجازت نہیں دیتیں کہ عورت کا جوابِ محبت سے دے۔ اختر کے اس عشق میں کوئی نئی بات نہیں ہے بقولِ زراق کے ۛ

ہزار بار دہرائے دہرے گزرا ہے

مگر اوصاف یہ ہے کہ اختر سے پہلے کسی نے اس جوش اور جذبے سے اپنی محبوبہ کا نام نہیں لیا۔ عشق بہت سوں نے کیا اور عذرا کے لطیف بیخِ اشادوں میں اسے بیان بھی کیا۔ مگر دل اپنی محبوبہ، اپنے عشق، اپنی واردات، اپنی جانِ راقوں اور اپنی چمکیٹِ شادوں کا مزے لے لے کر بیان نہیں کیا۔ بہت علم یا ستم پیشہ دوشمنی یا عورتی اور جواہر یا حجاب کے نام ہیں معلوم ہو جاتے ہیں مگر اور کچھ نہیں معلوم ہوتا۔ اختر نے جہاں سلی یا عذرا یا بھماز کا ذکر کیا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی آسانیِ غفلت نہیں بلکہ اسی فردوسِ ادنیٰ کی حوریں ہیں جو عشق کا جواب عشق سے دیتی ہیں، اور جن کے عشق پر غلٹ مسکراتی ہے۔ بکھانا کے متعلق کہتے ہیں ۛ

اسے پھولوں نے میری یادیں بے تاب دیکھا ہے

ستاروں کی غفلت نے رات بھر بے خواب دیکھا ہے

وہ شمعِ حسنِ تھی، پر صورتِ پروانہ دہتی تھی

یہی وادی ہے وہ بہم جہاں بیکانہ دہتی تھی

مذرا کے ساتھ چند لمحوں کی یادگار ملاحظہ ہو۔

فضاؤں کو مہلوؤں سے روشن کیا
ہواؤں کو خوشبو سے مہکا گئی
نبٹن میں آئی کچھ اس ناز سے
کر جیسے جن میں بہاد آگئی
تنہا کی بے تابیاں بخشش کو
جوانی کی داتوں کو ترپا گئی

سلی کے وادی میں آنے کا انتظار اس طرح ہوتا ہے۔

مقا و حیا کی کش مکش کین کر شاؤں کا
میں اس کے پاسیں بیکر کو کیڑو کر گداؤں کا
اور اس کے سلی اسے مسرت رنگ پر اوں کا

وہ چھوڑوں اور ستاروں سے بھی شرماے گی وادی میں
نہا ہے میری سلیے رات کو آئے گی وادی میں

یعنی اختر کی شاعری میں ایسی ذکاوت، حریت و صراحت، ہمالیہ و بربادی کے بھانے چاہنے اور چاہے جانے کی لذت ہے
اختر ان شعرا میں سے ہیں جو اپنی مشرقیت کے باوجود مشق کی لذت کو محسوس کیسے ہیں اور اسے بیان کرتے ہیں نہیں سمجھتے۔ ہماری بدلتی عشقیہ
شاعری میں احساس گناہ کچھ اس طرح چھایا ہوا ہے کہ لوگ کھل کر عشق بھی نہیں کر پاتے۔ وہ اس پر شرمندہ و پشیمان سے ہیں۔ بہتر اس لحاظ سے
مہر شاعر ہیں کہ ان کے ہاں پشیمانی نہیں ہے۔ مجھے، کوشنیل آگے ہے کہ ان کی سلیے ANNA KRENINA جیسی لازوال
تخلیق میں بھی (ANNA) کے عشق کو ایک جرم، ایک عذاب اور دکھ کہہ کر کہنے لگنے والا نشر قرار دیا ہے۔ چنانچہ
(ANNA) اور اس کا عاشق جب پہلی دفعہ بیک جا ہوتے ہیں تو بھی خوشی ان کی قسمت میں نہیں ہوتی۔ اختر کے سلیے
عشق ایک حادثہ ہے۔ وہ اس فریضے کو ادا کرنے میں خوش رہتے ہیں۔ ان کا عشق سرور و ممانیت، مادائیت یا مابعد الطبیعی حسن کے
بجائے ایک حسین جسم کا متعاشی ہے۔ ان کے یہاں جسم کی یہ مستی (BODY'S RAPTURE) ایک لذت ہے۔ دکھتی
ہے۔ جنلاق چاہے اسے کتنا ہی برے کہے لیکن ان کی لغت اس کا جواز ہے۔ اس دور میں فراقی اور جوش کے یہاں جسم کی یہ مستی اور بھی
نمایاں ہے۔ کچھ بوسے، خطرات، اور سید شغاف، اندوہ میں بالکل نئے نہیں ہیں۔ مگر اور دوسرے شعرا کے یہاں ان کی بہادری مغر
فریب ہے۔ لیکن بغیر کے بعد ایک مہذب، شریف اور اخلاقی نقطہ نظر نے اسے بازاری قرار دیا۔ وہ بھی اس پر غرور پردہ ڈال سکی۔
اسے غائب نہ کر سکی چنانچہ عشقیہ شاعری میں جنسی کشمکش سے روکینی آتی ہے۔ اور بول بھی شعرا و ادب کے عزائم میں سب سے
چمک دار موتی وہی ہیں جو ہنسیات کے سمندر سے عواصی کے بعد نکالے گئے ہیں۔ ہمارا پرانا ادب تنہا دہش کو پردے پردے میں

پیش کرنے کا قابل تھا۔ سید شفات کے بجائے سستی میں گھسنے ہوئے پیاسے یا صحاب غاسقہ اور کجراؤزد زیادہ مہذب تھا۔ اب غنی
جذبے کے صحت مند نشاط کو اتنی بڑی مغرسے نہیں دیکھا جاتا اور ادب میں یہ ذہنی خلگی۔ وہ بول نہ کم ہو رہی ہے۔

اختر کے یہاں لذتیت ہے مگر عریانی نہیں۔ جہانِ محبت ہے مگر پستی اور ابتذال نہیں۔ عورت ان کی نظریں کوئی
کھلونا نہیں بلکہ دیوی ہے۔ ان کے نزدیک کائنات اور اس کی ہر چیز پر عورت کی خدائی ہے۔ مگر اختر کی عورت سے زیادہ اختر کا
عشق اہمیت رکھتا ہے۔ یہ اقبال کے عاشقِ برجانی کی یاد دلاتا ہے جسے حسن جہاں بھی ہے اور جس حال میں بھی ہے عزیز ہے۔

گو عینِ نازہ ہے ہر لطف منظورِ خضر

حسن سے مضبوط بیان و فارغ ہوں میں

KEATS نے شاعری میں انکار کی بلکہ حیات اور خیالات کی جگہ جذبات پر زور دیا ہے۔ غنائی یا عشقیہ شاعری

میں جذبات کی گہرائی اور صداقت بہت کچھ ہیں۔ مگر عشقیہ شاعری میں بھی بڑی شاعری حسنِ عشقیہ نہیں ہوتی اور بڑی شاعری کے لیے
خیالات کی باندی یعنی تخیل کی قدرت اور کائناتی یا آفاقی رنگ ضروری ہیں۔ یہی عشق کو محض شش نہیں زندہ کی بھی ہونا چاہیے۔ اختر کے
یہاں انکار کی گہرائی یا باندی نہیں ہے۔ ان کے یہاں جذبات ہی جذبات ہیں۔ جذبات میں عشق اور عشق کی مصدقہ، حسن اور حسن کے
افراد، اختر خوب بیان کرتے ہیں۔ ان کا یہ شعر ناپائیدار نہیں۔ مگر ان کی شاعری کی اچھی مانند کی کتاب ہے۔

یہ کس کو دیکھ کر دیکھا ہے میں نے بزمِ ہستی کو

کہ جسے ہے خدائی میں حسین معلوم ہوتی ہے

ان کی غزلوں میں بھی کیا نہ اسلوب کے بجائے شاعرانہ رنگ اور جذباتی کیفیت ہے۔ مگر اس میں وہ انسان ہیں اور
ہرگز کہے بغیر اوجِ حرمت، جوش اور فراق کی باور دلاتی ہے۔ اور وہیں ہی عاشق میں جو اپنے عشق پر شرماتے نہیں بلکہ خضر
کرتے ہیں۔

یہ ہے چمک کے بھی اس حسن کو پہنچ نہ سکی	یہ جوں کھل گئے بھی اس کا شباب ہو نہ سکا
نازے گیسو کے سلی پہ بڑھے ہاتھ اختر	یوں نہ بانٹا شائے پ بام نہ کر
اس کے عہد شباب میں جینا	بچنے والا نہیں ہوا کیا ہے
مجھے سے خاندانِ عزتانا ہوا عوس ہوتا ہے	وہ میرے سامنے شراکے جب ہوتا نہ کہنے ہیں
بھلا کیوں کہ نہ جوں دتوں کو عید میں بقرہ اسکی	کبھی ہوا کبھی جو جس پہ نہت منکب بار اس کی
یوں تو مرد پہ چلتے نظر آئے دامن	کھینچتے ناز سے جس کو دہی دامن نہ ملا
طوب نوٹیں میں ہے وہ جان بہاد	نور و نگہبند کی داستانِ غموش

یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ اختر کی نظریں اور جوتی اور فوری اور شگفتہ تجربے کے اس دورِ جہر کی مین جواں کی نظموں
کا ہے۔ غزل میں جس بلاغت، جس بھرپور دوا، جس کلمہ آفرینی کا کمال ملتا ہے۔ وہ ان غزلوں میں نہیں ہے۔ نظموں میں جہاں تصویریں زیادہ
بڑی اور رنگ زیادہ شوش ہیں، نہیں زیادہ کامیابی ہوتی۔ ان کی موسیقی بھی نظموں ہی میں طغ دیتی ہے۔

چنانچہ اختر کے ہاں ایک زوجان عشق، اس کی سپردگی اور لذتیت ہے۔ یہ لاکھ سلی سہی موصحت مند ہے۔ اختر کی جنت یوں تو سلسلے، دیکھا نہ یا عذرا کی آغوش ہے۔ لگاس کی جنت کی تعبیر میں فطرت کا حسن بھی ہے۔ یوں بھی فطرت کے آغوش میں اختر کو ملن ملا ہے۔ ان کی جنت ایسی ہندستان کی ایک ایسی جنت ہے جو دامن کوہ میں ہے۔ پہاڑوں کا پس منظر اس کی عظمت اور تقدس کا ضامن ہے۔ اس کے گرد ایک دیانے حسین ہرانا ہے۔ جیسے حمد کی گردن میں لہڑ کی ہنسی۔ یہ وہ بانڈ کی کی روانی اور ایک مسلسل حرکت کے احساس کا ظاہر کرتا ہے۔ پھر وہاں پختہ ہیں، جھڑے ہیں۔ دلچسپ انھیاریاں ہیں۔ آدم کی شاخوں کے حریری پردوں میں غنوں کے خزانے ہیں۔ تارے نور کے چھانے ہیں، اور ہاٹ لڑ کی خواہیدہ بری ہے۔ لگ رہے سب یادیں ان کی عادت اباں اور شمشیں شہستان کی یاد کو اور روشن کرتی ہیں۔ اختر کے ہاں فطرت نہ (WORDSWORTH) دوڑو نہ تھک کی طرح ایک مقدس ہستی ہے۔ نہ نمبر کی طرح مجبور کے لیے پھروں کی بیج، اختر اور جوش دونوں فطرت پرست ہیں۔ اگرچہ اختر حسن کی طرح فطرت کی صورتی میں بھی دھندلے یا ایک حسین اہرام کے عاشق ہیں۔ جوش اختر سے زیادہ واضح ہیں۔ اور ان کی مفر فطرت کی بے مری پر بھی پڑتی ہے یہی وجہ ہے کہ میں اختر کو اردو کا پہلا روانی شاعر سمجھتا ہوں۔ فطرت عودت یا ماضی، ان سب کی صورتی میں اختر چیز سے زیادہ اس کے مقصود کے عاشق ہیں۔ ان کا انجمن عشق انہیں کسی چیز کو غور سے دیکھنے نہیں دیتا۔ ان کے ہاں رجوں، غنوں اور خطوط کی بہاریاں ہیں۔ چاندنی کی چھوڑیں اور مزدوسی مناظر کی نقادیں ہیں۔ بعض اوقات یہ یادیں انہیں اس دنیا اور اس کی تجلیوں سے دُور لے جاتی ہیں مثلاً مرزبین عشق میں سے

جنگلِ عالم سے دُور، آفتِ گوشتی سے دُور

اس کوئی دنیا سے دُور اس ظلم کی رستی سے دُور

اس رات اس دن سے الگ اس ادج اس رستی سے دُور ————— ایک مرزبین عشق ہے

اسی طرح تاثراتِ غم میں وہ ایک خیالی جنت کی تصویر کھینچتے ہیں۔ لگ رہے اس دنیا کی بہا، دن کے بھی دلدادہ ہیں۔ اور اس حد

تک دلدادہ ہیں کہ جنت کی بھی آرزو نہیں کرتے

یہ دنیا، یہ خفا سے اور یہ دلچسپی فضاؤں میں

یہ موسے چاند سورج کے، یہ تابیانی ستاروں کی

یہ زمست لالہ لادوں کی، یہ رخت کوہساروں کی

یہ بھینی بھینی آوازہ سی خوشبویاں ہواؤں میں

یہ بکری بکری سنی جھومنے والی گھٹاؤں میں

یہ تیزی آتشوں کی، روانی جوہاروں کی

یہ پھولوں کا ہجوم، اور یہ لطافت سبزہ زاروں کی

یہ موسیقی جو اقصاں سے پہنچوں کی صداؤں میں

یہ شمع یہ ترانے یہ شراب و شعر کا عالم
یہ آرائش مکالموں کی یہ زیبائش کمبختوں کی
یہ روانائی حسیوں کی یہ صحبت مازنینوں کی

یہ عربیں۔ یہ بہادریں۔ یہ شباب و شعر کا عالم
نہ لے جا خلد میں یا۔ بد میں پہننے دے تو مجھ کو
یہ دنیا ہے تو جنت کی نہیں ہے آرزو مجھ کو

اس وجہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اختر کی روحانی شاعری میں فراہیت کے بجائے زندگی کے حسن و مسرت کو جذبہ کر لینے کی تمنا ہے۔ اختر اور پوری نسل لکھا ہے کہ اختر کی شاعری میں گریز و ہجرت کی تمنا کو دھک دے۔ ہی ہے: اس میں شک نہیں کہ کہیں کہیں اختر گریز و ہجرت کی طرف بھی جاتے ہیں۔ مگر زندگی اس کا حسن اور اس کا دامن انہیں اپنی جنتِ ادنیٰ کی طرف لے آتا ہے۔
اختر کے یہاں عشق میں رہنے کی خواہش بھی ہے اور جنگ جوائی اور شیرازی کا دلور بھی۔ اور آرزوی کے نام پر مارنے نہ کرنے کی آرزو بھی۔ ان چیزوں میں بغاوت و بغاوت و بغاوت ہے۔ مگر دراصل، اختر کی روحانیت کے یہ مختلف پہلو ہیں۔ سطلے کی تصویر کو سینے سے لٹا کر سر جانا ایک مقدس فریضہ ہے۔ اور آرزوی کی جدوجہد میں دین کی خاطر تلوار اٹھانا اور دشمنوں سے ٹھینا ایک عبادت ہے۔ جوانی کو جہاں حدیں عزیز ہیں وہاں خوں چکان لکھنا کا بناء بھی۔ وہ محبوب کی خاک کے ساتھ اپنے لہو کی ہلکی کو نہیں سمجھتی۔ اس لیے یہ سپاہیانہ عشق جو بقول ماہرند کے ازمنہ و سطلے کے ایک نایت کی یاد دلاتا ہے۔ جوانی اور لہو کی روحانی کا عشق ہے۔ اور اس کی شدت اور تیزی باوجود سطلے ہونے کے دلچسپ ہے۔

وہی اختر کی فن کاری کو نوادوں۔ کہوں اور تداویں کے اس شاعر نے تشبیہات و استعارات سے بٹا کام کیا ہے۔ اختر کی تشبیہات نئی نہیں۔ لیکن اختر کے مقصد کو دیا کرتی ہیں۔ اس سے اختر کا شعور فنی ظاہر ہوتا ہے۔ روحانی شاعری میں فوق فطری عناصر اور انسانی فنی فنی بشری عناصر کو دیکھتا ہے۔ اختر نے اپنے استعاروں میں اسی اصول سے کام لیا ہے تاثراتِ نغمہ اور پوچھیں سالگرہ کا تہنہ دونوں میں یہی اصول کام فرما ہے۔ جن کی وجہ سے ان میں۔ روحانی اور دل کشی آگئی ہے۔

نفر کے سامنے رقصاں ہیں رنگین وادیاں گویا

شراب و شعر میں مری ہوئی ساری فضا میں ہیں

افق پر موجزن مستانہ خوابوں کی ہوائیں ہیں

فضا پس رہی ہیں لاد کی آبادیاں گویا

علاء میں پر فشاں ہیں صن کی ٹہریاں گویا

شاعری سے نذر کروں، آفتاب نذر کروں

کلی کا حسن گوں کا شباب نذر کروں

دیباغی غزل کی شادایاں کروں حاضر
ذلیل ساگرہ چروہو ہے حرمت ہے
لگاؤ حور کا رنگیں جواب نذر کروں
کہ میں بھی چروہو کا مہتاب نہ کروں

غزل اختر کی نگین دھندل دھندل، سبز ہر دوں میں لپٹی ہوئی فضا کے لیے یہی نگاری موزوں ہے۔ تبیں تاروں سے بے لطف
دیکھا ہے، یا یہی وادی ہے وہ ہم جہاں، کیا نہ رہتی تھی؟ "خوش آمدید" میں تشبیہات خیالی انگیز نہیں ہیں۔ خیال کو پہلانے کے لیے یہ اور
پڑھنے والے کا ذہن جھٹکا ہوا ایک رنگیں دنیا میں پہنچاتا ہے۔ اس رنگین دنیا کا حسن کچھ عرصہ کے بعد ماند پڑ جاتا ہے۔ یہاں کے پھولوں میں لکھنے
یہاں کی چاندنی دائوں میں سائے چھرتے نظر آتے ہیں۔ گردِ سبب دما بعد میں ہوتا ہے۔ شروع شروع میں تو یہ نغمیں ہیں "جادو کے درجوں تک
پہنچا دیتی ہیں۔ گرد و مین اختر ایسے شاعر ہیں جنہوں نے سائیت کی حمد و ادنیاب دنیا میں کھٹکتی اور روانی پیدا کی۔ سائیت ان سے پہلے عظمت انقدر
خال دیکھنے سے بھی لگے۔ اور بعد میں ان کے اثر سے تو یہ عام ہو گئے کہ انہوں نے اس میں کیا بیانی حاصل کی ہے۔ اگرچہ اردو میں سائیت کی وجہ سے
کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ اور اسی وجہ سے حال میں اسے ترک کیا جا رہا ہے۔

کیا اختر کی شاعری بے وقت کی، لکھی ہے؟ کیا اس کی حریت لم ہے؟ کیا اس کا حسن ایک رنگیں نغمے، ایک میٹھی یاد کا حسن ہے؟
کیا اس شاعری کی ہمارے ادب میں کوئی اہمیت نہیں؟ آج یہ سوال قدرتی طور پر ہمارے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ آج کی دنیا اور آج کے
ذہن کی ELIOT نے اپنی ایک نظم میں بڑی اچھی تصویر کھینچی ہے۔

I HAVE LOST MY PASSION: WHY SHOULD I NEED TO KEEP IT,

SINCE WHAT IS KEPT MUST BE ADULTERATED

یہ ذہن بڑا سخت کا فر ہے۔ یہ برجیں دھندلے ہیں چھپے ہوئے غار، ہر ملکوتی حسن کے ذوال، ہر مہربانے کے نقیب و فراز
سے واقف ہے۔ اس لیے یہ رومان کے بجائے حقیقت، عذبلے کے بجائے فکر، خواب کے بجائے بے لطفی اور ذہنی اذیت کے بجائے دینی غوار
کو پسند کرتا ہے۔ یہ فیصلہ صحیح ہے۔ اگر اس کے باوجود اختر کی محبت ارضی کا حسن نہ نہیں ہوتا۔ اس میں زندگی اور صداقت ہے۔ یہ زندگی ساری
زندگی نہیں ہے۔ حسن صرف شباب کی آواز دہکتی ہیں نہیں بلکہ نفرت کے بدلتے ہوئے تغافل، زندگی کے فتنے، انقلابات، نئے تجربات
اور دھمات ہیں بھی ہے۔ اختر کی شاعری کا بڑا حصہ حسن کے اس تصور تک نہیں ہے جتنا اس میں ایک ذہنی پچھن ہے۔ اگر اس پچھن کے باوجود
اس کی کشش تازگی اور رنگینی میں شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ ہماری اردو شاعری میں دوسرا بند نا بدست ہے۔ پرانی شاعری ایک مریض سوسائٹی اور
مریض عشق کی وجہ سے زندگی سے اور زندگی کے نشاط و انداز سے عروم محنتی، موجودہ دور میں زندگی کی سخت چکن و جواؤں کو بدست جلد
پس کر لیتی ہے۔ ان کے مزہ کامزاکر و ہمو جاتا ہے۔ وہ وقت سے بدست پہلے پورے ہو جاتے ہیں۔ ان کا احساس عروم انہیں کبھی کبھی
جھٹنے نہیں دیتا۔ اختر کی شاعری شباب اور اس کے رومان کی شاعری ہے۔ کیا ہوا اگر ان کا مادہ زیادہ دلیک نہیں رہتا۔ ان کے یہاں
جادو تو ہے اور شاعری میں جہاں میں جادو ہے بڑی چیز ہے اور جہاں جادو نہیں وہاں بڑی سے بڑی چیز بھی کی محسوس ہوتی ہے۔

فیضی کا نظم سربہ شعر

ڈاکٹر وحید قریشی

فیضی کے نظریہ شعر کو سمجھنے کے لیے ابو الفضل کے نظریہ فن سے واقف ہونا ضروری ہے فیضی ایک انفعالی کردار تھا۔ اس کا اپنے بڑے بھائی کے نظریہ فن سے متاثر ہونا ناگزیر ہے۔ اسی میں ابو الفضل کی عظمت اور فیضی کے نقطہ نظر کی صحت کا راز ہے۔ زندگی کے ابتدائی ایام ہی سے چھوٹے بھائی کی علمی فتوحات اور عام زندگی میں اس کے فیصلوں کی درستی نے مبارک پر داغ جمع کر دیا تھا کہ فیضی پر ابو الفضل کو ترجیح حاصل تھی۔ اس ترجیحی سلوک کو فیضی نے فوراً قبول کر لیا۔ اور ہمیشہ اپنے بھائی کی علمی تک و دواد اور معاملہ شناسی کا معتز ت رہا۔ اس انداز نظر کا اثر فیضی کے نظریہ شعر پر بھی پڑا۔

ابو الفضل کے نظریہ فن کے تین بنیادی نکات ہیں (۱) الفاظ و معانی کا رابطہ (۲) تعلید و انفرادیت اور تصوت (۳) ادب اور صوفیانہ انداز کی اہمیت۔ اگر کسی دور نے باقاعدہ الفاظ اور معانی کی برابری اور گہرے رابطے کو تسلیم کیا ہے تو وہ فیضی اور ابو الفضل ہی کا دور ہے۔ اگر فیضی نے قدیم ادب کی پوری کو علمی شکوک کے پیش نظر نا درست قرار دیا اور اپنے فن اور نظریہ فن کو یکساں کی ہونے سے بچا لیا اس طرح جاندار اسلوب بیان کے لیے راستہ صاف ہو گیا۔ قدیم اسلوب پر ابو الفضل کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے۔

ہمگی بیچ ہمارا اثرن الفاظ باشد معنی را پر و لفظ دانستہ بر وارثوں روئے ٹھکا ہوئے روئے

لے ہونے اور بچا جائیں اگر ہی صفا) لے انشاء ابو الفضل ص ۲۳ لے ابو الفضل نے ایک جگہ اگر نئے میں اپنے باسے پر فیضی کا یہ شعر نقل کیا جسے

صد سالہ مہیا بنی و اوست در کمال
دور اگر از دو ستر سالے فروں ترم

لے عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ جلد سوم ص ۹۹ پر فیضی کے حال میں لکھا ہے :-

فیضی ذو انداز بجز قریب پر اور خود کہ اور اعلامی نویسیست بجمہت علوشان دران وزن تخلص فیاضی اختیار نموده

وسازگار بنامد و بعد از یک دو ماہ رخت حیات از عالم برداشته

لے انشاء ابو الفضل ص ۲۸ لے اس لیے فیضی بھی محترم کا شی کی شاعری میں لفظ و معنی کی برابری کا قائل ہے :-

حریر با ب سخن محترم کہ در کاشت
بطر تازہ ترا ز ہر سخنوری دارد

کے ز نکتہ دران گفت و دیم اشعارش
عبارتیں کہ معنی سرسری دارد

گفتہ سخن او عبارت است
جہاں تے کہ بہ معنی برابری دارد

چہ طرف بدم ازین ہر دران قائل کش
کہ می کشد تخت از تن خیال لباس

ابو الغضائف کے خیال پر غور کیے بغیر شعر کا قصور سے ناظر جو ٹٹے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اگر وہی دور میں یہ آسانی اس لیے بھی ہے کہ اس زمانے سے ہندوستان میں ادب اردو کے قصور سے متاثر ہونا شروع ہو گئے تھے قصور کی تخلیقات میں یہ امتیاز کہ اردو تو صوفی شاعر ہے اور جاتی محض تک بند زیادہ گرا ہوسے لگا نتیجہٴ تغزل کی وہ ہفت رنگ پیک و یک شروع ہوئی جو ”تازہ گوئی“ کہلاتی ہے ”کمیات“ کی مخالفت کا رجحان بھی بڑے زور شور سے اٹھا۔ یہ بھی ایک حد تک اردو کا فیض ہے کہ ابو الغضائف اور فیضی کا صوفیانہ درجہ تعلیم کی منزل سے کہیں آگے اور ”تحقیقین“ کے دم قدم سے آباوے شعر اور قصور کا ایک دوسرے پر اثر انداز ہونا اس لیے بھی ممکن تھا کہ جیسے تصوف زندگی بسر کرنے کا ایک انداز تھا اسی طرح فن شعر بھی اپنے تمام لوازم کے ساتھ ایک ضابطہٴ کمیات ایک راہ عمل بن جاتا ہے فیضی تو میان تک کہ جاتا ہے :-

فیضیم عاشق جسمانی سخن کہ دو عالم مراد میں سخن است
از ہمہ دورے در سخن دارم قبلہ اعتقاد من سخن است
بیچ گاہے از دگر نرم نیست پیر میں اور سنا دمن سخن است

یہ پُر خلوص ذہنی رجحان جہاں فیضی کی شاعری کو جذباتی گہرائی اور وسعت عطا کرتا ہے وہاں اس کے نظریہٴ شعر کو بھی صوفیانہ انداز فکر سے متاثر کرتا ہے۔ اس دور میں اس کے بغیر جذباتی وحدت ممکن ہی نہ تھی۔ یہ اشتراکِ عمل نظریہٴ شعر اور قصور کو ہم گام کروینا ہے۔ اور یہ دور رجحانات میں زبان کی وحدت بڑی آسانیاں پیدا کرتی ہے ”معنی“ اور ”صورت“ واحد ذخیرہٴ الفاظی کو ظاہر نہیں کئے بلکہ ایک ذہنی افق کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ ابو الغضائف کے نزدیک قدما و معاصرین ”رہ زوہ پندار“ اور ”عارف کر وہ تعلیم“ ہیں۔ اور ان کے مقابلے میں اس کا اپنا اسلوب بیان ”نبیخ شاد کاظمی“ جس ادب پارے میں محبوبانہ صوفیانہ مہنیں ان کا کھٹنے والا ”ابو الامجد“ عبارت ”اور وہ مناجات برادرانی صورت“ کے لیے ”بازارِ چر اسباب“ ہے۔ دنیا داری کے معاملات انسان کو ”کیا کر“ ”سنیں بنا سکتے۔ اس کیسے گری کے لیے تو ضرورت ہے“ معاملات صوری و معنوی کا از صدق فروری داشتہ باشد“ کیونکہ یہی چیز ”تو بجز دوز آودن کے کام آتی ہے۔ بڑے ریاضی کے بعد کہیں جا کر نقطہٴ نظر حاصل ہوتا ہے :-

چشمِ جاں را مرم کش فیضی کہ اربابِ نظم روئے منی را بردن بائے عرفان ویدہ اند

لہ روی کہتے ہیں :-

نعلیقِ رائقِ تعلیمِ شایِ بر باد داد اے دورِ صلحتِ برینِ تقلید باد

فیضی کہتا ہے :-

دل بنگی بسترِ تحقیقِ بخشش آزادگی ز قیدِ تسلیمِ وہ

لہ افشائے ابو الغضائف ص ۲۸۵ لہ ایضاً

لہ ایضاً ص ۲۸۶ - (انوری کے ہائے میں)

لہ ایضاً لہ ایضاً

لہ ایضاً (حکیم سنانی کے ہائے میں) ص ۲۸۶ لہ ایضاً (ظہیر غازیابی کے ہائے میں) ص ۲۸۶

تصوت کی چھاپ جب نظریۂ شہ پر لگی تو فیضی اور ابو الفضل کا ادنیٰ زاویہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ تصوف میں ان کی منزل ”تقلید“ سے آگے تھی تو فیضی میں بھی ”خاترہ تقلید“ کو انھوں نے ناپسند کیا۔ اس طرح دو متعین ”اور نہ انفرادیت“ چمکنی ہو گئے اور آگے راستہ صاف تھا۔

اس سے پہلے تصوف اور شاعری کو یوں گھلٹا کر دیکھنے کی کبھی کوشش نہیں کی گئی۔ بسبب شاید یہ تھا کہ ہر علم کی حدود و مقرر تھیں اور یہ مندری نہ تھا کہ ایک علم دوسرے کے ساتھ مل کر عقل وحدت بنا سکے (جذباتی وحدت کا سوال ہی نہ تھا) اس لیے نظریۂ فن پر تصوف کا اثر اتنا قدر اس سے پہلے ہمیں نہیں ملتا۔ اگرچہ اصطلاحات کی یکسانیت پہلے بھی بائی جاتی تھی لیکن نظریۂ فن کا بنیادی تعلق تصوف کی بجائے عموماً علم معانی و بیان ہی سے رہا ہے۔ یہ اگر ہی دور کی خصوصیت ہے کہ شخصی کوششیں، اجتماعی رنگ اختیار کرتی گئیں اور ترقی خواہ علم صرف دے گا راگئے۔ ان عناصر کی زیادتی نے فارسی شعر و ادب کی کاپیٹ کر دی۔ اور اقتدار ادب جیسے بنیادی مسائل جو اس سے قبل محض زبان کو اپنی اساس قرار دیتے تھے تصوف کے زیر اثر اندر احیاءت کو بنیادی ماننے لگے۔ اگرچہ اس دور کے ادب سے بھی مد زبان کی اہمیت سے پورا انکار نہ ہو سکا۔ پھر بھی قطعی فیصلہ خیالات و جذبات کی اہمیت کے پیش نظر ہی ہو سکتا تھا۔ وہ ادب گھٹیا ہے جس کے تخنوبات ارفع و اعلیٰ نہیں اور ارفع و اعلیٰ محتوبات صرف صوفیانہ ہی ہو سکتے ہیں۔ یہ ابو الفضل اور فیضی کا عقیدہ تھا اس تراز میں انوری کی شاعری پوری نہیں اترتی بلکہ اسی پر سنائی کی شاعری کا ایک حصہ ناقص قرار پانا چاہیے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں خانقاہ کی ”خود سنائی“ لائق تعزیر بنتی ہے۔

اسے کاش اور آخری خودوش ایں قد۔ نفع رساندے تا از حسرت نیافت مراتب
وہی نہات یافتہ بگلشن ہر اسے خرمندی رسیدے سکھ

یہ اندازِ نفا بھی اتنا ہی خاص ہے جتنا زبان کو بنیادی قدر مان لینا تاہم اس سے ”جدت“ کا اندازہ تو ہوتا ہے۔ اگرچہ صوفیانہ شاعری کے سوا ہر شاعری کو گھٹیا قرار دے لینا خود فریبی سے کم نہیں۔ پھر اس نظر سے میں یہ خیالی بھی تو ہے کہ نفاذ محض صوفیانہ خیالات ہی کے انہار کو اہم مان لے اور اس طرح جامی اور اُن کے ساتھیوں کی خشک شاعری کے لیے راہ نکل آئے۔ اور جامی بھی ردی کے درجے کا شاعر سمجھ لیا جائے۔ اگرچہ ابو الفضل کو اس کا احساس سختی ہے ورنہ وہ ”مصدق“ کا لفظ استعمال نہ کرتا۔ لیکن اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ محض خلوص بھی شاعری کا مناسب منہ تو بات وہیں رہ جاتی ہے۔ اور اس طرح ابو الفضل کے اپنے وہ اشعار جو صوفیانہ خیالات کے حامل ہیں وہ بھی اعلیٰ درجے کی شاعری کہلا سکتے ہیں۔ حالانکہ ابو الفضل کی شاعری ایک خشک مولوی کی شاعری ہے اس کے برخلاف فیضی کی شاعری ایک زندہ دل صوفی کی شاعری ہے جس میں جذبات و احساسات کی رنگارنگی اور زندگی کی تمام نشانیوں موجود ہیں۔ تو پھر فیضی اس پھیلے ہوئے کیلے دامن بچا گئے، حالانکہ صوفیانہ خیالات کی عظمت کے وہ خود بھی قائل تھے۔ اور باہیات میں اس کا اظہار انھوں نے بڑے کیلے لفظوں میں کیا ہے۔ اس کا جواب ہمیں اس رد عمل میں ملتا ہے جو حاقی کے رد فاعل خلافت اس دور میں ہوا۔ اور جس میں فیضی حرقی۔ نظیری اور ظہوری سمیٹ کر یک۔

لے انشائے ابو الفضل ص ۴۴ - لے انشائے ابو الفضل ص ۴۴

لے ” ص ۴۴ - لے ” ص ۴۴

ہیں۔ یہاں پہنچ کر فیضی کہہ جاتی ہے راستے سے الگ ہو کر دوسرے محاصرین کے گروہ میں شریک ہو جاتے ہیں۔

فارسی شاعری کی بدھیمی کے ادوار کا اگر کبھی جائزہ لیا جائے گا تو حاقی اور اس کے معاصرین کی قریب بہت بڑے خواہد میں شمار ہوں گی۔ فنون لطیفہ کی ترقی و اشاعت کا زمانہ بھی کم و بیش یہی ہے اسی دور نے ہزاروں جیسے فی کا روں کو پیدا کیا۔ اور اسی دور نے مصوری۔ فن تعمیر اور دوسری صنعتوں کو عروج تک پہنچایا۔ لیکن یہی وہ بد قسمت دور ہے جس نے فارسی شاعری کی آبرو کو خاک میں ملایا۔ خود نظریہ شعر بھی اس دور سے اگر متاثر ہوا تو صرف اس قدر کہ تنقیدی اصطلاحوں میں ”سفن نگاری“ DESCRIPTIVE کی ترکیب کا اضافہ ہوا۔ ورنہ شاعری تنگ بندی ہی گئی۔ اور نظریہ شعر لفظی بحثوں کی آماجگاہ ہوا انارسی ادب پر کوئی بڑا احسان نہ مل سکا۔ فیضی لڑائی کا ہے نہ جانی کا۔ ممکن ہے منگوں کے حملوں کے دور رس اثرات خاص کر اقتصادی اثرات نے زندگی کی دنیاویں ہلاک غیر مفید علوم کی برادی کا سانپان کیا ہو۔ لیکن یہ توقعی ہے کہ فارسی شاعری خشک فلسفیانہ مروتنا فیوں اور بے جان صوفیانہ خیالات کا مجموعہ بن گئی۔ جس میں جذبات و احساسات کی صداقت تو کیا خود جذبات و احساسات کی موجودگی تک بحث طلب ہے۔ اس کا بلا واسطہ رد عمل نغائی کی ”دراش درنگ“ کی تحریک ہے۔ جس میں تصوف کی جگہ دنیا داری نے لی۔ بہار و گلکاری بزم آرائیاں۔ چنگ و سن کی نغمہ سراہیاں اور باد و ساغر کی ہنگامہ آرائیاں سطح نظر بن گئیں۔ ہندوستان کی سرزمین اس کے مقابلے میں ہمارے ملک سے خالی تھی۔ لیکن یہاں صوفیانہ ادب کی روایات مسلسل اور مربوط شکل میں باقی تھیں۔ یہاں تو متضاد عناصر میں یکجہت کی تلاش ہی سے نیا راستہ نکلتا تھا۔ باہر کی آمد کے بعد ایمانیوں کا تائنا بندھ چکا تھا۔ اور افغانستان کی سرحدیں بھی سمٹ سمٹ کر مغلوں کی آغوش میں چکی تھیں۔ اور دور مار شای میں فارسی زبان و ادب کے مرقی پیدا ہو گئے۔ اس نئی نغائیں اگری دوڑک نکھارا گیا۔ اس زمانے میں محمد شاہی جوان تو نہ تھے لیکن محمد شاہی کس بل مزدور ہو جو تھا۔ مغلیہ تہذیب کی شان و شوکت، فضا و فضا اور بے مے سنے کے انداز کو آرٹ کا سلیفڈ وئے کا دستور عروج پر تھا۔ اس فضا نے مرقی۔ فیضی۔ ابو الفضل اور سینکڑوں ادبا کو پروان چڑھایا۔ جن پر نفاہی ادب کو آج بھی ناز ہے۔ بالکل اسی طرح کی احمائی تحریک دہلی میں بھی پیدا ہو رہی تھی۔ جس سے ظہوری۔ ملک قمی اور بعض دوسرے شعرا نے کسب فیض کیا۔ اور یہ سب ادب کو نئی زندگی عطا کرنے والے تھے۔

شاعری ایک نئی تحریک سے زندہ ہو گئی۔ ”تازہ گوئی“ کا رواج ہوا۔ اگرہ۔ سیکری۔ اور دلی کی گلیاں اس نئی برباس سے مہر گئیں۔ یہ تبدیلی محض لفظی نہ تھی۔ اس کی تہ میں عالم گیر علم و ادب اور جذبات کی اعلیٰ توانائی تھی۔ نظریہ۔ مرقی اور فیضی کو گرد و پیش کے تغیرات کا احساس تھا۔ اور اسی احساس نے انھیں تازہ گوئی کا نام نہاد بنا دیا۔ وہ بات کہنے کا جذباتی انداز وہ چار و تفرل جو جاتی کو نصیب نہ تھا۔ انھوں نے اُسے پایا۔ غلیظ فن کاروں (محافظ۔ سعدی۔ رومی۔ خواجہ غفر وغیرہ) کے شہر باروں کے زیر سایہ اظہار کے راستے نکالے۔ رسمیات کو ترک کر کے روایات کے جائزہ رقصوں سے کسب فن کیا۔ انسانی شخصیت کی تدرتہ جذباتی جستجوں کو جاگرایا گیا۔ مشاہدے کی ندرت اور فن کی پختگی سے تغزل کی ایک انوکھی سلا کا انکشاف ہو گیا۔

گفت و گو سے علم یعقوب بر جیشیدا

کو کھی صنعت داشت لئے رقی ہے است

قوت بازو سے دل ہی ملدیشہ ما

لے باہر گان سخن صاف ندیدم و ملت بے سبب نیست کہ چندین نعلات است (فیضی)

دروں نام دنیا میں معشوق شود بادہ گز نام بود پیکر کند شیشہ نالہ
 بی وہ غلط نظر ہے جس سے فیضی نے اپنے بھائی کے زہد خشک کا توڑ کیا اور اپنی شاعری کو مادی اور خاص کر "ہزار گناؤں" کے علامت سے ملا کر اسے جادو شراب اور نور شید کا ہم سنگ بنا دیا۔ جہاں عورتی نے ہم دنیا کو ہم معشوق بنا کر اپنے زمانے کی نئی رو کا ساتھ دیا تھا۔ فیضی نے بھی تصوف کو جذبات کی سطح پر لا کر دیکھا۔ اور اس کی رحمت، پجلی اور مدرگی کو نمایاں کیا۔ اس سے اس کا فخر زیادہ شیریں اور طرب آ کر ہو گیا۔

از سمن زمرہ ہائے طرب آ کر دوبار	فیضی ایں بزم نشاط است لب مشوق بہ
بشعر ترہمہ آفتق را فرد گیریم	بہارِ فیضی چو آمد بہ دورِ مافیضی
چنین کہ گفتن من آبدار می آید	مگر کہ از آئینہ گریہ ام بود فیضی
غزلش عاشقانہ افتاد است	گرچہ فیضی براہِ زہد افتاد
حرف عشق از ہر سخن نزدیک تر	حال خود گویم کہ می باشد بدول

انسانی عشق کو بیان کرنے والے الفاظ اور آداب و اشغال کو تصوف میں برتتے ہیں وہ رومانی اور جذباتی نفا میں ساتھ ہی جو مادی عشق سے وابستہ ہے۔ یوں بعض مخصوص الفاظ اسے نغمہ جادو۔ شراب بخورشید۔ جام آفتش۔ مشعل تندیں۔ سرستی۔ (لا۔ انغول۔ حریف۔ نغمہ مستانہ۔ صہبا۔ بیکدہ۔ سے خانہ) کو ان کے ENOTONA CONTEXT سے علیحدہ کر کے وسیع تر کتبوں پر استعمال کیا گیا ہے۔ تصوف کے ساتھ ساتھ اس دور کے شعرا کا دوسرا محبوب موضوع فن شعر ہے۔ خود شعر کو موضوع بناتے ہیں بھی یہی علامت کا آداب ثابت ہوئیں۔

جب تصوف طریق حیات ہے اور شعر بھی طریق حیات ہے تو خود شعر کا موضوع بن جانا آسان ہے۔ لیکن سب سے زیادہ قابلِ توجہ پہلو اور مرکز جذبات موضوع یا تو معاصر شاعر (دقیب یا حریف) ہر سکے ہیں۔ یا پھر تخلیق کے وہ مراحل جو اپنے اندر جذباتی قدر و قیمت رکھتے ہوں۔ کیونکہ الہام کا سرچشمہ اور شعر کا منبع تو ہر حال میں دل ہے۔ دل۔ سو زدل۔ بجزیرہ۔ اظہار۔ اثرات یا بہ الفاظ دیگر شاعرانہ عمل POETIC PROCESS کے مختلف مظاہر یعنی موضوع شعر بننے کا آسان ترین حق رکھتے ہیں۔ اس موضوع پر اس دور کے شعرا کا سرمایہ کچھ زیادہ ہی ہے۔ اور فیضی کے دل تو دیوان کا تقریباً ایک ٹکٹ حصہ۔ انہیں موضوعات پر مشتمل ہے عورتی اور غلوہری کے ہاں بھی ایسے اشعار لکائی ہیں۔ لیکن نظری اور فیضی اس معاملے میں سب سے سبقت لے گئے ہیں۔ شعر کو الہام تو پہلے سے مانا جاتا ہے۔ اور اکبری دور سے کہیں پہلے شعر نے شعر اور صفیانہ الہام کا کام کر ڈل کر گومان لیا تھا۔ یہ دل عشق کا مرکز ہے یا عشق شعر ہو یا عشق خدا۔ اس لیے شعر کو جب فیضی نے موضوع بنایا تو اس کے اثرات میں محبوب کی تمام صفات اور عشوہ طرازیں بھی شامل ہو گئیں :-

لحہ دیوان عونی (و کشتو پر سیں) ص ۱۱

لہ نظیری کہتا ہے :-
 بزم خاص است در دہمتہ بدستور بیار
 معنی خود طلب کن سخن دور بیار

مست نہ سخن می رسد از دل برباب ما
 عاشقت کر بر بستہ زبان ادب ما
 باشع نہ سوز و درد متاب نہ سازیم
 خورشید بودا گنج افروز شب طلوع
 مطرب بلند ساز کن آتش تراز را
 در شعر من بجزاں غزل عاشقانہ را
 فیضی اگر نظر تو دمیت بلند بر کشی
 مشعل قدسیاں کنی معنی دل فروز را
 چہ عادیست نہ انعم بطرز گفتارش
 کہ باز نہ زبان سخن طراز را
 صریح ملک تو فیضی بہ بزم گاہ صبح
 تو بلند کند ارغنون تراز را
 فیضی حدیث مازنگاران بند پرس
 کہیں کار گاہ صحر بہ جادو گداختیم
 دوش زندان شیندند فیضی غزلے
 کہ بعد نعرہ مست نہ ز محفل بختیم
 فیضی حدیث عشق رقم زن نہ خلعت
 دوش زندان شیندند فیضی غزلے
 کہ چہ فیضی را سخنوں انگیزی آید سخن
 طرز گفتار سخن گویے سرا دیوانہ کرد
 ملک فیضی می و ہد گما سے نہ
 می رود معنی رنگیں شعلہ شعلہ
 بیاں گرم رض اندر شعر فیضی
 زب جادو آموز جادو خیالوں

فیضی اس طرز دل آویز کہ دلی یعنی
 گلزار شریعہ خندان من آموختہ

فیضی کے نزدیک شعر کی یہ الہامی صفات اس وقت ظاہر ہوتی ہیں جب دل عشق کی چوٹ کھائے ہوئے ہو۔ یہ
 غلش اضطراب شعر کی روح مردوں ہے :-

بشوق تازہ گلے گفتہ امی غزل فیضی
 بیاد آ رکھ اندکھتا ہے حیدہ ماست
 گرچہ فیضی از جہاں طو مایستی در شوق
 حبیب حال عشق باز اماند یوای غزل
 شب کہ فیضی سخن از سوز دل خود گفت
 دل صاحب نظر از گری معنی می نخست
 فیضی از حال دل و دیدہ سخن می رانی
 کہ سیاہی زیر ملک تو غزل آمیز است
 مجلس ماکو اس چنیں گرم است
 از نفسہائے آتشیں گرم است
 دل من سوخت فیضی از سخنست
 کہ ز معنی دل نشیں گرم است
 نظر فیضی را پیر می بینی کہ عشق
 صد چنیں گمانے رنگارنگ داشت
 بر دند ز پرده را ز فیضی
 گل پیر چنان چاک دامن

نظم من معنی خوشنہدہاں می داد
 کہ سیاہی بنویند و نایب مشگفت
 (فیضی)

لیکن اصل بر منوع وہ تحقیقی عمل ہے جس سے جذبات اکائیوں میں تبدیل ہو کر شعر بنتے ہیں۔ بعض اوقات جذبات کو بیجا مقلد ہوتی ہے۔ کہنے والا بہ زعم خود اپنے جذبات کے ابلاغ میں کامیاب ہوتا ہے لیکن شعر اپنا اثر نہیں دکھاتا۔

دوش ہر یادہ کہ بر باد و حسد لیکن محرم
دل میں سرخست و لے گری اجاب نہ داشت

بعض اوقات جذبات ٹوک ٹوک کر چلتے ہیں :-

گو ہر دل کم خند بہ دست فیضی پاکش اندر او جستجو کہ توداری
خون گویم از بس بخت کہ ہر گلیک گلدستہ تر بند و من غار بہ بندم
پہر معنی لے ایسے ہی ہوتے ہیں کہ جذبات کا حوالہ دھار لاوا اُبلتا جاتا ہے :-

فیضی ہے نوا کہ شد مکنتہ مر لے قدسیا ہر دوش از سنے قلزم زمزمہ ساز یا فتم
مگر ناز کی طبع زور مستم فیضی کہ خلد تر شدہ از نوک خامر آب چکید
ز فرق تا بہ قدم ہو ہوئے من معنی ست گمان میر کہ دریں غانہ نقشش دیوار دم

اس کا تجزیہ تو ممکن نہیں میں ایک اندرونی غلش ہے جس پر فتح پانے کے لیے فیضی اپنی ناکامی کا سہارا ”ہمت“ کو
بٹاتا ہے۔

با خود بہ نرو دیم دریں معرکہ فیضی وقت است کہ ہمت برساند و دما
از خود دہمت خود این قدر امید نہ د کہ بکجیغہ ز فیضیاں بہر بہر بندم طر

یہاں پہنچ کر شعری عمل کے تجزیے کی منزل آتی ہے :-

عجب ترا ز دل فیضی ندیدہ ایہ طلسم
کہ ہم گہر لہر و دہم محیط و ہم غواص

لیکن شعری عمل محض ایک غیر واضح اور ناقابل فہم الہامی کیفیت ہی نہیں۔ اس کے سہے تو زندگی ہی سے ملے ہوئے ہیں۔ ایک طرہ روایت (TRADITION) ہے اور دوسری طرف اپنی شخصیت کے گہرے نقوش اور تجربات کی اظہار گہرائیاں۔ تجزیہ دلی کے راستے ان گہرائیوں اور تعبیلوں میں ڈوبتا ہے۔ روایت بھی اسی پر اثر انداز ہوتی ہے، شخصیت بھی اپنا رنگ و روغن منجھاتی ہے۔ جب کہیں جا کر شعر میں کھٹاؤ باکپیں اور جادو جھرتا ہے۔ ان تمام پہلوؤں کو ایک قطعے میں فیضی نے یوں پیش کیا ہے :-

فیضی مہم کہ با حسد و آسمان نورد
یک چند سیر عالم انصاف کو دلام

ابو الفضل اسلوب کی دالا پاہنگی کے لیے ”عزم و درست“ کو ضروری قرار دیتا ہے اور اسکی تشریح میں کینٹائی انویض جھوٹے سخت، تنومندی غزوہ نیا زمندی اور عنایت ایزدی کا شامل حال جو نا اہم شمار کرتا ہے (انشائے ابو الفضل ص ۲۷۷) ہمت سے مراد غالباً یہی عزم و درست ہے۔

باگوذگونہ مردم عالم شستہ ام
سیر پرشت مدد ز داغ اعراف کردہ ام
ہم در زباں متالیح احلاق لودام
ہم در سخن تبتیح اسلاط کردہ ام
گرد و نیست در سخن من جلب عدا
کیں بادہ را بہ پرودہ دل صاف کردہ ام

اور یہی اس کے نظریہ شعر کا خلاصہ ہے۔

کتابیات

- ۱۱، انشائے ابوالفضل (نو کشتاریدین ۲۸)، آئین اکبری مرتبہ بلوغن (انگریزی ترجمہ) ۳۱، مکر تلمہ
شائع کردہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی ام، منتخب التواریخ۔ دیالوانی (۵)، مثنوی دومی —
(۶)، دیوانی نظیری (۶)، دیوان عربی (۸)، دیوانی فیضی (۸)، مرتبہ مولوی فیروز الدین)

ہج بھاشا کی پہلی گرامر

سید مسعود حسن رضوی ادیب

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد سلطنت میں کوکناش خانی یعنی بادشاہ کے کوکر کی فرائض سے ایک کتاب تحفۃ الہند کے نام سے لکھی گئی جس کا موضوع ہے اہل ہند کے علوم مذاہل۔ یہ کتاب چپ کر کبھی شائع نہیں ہوئی مگر اس کے چند نسخے مختلف کتابخانوں کی زینت ہیں۔ ایک نسخہ میرے کتب خانے میں ابھی موجود ہے مصنف نے کتاب کا دیب چر خود لکھا ہے، جو میرے نسخے میں محقق اور دوسرے نسخوں میں طولانی ہے۔ محقق دریا ہے سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب اورنگ زیب کے مطالعے کے لیے لکھی گئی اور طولانی دریا ہے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کے کسی بیٹے کے لیے لکھی گئی۔ اس کا ہم بعض نسخوں میں اعظم شاہ اور بعض میں معز الدین جہاندار بتایا گیا ہے مصنف کے والد کا نام سب نسخوں میں فرالدین محمد ہے، لیکن خود اس کا نام بعض نسخوں میں میرزا محمد اور بعض میں میرزا خان ہے۔

میرے کتب خانے میں تصانیف کوئی کی ایک شرح، مضامین الفکات کے دو قطعی نسخے ہیں۔ شارح کا نام میرزا جان بن فرالدین محمد ہے۔ یہ شرح ساتتہ میں یعنی اورنگ زیب نے عہد سلطنت میں لکھی گئی۔ پھر مجھ میں کہ مضامین الفکات اور تحفۃ الہند کے مصنف بھائی جانی ہوں۔ اگر تحفۃ الہند کے مصنف کا صحیح نام میرزا خان تھا تو میرزا جان بن فرالدین محمد اور میرزا خان بن فرالدین محمد کا حقیقی بھائی ہوتا اور زیادہ قرین قیاس ہو جاتا ہے۔

تحفۃ الہند میں ایک مقدمہ سات باب اور ایک خاتمہ ہے، جن کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے :-

مقدمہ۔ ناگاری رسم خط اور بھاکھا کے قواعد کلیہ۔

پہلا باب۔ پیشگی معنی اہل ہند کا علم عروض۔

دوسرا باب۔ ٹیک معنی اہل ہند کا علم قافیہ۔

تیسرا باب۔ انکار معنی اہل ہند کا علم بیان و بدیت۔

چوتھا باب۔ سنگار معنی اہل ہند کا علم عاشقی و مشقوتی۔

پانچواں باب۔ سنگیت معنی اہل ہند کا علم موسیقی۔

چھٹا باب۔ کوک معنی عورت مرد کے اقسام اور عورتوں کے ساتھ معاشرت۔

مازداہاں باب ۔ سادہ پاک یعنی اہل ہند کا علم تیانہ ۔ خاتمہ ۔ اہل ہند کے لغات و مصطلحات و کلیات ۔

مذکورہ کتاب کے دہتے ہیں ۔ پہلے حصے میں ناگری حروف اور رسم خط کا تفصیلی بیان ہے اور دوسرے میں بھاکھا کے قواعد کی تشریح ہے ، میں مصنف ، خود کو ان قواعد کا مخترع کہتا ہے ، یعنی اس کا دعویٰ یہ ہے کہ بھاکھا (برج بھاشا) کی گرامر اس نے پہلے پہل لکھی ہے ۔ میں نے ہندی کے مستند عالموں سے دریافت کیا مگر وہ اس سے پہلے کی کبھی ہوئی برج بھاشا کی کسی گرامر کا نام نہ بتا سکے ۔ برج بھاشا مصنف کا یہ دعوے صحیح ہے کہ یہ برج بھاشا کی پہلی گرامر ہے ۔ اگرچہ یہ گرامر کی کوئی جامع کتاب نہیں ہے ، پھر بھی تاریخی حیثیت سے غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے اور اردو کے بارے میں سائنسی تحقیق کرنے والوں کے لیے بہت کارآمد ہے ۔ اس سے کھڑی ہوئی اور برج بھاشا کا باہمی تعلق آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے ۔ مخدومہ کتاب کے اسی دوسرے حصے کا اردو ترجمہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے ۔

مصنف نے ہندی لفظوں کا وہ تلفظ اختیار کیا ہے جو بھاکھا والوں کی زبانوں پر جاری تھا اور یہ تلفظ کا تلفظ تفصیل کے ساتھ اس طرح بیان کر دیا ہے کہ کسی شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی ۔ میں نے اختصار کے خیال سے ان بیانات کو حذف کر کے ہر ہندی لفظ پر اعراب لگا دیئے ہیں ۔

زبان کی کیفیت

اہل ہند کی زبانیں متعدد ہیں ، لیکن وہ زبانیں جن میں تہذیب کی کتابیں اور نظم کے دیوان تصنیف کئے جاسکتے ہیں ۔ اور جو عربیہ اور ذہین مستقیم کو پسند آتی ہیں تین ہیں ۔

۱۔ سہنسکرت ۔ وہ ہر طرح کے علوم و فنون کی کتابیں زیادہ تر اس زبان میں تصنیف کرتے ہیں ۔ اُن کے عقائد میں وہ عالم علوی کی زبان ہے اور وہ اس کو آکاس بانی اور دیو بانی کہتے ہیں ، یعنی آسمان والوں کی زبان اور دیوتاؤں کی زبان جو کہ آسمانی اور علوی ہیں ۔

۲۔ پُراکرت ۔ بادشاہوں ، دزیروں اور بڑے بڑے لوگوں کی مدح زیادہ تر اس زبان میں لکھتے ہیں ۔ وہ عالم سفلی کی یعنی اُس عالم کی زبان ہے جو زمین کے نیچے ہے اور اُس کو پانال بانی ، اور ناگ بانی ، بھی لکھتے ہیں ، یعنی اسفل آسمانین کے رہنے والوں اور انسانوں کی زبان جو کہ زمینی اور سفلی ہیں ۔ یہ زبان مرکب ہے سہنسکرت سے جس کا ذکر پہلے ہو چکا اور بھاکھا سے جس کا ذکر اس کے بعد ہو گا ۔

۳۔ بھاکھا ۔ رنگین اشعار اور عاشق و معشوق کا بیان زیادہ تر اس زبان میں کرتے ہیں ۔ یہ اُس عالم کی زبان ہے جس میں ہم لوگ رہتے ہیں ۔ بھاکھا ، کا اطلاق عموماً سہنسکرت اور پراکرت کے سوا اور کل زبانوں پر ہوتا ہے اور خصوصاً برج والوں کی زبان پر ۔ برج ، ہندوستان کی ایک سرزمین کا نام ہے ۔ اصل اس کی مٹھرا ہے (جو ایک مشہور و معروف مقام کا) مستحق دیکھنے کے اس لفظ کو اسی تلفظ کے ساتھ استعمال کیا ہے ۔ ”رکھاکم سہنسکرت کے اس بولی میں ۷“

(شتوری قصہ بے نظیر)

نام ہے)۔ اور منقرض کے گرد چار کوس تک ہرج کی حد ہے۔ ہرج واہوں کی زبان سب زبانوں سے زیادہ فصیح ہے مشہور روایوں میں لکھا ہو چکا ہے کہ دو آب میں چھ خطہ واقع ہے جیسے چند واؤ وغیرہ وہ فصاحت کے لیے مشہور ہے۔ چند واہ ایک مشہور و معروف مقام کا نام ہے۔ چونکہ یہ زبان رنگین شعروں بشیر یہ جو باتوں اور عاشق و معشوق کے بیان پر مشتمل ہے اور شاعروں اور طبیعت وادوں میں زیادہ تکرار کی اور متصل ہے اس بنا پر اس کے قواعد کلیتہً بنائے گئے ہیں اور اس چیز کا اختراع کرنے والا یہ نجف ہے۔

شہد کا بیان

شہد - منسکرت زبان میں کہہ کو کہتے ہیں۔ بھانکھا واسے اس لفظ کو سین حملہ سے بولتے ہیں۔ ہمارے غویوں کی اصطلاح میں کلمہ وہ ہے جو کسی معنی کو ادا کرنے کے لیے بولا جائے۔ پہل ہند کی اصطلاح میں اس کی تین قسمیں ہیں۔ سُنڈیاؤن، کُز کُت اور کُتتا۔ سُنڈیاؤن اس کہے کو کہتے ہیں جو تینوں زمانوں یعنی ماضی، مستقبل اور حال میں سے کسی سے تعلق نہ رکھتا ہو۔ اس کی دو قسمیں ہیں :-

ایک وہ جو معنی پر دلالت کرنے میں کسی دوسرے لفظ کا محتاج نہ ہو مثلاً رام جو ان کے مشہور روایتوں میں سے ایک کا نام ہے۔ یا جیل جس کے معنی ہیں پانی۔ اس قسم کے کلموں کو سُنڈیاؤن کہتے ہیں عربی کی اصطلاح میں ان کو اتم کہتے ہیں۔ دوسرے وہ جو معنی پر دلالت کرنے میں کسی لفظ کا محتاج ہو۔ مثلاً پر عمری کے اعلیٰ اور فارسی کے بر کے معنی ہیں۔ اس قسم کے کلموں کو جزت کہتے ہیں عربی کی اصطلاح میں ان کو حرت کہتے ہیں۔

کُز تَب فعل کو کہتے ہیں اور متصل کے معنی ہیں کچھ کرنا کہ تَب وہ کلمہ ہے جو تینوں زمانوں یعنی ماضی، حال اور استقبال میں سے کسی ایک سے تعلق رکھتا ہے۔ انی تینوں زمانوں کو تَب کال کہتے ہیں۔ کُز تَب کی پانچ قسمیں ہیں، بھوت، کُز تَبان، بھو کُز، کُز یا، کُز ت۔

بھوت کا بیان

بھوت - فعل ماضی کو کہتے ہیں۔ اور فعل ماضی وہ ہے جو گزشتہ زمانے سے تعلق رکھتا ہے فعل ماضی لازمی میں آتا ہے اور فعل لازمی وہ ہے کہ فعل اپنے فاعل پر تمام ہو جائے اور اس کے پڑھ کر مفعول تک نہ پہنچے۔ وہ چار صیغے یہ ہیں :-

- ۱۔ آؤ، یہ صیغہ واحد مذکر غائب، واحد مذکر حاضر اور واحد مذکر محکم میں مشترک ہے۔
- ۲۔ آئے، یہ صیغہ جمع مذکر غائب، جمع مذکر حاضر اور جمع مذکر محکم میں مشترک ہے۔
- ۳۔ آئی، یہ صیغہ واحد مؤنث غائب، واحد مؤنث حاضر اور واحد مؤنث محکم میں مشترک ہے۔
- ۴۔ آئیں، یہ صیغہ جمع مؤنث، جمع مؤنث حاضر اور جمع مؤنث محکم میں مشترک ہے۔

لے یعنی بھانکھا واسے شہد کو سُنڈیاؤن کہتے ہیں۔

فعل متعدی ہی اسی طرح چار صیغوں میں آتا ہے۔ اور فعل متعدی وہ ہے کہ فعل اپنے فاعل پر تمام ہندو ہند کے بڑے کہ مفعول تک پہنچے نہایت متعدی کے بیٹھے مفعول کے اشتقاق کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں۔ یعنی اگر مفعول مذکر ہو جائے تو فعل مذکر لاتے ہیں۔ اور اگر مفعول مؤنث ہوتا ہے تو فعل مؤنث لاتے ہیں۔ مثلاً اگر مفعول واحد مذکر ہو تو کہیں گے، دیو اور اگر مؤنث ہو تو کہیں گے مادی اور اسی قیاس پر باقی صیغوں کو سمجھ لینا چاہئے۔

بُزْ تَمَّان کا بیان

بُزْ تَمَّان فعل حال کو کہتے ہیں۔ اور فعل حال وہ ہے جو گزشتہ دو آئندہ زمانوں کے درمیان میں ہو فعل حال چار صیغوں میں آتا ہے۔

۱۔ گزرت ہے۔ یہ صیغہ واحد مذکر غائب، واحد مؤنث غائب، واحد مذکر حاضر اور واحد مؤنث حاضر میں مشترک ہے۔

۲۔ گزرت ہیں۔ یہ صیغہ جمع مذکر غائب، جمع مؤنث غائب، جمع مذکر متکلم اور جمع مؤنث متکلم میں مشترک ہے۔

۳۔ گزرت ہوں۔ یہ صیغہ جمع مذکر حاضر اور جمع مؤنث حاضر میں مشترک ہے۔

۴۔ گزرت ہو۔ یہ صیغہ واحد متکلم کا صیغہ ہے۔

اوپر چاروں صیغوں میں لفظ گزرت کی ت کو اگر مفعول جمع ہو چھین تو مذکر کا صیغہ ہو جاتا ہے اور اگر مفعول جمع ہو چھین تو مؤنث کا صیغہ ہو جاتا ہے۔

مُجْہُور کا بیان

مُجْہُور فعل مستقبل کو کہتے ہیں۔ اور فعل مستقبل وہ ہے جو آئندہ زمانے سے تعلق رکھتا ہے فعل مستقبل آٹھ صیغوں میں آتا ہے۔

۱۔ کرے گا۔ یہ صیغہ واحد مذکر غائب اور واحد مذکر حاضر میں مشترک ہے۔

۲۔ کریں گے۔ یہ صیغہ جمع مذکر غائب اور جمع مذکر متکلم میں مشترک ہے۔

۳۔ کرؤ گے۔ یہ جمع مذکر حاضر کا صیغہ ہے۔

۴۔ کرؤں گا۔ یہ واحد مذکر متکلم کا صیغہ ہے۔

۵۔ کرؤں گی۔ یہ واحد مؤنث متکلم کا صیغہ ہے۔

۶۔ کرے گی۔ یہ صیغہ واحد مؤنث غائب اور واحد مؤنث حاضر میں مشترک ہے۔

۷۔ کریں گی۔ یہ صیغہ جمع مؤنث غائب اور جمع مؤنث متکلم میں مشترک ہے۔

۸۔ کرؤں گی۔ یہ جمع مؤنث حاضر کا صیغہ ہے۔

کرت یا کا بیان

کرت یا جاہل طرح پر ہے :-

- ۱۔ ستم بجاؤ۔ یہ اثبات نعل ماضی ہے۔ مثلاً آکر۔
 - ۲۔ ستم بجاؤ۔ یہ نفی فعل ماضی ہے۔ مثلاً نہ آکر۔
 - ۳۔ بجاؤ۔ یہ اثبات فعل حال و نعل مستقبل ہے۔ مثلاً کرکٹ ہے۔ کیسے کر۔
 - ۴۔ آئی بجاؤ۔ یہ نفی فعل حال و نعل مستقبل ہے۔
- نفی اور نفی کے لیے تو ن مفتوح (نہ) یا فقط تاکلمے کے شروع میں لگا دیتے ہیں۔

کرت کا بیان

کرت مفعول کو کہتے ہیں۔ اس پر واقع ہو مفعول کے آخر میں لگاتے ہیں۔ مثلاً پینورام راؤ نے یعنی رام نے راؤن کو مارا۔ اور کبھی مفعول کو تا علی سے پہلے لے آتے ہیں۔ مثلاً پینورام راؤ نے رام۔ اور کبھی ہ کو جو غیر مفعول ہے الفظ کے آخر سے حذف کر دیتے ہیں۔ مثلاً پینورام راؤ نے۔ اس میں پر فاعل کو مفعول سے پہلے لانا بہتر ہے۔ درہنہ قرینہ اور قیاس پر نظر کر کے معنی نکال لیتے ہیں۔

کرتا کا بیان

کرتا فاعل کو کہتے ہیں۔ اور فاعل فعل کرنے والا ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں :-

- ۱۔ سوا دھین۔ وہ فاعل جو خود کام کرے۔ مثلاً کاجی یعنی کام کرنے والا۔
 - ۲۔ پند دھین۔ وہ فاعل جو کسی دوسرے کو کوئی فعل کرنے کا حکم دے، خواہ امر کے ساتھ ہو خواہ نفی کے ساتھ۔
- اور امر کسی کو کوئی کام کرنے کا حکم دیتا ہے اور نفی کسی کو کسی کام سے روکتا ہے۔ امر حاضر ہی میں آتا ہے :-

- ۱۔ کر۔ یہ امر واحد مذکر حاضر کا صیغہ ہے۔
 - ۲۔ کر۔ یہ امر واحد مؤنث حاضر کا صیغہ ہے۔
 - ۳۔ کر۔ یہ صیغہ جمع مذکر حاضر اور جمع مؤنث حاضر میں مشترک ہے۔
- امر غائب بھی تین میںوں میں آتا ہے :-

- ۱۔ کرے۔ یہ صیغہ واحد غائب مذکر اور واحد غائب مؤنث میں مشترک ہے۔
- ۲۔ کرے۔ یہ صیغہ جمع غائب مذکر، جمع غائب مؤنث اور جمع متکلم میں مشترک ہے۔
- ۳۔ کرؤں۔ یہ امر واحد متکلم کا صیغہ ہے۔

نئی حاضر و غائب کے بھی ہی اس حاضر و غائب کے چرچے ہیں جن کے شروع میں نہ یا تا بڑھا دیتے ہیں۔

پُرلنگ کا بیان

- پُرلنگ مذکر کو کہتے ہیں۔ اور مذکر کے معنی ہیں مرد یا نر۔ اس کی دو قسمیں ہیں :-
- ۱۔ وہ جو علم ہو اور اس کے مقابل میں کوئی مونث ہو۔ مثلاً رستم اور کاٹھ جو دشمن و یوناؤں کے نام ہیں بلور
 - ۲۔ وہ کہ اسم مذکر غیر علم کے آخر میں الف لگاویں۔ مثلاً ہرگا کہ لفظ مرگ (مَرگ) پر الف بڑھا دیا گیا ہے۔

آشتری رنگ کا بیان

- آشتری رنگ مونث کو کہتے ہیں۔ اور مونث کے معنی ہیں عورت یا مادہ۔ اس کی دو قسمیں ہیں :-
- ۱۔ وہ جو علم ہو یعنی کسی معین شخص کا نام ہو۔ مثلاً سینتا اور رادھا، جو دشمن و عورتوں کے نام ہیں۔
 - ۲۔ وہ جو علم نہ ہو۔ اس کی بھی دو قسمیں ہیں :-
- (۱) وہ جس کا مقابل کوئی مذکر اور نر نہ ہو۔ مثلاً ترنگی یا ترنگی (گھوڑی) اور سہتشی (جھنٹی)۔
 - (۲) وہ جس کے مقابل مذکر اور نر نہ ہو۔ مثلاً بیاراجہ، اور آگنی (آگ)۔
- یہ آخری قسم مونث سماجی ہے اور اس کا استعمال فقط محاورے کے سننے سے تعلق رکھتا ہے۔
- جب پُرلنگ کو آشتری رنگ یعنی مذکر غیر علم کو مونث کر دینا چاہتے ہیں تو مذکر اسم کے آخر میں چند حرف بڑھا دیتے ہیں۔ وہ حرف یہ ہیں :-

- ۱۔ الف۔ مثلاً بڑدھ (بڑھا) سے بڑدھا (بڑھیا)
- ۲۔ ی۔ مثلاً دیو سے دیوی۔
- ۳۔ آئی۔ مثلاً رڈر سے رڈرائی یعنی رڈر کی بیوی۔ رڈر عموماً دیوتا کے معنی میں آتا ہے۔ اور خصوصاً مہادیو کو کہتے ہیں۔
- ۴۔ فی۔ مثلاً ترنگ سے ترنگی۔ کبھی آخری ی کو گرا دیتے ہیں اور صرف نون باقی رہ جاتا ہے مثلاً ترنگن۔

زین سک رنگ کا بیان

زین سک رنگ - غنئی کو کہتے ہیں یعنی وہ جو حقیقت میں مذکر و مذہن نہ عورت۔ محاورے میں ایسے گنتی کے چند اسم ہیں۔ ان سب کا ذکر طوالت کا باعث ہوگا۔ ان میں سے ایک لفظ کنڈل ہے، جس کے معنی ہیں حلقہ۔ اس جنس کا استعمال سنسکرت لہ ایک لفظ میں ہر حقیقی ہے۔

کے محاورے سے مخصوص ہے۔ جاکا میں متعل نہیں ہے۔

نہ یکن کا بیان

نہ یکن جمع کو کہتے ہیں اور واحد سے زیادہ کو جمع خیال کرتے ہیں۔ جمع بنانے کے لیے واحد لفظ کے آخر میں حرف تون لگا دیتے ہیں۔ مثلاً یکن (مذکارِ محورت) سے یکنان۔ اور تون سے پہلے ک حرف اگر ساکن یا موقوف ہو تا ہے تو اس پر زبر لگا دیتے ہیں جیسے کہ (ہاتھ) سے کزن اور پنگ (پانوں) سے یکن۔ اور جس لفظ کے آخر میں ق ساکن یا ی ساکن ہو تو کسی اس واؤ یا بے کو اپنے حال پر ساکن رہنے دیتے ہیں اور کسی اس پر زبر کی حرکت لگا دیتے ہیں۔ مثلاً سکسی سے سکعیں اور یچو سے یچوئیں اور کسی الف تون سے جمع بناتے ہیں۔ مثلاً سکسی سے سکھیاں۔

اسم اشارہ کا بیان

اسم اشارہ وہ اسم ہے جس سے کسی کی طرف اشارہ کریں۔ اسمائے اشارہ سات ہیں :-

- ۱۔ وا۔ یہ واحد غائب کے اسمائے کسبے ہے یعنی وہ
- ۲۔ تا۔ یہ جمع واحد غائب کے اسمائے کسبے ہے یعنی وہ
- ۳۔ یا۔ یہ واحد حاضر کے اسمائے کسبے ہے یعنی یہ
- ۴۔ جا۔ یہ جمع واحد غائب کے اسمائے کسبے ہے یعنی جو
- ۵۔ ان۔ یہ جمع غائب کے اسمائے کسبے ہے
- ۶۔ زن۔ یہ جمع حاضر کے اسمائے کسبے ہے
- ۷۔ جن۔ یہ جمع غائب کے اسمائے کسبے ہے

یہ ساتوں اسمائے اشارہ مذکر اور مؤنث میں مطرک ہیں۔

نہ یث کا بیان

نہ یث کلام کو کہتے ہیں۔ اور کلام دو کلموں سے مرکب ہوتا ہے۔ مثلاً رام آجیو

نہ یث کا بیان

نہ یث کا ترکیب اضافی کو کہتے ہیں۔ اور ترکیب اضافی وہ ترکیب ہے جس میں کلمہ اول کو کلمہ ثانی سے نسبت میں اصطلاح عرب میں کلمہ اول کو مضاف اور کلمہ ثانی کو مضاف الیہ کہتے ہیں۔ اہل ہند کی ترکیب اضافی تین کلموں سے مرکب ہوتی ہے۔ مثلاً چیت نام کو یہی ہیر نام۔ اس میں کلمہ چیت مضاف ہے اور کلمہ ہیر نام مضاف الیہ ہے اور لفظ کو جو آخر میں ہے علامت نسبت ہے۔ جہاں

کی مثال علامہؒ نے پیر میں لام مکسور کی جگہ اور ناس کی مثال غلام زید میں مضمت کے آخری کسوکے کی جگہ ایسے ہی ہندی میں جب مضمت المیر کو مضمت پر مقدم کرتے ہیں تو لفظ کو جو علامت نسبت ہے درمیان میں لاتے ہیں اور کہتے ہیں رام کو پوت۔ اس عمل پر بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ علامت نسبت کو حذف کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں رام پوت۔

ان حرفوں اور کلموں کا بیان جو اسموں کے شروع اور درمیان میں آکر مختلف معنی دیتے ہیں

(۱) ا (الف مفتوح)۔ اسم کے شروع میں آکر نفی اور سلبيت کے معنی دیتا ہے اور اس کو اصطلاح میں ناس یعنی نفی کہتے ہیں۔ مثلاً اجاتی یعنی نہ جانے والا نادانی۔

(۲) الف۔ اسموں کے درمیان میں آکر توار اور توانی کے معنی دیتا ہے مثلاً چلا چل یعنی روانہ۔ یہ الف ناسی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

(۳) ب (بائے مکسور)۔ اسم کے شروع میں آکر نفی اور سلبيت کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً بکل یعنی بے قرار اور بے آرام۔ کیونکہ کل کے معنی ہیں قرار اور آرام۔

(۴) م (مدین مفتوح)۔ اسم کے شروع میں آکر معیت اور ہمراہی کے معنی دیتا ہے مثلاً مکل یعنی سیلاب اور شاداب، کیونکہ کل کے معنی ہیں پانی۔ یہ اس کلمی لیاقت اور قابلیت کے معنی دیتا ہے مثلاً کپیٹ یعنی قابل اور شیدہ بیٹ۔ اور یہ حرف ناس معنی میں اس لفظ کے سوا اور کہیں نہیں سنا گیا۔

(۵) سُ (مدین مضموم)۔ اسم کے شروع میں آکر خوب اور اچھا کے معنی دیتا ہے مثلاً سُاس یعنی اچھی بو، والا، خوشبو دار۔

(۶) ک (کاف مفتوح)۔ اسم کے آدھ میں آکر عدم یا قوت اور قابلیت کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً کپیٹ یعنی ناقابل یا نالائق بیٹ۔ اور یہ حرف اس معنی میں اس لفظ کے سوا اور کہیں نہیں سنا گیا۔

(۷) گ (گاف مضموم)۔ اسم کے شروع میں آکر بد اور بُرا کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً گُرنگ یعنی بد رنگ، بُرے رنگ والا۔

(۸) ز (زائی مکسور)۔ اسم کے شروع میں آکر نفی اور سلبيت کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً زچ یعنی بے شرم، سبھا، کیونکہ زک اور لاج کے معنی ہیں شرم و حیا۔

ان حرفوں کا بیان جو لفظوں کے آخر میں آکر مختلف معنی دیتے ہیں

(۱) الف۔ اسم کے آخر میں آکر وصفیت اور فاعلیت کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً کپتا یعنی شاعر اور موصوت برصفت شاعری،

کیونکہ کپت کے معنی ہیں شاعر۔ دیو آ یعنی دینے والا اور موصوت برصفت دیندگی۔ کبھی الف تائین کے لیے آتا ہے

مثلاً پردھا یعنی بوڑھی عورت، کیونکہ پردھ بوڑھے مرد کو کہتے ہیں، جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ اور کبھی تائینت کساقہ

وصفیت اور فاعلیت کے معنی بھی دیتا ہے۔ مثلاً گزبا یعنی غور کرنے والی اور موصوت برصفت غور، کیونکہ گزب کے

معنی ہیں غور۔ اور کبھی الف تذکرہ اور نری کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً مزکا یعنی نہر۔ اسم علم کے آخر میں الف تذکرہ کا

فائدہ دیتا ہے۔ اور دکانسی کو بکھڑا ہے۔ مثلاً رما یعنی ملے رام۔ الف ذانیہ فارسی اور عربی میں ہی مستعمل ہے۔
(۲) پ۔ اسم کے آخر میں اگر صامی اور خداوندی کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً محبوب یعنی صاحب و خداوندی زمین کیونکہ حبو کے معنی ہیں زمین۔

(۳) ق۔ اسم کے آخر میں اگر مصدری معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً گشت یعنی گشتا شاکرنا۔
(۴) م۔ اسم کے آخر میں اگر فاعلیت کے معنی دیتا ہے مثلاً گھیرے یعنی ناؤ لکھنے والا۔ اس س کے آخر میں فاعل معنوی بھی لگا دیتے ہیں مثلاً گھیرو۔

(۵) ج۔ اسم کے آخر میں اگر پیدہ ہونے کے معنی دیتا ہے مثلاً بارج یعنی پانی سے پیدا ہونے والا۔ اس لفظ کا اطلاق کنول کے پھول پر اور ہر اس چیز پر جتنا ہے جو پانی سے پیدا ہو، کیونکہ بار کے معنی ہیں پانی۔

(۶) د۔ (وال کسور)۔ اسم کے آخر میں اگر ظرف مکان کے معنی دیتا ہے مثلاً بارو یعنی باؤں، کیونکہ بار کے معنی پانی ہیں جیسا کہ ابھی بتایا جا چکا ہے۔

(۷) دھ۔ یہ بھی اسمی معنی کا فائدہ دیتا ہے مثلاً اشدھ یعنی سمندر کیونکہ اشد کے معنی ہیں پانی۔ یہ قاعدہ گہرے کہ پانی کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں دھ بادل کے معنی کا اور دھ سمندر کے معنی کا فائدہ دیتا ہے۔

(۸) ک۔ اسم کے آخر میں فاعلیت کے معنی دیتا ہے مثلاً سیوک یعنی خادم، کیونکہ سید اور سیدو کے معنی ہیں خدمت۔ یہ کات بھی مصدری معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً نیارک یعنی نبات۔

(۹) گ۔ اسم کے آخر میں اگر راہ، روش اور رفتار کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً ازگ یعنی سیف سے راہ چلنے والا، کیونکہ آ کے معنی ہیں سینہ۔ اس لفظ سے سانپ راہ لیتے ہیں۔

(۱۰) ن۔ اسم کے آخر میں مصدری معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً چلن یعنی رفق، رواج، کیونکہ چل اور چال کے معنی ہیں رفتار اور طریقہ حرکت لان کی فاعلیت کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً سوچن یعنی موہنے والا، فریفتہ کرنے والا، کیونکہ موہ کے معنی ہیں فریفتگی اور کبھی جمع کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً کزن جو کڑ کی جمع ہے اور کڑ کے معنی ہیں ہاتھ۔ اور کبھی تائید کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً ٹرنگن یعنی گھوڑی، کیونکہ ٹرنگ کے معنی ہیں گھوڑا، جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔

(۱۱) و۔ (فاو معروف)۔ اسم کے آخر میں اگر فاعلیت کا فائدہ دیتا ہے مثلاً بائرو یعنی پرادینے والا، پاسبان، کیونکہ باہرہ اور پیرہ کے معنی ہیں پاس بانی اور نگہبانی۔

(۱۲) و۔ (زائے کسور)۔ اسم کے آخر میں اگر مفعول پر کے معنی دیتا ہے مثلاً داو یعنی اُس کو، کیونکہ دا کے معنی ہیں وہ۔
(۱۳) ی۔ (یائے معروف)۔ اسم کے آخر میں اگر نسبت کا فائدہ دیتا ہے مثلاً بگیری یعنی منسوب بہ اجمیر، اجمیر بنو دستان

کے ایک مشہور شہر کا نام ہے۔ سادہ یہی فارسی میں ہی مستعمل ہے۔ کبھی ی صفت اور فاعلیت کا فائدہ دیتی ہے مثلاً کرنی یعنی گرد کی صفت سے موصوف، غرور کرنے والا، کیونکہ کر کے معنی ہیں غرور۔ اور کبھی ی تائید کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً دجوبی یعنی دیو کی عورت، جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔

اُن کلموں کا بیان جو اسموں کے شروع میں آکر مختلف معنی دیتے ہیں

ا۔ وہ کلمے جو اسم کے شروع میں آکر ندا کے معنی دیتے ہیں۔ یہ دس کلمے ہیں :-

(۱) آجے۔ مثلاً آجے رام۔

(۲) آجے۔ مثلاً آجے نام۔

(۳) چو۔ مثلاً چو رام۔

(۴) آجو۔ مثلاً آجو رام۔

(۵) آست۔ مثلاً آست رام۔ یہ کلمہ فارسی میں مستعمل ہے۔

(۶) آسے جو۔ آسے اور آسے سے مرکب ہے۔ مثلاً آسے جو رام۔

(۷) آسے۔ مثلاً آسے رام۔ اس کلمے کو مونث کی ندا میں یا اسے معروف سے بولتے ہیں۔ مثلاً آری سکھی۔ اور سکھی کے معنی ہیں زن مصاحبہ۔

(۸) آسے۔ بغیر امت اول کے۔ مثلاً آسے رام۔ اس کلمے کو یہ بھی ندا سے معروف میں یا اسے معروف سے بولتے ہیں۔ مثلاً آری سکھی۔

(۹) آسے آسے جو۔ آسے اور آسے سے مرکب ہے۔ مثلاً آسے آسے رام۔ ندا سے مونث کے لیے اس کے دوسرے جز

رے کو یا اسے معروف سے بولتے ہیں۔ مثلاً آسے وی سکھی۔

(۱۰) آسے آسے جو۔ آسے اور آسے سے مرکب ہے۔ مثلاً آسے آسے رام۔ ندا سے مونث کے لیے اس کے پہلے جز آسے

کو یا اسے معروف سے بولتے ہیں۔ مثلاً آری آسے سکھی۔

ب۔ وہ کلمے جو اسم کے شروع میں آکر نفی اور سلبیت کا فائدہ دیتے ہیں۔ یہ دو کلمے ہیں :-

(۱) نہ۔ مثلاً نہ تھو مینی بے خوف، بے ترس، کیونکہ تھو کے معنی میں خوف اور ترس۔

(۲) آن۔ مثلاً آن دس مینی بے مزہ، بے ذوق، کیونکہ دس کے معنی ہیں مزہ اور ذوق۔

اُن کلموں کا بیان جو اسموں کے آخر میں آکر مختلف معنی دیتے ہیں

و۔ وہ کلمے جو اسم کے آخر میں آکر ماضی اور خداوندی کے معنی دیتے ہیں۔ یہ دس کلمے ہیں :-

(۱) کوشت۔ مثلاً روپ وشت یعنی صاحب حسن و جمال، کیونکہ روپ کے معنی ہیں حسن و جمال۔ کبھی مذکر کے لیے اس کلمے کے

آخر میں اللت لگا دینے میں اور کتے ہیں روپ وشتا اور وشت کے لیے یا اسے معروف لگا دیتے ہیں روپ وشتی۔

(۲) کار۔ مثلاً کارن کار مینی صاحب علم و ہنر، کیونکہ کارن کے معنی ہیں علم و ہنر۔

(۳) بال۔ مثلاً بال بال صاحب زمین و ملک۔ بادشاہ، زمیندار اور صاحب ملک پر اس لفظ کا اطلاق کرتے ہیں کیونکہ

جہو کے معنی ہیں زمین۔

۱) نہت۔ مثلاً نہت یعنی صاحبِ وفادہ و زمین اور صاحبِ مملکت۔ اس لفظ کا اطلاق بھی بادشاہ، زمیندار اور صاحبِ مملکت پر کرتے ہیں، کیونکہ نہت اور نہ زمین کو کہتے ہیں۔ قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ جہ زمین، ملک، دنیا اور مرد کے معنی دینے والے اسموں کے آخر میں نہت کا لفظ آتا ہے تو وہ بادشاہ کے معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً نہت یعنی پت، ولیس پت، جگ پت، نہت۔ لہذا نہت بھی ان اسموں کے آخر میں اسی معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً نہت یعنی نہت۔ کلہ پت۔ جب تازہ اور رات کے معنی دینے والے اسموں کے آخر میں آتا ہے تو چاند کے معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً تازہ پت۔ چھتر پت اور نہ پت۔ اور کلہ پت جب ندی کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں آتا ہے تو دریا کے معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً ندی پت۔

۵) اپس۔ جب اس لفظ کو کسی دوسرے لفظ سے ملاتے ہیں تو لکھتے ہیں الف کو حذف کر دیتے ہیں، کیونکہ قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ جس لفظ کے شروع میں الف ہوتا ہے جب اس کو کسی دوسرے لفظ سے وصل کرتے ہیں تو الف کو حالتِ تحریر میں حذف کر دیتے ہیں۔ مثلاً فیس یعنی صاحبِ وفادہ و زمین، کیونکہ نہت اور نہ کے معنی ہیں زمین جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ اس لفظ کو جی بادشاہ، زمیندار اور صاحبِ ملک پر اطلاق کرتے ہیں۔

۶) اپر۔ مثلاً کابی تر یعنی صاحبِ وفادہ و اندیشہ، کیونکہ کاب کے معنی ہیں شعر۔ سہسکرت میں لفظ اپر کو شبن کے ساتھ پڑتے ہیں۔

(۷) اند۔ مثلاً نہ اند۔ یعنی صاحبِ وفادہ و اندمردان، کیونکہ نہ کے معنی ہیں مرد۔

(۸) راج۔ مثلاً کب راج یعنی ملکِ اشعار، کیونکہ کب کے معنی ہیں شاعر۔

(۹) ایش۔ مثلاً دھیش یعنی صاحبِ سپہ، کیونکہ دھ حالِ سپہ کو کہتے ہیں۔

(۱۰) اوت۔ مثلاً چھراوت یعنی دولت والی عورت، کیونکہ چھ کے معنی ہیں دولت۔ اور ت کے آخر میں بے معروف بھی لگاتے ہیں۔ مثلاً چھماوتی۔ اور یہ لفظ کنول کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں پڑ سکتی ہے معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً پداوتی۔

ب۔ وہ لفظ جو اسموں کے آخر میں آکر غایت کے معنی کا فائدہ دیتے ہیں۔ یہ پانچ لفظ ہیں۔

(۱) آبادی کی تشبیہ کے ساتھ، مثلاً کھلیا یعنی کھیلنے والا۔

(۲) آر مثلاً کھلوار یعنی کھیلنے والا۔

(۳) آر مثلاً کھلوار یعنی کھیلنے والا۔ اس کے آخر میں بے معروف بھی لگاتے ہیں مثلاً کھلواوری۔

(۴) اک۔ مثلاً پیراک یعنی پیرنے والا۔

(۵) اڈ۔ مثلاً ٹاڈ یعنی راستہ چلنے والا اور مسافر۔

ج۔ وہ لفظ جو اسموں کے آخر میں آکر معدی معنی کا فائدہ دیتے ہیں۔ یہ آٹھ لفظ ہیں۔

(۱) بور۔ مثلاً بور بور یعنی بولتا۔

(۲) آئی۔ مثلاً خرائی یعنی جھانی، کیونکہ ترن کے معنی ہیں جھان۔

(۳) آپرے مثلاً پو یعنی ذہبی، کیونکہ مونا کے معنی ہیں فریہ۔ روزمرہ کی بول چال میں اس لفظ کے آخر والے واؤ کی جگہ الف استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں مثلاً پ۔

(۴) پچی۔ مثلاً بال یعنی پچی، یعنی علقہ لیریت۔ پچ کے آخر میں واو مجہول اور نون منہ بھی لگاتے ہیں اور کہتے ہیں بال پچوں۔ روزمرہ کی بانٹ جیت میں واو مجہول کی جگہ الف استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں بال پچاں۔

(۵) ٹوٹ۔ مثلاً آٹوٹ یعنی آٹا۔ روزمرہ کی بول چال میں واو کی جگہ الف استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں آٹناں۔

(۶) پت۔ مثلاً چکن پت یعنی عینائی، نریائی اور خودنائی۔

(۷) آپ۔ مثلاً ملاپ یعنی ملنا، ملاقات کرنا۔

(۸) آو۔ مثلاً بناو یعنی بنانا، آراستہ کرنا۔

دوسرے وہ لکھے جو اسموں کے آخر میں آکر وصفیت کے معنی دیتے ہیں۔ یہ دس لکھے ہیں :-

(۱) آئی۔ مثلاً سیائتم تائی یعنی سیایچی، کیونکہ سبکام کے معنی ہیں سیاہ۔ اس لکھے کو اس کے دوسرے جزئی کے بغیر بھی استعمال کرتے ہیں جیسے سیائنتا۔

(۲) آئے۔ مثلاً چکناٹ یعنی دہنیت او۔ چکنے ہونے کی صفت۔

(۳) آؤٹ۔ مثلاً مہز آؤٹ یعنی زمانہ نہیں، کیونکہ مہری کے معنی ہیں عورت۔

(۴) آس۔ مثلاً متحاس یعنی سیٹھ ہونے کی صفت۔

(۵) آہلی۔ مذکر کے لیے لام کے آخر میں واو مجہول لگاتے ہیں اور کہتے ہیں رگیکو یعنی رنگینی کی صفت سے موصوف مرد روزمرہ کی بول چال میں واو کی جگہ الف استعمال کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں رنگیلا عرونت کے لیے یاٹے معروف لگا دیتے ہیں اور کہتے ہیں۔ رنگیلی یعنی رنگینی کی صفت سے موصوف عورت۔

(۶) سار۔ مثلاً بلشار یعنی ملاقات یا میل جول کی صفت سے موصوف۔

(۷) کا۔ یہ لفظ عرونت کے لیے مخصوص ہے مثلاً آٹسار کا یعنی فسق و بدکاری کی صفت سے موصوف عورت، کیونکہ آٹسار کے معنی ہیں فسق و بدکاری۔

(۸) آہلی۔ مثلاً ڈھٹاویں یعنی بے حیائی اور بے شرمی کی صفت۔

(۹) اول۔ مذکر کے لیے لام کے آخر میں واو مجہول لگا دیتے ہیں اور کہتے ہیں ٹھو لو یعنی ٹھہلا ہونے کی صفت سے موصوف مرد روزمرہ کی بانٹ جیت میں واو مجہول کی جگہ الف استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں ٹھو لامونٹ کے لیے یاٹے معروف لگاتے ہیں اور کہتے ہیں ٹھوولی۔

(۱۰) آڈاں۔ مثلاً ٹھکواں یعنی نیم رنگ سرخی کی صفت سے موصوف مرد، کیونکہ ٹھکواں نیم رنگ سرخ کو کہتے ہیں۔ عرونت کے لیے اس لفظ میں الف کی جگہ یاٹے معروف لاتے ہیں۔ مثلاً ٹھکواں یعنی مذکورہ صفت سے موصوف عورت۔

وہ کلمے جو اسموں کے آخر میں آکر تصغیر کا فائدہ دیتے ہیں

- یہاں کی اصطلاح میں تصغیر کسی کو چھوٹا اور حقیر کرنا ہے۔ یہ کلمے چار ہیں۔
- ۱۔ دآ۔ مثلاً لنگرے لنگرے لنگر دلا اور فلگرے معنی ہیں شروع۔ مونث کی تصغیر کے لیے وا کی جگہ یا لاتے ہیں۔ مثلاً گاکرے گلمکریا اور گاکرے معنی ہیں گھرا۔ لکڑیا مذکر کے لیے نسبت کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً کنوچیا یعنی کنوچ کی طرف غسوب مرد۔ کنوچ ہندوستان کے ایک مشہور شہر کا نام ہے۔
 - ۲۔ دآ۔ مثلاً رمیہ سے رمیہ اور مہیہ کے معنی ہیں بارش۔
 - ۳۔ اڈنا۔ مثلاً ڈھوٹا سے ڈھوٹا نا اور ڈھوٹا کے معنی ہیں لڑکا۔
 - ۴۔ اڈت۔ مذکر کے لیے اس کلمے کے آخر میں وا مہول لاتے ہیں اور کہتے ہیں گھوڑا اور کبھی اس کلمے میں و اور معروف کی جگہ وا مہول بھی لاتے ہیں مثلاً غیر وکو یعنی چھوٹی گھڑی۔ ان دونوں صورتوں میں روزمرہ کی بول چال میں آخری وا مہول کی جگہ الفت استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً گھوٹا اور گھروٹا اور مونث کے لیے الفت کی جگہ یا سنے معروف لگاتے ہیں۔ مثلاً گھوٹی اور میر وٹی۔

وہ کلمے جو اسموں کے آخر میں آکر دارندگی کے معنی کا فائدہ دیتے ہیں

- یہ دو کلمے ہیں:-
- ۱۔ دھر۔ مثلاً گڑ دھر یعنی دارندہ کوہ۔ گڑ دھر کا دھر کا نام ہے، کیونکہ کہا جاتا ہے کہ کا خذ نے ایک وقت پہاڑ کو با خذ پرے لیا تھا۔ اس وقت سے اُن کا نام گڑ دھر ہو گیا۔ یہ کلمہ زمین کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں پہاڑ کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً دھر اور دھر یعنی دارندہ کوہ، کیونکہ دھر کے معنی ہیں زمین۔ اور مرت یعنی آب حیات کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں چاندھر کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً سندھ چاندھر۔ اور چاندھر کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں مہادیو کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً سندھ مہادیو۔
 - ۲۔ دھاری۔ مثلاً جٹا دھاری۔ یعنی جٹا رکھنے والا۔ اور جٹا کے معنی ہیں سر کے بال جو آپس میں چپک کر ایک ہو گئے ہوں۔

وہ کلمے جو اسموں کے آخر میں آکر دہندگی کے معنی دیتے ہیں

- یہ دو کلمے ہیں:-
- ۱۔ واچ۔ مثلاً دوکھ واچ یعنی درج دینے والا۔
 - ۲۔ واکھ۔ مثلاً شکھ واکھ یعنی آسام دینے والا۔

وہ کلمے جو اسموں کے آخر میں آکر کنسندگی کے معنی دیتے ہیں

یہ دو کلمے ہیں :-

۱۔ کبر۔ مثلاً دن کر یعنی دن کرنے والا۔ اس کا اطلاق آفتاب پر کرتے ہیں۔

۲۔ کرتا۔ مثلاً گن کرتا یعنی غائبہ کرنے والا۔

وہ کلمے جو اسموں کے آخر میں آکر لوٹ لینا، چھین لینا، لے بھاگنے کے معنی دیتے ہیں

یہ دو کلمے ہیں :-

۱۔ ہنر۔ مثلاً من ہنر یعنی دلہا، دل لے لینے والا۔ اس کلمے کے آخر میں ن لگا دیتے ہیں اور کہتے ہیں من ہنر اور

مونث کے لیے ن کے بعد یا ص معروف لگا دیتے ہیں اور کہتے ہیں من ہنر یعنی دلہا عورت۔

۲۔ ہنرنا۔ مثلاً ہنرنا یعنی ہر اکا دور کرنے والا۔

وہ کلمے جو اسموں کے آخر میں آکر مختلف معنی دیتے ہیں

۱۔ ہار۔ ایک کلمہ ہے جو کسی اسم کے آخر میں آکر لیاقت اور مزاد اوی کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً یون دار یعنی ہونے کے لائق، مثلاً

۲۔ آؤٹ۔ ایک کلمہ ہے جو اسم کے آخر میں آکر آئے کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً کسٹونٹ یعنی وہ چیز جس سے کسائی کی جائے۔

مذکر کے لیے اس کلمے کے آخر میں کھی الف لگا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کھی یعنی وہ چیز جس سے ستر عورت کیا جائے

یعنی آگاہ چھاپا جائے، کیونکہ کاجھ کے معنی ہیں عورت یعنی حم کا وہ حصہ جس کو چھپا رہنا چاہئے۔ اور مونث

کے لیے اس کلمے کے آخر میں بائے معروف لگاتے ہیں۔ مثلاً کسٹونٹ یعنی وہ چیز جس سے سونا یا جاندی پرکتے ہیں،

کیونکہ کس کے معنی ہیں پرکھنا۔ کھی یہ کلمہ ظرفیت کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً خزود یعنی وہ چیز جس میں کامل یا مریض کھتے ہیں۔

۳۔ بن۔ ایک کلمہ ہے جو اسم کے آخر میں آکر بے اور بغیر کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً لال بن یعنی بے معشوق اور لال کے معنی

ہیں معشوق۔ اس کلمے کے آخر میں الف ن بھی پڑھا دیتے ہیں اور کہتے ہیں لال بنال۔ اس کلمے کو کبھی اسم کے پہلے

بھی لائے ہیں اور کہتے ہیں بنال لال اور بنال لال۔

۴۔ سال۔ ایک کلمہ ہے جو اسم کے آخر میں آکر ظرف مکان کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً دعمرم سال، یعنی عبادت، غیرت،

دینداری، اور خدا پرستی کی جگہ۔ اس کلمے کو کبھی بغیر آخری الف کے بھی استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً جگ سال یعنی سکے

بنانے اور سونے جاندی کے پرکھنے کی جگہ۔

۵۔ آہند۔ ایک کلمہ ہے جو اسم کے آخر میں آکر پوس کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً چھلا ہند یعنی پھل کی سی نیز اور بری ہو۔

۶۔ چور۔ ایک کلمہ ہے جو درخت کے معنی دیتے والے اسم کے آخر میں آکر ہرن اور بندر کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً دکھ چور۔

۱۔ اور جگہ، بیا بان کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں اگر یہی معنی اور جگہ کی بیا بانی آدمی کے معنی دیتا ہے مثلاً بن چو۔ پانی کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں اگر ابو یا بان کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً مل چو اور سات کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں اگر صہوت کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً بن چو۔

۷۔ متی۔ ایک کلمہ ہے جو اسم کے آخر میں اگر کثرت کے معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً سل متی یعنی وہ جگہ جہاں کئی دریا بہتے ہوں یا ایسا دریا جس میں بہت پانی ہو، کیونکہ جس کے معنی ہیں پانی۔

۸۔ آتش۔ ایک کلمہ ہے جو اسم کے آخر میں اگر حصہ کے معنی دیتا ہے مثلاً دسواشن یعنی دسواں حصہ۔

۹۔ آؤتی۔ ایک کلمہ ہے جو اسم کے آخر میں اگر مقدار اور اندازے کے معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً کھجوتی یعنی سمجھنے کی مقدار اور اندازہ۔

اردو اور پنجابی

ڈاکٹر محی الدین زور

زبان اردو کا پنجابی سے جتنا قدیم اور جتنا گہرا تعلق ہے، اتنا کسی اور زبان سے نہیں ہے۔ اردو دنیا کی ایک ایسی عجیب و غریب زبان ہے جو ہمیشہ غلط فہمیں میں گھری ہوئی اور جس کو انہوں نے اس کی بے وقعتی، ہمہ گیری اور باہمیہ سے ہمہ روز کے باوجود ہمیشہ افسانہ پنپانے کی کوشش کی۔ اس کی شکل و صورت ہر دور میں بہت سوں کو دھوکہ دیتی رہی۔ اسی طرح اس کے آغاز و ارتقاء کی نسبت بھی بڑے بڑے ادیب اور محقق اکثر بھول بھلیوں میں پھٹتے رہتے ہیں۔ اور بعض اب تک بھی ٹینگ رہے ہیں۔ اس غمراہی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ کسی نہ کسی وجہ سے پنجابی زبان کے اس حصے کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہونے جو اس لئے، دو زبان کے بننے اور ترقی کرنے میں ادا کیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اردو کے آغاز و ارتقاء کا سراغ اس وقت تک کسی ماہر سائنات کو نہیں مل سکا جب تک کہ اس کے ساتھ پنجابی کے تعلق پر غور نہیں کیا جاتا۔

بعض لوگ غلط فہمی یا متافہمی تعصب کی وجہ سے اردو کو ہندی یا سندھی یا برج بھاشا یا کھڑی بولی کی بیٹی سمجھتے ہیں اور دوسروں کو بھی سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ ایسی غلطی ہے کہ اس کو مان لینے کی وجہ سے ہر منزل پر تخی غلطیوں کو نوادہ کر لینا پڑتا ہے۔ اور یہ سلسلہ لامتناہی بن کر بند پانچاں یا فیض و کمال کو بھی گمراہ کر دیتا ہے۔ سچ کہا ہے سے

خشتِ اول چون نہ دیدارِ کج
تاثرِ تباہی رسد و نزارِ کج

یہ غلطیاں اور غلط فہمیاں زیادہ تر یورپی محققین اور ماہرین سائنات کی پیدا کردہ ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جرمنی فرانسس اور انگریزی ماہرین سائنات نے ہماری زبانوں سے متعلق قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اور ہم ان کے احسان کے بے انتہا شکر رہیں گے۔ لیکن اس کے یقینی نہیں ہیں کہ احسان کے سعادت مندانہ اعتراف کے ساتھ ساتھ ہم ان کی غلطیوں کو بھی آنکھ بند کر کے قبول کر لیں۔

ہمارے ملک کی سیاسی و سماجی آزادی کے بعد سے ہمیں اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم اس باہمی ذہنی آزادی بھی حاصل کر لیں اور اپنی زبانوں اور ان کے ادب کے متعلق گہرا وادارہ و محنت مندانہ نقطہ نظر کو پیش نظر رکھ کر تحقیقات کریں اور ایسے غلط نظریوں اور باور ہوا خیالات کو چھان بین کے بعد علی الاعلان رو کر دیں جو کہ اپنی کم علمی یا یورپ کے ماہرین سائنات پر اعتقاد

یا ان کے بے جا عجب کی وجہ سے صحیح مان لیا کرتے تھے اور مان رہے ہیں۔
یہ عجب بات ہے کہ اردو اور پنجابی کے اصلی تصنیف کی نسبت کسی یورپی ماہر سائنات کا ذہن اب کس قدر غفلت نہیں ہوا۔
اس کی طرف سب سے پہلے ہر کسی کی نگاہیں توجہ منقطع ہوئی اور ہندوستانی اہل قلم ہی نے اردو اور پنجابی کے اس بنیادی تصنیف کو
سب سے پہلے بے نقاب کیا۔

آج سے راج صدی قبل مسیح ۱۹۰۲ء میں پروفیسر حافظ محمود شیرانی نے اپنی کتاب پنجاب میں اردو میں اس خیال کو نہایت
واضح انداز میں دلائل کے ساتھ پیش کیا تھا۔ اس کتاب کی اشاعت سے ایک سا اہل ہی راقم الحروف اردو کے آغاز و ارتقاء
پر مدینہ یونیورسٹی میں لسانیاتی تحقیقات میں مصروف تھا۔ میرے مطالعے اور تلاش جو تہوں ہی میں حقیقت بے نقاب ہوئی تھی فرق
صرف اتنا تھا کہ میں نے یہ واضح کیا کہ جس زمانے میں اردو پنجاب میں بنی اس وقت پنجاب اور دو آپہ لنگ و جہن کی زبان میں بہت کم
فرق پایا جاتا تھا۔ برج بھاشا، کھڑی بولی اور جدید پنجابی زبانیں بعد کو عالم وجود میں آئیں، چنانچہ میں نے اپنے مقالے میں اس نظریہ
کو مثبت و مبطل کے ساتھ بیان کیا۔ اس مقالہ کی تکمیل کے بعد راقم الحروف نے صورتیاتی نقطہ نظر سے اس کی مزید توثیق کی اور اس سلسلے
میں جو علمی تحقیقات کی گئیں ان کو کتابی صورت میں ”ہندوستانی فونیکس“ کے نام سے ۱۹۳۲ء میں پیر میں شائع کیا۔ بعد میں اس نظر
کی مزید وضاحت اور اہل اردو میں اشاعت کے لئے ایک اردو کتاب ”ہندوستانی لسانیات“ لکھی جو ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔
عزیز ۱۹۳۲ء کے بعد سے اہل اردو اور ماہرین لسانیات کے نقطہ نظر میں تبدیلی پیدا ہوئی اور اردو کے سر زمین پنجاب میں پیدا ہونے
اور لسانیاتی نشرو نما حاصل کرنے کا نظریہ تسلیم اور مسلم الثبوت بن گیا۔

۱۹۳۲ء میں ہماری زبان کے ایک قابل احترام شاعر اور ادیب پنڈت رحیم بخش داتا نے کتبچہ دہلوی نے اپنی کتاب ”کیفیت“
شائع کی تو اس میں بھی انہوں نے راقم الحروف اور محمود شیرانی کے اس نظریہ سے اختلاف نہیں کیا۔ بلکہ صفحات ۲۵ تا ۳۵ پر
اس خیال کی تائید کی کہ اردو کی پیدائش کے وقت شمالی اور شمال مغربی ہند کی زبان تقریباً ایک ہی تھی۔ لیکن ساتھ ہی شاید
دہلوی ہونے کی وجہ سے اس واقعہ کا صاف طور پر اعتراف نہیں کیا کہ اردو پنجاب ہی میں پیدا ہوئی بلکہ ذرا دامن چائے ہوئے
یوں لکھ دیا ہے کہ

”واقعہ کا ہرگز یہ نشانہ نہیں کہ کسی خاص مقام یا خطے کو اردو کا مولد ہونے
کے اعتبار سے محروم کیا جائے یا یہ طرہ اختیار کیا کہ اس سے چھین کر دوسرے
کی وسعت دے دیا جائے“

لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اردو کے پنجاب میں پیدا ہونے کی مخالفت بھی نہیں کی بلکہ اس کتاب کی صفحہ ۱۱۱ پر ایسے
اسماء، افعال، اضرار وغیرہ پیش کئے ہیں جن سے اردو اور پنجابی کا تعلق ظاہر ہوتا ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ ان دونوں زبانوں کا
تعلق نہایت گہرا اور نہایت قریبی ہے۔

پنڈت کیفی کے اس کو گونا گونا گواں کا اصلی سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی کتاب کی اشاعت سے دو سال قبل ہی
مولانا سید سلیمان ندوی جیسے فاضل اہل کی ایک کتاب ”نقوش سلیمانی“ ۱۹۳۹ء میں شائع ہو چکی تھی جس میں مولانا کے مختلف مضامین

اور خلیجہ شمال میں ۱۰۰ میل سے بعض بہت ہی قدیم یعنی ۱۹۱۵ء کے کھدے ہوئے ہیں لیکن ۱۹۳۲ء کے متغایے میں ملانے پر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو سندھ میں بھی ہے چنانچہ وہ طویل بحث کے بعد نتیجہ اخذ فرماتے ہیں وہ یہ ہے کہ ”قربن قیاس یہی ہے کہ جس کو ہم آج اردو کہتے ہیں، اس کا ہیملی اس داؤی

سندھ میں تیار ہوا ہوگا“ ص ۳۱

اس سے پہلے کے ایک خطے میں انھوں نے تحریر فرمایا ہے کہ
”اردو زبان کا پیدا ہونا کسی ایک قوم یا وقت کا کام نہیں بلکہ مختلف قوموں اور زبانوں کے میل جول کا ایک ناگزیر اور لازمی نتیجہ ہے۔۔۔۔۔۔
اردو شاہجہان کے عہد کی یادگار بتائی جاتی ہے، لیکن اصل یہ ہے کہ غوریوں خلیجیوں اور قلعوں ہی کے زمانہ میں یہ پیدا ہو چکی تھی“ ص ۶۔

ایک اور مضمون میں مولانا نے یہ رائے قائم فرمائی ہے کہ

”مخلوط زبان سندھ، گجرات، اودھ، وکن، پنجاب اور بنگال ہر جگہ کی صوبہ دار زبانوں سے مل کر ہو رہی ہیں الگ الگ پیدا ہوئی“ ص ۲۵

داخل ہو کر مولانا سلیمان مدوی کے پیچیدہ و غریب اور متضاد بیانات ”پنجاب میں اردو“ اور ”ہندوستانی لسانیات“ کی اشاعت کے بعد شائع ہو رہے ہیں جن میں اس مسئلہ کو بوری طرح واضح کر دیا گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے ان تحقیق اور لسانیاتی کتابوں کے مطالعہ کی زحمت ہی گزارنا فرمائی۔ لیکن ان متضاد بیانات اور زبانوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بعد جب پنڈت کیفی نے فلم اٹھایا تو فطری طور پر کسی نتیجے پر پہنچنے سے گریز کیا۔ اور چونکہ یہ دونوں اصحاب لسانیات زیادہ ”تاریخ ادب و نقد شعر“ کا نہیں، اس لئے اپنے علم و فضل اور وسعت معلومات کے باوجود اصل مسئلہ سے دور ہو گئے۔ یا شاید دوسرے مصنفوں کی تحقیق یا نظریہ سے ہم خیال ہونے کو اپنے تجرعم کے لئے کسر نشان تصور کیا۔

غرض ”نقوش سلیمانی“ اور ”کیفیہ“ کی اشاعت کے بعد اردو کے آغاز و ارتقاء اور جائے پیدائش کے بارے میں اردو اور ہندی کے ارباب فلم بھر تذبذب میں پڑ گئے۔ اور اردو کے پنجاب میں پیدا ہونے کے مسلم الثبوت نظریہ کو نظر انداز کرنے کا میلان شروع ہو گیا۔ اس میلان میں شاید اس لئے بھی تقویت پیدا ہونے لگی کہ اس نظریہ کے آغاز کا سہرا کسی یورپی محقق کے سر نہیں باندھا جا سکتا تھا اور ہم ہندوستانیوں کے نزدیک اب تک انگریز یا جرم یا فرانسیسی مصنف کا نام ہی کسی خیال یا نظریہ یا رائے کی صداقت و وحدت کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔

دوسری وجہ شاید یہ ہے کہ اس میلان کو ہوا دینے والے اردو اور ہندی ادیب چونکہ خود لسانیات پر کافی عبور نہیں رکھتے، اس لئے خود ذاتی تحقیق و تفتیش کرنے سے معذور ہیں۔

تیسری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان میں سے اکثر جمہوری واری مصیبت کے شکار ہیں اور ان پر روشنی اور عمل کے سوا کسی اور مقام کو اردو اور ہندی کا مرکز و منبع ماننے کے لئے تیار نہیں اور نہیں چاہتے کہ برج کی مقدس سرزمین اور اس کے نواحی علاقے

اس غفلت سے محروم ہو جائیں اور اردو کے آغاز کا سہرا پنجاب کے سر ہاندا جائے۔
 اردو کے آغاز و ارتقاء سے متعلق اردو کی جدید ترین سائناتی تحریروں کے تجزیہ سے قبل ضروری معلوم ہونا چاہیے کہ
 پروفیسر ڈاکٹر سیٹی کمار چٹرجی کی انگریزی کتاب ”انڈو آریہ اور ہندی“ اور پروفیسر ڈاکٹر سدھیشور رام کی اردو کتاب
 ”آریائی زبانیں“ کا بھی تذکرہ کیا جائے۔

ڈاکٹر سیٹی کمار چٹرجی لکھتے ہیں یورپی میں سائنات کے پروفیسر اور ہندوستان کے سب سے بڑے عالم سائنات اور
 محقق ہیں۔ ان کی تصانیف کی اولیت و اہمیت اور ان کے تجربہ عملی کی وجہ سے اگر ان کو جدید معاصرین ہندوستانی سائنات کا امام
 کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ان کی تحقیقات نے یورپ کے بڑے بڑے ماہرین اور خاص کر ”سائنس جرنل“ کے مرتب سر جارج
 ایلمر گریرسن کی غلطیوں کو بے نقاب کر دیا ہے۔ ہجرات کی درنا کو کہہ سرج سوسائٹی سے ۱۹۲۲ء میں ان کو ہندی، ہندوستانی
 کے فنون و نام پر تقریر کرنے کے لئے مدعو کیا تھا اور یہ تقریریں اس سوسائٹی کی طرف سے ۱۹۲۲ء میں ”انڈو آریہ اور ہندی“
 کے نام سے کتابی صورت میں شائع کی گئی تھیں۔ پروفیسر چٹرجی نے اپنی اس کتاب میں ”ہندوستانی سائنات“ سے ان الفاظ میں
 اتفاق کیا ہے کہ

The language that they (Muslims) first adopted was naturally that current in the Punjab. Even in these days, there is not much difference between the Punjab dialects, particularly those of Eastern Punjab, from those spoken in the western most parts of the United Provinces; and eight or nine hundred years ago, we might imagine that the difference was still less: it is even likely that an almost identical speech was current in Central and Eastern Punjab and Western United Provinces.” (p. 167)

اس کے بعد وہ اپنی مسالوں کی آمد اور وہاں اپنی بنائی ہوئی کوئی پنجاب سے ساتھ لانے کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

“It is likely that Punjabi Mohamaddans who came to Delhi as followers of the Turki and Persian conquerors had the greatest importance of all the Indian groups, in the new capital. They brought their dialect to Delhi; and their dialect, which agreed with those of the districts to the North and North West of Delhi in some important matters, gave the tone and supplied some salient characteristics to the new verkhess prache so business speech which came into being in the new capital city.” (pp. 168-169)

اس بیان کے آخری حصے میں پڑھی نے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہی کی محفل قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس سے آگے چند صفحات بعد ہی ڈاکٹر بیڑی آدوشتہ پارے کے حوالے سے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ اردو بولنے والے پنجاب ہی سے آئے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں۔

“Judging from the kind of speech the descendants of the North Indian Muslims, still speak in the Deccan, and from the language of early Dakvi Poetry of the 16th-17th centuries (cf. Urdu Shahpare, by Dr. S. Mohiuddin Qadri, Hyderabad Dakan Part I, 1929), it is clear that they mostly hailed from the Punjab and from the Bangaru and ‘Vernacular Hindustani’ dialects areas of North India.” (p. 184)

مگر بڑا تعجب ہوتا ہے جب سنی کمار جیسا حق آگے کی چند سطروں میں یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ کوئی اردو کوئی اور بولی سے بنی اور شمالی اردو کوئی اور بولی سے۔ وہ لکھتے ہیں۔

“The North Indian Vernacular which became established in the South was sister speech to Hindustani, if not exactly identical with it, being of some Punjab and Western United Provinces origin.” (p. 184)

چند اور سطروں کے بعد چڑی بھڑا دو کا اصلی وطن پنجاب ہی کو قرار دینے کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ چنانچہ شاد برہان الدین حاتم کی نظم ”سکہ سیلا“ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

“Shah Burhan’s language has some distinct Punjabi affinities, and it is noteworthy that he calls it Guj (a) ri as contrasted with Bhaka, i.e. Braj Bhaka. This name Gujri gives an indication of the origin and affinity of this dialect: evidently the Gujars of the Punjab had come in good numbers with the North Indian armies, and they maintained their name and their dialect in the Deccan for some time.” (pp. 185-186)

یہاں اس کا موقع نہیں ہے کہ پرنسپل سنی کمار چڑی کے ان ایلا ہر تضاد بیانات کے اسباب اور ان کے حسن و قبح پر تنقیدی نظر ڈالی جائے۔ البتہ اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ یہ ہم بیانات بھی ان غلط فہمیوں کا باعث ہیں جو بعد کے

اندوارا بابائے سلم کی لسانیاتی تحریروں کو نگراہ کر دینے کا باعث ہوئے اور جن کا ذکر آئندہ درج ہے۔
 پروفیسر جرجی کی تقریروں کے اس مجموعہ کی اشاعت کے چند ماہ بعد ہی ادارہ ادبیات اردو کی طرف سے
 پروفیسر ڈاکٹر سندھیشو روڈا کی ایک کتاب ”آریائی زبانیں“ میرے ہی مخدے کے ساتھ شائع ہوئی۔ سندھیشو روڈا پریس
 آف ویلز کالج جنوں میں سکونت اور لسانیات کے محکمے تک پروفیسر رہ چکے ہیں۔ انھوں نے موضوع کی مناسبت ”آریائی
 زبانوں پر نواس کتاب میں تفصیل سے بحث کی ہے لیکن اس کی تمہید میں ہندوی زبان کے ماخذ و ارتقاء پر بھی سرسری طور پر طالع
 خیال کیا ہے۔ لیکن اس سے بڑھتا ہے کہ انھوں نے اس مسئلہ پر غور ہی نہیں کیا۔ نہ تو مجموعہ دشیرانی کی کتاب ”پنجاب میں اردو“
 ہی پڑھی۔ نہ پنڈت کیسئی کی ”کیغیہ“ اور نہ ہندوستانی لسانیات ہی کا مطالعہ کیا۔ اگرچہ جرجی کی مذکورہ بالا کتاب کے جاہل
 حوالے دئے ہیں لیکن اردو یا ہندوی کے آغاز کی نسبت اسی پرانے خیالی کو دہرایا ہے کہ وہ دہلی کے بازاروں اور ضلع مرہٹھ
 کی زبان سے لی گئی ہے۔ (صفحات ۱۲، ۱۳)

آخر میں اردو ادوار ہندی کی ان کتابوں کا ذکر ضروری ہے جو گذشتہ چار پانچ سالوں میں شائع ہوئی ہیں۔ ان
 میں خاص طور پر دو کتابیں اہمیت رکھتی ہیں اس لئے کہ وہ لسانیاتی انداز میں لکھی گئی ہیں اور اردو کی ان معدومے چند کتابوں میں
 سے ہیں جو اس مخصوص موضوع پر اب تک شائع ہوئی ہیں۔

پہلی کتاب پروفیسر اعشام حسین کی ”ہندوستانی لسانیات کا خاکہ“ ہے۔ اعشام حسین صاحب نے دراصل جان ہیز
 کی مشہور کتاب ”این آؤٹ لائن“ کا ترجمہ اپنے ایک سیر حاصل مقدمے کے ساتھ ۱۹۶۱ء میں شائع کیا ہے۔ ان کا مقدمہ
 اگرچہ بطور یادگار، کتاب کے ساتھ شائع ہو گیا ہے لیکن بجائے خود ایک ”بسوط مقالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں اعشام حسین
 نے اس موضوع کی تمام مہمہ کتابوں کے مطالعہ کا بہت عمدہ پتہ نہایت سچھے چمٹے انداز میں پیش کیا ہے۔ لیکن بڑی حیرت
 ہوتی ہے جب یہ جملہ بھی اس مقدمے میں نظر سے گذرتا ہے کہ

”جیرلز بلاک (فرانسیسی ماہر لسانیات) نے جلفیہ پیش کیا ہے اور جسے
 ڈاکٹر زروٹے تسلیم کیا ہے، وہ یہ ہے کہ ابتدا میں پنجابی اور کھڑی بولی
 میں صرف تدریجی فرق رہا ہوگا۔ بعد میں ایک پنجابی بن گئی۔ دوسری
 کھڑی بولی“ (صفحہ ۵۳)

حالانکہ نہ تو پروفیسر زروٹ بلاک نے یہ نظر یہ پیش کیا اور نہ میں نے کہیں اپنی کتابوں میں ان کے کسی نظر یہ کی
 وضاحت کی۔ اس نظر یہ کے اگر کوئی بانی قرار دے سکتے ہیں تو وہ دراصل پروفیسر جرجی ہیں جن کی طرف میں نے
 ”ہندوستانی لسانیات“ میں صفحہ ۹۰ اور ”ہندوستانی فونٹیکس“ میں صفحہ ۱۹ پر اشارہ بھی کیا ہے۔ پروفیسر جیرلز بلاک نے
 دراصل اپنے ایک مضمون میں اس امر کی طرف اشارہ کیا تھا کہ ہندوستانی کے آغاز و ارتقاء پر غور کرنے وقت دہلی کے اطراف
 و کنارف کی بولیوں کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے اور ان کا یہ مضمون اسکول آف اوپنٹل اسٹڈیز، لندن کے ٹیٹن میں ۱۹۶۱ء
 میں اس وقت چھپا تھا جب کہ میرا مقالہ بی۔ اے۔ ڈی مکمل ہو چکا تھا۔ اگر یہ مضمون اس کی ترتیب کے دوران میں چھپتا تو میں

اس کی تائید تو یقیناً نہیں شاید زبردستی کرتا۔

پروفیسر جولز خود بھی محمود شیرانی کی کتاب اور میری تحقیقات سے اس وقت تک ناواقف تھے اور جب میں ۱۹۶۷ء میں لندن سے بی ایچ ڈی کرنے کے بعد ڈی لٹ کے لئے بیرس بینچا اور پروفیسر جیولز بلاک کے ساتھ گجراتی فارم امن ہندوستانی پر مقالہ لکھنا شروع کیا تھا تو وہ اس وقت ان مباحث اور نظریہ سے پوری طرح واقف ہوئے۔ چنانچہ جب بیرس ہی سے ہندوستانی فن کے لمس شائع ہوئی تو اس پر خود پروفیسر جیولز بلاک ہی نے مقدمہ تحریر فرمایا اور چونکہ وہ اس نظریہ کو سمجھ چکے تھے اس لئے اپنے مقدمے میں اس کی کوئی مخالفت بھی نہیں کی۔

لیکن جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ ہندوستانی مصنفین کے لئے کسی یورپی محقق کا نام ہی ضمانت کا کام دیتا ہے چنانچہ جیولز بلاک کے اس ابتدائی خیال کو یوں سمجھ لینے کے بعد پروفیسر احتشام حسین نے اپنے مقدمے کو اردو کے آغا زاد جیسے پیدائش کے بارے میں کوئی قطعی نتیجہ قائم کئے بغیر ہی ختم کر دیا ہے۔

یہی حال اس کی دوسری کتاب "مقدمہ تاریخ زبان اردو" کا بھی ہے۔ اس کو اکثر مسعود حسین خاں نے علی گڑھ یونیورسٹی کی بی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے کے طور پر مرتب کیا تھا۔ یہ مقالہ ابھی حال میں کتابی صورت میں شائع ہوا ہے اس مقالہ پر اگرچہ زیادہ تر پروفیسر سونی کار چہڑی کا انداز اختیار کیا گیا ہے اور ان کی تحقیقات سے استنادہ کیا گیا ہے لیکن جیولز بلاک کے مذکورہ بالا مضمون کو زیادہ قرار دے کر پوری کتاب میں اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ پنجابی سے توجہ ہٹا کر ہریانوی کو آگے بڑھایا جائے اور کچھ اس انداز میں کتاب لکھی گئی ہے کہ پنجابی واقعی ہریانوی میں چلی جاتی ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین یہ تو مانتے ہیں کہ :-

"یہ بات باریہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ ہندوستان کی جدید آریائی زبانوں کے وقوع کے وقت ہریانوی اور پنجابی میں خط فاصل قائم کرنا دشوار تھا۔" (صفحہ ۱۱)

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ عجیب و غریب خیالی بھی ظاہر کرتے ہیں کہ :-

"البتہ شورشینی اپ بھرنش کی حالتیں ہونے کی حیثیت سے پنجابی زبان کے مقابلہ میں ہریانوی اور کھڑی لہی کو زیادہ قدیم ماننا پڑ گیا۔" (صفحہ ۱۱)

اس کتاب میں مسعود صاحب نے ایک اجماع فرنگ ایشٹ پر مبنی ہے کہ انھوں نے موجودہ پنجابی اور موجودہ ہریانوی کا مقابلہ قدیم وکتی سے کر کے نتائج اخذ کئے ہیں۔ حالانکہ وکتی اردو نے جس وقت پنجاب میں نشوونما حاصل کیا اس وقت ہریانوی اور کھڑی لہی تو کچھ خود برج بھاشا بھی ایک جداگانہ زبان کی حیثیت سے عالم وجود میں نہیں آئی تھی۔ اور خود انھوں نے پروفیسر شیرانی کے اس نظریہ کو قبول کیا ہے کہ ہریانوی کی پیدائش مسلمانوں کی آمدوں کے بعد عمل میں آئی ہے۔ (صفحہ ۱۳)

ڈاکٹر مسعود حسین مانتے ہیں کہ لاہور کی ترک ہندی افسانہ نویس خواجہ مسعود سکھان پرورش پاتے ہیں جو ہندی زبان کے بھی بزرگ شاعر تھے۔ (صفحہ ۱۲۹، ۱۳۰)

اور یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ "خواجہ مسعود کسی ہندی زبان میں بھی شاعری کرتے تھے اور شاہیدان کا دیوان خسرو کے وقت

تک دستیاب نہ تھا۔ لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ ہندوی زبان کون سی تھی۔ اس لئے قیاس قائم کرتے ہیں کہ زبان لاہوری ہوگی۔ یہ ایک عجیب قیاس ہے جب کہ ہم کو معلوم ہے کہ امیر خسرو ہر جگہ کی زبانوں کا فرق جانتے تھے اور اپنے ہمد کے بہت بڑے ماہر محقق لسانیات تھے چنانچہ انہوں نے اپنے ہمد کی ہندوستانی زبانوں کی فہرست بھی لکھ دی تھی جس کو مسعود صاحب نے بھی صفحہ ۳۰ پر نقل کیا ہے۔ ایسی صورت میں اگر مسعود صاحب ان کی زبان لاہوری ہوتی تو امیر خسرو اس کو لاہوری ہی کہتے اور ان کی زبان اور مسعود کے دیوان کی زبان میں فرق ہوتا تو وہ ضرور یہ بھی واضح کر دیتے کہ ہم نے دہلوی میں شاعری کی اور مسعود نے لاہوری میں۔

لیکن اس کی بجائے انھوں نے اپنی اور مسعود دونوں کی زبان کا نام ہندوی ہی لکھا۔ اس سلسلے میں ایک اور بات بھی واضح کر دینی ضروری ہے کہ امیر خسرو نے اپنی زبانوں کی فہرست ہندوی کو الگ ہی رکھا اس لئے کہ یہ زبانیں میں عمومی حیثیت اختیار کر چکی تھیں۔ ان کے ہمد میں یہ کوئی مقامی زبان نہیں رہی تھی۔ اور انھوں نے جن زبانوں کے نام لکھے ہیں، وہ صرف مقامی ہیں اور ان مقامی زبانوں کی فہرست میں برج بھاشا کو انھوں نے جھلسوی اور پتیا جی کہ لاہوری لکھا ہے۔

مسعود صاحب دہلوی کو اردو کہتے ہیں اگر یہ صحیح ہوتا تو خسرو پر یہ الزام نہ تھا کہ انھوں نے برج بھاشا جیسا نام زبان کا ذکر ہی نہیں کیا۔

فقہ مختصر یہ کہ ہر بانی کو اردو کا اخذ ثابت کرنے کی کوشش میں ڈاکٹر مسعود حسین کی یہی کتاب ایسی گنجلک اور مہم و متضاد بیانات سے معمور ہوئی ہے کہ ان پر ایک سرسری تبصرے کے لئے بھی کافی وقت اور فرصت رکاوٹ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کتاب محنت اور تلاش و جستجو سے لکھی گئی ہے اور مصنف نے لسانیاتی مسائل سے گہرے شعف کا ثبوت دیا ہے۔ لیکن محض جیلز بلاک کی سند پر ایک قدر نظر بہ قائم کرنے اور پنجاب میں آغا زادو کے نظریہ کو غلط ثابت کرنے کی سعی میں اپنی ساری قابلیت وقف کر دی ہے۔

اس کی اشاعت کے بعد کوئی تعجب نہیں کہ اردو کے آغا زادو ارتقا کے بارے میں عام طور پر انتشار خیالی پیدا ہوا اور ہر شخص اپنی ٹیڑھ اینٹ کی مسجد اٹک بنانے کی کوشش کرنے لگے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس سب کتا بوں اور ان کے مندرجہ مہم و متضاد بیانات کی جانچ کی جائے اور ان میں جہاں جہاں غلطی ہے اس کی ترمیم و دلائل کے ساتھ پیش ہو۔ اور ادب بانی اور اردو دونوں زبانوں میں ایک ایسی مہم و کتاب ترتیب اور تلاش کی جائے جس میں لسانیاتی نقطہ نظر سے اور دلائل و براہین کے ساتھ اردو کے آغا زادو ارتقا اور اردو اور پنجابی کے تعلق پر روشنی ڈالی جاسکے۔

اس کتاب میں ان امور کا پھر تفصیلی جائزہ لینا پڑے گا جن کے بارے میں شیلا بی کیمنی چٹرجی اور مسعود حسین خاص نے بھی بحث کی ہے اور جس کے سلسلے میں ان کے آپس میں اتفاق یا اختلاف رائے پیدا ہوا ہے۔

اس بات کو صاف طور پر واضح کرنا پڑے گا کہ ہر بانی زبان کی پیدائش اردو کی پیدائش کے بعد عمل میں آئی ہے۔ اور اگر قدیم کوئی اردو کی بعض خصوصیات ہر بانی زبان سے ملتی جلتی ہیں تو اس کی یہ وجوہیں کہ اردو ہر بانی سے بنی بلکہ اس کا اصلی

سبب یہ ہے کہ اردو ادب ہر بانی دونوں کا سرچشمہ ایک ہی تھا۔

تدبیر و نئی اردو کی بہت سی کتابیں اس اثناء میں شائع ہو کر منظر عام پر آچکی ہیں اور آرہی ہیں۔ ان میں سے بعض ایسی ہیں جن تک چڑھی، شیرانی اور مسعود حسین خاں کسی کی رسائی نہیں ہوئی۔ اس لئے اب تدبیر و نثرین زبان کے ان نمونوں کا گورنارنگ، کبیر و تلمی داکس، مسعود اکس اور نوحہ چند برٹے کی زبان سے متقابلہ کر کے ان کے آپس کے لسانی اختلافات کو واضح اور ہمیں کرنا چاہیگا۔
وکن کی طرح گجرات مالوہ اور خانہ علیا کے تدبیر و نثرین کی کتابوں اور نثرین کی زبان بھی اس متقابلہ و موازنہ میں زیر بحث آتی ضروری ہے۔ اس لئے کہ ان علاقوں میں بھی سرزمین پنجاب ہی کے فیض یافتہ صدیقی سیاسی اور علمی حیثیت سے برسرِ اقتدار رہے ہیں۔

ان تمام امور کو پیش نظر رکھ کر جو کتاب مرتب ہوگی اس سے نہ صرف اردو کی ابتدا اور جائے پیدائش کے مسئلہ کی یکسوئی ہو جائے گی بلکہ پنجابی اور پنجاب سے اردو کے دبیر و نثرین کے بارے میں جو غلط نظریات عہد حاضر کے ادیبوں اور محققین کے دماغوں میں نشوونما پا رہے ہیں، ان کی تردید ہو جائے گی۔ اور اردو، ہندی اور پنجابی تینوں زبانوں کے ادیبان کو معلوم ہو گا کہ یہ تینوں زبانیں باہم وکرکتی پیوست ہیں اور یہ کہ سرزمین پنجاب نے ہندی اور اردو کی شکل میں ہندوستان اور پاکستان کو کیسی عظیم الشان نصیب عطا کی ہیں۔

تنقید میں نقطہ نگاہ کی اہمیت

شوکت سبزواری

تنقید ایک مفید فن ہے جس سے اچھا اور مفید کام لیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب صحیح تنقیدی شعور سے کام لے کر تنقید میں باقاعدگی پیدا کی جائے اور ایک فن کی طرح اس کی عمارت علمی بنیادوں پر استوار ہو۔ تنقید کو باقاعدہ بنانے کے معنی یہ نہیں کہ تنقید کے اصول منبہ شعر فنی کے بندے ملے قاعدے ہیں۔ کچھ پیمانے میں جن کی مدد سے شعر یا نثر پارے کو ناپ کر اس کی ادبی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ سونے اور چاندی کے پرکھیا کے پاس ایک کسوٹی ہوتی ہے جس پر گر کر وہ کھوٹے کھسے کی جانچ کر لیتا ہے۔ تنقید کے اصول بھی کسوٹی کی طرح ہیں جن پر شعر کے کھسے کھوٹے کو پرکھا جاتا ہے۔ یہ اصول اگر طے ہو جائیں تو تنقید میں باقاعدگی آجائے۔ اور وہ ایک مفید اور علمی بنیادوں پر استوار فن کی حیثیت اختیار کر لے۔

اس میں شک نہیں کہ ایک زمانہ تھا جب تنقید کے اصول مقرر تھے جن پر شعر کو پرکھا جاتا تھا اور جوان اصولوں کو جاننے تھے۔ وہ نقد و کلمات تھے۔ ان کے فیصلے اعلیٰ ہوتے تھے۔ لیکن یہ اس زمانے کی بات ہے جب تنقید لغتوں کی جانچ پرکھ اور نزدیک تو اس سے آگے نہ بڑھی تھی۔ نقد و کلمات کی فصاحت اور کلام کی بلاغت کے فیصلے صادر کیا کرتے تھے۔ اب تنقید بہت آگے بڑھ چکی ہے اب اس میں زندگی کی سمی وسعت آگئی ہے۔ آج جہزہ اصول مقرر کر کے انھیں معیار نقد قرار دینا ایسا ہے جیسے چھینیس انچی گز کی مدد سے اس وسیع اور ہموار کائنات کی وسعتوں کو ناپنا۔ آج کسی طرح بھی تنقید کے بندے ملے اصول نہیں ہو سکتے۔ پھر تنقید میں باقاعدگی اور ایک فن کی سی استواری کس طرح پیدا ہو؟

اس سوال کا جواب مختلف نقادوں نے مختلف طریقوں سے دیا ہے۔ یہ نقد مختلف نقطہ ہائے نگاہ کے مالک تھے۔ وہ زندگی کو ہی زاویوں سے دیکھتے تھے۔ شعر و ادب کے کارناموں کے پرکھنے میں انہی زاویوں سے انہوں نے کام لیا۔ اس لیے ہر ایک نے اپنی تنقید کا معیار الگ بتایا۔ میرے خیال میں اس سے تنقید کی حیثیت واضح نہیں ہوتی اور نہ اس میں باقاعدگی آتی ہے۔ تنقید میں باقاعدگی اسی وقت آسکتی ہے جب زندگی کی بابت ان نقادوں کے زاویہ نگاہ کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے اور معیار نقد مقرر کرنے سے پہلے اس نقطہ نگاہ کی حقیقت دریافت کر لی جائے۔ جو اس معیار کے لیے اساس کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے جس طرح تنقید کے بندے ملے اصول نہیں۔ اس کا کوئی قطعی معیار بھی نہیں۔ معیار یا تو چند اصولوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ جہاں اصول نہ ہوں۔ وہاں مجموعہ کہاں ہو سکتا ہے یا معیار ایک جامع اور کسی قدر مبہم اصول کا نام ہے جو اپنی جامعیت اور ابہام کی وجہ سے نہ تو واضح بھی ہے اور نہ قطعی۔ نہ منطقی کے

اصولوں کی کسی روشنی اس میں پائی جاتی ہے اور نہ کہ پڑھنے کے گزرنے کی کسی قطعیت مثلاً حسن کاوی، یا افادیت یا زندگی کی تنقید یا سماجی شعور وغیرہ۔ ان میں سے ہر ایک کو معیار نقد قرار دیا گیا ہے۔ کسی کے نزدیک حسن کاوی ادب ہے۔ کسی کے نزدیک افادیت، کوئی زندگی کی تنقید کو ادب بتاتا ہے اور کوئی سماجی شعور کو۔ حسن کاوی کی حدود کیا ہیں؟ افادیت کسے کہتے ہیں؟ زندگی کی تنقید کا معیار کیا ہونا چاہئے؟ سماجی شعور کی اساس کیا ہے؟ ان میں سے کوئی چیز بھی واضح نہیں۔ تنقید کے اصولوں کی طرح ان میں سے کسی معیار کے بھی بندے ملنے اصول نہیں بتائے گئے۔

ادب کے متعلق دو برے نقطہ نگاہ ہیں۔ جن پر تنقیدی نظریوں کی بنیاد قائم ہے۔ ایک نقطہ نگاہ تو یہ ہے کہ ادب زندگی کا آئینہ ہے جسے زندگی نے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ دوسرا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ ادب خود ایک متعلق اور آزاد نظام ہے۔ اس کا زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ ادب سے زندگی کا نانا جوڑنے والے آج کا اکثریت میں ہیں اور ان کے نقطہ نگاہ کو آہستہ آہستہ سبھی مانتے جا رہے ہیں۔ یہ ادب کو زندگی کا پر تو سمجھتے ہیں اس لیے ان کا خیال ہے کہ آج زندگی میں جو تئیں ہے جو زندگی ہے۔ ادب میں بھی یہی موضوع اور رنگ زندگی پائی جاتی چاہئے۔ ان کے نزدیک ادب کی کسوٹی خود زندگی ہے۔ زندگی کے تمام گوشے ادب کا موضوع ہیں۔ اس کے ہر چھوٹے بڑے پہلو کو ادب میں بیان کیا جاسکتا ہے زندگی میں سادگی بھی ہے۔ اور پرکاشی بھی۔ جھل بل بھی ہے۔ اور جس میں بھی۔ یہ سادگی، پرکاشی، جھل بل، اس میں ادب میں بھی سوبا جاسکتا ہے ادب زندگی کا ترجمان ہی نہیں نقاد بھی ہے۔ اس میں زندگی کی تصویر کشی ہی نہیں کی جاتی، زندگی کی تنقید اور اصلاح کا کام بھی اس سے لیا جاتا ہے۔

لیکن اتنا کافی نہیں۔ زندگی کی بابت ان کا نقطہ نگاہ کیا ہے۔ یہ معلوم ہونا چاہئے۔ اور ان کی تنقید کی حقیقت متعین کرنے کے لیے یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ ان کا یہ نقطہ نگاہ کہاں تک حقیقت کے مطابق ہے۔ دنیا میں ہر چیز کی قدر و قیمت اسی وقت معلوم ہو سکتی ہے جب اسے پرکھ کر دیکھا جائے۔ اس کا براہ راست ادبی تنقید سے تعلق نہ رہے۔ لیکن پھر بھی اس کی جانچ پڑتال ضروری ہے۔ اس کتب خیال کے تنقیدی فیصلوں کا دار و مدار جس نقطہ نگاہ پر ہے۔ اگر اس کی حقیقت واضح ہو جائے۔ تو اس کا اثر تنقیدی فیصلوں پر بھی پڑ سکتا ہے۔ یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ زندگی کے دو پہلو ہیں۔ ایک مادی، دوسرے فیر مادی۔ زندگی کی تعبیر جن دو کائناتی عناصر سے ہوئی ہے۔ ان میں سے

ایک مادہ ہے۔ دوسرے قوت۔ جسم مادہ کا مظہر ہے اور ذہن قوت کا جسم کثافت ہے۔ اور ذہن لطافت۔ یہاں تک تو کوئی اختلاف نہیں۔ اس کے بعد ایک کتب خیال کے نقاد زندگی کے مادی عنصر یعنی کثافت کو اصل زندگی سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مادہ قوت سے پہلے ہے۔ اول اول مادہ تھا۔ قوت بعد میں رونما ہوئی۔ بلکہ قوت مادہ سے الگ اور اس سے مختلف کوئی حقیقت نہیں۔ وہ مادے کی کسی قدر لطیف صورت کا نام ہے۔ اس میں توشید ہی کسی کو شبہ ہو کہ مادے کے تقدم و تاخر کا سوال بڑا راست تنقید سے متعلق نہیں۔ وہ طبعیات کا مسئلہ ہے جسے نقاد کی بھلتے ماہر طبعیات ہی حل کر سکتا ہے۔ دوسری زبانوں کے ادبی نقاد محض ادب و شعر کے نقاد نہ تھے۔ فلسفہ، نفسیات اور طبعیات کے ماہر بھی تھے۔ اس لیے انہوں نے اگر مادے کے تقدم کا دعویٰ کیا اور اسے اپنے تنقیدی نظریات کی بنیاد ڈھکڑا دی۔ تو کچھ سوچ سمجھ کر ادب جانچ پرکھ کر ہی کیا جس طرح ادبی تنقید ان کے غور و فکر کا نتیجہ تھی۔ اسی طرح ان کے تنقیدی نظریے اور ان کی اساس بھی ان کی ذاتی کچھ گاوی کی پیدوار ہے۔ لیکن اگر وہ کوشاںوں نے اس بنیادی نظریہ کو کیسے اپنایا؟ وہ ان کے ذاتی فکر اور کادش کا نتیجہ نہ تھا۔ اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ فلسفہ اور سائنس کے ماہروں کی ایک بڑی تعداد آج بھی اس نقطہ نگاہ کو صحیح نہیں سمجھتی۔

۱۰۔ اور قوت اگر ساتھ ساتھ تھیں تو یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں کہ ان میں سے مقدم کون ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی

بیٹہ کرنے بیٹہ جانے کو دن پہلے ہے یا رات۔ اصل سوال حقیقت کا ہے۔ زندگی کی حقیقت مادی ہے یا غیر مادی فیصلہ جدید طبعیات کی رُو سے کیا جاسکتا ہے۔ وہ اس کا ایک انفرادی پہلو بھی ہے۔ اگر بیٹے ہو جائے کہ زندگی کی حقیقت غیر مادی ہے۔ تو ادب میں مادی مطالعوں کو جو غیر معمولی اور اپنی حیثیت سے زیادہ اہمیت دی جا رہی ہے۔ قدرتی طور پر ان کی وہ اہمیت نہ رہے گی۔ اور اس کا ادب کے دوسرے مادی نظریوں پر بھی اثر پڑے گا۔ نیکو کے گارڈینز کے زمانہ نیک مادی اور زندگی کے مادی عنصر کی بڑی اہمیت تھی۔ اس وقت تک مادے کو ایک محسوس چیز سمجھا جاتا تھا۔ اور یہ خیال عام تھا کہ مادہ مقدار رکھنے والے چیز کے چھوٹے ذرات کا نام ہے جو اسے سخت اور درہیز ہیں کہ ذوہ کثرت کہتے ہیں اور نہ بڑے کہتے ہیں۔ مادی و ذیاتی بنیاد یہ ذرات ہیں جو مادہ کی تین ابتدائی صفات یعنی وزن، ہندسہ اور حجم (بعد کے حامل ہیں۔ لیکن جدید طبعیات کے نظریہ اضافیت و کثرت نے نیوٹن اور ڈالٹن کے قدیم طبیعیاتی نظریہ کا رُو پوچھ کر رکھ دیا۔ اور جدید تجربیات نے ثابت کر دکھایا کہ ذرات کی کوئی اہمیت نہیں۔ جسم کی ترکیب برقی لہروں سے ہوتی ہے۔ جنہیں آئنسٹائن کے لفظوں میں ”مجموعہ شدہ واقعات کا نام“ اور پروٹون و نیوٹرون کے لفظوں میں ”مختصر“ کہہ سکتے ہیں۔ برقی لہروں کی تعبیر میں بھی اور مثبت و دو قسم کی لہریں شامل ہیں۔ جدید طبیعیات کی رُو سے زندگی کی حقیقت برقی لہریاں ہوتی ہیں۔ اس نظام میں مادے کا درجہ بہت بعد میں آیا۔ اور یہ ترکیب کا نتیجہ تھا۔ برقی لہر سے برقی پارے بنے اور برقی پاروں کی ترکیب سے ذرات پیدا ہوئے۔ اور آخر میں ان ذرات کے اجتماع سے اجسام کی دنیا خلق ہوئی۔ نئی طبیعات میں زندگی کی اصل لطافت ہے۔ کثرت کو لطافت نے اپنی رُوئی کا سمرا بنایا۔ غائب آرد کو نفل کو شاعر ہے۔ اس سے جدید طبیعیات کے اس نظریہ کو اپنی تحسین کا رنگ دے کر اس طرح پیش کیا ہے۔

لطافت ہے نہ نافت جلو پیدا کر نہیں سکتی
چہی زنگار ہے آئینہ باد بہادی کا
دلانا دومی ہیں بات، اس سے پہلے اپنے سیدھے اعانہم کہ چکے تھے۔

پیکر از مہمت شدنے خازد
بادہ از مہمت شدنے مازو!
اردو کے سب بڑے مفکر شعرا و نقاد ان کا خیال بھی یہی ہے۔

دوامِ وہاں ہے۔ ہم زندگی!
ہر اک شے سے پیدا ہوا ہم زندگی
اسی سے ہوتی ہے بدن کی نمود
کر شے میں پوشیدہ ہے سوچ و دود
گراں گور ہے صحبت آب و گل
خوش آئی اسے صحبت آب و گل

اردو کے نقاد یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ زندگی کی اصل حقیقت مادہ ہے۔ یہ ان کی اپنی دریافت ہے۔ یہ بات وہ ایک خاص خیال کے مادہ پرست مفکران کی تقلید میں کہتے ہیں۔ یہ بالکل اتفاق ہے کہ ہمارے بزرگ زندگی کی بابت جو نظریہ رکھتے تھے۔ جدید طبیعات نے اس کی توثیق کر دی۔ اردو کے مادہ پرست نقادوں کو ایک خاص خیال کے مفکروں کی تائید محض جذباتی طور پر کرنا زیب نہیں دیتا۔ علمی مسائل میں ہمارے بزرگ بھی مہذبات سے کام لیا کرتے تھے۔ اگر بزرگوں سے اختلاف کرنا بھی صاحب نظری ہے۔ تو زیادہ بتر یہ ہے کہ زندگی کی بابت وہ اپنے اس مادی نظریہ کے اظہار میں مہذبات سے کام نہ لیں بلکہ دلائل کی روشنی میں اس پھندے سے دل سے غور کریں۔

میان ایک اور بحث سامنے آتی ہے جس کا تعلق تنقید کے بعض اہم نظریوں سے ہے۔ اس کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ اکثر نقاد یہ کہتے سنے جاتے ہیں کہ ارتقا رجعت پسندانہ نظریہ ہے۔ ہم انقلاب کے ماننے والے ہیں۔ لیکن یہ نقاد کبھی ارتقا کی وضاحت نہیں کرتے اور انقلاب ارتقا

ہیں جو نازک ذوق ہے۔ اس کا ذکر بھی وہ درامک کر تے ہیں۔ عام طور سے ارتقا، انقلاب میں فرق مدت کی کمی بیشی سے کیا جاتا ہے۔ اور یہ کہا جاتا ہے کہ جس تبدیلی میں وقت کم لگے وہ انقلاب ہے اور جس میں زیادہ وقت لگے وہ ارتقا ہے۔ یہ غلط ہے۔ مدت کی کمی بیشی کوئی معیار نہیں خود ارتقا کی صورت میں کہیں زیادہ وقت لگتا ہے اور کہیں کم۔ ایک نوجوان میں ڈالا جاتا ہے۔ اکثر چھ ماہ کی مدت میں ایک سرسبز اور لعلدارے ہوئے شجرت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن بعض نغمہ اچھے بھی ہیں جن کے برگ و بار لانے میں سال دو سال سے کم مدت نہیں لگتی۔ ارتقا اور انقلاب، دونوں کی کیفیت تبدیل ہی ہے۔ تغیر ایک ایسا عنصر ہے جو دونوں میں مشترک ہے۔ لیکن ارتقا میں تغیر آہستہ آہستہ اور بند بچ ہوتا ہے۔ در انقلاب میں یک بیک اور دفعتاً ارتقا کی صورت میں باہنے والی چیز کے درمیانی مدارج بھی ہوتے ہیں۔ انقلاب میں ان درمیانی مدارج کی گنجائش نہیں ایک بچے کی پیدائش کی مثال لیجئے۔ اولیٰ اول وہ ایک پانی کا قطرہ تھا جس نے پہلے ایک پتنگ کی شکل اختیار کی۔ پھر گوشت کے کوٹھڑے کی۔ اس کے بعد بچے اور پڑی کی تہیں چڑھیں، اس کے بعد لکڑی کا پردہ آیا۔ اور خیمیں ہان پھو گئی۔ بالکل یہی کیفیت تھم کی ہے۔ زندگی میں ارتقا ہے۔ آج تک انقلاب نہیں دیکھا گیا۔ وادوں نے انسان کی پیدائش کا جو نظریہ پیش کیا ہے۔ اور جسے دنیا کے سبھی ماہرین حیاتیات نے بھج ماٹا ہے، وہ بھی ارتقا ہے۔ اس کے مقابلے میں ہندو فلسفی نظریہ انقلاب یا کون و خدا کے قائل ہیں۔ اور بعض سامی مذاہب کا دھما بھی اسی طرز ہے۔۔۔ کہتے ہیں کہ سب سے پہلا انسان یک بیک وجود میں آیا۔ اور درمیانی تمام ارتقا ہی منزلوں کو بھٹانک کر وہ شوریٰ آخری مرحلہ پر پہنچ گیا۔

انہیں بہت پسند ہے۔ کوئی گمان تک سچا ہے۔ یہ عیاضی ارتقا کا ذکر تھا۔ معاشرے کا ارتقا بھی اسی خطہ کے برابر برابر ہے۔ زندگی میں پیچیدگیوں کے باوجود ایک طرح کی مجبوری ہے جو جنہیں قوموں کے مروجہ: زوال اور فساد معاشرے کے مدہ جزر کی داستانیں یاد ہیں۔ و مظهر ارتقا تاریخ و ذوق میں ارتقا کے قائل ہیں۔ آج تاریخ کی رفتار ترقی سے پہلے کے انقلاب میں تیز رفتاری جاتی ہے لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ جب تک کوئی قوم معاشری ارتقا کی تمام درمیانی منزلوں سے نہیں گزرتی۔ وہ جو بہت اوسادات کی آخری منزل پر نہیں پہنچتی (اور یہ بھی کون کر سکتا ہے کہ یہ آخری منزل ہے) اس میں شہر نہیں کہ انسانی مساوات کی منزل بھی دو ہے۔ آج دنیا میں ایسی قومیں ہیں جو جو بہت کے احساس سے محروم ہیں۔ اور ایسی قومیں بھی ہیں جو اس سے آگے بڑھ کر معاشری مساوات کے قریب پہنچ چکی ہیں۔ اس سے آگے بڑھنے کا ارادہ کر رہی ہیں۔ جب تک کسی معاشرے میں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی۔ وہ کبھی آگے نہیں بڑھتا۔ صرف چند افراد کی کوششیں اسے آگے بڑھانے یا انقلاب لانے میں مستقل طور سے نہ کبھی کامیاب ہوتی ہیں اور نہ آج اس کی امید ہے۔

ایک طرف یہ کہا جاتا ہے کہ معاشرے کی تاریخی رفتار میں ارتقا کا امکان نہیں۔ دوسری طرف چرلے، وینے نظام حیات کے درمیان ایک مجبوری دور تیار جاتا ہے۔ یہ دور تیز و سستہ سفر نہیں ہو سکتا۔ مجبوری دور کا امکان صرف ارتقا ہی صورت میں ہے۔ اگر معاشرے کی تاریخ ارتقا کے لیے نامزد ہے۔ اس میں صرف انقلابی طوفان اٹھتے ہیں، اور انقلاب کے جنگام خیز نازنے آتے ہیں۔ تو اس میں جس طرح بھی مجبوری دور کی گنجائش نہیں نکل سکتی۔ اور اگر نکل سکتی ہے تو صرف اس وقت جب زندگی کے رواں دواں کارواں کو کسی ایک مقام پر ٹھہرایا جائے جو زندگی کی تغیر پذیر ہندسہ سفر نہایت کے خلاف ہے۔ اقبال کو لوگ رجعت پسند بتاتے ہیں لیکن اس نے ذیل کے شعر میں زندگی کی جو فطرت بتائی ہے اس پر اس زمانہ کی ترقی پسندی کو قہراً کیا جاسکتا ہے۔

مہرِ نازِ نسبیں کارواںِ وجود

کہ خطہ ہے تازہ شانِ وجود

تین مسئلے ہیں، فقرت، معاشرہ اور ادب فقرت ان میں مقدم ہے۔ معاشرے کی بنیاد فقرت پر ہے۔ اور ادب کی بنیاد معاشرے اور فقرت دونوں پر فقرت نے جب ارتقائی طرقت تہم بڑھایا تو بالاصل ابتدائی فطری تقاضوں نے ابتدائی معاشرے کو جنم دیا اور جیسے جیسے انسان حیوانی افنی سے انسانی افنی کی طرقت بڑھنا لگا۔ معاشرے میں ترقی کے آثار رونما ہونے لگے۔ ایک زمانہ تھا جب انسان برہمنہ تھی گچھاؤں میں زندگی بسر کرتا تھا۔ اور کچی گوشت کھا کر اپنا پیٹ بھرتا تھا۔ اس وقت اس کی زندگی کی ضرورتیں بھی سادہ اور ابتدائی قسم کی تھیں۔ اس کا معاشرہ بھی، سناہی سادہ اور ابتدائی تھا اس کی ابتدائی ضرورتیں اس کے جلی تقاضوں تک محدود تھیں۔ لیکن میں میں کر زندگی گزارنے کی وجہ سے کچھ نئی اجتماعی ضرورتیں وجود میں آئیں جنہوں نے نئے تقاضوں کو ابھارا۔ یہ نئے تقاضے سماج کی پیداوار تھے۔ خاص میں سماجی ضرورتیں پوری کرتے تھے۔ اس لیے ان کی اساس سماج قرار پایا لیکن خود سماج کی اساس فقرت تھی۔ فطری اور حیاتی تقاضوں نے انسان کو مل جل کر مشترکہ زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا تھا۔ اس لیے گو، ہر مہرسی فقرت کو بھی سماجی تقاضوں کی تمدنی پیداوار کی اساس قرار دینا ہو گا۔ ادب سماج کی اعلیٰ تمدنی تقاضوں کی پیداوار ہے اس لیے سمحت تمدنی فطریہ ہے کہ ادب کے جدید رحمانات فقرت کے مزاج سے ہم آہنگ ہوں اور معاشرے کے ارتقائی رخ متقیں کرنے میں ہماری مدد کریں۔

فقرت کا مزاج کیا ہے؟ اس سوال کے جواب پر ہمارے تمام تنقیدی نظریوں کی بنیاد ہے۔ اس لیے اس کی تعین تنقید سے پہلے ہر چاہئے۔ اردو کی جدید تنقید میں آج کل دو فطریہ زیادہ نمایاں ہیں۔ ایک معاشرتی جو کار کی مارکس کی طرقت منسوب ہے۔ دوسرے جنسی جو فرقہ کے ذہن کی تخلیق ہے۔ ان نظریوں کی بنیاد انسان کی دو ابتدائی فطری خواہشیں ہیں۔ ایک توحش معاشرے دوسرے جنسی تحسین میں نے ان خواہشوں کو فطری اس لیے کہا کہ ان کی پیدائش میں سماجی تقاضوں کو دخل نہیں۔ انسان یہ خواہشیں حیوانی زندگی کے دور سے اپنے ساتھ لایا جو انسانی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد بھی اگر برقرار ہیں۔ لیکن ان کی حیثیت بیان اگر دما بدل گئی۔ اولیٰ اول انسان کی زندگی کا مقصد اپنی ان خواہشوں کی تسکین تھا۔ اس کے بعد خدا کو اس نے بقائے خفص کا وسیلہ سمجھا۔ اور جنس کو بقائے نوری کا۔ اولیٰ اول یہ خواہشیں مقصد کی حیثیت رکھتی تھیں۔ بعد میں یہ ایک اور اچھے مقصد کا ذریعہ بنیں۔ انسان نے حیوانی درجے سے ابھر کر انسانی درجے میں قدم رکھا۔ اس لیے شروع میں حیوان اور انسان میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا۔ حیوان کی طرقت وہ جبلت کا ظلم تھا۔ اس کے سامنے تقاضے پیدا انشی قسم کے تھے۔ صبر، گرمی، سردی، جسمانی تکلیف کا وہ صرف احساس کر سکتا تھا۔ جب وہ اس دور سے آگے بڑھا تو احساس نے نکھر کر سنبے کی شکل اختیار کی اور اس میں محبت، فقرت، عمر و دفعہ، اثنا و وقربانی وغیرہ اعلیٰ یا کیرہ جذبات نے پردوش پائی۔ اس کے بعد عقل کے نشو و نما سے بانی ہی اس کی دنیا بدل گئی اور دل پر عقل کا پرہ بیڑ گیا۔

آئی ہمارے چرچہ دوس نے مذہب کو پرانی نسل کی ابھی بتایا ہے اور جنس کو نئی نسل کی۔ اس لیے میں نئی نسل کی انجن کو لے کر اس مسئلے کو سلجھانا چاہتا ہوں۔ انسان، اولیٰ اولیٰ عورت کو۔ غذا کی طرقت۔ جنسی خواہش کی تسکین کا ذریعہ سمجھتا تھا اور ہر عین اور مہر مہریت کو لپیلائی مہر فی نظر سے دیکھتا تھا۔ اس وقت تک اس جنس لطیف نے اس کے دل میں محبت کی جوت مزاج کی تھی۔ محبت نے اسے، پٹانا سکھایا۔ پہلے وہ ہر شے کا پیرا نہ تھا۔ اب ایک دیوی کا بھائی بنا۔ جس کی قربان کاہ پر اس نے اپنا سب کچھ بڑھایا۔ اس زمانے سے عورت اور مرد میں ناہ کے محدود بیان استوار ہوئے۔ لیکن جب تک انسان پر مصطفیٰ محبت کا عہوت سمارا وہ ہر طور کو ایک ہی نگاہ سے دیکھتا رہا۔ جب ترقی نے ایک قدم آگے بڑھایا تو اس نے ماں، بہن، بیوی میں فرق کیا۔ اس سے پہلے فراموش ہوں سے شادی کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد یہ شادیوں منع قرار پائیں۔ یہ جذبہ محبت کی تہذیب تھی۔

— صنفی محبت کے جذبے کی تہذیب بھی ہوئی اور اس کی مثالیں بھی ہیں پرانی تہذیبوں میں ملتی ہیں۔ قدیم ہندوستان میں عورت کو دیوی (معبودہ) کہا جاتا تھا۔ اور کہیں کہیں ناکھدا لاکھوی کی پرستش کا رواج بھی تھا۔ ہت، پیدیش، اور سچ منتش کی بعض کہانیاں ہندوؤں کے اس عقیدے اور محل کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ یورپ کے سورمانی عہد میں بھی بڑے بڑے سورما عورت کے نام پر ہمیں سر کرتے نظر آتے ہیں۔ عرب جاہلیت کے اشعار میں عرب کے مرہٹوں کو عورت کی نظر میں اقیانوس حاصل کرنے کے لیے سر درحر کی بازی لگانے دکھایا گیا ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فطرت کا مزاج، ابتدائی فطری تقاضوں کی تحسین و تہذیب ہے جو معاشرے کی ارتقاء کے قدم بہ قدم ہوئی۔ اور ادب، جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا، سماج کے تمدنی تقاضوں کی پیداوار ہے۔ اس لیے تہذیب (یا تطہیر) فطرت کا مزاج ہی نہیں۔ سماج کا ارتقائی رُخ اور ادب کا سماج بھی ہے۔ جو لوگ ادب کی بنیاد ابتدائی جنسی جذبے یا غذا کو قرار دیتے ہیں۔ وہ اُلٹے پاؤں پیچھے کی طرف لوٹ جانا چاہتے ہیں اور حیات و کائنات ساتھ لے چلنے کی جگہ اسے پیچھے دھکیل رہے ہیں۔ یہ اگر ترقی ہے تو معکوس قسم کی۔ شعاع انقلاب جو جس نے ذیل کے شعروں میں شاید اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

حیف دل کو ”شکستِ زنداں“ نے

کردیا نسلِ تازہ سے مایوس

واٹے بردِ وضعِ شاعرانہ جدید

راگ لکھنؤ، زبانِ مکتبی چرخس

ان کے اسلوب میں یہ سخی تبلیغ

اہم تمام ترقی ممکنوس

جنسی نظریہ حیات کے اثر سے عورت اُردو کے نئے ادب میں اپنی پرانی جسمانی گیموں اور صنفی دعوؤں کے ساتھ آ رہی ہے اور ڈی ایچ لارنس وغیرہ جنس زدہ ادبوں کی تقلید میں ہمارے یہاں بیگو اور کلونٹ کو رعبیہ کردار تخلیق کے عمار ہے ہیں سانس ان کی دہی ہوئی خواہشیں کیدی جامہ ہی ہیں۔ سو یا ہوا حیوانِ جاگ رہا ہے۔ آفتاب نے اُردو ادب کے اسی رجحان کو دیکھ کر کہا تھا:۔

ہند کے شاعر و صورت گرد افسانہ نویس!

آہ بچاؤں کے اعصاب پر عورت ہے سوار

غذائی نظریہ حیات کی برکت سے آج روٹی انسانیت کی اعلیٰ نذروں کی جگہ لے چکے ہیں۔ بر خیال کی اچھائی اور برائی کا احیاء اب صرت روٹی بن گئی ہے۔ مارکس نے جب یہ کہا تھا کہ ”اپنے ماحول کے ساتھ میرا تعلق ہی میرا شعور ہے“ تو اس کا مقصد یہ نہ تھا کہ شعور ماحول کی پیداوار ہو تا ہے۔ وہ شعور اور ماحول کے تعلق پر زور دینا چاہتا تھا۔ ماحول سے وابستگی اس کے پیش نظر تھی۔ اور اس زمانہ کی تحویل پرستی کو دیکھنے ہوئے ماحول پر زور دینا کچھ بے جا بھی نہ تھا۔ لیکن اس کا مطلب آج یہ لیا جا رہا ہے کہ ادب اپنے ماحول سے چٹا رہے اور اس سے بلند ہو کر نہ دیکھے۔ یہ ادب کی غایت، فطرت کے مزاج، معاشرے کے ارتقائی رُخ، اسے نادان تغیب ہی نہیں! مایوس کسی ذہنی نارسائی بھی ہے۔

کا آئینہ دار ہونا چاہیئے۔ انبال نے ذیل کے اشعار میں انسان کی انہیں تہ ذہنی تحقیق صلاحیتوں کا ذکر کیا ہے۔

نواشب آفریدی چرخ آفریدم سفال آفریدی ایارخ آفریدم
بیابان و کساد و بارخ آفریدی خیابان و گلزار و بارخ آفریدم

میں آخر کمر از سنگ آئینہ سازم

میں آنکھ کمر از زبر نوشینہ سازم

اگر زندگی سے فرار ادب نہیں تو زندگی کی ولدلی میں پھنس کر رہ جانا اور اس میں بوٹ لگانا بھی ادب نہیں ہو سکتا۔ آج کے سماج میں معاشیات کی جو اہمیت ہے۔ وہ مناسب ہے لیکن ادب میں اس کو جو جگہ دے دی گئی ہے وہ نامناسب ہے۔ اسکی اخلاقی اور روحانی قدریں بہ نظر میں جا چکی ہیں۔ ادب میں سیاست آگئی ہے۔ پھول کی تہی سے پتھر کا جگر کا طعنا جارہا ہے۔ سوئی سے پتھر کے کام لیا جارہا ہے۔ یہ ادب نہیں۔ ایک مشہور نقاد کے لفظوں میں یہ ایسا ہے۔ جیسے کسی ہل کی ٹھیکے سے امداد اخلاق کا کام لینا یا گھنٹا مار کے آنکھ بھونٹنا جو مجروحہ نظام حیات اس قابل نہیں کہ اسے زندہ رہنے دیا جائے۔ لیکن اس کی شکست و ریخت میں ادب کو اپنا سراج، اپنا مقام اور اپنی مددش فراموش نہ کرنی چاہئے ادب قدروں کا خالق ہے۔ سیاست کے میدان میں اتارنا اور معاشی برکتیں ایک طبقے سے چھین کر دوسرے طبقے کے حوالہ کرنا۔ اس کو زیب نہیں دیتا۔ یہ اس کے مزاج و مہاج کے بیسے ناسازگار ہے اور بقول ہر بوٹ دیڑھلی کسی تسلی کو نرم و نازک پھول کی تہوں سے اڑا کر گھر گھر مانے والی مشین کے آہنی پیسے پر جھٹاتا ہے۔

یہ بھی صحیح نہیں کہ اس کے نزدیک تاریخ کا رُخ متعین کرنے والا تھا مگر معاشیات ہے۔ اس کے رفیق انگریز نے اپنے ایک خط میں اس خیال کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نہ سیاست، تاؤن، فلسفیانہ نظریات، مذہبی خیالات بھی تاریخی مسابقت پر اثر ڈالتے ہیں اور اکثر ان مسابقتوں کی شکل متعین کرنے میں غالب اور غایاں حصہ لیتے ہیں۔ ادب بھی ای ٹوٹو عناصر میں سے ہے۔ ادب نے آج سے پہلے فلسفہ اور مذہب کا ساتھ دے کر ایک صالح انسانی تہذیب کی تعمیر کی تھی۔ آج بھی وہ یہ خدمت انجام دے سکتا ہے۔ اگر ادب نے سیاست کی جگہ لی اور اپنی ساری کوششیں غیر طبقائی سماج کے قیام کے لیے وقف کر دیں تو اس کی موت زیادہ دور نہیں۔ طبقائی کشاکش ختم ہونے کے ساتھ ہی وہ بھی دفن ہو جائے گا۔

ادب کا براہ راست معاشی مسائل میں دخل دینا اور طبقائی اور طبقہ شائے کا بیڑا اٹھانا ایسا ہے جیسے مذہبی خیالات کی تبلیغ اور اخلاقیات کی نشر و اشاعت کا کام ادب سے لینا۔ دونوں ادب کے عمل و فعل سے باہر ہیں۔ ادب امداد ہے تبلیغ نہیں۔ لیکن اس کے باوجود موجودہ معاشی تفاوت کو ادب کی حمایت حاصل نہ ہونی چاہئے۔ ادب اپنی حدود میں رہ کر بھی ترقی پسند رجحانات کی رو باری میں حصہ لے سکتا ہے۔ ادب کا کوئی خاص موضوع نہیں۔ ادب زندگی کا رفیق ہے۔ اس میں زندگی کی سی وسعت ہے کسی ایک طبقے کے لحاظ سے، وہ گنتی بڑا کیوں نہ ہو۔ کسی ایک موضوع کے ساتھ ادب کو مخصوص کر لینا ادب کی بلند فطرت کے خلاف ہے۔ ادب سے یہ مطالبہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے۔ آسانی اور عام فہم زبان میں کہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے استفادہ کر سکیں۔ لیکن اس سے یہ مطالبہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنی سطح سے اتر کر وہ بات کہے جو عام چاہتے ہیں۔ عوام کو اٹھانے کی بجائے خود گر جائے۔ ان کی ذہنی تربیت کو نظر انداز کر کے ان کے سہم پر تیل کی مالش کرنے لگے۔

مولانا اسماعیل میر تقی نے بچوں کے لیے نظمیں لکھیں تو ان کی ذہنی سطح کے مطابق انہوں نے ”گوسا“، ”ریل گاڑی“ اور ”ایک لڑکی گھبراتی ہے دال“ جیسے سائنس کے موضوعات منتخب کئے۔ آج زندگی کے گونا گوں موضوعات میں سے کسان، مزدور، دہانتی، ہتھوڑا، چینی دروس کو ادب کے لیے مخصوص کیا جا رہا ہے۔ جس معنی میں اسماعیل میر تقی کی شاعری بچوں کی شاعری تھی۔ اس معنی میں آج کا اردو ادب انوار کا ادب ہے۔ وہ بھی محدود تھی یہ بھی محدود ہے۔ جو پیش کرتے ہیں :-

وہ دو عالم کا شاعر کیسا ! شعر میں گانٹھ دے جو چینی دروس
اس کے ذوق سخن کی دنیا میں صورت اک فضل ہے، زمانہ نہ پوس
ایک ہی میکے میں سب سہ ہوش
ایک ہی دائرے میں سب مجوس

طبقہ معتزلہ

نیا زفتح پوری

افراد کی طرح قوموں کی بھی نفسیات ہوا کرتی ہے۔ میں میں واقعات و حوادث کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور جنہیں عروج یا زوال کا سبب قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن بعض قومن کی یہی تاریخ کا معاملہ ہم کو یہ بتاتا ہے کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ صرف ایک واقعہ نے ایک ملت ساری نفسیات کو بدل کر رکھ دیا۔ اور ہوا کا کونخ دفعتاً دوسرے دوسرے ہوا۔ تاریخ اسلام میں ہم کو ایک ایسا ہی واقعہ ملتا ہے جس کو عام طور پر کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ حالانکہ اس کی اہمیت اتنی بڑی ہے کہ اگر وہ واقعہ پیش نہ آتا تو آج ساری دنیا کی تاریخ کچھ دوسری ہوتی۔

رسول اللہ کی حیات میں اسلام کی اجتماعی حیثیت ایک ایسی جی کی تھی۔ جس کی تمام لڑیں ایک دوسرے سے گھٹی ہوئی تھیں لیکن آپ کی آنکھ بند ہوتے ہی یہ لڑی ایک دوسرے سے جدا ہونے لگیں۔ اور اسلام کی "جلی متین" کمزور ہو گئی۔ ایسا کیوں ہوا۔ اس اتحاد کے ختم ہونے کا سبب کیا تھا؟ اس کا جواب مشکل نہیں۔ کیونکہ جس نے تاریخ اسلام کا سرسری مطالعہ کیا۔ جسے وہ بھی کچھ سکتا ہے کہ اس کا سبب رسول اللہ کی حاشیائی یا خلافت کا جھگڑا تھا۔ لیکن یہ بات ہمیں ختم نہیں ہو جاتی۔ زمین انسان کی پھر سوال کرتا ہے کہ یہ جھگڑا کیوں ہوا۔ اس اختلاف کی وجہ کیا تھی۔ اور اس کا جواب ہم اس کے سوا کچھ نہیں دے سکتے کہ اس اختلاف و نزاع کا سبب صرف یہ تھا کہ رسول اللہ وقت رحلت و اپنا جانشین نامزد کر گئے اور نہ کوئی واضح ایسا اصول متعین فرما گئے جس کو سامنے رکھ کر ان کی جانشینی کا مسئلہ طے کیا جاسکتا۔ اور تاریخ اسلام کا یہی وہ ایک واقعہ ہے جس نے نہ صرف تاریخ اسلام بلکہ تاریخ عالم کا رخ دوسرے دوسرے کر دیا۔ ————— ہر چند اس باب میں اہل السنۃ و الجماعت اور شیعہ حضرات اپنی اپنی طرف سے مستند و قائل پیش کرتے ہیں لیکن ان میں کسی کی کوئی دینی قہر یا آذمان نہیں ہے۔ "جہ" اور ادراع کے خضم میں رسول اللہ کا حضرت علی کے متعلق یہ ارشاد کہ

مَنْ كُنْتُ مَوْلَاكَ فَمَنْ مَوْلَاكَ

اپنی جگہ قلم۔ رحلت کے وقت آپ کا قہر کاغذ طلب کرنا جسے واقعہ فرما س کہتے ہیں۔ اپنی جگہ بالکل درست۔ اسی طرح زندگی کی آخری ساعتوں میں رسول اللہ کا حضرت ابو بکرؓ کو امامت کی خدمت تفویض کرنا بالکل صحیح لیکن ان میں سے کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں جسے ہم رسول اللہ کا کلمہ ہوا اور واضح زمان یا قطعی دلیل قرار دے سکیں۔

رسول اللہ کے ہمیشہ دوحاس نے تقریباً آخر وقت تک ان کا ساتھ نہ چھوڑا تھا۔ اور اگر وہ چاہتے تو نہایت آسانی

کے ساتھ صاف صاف انصاف میں مسک خلافت کو ملے کر سکتے تھے۔ آپ اگر یہ کہہ سکتے تھے کہ لا نقد تم لاؤ تا کہ میں اپنے بعد کچھ دیا بت چھوڑ جاؤں یا یہ کہ فلاں شخص دافع امت انجام دے تو کیا وہ اس سے زیادہ حقارت یافتہ نہ کہہ سکتے تھے کہ میرے بعد فلاں شخص کو اپنا سردار منتخب کرنا۔ یا وہ یہ نہ کہہ سکتے تھے کہ صحابہ میں سے کسی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں سے کر دو عرض کو بھی دستِ امارت پر حملے کا اشارہ نہ دیا دیتے۔ یقیناً آپ ایسا کہہ سکتے تھے۔ ایسا کہہ سکتے تھے۔ اگر آپ چاہتے ہیں آپ نے ایسا نہیں کیا۔ اور اس نہ چاہتے تھے ہوا کا رخ وقتاً بدل دیا۔ آپ نے ایسا کیوں نہیں کیا۔ یہ باطل مبرا منسوب ہے۔ جس کا بالکل موضوع سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمارے مقصود تو یہ ہے صوبہ قہر میں صرف یہ بتانا تھا کہ اسلام کی اجتماعیت کے درجہ پر ہر جانے کا حقیقی سربراہ کیا تھا جس کی بنیاد پر اسلام متحدہ جماعتوں میں بٹ گیا۔ اور آپس کی خانہ جنگیاں شروع ہو گئیں۔

یوں تو یہ نفرتی اسی وقت شروع ہو گئی تھی جب رسول اللہ کے بعد حضرت ابو بکرؓ کو خلیفہ بنایا گیا۔ کیونکہ یہ حضرت علیؓ کی تو قیامت کے خلاف ہوتا تھا۔ اور ان کا ساتھ دینے والے اعزہ کو بھی یہ فیصلہ پسند نہ آیا تھا۔ لیکن چونکہ حضرت علیؓ بڑے صلح کوئی انسان تھے۔ اس لیے وہ بالکل خاموش رہے۔ اور آخر وقت تک گوشش کرتے رہے کہ اسلام کا شیرازہ منتشر نہ ہو۔ لیکن جب حضرت عثمانؓ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔ اور اس کے بعد اس نے جنگ جمل اور جاک صلیب کی صورت اختیار کر لی تو وہ بھید مارجو عرب سے پکڑا ہوا تھا چھوٹ گیا۔ اور جماعت اسلامی سنی، شیعہ، خارجی، باغیہ وغیرہ متنفذ فرقوں میں بٹ گئی۔ جن میں سے ایک معتزہ عقیدہ بھی تھا۔

اس وقت ہم سنی، شیعہ اور خارجی کے متعلق کوئی گفتگو کرنا نہیں چاہتے بلکہ صرف معتزہ جماعت کی بابت مختصر عرض کرنا چاہتے ہیں۔ اور یہ انتخاب ہم نے صرف اس لیے کیا ہے کہ اس طبقہ سے زیادہ اسلام کی علمی و ذہنی خدمت کسی اور طبقہ نے انجام نہیں دی۔

رسول اللہؐ کے زمانے میں اسلام پر لحاظ عقائد بہت سادہ مذہب تھا اور یہ سادگی اس وقت تک قائم رہی۔ جب تک اسلام سرزمین عرب تک محدود رہا۔ لیکن رسول اللہؐ کے بعد جب فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا اور عرب و عجم ایک دوسرے سے ملے تو دوسری قوتوں کو مذہب اسلام کی حیثیت سمجھانے کے لیے نقل کے علاوہ عقل سے بھی کام لینا پڑا۔ اور یہی وجہ تھی جس نے علمِ کلام کی بنیاد ڈالی۔ اور معتزہ عقیدہ بھی وہ مبتدع تھا جس نے علمِ کلام کو انتہائی ترقی تک پہنچایا۔

سب سے پہلے خلقِ حق نے مسند جسے ائصال کی اساس اولین کہنا چاہیے۔ مسند جبر و قدر تھا۔ یعنی یہ عقیدہ کہ انسان سے جو کچھ نہ زد ہوتے ہیں وہ خود اس کے اختیار ہی افعال ہیں اور خدا کی مرضی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس عقیدے کو سب سے پہلے مجاہد نے ظاہر کیا۔ اور اسی لیے اس کی ماننے والی جماعت تدریج کے نام سے موسوم ہو گئی۔ لیکن چونکہ اس اعتقاد کا اثر وقت کی سیاست پر بھی پڑا تھا اور معتزہ حکومت بنی امیہ کا شدید مخالفت تھا اس لیے عبدالملک بن مروان نے مسند جبر میں معتزہ کو قتل کر دیا۔ مگر یہ عقیدہ معتزہ کے زمانہ ہی میں اس قدر رواج پا گیا تھا کہ بڑے دانشور اسے دہانا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ معتزہ کے بعد عقیلان دمشق نے اس کی ترویج شروع کر دی اور اس میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے مسئلہ کو بھی شامل کر دیا۔ جو حکومت کے لیے کہیں زیادہ خطرناک تھا۔ لیکن چونکہ یہ زمانہ عربوں کے بعد اب یزید کا تھا وہ دہانت و امانت میں اپنا شل نہ رکھتے تھے اور عقیلان کی سخت نکتہ چینیوں کو

بڑی خوشی سے گواہ کر بیٹے تھے۔ اس لیے ان کے مہذب تک تو زندان پر ہی طرح گھل کر اپنے عقائد کی تبلیغ کرتا رہا۔ لیکن جب جشام بن عبد الملک تخت نشین ہوا تو اس نے اسے گرفتار کر کے پہلے ہاتھ پاؤں کوٹھائے اور پھر قتل کر دیا۔
 واضح رہے کہ اس وقت تک مجدد اور فیضان کی جماعت کو صرف قدریہ یا مدیہ کہتے تھے اور اعتزال یا معتزل کا نام کوئی نہ جانتا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب بھرہ دار العلوم کی حیثیت لگتا تھا اور حسن بھری کے معلقہ درس کا بڑا اثر تھا۔ ان کے شاگردوں میں عرو بن مجدد اور واصل بن معاویہ شخص ایسے بھی آتے جو فیروز معمولی قوت اجتہاد رکھتے تھے اور مقالات سے زیادہ مقالات کے قائل تھے۔

اس وقت نقد اسلامی کی چار اصطلاحیں کا فرق واضح تھا۔ فاجر و منافق شریعت کے ساتھ زیر بحث تھیں اور خصوصیت کے ساتھ یہ مسئلہ بنیاداً برائے مذاہب تھا کہ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کیا کھنچا جائیے۔ اس سے قبل ثناء کبیرہ کے مرتکب کو فاسق و فاجر کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ لیکن خواجه نے کہا کہ ایسے شخص کو کافر کہنا چاہیے۔ چنانچہ ایک دن جی مسلما پیش تھا کہ حسن بھری نے کہا جیرے نزدیک ایسا شخص مسلمان تو ہے لیکن منافق مسلمان۔ واصل بن طلحہ نے کہا: میں ایک تیسری صورت اختیار کرتا ہوں اور وہ یہ کہ ایسا شخص مسلمان ہے نہ کافر حسن بھری یہ سن کر بہت پرہم ہوئے اور واصل و عمرو دونوں گاہ سے اٹھ کر پیسے لئے کہا بتا رہے کہ ان کے پہلے جانے کے بعد حسن بھری نے واصل کی بات کہا "قد اعتزل عنی" یعنی اس نے مجھ سے، دروادی اختیار کیا۔ اور اس کے بعد ہی اس کا لقب معتزل ہو گیا۔

مجھے روایت ہے کہ اس آخری ٹکڑے سے اختلاف ہے کہ کون کون حسن بھری کے یہ الفاظ تو ہیں۔ کہتے تھے اور معتزل جماعت جو آپ کو فخریہ منزل کہتی تھی کبھی اس نام سے موسم ہونا گوارا نہ کرتی۔ جس کی بنیاد تو ہیں و تنزیل رہی ہر علاوہ اس کے یہ بات تاریخی حیثیت سے بھی میں نہیں کیونکہ سیاسی نقطہ نظر سے معتزل جماعت بہت پہلے وجود میں آ چکی تھی۔

جب حضرت علیؓ خلیفہ ہوئے تو بعض اکابر صحابہ نے بیعت سے انکار کر دیا تھا۔ جن میں محمد زبیر، اسعد بن ابی وقاص، عبداللہ بن عمر، زید بن ثابت و غیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے علاوہ زبیر نے تو علانہ حضرت علیؓ کی مخالفت شروع کر دی۔ لیکن اور حضرات غیر جانب دار رہے۔ اہل مدینہ کی مدول بھی گونا گویا جانب دار نہ تھی۔ اور مصر کی مٹی جماعت بھی نیوٹرل تھی۔ اور حاجب مہری نے اس جماعت کی غیر جانب دارانہ پالیسی کے لیے نقد اعتزال استعمال کیا ہے۔ نوخیز نے بھی ان نیوٹرل رہنے والوں کو معتزل کہہ کر یاد کیا ہے۔ اس لیے اعتزال اور معتزل کا لفظ حسن بھری کی درس گاہ سے نہیں نکلا جاتا اس سے پہلے ہی وجود میں آ چکا تھا۔ اور چونکہ خلافت علیؓ کے مسئلہ میں واصل اور عرو بن عبید نیوٹرل تھے اس لیے اگر حسن بھری ان کو معتزل نہ کہتے تو بھی وہ معتزل ہی کہلاتے۔ اس غیر جانب داری کی مذہبی توجیہ انہوں نے یہ کی تھی کہ حضرت علیؓ اطہر، زبیر اور حضرت عائشہؓ شریب ہیں اپنی جگہ سب مسلمان تھے لیکن آپس کی برائی نے ان کو دو جماعتوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ پھر ظاہر ہے کہ ان دونوں سے صرف ایک جماعت ہی حق پر ہوگی۔ جس کا ہم کو علم نہیں۔ اس لیے نیوٹرل۔ نہ ہی منافق ہے لیکن اس غیر جانب داری کے کچھ سیاسی اسباب بھی تھے۔ اس میں شک نہیں کہ واصل بن عطا ایک حد تک علویین کا خلافت اور علویین کا طرد داد تھا۔ یعنی وہ حضرت ابو بکر اور

حضرت عمرؓ کو تو خاص صفت نہ ملتا تھا۔ لیکن حضرت علیؓ کو حضرت عثمانؓ پر مزور ترجیح دیتا تھا۔ اور یہی عہدہ دیدہ و زیبہ شعیبہؓ کا بھی تھا۔ جس کی قدر اصل میں علیؓ نے ہی مرتب کی تھی۔ علویین کے ساتھ اس کی ہمدردی کا ایک ہی اسباب بھی تھا اور وہ یہ کہ شعیبہؓ اس وقت امویین کا دور دورہ تھا، جہاں تک اس نے امیرنا شروع کیا جو اہل بیتؑ ہونے کے علاوہ اپنے آپ کو سنی خلافت کا ہر کرتے تھے اور جن سے داصل کو بڑی دل چسپی تھی اور جن کو کامیاب بنانے کے لیے علویین کو ملائے رکھنا مزور ہی تھا۔ لیکن وہ حکم خدا امویین کی مخالفت بھی نہ کر سکتا تھا کیوں کہ مذہب اعتدالی آجستہ امت اسلامیہ دربار میں بھی ملجوا گیا رہا تھا۔ بلکہ یزید بن عبد الملک نے تو علانیہ اس مسلک کو قبول کر لیا تھا۔

معتزلہ کی ترقی کا زمانہ جزو اس کا دور خلافت تھا۔ سناح پہلا فرماں روا تھا لیکن وہ صرف چار سال حکومت کر سکا۔ اور قیام سلطنت کی ابتدائی دشواریوں کی وجہ سے وہ کسی اور عارف توجہ نہ کر سکا۔ بیس دوسرے فرماں روا منصور کے زمانے میں معتزلہ کے قدم پوری طرح جم گئے۔ داصل کا ساتھی مرہ بن جہر چونکہ منصور کا بچپن کا دوست تھا اور دونوں ہم سبق رہ چکے تھے۔ اس لیے اس کے دربار میں مردن عہد کرہت و دروغ حاصل ہو گیا اور منصور اس سے اس قدر محبت کرنے لگا کہ جب اس کا انتقال ہوا تو وہ منصور نے اس کا مرثیہ لکھا جو اہل بیت کا باطل پہلا واقعہ تھا۔

داصل بن عطاء چونکہ پہلے ہی سے آل عباس کا طوط دار تھا اس لیے اس زمانے میں اس کے مسلک کو یوں بھی مقبول ہونا چاہیے تھا لیکن اس کا ایک شائبہ اور بھی تھا وہ یہ کہ منصور استقام سلطنت کی وجہ سے عین ہر موعوم و زمان کی ترقی کی حرمت مائل ہو گیا۔ اور مذہبی مشاغل کی اہم اہمات دے دی۔ وہ چاہتا تھا کہ اسلام پر جو کلمہ چینیوں ہوتی ہیں ان کا رد فی دلائل سے کیا جائے اور اس حدت کو معتزلہ ہی پوری طرح انجام دے سکتے تھے جن کا علیؓ ہر سراسر وقت داصل بن علیؓ تھا۔

داصل کی زبان دانی اور سانی جہالت کا یہ عالم تھا کہ جب وہ کوئی تقریر کرتا تھا وہ صرف اسے باطل قرار دیتی تھی کیونکہ یہ صرف اس کی زبان سے ادا نہ ہوتا تھا۔ ایک شخص نے استخانا اس سے پوچھا کہ اگر تمہیں یہ کہنا ہو کہ وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور اپنا نیزہ تانا تو تم رکب علیؓ نہ ہو جڑو۔ ”جہ“ کی جگہ کیا کہو گے۔ اس نے جواب دیا میں کہیں گواہ استغوی علیؓ جو اہم و محبوب عالم ہوں۔

موم مذہبی میں اس کے تجربے ہوتے ہیں اس قدر کہنا غالباً کافی ہوگا کہ مسال فیقیر کے استناد کے لیے جو چار ائمہ: قرآن حدیث۔ اجماع اور قیاس ماننے کے ہیں وہ اس سے مقرر کیے ہوئے ہیں۔ اصول فقہ کے جسے جسے مسائل سب سے پہلے اسی سے پیش کیے لازمہ کار دیکھی سب سے پہلے اس نے کیا اور محکم کام کو بعد از وہ خیر تھا ہی۔

العزل معتزلہ جماعت میں داصل بن عطاء جزی زبردست شخصیت کا نائب تھا اور اس کے عقائد اس قدر مقبول ہوئے کہ ملک کے تمام بڑے بڑے علماء اپنے آپ کو معتزلی قرار دینے پر غور کرنے لگے۔ اور ایک فرقہ اسی نام سے منسوب ہو گیا جسے داصلیہ کہتے ہیں۔

علیہ منصور کے بعد ہارون الرشید کے عہد میں مذہبی آزادی ختم ہو گئی کیونکہ اس میں قدامت پسندی زیادہ تھی اور وہ مذہبی منکران کو پسند نہ کرتا تھا۔ ان ہم چونکہ دربار خلافت میں براہ کمال اثر زیادہ تھا جو بڑے علم دوست اور آزاد خیال تھے۔ اس لیے معتزلی کی آبیاری کچھ نہ کچھ ہوتی رہی۔ ہارون الرشید کے بعد جب ہارون کا زمانہ آیا تو معتزلہ کو آگے بڑھنے کے لیے کھلا میدان باغھہ آگیا۔ لیکن ہارون خود معتزلی

حقانہ رکھتا تھا۔ ابوہندیل اور نعام مشہور صنعتی و معمار فلسفہ و حکومت کے ذہر دست امیر تھے ماموں کے استوار چکے تھے ابوہندیل کے متعلق ماموں کہا کرتا تھا کہ اقل ابوہندیل علی الحکوم کا فعل انعام علی الامام یعنی ابوہندیل کا سا پر کام پر ایسا ہے جیسے بڑوں کا سایہ انسانوں پر۔

باروں کے متعصب نے بڑوں کو یہ سمجھنے کا موقع دے دیا تھا کہ اسلام قتل کے مقابلے میں نہیں آسکتا۔ اور اس کی اشد صورت تلوار سے برکتی ہے۔ لیکن ماموں نے اس بدنامی کو دور کرنے کے لیے ایک بہت بڑی مجلس مناظرہ قائم کی اور جس میں مختلف مذاہب کے بڑے بڑے علماء کو شرکت کی دعوت دی۔ ان میں اویہ مذہب کا پیشوا یوان بخت بھی شریک تھا۔ مسلمانوں نے غصے سے ماموں نے ابوہندیل کو اعتراضات کا جواب دینے کے لیے ماموں کیا۔ یہ مناظرہ دلاں تک جاری رہا اور آخر کار مہرمان ابوہندیل کے ہاتھ رہا۔ ماموں نے نہ صرف بغداد میں بلکہ تمام ممالک میں مجالس مناظرہ کو رواج دیا اور ہر جگہ آزادی سے مذہبی گفتگو ہونے لگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چاروں فرقہ اسلام کی آزادی ملی اور قتل پسندی کا شرہ برپا اور ہزاروں بوجھ فلسفہ اسلام میں دھنس ہوئے۔

ابوہندیل کا استدلال بہت دل چسپ تھا تھا وہ فریق مختلف کے مسائل کو سامنے لے کر جواب دیا کرتا تھا۔ ایک بار کسی مجوسی عالم سے مناظرہ ہوا جو اپنے مذہب کو اسلام پر فائق قرار دیتا تھا۔ ابوہندیل نے وہاں بحث میں اس سے پوچھا کہ ”تک کیا چیز ہے؟“ اس نے کہا ”مذہب کی پیشی ہے۔“

ابوہندیل: ”اور کون سے کا کیا مرتبہ ہے؟“

مجوسی: ”کامیں مذہب کے پشتے میں بن کے بازو کٹ کر دنیا میں کشت کاری کے لیے بھیج دیا ہے۔“

ابوہندیل: ”پانی کیا ہے؟“

مجوسی: ”مذہب کا نور۔“

ابوہندیل: ”بھوک پیاس کیا ہے؟“

مجوسی: ”شیطان کا فترو و فتنہ۔“

یہ اس کو ابوہندیل نے کہا کہ مجوس بھی عجیب لہندہ ہے۔ جس نے مذہب کے فرشتوں کو ذبح کیا، خدا کے نور سے دھویا۔ خدا کی بیٹی پر دم کر کے چھوڑا اور پھر شیطان کے فترو و فتنہ کے حواسے لڑوا۔

ابوہندیل کی ذراستہ لڑائی نہایت دلچسپ واقعہ حاضر ہو۔

ایک بار وہ امیرا حسن بن علی غلبہ میں پہنچا تو دیکھا کہ ایک دروازہ منہ کے پاس میٹھا ہوا ہے۔ ابوہندیل نے پوچھا: ”یہ کون ہے؟“ امیر نے کہا کہ یہ بخاری ہے اور بخارم کے حساب سے پیشین گوئیال کرتا ہے۔ ابوہندیل نے کہا: ”اگر اجازت ہو تو اس سے کوئی سوال کروں؟“ امیر نے کہا: ”مذہب۔“

ابوہندیل نے ایک سیب جو امیر کے سامنے ہی رکھا ہوا تھا، اٹھا لیا اور بخاری سے پوچھا: ”تو اس میں اے کھاؤں گایا نہیں؟“ بخاری نے جواب کر کے جواب دیا کہ آپ اسے کھا لیں گے۔ ابوہندیل نے سیب ہاتھ سے لے لیا اور کہا: ”میں اسے کھا نہیں کھاؤں گا۔ بخاری نے کہا کہ آپ اسے کھا لیں، میں چھوڑ کر دوں۔ شاید حساب میں کچھ غلطی ہو گئی ہو۔“ ابوہندیل نے اس مرتبہ دوسرا سیب اٹھا لیا، امیر

نے پوچھا: ”دوسرا سبب کیوں؟“ ابو البندیل: ”اس لیے کہ اگر اس مرتبہ بخیر نہ ہو گیا کہ میں اسے نہ کھاؤں گا تو کھاؤں گا؟ بخیر بہت خفیف ہوا اور دوبارہ سے اُٹھ رہا گیا۔“

ابو البندیل کا ساتھی بلکہ اس کا شاگرد نظام جس کا نام ابھی یاد کیا گیا۔ تمام معتزلوں کا یہی تھا اس خصوصیت کا ایک تھا کہ اسے کھانا پڑھنا نہیں آتا تھا۔ پھر بھی ادب، تاریخ، فذ، کلام اور فلسفہ و حکمت کا زبردست ماہر تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس کے حافظہ کا یہ عام تھا کہ قرآن اُپل، تدریس، زبردست تغیروں کے اس کو اُپر تھے اور غریبے عرب کے ہزاروں اشعار اور فلسفہ کا نام کے نام مسائل اس درجہ شیریں تھے کہ وہ بلا تکلف ان کا حوالہ دے سکتا تھا۔

ایک دفعہ جعفر بن یحییٰ نے اس سے کہا کہ مجھے اس کے بعض مغزوں سے اختلاف ہے جعفر نے کہا کہ تم تو پڑھنا جانتے ہی نہیں۔ ہم کیونکہ سکتے ہو؟ یہ سن کر نظام نے اسے اسلوب کی کتاب کا ایک ایک مسئلہ اور ساتھ ہی ساتھ اس پر اپنا اعتراض بیان کرنا شروع کیا تو جعفر حیران رہ گیا۔

طبیعات میں سب سے پہلے اس نے ثابت کیا کہ رنگ، بو، آواز، ذائقہ، روشنی و حرارت و غیرہ مادی اعراض ہیں اور مادہ اعراض ہی سے علیٰ وجود میں آتا ہے۔ وہ جہد و لا تجزئ کا قائل نہ تھا۔ وہ معجزہ شش القراءہ وجود جنات کا بھی منکر تھا۔ وہ قرآن کی فصاحت و بلاغت کو بھی مجرہ دیکھتا تھا، لیکن تاریخ کا قائل تھا۔

وہ بڑا لطیف الحیاں شاعر بھی تھا۔ چنانچہ اس کا ایک شعر جس میں محبوب کی انتہائی نزاکت کا اظہار کیا گیا ہے ملاحظہ ہو:

وَمَرَّ بَقْلِي خَطْوًا فَجَرَحَتْهُ

وَلَمَّا رَحَلَتْ فَاقْطَعِي حَبْلِي

یعنی جب میں نے اس کا قدم رکھا اور اس کا گدرد میرے قلب میں ہوا تو وہ زخمی ہو گیا۔ میں نے آج تک کوئی انسان ایسا نہیں دیکھا جو محض اعتماد و خیال سے زخمی ہو جائے۔

افسوس ہے کہ میں عالم شباب میں اس کا انتقال ہو گیا۔ پھر بھی وہ اپنے بعد کافی تعداد شاگردوں کی چھوڑ گیا۔ جن میں جلیل کا شاعر ائمہ اعتزال ہیں جو نہا ہے۔ اور جس کی تصانیف میں کتاب الحیوان اور کتاب البیان والقیس اب بھی مشہور و مقبول ہیں۔ بعد کو معتزلہ جماعت کے دو فرقے نظام اور جاحظی کے نام سے مشہور ہو گئے جنہیں نظامیہ اور جاحظیہ کہتے ہیں۔

آفاق دیکھنے کے ماموں کے بعد معتزم اور آفاق تخت نشین ہوئے اور یہ بھی دو ذہن معتزل تھے۔ ان کے عہد کے قاضی القضاۃ احمد بن ابی داؤد جو سلطنت کے سیاہ و سفید کے مالک تھے، وہ بھی معتزل تھے۔ اس لیے معتزلہ کی دو ترقی جو ماموں کے زمانہ سے شروع ہوئی تھی معتزم اور آفاق کے عہد میں انتہائی عروج پر پہنچی گئی۔ اور ساری دنیا کھینچ کر اعتزال کی طرف آنے لگی۔

اس کے بعد معتزلہ تخت نشین ہوا تو یہ ترقی رک گئی۔ کیونکہ وہ فلسفہ و حکمت کا دشمن تھا۔ پھر بھی چون کہ معتزلہ عرب، طراسان، فارس، رمان اور خوزستان وغیرہ اکثر اسلامی ممالک میں اعتزال پھیل گیا۔ اس لیے معتزلہ اسے آسانی سے مٹا نہ سکا۔ اور چوتھی صدی ہجری کی ابتدا میں بھی جب معتزلہ پر زوال آچکا تھا۔ ابولعیلیٰ، بیا شخص پیدا ہوا جسے امام اعتزال مانا جاتا ہے

معتزلہ کے زوال کی صحیح تاریخ ابوالحسن اشعری کے وقت سے شروع ہوتی ہے۔ جو عقائد معتزلہ کے سخت مخالف تھے۔ چونکہ اب مہاسین کی سلطنت تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ اور سلاجقہ کے عروج کا زمانہ تھا۔ جو مذہبی آزادی کے سخت دشمن تھے اس لیے اب اعتزائ کو جبراً، زور و شمشیر سے بٹانے لگا۔ اور چونکہ سلاجقہ کے بعد بھی عینی مسلم حکومتیں نمودار میں آئیں سب کی سب اشعری عقائد کی باز یں تھیں۔ اس لیے انہوں نے یہی قوت سے اعتزال کا استیذان شروع کر دیا۔ اور آخر کار رفتہ رفتہ عقلی ادایوں کے دواڑے اسلام پر ہمیشہ کے لیے بند ہو گئے یہ

واجد علی شاہ کی ایک نیا تصنیف

ڈاکٹر ابوالکلیث صدیقی

واجد علی شاہ برصغیر کی سیاسی تاریخ میں ایک بڑا شخص ہے۔ اس کی عیش پرستی اور سلطنت سے بے خبری، نفاق اور گمان کے جلسے، نقالوں کی فحشیں، شاعروں کے اجتماع اور عاصیوں کی کثرت کو اجسٹ لوک سلطنت اور وہ کی مضبوطی کا ذمہ دار ٹھہرانے ہیں۔ ہم اس وقت واجد علی شاہ کی زندگی کے اس سیاسی پہلو سے تعلق نہیں رکھتے لیکن اتنا ضرور کہیں گے کہ واجد علی شاہ میں یہ خامیاں نہ تھیں جو ان کے ان سلطنت اور ضروری مطالبات میں شامل ہونا تھی۔ آخر بہادر شاہ ظفر اپنے کردار میں واجد علی شاہ سے مختلف تھے۔ ان پر عیش پرستی، نفاق، گمان اور خلاقی پستی کا الزام نہیں لگایا جاسکتا۔ لیکن ان کا کردار سلطنت دہلی کو نہ بچا سکا۔ دراصل ۱۸۵۷ء سے ۱۸۵۸ء تک سو سال پہلے سے ہندوستانی سیاست پر برطانوی اقتدار آہستہ آہستہ چھانا مار رہا تھا۔ یہاں تک کہ اگر برائے وطن سے بڑا اور ان میں دورایب ایسی سلطنت کے مالک بن بیٹھے جہاں دریاؤں میں امرت بہتا تھا۔ زمین سونا، گلن تھی، لیکن ہمارے لوگ پریٹ بھوک کر لکھانے اور تن ذرا کھانے کے لئے کپڑے سے بھی محروم تھے۔

اس سیاسی تاریخ کی بحث کو چھوڑ کر اگر تاریخ ادبیات کی طرف آئیں تو یہ زمانہ جو ایسے انتشار اور زوال کا ہے نہایت اہم معلوم ہوتا ہے۔ خود واجد علی شاہ اور بہادر شاہ ظفر اور ان کے متعلق شعرا اور ادیبوں نے جو تخلیقات کی ہیں وہ اس ادبی تاریخ کا ایک مستقل باب ہیں۔ واجد علی شاہ اپنی ایک کتاب میں خود اپنی تصانیف کی تعداد ۶۶ بتاتے ہیں اور ان میں سے بعض کی تفصیل میں ہے۔ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:۔

”یہ سب فقیر کے کتب خانے میں موجود ہیں اور جو نزول سلطنت اور غارت و بے محاشاں میں تاریخ ہو میں وہ خارج از حساب ہیں۔“ اس عبارت کے گھٹنے ابد بھی واجد علی شاہ زندہ رہے اور غار رہے اس عرصے میں اس تعداد میں اضافہ ہی ہوتا ہو گا۔ اس اعتبار سے واجد علی شاہ اپنے دور کے ایک ممتاز شاعر اور مصنف قرار پاتے ہیں۔ سلامین اور امر کے متعلق اکثر یہ گمان ہوتا ہے کہ جو کلام ان کے نام پر شہرت پاتا ہے وہ سب ان کی تصنیف نہیں ہوتا بلکہ وہ باری شعرا اور ادیبوں کی کاوشیں بھی ان کے نام سے منسوب ہو جاتی ہیں۔ ممکن ہے بعض حالتوں میں ایسا ہی ہو لیکن واجد علی شاہ کے بارے میں ہماری فطری رائے ہے

کہ جو چیزیں ان کے نام سے منسوب ہیں وہ واقعی ان کی اپنی تصنیف ہیں۔
ان تصانیف کے تنوع اور موضوعات کو دیکھ کر بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ ان کے معاصرین میں سے جن شعر
اور فنکاروں کی تحقیقات محفوظ ہیں ان کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ ان کے خوش چین نہیں ہیں، شاعر ہیں ان کا انداز
اگر چہ عام کھنوی نثران کا ترجمان ہے لیکن ان کا اپنا گوار اور ذاتی واقعات و حوادث اس کثرت سے اس کلام میں موجود
ہیں کہ ہمیں ماننے میں تامل ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ کی تصنیف نہیں۔ لیکن شاعری کے دفتر سے قطع نظر واجد علی شاہ کی
بعض تصانیف ایسی ہی جیسی ان کے معاصرین میں کسی اور نے تصنیف نہیں کی تھیں اسے واجد علی شاہ کی طبیعت کی ایک اور
جذباتی طرازی ان کے ذاتی مشاغل و مختلف علوم و فنون میں ان کی ہمارت عرض ان کے مکمل کردار کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایسی ہی ایک
کتاب ”بنی اسے“۔

اس کتاب میں واجد علی شاہ اپنا تعارف اس طرح کرتے ہیں :-
 " اختر شاہ آخر اودھ یعنی تھپتھپ راجہ وصفت و مولف سراپا تقصیر ہے۔ پندرہ برس کے سن میں والد رحمت خان نے دیہمہلا دھوریکہ میں برس کے سن میں تخت اودھ بجائے حضرت اعلیٰ قاسم نورانیس کی کسے سن میں بلاعد و ظلم والد انصافی ولے آزاری رعیت بے سبب تخت سے محروم کیا گیا۔ بیس برس سے کلکتہ محلہ برچکھولہ ملقب بہ ثیاہ برج میں قیام ہے۔ پچاس برس کا سن ہوا چھتیس جین قلعہ دہلیم فورڈ کلکتہ میں ناقہ تیندرا ساٹھ سے اوپر اوپر بادشاہ اللہ خیر بہ دور اولاد کو روک روکات میں ۱۲۹۶ھ سے بہ اعانت گورنٹ میں ہزار روپوں میں دو دختر کو بے عقد کر دیا۔ شجاع مانے کہ اس حساب سے بارہ دختر میں سن آئندہ میں بہ اعانت گورنٹ میں عقد ہوں گی۔ پچاس برس کے سن میں اپنی جلدی کیا کہ بوی کا تصنیف کیے۔ اس حساب سے "بہی" کا سن تصنیف ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ء قرار پاتے ہے "

کتاب کا موضوع : یہ کتاب جرتقریباً چار عینیات پر مشتمل ہے مختلف موضوعات پر حاوی ہے مثلاً : (۱) راگ مالارم (۲) ناگ وریا۔ (۳) دس (۴) بھنڈ تیوں اور بھنگ لعلوں کے باب میں (۵) پیشانی مشاعرہ (۶) شعبہ سے اور لطیفہ (۷) پسیلیاں (۸) خطاب محلات و بیگمات و خطاب شہزادگان و ارباب عالم پسند (۹) خطاب جانوریاں (۱۰) خطاب کبوتر خانہ مع نام (۱۱) خطاب مینڈھا خانہ۔ (۱۲) خطاب محلہ بلیوں کے (۱۳) ورجت (۱۴) خطاب کوٹھیوں اور کروں کے (۱۵) تانوں اختری حفظ عصمت مردوزن اور ہدایت بیگمات کے واسطے۔

راگ مالارم : موسیقی ہندوؤں میں جزو عبادت ہے۔ چنانچہ ابتدائے تاریخ سے ہندوؤں نے اس فن کو بڑا اہم چڑھایا۔

۵۔ ایضاً ۲۴۱ ۵۳ ۲۳ ۶۲۹ ۶۷۵ ۳۰۸ ۹۳۴
 ۱۳۵۵ ۱۲۱۰ ۳۶۵ ۳۶۵ ۳۵۳ ۱۲۲ ۳۵۳ ۳۵۳ ۳۵۳

اگرچہ اپنے دور زوال میں یون بھی دوسرے فزونی لطیفہ کی طرح صرف بہت جذبات کی تمکین کا ایک ذریعہ بن کر رہ گیا۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ فکاہوں نے اسے مختلف زمانوں میں اپنے خون جگر سے سپینا اور بڑے ریاض سے اس میں محنت کر کے اصول اور قاعدے مرتب کئے۔ مسلمان روایتی طور پر گانے بجانے کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن ان میں بھی صوفیوں کا ایک گروہ ایسا تھا جو سماع کی عبادت سمجھتا اور اس سے تزکیہ نفس کا کام لیتا۔ پھر ایک فقہر ایسا آیا کہ مسلمان فکاہوں نے اسے بحیثیت فن اختیار کیا اور اس میں بہت کچھ اضافے کئے۔ اور لوگوں کے علاوہ صرف ایک حضرت امیر خسرو کا تاریخی نام لینا کافی ہے۔ انھوں نے عربی اور ان کو ہندی راگوں میں ڈھالا۔ چنانچہ ہندی اور عربی موسیقی کی بھی آمیزش حضرت امیر خسرو کے مشہور قول میں ہے۔ اس کے علاوہ بے شمار راگ اور انگلیاں بھی ایجاد کیں۔ مغلوں نے موسیقی کی سرپرستی کی تو تان سین جیسا فکاہ پیدا ہوا اور سلسلہ بطور وضع و جاری بعض ریاستوں میں اب تک جاری ہے۔ واحد علی شاہ گانے بجانے کے عاشق تھے۔ بعض لوگ اسے محض ان کی عیش پرستی اور جذبات پر اس کی تسکین کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ لیکن خود ان کی تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس فن کو استادوں سے حاصل کیا تھا اور اس پر اس قدر محنت کی تھی کہ خود استاد کی کادر جرح حاصل ہو گیا تھا۔ اس کا ثبوت اور تحریروں کے علاوہ ’ہبی‘ کے پہلے حصے میں ملتا ہے جو راگ مالاسے متعلق ہے۔

اس باب میں مختلف فصلیں ہیں اور ہر فصل میں ایک ایک راگ کی تفصیل لکھی گئی ہے مثلاً ’چونقی فص‘ خیال، ’کے باب میں ہے۔ اس میں راگ کے نام، اس کے گانے کا وقت، بول وغیرہ بیان کئے گئے ہیں۔
(۱) خیال راگنی۔ رام کلی۔ تالی دھیمہ۔ تنالہ۔ اس کا وقت صبح سے پہر دن چڑھنے تک ہے۔
(۲) خیال ٹوڈی تالی دھیمہ۔ تنالہ۔ اس کا بھی وقت صبح سے پہر دن چڑھنے تک ہے۔
اس خیال کی مثال یہ ہے:-

آستائی مائی دی یہ جو بن دھ ماتیاں
اکھتر کے سنگ پریت کروں گی دھک دھک ہر دت موری چھاتیاں
انتر
(۳) خیال راگنی بھٹیار۔ اس کو ہر وقت پڑتے ہیں۔

آستائی، آج موئے گھر کراچ منڈیلا بے مائی دی
گلیوں گلیوں میں رست ہے دھکت ہے تھارا اکھتر یا را ملک او دھ داجے
انتر
پانچویں فصل سانوں کے بیان میں ہے۔

(۱) سانوں فلک کا مورتال روپک اور بیش بہا نہ روز پرتا جاتا ہے۔

آستائی۔ ستیاں ہی لاگت بوند گٹا دی

انتر
پہنے ہیں آہو مرا میں گے گیو اکھتر بن جیہ بہاری
ایضاً
آستائی۔ پدیاں بوندوں برسے رے گھنیا بوندوں برسے

کھڑے ہیں فقط پانچ گتیں ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں۔ پہلی چھری گت۔ دواہنے ہاتھ کی خمیلی بائیں ہاتھ کی پیٹھ پر رکھ کر دووں انگوٹھوں کو گھڑے میں حرکت دے اور ایک دوں گت پر ناچے۔ دواہنے پاؤں سے ایک اور بائیں پاؤں سے دواہنے کھڑے کا کم ایک پر ہی ہوتا ہے اور داہنی طرف سے گھومنا اکھڑی مقرر ہے۔

باقی چار گتیں ہنگا گت۔ ٹھنڈا گت۔ لٹکا گت اور پنکھا گت ہیں۔ ان کی بھی اسی طرح تفصیل بیان کی ہے۔ خاتمہ اس عبارت پر ہوتا ہے۔

”جاننا چاہیے کہ کھڑے میں فقط چار توڑے مستقل ہیں۔ پہلا بائیں چوڑا، دوسرا داہنے پر تیرا دووں زانوؤں پر بچوٹھا کھڑے ہو کر، ان پانچوں گتوں کو تصویروں کے ذریعے سے بھی پیش کیا گیا ہے۔ ان تصویروں کے تعلق سب سے پہلی بات یہ ہے کہ پانچوں تصویریں مردوں کی ہیں کسی عورت یا عورت کی تصویر نہیں ہے۔ ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ نایک ایک طرح کی تلاش جینی ہے۔ ہوائیوں کے رقص نے غالباً اس غلط فہمی کو تقویت پہنچائی ہے۔ ان تصویروں میں رقص مرد ہیں اور عورت شکل سے بچان معلوم ہو جی ہیں۔ اسی قسم کی گلاہ۔ اسی انداز کے بال اور مچھلیں۔ البتہ لباس میں پیشوا رہنے ہوئے ہیں۔ واجد علی شاہ کے تعلق پر مشہور ہے کہ اپنے میں بھی ان کے پاؤں کا انگوٹھ نکالی پر حرکت کرتا تھا۔ اور رقص میں انھیں ایسی ہمارت تھی کہ گھٹنوں پہن کر اس طرح تھوڑے کرتے کہ جس گھٹنہ سے چاہتے آواز پیدا کرتے اور جس گھٹنہ کو چاہتے ساکن و ساکت رکھتے۔

اس کے بعد کتاب کا سب سے اہم باب شروع ہوتا ہے۔ یہ دہس کے تعلق ہے۔ امانت کو آروڑوڑے کا باوا آدم اور کی اندر بھاگو آروڑوڑے پہلا ڈرامہ بتایا جاتا ہے۔ اسی سلسلے میں یہ کہا جاتا ہے کہ واجد علی شاہ کو دہس سے بڑی بھتی اور انھوں نے دہس تصنیف کئے تھے۔ مسئلہ اخلاقی بتایا جاتا ہے کہ واجد علی شاہ نے خود بھی اس دہس میں کام کیا تھا۔ یا نہیں، اور یہ بھی نہیں معلوم کہ ان دہسوں میں کس قسم کی تکنیک استعمال کی گئی تھی، بعض لوگ کہتے ہیں کہ واجد علی شاہ کے دہس کی تعمیر میں کچھ دہسی اثرات بھی پائے جاتے ہیں۔ اور بعض کے نزدیک اس میں ہندوؤں کے مذہبی دہس کا سا انداز ہے۔ یہ مسئلہ بھی اخلاقی ہے کہ واجد علی شاہ کے دہس اور امانت کی اندر بھاگو ڈرامہ کہہ سکیں گے یا نہیں۔ ان میں سے بہت سے سوالوں کا جواب خود واجد علی شاہ کے قلم سے اس حصہ میں مل جاتا ہے۔ اور اس اعتبار سے یہ تحریر آروڑوڑے کے ایک اہم باب کہ وضاحت اور سند کے ساتھ پیش کرتی ہے۔

اس باب میں جو کتاب کا چوتھا حصہ ہے۔ تفصیل میں پہلی فصل میں چھتیس آجیادی دہس ہیں۔ یہ لفظ واجد علی شاہ نسخہ استعمال کیلئے اور اس لئے اس میں کسی شہر کی گنجائش نہیں رہتی کہ یہ جملہ دہس خود واجد علی شاہ کی آجیادیا تصنیف ہیں۔ دہس کی نیا ری کے سلسلے میں واجد علی شاہ لکھتے ہیں۔

”سکھیاں پیشواز سے آتا سترہ ہر کہ ہیں اور خاموش بیٹھ جائیں۔ سا ندرے ان کے چراہ تصنیف راقم کا میں آستانہ جلاجلو سکھیں اب دہس کریں۔ اکھڑی کے من کو دھجائیں جس وقت راقم کا تخلص ہوں پر آئے فوراً سب سکھیاں کھڑی ہو جائیں اور جس مقام

۲۵) رہس خور (۲۶) رہس شمشاد (۲۷) رہس تالپوں (۲۸) رہس خندہ
 ۲۹) باادب (۳۰) خوب (۳۱) غصہ (۳۲) مطلوب
 ۳۳) ہمزاد (۳۴) نقہ (۳۵) من کسکی (۳۶) معشوق
 بیچتیس رہس واقعی واجد علی شاہ کی ایجاد ہیں اور ان کا تعلق ہندوؤں کے مورتی پرستوں یا نیم مذہبی رہسوں سے قطعاً نہیں
 ہے۔ تیس رہس کا نام راوہا ضرور ہے لیکن اس میں راوہا یا گردش کے رومانائی قصے کا کوئی اشارہ نہیں۔
 رہس یہ ہے :-

”تیس رہسوں کا نام گھوٹ بطنی لکھنؤ گھوٹ گت نکالیں وہ بطنی حکام ساتی عمل کریں۔“

یہ رہس اسٹیج ڈرامے کے تین اجزاء میں ہیں اول ہدایت کاری (۲) موسیقی (۳) رقص۔ لیکن انھیں صحیح معنوں میں ڈرامے
 نہیں کہہ سکتے۔ ان میں کوئی قصہ کہانی یا پلاٹ نہیں۔ نہ مکالمے اور مناظر ہیں جب تک یہ خاصہ شامل نہ ہوں ڈرامے کا یہ تصور رکھ دہاقتا
 کو عمل کے ذریعے سے پیش کرنے میں تشبیہ نہیں رہتا ہے۔ پہلے تین عناصر میں سے دو یعنی رقص اور موسیقی اگرچہ آج تک کسی نہ کسی حد تک
 آمد و ڈرامے کے لازمی جز رہے ہوتے ہیں تاہم ان کا بنیادی تعلق ڈرامے سے کچھ نہیں ہے۔ لیکن واجد علی شاہ نے راوہا کہنیا کے
 دو قصوں کو الگ الگ دو رہسوں کی شکل میں ترتیب دیا ہے اور ان میں ڈرامے کے باقی عناصر بھی آگئے ہیں۔
 پہلا نقشہ راوہا اور کہنیا کے اہل حالات اور نقش میں ہے۔

دو کھیلوں کا جوڑی بنانے کا کھجاری جام حسن نہیں۔ ایک کا نام ارغوان پری اور دوسری کا نام عزراں پری ہے اور ایک
 مرد شکیل و لوکر بہت نظر ہے۔ اس کا نام غریب ہے اور ایک کسکی جو گن بنے اس کا نام صحر ہے اور ایک مرد خدام جو گن کا ہے اس کا نام
 غریب ہے۔ بعد ازاں رہس سب کھیاں چھوڑ جائیں اور ایک جانب وہ فوں پر یاں کر سبوں پر چھیں اور ایک طرف جو گن کسکی پر اجلاس کے
 اور دیو پر فوں کے سامنے کر لے پانچ یا دس کھڑا ہو اور غریب جو گن کے سامنے دست بستہ اسناد ہو اور ایک جانب راوہا کہنیا
 بالٹ اور تہہ بند لگائے ہوئے گھوٹ نکالے ہوئے کر سبوں پر اجلاس کریں اور رام چیرا دو فوں کی خدمت میں دست بستہ
 حاضر ہو۔ اور پانچ کھیاں ایک کا نام لدا، دوسری ساکھا، تیسری چنید، چوتھی لدا وایہ گن لگا کے ہوئے چھوٹ کٹے ہوئے جلیان
 کھڑی ہوں اور چار بنیادیں مصوڑے کڑی سے پٹھری گاتی ہوئی راقم کی تصنیف پانی بھرتی ہوئی ہوں اور ایک مرد وصال کی صورت بنا ہوا
 معرکہ لڑی اور عصا بدست حاضر ہو اور چار کھن وایاں ہری راقم کی تصنیف گاتی ہوئی اور کھن سختی گاتی ہوئی ہوں جو گن کو چاہیے
 غمزدہ ہو جائیگا۔

(سوال غریب کا اور عرض صحر سے) جگ جگس جو آئندہ جو گن صاحب کیوں ملو لہو۔ کہا ہے جیا ملین ہے ؟
 (صحر کا ارشاد غریب سے) جو ہیں برن ہوئے ایک رہے ہے۔
 (عرض غریب) وہ کیا رہے ہے ہم سے کہنے کا ہر تو کہیے۔

- (ادب و صحرا) چو میں برس ہوئے مہکا اس گم ہی کہ را دھا کنہیا کا ناچ نہیں دیکھا۔
(معرضِ غربت) بس آپ کو اسی کا گم ہے۔ جانا ہوں تدبیر کرنے کو۔
- (غربت) غربت کا تختہ بس کرنا۔ غربت چلا اور غربت سے ملیندہ ملاقات کی اور رکنا،
(اسلام علیکم میاں حضرت!) اسلام علیکم میاں حضرت!
(جوابِ حضرت) وعلیکم السلام التین واللام الطعام والکلام لکشمش والباوام میاں غربت علی خان ہساور
بہادران کھٹ پٹ جنگ نامہ لے کر بیٹھ جو۔
- (پھر دونوں بیٹھ گئے حضرت اس طرح سے ہنسا کاؤن کاؤن کھل کھل کھل) (معرضِ غربت سے) (معرضِ غربت) میاں حضرت! ہمارے تھوڑے مدت سے مجاہی چارہ ہے، ہم کو تم سے ایک امضوری کہنا ہے اگر تم سے ہو سکے۔
- (جوابِ حضرت) کیا کام ہے؟
(سوالِ غربت) ایک ہوگیا ہے اس کو ایک غم ہے۔
(جوابِ حضرت) وہ کونسا غم ہے؟
(سوالِ غربت) جو کہ صاحبِ کشتی ہیں کہ مجھے را دھا کنہیا کے ناچ نہ دیکھنے کا غم ہے میں وعدہ کر آیا ہوں کہ شوش کرنا ہوں۔ اگر تم سے ہو سکے تو میرے وعدے کو پورا کرو۔
- (معرضِ جواب اور میں) تنقِ قتی دم صبی وٹک لانا جھوٹک جھٹا صندون معلق شرع کاؤن دم اور بچوں کی قسم جو میرے کئے مطلب برآمد ہو گا ہرگز رو بیٹھ نہ کروں گا۔ بوسہ بھی کرتا ہوں۔
وہیں اسی وقت حضرت غربت کو ہمراہ لے کر روانہ ہوا اور کہنے لگا۔
- (معرضِ غربت) بابا سا تو ر بازی۔ جمال بازی۔ نیزہ بازی۔ خلال بازی۔ شمشیر بازی۔ راست بازی! جلی میرے ساتھ اور مجھ سے زعفران پری اور غوان پری حاضر ہوا اور عرض کی ایک جوگن را دھا کنہیا کے ناچ کے غم میں جوگن ہوئی ہے اور چاہتی ہے کہ وہ ناچ دیکھے۔
- ذ زعفران پری اور غوان پری جوگن کو طلب کر کے اس کے غم کا حال پوچھتی ہیں اور یہ معلوم کر کے کہ چوبیس برس سے را دھا کنہیا کے ناچ دیکھنے کے غم میں مبتلا ہے حضرت کو حکم دیتی ہیں کہ جوگن کو را دھا کنہیا کا ناچ دکھا یا جائے چنانچہ ناچ کی تیاری ہوتی ہے)
- اس تیاری اور ناچ کو راجہ علی شاہ اس طرح بیان کرتے ہیں :-
را دھا کنہیا سکھیاں ناچو ہنڈولے کا ناچ

کنہیا کے سوال جواب کے درمیان رادھا کہتی ہے۔

راجن کے راج اور حراج ہمارا جگ جگ جیو آندر ہووہ مرنی ؟ جاہیں چھوڑاگ چھنیں راگیاں جت
تھیں وہ مرنی کہاں پھیر ڈائے دی بجائو۔

کنہیا جی اس سوال پر غور کرتے ہیں کہ وہ مرنی کھوئی۔ رادھا کہتی ہے میں تمہیں خوب جانتی ہوں وہ مرنی تم تو مہری کو دے
آئے۔ یہ کہہ کر رادھا روٹھ جاتی ہے۔ کنہیا ملنے کی کوشش کرتے ہیں۔ رادھا راضی نہیں ہوتی۔ کنہیا جی اپنے ملازم رام چیرا کو بلاتے ہیں
اور پھر رادھا کو ملنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ راضی نہیں ہوتی تو ایک ایک کر کے کھیون کو بیچ میں ڈالتے ہیں لیکن مقصد حاصل نہیں
ہوتا۔ اس وقت رام چیرا عرض کرتا ہے کہ ہمارا راج رادھا کو دانا سے مالگو اور تپسیا کر و شاید مل جائیں۔ اس وقت کنہیا جی آسن مار کر
دائیں ہاتھ سے ناک پکڑ کر سانس روکیں فوراً رادھا جی اٹھ کر گئے سے چھٹ جائیں۔ پھر کھلیاں لٹو پلو جا کر پی، لٹو پلو جا سوال تو اب
اور ناچ کا نامزتا رہتا ہے۔ رادھا کہتی ہے ہمارا راج اب جب ہی خوشی ہو گی جب مرنی ڈھونڈ کر لاؤ گے۔ اور کنہیا مرنی کی تلاش میں
نکلے ہیں۔ ہر ایک سے پوچھتے ہیں مہری مرنی کسی نے دیکھی ہے۔ مہری مرنی کسی نے دیکھی ہے۔ مہری مرنی کسی نے دیکھی ہے۔ رام پھر مذافیکہ دار بن کر سامنے آتا ہے
اور کہتا ہے مہری مرنی کسی نے دیکھی ہے۔ اس کے بعد کنہیا جی ایک کنہیا ہیں پیچھے ہیں جہاں چار پنہاریاں باہر بھرتی ہیں۔ کنہیا ان سے
سوال کرتے ہیں اور وہ کہتی ہیں ہاں ہم نے دیکھی ہے۔ ماکھن لا دو تو ہم دی۔ پنہاریاں کنہیا پریدہ اور علی شاہ کی نصیحت بختری گاتی رہتی ہیں اور
کنہیا جی ماکھن کی تلاش میں جاتے ہیں اور ماکھن پورا کر لیتے ہیں۔ پنہاریاں کو قید ہے اور مرنی واپس لے کر جاتے آتے ہیں۔ رادھا مرنی کی آواز
سن کر وہ کر کنہیا کے گئے سے چھٹ جاتی ہے اور بدل راضی ہو جاتی ہے۔ رادھا اس وقت سارا ندوں کے بیچ میں جا کر بیٹھتی گاتی ہے اور
خوب دل سے اترتے ہاتھ پاؤں سمیت ادا کرتی ہے۔

آستانہ : بجن لاکھیام کی بانسری رے

انتر : اندیا گنا سے اکھتر بانسری بجاوت کس جات جیاسے سانس رے

جہاں پہنچ کر قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ خاتمہ پر واد علی شاہ کہتے ہیں :-

” قصہ ختم ہوا۔ اگر شب بیداری منظور ہو تو ہر کچھ علیہ علیہ راج اور لاکھا کرات کا
کسی ہے مگر قصے اور درمیں وقت شب مزب اور بہتر معلوم ہوتے ہیں۔ دن کو
نہیں اچھے لگتے اس واسطے جب اس قصے اور درمیں کی کیفیت دیکھیں وقت
آسانہ کریں۔“

اس میں واد علی شاہ نے صرف قصے اور موسیقی سے متعلق ہدایات دینے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ پوشاک اور لوازمات کی بھی
صرحت کر دی ہے یہ فیصلہ پوشاک کنہیا جی کی، گھٹھہ مہہ جاگیہ گھاٹگرہ۔ گھوڑہ گادچہ کی مکٹ جاچہ کی چادر و دھڑے۔

” فیصلہ پوشاک اور زیور رادھا جی کی،۔ نچھہ۔ مینہ۔ تمام ہندو ذاتی زیور پھیرہ۔ لہنگا۔ پیشواز۔ بنری یعنی سراسری نقوشہ

معدنری آٹھ عدد ہوئے۔

اسی طرح کھجور، اور پریوں کی پوشاک کی تفصیل ہے۔ دیو کی پوشاک دیکھیے۔

جاگت سیاہ۔ پتلون سیاہ۔ وستنا سیاہ۔ نمزد یعنی حجاب سیاہ۔ چہرہ منور کی کمی نظر۔ گرجنی سیاہ۔ پرکلاں کا غدی ستا عدد ہوئے۔ اسی طرح جوگن کی آلات و پوشاک، لکھن والیوں کی۔ زور اور پوشاک پنہاریوں کی پوشاک مسافر کی۔ پوشاک غربت کی۔ پوشاک رام چیرا اور ہنس والیوں کی الگ الگ تفصیل بیان کی ہے۔

اسی انداز کا رادھا اور کنہیا کا، ایک دوسرا دوسرے بھی واحد معنی شاہ نے لکھا ہے اس میں رادھا کنہیا۔ چاروں کھجیاں اور کم از کم بارہ ہنس والیاں شریک ہوتی ہیں۔ دونوں قصوں کے خاتمے پر لکھتے ہیں:-

نوشتنہ بماند سیاہ بر سفید نویںدہ را نیست فردا امید
المنندہ انقد کہ تا ۱۲۹۲ عہ مقام کنتہ علما دیار برج ہی ہو دونوں قصے الگ الگ سمجھتے ہیں
دھوسوں کے تیار اور مرتب ہیں البتہ مقدمات علی اور زور میں راقم سے اس قدر مینا
نہیں ہو سکا جو تکمیل کرنا۔ زمان سلطنت اور استقلال میں سب کچھ خدا نے عطا کیا
تھا اور اب بھی اسی کی ذات سے امید ہے۔

دھوسوں میں جن لوگوں نے کام کیا ہے اور جو مختلف کردار انہوں نے ادا کئے ہیں اور جو ان کی نغز میں مقرر تھیں ان سب کی تفصیل ایک الگ باب میں بیان کی گئی ہے جس کا عنوان خطاب محلات اور نکبات اور خطابات شہزادگان اور ارباب عالم پسند وغیرہ ہے۔

”فصل پہلا جو سب سے پہلے تیار کریں رادھا منزن والیاں یہ اٹھارہ اسم ہیں: نواب صغیر محل صاحبہ والدہ اختری جاہ مرزا محمد لاشم بہادر۔ دوسری نواب تمیز دار صاحبہ بیگم افسر محل موصوفہ۔ موصوفہ محبت شہزادہ ایک سو نواہ۔ سہ روپے جیسے کے تنواہ دار اور باقی سترہ اسموں کے فی اسم ایک سو تین روپے مقرر ہیں۔ مجموع ایک ہزار نو سو: ایس روپے کے ماہوار رادھا منزن کی دھوس والیوں کو دینا ہے۔ تیسری نواب شمع بیگم صاحبہ عاشقہ راقم۔ چوتھی نواب عباس بیگم صاحبہ کنہیا۔ پانچویں نواب ناما رنجیت صاحبہ رادھا جیتی نواب خانانہ بیگم صاحبہ ارغوان پری۔ ساٹھویں نواب ستارہ محبت بیگم صاحبہ زعفران پری۔ آٹھویں نواب سلطان بیگم صاحبہ صواہر یعنی جوگن۔ نوویں نواب شمع بیگم صاحبہ لدا سکھی۔ دسویں نواب شعی بیگم صاحبہ ساگتہ سکھی۔ گیارھویں نواب عودسانہ بیگم صاحبہ جینی سکھی۔ بارہویں نواب خانانہ بیگم صاحبہ لڑا سکھی۔ تیرھویں نواب حجاب بیگم صاحبہ۔ چودھویں نواب راجان بیگم صاحبہ۔ پندرھویں نواب وزیر بیگم صاحبہ۔ سولھویں نواب حجاب بیگم صاحبہ۔ سترھویں نواب خوش قدر بیگم صاحبہ۔ اٹھارھویں نواب نور بانو صاحبہ۔ غلام حسین خاں منشی شریک بندہ اور قلم خان قدامت شاگرد بندہ اس جلسے کے معلم ہیں اور یہ اٹھارہ اسم راقم کی ممنوعات ہیں۔ سترکار راقم سے دھوس کے وقت بھاری پیشواؤں میں سالار و معر و مہر برادر اور غلٹنہ تختہ فی اسم علیحدہ ملا کرتے ہیں اور بعد قص میں سے نوشت خانہ میں احتیاط سے صندوقوں میں بند کر دیئے جاتے ہیں اور رادھا، کنہیا، پریوں، حجرا، عسرت، مسافر رام چیرا، ان سب کا بھی اسباب معہ

پنہاریوں اور ماکن والیوں کے میری عرف عامہ اور سب سے حسابات میں شامل ہیں۔ ان کی تحوا ہوں سے کچھ علاوہ نہیں۔ اس دہس کو ماشاً اللہ تیز حواں چر حواں برس شرو سے ہے۔ فی موفیق میں طاق شہرہ آفاق ہیں۔

اس بیان سے راوہا کنہیا کے دہس کی ابتدا کی تاریخ ۱۴۷۸-۱۲۹۲۰ قرار پائی ہے اور اس طرح امانت کی اندر سجا یقیناً اس سے پہلے کی تصنیف قرار پائی ہے۔ ناٹک ساگر کے مصنفین اندر سجا کی تاریخ ۱۲۸۵ بتاتے ہیں اور اس کے خیرت میں یہ شعر پیش کرتے ہیں :-

زرد کے وجد بول اپنے پر یزاد جہاں میں وحوم ہے اندر سجا کی

اس سے دہس کے دو لغوی "و" کے قیے سے ۱۲۸۰ برآمد ہوتے ہیں لیکن ان کے دیوان میں سورمہ خزانہ الفصاحت میں

جیسے ان کے صاحبزادے نے مرتب کیا ہے۔ یہ عبارت موجود ہے :-

"بعد اس کے احباب نے فرمائش کی کہ قصہ راجہ اندر اس طرح نظم کیجئے کہ جس میں

غزلیں اور مثنوی اور نثر اور ٹھہریاں اور مہلیاں اور سنبت اور رساوں اور دودھ

اور جینہ ہوں تاکہ اس زمان میں بھی طبیعت کی جودت اور ذہن کی رسائی دیکھیں

بمسب اصراہر دوست و یار یار و تاجار ۲۶۵ میں یہ قصہ تصنیف کیا اور

اندر سجا اس کا نام رکھا "

اگر ۲۶۵ اس تصنیف ہے تو پھر تاریخی مصرع میں اشاعت عبارت ہو سکتا ہے -

واجد علی شاہ کی ان عبارت سے اس قصہ کا بھی فیصلہ ہو جاتا ہے کہ انھوں نے دہس میں کوئی پارٹ او انہیں کیا کیا راوا منزل والیوں میں سے ذاب عباسی بیچ صاحب کنہیا کا کردار ادا کرتی تھیں۔ یہ عبارت عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ مردوں کا پارٹ بھی ایک عورت کو ادا کرنے کے لئے دیا جائے۔ کیونکہ دہس میں عام طور پر نام کر وار مرد ہی ادا کرتے تھے اور یہ روشن ایک سونے رنگ فائیم رہی خود وواجد علی شاہ نے رخاص کا نام فائیم خانی لکھا ہے تبصرے اس نام تفصیل میں ایک موقع بھی ایسا نہیں آتا جہاں بعض حضرات کا بیان کردہ فرامیسی اثر ظاہر ہوتا ہو۔ آگے چل کر ممکن کیا یقینی طور پر ڈولے کے مغربی تصورات نے آدود ڈولے پر اثر ڈالا لیکن اس ابتدائی دور میں یقیناً اس طرح کا کوئی اثر نہیں -

معلوم ہوتا ہے کہ وواجد علی شاہ کو دہس سے غیر معمولی دلچسپی پیدا ہوئی تھی اور رادھا منزل والیوں کے علاوہ انھوں نے دہس کے اور بھی جیسے ترتیب لئے۔ ان سب کی تفصیل موجود ہے -

۱) سارود منزل والیاں - پندرہ اسم - ۱۲۸۵ میں قائم ہوا۔ پیر خاں منشی شاگرد وواجد علی شاہ اور قلندر بخش رخاص شاگرد وواجد علی شاہ جلسہ کے معلم تھے۔ پندرہ دہس والیاں وواجد علی شاہ کی ممتوعات تھیں اور ان سب کو ملا کر آٹھ سو اسیچھ لکھ آٹھ آٹے ماہوار خزاہ طاق تھیں -

۲) بڑا جلسہ سلطان خانے والیاں جو ہیں اسم - ۱۲۸۴ میں قائم ہوا۔ ان کی تعلیم میں پیر علی بخش خاں منشی شاگرد وواجد علی شاہ اور ان کے بعد راج خان منشی اور قلندر بخش رخاص اور شار علی خان کچاواچی اور عیش الدود بہادر عیش شاعر اور علاحدہ اولہ رادھا و منشی جملہ

شاگردانِ واجد علی شاہ نے حصہ لیا۔ اس رہس کے سلسلہ میں واجد علی شاہ اپنے کمال فن کے بارے میں لکھتے ہیں۔
 ”گشتا خانہ (و فی عرض خدمت ناظرین اور شائقین اور طالبین اور مشائقان اور
 استاوان فن تال) دہلیہ میں ہے کہ ایک وجہ تالہ میں تین برس کے عرصے میں
 باون طرح کی نئے نئے غامی کچھاوی کو معصمتات جلسہ بتائی اور سب نے
 باعانتِ راقم اور شاگردانِ راقم یاد کیں مگر فرقہ نساً ایسا کچھ نعم اور ناقص العقول
 ہے کہ سوائے خود آرائی اور خود پرستی کو یا کوئی کام دنیا کا پروردگار نے ان کے
 متعلق نہیں کیا۔ چوبیس اسموں میں تین پارہ اسم تو ان لکھوں پر فادہ اور قائم ہوئے
 باقی سوائے لے کے لے جو چلے گئے وہ نہیں جانتیں۔“

اس سے صاف ظاہر ہے کہ واجد علی شاہ رہس میں بھی بڑا باطن کرنے والے اور اس کا مقصد محض تفریح، یا اندر سبھا کی طرح
 کسی فراموشی کو پورا کرنا یا محض نشرو نظم اور مختلف راگوں کو جمع کر دینا نہ تھا۔
 حسب دستور یہ چوبیس سلطان غننے والیاں بھی واجد علی شاہ کی ممنوعات تھیں اور ان سب کو ملا کر دو ہزار دو سو پچاس
 روپے آٹھ آنے ماہوار ملتے تھے۔

(۳) حضور والیاں یا خاص منزل والیاں گیارہ اسم عفا بیت غامی غمخوش بخش طبلہ اور جید علی دفاص شاگردانِ واجد علی شاہ
 معلم تھے۔ ان کو چار سو بیسٹھ روپے ماہوار ملتے تھے۔

(۴) سرور منزل والیاں۔ یہ بقولِ واجد علی شاہ ”صاحبات سن رسیدہ بھی ہیں“ سولہ اسم فی اسم میں روپیہ کی خواہاں
 تھیں سو بیس روپے ماہوار۔ غرض اس طرح کے بائیس جلسوں کی پوری تفصیل ملتی ہے۔ خانقاہ پرواجد علی شاہ لکھتے ہیں کہ۔

”جاننا چاہیے کہ زیر تعلیم راقم ناخبر پیرینا لیس اسم ہیں اور سب جلسہ ملا کر دوسو
 سولہ اسم گانے ناچنے والے اہل علم زو۔ ماشاء اللہ حیم بدوڑ تاختر کتاب ہذا راقم
 کے پاس ہر وقت و ہر ساعت و ہر لمحہ موجود ہیں مگر ملاقات اور صحبت اور جفا
 ہر روز انھیں سے ہوتی ہے جو بیتا لیس اسم زیر تعلیم حیم ہیں۔ جملہ آٹھ ہزار پانچ
 سو اٹھانے پہلے مشاہرہ ہوئے۔“

اس حساب مختلف رہسوں پر ملا کر سالانہ خرچ ایک لاکھ تین ہزار ایک سو پچھتر روپے تک جا پہنچتا ہے اور اس میں صرف
 مختلف اسموں کی خواہ شامل ہے۔

پوشاک، زیورات، انعام و اکرام، ہفتی، کچھاوی اور زفاصوں کی خواہ اس میں شامل نہیں۔ اگر اسے بھی ملا لیں تو صرف
 رہس سے متعلق واجد علی شاہ کا خرچ کم بیش ڈیڑھ لاکھ روپیہ سالانہ تک جا پہنچتا ہے اور یہ عالم اس وقت ہے جب واجد علی شاہ

معزول ہو کر مٹیا برج میں مقیم ہیں اور ایک مختصر سی پیشین برکزد رکھ رہے ہیں جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے کہ ان جلسوں کی تیاری جیسی کہ قیام سلطنت لکھنؤ میں بھی مٹیا برج میں نہ ہو سکی۔ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ لکھنؤ میں واحد علی شاہ اس میں کتنا حرج کھینے ہوں گے۔

دہس والیوں کے علاوہ ہندو مٹھی والا۔ دو کھادھی تئیس طبلہ نواز جھبالیس ساڑھی نواز۔ بائیس منجیرہ نواز۔ ایک نئے نواز۔ چھوڑا خاص۔ ایک شجہہ باز۔ دو ڈھولک نواز۔ ایک سرنگھار نواز اور اسی نضر نواز خانے اور چھوڑا وٹھل ملازم تھے جن کی تعداد تین ہزار دو سو اسی تھوڑے پالانیاں تالیس ہزار ایک سو تیس روپے سالانہ مقرر تھی۔ سرورٹھل ڈوئیوں کا خطاب تھا اور ان کے مرد و بہار وٹھل کھاتے تھے۔

واجد علی شاہ کے بارے میں اکثر کہا جاتا ہے کہ ناچنے اور گانے والی عورتوں اور ان کے متعلقین جو ہر وقت بادشاہ کو گھیرے رہتے تھے، نے انھیں خواب کیا اور ان کی صحبت میں امور سلطنت کی طرف سے جلعلی ہو کر بہت افعال اور بہت اذوال کی طرف مائل ہو گئے۔ کسی قدر یہ بات درست ہے لیکن دہس کے سلسلہ میں واید علی شاہ کا ایک بیان ایسا ملتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ڈوم ڈھولکوں کے مزاج، عادات اور اطوار کو ناپسند کرتے تھے۔ خاص جیسے وایوں کے سلسلہ میں لکھتے ہیں :-

”نیر سال متھنی ہوتا ہے کہ بھٹن خوان کی تعلیم دی ہی بدل جان صرف رہتا ہے۔ اب ماشا اللہ نے سر میں بچہ بنی واقعیات ہوئی جاتی ہے۔ بچانا، گوانا، ارتھ بھاؤ بنانا، کھڑے پاؤں سے لوٹا، کھٹن بچانا سب مجھے متعلق ہے کسی سازندے، نوازندے، معنی، زفاں کو ذرہ دخل نہیں، بلکہ ان کے ہمراہ سوائے راقم اور کوئی نہیں ہوتا۔ جو کبھی ایسا ہی دل جاتا تو سازندوں کو ہمراہ بھجوالا۔ دوسرے قبیلے جیسے کے بعد چکیوں پر دھو کر چترنگ تروٹ، زرانہ، وصال، روپک، تیورا، چوتالہ، دھیمہ تالہ، کیریک، چوب برہ، بھی، سولفاختہ، چھب تالہ، چاچو، غزل، ادھید، خیال، بھٹری کاتیاں سن۔ جو امر بھجے کے چھوٹے لکچر پاؤں سے نکالیاں ہیں۔ دو دین سو چیزیں سب حرکت کی آج تک بنا چکا ہوں اور تباہے چلا جا رہا ہوں۔“

نعلین بھی مضحک کرتیاں ہیں۔ سمجھا رہا ہوں کہ صورت اس کی یہ ہوتی تو جسے مرتب کرے اور حاضری والیوں اور سلطان خلع والیوں پر ایسی ایسی جلعلیں کہیں کہ جس کا کھانا شام کو شام کا بھی کو نصب ہوا مگر آخر کاماں صاحبوں نے سبب تاثیر محبت شانہ روزی ڈوم ڈھولکوں کا سامراج پیدا کیا۔ مجھ اکیلے کا اثر نہ ہوا۔ تعلیم دی ہی بھی تقریر پڑا علم کی طرف توجہ بالکل نہ کی مرنے کی طرف رجوع ہو گئے۔ یہ حالات دیکھ کر راقم الحروف نہایت کبید خاطر اور پریشان رہتا تھا کہ یا خدا کیا تدبیر کر دیں بغیر سازندوں کے ایک کلمہ زبان سے نہ نکالیاں بغلیں۔ ایک دن شاہ زمانی نے مجھے رنجیدہ خاطر دیکھ کر کہا صاحب تم کیوں شانہ روزی چپ رہا کرتے ہو۔ میں نے قصہ گذشتہ نقل کیا۔ انھوں نے اصلاح دی

تم خود کیا کم ہو اور وہی میں شریک کہنے ہو۔ میں نے جواب دیا سب جلسوں کی عادتیں غراب ہو گئیں وہ اب میرے زیر تعلیم نہیں آسکتیاں ہیں۔ انھوں نے نہیں کر جواب دیا ایک درندہ کو روکھنے ہیں۔ کوریاں چھو کر باں بولتی ہوں، کچھ کٹڑی کی طرح جھڑو تو دوسروں کے بلا تکلف ٹوٹیں گی اور نواب بارگاہ علی صاحبہ اور اعلیٰ کا رخصانہ داروغہ اشعانی السلطان اور نواب شہزادہ محل صاحبہ یہ سب بھی ایسے ہی کلمات زبان پر لائے، میں بھی راضی ہو گیا۔ الحق یہ عسلان یہاں تک مفید ہوئی کہ میں نے اب عمدہ شاقی لیا کہ مدت انگریزی ڈوم ٹھاڑی، مہرائی، کلاوت، گوشت، دھڑپے، خیالے، رفاخ بھادجی کے حوالے ایک اسم بھی نہ کروا گا۔

اسی تحریر میں واجد علی شاہ نے علم اور دے کو الگ الگ سمجھا ہے اور بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ علم اور فن کے حصول اور اسی جذبہ کی تسکین کے لئے پرسب کچھ کرنے تھے۔ یہ روایات ہے کہ ایک عالمی سلطنت کو ان فنون سے اس درجہ وابستگی پیدا کرنا مناسب بھی ہے یا نہیں لیکن یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جب واجد علی شاہ جیج یا غلط اس حرف مائل ہوئے تو انھوں نے فنکاری کا حق ادا کر دیا۔

آخر میں سوان پیدا ہوئے کہ واجد علی شاہ کے ان رسوں اور مجلسوں کا اردو ڈرامے کی تاریخ میں کیا درجہ ہے چھپیں انجادی رس جن کا پہلے کو کر کیا جا چکا ہے تصدیق سے عاری ہیں۔ ان میں آواکاری نہیں، مکالمے نہیں، مناظر نہیں، پھر انھیں ڈرامے کی تعریف میں کیے شامل لیا جائے۔ ان رسوں پر یہ اعتراض درست ہے۔ دراصل یہ صرف موسیقی اور انھیں فائزات میں ملکہ ان میں موسیقی کو مختلف اعضاء کی حرکات و سکنات زیادہ ہیں لیکن انہی رسوں پر رادھا کنہیا رس کی کیا وجہ ہے۔ فیض اور موسیقی ان رسوں پر بھی نمایاں عناصر ہیں لیکن ان میں ایک قصہ ہی نہیں ہے، مکالمے بھی ہیں، مناظر بھی ہیں، غنائ کرنا بھی ہیں جن میں مخرے کا کردار بھی ہے۔ کنہیا رس میں مناظر بار بار دہلتے ہیں مثلاً :-

(۱) (پہلا منظر) زعفران پری - ارغوان پری کا جلسہ۔ ویسا منے کھڑا ہے عزت جوگن کے سامنے دست بستہ استادہ ہے۔

(۲) دوسرا منظر۔ رادھا کنہیا، رام چیرہ ملازمہ چارنگیاں۔

(۳) تیسرا منظر۔ جوگن کا خادم عزت، مسافر کی صورت۔

(۴) چوتھا منظر۔ عزت اور عزت کی ملاقات۔

(۵) پانچواں منظر۔ رادھا کنہیا کا قصہ۔

(۶) چھٹا منظر۔ کنہیا کا مری کی تلاش میں روانہ ہونا۔ پنہا لہوں سے ملاقات۔

(۷) رسالوٹا منظر۔ مکھن، لہیوں کی تلاش۔ ملاقات، مکھن چکر لانے کا منظر۔

(۸) آٹھواں منظر۔ کنہیا مری بجاتے ہیں اور رادھا آکر ان سے پرٹ جاتی ہے۔

ان تفصیلات میں یہ پتہ نہیں چلتا کہ منظر کس طرح بدے جاتے ہیں۔ پردوں کا استعمال غالباً نہیں ہوا تھا ورنہ کہیں نہ کہیں ان کا

ذکر ضرور ہوتا۔ شیخ کے متعلق یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کی کیا شکل تھی۔ بادشاہ کنہیا ریس بارا ایلیا ریس جو ہندو مت والوں کے متبعوں پر ترتیب دینے کے عام طور پر رکھے میدانوں میں ادا ہوتے تھے اور سامنے کروارم وادرا کرتے تھے۔ واجد علی شاہ کے ریس ان کے محلات میں ہوتے تھے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ کسی کشادہ جگہ پر سامنے کروارم وادرا کرتے تھے اور تمام مناظر سلسلہ وار ادا ہو جاتے تھے۔ دیکھنے والوں کی اصل پسپائی گاؤں اور رقص نگ محمد و ہوتی تھی لیکن واجد علی شاہ کے ریس میں کئی مابین قابل غور ہیں۔ مکملے نشر ہیں۔ دیو پر بیاں موجود ہیں لیکن بنیادی کردار راجا کنہیا سکھیوں، ملازم، مہمانیں بھمن والیاں وغیرہ ہیں۔ ان کی اداکاری فطری، سادہ اور عجیب ہے۔

جس زمانہ میں واجد علی شاہ اپنے ریس تیار کر رہے تھے قریب قریب اسی عہد میں امانت نے اندر سجا ترتیب دی واجد علی شاہ کے ریس ان کے محلات تک محدود تھے۔ امانت نے اندر سجا عوام کی فرمائش پر عوام کے لئے لکھی۔ قدرتی طور پر اس میں فی لوازمات پاس قدر محنت بنیں گی جس قدر واجد علی شاہ اپنے ریسوں پر کیا کرتے تھے۔ اس میں گانے زیادہ ہیں اور ان میں تنگ بندی معلوم ہوتی ہے لیکن عوام کے لئے یہ ایک بنیا اور عجیب شغل تھا چنانچہ اس قدر مقبول ہوا کہ امانت کی طرح مداری لال نے اور پھر ان کو وکیر کر لوگوں نے اندر سجا میں اور دوسری سجا میں لکھیں۔ یہ سب ڈرامے کے جدید فن پر پوری نہیں اترتے لیکن اگر دو ڈرامے کی پیشبرد قبیلہ بھی ریس اور سجا میں ہیں۔

رہیں کے گلنے :-

کنہیا راجا کے ریسوں میں کثرت گانے میں جن سے واجد علی شاہ کی فطاری کا اندازہ ہوتا ہے علاوہ سوال ہوگا کہ جو گانوں میں ہیں ضمنی گانے بھی اکثر ہیں۔ ان میں دہرے، اواسے پھر بیاں اور مہ لیاں شامل ہیں۔ یہ سب گانے عام بلکہ عوام پسند ہیں۔ ان میں کچھ گانے نہیں ہیں اور نہ غزلیں ہیں۔ کچھ گانے نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ شاید ان کی کمی وقت اور جاں ناکا میں ریس کے عوامی انداز کی محفل نہیں ہو سکتی تھی اور غزل اس لئے نہیں کہ غزل کی کمی تھی کہ واجد علی شاہ اسے مانج گئے ہیں استعمال کرنا نہیں چاہتے تھے۔ بہر حال وہ ہولت کچھ ہوں اس قسم کے گانے ان ریسوں میں نہیں ہیں۔

رہیں کے بعد کتاب کا پانچواں باب شروع ہوتا ہے جو بھندہ تہوں اور ضخیم غلوں کے واسطے ہے۔ واجد علی شاہ آغاز میں لکھتے ہیں :-

”جاننا چاہئے کہ موجودہ عینیتی اور جملہ حکایات اور لطائف اونیوں کے

امیر خسرو دہلوی ہیں“

اس کے بعد مختلف علوم و فنون بالخصوص موسیقی میں امیر خسرو کے فنی کمالات کا ذکر تقریباً تین صفحوں میں کیا ہے اور اس سلسلہ میں امیر خسرو کی ایجادات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ہمیں واجد علی شاہ کے اس بیان سے اختلاف ہے۔ امیر خسرو کی طبیعت ان کے مزاج کی افتاء و شعر وادب میں ان کے رجحانات اور میلانات حضرت نظام الدین اولیائے ان کا عشق، درباروں میں ان کی عزت اور مرتبہ کے پیش نظر یہ بات قبول کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ امیر خسرو بھی بھندہ تہی اور نقالی پر بھی اترتے تھے۔

اسی طرح واجد علی شاہ کا یہ قول بھی درست نہیں کہ ”خانی باری بھی ایک شہزادے کو بھلانے بھلانے موزوں کر دیں اور اکثر ان کے سامنے آئین چڑھا کر اور انکار کر دیا کہ ان کا چھل کر ان الفاظ بڑے معمولی سے جو بھینڈ پڑتی ہیں بیان کر دیں گا۔ مسخراہن کر کے بھلانے تھے، یہ بات اس ثابت ہو چکی ہے کہ امیر خسرو خانی باری کے مصنف نہیں ہیں اور یہ کتاب ان کے کسی سو سال بعد تصنیف ہوئی لغالوں اور بھٹکوں کے فرقے سے متعلق ایک عجیب بات واجد علی شاہ کے بیان سے معلوم ہوتی ہے کہنے ہیں۔“

”اس فرقہ کو راقم نے پچھتم خود دیکھا کہ ایسے پابند عزم و صلوة ہوتے ہیں کہ جہاں آٹھ ہزار روپے کی قیبل سننے دھرو اور فرمائیں کہ کوکھ نما ز فوت ہونے دو۔ اگر فضل کے جاؤ گے تو ہزار روپیہ پر تمھارا ہے کبھی قبول نہ کریں گے پر نماز فوت پر بھالائیں گے“

اگر یہ درست ہو تو اسے بھی اس وضع دار کی کا ایک خطر ٹھکانا چاہیے جو اس عہد کی تہذیب و معاشرت کا ایک ہم و ہمایاں جزو ہے اور یہ کہ ایسا طبع بھی جو دنیا پر ہر بات با نام نظر آتا ہے اخلاقی اعتبار سے بالکل دلیلاہ نہیں ہو چکا تھا۔ لیکن واجد علی شاہ کا یہ بیان بھی کچھ ٹھکانا ہے۔

نقلوں کی فیصل خاصہ طویل ہے (ص ۱۲۴ تا ۲۹۳) اور تقریباً پورے دو سو صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ لیکن اس میں اکثر نقلیں ایسی ہیں جنہیں مشک کا مشاغل ہے۔ ان میں ایسا جو ش ہے کہ تعجب ہوتا ہے کہ عام جلسوں میں یہ نقلیں کس طرح ادا کی گئی ہوں گی۔ مثلاً گوئیدہ کی نقل جس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے۔۔۔

”ایک بی بی تجیں انھوں نے بھڑکا عضو تناسل آدھرو دینو یا تھا۔۔۔۔۔“

ان مختلف حکایتوں اور نقلوں کے پڑھنے سے واقعی عبرت ہوتی ہے اور اخلاقی اعتبار سے ایک دلیلاہ معاشرت کی تصدیق انکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے اس کے لئے واجد علی شاہ کماں تک ذمہ دار ہیں۔ قدرتی طور پر بار بار تعاری کے سامنے یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے خیال میں واجد علی شاہ اپنے دور کی پیداوار ہیں۔ ان کے دھسوں کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ رادھا کنہیا کا درس جو انھوں نے سب سے پہلے تیار کیا ۱۲۶۵ھ سے شروع ہوتا ہے۔ امانت اس سے پہلے ۱۲۶۵ھ میں اندر بھاگتے ہیں اور عیساکہ امانت کے دیوان کے دیباچے کی عبارت سے ظاہر ہے، دونوں کے نقل سے اور اصرار سے مجبور ہو کر کہنے ہیں۔ گو یا دھس یا تلچ گانے کا مذاق صرف واجد علی شاہ کی وجہ سے نہیں پھیل سکا بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہو گا کہ واجد علی شاہ خود اس کا شکار ہو گئے۔ واجد علی شاہ کی فطرت ان میں جا بجا جھجکتی ہے چنانچہ خاص منزل والیوں کے سلسلہ میں انھوں نے علم اور مرنے میں جو تمیز کی ہے اور جس طرح ٹو دم ڈھا ٹپوں سے اپنی بیزاری کا اعلان کر لیا ہے۔ اس سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔

اس فصل کے خاتمہ پر واجد علی شاہ نے اپنی ایک منزل بھی لکھی ہے کہ بظاہر اس غزل کا یہاں کوئی عمل معلوم نہیں ہوتا۔ غزل یہ ہے۔

فطرۂ رُخِ احمر سے رنگ لالہ اوڑا
کنان کی طرف بڑھتے بڑھتے دیکھ کے رُخ
کبھی چمک کے جو خاکِ فلک پہ عارض ہو
بتائیں کیا کدِ اِلات ہی ہیں وہاں لٹا
مجھے نہ صبر کیا اے ان نکاہوں نے
برائے پہنچ سیرِ شامِ حسنِ محض ہیں
کھنکھتی اس میں جو تعریفِ ادبِ یار بند
جو دیکھے بائی نیزہ تیری جست

ہما کی حرّت سرگوشش گل سے بالِ اوڑا
مثالِ کُنگِ فلکِ سیرِ مہرِ مالِ اوڑا
یہی ہیں سمجھا کتیرے مکانِ کاجالِ اوڑا
وہ کجاوہ خود دے وفزِ رُخِ قبائلِ اوڑا
مری تڑپ سے تو رنگِ رُخِ غزالہ اوڑا
ہما کی حرّت گھوٹے پری سے مالِ اوڑا
فلک پہ بازوؤں سے جلا کے سالہ اوڑا
کبیتِ برق کی مانند میرِ مہربانِ اوڑا

بہرغزل اپنے انازہ اور جنگ کے اظہار سے خالص لکھنؤی ہے اور تغزل کی کیفیت سے کبیر محروم ہے۔
 لطافت کے بعد ایک فصل میں چند پہیلیاں ہیں لغتوں کے اکثر شعرا اپنی شاعری کے آخری دور میں پہیلیوں اور چیمٹوں کو
 پرانے آئے ہیں۔ امانت سے لے کر جس کو روئی تک کے یہاں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ بیشتر جود اعلیٰ جذبات
 اور نفسی کیفیات سے کم تر تعلق رکھتے تھے علامہ محمد صابین اور شبلی آرائی و مضمون آفرینی کو معراج کمال سمجھتے تھے۔ خیال آرائی ہی کی
 ایک انتہائی شکل کہیں ہو جاتی ہے اور یہ لوگ غالباً اس منزل میں پہنچنے نہ تھے۔
 اس کے بعد مصل شروع ہوتی ہے۔ اس میں محلات اور ریگات کے خطابات ہیں۔ یہ حصہ تاریک ادب کے لئے شاید بہتر
 ہو سکتا۔ واجد علی شاد کو زندگی اور ان کی تاریخ کے سلسلہ میں اس حصہ میں سب سے معلومات ہیں۔ ان کی ہیکات محلات، ممنوعات
 کی تعداد ان کے نام خطابات اور مرثیہ کا اندازہ اس فہرست سے ہوتا ہے۔

محلانہ کی تعداد ۱۰۴ اور پنکھات ۳۲ ہے اور یہ ملا کر ۱۳۶ ہوتی ہیں۔ ان میں وہ محلات اور پنکھات شامل نہیں ہیں جو اپنے بغلہ نص وغنا اور برس کے سلسلے میں نکلی جا چکی ہیں۔ برس کے آخر میں ان کی تعداد جو ناچنے لگانے میں حصہ لیتی تھیں ۱۱۶ بتائی ہے جن میں سے ۳۴ ہم ایسے ہیں جو راجہ رست واجد علی شاہ کے زیرِ تعلیم تھے۔ ان سب کو ملا کر یہ تعداد ۱۶۲ تک جا پہنچی ہے۔ موصوفا میں سے واجد علی شاہ نے صرف چار کے نام بھی دیے ہیں۔ مصلیٰ پسند، اطلاع پسند، خیال پسند اور امیر النساء خاتم بنی مفعولات کی تعداد یقیناً اس سے زیادہ ہے کیونکہ بقول شمسہ واجد علی شاہ ایسے مذہبی آدمی تھے کہ نا محرم عورت کا سامنے آنا گوارا نہ تھا اور محل کی خادماں بھی مفعولات میں شامل کر لی گئی تھیں اور نواب اب رسال اور نواب صفی علیگ جیسے خطابات سے سرفراز تھیں۔ واجد علی شاہ کی زندگی کا یہ پہلو ایسا ہے جس کی کوئی معذرت پیش نہیں کی جا سکتی۔

اس سلسلے میں ایک مختصر نہایت دلچسپ ہے۔ واجد علی شاہ کو خطابات تقسیم کرنے کا عظیمی شوق معلوم ہوتا ہے بیانات و معاملات اور منوعات کے علاوہ شجر اوروں، بہروں، دامادوں، مرشد زراعتوں اور مرشدان اویلوں کے خطوط اب ان میں اور جو واجد علی شاہ نے لکھے۔ ان کے دربار میں صاحب اور حکام کو حفظ و لفظ اور ثناء و القاء اور لعل الطیب الدولہ سے ملنا دیکھنے تھا وہیں

۴۴ ہیں۔ آٹھ در و خان باغ ان کے علاوہ تھے۔ بیرب ملار ایک خاصی بڑی تعداد جوتی ہے اور اگر اس میں ان کے کیرلازمین متعلقین کو شامل کریں تو حیرت رہوتی ہے کہ واصلہ شاہ کے دم سے کتنے لوگ وابستہ تھے اور زوالی سلطنت کا اثر کتنے خاندانوں اور افراد پر پڑا ہو گا۔ واصلہ شاہ نے یہ کتاب طلباء پرچ میں ۱۹۲۶ء میں لکھی جب ان کی کڑواہک مخصوصی ملین پر ہو رہی تھی لیکن یہاں بھی متعلقین کی تعداد کو کم نہ تھی اور پھر واصلہ شاہ اپنے ان متعلقین کی بھی خبر گیری کرتے رہتے تھے جو ان کے چلنے آنے کے بعد کھنڈ میں رہ گئے۔ چنانچہ نواب ممتاز علی صاحبہا ران کی والدہ کو بڑی پابندی سے دوسرے بھیجتے تھے جب ہم واصلہ شاہ کے عیب شدہ نوکر نے ان سے فوج میں کم از کم ان کی سبقت کا یہ روشن پہلو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

واجد علی شاہ کی طبیعت میں جو ایجا کا وہ تھا افسوس کہ اسے اظہار کے لئے سخت مہم و میدان نہ ملا۔ اس ایک کافرانہ خطابات کی فہرست سے جو اسے حملات، بیگناہ، سرکاری حکام وغیرہ کو خطاب لینے کا رواج عام رہا ہے لیکن واجد علی شاہ کا بہنوق شاید جنوں کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ جانوروں کے لئے جو خطابات انہوں نے تجویز کئے اور جن کے مقلد وہ ہو کر کرتے ہیں ان میں سب اس لئے قائم کئے دوسرے کی نگر کو ذہن میں لے سنا میں۔ ان میں حدت اور تازگی کی مثال ہے مثلاً :-

۱۔ بیل ۴۷ خطابات - نو بزرگوار ایشہ! چین، عاشق، غص، کلاب، زنب، بزم، نوش، نوا، شام، چاند، یس، بیل، روبر، وغیرہ -

(۲) جل - ۸۱ خطابات - ولفکار، سحر بیان، غزل خواں، مطرب، معنی و غیرہ۔

(۳) کستورنی - ۲۲ خطابات - "درانه سمر، نانہ پیرا، رخت الحدید، انارکلی وغیرہ -

۴. نشاء مخطیبات

رہا بدوہم اخطا بات۔

۱۶. ویٹر ۱۳ خطابات۔

۴، چندوں م خط بات

۸: ان آیتوں کی تفسیر کے لیے اس کتاب کے مختلف حصوں میں مختلف مقامات پر حواشی دی گئی ہیں۔ ان حواشی میں اس آیت کی تفسیر کے لیے اس کتاب کے مختلف حصوں میں مختلف مقامات پر حواشی دی گئی ہیں۔

اسی طرح دعویٰ، طوعی، کچھڑی، پوشے، مرغ، درنگ، لاگنوا، مینا، جھنگڑ، جھکوتہ، پٹیا، نوعانی، لال، سرچ، دواج، لوا، رام، کوئل، گنیری، بیلا اور گدگد کے خطابات ہیں جو نورانی اور آدمی خاص کے خطاباتِ عیدیمہ ہیں۔ خطاباتِ نازی خان کی زبان انگریزی - خطاباتِ گائو خان، کبوتر خانہ، مینڈھا خانہ، مچھلیوں، درنگ، پشت تک کو خطابات سے محروم نہیں رکھا ہے۔ ان کے بعد درختوں کے ۳۳ خطابات ہیں اور آخر میں کچھڑیوں، مچھلوں اور کروں کے خطابات کی ایک طویل فہرست ہے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ یطویل فہرست واجد علی شاہ کی ایک خاص نفسیاتی کیفیت کی ترجمان ہے۔ واجد علی شاہ جو خود کو سلطانِ عالم سمجھتے تھے عملاً ایک مبہور اور نظر بنیاد انسان تھے۔ باوجود شہرت کا خواب انھوں نے دیکھا تھا لیکن بادشاہیت

کے اختیارات انھیں کبھی نصیب نہیں ہوئے۔ وہ شاہنشاہی ٹھٹھا اور بار و بار پسیا ناما چاہتے تھے لیکن اس کے لئے حصہ و بسط سے محروم تھے۔ وہ بہت کچھ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن سیاسی حالات ایسے تھے جو انھیں کچھ نہیں کہنے دیتے تھے۔ وہ سب وہ جس ماحول میں تھے وہ عملی حد و ہیکل نہ تھا۔ علوم ایسا ہوتا ہے کہ سید احمد شہید کی تحریک جہاد یا ۱۹۰۵ء کی سیاسی ہمد و جہاد سے نہ کوئی دلچسپی رکھتے تھے اور نہ اس میں حصہ لینے کے اہل تھے۔ قدرتی طور پر ایسا شخص اپنے جذبات و تخیلات، تصورات اور توقعات کی تکمیل کے لئے ایک تخیلی دنیا پیدا کرے گا اور سیاسی محدود خیالی فضا میں پرواز کرنا اسے گا۔ سید علی شاہ کے ایسی ہی دنیا تھی۔ اس میں ایک قسم کے آزاد ادب پائی کی کیفیت لفظی پائی جاتی ہے اور کہیں ایسی چٹکانی نہیں ملتی جس کے بھڑک اٹھنے کا مکان چوتھا۔ علم اور طبیعت کی دباوے بھاگ کر واد میں شاہ نے راگ اور نقش میں بنادیا۔ وہ نہ تھی۔ وہ جاگیر پر اور زور چور نہیں بخش سکتے تھے۔ اسے خطابات ہائے کرمی اچھے اے اپنے مذہب کی تسکین کرنی۔ یہ سب چہرہ و حوفا تھیں کس و جد علی شاد اس دھوکہ میں ایسے جتنا راستے کہ جھڑک تباہ نہ ملی۔ مملکت کی ضمنی اور ست۔ ولیہ میں نظر بندی اور تیار پریشانی ان کا قیام ایسے واقعات تھے جو ان کی تلمیحات کنڈل سکتے تھے۔ اس دور میں ان کے حکم سر پرش اور دیگر اشارتیں بھی ہیں لیکن کسی سیاسی یا سماجی شعور یا فلسفیانہ کیفیت میں کسی تبدیلی کے ترجمان نہیں ہیں۔ واد علی شاہ کو کدورت اور کدورت کی توجہ دینے کے راگ و تاب و گفتگو کا علم ہے۔ انھیں اپنی بیانات اور منوعات سے بچھڑنے کا علم ہے۔ انھیں سب کچھ ہے کہ جس کے لئے اب وہ پہلا سا اہتمام نہیں کر سکتے تھے۔ سب اسباب ہیں جن کی بنا پر وہ سید علی شاہ کے خیال میں اس نظر انداز تباہ پر کوئی نوحد یا ہر شے نہیں ہوتی۔ یہ حال تھا کہ واد علی شاہ کا ہی نہیں ان کے بعد کے دوسرے شعراء اور کادروں کی تھی۔ ان کی ویرانی پر انھوں نے رستہ میں جو کچھ لکھا ہے۔ اے لکھنویوں اس کی نظر نہیں ملتی۔

گناہ میں وہ انجینئرس ہیں۔ ان شامل ہیں۔ ایک عالم علم ان تمام انگریز تاجروں جس میں محل میں شہر و علاقہ اور ان کے لئے عصر و حالات کی کتابیں۔ انھیں ایک طرح سے واد علی شاہ کے ادب علامت کا خلاصہ کہہ سکتے ہیں جو سب سے واد علی شاہ کی دیکھنے والوں۔ راگ اور نقش کی کتابوں۔ محلوں میں طرح طرح کی عورتوں کے پورا اور عورتوں کی عام آمد و آمد پر مشتمل ہیں تو قدرتی طور پر خیالی ہوتا ہے کہ یہ سارا مال و ان علاقائی اعتبار سے کس قدر بہت ہوگا لیکن ان ہدایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ہر حال پر کس تھا۔ واد علی شاہ لکھتے ہیں:

۱۔ فدہ بھی کسی غیر مرد آخرم کے منہ پر نظر نہ آجیوں۔
 ۲۔ فدہ دوسری غیر مرد آخرم سے بات کرنے وقت اپنی نظر بہ سچی لکھنویوں کو
 مالک کے آگے خواہ عبیرت میں۔ فدہ دوسری جو شخص مالک کے روبرو پہنچتا ہے
 کسی ضرورت کے وقت اگر ان کے سامنے بھی پہنچ جائے تو مضا لقمہ نہیں سٹلے
 ویسے شخص لائق کے اور کسی ناچیز مرد کو قربانمانے کی اجازت نہیں۔ فدہ
 چوتھی کسی غیر ناچیز مرد کو کلوری پائی کی دینے کی اجازت نہیں۔ فدہ پانچویں

کسی نا محرم غیر مرد کو حقہ پلانے کی اجازت نہیں۔ دفعہ چھٹی۔ کسی غیر مرد نا محرم کا نام نہ نوا خواہ پیش مالک خواہ پس مالک بلکہ اس فرنے کے نام سے اسے پکارو یعنی کوئی آدمی ہے یا کوئی کبوتر یا زیا جاور یا زیا داروغہ یا باغبان یا کھانا دار یا ماسی پرورد وغیرہ، یہ نہ کہ کوئی نام تو نواب علی ہے پیار سے کہو متو یا خاں یا بیگ یا خان ادھر آؤ یا میر صاحب یا مرزا صاحب یا شیخ صاحب۔ دفعہ ہاویں۔ کسی نا محرم غیر مرد کے دست بدست کوئی چیز نہ لو بلکہ لانے والا زمین یا اس جگہ پر یا رام و مخالفت دھرے۔ بعد اس کے اپنے ہاتھ سے اٹھا کر لینے والے اپنے مصرف میں لائیں۔ دفعہ آٹھویں۔ غیر مرد نا محرم جو دروازوں سے فرش کو صاف کرے یا نا محرم عورتیں ان کو صفائی کی خود جگہ دے دیا کرے۔ ایسا نہ ہو کہ کسی کا ہاتھ ان کے اجسام سے صفائی کے وقت مس ہو تو باعث ناخوشی مالک و غضب خدا ہو۔ چاہے کد ان آٹھوں ہدایتوں کو ہمہ وقت مد نظر رکھیں تا خداوند اور خداوندوں خوشو، رہیں اور دنیا کا کار بھی بند نہ رہے۔ اگر تم سب کو پرے میں بٹھا دو یا جلنے کو کسی قدر تمھارے خداوند کو البتہ یہ عینی ہوگی اور عجب نہیں کہ اس بے عینی کی حجت سے تم لوگ اپنے خداوند کی ملاقات سے محروم ہو جاؤ اور اگر اس ہدایت پر عمل کی تو اپنے خداوند کے پہلو میں رہو گی عینہ قدرت دل میں گھر ہو گا۔ خدا تم جو رزق کا دای ہے پس ۛ

اسی سلسلہ کی ایک اور کڑی ہدایت نامہ برائے ملازمین ہے جس میں چھ دفعات ہیں۔

دفعہ پہلی۔ اپنے مالک کی عورت پر نظر کاٹنے نہ دیکھیں بلکہ جو کچھ کہنا ہو سچی نظروں سے کہیں۔ دفعہ دوم۔ اگر اپنے مالک کے رو برو بیٹھتے ہو تو کبھی، وقت ضرورت اپنی مالک کے آگے بھی بیٹھو۔ دفعہ تیسری۔ غدری اور متعہ نا محرم عورتوں سے نہ مانگو اور بسبب احترام اپنے مالک کے ان کے آگے بھی نہ کھاؤ۔ دفعہ چوتھی۔ کسی مالک کی عورت کا نام آؤ سنانے لو اور جھگڑ سے نہ لو۔ دفعہ پانچویں۔ کبھی نا محرم عورت کے دست بدست کوئی چیز نہ لو بلکہ کہو کہ رکھ دیجیے میں اٹھا لوں گا۔ دفعہ چھٹی۔ فرش جھاڑو و خوشحال رستے کا ہاتھ ان کے کسی عضو سے مس نہ ہو جائے کہ جو موجب طغیان اور کفر ہو جب ان چیزوں کو کھانا، گے کھیں دھوکہ نہ کھاؤ گے۔ اگر تمھارا مالک اپنی کل عورتوں کو پرے میں بٹھا دے تو کسی قدر اسے بے عینی بھی ہوگی اور تم زیادت سے محروم رہو گے۔

مزیں نیز یہ حدیث شریفہ صغیر المظہر ۱۲۹ھ

یہ ہدایات ملازمین اور خدمتگارانوں کے لئے تھیں۔ عملات اور نیکیات کے لئے بھی آداب عیسیٰ کی وضاحت کی گئی ہے۔ ان ہدایات سے اگر کچھ ثابت ہو یا نہ ہو امداد علی شاہ کی طبعی نفاست، نزاکت، صفائی پسندی اور ضابطہ پرستی کا ضرور پتہ چلتا ہے۔ پس دفعات پر مشتمل ان دلچسپ ہدایات میں سے جو خاص طور پر نیکیات سلطان خانہ مبارک جو ہر منزل

اور خاص منزل کے لئے بغیں۔ ملا حلقہ ہوں۔

دفعہ پہلی۔ ہمیشہ اپنے کو خوشبو رکھیں۔ دفعہ دوسری۔ دھویا ہوا جلہا کر چھوڑ کر اسے ملتا ہے یا اپنی لیاقت کے موافق جیسا بنا باہر پہنا کریں۔ زنا و زنا باہمی اور وجہ دار اور بچی پوشاک خواہ یا بھامہ، خواہ دوپٹہ خواہ چھوٹے کپڑے پہنا کریں۔ روزہ جن کے سپرد ہیں اور حرجان کے اہتمام والے ہیں ان سے مواخذہ ہوگا اور وہ ہی وادو غہ لوگ اس کے جوابدہ ہوں گے۔ پاؤں اور تلوے ہمیشہ آئینے کی طرح صاف اور چمکتے رہیں کسی طرح کا میل اور آخرو نہ ہوا کرے۔ بالوں میں خوشبو روغن اور انگوروں میں کاجل یا سرمہ، بالٹھوں میں ہندی پتھر نک ہمیشہ دھا کرے جو کٹوا بیاں میں وہ بغیر حکم از خود مسی نہ ملیں۔ کوئی بلاق پھیدنے کا قصد نہ کرے ممانعت قطعی ہے۔ بلانے کے وقت حتی الوسع جلد حاضر ہوا کریں۔ میباک و بے حجاب حاضر ہوا کریں وغیرہ۔

یہ تمام تفصیلات شاید آج پڑھنے والوں کے دلوں پر باخاط گزریں لیکن ان کی بڑی تاریخی اہمیت ہے۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ کی سلطنتیں جس عظمت کے انتظام اور انصرام میں صرف ہو سکتی تھیں ایسی باریک بینی اور مرئزہ فہم میں صرف ہو رہی تھیں۔ جن کا تعلق صرف ان کی ذات سے تھا معلوم ایسا ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ اپنے سیاسی اقتدار اور علی قوت سے اس درجہ محروم ہو چکے تھے کہ انہوں نے اپنے لئے ایک نیالی سلطنت تعمیر کر لی تھی۔ یہ سلطنت ان کے محانت تک محدود تھی جہاں ان کا ہی حکم چلتا تھا اور جہاں کا ذرہ و ذرہ ان کے جزم و ابرو کے اٹانے پر ڈھک کر رکھا تھا۔ تمام تفصیلات محلوں کی زندگی کا نقشہ انھوں کے سامنے چہر جالتے مشرقی قدروں کے آخری نمونے کے بن گئے تھے تو نفس میں شمرنے تک بھرے کی کوشش کی ہے وہ نقوش یہاں بغیر کسی تحقیر کے اپنی پوری آب و تاب سے نظر آتے ہیں۔ واجد علی شاہ کا مورخ اور اس عہد کا داستان خارا اس باب کو مشغل سے نظر انداز کر سکتا ہے۔

اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ واجد علی شاہ کی تمام نصایف میں ایک بنیادی ماخذ کی حیثیت سے یہ کتاب نہایت اہم ہے۔ اس میں ذاتی تفصیلات اور معلومات جس عین فراہم کی گئی ہیں وہ طعن اور بغیض میں اور کسی دوسرے ذریعہ سے حاصل نہیں ہوسکتیں۔ واجد علی شاہ کی شاعری ممکن ہے بعض لوگوں کو صرف لغائی یا بڑی معلوم ہو ممکن ہے بعض دوسروں کے نزدیک بڑی اعلیٰ قسم کی ہو لیکن جو کہ ہندوستان کے مسلمان نیکاروں یا نصیرین مسیحی اور فیس کے ماہرین کے کارناموں سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ اس کتاب کی دریافت کو بڑا وزن دیں گے۔ اس کا انداز بیان صاف و سادہ اور رکش ہے۔ اس میں کمسنوی تہذیب اور شاعری حاضر ہل تھلک یا تصنع یا بطل نہیں پایا جاتا۔ نہ اس میں بات سے بات پیدا کی گئی ہے۔ نہ محض خیالی آؤتبی یا تخیلی کی بلند پروازی ہے۔ اپنے موضوع کے اعتبار سے بھی یہ کچھ کم اہم نہیں۔ اور وہیں قانون لطیفہ پر کتابیں کہیں اور واجد علی شاہ کے زمانے تک تو یہ کسی اور بھی نمایاں تھی۔

مزاجت اللہ نیک کا دلی کا آخری بادشاہ اہل بکت تاریخی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ واجد علی شاہ نے بھی اسی انداز کی ایک تخیل شاعر کے لعل کے عنوان سے لکھی ہے جس میں ایرانی، ہندی، افغانسی اور اردو شعر کو شامل کیا ہے ان کی تعداد ۲۵ ہے۔ پہلا نام میان ناسخ کا اور آخری نام جزا کا ہے۔

[illegible]

انہی سے برأت کا نالغی کے کہ عورت کو یہ پتہ چلا ہوتا ہے۔ یہ کہہ کر انہیں یہ پتہ چلا دیتے اور دوسرا آدمی نالغی کے لیے تپے پہرہ نکال دیکھنے کے لیے باوا اساتے والا کہہ دیتا ہے یہ وہ عورت ہے کہ باوا میں جنس نہ رہا ہے۔ والا کہہ دیتا ہے وہ نالغی آج اس صبح کے ساتھ نکلتی ہے۔ اس کے بعد عورت کا نالغی پہننے کا طریقہ بتا دیتا ہے۔ اس وقت یہ مطلع کیا جاتا ہے کہ عورت کا نالغی پہننا چاہیے اور دونوں ہاتھوں سے باوا عورت کی طرح ٹٹوٹا جاتا ہے۔ مطلع ہوتا ہے :۔

شہادت با رکی ہم نے لہر ہے
ہاں ہے جس طرف ہے اور کہ دھرتے

میں نالغی کا مشاعے کے کے اجا ہو۔

عورت کی باخلف مشاعرے کے اہل محبت سے یہ ہمدردوں میں جو شاعر کہ شاعر کی سبھی کی میں فراموش نہیں کرتا۔
لیکن عینیت نہ خواہت فراموشی نہ از پر دیات وہ شاعر کی سبھی کی پر غائب آجیا نا ہے۔
انہ کے بارے میں وہ اہل محبت نہ کہ کوہ نہ کہ ہے وہ جی انہیں نہیب نہیں کرتا۔ کہیں نہیں ہے۔

[illegible]

اس مشاعرے کے سلسلے میں واجد علی شاہ نے خود اپنا بھی مختصر سا تعداد کر لیا ہے جو تہذیب میں نقل ہوا۔ اس میں واجد علی شاہ نے اپنی ۲۶ تصانیف کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے بعض تصانیف کی کئی کئی جلدوں پر مشتمل ہیں جی سے یہ تعداد وینچاس سے اوپر ہوتی ہے ان کی فہرست حسب ذیل ہے۔

- ۱۔ اختر ملک ۲۲، افسانہ عشق ۳۳، ارشاد خاقانی ۲۴، ایمان ۵۵، الہدایت ۶۱، بحر الغت ۷۵، بحر مختلف ۸۱، بنی ۹۰، تائید مذہب ۱۰۰، تائید فناء ۱۱۰، تائید خاص ۱۲۰، تائید فراق ۱۳۰، تائید مشغلہ ۱۴۰، غزالہ ۱۵۰، تائید نور ۱۶۰، تائید جمشیدی ۱۷۰، تائید ویر ۱۸۰، تخیل عشق ۱۹۰، توجہ و وض ۲۰۰، حزن اختری ۲۱۰، دریائے شمس ۲۲۰، دستور واجدیت ۲۳۰، دفتر تاج ۲۴۰، دیوان مبارک ۲۵۰، دفتر پریشان ۲۶۰، دہس ۲۷۰، سخن اشرف ۲۸۰، شہدائے فیض ۲۹۰، صیغہ سحافی ۳۰۰، صحت مبارک ۳۱۰، عشق نامہ ۳۲۰، قمر معنوی ۳۳۰، کلیات اختری ۳۴۰، کلیات سرور ۳۵۰، عمدۃ عاشقان ۳۶۰، مہدوات شہ ۳۷۰، مہابی نامہ ۳۸۰، مرق فرخ ۳۹۰، مساحتہ بین انفس و العقل ۴۰۰، ناچ ۴۱۰، نظم نامور ۴۲۰، مصلح ہنری ۴۳۰، میریت حیدری ۴۴۰، لغت نعت زبان ۴۵۰، چارپایہ کتابیں مرانی اور صاحب مظلوم شہداء کے گرد بیٹھ کر بیان کا حساب نہیں کیا۔ ۴۶۰، مجموعہ واجدیت۔
- آخر میں لکھتے ہیں:-

یہ سب فقیر کے کتب خانے میں موجود ہیں، اور جو نازل سلطنت اور غارت بدعاشان میں تاراج ہوئیں وہ خاروں اور سب ہیں۔

اس کے بعد واجد علی شاہ کی بارہ برس اور زندہ رہے۔ اس زمانہ میں جو کچھ لکھا وہ بھی اس میں شامل نہیں ان تصانیف میں سے شہزاد ناہید ہیں۔ بہ سب توجہ ہو ہیں تو واجد علی شاہ کے کردار پر پیش پند ہی اور عجائبی کے جو مہبت ہیں شاید عمل بیانے اور اس کی شخصیت اور کارناموں کا مکمل جائزہ لے کر اس کا صحیح مقام متعین کیا جاسکتا۔

ہماری داستانیں

وقار عظیم

کوئی کہتا ہے داستان — تو یہ شعر پڑھے کوچی جانتا ہے کہ
نبال پر بارِ حسد آیا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے لفظ نے بوسے مری زباں کے بیٹے

اور دل کے اس سہاس اور ارادہ میں کسی شاعری کو دخل نہیں — یہاں شاعری سے میری مراد محض مبالغہ آرائی سے ہے ورنہ سچ پوچھئے تو داستان اور شاعری میں بڑا تہیٰ تعلق ہے۔ دونوں کی پرورش تخیل اور تصور کی آغوش میں ہوتی ہے۔ اور دونوں احساسِ غم و اندوہ کا سرچشم ہیں۔ میرے لیے اور ان سب کے لیے جو داستانوں کی گونا گوں لذتوں سے آشنا اور اس سے کئے نشہ کے رسیا ہیں، داستان کے لفظ سے نہ جانے کتنے عجیب و غریب تصور و وابستہ ہیں کہ جب یہ لفظ کان میں پڑتا ہے، تصور یا تو جیتی جوتی چھتوں کی نگین یا دھوپ میں ڈوب جاتا ہے اور یا پھر ایسے ہماؤں کی سیر کرتا ہے۔ جہاں غم عشق اور غم رور گار دونوں غم کی خلش سے نا آشنا ہیں — ہر چیز میں وقعت، کشادگی اور انوکھاپن۔

یہ داستانیں راتوں کی تنہائیوں میں چھپ چھپ کر بھی جاتیں بچیں اور اس طرح محو ر کی شبِ فرقتِ اختر شماری کے غیر شاعرانہ شغل کے بغیر سپید ہونے کا مزد دیکھتی تھی اور گوشہٴ تنہائی سے الگ دوست احباب کی محفوں میں بھی، جہاں دنیا و اسے دن بھر کی سختیوں سے تھک کر کسی ایسے جہان کی سیر کرنے کو یکساں ہوتے تھے جو ان پر خود فراموشی کی کیفیت طاری کر سکے۔ کسی محلے ہوئے میدان میں چاندنی کے فرش پر، یارِ ان باصفا، کا ایک حلقہ جمنا ہوا ہے۔ اندر ہر ایک کی توجہ کامر کو صرف ایک شخص ہے جو ان سب کے حلقہ میں گھرا ہوا لفظوں سے رزم و بزم کی گونا گوں تصویریں کھینچ رہا ہے اور دیکھنے والے ہر نفس کو حیرت سے دیکھتے، وجد میں آتے اور خود فراموشی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ یہ محفل روزِ جنتی اور دو ذہن گھنٹے اور کبھی کبھی آدھی رات گئے ٹنک جاتی رہتی۔ سننے والے یہاں سے اٹھ کر جاتے ہیں۔ اور خواب فوشیں میں بھی اس رزم و بزم کے وہی رشتے دیکھتے ہیں جن سے ان کی زندگی محروم ہے۔

یہی محفل کہیں کہیں بزمِ آرائی کے سارے لوازم کے ساتھ منعقد ہوتی ہے۔ فرس، فرش، چاندنی، قالین، گاؤٹیکے، جھانڈاؤں، عودِ بخت، نضا صفقا، منڈ اور معطر ہے۔ اور داستان سننے والے امید و شوق کو جلو میں لے، غم و اندوہ کی دنیا کو خیر باد کہہ کر سرود و انسا ط کا سر باہر توجہ کرنے کے لیے، ایک ایک کر کے اتارے ہیں اور آئے واسے وقت کے انتظار میں اپنی جگہ پر بیٹھ جاتے ہیں۔ داستان

شروع ہوتی ہے، تخیل کی بلند پروازی نئے نئے مناظر ملنے لاتی ہے اور ہر منظر کی طرح کشی میں رنگینی بیان کے دریا بہاتی ہے۔ رنگینی بڑھتی جاتی ہے اور داد و تحسین کے نوسے بلند ہوتے جاتے ہیں۔ داستان سننے والوں کے جذبہ شوق و جستجو کو بڑھاتی رہتی ہے اور بالآخر اہل عقل داستان گو کے ساتھ نئے نئے علمیات کی سیر کر کے وہ کچھ پالیتے ہیں جو انہیں زندگی میں میسر نہیں۔

ایک منظر وہ ہے جب کوئی سرست نازخو استراحت سے۔ لیکن خیال اب بھی زندگی کی پیچیدگیوں میں الجھا ہوا ہے ماحصل کو کسی ایسے دار و دل کی ضرورت ہے جس سے کبوتری میسر آئے۔ کسی نے کسی داستان کا نغمہ دل نشین چھیڑا، بلیں بوجھل ہوئیں اور تخیل اور پیچیدگیوں کی دنیا اس کے کیف میں ڈوب گئی۔

اندھیر جو ہماری نگاہ کو کسی اور طبیب کے نسخوں سے دور نہیں ہوتی، اس کی دلجوئی چار درویشوں کا قصہ سن کر جاتی ہے۔ داستان ختم ہوتی تو ہمیں کے غفلت کی تیاری شروع ہو جاتی ہے۔

غرض داستان کے تصور کے ساتھ وہ سارے تصور جیتے جاگتے بن کر سامنے آتے ہیں جو صدیوں سے اس کے ساتھ وابستہ ہیں، انہی کرائی اس کا منصب آتے ہیں۔ وہ رہنمائی کے لیے دار و نئے شفا اور غم نصیبوں کے لیے مہربانہ ضرور دشادمانی ہے۔ اسے اپنا موش و غم خوار بنانے والے بے خودی و خود فراموشی کی آغوش میں پرویش پاتے اور ہر آن تازہ جہانوں کی سیر کرتے ہیں۔

بے خودی کی یہ دولت بے پایاں اس دنیا کا مقصد ہے جسے داستانوں نے اپنا بنایا ہے۔ یہاں کے حقائق ہماری آپ کی دنیا کے حقائق سے بالکل مختلف ہیں۔ اس میں جن، دیو اور پریاں آباد ہیں۔ یہ دنیا جادو و گردوں، جوجہوں، جوشنیوں، رماؤں کی دنیا ہے۔ اور یہ ساری مخلوق شاہوں، وزیروں، امیروں اور تاجروں کی زندگی میں دوستی یا دشمنی کے رشتہ سے منسلک ہے یہاں کے جنوں، دیووں اور پریوں کی طرح سامنے افسانہ بھی عجیب اشکفت ہیں۔ حد درجہ خوب و حد درجہ بد وضع، حد درجہ نیک، حد درجہ خیر کے مجھے، شمر کے پیکر، ہر چیز کی اتہا، ہر چیز کی معراج، بلندی سے بلند اور پستی سے پست۔ ان سارے افسانوں کو نرم و نرم کے ایسے معرکے پیش آتے ہیں جو اس سے پہلے کسی انسان کے تصور میں بھی نہیں آئے تھے۔ یہ سارے معرکے سر ہوتے ہیں اور ان کا انجام ہمیشہ طرب و نشاط ہوتا ہے۔ یہاں غم عشق اور غم روزگار و دلوں کا اندازہ دکانہ ہے۔ غم عشق تھت و دوستوں کے پیسے، غم روزگار صحت و جنوں کے لیے اور اگر عشق کو کبھی غم روزگار سے سابقہ بھی پڑے تو عشق کا نصب العین، ہائید غمی سے، رہنمائی خضر سے، مشکل کشا کی بیگی سے، احم و عطر سے، لوح سے، تعویذ سے، سحر و تسخیر سے یا اپنی بے مثال قوت بازو سے اسے بنانا اور شکر و روباہی کے سپرد کر کے خود مغرور ہو کر اور کامرانی کا تاج سر پہرہ رکھتا ہے اور انجام کار یوں داد عیش دیتا ہے کہ جو سنے، جو پڑھے وہ ٹھوڑی ہی دیر کے لیے سی، یہ بھول جائے کہ دنیا میں غم نہیں، تنہا ہیں اور نامراد ہیں۔

داستانوں نے انسانوں کی دنیا کے سامنے اس عجیب و غریب دنیا کا تخیل پیش کر کے رنگینی، بونفونی، کشادگی، ذواتی، رفعت، عظمت کا مفہم پیش کیا ہے۔ بے بسوں اور محروموں سے ان کی بے بسی اور محرومی چھپتی ہے کہ بے خودی اور خود فراموشی کے یہی بڑے انعام ہیں اور بے خودی کی دولت ہر چند ناقص و داستانوں کا ہے، کسی اور چیز کا نہیں۔ اس کا خمار اعضا شکن نہیں، اسی ہر زمانہ میں اودھم طبقہ میں داستانیں محبوب و مرغوب رہی ہیں۔ ادبیہ دعوے کرتے وقت میرے سامنے اردو کی داستانوں کی ڈیڑھ پونے دو سو برس کی تاریخ ہے۔

یہ قصہ محمد شاہ درگینے کے عہد کا ہے۔ بوستان خیال کے مصنف ۱۲۶۲ھ میں گجرات سے واپس آئے اور سلسلہ شریک تلاش درنگا میں مقیم رہے، اس زمانہ میں جہانگیر علی شاہ کا یہ مقام تھا کہ اس کے قریب ہی ایک قلعہ خانہ تھا۔ یہاں ہر طرح کے لوگ جمع ہوتے تھے، ان میں ایک صاحب ایسے تھے جو داستان گوئی کے فن سے آشنا تھے۔ انھیں دوسروں کے باروں قصے یاد تھے۔ لیکن ان سب کو اپنی طرف منسوب کر رکھا تھا۔ قصوں میں اپنی طرف سے پس منظر ثابت، اضافہ کر لیتا تھا۔ اس کے باوجود اپنی فن کاری پر محدود رہتا تھا۔ بلکہ غرور و خاد ایک دن کہنے لگی ”انسان سب قدر عظم و فضل میں دستگاہ پیدا کر سکتا ہے مگر فن قصہ گوئی ایسا وقت و مشق ہے کہ بغیر مناسبت و سمجھت کے ہر کو حاصل نہیں ہوتا۔ اہل محبت نے بھی اس کے نول کی تصدیق کی ہے۔“ ایک دن اس شخص نے کوئی ایسی داستان بیان کی جو اہل مجلس میں سے ایک صاحب کہیں اور بھی منہ پیچے تھے۔ انھوں نے کہا کہ داستان فلاں شخص کی ہے۔ غرض یہ محفل ہر روز جتنی رہی اور روز کوئی نہ کوئی قصہ کھڑا ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک دن محمد قلی خیالی نے ایک قصہ کی تمہید لکھ کر اس مجلس میں سنائی۔ اس پر ہونے والے داستان کو صاحب نے فرمایا کہ یہ قصہ تو فارسی میں تھا، لفظ تو عرب ہے کہ قصہ اردو میں ہے۔ اسی طرح کے اور بہت سے اعتراض تھے اور اس طرح مجلس میں دو فریق پیدا ہو گئے اور دونوں میں خاصا فساد ہوا۔ لیکن رفتہ رفتہ خیالی کی داستان گوئی کا شہرہ چلا اور ان سے کہا گیا کہ یہاں امیر تھرہ کی داستان سنائی جاتی ہے وہ ان تم بھی سنایا کرو۔ انھوں نے تعمیل کی۔ چران کی رسائی ایک کیر تک ہوئی جو داستان سننے اور قصہ گوئی کے لئے شہر تھیں تھے۔ یہاں سے نواب رشید الدین بہادر تک رسائی ہوئی۔ اور ان کی فرمائش پر بوستان خیالی کو باقاعدہ نویر لکھنا شروع کیا۔ دو برس مکمل کر کے ————— تیسری جلد شروع کی مگر اس کی وساطت سے بادشاہ کی خدمت میں پہنچے اور بادشاہ نے حکم دیا کہ اسے مکمل کیا جائے۔ نصف کی فرمائش پر بادشاہ نے اسے ہاتھ کا کتاب زد نویس اور خوش خط کام پر مقرر کئے۔ انہی دو جلدیں مکمل ہوئی تھیں کہ بادشاہ کا انتقال ہو گیا (۱۷۴۸ء) اور محمد قلی بنگال پہنچ کر نواب سرکار الدولہ کے دوبار سے وابستہ ہو گئے۔ اور انھیں کی فرمائش پر قصہ گو پندرہ جلدوں میں مکمل کیا۔

تو نئی خیالی نے اپنے دلی کے قیام اور قلعہ خانہ والی قصہ گوئی کی مجلس کا حال بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے اور اس بیان سے یہ نتیجہ نکلتے ہیں کہ داستان سننے اور داستان سننے کا جھکا لوگوں میں عام تھا اور اس شوق میں غلام اور خواص، امیر، وزیر اور بادشاہ تک شامل تھے۔ داستانیں اردو اور فارسی میں کہی جاتی تھیں، وہ نہ صرف کہی جاتی تھیں بلکہ لکھی بھی جاتی تھیں۔ قصہ گو اپنے ذہن اور خیال سے بھی قصے تراشتے تھے اور دوسروں کے قصوں میں ترمیم و اضافہ کر کے بھی سناتے تھے، لیکن پسندیدگی اور قدر وافر صرف مجمع ناخوشوں کو حاصل تھی۔

————— یہ زمانہ اب سے دو سو برس پہلے کا ہے۔ اردو کی اکثر داستانیں انیسویں صدی میں لکھی گئیں۔ منظوم داستانوں کا یہاں ذکر نہیں۔ لیکن شریک پہلی داستان جو ہم تک پہنچی ہے تحسین کی نظر زمر صغ ہے جو ۱۷۷۷ء میں لکھی گئی۔ اس کے بعد دو قصے جو فورٹ ولیم کالج کے انتہام میں لکھے گئے۔ ان میں میر اس کی بار بار دہرنا حیدر بخش حیدری کی آرائش محفل اور طوطا کہانی، خلیل علی خاں انشک کی داستان امیر تھرہ، ————— سنگھاسن بنیسی اور بے نال عیسیٰ زیادہ مقبول ہوئے۔ ان قصوں کا زمانہ تصنیف ۱۸۰۰ء سے ۱۸۲۵ء تک پھیلا ہوا ہے۔ اس دوران میں فورٹ ولیم کالج سے الگ ہی بعض آثار ایسے قصے لکھنے میں مصروف تھے جن کا انداز داستانوں سے ملتا ہے۔ ۱۸۱۵ء میں دریں کی نظر زمر صغ (بار بار دہرنا حیدر بخش حیدری کی آرائش محفل) لکھی گئی۔ ۱۸۱۵ء میں انشاء نے رانی کی لکھی۔ ۱۸۱۷ء میں محبوب نے نورتن لکھی۔ یہ ایسے قصوں اور داستانوں کے نام ہیں جو تصنیف ہونے کے بعد بار بار پیچھے اور مختلف حلقوں میں پسند کی نظر سے دیکھے گئے۔ شریک اس کتاب ہے کہ اس عہد میں اور قصے بھی لکھے گئے ہوں گے۔ بہر حال اس کے بعد سے شریک نے والوں نے داستان

کو ایک مستقل صنف ادب کی حیثیت سے اختیار کر لیا اور انیسویں صدی کے آخر تک اردو میں جتنی داستانیں لکھی اور چھاپی گئیں ان کی ضخامت مجموعی حیثیت سے اردو کے دہائیوں سے زیادہ ہوگی۔ ۱۸۳۷ء میں سرور کی فسانہ عجائب اور اس کے بعد تھوڑے تھوڑے وقفہ سے گلزار سرور، شگور، محبت اور سرور، افسانہ، بوستان خیالی، طلسم ہفت پرہیز، داستان امیر حمزہ اور اس کے علاوہ ۱۸۷۰ء، دفتر، بغیہ طلسم ہفت پرہیز اور بوستان اور طلسم ہفت پرہیز کی تین تین جلدیں، افسانہ، سرور، سخن، طلسم حیرت اور ان کے علاوہ بے شمار ترجمہ اور طبع زاد نکتے اور داستانیں جو اسم اور خاص کے فونی داستان خوانی اور داستان سرانی پر دلالت کرتے ہیں۔ اردو کے اکثر اچھے داستان گو غدر سے پہلے اور غدر کے بہت بعد تک دہلی، اودھ، امیر، بنارس اور جہاں آباد کے درباروں اور امیروں سے وابستہ رہے ہیں۔ اور اس تعلق اور وابستگی کے علاوہ شہروں میں داستان گوئی کی مجلسوں کا عام دستور رہا ہے جس میں دہشتان گو کبھی لکھ کر اور کبھی زبانی اپنی داستانیں سناتے دلوں کے دلوں کو مسرور کرتے اور ان سے ہدیہ تحفہ و خراج عقیدت و محبت وصول کرتے رہے ہیں۔ اردو کی اور لکھنؤ نے اپنے زوال اور انحطاط کے زمانہ میں بھی اپنی مجلسوں کو اس شمع سے روشن رکھا ہے چنانچہ دہلی میں ۱۹۲۹ء تک میر تقی علی داستان گو کی محفلیں مروج خاص و عام تھیں اور لکھنؤ میں ابھی عید کے دن داستان سنے پر ستارہ عیش باغ کے میدان میں مزاحمت کی داستانیں سننے جاتے ہیں۔ برصغیر کی زبانوں، وزیروں، امیروں اور عامیوں کی تھی۔۔۔ اب ذرا ایک جھلک ایسے ایسوں کی دیکھیں جن کے ذوق کی فطرت اور لطافت ہر زمانے کے لوگوں کے لیے مثال اور نمونہ رہے گی۔

جہاں کلاں سے۔۔۔ ڈاکو، گئے، گئے ہیں۔۔۔ غائب کے قیام مال داسے گھر میں بچوں اور بڑوں کی ایک محفل بھی ہوئی ہے۔ داستان پڑھی جا رہی ہے اور سب شوق سے سن رہے ہیں۔ غائب میر محفل میں۔ داستان سننے ہیں، اور حمان کہیں داستان کو مخاطب کو اپنی طرح ادائیں کر سکتا، داستان کا مسند اپنے ہاتھ میں لیے اور مکمل کرتے ہیں اور خوش ہو کر کہتے ہیں کہ دہلی کی زبان انہیں داستان کہنے والوں کے ہاتھ میں ہے۔

داستان سے غائب کو جو کچھ،۔۔۔ ابنگی تھی۔ اس کا اظہار ذاتی تو لکھنا اور سرور اور بوستان خیالی کے دیباچوں سے ہوتا ہے اور دیکھ کر اس مزید نقطہ سے جو انہوں نے میر تقی علی کے ذوق کو لکھا تھا۔ بوستان خیالی کے دیباچہ کے دو میں جملے سنئے:

”افسانہ داستان میں وہ کچھ سنا کہ کبھی کسی نے دیکھا نہ سنا“

پندرہ وند پیدا مغز تواریخ کی طرف، بطبع مائل ہوں کے لیکن تعہ کہانی کی ذوق بخشی
ویشاطا لکھنوی کے بھی دل سے قائل ہوں گے“

”داستان طرازی میں جملہ فنون سخن ہے۔ سچ یہ ہے کہ دلی ہمدانے کے لیے اچھا نہیں ہے“

اور اب دیکھئے میر ہمدی مجروح داسے خط کی عبارت، لکھتے ہیں:

”میرزا غالب علیہ الرحمۃ! ان دنوں بہت خوش ہیں۔ پچاس ساٹھ سو کوڑا کتاب

امیر حمزہ کی داستان اور اسی قدر حمزہ کی ایک جلد بوستان خیالی کی آگئی ہے۔ سنہ بوتلیں بادۂ ناب کی تو لنگ خانہ میں
موجود ہیں۔ دن بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں۔ رات بھر شراب پیا کرتے ہیں۔
کسے کیس مراوشن میسر ہو !

دگر جہنم باشد سکندر بود

مختصر یہ کہ عوام اور خاص دونوں میں داستانیں سننے اور داستانیں پڑھنے کا شوق کسی نہ کسی انداز سے اب سے تقریباً دو سو
بیس سے قائم ہے۔ بیچ میں چند برس ایسے آئے تھے جب ناول اور مختصر افسانہ کے نئے فن نے داستانوں کو مختلف محفلوں سے نکال کر
اس کی مسند پر قبضہ کر لیا تھا لیکن اب پھر خواص ان داستانوں کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ انھیں پڑھنے کے لیے وقت نکالنا چاہیے،
انھیں گفتگو اور تنقید کا موضوع بنایا جاتا ہے اور انھیں ایک نعمت غیر مترقبہ کی طرح کتب خانوں میں محفوظ کرنے کی کوشش کی جاتی
ہے۔ اور اب بھی ہجرت جیسے دیار غیر میں طلسم ہوش ربا، داستان امیر حمزہ اور داستان آزاد کے نئے ایڈیشن شائع کے محتاتے
ہیں اور یہ سب کچھ قصہ کہانی کی ان بے شمار کتابوں اور ان ضخیم کتابوں کے خلاصوں سے الگ ہے جو بیڑی پر بیٹھے داسے کتب فروش
صبح سے شام تک بیچتے ہیں۔ اب بھی ان کے رزق کا سب سے بڑا سہارا یہی داستانیں ہیں۔

داستانیں سننے اور داستانیں لکھنے میں ہمیشہ سے بڑا گہرا ربط رہا ہے۔ اور ہر زمانہ میں لوگوں کو داستانیں سننے اور پڑھنے
سے یکساں دلچسپی رہی ہے اور ہر زمانہ میں کئی اور کلمی جاننے والی داستانوں میں تخیل کی کار فرمائی سب سے زیادہ رہی ہے۔ فرق صرف
یہ ہے کہ داستان لکھنے اور لکھنے والوں نے مقامی ماحول اور مقامی مذاق سے متاثر ہو کر داستانوں میں داستان کی ساری خصوصیتیں
برقرار رکھ کر لکھی ہیں ان کے معنوں اور انداز میں جزوی تبدیلیاں کی ہیں۔ ان میں سے بعض فرق ارادی ہیں اور بعض غیر ارادی طور پر تحریر
میں داخل ہو گئے ہیں۔ فساد عجب اس اثر کی بڑی نمایاں اور واضح مثال ہے۔ اس قصہ میں ایک طرف تو سرور کی شخصیت نے داستان
کی تشکیل و ترتیب میں نئے نئے نقوش بنائے ہیں اور دوسری طرف لکھنوی معاشرت اور مذاق کے مخصوص انداز نے قصہ کی تفصیلات
میں امتیازی رنگ پیدا کئے ہیں۔ یہی صورت ذرا کمزور طریق پر باغ و بہار، آرائش محفل اور بوستان خیالی میں بھی موجود ہے۔ لیکن دہلی اور لکھنؤ
کی داستان گوئی، اور داستان نویسی میں مقامی مذاق نے جو امتیازی فرق پیدا کئے ہیں۔ داستانوں کے معنوں اور ان کی بیانی تفصیلات
سے زیادہ انداز بیان میں ظاہر ہوتے ہیں۔ جو داستان گو دہلی کے مذاق سے متاثر ہیں انھوں نے بیان میں سادگی، فصاحت اور سلاست
کو اپنا شیوہ بنایا ہے۔ اس کے مقابلہ میں جن داستان گو یوں پر لکھنوی ماحول اور مذاق کا اثر ہے، فصاحت، رنگینی اور عبارت آرائی ان
کے طرز کی نمایاں خصوصیت ہے۔ طرز بیان کی ان منفرد اور امتیازی خصوصیات کے اظہار کے لیے بڑی آسانی سے میر ان کی باغ و بہار
اور سرور کی فساد عجب کے نام ایسے جا سکتے ہیں۔ لیکن ان دونوں سے الگ دہلی اور لکھنؤ کے داستان گو یوں کی لکھی ہوئی حنفی
داستانیں ہمارے فطر کے سامنے ہیں وہ بھی مذاق کے اس نمایاں فرق کی منظر ہیں۔ طلسم حیرت اور سرور میں سخن جو میر امن
اور سرور کی حمایت میں لکھی گئی ہیں، اس فرق کے دو اور امتیازی نمونے ہیں۔ لیکن اس فرق کا جو عکس بوستان خیالی کے ترجموں
میں ہے وہ حیرت انگیز بھی ہے اور معنی خیز بھی۔ لیکن اس فرق کی وضاحت سے پہلے شاید بوستان خیالی کے ترجموں کی دلچسپ کہانی
بیان کرنی ضروری ہے۔

یہ بات عام طور پر علم میں ہے کہ فارسی میں بوستان خیال کے ۱۵ حصے ہیں اور پہلے مترجم مرزا غالب کے منتخب خواجہ امان دہلوی ہیں۔ انھوں نے سب سے پہلے بوستان خیال کی تیسری اور چوتھی جلد کا ترجمہ حدائق انظار کے نام سے کیا اور اسی پر مرزا غالب نے اپنا دیباچہ لکھا۔ اس کے بعد انھوں نے باقی جلدوں کا ترجمہ کیا۔ آخری حصہ کے ترجمہ میں مصروف تھے کہ دل میں درد ہوا۔ اٹھ کر بیٹ گئے اور اسی درد میں ان کا انتقال ہوا۔ ترجمہ کا باقی حصہ ان کے صاحبزادے خواجہ قمر الدین خان راقم نے مکمل کیا۔ بوستان خیال اتنی مقبول ہوئی کہ بعض چھاپہ خالوں نے اسے چھاپنے کی اجازت طلب کی۔ خواجہ قمر الدین نے کسی وجہ سے اجازت نہیں دی۔ دوسرے چھاپہ خالوں والے تو چپ میٹھ لیکن فحشی و لکھنؤ کو ان کے چھاپنے کی دھن لگی اور انھوں نے بوستان خیال کا ترجمہ اپنے اہتمام میں کر دیا۔ اسے اپنے مطبع میں چھاپا۔ یوں دلی اور لکھنؤ والوں میں بوستان خیال کے دو الگ الگ ترجمے ہوئے۔ ان کی مختلف جلدوں کے نام دلی اور لکھنؤ والوں نے الگ الگ رکھے لیکن سب تصویف کو ملا کر یہاں اور وہاں دونوں جگہ بوستان خیال ہی لکھا گیا۔ خواجہ امان کی ترجمہ کی ہوئی پہلی جلد ۱۸۶۶ء میں چھپی اور ان کا انتقال ۱۸۷۹ء میں ہوا۔ خواجہ امان نے جس جلد کا ترجمہ نہیں کیا تھا۔ اس کا ترجمہ لکھنؤ کے مرزا محمد سکری عوف جتوئے آغا نے کیا اور وہ ۱۸۸۰ء میں لکھنؤ پریس میں چھپا، اور باقی حصے بھی ۱۸۸۹ء تک مکمل ہو گئے۔ اب بوستان خیال کے ان دو ترجموں کی عبارتوں کا مقابلہ کیجئے جن میں سے ایک کا ترجمہ ایک دلی والے نے کیا ہے اور دوسرے کا ایک لکھنؤی نے، تو زبان و بیان میں دلی اور لکھنؤ کے انداز کا وہ فرق اور بھی نمایاں ہوتا ہے جس کا ذکر باغ و بہار اور نسائے عجائب کے سلسلہ میں آیا۔ آثار ہائے لیکن عبارتوں کے مفاد سے پہلے خود ترجمہ کرنے والوں کی کیفیت مزاج کی ایک جھلک دیکھ لیجئے جو ان کے ترجموں کے دیباچوں سے مترشح ہے۔

خواجہ امان اپنے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

”جس تحریر یا تقریر میں آرد و سائیکلی کا دخل ہو گا اور آدمی وہ کہ کوئی لفظ نیک سے خالی نہ ہو، بلا مرید وہ زبان اہل زبان کے نزدیک زبان عوام ہے، اس طرت کی ننگ بندی اور زبان درازی انھیں افسانوں کے واسطے لائق و خوشنما ہے جن کی تفسیر ایسی ہوتی ہے کہ ایک تھا بادشاہ، ہمارا تمہارا خدا بادشاہ — نہ یہ قصہ سر دفتر قصص اگر اچھا بنا نصراً اس کے ترجمہ میں سوائے بیان مصنف کے کچھ بھی خود مطبع کی جاتی جس قصہ ہرگز باقی نہ رہتا۔ خاکسار نے تریب و بیان و درازی زبان سے تعلق کی اور اہل و ہل کے روزمرہ کا مقلد ہوا۔ لیکن وہ روزمرہ کہ جو خاص عباد و اعزہ شہر کے سبے خلعت و بلا فصیح استعلا میں ہے“

مرزا محمد عسکری نے اپنے دیباچہ میں پہلے بوستان خیال کی اصل فارسی عبارت کی تعریف کی ہے اور پھر خواجہ امان کے اور اپنے ترجمہ کے انداز کا مقابلہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

”عبارت رنگین و معنی و مستح — فصاحت و بلاغت میں غلام توڑ دیئے ہیں۔ شعراء برستہ اور حسب حال، ایسی عمدہ طرز سے موقوف و محل پر لکھے ہیں کہ سہاں اللہ..... ما کر خواجہ امان صاحب دہلوی نے بھی نہ تھا عمدہ ترجمہ فرمایا ہے..... مگر جب اس ترجمہ کو ملاحظہ فرمائیں گے فصاحت و بلاغت، لطیف زبان، نازک خیالیوں میں بدرجہا بڑھا ہوا پائیں گے۔“

اب دونوں جگہ کے ترجموں کا ایک ایک منہ ملاحظہ کیجئے :

خواجہ امان کی عبارت ہے : ” راوی کہتا ہے کہ اس روز مہر سلاق دیو پر پورہ طاقت کو گیا تھا۔ تا نصف شب اپنے برادر بخور دے ہاں مہمان رہا۔ اس نا بکار نے حیوانات، قوی، ابنہ اور شراب غلیظ سے اکثر دیوانہ فطرت کی دعوت کی تھی۔ جب نصف شب گزری مہر سلاق دیو اپنے بھائی سے خواجہ امان، عبارت ہوا : اور کہا میں اس وقت پردہ دنیا میں کسی کو پہچاؤں گا اور شراب کے نشہ میں اس آدم زاد کا فخر خوش سمنوں کا۔ ہر چہ اس دیو مہمان دار نے کہا کہ یہ کیا دقت جاننے کا ہے مہر سلاق دیو نے نہ مانا۔ ۴

یہ عبارت لکھنؤ والے ترجمہ میں یوں ہے :

” اب وہ لکھنے دیو کے عرض کئے جاتے ہیں کہ جب وہ حرام زادہ چرغا دیو یعنی مہر سلاق دیو طاقت میں گیا۔ خواجہ امانین میں سے ایک کا مہمان ہوا۔ اور آدھی رات تک سوتے ہوئے نا تھی، دیکھ، بخور، طبعان چہ ہے، گونشیں کھایا کیا، یا لگو رہا ہے۔ جو شراب میں پڑے پڑے بغیر آتش جوش کھایا کئے تھے۔ جن میں بعض سے ملے اٹھتے تھے۔ ان کی شراب پیا کیا۔ نشہ میں یہ تو تک سمجھی کہ پیوں آدم زاد کا گانا سنوں۔ بھائی سے رخصت ہوا۔ یہی اس کی شرح چلا۔ ۴

حسن طرح و دلی اور لکھنؤ کی تحریری دو داستانوں میں مقامی مذاق نے طرح طرح کے فرق پیدا کئے ہیں اور ایک اختلافِ مادہ و دوا طول، ایک سادگی و دوسرا رنگینی، ————— ایک راوی اور دوسرا مستغنیہ کی طرح متماثل ہے۔ اسی طرح کہ جاتے والے راستہ اٹھانے میں بھی یہ فرق نمایاں ہے۔ چنانچہ وہی کے آخروں داستان گو میرزا قلی کی داستانوں کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ سادہ سادہ اور فصاحت اس کا جوہر ہے۔ لکھنؤ سے داستان گو یوں نے اپنے لیے الگ الگ رنگ مخصوص کر رکھے تھے۔ اور ہر ایک اپنے رنگ میں فخر و اور ممتاز سمجھا جاتا تھا۔ کسی کو بزم کے مرتبے کیچھے میں بدل طوطی حاصل تھا، کوئی رزم آرائی میں اپنا جواب تھا، کوئی شعروں کا کثرت سے داستان کو بڑھاتا تھا اور کسی کی داستان ایک ————— زعفران رازقی کہ جو اسے سمن ہنسی سے بول پڑے جو جانا بخور، ہر ایک کا ایک نرالا لہذا اور رنگوں کا یہ متنوع سنسنہ، ان کے مذاق کی رنگینی اور بے تعلوئی کی بنا پر تھا۔ لیکن یہ ساری رنگینی، ساری بے تعلوئی جیسے ایک خاص زمانہ کے لیے تھی۔ سنسنہ زمانہ وہ ساری صفتیں تھیں۔ جو ہم کو دیں۔ داستان گو یوں کے قدر وادان اور قدر شناس نہ رہے تو داستان گو داستان طرازی میں خوں جگر کس کے لیے کھپاتے بغیر یہ جو کہ بزم کی بڑی کے ساتھ نہیں ملے گی۔ داستان سنسنہ والے بھی کچھ اور سنسنے والے بھی، پڑھنے والے بھی اور لکھنے والے بھی اور کچھ حصر کے لیے داستانوں کے سارے حجم و فخر طاق نیساں کی قدر نہ کریں گے۔ لیکن زمانہ کو ان کی گوشہ نشینی اور گوشہ گیری بھی گراں گزری اور اس نے انھیں ان طاقوں سے ناز کر کر دینا شروع کیا۔ کر دینے اور دیکھنے والوں نے ان دفتروں کو راہ کا ڈھیر سمجھ کر دیا تھا، لیکن راہ کو اٹا پٹا تو اس میں سے بہت سی چنگاریاں جگنو اور ستائے بن کر چھانکیں اور نظروں کو ان میں شمش نظر آئی، لیکن کچھ نظریں ایسی بھی تھیں جنھوں نے ان چنگاریوں میں تو کچھ نہ پایا اور راہ کے ڈھیر کو سب کچھ سمجھ بیٹھے اور لکھنے والے کی اس میں عیب نہ کھائے ————— اور اس طرح جہاں تھوڑے بہت لوگ اب بھی ایسے باقی تھے جن کے نزدیک داستانیں ایک خاص زمانہ اور خاص مذاق کی بڑی دلکش تصویریں تھیں، ایسے لوگ بھی خاصی تعداد میں پیدا ہو گئے

حقے جو ہر چیز کو صرف اسی نظر سے دیکھتے تھے جوئے زمانہ اور اس نئے زمانہ کے مذاق نے انھیں عطا کی تھی۔

کہا جائے گا کہ داستان ایک دفتر تبہ معنی ہے — ایک ایسے ماحول کی پیداوار جو بھاری تاہم پختہ اور ہمارے تمدن اور اخلاق کی روایات پر ایک بدنامہ دارغ سے بدوہ یا تو ایسی زندگی کے ترجیح ان اور آئینہ وادیں جو ستر تا ستر زندگی کی کشمکش اور اس کے فطری تقاضوں سے بے نیاز ہے اور اس زندگی کے معجزہ جس کا سرے سے وجود ہی نہیں — جنوں، دیوں، پریوں اور جادو گروں کی دنیا، اس دنیا میں جو انسان پلٹے پھرتے نظر آتے ہیں وہ انسانی خصائص سے عاری ہیں۔ ان کی فوری ساخت اور مرثت غیر فطری ہے۔ ان کے جذبات، احساسات، فکر، عمل اور رد عمل سب چیزیں عام انسانی دنیا کے تجربہ اور مشاہدہ سے بعید اور محم وادماک سے بالاتر ہیں۔ ان میں خیال کی بد لگائی دے لگائی ہے — یہ داستانیں فن کے احساس تناسب سے عاری ہیں۔ ان میں برا مختصار ہے نہ اعتدال، ان کا سارانی وحدت اثر کے لطف اور کیفیت سے خالی ہے۔ یہاں واقعات ارتقاء کی فطری منازل طے کئے بغیر برب و نشاط کی مزلی آخر تک پہنچ جانے ہیں — غرض داستانوں میں فن ایک بھی نہیں اور عجیب ہزار۔

اب اگر کوئی ان سوطر کی عجیب جویموں اور نکتہ چینیوں پر اس نظر سے غور کرنے لگے کہ کیا داستانوں میں کچھ کچھ چھانیں، تو ایک چیز تو اسے بھی محسوس ہوتی ہے، اور وہ یہ کہ یہ داستانیں ہر طرح کے طب وایاس سے بھری پڑی ہیں۔ لیکن انھیں ان کی نظر کو اس میں حسن بھی نظر آتے ہیں اور جن باتوں کو عجیب کہنا آتا ہے۔ وہ داستانوں کے لیے ناگزیر ہیں — یا یوں کہیں کہ ان کے بغیر داستان داستان ہی نہیں بنتی۔ داستانوں پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ ان کی تعبیر و شکل سرے سے غیر فطری عناصر سے ہوتی ہے۔ جن، دیوں، پریاں، جادو گر، سمہر، اہم، عظم، تجویم، لور، نقش، قلب، ماہیت — اور ان سب کے ساتھ ایسے ہر جو طاقت جو اغزی، جرأت، ہمت، وجود و سخا، محبت، ایثار، ہر چیزیں عظیم المثال ہیں اور ایسی عورتیں جن کے حُسن و محبوبی کی دونوں جہانوں میں نظیر نہیں۔ یا ایسے انسان جو بدی کا مجسمہ ہیں اور ساری بدیاں ان میں ایک وقت جمع ہیں۔ ایک بڑی سے بڑی مہم کو سر کرتا ہے، ہفت خوں طے کرتا ہے، ادائیگی ہر ادائے عشق کو پہنچاتا ہے اور دوسرا اپنی ساری غیر معمولی قوتوں کے باوجود پیسے سے متعامد ہوتا ہے تو دوسرا ہی فعیب ہوتی ہے۔ وانا و دنیا آؤ، واعظ دنا ص طو سے ہند، احتند و ہماست کے دریا بہا دینے والی چھلیاں، ہمدرد و ہمدرد گیدر، غرض ایسی بے شمار باتیں جو نہ ہمارے مشاہدہ میں آتی ہیں، نہ تصور و خیال کے احاطے میں آتی ہیں، اس دنیا کے حقائق ہیں۔ نئے زمانہ کا نقاد ان سب چیزوں کو غیر فطری کہتا ہے اور اسی بنیا و پرو داستانوں پر سوغتی اور دیدنی ہونے کا حکم لگاتا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ غیر فطری عناصر داستان کے فطری عناصر ہیں۔ انھیں سے داستان داستان ہے۔ یہ نہ ہوں تو داستان داستان نہ رہے — اور داستان کی یہ ساری خصوصیتیں خیال کی رفعت اور بلند پرواخی اور فکر اور تصور کی قدرت اور وحدت طرازی کا کرشمہ ہیں۔ خیال داستانوں کو نئے سے نئے رنگوں میں رنگتا اور تجربہ آفریں اور پر ہیئت واقعات سے بزم کی تصویریں جلاتا اور درم کی صفت آرائیاں کرتا ہے۔ اس رنگین، ناکھ، ہجرت و استعجاب اور رفعت و شکوہ والی دنیا اور خیال کی بلند پروازی اور وحدت طرازی میں لازم ملزوم کا رشتہ ہے۔ اور یہی دونوں لازم ملزوم مل کر داستان کے فن کی تخلیق کرتے ہیں۔ یہی دو چیزیں داستان کا پورا فن ہے اور اس لیے ان کی موجودگی داستان کو فن سے عاری نہیں بناتی بلکہ حقیقت یوں ہے کہ یہ دونوں چیزیں نہ ہوں تو داستان فن کے لازم سے عاری ہو جائے۔ کہ یہی داستان کا فن ہے۔ لیکن داستان کا فن یہیں مکمل نہیں ہو جاتا — زندگی کا یہ غیر فطری انداز اور خیال کی بے ماہ روی اور بد لگائی فن کی تکمیل فن کی ابتدائی منزلیں ہیں۔ جو ارہ و صرف ان ابتدائی منزلوں میں اُلجھ کر رہ جائے اس کا مقصد و مقصود حیرانی و سرگردانی کے سوا کچھ نہیں۔ اس لیے

اچھے داستان گوئوں نے ان دونوں ابتدائی منزلوں کو ابتدائی منزلیں سمجھ کر اپنے منصب کے دوسرے مطالبات اور تقاضیات پر بھی نظر رکھی ہے اور جس حد تک اور جس نسبت سے ان مطالبات کو پورا یا بے وقرا کرنا ہے اسی حد تک اور اسی نسبت سے شہرت و بقائے دوام سے ان کا رشتہ قائم ہوا ہے۔

یہ سمجھئے کہ داستانوں کی دنیا اور اس دنیا کے بسنے والے عجیب و غریب الحلقہات ہیں، ان کی ہر بات کا انداز غیر فطری ہے جن کا مشق کا، جرأت و روانگی کا، کم و بیش کار کا، شہر کا، سیر چیز کی ابتدا میں انتہائی جھلک ہے، ہر بات مثالی ہے لیکن اس مثالی دنیا میں فن کا ایک تقاضا اور ایک مطالبہ ہے۔ اور وہ یہ کہ اس دنیا کی ساری چیزوں میں ان کے عجیب کے باوجود آپس میں ایک خاص تناسب ضروری ہے کہ انسان بھی ایسے ہوں تو ان کے مرقع مقابل بن سکیں۔ پریوں کا حسن ملک فریب ہے تو عشق بھی مجنون سرشت ہو۔ اس دنیا کی ہر بات کی تعبیر اسی دنیا کی ہر بات سے ہونی چاہئے جب یہاں انسانوں کی معمولی دنیا میں تو معمولی انسانوں کے سے عمل اور اخلاق کی دنیا موجود ہے۔ اعتدال کے منافی اور تناسب کے خلاف ہے۔ داستانوں میں فن کا وہ تناسب اور توازن تلاش کرنا جو نئے زمانہ کے ناول اور افسانہ کا ماہر الاہلیا ہے۔ بڑی عجیب سی بات ہے۔ لیکن اس کی پوری فضا اور پورے ماحول کے مختلف عناصر اور اجزاء میں تناسب کا احساس فن کا ایک لازمہ ہے اور فن کے اس لازمہ کی طرف سے بے توجہی اور بے نیازی یقینی طور پر فن کے لیے بڑا عجب ہے۔

لیکن فن کی کسی کمی کو جو عجب محض اس لیے نہیں کہ: جتنے کہ وہ کی بجائے خود کو فی اہلیت رکھتی ہے۔ فن کے کسی ایک عنصر کے فقدان کو اس لیے قابل توجہ سمجھا جائے کہ یہ فقدان دوسرے فن عناصر پر بھی اثر انداز ہوتا ہے اور اس طرح ایک عجب بہت سے عجب بن کر تحقیق، فنی تہذیب اور عظمت کو متاثر کرنا ہے۔ داستان بھی فن کے اس نازک تالوں سے سترائیں۔ داستان میں جہاں ایک طرف ہم اس کے مختلف عناصر میں پوری زندگی اور پورے ماحول سے مطابقت اور مختلف اجزاء اور عناصر کے باہمی تناسب پر زور دیتے ہیں۔ ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ داستان کے فن کا ایک بڑا خاصا یہ ہے کہ اس میں لطیف داستان یا افسانوی کشش اور دل نشینی بھی موجود ہو۔ اگر یہ بات زربے تعبیر میرے سے داستان کا وہ سارا تصور جو کمینگی خیل اور قدرت و ندرت کے محسن پر قائم ہے پارہ پارہ ہو جائے۔ لیکن خود اس لطیف داستان اور افسانوی دل کشی کا انحصار

اسی مطابقت اور تناسب پر ہے جس کا اپنی میں نے ذکر کیا۔ اور اس روانیت اور اس کے بولمکوں اور گوناگون مظاہر پر جھین تقید جدید کے ربا سے غیر فطری ہونے کی سند عطا ہوتی ہے۔ لیکن داستان کی محبوبی کا یہ بہت تراشوت ہے کہ غیر فطری، عوام کا منبع و مرکز ہونے کے باوجود اس دنیا کے رہنے اور بسنے والوں سے ہماری ہمیشہ قائم رہنے والی شناسائی ہے۔ اور جو جب ایسے ناموں کی جست و تب کرنے بیٹھے ہیں جھین یا نواد رکھنے کو جی چاہتا ہے یا یاد رکھنے پر مجبور ہیں جن کی کشاکش ہماری کشاکش جن کی کامرانی ہماری کامرانی اور جن کے اسرار و دوزخا اسرار و دوزخ ہیں تو غیر عادی اور ان کے لشکر کے بعض سپاہی، امیر و مہر، خواجہ بدیع الجمال، ملکہ انجن آرا، باغ و بہار کے پھلے درویش کی محبوبہ، ہشتاپڑ کے دربار کی حسین اور دانشمند بیٹی اس نہرست کی زینت بنتے ہیں۔ اور یہ نام وہ ہیں جو داستانوں کے سارے دفر کا ایک سرسری سا تصور بغیر کسی گوشش کے فکر کے سامنے آتے ہیں۔ یہ کو دار داستانوں کی مقبولیت کا ایک خاص پہلو ہیں۔ داستانیں انہیں کے کارناموں کے ختم دفر ہیں اور ہم ان مضمر دفر کو ان کے سارے بوجھ کے باوجود اس بے پڑھنے، سننے اور سنلے ہیں کہ یہ کارہائے نمایاں انہوں نے انجیم دیئے ہیں جھین داستان کو اور داستان نگار کے فن سے ہماری دلچسپی کامر کر بنایا ہے اور ہمارا جی چاہتا ہے کہ اگر ہم اور کچھ ذکر سکیں تو کم سے کم یہ تو ضرور جان لیں کہ ان کی باقصد زندگی کے قیمتی لمحے کس طرح بسر ہوئے ہیں، اور کس طرح وہ بڑی سے بڑی محم کو سر کرتے اور سخت

سے سخت ہفت نواں کوٹے کر کے کاسرائی اور بارادی کی منزلیں قصود کو پہنچتے ہیں۔ ان کی زندگیوں میں رفعت، عظمت، مروت، انسانیت، کرم، افتاد، شہادت، ہمت، ہوازدی اور بڑی سے بڑی مصیبت کے آگے سیدہ سیر ہوئے اور بالآخر منظر و منظر ہونے کی جو صفات مجتمع ہیں ان میں انسان کو ایسے خوابوں کی تعبیر نظر آتی ہے جو اس کی انتہائی آرزو کے باوجود حقیقت نہیں بن سکتیں۔ —————

داستانوں کا یہ غیر معمولی احمقانہ پہلو بھی داستان کے فن کا ایک لازمی عنصر ہے اور داستان گو اس کے اظہار میں جس حد تک اعتدال و توازن قائم رکھنے میں کامیاب ہو اور جس حد تک اپنی شخصیت کو واضع اور مصلح بننے سے محفوظ رکھ کر داستان گو کی شخصیت میں مدغم کرے اس کے کردار پڑھنے والوں کے لیے زیادہ حقیقی بنیں گے، ان سے اسے موافقت اور لگاؤ پیدا ہوگا، اور اس طرح داستان کی چھوٹی سے چھوٹی چیز اس کے لیے کشش اور دلچسپی کا موجب ہوگی۔ —————

اور یہی کشش اور دلچسپی ہر کہانی اور ہر داستان کے فن کا آخری پہلو ہے۔ آخری ہی اور پہلا بھی۔ داستان کی ابتدا اور اس کی انتہائی کے اسی اصول کی پابند ہے اور داستان اپنی طوالت، اپنی غیر یوزویت، اپنے عدم توازن و اعتدال اپنے غیر فطری عناصر، اپنے کچھ رو اور بے راہ رو خیال کے باوجود دلچسپ مزور ہیں اور اس طرح فن ایک اہم، سب سے اہم، ایک بڑا، سب سے بڑا اعضا پورا کرتی ہیں۔

مرزا رسوا کی تنقید نگاری

ڈاکٹر محمد حسن

اردو میں ادیب کی مابینیت اور اس کی نفسیانہ توجہ کی طرف بہت کم نقادوں نے توجہ کی ہے۔ عام طور پر ادیب کو ایک مسئلہ حقیقت سمجھ کر اس کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اور اس حصے میں بھی اس پہلو پر زیادہ زور دیا گیا ہے کہ اس کے رشتے ادبی روایت سے ملنے جائیں۔ اس عام میلان نے پیش نظر ایک ایسے ادیب کے تنقیدی واسطے چرچا دینے کی حد تک مہدیدیں۔ جس کی ساری شہرت ناول نگاری کی بنا پر قائم ہے۔ مرزا فتح محمدی رسوا کو ادبی دنیا "امراؤ بان اور ان کے معنی کی حیثیت سے جانتی ہے لیکن وہ درحقیقت بڑی جامع صفات کے انسان تھے۔ فلسفہ، ہیئت، علم نجوم، یہاں ہی، سائنس، الہیات اور اخلاق بھی پڑان کو غیر معمولی تہمت حاصل تھی۔

اس مقصد و مقاصد میں ان کے چند تنقیدی مراسلات کا تقارن کرنا مفید ہے۔ اس وقت اس قسم کے تین مراسلات میرے پیش نظر ہیں۔ یہ مراسلات کے دوران سے رسالہ "میں" کے مختلف پرچوں میں شائع ہوئے تھے اور انہیں بہت عرصے بعد مرزا احمد مادی عزیز لکھنؤ نے "رسالہ زمانہ" کا بیورو میں شائع کیا تھا۔

مرزا رسوا نے شعر و شاعری کے مسائل کو دوسرے تمام علوم سے مربوط کر کے پیش کیا ہے۔ پہلے مراسلے کے پہلے پیراگراف میں اپنے مقصد کی وضاحت اس طرح لکھتے ہیں:-

"میرے اس خط اور دوسرے خطوں کا جو اس کے بعد لکھے جائیں گے یہ نشانہ ہوگا کہ علم شرکی ان غریبوں کو جنہیں اردو زبان کی شاعری و صورت و رنگ ہی ہے حتیٰ الامکان بیان کر دوں۔ مگر یہ سنت مشکل ہے کہ ان امور کو سمجھنے کے لیے جنہیں میں ذکر کیا جاتا ہوں۔ مادی سائنس کی علم نفس سے واقف ہونا بہت ضروری ہے اور اس علم کی کوئی کتاب بالکل اردو میں نہیں ہے۔ شیخ برعل سینا کا ایک رسالہ نادرسی زبان میں میرے پاس تھا اور اس کا ترجمہ بھی میں نے اردو میں لکھا تھا اور تحقیقات جدید کے موافق بعضے حاشیہ تعلقات اس پر زیادہ کر دیئے تھے وہ تم ہو گئے؟"

شرکے کے بارے میں ایک واضح اور صاف بیان دوسرے مراسلے کی ابتدا میں ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مرزا کی فکر پر اخلاق اور الہیات کا اثر غالب تھا۔ اور اسی کے پیش نظر انہوں نے مطالبین کو "الغائی اور اہل حق" قرار دیا ہے۔ اور اخلاق سے ان کا بلا واسطہ ربط طوطا دکھا ہے۔

" میں اور جنیات سے قطع نفکر کے عرف بہ کہتا ہوں کہ بعض اشعار اخلاق کے لیے مفید ہیں اور بعض مضر۔ مثلاً وہ اشعار جن میں اخلاقی مضامین ہوں۔ وہ جسمِ صُن میں داخل ہیں۔ اور جن میں نفس پرستی کے مضامین ہوں وہ تہیج ہیں۔ لیکن ہمارے اور ہمارے بعض معاصرین کے بعض اشعار بلکہ ہمارے اکثر اشعار ان دونوں صنفوں سے معرکی ہیں۔ نہ ان میں کوئی صُن ہے نہ تہیج۔۔۔۔۔ ایسے شعر کیا ایک فعلِ بحث ہے؟

شاعری کا مگر اکثر تعداد و قرار دیا گیا ہے۔ حالی تک نے اسے اکتالیہ سے زیادہ دینی بتایا ہے۔ مرزا رسوا نے اس باتے ہیں بھی ایک دلی چپ بات کہی ہے۔ مضامین کو "الغائی" اور "الہامی" مانستے ہوئے اور موزونیت کو خدا و صلاحیت تسلیم کرنے پر بھی وہ اس بات کے قائل ہیں موزونیت کی اوسط استعداد عام طور پر سارے انسانوں میں پائی جاتی ہے:

" فطرت نے ہر انسان کو اوسط استعدادات عطا کیے ہیں۔ فطرت کے قواعد کلیہ میں اتفاقات و عوارض کو بہت کم دخل ہے۔ مگر خاص سے زیادہ غریب و مست اور مہم خاص سے زیادہ پرصورت۔ مثلاً شکل مل سکتے ہیں۔۔۔۔۔ اگر فطرت نے کسی کو موزوں طبع نہیں پیدا کیا تو وہ شعر موزوں نہ کہیسا موزوں پڑھ نہیں سکتا۔ مگر ایسے ناموزوں طبیعت و اسے شکل سے میں گئے لہذا اوسط درجہ کے مبالغہ و اسے اکثر موزوں طبع بھی ہذا کرتے ہیں؟

اردو تنقید میں مذاقِ سیم کی ایک منفی حیثیت قائم کرنے کی یہ ایک ابتدائی کوشش ہے۔ مرزا رسوا نے اس کی توثیق میں ملی اور معنی اثرات کو پوری طرح غور دیکھا ہے۔ اور جہاں فطرت کے خدا و ادیبانے موزونیت کا ذکر کیا ہے۔ وہیں یہ بھی ملاحظہ کر دی ہے کہ:-

"..... ملک، مزاج اور عادت کو بھی اس امر میں بہت کچھ لگا دیتے۔ فطرت نے ہر ملک کے مناسب ایک صورت خاص اور ایک طبیعت مخصوص پر باشندہ کو مہیا کیا ہے۔"

مذاقِ سیم کی مہمیت، اس کے نشو و نما اور تاریخی اوتقار پر مرزا رسوا نے تفصیلی بحث نہیں کی ہے۔ لیکن اوسط درجے کی موزونیت کو قومی مزاج کی خصوصیت قرار دے کر گویا انہوں نے شاعر کو بغیر معمولی طور پر۔ اور خدا و موزوں طبع میں قرار دیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے ملک اور قوم کے مزاج کا آئینہ دار بتایا ہے۔ اس طرح شاعر اور غیر شاعر میں فرق واضح کر دیا ہے اور فریق نہیں ہوتا۔ دونوں موزوں طبع ہوتے ہیں۔ ان ایک کی موزوں طبعیں اوسط درجہ کی ہوتی ہے اور دوسرے کی زیادہ ترقی یافتہ۔

موزوں طبع کی اس ترقی یافتہ شکل تک پہنچنے کا راستہ کیا ہے؟ مرزا رسوا نے اسے "ابتدا کی درستی" قرار دیا ہے۔ اور اس نتیجے سے ان کا نظریہ قدیم استاد و شاگردی کے اداسے تک پہنچ سکتا ہے۔ موسیقی کی مثال پیش کر کے کہتے ہیں۔

" اکثر استعدادات بہ سبب عدم مزاہلت کے ضائع ہو جاتے ہیں یا بہ سبب عدم علم کے ابتداء غراب ہو کر درستی کے قول نہیں رہتی۔ جو لوگ ابتدا میں کسی کامل اُستاد سے موسیقی حاصل نہیں کرتے۔ اور ابتدا ہی میں سر جو رہ چیک نہیں کر لیتے ان کو چارواں ادب سے اصول لاسنے کی مشق ہو جاتی ہے لہذا

ہر مبدی کو اپنی ابتدا کی درستی کا خیال نہایت ضروری ہے۔ اگر ابتدا ہی میں غراب ہو گئی تو استاد کامل کی کوششوں سے بھی کوئی اثر مرتب نہ ہوگا؟

مرزا نے خدمتِ قوت کی مثال لکھنؤ کے امام طرہ شاہی سے دی ہے اور اس بے روح صنعت گری سے اپنی برکت کا اظہار کیا ہے۔ جو لکھنؤ میں شاہی کی بنیاد بھی جاننے لگی تھی:

”مثلاً ہمارے شہر کے اکثر شعراء اور ان کے تلامذہ کو مناسبات الفاظ کا لحاظ حد سے نہا رہے
اگرچہ یہ ایک صنعتِ شعری ہے اور عنایتِ کام میں داخل ہے۔ غراب سلیقہ شعرا اس کو موجبِ شہر
میں شہر کرنے لگا ہے۔ اور اس پر عادت کا اثر اس قدر شائع و ذائع ہو گیا ہے کہ اب اس کا ترک
من قبیلِ عیالات سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح بعض تشبیہات جو کسی اگلے استاد نے کسی موقع پر نظم
کو دی تھیں ان کی اب اس کثرت سے چٹھاڑ لی گئی ہے کہ سننے والوں کو ان سے نفرت
ہو گئی۔“

اس بحث کو مرزا نے ایک دوسرے موضوع سے وابستہ کر دیا ہے۔ انہوں نے کہا یہ سوال اٹھایا ہے کہ تشبیہ اور استعارہ
کے استعمال میں، روایت اور تجربہ کا حصہ کیا ہونا چاہیئے۔ کیا شاعر کو آزمودہ تشبیہیں استعمال کرنی چاہئیں یا تجربہ اور براہِ راست مشاہدے
سے نئی تشبیہوں کی تشکیل کرنی چاہیئے۔ یہیں مرزا دوسرے ایک دوسرا سوال یہ قائم کیا ہے کہ انسانی ذہن کی تشبیہ و استعارے سے کیوں
لذت حاصل ہوتی ہے۔

”ان امور میں صرف قوتِ باعثِ لذت ہے۔ یعنی قافی کا قولِ سامع کے لیے صرف قوت کا
باعث ہوتا ہے۔ قوت سے ہاں قوتِ ذہنی مراد ہے۔ تو یہ مزید اس کی یہ ہے کہ انسان
میں دو موجبِ لذت کے ہیں (۱) استعمالِ قویٰ بحالتِ صحت (۲) ارتقاءِ علم اور ذہنی استعمال
قویٰ ایک حدِ خاص سے متجاوز کرنے کے بعد موجبِ الم ہو جایا کرتا ہے۔“

آگے چل کر لکھتے ہیں:

”تشبیہات موجبِ دبعید کے سننے کے بعد سامع کو قوتِ فکر کے استعمال کا موقع ملتا ہے۔ اور یہی
موجبِ لذت ہوتا ہے۔ تشبیہ کی قدرت ایک استعجابِ خاص کا باعث ہوتی ہے اور استعجابِ خود
ایک غیبتِ دائمی کا نام ہے۔ کیونکہ اس صورت میں دماغ کے ان مرکزوں تک اثر پہنچتا ہے۔ جو
ایک مدت سے بیکار پڑے تھے۔ تشبیہاتِ قریب و قریب میں استعمالِ قوت کا موقع ملتا ہے نہ
وہ باعثِ استعجاب ہیں اس لیے ان میں کسی قسم کی لذت نہیں ہے۔“

مرزا نے اس منزل میں بھی اقتدار پر زور دیا ہے۔ ان کے نزدیک تشبیہ صرف اسی وقت سرتِ نخل ہو سکتی ہے جب قوتِ
فکر کو مدِ امتداد سے زیادہ محنت نہ کی جائے۔ اگر اس کی نازک خیالی اہم، وقتِ ممنون اور معنی بندی کے مراحل تک پہنچ جائے گی تو
اس کی لذت ختم ہو جائے گی۔ اور بجائے انبساط کے انقباض کا باعث ہوتی ہے۔

”بعض صاحب معنی بندش رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ دہلیا بہت تھے۔ جن کے ہر شعر کو سمجھنے کے لیے قوت فکر کو عدم امتداد سے زیادہ محنت کرنا پڑتی تھی.....“ داغ کے پردے بہت ہی نازک ہیں۔ ان کی لذت کے لیے نازک خیالوں کی مزدوت ہے۔ نازک خیالی اور وقتِ مضمون دو امر جدا گانہ ہیں۔ ایک کے دھوکے سے دوسرے کو رہنمائی ملتی ہے۔“

نئی تشبیہوں کی تلاش کے لیے مرزا ستوائے ادبیات اور مطالعہ کائنات سے پیدا ہونے والے دوسرے تمام علوم کا ربط قائم کیا ہے۔ اور یہ ربط محض نادر تشبیہوں کی تلاش کے لیے موزوں نہیں ہے بلکہ اسی ربط کی بنا پر شرک دوسرے تمام علوم کے پہلو پہ پہلو رکھا جاسکتا ہے اور شعور کے اعلیٰ ترین حلقہ میں جگہ دی جاسکتی ہے۔ مرزا ستوائے نقیہ کی اور کئی شاعری پر سخت الفاظ میں تنقید کی ہے اور فطرت سے جس وابستگی کا مشورہ دیا ہے وہ ایک معنی میں محال کی پہچان شاعری کے شعور سے بھی زیادہ جھٹکتی ہے۔ اردو شاعری کے عام نقیہ پر بھیجے کے بارے میں لکھتے ہیں،

جس قسم کے استاد آج کل ہمارے گھٹنوں میں شائع ہوتے ہیں۔ کیا وہ شاعری جزو دینیت اور پیغمبری کے معنوں میں ہو سکتے ہیں۔ واللہ ایسا نہیں ہے اس کا ایک سبب کم علمی ہے۔ علم سے بیری مراد بہت سی کتابیں پڑھ لینا، کم از کم سلسلہ نفا میں کوئی نہ کوئی طور سے کام کر لینا نہیں ہے عقل اور فطرت تجھیں علم کے لیے کافی ہے مگر عقل سے کام لینا اور فطرت میں تصرف کرنا کسی قدر محنت چاہتا ہے اور اس کی جہن فرست نہیں۔

جس قدر مضامین پیش پا افتادہ تھے، ان کو الگ لکھنے اب ہماری مستادی صرف اس سے استنباط کرنے میں حرج ہوتی ہے۔ اور اگر اس کا سبب یہی ہم کو نہیں تو ان کو اور خراب کہتے ہیں۔ ہماری شہسوی سماجی اور کائناتی ہے نہ نظری۔ ہم خود فطرت کا مشاہدہ کر کے غور کرنے اور کتاب فطرت سے مضامین پیدا کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ اگلوں کے مضامین کو اپنے غفلوں میں دہرا دینا بجا خاص کام ہے اور اس پر ہم فخر ہے۔

اس تقلیدی روش اور استعارہ و استعارہ خیال بندی پر مبنی شاعری میں سخت تنقید کی ہے۔ مگر اس کا اصل ان کے نزدیک اخلاقی شاعری اور نیچلے مضامین کی فراہمی تھا۔ مرزا دتو اسے اس مسئلے کو پورے علمی پس منظر میں پیش کیا ہے۔ اور اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا کے نزدیک اخلاق کا تصور محدود نہیں تھا۔ اور شاعری کو وہ محض جذباتی ابالی نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے شعور کا ایک بزرگ ذریعہ گردانتے تھے۔ دوسرے سرائے میں ایک نکتہ بھی:

علوم طبیعیات، الہیات اور شریعت ————— بکرا ان کے مقاصد جدا جدا ہیں اور شاعر کو حکیم سے
اول مرتبہ پر رکھا ہے۔ گر حقیقت یہ ہے کہ حکیم سے وہ کام نہیں ہو سکتا جس کو شاعرانہ ذکاوت خیال
انجام دے سکتا ہے۔ غفلت سے دقیق مضامین کو انڈکنا اور اس کو کام فہم اور مؤثر الفاظ میں کہہ
جانا خاص شاعر ہی کا کام ہے اور کسی سے نہیں ہو سکتا۔ میں اس سے زیادہ ترقی کر کے کہتا ہوں۔

کہ حقائق اور معارف کو جس پیرائے سے شاعر ادا کرتا ہے نفسی کی مجال نہیں کہ اسے بیان کرے۔ خیال کے آئینہ خانہ میں عالم جبروت کی جھلک نظر آتی ہے۔ پیاری پیاری صورتیں مجسم ہوتی ہیں اور صورت و حرف کے ذریعے سے سامع تک پہنچتی ہیں۔

شاعر اور محکم کو مرزا آسمانے ایک ہی صفت میں لکھا کر دیا ہے۔ بلکہ شاعر کا مرتبہ محکم اور فلسفی سے بہت کچھ زیادہ بتا رہا ہے۔ آگے چل کر لکھتے ہیں:-

"شاعری کی وسعت مثل فصاحت عالم کے لائقا ہی ہے۔ اس کی جولا نگاہ فلسفہ کی حدود سائی سے کہیں آگے ہے۔ جن امور کو فلسفہ نے اب ثابت کیا ہے۔ شاعروں کی تخیل کئی قرن پہلے ان کو پا چکی ہے۔ شاعر اعلیٰ درجہ حکمت کو اس طریقہ دلآویز سے کہہ جاتے ہیں۔ کہ فلسفی کو ان کے بیان کرنے کے لیے بڑی بڑی دقیقیں پیش آتی ہیں؟"

اس فقہار سے مرزا آسمان کا نظریہ ادب اخلاقی یا فطرت پرستانہ سے کہیں زیادہ نفسیاتی معلوم ہوتا ہے۔ جو اس زمانے کے عام پس کے پیش نظر کافی تعجب خیز بات ہے۔ پہلے ہی مراسلے میں مرزا آسمان نے علم النفس کی عام اصطلاحوں سے بحث کی ہے اور صرف ان کے معنی اور مفہوم کو احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کو متبصر شاعرانہ نظریہ ادب کے سلسلے میں استعمال کیا ہے:

"..... ایسی چیزوں کو جو ہر ذہن کسی حاسہ کے معلوم ہوں، محسوس کہتے ہیں۔ ذہن کے اس فعل کو جس سے محسوس کا علم ہوتا ہے اس حاس کی تعریف یہ ہوتی، احساس مراد ہے۔ اس اثر کے شعور سے جو کہ نظام آلی یا کسی موثر کی تاثیر سے حادث ہوتا ہے؟"

"..... احساس کے لیے شے محسوس کا حاضر ہونا شرط ہے۔ مگر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شے کی صرف ایک ہی صفت کا ہمیں احساس ہوتا ہے اور سب صفتیں ہم کو یاد آ جاتی ہیں۔ اگرچہ وہ بالفضل غائب ہوں..... یا ایک ہی حاسہ کے محسوس نے اسی حاسے کی ویسی ہی محسوس کو یاد دلا دیا..... (۱) ایک حاسے کے محسوس نے دوسرے حواس کے محسوس کو یاد دلا دیا۔"

اس کے بعد لزوم ذہنی کے قوانین سے بحث کرتے ہیں۔ اودنی ذن ماثت اور تانان ذن مقارنت کا تذکرہ کرتے ہیں۔ کہ اکثر چیزیں جبریا تو ایک دوسرے کے مائل ہونے کی وجہ سے یاد آتی ہیں۔ یا ایک ہی وقت میں ایک ہی ساتھ شاہدہ میں آنے کی وجہ سے یاد آ جاتی ہیں۔ خواہ وہ مائل ہوں یا نہ ہوں۔

پھر ہر احساس کو زمین و آسمان میں تقسیم کرتے ہیں:-

"(۱) شعور محض (۲) اس احساس سے خاص لذت یا الم کا حاصل ہونا (جسے آگے چل کر مرزا آسمان نے وجدان کہا ہے) (۳) وہ احساس کسی خاص ترکیب کا باعث ہو اسے مرزا آسمان نے ادوار سے

تعبیر کیا ہے، مثلاً گلاب کے چہرہ کو دیکھنے سے ایک تہیہ علم ہوا کہ اس کا رنگ، ایسا شگلی ایسی اور خوشبو ایسی ہے۔ یہ شعر مضمون ہے۔ دوسری ہر کو گلاب کا رنگ اور شکل کے دیکھنے سے یا خوشبو کے سونگنے سے ہم کو مسرت حاصل ہوئی یا مثلاً اس کا کانتا چہرہ جاننے سے ہمیں الم ہوا۔ یا وہ لذت اس حد تک پہنچی کہ گلاب کے پھول کو توڑنے کا ہمیں شوق ہوا۔ چنانچہ ہم نے اسے توڑنے کا قصد کر کے اسے توڑ لیا۔ اور کانتے کے چہرہ جاننے سے جو الم ہوا تھا، اس لیے اس سے بچنے لگے۔

پھر شعور کا تجربہ کرتے ہوئے اس کو بھی مختلف حقائق میں تقسیم کیا ہے، بچتے دیکھے کا نام ادوات قرار دیا ہے۔ اور اس کی تعریف اس طرح کی ہے: یعنی کسی چیز کے مجموعہ صفات کے احساسات سے اس چیز کو شناخت کرنا اور مزید تجرید و تعمیم کا بہتے یعنی چیزوں میں عموم اور خصوص کی نسبتوں کا قائم کرنا۔ صنف ذرا اور صنف کا قرار دینا مثلاً ایک خاص طرح کی شکل اور رنگ اور خوشبو کے اعتبار سے گلاب ایک نام رکھا گیا۔ یا ایسی بہت سی چیزیں کہ اگرچہ ان کی رنگت اور شکلوں میں اختلاف ہے مگر بعض اوضاع خاص کی وجہ سے جیسے جیسے ہیں۔ اس لیے ان کو پھول کہتے ہیں۔

تیسرے درجے کو اسمہ مال بتایا ہے جو جزئیات سے ملے اور کلیات سے جزئی پر خاص علم رکھنے کا نام ہے۔ اس استدلال سے بھی صنف زاد ہے جو کہتے ہیں۔ مثلاً زید غازی ہے، غازی غازی ہے، غازی غازی ہے، بلکہ انسان غازی ہے یا مثلاً گل انسان غازی ہے۔ زید انسان ہے بلکہ زید غازی ہے۔ یہ پہلی صورت کہ استقراء اور دوسری کو قیاس قرار دیا ہے۔ چونکہ تفہیل جو ایک قسم کے مجموعہ صفات کو ایک نام رکھنا ہے، مثلاً انسان کا نام ہے، اس تفہیل کو بھی مرزا رسوہ نے دوسروں میں تقبیح کر دیا ہے ”ایک ہر جو کہ جو کہ ہیں انہیں خداوندی عزت حق ان کو پھر دہن کے سامنے لانا“ دوسری قسمی صورتیں جو عالم غیبی میں موجود ہیں نہ ہوں ان کو ایجاد کرنا۔ یہ تفہیل وہ اصل فن کی بنیاد سمجھتی ہے۔ مرزا رسوہ نے ایک اصطلاح کے تفصیلی تذکرے کے بعد یہ صراحت کی ہے:

”بعض لوگوں کو یہ خیال ہوگا کہ تفہیل خواہ مخواہ ایک جدید اصطلاح ایجاد کی گئی ہے، حقیقتاً یہ وہی ہے جس کو تفہیل کہتے ہیں اور محاکات اور اشتراح اس کی دو قسمیں ہیں۔ بنیاد خواہ کرے سے معلوم ہوگا کہ تفہیل ایک شرط ذہن کی ہے۔ جس کا ذہا ابتر اسے فشو و نما سے موزا ہے اور جس پر دو دو تان نہ کر اور تقابلی کے قائم کئے گئے۔ جن کا ذکر مابعد ہو چکا ہے۔ اور تفہیل کا غور ذہنی ترقی کا آخری درجہ ہے۔ جس سے اکثر اذیان بہت ہی کم بہرہ یاب ہوتے ہیں۔“

ہمارے تنقیدی ادب میں تفہیل کے لفظ کو کافی جگہ پر دہائی سے استعمال کیا جاتا رہا ہے انگلستان میں (FANCY) اور (IMAGINATION) کی توجیہ و تفسیر میں کافی بحثیں ہو چکی ہیں۔ اولیس، برگ، کورن کے مختلف تفسیرات سے ان دونوں الفاظ کو واضح طور پر الگ الگ کر کے پیش کیا ہے اور تفہیل کو ایک ایسی تخلیقی قوت قرار دیا ہے جو صرف عالم غازی میں موجود اشیاء پہلے حال کیجئے ہوئے مشاہدات کی مہموز منت نہیں بلکہ خود اپنی کائنات کی تخلیق کر سکتی ہے۔ ہمارے ادب میں غالب مرزا پہلے تنقید نگار ہیں۔

جنہوں نے تخیل اور تخیل کے اس فرق کو نمایاں کیا ہے۔ اور اس طرح اس کی نفسیانہ فوجیہ ہے۔ آگے چل کر محاکات اور تخیل کے فرق کو بیان کرتے ہیں:

"اگر تخیل کے اور اس کی دونوں قسموں کے ساتھ ساتھ لفظ شاعرانہ استعمال کر کے ہم شاعرانہ تخیل شاعرانہ محاکات اور شاعرانہ اختراع کہیں تو ہمارے مطلب کے لیے مفید ہو سکتا ہے محاکات وہ حالت ذہن کی ہے جب کہ وہ چیزیں جو کبھی عداوتیں حاملہ تھیں ان کی صورتیں جو خزانہ حفظ میں موجود ہیں۔ پھر ذہن کے سامنے آجائیں اس کو اس طرح کہتے ہیں۔ [جس کو درود زور و زلفہ نے EMOTION RECOLLECTED IN TRANQUILITY کہا ہے۔ م۔ ج] اس کی دو قسمیں ہیں (۱) غیر ارادی (۲) ارادی اور باقائدہ ان کے مدت تک ذہن کے سامنے رہنے کے اعتبار سے کہتے ہیں۔ اور یہ بھی یا ارادی یا غیر ارادی۔ شاعرانہ محاکات کے لیے ان کا سلیقہ چاہیے تاکہ الفاظ کے ذریعہ سے ان کا بیان کیا جائے تو وہ عداوتیں مقبول ہو یا محبوب کسی قبضہ و لبط کا ہو۔"

یہاں قبض اور لبط کی تشریح طلب اصطلاحات کو بھی مرزا نے واضح کیا ہے۔ قبض ان کے نزدیک وہ حالت دہرائی ہے جو اہل کے مشابہ ہے اور معراثرات سے دور رہنے یا ان کو دفع کرنے کی آمادگی ذہن میں پیدا کرتی ہے۔ جس طرح آنکھیں کوئی دُور ہونے کا خطرہ جو نزدیک بلک جھپک جاتی ہے۔ اسی طرح قبض کی حالت میں انسان اپنے کو ناخوش گوار صورت حال سے محفوظ کر لیتا ہے۔ اور نفسیاتی طور پر پیش بندی کر لیتا ہے۔ بسط ان کے نزدیک لذت یا بی کی حالت ہے اور لذت سے متنق ہونے کے شوق کا باعث ہوتی ہے۔ محاکات، تخیل اور تخیل کے اس نازک فرق کو سمجھنے اور بیان کرنے سے مرزا دوسرا تکنیکی مرتبہ کا اندازہ ہوتا ہے کہتے ہیں:-

"محاکات محض واقعہ کو کسی یا مورخ کے لیے ذیادہ مفید ہے۔ ذکر شاعر کے لیے اختراع صرف شاعر کا حق ہے۔"

تخیل کو مرزا نے شعر، دوجان اور اداوہ کے اعتبار سے تین شعبوں سے پیش کیا ہے (۱) وہ جن کا تعلق شعور سے ہے (۲) جن کا تعلق وجدان سے ہے (۳) جن کا تعلق ارادہ سے ہے اور جب ان کے اجتماع کو عقل ایک فرد و ادہ میں پیش کرتی ہے تو اس سے ایک مشابہہ کا ظہور ہوتا ہے جسے کمال کہتے ہیں۔ اس طرح مرزا رسوا نے حسن، افا دیت اور حقیقت تخیل اجزا کو ایک وحدت میں پرانے کی کوشش کی ہے اور اس طرح وہ تہذیب افلاطونی تصور تک پہنچتے ہیں۔ جس نے مغرب اور مشرق میں تنقید جمال کے سارے نظریات کو متاثر کیا ہے کہتے ہیں:-

"وہ ذات مقدس جس میں یہ صفات کمال پائے جاتے ہیں۔ حق الخیال، جمیل، لذت، غیر مطلق اور ثابت الغیبات ہے۔ مثالیہ اول یعنی حق موضوع فلسفہ الوجود کا ہے۔ جمال موضوع علم و حقیقت کا ہے۔ غیر موضوع علم اخلاق کا اور تصور باری تعالیٰ علامہ موضوع الہیات کا ہے۔ حقیقت

فلسفہ لامرئی سے وہ امر مراد ہے۔ جس کی مراد وہی کو فعل خارج ہیں تجزیہ کرتی ہے نہ صرف ذہن میں بلکہ اس کے ذہنی کے جس کا جو صرف ذہن میں ہے خارج میں نہیں ہے؟
 یہیں مرزا مسوا کے مقصود، مثال کے بارے میں چند اقتباسات پیش کرنا ضروری ہے۔ کائنات نے جمالیات کی بنیاد
 PURPOSIVENESS WITHOUT PURPOSE یعنی بغیر روزی، افادیت کے کسی شے میں مقصد کے ہائے جانے کو قرار دیا تھا اس پر
 کو مرزا نے بھی غور رکھا ہے:

”کھیل سے مراد یہ لڑاؤ ہے مقصود ہے۔ نہ وہ جس کو ہم کسی غرض سے دوست رکھیں جس کے حصول کا وہ واسطہ ضرور ہو بلکہ اس کا حصول میں مراد ہے؟“

یعنی بنیادی طور پر ہم اپنا مقصد آپ ہے۔ وہ کسی دوسرے مقصد تک پہنچنے کا ذریعہ نہیں ہے یہ جو سنا ہے کہ اس سے دوسرے مقاصد بھی حاصل ہوتے ہوں۔ لیکن وہ غمنی اور شادی ہوں گے۔ اصلی اور بنیادی نہ ہوں گے بقول مرزا مسوا :-
 ”مکن ہے کہ امر کھیل نافع بھی ہو یعنی کسی غرض ادنیٰ یا اعلیٰ سے اس کا حصول مطلوب ہو مگر جس حیثیت سے کہ وہ واسطہ کسی غرض کا ہے۔ اس مدد میں داخل نہیں مراد یہ لڑاؤ کہ ایک بہت عمدہ مثال بچوں کے کھیل سے لی جاتی ہے اس لیے کہ اس سے ان کی کوئی غرض شخص نوعی نہیں ہوتی۔ کوئی بھی کھیل کا شوق بچوں میں پایا جاتا ہے۔ ترقی کرتے کرتے اس حد تک پہنچ گیا ہے جس سے بہت بڑا شوق، مصوری، طرائق، تربیتی، شریعی ایسے فنون لطیفہ نکل آئے ہیں۔ بچوں کے کھیل اور کھیلوں بہت ہی سیدھے سادے ہوتے ہیں اور بڑھوں نے اپنے کھیلوں میں طرح طرح کی پیچیدگیاں اور لغاتیں پیدا کر لی ہیں۔ چشم حقیقت میں کے نزدیک اصل دونوں کی ایک ہی ہے؟“

کھیل اور فن میں نفسانہ ممانعت کا تصور پرورپ میں شوق کی تعانیف کے بعد عام ہوا ہے۔ ہمارے تنقیدی ادب میں اس تصور کو اضافت اور پوری شوق و سبک کے ساتھ پیش نہیں کیا گیا۔ گویا انے مقصد و شعور و شاعری کے پہلے یا دوسرے صفحے پر اس شخص کو بھی سماجی طور پر مفید بنایا ہے۔ جو ایک ویلن یا ہارپی پر پیش اپنی دھن میں مست ہو کر بکری بجا رہا ہے۔ لیکن بعد میں خود وہ بھی افادیت اور اخلاق کی پابندی میں بڑی طرح گر کر رہ گئے۔ مرزا مسوا کا تصور ان سے ذرا مختلف ہے۔ گو وہ بھی اخلاق اور فطرت پرستی کے خائل ہیں۔ ان کا دائرہ وسیع اور نفسانہ طور پر زیادہ مابعد الصبیحاتی ہے۔ جمالیات کے سلسلے میں مرزا نے صاف طور پر لکھا ہے :-

”فنون لطیفہ کے مقابل وہ فن ہیں جن کو نافع نہ کہنا چاہیے۔ مثلاً فن میکانکات (دھلیں بنانے کا فن) کے ذریعے سے وہ چیزیں بنائی گئی ہیں۔ جو انسان کی بقا اور ترقی تنہی اور نوعی کے لیے مفید ہیں“

لیکن یہ تقاضا اور مرزا کے نزدیک مکمل اور قطعی نہیں ہے۔ جمالیات اور افادیت میں کوئی ایسا نہیں ہے کہ دونوں ایک شے میں جمع نہ ہو سکیں۔ بلکہ یہ مسئلہ ضرور قابل غور ہے کہ ادبیات میں کسی کو بنیادی اہمیت حاصل ہوگی۔ اور کس کو ثانوی۔ حسن اور افادیت ایک جا

ہو سکتے ہیں۔ اور ان کو ایک جاگرتا ہی فن کی سب سے بڑی منزل ہے۔
 ”کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جہاں اور نفع دونوں صفیئیں ایک ہی شے میں جمع ہو جاتی ہیں۔ مثلاً ایک خوبصورت
 جیہڑی گھڑی ایسی چیز ہے منہ الزوق و نیز عند الغفل مقصود ہیں۔“

ہر صاحب فن کی مرض یہ ہوتی ہے کہ اس کی ایجاد میں دونوں صفیئیں پائی جائیں
 مگر ایسا نہ ہو کہ ایک کی رعایت سے دوسرا ناقص رہ جائے۔ ہر ایک صاحب فن کی مرادات عام
 ہے اگر اس سے دوسرا مطلب بھی نکل آئے تو فہر المراد مثلاً شاعر کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ اس کا
 شعر اصول سے درست ہو۔ اس میں کوئی ذاتی غریبی ہو پھر اگر اس سے کوئی نفعیت بھی نکلتی ہے
 تو سمان الطود نہ نفعیت گڑی کو نامحسوس شوق کے حواس کے اور خود ہر شاعر میں اپنی عزت
 بچانے کے لیے شعر مرہ کہے؟

اس کے بعد مزید انھوں نے فنون لطیفہ کی تقسیم ان کے ذرائع انبہار کے اعتبار سے کی ہے۔ بت تراشی، طرازی اور مصوری کو پہلی
 قسم میں شمار کیا ہے۔ کہ ان کا تعلق دیکھنے سے ہے۔ اور ان میں شکل اور رنگ سے کام لیا جاتا ہے۔ دوسری قسم میں موسیقی کو لکھا ہے جس
 کا تعلق سنا سے ہے اور سنے آواز اور ضرب سے کام لیا جاتا ہے۔ تیسری قسم فنون ادبیہ کی قرار دی ہے۔ جس کا تعلق نہ دیکھنے سے
 ہے نہ سنانے سے بلکہ سمجھنے سے اور جس کے انبہار کا ذریعہ الفاظ ہیں۔ مرزا نے فنون ادبیہ کے پہلے شعر کی اصطلاح استعمال کرنے کا مشورہ دیا
 ”لیکن اسے ہی نظم کے لیے ہونے ہیں۔ لہذا خوف القریاس سے“ شعر کی بجائے فنون ادبیہ کی تحدید اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس طرح ان
 کے نزدیک شعر کا خاص مقصد صرف یہ ہے کہ وہ الفاظ کے ذریعے شور اور وجدان کو متحرک کرے اور تعلق و بسط کا موجب ہو۔

بنیادی طور پر مرزا کا تصور فن اخلاقی سے زیادہ نفسیاتی معلوم ہوتا ہے۔ وہ قبض و بسط کا ایسی ذہنی کیفیت کے نمونوں میں
 استعمال کرتے ہیں۔ جن سے خط اور اخلاقی طور پر سب کاموں سے استراحت کا مادہ پیدا ہو اور زندگی کی بھی نعمتوں سے لذت پائی کی جھلکت
 حاصل ہو۔ اس لحاظ سے ادب ان کے نزدیک ترجیحات (PREFERENCES) کا ایک مجموعہ ہے اور مناسب سلسلہ پیدا کرنے کی کوشش
 ہے۔ انسان میں قدر، دل کی ایک ایسی ترتیب پیدا کرنے کی کوشش ہے جو انہیں چیزوں کی طرف راغب کرے اور بری باتوں سے روکے
 اور یہ کوشش بنیادی طور پر ترقیبی یا عارضی ہی سے زیادہ نفسیاتی اور دائمی ہی ہو سکتی ہے۔

شعر کی بنیادی تعریف کرنے کے بعد وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں۔ کہ فنون ادبیہ میں مضمنا اور ”غراض مرہ بھی شامل ہیں۔ مثلاً
 ”حکایت، توجیہ، استدلال، موعظت۔ اس صورت میں چاہیے کہ مصنف ترتیب مقدمات میں ایسی باق اور سیدہ کو صرف کرے جس سے اس
 کی تعینیت ان دونوں غرضوں کے لیے ہر وجہ اتم و اعلیٰ مفید ہو۔ اس کی مثال انہوں نے تاریخ اور سائنس سے دی ہے اور بتایا ہے کہ فنون ادبیہ
 میں جو قوت انبہار سب سے اعلیٰ سمجھی جاتی ہے وہی دوسرے نام میں بھی کام دیتی ہے۔

”اگر کوئی مومن کسی واقعہ تاریخی کو اس طرح بیان کرے جس سے سامع یا ناظر کی عقل میں جو بہو
 تعویذیں کھینچ جائیں یا کوئی حکیم کسی قانونِ فطرت کی توجیہ اس صورت سے کرے کہ ہر جہڑی میں جس
 اس کے آثار و نظائر آجائیں تو کہا جائے گا کہ وہ بیان اور توجیہ دونوں غرضوں یعنی عرض علی اور

عرض شری کے لیے ہرچہ اتم و اکمل مفید ہے۔ وہ علم جو بہت ہی خشک خیال کے لحاظ سے
ہیں مثلاً ریاضی اور منطق ان کے بیان میں بھی اگر سلیقہ شری سے کام لیں۔ تو سامع اور ناظر
اس سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ عرض علمی بھی بخوبی حاصل ہوتی ہے بلکہ اس
سے ایک قسم کی مدد بھی ملتی ہے۔

یہاں سلیقہ شری کو انہماک بیان کا جو ہر قرار دیا گیا ہے اور اس سلیقہ شری میں تخیل کے مناسب استعمال اور الفاظ کے دلچسپ
کسی واقعہ کی تصویر کھینچ دینے کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔ لیکن مرزا نے ادبیات میں حماکت کے استعمال کو دوسرے فنون لطیفہ کی حماکت
سے متاثر کیا ہے وہ شاعری اور معنوی کے فرق کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں۔ اور ان کے ذرائع انہماک کے فرق کو بھی۔

”فنون اور ہر جملہ احساسات جگہ جمیع عدا نیاات و عقیدات کے استعمال پر بشیر ہوگا وہ بڑے لید لفظ
و محلات کے اور سلیس قیاد میں اگرچہ ادب معنوی کی طرح کسی چیز کی رعیت اور شکل آنکھ سے
نہیں دکھا سکتا نہ خوش آئند مرقا لایوں تک پہنچا سکتا ہے لیکن وہ الفاظ کے ذریعہ سے ہر چیز
کی صورت معنوی تخیل پر کھینچ سکتا ہے نہ صرف ایک طرح سے بلکہ مختلف مضمون سے اور یہ نئی
تصویر پر نسبت جماعتی تصویر کے زیادہ قریب آتا ہے۔ الفاظ کے انتخاب اور تالیف سے نہ صرف
لغز بلکہ نثر میں بھی اصول موسیقی قائم پیدا کر سکتا ہے اور لطف یہ کہ ایسی حالت میں کسی اشعار کا
یا سلیقہ علمی کا ثبوت اور مل بھی دیا جائے گا۔ جو اس کی عرض خاص ہے۔“

اسطونے تاریک اور ادبیات سے فرق کی کافی الفاظ میں راحت کی ہے۔ مرزا نے اس فرق کو ایک اور پہلو میں نماکت کے
استعمال کو پیش کیا ہے اور جس طرح وہ ان نماکت کو مختلف طریقے پر اور مختلف انداز سے استعمال کرتے ہیں۔ اس کو پیش نظر رکھا ہے ایک
لامعہ حقیقت کے تابع ہے دوسرے کا متعدد انداز ہے ایک ترجمان ہے اور دوسرا نعت۔

”اگرچہ شاعر بھی واقعات کی موبہ تصویریں کھینچے میں نماکت سے بہت کام لینا ہے لیکن اس
کے حسن کا تعلق خاص اختراع سے ہے۔ بخلاف مورخ کے جس کا تعلق حماکت سے ہے جب
شاعر حماکت سے کام لیتا ہے اس وقت بھی اختراع سے باز نہیں رہتا اس لیے کہ شاعر کی نظر
اکثر مروجہ لذات اور تخیل کی طرف رہتی ہے۔ لہذا اس کو انتخاب کرنا ہوتا ہے مطلوب اسے
کسی دانستہ کی تفصیل بیان کرنا ہے تو وہ عدالت کے گوشہ میں ہر مہرئی ذکر کا پابند نہ رہے
گا۔ بلکہ صرف ان امور کو انتخاب کرے گا جو اس کے مطلوب کے لیے مفید ہوں۔“

یہاں اس علمی تنقید کا ذکر بھی ہے علی نہ ہو گا۔ جو اس ضمن میں مرزا نے اسٹانے مختلف آراء و اساتذہ کے اشارہ پر کی ہے ظاہر ہے
کہ اس سے ان کا مقصد ان کے کام پر اجماعی تبصرہ کرنا نہیں ہے اور جو اشارہ انہوں نے منتخب کیے ہیں وہ صرف زیر بحث موضوع پر اپنے
خیالات کی وضاحت کرنے کے لیے جن جیسے گئے ہیں۔ لیکن پھر بھی ان کے تنقیدی زاویہ نظر کی غازی عمل تنقید سے ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر
حماکت کے ضمن میں وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ شعر سے جو تصور قائم ہوا یا فضا تبصرہ ہو وہ جماعتی طور پر خوش گوار اور آسودگی بخش ہو اس

میں ناگوری اور کراہت کا پہلو پیدا ہو۔ لہذا جب خاموشی ادیب کسی واقعے یا مضمون کو بیان کرنے کے لیے اس کے نازدہ گوشے چن لیتا ہے اور چند مخصوص زاویوں سے اس کو پیش کرنا چاہتا ہے تو اس انتخاب میں غرض گوہر اور جمل پہلوؤں کو ملحوظ رکھنا مزدی ہے ایسے کام گوشوں کو ترک کرنا چاہیے جو قبول ان کے مغز یا غیر مغز میں اور بسط و قبض دونوں کے لیے معاون ثابت نہیں ہوتے اور انقباض کا باعث ہوتے ہیں۔ عملی تنقید میں وہ اس بات کو ایک کیلے کی حیثیت دے دیتے ہیں:-

”ہم اس موقع پر ایک بہت ہی سہل قانون امر مکروہ سے امتزاج کرنے کے لیے تحریر کیلے دیتے ہیں۔ اگر اسے یاد رکھیں گے تو شعرا اپنے مقصود میں عمدہ ہوگا وہ قانون یہ ہے ہر ایک شعر کے حاصل پر غور کر کے دریافت کریں کہ اس سے کس قسم کی تصویر ذہن میں پیدا ہوتی ہے اگر اس تصویر کے اجزایا لزومات قرینہ میں کوئی امر مکروہ شامل ہے۔ تو اس کو نفی کر دینا چاہیے۔“

اس کی مثال میں انہوں نے تین اشعار پیش کیے ہیں۔ جن میں سے دو غالب کے ہیں اور ایک ذوق کا۔ ذوق کا مشہور شعر ہے:-

واہ رے شر و محبت خوب ہی چھڑکا ملک
اتخوان میرے ہمالی کس مزے سے کھائے ہے

اس شعر پر ان کو اعتراض یہ ہے کہ اس سے ایک تصویر ذہنی پیدا ہوتی ہے جس میں ایک امر مکروہ شامل ہے یعنی انسان کی ہڈیوں کا ٹکھن ہونا اور ایک جائزہ اسے کھانا عمدہ ٹھیک نہیں ہے۔“

ایک دوسرے شاعر کا شعر انہوں نے پیش کیا ہے اور اس سے پیدا ہونے والی تصویر ذہنی کو بعید از قیاس مضحک اور مکروہ قرار دیا ہے۔ شعر یہ ہے:-

شغل اگر چاہتے ہو جی کے بھٹنے کے لیے
دل میں آئیٹھو بکھر مراٹھنے کے لیے

کہتے ہیں:-

”دل میں ایک شخص کا آہیشتنا اور ہمت بڑھا کر کچھ کرنا ایک مہل سی بات ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے اس شعر میں مخاطب مشرقی مجازی ہے۔ معشوق حقیقی اس سے منزہ ہے کسی کے دل میں بیشہ کر اس کے کیلے کو ملے۔“

غالب کے جواشعار انہوں نے نقل کیے ہیں ان میں ایک فارسی کا ہے اور دوسرا اردو کا ہے۔ فارسی شعر یہ ہے:-

واعلم ذسوز دل نہ تجمل وادوم زحسطن
لوئے کہ تن ذسوفتن استخوان دم

”ہڈیوں کے جلنے سے چراغ کا پیدا ہونا جو شاعر کو نعتی سے نقل دکھتا ہے واقعی ایک مکروہ امر ہے۔“

غالب کے اردو شعر پر بھی انہیں یہی اعتراض ہے:-

داغ دل گر مظر نہیں آتا
تو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

مرزا کا کہنا ہے :-

”دماغ دل کی بڑی ہر اندھ دھندل ہوگی صرف دماغ دل کا ذکر کیا کہ تھا کہ اس کے جینے اور اس میں بڑھ سکے پیدا ہونے کا بیان مفرح کیا گیا ہے۔ اس موقع پر جو کا استعمال اس امر کو وہ پر دلالت فرماتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ امور صرف مجاہد کے لئے ہیں اس کی صلیت کا لحاظ نہیں کیا گیا۔ تو اس کا جواب دیا جائے گا۔ کہ مجاہد کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ حقیقت اس کے ذریعے سے ذہن نشین ہو کہ جو مجاہدین اکثر امور متعلق کو عسکریات کے ذریعے سے جو اقرب الی الفہم ہیں بیان کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ مجاہدات جو اشعار مرقومہ بالا میں شامل ہیں اپنی حد میں دست ہیں۔ لیکن ان کا تخیل مکر وہ ہے، اس سے اس کا لطف معدوم ہو جاتا ہے“

پہلے مرحلے کے آخر میں موضوع اور انداز بیان کی بحث اٹھائی گئی ہے۔ فلسفیوں سے لے کر ادیبوں تک ہر ایک کو زبان کی تکی اور الفاظ کی حدود و سائی کی شکایت رہی ہے اور یہ بات عام طور پر کہی جاتی رہی ہے کہ وقت مضمون یا لکھنے فلسفیانہ خیال کا اظہار سادہ صاف اور سلیکے انداز میں نہیں ہو سکتا۔ مضمون کی گہرائی اور وقت اظہار کی سلاست کو ختم کر دیتی ہے اور بیان کی محتاس اور روانی قصص اور بناوٹ کی نذر ہو جاتی ہے۔ مرزا نے اس مسئلے کو اس انداز سے پیش کیا ہے۔

”شعرا نظر کرنے کے دو رخ ہیں ایک آزاد خیالی لفظ اور دوسرے آزاد خیالی معنی۔ جس زبان میں الفاظ کی باریکیوں کی طرف زیادہ توجہ کی جاتی ہے توجہ اسی طرف مبذول ہو جاتی ہے۔ معنویت کا خیال جاتا رہتا ہے، اور جب معنویت کا خیال پیدا ہوتا ہے تو فطری باریکیاں ترک ہو جاتی ہیں۔ ان دونوں میں نہایت یکساں ہے۔ ایک کی افراط دوسرے کی تفریط کا موجب ہوتی ہے۔ اکثر ایسے شاعر جو مضمون عمدہ کہتے ہیں ان کے الفاظ میں وہ سلاست اور نزاکت نہیں ہوتی جو ان شاعروں کے کلام میں ہوتی ہے جن کو مضمون کی جدت اور ندرت کا چننا لحاظ نہیں ہوتا۔ وہ صرف لطف زبان کے دل دادہ ہیں“

اسی بحث کا دوسرا پہلو مرزا نے اس طرح پیش کیا ہے :

”..... جو شاعر غلط مضمون میں ان کو طرزا دے مقصود میں بڑی دقت پڑتی ہے اس لیے کہ ہر ایک عہد خیالی کے لیے ایک جدید لفظ چاہیے ان کو زبان مرقعہ میں مفرقات کرنا ہوتے ہیں اور اس صورت میں ان کا کلام موافق دوزخ و عوام کے نہیں رہ سکتا۔ لہذا اکثر اشخاص جن کی نظریں علمی ہیں ان کو ایک قسم کی لامتنیہ معلوم ہوتی ہے“

اس کی مثال حیر کے دیوان کی پہلی منزل سے دیتے ہیں :-

• ہنگام گرم کن جو دلی نا صبور تھا

پیدا ہر ایک نامے سے شور و نشور تھا

اور کہتے ہیں :-

" خدا بھگوان گرام کیمن کو دیکھئے اور اوروں کو زبان کو مگر لائے کی ؟ اس معنوں کو کسی اور طرح ادا کرنا ممکن ہی نہ تھا "

لیکن اس بحث سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ مرزا رسوا مشکل الفاظ اور غائص ادبی زبان کے استعمال کے قابل تھے وہ فصاحت اور سلاست کے درجے کا لحاظ رکھتے ہیں۔ لیکن ان کے مراح کے فرق کو اجسی طرح سمجھتے ہیں۔ مثلاً غزل میں سلاست کا جو معیار ہوگا وہ قصیدے کی سلاست کا نہیں ہو سکتا۔ اس فرق کو انہوں نے اس استدلال کے ساتھ بیان کیا ہے :-

" غزل میں زیادہ تر سلاست ہی مناسب ہے اس لیے کہ اس کا موضوع سنجیدہ نہیں ہوتا قصیدہ اور مرثیہ وغیرہ میں خیالات اور ان کے ساتھ ہی زبان کو وسعت دینا چاہیے؟

اس بحث کا خلاصہ مرزا نے اس طرح کیا ہے کہ لفظی نزاع اور تکنیک کی باتیں انہوں سے نفس معنوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ اور جب بھی اذادہ بیان کے غیر ضروری اجزا پر زور دیا جائے گا اس کا انجام یہ ہوگا کہ شاعری صرف صنعت گری ہو کر رہ جائے گی اور اس میں جذبہ کی گرمی اور احساس کا خلوص اور شدت ختم ہو جائے گی۔

" وزن اور قافیہ کی پابندی شاعر کے لیے کم نہ تھی کہ اس پر روایت چھائی گئی پھر اور لفظی جھگڑے نکلائے گئے۔ بے چارہ جدید معنوں کہاں سے پیدا کرے۔ لفظی جھگڑوں کے بڑھانے سے مضامین کا دائرہ تنگ ہوتا جاسکے گا؟

اس دلیل کے ساتھ مرزا نے مترسین اور تن حریز کی شاعری کو متقدمین کے مقابلے میں پست اور سطحی قرار دیا ہے اور معنویت کی طرف رجحان کو مبارک بتایا ہے۔ ان کے پہلے مراسلے کے آخری حصے میں واضح طور پر یہ مباحث کی گئی ہے۔

" ہندوستان میں سو برس اور کئی شاعری آج کی شاعری سے ابھی تھی۔ مترسین نے جھگڑے سے زیادہ بڑھا دیئے۔ اس لیے مرزا جاتا رہا۔ مگر اس زمانے میں پھر رجوع معنویت کی طرف ہے اس لیے مجھے ان مراسلات کے لکھنے کی جرأت ہوئی؟

اس محقق مقالے کا مقصد یہاں رسوا کی تنقیدی نگارشات کا تعارف کرانا ہے۔ پہلے مراسلے کے ساتھ ہی یہ مقالہ بھی ختم ہوتا ہے اگر یہ کاوش مقبول ہوئی تو مرزا کے دوسرے مراسلات بھی تعارفی حاشی کے ساتھ پیش کیجے جائیں گے

اس مراسلے میں بھی جو موضوعات زیر بحث آئے ہیں ان سے اذادہ ہوگا کہ تنقید نگار کی حیثیت سے مرزا رسوا فیض مولیٰ استعداد کے ادیب تھے جس طرح ادب کے نفسیاتی عوامل اور فلسفیانہ مبادیوں پر انہوں نے اظہار خیال کیا ہے وہ اردو ادب کے تنقیدی رسائے میں غائص کی چیز ہے۔ ادب ان کے نزدیک صرف قدام کی پیروی نہیں ہے۔ بلکہ اس کے رشتے علوم انسانی کی دوسرے تمام ذخیروں سے ملے ہیں پھر یہ بات خاصی تعجب خیز ہے کہ مرزا رسوا کی تنقید میں مغرب سے جو معنوی رجحانیں ملنا وہ حاشی کی طرح اخلاق اور اصلاح کے تقویٰ ملک معدوم رہتے ہیں اور نہ قدیم رنگ سخن کے پیروؤں کی طرح محض لفظی نزاع، صحت زبان اور بیان کے فروعی مسائل میں الجھتے ہیں۔

ان مراسلات میں پہلی بار اردو تنقید نگار نے ادب کے فلسفیانہ مباحث کو دوسرے تمام علوم سے منسلک کیے پیش کیا ہے

پہلی بات تنقید۔ دانتھار سے اور ادب کی تخلیق کو نفسیاتی اور نفسیاتی انداز سے پرکھنے اور ان کے اصول و ضوابط قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگلے مراسلت سے یہ بھی اندازہ ہو گا کہ شاعری اور ادب میں احساس صحیح تجربے کے خلوص (GENUINE EXPERIENCE) اور مطلوبہ کی جہد گیری کی طرف جس حد میں رازدستو اٹھے رہنا پڑا ہے اس کی مثال ہمارے تنقیدی سرمائے میں بہت کم ملتی ہے۔ اپنے حدود کے رواج کے برخلاف وہ شاعر یا ادیب کو صرف اپنی ذات میں کم ہو جانے والا انسان نہیں سمجھتے بلکہ اسے کائنات سے باہر اور تجربے کے علاوہ شاعر کے علاوہ دوسرا پہنائی رکھنے والا مفکر قرار دیتے ہیں۔ یہ چند ایسے مسائل ہیں جن کی تازگی آج بھی قائم ہے اور ہمارے شاعروں اور اہم ہوں کو اس میں ان پر غور کرنے اور ان پر بحث کرنے سے بہت کچھ حاصل ہو سکتا ہے۔

تین بات رازدستو اٹھانے کا ہم تنقیدی نظریات سے آج اتفاق دیکھنا چاہتے ہیں ان میں سے کوئی نثر یہ بھی ایسا نہیں ہے جو خیال انگریز اور خیال انگریز نہ ہو اور جو حقیقت و تہذیب کے مسئلے میں کارآمد خیالات کے لیے معیار نہ ہو۔ پھر اب سے اتنے عرصے پہلے لکھے ہوئے یہ مراسلت حقیقتاً اپنے دور میں انقلابی حیثیت رکھتے ہوں گے اور اس دور میں اس قدر جدید اور تہذیب آگاہ ذہن سے ادبی مسائل پر سوچنا اور ان کا نام لکھا جاسکتا ہے۔ یہ کارنامہ خالصاً خالصی کے اہم شعراء و شاعری کے بعد ہمارے تنقیدی سرمائے میں سب سے اعلیٰ اور بلند مرتبے کا حق ہے۔

آزاد کی سیاحت

(سیرِ ایران)

(آغا) محمد اشرف

غدر ۱۳۰۵ھ کا ہنگامہ فرو ہونے کے پورے ۲۷ سال بعد (۱۳۳۲ھ میں) مولوی محمد حسین آزاد نے ایران کا سفر شروع کیا۔ اس وقت ان کی عمر ۵۵ سال تھی۔ اور گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر تھے۔ ادبی دنیا پر آب حیات اور دوسری تصانیف کے ذریعے آزاد کا سکہ بیچ چکا تھا چنانچہ خود کہتے ہیں کہ ”مئی ۱۳۳۲ھ میں پلٹ پٹن کی مقدار پوری گئی۔ دل برسوں سے آزاد و مذہب کے رجعت سلسلہ کے جھگڑے حرکت اور خدا سے برکت یعنی چاہیے“

سیاحتِ ایران کا محرک دو چیزوں کو کہا جاسکتا ہے۔ نایاب علمی اور ادبی کتابوں کی تلاش اور بعض فارسی کی کتابیں جو مصر سے زیر تصنیف تھیں۔ ان کی تکمیل۔ اس عرصے میں معیاری کتابوں کے فقدان کا ذکر کرتے ہوئے آزاد کہتے ہیں :-
”ہر وقت ایک نہ ایک کتاب کی ضرورت ہوتی تھی۔ اور یونیورسٹی بھی کسی کو کوئی کتاب نہ دیتی تھی۔ کیونکہ نہ اسے کسی سے مروت تھی نہ کسی قسم کی آمد۔ بعض دفعہ ہر روز ایک نہ ایک کتاب کی ضرورت ہوتی تھی۔ وہ بھی نہ ملتی تھی“
اسی سلسلے میں آگے چل کر فرماتے ہیں :-

”..... خدا سے اتفاق کی کہ اگر مجھے وسعت ملے تو ایک کتب خانہ نظر کاہ خاص و عام میں آماستہ کروں۔ اور جس قدر ممکن ہو ہر فن کی کتابیں اس میں رکھوں کہ کسی بددماغ سے انہما کیلئے کی ضرورت نہ پڑے“

۱۳۳۲ھ کی ایک تحریر کے مطابق اس وقت آزاد کو ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ اس قلیل رقم میں سے آزاد کتابوں کے لیے کس طرح روپیہ پس انداز کرتے تھے۔ اس کا حال انہی کی زبان سے سنئے :-

”میں اس عالم میں نے انتظام یہ رکھا کہ جو کچھ خدا دینا سکھ اس میں سے خرچ کرتا یا قیام کرتا غنا بربادوں کی طرح گزارہ کرتا تھا۔ اور اپنے مبارک ارادے سے غنا شہ ولی کو مدد شہ کتابخانہ اس انتظام میں

کوئی ایسی کتاب جو کم ہاتھ آئے۔ بل جاتی تو لے لیگا۔ کہ ایک دو کام آئے گی؟
آزاد کو اپنی کم ناگی کا پورا احساس تھا۔ دوسرے تشریح و تفسیر سے منازلی حیات طے کرتا چلا جاتا تھا۔ انہیں خیال آیا جو کتابیں اس
مکتب میں نایاب ہیں۔ وہ محبوب اور ایران میں اوزاں نہیں ملیں گی۔ اس لیے سفر ایران کا ارادہ کیا۔

اپنی تصانیف کی تکمیل کے سلسلے میں سہندان فارس اور فارس کی ایک لغت کے مسودے ان کے سامنے تھے سہندان فارس
اور فارسی زبان کی لغت اصل میں ایک ہی پروگرام کی دو کڑیاں تھیں سہندان فارس میں موضوع بحث غلاوچ تھا اور لغت کی ترتیب سے مقصد فارسی
روزمرہ کے الفاظ کا ایک ذخیرہ متیار کرنا تھا جو پرانی لغات میں نہیں ملتے تھے۔ سہندان فارس کا منصوبہ سیاحت ایران سے پورا ہو گیا۔ مگر
افسوس کہ لغت کے خیال کی تکمیل نہ ہو سکی۔ ان کے انتقال کے بعد جو کتاب لغت آزاد کے نام سے منسوب ہوئی ہے وہ بظاہر اس لغت کا
پہلا چرچہ معلوم ہوتی ہے جس کا نقشہ آزاد کے ذہن نے قائم کیا تھا۔

تقدیر آدمی کا مسودہ بھی تیار تھا۔ مگر آزاد اس کی زبان کی صحت روزمرہ محامدے کے مطابق ایران جا کر کرنی چاہتے تھے۔ آموزگار
باری چہ مسودات سے بعد میں ترتیب دی گئی ہے۔ یہ یادداشتیں بھی اسی سفر کا نتیجہ تھیں۔

سیاحت ایران کی ابتدائی منزلیں

رد الگے نفل بہت سے مزدوری اور کٹے کر جن کا طے کرنا ضروری تھا۔ بقول آزاد دھمت کا مقدمہ صوب سے زیادہ سنگین تھا
غالباً عکرم تعلیمات کے دائرہ پرانی اثر لایا جو اسے آزاد کی نوک جھونک کچھ عرصے جاری تھی۔ ان کے سامنے میں سنگ گراں ثابت ہو رہے
تھے۔ آخر یہ تمام سچے سچے ملے پائے۔ اور تہہ شہ میں خاص گورنٹ کی تقریر نے حصول دھمت سے کام دلایا۔

سفر کے اخراجات اور کتابوں کی خرید کے لیے ایک دھن سے آزاد دوپہر میں لہنا کر رہے تھے چنانچہ جبک میں دس ہزار رہا۔
اگ کیا۔ اور جبک کو چاہت کی کہ یہ رقم کلم جوری سلسلہ کو لاہو رکے مشورہ نہیں آزاد کے دوست نواسہ نوازش علی خاں قزلباش
کے حوالے کر دے۔ نواب موصوف نے اس کے حوصل میں سودا گران ایران کے نام خط تحریر کر دیا۔

تیسری وقت ان کی اپنی صحت سے تعلق تھی۔ خود لکھتے ہیں :-

”انہیں دو دن تقدیر سے مجھے چند دل شکن صدمے پہنچے جن میں سے صحت صدمہ

ایک جوان بیٹی کی موت تھی۔ جو حقیقت میں سات بیٹوں سے گراں بہا تھی۔ وہ میری

تصفیقات میں میرا ادھنا ہاتھ تھی۔ اس کے مرنے سے میرا دل ٹوٹ گیا اور تصنیفات

کا تمدن الٹ گیا۔ یہاں تک کہ اکثر ہوش مندوں کو حزن کا شبہ ہو گیا“

اس کے علاوہ چند ادیب ایرانی بھی لاحق تھیں۔ چنانچہ خویش و حاجب نے ضعیفی۔ سفر کی صعوبتوں اور دشواریوں کی بنا پر
آزاد کا ارادہ ترک کرنا چاہا تاہم میں بحث مباحثے ہوئے۔ آزاد علمی مزدور توں کا احساس دلانا چاہتے تھے۔ احباب کہتے تھے آپ تنہا کیے
جائیں گے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا۔ کہ انہوں نے اپنے لڑکے آغا محمد باہم کو جو اس وقت مرنے میں ملازم تھے۔ نوکری چھڑا کر لاہور
بلوایا مگر دھمت میں دیر لگی۔ اور حرا میں ایک اور ملازمت مل گئی۔ اس لیے چاروں ناپاچار تنہا سفر پر مکرماندی۔ دوستوں کو سمجھایا کہ

اس سے پہلے (۱۸۶۸ء) بھی تو وسط ایشیا کا تنہا سفر کیا تھا۔ اور وہ بھی کس بے سروسامانی میں کہ پل ابرس تک مفقود الحجز رہا تھا۔ اور سب سے بڑا آزاد کا وہی طبی اور ادبی ضرورتوں کا احساس تھا۔ مارتے ہیں۔

”جی ضرورتوں کے لیے میں جاتا ہوں، ملک اس کا محتاج ہے۔ اور تو کم کو خیال نہیں۔

لیکن پوگا ایک عرصے کے بعد اس سے بہتر ہے کہ میں ہی اس کام کو جاؤں یہ خصوصاً فارسی کی جامع اللغات کے بغیر فارس میں جانے کے اس کی تکمیل اور اعتبار ممکن نہیں“

ایک شخص نے تو ان کے منہ پر یہاں تک کہہ دیا کہ لوگ کہتے ہیں آپ کو جنن ہے۔ مبادا جھگ میں یا ہماز پر اس کا ظہور ہو۔ اس وقت کیا ہوگا لیکن آزاد کی جوانی بہت نے کسی بات کی پروا نہیں کی۔ اور خدا پر تو کھل کر کہے کہ ۳۳ ہجری ۱۲۵۸ء کو بذریعہ ریل لاہور سے کراچی روانہ ہو گئے۔ کراچی میں ایک پرانے شاگرد عظیمی مولوی عمر الدین بہت ماسٹر سندھ مدرسہ کے ہاں قیام کیا چونکہ ایران جانے والا ہماز ایک دن پہلے روانہ ہو چکا تھا۔ اس لیے مجبوراً ایک ہفتہ انتظار کرنا پڑا۔ اگرچہ طبیعت کے شوق کو یہ ایک ایک دن کی کمی مینے کے برابر تھا۔

سفر کا مقصد چونکہ ادبی تھا۔ اس لیے ہر قدم پر کان نئے الفاظ اور نئی آوازیں پر لگے ہوئے تھے۔ کراچی کے راستے میں سکھر سے کچھ لوگ گاڑی میں سوار ہوئے جب انھوں نے بات چیت کی۔ تو آزاد کے کانوں کو محسوس ہوا کہ ان کی بولی میں بہت سے لفظ فارسی کے ملتے ہوئے ہیں۔ اشتیاق نے مجبور کیا کہ اس کی اصل دریافت کی جائے۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ یہ کمرانی ہیں۔ وہی کمرانی جن کا ذکر کتابوں میں آزاد نے پڑھا تھا۔ اور جس کے راستے کئی مرتبہ لشکر اسلام ہند میں آیا تھا۔

کراچی سے بوشر کو روانگی

۱۲ اکتوبر ۱۲۵۸ء کو بویر ڈاک کے جہاز میں ۱۲۶ روپیہ کرایہ دے کر آزاد صوابہ پوٹو سفر تیسرے درجے میں کر رہے تھے۔ کیونکہ دس ہزار روپیہ میں سے زیادہ سے زیادہ روپیہ کتابوں پر صرف کرنا چاہتے تھے۔ دوران سفر میں ایک رفیق نے جو دوسرے درجے کے مسافر تھے۔ اپنا آرام دہ کرہ اور اس کی آسائشیں دکھائیں مگر آزاد نے یہ کہہ کر دل کو تسکین دے لی۔

”اتنے روپے جمع کر کے کتابیں کو تو ایک خانہ الماری کا آباؤ ہوتا ہے۔ اس لیے تکلیف

مجھے آرام معلوم ہوئی“

کراچی سے بوشر تک دس روز کا سفر تھا۔ آج کل کے تیز رفتار سیمرامے مشکل سے تین دن میں طے کرتے ہیں۔ ہماز میں، وان بھر اور برہمی طبع کی طرف سے بڑا اندیشہ تھا کہ ان کا مزاج صفراوی تھا۔ مگر شوق سفر کی وجہ سے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ بلکہ ایک دفعہ دوران سفر میں خیال بھی آیا کہ فضل ہائے مذکور کا اثر طبیعت پر ہے یا نہیں۔ لیکن غور کیا تو کچھ بھی نہ تھا۔

ہماز گوا اور جاسک کے سامنے سے گزرتا۔ پہاڑی سلسلہ کو دائیں بائیں گھومتا۔ منقطع سے چٹان ہاؤمز منظر مقصود کی طرف بڑھتا تھا۔ ہندو عمارتیں پر ہماز نے لنگر ڈالا۔ جھٹی چھوٹی کشتیوں میں چند فوجانہ دیکے خوبوئے۔ ناشپاتیاں اور انڈے بیچنے کے لئے آئے۔ آزاد کی توجہ ان اشیاء کی نسبت پیچھے والوں کی زبان پر مٹی زبان کے محقق نے فوراً پرکھا کہ سب کی زبان فارسی تھی۔ اور اس

سے پتہ لگایا کہ میاں سے خاک ایران شروع ہوتی ہے ہم سفر سافروں کے بھی لفظ لفظ پران کا دھیان تھا۔ آغا عبد الکریم ایک ایرانی رفیق سفر سے ملاقات ہوئی جو سوز سے براہ کراچی کر بلا جا رہے تھے۔ فارسی شاعری کا اعلیٰ شوق تھا۔ عربی میں بولتے مگر سواصل تھی۔ انگریزی میں بولتے مگر جہاز کی بستر دونوں کا یکجا ہوا۔ کہ دونوں ایک دوسرے کو غنیمت سمجھتے تھے۔ آخر ۱۰ اکتوبر کو ان کا جہاز بوشر کی بندرگاہ میں داخل ہوا۔

بوشر سے شیراز تک

بوشر پہنچنے کے بعد آزاد کا پہلا تاثر یہ تھا :-

”میاں سب سے نئی بات یہ معلوم ہوئی کہ چھوٹے چھوٹے بچے کھیتے تھے۔ فارسی بولتے تھے۔ جیسے ”ہزار داستان“

زبان کی تحقیق کرنے والے اور علم زبان کے ماہر خوب جانتے ہیں کہ اس فن کا وسیع ماہر ہر قدم پر ایک نئی بات محسوس کرتا ہے۔ جب کبھی کوئی فقرہ سننا ہے۔ اس کے کان اسی طرف لگ جاتے ہیں کہ اہل زبان نے اس مطلب کو کیسے ادا کیا۔ عبادے میں یہ بات کیسے آئی۔ آزاد کا ذکر ہمیں ان کے کان میں اسی تمام کیفیتوں کا لطف اٹھا رہے تھے۔ اور سفر کی منزل میں اس شوق میں آسان ہوتی چلی جاتی تھی۔ آزاد کے مشق کے لحاظ سے بوشر کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ یہاں کی زبان سندھ ہو سکتی تھی۔ مگر اس شہر میں علی گٹا ہوا ذبیحہ تھا لیکن اس کے باوجود کاروان کے انتظار میں آٹھ روز بوشر ٹھہرنا پڑا۔ آخر ۱۰ اکتوبر کو ایک ایرانی راہدار کو اسے پر لیا۔ اور شام کو شہر سے نکل کر کاروان میں شامل ہو گئے۔ یہ آج کل کا سافسٹ نہیں تھا۔ کم عمریوں دن رات سڑکوں پر دوڑتی پھرتی ہیں۔ آج سے ۶۰-۷۰ سال پہلے شہر بنیاد سے نکلتے ہی قاتلوں اور ڈاکوؤں کا خطرہ دامن گیر ہو جاتا تھا۔ اس لیے بغیر قافلے کے ایک دم نہیں بڑھ سکتے تھے۔

بوشر سے شیراز تک تقریباً ۵۰ میل کی مسافت ہے۔ اس سفر کو آزاد نے ۹ دن میں طے کیا۔ راستے میں سر بفلک پہاڑوں اور گہری گھاٹیوں کو عبور کرتا یہ قافلہ جوں کی توئی رفتار سے حرکت کر رہا تھا۔ کبھی کاروان میدان میں دھوپ کی شدت ہوتا تھا۔ اور کبھی برف و باران کا مقابلہ کرتا تھا۔ جہاں کہیں قافلے نے قیام کیا۔ آزاد خورد و نوش کا سامان ہتیا کرنے کے بعد علماء اور آقاؤں کی دھن میں گھر گھر اور مسجد مسجد تلاش کرتے پھرتے تھے۔ کھانے پینے کی طرف سے لاپرواہی کا یہ عالم تھا کہ رات کو ایک جگہ پلاؤں میں گیا اسے کھا لیا۔ جو باقی بچا اسے ایک پڑیا میں باندھ کر جیب میں رکھ لیا۔ کہ خدا جانے اگلی منزل پر کچھ کھانے کو ملے یا نہ ملے۔

کاروانی ایک عجیب سا لگاؤں ہے۔ آزاد نے یہاں ایک جوان عمر فاضل کو ڈھونڈ لیا۔ لا۔ ان کا نام شیخ محمد تھا۔ نجف سے تحصیل علم کی تھی۔ تین شخص معتدل ان کے پاس بیٹھتے تھے۔ ایک شخص کوئی کتاب دیکھ رہا تھا۔ شیخ نے یہ کتاب آزاد کو دی۔ اور کہا پڑھو۔ باقی حال آزاد سے سنئے۔

”میں نے کھول کر ایک جگہ سے پڑھنا شروع کیا۔ ایک لفظ پر انھوں نے ٹوکا میں نے پوچھا کہ میں غلطی پر نہ تھا۔ پھر بھی میں سوچنے لگا۔ انھوں نے خود سوچ کر نہ ملایا۔ کہ شہادہ دست خواندہ۔ بخوانید“

اس طرح دینک امتحان لینے رہے۔ آخر فرمایا "شہزادان عربی ماحوب درزیدہ ابد" مگر اس قصبے میں کوئی کلام کی کتاب ہاتھ نہیں آئی۔ شیراز سے ایک روز کی ماہ پر داشت اڑن شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں کی ٹھنڈی ہوا کا جس قدر شہر و تھا۔ اس سے زیادہ سردی آزاد کو لگی گھبرا کر گھوڑے سے کود پڑے۔ کہ دوڑ کر گرمی پیدا کریں۔ ہزار تدبیر کی مگر کھٹنوں سے پاؤں تنگ کہیں جس نہی مٹی۔ حد یہ ہے کہ پاؤں میں بی ٹون چڑ گیا تھا۔ آخر کوس بھر پیدل چل کر حواس درست ہوئے۔

۲۶ اکتوبر کی صبح کو شیراز میں وارد ہوئے اور ایک سرائے میں قیام کیا۔ مگر سفر کی صعوبت کے بعد یہاں بھی آرام کی صورت نظر نہ آئی۔ دل شکستہ ہو کر بستر خاک پر بیٹھ گئے۔ آخر اپنے آپ کو سنبھالا۔ گھڑی کھولی کر پڑے نکھارے۔ چونکہ وہاں بھی کتابوں کے انبار ساتھ لے جانے کا ارادہ تھا۔ اس لیے گھر سے بہت کم سامان لے کر نکلے تھے۔ حد یہ ہے کہ چہیزنگ ساتھ نہیں لائے تھے خفغان پہنا اور شیراز کی سیر کو نکلے۔ لیکن ابتدا اچھی نہیں ہوئی۔ پہلے ہی جی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہ غالباً محکمہ تلگراف میں ملازم تھے۔ اور ان کے ڈائریکٹر طہران سے دورے پر آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہہ دیا۔ ہمیں فرصت نہیں ہے۔ جب کتب خانہ دیکھنے کی اجازت چاہی تو بے رمی سے کہہ گئیں اس سے کیا فائدہ ہو گا۔

شیراز کے ایک رئیس ثواب حیدر علی خاں کے پاس پہنچے۔ وہاں بھی دعا قبول نہیں ہوئی۔ اندر ہی سے کھلا بھیجا کہ جب کلام ہو گا تو آنا۔ ہم مدد کریں گے۔ اصل میں آزاد کا مشن اس قدر زالا اور سفر کا مقصد ایسا اٹھکا تھا کہ ایرانی رئیس اور امیر زار سے اس کی اہمیت کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ لیکن آغا خان کی سرورہی سے آزدہ نہیں ہوئے۔ کیونکہ اب ان کی منزل مخصوص دان کے سامنے تھی۔ ثواب حیدر علی خاں ہی کے دروازے پر ایک دلال سے ان کی ملاقات ہوئی۔ یہ اٹھتیں ایک اور شخص کے گھر لے گیا اور کتا میں دکھائیں۔ کل ۲۳ صلیں ۲۷ روپے کو خریدیں۔ شیراز کی سرائے سے یہ تنگ آ چکے تھے۔ اس لیے کسی اور ٹھکانے کی تلاش ہوئی تاخیر زار علی اکبر کے ہاں محمان ہوئے۔ اس غریب زادے کی فلاکت پر بہت رحم آیا۔ ۱۳ روز تنگ اس کے ہاں قیام کیا اور اس کے صلے میں اپنے خوصلے سے بہت زیادہ رستم اسے دی۔ مگر اس کے بوڑھے باپ سے جو لوہار تھا۔ اور بند و تیل بنانا تھا۔ آزاد کو کلام ناک میں آ گیا۔

ایک ایرانی امیر کی علم پروری

شیراز کے آخری دور و روز ثواب حیدر علی خاں صدر کے ہاں گز اٹھے۔ اور یہاں معلومات کا سامان آزاد کو کمال و خود کے ساتھ ملا۔ ثواب میں طرح مال و دولت اور جاہ و منصب سے امیر تھے۔ ایسے ہی علم و فضل اور کتب خانے کے اعتبار سے بھی امیر تھے اس صاحب کمال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

دربا وجود و سنگھ امارت اور پرانہ سالی کے جب دیکھو گرد کتا میں جینی ہیں۔ ایک دو ملتا پاس بیٹھے ہیں۔ بیچ میں آپ ملا ہے میں مصروف ہیں۔ تبصر کرتے ہیں۔ حواشی لکھتے ہیں۔ ایک خوشنویس کا تہ قلم کی تہوں کی تکمیل کر رہا ہے۔ مصور نقاشی کر رہا ہے۔ کھانے کا وقت ہوا۔ وہیں پہلو میں دسترخوان بچھا۔ اٹھ پلے مسجد بٹھکانہ بجالائے۔ ایک روٹی کو اٹھا کر آنکھوں سے لگایا۔ پھر سب کے ساتھ کھانا کھایا۔ گویا یہ بھی ایک فرض تھا۔ کہ

اداکر یا پھر کتابوں کے حلقے میں جا بیٹے !

علم ادب کے ایک سربراہ کی اس سے بہتر تصویر کھینچی مشکل ہے۔ ذہب مدد کے ہاں پارس نامے کے مصنف حاجی مزار حسن سے بھی ملاقات ہوئی۔ جو آزاد کا دوسرا کوس کر ذہب کے ہاں ان سے ملنے آئے۔ ان کی شیراز سے رواں گلی میں ایک شب باقی قحی - شام ہو گئی قحی - بونریاں پڑ رہی تھیں۔ باصر اجمادت کے کر اپنے گھر لے گئے۔ اور رات بھر اپنی کتب ب سنانے رہے۔ آزاد نے بہت سے نکتے ان سے سن کر اپنی کتاب میں قوت کر لیے۔

ایرانی شرفا کی طرز دانش کے ذکر میں آزاد لکھتے ہیں کہ مکان کے ساتھ ایک مردانہ صحر پہلے ہے جو حرم مرے سے زیادہ آراستہ ہوتا ہے۔ اکثر مسافر طبع دوست جمع ملاقات کو آئے۔ اور ظہر کی غماز پڑھ کر رخصت ہوئے۔ یا رات کو دہیں رہے۔ اور صبح کو ناشتر کے رخصت ہوئے۔ ان طویل علمی صحبتوں میں ادبی تاریخی اور علمی نکتے بیان کئے جاتے تھے۔ گھر زمانے کے ساتھ ادب پر محبتیں بھی رخصت ہوئیں۔

شیراز کے دوران قیام میں آزاد نے۔ حافظہ سعدیہ اور شیراز کی مشہور مسجد شاہ چراغ کی زیارت کی۔ مگر اس زمانے میں شیراز کی رونق اور آبادی ختم ہو چکی تھی۔ بڑی بڑی وسیع اور قدیم مسجدیں اور کہنہ مدارس گے پڑے تھے۔ ان میں لڑکے صرف۔ بچہ۔ بلاغت فقہ اصول کی کتابیں سلنے رکھے رہے۔ مگر کتاب کے مسائل کتابی پر بحث کرتے رہتے تھے۔ اور علماء کتب علیہ کی تدریس سے پرانی پڑیوں پر ایک حیات چمکتے تھے۔ ہماری ملک کی طرح طلباء فقرہ بہ فقرہ نہیں پڑھتے تھے۔ بلکہ استاد کے سامنے کتاب قحی۔ طلباء اپنی اپنی کتابیں کھولے خاموش بیٹھتے اور استاد کتاب کے مطالب کو نہایت توضیح اور تفصیل کے ساتھ بیان کرتا جاتا تھا۔

مروج رضا شاہ پبلو کی کے محدث شیراز کو نئی زندگی ملی ہے۔ ورنہ آزاد لکھتے ہیں کہ وہ عالیشان اور سیہا باناد اور بلند اور فراخ مسجد جو کریم خان زندہ سے سو برس پہلے بنائی ہے۔ اگر وہاں سے اٹھائیں تو اصل شیراز ایک معمولی قصبہ رہ جاتا ہے۔

خواجہ حافظ کے مزار اور اس کے قریب چیل تن اور ہفت تن کی آزاد نے بہت شوق سے زیارت کی مزار کی الواح کو نقل کیا۔ تنگ آباد و خاک مٹھے اور آب رکتیادی کی سیر کی۔ اور سعدیہ میں جا کر گلستان بوستان کے پرانے اسباق کی یاد دلاؤ کی۔ شیراز کی دلچسپ نضا نے بہت دامن پکڑا لیکن جاننے کا موسم کوہ برف لیے سر پر چلا آنا تھا۔ بڑھاپے نے خوف کے لحاف میں دیک کر کہا۔ کہ شیراز تو دیکھ لیا۔ اب اصفہان کو دیکھو اور آگے بڑھو کہ تلاش کی منزل ابھی دور ہے۔ " شیراز کے دوست بہت دے سکتے تھے۔ مگر چند روز کے بعد آزاد ایک قافلے کے ساتھ شامل ہو کر اور تبر کو اصفہان روانہ ہو گئے۔

باقی سفر کا نقشہ

سفر نامے میں شیراز تک کا ذکر آزاد نے بہت وضاحت سے کیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ حصہ فی الحقیقت سفر نامے یا ڈائری کی ترغیب میں آتا ہے۔ علمی صحبتوں کے علاوہ شیراز کے محاسن و روزن خانوں اور ان علماء کا ذکر جو اس شہر سے تعلق رکھتے تھے۔ خاصی تفصیل سے موجود ہے۔ اگر تمام سفر نامہ اسی تفصیل سے لکھ جاتا تو ایران کے حالات اور اس دور کی ایک مکمل تصویر ہمارے ہاتھ آجاتی۔ مگر اسوں کے اس کے بعد سفر کی مصروفیات نے شاید اس تفصیل کی اجازت نہیں دی۔ اور تاریخی دلائل کی محکمہ مختصر نویسی نے لے لی۔ بعض جگہ فارسی میں کچھ حال تحریر کیا ہے۔ کیسے ہر قسم کی قافلی نقل کر دیا ہے۔ تاکہ یادداشت کے طور پر باقی رہے۔ آزاد کا ارادہ تھا کہ اس مختصر نویسی کو جھیل کر مستقل سفر نامے کی

شکل میں پیش کریں گے۔ مگر دوسرے ادبی کاموں نے صفت نہیں دی کہ اس تصنیف کو مکمل کر لے۔
بقایا سفر نامے کی تاریخوں اور مقامات کا موازنہ کرنے سے سفر کا یہ نقشہ تیار ہوتا ہے۔ جس سے یہ وحدۂ نقش کشاں ابا گر ہو جاتے ہیں۔

خیراز سے روانگی	۱۰ نومبر ۱۸۸۵ء
اصفہان میں آمد	۲۵ نومبر
(اصفہان میں قیام)	عزت پانچ روز
اصفہان سے روانگی	۳۰ نومبر ۱۸۸۵ء
طهران میں آمد	۱۰ دسمبر
(طهران میں قیام)	تقریباً ۳ مہینے
طهران سے روانگی	یکم دسمبر ۱۸۸۵ء
مشهد میں آمد	۲۹ اپریل
(مشهد میں قیام)	۱۲ روز
مشهد سے روانگی	۹ مئی

ہرات میں آمد کی تاریخ کا تعین نہیں ہو سکا۔ البتہ ہرات میں قیام ۲۸ روز رہا۔ ہرات سے قندھار کا سفر ۲۹ دن میں طے ہوا۔ قندھار میں قیام ۵ دن تک رہا۔ قندھار سے ۱۱ روز میں کوٹے پہنچے۔ اگرچہ یہ سفر صرف ۵ روز کا تھا۔ اور وہاں سے بذریعہ ریل شروع ماہ جولائی ۱۸۸۶ء میں لاہور واپس ہوئے۔

اصفہان اور طهران

خیراز سے اصفہان تک معلوم ہوتا ہے کہ اونٹ کے ذریعے سفر کیا تھا۔ سردی شباب پر مٹی۔ مگر پھر بھی جس گاڑی میں جاتے تھے۔ علم و ادب کی تجویداری تھی۔ ہر جگہ جا کر پوچھتے۔ اور جو اہل علم ہوتا۔ اس سے ملاقات کرتے۔ آزاد کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ چھوٹی سے چھوٹی آبادی میں بھی ایک دو عالم بلکہ کہیں کہیں صاحب اجتہاد مل جاتے تھے۔ ان کی حالت پر آزاد کو تعجب ہوتا تھا۔ مثلاً لکھت سے گائے کے لیے گھاس کندھے پر لے آتے ہیں۔ یا نہر پر کڑے دھور ہے ہیں۔ لڑکا گھر کی دیوار چن رہا ہے جب فارغ ہوئے۔ تو اسے شروع لحد یا قوانین الماصول کا سبق پڑھانے لگے۔ بر علمی غذا تمام ایرانی اہل علموں نے پائی۔ جس کی وجہ شایانِ سلف کی علم و ادب کی سرپرستی تھی۔ بار بار انھوں نے ایسے علماء سے کہا کہ تم اپنے لڑکوں کو طهران یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے کیوں نہیں بھیجتے۔ آزاد ہندوستان میں علوم قدیمہ کے زوال کے اسباب خود دیکھ چکے تھے۔ اور زمانے کی روش سے واقف تھے کہ آئندہ یہ گھر ملیو کتب اور درس و تدریس کے ٹھکانے زندہ نہیں رہ سکتے۔ مگر جب آزاد ایرانی علماء سے زمانے کی جو باتیں کا ذکر کرتے تو وہ ہنس دیتے۔

دوبارہ سفر میں ان کے پاس کھانے پکانے کا سامان نہیں تھا۔ کسی گھر سے روٹی مول لیتے۔ کہیں سے آدھے کہیں سے گھی اور وہیں کسی

کے گھر میں بیچو کو انڈوں کا دغلیہ پکا لیتے۔ اس ہلنے نہیں بہت سی باتوں کی تحقیق کا موقع بھی مل جاتا۔ چونکہ سفر کا یہ حصہ ماہِ محرم میں طے ہو رہا تھا۔ اس لیے جگہ جگہ جاس ہو، ایسے بھی شرکت کا موقع ملتا تھا۔ ان مجالس سے فیض روحانی حاصل کرنے کے علاوہ آزاد ایرانی شہر خاں کی تہذیب اور آداب مجلس کا بھی بہت ذریعہ سے مطالعہ کر سکتے تھے۔

راستے میں ایک سحر آمہ جاسی ان کا ہم سفر ہو گیا۔ جب مورچہ خاک گاؤں میں منزل ہوئی۔ تو اس بے برکت ایرانی گاؤں میں یہ دونوں گھر گھر روٹی خریدنے کے لیے دستک دیتے پھرے۔ حاجی کو بھی مزہ ہو گئی۔ کہ جب تک روٹی نہیں ملے گی۔ کوئی گھر بغیر دروازہ کھٹکھٹائے خالی نہ چھوڑے گا۔ آگے وہ پیچھے آزاد حاجی کہتا تھا۔ صاحبِ خانہ روٹی ہے۔ گھر میں سے کوئی بچہ نکل کر کہتا۔ نہیں۔ آزاد ہنس کر کہتے۔ انچھلنے حاجی کہتا — مرغ ہے آزاد آواز نکلتے وہ خدا نہ کرے۔ آخر ایک شخص کو پیسے دکھا کر روٹی بیچنے پر آمادہ کیا۔ اس نے سوائی میت لے کر چار خشک روٹیاں دیں۔ وہ لے کر خدا کا شکر کرتے مر گئے واپس آئے۔

سفر میں اس قسم کے دلچپ حادثوں سے طبیعت کی گرفت و محصل جاتی ہے۔

امصفاں کو اہلِ ایران نے نصف جہاں کا خطاب دیا ہے۔ آزاد بھی اس تاریخی شہر کے خوبصورت خیابان۔ چھتے ہوئے بازاروں۔ شاندار مسجدوں اور شاہی محلات کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ زندہ رود کے بل کی تعریف کی اور اس شہر کو سلطانِ صفوی کی لمبوں کا عجائب خانہ قرار دیا۔ آزاد صبح سے شام تک شہر کی سیر کرتے تھے۔ اور شام کو خشک کو بستر پر آ پڑتے تھے۔ ملا باقر مجلسی کی قبر پر فاتحہ پڑھتے گئے۔ مسجد جامع کی زیارت کی۔ یہ جگہ میمنوں رہنے کی تھی۔ مگر جاڑے کے ڈرنے پا چنگہ دن سے زیادہ نہ رہتے دیا۔ اب طہران کی منزل ان کے سامنے تھی۔ اور امداد وہیں ڈیرے ڈالنے کا تھا۔

امصفاں سے طہران کے راستے میں کاشان کے محلِ فاؤں کی صناعی اور چاکرستی کی داد دی۔ ملاحقن کاشانی کے مزار پر فاتحہ پڑھی۔ اور قریب حضرت امام علیؑ کی بجی کے مزار کی زیارت کی سعادت حاصل کی۔

طہران کی علمی فضا

سفر نامے کی عبادت اور تاریخوں سے طہران پہنچنے کی تاریخ کا تعین ۱۰ دسمبر ہو کر ہے۔ طہران کی یونیورسٹی مکتب خانوں پر کاروبار دفا تر۔ ادبی مجلسوں کا شوق آزاد کو راستے میں کہیں سانس لینے کی مہلت نہیں دیتا تھا۔ دوسرے جن اغراض کے لیے یہ سفر اختیار کیا تھا وہ بھی اسی شہر میں پوری ہو جاتی تھیں۔ افسوس کہ اس شہر میں تین مہینے کے قیام کا پورا حال دستیاب نہیں ہو سکا۔ درجہ معلوم ہوتا کہ کہاں کہاں انیس علمی کتب خانے تھے۔ البتہ اپنے لکچر میں اتنا حوالہ ضرور دیا ہے کہ کتابوں کی تلاش اور جامع لغات فارسی کے لیے مراعات کی بات آئندہ، جستجو شہر کے۔ اور سب سے پہلے شہزادہ فزا و مرزا کے حضور میں پہنچے۔ جو شاہِ ایران کے چھپاتے سلطنت کے بچیدہ معاملات انہی کی صلاح سے طے پاتے تھے۔ کئی عالم سر کا دین ذکر کرتے جو ہر وقت علمی ادبی کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ تحقیق الفاظ کے سلسلے میں ان کے صاحبزادے اعتقاد الملک نے بھی آزاد کی مدد کی۔ یہ یورپ کے علوم جدیدہ کی تحقیق کے بعد طہران آئے تھے۔ اور سنہ ۱۸۷۲ء میں بوسرے تھے۔ ان کی وساطت سے آزاد کی رسائی وہ سرے علماء اور امرات تک ہوئی۔ جن امرات کا آزاد نے تذکرہ کیا ہے۔ یہ سب مغربی علوم ماہر تھے۔ اور ان میں سے اکثر شاہزادے پر س اور برسی سے ڈگریاں لائے تھے۔ اصل میں اس وقت ناصر الدین شاہ قاجار کی سیاحت

یورپ کی وجہ سے اہل ادب و فن میں بھی مغربی تعلیم اور مغربی تہذیب کا رواج عام ہو چکا تھا۔ اور ایرانی تہذیب پر مغربی کچھ اثر کر چکا تھا۔ بہت سے امیر زادوں نے آزاد کی تحقیق الفاظ میں مدح کی۔ اور اپنی مروت، محنت اور بہت سے آزاد کو خرید لیا۔

اس زمانہ میں فارسی زبان کو ساری الفاظ سے پاک کرنے کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ اگرچہ اس نے زور سیلوں میں پیدا کیا۔ لیکن آزاد کی تحریک سے بہتر چلتا ہے کہ اس خیال کے زبردست حامی مرزا ابوالخاں افشار بگشلو اس وقت بھی طہران میں موجود تھے۔ انہیں حکومت کی طرف سے دیرانی دیر کا خطاب ملا تھا۔ اس کے علاوہ ترکی اور ترکی بھی خوب بولتے تھے۔ مرزا ابوالخاں کا خیال تھا کہ فارسی زبان سے زور مٹوئی لفظوں کو خارج کر دینا چاہیے۔ اور اس کی جگہ فارسی قدیم جاری کرنی چاہئے۔ آزاد کو ان کے مقصد سے بے ہمدردی تھی۔ لیکن طہران کا اسے اختلاف تھا۔ آزاد کہتے تھے۔ کہ علماء و حکماء کا اثر تمام ایران پر اس وقت جما ہوا تھا۔ اس خیال کی مخالفت کریں گے۔ اور عوام چونکہ اس مطلب کو سمجھتے نہیں۔ اس لیے ان کی تائید بھی جیسے نہیں آسکتی۔ اگر تمام تصانیف اور عام سرکاری کاروائی اس کی زبان میں ہونے لگی تو بیک گھر جانے کی۔ کیونکہ مدہ لفظ فارسی کے اب لوگ بھول چکے ہیں۔ اور ان کی جگہ زور الفاظ سے بچے ہیں۔ ہزاروں کے لیے لفظ فارسی موجود ہیں۔ مگر مستعمل نہیں۔ اور یہ ناممکن ہے کہ اونٹے اونٹے کام کے لیے ہر شخص ڈکشنری سے مدد لے۔

انہوں نے رائے دی۔ کہ جہاں تک ہو سکے الفاظ عربی کی جگہ فارسی الفاظ رکھو۔ اور وہ رکھو جو خاص و عام کے لفظوں کو اب بھی فائز ہیں جس عربی لفظ کی جگہ اصل لفظ فارسی کا نہ ملے۔ وہاں فی الحال عربی رہنے دو۔ یا مطلب کو کسی اور پہلو سے فارسی کے مانوس لفظوں میں ادا کرو۔ آزاد کی رائے تھی کہ یہ اس بار سے ہیں اخبارات سے بھی مدد لینی چاہئے۔ اور شاہ ایران تک اس بات کو پہنچانا چاہئے۔ کیونکہ بنیہ سرکاری امداد کے پر کام ملکی نہیں تاکہ شاہی تصانیف میں اس بات کا خیال رہے۔

آزاد کو شکیات ہے کہ طہران میں کوئی شاعر باللاستقلال نہیں۔ اصل میں فارسی شاعری فنا کی پر ختم ہو چکی تھی۔ آزاد نے اس کی وجہ یہ کہی ہے کہ جس قدر تہذیب پر مبنی ہے شاعری گھٹتی ہے۔ دوسرے شاہ اور اہل دربار پر یورپ کا اتنا غلبہ چڑھا ہوا تھا کہ ہر شاعر کی نسبت علوم و فنون کے زیادہ خواہاں تھے۔ پھر اہل دربار کس کی امید پر شاعری سے نکاح کرتے۔ آزاد دو چار شاعروں سے طہران میں ضرور ملے۔ لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ شاعروں کی ساری خوشحالی بعض امراء کی قدر دانی سے پہنچی جاتی ہیں۔ نہیں تو الٹ ہی رہی ہے۔

طہران کی علمی صحبتوں میں ۳۵ مبعینہ تک آزاد کا خوب بھی لگا رہا۔ مگر شوق کی پیاس کسی طرح نہ بجھتی تھی۔ اور دل اس سرچنے سے سیر نہیں ہوتا تھا۔ ۳۶ مبعینہ غرض خوب محنت اور ہر وقت میں گزرتے۔ طہران میں پھرنے کا بہانہ سرزدی کا موسم بھی تھا۔ آخر جب مارچ کا مہینہ آیا۔ اور ہمارے ایرانی کی سرزمین پر لشکر اتارا۔ تو آزاد بادلِ نخواستہ طہران سے رخصت ہوئے۔ اب ان کی صحبتیں ختم ہو چکی تھیں۔ اور ہر روز تمخواہ میں سے ۲۴ روپے کٹ رہے تھے چنانچہ جب آخری برف باری ختم ہوئی۔ تو یہ شوق کا زاد راہ اور رعیت کا کارواں باغ و کرک مشہد مقدس روانہ ہوئے۔

والیسی

سفر نامے کے مطابق طہران سے سرحدت کی تاریخ کا تعین تقریباً یکم مارچ کو ہوتا ہے۔ طہران میں ۳۵ مارچ تک پہنچے اور علی عباس میں منہمک رہنے کے بعد آزاد پر فارسی زبان کا ایسا جادو چل گیا تھا کہ ان تاریخوں میں سفر کی یادداشتیں انھوں نے فارسی زبان میں

کھسی ہیں، لیکن یہ سفر نامہ نہیں رہا، بلکہ صرف غمزدی یا دورِ اشقوت کے نوٹ ہیں۔

طہران سے مشهد جانے کے لیے آزاد نے وہ راستہ اختیار نہیں کیا، جو عام مسافر اور زائرین کے لیے مخصوص ہے۔ ایران کی سیاحت سے ایک نوحہ ان کی "حاکِ وطنی کو سفر کا بیہودہ کھانا" بھی ملتی ہے۔ اس لیے آپ ہمدان گئے، کہ جس کی خاک سے ان کے بزرگ پیدا ہوئے تھے اور جہاں سے ان کے اسلاف ہندوستان آئے تھے۔ ہمدان تک پہنچنے کی کوئی تفصیل نہیں ملتی۔ البتہ مختلف منزلوں کے نام اور ان کی مسافت کا ذکر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یکدم مارچ کو طہران سے روانہ ہونے کے بعد یہ مشهد تقریباً ۱۲ مہینے بعد اپریل کے آخیں پہنچے ہیں۔ ہمدان کے راستے میں کن کی مملکت سے طاعت ہوئی۔ ہمدان کی قدیم عمارتوں کو کیسا پایا۔ اور خاکِ وطن کو دیکھ کر آزاد کے حساس جذبات پر کیا گزری ان کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔

اس حجتہ سفر کی یادداشتوں میں جا بجا مشہور مقامات کا ذکر ہے۔ ہر مقام پر جس میں بزرگ کا مزار ہے۔ اس کا بھی ذکر کیا ہے۔ جگہ جگہ علم کی تلاش اور تاریخ کا جستجو آزاد کو تاریخی مقامات کا کھوج لگانے پر مجبور کر رہا ہے۔ بڑی بڑی سراؤں، مسجدوں اور مقبروں کے متعلق تاریخی عمارتوں کے حالات سے قطعاً نا اہل ہیں۔ حد یہ ہے کہ علماء اور علماءِ امن کی بات کو سس کر لٹال دیتے ہیں۔ بزرگوار میں جامع مسجد کے متعلق کوئی لکنا ہے کہ چار سو سال پہلے بنائی گئی۔ ایک اور شخص کا بیان ہے کہ اس کا بڑا دروازہ چوبیس سال پہلے اپنے بچپن میں بننے میں نے خود دیکھا تھا۔ جہاں جہاں انھیں کوئی تاریخی کتبہ کسی مدرسہ یا عمارت پر ملتا ہے۔ فوراً کتاب میں لکھ لیتے ہیں۔ بزرگوں کے مزار کی پر تاح پڑھتے ہیں۔ اور مشہور تاریخی شخصیتوں کا ذکر نہایت محنت سے کرتے ہوئے جاتے ہیں۔ راستے میں جا بجا صفوی بادشاہوں کی سڑکیں جو اب دیوان ہو گئیں ہیں۔ آزاد سے ان کے حق میں لکھا ہے خیر لکھوائی ہیں۔ اگر کسی کی زبان تہذیب کو کوئی واقعہ و خواہ وہ معمولی ہی سا کیوں نہ ہو (مل جاتا ہے) تو آزاد خود اسے نقل بند کر لیتے ہیں۔ اگر کسی قبیلے یا تہذیب میں کسی صاحبِ علم کا پتہ جلتا ہے تو بے تکلف آزاد اس کے دروازے پر حاضر ہو جاتے ہیں۔ اور منزل پر آرام کرنے کی بجائے علم و ادب کے موتی جمع کرنے کی ننگ و دین حضور ہیں جہاں کہیں کوئی علاحدہ مل جاتا ہے۔ فوراً اسے لکھ لیتے ہیں۔ اپنی زبان کے وہ فقرے جو کتابوں میں نظر نہیں آتے۔ اور صرف بولے جاتے ہیں۔ آزاد کے لیے خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔ اگر کسی عمارت سے میں مقامی طور سے اختلاف پاتے ہیں تو وہ نوٹ کر لیتے ہیں۔ اہلِ اصفہان کی اصطلاح طاق کر دین ہے۔ مزارِ اسان کے نصحا اس کی جگہ سر برون بالا برون بولتے ہیں۔ عوام کی اور کہتے ہیں۔ اسے بھی آزاد نے فوراً لکھ لیا۔ اہلِ محرم کی اصطلاح میں بھی ان کی ثروت نگاہی سے نہیں بچتیں۔ راستے میں جب کہیں کسی عالم سے ملاقات نہیں ہوتی تو محرف انشینوں سے ہی باتیں کر کے علم کے موتی روٹ لیتے ہیں۔

سبز دلوں کے بعد منشا پور کی مردم خیز سرزمین کا ذکر آزاد نے بہت محنت سے کیا ہے۔ اس وقت جو شرفا اس شہر میں آباد تھے ان سے مل کر ان کے ہم ادراغِ اندازِ فخر سے ملے تھے۔ یہ شرفیاء الدین عطاء کے مزار پر فاتحہ پڑھ رہے تھے۔ اور دوسرے بزرگوں کے مزاروں کے نام بھی دریافت کئے تھے۔ مگر اس کی عظمت کے مقابلے میں اس کی اس درجہ بڑی حالت اور گھنڈہ دیکھ کر آزاد ہلکے پڑے۔

حضرت بایزید بسطامی کے وطن بسطام کی محبت نے آزاد کو راستے سے ہٹا کر اپنی وطن کھینچا۔ لیکن اب وہاں فقط ایک گاؤں باقی رہ گیا تھا۔ آزاد نے اسے بھی دیکھا۔ مگر سب سے زیادہ حیرت انہیں بالاغیا بانی کے ایک چبوترے کو دیکھ کر ہوئی۔ اس چبوترے پر ایک بڑا ترانہ نصب تھا۔ اور پاس ناؤں کا شور مچ رہا تھا۔

اگرچہ بہار کا موسم شروع ہو چکا تھا مگر خراسان میں برف باری جاری تھی۔ ایک جگہ پر تکلیف اٹھانی پڑی۔ برف آبادام باسکی نکلا۔ راستہ تمام سفید تھا اور عالم گیر برف برس رہی تھی۔ آخر مشہد مقدس کا تقصیر دور سے نظر آیا۔ اور آزاد کی عقیدت مندا کھیل نام رضا کے حضور میں غم ہو گئی۔ فوراً گھوڑے سے اتر کر زمین چھلی۔ آزاد کے والد کو امام شامس سے جو عقیدت تھی۔ اس کا ذکر آزاد نے کیا ہے اور لکھا ہے کہ مولوی محمد باقر امام اکثر ایک تقصیر پر پڑتے تھے۔ جس کے تیسرے شعر میں طرق کا ذکر ہے۔ جب آزاد طرق پہنچے۔ تو وہ شعر یاد آگیا۔ انہی کی ربانی آزاد نے سنا تھا۔ کہ یہ قصیدہ حضرت کے دو معذمارک کے ایک دروازے پر آویزاں ہے۔

یارب ایں ارض مقدس چہ مقام است و چہ جا است

کہ زمینی تا بہ فلک نظمہ النوار خدا است

مشہد مقدس کی زیارت سے سرفراز ہونے کے علاوہ روضہ مبارک سے ملتی کتب خانے کی فہرست بھی مہتاب کی آزاد کے بیان کے مطابق یہ لائبریری کتب عجیب و غریب سے علوم و فنون کا خزانہ ہے کیونکہ سلاطین و امرا سٹے سلف سے عمدہ عمدہ نایاب کتابیں بھی کر ذخیرہ آخرت جمع کیا ہے مشہد کی تجارتی حیثیت اس کے خوبصورت خیابانوں اور آب و ہوا کی لطافت سے بھی آزاد بے خبر نہیں۔ ایک جگہ بازار میں انگوروں کا خرچہ آویزاں دیکھا۔ ابھی انگور کا موسم شروع نہیں ہوا تھا۔ پوچھے پر معلوم ہوا کہ یہ گزشتہ سال کے انگور ہیں ساگرچہ بعض مر جھا گئے تھے مگر بعض ان میں سے صاف اور درست تھے۔ یہ مشہد کی آب و ہوا کی تاثیر تھی۔

ہمدون و مشہد کی قبر دیکھی۔ علمائیں شیخ بہاؤ الدین علی، شیخ حر علی، شیخ طبری کے مزار پر گئے۔ اور کتبے نقل کئے۔ طبع مہتابی کے مزار پر کئی مرنبر حاضر ہوئے۔ شعراء میں فردوسی اور اسدی۔ طوسی کی قبروں پر گئے۔ اور اس مقدس مقام پر ۱۲ روز نظر کو وطن کی طرف قدم اٹھایا۔

مشہد سے ہمدونستان آنے کے دو راستے ہیں۔ ایک کومان ہوتے ہوئے بندر عباس پہنچتا ہے۔ جہاں سے پھر جہاز میں بیروت کو چلی آسکتے ہیں۔ اور دوسرا ہرات اور قندھار سے کٹنے کی منزل پر ختم ہوتا ہے۔ غالباً اس وقت تک وہ راستہ دریافت نہیں ہوا تھا جس پر آج کل کوئٹہ سے مشہد تک ٹائبرین سفر کرتے ہیں۔ آزاد نے بندر عباس کے راستے کو طولا فی سمحہ دوسرے اس راہ پر جانے والا کوئی کاروان نہیں تھا۔ اور انہیں اب شخصیت ختم ہو جانے کی وجہ سے ایسی کی جلدی تھی۔ اس لیے مجبوراً امرات اور قندھار کی راہ اختیار کی۔ کچھ لوگوں نے کہا بھی کہ راستے میں خفاؤں کی طرف سے خطرہ ہے۔ اس لیے سردار کو محو مابند عباس کے راستے اتنے جانتے ہیں۔ مگر ایک گروہ نے رائے دی کہ اب میر عبد الرحمن نے افغانستان کا ہندوستان ایسا چست اور درست کیا ہے کہ آج تک کبھی نہیں ہوا تھا۔ آزاد امیر عبد الرحمن کے عدل اور انتظام پر یقین کر کے توکل بخدا اس راستے سے مٹ کے پہلے ہفتے میں روانہ ہو گئے۔

دوسری منزل خیر یانی میں ایک فاضل ملا محمد علی کو دیکھا کہ اپنے لڑکے کو شریعہ کا درس دے رہے ہیں۔ لڑکے کی عمر اسی کی تھی۔ آزاد کو یہ دیکھ کر بہت لطف آیا کہ سات چڑھ کر اچھا کھا۔ اور تھوڑی دیر بعد کھینے کے لیے گھر کی دیوار پر چڑھ گیا۔ علمائے کی سادہ زندگی اور علماء کی بے تکلف زندگی کا ان کے دل پر بہت اثر پڑا۔

تیسری منزل سے روانہ ہوتے۔ تو بغیر ان کے نیند نے شیخوں مالدیر اور سہیل کوٹ گئے۔ اور لڑکے کو مہر کے بل زمین پر آن گرسے۔ خدا کی قدرت سر مال بالی نکلا گیا۔ نیا دہ فرشتہ اور سینے پر صدر پہنچا اور پہل کوٹ گئی۔ سارباہن زمین پر سے اٹھ کر لمحات میں

لیڈ کراؤنٹ کی کمر پورٹی سے جکڑ دیا۔ سب کو خیال تھا شاید مر گئے۔ صبح کے قریب منزل پر پہنچ کر رستہ کھولا اور آواز دی تو انھیں ہوش آیا۔ تین دن عجیب حالت رہی۔ نہ کوئی جراح اور نہ معیکہ نہ تدبیر الہی سنے جیسا ہی کی اور پہلی آپ ہی چمک اٹھی ہو گئی۔ مگر اس کی گرجا، قی رہ گئی جو باقی عہد کے ساتھ رہی۔

اب شمس ہرات کے دیرانے۔ سلاطین تیموری کے قدیم آثار اور مساجد کے کتبے دیکھنے آزاد قافلے کے مسافر قدیم باد کی طرٹ بڑے جا رہے تھے۔ ہرات کی ایک مسجد کے اندر نہایت عمدہ خط و نشان میں کوئی فرمان لکھا دیکھا۔ کوشش کی کہ اس کو پڑھ کر نقل کر لیں۔ مسجد کے اندر چند خوشخوار ملا جو دروں میں بیٹھے تھے۔ ان کے ڈر کے مارے غور سے نہیں دیکھ سکے کہ کہیں کوئی چھپا ہوا نمونہ ہو۔ اور مفت میں جان جائے کیونکہ ان کے نزدیک گائے اور آدمی کا کاشا برابر ہے۔ فقط اتنا کہ دنیا کافی ہے کہ ”ہم پر مکی درنگی“ بود کا پر (کافر) بود۔ کہ میدانہ کر گشت است“

اس نواح میں مولانا جامی اور ان کے استاد مولانا محمد والدین۔ امام فخر الدین رازی۔ اور محمد حسین واعظ کاشفی کے مزارات پر فخر پڑھی۔ یہ وہی ملا حسین واعظ کاشفی ہیں جن کی انوار سہیلی آزاد بچپن میں پڑھ چکے تھے۔ یہاں بھی علماء کی صحبت سے بعض حاصل کیا۔ اور جس بزرگ سے اس کی علمی قابلیت اور فضیلت کا حال نوٹ کر لیا۔ جو قابل ذکر نہیں تھے۔ ان کے متعلق صرف یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے۔

”باقی علماء بسیارند مگر قابل شرا۔ نیستند“

قریب ہی مولانا جامی کے استاد شیخ عیام کے مزار پر عقیدت کے چھل چڑھائے۔ اور سلطان سہزے کا مکمل مزار کو شاہ عباس صفوی کے ہاتھوں کھنڈے ہوئے دیکھا۔

کارنر کے مقام پر ایک پیر مرد سے ملاقات ہوئی۔ اس کے پاس دو نایاب کتابیں تھیں۔ مگر وہ کسی قیمت پر کتابیں دینے کو تیار نہیں تھا۔ آزاد کے پاس ایک ہفتی دانت کی سرسے دانی تھی۔ اس پر پیر مرد کی مال چمک پڑی۔ آزاد سرسے دانی کے بدلے کتابیں لے کر خوش خوش روانہ ہو گئے۔

سفر میں جب کبھی بادشہ ہوتی تھی۔ سب سے پہلے انہیں اپنی کتابوں کا خیال آتا تھا۔ ایک مقام پر اس زور کی بادشہ ہوتی کہ اونٹ پھسلنے لگے۔ خانے والوں کو مجبوراً چڑا کر ناٹا۔ سرودی کے مارے دم بند ہو جاتا تھا۔ دوسرے مسافر بادشہ سے بچنے کی تدبیر کر رہے تھے۔ مگر آزاد نے بوجھ اٹگے پیچھے اور پیٹے لگا کر کتابوں کو محفوظ کیا۔ اور پانی سے بچاؤ کے لیے ان پر مونسے مونسے ڈال دیئے۔ اور خود تو کھلم کھلا بیٹھ گئے۔

آگے چل کر پیر بادشہ ہوئی۔ اگرچہ سرودی اور ہوا کی طرف سے جسمانی تکلیف تھی۔ لیکن کتابوں کی طرف سے روحانی تکلیف کا احساس تھا۔ خدا خدا کر کے اگلی منزل پر پہنچے۔ اس موقع پر بھی آزاد کی انشا پر دازی کا دور کم نہیں جوتا۔ فرماتے ہیں:—

”در فقیح نے یہاں بھی کار سادی کے اونٹ بٹھائے۔ اور ہاج گروں کی آنکھوں

میں ایسی خاک ڈالی۔ کہ اونٹ لاد پھاند کراد پر اوپر غائب کر دیا۔ کسی کو خبر نہ ہوئی“

افغانستان کی سرحد میں داخل ہوتے ہی پروانہ ماہداری کی شہرت سے پڑناں ہونے لگی۔ ہرات میں نائب کوتوال انھیں

سید سالار کے سامنے لے گیا۔ آزاد نے وہ پرواز دکھایا، جو شہد میں افغانستان کی حکومت کے نمائندے سے انہوں نے حاصل کیا تھا۔ افغانی سید سالار غالباً ان پرچہ تھا۔ کسی اور سے پڑھو کر سنا۔ اگرچہ اس پر ہر گلی ہوئی تھی۔ لیکن سید سالار نے پوچھا کہ کیا یہ مہر مصلیٰ ہے۔ آزاد نے برجستہ جواب دیا :-

”صغیر کے سامنے مصلیٰ کو پیش کرتے ہوئے ہاتھ کاٹتے ہیں جہلی کا لٹکون پیش

کر سکتا ہے۔ اس جواب سے خوش ہو کر سید سالار نے کہا۔ بہت خوب تم روانہ ہو جاؤ“

اربابِ حکومت کی سختی کے علاوہ ہرات کے باشندوں کا سلوک بھی تکلیف دہ تھا۔ بچے سے لے کر بوڑھے تک در سپاسی سے لے کر بوڑھیا عورت تک ہر شخص سوال کرتا تھا۔ اور پھر آنکھیں بدلتا تھا اور کہتا تھا کہ کہاں سے آئے ہو۔ کیوں آئے ہو۔ کس راستے آئے ہو۔ کیا لائے ہو۔ کتنا پی کیوں لائے ہو اور اتنی کتنا پی کیوں لائے ہو۔ انہیں کیا کرو گے۔ یہ کیا کیا کیا ہیں ہیں۔ کس کس علم کی کتابیں ہیں۔ تم اس سامنے کیوں آئے ہو۔ یہاں کیوں بیٹھے ہو۔ کس رستے جاؤ گے۔ اس رستے کیوں جاتے ہو ؟

ایسے سوالوں سے آزاد کا کاکا کاکاں دم آگیا تھا۔ فخر ملک۔ اجنبی ماحول۔ کسی سے کچھ کہہ بھی نہ سکتے تھے کہ کہیں اور آفت میں نہ پھنس جائیں۔ جاسوسی کا الزام نہ لگ جائے۔ گھر کا فترے لگا کر گرون زدنی نہ ٹھہرائیں۔ دلی ہی دلی میں بیچ نہ بک کر رہ جاتے۔ یہاں ایک ایک گھڑی بہاؤ تھی مگر تندرست نہ رہنے کی وجہ سے ۱۲ روز گور گئے۔ ہرات کی محنت گیر یوں سے تنگ آ کر آزاد کو ایمانیوں کی محبت اور ان کی مہمان نوازی یاد آگئی۔ کس غلوں سے نکلتے ہیں :-

”ہزار رحمت ہے ملک ایمان پر کہ مہینوں وہاں رہا۔ جا بجا پھرا۔ اور سب سے ملاحظہ۔

برقم کی بات پوچھتا تھا۔ اور کھٹنا قنودہ بناتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ کسی بات کا شہر دل

میں نہ لاتے تھے“

ہرات کے قندھار اور کوئٹے کو روانگی

غالباً جون کے مہینے میں ہرات سے ہزار دقت آزاد معاذ ہوئے۔ ہرات سے قندھار ایم ایم منزل کی مسافت تھی۔ اور یہی سمجھ کر آزاد اس رستے سے آئے تھے۔ مگر یہ سفر پورے ۲۷ دن کا ٹا۔

یہ علاقہ تمام ایرانی ہے۔ باشندے صوفائیں ہیں۔ جہاں پانی دیکھتے ہیں۔ گبل تان کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ایمان کے سبز و نارند اور پُر لطفت نباتات کے بعد اس صحران کو دیکھ کر آزاد کا دل اندھیری اجاڑ ہوا۔ آواز دے کے قافلے میں ۱۰۰ نفر تھے۔ اس بے قافلے والے جوہر ہر میدان اور آب و ہواں منتے تھے۔ دریاہ چھوڑ کر ادھر نکل جاتے تھے۔ اور خواہ مخواہ ہی مسافت طے کی ہو۔ ہری گاس دیکھتے ہی منزل کر لیتے تھے۔ ہر مسافر نے اپنے ساتھ کھانے کا تو شہ بانڈھ لیا تھا۔ جہاں حوائشیں قیام تھیں۔ ان سے آٹا۔ گھی اور گھڑوں کے لئے سولے لیتے۔ اس علاقہ میں دو بچے پیسے کا مروج نہیں۔ چروں کا آپس میں تبادلہ ہوتا ہے۔ آزاد نے بھی اپنے ساتھ سربان اکٹھا کر لیا۔ سر۔ سر۔ کالی مرچیں۔ سرخ و غیرہ خرید کر رکھ لی تھیں۔ انہی چیزوں کے بدلے میں روٹی، دودھ، پھل اور گھی وغیرہ مول لے لیتے تھے۔ ان کے پاس پکھنے کا سامان نہیں تھا۔ اس لئے بہت سی مددیاں پکار کر رکھ لی تھیں۔ یہ پانچویں دن مکرگین

انہیں سکھایا۔ ایک جگہ کہا جانی میں بیٹھ گیا۔ وہ ہیپک گئیں۔ جب کچھ اور نہ ملتا تھا۔ تو ۱۰-۱۵-۱۵ دن کی سوکھی روٹی پانی کے گھونٹ سے کھاتے تھے۔ لوگ اپنی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگاتے دیتے تھے۔ کرنا پاک ہو جاتے تھے۔ کئی لوگ بچے کے کرانے کو کھڑے ہو گئے۔ کہ کافر ہے۔ لیکن جب یہ کسی کو دودھ، دہی وغیرہ کھانے کی چیزیں دیتے تو لے لیتے۔ اصل میں ان کی سختی کسی خاص سبب سے نہیں مٹی جانتے تھے کہ ہندوستان کے لوگ روپے واسے ہیں انہیں جس طرح ہو سکے وہاں کر دینا چاہیے اور بہانہ ہاتھ آجائے تو مارنے میں بھی دریغ نہیں کرنا چاہیے۔

قند ہار پہنچ کر بھی یہ مصیبتیں ختم نہیں ہوئیں۔ یہاں پانچ روز گزارنے مشکل ہو گئے۔ بہرات کی طرح قند ہار میں بھی راہ چلتے لوگ روک لیتے اور کہتے ”بیابا.....“

ایک دن میں کر آزاد کو بنا مار میں حبس محمول آڈیٹس نے روکا۔ اور وہی سوال کیا کہ کہاں سے آئے ہو۔ ان کا دل جلا ہوا تھا۔ انھوں نے جس طرح ان دونوں کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اس کا دلچسپ حال آزاد سے ہی سُنے۔

انھوں نے کہا ”ازہند آمدہ ام، بازہند میردم“

”چرا آمدی؟“

”تو گلو کہ چرا می پرسی؟“

ایک شخص نے بازو پکڑ کر کہا ”میدانی مانی تو اینم ترا گیم پیش امیر صاحب بریم۔ تو جاسوس فرنگ ہستی“

آزاد بولے ”صلیہ خوب۔ ماگوئیم۔ امیر صاحب مسافر ستیم، ملک شما آیدیم۔ ملک شما ماخو رویم۔ آرام یافتیم، دعای کیم می رویم۔ اس ہا بستند کہ حالہ بخیر خرابی شما می زند۔ فرنگ می آید۔ و در روی روند نوکری کی کنند۔ یک قوم مرغ بہ ہم ربیک ماکیاں بہ عاری فرود شد۔ بازو قلیکہ..... می آید۔ بہ کفر شما فتویٰ می نویسند“

آزاد کی ان بھیجی باتوں کو سن کر دونوں افغان گھبرا گئے۔ اور ایک دوسرے سے کہا۔ ”کہ گنبد؟ اور آزاد سے کہا۔ ”برودہ برودہ آزاد اپنی فتح کو اس آسانی سے ہاتھ سے جانے دینا نہیں چاہتے تھے۔ ایک چابک اور لگا پوچھا۔

”عالا اینم بغراؤید کہ اسم شریعت شما چیست؟“

ایک تیسرے شخص نے ان سے پوچھا ”این چه بلاست؟“

افغانوں نے تنگ آ کر کہا ”یہاں خرس است کہ من میگندارم اوئی گزارد“

قند ہار سے کوئٹہ تک کا کرابہ دس روپہ تھا۔ آزاد قند ہار سے عاجز آگئے تھے۔ اس لیے دس کی جگہ بارہ بیٹے دے کر سواری کو اسٹے پہلی۔ اور پانچ روز کا راستہ ادا دیں میں لے گیا۔ اور کوئٹہ پہنچ کر خدا کا شکر ادا کیا۔ اس زمانے میں کوئٹہ تک ریل کی لائن نہیں بنی تھی۔ اس لیے کوئٹے سے راولپنڈی تک ابھی سفر باقی تھا۔ سفر کی یہ آخری منزل کس اہتمام سے طے کی اس کا ذکر بھی آزاد ہی کے لفظوں میں سنئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے بہت خواندہ رہے۔ اس لیے کہ الٹ پلٹ کے سیاح کی طرح اپنے

محبوب کو ساتھ لیے منزل پر پہنچ رہے ہیں :-

”دوسرے دن ایک چھکڑا کر یہ پر کیا۔ اس میں کتابیں لادیں۔ اور آپ بچھڑا بچھا کر

اوپر بیٹھا“

سفر نامے کے متعلق رائے

سیر ایران نام کی جو کتاب اس وقت بازار میں ملتی ہے، اس کے پہلے حصے میں آزاد کا ایک کچر ہے جو انھوں نے ۲۵ جولائی ۱۸۷۱ء کو لاہور میں دیا تھا۔ غالباً یہ تقریر انھوں نے پہلے سے لکھ لی تھی۔ جسے اخبار فیتہ ہند نے شائع کیا۔ کچر کتاب کے ۳۴ صفحات پر عادی ہے کتاب کے دوسرے حصے میں ان کا سفر نامہ ہے جو ۱۷۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ کچر میں بار بار آزاد نے سفر نامے کا حوالہ دیا ہے۔ اور اکثر مباحث کو یہ کہہ کر ختم کر دیا ہے کہ ان کی تفصیل سفر نامے میں پیش کریں گے۔ موجودہ سفر نامہ جو سیر ایران میں چھپا ہے آزاد کی یادداشتوں اور ان تحریروں کا مجموعہ ہے۔ جو دوران سفر میں یہ لکھتے رہے۔ سفر کے ابتدائی حصے میں بہت سی باتوں کی تفصیل ہے مثلاً لاہور سے کراچی کا سفر کراچی میں ایک ہفتہ قیام۔ کراچی سے بڑشہ تک جہاز کا سفر اور بڑشہ سے شیراز تک کی سیاحت پر تمام حال سفر نامے میں خاص تفصیل سے موجود ہے۔ لیکن جوں جوں سفر بڑھتا گیا۔ اور دوسری مصروفیات پیدا ہوتی گئیں۔ سفر نامے کی طرف سے آزاد کی توجہ کم ہوتی چلی گئی۔ طہران کے ٹھہروں اور مشہور مقامات پر پہنچنے کی تاریخیں بھی موجود ہیں۔ لیکن طہران میں ۳۰ دسمبر کے قیام کے متعلق کوئی تفصیلی بیان نہیں ملتا۔ ہندوستان سے جہے تھے۔ تو جنسی اور قری و دلاؤں اور عجیل ڈانٹے جاتے تھے مگر بعد میں مرت قری تاریخیں نظر آتی ہیں۔ اس کی وجہ ایک یہ جی ہے کہ ایران میں قری تاریخوں کا رواج تھا اور سفر کی مصروفیت میں قری تاریخوں کے ساتھ شمسی تاریخوں کا مہیا کرنا مشکل ہو گیا۔ طہران سے رزائگی کے بعد مشہد پہنچنے تک کا حال بہت مختصر ہے۔ یہ سفر انھوں نے میرے حساب سے تقریباً دو ہفتے میں طے کیا۔ حالانکہ طہران سے مشہد کی مسافت ۹۰ سے زیادہ نہیں۔ سفر نامے میں ۲۲ مہادی لکھول (یک ماہ) طہران سے شاہ عبدالغفور جاتے کی تاریخ لکھی ہے۔ ۲۴ کو ابوان کیف قشلاق میں قیام کیا ہے۔ اور ۲۳ مہادی لکھول کو ابوان کا نام نظر آتا ہے۔ اس کے بعد کسی شہر کا حال نہیں ملتا۔ البتہ چند شہروں کی مسافتیں درج ہیں۔ اگر یہ مسافتیں سفر کرنے کے بعد لکھی گئی ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مصفاہان کے راستے قزوین گئے۔ اور وہاں سے ہمدان کا سفر کیا۔ ہمدان سے سرزادسں راستے تھے۔ اس کی کوئی خبر نہیں دی۔ کچر میں جی ہیرت ہے کہ ہمدان کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ لیکن طہران کی روایت سے مشہد پہنچنے تک ۲ مہینے کا طویل عرصہ اس بات کی کافی شہادت ہے کہ یہ ہمدان منور گئے تھے ورنہ یہ سفر اتنے دن میں طے نہیں ہونا چاہیے تھا۔

مشہد سے روایت کی تاریخ کا تعین بھی ممکن ہے۔ لیکن اس کے بعد کہیں تاریخ کا حوالہ نہیں دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایران کی خوبصورت سرزمین سے افغانستان کی بے آب و گیاہ سرزمین پر داخل ہونے کے بعد ان کا مقصد مرت ہندوستان پہنچنا رہ گیا تھا۔ دوسرے قدم قدم پر کھلیعت اور مشکلات کا سامنا تھا۔ اس لیے سفر نامے میں سوائے ان شکایتوں کے یا چند ضروری یادداشتوں کے بے حد اختصار سے کام لیا ہے۔

چوکی زبان اور انداز دی ہے۔ جو انہی کی دوسری تحریروں کا طرہ امتیاز ہے۔ اگرچہ دلچسپی چاہتا ہے کہ ایران کا ذکر ایسی سلطنت اور بلاغت سے کیا جائے جو ہمیں ہندوستان فارس کے دوسرے حصے میں ملتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ سفر کی کسل اور ننگانہ بھی دور نہیں ہوئی تھی۔ اور احباب کا اتفاق تھا۔ اس لیے جلدی میں یہ لکھ کر بیلدوسر تیاں یہ ہے کہ یہ تقریر آزاد نے بغیر کسی تحریری مادہ کے کی تھی۔ اخبار نویسوں نے نوٹ لے کر اسے اخبار میں چھاپ دیا۔

سفر نامے کا ابتدائی حصہ جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے تفصیل ہے اور اس کی زبان میں بھی بے تعلقی کے ساتھ افشاء پردازی کا رنگ موجو ہے۔ لیکن بعد میں جہاں مختصر نویسی سے صفوں کا بیان چند فقروں میں ادا کیا ہے۔ وہاں انشائی کوئی خاص بات نظر نہیں آتی لیکن اتنا آغاز ہوتا ہے کہ جو مطالب اس اختصار سے لکھے گئے ہیں۔ انھیں لکھنے والے نے اس خوبی سے لکھا ہے کہ بعد میں ان سے دفتر تیار ہوں گے۔

سفر نامے کی تاریخی اہمیت

سیر ایران کنی لحاظ سے ہماری زبان میں ایک دلچسپ اور قیمتی سرمایہ ہے۔ اول تو یہ پہلی اور آخری کتاب ہے کہ جس کی مدد سے ہمیں آزادی کی اپنی تحریروں سے ان کی زندگی کے متعلق معومات حاصل ہوتی ہیں۔ اگرچہ یہ مشکل سے ۹ مہینے کی خود نوشت سوانح ہے۔ لیکن آزادی کی زندگی کے متعلق داخلی شہادتیں اس قدر کم ہیں کہ اس پیش ہماوہ سے ہمیں بہت سی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ ان کا علمی ذوق، تجسس، تحقیق کا شوق، غالب علمائے زندگی، علماء اور فضلاء کی محبتوں سے نیدنہ حاصل کرنے کا شوق یہ سب باتیں سیر ایران سے ہمیں پہلے مرتبہ نمایاں نظر آتی ہیں۔ آزاد کے مذہبی اعتقادات، آل عیار سے والمانہ عقیدت اور بزرگان سلف سے محبت ان کی زندگی کے ان جلووں پر بھی خوب روشنی پڑتی ہے۔

آزاد نے سیاحت ایران جن مقاصد کے پیش نظر کی تھی۔ یہ اپنی جگہ ایسے بلند اور اعلیٰ مقاصد ہیں کہ انھیں ادبی سیاحتوں کی خدمت میں بہت اونچے درجے کا استحقاق دیتے ہیں۔ ۵۵ برس کی عمر میں جب کہ مصعب، عزیز اور احباب انہیں آرام کی صلاح دے رہے تھے۔ آزاد ایک مشکل اور زبردست مہم پر کمر باندھ کر ہوائوں جیسی ہمت کے ساتھ روانہ ہوتے ہیں۔ وطن کی محبت اور اہل وطن کی بھولی کا انھیں ہر وقت دھیان ہے۔ جب احباب ان کی دلیلوں سے قائل نہیں ہوتے تو یہ کہہ کر انہیں خاموش کرنا چاہتے ہیں۔

”ہمیں ضرورتوں کے لیے یہیں جانا ہوں۔ ملک ان کا محتاج ہے۔ اور قوم کو خیال نہیں۔ لیکن ہو گا۔ ایک عرصے کے بعد۔ اس سے ہمزہ کہ میں ہی اس کام کو کر جاؤں“

یہ فقرے صرف ایک انشاء پر وازا دیب کے نہیں۔ بلکہ ایک غمخوار مصلح اور ماہر تعلیم کے ہیں جو اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے ایک مدت سے جو کچھ خدا دیتا۔ اس میں سے کم خرچ کرتا۔ خانہ بربادوں کی طرح گردان کرتا اور صرف اپنے مہربانک دلنے سے خائے ولی روشنی کرتا تھا۔ آزاد کی اصلاحی کوششیں جدید فکر اور دی بنیاد ڈالنے کے بعد سے تمام ملک پر روشنی ہو چکی تھی۔ تعلیم نسواں اور دوسری اصلاحی تحریکوں میں بھی آزاد پیش پیش تھے۔ مگر ان کی اصلاح صرف ہندوستان تک محدود نہیں رہی۔ ایران کے دیہات میں جب عالموں اور فاضلوں کو گنہگار کی زندگی مہر کرتے دیکھتے۔ تو انہیں اپنی اولاد کو طہران یونیورسٹی میں تعلیم دلانے کا مشورہ دیتے۔ آزاد

ہندوستان میں مغربی اثر کا بڑھتا ہوا اقتدار اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ ان کے سامنے دہلی کی قدیم علمی اور ادبی جمعیتیں مریادہ ہو چکی تھیں۔ اور ان کی جگہ پنجاب میں یونیورسٹی اور کالجوں کو قائم ہوتے انہوں نے خود دیکھا تھا۔ یہ زمانے کے نبض شناس تھے اور جانتے تھے کہ ایران میں بھی یہ فضا چند روز کی مہمان ہے۔ ان کی نگاہیں سن لگا ہوں نے طہران کی بدلتی ہوئی فضا دیکھ کر فیصلہ کر لیا تھا کہ آئندہ ایران میں بھی وہی ہونے والا ہے جس کا تجربہ یہ خود ہندوستان میں عیشہ کے انقلابات کے بعد کر چکے تھے۔ اس لحاظ سے سیرایان انیسویں صدی کے آخری ربع کے ایران کی دلچسپ داستان ہے۔

اس سفر میں ایک کمی یہیں نمایاں نظر آتی ہے کہ تمام سفر نامے میں عوام سے ملنے جلنے اور ان کے رہنے بہنے کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ لیکن آؤ اور صحت ایک مقصد کے لیے گئے تھے۔ اور یہ مقصد انہیں ایک خاص طبقے کے لوگوں سے ملنے جلنے سے ہی حاصل ہو سکتا تھا۔ انھوں نے اس بات کا بھی دھیان نہیں کیا تھا کہ یہ ایران کی معاشی اور سیاسی تاریخ لکھنے جا رہے ہیں۔ اس لیے اس کمی کو ہم نظر انداز کر سکتے ہیں۔

نذیر احمد کی انفرادیت

ڈاکٹر سید عبداللہ

یوں تو سرسید کے رفقا میں سے ہر ایک شخص غیر معمولی قابلیتوں کا مالک تھا۔ اور اپنے اپنے خاص شعبوں میں ان

میں سے کسی کی نظیر آج بھی موجود نہیں مگر مولوی نذیر احمد ————— جنہیں بعض لوگ ڈپٹی نذیر احمد کہنا پسند کرتے ہیں ————— ایک ایسے مصنف تھے جن کی شخصیت اور جن کا دلچسپ تصنیف دوسروں سے منفرد تھا۔ یہ انفرادیت ان کے اکثر کاموں کی اس روح میں صاف ہے کہ انہوں نے سرسید کے بعد شاید سب سے زیادہ عام زندگی اور عام مسائل سے رابطہ رکھا۔ بشی ایک عام دانشور رکھتے تھے اور جسے بڑوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ادب میں بھی ان کا مذاق راگم سوجا سب نہ ہو تو عرض کروں کہ ”بورڈوائی“ ہی سا تھا۔ شان اور تہی، لطافت و لطافت و شرفانے ادب کے سے متاثرہ حزل کوہ بھی میں ہوں یا نہریت گاہ ندوہ میں ————— وہ بیگم ایک اشرافیہ خان سے ازدواج ہوئے ہیں۔ مولانا حالی ————— خوش صفات حالی ————— ان کی سادہ مزاج تو ہر جگہ شائعی اور مصالحت کی ہی کی تھی ————— وہ ایک نرم وادب تھے۔ نرم زبان اور شریفانہ لب و لہجہ، ان کا اقبایہ خاص تھا اشرافیت سے دب کر چلنا ان کی وضع تھی ————— سرسید اپنے اشرافیہ پلٹ خادم سے اتڑ کر عوامی اپیل تک ضرور آئے مگر ذہنا جمہوری اشرافیت ہی کے دلدادہ تھے ————— ان میں سب سے زیادہ جن شخص کو ہم عام لوگوں کے قریب ہاتے ہیں وہ نذیر احمد تھے۔ جن کی اپنی زندگی عوام ہی کے ماحول سے ابھری تھی۔ اور ان تجربات سے مالا مال تھی جن سے زندگی کی سر فہمیں پاک انہوں نے جمہور کی زندگی کو سزا دینے کے لیے ادب پیدا کیا جتنا اس دور کے کسی اور شخص نے پیدا نہ کیا۔

نذیر احمد کے ضمن میں میں نے عوامی، اشرافی، بورڈوائی و غیرہ کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ ان سے کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے۔ نذیر احمد کو تو ان اصطلاحوں کا ادراک ہی نہ ہو گا۔ ————— مگر ان کی تصنیف روح کا تہرہ یہی کہتا ہے کہ وہ تھے عوام دوست شخص۔ کیونکہ ان کی تصنیف کی غالب روح اس ہمدردی اور غمگسادی کے جذبے سے بریں ہے جو انہیں عام لوگوں کی زندگی کو سمجھنے اور ان کے لیے مناسب دستور حاصل تیار کرنے پر مجبور کرتی رہی ————— اور یہی نہیں سرسید کے بعد شاید وہی بڑے مصنف تھے۔ جن کی زبان میں عام لوگوں کی زبان کے قریب تھی ————— یہ صحیح ہے کہ اس میں ایک مخصوص عالمانہ طبقاتی محدودہ ضرور پایا جاتا ہے۔ مگر نذیر احمد کی گفتگو کی عمومی سطح عام ہی ہے۔

نذیر احمد نے کچھ کے لیے بھی کیا ہیں لکھیں اور تافانی کاموں کے ترجمے بھی کیے۔

گمان کی تصانیف کے اہم موضوع دو ہیں۔ اول ان کی دینی تصانیف دوم ان کے قضاے۔ ان دونوں اصناف میں وہ اپنے رفقاء سے منفرد ہیں۔ یوں کہنے کو تو سرسید ادران کے سارے رفقاء نہ مری نہیں کہلاتے تھے۔ اور اس لحاظ سے نیز احمد بھی نہ مری ہی سمجھے جاتے تھے۔ مگر نذیر احمد کی پھر تہیت میں ایک انتہائی شان رکھتی ہے۔ وہ مذہب کے معاملے میں آزاد اور تحقیق پسند آدمی تھے۔ وہ جس زمانے میں دہلی کالج میں داخل ہوئے اس زمانے میں وہ اپنی حنفی اختلاف برائے زوروں پر تھا۔ اس میں بھی وہ آزاد اور فرماں بردار سے رہے۔ بعد میں سرسید کی رقابت میں جو مری ہوئے ان میں بھی ان کی راہ اپنی پہنچی۔ ————— وہ نہ تو سرسید کے انشے معتقد تھے نہ سرسید کے مخالفوں کے پورے ہم نوا تھے۔ سرسید سے ان کا اشتراک صرف چند مسائل میں تھا۔ وہ سرسید کی طرح آزادی رائے اور عقل کی اہمیت پر خاص زور دیتے تھے۔ تقدیر، قوی، خیر و شر و غیرہ کے متعلق ان کا نظریہ وہی تھا جو سرسید کا تھا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ مذہب عین نفرت ہے اور سائنس اور دین کا آپس میں کوئی تقاضا نہیں اور ترک دنیا کا خیال ایک فیر اسلامی خیال ہے۔ مسئلہ تقدیر میں بھی وہ سرسید کے ہم نوا تھے۔ اور تنظیم جہاد کے معاملات و مسائل میں بھی ان کے ہم آواز تھے۔ ان سب باتوں کے باوجود وہ سرسید کے خیالات سے اختلاف بھی رکھتے تھے۔

وہ معبودات کے انکار میں ان سے متفق نہ تھے۔ وہ مغربی معاشرت کے معاملے میں سرسید کی سب باتوں کو صحیح نہ سمجھتے تھے اور بزرگانِ مملکت کے اجتہادات سے متعلق ان کو وہ بخشنے نہ تھے جو عام طور پر سرسید کی تصانیف سے مترشح ہوتی ہے حقوق و العزائم میں انہوں نے ایک معتدل شریعت کی بنیاد رکھنے کی کوشش کی ہے۔ جس میں زیادہ سے زیادہ چلک اور سہولت پائی جاتی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ مولوی نذیر احمد کی یہ دینی تصانیف اپنی جگہ خاصی اہمیت رکھتی ہیں۔ اور وہ کے مشہور ادیب مہدی لانادی نے ان کے تبرک کو اس وجہ اہمیت دی تھی کہ وہ رفقاء سرسید میں وہ سب سے زیادہ انہی کو اس کا استحقاق دیتے تھے کہ وہ اُردو میں ایک نامور اسلامی مرتب کو ہیں۔ ————— ادو حق یہ ہے کہ ڈاکٹر نذیر احمد اہل ایل ڈی کو یہ فضیلت مزدور حاصل تھی کہ وہ اُردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کی تدوین کی ذمہ داری لے سکتے۔ مگر نذیر احمد کا مزاج، ان کا ذہن، اور ان کی طرزِ انشاء کہتی ہے کہ وہ ناموس کی علمی اور فنی شان کو بوقرار رکھنے کی طبیعت صلاحیت رکھتے تھے۔ ————— وہ تو ہر چیز کو ایک عمومی سطح اور عمومی نقطہ نظر سے دیکھنے پر مجبور رہتے اور اسی سے انہوں نے ہر چیز کو دیکھا۔ ————— وہ تو قرآن مجید کے ترجمے میں بھی عامی یا عامی زبان استعمال کرنے سے باز نہ رہ سکے۔ (—————) اور یہ ایک واقعہ ہے کہ انہیں اپنی عوامیت کا خیال وہ بھی بگھٹاتا تھا تاہم نذیر احمد کے ذہنی تجربے سے انکار ناممکن ہے۔

نذیر احمد کی تالیفات میں دینی تصانیف سے زیادہ ناول میں ظاہر ہوئیں۔ انہوں نے دین کی خدمت میں ناولوں سے نوا کام کیا۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی دینی تصانیف کو وہ درجہ نہ دلا سکے جو ان کے ممتاز ہمعصر قسطنطنیہ کی علمی کتابوں کو حاصل ہوا۔ مگر انہوں نے عوام میں دین کی تبلیغ شہنشاہی سے کہیں زیادہ کی اس سے ان کو بھی شہرت حاصل ہوئی۔ اور ان کی تصانیف کو بھی قبول عام نصیب ہوا۔ عزمِ زبان۔ مزاج۔ لب و لہجہ۔ افادہ فکر۔ ————— ان سب چیزوں میں نذیر احمد اپنے دوسرے رفقاء سے الگ اور منفرد شخص تھے۔ وہ اردو سے الگ طرز پر سمجھتے تھے اور ان سے الگ طریق سے بات بھی کر جانتے تھے۔

نذیر احمد نے بہت سے قضاے لکھے۔ مراۃ العروس، ابن الروث، فضاء جنت، توبۃ النصوح، یاسمی، دیباچے صادقہ

ان سب میں نذیر احمد بہت اچھے ناول نگار نہ ہی ایک منفرد مبلغ اور بعض جمہوری معاشرتی مشکلات و مسائل کے اچھے ترجمان اور بہانہ ضرور ثابت ہوئے ہیں۔

نذیر احمد کی ناول نگاری کے متعلق عموماً یہ رائے غلطی لگی ہے کہ وہ نقد و نسی سے زیادہ واقف تھے کیونکہ انہوں نے اپنے نقدوں سے ویدادی، خدا پرستی اور اصلاح معاشرت کا کام لیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہیں نقد و نسی کے فن پر مہارت تھی۔ ان کے بلاٹ کمزور ہوتے ہیں اور کردار کی تصویر میں بھی انہیں کوئی چابک دستی حاصل نہیں۔ یہ سب درست ہے مگر نذیر احمد اردو کے اولین ناول نگار تھے جو واقف بھی تھے ————— اسی لیے انہیں طنز یا حقیقتاً واقف ناول نگار یا ناول نگار واقف بھی کہا گیا ہے۔

مگر وہ فن کے پرستار نہ تھے نہ فن کار ہونا ان کے لیے کوئی بڑی کشش کی چیز تھی ————— وہ تو مصلح اور مفاد پر ہونے ہی اپنی عزت سمجھتے تھے ————— اور اس عہد کے لیے انہوں نے نقد اور ناول دونوں سے فائدہ اٹھایا۔ تنقیر اور تنقیر و دونوں کے ذریعے انہوں نے اپنے عقائد کی تبلیغ کی۔ انہوں نے اپنی پرزور خطابت سے اپنے سامعین کو جس طرح مرعوب کیا اسی طرح اپنے موعظی ناولوں سے اپنے قارئین کو ترغیب دیا۔ ————— دونوں میدانوں میں "شے ایک ہی کام کر رہی تھی" ————— بات ایک تھی مرقعے دو، بقول غالب۔

وہی اک بات ہے جریاں نفس والِ حکمت لگی ہے

چمن کا جلوہ باعث ہے مری نگین زوائی کا

بہر حال ان کو اگر کوئی ناول نگار انہیں کہتا نہ ہے مگر ناول کی کوئی تاریخ ان کے ذکر سے بے نیاز نہیں ہو سکتی۔ ————— ان کے ناولوں کو ناول نہ کہتے تھے کہہ دیجئے کہا کی کہہ دیجئے انہوں نے اپنے زمانے کے عام لوگوں کی رجن میں متوسط درجے کے لوگ بھی شامل ہیں۔ زندگی سے اٹھنا لیا ہے ————— یہ ادب بات ہے کہ وہ ناول کے اصول کے مطابق بات نہیں کر سکے۔ ————— مگر ان کے اولین ناول نگار ہونے سے کون انکار کر سکتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ان کے نزدیک نقد اور ناول کے درمیان فیصلے کچھ زیادہ نہ تھے۔ ————— مگر انہوں نے ہر دوں اور جنوں کی کہانیاں نہیں کہیں۔ انہوں نے انسانوں کی کہانیاں کہیں ہیں۔ انہوں نے ہر قسم کی طرح کوئی باغ و بہار بھی نہیں کہی نہ چار درویشوں کو سیر کرائی۔ وہ تو اپنے زمانے کے "درویشوں" کی ہر کامیابی کو کستے رہے۔ اور ان کی سیر کو حق تعالیٰ تیار کرتے رہے جن کے پچھلے واقعات اور حقیقی زندگی صرف تفریح کے خیال سے نہیں صرف و اصلاح کے خیال سے بھی داستانوں سے مزین اور درجے زیادہ دلچسپ اور دل کش تھی۔ ————— نذیر احمد بات کرنے کے ذہن سے بے خبر نہ رہے۔ ان کے اپنے ہی درد اور سوسائٹی کی عین ————— ناول کی طرح بات کرنے یا بات بنانے یا کہا کی طرح لکھنے کا فن تو جی دست کے بعد بھی ہمارے ملک میں لوگوں کو نہیں آیا تھا۔ شکر کہ دیکھتے وہ تو سامنے کی عام زندگی سے صاف بچ کر ناول میں جا ماند ہوئے۔ ————— ان کے معاشرتی ناول بھی واقعتاً سے کئی کڑتے رہے۔ ————— اپنے زمانے کی باتیں کہنے کو آسان ہیں مگر کہنے کے لیے جی جہت دلدار ہوتی ہے، سرشارانے کہ بہت کی مگر زندگی کے معزز ہونے پر بھی وہ مڑدوسی کے (CETHRU) کی طرح "بہی کے کہے میں چراغ لے کر صوف گھومتے گھومتے رہے۔ سرگنگان وادی خلعت کو کوئی روشن راہ تو نہ دکھائے۔ —————

نذیر احمد نے اس کو کہے ہیں قد دکھا اور مردانہ راہ دکھا اور ان کے (CETHRU) نے تو "چراغ مراد" کی مدد سے

لوگوں کو روشنی بھی دکھائی۔

ہمارے نقادوں نے نذیر احمد کے ناولوں کو مطلقاً کہہ کر فنی لحاظ سے ان کی تنقید کی ہے ————— اور خالص فن کے نقطہ نظر سے ان میں نقائص ہیں بھی ————— مگر میں اب تک اس نظریے سے مانوس نہ ہو سکا کہ ادب میں اخلاق و موعظت کا کوئی عنصر آج نہیں سکتا ————— سوال تو صرف اتنا ہی ہے کہ ادب میں اخلاقی عنصر کا وجود اس طرح نہیں لگتا چاہیے کہ کہانی کا "امکان وقوع" برہاد ہو جائے اور خلاف فعل تقیاس پہلو پیدا ہو جائیں ————— یہ عیب تو نذیر احمد کے ناولوں میں موجود ہیں ————— مگر اخلاقی عنصر کا وجود ہونا تو کوئی عیب نہیں۔

نذیر احمد کے ناول آدھو کے اولین ناول تھے۔ اس لحاظ سے ان میں ترقی یافتہ ناولوں کی سب خوبیوں کی تلاش بے کار ہے۔ ان میں ہندوستانی مسلمانوں کے اہم دور کی معاشرت کی تصویریں ملتی ہیں۔ اس عہد کی ذہنیت، سماجی تقاضات، معاشرتی مغربیات کے بہترین رشتے جتنے نذیر احمد کے ناولوں میں ہیں اور کہاں دستیاب ہوں گے۔ ان کی وہی تدریجیت ہے جو ۱۹ ویں صدی کے بعض انگریزی قصوں کی ہے۔ جن میں ڈکنز، میکس ملر اور ڈی کے ایچ۔ جی۔ فیلڈ اور EVANGELICAL NOVELS شامل ہیں۔ ————— جس طرح انگریزی ناول کا یہ حشر اپنے نقائص کے باوجود زندہ رہا ہے اور زندہ رہنے کے قابل ہے ————— اسی طرح نذیر احمد کے قصے بھی زندہ ہی رہیں گے۔

اب آئیے نذیر احمد کے اہم قصوں پر الگ الگ نظر ڈال لی جائے۔ سب سے پہلے ابن الوقت کو لیجئے۔ بعض ممبروں کے خیال میں ابن الوقت نذیر احمد کی نام ترین تصنیف ہے ————— ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ مگر قابل غور بات تو یہ ہے کہ اس زمانے کے جدید تعلیم یافتہ گروہ کی کھوکھلی معاشرت اور انسانی کو اس سے زیادہ کس ناول نگار نے اپنے کس ناول میں پیش کیا ہے ————— فنی نقائص تو نذیر احمد کیا، اس دور کے ہر دور کے ناول نگار کے ہر ناول میں بھی موجود ہیں۔ نذیر احمد کے ناول مقدمہ کی ادو مطلق بھی ہیں اس سے بھی کسی کو انکار نہیں۔ پھر ناول کا رکن اہم جذبہ محبت۔ ان کے اس ناول میں ہے ان کی ادو ناولوں میں۔ مگر ابن الوقت میں اسس جمدی دور کی ذہنیت کی جو مرقع نگاری کی ہے اس کی شاہیں قلوب کے ناول نگاروں کی کتابوں میں بھی کم ہی ملیں گے۔ ابن الوقت اس عہد تدریجی کے عام افکار اور تشویش و اداہم کا ایک میل جسم ہے۔ ابن الوقت میں اس زمانے کی سیاسی فضا کے مناظر بھی اپنی پوری جرئت کے ساتھ معروض کر رہے ہیں۔ انگریزوں کے خیالات، دہلیا کے احساسات، سیاست و مذہب کی آویزش و دھماکت ————— اس کے ذریعہ ہندوستانی سوسائٹی کے تدریجی تغیرات ————— یہ سب باتیں نذیر احمد کے ناول سے باہر اور کہاں ملیں گی؟

ابن الوقت ایک ایسے شریعت زادے کی خیالی سرگزشت ہے جو پرانی معاشرت کو چھوڑ چھاڑ کر مغربی وضع اختیار کر لیتا ہے اور انگریزوں کی تقلید میں انگریزی طور پر عین کو اپنا لیتا ہے۔ مگر اس کے باوجود انگریز حاکم حکمرانی کے حقد میں اس کے طرز عمل کو ناپسند ہی کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے اس تلقین میں مغرب حاکم کو رہائی کا ادما منتظر آتا ہے ————— اور یہ وہ جرم ہے جو اس زمانے کے انگریز کو کسی طرح گوارا نہیں تھا ————— نتیجہ یہ کہ ابن الوقت پکارا از ہی سودا نہ و اذان سودا ناخدا رہتا ہے ————— اس خیالی تصویر کا واقعاتی اور تاریخی ترشح اگر دیکھنا ہو تو کیری کی کتاب (GOOD OLD DAYS OF JOHN COMPANY)

میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

خیال کیا گیا ہے کہ ابن الوقت کے پاس میں نذیر احمد نے سرسید پر چوٹ کی ہے اور دہرہ بہ بنائی ہے کہ نذیر احمد نے سرسید کے عروج اور قبول عام کے خلاف کسی پوشیدہ جذبہ رقابت سے منسوب ہو کر یہ کتاب لکھی ہے۔ اور اس طرح دل کی بیخواس نکالی ہے۔

مگر میں کہتا ہوں کہ یہ سب قیاس ہی قیاس ہے اور وہ بھی خاصا دور انداز۔ ————— یہ کتاب مولوی شبلی کی ہوتی تو ہم تسلیم بھی کر لیتے۔ کیونکہ شبلی تو آخری دور میں صاف صاف سرسید کے خلاف طنز و تفریق کر دیتے تھے مگر فریب نذیر احمد پر تو یہ انکم محض انتہام ہے۔ ————— اس لیے کہ نذیر احمد تو آخری عربک سرسید مرحوم کے مشن کے پہلے تینوں اور دماغنا دور سے کرتے رہے۔ ایسی صورت میں ابن الوقت کو خواہ مخواہ سرسید کی تصویر پر دینا خود سید صاحب کی ذات مندرہ صفت پر نادوا حاصل ہے۔ ابن الوقت میں تو داخلی طور پر کئی باتیں ایسی بھی بیان کی گئی ہیں جو سرسید میں موجود ہی نہ تھیں۔ نذیر احمد تو دلکش بھی مہذب صاحب کو اتنا گرا بڑا نہ سمجھتے ہوں گے کہ ان کو انگریزوں کا خوشامد ہی سمجھتے ہوں۔ یہ واقعہ ہے کہ سرسید نے لازمیت کے باوجود بڑی فیضان دانہ کی سبکی کر لی۔ ابن الوقت تو وہ شخص تھا جو اعلیٰ ثابتیت کے باوجود بعض اوقات بہت گرم تھا۔ یہ بات سرسید میں کہاں تھی؟ اس کے علاوہ سید صاحب کا سادہ ترین ابن الوقت میں کہاں پایا جاتا ہے۔ میرے خیال میں ابن الوقت سرسید کی تصویر نہیں بلکہ ایسویں صدی کے آخری نصف کے عام انگریزی تسلیم یافتہ نوجوان کی تصویر ہے۔ جو انگریزوں کے واضح و اطوار کی نقالی میں اپنے آپ کو اپنی تہذیب پر ہنساکر تھا اور بعض اوقات اپنی فزیت و محبت کو بھی چھوڑ بیٹھتا تھا۔

اس سلسلے میں یہ امر ملحوظ خاطر رہے کہ سرسید سے ان کے نقالی کنش کے افسانے اس بے جا عقیدت کا نتیجہ ہیں جو عموماً کسی محبوب شخصیت سے پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ اور جس کے ماتحت کسی معمولی اور دہانت دارانہ اختلاف بھی عقیدت مندوں کو گوارا نہیں ہوا کرتا۔ ————— ہم سمجھتے ہیں کہ سرسید کے تہذیبی عناصر سے ان کے تقویٰ بنا ہر فرقے نے جزوی اختلاف کیا۔ غالب حسن الملک سے زیادہ سرسید کا ہمدرد اور دوست کو نہ ہو سکتا ہے؟ یہ وہی حسن الملک ہیں جن کو سرسید ملک ملی دھمک دیتی دیکھا دیا گوشت پر لاگو شدت ہے اور تہا را خون میرا خون ہے) کہا کرتے تھے۔ پھر کیا حسن الملک کے سرسید سے نظریاتی اختلافات کو ذاتی حسد و رقابت کا دھج دیا جا سکتا ہے۔ مولوی حاتمی سے زیادہ تشریف مزاج کو نہ ہو گا۔ مگر انہوں نے بھی حیات تہا وید میں کئی مسائل میں سید صاحب سے اختلاف کیا ہے۔ یہ سب دیانت دارانہ اختلافات تھے۔ ————— اور نذیر احمد تو اس اختلاف میں بھی اور دل سے کچھ دیکھے ہی تھے۔ ابن الوقت سرسید پر چوٹ ہر زمانہ ہوا اس کو کل معاشرت پر یقیناً ایک لاری حملے سے جس کو قومی اور ملی روایات سے جوڑا بھی واسطہ نہ تھا۔ ————— اور جس کا اختیار کرنا خود انگریز کی نظر میں ایک مضحکہ خیز فعل تھا۔ کیونکہ اس میں بلا ضرورت خراشا کا رنگ غالب تھا۔ ————— اور قاعدہ ہے کہ خوشامد ہی خود اپنے عروج کی نظریں ذلیل ہو جایا کرتا ہے۔

نذیر احمد کی تصنیف ابن الوقت ایک لحاظ سے "قبل از وقت" تصنیف تھی۔ ————— یہ وہ اصل ایک اجماع تھا۔ اس برصغیر ہوتی مغرب زدگی کے خلوت میں کا بھر پور انہار جنگ عظیم آئل کے بعد کی تصانیف اور تحریکوں میں ہوا۔ ————— ابن الوقت نذیر احمد

کا ایک جیتا جاگن کر دار ہے۔ جتہ الاسلام جزو زین احمد کا ہیرو ہے باتیں تو لمبی لمبی کرتا ہے۔ مگر تہہ بہ تہہ کا ابن الوقت کا ہی بھاری رہتا ہے کیونکہ وہ قابل بھی ہے اور ذہین بھی!

یہ عجیب بات ہے کہ نذیر احمد کے بعض کردار ان کے مجرب کردار نہ ہونے کے باوجود ان کے بہترین کردار ہیں، مردانہ کرداروں میں ابن الوقت اور ذہب الفروج کا حکیم اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ ان کرداروں کی تعبیر سے انہوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ان میں فنی صلاحیت بھی موجود تھی۔ اور اگر وہ چاہتے تو اپنے نادول کو اپنے زمانے کے معیار سے بھی، ہندو ترس پرے جاسکتے تھے۔

حکیم ایک دندلا پالی شخص ہے۔ مگر اس کے ساتھ بڑبا مذاق اور فن پرست بھی ہے۔ حکیم دین و مذہب سے بیگانہ ہی محکم و من سے بیگانہ نہیں۔ اس کے پاس ایک اعلیٰ درجہ کا کتب خانہ ہے۔ جس میں آدھ اور ادب کے گرانمایہ جو ہر نظر آتے ہیں۔ اگرچہ الفروج کو ان اہل معرفتوں سے محبت نہیں مگر اس کا "چشمہ ہار" اپنی جہڑوں سے محبت رکھتا ہے۔ حکیم میں وہ خود مگری بھی پائی جاتی ہے جو اکثر اہل کمال میں بڑا کرتی ہے۔ وہ لطیف آزاد اور وسیع المشرب ہے۔ گرمیاں الفروج کے ذریعہ یہ سب کچھ کیجی ہے۔ نذیر احمد نے حکیم کی تخلیق میں اپنی ہنر و دی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ بہر حال حکیم نذیر احمد کا لافانی کردار ہے۔ اور ظاہر وار بیگ بھی مرد ادب کا ایک ذمہ دار و افلاک نشی دوست ہے۔ اس کی ظاہر وادی اور سخن سازی اور ہندو بہاداری بھی ہر طرح بھائی اور حقیقت کے قریب ہے۔

مراۃ العروس کی اصراری کہری میں بھی نذیر احمد نے بڑی احتیاط اور وقت و فکر کا ثبوت دیا ہے۔ مگر ان دونوں کرداروں میں بھائی نہیں پیدا ہو سکی ————— سرستے مراۃ العروس کے شعلے یہ اعتراض کیا تھا کہ نذیر احمد نے مراۃ العروس کو کرنا نہ سما سٹی پر ایک انتہام باندھا ہے ————— ممکن ہے یہ درست ہو اور کچھ نذیر احمد کے زمانے میں عاتقین کی نشا نشی چند عیال کی جو ————— مگر مجھے تو کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مراۃ العروس کے کردار کرنا کر داروں سے زیادہ عجیب وار ہیں۔ عورتوں میں اور نہیں کم از کم اصراری ٹکڑ اور بانسور تو ہے۔ مردوں میں تو یہاں کامل ہوا میاں فاعل یا کوئی اور سب بے شعور سے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ مراۃ العروس اور بنات الفحش اپنے رنگ کی اولین دلچسپ کتابوں کی حیثیت سے بہت مقبول ہوئیں ————— مگر یہ کتابیں ابن الوقت، ذہب الفروج اور نشا نہ جیتا جاگن کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔

فنا نہ جیتا جاگن کا شاید کامیاب ترین نقشہ ہے۔ اس کے تین لاجواب کردار جیتا، حیرت بیگم اور ہریالی معصنف کی کردار نگاری کے کامیاب نمونوں کے طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں ————— ناول تو یہ بھی مقصدی ہے۔ مگر فن کے امر اور موز سے جو واقفیت اس نقشے میں نظر آتی ہے۔ ان کے کسی دوسرے ناول میں موجود نہیں۔ اس میں پلاٹ کی تعبیر مناسب، مربوط اور معقول ہے۔ اس میں گفتگوؤں کا طول کم اور مکالموں کی ہیئت فطری ہے۔ اور مقصد فن کے ساتھ کچھ اس طرح ہم آہنگ ہو گیا ہے کہ اعتراض کی گنجائش بہت کم ملتی ہے۔

ایاتھی اور دیرائے صادقہ بھی ان کے نقشے ہیں، ایاتھی میں آزادی بیگم کے کردار، فاضی بھائی ہے۔ اگرچہ اس نقشے کے کردار بھی مکالموں میں باتوں کی بجائے لمبی تقریریں کرتے ہیں مگر ایاتھی میں نذیر احمد نے نفسیاتی تجربے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ روایت صادقہ میں دیانت داری، خدا پرستی، ادب و اطاعت کی زویدہ، تعلیم جدید کی خرابیاں اور عملی گوشہ کا لچ میں تعلیم و تربیت کا حال اور اس کے نقصان بیان کیے گئے ہیں مگر دیرائے صادقہ میں نذیر احمد کی واضح و جلیلت سب سے زیادہ ظاہر ہوتی ہے۔

نذیر احمد کے فن پر طرح طرح کے اعتراض کیے گئے ہیں مگر بسے اعتراض دو ہیں، اول ان کے ناولوں کا دوغلافہ انداز اور دوم ناول کی ہیئت کے متعلق بہ شور و۔ وہ نام نہاد ہیئت سے زیادہ بیانات کو اہمیت دیتے ہیں۔ انہیں یہ اشتیاق رہتا ہے کہ جو کچھ کہنا ہے سب کہہ دے ساری جزئیات سمیت، فی الفور کہہ دیا جائے۔ محل مقام کی بستی کا خیال وہ بہت کم رکھتے ہیں۔ پھر بھی یہ تو ماننا ہی پسے گا کہ نذیر احمد کی قوت مشاہدہ و تیز محنت اور انہیں جزئیات پر بڑا جود تھا۔ ان کے قصوں کی کردی کا نقطہ آغا زید ہے کہ وہ اپنے ناولوں میں اپنے نقطہ نظر کو زندگی سے (مخلافی اور بھائی انداز میں) ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ اپنے زمانے کی عقل پسندی کے بڑے ماننے ہیں۔ مگر اس عقل پسندی کے باوجود ان کی تخلیق میں عقلیت اور منطقیات کم ہے۔ ناول بھی مناسب، معقولیت، حد مناسب کا تقاضا کرتا ہے۔ اور یہ سب چیزیں وہ ہیں جن میں نذیر احمد کی عقل پسندی دب گئی ہے وہ نظریاتی لحاظ سے عقل پسند ہیں۔ وہ نہ رن سراسر جذباتی ہی معلوم ہوتے ہیں۔ اور ناول میں مقصد سے عشق کا اگر کوئی نقص ہے تو یہی ہے کہ اس میں ناول نگار اپنی معقولیت کو فراموش کر دیتا ہے۔

گزشتہ مباحث سے یہ بات ابھی طرح واضح ہو گئی ہے کہ نذیر احمد کی قلم کاری کا نصب العین محض چند مخصوص سماجی اور انسانی قصورات کی اشاعت تھا۔ وہ شاید بقدر نوبی کا فن ان کا خباثتے مقصد دہا ہی نہیں، وہ سرسید کے ایک ہم کار اور رفیق اور اس دور کے ایک مذہبی اور عیسوی معیل تھے۔ اور ان کے حق میں یہ کلمات ان کی شان اور ان کی اہمیت کی تشخیص کے مقصد سے استعمال نہیں ہوئے بلکہ ان کی حقیقت گردان کا اپنا مقصد اور نصب العین بالادادہ بھی یہی تھا۔ اس لیے فن کی بحث کو چھوڑ کر اب ہم ان افکار و قصورات کی اجمالی فہرست پیش کر دیتے ہیں جن کی اشاعت کی خاطر نذیر احمد نے نقد نویسی اختیار کی۔

نذیر احمد کے دھماات اور قصورات تقریباً دی گئے۔ جو سرسید کے دفاع کے مخصوص افکار سمجھے جاتے ہیں۔ ان کا اصل جذبہ محرک تھا۔ قوم کی اصلاح و ترقی کا خیال اور نئے حالات میں عیسوی و دینی افکار کی جدید تعبیر و توجہ۔ سرسید کے سب دفاع کی طرح نذیر احمد کا مقصد بھی یہی تھا جس کو انہوں نے اپنی دینی کتابوں کے علاوہ اپنے قصوں میں بھی پیش نظر رکھا۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ انہوں نے مذہب کی طرح خود نقد اور عیسوی امور میں عقل کی کار فرمائی کو بڑی اہمیت دی ہے۔ سرسید کے دفاع میں اگر شبلی کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ انہوں نے اسلامی تاریخ کو عقل کے سانچے میں ڈھال کر تاریخ کا ایک معقول تصور ہمارے سامنے رکھا تو نذیر احمد کا یہ انداز ہے کہ انہوں نے عیسوی زندگی کا ایک مثالی مگر معقول نمونہ قوم کے سامنے پیش کیا۔ جو بال معقولیت ان کے قصورات کا بنیادی وصف ہے۔ اس میں نذیر احمد کی خاص خدمت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی ان معقولی مساجدوں کو گروں کی آبادی اور خانگی زندگی میں خوشحالی اور مرست پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا۔ اور یہ اس معنی میں بہت بڑا کارنامہ ہے کہ خانگی مرست قومی ترقی میں بہت بڑی مددگار ہو سکتی ہے۔ اس عرض کے لیے انہوں نے عورتوں کو منزلی زندگی کا سبب بنایا و قرار دیا کیونکہ اچھی عورتیں ہی کارکن مردوں کا دے گاہاں انجام دینے کے قابل بناسکتی ہیں۔ جن گروں میں عورتیں مردوں کے لیے ذہنی تکلیف اور پریشانی کا باعث بن جاتی ہیں۔ وہاں کے مرد زندگی میں کوئی ترقی نہیں کر سکتے۔ ان کا سارا وقت اپنی عورتوں کے مسائل حل کرنے میں گزر جاتا ہے۔ نذیر احمد منزلی زندگی کے اس مادے سے ابھی طرح باخبر تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ قومی ترقی کے لیے عورتوں کی تعلیم اور ذہنی تربیت کی بے حد ضرورت ہے۔ اس کے لیے انہوں نے اعتراف کیا، صداقت اور آزادی یکم کے شالی کو ادھارے

سامنے پیش کیے۔

نذیر احمد کے ان فتوہات پر دو اعتراض کیے جاتے ہیں:۔ اول یہ کہ انہوں نے اپنے جلتے متوسط طبقے کے نچلے درجے کے لوگوں کے گرد اپنیں سکے ہیں اور حقہ قریبی سے مشغول وہی انہی کی اصلاح تھی۔ دوم یہ کہ ان کے سنوائی کردار جدید معاشرت میں ذمہ دہنے کے مستحق نہیں۔ ہمارے نزدیک یہ دونوں اعتراض بے جا ہیں۔ نذیر احمد کے قلمی کام مسلمان معاشرت کے لیے آج بھی مفید اور نفع بخش ہیں۔ ان کے سنوائی کردار بلاشبہ جدید نہیں مگر ہماری معاشرت میں مغربی زندگی کو پھیلانے کے لیے ”جدید سیرتوں“ سے زیادہ نذیر احمد کی مثالی صورتیں آج بھی زیادہ کامیاب ہو سکتی ہیں۔ اور شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مغربی فتوہات میں پٹی ہوئی ”بحر و شمول“ اور ”خود بخیر“ خواتین مردوں کی مشکلات میں اس طرح تعاون نہیں کر سکتیں جس طرح وہ خواتین جن کے نقشے نذیر احمد نے ہمارے سامنے پیش کیے ہیں۔ ہماری سوسائٹی کو آج پھر اصغر کی مزدورت ہے۔

نذیر احمد نے قریباً انصوح میں کلیم کو ایک فن دوست اور نفوج کو ایک فن دشمن کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے نفوج کی زبان سے فن اور ادب کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کی بنا پر یہ رائے قائم کی گئی ہے کہ نذیر احمد آرٹ اور ادب کے مخالف تھے اور بعض ”مولوی“ تھے۔ وہ نہ جانتے تھے کہ قلم کے تعلیم یافتہ لوگ آرٹ اور ادب میں دلچسپی لیں۔ مگر یہ نذیر احمد کے ساتھ زیادتی ہے۔ نذیر احمد آرٹ اور ادب کے مخالف نہ تھے۔ وہ ایک مقصدی دور کے ادیب تھے اور ادب کی افادیت کے قائل تھے۔ ان کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ آرٹ اپنی ذات میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ جو آرٹ برائے آرٹ اور جو ادب برائے ادب ہے وہ بے مبادی بلکہ مضرب ہے۔ آرٹ اور ادب کو زندگی کے لیے مفید ہونا چاہیے۔ اخلاق اور ادب کے سوال پر بھی ان کا نقطہ منفرس ہے۔ فحاشی اور عریانی میں ہر باگستان میں، ان کے نزدیک مضرب اور جملک ہے۔ بس یہی نذیر احمد کے خیالات ہیں اور یہ وہ خیالات ہیں جن پر بعد کے افادیت پسندوں نے خصوصاً اقبالؔ نے ہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ نذیر احمد قومی تعمیر کے ازمین دور کے دہاؤں میں سے تھے اس لیے انہوں نے ادب اور خصوصاً رائج الوقت یا روایتی ادب کے متعلق جس منفرسے کا اظہار کیا وہ قابل اعتراض معلوم نہیں ہوتا۔ اور اس سے ان کی کسی ”مولویت“ کا تشویش نہیں ہوتا۔ اور اگر اس کے باوجود قریبی نذیر احمد کو کوئی شخص مولوی نذیر احمد کہہ دے تو ان کی یہ مولویت بھی نہایت متعین مولویت ہے۔

نذیر احمد دین کیا ہے؟ اصلاح معاش اور فکر معاذا ان کے نزدیک ایک مکمل دین داد دہتے جو غصے کو بھی جانتے، انتقام نہ لے، جھوٹ نہ بولے، بغیر نہ کرے، عربین و طامع نہ ہو، جاہل اور سنت گیر نہ ہو۔ نمک او پھل نہ ہو مغزور اور مثلبہ نہ ہو و غیرہ وغیرہ۔ ”عزمن میں اس میں ایک اعلیٰ درجے کے انسان کی جملہ صفات موجود ہوں۔ اس مکمل انسان کی مجھ تصویر ہے جو نذیر احمد نے جملہ الاسلام کی زبان سے ابن الوقت میں کھینچی ہے۔

نذیر احمد کا دین داد کوئی تارک دنیا عابد و زاہد نہیں بلکہ دنیاوی فہم و فراست سے بھی آراستہ ہے۔ وہ سخت کوشش بھی ہے اور نیک عمل بھی۔ اس کی خدا پرستی اس کو دنیا داری سے نہیں روکتی۔ بلکہ ایک کامیاب دنیا دار بناتی ہے۔

نذیر احمد کی دنیا داری میں کفایت بخاری اور حیرت انگیز بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ یہ وہ اصل ان کے ان تجربات کی وجہ سے ہے جو انہیں اپنی زندگی میں حاصل ہوئے۔ انہوں نے زندگی میں غربت و افلاس کی تکلیفیں اٹھائیں۔ اس لیے انہیں دلچسپی کی قدر و قیمت کا بڑا احساس تھا۔ بنیادیں وہ یہ چاہتے تھے کہ قوم کے سب افراد اس کی اہمیت کو پہچانیں۔ خصوصاً غریب اور متوسط طبقے کے لوگوں کو اس کی بڑی ضرورت ہے کہ وہ روپے کا صحیح معرفت پہچانیں اور اپنا وہ پیہ نفع اور سیکار دفاعی نہ کریں۔

اس صدی کے مخصوص سیاسی تعلیمی اور معاشرتی تقورات میں نذیر احمد کبھی سرسید کے ہم خیال نہ تھے۔ انہیں کبھی مخالفت ابن الوقت کے جیسے ہیں انگریزوں کی پاس پر چڑھ کر دے کی ہے یا سید صادق کے خصل میں مل کر کھالچ کے جیز اسلامی ماحول کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ جدید انتہا پسندی اور فلوکے خلاف ایک در عمل ہے مگر سیاست میں نذیر احمد سید صاحب سے پورے پورے متفق معلوم ہوتے ہیں۔ البتہ جنسی اور معاشرتی امور میں وہ ان سے بہت مختلف تھے۔

نذیر احمد کے خیالات کے اس جائزے سے یہ بات اچھی طرح روشن ہے کہ وہ اس دور کے صحیح نمائندہ و ترجمان تھے ————— انہوں نے اپنے دوسرے رفقاء کی طرح ذہن کو بے لگنے کے لیے بہت سادہ ادب پیدا کیا ————— اور یہ ادب ایسا ادب تھا جس کا تعلق خواص سے زیادہ عوام سے تھا۔ اور اس لحاظ سے درجہ کا کہ پچھلے بیان ہوا، نذیر احمد کو سرسید کے رفقاء میں سب سے زیادہ عوامی کہا جاسکتا ہے۔ (عوامی مزدور لاہور کا شہر لاہور کے معنی میں نہیں جہود کے معنی میں)

شعبی کے علمی کارنامے اور ادبیاتی کے فنی شکار سب اپنی جگہ قابل قدر ہیں (جیسا کہ تذکرہ مہربان ہے) مگر نذیر احمد کا دائرہ خطاب ان سب سے زیادہ وسیع اور اپنے زمانے کے نثر نگاروں میں ان کی مقبولیت سب سے زیادہ تھی۔ کیوں کہ ان کی کتابوں کو خواص اور عام، مرد اور عورت، امیر اور غریب، دین دار اور دنیا دار بھی پڑھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ باوجودیکہ ان کی کتابوں کی علمی سطح اتنی کم نہیں تھی ان کے دوسرے رفقاء کی کتابوں کی ہے۔ ہم ان کو اردو کے بہت بڑے مصنفین اور انشاپر داؤد میں شمار کرتے ہیں ————— اور ہر چند کہ فنی لحاظ سے ان کے ناولوں پر اور علمی لحاظ سے ان کی دینی کتابوں پر اعتراض وارد کیے گئے ہیں مگر ناولوں میں ان الوقت۔ فضا، تنہا اور توبہ انصوح اور علمی کتابوں میں الحقوق والفرائض اور ادب کے ساتھ دوامی عمر پائے گی ڈاکٹر جاسن کے بقول اولی مذاق کے بدل جانے کے باوجود فیڈلنگ کی TOM JONES ابھی متروک نہیں ہوئی "ہمارے نقادوں کی کڑی تنقید کے باوجود ان الوقت اور فضا، تنہا ابھی زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔

نذیر احمد کا اسلوب بیان بھی ان کے فنی کی طرح منفرد ہے ————— ان کے اسلوب کے خصائص ان کے رفقاء کے اسلوب میں کہیں نہیں ملتے! وہ ایک خاص قسم کی زبان سمجھتے ہیں جو علمی بھی ہے اور عوامی بھی ————— مولوی سید انصاری نے اپنے رسالہ شکل میں ان کی زبان کو سوتا نا اور عام کیا کہا ہے ————— مگر اس کے لیے صحیح لفظ شاید عوامی ہوگا۔ ان کی زبان مابین ذہنی عوامی تھی اور عوامی وہ زبان نہیں جو درجہ ادب سے گری ہوئی ہو بلکہ وہ زبان ہوتی ہے جس کو عام اور خواص دونوں سمجھتے ہوں اور زندگی کے عام استعمال میں لاتے ہوں۔ یہ زبان صرف مخصوص اشرافیوں کی زبان نہیں ہوتی۔ نہ یہ زبان ایسی ہوتی ہے جس کو اشرافی منہ لگانا ہی پسند نہ کریں ————— یہ تو ایک عام استعمال کی زبان ہوتی ہے جو بہت اہمیت، بحث و مباحثہ اور معاشرہ و مسائل کے ہر موضوع میں استعمال ہو جاتی ہے۔

نذیر احمد کی زبان بھی اسی قسم کی ہے۔ اس میں ایک طرف محاورات و کنایات ہیں جو قومی ذاتوں اور معاشرتی لحاظوں کے آئینہ دار ہیں خصوصاً وہ جو گروں میں استمال ہوتے ہیں اور دوسری طرف وہ علمی محاورہ جو اس دانے کے عام تعلیم یافتہ طبقے میں دیگر عام لوگوں میں، مانوس و مقبول تھا۔ بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ نذیر احمد کی یہ دورنگی زبان دو مختلف مزاجوں کی نمائندگی کرتی ہے جن سے نذیر احمد کا اپنا مزاج مرکب تھا۔ چلتے یہ بھی ہر اس دورنگی زبان میں نذیر احمد نے جو یک نگی پیدا کی ہے اس پر بدنگی کا داغ نہیں لگا۔ جمہوری لحاظ سے ان کی زبان خوش رنگ ہی رہتی ہے، سوانحی فارسی کے متعلق اور اصطلاحات نذیر احمد کے لیے دوزخ کا درجہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے ان ثقیل و نامرکراہی زبان جادوؤں میں اس رزلے سے کھپایا ہے کہ ساری جہازیں پر فروغ نغمہ کی گئی ہیں۔ کیونکہ یہی تو وہ بڑا غضب العین ہے جو نذیر احمد کے لیے ایک ذہنی غایت کا درجہ رکھتا ہے۔ تند و تیز لہجہ اور پرشور آہنگ ان کی اس خطابت کی یاد دلاتا ہے۔ جس کی کوچ آج تک بھی کچھ بڑی عمر کے لوگوں کے سامنے میں عرض پیدا کر رہی ہے۔ پھر کیا اس پر فروغ آہنگ کے لیے غفلتوں اور ترکیبوں کے فروغ کی ضرورت نہ تھی؟ یقیناً تھی! ثقیل حروف اور ثقیل الفاظ نذیر احمد کی تحریروں میں برسی قیمت ہاتے ہیں۔ دنیا میں محتاج کو رو کر دیتے ہیں نذیر احمد اسی سے اپنی دکان سماتے ہیں۔ نذیر احمد نظم الفاظ کے خریدار ہوں تب بھی ان کی انشائی اصل کج دھج ثقیل اور کجست الفاظ سے ہی بنتا ہے!

اور پھر یہ بھی ہے کہ نذیر احمد کی انشائیں اصل قوت میں ہی وقت پیدا ہوتی ہے جب ان کے قلم میں غم و غصہ اور زجر و قہر کے جذبات مروج ہو رہے ہوں۔ نذیر احمد کی پیادہ تحریروں میں شاہ وہی ہوں کی جو سب سے ضعیفی باؤں کی قائم مقامی کر رہی ہیں۔ ان نوٹوں پر طنز و مقلعین، شکوہ و احتجاج، قہر و غلب، سوانحی کی ضرب الاشمالی مصرعے اور مقولے، زمانہ اور طبقاتی محاورات، مسلسل اور مفرد ترکیب سب ایک ایسے آئینے سے منظم ہو کر ایسے خوبصورت پیرایہ بیان میں منظم ہو جاتی ہیں کہ ان کا اثر قہر کی کیفیہ چارہ نہیں رہتا۔

نذیر احمد اپنے بیان میں جزئیات کو جس طرح پلچھتے آتے ہیں۔ اس سے ان کے بازوؤں کے پھیلاؤ کی تشبیہ سوجھتی ہے، جس کی پلیٹ میں جہیز سماہا قہر کے کوئی جہیز ان کے بازوؤں کے پھیلاؤ سے باہر نہیں رہ سکتی۔ نذیر احمد کے بیان کی اسی وسعت علمی سے متاثر ہو کر جمہوری انقلابی کلام نے تھے کہ اس شخص کی وسعت نفوذ پر صلاحیت رکھتی ہے کہ یہ اسلام کی قافوس کھلے۔ یہ تو وسیع بازوؤں والا ادیب اور عالم ہے۔ اور ایک لحاظ سے یہ فرق ظاہر بھی نہ تھی۔ اگرچہ قافوس کی ہر گز تفصیل بیان کی نہیں اجماع بیان کی مقامی ہوتی ہے۔ اور نذیر احمد کو اس ایما ذہن پر قدرت ہی نہیں تھی۔ یہ لاشعری کا خاصا تھا کہ وہ وسیع مضامین کو چند غفلتوں میں ادا کر سکتے تھے۔ نذیر احمد اس میدان کے مرد نہ تھے تو وہ ان کام کے آدمی ثابت ہوئے تھے جہاں بازوؤں کے پھیلاؤ کی ضرورت ہوتی تھی۔ نذیر احمد قافوس کے لیے نہیں عوامی خطابت کے لیے موزوں تھے۔ ان کی خطابت اور انشائی کو قید نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ قید بھی ہوئے تو شاید زنجیروں میں قید ہو سکے جہاں اصل کی پابندی قدم قدم پر انہیں ٹوکنی جاتی تھی کہ دیکھئے صاحب زیادہ بازو نہ پھیلا دیکھئے گا۔ اور یہاں بھی بسا اوقات ایسا ہڑا کہ نذیر احمد ٹھک کر الجھ جاتا لیکن اگلے اور کچھ پابندیوں جو زور سے ماند کر دیتی تھیں وہ خود ہی توڑ ڈالتیں۔ ان کے تالوئی تراجم بلاشبہ زیادہ مقید اور پابند ہیں۔ کیونکہ ان

گل بکاؤلی

محمد عبداللہ قریشی

اردو کے قدیم نثری قصوں اور بیوقوف انسانوں میں قصہ گل بکاؤلی بہت مشہور ہے۔ جس میں تاج الملک اور بکاؤلی کی داستانِ عشق بیان کی گئی ہے۔ اصل کہانی کی تاریخ کا علم تو خود تاریخ کو ہی نہیں۔ البتہ ہندوؤں کی بعض قدیم کتابوں میں اس کے حوالے ملتے ہیں۔ جن سے قیاس ہوتا ہے کہ ابتدا میں اس کے شائق کوئی کتاب سنسکرت وغیرہ میں لکھی گئی ہوگی۔ مگر اس کا کوئی ثبوت آج تک نہیں مل سکا۔

فارسی زبان میں یہ قصہ پہلے پہل عزت اللہ بنگالی نے ۱۸۶۲ء (۱۲۴۲ھ) میں اپنے ایک دوست تدر محمد کی فرمائش پر لکھا اور اس دوست کی وفات کے بعد اس کی یادگاہ کے طور پر اسے شائع کیا۔

اس فارسی قصے کی مقبولیت دیکھ کر ذرثِ ولیم کا بچے مشہور پرنسپل ڈاکٹر مہمان گلکراسٹھ نے لاہور میں لاہور ڈویژن کی گورنمنٹ ہند کے عہد میں نہال چند لاہوری سے اسے اردو نثر میں ترجمہ کرایا۔ اس ترجمہ کا نام ”مذہبِ عشق“ ہے۔ کتاب کے آخر میں ہجری اور مسیوی تاریخیں اس طرح لکائی گئی ہیں۔

عزمن جس طرح سے کہاں کو شاد	ہماری بھی دے یا الہی مراد
یہ فقہ ہوا جب بخوئی تسم	تو پھر نکرتا پہنچ تھی صبح دشم
یلا یک سنی میں نے آواز غیب	کہ ہے مذہبِ عشق تاریخِ دنام

۱۲۱۶ھ

ہوئی چہرہ خواہش کہ گلش باں	کریں مسیوی سال کو بھی جیاں
تو پھر آغوشِ غیب نے دی ندا	کہ اس مذہبِ عشق میں کوئی آ
کہے ”مذہبِ جام“ اگر اختیار	تو نا تو نہاں اس پہ ہوا شکار

۵۰۶

یعنی ”مذہبِ عشق“ کے ۱۲۱۶-۱۷۰۱ء میں ”مذہبِ جام“ کے ۵۰۶ھ و ۱۱۰۶ھ سے ۱۱۰۷ھ تک حاصل ہو جائیں گے۔
لاہور نہال چند کے آباؤ اجداد شاہ جہاں آباد دہلی کے رہنے والے تھے۔ دہلی کی تباہی کے بعد ترکِ وطن کر کے لاہور آئے

اور آج کل کر لاہوری کھلتے۔ اس قصے میں انہوں نے نہایت صحیح، با محاورہ اور باقاعدہ زبان لکھی ہے۔ پہلی مرتبہ یہ قصہ سنہ ۱۸۵۰ء میں شائع ہوا۔ دوبارہ اشاعت کے وقت میرٹھ علی انٹوس نے تخریفات کی۔ اس کے بعد ہندوستان کے مختلف علاقہ میں کئی مرتبہ طبع ہوا۔ اور ہمیشہ شوق سے پڑھا جاتا رہا۔ مرزا ابیم گریسن نے "نگرشک سرورے آف انڈیا" میں اس کے مختلف ایڈیشنوں کی ذہرت دی ہے جو نہایت طویل ہے۔

ڈاکٹر گیان چند عین ام۔ اسے ڈی فل صدر مشہور اردو مجیدہ کالج ممبہال نے اس قصے کے مختلف نسخوں اور ترجموں کی کیفیت یوں بیان کی ہے :-

فارسی - گل بکاؤلی از عزت اللہ بنگالی ۱۷۶۲ء تا ۱۱۳۳ھ

شعری از ذہنت اشعار دین مدی کے آخر میں۔

اردو - دکنی نسخہ ۱۷۳۵ء بارود خانہ اردو کے کتب خانے میں راسپرنگ

شعری تحفہ مجلس سلطان۔ بقول دتاسی پتاریکی نام ہے۔ اور اس سے ۹-۱۷۳۸ء تا ۱۱۵۱ھ تک ہے۔ لیکن دراصل ۶-۱۷۷۵ء تک ہے۔ رام بابو سکینندہ "تختہ الجاس" نام مہیتے ہیں۔ اور اس سے ۱۰۵۳ء برآمد کرتے ہیں۔

گلکشت منظم باخیا بان ریحان از ریحان الدین ریحان لکھنوی ۱۲۱۱ھ (انجمن ترقی اردو)

مذہب عشق از نہال چند سنہ ۱۲۱۶ھ عزت اللہ بنگالی کے فارسی قصہ کا ترجمہ۔

شعری گلابیسم از دیبا شکریسم سنہ ۱۲۵۲ھ

گل بکاؤلی قلمی منظوم ۱۲۶۱ھ از محمد داؤد علی ۲۶ داستان اور پانچ جلدیں۔ مصنف حیدر آباد سے کلکتہ گیا۔ اور میسر سلطان کے خاندان کی سرپرستی میں رہا (کتب خانہ مسعود حسن رضوی)

ہندی - بکاؤسن از بیج سنگھ وراٹھ سنگھ لکھنؤ۔ مذہب عشق کا ترجمہ۔

فرانسیسی - از گارسان دتاسی سنہ ۱۸۳۵ء

انگریزی - از بی بی جنرل۔ مذہب عشق کا ترجمہ۔

از نقیثت آری اپنی ہندو سن ۱۸۵۲ء ڈلی۔

کوسٹن نے دتاسی اور میٹل سے لے کر سنہ ۱۸۵۲ء میں "اے گروپ ایڈیشن رومانس (A GROUP

EASTERN ROMANCES) میں شامل کیا۔

از بابا بھو سنگھ سنہ ۱۹۰۳ء۔

مذہب عشق کی کہانی کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ پورب کے کسی بادشاہ ذہین الملک کے چار بیٹے پہلے سے موجود ہیں، پانچواں

”تاج الملوک پیدا ہوتا ہے جو بادشاہ کو بہت محبوب ہوتا ہے۔ مگر بخوشی اسے بادشاہ کے لیے نخست اثر قرار دیتے ہیں۔ بلکہ یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ اگر بادشاہ نے کسی کے لیے وہ دیکھ لیا تو اذہا ہر جائے گا۔ زین الملوک نے شیر خوار بچے کے لیے شہر سے باہر ایک مکان بڑا دیا۔ مگر تقدیر کے سامنے کیا چارہ۔ ایک روز بادشاہ شکام سے واپس آ رہا تھا کہ نوہ چشم پر نظر جا پڑی۔ اسی وقت آنکھوں کی مینائی جاتی رہی۔ علاج کے لیے چاروں تدبیریں کیں مگر ایک نہ چلی۔ آخر ایک بزرگ نے کہا کہ شفا صرف اس پھول سے ممکن ہے جو بکاولی پر ہی کے چمن میں ہے۔ بادشاہ کے چاروں بڑے بیٹے اس کی تلاش میں نکلتے ہیں اور سفر کرتے کرتے ایک شہر میں پہنچتے ہیں جہاں ایک بیسوا دہر نامی رہتی ہے۔ وہ بازاری عورت جو سر رکھنے میں اپنا جواب نہیں دیتی اور ایک بلی اور چوہے کی مدد سے ہمیشہ بازاری حیت لیتی ہے۔ چاروں شہزادے اس کے لال جاتے ہیں۔ اور اپنی تمام دولت بلکہ آزادی تک ہار کر اس کے غلام بن جاتے ہیں۔ وہ انہیں قید کر لیتی ہے۔ ہاؤنڈر ہاچوان شہزادہ تاج الملوک اپنے بھائیوں کی تلاش میں وہاں پہنچتا ہے۔ اور اس عیارہ کے گرد و قرب کوٹا ڈر کر ایک نیزے کی مدد سے اسے کھیل میں شکست دیتا، اسے اپنی لٹری بناتا اور تمام شہزادوں کو اس کی غلامی اور قید سے نجات دلاتا ہے۔ پھر یہی قسم کی مصیبتیں پھیل کر گل بکاولی کی تلاش میں باغ ارم کی جانب روانہ ہوتا ہے۔ راہ میں ایک مصیبت آگ دیو اسے قتل ہے جسے دیکھتے ہی شہزادہ کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ دیو خوش ہوتا ہے کہ آج مدت کے بعد لڑیہ شکار نصیب ہوا ہے۔ اتنے میں دیو کو چند ادب، آٹا، روغن اور شکر دیوڑے سے لے کر دے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ عزمًا بڑا جاتا ہے۔ اور ان سب کو اٹھا لاتا ہے۔ چونکہ دیو بھڑا زیادہ ہوتا ہے وہ بے ہوش ہو کر گر پڑتا ہے۔ تاج الملوک موقع غیبت جان کر نہایت لذیض مصلوہ تیار کرتا ہے جو دیو کے جوش میں اسے تک باطل تیار ہوتا ہے۔ دیو شیرینی کھا کر بہت خوش ہوتا ہے اور کہتا ہے۔ اے آدمی زاد! مالگ یا مالگتا ہے۔ شہزادہ گل بکاولی کی خواہش غامض کر کے دیو وہاں کے بہت خوفناک شکار سے بیان کرنے کے بعد آخر اپنی بہن حار دیو کی کے نام ایک خط دیتا ہے کہ اس آدمی زاد سے کسی کی مدد کی جائے۔ حمار کے پاس ایک آدم زاد کی محمودہ عرصہ سے مقید تھی۔ جسے وہ جان و دل سے عزیز رکھتی تھی۔ اس نے تاج الملوک اور محمودہ کے تعلقات میں ایسی مضبوط گرہ ڈال دی جسے جیتنے کی کوئی نہ توڑ سکا۔ محمودہ کی سفارش سے حمار نے بہت سے دیوؤں کو چھوٹے بنا کر باغ بکاولی تک ایک سرنگ کھدوائی۔ تاج الملوک اس سرنگ کی راہ اس عرض تک جا پہنچا۔ جس میں وہ پھول تھا۔ پھول اٹھا لیا۔ اور خراب گاہ بکاولی میں جا کر اپنی انگشتی نشانی کے طور پر اس سے برل لی۔ بکاولی نے جب آئینہ کھولی اور وہ پھول وہاں نہ پایا تو دنیا آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ بہت روتی، بہت پیٹی، کسی پرھنے ہوئی۔ کسی کو توڑ دیا دھکا دیا، کسی پر چوری کا الزام لگایا۔ مگر جو اصل گھمبیں تھا۔ اس کا پتہ نہ چلا۔

تاج الملوک وہ پھول لے کر دہر بیسوا کے کھمب میں پہنچا۔ تمام قیدیوں اور اپنے بھائیوں کو غلامی کا نشان لگا کر رہائی دلائی۔ گرد اسے تین چاروں بھائیوں نے وہ پھول اس سے چھین لیا۔ اور باپ کے پاس لے گئے۔ جس سے اس کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ اور ہر کاولی کی گل کے فراق میں رہوائی سی ہو گئی۔ اسے پھول چرانے والے سے فنا بخش ہو گیا۔ وہ اپنے پھول اور دل کے جد کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی ماری ماری پھرتی رہی اور بے شمار نگینیں اٹھانے کے بعد جب وہ زین الملوک کے کھمب میں پہنچی۔ تو اس نے بادشاہ کے اذہا ہر سے اپنے پھول کی کرامت سے دوبارہ مینائی حاصل کرنے کا چرچا سنا۔ وہ فوراً ایک خوبہ آدمی کا روپ دھار کر بادشاہ کے دوہار میں پہنچی۔ بادشاہ اس کی باتوں سے اتنا خوش ہوا کہ اسے اپنا وزیر بنا لیا۔

”تاج الملوک نے اپنے دیس پہنچ کر حالہ روہنی کا ایک ہال جو اس نے مشکل کے وقت کے لیے دیا تھا آگ پر لکھا۔ حالہ فرما حاضر ہوئی۔ اس نے پوچھا محمود کہاں ہے؟ کہا اس کے رہنے کے لیے زمانا ہے نہ باغ نہ حرم۔ اس لیے ان سب چیزوں کی ضرورت ہے۔ سالہ روہنی کی دروسے تاج الملوک اور محمود کی خاطر قلعہ بکاؤلی کے ٹورنے پر ایک مایشان علی گلشن نگاریں تھیں کرکڑیاں جن کی دھوم بادشاہ زمین الملوک تک پہنچی۔ بادشاہ اس سے ملنے کے لیے آیا۔ دونوں کی ملاقات ہوئی۔ بادشاہ کا وزیر مرزا رحیم بکاؤلی بھی ہوا تھا۔ تاج الملوک نے باقوں ہی باتوں میں بادشاہ سے پوچھا۔ آپ کے صاحب زادے کتنے ہیں؟ بادشاہ نے چاروں بیٹوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ کہ ایک اور بھی تھا مگر اس کم بخت نے تو مجھے اندھا کر دیا۔ یہ چاروں شہزادے بکاؤلی کا بھول لائے جس سے مجھے پھر دنیا کی نصیب ہوئی۔ تاج الملوک نے جیسا دوبر کی زبان چاروں شہزادوں کے کورت سے آگاہ کیا۔ اور جان جو کھوں میں ڈال کر بکاؤلی کے بھول تک پہنچنے اور مزہگ لگانے کا کام باجرا کرنا دیا۔ آپ نے بیٹے کو گلے لگایا اور قزحبت سے اس کی پشتانی چم لی۔

بکاؤلی نے جب اپنے تاج ہارے ہوئے کی کہا لی سنی تو سبے تاب ہو کر اپنے وطن گزارا دم چلی گئی۔ وہاں سے تاج الملوک کو ایک فراتیر خذ لکھا۔ اور رسن پری کے ذریعے اپنے گلیں کو اپنے پاس ہی ہوا لیا۔ بکاؤلی کی ماں کو سبب بیٹی کی نگاہ باز یوں اور ٹھانڈوں کا حال معلوم ہوا تو اس نے تاج الملوک کو دریا سے طعم میں ڈال کر بیٹی کو قید کر دیا۔ تاج الملوک عجیب عجیب ٹھیکس اختیار کرنا دیا۔ آخر طے ایک حصا اور کوئی دستیا ہوئی جس کی مدد سے وہ جہاں جانتا پہنچ جاتا۔ اس طرح وہ ایک ایسے فن قوت معزم میں پہنچا جہاں دیو دل اور پریوں کی حکومت تھی۔ وہاں روح افزا نام ایک پری سے جو بکاؤلی کی بچا زاد بہن تھی تاج الملوک کو اپنا دلکڑا سنا یا کہ کس طرح جہاں کے دیو نے اسے والہ رسن سے جدا کر کے قید کر رکھا ہے۔ عرض لالچی اور قوت کی مدد سے دونوں یہاں سے اٹھ کر دھوت افزا کے وطن میں جا پہنچے۔ روح افزا کے واپس آ جانے پر گھر گھر خوشیاں ہونے لگیں۔ یہ خبر سن کر جیل بھی اپنی بیٹی بکاؤلی کے ہمراہ مبارک سلامت کے لیے آئی۔ مسماں تاج الملوک اور بکاؤلی کی ملاقات بھی ہو گئی۔ روح افزا کی ماں حسن آباد اور خود روح افزا نے جمید سے کہ سن کر بکاؤلی اور تاج الملوک کی شادی کرادی۔ اور دونوں ہنسی خوشی باغ آدم میں رہنے لگے۔

شہزادہ کو جب وطن کی یاد آئی تو بکاؤلی کو ہمراہ لے کر گلشن نگار میں آیا۔ مختوڑے وہاں کے بعد بکاؤلی کو راجہ اندر نے یا د کیا۔ تاج الملوک بھی سایہ کی طرح محبت رواں کے ساتھ تھا۔ اندر راجہ اندر کی محفل میں جہاں بکاؤلی کی ناپیچی لاتی تھی برابر اس کے ساتھ رہتا تھا بکاؤلی اور قوت کی محفل کو راجہ کو مزہ ہو گئی تو دونوں کو جاک کر ادے گا۔ مگر شہزادہ کی ضد سے مجبور تھی۔ جب راجہ بکاؤلی کے گانے سے خوش ہوا تو اس نے کہا آج ہنگ جو ملتا ہے۔ میں تہا دی خواہش پری کر دیں گا۔ بکاؤلی نے تاج الملوک کو دلکا کر اس کی فراموشی کی۔ راجہ اندر ایک آدم زاد کو اپنی محفل میں دیکھ کر غضب ناک ہو گیا۔ اس نے بکاؤلی کو بد دعا دی جس سے اس کا نعت بدن پھرا ہو گیا۔ راجہ ہا برس تک رہا۔ شہزادہ بھی دودھ پیتا رہا۔ جب ملکہ پیمہ آیا تو بکاؤلی کے نصف انسانی جسم سے درد و فراق کی باتیں کیں۔ اس اثنا میں راجہ چتر سین دایئے سنگھ پری کی رکی چتر دوت شہزادے پر عاشق ہو گئی مگر وہ نہانا۔ آخر جب اس کو چوری کے الزام میں سب گئے قید کر دیا گیا تو اس نے شادی کا اقرار کر لیا شادی ہو گئی اور ایک صرناک باہم تھے رہے۔

بادرہ برس گزرنے کے بعد جب بکاؤلی نے ایک کسان کے گھر نیرنا جنم لیا۔ تو تاج الملوک بھی اس دھقان زادی کے حسن کا شہو سن کر وہاں پہنچا۔ چو کو دل پہلے ہی سے ملے ہوئے تھے بغیر کسی تکلیف و تردد کے شادی ہو گئی۔ شادی کے بعد دونوں چتر دوت کے

عمل میں آئے۔ اس کو ساتھ لے کر تاج الملک اپنے وطن گھنٹن لگا دیں میں پہنچا جہاں دلبر اور محمد وہ پہلے ہی سے بال بندھی موجود تھیں۔ تاج الملک کا دلبر بہرام روح افزا دلہن ماسق ہو گیا اور آخر بلاؤں کی سی سے ان دونوں کی شادی ہو گئی۔ غرض یہ

حاصل ہوئی ان گول کچے خار
بیرن شب زلف صبح دھوا
جس طرح انہیں بہم دلایا
پھر ملے ملے سب میں خدایا

اس قصے کے اجزائے ترکیبی کچھ ایسے ہیں کہ اس کو بہن حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلے حصہ تاج الملک اور بلاؤں کی شادی پر ختم ہوتا ہے۔ ایک حیثیت سے قصہ ہمیں ختم ہو گیا ہے۔ وصل کی راہ میں جو مزامتیں تھیں وہ جبردگر کی گئی ہیں۔ تمام مشکلات اور مسئلے حل ہو چکے ہیں۔ ہمارے جذبہ استفہام کو کسی بات کا انتہا نہیں دیتا۔ یہاں تک قصے پر فارسی رنگ ہے۔ اس کے بعد دوسرا جزو شروع ہوتا ہے اور بلاؤں کے دوسرے جنم کے بعد اصلی حالت میں آئے پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ قصہ خاص مہندوستانی ہے۔ اس کے بعد کہانی کو آگے بڑھانے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ تیسرا حصہ بہت مختصر ہے۔ اس میں بیرو اور بیرون بھی بدل جاتے ہیں۔ یہاں تاج الملک اور بلاؤں کی بھارتی بہرام و وزیر زادہ اور روح افزا منظر پر آجاتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف نے قصے کو دوسرے حصے کے بعد اور بڑھانا چاہا مگر اس سے باسانی ممکن نہ تھا۔ کہ بلاؤں اور تاج الملک کو لے کر ہی کچھ اخراج کر سکے۔ اس لیے بہرام اور روح افزا کو قلعے کے درمیان لایا گیا۔ یہ حصہ ایک ضمنی کہانی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اصل کتاب سے بالکل الگ تھلک معلوم ہوتا ہے۔

مگر اگر یہ خیال ہے کہ اس قصے کے بعض حصے قدیم داستانوں سے لئے جلتے ہیں۔ مثلاً دلبر بیوا، شہزادے کو بل بلاؤں کی ہم سے روکنے کے لیے برہمن اور شیر کی حکایت سناتی ہے۔ یہ سچ تیرے دکنی شے میں موجود ہے۔ شمالی ہند کے نسخوں میں کچھ اختلاف ہے۔

تاج الملک اپنے بھائیوں کو دھڑاں سے دبا کر آتا ہے۔ لیکن وہ اس سے دغا کرتے ہیں۔ یہی الف یلہ میں شہزادہ خداداد کی کہانی میں ہے۔

پھولی پاکسی اور چہرے آنکھوں سے چھو آنے سے مینائی کا حود کر آتا بھی یا خیال نہیں۔ اس کی ابتدائی مثال حضرت یعقوب علیہ السلام کا قصہ ہے۔

دو دوس کے درجے میں بنا رکھنا اور دین چرخ عرب ہی میں نہیں مہندوستانی کہانیوں میں بھی ملتا ہے۔

مگر بلاؤں میں ایک لڑکی دیو سے جس تبدیلی کر کے مرد ہو جاتی ہے۔ یہ بھارت کے اوجیدرگ پر دوسے یا گیا ہے شگندی عورت مٹی لیکن مرد کی طرح بدوش کی گئی۔ شادی کے موقع پر وہ جگل میں گئی اور ایک کیش سے جنس بدل کر مرد ہو گئی۔ جیسی جگل کے ایک حوض میں غوطہ لگا کر تاج الملک عورت ہو جاتا ہے۔ جس بدلنے کی مثالیں جتان کیسی کی چودھویں کہانی میں بھی ملتی ہیں۔ سندباد کی کہانی میں جنس بدلنے کے کنہیں کا ذکر ہے۔ الف یلہ کی دوسری کہانیوں میں چہرہ لا پانی پیٹنے سے چہرہ میں غوطہ لگانے سے جنس بدلنے

کا ذکر پایا جاتا ہے۔

تھک گل بکاؤلی میں جو عظم ہے اس کی شہس دانان امیر حمزہ یا ہوتا نہ خیال میں بھری پڑی ہیں۔
اندر سجا کا ذکر سنسکرت ادب میں تفصیل سے دتا ہے اور ہر شخص اس سے واقف ہے۔

بہار دانش میں چھپے وزیر کی کہانی میں ایک شخص چوب کو پری کے ساتھ پریوں کے ملک میں پہنچ جاتا ہے اور وہاں
سے شادی کر کے لوٹتا ہے۔ تاج الملوک کا اندر سجا میں پہنچا دینا کوئی مشکل نہ تھا۔

تھکے کے خاتمے میں ہیرام کو نفاخت بنا دیا جاتا ہے۔ کامروپ میں اس کا رواج گل بکاؤلی سے پہلے تھا۔

داخلی شہادتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ تھک گل بکاؤلی ہندوستان ہی میں لکھا گیا۔ پہنچ تنسکی کہانی، شنگھڑی کا قہقہہ اور
اندر سجا کا ذکر کافی ثبوت ہیں۔ دلبر میرا کا چور کرکینا ہندوستانی بات ہے۔ بکاؤلی ایک مٹھ میں قید ہوتی ہے۔ مٹھ کے انہدام کے
بعد وہاں سرسوں اگتی ہے۔ اس کے تیل سے کسان کی بڑی کے عمل مختار ہے اور بکاؤلی نیا جنم لیتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا
ہے کہ مصنف آداگون یعنی سانچ پر عقیدہ رکھتا ہے۔ یہ تھکے کی ہندوستانی اصل کا قوی ثبوت ہے تھکے کی عام افغان فارسی داستانوں کی
سی ہے۔ تمام نام فارسی ہیں۔ تھکے کا مرکزی نام بکاؤلی بھی ہندی یا سنسکرت کا نہیں۔ اس کے علاوہ مرغ اور صیاد کی حکایت میں حضرت
سیلوان کے دیہات میں انصاف کہا جاتا ہے یہ کسی اسلامی روایت سے لیا گیا ہوگا۔

”ذہب فتن“ کے چھپیں باب ہیں اور چونکہ ساری کتاب میں ایک ہی طویل فقرہ ہے اور ہر باب میں اس کا ایک حصہ یا
داستان بیان ہوتی ہے اس لیے ہر باب کو داستان کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ انش و داستانیں ”کتبے بن“ سے شروع ہوتی ہیں۔ اردو
ترجمہ میں اصل کتاب کے بہت سے فارسی الفاظ باقی رکھے گئے ہیں اور ذہنت کلام کے لیے جو تکرار لفظی ہوتی تھی اس کو بھی برقرار رکھا ہے
تو ترجمہ اصل سے بہت کم ہٹنے پایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا طرز بیان ضخیم اردو کی کتابوں کی طرح زیادہ سادہ اور سلیس نہیں، مہاجما
شاید الفاظ اور فارسی ترکیبوں کے ترجمے ہائے جاتے ہیں۔ ترجمہ میں آزاد کو طبع کام میں نہیں لایا گیا۔ ساری کتاب پر فارسیت سوار
ہے۔ بعض جگہ ہندی کے الفاظ بھی ہیں۔ لیکن جس زمانے کی یہ کتاب ہے اس کا لحاظ کرتے ہوئے بہت ہی کم ہیں۔ ان کے معاصرین میر
اجن، شیر علی افسوس اور مغرب علی وند ویزوی کتابوں میں ہندی الفاظ کا استعمال جس کثرت سے ہوا ہے اس کے مقابلے میں ان کی تحریر کو
ہندی الفاظ سے بالکل خالی سمجھنا چاہیے۔ مہارت کا مؤثر دیکھئے جب بکاؤلی میند سے جاگی اور اس نے گلاب کے حوض میں گل کو نہ دیکھا تو
اس کے چوڑی تلاش میں نکلی۔ دیکھئے کیا نقشہ کھینچا ہے۔

”جب بکاؤلی نے جادو بھری آنکھ کھولی اور خواب راحت سے جوبلی، پشوا ناز

سے پہنی، گلشنی سے ہالوں کو سلوارا، دوپڑا اوڑھا، آہستہ آہستہ جھوٹا آئینہ لکھیں سے

حوض کی طرف چلی۔ ہر ہر قدم پر وہ گل اذام اپنے نقوش قدم سے زمین کو پائیں باغ

بناتی تھی۔ اور گرداہ سے بیٹھم بلبل میں سرور لگاتی تھی۔ جب حوض کے کنارے پہنچی

دست نکلادیں سے گلاب اپنے دھما پڑوسنے لگی۔ اور چہرے کا جوار کہ منبر

کے مانند تھا۔ دھو دھو کہ گلاب میں ملائے اور حوض کو چادریں رت چشم مست ناز

سے دیکھنے بھانسنے لگی۔ ناگاہ گل بکاؤلی کی جگہ پر ننھا پڑی۔ ہر چند مجروح تالی نکلاہ کی کچ اس کا نشان نظر نہ آیا۔

ایک اور غور نہ ملاحظہ ہو:-

"کہتے ہیں کہ تاج الملوک فقیروں کے بھیس میں اپنے بھائیوں کے پیچھے چلا جا رہا تھا کہ ان کا ارادہ کیا عقد و سہاقت کرے۔ الغرض وہ جہاں آئے جہاں سے گئے۔ وہ بھی آن پہنچا۔ اور ایک کونے میں بیٹھ کر ان کی تسکین کیا اور جہانیاں جھوٹی جھوٹی سننے لگا۔ آخر وہ نہ سکا۔ سامنے آکر دو بہنوں کے گھٹنے لگا، آپس میں یہ کیا بے ہودہ باتیں کر رہے ہو۔ اپنا منہ دیکھو، گل بکاؤلی کیسے پاس ہے۔ اور اسی وقت اس کو کمرے کھول کر ان دغا بازوں کے سامنے دکھ دیا۔ شہزادے غصے میں آکر بولے بھلا اس کو مان کہ میری بات سچی نہ ہو تو ہم جو چاہیں تجھ کو سزا دیں۔ تاج الملوک نے کہا، سانچ کو کیا آج بہت بہتر؟"

"جب تاج الملوک سے ان کا عاقبت اندیشیوں نے گل بکاؤلی بھیس میں آیا اور وہ بچا رہا دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ شل ہے کہ قہر و دیش بھان دو دیش۔ پھر کچھ ہنوں کے پیچھے پیچھے بعد چند روز کے اپنے باپ کی سرحد میں آیا۔ ایک جنگل جو درختوں کا مسکن تھا اس میں جا پہنچا۔ اور چٹانوں سے آگ بھڑک رہا تھا کہ دیکھو، ہاتھ بالوں کو اس پر رکھ دیا۔ چوتھائی بجی نہ عجب ہوگا کہ وہ اٹھا رہا ہوا دیووں سمیت آہنچی اور تاج الملوک کو فقیروں کے بھیس میں دیکھ کر آگ ہو گئی کہ اسے شہزادے میری بیٹی کو کہا کیا اور تو نے اپنا حال کیا بنایا؟ تاج الملوک بولا کہ آپ کی توجہ سے سب خیریت ہے۔ لیکن ایک کام مجھے نہایت مزہ دی ہے۔ ہے اور اس کی تدبیر مجھ سے نہیں ہو سکتی۔ اس واسطے آپ کو تعذیر دی ہے۔ حوالہ نہ کیا کہ اسے جہاں باتیں نہ بنا۔ وہ کون ہے جلدی کہ تاج الملوک نے عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں کہ یہاں ایک محل اور باغ کہ ہو جو بکاؤلی کے قصور اور باغ کا سا ہو، بناؤں۔ تم جس طرح چاہو جلد بنوادو۔ وہ بولی اسے بیٹا! یہ کتنی بڑی بات ہے مگر میں اسے اس باغ اور عمارت کو نہیں دیکھا۔ عجب! میں دیکھ سکوں کہ کس طرح بناؤں اور بنوادوں۔ تاج الملوک بولا جس طرح میں کہوں اسی طرح بنوادو۔ حوالہ نہ کیا اسی وقت کئی سود پورعل بد خشاہی کے لیے اور بیگزوں حقیق بیانی کے لیے اور بنوادوں روپے اور جواہر میں قیمت کے واسطے ہر جہاد عرف بھیجے۔ دیووں نے تین روز کے عرصہ میں جواہر و غیرہ

کے جا بجا تو دسے لگا دیئے۔ پھر شہزادہ جس طرح بنائے لگا۔ اسی طرح وہ بنائے گئے۔ پہلے تو دونوں بڑے مٹی کھود کر چھینک دی اور وہاں دو خواص بھر دیا۔ اور اس طرح قطعہ علاقے پر جڑاؤ عمارتوں کی بنا ڈالی۔ غرض مقررے دلائل میں ویسا ہی قعر اور اس طرح کا باغ جو اہر نگارہ جڑاؤ بہترین درختوں سمیت اور زبرد اور یا قوت کے دو دلائل عالی شان مسکنے آئے بیچ میں ان کے ایک حوض مربع اسی قطعہ کا گلاب سے معمور بنایا۔ پھر ایک مکان میں فرش اسی رنگ کا بچھوایا۔ حاصل یہ کہ جتن جو اہر سونا دو پیہ دو لائے تھے اس میں سے آدھا مکانات کے بنانے میں خرچ ہوا۔ چوتھائی کا رخا نہ جات کی تیاری کو دے دیا۔ اور باقی خرچے میں داخل کیا۔

ان مثالوں سے آپ نے اندازہ لگایا ہو گا کہ زبان عام طور پر سمجھ اور نہیں۔ دو تین سطریں سادہ وصاف ہوتی ہیں پھر فارسی ترکیبیں شروع ہو جاتی ہیں۔ جن سے روای مروج ہوتی ہے اور قدم قدم پر عقو کو گئے کا احساس ہوتا ہے۔ اگرچہ اخلاقی حیثیت سے مشرقی ادب میں اس قصے کا کوئی درجہ نہیں پھر بھی جوئے کی خرابیاں جیسی تاج الملوک کے جہیز کو پیش آئیں۔ غیر کفر میں شادی یا عہد کے مصائب جو تاج الملوک اور بکاؤلی پر لگے۔ جہاں نہ ضد اور نامنا سب بے اعتباری کی آئینیں جو ہارے ہیرہ کے ہاتھوں راجہ اندر کے حکم سے بکاؤلی کو سہی پڑیں۔ بے اعتباری اور بھید کو محفوظ نہ رکھنے کا نتیجہ جس سے تاج الملوک نے وہ پھول اپنے ہاتھ سے گزادیا جس کے لیے اتنی دودھ و سوپ کی اتنے ہاتھ پاؤں مارے۔ اور اتنی سنجیاں جمیلی تھیں۔ یہ سب اور ان کے علاوہ اور ایسی باتیں بھی اس کتاب میں موجود ہیں جن کی تعمیل انسانی زندگی میں نہایت سبق آموز ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نام کی کو دشمنی، عیب کو ہیز، ذہر کے پیلے کو شربت کا گلاس کہہ کر چہرے کر کے آت سے ناواقف ہے۔ وہ ہدی کے چہرے پر حق و نہایت کا نقاب ڈال کر اسے پیش نہیں کرتا، بلکہ ہدی کی جب غفرتی کرتا ہے تو ہانک پکارت کہہ بھی دیتا ہے کہ یہ ہدی ہے اس کے فریب میں نہ آنا۔ جیچھے جب بادشاہ کے چادوں شہزادے ایک بازاری عورت کے پھندے میں پھنس جاتے ہیں اور تاج الملوک انہیں چھڑاتا ہے تو مصنف کا قلم ان واقعات سے یہ نتائج نکالتا ہے۔

”اے عزیز! تو نے معلوم کیا کہ یہ میں سننے کیا کہا؟ اس بات کا حاصل یہ ہے کہ دل عرش منزل تیرا جو رونق بخش تخت بادشاہی کا اور دیکھنے والا مادہ اور مجرور کا تھا۔ جب اس کی آنکھ اس حقیقت ناپاک پر پڑی۔ اس کی بصارت کو دھلک لگا اور دیدہ روشن تار یک ہو گیا۔ اب اٹھ اور سرمہ مینائی دھونڈ مینی لگی مراد کی تلاش میں کوشش کر۔ لیکن رادوں دینا کے عہدہ کی بازی میں کھمبہ فریب کا دھرا ہوا ہے مشغول نہ ہو جانا۔ مبادا ناخوش ہو کر چلے فریاد نہ کر سکے بنا دے اور بعد اس کے لکری، جی اور فریب کے چہرے کی مدد سے اچھا پائسہ

اپنی حسدِ مرضی پھیلے اور اہانک تیسے نوکل کا سرمایہ آخر ہو جائے۔ تب تو
کو دائم الجس کر دے۔ اگر تو صبر کے نبوے کی اعانت سے اس عتادہ کی بازی عظیم
کو درہم کر دے تو وہ فاعلہ جو بادشاہوں اور گزوں کشوں کی ہم نشین ہے تیری
فرمان بردار نوڈی ہو کر جا ہے کہ تجھ کو اپنے حسن و جمال پر اُٹھائے۔ پھر اگر تو
اس کے منہ پر اُلفت سے نگاہ نہ کرے تو قہین ہے کہ لگی مراد کے واسطے پرترا
دسترس ہو:

مولانا عبد الماجد دہلوی نے ایک مقالہ میں نقدِ گلِ بجاؤلی سے مسائلِ تعصوف و عرفان کا خلاصہ بیان کیا ہے۔
تاج الملوک سفر کرتے کرتے سرحدِ ملکِ بجاؤلی تک پہنچا۔ لیکن وہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ بجاؤلی جہاں وہ گلی مراد
پڑھ رہا ہے، اٹھارہ ہزار دیوؤں کی حفاظت میں ہے۔ اور سال سال بھر کی مسافت کے مقامات تک ان کی چوکان میٹھی ہوتی ہیں۔ ان کے
علاوہ بے شمار دیوئیں ہر وقت نغماتی کرتی رہتی ہیں کوئی پرندہ ہوائے راستے میں نہ پہنچ سکے۔ نیز چوہوں کا بادشاہ ہے مدو حساب شکر
لیجے زمین دو دراستوں کی پاسبانی کرتا رہتا ہے۔ تاج الملوک نے یہاں پہنچ کر ایک قوی بیل دیو کو کسی طرح اپنے موافق بنایا اور اس کی
ہنس مالد کو جو سب دیوؤں کی سربراہ تھی طلبا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی بدودہ ایک حسین دیوئی محمودہ کو اس کے نکاح میں دے دیا۔ مصنف
ان اسرارِ معرفت کی ترجمانی ان الفاظ میں کرتا ہے:

”اے عزیز! روشنی چشمِ ظاہر میں ہی سات پردوں میں ہے اور تجلی باری تعالیٰ کہ
نورِ دیدہ اولیا ہے ستر ہزار پردوں میں ہے۔ اگر یہ ارادہ ہے کہ وہ ہرے درمیان
سے انھیں تو پہلے اس ہرے نگہبانِ دیہنِ نفس کا جہاب بھیجے اس کا کہ اس کو بس
میں کہ وہ بعینِ لہنی کے روی کو چھوڑ کر محمودہ کے مقام میں پہنچائے۔ لیکن یہ
بات یاد رکھ کہ اگر دیوئے اُٹھائے تو یہ ہا ہا ہے:

تذکرۃ نفوس اور عرفان حق کی اس سے واضح تر تعلیم اور کیا ہو سکتی ہے؟ (دعوتِ بجاؤلی، ۱۹۴۰ء صفحہ ۱۸)
تاج الملوک مصائب و آفات کا شکار رہتا ہے۔ فلسفی تو بی ادبھا اٹھ، لکھ کر سو جاتا ہے۔ سو کر اُٹھنے کے بعد ایک عرض
میں نہاتا ہے خود سے حوریت میں جاتا ہے۔ ہر طرح کی مصیبتیں جھیلنے کے بعد ایک اور عرض میں حوٹ لگ کر پھر اپنی اصلی حالت پر آتا
ہے۔ یہ فلسفاتی کارخانہ داستانِ نویس کی زبان سے ایک عجیبہ حقانی و معارف بن جاتا ہے۔ وہ تاج الملوک کی فلسفہ سے دلی پرکھتا ہے
”اے یارِ اہل دہرا حق تعالیٰ نے بنی آدم کے سر پہ کراست کی تو پی ہینا کر اور
خلقت کا عداوت میں دے کر فلسفہ گاہ دنیا میں کہ مزید آخرت ہے حاقبت کی

لے مولانا کا یہ مقالہ پہلے پہل رسالہ ”معارف“ اہل علم گڑھ بابت جولائی ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اب یہی معنوں ”مجموعت میں لکھے
عزیزان سے معافیاً عبد الماجد دہلوی میں صفحہ ۶۹ تا ۸۰ پر طبع ہوا ہے۔

تخیل کے لیے بھیجا ہے۔ پس انسان کو چاہیئے کہ گل اور خار اور آب و سراب خوب پہچانے۔ ہر ایک پانچ کے پھول کو نہ سونگے۔ ہر ایک نہر سے گھڑا نہ بھرے کہ پہاں کا نئے گل سے رنگین اکثر شراب پر صدمہ آبِ اوھر و دھر ہے۔ اے عزیز! اگر گوہر دنیا کے لیے چہرہ بہاں میں غوطہ مارے گا۔ مقرر اس کا کلاہ اور عصا کھو دے گا یہ حکم اس بات پہ ہے کہ طالعِ دنیا خوش ہیں اور طالعِ بھولا مرد ہیں۔ تیرا بیکر معانی جو مانند مردِ کامل ہے وہ صدمہ و نان ناقص عقل جو جلتے گا۔ پس اس وقت تخیلِ بانی کے سوا کچھ چارہ نہیں۔ چاہیئے کہ دم بخود ہو کر بہرِ دنیا سے ذکرِ الہی میں غوطہ مارے اس کے بعد جو سرا تھاٹھے گا تو وہی عصا اور وہی تو پی سر پور لکھے گا؟

”اس قسم کی نضاع بہت پاکیزہ اور دلکش ہیں اور قصے کو نیشن کا رنگ عطا کرتی ہیں۔ فرقِ غزلت کے بعد جب یہ بند آتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ ایک تخیل ہے جس کی یہ تفسیر ہے۔ ان نضاع سے قصے کی فضا بلند ہو گئی ہے۔ قصے میں انہماک اور استغراق کے بعد ہم اس طرح جو نکتہ بڑھتے ہیں جس طرح کسی دنیا میں پھنسے ہوئے آدمی کو بلیا یک رحمت کا پیغام دیا جائے۔ اسے اس حالت سے خبر دے کر کہ میں سادہ تپایا جاتے۔ ان میں دھوکا بھی نہیں؟“ (اردو کی نثری داستانیں ص ۴۷)

مشہور فرانسیسی فاضل اور ادبِ اردو کے سرپرست و قدر شناس گارسن ڈی ماسی نے، جو انگریزی کی تعلیم کی ابتدا میں مدت تک ہندوستان میں مقیم رہے، اپنے بعض مکتوبات پر مشتمل ایک کتاب لکھی تھی جس کے فرانسیسی نام کا ترجمہ تاجِ الملوک و بکارتی کے اضافہ و مشق کے تصفیہ شدہ ہی ناسخ و نکات ہے۔

”قصہ گل بکارتی ہی گلابِ نسیم کا مخد ہے جو پینڈت دیانند کھنوی نے ۱۸۵۷ء (۱۲۷۵ھ) میں تصنیف کی۔ اور اسی قصے سے امانت کھنوی نے اپنے مشہور رنگ اور سجاوٹات تیار کیا جس کی تاریخ تصنیف ۱۲۸۳ھ (۱۲۶۰ء) کے قریب ہے۔ انگریزی میں بھی اس قصے کا ترجمہ ہو چکا ہے بعض دوسرے لوگوں نے بھی اس نام سے کتابیں لکھی ہیں۔ جن سے اس قصے کی بروہن پڑی اور متبوعیت کا پتہ چلتا ہے۔

”اگرچہ اس وقت نہال چند یا ان کی کتاب ذہبِ مشق کی کما حقہ قدر نہیں کی جاتی۔ کیونکہ نہ تو نہال چند کے طرز بیان میں کوئی ایسی خاص دلی کشی ہے کہ اردو بولنے والے ہمیشہ اس کے گرویدہ بنے رہیں اور نہ ذہبِ مشق ہی کا قصہ اس زمانے میں لوگوں کی دنیا میں بلکہ سامانِ بہم پہنچا سکتا ہے۔ اب اردو نے رتی کے اتنے دار چلے کر لیے ہیں اور اس میں لڑچکر کا اتنا کافی ذخیرہ فراہم ہو چکا ہے کہ ذہبِ مشق اور اس کے ساتھ کی دیگر کتابوں سے لوگوں کا دلچسپی لینا ممکن نہیں مگر وقتِ دلچسپی کا یہاں تک کہ اسے اب تک نظم نے اردو نثر کی جوشا خاں خدمات انجام دی ہیں اور اردو نثرِ نو پس کے ابتدائی اور دشوار گزار مراحل کو جن محنتوں سے طے کر کے آنے والوں کے لیے راست صاف کیا ہے وہ ایسی نہیں کہ اردو بولنے والی نسلیں ان کو سمجھ دیں۔ چارے ان پیشروانِ نثر میں نہال چند بھی ہیں اور اس لحاظ سے توجہ اور مطالعہ کے مستحق ہیں۔ ان کی خدمات ہی ان کی زندگی کے کارنامے کو اہمیت دیتی تھیں

یہ قلعہ برسوں تک ایک قلعہ کا، وندریہ قلعہ ہے۔ لیکن اس کی تہ میں تاریخی حقیقت موجود ہے جس کی تشریح مولوی سید احمد مدنی مرحوم نے اپنی پیش بہا تالیف فرنگیہ مصنفین میں کر دی ہے۔ فرنگیہ مصنفین کی اشاعت سے پہلے بھی بعض بزرگوں نے فرنگیہ آبادی اور کلنگ کے سرکاری دفتر سے اس کی تصدیق کی ہے۔ اور ٹیپل گھنڈی کی ایک قدیم تاریخ میں قلعہ امر کلنگ کے حالات پتہ کر جس کا کلنگ بکاؤلی سے خاص تعلق ہے اس کی بہت کچھ اصلیت معلوم ہو جاتی ہے۔ مہمات متوسط یعنی جبل پور و غیرہ میں اب بھی ایک خود رو پودا پایا جاتا ہے جو اکثر بانی کے کنارے لگتا ہے اور اس کے پھول کا مرقع انھوں میں ڈالنے سے اضطراب و غیرہ قسم کی کئی بیماریاں دور ہو جاتی ہیں اس کا نام بکاؤلی ہے۔ جس کی تاریخ سے واقفیت حاصل کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

آج سے نصف صدی قبل ایک جماعت قائم ہوئی تھی جس کا نام مسلم بکاؤلی اکیڈمی رکھا گیا۔ ایسی ہی ایشن تھا۔ اس نے بڑی تحقیق اور جہان میں کے بعد یہ بات پائیدار ثبوت کو پہنچائی تھی کہ یہ قلعہ نصف فرضی انسان نہیں بلکہ ایک پتہ واقعہ ہے۔ گو اس کے مصنف حضرت اللہ بنگالی نے جگہ اکیزی اور میا قلعہ آرائی سے کام لے کر اس کو بعد از قیاس بنا دیا ہے۔ حالانکہ اس واقعہ کے نقش اب تک موجود ہیں چنانچہ باغ بکاؤلی جس کو قلعہ میں باغ اندم لکھا ہے، اب تک موجود ہے۔ طبعی قلعہ بکاؤلی جہاں تک کوئی بشر پہنچ نہیں سکا۔ کوسوں لمبی اور چوڑی گہری دلدل کے مین وسط میں اس وقت تک قائم ہے۔ بکاؤلی کا تالاب، مندر اور توارہ گو مردہ اہام سے شگستہ اور زخمی حالت میں ہے۔ مگر زبان حال سے اپنی قدامت اور اپنے وجود کا ثبوت دینے کے لیے آتی ہیں۔ دہرہ میوا کے مکان کے گھنڈے رات جنہیں لہاں کے باشندے لکھا پڑا کاٹھن کہتے ہیں۔ زبان حال سے بتا رہے ہیں کہ انہی محلوں میں دہرہ میوا نے چورنگھل کو تاج الملک لکھا چاروں بھائیوں کو اپنا مذہم بنایا تھا۔ یہ سب نشانات پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ یہ

ابھی اس راہ سے گزرا ہے کوئی ہندو جی ہے شرفی نقش پایا

(لکشمی میگزین جنوری ۱۹۱۰ء صفحہ ۳۳)

امر کلنگ ہندوؤں کا ایک بہت بڑا قلعہ ہے۔ یہاں سے دریائے ندی اٹکتا ہے۔ اس سے ایک میل مشرق میں ضلع منڈلہ (لکشمی ناگ پور) کا ایک متوسطہ کا علاقہ اور جنوب میں سونیل کے خاصے پھلے پھلے پلاس پور کا علاقہ ہے۔ مغرب اور شمال میں بہار کے دریاں کی حدیں ملتی ہیں۔ خاص موضع امر کلنگ میں جو خوبصورت قلعہ واقع ہے اس میں پانچ چھ سو پنڈت اور بھاری آباد ہیں۔ امر کلنگ دراصل ایک بے جگہ ہے جس کے نام پر یہ موضع مشہور ہے۔ اس موضع کے ایک گوشے میں ایک مندر راجا کرن کے زمانہ کا اب تک موجود ہے جو سنہ ۱۶۵۷ء بمقام میں ایدل راجا تھا۔ ایک دھرمالہ مہاراجہ اندور نے بڑائی ہے جو آج سے پچاس سال قبل راج پات چھوڑ بیٹھے تھے۔ اس سے مسافروں اور باقروں کو بہت آرام ملتا ہے۔

نڈا کے وہاں پر ایک پختہ تالاب ہے جس کے ایک طرف ایک مندر بھی ہے۔ اس مندر کے چپے کے ایک قدیم نقشہ جاری ہے جس سے تالاب پر وقت مہاراجہ رہتا ہے۔ تالاب کے سرب کی طرف ایک اور عرض ہے جس میں پانی قلعہ قلعہ ہو کر داخل ہوتا ہے۔ نڈا کی دھار سے جو عرض سے قریب چالیس گز کے فاصلہ پر گرتی ہے یہ گھاٹ قدیم آبادی کا کام دیتی ہے اور نہایت دل فریب سماں پیدا کرتی ہے۔ اس گھاٹ میں قریباً دو میل پہاڑ کی ہندی سے پانی گرتا ہے اس کو کھل جاتا ہے جتنے ہیں۔ انسان کرے والے یا تاریخی اس کی دھار اپنے سر پہنچتے ہیں۔ مگر بڑے اور کمزور آدمیوں کے لیے اس کی ممانعت ہے۔ تالاب کے چاروں طرف بڑی اور بجا دی

بیٹے رہتے ہیں۔ یہاں لاکھ، اچیت اور ماگہ کے معینوں میں فیوگتا۔ جسے جو کئی ہفتے رہتا ہے۔ اس میں فقیروں اور محتاجوں کو کھانا بھی کھدایا جاتا ہے۔

سون ندی دیپاٹے نرہا کے دھانے سے دو میل مشرق کی جانب بھارت کے علاقے میں جا ملتی ہے۔ وہاں سے چکر لاکر ریاست دیوان میں داخل ہوتی ہے اور پھر دیپاٹے گٹا میں جا ملتی ہے۔ اسی سون وادی میں مونڈا کے قریب ایک بہت بڑا سرینر و شاداب اور مختلف قسم کے خوشبودار پھولوں سے آباد ایک جنگل ہے اس جنگل کو بناؤلی کا باغ کہتے ہیں۔ اسی جنگل میں ایک درخت ہے جس کے پھول ملری کے رنگ کے ہوتے ہیں۔ اسے بناؤلی کا درخت کہتے ہیں۔ گل بناؤلی نرہا میں بطور چڑھاوا چڑھتا ہے۔ پنڈوؤں کا کہنا ہے کہ گھوڑے چربی میں گٹک منکا کہتے ہیں) کے ساتھ گل بناؤلی پس کر اگر آنکھوں میں لٹکایا جائے تو آنکھوں کو جا لا دود جو جاتا ہے۔

کتاب تختہ خان بہادر میں لکھا ہے اور فشی محمد اقدی فوق مرحوم مرہاراجا کشمیری لاہور نے آج سے پچاس سال قبل اپنے سفر بکھیل کھنڈ میں لوگوں کی زبانی سنا تھا کہ مولوی سید بد علی تحصیلدار رام نرہا علاقہ دیوان جہان نیک سینے سکے انہوں نے اس علاقہ کی سیر و پیمائش کی مگر دلہل اور خادوا درجہائیوں کی وجہ سے وہ جنگل میں دوڑنا نہ جا سکے۔ اگرچہ امرکنک ان کی تحصیل میں تھا۔ ان کو آرام و آسائش، راہ واری اور اوقیت کے تمام ذرائع حاصل تھے۔ اس کے باوجود وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ابستہ و دوپیزنٹ اور بناؤلی کے گھوڑے دے وہاں سے آئے جو امتحان لگائے گئے۔ پیزنٹ کے درخت تو کچھ عرصہ بعد خشک ہو گئے مگر بناؤلی کے چند درخت حوالہ دیکھ کر ہم میں موجود تھے۔ شاید اب میں جوں۔ یعنی لوگوں کا خیال ہے کہ یہ اصلی بناؤلی کے درخت نہیں بلکہ وہ درخت ہیں جو جہاں ہم نشین کے اڑتھیں اصلی درخت کی خوشبو سے ایسے ہو گئے ہیں۔ جیسے ہمارے پنجاب میں قصور کی مینتی بہت مشہور ہے جو اصلی تو بہت کم اور صرف ایک آدمی کھیت ہی میں ہوتی ہے۔ لیکن اس کی خوشبو سے دوسری قسم کی مینتی کے کھیت بھی اسی طرح خوشبو واہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہے بناؤلی کے یہ درخت بھی ایسے ہی ہوں۔

خان بہادر مولوی رحمان علی وکیل دیہا دیوان میتم ستنا نے فشی محمد اقدی صاحب فوق کو بتایا تھا کہ سید بد علی تحصیلدار نے بناؤلی کے میں پچیس پھول بطور تحفہ میرے پاس بھی بھیجے تھے جن کو میں نے دونوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ وہ پھول زردی نال۔ اور خوشبودار تھے۔ تجربہ کیا گیا کہ جب کسی کی آنکھ آتش کرتی تو اس پھول کا عرق ڈالنے سے آرام ہو جاتا۔

گل بناؤلی کے حالات میں ایک کتاب تاریخ مسلم بناؤلی بھی مشہور ہے۔ جس میں لکھا ہے کہ امرکنک ایک جنگل کا نام ہے جو ایسا وسیع، جو غار و وحشت ناک اور اتنی دُور ہے کہ وہاں کوئی جانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ امرکنک دیوان سے بارہ منزل بیان کیا جاتا ہے اس جنگل کی آج تک پیمائش نہیں ہوئی۔ اس کی محدود اضلاع سنبھل، بلاں پور اور منڈل سے ملتی ہیں۔ یہ اضلاع جنگل سے بارہ بارہ اونڈیو تیرہ منزل کے فاصلے پر ہیں۔ اس جنگل میں بے شمار جھنڈے، درندے، گزندے، شیر، چیتے، دیکھ، بندر اور دیگر آفتیں ہیں۔ اس جیسے باغ بناؤلی تک تو لوگ ہر وقت پہنچ جاتے ہیں مگر قلعہ بناؤلی تک کوئی نہیں جا سکتا۔ اور یہ ایک مسلم معلوم ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس قلعہ سے ہر وقت دھواں اٹھاتا رہتا ہے اور دن رات ہیبت ناک آواز آتی آتی ہیں۔

قلعہ بناؤلی کس نے بنایا، کب بنا؟ اس کے متعلق لکھا ہے کہ ۹۵۰ھ بکری سے پہلے دکن کے ایک راجہ نے اپنے پھوٹے

بیٹے مہرچ سے ناواقف ہو کر اسے کوہستانی جنگل اور غیر آباد ملک دسے کر الگ کر دیا۔ جب مہاجر کے گرو کو بھرہوئی تو اس نے کہا کہ یہ سخت ناانصافی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہرگز سے بیٹے شہر ہو گا ملک ہرگز سرسبز ہو گا اور چھوٹے کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

عزیز داغ مہرچ تن بہ تقدیر اپنے حشر ملک میں جو اس کی فوج کے لیے بھی کافی نہ تھا، آیا۔ جب اس جنگل میں پنپا تو اسے پہننے کے لیے کوئی موزوں مقام نہ مل سکا۔ آخر ایک دن وہ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ جن میں اکثر باغی دان اور بھڑی تھے۔ امر کشاکش میں پنپا۔ وہاں اسے ایک بہت بڑا تالاب نظر آیا جس کی وسعت اور گہرائی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ مہرچ نے یہ مقام پسند کیا۔ اس کے میلوں نے اپنے ظم اور تہ بڑے ذہن سے تالاب کے وسط میں ایک قلعہ بنوایا۔ جس میں واقف کار لوگوں کے سوا کوئی جا نہ سکتا تھا۔ قلعہ کے علاوہ مکان اور قسم آمیز باغات بھی تیار کر لے جو بغا ہر انسانی طاقت سے بعید معلوم ہوتے تھے۔

مہرچ مہاجر کے گھر اسی قلعہ میں ایک بڑی پیدا ہوئی جو بہت حسین تھی۔ اور جس کی ہم پتری بنا کر بھڑیوں نے اس کے نیک اختر ہونے کی نشاندہی تھی۔ اس بڑی کے دو نام رکھے گئے۔ ایک مہربانی یعنی پریشہ کی امانت اور دوسرا زبڈال جس کے نام پر زبڈا مشہور ہے گریہ و دونوں نام زیادہ مشہور نہ ہوئے۔ ایک بیرائی نے اس بڑی کا حسن و جمال دیکھ کر اس کا نام بکاؤٹی رکھا جو آج تک مشہور ہے۔

معلوم نہیں تاج الملوک اور بکاؤٹی کے عشق و محبت کی داستان فرضی ہے یا اس میں کچھ اصلیت بھی ہے۔ بہر حال بکاؤٹی میں کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہے۔

نذیر احمد کا ذہنی تخریب

ڈاکٹر اعجاز حسین

اگر وہ ادب کی تاریخ پر اگر غور و ژوئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر انقلاب میں برسے ادیب پیدا ہوتے رہے ہیں۔ جب کبھی زندگی کو ہلکا کر دیا اور واقعات سے دو چار ہونا پڑا ہے تو امداد زبان نے بھی اپنا بہترین کام نامہ با خاص جو ہر دنیا میں پیش کیا ہے شاید یہ خصوصیت اس حامل کا نتیجہ ہو جو اسے ابتدائی زندگی میں ملا تھا۔ چونکہ اس کی نشوونما اور ادبی حیثیت بچپن اور بچکانوں کے درمیان ہوئی اس لیے اس کو طوائف میں مسکنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ اپنی توانائی و رعنائی کا مظاہرہ یہ زبان اس وقت ہمیشہ سے زیادہ بہتر انداز میں کرتی ہے۔ جیر۔ سوتا و جیرہ ایسی ہی حالتوں کی علامتیں ہیں اور جب خود کا زمانہ آیا اور اس سے سارے کسب میں ایک پہلی پیدا ہوئی پرانی قدیم ماضی کے نقاب میں روپوش ہونے لگیں اور نئی قدیم ایک سیلاب کی طرح مدعا ہوئیں تو امداد نے میں متذکرہ انقلاب ادیب پیدا کئے سیلاب کے تھکے ہی سر تیز۔ نذیر احمد۔ محمد حسین آزاد۔ حالی اور کئی ایک اہل قلم زبردست دل و دماغ لے کر سمندر ادب پر چھا گئے۔ حالانکہ ان بزرگوں کو قسمت سے وہ ماحول ملتا تھا جو صرف انتشار و پراگندگی کا مرتع تھلا کر ایسے ہی عالم میں جو کچھ ان لوگوں نے ادبی کا نام سے پیش کیے وہ ہر لحاظ سے قابل قدر اور اہم ثابت ہوئے۔ ان ہی ادبی مہاروں میں اپنی تعمیری صلاحیتوں کی بڑت نذیر احمد بھی ایک من زجگر پرکشے ہیں۔ جو ماضی اور حال کی قدروں میں ایک طرح کا امتزاج پیدا کرنے کی صحت مند فکر میں رہے ہیں۔ نذیر احمد نے کیوں ایک خاص طریقہ سے سوجھا اور ایک خاص طریقہ سے لکھا؟ جب ہم اس پر غور کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں تو پہلا سوال ان کے اس ماحول اور تعلیم کا آتا ہے جو ان کی ذہنی نشوونما میں کار فرما تھے۔ یہ سوچنا پڑتا ہے کہ ان کی فکر و نظریہ و تکنیک کی ساخت میں کیا خاص عناصر، افراد، ادارہ، اشعوری یا غیر اشعوری طور پر اثر انداز ہوئے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات نہیں میں یہ آتی ہے کہ مغربی مملکت اور اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کا دفاع و تقویت ہو چکا تھا۔ رفتہ رفتہ انگریزوں کی حکومت پوری قوت کے ساتھ ہندوستان میں اپنا اقتدار قائم کر چکی تھی۔ جس نے کچھ دماغ کو یقین دلا یا تھا کہ اب عہد ماضی واپس نہیں آسکتا۔ نئے دور میں نئے حالات سے دو چار ہونا جس کے لیے عمل کی ضرورت تھی۔ خواب دیکھنے اور تعبیروں کے اشتعال میں بیٹھ رہنا وقت ضائع کرنا ہے۔ مگر باوجود اس احساس کے کوئی تعمیری پروگرام لوگوں کے ذہن میں نہ تھا۔ مادی ترقی کے لیے بھی بے لوگ مذہب سے ہمارا سا کی امید ملائے تھے۔ اسی میں ہم سماجی کامل تلاش کرتے تھے۔ اور عہد ماضی کے خواب اور معتقد میں جی بھلا کر خوش رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ باوجود اس کے کہ انگریز تمام ملک پر چھا گئے تھے کوئی ایک ایسی مرکزی طاقت نہ رہ گئی تھی کہ ان سے دوا مزا لیتی۔ مگر ذہنی طور

ہر لوگ ان کی حکومت، ان کی تہذیب و عمر معاشرت سے متنفر تھے۔ اپنے آپ کو اہل اجداد کے طریق کار کو سراہتے تھے اور ان کے نقشہ قدم پر چلنے کو باعزت و فخر خیال کرتے تھے۔ بدلے بدلے ہر نئے حالات میں بدل جانے کے لیے تیار نہ تھے اور زمان میں حالات کو بدل دینے کی صلاحیت تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ سب ایک ذہنی کش مکش میں مبتلا تھے۔ چونکہ ذہن میں کوئی ایچ نہ تھی۔ اس لیے چارہ دنا چارہ وہی سب کچھ کر رہے تھے جو اس دور سے پہلے ہوتا تھا۔ چنانچہ نذیر احمد کی ابتدائی تعلیم بھی مکتب ہی میں ہوئی اور ابتدائی نقوش ذہن پر اپنا دہی اثر ڈال رہے تھے جو ایسے کبتوں میں پیدا کرتے تھے۔

نذیر احمد پندرہ سال میں پیدا ہوئے تھے۔ بھنور کا شہر کوئی خاص شہر نہ تھا۔ اور پھر ایک تحصیل کی ذہنی فضا کا جو عالم اس وقت رہا ہوگا اسے سوچئے اور آخر میں اسی کے ساتھ یہ بھی منظور میں لائیے کہ اس تحصیل کا ایک گاؤں ریدر اس زمانہ میں کیسے ملاحظہ رہا ہوگا جہاں نذیر احمد کی ولادت ہوئی تھی۔ ان کے والد سعادت علی کا سلسلہ نسب ایک بڑے بلند پایہ مولوی گھرانے سے ملتا ہے۔ شاہ جہان پور کا علاقہ اٹھم پوری کی اولاد میں سے تھے اور دو سو بی ایک خاص طہارت و بزرگی کے مالک تھے یہاں تک کہ ان کا شمار اپنے وقت کے مشاہیر لوہا میں ہوتا تھا۔ طہارت اور مولویت اس خاندان میں درودت سے آئی تھی۔ دایہ پال کے علاوہ نذیر احمد کی خیمال کا بھی یہی حال تھا۔ اس میں بھی لوگ بڑے پایہ کے گورے تھے۔ شاہی زمانہ میں قاضی رہ چکے تھے۔ مرنے کو نذیر احمد کا خاندان دو دو طرف سے مولویوں کا خاندان تھا۔ گھر کی پوری فضا ذہنی تھی۔ اس ماحول میں جبکہ پیدا ہوا ہوگا ہر جے کہ اس کی تعلیم و تربیت بھی ویسی ہی ہوئی ہوگی۔ جو وقت کا تقاضا نہیں ملے گا۔ پڑانے لوگوں کے ذہن کی کارڈ میں ایک بڑی ہوگی۔ معلوم نہیں کیا ایسے حالات ہونے کو نذیر احمد کے والد کو گاؤں سے شہر آنا پڑا۔ اس وقت نذیر احمد کی عمر صرف چار برس کی بتائی جاتی ہے۔ اس سن میں گاؤں کی ترنگ و تیرہ فضا سے نکال کر شہر کی فضا میں بچہ کا آجنا قدرتی امداد بھی حاصل تھی۔ جب تعلیم کا وقت آیا تو کسی قدر بڑے بڑے ماحول سے نذیر احمد کو ساتھ لیا۔ ابتدائی تعلیم کچھ مکتب میں ہوئی اور کچھ ان کے والد کے ہاتھوں ہوئی۔ یہ مسدود رہی کی طرف متوجہ رہا۔ نذیر احمد فاضل عربی پڑھتے رہے اس کے بعد ایک ڈپٹی کلرک مولوی نصر اللہ خاں سے نحو، منطق، فلسفہ کا درس لیا۔ کئی سال تک اسی ڈپٹی کلرک سے پڑھنے کا سلسلہ قائم رہا۔ ظاہر ہے کہ نذیر احمد کے ذہن میں پڑھنے کے ساتھ ہی سرکاری ملازمت کے بہار و قار کا بھی اثر پڑا ہوگا۔ ڈپٹی صاحب کے دنیاوی اعزاز کا نقش فیرشور ہی طوں ہونے کے ساتھ ہی ایک مستقل نشیت سے بن گیا ہوگا۔ بغیر سوچے سمجھے یہ احساس ہوا ہوگا کہ کاش یہ منصب مجھ کو بھی نصیب ہو رہا ہے اپنے گاؤں بلکہ شہر میں بھی کہاں ڈپٹی کلرکوں سے بڑے عہدے داروں کو دیکھتے رہے ہوں گے۔ لامحالہ خیال ہوا ہوگا۔ کہ ایک ڈپٹی کلرک ہونا کسب سے بڑا آدمی نہیں تو کافی بڑا افسر ہوتا ہے۔ چونکہ نصر اللہ خاں ڈپٹی کلرک سے کچھ سال تک فیض حاصل کرتے رہے جس میں علمی اکتساب بھی شامل تھا۔ اس لیے انسانی و شاگردی کے رشتے اور بھی مقبوت ہو گئے۔ ڈپٹی کلرک میں وہی وہی و دوسری دونوں اعزاز منگرتے ہوئے گئے۔ اس لیے سرکاری ملازمت اور ڈپٹی کلرک بننے کا شوق خود بخود پیدا ہو گیا ہوگا۔ اس وقت ہندوستانیوں کے لیے ڈپٹی کلرک ہی مزاج تھی۔ اس سے بڑا عہدہ اگر پڑے گا تو اس کے ساتھ سے ملازمت تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ملازمت کا نقد عروج اسی دہری کو نذیر احمد نے سمجھا ہو تو موجب نہیں۔ غالباً اس احساس و قناعت پر نتیجہ تھا کہ آگے چل کر نذیر احمد نے ڈپٹی انپکٹر خداس کی جگہ چھوڑ کر تحصیلدار بننے کو باعث افتخار سمجھا۔ علم و تعلیم کا اڑتو یہ ہونا چاہیے تھا کہ زیادہ سے زیادہ وقت و دماغ علم و تعلیم ہی کی نذر کرتے لیکن اس علم میں وہ کردہ اپنے ان جذبات کو عمل نہ کر سکتے جو نصر اللہ خاں ڈپٹی کلرک کی صحبت میں پیدا ہوئے تھے۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ جب ہم یہ دیکھتے

ہیں کہ وہ ایک عزیز گھرانے میں پیدا ہوئے تھے عصرت کے ساتھ دندلی گھر ہوتی تھی تو ایک احساس کمتری بھی بچپن میں پیدا ہو گیا تو بچی صاحب کتنے ہی سادہ مزاج کیوں نہ رہے ہوں مگر کچھ نہ کچھ طعنان تو دنیا اور کلچر کے دکھانے کے لیے کرنا ہی پڑتا رہا ہوگا۔ وہ ہمیشہ میں جو تنخواہ کی رقم ملتی رہی ہوگی اس کی آواز نذیر احمد کے کان تک بھی پہنچی رہی گی۔ اس کو سن کر وہ بھی سوچتے تھتے ہوں گے کہ اتنی بڑی تنخواہ کیسے لی سکتی ہے۔ اپنی عزتی کو روک کر نہ لے کے لیے ممکن ہے میں سے دولت منڈ بننے کی خواہش کی بنا وہ بھی پڑ گئی ہو ایک بات اور قیاس میں آتی ہے۔ کہ بچپن میں نذیر احمد نے اپنے باپ کو دنیاوی زندگی کے لیے مزہ نہ بکھا ہوگا۔ بلکہ انفرادیت کو ایسے اعزاز کا مرتفع تصور کیا ہوگا۔ کیونکہ علم و خاندانی وقار کی وجہ سے ان کے باپ سعادت علی کی عزت ایک مخصوص طبقہ کی تیار رہا ہوگا۔ لیکن یہ عزت دندلی کی آسائش سے بچکا یعنی تمام عمران کے والد نے عزتی میں لبرکی۔ برجنات اس کے بڑی صاحب پڑھے لکھے آدمی ہوتے ہوئے بھی مزدور بائیت دندلی کی فکروں سے مستغنی رہے ہوں گے۔ اس لیے نذیر احمد کو بھی خیال نہ ہوگا کہ علم کا وہی اچھا ہے جو دین و دنیا دونوں میں آدمی کا ساتھ دے مزدور بائیت دندلی بھی پوری ہوتی رہیں۔ کچھ جبر بھی پاس رہے اور توگ قابلیت سے متاثر بھی ہوتے رہیں۔ بھاری باتیں قیاس پر مبنی لیکن قیاس بے بنیاد نہیں جب ہم نذیر احمد کے ماضی و مستقبل کا رشتہ طے کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ ۹ برس سے ۱۲ برس تک کاسن ایسا ہوتا ہے جب بچہ کی خواہشات ایک شکل اختیار کرنے کی فکر کرتی ہیں۔ اور شعوری یا فوشوری طور پر وہ اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ نذیر احمد ۱۲ برس کے سن سے ۱۴ برس کی عمر تک بچہ بنے رہے اور ۹ برس کے تھے جب براہ درست نضر اللہ خاں سے سالانہ پڑا۔ ممکن ہے کہ اس سے پہلے بھی وہ ان کو دیکھتے رہے ہوں یا ان کے تذکرے سننے رہے ہوں لیکن چونکہ کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اس لیے اسے قیاس کو کر کے وہ پہلے سے ذہنی طور پر پڑ چکی صاحب سے مرعوب تھے ہم منظر اُزار بھی کر دیں تو بھی پانچ سال کی عمر تک بچہ کو متاثر کرنے کے لیے کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ اس لیے ان تمام باتوں کو داہم و گامان سے تعبیر کر کے مالا نہیں جاسکتا۔

نذیر احمد کی راوی دندلی ہیں سب سے اہم موڑ تو وہ تھا جو ان کو زلی ہیں غا۔ چودہ برس کی عمر میں باپ کے ساتھ نذیر احمد دلی پہلے آئے۔ ان کے باپ چونکہ ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو علم و فضل کا جویا تھا۔ پشت و پشت سے گھر میں دولت علم میراث کی طرح چلی آئی تھی۔ سب لکھو کے بھی وہ علم سے اپنی اولاد کو غروم نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ جب وہ دلی آئے تو خانبا ان کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اپنے بوجہ ناپکے کو علم سے آسائے کر دیں۔ خانبا تنگ دستی کی وجہ سے انہوں نے نذیر احمد کو ایک ایسے مدرسہ میں داخل کر دیا جو ادھر ادھر سے روٹیاں مانگ کر طالب علموں کا پرستہ کرتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سعادت علی کو اس سے بہتر کوئی جگہ نذیر احمد کی تعلیم کے لیے مقرر نہ آئی۔ کیونکہ بہتر حالات کے لیے مالی، مادی کی بھی ضرورت رہی ہوگی۔ جس کا انتظام غریب باپ نہ کر سکتا ہوگا۔ اس لیے چار دن چار مولوی عبدالخالق کے سپرد کر کے چلے گئے۔ یہاں جس عالم میں نذیر احمد نے اپنی طالب علمی کے دن پورے کئے وہ خود نذیر احمد کی دہائی بنیئے۔

"پڑھنے کے علاوہ میرا کام درمیان میٹھنا بھی تھا۔ صبح ہوئی اور میں چھری ہاتھ میں لے کر گھر گھر روٹیاں جمع کرنے نکلی کسی نے مات کی بھی ہوئی دال دے دی کسی نے چنے کی ٹکڑی ہی رکھ دی۔ کسی نے دیتیں سوچی۔ دجوں پڑھنا یا۔ عزیز ناگ رنگ کا کھانا جمع ہو جاتا۔ مسجد کے پاس ہی عبدالخالق صاحب کا مکان تھا۔ اچھے کھاتے پیتے آدمی ہیں ان کے یہاں ہر اقدام رکھنا مشکل تھا۔

اور میں نے قدم رکھا اور ان کی لڑکی نے ٹانگ لی۔ جب تک میرا دیر معالہ مجھ سے نہ پسرا لیتی نہ کھڑے ٹھکے دیتی نہ روٹی کا ٹکڑا دیتی۔ خدا جانے کہاں سے عمل بھرا معالہ اٹھاتی۔ چیتے چیتے ہاتھوں میں گئے پڑ گئے تھے۔ جہاں میں سے ماہ روکا اور اس نے بڑا انگیرا پر مارا۔ بھڑا جان ہی نکل جاتی تھی۔ بہر حال مارا دھاڑی دوڑا دیا جانا پڑتا اور روز ہی مصیبت جھیلنی پڑتی تھی۔ اس واقعہ کو ذہن میں رکھیے اور دوسرا واقعہ اسی سے ملتا جلتا ہے اس پر بھی عذر درگبیچے تو نذیر احمد کی ایک مخصوص ذہنیت کی بنیاد و رغبت کا سراغ مل جاتا ہے۔ غالب علی کے زمانہ میں نذیر احمد کو اپنے استاد مولوی عبدالغنی کے گھر کا کام بھی کرنا پڑتا یہاں تک کہ ان کی خورد سالی پتی کو کھانا بھی پڑتا۔ اس کو گود میں لے کر شہناہ پسرانا بھی ان کے فرائض منصبی میں داخل ہر گیا تھا۔ یہ تم غریبی بھی قابل دید ہے کہ بعد میں اسی لڑکی سے نذیر احمد کی شادی ہو گئی۔

یہ اور اس قسم کے واقعات اردو کے پہلے ناول نگار کے بیسے ادبی ناخیز بن گئے۔ اس کی ذہنیت کے اجزائے ترکیبی کی طرح ہر صحر کار فرما رہے۔ یہیں سے پتہ چلتا ہے کہ نذیر احمد کو ذائقے میں تجربہ اور محامدات کا پسند لگا۔ چودہ بندہ برس کے سن میں ان کا گھر دہلی میں اس طرح مانا کہ معمولی ذکر کے فرائض انجام دینے پڑیں، ظاہر کرتا ہے کہ وہ عورتوں سے بہت قریب ہو گئے تھے۔ کیوں کہ وہ لوگ بغیر کسی تعلقت کے ان سے کام لیتی تھیں اور آپس میں جو گفتگو کرتی تھیں اس کو اس وقت کا عزیز طالب علم اور مستقبل کا مولانا نذیر احمد صاحب تصانیف ذہن میں محفوظ رکھتا تھا۔ آمدورفت اور بے تکلفی کا سلسلہ شادی کے بعد اور بھی بڑھ گیا تھا۔ علاوہ ازیں اس کے کہ نذیر احمد نے اچھی خاصی علمی قابلیت اس عمر میں حاصل کر لی تھی۔ وہ یقین ہی سے بڑے ذہین تھے۔ اور وقت کا فائدہ کے لیے بڑے مشہور تھے۔ اس وقت جو گفتگو مستورات کرتی تھیں ان کو بغیر کسی ارادے کے ذہن میں محفوظ کر لیتے تھے۔ چنانچہ مزاج میں شوخی و شرارت بھی کافی تھی اس لیے عورتوں کے انداز بیان اور طور و طریقہ میں ایک لذت بھی ملتی ہوئی۔ بجزوے آکر یہاں کی زبان میں کافی فرق ظاہر ہوا۔ دہلی کی کسان زبان اور وہ بھی شریعت گراؤں کی شہتہ اور با محاورہ زبان ایک پڑھے لکھے آدمی کے لیے سرمایہ نشاط بن گئی ہوگی۔ وہ لڑکی جو ان سے معالہ پسوانی تھی اور اگر ان کا ہاتھ ٹوک جاتا تھا تو بے سے انگلیاں پکلی دیتی تھیں ان کے ذہن میں ایک خاص کردار بن کر ہمیشہ کے لیے رہ گئی۔ اس کی اس قسم غریبی اور بے رحمی و ہفتہ بھی آنا دیا ہوگا۔ اور لغزت کی بہر میں بھی جذبات میں دوڑ جاتی رہی ہوں گی۔ سوچتے رہے ہوں گے یہ کھاتے پیتے کھانے کی دلیاں نزاکت و امارت کی دھڑ سے خود کام نہیں کرتیں اور جو کام کرتا ہے اس کے ساتھ اتنی بے رحمی کا سلوک کرتی ہیں کہ گویا وہ آدمی نہیں ہوتا۔ نذیر احمد کو محسوس ہوا ہوگا کہ یہ لوگ دولت و امارت کا بے جا فائدہ اٹھاتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ عالم انسانیت سے دور ہو جاتی ہیں۔ خود کو انسان ہی نہیں دوسرے غریب لوگوں کو بھی انسان سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ان کی بچائی کا کیا ٹھکانہ یہ اور اس قسم کے اور بہت سے خیالات ایک ہونہار اور ذہین طالب علم کے دماغ میں آنا ضروری ہیں۔ وہ اپنے حاصل کردہ علم و اخلاق سے لوگوں کو دلکشا جانتا ہے کہ داد کو اس پس منظر میں سوچتا ہے جو اس کو اپنے بزرگوں اور ماحول سے ملا ہے۔ نذیر احمد کے گھر کا ماحول جو کچھ دیا ہوگا اس کی تفصیل تو کسی کو نہیں معلوم مگر قیاس کہتا ہے کہ جب فضیلت و ادب والی دونوں طرف سے بزرگان دین کی سرپرستی میں یہ گھرانہ پروان چڑھا تھا۔ اور نذیر احمد کے والد بھی خود دیں اور فروع عالم تھے تو لازمی ہے کہ گھر میں انسانیت، اتیزا تہذیب سب ایک مخصوص انداز کی رہی ہوں گی۔ اس طالب علم نے یہاں کی عورتوں کا اخلاق و کچھ کر لیا سچا

دعا ہو تو اپنی جگہ پر ہے مگر بہت ہی طور پر وہ انگریزوں سے قریب ہو گئے۔ اس قرابت کا ثبوت یہ ہے کہ اگر آباد میں انہوں نے انگریزی پڑھنی شروع کی۔ اور چونکہ فارسی دھڑی زبانوں کی گرامر اور ان کے حسن و قبح سے پوری واقفیت تھی اس لیے انگریزی زبان سے بھی واقفیت بہت جلد حاصل ہو گئی۔ کیونکہ ایک زبان کے جاننے والے کو دوسری زبان جان لینا زیادہ مشکل نہیں ہوتا چنانچہ نذیر احمد نے انگریزی میں بھی اچھی خاصی قابلیت حاصل کر لی۔ تاہم اس سے زیادہ انگریزی زبان کی لذت نے ان کو اس قدر متاثر کیا کہ موقع ہوا نہ ہو وہ لکھنے یا بولنے وقت انگریزی الفاظ اور وہ زبان میں محو ہوتے تھے۔ اپنے انگریزی پڑھنے کے سلسلہ میں ایک کچھ یہی کہتے ہیں۔

”میں ایسے اب کا بیٹا ہوں کہ دہلی والے کے پرنسپل نے ہر چند جانا کہ میں انگریزی پڑھوں، والد مرحوم نے جو ایک مغرب آدمی تھے مگر اپنے وقت کے برے دین وادعات کہہ دیا کہ مجھے اس کا سر جان منظور اس کا جیسا مالکان قبول مگر انگریزی پڑھنا گوارا نہیں؟ اب کا نذیر احمد بے حد احترام کرتے تھے۔ ان کے اس زبردست جذبہ کا بھی ان کو خیال تھا چنانچہ والد کی زندگی میں انہوں نے انگریزی کی طرف رجحان نہیں کیا۔ ان کے انخلاء نے کئی سال بعد تک اس وضع پر ہی کو نہایت دے۔ ملازمت میں والد آباد آئے کے بعد انگریزی پڑھنا شروع کی۔ اب کی محنت تک وہ ان مغربہ عناصر اس اقدام میں ایک طرح کی بغاوت ہے لیکن یہاں بھی ذاتی فائدے کا خیال پیش پیش ہے اور غائب وہی فائدہ اس بغاوت کا سبب بھی تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ بغیر انگریزی جانے برے انگریزوں کی حکومت میں ترقی کرنا ناممکن تو دشوار ضرور ہے۔ لہذا اس زبان کا بھی مطالعہ شروع کر دیا جو ان کے بڑے کام آیا۔ تعزیرات ہند کے ترجمہ سے خوش ہو کر گورنمنٹ نے ان کو تحصیلدار کی عطا کی اور پھر جلد ہی ڈپٹی کمشنر بنا یا۔

علم حدیث کی ایک کتاب کا ترجمہ ان کی مزید ترقی کا باعث ہوا وہ حیدر آباد جا بیٹے گئے اور وہاں پہنچ کر دفعہ دفعہ پورے آف دیونیو کے جبر ہو گئے۔ ستر سو روپیہ ماہوار تنخواہ ہو گئی۔ ایک اور مثال ایسی تھی جس سے ہماری اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ وہ ذاتی فائدے کے لیے مذہب سے بھی بغاوت کر سکتے تھے۔ سود لینا اسلام میں جرم قرار دیا گیا ہے مگر نذیر احمد اس کے جواز پر آمنا مہر تھے کہ برابر سود دیتے رہے اور مزید بھی مقرر کر لی تھی۔ ایک روپیہ سیکڑہ سود عاید ہوتے تھے۔ اپنی تصنیف الحقوق و فرائض میں سود کے جائز ہونے پر بحث کے مختلف داخلی نتائج سے اس کو حوالہ ثابت کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ یہ سب باتیں ان کی ذہنیت کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ نذیر احمد کے دل و دماغ پر عورتوں کے ہونا و مرد معاشرت کا میسر ہوئی اور پڑھا تھا۔ ان کی صورت و سیرت نے دہلی کی ابتدائی تعلیم و تہم کے زمانے میں ذہن پر نفوس پیدا کیے تھے وہی سب سے پہلے ان کی تصنیفات کا مرکز بنے۔ چنانچہ مراۃ العروس، نبات النشرب سب سے پہلے وجود میں آئیں۔ ان کتابوں سے نذیر احمد کی تصنیفی زندگی کی ابتدا ہوتی ہے۔ ان میں جو کچھ لکھا گیا ہے سب مستورات کے بارے میں عورتوں کی زبان ان کے لب و لہجہ میں نشست و برخاست کا مکمل نقش ان کی مصیبت جانتی تصویر اگر دیکھنا ہو تو ان کتابوں میں سب کچھ مل جائے گا۔ اس کے پس پشت یہ داغ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے گھر بوندگی اور عورتوں کا فائز مغر سے مطالعہ کیا تھا۔ ان کی خوبی و خرابی کو ناکہ کی طرح دیکھا اور مصلح کی طرح سوچا تھا۔ ان کو ان باتوں میں اتنی لذت ملی تھی کہ کتاب پر کتاب لکھتے جاتے ہیں اور سیری نہیں ہوتی۔ اس انہماک کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ان کا مطالعہ گھروں اور گھر والوں کے بارے میں وسیع تھا۔ ان کی بول چال میں نذیر احمد کی ادبی پیاس پیلا ہوتی تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ

دہلی کی زبان ٹکسالی تھی۔ دہلی واسے سی اہل زبان سمجھے جاتے تھے۔ نذیر احمد دہلی کے دتے اس لیے اساس کمزری تھا۔ وہ دہلی والوں کی صفت ہیں اگر اہل زبان میں شمار ہونے کا ہڈ پر عادی ہو گیا تھا۔ اس لیے بھی وہ زیادہ سے زیادہ محاورات مغرب الاثر لادوہ روزمرہ اپنی جگہوں میں پیش کرنے لگے تاکہ یہ سب کو اندازہ ہو جائے کہ مجھے بھی دہلی کی زبان پر آتا ہی ہو رہے جتنا کسی ادب کو ہو سکتا ہے۔ اس احساس کو انہوں نے مزدورت سے زیادہ اہمیت دی۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ زبان و بیان کا سیلاب ان کے ذہن کو بہا کر لیے جاتا ہے۔ اور وہ بعض وقت مجبور ہو کر اس میں بہے چلے جاتے ہیں۔ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن سنبھل نہیں سکتے ابتذال و رلاکت کلام میں آجاتی ہے۔ لہذا ان پر محاورات اور روزمرہ کا ایسا نشانہ سوار ہے کہ وہ بے خبر سے معلوم ہوتے ہیں محاوروں صاحبِ قاعدہ نے جو اس مسئلے میں مثالیں پیش کی ہیں وہ اس دھوکے کی بین دلیل ہیں ان ہی کو ہم یہاں بطور نمونہ پیش کرنا مناسب سمجھتے ہیں مثلاً (الاجتہاد میں تذکرہ ہجرت میں لکھتے ہیں :-

"اب تم ان حالات حق مصیبت کو حاضر فی الذہن رکھ کر ٹھنڈے دل سے انصاف سے تجویز کرو کہ پیغمبر حبیب مجھو! دھوکے رسالت کر کے کسی مفاد کی توقع کر سکتے تھے۔ اس دھوکے نے تو ان کی یہ گت بنائی تھی کہ :-

جھڑکی تو مدتوں سے مسادات ہو گئی
گالی کعبہ نہ دی تھی سو اب بات ہو گئی
باقی ہے مار کھانی تو سن لو گے ایک دن
اس کی گلی میں اپنی یہ اوقات ہو گئی

اس دھوکے نے ان کو شہر بدر کر دیا۔ (الاجتہاد ص ۵۸)

اجہات الامم میں اخلاق نبی کریم اور اسباب نکاح کے تذکرے میں ہجرت کے متعلق لکھتے ہیں۔

"تقریرت اور حمایت اور حفاظت نہ ہوتی تو رسالت کی پہل ایک گھڑی بھی مندر سے چڑھنے والی نہ تھی۔ لہذا وقت کے

بھروسہ پر پیغمبر تیز برس دشمنوں کے زعمے میں پڑے چھاتی پر مرمک دلایا کیے۔ یہاں تک کہ آخر کو پائے ثبات ملے۔ سب سے اہم گویا او بھاگ کر دینے جا پناہ لی"

ان مثالوں کو دیکھ کر کوئی کہہ سکتا ہے کہ منافات و تنبیہ کی کا خون نہیں ہوا۔ چلے۔ تہ شک لگنے ان کی بدگت جو ان کی چھاتی پر مرمک دلایا کیے، پائے ثبات اٹھ گئے، بھاگ کر یہ فقرے یا محاورے اس عظیم المرتبت تن کی شان میں ہیں جس کا نظیر معنی سنی پر پیدا نہیں ہوا۔ یہ صرف عام مسلمانوں کا عقیدہ نہیں خود نذیر احمد بھی رسالت تا دل سے اتنا ہی احترام کرتے تھے۔ مگر زبان دانی کا غرور اور محاورات کا چسکا ساری زمینیت یہ نبوت کی طرح سوار ہو گیا تھا۔ نہ حقیقتاً مراتب کا خیال اس کو رہا سکتا تھا اور نہ موقع شناسی اس کو اتار سکتی تھی یہ مزہ دے کہ ان کا دل دھڑکا ہو گا۔ احترام کے جذبے نے تم کو دھکا ہو گا کہ کس کی شان میں یہ الفاظ استعمال ہو رہے ہیں کس موقع پر ان فقروں اور محاوروں کا صرف ہر دہا ہے مگر زبان دانی کے جوش اور الفاظ کے استعمال

کر سنے کا نشہ اس بے اعتدالی سے زد و کسلا اور اس مذہبِ مذہبش کو دیا کہ نثری جہالت نالافی معلوم ہوئی۔ تو ہمارے مصرعے بھی چہاں کر دیئے۔ حالانکہ اس موقع کے لیے یہ مصرعے نہایت نامناسب تھے۔ اسی بے شکے ہن کی وجہ سے اکثر ان کی طرزِ تحریر عریض ہو جاتی ہے۔ کلام میں ناہمواری پیدا ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی یہ غموس ہوتا ہے کہ بات بلا وجہ بڑھاتی جا رہی ہے۔ یہ سب اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے جو الفاظ سے مھوٹا کیلئے کا ہوتا ہے۔ سب کچھ کہہ جانے پر بھی خیال ہوتا ہے کہ ابھی کچھ نہیں کہا گیا۔ اس لیے کہ مخصوص اندازِ بیان کی تشکیل باقی رہ جاتی ہے اور موزون ختم ہو جاتا ہے۔

نذیر احمد ایسے دور میں تھے جب انگریزی تمدن کے اثر سے نئی تدبیریں تشکیل ہو رہی تھیں۔ لوگوں کو ان پر اعتماد ہو رہا تھا۔ انگریز ادبِ یورپ کی ترقی کے مآذ کو سمجھنے کی کوشش ہندوستان میں ہو رہی تھی۔ ایک خاص طبقہ انگریزی تعلیم یا انگریزی اثر سے متاثر ہو کر اس نئی سنجیدگی پر پہنچا تھا کہ سائنس کی نئی تحقیقات و مضامین کا مطالعہ کیا جائے ان سے پرانی ذہنیت کو بدل جائے مذہب کو عقل کی دھمک سے دیکھا جائے، ترہات سے کنارہ کیا جائے۔ اور ایسی دہمیں جو مذہب کے نام پر جاری ہیں گر حقیقتاً خیال خام کی پیداوار ہیں وہ قوم و ملک کے لیے زہر ہیں ان سے اجتناب کیا جائے۔ انگریزوں کی ترقی کا ایک بڑا مآذ تجارت میں مضمحل سمجھا گیا۔ اصلاح کے لیے تنقیدوں اور تحریروں دونوں سے کام لیا جانے لگا۔ دوسرے الفاظ میں یہ سمجھنے کو نذیر احمد کا دور نئی تحقیقات و تحقیقات سے اثر ہے کہ اپنی قوم میں بھی ترقی کی روح چھوٹنا چاہتا تھا۔ اسی کو ذہنی طور پر آمادہ کر کے لیے معاملات کا ذخیرہ معرب کے خزان سے لے کر حوام کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا۔ عالی۔ سرسید۔ محمد امین آزاد اور ان کے تعلقہ دہم خیال ایسے ہی اصلاح کے علمبردار تھے۔ جس کو طبقہ مناسب معلوم ہوا اسی میں تبلیغ کرنے لگا۔ نذیر احمد نے پہلے پہل اس کام کے لیے جیسے جیسے اثاث کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ انہوں نے اس کا ذخیرہ کر کے لیے نئے آئینہ کار کا انتخاب کیا۔ ناول اور دوادب کے لیے نئی چیز تھی اس کا اپنا ہن بھی لازماً معلوم ہوا ہوا۔ اور پیامات کی تازگی بھی چاہتی تھی کہ پرانے قصے کہانی کو چھوڑ کر نئی منف میں باتیں پیش کی جائیں اس لیے نذیر احمد کا بہ اقدام ناول میں اصلاحی مقصد کو پیش کرنے کا خیال برسی نکتہ دسی پر مبنی تھا۔ بہر حال انہوں نے اصلاحی فریضہ ناول سے شروع کیا۔ اور لوگوں کی طرح نذیر احمد کے پاس بھی کوئی معاشرتی پروگرام ایسا نہ تھا کہ ان کی تحقیق سے تعبیر کیا جائے۔ درحقیقت ان کا ذہنی سرمایہ مغربی تمدن کا پرتو تھا۔ جس میں تقلید دیا وہ عقلی خلائی کم۔ بہر حال جو کچھ باتیں ان کی سمجھ میں آئیں اس کو قوم کی بہبود میں صرف کرنا انہوں نے مزدور سمجھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس اقدام میں غلوس تھا وہ دل دھان سے چلتے تھے کہ مسلمان ترقی کریں مادی ترقی کے لیے ان کے نزدیک مزدوری تھا کہ شہر دہی میں بھی مہندی آئے تداومت بدستی کے تنگ دائرے سے نکل کر نئے علوم سے متعارف و مافوق ہوں تاکہ نئے راستے اور ان کی تدریس سمجھ میں آئے۔ مختلف وجوہ سے نذیر احمد نے عورتوں کو زیادہ کمزور پایا اور مناسب سمجھا کہ ان کو پہلے مضبوط بنایا جائے۔ اس لیے ان کی ناولیں مآثر العروس اور بات النش و جودیں آئیں۔ جن میں علاوہ اور باتوں کے ذہن کی باہدگی کے لیے سائنس کے مختلف مسائل پر روشنی مائل کی گئی۔ مثلاً بات النش میں زمین کی کشش و ذہن مخصوص، ہوا کا داب، کشش، اتصال، مقطیس، زمین گولی ہے۔ اور آفتاب کے گرد گھومتی ہے۔ اور اس قسم کے اور بہت سے مضامین تھے۔ جن سے ہمارے کہ ان مسائل کو اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ شعور میں عقلی مضمر غالب ہو جائے۔ ذہنی گولے کشتے منطقی طور پر سمجھ میں آجائیں۔ موقوفات سے بہت کہ عریض حقیقت کی روشنی میں چلتے پھرتے گلیں۔ اور نئی عقل کی توانائی کے ساتھ

آگے بڑھے۔ نذیر احمد نے اپنی ذہنیت پر ایک جگر و زہرہ کیا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں۔
 ”اور اگر میں نے کالج میں نہ پڑھا جوتا تو میں کیا ہوتا۔ مولوی ہوتا۔ تنگ خیال، متعصب، اُکلی کھرا، اپنے نفس کے اقتساب سے فارغ، دوسروں کے محبوب کا مستحسن، بخود غلط مسلمانوں کا، دان و درت۔ تمام نے وقت کو صرف سناٹا ہاں گود، مولوی خانان کے ستے غلامانیت سے بنائے تھے۔ اسی لیے مولوی رانوں نے بہت بڑی نظریے دیکھا۔ حماقت معلوم کرتا ہے کہ انہوں نے بھی اقبال کی طرح سمجھ لیا کہ وہی کیا چیز ہے۔ قزمن کی حماقت کی جیسے۔ اس کو لیا جاسیے یہ جیسے چارے دو رکعت کے کلام ان کے نزدیک آدم کی بہری کے جیسے اب وہی شخص مردوں ہو سکتا ہے جو ترقی یافتہ دنیا کے حالات و تغیرات سے بخوبی واقف ہو مذہب کا اصل منشا بھی جانتا ہوا ہے۔ پر بھی تیسری نظر ذوال سقا ہو۔ تعصب و تنگ نظری کا شکار نہ ہو۔ محض یہ کہ ایسے کردار کا مالک ہو جو مذہبی اور مذہب کی اصل حقیقت سے واقف ہو انسان کو انسان سمجھتا ہو۔

ان محققہ الفاظ میں نذیر احمد نے اپنے اندر کے ممتاز لوگوں کی ذہنیت کا جائزہ پیش کر دیا ہے۔ ان کی رائے سے ذات جو سر پر آوردہ و گ توہمی و رہنمائی اور بنیادوں سے گزرے تھے۔ ان سب کے مزاج و مذاق کی نظریات اصول کے تینوں نظریات سے مرید حالی، آزاد، نور محمد سب اس نظریہ کے ساتھ راہ تبادلت میں گامزن تھے۔ کبھی کسی سے عرق ہوئی ہو تو اسے انسان پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ وہ نہ مرنے، ان بزرگوں کے سامنے مسلک تھا۔ نذیر احمد نو اصالت کے سلسلہ میں اتنا سخت تھا کہ وہ سچی سچی ایمان منس معلوم ہونے لگتے ہیں۔ شاہدوں میں نزاری کی حرکات و سکنات بیان کرنے کیلئے خود بھی میں بول اٹھتے ہیں۔ اس شہر و ملک کے ساتھ کھستے جاتے ہیں کہ پورا پورا جسے دے انول کے ٹھیک کے عروج ہونے کا خیال دے جانا ہے۔ ذوق سے تاسر و ذوق از جملہ کی منہا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جذبات سے ان کا دم گھٹ رہا ہے۔ بغیر اسے ہونے ان کی حالت غیر ہو جائے گی۔ کچھوں کا یہ حاصر اور بھی ہے لگا ہوا جانا ہے۔ اس رویہ کے پس پشت خائس و خود غمانی کا جذبہ نمایاں ہے۔ اور یہی جذبہ ان کی تمام ادبی کاوش میں اُبل پڑتا ہے۔ مزاج الاصل و محاورات کی تہرہ اور انویسی الفاظ کا بے مزورت و بے عمل استعمال ان کی اس ذہنیت کی غمازی کرتا ہے جو خود غمانی کے ذوق پر مبنی ہے۔

نذیر احمد کے ذہنی پس منظر میں سیاست کا زیادہ دخل نہیں مگر سماج پرست اور سادہ دہشت میں جو ذہنی ملامت ہے وہ کبھی گام نہیں لیا جاسکتا۔ اس سے سیاسی مسائل پر بھی ان کے خیالات متغیر ہیں گروہ ہے۔ اپنے ہی قریب پروردہ کی خیالات کی تہذیب، اتنی حق پرست اور خود داری ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ اس زمانہ میں لوگوں کا یہی شعور اتنا جلد نہا، جہاز تہ ہے۔ آزاد کی تلوار و گھنڈا آج کے نہیں حاصل تھی۔ نذیر احمد انہوں نے مختلف صورتوں سے عالم و علوم کے رشتہ پر جرئت نہائی ہے۔ وہ اس وقت کے گماندہ قابل قدر ہے ایک جڑا بہن اہلوت کی زبان سے ہر ذرے کے بعد انگریزوں کے بیٹے میں اُبلتے ہیں۔

انگریزی سلطنت رعایا نے ہندوستان کے حق میں ایک سیل ہے۔ جس کو اس وقت تک اکثر عوام اس نہیں بوجھ سکتے۔ تبدیلی سلطنت ہوں بھی کچھ آسان بات نہیں اور پھر ایسا تبدل کہ ماکم و محکوم دونوں میں کسی طرح کی مناسبت نہیں۔ مگر ایک زبان ایک مذہب ایک پس منہ و ستائشوں کے حق میں سلطنت کی بدلی گویا ساری غذائی بدل گئی۔ اگلے دم درمیانہ صلی ساری باتیں بے کام۔ کل تہذیبیں بے اثر اب ہر ایک مضمت مزاج آدمی خیال کر سکتا ہے کہ اس گروہ کو انگریزی ممداری سے خوش ہونے اور رہنے کی وجہ حصول

عفی یا نہیں؟

اس مسئلہ کی ایک کڑی اور ملاحظہ ہو، بنات انشیل میں ایک جگہ بادشاہ اور رعایا کے تعلقات پر کچھ غور توں میں بحث ہو جاتی ہے۔ اسانی ہی آخر میں آئے دیتی ہیں:-

"جتنے بادشاہ ہیں سب لوگوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ جب دنیا میں بہت آدمی ہر گئے تو آپس میں لڑائی جھگڑا اُٹھ گیا۔ تجویز یہ ٹھہری کہ آپس میں کسی شخص کو سروا نہ بنالیں۔ سب اس کا علم ہائیں اور اس کی اطاعت کریں اور اس سروا کا کام یہ ہو کہ وہ لوگوں کے جھگڑے سے روک دیا کرے۔ رعایا کی جان و مال و آبرو کا نگہبان رہے۔ اسی کا نام بادشاہ تھا لوگوں کا کام ہے اس کی اطاعت کرنا اور بادشاہ کا کام ہے رعایا کو آرام دینا"

اگر یہ مان لیا جائے کہ ان اقتباسات کے پس پردہ مسند خود بول رہا ہے تو نذیر احمد کا یہاں مغربیہ واضح ہو کہ مساندے آجاتا ہے۔ پہلے اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہندوستانیوں اور فرنگیوں میں مختلف وجہ سے بڑا بعد پاتے تھے اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہندوستانی اور انگریز کسی شہر و شکر نہیں ہو سکتے۔ اتنے دیادی اختلافات میں کہ ہندوستانیوں کا انگریزی ممداری میں غرض نہ ہونا ممکن ہے کیونکہ عالم و محکوم دونوں میں کسی طرح کی مسابقت نہیں۔ انگریزوں کے آجائے سے ہندوستانیوں کو محسوس ہوتا ہے کہ ان کا سب کچھ لو گیا اور وہ بیک جنبش قلم انگریزوں کی بدست محض ہوں گئے۔ نذیر احمد یہی نہ تھے مگر ان خیالات میں انہوں نے نفسی تحلیل پیش کی ہے وہ ان کے غمزدگی کا پر اثر ثبوت ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اس طرح ملک و حالات اور واقعات کا مطالعہ کیا ہے۔ اور حقیقت کو کتنی پختگی کی ساتھ محسوس کر لیا تھا۔ دوسرا اقتباس بھی ان کے خیالات کی ہندی اور آبادی فکر کی جین دلیل ہے۔ حالانکہ انگریزی شہنشاہیت اس وقت شباب پر تھی۔ مگر کے بعد ایک مدت تک انگریزوں کی محنت یریز زبان ہندی کا کام کر رہی تھی۔ اور یہ کتاب انشیل۔ خود کے صرف چند سال بعد شائع ہوئی۔ اس میں عوام کی قوت و حق کی طرح بیان کرنا کہ بادشاہ لوگوں کے بنائے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہی دیدہ ویرسی کا کام تھا۔ گو یہ عوام کو یہ سمجھانا تھا کہ قہاری اجتماعی قوت بادشاہ کی قوت سے زیادہ ہے اور نیز یہ کہ بادشاہ کا فرض آدھیں ہے کہ رعایا کی جان و مال و آبرو کی نگہبانی کرے۔ ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی دستانے کا بے باکی کے ساتھ پیش کرنے کے عادی تھے۔ حکومت سے ڈرتے تھے نہ مذہب و دواں سے۔ جو کچھ سوچتے تھے اس پر پختگی کی ہر ملاحظہ دیتے تھے۔ سمجھتے تھے کہ اس کے علاوہ کوئی ادبیات ناقابل قبول ہے۔ ان کی اصابت دانے میں شک ہو سکتا ہے۔ ان کے تعویض سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ لیکن ان کی بے باکی پر دود دانے نہیں ہو سکتیں۔

نذیر احمد کی ذہنیت میں ایک بڑے مزے کا اتفاق ہے جس قدر وہ دھیر دھیر پیہ فرج کیونے میں تجوس تھے اتنا ہی الفاظ کا ذخیرہ لگانے میں فیاض تھے۔ جلی کی وجہ تو یہ تھی کہ وہ حزب گرانے میں پیہا ہوتے تھے۔ عفی اور انارادی کے نشتروں سے دل پوری طرح واقف تھا۔ اس کو اب اپنے سے دور رکھنے کے لیے بائی پر منظر تھی۔ مٹی ہمیشہ بند رہی۔ لیکن انانڈو کے موت میں ان کا رویہ بالکل برعکس تھا۔ میرزا خاں سے کہ وہ اپنی جزی کی تقابلی روپے سے نہیں بلکہ اتفاق سے کرنا چاہتے تھے۔ جس سے۔ وہ یہ سمجھ کیونے میں ان کو لذت عتی تھی۔ ویسے ہی اتفاقاً ضرب اشال عمارات کے ٹانے میں مرا لیا تھا۔ اور یہ مراا جس حد تک غلبہ پایا تھا کہ کسی قیمت پر اس کے ترک کیونے پر ماضی نہ ہوئے۔ یہاں تک کہ ان کے لاسے پڑ گئے۔ ان کی ایک کتاب اجہات الامت نے ان کی ساری شہرت دینک نامی ہی آگ لگا دیا

اندواج رسول کے بارے میں لکھتے لکھتے الفاظ و محاورات کی بے اعتدالی اور اس سلسلے سے جو ان کو مختصراً غضب و جہاد پہ لکھو ایسے نامناسب فقرے کہ لکھے جو ہر لکھنا سے قابلِ اعتراض تھے۔ ان کو پڑھ کر عام بے چینی پیدا ہوئی۔ مسلمانوں کے جذباتِ نذیر احمد کے خلاف اتنے شعلہ ہستے کہ ان پر لکھنا لغوی ٹھیکھا گیا۔ علامہ کا اجتماع ہوا اور ان کی کتاب اہانتِ امامت کا جتنا بھی ذبیحہ ملی سب کو یکجا کر کے آگ لگا دی گئی۔ اس فقرہ نذیر احمد پر بڑا سخت اثر پڑا اس لیے کہ غرضاً وہ رسول اور اندواجِ مطہرات سے بڑی عقیدت مندی رکھتے تھے یہ معلوم کتنا ریاض ان بزرگوں کے اخلاق و سیرت کی اشاعت پر کیا تھا۔ اور آج ان ہی کو ان بزرگوں کا مخالفت سمجھا جا رہا تھا۔ ان کو اس بات کا اتنا صدمہ ہوا کہ اس کے بعد نہ کچھ لکھ سکے نہ پڑا وہ دن تک جی سکے یہ حادثہ ۱۹۱۱ء میں اور ان کا انتقال ۱۹۱۲ء میں ہوا۔

نذیر احمد کی زندگی کی تفصیل میں مذہب کا عنصر جزو غالب ہے وہ بغیر اس کے تقریباً نہیں اٹھتا۔ برصغیر کی تعلیم میں مذہب کی پائٹی عزت رہتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ مذہب و اخلاق کا چرچا دامن کا ساتھ ہے۔ ایک کو دوسرے سے الگ کرنا ناقابلِ اعتدالی بلکہ حماقت ہے۔ گو برہانغورج کے دیباچہ میں رقم طراز ہیں۔ شیخ کو مذہب سے جدا کرنا ایسا ہے جیسے کوئی شخص روح کو جسد سے یا گوشت کو کھانسی سے یا لڑکوں کو آفتاب سے یا عرض کو جوہر سے یا ناسخ کو گوشت سے یا عہدہ یا منہاک کو سنہ کا قند کو سنہ: گویا ان کے نزدیک مذہب سے الگ ہو کر زندگی اخلاق کے دائرے میں نہیں رہ سکتی۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان کے خیال میں اخلاق کا شیرازہ بغیر مذہب کے قائم نہیں رہ سکتا۔ دنیا ڈاکوئی اور تازان اس کو راہ راست پر نہیں رکھ سکتا۔ ان کا ذہنی ارتقار رسوم و قیود کا سہارا لیے ہوئے ہے جو کچھ دیکھنے یا سنتے پتے آئے ہیں اپنی تخیل کا عمل تعمیر کرتے ہیں۔ اس سے الگ یا آزاد ہو کر کوئی نیا تجربہ یا نئے نظریات ان کے ذہن میں نہیں۔ چنانچہ فصوح کو جب حشر کے میدان میں لے جاتے ہیں اور دہلی، وادیاں کرستے ہیں تو خدا کو بھڑکتا اور اس کی عبادت کو دیکھ کر ان کی سموری حد امتوں کا پرچہ بکھٹے ہیں۔ خدا کے یہاں بھی حالات دھڑکتے ہیں۔ مجرم کے لیے خود جرم تیار کرتے ہیں۔ گواہ کی ضرورت ہوتی ہے سوال و جواب کا سلسلہ یہ کرتے ہیں۔ اور آخر میں عدالتی فیصلے کی طرح خدا بھی اپنا حکم جرم کو سناتا ہے۔ گویا خداوندِ مہم کی عبادت کو دیکھ کر دیکھی ہی ہوں گی جیسے یہاں کچھ یوں ہیں جو ان کی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں حدت و اختراع کا مادہ نہیں۔ البتہ مذہب کی روح کو کما حقہ سمجھ لیا تھا۔ اور جو کچھ سوچا یا سمجھا تھا۔ اس پر سختی کے ساتھ کاربند تھے۔ اسی کو شمسِ جاہلیت کا تمام دنیا کی تاریکیوں کو دور کرنے کی فکر تمام جو کرتے رہے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاکِ طینتِ دا

ماضی کے ادبِ عالیہ سے متعلق

منار حسین

ایک ایسے زمانے میں جب کہ طبقاتی جنگ بہت تیز ہو جاتی ہے تو جذباتی و فوریانہ فوری کے باعث ادبی پردہ میں فطیلاں بھٹی رہتی ہیں۔ یہ تصور سیاسی تیرہندی کا نہیں ہے کیونکہ سیاست تو تیز ہوتی ہی ہے۔ بورژوا نظام کے ٹھکانے جن میں اُبھرتے جائیں گے طبقاتی جنگ کا تیز سوز لازمی ہے۔ تاریخ کا تعلق انہیں نظام کو زیادہ اُبھانے اور تیز کیسے ہی بنے۔ لیکن جب سماجی ارتقاء کے قوانین کا ارتقاء بہت جلد سے اور زیادہ فوری طور سے ادب پر کیا جائے گا تو اسے تو زبردستی ادب ہی کو نقصان پہنچتا ہے بلکہ انقلابی قوتیں بھی کمزور ہوتی ہیں۔ روسی تنقید میں اقتصادی بین دی کی اولیت اور طبقاتی جنگ، ادبی بے باکوں کا بہترین اکر ہے۔ لیکن جب اس آگے کو بقاعدہ تمام حالات اور علوم کا جائزہ میسر ہوئے مینا کی صورت سے استغناء کیا جاتا ہے تو یہی آلہ علم دشمنی اور اُجالت کا حربہ بن جاتا ہے۔ اشتراکی انقلاب کے پہلے اور بعد میں ضرورت اس ہی میں بلکہ انگریز اور مارکس کے زمانے میں بھی خود جرمی ہیں۔ ایسے ناقدین موجود تھے جو مارکس کو ایک مینا کی علم بنا کر ماضی کے ادب کو جانچنے کی کوشش کرتے تھے۔ ایسے نواق پر مارکس اور انگریز دونوں ہی نے اپنا ٹھکانا بنایا ہے۔ اسی طرح مینا نے بڑے گونجوں کے خلاف ضرورت بہت کچھ کھاسے بلکہ ماضی تنقید کے ذریعے سماجی دشمنی بھی کی ہے۔ ہر کوشش کریں گے کہ اپنے ماضی کے ادب کی کسوٹی بناتے وقت ان کی تعلیمات کو سامنے رکھیں۔ قبل اس کے کہ ایک اتنے بڑے مسئلے کو اٹھٹھایا جائے میں تہیہء امرت سماجی ترقی کے معنوم اور کلیدی ادب کے چند بنیادی مسائل کو پیش کر دوں گا۔

جسے ہم سماجی ترقی کہتے ہیں اس کا تعلق ترقی کے مختلف سمتوں سے ہے۔ معاشی اور سیاسی زندگی سے ساتھ اگر مادی اور دینی نقطہ نظر اور دینی نوع انسان کی وحدت کا تصور نہ اکٹھے کر لیں سمجھنا یا بیجے کہ ابھی ہماری ترقی ضرورت ناممکن ہی ہے جو اس میں محنت بھی ہے کیونکہ سماجی شعور ایک خلاقانہ قوت ہے جو معاشی بنیادوں پر اثر انداز بھی ہوتی ہے۔ اگر سماجی شعور کی بنیادیں مستحکم نہیں ہیں تو ممکن ہے کہ وہ ہمیں عوامی نظام کی طرف لے جائیں یا بڑے درجے پر بھی خیر و ہیں تعلیمات کے ذریعہ اثر بھی کر دیکھئے ملک محدود نہیں رکھتا ہے بلکہ اس کے دیہات اثرات کا ماحول بھی لازم کر دیتا ہے۔ لیکن ہے کسی زمانے کی ادبی تعلیمت فوری اثر کے اعتبار سے کمزور ہو لیکن سماجی ترقی میں دیرپا اثرات کی حامل ہو۔ اس حقیقت کا ایک نمائندہ پہلو بھی ہے۔

یہ بات تو مسلم ہے کہ ادب اور تہذیب کی ترقی طبقاتی سماج میں ہوتی چنانچہ طبقاتی اثرات کی چھاپ تو ادب اور ہر دو دنیا

ہی رہا ہے۔ لیکن جب ہم اس بارے میں سوچیں تو ہمیں سمجھتی ترقی نے معلوم کر بھی اپنے دہس میں دکھنا چاہیے۔ فلاح کا دور استحسان نظام کو جو دوسری لائن کے خیالی سے ایک بڑا زمانہ تھا۔ یہ جاسکتا ہے۔ لیکن بذاتی نظام کے متعلق ہے میں اس دور میں انسان نے زیادہ ترقی کی ہے۔ اس لیے اس دور کا چھوڑنا ترقی پسندی کا بھی دور رہا ہے۔ یوں کا تمام علم و ادب اسی دور میں بار آور ہوا۔ اس دور کے علم و ادب نے ترقی اور صحت دونوں ہی قوتوں کی نمائندگی کی۔ جسے کسی بھی دور کی سب چیزیں ترقی پسند نہیں ہوتی ہیں۔ اور نہ انہیں تاریخی تقاضوں کا نتیجہ ہیں اور نہ جاسکتا ہے۔ ترقی اور صحت کی دو باتیں ہیں ایک دوسرے کے ساتھ درست و گریبان رہی ہیں۔ سچی انتہائی ترقی کی قیام وراثت دیکھ کر ہمارا ایک نئی صورت میں تبدیلی کرنا ہے۔ وہ ناقص اور غیر مناسب۔ وہاں کہ وضع بھی بنانا ہے یہ مسئلہ اس وقت تک قائم نہیں ہے۔ اگر یہ وہی انتہا درست دیکھا جائے تو یہ ترقی و فلاح میں سمجھتی ہے۔ طریق پیدا واد کو چھلنے اور اس سے زیادہ۔ جسے زیادہ دلوں کو زیادہ اٹھانے کا موقع دینے اور اس بات کو آزاد کرانے کی جدوجہد میں جن قوتوں نے حصہ لیا ہے۔ انہیں ہم ترقی پسند کہتے ہیں۔ یہ قوتیں مختلف حلقوں میں ایک ہی وقت میں اپنے عملی حالات کے مختلف شعبہ صورتوں میں کام کر رہی تھیں۔ ہم ایک حلقہ کی مثال کو دروہ سے کہہ سکتے ہیں کہ انہیں کوہ پورہ کاؤ نہیں کر سکتے۔ پھر یہ کہ علم و ادب کی شہرہ منواری جیادوں کے ساتھ طبقاتی نظام میں آنا زیادہ درست نہیں رہا ہے جتنا کہ قیامی نظام میں تھا۔ طبقاتی نظام میں تو ان چیزوں نے اکثر و بیشتر ایک بار اٹھائی جیاد سے سمجھیں ہو کہ ابھی ایک آزاد زندگی بھی مقبلاً کر لی ہے۔ انہوں نے یہ آزادی اپنی مضبوطی ہوئی ہے کہ وہ اپنی ترقی کے انہوں نے قوتوں اور قوتوں کی بھی بناتے ہیں۔ انہیں ملکی تحریکوں کو چھٹنے وقت نہ صرف طبقاتی جگہ۔ بلکہ وہ سب سے بڑا ان کے مسلسل مطلق اور قانون کا بھی پسند چلا ہے۔ چونکہ ملکی تحریکیں ادب پر گہرے اثرات چھوڑتی ہیں۔ اس لیے ان کا نظام و معماران کی مطلق کے بہت بڑا رہا ہے۔ ملکی تحریکیں اس لیے بھی اہم ہیں کہ وہ ایک مخصوص مہم کے ضمنی نقطہ نگاہ اور اور ایک حقیقت کا بھی پسند دیتی ہیں۔ ان کی مدد سے ادب سمجھنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔ ادب کی کہ دینے لیتے نے نہ صرف اس طرح کی ہے کہ ادب خارجی حقیقت کو آئینہ بنے جس طرح اس طرح بھی کہ ادب اور ایک حقیقت میں بنانہ ہو بھی کرتا ہے۔ انہیں صفوں میں ادب ہماری جہانی اور اپنی مہذبانی زندگی کا ایک ایسا مرقع ہے جس کی مدد سے کسی بھی زمانے کی تاریخ نہ تب کی جاسکتی ہے۔ یہ تاریخ پورے سماج کی زندگی کی تاریخ ہوتی ہے جو حقیقت میں اپنے ادب پرانے کی جانب کی تاریخ ہوتی ہے۔ ترقی پسند ادب کسی نہ کسی معنی میں نئے کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس وقت بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ ممکن صورت سے نئے سے ساتھ کر لیں کہ جس حد تک اب دور کی مقصد و ندرتوں کی گنگنا تصویریں تمام کے ذہنوں میں تسلی ہے۔ ادب کا ذہن بھی گنگنا رہتا ہے۔ اسی لیے وہ اکثر متغیر باتیں بھی کرتا ہے۔ دلچسپ یہ ہے کہ وہ بذاتی اعتبار سے پرانے کے صفات بنانے کے نون میں ہی چیزیں دلانا پسند کرتا ہے۔ اگر وہ صحت مافی کی چیزیں واپس لانے کی کوشش کرتا ہے تو ہم اسے صحت پرست کہیں گے۔ خواہ وہ ایک مخصوص مہم کے پرانے بن کے صفات ہی بنانے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں نے اس چیز کو نام کیا اس لیے کیا ہے کہ جب انہی مہم کے پرانے کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے تو بہت سے نئے تعویذات کو بھی اپنا لقب ہے لیکن وہ ان تعویذات کی صرف اپنے طبقاتی مفاد کے لیے استعمال کرتا ہے اس کی یہ کوشش اس میں قیام کو زندہ رکھنے کی کوشش ہوتی ہے۔ اس کی واضح مثال اسلامی تاریخ میں امام غزالی کا نام ہے۔ اس وقت اسلام کی شرعی حکومت انہما کی شکل صورت میں تھی۔ شرع اور فقہ کا دور صحت سے ملنے ہو رہا ہے۔ دشنام شرع پرانے علوم سے نہیں تھے بلکہ انہما غزالی کو بھی پرانے علم کا علم کا مستند، اپنا پرانے لیکن امام غزالی

نے اسے جن مقاصد کے لیے استعمال کیا وہ قہری دجبت پسند تھے۔ اسے مادی ترقی کے بھانے روحانی استداراک کا ذریعہ بنایا۔ ہم میں مابعد طبیعیات کے متعلق کی مابین انہیں کی کوششوں سے کھلی ہیں۔ موجودہ دور میں اس کی نشان عدہ اقبال کی فکری کوششیں ہیں۔ علامہ اقبال نے اسلام کی روحانی جمودیت کو واپس لانے کی کوشش کی ہے۔ اس کوشش میں انہوں نے ان ذرائع کو بھی استعمال کرنا چاہا ہے جن سے یورپ میں ترقی ہوئی تھی۔ لیکن ایسے تمام ذرائع کو وہ اپنے مخصوص مقصد کا پابند بھی کر دیتے ہیں۔ ادیبی چیزان کے کام میں بھی تضاد پیدا کر دیتا ہے کیونکہ مادی ذرائع روحانی مقاصد کے ساتھ جھڑا نہیں ہو سکتے ہیں۔ اگر انسان فاضل فطرت پر ترقی یافتہ ماحول کے لئے جو اس کا عقیدہ صرف مادی ہو گا۔ یہی وہ سبب ہے کہ اقبال کے کلام کے ترقی پسند اجراء روحانی مخالفت کرنے لگتے ہیں۔ یوں تو عوام اقبال کا فلسفہ خود ہی چراغاں دار معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ شریعت یعنی نہایت اہم کا پابند ہو جاتا ہے تو اس کی بغاوت کی مدد دینی متعین ہو جاتی ہیں۔ میں ان قوموں میں سے نہیں ہوں جو شریعت کو ایک سیاں تصور بنا کر برائے نظام پر متعلق کر دیتے ہیں۔ شریعت کی نظریاتی بنیادیں بالکل متعین ہیں اور اس کے عمل کی تاریخ ایک جیسے دور پر مبنی ہوئی ہے اگر ہر اسلامی تاریخ کے ایک بہت ہی مختصر سے وقت کو چھوڑ دیں تو یہ ماننا پڑے گا کہ شریعت کی انکسالی جھٹنے نے استعمال کیا ہے اور جب تعبیریں لگنے کا وقت آیا تو تمام ترقیوں نے اس لیے ان نکات پیش کیے جن سے ممالک جھٹنے کی پوزیشن مضبوط ہوئی۔ بالآخر خلافت (دینی رہنمائی) ایک ایسا ادارہ بن گیا جس کی مخالفت کو ایک منہس ذلیل بنایا گیا۔

شریعت کی مخالفت اسلامی تاریخ کا ایک زبردست کارنامہ ہے۔ اس بغاوت کی ابتدا ان وحدت الوجودی اصولوں نے کی جو ایمان کے لئے وحدت الوجود سے متاثر تھے۔ یہ فلسفہ فوجوں کا نہیں تھا بلکہ پرمشیں تھا جس نے فطرت کی کیفیت اور دیگر قریب کی روایت کو جو آئینہ برسنے کی کوشش کی تھی۔ وحدت کی اس آواز کو ذوالنور مصری باپیزو لیسٹامی اور حلاج نے اٹھایا۔ اس کے لیے یہ آواز اٹھائی ہی مشکل تھی۔ اگر یونانی وحدت الوجود کے فلسفے کو توحید حلق کے فلسفے پر برتری۔ دراصل ہوئی۔ توحید حلق کے فلسفے میں مادہ حقوق ہے اور ایک خاص زمان و مکان کا پابند ہے۔ اس کی ایک ابتدا اور انتہا ہے۔ وہ اپنی حرکت و صورت پذیری میں قائم نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا ذوق اور خالق ایک دوسری قوت ہے جس طرح اس قوت نے قوانین فطرت وضع کیے ہیں اس طرح ماحول (مخلوق) کے لیے بھی پندرہ قوانین وضع کر دیئے ہیں۔

وحدت الوجود کے فلسفے میں مادہ و روح کے ساتھ جو دوسرے مادہ بھی روح کے ساتھ ساتھ ادنیٰ اور اذلی ہے۔ مادے کا کوئی خالق نہیں ہے بلکہ مادہ اور روح ایک دوسرے کے لیے جزو لا ینفک ہیں۔ اس طرح انسان کا ماحول اور مادہ و طبیعت ایندیز میں شامل ہو جاتا ہے۔ اگر انسان کسی چیز کی تخلیق یا مخدوم کرتا ہے تو اس میں شریعت کو بھی دخل ہے۔ کیونکہ طبیعت کا انہماک اس کے توحید یعنی انسانی حق ہی کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ وحدت الوجودی صوفیوں نے اسی منطق کی بنیاد پر اسلافی اتحادیات کو مزا و جود سے آزاد کر کے عمل میں منتقل کر دیا ہے۔ اور ان کام مذہبی دواؤں کو لڑنے کی کوشش کی جو انسانوں کے درمیان کھڑی کر دی گئی تھیں۔ ان اسباب کے تحت یہ کچھ تعبیر کی بات نہیں ہے کہ صوفی عوام میں بہت مقبول تھے۔ وہ رہا ہی زندگی سے گریز کرتے تھے اور انہوں نے اسلامی تاریخ میں یونانیت کے تمام ہونے کی مخالفت کی ہے۔ یہ تذکرہ اس لیے کیا گیا ہے کہ صوفیوں نے بغاوتوں کی کسی عوامی قوم میں جڑ نہیں پائی۔ لیکن عوامی تحریکوں کے ساتھ ان کی ہمدردی بالواسطہ شامل رہی ہے۔

جس حد تک یونانی وحدت الوہد کا فلسفہ اور ایرانی کبر و ترساکے مادی فلسفے کی ولایت تو حیدر مطلق کے فلسفے کے ساتھ ہم آہیز تھوکتی تھیں، اس عجز و انقباض کی بنا پر ہی ہمیں کوزری آتی تھی۔ اس فلسفے نے پہلی ہیئت امام غزالی کے اعتقادی اور دوسری ہیئت مجدد الف ثانی سرزندہ کی جگہ ہائے اہم غزالی نے منی وحدت الوجود کو اس کے مادی بیرونی سے باہر ہی آ کر دکھایا۔ حواسات کے فلسفے کو خاص وجدانی اور باطنی نمونہ کی بنا پر لغتوں کو روحانی شوق و مہارت کی چیز بنا دیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے شریعت اور طہارت کو بھی ہم آہیز کرنے کی کوشش کی۔ اسی طرح جب مجدد الف ثانی سرزندہ نے جبر و مست کو ہمہ اذ است میں تبدیل کیا تو ماسے کو باطنی ہی غفلت کی صورت دے دی۔ اس کے لیے صفحہ نہیں کہ وحدت الوجود کا بذات خود بھی جبر و ماسے اور روح کو ہم آہیز کرتا ہے۔ بہت سے معنوں میں محکم ثابت نہیں ہوا۔ بہت وجوہات اور دوسرے ماسے اور روح کی دونوں کو ہم آہیز کرنے کی ناکام کوشش کی۔ وہ یقینیت سے چھٹا۔ خاص نہ کر سکے۔ انہیں روح کو فاعل اور ماسے کو مفعول بنانا ہی پڑا۔ یہی وہ سبب ہے کہ اس فلسفے میں فکر کو عمل پر ترجیح دی گئی ہے۔ صوفیوں کی زندگی میں فکر پسندی، خاموشی اور اجتناب انہیں تقورات کے ماتحت آیا ہے۔ لیکن اس فلسفے کا ایک حسین پہلو بھی تھا۔ صوفیوں کی کمال کبر تسمیہ کرتے تھے اور ان میں لغت میں صرف انسان ہی کی ملوثہ پوری پر اپنا زبان رکھتے تھے۔ نیز کہ ایسا تنہا ہمارا انسان بھی اس مرتبے و اہل تھا۔

ہم آپ ہی کو اپنا مقصود جانتے ہیں اپنے سولے کس کو مہو و جانتے ہیں
اپنی ہی کی رسم ملوثہ کر چکے تھے اس روز کو ولین معدود جانتے ہیں

یہاں تو خداوند سے یہ پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں رہتی ہے کہ بتا تیری۔ ضایا ہے۔ بہر و امتیاز کا اعتبار تو صرف اس وقت باقی رہتا ہے جب کہ ہم اسے کو خلق تصور کریں۔ یہ کشمکش تو صرف تو حیدر مطلق ہی کی دی ہوئی ہے۔ جیسا ستر سوویں صدی کا اصطلاحی تصور اس کی دوسریوں کی کج سمجھا تھا۔ باہر تری کو بھی اپنی خود غفلت کا اعتبار جانا رہا۔

اسی طرح علاج کو نفسہ ہوتا ہوا بھی اصطلاحی دور میں باطنی ہی ختم ہو گیا تھا۔ صرف فنا فی اللہ کا لفظ یا اور وہ گیا تھا۔ علاج کے بقا باللہ کے اصول کے مطابق انسان ذات باری کی خدا نامہ صفات میں ضم ہو کر تغیر اور تخلیق پر آمادہ ہوتا ہے۔ علامہ اقبال نے اسی تصور کے ماتحت انسان کو خالق بھی بتایا ہے۔ فنا فی اللہ وہ درجہ ہے جب کہ وہ اپنی تغیر کو کسی تخلیق کے لیے فنا کو دیتا ہے جو کچھ بقا باللہ میں انسان کے بندہ رہنے کا تصور کمزور ہو جاتا ہے۔ اس لیے تہذیبی کٹے ماننے والوں نے اس کی بڑی مخالفت کی۔ اسے کفر کے برابر کر دیا گیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا۔ کہ مسلمان صوفیوں نے زیادہ تر فنا فی اللہ ہی کو درج دیا۔ پھر یہ کہ جائز و ناجائز نفع کا اٹھانا اس نیا لکھ کر جو ادیبین میں اور بھی دھکا تھا۔ بہت جلد زندگی میں کوئی بھی تخلیق پذیر مادی علوم کے ناگاہک ہے۔ یہاں اپنی شرع اور اہل صفا، دولی ہی سے مادی علوم کو ادراک حقیقت سے خارج کر دیا۔ اہل صفا تو عموماً اسات سے چلتے ہی رہے۔ لیکن اہل شرع نے تو اس کی بھی مخالفت کی۔ ان تمام چیزوں سے زیادہ اہم بات تو یہ ہے کہ وحدت الوجود ہی بنیادی طور پر اگر ایک صرف مٹا ہر لغت کی وحدت کے قابل تھے تو دوسری صرف کائناتی تخلیق کے مظاہر کی حامل حیثیت کو مانتے تھے۔ سچ کے ماسے میں ان کا یہ تصور نہ تھا کہ ذہن کسی معاہدے کی بنا پر اپنے اختیارات سچ کو تفویض کیے ہیں بلکہ یہ کہ انسان کو سچ اسی طرح ایک ماسے جیسے نباتات یا جمادات کی دنیا ہے۔ ان کا سماجی تصور (سلفہ منہ) نہیں بلکہ عالماتی ہے۔ اسی وجہ سے بنی نوع انسان کی وحدت و اہل

اس کی شاعری میں بہت نئی ہے۔ غالب کا شعر ہے ۔

یونہی کہ مریم شود نہ گنیں شوق تازہ چوند جانا بہ تن

اس شعر کے ماتحت ان میں انسان دوستی کا جذبہ بھی بہت شدید تھا۔ لیکن چنانچہ وہ اوسے کے ارتقا راہ میں اس کے

جدیائی ص سے واقف نہ تھے۔ اس لیے سماجی ارتقا کو طبقاتی کشمکش میں دیکھ سکے۔ یہ راز تو یوں۔ پ میں منفی انقلاب کے بعد ہی آشکارا ہوا۔ پھر بحیرہ ہوں سے اس کی توقع کیونکر کئے ہیں۔

بڑی ضمنی سی بات ہے لیکن کہہ بیٹے میں برج ہی کیا ہے ۔ یہ کہہ لیں دفعہ گیت نے اخلاقی ادب کا تصور دیا ہے۔ وہ

اسے اتفاق ہی سمجھتے نہ کہنے وحدت الوجود ہی تھا۔ اس کوینے کے ہاں میں اچھڑنے لگا ہے کہ "گوشتِ مردا کے تصور کے ساتھ نہیں چاہتا تھا۔ اسے تو یہ فطرت ہی سمجھا دیتا تھا۔ وہ تو صرف انسان ہی کے ساتھ ماض تھا۔ اس کی بر انسان و حق، ادب سے فہم نہ تھا۔ وہ

کہہنے کی کوشش۔ گوشت کا یہ سب سے بڑا کارنامہ تھا۔ اس اعتبار سے تو ماضی کے بڑے سے بڑے متفلسفین اور متفکیرین ہی اس سے بڑے

ہے۔ لیکن میں اسے اتنی نہیں سمجھتا ہوں۔ کیونکہ فارسی اور اردو ادب میں تو صرف وحدت الوجودی مضمون ہی نے خدا کے تصور کو بڑھایا ہے۔ یہیں فطرت اور انسانی کے اشتراک میں کرنا نہیں چاہتا ہوں۔ بلکہ میں مولانا روم کا ایک شعر پیش کر رہا ہوں۔ جس کی مدد سے آپ کو وحدت

کا اندازہ ہی سمجھ میں آجائے گا ۔

مئی گشت دریا باں رعد و ہل دریدہ

صوفی خدا دار و اوقیت آخرہ

یہاں مولانا نے صاف لغتوں میں وضاحت کر لی ہے کہ چکر کا دوسے کوئی خالق نہیں ہے۔ اس لیے انسان کا بھی کوئی

نہیں ہے۔ یہی مضمون صحیح کو انسانی کی طرف سے تھی۔ اور اس مضمون کے ماتحت کتنے صوفی شعرا عالم و دین کہہ کر خاموش ہو گئے۔ مجھے یہ کہنے

میں، مجھک نہیں ہے کہ فارسی اور اردو شاعر ہی۔ باگیر دارانہ نظام کے وہ نے ملک انسانی صفت کے گیت اسی فلسفے کے ماتحت

آئے ہیں۔ وہ تمام صوفی شعرا جنہوں نے شریعت کے ساتھ بیعت کر لی ہے، وہ بھی انسان کی غفلت کے ایک مذہب کا ہی ہیں لیکن اس

سے آگے قدم اٹھا نہیں چکے۔ انہوں نے زیادہ سے زیادہ ایک درمیانی راستہ اختیار کیا ہے۔ جس مذہب علما اقبال صراج کے

فلسفے سے متاثر ہیں انسان کو مریم پر لیا کر لکھا بھی کیا ہے لیکن جس مذہب و امام خدائی اور سر ہندی کے عقوت سے متاثر ہیں۔

ماوی فقہ کا ہے۔ انسانی صفت کی نفی بھی کی ہے۔ توحید صق اور وحدت الوجود کے متضاد دوسروں کے فلسفے ہی کی کوشش میں علما اقبال نے خدا سے تمنا کی کہ لامحدود اور محدود دونوں ہی بنایا ہے۔ اور یہی کوشش اجتہاد اور عقیدہ کے تضاد کو بھی قائم رکھتی ہے۔ ان کا یہ کہنا

ہے کہ اجتہاد و توحی کے زمانہ میں کرنا چاہا ہے اور عقیدہ انعام کے زمانے میں۔ جب بھی کوئی۔ مہنا انسان کو مقام کرنا بتا کر اسے مخلوق کا نسب بھی دے دیتا ہے تو وہ اسے بندہ معلوم بننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس پر مزید روشنی کوٹنے کے لیے میں یمن کی تحریک کا

آفتاب پیش کر رہا ہوں۔ حقیقت میں یہ خدا کا تصور نہ تھا جس نے ہیما نہ انفرادیت پرستی کو دیا ہے۔ یہ کام ابتدا کی جامع زندگی نے

کیا ہے۔ خدا کے تصور نے تو ہمیشہ سماجی جذبہ کو کمزور کیا ہے۔ خدا کے تصور نے کبھی بھی فرد اور سماج کے دشمن کو مضبوط

نہیں ہونے دیا۔ بلکہ معلوم ہوتے کو غلامی کی زنجیروں میں اس حقیقت کے ماتحت جکڑے رکھا کہ علم ان ہوتے پر خدا کا سایہ دہتا ہے ؟

اس میں شبہ نہیں کہ یمن نے جو کچھ کھا ہے مغرب کی تاریخ کو سامنے رکھ کر کھا ہے۔ یمن کی یہ عادت بھی نہیں ہے۔ کہ نعل سہانی کا قصہ تو ہمارے یہاں ہی کا ضرور ہونا ہے۔ اور یہ قصہ تو حید علی کا جزیروں سے لگتا ہے۔ وحدتِ وجود میں تو اس کی نگاہیں ہی رہتی ہیں۔ لیکن تو حید علی کے فلسفے سے متاثر ہونے کے بعد تو صوفیوں کے یہاں بھی دیوں کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا تھا جو یا تو سہاست سے لگتا روکش ہو گئے تھے یا پھر نعلِ بند کی مراعات کے فحاش تھے۔ جہاں تک ادبی فلسفے کے نقطہ نگاہ سے دیکھتے ہیں تو یہ عادت علیحدہ اور وحدتِ وجود دونوں ہی میں نمودار ہیں۔ لیکن جاگیردارانہ نظام کی گزشتہ تاریخ میں توحیدِ وجودی نے سیاسی حلقہٴ اعلیٰ کی گڑبگڑ میں اس کی پانچ پانچ کی طرح جنگ کی ہم آہنگی فراہم نہیں کر سکتے۔ اس نے اس جگہ میں اور ان کی عقیدت کے بنے عموماً کی گڑبگڑ کی بنا پر نکوٹ اور کام و زمین کی لذت کو انسانی رینڈیجھا اور شر و ادب میں عموماً کی تمام رعایتوں کو مٹا دیا ہے۔ اس سے منقوری: بہت گڑبگڑ تھی۔ ان کے فلسفہ کو کسی میں چیز کو محض قرار نہ دیا یہ وہی بات ہے۔ کہ اس نے ہر چیز کو ایک بدو بنا دیا لیکن حقیقت تو یہی ہے کہ یہ بدو کبھی اختیار نہ کیا۔ انسانی فحاشی کا دوسرے سے ماوراءِ ضرورت کو فرس میں لایا نہیں جاتا ہے۔ انوکھی چیزیں کچھ لوگ مانتے تھے دیوان کا مطالعہ حقیقت کے رنگ میں کرتے ہیں تو اس میں کسی کا قصہ ہے اور کتنے اور کتنے نے ان کو صرف حمد ہی کے رنگ میں دیکھا تو عموماً کہاں کو خوش مزاجی کے لئے کچھ نہ دیا کہ ایک عمدہ یہ غلطی تو زندگی اور حیات کا درد نہیں ہے۔ لیکن وہ اس بات سے بھی غافل تھے۔ وہ تو یہی جانتے تھے کہ حاکم کا عہد صرف مذہبی رنگ میں لایا جائے تاکہ کہیں مغرب اور ایشیائی سلطان اس کی پرانی بزرگمندی کو محسوس نہ کرے۔ وہ کسی بے ثباتی دنیا کی بات تو اس کی عظمت کو کوئی بھی ایسا شخص نہیں کر سکتا ہے جو دوسرے کو فوق سمجھتا ہے۔ لیکن اگر وہ فحش ہے تو اس کی ایک اور بات ہے۔ کہ ان کے اہل تہذیب کو تو یہ بتائی دینا کہ ان کی عادتیں نہیں جانتے۔ مسلمان صوفیوں میں تو یہ چیز تو حید علی ہی سے لگتی ہے۔ درجہ وحدتِ وجودی آزاد تو جیسے ہی دیکھتے ہیں ان سے ہم سہم پہلے نہ تو اید ہے اور نہ ہمارے بعد ان کی فحاش

پھر یہ پیرِ صوفیوں میں سے ساتھ کیوں خوب گردن تھی ہے۔ قصہ یہ ہے کہ ساری باتیں سے قول کے مطابق وحدتِ وجودی

بھی اس بات کو جانتے تھے کہ ہر چیز ہے۔ یعنی ہر چیز ایک صورت سے اور دوسری صورت میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔

ہر قصہ پرچمن کے شام کو سے غلوں بگڑیں۔ رات ٹھیکیں تب چولی یہ ہنسے۔ راتیں

مات میں ہیں ہر چہرہ تب سے غلوں تب خاک کے ہر شے سے انسان بھٹتے ہیں۔ راتیں

سب کہاں کچھ نہ وہی ہیں گلیاں بولیں

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پہاں بولیں۔ عادت،

شیرہ اسی سہرے سے بہت سے صوفیوں پر معلوم ہونے کا ازماع بھی لگایا گیا۔ لیکن یہ فیض کے اس نکتے کو سامنے رکھ کر

بھٹنے کے لیے ہر چہرہ سائنس کی حدود سے بڑھتی۔ جس سے اشیاء میں ایک عروم رہا۔ پانچا تیز و سرعت کو خاک کے ساتھ ہم جہتی کر دیا گیا۔ یہ تو صوفی

ہے کہ ہر چیز فنا ہوتی رہتی ہے۔ لیکن وہ ایک نئی صورت میں بہتی رہتی ہے۔ تسلسل زندگی کو بے فنا کر دینا یہ کثرتِ بہت اور نہ ان دیکھن

کے ادنیٰ و مساوی تہیہ کرنے کے بعد ادبِ صوفی شریعت میں اس اکتلا کے خلاف ہونے چاہیہ جبر اور غایت دونوں ہی کے یہاں یہ حریف کاراں ہوا

ظہر آتا ہے۔ دونوں ہی ہٹا کے راز کو فراموش کر کے خاک کو عزم کر دیتے ہیں۔

مری تعمیر میں خرمیہ ایک مکتوت مزل کی میری بقی مومن کا ہے خون گوم و بھال کا رناب
پہرتی ہے اپنے ساتھ گل منسل فنا آہ رہاں سے ہم ہوئے ناب و ہرجہ
مری مزدوں نے مجھ کو کیا برابر خاک میں نقش پا کی حرکت پامال اپنا ہرجہ
مزا ہے خاک ہونا، ہونک اٹھنے چرنا اس راہ میں ابھی تو درپیش مرے ہیں

بہر حال اس قریب و خریب کا جو کچھ سبب ہو اس سبب کے اٹھانے کیلئے تے حافظ کے زمانے سے اہل علم و ادب کی شاعر
مناظر ہوئے۔ اس سبب کے خاندان کی ترقی و ترقی کی حالت کے کہ ہے۔ لیکن جب ایک مخصوص خیال کو پروہ بنا کر صوفی شعراء کی انہی باتوں کی بھی
مخالفت کی جاتی ہے تو پھر انہی کی مخالفت و نظر بدنی ہے یا اپنے ذہنی و دماغی کا تحفظ۔ مثال کے طور پر حافظ کا ایک شعر دیکھئے :-

آسائش دینی تفسیر میں دور معرفت

با دوستان قنط با دشمنان مدارا

اس شعر کے بارے میں اگر کوئی شخص اس قسم کی رائے دے کہ جب حافظ نے یہ شعر کہا تھا تو ترقی پسند تھا۔ لیکن اب رجعت پسند
ہے تو اس کے یہ سنے ہوں گے کہ اس کا یہ تو کلاسیک ادب کے چانچے کی۔ باتیں نہیں معلوم ہے یا پھر وہ لوگوں کو کلاسیک ادب سے نفرت کرنا چاہتا
ہے۔ غلطی کے بعد سے کہ مرزا یار دار نظام کی مخالفت کی شور کے مختلف منازل سے ہیں۔ اگرچہ نئے دور کی لطافتی جگہ ہیں جس کا شعور
بہت ہی صاف تھا اور تندرست، ہم نگرانی کے بعد یا جگہ دارانہ نظام کے ادب کو چانچنے کی کوشش کریں گے۔ وہ ہیں یہاں تفسیر معوم ہوں
گئے۔ ایسی صورت میں ان کی معوی اندیت کہ بھلا کر ان کے جواباتی فکر کو نہا نا خود اپنے ساتھ خود کرنے کے برابر ہے۔ حال داس نے فوٹان
کے سامہوی ادب اور ٹیکسٹ کو اس غرض سے نہیں چاہا ہے۔ اور نہ یہ نظریہ یا سنی کے ادب کا مہر کے بارے میں دوسری ہیں۔ اوج ہے اس
کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ وکس کے ناووں میں انسان دوستی کا مذہب حقیقی جگہ کے تضاد پر غائب آچکا ہے۔ آپ وکس کو سنی کی تھوڑا باز
کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اس سے وکس کی صورت متنی نہیں ہے۔ حالانکہ وہ سرمایہ دارانہ نظام کا ناو نکلا تھا۔ اسے زیادہ سے زیادہ بورژوا انسان دوست
کہا جاتا ہے۔ اس کا مہم ہے کہ اس کی دوستی معوم ہونے کے ساتھ بہت ہی واضح ہے۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ وکس کے ناووں
میں جواباتی صفت نہیں ہے تو انسان دوستی بھی کے جذبہ کے تحت بھی وکس دوسری بہت زیادہ مقبول ہے۔ اب آپ ایک تفسیر میں اور
آتے۔ ٹیکسٹ کا کوئی بھی ایسا تو نام نہیں ہے جس میں اس نے اپنے ہیرو کو خدا کے ساتھ ہم نوا کیا ہو۔ بلکہ دیگر اس کا کوئی بھی ہیرو
تقدیر کی توفیق میں غائب نظر نہیں آتا ہے۔ ٹیکسٹ کے ہیرو سوویت دوس کے ہیرو کے شعور کو یہ دار نہیں کر سکتے ہیں۔ پھر بھی ٹیکسٹ ہیرو اس
میں پڑھا جاتا ہے اور وکس کے مقابلے میں زیادہ جواباتی صفت کے ساتھ۔ اب آپ ایک تفسیر میں اس سے بھی نیچے فرستے۔ یونان کا کلاسیک ادب
ہیں کا لائانی نقطہ نگاہ باطنی صفت ہے۔ آج کی دنیا میں کیا افادیت رکھتا ہے لیکن کلاسیک ادب کے رسالہ بدلتا تھا۔ اور اسے انسانیت کے
زمانہ غلطی کے لحاظ کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اسی ادب کے بارے میں لائل مارکس نے یہ کلاسیک ادب بھی لکھا ہے۔

یہ عجیب شکل نہیں ہے کہ یونان کے فنون و ادب اور اس کے ادوار و فصول کے قلم کے سماجی ترقی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ان کی ترقی
میں ترقی یافتہ وقت ہوتی ہے کہ وہ ان کی کہیں زبان کو خط کو سبب بنے ہوئے ہیں۔ اور ان معنوں میں ایک ایسا معیار قائم کیے ہوئے ہیں جس کو

حاصل کرنا بہت دشمن ہے۔ ایران کے کلاسیک ادب کے بارے میں لارل مارکس نے اپنے خیالات کا انہماک کئی جگہ پر کیا ہے۔ ان سب کو سامنے رکھتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچنا پڑتا ہے کہ ہامی کے ادب عالیہ کے بارے میں لارل مارکس کا نقطہ نظر کبھی صحیح نہ ہوگا اس کی حقیقت میں نظائیں ایک دوسرے دوسرے کے ساتھ گڑبگڑ نہیں کرتی تھیں اور چونکہ وہ سماجی شعور کے مختلف منازل سے جسی واقف تھے۔ اس لیے وہ جمالیاتی نقطہ حاصل کرنے سے باز نہ رہے تھے۔ آخر ادب عالیہ تو ایک حسن ہے۔ جسے مارکس نے ابدی حسن کہہ کر یاد دہا ہے۔ یہ ابدی حسن بقول حافظ جبر شخص حاصل نہیں کر پاتا ہے۔

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت و برونہ نہ ہر کہ آنیسہ ساز و سلکندری واند
اگر مارکس کا نظریہ درست ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ صرف شعر نہ صرف ماضی ہی اس ترقی پسند عقائد بلکہ آج کی تاریخ میں جی جس ہے کیونکہ وہ جمالیاتی خدا سبب بنا تھا ہے۔ ادب عالیہ ہم حافظ کے اس شعر کو نشان کے طور پر پیش کریں تو میں یہ ذہن چاہیے کہ دیکھو ایسا کوئی تو درست پسند ہوگا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اگر لوگوں کو اسے جو حقیقت ہوگا۔ لیکن یہ بات انہیں سننے سے نہیں ہے جو ماضی میں ترقی پسند و ادب عالیہ کے حامی رہے ہیں۔ اور جنہوں نے پڑھنے کے خلاف ہنگام کی بات کیوں کہ اس ترقی کے ساتھ آمیز ہے۔

اب میں حافظ کا ایک دوسرا شعر پیش کر رہا ہوں۔

حدیث از مشرب و سگ و دماند و ہر مکتبہ جو کس نکشو و دشا پد بہ حکمت این مقار

یہ واقعی بڑا جنت پسندانہ خیال ہے کہ جو مکتبہ حکمت سے رکھ سکے علامت مشرب کیونکر کھل سکتا ہے۔ غالباً یہی فلسفہ ماضی تھا۔ چہرہ میں نے ایرانی ادب میں مادی اور حسی فلسفے کو پھیلایا۔ لیکن میں بنیاداً کاسب دہائی کیوں ہوں۔

حافظ کے سن رجعت پسندانہ فلسفے کے بارے میں میراجونق و دمنل ہے۔ ماضی اور مادی علوم کی برتری ہوئی روشنی کے باعث ہے جب کہ روز بروز فلسفے پر غور کرتے رہے ہیں۔ کیونکہ بات حافظ کے وقت کے ہے جس میں عقلی اور آپ حافظ کے وقت کا جائزہ ہیں اور یہ بات یہ حقیقتیں مادی کی ہے۔ جب کہ وہ آپ میں اندر تھا۔ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ حافظ کے زمانے میں مادی علوم کی تعلیم ہی نہیں ہو کر تھی۔ مدرسوں میں صرف معتقولات اور معتقولات کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ معتقولات کو دائرہ فلسفہ انبیاء تھا اور معتقولات کا دائرہ احوال و فلسفہ انبیاء سے مادی علوم کو مل جاتی تھی۔ مادی علوم کے خلاف یہ جنگ تین سو سال پہلے سے جاری تھی۔ اس کی ابتدا مشہور عالم کے زمانے سے جو کہ جب کہ ماضی میں رخصت ہے کہ اس وقت وحدت الوجود کی کوئی ادبیں شہرہ کیا جاتا تھا، تو تہذیب کی وہ دور مادی علوم کی تعلیم پر پابندی نکادی گئی۔ اس وقت سے ایران مادی علوم سے دور ہوتا گیا۔ حافظ کے وقت میں تو ماضی فلسفی تعلیم رہی تھی۔ ایسے ماضی میں اگر حافظ نے فہمی حکمت کی تو کیا تصور کیا۔

..ہاں جب حافظ حکمت کے خلاف دمنل کر کے مشرب دمنے کی طرف بڑھتا ہے تو اس کا اشارہ صرف محسوسات کی طرف ہے اور محسوسات علم سے دور ہیں۔ انہیں محسوسات میں حقیق اور حافظ نے حسی فلسفے کو ایرانی ادب میں داخل کیا ہے۔ یہ ایرانی فلسفہ کی باقیشت تھی جو ہر ایک مادی فلسفہ تھا۔

گرمی گوید کہ بہت عالم نیست دب ردتھی

ادبیت کی بنیادوں کو استوار کرنے کے لیے پہلے اپنے حواس کی قوتوں کو بدھنے کا لازماً پڑتا ہے۔ مادی علوم انبیاء کی منطق کی کوکھ

[illegible]

ماضی کی کہیں روایات کو حقاقت سے دیکھنے کا یہ جذبہ اصل میں تاریخ کو مٹانے کا جذبہ ہے۔ وہ تاریخ کو وہی مٹا رہا ہے۔ جس میں کچھ احساس کم تری ہوتا ہے۔ وہ تمام اذہب اور شعرا و جرائد نے ان کو اس حد تک چمکانا نہیں سکے ہیں کہ اپنے کلام میں بھی ایک ادبی حسن پیدا کر سکیں۔ ماضی کی حسین روایات کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ان کی اصل حسن کا وہی ہمہ ہی ختم ہو جائے۔ پھر تو نام کے لیے میران خالی رہ جاتا ہے۔

یہ ادبی حلق صرف یونان کے کلاسیکی ادب ہی کے بارے میں صحیح نہیں سمجھتا۔ بلکہ ہر دور کی بہترین ادبی تخلیقات کے لیے ہیں صحیح ہے۔ ہر دور کے ادب کا نہ صرف مواد ہی بدلتا ہوتا ہے۔ بلکہ ہیئت بھی بدلتی ہوئی ہے۔ پھر بھی ان کے باہمی امتزاج سے جو حسن پیدا ہوتا ہے وہ سب کو نصیب نہیں ہوتا ہے۔ ہیں اس حقیقت کو ماننا پڑے گا۔ اور اس حقیقت تک پہنچنے کے لیے ہیں ادب کے متعلقات کا پڑھنا پڑا ہے۔ یہ بات تو صحیح ہے کہ ادب مخصوص قدروں اور خیالات کی تبلیغ کرتا ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس تبلیغ کا اثر واقعی ہے یا دیر پا۔ وہ ہمارے جذبات اور خیالات کو متحرک کر کے ایک دیر پا عمل کی تعمیر کرتا ہے۔ معروف وقتی جوش میں لاکر چھوڑ دیتا ہے وہ ہمارے احساسات اور نفسیات کی جوانی صلاحیتوں کو بچھوٹا کر دیتا ہے کہ نہیں۔ اس میں اتنی صلاحیت ہے کہ نہیں کہ وہ ہماری نفسیات پر اثر انداز ہو کر ہیں حالات کے رہنے اور خود اپنے کے رہنے میں رد کر دے۔ اور ہماری نفسیات کو کئی قدروں سے ہم فراق کے ایک نئی جذباتی تنظیم بھی کر دے۔ اگر یہ وقت اور صلاحیت کسی شاعر کے حکم میں نہیں ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ یہ تصور ماضی کی عین روایات کا نہیں ہے یہ اس کا اپنا تجربہ ہے۔ اس میں اتنی صلاحیت نہیں کہ وہ اپنے خیالات اور جذبات کو ایسے زندہ اور متحرک ساکنوں میں ڈھال سکے جن کی باز آوری سے ہمارے اندر جذبات نوید ابھولے۔ شاعر سے اور تجربہ کی بند کھانی انھیں نہیں اور قدم قدم پر صداقت کی داد دیتی جاتی۔ یہی وہ سادہ سادہ ہے جس پر ہم کو ہم کو کہنا پڑے۔ اور شاعر کے وقت کا اسکا سکتے ہیں۔ یہ آسان بات ہے۔ وہی وقت دیر پا ہو سکتی ہے جب کہ وہ شاعر کے مشاہدے اور سچائی کو اپنے ذاتی تجربے کی سطح پر محسوس نہ کر لیں۔ اور انہیں عقول، تخیل، اور تصویروں کے ذریعے محسوس نہ کر لیں جن سے ان کے احساسات متاثر ہیں۔ جہاں میں عوامی ادب اور ماضی کی روایات سے بہت سے چیزیں مستعار یعنی پڑیں گی۔ یہ کام سمجھنے اور چلنا چلنے سے زیادہ پیچیدہ اور تھکنے والا ہے۔ تجربہ کا کام تو وقتی ہوتا ہے۔ لیکن ادبی شاعر کا لائڈ دیر پا ہوتا ہے وہ انسانی ذہن میں رہتے بہتے ہیں۔ ہیں باہر آسکے اور اپنا تجربہ خیال بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے ترغیب موم میں ایک ایسی پائیداری ہوتی ہے جو کہ ان کا باہمی مقابلہ کر سکتی ہے۔ یہ ایسا ہی ادب چھائی پر چھوٹے کا حوصلہ بھی بخشتا ہے۔ یہ مرتبہ تجربہ کو حاصل نہیں ہوا کرتا ہے۔ شاعر ادب کی تخلیق، تھکرات کی باز آوری نہیں بلکہ اندر کی تخلیق کرنے کا کام ہے۔ اس پر سب سے حریف کے ادبی مباحث میں جنہیں تفصیلات میں بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ انہیں محض میں یہ بخورہ بھی نہیں ہے۔ اس حریف کا کہہ سکتے ہیں شاعر پر علم ادب کے کام کا معاملہ بہت ہی ہرگز ہے۔ گوہر کی ادب فلاں کے ادب سے بنیادی طور پر مختلف ہے تاہم اس نے غلابی سے ٹھکانا لیا۔ چرخوں کا فن کسی حد تک مزاح و اس اور اندرونی کے مباحث کا حامل ہے۔ پھر بھی گوہر کی کو یہ کہنا پڑا کہ میں جب تہذیبی فن سے اپنے فن کا مفاخرہ کرتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں قلم سے نہیں بلکہ ہاش سے مکہ رہا ہوں۔

یہ ایسی شاہیں ہیں جو شعر و ادب کی تخلیق میں شگ میل بن سکتی ہیں۔ اور اگر انسان محنت کرتا ہے تو وہ اپنے فن کو پانچویں سکتا ہے۔ پھر بھی وہ صرف اسی لئے سے صحیح ادبی تخلیق تک نہیں پہنچ سکتا ہے۔ اسے عوام کی ذہنی سے سبق لیکنا پڑتا ہے اور جب وہ یہ کام لائی کے کسی انقلابی موڑ پر انجام دیتا ہے تو اسے ماضی کی روایات کو بھی جگانا پڑتا ہے۔ وہ ماضی سے نعرے اُٹا رہا ہے اور محسوس سب قرض قیاس ہے تاکہ وہ نئی حقیقت کو عوام کے محبوب جہوں میں پیش کر سکے۔ آج کا انقلابی شاعر جس حد تک اس حقیقت سے دور ہوتا جائے گا عوام سے بھی دور ہونا چاہئے گا۔

اچھا شعر کہنا خزانہ جملے کے برابر ہے اپنی ناکامی پر اور زیادہ محنت کرنی چاہیئے کہ لوگوں کو اس کے معیار میں سے بڑھ کر دینے کی کوشش کرنا چاہیئے

فراق کے خطوط

بنام محمد طفیل ایڈیٹر نقوش

(۱)

۴ جنک روڈ، الہ آباد

۱۴ فروری ۱۹۵۳ء

پیارے طفیل صاحب، تسلیم۔

ایک مدت ہو گئی جب آپ کا محبت نامہ مل تھا۔ میری ہر توفیق دیکھئے کہ اٹھارہ ماہ بعد جواب لکھنے بیٹھا ہوں، امرکئی برسوں سے میرے لیے بڑی مصیبت یہ ہو گئی ہے کہ میرے پاس حق تعالیٰ کی اس کا جواب دینا میرے بس کی بات نہیں۔ آپ کے خطوط تو میرے دل و دماغ میں تازگی پیدا کر دیتے ہیں۔ لیکن بہت سے خطوط ایسے بھی آتے ہیں جن میں اصحابِ نقوش و محبت کی باتیں تو لکھنے ہیں لیکن جنہیں پڑھ کر کھوتا تھا، کثرتِ محسوس کرتا ہوں۔ شہرت میرے لیے ایک مصیبت ہو گئی ہے۔ میری جینٹیل بھی کئی ہیں۔ اردو، ہندی، انگریزی تمام محسوس سے ظلموں، غریبوں، انشکے، مٹاؤ، بیعت، مانت، صلاح مشورے کی مانگیں آتی رہتی ہیں جو ذہن میں ایک پرانہ انداز اور اشتیاق پیدا کر دیتی ہیں۔ پھر بچپن اور تقریروں کی بھی مانگیں آتی رہتی ہیں اور ان سب پر مستزاد انگریزی ادب کے کامنٹیسی کی ذمہ داریاں، ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ جاتا ہوں۔ میرے لیے میری ناک مرث امیدوں کی حامل نہیں ہوتی بلکہ ایک عظیم کی حامل ہوتی ہے۔ صحت کی غزل، نیم خوابی، سودا کی مزاج کی وجہ سے جمیٹ کا اشتیاق، اٹھن اور ڈھیر مٹ جسم کی مستقل تھکن، مانت میں رشتہ آجانے کی وجہ سے لکھنے سے معذوری، ان تمام باتوں میں جتنا ہوں، ہر حال کام میں کیے جا رہا ہوں اور انہی آپ کے ایک ادیب کے ذرائع جیسے تھے پورے کرنا جا رہا ہوں۔ ہر بھی ساتھ کے گلب ٹنگ ہے (تاریخ پیدائش ۲۰۰۱، اگست ۱۸۹۶ء) پھر بھی اپنے شہر کو کچھ ایسی تربیت دے سکوں کہ داخل سکول کا سر رستہ ان سے جوڑنے نہ پائے۔ اس امر کا خیال رکھتا ہوں کہ جو جو خطاں اٹھتے ہیں وہ میری شخصیت کی سطحوں پر راکھ پھیل جائیں تو بھی میرے شہر کی گہرائیاں اپنا سکول و قوانین قائم رکھیں۔

آپ نے ایک ماسن میں کئی باتیں کہہ دی ہیں۔ لیکن میں ماسن کے سے کہ بھی سب باتیں کہنا چاہوں تو بھی آپ کی ساری باتوں کا جواب منسلک ہے۔ ہر حال آپ سے کہہ کے بغیر مان پھرنا بھی مشکل ہے۔ اس لیے آج یہ عرض کیے دیتا ہوں کہ تجھے شکر کہنے کے لیے

کسی خاص ماحول یا مودگی کی ضرورت ہوتی ہے یا نہیں؟

نظیر میری زندگی کا خاص ماحول دوسروں کی زندگی کے فانی ماحول سے زیادہ مختلف نہیں۔ میرا تعلق دینی طبقے سے ہے اور اس طبقے کی عام خصوصیتیں ہیں۔ زندگی میں جس بات کو اس طبقے کی اچھی بری باتیں خوبیاں اور کمزوریاں اپنی زندگی میں بھی پاتا ہوں۔ اس کے باوجود اپنی ایک انفرادی شخصیت بھی رکھتا ہوں جس کے نمایاں ماحول ہیں۔ درہم گھر کو اپنے ہم چمکوں سے ممتاز کرتا ہے۔ بچپن ہی سے میں اپنے بھائی بھائیوں سے اپنے کو بہت مختلف پاتا تھا۔ مثلاً میں ان سب سے زیادہ مذہبی تھا۔ اور عزت کی غیر معمولی شدت میں اپنے اندر پاتا تھا۔ باوجود چار برس کی عمر میں مجھے عود و بربط محسوس ہوتی تھیں۔ مگر عزت سے میں ان کو ترک کر دیتا تھا کہ میں ان میں کھو جائے کرتا تھا۔ میرے چچن کی دوستیاں بھی بہت شدید قسم کی ہوتی تھیں۔ انہیں کے گیل اور کھڑوں سے بھی اتنی زیادہ دست کاوت محسوس کرتا تھا۔ کہ گھر و اسے عجیب کہتے تھے۔ اور کبھی بھی میرا مذاقی نہ لگتے تھے۔ میری دوا کا نہا ہے کہ دو تین برس کی عمر میں سے میں کسی بد صورت مرد یا عورت کی کوہنہ ہانے سے انکار کرتا تھا۔ مگر ہانک نہ کرتا تھا کہ اب یہ وہی ہے جسے میں نے دیکھا تھا۔ اس کی خوب قسمی آتی تھی۔ اور کبھی کسی اس کے سے نہتے پاؤں بھی جاتا تھا۔ نوکس ہوس کی عمر سے میں جس لڑکی یا لڑکے، مرد یا عورت کو اپنے دو ایک میں خوب صورت سمجھتا تھا۔ سے دیکھ کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ میرا جسم حلیہ میری زبان تک چل کر باہر کی صورتوں سے ہر ایک شخص سے برائی لگنے والی صفت تیرا۔ اندر میں ہر شخص کے کافی پہننے پیدا ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ زندگی میں اچھا، خلوص اور شرافت کی قدریں بھی مجھے بنی ہوئی مود پر متاثر کرتی تھیں جن کی مثال نہ ہوتی۔ اور تعلقات میں ان قدروں کی جھلک دکھائی دے جاتی ان سے میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔ اگرچہ میرا ایک بھائی تھا۔ مگر تھا۔ اور شرف کو سب سے مانتا تھا۔ پھر بھی نہیں ہی سے اپنے اندر ایک احساس نہ تھا کہ میں پاتا تھا۔ لگے آنکھوں پہ بھی بتا دوں کہ میں میں جو ابتدائی کتابیں پڑھنے کو ملتی تھیں ان کے حسن اسلوب سے میں بہت متاثر ہوتا تھا۔ اور بد اسلوبی سے بد مزہ ہوتا تھا۔ اس طرز زندگی کے ساتھ ساتھ ہر سال کٹ گئے۔ یہ تیرہ برس کی عمر سے شعر کہنا چاہتا تھا لیکن جب پہلے کہہ چلا ہوں کہ میری زندگی مذہب سے اتنی برائی تھی کہ اس میں جسے خدا مذہب کے لیے ان دنوں ملے تھے۔ اور شعر گوئی کی خواہش کٹ گئی کہ وہ جاتی تھی۔ یہ لکھنے پر پہلے بسا دینی تہجیب میں جاتی تھی۔ ان دنوں اس نے ہر برس کی عمر میں میری شادی کر دی تھی۔ میری بوی کی صورت شکل دینی تھی مگر اس سے بھی کئی بڑی جوان لوگوں کی تھی جن کی عمر میں میں سے میں دو تین برس کی عمر میں ہی انکار کر دیتا تھا۔ اور زندگی کی دوسری صدی میں بھی ان بڑھاپوں سے میری بڑی دین کم تھیں۔ میری شادی نے میری زندگی کو ایک ذہن موت بنا کر رکھ دیا۔ زندگی کے حجاب ہو جانے کے باوجود میں نے خود کو کبھی نہیں کی۔ ناچاگل ہوا۔ اور ہر لمحہ پیشہ بنا نہ زندگی کی ذمہ داریوں سے دست بردار ہوا۔ اس لیے کہ شہید حسن برقی کے باوجود زندگی کی شرافت کی کہ قدریں مان چکا تھا۔ ان کا میں نے سہا دایا۔ فرض شناسی کے مجھے زیادہ ہونے سے بچا دیا۔ یہ ضرور ہوا کہ سان بھر کے مسلسل نیند نہیں آئی۔ اور صحت مستقل عود پر برآمد ہو گئی۔ پھر بھی جو کچھ دینی کا جو بھی تھا۔ اس لیے کالج اور یونیورسٹی کے امتحانوں میں بہت اونچی پوزیشن میں لاتا رہا۔ بی۔ اے کا نتیجہ نکلنے سے پہلے ہی میرے والد مرضی کو رکھ کر شاہ فرست کر دیا۔ یہ جو منتر کے سب سے مجھے دیکھتے انشاء فرما گئے۔ اور ایک کچل کر ہمتی کے نام سال کی جیسے سر پر آ گئے۔ بی۔ اے میں اس دوروں کے لیے میرا انتخاب ہو چکا تھا۔ لیکن بی۔ اے اور بی۔ اے کے لیے مجھے اتنا داس بنایا تھا۔ کہ میں

دونوں سے مستثنیٰ ہو گیا۔ ان تعلیمت وہ اور کرب آگئیں حالات میں میں نے شاعری شروع کی اور بہت آہستہ آہستہ میں اپنی آواز کو پاسٹھ لگا میرا داخل موقد اور خاموشی ماحول کو بچھپائی میں بن گئے تھے۔ اب جب شاعری شروع کی تو میری یہ کوشش ہوئی کہ اپنی ناکامیوں اور اپنے ذہنی غلوں کے لیے اشعار کے ذریعے سے مرہم بنانا کہوں۔ میری زندگی جتنی تلخ ہو چکی تھی اتنے ہی پرسکون اور جہات انفرادی اشعار کہنا چاہتا تھا جگہوں کہوں کہ تلخی کو شیرینی میں بدل دینا چاہتا تھا۔ عام طور پر رات گئے اشعار کہنا شروع کرتا تھا۔ اور منزل رات دہے ختم ہوتی تھی۔ کبھی کبھی قوالیا بڑا ہے اور بڑھتی اور اور منزل کا قطع ہوتا۔

مجھے آج سے کہن ہیں سحر شام مستہ اق
ایک تصویر ہوں میں رات کے کت جانے کی

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رات کی کنیتیں اور رات کی عزت جس طرح میرے اشعار میں دفنا باذہنی ہیں وہ چیر کہیں اور نہیں ملے گی۔ میرے کام کا ایک حصہ ایسا ہے جس کی بنا پر مجھے شاعر غریب کہنا جاسکتا ہے۔ مزدوج بالا شعر لکھنے کے پچیس برس بعد میں نے یہ دبا بھی گئی۔

دن ڈوب گیا قرات کچھ اور بھی ہے
آنکھ اور جمل وارعات کچھ اور بھی ہے
خاموشی و تیرگی و خنک کے سوا
سے انجم و ماہ رات کچھ اور بھی ہے

آدھی رات اور جھکیاں کے موان سے میری دو نفیس رات کی ترجمانی اور معنوری کی مثالیں ہیں۔ ان کے علاوہ میرے ہونے کے کام میں رات کے متعلق صد اشعار اور دریا بیاں بھری ہوئی ہیں گی۔ یہ خط اپنے اس مقطع کے ساتھ ختم کرتا ہوں۔

فراق دیکھ شب غم کو از قہر بخوم
چھڑا ہوا ہے سکوت ابد کا افسانہ

کچھ اور اشعار یاد آگئے۔

تاریکیاں جھک گئیں آواز دو دوسے
میری منزل سے رات کی زلفیں سوز گئیں

چھڑتے ہی منزل بڑھتے چلے رات بھگتے
آواز مری گیسوے شب کھول دی ہے

جب سے منزل کو چھوٹا ہوں راتیں کو سینے لگتی ہیں
فلات کیسے نہیں ہم ہیں روز چہراناں کرتا ہوں

اب دور آسمان ہے نہ دور مہمات ہے
اے دور، بھر تو ہی ہاگتنی رات ہے

اچھا اب رخصت چاہتا ہوں۔ لیکن رخصتی سے پہلے اتنا بد چھٹا چاہتا ہوں، کہ ایسا ایلی آپ کو میرے بچپن اور میری ذات سے اتنی دل چسپی کیوں پیدا ہو گئی ہے۔ اگر ان باتوں کا صاف صاف جواب دیجئے گا، تو میں بھی صاف گوئی پر آمناں آؤں گا۔

ایک بولتی ہوئی منزل حاضر ہے۔ اپنی رائے سے مزور اور جلد مطلع فرمائیے گا۔ اس لیے کہ شاعر ہر وقت داد کا محتاج ہے، اور مجھے تو میرے فن نے باقی سفر سے کچھ زیادہ ہی بھوکا بنا دیا ہے۔

آپ کا

فسراق

گزشتہ میری صحت اب کسی طرح سنبھل نہیں سکتی۔ اگر کچھ دن جیتا بھی دلا تو اسی فکر میں جینا ہو گا کہ اپنا مجموعہ کلام اور دیگر تصانیف کسی ایسے ناشر کو سونپ دوں جو میرے اس حاصل زندگی کو ضائع اور ناپید نہ ہونے دے

(۲)

چیمبک روڈ، الہ آباد

۲۲ فروری ۱۹۵۳ء

برادر دم۔ تسلیم

نہیں تو آپ بھی میری طرح ڈوب جاتے ہیں اور میں جواب کی راہ نکلتا رہتا ہوں۔ لیکن اب کے آپ نے بڑی جلدی جواب دیا۔ بول معلوم ہوتا ہے کہ جیسے پہلے ہی سے جواب لکھ رکھا تھا۔ غزل کی پسندیدگی کا بہت بہت شکریہ! البتہ مجھے آپ کی یہ بات بہت غلطی۔ کہ ایک شعر وزن میں نہیں۔ علامہ آٹھنوی صاحب! اسے ایک باہر پھر پڑھیے، نہ تو اس شعر کو کاٹھیے گا اور نہ ہی خود ترمیم کیجئے گا۔ مجھے وہ شعر کچھ بھیسنے میں خود اس کی غلطی دیکھ لوں گا۔ آپ نے پہلے تو غزل کی بڑی تعریف کی۔ اور میں پڑا خوش ہوا کہ میرے کلام کو میری ہی طرح اور بھی عزیز رکھتے ہیں لیکن قطعاً میں سن گستاخاںات سے بچتا ہوں۔

آپ میرے حالات زندگی سے واقف ہونا چاہتے ہیں، تو میں بھی یہ کوشش کروں گا کہ آپ کی باتوں کا جواب لکھتا ہوں۔ اور اس طرح چار چھ مہینوں کا سکوت اٹھاؤں گا۔

میری زندگی کے داخلی اور خارجی ماحول پر زیادہ نہ بھی کچھ روشنی تو میرے پہلے خط سے پڑی ہوگی۔ اس خط میں یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ کن حرکات و مقاصد کے ذریعہ میں شعر کہتا رہا۔ یہ بھی بتاؤں گا کہ اندوہ آج زندگی کے مذاہب ہو جانے کے بعد کیا میری کوئی مشقیہ زندگی بھی رہی ہے۔ اور اس کا میری شاعری پر کیا اثر رہا ہے۔ میں شاعری کا ایک مقصد یہ بھی سمجھتا ہوں۔ کہ زندگی کے خوش گوار اور ناخوش گوار حالات و تجربات کا ایک سچا جیاتی احساس حاصل کیا جائے۔ زندگی کا ایک دھروانی شور و حاصل کرنا،

وہ آسودگی اور ملانیت عطا کرتا ہے جس کے بغیر زندگی کے دلکش رنگ دوڑن ناممکن رہتے ہیں۔ یہی احساس میرے محرکات شعری رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر قوم کی ایک تاریخ ہوتی ہے۔ اور اس کا ایک مزاج ہوتا ہے۔ اس کی اجماعی زندگی کی کچھ طینہ تریں ہوتی ہیں۔ پھر قوم انسانیت کی زندگی بھی تاریخ ہوتی ہے۔ اور اس زندگی کی کچھ ارتقائی قدیں ہوتی ہیں۔ قومی زندگی اور عالم گیر زندگی کی ان قدروں اور ہندوستان کے کچھ کے مزاج کو اپنی شاعری میں سمونا ملی اور عالمی زندگی کے پاکیزہ محرکات کو لایا کی عطا کرنا ہی میرا مقصد شاعری رہا ہے۔ اردو شاعری میں بہت سے محاسن کے باعث بہت سی جہدیں ہوں اور قدروں کی کمی رہی ہے۔ دو مثالیں دیں گے۔ حالی اور اقبال کی حالی کا دل بہت نرم ہے۔ بچوں اور شرافت ان میں کوٹ کوٹ لکھری ہوئی ہے۔ لیکن گہرا جذبہ فکر یا فلسفیانہ دماغ ان کے یہاں نہیں ہے۔ یہ چیزیں اقبال کے یہاں بدرجہ اتم ملتی ہیں۔ لیکن پرمیسی سے ایک جنگونی کا جذبہ بھی ان کے یہاں ملتا ہے۔ اور طاقت یا قوت خواہ کسی طرح کی بھی ہو اس کے لیے ایک اندھی پرتش بھی اقبال کے یہاں ملتی ہے۔ جنگیں جیتنے، ملکوں کو فتح کرنے اور ان پر اسلامی حکومتیں قائم کر دینے کو اقبال بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ ایک سنگین کوشش کے مزاج کا اثر ان کا کام پڑھ کر گناہ یہ ہو جاتا ہے۔ اسلامی کثرت کے تقویر کی زنجیروں میں ان کی شاعری جکڑی ہوئی ہے۔ شاعری میں میری کوشش بہت دیر تک تو سماجی یا سیاسی یا وطنی موضوعات سے الگ۔ ہی اور کافی دیر تک تو اپنی شاعری میں حسن و عشق ہی کے چاروں پہلوں کا ردا اور اس کی کوشش کرتا رہا کہ ہمنیت کو کمزور کیے بغیر اور اخلاقی و عجمت یا عشق حقیقی سے قطع نظر کے ہمنیت کو زیادہ سے زیادہ دھچکاں۔ اور اسے جس جس سے ملا لیا کر سلوں۔ عشق کے علم و دانش اور حسن کے تقویر کی تہذیب و تالیف مروج ہی سے میری کوشش ملتی۔ عشق شاعری کو سمجھتے، عقلی، خشکی، خشونت، امنائزٹ اور جھوٹے پن سے بچانا۔ اور اس میں زندگی کی اعلیٰ ترین قدیں سمونا یا میری کوشش رہی ہے۔ مغربی ادب خصوصاً روسو، ہتھ کی شاعری اور انگریزی ادب کے دیگر کار و مشاہیر کے کارنامے، منسلک ادب کے کارنامے، نادر ہی ادب کے کارنامے۔ مجھے بڑا متاثر کرتے رہے ہیں۔ میری اردو شاعری، جذبات و جذبات کے معاملے میں اور معیار شاعری کے معاملے میں جتنی غیر اردو ادب سے متاثر رہی ہے۔ اتنا اردو شاعری سے متاثر نہیں رہی۔ البتہ جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے۔ یہی اردو شاعری کے مشاہیر سے استفادہ کرتا رہا ہوں۔ پھر بھی اپنی اردو کو اپنے وجدان کے سانچے میں موٹا کرتا رہا ہوں۔ اور اس کی کوشش کرتا رہا ہوں کہ میرے اسلوب میں کتابوں کی زبان کے بدلے زندگی کی اور تازہ آب زندگی کی زبان جیت جاتی شکل میں، اچاگر ہو پھر کسی کیفیت کو محض مکمل طور پر بیان کر دینا میرا مقصد نہیں رہا۔ قادر الکلامی ایک طرح کا مجرب بیان ہے۔ کیونکہ ہر کیفیت یا ہر خیال کے عمدہ و مطبوعی پہلو کے علاوہ اس کا ایک وجدانی پہلو ہوتا ہے۔ جس کے لیے مراحت کے ساتھ ساتھ اشتراکیت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس اشتراکیت کو اپنے اشعار میں سمونا میرے خاص مقاصد شعری ہیں رہا ہے۔ اس طرف ہمارے اردو کے شرا کی توجہ بہت کم رہی ہے۔

جب میں زندگی میں عمل کی حیثیت سے متاثر ہونے لگا تو اس کے ساتھ ساتھ اشتراکیت کا نصب العین بھی سمجھ میں آنے لگا۔ ۱۹۳۷ء کے بعد سے میری متعدد منظموں، غزلوں اور ہامیوں میں یہ خیالات جگہ پانے لگے۔ اشتراکیت کے فلسفہ میں عمل کے جو معنی ہیں وہ انسان کی گذشتہ تاریخ کے عمل کے فلسفوں سے بہت مختلف ہیں۔ اب میری کوشش ایسی نئیوں میں ہے جو نئے فنی کوساں کو عالمگیر انسانیت کے ارتقاء کی دہشتی میں پیش کر دیں۔ محض تکلیف ہونا یا زندگی جیسی ہے اس سے متاثر نہ ہونا، قومی کچھ اور قومی مزاج کے

تعمود پر دیکر کرنا ہے اب میں نالافی بجھنے لگا۔ اب دنیا اور زندگی پر دھوکے کے بدلے دنیا اور زندگی کو بدلنے کا تعمود میرے اندر کالہ لگے ہوئے تھا۔ دنیا کو بدل دینے کے عالم گیر عمل اور حوام عالم کی متحرک کوششوں کی معنویت، دور درسی اور اُس کے وجدانی پہلو کو ادب میں چلائے اور روشن کرنے کو میں بہت اہمیت دیتے تھا۔ پھر بھی مجھے اُس کا اعتراف ہے کہ میری زندگی بہت حد تک جنسیت زدہ رہی ہے اور ہے۔ جنسیت سے چھٹکارا پانے کے بدلے میں نے اُسے شعوری اور وجدانی طور پر گہرا ہنانے کی کوشش کی ہے۔ میری جنسی زندگی کو اس بات سے نہیں سمجھا جاسکتا کہ میرے کن کن سے تعلقات رہے ہیں۔ ان تعلقات کو میں نے کس طرح منظم کیا ہے۔ جنسیت کو کتنا لطیف بنا سکا ہوں، جنسی جذبات و تجربات کو کتنا لطیف اور رنگین بنا سکا ہوں، اگر ان باتوں کا پتہ چھانا ہو تو میری غزوں، بہابیوں اور عشقیہ نظموں میں ان سوالوں کا جواب ڈھونڈنا چاہیئے۔

میرے زمانے میں مرد اور عورت آزادی سے مل نہیں سکتے تھے اور نہ محبت کر سکتے تھے۔ چوری چھپے کی بات اور ہے۔ اب بھی تبدیلی حالات کے باوجود صورت حال بہت کچھ یہی ہے۔ اس لیے مجھے کچھ عورتوں کے حُسن سے متاثر ہونے کے موقعے تو ملے ہیں لیکن اُن سے عشق رہنے کے موقعے نہیں ملے ہیں یا بہت کم ملے ہیں۔

بالکل کی جنسی تعلقی سے بچنے کا نام نہیں ہے بلکہ اس تعلق کو دھما دھما دھما یا قیافت سے متصف کرنے کا نام ہے جو چیز اس محبت کو جنم دیتی ہے وہ وہی ہے جو معمولی جائزوں کی جنسی زندگی اور جنسی تعلقات سے یا معمولی آدمیوں کی جنسی زندگی اور جنسی تعلقات سے ایک احساس اور پے ہوئے دل و دماغ والے انسان کی جنسی زندگی کو داخلی طور پر مختلف بنا تی ہے۔ جب جنسی جذبات کسی شخص کی پوری شخصیت میں محول نہ جائیں۔ اور اس کے منتقل کردار کا جزو بن جائیں۔ اور جب جنسی خواہش کے مقابلے میں احساس جمال بہت زیادہ بڑھ جائے اور بہت زیادہ لگرا ہو جائے۔ تب جنسیت عشق کا مرتبہ حاصل کر لیتی ہے۔ کیا میرا عقیدہ کلام آپ کو یہ احساس کرتا ہے کہ جنسیت اپنی تمام گناہوں سے پاک ہو کر میرے شعور اور کردار کا جزو لطیف بن گئی ہے؟

صاف کرنا میں نے اس خط میں خواہ مخواہ "خطیبانہ رنگ" اختیار کر لیا۔ آپ تو بعض اوقات ایسی الٹی میڈیا باتیں کر دیتے ہیں جو ہم نازک مزاجوں پر گراں گذرتی ہیں۔ اگر آپ یہ لکھنا گراں گذرنا تو آپ سے معذرت چاہئے میں بھی گھٹ آئے گا۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ مجھے لاجور ملائیں اور میں نہ آؤں۔ البتہ جو حق کا وعدہ میں نہیں کرتا۔ آپ اُن سے براہ راست خط و کتابت کریں۔ میں بھی لغتہ و لغتہ دوں گا۔ اور آپ کس کس کو بلا رہے ہیں۔

آپ کا
فسراق

(۳)

پتہ ایک روڈ، الہ آباد

یکم مارچ ۱۹۵۳ء

برادرم۔ تسلیم۔

آپ کا طویل خط ملا، شکریہ کہ آپ دوسری اشاروں سے لکھے، یا تو قائل ہو جائے یا کیجئے، مجھ پر کیا بات ہوئی کہ صاحب میں آپ کی اتنی سہمی باتوں پر ایمان لانے کے لیے تیار نہیں، میری باتوں پر سبے شک ایمان نہ لایئے، لیکن مجھے قائل کرنے کی کوشش نہ کیجئے، ورنہ میں آپ کے جوابوں میں الجھ جاؤں گا۔ ادب بات آگے نہ بڑھ پائے گی۔ اور پھر آپ مجھے یہ طعنہ دینے بیٹھ جائیں گے کہ میں الفاظ کے جادو سے قائل کرنا چاہتا ہوں۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ ایڈیٹروں کو تو خدا بھی قائل نہیں کر سکتا، خدا کا لفظ مجھ سے کہے لیے لیا ہوں) اور میں تو ایک شاعر ہوں۔

اچھا ان باتوں کو چھوڑ بیٹے اور یہ دیکھئے کہ مجھے کچھنے خطوں میں اپنے نفسیاتی تجزیہ کی دیانت دارانہ کوشش میں مغفبت خواسطے کرنا پڑا کہ نہیں۔ حقیقت شہوانی لذت و عشق انسانی بہبودی اور ترقی، انسانیت کا صحیح نظریہ یا بول کیئے کہ عشقیہ دلچسپیوں کے ساتھ تیز جیسی اور غیر عشقیہ اہم امور و مسائل میں دلچسپی ان تمام چیزوں اور رجحانات یا محرکات کو اپنے کے دائرہ میں گھوننا اور اتنے مختلف اجزاء کو اپنے اندر جذب کر کے اپنی شخصیت کی ایک پوری، کافی بنانا، ان مختلف اجزاء میں ہم آہنگی پیدا کرنا یہی کوشش رہی ہے، اس خط میں پہلے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میری ملی، فلسفیانہ، سماجی اور سیاسی دلچسپیوں نے میری عشقیہ شاعری پر کیا اثر ڈالا۔ ۱۹۳۶ء کے قریب میرا دھماکا اشتراکیت کی طرف ہونا شروع ہوا۔ لیکن جیسا پہلے خط میں عرض کر چکا ہوں۔ (لیکن ہی سے حسن پرستی کے ساتھ ساتھ اور اس سے ملی ہوئی میرے اندر کچھ اور صفیں بھی تھیں۔ یعنی زندگی کی اعلیٰ تندرلی، نیکی، خلوص، بہمدی، شرافت، انسانیت دوستی، علم پرستی، حقیقی محبت پرستی اور بعد کو اشتراکیت کا علم ہونے کے پہلے سے سچی وطن پرستی اور ہندوستان کی آزادی، ہندوستان کی عظمت کا احساس یہ تمام چیزیں میرے اندر کارفرما تھیں، اس لیے شروع ہی سے میری عشقیہ شاعری میں یہ تمام محرکات و اقدار اعلیٰ طرح کارگر ہوتے رہے کہ عشقیہ جذبات میں شرافت اور تربیت یافتہ انسانیت کے عناصر کھل کر مل گئے۔ جنسیت یا عشق اور جنسیت و عشق ہیں۔ تو معذرت کی اچھی عشقیہ شاعری کو یہ جنم دے سکتے ہیں۔ لیکن بلند عشقیہ شاعری اس آدمی کے لیے ممکن نہیں ہے۔ جو بڑی جنسیت یا زہے عشق ملک اپنی دلچسپیاں محدود رکھتا ہے۔ جب میں نے ہوش نبھالا تو ہندوستان میں نشاۃ ثانیہ اور نئی شاعری کا آغاز ہو رہا تھا۔ قومی زندگی میں ایک بڑا پن آ رہا تھا۔ اس لیے ہماری عشقیہ شاعری میں بھی ایک بڑا پن آنے لگا تھا۔ واقعہ اور آئینہ کا اظہار دومرے رہا تھا۔ خود میری زندگی میں عشقیہ محرکات کے ساتھ ساتھ دوسرے اچھے محرکات تھے۔ اور قومی زندگی میں جو نئے اقدار پل رہے تھے۔ ان دونوں نے مل کر میری عشقیہ شاعری کو پروان چڑھا دیا۔ — پھر ۱۹۳۶ء سے اشتراکی فلسفہ نے میرے عشقیہ شعور اور میری عشقیہ شاعری کو نئی و معین اور نئی معنویت دی۔ یہ حقیقت دہرانے کی ضرورت ہے کہ میری جنسیت

زندگی اور عشق زندگی نہ جنسیت کو چکا سکتی ہے نہ عشق کو اور نہ عشقیہ شاعری کو۔ عشق اس وقت عشق بنتا ہے جب عاشق محض عاشق نہ ہو بلکہ کافی حد تک ایک مکمل انسان ہو۔ میں نے یہ غصہ کیا کہ میری عشقیہ شاعری میں اور اردو کی کچھلی چوٹائی صدی کی شاعری میں قومی زندگی کی بیداری نئی توانائیاں اور نئے امکانات پیدا کرتی جا رہی ہے۔ لوگ ترقی پسندی کو بلند پایہ اور موزون عشقیہ شاعری کا دشمن غلطی سے سمجھ بیٹھے تھے۔ اجازت دیجئے کہ میں یہاں اپنے کچھ عشقیہ اشعار پیش کروں۔

یہ زم زم ہوا بھلا رہے ہیں چراغ ترے خیال کی خوشبو سے بس بے ہوش ہیں دماغ
جو چھپ کے تاروں کی آنکھوں کا دل دھرتا ہے اسی کے نقش کتبہ پائے جل اٹھے ہیں چراغ

فرش سے خانہ پہ جلتے چلے جاتے ہیں چراغ دیدنی ہے تری آہستہ روی اسے ساقی
خاک میں چوٹ دہی تھی یہ نہ جانے کب کی دگ چیمانہ لبو دینے کی اسے ساقی

زندگی کو بھی منہ دکھانے سے دو چکے تیرے بغیر بہت

اس کپسرن کرم پہ تو آنکھوں پر پڑے کیا تو وہی غلوس مرزا ہے آج بھی

ہر گز پیش چشم نہ لکھیں دوراں ہر ایک ادا موج شراب طرب آگئیں
آغا و شہادت ہی میں صحرورت پہناں پہلی ہی نگاہوں کے جہاں الفت دیریں
موسیٰ ملن انڈاز سے ان تھوڑا کھٹا ہیں ماحقہ طوطہ ترے سادہ سببیں
وہ ہر نفس حسن میں خوشبو سے محبت وہ دھبہ گل افشانی لب ٹائے شکاریں

غربت عداوت سے میں اپنی عشقیہ جمایا کرتی تھا جہاں انگلیں پیش نہ کروں گا۔ اور نہ منزلوں سے زیادہ اشعار کی مثالیں دوں گا لیکن مندرجہ بالا اشعار پر اگر آپ مزہ کر سکیں گے تو دو حقیقتیں کھل جائیں گی۔ پہلی حقیقت یہ ہے کہ ان میں کوئی سماجی سیاسی یا کوئی غیر عشقیہ یا اخلاقی خیالات یا مضامین نہیں ہیں۔ یہ محض یا سو فی صدی عشقیہ شاعری ہے۔ لیکن بغیر علمی اخلاقی سماجی اور سیاسی محرکات کے یہ عشقیہ شاعری ممکن ہی نہیں۔ جنسی عشق، زندگی کی دوسری دل چاہیوں سے دست بردار ہو کر یا اگر بیان بھلاؤں میں نکل جانے کے بعد یا تو جنوں میں مبتلا ہو جائے گا یا نامرد ہو کر رہ جائے گا۔ ہمارے اردو شعراء جسمی لحاظ سے نامرد نہیں تھے۔ لیکن چونکہ زیادہ تر یہ شعراء وسیع دلچسپیاں نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے ان کی عشقیہ شاعری میں وہ قوت یا زندگی نہیں ہے، جو ان شرار کی عشقیہ شاعری میں ہے، جو جہات و کمالات میں بھی دل چسپی رکھتے تھے، مثلاً میر، آتش، غالب۔

تو عشقیہ شاعری میں میری کوشش یہ رہی ہے کہ خرافات و صداقت جذبات کے ساتھ ساتھ اشاریت کیفیت ہر گز یاد دہشت

معنویت، تخلیقِ خُدا اور زبان و بیان میں ایک مالگیر ہے، انسان کے دل کی حرکیں اور ایک آفاقت پیدا کر سکوں۔ فنی حاسن اگر آپس ترانیں صفات اور مقاصد کو بجالانے اور چکانے کے لیے آئیں۔ دنیا بھر کا عشقیہ ادب ہر مرتبہ کا ہے۔ معمولی ادب درجے کا اور بلند مرتبہ، آخر ان کے آفاقی ادب سے استفادہ کرنا بھی میرا مقصد نہا ہے۔ اور اس طرح عشقیہ شاعری کے ایسے ہیں زندگی بندی اور پاکیزگی پیدا کرنے میں مجھے کافی مدد ملی ہے۔ شخصیت اور شاعری صرف اپنے بڑے یا اپنے سہارے ہرگز بلند نہیں ہو سکتیں دوڑوں بلندیاں اُٹھ کر کرتی ہیں۔ تہذیب انسانی سے۔ ہر شخص کی بلند شخصیت اور ہر شاعر کی بلند یا یہ شاعری دوسروں کی دین سے بات صرف اتنی ہے کہ ہر خاص و عام اس دین کو حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

میں نے اپنی عشقیہ شاعری میں ایک اور قسمی صغر کرنا چاہا ہے اور وہ ہے حیات و کائنات پر مکمل ایمان۔ میرے لیے اس کی باطل مزودت نہیں تھی کہ خدا پر پہلے ایمان لا کر قدرت یا خلقت پر ایمان لاؤں۔ ہوں تو میری عشقیہ شاعری میں دُکھ، درد، غم، آنسو، اضطراب، نا کامی، سبھی کچھ ہے۔ لیکن ان اس شاعری کا حیات و کائنات سے بیزادی نہیں ہے۔ بلکہ حیات و کائنات پر ایمان کو تعزیت پہنچانا ہے۔ تصرف کا سہارا دے بغیر مجازی دنیا کی پاکیزگی اور خیر و برکت کا احساس کرنا میری عشقیہ شاعری کا مقصد دیکھتے حقیقت جسے حقیقت کہتے ہیں، وہ میرے نزدیک اسی مجازی دنیا کا ارتقاء پذیر وجود ہے۔ البتہ اب سے میں برس پہلے تک حیثیت اور لغتوں کا کچھ اثر مزور رہا ہے۔ لیکن عصری کائنات کی عبادت و پاکیزگی کا براہ راست احساس میرے اندر ہمیشہ رہا ہے

بہت اچھا جب لاہور آؤں گا، تو آپ مجھ سے باتیں پوچھ لیجئے گا۔ یہ خطوں کا سلسلہ بڑا درد دے رہا ہے۔ جوشِ محراب کھنڈ کے شاعر سے میں آتی ہوں گے۔ تو میں بھی اُن سے بات کروں گا۔ بات کیا کروں گا بلکہ بات بکلی کروں گا۔ آپ نے اندازے کے سلسلے میں جو رقم بھجوانا تھی، وہ اب تک نہیں پہنچی۔ براہ کرم اس کا بعد خاص خیال رکھیں۔

آپ کا
فراق

(۴)

۴ بیگ روڈ، الہ آباد

۳۱ جولائی ۱۹۵۳ء

برادر دم۔ تسلیم۔

آپ نے اپنے خط میں یہ کیا لکھ دیا کہ میں نے عشقیہ شاعری کے پردے میں بعض ہلکی ہلکی باتیں کی ہیں۔ اگر آپ کے خیال میں میں نے ہلکی ہلکی باتیں کی ہیں۔ تو آج مزور ذرا مکمل کر باتیں سن لیں۔ تاکہ میرا یہ پہننا مجذوبانہ مد تک بے مثال بن جائے۔ یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کہ میں جنسی مومنوعات پر آکر محصل بہا ہوں۔ بلکہ میں بعض اہم شخصیتوں پر آزادانہ اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں۔

اجھا تو سینے۔ آغاز شباب سے لمبی زندگی پانے والوں کی بھی عشقیہ یا جنسی زندگی زیادہ سے زیادہ ساتھ ساتھ بڑھتی رہتی ہے۔ یعنی ۵۰ یا توڑے برس کی عمر تک۔ اس دوران میں کسی شخص کے جتنے بھی محبوب و معشوق ہوں۔ ان سے وہ زیادہ سے زیادہ چار پانچ ہزار ماہ مل سکے گا۔ یعنی زیادہ سے زیادہ تین چار سو معشوقوں سے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جنسی زندگی کا مکمل حصہ یعنی برس و کنار، وصل و ہجر، شکر و شکایت، وفا و جفا، انتظار، نامہ و پیام اور اسی قسم کی مٹی بھر تین عشقیہ زندگی کے اخیر تک قائم رہتی ہیں، لیکن انہیں مٹی بھر باتوں سے عشقیہ شاعری ایک ہی شخص کے ہاتھوں ہزار عشقیہ اشعار کہلا سکتی ہے جیسے انگریزی شاعر کیٹس (CATS) کے ایک خط کی یاد آگئی کہ جس طرح ایک کمری دیوار کے دو تین نقوشوں سے جلائی شاعری شروع کرتی ہے اور ہزار ہا نامہ اور حلقے بناتی ہے، اسی طرح شاعرانے گئے بزرگوں کے سہارے ایک پورا ایمان عشق کھڑا کر دیتا ہے یہ بھی یاد رکھنے کی چیز ہے۔ کہ زیادہ تر حالتوں میں کسی عشق کے معشوق کی تعداد دو تین ہی زندگی بھر میں ہوتی ہے۔ اور ان معشوقوں سے دو چار ہزار ہی وہ زندگی بھر میں مل پاتا ہے اور ان دو چار سو علاقوں میں وہی مٹی بھر تین اپنے گھر کو دہرائی دیتی ہیں۔ آگے دن نئی دار و دہلیں نہیں ہوتیں۔ اور ویران نہاد ہو جاتا ہے۔ ہزاروں اشعار کا۔ اگر یہ تجربہ نہیں کیجئے جائیں اور انشائے کا سہارا ملایا جائے تو شاید چالیس پچاس صفحات میں سب باتیں بیان ہو جائیں گی۔ لیکن یہ شاعری کا جادو ہے کہ ایک ایک بات اور واردات ہزار ہزار دنیا جنم لیتی ہے۔ یہ تراکد و تجدید جذبہ عشق کے استقلال سے پیدا ہوتی ہے۔ جمہول لذت پرستی حقیقت کی مدد سے قریب قریب لا محدود و محدود لذت و صلاحیت حاصل کر لیتی ہے۔ اب اگر سارا دیران مغل چرما جائی تو سبھرا خواہو فرمانا پڑے گا کہ شاعر کی زندگی و ذہنیت ناقابل اصلاح ہوس کاوی کی تشکا رہیں۔ لیکن اگر واقعی کسی کا دیوان لطیف پاکیزہ و یگانہ پر معنی عشقیہ جذبات اور جمالیاتی احساسات سے مالا مال ہے تو نہیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ شاعر کی جنسیت عشق کا مرتبہ حاصل کر چکی ہے۔ وہ عشق بھی محض شاعر کے کردار کا متعلق جزو نہیں بن گیا ہے۔ بلکہ شاعری کے روپ میں دلکا رنگ انداز سے مجرور ہوا ہے اور خلا کا نہ خلوص ہی ایسا کر سکتا ہے۔

تو ایک تھا مرے اشعار میں ہزار ہوا

اس اک چراغ سے کتنے چراغ جل اٹھے

اس خلا کی کاروائی ہے؟ چند محدود و تجربہ اور باہر ہزاروں سننے والے کیسے دھار لیتی ہیں، یہ ذرا پیچیدہ سوال ہے۔ شاید بات یہ ہے کہ داخلی کیفیات یا کوئی داخلی کیفیت گھٹنے کی چیز نہیں ہے۔ جسے ہم ایک جذبہ کہتے ہیں۔ جب وقوف یا ادراک اسے چھوڑتا ہے یعنی جب ہر علم جذبہ بنتا ہے تو اس کے بلے شمار پہلو نظر آئے گئے ہیں۔ اس طرح وعدت سے کثرت پیدا ہوتی ہے، ہر حقیقت ایک ہوتی ہوئی بھی کئی حقیقتیں بن جاتی ہے۔

ایک عاشقی کی جنسی زندگی کو یا اس کے جنسی اعمال کو بے نہاد اشخاص ہلا دیوں اور خلا کا دیوں سے تعبیر کرتے ہیں کہ

نہ میں آیا عشق اعظم

نوٹ پڑے دنیا کے کیف

اذل کی صبح سے اُس عشق کا نہ راز کھلا

جو شہر شہر ہے بدنام کوہ کوہ رسوا

یہ دازاگر کہیں کچھ لکھتا ہے تو حقیقی عشقیہ شاعری میں لکھتا ہے یا عاشق کی زندگی کے اُن پہلوؤں اور گاموں میں لکھتا ہے جن کا سرور شدہ لگ جیسی یا عشقی زندگی سے ملانیں پاتے۔

بنییت کا خواہش یا حاجت، دوائی کی طرح سے امیر کر ایک منتقل جذبے کی شکل اختیار کر لیتا، اس میں اتنا کسے حیات انسانی کا کونسا مقصد نہاں ہے؟ — قیاس نسل کے لیے تو جیسی خواہش یا ایک خواہش مراد لانی ہے، عشق کس مد میں آتا ہے مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے، کہ ایک عظیم تہذیب میں مل کی وقتیں اور اس کے بے شمار پہلو متعلق عشقیہ جذبات کی دین ہیں۔

انسان کو محض کھاتے پیتے گزارے اس منزل سے وہ پاؤں آگے نہ دھرے

دستی کے عمل کی انتہا حید و شکار گھر عشق نہ ہر مل ترقی نہ کرے

عشق کی معناتی معنی شعرو شاعری، دق و سرود، تاج محل اور اجنتا یا دیگر فنون لطیفہ تک محدود نہیں، بلکہ تہذیب کا پورا گارہ اُس میں بنییت کی تحقیق ہے۔ جو عشق کا مزید حاصل کو ملکی ہے۔ اب سوال یہ آتا ہے کہ لار آمد عمل یا افادیت سے شاعری اور دوسرے فنون لطیفہ کا کوئی تعلق ہے یا نہیں، کیا یہ فنون تاہم کچھ کے مقاصد کی تکمیل میں مدد ہوتے ہیں۔ یا ان مقاصد سے الگ تھک چر رہے؟ کیا وجدان ہمارے وجدان ہوتا ہے یا ولسے عمل؟

ظہر قراس کا ہمیشہ رہتا ہے کہ فنون لطیفہ آپ اپنے لشکار ہر کردہ جائیں اور نفع حال و قال ہو کہ وہ جائیں۔ لیکن شاعر اور اس کے سماج کی پیدا رفتی اس شخص سے شاعری کو محفوظ رکھ سکتی ہے۔

اسے شاعر خوشنوا آری ہے وہ ذات جو سوئی ہوئی جوت جگائے دن رات

اپنی ہی لذت بیان میں نہ ہو گم دم بھر نہ جھٹے منصب نفاذ حیات

حقیقی شاعرانہ وجدان محض کائنات کے وجود کے احساس سے نہیں پیدا ہوتا بلکہ اس وجہ سے کچھ علم اور کچھ ہی قدرت سمجھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس وجود کا سچا ادراک اس داؤ کا انکشاف کرتا ہے کہ وجود کائنات برکات سے ایک متحرک اور تغیر پذیر وجود ہے۔ کائنات کی تخلیق جو نہیں چلی بلکہ ہر وقت جاری ہے۔ اور اس مسلسل تخلیق کا ماضی آدمی کی ذات ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب سے سینکڑوں برس پہلے کی شاعری کے مشابہت سے اپنے زمانے کی کائنات کو جس طرح سمجھا تھا وہ کائنات تو اب بدل چکی۔ اور وہ کائنات ہمیں واپس دی جائے تو ہم اُسے کوڑیوں کے مولیٰ سمی نہ خریدیں۔ لیکن، ولایت ہومر، ورجیل، گالی دس، زروکسی، حافظ، قس داس اور ٹیگنیر کے گارنا سے اب بھی مدد ماہیا سے ہوتے ہیں۔ ان شاعروں کی دنیا لینے سے ہمیں انکا رہے اور ان کے گارنا سے کھودینے سے بھی ہمیں انکا رہے۔ یہ اس لیے کہ ماضی کے وہ پہلو ہوتے ہیں، ایک وہ پہلو جو حالی و مستقبل میں اپنی ہیئت کو تبدیل کر کے قائم رہے گا۔ دوسرا وہ پہلو جو اب قائم نہیں ہے۔ شاعر ماضی کے وہ پہلو زندہ جاوید شکل میں پیش کر دیتا ہے۔ اور ماضی سے ہم امیر تے ہیں اس کا زندہ شعور ہمارے اندر پیدا کر کے ہماری بدلتی ہوئی زندگیوں کا تسلسلہ محفوظ کر دیتا ہے۔ یعنی ماضی کی زندہ وادجوں کی مدد کو محفوظ کر دیتا ہے ہم ماضی کے کوہ کوہ رسوا کے ماضی کی مصنویت سے اگرچہ ہم بدلتی

کوہن تو مال کو بھی کھڑے نہیں گئے۔ ہیں حال کو ماضی نہیں بنانا ہے۔ لیکن حال اور ماضی میں جو رشتہ ہے اُسے سمجھنا از حد ضروری ہے۔ اور ماضی کا ادب عالیہ سب کا سب فنا ہو جائے گا تو ہمیں حال و مستقبل کی تعبیر میں بہت سی دگامیں پڑیں گی۔

آپ کے معنوں پر محض رہتا ہوں۔ تعریف اس لیے نہیں کرنا چاہتا کہ کہیں آپ اکیسے نہ لگیں۔ اور یوں ہم آپ سے معافی سے محروم ہو جائیں۔

اور آخری بات یہ کہ خفا ہونا چھوڑ دیجیے۔ اسنے نقد آدمی ہوتے ہوئے۔ جب آپ بچوں کی طرح دودھ جانا چاہتے ہیں تو چاہیج لگتا ہے۔ فراق اور کشمیں میں محو ذرا سا فرق تو ہے۔ بہر حال عزل حاضر ہے اور اسلامی ادب کے بارے میں بھی چند سطور نذر ہیں۔ یہ آپ کے ڈاکٹر احسن فاروقی صاحب کو کیا ہو گیا ہے۔ پہلے تو آپ سے جھگڑتے۔ اب تو ان کی بیماری علاج معلوم ہوتی ہے۔

”پچھلے دنوں سخت بیمار رہا ہوں۔ اس لیے جلد جواب نہ دے سکا۔ مجبوری تھی۔

آپ کا
ذائقہ

(۵)

شب یک دھو۔ الہ آباد

۱۶ جولائی ۱۹۵۳ء

ملاوہم۔ تسلیم

آج میں آپ کو بڑا معقول قسم کا خط لکھنا چاہتا ہوں۔ موضوع تو آپ کا ہے۔ لیکن لکھوں گا تو میں، کئی دنوں کے بعد آج طبیعت تسلی ہے۔ اگر تم بھی تسلی کے چلا تو مجھے وہ لطف نہ آئے گا جو قلم کے پھسلنے میں ہے۔ بہر حال مسک بڑا نازک سا پھیڑ رہا ہوں وہ یہ کہ میں اپنی شاعری سے خوش ہی خوش ہوں یا کسی قدر نا آسودہ بھی ہوں۔ میں معقول و مناسبت مدعا ہے اپنے کام کے اس قدر سے آسودہ و مطمئن ہوں جسے میں اچھا سمجھتا ہوں۔ لیکن اپنے کسی شعر، غزل، دیہاجی یا نظم کو مرثیہ آفر نہیں سمجھتا۔ میر۔ غالب، آتش، آفتاب، ایکلہ، مسک کے چند ترانے کا کام کہیں اور دو شاہزادہ مرثیہ آفر نہیں تسلیم کرتا۔ اپنے کام کے جس حصوں کو میں مزہ جانب دار ہو کر پسند کرتا ہوں ان کی بھی مختلف سطحیں ہیں مختلف قدیں اور مختلف رتبے۔ میرا بڑا چھاشتر ضخیم ترانے شاعری نہیں ہے لیکن کس شاعر کا اچھا شعر عظیم ترین شاعری ہے! میں یہی اچھی اور بدتمنی بھی شاعری کو سکا ہوں، اس سے کہیں اچھی شاعری کا تصور کر سکتا ہوں۔

اگر مجھے اپنے پرے کام پر مشغول ہونے کی فرصت ملے تو میں اس فرصت کو پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں تاہیں اپنے بہت سے اشعار کو اور میں چکا دینے کی امید رکھتا ہوں۔ خاص کر غزل کے اشعار اور اپنی بہت سی دیہاجیوں کا۔ انہیں پھر سے چھونے کی ضرورت ہے (THEY NEED RETOUCHING) ابھی میرے تحت اشعار بھی سینکڑوں عزیز ہیں اس طرح لگنا ہی میں کہیں گنگناہٹ سن نہیں سکتا۔ مرثیہ ایسا عموماً کرتا ہوں کہ میرے اندر ایک گنگناہٹ ہی ہو رہی ہے ابد میں۔

اپنی فلموں کے بارے میں میں یہ عموماً کرتا ہوں مجھے طور پر ان میں کئی خرابیاں ہیں۔ لیکن تہنی اچھی فلمیں ہیں کہہ سکا ہوں ان کی

دس گنی تعداد یا مقدار میں نہیں کہنا چاہتا ہوں۔ میری دونوں اولیٰ اور تعلیم یافتہ حلقوں میں بہت سراہی گئی۔ اگرچہ یہ دونوں نہیں فیہ متفق ہیں۔ لیکن آپ کے حضرت بگڑاؤ ہادی ایسے سراپا منزل شاعر اور حضرت جرجش بیچ آبادی جیسے سراپا نظم شاعر نے بار بار ان پر دم کیا اور یہی کھول کر داری۔ اور اگرچہ ان نقول میں کوئی کھلا وصال مقصد نہیں ہے۔ بلکہ صرف متزلزل داری اور تخلیق فضا ہے۔ پھر بھی علیٰ سردار جرجی اور ان کے ہم نوا دہم شعر شاعر نے ہی کھول کر ان کی داد دی۔ یہ دونوں ہیں۔ آدمی ذات اور پرچہ پانیان۔ اگر خیال آتا ہے کہ اس آغاز میں کم از کم دس نہیں اور ہوں۔ میری ایک اور نظم ہے۔ قصہ شب بے شبے میں بہت اچھی جمایا یہ نظم نغمہ نغمہ ہوں اور جو آؤ دو کے تمام مشاہیر سے داد حاصل کر چکی ہے، وہ چار ایسی اور نہیں کہنا چاہتا ہوں۔ اپنی ترقی پسند نقول میں داستان آدم، دونیاں اور کچھ دوسری نقول مجھے پسند ہیں۔ میں ان سے بھی چند ترانہ لائیں پکاس اور نقول کہنا چاہتا ہوں۔

میں نہ تو اقبال، جرجش، جلیست کی تقلید کرنا چاہتا ہوں اور اگرچہ ان کے حسان کلام کا مجھے اعزاز ہے، نہ یہ کہ شاعر کی سونی صدی تقلید کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن یہ فیہ کلم الدین احمد کے اس بیان سے متفق ہوں کہ رورڈ کی نقول بھی حریت زدہ ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ رورڈ سوتہ۔ کیش، شینے، کوچ، عینی سن۔ جیٹو آؤ، سون، سون، ویرہ شعرا کے اسلوب اور تکنیک میں جہت نماز جہتیں ملتی ہیں۔ اور کھلاوت اور نقول کے ساتھ جرجش کی ملتی ہے اس نونے کی کچھ نقول کہہ سوں، کچھ ایسی نقول کہہ بھی چلا ہوں۔

ہمارے نئے شعراء فیہ متفق نظم میں جرجشیں کر رہے ہیں اس سے سراہا ہوں لیکن متفق شاعری کے امکانات ابھی ختم نہیں ہوئے۔ انگشتان کی شاعری اور دس شاعری سے بہت پرانی ہے۔ لیکن آج تک اس میں دھماکا دہنی متفق شاعری ہو رہی ہے۔ اگرچہ انگریزی شاعری کے سمن دن سے اس میں فیہ متفق نظم (BLANK VERSE) داخل ہو چکی تھی۔ انگریزی کے مشہور ode ایسی پیریز ہیں جنہیں ہم اپنی متفق شاعری کے لیے نونے بنا سکتے ہیں۔

اپنی شاعری کی خوبیوں اور اس میں جو کچھ محسوس کرتا ہوں اس کے بارے میں اظہار خیال کر چکا۔ اس دور کے شاعروں سے گزارش کروں گا کہ وہ انیسویں صدی کی سفری شاعری کا بغور مطالعہ کریں۔ اور قدیم مشاہیر اور دوسرے کلام کو بار بار پڑھتے رہیں۔ قدیم ادب سے استفادہ کیلئے بغیر کام نہ بنے گا۔ لیکن قدیم ادب کا شمار ہر جہان سے بھی کوئی کام نہ بنے گا۔ ہمارے دوسرے، دوسرے، فضا، حس، لمس اور وہ دیگر حاسن شاعری جن کے نونے قدامت پیش کر چکے ہیں۔ انہیں نوراؤز کر کے ہمارے نئے شاعر کہیں گے۔ انہیں نئے اسلوب مفرد پیدا کیے جائیں۔ اور دین کی تجزیہ مفرد قوی جائیں۔ لیکن جو کچھ شاعری کو نڈل کھینچنے میں ان کا مفرد لحاظ رکھا جائے۔ حسن نیت، کہہ دینے سے باندھے انداز بیان سے باجوہ نکال دینے والی بات کہہ دینے سے شاعری زندہ نہیں رہ سکتی۔ ہماری شاعری حسن مختلف افراد کے ادراک کی امیج رہ کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ نئی شاعری بھی زندہ رہے گی جب وہ ہماری تہذیب اور ہمارے قدیم ادب کی دین ہو۔ ہمیں اپنی شاعری کو اپنے اور دنیا کے قدیم مستند ادب کا سہارا لے کر نیا بنانا ہے۔ ایک بات اور عرض کروں۔ انگریزی کے ایک بڑے ادیب کا عقول ہے کہ قدیم ادب شاعری اولیٰ ہوتا ہے (GREAT LITERATURE IS SELDOM LITERARY) میں شروع ہی سے ادب کو ادبی زبان دینے کے بجائے نڈل کی زبان دینے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ زبان والی حاجتی منہم ہے حیات والی و حیات شناسی۔

آپ کا
فراز

(۶)

شب بیک، روڈ - الہ آباد

۵ اگست ۱۹۵۳ء

برلوم تبلیم

اس خط میں اُن سباحت پر مزید روشنی ڈالنے کی کوشش کر دیں گا۔ جو میرے پہلے خطوط میں ذہیر غزوہ سے ہیں اور میں آپ کی ان باتوں میں نہ الجھوں گا، جن میں آپ نے اڑھائی لکھائے۔ بس میری باتوں کو چلنے سے سنتے جانیے۔ جب آج سے پہلے کا ادب موجودہ نئذیب کا ایک مذہب جو بن چکا ہے تو یہ امر لازمی ہو جاتا ہے کہ ہر ملک محال شاعر قدما سے اپنے مزاج و صلاحیت کے مطابق استفادہ کرے۔ میں نے اُردو اور دوسری زبانوں کی اچھی شاعری سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ لیکن میں نے کبھی نہیں چاہا کہ میں میر غالب - فقیر اکبر آبادی، آتش، آقبال، جوش یا کسی بھی مشہور اُردو شاعر کا طبع دوم بن کر رہ جاؤں میرا یقین ہے کہ اگر میرے کلام سے تمام قطعے کاٹ دیئے جائیں اور دوسرے مشاہیر اُردو کے نازندہ کلام سے اُن کے قطعے کاٹ دیئے جائیں اور سب کو لٹڈ کر کے ایک پندہ بنا دیا جائے تو اہل نظر حضرات اس بے نام و شخص پندے میں سے میرا اور دوسرے شعراء میں ہر ایک کا کلام الگ الگ کر لینے میں قریب قریب سو فی صدی کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن اگر وہ حاضر گذشتہ اُردو کے دوئم اور سوئم مرتبہ کے شعراء کا کلام اسی طرح لٹڈ کر دیا جائے اور ان کو جب جعفر علی خان آؤ کے مجموعہ ہمدان کی غزلوں سے قطعے کاٹ کر اس دوئم اور سوئم دوہے کی شاعری کے پندے میں ملا دی جائیں تو ان شعراء کے کاموں کو الگ الگ کرنے میں کسی کو کامیابی نہ ہوگی۔ کمزور شاعری خواہ اُسے کتنی پرچا اور سفاک جاسے۔ خدا محال اور شخصیت سے محروم رہتی ہے۔ لیکن یہ بھی نہیں سمجھنا چاہیے کہ میر غالب سے کم تعیثیت کا شاعر ہی نہ نہیں ہو سکتا۔ جراثیم اور ناسخ، میر غالب سے بہت کم تھیں۔ لیکن جراثیم و ناسخ دونوں صاحب طرز ضرور ہیں۔ اب اگر کوئی شاعر دوئم سوئم و درجہ کی شاعری کرتا ہوا بھی ایسی کمزور شاعری کرتا ہے کہ اس کا کوئی اپنا رنگ نہ ہو پائے اس کی شاعری میں نمایاں خدا و خال نہ پیدا ہوں۔ ایسے صفات نہ پیدا ہوں، جن میں اس شاعر کا کوئی شریک نہیں تو اس شاعری کو تو ہم جان تو سکتے ہیں لیکن اُسے نہ ہم مان سکتے ہیں نہ پہچان سکتے ہیں۔

میں نے ادا تاس کی کوشش نہیں کی کہ اپنے طرز کلام کی ڈیڑھ اینٹ کی مہمدا لگ بناؤں۔ اگر میرے کلام کا ایک نمایاں اور مخصوص رنگ ہے اور ایک مخصوص طرز ہے تو یہ اقبالیات تیری شاعر شخصیت سے میرے کلام میں داخل ہو کر پیدا ہوتے گئے۔ البتہ میری شاعری کے آغاز سے پانچ سات برس تک جیسے دور بجز بک سکتے ہیں۔ میرے کلام میں تنقید کا عنصر تدریجاً زیادہ ہے۔ اور میری اپنی آواز نہ ڈال دی سی ہے۔

لیکن جیسا عرض کر چکا ہوں ایک مخصوص رنگ اور نمایاں خدا و خال دوئم و سوئم و درجہ کی شاعری میں بھی پائے جاسکتے ہیں۔ بلند مرتبہ شاعری یا وہ شاعری جسے ہم ادبیات عالیہ کہتے ہیں۔ اس میں ایک منفرد شخصیت کے علاوہ فن اور زندگی کی اعلیٰ قدروں کا مرکزی جوہر ہے جات و کائنات کی عظمت، اخلاقی وسعت، حیات و کائنات پر انی ایمان اور حیات و کائنات سے بیکراں محبت۔ یہ مرکزی جوہر حقیقی شاعری اور دیگر موزونات کی شاعری دونوں کو عظمت عطا کرتا ہے۔ آتش اور آتش کے شاعروں کو سہے لیجئے آتش کی اُستاد کا راز ان کی زبان دانی، طباطبائی، ذہانت، معنوں آذنی میں اس مدح نام نہیں ہے جس میں مذہب آتش کے تفکر کی انانیت میں

وہ راز پنہاں ہے۔ اور کلام آتش کی اناقیت کے مزاج میں جلتی طور پر مٹنے سے کرکئی موصوعات پر جو اور جس طرح آتش نے سوچا۔ اسی طرح دھبہ دھبہ بھی سوچا ہو لیکن وہ موصوعات آتش کے دھبہ میں اس سے زیادہ دھبہ رس، اثر و پرمکھت اور پرمکھت بن گئے۔ جتنا وہ دھبہ دھبہ کے دھبہ میں بن سکے تھے۔ جہذا شاعری فی الحقیقت جمالیاتی عظمت کی تلاش ہے۔

جنسیت اور عشق کے بارے میں بھی پہلے کے خطوط میں کئی باتیں کہہ چکا ہوں۔ آج یہ کہنا ہے کہ بڑے عاشق کا عشق اتنا بڑا عشق نہیں ہوتا جتنا جتن بڑے انسان کا عشق بڑا ہوتا ہے۔ لہذا ہر جنسیت محض جنسیت ہے۔ لیکن سیکس پیئر، کالی داس، حافظ، گیتے، دانٹے کی جنسیت عوام کی جنسیت سے بہت جہذا چیز ہے۔ عشق صرف دل کا معاملہ نہیں ہے بلکہ دل سے زیادہ دماغ کا معاملہ ہے۔ جھوٹے دماغ کا آدمی بڑے سے بڑا عاشق ہو کر بھی کو دایا بڑا عاشق ہوتا ہے۔ بڑا عاشق نہیں ہوتا۔ ایسا آدمی اگر معشوق پر مرث مرث جائے، اپنے شہتہ خصوص سے وہ اپنے جسم کو چھلنی بھی کر ڈاٹے یا جھگڑوں میں نکل جائے یا معشوق کی خدمت کے لیے اپنی زندگی قربان کر دے۔ پاگل بھی ہو جائے، خودکشی بھی کرے یا جو کچھ کرے۔ جہذا دل و دماغ والے عاشقوں کی باری نہیں کر سکتا۔ خواہ آفرالہ کو کوئی ڈراما کی یا فیضی کوئی حالت اپنی نہ بنائیں اور کچھ نہیں لکھیں کہ داد و ادب عشق کو برواشت کر لیں۔ وہ خاک کے سبزے دلی کا بڑے عاشق کا کلام نہیں ہے، دیوں تو تیرنے کہا ہے۔

پرستش کی لئے بت یہاں تک تری

نظر میں سمجھوں کی خدا کر چھلے

لیکن یہ پرستش درجہ سناں یا درجہ سناں کے نام نہیں ہے۔ یہ ایک داخلی عمل ہے۔ اس داخلی عمل سے حسن کے انداز کی تخلیق ہوتی ہے۔ جنسیت بھائے بھائے نسل کی مٹانے ہونے کے اوقات تہذیب کی مٹانے میں جاتی ہے۔ کبھی مخلوق بیان ہے کہ ایک تربیت یافتہ یا فدا کلام عاشق کو پتا معلوم ہوتا ہے۔ جو لوگ جنسیت کو عشق سے خارج کرنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں۔ کہ ایسا عشق کلام ہو ہی نہیں سکتا۔ جب حسرت مولائی کہتے ہیں۔

دیکھنا بھی تو انہیں دوسرے دیکھا کرتا

شیدہ عشق نہیں حسن کو دسوا کرتا

یہ انداز فی عشق محض ایک برائے بیت چیز ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور اس دوسرے دیکھنے میں بھی جو مادہ کار ہے۔ وہ

جنسیت ہی کا مادہ ہے۔

یہ بات ہم افراد سے گذر کر قوموں اور تہذیبوں کے لیے کہہ سکتے ہیں۔ وحشی یا نیم تہذیب قریب اس کی مثالیں تو پیش کر سکتی ہیں۔ کہ ان کی کئی افراد جہذا عشق کے تحت آگ میں کود پڑے۔ لیکن ایسی قوموں کا عشق ان مثالوں سے بڑا عشق نہیں بن جائے گا۔ البتہ قابل قدر عشق ضرور دے گا۔ لیکن عشق کا مقصد معشوق سے دھماکے کے علاوہ ہذا ہذا عشق اور احساس جمال کو جہذا بنانا ہے اور اس کے برخلاف تہذیب و تمدن کی تخلیق کرنا ہے۔ سیکس پیئر کی مشید شاعری علامہ آزاد کے زمانے کے غیر مشیدہ عظیم کلاموں سے بڑے عشق سے شیکسپیئر کی شاعری۔ لیکن کی تعینات، نئی دنیا کی دریافت، انکلتان کی نشاۃ ثانیہ، یہ سب ایک ہی تاریخ عمل یا دورہ کی پیداوار ہیں۔ ہماری اردو شاعری نے کسی بڑی قومی زندگی کے اعوش میں نہ ہم نہ تقاضا بردار چڑھی۔ جیسا پہلے عرض کر چکا ہوں خود میری شاعری میں اگر داخلی کچھ بڑی چیزیں ہیں تو وہ سب کی سب ایجاد بندہ نہیں ہیں۔ بلکہ اس ہندوستان کی دین ہیں۔ جن کی نشاۃ ثانیہ راجہ رام موہن داس کے وقت سے شروع ہو چکا ہے۔ حقیقت شاہ جہاں، مرہٹہ، قاجار، اور انگریزوں کا دور تہذیب کا معادہ ہو گیا۔ وہ قوم کے لیے جھوٹے حال قابل

یا محض لغنی طبع کا باعث نہ بنے گی۔ بلکہ دھواں و فکر کی ایک بڑی یونی ورسٹی ہوگی۔ بڑی مشیت شاعری کی نگاہ میں جہاں ایک طرف معشوق ہوتا ہے۔ وہاں دوسری طرف ترقی زندگی اور اس کے اسکاٹات ہوتے ہیں۔

ایک مسکراہٹیں انہما در خیال کرنا چاہتا ہوں، معشوق ذہنی اور اخلاقی طور پر کوئی فوق الانسان نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک معمولی انسان ہوتا ہے۔ — تو کیا اس کا اس قدر گرویدہ ہو جانا کہ اس سے قیمتی انسان کا لفظ بھی ناممکن ہو جائے، ایک جھوٹ یا مبالغہ نہیں ہے؟

سو دا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ

کیا جانیئے ترے آئے کس آن میں دیکھا

محبت کی مشہور داستانوں یا واقعوں کے معشوق اپنے زمانے کے حسین ترین انسان تھے۔ لیکن ناقابل برداشت جنسی کشش عاشقی میں پیدا کر دیتے تھے۔ اور یہ معمولی دل و داغ رکھنے والے عاشقوں کے دلوں میں دنیا کے حسین ترین انسان نظر آتے تھے۔ محض طور پر تو یہ ایک بھرم ہے۔ لیکن اس بھرم میں ایک دانہ پزیدہ ہے۔ اور وہ مانڈ بھائے نسل نہیں ہے۔ بلکہ اقل بھائے نسل ہے۔ بھائے تہذیب نہیں ہے بلکہ اقل بھائے تہذیب ہے، معشوق کے جمال کی یہ داخلی کشش مجموعی حیثیت سے ایک بہتر نسل اور بہتر تہذیب کی ضامن ہے، جنسیت شدید جذبات کے سہارے بہتر نسل پیدا کرتی ہے۔ یہ مزدوری نہیں کہ اگر کسی مرد اور کسی عورت میں انتہائی عشق ہو تو اولاد بہت جلد تیار ہوگی۔ لیکن اسکا بستر اولاد کے پیدا ہونے کا مزدور ہے۔ اولاد کی ترقی میں سب سے زیادہ حصہ ماں باپ کی باہمی محبت ہے۔ اگرچہ اور چیزوں کا بھی اس معاملے میں حصہ ہے۔ پھر بھی والدین کی باہمی محبت بچے کی زندگی کو جنت بنا دیتی ہے۔ یعنی اسے ترقی کے بہترین اسکاٹ فراہم کر دیتی ہے۔

لیکن ہم جنسوں کی پُر غرض جنسی محبت سے اولاد تو نہیں پیدا ہوتی۔ پھر اس سے تہذیب کو کیا فائدہ ہوتا ہے۔ ایک فائدہ عاشق و معشوق کی زندگی میں اخلاقی پیدا ہو جانا اور دونوں کی شخصیتوں کی تالیف و تہذیب۔ دوسرے اگر عاشق کی شخصیت معشوق سے بڑی ہے تو معشوق درجہ اعلیٰ میں آدمیوں کے معدن بہت کچھ بن سکتا ہے۔ بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ لیکن جیسے پہلے عرض کر چکا ہوں۔ ہم جنسوں سے محبت اسے اعلیٰ افراد تک محدود رہے تو اچھا ہے۔ پھر اگر ایسی محبت میں عین میں سے کوئی شاعر فن کار یا کسی دوسری کارآمد دلچسپیوں کا حامل ہے۔ تو یہ محبت اس کی ان دلچسپیوں کو پروان چڑھانے میں بہت مدد دے سکتی ہے۔ یہاں بھی دینی بات کبھی جملے کی جیسی چھپو رکھے آدمیوں کی امداد پرستی کو مستحاطا بہت سے گناہ میں تہذیب یا شائستہ عشق و شوق کی امداد پرستی سے کوئی نسبت نہیں۔ ہر امداد پرست غذا یا شہدا نہیں ہوا کرتا۔ اور نہ غریب و غنا ہوتا ہے۔ ایدوڈو یا پیٹر کی تصنیفات اس نازک مسئلے پر بہت بصیرت افروز ہیں۔

دیکھئے میر ان خلوں میں کتنی محنت کر رہا ہوں۔ تاکہ آپ کو میری ذات اور میرے خیالات کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل ہوں۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ میں نے آج تک کسی سے بھی اتنی کھل کر باتیں نہیں کی ہیں۔ نہ جانے کیا بات ہے۔ کہ مجھے آپ کی ہر بات کی تعمیل میں ذہنی سکون حاصل ہوتا ہے۔ اب مجھے اپنی زندگی پر کوئی عبور و سر نہیں رہا، نہ جانے کب مر جاؤں۔ کافی عمر ہو گئی ہے کب تک شکر کہہ کر کوئی سکون گا۔ اور اب مجھے یہ امید بھی ہے کہ آپ میری زندگی میں یا میرے مرنے کے بعد اب ایسا معنوں کو سکھائیں گے۔ جس سے میری ہر ذہنی شخصیت سب کے سامنے آئے گی، کیا یہ گرم میری زندگی کے عہد ہوگا یا زندگی ہی میں۔

آپ کا

نواب عماد الملک (مولوی حسین بلگرامی)

ڈاکٹر عبدالحق

اٹھارھویں صدی میں ہندوستان کو ایک نئی قوم اور ایک نئی تہذیب سے سابقہ پڑا۔ یوں تو یورپ سے پہلے پرتگالی آئے اس کے بعد ولندیزی اور فرانسیسی۔ لیکن ان کا کوئی زیادہ اثر ملک پر نہیں ہوا۔ پرتگالی ہندوستان میں دو مقصد سے آئے تھے۔ مسالوں کی تجارت سے روپیہ کمانے اور عیسائی مذہب پھیلانے۔ ان دونوں مقصدوں کے حصول میں انھوں نے بڑے ظلم و جبر اور سفاکی سے کام لیا۔ ان کی یادگار اب ان کے کچھ لفظ اور کچھ دیسی عیسائی اور کچھ دھلے مردوزن باقی رہ گئے ہیں۔ ولندیزیوں اور فرانسیسیوں کا کوئی قابل ذکر نشان باقی نہیں رہا۔ البتہ انگریزوں کے قدم یہاں ایسے جمے کہ وہ آکاس پیل کی طرح سارے ملک پر چھا گئے۔

ان سے قبل جتنے فاتح ہندوستان میں آئے وہ شمال مغرب کی طرف سے داخل ہوئے۔ مگر یہ یورپی قومیں سمندر کے راستے تجارت کے بھیس میں آئیں اور تجارت کی کویتھیاں بنانے بنانے تلے بنانے اور شکر جمع کرنے لگیں۔ اور ملک زب عالمگیر کے بعد سلطنتِ دہلی میں اخطا ط شروع ہو گیا تھا۔ رفتہ رفتہ قسمت یہاں نکلتی تھی کہ بادشاہ صرف نام کے بادشاہ رہ گئے جو بے خود مختار ہو گئے۔ کبھی آپس میں لڑنے کبھی غیروں کی مدد سے ایک دوسرے پر حملے کر بیٹھے۔ کبھی ان کو غیروں سے جا بھڑتے اور کبھی ہڈاری کر کے خود اپنی جڑ کاٹتے پرآ ما وہ ہو جاتے۔ انگریز ان حالات کا ایک شاطر کی طرح مطالعہ کرتا رہا اور کبھی موافق کو ملتا تھا تو جانتے نہ دیا کبھی ایک کے ساتھ ہو گیا اور دوسرے کو شکست دے دی اور اس ملک کے معاوضے میں حصہ نام سے گرائی قدر رقم لے لی اور کچھ حصہ ملک کا بھی سنبھال لیا۔ کبھی کسی کو بڑھتا ہوا دیکھ کر چھپر خانی شمرغ کر دی اور اس کے حواریوں سے مل کر اس کے عالتے پر چڑھائی کر دی اور بندر بانٹ کے قدیم اصول پر اچھا حصہ اپنے لئے دکھ لیا اور منہ بھرائی کے طور پر ایک ایک ملک اس اختیار کے سامنے ڈال دیا۔ کبھی بادشاہ سے فرمان حاصل کر کے مصلوبہ علاقے کے قبضے کو جائز قرار دے لیا۔ ہمارے اسلاف ان فرنگیوں کو کبھی خاطر میں نہ لائے۔ ان کا لباس، کھانا پینا، رہتا سہتا، عادات و اطوار ان کی زبان و سخن ان کی ہر بات ان کی نظروں میں نا مانوس اور ناشائستہ تھی۔ ہمارے ایک لغت نویس نے فرنگی کی عجیب و غریب تعریف ان الفاظ میں کی ہے :-

”یکے از جانوران و دیانی کہ گاہ بگاہ یہ سافل فرداری شود“

اس میں گاہ گاہ برسا مل نواد می شود، کا کلمہ خاص طور پر قابلِ غور ہے۔ ہمارے بزرگ زیادہ سے زیادہ ان کی تعریف یہ کہتے تھے کہ کارِ بگرا چھپیں، بندوبست، زوہ، نگہری وغیرہ خوب بنانا ہنستے ہیں۔ صاحبِ علم نہیں۔ وہ بھی مسلمانوں سے خوش نہ تھے اور اپنا وفادار خیال نہیں کرتے تھے بلکہ باغی سمجھتے تھے۔ ان کا ایسا سمجھنا کچھ بے جا نہ تھا اس لئے کہ سلطنت انھوں نے مسلمانوں سے لی تھی۔ اس لئے مسلمانوں سے برگماں تھے اور برگماں رہے۔ انھوں نے ابتدا میں جس مکر و فریب، جھلسازی، اندرونی سازشوں اور کجمنوں سے اپنا تسلط برپا کیا اور خاص کر اسلامی حکومتوں سے جو معاہدہ نہ بناؤ کیا اس نے مسلمانوں کے دلوں میں ان کی طرف سے نفرت پیدا کر دی۔ ان کے چیتنے اول درجے میں پارسی اور دوسرے درجے میں ہندو تھے۔ مسلمانوں کو ایسے مہمقاوات، تہذیب و دیاریات اور علم و فضل پر مرقہ تھا۔ وہ اس ملک کے فاتح اور حاکم رہے تھے۔ انھوں نے ایک نئی تہذیب کی بنیاد ڈالی تھی جس نے ملک کی کایا بدل دی اور ماہِ جوہرِ اہلِ سلطنت کے انھوں نے اپنی انفرادیت کو قائم رکھا اور انگریزوں کے سامنے نہیں جھکے۔ وہ اسے حقیر اور رنج سمجھتے رہے۔

ہر دور کا ایک تقاضا ہوتا ہے۔ اس تقاضے کو سمجھنا اور سمجھ کر اپنے ماحول اور حالات کی دوسے اپنی تنظیم کو قائم کرنا ہر زمانہ حیات میں سنبھلے رہنے اور کامیاب ہونے کے لئے ضروری ہے۔ ہندو اس راز کو سمجھتے تھے۔ وہ اپنے ملک میں ایسے کی دور و بیکر چکے تھے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے یہ پہلا موقع تھا۔ انھوں نے اس کی پروا نہ کی اور بالآخر اس کا خمیازہ جھکتا پڑا مسلمانوں میں دو چار ہی خاندان ایسے تھے جنھوں نے اس کشمکش کے اندیشہ کی دوزخ میں زمانے کے بغیر بچا لے اور اپنی حیثیت اور وقار قائم رکھنے کے لئے بڑھے اور زمانے کا ساتھ دینے میں کچھ پس و پیش نہ کیا۔ ان میں ایک مولوی سید حسین علی کا خاندان تھا جس نے ہوا کا رخ دیکھ کر انگریزی حکومت کا تقرب حاصل کیا۔

مکرم اودھ کا نہایت مرموز خیر قصہ ہے۔ اس خاک سے ایسے جلیل القدر عالم و فاضل آئے جن کے نام اپنے بھراور علم و فضل کی وجہ سے ملکی دنیا میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ سید حسین کے دادا سید کریم حسین کو انگریزی نوٹس حاصل ہوا اور وہ بہ عہد نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ ۱۲۴۳ - ۱۲۵۲ھ سرکارِ اودھ کی طرف سے سفیر ہو کر گلشن کے گورنر جنرل لارڈ ٹینک کے دربار میں پہنچے۔ ان کی اولاد سید زین الدین حسین (والد سید حسین) اور سید اعظم الدین حسین نے وارن ہیسٹنگز کے بنا کر وہ مدرسہ عالیہ میں علوم مشرقیہ کی تعلیم کی اور ایسے زمانے میں جبکہ انگریزی پڑھا حاکم سمجھا جاتا تھا انگریزی بھی سیکھی۔ یہ پہلے مسلمان تشریف لائے تھے جو اس بدعت کے متحرک ہوئے اور باقاعدہ انگریزی تعلیم حاصل کی۔

سید حسین کے چچا اعظم الدین حسین نے انگریزی حکومت میں بڑا اعزاز اور اہتمام حاصل کیا اور بڑی ذمہ داری کی خدمات پر مامور رہے۔ ابتدا میں لارڈ ٹینک کے اسے ڈی کان اور ترجمان رہے۔ اس کے بعد وہ سندھ میں حکومت کی طرف سے بطور سفیر یا پولیٹیکل ایجنٹ امیران سندھ و افسر اعلیٰ اجازت رانی و ریاست سندھ میں گئے۔ یہ عہدہ انگریزوں کے لئے مختص تھا۔ مگر امیران سندھ اپنے ملک میں انگریزوں کا آنا پسند نہ کرتے تھے۔ سندھ میں سیدوں اور بہروں کی بے حد تعظیم و تکریم کی جاتی ہے اس لئے وہ ان کے لوگ ان کا بہت احترام کرتے۔ ہاتھ چومتے اور قدم بیٹے۔ نواب عماد الملک فرماتے تھے کہ وہ کبھی کسی کے سامنے انگریز کی کتاب نہ پڑھتے تاکہ لوگوں کو بدگمانی نہ ہو۔ اکثر سندھی ان کی خدمت میں آنے دینے کے لئے حاضر ہوتے تھے۔ اس لئے

جب کبھی کوئی عربی شعر یا آیت قرآنی توروہ کاغذ پر لکھ کر ایک ٹوکری میں ڈال دیا کرتے تھے جب لوگ غریب مانگتے آتے وہ ہر ٹوکری میں سے تعال کا مال رو سے دیا کرتے۔ کچھ عرصے کے بعد کسی دفعہ نے یہ افواہ پھیلادی کہ شخص دراصل انگریز ہے مسلمان نہایت ہے۔ آدمی تنے کو سے بچنے لوگوں کو یقین آگیا اور زور کش برپا ہوگئی، اس سے ان کو جان کا خطرہ ہو گیا اور وہ راتوں رات ہمارے بیچ نہ نکل بھاگے۔ اس کے بعد وہ ڈپٹی کلکٹر و ناظم ہند دست بہاڑ چرمیں پرگنہ کی خدمت پر مامور ہوئے۔ دوبارہ یحییٰ علیہ السلام برنگال کے مہذب نامزد ہوئے حکومت نے سی۔ ایس آئی کا خطاب عطا کیا۔

سید اعظم الدین حسین کے دوسرے بھائی سید ربیع الدین حسین نے حکمرانان میں ملازمت اختیار کر لی۔ ۱۳۳۱ء میں چلی کلاٹر اور چلی مسریٹ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اس ملازمت کے دوران ہی ان شخص ایک مدت تک اسلحہ ۲۰ بارہو کا لباس پہنے کا افسانہ ہوا۔ چنانچہ مولوی سید حسین کے ملازمت بھی مغانا بدھ کی تہم جوہی سے مل گیا کہ قصیدہ صاحب گنج میں مولوی سید صاحب شہیدؒ نے یہی پیش کیا کہ ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔

[illegible]

اس دور میں ان کو کھیتوں کی معاشرت اور وہاں کی تہذیب و آداب و استعمال اور مذہبی رعاتیات، کھیتے کا احساس برقی ملا اور وہاں کے عوام و انگریزوں کی صحبتوں سے متغیر ہوئے۔ اس زمانے میں کھیتوں میں شمولیت اور خاص کر کم ٹیکہ کو ڈیڑھ سو گز تھا۔ ان تمام باتوں کا ایک مثال نعیم باغیہ تھوڑا سا پر اثر مہمان دوست تھا۔ پیر مہینے کے زمانے میں انھیں کھیتے ٹانگری کی اوڈھی کے ذریعے بھی انجام دیتے پڑے۔ یہ انہی و تعلقداران اور دھکے کے مفاد و اغراض کی حمایت کے لئے جاری کیا گیا تھا۔ اس زمانے میں گوشت کے نہر پر وہ خالی چاہیں۔ اس سے تعلقدار اب اوور و سٹاکس میں تھکے گا اور ذائقہ تھا۔ اس لئے تعلقدار اس نتیجے کے تحت مخالف تھے۔ اخبار یا بیرتے اور نعیم باغیہ کی خبر اچھا جانا تھا، اس خبر پر جی تادیبیں پر زور اور ٹیکل لگے۔ کھیتوں ٹانگری کے تھوڑا اوڈھی سے ان مضامین کا جو اب لکھا اور گوشت کی تجویز پر سخت ناک چینی کی۔ ایسی نکتہ چینی اور وہ بھی تعلقداران اوور کے اخبار میں حکومت کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ پیر مہینے میں محرم کتاب میں لکھے اور انھیں اوڈھی سے دست بردار ہونا پڑا۔ اب ان کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ نواب سلازلہ صاحب ہمارے راولپور ناظرہ بروک کی ملاقات کے لئے کلکتہ تشریف لے گئے۔ وہاں سے واپس میں سیر و سیاحت کرتے ہوئے کھیتوں اور دھکے۔

گورنمنٹ آف انڈیانا نے ان کی همانداری اسی شان سے کی جیسی خود مختار رسولے عظام کی کی جاتی تھی۔ کل گورنران صوبہات ہند کو حکم پہنچ گیا تھا کہ ان کو اپنا نام بھیجیں۔ چنانچہ اسی غرض سے ریڈیٹ سے ریڈیٹ وقت مسٹر سائڈوس پرکاش نے لکھنؤ میں نواب صاحب جنرل اہل ہیر چیف کشتہ کے ہاں نوکری ہو گئے۔ جنرل ہیر نے قطعہ داران اودھ و دیگر امراء کے شہر سلاطت کو ان کی منجھدای کے پروفیسر جین کا تعارف بھی نواب صاحب سے کروا دیا اور ان کی علمی و ادبی قابلیت کی بہت کچھ تعریف کی۔ نواب سر سالار جنگ بہادر بہت مروضہ شناس اور قدروان تھے اور ان اصلاحات کے پیش نظر وہ جیدر آباد کی ریاست میں کرنا چاہتے تھے ان کی پریشانی کے ہندوستان کے قابل اور تجربہ کار اشخاص کو اپنی ریاست میں کھینچ لائیں۔ جیسا کہ سید حسین سے ملنے کے بعد ان کو ریاست کی ملازمت کی ترغیب دی اور فرمایا کہ میں جب جیدر آباد واپس پہنچوں تو غم ضرور آؤ اور مجھ سے ملو۔ لیکن وہ جیدر آباد نہ گئے۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ نظر ثانی کے مزاج میں سختی تھا اور اس کا کچھ خیال نہ کیا۔ دوسری وجہ غالباً یہ معلوم ہوتی ہے کہ لوگ ریاست کی نوکری کو انگریزی ملازمت کے مقابل میں کمزور و ناقابل عقیدہ سمجھتے تھے۔ نواب سر سالار جنگ کو اس کی بڑی شکایت تھی اور جب وہ اس قسم کی کوئی بات سنتے تھے تو انھیں رنج ہوتا تھا کہ یہ لوگ انھوں نے اپنی ریاست کو منظم اور باضابطہ بنانے میں بڑی حکمت اور زہد سے کام لیا تھا اور اس کام میں ایسی ایسی مشکلات سے مقابلہ کرنا پڑا جن کا اس وقت تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ آخر خود نواب صاحب ہی نے امر کر کے بل بھیجا۔ اس کے بعد بھی پس پیش کرنے رہے اور آخر ۱۸۷۸ء میں جیدر آباد آئے اور اُس کے بھی ترقی جینے کی نصحت لے کر جیدر آباد پہنچے تو نواب سر سالار جنگ نے ان کے حالی پر اس قدر شفقت اور عنایت فرمائی کہ وہ ہمیشہ کے لئے یہیں کے ہو گئے۔

آئندہ میں نواب صاحب نے انھیں اپنا پرسنل سسٹنٹ (مددگار پیشی) بنایا۔ یہ خدمت بڑے اعتماد کی تھی یہ پانچوں کے ساتھ برٹش گورنمنٹ کا یہ معاہدہ تھا کہ وہ کسی انگریز کو بغیر اجازت گورنمنٹ آف انڈیا ملازم نہیں رکھ سکتے۔ اس وقت جیدر آباد میں انگریز ہی مختار (سیکریٹری) ایک انگریز مسٹر اولی فینٹ تھا۔ گورنر جنرل ولیمز جی جو پھی ریاستوں کا سخت مخالف تھا اور کئی ریاستوں کو ہرب کر چکا تھا۔ اس نے اس بنا پر کہ جیدر آباد گورنمنٹ کے مصارف کی رقم کئی سال سے ادا نہیں ہوئی تھی ریاست کے ذریعہ علاقہ برادر پر عارضی قبضہ کر لیا تھا حضور نظام ان کے امر اور اہل جیدر آباد کو اس کا بہت صدمہ تھا اور یہ واضح ایسا تھا جو دولت آصفیہ کے دل پر آخر و تمک ہر اہل اور ہر چند اس واضح کے مٹانے کی کوشش کی کہ گورنر دست مارے اور روئے نہ لے گا معاملہ تھا کامیابی نہ ہوئی۔ سر سالار جنگ نے اس حکم کا آغاز کیا۔ ان کی سب سے بڑی یاد دہانی کے یہ علاقہ انگریز گورنمنٹ سے واپس لے لیا جائے۔ ان باتوں سے انگریز گورنمنٹ بہت گھبرائی تھی۔ نواب سالار جنگ نے قدر کے زمانے میں انگریزی حکومت کے بجائے جس جو نے تعمیر مدد کی تھی وہ ایسا بڑا احسان تھا کہ انگریز ان پر مائدہ ڈالتے ہوئے جھگڑتے تھے وہ کبھی کے ختم کر دیئے جاتے۔ بلکہ اور اس قسم کے دیگر معاملات کے متعلق مراسلت انگریزی میں ہوتی تھی اور سیکریٹری مسٹر اولی فینٹ انگریزی حکومت کو ترک کر کے ترک کر دیتے تھے۔ بزرگوار صاحب ضعیف ان پر برٹش گورنمنٹ کا عتاب نازل ہوا اور ان کو جیدر آباد بھیڑنا پڑا۔ مولوی سید حسین ان کے شریک معتمد

دجائٹ سیکرٹری) تھے گو بائٹر ایک بجرم تھے۔ حیدر آباد میں جب براؤن اڈمپل کے مولوی سید حسین علی معرض عقاب میں ہیں اور حیدر دے کے بعد نکال دیئے جائیں گے تو آراب سالہ رنگ نے سن کر فرمایا کہ سید حسین کے کالے جانے سے پیسے میں خود اپنے عہدے سے استعفا دے دوں گا۔ اس سے آراب صاحب کی کمالی قدر دوانی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ مولوی سید حسین کو بہت عزیز رکھتے تھے اور ان پر کمالی اطمینان کرتے تھے۔ ان کا حکم تھا کہ کوئی انگریزی مسئلہ اس وقت تک جاری نہ کیا جائے جب تک مولوی سید حسین کی نظر سے نہ گزر جائے۔

۱۸۷۱ء میں آراب صاحب نے یورپ کا سفر کیا تو مولوی سید حسین ان کے ہم کلاب تھے۔ واپسی پر مولوی صاحب کو بنایا ریویٹ سیکرٹری اور متحدہ صبیغہ منصفیات مقرر فرمایا جس میں ہر شے تعلیم اور بعض چھوٹے موٹے محکمے شامل تھے۔ حکومت میں جب حضور نظام میر محبوب علی خان، مسند نشین ہوئے اور میر لاہن علی و عماد اساطلت بدرالہامی پرمہ فراز ہوئے تو ایک کونسل آف اڈمپٹ کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد اہم معاملات حکومت میں منظور و دینا تھا۔ اس مجلس کے محمد (سیکرٹری) مولوی سید حسین قرار پائے۔ اس کونسل کے میجسٹریٹ خود بنفس نفیس اعلیٰ حضرت (میر محبوب علی خان) تھے۔ اس سال جوشن نوروز میں ان کو علی یار خان مومن جنگ کا خطاب ملا ہوا اور ۱۸۷۳ء میں برقیہ میں جو نوروز عماد الدولہ اور شمس الدین مبارک کے مولو پر عماد الملک کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔

کرنل مارشل کی عمر ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳ء میں مولوی صاحب علی حضرت کے برائوٹ سیکرٹری مقرر ہوئے۔ علی حضرت نے دست مبارک سے اپنی زبان میں، ایک رقعہ مولوی صاحب کو لکھا جس کے الفاظ یہ ہیں:-

”آراب عماد الملک بہادر۔ آپ کے واسطے خدمت خانگی پر ایوریٹ سیکرٹری کی تفری کیا ہو جو اس خدمت کے واسطے کسی کو نہ سمجھا۔ ایسا قابل شخص انگریزی فارسی اور دوا و روایت کو عینی دیکھنے والا۔ اور جو اس خدمت کی کارروائی ہر گز وہ آپ کے پاس لکھ کر بھیجواؤں گا یا خود آؤں گا۔ مگر آپ کل دس بجے صبح میں آکر نذر دینا“

(دوستخط یا محبوب)

۱۰ جمادی الثانی ۱۳۰۶ھ روز شنبہ شب شریفہ

چند سال کے بعد ۱۹۰۲ء میں دوسرے دن صاحب سے کمارکش ہو کر وہ صرف ناطع تعلیمات (ڈائریکٹر بلک انٹرکشن) ممالک محرومہ سرکاری کے عہدے پر مقرر ہوئے اور آخر تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ یہ اگرچہ بعض اوقات اس سے بڑے مناسب پرفراز گئے لیکن انھوں نے نظام تعلیمات کو کبھی نہ چھوڑا اور ہر حال میں اپنے ساتھ لگائے رکھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ انھیں بالظن تعلیم اور علم و ادب سے خاص لگاؤ تھا۔ دوسرے وہ یہ سمجھتے تھے کہ بڑے عہدوں پر لیجائی ہوئی نظریات پڑائی میں اور افتاد کے بلکہ سفارشیوں اور سازشوں کی مدد سے ان کے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اہلیت و نااہلیت کوئی نہیں دیکھتا۔ نظام تعلیمات ایک معمولی عہدہ ہے، تنخواہ بھی زیادہ نہیں اور نفوت و اقتدار بھی واجب ہی واجب

ہے بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ دوسرے یہ مجدد دوسرے فوائد سے بھی محروم ہے۔ یاد ہو: اس کے نواب عماد الملک کا وقار بوجہ علم فضل اور اعلیٰ سیرت کے ایسا تھا کہ ان کے اعلیٰ افسر اور بڑے بڑے امراء و وزراء ان کا احترام کرتے تھے۔ وہ تقریباً ۳۲ سال تک دوسری خدمات کے ساتھ بلا وقفہ اس عہدے پر رہے۔ ریاست حیدرآباد میں باقاعدہ تعلیم کی بنیاد وہی نے رکھی اور سرشتہ تعلیم کی جاریہ تعلیم آپ ہی کے ہاتھوں ہوئی۔ مدارس اور طلبہ میں بہت کافی اعنائہ ہوا۔ علاوہ اس فرائض منصبی کے ان کے اثر اور محبت سے حیدرآباد میں علمی ذوق کو بہت فروغ ہوا صنعت و حرفت کے مدارس بھی ریاست میں آپ ہی نے قائم کئے۔ یہی صنعت کے بڑے قدروان تھے۔

حیدرآباد میں ان کے علمی ذوق کی دوسری قابل یاد کاریں ایسی ہیں جن کی افادیت اور اہمیت کبھی کم نہ ہوگی ایک کتب خانہ سرکار عالی اور دوسرا اثرۃ المعارف اس کتب خانہ کے لئے بطور عسک کے علاوہ ناوڑ اور گیارہ علمی کتابیں ایسی جمع کیں کہ اس کا شمار اس برہمچکر کے بہترین کتب خانوں میں ہو گیا۔ یہ ناوڑ و خطوط زیادہ تر عربی زبان کی ہیں۔ ان میں سے بعض ایسی ہیں کہ جی کا کوئی دوسرا نسخہ دنیا کے کسی کتب خانے میں نہیں۔ علمی کتاب کی دوسری چیزوں کی طریت کوئی خاص قیمت نہیں ہوتی۔ یہ قدروانی پر ہے۔ بعض وقت سودا کرنے میں انمول کتاب ہاتھ سے جاتی رہتی ہے اور اس کا بیچنا و اعلیٰ بھر رہتا ہے۔ نواب عماد الملک کتاب کے بڑے قدروان تھے اور اس قدروانی کا نتیجہ تھا کہ جب کوئی ایسی کتاب آگئی تو لئے بغیر نہ چھوڑتے اور منہ مانگی قیمت دیتے۔ اس دنیا میں کی بدولت کتاب فروش یا جن کے پاس کوئی اچھی یا ناوڑ کتاب ہوئی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ جو لوگ کتاب کی قدر قیمت سے واقف نہیں تھے وہ اس پر بہت سمجھتا تھے اور اسے اس وقت سے منسوب کرنے اور طعن کرتے کہ مولوی صاحب سرکاری روپیہ ان چیزوں پر ضائع کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک بار انھوں نے جارج بارکس کوئی کتابیں آٹھ ہزار روپیہ میں خریدیں اور جب رقم کی منظوری کے لئے مطلوبہ مدارالہام سرکار عالی، نواب وقار اللہ راہی کی خدمت میں پیش ہوا تو کسی صاحب نے چپکے سے کہہ دیا کہ سرکار مولوی سربراہیں صاحب کی ماموت

ہے کہ وہ کتابیں خریدنے میں سرکاری روپیہ بیکاری سے خرچ کرتے ہیں اور جو حقنی قیمت مانگتا ہے دے دیتے ہیں۔ نواب عماد الملک کو بھی اس کی سن سن پہنچ گئی۔ انھوں نے مدارالہام سے کہا کہ کتابیں واپس فرمادی جائیں، میں انھیں خود خرید لوں گا اور یہ سچ کہ اس سے جا رگنی قیمت وصول کروں گا۔ مدارالہام نواب وقار اللہ راہی نے جو بہت باعزت و باعزت قیاس اور سرپرست امیر تھے بہت معذرت کی اور فوراً رقم ادا کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ ایک ایسا ہی واقعہ میرے سامنے پیش آیا۔ نواب عماد الملک نے کچھ کتابیں خریدیں اور رقم کی منظوری کے لئے ہوم آفس کو لکھا۔ سررشتہ تعلیمات ہوم آفس کے ماتحت ہے۔ اس وقت ہوم سیکرٹری فضل العلماء نواب حیدر اللہ خان و نذر اللہ مولوی صاحب اللہ خان تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ بعض کتابیں جو مطبع نول کشور سے چند روپے میں لی سکتی ہیں ان کی قیمت ڈیڑھ ڈیڑھ اور دوسروں کے لئے تو انھیں تعجب ہوا اور لکھا کہ کتابیں ملاحظہ کے لئے بیکاری صاحب نے بلے چون وچو منظوری دے دی۔ نام کے فضل العلماء صاحب کیا جانیں کہ ایک بیان اگر دیکھیں۔ ہوم سیکرٹری صاحب نے بلے چون وچو منظوری دے دی۔ نام کے فضل العلماء صاحب کیا جانیں کہ ایک کتاب جو بازار میں دو چار روپے میں لی جاتی ہے وہی کتاب اگر مصنف کے ہاتھ کی لکھی جاتی ہو یا اس کا کوئی قدیم صحیح

نفرش جانے تو اس کی قدر و قیمت کس قدر بڑھ جاتی ہے۔ اس طرٹ نواب عماد الملک نے نایاب کتابوں کا بڑا اچھا ذخیرہ سرکاری کتب خانہ میں جمع کروایا۔

علمی لحاظ سے نواب صاحب کا دوسرا بڑا کام دائرۃ المعارف کا قیام ہے۔ اس کا مطلق بھی ہے۔ اس ادارے نے عربی کی بہت سے نادر کتابیں طبع و نشر کی ہیں۔ یہ ایسی کتابیں ہیں جن کے قلمی نسخے نایاب تھے اور دایک سے زیادہ دنیا میں کسی دوسری جگہ نہیں پائے جاتے تھے۔ ان کی قدر اور شہرت ہندوستان سے زیادہ عرب ممالک اور بلاویں میں ہوئی۔ اس ادارے کا قیام ۱۳۳۸ھ میں ہوا۔ اس وقت باغیچہ سرحدیہ ماہنامہ اس کے مصارف کے لئے مغرب ہوئے۔ اس کے بعد نواب صاحب کی تحریک پر اعلیٰ حضرت نے ۱۳۳۹ھ (۱۹۲۱ء) میں اسے ایک لاکھ روپیہ اور ایک سال بعد باغیچہ لاکھ روپیہ عطا فرمائے۔ بھارت کے ناجائز قبضے کے بعد ریاست حیدر آباد و بھوجاغات نازی ہوئیں ان میں وہ ایسی ہیں جن کا صدر کبھی نہیں بھولی سکتے۔ ایک عثمانیہ پوزیسٹی کی تحریک دور و دوری و دائرۃ المعارف کا خاتمہ۔ انیسویں نواب عماد الملک کی یہ بے نظیر علمی یادگار ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔ لیکن اس نے جو قابل قدر کام کیسے وہ ہمیشہ یادگار رہے گا اور کبھی نہیں مٹ سکتا۔

نواب صاحب کو عربی زبان سے بے حد محبت تھی۔ دائرۃ المعارف اسی محبت کا نتیجہ تھا۔ مولوی عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں:-

”مجھے ایک مرتب تک بالذات ان کی روزانہ مصنفوں میں شریک ہونے کی عزت حاصل رہی ہے اور ان کے طالب علمانہ مشاغل میں شریک ہو کر میں انسان کے علم فضل سے نادمہ انتہا کیسے اسی سبب مجھے ان کی واقفیت عامہ ان کے مذاق اور ان کے اسلوب زندگی کا اندازہ کرنے کا بخوبی موقع ملا۔ شعر کے کلام کا مطالعہ کرنے میں چند روز میں ان کے ساتھ شریک رہا اور نظر آبا کہ جیسی حقیقت نہ مبصرانہ نظر کلام عرب پر ان کی پڑتی ہے بہت کم کسی کی پڑتی ہے سچ یہ ہے کہ میں نے انھیں ادب عربی میں گیتائے روزگار پایا۔ جاہلیت عرب کے ساتھ اور خالص عربی مذاق کے دلدادہ ہیں بشرطے جاہلیت کے کلام پر سرمتھتے ہیں اور مولدین کے کلام کو بالکل بنبرپ نہ کرتے۔“

حیدر آباد یونیورسٹی کے انفرسٹرکچر کے خطبہ صدارت میں اپنے جامعہ عثمانیہ کے ذکر کے دوران میں عربی زبان کی تعلیم کا خاص طور پر تاکید کی تھی۔ فرماتے ہیں:-

”دوسرا امر جس کی طرف کار بردارانِ جامعہ علمیہ کی توجہ مبذول ہونی چاہیے وہ یہ ہے کہ اس جامعہ کے مسلمان طلبہ بطور دوسری زبان تعلیمی کے عربی کے اختیار کرنے پر مجبور نہ جائیں۔ اگر فقط اردو انگریزی پر اکتفا کیا گیا تو بحرِ ناکامی کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ دوسری یونیورسٹیوں کے کامیاب طلبہ سے آپ کے کامیاب طلبہ پیچھے رہ جائیں گے اور آپ کی ساری محنت اٹکارت جائیگی۔ طلبہ کو وہ پابری فضیلت نصیب نہ ہوگا جس کی ان کو اور ہم کو اور ان کی قوم کو ضرورت ہے۔“

عربی زبان کو مختلف جہتوں سے ہم مسلمانوں پر مبنی محکم حاصل ہے۔

اس کے بعد اس کی تفصیل بیان کی،

”میں نے اور ملک بہادریں کالج قائم کرنے کی تجویز کی تھی۔ نواب صاحب کی تائید و تحریک سے جلد منظوری حاصل ہو گئی۔ قیام کالج کے بعد آپ نے ان طلبہ کے لئے ریفینڈمنٹ کے جنھوں نے عربی زبان لی تھی اور ہر سال بغیر یاد دہانی یا تفسیل کے وقت پریمر سے پاس چیک اُچھانا تھا۔“

مودی جیپ ارمان خان شیروانی نواب صدر یا جنگ نے مرحوم نواب صاحب کے علم و ادب کے شرف کے متعین اپنی

ایک تقریر میں یہ واقعہ بیان فرمایا،

”جس سال آلی انڈیا مسلم ایجوکیشن کونفرنس گجرات میں منعقد ہوئی، وہاں پڑنی علی کتابوں کی کتابیں دیکھ کر میں نے ایک اپیل شائع کی کہ روپے کی امداد سے کران کتابوں کے خریدنے اور حفظ کرنے کا انتظام کیا جائے۔ نواب عماد الملک بہادر مرحوم نے اپیل پڑھ کر خط لکھا کہ اپیل پڑھ کر کتابوں کی کتابیں پڑیں روپے ہوں۔ افسوس ہے کہ اس وقت میرے پاس روپے نہیں اس لئے ایک ہزار روپے کا چیک پیش کرتا ہوں۔ یہ بھی مرحوم کی کرم انہی اور علم کی شہادت ہے۔“

اسی طرح نواب اسحاق خان مرحوم بیکر ٹری مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ نے امیر خسرو کی تصانیف کی اشاعت کا اعلان کیا تو نواب عماد الملک بہادر نے بہت مسرت کا اظہار کیا اور مالی امداد کا بھی وعدہ فرمایا۔ اس قسم کے علمی و ادبی کاموں کی امداد کے لئے وہ بغیر طلب اور تحائف کے آمادہ ہو جاتے تھے۔

وہ اس قسم کے تمام علمی کاموں میں بڑی خوشی اور فیاضی سے مدد دینے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۱۱ء میں نواب صاحب نے نواب محمد اسماعیل خان آنریری بیکر ٹری مدرسۃ علوم مسلمانان علی گڑھ کو خط لکھ کر امیر خسرو کی تصانیف کی نشر و اشاعت کی طرف توجہ دلائی جس کے بعض اقتباسات درج ذیل ہیں:-

”نہایت وثوق کے ساتھ یہ توقع ہے کہ اسلامی ہندوستان میں کوئی مصنف ایسا نہیں کرے جس کی تصانیف اس وجہ لائق حفاظت و اشاعت ہوں جیسا کہ امیر خسرو۔۔۔۔۔ اگر آپ کی کوشش سے اس شہور زمانہ عظیم النظیر مصنف کا پورا اہم نظم و منظم ہو کر چھپ گیا تو یہ قوم کی ایک بڑی عظیم الشان خدمت ہوگی جس کا نفع غیر محدود ہوگا اور جو سعی کرنے والوں کے نام کو بھی زندہ جاوید بنا دے گی۔“

میں دولت مند نہیں ہوں۔ اگر میرے پاس دولت ہوتی تو میں اس کام کے لئے اس کو وقف کر دیتا۔۔۔۔۔ میں ہر جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا میں اس کام میں مانی

مردودوں کا اور اپنے احباب سے بھی کچھ رقم وصول کر کے بھیجنے کا کام شروع کرنے کے لئے
خود ایک ہزار روپے اس وقت دینا ہوں اور بوقت ضرورت ایک ہزار اور دو لگا دیا

اس کے بعد نواب اسحاق خان بالکل آمادہ ہو گئے۔ نواب عمار الملک نے دو ہزار روپے۔ سرکار عالی سے سادھے سات
ہزار، نواب سالار جنگ سے ایک ہزار، مولوی انوار اللہ خان صاحب (فضیلت جنگ) سے پانچ سو لکھ گیارہ ہزار جمع کر کے
بیجے۔

اسی طرح وہ اہل علم کی مدد کرتے تھے اور جب کبھی ان کے علم میں آ جانا کہ فلاں عالم کوئی مفید علمی کام کر رہا ہے تو سفارش
کر کے حکومت سے امداد و تولد میں ویرنہ نہ کرتے۔

مولانا محمد وائیں لڑکی مرحوم ایک عالم تھے۔ علوم اسلامیہ پر ان کی نظر بہت وسیع اور گہری تھی بہت بڑی خیال
اور نمائندہ زندہ دلان اور خوش مزاج بزرگ تھے۔ وہ مصنفین اسلام پر ایک کتاب کیا انسا بیگلر بیڈیا لکھ رہے تھے۔ ایک سبیل
مصر میں طبع ہوئی تھی اور وہاں کے علمائے اسے بہت پسند فرمایا۔ دوسری جلد کی نوشت ابھی نہ آئی تھی کہ جنگ عظیم کی آفت
نازل ہوئی اور وہ مسودہ تلف ہو گیا۔ میں نے نواب عمار الملک بہادر سے اس کا تذکرہ کیا تو انہوں نے فوراً اعلیٰ حضرت منظور
نظام کو لکھ کر مقرر کی حاصل کی اور مولانا کو جید رآبا و غلب فرما کر اس کام پر مامور کر دیا اور ایک مفتون خواہ ان کے لئے مقرر
ہو گئی اور ایک مختصر مسماعلہ بھی دے دیا گیا۔ یہ بہت وسیع اور عظیم الشان کام تھا۔ مولانا وائیں رات میں ہی مصروف رہتے تھے
چند جیسے دائرۃ المعارف میں طبع بھی ہوئے۔ باقی جلدات عثمانیہ یونیورسٹی کے ادبی انبار میں پڑی سرکاری ہیں جن کا اب کوئی
قدردان نہیں۔ اس تصنیف کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جب اس کے بعض حصے ڈاکٹر کریم شہید کی نظر سے گئے تو سرکاری علوم کے
محقق خاص بن گئے تو انہیں یقین نہ آنا تھا کہ یہ اتنا بڑا اور ایسا مشکل کام ایک فرد واحد کیا ہوا ہے۔

اسی طرح جب مولوی عبد الجبار خان ملک پوری نے کوئی کی مسودہ تالیف شروع کی تو نواب صاحب نے سفارش کر کے
دولت اصفیہ سے چھ ہزار روپے منظور کرائے۔

مولوی عبد اللہ خان نے بعض بہت مفید علمی کتابیں بھیجو کر شائع کیں۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور کتب خانہ اصفیہ
میں رہتے تھے۔ نواب صاحب نے ان کی سرپرستی فرمائی اور سرو آزاد اور آزاد نظام عباسی کتابوں کی اشاعت پر اپنی جیب سے
مختلف اوقات میں کئی ہزار روپے عنایت فرمائے اور اعلیٰ حضرت سے سفارش کر کے تاحیات پچاس روپے وظیفہ مقرر کر دیا۔
پیسے ہی ایک دو صاحبوں کا جو علمی یا مذہبی کام کر رہے تھے میں نے ان سے اور انہوں نے اعلیٰ حضرت سے
سفارش کر کے منصب ایجنی و دوائی وظیفہ مقرر کر دیا۔

عالم علموں کی اکثر مدد کرتے رہتے تھے اگر کسی تعلیم کے شوقین ناوار دا لب علم کی سفارش کی تھی تو تعلیمی وظیفہ مقرر کر دیتے
ایک روز مجھ سے فرمائے گئے کہ کوئی سے ایک نوجوان عبد الرؤف کا خط آیا ہے جو ابھی اچھی انگلستان سے بیرسٹری کی ڈگری لیکر
آئے ہیں لیکن جو کچھ اسطاعتی اپنا کام شروع نہیں کر سکتے۔ انہوں نے مجھ سے مالی مدد طلب کی ہے۔ میں نے کہا یہ نوجوان میرن صاحب
کے نواسے ہیں۔ ان کو اس کا علم نہ تھا۔ لیکن وہ اس نوجوان کے حسن تحریر سے اس قدر متاثر ہو گئے کہ فوراً لکھ کر بھیجا کہ تمہیں کس

تندرتم کی ضرورت ہے، اخلاص و دکر اس کا انتظام کروا جائے۔ وہ بھی ایسے خود وادار و شریف انفس تھے کہ جواب میں لکھا: یہاں حسب دل خواہ انتظام ہو گیا ہے۔ آپ زحمت نہ فرمائیں۔ ایک روز مجھ سے پوچھنے لگے کہ کیا معلوم ہوا ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے طلبہ کی ٹیم کھیلوں کے دورے پر جا رہی ہے۔ میں نے کہا: ملان فلاں مقام پر جائیں گے۔ بیسنے کے بعد کی سوئیچے ان کے سفر خرچ کے لئے بھیج دیئے۔

نواب صاحب کا ادبی ذوق اعلیٰ دیکھنا۔ فارسی اور عربی کے جید عالم تھے فریخ خوب جانتے تھے اور انگریزی زبانی پر حیرت انگیز قدرت تھی۔ وہ ایرانیوں سے فارسی میں اور عربوں سے عربی میں بلا تلافی گفتگو کرتے تھے۔ جب میرزا نادر خان ہندوستان آئے اور ان کے پروگرام میں علی گڑھ کلن کا معائنہ بھی تھا تو نواب محسن الملک نے امیر صاحب کی خدمت میں پیش کر کے ملنے کا دعویٰ کیا۔ سپاس نامہ نواب حماد الملک بہادر ہی سے لکھا یا تھا۔ عربی اوب کے ذوق کے متعلق نثر صاحب کی رائے لکھ چکا ہوں کہ وہ جاہلیت کے شعاع کے سوا وہ اور پر جوش کلام کے بہت مراح تھے اور مرتدین کا کلام پسند نہیں کرتے تھے۔ فارسی میں وہ شیخ سعدی کے بہت فاضل تھے اور شیخ کی عاشقانہ شاعری کو حافظ کی شاعری پر ترجیح دیتے تھے۔ اردو میں بکھیتی کی شاعری بہت نا پسند تھی۔ انھیں لغوی عنایت سے جس پر لکھنوی شاعری کا ورد و مدح اور عیانہ خیالات بہت چڑھتی۔ وہ کہتے تھے کہ ہماری زبانوں (اردو، فارسی، ہندی) میں نثر بھی ہی نہیں وہ ایک قسم کی شاعری یا نیم شاعری تھی۔ حالی نے اردو کو تین نثر خطا کی جو علمی اور ادبی مضامین ادا کرنے کی قوت رکھتی ہے۔ میرا میں کی شاعری کے بہت مراح تھے اور ان کے کام کے بعض اشعار انھیں وہ ان کا شکر کا سمجھتے تھے۔ زبان کی یاد تھے اور کبھی کہتے تھے لیکن کتنے تھے میر صاحب جن بعض اوقات لغوی رعایت اور صنائع بدائع سے واپس نہ جاسکے۔ جتنا پھر فرماتے تھے کہ میں نے میر صاحب سے پوچھا کہ ”آپ غلطی رعایتوں اور صنائع بدائع کو پسند کرتے ہیں“ تو انھوں نے جواب دیا: نہیں! لیکن آخر لکھنؤ میں درخت ہے۔ انگریزی زبان میں متعدد شعاعے اور مضامین اور نظمیں جو انھوں نے مختلف ادفات میں لکھیں کتاب کی صورت میں شائع ہو گئی ہیں۔ اس جنم میں ان کا وہ فاضلانہ مقالہ بھی ہے جو انھوں نے ”اصطلاحات علمیہ“ پر تجزیہ فرمایا تھا۔ یہ آج سے تقریباً سو راسی پرانے برس پہلے لکھا گیا تھا مگر اب بھی پڑھنے کے قابل ہے اور اس میں جو نکات اصطلاحات کے وضع یا ترجمہ کرنے یا اپنے مندرجہ الفاظ کو کام میں لانے کے متعلق بیان کیے ہیں اور انگریزی اصطلاحات کو جنہم اختیار کرنے کے خلاف جو بحث کی ہے اور اس مسئلہ کے متعلق بعض مختلف آرا پر جو عقیدہ فرمائی ہے اس کا مطالعہ اب بھی ہمارے لئے مفید ہو سکتا ہے۔ نواب صاحب کی انگریزی انشائیہ وازی کے نہ صرف ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ بلکہ اہل زبان بھی معترف تھے۔ ۱۹۰۷ء میں مسلمانوں کا ایک وفد آغا خان کی سرکردگی میں لاٹوٹو کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ مسلمانوں کا بہت اہم اور تاریخی وفد تھا جس میں ملک کے متعدد صاحب الزائے اور نام و نمود کے مسلمان شریک تھے۔ یہ وفد مسلمانوں کے لئے بہت فائدہ تھا۔ تفسیر فقہیم نکال کے بعد مسلمانوں میں عام طور پر پاکسی اور افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ وفد کی تجویز نواب محسن الملک کے فکر رسا کا نتیجہ تھی جو اپنے وقت کے نہایت دور بین اور روشن خیال سیاست دان تھے۔ انہی نے آغا خان کو گھیرا اور نواب عماد الملک کو بلا کر وہ ایڈریس لکھوا دیا جو اس کے لئے خدمت میں پیش کیا جانے والا تھا۔

صرف وقت کے تقاضے کو ملحوظ رکھنا اور دوسرا قدیم رسم و رواج اور وضع کا بایں نہ تھا۔ جہاں سنتا وہیں رہا۔

امیرانہ شان سے رہنے تھے لیکن اس میں نقص نہ تھا۔ عالی شان کو کچھ بھی اور اسی مناسبت سے اس کا فریخ اور سامان تھا۔ مزاج میں بہت لطافت تھی۔ عائی کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ریاست میں ان کا کوئی بہت بڑا عہدہ نہ تھا۔ لیکن زمانہ ملازمت میں اور خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی ان کی خودداری اور وقار ایسا تھا کہ تمام عہدہ دار اور امراء و وزراء ان کا بہت ادب و احترام کرتے تھے اور اس طرح ملتے تھے جیسے کوئی خورہ کسی بزرگ سے ملتا ہے۔

ان کی امیرانہ شان و معاشرت اور زلفا پر ہی مکمل رکھا تو اور عجب داب کو دیکھ کر لوگ ان کے پاس جاتے تھے کبیرتے تھے لیکن وہ بہت صاف باطن و باہر تھے اور کسرا مزاج تھے۔ خاص کر اہل علم سے اہل کبریت خوش ہوتے تھے اور بے تکلف علمی باتیں کرتے تھے۔ ایسے وقت میں کوئی بڑا شخص آجاتا تو بیٹے سے صاف انکار کر دیتے۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ ان کے فرزند نواب عقیل بیگ ان سے ملے آئے۔ اس وقت نواب صاحب کے پاس مولوی ہاشم ندوی بیٹھے ہوئے تھے جو نواب صاحب کے کتب خانے کی ترتیب وغیرہ کا کام کرتے تھے۔ نواب عقیل بیگ نے شہادت کے لئے میں آئے تو مولوی صاحب نے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔ کیا نیچے آپ کا جھٹکا کھڑا ہے دھڑکا دیکھیں ایک ادنیٰ قسم کی سواری ہے، ہاں یہ بیٹے ہی نواب صاحب سخت پرہیزگار اور کٹنگے تھے۔ تم اہل علم کی توہین کرنے ہو؟ نہ سہولت کے لئے تھا دیا اب ایک دانے میں جو تیاں چھٹا چڑھا تھا، غرض اس بری طرح ڈانٹا کہ وہ باپنی پائی ہوئے عقیل بیگ کا اشتیاطن کرنا نہ تھا۔ بات یہ ہے کہ مولوی صاحب کا جھٹکا پورے کوئی نو بیس میں بیڑیڑ کے میں سہنے کھڑا تھا جس سے ملے جانے والوں اور دوسری سواروں کو زحمت ہوتی تھی۔ غرض یہ کہ اس معاملہ میں نواب علی الدین بہت سخت تھے۔ وہ علم کی قدر کرتے تھے خواہ صاحب علم کیسی ہی سستہ حال اور پیٹے پرانے پتروں میں ہو۔ وہ خود بھی طالب علم تھے اور باوجود اس وجہ پر پیچھے گئے ان کے مزاج میں طالب علمانہ مساوگی موجود تھی اور ادنیٰ مٹی گشتگو میں ان کا اندازہ نہ تھا طباطبائی ایسا ہی ہوتا تھا جیسے ایک طالب علم سے ہر تلبے۔ اس وقت وہ وقتی مراتب کا بالکل خیال نہیں کرتے تھے۔

آر و روزانہ ادب سے انھیں خاص لگاؤ تھا چنانچہ حیدر آباد آنے کے دو دن ہی میں اس کے لئے ایک ماہانہ آر و روزانہ "عزیز القواعد" جاری کیا۔ ہر سالہ و سالیانہ جاری رہا۔ اس میں متعدد ماہانہ شائع ہوئے ان میں سے شہادہ بیشتر سائنسی موضوع پر تھے۔ ہمارے تعلیم یافتہ حضرات کے شعاریں اب تک یہ بات واصل ہے کہ آپس میں انگریزی میں بات چیت کرنے میں اور انگریزی میں خط و کتابت کرتے ہیں۔ نواب علی الدین ملک ہمیشہ آر و روزانہ میں گفتگو کرتے تھے ایسے لوگوں سے جن کی زبان اردو ہے یا جو آر و روزانہ جانتے تھے۔ انگریزی میں بات چیت کرنے کے لئے انگریزی اور جو کچھ اتفاقاً جانتے تھے۔ البتہ جب کسی ایسے شخص سے ملاقات ہوتی جو آر و روزانہ جانتا تھا مثلاً ایرانی، عرب یا انگریز تو اس سے اس کی زبان میں باتیں کرتے تھے۔ ایک بار ایک صاحب جو پیسے بڑے اندیا میں ایک اعلیٰ عہدے پر تھے اور بعد میں بیرونی میں وزیر چکے تھے نواب صاحب سے ملے آئے اور اتنے ہی انگریزی میں گفتگو کرنی شروع کی۔ نواب صاحب نے فرمایا ہماری زبان انگریزی نہیں اور نہ غالباً آپ کی ہے۔ کوئی انگریز آجاتا ہے تو میں اس سے سڑیڑ انگریزی میں بات چیت کر لیتا ہوں ورنہ میں انگریزی

زبان میں بات چیت کرنا ناپسند کرتا ہوں۔ وہ صاحب بہت نڈر مندہ ہوئے اور معذرت کر کے فریڈی۔ وہ ہندوستان کے نظام تعلیم کو اس وجہ سے بھی ناپسند کرتے تھے کہ اس میں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے۔ ان کی رائے میں یہ طریقہ صرف اصولی علم میں مانے جاتا ہے بلکہ اس کا اخلاق پر بھی برا اثر پڑتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جامعہ عثمانیہ کے طریقہ تعلیم کے حامی تھے کہ اس میں ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ چنانچہ ان خیالات کا اظہار انھوں نے اپنے خطبہ صدر اساتذہ جیدہ آباد اور ایجوکیشنل کانفرنس صنعت و جیدہ آباد وکن ۱۹۱۷ء میں کیا ہے جس کا مختصر اقتباس پیش کیا جاتا ہے :

”ماذی مدارس میں ابتدا سے انگریزی مشروٹ کر دی جاتی ہے جو ہمارے لئے ایک اجنبی اور نہایت اوق زبان ہے اور بڑے محبور کئے جاتے ہیں کہ تمام تہذیبی فنون مثلاً حساب جغرافیہ تاریخ وغیرہ کے اسی غیر مانوس زبان کے ذریعہ کیجیں جس کا نتیجہ یہ بنتا ہے کہ اپنی زبان سے کم و بیش نا الف رہ جاتے ہیں اور انگریزی بھی سچی طرح نہیں آتی۔ بیشتر فقہاء و فطہر کو دس دس بارہ بارہ سال اسکول ہی کی حدود کے اندر صرف کرنے پڑتے ہیں۔ اس موعودہ دراز میں ان کو کیا حاصل ہوتا ہے۔۔۔ انگریزی قدرے قلیل سیکھ لیتے ہیں۔ انگریزی میں حساب کے معمولی سوالات کا جواب دے سکتے ہیں۔۔۔ جغرافیہ جانتے ہیں، اقطار و دنیا کے نام جانتے ہیں، خاص خاص ملکوں کے مشہور و معروف شہروں، مدیوں، پہاڑوں، کنے انگریزی نام بتا سکتے ہیں اور نقشے میں ان کا نشان دے سکتے ہیں، یورپ خصوصاً انگلستان کی تاریخ کسی قدر جانتے ہیں، ہندوستان کی تاریخ سے بھی ایک حد تک واقف ہیں اور اب کو بتا سکتے ہیں کہ جہانگیر ایک شرابی مملکت سے بے خبر اور اورنگ زیب ایک سخت منتعصب اور ظالم بادشاہ تھا۔ اپنی زبان سے بالکل لاعلم نہیں کہ سر بول لیتے ہیں مگر اپنی مذہبی زبان اور بزرگوں کے عنبر و احادیث کا نقل و بلد ہیں۔ طبع میں چار پانچ سال تعلیم پانے کے بعد ان کی حالت میں زیادہ تغیر نہیں ہوتا۔ پھر اس کے ہمہ تن مغربی و غلط فہم بن جاتے ہیں۔ ہر امر میں مغربی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے قومی اخلاق اور پاکیزہ تہذیب چھوڑ کر مغربی اخلاق اختیار کر لیتے ہیں۔ اس میں گنت و تشہید بات چیت سلام علیک سب انگریزی زبان میں کرنا ان کو کھانا ہے۔ کھانا پینا انگریزی سم کا پسند کرتے ہیں۔ اپنے آٹھ کر وٹم نہ جان ہند کو مسلم ڈھاکہ کسی کے نام سے شرف بخشتے ہیں۔ اپنی زبان میں تقریر و تقریر کرتے ہیں تو اس میں حتی الوسع انگریزی لغات کی بھرا کر دیتے ہیں۔ بہتوں کو نماز نہیں آتی سو رے یاد نہیں۔ ایک صاحب کو میں نے تسبیح کلمہ توحید تک معلوم نہ تھا کہ

کیا شے ہے اور کس کا نام ہے؟
 ”اگر میں انگریزی ذریعہ تعلیم کے متعلق فرماتے ہیں،
 ”اگر یہی حرفہ تمام راجہ تو جاری آباؤی زبان یعنی اردو ایک جاہلانہ زبان رہ جائیگی
 اور عام طور پر ہمارے ہم قوم و ہم وطن علوم مغرب سے نا آشنا رہیں گے۔۔۔۔۔
 اگر اس مبارک عثمانیہ یونیورسٹی یعنی جامعہ عثمانیہ کو جس میں خاص اردو زبان واسطہ
 تعلیم علوم و فنون قرار دی گئی ہے حسب امید کامیابی ہوگی تو یہ سیرت جانیے گا
 اور ہماری زبان قلیل عرصے میں دولت علیہ سے مالا مال ہو جائے گی۔“

جب ۱۲۸۶ھ میں انجمن ترقی اردو کا کام شروع ہوا تو میں نے عداوت کے لئے نواب صاحب کا نام پیش کیا۔ انجمن
 کی مجلس انتظامی نے بلا اتفاق منظور کیا اور تحقیق یہ ہے کہ ہر اختیار سے کوئی دوسرا شخص ان سے بہتر نہیں انجمن کی عداوت کیے
 نہیں مل سکتا تھا۔ انجمن کو ان سے علاوہ ادنیٰ عینی مشورے کے ہر قسم کی مدد ملی۔ مثلاً میں نے ایک دن عرض کیا کہ اگر آپ
 ہلائی نس آغا خان سے انجمن کی امداد کی درخواست فرمائیے تو امید ہے کہ معقول عطیہ مل جائے۔ کیونکہ وہ قومی اور دینی کاموں کی
 امداد میں بہت فیاض ہیں۔ انھوں نے فوراً کاغذ رقم لے کر فارسی زبان میں خط لکھ مارا۔ مگر آغا خان نے کوئی جواب نہ دیا اس
 زمانے میں آغا خان یورپ میں تھے۔ اس کے کچھ دنوں بعد ہی سید راس مہود نے انگلستان کا قصد کیا۔ میں نے ان سے کہا آغا خان
 جی آج کل وہیں تشریف رکھتے ہیں وہ ان کو لکھنا کہانیے گا۔ حضرت نے نواب عماد الملک کے خط کا جواب نہ دیا یہی عداوت
 سفر سے واپس آئے تو کہا آغا خان سے ملا تھا۔ انھوں نے فرمایا کہ فلاں تاریخ کو بمبئی پہنچے والا ہوں وہاں ملے۔ چنانچہ اس
 تاریخ کو میں اور سید صاحب بمبئی پہنچے۔ معلوم ہوا کہ وہ پونا تشریف لے گئے ہیں اور کہہ گئے ہیں کہ پونا آکر ملنے۔ میں نے سید صاحب
 سے کہا۔ بس آپ تشریف لے جائیے۔ مجھے معاف رکھئے۔ وہ گئے۔ ہزبانی نس آغا خان نیاک سے ملے۔ انجمن کا معروضہ سماعت
 فرمایا۔ اپنے کاغذ خاص کو بلا باع حکم دیا کہ انجمن کو ایک ہزار روپیہ مانگے حساب سے دس ہزار کا عطیہ ہماری طرف سے دیا
 جائے۔ اس نے فوراً یہ حکم اپنی دستخطی میں لٹک لیا۔ اس کے بعد کئی بار یاد دہانی کی گئی جواب نہ دارو۔ بڑے آدمیوں کے وعدے
 ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جی جتنا بڑا ہوتا ہے اس کے وعدے کے ایسا کو بھی اتنی ہی ورنہ کتنی ہے۔ میرے پاس ایسے بہت سے شاندار
 وعدے کو تجربہ ہیں۔ اس دن وہاں میں قرائن کی کچھ اور کچھ نہ ہوگی۔ ایک روز داؤد خورشید کے آگے پیش کر دے پڑیں گے۔

اسی طرح جب بی جید راجا سے وطن دشمنی ہند، جانے لگا تو نواب صاحب نے عرض کی کہ اگر مناسب ہو تو انجمن
 کی امداد کے سلسلے میں ایک خط نواب صاحب رام پور راجا صاحب عادل خان کے نام منابت فرمایا جائے۔ آپ نے ایک خط
 فرمایا رسوائے ریاست رام پور کے نام لکھ کر دیا جس میں انجمن کے کارناموں کا مفصل ذکر تھا۔ میں نے یہ خط لے کر نواب صاحب
 کی خدمت میں پیش کیا۔ چند سطریں بڑھ کر اپنے مختص خاص کے جواب کر دیا جس نے جانے کہ انجمن کے متعلق کچھ عرض کروں لیکن انھوں
 نے نواب عماد الملک کی توصیف و نشانہ شروع کر دی۔ وہ ان کا نام بڑے ادب سے لیتے تھے اور ان کی باتوں سے صاف معلوم
 ہوتا تھا کہ ان کو نواب عماد الملک سے خلوص ہے۔ وہ ملتیانہ لہجے میں مجھ سے بار بار کہتے رہے کہ کسی طرح آپ انھیں یہاں

لایسے مجھے بے حد مسرت ہوگی۔ میری بڑی قناعت ہے کہ وہ کچھ دن میرے پاس آکر رہیں۔ میں نے کہا ان کی ٹانگ کو جب تک صدمہ پہنچا ہے انہیں اٹھنے بیٹھنے میں بہت تکلیف ہوتی ہے جب کسی سے ملاقات کرنی ہوتی ہے تو اپنے خاص کمرے سے پیٹے وار کرسی میں باہر آتے ہیں۔ ایسی حالت میں ان کا بہانہ آنا محال ہے۔ کہنے لگے آپ کسی طرح انھیں بلوئی تاکہ لے آئیے پھر میں بمبئی پہنچ کر نہایت آسائش و آرام کے ساتھ یہاں لے آؤں گا۔ غرض میں وہاں تین چار روز رہا۔ بہت خوشی سے ملے۔ بلکہ بعض اوقات دور ہی سے دیکھ کر بڑے تپاک سے "آئیے آئیے مولوی صاحب آئیے" کہتے اور تڑپ کر اوجھڑا دھس کر باتیں کرتے رہتے لیکن انھیں کا معاملہ کبھی بچ میں نہ آنے دیتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو غیر ضروری اور بے جا کاموں میں روزانہ زہر ادا دے روپے صرف کر دیتے ہیں۔

اورنگ آباد سے مجھے اکثر سرکاری کاموں یا محکمہ تعلیم یا یونیورسٹی کی کمیٹیوں میں شرکت کے لئے حیدر آباد یا دہلی یا ٹانہ خوا۔ قیام حیدر آباد کے ان آیام میں نواب صاحب سے ملنا نہ ہوتا تھا۔ ایک روز جو میں گیا تو چلتے وقت مجھ سے پوچھے گئے کیا امیر علی بنک کی قیام گاہ کے قریب ہے؟ میں نے کہا یہاں قریب ہی ہے۔ فرمایا یہ خط بنک میں بھجوا دیجئے گا۔ آخر زمانے میں وہ چلتے وقت کسی ایسے ملنے والے سے جو قابل اعتماد ہو اور جس سے تکلف نہ ہو رخصت کے وقت یہ پوچھ لیتے تھے کیا لوگ خانہ آپ سے قریب ہے؟ اور جو وہ کہنا کہ قریب ہے تو وہ اپنے خط و دے دیتے تھے کہ بریڈاک میں ڈروا دیجئے گا۔ میں نے مکان پر ہنر خط بنک میں بھجوا دیا۔ دوسرے دن بنک نے مجھے اطلاع دی کہ نواب عطاء الملک نے دو ہزار کا چیک انھیں کے نام پر بھیجا تھا جو انھیں کے حساب میں درج کروایا گیا ہے۔ دوسرے دن جو میں ملنے گیا تو میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ فرمایا اس کا اعلان نہ کرونا اور کسی اخبار یا پورٹ میں لکھنا۔ میں نے عرض کیا کہ یہ رقم انھیں کے حساب میں درج ہوگی تو سالانہ رپورٹ میں بھی ذکر آجگا اور جیسے اور عطیات کا اعلان کیا جاتا ہے اس کا بھی کیا جائے گا۔ آپ بوضوح فرماتے ہیں اس میں کیا مصلحت ہے۔ کنگ کو بھی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا وہ کہے گا مجھے کیوں نہیں دیا۔ اس کی تشریح کی ضرورت نہیں جو لوگ حضور نظام مرہٹا کی علی خان کی عادات و خصائل سے واقف ہیں وہ سمجھ گئے ہوں گے۔

رسالہ اردو کو بالائزمام پڑھتے تھے۔ بعض اوقات بعض مضامین کے متعلق رائے یا مشورہ دیتے اور کبھی کبھی الفاظ کی صحت و غلطی کے متعلق رائے لکھ دیتے۔

جب نواب یوسف علی خان سالار جنگ ثالث عمدہ مدارالمہامی پرنس فرما رہے تھے تو اس خیال سے کہ یہ نوجوان ہیں اور نظم و سنن ریاست کا تجربہ نہیں رکھتے نواب عطاء الملک ان کے مشیر مقرر ہو گئے۔ اس زمانے میں آپ نے ایک گشتی مرسرہ جاری فرمایا جس میں حکامک محروسہ سرکار عالی کے تمام دفاتر کو ہدایت کی کہ اگر دوسرا سون میں بلاوجہ انگریزی الفاظ استعمال نہ کئے جائیں۔

انھیں جھوٹ سے سخت نفرت تھی اور جھوٹ کو کبھی منہ نہیں لگاتے تھے۔ ہمارے شرفاء و مروت میں اگر یا نابلیغ قلوب کی خاطر یا اس خیال سے کہ دل شکنی نہ ہو سچ کو چھپاتے یا جھوٹ کے فریب میں مبتلا ہیں۔ یا ایسے کام کی حامی بن جیتے ہیں جو وہ نہیں کر سکتے یا اس کا کرنا ان کے ضمیر کے خلاف ہے۔ اس کا نتیجہ کذب یا سفسٹیا فی ہر تلبتہ۔ نواب عطاء الملک کا مسک

بالکل صاف تھا۔ جب وہ کسی کام کو نہیں کر سکتے تھے یا نہیں کرنا چاہتے تھے یا اسے اپنے اصول اور وضع کاری کے خلاف سمجھتے تھے تو صاف انکار کر دیتے تھے۔ انھوں نے جبراً آواؤ اُسے کے بعد جو عزمین الفوائد رسالہ نکالا تھا اس میں ان کا ایک مضمون ”راستی و راست باؤی“ شائع ہوا تھا۔ اسے پڑھ کر ان کی سیرت سامنے آجاتی ہے۔ وہ راست گفتاری اور صاف گوئی میں نیک نام نہیں بدنام تھے۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خان نے برسبین تذکرہ اپنے صاحبزادے اور اعلیٰ ارکان ریاست سے جو اس وقت حاضر تھے پوچھا کہ لوگوں کا میری خدمت کیا خیال ہے۔ ان صاحبزادوں نے عرض کیا کہ رعایا حضور کی فیاضی، رحمت و تدفین، سباست و تدبیر کا روائی اور عالی داعی کی صلہ مدراج ہے۔ عرض ہر ایک نے تقریب کے بل باندھ دیئے۔ نواب محمد المکمل خاموش بیٹھے رہے۔ آخر اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔ مولوی صاحب آپ نے کچھ نہیں کہا۔ نواب صاحب نے کہا۔ لوگ کہتے ہیں کہ آپ شرب پیئے پڑے رہتے ہیں۔ کام کی طرف بالکل توجہ نہیں کرتے۔ صرف اٹھا کارروائیوں کی کئی مینیجمنٹ پی رہتی ہیں۔ ریاست کا اختلاف مزب ہو۔ ہلے ہے۔ یہ سننا تھا کہ دربار میں سنا چکا تھا اعلیٰ حضرت نوراً اٹھ کر اندر چلے گئے۔ جن لوگوں نے ہمارے سابق بادشاہوں کے حالات پڑھے ہیں انھیں معلوم ہے کہ ان کے حضور میں خفیہ سے اختلاف ہیں مگر جی جانی کی بغیر نظر نہیں آتی تھی۔ یہی حال دولتِ اقصیٰ کے فرمانرواؤں اور ان کے پیشتاب و نشانہ داروں کے درباروں کا تھا۔ ایسی جہالت تو کبھی خفیہ سے خفیہ اختلاف کی بھی محال نہ تھی۔ ان کے دربار مولوی صاحب کی یہ سب بیانی سن کر دنگ رہ گئے اور در رہے تھے کہ دیکھئے اعلیٰ حضرت قدر قدرت کا کیا عتاب نازل ہوتا ہے۔ دوسرے روز اعلیٰ حضرت نے نواب محمد المکمل کو یاد فرمایا۔ جب حاضر ہوئے تو فرمایا، آپ کو سب کے سامنے ایسا نہیں کہنا چاہیئے تھا۔ نواب صاحب نے عرض کیا کہ حضور نے سب کے سامنے دریافت فرمایا تھا۔ اگر میں سب کے سامنے ایک بات کہتا اور خلوت میں دوسری توجہ جوٹ اور منافعت ہوتی۔ اعلیٰ حضرت تب اندر سے باہر تشریف لائے تھے تو ان کی ایک مٹھی بند تھی۔ نواب صاحب کا جواب سننے کے بعد اعلیٰ حضرت نے معنی کھولی اور الماس کی ایک بیش قیمت انگلی کی عطا فرمائی۔ نواب صاحب کے فرزند نواب ہمیدی یا رجب نے مجھے وہ انگلی دکھائی تھی۔

اب آپ اس شریف النفس اور ہر لحاظ پر فرماؤ کہ فرزند اور جانشین آصف جاہ سابق میر عثمان علی خان کا حال مٹنے کے اس نے نواب صاحب کی راست گوئی کا کیا صلہ عطا فرمایا۔ کوئی راجہ دیہ بھی یا وہ نہیں، مگر جہادِ حیرت پشاور یا جہانچہ نا بھریا کوئی اور ریاست کے مہمان تھے۔ اعلیٰ حضرت نے ان کے اعزاء میں اپنے عمل میں ایک بڑا اثر ڈال دیا۔ کھانے کے بعد باتوں باتوں میں مسئلہ ازدواج پر بحث چھڑ گئی۔ اس میں کہیں اعلیٰ حضرت نے یہ کہہ دیا کہ اسلام میں اس بارے میں بہت سہولت اور آزادی ہے۔ نواب صاحب نے فوراً ٹوکا کہ یہ صحیح نہیں ہے، اسلام نے اس معاملہ میں ایسی کڑی شرط لگا رکھی ہے کہ آدمی ایک سے زیادہ بیویاں نہیں رکھ سکتا۔ نشانہ دکن کو اختلاف کی تاب کہاں سخت برہم ہوئے اور طیش میں آکر فرمایا کہ آپ یہاں سے چلے جائیے۔ نواب صاحب فوراً اٹھ کر چلے آئے۔ دوسرے روز علی الصبح اعلیٰ حضرت کے معتمد بیٹی علیات الدین (انکھریٹنگ) نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ اعلیٰ حضرت نے فرمایا ہے کہ آپ ریاست جبراً راہ سے چلے جائیے اور آپ کو کونسل آف سٹیٹ کی مستعدی کی چونخواہ اب

مندر طتی رہی ہے وہ بھی واپس کر دیجئے۔ نواب صاحب نے کہا کہ وہ رقم بطور امانت بنک میں جمع ہے۔ میں اس کا ایک حصہ بھی اپنے تصرف میں نہیں لایا۔ وہ آج ہی واپس کر دی جائے گی۔ اور اسی روز حیدر آباد کو الوداع کہہ کر پرنالہ نیشنل لے گئے۔ شخصی حکومت کے فرمانرواؤں کا دلنے ٹوٹنا ہے بلکہ انھوں نے نواب صاحب کو بے شکیر، بے اصولے، گھڑی میں فرشتہ اور گھڑی میں شیطان، جو شخص انھیں پر خط لکھتا ہے "حماد الملک ہماور خزا لا فاعل والاقران" آپ کے ساتھ ہم کلامی و ہم طعانی نہ ہو کر ایک زمانہ گذر گیا ہے لہذا کل صبح وہ سب کے شریک بریک فاسٹ ہوں تو باعث مسرت ہے۔ ایک خط میں نواب صاحب کے اندیا کو تسلی سے مستغنی ہونے پر لکھتے ہیں ایسی با وقعت حدوت سے وقعتہ استغنا دے دینا تمام مسلمانان ہند کے لئے ایک بار مسرت کا باعث ہے کیونکہ آپ جیسا مدبر، معاتب دلتے، مخرب کار، واقف اسرار پھر دوسرے شخص اس خدمت پر شغور ہوا محالات سے معلوم ہوتا ہے۔۔۔۔۔ یہ وہ الفاظ ہیں جن سے وہ اپنی ریاست کے بڑے سے بڑے امیر با وزیر کو مخاطب نہیں کرتے وہی شخص ان کو ارجحان کے استاذ بھی ہیں اور بارے نکال و تیلے اور دربار ہی سے نہیں حیدر آباد سے خارج البند کر دیتا ہے۔

دوسرے روز جب صاحب ریڈیڈنٹ کو معلوم ہوا تو وہ اعلیٰ حضرت سے ملے اور بہت افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ نواب صاحب، الملائک محمدی شخص نہیں مسلمانان ہند کے ولوں یہاں کی بری عزت و وقعت ہے اور حکومت ہند بھی ان کو بڑی عزت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ ان کے ساتھ چار و بار تاؤ ہوا ہے اس سے لوگوں میں آپ کی طرف سے بہت ناراضی اور بدگمانی پیدا ہو گئی۔ چنانچہ نور ان کو دہلی کا فرمان بھیجا گیا۔ وہ اس واقعہ سے بہت آزدہ خاطر ہو گئے تھے اور آٹا نہیں چاہتے تھے نہیں اپنے فرزندوں اور احباب کے اصرار پر واپس آ گئے جس روز حیدر آباد پہنچے تو اعلیٰ حضرت نے فوراً ملاقات کے لئے طلب فرمایا۔ نواب صاحب نے کلام بھیجا کہ میں ٹھکا ہوا ہوں اس وقت نہیں آ سکتا۔ لیکن اعلیٰ حضرت نے جب بہت اصرار کیا تو وہ کنگ کو بھی گئے۔ دو روز ہی سے ابلند آوازیں جیسا کہ ان کا قاعدہ ہے، مافی ٹیوٹر، مافی بیوٹر کہہ کر استقبال کیا۔

انجمن کی محمدی کے ابتدائی زمانے میں میں نے ایک حوالہ داشت بعض امداد انجمن میں لگا ہوا اعلیٰ حضرت میں پیش کی تھی۔ بارہ سو سالانہ امداد منظور ہوئی۔ نواب صاحب کو اس کا علم ہوا تو بہت ناخوش ہوئے اور مجھے لکھا اسے قبول نہ کیجئے، انکار کر دیجئے۔ ریاست کے خزانہ پر صاحب ہماور کا فیصلہ ہے۔ اس وقت صدر الامام فاضل سر ریجنالڈ گلوانی تھے، میں نے اسے خلاف مصلحت خیالی کیا کیونکہ آئندہ بہت سی توقعات تھیں۔

حیدر آباد اس پر تعلیم کے سب سے بڑی اور با عظمت ریاست تھی۔ اس کی تہذیب اور روایات خاص تھیں۔ لوگ خوش حالی تھے۔ سر سالار جنگ کے زمانے سے اس کے نظم نس میں بند رچ رفتی ہوتی گئی اور بیسویں صدی میں ہر اعتبار سے بوجہ کو پڑ گئی۔ شخصی مصلحتیں سازش کا گھر ہوتی ہیں۔ بیڑیں یہاں نوب پھولتی چلتی ہے۔ سر سالار جنگ بڑے مدبر تھے۔ وہ ریاست کے ہر شعبے پر نظر رکھتے تھے اور ہر جہہ دار سے اس کی صلاحیت اور قابلیت کے مطابق کام لیتے اور ہر ایک کے کردار اور کام پر ایسی نظر رکھتے تھے کہ کسی کو اپنی حد سے تجاوز کرنے کی ہمت نہ ہوتی

تھی۔ ان کی وفات کے بعد چشم گزراں اٹھ گئی اور سازشوں کا دروازہ کھل گیا۔ آپس کی کش مکش اور رقابت نے طرح طرح کی ریشہ و دانیوں پر ابھارا اور دھیرے دھیرے کو گرانے کے لئے کذب و افترا، بہتان اور اس سے بھی بڑے حربے استعمال کرنے سے نہ بچ سکے تھے۔ سازشوں کا یہ حال ایسا پیچ و پیچ تھا کہ ماحول کے اثر یا ذاتی تعلقات کی بنا پر اس میں بعض ایسے اشخاص بھی بچیں جانتے تھے جن کا کوئی ذاتی فائدہ نہ ہوتا تھا۔ نواب عماد الملک کو اس قسم کی بعض سازشوں میں الجھانے کی بہت کوششیں کی گئیں وہ اپنے اصول پر قائم رہے اور ان کا دامن اس وقت بھی اور اس کے بعد بھی اس آلائش سے پاک صاف رہا۔

پاک ہیں آلافتوں سے بندشوں میں بے لگاؤ
رہتے ہیں دنیا میں سرسکے درمیاں سب سے الگ

انہوں نے اپنے ذاتی رسوم اور اقتدار سے کبھی انفرادی اور یا فراموشی کا کام نہیں لیا کیلئے اعلیٰ حجت مرحوم کسی وجہ سے اپنے پیشی کے برتری اور نواب سراج میں جنگ سے ناخوش ہو گئے اور نواب عماد الملک کو لکھا کہ میں آپ کی جگہ آپ کے فرزند محمد شمس کو مقرر کرنا چاہتا ہوں۔ نواب صاحب نے لکھا کہ وہ اس کام کے اہل نہیں مناسب یہ ہوگا کہ ضرور امین جنگ ہیں کہ ان کی سابقہ خدمت پر فعال فرما دیں۔ مقررہ پیشی کی خدمت (جو بعد میں صدرالکرامی پیشی ہو گئی) ایسے اعزاز اور اقتدار کی خدمت تھی کہ ریاست کا کوئی دوسرے عہدہ دار اسے نعمت غیر متفرقہ سمجھ کر کسی بات سے نہ ہلے نہ ہٹا۔ ایک دوسرے کو پیڑھہ نظام نے لکھا کہ میں آپ کے فرزند علی جنگ کو کوڑا لے کر شہر کی خدمت پر مامور کرنا چاہتا ہوں۔ اس زمانے میں کوٹوالہ شہر کی قوت و اقتدار کا مقابلہ کوئی عہدہ دار نہ کیا کرتی، میرزا و زریجی نہیں کر سکتا تھا۔ نواب صاحب نے صاف لکھ دیا کہ میں جنگ کو کام کے اہل نہیں، کسی دوسرے شخص کا انتخاب فرمایا جائے۔

ان کے سامنے اور ان کے برابر سے بڑے بڑے اشخاص آتے اور بیٹے گئے لیکن نواب عماد الملک نہایت عزت و احترام کے ساتھ ان کے حیدر و باوقار رہے اور ہر وہ میں ان کا اعزاز پہنچنے سے زیادہ ہوتا رہا۔

پرنس انڈیا اور گورنمنٹ آف انڈیا میں بھی ان کا ایسا ہی اعزاز تھا۔ چنانچہ لاہور گورنر نے جو ریموڈ کی کمیشن بنوائی اس میں ان کے بیٹے کی شہرت اور اصلاحات کے لئے بہت سی ترغیبیں بھیجیں۔ ان کے ایک رکن نواب صاحب کی منتخب کیے گئے تھے۔ اس سے پہلے ہر دہائی کا دورہ کیا کرتے تھے۔ یہ عہدہ لاہور گورنر اور میرزا علی بیگ کو تسلیم کر کے ہر منتخب ہوئے۔ لاہور میں لاہور گورنر نے ان کی بار بار ہر ہند کی کونسل کے لئے دو ہندوستانی کمپوز کا انتخاب کیا۔ ایک نواب عماد الملک تھے۔ محمد علی ایچ بیٹنل کاغیراس کے دو بار صدر منتخب ہوئے۔ ایک بار شہر میں میرٹھ کے ابلاس میں بڑا ناہر سید اور دوسری باجیب سنگھ میں کاغیراس کا اجلاس رام میں ہوا۔ لاہور میں مدراس لیجر میں کے کان و کھنڈن (مجلس تفسیر مسلمانوں میں نامیہ عداوت پڑھا۔

مجھے یہ یاد ہے کہ بعض اوقات تعجب ہوتا اور مزاجی ناؤنی امت کا کردار نہیں کہ ابتدا میں جن بزرگوں نے ان کی ہر معاشرت کی نگہ دیکر کا انکار کیا تھا وہ اپنے ہنسنے میں بہت کچھ تبدیلی کر لی تھی وہ کھانا پانا بھی کھاتے تھے۔ سرسید صاحب، نواب حسن الملک،

نواب محمدا الملک کے دسترخوان کا میں نے یہی رنگ دیکھا تھا ہرے کہ انگریزی مبلے پر سے کھانوں میں وہ ذائقہ اور شجارت کماں چہاڑے کھاؤں میں ہے؟ اب تو لوگ وہ کھانے بھول گئے نام تک یا ونیں، ان کے بچنے والے رہے اور نہ بچانے والوں کے قدر ان اب جو کھانے ہم کھاتے ہیں وہ نہ انگریزی ہیں نہ مغربی۔ یوں کھانا سب ہی کھاتے ہیں۔ لیکن ان میں کتنے ہیں جو کھانے کا ذائقہ، لطافت اور آب و ملک کا بھی ذوق رکھتے ہوں۔ نواب محمدا الملک بہت نفیس اور لذیذ کھانا کھاتے تھے۔ لیکن ان کے کھانے بہت مرغی ہوتے تھے۔ خدا صانع یہ لوگ ہر کھانے کس طرح منعم کر دیتے تھے جبکہ کسی قسم کی ورزش کے بھی عادی نہ تھے۔ ایک بار وہ مجھے اپنے ساتھ دھارا باؤ لے گئے جہاں ان کا ایک اچھا سا باغ اور نکلہ تھا۔ کھانا ان کے ساتھ کھا کر پڑا۔ شرکے کھانے پر وہ بار بار تو کہتے تھے کہ کیسے جو ان ہو تم سے تو میں بدشاہی اچھا ہوں تم سے تو گنا کھاتا ہوں۔ ان کے اصرار پر بھی میں نے کھانا بہت احتیاط سے کھایا۔ لیکن یہ مرغی کھانا جس میں لکڑی باجی تھیں مجھے راس نہ آیا اور رات بھرے چینی رہی صبح ہوتے ہی میں نے وہاں سے نکلی مہنگے کی ٹھانی لی مگر نواب صاحب نے جلنے نہ دیا اور پھر نے پارس قدر اصرار کیا کہ میں مجبور ہو گیا کہ کھانا میرے سامنے آنا تو میرے دو گئے کھڑے ہو جاتے۔ نواب صاحب سیر کر کھانے پر پہنچے اور طبع کرتے تھے۔ انہیں یہ خبر کہ مجھ پر کیا مبنی ہوئی ہے تیسرے دن تو میں نے ایک زسفی اور جید راہبوا جاکر بتا دیا۔ نواب صاحب کھانا اختیار اچھا کھاتے ہی تھے لیکن کھانے کی خوبی اور اس کی بارگاہوں کو بھی خوب سمجھتے تھے بعض چیزیں تیرو بھی بچانے تھے۔ خاص اصرار کی، والی جس میں کرف کی لاگ دیتے تھے بہت لذیذ مرغی تھی۔ قدر دان بھی ایسے ہی تھے۔ ایک روز جو میں ان کے ہاں گیا تو بایا دیکھتا ہوں کہ ایک صاحب ان کے ساتھ صوفے پر بیٹھے ہیں اور وہ ان سے نئے کھانے کا بتا رہے ہیں جس وقت میں پہنچا تو نواب صاحب ان سے کھانے کی تعریف کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ بیٹھے جاؤ لی نہیں نے خوب پچانے تھے لیکن شکر نمی تھی۔ نمی شکر گرم ہوتی ہے۔ اس نے کہا آپ نے صبح فرمایا۔ اس وقت پرانی شکل نہ مل سکی تھی استعمال کرنی پڑی معلوم ہوا کہ یہ حضرت ملا دل تھے۔ نواب صاحب کے ملاقاتیوں میں دو چار ہی ایسے تھے جو ان کے ساتھ ایک صوفے پر بیٹھ کر اس طرح باتیں کرتے۔ کمان کی قدر ہو تو ایسی ہو۔

ان کے خاص دوست اور ملنے والے بہت کرتے تھے مگر جس سے رابطہ تھا وہ خلوص کے ساتھ تھا۔ وہ اہل علم سے مل کر بہت خوش ہوتے تھے اور ایسے اشخاص پر جن میں طالب علمانہ جھڑپ اور صحیح ذوق ہرنا بہت مہربان ہوتے اور ان کے لئے جو کچھ بھی ممکن ہوتا کرتے کو تیار ہو جاتے تھے جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔

پرانے دو گوں میں ایک بات یہ بھی تھی کہ جس پر ایک بار اعتبار کر لیا بس اس کے ہو گئے۔ ہزار کوئی اس کے خلاف کہے وہ نہیں سنتے تھے۔ یہی کیفیت سرسید احمد خان کی تھی۔ اسی افتخار کا تجربہ تھا کہ ان کے انگریز ملازم نے ایک لاکھ کا غبن کروایا۔ نواب صاحب کے دفتر میں ان کے ایک مددگار عبداللہ بیگ صاحب تھے۔ میں نے ایک روز نواب صاحب سے کہا کہ اس شخص کی ویانت متبہ ہے اور جہاں تک معلوم ہوا ہے یہ آدمی اچھا نہیں ہے۔ یہ سن کر بہت برہم ہوئے اور کہنے لگے جو ایسا کہتا ہے وہ خود ایسے ہیں۔ وہ بہت اچھا آدمی ہے۔ لیکن پھر پھر سے ہی عرصے بعد جب دفتر کے حسامات کی تیغ ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ بہت سا سرکاری رد پر اپنے تصرف میں لے آیا ہے اور غبن کے الزام میں خدمت سے برطرف کروایا گیا۔ اس تذکرے سے یہ قصد نہیں کہ ان کے متعلق یہ ایسے ہی تھے۔ بعض اشخاص جن پر ان کو اعتماد تھا و تحقیقت اپنی سہرت، کردار اور تاملت کے اعتبار سے بہت

قابل قدر تھے۔

مذہباً شیعہ تھے۔ لیکن اہل تشیع کے بعض عقائد مثلاً تئیسے اور تئیسے کے تحت مخالفت تھے اور کہتے تھے کہ جاہلوں کے عقیدے ہیں۔ نواب رام پور مرحوم رحمان علی خان (جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں) نواب عماد الملک بہاولپور کے حداثہ اقتدار میں تھے۔ ایک ملاقات کے وقت جب ان کا ذکر آیا تو کہنے لگے کہ ایک بات میں ہمیں ان سے اختلاف ہے اور کسی علت وہ اس معاملے میں ہم سے اتفاق کرنے پر آمادہ نہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ اختلافی معاملہ لفظی تھا۔ علاحدہ مذہب نے بعض شیعہ عقائد اور نہایت قابل اور روشن خیال اشخاص کو یہ کہنے نہایت "النفیۃ دینی و دین آباؤی" وہ نہایت بے تعصب شخص تھے کسی مذہب یا مذہبی فرقے سے متعلق کسی قسم کا تعصب نہیں رکھتے تھے۔ مولانا سید ابلیس شہر رکھتے ہیں کہ مولوی بنی نعمانی میرے کہتے تھے کہ میں نے الفاروق کو شائع کیا تو اس کا ایک نسخہ نواب عماد الملک بہاولپور کی خدمت میں بھیجا اور ان سے خواہش کی کہ اس کی نسبت آپ اپنے خیالات ظاہر فرمایں۔ اس کے جواب میں انھوں نے تحریر فرمایا کہ گذشتہ تیرہ سو برس میں صرف ایک شخص پیدا ہوا جس کا نام عمر ابن الخطاب ہے۔ لہذا ان کی لائف لکھنا اسلام کی خدمت حق جو آپ نے، اور اکی "سہرشتہ تعلیم بہت وسیع فہم ہے اور سیکڑوں آدمیوں کا فخر ان کے ہاتھ میں تھا لیکن انھوں نے کبھی مذہبی یا سلسلہ داری سے کام نہیں لیا۔ اس معاملہ میں بہت فرائض دل تھے۔ بعض عیسائی مشنریوں اور دوسرے غیر اسلامی اداروں کی جو اشاعتیں تعلیم کا کام کرتے تھے وہ وقتاً فوقتاً مدد دیتے تھے۔

آخر زمانے میں انہیں مذہب سے خاص لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ گنگوہی اکثر عامین اسلام کا ذکر کرتے تھے اور انہیں کیا کہتے تھے کہ لوگ اصول سے زیادہ فروع پر زور دیتے ہیں اور نوہات کو مذہب سمجھ رکھا ہے۔ کہتے تھے اصل اسلام الی حدیث و دلیلیں ہے۔ یہ اثر ان پر زمانہ طفولیت سے تھا جبکہ وہ اپنے والد کے ساتھ بنگال کے مختلف اضلاع میں رہے۔ اس زمانے میں شاہ اسماعیل شہید علیہ الرحمۃ کے بے لوث سرفروش داعی اور واسطہ اشاعت اسلام کی خاطر بنگال کے اضلاع کا دورہ کرتے تھے۔ وہ کبھی بھی ان کے ہاں اگر عہد مان رہتے اور ان کے والد ان کی بہت خاطر مدارات کرتے۔ نواب صاحب کہتے تھے کہ یہ لوگ کشمیر میں سفر کرنے اور اسلام کی تبلیغ کرتے تھے۔ ان بزرگوں نے گاؤں سے گاؤں میں لڑنے لگے تھے۔ یہ تو سلم ہرے محض اور بچے مسلمان تھے۔ یہی وقت تھا کہ وقت آتا فوراً سب کام چھوڑ چھا کر نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے مثلاً کعبت میں کوئی بل حلا رہا ہے تو اذان سننے ہی بل جہاں تھا وہیں رو جاتے گا یا کسی اور کام میں مصروف ہے تو کام جس نوبت پہنچے وہیں چھوڑ دیا جاتا۔ یہ اپنے عقائد میں بہت راسخ تھے۔ مجال نہ تھی کوئی شخص قبر پر بیٹھ لے چڑھا رہے یا کسی قسم کی کوئی اور بدعت کرے اس بات پر بہت افسوس کرتے تھے کہ ان مجلس مجاہدوں کے بعد جب پنجاب کے جاہل اور دنیاء و امیریوں نے آنا شروع کیا تو پھر اسے بڑی مختلف قسم کے نوہات اور بدعتوں میں پھنس گئے۔ شاہ اسماعیلؒ کے دعوت کے تقریباً اور پچاس اسلامی جوش کے بہت قائل تھے۔ لڑکپن کا یہ اثر ان کے دل پر آج تک تازہ رہا۔

جیسا کہ میں نے ابھی لکھا ہے آخر زمانے میں اسلام کی حقانیت اور قرآن پاک کی تعلیم کی عظمت ان لائیکہ خیال ہو گئی ان چیزوں کو وہ طرح طرح سے بیان کیا کرتے تھے۔ ایک روز مولانا آزاد اقدس خان (فضیل جگ) صدر الصدور سے

قرآن مجید کی فصاحت کے بعض نکات بیان کر رہے تھے دوران گفتگو میں فرمایا کہ لوگوں نے الفاظ قرآن پاک کی سبب بیزاری اور ترک کی طرف بہت کم توجہ کی ہے اور اسی ضمن میں کہا کہ آیتہ الکرسی کے الفاظ میں ایسی حسن ترتیب ہے کہ وہ بیان پر ادا کئے جاسکتے ہیں۔ اسلام کی تبلیغ کو بہت بڑی اسلامی خدمت سمجھتے تھے ماسی بنا پر وہ خواجہ کمال الدین کی بہت عزت کرتے تھے اور خواجہ صاحب اور ان کے رفقاء نے تبلیغ کا کام سچ مختلف محاکم میں کیا اس کے بہت شاخاں تھے۔ غالباً انہی کی تحریک پر سرکار سے خواجہ صاحب کو مالی امداد بھی دی گئی۔

ایک روز مجھے سے کہنے لگے کہ ہندوستان کا آئندہ سربراہ دلیدر اندم ہے جیسے ہی آئے گا۔ کچھ مدت بعد صاحب کا مدھی جی میدان سیاست میں جلوہ فرما ہوئے تو مجھے خواب صاحب کی پیشین گوئی یاد آئی۔ اس سے قبل انڈین نیشنل کانگریس انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کے تصرف میں تھی۔ عوام سے کوئی رابطہ نہ تھا۔ گاندھی جی اپنی قوم کے مزاج کو خوب پہچانتے تھے انھوں نے یک نیت اپنی طرز زندگی، سب طرز بدل دی جیسے ساپ انہی کپڑوں بدل دیا ہے۔ وہ ننگے سر پہننے لگے پاؤں جوتے گھٹنوں سے اوپر ایک غرق سی باندھ لیتے آگے سے اور سینہ چھپانے کے لئے کھدکا بڑا سا ردیاں یا چھوٹی سی چادر ڈال لیتے۔ اس کے بعد سے ان کی زندگی درویشانہ اور زاهدانہ ہو گئی اور وہ وقعتہ ہو رہے تھے اس کرم پنہن کا مدھی سے تعلق لگا کر رہ گئے۔ ہندو تعلقت ان کی پوجا کرنے لگی اور ان کے ایک ایک لفظ کو الہام و وحی سمجھنے لگی۔ کانگریس کا دروازہ عیسائی کھل گیا۔ انگریزی کی جگہ ہندی، ہندوستانی اور دو میں تقریبوں ہونے لگیں۔ ہندو ڈانڈا، ڈھول، گھٹاؤں کو خلافت کے اہلے والیا دکھایا کہ ان کے سر گرد وہ اور فلکا گاندھی جی کا دم بھرنے لگے۔ گاندھی جی نے مذہب کو سب سے مست بنایا سب پر یا کہ وہ غمزدہ ہی عرصے میں ہندوستان کے باؤی اور روحانی پیشوا ہو گئے۔

خظوں کا جواب بالالزام دیتے تھے اور اپنے فہم سے کہتے تھے۔ کبھی دوسرے سے نہیں کھولتے تھے اور کبھی فونٹین پر استعمال نہ کیا۔ اپنی تمام تحریریں اردو، انگریزی سب خود لکھیں اور اپنے قلم سے لکھیں۔ ایسے زمانے میں بھی جب وضع جیت ہو گئے تھے اور سی مذہب بصارت کا بھی عارضہ تھا انھوں نے کبھی اپنے خط یا اپنی تحریر پر کسی سے کھنواہی گوارا نہیں کیا۔ مہاتما نہ تو کھلا گاندھی رنگ خود برداری تھے۔ خطاب کرتے تھے، آخر زمانے میں ترک کر دیا۔ سبیدرامی بھی معلوم ہوئی تھی۔ حق پرست تھے۔ بیچران سارنے لگا رہتا تھا۔ سگرٹ سگار بہت ناپسند کرتے تھے۔ کتے تھے ہمارے کے سفر میں ایک بار سگرٹ سگار بیچنے کی کوشش کی۔ اس کی ٹوس بہت تکلیف ہوئی اور برقی میں بھی خواش معلوم ہوئی۔ زبان میں بھی سی تکلف تھی۔ حامد مزب تھے۔ ہمیشہ ہندوستانی میں جید رہا دی ہاس پہننے لگے۔ جب سبیلڈر کونسل کے ممبر ہوئے تو لباس میں تبدیلی کرنی پڑی لیکن یہ تبدیلی عارضی تھی۔ انڈیا کونسل کے ممبر مقرر ہوئے اور لندن میں رہنا پڑا تو انگریزی لباس اختیار کرنا پڑا۔ ان کے قوی بہت اچھے تھے۔ صحت قابل رشک تھی۔ لندن میں ایک حادثے سے ٹانگ میں چوٹ آگئی۔ زخم اچھا ہو گیا مگر ہڈی کا جوڑ ٹھیک نہ ہوا۔ اس سے انھیں اٹھنے بیٹھنے میں تکلیف رہتی تھی۔ اگر یہ صدمہ نہ ہوتا تو کسی سال اور زندہ رہتے۔ پھر بھی ۸۳ برس کی عمر پائی۔ کبھی کبھی بے تکلف دوستوں کے ساتھ شطرنج بھی کھیل لیتے تھے۔ کسی زمانے میں سنا کہ ابھی شوق تھا۔

ان کی یادگار یہ چند تصانیف ہیں:-

۱۔ سوانح سرسالا جنگ - یہ نواب سرسالا جنگ کی مختصر سوانح عمری انگریزی زبان میں ہے مسئلہ میں جو نواب جنگ کی وفات کا سال ہے لکھی گئی۔

سرسالا جنگ ان کے عمن تھے اور ان کا ذکر بڑے خلوص اور محبت سے کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ سیاست کا معاملہ نہیں، مردم شناسی اور قدر دانی میں اورنگ زیب کے بعد کوئی شخص ہوا ہے تو وہ سرسالا جنگ تھے اس کا ترجمہ اردو میں بھی ہو گیا تھا۔

۲۔ DESCRIPTIVE SKETCHES OF THE NIZAM'S DOMINION - اس میں ریاست حیدر آباد وکن کے جغرافی، تاریخی واقعات، انتظامی حالات، ریاست کی صنعت و حرفت وغیرہ کا دلچسپ بیان ہے۔ اس کتاب کی تالیف میں مسٹر ڈبلیو ولٹ بھی شریک تھے۔ یہ کتاب دو ضخیم جلدوں میں ہے۔

۳۔ رسالہ حماد الملک - اس میں نواب صاحب کے وہ تمام خطا میں، خطبات و مقالات ہیں جو تیار فرمائے اور وہیں تحریر کیے۔

۴۔ انگریزی خطا میں - مقالات و خطبات اور انگریزی نملوں کا مجموعہ۔

۵۔ قرآن پاک کا ترجمہ - یہ نواب صاحب کا سب سے اہم اور قابل قدر کام ہے۔ یہ ترجمہ اپنے نہایت تحقیق و کاوش اور محنت سے کیا تھا اور اس کے لئے خاص اہتمام کیا تھا اور ایک بڑا ذخیرہ قلماسروا عادیث اور لہجات اور مطالعہ و کتاب کی تصانیف کا جامع کر لیا تھا۔ ان کی کوششیں یہ تھیں کہ ترجمے میں حتی الامکان اصل کی سی سادگی، شان اور قوت باقی رہے۔ مزاج میں بڑی احتیاط تھی۔ بہت غور و فکر کرتے اور ایک ایک لفظ کو جانچتے اور لڑتے تھے۔ اس کے ساتھ فعلی پابندی کا بھی خیال رکھتے۔ ان کے پیش نظر بائبل کا انگریزی ترجمہ تھا۔ سولہ پاروں کا ترجمہ مکمل کر لیا تھا اور بطور پروف کے چھپوا بھی لیا تھا۔ نظر ثانی کے وقت مولوی عبداللہ صاحب بھی مشورہ کرتے تھے۔ انیسویں کے جوہر کبرسی، صنعت بصارت اور ناگ کے صدرے کے یہ کام جو ان کے فضل و کمال کا بہترین نمونہ تھا جاری نہ رہ سکا۔

نواب حماد الملک بہادر کی شخصیت اس زمانے میں بعض اقداب سے عجیب سی معلوم ہوگی۔ وہ شرقی اور مغربی تہذیب کے جامع تھے آدمی کو علم، دولت، آسائش و آرام محنت سے مل جاتا ہے۔ لیکن صبح ذوق بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ یہ دولت نہ علم سے ملتی ہے، نہ مال و زر سے اور نہ محنت سے صبح ذوق زندگی کی جان ہے۔ اس سے زندگی کے ہر شغل و مشیہ میں ایک نرم اور سہانی سی روشنی آجاتی ہے جو رواداری، اعتدال اور اطمینان قلب پیدا کر دیتی ہے اور باوجود مثبت فرائز اور ادھولٹ گھاہیں کے سفر حیات کے طے کرنے میں بہت کچھ سہولت ہو جاتی ہے۔ حسن ذوق نواب حماد الملک کی زندگی کے نظریہ ہر پہلو میں پایا جاتا ہے۔ ان کی طرز معاشرت اور ظاہری شان ایسی تھی کہ لوگ ان کے پاس جاتے ہوئے پہچانے تھے۔ وہ ایسے لوگوں سے جو ذوقی علم اور ذوقی تہذیب سے عاری ہوتے گودیا دی حیثیت سے ان کا باہر نکلتا ہی بلند ہوتا، ملنے سے ابا کرتے اور ایسے صاحب ان کا بڑا خوشگوار پیشہ ہوتا تھا۔ لیکن اہل علم کی ملاقات سے بہت خوش ہوتے۔ ان سے گل لکے باتیں کرتے۔

ان ملاقاتوں میں طالب علمانہ مساوی، خلوص اور پھر روی پائی جاتی تھی۔ وہ غریبے غریب عالم باطالع علم کے مقابلے میں بڑے سے بڑے جاہل امیر کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے تھے۔ انھوں نے علم و ادب کی اشاعت اہل علم اور علمی اداروں کی امداد و سرپرستی میں ہمیشہ فراخ دلی سے کام لیا اور اس سے ان کو کبھی خوشی ہوئی تھی۔ وہ صادق القول، با وضع اور پابند اصول تھے۔ ان میں قدیم وضع اور جدید مذہب کی بعض خوبیاں اس خوش اسلوبی سے باہم ملی ہوئی تھیں کہ اس امتزاج نے ان کی روش زندگی میں ایک قسم کا حسن پیدا کر دیا تھا۔

ان کی صحبت و گفتگو میں سے ملتی۔ اس میں یکپانہ اور طالب علمانہ دونوں شاہیں نظر آتی تھیں۔ اپنے زمانے کے بدلنے حالات اپنے بزرگوں کی خودداری، وضع واری اور محتاطیت کے کارنامے اور ان کے زہمت، اسراف اور بے بسی کے تھے۔ بڑے منہ سے یہ بیان کرتے تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ قدیم اساتذہ کے کلام پر بہت اچھی نظر ملتی اور خاص محصلوں میں ان کا منتخب کلام سناتے اور کبھی کبھی شعر کے محاسن و معائب پر تنقیدی نظر ڈالتے تھے دیکھ کر ان کے ذوق کی داد دینی پڑتی تھی۔ اگر کوئی ان چیزوں کو قلمبند کر لیتا تو وہ ایک نادر بیاض ہوتی۔ مولانا حالی نے کسی جگہ ذکر کیا ہے کہ مظہر جان جانا نے اساتذہ کے کلام سے منتخب اشعار کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جس کا نام "خریطہ جوابہ" تھا۔ اس کا وہی کی شاعری بہت اچھا اثر پڑا۔ پڑانے صاحب ذوق اور جسے اچھے حضرات اپنے پاس ایک بیاض رکھتے تھے۔ جہاں کہیں کوئی اچھا شعر یا کوئی خیال یا کلام کی بات نظر پڑی یا کوئی تجربہ نئے یا نئے لگا دھجٹ اپنی بیاض میں لکھ لیتے تھے۔ غرض نواب عماد الملک کی صحبت میں بعض واقعات ایسے علمی و ادبی نکات مل جاتے تھے جو گہرے مطالعہ اور فہم کا نتیجہ ہوتے تھے۔ ان کے علمی ذوق، علم و ادب کی سرپرستی اور صحبت سے جو فیض لوگوں کو پہنچا وہ ان کی تابعدار کہیں زیادہ استوار اور دور رس تھا۔

وہ جس خدمت پر مدت و راز ناک فائز رہے۔ اگرچہ اس میں ایک گونہ نثری ہوئی لیکن جیسی ہوئی جاپیے تھی وہ نہ ہو سکی۔ اس کا انہیں خود بھی اعتراف تھا۔ اس کی وجہ ہے۔ ان کاموں کے لئے جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنے سرپرست کے منصوبوں اور تجویزوں کی منظور کیلئے ہمت سے جتن کرنے پڑتے ہیں کبھی اپنے اعلیٰ افسروں سے مل کر اور ان کو خوش کر کے کام کالنا پڑتا ہے اور کبھی لٹکھڑکھڑ کر اور اپنے روضہ سے کام لیکر منظور یا حاصل کرنی پڑتی ہیں۔ نواب عماد الملک اس قدر خوددار اور مہربان اور اپنے اعلیٰ افسروں سے اس قدر بلند مرتبہ تھے کہ اس قسم کی دہراور دوڑ وھوپ یا اپنے افسروں کی خوشنودی کی کوشش ان کے اہلکار سے باہر تھی۔

ان کے علم و فضل، وسیع معلومات، علمی و ادبی ذوق اور عربی، فارسی، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کے گہرے مطالعہ کو دیکھتے ہوئے ان کا علمی کام اس نوع سے کم ہے جو ان سے کی جاتی تھی۔ حیدرآباد کے ان کے حالات اور ماحول کی آٹھ کی تعمیرات نے ہزاروں طرحی طرز معاشرت تھے آسانی پیدا کر دی تھی اور کام کا وہ دلولہ جو انہیں تھا وہی نہیں تھا لیکن بے دریغ علمی سرپرستی، علمی فیض، فاضلانہ استغناء، اعلیٰ سیرت اور بے لوث کردار کی وجہ سے وہ دولتِ اصغیر حیدرآباد و دکن کی تاریخ میں ہمیشہ عزت کے ساتھ یاد رہیں گے۔

سر سید احمد خاں

عنایت اللہ دہلوی

۔ غالباً جولائی ۱۸۵۷ء کا زمانہ تھا کہ میرے والد مرحوم (مرزا نادر علی شاہ) جو اُس وقت میرزا کاظم آباد میں پروفیسر تھے۔ گھر میں کئی قلیل و بلی میں ختم کر کے الہ آباد واپس جاتے تھے۔ اس مرتبہ انھوں نے مجھے اور میرے بڑے بھائی کو جو مجھ سے تین برس بڑے تھے اپنے ہمراہ لے جانا چاہا، تاکہ الہ آباد میں ہماری تعلیم کو کئی بہتر ذریعہ دست کریں۔ راستہ میں سید صاحب (مرسید جوم) کے پاس علی گڑھ میں قیام کرنے کا قصد کیا۔ میری عمر اُس وقت آٹھ برس کی تھی اور یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے اپنی والدہ سے جدا ہونے کا اتفاق ہوا۔ چلنے کا وقت آیا تو انھوں نے ہم دونوں بھائیوں کو گلے لگایا۔ پیار کیا اور کوئی دعا پڑھ کر دم کی۔ مجھے بے اختیار رونا آیا مگر میں نے ضبط کیا۔

اس سے پہلے میں کبھی ریل پر سوار نہ ہوا تھا۔ سیشن پہنچ کر گاڑی میں بیٹھا۔ بیٹھا کیا، کبھی دوڑ کر اس کھڑکی سے منہ لگا کر جھانکتا تھا کبھی اُس کھڑکی سے۔ اور سب سے زیادہ بے قراری اس گاڑی کی تھی کہ دیکھنے ریل کب چلتی ہے؟ اور کب ٹوکتی ہے؟ آخر کار یہ وقت بھی آگیا۔ ریل کھسکی سیشن کی جتنی صورتیں تھیں ایک ایک کر کے پیچھے رہتی گئیں۔ ٹرین بھی سیدھی سیدھی سانپ کی طرح لہرائی جتنا کاپیل آتے نہ ہی فرٹے پھرنے لگی۔ پتھروں کی لئے دار و درازیں اور رفتار کی تیزی کے ساتھ ہوا کے جھونکے دل میں ایک آئینہ پیدا کرنے لگے۔ اب معلوم ہوا کہ میدان کھیت۔ گاؤں۔ آدمی۔ درخت۔ مویشی کوئی ایسا نہ تھا جو دلی کی طرف نہ جھانکا جاتا ہو میں اپنے وطن سے نکلا اور یہ میرے وطن کی طرف چلے۔ دور کی چیزیں آہستہ اور پاس کی اشیاء بے تحاشا دور کی نظر آئیں۔ جہر دکھایا آسمان کے کنارے زمین سے ملے ہوئے معلوم ہوئے۔ آو پر سورج تھا اور چلتے پھرتے بادل۔ نیچے دھوپ تھی اور چھائوں کے ٹکڑے کبھی یہاں کبھی وہاں۔ انجن کی طرف کبھی سیاہ گٹھا دور نظر آتی تھی تو گھوڑی دوڑیں ٹرین دھوپ سے نکل کر بادلوں کے سایہ میں آجاتی اور ہر طرف اندھیرا چھا جاتا۔ بادل کی گرج جیسے گھر میں آسن کر ڈر لگا کر ساتھ اب یہاں سنائی بھی دیتی تو بہت بلی۔ یہ کیفیت بھی تھوڑی دیر میں بدل جاتی اور ٹرین اندھیرے کو چھوڑ کر روشنی میں آجاتی۔

جب کوئی سیشن قریب آئے کہ جوتا نا انجن ٹرین کو پلیٹ فارم پر لانے کے لئے پٹری بدلتا اور پھر کوسا لٹا لٹا ہوا گرج کا منہ کھڑکی سے باہر ہوا اور انجن کو اس حال میں دیکھ کر تالیاں نہ جلنے لگی۔ چھوٹے شیشوں پر ریل کے ٹھہرنے ہی مسافروں کی بھاگ دوڑ لگا رہی گاڑی سے آترک انجن تک پہنچے مستقیم جانا اور پھر بری جھنڈی دکھا کر ٹرین کو چلنا کرنا اس کے بعد اپنی

لگاؤ کی طرف آگیا چلتی دہلی میں دوڑ کر پائے دان پر کھڑا ہو جانا۔ بڑے شیشوں کے قریب بہت سے انجنوں کا اظہار۔ کوئی کھڑا ہے۔ کوئی چل رہا ہے۔ کوئی صاف نظر آ رہا ہے۔ کوئی دھوئیں اور بھاپیں جھپٹا ہوا ہے مگر جیتے چلاتے سب ہیں۔ بھر پور ہلکا ہلکا چال سے وقفہ بڑی گرج اور لرز سے شیش کی اونچی اور نیچے چھت کے نیچے داخل ہونا۔ پلیٹ فارم پر لوگوں کا ہجوم۔ ٹیلیوں اور مسافروں کا شور و سوسے والوں کی بے تنگی بولیاں۔ ہونٹوں اور چائے خانوں کا چمکنا ہوا سامان۔ اگرچہ یہ سب معمولی چیزیں ہیں مگر میرے لئے تو آج دنیا کے مشاہدوں کا ایک دفتر کھل گیا تھا۔ جو نئی چیز دیکھنا۔ چاہتا کہ والد بھی اسے دیکھیں کبھی دفعہ انکھوں میں کہنے کی داکھ بھی پڑی مگر میں دیکھنے سے باز رہا۔ غرض اسی حال میں چند گھنٹوں کے سفر کے بعد علی گڑھ آ گیا۔ والد یہاں آ رہے۔ اتنا یاد ہے کہ کسی نے کہا کہ ”سید صاحب نے گھڑی بھیجی ہے۔“ شیشوں سے نکل کر ہم سب اس گاڑی میں بیٹھے اور تھوڑی دیر کے بعد ایک احاطہ میں جس نے ان معلوم ہوا داخل ہوئے۔ ایک بڑے بنگلے کے سامنے رساتی میں اگر گاڑی بھڑکی۔

میں نے اس بنگا آکر بڑی دھن کے مکان دوڑ سے دیکھتے تھے کبھی اُن کے اندر نہیں گیا تھا۔ گاڑی سے اتر کر ہم کئی کروں سے گزرتے ہوئے ایک بڑے کمرے میں آئے جو مجھے بہت وسیع معلوم ہوا اس کمرے کے سب سے بڑے دروازے میں خس کی ٹنگی لگی ہوئی تھی اور منہجہا اصل رہا تھا مگر کھینچنے والا نظر نہ آتا تھا۔ کمرے میں بہت سی خوبصورت کرسیاں کئی وضع کی تھیں ہوتی تھیں اور خس کی خوشبو کے ساتھ کوئی اور خوشبو بھی دہان موجود تھی جو بہت اچھے معلوم ہوتی تھی خس کی ٹنگی کے قریب ایک میز پر جس کی پرشش سبز چمک بہت سے فائدہ دہانہاں تھی اور کچھ چمکی ہوئی چیزیں نہایت سلیف اور خوبصورت تھیں۔ کبھی جوئی خفیں میز کے قریب ہی کرسی پر ایک بھاری بھر کم ادھی سفید سر۔ سفید اور سی۔ سفید لباس۔ موٹے موٹے پاؤں اور ان میں سپر جو مجھے قاتلین کے ٹائٹ سے معلوم ہوتے تھے۔ شیش کا ساکلا۔ فلنگ لگی ہوئی۔ برتنہ سرٹھے تھے۔ یہی سید احمد خان تھے جنھیں دلی کے بعض لوگ صرف ”علی گڑھ والا“ کہتا تھا کافی تھکتے تھے اور وہ ایک خوف اور پرہیز کی چیز سمجھے جاتے تھے۔ سید صاحب والد صاحب کو کچھ کرا سلام علیکم کہتے ہوئے کرسی سے کچھ کھینچے اُٹھے اور یہ کہہ کر کہ ”آپ آگئے“ والد صاحب سے مصافحہ کیا اور ہم دونوں بھائیوں کو دیکھ کر کہا: ”اے یہ کون ہیں؟“ ہم دونوں قریب گئے اور بھنگ کراہا ب کیا۔ سید صاحب نے ہماری صورتیں خود سے دیکھیں۔ پھر خوب ہنسے اور والد صاحب سے باتیں کرتے گئے۔ اب یہ کبھی سید صاحب کی صورت دیکھنا تھا اور کبھی کمرے کے ساز و سامان کو۔ فرنیچر کی کھنکھناتی ٹھنڈی ہوا۔ ہر طرف صفائی اور سلیف۔ نیچے فرش پر زرد و عا شیبے کے کمرے اور نیلی دھاریوں کی دری اور سفید پرائی سی چھت گہری۔ دیواروں پر ہلکا فیروزی رنگ۔ کبھی کبھی سنہری چوکنٹوں میں تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ ہمیں پہاڑ، سمندر، زار اور جیتے نظر آتے تھے۔ جی جی جانتا تھا کہ میں بھی انھی میں کہیں ہوتا۔ آتش دان کا کوئی میرے لئے اس قدر رُحمت تھا کہ اب بڑی سے بڑی خاموشی کا ماحول لطف نہیں دے سکتی۔ اس کا دس پر بہت سی خوبصورت رنگ پر رنگ کی چیزیں دیکھی ہوئی تھیں اور ان کے اوپر دیوار میں ایک عجیب صورت کا کھنکا لگا ہوا تھا۔ سید صاحب اور میرے والد صاحب باہیں کھٹے کھٹے چپ ہو جانے تھے تو کھینچنے کی کئی آواز کے ساتھ اس گھنٹے کی کھٹ کھٹ میرے تصور میں اس کمرے کی بزرگی اور عزت کا دو بالا کردیتی تھی۔ کورس پر جو چیزیں آراستہ تھیں اُن میں سب زیادہ دلکش شاہ مرمر کا ایک چھوٹا سا درخت تھا جو شیش کی صندوق میں رکھا ہوا تھا۔ یہ مجھے منصور کا مقبرہ معلوم ہوا جسے میں وہاں میں بار بار دیکھ کر کھنکا تھا ایک ہی بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تاج بی بی کا درخت ہے۔ میں اس کو ایک کھونا اور اس کے اوپر اس کا مالک ہوا قابل رشک سمجھنے لگا۔ مگر یہ کچھ میں نہ آتا

جب کچھ بات ہوگی تو آدمی نہ آکر کھا کھا میز پر ہے۔ اس پر سب لوگ اُسٹے اور کھانے کے کمرہ میں آئے۔ پہلا پھر میری آنکھوں کے لئے عجیب و غریب منظر تھے۔ میز پر نہایت مسند چادر چھنی کے برتن۔ شیشے کے گلاس۔ چاندی کے چھچھے۔ لائق دانت کے دستے کی چھریاں میز پر رکھی تھیں۔ میز پر دو بڑے ساڈا لمبیپ روش تھے۔ پکھا چل رہا تھا۔

اس سامان کو دیکھ کر مجھے اپنے گھر کا سترخان۔ برتن اور فنیل سوز یاد آیا۔ میری والدہ و سترخان عیش اجل بھوایا کرتی تھیں۔ مگر وہ گاڑھے کاہن تھا۔ اس میز پر پوش کی معافی اور ایک سے اسے کیا نسبت تھی۔ برتن تانبے کے تھے۔ قفسی وار ہوتے تھے۔ چھنی کے برتن خاص خاص کھانوں کے لئے یا جب کوئی ہمسایہ آئے تو رتے جاتے تھے۔ شیشے کے گلاس صوف گرمیوں میں یا زخمان تریب ہی اطلاع کے وقت نکالے جاتے تھے۔ اما میں ان کو ہاتھ لگاتے تو سوتے ڈرتی تھیں۔ پھر یہاں اور چاندی کے کاسے تو ہیں۔ کبھی تو ابیں ہی نہ دیکھے تھے۔ گھر کا تھیل سوز اگرچہ روزمرہ سمجھوایا جاتا تھا مگر اس کی صورت شکل اور ڈھکائی ہوتی روشنی ان لمپیوں کی صفات اور تیز روشنی کے سامنے کیا حقیقت رکھتی تھی۔

باتیں کرنے اور باتوں پر قہقہے لگانے سب لوگ میرے گرد و کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تین چار سفید پوش ملازم اور ایک بہت بڑی مٹی والی کادیاں پتلا سونے کا کھارے حدیثیت و جالاک اور تیز خانساں طرح طرح کے کھانے سامنے لٹا تھا۔ اور سب لوگ چھوٹی سے حسب ضرورت کھانا اپنی رکابی میں نکال کر کھاتے تھے۔ ہم دونوں بھائیوں کی رکابوں میں بیٹھے خانساں مانے اپنے ہاتھ سے کھانا نکال کر دیا۔ کھانے کے ذائقہ کی نسبت میں نے غور نہ کیا مگر یہ یقین ہے کہ وہ گھر جیسا نہ تھا۔ اور سچی بات یہ ہے کہ میں نے نئی چیزوں کے دیکھنے میں ایسا مصروف تھا کہ کچھ مجھ ہی میں نہ آیا کہ کیا کھا رہا ہوں۔

جب ہم دونوں کھانا کھا چکے تو سید صاحب نے ایک ڈاکٹر کے کہنا کہ ان بچوں کو ان کے پلنگوں پر لے کر سلا دو۔

مجھ پر ہتھی چڑیوں کی آواز پر آنکھ کھلی۔ میں بے انتہا خوش تھا۔ تین بھڑیاں تک دیکھی تھیں، ان کی نسبت بیسیوں سوال والے کرتا تھا۔ اور بار بار پوچھتا تھا کہ الہ آباد میں یہ سب چیزیں ہونگی یا نہیں؟ والد بھی تو جواب دے دیتے تھے کبھی نہیں کہ جب ہر جاتے تھے۔

والد نے مٹی گڑا میں دو دن قیام کیا۔ پھر الہ آباد روانہ ہو گئے اور دوسرے دن سورج ابھی نہیں نکلا تھا کہ وہاں پہنچ گئے۔ ساڑھے آٹھ برس کی عمر میں سید صاحب کی طرز معاشرت پر میرا چھوٹا سا دماغ خود کرنے کے قابل تو کیا ہوتا تھا۔ ان کے جگہ کی بہت سی چیزیں ایسی تھیں کہ مجھ چاہتا تھا میرے پاس بھی ہوتیں۔ اب یہ شوق پیدا ہوا کہ جہاں بھی ہوں وہاں کی ہر ایسی ہی اچھی ہو۔ ایسے ہی کھانے میدان ہوں۔ باغ ہو۔ باغوں میں پھولوں کے پھلے ہوں۔ گرو ویش کی سب چیزیں صاف ستھری۔ پکائی ہوئی۔ پکے کھلے رنگوں کی ہوں۔ اور کوئی چھریلی اور خراب نہ ہو۔ یا ایسا خیالی تھا جس کا بہت کچھ اثر طبیعت پر تمام عمر غالب رہا۔

(عطیش بیچ محمد امین بانی تہی)

نواب صدر یار جنگ بہادر

(مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی)

ماکرام

نواب صدر یار جنگ بہادر سے میری ملاقات محض حسن اتفاق کا نتیجہ تھی۔ وہ بالعموم علی گڑھ حبیب نگ میں رہا کرتے تھے، میں وہی سے آگے کہیں گیا ہی نہیں تھا۔ ان کا عقیدہ احباب مجاہدین میرزا و بیچروں سے بہت بلند تھا، اور ان کا جو فرق تھا وہ ظاہری ہے۔ پس عام حالات میں اس بات کا بہت کم امکان تھا کہ ہم بھی ایک دوسرے سے مل سکتے۔ لیکن اس کے باوجود ہم ملے۔

ہذا یکراں ۱۳۵۳ھ میں مجھے غائب کی کتاب سب سے دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ یہ مختصر سا مجموعہ جس میں شکل سے چیز سات سو شعر ہوں گے۔ غائب نے اپنی زندگی کے آخری ایام یعنی ۱۲۸۶ھ میں شائع کیا تھا، لیکن چونکہ اس کے بعد نہ ہر ایک کہیں سے چھپا، نہ کلیات ہی کے کسی ایڈیشن میں اسے شامل کیا گیا۔ اس لئے مدت سے نایاب ہو چکا تھا۔ غائب کی بعض اپنی تحریروں اور یادگار غائب میں اس کا ذکر جو دہستہ، اور ہمیں سے مجھے اس کا پتہ چلا تھا۔ میں نے ادھر ادھر بعض اسباب کی خدمت میں لکھا کہ اگر آپ کے پاس یہ کتاب ہو تو چند دن کے لئے مستعار عنایت فرمائیے۔ ہر عذر سے یہی جواب ملا کہ نہ ہمارے یہاں ہے نہ ہم نے اسے دیکھا ہے۔ البتہ مولانا بسیمان ندوی مرحوم نے اتنا اضافہ کیا کہ نواب صدر یار جنگ بہادر کی خدمت میں لکھ کے دیکھو۔ ممکن ہے ان کے کتب خانے میں اس کا کوئی نسخہ محفوظ ہو۔ چنانچہ میں نے ان کی خدمت میں لکھا۔ بالے اب کے تیر نشانے پر بیٹھا۔ ان کا جواب یہ مژدہ لایا کہ ”سب سے پہلے“ کا ایک نسخہ میرے یہاں موجود ہے، یہ حق تعالیٰ تعزیر عادت۔

یہ گریو کا ذکر ہے۔ میں ان ایام میں لینے نام کے سلسلے میں شے میں مقیم تھا۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ اگر ممکن ہو تو کتاب مجھے مستعار بھیج دی جائے۔ میں اس کی نقل لے کر اسے بر حفاظت واپس کر دوں گا۔ اس پر انھوں نے فرمایا کہ آپ کہاں اتنی رحمت کریں گے۔ میں یہیں سے آئے نقل کروا کے چند دن میں بھجوا دوں گا۔ چنانچہ پندرہ برس میں دن کے بعد انھوں نے

یہ نقل مجھے بھیج دی۔ آپ میری خوشی کا اندازہ نہیں لگا سکتے، میں نے اس کی تلاش میں پانچ چھ مہینے صرف کئے تھے اور تقریباً پانچ سو چھ لکھا تھا۔ اگرچہ یہ چیز میرے خیال سے بہت کم حجم کی تھی، تاہم کچھ ہی موقوفات کا کلام تھا اور اتنا نایاب کہ بڑے بڑے صاحبِ وقت حضرات کے کتب خانے اس سے خالی تھے۔ اور وہ خود اس سے ناواقف تھے۔ اس لئے میں جتنا فخر بھی کرتا تھا۔ انھوں نے جو نقل مجھے بھیجی اس میں بہت غلطیاں تھیں۔ اس میں یہ فیصلہ نہ کر پایا کہ آیا اصلی کتاب ہی اتنی غلط تھی؟ یا نواب صاحب کے کاتب نے دو اتنی اصلاحیں دی ہیں۔ ان میں سے کتنی غلطیاں تو ایسی تھیں کہ میں نے خود ہی اٹل سے نہیں درست کر لیا۔ پھر بھی کچھ ایسی رہ گئیں کہ ان کے سمجھنے سے قاصر رہا۔ ایک آدھ لکھ لفظ ہی لکھنے سے رہ گئے تھے۔ میں نے جب اس کا اظہار کیا تو نواب صاحب نے اس کا جواب ملا کہ اگرچہ کاتب بہت محتاط آدمی ہے لیکن امکان ہے کہ اس سے غلطیاں ہو گئی ہوں۔ اس پر میں نے دل میں یہ کیا کہ جب دہلی جانا ہوا، تو ایک دن کے لئے علی گڑھ جلا جاؤں گا۔ اور وہی نسخے اس کا مقابلہ کر کے درست کروں گا۔ نواب صاحب مرحوم نے بھی مجھے دعوت دی کہ جب پہاڑ سے اتریں تو یہاں آئیے اور کتب خانہ دیکھ کر جائیے۔ یہ تو زمین تھی خواہش تھی۔ میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے آنے کا وعدہ کر لیا۔

اس کے پتھر طے دن بعد میں وہی آیا۔ یہاں ایک دن اب باہنہیں۔ باہنہ میں کوئی کتاب دیکھ رہا تھا کہ اس میں حکیم مومنوں کے فارسی دیوان کا ذکر پڑھا۔ میں نے پھر ان کی خدمت میں لکھا کہ آپ کے ہاں جب کچھ نسخے مومن کا فارسی دیوان ہے۔ انھوں نے فوراً جواب دیا کہ ہاں، دیوان کا ایک نسخہ موجود ہے، لیکن اب میں اسے آپ کو سمجھوں گا نہیں۔ اپنا وعدہ وفا کیجئے۔ یہاں آئیے اور جو چاہیئے لے جائیے، میں خود کتنے دن سے دیاں جانے کے لئے پرتوں رہا تھا، لیکن کمزوریاں، عجزات نہیں دیتے تھے۔ اسی صبح میں جس دو تین مہینے نگل گئے۔ آخر ایک سہ پہر کہ میں نے پڑا کے بستر باندھا اور بغیر اطلاع دے علی گڑھ پہنچ گیا۔ گاڑی وہاں مغرب کے بعد پہنچی تھی اور اچھا خاصا اندھیرا ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ جب میں علی گڑھ کے سیشن پر اترا ہوں تو بوندیاں بھی پڑ رہی تھیں۔ اب میں نے خیال کیا کہ یوں ہے اطلاع اٹلے میں غلطی ہوئی ہے۔ اگر وہ یہاں نہ ہونے تو عجیب۔ لیکن یہ خیال ایک لمحے سے زیادہ میرے دماغ میں باہنہیں۔ ہائے کیا زمانہ تھا۔ وائے ہمارا اگر نہ ہوتے تو کوئی قیامت آجاکے گی، رات کی گاڑی سے واپس چلے جانا۔ بہر حال میں نے سواری لی اور چہرہ رشت میں میرس روڈ پران کی کوٹھی حیدر منزل میں جا پہنچا۔ وہ خود اس وقت موجود نہیں تھے۔ ملازم مجھے اندر جناب عبدالجبار صاحب پاس لے گیا میں نے آداب عرض کیا اور اپنا تعارف کر کے خاموش ایک طرف بیٹھ گیا۔

نام آگیا ہے، اس لئے مناسبت معلوم ہوتا ہے کہ میں جناب عبدالجبار خاں صاحب کا تعارف کرا دوں۔
نواب صدر یار جنگ مرحوم نے اپنے گھر میں جن نکاح کئے۔ پہلی بیوی ان کے چچا حاجی محمد عبدالشکور خاں صاحب کی عسائری تھیں، نواب صاحب و جرم کے سب سے بڑے صاحبزادے خاں بہادر حاجی مولوی محمد عبدالرحمن خاں صاحب نے شہر علی، انہی بیگم کی اولاد ہیں۔ دوسری شادی بھی اپنے چچا خاندان ہی میں ہوئی۔ یہ بیگم جناب محمد عبدالشکور خاں شیر والی زین بیگم دوسری تھیں۔ نواب صاحب کا تیسرا نکاح جناب مولانا عبدالغنی خاں صاحب متوفی قائم گنج (منیر فرخ آباد) کی دختر نیک اختر جناب نے بیگم صاحبہ سے ہوا مولانا عبدالغنی خاں مرحوم شہر کتاب ارضانی آصفی کے مصنف ہیں جس میں فارسی مصنف کے مصلوں کی اسناد کلام اسنادہ

سے جمع کر دی گئی ہیں۔ یہ کتاب اُن کھڑکتوں میں چھپ چکی ہے۔ اس کے علاوہ سوادِ عرب اور ایک تذکرہ شعرا فارسی بھی ان سے یادگار ہے۔ مولانا عبد الغنی خاں نواب صاحب کے استاد بھی تھے۔ انھوں نے فقہ اور حدیث اور تفسیر کی متعدد کتابیں ان سے پڑھیں۔ یہی مولانا عبد الغنی خاں صاحب جناب عبد الوہید خاں صاحب کے والد بزرگوار تھے اور جناب زینب بیگم صاحبہ ان کی سگی بہنوئی تھیں۔ نقیض دہلوی کے نام سے کبھی کبھی مضمون بھی لکھا کرتی تھیں۔ وہ تین سال ہونے کے انتقال فرمایا۔

ایک اور بات یاد آگئی۔ غالب نے ایک غزل میں اپنے تمام شہر فارسی کو معاصرین کا ذکر کیا ہے۔ قطعہ ہے۔

ہستہ را خوش نفسا نند سخن در کہ بود ۱
 باد در خلوت نشان مشک فشان از دم شان
 موئن و تبر و صہبت فی دلوئی دامگاہ ۲
 سترتی اشرف و آرزوہ بود و عظیم شان
 غالب سوختہ جاں مگر چہ نیز زو بہ شمار ۳
 جست در بزم سخن ہم نفس و ہم و دم شان

یہاں دوسرے شعروں میں مولانا عبد الوہید خاں غلوئی ہیں۔ یہ غلوئی ہمارے مولانا عبد الغنی صاحب کے تھیں۔ مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی کے شاگرد تھے اور سید احمد بریلوی سے سمیت تھے۔ طبابت میں بھی بدولتی حاصل تھا۔ انھوں نے اپنے وطن ہی میں تپ محرقہ سے وفات پائی اور یہیں دفن ہوئے۔ صہبائی انہی کے شاگرد تھے۔ تاریخ وفات ہے: "مذیاب و سخن فناء" بات سے بات یاد آتی ہے۔ غالب کے نامہ زرا غلام حسین خاں آگرہ کے روسا میں سے تھے۔ غالب نے اپنی والدہ جناب عروت النساء بیگم صاحبہ کا نام صرف ایک فارسی خط میں دیا ہے۔ جو انھوں نے آگرہ ہی کے ایک صاحبِ خدا واد خاں اور ان کے بیٹے صاحبزادے دلی واد خاں کے نام لکھا ہے۔ اس خاندان کے غالب کی ناخیاں سے ہیں وہیں کے تعلقات تھے اور اسی سلسلے میں غالب نے یہ خط بھی لکھا ہے۔ اصلی خط کتب خانہ جید گنج میں موجود ہے۔ تو خیر ان خدا واد خاں کے ایک اور صاحبزادے کریم واد خاں بھی تھے، ان کریم واد خاں کی اولاد میں چار بیٹے اور دو بیٹیاں جو ہیں۔ ان سب کے نام لکھنا تو غیر ضروری ہے۔ البتہ ان میں سے ایک صاحبزادی کا نام سہم اللہ بیگم تھا۔ یہ مولانا عبد الغنی خاں سے منسوب تھیں، اور جناب عبد الوہید خاں صاحب انہی سہم اللہ بیگم کے صاحبزادے ہیں۔ مگر بابر غالب کے مکتوب ابیہ جناب خدا واد خاں کی پوتی کے بیٹے چھوٹے۔ غالب کے جس خط کا اوپر ذکر ہوا وہ انہی نے نواب صاحب معذور کو دیا تھا، جو ان کے خاندانی کا غذا ست میں معذور تھا۔

یہ عبد معزضہ، بحرِ طویل میں چلا گیا۔ بہر حال جناب نواب صاحب نو بجے کے قریب مکان پتھر لایا۔ جو نئی پینچ انھیں میرے آنے کی اطلاع ملی۔ فوراً اس کمرے میں آئے جہاں ہم لوگ تھے۔ میں ایک طرف دہرا سے ٹیک لگا کر دوزاؤں بیٹھا تھا۔ دروازہ کھلنے پر نظر اٹھا کے سوچ بکھتا ہوں تو وہ سامنے کھڑے تھے۔ اگرچہ میں نے انھیں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن میں نے تیانے سے فوراً پہچان لیا۔ پہلے حلیہ سنئے۔

بہت لانا تدر کوئی چھوٹ کے قریب اکسرتی جم۔ سونہ و سپید رنگت۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں ریلی سوتواں ناک، خضاب لگی ہوئی کھروان دار اسی خضاب رنگے کچھ دن ہو چکے تھے، کبوترانہ چڑوں سے سپیدی بھیلنے کی غلی چہرے پر سکا سٹیکھل رہی غلی، جس سے سامنے کے دانت نمایاں ہو گئے تھے، اور ان کے پان کے شوق کے غماز تھے۔ جسم پر

بندگے کا شیردانی مانا گرم کوٹ اور نیچے غالباً اُسی کپڑے کا پاجام تھا۔ سر پر ٹوپی تھی، اور اس کے اوپر منڈلے کی شکل میں پسید شال اڈھتے تھے، ایسے خوبصورت اور جامد زیب آدمی میں نے بہت کم دیکھے تھے۔

بہت نچاک سے ملے اور اٹھا کے اپنے ساتھ دوسرے کمرے میں لے گئے۔ برآمدے میں سے گزرتے ہوئے فرمایا، آپ نے خط کیوں نہ لکھا؟ اسٹیشن سے یہاں تک آنے میں تکلیف ہوئی ہوگی آپ کو، مکان تو آسانی سے مل گیا تھا؟ اپنے لکھا ہوا قلمیں کسی کو اسٹیشن پر بھیج دینا۔ غرض اسی طرح نابڑنوا لکھنؤ نے چار سوال کر دئے، لیکن لمبے میں کسی طرح کی حجت اور گھبراہٹ نہیں تھی۔ بلکہ آواز بہت نیچی تھی، اور ایک ایک لفظ انھوں نے انگ انگ کہا، کمرے میں پہنچے تو چھوٹے ہی فرمایا، میں تو آپ کو زیادہ عمر کا خیال کرتا تھا، آپ تو ماشاء اللہ بالکل جوان ہیں۔ میں نے عرض کیا، فائدہ جوائی کی لمبی ایک ہی کمی، ساری عمر تیس سال میں بسر ہوئی ہے، وہاں یہ معلوم ہی نہیں ہوا کہ جوائی کس چیز کا نام ہے؟ غم عشق؟ تو خیر نہیں۔ ”غم روزگار“ شے میں پریشان لکھا، اس لئے دل جوائی ہی میں پڑھا ہو گیا۔ کھنکھنے لگے، میں تو آپ کے غارسی کے ذوق بہت جبران ہوا۔ ابھی ”سبد چین“ کی فرمائش سے جو تعجب ہوا تھا وہی غم نہیں ہو پایا تھا کہ آپ نے مومن کے غارسی دیوان سے مصلحت پوچھ بھجوا، پھر میری نازی بھلا کا سال پوچھا۔

فرمایا، میں مولانا سید سلیمان اشرف صاحب کے پاس گیا تھا، ایک مدت سے میمورل ہے کہ جب یہاں علی گڑھ آتا ہوں تو اگر وہ یہاں موجود ہوں تو شام کا وقت ان کے ساتھ گزارتا ہوں، اور ادبی باہم عینا کی نماز کے بعد ہوتی ہے۔ اب معمول سے ذرا دیر ہو گئی۔ پھر ان کی تعریف اور علم بفضل سے متعلق چند کلمات کہے۔ اس کے بعد موضوع سخن بدل گیا، غارسی اور اردو علم و ادب پر گفتگو ہونے لگی۔ اسی طرح رات تک ہم بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ میں دل میں شرمندہ ہو رہا تھا کہ خواہ مخواہ ان کے آرام میں دخل ہو رہا ہوں، لیکن وہ اتنی محبت اور دل نبشی سے گفتگو فرما رہے تھے کہ اگر وہ اس میری بے وقت کی ہرزہ مرائی سے بے آرام بھی ہوئے تو انھوں نے لفظی کسی طرح اسے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ آخر آدھی رات کے قریب میں نے باتوں باتوں میں اشارہ کیا، تو نہایت لطف سے فرمایا۔ ارے آپ کی دلچسپ باتوں سے مجھے اس کا تو خیال ہی نہیں رہا کہ آپ سفر سے آئے ہیں۔ تھکے ماندے ہوں گے، اچھا اب آپ آرام کیجئے۔ کل صبح انشاء اللہ حبيب گنج چلیں گے، میں نے عرض کیا، یہ دو تین گھنٹے کا گاڑی کا سفر ہی کوں! ایسا مستحق کہ میں شک جانا۔ آپ کی تکلیف کا خیال ہو رہا ہے۔ بہر حال ہم نے ایک دوسرے سے شب بھر کہا اور میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔

اس دوران میں باہر بارش زیادہ شدید کی سے ہونے لگی تھی، اور ساتھ ہی تیز ہوا بھی چل رہی تھی۔ بد قسمتی سے میرے کمرے کے ایک روشن خانہ میں کچھ غرابی تھی۔ یہ پوری طرح بند نہیں ہوا تھا اور ہراسے اس کا پٹ کھٹکھٹا تھا۔ رات بھر اسے سنگم آواز کے باعث میں بیٹیک طرح سید سنہیں سکا۔ خیر صبح کو اٹھا، حمام میں پانی گرم ہو رہا تھا۔ تباہاٹو ناشتہ کے بعد ہم نواب صاحب کی موٹر پر حبيب گنج کے لئے روانہ ہوئے۔ اگرچہ بارش ختم ہو چکی تھی، لیکن ہوا میں خاصی نمی تھی۔ اور سردی بھی خوب چمکائی تھی۔ ڈرائیور کے علاوہ ہم تین آدمی تھے۔ نواب صاحب اور ان کے صاحب کلا احمد اور میں۔ نواب صاحب اور میں پچھلی طرف بیٹھے اور ملا احمد صاحب ڈرائیور کے برابر میں آگے بیٹھ گئے۔ سزا بہت غراب

تھی۔ اس کا اکثر حصہ پہلے ہی شکستہ سا تھا۔ وہی سہی کسریات کی بادش نے پوری کر دی۔ گرگھوں میں پانی بھر گیا تھا، اور جہاں پانی نہیں تھا وہاں کچھ مو رہی تھی۔

گھنے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ہم افسانہ خیراں حبیب گنگو پڑھنے۔ علی گڑھ سے ناشرہ کر کے چلے گئے اور دوپہر کے کھانے میں ابھی بہت دیر تھی۔ اس لئے ہمارے پاس کافی وقت تھا۔ پہنچنے ہی نواب صاحب نے کتب خانہ کھولنے کا حکم دیا، جنہم صاحب آگئے۔ ملازموں نے کرسیوں کو جو ہار ڈال دیا اور ہم داخل ہوئے۔

اللہ اللہ! میں اپنے تاثرات کا حال کیا لکھوں۔ ہر طرف ہزاروں بیش قیمت کتابیں قریب سے الماریوں میں چھپی رکھی تھیں۔ غائب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اگر کسی پچھلے شاعر کے ہاں کوئی ایسا مضمون بندھ گیا ہے جو میرے یہاں بھی پایا جاتا ہے، تو اس سے یہ خیال نہ کر کہ مجھے اس سے ڈر ہو گیا ہے، بلکہ یقین حاصل کر کہ اس سے نہانی غاۃ ازل سے میرے مضمون کی چوری کر لی تھی۔ کچھ ایسا ہی حال میرا اس وقت ہوتا ہے، جب میں کسی جگہ کوئی اچھی کتاب دیکھتا ہوں، مجھے یوں لگتا ہے، جیسے غلطی سے میرے جیسے کی چیز یہاں آگئی ہے۔ اور یہاں تو ایک دو نہیں ہزاروں کتابیں میرے ارد گرد پڑی تھیں۔

زفر قیوم تابعت دم ہر کہا کہ می نکر دم
کرشمہ وامن دل می کش کہ عاینا است

نواب صاحب کا حبیب عالم تھا، وہ ایک کتاب منظر آتے، مجھے دکھاتے اور پھر اس کی خوبصورتی کو انانہ شرح کرتے۔ یہ ملک الشعراء کا اعلیٰ کا دیوان ہے۔ اس میں بہت سا کلام خود طالع کے قلم سے لکھا ہوا ہے۔ اس طرف میری توجہ علامہ شبلی مرحوم نے دلائی تھی۔ میں نے جب یہ دیوان خریدایا تو بعض قدامت اذکار نے کہنے کی تھی کہ باعث، لیکن انھوں نے اسے دیکھ کر لکھا کہ اس میں بہت سی غریب اور عوالم کے ہاند کی ہیں۔ دیکھتے یہ اثرات روشنائی کی نظر بجا ہے۔

یہ مثنوی کا ایک قدرتی نسخہ ہے۔ جہاں تک معلوم ہو سکا اس سے قدیم نسخہ جو میری کے شہر میں آج بھی تلفظ میں ہے، کے کتاب خانہ میں ہے۔ جو اس سے صرف چھ برس پہلے کا لکھا ہوا ہے۔ یہ نیز نسخہ حضرت ادو ملک زیب عالمگیر کے کتاب خانہ میں رہا ہے۔ یہ وہی کن قمری صاف پڑھا جاتا ہے۔ ”محمد اور ملک زیب بادشاہ“

یہ نسخہ سحر کی برساں ہے۔ اس پر اودھ کے نہیں باو شاہوں کو تحریر بھی نصیر الدین حیدر۔ امجد علی شاہ اور امجد علی شاہ۔

چندوں پہلے ایک نازہ فتوح آئی تھی۔ ملا سعد الدین تھا زانی کی مطول جنم سے کہہ کے اُسے منگوا لیا۔ اس کے شروع میں پانچ چھ سطری اس شان سے لکھی تھیں کہ آھی عبارت بہت قدیم اور منثور علی اور بانی آدمی تا فعل بعد میں معلوم ہوا کہ یہ حصہ خود نواب صاحب نے پورا کیا تھا، پاس ہی میز پر مکتبہ شیشہ پڑا تھا۔ اٹھایا اور اسے میرے ہاتھ میں دے کے فرمانے لگے۔ دیکھتے تو یہ عبارت پڑھتے تھے ہیں۔ دگ دگ کے پڑھنے لگا۔ آخر میں ”نور الدین ابن اکبر شاہ غازی“ کے الفاظ آئے۔ گویا یہ خود جانیگر کے ہاند کی غریب تھی۔ اور اسی لئے انھوں نے مجھے اس کے پڑھنے کے لئے کہا تھا۔

بآبر باہر ہونے کے بیٹے کامرائی کا دیوان اس سے تھوڑے دن پہلے شائع ہوا تھا۔ اس کے ساتھ چند ایسے صفحوں کے عکس دستے گئے ہیں، جن پر مل بادشاہوں کی تحریریں یا دستخط ہیں۔ میں اسے دیکھ کر حقا تھا۔ اسطول کی یہ عبارت پڑھنے کے بعد میں نے کہا کہ جہانگیر کا سوا خط بالکل وہی ہے جو کامرائی کے دیوان میں ہے۔ یہ من کر بہت مسرور ہوئے۔ اور کہا تو اپنے کامرائی کا دیوان دیکھا ہے۔ پھر اسے بھی منکوا یا اور ہم دونوں اسے دیکھ دیکھ کے خوش ہوتے رہے۔

غرض ہم دینک اس جنت نگاہ کے نقارے میں مشغول رہے۔ وہ کتاب نکوانے اسے دکھاتے اور اس کی خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے جاتے۔ اگر میں کوئی ایسی بات کہہ دیتا جس سے اس کی کسی طرح کی اہمیت واضح ہوتی تھی تو خوشی کا اظہار فرماتے۔ وہ مجھے کہتا میں اس طرح دکھا رہے تھے جیسے میں کوئی بہت بڑا مبصر یا صاحب علم و فن ہوں۔ وہ ہر طرف سے بے پروا ہو کر بول کتاب پر کتاب نکلا رہے تھے، گویا آج پہلی مرتبہ انھیں کوئی کتابوں کا قدردان ملا ہو، اور میں اپنی بے مالکی اور ان کی قدرے نوازی پر حق عرق ہوا جا رہا تھا۔ حضرت خواجہ میر درد و علیہ الرحمۃ کا شعر ہے سے

یاراں ز زہربانی داند، ہر چہ و دانشد

ما خوب می شنایم، لے درد آنچه مائیم

اصل بات یہ ہے کہ وہ بغض و سب کچھ ہینے ہوئے بھی اساسی اور بنیادی طور پر علمی آدمی تھے۔ ان کی ذوق اور ذوق کی تنگیوں اگر ہوتی تھی تو کتابوں سے یا صاحب علم اصحاب کی صحبت میں۔ جہاں کہیں انھیں بیرونوں چیزیں میسر آجائیں ان کا بیرونی پر وہ جو بہ حال عارضی چیز تھی، اٹھ جاتا اور وہ اپنے اصلی روپ میں نمایاں ہوجاتے۔ میر سے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا۔ میں جب ان سے ملا، تو وہ بے نقاب ہو گئے، مجھ یا غلط، ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا، کہ میں بھی پڑھنے لکھنے کا شوق رکھتا ہوں اور کتابوں کا قدردان۔ اس صورت میں عمر مرتبہ، علم کا تعاون کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اہم چیز یہ تھی کہ میں بھی ان کے خیال میں علم کا شوقین اور کتابوں کا رسیا تھا۔ یہی چیز ہم دونوں میں گہرا قدر مشترک تھی۔ اس کے بعد بھلا یہ کیسے ممکن تھا، کہ وہ ایک ہم مشرب و ہم خیال شخص کے سامنے اپنا اند و خضر نہ رکھ دیتے۔ اس میں کسی حد تک جذبہ تفاخر بھی شامل تھا۔ آپ نے بار بار دیکھا ہوگا، کہ آپ کا بچہ، جب تک اپنا نیا کھلونا اپنے ہم چلیر کو نہ دکھائے، اسے میں نہیں آتا۔ اس کی تہذیب میں بھی یہی بات ہے، یعنی کسی ہم خیال کے ساتھ کھلونے سے لطف اندوز نہ ہونا اور اپنی ملکیت کا غرور اور اس کی ناقص کی خواہش۔

نواب صدر باجگت نے میر کی محنت سے یہ کتاب جمع کیا۔ بدقسمتی سے ایسی جگہ تھا، کہ وہ ان تک پہنچا انسان نہیں تھا۔ اس لئے بااوقات واقعی صاحب ذوق حضرات بھی وہاں جانے سے بچکھاتے تھے۔ لیکن اگر کسی طرح نواب صاحب کو معلوم ہوجاتا تو وہ دعوتیں دے دے کر انھیں بلائے۔ اپنا اہمان رکھنے اور جب واقعی کوئی قدردان مل جاتا، تو پھر لے نہ سکتے۔

سری کرشن مورشاہو منشی نے ایک شعر میں اپنی دو دل پسند چیزوں کا ذکر یوں کیا ہے سے

وخیبر مقاور فی الدنی سرچ ساج

وخیبر جلیبی فی الترمان کتاب

یعنی دنیا میں بہترین نشست برق دفنا گھوٹے کی زین ہے اور زندگی میں بہترین ساتھی کتاب ہے۔
 یہی دوسرا مصرع کتب خانے کا مہر ہے۔ اڑکی ایک کھوئی مگر میں یہ کہہ رہا تھا اور جو کتاب یہاں داخل ہوتی اس پر یہ مہر لگا جاتی تھی۔

آخر ہم اندر سے نکل کر باہر کے برآمدے میں آگے بیٹھ گئے۔ یہاں دیوار پر مختلف تصویریں، نقشے، مرنے وغیرہ لگ رہے تھے۔ ہندوستان کا ایک پرانا اور دل کش فلمی منظر تھا جس میں ساتھ ساتھ مختلف علاقوں کی زرمی پیداوار اور حیوانات بھی تصاویر میں دکھائے گئے ہیں۔ ہمارا جو سرشتی پرشاد ورم کو آخری زمانے میں مصوری کا بھی شوق ہوا تھا یہاں ان کی دستکاری کے بھی چند نمونے دیکھے۔ تصویریں فنی ہیلے سے تو داہمی ہی کسی تھیں۔ البتہ تبرک حیدر تھیں۔ شروع میں غالب کے جس خط کا ذکر کرتا تھا وہ بھی موجود تھا۔ اس خط کے آخر میں تاریخ تحریر سن ۱۲۸۵ھ قمری ہے، جو بدقسمت غلط ہے۔ دیوبند اس پر بحث ہوا کی کہ تھیک تاریخ کیا ہے۔ بہر حال کچھ فیصلہ نہ ہو سکا، اور جو بھی کیسے سکتا تھا محض قیاس آرائی ہی تھی۔ ثبوت کیسے مہیا کیا جاسکتا تھا؟ ذکر غالب کے ساتھ میں نے غالب کی جس تصویر کا عکس دیا ہے وہ میں نے یہیں سے لی تھی۔

اتنے میں ملکہ کا وقت ہو چلا تھا۔ مزایا، اگر کھانے کے بعد ملنے کے لئے کوئی کتاب لینی چاہیں تو کھلو لیجئے، میں نے گزارش کی کہ ”سید مجاہد“ کا مہلو منظر دلائیے تاکہ جو فعل اپنے مجبوراً ہے اس سے مقابلہ کر سکوں۔ نیز مومن کا فارسی دیوان۔ کتا ہیں آئیں اور ہم باہر چلے آئے۔ میں اپنے کمرے کی طرف گیا اور وہ مسجد کی طرف۔

”سید مجاہد“ کی پہلی شہرت ۱۸۶۷ء والی اشاعت میں کتابت کی بہت غلطیاں رہ گئی تھیں، اور اس کے بعض میں غلط نام لگایا گیا تھا۔ سوء اتفاق سے جسے سب کچھ والے نسخے سے یہ غلط نام غائب تھا۔ اس لئے میں پوری تصحیح نہ کر سکا۔ آخر میں نے یہ کام ہارڈنگ لائبریری (دہلی) کے نسخے کو دیکھ کر کیا تھا۔ اس کے باوجود میرے شانہ کردہ ایڈیشن میں بعض غلطیاں رہ گئیں جن کا مجھے افسوس ہے۔

ٹھوڑی دیر بعد ملا احمد مجھے کھانے کے لئے بلانے آئے۔ دسترخوان کلاوی کا ایک نچا ساخت تھا۔ اس پر سفید چادری تھی۔ تخت کے چاروں طرف کرسی تھیں۔ ہر لوگ ان برائتی پاتی ہار کے بیٹھ گئے۔ نواب صاحب حضور دسترخوان کے ایک سرے پر تھے۔ ان کے سیدھے ہاتھ پر ان کے خلف الکہ خان بہادر محمد عبدالرحمن خان صاحب تھے۔ اور ان کے بعد ملا احمد میں نواب صاحب کے بائیں طرف تھا۔ میرے برابر میں ایک اور صاحب بیٹھ تھے جن کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ میں میں بائیں کھانے پر تھے۔

کھانے میں نور محمد بلاؤ تھا۔ ترخ کلاسی تھا، شامی کباب تھے، ترکاری تھی۔ ملازم نے نواب صاحب کے سامنے ایک رکابی میں کوئی خاص چیز لاکے رکھی۔ یاد نہیں رہا کہ کیا تھا۔ انھوں نے اس میں سے ایک اور رکابی میں ٹھوڑا سا کھال کے بجائے عنایت فرمایا۔ کھانے کے دوران میں بات چیت ہوتی رہی۔ اس کے بعد کچھ مٹائی آئی، جناب خان بہادر نے یہ کہہ کر مجھ پرین کی کہ شوق فرمائیے۔ بازار سے نہیں آئی، بلکہ خانہ ساز ہے۔

کھانے کے بعد نواب صاحب آرام کے لئے اندر نشتر لے گئے۔ میں اپنے کمرے میں آیا اور مومن کا دیوان

دیکھتا رہا۔

پیارے بچے کے لگ بھگ میں پھر بڑے کرنے کی طرف گیا۔ نواب صاحب ملاقات سے فارغ ہو کر عصر کی نماز کے لئے جا رہے تھے مسہر بڑے پچھا ملک کے باہر تھے جہاں جماعت ہوتی تھی۔ ان کی واپسی پر ہر رات کے کھانے تک بیٹھے باقی کتنے رہتے اور میان میں ایک مرتبہ وہ مغرب کی نماز کے لئے اُٹھتے۔ لیکن نماز کے بعد سیدھے وہیں واپس آئے جید راجہ کے زمانہ قیام اور انگریز ریڈیٹرٹ سے اپنی پچھلیس کے حالات سناتے رہے۔ ہمارا جہر کشن پرشنا وشنا و مرحوم کی وضع داری کا ایک قصہ قابل ذکر ہے۔ فرمایا، مجھے پان کی عادت ہے، لیکن تبا کو نہیں کھانا، میں جب یہی مرتبہ ہمارا جہاد کے ہاں گیا تو وہ خاصداں میں پان رکھ کے لائے، میں نے شکریہ ادا کیا اور پان لے لیا۔ واپس جا کے اب دوسری مرتبہ وہ زروہ لے کے آگئے۔ میں نے پھر شکریہ ادا کیا اور غدر کیا کہ میں تبا کو نہیں کھانا، میں جید راجہ میں بارہ برس رہا اور ہمارا جہاد سے اکثر ملاقات بھی ہوتی تھی جب بھی میں ان کے ہاں جاتا۔ وہ پہلے پان کی گھڑی لائے جو میری لے لیتا۔ پھر تبا کو لائے میں شکر ہے کہ ساتھ غدر کر دیا، وہ خوب جانتے تھے کہ میں تبا کو نہیں کھانا، لیکن کبھی ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا کہ انھوں نے مجھے تبا کو پیش نہ کیا ہو۔

اس پہلی ملاقات کے موقع پر اپنے ہمراہی نوٹ بک میں مندرجہ ذیل عبارت رقم فرمائی۔

براہ دوستیما ہر کہ بنے منت قدم سب بد
بہر گامیکہ بردارو، ازوپائے نومی چیتے

کتیبہ حبیب الرحمن

بفرمائش ملک رام صاحب بوقت ورود ایشان در حبیب گنج، اشوال المکرم ۱۳۳۵ھ مطابق ۳۱ دسمبر ۱۹۳۷ء۔

اگلے دن میں واپس دہلی چلا آیا سچے وقت آپ نے اپنی تصنیفات کا مجموعہ میرے ساتھ گاڑی میں رکھوا دیا۔ یہاں آگئے کہ غور سے دن بعد میں نے پہلے ”سہدیین“ اور پھر ”ذکر غالب“ شائع کیں۔ دونوں کے نسخے میں نے ان کی خدمت میں بھیجے جو حاصل افزائی فرماتے میرے بہت تعریف کی۔

(۲)

اتفاق سے میں ۱۹۳۹ء میں ملک سے باہر چلا گیا۔ جنگ کا سارا زمانہ باہری رہا، اور ۱۹۴۶ء کے آخر میں واپس وطن آیا۔ اس تمام دوران میں خط و کتابت کا سلسلہ ہمارے درمیان جاری رہا، میں جب لوٹ کے آنے والا تھا، تو انھوں نے کھا کھج واپس آؤ تو حبیب گنج ضرور آنا۔ چنانچہ میں تعین حکم میں فروری ۱۹۴۷ء میں علی گڑھ گیا، میں نے جانے سے ایک دن پہلے تار سے انھیں اپنے آنے کی اطلاع دی، میں صبح کی گاڑی سے گیا تھا۔ کوٹھی پر پہنچا تو اب کے پھر جناب عبدالعزیز خان صاحب سے ملاقات ہوئی، انھوں نے مجھے پہچانا نہیں جو اتنے دن کے وقفے کے بعد کچھ ایسا غیر متوقع بھی نہیں تھا۔ بہر حال ان سے معلوم ہوا کہ نواب صاحب قبل حبیب گنج میں ہیں، میں فوراً وادوں جانے والی لاریوں کے آؤسے پہنچا۔ اب رہنے کا حال کیا، بیان کروں، لیکن کلمہ ہر زمانہ جیسے

پچھلے دس برس میں سرک کی مرمت تک نہیں ہوئی۔ بلکہ اب اسے سرک کہنا ہی غلط تھا۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ دونوں طرف کھیت تھے اور ان کے بیچ میں ایک خاصی چوڑی روشنی تھی جس پر بہت بار ایک مٹی کی چھانچ تھم جھا دی گئی تھی۔ موٹر کے پیچھے گروہ دفار کا ایک طوفان چھایا ہوا تھا، اور اگر بدقسمتی سے کہیں سامنے سے بھی کوئی لاری یا موٹر انٹھکتی تو پھر خود ہی تصور کر لیجئے کہ مسافروں پر کیا گزر جاتی ہوگی۔ سفر کا آخری ڈیڑھ دو میل کا ٹکڑا اس کے پائنتے پر لے کر نالفا۔ یہاں میں اڈے پر اترا اور ایک نائنتے پر بستر رکھ کر لگے روانہ ہوا۔ لیکن یہ راستہ بھی اتنا خراب تھا کہ ہجکروں کے مالے میری طبیعت خراب ہونے لگی، لاجار دو تین فلائنگ کے بعد میں اتار کھڑا ہوا باقی مسافت میں نے پیدل پوری کی اور سامان نائنتے پر آیا۔

میں ڈھائی تین بجے کے قریب صیب گنج پہنچا۔ نواب صاحب مرحوم باہر کے مغربی پادے میں فرش پر بیٹھے صیب محمول تلاوتِ قرآن میں مشغول تھے۔ میں ملا احمد صاحب کو آداب عرض کر کے خاموش بیٹھ گیا۔ جب تلاوتِ قرآن ہوئے تو میں نے ٹھک کے سلام عرض کیا چونکہ اب اونچی سنسنے لگے تھے اس لئے نائنتیں ملا احمد صاحب نے کما کر ادا کرنا چاہیے۔ چنانچہ میں نے منہ کان کے قریب صیب صاحب کی اونچی آواز سے دوبارہ کما آداب عرض کرنا ہوں۔ چند لمبے تک فورسے دیکھا، میں نے بھی نام نہیں بتایا اور چپ چاپ آدے کے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔ ایک نفلت پھان کے سرورق کھڑے ہو گئے اور لپٹا لیا۔ احمد اکبر اس معانے کی گرم حرشی سے اب تک لذتِ لذو ہمارا ہوں معلوم ہوا کہ دیوتا ماراضیں محمول نہیں ہوا۔ ہوا یہ کہ چونکہ تار میں نے عملی گڑبگڑ کے سنے سے کچھ سمجھا تھا۔ وہاں سے جناب عبدالوہید خاں صاحب نے آگے کستی روانہ کر دیا۔ چنانچہ میرے پیچھے کے آدھ روپن گھنٹہ بعد ایک شخص ڈاک کے آگے آیا اسی میں تار بھی تھا۔

نواب صاحب نے ملازم کو حکم دیا۔ وہ پانی کا ٹونا، صابون، ٹولیا وغیرہ لے آیا۔ میں نے ہاتھ منہ دھویا۔ اتنی دیر وہ میرے پاس کھڑے رہے۔ پھر چائے آئی سب نے پی۔ چند منٹ بیٹھے کے بعد مصر کی نماز کے لئے مسجد میں چلے گئے۔ حالت ہوئے مسر دایا۔ مغرب کے بعد آپ کی پچھلے سات برس کی رام کہانی سنوں گا کہ کہاں کہاں رہے اور کیا کیا دیکھا۔ میں نے عرض کیا بس روچشم شام کے کھانے کے بعد ہم لوگ بڑے کرے میں گئے۔ نواب صاحب اور ملا احمد وہیں۔ اگرچہ میں نے اس چھ سات برس میں شرق اور سطو اونی کے تمام اسلامی ممالک کی سیر کی تھی، لیکن زیادہ قیام مصر میں رہا تھا۔ کہنے لگے، دیکھئے صاحب آروہ میں گفتگو نہیں ہوگی آپ اتنے دن مصر میں رہے ہیں یقیناً عربی بہت اچھی بولتے ہوں گے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک بات کی وضاحت کر دوں۔

یوں کہنے کو تمام عربی ممالک کی زبان عربی ہے۔ لیکن جب باہر سے کوئی ایسا شخص یہاں آئے جس نے ساری عمر عربی پڑھی ہو اور اپنے آپ کو عربی کا عالم سمجھتا ہو تو اگر وہ یہاں علم لوگوں سے بات چیت کرے، تو بلا میں اندر عرض کرتا ہوں، کہ وہ ان کی سمجھ اور انھیں سمجھانے میں بہت دقت محسوس کرے گا۔ بات یہ ہے کہ عام بولی چال کی بولی، کتابی زبان سے بالکل مختلف ہے۔ اس عربی زبان دراجر اس کے اپنے اصول ہیں۔ اس کی گرامر الگ ہے۔ اس کی لغات الگ ہے۔ اس کا بول و لہجہ الگ ہے۔ غیر ملکی عاملوں کو تو سمجھ کر ہیے کہ ان غریبوں نے سوائے کتابیں پڑھنے کے کسی کو کم بولتے سنا ہوگا خود عربی ممالک کا یہ حال ہے کہ ایک مصری ایک عراقی کی بات سمجھنے میں مشکل محسوس کرتا ہے، حالانکہ دونوں عربی بولتے ہیں۔ ایک طیفہ یاد آگیا۔ میرے ایک مصری دوست

ہیں، وہ کسی زمانے میں مارسیلز (فرانس) میں مصری قنصل تھے۔ مراکش کا علاقہ، فرانسیسی سلطنت کا حصہ ہے۔ ایک دن کچھ مراکشی باشندے کسی کام سے اُن کے دفتر میں آئے۔ اب خیال رہے کہ مصر اور مراکش دونوں ملکوں کی زبانیں عربی ہے، فرانسیسی، فارسی، اردو، چینی، ان کی گفتگو کا ایک لفظ سمجھا ہوں، آخر ایک ترجمان بلا نا پڑا جو طرفین کی باتوں کا ترجمہ کرنا لگا، اور اس خدمت معاملہ طے ہوا۔ پھر ہر ایک جگہ کی بولی میں دخل الفاظ ہیں۔ یعنی دوسری زبانوں کے لفظ عربی میں ایسے دس گئے ہیں کہ لوگ انھیں بے تکلف بولتے ہیں، اور قطعاً کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ مزاحین میں معلوم ہی ہے کہ یہ عربی کا نہیں کسی غیر زبان کا لفظ ہے۔ مراکش اور تونس میں فرانسیسی اور سپاہیوں کے لفظ راہ گئے ہیں مصر میں فرانسیسی اور اطالوی۔ اسی طرح عراق میں فارسی اور ترکی۔ اور یہی حالی دوسری جگہوں کا ہے۔ اگر اس بیرونی آئینہ سے کچھ محفوظ رہیں ہے، تو عجائیہ کی زبان، اگرچہ یہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہی کہ پھر یہ عراقی عوام ہی ملک محمد و انہیں ملکہ تعلیم یافتہ اور عالم لوگ بھی جب آپس میں بات چیت کریں گے تو اسی وادج زبان میں۔ یوں کہنے کو ٹھیک لگے ہیں گے، کیونکہ کئی زبانیں بدلی، بس ان بولیں گے ہی عام بولی۔

اسی صورت حال کو ملاحظہ رکھ کے میں نے عربی کا کچھ عربی میں بات چیت کرنے میں کوئی عذر نہیں لیکن بے اعتبارانہ میری زبان پر، اور جو کلمات آج بھی گئے جو اولیٰ تو آپ کہیں گے نہیں ادا اگر کچھ بھی گئے تو عربی کا ہے، یہ اچھا عذر مذاق بن جائے گا۔ فرانسیسی کے پروانہ کچھ، چنانچہ ہم پہلے پندرہ دن تک عربی میں گفتگو کرتے رہے۔ میں نے کوئی شے نہ کہنی تو میری زبان بخوبی اور صحیح ہو لیکن پھر بھی شے نہ ہونے کے سبب کہیں کہیں وادج لفظ آگئے۔ موضوع عربی اسلامی ممالک کے حالات تھا۔ وہاں کے لوگوں کے دینی اور معاشرتی مسائل سے متعلق پوچھے رہتے جب میں نے بتایا کہ مذہب عرب میں اور دولت کی تقسیم بہت غلط طریقہ پر ہو رہی ہے۔ ملک کا تمام سرمایہ چند خاندانوں میں جمع ہو گیا ہے۔ نوکروں کی جمعیت بہت بڑھ گئی کی طرف سے کوئی انتظام نہیں، مغربی سیاسی اقتدار کے ساتھ ساتھ غیر اسلامی بدلتے خلافت، اسلام تمدن و معاشرت پر عمدہ مادہ تو بہت آسوں کرتے رہے۔

اس کے بعد اردو زبان وادج کا سلسلہ چلا۔ مولانا ابوالکلام آزاد سے جو خطوط قلمبند ہوئے ہیں، ان کے نام گئے تھے اُن کا مجموعہ ”غبارِ خاطر“ کے نام سے چند ماہ پیشتر شائع ہو گیا۔ میرے پیچھے سے تھوڑے دن پہلے ایک اور مختصر کتاب اُن کے ایک عزیز نے مرتب کر کے ”کاروان خیال“ کے عنوان سے چھاپی تھی۔ اس میں مولانا آزاد کے علاوہ اُن کے اپنے خطوط بھی ہیں۔ ”غبارِ خاطر“ کا ایک بہت خوب صورت ایڈیشن لاہور سے نکلا تھا۔ اس کے آخر میں ایک خط بھی آیا وہ جس میں اسلامی متون سے متعلق بحث ہے۔ کاروان خیال کے ساتھ اس خاص ایڈیشن کا ایک ترجمہ برپا تھا۔ دونوں کتابوں کو اُنھوں نے یاد دلان پر متحد کر کے مجھے عنایت فرمایا۔ پھر مولانا آزاد کی تحریر و لفظ اور عافیت کی تعریف کرتے رہے۔ مجھے خیال ہوا کہ ان کی زندگی کے کچھ حالات دیکھوں۔ چنانچہ میں نے اُن کے خاندان، تعلیم اور جبر و آزاد کی ملازمت سے متعلق کتنے سوال کئے۔ جواب دیتے رہے۔ پھر فرمایا، میرے ایک عزیز نے پچھلے دنوں میں گھر کے رسالے مصنف میں میرے متعلق ایک مضمون لکھا ہے۔ اس میں کچھ غلطیاں در آئی ہیں۔ بہر حال اس پر ایک نظر ڈال کے آپ کو سمجھ دوں گا۔ چنانچہ حسب وعدہ یہ پرچہ انھوں نے مجھے بھیجا تھا۔ اس میں بعض اصلاحیں خود ان کے قلم سے ہیں بعض کسی اور کے۔

اگلے صبح ہم ناشتے کے بعد کتب خانے میں پہنچے۔ میرے پاس دیوانی غالب کا ایک نسخہ ہے جس کا پہلا اور آخری ورق غائب ہیں۔ اس لئے مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ یہ کہاں سے اور کب شائع ہوا۔ قرآن سے البتہ مجھے اس بات کا یقین تھا کہ میرزا کی زندگی میں چھپا ہے۔ اس کے آخر میں تیر رشتاں کی لکھی ہوئی تقریر ہے جس نے غلط فہم کیا کہ یہ لکھنؤ (شہر) میں شائع ہوا۔ چنانچہ میں نے اسی طرح ”ذکر غالب“ کے پہلے ایڈیشن میں لکھ دیا۔ بعد میں اپنی غلطی پر متنبہ ہوا۔ اب یہ بات نزاع ہوئی کہ ۱۸۵۷ء میں آدو دیوان کا کوئی ایڈیشن شائع نہیں ہوا تھا۔ لیکن ایک نئی لکھی پیدا ہوئی کہ آخر میرے پاس جو نسخہ ہے یہ کہاں اور کس سال میں چھپا۔ میں احتیاطاً اسے اپنے ساتھ لیتا گیا تھا کہ اگر کتب خانہ حبیب گنج میں بھی اسی ایڈیشن کا کوئی اور نسخہ ہو تو مقلد سے یہ عقیدہ حل ہو جائے۔ خوش قسمتی سے یہاں ایک مکمل نسخہ موجود تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ مطبع احمدی شاہد رہ دہلی والا ۱۲۸۶ھ کا نسخہ ہے۔ اس میں بہت غلطیاں وہ گئی تھیں جنھیں شعر چینی سے رہ گئے، بعض دوبارہ چھپ گئے۔ کتابت کی غلطیوں کا تو ذکر ہی کیا۔ اسی لئے میرزا نے فوراً مطبع نظامی کانپور میں نیا ایڈیشن چھاپنے کی اجازت سے دی تھی۔ ہمیں کتب خانہ میں اس کے بچے ابھی چند سی منٹ ہوئے تھے کہ فرمایا، نیچے آپ سے متعلق ایک نسخہ ہو گیا ہے۔

لے مالک ملک و فائے یاراں

دل رام تو شد نہ دانت صد جاں

میں آٹھ کے آداب بجالایا اور ان کا شکریہ ادا کیا۔

میں نے عرض کیا کہ اپنی کوئی تصویر ہو تو مرحمت فرمائیے۔ ورنہ تصویروں کے ذخیرے میں سے تلاش کرتے رہے سبب پرانی چیزیں نہیں۔ اور ان میں سے بھی کوئی اکیلی تصویر نہ ملے گی۔ چونکہ میرا شام کو واسپی کا ارادہ تھا۔ فرمانے لگے جیسے میں آپ کے ساتھ علی گڑھ تک چلتا ہوں، وہیں اسٹیشن پر اتروائیں گے۔ میں نے کہا کہ نہیں اتنی زحمت کی کیا ضرورت ہے۔ کہنے لگے زحمت کچھ بھی نہیں۔ میں گلی تو جانے ہی والا تھا، آج چلا جاؤں گا۔ ہوں علی گڑھ تک اور ساتھ بھی رہے گا۔ غالباً یہ بھی فرمایا تھا کہ مجھے کل کسی کام سے الہ آباد جانا ہے۔ لیکن ہمیں حبیب گنج سے رواج ہونے جوئے دیر ہو گئی۔ جاڑوں کے دن، پانچ بجے ہی خاصا اندھیرا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب تک ہم علی گڑھ پہنچے، روشنی اتنی کم ہو چکی تھی کہ تصویر اتروانے کا وقت نہیں باق تھا کہنے لگے کوئی بات نہیں، پھر کسی وقت اترواؤ گے بعد ونگا۔ اگرچہ یہ افسوس ضرور رہے گا کہ اب اس میں نہیں ہوں گے۔ راستے میں گرو وغیار کے ملوانان کو دیکھ کے میں نے عرض کیا کہ اس دل بادل کو دیکھ کے فروہی کے شکر کی حقیقت واضح ہو گئی۔

زس گرو میداں کہ بر شند بہ دشت

زمین شش شد و آسمان گشت ہشت

بہت سرد رہے۔ پھر جو حافظے پر زور دے کر شائبہ کے اسی مقام کے آٹھ دس شعر سنائے میں ان کی یادداشت پر ونگ رہ گیا۔ اس وقت ان کی عمر کے بیٹے میں تھی۔ اور ظاہر ہے کہ شائبہ اندام انھوں نے ایک زمانے سے نہیں دیکھا ہوگا۔ کوئی ایک آدھ شعر کسی جگہ سے حسب موقع پڑھ دینا کوئی کم نہیں۔ یہ بات ہر کوئی کر سکتا ہے۔ لیکن یوں اچانک ایک شعر

سن کر آگے پیچھے کے شرف و دنیا معمولی بات نہیں۔

مرحوم کی ایک عادت تھی کہ اگر وہ کسی بات کا جواب نہیں دینا چاہتے تھے تو عموماً خاموش رہتے یا کوئی اور کچھ بڑبڑاتے۔ اس سفر میں بھی ایک اسی طرح کا تجربہ ہوا۔

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے مولانا شبلی کی سوانح عمری "حیاتِ شبلی" کے عنوان سے لکھی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی تھی، اس کا پورا مسودہ نواب صاحب مرحوم نے دیکھا تھا، اور انھوں نے اس پر بجا بجا احسانے کیے جو کتاب کے ساتھ چھپ گئے ہیں۔ اسی زمانے میں بارون کو مشغلہ ملائمہ آبا اور انھوں نے مختلف رسالوں میں شبلی اور علیہ بیگم کے موضوع پر مضامین لکھ کر ایک نادر نادر دیا۔ بلکہ یاد پڑتا ہے کہ غالباً جبراً یا دباؤ پر سے ایک تقریر بھی اس موضوع پر نشر ہوئی تھی جس وقت وہ شاہناہ کے شعر جمعہ شاد دے تھے میرا وہی شعر انجم کی طرف منتقل ہو گیا جس کے چند حصے میں مولانا شبلی نے کوئی سو صفحے میں شاہناہ پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ شعرا انجم اور شبلی سے مجھے شبلی اور علیہ بیگم کا قصہ یاد آ گیا۔ اب مجھے شہادت اور تحقیر کی سوچیں جن اچھا ہے "حیاتِ شبلی" پڑھی ہے، انھیں معلوم ہے کہ مولانا سید سلیمان نے اس سے متعلق ایک نکتہ نہیں لکھا، حالانکہ یہ ایسی بات نہیں جسے یوں نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ اگر اس میں کچھ اصلیت ہے تو اس کا بڑا اثر ان عزائم پر لینا چاہیے تھا۔ کیونکہ اس سے مولانا شبلی کی عظمت اور قیاد میں کسی طرح کی کمی نہیں ہوتی، اور اگر یہ غلط ہے تو پھر اس کی ساری تردید کی ضرورت تھی۔ کیونکہ اگر آج یہ مسئلہ صاف نہ ہوا تو پھر قیامت تک نہیں ہوگا۔ اس وقت مولانا شبلی کے ملائمہ اور اصحاب اور تربیت یافتہ اصحاب ہمارے درمیان موجود ہیں جو اس موضوع پر ذمہ دار نہ اور واقف کار نہ انداز میں لکھتے ہیں۔ بعد میں آنے والے تو بہر حال انھیں کے خوشہ چینی ہوں گے۔

ان ہی رعایتوں کے خیال سے میں نے ان سے سوال کیا کہ کیا آپ نے "حیاتِ شبلی" میں کوئی مرغلزاشت محسوس نہیں کی۔ پوچھا، کیوں آپ کا اشارہ اس طرف ہے میں نے کہا یہی علیہ بیگم والے قحطے پر بھی کچھ لکھنے کی ضرورت تھی۔ ہاں ہوں کہ کہ وہ گئے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس سے متعلق گفتگو کرنے پر تیار نہیں۔ اور میں یہ محض خطائے بزرگان گرفتِ خطا سمت پر عمل کرنے کو تیار نہیں تھا۔ بہر تہ زمانہ سے کام لیتے ہوئے میں نے پھر کہا۔ مکاتیبِ شبلی میں آپ نے مولانا کے خط ہمدی افلاوی کے نام ضرور پڑھے ہوں گے، جو اب اثبات میں دیا۔ پھر پوچھا کہ کیا آپ نے ہمدی افلاوی کے خطوط کا مجموعہ دیکھا ہے۔ فرمایا۔ ہاں، ایک زمانہ ہوا دیکھا تھا۔ میں نے کہا آپ نے خطوطِ شبلی بھی ضرور دیکھے ہوں گی جس میں شبلی کے وہ خطوط ہیں جو انھوں نے علیہ بیگم اور ان کی بہن کے نام لکھے تھے، فرمایا، ہاں یہ بھی بہت مدت ہوئی دیکھے تھے۔ اب میں نے انہی تہذیب کے بعد سوال کیا کہ ہمدی نے مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں صاف لکھا ہے کہ مولانا شبلی کا مجھ سے پرہیز نہیں تھا۔ آخر یہ کس بات کی "پرہیز واری" تھی، کہنے لگے، مجھے یہ کتاب دیکھے اتنا زمانہ ہو گیا ہے کہ اب بھٹیک طور پر کچھ یاد نہیں۔ میں نے کہا، اچھا یہی سہی، لیکن آپ اصحاب کی یہ کمال خوشی بھی تو شک پیدا کرنے والی ہے۔ آخر آپ لوگ کھل کے کیوں کوئی بات نہیں کرتے۔ کہنے لگے، "ما فائدہ، فائدہ یہ کہ اس سے دودھ کا دودھ اور دانی کا پانی ہو جائے گا۔ کل کے مورخ کے لئے روشنی بنی ہو جائے گی، اور اس کے لئے فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی" انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اب میں نے

گستاخانہ جہاد سے کام لیتے ہوئے ایک اور حربہ استعمال کیا۔ میں نے کہا قرآن کہتا ہے "لا تکتعوا الشهادات" کسی سبیلے میں اگر تعین کچھ بات معلوم ہو تو اس کے انہار سے دریغ نہ کرو اور اسے مت چھوڑو، اور آپ حضرات میں کہ سب کچھ جانتے ہوئے خاموش ہیں۔ اوپر چھپے پر بھی نہیں بتاتے۔ لیکن صاحب یہ وار بھی خالی گیا۔ وہ ہنس کے ٹال گئے۔ اتنے میں ہم علی گڑھ پہنچ گئے۔

پیر شام کی گاڑی سے واپس دہلی چلا آیا۔ اس موقع پر اپنے میری نوٹ بک میں تحریر فرمایا تھا۔

لے آؤ نہت باعوث آباوی ما

ذکر تو بود ز منہ شاد دلی ما

بفرمائش مالک رام صاحب بوقت ورود و محرم مقام حبیب گنج

فی البدایہ

لے مالک ملک و فائے یاران

دل رام نوشہرہ فدائت حد جہاں

حبیب الرحمن صدر یار جگمگ

حبیب گنج، ۲۶ فروری ۱۹۴۲ء

پیر میری ان سے آخری ملاقات تھی۔ اس کے جلد بعد ہی میں دوبارہ ملک سے باہر چلا گیا۔ پہلے خط و کتابت برابر جاری رہی لیکن پھر بہت بے فائدگی پیدا ہو گئی۔ بلکہ آخری سال میں تو بالکل بند ہو گئی تھی۔ لکھا کہ اب کچھ لکھتا ہوں تو انگلیاں درد کرنے لگتی ہیں۔ میں نے بھی بار خاطر ہونا بے درد نہ کیا۔ جناب عبدالوجید خاں صاحب نے ان کی خبر برابر ملتی رہتی تھی۔ آخر ایک دن ان کا خط ملا کہ وہ ۱۱ اگست ۱۹۵۵ء کو جمعہ کے دن صبح کے سات بجے اپنے خاں جنینی سے جاملے۔

ان اللہ وانا الیہ راجعون۔

(۳)

موت بی آدم کی میراث ہے۔ اس سے مفروض نہیں۔ وہ طبی عمر گزار کر وہاں گئے جہاں ہم سب کو جانا ہے۔ وفات کے وقت عمر ۸۶ برس تھی۔ یعنی کتاب مقدس کی مقرر کردہ حد سے بھی ۱۴ برس زیادہ۔ تو اس پہلو سے کوئی افسوس نہیں۔ یہ مرحلہ ٹالے ٹل نہیں سکتا۔ ایک نہ ایک دن ضرور پیش آتا۔ وہ رئیس بن رئیس تھے۔ لیکن انھوں نے اپنی عمر عیسوی کی لغویات میں ضائع نہیں کی۔ علم کو اس طرح حاصل کیا جس طرح اس کا حق ہے۔ پھر ملک کے علم و عمل کا شاہد بھی کوئی ایسا گوشہ ہو گا جو ان کی مادی یا معنوی اعانت سے شاکم اور فیض یاب نہ ہو۔ یہ بھی قابل غور بات ہے۔ لیکن افسوس ہے تو اس بات کا کہ اب ان سا انسان نہیں ملے گا جس دور کی وہ پیلہ وار تھے وہ دور ہی ختم ہو گیا۔ اب ان کے سے انسان پیدا ہی نہیں ہوتے۔ ایک آدھ اور صورت جس اس دور کی یاد گار باقی ہے، وہ بھی جھلملائی شمع ہے۔ ہوا کا ایک جھونکا آیا اور گل، اس کے

بعد گھپ اندھیرا۔

زمانے نے اپنا درق اٹٹ دیا ہے۔ آج حیرت اور خلوص، دوستی اور وفا، اخلاق اور نذر دانی، علم اور فن، دین اور دنیا، غرض ہر چیز کا مفہوم ہی بدل گیا ہے۔ مروجہ اس زمانے میں پیدا ہوئے، پھلے پھولے اور پروان چڑھے۔ جسے ہم ایک لفظ میں بیان کرنا چاہیں تو وضع داری سے بہتر علم نہ ملے۔ وضع داری، ایک قانون، ایک ضابطہ کا نام تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آپ جس طرح کسی شخص سے آج ملے ہیں، اسی طرح آج سے پچاس برس بعد بھی ملیں گے۔ زندگی کا جو اصول آپ نے بنا لیا ہے، اب کوئی طاقت آپ کو اس سے ادھر دھرنہ نہیں کر سکتی۔ آپ کی دوستی کسی اصول پر مبنی ہوگی، اور مخالفت بھی۔ یہ نہیں کہ جھڑکی ہوا ہوئی اسی طرف پھیر گئے۔ اسے ہم وفاداری بشرط استواری سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ مروجہ اسی اصول کی جعلی پھرتی تصویر تھی۔ اب یہ تصویر پھر نظر نہیں آئے گی۔ سمیر کا ایک شعر یاد آگیا۔ اسی پر ختم کرتا ہوں۔

باقی ہماری یادیں پھر باقی ایسی نہ سنبھلے گا
جب کہنے کسی کو سننے کا تو دیر تک سرو حسیۂ کا

ابوالکلام آزاد

علامہ رسول مہر

نوافروست زادہ برہم عمو

غزل بہ زمزمہ خرام کہ پیوہ باہست اند

۱۹۱۳ء کے مہینہ گراما آغا ز تھا میں ایف اے کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا کہ چند دوست وقت کے لئے ایک نام میرے پاس لائے اور پلے کہ ”حرب اللہ“ کے مہینہ جاری۔ میں نے پہلی مرتبہ یہ نام سنا تھا، لیکن دوستوں پر اطمینان تھا اس لئے تذبذب کے بغیر وقت خط کر ڈیئے۔ دیکھا کہ چھوٹا سا فارم ہے۔ اس پر ٹائپ میں تین چار سطریں چھپی ہوئی ہیں۔ اوپر چلی حروف میں ”من انصار الی اللہ“ نہ قلم ہے۔ اس کے نیچے قرآن مجید کی ایک آیت ہے اور اس کے ساتھ اردو ترجمہ۔ باقی ان تحریر نام: بیٹھے۔ عمراور پتے کی جگہ خالی چھپڑا رکھی ہے۔ چند روز بعد میں اس فارم کے متن سب کچھ بخوبی لیا۔ ایف اے کا امتحان دے کر کھر جانے لگا تو دوستوں سے پوچھا کہ جی، کوئی دھپسہ متعلقہ بناؤ، جس سے تجھے امتحان کے انتظار کا وقت بخوبی گزر سکے۔ انھوں نے کہا کہ اخبار جاری کرادو۔ ورس تھی دو اخباروں کے نام تجویز کر دئے۔ ایک ”روزنامہ“ ”زمبند“ اور ”مقتدرۃ الملل“۔ ”الملل“ کا چندہ اس زمانے میں آٹھ روپے سالانہ تھا اور ”الملل“ ہر چھپکا تھا کہ جو لوگ ایک معین مدت میں خریداری کی درخواست کریں گے ان کے چندے میں سے سارے مدت روپے ”ہلال احمدیہ“ میں بھیج دیئے جائیں گے۔ میں نے ہم حرم و ہم ثواب کے پیش نظر فوراً درخواست پیجی، لیکن نہ اس وقت تک ”الملل“ کی شکل دیکھی تھی نہ یہ معلوم تھا کہ وہ کس قسم کا پرچہ ہے۔ صرف اتنا جاننا تھا کہ ”حرب اللہ“ کا فارم ”الملل“ ہی کے دفتر سے آیا تھا۔

میں گھر پہنچا تو چند روز بعد ”الملل“ کا دی۔ پئی آگیا۔ پرچہ کھولا تو فوراً ٹائپ میں چھپا ہوا تھا اور ٹائپ کے پیشے کا میں حامی نہ تھا۔ تکلف سے عبارت پڑھنی چاہی تو وہ عربی الفاظ و تراکیب سے لبریز تھی اور جا بجا آیات درج تھیں۔ کچھ وقت صرف کرنے کے بعد میں نے سمجھ لیا کہ ممکن ہے ”ہلال احمدیہ“ میں چندہ دینے کا ثواب ”میرے نام اعمال میں لکھا جائے۔ لیکن ”خبر“ کی آمد پر نقش بر آب ثابت ہوئی۔ پرچہ دیئے ہی رکھ دیا اور اس کے کسی حصے سے استفادہ کا سوال باقی نہ رہا۔ آٹھویں دن پرچہ آتا تھا۔ میں اسے کھولتا اور پڑھے بغیر ایک جگہ دیکھتا جانا۔ چھٹا سوا دن پرچہ آیا تو اس میں ”حرب اللہ“ کے اعراف و مضامین کا ذکر تھا۔ میں چونکہ اس جماعت کا ممبر بن چکا تھا اس لئے طبیعت پر جوہر کے معنوں میں پڑھا کہ جس جماعت

سے وابستہ ہو رہا ہوں، اس کے مقاصد سے آگاہی لازم ہے۔ فارغ ہوا قول پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ پھر تمام پرچوں کو
اول سے آخر تک حرفاً حرفاً دیکھا اور اس امر پر براہِ فہمیں کرتا ہوا کہ پہلے دن اس کا باقاعدہ مطالعہ کیوں نہ شروع کر دیا۔
بے غم عشق تو صد جیت از عمر ہے کہ گزشت

میش از ہی کاشش گرفتار غمت می بودم

میں گاؤں میں رہتا تھا، جہاں جھپٹے میں تین مرتبہ ڈاک آتی تھی، اللہ کی امداد کے دن ڈاک کے کی پیشوائی سے جو رشت
اشتیاق میں میل میل، ڈیڑھ ڈیڑھ میل بائزکل جانا۔ جہاں وہ ملتا وہیں سے پھر کھول کر پڑھنا شروع کر دیتا اور جو دوست یا
موجودین کے لئے آتے، ان سب کو ایک ایک مضمون سناتا۔ یہ اللہ سے عشق و شغف کی ابتدا تھی، اسی وقت سے دہلانا ابوالعالم
آزاد کے ساتھ عقیدت کا رشتہ استوار ہوا۔ چالیس سال کی مدت میں کاروانِ حیات نے دہلی کی انقلابی و سبکیاؤں میں گزر لیٹے
کیے۔ لیکن پیرشتہ استوار ہے۔ استوار تر ہوتا رہا اور آج بھی جبکہ آخری منزل بہت قریب نظر آتی ہے، اس تمنیٰ کو زندگی کی
ایک عزیز ترین شمع بجھنا ہوں۔

اسی زمانے میں مولانا سے خط و کتابت شروع ہو گئی تھی اور میری درخواست پر انھوں نے اپنی ایک دستخطی تصویر بھی بھیج
دی تھی۔ اگرچہ اس واقعے کو ایک ٹمکڑ دیکھی ہے، لیکن آج بھی تصویر پانے کی لذت اسی طرح محسوس کرتا ہوں، گو یا یہ نعمت ابھی
حاصل ہوئی ہے۔ مولانا سے ملاقات ۱۹۱۹ء میں ہوئی جب میں بی۔ اے میں پڑھتا تھا۔ وہ راولپنڈی کا نفرنس سے مراجعت پر
ریٹائر ہوا تھا، لیکن میرے تھے۔ میں چند احباب کی معیت میں زیارت کے لئے گیا اور انہیں دیکھا تو اپنے ذہن میں جو تصویر قائم کر لیا
تھا، اس سے وہ بالکل مختلف تھے۔ یہ نہ قامت جسم نہایت بولا پتلا، رنگ سرخ و سفید، داڑھی موچھ صاف، کبیل اوڑھے
پنگ پٹیٹھے تھے۔ صرف چند منٹ سرسری باتیں ہوئیں۔ میرا تعارف ہوا تو فرمایا کہ آج شام کے چار بجے طویل ترہ وقت
پر حاضر ہوا تو ان کے علم فضل کا رعب دل پر اس قدر چھایا ہوا تھا کہ چند بائیں عقیدت کو دل ہی دل میں موزوں الفاظ کا لباس
پہنانے کے لئے ہر کوشش نا کام رہی، گو یا یہ نقشہ پیش تھا۔

آزادہ زمین حال شب وصل چہ پیسی

نے دل نیرم داشت آزادہ از دل نیرم بود

مولانا نے پوچھا کہ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد کیا ارادہ ہے؟ میری کچھ میں اس کے سوا کچھ نہ آیا کہ اخبار جاری کر دوں گا، تاکہ
ملک و ملت کی کچھ خدمت بجا لاؤں۔ فرمایا: "شغف اچھا ہے، لیکن تمہیں اندازہ ہے کہ اس طرح منزل مقصود کے قریب
پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا؟ فرض کرو کہ ابتدائے کار ہی میں آرزو کے مطابق سادہ میسر آجائے، تو اس کے استغناء اور اس کی
آواز کی پذیرائی کے لئے کم و بیش دو سال کا انتظار لازمی ہوگا۔ پھر دو سال اس پذیرائی کے نتائج کا انتظار کرنا پڑے گا۔ گو با جس
دریغ خدمت سے کام لینے کا ارادہ کئے بیٹھے ہو، اس کے نتائج دیکھنے کے لئے کم از کم چار سال صرف ہو جائیں گے۔ میر
نزدیک حالات کی رفتار ایسی ہے کہ اس مدت کے ایک حصے کا بھی انتظار مشکل ہے۔ بہن کہا جاسکتا کہ اس اثنا میں کیا کچھ
ہو جائے گا؟ میں دم بخود رہ گیا اور عرض کیا کہ آپ فرمائیں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ فرمایا کہ امتحان سے فارغ ہونے کا انتظار کر دو۔

”الہلال“ بند ہو چکا تھا مولانا نے ”البلبل“ نکالا تو اس کے ساتھ ہی ملکہ میں ”دارالارشاد“ قائم کر دیا جس میں یہ نقشب فرزانہ کو قرآن مجید کا درس دیا کرتے تھے۔ یہ فوجی اور دینی کارکنوں کی تعلیم و تربیت کا وہ مرکز تھا جس کے لئے مولانا ”الہلال“ کے زمانے سے انتظامات کر رہے تھے۔ لیکن ”دارالارشاد“ کے قیام کو ابھی چند ہی مہینے گزرے تھے کہ حکومت بنگال نے انہیں بنگالی کے حدود سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ وہ راجپوت چلے گئے تو وہاں انہیں نظر بند کر دیا گیا۔ ساتھ ہی ”البلبل“ بھی بند ہو گیا اور ”دارالارشاد“ بھی۔ اس آفتاب میں دس صرف اڑھائی تین پارے تک پہنچا تھا۔ میرے دل میں ان کی ذات بابرکات سے استغاثہ کی جو آرزوئیں موجود تھیں وہ بھی خون ہر کر رہ گئیں۔

پہناں تھا دمِ منتِ قریب آشیانے کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

۱۹۲۲ء میں نظر بندی سے دہا ہوئے تو ملک میں ترک مولات کی تحریک جاری ہوئی اور وہ ہمدن اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے وقت ہر گئے۔ میں اس زمانے میں ”زمیندارشہ“ وابستہ ہو چکا تھا۔ ان سے نیاز مندی کے روابط کی تجدید ہوئی۔ اگرچہ سیاسی افکار میں بعض اوقات اختلاف کی صورت بھی پیش آتی رہی۔ لیکن رشتہ عقیدت بدستور قائم رہا اور ذاتی تعلقات میں تفصیلی اللہ کوئی ضل نہ آیا۔ ہمارے ہمد کی حالت یہ ہے کہ حسن نیت کی بنا پر چھی کسی سے اختلاف ہوتا ہے ناقابلِ بدداشت سمجھا جائے۔ لیکن مولانا اپنے دوسرے اوصاف و عمائد کی طرف اس ضعف میں بھی گمانہ حیثیت کے مالک ہیں کہ رائے کے اختلاف یا مسلک کے تفاوت کو انھوں نے ذاتی تعلقات پر کبھی اثر انداز نہیں ہونے دیا۔

میں ان کے بے مثال علم و فضل کے متعلق یہاں کچھ نہ کہوں گا جو نصف صدی سے اس کو بین برز میں کے آسمان پر آفتاب جہاں تاب کی طرح تابندہ و درخشندہ ہے۔ وہ ان اصحاب میں سے ہیں جنہیں قدرت صدیوں کے بعد عالمِ انسانیت کو اپنی عالمِ نعمت کے طور پر عطا کرتی ہے۔ وہ تحریر و تقریر دونوں کی قلمیوں کے تاجدار ہیں۔ ان کی غیر معمولی صلاحیتیں اس زمانے میں بھی مشہور فرما کر وہاں علم و فضل کے لئے بیکسر حیرت انگیز تھیں جب ان کی عمر پندرہ سولہ برس سے زیادہ نہ تھی۔ ۱۹۰۹ء میں وہ پہلی مرتبہ انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسے میں شرکت کے لئے لاہور آئے تو خواجہ الطاہر حسین حاکمی بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ مولانا وحید الدین سلیم جو مولانا کے گرو خواجہ صاحب مرحوم کی خدمت میں پہنچے تو دیکھا کہ خواجہ صاحب اس لڑکے کی عمر گنتی ہوگی؟ انھوں نے فرمایا کہ چودہ پندرہ برس کے ہوں گے سلیم نے کہا یہ ”لسانِ الصدق“ کے ایڈیٹر ہیں۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ ان کے والد ایڈیٹر ہوں گے۔ جب معلوم ہوا کہ یہی ایڈیٹر ہیں تو متحیر رہ گئے اور بہت شفقت فرمائی۔ اس وقت سے مولانا کے ساتھ گروے والے ایڈیٹر ہو گئے۔ ”الہلال“ کا ابتدائی دور تھا کہ مولانا ایجوکیشنل کالفرنس میں شرکت کے لئے گئے۔ خواجہ حاکمی کے فرزند ابجد خواجہ جاحدین بھی اس میں شریک تھے۔ ان کے ہاتھ خواجہ صاحب سے مولانا کو بہت بہت سلام کلا بھیجا۔ نیز فرمایا کہ ”الہلال“ آج اسے جو ارجا رہا پکا پکا چار دن اس کے سوا کوئی مشغولیت نہیں رہتی۔

اس سے بھی عجیب تر واقعہ یہ ہے کہ مولانا بارہ تیرہ برس کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے ”ارغوانِ قرخ“ کے نام سے ایک گلہ زنہ نظم تھی جس کی مالا نہ عرصوں پر گلہ زنہ میں مشاعرے ہوتے تھے۔ اس زمانے کی کہی ہوئی غزلیں اس گلہ زنہ میں شامل تھیں

ہوتی تھیں۔ مرزا غالب کے ایک شاگرد نادر شاہ خان ننوتی دہلی کی حکومت میں منجھ تھے۔ انھیں کسی طرح بقیہ نہ آتا تھا کہ مرزا خان جو مولوی شاعروں میں ممتاز تھے انہی کی ہوتی ہیں۔ ایک روز مولانا مسجد میں مل رہے تھے۔ نادر شاہ خان نے روک لیا اور کہا کہ ایک شاگرد نے جان غدا میں دال دی ہے۔ میں بیمار ہوں اور وہ غزل کے لئے تمنا میں ہے۔ چہرہ سراسر قوت کہہ دو۔ انھوں نے ذہن بنائی ”یا نہ ہو“ ”شاد نہ ہو“ مولانا نے ایک کتبہ فروش کی دکان پر بیٹھ بیٹھے چھ شعر کہہ دیئے۔ نادر شاہ خان بولے کہ اشعار کی تعداد طاق ہونی چاہیے۔ مولانا نے بے توقف کہا ہے

وعدہ وصل بھی اک طرفہ تماشے کی ہے بات

میں تو بھولوں نہ کبھی، ان کی کہیں یاد نہ ہو

نادر شاہ خان نے کہا کہ صورت سے تو اس بارہ برس کے صاحبزادے معلوم ہونے پر لیکن خدا کی قسم عقل باور نہیں کرتی۔ شمس العلماء شبلی مرحوم سے بھی اسی قسم کا واقعہ پیش آیا۔ ان سے مولانا کی خط و کتابت تھی۔ شبلی صاحب نے بیتی لکھے تو اس زمانے میں مولانا وہیں مقیم تھے۔ ایک دوست کے ہمراہ ملاقات کے لئے پہنچے۔ دوست نے نادر شاہ خان کو یقین نہ آیا کہ ابوالکلام آزاد وہی ہیں جب شک کی کوئی گنجائش نہ رہی تو اس دورگردیدہ ہو گئے کہ ”الندوہ“ کی ایڈیٹر کی سوچ وی اور مولانا نے شبلی صاحب کے اواخر سے ۱۹۰۷ء کے ادائ تک یہ خدمت انجام دی۔

بہر حال جو دور کے ابتدائی مراحل میں وقت کے اکابر عظم فضل کے لئے باعث حیرت و استعجاب بن گیا تھا اس کی شای عظمت کے منتقم میں کج زبانی کہہ سکتا ہوں۔ مولانا کا خدا نے عظیم عہد کی حافطہ عطا کیا ہے۔ اس کی محسوس و مشہور مثالیں ”تذکرہ“ اور ”غبارِ خاطر“ کی شکل میں دنیا کے سامنے موجود ہیں۔ ”تذکرہ“ راجی کی نظر بند کی کے زمانے میں لکھا گیا، جب مولانا کے پاس کوئی قابل ذکر کتاب موجود نہ تھی ”غبارِ خاطر“ کے خطوط احمد نگر کی سیری کے زمانے میں مرتب ہوئے۔ اس وقت بھی وہ کتابوں سے بڑی حنک محروم تھے۔ لیکن ان کتابوں کے مطالعے سے ہنر پرانہ شکرا راہو سکتے ہیں کہ بڑے بڑے کتب خانوں میں بیٹھ کر بھی اس قسم کی چیزیں مرتب نہیں کی جاسکتیں۔ ”غبارِ خاطر“ پس مرتبہ لاہور میں بھی تھی اور اس کی کاپیاں دیکھنے کا کام مجھے سونپا گیا تھا ”تاثر الامراء“ کی ایک عبارت کے منتقم میرے دل میں بشیر بیدار ہوا مطبوعہ کتاب میں عبارت وہی تھی جو مولانا نے ”غبارِ خاطر“ میں درج کی تھی۔ میرا خیال ہے کہ کتاب ایڈٹ کرنے والے نے ایک لفظ کے سمجھنے میں غلطی کی۔ انصواب کی نغوض سے مولانا کو لکھا۔ فرمایا ”منقول عبارت درست ہے اور ”تاثر الامراء“ کی غلط جگہ کے غلط معنی پر غلط طرف ادھر کی سطروں میں موجود ہے۔ میں نے تین سال پیشتر ”تاثر الامراء“ دیکھی تھی اور یہ الفاظ اسی طرح لوحِ حافظہ پر منقوش ہیں“

سرمیت و استقامت مولانا کے آئینہ جلیں کے درخشاں ترین جوہر ہیں۔ انھوں نے جن اصول و مقاصد کی دعوت کے لئے زندگی وقف فرمائی، ان پر کاربندی اور عمل پیرائی میں ہمیشہ جہان کی طرح جے رہے۔ اس سلسلے میں ان کی صحت کو نقصان پہنچا، کاروبار تباہ ہوا، ان کی نہایت قیمتی تصانیف کے مسودے ضائع ہو گئے، انھوں نے علمی یا دوشوق کے جوہر عرصے مرتب کئے تھے اور انھیں اپنی زندگی کا حاصل سمجھتے تھے، وہ صبت تلاشیوں میں تلف ہو گئے، لیکن ان کی شانِ عزت

ان تمام نقصانات سے بالکل غیر متاثر رہی۔

ذاتی تعلقات کے سلسلے میں ایک نہایت دشوار دلی گدا زمرہ امتحان اس وقت پیش آیا جب احمد نگر کی اسیری کے زمانے میں ان کی اہلیہ محترمہ سمیت پیار ہوئیں۔ اس موقع پر سپرٹنڈنٹ ان کے پاس پہنچا، ورنہ اگر حکومت سے کچھ کہنا ہوتا تو وہ فوراً بھی پہنچا ہوا نہ ہو گا۔ مطلب غالباً یہ تھا کہ اگر رفیقہ حیات کی شدید علالت کی بنا پر مشروط رہائی کی درخواست کریں تو وہ حکومت کے ملاحظہ میں پیش کر دی جائے گی۔ لیکن مولانا نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں حکومت سے کوئی درخواست نہیں کرنا چاہتا۔ سپرٹنڈنٹ نے پشٹ جو ہر لڑائی کی دسالت سے بھی مولانا کو راضی کرنے کی کوشش کی لیکن وہ جو فیصلہ فرما چکے تھے، اس پر قائم رہے۔ وہ خود فرماتے ہیں:

”جو تھی خطرناک صورت حال کی یہی خبر ملی..... میں نے محسوس کیا کہ طبیعت کا سکون ہل گیا ہے اور اسے قابو میں رکھنے کے لئے جدوجہد کرنی پڑے گی۔ یہ جدوجہد دماغ کو نہیں مگر جسم کو کھٹکا دیتی ہے۔ اس زمانے میں میرے دل و دماغ کا جو حال رہا ہے اسے چھپانا نہیں چاہتا۔ میری کوشش تھی کہ اس صورت حال کو پورے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کروں۔ اس میں میرا ظاہر کامیاب ہوا لیکن شاید باطن نہ ہو سکا۔“

آگے چل کر فرماتے ہیں:-

”میں نے تمام معمولات جاری رکھے لیکن..... اعتراف کرتا ہوں کہ یہ تمام ظاہر و ارباب دکھاوے کا ایک پارٹ نہیں جس سے دماغ کا مغرورانہ احساس کھینٹا رہتا تھا، اور اس لئے کھینٹا تھا کہ کہیں اس کے دامن صبر و وفادار چرچے عالی اور پریشانی خاطر ہی کا کوئی دھبہ نہ لگ جائے۔“

اس کے باوجود مولانا نے حکومت سے کوئی درخواست نہ کی اور ان کی صاحبِ عزت رفیقہ حیات اس سبب میں دنیائے بے رحمت ہوئیں جب وہ سینکڑوں میل دور اپنے اہم اصول و نظامہ کی خاطر احمد نگر کے قلعے میں محسوس تھے۔ اصول و نظامہ کی قربان گاہ پر عزیز ترین رشتہوں کو وہی منتہیاں اس طرح بھینٹ چڑھا سکتی ہیں جنہیں بھشتہ حیات سے حرمت و استقامت کی غیر معمولی صلاحیتیں ارنائی ہوئی ہوں۔

مبادی کسی کو کھالی ہو کہ مولانا اس افنا و پریشانی و اضطراب و پریشانی سے تو محفوظ نہ رہ سکے، جیسا کہ انھوں نے خود اعتراف کیا ہے۔ یہ سچ ہے لیکن یہ خیال صحیح نہ ہو گا۔ صبر کا منہم ہی یہ ہے کہ انسان مرجعاتِ عمر کی شدت و فراوانی کے باوجود اپنے احساساتِ عزت پر غالب پالے اور انھیں مناسب حدود سے متاثر نہ کرے۔ یہ نہیں کہ احساساتِ سرے سے باقی ہی نہ رہیں اور انسان کا دل پتھر بن جائے۔ ایک سلیم الغطرت انسان کی طرح مولانا طبعی احساسات سے بدرجہ اتم بہرہ مند تھے۔ کون انمازہ کر سکتا ہے کہ رفیقہ حیات کی خطرناک علالت کا غلط فہمی ہی ان کے دل پر کیا قیامت گزری ہوگی۔

خصوصاً اس حالت میں کہ وہ امیر تھے اور باس رہ کرتیا دوا رہی بھی نہ کر سکتے تھے، جو اکثر انسانوں کے لئے فی الجملہ باعث تسکین قلب ہوتی ہے۔ یقیناً انھیں بھی آرزو ہوگی کہ رہائی ملے تو خود اپنی اہلیہ کا علاج کرائیں اور تازہ بہ تازہ مکان اس کا دکھ مٹانے کی کوشش کریں۔ لیکن ان کے سامنے زندگی کے اہم بنیادی اصول و مقاصد بھی تھے۔ وہ کوئی ایسی صورت قبول نہ کر سکتے تھے جو ان اصول و مقاصد کی آبرو پر اثر انداز ہوتی۔ انھوں نے جب اس مسئلے میں قدم رکھا تھا تو ان تمام قربانیوں کا اہل فیصلہ کر لیا تھا جو اس سفر کے لوازم میں شامل تھیں۔ جب بے پردہ وہ قربانیاں طلب کی گئیں تو وہ لالہ نے ایک صاحب عزیمت انسان کی طرح انھیں پیش کرنے میں تامل نہ کیا۔ ذاتی تعلقات کے سلسلے میں غالباً یہ سب سے بڑی قربانی تھی جس کا ان سے مطالبہ ہوا۔

ایک مرتبہ انھوں نے مجھے تحریر فرمایا تھا :-

”بروقت سے پیش نظر رکھئے کہ استقامت اصل کار ہے۔ اگر ایک آدمی فوج کی ٹوکی قبول نہیں کرتا تو یہ کوئی جرم نہیں، لیکن اگر سپاہی بن کر میدان جنگ میں آکر پیچھے ہٹتا ہے تو اس کی سزا موت کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔“

ہاں، وہ عشقِ بہت کچھ رفتن و بارگشت

جو رہا دنیا عتوبت بہت و استغفار نصبت

دریا میں آنے سے پہلے سب کچھ سرق لینا چاہیے، لیکن جب آگئے تو مروجہ کا شکوہ فضولی ہے، اوکھی بھی سنا نہ جائے گا۔ ممکن ہے پہلے ہی غوطے میں خود بخود نہنگوں کا سامنا ہو جائے لیکن جو شخص سمندر میں کودتا ہے اسے نہنگوں کے وجود سے بے خبر نہ ہونا چاہیے۔“

مولانا کی ذات گرامی اس تعلیم ہی کا نہیں بلکہ ہر اس تعلیم کا عملی نمونہ رہی ہے جو ان کی زبان پر جاری ہوئی۔ بلاشبہ ان کے قلب پر بھی رنج و الم کی قائم کیفیتیں پرہیزگارتی سے طاری ہوئیں جو عجز و بزرگوں کی مشورت سے انقطاع کا لازمہ ہیں لیکن انھوں نے مقامِ صبر کے واجبات جس شائستگی و عزیمت سے ادا کئے، ان کی مثالیں تاریخ میں بہت سی کم ملتی ہیں۔ مہجرتِ ہندوستان سے متاثر ہونا نہ تسلیم کا خاصہ ہے لیکن احساسات پر قابو پالینا صرف صابرین و مشرکین کا کام ہے۔

ان کی زندگی میں استقامت کی ایک اور نادر مثال ملتی ہے، جب ہم قوموں کی اکثریت نے ان کے سیاسی مسکنات سے اختلاف کیا۔ میرے علم کے مطابق وہ اپنے لئے سلسلہ میں جو راہ عمل طے کر چکے تھے اس پر مدتِ العمر بے خوف و تردد قائم تھے۔ بیچ میں اکثر ایسے مرحلے آئے کہ بڑے بڑے مودی دارانِ عزم و ہمت کے قدم بھی لٹکھڑا گئے۔ انھوں نے اپنا مسکن بدلنے کے لئے معقول و لائق بھی فراہم کر لئے لیکن مولانا کے نزدیک صحیح مفہد اور بہترین راستہ وہی تھا جو انھوں نے ۱۹۴۷ء میں اختیار کیا تھا۔ اس سلسلے میں انھیں بے شمار قربانیاں کرنی پڑیں۔ کم و بیش دس سال قید و بند میں گزارے۔ ان کے نہایت اہم دینی و ملی مشاغل کو محنتِ نقصان پہنچا۔ وہ دینی و ملی معاش بھی بالکل تباہ ہو گئے جو انھوں نے اپنی طبیعت کے ذوق کے مطابق اختیار کر لئے تھے اور جن میں وہ سب سے بڑھ کر کامیاب

تھے۔ لیکن ان تمام قربانیوں سے گراں بہا تر قربانی یہ تھی کہ ان کی ہر دل عزیزی کی متاعِ عظیم کی کمر لکھ کا ڈھیر بن گئی۔ وہ اپنی یہ معمولی صلاحیتوں کی بنا پر مغربانِ شباب ہی میں ہمہ گیر شہرت حاصل کر چکے تھے۔ وہ جس طرف نکلتے تھے، لوگ اپنی آنکھیں ان کے لیے پھیلنے پر آمادہ رہتے تھے اور یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہ ہو گا کہ ان کے لئے مسلسل ہفت روزہ عقیدت کی جن گرم چوبیسوں کا اظہار ہوتا رہا، وہ شاید مولانا محمد علی مرحوم کو مستثنیٰ کرنے کے بعد کسی مسلمان رہنما کو نصیب نہ ہوئی اور یہ غیر معمولی ہر دل عزیزی انھیں اس وقت حاصل تھی جب ان کی عمر بیس اور تیس کے درمیان تھی۔ خاص طور پر قابل ذکر امر یہ ہے کہ ان سے محبت و عقیدت کا ملا لے غرضانہ تھی، یعنی وہ ان رہنماؤں میں نہ تھے، جنہیں مختلف گروہوں نے صاحبِ اختیار و اختیار دیکھ کر فریج باب و مقاصد کا مرجع سمجھ لیا ہو، لیکن انھیں پتہ نہ تھا کہ ان مقاصد کے لئے استقامت و عزیمت کی راہ میں ہر دل عزیزی کی متاعِ عظیم کی قربانی کرنی پڑی اور وہ جس شے کو تپن سمجھتے تھے اس سے بالی برابر بھی ادھر ادھر نہ ہوتے۔ یہ قربانیاں ذکر و بیان میں شاید بہت دل پسند معلوم ہوں۔ لیکن اس پر عمل سہل نہیں۔ نقہری کیا خوب کہہ گیا ہے۔

بیمست آسان بصفِ آتشِ ذوال
فی مائدہ گر جبہ از پروانہ خوش

یہاں سوال مولانا کے اذکار و آرائی کی درستی یا نادرستی کا نہیں مقصد صرف یہ ہے کہ ان کی شانِ عزیمت و استقامت واضح ہو جائے۔

مولانا کے عادات و خصائص کا باب بہت وسیع ہے اور اپنے علمی و ادبی جہر و دل کی طرح عادات و خصائص میں بھی وہ بالکل یکانہ حیثیت کے مالک ہیں مثلاً سحر خیزی ابتدائی دور ہی سے ان کی فطرتِ ثانیہ بنی ہوئی ہے۔ وہ ہمیشہ آدھ دن آتھے ہیں، گویا نظیری کے اس شعر کی عملی تصویر ہیں۔

عباد مست سحری راکنِ نظیری کم
کہ ہر سحر کرد و عالم نے صبح لگا ہی کرد

ایک مرتبہ سیاسی مصروفیتوں کے سلسلے میں لاہور آئے۔ ہر دین کا مورم تھا۔ جس نے عرض کیا کہ "طلاقات کے لئے کوئی وقت بتا ہے۔" فرمایا: صبح کے چار بجے سے آٹھ بجے تک لی گئے ہو۔ وہ آٹھ دس دن یہاں مقیم رہے اور میں زیادہ سے زیادہ پانچ بجے ان کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ میں گھنٹہ اعلیٰان سے باتیں کرنے کے لئے مل جاتے تھے۔ پچھلے دنوں میں دلی گیا تو اس وقت بھی وہ اپنے انتظامی کاموں میں بہت مصروف تھے۔ دس دن ان کے پاس پھر آ رہا۔ یہی صبح کا وقت تھا کہ لے کر نکلا۔ سیاسی ہنگاموں میں محرک گزارنے کے باوجود انھیں خلوت و تنہائی بہت پسند ہے۔

تنہائی و خلوت طلبِ عشقِ نظیری
ابنِ خلیل و خدمِ رابعِ امیرِ شمس

وہ ایک زمانے میں بہت خوش پرش تھے۔ غالباً سلاطین سے کھدہ پھینا شروع کیا اور اب تک اسی پر قائم ہیں۔ وہ ابتداً ہی سے ملکی غذا کھانے کے عادی ہیں اور بہت کم کھاتے ہیں۔ آج کل تو غذا کی تعطیل غیر معمولی صورت اختیار کر چکی ہے لطیف چینی

چائے وقتاً فوقتاً ضرور پیتے ہیں اور اس کے دلکش تذکرے، غبارِ خاطر میں عاجز و مجبور ہیں۔
 انھوں نے کبھی کسی کا حسان لپٹا گوارا نہیں کیا۔ سچی کہ اپنے ان عقیدت مندوں سے بھی کوئی تحفہ، نیا زہ، آسانی قبول نہیں کرنے تھیں۔ انتہائی شفقت و نوازش سے انھوں نے عزیزوں کا درجہ دیکھ لیا۔ ایک مرتبہ انھیں عرقِ اقسا کا عارضہ ہوا۔ شفاء الملک حکیم فخر محمد جی نظامی مرحوم بھی میری طرف مولانا کے عقیدت مند تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ مولانا سے بیماری کے مفصل حالات پوچھ کر مجھے بتاؤ۔ میں ایسا نسخہ تجویز کر دوں گا کہ بفضلِ خدا یہ عارضہ دوبارہ نہ ہو گا۔ میں نے حالات منگوائے۔ حکیم صاحب مرحوم نے خوب غور و فکر کے بعد نسخہ تجویز کر دیا اور یہاں سے واپس کلکتہ بھیج دی گئیں۔ ان سے فائدہ ہوا۔ حکیم صاحب کی رائے تھی کہ وہیں کچھ دیر جاری رہتی جا چکیں۔ مولانا نے لکھا،

”مجھے حکیم صاحب کی دواؤں کے استعمال میں ہرگز تاثر نہیں۔ اگر اب بھی ان کا فیصلہ یہی ہے کہ جو ہر منشی وغیرہ استعمال کرنا چاہتے تو ضرور کرنا۔ مگر شرط یہ ہے کہ وہ دوا خانے کو حکم دے دیا کریں تاکہ مرتکبات دی۔ پی پائسل کے ذریعے بھیجتے رہیں۔ اس صورت میں شک و گمان رہوں گا اور انشراحِ خاطر سے علاج کروں گا۔ ورنہ طبیعت ترک جاتی ہے کہ تحفہ ایک مرتبہ ہونا چاہیے نہ کہ مسلسل۔ اگر حکیم صاحب با آپ سے منظور نہ کریں گے تو پھر میں نہ تو فراغِ خاطر کے ساتھ دوا استعمال کروں گا نہ اقتداء و اہم کی حالت گوارا ہو سکے گی۔“

ایک مشہور عالم دین نے مولانا کی تفسیرِ فاتحہ کے بعض حصوں پر ایرادات کئے اور اس سلسلے میں مناظرانہ رنگ اختیار کر لیا۔ ایرادات کے متعلق مجھے بعض باتیں مولانا سے پوچھنے کی ضرورت پڑی جو مٹا دی گئی تھیں کہ کتاب آئیے نہیں پچھی تو میں بھیج دوں۔ فرمایا۔ ”کتاب ہرگز نہ بھیجو۔ یہی بہتر ہے کہ میں اسے نہ دیکھوں۔“

”مسئلہ اسے میں نے جہنمی باتوں کا ہمد کیا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہر اس شخص کو جو منہ انحرافِ طریق پر میرے خلاف کچھ لکھے گا نہ تو جواب دوں گا، نہ اس کی شکایت سے اپنے نفس کو آلودہ کروں گا۔“
 پنجاب کے ایک سیاست دان نے ایک بیان میں ایسی باتیں کہیں جو مولانا کے نزدیک بکھرے اصل تھیں۔ انھوں نے مجھے لکھا :-

”اگر میری طبیعت کا وہ اندازہ ہوتا جو اس وقت تھا جب اللہ تعالیٰ تھا، تو یہ ایسا عرصہ نہ کہ اب ہے کہ وہیں معلوم کسی عام بیان میں میرے ظلم سے کیسے سخت الفاظ اس شخص کی نسبت نکل جاتے، لیکن اب میرا حال دوسرا ہے۔ کوئی شخص لکھنے ہی تیج فعل کا مرثب ہو، میں یقین کے ساتھ اسے سبک میں بڑا کہنا پسند نہیں کرتا۔ ہمیشہ ایسے موقعوں پر اپنا نفس سامنے آ جاتا ہے۔ میں چونک اٹھتا ہوں کہ اگر بڑا ہی کتا ہے تو اپنے نفس کو کیوں بڑا نہ کہوں؟“

آخر میں فرماتے ہیں :-

”اگر ایک ترقی اسلام میں صدقِ مقال نہیں تو اسلام میں سے کوئی چیز بھی نہیں۔ ولیس وراء ذلك من الامجان حبة خردول“

ایک مرتبہ دینک ملاقات کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ میں نے ایک مریضے میں شعلہ اصفہانی کا یہ شعر لکھ دیا۔
 آں بخت نہ وادیم کہ ہم نرم تو باشیم
 ماوس راہ تو آجے ونگاہے
 انہوں نے جواب میں تحریر فرمایا کہ اس شعر کا بیان کیا موقع تھا :

” ایک حدیث قدسی ہے ، میں تعجب اِلیٰ ششباں فقرتبت الیسا ذرا عا
 و جو ایک باشت میرے قریب آتا ہے میں ایک پائیر اس کے قریب جاتا ہوں
 عمر میری یہ کوشش یہی ہے کہ اس وصف کے خلق سے محروم نہ ہوں۔ اب
 بھی اس پر عامل ہوں اور عامل نہ ہوں گا۔ ہزار بار یہ وعدہ ہزار بار کیا۔“

مضمون بہت طویل ہو گیا۔ لیکن جو کچھ لکھنا چاہتا تھا ، نہ کہہ سکا۔ وہی عرقی والی بات ہوئی کہ ۔۔
 زبان نہ لکھتے تو مانور از من باقیست بضاعت سخن آفر شد سخن باقیست
 انہوں نے لکھا کہ ایک اعتبار میں کرتا ہوں جو ان کے ایک طویل مکتوب سے ماخوذ ہے۔ کچھ کئی پختہ نہیں فرما
 رہے تھے کہ خلافت عادت ان کے علم سے یہ الفاظ لیے اختتام لکھ گئے۔ فرماتے ہیں :

” افسوس ہے کہ زمانہ میرے مانع سے کام لینے لگا کوئی سامان نہ کر سکا۔ غالب کو قذوف
 اپنی ایک شاعری کا ردنا تھا۔ نہیں معلوم میرے ساتھ تیر میں کیا کیا چیزیں چاہیں گی۔
 ناروا بروہ باز ارجہاں جنس و سب روئے شکستہ داز طالع و کائنات رنم

بعض اوقات سوچتا ہوں تو طبیعت پر حسرت و الم کا ایک عجیب عالم طاری ہوجاتا ہے۔ کہ بہ علم
 فنون ، ادب ، انشا ، شاعری ، کوئی داوی ایسی نہیں جس کی بے شمارائی راہیں مبدیہ حاضر نے مختصر کر رکھے
 ولی و دماغ پر نہ کھولی دی ہوں اور ہر آن ہر لمحہ بخششوں سے وامن مالا مال نہ ہوا ہر پختہ یکہ ہر روز
 اسنے آپ کو عالم معنی کے ایک نئے مقام پر پہنچاتا ہوں اور ہر منزل کی کرشمہ ستیاں پچھلی منزل کی جلیو طرز پر
 ماندر کرتی ہیں لیکن افسوس جس ہاتھ نے فکر و نظر کی ان دونوں سے کرنا کر لیا۔ اس نے شاید سر و سامان کار
 کے لحاظ سے فی دست رکھنا چاہا۔ میری زندگی کا سارا ماقم یہ ہے کہ اس ہمدرد عمل کا ادھی نہ تھا
 مگر اس کے حوالے کرو یا لگی۔“

یہ جو کچھ فرمایا گیا ہے سنسن گستری ہے ، نقلی بلکہ اسرت شغیت ہے ، کاش مجھے انداز شناسی میں سنائی کا درجہ نصیب ہوتا تو
 اس کی زبان سے کہتا ۔۔

وہ ہا باید کہ تا یک مروی بیدار شود
 با بیدار اندر خراسانی یا اوسیس اندر قون

مہدی حسن

عبدالمجید وریا باوی

سنہ ولادت ۱۸۴۲ء، سنہ شہر ہوگا۔ وفات ۱۹۲۱ء میں ہوئی۔ عمر ۷۵ سال کے اندر ہی رہی۔
 ہوش کی آنکھیں جب کھولیں تو اپنے وطن گورکھپور میں رنگ پیدا ہوا ریاض خیر باوی کا۔ ریاض کا وطن
 افسیاری گورکھپور تھا۔ وہیں شباب گزارا۔ وہیں سے ریاض الاخبار ہفتہ میں دوبار رسد رسدہ کی اصطلاح اس وقت تک نہیں چلی
 تھی نکالا۔ وہیں سے فتنہ اور عطر فتنہ کے شگرف چھوڑتے رہے۔ اور وہیں سے انگریزی ناولوں کو پانتے رہے۔ آج یہ سارے فلم
 اور حوالے قصہ طلبہ تعلیم ہیں۔ ان کی دفعتی تشریحیں سنتے پہلے۔ ریاض الاخبار نام کا سیاسی پرچہ تھا لیکن اس کی ادبیت
 اس کی سیاست پر کہیں غالب۔ ریاض اس میں شرکی شاعری کرتے۔ اور لوگ بھی بھلے سیاسی معلومات لے کر زبان وانشاء کی
 خاطر خریدتے۔ فتنہ اس کا ایک انتہا متا سامعینہ صحیفہ تھیں کارنگین کاغذ پر نکلتا۔ اور طیفوں چٹکوں سے دل بہلاتا رہتا۔ عطر فتنہ کی بات
 اب خوب ذہن میں نہیں۔ اسی شان جمالی کا یہ پرچہ غالباً شرف نظم کی بہار دکھانا۔ بہر حال اتنا یاد ہے کہ یہ دونوں پرچے نام کے فتنہ
 قیامت کی شریانی دکھانے رہتے۔ اور رینالڈ زویرو کے عالم پسند انگریزی ناولوں کو ریاض اردو میں اپناتے دہتے چنانچہ نیا لائڈ
 کا (LOVES OF THE HAREM) محرم مر کا نام پاک اردو میں اپنا نام کر گیا۔ اردو سے مقلی کے لطیف و شہتہ جملے کر گیا
 سائید میں ٹھٹھے چرتے۔ اور پھر ریاض اور ان کے دوست رسا رام پوری کے مزے دارا شمار۔ عطر میں بسے چرتے۔
 یہ فضا تھی جس میں ہندی مرحوم نے آنکھیں کھولیں، اسی میں ہے، بڑھے سالہا سال بعد ریاض کو ایک خط میں لکھا،
 ”مجھ کو آپ کے ساتھ جو خاص تعلق ہے، آپ کو معلوم ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ میں اس
 وقت سے آپ کے لڑ بچہ کا دلدادہ ہوں جب لڑ بچہ کا صحیح مفہوم بھی میرے ذہن میں
 نہیں تھا“ (ملکاتیب ہندی ص ۱۸۰)

دیکھ کر مرحوم ٹیڈیڑا بنا مہر نعتاؤں آگے ہلے نام اس سے کہیں زیادہ کھل کر لکھا ہے۔
 ”مرحوم ریاض و خدا سے توفیق ملائے، مرحوم نے کئی بار اپنے ازل سے اپنے لڑ بچہ
 کی کئی ناکتوں پر طے چرتے ہیں، وہ ریاض کے فلم کی آواز باز گشت ہے۔ آج
 لڑ بچہ پر طے آزمائی کے لئے بہتر ہے، اُن کے کھڑے ہوں گے۔ لیکن میں نے پہلے پہل یہ

لفظ ریاض الآخر میں دیکھا۔ جب اس کے مفہوم سے بھی اچھی طرح واقف نہ تھا
..... موجودہ لکچرار تقاضی حیثیت سے ریاض سے بے نیاز نہیں ہے وہ
جس طرح نظم کا مالک ہے۔ اُن کے تشریحی ہے۔ اور یہی اختیار ناقض ہے جس کی بنا پر
وہ انشاء پر داری کا تسلیم الثبوت مبرور ہے۔ (مکاتیب ہندی صفحہ ۱۱۱)

پیدائش محلہ منڈت پور، گورکھپور کے ایک کھنڈے پتے شریف اور مذہبی رنگ کے خاندانی ہیں۔ والد گورکھ پیکٹر
تھے۔ گھڑی کا ایک جتہ کتب کلاز تھا، وہیں پیدہ ہو کر حسب دستور وقت اُردو فارسی پڑھی۔ ممکن ہے کہ عربی کی بھی تشدد بعد حاصل کی ہو۔
اور پھر گھڑی روز ملی گڑھ ہمارا اسکول کے درجوں میں پڑھا۔ طبیعت بڑی اخلاقیاتی تھی۔ مزاج میں نفاست و لطافت اور آرزو ادب
سے مناسبت، یہ چیزیں معلوم تو نہ تھیں فطرت کی طرف سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ جس انہیں کے سہارے بغیر کوئی ڈگری یا سند
حاصل کے گھڑی روز میں اتنا کر لیا اور ایسے چل سکے کہ اچھے ڈگری والوں کو راستہ نہ تھے، اور بڑے بڑے سند والے ان کا
سامنا کرتے چپکے تھے۔ یکم ہندی کی روایت ہے کہ شروع میں گھڑی کسی انگریز سے بھی پڑھا تھا (افادات ہندی صفحہ ۱۱۱) یہ روایت
انہوں نے یقیناً مرحوم ہی سے سنی ہوگی۔

یہ یکم دوسری بیوی تھیں بڑی چھٹی اور صبح سنی میں شریک زندگی۔ پہلی بیوی کا انتقال مرحوم کی جوانی ہی میں ہو گیا تھا
یہ عقد اس کے بعد ہوا۔ معاشرت میں ”صاحبیت“ کا اثر ممکن ہے کہ انہیں ہر صاحب کی کسکی کا نتیجہ ہو۔
شعوری طور پر پچھن میں صلی اثر سب سے زیادہ سرسبز بدلا ہوا۔ ان کے تہذیبی اخلاق ان کا ایک جلد دیکھنے کو دل چاہی تھی۔
انہیں یکم ہندی کی روایت ہے کہ

”وہ اکثر اس کا ذکر کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ صرف اسی تہذیب اخلاق
نے مجھے آدمی بنا دیا“ (افادات صفحہ ۱۱۱)

مرحوم کا شمار مصنفین کے زمرہ میں تو مشکل ہی سے کیا جا سکتا ہے تصنیف یا تالیف ان کی ایک بھی نہیں۔ خوب کہا ہے
ہمارے آردو کے رئیس المصنفین مولانا سید سلیمان ندوی نے کہ۔

”مرحوم کوئی پیشہ و مصنف نہ تھے جو پھلوں کی ذمہ داری کے لئے اپنی تصنیفات کا
ذخیرہ کچھڑ جانتے۔“ (مکاتیب صفحہ ۱۱۱)

مضمون نگار بھی وہ کوئی پیشہ و راہ ور بڑے شائق نہ تھے ذخیرہ تحریریں ان مضمون میں چھوٹے اور بڑے سب ملا کر انہیں
جس زمرہ تنقیدی شامل ہیں۔ یہ ہندو واروں اور ماہناموں میں پھیلے ہوئے مضمون ۱۹۵۹ء تا ۱۹۹۱ء یعنی ۲۰ سال کی مدت میں شائع
ہوئے۔ اس حساب سے اوسط ہر سال ڈیڑھ مضمون کا پڑتا ہے مابین اوسط ہر ماہ واقعہ یہ ہے کہ عموماً سال میں دو ایک مضمون لکھتے وہ
بھی جب طبیعت خوب حاضر ہوئی اور لکھنے کا کوئی داعیہ قوی موجود ہوتا۔ کسی کسی سال جب طبیعت میں روح آتی تو چار چار یا پانچ پانچ
مضمون بھی لکھ ڈالتے اور دہلیان میں مضمون کیا برسوں کا ستا تھا۔ تصنیف کے نام سے کل کائنات ہی ہمیرہ مقالات ہے
جو افادات ہندی کے نام سے دفاتر کے بعد شائع ہوا ہے۔ بیچارہ کو نظر ثانی و ترمیم و دیگر کام کوئی موقع نہ مل سکا اور ہر صاحب ہجر

جانتا ہے کہ اس کے بعد قریب کماں سے کماں بچ جاتی ہے۔ نامکمل تھا کہ مسئلہ ۱۹۱۹ء مسئلہ ۱۹۲۰ء والے مہدی جس نے ۱۹۱۹ء میں مسئلہ ۱۹۲۰ء کے مہدی سے دھوکہ دیا تھا۔ انادی والاقتصادی و کالسی معنی سادہ پھلا لگا رہتا تھا، کی کسی غریب کو دیکھتے تو اسے بے لطف لگاتے بلا اصلاح کئے جلسہ چھوڑے دیکھتے ————— افادات کی خدمات ۲۶۶۲۰ قطع پر درودوں کے کھے ہوئے دیباچہ وغیرہ کو نکال کر ۴۰ صفر کی ہے۔

اور ان اس سے کچھ کم خدمات کی ایک اور کتاب بھی ان کے نظم کی دہن منت نکل آئی۔ یہ ان کے خطوط کا مجموعہ ہے مکاتیب مہدی کے نام سے ————— مرحوم بڑے اچھے بڑے پاکیزہ خط نویس تھے۔ نظم انسانی گراں کے ان اشعار کی کمالات کو ضائع ہونے دیا جاتا۔ کچھ قدروان احباب و اعزاء نے انہیں بچا کر رکھ لیا تھا۔ یہ ادبی جواہر پارے اگر ضائع ہو جاتے تو اردو کا ایک قیمتی سرمایہ گم ہو جاتا۔ پہلے کی ساری سرکاری ملازمت میں گزری۔ وہ بھی کچھ ادبی نہیں پہلے نائب تحصیلدار رہے پھر تحصیلدار ہو گئے۔ پھر ان میں اس زمانہ میں کچھ داہمی ہی ہوتی تھیں۔ یہ پھر شہرے شاہ خرچ، مزاج کے شوقین، نفاست جسم، کھانا ہر تو ضعیف، کپڑے ہر تو ضعیف، مکان اور اس کا فرنیچر ہر تو ضعیف، ہر خرچ اسیلا۔ ہاتھ ہر خرچ یہ کھلا ہوا۔ اللہ ہی ہر حال میں ہے کہ گزیر کس طرح کی چھٹی بھری کے گئے کپڑے کے حوصلہ و امان کیسے پورے کئے۔ لڑکوں کی تعلیم کے اخراجات کیونکہ نکالے۔

کسان کا زمانہ تو خبر بنارس اور الہ آباد کی صد تحصیلوں میں گذرا۔ باقی مشرق و جنوب کی حالت کی۔ یہ ان کے بچے ہیں جن کی بے سر کیا، جہاں کن لوں کے کسی بڑے وغیرہ کے وجود کا کوئی سوال ہی نہ تھا تحصیلدار کی کچھیلوں کو دیں بھی کوئی مناسبت نہ تھی اور تعلیم منقول سے نہیں ہے اور پھر جبکہ قیام بھی ایسی جگہ ہو۔ جہاں کو سوں کی سطحی صحبت کا پتہ نہ کسی کتبہ بناوا۔ کاناں، تو ایسے کو دیکھیں اور اتنے غیر علی باحوال ہیں کہ وہ کہ جلد متعلقہ نگاری کو ڈالنا ایک آسانی نہ تھی۔

نئی نئی رنگیں گڑھنے اور مارگریزی سے لے کر اردو میں نئے نئے لفظ، نیا نیا اور خراج کتبہ میں مرحوم کو ایک حد تک عکس تھا اور اگر کہیں علمی استعداد مولانا خدیر احمد دہلوی کی کسی جوتی یا لائحات اور زبان وانی سے مناسبت محمد حسین آزاد کی سی، تو مہدی حسن اس میدان میں سب کا پانی سے جلتے اور اپنے معاصرین کو کہیں یہ سب تہہ دھاتے۔ پھر بھی جتنا کچھ ہو گئے وہ بہت سے پیشہ ور سندھتھیں کے بے لطفی باعث رنگ ہی جو سکتا ہے۔

ماستر ٹیپ کے لے، "خراج فائدہ"، "ہنی مون" کے لے، "مہدی زرافات"، "جوانیت" کے لے، "نقد سکھ و مٹی"، "ایٹلیٹ کے لے"، "سوامی رام" کے لے، "اس کے لے" الفاظ خلا معلوم کئے انھوں نے چلانے چاہے، اور ان میں سے کوئی کوئی پل ہی کئے ————— غیر متاثرہ جنہیں لبہ آدھ گھٹہ ملا کہیں کے ساتھ "دماغی جھٹیں غیر فانیوں کے ساتھ" "پیارے جناب" اس قبیل کے بھی بہتیرے نقش انھوں نے انگریزی سے اپنا لے۔ کچھ ان میں سے جو گئے اور کچھ لگے! ————— انگریزیت سے متاثر بہت زیادہ تھے اور وہ زمانہ ہی خاص تاثر کا تھا اس لئے وہ اکیلے کیا، سب ہی متاثر تھے، اس لئے لفظی اختراعات میں بھی انگریزیت کی جھلک آتی اور وہ لفظ اور فقرے آدھ میں کھپتے تھے۔

اپنے مذہب اور میں پورے اہل سنت والجماعت تھے۔ یعنی سرسید، آزاد، فخر احمد، حالی، شبلی کے قائل۔ یہ ادوات ہے کہ کبھی آڑا کی اہمیت کا کلام کرتے، کبھی مذراہ کی عظمت کا قلم ہوا میں لڑتے، کبھی شبلی پر جان چھڑکتے، کبھی حالی کی اداؤں پر داری جلتے۔ اور کبھی سرسید کو اتنا دائل کے رتبہ پر رکھتے ————— یہ سارے دعوے ایک دوسرے کے منافی نہیں۔ اپنے اپنے سیاق میں اور مناسب موقع پر، یہ سب بائیں ٹھیک ہیں۔ اور اسی "تفضیلیت" کی گھٹائش مذہب اہل سنت میں پوری طرح موجود ہے۔ سنجیدہ اور علمی ادب آڑو کے ان "عناصر خمسہ" کے علاوہ ادب خالص کے بھی آئندہ دوں کے برستا روں میں تھے۔ ریاض کا نام آؤ پر گزریگا۔ ایک ادراسی دور کے بہت اچھے کھنے والے، تیرہویں صدی اور صلائے عام کے ایڈیٹر غنی ناصر علی دہلوی تھے۔ دنیا تو اب ان کے نام ہی کو بھول چکی ہے۔ "ادب لطیف" کی اصطلاح پر بعد کو چند فاعیوں نے اپنا قصہ جمالیا۔ ورنہ انشاء کی یہ شاخ دراصل ناصر علی کا خاص حصہ تھی۔ اور دہلوی ان کے نام پر بیٹے ہوئے تھے۔

خٹک نگاہی ان کے مذہب میں بمنزلہ کھڑی "مولویت" اور "سیرت" سے اسی لئے ہیزا رہتے۔ اور تو او خود مولانا سید سلیمان سے مدعوں ان کی "مولویت" کی بنا پر بدین اور ان کے کلمات کے منکر رہے۔ مولانا شبلی کے انتقال کے دوران کے لئے واقعہ پر ملال تھا، معاً بعد ۷ دسمبر ۱۸۸۷ء کو مولوی عبدالحق وریا با دہی کے خط میں لکھتے ہیں:-

"سیرت نبوی کی تشکیل اب قیامت تک ہر جگہ سنستا ہوں میان سلیمان اور پروفیسر محمد الدین ترتیب دیں گے۔ اس سے تو نہ ہر نا اچھا تھا۔ لہذا معتدی حصہ مرحوم نے نہیں لکھا ہوگا، جسے وہ تاریخی حصہ کے بعد شروع کرتے" (مکاتیب ۱۲۸) بدگمانی بے عمل ہی تھی، کتب تک قائم رہتی۔ حقیقت کی پہلی ٹھیس سے چلنا چور ہو گئی۔ فوری سلاہ میں خود سید الطائفہ مخاطب کے لکھتے ہیں:-

"میں نہایت افسوس ہے، آپ کی ازبانی منتخبات کو دیکھ رہا ہوں، میرا خیال تھا تصنیفی عہد علامہ شبلی کے ساتھ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ اس خیال کو میں نے ایک مستقل عنوان کے تحت میں پھیلا یا ہے۔ "آرٹو لوگ پیکر کا دم واپس" "مختصر سب آپ کی نظر سے گزرتے گا جس میں میں نے دکھا یا ہے کہ دارالمصنفین سے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے" (مکاتیب ص ۹)

پھر ستمبر ۱۸۸۷ء میں ارض القرآن کی رسید دیتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"میں مولویت سے زیادہ آپ کی ادبیت سے متوجہ ہو رہا ہوں۔ ذہنی نفس مزاج کے لحاظ سے قطعاً لائق شکایت نہیں یعنی کہیں سے بے جوڑ نہیں۔ اور سب

تناسب میں کہیں سے کو کسر نہیں، فوج کی حاجت میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔" (ص ۱)

اور پھر:- "یہ کہنا بھول گیا کہ طبعیہ لٹریچر کی لطافت آپ کا حصہ ہے (مصلح)

اور ایک بار اور معارف کے بعض چٹپٹے شذرات کی واد میں جو مسز مراد بی نائیڈو کے سلسلہ میں تھے:-

” آپ نے شاعرہء وکی پر چو بھلیاں گرائی ہیں اور اس سلسلہ میں محنتوں سوسائٹی چسپس خوبصورتی سے لے دے کی ہے، سچ یہ ہے وہ نازک خیالی کی آغوشی حد ہے، میں نے باد بار پڑھا اور لطافت اٹھاتا رہا — جس زمانہ میں یہ پہلی دفعہ ایٹھ پڑائی ہے اور اس کی زبان سے یہ شعر نکلا ہے —

در رہ منزل لیلے کہ خطر با ست بے

شرط اول قدم آن ست کہ جنوں باشی

خوب یاد ہے کہ ہتیرے دل خاتم کیا گئے تھے۔ چڑھتی دو پہر سے طحلی چھاؤں زیادہ خوشگوار رہتی ہے۔۔۔۔۔ مدت سے سوچ رہا تھا کہ اس کی جگہ اونسائیت کو اپنی چند سطروں کا تختہ مشق بناؤں لیکن آپ نے میرے لئے بالکل گھٹا کٹش نہیں چھوڑی اور ساتھ ہی میرے دل کا ارمان پورا کر دیا۔ جو خاکہ آپ نے کھینچا ہے اور جس پہلو سے چوٹ کی ہے، وہ تعلیق کی چیز نہیں۔ غلاف شکر میں اس طرح کوٹ کوٹ کر زہر بھرا ہے کہ خود آپ سے داہلے نہ کچی جا رہتا ہے۔“ (ص ۱۷)

عام طور پر مزاج متوازن اور رابین جینی تلی رکھتے تھے نہ مدرج میں غلو نہ ہجر میں مبالغہ نہ افراط نہ تغریظ لیکن آخر ہنر تھے چوک ہی مالتے تھے۔ ان سطور کا راقم آج کا بنا ہوا ”مولانا“ اس وقت بڑا کٹر ”مشر“ تھا اور مرحوم سے میں کوئی ۱۶-۱۷ سال چھوٹا۔ بس بس پر اس عمر میں ہر مان ہونے کو کوئی حد ہی نہیں مگر تیرب کے وزن کے ذوق اور افادت کی سطروں پر سطر ہی سی خود دوازی کی نذر ————— حوصلہ افزائی کی بھی کوئی انتہا ہونا تھی۔

مزاج کی نفاست اور طبعیت کی شرافت میں اپنی نظیر آپ تھے یوں کہتے کہ ان کی تخلیق میں جزو اعظم ہی دو عنصر تھے۔ کتنے وقت کا غنہ نفیس ہو۔ قلم نفیس ہو۔ روشنائی نفیس ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ موسم خوشگوار ہو۔ جب کہیں ان کا قلم حرکت میں آئیے۔ مسودہ لکھتے وقت کیا مجال کہ کوئی داغ و جہت پڑ جائے یا کہیں کا ٹیڈیٹ کو راہ ملے۔ سرکاری ملازمت سے آزاد ہونے اور وقت قانسرا بنا رکھتے، جب بھی اتنی رعایتوں اور اتنے التزامات کے بعد کہہ سکتے ہیں کہ ان کی بڑا ذخیرہ اپنی یاد کا رچھوڑ جاتا ہے؟ جتنا کھڑا الایہی بہت قیمت ہے۔

کتابی نہایت صاف ستھری رکھتے اور جلد عالی سے اعلیٰ بندھو کہ سیکینڈ ہینڈ یا استعمالی کتاب وہ ہاتھ میں لینا کیا جانیں۔ دو شیرہ کا غدی ”انھیں کی زبان میں دست غیر سے مس ہو جانے کے بعد“ ان کے کس کام کی رہتی۔ کھانا نفیس کھاتے، کپڑا نفیس پہنتے۔ مکان، فرنیچر، ہر چیز میں صفائی، نفاست اور لطافت کا خیال سب پر مقدم کیا کرتے کہ سیکنڈ کلاس کوئی سی بھی شے ہو، مجھ سے برا اثر نہیں ہوتی۔ جو چیز بھی ہو اور پڑاؤ کی ہو۔

اور شرافت نفس تو کچھ اس سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔ کسی کی دلی آزاری کیا و تشنگی بھی جانتے ہی نہ تھے اور تحریر میں

درشت و مظلوم الفاظ لانے کو گالی کے برابر سمجھتے تھے۔ کہتے تھے کہ ایسے جلد سے قبل لفظ لانا مخبر کا حق نہ رہا ہے۔ موزِ لطیف اشاروں کے بلوں کے جواز کے نفاذ تھے اور ملکی بھپکی چوٹیں کر جانے کے بادشاہ تھے۔ اور خیر خود تو اس پر حالی تھے ہی، دوسروں کو اس روش سے ہتھکے تو لوگ دیتے۔ شذراتِ معارف کی ایک عبارت پر مولانا سید سلیمان کو لکھتے ہیں۔

”میری عرض یہ ہے کہ نقیض الفاظ کی جگہ صرف مفہومی تغنی سے کام لیا جائے۔ یہ باقی کوئی اور آپ کو نہیں کہے گا لیکن مجھ کو جس حد تک خلوص ہے، اس کا اقتضا طبعی یہ ہے کہ جی کتنوں پر غایت ظہور کی وجہ سے دوسروں کی نگاہ نہیں پہنچتی، ان کو آپ کی ترجمہ میں لاؤں“ (ص ۷۷)

میری دورِ جاہلیت کی ایک کتاب فلسفہ اجتماع ”نامہ ہے، فلسفہ اعلیٰ کی حالت میں لکھی ہوئی۔ اس میں پیروں کا ذکر صاحبِ جاہ ہے بالکل ذہنی لیڈروں کی حیثیت سے ہے۔ اور ان کے کارناموں پر تنقید و تبصرہ اسی انداز میں، جس میں قوی دھکی لیڈروں پر ہوتا رہتا ہے۔ اپنے نزدیک اُس وقت اس میں ہر جہت ہی کیا تھا؟ اور اگر کوئی روکنا تو کیا تو جواب میں اس کی مولویا نہ تنگ لغوی اور محاسب پر لے ڈھری ہوئی تھی۔ جہدی مرحوم میری تحریک کے تدریسی اصولوں میں نہیں، پرستاروں میں، عاشقوں میں تھے۔ اس کے باوجود کچھ چینی بعد جب لکھو آئے تو مجھے ایک موقع پر تنہا پا کر بولے کہ :-

”فلسفہ اجتماع کا عاشق زار مجھ سے بڑھ کر کون ہوگا، لیکن سن میں مجھ سے چھوٹے ہو اس لئے ایک بات کان میں ڈالے دیتا ہوں پیروں خصوصاً سیمیر اسلام کا تذکرہ جس طرح آیا ہے، اس سے صاف استغناء لگتا ہے۔ عقائد کی بحث سے قطع نظر یہ رنگ کسی سنجیدہ مصنف کی متانت تحریک بھی تو مانتا ہے۔ جتنی شخصیتوں کا ادب و احترام کروڑوں انسان کر رہے ہوں، ان کے مزید کا لحاظ رکھنا تو لازماً تہذیب و شائستگی ہے۔“

بات اتنے خلوص سے کہی گئی تھی کہ سیدھی دل میں آ گئی۔ اور جو دل سے منکر و مذہب تھا، وہ کم انکم زبان و علم کی حد تک تو آدمی بن گیا۔ اور پھر دوسرے بعد جب اس کتاب پر جید رآبا وہی سخت لے ڈھے ترموع ہوئی تو اپنے اسی اخلاص و شرافت کے تقاضے سے مجھے لکھا :-

”میں نے آپ کے کلموں میں ذکر کیا تھا کہ آپ نے گورنمنٹ کی تنقیص نہیں کی تاہم اظہار خیال کی باریک تہ میں ایک طرح کی تشویش باقی مانتی ہے۔ اور یہ تعلمانہ رنگ ہے، مستشرقانہ سنجیدگی نہیں، ایک مذہب لفظ کے ہمیر پھر سے یہ شائبہ دور ہو گئی ہے اور مقصود پھر بھی ہاتھ سے نہیں جانیگا۔ جیسی آپ کیلئے کر سکتا ہوں آپ اجازت جیتے ہیں؟ (مکاتیب ص ۷۵)

یہ تو آپ جتنی بھی باقی اسی طرح کی مثالیں کوئی گمانے پر آئے تو ان کی تحریروں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اچھی خاصی نکال سکتا ہے۔ خود بڑے ”آزاد خیال“ تھے اور بڑے ”روشن خیال“، ملائیت کے نام سے ہزار مولوت کے سایہ سے پناہ مانگنے والے، لیکن ہرگز آدمشردی اور ہر دور روشن خیالی پر چھاپ تہذیب و شائستگی اور شرافت کی لگی ہوئی۔

تحریکِ اصل جو ہر شوخی بھی خلاف نہیں شوخی UR H M H T W - تنقید آدنی نہیں بلکہ صرف ایک

انفصال کیفیت جو بہت پہلی ذہن و نظوں پر کمر اٹھ لے آئی اور اس عموک قوی نہیں جو حرارت جسم کو انتشار میں لے آئے، صرف ممکن جو مسرت کی بلکی ٹھنڈک جسم میں دوڑا دے۔۔۔ وصال نہیں صرف خیال و صل۔ بقول شخصے ۴

خیالی میں مرنے و صل دلربا کے لئے !

مشاور کا انتظار ہو گا۔ دو جا رہا ضرور علی جو، ادبی ہو، مذہبی ہو، قلم کی شوخیاں سنا سکا کہیں علی نہیں چھوڑتیں۔ مولانا ناشکی کی غیر فلسفیانہ نیز مشکلانہ کتاب الکلام نمی نئی نکلی ہے اس پر تبصرہ کر رہے ہیں۔

”ہم کو ان کلام کے ہونے کسی کتاب کی ضرورت نہیں۔ جو حضرات جدید علم کلام کی ضرورت کا احساس رکھتے ہیں وہ دیکھیں گے کہ فاضل پرہیز نے ایک طرف تو بڑے میاں یعنی غریب کی بگڑی نہیں اتاری اور ساتھ ہی یورپ کے کوئیز پڑوں میں بھی فلسفہ و سائنس کے سامنے تیرہ سو برس کے بوڑھے سے بڑھ کر نہیں جھکے، بلکہ دونوں میں مصافحہ کر دیا۔ یہ معتدل روش جو اس علمی نزاع میں احتیاج کی گئی وہ شبلی ہی کا حصہ تھا“ (افادات ۱۳۵)

ایک اور حجتہ اللہ وہ مولانا شبلی کے ماہنامہ کا تعارف کردار ہے جس میں اس کی تمہید میں :-

”غالب زندہ ہوتے تو شبلی کو اوروں سے خاصہ کی وادہ ملی جس نے ایک فوجیہ بازاری میں ایک کی چھوکی کو جس پر انگلیاں اٹھتی تھیں، آج اس لائق کو دیا کہ وہ اپنی بڑی پوٹھیوں اور نقد بہنوں یعنی دنیا کی ملی زبانوں سے انھیں ملا سکتی ہے۔ جو بنوں پرانی ہوئی کھلی نہیں پڑھ سکتی تھی مدوں شعر اسے گاڑھا اٹھا رہا۔ یہ تفتلے سن بری طرح کھل کھل ہاتھ پاؤں نکالے اور ہنیرے بننے لگا دیئے۔ کیونکہ ایک زمانہ شیراز تھا۔ لیکن یہ باتوں ہی باتوں میں سب کو ثابت رہی بعض جگہ اب بڑی کے سامان ہو رہو کہ گھر آئے اور بال بال بچی۔

آخر میں ملک کے منجھے یعنی ناول نویس ذہیان تک پہنچے پڑے کہ اس کی پرودہ واری میں کچھ اٹھا نہیں رکھا تھا کسی کمی بھی دینی زبان سے اُسے یہ کہتے ہوئے سنا۔۔۔ اری اٹھ جاؤ گی میں جوں کے۔۔۔

لیکن دفعہ اس کی حالت نے پلٹا کھا یا کثرت فراش باعث تجدید کی ہو گئی۔ اچھے دن آتے ہیں تو گویا جی جاتی ہے۔ اب وہ مختصر ملائی گیندوں میں داخل ہے لیکن سنا کی کہ خوش اوصاف بشی سے زیادہ مانوس ہے اور قریب قریب انہیں کے تصرف میں رہتی ہے اللہ وہ اسی کا ایک شہر پیش ہے۔ (انعامات ص ۱۵۱)

ایک وینڈر ایل قلم سے ان کی کورتہ قلبی کشاکش گرمیوں کے رمضان کے زمانے میں کرتے ہیں اور اپنے قلم کے بانگین سے صحرائے خشاک کو لالہ زار بنائے دیتے ہیں۔ ۱۔

خیر تو ہے آپ کا بالکل پتہ نہیں، کیا آپ کے رمضان سے میرے مئی کے شہزادہ کچھ کم ہیں، جو ایک دوسرے آپ مہربان رہے ہیں، تحریری غلطی دند مشرب دوستوں کے لئے کسی طرح معذور نہیں، سوزہ رکھیے

نہ کیجئے گلے مجھے یا وضو نہ کیجئے۔ (دکاتب مستطاب)

میں ایک سال جید آباد رہا۔ مختار بیونیر سی قائم ہو رہی تھی اور اس کا مقصد تہہ اجیش سرشت تا لب و زجر ایک سال قبل ۱۹۱۷ء میں مکمل کیا تھا۔ میں اسی میں تھا۔ بھائی کی آڑے کروں کے اخبارات نے گولڈا ری شروع کر دی۔ اور مدت قیام کے چند مہینے بڑے سخت معرکوں میں گزرے۔ سال بھر بعد لکھنؤ واپس آیا ہوں، ضابطہ صرف و صحت کے کہ لیکن دل میں انتہائی نیت متحکم کر کے۔ حضرت ہمدی جیسے شخص کو سارا ماجرا بھر بھیجا ہے۔ اب جواب ملاحظہ ہو۔

”جس طرح ایک بھوکا خوش ذائقہ کھانے پر گرتا ہے اور جب تک لقمہ زبردست جلد حلق سے نیچے نہیں آتا رہتا اس کی تسکین نہیں ہوتی۔ میں چھپا پانہیں چاہتا کہ آپ کے دلچسپ عنایت ناموں کے ساتھ مجھے بھی یہی صورت پیش آتی ہے۔ اس میں میرے کنگلے پن کو اس قدر دخل نہیں جس قدر آپ کے بھلی کہہ کر بیعت جلد جلد میرے حصہ میں نہیں آتی۔ خوش ہوا نفس کی تیلیاں ڈھلے اور پر شکستہ طائر کو سوائے وطن نصیب ہوئی۔ وطن بھی لائق رشک لکھنؤ جس کی فصل کے بسیدہ آپ کی منشیط و ماضی کیلئے ڈاکوڑا کافی ہے۔“

آپ لکھتے ہیں کہ ”اب وقت اپنا ہے، قلم اپنا ہے، دماغ اپنا ہے“ ایک صاحبزادی ہیں صاف کیوں نہیں لکھتے کہ بگم اپنی ہیں۔ یہ نمک ترہ گلیا تھا کی پوری کے ویتا ہوں۔“ (صفحہ ۷)

میری شادی کو تقریباً ۱۵ سال ہوئے ہیں۔ جوری اور سالیوں کے ساتھ لکھنؤ سے باہر اپنی سسرال آگیا ہوں دیلی کا سفر خاصا دلچسپ رہا۔ حضرت ہمدی کو لکھنؤ بھیجا۔ جواب میں آپ بھی شریک ہوں۔

”آپ کا پرستان سفری دھلی تخت رواں (دلی) پر بہت ہی قابل رشک ہے۔ سچ یہ ہے کہ جنس لطیف اپنی پاکیزہ دلی اور کافرا دانی کے ساتھ کائنات کے خوبصورت چہرہ کا غارہ ہی نہیں ہے۔ ہمارے لئے شرط زندگی بھی ہے کہ بغیر اس کے دنیا سرے سے رہنے کے لائق نہیں تھی۔“ (صفحہ ۷)

صاحب معارف کو معارف اور مطبوعات دارالمصنفین کی لوح کی سادگی (سادہ لوحی) نہیں! پرتو جبر کرنا چاہتے ہیں تو قلم کا بل بول نغمہ سرا ہوتا ہے۔

”یہ غلط ہے کہ فلسفہ حسن آرائش و زیبائش سے بے نیاز ہے۔ صورت کتنی ہی حسین ہو، لیکن جوگی کے بعد وہ چوٹی

نہیں رہتا۔ ہر تراش و تراش کیل کے آئینے ہی اس کی روح وچ، تراش تراش سبب فرق آجاتا ہے۔“ (صفحہ ۱۸)

سارا ہمدی لکھنؤ میں شریوں کی تعلیمات سے جمل جمل کر رہا ہے۔ شری کہیں کہیں بڑھ کر سیکھے ہی کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ مناسبت کی باتیں اس منزلی پہنچنے کو بھی ہونے لگی ہیں اور پرہیز کی باتیں زبانِ قلم پر پے پروہ ہو کر آئے گی ہیں۔

مثالیں — ایک آدھ — لیجئے۔ مخاطب مولانا سید سلیمان صاحب برائے مناسبت و تقدس ہیں۔

”میں خدا کر کے ڈیڑھ سال کے بعد گیس سے چھوڑنا بھی تحصیل لاری پر جس کا چنداں شائق نہیں ہونے لگا

یہ اضافی تصریح اس لئے ہے کہ دلی آیا تو دارالمصنفین میرے لئے گھر آگئی ہوگا اور آپ کو سہ ہر باہم کی

جگہ، آپ صورت ہونے تو کہتا، لب برب کی ٹھہر گی۔ آخری فقرہ سے آپ کے تقدس ہی کچھ فرق تو نہیں آتا؟ (صفحہ ۱۸)

انہیں سدا جنت پہلی بیوی کی ذات پر دوسرا عقیدہ کیا ہے اور اتفاق سے اس وقت کچھ عیال تھے حضرت ہمہی کو ایک مشعلہ ہاتھ لگایا اور گفتگوئی کس کس طرح ان کی زبان پر آگئی تھی۔

میں مشتاقا مولوی عیادت کے دیکھنے ہوئے ہیں۔ لیکن آپ کی روداد پر وہی جہاں تک معلوم ہوئی بغیر حصارِ نازا ہے۔ یہ کیا کہ مرہوم بہر کہ مصنف فنی کی آبرو کو بھی خیر گزری کہ عیادت پر نہ رکھ لیا لیکن وہ دونوں کو قتل رہے گا کہ جسے بستر شکن ہر ناخوادہ شاعری کی اصطلاح میں بستر نگار عورت کہتی ہی نازک اور چمکدار ہو، لیکن یاس کی فطرت کا راز ہے کہ صرف مقابل کے نقل پر غالب رہتی ہے، یعنی وہ دبانے والی نہیں۔ یہ وہ پس پشت خدا کے طرف قبول کی بندوں کے حیرت میں آتی ہے یہ تصریحات آپ کے مذاق سے کہتی ہی ریگزنہ ہوں عزیز بنیدہ نہیں اور گدا آپ کا بھتی مومن (عبدالرزاق، بستر عیادت پر گزرا تا ہم میں سنانا چاہتا ہوں آپ کہاں کہاں اپنے قصر کی تلافی کر سکے اور آیا آپ خوش ہیں؟) وہ آتشہ اچھی سمجھی ہوائِ نشہ مستی کھار اور طرح کا ہے جس میں اس نشہ کا اثر آپ کے لطیف پر دیکھنا چاہتا ہوں۔ (ص ۳۳، ص ۳۳)

سید صاحبِ تفسیر اس زمانہ میں جو ان نئے۔ ایک اور بزرگ مولوی مقبول احمد صاحبِ صمدی تھے۔ میں نے انھیں جب دیکھا،
سینئر لٹریچر ہی پایا۔ حضرت ہماری سے ان سے بھی ایسی ہی چوٹ کی ہوتی تھی۔

اس سے اگے بڑھیے تو سرحدیں عوامی فانی کی بنیاد پر جاتی ہیں۔ اور مادی مروجہ اس صنعت میں بھی بندہ تھے اور اس میلہ میں کسی سے پیچھے رہنے والے۔ بلکہ ان کے ادب کی بھی یہی صنعت ایسی ہے جو انھیں آج کے "نئی پسندوں" کی "زم میں" پریشان "بنائے" ہوئے ہے۔ ————— زیادہ فوٹو اس صنعت کے فروغ میں کرنے کی بہت کہاں سے لائی جائے۔ دل پر جبر کر کے دوچار فوٹو دھرائے بغیر بارہ نہیں :-

عورت بھینستی ذرا مشکل سے ہے۔ لیکن جہاں بھینسی، اس سے کچھ نیچا اور ایسے زمینیں کرتی۔ اس کی پہلی غایت زندگی و سرے کی بچاؤ ہے۔ اس کی فترحات اس کا سرمایہ نشاط ہیں جس سے اس کے دل کو راحت ملتی ہے اور جس سے وہ جیتتی ہے کبھی دستہ دار نہیں ہو سکتی۔ وہ دار کے کھے کی کوئیکو لیماس کی فطرت میں داخل ہے۔ شانہ سے اچھل کر خود گرا گئے لیکن اگر اتفاقی سے گر جائے تو وہ دل میں خوش ہوگی۔ وہ ہر لمحہ مرے اچھل میں دراصل اسے پسینہ کا بھار فافٹ کرنا منظور نہیں بلکہ وہ چاہتی ہے کہ وہ نظر حاکم کو دیکھنے۔ عزم کا جائزہ نظریہ ایک بابک طرح کی واؤ جس سے جو ہر بار پاسانی کے ساتھ ٹھہری وہ اپنے بیکر رنگی۔

اسی لئے جوانی کی آرائشوں میں دستاں کی طرح چمکتی ہوئی چیز اسے دل سے پسند ہے جس میں یہ ان سرکشوں کو قید رکھتی ہے جنہیں عورت کے ارمان مجسم کیے۔ مے دوا آتش و بھی شباب کی جب کچھ کھچکا قدرتی کششوں میں بھری ہو، تو کوئی ہے جو ان کی کیف منی اور لے خودی کے عہدوں کی پیش کا ولادہ نہ کرگا۔ ترکیب عناصر ہی تو ہے۔ ذرا طرت کی شوخی دیکھے گا، فتنہ قیامت زائیکے عجائبات نکلیں گی، تو ان کا ہونا میں میاں جس میں ہمیشہ خف رہا ہے اور آج بھی اختلاف مذاق کے لحاظ سے

حق کے لئے کوئی نصاب مشترک قائم نہ ہو سکا۔ تاہم ہر زمانہ میں عورت کا مقیاس ان شباب وائرچس کا مرکز رہا ہے۔ آج تک نئے نئے نہیں آیا کہ اہل چین کی چوٹی ناک کی طرح سپاٹ سپینڈلی کیوں پسند پاتے ہو۔
(انادات ص ۱۷۷)

بعض تصورات اس سے بھی زیادہ فاش و بے پردہ ہیں — اور شرعاً کی عقل میں یہ بولی ٹھوکی آج بھی کچھ عجیب ہی سی ہے آج سے ۴۰-۱۰۰ سال قبل ۱۹۱۳ء میں جب یہ مضمون اول بار شائع ہوا ہے، تو ظاہر ہے کہ اس وقت یہ کن نظروں سے دیکھا گیا ہوگا!

ہمدی ادیب و دانشور ہوا ہی نہ تھے کچھ حکیم بھی تھے۔ اور خود لاکھ نہیں نہیں مکتے رہیں، کہیں کہیں بائیس صدی اور اورحالی کے رنگ کی کرکٹیں ہیں۔ اپنے تجربہ کی باتیں دوسروں کو بتاتے ہیں ان کی زندگی سناورانا چاہتے ہیں، اور دنیا کا نشیٹ فراز جس طرح خود ان کی نظر میں ہے، بے اختیار چاہتے ہیں کہ ان کے اس پاس والے بھی اس سے مستفید ہوں۔
ہمدی ترانہ نگاری کے شہدائوں میں تھے اور خود بھی کچھ درجہ اول کے مذہبی نہ تھے اس پر بھی دیکھئے کس حکیمانہ انداز سے میری بے ادبوں پر پڑ گئے ہیں زمانہ پھر یاد کر لیجئے کہ میرے شباب الحاد کا نام ہے۔

گزشتہ تصنیفات کی نظر ثانی کے مسئلہ میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ فلسفیت کے زوہد مذہب کی نسبت کوئی رہنما کی خاطر ادا اہسان ہو جس سے اس کی تجویز تو بیز غفرت سی ہے دنی بھی پائی جاسکے۔ جو کچھ کھئے، مسلم بن کر لکھئے کہ سنجیدگی تصنیف کا اقتضا یہی ہے۔ یہ نکتہ ہم برس کے بعد سمجھ میں آ گیا۔ لیکن اس دو بیان میں میں آپ کو کہ از کم ڈاکٹر لیبیان کی طرح نیا حق دیکھنا چاہتا ہوں جو نہ کسی باقی مذہب کی فسقیت کا اثر واصل یعنی پھری زہر کی بجائی کا مصداق ہوگا۔ اردو میں شبلی کے فصلی اعظم کو محمد نہ لکھئے، حضرت لکھئے، تو میرا آپ کا شکر گزار ہوگا۔ (ملکاتیب ص ۱۷۷)

باندے میں میرا چھوٹا اور پہلا پیر شہسہ میں عالمگیر دہائی انقلابوں کی زندگی دو ایک روز بعد پوری کر دیں میکس جیمز میں لکھئے آگیا ہوں۔ حضرت ہمدی تعزیت نامہ لکھتے ہیں۔

”نمائت افسوس ہوا کہ عہد کا اثر اولیں ضائع ہوا۔ غالباً یہ عالمگیر بخار کی غایت ہوگی۔ ہماری مقصد ہمدی آپ سے زیادہ ان کے ساتھ ہے جن کی ہماری گود و دفعہ عالی ہر گئی اور جن کا آجکل یہ نقشہ ہوگا۔

یہ سیمینہ میں تا زندگی رہے گا

نزا داغ دل میں نشانی رہے گا

آپ تہما نہ چھوڑتے تو اچھا تھا ساتھ دیکھئے یا ساتھ دیکھئے کہ نئی نئی پوٹ کے لئے سر ہم نے خرمی ضرورت ہے۔

”قانونی نظر کا یہی ہے نکالیں بعض وقت بلائے جلیں ہوئے۔ مگر یہ انسان کی عام تقدیر ہے۔“ (ص ۱۷۸)

لے شبلی کی سیرۃ النبی (جلد اول) کے مطالعہ کا باعث ہو گیا کہ صاحب بیرونی کی حکمت کا اس دور میں قابل ہو گیا تھا کہ تصنیف مصرع اعظم کے دہر پر لکھتے لگا تھا۔ انکا محض کے مقابلہ میں یہ درجہ بھی قیمت تھا۔ اور ہمدی مرحوم میری اس نصیحت کے راز دار تھے۔

میں حیدر آباد میں ہوں وہاں کے جوڑ توڑ اور گلی کی سازشیں ایک کھلا ہوا راز تھیں۔ میں کس زمانہ پر کار کا حضرت ہمدی کی ولی آرزو کہ میں محمود ہوں سے بچا ہوں، دیکھئے، پر مشورہ بھی بائیکین کی کن اداؤں کے ساتھ پیش کرتے ہیں :-
 ”جس جلیل القدر شخصیت کا آپ نے ذکر کیا ہے اپنے دوا بطور ان سے قائم رکھیے“

اور ہم جیلوں میں یعنی جس دائرہ میں آپ ضابطہ سے رکھے گئے ہیں ان میں سے کسی سے کامیابی تو جیکبھی مجید سے بعید توقع کا ذکر بھی نہ آئے۔ اسی طرح شب کے کھانے کا راز غمار صبح بھی نہ افشا کرنے پائے، آپ خود نفسیات کے عالم ہیں، لیکن جی نہیں ماننا چھوٹا لہجائی سمجھ کر صد دوسے نکل جاتا ہوں۔

میں نے بہتر سے بہتر شناس کر لہی و تیا میں کم بین پایا۔ دوسروں کے لطف قائم رکھنے کی صورت صرف یہ ہے کہ ہم نسبتاً ان سے بہتر حالت میں ہوں۔ اس خاصہ ضمیمت کو نفسیات کی کس شاخ کی تحت میں رکھیے گا؟ (۴۹، ص ۵۰)

اور پھر یہ خبر شکر کہ میں حیدر آباد سے ایک معقول ملازمت چھوڑ کر چلا آیا ہوں اور وہاں ہی کا قصد نہیں لکھتا، کس طرح مجھے پکارا کرتے ہیں :-

”کیا واقعی اب وہاں ہی کا قصد نہیں؟ آپ تو فلسفی ہیں و بنا دیکھنے کے لئے ہے، برتنے کے لئے نہیں اور لو کی حماقت سے لطف اٹھانا بھی ایک عیش ہے“ (۵۶، ص ۵۷)

اپنے ایک عزیز قریب کے سامنے جو ساتھ ہی مجلس دوست بھی ہیں، اپنا دل کھول کر یوں رکھ دیتے ہیں :-

”کچھ باندھو، میری وطنیت یعنی دنیا کے احباب تم ہی دونوں تک محدود ہے۔ اونچی سے اونچی سوسائٹی میں اٹھا بیٹھا، بڑے بڑے جگہ گاتے نظا سے دیکھے، عمر اس میں گزری لیکن قسم لے لو اگر تمہیں خیر ہوئی ہوں بجلی کی ہرکش دبا روشنی میں بیٹھ کر بھی کہیں اپنے سادہ چراغوں سے بے نیاز نہ ہوا۔ اسی سے زیادہ نمائشی و تیا میں ہم سے کیا جانتے ہو، اچھے اچھوں کو دیکھا آپ سے باہر و سب سہری کی چٹنی چٹنی تصویر بن جاتے ہیں“

ہمدی مرحوم کوئی بڑے مذہبی نہ تھے۔ لیکن مذہب، بیزار و مذہب وطن بھی ہرگز نہ تھے۔ آزاد خیال سے تھے اور اپنی مذہب شری کو ہر جگہ اچھلتے دھتکتے تھے ”مولویت“ کے نام سے چڑھتے اور ”مولوی“ پر خارا کھائے بیٹھے دہشتہ تاہم مسلمان تھے، توحید کے قائل اور رسالت کی تصدیق کرنے والے۔ لباس مغربی زیب تن رہتا لیکن لباس کے اندر دل خالص مشرقی تھا۔ و مانع مغربیت کے اثر سے آپ کی کہ لینے لگتا لیکن یہ اسے گھوم بھیر کے پھر ایمان و اسلام کی طرف واپس لے ہی آتے۔

سید مرزا سراج جنگ بہادر و صدر المہام پیگاہ اعلیٰ حضرت تھے۔

شفقت، ہمدردی، اور اخلاص کے چمکے تھے۔ قلب رقیق تھا کسی کی تکلیف نہ دیکھ سکتے۔ اپنے بیگانہ سب کے ساتھ
 حسن سلوک کی فکر میں لگے رہتے۔ اور اپنی فیاضی کا دروازہ کسی پر بند نہ رکھتے۔ نماز پابندی سے نہ پڑھنے لیکن جب کسی پڑھنے اور اکثر
 غسل تازہ کے بعد ہی پڑھتے تو رقیق حیات، ہمدی بیگم کا بیان ہے کہ ششون حضور کے ساتھ پڑھتے، اور دعا مانگتے وقت فرمودہ
 بمودیت بن جاتے۔۔۔۔۔ زندگی کی فطرت کچھ روزہ اور مل جاتی تو مجھے اپنی جگہ یقین ہے کہ ان کی اسلامیت خوب پختہ اور
 نمایاں ہو کر رہتی اور اپنی تخلیقات حرفی و لفظی کو نظر ثانی و اضافہ کے بعد ہر طرح پاک و پاکیزہ بنا کر ایک بڑا ذخیرہ صیح معنی میں
 ”ادب لطیف“ کا اپنی یا و گار چھوڑ جاتے۔

علامہ عسماوی

ابوالخیر مودودی

مستطیل سراور کشادہ الجھری پیشانی کے عسماوی صاحب بڑے جامع کمالات تھے۔ اسلامی علوم نقلی و عقلی کے غلط و سید النظر مورخ، مولیٰ، فارسی آردو کے انشأ پر از اویب، انگلیں بیان و گرم لہجہ شاعر، کتاب میں و بعدہ در باقی امور میں جنتی۔ ان کا حفظہ طر فہما تھا۔ میسویوں مرتبہ کے چلے ہوئے رستے پر ان کو کھینچ دیکھے، رستہ نمونی جا میں گئے اور بغیر وہ فانی کے اپنے گھر واپس نہیں پہنچ سکیں گے۔ حد یہ ہے کہ مسئلہ کے دیباچی انفلوانزا میں رفیقہ حیات نے ان کو زندگی کے رستے میں چھوڑا اور وہ بیرکستہ بھی بھولی گئے۔ لیکن کتاب، کوئی بھی ہو ————— فسانہ آزاد، کوچاک باختر، نائیکا مجید یا کوک شاکر ————— ایک دفعہ نظر سے گزر جاتی شرط ہے، ناممکن ہے کہ اس کے مضامین ان کی یاد سے اوجھل ہو جائیں۔ بلکہ بعض خاص خاص جگہ اور فقرے لفظ لفظ یاد رہتے۔ ہمیدہ بھر ایک ہی چیز کھلائیے، وہ شوق سے کھالیں گے، لیکن ایک ہی قسم کی کتابیں مسلسل پڑھے جائیں، یہ ناممکن تھا۔ تبدیل واقعے کے لئے ————— اور ذہنی میمنہ کے لئے ————— تیر تھوڑا م فیروز پوری کے نزدیک بھی پڑھتے تھے۔

عسماوی صاحب کے نام سے، میں سب سے پہلے، امرت سر کے اخبار ”دیکل“ کے درجے واقف ہوا۔ اور ابوالکلام صاحب کے نام سے ہی اولاً ”دیکل“ ہی کے درجے آنکھیں روشن ہوئی تھیں۔ ————— میر میرے بدوشور کی بات ہے۔ بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں ”دیکل“، بڑا نامی گرامی اخبار تھا اور اس وقت کی صحافت میں اصابت رائے و مناسبت تحریر اور خوبی کے لحاظ سے بہت ممتاز تھا۔ عسماوی صاحب اس کے ایڈیٹر اور ابوالکلام صاحب کے حاشیہ تھے بشور بڑھتا گیا اور عسماوی صاحب نے واقفیت بڑھی تھی: ”اندوہ“ کے پرلے پرچوں میں اعجاز القرآن اور ابن خلدون وغیرہ پر ان کے مضامین اور سب ایڈیٹری میں ان کا نام نظر آیا یہاں بھی وہ سب ایڈیٹری میں ابوالکلام صاحب کے حاشیہ تھے۔ پھر ”دیکل“ کی ادارت کے ساتھ ان کی تراوش قلم سے ”تہذیب الاخلاق“ کے نام سے ایک ماہ نامہ نکلتے لگا جس میں نقلی علوم کے پہلو پہلو مسلمانوں

۱۰۰۰ - ۱۰۰۰

۱۰۰۰ - ۱۰۰۰

کے عقلی و ادنیٰ فانی علوم پر بلند پایہ عقائد و مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس زمانے میں انھوں نے اپنا لکھا کہ اب معلوم ہوتا تھا بند لڑکے کیلئے شہر سے چند منزلیں اڑے کیں تو ان کے ایک عربی ماہنامے ”البیان“ پر آگاہی ہوئی۔ یہ ماہنامہ عوامی صاحب کی ادارت میں کھنڈ سے ۱۹۰۲ء میں نکلا، جسے وہ شہر و ملک کامیابی سے پلاتے رہے۔ اسی زمانے میں ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ کئی ملک میں پہلے شخص تھے جنھوں نے بیرون ہند کی صحافت سے ناظرہ جڑا، اور ضرورت کے رسالوں اخباروں میں مضامین لکھے۔ ”البیان“ اسی زمانہ کے سہ ماہی نکلا تھا۔ پھر جب ”السلام“ نکلا تو کچھ دنوں بعد ”دکھن“ کی لوح سے ان کا نام رخصت ہو گیا، اور معلوم ہوا کہ اسلام صحابہ نے عوامی صاحب کو ”السلام“ کی ملکیت ادارت میں بیٹھ لیا ہے۔ ”السلام“ سے مقرر علی خاں صاحب نے ان کو ”زمیندار“ میں کھینچا، اور دو تین برس کے وقفے کے بعد ان کا نام مقرر علی خاں صاحب کے غیر رسالے ”ستارہ جمع“ میں شریک مدیر کی حیثیت سے فہم دار صحافت میں غالباً یہ ان کی آخری فہم دہی۔

یہ معرفت بہت لمبا دور بھر تک تھی، لیکن عوامی صاحب کی علمی فضیلت کا ایک بے غور و فہم واقعہ اس وقت میرے سامنے آیا جب میں دارالترجمے سے متعلق ہو کر مجید آباد کا دھارما تھا۔ جہاں مشورے کی غرض سے حکیم اہل خاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، حکیم صاحب نے فرمایا: وہاں ایک بڑے فاضل شخص عوامی صاحب بھی ہیں۔ سفیر کابل ۱۹۰۹ء سے تاریخ ابن خلدون کے فارسی ترجمے کی فکر میں تھے، ایک دن سید صاحب نے مجھ سے کہا، علی صاحب! آپ کے ہندوستان میں ایک آدمی ایسا نہیں ملتا جو ابن خلدون کی ”تاریخ“ کا ترجمہ کرے۔ مجھے تین سال کا ترجمہ کرنا ہو گئے۔ مجھے یہ سن کر بڑی شرم آئی، سوچا ہا، مولوی عوامی صاحب بڑے بھائی سے ”تالوار“ پڑھا تھا، میں جانتا تھا کہ وہ عربی فارسی میں بڑی دست گاہ و کھٹے ہیں، تھک لکھ کے ان کو بلایا اور انھوں نے یہ کام انجام دے دیا۔ قابل تعریف بات یہ ہے کہ بہترین ترجمہ کیا اور دو سال میں پوری کتاب کا ترجمہ کر دیا۔

یہ قسمت کی تیرنگی تھی کہ عوامی صاحب جس شعبے کے رکن تھے اسی شعبے سے ایک دو مہی منسلک ہوا جو ان کی پابندار میں بیٹھنے کے قابل تھا۔

لیکن اس گہرے تاثر کے باوجود میرے دل میں شوق ملاقات نہ تھا۔ خیالی تھا کہ جب وہ ایسے ہی فضیلت پناہ میں تو اپنے متحدہ ہم کاروں کی طرح اپنا سارا علم اپنی خصوصیتی پر لا دے رہتے ہوں گے، انھوں میں سخت فخر تھی ہوگی، زمین پر اس طرح چلنے ہو گئے

۱۔ کہیں ایک ڈپ سے عوامی صاحب کی مستحق تصانیف و مذاہات میں ”حکمت“، ”علم الحدیث“، ”فلسفۃ القرآن“، ”فلسفۃ ابن عربی“، ”مناہج العرب“، ”تاریخ عرب قدیم“ اور تراجم مفتی محمد عبدہ کی مشہور کتاب ”الاسلام والاصول“ (جو دینان نے جواب میں لکھی) نتیجہ عبدالحزب شافعی کی ”الاسلام دین النطق“ اور امام راجح کی ”تفصیل الفتاویٰ مع تصحیح السعدی شافعی“ ہوئی۔ ۲۔ ایسا ہی تین حصوں پر مشتمل تھا، ایک حصے میں عرب ممالک کے لئے ہندوستان کی تاریخ و رجال اور حالات، سامریہ عربی میں مضامین ہوتے تھے۔ دوسرے حصے میں عرب اہل علم کے مضامین، با ترجمہ درج کئے جلتے تھے اور تیسرے حصے میں بلاد اسلام کے حالات اور خبریں آردو میں ہوتی تھیں۔ ہندوستان سے زیادہ ضرورت و بیروت اور شمالی افریقہ، تونس و الجزائر و مراکش میں اس رسالے کی مانگ ہوئی۔

گوہاگوئی کے سروں پر چل رہے ہیں، اور باقی آنکھیں بند کر کے اس طرح کٹے ہوں گے جیسے بہت دور کسی سیارے میں بیٹھے اپنے بندے پر وحی نازل فرما رہے ہیں ————— گرجب ان کو کھیا، تو پہلی نظر میں وہ جس پر ان کی شخصیت کا پہلا عکس یہ پڑا کہ یہ شخص اپنے تئیں کوئی غیر معمولی ولایت الہی نہیں سمجھتا، محض انسان، لاکھوں کدوئوں انسانوں کی طرح کا ایک انسان! اور اس سے زیادہ کچھ ہونے یا مٹنے کی کوشش بھی نہیں کرے گا۔ اور میں پھولی گیا کہ وہ کوئی بڑے جنادری فضیلت پناہ میں، اور میں سطوت و ریاست ہمت دور کھڑا ایک نادان لڑکا ہوں۔ چہرے پر شرافت کی ملاحیت، خدو خال میں علم کا دھچاؤ۔ آنکھوں میں گہرے پانی کا وقار۔

اسلاف عالی گوہر تھے۔ علم صدیوں سے تواتر تھا، مہاد منصب بھی چاہا۔ نیک نہاد اولاد نہ جودار بزرگوں کی حقیقی میراث پر سے حق سے محروم رکھی اور ایک نسل نے دوسری نسل کو پھپھادی۔ نیا بے رنگ صدیقی تھے، صدیقیت ان کے علمی شرف کے ساتھ ان کے ادب و ضاح کا طوار میں نمایاں رہی۔

شیخ محمد نام ایک صاحب فضل و کمال اس خاندان کے مورث تھے وہ آٹھویں صدی کے آخری برسوں میں ہندوستان آئے۔ اس زمانے میں علم کے خاندان کی آخری منزل پر دب تھا۔ شیخ محمد بھی میں بیٹھے اور جن پر، میں خود وہ اور ان کے گھرانے کے لوگ اناؤہ علوم میں مشغول ہو گئے۔ ابراہیم شرفی کے زمانے میں اس گھرانے کے درس علوم کا شہرہ زبان زد عام تھا۔ اس نے بارہ کالی سیر حاصل جاگیر دے، ان لوگوں نے انھی دیہات کو اپنی درس گاہ بنا لیا۔

مسلمان بادشاہوں کی یہ جاگیر بخش جان ایک مستقل فکر کی حامل تھیں۔ جاگیروں کا مدعا تہذیبی اداؤں کے لئے افراد و اختیار دے رہا رہ کر دیتا تھا۔ ہر درس گاہ و ترب و جزا کے طلبہ کی اقامتی درس گاہ ہوتی تھی۔ اکثر و بیشتر طلبہ تین کے کپڑوں سے گھر سے چلتے اور جس درس گاہ میں پہنچتے، فراغت حاصل کرنے تک ان کے تمام مصارف کی دہی درس گاہ کھیل ہوتی۔ یہ وہیاتی درس گاہیں صحت مند تعلیم و تربیت کے علاوہ تبلیغ کا بالواسطہ وسیلہ تھیں۔

عمادی خاندانی نے لورپ کی سہیل میں تقریباً ساڑھے چار سو برس تعلیم و تہذیب کی شمعیں روشن رکھیں۔ آخر زمانے میں سرگھور میں شیخ عبدالقادر عکادی کی درس گاہ مروجہ علم تھی، جس میں ایک وقت دو سو طلبہ مقیم رہتے تھے۔ بادشاہی وقتوں کی جاگیر اور صحت فوانی کے ابتدائی دور میں ضبط ہو چکی تھی، لیکن چند نور جاگیریں یہ تھیں غوان کی ذات تھی۔ بزرگوں کا زرخیز۔ "امروز" ایک گاؤں تھا، اس کی آمدنی سے طلبہ کی مدد کرتے اور دونوں وقت کا کھانا ان کے ساتھ ایک وستر خوان پر رکھتے۔ پیلادی صحت کے پروا دیتے۔

اس تعلیمی اقدار تہذیبی تمدن گزاری میں جو ترقی ملی اپنے دائرہ عمل میں مردوں کے ساتھ شریک تھیں، اور یہ ہمارے معاشرے کا سبب بڑا دیرپا اور مستور تھا، اسی سے خاندانی اوصاف و ملامت پائے تھے، تہذیب و دانش کی برومند ترقی تھی اور معاشرے کا شیرازہ بندھا رہتا تھا۔

عمادی صاحب علمی شغف کی اس حامل میں کچھ کھولی تھا نہ ان میں اب تک بولی چالی کی زبان عربی تھی، صرف و نحو داوی سے چٹھی۔ اور گیا رہ برس کی عمر میں اتنی استعداد حاصل کر لی کہ خود "الف لیلہ" پڑھ لیتے اور اس کے مشکل مقامات لغت کی مدد

مل کر لیتے۔ اسی کتاب نے عربی انشا کا شوق پیدا کیا۔ علوم و ادب اپنے والد اور دادا سے پڑھے، دو زنی بزرگ صاحب فضل تھے۔ ادب کی دوسروں اہل علم کتابیں چھوڑ کے قرآن اور حدیث کے درس میں بہترین ادب عالم بھی پڑھا دیا۔ اس طریق تعلیم سے طالب علم میں یہ استعداد پیدا ہو گئی کہ حافظہ و ابن قیہد کی ادبی مصنوعات اور کلام عرب کے عجوبوں سے خود استفادہ کرے۔ یہ زندگی سے ہلکتے بولتے، کھڑے اور سادہ، لطیف اور لطیف، کائنات کی قول تھے ادب کی تعلیم تھی۔ شیعہ اور حریری اس کے اگے پانی تھے نسلی اور عقلی علوم میں ملا نظام الدین کے اصول پر مبنی کی ایک ایک دو دو و جابج و مستند کتابیں پڑھائیں، فقہ میں عام تصاب کے خلاف امام محمد شیبانی کی جامع صغیر و جامع کبیر پر انکشاف، اور آخر میں امام رازی کی شرح اشارات پڑھائی۔ یہ دس نظامی پڑھاؤ تھا۔ اس کے بعد شیرازی و دیسیات سے فکر و نظر کی وسعتیں حاصل کرنے کے لئے مولوی ہدایت اللہ خان رام پوری کے درس میں داخل کر دیا۔

ہزاروں سختیوں میں ان بزرگوں پر جنہوں نے فقہ میں سلاست دی کا قانون ذکر نہیں کیا، اور بنیادی تعلیم میں آزاد و فکر کا سبق پڑھا یا۔ اگر تصاویر اسنہ عمادی صاحب قدوری شریف اور مولانا کنز الدقائق کی آلی اولاد کے چکر میں پڑھتے تو اور جو کچھ بھی جوتے لیکن بلند نگاہ اور وسیع القلوب عمادی صاحب نہ جوتے، چھوٹی چھوٹی باتوں میں ٹپکتے، "صورت معنی" اور "معنی صورت" کے کاتوں میں الجھتے، دوسروں کے لئے بھی مصیبت بنے رہتے اور خود اپنے لئے بھی۔ قرینے کی مٹھی میں سچی مٹائی ڈاڑھی کو کب بشت و دو انگشت بنانا پڑتا۔ ٹپکتے ڈھکا پانچا نہ دیکھ سکتے، اور یہی اتنی گہری ترشوائی کہ مریجوں کے وجود کا اطلاقی ہی نہ ہو سکتا۔ شرح اشارات رازی کا سبق حقیقت میں آزاد و فکر کا سبق تھا۔ امام رازی بڑے بہتشنہ تھے انھوں نے شہ نشین کے طاقتور سے بڑے بڑے بڑوں کو گرا یا ہے اور بڑے مرے سے ان کا ٹھکڑ کیا ہے۔ اور اس بت شکنی کے بعد بہت بڑا احسان یہ فرمایا کہ خود اپنا بت کسی طاقتور میں نہیں بٹھایا۔

درسیات سے فراغت کے بعد حکیم عبدالحمید خاں صاحب سے، ولی، جاکے طب کی مشہور کتاب "القانون" پڑھی۔

مولوی ہدایت اللہ خان رام پوری، مولوی فضل بن خیر آبادی کے گجائے روزگار شاگردوں میں تھے۔ چند سال رام پوری میں دس دیا، پھر شملہ میں جون پور آئے اور مدرسہ امام بخش کو دینی بخشی۔ مولوی حبیب اللہ خاں بیروانی ان کی کریم انفسی کا ایک لائق تھے۔ بڑے مرے لے کر یہاں فرمایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ استاد اعلیٰ مولانا لطف اللہ مدرسہ عالیہ کے امتحان کے سلسلے میں رام پور تشریف لے گئے سخت گرمیوں کا موسم تھا، امتحان سے فراغت پائی تو بارہ بج چکے تھے۔ استاد اعلیٰ کی عادت تھی کہ دوپہر کے وقت باہر نکلے تو سر پچا دوڑا لیتے، چادر ڈال کے مدرسہ سے پیادہ پا استاذ اعلیٰ مولوی ہدایت اللہ خاں رام پوری کے مکان پر پہنچے، مولوی صاحب نیلوفر کرنے زنانے میں جا چکے تھے، اطلاع پانے ہی پر تشریف لے گئے اور اس نشان سے ہمان عزمی کی پذیرائی کی جو انی بزرگوں کا حصہ تھا۔ اپنے پیچھے کو بھیج کر انہوں نے تازہ پانی منگوایا اور خود اپنے ہاتھوں سے اپنے ہمان کے پاؤں دھوئے۔ سپاس گزاری یہ بھی کہ مولوی لطف اللہ صاحب نے دھوپ میں گرم فرمایا، اپنے ہر مرتبہ لوگوں کے ساتھ ان بزرگوں کے یہ آداب تھے۔

پھر رام پور میں عربی و عربیہ سے فہم حاصل کیا، اور طبیب صاحب کے کتب سے کتب نوازی کی سند پر بٹھا دیا۔

اس زمانے کی کچھ دنیا میں مولوی عبدالسی اسی ایک مشہور و مقبول شخصیت تھے۔ وہ مولوی عبدلئی و بی بی کے ممتاز شاگردوں میں تھے۔ اور رام پور کے مدرسہ عالیہ میں مدرس رہ چکے تھے۔ مدرسہ چمڑا کر لکھنؤ میں اصح المطابع کے نام سے مبعوث قائم کیا۔ جس میں حدیث و فقہ، خصوصاً عربی کی درسی کتابیں تصحیح و تہذیب کے ساتھ چھاپتے تھے۔ اسی صاحب کو اپنے اس کام کے لئے ایسے لوگوں کی جستجو رہی تھی، جو ادب اور مختلف علوم میں دست گاہ رکھتے ہوں اور غلط شیعوں کی تصحیح میں ان کی مدد کریں۔ وہ اپنے کسی کام سے رام پور آئے، طبیب صاحب نے ان کے موزوں ترین آدمی سے ان کو متعارف کیا، اور عمادی صاحب کتب سے مطبع کی زینت بن گئے۔ یہاں علمی اور طبیبہ مشغول تھے اور عمادی صاحب اول سے آخر تک لفظ بلفظ ایک ایک کتاب پڑھتے اور نقل و کتابت کی غلطیاں درست کرتے۔ اسی صاحب کو کامپیاں اور پروف دیکھنے میں بڑی حدت تھی، جیسے بچوں کو تھوڑے کے ساتھ قرآن پڑھایا جاتا ہے۔ اسی طرح وہ کامپیاں اور پروف پڑھتے تھے۔ یہ کام انھوں نے اپنے دفتر رکھا۔ کام لاوارہ و بے سبب کر لیا اور حدیث و فقہ کے علاوہ عقولیات کی بہت سی کتابیں اور ورسا کی تقریباً تمام کتابیں شائع کیں۔ اصح المطابع کا نام وری حلقوں میں محبت طباعت کی ضمانت بھی جاتا تھا۔ عمادی صاحب کہتے تھے کہ اس کام سے مجھے بڑا فائدہ پہنچا، غلطیوں کی تصحیح کے ٹھیک اور پرکھ کر استعد و پیدا کردی، اور غور پر پڑھنے کی وجہ سے مباحث و جنائش ہو گئے اور پوری کتابیں پڑھنے سے تفصیل اس کے مباحث سامنے آ گئے۔

تبعیہ کا بابا جب ہلکا ہوا اسی صاحب نے پہلے الریاض نام ایک عربی ماہنامہ جاری کیا۔ پھر عبدالوہابی صاحب کے ہتھام سے "العباس" جاری ہوا۔ یہ دونوں رسالے عمادی صاحب کی مدد سے بن گئے تھے جب ناخن نرم تھے اس وقت سے عربی انشاء کا ذوق پرورش پا رہا تھا۔ تصحیح کے کام سے جب فرصت پائے عربی جوامد کو مضامین بھیجتے دیتے تھے۔ اسی صاحب نے مناسب تھا کہ یہ ابرکرم جو باہر رہتا ہے گھری میں کیوں نہ برے۔

۱۔ عربیہ و عربیہ اور عالم سے ایک نادرہ تھے، علوم کا بہتادریا، وطن نگہ تھا، نہ جانے ہندوستان اس طرح کیلئے مولوی فضل حق جبر آبادی و دکنی کے مشائخ سے عقولیات میں کمال حاصل کیا، یعنی علوم میں صاحب دست گاہ تھے، کتاب سے بے نیاز، ان کا علم ان کے سینے میں تھا۔ ادب میں اپنا جواب رکھتے تھے، کلام جاہلیت پر اس قدر غور تھا کہ انھوں نے قصیدے پر قصیدہ مسلسل سنے جاتے، پڑھنے کا عذر سے شعر کی تصویروں کی عکاسی کر دیتے اور لہجے سے شعر کی بیویں نمایاں کر دیتے۔ طباطبائی بیان کرتے اور داوود سخن دیتے۔ محاشی یا نمائش شعر سناتے نہ لے آجکلے لوگ شعروں کو ہر رنگ و بہ معنی شعر سے جانتے ہیں جس میں ہوش جاتے کسی کا پیار نہ جلتے دیتے۔ نواب ملک علی خاں کی مجلس کے مجلس ہزارہ انسان تھے، جہڑ و ہزل میں طاق، نواب ان کی بہت تازہ زبان کرتے۔ مذہب میں پانی تھے جس رنگ کے کلاس میں جا ہوڑاں دو، مگر ہتھ تھے، اسلام بہکے دائرے کے اندر مدلول مدرسہ عالیہ کے صدر مقرر تھے، اور طلبہ کے ذیلیے بڑی فراخوصلگی سے بھرتے تھے۔ خدا کی رحمتیں ہوں اس مرد آزاد و بے باک پر۔

عمادی صاحب کے فضل و کمال سے سب اُعراس وادارہ کے اور جید آباد کے دوسرے علمی اداروں کو استفادے کا شرف حاصل ہوا۔ اعلیٰ حضرت حضور نظام نے (خدا ان کو اپنی حفظ و امان میں رکھے) اس قدر شناسی کے ساتھ تعلق و فرمایا تھا کہ ایسے علم و فضل والے علماء خال خال نظر آتے ہیں۔۔۔۔۔ مشرقی شعبے میں اس پایہ کے فاضل شخص کا مروجہ و ہونا مشرقی شعبے کا برا اثر ہوگا۔ وادارہ کے کو یہ بڑا اثر "نقدیاً" بائیس سال حاصل رہا۔ اس مدت میں وہ بھی کچھ مہرہ: مترجم، ناظر، مکی۔ علمی مہتر، و اضع اصطلاحات۔ عمادی صاحب کو عربی فارسی کی قدیم و جدید لغات و مصطلحات پر بڑا عبور تھا۔ اس لئے وہ ہر شعبے کی مجلس مصطلحات کے مستقل دکن تھے، اور ان کو ارکان مجلس میں بڑا امتیاز و احترام حاصل تھا۔ بایں مہرہ علمی رہنمائی سے ایک قدم آگے نہیں بڑھتے تھے۔ اصطلاح وضع کرنے میں مدد دیتے اور اس بات سے غرض نہ رکھتے کہ ان کی یہ دوا درگاہ کی قبول کی گئی ہے یا نہیں۔ وہ اپنی شخصیت کا وجہ نہ دے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔

دامۃ المعارف اور کتاب خانہ آصفیہ حیدر آباد کے دو عظیم ترین بین الاقوامی شہرت کے ادارے ہیں عمادی صاحب ان دونوں کے رکن رہے۔ وادارۃ المعارف نے تاریخ اور فلسفے کے علاوہ ہیئت و ہندسہ وغیرہ علوم کی متعدد کتابیں بری شرقی شاسوں کے اشتراک سے ایڈٹ کی ہیں۔ اس قسم کی تمام کتابوں کی تصحیح و تہذیب کے نگران اعلیٰ عمادی صاحب مقرر کئے جاتے تھے۔ کتاب خانہ آصفیہ کی مجلس غلوطات میں وہ علمی سخنوں کے مستند مبصر تھے۔ کتاب کسی مونس و مضمون کی ہو، اس کی علمی قدر جانچنے میں ان کی نگاہ بہت تیز تھی۔ لیکن مادی قیمت کی ہوا ۱۹ میں وہ کورسے تھے اور اس سے سرواڑی نہ رکھتے۔ جس نے زندگی بھر بازار جاکے کوئی چیز خریدی ہی نہ ہو، وہ قیمت جانچنے میں تیز نگے ہی لگاتا۔ ایک درگیری اور حکم گیری ان کی شخصیت کی ایک بنیادی ایڑ تھی۔

۱۔ مترجم کی حیثیت سے عمادی صاحب کے قلم سے سرفہاں کتابیں نکلیں:-

- ۱۔ مؤرخ مسعودی کی "تنبیہ و انشراح" اور "مرقۃ الذہب" (۲) مؤرخ طبری کی "تاریخ الرسل والملوک کی آقوی و جلدیں۔
- ۳۔ طبقات ابی سعید کی بارہ جلدیں۔ (۴) ابن جریر کی "امل و اعلیٰ"۔ یہ آخری دو کتاب تفسیر حدیث علم غلام و فصد اور مذہب کی معلومات کا ایک عجیب مجموعہ ہے۔

۲۔ باجوہی صدی ہجری کے مشہور فلسفی و طبیعی و ریاضیاتی مصنف ابن اثیم کے حسب ذیل رسائل:-

- (۱) رسالۃ الضوء
- (۲) رسالۃ المرآۃ یا دار المحرقۃ بالدارۃ
- (۳) رسالۃ المرآۃ یا دار المحرقۃ بالدارۃ
- (۴) رسالۃ المسائل
- (۵) رسالۃ المسائل
- (۶) رسالۃ المسائل
- (۷) رسالۃ الضوء و القمر۔

حدث ابن جریر کی مشہور تاریخ ابن جریر کی خالوں کا وسنہ معصوفی۔ حدیث وغیرہ۔

حیدر آباد سے عادی صاحب کے تعارف کا ذریعہ ظفر علی خان صاحب تھے ————— یہاں حیدر آباد سے میری مراد حیدر آباد کی دوح ہے۔ دوح کا مظہر انیس سے حیدر آباد و حیدر آباد کا ————— اور نیچے زمین و زمین کی کچھ اس شان سے تعریف کی کہ پیش کا سے تار کے ذریعے جلی ہوئی، رہا ہی نباس برطرف کر دیا، پہنچنے ہی باور باب کیا، تو سنی شیعہ کو ان کی کلمت کا اثر نہ تھا۔ پہلی ملاقات میں ہندو ذات کا نقش، سنا نہرا پڑا، عوامی صاحب خاص، تعبا زور کے مور و بن گئے، ایسے اعتبار میں وہ کچھ مضر دئے۔ بارگاہ میں کو نادر غلی کیا میں ملنے والی عام کی غرض سے ان کی نہ بنی، اور جسے رے صنف اپنی جو کتابیں، وارنس و سرپرستی کی غرض سے پیش کرنے ان کی قدر و قیمت جاننے کے لئے ایک ہی مختصر جوہر بنی، عادی صاحب ایسی ہی معاملت تھی، براہ راست ہمارے فاموس ————— اور ہمارے جانتے، حمایت لئے جانے۔ اسے جاننے کی غرض سے اور نصف جاتی بیچارہ آفر کے دروازے ان پر کھولے، ایسے اور اس کی دوزخ کو بھی مواسے دئے، کیجئے کہ انفاق میں، صاحب کے سانس کو نہیں ملتا، خود لیے لئے ہندو دکن کی سی باسی تار پر، کھائی، اور سب سے زیادہ یہ کہ اپنے اہمیتان اور اپنی تلاوت میں اسدفا دئے گئے تو اس لئے ہی راجی تو جو ان کی نسبت تو ان کی جان کی کو کچھ کرنا، ان میں کو کسا، محمد مسند دئے اور اگر اس میں غلطیاں جوڑ تو جسے پر باصدا کر دو کیس قدر دغا میں بد دئے والا تھا اس بات کو یہ غلطی اور غلطی، لیکن عادی صاحب کا جوہر دست اس قدر اعلیٰ اور گراں مایہ تھا کہ یہ سارے اعتبار اس میں غلبہ میں باقی کی ایک بوند تھے!

عادی صاحب کے تصور خدیث نعمت ”جہی، ان باتوں سے ذکر سے اپنی زبان کبھی آلودہ نہیں کی۔ وہ جو آلودگی ایک کلمات ہے، پہلی کو کمزور میں ڈال، مائل، اسی طرح انھوں نے یہ ساری مہر کے، اور ان کے ذکر کا فخر خاموشی کے کعبوں میں ڈال دیئے۔ جس سے زیادہ طوطہ بازی اور کیا ہوئی۔ کہ وہ جی ان کاموں سے بے خبر رہتے تھے۔

لے۔ ظفر علی صاحب کو اعلیٰ حضرت آصف سابق اپنے زمانہ نشہ دہی سے جانتے تھے، اور اسی جانتے کی وجہ سے ملک بدر کئے گئے تھے۔ اس بات پر بھی کہ اعلیٰ حضرت آصف سادس، دہر محبوب علی خان کے حکم سے تمام سیکرٹری شہزادہ ولی محمد کو ملک کا قلم کھائے جاتے تھے، ظفر علی خان صاحب اس زمانے میں مہر سیکرٹری عوزیر زار صاحب کے اسسٹنٹ اور میں کار تھے، کاغذات پیش کرنے سمیت، ان کے ساتھ جاتے، عوزیر زار صاحب تمام سیکرٹریوں میں سب سے زیادہ لائق، فائق، اسبابی اور کام میں وعدہ برقی تھے، ولی محمد کی نگاہ میں بہت عوزیر ہو گئے۔ دوسرے سیکرٹریوں کو ان کی کو قیبت گراں گزری، وہ ان لوگوں کے لیے سازش گھڑی کہ سب عوزیر زار ولی محمد کو برسرِ امت دار لانے کی سازش کر رہے ہیں۔ اس یادداشت میں عوزیر زار صاحب اور ان کے دو لیف ظفر علی خان صاحب ملک بدر کر دیئے گئے۔ اعلیٰ حضرت آصف سابق نے یہ بات یاد رکھی، اور جب ظفر علی خان صاحب کرم آباد کی قید محض سے نکلے اور اسی کے لگ بھگ زمانے میں عثمانیہ یونیورسٹی کی اخصائی کتابوں کے لئے سر مشترک تالیف و ترجمہ قائم ہوا، تو ظفر علی خان صاحب کو حیدر آباد بلا دیا اور اپنے خاص فرمان سے مغربی شیعہ کا رکن مقرر فرما دیا۔

یہ ان کے کھرے علم کا گھبرانا تھا۔ انا ہمہ۔ اس ذات سے، یا احساس جس قدر واضح اور متقیم اور علم و نظریہ نواز
ہوتا ہے اسی قدر گھبرانا ہوتا ہے، اور جس قدر گھبرانا ہوتا ہے اسی قدر عیش و عشرت و شہوات کی تسکین پاتی ہے۔ لیکن ایسا
جس نفس کیفیت کا اظہار ہے، وہ متقیم اور متوازن احساس ذات نہیں! انا کی بڑبستی ہے۔ عموماً ہی صاحب کو
احساس تھا کہ وہ علم و نظریہ سے بہرہ مند ہیں، ان میں ایک خاص کمال اور خاص عبیرت ہے، اس احساس اور فطرت و شہوات
بزرگوں کے فطرت و تربیت نے ان کی ہر قسم کے احساس و عیش و شہوات کی شخصیت کو ختم دیا۔

ان کی شخصیت میں اس قدر اعلیٰ انسانی غریبان تھا جس پر آج کے دھونڈے بھی کہیں نظر نہیں آ سکتیں، نہ غافلانہ
میں نہ مدرسوں اور مکتبوں میں، نہ مسجدوں میں، نہ کسی بڑے سے بڑے ادعا کی مہذب میں، انسانے کا تو ذکر ہی کیا، نجات اور
تجتنی پر چاہیں جن ان میں نہ تھی۔ اپنے ہر ملنے، نہ کسی بڑے سے بڑے ادعا کی مہذب میں، انسانے کا تو ذکر ہی کیا، نجات اور
پیش آنے کو یادہ خود پر حقیقت میں ان سے چھوٹے ہیں۔ اپنی کسی بات، و کسی حقیقت سے ایک جاہل پرست نہیں کو اس بات کا
تضعیف سا بھی احساس نہ ہوتا دینے کو وہ اپنے آپ کو کچھ سمجھتے ہیں۔ نیکی اور درست گیری کا بڑبست ایک دفعہ شروع
کر دیا مئے و مہتاب قائم رکھا۔ ان کی خواہش میں دست گیری کی ایک نفس مدغم و محو نہیں چھوڑیں سوا سوا۔ ویسے کی
مستقل مدافع و ان کا اپنا حصہ کھانے پینے، وراہ پر ہی مصروف سمیت پانچ فی صد تھا اور دست گیری کا میں فی صد
دست گیری اس شان سے کرتے کہ اوچا کا پڑھنا پڑھنا اور نیچا کا پڑھنا اور نیچا۔ جیسے میر دیا اعلیٰ اپنے پروردگار کو اور
سعادت مند شاگرد اپنے استاد کو نذر پیش کرتا ہے۔ عیدین کے موقع پر و فخر کے چراسوں کی گروہ عید کے سلام کو آنا
تو اگرچہ ہاں، عام و ستر پر تھا کہ چراسوں، سلام و عید کی اور انعام دلو دیا، لیکن عموماً صاحب ان سب سے معاف کرتے، بزرگ
داشت سے ان کو بھانسنے، خود ہر ایک کو عطا یا پیش کرنے اور عید کا انعام دینا، اسی طرح پیش کرنے میں عین اعلیٰ حضرت کو
نذر پیش کی جاتی تھی عید اور عید گروہ میں سے لغت و رسم سے خارج رہی ہے، لیکن عموماً صاحب کی خدمت میں حاضر ہونا مذہم تھا۔
ان کی بلندیاں و کبر و میری پستیوں پانی پانی ہو جاتی تھیں۔ اور کچھ پرچنے تو ہی پسند تھا، یا احساس انہی کی بلند انسانیت کا وہی فیض تھا۔
شروع میں ایک دفعہ میں نے اس طریق پر جسارت سے کچھ لکھا، فرماتے گئے: جب عموماً اعلیٰ حضرت کی جناب میں اس عزت و عید کی نذر

تقدیر کی طرف کا تحفہ ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں شیخ خضر دہلوی ہندوستان لائے، دو بزرگ سال تھے، اس حسب فیض اور بچے
کام میں صاحب ہاں تھے، ہر کوشش باب لکھنے، ان کا سب سے بڑا کام تھا، خود اپنے قلم سے لکھنا، اعلیٰ حضرت کی خدمت میں
منتقل ہوئے۔ وہ خود تو وہاں ہی اس کا وہ نظریہ ان علاقوں کو پورہ کر کے واپس چلے گئے، جہاں سے آئے تھے،
لیکن ہاں، ان سے ایک کتاب تھی، ان کا نظریہ تھا، ایک باب وہاں اس کے متعلق تھے، اور طریقہ تہمت میں ہی اس
فرز تھا، کا پورہ نہ تھا، چرچا کا ہی نام، صاحب طوین منت ہوئے۔ عموماً ہی صاحب کے ذریعہ شہرت و مہادوں کے ملنے سے
متعلق تھے، شہرت و فخر کی کاغذ، وہ نظریہ میں طبیعت انہیں ہے، قبائلی فکر کی باکی و بلے باکی، خوش دلی خوش اندیشی، شہرت
نے اتحاد و لاچار میں خضر دہلوی کا تحفہ تہمت لکھا ہے۔

پیش کرتا ہے، تو یہ لوگ بارہ ذی قعدہ کی اس کے مزار اور جن عبادت کی نگاہ میں سب اس سے اعلیٰ اور جس کے مذہب میں اور وہ مسکافوئی ترین غلام ہے کہ ان کے لہجہ میں بھرپور انسانیت کا خلوص اور گہرا زخا۔ اس وقت بھی جب میں یہ لکھ رہا ہوں وہ دوسری اور گہری آواز میرے دل میں پھرتی جا رہی ہے۔

تو کہوں کہ ساتھ بارہ ذی قعدہ تھا۔ تو گرفت دوتھے وہیں ان کا سارا اگہراں کے دسترخوان میں رہا کی جگہ صحت و صحت، بلکہ ان کے مہمان بھی جو خود کھاتے وہی ان کو کھلاتے۔ لذت کا دم وہیں سے زیادہ ان کو دسترخوان کی وسعت و صحت بھی دکھائی دیتی تھی۔ ان کی دیکھ رہا لی علاج معالجہ کرنے اور ان کے بچوں کو پختہ بچوں کی تربیت دینے۔

عزیزوں کے ساتھ بہت گفت و شنید۔ وہیں جب علیہ عہد ان کو سناؤں کے لئے سوغاتیں لے جاتے، بچوں کو نقدی دیتے۔ حاندان کے خدمت و بچہ کو ان کے رحمان کے مطابق پڑھا دیا۔ ایک خطبہ کو ادب کا اور ان کے عہدہ اے کے ساتھ ساتھ کاموں کا سناؤں تھا، دونوں کو بلا امتیاز ایک ساتھ مل کر نہ میں پڑھا دیا۔

حیدر آباد کی جاہ نما معاشرت کا ان پر اتنا بھی اثر نہ تھا جتنی ملنے پڑاؤس ہو جی ہے۔ نمونے کی عالی شان ساوگی جو ہمیشہ ان کا شعار تھی، حالات کے تغیر سے اس میں سرگودشتہ نہ آیا۔ ان کے ایک بہت پرلے ہم وطن دوست تھے کہ ان سے وطن میں زندگی کی جو رکش و گنجی تھی وہی آج اس مرکز جاہ و نمائش میں دیکھ رہا ہوں نہ ان میں کوئی فرق ہے۔ نہ لباس اور بود و باش میں۔ اور اسی سلسلہ میں عادی صاحب کی تحصیل علم کے واقعات سنائے۔

انفراست کیے باوجود ای، جو کہ جی میں ان کی ٹوٹی ہوئی تھی، بھندے سے آزاد آدمی کی مادی کی رقم نہ تھی، ڈھیلی ڈھالی گھنٹوں سے بابت سے کچھ بارہ ذی قعدہ کی ڈیڑھ گھنٹے پانچے، گھنٹوں سے اوچے نہیں۔ اتنے نیچے کہ انہوں سے ملے دھتے یہ چیز خاص ان خاص قسم کے لوگوں کو بہت گراں گزرتی تھی عمارت اور علم سے کبھی گراں جہر نہ ہوتے جو ان سے مل کر پختہ تھے۔ کوئی مجلس جو اسی لباس میں جاتے، جلوہ بازی کا جدا لباس کیش، وہیں نہ تھا۔

لباس کی طرح تعلقات میں بھی بڑے دستدار تھے جس سے جو تعلق تھا حاضر و غائب کیاں تھا، وہیں چرگئی زندگی بھر کا ہنر و ہنر بن گئی۔ تو جن جاے کسی کی ہر کسی قسم کی جو، اس سے انہیں سخت اذیت ہوتی تھی۔ بدگوئی، دل آزاری، طنز و ستہ، اپنی ذات کے متعلق تو کرا دیا ان کے مذہب میں گناہ تھے۔ آپ اپنی گفتگو میں اس مذہب کی جتنی کہ مفید اور سبق آموز ہوتی جو اصول افزائی ان کی خصوصیت تھی جس میں ذرا بھی کمی نہ ہوتی، اس کے لئے سراپا شفقت بن جاتے۔ کم استعدادوں کے کام کو اپنے شمار سے نہیں، ان کے مقام سے دیکھتے، اور وہ صلہ بڑھاتے۔ رد و کہ بحث و تکرار سے پرہیز کرتے تھے۔ لیکن بطور نصیحت کوئی، ان کو ملتی بات چیلنے کے ذمہ دریش کا لطف لینے اور لطف، خود دیکھتے۔ شواہد اور نو مسائل، اور لطافت و لطافت، ان کے تسکون میں بہت تھے۔ انسان خواہ کسی درجے کا ہو، ان کی باتوں سے غلط ہوتا تھا جس مسئلہ پر گفتگو کرتے کہاں تو یہاں نظر آتے، عوامی فاری اور دینیوں نے ان باتوں کے جزاؤں شہر، چیدو ہرل ہر قسم کے ان کے خزانہ و خزانہ میں محفوظ تھے، مثلے اور گنتہ سب کرتے، مطلقہ کے توبہ تھے ان کی طبیعت کو لا زار بنا دیا تھا۔ ادنیٰ تا مہجی اور فنی لطیفوں کی بھل چھڑیاں چھوڑتے، خوش وقت کرتے اور خوش وقت ہوتے، منہ بند کر کے اس صدمہ ہنسنے کو سارا جسم مل جاتا۔ شاید مقامی عمارتوں کی طرح ہنسنے کا عمارت بھی مقامی چیز ہے۔ ہنسنے کی بالکل ہی وضع جو مولوی

ابو کبریت کی بھی تھی، دونوں جون پوری ہفتے، ممکن ہے ہفتے کا یہ سا چارون پر کی قدیم شائستگی نے طحالا ہر۔
 تروپ کے انداز میں نزدیک نہ کرنا اور غلطی کی اصلاح "غلط ہے" کہہ کے نہ کرنا ان کی مستقل عادت تھی۔ اور یہی مستقل
 عادت تھی کہ جو لوگ بیٹے کے شوقین ہوتے بڑی نکتہ آفرینی سے ان کی تسکین خاطر کرتے۔ ایک صاحب کو علامہ نے کاسودا ہوا،
 خوب مدارات کی، وہ "حضرت العلامہ" بن گئے اور اس مسند پر کہ عمادی صاحب نے علامہ کھردہ پایسے، علامہ بن کو اپنا قانونی
 حق سمجھ دیا اور عمادی صاحب نے طرح داری سے کھردہ پایا کہ جامع العلوم کتاب کو منسلکہ کتے ہیں اور جامع العلوم شخص کو علامہ پیر
 دست بلاشبہ علامہ ہیں اور ایسے علامہ کم ہوتے ہیں۔ نغز کو کے لئے شے لطیف ضروری ہے اور یہی لطیف کا گوشہ تھا نغز کے
 عالم لوگ جھٹاتے، عمادی صاحب نے کہا: میرا با آپ کا اس میں ہرج کیا ہوا، وہ غریب علامہ بننے کی کوشش ہیں کچھ بن ہی
 جاتے گا، مگر تھے قانون نہیں میرا تو یہ مسلک ہے۔

ہمیں تو شیخ و پیر کی سبھی کی سنسنی
 یہ کیوں و کہ اس نے توڑیں پکارتے تھے

کسی بات کو وہ غلط جانتے ہوں، مگر اس کی مدد انتہا ہی درپے نہ تھا۔ کیا خوب اس طرح کہتے کہ ہر اپنی جگہ مطمئن وہ اپنی
 جگہ خوش۔

اور یہی مدارات تھی کہ قانون کے مترجم سعد علی صاحب محوی نے عربی ادب پڑھنے کی خواہش کی اور استاد صاحب
 شاگرد کو اس کے کمرے میں جانے پر جانے لگے۔ محوی صاحب علی گڑھ کے پڑانے فارغ التحصیل اور علامہ شبلی کے شاگرد تھے، عربی
 میں نمایاں استعداد علامہ شبلی نے ان کو تھپتھپا دیا تھا، کسشن بیج رہ چکے تھے، جوش صاحب نے خیال کیا کہ شاید وہ سب بقہ
 کسشن بھی کے موڑے کی، جو سے خود پڑھنے نہیں آتے، اور عمادی صاحب کو جھنجھڑ ڈالا۔ خوب پرستے، خوب پرستے، جتنے پرستے
 اتنے ہی وہ نہال ہوئے، جھڑی تھی تو بڑے ٹھہرے پرستے پڑے میں پرستے۔ ان کے آئندے سے مجھے کچھ تذکر نہیں لگ جانے گا۔
 یہ بات تو قابلِ تدریس ہے کہ انھیں اس عمر میں بھی پڑھنے فاشوق ہے آپ پڑھئے عمادی آپ کی جناب میں بھی حاضر ہوگا، انہی
 محوی صاحب کے ہاں ضابطہ میں غفر علی صاحب نے بیان کیا تھا یہ سلسلہ یا سلسلہ کی بات ہے کہ کھیر سے ڈاکٹر اقبال
 نے ذکر کیا کہ میں ان عربی کا فلسفہ سمجھنا چاہتا ہوں، کوئی ایسا آدمی بناؤ جو مجھے ان عربی کی تفصیلات اور فتوحات کے مباحث
 اور فلسفہ سمجھا دے۔ میں نے اپنے علامہ کو تجویز کیا اور یہ حضرت خود جانے پڑھانے لگے۔ "محوی صاحب نے زبردستی، کہ رسم
 پابندی اوقات ملتی جاتی ہے۔

میں نے ایک مرتبہ تاریخ ابن خلدون کے فارسی ترجمے کا نقشہ دیکھا، بہت سا دگی سے اٹا تھا، جو بزرگ یہ کام خوش اسلوبی
 سے انجام دے سکتے تھے وہ روز سے ہو چکے تھے، محوی شبلی سید صاحب کے زیر ہدایت وقت کے ضروری مباحث پر لکھنے اور تحقیق و
 مطالعے میں مشغول تھے، اور فقہ گو یا مقام کر دیا۔

مولوی سید علی صاحب کو بہت ملال تھا کہ ان کے مضامین ابوالکلام کے نام سے شائع ہو گئے، ایک دن
 وارہمضنین کا کس کتاب کے مسئلے میں عمادی صاحب کے پاس دفتر نشر لایا، یہ فقہ لازم گفتگو سے تھا، فرمایا: یاد ہو گا مولانا

آپ کو، وہ میرا کان پور کی مسجد والی مضمون اور ابوالکلام صاحب کا برہمی کا خط! اسی مضمون سے شہرت لی اور اسی مضمون پر کھنے والے کو تنبیہ و تلعب سے نوازا۔۔۔۔۔ اور مولانا! آپ نے دیکھا، آپ کے وہ مضامین بھی اپنی مملو کات ارتقی میں شامل کر لئے جو آپ دہاں چھوڑ آئے تھے۔۔۔۔۔ اور ان مضامین کی خوب ستائش فرمائی جمادی صاحب نے کہا: چھوڑیے جناب مولانا (برہمادی صاحب کا خاص انداز تحا طلب تھا) ان باتوں کو، اب وہ مضامین نہ مولانا ابوالکلام ہی کے لئے کوئی حیثیت رکھتے ہیں نہ آپ کے لئے۔ یاد کے قابل تو وہ محبتیں ہیں جو مولانا ابوالکلام کے ساتھ گزر گئیں۔ پھر وہ لطف و محبت حاصل نہ ہوا، سید سلیمان صاحب کو یہ بات خوش نہ آئی۔ بڑی دل گرفتگی سے عوامی صاحب کی صورت دیکھنے لگے۔ میرے لئے یہ بہت دل چسپ مطالعہ تھا۔

ان کا، سہی، وجدان کلیۃً عقلی تھا، اور وجدان الفاظ کا زندانی نہیں ہوتا۔ وہ اپنے افکار و معتقدات میں بے حد اسخ تھے اور دوسرے کو اپنے معتقدات و رسوم کی پوری آزادی دیتے اور تصادم سے پرہیز کرتے تھے۔ ان کے لئے والوں میں غالی شیعہ بھی تھے، راسخ اسماعیلی بھی، اور ایسے بے فکرے بھی جو، انگریزوں کی زبان میں گفتگو کیا کرتے، اور یہ سب ان کی محبت سے کیسا ہی فرحت و انس باطاعت حاصل کرتے۔ ایک غالی شیعہ دوست نے پوچھا: مولانا! اسلام کے موسیقی کی سرپرستی کیوں نہیں کی؟ بولے: آپ جن کو موسیقی سمجھتے ہیں اس کی سرپرستی اسلام نے اس وجہ سے نہیں کی کہ وہ طبعی اور ساز گار تھے پیدا کرنے نہیں جانتا۔ غیر شکن جید کر آپ پیدا کرنا چاہتا ہے، انکفران کے نزدیک لغت اور اصطلاح دونوں لحاظ سے، عقل سے بغاوت ہے اور استدلال ایمان کی تسلیم بنیاد فراہم کرتا ہے۔ مولوی مضمونی نے استدلال کو پالنے جو ہیں کہا ہے، وہ بوائے، انہیں کہتے ہیں۔ مولوی کے شعر کو انھوں نے یوں بدلا ہے:

بائے استدلال باں روئیں بود پاسے روئیں بائیں کیوں بود
بسکہ استدلال کا روئیں ماست غمرازی باز داروین ماست

اور یہ استدلالی طرز، دینی اور داری علمی امور میں، ان کا اصول کار تھا۔

وہ اپنی تسکین خاطر کے لئے جب کسی مسئلے کی تحقیق کے درپے ہو جاتے، تو دن رات اسی دھن میں لگے پھرتے اور تحقیق کے پھل سے خواہ ان کی خواہش کے مطابق ہو یا خلاف، نشا و نشاد ہوتے۔ ان کا مدعا صرف تحقیق ہوتا تھا، وہ اپنی خواہش اور نقطہ نظر کو محور نہیں بناتے تھے۔

تاریخی مطالعے میں ان کا طریقہ عام روش سے جدا تھا۔ وہ واقعاتی تاریخوں سے صرف زمین کا کام لیتے تھے اور عمارت گری کے لئے تذکرہ و تراجم و رقعات و محاضرات (گفتگوئی کتابوں) اور دوسرے مآخذ سے واقعات کو روٹا کر لے لے کر لگاتے۔ اس کے لئے وہ قصوں اور کہانیوں اور قصیدوں کا بھی مطالعہ کئے تھے۔ ہندوستان کی تاریخ کے سسہیل انھوں نے شاہی فرمانوں، جاگیر و شقیں اور پرائے وقت ناموں کا بڑا ذخیرہ جمع کیا تھا۔ اہمات اور دوسری علمی سرکاری مدوں و دوحاتی ہزار سالہ لائبریری جو آمدنی ہوتی وہ قلمی کتابوں اور ایسے ہی ذخیروں کے لئے وقف کر دی تھی۔

بدنام و اندی سے ان کو بہت ہمدردی تھی، کھتے تھے کہ وہ بہت بڑا مصطفیٰ ہے۔ اس نے تاریخ اور زمانے کو ہمو کر

ایک نیا اسلوب پیدا کیا تھا۔ اس کے فن سے سادہ سادگی کی اکثریت ہر زمانہ میں بڑے ذوق و شوق سے مستفید ہوئی۔ وہ نورث کی بجائے ایک باعقد نقاش ہے اور اس کی نقاشی اس ماحول کا وافر آب و رنگ مہیا کرتی ہے۔ یہ ان کے تاریخی حلقے کا اندازِ نظر ہے۔

ابن خلدون نے دو نظریوں: عربوں کی بدویت کے نظریے اور علم و ادب میں عربوں کی ترقی و ترقی کے نظریے سے سخت اختلاف تھا۔ کہتے تھے کہ مشرقین نے زیادہ تر ان دو نظریوں کی وجہ سے ابن خلدون کی سائنس کی ہے۔ ان کی محققانہ رائے یہ ہے کہ ابن خلدون کے یہ دونوں نظریے بے عمل ہیں تاہم عرب قدیم اور صاف انویسٹمنٹ ہیں ابن خلدون کے نظریے بدویت کی تردید میں غریب ہیں۔ لیکن ان کو اپنی معنادار روش کے مطابق تردید کے عنوان سے پہنچ نہیں گیا۔

مقالہ ہو یا ترجمہ، برواضی ترجمہ اور کسی پر اگر کثرت یا محض میں شاذ و نادر کوئی لفظ غلط زد ہونا بدایت خود لکھنا چھوڑ دیا تھا۔ ترجمہ لکھنے سے ترجمہ لکھنے کا ڈھنگ اکثر و بیشتر یہ ہوتا: جملے جملے، کتاب ایک نظر دیکھتے اور فقرے روانی سے دلی دہتے۔ خوبی یہ ہوتی کہ ترجمہ فعلی ہوتا۔ مبع عباراتوں کے فعلی ترجمے کی یہ شان تھی،

والعقور الباهر والکواکب المذاہر
والغمام الماطر وما بالبق من طائر وما
احتدی بعلم مسافر من مفید وغائر
لقد سبقها شمس اہیۃ الی المنازل
منہ و آخر ابوہم ہمة بذلک خابو
نقصی لہا شمس بغلجہ
آنے کا فیصلہ کیا۔

قسم سے مادہ تابان کی، نجم درخشان کی، اور زبان کی، مرغان
فضائے آسمان کی قسم ہے اس پہاڑی نہیں کہ جس کے سر پر
کوراہے فراز پسند ہوں یا نشیب کیر سب کی پناہ ملے کہ
خوبیوں میں یا شرم آئینے سے بڑھ کے ہے آگے پیچھے ہر حال
میں بڑھ چڑھ کر ہے۔ ابو صہبہ اس کا خبر رساں ہے اور
یہی اس کا بیان ہے۔ اس بیان کے ساتھ ہاتھ کے غالب

لوگوں کی خدمت طرح طرح سے کرتے، ایک صاحب کے پاس قدیم قلمی کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا جانتے تھے کہ تصنیف کتاب خانے میں پہچان دامن نکل جائے۔ ان سے کہا: فہرست بنا دیجیے ہر کتاب پر مختصر سا تعارف لکھیے کہ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو۔ تعارف لکھنے کا کام ان کے بس کا نہ تھا، یہ کام اپنے ذمے لے لیا، اور با احسان سے یہ کہہ کے ان کو سبکدوش کر دیا کہ مجھے بڑھنے کو ابھی کتابیں ہیں لی جاؤ گی۔ وہ ہر پتے دس پانچ کتابیں لانے اور تعارفی نوشتوں کے ساتھ اپنی کتابیں لے جاتے۔ جینزوں پر سلسلہ جاری رہا۔ تہی کلکٹر کو کس کس کے لئے اٹھاتا ہے۔ چند نمونوں سے تعارف کی فہم فصیحوں کا اور ادبی شان کا اندازہ ہو گا:

کبھی بے اسلام: اللہ تعالیٰ نے کائنات کی کوہن کیوں کی۔ نبات و معدن و جہاد میں قدر مشترک کیا ہے نقص خلقت کی کتنی گنتاںش ہے۔ سالمات کتنے ہیں اور ناقصات کتنی قدر ہیں جو ہر دم و فہم کی کیا نسبت ہے، جہی اجسام کو بقا ہر نصبت اور بطور محسوس کیا جاتا ہے کیا حقیقت میں ان کے اندر عمل نہیں ہے کہ اعمال انصیبہ و تزیل و تخیل و ترکیب سے وہی جس سائل و ترغیر عالی میں پہنچ سکے اور صنعت گری کے طفیل سب کو لے کر میرے میں تبدیل کر لیا جائے!

ایک ایسے زمین میں مشاہیر شعرا کا طبع کی زمانائی کاہریت خیر نگار خانہ معنی اہل نظر کے ذہنی شگفتگی کا انوار و انبار سامان رکھتا ہے جس سے ادب فارسی میں عہد بعد حسن بخار و لطیف ذوق و عروق فکر کی ایک ایسی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے کہ فارسی کی حد تک ایران و ہندوستان آج تک اس سے نا آشنا ہے۔

اسی سلسلے میں مضمونوں کے نقیاس، ادب میں تاریخ اور تاریخ میں ادب کی شان دکھاتے ہیں۔
را۔ ساتویں صدی ہجری کے آخری آیام میں، بغداد، قائم دین سیلاب تاتاری نذر ہو چکا ہے۔ ہولناکیاں گھٹائیں اباقا، سر برائے مسطوت ہے، تبریز جو زبیدہ خانوں کی یادگار تھا، آج اس میں تاتاری لشکر کی بھاؤنی ہے۔ دوم و عراق و ایران و توران و ماوراء النہر، چھینے اسلامی ممالک تھے سب کھرکے ٹرے میں آچکے ہیں، مصر و شام کی ایک بچی بچائی اسلامی سلطنت رہ گئی ہے جہاں حاکم خلافت نے پناہ لی ہے، مگر اب اس پر بھی چڑھائی کے سامان ہوئے ہیں اسی ضرورت سے خود اباقا، تبریز، میں لشکر زور ہے۔ اور صاحب دیوان روز پر عظم خواجہ شمس الدین محمد زنا کبہ پوری ہے کہ مغولستان سے لے کر ایران تک کی تمام فوجیں یک جا کرنی جاہلی پوری قوت کے ساتھ جانی، فقط طے کے منادوں پر حملہ ہو سکے۔“

(۲) ہجرت نبوی پانچواں صدی ہجری میں علی علیہ السلام دشت کو بلایں شہید ہو چکے ہیں، جو تیس انتقام نے عراق کو ایک غلہ خوار بنا رکھا ہے۔ زید و آل زید پر عام بیزاری مزید ہے، تو آپس کا قحط خانہ ہو چکا ہے کہ تو یہ تانا اب بھی برپا ہے۔ اسی حالت میں قبیلہ ثقیف کا ایک جوان مرد، لکھتا ہے اور سب کو بھاؤنا ہے۔ اس کی کیت ابوسحاق ہے، پیسے خاریجی وہ چکا ہے، اس میں کامیابی موعودم نظر آتی تو اب زمرہ طرف داران اہل بیت میں اپنے تئیں منسک کرنا چاہتا ہے، باہر پرست ہے اس سے کھٹکتے رہتے ہیں کہ سیدنا حسن مجتبیٰ کے عہد میں اس کی کاٹ پھانس دیکھ چکے ہیں، اب نہ جلنے یہ کاٹا کیا کی کھلائے، یہ غنہ کیا قیامت ڈھائے۔“

اُردو میں شعرا کہتے تھے، عہد شباب کی ایک منزل ہے۔۔

چشمِ بزمِ کعبہ کے گزیش میں نظام اے ساقی	گردشِ ساغر و عینا کو سلام لے ساقی
سلطنتِ کعبہ کی جاتی رہی عالمِ بیدی	اب کمالی و لولہ مشربِ مدام لے ساقی
شیشہ بے منظرِ جلوہ خورشیدِ ازل	مجھ کو دکھا نہیں ماہِ تمام لے ساقی
کعبہ دل میں تہوں کو ہے خدائی کا غم دور	لب نکالتے پھر اللہ کا نام لے ساقی
پُر توڑ صبح بنا کو شمس سے ہوگی کا فور	گیسو بند بگ خوار کی شام لے ساقی
بیخِ ابر سے نئے آشام کہیں ڈرتے ہیں	وہمِ شمشیر ہے دندوں کا مقام لے ساقی
مے گل رنگِ شادیت کا چیلے بزم میں دور	
آجلی ساعتِ افطارِ عصیام لے ساقی	

فارسی میں یوں دواؤ سخن دیتے ہیں :-

جبین زہد زنا فدا کی نشند روشن ہزار سجدہ کند نور پر جبین زسد

حرمان تو زہمت کو تاہ بن تست ہرگز دو کریم بکا خزنہ بستہ اند

اہل سیش ہمدانہ نشی دوزخ بر اماں ہر کہ در غلہ در آید نہ بر بندش نجیم

عجب آئی نیست کہ اعجاز میجا داری عجب این نیست کہ بیجا تو بیجا ز رست

فریب دیکھ نمودے کثرت اس مخور حجاب دار نموداری کمر بخشند

عجب مدار اگر مرعہ حسن نہ پرورد ندا وہ تہمت پروا ز بالی در بخشند

جہاں نش کہ جہانے و گر پدید آید کلیم فقر تریا بند و تاج زر بخشند

عالم اور علامہ ہونا کوئی بڑی بات نہیں، بڑی بات انسان بڑا ہے جو عوامی صاحبِ بخشنے بڑے عالم اور علامہ
تھے اس سے زیادہ اعلیٰ قسم کے انسان بخشنے۔ بلند نگاہ اور کریم انفس، قلندِ رصفت اور قلندِ سیرت، ان کی نہ لگتی شرافت
نفس کے امتزاج کی نمود تھی۔

ظفر علی خان

شورش کا شہیری

مہر پرورد کے لئے ظفر علی خان اباب بھوئی بسری کمانی ہیں۔ آج سے صدیوں نہیں ہیں پہلے ابراہیم طوسی بولتا تھا۔
وہ ہندوستان کے پنجابی رہنماؤں میں سرفہرست، مجموعۂ انضاد اور جامع صفات تھے۔ اب تو بزرگوار کٹنا سچیں لیکن
جب جوان تھے۔ آگ لگنے، ایک زندگی میں کئی زندگیاں اکٹھی ہو گئی تھیں۔ ادیب، خطیب، بھائی، شاعر، ریاست۔
آج لکھا ہوا، ایک گم شدہ وزن ہیں اوہیل و نہار کی بہت سی گردشوں نے ان کے آفتاب کو کھنکھایا ہے، لیکن ایک زمانے میں
ان کا آفتاب نصفۂ ایشیاء پر تھا۔ حتیٰ کہ ان کا وجود ملی حدودِ ہند کی ایک تاریخ بن گیا۔ ہر چند اس زمانے میں ایک عجیب سا تضاد
مائل ہے اور ظفر علی خان اس تضاد کا ایک شدید ظہر ہیں۔ لیکن اس تضاد میں بھی اتنی دلکشی ہے کہ زمانے کے اس حال و
نور سے ملا کر ان کی شخصیت کو دیکھیں تو اس میں نہ صرف ادب کی فراوانی اور سیاست کی دیوانہائی نظر آتی ہے، بلکہ وہ ایک
عجیب و غریب پیکر دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا ادب ان کی زندگی سے متاثر ہے اور ان کی زندگی ان کی سیاست کا عکس
اور ان دونوں کے امتزاج سے بر صورت بنتی ہے۔ اس سے ایک ایسا وجود ابھرنا ہے جس میں صوری ٹھوڑی بہرگشتی زیادہ
ہے۔ ظفر علی خان تیرا پا بسنا مہ تھے اور ظاہر ہے کہ ہر کامے میں حکایتیں شاد اور شغلِ بانی وافر ہوتی ہیں۔ ظفر علی خان
کی شخصیت سے ہم محسوس اور ان کے جانشینوں نے جو اغاغل برتا، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ظفر علی خان نے گرد و پیش کی
محامدیں دھلے ہیں زبان اور قلم کو ہمیشہ کرزا لہرِ شکن بنائے رکھا۔ نتیجہ معلوم کہ۔۔۔ آج وہ ماضی کی نامرہا تھی کے باہر
دو دو چراغِ محفل نظر آتے ہیں، لیکن اس کے باوجود کوئی ادبی یا سیاسی نقشہ ایسا نہیں جس میں ان کا خطر نہ ہو۔ اور پھر
محض خط ہی نہیں رنگ بھی ہیں۔ کہیں مدح، کہیں شوق، اخیں ان خطوط اور نمونوں سے ملیدہ کر کے لکھنا زیادتی ہے وہ
جو کچھ بھی ہیں اپنے ماحول کی عدا ہیں۔ اور اسی سے ان کی میرت عبارت ہے۔ وہ ایک ایسی تصویر ہیں جس میں
بولکونی ہی بولکونی ہے۔

اب سے چالیس چالیس برس پہلے پنجاب سپاہیوں کی محفل منڈی تھا۔ صدیوں تلاش کروں کی گزر گاہ رہا۔ بڑا نیلے
پنجاب کو خطۂ انقیاد میں لیا تو یہ ذہنیت، درختہ ہو گئی۔ حتیٰ کہ نامرہ صورتِ برطانوی نفاذ کی جلا نکام ہو گیا۔ اس
سارے عرصہ میں صوبے کی اصل پیداوار سیاسی ہی رہے یا پھر ظفر علی خان کی مخصوص سیاسی اصطلاح میں کاسہ لبیان سرمدی۔

جن کا طفرے اختیار نہ کیا۔ وہ فدا دای بشر پستواری تھا۔ ادھر ہندوستان کے دوسرے حصوں میں سب سے شہر کی کہیں جھوٹ چکی تھیں، لیکن پنجاب ہر مصلح پسند و تارک تھا۔ بعض سٹوں میں چند گونہ بھارت آزادی کی جاتی تھیں لیکن ان کا دائرہ نہایت مختصر نہ تھا۔ ایک محکمہ قومی اور اس میں چند چراغ ————— بالفاظ دیگر ایک لطیفاتی طاق پیدا ہو رہا تھا جس سے عامۃ الناس ہمد و جود محسوس تھے۔ طفر علی خان نے ایسا کیا۔ سی پور میں نعرہ دست نیز بلند کیا۔ ادھر لاہور میں کسی ادبی مجلس میں جہانگیر تھیں۔ ان کے بانی محمد حسین آزاد تھے۔ عبد القادر نے مخزن خلا تو ایک نرم آراستہ ہو گئی۔ ادھر صحافت میں دو چار اخبار پیش رو تھے لیکن طفر علی خان بوشی، مائی، و آفر، حسن الملک، وراں ہمارے دوسرے اکابر کی مجلسوں سے فیض یاب ہو چکے اور حیدر آباد کی خوشگوار ادبی فضا میں رہ چکے تھے۔ ایک بار ٹیکے کر آئے ————— وہ کسی ملازمت کے خارج نہیں تھے لیکن انھوں نے نرم کر نرم میں دھمالا یہ زمیندار جو ان کے والد کی امانت تھا، اس کی سیئت بدل ڈالی۔ وزیر آباد سے لاہور منتقل ہو گئے اور وہیں سے زندہ دار کاٹنا شروع کیا۔ ان کا ادبی مذن بہت فہم چکا تھا۔ علی گڑھ کی تعلیم، حیدر آباد کی صحبتیں، برصغیر، شہلی اور صالی کا تلفظ ————— ان سے ایک مفرد طفر علی خان نکلا۔ ————— آرو و جو مشکل خیاب کے چند گھراؤں میں رہا پیدا کر سکی تھی، اب عوام کے مزاج میں خیل برتنے لگی۔ پڑھے لکھوں کا مناسب چنداں مختیر ہی تھا۔ لیکن تاریخین کی قلت نے سامعین کی کثرت پیدا کر دی اور دھڑکتی آنکھوں اس سیر سے اس سرے تک طفر علی کا نام ہو گیا جس کا مطلب تھا کہ طفر علی نے ان کے بے شکایت فکر و زبان ہونے لگے۔ ————— انفاقاً بڑی چیز ہیں۔ ادھر طفر علی خان نے وزیر آباد کی ادارت سنبھالی اور حیدر آباد میں جنگ چھڑ گئی۔ یہ پہلا سیاسی مؤرخ تھا جو مسلمانوں کو شہر کے بعد مرنے والا اور ان میں اپنے باؤں پر اٹھنے کی ذمہ داری بہت پیدا ہوئی۔ ————— طفر علی خان ادبی اعتبار سے سونا پتے ہی تھے، اس سیاسی اتفاق نے سہاگہ کا کام کیا اور چند ہی دنوں میں ایک نیا دھول پڑا ہو گیا۔

یہ زمانہ تھا جب مسلمانوں کی کثرت کا تاثر آواز ہو چکا یا بعض مدائینوں کے مطالب ہو رہا تھا۔ اپنے نہ سہی کہ ان کی مصعبین بسا اوقات ظہار آ رہی ہیں، لیکن پرائوں کا خیال ہے کہ اس دور کے اسلامی جذبات کی نظر چار شخصیتیں ہیں۔ ابوالکلام، انسانی، محمد علی اور طفر علی خان۔ ان چاروں میں بہت سی خصوصیتیں مشترک اور بیشتر میں تضاد تھا۔ لیکن ان کے اشتراک اور تضاد دونوں میں حیات کی تکی روح کا فرما تھی۔ ابوالکلام علم و عمل کا مروج تھے لیکن وہ جس مقام سے چکا نہ تھے، دہلی، انھیں ہی احساس رہا کہ وہ اپنی ہی قوم میں ایک اجنبی آواز اور اپنے ہی ملک میں ایک غریب آمد رہیں۔ ————— انبال کی نگاہ میں ان کا عمل تھا۔ محمد علی ایک نصب العین تھے جو کا امتیاز تھا۔ ————— کہے کہ کشتہ زار شہزادہ قلیہ نامیست۔ ————— اور طفر علی خان ————— میں اندر مریض و دہم دار و ریس را کی حدائے باؤ گشت۔

اس وقت مولانا مریض ہو چکے تھے۔ ادھر سے کچھ آدھے آدھے پیدائش شدہ باطل سلوک کے ایک کاؤں کو گت مہر قیاس پیدا ہوئے۔ وزیر آباد میں ان کا مریض ہو گیا اور علی گڑھ سے کشتہ میں اپنی سہیلی سہیلی کے ساتھ لے کر لائے۔ ان کے اس سفر کے دوران میں کئی کئی گھنٹے گئے اور اس غم میں ملازمت کر لی۔ وہاں اپنے ایک افسر سے کچھ بڑے بڑے ان کی پوچھی اور ملازمت سے دست کش ہو کر مریض ہو گئے۔ ————— علی گڑھ کو گئے۔ ————— وزیر آباد میں ان کے لیے ایک نواح بن گیا۔ لیکن کوئی جو بھلا نامیست کے انتہا دہشتہ کی وجہ سے پڑی ہوئی سیکڑی کی ضرورت تھی۔ آپ نے اخبار میں اُسٹھا دیکھا، وزیر است گذرنا۔ ————— اور جو ہر صفا:

کی فکر لازم ہو گئے۔ وہاں تھوڑا عرصہ قیام کیا۔ پھر حسن الملک سے سفارتی خط لے کر حیدر آباد چلے گئے۔ نواب افسر جنگ سے ملے انھوں نے فوج میں ملازم رکھ لیا۔ وہاں کسی نہ کسی طرح فوج سے دارالترکین میں چلے گئے۔ چند ہی دنوں میں اس سسٹم جسٹسز ہو گئے۔ میر عثمان کیلچا کے انا میں بنے سوز مرزا، بہم سکھوڑی، لکھ، ان کی ازبک سے اسٹنٹ جوہر کرڑی کے ہندو سے نکلیے۔ ان کا تباہی و تباہی نواب سر بلند جنگ ان کی حکمران ہو کر رہی ہو گئے۔ وہ ہندو سے فوجی اور اور پڑھتے تھے۔ ہر لاکھ کی دولت میں کوٹھنوں کا پتہ آتا۔ پھر دفعہ سوا نہیں ملے کہ فوج سے کئے فکدان لادے۔ قلم اٹھایا اور جو کچھ ماری۔ سرحد جنگ کو بھی خبر ہوئی۔ مولانا بھی لے کر میر فتح علی بدایونی کے ہاں رہ رہ چلے گئے۔ اور وہ بھی ملازمت سے بیزار رہے۔ وہ لوں نے بھی میں، پورٹ اسپیرٹ کا دفتر کھولنے کی صفائی اور مستغفرا سے کرخصت ہو گئے۔ وہاں مکان کر رہے کروڑی لکھ کر شل بکس نے نام سے ایک تجارتی ادارہ قائم کیا۔ جاپان سے بیٹم اور اذلیت سے باغی دان کا سامان، واد کیا، مگر میں منتر سے نہ چڑھی۔ وہ دونوں ادب تھے اور یہ کار بار خاصہ بزرگ و دل شکستہ جوہر بدایونی ملے گئے لیکن ایسے کوئی۔ یونہی نکالنے کا فیصلہ کیا۔ اسی سوچ ہی رہے تھے کہ وہ بزرگ و بارہ ہوم سکھوڑی ہو گئے۔ انھوں نے تار سے جو چیزیں، میں سے حیدر آباد پہنچے، وہیں بیٹو مکمل کے جسٹسز دفتر ہوئے۔ یہاں آپ نے لارڈ کرڑی کی تالیف خیا بان فارسی کا اردو میں ترجمہ کیا، اور شہرت پائی۔ چاہا، یونہی لکھ باجی سو شیلے، انعام میں دے ہوا ایک بانی نواب کو کسی اور توجہ پہلے انعام تھا خود انعام نے ازاد ہندوستانی میں ہر دور سے محنت فرماتے۔ آج میر محبوب علی خاں کے استاد اور مرجع رہے۔ انھوں نے خط و لکھی جس میں محبت زبان کی بے حد تعریف کی۔ ————— احسن مارہ دی باوی میں سر داغ کے قلم سے نہ کا ہو سکے بڑا کلمہ لکھا۔ وہ بھی آخر لفظ ہے۔ ————— اس سے پہلے مولانا سیر تعلیمات و فسانہ لندن اور سمنہر کھو کا وزیر ہو کر چلے تھے۔ مولانا جو نظام آباد کا لکھتے کہ حضرت علی خاں فسانہ لندن کے بھائے علی علی کتاب از میر کرختے تو ان کی خدمات علمی میں شمار ہوتا ہے کہ مذہب و سائنس کے متعلق ان کی رائے ہے کہ ایک مفید دینی خدمت ہے۔ غرضیکہ ان کا ہم سے مولانا کی ادبی حیثیت کا نہ ہوا کیا۔ اسی دانی موسیٰ رہی میں طبعی رنگی جس نے تمام ریاست کو باؤ والا اور شاعر لوگوں کی اعداد کے لئے ترقی، چل چلی۔ مولانا نے اس پر جو طویل نظم لکھی وہ اس سے ادبی و شعری عقلموں میں ان کا نام اور شہرت ہو گیا۔ اس نظم کو برصغیر کے اعتبار سے اوجیت کا درجہ ملے۔ اس اثنائیں دن۔ یو یو جہاڑی کیا۔ جنگ روس و جاپان کے نام سے ایک مضمون ڈرامہ لکھا۔ اس کی ادبی حیثیت علمی کی نہیں، لیکن ادبی اعتبار سے فائز اور اعلیٰ مانو رہے۔ —————

ایک روز نواب افسر جنگ فریج کے جوائن کی نیزہ بازی دیکھ رہے تھے۔ آپ قریب ہی کھڑے تھے۔ ————— ہی چلو تو نواب افسر جنگ سے عرض کی کہ

تو دستگیر شوالے خضر ہے غبتہ کرم

پیادہ می روم و مسردان سوار آند

افسر جنگ مسکرائے۔ نیزہ موجو تھا، گھوڑا اطلب کیا۔ فرمایا:

میں میدان و میں گئے امت

مولانا تامل کے بغیر گھوڑے کی پیٹ پر بیٹھ گئے اور آں واحد میں بیٹھ کھاڑ لائے۔ ————— ایک دن داغ کے ہاں شریک مجلس تھے

[illegible]

اُڑنے نہ پائے تھے کہ گزشتہ دو مہینے
 نوہیندار کا کھوکھٹا دیا گیا اور ملازم آبا میں نظر بند نہ کئے۔ وہاں سے متنازعہ شخص غلامین تاجہ کے ہاں کو اس کی شہرگ
 بھوکئی گئی جن لوگوں کے سپرد حساب اکام تھا وہ وہاں اسے سنا سنا کر اور شہریوں کے لالچوں کو بھی شہر کی نظر سے دیکھتے تھے۔
 ایک زمانہ میں نوہیندار کو محض اس لئے ایک بڑی رقم کی مضبوطی سے دوچار ہونا پڑا کہ اس میں کسی مفاد کا نام نہ ہو۔ یہ شہر تھا۔
 کس پھینکے ہیں اور ان کی طرف بلکہ فریضی
 لے خاتمہ برآمد نہیں سمجھو تو اچھا دیکھو

[illegible]

”ملک میں کسی غریب کو بیعتوں کے بجائے ہفتوں میں جلا کر چاہو، تو غفر علی تھان اور شریک علی کو کچھ ٹھوڑو۔ وہ سرعت تمام فی قلعہ بنا ڈالیں گے، لیکن جب قلعہ بن جائے تو ان کو فوراً باہر کر دو کیونکہ وہ پھر اس قلعے کو ڈھا دیں گے۔“

الغرض ظفر علی خان انہی حادثوں کی مخلوق اور یہ حادثے ان کے سر پا پا کو محیط ہیں۔ بظاہر یہ ان کی زندگی کا سیاسی پہلو

ہے لیکن حقیقتاً ادبی ہے کیونکہ ان کا ادب ان کی سیاست کی تخلیق نہیں۔ ان کی سیاست ان کے ادب کی پیداوار ہے۔ ان کی سیاسی زندگی میں جو چمک ہے، وہ ان کے ادب کی وجہ سے ہے۔ ظفر علی خان میں سے ادب کو حذف کر دیں تو ایک فرد رجحاناً اور شخصیتاً اوجھل ہو جاتا ہے۔ بعض نقاد لوگوں کی رائے ہے کہ ظفر علی خان کا ادب ان کی سیاست کے ہاتھوں پٹ گیا۔ وہ سیاست کے پتھے پتھر سے نوازی اعتبار سے اقبالی اور ابوالکلام کی صفیں ہوتے اور رنگامی ادب کی جگہ تخلیقی ادب پیدا کرنے اس کے برعکس دوسرا خیال یہ ہے کہ یوں ہوتا اور وہوں ہونا کی بحث سرے سے غلط ہے۔ ظفر علی خان پیکر ہی اس امتزاج سے بنا ہے۔ اگر ادب کا کوئی مقصد ہے تو ظفر علی خان کے ادب نے جو جو حسن اس مقصد کو پورا کیا ہے۔ بلکہ ان لوگوں سے زیادہ مقصد کی خدمت کی ہے جن کے ہاں ادب محض ایک سماجی نظام کی اکھاڑ جھینک کے لئے آلہ تخریب ہے۔ یقیناً رنلڈ کے الفاظ میں ادب تنقید، حیات، تفسیر حیات اور تعمیر حیات ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ خود حیات کیا ہے؟ اس کا موقف کیا ہے؟ اور اس موقف تک پہنچنے کے لئے وہ کون سے اصول ہیں جن پر زندگی کا نظم قائم ہے۔ ظاہر ہے کہ زندگی ایک فرضی ہے اور اس فرض کے کچھ مقاصد ہیں۔ ان مقاصد کے بارے میں جان تک احوال و ظروف کا تعلق ہے، ہمیشہ اختلاف رہا ہے۔ ہر دائرہ انسانی میں حرکت و عمل کے خطوط ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ظفر علی خان نے جن ماحول میں قدم رکھا، وہ مسلمانوں کے لئے عمدہ و جہاں تھا۔ تمام عالم اسلامی کے مسلمان مسخوریہ پر پکے ہاتھوں بت رہے تھے۔ ابھی ایسے لوگ زندہ تھے جنہوں نے ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے محو ہو جانے کا سانحہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا یا جن کے لئے یہ غم تازہ تھا۔ ادب عرب میں قومی تحریک نے بال و پر پیدا کرنے اور حریت کا احساس کرو میں بیٹے لگاتار۔ ظفر علی خان نے ایک مرد کاردار کی راہ اختیار کی۔ اب تک مرزا دکن بیدار و مستعارہ و تشبیہ میں بائیں کی جاتی تھیں۔ چنانچہ غالب اس مقام پر ایک آہ سرد نظر آتے ہیں۔ ان کے خوشہ چینوں میں حاتی نے نالہ دروہن کیا۔ شبلی صف نامہ میں شریک تو رہے لیکن آخر تاریکی کی راہ پر نکل گئے۔ اگر نے عقیدہ و ظہیر کو اختیار کیا۔ ان کے ہاں آنسوؤں اور فقہوں کا امتزاج ہے۔ اقبالی، ایشیائی کارل مارکس کی جنسیت سے آگے بڑھے اور وہ قومی سے زیادہ بین الاقوامی نظر آتے ہیں لیکن ان کے مخاطب مسلمان ہی تھے۔

ظفر علی خان نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ادب کو عوام کے لئے ڈھالا اور اس کی عزت بھی قائم رکھی۔ انہوں نے اپنے آپ کو مسلمانوں کے جذبات کا سفیر بنالیا۔ جو بائیں اب تک دشمن درمی سے کسی جاتی تھیں دھمک کر کھٹے آگئیں۔ ظاہر یہ کہ رکھا تو سب ہاتھ اٹھایا۔ مرحلہ برہنہ تھا کہ جن غیر ملکیوں کے قصد میں ہندوستان سے ان کے خوف اور جبر کو ذہنوں سے خارج کیا جائے۔ اور یہی قومی تحریک کا ابتدائی شہوہ ہوتا ہے۔ ظفر علی خان نے فیملی حکومت پر تباہی ڈالتے کئے۔ جن جوں قومی تحریک پھیلتی گئی، توں توں ان کا غم نیز ہوتا گیا۔ انہوں نے برطانوی نظم و نسق اور اس کے کل پر ہونے کی ہدف تنقید نہیں بنایا بلکہ ان کے ہندوستانی معاشرہ کو بھی آڑے ہاتھوں لیا۔ ان کے اس جملے کی بیسیب بھی آگئے۔ افراد و مجالس، عقیدہ، نظریات، تحریکیں اور اپنے پرانے۔ ان کی مدارات کے لئے ایسی اصطلاحیں اور ترکیبیں وضع کیں کہ سبھی داد دے آئے۔ ان میں نمایاں بھی نہیں اور کچھ کے بھی، لیکن اس کے سوا چارہ بھی نہ تھا۔ عوام ہمیشہ جذبات پر لکھے ہوتے ہیں۔ شاعری بھلے خود جذبات کہ پیداوار ہے اور محافاتی کی بنیاد بھی چھوڑ ہے۔ اور قومی تحریک میں جذبات کا بلیغ نفرت اور محبت سے ہوتا ہے۔ لوگ

جذبات ہی کے بل پر نفرت کرنے اور جذبات ہی کے ذریعہ محبت کرنے ہیں۔ ان تمام محرکات نے ظفر علی خان کے نظم کا سلوب متین کیا اور نظم و شعر کے میدان میں یکبر نامہ ہو گئے۔ پھر ان سال سے صحافتی شاعری پیدا ہوئی جس میں قصیدہ تھا یا ہجو — اور ظفر علی خان کا سارا کردار اس میں جھلکتا ہے۔ ان کے ممد و معین کی فہرست مختصر لیکن معزوبین کی فہرست طویل ہے۔ جن ہستیوں اور عقیدوں کا انھوں نے خراج ادا کیا ان میں محمد باری لعلیلا اور نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو مستغلا ہیں۔ اس باب میں انھوں نے سنگلاخ سے سنگلاخ زمینیں منتخب کیں اور سنگت سے سنگت شعر نکالے۔ ان کے عقیدہ کلام کی بنیاد ہی خصوصیت یہ ہے وہ دوسرے شعرا کی طرح غلو سے کلام نہیں لیتے بلکہ حضور کی سیرت کا نقشہ و دان کے حاسن کی تصویر اس کمال سے کھینچتے ہیں کہ سنگلوں کے سامنے سیرت النبی جلتی چھڑتی نظر آتی ہے۔ چنانچہ خواجہ حسن نظامی نے ایک دفعہ آپ کے قلمی چہرے میں لکھا تھا کہ قیامت کے روز اپنی فتوح کے باعث تجھے جاہش گے۔ خود ظفر علی خان اپنے اس کلام کو توشہ اعزّت سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ انھیں اسلام اور تادیخ اسلام سے والہانہ عقیدت ہے۔ بعض مسلمان بادشاہوں کی تعریفیں انھوں نے بہت کچھ لکھا اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی مسالوں کو تلقین کی ہے۔ مثلاً صلاح الدین ایوبی، محمود غزنوی، اورنگ زیب اور اس زمانہ میں ابی سعید، امان اللہ خان، مصطفیٰ کمالی ان کے ممد و معین تھے بعض تحریکوں کی تائید و اعانت کے لئے جذبات کی شیشی کے ساتھ قلم اٹھاتا تھا مثلاً لا کھڑی، خلافت، آسراء، کالی، رگودادہ تحریک، مسلم لیگ، اتحاد ملت وغیرہ۔ اسی طرح بیشتر ہم سفر رہنماؤں اور ہم نوا عزیزوں کو بھی ہدیہ سپاس پیش کیا۔ لیکن ان رہنماؤں و عزیزوں اور تحریکوں کے معاملہ میں ان کے دل و دونوں طرح کے جذبات عام ہیں جن کی تعریف کی اس کی بوجہ بھی تھی، اور جس کی ستائش بھی کی۔ مولانا کے عزیز مجھے ”ہمارا ستان“، ”نگار ستان“ اور ”چشتا“ اس سے لبریز ہیں۔ بلکہ ان واقعات کی دستاویز — حقیقت یہ ہے کہ مولانا کا کلام پوری نصف صدی کے سیاسی واقعات کی منظر نگار تاریخ ہے۔ ایک مورخ اس میں واقعات اور حالات کی بہت سی گم شدہ کڑیاں تلاش کر سکتا ہے۔

اس کے علاوہ مولانا کے تین مجموعے اور نئے۔ پہلا ”روح معانی“ — یہ اصل گوجکھڑ خلافت کا فقر اس کا خلیفہ تھا۔ اسی کے اخیر میں چند نظمیں درج تھیں جنھیں ہمارا ستان میں شامل کر لیا گیا۔ دوسرا ”حسبیت“ — یہ مولانا کے زمانہ کی کلام کا مجموعہ ہے جو اپنے پانچ سالہ قید کے دوران میں شاعری سطر ل جلیں میں سپرد قلم کیا۔ تیسرا ”ارخانِ قادیان“ جس میں مقالات کے علاوہ وہ نظمیں ہیں جو آپ نے قادیان کی قید پر لکھیں اور اب ان کے دوسرے مجموعوں میں ملی ہیں۔

جہاں تک معزوبین کا سوال ہے، ان کا کوئی معاصر اور حماقت ان کے قلم سے نہیں بچا۔ بہانہ تک کہ علامہ اقبال، قائد اعظم، ابراہیم کلام، آزاد، محمد علی جوہر، گاندھی جی، جواہر لال نہرو جی ان کے قلم کی زد میں آچکے ہیں۔ اور حماقتوں کا تو ذکر ہی کیا یہی حال عقیدوں اور نظریوں کا ہے۔ اس طنز بلکہ تضحیک میں ان کا جواب نہیں۔ اس میدان میں انھوں نے اچھے اچھوں کی دستاویز نصیحت کے کچھ کھولے اور برسے برسوں کو چاروں شائستہ کیا ہے۔

مولانا سے پہلے ہجو کا انداز شخصی یا ذاتی تھا جس کی بہترین مثالیں مسودا، انشاء اور معصی کے ہاں ملتی ہیں۔ یا پھر اجتماعی طنز جس کے موجد و خاتم اکبر لہ آبادی ہیں ظفر علی خان نے سیاسیات میں ہجو کو استعمال کیا اور اس کی بنا قومی و ملکی مقاصد پر رکھی

گو ان میں ذاتیات کا ذہر لیا بیت ہے اور ہر ایک بشری تقاضا ہے۔ لیکن اس افراط و تفریط کے باوجود اس میں جو جذبہ کار فرما ہے، وہ اتنا ہی ہے۔ ان مجبور ہیں جن کا اصل نشانہ برطانوی ڈیپریسی، ہندو بغاوت، قادیانی ثبوت اور اپنوں کی کاسٹ سسٹم ہے کہیں کہیں دشنام بھی ہے۔ لیکن تلخ زواری کے باوجود بعض اچھوتی شیشیہیں، دلچسپ اشعارے، عمدہ ترکیبیں، اور ملاویز کتا بیچے ملتے ہیں۔ گویا تاریکی کی درستی کو محسوس کرتا ہے اور بعض ناک بھجوں بھی چڑھاتے ہیں۔ لیکن مشیران اشعار پر سر دھتے اور صا و کرتے ہیں۔

اس قدر ت کلام پر مولانا نے بڑے بڑے معرکے سر کئے۔ زمینداران کے آیام صحت تک ایک ادارہ رمل — کئی اُسے اور کئی گئے — عبداللہ الساموی، وحید الدین سیم پانی پتی، نیاز فتح پوری، غلام رسول قمر، عبدالجبار سالک، چرچاں حسرت، مرتضیٰ احمد کشیش، اور نصیر اللہ خان عزیز، یہ سب اپنے اپنے وقت پر زمیندار کی دجاہت کے ستون ہے — بعض نے علیحدگی اختیار کی تو شعر و سخن اور تضحیک وطن کا ڈول ڈالا، لیکن مولانا کے شباب کا زمانہ تھا، جو سامنے آ یا مات کھا گیا۔ —!

عجیب زمانہ تھا، مسلمان رہنما تر حکم خلافت کے منجھن سے منتشر ہو کر ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو رہے تھے — مولانا محمد علی، مولانا فضل علی خان، ادو خواجہ حسن نظامی میں بڑے بڑے قلمی معرکے ہو چکے تھے۔ دو زمانہ انقلاب، مرحوم ان معرکوں کی دلاؤ پر فصل تھا — مولانا نے انقلاب پر چوٹ کی —

مجموعہ انقلاب کا اقبال و فون ہیں

انھیں شبہ نہ تھا کہ انقلاب کے اچھڑائیں علامت اقبال اور ملک فیروز خان فون کا ہاتھ ہے — بس اس پر ایک معرکہ گرم ہو گیا۔ انقلاب کے ہم قراءوں میں نیاز مندانی لاہور بھی — قمر و سالک کے علاوہ تاثیر، قاسم جھٹ، پطرس اور ان کے ساتھی — ادھر تھانظر علی خان — ادھر افکار و حوادث ادھر رکاوٹ — وہاں کی کٹھنے والے، کوئی نظم لکھ رہا ہے، کوئی افتتاحیہ اور کوئی افکار و حوادث کے عمل سے پیچھے رہا ہے اور مولانا جن کو چمکی لڑے ہیں — ایسے محروم ہیں مولانا کا ادبی نام ناقص ہوتا — پھر ایک نام نہیں کی نام — ادھر افتتاحیہ لکھا، ادھر نکالت اور پھر سنگلاخ سے سنگلاخ نہیں، نئے نئے قوافی، نئی نئی ردیفیں اور بولی ہوئی نظم — کتا ہے ہرے حسرت بھی ہاتھ پٹا اور ایک آدھو دفعہ اختر شیرانی نے بھی عکاس کے نام سے چند نظمیں کہیں — مگر ظفر علی خان بلا کے شمسوار تھے — لڑائی تیز ہو گئی، اعلان کیا —

زمیندار ایک آپ اتنے عجرا و ج مصافت پر

یہ اک تکل لڑے گا آپ کی ساری پیٹنگوں سے

اب فقرے بازی شروع ہے، شعر جل رہے ہیں، مصرعے ہرے ہیں، ادھر سے سخن توڑا جا رہا ہے، ادھر سے جواب آن غزل آ رہا ہے کہیں فنز مرگم تو اے کہیں بھینٹ، آتش فشار — اور پھر ایک آدھو دن کی بات نہیں — مفتون پیہ جدا — حریفان بدلتے، حریفان دشنام ہر گئے تو بات مٹلے سے منقطع پراگئی — غنیم جو رنگ ہے اور مولانا تارخ —

ہم تھے حریفِ بذرہ، وہ دشنام کے حریف
ایک ایسی دیکھتے تھے کہ عاؤں پر گرم ہو گیا۔ مولانا نے کہا —

انقلابِ باستان ہیں زمانے کے
تھر د سالک کے انقلاب کو دیکھو

اب جو مصرع اٹھا یا تو شاعر ہو گیا — یک منزلہ، دو منزلہ، سرِ منزلہ — نظم و نثر کی فراوانی — انقلاب کے کبھی ساتھی اور مولانا کے تمام رفیقِ سیاسی — سالک نے کہا ”خلافت کی بلیاں ہمارا کھبا نوچنے پر آنا وہ ہیں۔“ مولانا نے جواب دیا ”یہ کیوں حضرت ! خلافت کے ابو ہریرہ یعنی مولانا عبد القادر قصوری کے متعلق کیا ارشاد ہے —

اور پھر یہ عمر کے محض تھر د سالک تک ہی محدود نہ تھے — ان کا دائرہ پورے ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا بعض حواری و تالیق پر ایسے جبرستہ شعر کہے ہیں کہ ان کا جواب نہیں بشواریوں کی بغاوت سے متعلق زمیندار میں افشاریہ لکھا تو سر آغا غلٹا ہے

جنگ کا کب ہے سینہ کسی شہزادی میں

کوئی معشوق ہے اس پر وہ نہ ٹکا رہی میں

کسی سکہ میں مٹ رہا ہے مجھ کو — نظم اٹھا یا، ادارہ لکھا اور عنوان میں یہ شعر ہے

کیونکر اس کی نگہ ناز سے جب نہا ہو گا

زہر دے اس پر یہ تاکید کہ نہا ہو گا

ایک زمانہ میں علی براوردان سے گاڑھی چھتی تھی اب جو اختلاف کی ہوا چلی تو عمارت ہی بیچ رہی ہے

دو نوں نے لکے ڈالی ہے سلا میوں میں پھوٹ

ہے صلح دہشتی سے علی بجائیوں کو ضد

منڈلا رہے ہیں آج خلافت کی لاش پر

دہلی کے اور بمبئی کے موٹے موٹے گد

اور پھر ایسے ایسے خلیفے نکالے کہ مضمون سے قطع نظر بے اختیار دوا دینے کو ہی چاہتا ہے — علامہ اقبال سے عمر و دستا نہ تعلقات

ہے ایک زمانہ میں حضرت علامہ نے دو زمانہ احسان کے حاضر علی خان غفر کر پیغام تھے کہ کیا تھا کہ — مولانا کا نظم مصطفیٰ اکمال

کی کواد ہے — یہی سامعِ کیشن کی تھر پر مولانا ان کی تواضع بھی کر چکے تھے ہے

مالگ کر اجابِ رحمت پسندی کی کدال

قبرِ زادی کی کھودی کس نے ہر اقبال نے

لاٹ لی پنجاب کی تاک آپ اپنے ہاتھ سے

آبر و ملت کی کھودی کس نے ہر اقبال نے

گاندھی جی کے ہر کاب تھے — توان کے نصیب دے کئے مثلاً —

پرو و دگار نے کہ دہے منزلت شناس

گاندھی کو بھی یہ مرتبہ پہچان کر دیا

لیکن دھڑے تو پھر مٹے نہیں — زاہرہ نظری بدل گیا ہے

بھارت میں بلا میں مدی نہیں ایک سو دو کر گاندھی ہے

— انصرض مولانا کا تمام کلام ان شعری اسامات سے بھرا ہوا ہے — ایک عام آدمی کے لئے یہ تعصبات بظاہر حیرت انگیز ہیں

لیکن مولانا نے جو کچھ لکھا وہ اصلاً ہماری یہ پاس سالہ سیاست کے داخلی اختلافات کا رنگا رنگ مرقع ہے۔ ان کے جذبات کی وہاں بے نقابیں ہیں، مدح اور قدح ————— وہ جس آنکھ سے جو تصور دیکھتے ہیں، اسی کو کھینچتے ہیں۔ ان کے انی مجمع شعر کی نہیں۔ انھوں نے ہمت ہی قیمت نظموں اور سیرکوں میں شکر کئے ہیں۔ لیکن یہ ہے کہ ان کا انتخاب نہیں ہو سکا۔ مولانا نے زندگی بھر جتنے شعر لکھے، وہ دس بارہ ہزار سے کیا کم ہوں گے؟ اور جو کچھ ان کے قلم سے نثر میں نکلا ہے اس سے کسی جلد میں مرتب ہو سکتی ہیں گلیں کام کے لئے فرصت اور محنت کی ضرورت ہے خود مولانا بوڑھے ہو گئے اور زمانہ کا مذاق سخن بدلتا چکا ہے۔

ایک نوجوان جس نے مولانا کو ہندوستان میں نامور کیا وہ ان کی مددگار ہو گئی ہے۔ ان کا تمام کلام ارتحال کی یادگار ہے، باوجود ان کے سب سے بڑے گویا کہ ان سرکوں کو کچھوں دیکھ دے کسی نے فراموش کی اور شعر ہو گئے۔ جلسہ میں گئے، حاضرین نے اصرار کیا، نظم کہنا۔ طبیعت کی آمادگی کا یہ عالم رہا کہ ایک ایک نشست میں دس دس نظموں موزوں ہو گئیں۔ ادھر کا بجٹ نوجوانوں کا ایک وفد حاضر ہوا، عرض کیا۔ مولانا شعر۔ فرمایا ایما کی شعر کہاں۔ ہر وقت طبیعت حاضر نہیں ہوتی۔ انھوں نے اصرار کیا۔ چپ ہو گئے، جتنے کا کٹ کھینچا اور کہا۔ اچھا کھو۔ اب یہی کٹ ایک شعر کھولے جا رہے ہیں اور اس طرح پندرہ میں شعر کھڑے۔

”جتنے کی لئے میں آئی، انگوٹھا انگشت شہادت پر پہنچا۔ پیشانی پر ہلے اور بالفاظِ حسرت کھٹ سے شعر سامنے آگیا۔ اب بندش پھوڑ کھینچے تو علم ہوتا ہے کہ کل کا بنا ہوا شعر ہے، ہاتھ کا بنا ہوا ہی نہیں۔“

جب تک تو اس بجائے مولانا خوش خیال تھے۔ ہر کو چہ میں قدم رکھا اور پھر کہیں نہیں۔ ۴

گھم دیکھ لیا، دل شاد کیا، خوش وقت مجھے اور چل نکلتا

ہاتھ کے سخی، دل کے سادہ۔ اکثر نوجوان ان سے روپیہ پوچھتے تھے۔ جس اواسے کہنا تھے اسی اواسے خرچ بھی کرتے تھے۔ دفتر میں ہونے لگا گامی رشتی۔ سفر میں ہونے تو ملازم اور حقہ ساتھ رکھتے۔

زندگانی کے لطف دوسری تو ہیں جس کی چاہئے شام کا حقہ

انھیں زمیندار کی زبان اور کتابت کا بڑا خیال رہتا۔ ایک دفعہ اپنے خواہراڑے ہمدی علی خان (مصنف چاند گاہ اور دوسرے افسانے) کو زمر کی ایک بھولی سی لغزش کے باعث دفتر سے الگ کر دیا۔ اور صفحہ اولی پر ایک طویل طویل معذرت لکھی۔ ہر کاتب کے دست خط کا سزا تھ جیتے۔ دائرے اور نقشے خاص طور پر دیکھتے۔ کسی کے کلام پر بہت کم اصلاح دیتے کسی کی نظم پسند آتی تو اس میں ایک آدھ جگہ غلط لکھا دیتے جس سے مصرعوں کا حسن سوا ہو جاتا۔

ایک دفعہ دفتر میں عرض کیا۔ مولانا آپ کی زندگی تو عین سفر ہے۔ فرمایا:

”تم ٹیکس کتے ہو۔ ایک حقہ زنداں ہی بسر ہو گیا، ایک سیای سیافوں کی جینٹ پر چڑ گیا۔

قلم و دوات کی صحبتیں تو شادی میسر آئی ہیں۔ جی جاتا ہے زمیندار انگلستان کے اجنادوں

کی طرف پرنکلتے لیکن روپیہ۔“

اور روپیہ زندگی بھر ان کے لئے ایک پرالم رہا۔

جب کبھی ادارہ لکھتے تو اس کا پروف بھی خود ہی دیکھتے۔ اس کی لکھائی کے لئے کاتب بھی تجویز کرتے۔ ایک دفعہ راقم نے پروف بڑھا تو قلمی نہ ہوئی خود پڑھا آخر ایک غلطی کی گئی، مگر خوش قسمت تھے اور انعام میں بہارستان کا ایک خوبصورت فرمایا۔ ہندوستان کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں مولانا نہیں پہنچے۔ وہ دھوکوں سے خیر اور مالدار سے بری گزرتا ہے۔ اپنے زمانہ میں وہ ایک صاف گوشت خور تھے۔ یعنی الفاظ کی نوک چک درخت، جڑیں فقرے، خوبصورت بندشیں، صحت مند استعارے، طبیعت میں دوائی بلکہ طبیعتی، ہر موضوع پر تقریر کرتے لیکن اپنا موضوع کہیں بھی نہ چھوڑتے۔ ان کی تقریر مہربان آدم سے شروع ہوتی اور سطر عطا خلافت پر ختم ہوجاتی۔ تمام دنیا کے مسائل زیر بحث آجاتے۔ ان کا دل اس سے ہمیشہ کھلی رہا کہ مسلمان اپنی سیدہ صدیقہ، روایات کو گھلا رستہ طاقی نسیان بنا چکے ہیں۔ ان کے قومی میں غملاں اور اعضا میں اختلال آ گیا ہے۔ ان کی مرکزیت کا شیرازہ منتشر ہو چکا ہے اور ان کی داستان صاحب جناب معلم الملکوت کے روداد اشک کے مانند دراز ہے۔ اور یہ مولانا کا مخصوص انداز تھا۔ وہ خطاب کے میدان میں ابوالکلام آزاد و یا عطاء اللہ شاہ بخاری نہ تھے۔ لیکن بہت کچھ نہ تھے۔

ان کی بے شمار آرزوئیں تھیں اور انہی کے قصور میں انھوں نے عمر کے چوراسی سال تباہ کئے۔ مگر ایک ہی آرزو پروان چڑھی۔ اور وہ ہے ملک کی آزادی۔ اور غالباً یہ آرزو سب بڑی آرزو ہے۔ اب وہ ہڈیوں کا ایک ڈھیر ہیں۔ حواس کا احتجاب۔ اور سچ تو یہ ہے بڑھا پا بجائے خود جو ان کی ہے۔ بے تصرف اونٹ ہے۔

اویس نہ آئے، صدا کہ چلے
میاں خوش رہو، ہم دعا کہ چلے

جگر صاحب

رشید احمد صدیقی

بالکل یاد نہیں آنا جگر صاحب سے پہلے پہل ک کہاں اور کیسے ملاقات ہوئی، ممکن ہے الہ آباد میں ہوئی ہو جہاں اصغر صاحب مرحوم ہندوستانی اکیڈمی (بی۔ بی۔ این) میں صیغۂ اردو کے مشیر ادبی تھے۔ کسی کام سے الہ آباد جانا ہوتا تو میرا قیام اصغر صاحب کے ہاں ہوتا۔ یہ زمانہ اور اُس کے بعد کافی زمانہ ایسا تھا جب جگر صاحب پر شراب کا بڑا انس نہ تھا۔ رفتہ رفتہ مجھ سے اتنی راہ و رسم ہو گئی کہ جگر صاحب جب کبھی علی گڑھ تشریف لاتے تو میرے ہاں ٹھہرتے۔ یہاں تک کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے بڑے عزیز اور خرم دوست بن گئے۔

الہ آباد میں اصغر صاحب کے سامنے جگر صاحب اس طرح خاموش، متوجہ اور اسٹیمیں نیچی کئے ہوئے بیٹھے کہ ان سے گفتگو بھی کی جاتی تو صرف "ہاں"، "نہیں"، "میں شکر سے جواب دیتے اور پھر رنجھ کا لیتے۔ اصغر صاحب مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے۔ ان کے ہاں پہنچ جانا تو وہ ایسے خوش ہوتے جیسے ان کا رُواں دُواں سُکھنے لگا ہو۔ ان کے اس طرح خوش ہونے سے مجھ پر اسودگی اور شغلی ایسی کیفیت طاری ہوتی جیسے میں ان تمام لوگوں کا قصور و عاف کرنے لگا جنہوں نے میرے ساتھ ظلم و زیادتی کی تھی۔

کبھی کبھی وہیں جگر صاحب مل جاتے۔ ان کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ خود نہ آئے ہوں، بلکہ کسی نے پہنچا دیا ہو اور اس کے منظر ہوں کہ موقع ملے تو پھر اپنی قم پر چلے جائیں۔ ان کے مراجع میں اصغر صاحب مجھ سے تفصیل سے گفتگو نہ کرتے۔ میں بھی کوئی ذکر نہ چھیڑتا۔ ہم دونوں بیٹھے ہوتے تو جگر صاحب اٹھ کر چلے جاتے۔

اصغر صاحب، جگر صاحب کو زیادہ خاموش یا آلتا یا تڑا دیکھتے تو کبھی کبھی مسکرا کر یہ فیضہ، "ان کو سنا دیتے، چاہے جہاں پھر، لوٹ کر نہیں آنا پڑے گا" اس کے بعد مجھ سے مخاطب ہو کر مٹھنا لوٹنا شروع کر دیتے۔ ایک دفعہ میں نے پوچھا: "اصغر صاحب کہاں آنا پڑے گا؟ بیچارے آؤ جلتے ہیں؟" اصغر صاحب ہری طرف دیکھ کر مسکرائے۔ ان کی آنکھیں ان سے زیادہ مسکراتی تھیں۔ پھر بولے، "ابھی کہاں آئے ہیں، ابھی تو لائے جاتے ہیں؟" ایک دفعہ الہ آباد پہنچا تو اصغر صاحب کے ہاں جگر صاحب پھر اسی حال میں ملے۔ کھانے کا وقت آیا تو میں اور اصغر صاحب کھانے کے کمرہ کی طرف چلے۔ جگر صاحب نے شرکت سے معذوری کا اظہار کیا۔ "اصغر صاحب اس دن کچھ بد نظریے معلوم ہوتے تھے۔ چلتے پھرتے کھڑے ہو گئے اور جگر صاحب کو مخاطب کر کے بولے۔ "یہ سب تمہارے شعر نہیں سنئے تھارا گوشت کھاتے ہیں؟" اصغر صاحب کی آذر دگی پر کسی قدر برہمی کا رنگ چھلانے لگا تھا۔

میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور کھانے کے کمرہ میں داخل ہوا۔ اصغر صاحب کھانے کی طرف متوجہ ہوئے تو میں نے کہا: ”مفتاح! آپ تو کھنوی شادی کے تہیہ پر استغناء روی کے کسی شیدائی نہ تھے۔ یہ گوشت کا کیا قصہ ہے؟“ کھانے سے ہاتھ روک لیا۔ کچھ غلغلہ مچ گیا۔ زیادہ دیر نہیں گزری کہ وہ اپنے صاحب آپ کو کیا معلوم یہاں ایسے بے رحم لوگ بھی ہیں جو ان کو جہاں چاہتے ہیں پکڑ لیتے ہیں اور یہ جو اسپرٹ ہوتی ہے تمہارا وہ پلا پلا کر ان سے شہر سٹے ہیں اور جب یہ اور جوئے ہو جاتے ہیں تو کچھ پرلا و پچا نہ کر یہاں پہنچا دیتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ اصغر صاحب بے کیف ہو گئے ہیں اور کھانے سے بھی ہاتھ کھینچ لیا ہے۔

میں نے پوچھا: ”اصغر صاحب آپ نماز تو پڑھتے ہیں؟“ بولے: ”ہاں، میں نے کہا۔۔۔۔۔ صاحب تو آپ کو صاحب کشت و کرامات بھی بتاتے ہیں۔“ بولے: ”جی تو پھر؟“ میں نے عرض کیا: ”۔۔۔۔۔ صاحب نے آپ کا ایک شعر شکر آپ کو مستجاب اللہ بتا دیا۔“ بولے: ”آپ بھی تو کچھ کہیے؟“ میں نے کہا: ”آپ اللہ سے دعا کیوں نہیں مانگتے کہ جگر صاحب کا گوشت کھلے والے وچیر بیہوش ہو جائیں؟“ اصغر صاحب ہنس پڑے اور ہم دونوں کھانے میں مصروف ہو گئے۔ کھانا کھانے پر جوں جوں ضرورت پڑی اس سے پوچھتے جاتے تھے یہ کھانا یا وہ کھانا جو صاحب کے لئے رکھ دیا ہے یا نہیں۔ اس سے اطمینان نہ ہوتا تھا تو ڈونگے اور پلیٹ سے نکال کر علیحدہ پلیٹوں میں رکھتے جاتے اور کھتے ”یہ سب جگر صاحب کے لئے ہے۔ بغیر کھانا کھلائے ان کو باہر نہ جانے دینا؟“ میرے گھبراہٹ میں بڑا جگر صاحب کو بہت عذر دیکھتا تھا۔ ”یہ تو میری اور ہر کسی کی جگہ صاحب محبوب مقبول تھے۔ اس زمانہ میں میری شراب کا بڑا زور تھا۔ اکثر غافل اور بدست شہر سے لاتے جاتے۔ یہ تو میری کسے اور کوئی نہ کوئی طالب علم مل جاتا تو اس کو میرا لانا میں گھر پر موجود ہوتا تو وہ کمرہ میں پہنچا کر دیکھ بھال میں مصروف ہو جاتا۔“

یہ طالب علم جو جگر صاحب کی زنگ اس طور پر کرتے جیسے کوئی اپنے باپ یا بھائی کی خدمت کر رہا ہو یا کوئی نرس مساجم میں مبتلا رہی کی زنگ کرتی ہو۔ اور یہ اس زمانہ کی بات ہے جب جگر صاحب اور یہ طالب علم دونوں اپنی اپنی جگہ پر ان باتوں کے منتہی جن کے قہقہے آواز بولیں اور داستانوں میں ہم پڑھتے آئے ہیں۔

میں آجاتا تو طالب علم چلے جاتے اور معلوم نہیں کیوں اور کیسے جگر صاحب خاموش اور نودب ہو جاتے۔ لیکن ان کو کچھ سے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کہ سمندر کی تہ سے کوئی طاقتور موج ابل کر باہر آنے والی ہو لیکن سطح کے قریب پہنچ کر ایک بیک زونچم کر کے واپس چلی جاتی ہو۔

یہ باتیں ہیں اس لئے نہیں بیان کر رہا ہوں کہ اس میں میری بڑی ملوثی ہے۔ میری ہیبت ہوتی تو میں اتنا جوق نہیں ہوتا کہ اس کیونڈے طریقے سے اس کی ناکش کرنا۔ جگر صاحب مجھے یہی روش کاایت ہے کہ وہ میرے سامنے مودب کیوں ہو جاتے ہیں۔ مجھے ایسے آدمی سے ملنے میں بڑی اٹھن ہوتی ہے جو مجھے ہر وقت گارڈ آف آنرز دیتا رہے اور اس سے بھی کچھ کم گرفت اس وقت نہیں ہوتی جب کوئی شخص میرے سامنے مجھ سے زیادہ مفرط ہونے کی کوشش کر لے !

جگر صاحب اپنے حلقہ کے لوگوں میں پیٹھے ہونے میں ذہنت خوش اور بے تکلف ہوتے ہیں۔ ایسے جگر صاحب کے پاس چائے سے بہرہ یز کرتا ہوں۔ لیکن اتفاقاً باضروست کچھ جاؤں تو وہ اس طرح خاموش اور بغیرہ ہو جاتے ہیں جیسے کتب کے چھوٹے تپتے ہیں۔ بول یا اور ہم چارہ سے ہر دم اور وقتاً مودری صاحب نمودار ہو جاتے !

جگر صاحب یقیناً مجھ سے بہتر انسان ہیں۔ وہ مجھ سے مساوات برتن، میری عبادت کریں، مجھ سے خدمت لیں۔ مجھ سے جگر صاحب کی باغی کر رہیں یہ ساری باتیں سمجھیں آتی ہیں لیکن وہ مجھے حرمین شریفین تک کم کر لوں یا کسی اردو اخبار کا آرو باختر ایڈیٹر یا برطانوی ہمد کا کھانا بند کر دیں، یہ میرے لئے ڈوب مارنے کی بات تو ہے ہی خود جگر صاحب کے لئے کوئی غری کی بات نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان کے مان میرا جو رکھ رکھاؤ ہے، وہ غالباً اس قفل سے ہے جو مجھے اصغر صاحب یا اصغر صاحب کو مجھ سے تھا۔ اس طرح کی باتوں کا جگر صاحب بڑا لحاظ کرتے ہیں۔ وضع داری شریفوں کی پڑائی کر دے گی ۱

ایک دفعہ خبر آئی کہ جگر صاحب شراپے تائب ہو گئے۔ یقین نہ آیا کہ ایسا سنا میرا گاہک تھا کہ آج نہیں کل یہ خبر ہو گئی کہ پھر سے شروع کر دی۔ بڑی عاداتیں اس آسانی سے نہیں چھوڑیں جس آسانی سے اچھی عادات چھوڑ جاتی ہیں۔ سو چار تھا کہ جب میں اپنی معمولی بڑی عادات چھوڑ دینے پر قادر نہیں ہوں تو جگر صاحب شراب کیسے چھوڑ دیں گے جس میں وہ اس طرح ڈوبے ہوئے تھے جس طرح شاید جوش گریہ میں غالب کا دل ڈوبی ہوئی اسامی تھا !

جگر صاحب شراب سے کیوں اوجھڑے تائب ہوئے اس کا مجھے علم نہیں۔ بس بارہویں امی سے کبھی ذکر نہ کیا۔ اتنا اہمیت جانتا ہوں کہ اسی پر شراب کا کتنا ہی غلبہ کیوں نہ ہو تاہم ان سے کوئی ایسی حرکت نہ ہوتی ہے متبادل کہہ سکیں۔ ان کی زبان سے خفیات نکلتے نہیں نکلتے تھے۔ وہ کبھی دھڑکنے دھڑکنے نہیں پائے گئے۔ مجھے تو اکثر غم سے ہوا جیسے کیف و سرخوشی بخشنے کے بجائے شراب ان کی انتہائی درد و کرب میں مبتلا کر دیتی ہو۔ ان پر پھوڑی شراب بھی بہت اثر کرتی تھی۔

ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ ان کے اعصاب بڑے ذکی لمس ہیں اور غمخواری سے ہی غم کی کمی بہت ہوجاتی ہو۔ شاعری میں بھی ان کا یہی حال ہے جیسے خیال یا جذبہ برقی رہیں کہ ان کے جسم و جان کو کچھ بھنا و تبا ہو۔ کچھ دنوں سے ان کے کلام میں یہ بات بظاہر کم ہو گئی ہے لیکن غور کرنے پر محسوس ہوتا ہے کہ جو بات کہی گئی ہے، اس میں تاثرات کی شدت ہے لیکن ان کی کیفیت کیا ہے زیادہ محرم آواز اور انداز میں۔

جگر صاحب کی شاعری میں ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ اصلاً وہ دوری و دوری کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کی رفتار اور سمت کا مطالعہ کیا جائے تو آسانی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ فراق کے شاعروں وصال کے نہیں۔ ان کا محبوب رشتہ کا انڈیا CENTRIFUGAL (دور گرہن) ہے۔ یہی سبب ہے کہ جگر صاحب کی شاعری میں محبوب کی محبت میں کہیں کوئی غفلت نظر نہیں آتا اور ان کا کلام اس آواز کی راہ دوری سے پاک ہے جو ہر آدمی شاعری اور موسیقی میں کل نظر آتی ہے۔ میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ جو شاعروں میں دھڑکنے دھڑکنے کے اعتبار سے محبوب سے قریب سے قریب اور جسم و جان کے اعتبار سے دور سے دور ہو، وہ اس شاعر سے بالعموم بہتر و برتر ہو گا جس کی پوزیشن اس کے بالکل برعکس ہو جگر کے نقاد کو یہ نکتہ ملاحظہ نظر رکھنا چاہیے۔

شراب چھوڑنے کے بعد جگر صاحب طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا ہو گئے۔ یہ زمانہ ان پر بڑا سخت گزرا محنت و غم

۱۔ اس سے کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ میرا مطلب شراب کی فضیلت جتنا ہے۔ یہاں شراب کے چھوڑنے اور مصیبتوں کے آئینہ سبب اور مستحب کا اشتہار نہیں ہے۔ (ارشید صدیقی)

ہر گئی طرح طرح کی ذمہ داریوں نے آگھیرا، مالی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی۔ جگہ صاحب نے جس بارہوی سے ان مصیبتوں کو جھیل دیا جو صاحب کا رزمیہ ہے۔ لکھتے ہیں کہ ”یہ روزِ بد و شبِ مانتاب“ اُسے ہوں گے اور جگہ صاحب پر سے گزر گئے ہوں گے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

جگہ صاحب بڑے مذہبی آدمی ہیں۔ مذہبی لوگوں کے بارہوی میں میرا تجربہ کچھ اچھا نہیں ہے۔ میں نے اکثر ایسے لوگوں کو مذہب میں مبتلا پایا جن میں اخلاقی کمزوریاں ملتی تھیں۔ یہ لوگ خدا کو اس مطلق سے قائل کرتے رہتے ہیں، میں عین شادیان کرتا اور طلاق دیتا ہوں اتنی ہی زائر کھینچتا ہوں، تو پھر لیتا ہوں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح امریکہ ہر چیز کی قیمت ڈال رہی دھوکے کرتا ہے اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کا کفارہ نفلوں میں قبول کر لیتا ہے۔

مذہب بڑی سخت اور بڑی قابلِ قدر آڑ گشت ہے۔ بالخصوص مسلمانوں کا مذہب۔ جس طرح کس مذہبی لوگ میسر ہوتی نظر ہیں، وہ اس درجہ بے وقوف ہوتے ہیں کہ انہی میں نہیں سمجھتے کہ جب وہ اپنے اوپر کے معمولی سوچھ سوچھ کے لوگوں کو دھوکہ نہیں دے سکتے تو وہ خدا کو کیڑا کر دھوکہ دیں گے جس کی صفات کا ان کو علم ہے۔ یقین ہو یا نہ ہو۔ ان کو یہ بھی نہیں معلوم کہ خدا نے اپنے سارے اختیارات اُن بندوں کو ہمیشہ کے لئے منتقل کر دیئے ہیں جن کا وہ حق مارنے رہتے ہیں۔ ایسے معاملات میں وہ خدا کے ہاں جتنی عرضیاں بھیجتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو پڑھے بغیر عدالتِ عمارت کو واپس کر دیتا ہے۔

ان میں بعض ایسے معمولی صوفیوں میں گئے جو اس کو شش میں رہتے ہیں کہ خدا کو نہ سمجھتے اُن فرشتوں میں کو دھوکہ دے کر کارہار کی کرلیں جو ان کا اعمالِ مردہ تپ کرنے کے لئے کا دھون پر بچا دیتے گئے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ آخرت میں پتواری کے اندراجات کی بنا پر مقدمہ جیت لیں گے!

جگہ صاحب ان معنوں میں مذہبی آدمی ہیں کہ وہ اللہ رسول اور انسان کے حقوق پہچانتے ہیں اور اس کا لحاظ رکھتے ہیں کہ جس کا جو حق ہو، اُسے پہنچ جائے۔ وہ نفع کے منرا اور ضرر کے نفع کو جانتے ہیں۔ اُن میں جیسا ہے، وہ پرانی چیز کو اپنانے کے ورپے نہیں ہوتے ان میں عبرت اور حجت ہے۔ ظلم اور زیادتی اپنے پر جو تو جھیل جائیں گے دوسرے پر ہوں تو اس کی حمایت میں اپنے کو منظرہ میں ڈال دیں گے۔ اُن کے یہ جو ہر غیر ملک کی ملاکتوں میں کھتے! تفصیل میں طوالت ہے۔

جگہ صاحب عالمِ فاضل نہیں ہیں۔ مذہب جو، سیاست جو، شعر و ادب جو، ان پر ان کی گفتگو منطقیانہ یا فلسفیانہ نہ ہوگی۔ ان کا احساسِ جتنا صریح اور شدید ہے، انہی ان کا مطالعہ کسیریع نہیں ہے۔ وہ خود اپنی شاعری کے بارہوی تفصیل سے گفتگو نہیں کر پاتے۔ وہ اپنی شاعری سے باہر نکل کر کسی اور کی شاعری پر غور کرنا نہیں چاہتے۔ شاید غور کو بھی نہیں سکتے جس کے جذبات تند و تیز ہوں، وہ غور کرنے کا تحمل نہیں ہو سکتا۔ جگہ صاحب اقبال کی شاعری کے کچھ ایسے قائل نہیں ہیں۔ تاہم بھی نہتے۔ دونوں کا یہ کہنا ہے کہ شاعری میں فکر و فلسفہ کیسا؟ حالانکہ دونوں بالخصوص جگہ صاحب جب جنت و جہاں سے بلند ہوتے ہیں، اقبال کے قریب ہو جاتے ہیں۔ لیکن جگہ صاحب شعر و شاعری کے بارہوی جو کچھ کہتے ہیں، درست اور وزن سے قطع نظر اس میں غلوں کی پاکیرگی اور یقین کی عملی طرہ ہے۔

میں نے جگہ صاحب کو تقریباً ہر حال اور محبت میں دیکھا ہے۔ خوبصورت نوجوان، آواز خوش عودوں میں، ماں

ہیں بیٹیوں میں، عمامہ اور اکابر کی موجودگی میں، طلباء اساتذہ اور دوسرے سربینہ اور ثقہ حلقوں میں۔ گفتار کو روا رکھنے کا اعتبار سے میں نے ان کو کہیں قابل گرفت نہ پایا۔ عورتوں کی موجودگی میں جگر صاحب غیبت و شقیق نظر آئیں گے۔ ان کی زبان سے کوئی ہلکی بات نہ نکلے گی اور نگاہ کبھی بے باک اور بے عماما نہ ہوگی۔ عورتوں کی موجودگی سے قطع نظر بے تکلف دوستوں میں ہیں سنے کبھی یہ نہ دیکھا کہ جگر صاحب نے بے جبا میں یا فخریہ کوئی ایسا جملہ کہا جو جس میں عورتوں سے تفریح یا محوئوں کی تضحیک کا پہلو نکلتا ہو۔ کم سے کم میری جان بچان کا کوئی آرد و شاعر ایسا نہیں ہے سوا قافی مرحوم کے جو اس بارہ خاص میں جگر صاحب کا منہ بند کر سکے۔

دوسا اور رام آکے سلسلے جگر صاحب حتی الوسع اپنا اور ان کا دونوں کا رکھ رکھاؤ ملحوظ رکھتے ہیں۔ لیکن اس طرح کی مصبوتوں میں جگر صاحب کی طرف سے میں ہمیشہ متزور رہا۔ اس لئے کہ معمولی آدمیوں کی بدتمیزی وہ بالعموم نظر انداز کر دیتے ہیں۔ لیکن کسی بڑے آدمی سے ذرا بھی کوئی ناواقف حرکت سرزد ہو جائے تو جگر صاحب بغیر کچھ کے باکئے نہ رہیں گے۔ چاہے اس کا انجام کچھ ہی ہو۔ بھوپال کے نواب زادہ رشید الظفر صاحب زمانہ طالب علمی سے جگر صاحب کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ ایک زمانہ میں انھوں نے جگر صاحب کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ اور کسی طرح کی کوئی پابندی نہیں عائد کی تھی کہ وہ کبھی کریں یا کہاں رہیں۔ اس زمانہ میں والیاں ریاست میں سے اکثر یہ جانتے تھے کہ جگر صاحب ان سے وابستہ ہو جائیں۔

ان میں سے ایک جو بہت بڑی ریاست کے چشم و چراغ تھے اس کے درپے ہوئے کہ جگر صاحب جس معاوضہ اور شرط پر چاہیں ان کے تشریفیں میں شامل ہو جائیں۔ طرح طرح سے ددے دے ڈالے گئے جگر صاحب کی مالی حالت خراب تھی۔ بھوپال کے وظیفہ سے بس لبرادفات ہو جاتی تھی۔ جگر صاحب اس آفر کو خوش سہلی سے ٹالتے رہے۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ رئیس نے جگر صاحب سے بر ملا اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔ جگر صاحب نے بات ٹانسی چاہی، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ اصرار بڑھا اور اصرار میں کچھ رنگ امارت کا بھی جھلکا۔ جگر صاحب بے تاب ہو گئے۔ بولے۔ ”جناب آپ مجھے دامن خریدنا چاہتے ہیں۔ بن نورشید الظفر خان کے ہاتھوں بک چکا ہوں۔ حاضرین سناٹے میں آگئے اور جگر صاحب گھر آ گئے۔

جگر صاحب میں موت اور وضعار ہی بہت ہے۔ جس سے رسم و رواج بچائے اُس کے لئے وہ تمام آداب بتاتے ہیں جو شریفوں میں قدیم سے چلے آئے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے بڑے دھوکے کھائے اور نقصان اٹھائے جگر صاحب کا سنا رکھنا ہے۔ میتوں میں نہیں ہے۔ مدتوں بڑی سنگی تشریف سے بس برہنہ ہے اب بھی عروج آمدنی سے بہت زیادہ ہے لیکن انھوں نے اپنی تنگدستی کا اظہار کسی کسی سے نہیں کیا۔ ہمان کا غیر مقدم اس طرح کہتے ہیں جیسے ان کے گھر خیر و برکت کا نزل ہو رہا ہو۔ تکبر و تواضع میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے۔ کپڑے اچھے پہنتے ہیں۔ سامان قیمتی رکھتے ہیں جس کی ہمیشہ کوئی نہ کوئی مانگ لیتا ہے یا چراتا ہے ورنہ خود کہیں کھواتے ہیں!

جگر صاحب جب کبھی میرے ہاں آتے ہیں بے سرائی کیا۔ جگر صاحب سفر میں کیا کھواتے؟ اور تقریباً

ہمیشہ ہی معلوم ہوا کہ کچھ نہ کچھ کہیں نہ کہیں چھوڑ آئے۔ ایک دفعہ شاعرہ میں جو کچھ ملا تھا اُسے حیرت میں رکھ لیا تھا جن کے ہاں میٹر سے تھے انھوں نے جگر صاحب کی دیکھ بھال کے لئے اپنے کسی حوزہ کو مقرر کر دیا تھا۔ انھوں نے جگر صاحب کی بڑی خدمت کی، ہر وقت موجود رہتے اور اظہار عقیدت کرتے۔ جگر صاحب کو غافل کچھ کہ انھوں نے سالے روپے نکالی لئے۔ جگر صاحب کہتے تھے کہ وہ سب دیکھ رہے تھے، لیکن جیب رہے ہیں نے پوچھا، یہ کیوں؟ بولے یہ واقعہ ایسے وقت ہوا جب میں جانے قیام سے تھمت ہو کر سٹیشن آ رہا تھا۔ بہت سے لوگ موجود تھے۔ کچھ اچھا نہ معلوم ہوا کہ وہاں اس چوری کا اعلان کروا کر کسی شریف آدمی کو رسوا کر دیں؟

جگر صاحب جس کے عہد میں رہتے ہیں اس پر بہت کچھ اپنا ہی صرف کر دیتے ہیں۔ میں نے غصہ میں ان کو آپس سے باہر ہونے نہ دیکھا کچھ چلانے نہ پایا۔ اپنی بڑائی بھی ان کی زبان پر نہ آئی دوسروں کے عیب انھوں نے کبھی نہیں ڈھونڈے نہ کبھی ان کی تشہیر کی۔ ایسے لوگ کم ہیں جو اپنی بڑائی جتانے کے لئے ایسا نہ کرنے ہوں۔ جگر صاحب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ عام شعر ا کی مانند اس ناگ میں نہیں رہتے کہ کوئی غریب اور شریف مل جائے تو اپنے اشعار سنا سنا کر اسے اوجھڑوا کر دیں!

جگر صاحب کو مصمم ہوتوں سے کھینٹے ہوئے کم لوگوں نے دیکھا ہوگا۔ بالخصوص ایسے حال میں کہ جگر صاحب کو میرٹھوا ہو کر انھیں کوئی دیکھ رہا ہے۔ بچے سے کہیں زبیا و مصمم وہ خود نظر آتے ہیں۔ وہ اتنے خوش اور کفایت معلوم ہوں گے جیسے آن کے سر پر آسمان نہ ہو۔ جگر صاحب کا چہرہ بشرو ایسا نہیں ہے کہ کوئی بچہ ان کے سامنے بے تکلف ہو سکے۔ اس کی کمی جگر صاحب طرح طرح سے پوری کر لے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو بچہ کا کھلونا بنا دیتے ہیں۔ ایسا کھلونا جس کو بچہ نہ کھیلے تو کھلونا نہ کھیلے گے۔ وہ بچوں سے صاف صاف، معافہ یا چرما جاتی نہیں کرتے، نہ وعائیں دیتے ہیں نہ تلقین کرتے ہیں۔ نہ اُسے ملّت کی خدمت یا بخاری کے لئے تیار کرتے ہیں۔ وہ اس کے سامنے اپنی شاعری بھول جاتے ہیں، اپنی عمر، صحت، تعلیم، زبوں حالی سب فراموش کر دیتے ہیں۔ بس طرح طرح سے خوش ہوتے ہیں اور بچہ کو خوش کرنا چاہتے ہیں۔ بچے خدا کا صمد طرح ہوتے ہیں جن پر خدا طرح طرح سے ملیح آزمائش کرتا ہے!

میں نے بعض مشہور مستند اور مرید سیدہ شعرا کو دیکھا ہے جو دوسرے شاعروں کی بڑائی بیانی کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ شاعرہ میں شاعر اپنا کلام سنا رہا ہے اور یہ بیٹھے اس پر بازاری فقرے چسٹ کر رہے ہیں اور اس پاس کے نالا لفقوں سے اپنی اس خفیت اور کمزوری کی داد لینے جا رہے ہیں۔ اس طرح کی بے ہودگی کسی اور میں ہوتی ہو، شاعر میں ہرگز نہ ہونی چاہیے۔ اس طرح کی حرکت شاعر، ہی نہیں کرتے، وہ لوگ بھی کرتے ہیں جو شعر و ادب کے پاکر کچھ جلتے ہیں اور تھیموں کو کراہیہ شاعر و ادب کی خدمت میں گزارا ہے۔ بس یہ گوارا نہیں کہ ان کے ہونے دوسرا کہوں!

بعض شعرا، بعض اشعار اور بعض مبالغہ و مبالغہ ہونے ہیں جب بھینٹی یا فقرے بے اختیار زبان پر جاتے ہیں۔ اسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ یہ فقرے اور بھینٹی کبھی کبھی وہ مزادے جاتے ہیں جو اچھے اچھے اشعار نہیں کہہ پاتے، لیکن اس طرح کے فقرے اور بھینٹی کئے کا حق شاعرہ میں سامعین کو حاصل ہے خود شعرا کو نہیں۔

مشاعروں میں اب یہ بات عام ہو گئی ہے بالخصوص دہلی کے ہلکے مشاعروں میں۔ آج کل شاید ہی کوئی اور تظہیر ایسی ہوتی ہو جہاں بے ہودگی اور اُردو بازی کے ایسے مناظر دیکھے جانے ہوں جیسے دہلی کے اس طرح کے مشاعروں میں۔ عام مجمع میں جہاں شریعت خواہین، ذمہ دار و حکام، پیشوا یا نالک و قوم وغیرہ ملک کے اکابر، نامحکم لڑکے اور کئی موجود ہوں وہاں شعر کا جو قہوم کا ناموس ہوتے ہیں، انگریز اور ملائیم شراب پی پی کا اس طرح کی نالائقی دکھانا بڑے رنج اور شرم کی بات ہے۔

مجھے تو کبھی کبھی اس کا اندیشہ ہونے لگتا ہے کہ شاید وہ دن بھی دور نہیں جب دہلی کا کوئی مہتملار یا بدوار مشاعروں کی کوئی سرگرمی بنائے اور انہیں فری اسٹائل میں ان کے کرب اور کثرتِ شہر شہر دکھانا پھرے! خلوت ہو یا جلوت جگر صاحب کہ میں نے سماعتی شعرا کے کلام پر کبھی حاشیہ لکھنے نہیں پایا یا مشاعرہ میں اُن کی طرح سنجیدہ اور خاموش بیٹھے والا مشاعرہ شایر ہی کوئی اور ہو۔ اُن کی زبان سے کوئی فقرہ کبھی نکلے گا بھی تو تعجب اور ہمت افزائی کا۔ یہاں مجھے ناواقف اور جتنی مرحوم بے اختیار رہا و آئے ہیں۔ لکھنؤ کے یہ بالکل اشدّ مشاعرہ ہیں جس میں ادب و احترام سے بیٹھے اور مناسب موافق پرستیں کے کلمات جس شریفانہ انداز سے کہتے وہ اب کہیں نہیں نظر آتا۔

یہ مشاعرہ میں شروع سے آج تک دو زانو بیچ کر نظر کئے ہوئے بیٹھے رہتے، خواہ مشاعرہ کتنے ہی دیر میں کیوں نہ ختم ہوتا۔ کبھی چائے، پانی یا پانی کی ذرائع نہ کرتے۔ کوئی پیش کر دیتا تو بڑی فروتنی سے قبول کر لینے یا بعد کر دیتے۔ ان لوگوں نے ایسے مشاعروں میں بھی شرکت کی جہاں مخالف کبیر کے شعرا اور اُن کے حمایتی موجود ہوتے اور اس کا اندیشہ رہتا کہ کہیں کوئی ناظم فقرہ نہ کہہ دے لیکن آج تک کوئی ناگوار پیش نہ آئی۔ مخالفین کا کلام یہ دونوں بڑے شوق اور شائستگی سے سنتے اور داد دیتے تھے۔

ثاقب صاحب کو ملی گڑھ سے بڑی اُلفت تھی۔ کوئی بڑی ہی مجبوری ہوتی تو خبر ورنہ یہاں کے مشاعروں میں ضرور شرکت کرنے میں ہی طالب علمی کا زمانہ تھا۔ ثاقب صاحب کی بارک کے ایک کمرہ میں بٹھرتے ہوئے تھے۔ وہ بھرکا سفر کر کے لگتے تھے۔ طبیعت قیاساً زہنی۔ رات کو مشاعرہ تھا۔ میں نے سون گیا آپ آرام فرم لیں، وقت آئے پس حاضر ہو جاؤں گا اور آپ کو لے جاؤں گا۔ فرمایا: میں نہیں، میرا آپ مشاعرہ کے خلاف ہے کہ جب جل کا جی چاہے آجائے اور جب جی چاہے چلا جائے میں آپ کے ساتھ آجی چلتا ہوں۔

اس مشاعرہ میں ثاقب صاحب کے دو اشعار علی گڑھ میں بہت مقبول ہوئے۔ جیسے اس کی رات کو سینا ہوا اور صبح اس کے مقبول فنی لکھنے یا مصنفین کچھ بچ کر زبان پر آ گئیں۔ اُس زمانے میں علی گڑھ کے مشاعروں کا یہی حال تھا، اچھے اشعار ہر چھپے بڑھنے کی زبان پر روانہ ہو جاتے تھے، ثاقب صاحب کے وہ دو اشعار یہ تھے۔

باغیاں تھے گئے وہی جب آئینہ کو مرے جن پر نگاہ تھا، وہی پتے ہوا سینے لگے؛
ہے روشنی فضا میں مگر سو جھٹ نہیں ابرسیا ہ جانب کُتسا رو کچھ کر؛

جگر صاحب میرے ہاں شریف لاتے ہیں تو چند باتوں کا میں خاص طور پر خیال رکھتا ہوں۔

اولیٰ یہ کہ جگر صاحب کی صحت ابھی نہ ہوگی۔ اس لئے اپنے عزیز ترین ڈاکٹروں کو بلوانا ہوں جو ان کا مکمل معائنہ کرتے ہیں۔ وہ دوا اور غذا تجویز کریں گے، پرہیز بتائیں گے اور دوسرے شوروے دیں گے۔ میں ان سب پر جگر صاحب سے عمل کرواؤں گا۔

دوسرے یہ کہ جگر صاحب معلوم نہیں کہاں کہاں کا اور کتنے دنوں کا جگر دکاتے ہوئے آئے ہیں۔ ان کے ساتھ میلے کچھ چاؤر، غلاف، توڑے کا انبار ہوتا ہے۔ دھوبی بلوا کر یہ کپڑے اس کے حوالہ کرونگا۔
تیسرے یہ کہ جگر صاحب کا خط بڑھا ہوا تھا۔ اس کے لئے نائی بلواؤں گا تاکہ وہ جگر صاحب کو نوک پلک سے دست کر دے۔

چوتھے یہ کہ اس بات کا انتظام کروں گا کہ جگر صاحب کے شقائق ان کو ملی گڑھیں گھسیٹنے نہ پھرے۔ ادویہ ملان نہ اپنا کلام ان کو سنائیں نہ ان کا کلام نہ سنیں۔

پانچویں یہ کہ جگر صاحب کے پاس جو نقدی ہوتی ہے اسے ضبط کر لیتا ہوں تاکہ وہ علی گڑھ میں نہ پے اس طرح نہ خرچ کریں جس طرح بعض حکومتوں پر خرچ کرتی ہیں۔

چھٹے یہ کہ جگر صاحب رخصت ہونے لگتے ہیں تو میں خدا حافظ کہنے کے لئے نہیں موجود ہوتا اس لئے کہ جگر صاحب کہہ اس گداؤں کے ساتھ رخصت ہوتے ہیں جیسے نہ ان کو میری زندگی کا بھروسہ ہے نہ اپنی زندگی کا اور اس طرح سے رخصت ہونا یا رخصت کرنا میرے بس کی بات نہیں!

ذاکر صاحب

ڈاکٹر عابد حسین

طفیل صاحب کی فرمائش پہنچی کہ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت پر ایک مضمون "نفوس" کے لئے لکھو۔ پہلے میں نے حضرت کی، دو چورہ سے۔ ایک تو سست سوجھے اور سست لکھنے کی عادت کے کارن میں ہوں ہی رسالوں کے لئے مقررہ وقت کا اندر مضمون نہیں لکھ سکتا اور پھر اس زمانے میں شدید مصروفیت کی وجہ سے اور ایسی شکل ہے۔ دوسرے ڈاکٹر صاحب جیسی صدر رنگ و بیک رنگ شخصیت کا نقشہ ایک مضمون کی چھوٹی سی لوح پر تارنا قلم کا نہیں بلکہ مو قلم کا کام ہے جس میں مجھے دستگاہ حاصل نہیں۔ مگر پہلی شکل طفیل صاحب نے مجھے کچھ اور مہلت دے کر حل کروئی اور دوسری خود میں نے یہ سوجھ کر حل کر لی کہ اگر اس قوت ایسا مضمون لکھنا ممکن نہیں جس سے میں مطمئن ہوں تو ایسا ہی کسی جس سے میں غیر مطمئن رہوں۔ شاید میرے اطمینان کی کسی دن اس موضوع پر ایک سیر حاصل مضمون اور (شاید ایک پوری کتاب) لکھوا دے۔

شخصیت کیا ہے؟ اس پر مفصل بحث کرنے کا اس وقت مرقع نہیں۔ عملی طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ شخصیت ان جسمانی اور اخلاقی صفات کا ایک ہم آہنگ مجموعہ ہے جن کی بدولت کوئی شخص عام لوگوں سے امتیاز حاصل کرتا ہے اور ان پر اثر انداز ہوتا ہے۔ بعض اوقات ہم شخصیت کے مالک یعنی اس انسان کو کبھی جو غیر معمولی جسمانی اور اخلاقی صفات رکھتا ہے شخصیت کہہ دیتے ہیں۔ اس مضمون میں شخصیت کا لفظ ضرورت کے مطابق دونوں معنوں میں استعمال ہو گا۔

یہ بات تو شخصیت کی تعریف ہی میں داخل ہے کہ وہ اپنے ماحول پر اثر انداز ہوتی ہے۔ البتہ اس بارے میں بہت کچھ اختلاف ہے کہ اس کے اثر کی کیا حدود ہیں۔ اکثر نے کہا ہے : ۶

مردہ ہیں جو زمانے کو بدل دیتے ہیں

اور انسانی نے تو شخصیت کو (جسے وہ خودی کہتے ہیں) خدائی کی حد کے قریب قرب پہنچا دیا ہے۔ گلیے لوگ بھی ہیں جن کے نزدیک شخصیت سراسر اپنے زمانے یا ماحول کی پیداوار ہوتی ہے۔ عام طور پر تصوریت IDEALISM کے علمبردار اس کے ناکل ہیں کہ شخصیت اپنے ماحول پر غیر محدود اثر ڈال سکتی ہے اور بہت بڑی شخصیتیں واقعی قوموں کی زندگی اور زمانے کے دھارے کو بدل سکتی ہیں۔ مگر مثبت POSITIVISM کے پیرو یہ سمجھتے ہیں کہ بڑی سے بڑی شخصیت کا

اثر بھی بہت محدود ہوتا ہے۔ بلکہ خود شخصیت اپنے طبیعی، سماجی اور رعبی زیادہ معاشی ماحول کے سانچے میں ڈھل جا کر رہتی ہے۔ فلسفیوں کی افراط و تفریط سے بچ کر تاریخ کا بے لاگ مطالعہ کرنے والا ماحول ہے کہ شخصیت اس انجن کی طرح ہے جس سے بڑی سے بڑی اصلاحی یا انقلابی تحریک کی گاڑی کھینچی جاسکتی ہے۔ لیکن خود بہرہ انجن جس طاقت سے چلتا ہے وہ اسے زلزلے یا ماحول سے ملتی ہے۔ ایسی شخصیتیں جن میں اصلاح یا انقلاب پیدا کرنے کی صلاحیت ہے کبھی کبھی پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن ان کی صلاحیت کا قوت سے فعل میں آنا اس پر موقوف ہے کہ ان کے زمانے کے حالات اور زمانے کے لوگ ان کا ساتھ دیں۔ میں نے اپنے زمانے یعنی بیسویں صدی کے نصف اول میں جن مسلمانوں کو روح تاریخ پر نمودار ہوتے دیکھا تھا ان میں کھری شخصیتیں بھی تھیں اور طبع کی بھی تھیں۔ نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں میں عام طور پر طبع کا مال کھرے والے ہیں۔ یہ کہیں زیادہ مقبول ہوا۔ اس لئے کہ اس میں ظاہری چمک جس پر مسلمان حان دیتے ہیں وہ زیادہ بھی۔ ذاکر صاحب ان کھری شخصیتوں میں سے ہیں جن کی مقبولیت کا دائرہ اب تک بہت محدود ہے۔ لیکن طبع کی عارضی چمک ماند پڑتی شروع ہو گئی ہے اور کھرے سونے کی پائدار دمک ہرستور موجود ہے۔ لیکن ہے اب ہندوستان کے مسلمان ذاکر صاحب کی شخصیت کو پرکھ سکیں۔ ہم دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے ہیں اور ان کی مدد کے لئے ذاکر صاحب کی شخصیت کی نشوونما اور موجودہ آب و رنگ پیچھے ڈالی ہوئی روشنی ڈالتے ہیں۔

ذاکر حسین ۱۹۵۷ء میں حیدرآباد (دکن) میں پیدا ہوئے ان کے والد فدا حسین خان صاحب ضلع فرنگ آباد (ہریانہ) کے مشہور قصبہ قائم گنج کے رہنے والے تھے اور حیدرآباد میں وکالت کرنے تھے، قائم گنج کے بچپان عبدالوس سے سپہ گری کا پیشہ رکھتے تھے چنانچہ ذاکر حسین کے خاندان کے بھی بہت سے لوگ فرنگ میں ملازم تھے۔ ان کے والد کا مشرقی علوم کی اعلیٰ تعلیم پانا اور وکالت کا پیشہ اختیار کرنا قائم گنج والوں کے نزدیک بدعت سے کم نہ تھا۔

ذاکر حسین کا بچپن حیدرآباد میں گذرا لیکن وہ لہسنے گھر کی چار دیواری میں پے اور بڑھے اور ریاست کی جاگیر دارانہ آب و ہوا سے متاثر نہیں ہوئے۔ اس زمانے میں سب سے گہرا اثر ان کی عبرت پر اپنے چہرے شاہ صاحب کا پڑا جس کے وہ بہت کم عمری میں بہرہ بردہ ہو گئے تھے۔ یہ بزرگ ذاکر حسین کے عزیزوں میں سے تھے اور حضرت شاہ طالب حسین فرنگ آباد سے اراوت رکھتے تھے جس شاہ صاحب پر ایک داروات ایسی گذری تھی جس سے ان کی روحانی زندگی کی کا با بلیٹ گئی ابتدا میں وہ ہندوؤں سے تعلق رکھتے تھے اور شاید انھیں بڑبھلا بھی کہتے تھے جب ان کے مرشد حضرت شاہ طالب حسین کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے ان کی تادیب اور تہذیب کے لئے بیگم دیا کہ تم چوٹی رکھو اور پٹا رنگ پیدل جاؤ اور دو اہم اولیٰ سنا دیب نے جس شاہ صاحب کو آدھ روی اور صلیح کل سکھانے کے علاوہ جانیان جہاں گشت نہا دیا اور ان کا بیٹا عار جو گیا کہ ایک گٹھڑی کھڑی اور کتابوں کی ساتھ لئے، بیدل دیا بھر میں پھر آکر تے۔ جب بھی حیدرآباد کو کچھ دن رہتے تو ذاکر حسین کا مٹاؤ اثر کا کام زیادہ تر ان دو رفیقوں سے انجام دیتے، ایک تو وہ کس مرید سے علم دین یا سلوک و معرفت کی کسی کتاب کی نقل کرتے، دوسرے اسے دوبرہ دیتے اور دوسرے حاجت مندوں کو اس کے پیچھے لگا دیتے کہ خیرات و حسنات کی منتیں اسے اس کا دل بھی مکمل

جلئے اور باقاعدگی۔

ششہ میں ڈاکٹر حسین تعلیم کے لئے آمادہ کے اسلامیہ ہائی اسکول میں بھیج دیئے گئے جسے سید احمد خان کے ایک دوست کے رفیق مولوی بشیر الدین نے قائم کیا تھا۔ ان بزرگ کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ انھیں ایک ہی دھن تھی اور اپنی دھن کے پکے تھے۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر سید الطاف حسین ان بچے معقول ہیں سے تھے جو اس راز سے واقف ہوتے ہیں:

درس ادب اگر بود ز منہ محبتش

جمعہ برکتش اور طفل گر یز پائے را

ڈاکٹر حسین کے حساس دلی پر مولوی صاحب کی ایک جھجھکت اور سید صاحب کی بہت سی صفات کا بڑا گرا نقوش بیٹھا جو کبھی مٹ نہ سکا۔

۱۹۱۳ء میں ڈاکٹر حسین ایم۔ اے۔ اور کالج علی گڑھ میں داخل ہوئے۔ انٹر میڈیٹ انھوں نے سائنس میں پاس کیا اور ۱۹۱۵ء میں بی۔ ایس۔ سی کا امتحان دینے کے لئے لکھنؤ کو بھیجیں کالج میں داخل ہوئے تاکہ میڈیکل کالج میں داخلہ لے سکیں۔ لیکن شدید علالت کی وجہ سے اس ارادہ کو ترک کر کے پھر علی گڑھ واپس آنا پڑا۔ اس طرح ان کا ایک سال بیکار گیا۔ اس بار انھوں نے امرٹس کا کورس لیا۔ ۱۹۱۷ء میں بی۔ اے اور ۱۹۱۹ء میں اقتصادیات کے مضمون میں ایم۔ اے۔ پری ولس پاس کیا۔ ایم۔ اے۔ کی تیاری کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر حسین اقتصادیات کے شعبے میں جو نیر لکچرار کے فرائض انجام دے رہے تھے کہ علی گڑھ میں ترک ہوا کہ کا زلزلہ آیا جس سے سید احمد خان کا ایم۔ اے۔ اور کالج ذیرو ذیرو کو ڈاکٹر ضیاء الدین کی مسلم لیونریشن گیا۔ کچھ لوگوں نے غم مرقی عمارت سے نکل کر ایک خیرین کی ہستی میں بنیادی اور اس کا نام جامعہ ملیہ اسلامیہ رکھا ان پناہ گزیروں میں ڈاکٹر حسین بھی تھے جو اب ڈاکٹر صاحب کہلانے لگے تھے۔ علی گڑھ کالج کی تعلیم کے دوران میں ڈاکٹر حسین یونین کے اور عام طور پر اہل علموں کی اجتماعی زندگی کے روح وروال تھے۔ انھوں نے اپنے بہت سے سائنسیوں پر گہرا اثر ڈالا۔ لیکن خود سب سے گہرا اثر ڈاکٹر ضیاء الدین کا قبول کیا۔ گو وہ مثبت نہیں منفی اثر تھا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کی ذات ان سب صفات کا مجموعہ تھی جن سے ہر کار برطانیہ کا تقرب اور صنادید قوم میں مقبولیت حاصل ہوتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے شعوری یا غیر شعوری طور پر ڈاکٹر ضیاء الدین کی پیروی معکوس کر اپنی زندگی کا اصول بنا لیا۔ ۱۹۲۰ء میں جب کانگریس جی اور مولانا آزاد نے علی گڑھ کے طلبہ کو ترک مولات کی دعوت دی تھی اور مولانا محمد علی نے شیخ احمد مولانا محمود حسن مرحوم کے دست مبارک سے جامعہ ملیہ کا افتتاح کر دیا تھا تو ڈاکٹر صاحب کے لئے ایم۔ اے۔ اور کالج کو چھوڑ کر جامعہ ملیہ میں شریک ہونے کا فیصلہ کرنا نہایت دشوار معلوم ہو رہا تھا کسی روز سید گلشن میں مبتلا رہے مگر ایک دن جب ڈاکٹر ضیاء الدین نے انھیں بلا کر بڑی محبت سے زندگی کے نشیب و فراز بھانے اور یقین دلایا کہ ایم۔ اے۔ اور کالج میں وہ کہہ کر کہہ کر ایک ہی سال کے اندر ڈیڑھ لکھڑی ل جاوے گی تو ڈاکٹر صاحب کی مشکل آسان ہو گئی۔ وہ فوراً ایم۔ اے۔ اور کالج کو خیر باد کہہ کر جامعہ ملیہ پہنچ گئے۔

دو سال تک جامعہ ملیہ کی تعمیر میں مولانا محمد علی کا ہاتھ بٹانے کے بعد ۱۹۲۲ء میں ڈاکٹر صاحب معاشیات کی مٹا تعلیم حاصل کرنے برلن پہنچے میری ملاقات ان سے ایک مرتبہ علی گڑھ میں ہو چکی تھی۔ لیکن اب سو اتین برس تک میرا ان کا

ہر وقت کا ساتھ دیا۔ میں نے انھیں ہر رنگ میں جو کھا پایا جس سے زیادہ مجھ پر اس بات کا سکہ بیٹھا کہ
 ڈاکر صاحبؒ اور ایام جوانی چنان کہ اندروانی کی دوائی پر بخار سے بڑی پامردی سے گزرتے۔ گھبرا کر بھاگنے کی کوشش میں
 کانٹوں میں الجھے نہیں بلکہ اوسان قائم رکھے وامن بچائے قدم بٹھائے چلے گئے۔ برہنہ میں ڈاکر صاحب کے استادوں میں پروفیسر
 ذمہ دارؒ اور دوسرے بڑے پائے کے عالم تھے جن سے انھوں نے بہت فیض اٹھایا مگر فیضان اگر تھوڑا بہت کسی سے پایا
 تو شاہد میرے استاد انگریز سے جو خبر کے ساتھ ساتھ نظر بھی رکھتے ہیں۔

۱۹۳۶ء میں ڈاکر صاحب برہنہ سے ڈاکٹر ڈاکر حسین بن کر لڑے تو ملک کی بی کیفیت کچھ کر ترک موات اور خلافت کی تحریک
 ٹھنڈی پڑ چکی ہیں اور لوگوں پر خصوصاً مسلمانوں پر ایک ظلم افسردگی چھائی ہوئی ہے۔

گلشن میں کہیں بے دما ز نہیں آتی

اللہ دے سناٹا وار نہیں آتی

مگر ایک آواز اب بھی سنائی دے رہی تھی اور وہ جو ان کے دل کی آواز تھی :

بے گانہ ہوتی دنیا کسم درہم افستے

اکبر ہی طبیعت ہے جو باز نہیں آتی

پیخت جان طبیعت باز نہیں آتی اس نے جامعہ ملیہ کی سرکشی ہوئی بلی کیوں جگر سے سینا اور پردان چڑھایا ۱۹۲۷ء کے آخر
 میں حکیم اجل خان کے انتقال کے بعد جامعہ ملیہ کو چلانا قریب قریب ناممکن نظر آتا تھا۔ جن لوگوں نے ان دنوں ڈاکر صاحب کے ساتھ عالم
 کیسے وہ جانتے ہیں کہ کوسال کے فقدان، اپنوں کی مخالفت، بغور کی شہادت، حکومت کے عقاب کے باوجود جامعہ ملیہ کو چلانا ہر ایک کا
 کام نہیں تھا۔ یہ وہی کرسکتا تھا جسے خدا پر انسان پر اور خاص کر اپنے آپ پر سچا پورا اور کھرا ہوسہ ہو۔ جو اپنا زنا ڈاکر صاحب نے جامعہ ملیہ
 کے لئے کیا اس میں تو میں، دمن کی قربانی تو سب کو نظر آتی مگر ایک قربانی جو حوصلہ مند طبیعتوں کے لئے ان سے مشکل ہے بہت کم لوگوں
 نے دیکھی وہ یہ ہے کہ سبک لیڈری کے منصب جن کے لئے ڈاکر صاحب کے ہم قدم ہزاروں جن کرتے تھے ان کو بے مانگنے دے تھے
 مگر انھوں نے بے تامل چھوڑ دئے۔ اس لئے کہ ان کے نزدیک تعلیم کا کام یوں بھی جیو کی چاہت ہے اور ان دنوں جامعہ ملیہ کی جوئے شیر
 لانے کے لئے خاص طور پر اپنے آپ کو بری طرح کھانے اور پتہ مار کر کام کرنے کی ضرورت تھی۔

ان دنوں ڈاکر صاحب کو قریب قریب سچی قومی اور ملی لیڈروں سے ساتھ ملا لیکن ان کی شخصیت پر فاضل و کراثر صرف
 ہوتا گا ندھی اور جگم جمل خان کا بڑا گانڈھی ہی کی حق بینی، حق شناسی، حق کوئی اور ہمہ گیر انسانیت کی آج گئے ان کے سونے کو کندن بنایا
 تو حکیم اجل خان کے ملق و مروت، صبر و جمل نے اس پر جلا کر دی۔

بزرگان قوم میں سے سوا ڈاکٹر انصاری اور مولانا ابوالکلام آزاد کے سب اس بے دلی کی فضا میں جو خلافت اور سورج کی
 تحریک کے ناکام ہونے کے بعد چھا گئی تھی، اس ادارے کی کتنی حکومت کی مدد کے بغیر بارگاہ سے بہت دیر چکے تھے۔ ڈاکٹر ڈاکر حسین
 نے وہ کام کر دکھایا جو انگریزی تعلیم پائے ہوئے مسلمانوں کے کبھی خواب و خیال میں بھی نہ آیا تھا۔ انھوں نے گاندھی جی کے شولے سے
 جامعہ کے استادوں میں سے ان لوگوں کو ساتھ لے کر جنھوں نے میں سال بے سالے نام معاہدے پر جامعہ ملیہ کی خدمت کا عہد کیا، انھیں تعزیری

کی بنا ڈالی۔ اس انجمن نے جامعہ تلیہ کو اپنے ماتحت میں لے لیا اور جیلا با۔ اور باب حکومت روٹے لٹکانے رہے۔ بزرگان قوم والا مٹا مٹا کر دوسرے متنا دیکھتے رہے اور خود واران قوم ذکر صاحب کی سرکردگی میں روٹی سوکھی کھا کر، موٹا بھوٹا پس کی ایک آن روٹی لکھ لکھ کر کی تعمیر کرتے رہے۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۴۸ء تک کا زمانہ ذکر صاحب کے لئے بڑی سخت آزمائش کا زمانہ تھا۔ یوں تو ہندوستان کے خون میں تحریک آزادی نے ۱۹۱۷ء سے یہاں پیدا کر رکھا تھا۔ لیکن ۱۹۳۷ء میں حکومت خود اختیاری ملنے کے بعد ہندوستان اہل عرض کی آخر کے تصادم سے فرقہ داری زہر اس شدت سے پھیلنے لگا تھا کہ یہاں خون نے زہر باد کی صورت اختیار کر لی۔ ذکر صاحب اور ان کی جامعہ علیہ اس زمانہ میں دو گنہ رنج و فدا میں مبتلا تھی۔ فرقہ پرست ہندو اور مسلمان چاہتے تھے کہ دونوں کو فرغت کی آگ میں لپیٹ لیں یا جلا کر خاک کر دیں۔ قوم پرست ہندو اور مسلمان چاہتے تھے کہ دونوں کو محبت کی زنجیروں سے سیاست کی جنگ میں گھسیٹ لیں اور کشتہ کو پورا احساس تھا کہ اس وقت جب ملک کی موت اور زندگی کا فیصلہ ہونے والا تھا سیاست سب سے زیادہ اہم چیز ہے۔ لیکن ملک کی روح جمہور کی روح نہیں تھی۔ دشمنوں کی عداوت اور دشمنوں کی محبت دونوں ان کو عملی سیاست میں کھینچنے میں ناکام رہے۔ لیکن ذکر صاحب نے اپنی ساری کوشش کی کہ کانگریس اور مسلم لیگ میں مصالحت کرنے اور ملک کی تقسیم کو روکنے میں گاندھی جی کا ہاتھ بٹا لیں اور انھیں آخر تک یہ اُس۔ ہی کہ اس کوشش میں کامیابی ہوگی۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء میں جب معتبر ذریعوں سے معلوم ہوا کہ ذکر صاحب کو اپنی قومی گاندھی میں رکھنے کی تجویز ہے تو انھوں نے اس امید پر کہ ایک دن کانگریس اور لیگ کی مشترک کامیابیت ہندوستان کا اصول مان کر بنے گی۔ اس وقت وزارت قبل کرنے سے انکار کر دیا۔ اور یہ وہی کر سکتا تھا جو اقبال کی اصطلاح میں مر و فقیر ہو۔ مگر اُسے معاملہ پروردہ کر طوفان کر دینے کی سعی کیا کامیاب ہوئی۔ فرقہ دارانہ فساد کی آگ بجھ گئی ہی چلی گئی۔ ہندوستان کی تقسیم کرنا ہی چاہس کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کے جسم و روح تین ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئے۔ ————— بھارت ہندوستان، مغربی پاکستان۔ ذکر صاحب کے مگر پرکھے چل گئے۔ ان کی آنکھوں میں دنیا کا ایک چمک رہا تھا۔ مگر اس اندھیرے میں انھیں اپنے فرض کی راہ صاف نظر آتی رہی۔ انھوں نے پاکستان کو دماغے نیروی اور اپنے آپ کو قن من سے، ہندوستان (بھارت) کے حوالے کر دیا۔

۱۹۴۷ء کے بعد کے تین سال ذکر صاحب کے لئے سخت روحانی کرب اور شدید جسمانی اور دماغی محنت کے تھے۔ اس عرصے میں انھیں دینی کے مسلمانوں کی تباہی، اضطراب، مایوسی، ہراس، دہلی میں آئے ہوئے ہندوؤں اور سکھوں کی بے سرو سامانی، صحبت آوردگی پیش کے گھر خراش منظر دیکھنے پڑے اور ان سب کی کیساں خدمت کرنے والے مردوں اور عورتوں کے ساتھ ان ٹھک کام کو نبھانا پڑا گاندھی جی کی شہادت کا جانکا جھانکا صدر مٹھا نا پڑا، جامعہ تلیہ کو اپنے مختصر ساتھیوں کے سپرد کر کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو اندر و باہر کے بے شمار خطروں سے بچانے کی جد و جہد کر پڑی اور اسی زمانے میں یونیورسٹی کمیشن کے ساتھ سارے ملک کی خاک کھجانی پڑی۔ روح و دماغ اور جسم تینوں پر مسلسل بوجھ پڑنا رہا تو انسان کہاں تک سہہ سکا ہے۔ آخر جسم کی قوت برداشت نے سجاوٹ ڈال دیا۔ ۱۹۴۹ء کے آخر میں شدید بھاری مرض (THROMBOSIS) کا حملہ پڑا جس سے جان کے لئے پڑ گئے۔ مگر خدا کو ذکر صاحب کچھ اور کام لینا تھا۔ اس لئے چار پانچ مہینے صاحب فراس رہ کر چپے ہو گئے۔

۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۱ء میں ذکر صاحب نے اپنا سارا وقت اور توہم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی خدمت میں صرف کی اور جہاں

نیک ان سے جو سکتا تھا نا امیدی میں اُمید، بے ولی میں ولولہ، بد نظمی میں نظم پیدا کر کے علی گڑھ کو ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں بڑی اونچی جگہ پہنچا دیا۔

۱۹۵۲ء سے ان کی مصروفیتوں کا دائرہ بڑھ گیا ہے۔ ہندوستان کی پارلیمنٹ کے ابراہن بالا، یونیورسٹی گرانٹ کمیشن اور اس طرح کی بے شمار عارضی اور مستقل مجلسوں کی رکنیت، انجمن ترقی اردو (ہند) اور عثمانیہ یونیورسٹی کی تنظیم کمیٹی کی صدارت ان کے وقت کا بہت سا حصہ رہے لیتی ہے۔ اس لئے ان کو مسلم یونیورسٹی کے کاموں میں ہاتھ بٹانے کے لئے بعدی کے ایجوکیشنل سروس کے قابل ترین افسر سرد فوراً اشد صاحب کو بلا کر پرووائس چانسلر نانا پڑا ہے۔ مگر اب بھی ان کی توجہ اور سعی کامرکز علی گڑھ ہے اور اس کو سنوارنے اور سدھارنے میں دل و جان سے لگے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کی نشو و نما کا ایک سرسری سا خاکہ کھینچنے کے بعد اب ہم اس میں کچھ نچوڑا سا رنگ بھرنے ہیں تاکہ اس نفی تصور کے نقش کشی حد تک اُبھر آئیں۔

میرے عزیزم استاد پروفیسر اشیر انگری نے انسانی شخصیتوں کی چھ بنیادی نفسی قرار دی ہیں۔ مذہب، سماجی، علمی، جمالی، سیاسی، معاشی۔ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت ان میں سے دوسری قسم سے تعلق رکھتی ہے یعنی لگی س میں مذہب و نصرت، فکر و نظر اور ذوق جمالی کا خاصا گہرا رنگ ہے اور اقتصاد و سیاست کا کچھ بلکا سا رنگ مزبور ہے۔ لیکن ساری زمین انسان وقت سے رچی ہوئی ہے، ان کے لئے انسان سے خواہ فرو کی شکل میں ہو یا جماعت کی شکل میں، محبت اور اس کی خدمت کو نہ کرنا نہ کنی مذہبی یا اخلاقی فرض ہے، جس کے لئے شعور، عقیدے اور ارادے کی، نہ کوئی علمی اصول ہے جس کے لئے فکر کی، اور نہ کوئی سیاسی تدبیر ہے جس کے لئے تدبیر کی ضرورت ہو بلکہ وہ نوا ان کی فطرت کا قانون ہے جو بلا شعور، بلا ارادہ کام کرتا ہے۔ ہم سنا کہ میں کہ فلاں شخص نے دو سنوں عزتوں یا عام طور پر بندگان خدا کی خدمت کا بیڑا اٹھا یا ہے۔ فلاں نے قوم و ملت کے لئے اپنی زندگی کو وقف کر دیا ہے۔ دنیا کو کوچ دیا ہے، اثبات دیکھے، قربانی کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو میں نے پچھلے ۳۲ سال میں ہمیشہ افراد اور جماعتوں کی بھلائی کی کوشش میں محو دیکھا ہے۔ لیکن میرے علم و یقین میں نہ انھیں کبھی خدمت کا بیڑا اٹھانے کا احساس ہوا، نہ اپنے آپ کو وقف کرنے کا، نہ دنیا کو کوچ دینا، نہ اثبات اور قربانی کا۔ احساس ہوا تو صرف یہ کہ زندگی کا دھارا خود بخود بے تعلقت، بے رکاوٹ ایک سمت بہہ رہا ہے اور انھوں نے کہا اچھا ہے بہنے دو۔ سماجی یا انسان دوست ڈاکٹر کی ایک اور بڑی پہچان ہے اور وہ بھی ڈاکٹر صاحب میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان میں خودی ”اور بے خودی“ اس طرح گھل مل کر شیریں شرک ہو گئی ہے کہ دوسرے انسانوں کے مقابلے میں خواہ وہ کسی ملک، کسی مذہب، کسی طبقے کے ہوں انھیں احساس کمتری اور اظہار برتری کی گمشدگی سے گزرا نہ، خود فروشی اور خود فراموشی کے بیچ میں ہموار نہ نہیں پڑتا۔ نئے آدمی سے وہ اس طرح کھلے آغوش اور کھلے دل سے ملتے ہیں جیسے برسوں کا دوست ہو، وہ انسان کو کتاب سمجھ کر اس کی تعقید، تکلیل اور تجزیہ نہیں کرتے کہ کسی جہز کو رد، اور کسی کو قبول کریں، بلکہ جیسا ہے سارے کا سارا لے لیتے ہیں اور اپنے کو قائم و دائم رکھنے کے لئے اس کے لئے کرتے ہیں۔ اخلاقی رہنما ہمیشہ سے کہتے آئے ہیں اور ہمارے زمانے میں گاندھی جی نے اس پر بہت زور دیا ہے کہ بڑے آدمی اور اس کی بڑائی میں فرق کرو، اس طرح جیسے بیمار اور بیمار کا

جین کرتے ہو۔ بڑائی کو ضرور بڑا کہو اور بونگہ کرنے کی کشش کرو۔ مگر اس انسان کو جس کے اندر بڑائی لفظ آئے یہاں کی طرح ہمدردی کے قابل، علاج کا محتاج، محبت کا سزاوار سمجھو۔ اس اصول پر اپنی طبیعت کے نقصان سے علی کرتے ہوئے نہ کسی کو دلچسپ ہے تو ذاکر صاحب کو۔ بڑے اعمال کی وجہ سے کسی کو بڑا سمجھنا تو درکار، ذاکر صاحب کی اتھارہ موت اکثر انسانی کے جوہر انسانیت کی غماز اس کے بڑے اعمال کو قید نہیں تو گو اراضہ ور کر لیتی ہے۔ کسی کے دل کو لاندہ میں لینا ان کی طریقت میں حق اکبر ہے اور کسی کے دل کو توڑنا کبیرہ کفر ہے۔ ان کی طبیعت جو صلہ مند ہے اور قوی اعزاز، انتہائی منصب بے مانگے ملے تو ان کا دل قبول کرنے کو جانتا ہے۔ لیکن اگر اس میں کسی حریف کا مقابلہ کر کے اس کو شکست دینا ہو، کسی انسان کو روئندہ کر کے چھٹا ہو تو وہ عموماً پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ جب ذاکر صاحب قیلم کے لئے برہنہ پہنچے تو وہاں کے ہندوستانیوں کی قومی انجمن ہندوستان ایسوسی ایشن کے خمداد اردل کا انتخاب و رہنشا تھا۔ ذاکر صاحب کی شخصیت نے چند ہی روز میں ان کا کراٹر ڈال دیا تھا کہ بہت بڑی اکثریت ان کو صدر منتخب کرنا چاہتی تھی۔ لیکن ذاکر صاحب اپنے حریف کے حق میں متبر وادار ہو گئے۔ دو ہرے سال جب لوگ انھیں اچھی طرح جان گئے تھے اور کسی کے دم و گمان میں ملی نہ آسکتا تھا کہ وہ ان کا حریف بنے، ملامتا بلوہ صدر منتخب ہوئے۔

انسان دوستی کے بعد سب سے گہرا رنگ ذاکر صاحب کی شخصیت میں خدا پرستی ملے ہے۔ ان کی وینڈر لری دنیا داروں کے پرے میں سے بھی نہیں تھوڑی بہت جھلکتی رہتی ہے۔ لیکن اچھی طرح چمکتی اس وقت ہے جب اس باس کی فضا میں ماری کا اندھیرا اٹھ جاتا ہے۔ ان کے ایمان کی ثابت قدمی اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب اچھے انھوں کے ایمان ڈالوں ڈال کر جاتے ہیں۔ اس کی سب سے روشن مثال وہ ہے جب ستمبر ۱۹۴۲ء میں وہیں میں مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ ہو گیا تھا، جامعہ ملیہ کے کارکنوں کی بحالی ہر وقت خطرے میں تھی اس کے بہت سے سپہ ہمدرد جو اہل ازلے کچھ جانے نہ تھے اصرار کر رہے تھے کہ کچھ دن کے لئے وہیں چھوڑ دو کہیں اور چلے جاؤ۔ لیکن ذاکر صاحب کے قدم جیسے تھے اور ان کی وجہ سے ہزاروں اکھڑے ہوئے قدم پھر چمکے۔ سماجی اور روحانی ہلاکت کے سیلاب میں ذاکر صاحب نے ہنر خود اپنانا سکھ لے رکھا بلکہ بہت سے ڈوبنے والوں کو یہاں تک کہ ان کو گولی کو پتھر دان کو ڈوبنا چاہتے تھے، سہارا دے کر کنارے پر پہنچا دیا۔ ان دونوں ذاکر صاحب نے ایک دوست کو کھانا کچھ انسان کی انسانیت پر بھروسہ ہے جنوں کی یہ لہر دیکھتے دیکھتے گتے گتے رہ جائے گی۔ ظاہر ہے انسان کی انسانیت پر ایسا بھروسہ ہی کر سکتا ہے جو خدا کی خدا کی برائی ایمان رکھتا ہو۔

نفاستِ ذوق اور لطافتِ احساس وہ صفات ہیں جو ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کی نگارنی سے ناسازگار و ماحول کے باوجود ابھر کر رہیں۔ مولوی بشیر الدین کے اٹھارے اور ڈاکٹر عبداللہ کے عملی گوشے ہیں، رہ کر شعر و ادب اور فنونِ لطیفہ کا قانون رکھنا روزمرہ کی زندگی میں، دینِ مہن اور اخلاق و آداب ہیں۔ بیرونی صفائی اور خزانہ اندرونی پاکیزگی اور حسن و تناسیب کا لحاظ رکھنا ہمت و شہنائی۔ گھر ڈاکٹر صاحب نے کر دکھا یا۔

جامعہ قیصر کے نورنگ رشی ہی میں ذکر صاحب نے اپنے گھر اور اپنے ارادے کو ساوگی اور سلیقے کا نمونہ بنادیا تھا۔ اب علی گڑھ میں جہاں انھیں مقابلہ فرارغت حاصل ہے، اُن کی ذاتی توجہ اور انتہام کی بدولت وہ اس چانس کے پچکلے سے لے کر بغیر رشی کی آخری حدود تک ساری سستی نگراں نظر آتی ہے۔ سرکاروں، نابالوں، چربچوں کی صفائی سے صحت جسم و صحت

دماغ و دلوں کی سطح اور پہنچی ہو گئی ہے۔ علی گڑھ کی بے ہنگم اور بد نما عمارتیں ڈاکر صاحب کی آنکھوں میں طالب علمی کے زمانے سے کھنکھاتی ہیں۔ مگر ظاہر ہے انھیں ایک دم سے گرا کر بدل نہیں سکتے۔ اب جہان تک دسالی بسر کرتے ہیں نئی عمارتیں اپنے مذاق کے مطابق بنوا رہے ہیں۔

موسیٰ بیگ اور مصوری میں ڈاکر صاحب خاصا وسیع ذوق رکھتے ہیں اور شرقی اور مغربی فنکاروں کے کمال سے کیا ان لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان کے پاس منتخب تصویروں اور رنگا رنگوں کا ایک چھوٹا سا مجموعہ ہے جس میں بہت سے آہستہ آہستہ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ خطاطی کا فن بھی ان کا پسندیدہ فن ہے اور ایک زمانے میں ان کے پاس کتبوں کا بہت اچھا ذخیرہ تھا جس کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا۔ شعریں ان کی دلچسپی کا دائرہ آوردہ فارسی، انگریزی، جرمن شاعری کو محیط کئے ہوئے ہے۔ مگر سب سے زیادہ حظ وہ فارسی شاعری سے خصوصاً قبائل کے فارسی کلام سے اٹھاتے ہیں۔ ڈاکر صاحب کو عجم و عجم کر و کشن میں ہیں انقبالی کے شعر پڑھتے سننے تو آپ کو یاد آجائے گا کہ انقبالی مفکر، معلم، مصلح ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھے۔

علیٰ متنازل میں ڈاکر صاحب کو سب سے زیادہ دلچسپی اس سے کم پڑھانا اور اس سے کم لکھنا مرغوب ہے۔ کتب بینی کا ان کو اتنا کھرا اور سچا شوق ہے کہ انتہائی مصروفیت و پریشانی بہانہ نہ کہ عداوت کی حالت میں بھی اس کا تقویر بہت سلسلہ چلندا رہتا ہے۔ باقاعدہ مقبول انھوں نے علم معاشیات کی کئی کئی اور ان کے چل کر فن تعمیر کو اپنا فن بنا لیا۔ لیکن ان کا مطالعہ ان دلوں کے علاوہ اور دنیا بھر کے موضوعات پر بھی حاوی ہے۔ البتہ فتنے کہانیاں جن کا شوق اس زمانے میں لوگوں کو خط کی عذوبت پہنچ گیا ہے، ڈاکر صاحب کم پڑھتے ہیں، درس و تدریس کا کام جب تک انھوں نے کیا، خاصی دلچسپی سے کیا لیکن باقاعدہ درس سے زیادہ ان کو اس کی لگن تھی اور اب بھی سے کڑھنے کے دل میں عام مطالعہ کا، اپنی زبان سے پڑھنے اور لکھنے کا شوق پیدا کریں علی گڑھ ہی پر موقوف نہیں کسی یونیورسٹی کا کوئی نوجوان طالب علم یا استاد جو ذرا منصب کی طلب اور پارٹی بازی کی نیت سے محفوظ رہ کر خلوص سے علی کام کرنا چاہتا ہے، ڈاکر صاحب کو دل سے عزیز ہوتا ہے اور وہ اس کی اپنے امکان بھر پوری مدد کرتے ہیں۔

ڈاکر صاحب اردو انگریزی تقریر و تحریر پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی تقریر ساواگی اور پرکاری میں ان کی شخصیت کی لہریں ہوتی تصویر اور ان کی تحریر اگر کسی سے گھٹی ہوئی ہو سبے ساختہ ہیں، جوش اور خلوص میں ان کی سیرت کا آئینہ ہوتی ہے۔ لیکن ہندوستان کی علمی اور تعلیمی دنیا کو ڈاکر صاحب سے بے شکایت ہے کہ وہ بہت کم بولتے اور لکھتے ہیں۔ تقریر سے بچنے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ قلب کی بیماری کا دورہ پڑنے کے بعد ڈاکٹر وئی نے ڈاکر صاحب کو زیادہ تقریر کرنے سے منع کر دیا ہے۔ شاید اس وجہ سے کہ وہ اس میں دل کی طاقت بہت کھپتے ہیں۔ اب دہریہ تحریر سوس اس کے لئے آج کل تو انھیں جتنی فرصت چاہیے، وہ نصیب نہیں، لیکن دراصل یہ ان کی جڑانی کمزوری ہے کہ لکھنے کے کام کو برا بھانتے دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ باقوہ بالکل ہی ٹل جاتا ہے یا عین وقت پر رات بھر جاگ کر سو رہا کیا جاتا ہے۔

لوگوں کو مشکل سے یقین آئے گا کہ میری صدی کی دوسری چوتھاں میں ہندوستان میں زندگی گزارنے اور جامعہ علیہ اور مسلم یونیورسٹی جیسی قومی اور ملی تعلیم گاہوں کے وائس چانسلر رہنے کے بعد ڈاکر صاحب کیا سست سے بالکل بے تعلقی

رہے۔ سیاسی لیڈر بننے کے لئے جن اوصاف کی ضرورت ہے، ان میں سے اکثر ذاکر صاحب میں بڑے بڑے لیڈروں سے زیادہ موجود ہیں۔ — مرد شناسی، موقع شناسی، مصلحت بینی، شخصیت کی کشش، زبان کی طلاقت، حلیہ فیعلہ کرنے کی ترقی۔ گویا تو مصلحتی کی غالب صلاحیت نے انھیں اس طرح بائذہر کر رکھا کہ کسی اور صلاحیت کے اُڑانے کا موقع ہی نہیں دیا۔ دوسرے اور بڑے صفات کے باوجود ان میں ایک صفت یعنی سخت دلی کی اس حد تک کمی ہے کہ سیاسی لیڈری کے میدان میں ان کا کامیاب ہونا بہت مشکل ہے۔ جس کا دل دوسرے کو کر لیتے ہوئے دُکھتا ہو وہ اس کا اُڑنے میں ہر ایک سے جیت ہو سکتا ہے۔

سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ اقتضائات اور رعاشیات میں ہمارے حاصل کرنے کے باوجود
اقتصادی بحیثیت ذاکر صاحب کا سب سے کم زور پہلو ہے۔ جہاں تک ان کا پس جیلڈ ہے وہ کم کام پہلے سے پُر مغصوبہ بنا کر
نہیں کرتے۔ اس لئے اکثر انھیں بے جا زحمت اور زیرباری ٹھانی پڑتی ہے۔ ضبط و نظم کی کمی نے ان کی کارکردگی کو جتنی ہموار
سکتی تھی، اس سے کم کر دیا ہے۔ ان کا معاشرتی قانون یہ ہے کہ طلب کو رسد کا یا بند نہیں بلکہ رسد کا یا بند بناؤ۔ چار
ویکھ کر پاؤں نہ پھیلاؤ بلکہ پاؤں دیکھ کر چادر بناؤ۔ یہ بات اصولاً بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے لیکن اس پر عمل کرنے میں بڑی
وشواریاں مٹتی آتی ہیں۔ جہاں تک قومی کاموں مثلاً جامعہ علیہ اور مسلم یونیورسٹی کا تعلق ہے ذاکر صاحب کا یہ اصولی کہ وہ
خارج ضرورت یا حوصلہ کے مطابق بڑھانے چلے جائیں اور آمدنی خرچ کے مطابق بڑھنے کی امید رکھیں، عموماً کامیاب ہوا اس لئے
کہ قوماً و حکومتیں ان کی عزت و نمائندگی لالچ کبھی بڑی۔ لیکن کئی زندگی میں انھیں بے اندازہ خرچ کرنے سے صرف و غرت
کے زمانے میں سخت و قسطنٹین ٹھانی پڑیں بلکہ اب کب کو نہ ذرا غمت کے زمانے میں بھی ٹھانی پڑتی ہیں اس لئے کہ جس نسبت سے
آمدنی بڑھی اسی نسبت سے جا و بیجا خرچ خصوصاً اوور دس بھی بڑھتی چلی گئی۔

ہم نے دیکھا کہ داکر صاحب کی شخصیت کے کئی پہلو میں مگر ان میں مرکزی اور بنیادی حیثیت انسان دوستی کو حاصل ہے۔ انسان دوست شخصیت تو سہ کی جوتی ہے۔ ایک مرشد و معلم کی دوسرے صلح و عباد کی۔ مرشد و معلم کی فزیر کا موضوع انسانیت و محبت فر دے ہے۔ وہ ارشاد و عبادت تعلیم و تربیت کے ذریعے افراد کے اندر ان قدر دل کو پیدا کرتے ہیں جو اسے انسانیت کے بلند منصب کے سزاوار بنائیں۔ صلح و عباد کا کام انسانی جماعت یا سماج کا سدھار کرنا ہے یعنی ان غریبوں جو سماج میں پیدا ہو گئے ہیں، لڑنا اور ان کو دور کرنا، تاکہ انسانییت کی دبی ہوئی، روندی ہوئی قدویں بھرا لیں، چمک اٹھیں۔ دونوں قسم کے انسان دوستوں کی زندگی کا قانون محبت ہے۔ لیکن ایک کے دل عبت جمالی شان و کھانی ہے، دوسرے کے دل جلالی بھی کمی ہے، دونوں شائیں ایک ہی شخصیت میں جمع ہو جاتی ہیں۔ اور وہ ہمیر یا عہد کی شخصیت بن جاتی ہے۔

و اگر کسی سبکی انسان دوستی، اب تک مرشد و معلم کی شان رکھتی ہے۔ وہ انسان کو فرد کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اس کی روح سے محبت رکھتے ہیں۔ اور اسے تعلیم و تربیت کے ذریعے سنوارنا چاہتے ہیں۔ وہ کہہ سکتے ہیں اچھے مسلمان پیدا کرو، اچھی اسلامی جماعت پیدا ہو جائے گی۔ اچھے ہندوستانی بناؤ، اچھا ہندوستان ہی جلتے گا۔ لیکن وہ اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ معلم کا دوسرا ہر کام مرشد کی خلفاء، وہ فوٹن کا اثر فرد کی تعلیم و تربیت میں محدود ہے۔ دوسرے اجتماعی ادارے، خاندان،

طبقہ، قوم، مذہب، رسم و رواج اگر الگ الگ نہیں تو مل کر انسانی شخصیت کی تشکیل میں کہیں زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ اگر ان اجتماعی ساچروں میں سے اکثر خراب ہو گئے ہوں، اگر آوے گا وہی مگر اچھا ہو تو معلم اور مرشد کی ساری سعی و کوشش برباد ہو جاتی ہے جب تک کوئی مصلح اور مجاہد اجتماعی ساچروں کو نہ سدھارے یا ان کو توڑ کر نئے سانچے نہ بنائے اور جو ایک ہی شخص میں معلم اور مرشد کے ساتھ مصلح اور مجاہد یعنی مجموعی طور پر مجدد کی شان پیدا ہو جائے تو پھر کیا کہنا! شاید اگر صاحب جیسے صوفی فنن کو یہ توڑ پیوڑ قانونِ وحدت اور اربعینِ محبت کے خلاف نظر آئے۔ لیکن اس مشکل کو اس مردِ عارف نے حل کر دیا ہے جس نے کہا ہے -

نفسِ حق را ہم ز امرِ حق شکن!

بر زجاجِ دوست سنگِ ویرت زن

اور اس مردِ عمل نے ثابت کر دیا کہ پُرانے سانچے خواہ سنگِ خارا کسے بنے ہوئے ہوں بے فائدہ و اگر زُمنِ مسکِ بالحق صرف ”سنیہ گروہ“ سے توڑے جاسکتے ہیں -

مرزا عظیم بیگ چغتائی

شاہد احمد دہلوی

اللہ بخشہ مرزا عظیم بیگ چغتائی بھی خوبوں کے آدمی تھے۔ سدا کے مزاج پر طے۔ پیدا ہوئے تو اسے خیف و کمزور کہہ دئیے گئے پہلوں پر رکھے گئے۔ بڑے ہوئے تو روکی مرچیں۔ اللہ کا دیبا گھر میں سب کچھ موجود تھا۔ وصال بھی جائدا رخصی اور نصیب بھی ساونٹی۔ ان کے والد عظیم بیگ چغتائی پو۔ پی میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ آبائی وطن آگرہ تھا۔ یہیں ان کی جدی جائدا بھی تھی۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی کے نانا منشی امرا علی تھے جو اب سے نصف صدی پہلے کے مشہور ناول نگار تھے۔ ان کی تصانیف ”زرم بزم“ اور ”البرٹ بی“ ایک زمانے میں بہت مقبول تھیں۔ مرزا صاحب کے والد بڑے ٹھٹھ کے آدمی تھے۔ سرسید کی سنجیدگی دیکھ کر ان کے لئے گریہ کے ابتدائی گرجے ہوئے تھے۔ اپنے زمانے کے اچھے کھلاڑیوں میں شمار ہوتے تھے۔ ورزش کا بھی شوق تھا۔ سواری کے لئے منہ زور سے منہ زور گھوڑے تلاش کر کے رکھتے تھے۔ بڑے طاقتور آدمی تھے۔ ایک بلی نے گھر والوں کو بہت عجب کر دکھا تھا ایک دن وہ اسی کے ہاتھ آگئی۔ ہاتھ اس کی کمر پر پڑا۔ چاہتے تھے کہ اسے گھر سے باہر اچھال دیں مگر وہ کم بخت غلامی میں پست گئی۔ انھیں بھی تاؤ آگیا۔ اس نے اپنے بچوں اور وادانتوں سے ان کی کلائی اور جھڑی نگرانوں نے بھی اپنے پیچے کی گرفت اتنی سخت کی کہ اس کی ہڈی پہلی ایک ہوئی اور اسے اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک اس کا دم نہ نکل گیا۔ ویسے وہ بڑے خوش مزاج آدمی تھے اور چھوٹے بڑے سب اچھی طرح پیش آتے تھے۔

چغتائی صاحب چونکہ پیدائشی کمزور ہوتے تھے اس لئے او بچوں کے مقابلے میں ان کی طرف والدین کی توجہ زیادہ رہتی تھی۔ لاڈ پیا میں پلے۔ کچھ گھر پر پڑھا، کچھ اٹاؤہ کے سکول میں۔ اس کے بعد علی گڑھ سے بی۔ اے اور ایل ایل۔ بی کے امتحانات پاس کئے۔ کالج ہی کے زمانے میں نواب مزل اللہ خان کے ہاں ملازمت بھی کر لی تھی۔ بیکونیک شادی ہو گئی تھی اور اخراجات پورے نہ ہوتے تھے۔ اسی زمانے میں مصر میں ٹکری بھی شروع کر دی تھی، بلکہ بچوں کی کہانی ”نقصیر صحر“ کا پہلا حصہ میٹرک پاس کرنے سے پہلے ہی لکھ چکے تھے۔ اس کے باقی دو حصے بعد میں لکھے۔ حنفی اور ذہین ہفت تھے جہاں کمزوری کی تلافی و مافی قوت سے ہو گئی تھی کالج کے زمانے میں اسلامی تاریخ کے سلسلے میں مذہب کا مطالعہ بھی کر ڈالا اور حدیث اور فقہ سب چاٹ گئے۔ علی گڑھ والوں کی طرح یہ بھی آزاد خیالی اور مغربیت کے دلدلاؤہ تھے۔ قدامت پسندی اور مذہبی خیال والوں سے ان کے مباختے رہتے گئے۔ انھیں اس میں بھی مزہ آتا تھا کہ دوسروں کو چھیڑیں، ستائیں، جلاہیں۔ حدیثیں از بر تھیں مستند کتابوں کے حوالے یا دتے۔ بڑے دھڑتے

سے قائم کر دیتے تھے۔ اس کے بعد یہ نوبت آگئی کہ تشرط لگا کر بحث کرتے تھے۔ شلا گئی مولانا قسم کے آدمی سے دائرہ دیکھنے نہ دیکھنے بحث تھکتی تشرط لگاتے کہ ”اگر حجت گئے تو ہم دائرہ دیکھ لیں گے اور اگر ہم جبر گئے تو تمہاری دائرہ میں نوٹ لیں گے بہت سے تشرط کی ذمیت ہی سے گھبرا کر بھاگ جاتے اور اگر کوئی جہت کر کے جم گیا تو سمجھو کہ اس کی شامت آگئی سب لڑکوں کو بیٹواتا دے دیا جاتا۔ شام کو ایک چم خفیر کی موجودگی میں بحث شروع ہوتی گئی جن میں کھولی جاتی، دلیل کی تصدیق یا تردید کی جاتی۔ آخر میں نہ جلنے کیا مرنے کا چھٹائی ہی ہمیشہ جیت جاتے۔ پھر کسی منہج کے مان سے شیعہ کا سامان منکا یا جانا اور نہایت احتیاط سے دائرہ میں نوٹ کر محفوظ کر لی جاتی۔ اس طرح انھوں نے کئی دائرہ جیاں جیتی تھیں۔ ایسا ہی مرنے کا منکا کہ جینی ہرنی و دائرہ بیچ دی جاتی تھی۔ وہ اس طرح کہ ہارے ہوئے مولانا سے اس کی کوئی مناسب قیمت لے لی جاتی اور ان کو دائرہ بخش دی جاتی۔ اس ”خاص“ سے بارگاہی مٹھا کی منگلتے اور سب کو شیرینی تقسیم کی جاتی۔ ایسے ہی ایک ملت میں چھٹائی صاحب ایک دفعہ ہار گئے۔ انھیں دائرہ دیکھنی پڑی۔ اس وقت کی ایک تصویر بھی تھی جسے میں نے ”کامران“ کے سرورق پر چھاپا یا تھا۔ خدا جانے پھر کیا کفارہ ادا کر کے اس سے بجات پائی۔

چھٹائی صاحب کی شادی رامپور کے ایک پٹھان گھرانے میں ہوئی تھی جو مذہب کا بڑی سختی سے پابند تھا چھٹائی صاحب نے شادی کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ بیوی کا رقعہ آتروا دیا اور انھیں کھٹے بندوں لانا لے جانا شروع کر دیا۔ اسی وضع سے انھیں اپنی سسرال رامپور بھی لے کر پہنچے تو وہ لوگ بہت بگڑے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ان کی اوس سسرال والوں کی قاتلی ہو گئی۔ مصیبت بھاری چکر چھٹائی کی! باب بھائیوں کو یہ زعم کہ ہماری لڑکی بھلا ہمارے گھنے سے باہر کیسے ہو سکتی ہے۔ راہروں کیلئے مرزا کو چاہے جان چلی جائے آن۔ جانے پائے۔ اڑ گئے کہ صاحب وہی ہو گا تو ہم کہتے ہیں۔ مگر پھر بچے ہوئے نہ گئے۔ ایسا ہرگز ہو ہی نہیں سکتا۔ کتنے براوری کے سب بڑے بوڑھے جمع ہوئے۔ صلوات ہوئی کہ لڑکی کو گھر بٹھا لیا جائے اور داماد صاحب کو بیک بینی و دو گوش روانہ کر دیا جائے۔ چنانچہ مرزا صاحب کدو یا گیا کہ ٹھنڈے ٹھنڈے پھرتے نظر ہے مرزا کسول گئے مگر کیا کرتے، بولے ”میری بیوی سے اور بچہ بیٹھے۔ اگر وہ بھی یہاں رہنا چاہتی ہیں تو خوشی سے رہیں میں جلد جاؤ اور اگر وہ میرے ساتھ چلنا چاہتی ہیں تو آپ تو آپ دنیا کی کوئی طاقت انہیں نہیں روک سکتی“ بابت معمول تھی۔ سمجھیں آگئی۔ لڑکی سے پرچھا تو وہ ٹیک بخت چارو ڈھکر کھڑی ہو گئی۔ اس غریب کو مرزا بھائی نا تھا۔ ماں باپ کے کھوے سے قحطی کب تک پیشی رہتی؟ گھروالوں نے کہا ”بی بی! ہماری بابت نیچے کے جبار ہی جو تو عجب کبھی اس دہلیز پر نہ آنا۔ آج سے تم ہمارے لئے اور ہم تمہارے لئے مر گئے“ وہ بچاؤں و حصاروں و دقتوں میں ان کے ساتھ ہوئی اور دونوں میکے نہ گئی۔

تعلیم سے فائدہ ہونے کے بعد چھٹائی صاحب نے کتاب قرآن اور پردہ ”لکھی۔ پھر چند سال بعد حدیث اور پردہ“ اور اس کے بعد ”صبر بعد“ رقص و سرود“ اسی حصے میں کچھ لوگوں کے کھانے اور کچھ اپنے تعلق جرات کی وجہ سے انھوں نے مذہب کی طرف سے اپنی توجہ ہٹا کر ادب کی طرف کر لی اور ۱۳۲۵ھ سے ان کے ادبی مضامین اور افسانے شائع ہونے لگے۔ جنوری سنہ ۱۳۲۸ھ میں ان کا افسانہ ”انگوٹھی کی مصیبت“ نیز نگ خیال کے سالنامہ میں شائع ہوا۔ اس افسانے کے چھپنے ہی ہمارے ادبی حلقوں میں ایک بھر پور سال گیا جس کو کھیر اس کی زبان پر اسی کا ذکر۔ بعد میں چھٹائی صاحب نے وہ بے شمار

خطوط مجھے دکھائے جو اس افسانے کے بارے میں ان کے پاس آئے تھے۔ بیشتر خطوط توصیفی تھے لیکن بعض خطوط عین سیاقی کیفیت کی روشنی میں افسانے کے بعض مقامات کی توضیح چاہی گئی تھی۔ بعض میں شعور اور لا شعور کی بحث کی گئی تھی۔ ایک خانوں نے بوجھا کہ میر جب بیرون سے پوچھتا ہے ”بھولوگی تو نہیں“۔ بھولوگی تو نہیں..... بھولوگی تو نہیں.....“ تو اس میں جو دفعے ہیں کیا آپ بتائیں گے کہ بہ لذت افسانہ سے مغلوب ہونے کے ہیں؟ چنانچہ صاحب بولے ”ہمیں آج تک یہی نہیں معلوم کہ لذت افسانہ کیا ہوتی ہے۔“ چنانچہ ہم دونوں نے لغت میں اس کے معنی دیکھے۔ اور چنانچہ صاحب ہنس کر میر سے تو ہم میں بھی یہ بات نہ آئی تھی۔ لوگ بھی کیسی کیسی توضیحات کر لیتے ہیں!

اس افسانے کے بعد چنانچہ صاحب کے چند اور افسانے دوسرے رسالوں میں چھپے مگر وہ اس طرز کے نہیں تھے۔ اس سال اس سے بہتر اور کوئی افسانہ چھپا ہی نہیں۔ حالانکہ اس زمانے میں بڑے بڑے افسانہ نگار تقریباً سبھی زندہ تھے اور لکھ رہے تھے۔ اس کے کوئی ایک سال بعد میر سے پاس ایک خط علی گڑھ سے آیا۔ اس میں چنانچہ صاحب کا خط اور وہ افسانے خط میں برائے خاص تھا اور کس قسم بھی۔ ساقی دیکھنے کی خواہش بھی ظاہر کی تھی۔ ان کا خط پاکر نے حد توڑی ہوئی اور اسی دن سے ان سے ملنے کو جی چاہنے لگا۔ یہ افسانے تھے ”خوش چکر“ اور ”گولڈر“۔ دوسرا افسانہ بہت مشہور ہوا اور جب ان سے پہلی ملاقات ہوئی تو ہم نے ضرور بنایا کہ ”گولڈر“ کا پورا ناول کیسے مرتب کیا جائے۔

مرزا صاحب کا پہلا خط ملنے کے بعد ان سے دس سال تک خطوط کا تبادلہ سلسلہ شروع ہوا کہ شاید یہی کوئی ہفتہ نافہ ہوتا ہو۔ ان خطوں میں دنیا زلمنے کی باتیں ہوتی تھیں۔ اور جب خطوں سے جی نہ بھرتا تو وہ دلی چپے آتے یا مجھے ان کے پاس جانا پڑتا۔

پہلا خط مجھے کے دو تین ہی مہینے بعد ان کا خط آیا کہ میں دلی آ رہا ہوں اور رات کی فلاں گاڑی سے، یہی بھی سنا ہوں گی۔ مرزا صاحب کی تصویر ہم سب دیکھ چکے تھے۔ رات کو میں، انصاری، اوفضل حق قریشی انھیں لینے سٹیشن پہنچے دلی آئی، ایک ایک ڈبہ چھان مارا چنانچہ صاحب کا کہیں بیڑ نہ چلا جب گاڑی بالکل خالی ہو گئی تو ہم سٹیشن سے باہر نکل آئے۔ سامنے مرگ پر سے ایک ٹانگہ گذرا۔ اس میں ایک خانوں اور ایک صاحب دکھائی دئے۔ فضل حق نے کہا: ”وہ حارثہ جو چنانچہ صاحب آپس سے اور انصاری نے چونک کر انھیں دیکھا۔ کوئی بڑا حیران یا سا آدمی تھا۔ موٹی سی عینک لگاے، پھر ہم سب ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس پڑے۔ اگلے دن صبح میں گھر ہی میں تھا کہ اطلاع پہنچی ”چنانچہ صاحب مردانے میں آئے بیٹھے ہیں“ میں لپک کر پہنچا تو دیکھا کہ عینک میں وہی ٹانگے والا بڑھا بیٹھا ہے۔ غور سے دیکھا تو اسے تصویر سے کچھ مشابہ پایا۔ اس نے کہا ”آپ میں شاید صاحب“ میں نے کہا ”جی ہاں“ اور وہ مجھ سے جھپٹ گئے۔ بولے ”اماں میں تو سمجھا تھا کہ کوئی خوفناک شکل کا مولی ہوگا۔ مولی سٹا ہر احمد، تم تو اچھے خاصے آدمی ہو“ پھر خوب ہنسنے تو میں نے دیکھا کہ نیچے کے جاودانت غائب۔ زرد چہرہ، آنکھوں کے کونوں پر بے شمار جھریاں، کچھ پچکے ہوئے۔ جوتوں کے دونوں طرف قوسیں۔ لبوں پر لاکھا سا جھرا۔ چھوٹی چھوٹی کمری ہوئی منجھیں، داڑھی صاف، دہلا ہنکا سا شخص عینک کے موٹے موٹے شیشوں میں سے مجھے سمجھا کہ ہاں ہے۔ میں نے کہا ”مرزا صاحب! آپ اپنی تصویر سے بالکل نہیں ملتے بالکل رات کو آپ کو مانگے میں جاتے دیکھا مگر میں نے

آپ کو نہ پہچانا۔ کہاں ٹھہرے؟ کہاں کہاں ہیں؟ میرے گھر کا پتہ تو آپ کو معلوم ہی تھا۔ یہاں سیدھے کیوں نہ چلے آئے؟“ بولے۔
 ”میں نے بھی نہیں اسٹیشن پر دیکھا تھا کہ تمہیں جانا نہ تھا۔ طبیعت کا بچ میں میری ایک بہن ہیں، ان کے یہاں چلا گیا۔ اب تمہارا گھر کھینچا۔
 شام کو آجائوں گا بھری کر لے کر“ اس کے بعد ان سے رسالوں اور مضمون نگاروں اور مضمونوں کی باتیں ہوتی رہیں۔ اندازہ ہوا کہ
 مرزا صاحب کی قوت گوئی بھی بہت بڑھی ہوئی ہے۔ دوسرے کو بلاں ہوں سے آگے بڑھنے کی رحمت نہیں دیتے۔ مگر باتیں اتنی
 دلچسپ کہ گھنٹوں سناؤ اور جی نہ بھرے۔

شام کو مرزا صاحب حسب وعدہ منہ یکدم کے آگے رات کو سب احباب جمع ہوئے اور خوب فیضہ چھی رہے۔ بات
 گئی احباب رخصت ہوئے تو ہر سونے کے لئے بیٹھے، مرزا صاحب، میں اور میرے منجھ بھائی۔ مرزا صاحب بولتے رہے میں سننا
 رہا۔ وہ بولتے رہے، میں سو گیا۔ صبح اذانوں کے وقت انھوں نے آپ ہی آپ پھر بولنا شروع کر دیا۔ دیکھا کہ ہوں ہاں غائب
 ہے تو میرا شانہ ہلا کر بولے: ”ارے بھی تو میرا انصرون کا پوتا آخر ایک نیک خواب دیکھتا ہے گا؟“ ناچار جاگ کر ان کی باتیں
 سننے لگا۔ بولے: ”سنئے ہو، میں ابھی بیت الخلا گیا تو ایک افسانے کا بلاٹ سمجھ میں آ گیا۔ آج جانے سے پہلے تمہیں ہم وہ افسانہ
 لکھ کر دے جائیں گے۔ لوں اب اٹھ بیٹھو منہ ہاتھ دھو ڈالو“

اتنے ہی کرتا رہوں اور افسانہ سننے چلتا؟ صاحب نے اٹھا افسانہ لکھ ڈالا۔ نشتے کے بعد کوئی صاحب ان سے
 ملنے آئے۔ میں گئی۔ کوئی گھنٹہ بعد کے بعد آیا تو ان کے پاس افسانہ مکمل تھا اور وہ میرے منجھ بھائی سے بیٹھے باتیں کر رہے
 تھے۔ وہ پولیس کے آدمی، ادب کے گھمبیلوں سے اللہ نے انھیں محفوظ رکھا تھا۔ بولے: ”یو ماں سمہار انھیں۔ خوب آدمی
 ہیں تمہارے چچا کی صاحب بھی معیاں غضب خدا کا، ساری رات باتیں کرتے رہے تم دونوں! وہ جب سوئے تھے تو ہم
 باتیں کر رہے تھے۔ باب جاگے تو ہم باتیں کر رہے تھے۔ سمجھے کہ ہم ساری رات ہی باتیں کرتے رہے۔ مرزا صاحب اس لطیفے سے
 بہت محفوظ ہوئے۔

اس کے بعد انھوں نے اپنے افسانے کی شان نزول بتائی کہ ”کل جو تم نے مجھے اسٹیشن پر نہیں پہچانا تو خاصی پریشانی ہوئی مگر وہ
 میری تصویر مجھ سے نہیں ملتی۔ اور بھی وہ تصویر کس کام کی جو محل سے مل جائے؟ یہ افسانہ اپنی تصویر پر لکھا ہے۔ اس کا عنوان ہے: ”کس
 کی تصویر ہے؟“ اس کے بعد انھوں نے افسانہ سنایا۔ حیرانی ہوئی کہ نظم برداشتہ ایسا سنگستا افسانہ! اور اس کے بعد انھوں نے ان کی یہ
 کیفیت دیکھی کہ باتیں کرتے جا رہے ہیں اور افسانہ بھی لکھ رہے ہیں۔ حالات میں مخدوم بھی مٹی کر رہے ہیں اور افسانہ بھی لکھا جا رہا ہے
 اور بعد میں معلوم ہوا کہ اس افسانے کے کچھ دوق تو گھرا گئے اور کچھ مزم کی شکل میں لک کر حالات کے فائنل میں چلے گئے۔
 ایک دفعہ اپنی دکات کے زمانے میں مجھے جو جو ملا یا۔ مل نے لکھا: ”اگلے ہفتے آؤں گا۔ کچھ دوق سے ملنا جاؤ تو لکھے۔“
 خط آیا یہ اور کچھ لاؤ یا نہ لاؤ، پائے ضرور لانا۔ ”میں ہر گز نہیں کھائے ہوئے۔“ دوق سے جو وہ پور کوئی جو میں لکھنے کا راستہ تھا میں نے
 سوچا کہ پائے لے جاؤں گا، جاؤں گے دن ہیں، خراب نہیں ہوں گے۔ اتفاق سے ایک عزیز بچہ پور کے آئے ہوئے تھے۔
 انھوں نے کہا: ”اسٹیشن ہی پر دھرتے جاؤ گے۔“ جہ پور، جو وہ پور کسی ہندو ریاست میں لگے نہیں ہوتی۔ اور لینے کے دینے پر چسپ
 اس لئے ارادہ ملتوی کر دیا مگر جو وہ پور پہنچتے ہی مرزا صاحب نے پہلا سوال ہی کیا: ”پائے لائے تمہارے لئے؟“ میں نے نہ لائے کی وجہ

بتائی تو بولے: ”اے بھئی ہم دیکھیں ہیں، اگر نرم پڑے جاتے تو ہم نہیں جڑ مانے، دسے کہ تھیرا لانے، ابھی ہمارے ایک موکل کی کار کی کھڑے ایک گھوڑا مانا سے ہو گئی تھی۔ ان محترمہ کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ عدالت نے بارہ روپے جڑ مانہ کیا، میں نے کہا: ”آپ کی کالت یہاں کچھ چلی بھی رہی ہے؟“ کہنے لگے: ”کیوں نہیں؟ ہمارا رجسٹر دیکھو“ یہ کہہ کر اپنا رجسٹر نکال کر دکھانے لگے۔ کسی سے پیشگی پانچ وکسی سے دس وصول ہوئے تھے۔ پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ باقی میں ڈال رکھے تھے بہت تنگ کر دئے۔ پچھینے چاہیں دوپے کی آٹنی ہوئی، پچھو ہٹا یا میں ہیں“ میں نے کہا: ”مانسا اٹھ سو پل رہی ہے“ بولے: ”میں انم یافت کو دیکھتے ہو، لٹا یا کو دیکھو، ہزاروں پر تو بت ہے، ہزاروں پر یہ کوئی موکل آگیا تو جو دھڑی سنی کو لا کر کہا: اس سے کہہ دو کہ وہیل صاحب کے پاس کام بہت ہے۔ کل کپڑی میں ملے۔ اے تم جیتے نہیں ہمارے دوست وتی سے آئے ہوئے ہیں۔ موکل تو اور بھی آجائے گا۔ یہ کب کا ہٹا آئے ہیں“ اور پھر رز صاحب کی ویسپ بائیں شروع ہو جائیں اور باتیں ختم ہونے نہ پائیں کہ وہ اپنے کسی ناول کا مسودہ سنانا شروع کر دیتے۔ اس زمانہ میں انھوں نے ایٹاناولٹ ”وہ پیاڑ“ لکھا تھا۔ بولے: ”میں پڑھنا ہوں، تو اس کی زبان بھیک کرنے جاؤ“ میں نے کہا: ”آپ کی زبان ایسی نہیں ہوتی کہ میں سے بھیک کروں“ کہنے لگے: ”نہیں، مجھے اپنی کمزوری معلوم ہے۔ میں زبان کا بالکل خیال نہیں رکھتا، بس لکھے چلا جاتا ہوں“ ”میں نے کہا: ”تو اب یہ مسودہ مجھے دے دیجئے، میں اس کی نظر ثانی کر دوں گا“ کہنے لگے: ”ابھاسن ڈو۔ ابھی مکمل کہاں ہوئے۔ پلاٹ اگر ایک جگہ آگیا ہے۔ آگے نہیں چلتا“ پھر دو گھنٹہ تک وہ سنانے سے۔ اور مسودہ ختم ہو گیا۔ پوچھنے لگے: ”بتاؤ اب ختم کیسے کریں؟“ میں نے کچھ بتایا، ان کی کچھ میں لگیا، بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے: ”بس بھئی کل کی روایتی مٹری کر دو تو ہم اپنا بارہ ناول مکمل کر کے تمہیں دے دیں گے۔ اس قدر لیا جت سے دو کہنے تھے کہ مجھے شرمندگی ہونے لگتی تھی۔“ انھیں نیند بہت کم آتی تھی۔ رات کو بارہ ایک گھنٹہ جاگتے تھے۔ اس لئے میں صبح سات آٹھ بجے تک اٹھتا تھا۔ پھر دوپہر کو ضرور سوتا تھا۔ غرض میں تو سوتا ہی رہا اور انھوں نے ”ویلیاڑ“ مکمل کر دیا اور وہ ایک افسانہ بھی لکھ کر بیٹھا دئے۔

چھٹائی صاحب کے اور سب عزیزوں کو دیکھ کر کہنا پڑا کہ: ”اب خانہ تمام آنا اب است“ بڑے بھائی ملے تو بن سندر و تو انا معلوم ہوا کہ آپ بھی تھم ڈکلاس دیکھیں۔ نیچے کے چار وائٹ غائب۔ مرزا صاحب سے چھوٹے بھائی ملے۔ نری الجندہ مرزا جا صوفی نیچے کے چار وائٹ غائب۔ ان سے چھوٹے بھائی بالکل چھٹائی صاحب کی شکل کے گرا چھوٹے بھائی ملے۔ آپ کیا کرتے ہیں؟ فرمایا: ”مہنا ہوں“ نیچے کے چار وائٹ غائب۔ سب سے چھوٹے بھائی مذہبی سب سے بڑے۔ مانسا اندر دوزار، یہ لبتا تو گنگا جوں معلوم ہوا کہ آپ کو روئے ہے۔ نیچے کے چار وائٹ غائب۔ تھیرے نہ رہا گیا، میں نے مرزا صاحب سے پوچھا: ”یہ کیا مصیبت ہے کہ سب کے چار چار وائٹ غائب؟“ کہنے لگے: ”آپ وائٹوں کے ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ انہی چار وائٹوں سے پورا رہا ہو تا ہے۔ بس سب اکٹھا ڈاکٹر دوائے؟“ جب مصیبت چھٹائی میں تو سب سے پہلے میں نے یہی دلچسپی کہیں ان کے بھئی چار وائٹ تو غائب نہیں؟ پھر اعدان کے سارے وائٹ برقرار تھے۔

ایک دفعہ پھر خط لکھا کہ ”ملے کو بہت جی چاہئے ہے۔ آجاؤ۔ کسی کے نوکر فقور دی ہو۔ تم آؤ گے تو تم سے ڈس کس کر کے کئی افسانے لکھیں گے“ میں پہنچا صحت پہلے سے بدتر تھی۔ کھانسی زیادہ تھی۔ میں نے کہا آپ اپنی صحت کی طرف سے غفلت کر رہے ہیں۔ کہنے لگے: ”ڈاکٹر کہتے ہیں نہیں وتی ہے۔ میں کہتا ہوں مجھے وتی نہیں دہم ہے“ ان کی حندی طبیعت نے ڈاکٹروں کی دوائے ماننے

سے بھی انکار کر دیا تھا۔ من مانی و دوائیں کھاتے رہتے تھے۔ گھروالوں میں سے بھی کسی کی نہ سنتے تھے۔ بلکہ جو کچھ کوئی کہتا وہ بدکردار کے خلاف کرتے اور تکلیف اٹھاتے۔ بھائی بھی ان کی خدمت سے پریشان ہوتی خلیں گمران کی ایک بھی پیش نہ جاتی تھی۔ بھاری خاموشی سے سارے گھر کا کام بھی کرتیں، بچوں کی نگہانی اور پرورش بھی اور شوہر کی خدمت بھی۔ اور کیا مجال جو کسی پیشانی پر شکن تک آجائے۔

دو تہی انسانے تو جیتنا فی صاحب میرے لئے پیسے ہی سے کھہر رکھتے تھے۔ کئی افسانوں کے انھوں نے پلاٹ سنائے سب اچھے، ایک سے ایک عمدہ۔ ایک مارواڑ کا رومان منایا۔ سوانہ کی رو میں۔ سب سے زیادہ مجھے پسند آیا۔ کہنے لگے ”تو لاؤ بیٹے اسی کو کھہر ڈالیں، اور کاغذ قلم لے کر کھٹا شروع کر دیا۔ میں بیٹھا واقعی کھیاں مازا دیا کیونکہ اس سال دہلی میں دینا کی کھیاں اٹھی تھیں۔ ایک گھنٹہ میں انھوں نے کئی صفحے لکھ ڈالے، پھر بولے ”میاں بڑھکیل چکے۔ تو ذرا اب تم قلم دو میرا تھک گیا“ میں نے قلم سنبھالا۔ وہ بے تکلف بولتے رہے میں کھٹا رہا۔ دو تین صفحے لکھ کر میں نے کہا ”بس جی میں تو لکھ چکا۔ مجھے تو نیند آ رہی ہے۔ مرغی کھانے کھلانے جو نوسونے ہی دو“ کہنے لگے ”اچھا تو چھروانی لگا کر سو رہو۔ عصر کے وقت انھوں نے جگایا ”کیا آج چائے نہیں پیو گے؟“ اٹھنا پڑا، بولے ”افسانہ ختم پر آ رہا ہے۔ شام تک ختم ہو جائے گا“ میں تو جاری کر کسی کے ساتھ لگ گیا۔ مرزا صاحب بیٹھے کھتے رہے چوراج علی گھر والیں بہتیا تو بڑے خوش خوش بیٹھے ہوئے تھے۔ کہنے لگے ”تو بھئی یہ افسانہ“ اور کوئی چالیس فی ایک سو کا بلندہ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے کہا ”شائیں ہے مرزا صاحب آپ کی سمجھت کہ۔ بس کل صبح کی گاڑی سے میں جلا جاؤں گا“ جانے کے نام سے ان کا مڑا اڑ گیا۔ کہنے لگے ”نہ جانے کیا بات ہے تم آج ملنے جو تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں جانا نہیں ہوں کل نہ جاؤ، تم نہیں دوا افسانے اور لکھ دوں گے“ انھوں نے یہ بات کچھ ایسے اندہ ناک لہجے میں کہی کہ میرا دل بھرا۔ میں نے کہا ”اچھا میں برسوں جلا جاؤں گا“ بچوں کی طرح خوش ہونے لگے۔ مجھے تو خودی دیر بعد خیال آیا کہ میرے پاس جیتنا فی صاحب کے تقریباً سو صفحے کے مضامین تو ہو ہی جائیں گے۔ اگر سو صفحے کے اور ہو جائیں تو ”چھٹا فی نمبر“ ہی کہوں نہ چھاپ دیا جائے۔ اتنے بڑے مضمون نگار اور ایسے پیارے دوست کی ایک ابھی یادگاری قائم ہو جائے گی۔ بس نے ان سے کہا کہ ”مرزا صاحب! تو پھر آپ یوں کیجئے کہ کل تو آپ مجھے جو کچھ لکھ کر دے سکیں ہے، میں اس کے بعد پندرہ بیس دن میں مجھے چھ مضمون اور لکھ دیجئے۔ میں ”جیتنا فی نمبر“ چھپا دیتا ہوں“ یہ تجویز انہیں پسند آئی۔ پوچھا ”ایک بھی جائے گا؟“ میں نے کہا ”نہ بننے کی کوئی وجہ نہیں“ کہنے لگے ”ایک صفحے میں نہیں سب مضامین پہنچ جائیں گے“ میں نے چند تجویزیں انھیں بتائیں کہ اس طرح کے مضامین ضرور لکھیے مثلاً ایک آدھ غمناک افسانہ، دو ایک مکالمے یا ڈرامے اور ایک مضمون یہ کہ ”میں مضمون کیسے لکھتا ہوں“ کہا ”یہ سب ہو جائے گا؟“

اگلے دن وہ مضمون تو انھوں نے لکھ کر دے دیے اور بیسیوں پلاٹ سنائے۔ پھر کہنے لگے ”کھتے کھتے میرا تھکناک جاتا ہے۔ اگر کوئی شارٹ پیسڈ میں کھتے والا دل جانے تو میں کی نا دل ہوں دوں“

اگلے دن صبح سویرے میں نے اٹھ بیٹھا۔ بستر لیٹنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ مرزا صاحب آگئے۔ انشوروی چہرے سے غامض تھی کہنے لگے ”ارے بھئی سنتے ہو، آج اور نہ مٹھ جاؤ، سارے مضامین ساتھ ہی نہ لیتے جاؤ؟“ دل کٹ گیا ان کے اس غلوں کو دیکھ کر میں نے کہا ”اگر آپ کو میرے مٹھ جانے سے خوشی ہوگی تو میں ضرور مٹھ جاؤں گا، مگر مجھے بیگوارا نہیں کہ آپ میرے لئے مرتے ہیں۔“

بندہ دن میں تو یہ مضامین لکھ جاتی تھے جو میرے پاس ہیں۔ باقی آپ پھر مجھے دہیجے گا، اسلئے اسے بھی تم نہیں جانتے کہ تمہارے بہاں جو نے سے میری کیا کیفیت ہے۔ کچھ کمنا ہوں میں بالکل ندرت ہو گیا ہوں۔ بھوک نہ لگی، خوراک نہ لگتی ہو گئی۔ جی چاہتا ہے کہ لکھوں اور لکھتا ہی ہوں۔ میں اس وقت سے ڈر رہا ہوں کہ تم چلے جاؤ گے تو مجھ سے ایک لفظ بھی نہیں لکھا جائے گا اور پھر بیماری مجھے دہیجے گی! میں نے ان کو ہلانے کے لئے کہا: اب تو آپ پہلے سے بہت اچھے ہیں۔ میں دلی جا کر چند یونانی مرکبات آپ کو کھجوں گا ان سے دہی بھی کمزوری بھی جاتی ہے گی۔ مگر وہ چھبکی سی ہنسی ہنس کر رہ گئے اور بولے: بس تو آج تم نہیں جا رہے؟ میں نے کہا: تھیں! جلدی جلدی بھائی سے جا کر کہا: شاہ صاحب آج نہیں جا رہے۔ آج انھیں جو پڑ کی سیر کرائی جائے گی۔ فرمائز انا ششہ کراؤ آج! ناشتے کے بعد کسی دوست کی کامرنگائی۔ شہر کا ایک چکر اس میں لگایا۔ پھر ایک پڑانا فلعہ دکھایا۔ ایک نیا عمل تیار ہو رہا تھا، وہ دکھایا۔ ایک عورت تھیں، ان سے طواہر دوہر کو گھر آئے، کھانا کھایا۔ باتیں کرتے کرتے میں تو سولگیا اور انھوں نے اتنی دہی میں دو چھوٹے چھوٹے ٹھنڈے لکھائے۔ کہنے لگے: آج رات کو تمہیں ٹھانا بھی سونایا جائے گا! میں نے کہا: آپ کو تو اس سے نفرت ہے۔ بولے: نفیس تو نہیں ہے۔ ایک ہندو بچہ لگا لگا ہوا ہے، اسے بلوایا ہے۔ وقت اچھا گذرا۔ صبح ناشتہ پھر کچھ روکنے کی تمہارا بھائی تھی کہ بھائی نے کہا: کیوں آپ انھیں پستان کرتے ہیں۔ گھوڑے پریشان ہوں گے کہ ان دنوں کو کہہ کر گئے تھے، آت چھو دن ہوئے! کہنے لگے: اسے صاحب یہ کسی کے ذکر تو نہیں نہیں کہ ان کی حاضری ضروری ہو۔ ہم یہاں سے ان کے گھر تارٹے دیتے ہیں۔ انھیں اٹھ کر بات کا کرکے؟ بھائی شاید کچھ اور کہتیں مگر میں مرزا صاحب کا چھ سال کا بچہ بنو بول پڑا تھا! ماں یہ دلی میں کیا کرتے ہیں؟ بھائی نے کہا: کچھ بھی نہیں! بچے نے کہا: تو پھر یہ کھاتے کہاں سے ہیں؟ ہم سب ہنس پڑے اور وہ بات بھی آرگئی۔ چلتے وقت مرزا صاحب نے کہا: وعدہ کرو کہ پھر جلدی آؤ گے! میں نے کہا: جب آپ یا د فرما میں گے حاضر ہو جاؤں گا!

نواب صاحب جاوہر خیر نہیں کب سے چغتائی صاحب کی قدر دانی پر مائل تھے۔ کچھ عرصے بعد سنا کہ نواب صاحب نے انھیں جاوہر بلا کر تہیف رنج بنا دیا۔ مرزا صاحب نے جاوہر بلا دیا۔ میں وہاں بھی گیا۔ نہایت عالی شان کوٹھی انھیں ملی ہوئی تھی۔ چغتائی صاحب بہت بڑے عہدہ دار تھے اور نواب صاحب کے مزاج پر بھی چڑھے ہوئے تھے۔ مجھے سمجھا کہ نواب صاحب سے کب ملے گا؟ میں اتنے بڑے آدمیوں سے نہیں ملتا جن سے مل کر مجھے دولت محسوس ہو! مرزا صاحب نے کہا: اسے بھی تمہارے دوا کے پورے قدر دان ہیں یہ نواب! میں نے بہاں لوگوں سے سنا ہے کہ نواب صاحب ایک دفعہ ایسے بیمار پڑے کہ ان کے جیلے کی اس نہری۔ انھوں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی بزرگ کہہ رہے ہیں۔ مولوی نذیر احمد کا ترجمہ قرآن شائع کر دو تم اچھے ہو جاؤ گے۔ انھوں نے تمہارے والد سے اجازت منگوائی اور دو جلدوں میں صرف ترجمہ اپنے چھاپے خانہ سے شائع کیا اور انھی اچھے ہو گئے۔ تو وہ تم سے مل کر بہت خوش ہوں گے! میں نے کہا: اور کچھ خبرات بھی مجھے دیں گے! مرزا صاحب نے کہا: تو پھر کیا پڑا؟ میں نے کہا: مجھے معاف فرمائیے، میں تو صرف آپ سے ملنے آیا ہوں۔ میرے تو نواب یا بادشاہ جو کچھ ہیں آپ ہیں! مگر مرزا صاحب نے میری اس بات کو کچھ پسند نہیں کیا اور دلی میں شاید کچھ نا راض بھی ہوئے۔

جاوہر میں مرزا صاحب کی سعادت اور بھی زیادہ خراب رہنے لگی۔ وہاں کی مرطب آب و ہوا سے ان کی سانس

کی شکایت اور بڑھتی اور صحت گرتی ہی چلی گئی۔ شناسیہ شکل سے دو سال جا ورہ میں رہے ہوں گے، ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ آپ جو دھپور واپس چلے جائیے ورنہ آپ یہاں بہت مہلکہ جا رہے گے۔ مرزا صاحب بیمار ہی کا فخر کر کے جو دھپور چلے آئے اور یہاں سے استعفیٰ بھیج دیا۔ وکالت کا کام پھر شروع کیا مگر بدن میں جان نہ ہونے کی وجہ سے وکالت ٹھس ہی رہی۔ اس لئے اپنی کتاب چھاپنے کا کام خود شروع کر دیا تھا۔

اب سے کوئی پچاس سال پہلے مولوی نذیر احمد صاحب نے ایک کتاب "اعمال الائمہ" لکھی تھی۔ یہ کتاب ایک دریدہ و زہن پادری کی کتاب کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ اس نے آنحضرت صلی علیہ وسلم پر بعض بڑے بے ہودہ اعتراضات کئے تھے جن میں خاص طور پر ازواج مطہرات کے مسئلے میں ناگفتہ بہ باتیں کی تھیں۔ اس کتاب کا ایک جواب سرسید احمد خاں نے لکھا تھا اور ایک مولوی نذیر احمد نے۔ یوں تو یہ کتاب شروع سے آخر تک ایک علمی اور تاریخی کتاب ہے اور اپنے مواد کے لحاظ سے نہایت قابل قدر ہے۔ لیکن مولوی صاحب نے احترام کے الفاظ کسی نام کے ساتھ اس میں نہیں لگائے ہیں۔ اور بعض جگہ فہرے بھی ایسے لکھ گئے ہیں جو زمان کے اعتبار سے چلے گئے ہی کیسا کیوں نہ ہوں، رسانی مقبول و اہل بیت کے ادب و احترام کے لحاظ سے قابل اعتراض سمجھے گئے۔ مولوی صاحب اس پر ایسا بیان کا جو اربوں پریش کرنے لگے کہ چونکہ ایک عیسائی پادری اس ساری کتاب کا مخاطب ہے، اس لئے ان کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ یہ تو صریح صریح ہوا غلط بیان اس سے بحث نہیں ہوتا یہ کہ ہمارے علمائے اس کتاب کو فتنہ انگیزی اور مولوی صاحب کو کافر قرار دیا۔ مسلمانوں کے ایک بڑے ذمہ دار ایڈیٹر نے رفع شر کے لئے اس کتاب کے سارے فتنے مولوی صاحب سے اپنی تحویل میں لے لئے۔ اور مولوی صاحب کی بنیاد جازت انصاف علماء کے جلسے میں لے جا کر علواً ابانہ منظر اس ناگوار واقعہ کے بعد مولوی صاحب تین چار سال زندہ رہے مگر انھوں نے ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ شائد اعمال اس کتاب کا فتنہ کتب سے میرے ہاتھ لگ گیا اور میں نے یہ سوچ کر کہ ایک اچھی کتاب سے مسلمان کیوں عروم رہیں، اسے جو کالوں چھاپ دیا۔ اس کا پتہ لکھا کہ پھر ہمارے علمائے اس کے خلاف تحریک شروع کر دی۔ حکومت پر زور ڈالا کہ کتاب ضبط کر لی جائے۔ حکومت کو بھلا کیا غرض پڑی تھی کہ خواہ غواہ اس جھگڑے میں پڑے، جب آدھ سے کامیابی نہ ہوئی تو مجھ پر بزرگوں سے دباؤ ڈالوا گیا۔ یہ بھی ناکام رہا تو قسطنطنیہ دھمکیاں دی گئیں اور ہر شہر میں اور تلی میں اس کے خلاف جلسے ہونے لگے۔ چیختا چیختا صاحب نے مجھے جو دھپور سے لکھا کہ ساری کتاب مجھے بھیج دو اور اعلان کر دو کہ کتاب میرے پاس ہے جس میں ہمت ہو مجھ سے لے لے۔ میں نے انھیں دوسرے جلد بھیج دیں کہ محفوظ ہو جائیں۔ اور کتاب کی اشاعت روک دینے کا اعلان کر دیا۔ مسلمانوں نے مجھے نہ صرف معاف کر دیا بلکہ خوش بھی ہوئے کہ جلد غلطی انسان ہی سے ہوتی ہے۔ یہ کیا کہم ہے کہ کتاب کی اشاعت بند کر کے اس نے اپنا مالی نقصان کر لیا۔ آدھ مرزا صاحب کی ضدی طبیعت نے زور مارا اور انھوں نے ایک مرکز "الغلاب" لاہور میں چھپوا دیا کہ "اعمال الائمہ" شاہد احمد کے پاس اب نہیں ہے، میرے پاس ہے جس میں ہمت ہو مجھ سے لے لے، بلکہ مسلمانوں کو چاہیے کہ مجھ کا شکریہ ادا کریں اور انھیں دیکھیں۔ اس کے چھپتے ہی بس آگ ہی تو لگ گئی۔ پندرہ دن بعد مرزا صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ جو دھپور کے مسلمانوں نے ان کے گھر کو گھیر لیا اور زبردستی ان سے ساری کتابیں لے گئے۔ اس کے بعد وہ کچھ

جا رہے تھے زود چارہ معاشرہ نے ان پر لکھنویوں سے حملہ کیا اور ان کے ایک ہاتھ میں سخت ضرب آئی۔ مرزا صاحب نے کھانا بھاری ٹیٹوئی ہوئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ باؤر مسلمانوں کے جلسہ عام میں نوکر کو اور انرا اسلام کو روکنے کا فریاد اور قتل کرنے کا جواز دے۔ سارے شہر میں لگ بھگ ہوتی تھی۔ لاکھوں میں سے کتنا ہوں کہ کتاب میں نے نہیں لکھی، دلی والے نذیر احمد نے لکھی تھی مگر سب یہی کہ نہیں فرم نے لکھی ہے اور اس میں تم نے سب کو گالیاں دی ہیں۔ چنانچہ مصوٰت اسی میں بھی کہ اپنے آپ کو کہاں کے علماء کے حوالے کر دوں۔ علمائے ایک بڑے جلسے میں لے گئے۔ چھپرے سب کے سامنے توبہ کرائی، مجھے کلہ پڑھوایا اور دوبارہ مجھے مشرت بہ اسلام کیا۔ تب کہیں جان بچی خیر مجھے اس تکلیف اور رسوائی کا بھی اتنا افسوس نہیں، مگر بے حد رنج ہوا اور شرم آیا یہ دیکھ کر کہ وہ دوسو عہدیں جو تم نے مجھے بھیجیں اور مجھے سے مولوی زبردستی چھین لائے تھے، اس جلسے میں جلانی گئیں۔ افسوس کہ پچیس تیس سال میں مسلمانوں نے کوئی ذہنی ترقی نہیں کی۔“

ایک دفعہ مرزا صاحب کا سخت اصرار ہوا کہ خود بھی آؤ اور بھائی کو بھی لے کر آؤ۔ تعیل اشت دلی گئی۔ اب کے جو شخص دیکھا تو بڑا دکھ ہوا۔ ان کے پاؤں رہ گئے تھے اور چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے۔ بنجارہ وقت رہتا تھا۔ کھانسی بہت بڑھی ہوئی تھی۔ سو کہہ کر قاتل ہو گئے تھے۔ مگر دماغ اسی طرح روشن اور مزاج اسی طرح بکاش تھا۔ خوش تو ہمیشہ ہی ہوتے تھے۔ اب کے بہت خوش ہوئے۔ بولے: ”دیکھو! ابھی تم آگے ہو اور ابھی ہماری بیماری جاتی رہی۔ مرزا صاحب نے کہا باقی کرتے ہے۔ ہشتے رہے، ہنساتے رہے۔ ایک نالی شراب، کھانا شروع کیا تھا مگر چند باب ہی لکھ سکے تھے۔ اس کے پچھڑے سناٹے اور چھاپنے کے لئے مجھے دئے۔ رات کو جب دسترخوان بچاؤ لکھ کر سامنے بیٹھ گئے۔ بھائی وہاں سے چھین کر آپ کو کچھ نہ کھانے کا کئے گئے۔ کھانے کے تو ہم ضرور۔ اب ہم بالکل تھیں، کوئی بیماری نہ تھی۔ مجھ سے کہتے جلتے تھے۔ ارے بھئی یہ میں ہی دو۔“

بھائی جھلاتی تھیں مگر وہ اپنا کام کئے جاتے تھے۔ کھانا نوجوان سے کیا جانا خود مرزا صاحب چکھ لیا۔ بارہ ایک بجے تک باقی کہتے رہے۔ صبح جب مرزا صاحب کو دیکھا تو ان کی حالت غیر تھی۔ معلوم ہوا کہ سخت بد تھی ہوئی۔ رات بھر اکتے اور ڈالتے رہے۔ طبیعت نکل گیا۔ اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ آواز بھی نہ نکلتی تھی۔ دو دن میں طبیعت کو منجھل گئی تھی۔ ہم بازار سے گھوم پھر کر آئے تو کھانے کے سارے پلنگ پر بیٹھ ہوئے تھے۔ بڑے زور افسانہ تھا۔ رے سے لکھا ہے۔ پڑھ کر کسٹنا یا۔ حنون تھا۔

”دیکھ کر ڈول۔“ میں ہنس رہا تھا، مرزا صاحب بھی ہنستے جاتے تھے۔ مجھے کیا خبر تھی کہ یہ ان کا آخری افسانہ ہے، اور میرے لئے ان کی یہ ہنسی بھی آخری! اگلے دن میں وہ ایسا جانا تھا۔ رات کو باقی کرنے کہتے میری بیوی سے بولے ”آپ کا آنا اب سے وقت میں ہوا کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے“ پھر ایک اپنا چھپا ہوا لیٹرا فاما لاداس میں کچھ لکھ کر انھیں دیا کہ اسے قبول کر لیجئے۔ انھوں نے پھر کمری طرف بڑھا دیا۔ مرزا صاحب نے کتاب کو لٹار، ”لاحتی تصنیف ان کے نام منتقل کرو یا تھا۔ میں نے کہا یہ نہیں ہو سکتا۔ ہم آپ کے بچوں کی حق تلفی ہے“ کہنے لگے۔ تم خاموش رہو جی تعین ٹھوڑی دے رہے ہیں“ نہیں مانے اور زبردستی وہ کاغذ میری بیوی کے ہاتھ میں رکھ دیا۔

مرزا صاحب کی صحت گرتی ہی چلی گئی۔ ان کے خطوں سے ان کا حال معلوم ہوتا رہتا تھا۔ اس کے بعد ایسے خط آنے شروع ہوئے جہاں ان کے اپنے ہاتھ لکھے ہوئے نہیں ہوتے تھے۔ پھر ایک دن ان کا خط ملا کہ آخری بار اگر ل جاؤ، کچھ پلا

بیٹے آنا۔ میں نے روٹنگی کا تار دیا اور رات ہی کی گاڑی سے چل پڑا۔ اسٹیشن پر ان کے چھوٹے بھائی آئے تھے۔ میں نے پوچھا۔
 ”چیتا صاحب کا کیا حال ہے؟“ بولے ”وہی ہے“ مسجد میں نہ آیا کہ وہی ہے کا کیا مطلب ہے۔ گھر پہنچے تو دیکھا کہ ان کے ہاتھ کے مکروں میں سستا نا، نہ بھائی نہ بچے۔ ایک کمرے میں ٹینک پر لحاف اور اسے چیتا کی صاحب پرٹے تھے۔ پاس کوئی نہیں تھا۔ میں نے آواز دی اور سلام کیا تو منہ پر سے لحاف ہٹایا۔ مجھ پر پھلی گر پڑی۔ مرزا صاحب کے بدلے ایک سکھ دکھائی دیا۔
 کڑ بڑی وار بھی موٹھیں اور بڑے ہونے سر کے بالوں پر ایک رومال بندھا ہوا۔ پیلا چہرہ، پھینک پھینک لہجہ، لحاف ہٹا تو اس میں سے بدلو کا ایک بھکا آیا۔ بالوں کے نیچے پانی کے پیالے رکھے ہوئے تھے، ٹھنڈے ٹھنڈے چیرے پھر پھر سے تھے۔ میں رونے لگا۔
 وہ بھی آب ویدہ ہو گئے۔ میں نے کہا ”یہ کیا حالت ہو گئی؟“ بولے ”بس اب ختم سمجھو“ پھر ایک دم سے مسکرتے اور کہتے ہوئے بولے ”اسے اسے آپ کو دیکھئے“ اور لحاف میں سے ایک چیرے نا چٹکی میں کچا کر نیچے پھینکا۔ رونے سے پیسے ہی اپنا حقہ لینے چلے آئے۔ اتنے میں اندر کے صبح کا ایک دروازہ کھلا اور ان کی والدہ اندر آئیں۔ بولیں ”مٹے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟“
 مرزا صاحب نے کہا ”یہ شاہد صاحب آئے ہیں، انھیں پیسے چاہئے پورا“ ”جی“ اناں چلی گئیں تو ان کی باتوں سے معلوم ہوا کہ اب صرف امان ہی ان کا خیال رکھتی ہیں۔ ماشاء اللہ بھرا بڑا گھر تھا کوئی ان کے پاس نہ آتا تھا۔ میں نے کہا ”بھائی! اور کچے کہاں ہیں؟“
 بولے ”رام پور؟“ میں نے کہا ”وہ کیوں؟“ کھنکھ گئے ”یہی کو میری خدمت کرنے کو تھے خود حق ہو گئی۔ میں نے ان سے بار بار کہا کہ تم یہاں سے چلی جاؤ ورنہ تم بھی مر جاؤ گی۔ گردہ نہ مانیں۔ جب میں نے دیکھا کہ میں تو مری رہا ہوں اور اگر کہ یہ یہی گئیں تو یہ بھی مر جائیں گی، تو میں نے ان سے کہا ”اگر یوں نہیں جاؤ گی تو ہم تمہیں طلاق دے دیں گے۔ وہ پھر بھی نہیں گئیں۔ میں نے ان سے کہا ”وہ کیا کہ آپ کو ہم نے طلاق دے دی، آپ یہاں سے تشریف لے جائیے، تو انھوں نے کہا ”آپ کے طلاق دینے سے کیا ہوتا ہے۔ ہم نے طلاق نہیں لی۔ تم یہاں سے نہیں جائیں گے۔ آخر میں نے تنگ آکر ان کے میکے والوں کو خط لکھا کہ اپنی لڑکی کو اکر لے جاؤ، میں نے اسے طلاق دے دی ہے۔ خط کے پہنچنے ہی ان کا بھائی آدھکا اور زبردستی اپنی بہن کو یہاں سے لے گیا۔“
 میں نے کہا ”یہ آپ نے اچھا نہ کیا۔ ساری عمر کی خدمت کا آپ نے یہ صلہ دیا انھیں“ کھنکھ گئے ”بھائی! اگر وہ یہاں رہتی تو قحی مر جاتی۔ ان کے پچلنے کی اور کوئی صورت ہی نہیں تھی، اور اُن سنو، اصل میں طلاق ہوئی نہیں ہے۔ مگر ان کے گھر والوں کو بس جانتا تھا کہ ایک خط میں ہی اکر لے جائیں گے۔ بیوی نے بہت کہا مٹی یہ طلاق نہیں ہے مگر ان کے بھائی نے کہا ”جب انھوں نے ہمیں لکھ کر یہ بھیجی یا تو اکر نہیں ہوئی تھی بس بھی ہو گئی۔“

اس کے بعد ان کی اماں اور بھائی اور صحت چیتا کی سے باہر کرنے معلوم ہوا کہ ہماری نے مرزا صاحب کے دماغ پر عجیب طرح کا اثر ڈالا ہے کہ انھیں دوسروں کو تکلیف پہنچا کر کھٹک آتا ہے۔ مثلاً بھائیوں بھائیوں کو لڑوا دیں گے کسی پر چوری کا الزام لگا دیں گے۔ طبیعت سے گھر گھر کوئی ایسی بات کریں گے کہ دوا دمی اچھو جائیں۔ ہم سب نے تنگ آکر ان کی طرف کا ناجائز چھوڑ دیا۔ بس ماں کی ہی مانتا ہے جو برداشت کر رہی ہے۔ میں نے کہا ”مگر اب تو ان کا بڑی وقت ہے۔“
 ”کے دن جنہیں کے پچاڑے“ مگر سارے بھائی بہن ہی کہتے تھے کہ ”یہ نہیں مریں گے۔ کتنی ہی دفعہ ہر چاہے کہ مٹے بھائی مر رہے ہیں، مٹے بھائی مر رہے ہیں۔ سب بھاگے بھاگے آئے اور وہ نہ مرے نہ مرے۔ پھر اچھے خلعے ہو گئے۔“ اس گھوٹ میں دل

رہتا ہے، جبرن ہو گیا، عجیب بے کسی کی زندگی تھی۔ گرم گرم بخار چڑھنے، پنڈا جھلکتا رہتا۔ ہڈیاں ناک سوکھ گئی تھیں۔ کھانسی کے مارے سینے میں سانس نہ سمانا تھا۔ پاؤں بالکل بے کار ہو چکے تھے۔ گرد و مائع روکشن تھا۔ کوئی تیار دار نہیں۔ پیسہ کوڑی پاس نہیں۔ نہ جانے کس وقت دم عمل جائے۔ گھر والے تو مٹھلی ہیں کہ یہ مرتے ہی کے نہیں، میں نے جی میں کہا: اللہ تیری نشان ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس نے دنیا کو منسا یا اور مرتے کے بعد بھی ہنسنا رہا ہے۔ اور اس عذاب میں مبتلا: تو ہی اپنی مصلحتوں کو خوب جانتا ہے۔ ”جب میں ان سے نصیحت ہونے لگا تو بات نہ بڑھا یا اور میرا فائدہ اپنے کام تھا میں نے لیا۔ میں دور رہا تھا۔ وہ بھی روئے ہر تھے میں نے کہا: یہ روئے رکھ پیسے نہ پوچھنے لگے۔ کہتے ہیں؟ میں نے کہا: دوسری میں۔ اگر زیادہ کی ضرورت ہو تو میں ولی پہنچ کر اور بھیدوں کا۔ بولے: ”بہت ہیں تنگے کے نیچے رکھ دو“ خدا سنا دیا کہہ کر میں آنسو پونچھتا باہر چل آیا۔ پھر ان کی صورت دیکھنی نصیب نہیں ہوئی۔ مٹا یہ دو ہفتے گزرے ہوئے تھے کہ ان کے انتقال کی خبر ملی۔ میں نے کہا: ”لو جنتی وہ مر گیا جو فرما نہ تھا:“

اِنَّ اللہَ وَاَنَا الیہِ مارجعون “

منسو ماموں کی موت

حامد جلال

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ منسو ماموں میانی صاحب کے قبرستان سے اٹھ کر گھر چلے آتے تو میں ان سے کیا کہوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ میں ان کی حیاتِ ثانی کے مجھے نہ کو نظر انداز کر کے ان سے صرف آنا کہوں گا۔ منسو ماموں باآپ نے آج تک جتنی غیر ذمہ دارانہ حرکتیں کی ہیں ان میں سب سے زیادہ غیر ذمہ دارانہ حرکت آپ کی موت ہے۔

بہاول پور میں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان کرکٹ کا دوسرا ٹیسٹ میچ ہو رہا تھا اور میں ڈنگا سٹیڈیم میں بیٹھا طالع یا رخصاں کو شیخ کا چشم دید حالِ شکر کرنے میں مدد دے رہا تھا کہ لاہور سے میرے نام ایک ٹکٹ کواٹنی اور مجھے بتایا گیا کہ آج صبح سعادت حسن منٹو کا انتقال ہو گیا۔ میں خود فوراً غم سے بے تاب رہا۔ میں سوچا کہ مجھ میں شدید براؤنڈی پیرا ہو گئی۔ مجھے منسو ماموں پر انتہائی شدید عقیدہ رہا تھا کہ وہ اپنے جیویں بچوں کے ساتھ یہ سلوک کس طرح کر سکتے ہیں؟ لیکن میں نے اس کا اظہار نہیں کیا اور جب یہاں بولا تو میری آواز سے غیر معمولی تشویش نمایاں تھی۔ میں نے پوچھا کہ کیا انتقال ہوا؟ ”جواب ملا کہ ہوا“ اس جواب سے مجھے بڑا اطمینان ہوا۔ کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ اچانک گھر سے باہر کسی اور مقام پر موت سے ہم آغوش نہ ہو گئے ہوں۔ عین ممکن تھا کہ کسی ناگئے پر کسی ریسٹوران میں کسی چائے کے دفینے نیٹے پیسٹے باکسی فلم سٹوڈیو میں انھیں اچانک موت آگئی ہو۔۔۔۔۔

جب میں اپنی نگاہیں دوبارہ اٹھایا تو انھوں نے کیا حال بیان کرنے والے ساتھیوں نے اشاروں سے پوچھا کہ کیا بات ہو؟ میں نے ایک کاغذ پر یہ جملہ لکھ دیا: ”اپارٹمنٹ سے سعادت حسن منٹو کو آؤٹ ڈسٹریسٹ ہو گیا۔“

منسو ماموں کو آؤٹ ڈسٹریسٹ کے لیے اپارٹمنٹ سے کسی بارائیں کی سائیکل تھیں لیکن ہر بار پابل مسٹر وکروی گئی تھی۔ اب ان کی بے مبرادوں اور اداؤں انکو ختم ہو گئی تھی۔ وہ کرکٹ کے کھلاڑی ہوتے تو میں یقین سے ساتھ نہ کھڑا ہوتا۔ کہیں نہ کہیں صحت کے لیے میرا دلچسپ اور مختصر کھلاڑی نہیں بن سکتے تھے۔ جسے وہ لاہور کے تیسرے ٹیسٹ میچ میں کھیلتے ہوئے دیکھنے کے لیے حشر تانے لگے۔ اس کا علم مجھے ان کی موت کے چوبیس گھنٹے بعد گھر پہنچ کر ہوا۔ وہ حقیقت ان کی زندگی کی آخری دو خواہشوں میں سے ایک خواہش یہ تھی تھی۔ اپنی موت سے ایک دن پہلے انھوں نے ایک ریسٹوران میں اپنے دوستوں سے کہا تھا: ”حامد جلال کو داپس آجائے۔ دو۔ میں اسی کے ساتھ ٹیسٹ میچ میں صحت کا کھیل دیکھنے جاؤں گا۔“

ان کی دوسری خواہش اس لیے بارود کا غوروت کی موت پر افسانہ لکھنے کی جتنی جس کی ہر نہ لاش گجرات میں مڑی کے کنارے

پانی کی مٹی۔ اخباروں میں شائع ہونے والی اطلاعات کے مطابق اس عورت اور اس کی نئی بیوی کو کوس کے آڑے سے اغوا کیا گیا اور نصف درجن کے قریب برس پرنتوں نے اپنی ہیمانہ خواہشات کی تکمیل کی اور جب وہ کوٹھڑی سردی میں ان کے محل سے نکل کر کھانگی تو اس کے جسم پر لباس کا ایک تار بھی نہ تھا چنانچہ دونوں ماں بیٹی نے سمجھ کر دینے والی سردی میں دم توڑ دیا۔ اس المیہ سے ختم ماموں نے بعد متنازعہ ہوئے تھے۔ اسی روز شام کو گھرات سے کچھ لوگ ان کے پاس آئے تھے اور انھوں نے عادیہ کی مزید تفصیلات بتائی تھیں۔ اس سے ان میں ضرور اشتعال اور جہان بیدار ہو گا اور میرا خیال ہے کہ اس کے بعد ختم ماموں نے معمول سے زیادہ شراب پی کر بلی ہوگی جو ان کے لیے ہلک ثابت ہوئی۔

وہ کافی شام گزرنے کے بعد گھر واپس آئے، تھوڑی دیر بعد انھیں خون کی تہ ہوئی۔ میرے چھ سالہ بچے نے جو ان کے قریب ہی کھڑا تھا، خون کی دھاریوں کی طرف انھیں توجہ کیا تو انھوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ کچھ نہیں۔ یہ بیان کی پیک ہے۔ انھوں نے اسے یہ ناکید بھی کر دی کہ وہ اس کا کسی سے ذکر نہ کرے۔ اس کے بعد انھوں نے حسب معمول کھانا کھایا اور مونس گھر بھر میں کسی کو دھم دگمان بھی نہ تھا کہ کوئی بات خلاف معمول ہوئی ہے کیونکہ میرے لڑکے نے مٹو ماموں کا راز کسی پر ظاہر نہیں کیا تھا۔ ممکن ہے خود مٹو ماموں کو بھی اس کے متعلق کوئی تشویش نہ ہوئی ہو۔ یوں بھی وہ گھر والوں کو ایسے معاملات سے بے خبر رکھنا ہی پسند کرتے تھے کیونکہ ہر طرف سے شراب ترک کرنے کا مطالبہ شروع ہو جاتا تھا۔

رات کو کچھ بھر تھا کہ انھوں نے اپنی بیوی کو اٹھا کر بتایا کہ وہ شدید درد محسوس کر رہے ہیں اور اب تک بہت سا خون مناسق ہو چکا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کا گھر بکھر گیا ہے۔ ان کی بیوی نے جب یہ دیکھا کہ وہ اس صورت حال کا قائل تھا تو مقابلہ نہیں کر سکتیں تو انھوں نے گھر کے دوسرے لوگوں کو جگایا اور انھیں نعت کے سوز سے ٹھانے کی حید و جد شروع ہو گئی۔ اس سے پہلے کی شدید عادتوں کے بعد وہ شعیاب ہو چکے تھے اس لیے کسی کو یہ خیال تک نہیں ہو سکتا تھا کہ اب وہ صفت چھٹھٹوں کے ہمان ہیں۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ انھیں آؤٹ ڈینے کے لیے اسپاٹر کی انگلی اسی وقت سے فضا میں بلند ہوئی شروع ہو گئی تھی جب مٹو ماموں کو خون کی پمپلی تہ آئی تھی۔ فٹو ماموں کے آخری لمحات کے متعلق میں نے جو کچھ سنا ہے اس سے میں بھی اندازہ لگا سکا ہوں کہ کافی دیر تک انھیں خود بھی یقین نہیں تھا کہ ان کا وقت اب آگیا ہے۔ ڈاکٹر کے انگلیش وغیرہ لکھانے کے گھنٹہ ٹیڑھ گھنٹہ بعد تک وہ مایوس نہیں ہوئے تھے لیکن اس علاج کے بعد بھی ان کی حالت خلاف معمول نہیں سمجھی۔ ان کی ہفت بار بوٹی گئی اور دس میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ خون کی تہ بھی بند نہیں ہوئی۔ صبح کو ڈاکٹر نے تجویز پیش کی کہ مٹو ماموں کو ہسپتال بھیجا دیا جائے۔

اس وقت ختم ماموں کے ہوش و حواس بالکل بجا تھے اور ہسپتال کا نام سننے ہی وہ بول اٹھے "اب بہت دیر ہو چکی ہے مجھے ہسپتال نہ لے جاؤ اور یہیں لوگوں سے پڑا رہنے دو۔"

گھر کی عورتوں کے لیے یہ منظر ناقابل برداشت تھا۔ انھوں نے رد و ناشروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر ختم ماموں فوراً مشتعل ہو گئے اور انھوں نے غضب ناک آواز میں کہا "خیر وار ہو کوئی رو۔" یہ کہہ کر انھوں نے اپنا مژدہ راضی سے بند کر لیا۔

ختم کا یہ اصلی روپ تھا۔ جس شخص کی زندگی کا کوئی گوشہ آج تک دنیا کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہا تھا وہ کس طرح برداشت کر سکتا تھا کہ لوگ اسے مبرا ہوا دیکھیں۔ ختم ماموں مجسم غیظ و غضب بنے ہوئے تھے معلوم نہیں وہ اپنے آپ سے ناراض تھے یا شراب سے

جوان کی قبل از وقت موت کی ذمہ داری۔

ایڈیٹرز نے سب سے پہلے صرف ایک یاد دہانوں نے اپنے مضمون سے خدائی نشانیاں انھوں نے کہا تھے بڑی سروکاری لگی رہی ہے۔ اسی سردی شایعہ قریب ہی نہیں لگتی میرے اوپر اور خدائیں مثال دو کچھ دیو تو گفت کے بعد ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نمودار ہوئی، انھوں نے آہستہ سے کہا میرے کوڑھی عجیب ہیں ساڑھے تین روپے پڑے ہیں ان میں کچھ اور پیسے ملا کر تقریباً بی سو روپیہ مل گیا دو.....؟

شراب کے لیے ان کا اصرار جاری رہا اور ان کی تسلی کے لیے ایک پو اسٹا گلیا گیا۔ انھوں نے قبل کو بڑی عجیب اور آسودہ نگاہوں سے دیکھا اور کہنے لگے ”میرے لیے دو بیگ بنا دو۔“ اور یہ کہتے ہوئے درد اور شہدائی تشنجی دورے کے باعث وہ کانپ مے اٹھے۔

خوشاموں کی سٹکھوں میں اس وقت بھی اپنے لیے رحم کا کوئی شائبہ موجود نہ تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ ان کا وقت اس پہنچا ہے، لیکن ایک بار بھی اور ایک لمحے کے لیے بھی انھوں نے اپنے دو چہرہ باقیات نہیں طاری ہونے دی۔ انھوں نے اپنے بچوں کی سبکی اور کواپسے نہیں ہٹا۔ باوجود ہنگامہ واپسیوں یا وصیت کے کبھی قائل نہیں تھے۔ ان جیسی شخصیتوں کے لیے زندگی اور موت کے مابین وہ قائل بہت ہی بھم اور غیرواضح ہوتی ہے اور یہی سنا جلی چلنے کی زندگی اور روح تو پہلے ہی ان کے جسم سے ان کی کتابوں میں منتقل ہو چکی ہوتی ہے۔ — دہاں پہنچ کر انھیں غیر فانی ہونے کا یقین ہو جاتا ہے۔ دہاں وہ ابد تک زندہ رہتے ہیں۔ ہستے بولتے رہتے ہیں، محبت کرتے رہتے ہیں۔

بسنز مرگ پر فطام ملنے سے شراب کے سوا کوئی اور چیز نہیں مانگی۔ انھیں بہت پہلے معلوم ہو چکا تھا کہ شراب ان کی جانی نہیں ہے اور وہ اسے موت کا ہم نام سمجھنے لگے تھے جس پر سماں کی فکری صورت میں ٹھکن نہیں ہے۔ جس طرح موت کے آگے انسان بے بس ہو جاتا ہے۔ اسی طرح فطام ملنے سے شراب کے سامنے باطل ہے بس ہر مرتے تھے لیکن ان کی فطرت چونکہ جہنم سے باخبر نہ تھی اسی لیے انھوں نے موت سے بھی بغاوت کی فتنی۔ انھیں شکست سے محبت فطرت فتنی خواہ وہ موت کے انھوں ہی کیوں نہ ہو اور یہی وجہ تھی کہ وہ موت سے تنہا نہیں رہنا چاہتے تھے جہاں کوئی انھیں تہانہ نہ دیکھے جسے ان کوئی ان کی شکست کا نظارہ نہ کر سکے۔

ان سے کم درجے کا آدمی شاید ایک خورامانی موت کا اہتمام کرتا تاکہ اس کے مرنے کے بعد لوگ اس کا چرچا کریں، اس پر مضامین لکھے جائیں اور اس کے اعزازاً باب کھم سکین کہ اس کی زندگی حضور الہی بھی جسے ہم پسند نہیں کرتے لیکن مرنے سے پہلے وہ منقطع ہو گیا تھا اور اچھا آدمی بن گیا تھا لیکن نظرموس ریاکار نہیں تھے۔ انھوں نے اس خواہش کا سختی سے مقابلہ کیا۔ ان کی موت کے وقت موت ایک پولو خورامانی تھا یہی شراب طلب کرنے کا منظر لیکن اس کا فائدہ بھی مرکزی کردار کو پہنچ سکتا تھا کیونکہ اس کا صحیح مفہوم موت وہی جگہ نکلتا تھا۔

میں اس وقت موجود تھا تو مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے ذہن کو ایک حد تک ہیر سہا منے سے بے نقاب کر دیتا اور یہ کچھ مشکل بھی نہیں تھا لیکن اللہ صفت اتنا کہنے کی ضرورت تھی۔ سانپ اور انسان کی کہانی نہ لکھنا میں اپنے سرگوشیاں میں متجسس دیتا اور شراب کا آخری جام انھیں پینے کو دے دیتا۔ صوفی ایک جملہ کلمات واضح کر دینے کے لیے کہ ہونڈ سانپ اور انسان کی کہانی

صرف اتنی لمبی کہ ایک آدمی نے اپنے دوستوں کے منع کرنے کے باوجود ایک زہریلا سانپ پال رکھا تھا اور ایک دن سانپ نے اپنا سارا زہر اس کے جسم میں آنا دیا، تو اس نے بھی سانپ کو کھڑا دیا اور اس کا سر کاٹ کر کھینک دیا۔

ایبرہمن جیسے ہی دروازے پر آکر کھڑی ہوئی، انھوں نے شراب کا پھر مطالبہ کیا۔ ایک چمچ دوسرے ان کے منہ میں ڈال دی گئی لیکن شاید ایک قطرہ مشکل سے ان کے حلق سے نیچے اتر سکا ہو گا۔ باقی شراب ان کے منہ سے گر گئی اور ان پر عشی طاری ہو گئی۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ انھوں نے اپنے ہوش و حواس کھوئے تھے۔ انھیں ایسی حالت میں ایبرہمن میں لٹا دیا گیا۔

ایبرہمن ہسپتال پہنچی اور ڈاکٹر انھیں دیکھنے کے لیے اندر گئے تو منظر ماموں مر چکے تھے۔ دوبارہ ہوش میں آئے لیکن راستے ہی میں ان کا انتقال ہو چکا تھا۔

میرادوست، میرادشمن

عصمت چغتائی

اٹو لٹی تیر کی چوٹی میں ایسوں پر چڑھتے ہوئے مجھے گھبراہٹ ہی چھوئی تھی جیسے کبھی امتحان کے بال میں داخل ہونے سے پہلے ہوا کرتی تھی۔ مجھے ویسے ہی نئے آدمیوں سے ملے گئے گھبراہٹ پر آ کر اتنی دلچسپی نہیں تو وہ دنیا کوئی مضبوط تھا جس سے میں سبیل بانٹے عمارت کا قطعی پیری گھبراہٹ و حشمت کی حدوں کو متوجہ نہ کرتی۔ میں نے کتاب سے دبا چھوڑا ایس میں ساید ٹیگٹھ پر نہ ہوا۔ کچھ کتابت نے میری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

”وہ شام کو لگسکی پر رہتا ہے کیونکہ وہ شام کو روز پیتا ہے۔“

یہ فیصلے سرے پر سونڈ سے ایک نوٹروں اور دو جی بی بیٹا برائے بیٹو کیسے جی کا کر لیا۔ ایسا بھی کیا۔ مجھے کسا تو نہیں بلاتے تھے۔ وہ جو اس کی زبان کی نوک پر ٹٹک ہے۔ میں گھبرا تو ہوں نہیں جو یہ ناک ماری تو مجھ پر نہیں آئی۔ چروائی کروا کر دوسری عیال طے کر کے وہ میں منزل پر پہنچے۔ فیلٹ کا دروازہ کھولا تھا۔ ٹٹا ٹٹک۔ دسم کا کے میں ایک کبے میں صوم و صیٹ پڑا تھا۔ وہ دنی طرف ایک بڑا سا سفید اور صاف پلنگا۔ پڑا تھا۔ کھڑکی کے سامنے بی بی ایک لڑی چندی لڑی بی بی کے سامنے ایک بڑی بی بی کی ایک بار یک ٹکڑے کی شکل کا انسان اکثر وہ بیٹا ہوا تھا۔ "اے اے اے اے" بڑی خندہ بی بی سے بڑھ کر اٹھ رہا تھا۔ منہ ہنسنے لڑی پر اکثر وہ بیٹا تھا اور بہت جھستہ لڑا تھا۔ خندہ بی بی جب کھڑا ہوتا تھا تو کھڑکی کے اس کا قد سا ہلکا تھا۔ آنکھوں اور بعض وقت جب منہ کیوں نہیک کر کھڑا ہوتا تھا تو بڑا مزہ ملا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے جسم پر کھڑے رکھ کر پانچا پانچا اور درجہ چارہ چارہ صدی کی تھی۔

اگر سے میں گھنٹا تھا آپ نہایت کلافوں کوئی ٹوکھو کی طرف میں میں کہ۔ "س نے دانت نکال کر ہنستے ہوئے کہا۔

ایک دم نہ باپ بیٹے پرے لے۔
اور دوسرے لمحہ دونوں پر رایتن دی سے جڑ کر کھینٹ کھینٹ گئے کہ جیسے اتنے عرصے ایک دوسرے سے ناواقف رہ کر کھینٹنے لڑا کھینٹا ہوا دوسرے پر اکرا کر ہوا۔ وہ تین بار بات مٹھتی لیکن ذرا سا مختلف باقی تھا لہذا دوسری ملاقات کے لیے انھار بھی کٹی گھنٹے ہمارے جہڑے مشورین کی طرف مختلف مضمرات پہلے کرتے رہے اور میں نے جلد ہی معلوم کیا کہ کمزیری طرح خوشحالیات کا شے کا عادی ہے۔ پر دینی بات سننے سے پہلے ہی بولی اٹھتا ہے اور جو دوسرا سہا مختلف تھا وہ بھی غائب ہو گیا۔ باتوں سے بحث اور بحث نے ناقابل فوج چھوٹا ک کی سعادت اختیار کر لی اور صرف چند گھنٹوں کی جان بچان کے بل بوتے پر ہم نے ایک دوسرے کو نہایت ادنیٰ قسم کے غفلتوں

میں اچھی بھائی اور کچ بھٹ کھڑا لا۔

گھسان کے بیچ میں نے ایک بار کندھے پر کمر سے دیکھا۔ موٹے موٹے ٹیشوں کے چھپے چھپے ہونی بڑی سیلانی ہوئی تھی۔ انکھیں نہیں دیکھ کر مجھے بے ساختہ مور کے پیر یاد آ گئے۔ مور کے پر اور آنکھوں کا کیا جوڑ؟ یہ مجھے کبھی نہ معلوم برسکا۔ بخیر مجھ پر نے ان آنکھوں کو دیکھا مجھے مور کے پیر یاد آ گئے۔ شاید رحمت اور ستافی کے ساتھ ساتھ ان میں بے ساختہ شگفتگی مجھے مور کے پروں کی یاد دلائی تھی۔ ان آنکھوں کو دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ انہیں تو میں نے کہیں دیکھا ہے۔ بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ہنقد لگاتے، سبیدگی سے سکر لے، ہنر کے نشتر رساتے اور پھر نزع کے عالم میں بھراتے! وہی نازک نازک ہاتھ پیر سر پر لگا کر بھر بال چمکے زرد زرد گال اور کچھ بے شک سے دانت۔ پیٹے پیٹے اچانک فٹو کو اچھو لگا اور وہ کھانسنے لگا میرا ماتا ٹھٹھا۔ یہ کھانسی نوجوانی پہچانی سی تھی۔ اسے تو میں نے بچپن سے سنا تھا۔ مجھے کوفت ہونے لگی نہ جانے کس بات پر میں نے کہا:-

”یہ بالکل غلط“ اور ہم باقاعدہ لڑ پڑے۔

”آپ کچ بھٹی کر رہے ہیں۔“

”حقیقت ہے یہ۔“

”وہ حادلی ہے مہمسنہ سن!“

”آپ مجھے بہن کیوں کہہ رہے ہیں؟“ میں نے پوچھ کر کہا۔

”بس یونی، عوام میں جو رتوں کو بہن کہہ سکتا ہوں میں اپنی بہن کو بھی بہن نہیں کہتا۔“

”تو پھر مجھے چڑا ہے کہ کہہ رہے ہیں؟“

”نہیں تو وہ کیسے جانا آپ نے؟“

”اس لیے کہ میرے بھائی مجھے ہمیشہ جلاتے پھرتے اور مارتے پیٹتے رہے یا پھر کر پھرتے ہیں۔“ منو زور سے ہنسا۔

”تب تو میں ضرور آپ کو بہن ہی کہوں گا۔“

”تو اتنا یاد رکھئے کہ میرے بارے میں میرے بھائیوں کے خیالات بھی کچھ خوشگوار نہیں ہیں۔ یہ آپ کو کھانسی ہے اس کا

علل کیوں نہیں کرتے؟“

”علل؟“ وہ اکثر گڈ سے ہنسنے ہیں۔ تین سال جو بڑے ڈاکٹروں نے کہا تھا سال بھر میں مر جاؤ گے نصیب ٹی۔ بی ہے۔ صاف ظاہر

ہے کہ میں نے مر کر ان کی پیشین گوئی کو سچا ثابت نہ ہونے دیا اور اب تو بس میں ڈاکٹروں کو احمق سمجھتا ہوں۔ ان سے تو میری مراد جو

کرنے والے زیادہ عقلمند ہوتے ہیں۔“

”یہی آپ سے پہلے ایک بزرگ فرمایا کرتے تھے۔“

”سکون بزرگ؟“

”میرے بھائی عظیم بیگ، انہیں ٹی کے نیچے آرام فرما رہے ہیں۔“

منو زور دہرے عظیم بیگ کے فنی پر بحث کرتے رہے۔ آئے تھے صرف ملاقات کرنے لیکن باتوں میں رات کے گیارہ بج گئے،

شاہد جو ہماری جوتوں الگ تنگ بیٹھے دیکھ رہے تھے بھوک سے تنگ آچکے تھے۔ ملا رہتے پہنچتے پہنچتے ایک بج چلے گا لہذا کھانا کھا ہی لیا جائے۔ غیٹے بچے سے الماری سے بیٹھیں اور چھ نکالنے کو کہا اور خود بوتل سے روٹی بیٹے چلا گیا۔

”مذرا اس برنی سے اجار نکال لیجئے۔“ غیٹے تیزی سے بیز پر کھانا لگا یا اور کرسی پر گھڑوں بیٹھ گیا۔ وہی میز جو دم بھر پہلے او بی کا رگزاراؤں کا میدان بنی ہوئی تھی ایک دم کھانے کی بیز کی خدمات انجام دینے لگی اور بغیر کسی سے پہلے آپ ”کے ہم لوگوں نے کھانا شروع کر دیا جیسے برسوں سے اسی طرح کھانے کے عادی ہوں۔“

کھانے کے بیچ میں گرامر ماسٹر چلنا رہا۔ گھم پھر کر غیٹے لحاف ”کے بخیر ادھیڑ نے گنا جوان دنوں بیری دیکھی رگ بنا ہوا تھا میں نے بہت ٹٹانا چاہا مگر وہ ڈھٹائی سے اڑا رہا اور اس کا ایک ایک ٹاگھٹیت ڈالا۔ اسے بڑا دھکا لگا پش کر کہ مجھے ”لحاف“ لکھنے پر افسوس ہے۔ خوب صبح کی سناٹا میں اور مجھے نہایت بزدل اور کم نظر کہہ ڈالا۔“ ”لحاف“ کو اپنا سنا ہکا مانے پر تیار نہیں تھی اور غیٹہ مجھ سے غیٹہ ہی دیریں ”لحاف“ سے لمبی بڑھ چڑھ کے ہم نے بحث کر ڈالی نہایت کھل کر، اور مجھے تعجب ہوا کہ متو گندی سے گندی اور بیوردہ سے بیوردہ بات و حضرے اس مغفلیت اور بھولپن سے کہہ جاتا ہے کہ ذرا جھکا محسوس نہیں ہوتی۔ یا وہ ملت دینا ہی نہیں۔ اس کی باتوں پر ہنسی آجاتی ہے گھن یا غصہ نہیں آتا۔

چلتے وقت اس نے پھر مقفیہ کا ذکر کیا۔ اتنی دیر ہم بیٹھے وہ اور غیٹہ کو صفحہ کی یاد نے کئی بار ستایا۔

”مقفیہ بہت اچھی لڑکی ہے۔“

”مقفیہ بہت عمدہ سالن بھائی ہے۔“

”آپ اس سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔“

”بہت یاد آ رہی ہے تو اسے ہلاکیوں نہیں دیتے۔“ میں نے کہا۔

”ارے..... کیا بگتی ہر اس کے بیڑیوں نہیں لگتا۔“ وہ اپنی اہمیت پر اترنے لگا۔

”غیر تو رسمی پر لمبی آجاتی ہے۔“ میں نے بات ٹٹالی اور وہ ہنس پڑا۔

”آپ کو مقفیہ سے بہت محبت ہے؟“ میں نے رازداری کے انداز میں پوچھا۔

”محبت!“ وہ چیخ پڑا جیسے میں نے اسے گالی دی ہو۔ ”مجھے اس سے غلطی محبت نہیں۔“ اس نے کڑوا منہ بنا کر بڑی بڑی

پتلیاں گھمائیں۔ ”میں محبت کا قائل نہیں۔“

”ارے آپ نے کبھی کسی سے محبت ہی نہیں کی؟“ میں نے مصنوعی حیرت سے کہا۔

”نہیں۔“

”اور آپ کے کبھی گھسٹے بھی نکلے۔“ خسرو لمبی نہیں ہوتی ٹھکر گالی کھا سی تو ضرور ہوتی ہوگی۔ وہ ہنس پڑا۔

”محبت سے آپ کا مطلب کیا ہے محبت تو ایک بڑی لمبی چوٹی چیز ہے۔ محبت ماں سے بھی ہوتی ہے بہن اور بیٹی سے بھی

..... بیوی سے بھی محبت ہوتی ہے چلوں اور بوٹ بھٹے سے بھی محبت ہوتی ہے میرے ایک دوست کو اپنی کتیا سے محبت ہے،

ہاں مجھے اپنے بیٹے سے محبت تھی۔ وہ بیٹے کے خیال پر اچانک کر کرسی پر اونچا ہو گیا۔ خدا کی قسم اتنا سپردوں چلنا تھا۔ بڑا شر بہر تھا، گھٹسوں

چلتا تھا تو فرش کی دراڑوں میں سے مٹی نکال کر کھالیا کرتا تھا۔ میرا کہنا بڑا ماننا تھا۔ حاسم اپن کی طرف مڑنے اپنے بیٹے کے عجیب و غریب ہونے کا یقین دلانا شروع کیا۔

”آپ یقین کیجئے چھ سات دن کا تھا کہ میں اسے اپنے پاس ملائے گا۔ میں اسے خود تیل کی گھٹانا تین مہینہ کا بچہ نہیں تھا کہ ٹھٹھا کر رہے تھے۔ بس عقیدہ کو کچھ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ وہ دودھ پلانے کے سوا اس کا کوئی کام نہ کرتی۔ رات کو نو بس چڑی سوئی رہتی۔ میں چپ چاپ بچے کو دودھ پلا دیتا۔ اسے خبر بھی نہ ہوتی۔ بچے کو دودھ پلانے سے پہلے بڑی ٹھان یا سپرٹ سے سمات کر لینا چاہئے نہیں تو بچے کے منہ میں ڈالے ہو جاتے ہیں۔ وہ بڑی سبکدلی ہے بولا اور میں حیرت سے اسے دیکھتی رہی کہ یہ کیسا مرد و اسے جو بچے پالنے میں مشغول ہے۔

”مگر وہ مر گیا۔ غصے نے مصنوعی مسرت پر ہر لاکر کہا۔“ اچھا ہوا جی وہ مر گیا۔ نیسے تو اس نے آیا جانا والا تھا۔ اگر وہ زندہ رہتا تو آج میں اس کے بڑے دھوتا پرتا پرتا ہو کر رہ جاتا۔ مجھ سے کوئی کام نہ خطوڑی ہوتا۔ کچھ صحت نہیں اچھے اس سے شئی تھا۔ چلتے چلتے اس نے پھر کہا کہ عید آئے وانی ہے بس جی خوش ہو جائے گا آپ کا اس سے مل کر۔ اور واقعی صفتیہ سے مل کر میری خوش زندگی۔ بتوں میں ہماری اپنی گفت گوئی کہ سر جوڑ کر پوشیدہ باتیں بھی ہوتے تھیں جو صرف غریب ہی کہتی ہیں جو تین ہی کہتی ہیں جو مردوں کے کانوں۔ لکے نے نہیں ہوتیں۔

مجھے تو یہ صفتیہ کیوں نہ چڑھے کہ تھے دیکھ کر غصے میں گیا اور طعنے دیتے لگا۔ اس نے پچھلے کر سے کی چوٹی دیوار سے کان لگا کر ہماری ساری گفتگو سن لی تھیں۔ وہ نہ بیٹوں کی طرف بولا۔

”تو یہ تو یہ میرے فرشتوں کو بھی نہ ہیں کہ جو بھی اپنی سندی گئی باتیں کرتی ہیں۔

صفتیہ کے شرم سے کان دلی ہو گئے۔

”اور آپ سے جو صفتیہ ہیں مجھے کتنی امید رہی کہ یوں مجھے کی جاہل جوڑوں کی طرح باتیں کریں گی۔ اب شادی ہوئی و شادی کی رات کسی گدڑی بچہ پوٹ اور کیسے بیدا ہوا نہ ہے۔ وہ پھڑانے لگا۔

میں نے فوراً لنگر لگائی۔ ”جی۔ یہ صفتیہ میں آپ کو اتنا شک نظر نہ سمجھتی تھی۔“ آپ بھی ان باتوں کو گدڑی کہتے ہیں۔ ان میں گندہ کیا ہے۔ بچہ کی پیداوار سنو دینا کہ سین تین سالہ ہے اور یہ کاما یو بی بی تو ہمارا فرزند تھا۔ کون سے کیا سمجھتے ہیں آپ کیا کان میں مجھے شے دینا سمجھا یا گیا۔ ہے۔ وہاں کے بڑے سے بڑے بھی آپ کی شرت تک بیویں چھو کر تو یہ کہتے رہتے تھے کہ جوڑوں ہی سے تو ہم نے زندگی کے بہتر ترین راز حاصل کیے۔

”یہ صفتیہ بھت جاہلی ہے۔ اور آپ کو بچہ نہیں گنتی ہر بات پر تو یہ کہہ کر رہی ہے۔ آپ کی تحریروں سے صفتیہ تھا ہے آپ کا جو نہیں گندہ اتنا اس سے گھٹوں باتیں کر کے کہ فورے میں گنتی ہدی ازاد کی دلال کے دیڑھے۔۔۔

”اس نے صفتیہ تو رے میں ہدی کہاں پڑتی ہے۔ صفتیہ نے ہیبت زدہ ہو کر کہا۔

او ڈیڈو بڑا۔ وہ بعد تھا کہ ہدی ہر کمانے میں بڑی جانتے اور جو نہیں بڑی تو یہ مراد غلط اور انصافی ہے۔ میرا ایک راجپوت دوست تھا وہ گئی، وہ ہدی کی کرباؤں میں کسرت کیا کرتا تھا۔ پورا پھولان تھا۔ اور ہم نہ رہتے کہ آپ کا دوست بھی اور ہدی

چھوڑ کر چھوڑ دینا تھا۔ ہم کسی شرط پر ہمدی ٹالنے کو تیار نہیں اور ڈھک کو قائل ہونا پڑا۔

میں اور ڈھک اگر پانچ منٹ کے ارادہ سے بھی ملے تو پانچ گھنٹے کا پروگرام ہو جاتا۔ خطرے سے بحث کے الیسا معلوم ہوتا جیسے فزنی قوتوں پر دھار رکھی جا رہی ہے۔ حالاً صاف ہو رہا ہے، دماغ میں بھار دوسری دی جا رہی ہے اور بعض وقت بخشش اتنی طویل اور گھنم مار ہو جاتی ہے کہ اب معلوم ہوتا بہت سے کچے ٹوٹ کی گولیاں اُلجھ گئی ہیں اور واقعی سوچتا اور سمجھنے کی قوت پر بھار ڈھک دووں نکلنے جاتے اُلجھے جاتے، ہمدی کی پیدا ہونے لگتی۔ مجھے تو اپنی شکست کو چھپانے کا حکم تھا، مگر ڈھک بالکل روٹا ہوا تھا، آنکھیں موندھیں، کی طرح تن کر لیں جانیں۔ تھکے پھر کٹنے لگے نہ کہ ٹوکڑا کیسیلا ہو جاتا اور وہ جھٹلا کر اپنی حمایت میں سناہ کو پکڑتا اور جنگ ادب یا فلسفہ سے پلٹ کر گھر پر مصورت اختیار کر لیتی۔ غصہ بھٹاتا کر جلا جاتا۔ شاہد مجھ سے ملنے لگے نہ میرے دوستوں سے اتنی بد فہمی سے کیوں باتیں کرتی تھیں؟ غصہ آج خفا ہو کر گیا ہے اب وہ ہمارے ہاں نہیں آئے گا اور نہ میری بہت سے کہ اس کے ہاں جاؤں، وہ بد فہم آدمی ہے۔ کچھ ایسی شے کا تو میری اس کی پُرانی دوستی ختم ہو جائے گی۔

اور مجھے بھی کئی محسوس ہونا کہ واقعی میں نے غصہ کر دیا بات کہ دوسری ممکن ہے غصہ جاتے اور ہماری اور صفائی کی دوستی بلع ختم ہو جائے جو اب غصہ سے زیادہ گہری اور پائیدار ہو گئی تھی۔ غصہ کی تہ و دار کی عزت اور کھدوں کو پہنچتی تھی۔ وہ اپنے دوستوں پر عجب جملے کا بڑا متفق تھا اور اگر ان دوستوں کے سامنے جہ کہ وہ عروپ کر لیا جو کوئی اس کا مذاق بنارے تو وہ بڑی طرح چڑھا یا کرنا تھا اس کا خیال تھا کہ ویسے وہ اور میں تو پتے کے پتے ہیں ایک دوسرے کو کہ میں سکتے ہیں مگر "عام لوگوں" اس کے سامنے ایک دوسرے پر چڑھ کر نہ کرنی چاہئیں۔ وہ زیادہ تر اپنے ملنے والوں کو ذہنی سطح کو پتے سے چاہتا تھا۔

لیکن سچ لڑائی میری اور اتفاق سے نام کو پھر ملاقات ہو جاتی تو وہ اس تدرجوش سے ملتا جیسے کچھ ہمدی نہ ہوا اور ویسے ہی لکھلکھل کر باتیں کرتیں۔ بخیر، میری ایک دوسرے سے بڑے ادب اور ضرورت سے زیادہ نرمی سے بڑے مہربانیت ہمدی میں ہاں ملانے کے بعد اعلیٰ اس شخص سے دل آنا جانا اور اس کا بھی اور پھر پھیلنے لگتی دونوں طرف سے آتش بازی اور گولوں کی کئی تندہی آجانی تھی لوگ ہم دونوں کو یوں اُلجھا کر مڑا لینے لگتے اور ہم پھر بل کر ایک دوسرے سے مل جاتے۔ ہم بحث کرتے تھے اپنی دلچسپی کے لیے کہ ان کے لیے یقیناً بین کرنا صاف سید کر کے۔ منو کی بجلی بھی راستے تھی کہ گھر پر چاہتے تھے اپنی سیدھی بحث کر لیں مگر غصوں میں ہمیں مہرچہ بنا کر جانا چاہیے اور مارا مہرچہ آنا مضبوط ہو گا کہ لوگوں کے چپکے چپکے اور سے کا مگر مجھے عمر مہرچہ سے اپنی دنیا داروں کا احساس نہ ہوا اور مہرچہ لکھڑوں کے جیسے کئی طرح بھٹکاتے لگتا۔

یہ مجھے بھی نہ معلوم ہو رہا کہ کتنی کر بہت ہے یا بہت کم کر رہا ہے۔ میں نے اس کی جال میں اُلجھ کر ہٹ با نیان میں لکنت نہ بائی۔ مجھے تو کبھی کوئی فرق ہی نہیں محسوس ہوا۔ ہاں بس اتنا معلوم ہونا تھا کہ جب زیادہ بہتہ ہو تو یہ یقین دلائے کی کو کشش کرنا تھا کہ وہ بالکل نشہ میں نہیں اور صبر کو آجھا نا تھا۔

"میں آپ سے کچھ کہتا ہوں عصمت بہن میں بالکل نشہ میں نہیں اور میں آج پینا چھوڑ سکتا ہوں میں جب چاہوں پینا چھوڑ دوں آپ شرط لگائیے۔"

"میں شرط نہیں لگاؤں گی کیونکہ آپ ہار جائیں گے۔ آپ دینا نہیں چھوڑ سکتے..... اور آپ نشے میں ہیں۔"

کیسا کیا فخر و شہرت دیتا کہ وہ لٹے ہیں نہیں وہ اسی وقت دنیا چھوڑ سکتا ہے صرف شرط لگانے کی دیر ہے۔ ایک دن تنگ آکر مجھے شرط لگانا پڑی اور فخر و شہرت لایا گیا۔ جس حیرت گئی۔ عجیبی بہ شرط تو لگی تھی لیکن کوئی رقم منتر نہ ہوتی تھی۔ اس کے بعد جب فخر و شہرت بہت بڑھتی اور وہ شرط لگانے پر اڑ جاتا اور اس نے شرط لگانے کے کھو خلاصی نظر نہ آتی تو یاد کر مجھے شرط لگانا ہی پڑتی۔

منٹو کو خود ستانی کی عادت تھی مگر کبھی میرے سامنے اپنے ساتھ مجھے بھی گھسیٹ لیا کرتا تھا اور اس وقت میرے اور اپنے سر آنا میں کسی کو ادب نہ ملتا۔ خاص طور پر کرشن چندر اور دیپند سنیا تھی کے خلاف ہرجانا۔ اگر ان کی تعریف کرو تو منگ اٹھتا۔ میں کہتی آپ کوئی تنقید نگار تو ہیں نہیں جو آپ کی بات مانا جاسے اور وہ تنقید نگاروں کو کبھی کبھی سناٹے لگتا۔ ایک سرے سے ان کے وجود کو ہی تم قائل سمجھتا خاص طور پر ادب کے لیے۔

”بھکواس کرتے ہیں یہ لوگ۔“ وہ حمل کر کرتا۔ ”جو یہ کہتے جاتیں بس اس کا اٹل کرتے جاؤ یہی لوگ جو اعتراض کرتے ہیں مجھ پر چھپ کر میری کہاں کیا بڑھتے ہیں اور ان سے کچھ کہنے کے بجائے لطف اندوز ہوتے ہیں اور پھر اس لطف کی یاد پر نام ہر کراہی فول گئے ہیں۔ وہ کبھی آنا چڑھتا کہ میں اسے تسلیم کرتے ہوئے کو کتنی جب آپ کو یقین ہے کہ یہ اول فول گئے ہیں تو آپ ان کا جواب کیوں دینے لگتے ہیں اگر تنقید سے آپ کو وہ نہیں ملتی تو نہ یہ مجھے مگر اسے عام کو تو مطعون نہ کیجئے مگر وہ بھٹاتا رہتا۔ ایک دن بڑی تنجید و صبر نہ بنائے آئے اور کہنے لگے۔

”مقدمہ داری کریں گے“

میں نے کہا: ”کون؟“

کہنے لگے: ”تم ایسی ہی اور آپ۔ اس مرد و نہ میری اور آپ کی کہانی ایک مجموعہ میں یہ کچھ کر چھاپی ہے کہ فیض ہے ایسے ادب سے ملک کو بچانا چاہئے۔ اب اس کم محنت سے پوچھو کہ کسی اعلیٰ بات کر رہا ہے۔ ایک ذرا سے کتاب میں چھاپ کر شہرت کر رہا ہے۔ دوسرے پیسے کمانے کا الگ انتظام کر رہا ہے۔ اس نے جاری اجازت کے بغیر کہیں کہا نیاں چھاپی ہیں اسے نوکس دلوارا ہوا کہ ہر جانور سے۔“ پھر نہ جانے بھول بھال گئے۔

منٹو اپنی ڈینگوں سے زیادہ میرے سامنے اپنے دوستوں کی شہی گھارا کرتا تھا۔ رفیق نوری سے کچھ عجب قسم کی محبت تھی جو بڑی سمجھ میں نہ آتی جب اس کا تذکرہ کیا کہ یہ کہا: ”بڑا بد معاش لنگھتا ہے۔ ایک ایک کر کے چاہتوں سے شادی کر چکا ہے۔ لاہور کا کوئی رند ٹہنی نہیں جس کی اس نے اپنے چلنے پر ناک نہ لگسوالی ہو۔“

بالکل فخر کا ایسے ذکر کرتا جیسے بچے بڑے مینا کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کے عشقوں کے قصے تفصیلاً سے سنا یا کرتا ایک دن مجھے اس سے ملانے کو کہا۔ میں نے کہا: ”کیا کروں گی مل کر؟ آپ تو کہتے ہیں لنگھتا ہے وہ۔“

کہنے لگے: ”ارے جب ہی تو ملارہا ہوں۔ یہ آپ سے کس نے کہا کہ لنگھتا اور بد معاش بڑا آدمی ہوتا ہے۔ رفیق نہایت شریفانہ آدمی ہے۔“

میں نے کہا: ”منٹو صاحب! لنگھا، شریف، بد معاش یہ آخر کیسا آدمی ہے بری سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ مجھے بتاؤ کہ یہاں وہ کھلا کر کہتے ہیں شاید ویسا نہیں۔“

”آپ بنتی ہیں۔ منٹو نے بُرا مان کر کہا۔“ بھی تو میں آپ کو قیق سے ملانا چاہتا ہوں۔ بڑا دلچسپ آدمی ہے کوئی عورت بغیر عاشق ہوئے نہیں رہ سکتی۔“

”میں بھی تو عورت ہوں۔ میں نے فکر مند بن کر کہا اور وہ کھسیانا ہو گیا۔

”میں آپ کو اپنی بہن سمجھتا ہوں۔“

”مگر آپ کی بہن بھی تو عورت ہو سکتی ہے۔“

منٹو نے فخر سے لکھایا۔ ”ہر سکتی ہے۔ یہ خوب کہا۔“ مگر منٹو کو خند ہو گئی۔ ”آپ کو اس سے ملنا پڑے گا۔ دیکھتے تو سہی۔“

”میں اسے اسٹیشن پر دیکھ چکی ہوں۔ آپ نے میرے ایسے کان بھر دیے تھے کہ میں بھاگ آئی کہ کہیں کہ بخت پر عاشق ہی نہ ہونا پڑے۔“

اور قیق سے ملنے کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ منٹو کا مطالعہ کتنا گہرا ہے۔ باوجود دنیا کے سافٹ ویئر کے جنہوں نے وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو ایک ہندو مت انسان میں ہونا چاہئیں۔ وہ ایک عجیب بدعاش ہو سکتا ہے۔ سادہ بی نہایت ایمان دار اور شریف بھی۔ یہ کیسے اور کیوں؟ یہ میں نے مجھے کئی کوشش نہ کی۔ یہ منٹو کا میدان ہے وہ دنیا کی ٹھکانہ کی گورے پر چھٹکی ہوئی غلطی میں سے ہوتی ہے۔ نکال لانا ہے۔ گورے کا رید ہے۔ اسے شوق ہے کہ منٹو دنیا کے ستارے والوں پر اسے بھروسہ نہیں۔ ان کی عقل اور فیصلہ پر بھروسہ نہیں۔ وہ ان کی شریف اور پاکیزہ بیویوں کے دل کے چو پھولیتا ہے اور کوٹھے میں رہنے والی بڑی کے دل کے تقدس سے اس کا موازنہ کرتا ہے۔ عطر میں ڈوبی ہوئی عیش پسند دہن سے میں اور پسینے میں سڑتی ہوئی گھانن زیادہ خوشبودار معلوم ہوتی ہے۔ ”تو“ میں حالانکہ جسم ہی جسم ہے۔ خور سے دیکھتے تو جسم کے اندر رُوح بھی ہے۔ عیش پرست طبع کی پچھے ہوئے دوسری طرح پچھلیوں دار رُوح اور کچلے ہوئے لطیف کی نصرت سے دور مصلحت۔ اگر طبعاتی تفریق کا سوال نہیں تو ہم اسے قطعی طور پر جسمانی سوال بھی کہہ سکتے۔ منٹو کے ذہن میں ضرور دو وطنوں کے فرق کا خیال تھا اور وہ اس محبت کو جس کی دنیا چاہا کرتے تھے میں پرچنے میں بڑی ہمدردی محسوس کرتا تھا۔

وہ ہمیشہ اپنے بدعاش دوستوں کے کاندھے پر غم نہ بٹاتا کرتا۔ ایک دن میں نے جھانکے کہ وہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ اصل میں نہ ہزاروں رنڈیوں سے سناں کا تعلق رہا اور نہ ہی انھوں نے کبھی کسی عورت کی آبروریزی کی اور وہ طرح طرح سے مجھے یقین دلانے لگا کہ یہ لوگ واقعی بدعاشیاں کہتے ہیں اتنی ہی جلد اس سے بھی زیادہ۔

”سب جھوٹ ہیں وہ اندلی کرنے لگی۔“

”ار سے آپ کو یقین کیوں نہیں آتا۔ بازار میں جو چاہے جاسکتا ہے۔“

درمکاروں لوگوں کی اتنی محنت نہیں جو طوائفوں کے کوٹھوں پر جا سکیں۔ بہت کرتے ہوں گے گا ناخن کر چلے آتے ہوں گے۔“

”مگر میں خود گیا ہوں رنڈی کے کوٹھے پر۔“

”گا ناخن۔“ میں نے چڑایا۔

”جی نہیں۔ اپنے دام وصول کرنے اور ہمیشہ میرے دام وصول ہو گئے۔“ پھر بھی میں نے کہا۔

”میں نہیں یقین کرتی۔“

”وہ کیوں؟“ وہ اٹھ کر بالکل میرے سامنے خالین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔

”بس میری مرضی۔ آپ میرے اوپر محب ڈالنا چاہتے ہیں۔“

”بھئی خدا کی قسم میں کہتا ہوں میں کیا ہوں۔“

”خدا آپ کو یقین نہیں بیکار اسے نہ کھینٹے۔“

”اپنے مرحوم بچے کی قسم کھاتا ہوں میں ایک بار نہیں بلکہ.....“

”مرحوم بچے کو اب آپ چھوٹی قسم کھا کر کیا نقصان پہنچا سکتے ہیں؟“

اونٹرو وہیں بیٹھ کر مانا کر بیٹھ گیا کہ آج تو منہ کر رہوں گا کہ میں زندگی باز ہوں۔ صغیر کی گواہی دلائی ہیں نے ونٹ میں صغیر کو

جست کر دیا کہ میں ہے یہ تو سہے کہہ کر گئے ہوں کہ زندگی کے یہاں جا رہے ہیں اور اگر گئے ہیں تو اسلام کو کسے چلے آئے ہوں گے۔

صغیر چپ سی ہو گئی۔ ”اب یہ قسم نہیں کہہ سکتی کہ اسلام کر کے آگئے یا.....“ وہ محب کو بچہ میں رو گئی۔

منٹو نے خوش میں کچھ یاد تیزی سے پی ڈالی اور مٹی طرح لڑنے لگا کہ یہ تو آج منہ کر چھوڑوں گا کہ میں کچھ زندگی باز ہوں اور میں نے

کہہ دیا آج اور کی دنیا اوجھ ہو جائے میں مان کہے دوں گی نہیں۔

ایک تو نشہ دہرے منٹو کے مزاج کی جلی غلی اگر میں چلتا تو میرا منہ بیچ لیتا۔

صغیر نے مسرور کرنا۔ ہن مان جاؤ۔ شاہد نے کہا بس اب کچھ چلو منٹو نے شاہد کی ٹانگ لینا شروع کی اور کہہ دیا کہ بغیر شامل

ہوئے جانے نہیں دوں گا۔ خاصا ہنگامہ ہو گیا۔

بڑی سوجھ بکھ سے منٹو نے شاہد سے کہا چلو زندگی کے یہاں بھی اسی وقت آج میں قائل نہ کروں تو میں نے ماں کا دودھ نہیں

سو کا دو دھربیا۔ سو میں نے اوڑھ لیا۔

”آپ جانتی ہیں میں نے نہیں پوچھی بالکل بوج پر گھوم کر آجاتی گئے اور ہم یقین نہیں کریں گے کیا فائدہ؟“

اب تو منٹو کے سر میں گئی تو ایسی میں جا کر شاید ہی سمجھی ہو غصہ ضبط کر کے پوچھا۔

”پھر کیسے یقین دلایا جائے؟“

میں نے کہا۔ ”بہن یعنی مجھے اور صغیر کو بھی ساتھ لے چلئے۔“

”میں نہیں جاؤں گی۔“ صغیر گڑی۔ ”تھا تو دریاغ خراب ہوا ہے تم ہی جاؤ۔“

”جائے گی کیسے نہیں۔“ منٹو نے کہا۔

”چلو چلو.....“ صغیر کو کم سے کم تھک ماری اور چاروں چلے۔ دروازے سے ہم دونوں نکل آئے، منٹو کو صغیر نے نہ جانے

کیسے قابو میں کیا۔ دوسری دفعہ جب ملاقات ہوئی تو منٹو نے خوب قہقہے لگائے اور پھر پچکے سے کہا۔ ”ملکاب تو مان جاؤ۔“

میں نے کہا۔ ”تعلق نہیں۔“

مجھے نہیں معلوم منٹو کو تجربہ تھا یا جو کچھ اس نے زندگی کے بارے میں کھا ہے وہ اس نے اپنے اصول و یقین کی

باہر ہے کیونکہ اگر وہ زندگی کے کوٹھے پر گیا بھی ہو گا تو وہاں زندگی سے زیادہ اس نے ایک حیرت کا دل دیکھا ہو گا جو باوجود بیکہ مری کا

کیڑا ہے مگر زندگی کی قدروں کو پیار کرتی ہے۔ اچھے اور بُرے کو ناپنے کے جوہر بانی عام طور پر بنا دیے گئے ہیں وہ انھیں بڑا دلچسپ کر اپنی بنائی ہوئی قیل سے ان کا اندازہ لگنا تھا۔ غرض اچھے و خبیث اور نیکے انسان کی رنگ و صورت بھی پوچھ سکتی ہے۔ دگر بنی نافرمان، جیسا ترقین انسان بھی دلیاؤں پر بازی لے جا سکتا ہے۔ بدن و جوان دلیا بھی سرنگوں ہو سکتے ہیں۔ غری رضا کار بدکار بھی ہو سکتے ہیں اور لاش سے زنا کرنے والا خود لاش بھی بن سکتا ہے۔

کبھی کبھی ہیرا اور منگو کا جھگڑا انسانیت پر جاننا کہ دور ٹوٹی معلوم ہوتی۔ ایک دن کسی بات پر ایسا چڑا کہ آنکھوں میں خون اتر آیا۔ دانت پیس کر بولا۔

”آپ عورت ہیں ورنہ ایسی بات کہنا کہ دانت کھٹے ہو جاتے۔“

”دول کارہان نکال بیٹھے مروت کی ضرورت نہیں۔“ میں نے چرایا۔

”اب جانے بھی دیکھے کوئی مرد جوتا تو بتاتے۔“

”بتا بھی دیکھے ایسے کن کون سے تیر زکشت میں باقی رہ گئے ہیں نکال بھی دیجئے۔“

”آپ جھینپ جانیں گی۔“

”دفعہ مہ کی نہیں جھینپیوں گی۔“

”دو آپ عورت نہیں۔“

”دیکھوں کیا حررت کے لیے جھینپنا اشد ضروری ہے، چاہے جھینپ آئے یا نہ آئے، بڑا افریس ہے غصہ صاحب! بھی جو رتوں اور مردوں کے لیے الگ الگ اصول بناتے ہیں۔ میں کبھی بھی آپ نہ عام لوگوں کی سطح سے بلند ہیں۔“ میں نے مسک لگایا۔

”قطع نہیں..... میں عورت اور مرد میں تفریق نہیں سمجھتا۔“

”تو پھر کہنے نہ وہ جھینپا دینے والی بات۔“

”نہیں۔ اب قصداً اڑ گیا۔ وہ جنس کر بولا۔

”اچھا دوستی ہی میں کسی تباہی سے وہ کون سی خطرناک بات تھی۔“

”کچھ نہیں..... اب کچھ یاد نہیں رہا۔ شاید کڑی موٹی کسی گالی دے دیتا۔“

”بس؟“ میں نے نا اُمید ہو کر کہا۔

”یہ شاید کس کے بھائی چڑا رہا تھا۔“ نام ہو کر بولا۔

”مجھ پر کچھ بھی اثر نہ ہوتا میں نے ایسی کچھ گالیاں سُنی ہیں کہ حد نہیں اور میرے بغیر بھی خالص زور کے بڑچکے میں مگر پہلی دفعہ آپ نے عورت مجھ کو رعایت کی۔ میرے بھائی تو لگا چکے ہیں کئی بار۔“ اور ہمارا ملاپ ہو گیا۔

ایک دن دفتر میں گرمی سے پریشان ہو کر میں نے سر جاکر منگو کے یہاں آرام کروں پھر واپس ملا جاؤں۔ دروازہ حسب معمول کھلا رہا تھا مگر دیکھا تو صفیہ منہ پھلجائے لیٹی ہے۔ غر بابت میں جھاڑو لیے شاسٹ پلنگ کے نیچے ہاتھ مار رہا ہے اور

ناک پر گڑنے کا دامن رکھے میز کے نیچے جھاڑو چلا رہا ہے۔

”یہ کیا کر رہے ہیں۔ میں نے ہنر کے نیچے جھانک کر پوچھا۔

”ہر گز کھیل رہا ہوں۔“ منٹو نے بڑی بڑی مورچہ جیسی پتیلیاں گھما کر جواب دیا۔

”یہ لیجئے اہم نے سوچا تھا ذرا آپ کے یہاں آرام کریں گے تو آپ لوگ روٹے بیٹھے ہیں۔ میں نے وہاں جانے کی دھمکی دی۔

”ارے! صفیہ! کھڑے ہو۔“ آؤ آؤ۔“

”کابے کا جھگڑا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”کچھ نہیں میں نے کہا تھا نا بیکار گزرتی وغیرہ مردوں کا کام نہیں۔ بس جیسے تم سے اچھتے ہیں مجھ سے بھی اچھ پڑے کر نہیں

مردوں کا کام، میں ابھی جھاڑو دے سکتا ہوں۔ میں نے بہت روکا تو اور کڑے، کسے کئے ایسا ہی ہے تو طلاق لے لے۔“ صفیہ

نے بسور کر کہا۔

منٹو سے جھاڑو چھڑانے کے لیے میں نے بن کر کھانہ شروع کیا۔ ”صبح ہی صبح منٹو کی کھانسی نے صحن صاف کرنے

کے بہانے وصول حلق میں جھنجکی، اب آپ ارمان نکال لیجئے۔ گرہی کے مارے جان نکل رہی ہے۔“

جلدی سے جھاڑو چھوڑ کر منٹو کی طرف سے برف لاسنے چلا گیا۔ صفیہ منڈیا بگھارنے چلی گئی۔ برف لا کر منٹو نے تولیہ دہرا رہ

مار مار کر توڑی اور پلٹ پلٹ میں پھر کر سامنے رکھ دی اور کڑوں بیٹھ گیا۔

”اور سنائیے۔“ اس نے حسبِ عادت کہا۔ لائڈی کے گھارے مجھے زور سے اُگائی آئی۔

”افوہ! صفیہ! کاترہ جلا رہی ہے۔“ میں نے ناک بند کر کے کہا۔ منٹو نے چمک کر مجھے دیکھا سر سے پیر تک بڑی پتیلیاں

گھما رہی اور جھلانگ مار کر چھٹا سا دوجی خانے میں صفیہ کی پیچھے رہی اور اس نے پھر ٹٹا پانی پیلی میں جھونک دیا۔

واپس آکر وہ ہما ہما سامان سے کرسی پر بیٹھ گیا اور پھر کچھ جھینپ کر ہنس دیا۔

میں بہنؤں کی طرح دیکھتی رہی۔

صفیہ بڑ پڑائی آئی تو اسے زور سے ڈانٹا پھر بڑے شریٹے انداز سے بولا۔

”آپ کے پیٹ میں پھر ہے؟“ جیسے پتھر سے نہیں خود اس کے پیٹ میں ہو۔“ میں نے فوراً ٹٹوایا۔ جب صفیہ کے

پیٹ میں کچھ تھا تو اسے بھی گھارے اُگائی آئی تھی۔“

دعویٰ صاحب! خدا کے لیے دایئیں جیسی باتیں نہ کرو۔“ میں نے چوکر کہا۔ وہ زور سے ہنسا۔

”ارے واہ۔ اس میں کیا مچائی ہے۔ ارے آپ کو کھٹی جیسی چیزیں بھاتی ہوں گی۔ میں ابھی کیریاں لاتا ہوں۔“ وہ لبک کر

نیچے گیا اور گڑنے کے اس میں بچوں کی طرح کیریاں بھر کے لے آیا۔ کیریاں پھیل کر مٹی نفاست سے نلک مرچ گھا کر مجھے وہیں اور خود اکلواں

بیٹھا مجھے فور سے دیکھ کر سکاٹا رہا۔

دعویٰ ارے صفیہ! وہ چلیا۔

صفیہ دھوئیں سے آنی اٹکھیں، پھل سے پکھیتی ہوئی آئی۔ کیا ہے نظیر صاحب! کتنا چلاتے ہو؟“

نیک نہ گھسیٹا جانا۔

یہ زندگی واقعی جو غم کو سب سے زیادہ دلچسپ معلوم ہوتی تھی مقبول آمدنی پر، دنیا پلانا ہو، قحطیوں اور سب نے نکلیاں۔ ہر بات مذاق معلوم ہوتی تھی۔ اسی زمانے میں لاہور گورنمنٹ نے میرے اور منظر پر مقدمہ چلا دیا۔ منظر کی دیر بند آرزو برآئی۔ لاہور میں بھی لطیف آگیا خوب دعوتیں اڑائیں۔ اسی زمانے میں لاہور کی زیارت ہو گئی۔ زری کے جوئے خریدنے ہم دونوں ساتھ گئے۔ منظر کے پر بہت نازک اور سفید تھے جیسے کونل کے بھول۔ زری کے جوئے بہت چھنے گئے۔

”میرے پیر پڑے بھڑے ہیں۔ میں نہیں خریدوں گی اتنے خوبصورت جوئے۔“ میں نے کہا۔

”اور میرے پیر اتنے زمانے میں کہ مجھے ان سے شرم آتی ہے۔“

مظہم دونوں نے کئی چوڑ جوئے خریدے۔

”آپ کے پر بہت خوبصورت ہیں۔“ میں نے کہا۔

”بجو اس ہیں میرے پیر لایسے بدل لیں۔“

”بدلتا ہی ہے تو لایسے سہ بدل لیں۔“ میں نے رائے دی۔

”بجھا! مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ منظر نے جھک کر کہا۔

محبت کے مسئلہ پر کتنی ہی جھڑپیں ہر شے ملکر کسی فیصلہ پر نہ پہنچ سکے۔ وہ یہی کہتا۔

”محبت کیا ہوتی ہے؟ مجھے اپنے زری کے جوئے سے محبت ہے۔ دین کو اپنی پانچویں بیوی سے محبت ہے۔“

”میرا مطلب اس عشق سے ہے جو ایک نوجوان کو ایک دوستیہ سے ہو جاتا ہے۔“

”ہاں..... میں سمجھ گیا۔“ منظر نے دو درمائی کے دھندلوں میں کچھ ٹٹول کر سرچنے پر نے خود سے کہا: ”کشمیر میں ایک چوہا بانی تھی۔“

”بھیر؟“ میں نے دوستانہ سننے والوں کی طرح ٹٹکا رہ دیا۔

”نچو کچھ نہیں۔“ وہ ایک دم بچاؤ کے لیے تن گیا۔

”آپ مجھے ان کی گندی باتیں تو بتا دیتے ہیں اور آج آپ شرما رہے ہیں۔“

”کون کہہ شرما رہا ہے؟“ منظر نے واقعی شرما کر کہا..... بڑی شکل سے اس نے سنایا۔

”میں جب وہ مویشی ہانکنے کے لیے اپنی کھڑی اوپر اٹھاتی تھی تو اس کی سفید کھنی دکھائی دے جاتی تھی۔ میں کہہ جاتا تھا: ”دو ایک کبل لے کر ہاڑی پر جا کر لیٹ جایا کرتا تھا اور اس راس روکے اس لمحے کا انتظار کیا کرتا تھا جب وہ ہاتھ اوپر کرے تو استین ہرک جاتے اور مجھے اس کی سفید کھنی دکھائی دے جاتے۔“

”کتنی؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں..... میں نے سو لکھ لکھی کے اس کے جسم کا اور کوئی حصہ نہیں دیکھا۔“ منظر نے دھارے پڑے ہوتی تھی۔

”کے جسم کا کوئی خط نہیں دکھائی دیتا تھا مگر اس کے جسم کی ہر جنبش پر میری آنکھیں کتنی کی جھلک دیکھنے کے لیے جاتی تھیں۔“

”پھر کیا ہوا؟“
 ”پھر ایک دن میں کپل پر لیٹا تھا، وہ مجھ سے تھوڑی دیر مگر بیٹھ گئی۔ وہ اپنے گریبان میں کچھ چھپانے لگی ہیں نے پوچھا مجھے دکھاؤ تو شرم سے اس کا چہرہ گلہابی ہو گیا اور بولی کچھ نہیں۔ بس مجھے ضد ہو گئی۔ میں نے کہا جب تک تم دکھاؤ گی نہیں جانے نہیں دوں گا۔ وہ رپا ہنسی ہو کر گھبراہٹ میں مجھ پر آ کر گویا اور آخر کو بڑی رد و کد کے بعد اس نے مٹی کھول کر تنصیلی میرے سامنے کر دی اور خود شرم سے گھٹڑوں میں منہ دے دیا۔“

”کیا تم اس کی تنصیلی پر؟“ میں نے بے صبری سے پوچھا۔
 ”مصری کی ٹولی! اس کی گلہابی تنصیلی پر برف کے ٹھٹھے کی طرح بڑی بھلدار ہی تھی۔“
 ”پھر آپ نے کیا کیا؟“
 ”میں دیکھنا نہ گیا۔ وہ پھر سرخ میں ڈوب گیا۔“

”پھر؟“
 ”پھر وہ اٹھ کر بھاگ گئی۔ تھوڑی دیر سے پلٹ آئی اور وہ مصری کی ٹولی میری گتہ میں ڈال کر نظروں سے اوجھل ہوئی۔ وہ مصری کی ٹولی بہت دنوں تک میری قمیص کی جیب میں بڑی رہی۔ پھر میں نے اسے دراز میں ڈال دیا اور کچھ دن بعد چیر نکالیں کھا گئیں۔“

”اور ٹولی؟“
 ”کوئی سی ٹولی؟“ وہ چونکا۔
 ”وہی جس نے آپ کو مصری کی ٹولی تھما دی۔“
 ”اسے میں نے پھر نہیں دیکھا۔“
 ”دکس قدر پچھتاہٹ ہے آپ کا عشق!“ میں نے ناامیدی سے چڑھ کر کہا۔ ”مجھے تو بڑے کسی شعلہ بہ امان قسم کے عشق کی امید تھی۔“

”قطعی پچھتاہٹ نہیں۔ غصہ تو پڑا۔“
 ”بالکل رڈی۔۔۔۔۔ غصہ تو ریٹ۔ مگھلا عشق۔ مصری کی ٹولی لے کر پیلے آئے۔ بڑا تیر مارا۔“
 ”تو اور کیا کرنا؟ اس کے ساتھ سو جانا؟ ایک ترائی پلا اس کی گردن میں جھپٹ کر آج اس کی یادیں اپنی مرغانی کی ڈنگیں مارنا۔“ وہ گڑبڑا۔
 ”ٹھیک کہتے ہیں آپ مصری کی ٹولی کو کھلا کر کھانے کی نہیں دھیرو دھیرو سے چرنے کی چیز ہے۔“
 ”یہ دی غصہ تھا۔ غصہ نگار۔ گندہ دہن! جس نے بڑے کھلی تھی۔“
 ”جس نے“ ٹھٹھاگوشت“ دکھا تھا۔“

لیکن مرزا غالبؒ، ”میں جو دعویٰ بیکم مرزا غالبؒ کی محبوبہ ہوا نہ ہوا اس کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا مگر مٹھو کے خیالوں کی اعلیٰ ضرورت ہے جسے وہ اتنے نہیں لکھا ناچا ہوتا۔ جس کی گلہابی کی جھلک دیکھنے کے لیے وہ ساری زندگی بیٹھ سکتا ہے۔ یہ تھا وہ تصادف بشر کی خفگی کی ادلی

میں مختلف اوقات میں ظاہر ہوتا تھا۔ ایک طرف وہ ”نہا قانون“ کہتا ہے اور دوسری طرف ”بو“..... دونوں میں وہ خود کو فحش کہہ کر کہتا ہے لوگوں کو ایک فحش نگار یاد رہ جائے اور واقعہ نگار کو وہ بھول جائے جس نے قصداً یا سہواً..... ایک ہی بات ہے!

ملک میں فساد شروع ہو گئے بیزارے کے بعد اس کو ملٹی کے وہاں اس کو ملٹی میں کیے جانے لگے۔ منٹروں نے فحش نگاروں میں قریب قریب مستقل تھا۔ وہ بڑا خوش نظر آتا تھا۔ مدح سرائی جو اس کی زندگی کا سہارا تھی اسے ملٹی تھی کہ اس کی نظم ”آٹھ دن کا سیلاب نہ ہوئی۔ نہ جانے کیوں وہ فحش نگاروں کو شرم کا رے کے ساتھ ہمیشہ مایوس بنا دیتا تھا۔ اسے شوک کا بہت پسند تھا۔ منٹروں نے نہ جانے اسے کیا کہہ دیا تھا کہ وہ ایک دم اس کے خلاف ہو گیا۔

”بکواس ہے ملٹی۔ فراط ہے بکا۔“ وہ ملٹی سے کہتا۔

ملٹی مایوس ہو کر اس نے مجھے بھی مایوس ہی ایک سال کے لیے سینئر یوٹیوپا منٹروں میں کام دلوا دیا اور بہت ہی خوش ہوا۔

”اب ہم دونوں مل کر کمانی نکلیں گے۔ تنہا چل جائے گا۔ میری اور آپ کی کمانی شوک کا سہارا نہیں ہو سکتی گے۔“

ایک کمانی منٹروں کے زیرِ غور تھی، شوک کو وہ پسند تھی۔ اس سے پہلے اسے منٹروں کی کمانی پسند تھی پھر دل سے اڑ گئی اور منٹروں کی کمانی پسند آئی۔ میرے آنے سے بعد اسے میری کمانی پسند آ گئی۔ منٹروں کو ناگوار نہ گذرا اب شوک کا رے مجھ سے منٹروں کی کمانی پر کام کرنے کو کہا اور منٹروں کو میری کمانی پر اکتیو یہ کہتا تھا مجھ سے اور میں منٹروں سے شامی ہونے لگے۔ اور کمال امروہی ”محل“ کی کمانی سے کر آ گئے اور شوک کا رے کو وہ پسند آ گئی اور منٹروں کی کمانی کھانی میں پڑ گئی۔ اب صرف عزت کا سوال رہتا تو اور بات تھی۔ وہاں تو قریباً ہر گھنٹہ ہمارا کمانی نہیں بن رہی ہے تو ہم کسی شمار و قطاری میں نہیں۔ گو ہم سے کہہ: یا گیا تھا کہ جہن سے بیٹھو۔ خواہ ملٹی رسے کی کیونکہ منٹروں کے ہر جگہ ہے لیکن کمانی ہماری نہیں ہے کی لہذا میری اور شوک کی پوری کوششیں اپنی کمانی منٹروں کے لیے کی گئی ہیں اور شوک کا رے کے دوسرے درجہ کی تصویروں کی قطاریں منٹروں کے بنائی جانے لگی۔

منٹروں کی کمانی رہ گئی۔ منٹروں نے بھر اپنے کر سے میں بیٹھا اپنی کمانی کی اوج میں کیا کرتا کبھی انجام کو آفا زبنا کر کہتا کبھی آفا کر انجام بنا کر کبھی وسط سے شروع کر کے آفا زبنا کر کہتا اور وسط کو انجام بنا دیتا۔ باوجود ہزاروں آپدیشنوں کے کمانی کی کوئی کل شوک کا رے نہ آئی منٹروں میں نہ آتا۔

”آپ گنگولی کو نہیں جانتیں، میں جانتا ہوں۔ وہ میری کمانی میں مزدور کام کرے گا۔“

”آپ کی کمانی میں اس کا رول درمیان نہیں باپ کا ہے وہ کبھی نہیں کرے گا۔“ اور منٹروں سے پھر لڑائی ہونے لگتی۔ منٹروں نے زبان سے — یہاں اپنی فکر پڑی تھی اور وہی ہوا کہ ”منڈی“ اور ”محل“ بن گئیں۔ منٹروں کی کمانی رہ گئی۔ منٹروں کو اس کی امید ملتی اور اسے بڑی وقت محسوس ہوتی۔ وہ سب کچھ جھیل سکتا تھا۔ یہ قدری نہیں جھیل سکتا تھا۔ اور ملک کے حالات ہی ابتر ہو گئے۔ اس کے ہر ہر بچے اسے پاکستان بنانے لگے۔ منٹروں نے ہم سے بھی چلنے کو کہا۔ پاکستان میں جہن مستقبل ہے۔ وہاں سے جہاں کے ہر منٹروں کی کمانی میں ملے۔ وہاں ہماری ہم ہوں گے، بہت جلد ترقی کر جائیں گے۔ میرے جواب پر منٹروں نے ہنسی بھری نظر سے دیکھا۔ ان کی لڑائیوں اور جھگڑوں سے میرے آپدیشن منٹروں کی کمانی میں ہمیشہ اصل پر محسوس نہیں ہوتی۔

اور اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ کتنا بزدل ہے۔ کتنی قیمت پر لمبی وہ اپنی جان بچانے کو تیار ہے۔ اپنا مستقبل بندنے کے لیے وہ بھاگے ہوئے لوگوں کی زندگی کی کمانی پر دانت لکھنے بیٹھا ہے اور مجھے اس سے نفرت سی ہو گئی۔ اور ایک دن وہ بغیر اطلاع کیے اور طے پاکستان چلا گیا۔ مجھے بڑی ہنک محسوس ہوئی۔

پھر جب اس کا خط آیا کہ وہ بہت خوش ہے۔ بہت عمدہ مکان ملا ہے۔ کشادہ اور خوبصورت، قیمتی سامان سے آراستہ۔ ہیں اس نے پھر لکھا: قصائی ختم ہو گئی تھی اور ہم نے آرزو شروع کر دی تھی، بڑے وقت آئے تھے اور چلے گئے تھے۔ اس کے پھر دو خط آئے۔ اس نے بلایا تھا کہ ایک سینا لانا کروانے کی امید دلائی تھی۔ مجھے بڑا دکھ ہوا۔ اس کی محنت کا پہلے ہی نتیجہ تھا کہ اب اور بھی مان جانا پڑا مگر میں نے اس کے خط پھاڑ دیے اس بات سے بڑا کرکھ وہ میرے اصولوں کی قدر کریں نہیں کرنا۔ میں نے تو اسے جانے سے نہیں روکا۔ پھر وہ مجھے اپنے راستے پر کبیریں گھسیٹ رہا ہے۔

پھر سنا خط بہت خوش ہے۔

مکان میں گیا مگر: و سر امکان بھی خاصا اچھا ہے۔

ایک سڑکی اور پیدا ہوئی۔

اور سال گزرتے گئے۔

ایک دن کی اور پیدا ہوئی۔ مٹکا کا ایک خط آیا: کوکشن کر کے مجھے ہندوستان بلالو۔

پھر معلوم ہوا کہ مٹکا پر مقدمہ چلا اور جیل ہو گئی۔ اٹھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے۔ کسی نے احتجاج بھی نہ کیا بلکہ کچھ ایسا لوگوں کا دیتے تھا کہ اچھا ہوا جیل ہو گئی۔ اب درماغ درست ہو جائے گا۔ نہ کہیں جلسے ہوئے نہ میٹنگیں ہوئیں نہ ریزولوشن پاس ہوئے۔

پھر معلوم ہوا کہ درماغ چل نکلا اور پاگل خانے میں بار دوست بچایا آئے ہیں۔

مگر ایک دن مٹکا کا خط آیا۔ بالکل پرشوش و حواس میں لکھا تھا کہ اب بالکل ٹھیک ہوں۔ اگر کوئی سچے سے کہہ لیں مگر بلالو تو بہت

اچھا ہو۔ اس کے بعد وہ صوبہ کوئی غیر نہیں ملی۔ نہ ہی میرے خط کا جواب آیا۔ پھر سنا کہ دوبارہ پاگل خانے چلے گئے۔ اس خط کی خبروں سے بڑا رونا لکنا تھا۔ پوچھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ خدا جانے اس کا اگلا قدم کہاں پڑا ہو مگر پاگل خانے سے آگے جو قدم پڑتا ہے وہ لوٹ کر نہیں آتا۔ پاکستان سے آنے والے لوگوں سے بھی اتنی کڑوی خبر نہیں کہ جی ادب گیا۔ بے طرح پینے لگے ہیں۔ اپنے پرانے ہر ایک سے ہنس مانگ بیٹھتے ہیں۔ اخبار والے بٹھا کر سامنے مضمون لکھواتے ہیں۔ میٹنگیں پیسہ دو سب کھا جاتے ہیں۔

مٹکا کا آخری خط آیا جس میں ایک مضمون اپنے اوپر لکھنے کو کہا تھا اور بے ساختہ میری خوب زبان سے نکل گیا کہ اب تو کرنے کے بعد ہی مضمون لکھوں گی۔

اور آج مٹکا کرنے کے بعد میں لکھ رہی ہوں۔ غلطی نہیں ہو سکتی کہ میرے اور مٹکا کے درمیان بہت کچھ ہو چکا تھا۔ آج صرف ایک کسک زندہ ہے۔ یہ پتہ نہیں چلنا کہ کس بات کی کسک ہے؛ کیا اس بات کی ندامت ہے کہ وہ مر چکا اور میں زندہ ہو؟ یہ برے سینے پر لپڑہا جس جیسا اب مجھ کو ہے؟ مجھے تو مٹکا کوئی ترسنا یا دہشت اور اس کا تو فعل بھی کیا تھا یہی ناکہ اس نے مجھے بس کہا تھا۔ مگر میں تو کھڑی بھائیوں کو دم توڑنا دیکھتی ہوں اور کچھ نہیں کہہ سکتی۔ مرنے والے زخم لگا جاتے ہیں جو نہ ٹوکتا ہے نہ رستہ ہے۔

منہ سٹو میرا دشمن

اوپنڈر ناتھ اشک

منہ سٹو میرا دشمن کھانا تھا۔ ہمیں خاصی چھپشلی تھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جب تک ہم اکٹھے رہے ہم نے ایک دوسرے کو سخت چوٹیں پہنچائیں۔ کتبہ ایٹلر بھی سے شائع ہونے والے نئے ادب کے سہارا کے سلسلے میں سعادت سن ملو کا جو ایٹلر کرشن چندر نے لکھا اس میں اس چھپشلی کا ذکر بھی کر دیا اور ہماری یہ دشمنی روایتی ہو گئی۔ یہاں تک کہ ایک دوست نے اسی دشمنی کا ذکر کرتے ہوئے مجھ سے اصرار کیا ہے کہ اگر میں نے منہ سٹو کے بارے میں مضمون نہ لکھا تو وہ مجھے کبھی نہ بخشے گا۔ لیکن آج جب منہ سٹو دنیا میں نہیں ہے، میں سوچتا ہوں کہ کیا ہم واقعی دشمن تھے؟ اور پندرہ بیس برس کا جائزہ لیتا ہوں تو پتا ہوں کہ اگر ہمارے تعارف کی ابتدا دشمنی سے نہ ہوتی تو ہم بہت اچھے دوست ہوتے۔

منہ سٹو کی اور میری اختلافیں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ دلکین ہی سے دنیویانہ فطرت رکھنے والی دوکانوں کے اوپر چاروں میں جیسے والی خیریت کی محفلوں میں شامل ہوتا تھا اور رات کو خواب بھی تماشہ ہی کے دیکھتا تھا اور میں نے کبھی تماشہ کو ہاتھ نہیں لگایا وہ نہ بیاٹوں تھا اور میں نے شراب تو دور ریٹھ کر لی پہلی بار ۱۹۴۲ء میں پیا جب میں بیس برس کا تھا۔ اس نے کٹھن کھنیاں ہویا میرا منہ ہی ہو یا فارس روٹ، اس بازار کی خوب میر کی تھی اور میں نے اُدھر جھانک کر کبھی نہیں دیکھا۔ بات یہ ہے کہ ماں نے مجھ ہی سے ان تینوں کے خلاف سخت نفرت میر سے دل میں بھردی تھی۔ والد فخر نے ان تینوں میدانوں میں جو کارہائے نمایاں سر انجام دیے، میرا خیال ہے کہ ہمارے خاندان کی آئندہ دہائیوں میں اس سلسلے میں کچھ بھی کیے بغیر ان پر فخر سے سر بلند کر سکتی ہیں۔ ان کے ان کی کاموں کی وجہ سے گھر کی معیشتی حالت ہو گئی اور ہم نے جس قسمت میں بچپن کے دن کاٹے اس نے خون کو کچھ ایسا سمجھ کر دیا کہ آج جب میں گڑھ یا شراب کو دیکھا معیوب نہیں سمجھتا، کبھی کل کھینے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ چاہی، جب ایک اُدھر بیگ چڑھا لیتے تھے عمو انورہ لگاتے تھے۔ گڑھ کی نذر کہ کفن کے لیے! وہ حال ہی میں جیسے تھے اور انھوں نے کبھی مستقبل کی فکر نہیں کی۔ رد عمل کے طور پر میں نے لوگوں کی ہیں زندگی کا سارا خاکہ تیار کر لیا تھا۔ اوڈھو گھر میرے اس زہد، حساسیت، پلاننگ، کھانا بیت شماری اور مٹھا ڈس سے سخت نفرت تھی۔ اپنی اس نفرت کا اظہار اس نے کئی بار سخت ترین الفاظ میں کیا۔

..... مجھے منہ سٹو نے فتنہ میں کام کرنے کے لیے بھی بلایا تھا۔ میرے بھی پہنچنے کے دوسرے سیتھیر سے دن کا کچھ

ہم کو ٹکڑی میں آسنے ملتے بیٹھے گرائٹ روڈ کو جا رہے تھے۔ غٹھ نے تھوڑی سی پی ریکی تھی۔ اچانک اس نے انگریزی میں کہا۔
 "I LIKE YOU THOUGH - I HATE YOU."

..... ٹیڑھ سال بعد ہم غلطان کی کٹھیں میں بیٹھے تھے۔ لچکا دقت تھا۔ غٹھ کی میز پر حسب و متور راجہ ہمدی علی خاں، واجپا وغیرہ دو ایک دوست تھے۔ جی۔ راہ کی میز پر اپنی فریٹ کے دو ایک دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ نہ جانے کیسے غٹھوں کے واہ کو منہ بیکار اور کپال کرنا۔ یسین فرد کے کھوپڑی کو توڑنے کی دم کا ذکر جلا مٹھنے دانت ہیں کر کہا۔ اسے شک جب مرے گا تو اس کی کپال کر یا میں کروں گا۔

..... میں کہے۔ ای۔ ایم۔ پنپال میں بیار پڑا تھا۔ ٹوکڑوں نے دفن کا فتوے دے دیا تھا۔ واجہ ہمدی علی خاں مجھ سے ملنے آیا اور اس نے کہا۔ غٹھ کہتا ہے کہ سالہا اس طرح پسیدہ نہ جوڑنا تو بیار نہ پڑتا۔

جب گرائٹ روڈ کو جاتے ہوئے غٹھ نے مجھ سے کہا تھا، میں تمہیں پسند کرتا ہوں لیکن مجھے تم سے سخت نفرت ہے تو میں نے جواب میں کہا کہ یہی حال میرا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے محض جواب کے لیے جواب دیا تھا ورنہ غٹھ سے مجھے دراصل کبھی نفرت نہیں ہوئی۔ رہا غٹھ تو اس نفرت کے باوجود جس کا اظہار وہ دفن تو کرنا تھا اور اس اقتصاد کے باوجود جو ہماری طبیعتوں میں تھا میں پاچھی طرح جانتا ہوں کہ ہم دونوں گہرے دوست ہوئے اگر میں نے اپنے غٹھ کو اپنے میں غٹھ کو بنا دیکھنا بنا جانے، بنا پڑے اس کے غٹھ ایک سخت محلو نہ کس دیا ہوتا۔

بات شاید ۱۹۳۸ء تا ۱۹۳۹ء کے آس پاس کی ہے۔ غٹھ کی ایک کہانی، خوشیا، ایک رسالے میں چھپی تھی۔ میں ادا اجڑ گھڑی کے اس زمانے میں ساتھ ساتھ لکھا پڑھا کرتے تھے۔ وہ کہانی کھٹے تو مجھے اکر سنانا نہ بھرتے اور میں لکھتا تو انھیں جاسٹا لکھ دوں میں کہ معصوم کے افسانوں پر تباہ و خرابیات کرتے اور مصیبت کو فوجانی میں جتنا ہے، ہماری رٹیں خاصی تیز ادا تھی جوتیں۔ یہی ہے خوشیا کے بارے میں میری رائے پوچھی۔

میں نے اس وقت تک غٹھ کی کوئی چیز نہ پڑھی تھی نہ اسے دیکھا تھا۔ مرگنہ شبت امیر کے نام سے جہاں ایک زوجہ غٹھ کے نام سے شائع ہوا تھا اور میں نے کسی سے سنا تھا کہ وہ روسی افسانوں کے ترجمے میں دلچسپی دے کر کسی ناشر کی تلاش میں لاہور آیا تھا۔ اس بات میں کہاں تک صداقت ہے یہ میں نہیں جانتا۔ بہر حال خوشیا کی اشاعت سے پہلے غٹھ کے بارے میں کبھی دو ایک باتیں میں جانتا تھا اور چونکہ لکھنا میں نے کوشش کی تھی اور یہی سے بہت پہلے شروع کر دیا تھا، میں بھی بہت غٹھ سے بڑا ہوں اور اس وقت تک میرے کچھ مشہور افسانے، چاچی کو کپال، قص و غیرہ لکھے جا چکے تھے اور مزہ کم کو میں بعد اگھنے والے سے کمتر سمجھتا تھا، اس لیے میری نظروں میں غٹھ کی کوئی خاص وقت نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ خوشیا پڑھتے وقت بھی میں پہلے ہی مصنف کے خلقات تھا۔ خوشیا مجھے بہت اچھا بھی نہیں لگا حالانکہ غٹھ کی کہانیوں میں اسے خاصا دیر حاصل ہے اور بنیادی خیال کو نگہ کرنے سے بہت اچھی طرح نیچا پڑے تو مجھے یہ اعراض تھا کہ خوشیا حقیقی کردار نہیں بلکہ مصنف کے دماغ کی اختراع ہے۔ میرے ایک دوست اس زمانے میں باقاعدہ اس لکھی کی سیر کرتے تھے اور ان کی وساطت سے مجھے اس کے آداب و قواعد سے نامی واقفیت تھی۔ پچھلے طبع کی کی طوائفوں کے جیسی کہ خوشیا کی کہنا ہے،

و لا محالہ ان سے پہلے ہی کھانی کی طرح ہمت و ہمت ہو جاتے ہیں۔ یہ بات میں یقینی طور پر جانتا تھا۔ اسی لیے یہ خیال تھا کہ خوشیاں کا کردار عجیب و غریب ہے۔ یہی ہے کہ جب خوشیاں آگے بارے ہیں میری رائے پہنچی تو اس وقت فی شعوری طور پر یہ باتیں میرے دماغ میں نہیں آتی۔ پس یہی وجہ ہے کہ دن گئے کسی چیز پر اتنی سنجیدگی سے غور کرنے کی عادت نہ تھی۔ جو میں آج تک دیتے تھے۔ اسی لیے میں نے کہا: دو کوڑی کی کہانی ہے۔

میں نے یہ بات کہی اور بھول گیا لیکن یہی نہیں بھولا اور جب کچھ عرصے بعد یہی دہی گیا اور وہاں ٹوٹے جو اس وقت آلا میڈیا میڈیو دہی میں آگیا تھا، اپنی عادت کے مطابق اسے پریشان کیا تو نہ جانے کیسے اور نہ جانے کس سلسلے میں یہی نے خوشیاں کے بارے میں یہی رائے کا ذکر کیا۔

دہی سے واپس آکر یہی نے پتھر سے اپنی ملاقات کا حال سنا یا اور کہا کہ میں نے تقریباً ہفت روزہ کی بات پچھائی ہے۔ چلو مجھے بھی یہ خیال بھی نہ تھا کہ غم اور اس کی ایک دوسرے کا اس کا میں گئے اس لیے میں نے اس اطلاع کو سنا ان سنا کہ یہاں تک کہ ۱۹۴۷ء میں جب کہ رتن چندر کے ملاو سے پرہیز ہوئی۔ یہ پیشین گوئی اور وہاں جلنے کی علامت ہو گئی تو مجھے پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ میرا وہ ریکارڈ کہاں تک پہنچ گیا ہے۔ دو سٹون نے میری ملازمت پر اس لیے غری کی کا اٹھارہ لاکھ روپے کا بدلہ ملے یعنی اگرچہ میں اور مٹھو بھی آٹھ سائے نہ ہوتے تھے لیکن گوگوں نے ہم کو ایک دوسرے کا حریف مان لیا تھا۔

دہی میں اپنی لکری پر آئے کے دوسرے ہی دن مجھے اس بات کا پتہ چل گیا اور جو لوگوں ایک بڑی تکلیف دہ اور کمیشن پوری زندگی سے نجات پا کر آیا تھا اس لیے اس خیال سے میری روح کا پتہ گئی کہ مجھے کبھی سے عقاب کرنا پڑے گا۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ میں موقع ملے ہی مٹھو کو سمجھوں گا کہ لوگ محض تماشہ دیکھنا چاہتے ہیں اس لیے ہم کو یہ تماشہ نہیں دیکھنا ایک تو یہ کہ یہی لوگوں اس وقت مٹھو کا طوطی بولتا تھا۔ دوسرے وہ پہلے ہی سے مجھے بچا کھانے کے لیے اُدھار کھاتے بیٹھا تھا اس لیے میری کوششیں بار آور نہ ہوئیں۔ یہی لوگ دفتر ان دنوں ملی پور روڈ کی ایک کونوی میں تھا۔ بڑے کمزے آفیشن ڈائریکٹر، ڈیو گرام ڈائریکٹر اور بیوروکریٹس کے پاس تھے۔ جھوٹے کمروں میں سے (جو شاید کوٹھی کے ہاتھ دوڑ رہے ہوں گے) ایک میں رائے دوسرے میں کرنشن اور تیسرے میں مٹھو بیٹھتے تھے۔ یہ کرے ساتھ ساتھ تھے۔ مجھے ابھی یاد ہے میں کرنشن کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ کرنشن مٹھو کو دیکھ کر دوسری طرف ایک کونوی میں داخل تھا، گیا ہوا تھا اور میں کوئی غیر نگاہ نہ تھا کہ مٹھو ملتا ہوا آیا اور ادھر ادھر کی بات کر کے اس نے خوشیاں کی بات چھیڑی۔

میرے معلوم ہوا ہے کہ انھیں میری کہانی خوشیاں پسند نہیں آتی۔ وہ بولا۔

میں نے ٹانگے کی کوشش کی لیکن مٹھو بول جھوٹے والا نہیں تھا۔ انھیں اس میں کیا پسند نہیں آیا؟ اس نے پوچھا۔

میں نے اسے سمجھا دیا کہ میں یہاں ہندی اصلاح کاری حیثیت سے آیا ہوں، میرا تھا راکوئی مقابلہ نہیں، تم میرے سے کام کرو اور مجھے کام کرنے دو، انھوں نے کہتے ہیں کہ میں مت چلو۔ لوگ تماشہ دیکھنا چاہتے ہیں، ہم کو یہ تماشہ نہیں دیکھنا۔

میں نے مٹھو سے مجھے بات نہیں کر کہہ دی۔ اس نے اٹھ کر جنبش سے جیسے میری بات کو کھاتے ہوئے ہی سوال دہرایا اور شاید کوئی محنت بات بھی کہی۔ مجبوراً میں نے کہا کہ کہانی وہ ابھی ہے لیکن حقیقت نہیں؟

”کیوں حقیقت نہیں؟“

تب میں نے اپنا اعتراض بتایا یہ تعین ایک خیال پر تھا اور تم نے اپنے آپ کو دلال کے روپ میں رکھ کر ویسی صورت میں اپنے رد عمل کو ظاہر کر دیا۔ تصفیٰ دنیا میں خوشیاں دلائی دلال ہوتا تھا تا اس کے سامنے یوں برہنہ ہوجاتی تروہ اسے وہیں دبی لیتا۔
تم نے جو کچھ کھا وہ ایک پڑھ لکھا شاعر و شاعر سمجھا جاتا ہے اُن پر دلال نہیں۔

کچھ اسی طرح کی بات بڑے زوروں سے میں نے کہی۔ منٹو کو بھر کر چپ رہا، پھر تکرار کر دیا: "ہاں ہاں! میں وہ دلال ہوں منٹو وہ دلال ہے تعین افسانہ نویس کا علم بھی ہے، غم خورد کیا کہتے ہو؟"

لیکن اس وقت کرشن چندر آیا کیا مجھے اڈوانی (پیشین ڈائریکٹر) نے بلایا یا جا لے لیا ہوا "بہر حال وہ عقدہ دینے پر تیار تھا۔ لیکن وہ عقدہ کچھ ختم نہیں ہوا۔ وہی میں جو پیش اس کے بعد ہی سو رہی، منٹو میرے اس اعتراض کو بھی نہ بھول سکا۔
..... لیکن وہ عقدہ کچھ ختم نہیں ہوا۔ وہی میں جو پیش اس کے بعد ہی سو رہی، منٹو میرے اس اعتراض کو بھی نہ بھول سکا۔
گزشتہ سال نقوش کے کسی خاص نمبر میں آرزو ادیبوں کا ایک سمپوزیم شائع ہوا تھا اس وقت جب آرزو میں کوئی نیا افسانہ لکھے ہوئے رادھ میرے جوافسانے آرزو میں بھیجے گئے وہ ایک طرح سے ہندی سے ترجمہ ہوئے ہیں (مجھے آدھ برس پہلے کو کہتے ہیں اور میرے احباب اور آرزو کے ناظر تک مجھے بھول گئے ہیں) منٹو کو میں یاد رہا۔ خوشیائے بارے میں میرے اعتراض اور اپنے جواب کا ذکر کرنا وہ اس سمپوزیم میں بھی نہیں بھولا۔

اس کے بعد اگرچہ میں نے بڑی کوشش کی کہ منٹو سے بیری جھگ نہ ہو، اپنی میزبانی اٹھا کر دوسری منزل میں لے گیا لیکن میری تمام کوششیں ناکام رہیں۔ میرا جی بھی نیچے اترتا رہا۔ منٹو محنت و حقارت کی نظر سے مجھے دیکھتا اور کسی کیسی طریقے سے اپنی لغت کا اظہار بھی کر دیتا۔

ان دنوں کی بڑی صاف تصویر داغ کے پردے پر نقش ہے۔ منٹو دیکھو کہ اُسے ڈرامے لکھنے پر آمادہ تھا کرشن چندر اور اسے اپنی لغت کا اظہار بھی کر دیتا۔
ان دنوں کی بڑی صاف تصویر داغ کے پردے پر نقش ہے۔ منٹو دیکھو کہ اُسے ڈرامے لکھنے پر آمادہ تھا کرشن چندر اور اسے اپنی لغت کا اظہار بھی کر دیتا۔
کے وقت میں ایک آدھ ڈرامہ بھی لکھ دیا کرتا تھا۔

منٹو کا ڈھنگ یہ تھا کہ وہ آرزو کا نائب راسٹر لے کر بیٹھ جاتا اور کرشن سے پوچھتا: "لو بعضی کس پر موضوع پر ڈرامہ لکھنا ہے؟"
موضوع سننے ہی فوراً غلط کرنا شروع کر دیتا اور شام تک سو دھ کرشن کو دے دیتا۔ منٹو کو اس بات کا غم تھا اور اس کا اعلان وہ عموماً کیا کرتا تھا کہ وہ جس چیز پر چاہے ڈرامہ لکھ دیتا ہے۔ زید پور کے ڈراما اسٹوڈنٹ۔ غلام محمد، سید عزیز احمد، غلام اکبر، بھائی، تاج محمد وغیرہ اسے مانگتے رہتے تھے۔ منٹو کہتے کہتے انھیں ڈرامہ سنبھالنا پڑتا تھا اور وہ من کر منٹو صاحب، آپ ڈرامہ کے بارگاہ میں لگتے ہوئے منٹو کے خرقے پر چالنے لگا کر اسے غصے جادو اور محنت صاحب سے ٹوکنا مینے ہلانے کا سہرا تھا اور اڈوانی اس سے اس لیے دہشتے تھے کہ منٹو کے کوئی رشتے دار منٹو کے اڈوانی کے ساتھ مل کر ڈرامہ لکھنے پر آمادہ ہو جاتا۔ منٹو صاحب، ہنسی دیتی اور ہر معاملے میں منٹو کی رائے منکر کا درجہ رکھتی تھی۔ منٹو خود لایوں یا دوستوں میں گھبراتا تھا۔ منٹو کے وقت کبھی اس کے اور کبھی کرشن کے کمرے میں محفل تھی۔ میں بھی کبھی کبھی لکھتا ہوتا تھا۔ منٹو کبھی مجھے بات نہ کرنے دیتا۔ میرے بارے میں کوئی نہ کوئی تنقید میرا دل کا زخم دیا کرتا اور اگرچہ میرے معاملے میں لوگ اس کا سہارا دیتے مگر مجھے بڑی کوفت ہوتی۔

آخراک وہ ہیں نے کرشن سے کہا: "دیکھو بھائی! تم کو منٹو کو سمجھا دو۔ وہ مجھے خواہ مخواہ تنگ کرتا ہے۔ میں اس طرح

دے جانا ہوں۔“

”تم بھی اسے تنگ کرو، کرشن نے کہا، میرے بھانے سے وہ کیا سمجھے گا؟“

اور اس دور میں دفتر گیا تو میں نے طے کر لیا کہ آج میں غڑ کو پریشان کروں گا۔ کچھ دن پہلے اس کی کمائی دھواں شائع ہوئی تھی۔ کمائی مجھے بے حد پسند تھی۔ غڑ نے ایک نازک موضوع پر بڑی نزاکت اور فاضلت سے فساد لکھا تھا، لیکن میں تو شرارت پر تلا ہوا تھا اور جو تو میں اس دوران میں غڑ کی امانیت کے ہر پہلو کا مطالعہ کر چکا تھا اس لیے میں نے اپنا طرز عمل طے کر لیا۔ دفتر پہنچ کر میں غڑ کے کمرے میں گیا۔ وہ ابھی آکر بیٹھا ہی تھا کہ میں نے کہا۔ ”میں نے تمہاری کمائی دھواں، پڑھی۔“

”دیکھی گئی؟“

”اچھی ہے، اب تم چٹھی پڑھو۔“

غڑ کو پھر کچھ رہا۔ پھر اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں تقریباً باہر نکالتے ہوئے کہا، ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

میں نے کچھ نہیں کہا اور وہی بات دہرا دی۔ ”بس اب تم چٹھی پڑھو۔“

اس وقت شخصیت نے لحاظ نہ لکھا تھا، غڑ چٹھی پڑھا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ تم خود کیا افسانے لکھتے ہو، لیکن کچھ دن پہلے وہ

اس بات کا اعلان کر چکا تھا کہ اس نے بھی میرا افسانہ نہیں پڑھا اس لیے اس نے کہا، ”تم کیا جھک مارتے ہو؟ میں نے تمہارے ڈور اسے پڑھے ہیں۔“

اس وقت میرا مجموعہ ”پانی“ چھپ چکا تھا اور میں کچھ بہت اچھے ڈرامے لکھ چکا تھا۔ چونکہ غڑ نے کافن مجھے خوب آتا ہے اس لیے طرح دے کر میں نے کہا، ”میں تو ڈرامہ لکھنا ابھی سیکھ رہا ہوں، اس لیے میرے ڈراموں کی بات چھوڑ دو، لیکن تم جو ڈراموں کے بادشاہ کہلاتے ہو، جیسے جھک مارتے ہو؟ وہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ کروٹ، ”میں تمہارے ہاتھ کے افسانہ“ ”رین“ کے کہانی چڑائی آئے۔ ”روح کا نامک“ پورے کلا پورا ترجمہ کر دیا ہے اس وقت میں نے مصنف کا نام بھی لیا تھا، اور خواہ مخواہ نہیں دیا، میں اچھے نمائندگی نہیں لکھتا، لیکن طبعاً ادب لکھتا ہوں۔ میری اچھی بڑی چیز بڑی اپنی ہے، کسی دوسرے کی چڑائی تو نہیں۔“

غڑ جھکا، لیکن میں وہاں نہیں ٹکا۔ کرشن چندر کے کمرے میں آ گیا۔ غڑ ڈرامہ لکھنے جا رہا تھا، لیکن ڈرامہ لکھنا تو دور رہا، اس کے لیے اپنے کمرے میں بیٹھا تنگ شکل ہو گیا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے کرشن کے کمرے میں آیا۔ اس نے پھر مجھ سے افسانہ کے فن کو لے کر بات کرنے کی کوشش کی، لیکن میں پھر طرح دے کر نکل گیا اور سڑوٹو دیو چلا گیا۔ غڑ نے سڑوٹو میں میرا بیچھا کیا۔ لیکن میں پھر ٹال گیا۔

اسی شام دشوارتر عادل اپنے دوست اور بہنوئی مسٹر مدن موہن بھٹہ کے ساتھ غڑ سے ملے گیا۔ اس نے مکر بنایا کہ غڑ نے انھیں اپنے افسانوں کا مجموعہ دیا اور مجھے بے شمار گالیاں کہنا شک سالہ اپنے آپ کو مجھتا کیا ہے؟ اس کو افسانے کے فن کی اجداد کا بھی علم نہیں۔ ادب لطیف میں اس نے افسانہ کے فن پر جو معنویں لکھا تھا وہ کیا کچھ اس سے دیکھو وغیرہ۔

تین دن تک غڑ مجھے گالیاں دیتا رہا۔ میں اوپر اپنے کمرے میں بیٹھا وہ سب سن رہا، کیونکہ ناشانی بڑے خوش تھے اور غڑ کو کیا کہتا ہے وہ مجھے رانی راتی نہانا نہ بھرتے تھے، لیکن میں چپ رہا اور دل ہی دل میں ہنسنا بھی رہا کہ جیسا میں نے سوچا تھا ویسا

ہی ہوا اور انھوں نے کہنا دیا کہ راجا دل خواستہ مجھے وہ سب کچھ کرنا چاہتا ہے جس کی دو قسموں کو توفیق تھی۔
 میں نے ان کے افسانے پسند کرتا تھا۔ خوشنیا کے بعد میں نے فقر کے کئی بہت اچھے افسانے پڑھے تھے۔ نیا قانون، منتر، منتر، منتر،
 ڈر، پوک، موسمی، شرارت، ہنسک، مسٹر ڈی کو سٹا، مجھے بہت پسند آئے تھے لیکن جب تک میں دلی میں رہا میں نے کبھی منٹر کے سامنے اس
 کے افسانوں کی تعریف نہیں کی جو نیکو منٹر کی نظر کافی تیز تھی اس لیے خوشنیا کے پڑھنے پر وہ خوش ہو کر تھا لیکن خوشنیا کے لیے
 اس کے دل میں کوئی عورت نہیں رہی تھی۔ یہ عجیب بات ہے کہ کرشن نے مجھ کو دلی بلا کر منٹر کے مقابل لا کھڑا کیا لیکن جب بھی وہیں جھگڑا
 ہوا اس نے ہمیشہ منٹر کی طرف داری کی منٹو اس کا فائدہ اٹھایا لیکن کرشن کے لیے اس کے دل میں عورت نہ تھی۔ وہ اسے ملی
 گالیاں دیتا تھا۔ چونکہ ان دونوں منٹو کو ہر وقت خوشنیا کی لوگ گھیرے رہتے تھے اس لیے میری اس حقیقی تعریف کو بھی خوشنیا پر محمول
 کر لے یہ میری انا کو منظور نہ تھا۔ میں دوستہ منٹر کے اچھے افسانوں کا ذکر چھڑھڑھانا اور اس کے کردار افسانوں کی تنقید پڑنے والی
 سے کرتا تو خیر کہ عامی تنقید میں بھی تھی۔

ان دنوں وہ بیاں نگاری کو ترقی پسندی سمجھا جاتا تھا۔ احمد علی، محبت اور منٹو اس کے علمبردار تھے۔ کرشن کھل کر نہ کہتے تھے
 لیکن انھوں نے ملٹی ای کی ان کیوں کا ایک فارمولہ بنا رکھا تھا جس میں وہ رومان، انگریزی اور ترقی پسندانہ طرز میں منٹو کی سی بویائی ملی مادیت سے
 تھے۔ میرا کہنا تھا کہ عورتوں کی محبت، فزونی اور پرواز کے علاوہ بھی بیسیوں مسائل ہیں جو اتنے ہی اہم ہیں لیکن نہ جانے کیوں اس وقت
 ترقی پسندوں کو بویاں نگاری اور گھٹیا درجے کی طاقتوں کے چاروں میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کا مار سے مارے پھر بے زاری واحد موضوع
 سوچنا تھا۔ جب میں کرشن سے کہنا کہ ترقی پسندی نہیں تو کرشن کہنا کہ جو نیکو منٹر کیسب کچھ نہیں کہتے اس لیے انھیں منٹو اور محبت (ان
 دونوں کے ساتھ وہ اپنے کو بھی شامل کر لیتا) سے سخت جڑا ہے۔ ایک دن منٹو نے ملٹی ای کی ایسی ہی بڑا ملٹی ای نہیں نے ملے کیا کہیں بھی ایک
 ایسا ہی افسانہ لکھوں گا۔ یہ یاد نہیں کہ کسی نے وہ موضوع تجویز کیا یا میں نے اپنے آپ لکھا لیکن ہم دونوں نے ایک ہی موضوع — یعنی
 نوکروں کے سامنے مالکوں کی جھڑپ بے پروائی — پر افسانے لکھے منٹو نے ”بلاؤز“ اور میں نے ”آبال“ دونوں افسانے ملٹی ای
 دلی کے ایک ہی نمبر میں ”بائیس سالنا میں“ چھپے۔ آبال، نوکروں نے بہت پسند کیا۔ کرشن نے اس سے اس وقت تک کے
 میرے افسانوں میں بہت ہی مانا۔ بعد میں اس کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا تو وہ ملٹی ای کافی پسند کیا گیا۔ ”بلاؤز“ اور ”آبال“ اس وقت کے میرے
 اور منٹو کے آرٹ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ بویائی دونوں افسانوں میں ایک جیسی ہے۔ مالکوں کی جھڑپ بے پروائی کا اثر دونوں افسانوں کے
 نوکروں پر ایک جیسا ہوتا ہے لیکن جہاں بلاؤز کے انجام کی حقیقت کو ری حقیقت ہے وہاں آبال کے انجام میں نوکر کی ٹریجڈی کے ساتھ
 سماجی ٹریجڈی بھی نہیں ہے اور انسانی سماجی حقیقت (SOCIAL REALISM) کا نونہ پیش کر رہا ہے۔ افسانہ نگار کو حقیقت جیسی
 ملٹی ای ہے اس کا خاکہ کہہ دیتے ہیں کہ وہ خود کو محسوس کر رہا ہے یا اس حقیقت کے پس منظر میں سماج کا بھی جائزہ لینا چاہتے ہیں بحث طویل ہے
 اور فن برائے فن، اور فن برائے زندگی کے پیرو اس موضوع پر ہمیشہ بحث کرتے ہیں گے ہر حال منٹو کے ساتھ چھپنے والی چھک
 میں میں نے ملٹی ایسی ایک افسانہ لکھا اور اگرچہ اس کی ٹری تعریف ہوئی لیکن پھر میں نے اس طرف کا رخ نہیں کیا۔ اس لیے میں
 کہہ دیتا ہوں کہ میں نے کبھی یہ موضوع نہیں لکھا جو اس لیے کہ وہ میرے مزاج اور طبیعت سے میل نہیں کھاتے۔

باری صاحب کے ہاں سے میں ٹٹو نے لکھا ہے کہ وہ بڑے چھپوٹو قسم کے آدمی تھے لیکن میٹر کو جیسا کہ میں نے دیکھا میرا خیال ہے کہ ماری صاحب کا کچھ اس طرحی تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے کھار کے اس پہلو سے خود وقت نہ ہو جی حالات میں صاحب ایک دن ٹٹو بل سے غائب ہو گیا تقریباً انہی حالات میں وہ بلوچی سے پاکستان بھاگ گیا۔ دہلی سے اس کے خزا کا باعث میں تھا اور وہیں سے نندیرا جیری لیکن حقیقت یہ ہے کہ میٹر خود بھی اس خزا کا باعث تھا کیونکہ دہلی میں جب تک وہ مارتا چلا جاتا تھا، خوش رہتا تھا اور جب دوسرے اسی کے حلوں کو اس پر آزما تے تھے تو وہ بہدان چھوڑ کر لھاگ جاتا تھا۔ بلوچی سے لھاگنے کے باوجود میں نے نندیرا جیری کی مخالفت کا ذکر کرتے ہوئے ٹٹو نے لکھا ہے۔

”میں نے بہت غور کیا، کچھ کھجی نہ آیا۔ آخر میں نے اپنے آپ سے کہا میں تو بھائی
مکمل راستہ نہیں لے گا۔ کلا روٹ روک لو۔ دوسرا جو کی گئی سے چلے
جاتا۔ اور میں باجو کی گئی سے پاکستان چلا آیا۔“

دہلی سے پاکستان میں غائب ہو گیا تو میں حیران رہ گیا تھا حالانکہ یہ افواہ اڑی تھی کہ اسے ظلم میں نوکری مل گئی ہے لیکن سوال بعد اس نے خود مجھے بتایا کہ وہ کسی نوکری کے بغیر دہلی سے چلا آیا تھا۔ باجو کی گئی سے مکمل راستہ نہ ملنے پر۔ بالکل ویسے ہی جیسے کہ حال بعد وہ بلوچی چھپوٹو گیا۔

میرے والد زندگی بھر لڑتے رہے، نوکری نہ رکھنے کے لیے اسے ساتھ ساتھ دو دوسرا نوادہ لگا یا کرتے تھے وہ تھا۔ مسرتا تم جنگ دائم۔ اور وہ اپنے لوگوں کو بھی یہی نیک صلاح دیا کرتے تھے۔ چونکہ ان کا خیال تھا کہ ان کا کوئی بیٹا شہر کا مہر ہے بڑا اڑا کا ہوگا اس لیے وہ سب کو لڑنے کے طریقے بتایا کرتے تھے سب سے زیادہ زور وہ اس بات پر دیا کرتے تھے کہ جو آدمی ہٹ سکتا ہے وہی ہٹ بھی سکتا ہے۔ پیشے سے بڑا مشکل ہے۔ پٹو اوپیشے والے کو نہ چھوڑو۔ میری محنت توڑ لیکن ہی سے خواب تھی۔ اسپتالہ بالہ بھائیوں کی طرح نہیں کیا طوا، لیکن یہ بات ضرور ذہن نشین ہوگئی اور کنٹینر جہاز میں جہاں بھی سر کر رہا ہے میں نے ہٹ کر آخر پیشے والے کو ہٹ دیا ہے۔

ٹٹو سے میرا دو بار سابقہ بڑا۔ ایک ہار دہلی میں اور دوسری بار بلوچی میں۔ دہلی میں میں نے اسے دک مے دی لیکن بلوچی میں باری جوڑا برابر دی۔

”دھواں کے سلسلے میں ہم میں جو شٹاک ہوئی اس کے بعد میرے اور اس کے تعلقات اور بھی کشیدہ ہو گئے۔ چونکہ میٹر زو میں تھا اور کرشن اگرچہ مجھے کچھ نہ کہتا تھا لیکن یہ راز میٹر کے لیے دھواں میں جاتا تھا اس لیے یہ اور اور چھپا چھپتا تھا لیکن اس دوران میں اپنے دھم میں میٹر راستہ سے بھی جا گڑ بٹھا۔ راستہ آزاد ظلم کے بانی کھے جاتے تھے اور میٹر کو آزاد ظلم سے چڑھتی۔ انہی دونوں راستہ کی نظموں کا مجموعہ زور اور اسے نام سے شائع ہوا جس پر کرشن چندر نے دریا بھگھا۔ میٹر نے دونوں کا مذاق اڑایا۔ اس نے نیلی گیلی کے عنوان سے ایک ڈرامہ بھی لکھا جس میں راستہ کی ظلم سے ان الفاظ لے کر ان کا مذاق اڑایا۔ ڈرامہ آزاد ظلم سے شروع ہوتا ہے۔ دو دھواں دیکھتے۔ مسجد و شاعر۔ کرشن اتم نے کبھی کسی وحدت کے ٹھنڈے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دھالے ہیں؟

صکوشن۔ ۱۔ ٹھنڈے ہاتھ..... ۹۰

مسجد :۔ ٹھہرو، مجھے اپنا فقرہ درست کر لینے دو۔۔۔ اب بتاؤ کیا تم نے کسی اجنبی عورت کے ٹھنڈے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبائے ہیں۔۔۔ ایسے ہاتھ جو چاند کی طرح خشک ہوں۔۔۔ کسی اجنبی عورت کے ہاتھ جو تمہاری زندگی میں لپکا داخل ہو جسے رات کے منسلان اندھیرے میں کوئی نہ جکڑ سکتا آسکے۔

کوشش (غفاق کے طور پر) اپنی دُوم سے لائیں باندھے۔۔۔ نہیں۔۔۔ چاند کی ٹوٹی چوستا ہوا دھڑکنے لگی تھیں آج ہو گیا۔۔۔ کیا ہے سعید۔ یہ ٹھنڈی ہی عورت تھائی زندگی میں کب داخل ہوئی؟ کچھ دن غڑاؤ تھا وہی کا، راشد کی نافرمانیوں کا، اجنبی عورت کا، زمستان کی رات کا غاق اٹھاتا رہا، پھر اس نے کوئی دوسرا موضوع دھونڈ لیا اور بات آئی چٹائی ہوئی لیکن راشد اسے نہیں بھولے۔

اس کے بعد ایک دن آٹھ بجے کوئی ڈرامہ لکھا اور راشد کو پڑھنے کے لیے دیا۔ راشد ٹاپ شدہ مسودہ اپنے کمرے میں لے گئے اور کچھ دیر بعد واپس آ کر انھوں نے مسودہ واپس کیا۔

تکلیف ہے وہ مضمون نے پڑھا۔

”نہایت اچھا ٹاپ ہو رہے۔“ راشد نے اس اسٹنڈ آپ پر مسکراہٹ کے ساتھ کہا جو ان کی اپنی پیر فکری اور مضامین کی نوک کا باب، ہو گیا۔ اس کے بعد مضمون راشد اور ان کی نظموں کو کوسا رہا۔ اپنے کسی دوست سے اس نے راشد کی نظموں پر ایک مضمون بھی لکھوایا۔

ہندی اصلاح کار کی حیثیت سے میں زیادہ وقت راشد کے ساتھ گزارتا تھا اور چونکہ مٹھوا اور راشد میں جلنے لگی تھی راشد میرے پڑوسی بھی تھے اس لیے میرے زیادہ نقصان نہ پہنچا سکتا تھا تاہم مجھے پریشان کرنے میں مٹھو نے کوئی گہرا ٹھکانہ نہیں۔

پھر غالباً ۱۹۴۲ء کے اوائل ۱۹۴۳ء کے شروع میں (طیک سن مجھے یاد نہیں) اچانک ایک دن راشد ترقی کر کے پروگرام ڈائریکٹر (پروگرام ایڈیٹر) ہو گئے۔ راشد نے چارج سنبھالے ہی پہلا کام یہ کیا کہ کرشن کی غیر حاضری میں اس کا تبادلہ کنستراڈیا۔

بات دراصل یہ تھی کہ راشد کو چھوڑ کر بی بی کے ریڈیو اسٹیشن پر پروگرام اسٹیشنوں میں کرشن سب سے قابل تھا اور باقی جتنے پروگرام اسٹیشن تھے وہ اپنا سٹیبل ڈول مانتے نہیں کرشن سے مدد لیتے تھے۔ اس لیے اس کے کام میں خلل نہ دیتے تھے اور بہت سی باتیں کرشن براہ راست ڈائریکٹر سے منظور کر لیتا تھا۔

راشد کی خلوت میں اس پریت کو کافی خلل ہے۔ انھیں یہ منظور نہ تھا کہ کرشن ان کو نظر انداز کر جائے۔ اس لیے انھوں نے اس کو کھینچا دیا لیکن کرشن کی تبدیلی جن حالات میں ہوئی اسے راشد نے ان کی غیر حاضری میں ان کے خلاف کچھ الزامات لگائے اور کچھ بھاری صاحب

بمک راشد کی براہ راست رسائی تھی اس لیے فوراً تیار کر دیا، اس سے مجھے رنج ہوا اور میں نے راشد سے اپنے اس اخذ کا اظہار بھی کیا۔ راشد امید کرتے تھے کہ میں ان کی تائید کروں گا لیکن جب میں نے کرشن کی طعنہ آری کی تو باوجود اس کے کہ ہم برابر کے گھر میں رہتے تھے اور میری بیوی اور دیگر راشدیں بہت اچھے تعلقات تھے، روز کا ملنا جیسا تھا راشد مجھ سے بدظن ہو گئے۔

راشد پروگرام ڈائریکٹر ہو گئے اور کرشن چلے گئے تو مٹھو نے کچھ ہی دنوں میں دوسرے پروگرام ڈائریکٹر مسزینہ راجپوتہ کو لگا دیا۔ اس کے چند دن پھر مٹھو نے ایک جیسا مسوٹ اسے پڑھ کر دیا اور اسے اپنی طرف بلوایا۔ اتھوئی چوٹی مجھ سے خوش تھے اس لیے

انھوں نے مجھے نئے پروگرام اسسٹنٹ کے آئے تاکہ کرشن کی جگہ سنبھالنے کے لیے کہا۔ منٹو کا ڈرار شیڈر بل پر تھا۔ میں نے ہڈو پریس بھی کیا۔ مجھے ابھی طرح یاد ہے کہ منٹو اس کی ریسرولن میں منٹو پر بھی تار مارا۔ حالانکہ وہ شاہی اپنے ٹرائس میں دلچسپی لیتا تھا۔ اس دوران میں لکھنؤ سے منڈی کا ایک پروگرام اسسٹنٹ کرشن کی جگہ لینے پہنچا۔ نہایت بدصورت، لمبا ٹانگا، چوٹی ناک والا نوجوان تھا۔ اڈوانی نے صبح اسے اور مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور اس سے کہا کہ وہ کچھ دن تک مجھ سے کام سیکھے۔ کرشن کے کمرے میں ایک بڑا دروازہ دروازوں کے علاوہ زیادہ جگہ نہ تھی۔ میں میٹنگ کے بعد کرشن والی کرسی پر جا بیٹھا اور اس دن کا کام نہانے لگا لیکن میٹنگ کے بعد ہی منٹو نے اس لکھنوی پی۔ اے (پروگرام اسسٹنٹ) کو کھٹایا کہ وہ پروگرام اسسٹنٹ ہے اور اسے کرشن والی کرسی پر بیٹھا چاہئے۔ وہ اپنے آپ کو کھٹتا بھی بہت کچھ تھا۔ کام سیکھنے کی بات بھی اسے اچھی نہ لگی تھی۔ اس نے رات دن پچھوڑا تھا۔ لکھنوی اس سے یہی کہا کہ ڈراما بیڈیا منٹو کی سب ذمہ داری تھا وہی ہے۔ انکسٹ وائرڈسٹ ہے۔ کوئی بھی خانی ہو تو جواب وہ پروگرام اسسٹنٹ ہی ہوگا۔ مجھے ان سب باتوں کا علم نہ تھا۔ میں کرشن والی کرسی پر مزے سے بیٹھا کام کر رہا تھا کہ منٹو اس لکھنوی پی۔ اے کے ساتھ آیا میرا دھیان سوسے میں لگا تھا کہ منٹو نے میری کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: یہ آپ کی کرسی ہے۔ ”ساتھ ہی اس نے میرے سامنے چوڑی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: آپ ادھر آ جاہیے۔“

میں نے نگاہیں اٹھائیں۔ پی۔ اے کی آنکھوں میں حکم تھا اور منٹو کی آنکھوں میں اتنا جھجک۔ مجھے معاملہ سمجھے میں دیرنگی میں نے کہا: میں اور اپنے کمرے میں جاتا ہوں۔ آپ کو میری ضرورت ہو تو وہیں آ جاہیے گا۔

اور میں چلا گیا۔ میری آنکھوں کے آگے عقدہ کے مارے اندھیرا چھا گیا۔ رات دن سے میں نے نوک کیا تو معلوم ہوا کہ لکھنوی پی۔ اے ان سے مل چکا ہے۔ یہ بھی پتہ چل گیا کہ وہ چاہتے ہیں ان کے پروگرام اسسٹنٹ خود ہی غلطیاں کر کے سیکھیں۔ دراصل یہ بات پسند نہ آئی تھی کہ اڈوانی نے میں ان سے پوچھے مجھے کرشن کی جگہ کام کرنے کو کہ دیا۔ میں اس کا شائق بھی نہ تھا کہ جگہ ایک بار حسبِ محکم صاحب نے مجھے پی۔ اے کی جگہ آؤ کی تھی تو میں نے انکار کر دیا تھا لیکن ایک بار جب میں اس جگہ جا بیٹھا تو اس طرح اٹھنا اور وہ بھی منٹو کے سامنے اس کی انجیٹ پر مجھے کھل گیا۔ پہلے خیال آیا کہ اڈوانی کے پاس جاؤں کیونکہ انھوں نے ہی مجھے بھی لکھنوی پر مہر چاکر اڈوانی کچھ نہ کر سکیں گے۔ منٹو کی آنکھوں کی ناک خانہ جگہ میرے دل میں دو رنگ گھاؤ کرتی چلی گئی۔ اس شخص پر ایک لمحے کے لیے خیال آیا کہ اس شخص سے دس روپے، پھر خود ہی اس پر پچاس روپے، پھر خود ہی اس پر پچاس روپے کے لیے میں جا بیٹھا۔ منٹو کی آنکھوں کی دی بجائے سامنے منٹو ————— خدا گواہ ہے اگر منٹو اس لکھنوی پی۔ اے کے ساتھ نہ آیا ہوتا اور اس کی آنکھوں میں وہ جھجک نہ ہوتی تو میں سب نہ کرتا جو میں نے کیا اور منٹو کو وہی نہ پچھوڑتی پڑتی۔

اس وقت کمرے میں جا کر بیٹھا تو کام نہ کرنا میرے لیے بیکار ہو گیا۔ بار بار اپنی ہینک کا خیال آنے لگا۔ رات دن عقدہ آتا۔ اس لکھنوی پی۔ اے پر عقدہ آتا لیکن سب سے زیادہ عقدہ آنا منٹو پر! اس کی آنکھوں میں جو جھجک تھی اس سے پتہ چل گیا تھا کہ میری ہینک کرنے کا فائدہ وہ پی۔ اے ہے نہ راستہ۔ منٹو سے اور میں نے ملے کر کیا کہ منٹو کو اس سازش کا براہ کچھ اشارہ کیا کہ میرے عقدے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جتنے دن میں نے کرشن کی جگہ کام کیا اس میں منٹو کا ڈرامہ پروڈیوس کیا اور حقی الامکان کو شش کی کر میں اس میں

ایک نفلذ کاٹوں اور وہ اچھے سے اچھا پروڈیوس ہو۔ کچھ پہلے کا ختم ہوا کچھ ناز و ہنس کا گھاؤ کا کام دام چھوڑ کر میں بس کہنیاں ریزہ ریزہ ہوتی ہیں
پر لکھوٹی رکھ کر بیٹھ گیا۔

جانے ابد آدمی سے کسی نے ہر شے چاکھیک کے آئینہ میں تعلیم پائی تھی یا جانے ہمارا خدا ان سے وابستہ تھا یا ہمیں
سے والہ عزیمت سے اس ہر شے کے کارنامے میں شریک نہیں نے اسی کی طرح سوچا سیکھ لیا تھا۔ ہر حال ہمیشہ جب مجھ پر مصیبت آتی، میری نگاہ
اور صبح کی قزاقوں اور لمبی نیلی سے کام کرنے لگیں اور توہین کرنے والے کو، اگر وہ میرے برابر کا ہے یا مجھ سے اونچا ہے، میں نے کبھی
معاف نہیں کیا (اور یہ بات کتنی لمبی جبری کہوں نہ ہو) اس سے ضرور انتقام لیا اور نہ صرف ہر مصیبت سے نکلا ہوں بلکہ ایک دم
آگے ہی بڑھا ہوں۔

سورجنے پر مجھے محسوس ہوا کہ یہ لکھنی پروگرام اسسٹنٹ نہایت احمق آدمی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ منتوں نے اسے بھڑکایا
لیکن جو منظر کے کہنے میں آگیا، اس کی حماقت میں کی شک ہے۔ اس وقت بھی ہندی میں یہ لاکافی نام تھا۔ اس نے یہ نام نہ سنا ہوا اسی
بات نہیں۔ وہ بھلا درہم تا تو مجھے الگ لے جا کر بات کر دیتا اور بروں چلنا نہ سمجھتا۔ لیکن جسے کچھ نہ کتا۔ سر ہا کہ اس حق کی کو آواز دینا
جائے اور کچھ پر بعد میں نیچے گیا لکھنوی بی۔ اسے سینہ تانے چھٹی ناک پڑھانے، کھنڈے، اپنے نقشے میں لکھا کہ
کیسے چپ صاحب (جو اس وقت کھنڈے کی شیش ڈائریکٹر تھے) اسے چاہتے ہیں اور کیسے کیسے اس نے وہاں کا رہنے نماں براہِ انجام
دیے ہیں اور منظر (اپنی عادت کے خلاف) چپ چاہ پاؤں کو کسی پر رکھے، کھنڈے، ہانوں میں رہا ہے ہنر گزاش کی بنی نہ لیاں
میں رہا تھا۔ میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ کسی تو دوسری تھی نہیں کہ بیٹھتا۔ دونوں نے ایک نظر مجھے دیکھ لیا۔ کچھ دیر کے بعد منظر کو چپ صاحب
کا چہرہ اسی ہلا کر لے گیا تو میں نے ان لکھنوی حضرت سے کہا: ”مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ آپ ہندی کے آدمی ہیں۔ اس شیش پر ہندی کے
ایک پروگرام اسسٹنٹ کی جڑی ضرورت تھی۔“ اور میں نے اسے شام کو گھر پر جانے کے لیے دعو کر دیا۔

میں ان دونوں میں ہزاری میں رہتا تھا۔ وہاں نزدیک ہی ایک چھوٹی سی پھاڑی اور خوشنما بنگل ہے۔ برسات کی شام تھی۔
جائے ہلا کر میں اس لکھنوی احمق کو راج پر لے گیا۔ بادل گھر سے ہونے لگے اور بڑی لمبی بھاری ٹپڑی تھی۔ وہ تھا، رانی ترغیب کرتا، کہ کس طرح
اس نے ڈرامے لکھے، کس طرح چپ صاحب نے کہا کہ ویسا لکھو پٹ (SCRIPT) ہندی میں کوئی نہیں لکھتا اور کس طرح انھیں نے
اس کی معارفش کر کے اسے پروگرام اسسٹنٹ بنا دیا۔ میں نے بھی اسے خوب چنگ پر چڑھایا۔ اس کی شخصیت کی تعریف کی اسے
سمجھایا کہ اگر شروع ہی سے اس نے اپنا لکھنا جاری تو سب اس سے خوف کھاتے، انہیں آرٹسٹ نواز چھے سے اچھے کو بد بھونا کر
رکھ دیتے تھے۔ میں نے اس سے یہ بھی کہا کہ پی۔ اسے کام ہے کہ جو ڈرامے براڈ کاسٹ ہوں انھیں اچھی طرح پڑھے، ویٹ
(VET) کرے۔ اس نے کہا کہ وہ ایک لمبی چپ پڑھے اور ویٹ کیسے بنیے براڈ کاسٹ نہ ہونے دے گا۔ اب جب آپ آگئے
ہیں اور ہندی جانتے ہیں۔ میں نے کہا: ”نہیں آئندہ ڈرامے آپ کی سہولت کے لیے ہندی رسم الخط میں لکھوں گا بلکہ ناز و سوسے
ہی آئیں گے، وہ آپ مجھ سے مل کر ویٹ کیا سمجھتے اور بروں اچھی طرح دیکھ کر براڈ کاسٹ کیجئے کیونکہ قراب ڈرامہ براڈ کاسٹ ہر تو
ذمہ داری آپ کی ہوگی اور میٹنگ میں ٹائٹ آپ ہی کو پڑھے گی۔“ اس پر اس نے اپنی قابلیت کے بارے میں میرے علم کو اور
بڑھایا اور بہت خوش خوش واپس ہوا۔

اب شیطانی تو تین جینے پہلے بن جاتا تھا اور وہ کرشن بن کر گیا تھا۔ میں جینے دوسرے جینے ڈرامہ لکھتا تھا اور مٹر کے تین ڈرامے ہر جینے ہوتے تھے۔ اگلا ڈرامہ مٹھی کا تھا۔ نام تھا (جہاں تک کہ مجھے یاد ہے) "آوارہ" اپلاٹ وغیرہ مجھے سب بھول گیا ہے۔ اتنا یاد ہے کہ وہ ڈرامہ بھی مٹر کے ان دنوں لکھے بیشیز ڈراموں کی طرح ایک ہی دن میں لکھا ہوا تھا۔ دوسرے ہی دن اس لکھنوی بی۔ اے نے اس کا مسودہ نکالا اور مجھے بگایا۔ میں اسے سٹوڈیو میں لے گیا اور وہاں جا کر اسے سنائے لگا۔ اس کو زبان وغیرہ یاد اور وغیرہ کی خاک مجھ ذہنی ڈرامہ سنائے سنائے میں کہتا "کیوں صاحب اس لفظ کی جگہ بلفظ ہو تو کیسا رہے؟" اور وہ کہتا "ہاں ہاں یہ بہتر ہے۔" اسی طرح میں لال پٹیل کی مدد سے الفاظ اور محاورے بدلتا چلا گیا۔ وہ چار ٹکڑوں کے گولی نشان لگا دیے۔ میں نے ان حضرت سے کہا کہ راشد صاحب ان الفاظ کے تحت خلافت ہیں۔ ان کے ساتھ سال ڈیڑھ سال کام کر کے میں جہاں گیا ہوں۔ میں ان کو نہیں بدلتا یہ وہ خود بدل دیں گے اور اس طرح ان تبدیلیوں کی تمام ترمیم داری ان کی ہر جائے گئی۔ ڈرامہ کا اختتام میں نے کاٹ دیا اور اس کی جگہ تین اختتام تجویز کر دیے۔

جیسا کہ میں نے سوچا تھا، ویسا ہی ہوا۔ اس لکھنوی بی۔ اے نے راشد پر ڈرامہ ڈالا کہ اس نے مٹر کا ڈرامہ پڑھا ہے۔ بڑا خام ہے۔ اس نے ٹری محنت سے ویٹ کیا ہے۔ راشد مسودہ لکھیں اور پاس کریں تو براؤ کا مسٹ ہو۔ راشد تو مٹر سے پہلے ہی مجھے سمجھتے تھے، ان کو اپنا پڑا نابلد لکھانے کا موقعہ ملا تھا کیا اور انھوں نے وہ چند الفاظ بھی جن میں نے لال پٹیل سے گولی آخر بنا دیے تھے، بدل دیے۔

جب فلم کو معلوم ہوا کہ اس کا ڈرامہ ویٹ ہوا ہے تو اس کے سر پر خون سوار ہو گیا۔ وہ ڈرامہ کو بکھر کے کہے میں گیا اور اس نے راشد اور اس لکھنوی بی۔ اے کو بے لفظ مضامین اور کہا کہ ڈرامہ ہو گا تو نا ایک لفظ کہے ہو گا ورنہ نہیں ہو گا۔ میں اور ٹری کلارک (انگریزی ناؤٹس) کے کہے میں بیٹھا کرتا تھا۔ اڈوانی کے کہے کا روشن میری آنکھوں کے سامنے ہوتا تھا۔ نیچے اڈوانی کے کہے میں مٹھی بچھواتے زور سے چلا رہا تھا کہ میں اٹھ کر روشن دان کے پاس چلا گیا اور جھک کر اندر کا نظارہ کرنے لگا۔ راشد کہہ رہے تھے کہ انھوں نے خود ڈرامہ پڑھا ہے اور ہو گا تو نا ہی تبدیلیوں کے ساتھ ہو گا ورنہ نہیں ہو گا اور ڈیویشن (DEVIATION) یعنی جدول کے انحراف کی ذمہ داری ان کی نہیں ہو گی۔ جب ہم باہر والوں کی چیزیں ویٹ کر سکتے ہیں تو اپنے آرٹسٹوں کی کیوں نہیں کر سکتے اور مٹر جو جسے میں بند شہر کی طرح تھلا رہا تھا اور تقریباً چھوڑا کرتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ ڈرامہ ہو گا تو نا ہی وہ نہیں ہو گا ورنہ نہیں ہو گا۔

مجھے مٹھی اس تھلاہٹ کو دیکھ کر کچھ عجیب سی شیطانی مسرت ہوئی۔ مٹر نے مجھے متنبہ کیا یاں دی تھیں، میری ترقی کے راستے میں جو رکاوٹیں ڈالی تھیں، اُردو کا ٹاپ، رائٹر برے، مٹر نیچتے ہوئے چہ چالیس روپے بھٹ بول کر زیادہ لے لیے تھے اور اوپر سے مجھے بنایا تھا اور جتنا بھی مجھے سستا تھا اس سب کا صلہ ان چند لمحوں کی اس کی تھلاہٹ میں مجھے مل گیا۔ ساری ٹھک ٹھک کواردی اگوست۔ "میں نے سنی کہ میں بنی کا محاورہ دہرایا اور واپس اپنے کمرے کی طرف بھاگا۔

مجھے یاد نہیں اڈوانی نے کیا فیصلہ دیا تھا، غالباً انھوں نے راشد پر سب کچھ چھوڑ دیا تھا اور پروگرام ڈرامہ میٹر کے کام میں مداخلت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بہر حال ایک عجیب سی شیطانی مسرت سے عموماً واپس آکر کسی پہلی بچہ گیا اور لائیکس میز پر

پھیل کر اطمینان کی ماسلی۔

لیکن اس مسرت اور اطمینان کے باوجود کچھ عجیب طرح کی تکلیف اور اُسی کا احساس دل و دماغ پر طاری ہو گیا۔
آنکھوں کے سامنے منٹو کی تلملاہٹ، اس کے خوبصورت اُتھتے پر پڑی ہوئی ہنسنیں، اس کی باہر کونکلی ہوئی آنکھیں — سب کچھ گھوم گیا۔ اور اس تلملاہٹ کا باعث میں تھا۔ میں چودھریقت اسے چاہتا تھا، اس کے پاس بیٹھنا چاہتا تھا، اس کے افسانوں کا اس کے نام نہاد چاہنے والوں سے کہیں زیادہ مداح تھا۔ میں جس نے دو ایک مہینہ پہلے اپنے ڈراموں کا دوسرا مجموعہ پڑا ہے، اس کے نام منون کیا تھا۔
’پڑوا ہے‘ کا ایک نسخہ میرے پاس پڑا ہے۔ منٹو کے نام کیا ہوا انتساب میرے سامنے ہے۔

منٹو کے نام

جہاں بھی مجھے بہت اچھا لگتا ہے اوکھی بخت بُرا

میرے اس وقت کے جذبات کا کتنی صحیح تصویر یہ انتساب پیش کرتا ہے۔

دوسرے دن میڈنگ میں ڈرامہ کا فقرہ پیش ہوا۔ کھنوی بی۔ اسے نے رشتہ کے کتنے پڑوسے کی بھرپوری تنقید پیش کی۔ آل انڈیا ریڈیو کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی ہونے والے ڈرامے کی تنقید میڈنگ میں ہو سکیں چونکہ ڈیوی ایشن کا سوال تھا۔ اگر وہ ڈرامہ نہ چوڑو اس کی جگہ دوسرا ڈرامہ چھپنے کی بات تھی اس لیے رشتہ نے میڈنگ میں وہ بات اٹھائی۔ کھنوی بی۔ اسے پہلے ہی وہ تنقید تیار کر لے لی تھی اس لیے پڑھ دی۔ بہر حال منٹو کی تنقید چوڑو وہ بھی بھرپور میڈنگ میں ہو سکی۔ نہ ہوا تھا۔ منٹو اس طرح اپنی تنقید سننے کا عادی نہیں تھا۔ کھنوی بی۔ اس کی کچھ کے بارے میں اس نے دو تین تیز باتیں کہیں اور تیز باتیں کہنے وقت منٹو کچھ سوچا نہ تھا۔ مجھے پھر تنقید آگیا اور میں نے کہا کہ یہ ڈرامہ میری نظر سے لٹی گزرا ہے اور ان صاحب کے ہاتھ اٹھیک تنقید کی ہے۔ اور چونکہ سب قطع و برید میں نے کی تھی اس لیے میں نے بڑی معافی سے اس ڈرامے کی کزوریاں اُجھا کر دیں۔

مجھے اب یاد نہیں، منٹو نے کیا کہا لیکن قصیدیں اس نے میری تقلیدیت کے بارے میں کوئی تیز بات کہی جس کا مطلب تھا کہ تکنیک کے ضمن میں کچھ نہیں جانتا اور پوچھا کہ تم اس سے بہتر کچھ کر دکھا سکتے ہو؟
میں نے اور بھی تیز لوجس کہا کہ میں دس برس تک ڈرامہ لکھنا سیکھا سکتا ہوں۔ تم اوپر میرے کمرے میں آؤ تو تمہیں بتاؤں ڈرامہ کیسے لکھا جاتا ہے اور یہ ڈرامہ بھی بہتر بنا کر دکھا دوں۔

بات بڑھ جاتی لیکن شورشیں کر اڈوانی صاحب اپنے کمرے سے آگئے۔ طے ہوا کہ ڈرامہ سمجھ شدہ حالت میں ہو گا اور چوتھا اپنے آؤٹسٹ کا سوال ہے اس لیے جلد سے انحراف نہیں ہو گا۔

فٹو میڈنگ کے بعد دفتر میں نہیں ڈکا۔ اس نے ٹائپ رائٹر اٹھا یا اور چلا گیا۔ دوسرے دن بھی وہ دفتر نہیں آیا۔ دوسرا کوئٹہ شید صاحب دیکھ کر ڈیٹا انٹارمیشن ایڈیٹر کا میڈنگ، کافون کیا کہ منٹو کا ڈرامہ اگر براڈ کاسٹ کرنا مقصود ہو تو منٹو کے کچھ ہونے مسودے کے مطابق کیا جائے ورنہ رد کر دیا جائے۔

اٹھیک واقعات مجھے یاد نہیں رہے۔ غالباً ڈرامہ شید صاحب نے منگایا تھا اور پھر انھوں نے یہ بیجا مہم چلائی۔

راشد چونکے ہوئے غصے کو وہ جدول سے انحراف نہیں ہونے دیں گے اور ڈرامہ قہجی شدہ حالت میں کریں گے اس لیے منظر نے غور کیا کہ ذریعہ اسے کسٹل کر دیا تھا۔
تیسرے دن بھی منظر و فز میں نہیں آیا۔ ڈرامہ اس نے منگا لیا۔ چوتھے پیا پیا یوں یا غالباً ساتویں دن منسا کہ وہ مہم چلا گیا ہے اور اسے فلم بنی میں پانچ سو کی جگہ مل گئی ہے۔

گرائنڈ روڈ کو جاتے ہوئے وکٹوریہ میں بیرے سانسے بیٹھے بیٹھے منظر نے بتایا کہ نوکری دوکری اسے کچھ نہیں ملی اور بیٹی میں اسے خاصی تکلیف ہوئی۔ بیوی کو وہ دہلی میں چھوڑ آیا تھا۔ بعد میں فلستان میں اسے ساتھیوں میں سوکری نوکری ملی تو غالباً اس کا دوست نذیر جاکر اس کی نکاحی کر لیا۔

”وہ تمہارا لال کیا ہوا مسودہ اب بھی میرے پاس محفوظ ہے“ اچانک منظر نے کہا۔ یعنی جس طرح مجھے نہ راشد پر غصہ تھا نہ اس لکھنوی بی۔ اسے پرکھ منظر پر غصہ تھا، اسی طرح منظر کو بھی ان دونوں کے بچنے بچنے پر غصہ تھا، اس کا ڈرامہ میں نے کاسٹ سے یہ بات وہ جان گیا تھا۔

”اب تمہارے کیا ارادے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

منظر مجب رہا۔

”وکیو، دہلی کی دہلی میں رہی۔ اگر میں اسی طرح لڑتا ہے تو مجھے فلستان کی نوکری منظور نہیں۔ وہاں ساتھیوں میں سہانا جوں آراستہ ہوں۔ یہاں پانچ سو بیچ۔ ملے اور بیچ کر رہی نوکیلا فائدہ؟“

”نہیں نہیں۔ ویسا کچھ نہیں ہوگا۔“ اور اس نے انگریزی میں فقرہ پورا کرتے ہوئے کہا۔

اس دن گھر واپس آکر میں نے صفی بھائی سے کہا، ”دیکھئے، منظر نے مجھے قیمتی ملایا ہے جس میں انہیں رہا تھا۔ دو بار ڈرامہ مجھے پر چلا آیا جس نے منظر نے قانون باتوں میں بتا دیا ہے کہ وہ آوارہ کامسودہ منظر لے ہوئے ہے اور دہلی کے اس واقعہ کو نہیں بھولا۔ ہم دہلی میں لڑتے رہے ہیں اور لوگوں کے لیے تماشہ بنے ہیں۔ اب اس نے اپنے بچے کو آپ اسے سمجھانے کے لیے مجھے یہاں تنگ کر کے رکھ دیا۔ وہ تنگ کرے گا تو میں بھی تنگ کروں گا اور آخر ہم دونوں تنگ ہوں گے۔“

منظر اور صفی بھائی نے مجھے یقین دلایا کہ ویسی کوئی بات نہیں ہوگی اور میں نے اگرچہ کانٹریکٹ پر دستخط کیے لیکن ہاں کر دی لیکن جب بعد میں سے سوچا تو میں نے ملے کیا کہ میں حتی الامکان اس بات کا رقعہ ہی نہ آنے دوں گا کہ منظر سے میری لڑائی ہو رہی ہے جو میں جتنی بھی میرے واقف کا رقعہ ان سے مل کر میں نے فلستان، اس کے کتا دھڑا شہدہ بھجی اور وہاں کے طریقہ کار کے بارے میں واقفیت حاصل کی۔ میں خاص طور پر ان لوگوں سے ملا جو منظر کے ساتھ کام کرتے تھے اور اب وہاں نہیں تھے۔ مجھے تین چار آدمی انہوں کا پتہ چلا۔

۱۔ فلستان کا باس بھجی زمانہ قدیم کے سادہ پستان دار و فعل جیسا ہے جو فلاسوفی کو کوڑے مارا کہ ان سے کام لیتے تھے۔

۲ - فلستان میں منظر کا ایک پھر ترانہ ہے۔

۳ - جب سال بھر پہلے شام لطیف نے خیر انام تجویز کیا تھا تو منظر نے فلستان میں بیرے آنے کی کئی غنماٹ کرتے ہوئے کہا تھا کہ اشک بڑا خطرناک آدمی ہے۔

۴ - فلستان میں ایک ہی منظر کو سب مکالمہ نویس لکھتے ہیں۔ منظر سب کے مکالمے بڑھتے ہیں اور سب کو روکر کے خود لکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ سب سے اچھا ہوتا ہے۔ اسی طرح انھوں نے شہدہ لطیف اور منترشی کو فلستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا، جبکہ شہدہ لطیف ہی منظر کو فلستان میں لے گیا تھا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک سال پہلے منظر نے مجھے خطرناک سمجھا تھا تو سال بھر بعد میں کس طرح اتنا بے ضرر ہو گیا کہ خود اس نے ہی مجھے بتلایا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب منظر نے مجھے فلستان میں کام کرنے کے لیے خط لکھا تھا تو خود میں نے اپنے آپ سے یہی سوال کیا تھا اور پہلی بار میں نے جانے سے انکار کر دیا تھا لیکن ایک مہینے بعد جب منظر نے مجھے تار دیا کہ انڈیو کو آؤ اور سیکڑے ملا س کا کمرہ کیپنی دے گی تو چونکہ کوشتی ٹرنگک لینے پہنچی جا رہی تھی لہذا میں بھی تیار ہو گیا۔ خیال تھا کہ اور کچھ نہ سہی تو بیچ کی میری ہوجائے گی لیکن وہاں جانے کا فیصلہ کرنے کے باوجود میں سوچا تھا کہ آخر منظر نے مجھے کیوں بلایا ہے۔ اس وقت میں جس نتیجے پر پہنچا تھا اس میں مجھے یہی چل منظر نے ملے اور وہاں کے حالات جانے پر پتھر ٹوٹی سی تیریم کمنی ٹری لیکن اس بنیادی وجہ میں فرق نہیں پڑا چونکہ اس قصبے کا ایک نفسیاتی ہسپتال بھی ہے اور صاف دلچسپ ہے اس لیے میں اس کا ذکر نہ ضروری سمجھتا ہوں۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا مجھے منظر سے نفرت نہ تھی۔ نفرت یا محبت کے لیے کچھ وقت کا ساتھ ناگزیر ہے اور میں تو پہلی آنے سے پہلے منظر سے ملا بھی نہ تھا اور جب ملا تو پہلی ملاقات میں جہاں ناک نکل و صورت کا تعلق ہے وہ مجھے اچھا لگتا تھا۔ گورا چٹا رنگ، پنکلا چہرہ پر اجسم، فراخ پیشانی، ستوان ناک، بڑی بڑی آنکھیں اور ہونٹوں پر اتھڑا تیز مسکراہٹ۔ منظر کی یہ پہلی جھلک ہے جو میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ اس دوران میں میں منتر، "نیانا لون"، اور شاید مسرٹو کی کوسٹا، پڑھ چکا تھا اور یہ افسانے مجھے بے حد اچھے لگے تھے اور منظر نے میرے دل میں ایک مترجم کے بجائے ایک ذہن افسانہ نگار کی حیثیت سے جگہ بنا لی تھی۔ لیکن دہلی میں بیرے آنے سے پہلے ہی ہمارے لیے جو پارٹ طویل گئے تھے ان سے نجات نہیں ملی۔ ہمیں ایک دوسرے کا حریف ہونا تھا اور ہم باہم حریف ہو کر رہے۔

لیکن جب منظر اچانک دہلی سے چلا گیا تو مجھے بڑا افسوس ہوا کہ میں کھنٹو تبدیل ہو گیا تھا، اختر الایان کو رائے نہ جوتا دلوادیا تھا۔ چٹا چہرہ، ایراجی اور راجہ ہمسایہ، علی خاں، رائے نہ جوتا میں گئے رہتے تھے اور راستہ چونکہ مجھے کرشن کا آدھی سمجھتے تھے اس لیے مجھے تنگ کرنے کے درپے تھے۔ منظر کی غیر موجودگی مجھے بہت شاق گذرتی تھی۔ یہ طریق ہے کہ منظر کے رہنے پر کبھی کبھی جھپٹ ہو جاتی خاصیت چٹپٹا بھی ہوتی تھی، لیکن اچھے سے اچھا لکھے میں دہلی میں تھی اور ایک عجیب سی قربت کا احساس رہتا تھا۔ منظر کے پہنچ جانے کے بعد اس کی اور اس کے افسانوں کی تعریف نہ کرنے کے سلسلے میں میں نے اپنے اوپر زبردستی جو قید لگا رکھی تھی اسے ٹوٹا دیا۔ منظر کے پہنچ جانے کے سال دو ٹوڑے سال بعد۔ ٹھیک سن مجھے یاد نہیں، اس کا افسانہ "بڑا شائع ہوا۔ اس افسانے کے شائع ہونے ہی اس کے خلاف ایک شور مچا رہا ہو گیا۔ چودھری اندرا مہارے

اس بار سے جس میری لمبی رائے مانگی میں نے بڑے ”کی خوب تعریف کی۔ مجھے بڑے کے کنٹنٹ سے بے غرض نہ تھی، میں اس افسانے کی تکنیک پر خدا تھا۔ ابھ بڑی ناز کی قلم کو منظر نے جس جا مکہ تھی سے بڑے ”میں سمجھا ہے، وہ نہ صرف قابلِ داد ہے بلکہ قابلِ تقلید بھی ہے۔ میں وہ افسانہ اپنے کئی دوستوں کو سنا چکا ہوں جن میں ہندی کے مشہور افسانہ نگار شپال لمبی شامل ہیں اور شپال میری رائے سے متفق ہیں۔ ہر ہندی افسانہ نگار کو میرا مشورہ ہے کہ افسانہ کی تکنیک کو جاننے کے لیے وہ بڑے، مزدور پڑھے۔ تکنیک کے کمال کے لحاظ سے اس کے جوڑ کا افسانہ ہیڈی کا ”لا جوتی“ ہے۔ اس کے علاوہ کئی دوسرا افسانہ آردو ادب میں اس کی جھلک دیکھنے کے لیے ہیں۔ دیتا۔ لا جوتی میں ہیئت ہی نہیں کنٹنٹ کا بھی کمال ہے۔

بر حال مجھے خیال ہوتا ہے کہ بڑے کے بارے میں جو خط میں نے جو حریٰ خذیر احمد کو لکھا اس نے منظر سے اس کا ذکر کیا اس کا خلاصہ انھیں بھیج دیا کیونکہ جب میں لمبی گیا تھا تو منظر نے اس کا ذکر کیا تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ اس خط کے بعد میرے بارے میں منظر کا کچھ ڈھیلا ہو گیا اور یہی وجہ ہے کہ جب ڈائریکٹریٹن برسِ فلستان میں ایک فلم بنانے آئے اور ایک شے کا ڈیوٹیاں کر کے کی بات چلی تو منظر ہی نے میرا نام تجویز کیا۔

لیکن ایک دوسری وجہ بھی تھی۔ غیر تجویزی طور پر جس کالجھے اس افسانہ اور جس کی تصدیق میں ہی ہوئی۔ منظر اگر شراب نہ پینے ہوتا اور وہی کے واقف کا ذکر کرتے نہ ہوتے، آوارہ لکے اس سودے کا ذکر نہ کرتا جس میں نے کٹ چھانٹ دیا تھا تو اس کی خوشی میں جھلنا رہتا کہ میری طرف سے منظر کے دل میں جو کہ درت تھی وہ وصل گئی ہے منظر ڈھیلا پڑ گیا تھا لیکن وہ اس واقعہ کو ذرا عرصہ نہ کر سکا تھا۔ سال بھر پہلے فلستان میں اس کی پوزیشن اتنی مضبوط نہ تھی۔ اس وقت میں وطن جانا تو اگر میرا اور شاپا کیسیر اور سنو تھی کا کٹ بن جاتا تو منظر کو تکلیف دیتی۔ اس لیے اس نے یہی فی الحال غفلت کی۔ جس وقت اس نے مجھے بلایا اس وقت شاپا بدطیبت اور سنو تھی فلستان چھوڑ چکے تھے اور منظر کو کئی کی ناک کا بال بٹا ہوا تھا۔ مجھے دوستوں نے بتایا کہ منظر افسانے کے مکالموں کے پرچے پڑا دے گا۔ منظر خود اور ورجی باؤس کے لیکن تمھاری جان میں آجائے گی اور میں سمجھ گیا کہ میں نے اس کے ڈرائے کی جو دھماں اڑانی تھیں اس کا انتقام لینے کی ترکیب اس نے یوں نکالی تھی اور چونکہ میں ”ہاں“ کر چکا تھا اور وہی میں مشہور ہو گیا تھا کہ میں نے فلم کی کوئی کمری ہے اس لیے میں واپس لوڑ گیا لیکن میں نے فلستان میں اپنا لاٹر عمل طے کر لیا۔

میں نے اس وقت تک کہ منظر کی طرف سے کیے جب تک فلستان میں مجھے الگ کمرہ اور الگ بیکری نہیں ملی تھی پہلی احتیاطی طور پر منظر میں اچھے منظر کے کی فہم نہ آئے، اور یہ طے نہیں ہو گیا کہ صرف میں ہی تنہا ہوں گے لیے مکالمے لکھوں گا اور میں ہی ڈائریکٹنگ ڈائریکٹنگ کروں گا۔

میرا پہلا فلم ”مزدور“ تھا اور دوسرا ”سفر“ جسے ہترائے ڈائریکٹنگ کیا۔ نہ صرف پہلے کے بلکہ دوسرے کے مکالمے بھی صرف میں نے لکھے اور میں فلستان کا ڈیوٹیاں سال نسبتاً آرام سے گزر گیا۔ منظر کو اس بات کا قلق ضرور ہو گیا کہ میں نے اس کی حال کا کٹ دی لیکن میں نے اپنی عادت کو جانتے ہوئے نہ تھا کہ منظر نے اس بات کا انتظام کر لیا کہ جہاں تک ممکن ہو اس سے بچا جائے۔

لیکن میری تمام احتیاط کے باوجود آخر منظر مجھے ایک چوٹ پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔ میرا فلم ”مزدور“ خواہ باکس آفس پر

کامیاب نہ رہا تھا لیکن میرے مکالمے ۱۹۴۵ء کے بہترین ڈائلاگ سمجھے گئے تھے اور مجھے ایک سسٹم بھی ملتی تھی، میرا دوسرا فلم "سفر" باکس آفس پر بھی کامیاب رہا اور مظاہرے کے میرا گریڈ بھی بڑھ گیا تب اشوک کمار نے اپنا ایک فلم پروڈیوس کرنے کی خواہش ظاہر کی وہ مجھ کو مان گئے۔ مگر کے دونوں فلم "جل جلالہ" اور "شکاری" دو دو سال لینے کے باوجود کام رہے تھے اس لیے اشوک کمار میرے پاس آئے اور انھوں نے مجھ سے ایک کہانی لکھنے کی درخواست کی۔ میں نے ان کو دو تین پلاٹ جو میرے ذہن میں تھے سنائے۔ اشوک نے ایک پسند کر لیا اور مجھ سے کہا کہ میں ایک خاکہ سا لکھ لوں لیکن میں نے کہا کہ لکھنے سے پہلے ایک شرط وضع کرنا چاہتا ہوں کہ میں کہانی لکھنے کا دو ہزار روپیہ پیشگی لوں گا۔ میں اس وقت پہلے سات سو کے ذریعہ تھوڑا پارہ لکھا۔ لیکن میرا کہنا تھا کہ میں مکالمہ نویس کی حیثیت سے ملازم ہوں کہانی نویس کی حیثیت سے نہیں۔ کہانی لکھوں گا تو اس کا دو ہزار لوں گا اور ڈائلاگ لکھنے کے کھانے لکھوں گا۔ اگرچہ اشوک کمار کو میری کا سالانہ لیکن ان دنوں سال بے سہولتی کے تعلقات کچھ کشیدہ تھے۔ اشوک نے کہا۔ "آپ مجھ سے کہتے ہیں لیکن مجھ سے خوش نہ لگتے ہیں۔" میں نے انکار کر دیا تب اشوک نے کہا کہ میں کچھ مختصر ناول سے کسوں کا آپ بات کر لیجئے گا لیکن اس دوران میں آپ ایک خاکہ ضرور لکھ ڈالیے۔

خط کو یہ خبر مل گئی کہ اشوک میرے پاس پہنچا اور میں دو ہزار روپیہ مانگ رہا ہوں تو اس نے واپس آ کر لایا تھا اشوک کو اپنے غلیظ پرلے گئے شراب و آچا کے دن اعلیٰ قسم کی برقی لکھی۔ اشوک کو انھوں نے اس وقت تک نہ آنے دیا جب تک یہ طے نہیں کر لیا کہ میرے ناول کی کہانی لکھنے کا اور دوسرے دن اس کا مہمور ہو جائے گا۔

چونکہ کہانی کوئی تیار نہ تھی اور مہمور ہو گیا تھا اس لیے "آٹھ دن" کے خاتمے کے سلسلے میں کیا کیا دفتیر میں نہیں، یہ ایک الگ سی کہانی ہے لیکن چونکہ میرے یہ جانتے ہوئے کہ میں نے الگ سے معاوضہ مانگا تھا، بغیر معاوضہ لیے افسانہ لکھنا منظور کر لیا یہ اور بات ہے کہ جب آج کل میں گئی تو اس نے پریشان کرنا شروع کیا اور کہانی کی مدد بھی کچھ معاوضہ لیا، اور اچھی خاصی نرسل کر کے میرا پتہ کاٹ دیا اس لیے مجھے بہت برا لگا۔ خصوصاً اس وقت جب میں افسانہ کا خاکہ لکھ کر اشوک کے آنے کا انتظار کرتا رہا۔ مہمور ہو گیا۔ مگر جی جھ سے خوش نہ لگتے اس لیے سوا اس کے کہ میں زہر کا گھونٹ پی کر وہ جانا اور کچھ تہہ ہوسکتا تھا۔ لیکن کچھ ہی دن بعد میں نے غصے سے بدلہ لینے کی ترکیب نکال لی۔ "آٹھ دن" کا ڈائریکٹر غفلت کا ایڈیٹر دتا رام پانی مقرر ہوا تھا۔ اگرچہ ڈائریکشن تو اشوک ہی کی تھی لیکن چونکہ پانی بڑا قابل ایڈیٹر تھا اس لیے اس کی حسیاتی قلمی میں نے پانی کو سوا لایا اور "آٹھ دن" میں پینڈٹ طوطا رام کا ایک مزاحیہ رول لے لیا۔ جب کہانی شروع ہوئی تو یہ دو ایک مناظر کا رول تھا لیکن میں نے اس خوبی سے اپنا پارٹ کیا اور بغیر ری ٹیک (RETAKE) کے کیا کہ اشوک کو بہت پسند آیا اور اس نے طے کیا کہ یہ رول بڑھا کر سارے فلم میں رکھا جائے۔ اس کے علاوہ پینڈٹ طوطا رام کو کچھ ہندی بولنا تھا اس لیے بیسٹ کے سب ڈائلاگ میں لکھتا تھا۔ مگر ایک لائن لکھنا تو چاہ کر دیتا، مگر ایک سین لکھنا تو نہیں اس کے دو بنا دیتا۔ مجھے میٹج ایکٹنگ تو پسند ہے لیکن فلم ایکٹنگ کو فلم ہنگ کی طرح میں کوئی اہمیت نہیں دیتا لیکن مگر کوئی پریشان کرنے کے لیے وہ مٹھکھنیز رول میں کرتا رہا اور مٹھکھنیز پریشان ہوا کہ ایک دن سبٹ پر لکھا پانی تک کی فوٹ اگلی۔

اور اس بار ہم دونوں ساتھ ساتھ غفلت سے الگ ہوئے اور اگرچہ اشوک اور آچا مگر کے دست لگے اور مٹھ

ان کے ساتھ بیٹھی ناکیز چلا گیا جسے اشوک نے تھوڑے سے عرصہ میں خود لیا تھا، لیکن ڈرو ماں ایک لمبی کانٹن نے دے سکا۔ جب میں بچہ مٹی سے الہ آباد آئے تو مجھے اشوک سے ملا اور میں نے پوچھا کہ فطو کیوں چلا گیا تو اس نے کہا کہ اس نے کمانی لقمی لقمی لیکن ہم نے کمال امر وہی کی کمانی دھل "لینے کا فیصلہ کر لیا۔ فطو کچھ کہے بیٹھ چلا گیا، حالانکہ ہم نے کہا تھا کہ اس کے بعد تمہارے والدی کمانی بنائیں گے لیکن اس نے نہیں سنا۔

درحقیقت ساڑھ بیڑا رکھ کر دوسٹ و آچا (جو فطو کا دوست تھا) اور بیٹی ناکیز کے دلک و آچا میں فرق تھا اور مٹوا ایسے آدمیوں میں گھر گیا جنہیں کبھی اس نے غلغلہ نہ دیا تھا اور جب اس نے دیکھا کہ کمال لڑا راستہ بند ہے، کاروٹر نہیں چلے گی تو وہ باجو کی گئی۔ سب سے پاکستان چلا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کلیدی (سامیوں پر مسلمانوں کے آنے کی وجہ سے ایک دو چٹیاں اشوک اور اور آچا کو مٹی تھیں، لیکن فطو کو آگ لگا تھا اور خود بیکار ہو جانا آسان نہیں۔ اس کا اثر نہ شاید طیف نے لیا نہ نذر اجیری نے فطو کے دل ہمنے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ پہلی کمانی نذر اجیری کی تھی مٹی اور دوسری کمانی کمال امر وہی کی۔ جس دن کمال امر وہی کی کمانی کا پتہ چلا فطو نے بسبھی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

لیکن فطو کی اس بدن چھوڑت اور باری صاحب کی بدن چھوڑت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ باری صاحب کی بچھڑت میں غالباً ڈرو ماں کا عنصر تھا جو فطو کی بچھڑت اس کی زبردستی انانیت کے باعث تھی اور اس کی اسی انانیت میں اس کی عظمت کا راز مضمر ہے۔ فطو کو خوشام کرنے سے غار نہیں تھا۔ بھوتی کے پاس بیٹھ کر ان کی خوشنودی کے لیے فطو کو غالب کے اشعار سناتے ہیں نے بکھارے، ان اشعار میں بھوتی کے بھوتی کے سامنے غالب کے فطو پڑھنا جینس کے آگے ہیں بجا ہے۔ اس سے فطو کی عظمت کم نہیں ہوتی اپنے فتن میں ان کا کوئی نافی نہیں، لیکن غالب کو سمجھنا ان کے بس کی بات نہیں اور فطو بھوتی کے ناطے بنگال کا چھوڑنے سے چھوٹا شاعر ان کے نزدیک غالب سے بڑھ چکا ہے! اشوک اور آچا کی محفل میں بیٹھ کر سوتیہ لپیٹنے سناتے دیکھا ہے۔ ان پڑھا بھوتیوں اور میرزا ڈار بھوتیوں کی محفلوں میں بڑی سرگرمی سے بھرتا ہے، کرتے ٹھنسا ہے (جسے فطو بھوتیوں اور دوسرے بڑے بچے کا نام دیتے تھے، لیکن ان میں سے کسی بھی کام میں اس کی انا کو تھیں نہیں پہنچی، کیونکہ اول تو یہ کہ وہ ان کو اپنے سے کہیں کم تر سمجھتا اور دوسرے یہ سب لوگ خواہ فطو کو کسٹی سمجھتے ہوں، مثالی سمجھتے ہوں لیکن اول درجے کا ڈراما شاک رائٹر سمجھتے تھے۔ آل پڑا پڑا کی اس میٹنگ میں جہاں رائد نے میں نے اور اس محفل میں بی۔ اسے نے اس کے ڈرامے کی غید کی اور میں نے ناکیز کے صطو بھوتی جہاں اشوک اور آچا اس کے جگری دوستوں نے اس کی کمانی کے مقابلے میں نذر اجیری اور کمال امر وہی کی کمانیاں لیے ہیں، فطو کی انانیت کو زبردستی تھیں پہنچی اور جب اس کی انانیت کو تھیں لگی تو پھر وہ اس کے لیے پھرنا مشکل ہو گیا۔ کوئی مٹی کھال والا ابن الوقت مصنف ہوتا تو ہنگ برداشت کرنا سہرا لچی وڈاں چار ہوتا لیکن فطو کی انانیت کے لیے وہ جنگ نام قابل برداشت تھی اور پھر پٹ کر بیٹھ دینے کے فتن وہ ماہر نہیں تھا اس لیے دونوں بار میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ دونوں بار اسے سخت تکلیف ہوئی، دوسری بار تو اس کی جان باری، لیکن تکلیف کے جوت سے باری انانیت کو تھیں لگنے دینا اس نے منظور نہ کیا۔

پارٹی ہوا، میٹنگ ہر نامدل یا انظار میں فطو ہمیشہ پیش پیش رہتا پسند کرتا تھا۔ اگر کسی پارٹی یا محفل میں کوئی دوسرا آدمی

لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لے تو وہ بڑی خاموشی سے بیٹھ کر کسی کوتاہے لکھک جاتا تھا۔ یوں نو فسطان میں اپنی ملازمت کے شروع کے دنوں میں جب میں نے کانٹریکٹ پر دستخط کیے تھے اور میری شرطیں مکرجی نے اچھی منظور نہ کی تھیں اور میں مکرجی کو فائبر کے بجائے ہمارے دیوتا کے گیت سنایا کرتا تھا، میں نے شوکی کی امانیت کے اس پہلو کو دیکھا تھا لیکن ایک خاص واقعہ ہے جسے میں بھول نہیں سکتا۔

۱۹۴۵ء یا ۱۹۴۶ء کے اوائل کا ذکر ہے۔ ٹھیک عینہ مجھ سے اسی سال میں امریکہ کا ویا انگلستان کا میرے چھ ماہوں میں ایک مشورہ کیا گیا تھا۔ میں نے اس ایکڑ کا صرف ایک فلم دیکھا تھا جس میں وہ موٹر سائیکل ریس میں شامل ہوتا ہے اور اس پر کرتیئر کوٹا ہے کہ وہ کھینے والے ہنسی کے مارے بوٹ بوٹ ہو جاتے ہیں۔ بہر حال میں میں وہ ایک دو موٹر بوٹوں میں گیا۔ رائے ہمارے چچی لال نے اسے فسطان میں بھی دھو کیا۔ شام کو فسطان کی کینٹین میں جو کھلے میں بنی تھی اور چھت کے باوجود تین طرف سے کھلی تھی، میں نے لگا دی گئیں اور شہنشاہ مکرجی کی گان کو بھی، انوک، واجا، چنگر، برن، نیپالی وغیرہ اکٹھے ہوئے۔ چنگر اس ایکڑ کو چارے ہاں آنے سے پہلے فلم پر دو لوگوں کی ایسوسی ایشن میں جانا تھا اس لیے اسے دیر ہو گئی۔ بڑے مکرجی اٹھ گئے، باقی لوگ وہیں بیٹھے گپ شپ کرتے رہے۔ منظر صوبہ بھول (BOSS) کے ساتھ بیٹھا بقول شیشام اپنی بڑی بچی ان پر ضاع کرتا رہا۔ میں نیپالی برن وغیرہ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ آخر ایک صاحب اپنی بیوی کے ساتھ تشریف لائے۔ لمبوترنا سامنے — جسے کسی نے دونوں بیویوں کو تشفی میں کس کر چپا کر دیا ہو، نکلی، دیسا ہی جیسا فلم میں دیکھا تھا۔ ان کی بیوی بڑی حسین تھی۔ ظاہر ہے کہ روپیہ اور نام کی کشش نے اس جوڑ کو اس گھر کے پہلو میں لٹھکایا تھا۔ بہر حال اس کے آگے آگے رائے ہمارے چچی لال اور مکرجی آگے کینٹین میں ایک بڑی نیز چچی تھی اور اس کے ساتھ چھٹی چھٹی نیز چچی تھیں۔ بڑی نیز چھی لالوں اور کچھ نیزوں پر دوسرے لوگ بیٹھے تھے۔ میں نیپالی وغیرہ کے ساتھ ایک چھٹی نیز چھی تھی۔ باجیٹا لیکن شوک کے ساتھ بڑی نیز چھی تھی۔ لیکن ایک ڈاس ایکڑ کے ساتھ آنے والے لوگ زیادہ تھے۔ دوسرے رائے ہمارے کے ساتھ بھی چڑھ مان تھے۔ انوک اور گان مکرجی لالوں میں سے تھے، مکرجی نے واجا اور شوک کو اشارہ کیا کہ وہ چھٹی نیز چھی تھیں۔ واجا اٹھ کر چھٹی نیز چھی لکڑ کے پاس جا بیٹھا۔ اس نے شوک کو بھی پاس بٹھانا چاہا لیکن شوک نہیں بیٹھا۔ اس آخر انفری میں جب ہمارے بیٹھ رہے تھے، شوچ چپ چاپ لکھک گیا۔ میں یہ سب تاشہ دیکھ رہا تھا۔ جب وہ میرے پاس سے گزرا تو میں نے کہا۔

”کیوں؟“

”چلو چلیں۔“

”کیوں؟“

”سب کو اس سے۔“

”جیو، میں نے کہا۔ جہاں اس کو اس کے انتظار میں ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھے ہیں وہاں آدھ گھنٹہ اس کے ساتھ بیٹھ لینے ہیں۔“

لیکن شرطیں مکرجی سے کینٹین سے نکل گیا۔

”کچھ خشتے“ میں نے شوک سے شیشام پر جھکی لکھا ہے اس میں اس کی امانیت کے اس پہلو کی جھلک بار بار ملتی ہے لاہڑ

میں شام آیا تو اس کو ملنے والے اتنے تھے اور وہ لوگوں کی فوج کو اس طرح کھینچے ہوئے تھا کہ غلو کی آنا کو بار بار ٹھیس لگتی ہے۔
 فنو کہتا ہے:-

”شیام نے مجھ سے کہا — میرے ساتھ ہو، لیکن اس کے دماغ کی مضطرب کیفیت کے احساس نے مجھے سخت پرالگہ کر دیا۔ اس سے وعدہ کر کے کہ رات کو میں اس سے فیصلی ٹرل میں ملوں گا، چلا گیا۔“

لیکن جیسا کہ میں نے منظر کو دیکھا اور جانا ہے، منظر کے چلے جانے کی وجہ (یا وجہ اس کے دیرینہ دوست کی اس خواہش کے کہ وہ اس کے ساتھ رہے) اور کچھ نہ ملے، اس کی انتہائی۔ اس کی اس اچھن کو گھٹن کو میں نے اس امر کی (یا انگریزی) ایک طرف کی آمد پہلے محسوس کیا۔ یہ کبھی نہ جب منظر اٹھ جائے گا، شاید یہ کی تو وہ ایک نکتہ اور اس ہو گیا اور پھر وہ ان میں سے کسی سے مشکل ہو گیا۔ منظر، شام سے منظر پہلے ہی گیا، لیکن اس ملاقات کا حشر یہ پہلی ملاقات سے مختلف نہ ہوا اور منظر اور منظر پر چکر واپس گیا۔ یہی میں جب وہ شام سے اٹھا تھا تو عموماً شام نہیں، منظر لوگوں کی توجہ کا مرکز نہ ہوتا تھا، کیونکہ انگریزوں اور انگریزوں میں وہ اپنی قابلیت لطیف کوئی اور نہ سخی سے سننے والوں کی توجہ کو اپنی طرف لگاتے رکھتا تھا، لیکن لاہور کی ان دو ملاقاتوں میں، سننے والے آڑٹ نہیں تھے، عام لوگ تھے، جن میں سے شاید کو سب جانتے تھے اور منظر کو چند ایک جانتے تھے وہ بھی نہنگی طور پر جلوں گئے تھے اور میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس بات سے منظر کو جرات ہے آپ کو سب سے بڑھتا تھا، کتنی کوفت ہوئی ہوگی۔

مخصوص طرح میں بیٹنا جانتا تھا لیکن چٹنا نہیں پڑنا جانتا تھا لیکن چٹنا نہیں، اس کی طرح ملائی گرتا تھا لیکن مذاق برداشت کرنے کی حس اس میں مفقود تھی۔ وہ ہست ذکی! ابھی تھا اور اپنے مصنفان میں بار بار اس نے اس کا ذکر کیا ہے) لیکن دوسرے علمی ذکی! ابھی ہو سکتے ہیں، دوسروں کو بھی بات سمجھ سکتی ہے اسے وہ اونچے درجہ کا افسانہ نگار اور ماہرِ نغمات ہونے کے باوجود نہ جانتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے اس بات کا بھی خیال آتا تھا لیکن انسان کی یہ عام خامی ہے، اس کتاب کی بارِ نفس سے اندھے ہوئے لیکن اپنے افسانوں اور ناولوں میں انھوں نے اس کے خلاف لکھا۔ بالوراک نے، اپنے افسانوں اور ناولوں میں زندگی کی بے شمار حقیقتوں کو بے نقاب کیا ہے لیکن اپنی ذاتی زندگی میں وہ انھی کی حقیقت نہ سمجھ سکے کہ انھیں روپیہ بے دریغ اور بچکانی چیزوں پر نہ خرچ کرنا چاہئے، ہوائی قلعے نہ بنانے چاہئیں اور بے دریغ قرض نہ لینا چاہئے۔ مسعود خراساں پر زندگی کی کافی چھٹی حقیقتوں کا عظیم فن کار کی چابکدستی سے قلم بند کرنے والا زندگی بھر عیاں حقیقتوں کو نہ سمجھ سکا اور بے حد پریشان رہا۔ آج بھی یہ سب اچھی طرح سمجھتا ہوں لیکن ان دنوں حقیقت نگار ہونے کا دھوکے مارنے کے باوجود وہ زندگی کی اس بڑی حقیقت کو نہ جانتا تھا۔

میں جس دنوں دہلی گیا، منٹو کی ایک کہانی کا پڑا چڑھا تھا۔ اس کا نام تھا ”ترقی پسند“۔ چرچا اس کا یوں تھا کہ منٹو نے وہ دو روز دنیا رٹھی اور بعد پھر کبھی کبھی میر سے بہت نزدیک تھا اس لیے کبھی ذمیت میں میں نے منٹو کی دم کہانی پڑھ لی۔ کہانی میں جو قصہ درج تھا وہ مجھے معلوم تھا کہ منٹو کی کہانی تھی مجھے بتا چکا تھا۔ بات یہ تھی کہ کوک گیت لکھتے لکھتے سنیاتھی ایک دم افسانے لکھنے لگا تھا۔ سنے ادیب یا شاعر کو اپنے افسانے یا شمسٹانے کا مرض ہوتا ہے سنیاتھی کو بھی تھا، ہر سکتا ہے کہ دوسروں کی نسبت

”نئے دینا“ کے شائع ہوتے ہی لاہور اور دہلی کے ادبی حلقوں میں ایک شور مچا ہو گیا۔ چونکہ غلطی اپنے اچھے سے اچھے وقت کی عزت کسی بھی وقت اُٹا کر رکھ دینا تھا اور اپنے سامنے بھی کسی کو کچھ نہ بٹھانا تھا اس لیے یار دوستوں کو اچھا موقع ملا تھا۔ دوست اسباب جب اکٹھے ہوتے کسی نہ کسی بہانے اس کہانی کا، یا سنیا لکھی کا یا بیدی کا ذکر کر کے اسے پھیلنے لگے۔ غرض اس کہانی کا ذکر آتے ہی کس طرح چڑھتا۔ دنیا جان کا مذاق اڑاتے ہوئے مذاق کیے جانے پر کس طرح سبج پا جاتا، اس کا ایک واقعہ آج بھی مجھے یاد ہے۔ لچ کا وقت تھا، لوگ کھانا وغیرہ کھا کر کمرش کے کمرے میں آکٹھے ہوئے تھے۔ خوب ہمدردی تھی۔ کمرش اپنی کمری پر بٹھکاتے بیٹھا سب کی مٹن رہا تھا۔ اس کے سامنے کی کرسی پر بیٹھا ڈاؤں اوپر کیے گھنٹوں کو باہوں میں دبائے گھڑوں بیٹھا تھا۔ آندھ تو اس اور دوسرے پروگرام سسٹنٹ غلو کی کمری کے گرد گھبرا بنا کئے کھڑے تھے۔ (اخترا ایمان اور میراجی شاید اس وقت ریڈیو میں نہیں تھے، یا شاید تھے مجھے یاد نہیں) حفیظ جاوید نیچے درج پر دیوار سے بیٹھ کھائے، گھنٹے پر ٹانگ رکھے آدھ لیٹے، آدھ بیٹھے خاموشی سے سب کچھ مٹن رہے تھے۔ میں ذرا دیر سے پہنچا تھا۔ کمرے میں جگہ نہ تھی اس لیے کوئٹے میں بیٹھے ریکارڈوں کے اوپے صوبہ پر مائل تھیں بچے کو ٹھکانے بیٹھ گیا تھا۔ تھی جانے کس نے اور جانے کیسے سنبھال لکھی کی بات پھیل دی اور کہا کہ نہایت گھٹیا افسانہ لکھا رہے۔ دوسرے نے کہا: ”لیکن نئے دینا تو اس نے خوب کہانی لکھی ہے۔“

”واہ!“ کمرش نے سر اور دایاں ہاتھ ایک ساتھ اٹھا لئے ہوئے کہا، لیکن اسی وقت اس کی نگاہیں غٹھ سے چارہ میں پڑ گئیں۔ کا نام سنتے ہی چونکا بیٹھا تھا اور کمرش کا اظہار ہوا کہ ”اٹھ بیٹھے آگیا اور گاہیں پھر جھجک گئیں۔“ اور تب کسی نے منٹو کو بتائے ہوئے کہا: ”ارے یار! سنیا لکھی کیا کھا کر ویسا افسانہ لکھے گا وہ تیری ہی کھا رہا ہے۔“ ”بیدی کا تو نہیں“ تیسرے نے کہا۔ ”لکھا تو سنیا لکھی ہی کا ہے بیدی نے اس میں پتے لکھتے ہیں اور کہانی رواں نہ رہے۔“

”ہم نے سنا فحش کا بھی ہاتھ ہے۔۔۔۔۔۔“

اور اس وقت غٹھ نے پاؤں نیچے کیے اور سب کی آوازوں کو جیسے اپنی آواز کی کڑنگی میں ڈبوئے اور اپنی بڑی بڑی منٹھیں جیسے ٹپھوں سے ٹپکتے ہوئے کہا: ”بیدی اور فحش کیا، اس میں تاثر کا ہاتھ ہے، تشم کا ہاتھ ہے، سذت منگھ سیکھوں کا ہاتھ ہے، سڈوہی سڈوہی کا ہاتھ ہے۔“

تب مجھے نہ جانے کیا منہ چھا، منٹو کو بات ختم کرنے کا موقع دینے نہیں لے کہا: ”اپنے بارے میں یا سب کو غلط فہمی جتنی ہے، وہ شام لال کو پر تھانا، گورکھ سنگھ لال کا باڈیٹر وہ بھی اپنے آپ کو اسٹیڈیشن سمجھا کر تھا۔۔۔۔۔۔“

میں نے شام لال کا ذکر کیا تھا کہ دوستوں نے زور کا فتورہ کیا لیکن اس سے پہلے کہیں بات پوری کرنا یا فتورہ ختم ہونا غلط سمجھا کر اٹھا، اور اس نے غصہ سے پگل ہو کر دو تین غلیظ کلاموں کے ٹھیلے میری طرف پھینک دیے۔

کوئی دوسرا موقع نہ تھا، منٹو جھجکا لی دیتا تو میں کھینچ کر ایک چوڑا کس کے منہ پر جا دیتا لیکن منٹو کی طرح مذاق کرنے کا بھی ایک فن ہے۔ مذاق مذاق میں جڑ جڑھاتا ہے گالی دیتا ہے، ہاتھ اٹھاتا ہے دراصل وہی بٹ جاتا ہے۔ غٹھ نے گالیاں جابجاں تو لوگ اور بھی زور سے منہس دیے کمرش نہیں ہنسا۔ اس نے منٹو کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا: ”کیا کرتے ہو؟“ اور دوسرے لمحے منٹو نے اپنے لہجے

قابو پایا۔ بڑھ کر میرا ہاتھ تھا اور دھیرے سے انگریزی میں کہا: ”ڈونٹ مائنڈ اٹ (DO NOT MIND IT)“

اس وقت چاہے غٹاؤں دو گلاباں بھی دے لیتا تو شاید میں ہاتھ نہ اٹھاتا لیکن دوسری بار مجھے یاد ہے غٹے لگانے کی ہی اور میں ہاتھ اٹھانے کو تیار ہو گیا۔ اگر وہ ذرا لمبی مڑے کھڑکھٹا تو سر پھٹول ہو جاتی۔

فغانستان کے زمانے کی بات ہے، ”آٹھوں“ کی شوشنگ چل رہی تھی اور میں نے اس میں پنڈت طہار رام کا ایک بڑا بیڑا لے لیا تھا۔ چرچہ دن کو سڑکوں پر نہ تھے اور اسٹوک کار نے زبردستی پروڈکشن لے لی تھی اس لیے ”آٹھوں“ کی شوشنگ رات کو ہوتی۔ غٹاؤں کو سیٹ پر آنے کا عادی نہ تھا۔ اس کے اشغال دوسرے تھے لیکن جب سے میں نے تکویم لے کر ”آٹھوں“ میں رول لے لیا تھا اور سڑک کے کھٹے کھٹوں میں ردوبدل کرنے لگا تھا تو غٹاؤں کی کوئی سیٹ پر آنے لگا تھا۔ رات کو وہ پیلا پایا کرتا تھا اور سیٹ پر آنا اسے بے حد شاق گزارتا تھا۔ لیکن میں اس کے کھٹوں کو ”میں“ نہ کر دوں، اس بات کا اسے ڈر تھا۔ اسٹوک کی کہانی کے سلسلے میں میرے ساتھ اس نے جو زیادتی کی تھی، اس سے میں بے حد بڑا ہوا تھا اور اس کو تنگ کرنے کے درپے تھا، لیکن میری یہ عادت ہے کہ لڑائی میں بھی شادی غلطی اپنے سر لیتا ہوں۔ ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتا ہوں کہ غلطی دوسروں کے سر رہے۔ اس موقع پر بھی میں نے غٹاؤں کو آٹھوں پر لگا کر وہ بے اختیار دھڑکنا لگا دے بیٹھا، لیکن ٹخنے والوں کو غلطی اسی کی معلوم ہوئی۔

”آٹھوں“ کی شوشنگ کے بعد میں بیاد ہو کر بیچ گئی چلا گیا تھا اور میں نے وہ غم نہیں دیکھا اس لیے مجھے اس کی کہانی یاد نہیں۔ آٹھوں کے رات کی شوشنگ تھی، شادی کا سیٹ تھا۔ مجھے پنڈت کی حیثیت سے بیرونی شادی کرنا تھی اور میں دھوکے دھونے کے بدلے بدلتے بدلتے بیٹے، ”رام نامی“ دو بیٹے گلے میں ڈالے سر پر بیڑوں سے لپٹی سحائے دیدی پر چڑھا تھا اور میری ماں سے ایسا پارٹیکلر کر رہی تھیں، میرا جھگڑا ہو رہا تھا۔ اس میں کہیں غصہ نہ لگایا۔ تو کیا میں جھک مار رہا ہوں؟ ”یہ شاید یہ غصہ تھا۔“ میں مڑ کر جھک نہیں مار سکتا۔ ”بہر حال جھک مارنے کا محاورہ غٹے استعمال کیا تھا۔ اسٹوک ہدایات دے دے رہے تھے۔ غٹے پڑے ہوئے اور چپ چاپ ایک طرف بیٹھا سین ٹھٹھ ہوتے دیکھ رہا تھا کہ اچانک مجھے شرارت ہو گئی اور میں نے سنجیدگی سے کہا: ”میں بیڑا لگاؤں نہیں بول سکتا۔“

”کیوں؟“ اسٹوک نے پوچھا

”جھک مارنا ہنسنا بھرا شہ ہے۔ دیدی پر بیٹھا ہوا دیدوں کا کوٹنا، دھرم پرائن برہمن ایسا دیکھی نہیں بول سکتا۔“

”لیکن یہ تو محاورہ ہے۔ غٹاؤں کو اٹھا۔“

”بہت سہلے محاورے ہیں جو بڑے معنی خیز ہیں لیکن شریف لوگ نہیں بڑے، اسی طرح دیدی پر بیٹھا ہوا پنڈت یہ ہنسنا بھرا محاورہ نہیں بول سکتا۔“ میں بولا۔

”لیکن محاورے کا مطلب تشدد بھرا نہیں۔“

”جھک کب ہے پھل، جھک مارنا، پھل مارنا۔ مطلب اس محاورے کا کچھ بھی ہو، لیکن کوئی پنڈت اسے نہیں بول سکتا۔“

”بنگال کے پنڈت پھل مار تے ہی نہیں کھاتے بھی ہیں۔“

”لیکن پنڈت طہار رام بنگالی نہیں، انہی نے کہانی بنگالیوں کی ہے۔“

”مگر کچھ اس کرتے ہو۔“ منظر جھلا اٹھا۔ ”تھیں یہی فقرہ بولیں ہوگا۔“

”میں نہیں بول سکتا۔ میں ویڈی پر بیٹھا ہوا برہمن ہوں۔“

”میں بھی برہمن ہوں۔“ غصہ کر گیا۔

”برہمن تمھارے اجداد ہوں گے اس وقت تو تم یہاں جھک مار رہے ہو۔“

اور منظر نے بے اختیار ہرگز زور سے مجھے گالی دی۔

آج اپنے اس اعتراض کی بات سرجتا ہوں تو مجھے بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ درحقیقت دل میں مجھے اس وقت بھی ہنسی آ رہی تھی لیکن اوپر سے بے حد سنجیدہ بنا ہوا تھا۔ اس بات پر زور دے رہا تھا کہ شمالی ہند کا کوئی دھرم پرانہ پنڈت ویڈی پر بیٹھ کر لسا تھا وہ نہیں بول سکتا۔ اعتراض نہایت چوتھا لیکن جو گنگھی دیا سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایسے پچھلے اعتراضوں کی سیٹوں پر شب و روز سوتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اعتراض پھر سے لیکن برہمن یہ بول سکتا ہے یا نہیں، اس سوال نے اسے ایک دم وزن عطا کر دی تھی زیادہ لے نہایت ڈر چوک آدمی ہوتے ہیں۔ بڑے سے بڑا انسانک وہاں ہورت کرتا ہے حالانکہ ان مورقوں کے باوجود آئے دن عمارتیں ہوتی ہیں، غم فیل ہوتے ہیں اور فنا کن سرخسارہ اٹھاتے ہیں،یری بات اشوک اور راجا کو شیک گئی۔ منظر نے گالی دی تو میرا پتہ اور بھی بھاری ہو گیا اور چونکہ میں مذاق نہ کر رہا تھا اور طاقی پر آمادہ تھا اس لیے میں نے کہا: ”کچھ منظر! میں سیٹوں میں نہیں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ تم بھی سیٹوں میں نہیں ہو اور تم نے لمبی کھسے تو میں نہیں اٹھا کر سٹوڈیو کے باہر پھینک دوں گا۔“

معالے نے کچھ ایسا رخ اختیار کیا کہ اشوک گھبر گئے۔ شرمناک کر گئی۔ انھیں ٹھکر ہوئی کہ کم دونوں اڑے رہے تو شوٹنگ نہ ہو سکے گی اور چار چھ ہزار کی ڈرٹ جانی گئی۔ وہ منظر کو ہارے گئے یا شاید مجھے لے گئے یہ مجھے یاد نہیں، لیکن کچھ دیر بعد جب ہم سبھٹ پر آئے تو منظر نے میرے ہاتھ کو آہستہ سے دبا تے ہوئے افسوس کا اظہار کیا۔

اس کے بعد وہ پھر نہیں بیٹھا، گھر چلا گیا۔ کچھ بھی وہ رات کو سبٹ پر نہیں آیا میں نے مکالمے ہی نہیں مناظر تک بدل ڈالے لیکن پھر اس نے میرا ستر نہیں کاٹا۔

منظر کو گالی دینے کا ہمت شوق تھا۔ اس بات کی اسے بڑی خواہش تھی کہ وہ کرشن کو ایک اور ضبط گالی دے سوائے ان کے تو کتا ہی رہتا تھا، لیکن کرشن بھی ایسا موقع نہ آنے دیتا تھا منظر مجھے گالی دینا چاہتا۔ دو تھوں کا تو میں نے ذکر کر دیا۔ ایک بار اس نے دو مجھے گالی دی۔ ان دنوں ہم میں تناؤ نسبتاً کم تھا۔ کچھ بھی نے اشوک اور منظر وغیرہ کو رک جینے کے لیے سنسنی کو کچھ بلایا تھا اور آٹھ دن کے لیے اس کا ایک گیت منظر کو کر لیا تھا۔ مجھے اس بات کی خبر تھی لیکن منظر سنسنی کو دلاؤ آنا پسند نہ کرتا تھا اس لیے وہ ایک گیت مجھ سے کھینچا اور اٹھا، ہم سب رنگ و دم سے دفتر کی طرف آ رہے تھے کہ وہ بیٹھا چڑھتے ہوئے منظر نے اپنا نام مجھے باؤں باتوں میں دھیرے سے گالی دی۔

کسی زمانے پر میں خود بڑی گالیاں لیکن تھا۔ والد محترم مت ہی گالیاں تصنیف کرتے ہیں جیتے تھے۔ بول بھی جانتا تھا گالی فیز جملہ ہے۔ سوت جب ملتے تھے تو بڑی بھاری ہجر گالیاں سے ایک دوسرے کا زیر قدم کرتے تھے ہم آغوش ہوتے تھے۔ مجھے اچھوٹے یاد ہے میں بھیشم لالہ ہوس کے فتر میں کام کرتا تھا اور اپنے سینٹر ایڈیٹر جیو بابا کو کچھ کھانکے ساتھ دھو دھو میں رونما کرنا کہیں کی جنشیت سے بہت مشہور رہا ہے۔ منظر اور اب آل انڈیا ریڈیو کے کسی شعبہ میں گنتی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور بڑے روڈ پر جا رہا تھا کہ سامنے سے میرا ایک کپڑا کا دوست کمرزٹ کٹا اور ادا کھلیا۔

دوبری سے اس نے ایک بڑی کالی سے برا حال چال پوچھا اور میں اس سے ملنے لگی کالی دیتا ہوا اس سے تنگی کر گیا۔ آج یہ بات کچھ غراب کی ہی معلوم ہوتی ہے اور حال انکیز میری ہی اسی طرح مجھے خاصا غریب پہنچتی ہے لیکن جہاندر سے لاہور آنے والے اشک اور لاہور آباد کے اشک میں زمین آسمان کا فرق ہے) گو رکھا صاحب ہیراں و شمشاد کھٹے دیکھتے رہے۔ بعد میں نے انھیں دکھایا کہ وہ میرا انکیز آیا تھا اور جہاندر کے لنگوٹ میں یاروں میں بغیر ہمدی کی بیانی رکھ ہے..... کاش منٹوں اور ٹھوس ایسا یاد نہ ہوتا اور ہم دونوں بے تعلقی سے ایک دوسرے کو کالی دے سکتے لیکن دفتر کی ہر عین میں پڑھتے ہوئے اس نے صبر سے مجھے جو کالی دی تھی اس میں بے تعلقی کی یاد نہ تھا میرا سنا تھا کہ وہ کالی دے سکتے تھے عموں سے کہہ کر ان کو اس نے کالی عاوضی سے سُن لی تھی اور علی گڑھ میں گائیڈ جس کی اور بے تعلقی نہ ہونے کے باعث میں کالی دے نہ سوں گا میں نے فوراً کہا: ”کچھ منٹو اتم امرت سر کے ہر تو میں جہاندر کا ہوں میں گایاں دو گان تو تھاری طبیعت صاف مجھے لگی دوبارہ تم مجھے کچھ کالی مت دینا۔“

منظرب گلی جیسے پر معافی مانگ لیتا تھا، اتنا مادہ اس میں تھا تو یہ کیا وجہ ہے کہ ہمیں برابر کشیدگی رہی اور ہم ہٹنے سے جس نے خود اس بات پر غور کیا ہے اور میں ہمیشہ اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ زندگی کی اس سلاطین میں ایک دوسرے کے مقابل رکھ دیا گیا ہے اور ہم ہٹنے پر مجبور رہے۔ اگر کہیں برابر مل کے بیٹھنے لگی تو ایک دوسرے سے سو ڈانٹا، ایک دوسرے کے پیڑھے سے کواٹ کر کوشیت بیٹھے والے ہوں کی طرح۔

ہم نے ایک دوسرے سے ملنے کی کوشش نہ کی ہوا، ایسی بات نہیں لیکن ہماری انا یا احتیاط کھل کر ہمارے ملنے کے راستے کی پیشہ رو یا رن ٹی نہیں ملنے کی کوشش کی تو مٹھتا رہا، مٹھنے کی کوشش کی تو میں تاراج ہو گیا، ٹھیک سن یا نہیں لیکن کوشش لکھنؤ چکا تھا، رات بھر کمرہ ڈرامہ ریکرڈ کر رہا تھا، جیسے جیسے وہاں پہنچا وہاں پہنچا، کوئی صاحب کو ابھی مٹھ نہ لیا تھا، اس لیے اس نے کہا کہ اس وقت کا مٹھنا ہی نہیں ہے، تو مٹھنا ہی نہیں تھا، دینا تھا، شام کا وقت تھا، درجیل چلے گئے تھے اور میں بزم پر بیٹھا کوفی ڈراما یا گمانی ٹھہرا تھا۔ کوشنیا اندر باورچی خانے میں کھانے پکاتے کا انتظام کر رہی تھی کہ کاحانگ باہر کھڑک پر سے سخت آواز بھی آواز آئی۔ "اسٹاک!"

دعوتِ نبویؐ! — مجھے خیال آیا — اور یہ ادا دل دھک سے رہ گیا کیونکہ اگرچہ میں اس کے گھر (۹ ص) میں مل کر کشتی پر گھبراہٹ میں تین چار بار گیا تھا، لیکن وہ کرشنہ (۱۲) پر نہیں ملھی میرے گھر آیا تھا حالانکہ میں تیس ہزار میں بھیج دے کے مندر کے کمرے میں رہتا تھا اور وہاں سے گھروں میں نصرتِ ال سے زیادہ کا حاصل نہ تھا۔ میرے ہاں تو دور رہا، وہ کبھی کرشن چندر کے ہاں بھی نہ آیا تھا جو میرے نزدیک ہی رہتے تھے (میرے آنے سے پہلے آیا جو تو میں نہیں جانتا)

لیکن میں نے فوراً جواب نہ دیا نہ اٹھ کر دروازہ کھولا کیونکہ آواز اگرچہ مشک کی معلوم ہوئی لیکن یقین نہ آیا کہ مشک ہے۔

”اشک!“ وہی کرخت، تکیجی، قدرے چڑچڑی آواز۔

میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ غصہ عظیم بھائی اور ان کے ساتھ ایک گوارا، بڑی خوبصورت آنکھوں اور نیکیوں ناک نقشہ والا نوجوان — تمیز اندر آئے۔

فطرنے تعارف کرایا۔ میسور پر وزیر ہے (میراجتیبایا میراجدوست) منظر کیا کہا مجھے یاد نہیں) تم سے ملنا چاہتا تھا۔ میں نے

کہا، "بلوطا لائیں۔"

میرے پاس اس وقت دو چھوٹے چھوٹے ٹکڑے، ایک کوٹھڑی اور ایک کچن تھا۔ منہر لا ل لھا کو گریسبل کشتہ دہلی نے نکال دیا۔
کے کچے چھوٹے غریب الوطنوں کے لیے بارکون جیسے ۲۰ کوڑا بنا رکھے تھے۔ جس وقت کا ذکر ہے، رائے ایک فرد میں تین فرد اور کشتہ
پانچ فرد کو کوڑا تیس رہتے تھے۔ ایک کوڑا سمیٹنے کا اور ایک بیٹھنے کا تھا۔ بیٹھنے کے کمرے میں سے ایک کمری یہ کام کرنے کے لیے رکھی گئی
اور بیٹھنے کے لیے ایک دوی اور جامع فرض پر بچھا رکھی تھی۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے کہا: "بیٹھ بیٹھو!" اور کوٹھیا کو آواز دی
کہ کوٹھیا بٹھا دو صفیہ لہانی آئے ہیں بٹھا دو پر پر بیٹھ گئے، صفیہ لہانی اندر باورچہ خانے کی طرف چلی گئیں اور میں اس وقت تک بات چلائے
کی کوشش کرتا رہا، جب تک صفیہ کو تسلیہ کے ساتھ بیٹھ گئیں نہیں آئیں۔

مجھے اس میٹنگ کی کوئی بات یاد نہیں ہے۔ اس کے کسود پر ویر کی آنکھیں بڑی خوبصورت تھیں، اس کا ناک نقشہ سید خوش تھا اور
میں نے کئی بار در زیادہ دیکھا۔ میں سس اس کی طرف دیکھا اور میرا خیال تھا کہ وہ قیاسی دنیا میں میری کثیفیت سے شہر ہوگا شاید وہ اس وقت کسی
فلم کمپنی میں ڈکرتھا جانے کی کوشش کر رہا تھا، بٹھا دو اور کمری اور بی باتیں کرتا رہا اور میں سنا بیٹھا رہا۔ بات کو سننے کی طرف میں مڑا پر پڑے
یہ نہیں دیکھا کہ اس سٹون کی میری ہر پڑھی ہے وہ کب نہی آیا ہے لیکر رہا ہے کب تک نہی کب بات چیت کو میں نے ذاتی کچ نہیں دیکھا کہ
باتیں کرنے کے لیے بیٹھ رہا بلکہ جب کوٹھیا آئی تو ان لوگوں کو باتوں میں مشغول چھوڑ کر میں کام کرنے کا مطالبہ کرتا رہا۔

میں نے ایسا نہیں کیا، جب میں اس کے ہاتھ میں سوچتا ہوں تو یہاں تک کہ مجھے اس بات کا ایک منٹ کو بھی یقین نہیں آیا
کہ وہ پڑھنے سے ملتا ہے، ہاں تھا اور مٹو اپنے شام کے شعلے سے خوش کوٹھیا کے کمرے سے ملنے چلا آیا تھا، صفیہ لہانی کو ٹکٹا سے ملنا چاہی ہو گی
بیات بری ہو گی اس کی صفیہ کوٹھیا کو چاہی تھیں اور کشتی صفیہ اور کشتہ دونوں کی عزت کرتی تھی لیکن مٹو نے اس بات کا ذکر نہیں کیا اور
برے ہاں آنے کا جو بہانہ اس نے بنایا اس کا مجھے یقین نہ تھا۔ پھر مٹو کے اس طرح آنے میں اس کے اس طرح آواز دینے میں جیسے ہاں
بیٹھنے اور باتیں کرنے میں کچھ ایسا انداز تھا جیسے میرے ہاں اگر وہ مجھ پر کوئی بڑا احسان کر رہا تھا اور مجھے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے تھا۔ ہاں تو
میں اس نے بنا بھی دیا کہ وہ اس ڈیڑھ برس میں کشتہ کے گھر بھی نہیں آیا اور مجھے اس کا یہ انداز کھل گیا تھا۔

مٹو کی بات میں نہیں جانتا، لیکن اس ملاقات کی بے کیفی مدتوں میرے رماغ پر حاوی رہی میں بھڑکڑاؤ میں ہوں، مٹو بھی اقل بوجھ کا
پھوڑا ہے لیکن ایک دوسرے کے ہر جگہ کی جانے ہماری امانیت کے کن تاروں کو چھوڑ دیتی تھی کہ وہ بے ساختہ تنہا تھے مجھے بھی طرح
یاد ہے کہ جب میں کمری پر بیٹھا کھٹے کا ہلکا کر رہا تھا اور پاس ہی دوی پر بیٹھے مٹو اور کسود، صفیہ لہانی اور کوٹھیا، باتیں کر رہی تھیں میں سوچ
رہا تھا کہ میں کہوں ان کی باتوں میں شامل نہیں ہونا، جب وہ میرے گھر آئے ہیں تو مجھے ایسا کھٹیا پن نہ کرنا چاہیے تھا کہ چلوں مٹو کے آنے
کا صحیح مقصد جانتا تھا جسے اس نے اس میں ہنسی کے زیر اثر دوبارہ کھانا تھا، اس لیے میں کھل نہیں سکا۔ مٹو کا ساتھ کا جڑی مٹو کو اپنی باتوں سے
نور ایچے آئے تو دیکھ کر میرے دل میں غم پیدا ہوا لیکن ان باتوں سے اسے انداز لے کے کامیابی پر مجھے اتنی ہی مقدار میں خوشی ملی تھی۔

مٹو پھر میرے گھر بھی نہ آیا۔ دہلی میں بھی نہیں، ممبئی میں بھی نہیں اور اس نے دہلی چھوڑ جانا منظور کر لیا لیکن اور زیادہ نیچے
آنا اسے منظور نہ ہوا۔

منٹو صاحبؒ

محمد طفیل

اس مضمون کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ منٹو صاحب کی زندگی میں اور دوسرا حصہ ان کے انتقال کے بعد لکھا گیا۔

(۱)

اس وقت میں شدید درد و سہ، نہ جانے یہ جی کیوں چاہتا ہے کہ درد بڑھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں اس وقت منٹو پر کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ سو دن پہلے کی دہائی کی فوجیت بدل جائے۔ اس لیے کہ میں نے منٹو کے انسا نے پڑھتے ہوئے عموماً سر کی بجائے دل میں درد محسوس کیا ہے۔ میرے علاوہ اور بھی کئی ایک اسی اذیت میں مبتلا ہوں گے۔ بعضوں کے دل میں ان کے انداز و بیان کی رنگینی اور چٹ پٹپٹ سے درد ہوتا ہے۔ جبراً اٹھا دیا گیا ہے؟ یہ آپ کو پھر کبھی بتاؤں گا۔ اس لیے کہ میں اس وقت منٹو کے فن کی بجائے ان کی شخصیت پر کچھ مومل کرنا چاہتا ہوں۔ منٹو کے فن پر لکھنے کا حق ہمیشہ کی طرح نقادانِ کرم کو سونپنا ہوں۔ ورنہ وہ محاورہ صادق اسے لگا کہ چھوٹا منہ اور بڑی بات۔

ایک دن اتار گلی میں ایک صاحب کو انسانی انداز میں پیدل چلتے دیکھا تو ذہن میں آیا کہ اسے منٹو پڑھنا چاہیے۔ یہ خیال اس لیے بھی ذہن میں آسکتا تھا کہ منٹو صاحب بھٹی سے لاہور آچکے تھے۔ چند دنوں بعد ایک صاحب ہمارے دفتر کے سامنے سے سائیکل پر گزرے، سائیکل بالکل نئی تھی۔ صاحب سائیکل نے ہمارے دفتر کے اندر کچھ اس نئے انداز سے دیکھا کہ ذہن میں پھر کیا کہ وہ منٹو گیا۔

ابھی ٹھوڑی سی دیر ہوئی تھی کہ بزرگ احمد ندیم قاسمی آئے اور انہوں نے بتایا میں آپ کے پاس ٹھیک وقت پر پہنچ جانا۔ لیکن راستے میں منٹو صاحب مل گئے تھے۔ اس لیے آدھ گھنٹہ ان سے باتوں میں گزر گیا۔

کچھ دنوں بعد جب پھر ندیم صاحب آئے تو ان کے ہمراہ ایک اور صاحب بھی تھے۔ وہی جن کو میں نے اتار گلی میں دیکھا تھا یا دفتر کے سامنے سائیکل پر گزرتے دیکھا تھا۔

ندیم صاحب نے تعارف کرایا یہ آپ سعادت محض تھی۔ امد میری طرف اشارہ کر کے آپ طفیل صاحب ہیں؟

غٹو صاحب میں سو سو چوبیس کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ موجود ہوں، تو دوسرا لاکھ کو کشتش کیسے، وہ کسی کو بولنے نہیں دیں گے۔
 ہاتھ ان کی دلچسپ اور معلوماتی ہوتی ہیں۔

وہ میرے پاس پہلی مرتبہ آئے تھے، اور آتے ہی انھوں نے باتیں شروع کر دی تھیں اس لیے مجھے موقع ہی دہل سکا کہ پانی دانی کے لیے پوچھتا۔ پھر بھی میں نے ان کے مسلسل پانی میں یہ بات بھجور دی۔
 ”غٹو صاحب چائے پیسے گئے؟“

غٹو صاحب اس وقت نان اسٹاپ موڈ میں تھے۔ اس لیے انھیں میری مروت بھی ناگوار لگ گئی اور جھٹ بولے ”ہٹا دیا، اس وقت چائے سے زیادہ گرم باتیں ہو رہی ہیں۔“

باقول ”کاسل تو ٹوٹی ہی چکا تھا۔ اس لیے کسی اور طرف چل نکلے اور ندیم صاحب سے کہا: ”مجید ر بادکن میں کئی ایک کو یہ فکر تھی اور ہے کہ میری شادی مصحف سے ہونی چاہئے تھی۔ نہ جانے یہ لوگ ایسی باتیں کیوں سوچتے ہیں جب یہ بات میری بیوی نے سنی تو وہ کہاں ہو گئی۔ اس کے بعد دو دنوں کی آپس میں بڑی دوستی ہے۔ پھر تھی نہ حیات پر بھی آگے آگے تھی۔ اس لیے اس کا کتاب ہونا برحق تھا۔“
 پھر ————— اسے یاد دہانے کا کیا پوچھتے ہو۔ اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے! بڑے عاٹ سے دن گزارا ہے۔ ڈیڑھ دو ہزار کی آمدنی تھی۔ بڑی قدر تھی۔ ہر کوئی غٹو غٹو کرتا تھا۔ مملکت خداداد میں آئے تو یہ بھنڑوں کے پاس خود مانا پڑا کہ کبھی ہمارا کتاب چھاپ لو۔ کئی بار چلی جا ہا کہ بیچ مرگ کر پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگاؤں، پھر سوچتا ہوں کہ لوگ مجھے یا گل کہیں گے۔“

اس نذر کے پر غٹو صاحب زرا اندر ہو گئے اور شاید افسردگی ہی دودھ کرنے کے لیے انھوں نے اپنا خوبصورت سگریٹ کیس نکالا، ایک سگریٹ بیچم صاحب کو دیا ایک خود اپنے با ایک باریک لیون پر نکھایا، جب سے ماچس نکال ہی رہے تھے کہ ایک دم میری موجودگی کا خیال آیا اور بولے ”بھئی مصحف کرنا؟“ ادھر سگریٹ کیس میری طرف بڑھا دیا۔

ندیم صاحب نے مشکل کشائی کی اور کہا کہ یہ نہیں چیتے۔ غٹو صاحب پیسے کے لفظ کو لے اڑے یہ ہائے کجغت تو نے ہی ہی نہیں! سگریٹ پینا کیا ہوتا ہے۔ پینا تو وہ جوتا ہے۔“

پھر ندیم صاحب سے پوچھا ”فاکسی صاحب آپ نے ہر مضمون ”سویرے جو کل آنکھ میری کھلی“ پڑھا ہے؟“ ندیم صاحب نے حسب عادت ”جی ہاں،“ کہا ”مجید رادہ مضمون کیسے کہہ اسے، بکواس اسے۔“
 غٹو صاحب کی محادثہ ہے کہ اگر ان کی کسی چیز کی تعریف کی جائے تو وہ عموماً بھی جواب دیتے ہیں، یا صرف اتنا کہہ دیں گے ”بس ٹھیک ہے۔“ پھر خود ہی اسی مضمون کی تعریف شروع کر دیں گے اور وہ بھی حواسے دے دے کر مثلاً اس میں وہ فقرہ بڑا اچھا تھا کہ

”صبح کا وقت تھا، عجب ہمارا مٹی اور مٹی سیر تھی۔ قریب قریب ساری دکانیں بند تھیں۔ ایک حلوائی کی دکان کھلی تھی۔ دکان کی طرف بڑھا تو کیا دیکھتا ہوں بھلی کا پنکھا چل رہا ہے۔ لیکن اس کا منہ دوسری طرف ہے۔ میں نے حلوائی سے کہا۔
 ”یہ اُسے رُخ کا پنکھا چلانے کا کیا مطلب ہے؟“ اُس نے گھور کر مجھے دیکھا اور کہا

”دیکھتے نہیں ہو“ — میں نے دیکھا — پنکے کا رخ تاڑا مظهر محمد علی جناح کی تصویر کی طرف تھا“

پھر انہیں کوئی دوسرا پیرا گراف یاد آگیا تو وہ بھی سنا دیا:

”ایک دم شور برپا ہو گیا کیا دیکھنا ہوں کر ٹکے ہاتھوں میں کاغذ کے بڈل بیجے چلا رہے ہیں اور اندھا دھند بھاگ رہے ہیں۔ جہانت جہانت کی بولیاں سننے میں آئیں۔ اخبار ایک دسے تھے۔ تازہ تازہ اور گرامر خبری۔ دہلی میں جو تاجیل گیا لکھنؤ میں فلاں کوٹھی پر کتوں نے حملہ کر دیا پاکستان کے ایک تجوی کی پیش گوئی بشیر درویشوں میں آزاد ہو جائے گا“

اس وقت انھوں نے یہ فقرے بغیر کسی ربط کے سنائے تھے۔ یہاں ان کی کتاب سے فعل کر دیئے گئے ہیں۔

اس کے بعد بھی دسے کہاں۔ کہنے لگے آج کل عجیب ٹوٹے۔ افسانہ لکھنا چاہتا ہوں تو مضمون ہو رہا تاہم اگر مضمون لکھنا چاہوں گا تو ڈرامہ ہو جائے گا نہ جانے اس وقت مجھے بیٹھے بیٹھے کیا ہو گیا اور جھٹ سے بول پڑا۔

”اگر آپ نے بیک وقت ڈرامہ، افسانہ اور مضمون لکھنا چاہا تو آپ سوالیہ فنانس ہی کر رہ جائیں گے“

اس فقرے پر مفتو صاحب بخٹو نہ ہوئے اور کہا ”اچھا اے، اچھا اے“ چونکہ انھیں اپنے پر کوئی جھینگی ہوئی بات گوارا نہیں ہوتی، اس لیے ذرا سوچ کر بول ہی پڑے ”بات تو آپ نے اچھی کہی ہے، بدقسمتی سے میری اور آپ کی بے تکلفی نہیں ہے اس لیے جواب ارسال کرنے سے معذور ہوں“

نذر صاحب سمجھ گئے کہ یہ اس وقت کس قسم کا جواب دے سکتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے سکرا کر کہا ”آپ انھیں کوئی جواب نہ دیں۔ یہ ذرا اور تقسیم کے آدمی ہیں“ اور تقسیم سے اس وقت نہ جانے ان کی مراد کیا تھی۔ لیکن نذر صاحب کی باتوں کا رخ تقسیم کی طرف چل نکلا اور کہا ”آپ نے میرے مضمون ناک کی قسمیں پڑھا ہوگا۔ وہ، وہ، ہاں وہی آئی جو ان کی ناک تو اتنی چمکی گئی“

میں نے اس مضمون میں ناک کی قسمیں گنوائی ہیں۔ اس مضمون میں ایک شعر بھی کوٹ کیا ہے جو مجھے ناک کی مناسبت سے بڑا پسند ہے۔ وہ کیا ہے تھکا بھٹی وہ تھکا۔ ہاں!

ناک میں نیم کا فقط تھکا شوخی چالا کی اتقصا سہی کا“

اس کے بعد انھوں نے اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے، موٹے موٹے شیشوں والی عینک میں سے دیکھ کر نذر صاحب سے پوچھا ”آپ یہاں بیٹھیں گے؟“

نذر صاحب نے اپنا لکیر کلام دہرا دیا۔ ”جی ہاں!“ تو آپ کھڑے ہو گئے اور کہا ”اچھا بھی میں چلتا ہوں“ پھر تو ان سے اکثر ملاقاتیں رہیں۔ قریب قریب روز۔ عموماً ان کی ملاقاتوں کا انداز یہ ہوتا ہے کہ مسلسل ملاقاتیں بنجھیں گے۔ کبھی کبھی اچانک ناپید ہو جائیں گے۔ بات صرف اتنی ہو گی کہ ملاقاتوں کا رخ کسی اور کی طرف مڑ جائے گا۔ اسی کا یوں رد پوش رہنا چند

دو دن کا یا زیادہ سے زیادہ چند ہفتوں کا ہو گا۔ تاکہ سے اترتے ہی دُور سے اسلام علیکم کے ساتھ ملاقات چھینک دیں گے۔ پھر یہ کہیں گے۔
 ”دس روپے یا پندرہ روپے دوائی کے لیے دینا“ جو دینے پڑتے ہیں۔ لوگ دوائی اُس لیے پیٹتے ہیں کہ صحت یاب ہوں۔ لیکن یہ دوائی
 اُس لیے پیٹتے ہیں کہ صحت اور خواب ہو۔ ان کی دوائی کا نام شراب ہے۔ پہلے یہ دوائی کو پیٹتے ہوں گے۔ اب دوائی انھیں پی جی ہے
 اور کسی دن بھیٹے بھیٹے ہم برس نہیں لیں گے کہ منٹو صاحب کا انتقال ہو گیا۔

یہ سب جانتے ہیں کہ منٹو اور دو کا ممتاز افسانہ نگار ہے، جو ان کی اس حیثیت سے منکر ہیں، مجھے اُن کی رائے سے اتفاق
 نہیں۔ لیکن ایک بار ایسا بھی ہوا کہ منٹو صاحب نے ایک افسانہ مجھے نقوش کے لیے دیا جس کا نام ”نقطہ“ تھا، میں نے وہ افسانہ پڑھا
 تو مجھے پسند نہ آیا۔ دُرے دُرے اس کا اظہار ان سے کیا۔

منٹو صاحب نے بُرا نہ مانا بلکہ ایک اور افسانہ لکھ دیا۔ میری نظر میں وہ بھی پہلے جیسا ہی تھا۔ جب منٹو صاحب کو دوسرے
 افسانے کے متعلق بھی میری رائے کا علم ہوا، تو انھوں نے کہا کہ کل ایک اور افسانہ لکھ دوں گا اور اس وقت تک لکھتا رہوں گا، جب
 تک کہ آپ یہ نہ کہہ دیں کہ یہ افسانہ مجھے پسند ہے۔

اس کے بعد انھوں نے مجھے ایک ایک دن کے وقفے سے دو افسانے دیئے وہ دو دن مجھے بے حد پسند آئے۔ ایک
 کا نام ”موزیل“ تھا، اور دوسرے کا نام ”سُرک کے کنارے“۔

منہ و جہ بالادافع کے اظہار کا میرے نزدیک سوائے اُس کے اور کوئی مقصد نہیں کہ اس تناظر اُلکھنے والا اتنے بڑے دلی
 گھر کے کا بھی مالک ہے۔ ہر فن کار کو اپنی ادنیٰ سے ادنیٰ تحریر بھی بڑی عزیز ہوتی ہے اور وہ اس کی نشان بین ایک حرف بھی سننے کے لیے
 تیار نہیں ہوتا اور پھر منٹو ایسا فن کار، جو فن کار بھی ہے اور منہ پھٹ بھی۔ اس وقت انھوں نے نہ مجھے یہ طعن دیا کہ میں بتا لیکن
 ہوں اور نہ ہی یہ ثابت ہونے دیا کہ منہ پھٹ بھی ہوں۔

دیہیے ان کی زبان کے آگے کوئی خندق نہیں۔ کبھی کبھی پی کر آجائیں گے، اور کہیں گے ”کل آپ نے فلاں صاحب کے سامنے
 کیا کہہ اس کی غلطی، میری جان! میرے اور اس کے تعلقات اور قسم کے ہیں۔ معاف کرنا۔ وہ بھی حرام زادہ، آپ کو کیا پڑی غلطی کہ وہی
 بات آپ اس سے بھی کہہ دیں، جو میں نے آپ سے چھپا کہ کئی غلطی۔ دیہیے میں ڈرتا نہیں ہوں، وہ میرا کیا کرے گا، میری جان! آپ
 بھی عجیب آدمی ہیں۔ معاف کرنا آپ کو پتہ نہیں کہ آپ نے بڑی کیڑہ حرکت کی جب میں نے سنا تو کہ گلاب ہو گیا۔ میری...“
 میں ایسے مواقع پر خاموش رہتا ہوں، یا صرٹ مسکرا دیا کرتا ہوں۔ اس جیسے کہ اس وقت ان کی باتوں کا کوئی سر پر نہیں ہوتا
 اور اس وقت غٹو کی بجائے شراب بول رہی ہوتی ہے۔

بعض اوقات جب غٹو اور شراب مل کر بولتے ہیں تو اس وقت غٹو پر بھی پیار آتا ہے اور اس کی باتوں پر بھی۔ لیکن ایسے
 مواقع ذرا کم ہی آتے ہیں۔ عموماً وہ یہ کہو اہی تنہا ہی ہی کہتے ہیں۔ وہ اپنی اپنی باتوں کی بدولت دوبارہ پاگل خانے جا چکے ہیں۔
 پہلے مرتبہ منٹو صاحب ماضی خوشی خود ہی گئے تھے۔ دوسری مرتبہ زبردستی ان کے گھر والوں نے بیہوشی کی دوبارہ واپسی
 پر میں نے ان سے پوچھا تھا کہ منٹو صاحب آپ کس خوشی میں مبتلا ہو چکے ہیں اور آتے ہیں۔
 کہنے لگے کہ کبھی پہلی مرتبہ تو خود بڑے چاؤ سے گیا تھا کہ وہاں جا کر ذرا شراب چمکواؤں۔ سنا تھا کہ وہاں اس انداز سے علاج

کیا جاتا ہے کہ آدمی آسانی کے ساتھ شراب ترک کر دیتا ہے۔ لیکن وہاں جا کر جو طبیعت صاف ہوئی۔ وہ بیانی نہیں کر سکتا۔ دوسری مرتبہ گھر والوں نے زبردستی بھجوا دیا۔ حالانکہ میں نے ان کی بڑی مت سماجت کی۔ لیکن کسی نے ایک نہ سنی۔ وہاں پہنچ کر میں نے ڈاکٹروں سے کہا کہ میرا ذہنی معائنہ کروایا جائے اس لیے کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ لیکن ڈاکٹروں نے بھی ایک نہ سنی۔ کئی میرے ایک دوست مجھے طے مٹے تھے، تو میں ان کے ساتھ چلا آیا۔ وہ مجھے ڈھونڈتے ہوئے گئے، ڈھونڈھا کریں۔ یا گل کہیں کے۔

منو صاحب کا مزا اس وقت آتا ہے جب ان سے عریانی یا خفاشی کے مومن پر گھٹکوں کی جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھے بڑی جرات ہے کہ لوگوں نے میرے وہ بے شمار افسانے نظر انداز کر دیئے ہیں جن میں جس کا تذکرہ تک نہیں۔ میں نے جنسی افسانے تو شاید چند ایک ہی لکھے ہیں۔ باقی تو بس افسانے ہیں جن حضرات کو میرے افسانوں میں خفاشی نظر آتی ہے، وہی دکان دکان پھرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ ٹھیک کوئی نئی کتاب آئی۔ ان کا خیال ہے کہ میری تحریروں یا تو وہ حضرات پڑھتے ہیں، جنہیں میرے فن سے بہا ہے یا ”اعتزائے“ پڑھتے ہیں تاکہ مجھے برا بھلا کہہ سکیں۔ میں بھی وقت آنے پر ہر ایک کا قرضہ چکا دیتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنی ایک کتاب کا انتساب یوں کیا تھا:

”ایڈیٹرین و دنیا کے نام، جس نے مجھے مسکند زیادہ لایا دیں۔“

اب جی جانتے ہیں کہ تہذیب مولانا محمد امجد صاحب دریا بادی کے نام بھی ایک کتاب معنون کر دوں۔ اس لیے کہ موصوف نے میرے خلاف لکھ لکھ کر میرے افسانوں کی تردید کی ہے۔ اگر میں اپنی زندگی میں ایسا نہ کر سکا، تو بہت ٹھیک ہے کہ ہنسنے کے دن مولانا موصوف ہنس کر ہوں اور مجھے مذمت ہو۔

یعنی ان محترم، متبیوں کا تذکرہ چھوڑ دے دوست قاسمی صاحب نے بھی میرے نام ایک کھلی چھٹی لکھ دی۔ میرا دل چاہا کہ میں بھی ہندو لفظ لکھ کر چھپوا دوں۔ لیکن قاسمی صاحب کی شرافت اُسے لکھی۔ عسکری نے سیاہ جلیے پر دیا چھ لکھ دیا تو بار لوگوں نے اڑا دیا کہ مجھ پر عسکری چھایا ہو، ہے حالانکہ وہ خود انساں سیدھا سادا اور بھولا بھالا ہے کہ اپنے اوپر تو چھاپا نہیں سکا، مجھ پر کیا چھانا۔

پہلے ترقی پسند میری تحریروں کو اچھالتے تھے اور فخر کرتے تھے کہ منٹو ہم میں سے ہے۔ اب یہ کہتے ہیں کہ منٹو ہم میں سے نہیں ہے۔ مجھے نہ ان کی پہلی بات پر یقین تھا، نہ موجودہ پر ہے۔ پہلے ترقی پسند کہتے تھے کہ منٹو ہم میں سے ہے۔ میں کہتا تھا، ٹھیک ہے۔ اب مجھے حلقہ اناربابی واقوں نے اپنا مہر بنا لیا ہے۔ میں کہتا ہوں ٹھیک ہے۔

مجھ سے کوئی بچے کہ منٹو تم کس جماعت میں سے ہو تو میں عرض کروں گا کہ میں اکیلا ہوں، میرے معاملے میں اکیلا ہوں۔ جس دن میرا کوئی نانا پیدا ہو گیا میں لکھنا چھوڑ دوں گا۔ ویسے کوئی جماعت میرے نام کو اپنی جماعت کی فہرست میں شامل کر کے فخر کر سکتی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اب منو صاحب میں یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ ہر ایک سے کہیں گے کہ گل ظلال صاحب طے تھے اور انھوں نے میرے خلاف افسانے کی بڑی نعرہ بولت کی۔

پرسوں کا بھی سے ایک صاحب آئے تھے وہاں سے ان کا نام کیا تھا وہ کہتے تھے کہ منٹو صاحب میں نے آپ کی ساری کتابیں پڑھی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ میں آپ کو اوروں کا سب سے بڑا نشانہ بنانے لگا ہوں۔

گل ظلال صاحب نے شیو پورہ سے دو کھنٹر گھی کے اس لیے بھجوا دیئے کہ وہ مجھے بڑا امیر سمجھتے ہیں۔

میں نے مال روڈ پر ایک دکاندار کو اپنی دو تصویریں فریم کے لیے دی تھیں۔ کوئی صاحب محبت کے اعتبار کے طور پر وہاں سے فریم کے دوپے دے کر میری دو وزنی تصویریں لے گئے۔

میرا یہ سگریٹ کیس کم ہو گیا تھا۔ اس کے دوسرے دن ایک صاحب اسے لیے ہوئے آئے، اور کہا غوث صاحب! سلام! یہ اپنا سگریٹ کیس رکھئے مجھے فلاں جگہ پڑا ہوا ملا تھا۔ میں نے اُن سے کہا تھا۔ آپ کو کیسے علم ہوا کہ میں یہاں رہتا ہوں، وہ کہنے لگے وہ آپ کو بھلا کون نہیں جانتا۔

اُدھر ممتاز شیریں میرے فی پے کتاب لکھ رہی ہیں۔ ادھر میرے افسانوں کا انگریزی میں ترجمہ عجیب رہا ہے۔ ایک دن ایک صاحب نے کلمشی منشن میں افسانوں کھالی۔ ڈاکٹر بلایا گیا۔ ڈاکٹر نے قے کرانے کے لیے کوئی دوا تجویز کی۔ مگھاس نے دوائی پیسنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں مرنا چاہتا ہوں۔ شور جو تھا تو میں بھی پہنچا، میں نے کہا۔ بھئی دوا کھا لو۔ اس نے کہا تم کون ہو؟ میں نے کہا۔ میں منٹو ہوں۔ اُس نے اسی حالت میں کہا۔ بڑا اچھا ہوا کہ میں نے آپ کو مرنے سے پہلے دیکھ لیا میں آپ کو بہت برا رائٹر سمجھتا ہوں۔ چنانچہ میں نے اسے حکم دیا کہ تمہیں دوائی چٹنا ہوگی۔ چنانچہ اس نے دوائی لی۔

ایک دن میں انارکلی اور مال روڈ کے درمیان بیہوش ہو گیا۔ مجھے کچھ خبر نہیں کہ کیا ہوا۔ بس اتنا یاد ہے کہ کچھ ایسے معلوم ہوا کہ کسی نے میری گردن پر لکھا تھا مارا ہے اور میں بیہوش، کوئی آدھ گھنٹے کے بعد ہوش آیا تو دیکھا کہ ایک سائیکلوں کی دکان میں لوہے کی کرسی پر بیٹھا ہوں۔ ایک ہجوم میرے ارد گرد، سب غوث منٹو کر رہے ہیں۔

میں نے کہا ”ما جوا کیا ہے؟“

الغرض نے جواب دیا ”آپ کو چوٹ تو نہیں لگی؟“

”میرے کپڑے کیوں گیلے ہیں؟“

”اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“

میں نے ٹیٹا کر کہا ”کیا بکواس کر رہے ہو؟ تم لوگوں نے میرا جلوس کس سلسلے میں نکالا ہے؟“

بعد میں معلوم ہوا کہ میں بیہوش ہو گیا تھا۔ اس لیے لوگوں نے پانی کے چھینٹے مارا دے، مجھے ہوش میں لانا چاہا تھا۔ یہی علم ہوا کہ بعض لوگوں کا خیال تھا، مجھے مرگ کا دورہ پڑا ہے، اس لیے مجھے خوب خوب جوتیاں ”سونگھائی“ گئیں۔

جب میں نے بات سنی تو مجھے خطرہ یہ ہوا۔ ناک کو ہڈی کے دیکھا کہ چھوٹی سی جوتی اس کے اندر نہیں رہ گئی۔ یہی وجہ تھی کہ میں ایک دم گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ لوگوں سے کہا ”میں گھبرا جانا چاہتا ہوں۔ تاکہ منگو آدو؟“

”تاکہ منگو آدو؟“ اب سب منٹو کر کے گھر چھوڑنے جا رہے تھے۔ ہم غوث صاحب کو گھر چھوڑنے جا رہے تھے۔ غوث صاحب میری خوش قسمتی ہے کہ آج آپ سے اس ڈرامائی انداز میں ملاقات ہو گئی۔ میں آپ کو دنیا کا بہترین افسانہ نگار ماننا ہوں۔ میں نے فلاں فلاں مغربی افسانہ نگاروں کو پڑھا ہے۔ لیکن آپ کے سلف سب ہیچ ہیں۔

میں نے اُن صاحب سے کہا کہ میں کیا ہوں، بس افسانہ نگار ہوں۔ اب تو میں افسانہ نگار بھی نہیں ہوں۔ افسانہ نگار اس وقت

ہوتا ہوں جب میرے ہاتھ میں قلم ہوتا ہے۔ جب میرے ہاتھ میں قلم نہیں ہوتا، اس وقت میں کچھ نہیں ہوتا۔ اب افسانے کہاں ہیں حقیقت لکھوں۔ افسانے ادھر رہ گئے۔ جو افسانے ادھر رہے، انھیں بھی مار بھگایا ادھر یا ان کے ساتھ کچھ اور کر لیا گیا۔ وہاں ایک شریک پرکشی افسانے ملتے تھے۔ یہاں کئی مٹر کوں پر ایک افسانہ نہیں ملتا۔ اب یہ افسانہ مٹوڑا ہے کہ سعادت حسن منٹو مال روڑ کے قریب بیہوش ہو گیا اور لوگوں نے اس کی پانی کے جھینٹوں اور چوڑی سے تواضع کی۔ میری جالی! یہ افسانہ مٹوڑا ہے کہ —

ایک بار کسی صاحب نے ان کے افسانے ”موزیل“ کی بات چھیڑ دی۔ منٹو صاحب گویا ہوئے۔ وہ افسانہ میں نے مٹوڑا ہی لکھا ہے۔ وہ تو موزیل نے لکھوایا تھا۔ بھیٹے افسانہ لکھتے وقت کچھ پتہ نہیں ہونا کہ مجھے کیا لکھنا ہے۔ قلم روات سنبھالنا ہوں تو کاغذ کے دوبر ۸۶ لکھ دیتا ہوں۔ پھر سوچتا ہوں کہ افسانہ لکھنا ہے، افسانہ لکھنا ہے، افسانہ لکھنا ہے۔ کیا لکھوں، کیا لکھوں، کیا لکھوں۔ معاً ایک بات سمجھ جاتی ہے۔ مثلاً وہ درخت کے نیچے کھڑی تھی۔ پھر قلم رکھ دیتا ہوں، مگر پتہ چلتا ہوں، یا پشیماب کرنے چلا جاتا ہوں، یا پان کھانے کے لیے نکل جاتا ہوں۔ وہاں اگر ”وہ“ سے پوچھتا ہوں کہ بتاؤ تو کیا کہتی ہے۔ وہ جو کچھ مجھ سے کہتی جاتی ہے۔ میں لکھنا جاتا ہوں۔ وہ جھڑ جاتی ہے میں اس کے ساتھ ساتھ جاتا ہوں، البتہ میں اسے لکھیں سے دیکھنا جاتا ہوں۔ کردہ نکل سمورت کے اعتبار سے کسی سب سے۔ اس میں قابل غور کوں کوئی باتیں ہیں۔ اس کے سینے کا اُبھار کیسا ہے۔ وہ جب ہنستی ہے تو اس کے گاموں میں گرے پڑتے ہیں یا نہیں۔ وہ جب چلتی ہے تو اس کا انداز کیا ہوتا ہے۔ جب وہ مسکراتی ہے تو کہیں دل ٹوٹ کے تو نہیں لے جاتی۔ یہ ہر علم میرے لیے نازک ہوتا ہے کہ جب وہ دل پوشے پر آتی ہے تو خود کُشی بھی ہے یا نہیں۔ بس اس کا علم مجھے نہیں ہوتا۔ جب افسانے کا آخری حصہ آتا ہے تو ان تمام کرداروں سے پوچھتا ہوں کہ کبھی اب بتاؤ تمہاری کیا کیا مرصی ہے؟ تم میں سے کس کس کو مار دیا جائے؟ تم میں سے کس کو مار دیا جائے۔ بعض کردار مرسنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اُن مقبیل زندگی بخشی۔ پھر دوسرے کردار سے مشورہ کرتا ہوں وہ جو کچھ کہتا ہے اس پر صاف کر دیتا ہوں۔ ان میں سے جو کوئی مرنے کے لیے راضی ہوتا ہے اُسے مار دیتا ہوں یا وہ سالادور سالی جو کچھ بھی کرنا چاہے، میں اُسے سلق نہیں روکتا۔ البتہ آخری فقرہ منٹو سوچتا ہے اور افسانہ مکمل ہو جاتا ہے۔ مثلاً موزیل کا پہلا فقرہ مٹوڑوچی نے پہلی مرتبہ — چار برسوں میں پہلی مرتبہ رات کو آسمان دیکھا تھا۔ میرا ہے اور پھر آخری فقرہ ”مے جاؤ اپنے اس مذہب کو“ میرا ہے۔ باقی سب کچھ موزیل کا ہے۔

پھر موزیل کے وجود پر بحث ہوگی۔ ”میں“ میں ایک یہودی تھی۔ بڑی بڑی لڑاؤں والی، دھڑلے کی عورت، وہ اس کرت کے نیچے کچھ نہیں ہنستی تھی۔ افسانہ لکھتے وقت وہ دماغ میں اُبھری۔ اس کا نام بھول گیا تھا تو میں نے سوچا کہ ہمارے فلیٹ کے سامنے بھی تو ایک یہودی رہتی تھی اور اس کا نام موزیل تھا۔ ادھر بڑی بڑی لڑاؤں کا قصیدہ میں اُبھرا۔ ادھر موزیل کا نام، تو میں افسانہ ہو گیا میل اس میں کوئی کمال ہے۔ اگر کوئی کمال ہے تو موزیل کا ہے۔ —

دوبلے اس سلسلے میں منٹو صاحب نے جو کچھ تحریری طور پر فرمایا ہے۔ وہ بھی سُن لیجئے، مرنے کی باتیں ہیں :

”اب آپ کو کیا نازاں کر میں افسانہ کیونکہ لکھنا ہوں۔ یہ بڑی اچھی بات ہے۔ اگر میں دس طرح، کو پیش نظر رکھوں تو یہ جواب دے سکتا ہوں کہ اپنے نعرے میں صحت پر مبنی جانا ہوں۔ کاغذ قلم پکڑنا ہوں اور رسم اللہ کر کے افسانہ لکھنا شروع کر دیتا ہوں۔“

میری تین بچسوں خور عیادی ہوتی ہیں، میں ان سے باتیں بھی کرتا ہوں، ان کی تمام باتیں ڈائریوں کا فیصلہ بھی کرتا ہوں۔ اپنے لیے 'سلاو' بھی تیار کرتا ہوں۔ کوئی ملنے والا جلسے تو اس کی خاطر عیادی بھی کرتا ہوں۔ مگر افسانہ لکھے جاتا ہوں۔ میں افسانہ نہ لکھوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں نے کپڑے نہیں پہنے یا میں نے غسل نہیں کیا۔ میں افسانہ نہیں لکھنا۔ حقیقت یہ ہے کہ افسانہ مجھے لکھتا ہے۔ میں بہت کم پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ یوں تو میں نے جس سے اُدھر کتابیں لکھی ہیں۔ لیکن مجھے بعض اوقات عبرت ہوتی ہے کہ یہ کون ہے جس نے اس قدر اچھے افسانے لکھے ہیں، جس پر اُنے دن مقدس چلتے رہتے ہیں۔ جب فہم میرے ہاتھ میں نہ ہو تو میں صرت سعادت حس ہوتا ہوں، جیسے نہ اُردو آتی ہے نہ فارسی، نہ انگریزی، نہ فرانسیسی۔ بعض اوقات میں بیوی کے کتے پر قلم پائسل اٹھاتا ہوں اور لکھنا شروع کر دیتا ہوں۔ دماغ بالکل خالی ہوتا ہے۔ لیکن جیب بھری ہوتی ہے۔ خود بخود کوئی افسانہ اچھل کے باہر آ جاتا ہے۔ میں خود کو اس لحاظ سے افسانہ نگار نہیں جیب کترا سمجھتا ہوں جو اپنی جیب خود ہی کاٹتا ہے اور آپ کے حوالے کر دیتا ہے۔ مجھ ایسا بیوقوف دنیا میں کوئی اور ہو گا؟

ایک مرتبہ میں نے منٹو صاحب کی ضمانت دی۔ اس کا حال آپ نے منٹو صاحب کی زبانی سنا ہو گا۔ میرے اور ان کے بیانی میں بدیہی فرق یہ ہو گا کہ وہ ایک بڑے لکھنے والے ہیں اور میرا لکھنے والوں میں شمار ہی نہیں۔ الحمد للہ کہ میرا لکھنے والوں میں شمار نہیں درز میں بھی بعض اوقات العزم وادب و شعرا کی طرح کسی کو خاطر میں نہ لاتا۔ ہر ادیب کے متعلق یہی کہنا کہ فلاں کیا لکھتا ہے۔ فلاں کی زبان چمک نہیں۔ فلاں کا مشاہدہ ناقص ہے، فلاں جاہل ہے۔

ایسے اساتذہ کی موجودگی میں کون کسی کے منہ لگے۔ ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ میں نے منٹو صاحب کی ضمانت دی۔ میرا سمجھنا بھائی سخت بیمار تھا۔ میں اس کی دوائی کے سلسلے میں ڈاکٹر کے پاس آیا ہوا تھا اور اس کی کیفیت بیان کر رہا تھا، وہاں یہ پیغام ملا کہ ہاجرہ ہنس آئی ہیں اور آپ کو بلا رہی ہیں۔

میں نے سوچا کہ ایک خاتون دفتر میں بیٹھ نہ رہے۔ چل کر پہلے ان کی بات سن لوں۔ پھر دوائی لے جاؤں گا۔ ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ ابھی آیا۔ میں اپنے بھائی کی بیماری سے سخت پریشان تھا۔ پھر بھی برنائے شگفتہ سہی سے منہ نہ ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ میں اصرار کر رہا تھا کہ میں آپ کو چاہئے پلاڈن گا اور وہ کہہ رہی تھیں کہ ہرگز ہرگز نہ پیوں گی اور طفیل کی چائے تو کبھی نہ پیوں گی کہ اتنے میں منٹو صاحب تشریف لے گئے۔ وہ تانگے میں سوار تھے۔ انھوں نے میری طرٹ اشارہ کر کے آدھوی خندا دھر کر گائی

میں فدا دھر، منٹو صاحب ذرا دھر آئے اور ہمارا آستانہ سامنا دفتر اور سرگرم کے درمیان درمیان ہوتا۔ منٹو صاحب نے کہا کہ درمیان سے راستہ آؤ اور میری ضمانت دے دو میں اپنے چند دوستوں کے پاس گیا تھا، ان میں سے کوئی نہیں ملا۔ اس وقت میرے لیے یہ فیصلہ مشکل تھا کہ یہ اس وقت یہاں مجھے اپنا دوست سمجھ کر آئے ہیں یا دشمن سمجھ کر (ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی کہا کہ کل پانچ ہزار روپے کی ضمانت ہے۔

میں نے یہ غدر کیا کہ میں تو گھر سے بھائی کی دو ایجنے کے لیے آیا ہوں۔ اس لیے آپ یہ کام کسی اور کے سپرد کر دیں۔ بہت ممکن ہے کہ میری پانچ ہزار کی ضمانت بھی منظور نہ کی جائے۔

اس پر منٹو صاحب نے کہا کہ آپ آدھ گھنٹے میں واپس آجائیں گے اور ساتھ ہی کئی سوالیہ جڑ بیٹے۔ ”آپ کا ذاتی مکان ہے؟ آپ کا بیک بلیس تو اتنا ہو گا؟“ جب میں نے نفی میں جواب دیا تو کہنے لگے ”اباؤ ہو جائے گی ضمانت، آخر اتنے بڑے اداکارے کا مالک پانچ ہزار کی بھی ضمانت نہیں دے سکتا۔“

ہاجرہ بہن نے بھی نفردیا ”چلے جائیے نا آخر ہرج ہی کیا ہے؟“
چنانچہ دھڑکتے دل کے ساتھ اور ذہن میں گھر پر پریشانیوں کے ساتھ تاکنے میں بیٹھ گیا۔ تاکنے میں نصیر انور اور رحمت راسے موجود تھے۔ اب تاکہ انارکلی سے نسبت روڈ پہنچا اور راستے میں باتیں ہو رہی ہیں۔ ”کل جو تھا ننداد میرے وارنٹ لے کر آیا تھا بڑا اثر بہت آدمی تھا میں نے اس سے کہا کہ کل صبح خود تھانے میں اپنے ایک منٹو صاحب سمیت حاضر ہو جاؤں گا اب آپ جائیں اور مجھے آرام کرنے دیں۔ چنانچہ انھوں نے میری بات مان لی اور میں رات بھر آرام کرتا رہا۔“ کبھی نصیر انور کہتے ”منٹو صاحب آپ ایسے افسانے کیوں لکھتے ہیں جن پر مقدمے کی ذمہ داری آئے۔ کبھی میں کہتا کہ منٹو صاحب اگر آپ کو وقت مقررہ پر حاضر عدالت ہونا ہے تو مجھ سے ضمانت دلوائیے ورنہ مجھے پریشان نہ کیجیے گا۔“

جس وقت ہم نسبت روڈ سے میکوڈ روڈ پر پہنچے تو منٹو صاحب نے کہا ”اگر اس وقت طفیل صاحب نہ ملے تو بڑی مشکل ہوتی۔“ اس پر نصیر انور نے کہا ”آپ کی مشکل تو حل ہو گئی۔ اب آپ طفیل صاحب کے لیے مشکل پیدا کر رہے ہیں۔“

اس پر منٹو صاحب ہنسے اور کہا ”مہین نہیں، ہرگز نہیں۔ آخر مجھے ایک بار تو کراچی جانا ہی ہے تاکہ یہ ٹھکانہ ختم ہو جائے تاکہ میکوڈ روڈ سے قلعہ گوجر سنگھ کی طرف خطر نہ پڑے۔ بالآخر تاکہ دوسرے پولیس کے سامنے جا کر دیکھ لوں گا۔ ہم نے دفتر میں جا کر اپنی آمد کی غرض بتائی۔ وہاں میرے بھی ایک شے والے مل گئے۔ انھوں نے جب یہ سنا کہ میں ایک ضمانت کے سلسلے میں آیا ہوں تو انھوں نے کوشش کی کہ ضمانت جلد سے جلد ہو جائے۔ حالانکہ اس وقت میرا دل یہ چاہتا تھا کہ وہ کچھ ایسا ہیر پھیر کریں کہ قاضی صاحب میری ضمانت ہی قبول نہ کریں۔ وہ میرے دل کی گہرائیوں تک پہنچ کر یہ اندازہ نہیں کر سکتے تھے کہ میں یہاں محض مروت کی بنا پر آیا گیا۔ اس لیے کہ مجھ سے ایک بڑے لکھنے والے کی دلالتا نہیں دیکھی جاتی تھی۔

چنانچہ صاحب ضمانت ہو گئے۔ دوسرے لمحے منٹو صاحب نے یہ فیصلہ سنایا کہ میں کراچی نہ جا سکوں گا اس لیے کہ صحت خراب ہے۔ ڈاکٹری سرٹیفکیٹ بھیجا دوں گا۔ ان کے منہ سے اس وقت یہ فقرہ منہ میں جیراں رہ گیا۔ اس لیے کہ وہ کراچی نہیں جا رہے تھے جیرانی اس لیے بھی ہوئی کہ میں نے ان کی صحت اس دن سے اچھی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

اس وقت مجھے منو صاحب پر پڑا غصہ آیا۔ حالانکہ غصہ مجھے اپنے اوپر آنا چاہیے تھا۔ بہ فرجن محال اگر اس وقت مجھے اپنے اوپر غصہ آجانا تو کیا ہوتا۔ بالآخر تاکنے پر پھر سوار ہوئے اور نالگے کا رخ ہمارے دفتر کی طرف کر دیا گیا۔ راستے میں پاکستان ٹائمز اور امر دہ کا دفتر آیا تو نالگہ کو روک دیا گیا۔ اوپر پہنچے جس کسی نے سنا کہ میں نے منو صاحب کی ضمانت دی ہے تو سب نے یہی کہا کہ منو صاحب وقت مقررہ پر حاضر عدالت نہ ہوں گے۔ منو صاحب ان لیدار کس پر ہنستے رہتے اور کتنے رہے۔ ”نہیں یار! کہوں نہ جاؤں گا۔ سالانہ دہ اس سے پہلے مجھے کہہ چکے تھے کہ نہیں جاؤں گا“

بالآخر ایک بات میرے ذہن میں آئی اور میں نے منو صاحب سے کہا: ”اگر میں کل صبح کے لیے دو سیدیں بک کر ادوں۔ تو کیا آپ اور نصیر انور کراچی چلے جائیں گے؟“ منو صاحب نے میری اس پیشکش کو قدر سے تکلف کے ساتھ قبول کر لیا۔ بعد ازاں منو صاحب سے گزارش کی گئی کہ آپ گھر قنبرا قنبرا لے جائیں میں سیدیں بک کر انے کا بندوبست کرتا ہوں۔

چنانچہ پاکستان ٹائمز کے دفتر سے اپنے دفتر تک پیڈل آیا۔ اپنی سائیکل سنبھالی، سائیکل پر سوار ہوا تو بھائی کی بیوی اور اسکی دو ادھر بار لگتی۔ سائیکل کے پیچھے کے ساتھ ساتھ میرا داغ بھی گھومنے لگا۔

سیدیں بک کر آنے میں بڑی دشواری ہوئی۔ ریڈر ویشن آفس سے معلوم ہوا کہ چار دن تک کوئی سیدٹ خالی نہیں۔ رادھر وقت یہ معنی کہ منو صاحب کی دوسرے دن عدالت میں حاضری تھی۔ چنانچہ شذکت خانوئی صاحب کے پاس ریڈر ویشن پیش کیا۔ انھوں نے پہلے تو خوب سخت سسٹ کیا۔ لیکن پھر یہ انتظام کر دیا کہ اگر ہم لوگ کل صبح سات بجے سیشن پر پہنچ جائیں تو سیٹوں کا انتظام ہو جائے گا۔

میں نے اس کی اطلاع منو صاحب کو دے دی اور ان کی سیگم اور ہمشیرہ سے بھی کہا کہ انھیں صبح تک تیار کر دیجئے گا۔

تاکہ میری ذمہ داری ختم ہو۔

رات کو جب گھر پہنچا تو گھروالوں نے شکایت کی کہ بھائی آتنا بھار ہے اور قعیں دو ایک پہنچانے کی فرصت نہیں مجھے بڑی نڈا ہوئی۔ لیکن میں ان سے کیا کہتا کہ مجھ پر آج کیا مٹی ہے۔ رات بھر کبھی بھائی کی بیوی کا خیال آتا رہا۔ کبھی منو صاحب کی گرم فابریوں کا۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ میں ایسے مواقع پر بچائے اختر شماری کے زخم شماری کرتا ہوں۔ چنانچہ رات بھر یہ شغل جاری رہا۔ صبح ۵ بجے گھر سے چل نکلا۔ گھر والے میری شب بیداری سے ہی کافی پریشان تھے جب علی الصبح گھر سے نکلا تو وہ اور پریشان ہو گئے۔ اس لیے کہ میں سردیوں میں رات کے گیارہ بجے سے پہلے سونے کا اور صبح ۵ بجے سے پہلے اٹنے کا عادی نہ تھا۔

ان کے استفسار پر میں نے صرف اتنا کہا کہ میرا ایک دوست کراچی جا رہا ہے اسے سیشن تک چھوڑنے جا رہا ہوں۔ ابھی تھاؤں کا اور بھائی کی دوا بھی لاؤں گا۔ جب بھائی دروازے کے باہر پہنچا تو سوجا کہ نالگے میں بیٹھ کر منو صاحب کے ہاں پہنچوں۔ پھر خیال آیا میں بہت سویرے جا رہا ہوں، جلدی پہنچ گیا تو منو صاحب کو تکلیف ہو گئی، دُھر یہ بھی دھڑکا، اگر میں نے جلدی پہنچنے میں دُسا می خلعت کی تو منو صاحب گھر سے بھاگ جائیں گے، پیدل ہی چل نکلا۔ اپنے بجائے ان کی تکلیف کا زیادہ خیال رہا۔

راستے میں کتنوں نے بھی جھونک بھونک کر استقبال کیا۔ سوچتے ہوں گے کہ اس شکل و صورت کا انسان آج ادھر کیسے ایک آدھ جگہ بھگتی نہ تھی سڑک صاف کرتے ہوئے کہا ”ہٹ جاؤ با بوجی“ اس وقت بڑا جی چا کہ ذرا اس کے پاس لگوں۔ اس کی غیریت اور

اس کے بالی بچوں کا احوال پوچھوں۔ پھر نہ جانے بہت کیوں نہ ہوئی۔ اس کے باوجود جب غٹو صاحب کے مکان پر پہنچا ہوں تو کافی سو رہا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ ان کی بیگم نے دروازہ کھولا، غٹو صاحب کو جگایا تو غٹو صاحب آنکھیں ملٹے ہوئے آئے اور اسلام علیکم سے استقبال کیا۔ اس وقت ان کے گلے میں ایک بڑی سی گرم چادر پٹی ہوئی تھی، جیسے مغز لپیٹا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد نصیر افزہ بھی آ پیچھے۔ تینا گھر لگ گیا گیا، ان کی ہمشیرہ، بیگم اور بچیوں نے ہمیں وداع کیا اور خیریت سے واپسی کی دعا مانگی۔

ایکشن پر سیدلوں کا انتظام ہو چکا تھا۔ جب سامان گاڑی میں رکھ دیا گیا تو غٹو صاحب نے شراب کی بوتلوں کو نکال کر ایسی جگہ رکھ دیا، جہاں ہر آنے والے کی نظر پڑتی تھی۔ میں نے غٹو صاحب سے کہا، ایسا نہ کیجئے۔ انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک جھوٹی سی سبز رنگ کی کاپی نکال کر دکھائی کہ میرے پاس شراب کا پر مٹ ہے۔ یہ بات ان کے منہ ہی میں غئی کہ گاڑی میں چھک چھک چھک دو سہرے دن اخبار میں آیا کہ غٹو صاحب عدالت میں حاضر ہو گئے تو جانی میں جان آئی۔

ایک وقت غٹو صاحب پر یہ بھی آیا کہ جب وہ ایک دم بیٹھے بیٹھے کھٹے لگے۔ ”ارے بھئی سنو تھانیں ستان تھان تو م ستان تو م“ (پرنہ نہیں کیا ابلال) جو صاحب غٹو صاحب کے پاس بیٹھے ہیں۔ وہ پرنیشن کہ ایک دم اخیں کیا ہو گیا۔ رادھر سے استفسار ہو گیا کہ سنیں۔ غٹو صاحب کہیں گے ریڈیو، ارے بھئی کہاں ہے؟ جواب ملے گا ادھر آؤ اور میرے کالوں کے ساتھ اپنے کان لگا دو۔ آری ہے تا آواز۔ واہ وا کیا گل پاپا یہ کیمت نے پھر ہاتھ کے اشاروں سے سر کے تار چڑھاؤ کا ساتھ دیں گے کبھی کبھی تھک جیٹیں گے، اور کبھی کھڑے کھڑے پیچ جیٹیں گے ساتھ ہی تبصرہ بھی۔ ”بائے ظالم نے مار ڈالا۔ یا ”ظالمی“ نے مار ڈالا درواہ دا، شا باش، ہائے۔ اگر اس وقت شرارت سے کسی نے کہہ دیا کہ غٹو صاحب جو کچھ آپ سن رہے ہیں وہ نہیں سنا ہی نہیں دیتا۔ اس لیے ہمیں کاغذ پر لکھ کر بتاتے جائیے تو وہ کاغذ اور قلم منہ سے ہوتے ہیں منہ سے بھی دیں گے کہ گاؤں میں تیل ڈال کر اور دوسری ماشیں کر دیا کر دو۔ اور ساتھ ہی لکھنا شروع کر دیں گے پیلے دو تین پنجائی گیت لکھیں گے، پھر کہیں گے ”اب اردو کے کانے سینے“ وہ بھی نہیں جاد لکھ۔ ڈالیں گے۔ یہ ریڈیو دو تین بیٹے ملک غٹو صاحب کے گاؤں میں بجاتا رہا۔ جسے صرف ان کی اکیل جان سننی رہی اور لوگوں کو یہ لکھ کر یا خود سننا کراتے رہے۔ پھر نہ جانے کیوں ان کے کان کے ریڈیو کے والوز خراب ہو گئے اور ریڈیو بجا بند ہو گیا۔

انہی دنوں کا ذکر ہے کہ ایک دن شام کے قریب ان کے گھر گیا تو باہر سے دیکھا کہ غٹو صاحب گارے ہیں۔ کبھی ہاتھوں کو گاؤں تک لے جا رہے ہیں۔ اور کبھی سر کے ساتھ ساتھ ہاتھوں کو پچھا رہے ہیں۔ میں باہر کھڑا کافی دیر تک تماشہ دیکھتا رہا۔ آخر بنا بکے تنگ آ کر آواز دی۔ ”اُن کا نوکر باہر آیا تو ہمیں لے گا۔ دراز غٹو صاحب کو بلاد دیجئے۔“ اُس نے حاکم غٹو صاحب سے کہا کہ کوئی صاحب آپ کو بلد رہے ہیں۔ غٹو صاحب نے جواب دیا ان سے جا کر کہہ دو، اس وقت غٹو صاحب نہیں آ سکتے، گا ناگا رہے ہیں۔“

پھر خود ہی چلے آئے اور دروازہ کے قریب آکر سلیک کو ٹھیک کرتے ہوئے کہا ”کون ہے؟“ اچھا آپ ہیں بھئی معاف کرنا، میں اس وقت گارہ تھا۔ آؤ تم بھی گا نا سنو۔“ میں نے پوچھا ”اور کون کون ہے؟“ کہنے لگے ”کوئی نہیں ہے۔ گھر کے کچ لوگ ہیں آؤ آؤ۔ آؤ۔“

مقدموں کی بھر مار نے اب اخیں سننے پر مجبور کر دیا ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ اب ان سے افسانے نہیں سن سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس عرصے میں جو کچھ لکھا ہے وہ بحیثیت مجرمی ان کی ناکام تحریریں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ افسانہ بعد میں لکھنا ہوں۔

مقدمہ پہلے چل جاتا ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ جی بھارتا ہے کہ کھنا دکھنا چھوڑ دوں اور پاکستان اور ہندوستان سے دو کبیل چلا جاؤں۔ وہاں بیٹہ کر خوب جی کھول کے افسانے لکھوں، شاعری کے لیے انھیں یہاں بھی اردو ناکہ سارے ہلشہ اندر ہو جائیں۔ اپنی تو جان چھوڑے۔ میں سفید کو سفید کہنے پر مجبور ہوں، حکم ہوتا ہے کہ نہیں سفید کو سیاہ کہو، سیاہ کو سفید کہو۔ اگر سیاہ اور سفید دونوں نظر آ رہے ہوں تو کچھ نہ کہو چپ رہو۔ پھلکا ہوا سیدھے نکل کر باختر کشی کر لو۔ پھر مجھے جو سزا ملی ہے وہ بھی انگریز بہادر کے زمانے کی۔ میں تو ایک ہی طرح کی سزا میں محکومیت کے بوجھ میں ہوں۔ چاہئے تو یہ تھا کہ مملکت پاکستان میں مجھے اسلامی سزا میں ملیں، ناکہ درامنی ہی کی وجہ سے دل کو ڈھارس دیتی۔ لیکن یہاں تو معاملہ وہی ہے کہ جو قتلہ انگریز بڑی سیاسی قوم ہے وہ یہاں سے اس جہم بجا کر لے گئے ہیں لیکن اپنی روح چھوڑ گئی ہے۔ بعض اوقات میرا جی چاہتا ہے کہ ایک سب ٹیلا (یہ اُن کا خاص لفظ ہے) قسم کا افسانہ لکھوں جس میں سماج اور مملکت کے تمام نااموروں کو ایک ساتھ جیڑ دوں۔ خوب خوب فطرتی کروں۔ اس کے بعد بعد پورنگ پاشی کروں۔ انجام کار اپنے آپ کو گولی مار دوں اور یہ سمجھ لوں کہ مقصد ادا ہو گیا۔

منٹو صاحب پنجابی بولنے میں بڑی آسانی محسوس کرتے ہیں۔ جب انھیں خبر ہو جائے کہ مخاطب تو اہل زبان ہے، تو ان سے استفسار کریں گے۔

”آپ پنجابی سمجھتے ہیں نا؟“ ظاہر ہے کہ مخاطب نہ سمجھتے ہوئے بھی اثبات میں سر ہلانے لگا اور اردو میں جواب دے گا کہ بول نہیں پاتا، سمجھ تو لیتا ہوں۔

اس پر منٹو صاحب کہیں گے ”معاف کیجئے گا“ جب میں اردو بولتا ہوں۔ تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میرا منہ بک گیا ہے یا پک رہا ہے۔ اردو بولتے ہوئے میرے جیسے جیسے دھنکے لگتے ہیں۔ تالوار زبان کے نیچے جو جگہ ہے وہ مجھے چٹاپ چٹاپ کٹی معلوم ہوتی ہے۔ ایسے میرے معافی معاف کرنا، میں پنجابی ہی میں بات کروں گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مجھے اردو کوئی نہیں ہے۔ سوچتا ہوں کہ جب لکھنا اردو میں ہوں تو پنجابی میں باتیں کروں۔ اگر آپ چاہیں تو میں اردو میں بھی باتیں کر کے اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال سکتا ہوں۔ منٹو صاحب عموماً گھر میں ملتے ہیں یا تانگے میں ہوتے ہیں۔ کسی تانگے کی پھلی سیٹ، پرورد سے کوئی بیمار لیٹا ہوا نظر آئے۔ جو لئے رُخ ٹیک لگا کے لیٹا ہو، تو فوراً کوئی رستہ قائم نہ کیجیے گا۔ تانگے کے قریب آنے کا انتظار کریں گے گا۔ بہت ممکن ہے وہ منٹو صاحب ہوں۔ اگر ان کے دو ایک ہم بولن و ہم گلاس ساتھ ہوں تو وہ اگلی سیٹ پر بیٹھیں گے اور اپنے اُن قدر داؤں سے کہتے جا رہے کہ میں ایک بہت بڑا افسانہ لکھنا چاہتا ہوں، لیکن ڈرتا ہوں کہ مقدمہ چل جائے گا۔ اگر مقدمہ چلا تو مجھے دھک ہو گا۔ اس لیے کہ میرے ذہن میں خواہ مخواہ آئے گا کہ اپنی حکومت تو فرائض منصبی سے بھی بگلا نہ ہو گئی۔ یا مجھے یہ سوچنا پڑے گا کہ وہ افسانہ بڑا ہی حق و گلاس ہے ورنہ حکومت ضرور اکیٹھ لیتی۔

منٹو صاحب میں ذاتی طور پر بڑی خوبیاں ہیں۔ لیکن شراب نے اُن میں کئی کمزوریاں پیدا کر دی ہیں۔ پہلے مجھے اُن پر غصہ آتا تھا، اب ترس آتا ہے۔ میں تو اُن کے فن پر اُن کی تمام کمزوریوں کو ناکر سکتا ہوں۔ کسی اور کا حال خدا جانے۔

(۲)

مر کے آخری دنوں میں مرحوم یہ چاہتے تھے کہ ان کی زندگی ہی میں ان پر کوئی اچھا سا لٹریچر چھاپ دے۔ اس سلسلے میں اردو

کے پاس بھی گئے ہوں گے میرے پاس بھی آئے، اور جو میری اور ان کی اس بارے میں گفتگو ہوئی تھی۔ وہ مندرجہ ذیل ہے:

”میار فٹو بنز نکالو“

”جی!“

”میں کتنا ہوں نقوش کا فٹو بنز نکالو“

”آج یہ آپ کیسی باتیں۔۔۔“

”تمہارا خیال یہ ہے کہ میں نشہ میں ہوں اور کہو اس کر رہا ہوں“

”آخر اتنی جلدی کیا ہے۔ چپ چلے گا“

”میں اس کا انتظار نہیں کر سکتا کہ پہلے مر کے دکھاؤں۔ پھر بنز چھپے“

”مرنے کا نام نہ لیجئے۔ ابھی آپ کی بڑی۔۔۔“

”اب جی کر بھی کیا کروں گا۔ اب تو میں خود مرنے پر راضی ہو گیا ہوں“

”اچھا! یہ بتائیے، اس بنز میں کیا کیا ہو گا؟“

”اب تک مجھے جتنی لگائیاں ملی ہیں، وہ سب سے پہلے چھپی گئی اور بتنے پر تو فون نے میری تعریف کی ہے وہ سب سے آخر میں چھپے گی۔ بیچ میں میرے تین چار غیر مطبوعہ افسانے اور اسٹج ہوں گے۔ بہر حال تمہیں زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ریہنبر تمہیں میں مرتب کر دوں گا“

”اگر آپ مرتب کر دیں گے تو میں کیا کروں گا؟“

”تم جھک مارنا“

”اس صورت میں تو آپ خود ہی ایک مجموعہ مرتب کر میں اور اسے کتنی صورت میں چھاپ لیں“

”میں چاہتا ہوں، نقوش کا فٹو بنز نکالے“

”تو پھر آپ کا اس بنز کی ترتیب و تدوین سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔ میں کسی کی رائے تک برواشت نہیں کر سکتا“

”تو اپنے آپ کو سمجھنا کیلئے کیا تو مجھ سے زیادہ قابل ہے“

”قابلیت کو چھوڑیے۔ یہ معاملہ ذمہ داری کا ہے“

”ذمہ داری کو چھوڑو۔ یہ معاملہ قابلیت کا ہے“

”اس معاملہ میں مجھے آپ کی قابلیت سے انکار ہے“

”اچھا تو تم پھر جیسی میری دگت بنانی چاہتے ہو میری زندگی ہی میں بناؤ اور“

”فٹو کے انتقال کو ادیبوں نے ایک ادبی حادثہ قرار دیا۔ یہ بات ہے بھی ٹھیک، اس لیے کہ اُس نے افسانوی ادب کو

اتنا کچھ دیا ہے کہ اُسے کبھی فراموش نہ کیا جاسکے گا۔ نہ اب نہ جب“

میں نے بھی دوسرے رسالوں کی طرح نقوش کا فٹو بنز نکالا۔ جو اپنی جامعیت کے اعتبار سے دیگر رسائل سے بہتر تسلیم

کیا گیا۔ اس میں مرحوم کی بہن تو غیر مطلوبہ کہنا نیاں تھیں، دس مائندہ انسانوں کا انتخاب بھی مرحوم کا اپنا تھا۔ نہ پر لکھنے والوں میں ممتاز شہسوار، ممتاز عظیم، محمد حسن عسکری، عابد علی عابد، ابوالکلیت صدیقی، عبادت بریلوی اور ممتاز حسین تھے۔
شخصیت پر لکھنے والوں میں عصمت چغتائی، اوپندر ناتھ اشک، احمد ذریعہ قاسمی، ہاجرہ مسرور، ابوسعید قریشی، حامد جلال، غلام عباس اور اتم المحدث تھے۔

منٹو نے یہ تبصرہ کرنا میرے فرائض میں شامل نہیں ہے۔ لیکن ایک بات کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں۔
جب میں نے منٹو کے لیے مضمون میں فرائض کر کے شروع کیے تو قدیم اللہ شہاب کو بھی دعوت دی۔ جسے انھوں نے منظور کرتے ہوئے یہ لکھا کہ ”مضمون جلد بعد ازاں کا اور وہ ایک خط کی صورت میں جو گا جو منٹو آپ کو عالم بالا سے لکھیں گے“ یہ خیال مجھے بہت پسند آیا۔ اس لیے کہ اس میں منٹو کی پوری شخصیت آسکتی تھی۔ اور وہ تمام مسائل بھی آسکتے تھے، جو منٹو سے متعلق ہو سکتے تھے۔
جب شہاب صاحب اپنی مصروفیات کی بنا پر وقت نہ نکال سکے، تو میں نے اسی انداز میں جو کچھ لکھا۔ اُسے یہاں پیش کرتا ہوں۔ جو ”منٹو کا ایک خط“ کے نام سے منٹو نمبر میں چھپ چکا ہے۔ اس خط میں میں نے کوئٹہ کی غنی کہ منٹو کا اسلوب بھی آسکے۔
کامیابی خدا معلوم :

برادرم، السلام علیکم

مجھے یہاں آئے ہوئے ساڑھے تین مہینے گزر چکے ہیں۔ لیکن میں تمہیں اپنی خبریت کا خط نہ لکھ سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ماحول میرے لیے ناقص رہا حال اس ماحول سے یقیناً بہتر ہے جس میں میں نے ۴۲ برس تک جب کامیابی تھی — وہاں جب تک رہا سوئی بہ ٹھکانا رہا۔

جب سے یہاں آیا ہوں، نہ عقیدے مجھے کوئی فراموش کی ہے اور نہ ہی کمیت، نہ بہت اور نصرت میں سے کسی نے، درجہ اکر رہا ہوتا تھا۔ اب افلاں چیز لا دو، فلاں چیز لا دو۔ تعین تو علم ہے کہ مجھے اپنی بچیوں سے ہے اتنا محبت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب ان کی فراموش اپنی تنگدستی کی بنا پر پوری نہیں کیا ہوتا تھا۔ تو خون کے آنسو رو دیا کرتا تھا۔ حتیٰ کہ بعض محض سال ایسے بھی آئے تھے کہ بچی کی سالگرہ تھی اللہ حیرت میں بھڑکی کوئی نہیں۔

ایسے ماحول میں میں کب تک رہ سکتا تھا۔ قدرت تو مجھے ایسے انسان بخش ماحول میں اور رکھنا چاہتی تھی۔ لیکن میں نے خود ایسے وسائل اختیار کر لیے تھے کہ آپ کے جہنم دار سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

میں جب تک وہاں رہا۔ آپ لوگوں ہی کے غموں میں گھلتا رہا۔ نہ صرف گھلتا رہا بلکہ آہستہ آہستہ معدوم ہی ہو رہا تھا۔ یہاں ہر وقت یہی دعا کیا کرتا ہوں کہ یہ زندگی میرے تمام بے عصرا فساد نگاہوں کو جلد نصیب ہو۔ اس لیے کہ وہاں رہ کر میں نے جیسی ان کی زندگی بسر ہوتے دیکھی تھی۔ وہ تو بے بسی ہی بدتر تھی۔ جب بھی کو وہاں سے آنا پڑا۔ تو نہ جانے وہ کیوں گئے ہوئے ہیں۔

آپ کے تمام لکھنے والوں سے تعلقات ہیں، جو لاہور میں موجود ہیں۔ ان سے نہایت کم دین جو لاہور سے باہر ہیں۔ انہیں بدریغ خط مطلع کر دیں کہ وہ سب کے سب یو پی بچوں سمیت میرے پاس آجائیں۔ میں نے یہاں تمام ابتدائی معاملات طے کر لیے ہیں۔ اس لیے کسی کو تکلیف نہ ہوگی۔

زمانے نے زمیری قلم کی امداد دوسرے اہل قلم کی۔ تمہیں علم ہے اگر ہر لوگ ہی تمہارے ہاں نہ ہوتے تو سوائے علم، ادب اور آرٹ کے سب کچھ ہوتا۔

یہاں جو بھی پہنچ گیا ہے۔ مرے میں ہے۔ اکثر قلم کاروں سے ملاقات رہتی ہے۔ صبر میری ہی طرح پھولے بیٹھے ہیں بعض نے تو تمہارے نمائش آباد کی شان میں ایسی ایسی تجویزات سپرد قلم کی ہیں کہ جب تک کلیجہ کو دوڑوں ہاتھوں سے نہ ختم لیا جائے سنی ہی نہیں جاسکتیں۔ اگر وہ جھپ گئیں، تو تمہارے ہاں کے بعض سر بھیے سر باز پر عین گئے۔

بہر حال، تجویزات کا وہ مجموعہ جب بھی شائع ہوا تمہیں اس کا ایک نسخہ مندر بھیجوں گا۔ نقدِ شاعری میں اُس پر تبصرہ کر دینا۔ تمہارے ہاں کے ادیب اور تمہارے پڑوسی ملک کے ادیب اپنے اپنے ناخداؤں سے جو بڑی خوشگوار قسم کی امیدیں وابستہ کئے بیٹھے ہیں۔ وہ سراسر حماقت ہے۔ ان خوشگوار قسم کی امیدوں کے پیٹ میں تو صرف بہن خوش فہمی لپی تانے سو رہی ہے۔

تمہارے ہاں کی سیاست تو بڑی دھڑن تختہ قسم کی ہے۔ آج کوئی وزیر ہے۔ نکل جیل میں ہے۔ اگر کوئی جینرل چلے جیل میں تھا اور ساتھ ہی غدار وطن بھی، تو آغا خان اذہر ہو جاتا ہے۔ یہاں پر میرے احباب جب تمہارے ہاں کی سیاست کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو یقین جاننا، میں مارے شرم کے پانی پانی ہو جاتا ہوں۔

تمہیں علم ہے کہ جو پیر آپ کے ہاں باغِ مقدسے صرف غمناشی کے جرم میں چلے گئے۔ حالانکہ میں نے کوئی غرض تحریر نہیں لکھی تھی۔ اس ضمن میں مجھ پر کیا کیا قسم نہیں ڈھائے گئے تھے۔ کبھی دارنٹ نکلے، کبھی گرفتار ہوا۔ کبھی دوستوں سے ادھار مانگ کر جرم ادا کیا۔ اس کے باوجود میں نے انصاف زندہ باد کا فقرہ لگا تھا۔ اگر میں کچھ دن اور دوں رہ جاتا تو بہت ممکن تھا۔ مجھ پر نئی، ڈاکہ لانی اور زنا بالجبر کے جھوٹے مقدمے بنا دیئے جاتے۔ جہاں ناکرہ گناہوں کی سزا ملتی ہو وہاں کون محض رہے۔

اگر حکومت کے عتاب سے بچ جائیں تو نقاد بھی نہیں چھوڑتے۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ میں ساری عمر نقادوں سے دور بھاگا ہوں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ بعض نقاد بھی مجھ سے دور بھاگتے ہیں۔ اصل میں یہ لوگ وہ ہیں جو گہرے ہوئے انسان تو ہیں اور گہرے ہوئے شاعر نہیں ہیں۔ یہ لوگ جب تخلیق کی قوت سے محروم ہو جاتے ہیں تو تنقید میں علامتیں جالتے ہیں۔ مجھے ان سب سے خدا واسطے کا میرا رہا ہے۔ اس لیے کہ جب یہ قلم ہاتھ میں لے کر بیٹھتا ہوں تو ابھی چھریں میں سوسوچیں نکالتے ہیں۔ لیکن ان حضرات کو اپنی تحریر کے جو ب کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ خدا کے لیے مجھے ان سے تمنا شاید لکھے پڑھوں سے بچانا۔ ایسا نہ ہو کہ میرے موجود نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے اپنے قلم تیز کر لیں اور میرے فنی کی دشمنی کا جھنکا کر دیں۔

آج ادب بھی ترقی کئے گا کہ جو نقاد سکے، اُس کا اٹل کیا جائے۔ نقادوں کا فضا بھی یہی ہوتا ہے۔ لیکن اسے میرے سوا کبھی کوئی نہیں ہے۔

کاش مجھے یہاں کوئی نقاد مل جائے تاکہ میں اُس سے تنقیدی بحث کر سکوں۔ تنقیدی بحث کرتے ہوئے اگر کسی نے ان تین لفظوں کا صحیح استعمال کر لیا تو مجھ لیے بازی لے گیا۔ وہ تین الفاظ یہ ہیں۔ اگر، مگر اور لیکن۔

جب تک نقاد تخلیق کی قوتوں سے مالا مال نہ ہوں گے۔ ان کی تحریروں میں نہ توازن پیدا ہو گا اور نہ واقعیت کی کھانہ

مخلص، جب فن کا دے دل کے ساتھ فقاہد کا بھی دل دھر سکے گا تو ہر کچھ کھاجائے گا اس پر ایمان لانا پڑے گا۔
 یہاں شراب مہور عام ہے۔ پانی نہ پیچھے شراب مہور نوش کر لیجئے۔ تمہارے ہاں تو بڑی خرد و کلاس قسم کی شراب ملتی تھی اور
 اس جگہ پاش شراب کے لیے بھی مجھے کیا کیا جتن نہیں کرنے پڑتے تھے۔ بعض اوقات اس نامراد کے لیے ذیل نگہ ہوا۔ دوستوں میں میری
 عزت نہ رہی۔ جدمہ جاتا تھا، احباب نہ مورتی لیتے تھے۔ راستہ تک چھوڑ کر انجان بن جاتے تھے۔ اگر کسی سے مدد پھر ہو جاتی تو وہ میرے
 منہ پر چھوٹی تئیں کھا کھا کر کتا تھا کہ میری جیب میں وہی رنگ نہیں ہے حالانکہ میں جانتا تھا کہ اس جیب میں وہی چھوڑا اتنے درپے ہیں کہ وہ
 مجھے اس خانہ خراب کی کئی بوتلیں خرید کر دے سکتا ہے۔ میں شراب کو خانہ خراب اس لیے کتا ہوں کہ اس کی بنا پر کئی بار خانہ میں خرابی پیدا
 ہوئی تھی۔

ایک بڑی خطرناک مگر ماز کی بات کہتا ہوں۔ اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ ورنہ پوچھے۔ یہاں جتنی لڑکیاں ہیں، وہ سب ہزاروں
 برس پرانی ہیں۔ لیکن ان بکجنتوں کا جسم ابد باکین تقدس تو رہے۔ اس مسئلہ پر تم سے بات کرنا قطعی حماقت ہے۔ اس لیے کہ تم اس سسٹے
 میں نہ جھنڈو رائج ہوئے ہو۔ تمہاری چندینت کا احترام کرنے کے باوجود میں یہ کہوں گا کہ ان سب میں ایسی پُر ذکاوت کشش اور سپردگی
 سی پائی جاتی ہے کہ تمہارے ہاں کی لڑکیاں ان کے سامنے بالکل بچواں ہیں۔

یہاں ایسے ایسے جمال اور دل کے بھی ہیں کہ تمہارے ہاں کا کوئی شاعر ادیب دیکھ لے تو اُس کجمنت کے بے ہوش بخنے
 کے قطعی امکانات موجود ہیں۔ بہت ممکن ہے۔ جاہزی ہی نہ ہو سکے۔

میں ساری عمر ادبی تخلیقات کے سلسلے میں اپنے ہمعصروں سے شرمندہ نہیں ہوا تھا۔ اس لیے ہی کہ میرے مقابلے ہی کا کون
 تھا۔ لیکن یہاں آیا تو غالب نے بڑا پریشان کیا۔ بڑا پیچھے باز ہے۔ کہنے لگا: "تو تو میرا چور ہے۔ میرے شعروں سے تو نے اپنے آسائوں
 کے عنوان چنے۔ کہتا ہوں کہ نام تک نہ سکوئے تو میرے شعروں کو دھرد گرد ادا محسن کشی ایسی کہ میرے بارے میں چوٹی کہا جاتی تھی،
 اُس میں بجائے میری شکنداری کے انہار کے میری کسی خوبی کا ذکر تک نہیں کیا۔ بلکہ انہی میری کمزوریاں بگڑا کے رکھ دیں کہ میں بڑا وہ تھا،
 رزمی باز تھا، جو اکیلے تھا اور اس کی یادش میں جیل تک ہو گئی تھی" وغیرہ وغیرہ۔

انھیں علم ہے کہ میں تمام کھنے والوں میں مرث غالب ہی کو تو مانتا تھا۔ جب اُس نے بھی مجھ سے ایسی باتیں کہیں تو میں نے
 دل میں کہا۔ لعنت ہو سعادۂ حق مرثو تمہاری حقیقت نگاری پر۔

لیکن غالب ہے بڑا ذہن دل قسم کا انسان، میری اتنی زیادتی کے باوجود گاڑھی چھپتی ہے۔ ہم اکثر ایک ساتھ بیٹھے ہیں اور پیتے
 ہیں۔ جب ہم حقیقت آتش ہوجاتے ہیں اور ہماری ابدیاد ہوتی ہے تو غالب کہتا ہے۔ "میں تم سے بڑا افسانہ نگار ہو سکتا تھا۔ لیکن میں نے
 اسے فضول چیز سمجھ کر ہاتھ ہی نہیں لگایا تھا" اور میں اُس سے کہتا ہوں "شکر کہنا کو فساد کمال ہے مرثا صاحب، میری تو نثر کی ہر ہر سطر میں
 ایک شکر کیا پوری غزل کی غزل پنہاں ہوتی ہے۔" بات دونوں کی غلط ہے۔ اس کا علم اُسے بھی ہے اور مجھے بھی۔ لیکن ہم اپنی اپنی انانیا کیا کریں۔
 پچھا سام کا دیدہ نہ تو تمہارے ہاں دونی راستہ تو گئی ترقی کر رہا ہے۔ مبارک ہو۔

ملے فقاہدوں کے بارے میں غصہ کے جویالات ہیں، مجھے اُن سے اتفاق نہیں ہے۔ لیکن مجھے ان کی رائے کے سلسلے میں خود کوئی ترجیح
 کو نہ لانا تھی۔

بڑوں کی عزت مزبور کرنی چاہئے۔ لیکن سعادت مندی کے معنی یہ بالکل نہیں کہ تم اپنی نفسی سی جان بھی خطرے میں ڈال دو میں نے یہ خبر بدیہی سنی ہے کہ آپ تو تھارے ہاں کا سارا کام وہی کرتے ہیں اور ہم سب آؤؤں کی طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھنے اندھیرے کے قفل پر جمع اتنی قیامت سانی بھی نہیں ورنہ چھپنا ڈنگے۔ سوچ کر تم لوگوں نے اپنی خود داری تک کو قفل لگائے الماریوں میں رکھ دیا ہے۔

معصیت پیسے کہ میں یہاں سے بچا سام کے نام کو ٹی خط نہیں لکھ سکتا۔ ورنہ میں اسی سے اپنی جدو میں دھننے کی درخواست منظور کرتا۔ دعا کرو کہ وہ خود ہی میرے پاس جلد سے جلد آجائیں تاکہ تمھاری جان چھوٹے ہیں ان سے وٹ ہی تو لگا۔ فردا کو فراڈ بھی بچا رکھنا ہے۔ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ جب سے یہاں آیا ہوں تمھارے ہاں میرا بڑا سوگ منا گیا۔ خدا کی قسم یہ سنتے ہی میرا دل کھاپے گیا۔ اس لیے کہ جب تک میں دہاں ہوں۔ سبکے مل کر مجھے اپنے ہاں سے دُور کرنا چاہا۔ جب یہاں کچھ دوسروں کی اور کچھ اپنی مرضی سے اگلیا ہوں تو ریڈیو پر اس ناچیز کی گشتگی کے اعلانات کیوں کئے جاتے ہیں۔ یہ وہی ریڈیو دے لے یہ جو مجھے اپنے ہاں گھسنے تک نہیں دیتے تھے۔ رسلے اور اخبار والے بھی میرے روپوش ہونے پر خصوصی مبالغہ کر رہے ہیں۔ ان کا بھی میرے ساتھ یوسف کے بھائیوں ایسا سلوک تھا۔ ان حالات میں تم سب کو اپنے اس منافقانہ رویہ پر شرم آنی چاہئے۔

یہاں میرے کچھ قدر دان پیدا ہو گئے ہیں اور پچھلے دنوں انھوں نے میرے ذمہ کام کیا تھا کہ میں یہاں کے بے میں اپنی سرمایہ ریورٹ پیش کروں، یہ فیروز میرے سپرد اس لیے ہو، تھا کہ ان کے خیال کے مطابق مجھ جیسا حقیقت نگار یہاں کوئی نہیں ہے۔ میں نے بھی اپنی عادت کے مطابق کچھ لکھ دیا ہے۔ بڑی بے فائدہ ریورٹ ہے۔ اس میں اپنے ایک دوست کی خوب ڈٹ کر مخالفت بھی کی ہے۔ اور اس کا جو معاشرہ اندری اندر چل رہا تھا، اس کا بھی کچھ لکھ دیا ہے۔

حقی کہ میں نے ریورٹ میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ یہاں جو داڑھی دھندلوانے کا دستور ہے، وہ بعض مستعین قسم کی ٹھیکوں پر لگا کر گوتا ہے۔ اس لیے اس کی اجازت ہونی چاہئے کہ جس کا دل چاہے داڑھی رکھے جس کا دل چاہے نہ رکھے۔ اتنے بڑے حاکم کے سامنے اتنا کہہ دینا اور کسی قسم کی جھجک محسوس نہ کرنا، خالصی کا گھر نہ تھا تھا ہے ہاں ایسی کوئی گھری بات ذرا سے وزیر اعظم کے سامنے کہہ دینا تو میری زبان گڑھی سے نکلوا دی جاتی۔

اطلاعا عرض ہے۔ یہاں میری کتاب لکھنے فرشتے، کافی پسند کی گئی ہے۔ سو کے تو میری بیوی بچوں کا خیال رکھنا۔

خاکسار
سعادت حسن خٹو
۲۰ اپریل ۱۹۵۹ء

منٹو کا فن

وقار عظیم

منٹو کو اس کی حقیقت نگاری، اس کی نفسیاتی منٹنگانی، اس کی دور بین و دور رس نگاہ، اس کی جرأت آمیز اور بے باکانہ جھڑپ، سب سے مست، معاشرت اور مذہب کے اجمارہ و انوں پر اس کی تلخ لیکن مصلحانہ طنز اور اس کی مزے دار طنز و بازیوں کی وجہ سے سرا پایا ہے اور سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور ان سب سے بڑھ کر جنسی زندگی پر اس نے مخصوص اور منفرد انداز سے نظر ڈالی ہے اس پر اسے مصلحوں کیما گیا ہے اور اس داد کو سب سے زیادہ مستحق ہیں لوگوں کا جو رویہ رہا ہے اس میں جی پسندی اور توازن بھی ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ انصاف نظر بھوکا جذبہ غالب نظر آتا ہے تنقید و تبصروں کے اس سارے کھیل میں جربرسوں سے منٹو کی زندگی اور اس کے افسانوں کے محور و محمولہ جادو سے منٹو ایک مثالی ہیرو بھی نظر آتا ہے اور مثالی و نیلین بھی۔ کچھ نظریں اس بات کی عادی ہو گئی ہیں کہ اسے جس شخص کا جسم بھگ کر رکھیں اور کچھ نکاحوں کو اس میں برا بیٹوں کے سوا کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو ان دونوں طرح کے دیکھنے والوں کو جسہ ذاتی شدت پسندی نے اصل حقیقت تک پہنچنے اور اس کے کھوٹے کھرے کو پہچاننے کا موقع نہیں دیا۔ دنیا کی ہر دوسری چیز کی طرح منٹو نہ ”محض“ اچھا ہے اور نہ ”محض“ بُرا۔ اس کے افسانے نہ خالصتاً حسن و جمال کے مظاہر ہیں اور نہ محض بُرائیوں کے حامل۔ اس کی حقیقت نگاری اس کی نفسیاتی منٹنگانی، اس کی دور رس اور دور بین نظر، اس کی جرأت آمیز جھڑپ، اس کی تلخ مصلحانہ نظر اور اس کی سنگین طنز و بازی کے اچھے اور بُرے دونوں پہلو ہیں۔ کبھی بہت اچھے اور کبھی بہت بُرے۔

ان اچھے، بُرے اور کبھی بھی بہت اچھے اور بہت بُرے پہلوؤں کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی جائے تو سب سے پہلے انسان کی نظر ان بے شمار موضوعات پر پڑتی ہے جن تک منٹو کی نظر پہنچی ہے۔ کلرک، مزدور، طوائف، رنچر، اہل آباد، رانہ باز، کشمیر، بمبئی، دہلی، لاہور، فلم اسٹوڈیو، کالج، بازار، گھر، ہوٹل، چاند خٹلے، کنبچے، پورٹھے، جوان، عورتیں، مرد اور ان سب کی ذہنی کمزوریاں اور ان سامان چیزوں سے بڑھ کر جنس اور اس کے گونا گوں مظاہر منٹو کے موضوعات ہیں۔ ان موضوعات میں سے بعض منٹو کو زیادہ عزیز ہیں بعض کو کم عزیز۔ کس اور کس پر شہسوار طاری ہوتی ہے وہ دوسری جگہوں پر نظر نہیں آتی۔ بعض افراد کا ذکر وہ جس اور اسے خاص سے کرتا ہے وہ ادا بہر مرقع پر نمایاں نہیں ہوتی اور بعض باتیں کہتے اور بعض روزانہ گزار کر نہیں اسے جوڑا آتا ہے وہ دوسری باتیں کہتے اور کہتے وقت شاید محسوس نہیں ہوتا لیکن وہ کسی کو کہے گا ہو، کسی شخص کا ہو اور کسی بات کا ہو یہ کہیں نہیں معلوم ہوتا کہ منٹو اس کو کہے گا یا نہ کہے گا۔ اس شخص کے دل کے سارے عجیبہ اور اس بات کی ساری نزاکتوں اور لطافتوں سے واقف نہیں۔ جہاں تک ان گونا گوں موضوعات

کا تعلق ہے ان کے سلسلہ میں ایک اور چیز بھی ملنے آتی ہے اور وہ یہ کہ بعض موضوعات کو اپنے افسانوں میں جگہ دے کر منظرِ بہشت کی دل آزاری کی ہے، بہشت میں کی بُرائی اصل کی ہے اور بہشت میں کی گالیاں مٹی ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بہشت سے پڑھنے والوں نے انہی گالیوں کو میاں بنا کر منظر کے فنی مرتبہ کا اندازہ لگانے کی کوشش کی ہے اور یہ بات بہشت کم کم کئی جگہ اور اکثر دینی زبان سے کہی گئی ہے کہ افسانہ نگار کی حیثیت سے منظر کو بچانے کے لیے اس کے فن پر سب سے پہلے نظر ڈالنی ضروری ہے اس لیے کہ منظر کی افسانہ نگاری میں ان موضوعات کی بھی اہمیت ہے جن کا منظر نے پوری فنی ذمہ داری سے انتخاب کیا ہے اور اس نقطہ نظر کی بھی اہمیت ہے جو ان موضوعات کے انتخاب کا ذمہ دار ہے، لیکن حقیقت میں جس چیز نے منظر کو متوجہ بنایا، جس چیز نے اسے وہ بُرائی دینی میں کوئی دوسرا افسانہ نگار اس کا ہمسرہ نہیں وہ اس کا فن ہے اور منظر کی شخصیت اور اس کی افسانہ نگاری کے خواہ کسی ہیلو پر کچھ کھائے اس کے فن کا ذکر ناگزیر ہے اور جب ہم یہ کہتے ہیں فن کا ذکر ناگزیر ہے تو ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ منظر نے جو بے شمار بائیں اپنے افسانوں کے ذریعے اپنے پڑھنے والوں تک پہنچائی ہیں ان کے اظہار کا اسلوب کیا ہے اور اس اسلوب کے اجراء سے ترکیب کیا ہیں۔

لیکن اس بات کا جائزہ لینے سے پہلے کہ منظر کی افسانہ نگاری کا فن کیا ہے اور منظر کے اسلوب فن کی کیا حدیں ہیں شاید اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ جب منظر کے موضوعات اور اس کے نقطہ نظر سے ایک ہم اس کے فن کا ذکر کرتے ہیں تو ہم اسے ذہن میں فن کا مفہوم کیا ہوتا ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلی چیز جو منظر کی طور پر بحث کرنے والے کے سامنے آتی ہے منظر کے دو مبادیات اور مضامین ہیں جو ادب کی ایک صنف اور دوسری صنف میں مابالائے مذکور سمجھے جاتے ہیں۔ داستانِ ناول، ناول اور افسانہ بنیادی طور پر یہ کہانی ہونے کے باوجود تکنیک کے اصول و قواعد کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اچھا داستان گناؤں، ناول نگار ڈراما پیشہ اور افسانہ نگار داستان، ناول، ناول یا افسانہ کہتے وقت ان اصول و قواعد کی باندی کو اپنا فرض، اویں جانتا ہے۔ ایک خاص صنفِ ادب کے ساتھ اس نے جو رشتہ قائم کیا ہے اس کے غلط اور صداقت کا تقاضا ہے کہ وہ اس صنفِ ادب کے ان اختیازی اصول و قوانین سے پوری طرح واقف ہو کر انھیں پوری طرح بستے۔ ان اصول و قواعد کو جن کا دوسرا نام اس صنف کی تکنیک اس کی روایات یا اس کا فن ہے۔ جانا سمجھنا وہ ان کا صدیقی دل سے احترام کرنا اس رشتہ کا پہلا مطالبہ ہے جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا اس لیے کسی فن کار کے فن کا جائزہ لینے کی پہلی منزل ہی یہ دیکھنا ہے کہ اس فن کار نے فن کے ابتدائی مطالبات کو، ان اصول و قوانین کو اس کی روایت کو کس حد تک جانا سمجھا، محترم جانا اور اپنے فن میں برتا ہے۔

فنی جائزہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ فن کار نے فن کی روایات کی باندی کرنے کا حق اور اگر کے اپنے خیال اور اس کا دوسروں تک پہنچانے کے کیا کیا وسیعے استعمال کیے ہیں۔ ان مختلف وسائل کے استعمال میں فن کار کے قبل نظر اور ذہنی کاوش اور انھماک و توجہ کو خاص داخل ہوتا ہے اس لیے جو فن کار اپنے فن کو جس حد تک زیادہ عزیز رکھتا ہے اور جس حد تک اسے اس فن سے اپنے رشتہ اور تعلق کا احساس زیادہ گہرا اور شدید ہوتا ہے اسی حد تک اس کی توجہ انھماک اور ذہنی کاوشوں کی بروقت اظہار و ابلاغ کے اچھے سے اچھے اور نئے سے نئے وسیعے اس کے ہاتھ آتے ہیں۔ اظہار و ابلاغ کی ہی منزل ہے جہاں صنف کا تکنیک اور دیگر حقیقت میں اس کی شخصیت کے مختلف اجزاء اور عناصر ہیں اظہار و ابلاغ کے وسائل میں نئے نئے رنگ لگنا ہے یہی رنگ صنف کے انداز اور اسلوب کی خصوصیت کا منظر ہے اور اسے اس فنی جائزہ کا ایک اہم جز سمجھا جاتا ہے جس میں فنی روایات

اور اظہار و ابلاغ کے دوسرے وسائل شامل ہیں۔
 فنی جائزہ لیتے وقت اور اس جائزہ کی بنا پر فن کار کے فنی مزید کا اندازہ لگاتے وقت چند اوسانیں بھی ایسی ہیں جو بیشتر نظر نہ رکھی جاتیں تو یہ فنی جائزہ ادھورا رہتا ہے۔ ان میں سے ایک بات تو یہ ہے کہ فن کار اپنے انھماک، توجہ اور کاوش سے اظہار کے وسائل میں جو نئے نئے پہلو پیدا کرتا ہے اور اپنی شخصیت کی قوت اور انفرادیت سے جو رنگ بھرناسے ان پہلوؤں کا نگینہ بناتا اس رنگ کی شرمی ہمیشہ قائم نہیں رہتی۔ فن کار کے احصاب ایک خاص منزل پر پہنچ کر اس انھماک اور کاوش کے اہل نہیں رہتے جس سے اظہار کے وسائل کو نیا بنانا اور بدلتی ہوئی ہے اور ایک خاص مقام پر پہنچ کر اس کی شخصیت کے مختلف عناصر پر انتشار کا جذبہ پڑتا ہے تو فن کار بگ بگ پھیکا ہونے لگتا ہے۔ یہ باتیں فنی جائزہ لینے والا نظر انداز نہیں کر سکتا اس لیے کہ ان خفا کی کیفیتیں نظر کے بغیر فن کار کے فن کے ارتقا کا سراغ لگانا ممکن نہیں۔

اس سلسلہ کی دوسری اہم پہلو یہ بات ہے کہ گو شخصیت کے عناصر کے ساتھ ساتھ فن میں انھماک اور کاوش بھی لازمی ہے لیکن فن کار کو فن کے ساتھ ایک خاص مدت تک تعلق رکھنے کی بنا پر اظہار کے وسائل پر ایک قدرت حاصل ہو جاتی ہے اور یہ قدرت اس کی شخصیت کے انتشار اور انھماک اور کاوش کی کمی کے باوجود اس کے اسلوب اظہار میں ان عناصر کو کافی اور قائم رکھتی ہے جس کے فن کی اقیانسی خصوصیت سمجھے جاتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ یہ عناصر ہمیشہ ظاہر ہونے کے بجائے سبک سمجھی جاتی ہیں اور انھماک میں چمک دکھا کر غائب ہو جاتے ہیں۔

مثلاً گے افسانوی فن میں فن کے یہ سارے اارج بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اس کے فن سے ہی ساری ضروریں جو طرح طرح کی ہیں اردو کے کسی اور افسانہ نگار کے یہاں ان کا سراغ نہیں ملتا۔

افسانہ ناول، ڈراما، داستان، کہانی — ان سب میں بعض عناصر مشترک ہیں۔ کوئی نہ کوئی واقعہ اس شخص سے تعلق رکھنے والے کردار واقعہ کی ابتدا اور اس کے خاتمہ تک اس کے مختلف اارج، مصنف کا ایک مختصر میں اندازہ اور نظر، سب کچھ اس کہانی میں بھی ہوتا ہے جو چوپال میں بیٹھنے والے بڑی ساوگی سے ایک دوسرے کو سناتے ہیں، اس کہانی میں بھی جو بڑی بوجھ رات کی خاموشی میں بچوں کو سنانا ہے۔ اس افسانے ناول اور ڈرامہ میں بھی جو فن کے پورے احساس کے ساتھ کھانا ہوتا ہے لیکن ان کی مشترک پہلوؤں سے قطع نظر کہانی کی ان مختلف اصناف میں سے ہر ایک کی ایک ایک امتیازی خصوصیت بھی ہوتی ہے جو اسے دوسری صنف سے منفرد کرتی ہے۔ داستان میں تخیل اور تصور کی نگینیں بڑے میں کوئی نہ کوئی کشمکش، ناول میں زندگی کی وسعت اور گہرائی اور افسانہ میں موضوع کی اگائی یہ اقیانسی اور انفرادی خصوصیات ہیں ساخانہ دوسری طرح کی کہانیوں سے اسی لحاظ سے منفرد اور ممتاز ہے کہ اس میں واضح طور پر کسی چیز کی ترجمانی اور صورتی ہوتی ہے — ایک کردار، ایک واقعہ، ایک ذہنی کیفیت، ایک جذبہ، ایک مقصد، مختصر یہ کہ افسانے میں جو کچھ بھی ہو، ایک ہو۔ عام طور پر افسانہ نگار افسانہ کی اس دنیا کی خصوصیت کی طرف سے غفلت برت کر افسانہ لکھتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ افسانے پڑھنے والے کے ذہن پر وہ گہرا اثر قائم نہیں کر سکتے جو ہر اچھے افسانہ کے ساتھ وابستہ ہونا چاہیے۔ اردو کے افسانہ نگاروں میں پرچہ پڑھنے کے اکثر افسانہ کی اقیانسی خصوصیت کو پیش نظر رکھا ہے لیکن کبھی کبھی جذبات کی رومیں بہ کر ان سے بھی اس معاملہ میں کوتاہی ہوتی ہے۔ ایک فن کار کی حیثیت سے پڑھنے والی پوری فنی زندگی

کبھی اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا کہ انھیں اپنے افسانہ میں کوئی ایک بات کہتی ہے اور اس طرح پڑھنے والے کے ذہن پر ایک خاص تاثر قائم کرتا ہے۔ ان کے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے افسانے کا مطالعہ کرنے کے بعد پڑھنے والے کو گمان ہے کہ لے شا چیزیں آتی ہیں۔ یعنی منظر کا ہر گہر شاہ جس ماحول پر اپنی نظر ڈالتا ہے اس کے باریک سے باریک پہلو کو نظر میں رکھ کر اپنے افسانہ کا پس منظر بناتا ہے۔ واقعہ اور کردار کے ذکر میں غلط بہت کم اس جرم کے متکرب ہوتے ہیں کہ وہ واقعہ اور کردار کی پوری تفصیلات پر عبور حاصل کیے بغیر اس کے متعلق کچھ کہنے کی کوشش کریں لیکن ایک مخصوص ماحول یا کردار کے ہر پہلو اور اس کی ہر فرعی اور جزوی کیفیت سے پوری طرح واقف ہونے کے بعد بھی وہ اس ماحول یا کردار کی صورتوں کی اپنی افسانہ نگاری کا مقصد نہیں بناتے۔ یہاں حلقہ عام ایک مخصوص تاثر پیدا کرنے کے لیے پس منظر یا وسیلہ کا کام دیتا ہے لیکن حقیقت میں اس پس منظر کے نتیجے کوئی ایک تاثر پیدا نہیں کیا گیا۔ کیفیت موجود ہوتی ہے جسے سامع یا ناظر کے ذہن تک پہنچانا افسانہ نگار کا مقصد ہے۔ مثلاً ان کے افسانے "نیا قانون" "خوشیا" "لعرہ" اور "نیا سال" پڑھ کر پڑھنے والا افسانہ نگار کے شاہ ہے، اس کے تجزیہ، فکر اور تجزیہ جیات کی بدولت بے شمار چیزوں کا عکس اپنی آنکھوں کے سامنے محسوس کرتا ہے لیکن ان بے شمار چیزوں کا مشاہدہ مجموعی طور پر اس کے ذہن میں ایک خاص کردار کی ذہنی کیفیت کا نقش بٹھاتا ہے۔ افسانہ پڑھتے وقت ایک نئے ماحول اور ایک نئی فضا کی آن گنت تصویروں کی نظر کے سامنے آتی اور رخصت ہوتی رہتی ہیں اور ان سے حسب موقع پڑھنے والا لطف و حظ محسوس کرتا رہتا ہے لیکن افسانہ ختم کر چکے کے بعد افسانہ نگار کے مصورتانہ قلم کے بنائے ہوئے یہ بے شمار نقش رخصت ہو جاتے ہیں اور خود رخصت ہوتے وقت صرف ایک چیز پڑھنے والے کے ذہن پر چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ چیز "نیا قانون" "خوشیا" "لعرہ" اور "نیا سال" کے مرکزی کردار کی ایک مخصوص ذہنی کیفیت ہے۔ یہ سب افسانے اپنی واقعاتی اور نفسیاتی رنگائی کے باوجود مجموعی حیثیت سے صرف اس گہرے تاثر اور اس عذباتی کیفیت کے ترجمان ہیں جس میں ایک خاص خود مثلاً ہے "منظر" اور "ممبر" اور اس کا انتقام اپنی دلچسپ اور رومانی تفصیلات کی بنا پر شروع سے آخر تک پڑھنے والے کو متاثر کرتے رہتے ہیں۔ ان افسانوں میں جو کردار پڑھنے والے کے سامنے آتے ہیں ان کی ایک ایک بات میں ان کے مخصوص مزاج اور اس مزاج کی منفرد خصوصیات عکس ہے لیکن افسانہ پڑھ چکے کے بعد پڑھنے والا جس چیز کا سب سے نمایاں اثر قبول کرتا ہے وہ صرف ایک واقعہ ہے۔ ایک صورت میں واقعہ کی پہلی پہلی ہنسا دینے والی کیفیت اور دوسری صورت میں رومان اور مزاج کا ایک عجیب تاثر پڑھنے والے کے ذہن پر ہر دوسری چیز کے مقابلہ میں اپنا نقش چھوڑ کر جاتا ہے۔ اس طرح ہر ایک ایک مخصوص ماحول اور فضا اور اس ماحول اور فضا میں رہنے والے گونا گوں کرداروں کی انفرادیت کا نقش ہونے کے باوجود مجموعی طور پر ہر ایک کی ہیروئن سوگندی کے کردار کی ایک مکمل تصویر ہے۔ وہ ساری فضا جو افسانہ نگار نے مشاہدہ جمیل اور فکر کی پوری قوتوں سے کام لے کر تخلیق کی ہے اور وہ سارے کردار جن کی بدولت اس فضا کا خصوصی رنگ واضح ہوتا ہے بل کر سوگندی کے کردار کو مکمل کرنے میں حصہ لیتے ہیں اور اس طرح افسانہ میں بہت کچھ ہونے کے باوجود سوگندی ہی سب کچھ ہے۔ افسانہ ختم کرنے پر سوگندی کے علاوہ باقی سب چیزوں کو باقی کرداروں کو بھول جاتے ہیں۔ وہ گرد پیش کی ہر چیز کو یاد آکر اس طرح چھوڑ جاتی ہے کہ ہمارے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ ہی نہیں رہتا کہ صرف سوگندی کو یاد رکھیں اور اس طرح یاد میں جیسے ہم اسے برسوں سے جانتے پہچانتے تھے۔ اس کی ہر چھوٹی بڑی بات اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے اور اس کے دل کا ہر زائچہ اور اشارہ منو کی افسانہ نگاری میں مختلف منزلوں سے گزری ہے۔ ان منزلوں میں سے بعض منزلیں ترقی کی ہیں اور بعض منزلیں کمی

ان میں سے ہر منزل میں مٹوٹے اپنے اس منصب کو برابر یاد رکھا ہے کہ اسے کہانی کے ذریعہ صرف ایک چیز یا ایک بات قاری کے ذہن تک پہنچانی اور اس کے عمل میں آسانی اور جاگزیں کرنی ہے۔ افسانہ نگاری کے اسی بنیادی اصول نے یہ بات بھی سکھائی ہے کہ کہانی ختم ہونے کے بعد قاری کے ذہن پر ایک واحد تاثر قائم ہونا چاہیے لیکن یہ واحد تاثر پیدا کرنے اور اسے قائم رکھنے کے لیے اسے مختلف فنی وسیلے استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ فنی وسیلے اگر پوری ذمہ داری اور پورے فنی احساس اور خلوص کے ساتھ کام میں نہ لائے سبائیں تو مجموعی تاثر کا حصول بھی ناممکن ہو جاتا ہے اور کہانی کی اس وحدت میں بھی فرق پیدا ہو جاتا ہے جو اس کی بنیادی اور انہایتی خصوصیت ہے۔ افسانہ نگاریہ سوچ کہ اور یہ فیصلہ کر لینے کے بعد کہ اسے اپنے افسانے کے ذریعہ قاری کے ذہن پر کون سا واحد نقش قائم کرنا ہے، اپنے افسانہ کا ایک طوابع بنانا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ افسانہ کس طرح شروع ہوگا، کس طرح آہستہ آہستہ آگے بڑھے گا اور کس طرح ختم ہوگا۔ اچھی کہانی کی خصوصیت جہاں ایک طرف یہ ہے کہ وہ ختم ہو چکے کو پڑھنے والے کے ذہن کو تاثرات کے نشا میں مبتلا نہ کر دے، دوسری اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ لکھنے والے نے کہانی کے مختلف حصوں میں آہستہ آہستہ ایسی فضا بنائی ہو کہ پڑھنے والے کا ذہن اس مجموعی تاثر کو بڑے فطری انداز میں قبول کرے۔ فضا بنانے اور ذہن کو ایک خاص تاثر قبول کرنے پر آمادہ کرنے کا مشکل کام یوں تو پوری کہانی میں جاری رہتا ہے لیکن اس کا نقطہ آغاز افسانے کے وہ ابتدائی الفاظ ہوں گے جن میں افسانے کی تمہید کہتے ہیں۔ افسانہ کی تمہید افسانہ کی فنی جڑی اہم جڑی دھار اور افسانہ نگار کے نقطہ نظر سے بڑے کام کی منزل ہے۔ افسانہ نگار نے اپنے ہم سفر کی ابتدا اگر پوری طرح قدم ہمارے کمر واری اور استواری کے ساتھ کی ہے تو آگے کا سفر اس کے لیے خود بخود آسان ہو جائے گا اور سب سے بڑی بات یہ ہوگی کہ اسے اپنے سفر کے بالکل شروع ہی سے ایسے ہم سفر مل جائیں گے جو قدم سے قدم ملا کر اس کے ساتھ چلیں گے۔ یہ ہم سفر وہ قاری ہیں جو افسانہ کی موزوں تمہید سے متاثر ہو کر افسانہ کے آنے والے حصوں کو دلچسپی اور اشتیاق کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اچھے افسانہ نگار بھی اپنے افسانے کی تمہید کی طرف سے غفلت نہیں کرتے۔ قاری کے ذہن پر پوری طرح چھا جانے کا جو نصب العین افسانہ نگار کے سامنے ہے وہ مناسب اور موزوں تمہید کے ذریعہ آدھا بلکہ بعض اوقات آدھے سے بھی زیادہ اس کے قبضے میں آ جاتا ہے۔ مٹوٹے ایک دیانت دار اور خلوص فن کار کی طرح ہمیشہ اپنی جیت اسی میں جاتی ہے کہ وہ موزوں تمہید سے شروع ہی قاری کے ذہن پر چھا جائے۔ مٹوٹے اچھے اور بڑے جتنے افسانے بھی لکھے ہیں ان کے موضوع اور خیال سے پڑھنے والا خواہ متعین ہو یا نہ ہو لیکن افسانہ کی تمہید میں اسے ضرور ایک دلکش محسوس ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو افسانہ پڑھنے پر مجبور سا پاتا ہے۔

مٹوٹے اپنے افسانوں کی تمہید سے مختلف مقاصد پر مختلف کام میں آتے ہیں لیکن کام خواہ کچھ بھی لیا ہو قاری کے ذہن پر ابتداء ہی سے ایک گہرا نقش بٹھانے میں کامیابی ضرور حاصل کی ہے۔ مٹوٹے کے چند افسانوں کی تمہیدیں دیکھ کر اندازہ لگائے کہ تمہید کی پڑھنے والے کے لیے دل نشین بنانے کے علاوہ اس نے اسے کن کن فنی مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے۔

”نیا قانون“ اس طرح شروع ہوتا ہے:-

دنگو کو چوان اپنے اٹے میں بہت عقلمند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گراس کی علمی حیثیت صفر کے برابر تھی اور اس نے کبھی اچھل کا مزہ بھی نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود اسے دنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اٹے سے کہ وہ تمام کچھ اچھل کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی کہ دنیا کتنی

کیا ہو رہا ہے اسٹاڈنگ کی وسیع معلومات سے بھی طرح واقف تھے۔
اسی طرح بلاؤز کی تمہید یہ ہے:-

”کچھ دنوں سے مومن بہت بے قرار تھا۔ اس کا وجود کچھ بڑا سا ہن گیا تھا کہ مکتے وقت باقیں کرتے جیسے سختی کہ سوچنے پر بھی اسے ایک عجیب محم کا درد محسوس ہوتا تھا ایسا درد جس کو اگر وہ بیان بھی کرنا چاہتا تو نہ کر سکتا۔“

ان دونوں تمہیدوں کے ذریعہ قاری کا تعارف دو کرداروں سے ہوتا ہے لیکن ایک ایسے انداز میں ہوتا ہے کہ اس کے دل میں ان دونوں کے متعلق کچھ اور جاننے کی خواہش پیدا ہوتی اور اسے افسانہ کا باقی حصہ پڑھنے پر گامی اور مجبور کرتی ہے۔
دو تمہیدیں اور دیکھئے:-

”گھر میں بڑی چہل پہل تھی۔ تمام کمرے لڑکوں، بچے، بچیوں اور عورتوں سے بھرے تھے اور وہ شور مچا رہا تھا کہ کان بڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اگر اس کمرے میں دو تین بچے اپنی باؤں سے پیٹنے دو دھپینے کے لیے بللا رہے ہیں تو دوسرے میں چھوٹی چھوٹی لڑکیاں دھو کی لیے بے تھری تانیں اڑا رہی ہیں۔ نہ نال کی خبر ہے نہ لے کی، بس گائے جا رہی ہیں۔ نیچے ٹیوٹری سے لے کر بالا کی منزل تک مکان مہانوں کے کچھ کچھ بھرا تھا۔ کیوں نہ ہو، ایک مکان میں دو بیاہ رہے تھے۔ میرے دونوں بھائی اپنی چاندنی دینیں سیاہ لڑائے تھے۔“

”میری اور اس کی ملاقات آج سے لڑکپن سے پہلے اپنی پندرہ سوئی۔ شام کا وقت تھا سورج کی آخری کرنیں سمندر کی ان دور دراز لہروں کے نیچے غائب ہو چکی تھیں جو ساحل کے نیچے پر بڑھ کر دیکھنے سے پڑے کپڑے کی تہیں معلوم ہوتی تھیں۔ میں گیٹ آف انڈیا کے اس طرف پہلا نیچہ پھر ٹرک جس پر ایک آدھی مچی والے سے اپنے سر کی مالش کر رہا تھا دوسرے نیچے پر بیٹھا تھا اور دھڑنک پھیلے ہوئے سمندر کو دیکھ رہا تھا۔ دور، بہت دور جہاں سمندر اور آسمان مل کر رہے تھے، بڑی بڑی لہریں آہستہ آہستہ اٹھ رہی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت بڑا گھرے رنگ کا خالین ہے جسے اُدھر سے اُدھر بیٹھا جا رہا ہے۔“

پہلی تمہید ”مشورہ“ کی ہے اور دوسری ”بانجھ“ کی۔ دونوں تمہیدوں میں افسانہ نگار نے آنے والے واقعات کے لیے کیا یک فضا بنایا کی ہے اور اس فضا میں دونوں مرقوں پر اتنے زیادہ رنگ بھرے ہیں کہ دیکھنے والا خود کہ ان لوگوں کی کثرت میں ڈوبتا اور جذب ہوتا ہوا محسوس کرتا ہے اور پھر یہ سوچ کر دیکھیں اس کے بعد کیا ہوتا ہے افسانوں کو آگے بڑھتا ہے۔

”پچھا“ کی تمہید صرف ایک جملہ ہے لیکن اس جملے سے افسانہ نگار نے اپنا کام ایک دوسری طرح نکالا ہے:-
”گوپال کی ران پر جب یہ بڑا چھوٹا نکلا تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔“

گہرے کے متعلق افسانہ نگار نے اچانک جو خبر سنائی ہے اس سے قاری کے اوسان بھی نفقش سے بہت ضرور خطا ہو جاتے ہیں اور وہ گہرا کہرا اپنے دل سے سوال کرتا ہے کہ اس کے بعد کیا ہوا ہو گا۔ یہی افسانہ نگار کی حیثیت ہے۔ اس نے ایک معمولی سی خبر سننا کہ قاری کو اپنے ساتھ یا اپنے پیچھے چلنے پر مجبور کر دیا۔

ایک اور افسانے کی تہید دیکھئے:-

”ایک نہایت ہی نفقش نگار اس چوٹل میں دیسی و سکی کی بولی ختم کرنے کے بعد طے ہوا کہ باہر گھوما جائے اور ایک ایسی عورت کی تلاش کی جائے جو چوٹل اور سکی کے پیدا کردہ نفقش رکھ کر دور کر سکے۔“

یہ تہید ”پہچان“ کی ہے۔ اس میں نہ کسی کردار کا تعارف ہے نہ کوئی ضمایا ماحول بنانے یا پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے نہ کوئی چمکا دینے والی خبر سنائی گئی ہے بلکہ ٹرسو واضح اشاروں میں یہ بتا دیا گیا ہے کہ آگے کیا کچھ ہونے والا ہے اور اس طرح آنکھ کے آستانے سے قاری کو گویا یہ دعوت بھی دی گئی ہے کہ آؤ اگر تم بھی ان شراہوں کی سرگردانی دیکھنا چاہتے ہو تو آ جاؤ۔ اور مسعود قاری فوراً غور قبول کر لیتا ہے۔

اور سنئے:-

”اسے یوں محسوس ہوا کہ اس سنگین عمارت کی ساتویں منزلیں اس کے کاندھوں پر دھر دی گئی ہیں۔“

یہ ”نفقش“ کی تہید ہے اور اس میں افسانہ کے مرکزی کردار کی شوال کی ذہنی کیفیت کا نفقش قاری کے دل میں بٹانے کی کوشش کی گئی ہے اور ہر قاری شاید یہی کہے گا کہ افسانہ نگار ابھی کوشش میں کامیاب ہوا ہے۔ اس لیے کہ کیٹولال کے اس شدید احساس کے پیچھے کیا واقعہ کام کر رہا ہے، اس کے دل میں یہ جاننے کی غش پیدا ہو گئی ہے اور اس طرح یوں سمجھئے کہ افسانہ نگار کا تیر نشانہ پڑ چکا۔

”دن بھر کی نکل مانی وہ ابھی ابھی اپنے بستر پر لیٹی تھی اور لیٹتے ہی سو گئی تھی۔ یہ بستر کس کی کا داروغہ صفائی جسے وہ سچے کے نام سے پکارا کرتی تھی، ابھی ابھی اس کی پٹیاں پٹیاں جھنجھوٹ کر شراب کے نشے میں پڑ گھر کو واپس گیا تھا۔ وہ رات کو وہیں ٹھہر جانا سمجھتا ہے۔“

ابھی دھرم تہی کا بہت خیال تھا جو اس سے بے حد پریم کرتی تھی۔

یہ تہید ”ہنگ“ کی ہے اور اس میں افسانہ نگار نے ایک کے بجائے کئی باتیں کہی ہیں۔ ایک تیر سے کئی تنکار کی ہے اس لیے کہ افسانہ میں آگے چل کر جو گھمان شروع ہونے والا ہے اس کا تقاضا ہی یہ ہے کہ وہ بات سید سے سادے انداز میں کہنے کے بجائے ذرا تکنیکی طور کے ساتھ کہے۔ قاری افسانہ نگار کے ان تکنیکیہ خبروں کی پہچان جاتا ہے اور یہ سوچ کر کہ دیکھیں یہ تنگ زار سر جو جاتے جاتے اور ابھی بیوی کا محبوب داروغہ صفائی آگے چل کر کھانچا کھلا تھے جس، افسانہ کے خیر حاد میں کوہ پڑتا ہے۔

موت نے افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنے منصب کو پوری طرح پہچانا اور اپنے ترکش کے نیزہ کی اہمیت کا صحیح اندازہ کیا

انہی تیروں میں سے ایک تیرا اس کے افسانہ کی تمہید ہے جو یہ افسانہ میں ایک نیا کام کرتی ہے اگر دیکر متعارف کرنے کا، ایک خاص فضا یا ماحول بنانے کا، ایک پیکر بنی ہوئی جڑ بنانے کا کسی کردار کی ذہنی کشمکش کی صورتی کرنے کا، اپنے والے واقعات کے لیے زمین ہوا کرنے کا اور کبھی کبھی ایک وقت کئی طے محلے قصہ پردہ سے کرنے کا، لیکن ان گونا گوں کاموں کے علاوہ جو کام غٹو کے افسانہ کی بہرہ نمیدے ملنے سے لیا ہے۔ یہ ہے کہ وہ قاری کے ذہن کو بیدار کر کے اس کے دل میں گدگدی پیدا کر کے یا اس کے ذہن میں آگے بڑھنے کی خواہش پیدا کر کے افسانہ پڑھ لینے پر آمادہ کر دے۔ غٹو کی فنی کامیابی کی یہ بڑی اہم منزل ہے اور یہ منزل طے کرنے کے لیے اس نے عموماً پورے سوچ بچار سے قدم اٹھایا ہے۔

تمہید افسانہ کا پہلا قدم ہے اور اس کا انجام اس کی اتنی منزل۔ افسانہ نگار اپنی تمہید کے ذریعہ پڑھنے والے کے ذہن اور دل پر تسلط جمانا اور اسے افسانہ کے آنے والے حصوں میں دلچسپی لینے کی طرف مائل کرنا ہے۔ بننے والے حصے سفر کی مختلف منزل میں جن میں طرح کی صعوبتیں مسافر کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ نہ جانے کیسے کیسے کاٹنے ہیں جو اس کے تلوں میں چھٹنے کے لیے بے قرار نظر آتے ہیں۔ افسانہ پڑھنے والا ان صعوبتوں کو آسان بنانے اور راستے میں پھیلے اور بکھرے ہوئے کانٹوں کو راستے سے ہٹانے کے لیے افسانہ نگار کی رہنمائی اور مدد کا طالب ہوتا ہے۔ بالآخر افسانہ نگار کی رہنمائی اسے منزل مقصود تک پہنچاتی ہے جسے ہم افسانہ کا انجام کہتے ہیں۔ راہ کی ساری کٹھنیں منزل طے کرنے اور پیچھے والے کانٹوں کی خدش کو گوارا اور آسان بنالینے کے بعد اس کی سب سے بڑی خواہش اور تمنا یہ ہوتی ہے کہ اس کی منزل اس کے قلب و ذہن کے لیے کون و راحت کا سرمایہ بن جائے۔ پڑھنے والے کے ذہن کو یہ یوں اور اس کے دل کو یہ راحت دینے کے لیے افسانہ نگار کو ایک ایسے انجام کی جستجو کرنی پڑتی ہے جو جنسیت سے طے کی ہوئی منزلوں کا مطابقتی نتیجہ معلوم ہوا اور پڑھنے والے کے لیے قابل قبول ملے ہو۔ جو وجہ ہے کہ افسانہ نگار کو اپنے انجام کی تلاش میں پوری ذہنی کاوش کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ افسانہ کے خاتمہ پر افسانہ نگار کی ذرا سی تسکین، ذرا سی تن آسانی، ذرا سی مل انکھاری اور باطن معمولی سی غفلت اور مطمئن اس کے افسانہ کا خون بھی کرسکتی ہے اور پڑھنے والے کے لیے کوئی خوش کا باعث بھی بن سکتی ہے۔

غٹو نے اپنے افسانوی فن میں انجام کی ان زائکوں کو بوری طرح محسوس کر کے عموماً اپنا فن منصف پورا کرنے کی طرف توجہ دی ہے۔ اس نے اس انجام سے متاری کے ذہن کو متاثر کرنے کی خدمت بھی انجام دی ہے اور افسانہ کو افسانہ کی جنسیت سے مکمل کرنے کا کام بھی لیا ہے۔ غٹو کے فیض افسانوں کے انجام دیکھ کر اس کے فن کی خصوصیت کا اندازہ لگائیے۔

ابن کا افسانہ "نیا قانون" اس طرح ختم ہوتا ہے:-

"منا دنگو کو پولیس کے سپاہی تھانے لے گئے۔ راستے میں اور تھانے

کے اندر وہ نیا قانون، نیا قانون چلاتا رہا مگر کسی نے ایک نہ مٹھی۔

"نیا قانون، نیا قانون کیا ایک رہے ہو۔ قانون وہی ہے پرانا"

اور اس کو حالات میں بند کر دیا گیا۔"

"پچھا" کا انجام یہ ہے:-

"نرلا بڑے انماک سے پچھا تا شاہ رہی تھی۔ اس کی تیل تیل انگلیاں تھیں جسے بٹافیسر کلیم

لے رہی تھیں۔ بھاکا کاٹنے کے بعد اس نے تقریباً سامنے نکال کر اس پر پھیلایا اور گردن جھکا کر اپنے کمرے کے بٹن کھولے۔ سینے کے دائیں طرف چھڑا سا اکھاڑ تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نکلے پر صابن کا چھوٹا سا مکمل ٹکڑا لگا ہوا ہے۔
نرطالے بھاسے پر چھوٹا سا باری اور اس منہ سے اکھاڑ پر جمادیا۔

”شہنشین“ کے آخری الفاظ یہ ہیں :-

”وہ دیر تک سوچتی رہی۔ وہ اب زیادہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔ نرطالی دیر کے بعد اس نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا: ”مجھے زندہ رہنا ہو گا۔“
اس کے اس دھیمے لہجے میں عزم کے آثار تھے۔ اس ٹھنکی ہوئی جوانی کو کون کھینچتی ہوئی بھانڈی میں چھوڑ کر میں اپنے قلیڈ پر چھلایا اور سر گیڑا۔“

”ہنسک“ کی ہر وہ سن سونگڈی ہم سے اس طرح نصحت ہوتی ہے :-

بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اس کو اپنا دل پرچا کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خادش زوہ کے گونگوں میں اٹھایا اور ساکھان کے چوڑے پلنگ پر اسے پہلو میں لٹا کر سو گئی۔“

”..... اس کے سلق سے ایک نعرہ..... کان کے پردے پر ڈوبنے والا نعرہ،
پنگلے ہونے گرم گرم لاوے کے مانند نکلا..... بہت تیزی.....!
جھننے کبوتر بٹل کی منڈیروں پر اگھڑ رہے تھے ڈر گئے اور پھر پھر اٹھنے لگے۔ نعرہ
مار کر جب اس نے اپنے قدم زمین سے بٹل شکل کے ساتھ علیحدہ کیے اور وہ ابیں مڑا
تو اسے اس بات کا پورا یقین تھا کہ بٹل کی عمارت اڑا اڑا چم نیچے گر گئی ہے
اور یہ نعرہ من کر ایک شخص نے اپنی بیوی سے جو یہ شور مچا کر ڈر گئی تھی، کہا: ”بھلا ہے۔“

(نعرہ)

”..... پہلے پہل تو میں بہت متحیر ہوا کہ یہ کس کی حرکت ہے مگر فوراً ہی صبر مطلق صاف
ہو گیا۔ سید اجمیری غیر حاضری میں اپنی سیاسی سلطنت پر نہایت کامیابی سے چھاپا مار
گئے تھے۔“
(میرا اور اس کا انتقام)

”اس واقعہ کو ایک زمانہ گزر چکا ہے مگر جب کبھی میں اس کو یاد کرتا ہوں، میرے منہ پر
میں سوئیاں ہی چھبے لگتی ہیں۔۔۔۔۔ یہ نامکمل دوسرے ہمیشہ میرے ہوشوں پر طغیاں ہے گا۔“
(زمانہ نامکمل تجربہ)

”جب اس کو غسل دینے لگے تو ہسپتال کے ایک ڈاکٹر نے مجھے بڑا یاد رکھا، مگر ڈاکٹر
صاحب! اس کی مٹی میں کچھ ہے،“ میں نے اس کی بند مٹی کو کھول کر دیکھا۔ دوسرے کے
دو کلیپ تھے۔ اس کی بیگونی یادگار!
”ان کو نکالنا نہیں سید اس کے ساتھ ہی دفن ہوں گے“ میں نے غسل دینے والوں
سے کہا اور دل میں حکم کی ایک عجیب و غریب کیفیت لیے دفتر چلا گیا۔“
(بیگونی)

”وہ گھبرا کر اٹھا اور سامنے کی دیوار کے ساتھ اس نے اپنا ماتھا رکھنا شروع کر دیا
جیسے وہ اس سید کے کافران مٹانا چاہتا ہے۔ اس عمل سے اسے جب حتمی طبیعت
پہنچی تو وہ پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔۔۔۔۔ مگر جھکا کر اور کان دھے بڑھیلے کر کے اس نے ٹھکانا
آواز میں کہا: ”اے خدا! میرا سجدہ مجھے واپس دے دے۔۔۔۔۔“
(سجدہ)

مٹی کی مختلف کہانیوں کے یہ سب خاتمے جہاں ایک طرف اس مشترک خصوصیت کے حامل ہیں کہ ان سے پڑھنے
والے کو اپنے ذہنی انتشار کے ختم کرنے میں مدد ملتی ہے اور وہ کہانی کے انجام میں اپنے اس اشتیاق کی تسکین تلاش کر لیتا ہے
جو کہانی کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس میں پیدا ہوتا اور بڑھتا رہتا تھا، دوسری طرف وہ ان میں سے ہر ایک خاتمہ کو اس منطقی ربط کی غرض
کڑی بنا کر جو کہانی کی تمثیل سے شروع ہو کر براہِ رزادہ منظم رفتار پر تھا، افسانہ کی فنی زنجیر کو مکمل کر لیتا ہے۔ ان میں سے ہر خاتمہ کی ایک
نفسیاتی اور جذباتی حیثیت ہے اور دوسری فنی فطرت نے جذبات، نفسیات اور فن کے رشتے جوڑے اور انھیں مضبوط بنا کر میرے ہمیشہ
اپنی کہانیوں کے انجام سے کوئی نہ کوئی کا درلبا ہے۔

”نیٹافانوں“ کے خاتمہ میں اسٹنڈرڈ منگو خاں کی اس جذباتی شدت کا ایسا متضاد ردِ عمل ہے جس سے پڑھنے والے کے
دل میں درد کی ایک ٹپس اٹھتی ہے۔ ”پچھا! کا انجام واقعہ نگاری اور نفسیاتی تجزیہ کا بڑا صید حاسد اور ایک ایسا غیر متوقع امتزاج ہے
جو ایک معمولی سے واقعہ کو اس کی نظر میں بڑی اہمیت دے دیتا ہے۔“ شہ نشین پر لکا انجام جذباتی کشیدہ و کشمکش اور اس کے بڑے
سادہ لیکن فن کارانہ حمل کی تصویر ہے۔ ”ہتک“ کے انجام میں افسانے کے وسیع پس منظر، ایک خاص کردار کے شدید ردِ عمل اور زندگی

ایک بڑے دھڑکتے ہوئے ناموس کو بظاہر ایک معمولی سداغیر کے نوکر سے اس طرح حل کیا گیا ہے کہ تاریکی شدت کم ہونے کے بجائے ایک منتقل صورت اختیار کر لیتی ہے اور پڑھنے والا سو گندی کی جذباتی شدت میں اس کا ہم ڈا ہو کر ہر اس چیز سے نفرت کرنے لگتا ہے جو سو گندی کے نزدیک تداہل لغزین ہے۔ "نعرہ" کے آخری چند جملوں میں کہانی کے مرکزی کردار کیشو لال کی جذباتی شدت اور اوصاف کش کو تھوڑے سے لفظوں میں بیان کر کے افسانہ کو جس جگہ پر ختم کیا ہے اس کی سادگی فصاحت کی شدت کو اور بھی نمایاں کر کے زندگی کی طرحی کو تلخ تر بنا دیتی ہے۔ جذباتی شدت اور فصاحت تلخی کو اس طرح کی سادگی سے نمایاں کرنا نمونہ کے افسانوں کے خاتموں کی ایک واضح خصوصیت ہے۔ "میگو" کا انجام منٹو کے فن کی ایک اور خصوصیت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور وہ یہ کہ منٹو اپنے افسانہ کے خاتمہ پر ایک بظاہر بالکل غیر اہم اور معمولی بات کہہ کر پڑھنے والے کے ذہن کو ایک بار پھر بڑی تیزی سے ان سادہ واقعات میں گمراہ دیتے ہیں جو افسانے میں اس سے پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ اس مرتبہ یہ معمولی غیر اہم بات کہہ رہے ہوتے واقعات میں ایک ایسا رنگ بھرنے ہیں جو افسانے میں پہلے پڑھنے والے کی نظر سے اوجھل رہا تھا۔ "میرا اور اس کا انتقام" میں آخری جملے بھی جہتی تلخی بھی ایمانیات کہانی کے دونوں مرکزی کرداروں کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کو آئینہ کی طرح روشن کر دیتی ہے۔ دونوں کرداروں نے کہا میں شروے سے خوفناک ہو چکا ہوں اور کہا ہے اس سے مختلف پڑھنے والے کو مختلف نتائج اخذ کرتے ہیں اس سید سے سادہ جملے سے ان میں کلیم رنگی اور ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے اور ہر پڑھنے والا صرف ایک واضح اور صریح نتیجے کے سوا کسی دوسرے نتیجے پر نہیں پہنچتا۔ "ناٹھل ٹھہر" میں آخری جملے میں بات کہنے کے ایک نئے انداز سے ایک معمولی سے روایتی واقعہ کو ایک ناقابل فراموش یاد کی حیثیت مل جاتی ہے۔ "سیدہ" کا انجام منٹو کی اس منفرد خصوصیت کی ترجمانی کرتا ہے جس میں افسانہ نگار کو کوئی ایسی بات کہہ کر جس سے پڑھنے والوں میں سے بعض کے تصورات پر ایک چرٹ مٹی لگتی ہے اپنے فن کے لیے زندگی کا سامان مہیا کرنا ہے۔

منٹو کی مختلف کہانیوں کے ان خاتموں پر نظر ڈال کر ان افسانوں کا فنی تجزیہ کرنے والا واضح طور پر یہ بات محسوس کرنا ہے کہ فن کے لفظ نظر سے سب خاتمے افسانے کے مجموعی ناظر کو مکمل کرنے کی خدمت انجام دینے کے علاوہ پڑھنے والے کے ذہن کے لیے اس مسرت کا باعث بنتے ہیں جو ہر اچھی فنی تخلیق کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ ان سب خاتموں میں کہنے والے کی تہذیبی اور اس کے انداز فکر کی ندرت اور شوخی ہر جگہ ایک نیارنگ پیدا کرتی ہے کبھی محض سادگی بیان سے کبھی تضاد سے کبھی تکرار سے کبھی مزاح کی شوخی سے کبھی طنز سے کبھی شہادہ فکر اور تخیل کے امتزاج سے وہ اپنے فن کی تکمیل میں مدد دیتا ہے اور پڑھنے والا اگر غور سے دیکھے تو یہ محسوس کرنے میں وقت نہیں ہوتی کہ افسانہ کے خاتمہ کا بیاننا زاہد کی طرح سچا سمجھا ہو ہے۔ افسانہ نگار نے خاتمہ کے وہ جذبے جن میں ہر جگہ اس کی ذہانت اور شگفتہ اور شوخی نمایاں ہے محض اتفاق کا نتیجہ نہیں، افسانہ نگار نے مختلف مرحلے طے کر کے یہاں تک پہنچا ہے۔ بلکہ شاید یوں کہنا زیادہ صحیح ہے کہ افسانہ نگار نے اسے اس منزل تک پہنچایا ہے اور اس طرح پہنچایا ہے کہ ٹھکن کا شائبہ بھی پیدا نہیں ہونے پایا۔ افسانہ کے انجام میں وہی تاہم کی توانائی یہاں بھی ہے جو اس کے آغاز میں تھی اور یہ نتیجہ ہے افسانہ نگار کی اس فنی توانائی کا جو ہر عدد پر اور ہر منزل میں اس کی جو جہاں و ہم سفر ہے۔

افسانہ نگار کا آغاز اور اس کا انجام — ان دونوں مرحلوں کے درمیان افسانہ نگار کو کچن مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے وہ اگر ان میں سے کسی ایک کی اہمیت کی طرف سے کبھی غفلت یا بے نیازی برتنے تو افسانہ کے مجموعی ناظر میں فرق پیدا ہو جاتا ضروری سے بیوقوف

فن کے ان مراحل کا پورا احساس ہے اس لیے ان کا ہر افسانہ آغاز سے انجام تک بعض واضح مرحلے طے کرتا ہے اور اس طرح ہر انجام میں ایک ایسی منطقی جڑی ہے جس کا پڑھنے والے کو احساس ہوتا لیکن اس سے وہ متاثر اور مسرور ہوتا ہے افسانہ شروع ہر کڑی میں لیکن بھی مثل حال سے، بڑے نرم لیکن بڑے توانا قدم رکھتا ہوا آگے بڑھتا ہے اور جوں جوں آگے بڑھتا ہے پڑھنے والے کے دل و دماغ پر اس کا قبضہ زیادہ مستحکم اور زیادہ یقینی ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ اس دھیمی اور چھٹی رخصت سے افسانہ اپنے انجام کو پہنچتا ہے اور افسانہ کے ہر مرحلہ پر اس کا ساتھ دینے والا قاری سفر کے اختتام پر ایک طرح کا سکون، ایک طرح کی مسرت محسوس کرتا ہے۔ اسے یوں لگتا ہے کہ اس نے کوئی بہت بڑا مرحلہ طے کیا ہے اور جڑی کامیابی سے طے کیا ہے۔ یہ احساس حقیقت میں افسانہ نگار کی فنی کامیابی کی دلیل ہے۔ ایک ایسی کامیابی جو یوں ہی آفاقی فاکٹور نہیں آجاتی۔ اس میں لکھنے والے کو بڑے سوچ بچار سے کام لینا پڑتا ہے۔ آغاز اور انجام کے درمیان کی ہر چھٹی بڑی کڑی کو بڑی احتیاط سے اس جگہ جو ٹاپا جاتا ہے جو اس کے لیے زیادہ نوزوں ہو کوئی کڑی اگر ذرا بھی جھک سے بے جگہ ہو جلتے تو ساری زنجیر دھم دھم ہو جاتی۔ اس کے ابتدائی سرے اور آخری سرے میں جو ہموار ربط ہے اس میں جھلکے چڑھا میں اور پڑھنے والے کے لیے اس ربط میں ایک خوشگوار جھک رکا جو تصور پر مشتبہ ہے وہ، نیزہ ریزہ ہو جاتے۔ ہمارے کہ افسانہ نگاروں نے کڑیوں کے ربط کی اس جھک کے احساس کو اہمیت دی ہے اور جنھوں نے کیا ہے انھوں نے ہمیشہ اس کے فنی مطالبات کا پابند رہنا ضروری نہیں سمجھا۔ غور کے فن کا یہ اور امتیاز ہے کہ اس نے آغاز اور انجام کو ایک زنجیر میں منسلک کرنے کی اہمیت سمجھی نہ ٹھٹھکتے ہوئے ہمیشہ ہر افسانے کی ضرورت کے مطابق اس کے درمیان حوصلہ کی ساخت، ترتیب، رفتار اور اتار چڑھاؤ کو پوری فنی ذمہ داری کے ساتھ جڑتا ہے غور کے نزدیک فن کے ان مراحل کی بڑی اہمیت ہے اس کا اندازہ منظر کے بعض افسانوں پر نظر ڈال کر کیجئے۔

’نیاتاقون‘ کے استاد منگو خاں کے جذبات کی پہلی منزل تو وہ ہے جب وہ ہندوستان میں نافذ ہونے والے جدید فنی تیز ترین کنوٹشی سے پھیرلا نہیں سکتا اور اس کا انجام یہ ہے کہ نیا قانون نافذ ہو جانے کے بعد بھی اسے ایک گورے سے ملنے کے مجرم میں جو آلات میں بند کر دیا جاتا ہے۔ اس آغاز اور انجام کے درمیان حوصلہ کو اس طرح پرکھنا کہ افسانے کا انجام پڑھنے والے کے لیے حد درجہ کرب انگیز بن جائے، غور کے فنی احساس کی پیدائی ہوئی ترتیب تو غور کا مظہر ہے۔ نیا قانون نافذ ہونے کی خبر سن کر منگو خاں کو چوتھی جڑی فنی جس کے لیے نئے قانون کے نافذ ہونے کی نائن تک غور نے کئی ایسے موقعے پیدا کیے جن پر منگو خاں کی حالت دیکھ کر قاری برابر یہ اندازہ لگاتا رہتا ہے کہ اس کی مسرت آہستہ آہستہ وارنگی اور دیانگی کا درجہ اختیار کر رہی ہے۔ بالآخر جب وہ دوسرے سید آہنچتا ہے تو اس کی مسرت وارنگی اور دیانگی اشتہق آراوی کو جسم دیکھنے کے لیے بیتاب نظر آنے لگتی ہے اور عین اس وقت جب اس وارنگی شوق کو رٹا ہوا اپنی تکمیل کا موقع مل جاتا ہے اسے جوالات میں داخل ہونا پڑتا ہے۔ اور اس طرح منگو خاں نے جذبات و احساسات کے جو متعدد نازک مرحلے طے کیے تھے ان کا یہ غیر متوقع انجام دیکھ کر وہ تو غور پر متحیر ہو جاتا ہے اور قاری کے ذہن پر ایک ایسی بڑی کڑی کا نقش مرسم ہو جاتا ہے جو اپنی انتہائی سادگی کے باوجود حد و حد پر پڑھنے والی ہے۔

’نیاتاقون‘ غور کی بڑی مشہور اور بڑی اہم کہانی ہے اس لیے اس میں آغاز اور انجام کے درمیان واضحت کا یہ فنی

اتنا چڑھا دیا، ناکارک اور کجی اور ایک شدید فحش کا نقطہ شروع شاید بعض لوگوں کو یہ سوچنے کی طرف مائل کرے کہ منظر اس طرح کے مرحلے صرف ایسے افسانوں میں ملے کرتا ہے جو موضوع کے لحاظ سے اہم ہیں حالانکہ خود سے دیکھا جائے تو یہ بات نہیں۔ منظر فن کے نقطہ نظر سے اپنے ایک افسانے اور دوسرے افسانے میں امتیاز برتنے کا قائل نہیں فحش کے جو مراحل اہم اور ضروری ہیں وہ اس کی ہر کہانی میں کیساں توجہ اور انہماک کے ساتھ پورے ہونے چاہئیں۔ اس انداز سے کہ جیسے منظر کی چھ آدھ اور کہانیوں پر ایک سرسری ہی نظر ڈالئے۔

”منتر“ اور ”میرا اور اس کا انتقام“ موضوع کے اعتبار سے دو بالکل سیدھی سادی اور غیر اہم سی کہانیاں ہیں جن کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ پڑھنے والا انھیں چر کر پیموس کرے کہ اس نے ایک جلی پھلکی تعریفی چیز پڑھی ہے۔ ان دونوں افسانوں کا مجموعی تاثر کسی طرح کے غماری پر بھی اس تعریفی تاثر کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ لیکن منظر نے ان دونوں کی ترتیب میں بھی پورے فنی انماک سے کام لیا ہے۔ دونوں افسانوں کا آغاز دونوں کا انجام اور دونوں کے آغاز اور انجام کے درمیان کی فترتیں پورے فنی رکھ رکھاؤ کے ساتھ ملے ہوئی ہیں۔

”پچا“ اور ”بلاؤر“ اور ”کالی شوار“ ایسے موضوعات کی کہانیاں ہیں جنھیں منظر کے محبوب موضوع کہا جاسکتا ہے اور جن پر موضوعات کے تہی تعنی نے منظر کو ارد گردی سے بڑا افسانہ بنکار دیا۔ ”پچا“ اور ”بلاؤر“ میں ایک طرح کے اور ایک طرح کے ان بچوں نے اوجھلے اور محسوس و محسوس اس حالت کی مصوری ہے جو شباب کی صیرت اور کھٹن منزل میں قدم رکھنے سے پہلے دل میں ابھرتے اور عجیب و غریب شکلیں اختیار کرتے ہیں۔ ان دونوں افسانوں کو بڑے سیدھے سادے انداز میں شروع کرنے اور اسی سیدھے سادے انداز میں ختم کرنے کے علاوہ آغاز اور انجام کو کوئی معنویت دینے کے لیے افسانہ نگار نے بہت سے سچے سچے تجربے اہم اہم استعمال کیے جو ہر ایک ایسی قصائدا کی ہے جو پوری توجہ اور پورے انماک کے بغیر ظہور نہیں کر سکتی۔ افسانہ نگار کے اسی فنی انماک و غور و فکر نے دوسرے سادے افسانوں کو ایک علمی حیثیت دے دی ہے لیکن کمال یہ ہے کہ افسانے نفسیاتی نقطہ نظر سے دو اہم مسئلے ہونے کے باوجود فن کے ان محدود سے باہر نہیں جاتے جہاں سے نکل کر کہانی کہانی نہیں بنتی۔

یہی صورت ”کالی شوار“ کے ساتھ ہے۔ کالی شوار میں طوائف کی زندگی اور اس کے گھناؤنے ماحول سے تعلق رکھنے والی بہت سی چیزیں بڑھنے والے کے سامنے آتی ہیں۔ اسی ماحول میں واقعات ہیں ایسا اتنا رابطہ پیدا ہوتا ہے اور وہ ایسے پیچ و بچہ مراحل سے گزرتے ہیں کہ پڑھنے والا ماحول کے گھناؤنے پن کی طرف متوجہ ہوئے بغیر صرف ان نفسیاتی محرکات میں نہیں جھپٹتا ہے جو کرداروں کو ایک خاص طرح کے عمل کی طرف مائل کرتے ہیں۔ کالی شوار رابطہ افغون کی گندی کہانی ہونے کے باوجود پڑھنے والے کو اس لیے متاثر کرتی ہے کہ اس میں اس ماحول کے دو کرداروں کی فزیمی کیفیتیں کا ایسا تجزیہ ہے جس میں کہانی کی سادگی بھی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ افسانہ نگار نے شروع سے آخر تک افسانے میں جتنی چھٹی بڑی باتوں کو ایک زنجیر میں مربوط کیا ہے ان میں ایک ایسا رشتہ پیدا ہو گیا ہے جو کسی محنت سے سخت حادثہ سے بھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ کہانی کے مختلف جھگڑوں میں یہ بھی نہ توٹنے والا رشتہ قائم کرنا، اس کے آغاز اور انجام کو اس طرح چھوٹی بڑی بہت سی اہم اور غیر اہم باتوں کے ذریعہ ایسے میں جوڑنا کہ وہ فن آہیں میں لازم و ملزوم معلوم ہونے لگیں اور دونوں منطقی طور پر یوں شیر و شکر ہو جائیں کہ ایک دوسرے کا سبب اور نتیجہ بن جائیں منظر

کے فن کی ایسی خصوصیت ہے جو ان کے ہر افسانہ میں ریاکم اتر کم اکثر افسانوں میں موجود نظر آئے گی منظر نے اپنی اسی خصوصیت کے ذریعہ بہت سے پڑھنے والوں کو اپنا گرویدہ بنایا ہے۔

(۲)

منٹو کے افسانوی فن کا ایک پہلو وہ ہے جس کا ذکر میں اب تک کرتا رہوں اور جس میں افسانہ کی مجموعی ساخت و ترتیب تشکیل اور تعبیر جیسی چیزیں شامل ہیں۔ افسانہ کی بنیاد اس کی اٹھان، اس کے واقعات کا آثار چھڑاؤ، ان واقعات کے سچ اور جھوٹ اس آثار چھڑاؤ کیچ اور الجھاؤ کے بعد افسانہ کا نقطہ وقوع اور اس کا خاتمہ، ان سب چیزوں کا تعلق افسانے کے ڈھانچے اور اس کی ساخت سے ہے اور اس ساخت میں افسانہ کی ظاہری ہیئت اور اس ہیئت کا مجموعی تاثر پڑھنے والے کے لیے وہ سب سے اہم چیزیں ہیں۔ منٹو نے افسانوی فن کے اس ظاہری اور خارجی پہلو کو اور اس کے مختلف اجزاء و احوال کو جو اہمیت دی ہے اس سے ہمیں یہ اندازہ لگانے اور نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی کہ منٹو ایک فن کار کی حیثیت سے فن کے ان ظاہری پہلوؤں کو اپنے افسانے کی ساخت اور تشکیل میں ایک بنیادی اور اہم حیثیت دیتے ہیں اور ان کی اہمیت ان کے نزدیک اس لیے ہے کہ یہ پڑھنے والے کے ذہن اور قلب پر ایک مخصوص تاثر قائم کرنے کے یقینی وسائل ہیں جو باقی فن کار کا مقصود بالذات فن کے یہ ظاہری پہلو گرگز نہیں تو ان ظاہری پہلوؤں سے ایک اہم وسیلہ کا کام لے کر تاثر پیدا کرنے کا وہ مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے جو ہر اچھے فن کی مشترک خصوصیت ہے۔

اس لیے منٹو کے فن کا تجزیہ کرنے کی یہ ابتدائی منزل طے کر لینے کے بعد جس بیسوچا پڑتا ہے کہ منٹو نے اپنے افسانوں میں تاثر پھیری کی خصوصیت کو فن کی بنیاد بنا کر اس کے حصول کے لیے ان خارجی اور تکنیکی چیزوں کے علاوہ اور ایسے کون کون سے طریقے برتنے اور استعمال کیے ہیں جنہیں ہم اس کے اسلوب نگارش کی خصوصیت کہہ سکیں۔ یہ صحیح ہے کہ کسی افسانے کے مجموعی تاثر کو ایک خاص رنگ دینے میں فن کے ان ظاہری پہلوؤں کا بھی ایک خاص مقام ہے جن کا ذکر اب تک ہزار بار ہے لیکن ان سے بھی خاص حیثیت ان ظاہر اور باطن کے ان طریقوں کو حاصل ہے جنہیں ہر مصنف اپنی اپنی پسند اپنی اپنی صلاحیت اور مذاق کے مطابق برتتا ہے۔ ایک سیدھی سادی پیچیدہ سے پیچیدہ بات کہنے کا انداز رکھا جو اس کے لیے کسی خاص عمل پر سیدھا کہ فخر سے اشارے، کنایے، تشبیہ، استعارے، تضاد یا انحراف میں سے کون سا حربہ زیادہ مؤثر ثابت ہوگا یہ بات ہر مصنف اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق سمجھتا اور اپنی صلاحیتوں کے مطابق ان میں سے جس حربہ یا وسیلہ کو جس خاص عمل کے لیے نوزوں اور نرتر گھتا ہے استعمال کرتا ہے لفظوں، فقرات، اشاروں، کلاموں، تشبیہوں اور استعاروں کے استعمال کا یہی مخصوص اور متغیر انداز ایک مصنف اور دوسرے مصنف کے اسلوب میں فرق پیدا کرتا ہے۔

منٹو کے افسانوی فن کو اگر اسلوب اور انداز کے ان وسائل کے نقطہ نظر سے پرکھنے اور جانچنے کی کوشش کی جائے تو سب سے پہلی چیز جو پڑھنے والے کو شدت کے ساتھ متاثر کرتی ہے یہ ہے کہ منٹو کے پاس معمولی سے معمولی بات کے لٹھار کے لیے ایک غیر معمولی انداز موجود ہے۔ فقرہ کی ساخت میں معمولی سی تبدیلی، لفظوں کے برتنے میں تھوڑی سی تبدیلی پسندی اور بہت اہم اور

۱۵- ”ہیں نے انگریزوں سے اس کے بالوں میں لٹکھی کرنا شروع کر دی۔ میں یہ محسوس کرنے لگا کہ اس کے بال میرے اٹھنے پر خیال ہیں جن کو میں اپنے ذہن کی انگریزوں سے منسوب کرتا ہوں۔“

۱۶- ”اسے صرف اپنے آپ سے غرض تھی اور بس۔ دوسروں کی عزت پر وہ ہمیشہ اپنی دوزخ کو ترجیح دینا اور عقائدِ دنیا سال،

۱۷- ”محبت ایک عام چیز ہے۔ حضرت آدم سے لے کر ماہرِ شہناز تک سب محبت کرتے آئے ہیں۔“ (قبض)

۱۸- ”زندگی کیا ہے؟۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک آونی خراب ہے جس کے حوالے کا ایک سہرا ہمارے ہاتھ میں ہے

وہاں کیا ہے۔ ہم اس خراب کو اُوچھٹے رہتے ہیں۔ جب اُوچھٹے اُوچھٹے دھاگے کا دوسرا سہرا ہمارے ہاتھ میں آ

جائے گا تو یہ قسم جسے زندگی کہا جاتا ہے، ٹوٹ جائے گا۔“ (مصری کی ٹولی)

منٹو کے افسانوں کے بیوقوفِ اعتقادات اس کے اندازِ بیان کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہیں۔ مثالِ غیرِ امن منگو

نے جب یہ بات کہی کہ ایسی جبرستوں کو بھی خوش ہو جائے تو یہ معمولی سی بات تھی لیکن یہ نظائرِ معمولی معلوم ہونے والی بات منٹو کے

نزدیک ہمتِ احمق تھی۔ منٹو کے منٹو کے مزاج اس کی ذہنی سطح اور گہنے تھوکی مختلف خصوصیتوں کو جمع کر کے ایک ایسا جملہ دکھا جو منگو

کی ذہنی کیفیت کی پوری ترجمانی کرتا ہے۔ منگو کی جذباتی شدت کے اظہار کے لیے منٹو نے جو جملہ وضع کیا ہے وہ منٹو کا منفرد رنگ ہے

ایک چلنے ہوئے غیر خمیدہ فقرے کو ایک بے حد اہم اور گہرے مفہوم کا حامل اور ترجمان بنانا منٹو کے جدت پسند اسلوب کی

ایک خصوصیت ہے۔

مثالِ نمرہ ۱۸ میں پڑھنے والے کے سامنے جو تشبیہ آئی ہے اسے دیکھ کر پڑھنے والے کو اس کے نشہ پن کا احساس تو

ضرور ہوتا ہے لیکن وہ سوچتا ہے کہ اس تشبیہ میں کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں ہے کہ منٹو کے سوا کسی اور کا ذہن اس تک نہ پہنچ سکتا۔

لیکن منٹو یہ کہتے ہیں کہ ”آپ نیچے سے دھیلے اور پتھ مار کر انھیں گر سکتے ہیں۔“ تو پوری تشبیہ پر منٹو کے منفرد اور امتیازی اسلوب کا

رنگ چھا جاتا ہے اس لیے کہ یہ جملہ جو خیال یا بیان کے اعتبار سے بالکل معمولی سا اور جلتا ہوا ہے۔ ہزاری عورت کے کردار اور

اس کی ان خصوصیات کو پوری طرح بے نقاب کر دیتا ہے جو اس جماعت کی عورتوں کی زندگی کا امتیاز سمجھی جاتی ہیں۔

تیسری مثال میں ابتدائی منٹو نے عین شہدہ کی جو باریک بینی ہے وہ خود اپنی جگہ منٹو کے طرزِ فکر کی ایک خصوصیت ہے لیکن

جس عورت کے ہاتھ سے وہ موڑیاں نیچے گر رہی تھیں اس کے لیے منٹو کے دل میں گھن بھی ہے اور نفرت بھی۔ اس گھن اور نفرت کا

اظہار کرنے کے لیے اکثر گھنے والوں کو جو کچھ منٹو نے غوطہ زنی کر کے نہ جلتے کیسے کیسے جو بار بار دہلنے کے ٹکڑے ہیں لیکن منٹو کے پاس شہدہ

سے شہدہ جذبہ کے اظہار کے لیے آسان سے آسان لفظ موجود ہیں اور ان لفظوں کو ایک ایسی ترتیب دینا کہ منٹو کے طرزِ فکر کی عین عینیت تو

سادہ و مختصر ہو جائے لیکن اس کی معنویت کی گئی زیادہ ہو جائے منٹو کی قدرتِ بیان کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ ادنیٰ اس لیے کہ یہ کرشمہ

کبھی کبھی نہیں ہمیشہ طور پذیر ہوتا رہتا ہے۔

یہی صورتِ مثالِ نمرہ ۱۸ کی ہے جہاں منٹو نے اسی طرح کی ایک اور عورت کا ذکر کیا ہے جو ان کے نزدیک قابلِ نفرت نہیں ہے

لیکن نفرت اگر ایسے لفظوں کے ذریعہ ظاہر کی جائے جو یہی طور پر جذبہ نفرت کے مظہر ہوں تو بیان میں عمومیت آجائے منٹو نے اپنے

انداز کو ہمیشہ عمومیت سے بچایا اور سادگی کی بیان کو گہری معنویت کا ترجمان بنایا ہے۔

مثال نمبر ۱۰ تاثر الجھڑی کی خصوصیت کے لحاظ سے اوپر کی دونوں مثالوں سے ملتی جلتی ہے، فرق صرف یہ ہے کہ بیان پیرنٹ کی ایک سادہ سی مثال نے پڑھنے والے کے لیے جلی شوشو کے نام میں وہی لذت پیدا کر دی ہے جس سے افسانہ نگار کا دل پوری طرح آتا ہے۔

مجھے اور ساتویں مثال نمبر کے انداز بیان کی ندرت اور قدرت کلام کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ نثر نگار نے کیا کے شدید سے شدید تاثر اور اس کے دل کے نازک سے نازک اور لطیف سے لطیف جذبہ کا بیان ایسے لفظوں میں کرتے ہیں کہ وہ شدید تاثر اور نازک اور لطیف جذبہ عجمی جو کہ پڑھنے والے کے سامنے آجاتا ہے۔ ایک غیر مری اور غیر مادی جس ایک محسوس اور مادی حقیقت بن کر نظر کے سامنے آتی ہے۔

آنکھیں اور بون متاویں نمبر کے دو نئے قصوات پیش کیے ہیں۔ بالکل اور مسقط کا ایک واضح نمونہ ہمارے ذہن میں موجود ہے اس لیے جب نمونہ بحث کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ وہ بالکل جو سکتی ہے یا اس کا استقاط ہو سکتا ہے تو ہمارے ذہن میں اس کا جو فروغ تاثر قبول کرنا ہے اس پر انھیں اور ندرت کی ایک نئی جلی کیفیت ہوتی ہے لیکن جب آہستہ آہستہ وہ نئے بیانیہ میں ان لفظوں کے مفہوم پر غور کرنا شروع کرتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ نمونے ایک گہرے تصنیف خیال کے اظہار کے لیے دو ایسے لفظوں کا انتخاب کیا ہے جو کسی طرح بھی اس فلسفہ اور فکر کا بوجھ اٹھانے کے اہل نہیں تھے لیکن نمونے کی جانب دینی کی بدولت ان دونوں معمولی اور حقہ لفظوں کی حیثیت بالکل بدل گئی۔ انھوں نے نہ صرف ایک ایسی حقیقت کا اظہار کر کے کیا بیانیہ سے کہہ دیں جس کے وہ اپنی ذاتی حیثیت سے اہل نہیں تھے بلکہ پڑھنے والے کے لیے سوچ بچار کے دروازے بھی کھول دیے۔ نمونے کے اسلوب کی قدرت پسندی نے بعض اوقات چھوٹے لفظوں سے بڑا کام لیا ہے اور اس طرح معمولی لفظوں میں فنی طور پر ایک گہرائی اور بزرگی پیدا ہو گئی ہے۔ ————— یہی صورت ان دونوں مثالوں میں ہے۔

دوسری سے لے کر پندرہویں مثال تک ہر جگہ نمونے بہت فرق کے ساتھ نمونے کے طرز اور اسلوب نگارش کی اس خصوصیت کا حامل ہے کہ وہ کسی کردار کی ذہنی کیفیت کی ساری شدتوں اور گہرائیوں کو کبھی بالکل سادہ محسوس سے کبھی ایسی تشبیہوں اور مثالوں سے جو دوسرے لکھنے والے کو یقیناً اس موقع پر سب سے محل معلوم ہوتیں جہاں نمونے انھیں کا بیانیہ سے جڑتا ہے اور کبھی بہت ہی جلی واضح تصویروں سے اس طرح بیان کر دیتے ہیں کہ پڑھنے والا کسی طرح کی جبروت کے احساس کے بغیر اس جذباتی شدت اور گہرائی ممکن تاثر قبول کر لیتا ہے۔ ————— دل کی بات ایک زندہ اور مری حقیقت بن کر اس کے سامنے آکھڑی ہوتی ہے اور بالاعلان کہتی ہے کہ کہیں میں یہ سونے جھج جھج طرح پہچان لو اور دیکھنے والا ایک ہی نظر میں اس زندہ حقیقت کو اس طرح پہچان لیتا ہے کہ وہ اس کے لیے قابل فراموش بن جاتی ہے۔

سولہویں مثال میں نمونے کے اسلوب کی یہ خصوصیت نمایاں ہے کہ کسی واقعہ یا کردار کے سلسلہ میں قاری کو کوئی غیر متاثر فوراً دوسرے جگہ سے اس خبر کی وضاحت کرتے ہیں اور اس وضاحت کے بعد واقعہ کا وہ پہلو یا کردار کی وہ خصوصیت کی کیفیت جس کا بیان خصوصاً آئینہ کی طرح روشن اور صریح کی طرح نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔

سترہویں مثال بھی اسی طرح کی وضاحت کی ایک دوسری شکل ہے۔ یہاں افسانہ نگار نے ہمیں ایک نمونہ کہہ کر سنائی کہ محبت

ایک عام چیز ہے اور اس خبر کی وضاحت کے لیے جو مثال پیش کی وہ قطعا مذاق اور طعنے کی ایک بات معلوم ہونے کا وجود اس قدر منطقی ہے کہ نہ فی نفسہ والا اسے جھٹلانے کی جرات نہیں کر سکتا۔ منٹو کے فلسفہ کی طرح ان کی منطق بھی غیر معمولی سمجھانے کی محتاج نہیں یہاں بھی سادگی بیان اور آسان ترین بات کو حد درجہ معمولی سمجھ کر اس کی کامیت بڑھانے کی خصوصیت بڑھ کر سامنے آتی ہے۔

آخری مثال میں بھی منٹو کے نگار اور اسلوب کی اسی خصوصیت کی آمیزش اور مزاج ہے جہاں نگار سے خیال اور سببی سادی عبارت اور معمولی سی تشبیہ کو اس طرح ایک ہی زنجیر کی کڑیاں بنایا جاتا ہے کہ پڑھنے والا سب سے گہرا گہری باتیں اور فلسفیانہ حقیقتیں واضح کرنے کا ہنر اپنا اور نثر میں انداز وہ ہے جسے منٹو نے اپنا ہے۔

منٹو نے اپنے افسانوں میں سید سے سادے روزمرہ کی بول چال کے جملوں سے ایسی مثالیں اور تشبیہوں سے جو دوسروں کی نظر میں باطل و غیرہ اور بے حقیقت ہیں اور ایسے جتنے ہوتے فقروں سے جن میں سنجیدگی و ممانت کا شائبہ تک نہیں ہوتا نگہری سے نگہری، سمجھ سے سمجھ اور مزوثر سے مزوثر بات کہنے کا کام لیا ہے اور ہر جگہ اس سادگی اور عمویت کو تصور آؤں، منٹو تشبیہ اور خیال اور زبان بنایا ہے۔ پھر بھی بہت کم مقامات ایسے ہیں جہیں پڑھ کر تلافی کے دل میں یہ بات آتی ہو کہ دو مردوں کے فکر اور خیال کی شمع جلانے والے منٹو نے یہ باتیں کہنے کے لیے اپنے ذہن پر زور دیا ہے۔ منٹو نے جو کچھ کہا ہے اس میں آدوٹا کو نہیں، ایک ایسی بات جو حقیقت کے زور اور اس کے بے لوث خلوص کی مظہر ہے۔ منٹو کے پورے اسلوب پر بھی یہی منطقی اور بے ساختگی چھانی جاتی ہوئی ہے۔ اس کا پورا پورا منٹو کی تشبیہوں میں بھی نظر آتا ہے جو اس کے نثر کی فن کے بڑے صباغین ہیں۔ ایسے تینوں کی منٹو کے نثر میں کوئی کمی نہیں۔ بے شمار تشبیہوں میں سے چند پر نظر ڈال کر اندازہ لگا لیتے کہ منٹو کا ہر رنگ اور ہر صفت فن ان تشبیہوں سے کب کب اور کس طرح کام لیتا ہے۔

اسناد منٹو نے فوجی گوروں کے چہرے کا تصور بنارے سامنے پیش کیا ہے وہ کس قدر مکروہ اور گھٹاؤنا ہے:-

”ان کے لال جھلیں بھرے چہرے دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آ جاتی ہے جس کے جسم پر سے اوپر کی پھٹی گل کر جھڑی ہو۔“ (نیما قانون)

منٹو کے دل میں یا منٹو کے کسی کردار کے دل میں، کسی چیز، کسی واقعہ یا شخص کا جو تصور ہے اسے دوسرے کے ذہن تک جوں کا توں پوری طرح منتقل کرنے کے لیے منٹو کے پاس الفاظ، فقرے اور جملوں کی کمی نہیں۔ اسی طرح ان کا ذہن ناہرہ شکل منٹو کے ذہنی اور جذباتی تجربہ کو اس کی مکمل نقل و کتبوں اور الفاظوں کے ساتھ دوسروں تک پہنچانے کے لیے ایسی تشبیہیں وضع کر لینے پر قادر ہے جن کی بدولت کسی اور کا ذہن منٹو کی ہی منٹو بن جاتا۔ یہی خصوصیت اوپر کی مثال میں ہے۔

منٹو جس طرح الفاظ اور جملوں کے ذریعہ محبت، نفرت، حقارت، رشک، حسد، خلوص، صداقت اور دھوکہ کرم کے احساسات میں قاری کو پوری طرح اپنا بنو جاتا ہے اسی طرح تشبیہوں کی مدد سے — اور اکثر بالکل معمولی تشبیہوں سے — وہ ہر طرح کے احساس اور جذبات کو اس طرح جیتا سا گنا کر پڑھنے والے کے ذہن میں اتار دیتے ہیں کہ وہ جذباتی طور پر اپنے آپ کو افسانہ نگار کے سپرد کر دیتا ہے۔ — اسناد منٹو کی زبان سے بار بار دہائیوں کی عمر بچوں کی کھٹیاں میں گھسے ہوئے کھٹیلے بٹائے اور اس بات کو اس طرح مکمل کرتے ہیں کہ ”نیما قانون ان کے لیے کھوٹا ہوا پانی ہو گا۔“ منٹو کے فن کی یہ خصوصیت قابلِ ملاحظہ ہے۔

جب استاد بنگو کی گاہ پر گورسے کی آنکھوں سے چاہے نہیں تو ایسا معلوم ہوا کہ یہ ایک وقت آئینے سامنے کی بندہ توں کی گولیاں خارج ہوئیں اور آپس میں ٹکرا کر ایک آتشیں گولہ بن کر اوپر کو اڑ گئیں۔ بندہ توں سے نکلی ہوئی گولیاں کی تشبیہ میں کوئی شبہ نہیں لیکن اس کے برعکس صرف نے ایک شدید احساس کو ایک واضح اور مری شکل دے دی ہے۔

ایسی تشبیہیں جن میں بولوں بظاہر کوئی نیا بن نہ ہو دوسروں کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتیں بلکہ بول کا ڈور اس قصور جھینڈ دیتا ہے۔ جن میں ہر زور میں مشابہت تلاش کر کے اسے بڑی بے تکلفی سے صرف کرنا سہا اور ایک معمولی اور بظاہر بے حیثیت سوشلسٹ ایک مکمل طور پر حاصل اور ایک نئے سے توجہ کی محاسن بن جاتی ہے۔ بندہ توں سے نکلی ہوئی گولیاں جیسے اور بہت سی سیدھی سادہ اور اپنے ناظر کے معاملے سے ایک تشبیہیں مٹوئے۔ افسانہ میں نہ مقدمہ پر مبنی ہیں۔ ایسی چند مثالیں ملاحظہ کیجئے:-

”وہ بڑی خوفناک عورت تھی۔ اس کا منہ بچہ اس انداز سے کھلتا تھا جیسے میوں چوڑنے والی تشبین کا کھلتا ہے۔“ (پچان)

”اس کی آنکھیں مست تھیں اور ہنر کا تارہ زخم کے مانند کھلے جھٹے تھے۔“

(شوشر)

خوشیا کے مردانہ وقار کو اس بات سے سخت دھکا لگے کہ کھانا پر مبنی اس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی اور اپنی اس حرکت کا جواز یہ کہہ پیش کیا کہ ایک بچہ ہے۔ اپنا خوشیابی تو ہے۔ یہ بات خوشیا کے دماغ میں طرح طرح کے روپ بھر کر اسے سنائی اور پریشان مرقی ہے۔ ان بے شمار روپوں میں سے ایک یہ ہے:-

”خوشیا زہرا سالوہ بلا ہو گیا جو اس کے بہتر بہ وقت ڈھنسا رہتا ہے۔“

(خوشیا)

”باجھ“ میں ایک منظر کا تصور مٹوئے اس طعن پیش کیا ہے:-

”کبھی کبھی کسی آنے یا جانے والی موٹر کے دارن کی آواز بلند ہوتی اور یوں معلوم ہوتا کہ بڑی دلچسپ کہانی سننے کے دوران کسی نے زور سے ہوس کی ہے۔“

تبدیلی بھی بے معمولی نہ ہو لیکن اس تک مٹوئے کو کسی اور کے مذہب کی کراسائی اسے بغیر معمولی بھی بنا دیتی ہے اور بدلتی محض کی طرف اشارہ دیا کرتی ہے۔

”مکملی ————— ہوں سمجھنے لگاؤں کے راستہ بچھڑا ہوا مسید شائیں شائیں کرتا آتا کسے دل میں اڑ گیا۔“ (نعرہ)

”ابا بار یہ دو گالیاں جو سہم نے بائیں پان کی ایک کے مانند اپنے منہ سے اگل دی تھیں اس کے کالوں کے پاس نہ ہر بی بوڑوں کی طرح جھنجھٹا شرم کر دیتی تھیں۔“

(نعرہ)

”دو گالیاں جیسے اس نے اپنی لڈ سے وار کر رہی ہیں سے دو ٹھل نکال کر پھینک دیے
ہیں۔“
(نعرہ)

دو گالیاں — — اس کے بچے میں آئی کہ اپنے سینے کے اندر راتھ ڈال کر وہ ان دو
پتھروں کو جو کسی جیلے لگتے ہی نہ تھے باہر نکال لے۔
(نعرہ)

ایک گالی باد و گالیاں — میرے اور آپ کے لیے دو مٹی سناٹی بے حقیقت باتیں ہیں جنہیں آدمی جمع سے شام تک
ہر ایک کے منہ سے نکلے گئے ہیں لیکن بشو لال کے دل پر ان گالیوں نے جو اثر کیا ہے اس کی شدت اور ٹرپ کو منٹو ان گنت تشبیہوں کے
ذریعہ پوری طرح واضح کر دینے پر قادر ہیں۔ اوپر کی چاروں تشبیہوں میں کوئی نیا پن نہیں لیکن ان زبردست تشبیہوں سے نمونے بار بار جو کام دیکھتے
اس سے عموماً یہ تشبیہیں پیدا ہوتی ہیں یہ سہل سمجھتے ہیں کہ آئی آئی ہے۔
منٹو نے ایک ہی تشبیہ سے ایک بہت وسیع منظر کی تصویر کھینچنے اور فصاحتاً مکر کرنے کی جو حد مت لی اس کی حید اور تصویریں دیکھیں
پہلی، دوسری، دسواں کی ہیں:-

”مگر کچھ ایسی ہی کیفیت کا حامل تھا بزرگ کے چڑنے پہن کر چلنے سے پیدا ہوتی ہے:-

(دسواں)

”ایک کبوتر اور ایک کبوتری پاس پاس پر پھلے بٹھے تھے۔ ایسا معبود مہنا تھا
کہ دونوں درجہ سخت کی ہوئی بندیا کی طرح گرم ہیں۔“
(دسواں)

”وہ کچھ اس طرح مٹی جیسے کسی نے ہندی سے برہمنی کپڑے کا نشان کھول کر نیچے پھینک
دیا ہے۔“
(نصیری کی مٹی)

وہ ایک منہ سے وار تشبیہیں اور دیکھتے اور اندازہ لگائیے کہ منٹو چیزوں کو کیسے کیسے کو شوں میں سے نکال کر منظر عام پر لانا اور
چڑھنے والے کے ذہن کو ہمہ دم ایک نیا نقش بنانے میں مدد دیتے ہیں:-

”یہ اسٹاک کا لٹی عجیب چیز ہے پر سے چوٹن کر کے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسٹاک
بنی رہا ہے۔“
(مجدد)

”اپنے آپ کو چھپانے کی غرض سے کوشش میں وہ ایک ایسا بے جان لطیفہ بن کے
رہ گیا تھا جو بڑے ہی غامض انداز میں سنایا گیا ہوتا۔“
(مجدد)

”وہ کر رہی پر اس انداز سے اکیلا بیٹھا تھا جیسے شطرنج کا پٹا ہوا ہوا بساط سے بہت دور
پڑا ہے۔“
(مجدد)

”اس کی شرات اب دم کنی ٹکری بن کر رو گئی تھی۔“ (بجود)

”نئے سال کی آمد پر وہ خوش تھا۔ جس طرح اکھاڑے میں کوئی نامور پہلوان اپنے
نئے مقابل کی طرف خرم ٹھونک کر بڑھتا ہے۔“ (نیاسال)

یہ سب تبسمیں پڑھنے والے کے تصور اور تخیل کو زندگی کی ایک لہر دے کر، اسے ایک ایسی تصویر بنانے میں مدد دیتی ہیں جس کا ہر رنگ ٹیکھا اور مقلش واضح ہے۔ منٹو کی تشبیہوں کا یہ اعتبار ہے کہ ان میں سے کوئی نہ زندگی کی ٹرپ اور تیزی سے خالی نہیں۔ ہر تشبیہ کے پیچھے ایک مکمل اور واضح تصویر چھپی ہوئی ہے جسے منٹو کی فنی چابک دستی اس طرح بر محل استعمال کرتی ہے کہ پڑھنے والا اس تصویر کا پورا اثر قبول کرتا ہے اور وہی ذہنی اور جذباتی نتائج اخذ کرتا ہے جو افسانہ نگار کے ذہن میں ہیں۔ منٹو کا اسلوب اظہار جس میں الفاظ، فقرہ اور تشبیہوں کو یکساں اہمیت ہے۔ مکمل تاثیر کی تکمیل کو اپنا نصب العین بناتا ہے اور شاید بہت کم محسوس ایسے ہیں جن پر اسے اپنا فنی مقصود حاصل کرنے میں پوری کامیابی حاصل نہ ہوتی ہو۔ اس کی اس کرایائی میں تشبیہوں کے علاوہ ایک اور خاص چیز بھی دخل ہے۔ اور وہ ہے تکرار۔

نظر اور منٹو کی اسلوب اظہار کی ایک ایسی خصوصیت ہے جسے نثر سے زیادہ نظم میں برتا گیا ہے لیکن اردو اور فارسی میں عموماً تکرار کو ایک صنعتی صنعت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اس لفظی صنعت سے لکھنے والوں نے عموماً ملوثی ترنم اور تاثیر چھڑی کا کام لیا ہے۔ گو کبھی کبھی یہ اثر محض صوتی ترنم کو اثر کے علاوہ جذباتی کیفیات کے اظہار کا وسیلہ بھی بناتا ہے۔ مثلاً میں مغربی اسالیب کے اثر سے لفظوں اور فقرہوں کی تکرار خاص عام ہو گئی ہے۔ چنانچہ ہمارے افسانہ نگاروں کے یہاں جا بجا اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن کسی افسانہ نگار نے اظہار کے وسیلہ کو اپنے فنی اس طرح شامل نہیں کیا جیسے منٹو نے۔ منٹو کے مشہور افسانوں میں سے خوشیا، نغمہ، جلاؤز، ہنسک، نیانا، لونا اور نسبتاً کم معروف افسانوں میں ان کو کا پچھا اور قہقہہ اس فن کے ترے کا مایہ مظہر ہیں۔

دو تین افسانوں پر نظر ڈال کر دیکھئے کہ اس تکرار سے منٹو نے کیا کام لیا ہے۔

”نغمہ“ میں کیشو لال اپنے سیٹھ کے ساتویں منزل والے بالا خانے سے نیچے اترتا افسانہ نگار کے لفظوں میں :-

”اسے یوں محسوس ہوا کہ اس سنگین عمارت کی ساتویں منزلیں اس کے گاندھوں پر دھری گئی ہیں۔“

اس لیے کہ دو جیسے کا کرایہ ادا نہ کرنے کی سزا میں سیٹھ نے اسے دو گالیاں دی تھیں اور دو گالیاں اس کے پورے وجود میں عافی جاتی تھیں۔ ان گالیوں کے کیشو لال کے دل پر جو کچھ مرتب رہی ہے اس کے اظہار کا بہترین ذریعہ منٹو نے تکرار کو بنایا ہے۔ یہ گالیاں اس کے ذہن اور جذبات بلکہ اس کے وجود پر کس طرح چھائی ہوئی ہیں اس کی تفصیل منٹو کی زبان ہی سنئے :-

”..... مالک مکان نے مجھے اسے آکر اسے گالی دی۔ گالی..... یوں لگنے لگی کہ انوں کے رستے کھل چکا ہو اس پر شاہین شاہین کرتا اس کے دل میں اڑ گیا اور اس کے سینے کے اندر جو بڑھ چکا اس کا تو کچھ ٹھکانا ہی نہ تھا۔“

”اس کے جی میں آئی کہ اس گالی کو جسے وہ بڑی حد تک نگل چکا تھا، سیٹھ کے بچہ پاپے کے چہرے پر تے کر دے مگر وہ اس خیال سے باز آ گیا کہ اس کا غرور تو باہر نٹ پانچہ پر پڑا ہے۔۔۔۔۔“

”سیٹھ نے اسے پوچھا کہ دی۔ اتنی ہی موٹی جتنی اس کی چربی بھری کر دیں مگر اسے بچوں کا کہ کسی نے اوپر سے اس پر کوڑا کرکت پھینک دیا ہے۔۔۔۔۔“

”ایک نہیں دو لگائیں۔۔۔۔۔ بار بار یہ دو لگائیں جی سیٹھ نے بالکل پان کی بیک کے مانند اپنے منہ سے اگل دی تھیں اس کے کانوں کے پاس زہریلی بھڑوں کی طرح بعضہا، شروع کر دیتی تھیں اور دھنخت بے چین ہو جاتا تھا۔“

”چلتے چلتے ایک نکتے سے اس کی ٹلموٹی۔ کتے نے اس خیال سے کہ شاید اس کا زخمی پہیل، یا کیا ہے چاقوں کیا اوپر سے ہٹ گیا اور وہ کچھ کو سیٹھ نے اسے پوچھا کہ کی سی ہے۔۔۔۔۔ گالی۔۔۔۔۔ گالی ٹیک اسی طرح اس سے اٹھ کر رہ گئی تھی جیسے بھڑی کے کانٹوں میں کوئی پڑا۔ وہ زخمی کوشش ہے آپ کو چھڑانے کی کرتا تھا اتنی ہی زیادہ زخمی ہوتی جا رہی تھی۔“

”سیٹھ نے ایک گالی دی اور وہ کچھ نہ بولا۔۔۔۔۔ وہ سری گالی دی تو لمبی وہ خاموش رہا جیسے وہ مٹی کا پیلا ہے۔۔۔۔۔ بڑی کاپٹلا کیسے ہوا؟ اس نے ان دو گالیوں کو سیٹھ کے ٹھوک بھرے منہ سے نکلنے دیکھا جیسے دو بڑے بڑے چہرے مورچوں سے باہر نکلے ہوں۔“

”جب اس کے سامنے ایک برٹرنے اپنے ماتھے کی تکیاں روشن کیں تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ دو گالیاں لکھیں کہ اس کی آنکھوں میں دھنس گئی ہیں۔“

”لگائیں۔۔۔۔۔ لگائیں۔۔۔۔۔ کہاں تھیں وہ دو گالیاں؟ اس کے جی میں آئی کہ اپنے سینے کے اندر راتا تھا ال کر وہ ان دو تھوڑوں کو کہ کسی جیلے گلے ہی نہ تھے باہر نکال لے اور لکھی

بھی اس کے سامنے آئے اس کے سر پر دے مارے :

”اس کا دماغ آگ کا ایک پتھر بن گیا۔ اس پتھر میں اس کے سارے پیرائے اور
نئے خیال ایک دھڑکی جوت میں گدھو گئے۔۔۔۔۔ دو مہینے کا کرایہ اس پتھر کی دھڑک
میں دھڑکتے لے کر جانا۔۔۔۔۔ سات منزلوں کے ایک سرباز دھڑکتے سمیٹھکی ہتھیری
آواز اس کے سر پر سٹکراتا جو بجلی کا پیپ او۔۔۔۔۔ یہ موٹی کالی۔۔۔۔۔ پھر دوسری
۔۔۔۔۔ اور اس کی خاموشی۔۔۔۔۔ یہاں پہنچ کر آگ کے اس پتھر میں پڑ پڑ کو لیاں ہی نکلتی
شر و جوحاں میں اور اسے ایسا محسوس ہوتا کہ اس کا سینہ پھٹنی ہو گیا۔

نعرہ میں کامیوں والے وانگو کی مگر اسے فٹو نے آہستہ آہستہ کیسٹو لال کے ہنسی اور جذباتی بھجوان کو واضح کرنے میں مدد
دی ہے اور اس تکرار اور بٹھنے دہنے میں کمال ہم آہنگی پیدا کر کے اس انجام کے یہ نفسیاتی اور فنی جواز پیدا کیا ہے جس میں کمال خیال
کے دل کا سارا درد اور اس کی شخصیت کا سارا کرب و اضطراب سمٹ کر وہ نعرہ ہی کیا جس سے کیسٹو لال کے دل کو مزہ و تسکین مل
گئی لیکن کھینے والوں نے صرف یہ نعرہ کیا کہ ”گلا ہے۔۔۔۔۔ فٹو اپنے فحش فسانے کی تمہید اس کی اٹھان اس کے منتظر معروض
اور اس کے انجام کو جو اہمیت دیتے ہیں اور ان مختلف مراسل کے درمیان پرے غلوں اور اٹھاک سے ربط و تسلسل کا جو رشتہ قائم
کرتے ہیں وہ نعرہ ”ہیں گالیوں کے ڈر کہ تمہارا سے پورا ہوا ہے“ تکرار ہی نے اس فسانے میں ایک خاص کردار کی دوہنی کیفیت کے
اضطراب کی مصدوری کی ہے تکرار ہی نے فسانہ کو آہستہ آہستہ فحش کی طرف لے جا کر ایک سوچے سمجھے انجمنہ نام پچایا ہے اور تکرار
ہی نے اس نازک نگین کی ہے جو قاری کے نقطہ نظر سے اس کا مقصد ہے۔

”بلوڑ، شباب کی نازک اوجہاں گما زمنزل میں قدم رکھنے والے سوچن کی اس جھنجھ بیداری کی کہانی ہے جس کے معنی اسے
خود بھی اچھی طرح معلوم نہیں۔ اس نازک نفسیاتی منسوج کی کہانی فٹو نے چند اشارات اور تصورات کو ایک ہی لڑی میں پرو کر تصورات کی
تکرار کی زبانی سنائی ہے۔ اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ ایک دن میں لو :

”شکید کی سفید نعل میں کالے کاسے باون کا ایک پتھر نظر آگیا۔۔۔۔۔ یہ گچھا سے بہت

بھلا معلوم ہوا۔ ایک سنہی ہی اس کے سارے بدن میں، ڈر گئی۔ ایک عجیب و غریب

خواہش اس کے دل میں پیدا ہوئی کہ یہ کالے کالے بال اس کی پچیس بن جائیں۔“

مومن کے دل میں اس کے بعد صندے صندے خیال پیدا ہوتے رہے لیکن وہ ان کا مطلب سمجھنے سے قاصر رہا اور آخر

ایک دفع جب اس نے اپنا ٹرانک کھول کر اپنے عید کے لیے بنے ہوئے نئے پتھروں پر نظر ڈالی تو۔۔۔۔۔

”روٹی کا خیال آئے ہی اس کے سامنے اس کا ٹھنڈا آگیا اور ٹھنڈا فورا ہی ان

کالے کالے بالوں کے کچھے میں تبدیل ہو گیا جو اس نے شکیلہ کی بغل میں دیکھا تھا۔

اور پھر کمرہ صاف کرتے ہوئے اس نے سائٹن کی چمکی کی کترنہ اپنی جیب میں رکھ لیں اور گٹے دن یوں ہی الگ چمک کر ان کے دھانگے الگ کرتے شروع کر دیے.....

”جتنی کہ دھانگے کے چھوٹے ٹپسے ٹپسوں کا ایک گچھا سا بن گیا۔ اس کو ہاتھ میں لئے کروہ و بانارہ، مسندارہ، فیکین اس کے قصور میں شکیلہ کی وہی مثل لپٹی جس میں اس نے کالے کالے بالوں کا ایک چھوٹا سا گچھا دیکھا تھا.....“

اس کے بعد وہ جب بھی اندر آ کر بلاؤں کو دیکھتا تو.....
 ”... اس کا خیال فوراً ان بالوں کی طرف دوڑ جاتا جو اس نے شکیلہ کی بغل میں دیکھے تھے۔
 اور بالآخر ایک رات کو.....

”... جب وہ سویا تو اس نے نچٹی اوٹ پٹا ننگ خواب دیکھے۔ ٹپٹی صاحب نے پتھر کے کونٹوں کا ایک بڑا بڑا صیرا اس سے کوٹنے کو کہا۔ جب اس نے ایک کونڈا اٹھایا اور اس پر پتھوڑے کی ضرب لگائی تو وہ نرم نرم بالوں کا ایک گچھا بن گیا۔ یہ کالی کھانڈ کے مہین مہین تار تھے جن کا گولہ بنا ہوا تھا۔ پھر یہ گولے کالے رنگ کے خبار سے بن کر ہوا میں اڑنے شروع ہوئے۔ بہت جلد جا کر یہ پھٹنے لگے۔ پھر اندھی آگئی اور مومن کی روفی گئی کا پھندنا کہیں غائب ہو گیا۔ پھندنے کی تلاش میں نکلا۔ کبھی اور آن کچھ جگہوں پر گھومتا رہا۔ ایک کالی سائٹن کے بلاؤں پر اس کا ہاتھ پڑا۔ کچھ دینک وہ کسی دھڑکنے والی چیز پانا ہاتھ پھیرتا رہا۔ پھر دفعتاً ہڑبڑاکے اٹھ بچھا۔ تھوڑی دیر تک وہ کچھ سمجھ سکا کہ کیا ہو گیا ہے۔

اس فنیاتی افسانے کی فنی ترتیب اس کے اٹھان، اس کے رقصانہ اس کے نہننا اور اس کے انجام اور پھر سب کے باہمی ربط اور توازن میں غلطیوں کے ایک خاص قصور کی نمونہ کو فن کی بنیاد بنایا ہے۔ افسانے کے مرکزی کردار نے ذہنی کشمکش کے جو مراحل طے کیے ہیں ان کے اظہار کے اور طریقے بھی ہو سکتے تھے، لیکن غلطی کے اس افسانے کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے قصورتانہ کی جس نمونہ کو ایک خاص تاثر پیدا کرنے کا فنی وسیلہ بنایا ہے وہی وسیلہ اس مقصد کے حصول کا بہترین ذریعہ ہو سکتا تھا۔ فنکار کی حیثیت سے غلطیوں نے اپنے لیے یہ اعتبار مخلص رکھا ہے کہ جب کسی خاص عمل پر یہ فنی اسلوب سے کوئی تاثر پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہی فنی اسلوب اس عمل کا بہترین اسلوب معلوم ہوتا ہے۔ غور اور بلاؤں کی مثالوں سے غلطی کے فن میں نمونہ کی جس اہمیت کی وضاحت ہوتی ہے وہی ایک نئے اسلوب سے بہتک، خوشنیا، انوکھا پنٹھا اور قبض جیسے افسانوں میں

لہی، جاگر ہوتی دکھائی دیتی ہے۔

منٹو نے انھار کی طرح 'تضاد کو لہی اپنے تاثرات کے انھار کا ایک وسیلہ بنایا ہے اور اسے طرح طرح سے اپنے افسانوں میں برتا ہے۔۔۔ ہماری سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی زندگی میں تھروں کا جو حیرت انگیز تضاد ہے اسے منٹو نے ہمیشہ بڑے اندیشہ اور تشویش کی نظر سے دیکھا اور اپنے افسانوں کے ذریعہ اس تضاد کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ سماج کے مختلف طبقوں میں اونچے نیچے اور معاشرتی اور معاشی کشمکش زندگی کے متغیر و مختلف افراد کے خیالات اور نظریات میں اختلاف اور ضد، ایک ہی فرد کے ظاہر اور باطن میں بریکی فرق اس تضاد کی بعض نمایاں شکلیں ہیں۔ منٹو نے اس تضاد کو اور اس کے علاوہ زندگی کے مختلف شعبوں میں ظاہر ہونے والے یہ ایسے تضاد کو جو انسان کو قریب میں مبتلا کرتا اور اس کے سکون و مسکن کی بربادی کا باعث بنتا ہے، ایسے محبوب اور اسے جس میں لفظ، فقرے اور افسانے کے مختلف اجزاء مل جمل کر ایک سندست انجام دیتے ہیں بے نقاب کیا ہے۔

تضاد کی مختلف صورتیں کس کس شکل میں ان کے افسانوں میں نمایاں ہوتی ہیں اس کی چند مثالیں ملاحظہ کیجئے۔ پہلا اقتباس نعرہ کا ہے جس میں کیشو رائے کے جذبات کی مستوری میں نصیحتات کے اس تضاد سے، دلی ہی ہے جو طبقاتی اور نجی کا پیدا کیا ہوا ہے۔۔۔

”اس گھر کا اندھا صیپ کئی بار بجلی کے اس بلب سے ٹکرایا جو مالک مکان کے گنجانے کے اوپر مسکار رہا تھا کئی بار اس کے چہرے کے کپڑے ان گھنٹوں پر ٹپک کر، پھر اس کے بدن سے چمٹ گئے، جو دیوار میں لٹری چمک ہی تھیں۔“

اسی طبقے تضاد کی ایک شکل بلاؤز، میں اس طرح دکھائی دیتی ہے۔۔۔

”... تو کروں کے متعلق کون ٹوک کر تہے، پچھن سے نے کر ٹھہرے ٹانگ وہ

تمام نمز میں بدل طے کر جاتے ہیں اور اس پاس کے آدمیوں کو خیر ناک نہیں ہوتی۔“

دو کردار ایک ہی صورت حال کو اپنے اپنے جذبات اور تصورات کی روشنی میں کس کس رنگ میں دیکھتے ہیں اس کا انھار، ہٹنک، میں کی جگہ ادھو اور سوگندی کے جذبات کو واقعات کی شکل دے کر کیا گیا ہے۔ ان ہی تصویروں میں سے ایک یہ ہے۔

”ایک ہاتھ سے سوگندی سے پکڑی والے کی تصویر تائی، ی اور دوسرا ہاتھ اس فریم

کی طرف بڑھایا جس میں مادھو کا فوٹو چڑھا تھا۔“ ادھو اپنی جگہ سمٹ گیا جیسے ہاتھ اس

کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایک سیکنڈ میں فریم کی سمت سوگندی کے ہاتھ میں تھا۔

نور کا تعقید لگا کر اس نے ”اونہ“ کی اور دونوں فریم ایک ساتھ کھڑکی میں سے

باہر پھینک دیے۔ دو منٹوں سے جب فریم زمین پر گرے اور پختہ ٹوٹنے کی آواز

آئی تو ادھو کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ہے بری شکل سے

اس نے غصہ کرنا تھا۔ ”اچھا کیا۔۔۔“ مجھے بھی یہ فوٹو پسند نہیں تھا۔“

آخری جملہ میں ملاحظہ کرنے کو کہ جسے وہ اس کے دل کی بات نہیں۔ اس مجبور نے اور بے بسی نے ایک پُر فریب بھڑکتی شکل اختیار کی ہے۔۔۔۔۔ اس مجبوری اور بے بسی اور ظاہر و باطنی کے تضاد کی ایک اور تصویر دیکھئے۔۔۔۔۔
 ”..... ملاحظہ فرمائیے۔ وہ گوی ہوئی کوئی اٹھانے کے لیے تھکاؤ کو گننے کی گرت
 کھانی دی، خیر دار۔۔۔ پڑی بہنے دے دیں۔۔۔ تو مابقی سے پوچھا پچھتے ہیں
 اس کوئی آؤ رگڑ کر دے گا۔“

سو گندی کے اس تعلق سے جو ہے جگہ میں کی تضاد ایک جگہ اکٹرا جمع ہو گئے ہیں۔۔۔۔۔ ایک تضاد تو وہ ہے جو گندی کے ان جذبات کی شکل میں ظاہر ہوا ہے جن میں حالات نے ایک نمایاں ترقی، اور انقلاب پیدا کیا ہے۔۔۔ وہ تضاد اس طرز میں پیدا ہے جس میں سو گندی ایک ایک لفظ کو بجا رہا ہے۔ تیسرا تضاد الفاظ کے اس غور سے ظاہر ہے جو کہ اسے جوئے واقعات اور موجودہ صورت حال میں تضاد میں کر رہا ہوا ہے۔

”ہٹک، کا خاتمہ جذباتی تشنگی کے اس تضاد کی ایک نفسیاتی اور فنی کارائے تفسیر ہے۔۔۔
 ”ہست و ہست“ وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد جب اس کو اپنا دلی
 پر جانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے غم کو زندہ کئے اور گویا دھواں کو گویا
 کے چوڑے پٹی۔۔۔ برا سے پہلو میں لٹا کر گئی۔“

معاشرتی، جذباتی اور نفسی کیفیتوں کے تضاد کو ظاہر کرنے پر غور کو جو قدرت حاصل ہے اس کے علاوہ اس کے فنانس
 میں یہ تضاد بعض دوسری فنی اور فنی صورتوں میں بھی رونما ہوتا ہے۔ ان کے فن کے دوسرے پہلوؤں کی وضاحت کے لیے اس تک
 جو بہت سی مثالیں پیش کی گئیں ان میں ایک جگہ اس کے مختلف رنگ چھلنے دکھائی دیتے ہیں۔۔۔۔۔ مثلاً، ”دہ“ کے پورے افسانے میں ابتدا
 اور انجام کا تضاد دو طبقوں کی زندگی کے انداز کا تضاد اور دو آدمیوں کے ایک ہی بات کو دو تھماؤں میں دیکھنے کا تضاد اور پوری طرح نمایاں
 ہے اور اس کو ذکر کو ختم کرتے وقت محبت کے سلسلہ میں غم کی گوی ہوئی وہ بات اب بھی میرے ذہن میں تازہ ہے کہ حضرت آدم سے
 ماں بننا رنگ ہر انسان نے محبت کی ہے۔

مثلاً کے فن کی وہ ساری خصوصیتیں ہیں کا تعلق ایک طرف تو فن کے ان مطالبات سے ہے جن میں تکنیک کے مبادیات
 اور اس کے لوازم کہہ سکتے ہیں اور دوسری طرف زبان و بیان اور اظہار و بلاغ کے ان وسائل سے جن کی بدولت افسانہ نگار کا خیال
 اس کے تاثرات و تصورات دوسروں کے ذہن اور قلب میں جگہ کرتے ہیں لیکن افسانہ نگار کی زندگی کے متعلق جو کچھ کہتا ہے وہ صحیح شائد
 کی دوسرے اور کسی خاص تجربہ کی تفصیلات ہیں سے اپنے کام کی جزئیات منتخب کر کے تفصیلات کا مکمل مشاہدہ اور کسی خاص محل کی
 ضروریات کے مطابق ان میں سے موزوں جزئیات کا انتخاب، یہ افسانہ نگار کی زندگی کے فن کے جسے ضروری مطالبات ہیں۔ ہمارے اکثر
 اچھے افسانہ نگار ان مطالبات سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں۔۔۔۔۔ فوق صرف یہ ہے کہ ہر ایک نے اپنا مخصوص
 اور غرضانہ انداز تخلیق بنا کر جزئیات نگاری کا ایک نیا انداز قائم کیا ہے چنانچہ اس خاص نقطہ نظر سے غور کا ایک اپنا رنگ ہے جو کسی
 دوسرے کے رنگ سے نہیں ملتا۔ غم کو جسے ہمیشہ کسی واقعہ یا کردار کے تاثرات و فحش کی وضاحت کے لیے ایسی جزئیات کو زیادہ

اجیت دی ہے جس میں دوسرے عموماً فوجی کھڑے نظر انداز کر دیتے۔ غصہ میں طرح بیان و اظہار خیال کے معاملہ میں اور اپنے قصودات کی وضاحت کے لیے تشبیہوں کا استعمال کرتے وقت فوجی کو اہم اور غیر فوجی کو نہروری اور معمولی کو غیر معمولی پر ترجیح دے کر تاریکی شدت اور رہائی پیدا کرتے ہیں اسی طرح جزییات کے انتخاب کے سلسلہ میں بھی انہوں نے غلط ججہ اہم اور معمولی پہلو کو اہم اور غیر معمولی پہلوؤں پر ترجیح دی ہے اور اپنی سوریہ کو خواہ وہ واقعہ کی ہوا کردار کی انہیں معمولی رنگوں سے شغف اور نہ لکھا بنایا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل پندتاہوں میں دیکھئے :-

مار واپڑوں کو ان کے ٹھکانے پہنچا کر اس نے ان کی مین وینہ علاقہ کی روکان پر آدھو سیدھی کی تسمیٰ کر ایک ڈیڑھ گھنٹہ اور پچیس گھنٹہ میں دربار ان کو کھڑے ہوئے۔
ایسے ہی بلند آواز میں ملانہ بہت نیکی ایسی ہی تھی :-
یہ استاذ تعلیمین یا قانون میں :- اس افسانے میں اتنی کی دو تصویریں اور ملاحظہ ہوں :-
”جیسا تو فیہی کھچ کر ٹھکانے سہاری کر اس کی نڈال مقصود پر آدھو اور جب سے بھرٹ نکال کر بائیں ہڈی آتھو دو ٹھکانوں میں رہا کر ٹھکانا یا اور اکی شست کے ٹڈے پر پھیل گیا۔“

گھوڑے کی بائیں کھچ کر اس نے ناٹھ ٹھکانا اور پچیس شست پر بیٹھے بیٹھے کرے سے پوچھا :-

”صاحب بہادر ! کہاں جانا ٹھکانا ہے :-
اس سوال میں بلا کا طہ یہ انداز تھا :- صاحب بہادر کہتے وقت اس کا اور پر کا مڑھن ہوا
بیٹے کی طرف کھچ گیا اور پاس ہی کال کے اس طرف جو دھوم کھینک کے
تھنے سے ٹھوڑی کے بلانی تھنے تک چلی آئی تھی ایک لڑکے کے ساتھ گھری ہوئی۔“

انہی چھٹی چھٹی جزییات سے میں استاذ کو پوری طرح پہچاننے اور اس کی شخصیت کی گہرائیوں میں جذب ہونے کا موقع ملا ہے۔ ”پچھا“ میں گویا ان کے پناہی کا ذکر ایک جگہ اس طرح آیا ہے :-

”اس کو اپنے پناہی کی وہ دانت اچھی طرح یاد تھی..... اس کے پناہی لڑکے کے پاس
تھانے دار لنگٹ ہاند سے مل کی دھار کے نیچے اپنی کچی چھڑا کر کے اور بڑی قدر بڑھانے
مڑھنوں میں سے ام کا دس چوس رہے تھے۔“

”پچھا“ میں کچھ شب زندہ داروں نے جرم کردن کا جائزہ لیا تھا ان میں سے ایک کی تصویر بڑھنے یوں بنائی ہے :-
”کو نے میں ایک بہت بڑا پلٹ تھا جس کے پاسے رنگیں تھے۔ اس پر پناہی ہو جا رہا۔“

بجی ہوئی تھی تکلیفیں چٹا تھا جس پر نہ رخ رنگ کے بھول کر طے ہوئے تھے پلنگ کے ساتھ والی دیوار کا رخس پر تل کی ایک میلی بڑیل اور لڑکی کی کٹھنی پر لی تھی۔ اس کے دانتوں میں سر کا میل اور کئی بال چسپے ہوئے تھے پلنگ کے نیچے ایک بوٹا چمک تھا جس پر ایک کالی گرگانی رکھی تھی۔

”کپڑے اس کے خستہ حالت میں تھے لیکن میبلے نہیں تھے کوٹ کی استینوں کے آخری حصے اثراتِ شمعِ اعلیٰ کے باعث کھس گئے تھے اور پچھوٹے ٹکڑے ٹکڑے تھے۔“
(بانجھ)

”بادرپی نامہ میں گرمہ صالحوں کے دقت جب ہو ہے سے بو ہلکا تا اور بھگوس سے چھت میں ایک گرجی دوجاتی تو برہمن کے سنگے پیروں کو برہمن بہت حق پرستی“
(بلانڈ)

”وہ ساکوان کے لمبے اور چوڑے پلنگ پر اوڑھے ہوئے تھی۔ اس کی باہری جوا کا دھونک نکلی تھیں تنگ کی کانپ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں جو اس کی کانپ کے بائیں کے باعث پتے کاغذ سے جدا ہو جاتے۔ دائیں بازو کی بنا میں کان اور گوشت ابھرا تھا جو بار بار ہونٹوں کے باعث میل ثلث اختیار کر گیا تھا“
جیسے ہی ہونی مرغی کی کھال کا ایک ٹکڑا اڑا رکھ دیا گیا ہے۔“
(ہنگ)

یہ منو کی جزئیات نگاہ کی صفت چند شاہین ہیں اور ان کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ منو نے کسی واقعہ کی تصویر کشی کرنے کی ماحول یا منظر کا مجموعی تاثر قائم کرنے یا کسی کردار کی ظاہری ہئیت اور باطنی کیفیات بنانے کے لیے جو باتیں بیان کی ہیں ان میں کبھی چھوٹی چیز اور چھوٹی بات کو خوب اچھ کر نظر انداز نہیں کیا۔ منو فن کار بننا اور فن کار کے نزدیک کوئی بات اور کوئی چیز معمولی اور مستحکم نہیں ہوتی۔ دوسروں کو معمولی اور مستحکم نظر آنے والی چیزیں عامیہ معمولی تاثرات اور نتائج کی حامل بن گئی ہیں، بشرطیکہ فن کار انہیں صحیح انداز سے اور عمل رتنے پر قادر ہو اور یہ قدرت منو میں بدرجہ اتم موجود ہے چھوٹی چھوٹی جزئیات انہیں عزیز ملی ہیں اور ان کی نظروں میں محترم ملی جزئیات کی قدر چھاننے انہیں ہنر رکھنے اور مجتہد سمجھنے نے منو کے فن کو انہیں انہوں میں پسندیدہ بنایا ہے۔
منو کے فن کے مختلف پہلو ہیں جن میں انسانی ساخت و تشکیل اور اس کے اجزاء کے علاوہ اسلوب نگارش کی ساری خصوصیتیں

شامل ہیں یعنی تشبیہیں، استعارے، کنایے، الفاظ اور فقرہوں کی تلوار اور ان کے استعمال میں تضاد کا صفت اس کی شخصیت مزاج اور اندازِ نظر سے متاثر ہونے میں غلطی کے سوجھنے کا ایک خاص انداز ہے۔ وہ زندگی اور اس کے مسائل کو مختلف اوقات میں مختلف زاویوں سے دیکھتا ہے اور جو کچھ دیکھتا اور سوچتا ہے اسے بڑے جھک، خوف اور اندیشہ کے جراثیم کے ساتھ بیان کر دیتا ہے۔ ان سب باتوں میں اس کے صفت پسندِ اچ اور توانا شخصیت کو بڑا دخل ہے۔

منٹو کی نظمیں گہرائی میں جاتی ہیں۔ سیاست، معاشرت، دین، اخلاق — معاشرہ اور زمانہ سب پر اس کی گہری نظر ہے۔ اس کی باریک بین اور چمکتے دس نگاہ ہر ایک کے حسن و قبح، اچھائی برائی اور عجیب و غریب طرح کو سمجھتی ہے کہ اجتماعی اور انفرادی زندگی کی کوئی حقیقت اس سے پوشیدہ نہیں رہتی۔ اس طرزِ عجیب و غریب پروری طرح احاطہ کر لینے کے بعد وہ ان میں سے ہر ایک کا اس نظر سے تجزیہ کرتا ہے کہ ان میں سے کون سی چیزیں فوہ اور حاکمیت کو دھوکے میں رکھتی ہیں، کس سے انسانی زندگی عذاب میں مبتلا ہے اور کس سے انسانی زندگی اس سہولت و مسرت سے محروم ہوتی ہے جو فطرت کا مقصد ہے۔ منٹو انسانی زندگی کو اس کے صلب، تنہائی، دلاؤ یعنی سیاست، معیشت، دین اور اخلاق میں فطرت کے بتائے ہوئے راستے پر اور اس کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق چلی چلی پروان بڑھتے دیکھتا یا ہر تہا ہے اور جب اس پہلو سے زندگی کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو یہ جلتا ہے کہ انسان نے انسان کے ساتھ سخت نا انصافی کی ہے اور اب ایسے انداز سے کہ جسے کمال انصافی کا شکار ہونے والے خود نہیں جانتے کہ ان کے ساتھ کونسا نا انصافی کر رہا ہے اور کس طرح کر رہا ہے۔ منٹو نے اس نا انصافی کو مٹانے اس کا پردہ فاش کرنے اور اس کا طلسم توڑنے کو اپنے فن کا مقصد بنایا ہے۔

زندگی کی اس بہت بڑے اور بے حدانہ کام کا بیڑا اٹھانا بھاری ہے لیکن اس سے سخت تر یہ ہے کہ اسے کوئی عملی شکل دی جائے۔ منٹو کی مخصوص نظر نے انھیں جو کچھ دیکھا اور اس مشاہدہ کے بعد ان کے احساس و درد نے انھیں جس کام کی طرف مائل کیا اس کے راستے میں بڑی راہ میں ہیں۔ نا انصافی کرنے والا سیاست، معیشت، دین اور اخلاق کے اداروں میں اجارہ داری کی لائقوں کے راز جاننے والا ایسے لوگوں کا سب سے بڑا دشمن ہے جو اس کے رخ سے صریح اور طلسم کے پرستہ اٹھا کر اس کی حقیقت کے گھٹاؤ نہیں کر دے اور سوا کرتا ہے اس لیے اس کا کام کا بیڑا اٹھانے والے کو اتنا بڑا اتنا بے خوف و جری ہرنا چاہئے کہ وہ ہر فن کے مقابلے کے لیے سینہ سپر رہے۔ منٹو کو فطرت کی طرف سے یہ بے خوفی، ہر جرات اور ہر راہ کی گھڑائی تھی۔ اس کے اعصاب میں اتنی قوت تھی کہ وہ ہر راہ کو بلیبی سے روکے اور اس کی ضرب کو بے نیازی اور شکستہ طبیعت سے تحمل لے۔ منٹو کے فن پر ان کی اس بے خوفی نے بڑا کھانڈ اثر ڈالا ہے۔ اچھا لکھی اور بُرا لکھی۔ اچھا اس طرح کہ زندگی کی ہر چیز کا تجزیہ کر کے انھیں بے نقاب کر کے اور اس پر آنے والی اوقات ایسی کاری ضرب لگانے کے کچھ کھانے والا غلام کر دے جائے انسان اور زندگی کی بڑی خدمت کی ہے اور ہر اس طرح کہ حیات انسانی کے بعض مستور پہلوؤں اور پوشیدہ رازوں کو اپنی نزدیک نگاہی سے یوں بے نقاب کیا ہے کہ جیسے ہونے ماسوروں کی نائش کے سوا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اور کبھی کبھی حقیقت میں ہی اور حقیقت نگاہی سے دوا والوں کو صرف عیانی دکھائی ہے۔ یوں اس بڑے پہلو کا ایک اچھا پہلو یہ ہے اور اس کی تاویل ہی کہ کہہ کر کی جاسکتی ہے کہ سب کو منٹو کا مزاج تھا اس کی شخصیت تھی اور منٹو فربہ کھانے کی طرح فربہ دینے کو بھی گناہ سمجھتا ہے۔ اس نے اپنے فن پر اپنے آپ

کو پوری طرح بے نقاب کیا ہے۔

خوب کے ماحول کی یہ سب خصوصیتیں جنھوں نے اس کی شخصیت اور فن و فنون میں اقدار اور انفرادیت کے پلوناپاں کیے ہیں۔ سیاسی ماحول، معاشرتی انتشار، مذہبی کشش اور بعض صورتوں میں ذاتی اور عجمی حالات سے متاثر ہوئی رہی ہیں۔ منٹو نے اپنی زبردست قوتِ ادبی سے ہر طرح کے انتشار، کشش اور رد و ٹپ میں پیدا کر دیئے وائے حالات کا ماحول طرزی و برزی اور ہر فردی سے کی۔ دیکھئے انوں نے دیکھا ہے کہ اکثر منٹو نے ان سب فنونِ مہلوب کر کے اپنے نئے فن کی راہ دکھائی اور اپنے فن کو زندہ رکھا ہے۔ لیکن دیکھئے وائوں نے بڑے درد و غم کے ساتھ حالات کے طوفان، انتشار اور کششوں کی تلاؤں سے اس کے ہر دھڑکے کو زندہ رکھا ہے۔ لیکن دیکھئے وائوں نے دشوار گزار دن کے بعض محنت و محوں پر اور بعض منزلوں میں اس نے اپنے آپ کو بے دست و پا سموس کیا اور اپنے آپ کو ماحول سے شغف قہر کیلے پر آمادہ کیا ہے۔ شغف کے اس احساس نے اس کے اعصاب پر اثر ڈالا اور جب اس نے اعصاب کی قوت بڑھا کر کہنے کے لیے کسی آبِ زندگی کو پیا، مارا یا بنا تو اس نے اعصاب پیلے سے بھی زیادہ بے بس اور مجبور کر دیے۔ یوں کبھی کبھی اعصاب کی اس سخت کشش اور عاجی ماحول اور یہی زندگی کے اس تصادم میں کبھی اس کی شخصیت کی توانائی ہر چیز پر غالب آتی ہے اور فنون کی شخصیت کی عظمت اور مہجی نمایاں ہوتی ہے۔ لیکن یہ عارضی فنون، اعصاب اور زیادہ مغلوب اور پانیانے کو پیشِ نمبر ہے۔ منٹو کی زندگی میں ماحول اور اعصاب کی یہ جنگ یوں تو اس کی حیاتِ فن کے ہر دروہ میں جو کچھ لکھا ہے اس میں اس شدت و قوت کے تو اتنی جھلک نمایاں ہے کبھی ایسا ہوا ہے کہ منٹو نے مدقوں کچھ نہیں لکھا کبھی ایسا ہوا ہے کہ اس نے کئی مہینے یا سال مسلسل دروہ ایک افسانہ لکھا ہے اور اس طرح تو اترتو مسلسل لکھے ہوئے افسانوں میں کبھی کسی ایک سہولت و کوئی مہینہ یا سال نہیں لکھ سکا اور کبھی ہر دروہ ایک اچھا افسانہ لکھا۔ انھوں نے جو محوے، ٹھنڈا گوشت کے سب افسانے، موائے خندا گوشت کے، ۱۳۴۱ جولائی ۱۳۴۱ء کے درمیان لکھے گئے، ناہایت کا خاتمہ، مجموعہ کے سب افسانے یکے بعد دیگرے ۱۳۴۱ء میں ۱۳۴۱ء کے درمیان لکھے گئے۔ اسی طرح یزید، مجموعہ کے سب افسانے ہم اکتوبر اور دہ، نومبر ۱۳۴۱ء کے درمیان لکھے گئے۔ منٹو نے آخری دور کے بعض اور مجموعے جو زیرِ ترتیب اور زیرِ شاعت ہیں منٹو کی اس پہلی کیفیت کی ترجمانی کرتے ہیں اور ان افسانوں کو پڑھ کر ٹھیکے والا نمایاں طور پر تین باتیں محسوس کرنا ہے۔ ایک بات تو یہ ہے کہ اس دور کے لکھے ہوئے افسانوں میں سے اکثر عجمی حیثیت سے منٹو کے کم تر درجے کے افسانے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس دور میں بھی جب بظاہر منٹو کا فن، انفرادیت کی منزلوں سے گزر رہا ہے، جیسا کہ اوپر مذمت، اچھے افسانے ہی لکھے ہیں اور دوسرے یہ کہ ان افسانوں میں بھی بعض مجموعی حیثیت سے ان کے اچھے افسانے نہیں کہہ سکتے۔ عجمی فنون کی مانند ان کی جدت پسندی، ان کی شوقیہ، ان کی گہری طنز اور فن کے ساتھ ان کی نظری مہاسبت جملہ نمائندگی ہے منٹو کی قادرِ الطافی اور اس سے بھی بڑھ کر ان کے فن کی یہ خصوصیت کہ وہ کہانی لکھنا جانتے ہیں اس دور میں بھی اس قدر ہی اور تو اقل کے ساتھ نمایاں ہے۔

منٹو کے پروردگار کے افسانے۔۔۔ بہت اچھے اور بڑے سب افسانے۔۔۔ دیکھ کر پڑھنے والا ان کی جس عظمت

سے سب سے زیادہ متاثر ہوتا ہے یہی ہے کہ ان افسانوں میں کہانی کی لذت ہے مگر حکومت نے ایک تصدیقوار مارجین قائم کر دیا اور اس نے جب افسانہ نگاری شروع کی جب بھی اس میں فطرت کی وہی برقی اس صلاحیت کو برسنے کی پوری قوت تھی اور سب اس نے مجبور اور بے بس ہو کر مرنے سے جہنم میں پہلے تک افسانے کو تھکے تو اس کی یہ صلاحیت اس میں اپنے لیے محاسن کے ساتھ خود کو دھکی۔

مغزوہ لوہک فقہ گوئی منبیت سے کچھ کر کے بائیں معلوم نہیں اور فقہ گوئی کے ساتھ اس کے فطری میلان اور فتنے کے ساتھ اس کے بے پامان لگاؤ نے اس میں ایسی گڑبگڑیں سے پوری طرح غامدہ اٹھانے کی عادت پیدا کر دی تھی۔ مغزوہ کو علم تھا کہ زندگی میں جہنم بڑا ایک کمائی ہے۔ ہر انسان اور بہ واقعہ خواہ وہ کتنا ہی کم حیثیت اور کم پائی کی محسوس کیوں نہ ہو کمائی کا بڑا سرزدن اور دلچسپ موضوع ہے۔ لیکن اس کے لیے بدتر طے اور نظام بہت معمولی معلوم ہونے کے باوجود بشرط فقہ گوئی کے لیے بڑی اہم ہے اور بدتر طریقے کہ انسانی کھنڈوں والا اختیار اختیار کرنا جتنا لوہک کو کمائی شروع سے تھی اس میں اور کمائی کی نفسی جھڑپیں اس کے لیے ایک بے گنت عورت تھکی دھندہ قائم ہو جائے۔ پڑھنے پڑھنے والا محسوس کرے کہ فقہ گوئی اسے اپنا کم راز کچھ کر کے اپنے دل کی بڑی بات بتائی ہو گی، مگر نہیں کرے گا وہ اپنی خوشی اور غم میں اس کے دل کی شہ کیسے لگا کمائی کھنڈنے والے کے دل میں ایسی ظن سے ہر محسوس ہوا اور ایک جان و دوتا ہو کر اس سے معمولی سے معمولی بات بھی اس میں لگنا کہ جیسے وہ بے حد ہرے کمائی کھنڈنے والے کی بڑی حیثیت سے ہے فقہ گوئی کے میدان میں یہ حیثیت حاصل کرنے میں بہ حد وہ بڑی سے بڑی اور جتنی سے جتنی بات اس طرح نہیں کرنے کے انداز میں دوسروں سے نہ ملتا تھا کہ دوسرے اس کے جھوٹ کو اس کے پروفیشنل کو اس زندگی کی خوشی میں پے ہونے محبت و محراب تصور کو کچھ قبول کرتے اور اس سے تعلق دیتے تھے معمولی سی بے حیثیت بات کس طرح کمائی میں ملتی ہے اس کی مثال مثلاً کہ افسانہ جہت دان ہے۔ کمائی میں کس طرح بالوں کا مزاج اور کس کے اپنے دوسرے فتنے کے احساسات میں محسوس طاقت پیدا کی جاسکتی ہے اس کا اندازہ چند مضمین میں والا میرا نام اور صاحب نے تو لکھی اور اس سادہ و چار جہت عدوانی کے بعض نشانات ملاحظہ فرمائیے کہ کتنی بے ادب اور دلہا صاحب جیسے افسانوں کو پڑھ کر ہر محسوس ہے اور کس طرح عجیب و غریب اور انسانی اہلی افسانوں کی طرح ہر محسوس اور مغزوہ کی ایک دوسری مختلف پیش کی کر رہے ہوں کہ وہ لوگوں کو بل بوتہ سے ہیں۔ یہ ان صاحب کرامات بادشاہت کا خاندان کے لیے دعا و احوال کے لیے جیسے افسانے پڑھ کر محسوس کیا جاسکتا ہے مثلاً پیر خیر سے ماحول میں سے انسانی سے کوئی کمائی پیدا کر لیتا تھا دیکھنے والے کو یہ بتی تھی وہ کس کو کس طرح تنبیہ و عقاب کے لیے آسمان پر لکھا تھا اور بھی زیادہ حیرت انگیز تھی لیکن یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ مغزوہ کی دنیا جانتا تھا اور بھی اور بہت کمائی کی زندگی کے باوجود ایسے تھوڑے اور دھنڈا میں بھی وہ کمائی کھنڈا نہیں تھا اسی لیے اس نے افسانہ کے انداز میں خوشی کے فتنے شوق سے مجھے حائل تھے۔

[illegible]

کئے باوجود بہت بڑا فن کار تھا۔ اس کے مشاہدہ، تخیل، تصور، فکر اور احساس میں اس کی شخصیت کا بڑا گہرا رنگ ہے اور شخصیت پر غیر معمولی قوت و توانائی۔ — وہی قوت و توانائی اس کے پورے فن پر چھائی ہوئی ہے اور اسے والے ہر دور میں ہر طرف کے حوادث کے خلاف پہنچ کر اس فن کی حفاظت کرے گی اور اسے زندہ رکھے گی۔ — منظر گر کیا — لیکن اس کا فن اسے مرنے نہیں دے گا۔

غالب

(۱)

بنام چودھری عبدالغفور صاحب ترمودہ

جناب چودھری صاحب کٹ۔

میں تو خدمت بجا لیا۔ طر اس کے صلے میں زمین باتیں جانتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ آرمہ میں مولوی سید فزوند اللہ کے مکان کا پتہ مجھے
 کلمہ بھیجتا کہ میں ان کو تنہیت لکھوں۔ دوسرے یہ کہ تہرا خاندان کو واپس بھیجتا ہوں۔ حضرت صاحب کٹ کی دشمنی مدت کو حریف، محروفت
 نے غالب کے قدر داروں میں کون ہے جس نے غالب کے خلو و پرشے ہوں اور وہ چودھری عبدالغفور ترمودہ سے ناواقف ہو۔ چودھری صاحب ماہرہ و ضلع
 ایسٹ کے روسا ہیں تھے۔ اور ان کا خاندان کئی صدیوں سے وہاں آباد ہے۔ اناب کے عزیز ترین دوستوں میں تھے اور ان کا شمار ان کے مایہ ناز شاگردوں میں ہے
 فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شریک تھے اور غالب سے اصلاح لیتے تھے۔ اشعار اب بہت کم کہتے ہیں۔ غالب کا یہ نادر و قدرا قلم نے ان کے خاندان کے
 ہر ذرہ سے حاصل کیا ہے۔ رخصتا والہ ہیں احمد۔ لگے ترمودہ نے ۳۶ شروں کا ایک اردو قصیدہ اور ۹ قطعات اصلاح کے لیے میرزا کے پاس بھیجے تھے۔ برقعہ کا انداز جس پر
 ترمودہ نے اپنے اقدار سے تشا۔ لکھے ہیں اور غالب کی اصلاح سے مزین ہیں اتفاق سے میرے ہاتھ لگا گیا۔ قید کے لیے گیا اور اشعار غالب کی اصلاح ہے بعض قطعات
 غالب نے نامی تو جی۔ ہے ایک شعر انہیں بہتر آیا تو سرانگھٹا نہ اور وہ لکھ لے لے تم زور دیا ہے۔ خدمت سے مراد اپنی شروں کی اصلاح ہے۔ لکھ میرزا کا می ۱۲۲۹ء
 حضرت صاحب عالم کے نوے اور میرزا کا نوے کا شمار۔ ان دونوں کے تعلقات کی داستان دیکھنی ہو تو احوال غالب ملاحظہ فرمائیے۔ لکھ میرزا کا می کے گھر میں ۱۲۸۸ء
 میں ایکس فیو پیدا ہوا ہے۔ ترمودہ نے اسی سلسلے میں تنہیت کے قطعات لکھے ہیں اور اب غالب تنہی کو مبارکباد کا خط لکھا جا چکے ہیں۔ اسی لیے ان کا پتہ پوچھ رہے ہیں۔
 قیاس ہے کہ نہ تنہی کے تعلقات کا خط ترمودہ لکھا ہوگا۔ لیکن یہ خط بھی ان کے مزاروں خوں کی طرح اب تک اسلو سے ہے۔ یہ صاحب زاوے کا نائب ترمودہ امیر ہیں
 جو کافی خاص رکھتے تھے۔ ان کا ذریعہ فیض معدودہ تذکرہ شاگردان صغیر: اند تذکرہ یادگارہ منیر میں موجود ہے موصوفہ ان میں ان کی تصویر بھی چھپی ہے جو اقسام
 اور اردو شریکی نمشا پر کے ساتھ درما آج کل دہلی و دیگر جہاں ۱۹۰۹ء میں شائع ہوئی ہے۔ یہ مراد صاحب عالم ماہر دی ۱۲۱۱-۱۲۸۸ء میں جس کے خطوط سے
 غالب کو بہتر شناخت ہوئی کہ ان سے پہلے نہیں جانتے ترمودہ کی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:-

حضرت کی تحریر کا ایک نسخہ بھی اگر بچا ہوا ہو تو دیدے ہو بھیجیں ایمان نصیب نہ ہو و خط بہت روایہ کے پاس بھیجتا ہوں، احرف بکرت
 اس کی نقل اس کے پھر بھیجے تاکہ جواب لکھنے میں سہولت حاصل کروں۔ (رخصتا والہین احمد)

اپنے ہاتھ سے لکھو اور مجھ کو بھیجنا کہ میں ان کو نہایت میں خط لکھوں۔ واللہ ہرگز مجھ سے بڑھائیں گی۔ تشریف دے تو فرمیں ہوں
 لکھا کروں۔ تم یہ بوجھ مجھ پر سے اٹھاؤ۔ تیسری بات یہ کہ یہ معاطہ حضرت صاحب پر ظاہر نہ ہو اور میرے اس خط کا جواب
 جلد آئے۔
 غالب - ۲۵ دسمبر ۱۸۶۹ء

۲

۳ مارچ ۱۸۶۶ء

اے میری جان!

کس وقت مجھ سے غزل مانگی کہ میرے واسطے لکھیں گے جواب دینے کا زمانہ قریب آگیا۔ میرا عمل اب جس کو دیا منت
 کرنا ہو اور اہل علم سے دریافت کر کے تمہاری خاطر عزیز ہے۔ غزل کی بارے نفس ناطقہ سننے لگی، بھی طرح مدد دی۔ فضا
 پہنچتے ہیں۔ لیکن رشتہ مراد نہ عارفانہ۔

غزل

ملک نہیں کہ بھول کے بھی آسمان ہوں	میں دشت غم میں آہستے صبا دیدہ ہوں
ہوں درویش و جبر ہوں یا اختیار ہوں	گو ناز کشیدہ لگا افسانہ ہوں
جان لب پر آئی تو بھی نہ شیریں جانا دین	از بس کہ تخی غم عجب ال چنیدہ ہوں
نہ شجہ سے علاقت، نہ ساعز سے رابطہ	میں مریض مثال میں دست دیدہ ہوں
ہوں خاکسار، پر کسی سے ہے مجھ کو لاگ	نہ داؤد فناؤہ ہوں نہ دام چنیدہ ہوں
جو چاہیے نہیں وہ مری قدر و منزلت	میں یوسف بنیمیت اول خمیدہ ہوں
ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ	ہوں میں کلام نغمہ، اسے ناشنیدہ ہوں
اہل دروغ کے حلقہ میں ہر چند ہوں ذلیل	پر مامیوں کے ذرخے میں ہیں بگزیدہ ہوں

پانی سے سنگ گزیدہ تو ہے جس طرف اسد

تو تباہوں آئینے سے، کہ مردم گزیدہ ہوں

(۳)

بنام جناب ذکی دہلوی مرحوم

بندہ پرورد!

آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ آپ اذرو کے شرافت نبی دلیاقت جسی آفتاب و ماہ تاب ہیں۔ آپ کا کیا کہنا ہے۔ اس

لے یہ خط اب امین الرحمن احمد خان بہادر والی دارو سکرام ہے اس کے شروع میں درج ہے اس خط میں گورو کی جو غزل ہے وہ شائع شدہ ہے خط سے معلوم
 ہو گیا کہ یہ غزل کب بھی لکھی تھی۔ (نامک نام)

عربی علم و فضل میں وہ پایہ بلند حاصل کیا ہے کہ دوسرے کو یہاں تک پہنچنا مشکل ہے شہزی کے اشعار میں نئے دیکھے اور پسند کیے بلوریں پہلے پہلے ہیں۔ اردو فصیح، جرات پس، الفاظ نہایت بنیدہ و شیریں، صرف صرف شہتہ و رفعت جو مضامین نظم میں چاہئیں وہ سب موجود و فوری مدح میں آتا ہالذکر کیا۔ میں تو قلم سخن کا گلے خاک نشین ہوں۔ شہشاہ کہاں سے ہو گیا۔ خیر آپ کی ارادت میرے لیے موجب سعادت ہے۔ جرم صاحب شرف میں خود سائی کو بڑا جانتے ہیں کیا انہوں نے بکوز شاعر بالاجوہ لیرہ نہیں سنا ہے یا اساتذہ مستند الکمال کا فخر یہ کلام ادن کی مغر سے نہیں گزرا؟ ————— اللہ العزیز اس امر خاص میں کیا کیا بلند پروازی اور اپنے کلام کی کیے کیے طرح فرازی کی ہے۔ نیکوئے عالمگیری کہتا ہے۔

چہیت دانے ہادہ گلگون معنی جو ہرے

حسن را پردہ و گارے عشق ما بین میرے

تین شعر میں تین شاعروں کے سبیل کو مزہ بہاں لکھا ہوں باقی غائد کلام اہل سن پر حواسے کہتا ہوں یکساں کہتا ہے۔

بر اقصیٰ صفیٰ رسول ایض

سنائی و خردی از آست فم

دوسرا اس سے بھی بڑھ کر کہتا ہے۔

بر ملک سخن آں خدائے قدیم

کہ معنی کیے باشر از بند گام

تیسرا کچھ اور ہی راگ گاتا ہے۔

حرف کوثر کہ مشرب الودعت

تا و دانے ذرا گنج حست

تاودان معنی موری اور ہاد گین اس گوشے کو لکھتے ہیں جس میں مغز اور محام و طر و کا پانی میں جوتا ہے۔ نوزد با شہزاد شطیحات اشعار۔

میر صاحب میں بہت بڑھا ہوئی ہوں اس پر امراض متفاوہ مرصعہ میں گرفتار قوی بالکل مضمل تھا، بیٹھا لکھنا چھٹا سب مشکل ایسا تا

اگر تیر جواب میں تاخیر ہو جائے سعادت رہوں۔ والسلام مع الوفا الاحترام! فقہ!

دعائے خیر کا طالب فقیر غالب مرہنوی ۱۸۶۸ء

۱۰ ربیعہ چہار شنبہ

(۴)

ہام نواب امین الدین احمد خاں

بھائی سے دوسراں میں ایک ذیہ کہ محمود نیر کے خاتے کو کیا کروں۔ وہ مینی تھا اس حقیقت پر کہ زلی کثور، نواب ضیا الدین خاں

لے نواب امین الدین احمد خاں، نواب احمد بخش خاں کے بیٹے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد نواز کے زمین قراہ پاسے۔ ۱۸۶۷ء سے اپنی وفات

سے واسطے انطباع کے لے گیا۔ جب یہ واقعہ ہوا تو اب اس کو نکال دیا۔ اول امداد کی جو کئی شریعتیں دہ لکھو دیں۔
اورانی اشعار مرعوی زین العابدین خاں مستعار ہیں۔ اس واسطے کہ تم اپنے دل کے مجھ سے کی نصیحت اس سے کرو۔ پھر یہ امر واقع ہوا
یا میرے والد ہے۔
تو جبر الہی اللہ کی جلد واپس پہنچی ہے۔

جواب کا طالب :- غائب

(۵)

بنام عزیز اللہ شاہ عزیز مصطفیٰ پوری

خان صاحب عزایت خاندان سلامت !

آپ کا مربانی نام آیا۔ اورانی دیکھ کر منظر زور جوئی خوشامد غیر کا شیوہ نہیں۔ نگارش تمہاری پہنچ رہے سابق کی تحریر سے نفعاً و
مناہجہ کر ہے۔ اس میں یہ معانی نازک اور الفاظ آب واد کہاں؟ اگر ایک اس سے نہیں آگاہ کرنا ہوں کہ یہ منظر ہندی کی نہیں

بقیہ حاشیہ :- ۱۸۹۹ء تک دارودی جاگیر کا اختتام انہی کے ہاتھ رہا۔ ذواب ضیاء الدین احمد خاں تیرہ درختیں ان کے بھائی تھے اور جاگیر میں
شریک تھیں، انیس اور ہجرت سے کچھ تعلق نہ تھا۔ امین الدین کے انتقال کے بعد ذواب علاؤ الدین احمد خاں علانی ان کے جانشین ہوئے۔ ان سے
لوگوں سے غائب کے گہرے تعلقات تھے۔ اس وقت ہر مکتوب ایذا کا نام دوج نہیں۔ لیکن قریب بہ یقین ہے کہ مرزا نے یہ دفعہ ذواب امین الدین
احمد خاں کو لکھا ہے اس پر تاہیج دوج نہیں۔ راقم کے خیال میں اس کا زمانہ تحریر ۱۲۸۰ھ (مطابق ۱۸۶۳-۱۸۶۴ء) عماد الدین احمد سے ۱۲۸۰ھ
منشی ذوال کثرہ دہلی آئے اور مرزا سے ملے۔ انہوں نے کہا کہ تشریف لے کر خواہش ظاہر کی مرزا نے ذواب ضیاء الدین خاں سے متوجہ نہ کرکے
صاحب کے حوالے کیا۔ چھپنے میں تعویذ برائی تو مرزا یارس میرے اور انہوں نے یہ دفعہ لکھا۔ بالآخر کثرت ہمار سال کے بعد ۱۲۸۴ھ میں مبلغ ذوال کثرہ
سے شائع ہوا۔ یہ ایڈیشن اب بہت کیاب ہے۔

۱۔ زین العابدین خاں مانت، مرزا کی سال کے بیٹے جنہیں غائب اپنے بیٹے کی طرح پکارتے تھے۔ پہلے شاہ فیض کے شاگرد ہوئے پھر مرزا سے اصلاح
پہنچ گئے۔ دیوان اردو کے کئی نسخے ہندوستان میں موجود ہیں۔ ۲۔ غائب تاہیج دوج عالم مصنفہ افکار کا وہ ترجمہ ہوا ہے جو مولوی کرم الدین دہلی نے کیا تھا۔
اور ملین العلوم دہلی سے ۱۸۴۴ء میں شائع ہوا تھا۔ عماد الدین احمد سے ۱۸۴۴ء میں طرز مصطفیٰ پوری ۱۸۴۴ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے ان میں عربی و فارسی کی تحصیل کی
قدر کے بھروسے ہوئے تو لکھنؤ چھوڑ کر مصطفیٰ پوری آئے اپنی تحصیل چلے گئے اور وہیں انہیں اپنی پدی عمر گزار دی۔

قصائیف کی تعداد چالیس سے کم نہیں ہیں میں دیوان اردو، اردو لاہوت، ختم نکل، کام نظم فارسی اور اشعار، پیش کش شاہ چٹانی، ایچ دفعہ
تحریر مسافر جواب و مغلوم، اردو مثنوی فتح حسین، درجہ شاہ نامہ تالیف ذکر ہیں عزیز کا انتقال ۲۰ جولائی ۱۹۲۸ء کو ہوا۔

یہ دیوان دفعہ غائب کے دفاتر کے کسی مجھے میں اب تک شائع نہیں ہوئے اور عماد الدین احمد

لکھ شاہ صاحب کی فارسی نثر کا مختصر ماحولہ جو چھپ بھی گیا ہے۔

ہے۔ ارواحِ حقانِ مخلصہ واضح عالمِ لہری سراودوں میں سے ایک شخص تھا۔ مہا بھارت اور پنج و قہر اس کی فکر کا نتیجہ ہے۔ قوالی کرتا
کی طرزِ ایجاد کی برائی اس کی ہے۔ مہم سے متاثر ہو کر نکلا۔ یعنی تم نے خوب کھا ہے۔
نقاش نقشب ثانی بہر کشد ز آدل
جہاں آپ نے بغیر حاصل کھا ہے وہاں آپ بہر حق سے معرفت ہوئے ہیں۔ متوقع ہوں کہ پاشع نکال ڈالو یا عرف کی
جو شخص کھے دو۔

نجات کا غالب ۔ غالب

(۶)

بنام عزیز اللہ شاہ قزاقی صنی پوری
معنی شناس نہ مشفق، خطا میں جا ست۔ یہ جولو کہ با میرا شعر نکال ڈالو یا عرف کی جو شخص کھے دو میرا جب حال ناظر کیوں بٹھا اور اس
سے یہ منہ پر کیوں نہ پیدا ہوا کہ میں تمہارے کلام کو اصلاح زدوں گا۔ تمہیں فوڑ کو کدھر کو قہر سے ہے یا نام سے
عرف سے۔ میں نے تو اصلاح ہی تم نے لیا نا، ذہن نہ مارا موج ہے اکثر کبھی کی عرف جاتا ہے کہادی اس خیر میں ملک و اصلاح کی
تجما نشی نہیں۔ پنج و قہر سابق سے فقط و مثلاً تھا، ہی جہات بہتر ہے۔ اس قول کو بار نہ کر دو گے تو قہر اس کا وہی اور حاج طبع ہو گا
مع سود ملن۔

نجات دہندہ ۔ غالب

(۷)

بنام ہاسلرم

ہندو پروردہ!
آج میں نے وہ انگریزی معنی رواں کر دی اور سچ کو آپ کا کلام سودہ اور میرے معنی کا قہر آپ کے نام کا مجھ کو دے گیا۔ اس
عنایت کی کٹر میں کیا خدمت بکھانا ہمارے ایک دہائی بھجنا ہوں اس کو آپ چھ کر اور لطف اٹھا کر راجہ صاحب کی خدمت
میں بھیجا دیجئے۔

یہ بات متلوک ہے کہ مینا باناد اور پنج و قہر واقعی طہوری کی لکھی ہوئی ہے اس سبب کے لیے ڈاکٹر تیز احمد لکھنؤ یونیورسٹی کا تحقیقی
مقالہ مینا باناد دیکھا جائے۔

مے شاہ صاحب نے غالب کی جگہ مرزا نوشہ لکھ دیا تھا۔ غالب کو اپنے عرف سے جو معنی وہ معلوم ہی ہے۔ (مخبر اللہ ہیں)
تہ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ قہر کس کے نام ہے (اکبر علی خاں رام پور)

امید پر تشددِ بیم و تحیفِ بیم دونوں طرح متعلق ہے ایسا نہ ہو کہ جنابِ ممدوح اس کو ضمانت کیجیں۔ پہلے اود دوسرے مصرع میں پختہ بیم ہے اوسے مصرع کا بیم مشرود ہے۔

غالب !

(۸)

بنام جناب علاء الدین خان علائی

جانِ غالب !

دو نہا تہار سے تھوڑے پہنچے۔ مفرقِ مرقا میں سے ہے۔ بیشتر اوس کے کام میں مضامینِ حقیقت آگئیں ہیں۔ لیکن دامانِ گودار دو گریبانِ گودار دو اس زمین میں اس کی مزل میں نے نہیں دیکھی۔ حاجی محمد جانِ تدری کی مزل اس زمین میں ہے ۔

در بزمِ وصال تو بہ کلامِ قنات

نظارہ زنجیرِ مزلِ گلِ نادر

یہ ایک شعر اس کا ہے یا وہ ہے۔ بھائی تہار بابِ دگلان ہے یعنی جھو کہ زندہ سمجھتا ہے میرا سلام کہہ دو۔ یہ شعر میرا چھ سناؤ ۔

گلانِ ذلیت ہو در منتِ زبے در ہے

ہست مرگ دے بد تاز گمانِ تو نیست

مجھے لاؤر لیکن کے کٹر پڑ رہے ہیں۔ وہ تم کو مشرود سخن کا طالب ہی زندہ برتا تو دیں کیوں نہ چلا آتا۔ مجھ پر سے یہ تکلیف ادا کرو

اود تم اسی زمین میں شرک کہ کھینچ دو میں اصلاح دے کہ بیچ دوں گا۔ صمائے پیر بہاے پیر، واللہ میرا کلام ہندی یا نادی کچھ میرے پاس نہیں ہے آگے جو کچھ حافظہ میں موجود تھا وہ لکھ چکا اب کچھ یاد آگیا وہ لکھتا ہوں ۔

ہاں کہ ماستم سخن از ننگِ و نامِ ہیست

و ادر خاصِ جغت و تفر و عامِ ہیست

بستم زخون دل کہ دو چشمِ ازان پڑ است

بادوست برکہ بادہ پر خلوتِ خود و دھام

ماضیہ فیم و بودے دوائے ما

از کاسہ کرام نصیب است خاکِ دا

گرنِ جزوہ نثراب و نہ بینی بھامِ ہیست

دانکہ کہ خود کوڑ و دارِ اسلامِ ہیست

ماختگانِ مدبرِ حلال و حرامِ ہیست

تا از فلک نصیبہ کاس کہ امِ ہیست

غالب اگر ضرورتِ مصحف ہم فروخت

ہر سہ چرا کہ زخِ مئے عملِ نامِ ہیست

۱۔ شعر نہ یاد آئے ہا یاد آئے خیر گلشن کر یہ بھی کافی و مستحق ہیں۔

دل برد و حق آفتت کرد لہر نزاں گفت	یہاں توں دید و ستم کر نزاں گفت
دور نہ گلشن نہ بچ و خیر نزاں برد	دور نہ گلشن باز و ساغر نزاں گفت
رخشدگی سادہ و گون نزاں بست	نہ بندگی بارہ و پر کر نزاں گفت
ہم سوز دم بارہ و ساقی نزاں خواند	ہمراز نہ شادیت و آذر نزاں گفت
دور کم روئے سایہ و مرچ شہر بخویم	ہما سخن اذلو بے کو کر نزاں گفت
ہمراز سر آمد چہ نہ دم ز غلغلہ	گر خود تکی رفت بخیر نزاں گفت
آں باز کہ در سینہ نہانست نہ و غلغلہ	بردار توں گفت و پر نزاں گفت

لاشعے عجب افتادہ ہیں شیفہ مارا
مومن برد و غالب دکان نزاں گفت

کوئی امید بر نہیں آتی	کوئی صورت نظر نہیں آتی
آگے آتی تھی حال دل پہنچی	اب کی بات پر نہیں آتی
موت کا اب دن میں ہے	نہ نزدیک نہ دور نہیں آتی
داغ دیاں گر نظر نہیں آتا	بوجھ میں ہے جاہ و گز نہیں آتی
جہان تہوں پہ ملت نہ بد	پر طبیعت اور نہیں آتی
ہم دیاں ہیں جہاں ہم کو بھی	کچھ ہماری خبر نہیں آتی
کہہ کس منہ سے جا شے کا تے	شرم نہ کر کہ نہیں آتی

نکتہ چس ہے خیر دل اس کو سنا سنے نہ سنے
میں جانا تو ہوں اس کو گر ملے جذبہ دل

لہ یہ خط پہلے چھپ چکا ہے مگر نام لکھی پہلا خط اس مصرع پر ختم ہو جاتا ہے۔

یہ مصرعہ کہ درخ سے لعل نام چیت (خطہ ہر مکانیب غائب مرتبہ تہذیب دوم)

خط کی باقی عبارت اس میں نہیں آتی لیکن اصل خط میں موجود ہے جو غالباً کسی وجہ سے ابتدا ہی میں حذف ہو گئی یہ نہا سنے اپنی ایک اور فارسی غزل اور دو اردو غزلیں بھی اس خط کے ساتھ بھی تھیں جو مضمون خط سے واضح ہے۔ (دارد سے ایسے غزلوں کی فرائض آتی تھی جنہیں گلنے کے لیے قوال کو دیا جا سکے۔)

اور اس کے ساتھ آپ کے نام نامی کی بقیہ ولایت نشانی تمام رکلیں۔
 درست العلوم کی درمیان کی عمارت جو سنٹرل ہالی سے سرسرم ہے بہت بڑی عمارت ہے سات ہزار روپیہ اس کی لاگت کا تخمینہ ہوا ہے
 معلوم ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ لاگت آدھے لی — اس میں نہایت خوش اطوبی سے ایک سو بیس پتھر لگائے گئے ہیں
 جس بزرگ نے اس پر دیا ہے وہ روپیہ اس کی تعمیر کے فنڈ میں جمع کیا گیا ہے۔ اور ان پتھروں میں سے ایک پتھر اس کا نام
 کندہ کر دیا ہے۔ جن قدر نام کندہ ہر جگہ ہیں: غیر قوم کے لوگ جب آن کر دیکھتے ہیں تو قومی عظمت کا یہ ہتھکڑا ان کے دل پر
 ہوتا ہے اور مسلمانوں کے دل بھی ایک قسم کی زحمت اپنے میں پاتے ہیں۔ پس میرا وہ ہے کہ آپ کے ذریعہ کو بھی اسی فنڈ
 میں داخل کر دیں۔ اور آپ کا نام بقیہ ولایت کندہ کر دیں جب کہ آپ نے یہ بدیہ عمارت کیا اور حجہ کو متولی کیا کہ اس کی کاغذی
 میں صرف کروں تو اب آپ کو اس میں مداخلت ضرور نہیں ہے۔ آپ تو اب میں داخل ہو گئے اب جو کچھ قراب دیا میری گردن پر
 ہے۔ اگر میری نیت بخیر ہے تو خدا سے امید ہے کہ حجہ کو بھی میری نیت کے موافق بدل دے گا۔ اس تحریر کا میں آپ سے جواب
 نہیں چاہتا میں کروں گا وہ جو اللہ چاہے گا۔

مفتانِ بکریشی کا فتویٰ کہ اجلاس اب کے سال الہ آباد میں ہو گا۔ ۲۸، ۲۹، ۳۰ اور ۳۱ دسمبر تواریخ اجلاس مقرر ہوئی ہیں۔ پہلے
 اجلاس میں وہ امرہ تفتیشی پائیں گے جو بحث کے لیے میں جن گئے۔ مگر تمام مجلسیں تعلیم مسلمانان سے متعلق ہوں گی۔ قراب محسن الملک
 مولوی سید محمد علی خان غانا اسباب تہذیب مسلمانان پر لکچر دیں گے۔ ہمارے کالج کے ایک نہایت نیاں اور عالم بدیع راہی
 مشرق و مغرب میں اور جادو میں اسلام کی ترقی اور دہائی کے مسلمانوں کی حالت پر لکچر دیں گے وہ یہ ثابت کریں گے کہ لائبریری ذمہ داری
 کے دہائی اسلام پیدا ہے۔ اسی وقت انہی دو صاحبوں کا ارادہ معلوم ہوا ہے۔ مگر غانا مولوی سید علی جگرانی جو حیدر آباد سے آئے
 واسطے میں وہ بھی کوئی لکچر دیں گے۔ خوشی کہ تمام جلسہ میں اُن سے مسلمان اُن سے مسلمان اس کے سوا کچھ نہ ہو گا۔
 گذشتہ سال کی اجلاس دہلی میں بلورنڈا رانا آپ کے ملاحظہ کے لیے بھیجا ہوں، منظور فرمائی جاوے اور آپ حجہ کو
 ہمیشہ اپنا زمانہ ایک عاجز بنایا زمین تصور فرمادیں، آپ کی خدمت میں نیا زمانہ اجلاس ارسلان کسٹن باعث میرے فقر کا ہو گا۔ والسلام
 علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

خاکسار سید احمد علی گڑھ ۲۰ نومبر ۱۸۹۰ء

(۲)

تمام قراب سید علی حسن مرحوم

جناب مولوی صاحب عہدوم و کرم سظمین ابراہیم مولوی سید محمد علی حسن خان بھادو
 فائز شاہ نامہ عالی عمرہ ۲۰ ذوالحجہ ہجرتی ۱۳۱۰ء میں لکھا گیا۔ جو کچھ کہ آپ نے دیکھے بہتری مسلمانوں کے حق میں مراد عالیہ سے
 سنی فرمائی۔ اور حدیث العلوم اور اس ناہیز کے حق میں لکھنے والے اس کی نسبت بجز اس کے کہ اب کرم علی اللہ اللہ کی اہل مسلمان ہوں
 بلاشبہ مراد عالی کو نیز درست انصاف میں نامی ہو گا۔ خصوصاً اسی وجہ سے کوئی تین سب سے بہت کچھ غلط باتیں نسبت درست العلوم کے مشہور

کر رکھی ہیں۔ عداوہ اس کے ایک عام خیال نہت سنات اور مہرات کے محدود ہو گئی ہے۔ اس خیال کو توڑنا اود یہ بات دل میں خواتی کر درحقیقت جس امر کی مسلمان کو عزت ہے اود جس کے نہ ہونے سے مسلمان کی مذہب و ذلت ہو جانے سے اود اس کے ساتھ اسلام کی بھی ذلت ہے اس میں تائید کرنا اود اس ذلت سے مسلمان کو نکالنا سب سے بڑی حسنت میں شامل ہیں۔ اود نانا برسے کر دین میں یا فقہاء میں کچھ کام کرنے والی نہیں ہے مگر انگریزی نہ جاننے کے سبب روز بروز مسلمان ہندوستان ذلت و خوار ی میں پڑتے جاتے ہیں۔ عہدہ ہاسنے سرکاری سے روز بروز خارج ہوتے جاتے ہیں اصلی عہدے ان کے ہاتھ سے نکلنے جاتے ہیں۔ ہندو بنگالی روز بروز ترقیاں پاتے جاتے ہیں اود مسلمان ہر امر میں ان کے مغلوب و دست نگر ہوتے جاتے ہیں۔ پس مسلمان کو ہندوؤں دیکھائیوں پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے یا ان سے مغلوب نہ ہونے کے لیے مسلمان کو انگریزی زبان کی تعلیم دینا درحقیقت ہندوؤں اود دیکھائیوں پر ان کو فتح مندر کرنا ہے اود اس زمانہ میں جو حال مسلمان کا ہے درحقیقت ان کی تعلیم انگریزی میں ادا کرنا پوری حسنت میں داخل ہے مگر لارہ عالیہ کو با عموماً مسلمان کو اس خیال کی طرف معاملات سے ہے۔

مدرسۃ العلوم میں مسجد کی تعمیر مکمل نہ ہونے سے درحقیقت طالب علموں کو ناز کی تکلیف ہے۔ ذاب سر آسماں جاہ نے جس قدر دیر دیا تھا اس سے مسجد کو کسی تک تعمیر ہو کر رہ گئی ہے۔ اسی پر ایک چھڑائی دیا ہے جس میں ناز ہوتی ہے۔ وہ سو طالب علموں کے قریب پاکی وقت ناز پڑتے ہیں۔ ان کے وضو کے لیے پانی کا انتہام بھی مشکل ہوتا ہے۔ اس کے لیے کونان بھی بن رہا ہے۔ مسجد کے صحن میں وضو کے لیے حوض بھی بن رہا ہے۔ اگر لارہ عالیہ مسجد کے لیے تائید فرمائیں گی تو بہتر ہے اسی کی کسی قدر تکمیل ہو جاوے گی۔ میں کل مہماں سے علی گڑھ جاؤں گا اود وہاں پہنچ کر کوئی تائید بخود آئی مسجد پر ترقی کے آپ کو اود وزیر صاحب کو اطلاع دوں گا۔ ہمارے سب کام تو کلمتہ علی اللہ ہوتے ہیں، جو خدا کو منظور ہو گا ہو گا۔

کار ساز ما بفسر کار ماست

فسر کار ما آزاد ماست

جو خدا کو منظور ہے وہ ہو گا۔ مگر آپ نے جو سوس و کوشش کی اس کا شکوہ ہم پر واجب اود ابرو دینا خدا کے اختیار میں ہے۔ والسلام علیکم!

خاکسار

سید احمد۔ الہ آباد۔ رگت ۱۸۹۱ء

(۳)

بنام ذاب سید علی حسن صاحب

جناب خندومی و کرمی!

بجواب جنابیت نامہ طےسں جوں کو جو آپ کی عرضی ہے اوس کی تعمیل میں ہم سب کو افتخار ہو گا۔ تقبل اود اشد ہو گی۔ بعد ازاں مغرب ہم سب حاضر دولت خانہ ہوں گے اود وہاں سے کمال کھارائشیں چلے جاویں گے۔

خانہ آباد دولت زیادہ والسلام !

خانکساہ سید احمد ۳ رجب ۱۲۹۱ھ

(۴)

بنام ذاب علی حسن مرحوم

مقدم کرم بندہ جناب ابو الفتح ذاب سید علی حسن خان بہادر

بعد سلام سزوں التماس یہ ہے کہ غلط اس شفقت اور عنایت کے جو آپ کو میرے حال پر ہے اور مجھ کو اس قسم قومی ہمدردی کے جو سلاخوں کی ترقی اور بہبودی کی آپ کے دل میں ہے۔ مجھے جرأت ہوتی ہے کہ آپ کی خدمت عالی میں ایک مزوری التماس کروں۔

آپ کو معلوم ہوا ہو گا کہ دفتر مدرسہ العلوم کے میزگرگ نے بذریعہ جلی چکوں کے ایک ذخیرہ زبانت مدرسہ العلوم میں سے جو نکتے ہیں جمع تھانین و تقریرت کر لیا جس کے سبب سے نقصان گہر زبانت مدرسہ العلوم ہو گیا۔ اگر وہ تھانین و تقریرت صرف زبانت ہی میں ہوتا تو صبر کیا جاتا۔ مگر اس تھانین و تقریرت کے سبب چوالیس ہزار روپیہ نکت کا دوسرا پر فاضل ہو گیا اور اگر زبانت فاضلات کی ادائیگی جلد تہذیبی نہ کر لیا جاتا تو اس کا سوداں قدر بڑھ جاتا جس کا ادائیگنا ناممکن ہو گا۔ اس لیے یہ تجویز ہوئی ہے کہ اس زبانت کو چند باہمی سے جس قدر ممکن ہو ادائیگا جادوئے چنانچہ اس کے لیے چند لکھو لیا ہے اور اجناس اور فرشیان لکھنے کے قریب دس ہزار روپیہ کے چندہ دینے کا وعدہ کیا ہے اور اوڈ لوگوں نے بھی اس میں چندہ دیا ہے۔ اس لیے میں آپ سے تین امر کی درخواست کرتا ہوں اور امید ہے کہ آپ اس پر توجہ فرمایاں گے۔

اول یہ کہ آپ بھی اپنی ذابت خاص سے اس نقصان کو بڑھانا کو نہ لے کر میں کچھ امداد فراہم کر تا کہ زبانت نکت کا ادائیگا جلائے دوسری درخواست یہ ہے کہ اگر ممکن ہو تو حضور جناب یلیم صاحبہ سے بھی اس باب میں عرض و معروف کریں۔ الاحباب محمد و بھی کچھ عنایت فرمادیں گی تو اس وقت میں نہایت درپیشگی۔ اگرچہ میرا اداہ حق حاضر جناب یلیم صاحب کی خدمت میں بھی کوئی عرضی لکھوں۔ مگر میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ اگر آپ سے اس باب میں کچھ ممکن ہو تو عرض و معروف کیجئے۔

تیسری درخواست یہ ہے کہ علاوہ اپنی ذات خاص اور حضور جناب یلیم صاحبہ کے اوڈ لوگوں سے بھی اگر ممکن ہو تو اس امر کے لیے کچھ چندہ و معلیٰ کیجئے۔ آپ کی کوشش اور سعی سے امید ہے کہ کچھ نہ کچھ وصول ہو جائے گا۔ والسلام علیکم۔

خانکساہ

سید احمد - علی گڑھ

۱۲ جون ۱۸۹۶ء

(۵)

بنام نواب سید علی حسن مرحوم

جناب غفورم و کرم مغفورم ابو النضر نواب سید محمد علی حسن خان بھادور! محمد رفیع نواب علی صاحب احکام تھارہ رو بجا۔ یہی جناب کا خطورہ فرما رہا ہے کہ ۲۹ ستمبر ۱۸۹۶ء میں نصف قطر نوٹ کر کے قدرتی ایک ہزار روپیہ جو آپ نے اذراہ فیاضی و شفقت پر دیا نہ جتنی نقصان کا کج ضایت فرمایا ہے میرے پاس پہنچا، میں آپ کی عبادت و نوازش کا دل سے شکر ادا کرتا ہوں اور شکر ادا کرتا رہوں گا۔ اور یہ عرضیں دینا زبہور رسید نصف قطر ثانی نوٹ ذکر و خدمت عالی میں مرسل ہے والسلام علیہ وعلیٰ اسلم!

خالصہ

سید احمد۔ علی گڑھ۔ ۸ ستمبر ۱۸۹۶ء

محمد حسین آزاد

(۱)

بنام محمد نوح رضوی چھپلی شہری

آپ کے حب الوطن کا خیال قابلِ ہزار تعریف کے ہیں اور یہ ضایت خاص جو ہندو آزادی کے حال پر مبذول ہوئی ہے اس کا تشکر یہ ادراہی نہیں ہو سکتا۔ لیکن میں اپنی طبیعت کا حال کیا بیان کروں۔ آپ تصویر مٹھاتے ہیں میرا یہ حال ہے کہ کئی برس ہر سنے آئینہ دیکھنا چھوٹ دیا کہ کیا تھا اودی کیا ہو گیا۔ کبھی آئینہ سامنے آجاتا ہے تو پستے آپ کو پہچان نہیں سکتا۔ جو شخص خود اپنی صورت دیکھ کر ہڑتائے اسے فوٹو گراف اتودنا اور تصویر کو اس عالم شہر کا ناک لگا دیا ہوگا۔

دو برس جوئے ایک دوست رستے میں سے بہاؤ کر کے مجھے لے گئے اور میری تصویر اتروائی، اگرچہ رنج ہوا۔ مگر پھر شکر خدا کیا کہ الحمد للہ اسے صحیح الاصفا ادبیم صورت پیدا کیا ہے اور دکھا ہے۔ حقیقتاً اب میں اپنا حال کیا عرض کروں۔ وزیر جینے کے بعد آج انشا اللہ نہانے کا ارادہ ہے، اگر خدا چاہے کہ اسے کیا کروں فرصت نہیں ہوتی اور جو وقت بچتا ہے کہتا ہوں کہ چار سطریں لکھوں گا۔ نہانے کو پھر دیکھ لیا جائے گا۔ آج کل دربار البری کھڑا ہوں، اس میں اکثر کے امر سے دربار کا حال آپ اسی طرح پچھیں گے جس طرح اب حیات میں شہر لے کر دوکا۔ میں نے ارادہ کیا ہے کہ ایک ایک میرے حال کے بعد اس کی تصویر بھی ہو۔ چند تصویریں ہم پہنچائی ہیں۔ مگر میں اب تک نہیں ملیں۔ اگر آپ کے ذریعے سے ممکن ہو تو مزید مطلع فرمائیں۔

محمد رفیع علی حشر۔ فردی ۱۵۴۲ء

(۲)

بنام میر حسن چہر آباد

جناب بہمن! ادام آباکم وصلی اللہ علیکم!

تسلیم - آپ کا رحمت نامہ تو پہنچا مگر اس نے رنج کو دوبا لایا۔ کیونکہ نہایت دل شکستگی پائی جاتی تھی۔ بے دل ہرگز نہ ہونا چاہیئے مگر اللہ العالیٰ جو موجود ہیں۔ اللہ اللہ پیٹے سے اچھا ہوگا۔ میں نے انہیں احتیاج کی کچھ نہیں مکی۔ آپ کو بھیجے گا کہ رجوع قلب سے عرض کرتے ہیں۔ سب مشکلیں آسان ہوں گی۔

مجھے پھر کون سی مشکل ہے لے لے تیر
اگر تیرا علی مشکل کٹ ہے

میں گزرا رو سیاہ کس منہ سے کہوں کہ عاکر تا ہوں۔ یخ چرخ کچھ ہے خدا قبول کرے۔ دنیا کے اعتبار سے اتنا بڑا کہ جہاں جہاں بوسا خیالات کو کہ لا، جہاں جہاں بوسا قلم کو رسائی دی ہے۔ جو کچھ خدمت میں پہنچا ہے لا حظ فرمائیے گا۔ میرے پاس کیفیت احوال کے پہنچنے کا کوئی رسد نہیں، آپ ہی کوئی تسلی نامہ لکھیں تو لکھیں اگرچہ جیلوں کو اس بات کا یقین نہ آئے لیکن غالباً آپ کے دل پر اس فقرہ کا اثر ہوگا کہ مجھے شاید ہی کچھ آپ سے کم رہی ہو۔ میں رویا اور میں نے میرے بیان سے اس مرحوم کی عاجز یہ سیت پڑھی مجھے امید نہیں کہ ان کے بیٹوں نے پڑھی ہوگی۔ حضرت آپ ہم لوگوں کو نہیں جانتے آپ کے جد جانتے ہیں۔ ہم کچھ اوروں کو ہیں۔ اللہ ان کے صدمے سے ان کی ناک آسمان کے صدمے سے، ان کے کون کے صدمے سے غیر درکت شامل حال رکھے۔ اور فی اللہ توفیر عرض ہے کہ خدا آپ کی بات کو بنا دے۔

فقط والدہ عار با تہاس الدعاء!

آزاد: ۱۵ فروری ۱۸۸۳ء

تیرمینیائی

(۱)

بنام عشق محمد مکرملی سیم ترمذی شیر آبادی

ترجمہ من۔ کل قصبات تاریک ہیں چاک ہوں۔ ایک قطعہ تاریکی اپنی طرف سے بڑھا دیا ہے، اس کے بعد خیال آیا کہ نام سے تاریک بیا کی جائے۔ اس وقت ایک صورت سے موزوں ہوئی اس کو کلمے پہنچا ہوں۔ اگر یہ قطعہ پسند ہے تو خیر۔

خفت کد باز نجا کہ کند شد سید جاک طاعتش در روشن آلودہ بزم آہ کنوں
سال مرگ نام نہام مرحوم پیدا کرد اجتر دریا من خاطر بادوسم آہ کنوں

۱۲۹۹ = ۱۱۲۶ + ۱۵۳

چاہیے کہ سید دروزن تاریکوں کی اور کیفیت پسند اور ناپسند سب عزیزان و باطن انہی کے کلمے بھیجئے اور میں تاریخ کا گذرہ ہرنا قرار پاسے اس سے بھی اطلاع دیجئے۔ میرے ایک شفیق سفور شیرازی میرے پاس تقریر لکھتے تھے انہوں نے اس تاریخ

کو پندرہ لاکھ دوسو سے اقل کے اس طرح موزوں کیے۔

انہیں ماتم سرائیہ چہشم دوزخدار

ماتم ذبیحان کو از دور بخوم آمد کنوں

ماتم آتم امیر احمد اذ نام پور

۱۷ جمادی ۱۸۸۳ء

(۲)

بنام مرزا داغ دہلوی

مصدقہ تلعقب آتم۔ قدیمی کرم سلامت۔ سلام مسنون اخلص مقرون۔ مدت کے بعد فراخ نامہ کیا۔ مسنون یا فاعدی
زنیام۔ ہندہ نواز مجھے یاد رہیں کہ میں نے کسی خط کا جواب قلم اٹھا لیا ہو۔ یہ میرے مقدر کی نارسائی کو خط نہ پہنچا ہو۔ بہر کیت جرم ناکوہ
کا مدعو خواہ ہوں۔ انبار گو دیکھو میں بیا قن نے آپ کا خطبہ بکھاب استاد اس سلطان برنا اور سات سو روپیہ مشاہرہ مقرر ہوتا چھا پایہ
دیکھ کر نہایت مسرور ہوا تھا۔ مگر اس تحریر میں ان دونوں اعزازوں کا ذکر نہ تھا۔ اس وجہ سے وہ مرد کھیت کی حرمت افزائی جو سرکار
دولت دار نے تکر سے فرمائی وہ میرے سرور اور آئندہ ترقیوں کی امیدوں کو ٹھکا ہے میں خدا جل جلالہ میں لائے۔

شکایت جو آپ نے صنم خانہ عشق دیوان دم کے نہ پہنچنے کی کہی ہے وہ دیوان چھا کہاں؟ در نہ ممکن تھا کہ نہ پہنچتا۔
کالیفات کہن کا حضور میں آپ کے واسطے سے نہ پہنچا صاف انداز اس وجہ سے نہ تھا کہ آپ نے شک و محذور سے نگرانی میں انہوں
کو اتنی مدت تک بکھا کی اور میری طبیعت کی صفائی دیکھ کر بھی آپ کو بدگلیاں باقی ہیں۔ میان بڑے ہر گئے ہو یہ شہرہ چھوڑ دو کہ
زبردستی کا دھت کے لیے ایک بات قرار دی ہے۔

اڈل تو میں خطاب لینے ہی کے قابل اپنی تاملیت کو نہیں سمجھتا اور پھر درخواست دے کہ خطاب مانگے تو بالکل پسند
نہیں۔ میان اب تو وہ وقت آ گیا کہ مرعہ و حضور کا خطاب بارگاہ شہنشاہ حقیقی سے عطا ہو۔ کوئی اور حوصلہ نہیں ہے۔

آپ کا تازہ کلام دیکھ کر کبھی خوش ہو جاتا ہے میں کمالیہوں جو بیچوں، اسی حضور و مشاہرے کسی کسی گلدستے والے
کے اصرار سے کچھ لکھا ہوں تو وہ چھپ جاتا ہے۔ یہ فراموش چشم بدود، آپ کے واسطے ہیں کہ شکر کے سوا کوئی فکر نہیں خدا
بحیثیت خاطر بڑھا لے۔

لے ۸۹۱ھ میں غلام دکن میر محمد علی خاں نے مرزا داغ کو کوشا و سلطان کا خطاب دیا۔ انہوں میں اس کا خط گرہ چھا۔ امیر مینائی
نے بھی دیکھا۔ مگر وہی دن میں مرزا داغ کا خط امیر کے پاس آیا۔ لیکن انہوں نے اپنے خطاب و اعزاز کا ذکر نہ کیا تھا۔ اس خط کے جواب میں
امیر صاحب نے یہ خط لکھا۔

لے یعنی مرزا داغ کے خط میں۔

لے مرزا داغ نے اپنے خط میں امیر صاحب کے خطاب کے متعلق امتنا لکھا ہو گا اس کا جواب ہے۔

اڑتے پارہ استاد سلطان ہونے کی مصافی کو لا: یا مٹا دو، یا مٹا دو برسوں کہا کیا ہے۔ اب جو وہ وقت آیا تو
اسناد کی شیرینی نثار دو۔ امید ہے کہ کبھی کبھی رسم رسل و رسا کی رہے۔ میں ابتداء سے تمہارا دوست اور خیر خواہ ہوں۔ میری طرف
سے گمان فاسد نہ کیا کرو۔ زیادہ کیا لکھوں۔

۳۱ مارچ ۱۹۰۳ء امیر فقیر

داغ

(۱)

بنام نواب حسن علی خان امیر جاگیر داد

نواب صاحب تعالیٰ شہادۃ اللہ تعالیٰ

تین دن سے خدا کا منتظر ہوں، جواب نثار دو۔ لفظ بی جو شرفدار کے واسطے ہے اس پر تھا ہوں میں نے خوب جھاڑا ہے۔ پانچ
دو چھ بڑی سے لائیں پچاس ہاں سے گئے دس آپ سے مانگتی ہیں اور ان کو چھ ڈیئے گا۔ میں نے جہان کو خطا لکھا ہے۔ وہ
اتنے خط ہیں اس کو اتنے سے لے کر آپ پہنچا دیں تو بڑی عنایت۔ ایک طزل طنوت اور چھپتا ہوں۔ یہ نہ معلوم جہاں کو پہلی سب
خزینہ بیضہ میں صاف چھوڑ گئیں کہ ابھی کوئی اتنی ہیں یہاں خیریت ہے۔ کبھی کی شدت ہے۔ بچل کو دعائیں۔ فقط
فیض الملک داغ دہلوی یکم جون ۱۹۰۳ء مطابق ۱۷ ربیع الاول ۱۳۲۱ھ

(۲)

بنام نواب حسن علی خان امیر جاگیر داد

نواب صاحب سلام!

میں خیر کا طالب ہوں، حرج کا منتظر نہیں۔ مرمت کی صورت ہوئی اس بارش میں مشکل ہے۔ بی حجاب کل سے دارو ہیں۔
اور آپ کی مشاق۔ ان کا مکان گرا، جان بچ گئی۔ اس کی مرمت ہو رہی ہے۔ یہاں تو ٹھکانا نہیں۔ زیادہ نیاز!

فیض الملک داغ دہلوی

یکم اگست ۱۹۰۳ء مطابق ۱۷ جمادی الاول ۱۳۲۱ھ بروز یکشنبہ

اے اس بے تکلفی اور غصہ صلا کی کہنا!

ڈپٹی نذیر احمد (۱)

بنام جناب سید علی حسن خان بہادر

جناب عالی!

گرامت نامہ پہنچا۔ میں نے حقیقت و احمی بے کم و کاست بالمشافہ عرض کر دی تھی۔ اب کامیابی ہو تو اور ناکامی ہو تو دونوں صورتوں میں جناب کا احسان میرے ذمہ ثابت ہو چکا اور میں مدت طعمہ غمزنہ رہوں گا۔ اگر کسی مہتمم کے لیے سفارش نہیں کی گئی تو ناکامی کا احتمال ضعیف ہے۔ لیکن آپ نے خط میں اس کی کچھ مزاحمت نہیں فرمائی۔ وہی حکام انگریزی کی سفارش اس کا حال یہ ہے کہ برس برس سے میں سرکار انگریزی سے بے تعلق تھن ہوں۔ دس برس کے قریب حیدر آباد و آداس کے بعد سے خزانہ نشین ہوں۔ از بسکہ حضرت کی جتنی مہتممی طبیعت نے بے ناگزیر خواہش اور دربار داری کو گوارا نہ کیا۔ لیکن جس وقت تک میں سرکار انگریزی میں مہتمم یعنی ٹیکٹ گوارڈنگ کے سرٹیفیکٹ کتاب میں آپ نے ملاحظہ کیے ہوں گے۔ بڑی خدمت کے لیے بڑے مہدیاروں کی سفارش درکار ہے اور یوں دئی کے چوٹی کشتہ اور کمزیر گھوڑے چھانتے ہیں ان لوگوں نے میرے بلکل سے ہیں اور مرد و میری نسبت اچھا خیال رکھتے ہیں اور پوچھا جائے تو اچھا ہی ظاہر کریں گے۔ لیکن میں ان کی کوئی نصیحت پر ان کے سلام کو بھی نہیں لگی۔

چونکہ آپ نے ایک طرح کا تعلق اس معاملہ سے پیدا کر دیا ہے۔ وقتاً فوقتاً مجھ کو اطلاع ہوتی رہے تو مزید جنابت

خالسار نذیر احمد ۳ دسمبر ۱۸۹۶ء

(۲)

بنام جناب سید علی حسن خان بہادر

جناب عالی!

السلام و علیکم! آپ کو شکر یہ معلوم ہے کہ میں نے بڑی محنت سے قرآن مجید کا اردو ترجمہ کر لیا ہے۔ مجھ کو اس کے لیے تین برس محنت شاقہ اٹھانی پڑی ہے اور تراجم موجودہ اور تفاسیر اور احادیث سے مطابق کرنے کے لیے مولویوں کا مشافہہ دیکھا پڑا ہے تب کہیں جا کر یہ ترجمہ میرے نزدیک بالعمادہ سلیس و مطلب نیز مستند اور تراجم موجودہ سے بہت بہتر ہوا ہے۔ ترجمہ کے ساتھ اشعار بھی لکھے گئے ہیں اور منظوم ہے کہ ان اشعار میں اچھی طرح اعلان کر دیا جائے کہ قرآن مجید کا یہ ترجمہ جلی مکتبہ ہے۔ پہلے آپ دیکھ دیجئے کہ اچھی طرح اطمینان حاصل کر لیجئے کہ آیا واقعی میں یہ ترجمہ تراجم موجودہ سے بہتر ہے یا نہیں اور اگر آپ کے نزدیک بہتر ثابت ہو تو آپ اس کی سرپرستی کیجئے کہ نگہ اس کی اشاعت میں مدد دینا گویا اعراض رسالت کی تکمیل کرنا ہے بلکہ اگر

آپ کو اعلیٰ تو اس ترجمہ کی کیفیت کو سراہنے کوئی نہ کرے اور ان سے مراد یہی ہے کہ یہ ترجمہ کے بحر اور سواد خط اندر چھاپے سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ قیمت جو قرار دی گئی ہے اس میں کوئی ناقص معاصر نہیں مدد میں اگر اپنی محنت اور مدد روپوں کی تنخواہ ملے گا تو عرصہ فی جلد لگاتار پڑتی۔ اس میں نے یہ کام استثنائاً کیا ہے۔ ان امری الا علی اللہ میرے ہاں آپ سے تفصیل عنایت نہ ہونے کا افسوس باقی رہ گیا۔ ترجمہ تو پورے آپ کی خدمت میں لے آؤں گا کیا ہے۔ اور صرف خرچہ کا۔۔۔۔۔ کیا کیا ہے براہ مہربانی۔۔۔۔۔ کو لکھیے گا۔ خط

خاکسار۔ تدبیر احمد مرحوم دی ۲۸۹۶

(س)

نام خانہ جادو رجبہ العزیز ۶۷ دہرائی

(جواب خط یکم دسمبر ۱۹۰۳ء)

اسلام علیکم۔ سب سے پہلے میں آپ کو مرگ و بڑا پرس کی مرگ کا مان آپ نے انجاریں بھی چھاپا ہے تعین صبر کرنا ہوں۔ اگرچہ آپ محتاج تعین نہیں ہیں۔ جمال شریف کی جلد بندی کے دام لکھنا میں نہیں جلدیں آپ غائب فرماتے ہیں اس کی بابت استفسار طلب بات یہ ہے کہ کینیڈا جو آپ منظور کرنے میں اس کی تہذیب کیا ہے مجھے یاد نہیں اور میرے پاس کوئی اس کی بابت اشتہار ہے۔ کالڈن کی شرکت حروف ہے۔ اعتدال مزاج پر مائل ہوتا ہے۔ دو اوجستہ، اول دورانی استرا و برستہ دہائی کے لوگ آؤدو کہ سمجھتے ہیں اور گزشتہ نہیں سمجھتے۔ اعتدال آپ کا اور آپ جیسے لوگوں کا شریک کا نظریں ہونا نہایت ضروری ہے۔۔۔۔۔ نہ ہیں تو، نہ ہی عام کالڈن کو سوزہ تسلیم میں پادشاہ باتوں کا کھڑے ہو کر اٹھ کر دیا۔

خدا کی بابت جو کہ کہنا ہے کوہنی کا اہتمام حیدر چاہئے نہیں مذہب انجاریں بھی بعض جیسے برکتے ہیں۔ جیسے کسی شخص نے آپ کے انجاریں لکھ مارا کہ مسلمان کی ترقی کے لیے پابندی ہے۔ جب ضروری نہیں انہی شاید تجھے پوچھے میں کسی صاحب نے وضعا ہم متاثر ہوں سے۔ دین کی پیش گوئی استنباط کی۔ لغزب۔ اصل۔ بلکہ نہ سبب ضرورت۔ ایسی باتوں سے قرآن کے فرمان کو سے بتا رہا تھا جابا ہے اس قسم کے مضامین آپ کے اور آپ کے انجاریں انجاریں نہیں اور میرے لایک۔ ایسی باتوں سے اسلام کو نقصان پہنچتا ہے۔

ہاں ————— محامیوں جو جلد جائیں گی ان کی خدمت میں انہی ہوتی ہیں جس نے اسے قسم ادائیہ تھا۔

خاکسار۔ تدبیر احمد۔ ۲۸ دسمبر ۱۹۰۳ء

مولانا حالی

(۱)

بنام حسن الملک

جناب مولوی صاحب محترم و مکرم معظم دوام جمہلیم
 بعد تسلیم دینا نہ کے التماس یہ بہت کہ دو جلدیں کتاب مہیات سعدی کی اور دو جلدیں سندس مدح و جزاء اسلام کی خدمت والا
 ہیں اور مالی کتابوں ان سے دوسری جلدیں آپ کے ملاحظہ کے لیے اور دوسری دو جلدیں جن پر روپلی نقشبندی ہوا ہے جنہ
 نواب صاحب بہادر دام انبیا علیہ السلام کے لیے ہیں۔ پہلی کتاب میں نیاز مند نے شیخ سعدی کی لائف اور ان کی تمام تصانیف
 پر ایک بڑی کئی قدر و جدت کے ساتھ لکھا ہے جس پر شفیق خضر کا رائے صاحب کا دیوبند علی گڑھ اسٹیٹ پرنٹ مرشد ۱۹ مارچ میں
 چھپا ہے اور صبح کو پنجاب اور اعلیٰ شمالی و مغرب کے معتبر اصحاب میں مٹا پسند کرتے ہیں۔

دوسری کتاب یعنی مدح و جزاء ماسلام کے آخر میں ایک نیا جیمہ ۹۰:۱۰ ہذا کا اکثر اکا بر و اجاب کی ترکیب سے اضافہ
 کیا ہے جس کی نسبت ابھی میں نہیں کہہ سکتا کہ چاہک کی کیا راستہ ہو گی۔

فان کتاب کو کثرت محبت مرحوم کے سبب یاد نہ کرنا چاہتا ہوں کہ ان دونوں کتابوں کی نسبت
 جب کہ ان کی ترتیب ۱۰۰ تو دین ختم نہ ہوئی تھی۔ خاندان سامی کی حالت سے مختلف اوقات میں ادانت و غریب اداری کی امید
 دلائی گئی تھی اور زیادہ تر اسی امید کے پورے پورا ان دونوں کتابوں کے ایک ساتھ چھپوانے کی برأت کی گئی ہے التماس
 یہ ہے کہ ان کتابوں کی اشاعت اس ملک میں جلد ہی جیسے کہ ان کا زیادہ فزائش و کرم دونوں شخصے ہر حصہ و نواب صاحب مداد
 کی نذر کے لیے ارسال خدمت والا کیجئے جاتے ہیں۔ مع عرضداشت ملاحظہ کیا نامہ پیش گاہ جناب غفرہ ایدہ میں
 گزراں کہ جس قسم کی غائیہ رعایت ممکن ہو اس کے لیے سنا دیش فرمائیں۔

جو محنت اور زہداری جو کہ برداشت کوئی پڑی ہے اس کا تدارک خاطر خواہ ہو جائے گا۔ اگرچہ مدد و ستان
 میں مصنف کی وقت ایک برس سے زیادہ نہیں ہے اور میرا کوئی حق آپ پر ایسا ہے جس کے سب سے آپ
 کو ایسی تکلیفیں دینے کا ہونا سمجھوں لیکن سچ یہ ہے کہ آپ کے ساتھ ہم لوگوں کو ایک حسن ظن اس قدر چاہیے کہ جس امر کی
 تحریک کو دعا کی برسی سے زیادہ گزر چکے ہیں آج ملک اس سے قطعاً ایسی نہیں ہوئی کہ میرا خیالی تو بہت مشکل ہے۔ اگر یہ امید
 بھی قائم رہے تو فیت ہے

زیادہ نیاز

نیاز نامہ خاکسار الطاف حسین حالی از دیوبند چھپرت ۲۶ مارچ ۸۹ء

لے گا کہ یہ خط مودود ہے و اب حسن الملک کا اور اسی سلسلہ میں ان دونوں کتابوں کی جلدیں میرا دیوبند طبع کی گئی ہیں جس کی نقل اور عبدالرحیم خاں کے
 مودود خود کی نقل موجود ہے۔ اصل خدیوے پاس محفوظ ہے (تلیس کاظمی)

(۳)

بنام مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب دین سکیم پور

جناب میں !

لفظ فاتحہ میں چار شہزادے غلوپا ہے۔ لیکن رات ادبات کا قافیہ بھی شعر ارسلے باندھا ہے۔ قافیہ کے کی ضرورت ایسی اسکا صنف فردگذاشتوں کو جائز کر دیتی ہے۔ مرزا غالب لکھی اور کئی کی جگہ لکھو اور کسو کو فیض کچھتے تھے۔ لیکن ان کے اردو دیوان میں قافیہ کی جگہ کسو اور کجود بندا ہوا ہے۔ میں بھی پیشہ فاتحہ کو اسے غلوپا کے ساتھ لکھا ہوں۔ مگر قافیہ میں بات باندھنا جائز سمجھتا ہوں۔

نیا زائد

خاکسار الطاف حسین حالی اپنی بہت عملہ اہل ارباب اور فروری ۱۸۹۰ء

(۳)

بنام مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب دین سکیم پور

مخدومی !

مہمان ناخاندہ عزیزاقرامہان خاندہ پہنچا بادجو دیگر کئی صنف فرست کے سبب مملو عات جدیدہ کے مطالعے کے لیے بالکل وقت نہیں ہے۔ اسی حالت میں تہذیب صنف کے رسالہ علمائے سنت کو دلچسپا گیا۔ انٹرس ہنس کے کچھ اس عمدہ تصنیف پر مفصل دیارک کرنے کی فرست نہیں ہے مگر غفر یہ ہے کہ اس رسالے نے میرے دل میں آپ کی محبت اور عظمت نسبت سابق کے اعطاف مضامین کر دی ہے۔ مسلمانوں کے لڑکچر میں اپنی طرز کی یہ پہلی کتاب ہے شاید کوئی ناواقف آدمی یہ کہے کہ کیا مسلمانوں نے فن رجال میں ایسی عمدہ لکائی ہیں نہیں لکھیں مگر ایسا سوال کرنا سخت غلطی کی بات ہے۔ آپ نے درحقیقت وہ کام کیا ہے جو انگلستان کے مشہور مصنف مریموٹی نے سلف سلف کے لکھے ہیں کیا ہے۔ اس سلسلے میں ہزاروں باخبر گویاں پھر کر ایک چھوٹی سی کتاب لکھی ہے جس سے بہتر آج تک کوئی کتاب انگریزی میں اس طرز کی نہیں لکھی گئی۔ مسلمان علماء کے حالات لکھنا ادبات ہے اور نام باخبر گویاں کو دیکھ کر چند عزیزان بجز کو کہنے اور ہر عنوان کے نام سب اس دفتر میں الہی سے مضامین انتخاب کرنے اور ان کو جدا جدا عنوان کے تحت میں درج کرنا نہایت محنت اور دیاقت اور غور و فکر کا کام ہے آپ کی تصنیف میں اور مشہور محکم کی کتاب میں صرف یہ فرق ہے کہ اس نے سلف سلف میں کتاب کا موضوع صرف علماء میں محدود نہیں رکھا بلکہ اس میں تمام دیندار اور موجد و دختر آویزہ شیشین اور ہر سالہ و جزوہ و غیرہ شامل ہیں اور اس رسالے میں صرف علماء کے حالات سے بحث کی گئی ہے اگر آپ اس کے دائرے کو زیادہ وسیع کر دیتے تو بہ بالکل اسی قسم کی کتاب ہر جماعت میں سلف سلف ہے۔ اس کتاب میں اور بھی بہت سی خوبیاں ہیں۔ مگر میں صرف ایک خوبی کا جو کہ تمام تصنیف کی جان ہے ذکر کرنا کافی سمجھتا ہے

میں خیال کرتا ہوں کہ اگر آپ انگلش لڑکچر سے واقف نہ ہوتے تو ایسی تصنیف کا خیال ہرگز آپ کے دل میں نہ کرتا

پس تا وقتیکہ مذودہ اصل انگریزی تعلیم کی ضرورت پر ذود نہ دے گی اس کی چیخ و پکار سے کوئی مستند پیرائینیں ہو سکتی
اسی کے ساتھ میرا یہ بھی خیال ہے۔ کہ انگریزی تعلیم جب تک کہ اس میں شرقی تعلیم کی جاشنی مذہبی جائے گی۔ ہرگز مفید و آدمی
پیرائینیں کر سکتی۔ مجھے ایک انگریزی تعلیم یا فتر بھی ایسا نظر نہیں آتا جو مسلمان علماء کے حالات پر ایک ایسی کتاب لکھ لے جیسی
کہ آپ نے لکھی ہے۔ میرے نزدیک یہ کتاب ایسی ہے کہ اس کی ایک ایک دود و جلدیں ہر دورہ اسلامیہ میں رہنی چاہئیں
بلکہ جمہور کالج کے طلبہ بھی اس سے مستفید ہوں تو بہت مناسب ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ کتاب آپ نے اپنے خرچ سے چھپوائی
ہے یا نہ ذوالعلماء نے اس کو چھپوایا ہے۔ مسلمان اذو غاص کہ پرانے خیالات کے مسلمان ایسی کتابوں کے خریدنے میں بہت
مہلک ہیں۔ اس لیے مدارس اسلامیہ میں اس کو مفت تقسیم کرنا چاہیئے۔ آخر میں میری یہ دعا ہے کہ خدا تعالیٰ ہمارے عام
دشمنوں اور دشمنیوں کو اسی طرح زبور و علم و یاقوت و حسن اخلاق سے آراستہ کرے جیسا کہ اس نے ترقی و ترقی دہی میں آپ کو
زبور و علم و فضل و اخلاق سے آراستہ کیا ہے اور آپ کو عید و عیدوں کا روزگار سے محفوظ رکھ کر صدوی سال تک ذفرہ و سلامت رکھے۔

ذیادہ بناؤ

غاکسار اعلان حسین عافی مٹھی عزا انہائی پت۔ ۱۰ ستمبر ۱۸۹۸ء

نواب محسن الملک

(۱)

بنام فشی و کار اللہ صاحب

محترم و کرم بندہ فشی و کار اللہ صاحب ذوالعظ

مولوی سید احمد مصنف فرنگیاب آصفیہ جن کی چار سو کتابیں سرکار نے خرید فرمائی ہیں یہاں آئے اور جناب نواب دارالعلوم برکات
خانی کی عازمت حاصل کی۔ قراب انتصار و جگت ہمارا وہ بندہ نے بھی ان کے مشکلات کو جرات کے بچاؤ کے ختم ہونے میں
پیش میں میںیں اور سرکار میں عرض کیا کہ کسی طرح اس کتاب کا نام ہو جانا چاہیئے تاکہ جس عرض سے سرکار نے چار سو جلدیں خریدی ہیں
وہ حاصل ہو اور اس پر یہ امر قرار پایا ہے کہ یہ معاملہ آپ کے سپرد کیا جاوے اس لیے میں آپ کو تکلیف دیتا ہوں کہ آپ
فرمائی لکے اتنی محنت اپنے آپ کو ادا فرمائیے کہ جو معاملہ ان کا سرکار سے ہے وہ کس طور پر ہو سکتا ہے اور وہ کس طرح
اس کے پتے سے نہایت حاصل کر سکتے ہیں اور سرکار کی کیا مدد اس کام میں معلوب ہے اور کاندھ بانی مافذہ کتاب کے چھاپنے
کے لیے یہ بہتر ہوگا کہ مولوی علیچند آباد میں چھپائی جاوے اور مولوی سید احمد صاحب اس کی تصحیح یہاں آکھیاں دہ کر
کہا گیا کہ آپ سے بہتر اس کام کے واسطے دوسرا کوئی نہیں ہے۔ اس لیے آخری تصحیف اس کا آپ کی دسکے عالی پر عودہ

لے نواب وقار الملک۔

طور پر ہر سگے کا۔ زیادہ نیاز!

محسن الملک احمدی اشانی ۱۳۰۷ھ (۲۰ فروری ۱۸۹۰ء)

(۲)

بنام ذاب پیر علی حسن

جناب محترم کرم بندہ ذاب علی حسن خان بہادر

آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ آپ گھنٹوں تشریف لے گئے ہیں اور امین الدین کے ذریعہ سے آپ کا پتہ بھی دریافت کیا تا کہ خط لکھوں مگر پتہ معلوم نہ ہوا۔ آپ کا شکریہ ادا کرنا ہوں کہ آپ نے عنایت امر بھی کر دیا فرمایا۔
آپ نے جو خواہش فرمائی ہے وہ تمام قوم کی کنوئی کا باعث ہے۔ آپ کو قومی تہذیبی توجہ سے ہمیشہ سے ہے اب وہ آتش اور منتقل ہو گئی ہے۔ یہ قوم کی عرض نصیبی ہے۔ اگرچہ آپ کا بھوپال سے تشریف لانا دشمنان کو ہندوستان سے قوم کے لیے مفید ہو۔

حدود مقودہ سبب خیر گزشتہ خواہد

غیر پایہ و مکان تیشہ گزشتہ

قوم کی پہلی خدمت تو یہ ہے کہ آپ تعلیمی مسائل پر آٹا ڈھنسا کر کچھ مضمون لکھ کر مل گدھ انجی ٹرٹ ٹرٹ میں بھیج دیا کیجئے۔
دوسری یہ ہے کہ اپنے دوستوں اور علاقائیوں کو قومی کاروں پر متوجہ کیجئے اور عمدہ مشورہ اور صلاحیں سمجھ کر دیا کیجئے۔ ایک تجویز جو رہتی ہے کہ تعداد بڑھانے کی زیادہ کی جائے۔ اس وقت جتنی جگہ ہیں وہ سب معمور ہیں۔ اگر یہ تجویز مقصور ہوئی تو یہ ایک کی خدمت میں آپ کا معزز نام بھی جلد نظر آدے گا ٹرٹ ٹرٹ ہونا اور نہ ہونا اور بات ہے۔ آپ کی شان اس سے روشن اور اعلیٰ ہے اور آپ سے ہر طرح کی مدد ملنے کی امید ہے۔

میں ایک درخواست جو نہایت چھوٹی ہے کرتا ہوں، یعنی ہے کہ آپ اس کو مقصور فرمادیں گے یعنی مل گدھ انجی ٹرٹ ٹرٹ گزشتہ کہ آپ کو معزز اگر کسی جس کی سالانہ قیمت ۷۵ ہے اور اگر معاذین میں آپ داخل ہونا چاہیں تو وہ ۱۵۰ روپے آپ دے کر اس کو مدد دے سکتے ہیں۔ کچھ انہما راجدہ نمونہ آپ کی خدمت میں مرسل ہے۔

محسن الملک، اذمل گدھ یکم اگست ۱۹۰۲ء

(۳)

بنام مولوی بشیر الدین

محذوفی مولوی بشیر الدین صاحب!

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں اور کیونکر آپ کے ساتھ کام کروں۔ ایک بڑی عادت آپ میں ہے کہ آپ

خطوں کا جواب نہیں دیتے۔ اگر دو سطریں جواب بھی دے دیا کرو تو اس قدر تو معلوم ہو کہ تم دفعہ ہوا اور میرے نہیں میں نے تم کو تین خطوں کے گرایک کا بھی جواب نہیں آیا تاہم دنیا میں ہا سال کی طرح پھر میری وقت اور رسوائی ہوگئی۔ کہ وقت پر کام نہ ہوگا۔ آپ نے اس وقت تک رد و لیٹن بھیجے نہ چندہ کی فرست اور میں اس وقت تک ادب سنگیٹھی کے لمبروں کو کچھ اطلاع نہیں دے سکا جو غنیمت کا مول کے لیے مقرر ہوئے ہیں۔ آج کا انبار بھی پہنچا میں میں ہی سب کچھ ہے۔ سولے کا نفرنس کے نہ اس کی کچھ کیفیت ہے۔ رد و لیٹن۔ اڑھے تو پریڈنٹ کو سختی کے ساتھ برا بھلا کہا گیا ہے۔ طریقہ یہی جس سختی سے آپ تحریر کرتے ہیں بھڑکنا تو پسند نہیں ہے۔ آپ ہی شاید اس کو پسند کرتے ہوں۔ دسے ظاہر کرنے کے لیے ضروری نہیں ہے کہ حق سے کام لیا جائے۔ بلکہ تاریخی ان میں ہے کہ بنیاد طلب زم فضوں میں ظاہر کیا جائے اور انسانیت اور اخلاق کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے۔ لیکن مجھ کو اس سے کچھ مطلب نہیں، میں آپ کا ناصح ہوں نہ آپ کسی کی سننے والے ہیں۔ ہاں مجھے اس بات کا ہے کہ آپ مجھے بہت تکلیف دیتے ہیں اور وقت پر میرے خطوں کا نہ جواب دیتے ہیں نہ کام کرتے ہیں۔ آپ رد و لیٹن اور فرست چندہ کی بھیج دیجئے یا جواب دیجئے ورنہ میں کوئی اور انتقام کروں گا۔ مجھے پاد سال کے سے اتنا غم آئے ہیں کہ باتوں میں دن گزار جاویں گے اور پورے وقت پر بنا نہ ہوگی۔ لیکن میں آپ سے صاف کہے دیتا ہوں کہ میں اب اس کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر آپ بدھوت نہ کھ سکیں تو جن لوگوں نے ٹاٹ لکھے ہیں ان کو بیرے پاس بھیج دیجئے تاکہ میں خود اپنا سر ہاؤن اور آپ کو آئندہ تکلیف نہ دوں۔

یہ کیا طریقہ آپ نے اختیار کیا ہے کہ اڈل آپ اخبار میں شائع کر کے کالج کو مد نام اور فضیحت کو دیتے ہیں پھر مجھے توجہ دلاتے ہیں۔ کالج کے طالب علموں پر سن کا کیا حال چلا اور کیا سوا جس پر آپ میری توجہ چاہتے ہیں۔ اور دوسرے توجہ ہونے کے آپ بذریعہ اخبار کالج کی فضیحت کرنے پر آمادہ ہیں۔ مجھے اس وقت تک کچھ معلوم نہیں کہ کیا اخبار سنے اخبار میں لکھنے کے اڈل مجھے تو اطلاع دی ہوئی۔ یہ کوئی دیکھتی نہیں ہے نہ کالج کی غیر خواہی نہ آپ اسی بائیں کہ جس سے مسلمانوں کو کالج کے خلاف جوش پیدا ہوا اخبار میں لکھ دیں اور مجھ کو خبر تک نہ کہیں اور پھر بھی لوں گے ان میں جس سے یہ بھی نہ معلوم ہو کہ کیا آفت آئی۔ کیا قیامت ہو پا رہی۔ خیر اگر اسی کا نام آنا دی اور غیر خواہی ہے تو یہ آپ کو ہمارا کہہ دے اور جو آپ کا دل چاہے کریں انوار احمد اور علی محمد کہاں ہیں۔

محسن الملک ۵ جنوری ۱۹۰۴ء

نواب وقار الملک

(۱)

نام سر سید احمد خاں

جانب قبلہ و کعبہ اسلامت

تسلیم! آپ کا ارشاد تو بہتر از حکم کے ہے جس کے بعد سکونت کے سوا اس قسم کے معاملات میں کچھ چارہ ہی نہیں ہے۔

لیکن جو وجہ ارشاد ہوئی ہیں ان کی نسبت اس قدر عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ میریوں میں سے بھی بہت سے ہوں گے جو ان مضامین کو جن کو وہ سن چکے شاید دوبارہ پڑھنے کی تعلیم دے کر ہیں اور جن بزرگوں غیر میریوں نے غلط فہم پڑھی ہے۔ ان کو مضبوط پلٹ سے بہت ہی کم تعلق رہے گا۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ کیا یہ غیر اخبار کے انگریز پڑھنے والوں کے لیے تو ادر و مطلوبہ پلٹ سے کچھ تعلق نہیں اور اس طرح بڑا مفیدہ لوگوں کا خیال اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ کسی پر وقت مسلمان نے اس بات کی بھی کلافنس میں دے دی کہ گورنمنٹ کو چاہیے کہ وہ اپنے موجودہ مسلمان ماسٹروں کے ذریعے سے یہ بھی تعلیم بھی کرا دے۔

مگر میں آپ پر عرض کر چکا کہ اگر آپ کی رائے سو سنی کے اخبار میں جو اردو انگریزی دو زبان کا اخبار ہے، اصلاح کی نہیں ہے تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن اس حالت میں جسے آپ کو آزاد کھجوں گا اگر کوئی موقع مجھے ملے تو میں اپنے آپ سے اس پر جیسے کہ ملنے کی کوئی سب کا اردو انگریزی کولن اور ادبی کے ساتھ وہ دوسری اصلاح ہوگی کہ یہ میں قلمی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ ایسا ہی کر دوں گا۔ نورث یاد رکھی کر دوں۔ واپس لے لے

خاکسار۔ مشتاق حسین امر دسمبر ۱۵ مارچ ۱۸۹۳ء

(۲)

بیم خواب تیر علی حسن صاحب

جناب خواب صاحب مخدومی دھنسی خواب حمام ملک بہار برصغیر

اسلام و عیسائیت دو بڑا کتا باجمہ کو اگرچہ جناب سے شرف قدم بوسی حاصل نہیں مٹا۔ لیکن دیکھ کر اکثر اوقات سنتا رہا ہوں اور خصوصاً جناب مولوی حافظ سید احمد رضا خان صاحب سے بہت کچھ جناب کے متعلق سنا ہے اور فکروں کیا ہے کہ قوم میں بھی ایسے افراد موجود ہیں۔ میں گزشتہ چند مہینے میں علی تھا۔ اور اس لیے جن کا مذاق کو گھنے دو بیٹھے پہلے پھنسا اور دیکھنا چاہیے تھا ان کی نسبت اب آئی ہے اور آج شام بھی میں نے جناب کا مصنفوں عرب کی تصنیفات اور یورپ کی فیاضی پر گزشتہ سنی کے معاد میں پڑھا ہے جو کہ جناب نے اس مصنفوں میں علی گڑھ کی کوششوں کے متعلق ظاہر فرمایا ہے میں اسے ذاتی تجربہ کی بنیاد پر جو رد و زیادہ عرض کر رہا ہوں کہ اس کی حالت میں مجھ کو حاصل ہو رہے ہیں کہ وہ باطل جیسے ہے اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ مذہبی تعلیم کی نسبت جو کہ دامن سے جدا تعلق تھی وہ محض راستے پر تھی۔ فیاضی کہیں یہ ارادہ نہیں کیا تھا کہ علی گڑھ دینا وہی تعلیم کی تھی کہ ساتھ مذہبی تعلیم بھی پڑھنے پر تھی کہ اسے حاصل کریں اور اسلامی اخلاق ان میں پیدا ہوں۔ لیکن خوردہ زمانہ گزرا ہے ادب دیکھنا ہے کہ صاحبان علی وقتہ زمانہ موجودہ دائرہ اس میں کیا تغیر پیدا کر رہے ہیں۔ اس وقت تک خواب بھی دامن جو کہ کہا گیا ہے اور کہا جا رہا ہے وہ صرف چند الفاظ سے اور کچھ زیادہ نہیں ہے۔ وقل اللہ یحوت بعد ذلک امرہ معاد کے اس مصنفوں میں جو کہ حضرت نے تحریر فرمایا ہے اس میں جان سخن ہے کہ قوم اور علماء میں پھر زبردستی تقابل ہو اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ مطلب فی زمانہ مذوق العنا کے گروہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔ مگر مؤامروں نہایت کے گروہ کے

خواب و تدارک کے لئے کلافنس کے اجلاس ۱۸۹۲ء میں تعلیم و فہیات پر جو پیش کیا تھا اس کے سلسلے میں یہ خط و کتابت ہے۔

ناہم صاحب اور نائب ناہم صاحب اور چند شاہیر علماء مدوہ نے جبرانی سے اردوہ کو اپنی تشریف آوری سے عزت بخشی تھی۔ اس وقت میں نے ان حضرات سے دریافت کیا تھا۔ کہ کیا بھوپال میں بھی اردو کی طرف سے کوئی تحریک ہوئی ہے تو اس کے جواب سے میں اسی قدر تعجب نکال سکا کہ کوئی نوڈ تحریک نہیں ہوئی اور اب جناب کے ان تازہ اخبار و رسائل کے لحاظ سے میرے نزدیک مناسب ہے کہ آئندہ جلسہ مدوہ کا بھوپال میں ہو۔ ایشیائیک اولاً جناب اور نائب مارہام صاحب با نقابہ اس کو پسند فرمائیں اور پھر حضورِ عالیہ متعالیہ دامت تہا اس کو منظور فرمائیں اور جس وقت کریں اردوہ جو اردو متلوری ہو جائے تب جلسہ کے دن اور اوقات کا تعین حضورِ عالیہ متعالیہ دامت تہا جناب اور نائب مارہام صاحب کی مرضی اور صوابدید پر مختصر ہوگا اور حضرات مدوہ یقیناً کمال تشکر و افغان سے اس کو قبول کریں گے۔ اور پھر یہ امر محتاج بیان نہیں ہے کہ مدوہ کا جلسہ بھوپال میں ہو گا جس کی نسبت یہ بیچھوڑ پر کہا جاسکے کہ مدوہ اسباب ایک جہ تھا اور اس جلسہ نے اس میں جان و مال دی ہے اور اس جہم سے جان میں جان کا پڑنا ان کیوں نہ پھر درست اور محسوس کی دسے گا جس کے کمزور ہو کر قوت جاننے سے تو ہم اسلئے مدوہ کے ساتھ صرف اس کے نام باقی رہ گیا ہے اور حضورِ عالیہ دامت تہا اسی زمانہ میں مدوہ کی ورنہ راست پر مدوہ کا ولی ہونا منظور فرمائیں جو گویا تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی اور توہم کی مٹی پر ہی ہر کی اور بھانڈوں کی نظر اور مدوہ اولیٰ تہا میری اور شاہان مرہم اور نواذات کے جو حضورِ مدوہ کی ذات با برکت کے ساتھ خفق میں آئندہ کسم پیرن کا جہدہ حضورِ مدوہ کے واسطے ہے مدعوڑوں کو سمجھا جاوے گا۔

حضورِ کلہ مشور قہر ہند کے فاؤنڈر ذرا ن۔ دینی ہندوستان میں حضورِ عالیہ متعالیہ ہی اس کی مشفق ہیں کہ مدوہ مذہبی حیثیت سے مسلمانان ہند کی ماہ پر مشفق و مشفق تسلیم کی جاوے۔ حضرت کے نام نامی کے ساتھ خواہ مخواہی تعلیمات کا انتظام دیکھ کر جس انتظام سے اس میں مدوہ کو اختیار حاصل ہوتا ہے۔ آج کی ڈاک سے چند کلمات اردو انگریزی جناب کے علاوہ کی طرف سے بھیجتا ہوں اور یہ نتیجہ ہے جو میں نے چار سال کی متواتر کوشش میں اپنے صدماتِ متعدد و مالک مغربی و شمالی و اردوہ کے واسطے حاصل کیا ہے اور جس کے ذریعہ سے اب یہ بات خود ادا ملک کے ہاتھ میں آگئی ہے کہ مدوہ انگریزی سرکاری مدارس میں دینیات کی تعلیم کا انتظام کریں اور جس پر بھی دیکھیں تو پھر ان کو خدا کیسے۔

مدوہ کے جلسہ بھوپال کی نسبت ایک اضیالی کارروائی ہے جس کا ذکر میں نے آپ پیش کیا تھا گویا ہم اس قدر اس کے متعلق بھی عرض کر دینا کافی ہے کہ اگر وہاں ہمارے اس کو پسند فرمائیں تو میں اس کے کہ اس پسند کی کوئی اپنا کر لیا جائے وہ صاحب ریخت گورڈنجرل سے کسی عاقبت کے تعلق پر اس کا مرتبہ ذاتی تذکرہ کنایت کرے گا اور ابھی میری طرف سے یہ صرف میرے ہی خیالات کا اظہار ہے۔ حضرات مدوہ پر میں بھی اس کے بعد ہی پیش لکوں گا۔ والسلام

خاکسار

مشتاق مصیب اندامروہ۔ ۲۶ جولائی ۱۸۹۹ء

ملہ ذاب سید مل حسن رضی اللہ عنہما الملک، ذاب سید مل حسن علی کے فرزند حضرت علیؑ کے متک علم و تعلیمات کے پانچ رہے۔ پھر حضرت علیؑ متناہی کر لی۔ وہیں وفات پائی۔

(۳)

بنام حسن الملک

جناب مزدوی!

آپ خفا ہوتے ہوں گے کہ آپ کے غفلوں اور غرضیاتا رول کا جواب وقت پر نہ ملا۔ اصل یہ ہے کہ میں نے شلو سے کونستے وقت ار آباد کے مقام سے ایک ہفتہ کی رخصت کر کے ملاوہ عید کی تسکین کے لیے لی تھی۔ پرموں شام واپس آیا ہوں مگر صحت خراب ہے۔ آپ کا ایک خط، ہرجو لائی کا دو خط، مراگت کے لئے۔ جواب آئندہ کے خط میں ردوں گا ہاکی ہر پڑاؤ پر بیکہ مشتاق آپ کا خط عجب کو دیاں سے چلنے کے دن شلو میں ملا تھا۔ پہلی ہی منزل میں مراگت کے تار پر دیر بیٹھنے کا حکم حیدر آباد پہنچ دیا تھا۔ خیال ہے کہ اس وقت دیر پہنچ گیا ہوگا۔ میرا ریش صاحب کا فقرہ حقیقت اس قسم کی پالیسی ہے جس کو میں ہمیشہ عزیز رکھتا ہوں۔ ہنرت دشمنو ساتھ کو جب میں نے اپنا بدوگا رستمیر عدالت جہا راجہ صاحب کے وقت میں بنایا تھا تو وہ بھی پالیسی تھی کہ اپنی صفائی اور راست بازی کا پاس کیا۔ جواب میں اس لیے دیر ہوئی کہ اذہ اؤس کے بغیر سردی صاحب کو صاحب دینا جتنا سب دشمن تھا۔ آپ کے حکمان پر سب حیرت ہے نہ اس کے لیے اب تو جہد کو کسی گئی گیا۔ میں مفصل آئندہ کہوں گا۔ والسلام والتسلیم!

خالک ر

شقائق حسین۔ حیدر آباد وکلن، مراگت ووشندہ جج

شبلی نعمانی

(۱)

بنام مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی

مہاراجک داد۔ دیو پو پڑھا اور بار بار پڑھا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ تحمین نہیں بلکہ حسد کے قابل ہیں اور سکا یہ ہے کہ اگر آپ کسی کموشین کے موہ پر آئیں تو مجھ میں اسی کم ہنرت فیلک کا ظہور ہوگا۔ یہ دیو پو انہاڈنگ عددودہ کو ام ڈپڑ جائے گا۔ اس کو ایک رسالے کی صورت میں چھپنا اور شائع ہونا چاہیے۔ اس سے اور حمرہ کونستے قائم ہوں گے۔ اور

۱۔ یہ مکتوب غالباً نواب حسن الملک کے نام ہے جب وہ مدنیات کے مقدمے کی پروسی کے لیے دولت آصفیہ کی طرف سے لندن گئے ہوئے تھے۔

۲۔ جہارت پڑھی نہیں گئی۔

عمرہ غزنے تمام ہوں گے۔ اور شاید رفتہ رفتہ حیاتِ مہادیہ کا کل خونِ تازہ ان نقوشوں سے نکل جائے۔ واسلام !
شعبی۔ ۲۴ فروری ۱۹۰۲ء از حیدر آباد

(۲)

بنام مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی

مکرمی !

یاد رہے کہ جب کوئی علمی رسالہ نکالنا چاہتے ہیں تو قریباً سال مہر کے لیے مضامین تیار کر لیتے ہیں تب نکالتے ہیں
الغرض کے لیے سب یہ ہونا چاہیئے اور چونکہ بڑی دقت چھپنے کی ہے اس لیے میری قریہ رائے ہے کہ دو تین مہینے کاؤٹیز
اس طرح چھپا لیا جائے کہ صرف مائیکل ایچ اور علمی جہوں کے اٹنا نہ کروینے کے بعد رسالہ نکال جائے۔ میں نے ایک چھوٹا سا
مضمون "نقہ تفسیر" ایک دیوبندی منطق پر، جس میں یونانی منطق کی تعلیمات بتائی ہیں۔ ایک فرنگی عالم کے ایک مضمون کا جو اسلام پر
سے زہر کر رہا ہے غرضی مولوی روم پر تقریباً ایک وسیع سلسلہ شروع کیا ہے۔ آپ کی اسی مرتبہ جزیہ سے مضامین لکھ چکے ہیں
کے اخلاق سے شروع کیجئے اور جو خیال آتا جائے۔ ان پر بتائیے قطع کیا ہو۔ کیا آدو سے معنی کے برابر؟ لیکن خط اس سے
جلی ہونا چاہیئے۔ ڈیڑھ کا ترجمہ عربی میں کیا ہو۔ دوسرے اچھا کوئی لفظ نہیں ملتا۔ لوح پر ڈیڑھوں کا نام لکھا ہوگا۔ میں اس کو بھی
مڑا دیتا۔ لیکن اولیٰ تو مراد ہی احکام سے اس کی ضرورت ہے۔ دوسرے یہ کہنے لوگوں میں مذکور ہے کہ اس قدر اظہر چلی
ہے کہ محض مذکور کے نام سے اس مسئلے میں اس کی کچھ وقعت نہ ہوگی ان دسلے کے صفات کس قدر ہوں۔ میں تو دو
جزو کا ہی سمجھتا ہوں۔ والتسلیم !

شعبی۔ ۲۴ اکتوبر ۱۹۰۳ء

(۳)

بنام ذاب علی مس

جناب ذاب علی مس خاں صاحب باقاعہم !

نثارِ بلبلی کن ہر مستراح کہند و نوا
فغان از گرمی بکا مژخو جان نہ روشنی
طراز مند حبشید و فرساج خسرو را
ہم آہینہ از لبت عارض خلعت و سرو را

مولانا شبلی کی یہ مزل کلمات کچھ دسترگاہی میں شائع ہو چکی ہے۔ صنفی الدولہ حسام الملک ذاب علی مس خاں بہادر کے نام کے ساتھ تب بھی
مکتب شبلی میں چھپ چکے ہیں۔ لیکن یہ مکتوب کہیں شائع نہیں ہوا۔ اگرچہ اس میں مزل کے سوا کچھ نہیں لکھا۔

نثارِ بلبلی کی روشنی سے مستحق ہے اور نہ قبول نہیں ہوا۔ سبیل کا بیجا وی مقید رہے کہ دنیا میں کوئی تو نہیں۔ ایک یونانی دوسری امریکی اسی کو زلف
سے بھی کہہ سکتے ہیں اداسی کا نام وحدت کے مقابلے میں غایت ہے۔ عربانِ روشنی نے زلف عارض سے خلعت و نوا کو باہم ملا دیا۔

ہر سوائے مجرم و دہلوی شمش ہے پودا
مرد شوق از سر دہلی افنا داست دہودا
برہ ساقی نے بانی کہ درخت کجای یافت
کہ آد آب جو پانی و گلشت اپا لودا
بیاضی بر یاد چڑ گیا سے مرعاش
دگر وہ پارہ گردان این قلعے نہ پھر تورا

شبی۔ انجیبی کیر دود۔ جگہ دھن کاست پست آفس بانی کلا

۱۶ ستمبر ۱۹۰۶ء

اکبر الہ آبادی

(۱)

بنام فشی محمد الدین ذوق

الہ آباد۔ کرمی سلا اللہ تعالیٰ۔

عمری گزریں آپ سے مرسلت نہیں ہوئی۔ میں کیا کہوں ایک مدت سے کس مصیبت میں ہوں۔ مرث میل ہی نہیں ہوں۔
اس کے سوا ادب بہت کچھ ہوں۔ تفصیل کیا عرض کروں۔
پڑ گئے گیسے اداہم تہاں کے چھندے
بابہ زنجیر ہے اکبر کا قلم آج کے دن
بہر حال دعا ہے کہ خدا عاقبت بہ خیر کرے۔

رسالہ طریقت ماہ دیکر ۱۵ دیکر کو دل خوش ہو گیا۔ زوائد تصنیف، انعامیوں، خود آرائیوں، خود فرشتوں سے پاک۔ پچھے دھانی
منیدہ معنائیں سے مالا مال۔ ہر اک اند۔ مس کو دہلی کی تقریر سہمان اللہ لڑا علی نور۔ بابا صاحب کے خیالات بھی خوب۔ کیا اچھا ہوتا
اگر یہ پڑچہ انگریزی زبان میں شائع ہوتا۔ کچھ مزو نہیں کہ اصلی درجہ کا انگریزی لکھ کر جو کام سے کام صلب سے صلب۔ کاشش
گورنمنٹ اسی طریق کی حامی اور مددگار نہ ہو۔ امیر محمد دنیا دوستی کا عند کہہ کر گیا اپنا ہی گرنوٹا نے کی دنیا و تمام کرتا ہے نہی خیریت
لیکھے۔ دعا بچھے، دعا دیکھے۔

۲۶ دیکر ۱۹۱۵ء

اکبر

(۲)

بنام مولوی میر الدین صاحب دھرم ایڈیٹر البشیر

جناب ایڈیٹر صاحب۔ جناب مولوی میر الدین صاحب دھرمی نے لڑائی عید کا جہا عمارہ آدود و ترجمہ

ملہ چھاپی اور پالو بیسی کی مشہور دہشت گاہیں ہیں۔

شائع کیا ہے۔ وہ درحقیقت نہایت عمدہ بلکہ لاجواب ہے۔ اس سے بہتر خدمت اسلام کی اس زمانے میں ذہن نہیں آسکتی۔

اللہ تعالیٰ مولوی صاحب کو جس کے غیر عطا فرمائے ان کے علم و قابلیت سے قوم کو بہت فائدہ پہنچا۔ ادب بہت فائدہ پہنچنے کی امید ہے۔

بعض مقامات پر مجھ کو شبہ پیدا ہوا ہے یا تو میرا شبہ ہے یا اس کے۔ اور ایسا ہونا کچھ بعید نہیں کیونکہ انیسویں صدی کی روشنی کے ضمن میں عقل و قیاس کو اس منزل میں کہاں تک رسائی ہو سکتی ہے اور یا فی الواقع ترجمہ میں کچھ غلطی ہو گئی۔ ایسا ہونا بھی کچھ بعید نہیں کیونکہ مولوی صاحب کے مددگار اور بزرگ داد بھی تھے۔ شاید کسی نے غلطی کی اور نقل ثانی میں اس پر نگاہ نہ پڑی۔ اتنے بڑے عظیم الشان تاجرنِ حضرت کے ترجمے میں اگر کہیں دوچار غلطیوں پر سفر نہ پڑی تو کچھ تعجب نہیں۔ اب میں ایک شبہ بیان کرتا ہوں۔ سودہ واقعہ کے ترجمہ پر صفحہ ۹۵۱ لغتِ خفقا الا نسا ت فی احسن تمویس مشدہ سدرۃ اسفلہ فیہ کما ترجمہ حسب ذیل کیا گیا ہے۔ ہم نے انسان کو بہتر سے بہتر ساخت کا پیدا کیا۔ پھر ہم اس کو روپ و ہاکسے (کنز سے کنز مخلوق کے درجے میں ڈال دیا)۔

یونیت میں جو الفاظ توضیح کے لیے بڑھائے گئے ہیں اس کی صحت میں مجھ کو شبہ ہے۔ درحقیقت ترجمہ غلط نہیں ہے صحت میں شاید غلطی ہوئی ہو یا خیال تھا اور ہے کہ یہاں جوائی اور بڑھا پامقصور نہیں ہے۔ بلکہ انسان کی روحانی اور اخلاقی حالت کا بیان ہے ترک دنیا کن و مگنور۔

دوسری آیت الا الذین آمنوا و عملوا الصالحات فلھم اجر فی عرصۃ من احوال کی تائید کرتی ہے اگر میرا خیال صحیح تسلیم کیا جائے تو آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح چاہیے اگر میرا خیال صحیح تسلیم نہ کیا جائے تو یہ بات زیر بحث ہوگی

نیداکر حسین اذاد آباد

مولانا عبدالحکیم شتر

(۱)

ہنام مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی

جناب مہرمن - اسلام و علیکم

آپ نے اپنے والدان سے مرخص ہو کر ۱۳۱۹ھ میں جناب حکیم سید عابدین صاحب قبلہ مرحوم و منور کی محبت و تلمذ و فائز کے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا ہے مجھ سے اس میں شک نہیں کہ حکیم صاحب مرحوم کی زندگی کا بہت زیادہ حصہ آپ ہی لوگوں میں گزرا۔ اور جس طرح آپ نے ان لوگوں کو اپنا بنالیا تھا۔ اسی طرح ان کو بھی مرستے و دیکھتے آپ ہی کے ساتھ تعلق رہا جس

دیس کے گھر انتقال ہوا وہ بھی آپ کے ایک عزیز عزیز ہیں اور اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ جس دن انتقال ہوا اسے میں ہستی پائی
جناب غیل اللہ خاں صاحب کے گھر کے لوگوں کا علاج کرنے کو جانے والے تھے۔ میں آپ کا بہانہ ہی بنکر گزارا ہوں۔ اور
اسی طرح حکیم صاحب مرحوم کے تمام متعلقیین آپ کے کمروں میں کہ ایسی کم داندروہ کی حالت میں آپ نے دل دہی اور لاشیٰ دینے
کی کوشش فرمائی۔ حکیم صاحب مرحوم کے جن اوصاف کا آپ نے تذکرہ فرمایا، وہ اوصاف بے شک ایسے ہیں کہ اسی جتنے
کے بد لوگوں کے ساتھ ختم کرتے جاتے ہیں۔ جس سے خردان مرحوم کو قطع تھا۔ مگر عجزی میں کہتا ہوں کہ آپ پھر بھی اس عظیم
مدد سے کوشش نہ کیلیں گے جو اس نیک ذات کے آٹھ جانے سے ہم لوگوں کو ہوا ہے۔ وہ حقیقت خاندان ہی بڑی تھی۔
آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ جس خاندان کی یادگار حکیم صاحب مرحوم تھے۔ اس کی پھلی یادگار ایسے وہی تھے۔ اور اس کا لازمی
نتیجہ تھا کہ ضیفہ اور بیوہ عورتوں کی ایک بڑی برادری کی خبر گیری وہی کرتے تھے۔ اب ان لوگوں کی سب سے کسی کی حالت ایسی
نازک ہے کہ خیال کرنے سے بھی دل کانپ جاتا ہے۔ اگرچہ مرحوم کے بعد قدرۃ ان تمام باتوں کا زمرہ دار ہیں۔ مگر
ایسی فیاض و نیک ذات کی جائیشی کے لیے بہت سی لیاقتیں چاہیے ہیں۔ جو مجھ سے ناگوارہ شخص میں باطل نہیں۔ اصل یہ
ہے کہ میرے ختم ہو کر پھر مرحوم دکھا جاسکتا ہے۔ مگر ان لوگوں کے دل کو دھارس بندھانا اسکان سے باہر اور عذر اسی کے
افتیاد میں مغفرتا ہے جس کو اب مرحوم کے بعد زندگی کے باقی ماندہ کام بہر کو ناشر و بلکہ غیر قابل برداشت مصیبت مغفرتا
ہے۔ حکیم صاحب مرحوم کو آپ کے خاندان بھر میں آپ کے والد ماجد سے بہت زیادہ تعلق تھا۔ ان کو ہمیشہ یاد کرتے
تھے اور ان کے نیک اخلاق اور ان کی کریم انفسی کے ہر وقت معترف و یاد کرتے تھے۔ یقیناً ان کو بھی بہت بڑا صدمہ
ہوا ہوگا۔ آپ کی طرف سے میں نے جناب حکیم صاحب مرحوم کے گھر میں لوگوں کو بہت کچھ تسلی بخشی دی۔ اور وہ سب
آپ کے شکر گزار ہیں۔ میں ان دنوں گھنٹوں سے باہر تھا اور اسی وجہ سے والا نا اے کے جواب میں تاخیر ہوئی۔ مجھے
خداست ہے کہ گھنٹوں میں بھی ایک اتفاقی اور فوری بیماری کی وجہ سے مجھے ملنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ جس کے لیے معذرت
خواہ ہوں۔ والسلام

میں ہوں آپ کا خادم محمد عبدالحکیم شرر از گھنٹوں

۲۳ اپریل ۱۸۹۹ء

(۲)

بنام نواب سید علی حسن

جھانے دو واسے میں۔

کاداب و نیاز اور اسلام و حکیم کے بعد بعد اعراب عرض ہے کہ گڑھی نامہ مورخہ ۴۱۲۷ ج ۱ لاہور شمسہ واصل ہو کر باعث
مرفرائی ہوا۔ میں دھندہ کر گیا تھا اس کو بھولا نہیں۔ آتے ہی مولوی سید عبد المجید صاحب سے اس بارے میں گفتگو ہوئی اور
معلوم ہوا کہ اس بارے میں جناب نے ان سے بھی مرسلت فرمائی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ میں اس معاملہ میں خود کرتا رہا جن
خاندانی تعلقات کا جناب نے تذکرہ فرمایا ہے۔ ان کا پتہ لگاؤ دشوار ہے اس لیے کہ جن دنوں یہ واقعہ ہے اس زمانہ میں پہلا

وفا تو کی ایسی اجڑھات تھی کہ کسی اگلے خاندان کا ادب تو لگانا قریب قریب غیر ممکن کے ہے۔ اور بالفرض پتر لگے بھی تو حاصل کیا۔ اس لیے کہ ان کے ثبوت سے کوئی خاص حق حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔

دہا یہ امر کہ جناب یہاں تو وطن اختیار فرماتا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے کسی اجازت کے حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر شخص آزادی کے ساتھ وہاں آ کے رہ سکتا اور جائداد خرید سکتا ہے۔ اور وطن اختیار کرنے کے چند ہی روز بعد سے اُسے محلہ حقوق حاصل ہو سکتے ہیں، بجز اس کے کہ لازمت کے لیے بارہ سال تک یہاں مقیم رہنا ضروری ہے۔ گریبان کا جانے اور مکان خرید لینے کے بعد اگر درخواست کی جائے تو یقیناً یہ بارہ سال کی شرط بھی اڑ سکتی ہے۔ الفرض آپ کے لیے کوئی امر مانع وطن حیدر آباد نہیں ہے۔

لیکن یہ بات کہ آپ کے تشریف لانے سے پیشتر حضور سے کوئی اجازت حاصل ہو تو بقول بید عبد المجید صاحب کے ایسی درخواست کو اصل حضرت مشہد مغروس سے دیکھیں گے۔ اور خیال ہو گا کہ اجازت تو اس کے پورے میں کوئی اور حق حاصل کرنا مقصود ہے اور ایسے شہر کا پیدا کرنا اچھا نہیں۔ میرے خیال میں اگر جناب کو یہاں رہنے کا شوق ہے تو عمرہ کو بھی یہاں خرید لینے اور اس میں آ کے رہنا شروع کر دیجئے۔ اور یہیں کے قیام کے زمانہ میں وہ کوششیں عمل میں لائیں جن کو جناب یہاں آنے سے پہلے کر رہے ہیں۔ آجائے اور مکان خرید لینے کے بعد سب باتیں بہ آسانی مگر خود بخود پوری ہو جائیں گی۔

میں یہاں حضور کی سیرۃ کھنے کے لیے بلا گیا تھا۔ اور میرا سابق کا وظیفہ ملا کے پانچوہ دہرے ماہرہ تنخواہ قرار پائی تھی یہاں آنے کے بعد اس کام کے لیے تین سو تین تائیس ماہرہ کا عمل ملا۔ اور مود جمع کرنے کی کوشش شروع ہو گئی اور دفتر کا کام دفتر شرکت عثمانیہ قرار پایا۔

اس کے بعد اعلیٰ حضرت کے ایک فرمان سے حکم ہوا کہ مجھ ہی سے ایک مکمل تاریخ اسلام تصنیف کرائی جائے اور اس کی بابت حدا گارہ ماہرہ دی جائے۔ اس حکم کے مطابق میرے لیے علاوہ ماہرہ مابقی کے دوسری ماہرہ پانچوہ دہرے اور تین سو چھترہ دہرے ماہرہ کا عمل معتمدی سے منظور کر کے بارگاہ خسروی میں پیش ہوا ہے۔ شاید آج ہی کی میں منظور ہو کے بجائے گران سب جائزہ دوں پر اخصاص ہیں سنا مزد ہو گئے ہیں۔ بہر حال شک ہے میں حضور میں بلا واسطہ عرض پیش کر سکا ہوں اور جو لکھا ہوں اُس کا ثواب مجھ پر ملتا ہے۔ میرے حال پر نفرت بھی غیر معمولی ہے۔ مگر باوجود یہ کہ موقوفہ اہل ایک ہی بار ملا ہے۔ لیکن صاحب اور شاہی مزاج کی ذاکت کی یہ حالت ہے کہ اپنے امر و متعلق کے سوا اور کسی بات کے عرض کرنے کی مجھے ہانسی اور کوہرات نہیں ہو سکتی۔ آئندہ اگر زیادہ صحبت ہو تو جس کے چاہا کچھ ماہ بعد تقصی امید ہے اس وقت شاید کسی اور بات کے عرض کرنے کا موقع بھی مل سکے۔ والسلام

۲۵ جولائی ۱۹۱۸ء خاکسار محمد عبد المجید شکر

پیادے صاحب اور اچھے صاحب کی خدمات میں سلام نیاز اور ادب قبول ہو

دشوق، محبوب پورہ، جام باغ، جہد آباد دکن

ریاض خیر آبادی (۱)

بنام احسن ماہ ہروی

مکرمی!

کارِ مودت - ریاض الاخلاص کی بابت عرض کردہ قیمت قبل ذمے لاشکر یہ - ستمبر سے پہلے تلاش کر کے آج یا کل غالباً روانہ کر
دل گا۔ مگر دیکھتے گا۔ ناگوار نہ ہو میری صاف و سخی حرکت دلائی ہے۔ ورنہ قبول میرے۔

میں جانتا ہوں ذہن طلبی کو کمال حیب

دہنا دروغ ہے مرے دست سوال کا

اگر میرا یہ فعلی کچھ بھی گراں ہو تو بے تکلف واپس کر دیجئے گا میں تاوان کو سزا قصور سمجھ کر پھر وہی پرچہ پوسٹ روانہ کر دوں گا۔ یہ
امر کہ انعام زیادہ ہے وگرنہ نہ کریں گے۔ میں نے مرثیہ داسے لانا ہمارا کیا تھا۔

ہر کے معصیت غریب علموی داند

آپ کو مزود مجھ سے دلی منس ہے۔ اس قدر متاثر ہوں کہ بے تکلف آرزو کے یک جہتی کر بیٹھا۔ آپ میرا خیالی صبح بھین بات
یہ ہے کہ میں دوسرے پریشان ہو رہا ہوں۔ اول تو بالکل تھی کیسے پر خورد ہا عداوت و زندقہ کی ہر وقت فکر دوسرے صحن تنہا ایسے
جہاد کی کام تھا جب ہی چل سکتے ہیں کہ انسان فارغ اہالی ہو صیغہ طاعت و بیعت و بیعت ہوں۔ معافی

نگلی حواہ اور میں لاغر

کیا پچھڑے گی کیا ہنسائے گی

یک جہانی لا کرئی مناسبت طریقہ ممکن ہوتا تو آپ کی ذاتی مالی حمایت سے ایک مرتبہ زمین سربراہ اوصاف کے کی کوشش کی
جاتی۔ مگر جس اتفاق کہاں ممکن۔ وہیں مزود قائم کیجئے صرف گدڑے کیلئے۔ جہاد کی چھپائی یا اخبار نکالنے کو ماہر بہت ہی چھوٹا
مقام ہے۔ بہر حال کچھ کرتے رہتے۔ خوش نام آدمی کے کام۔ طرح میں غزل تو دونوں طرف ہی اکتفا نہ خاص چاہتا ہوں یہاں
لا کام ہے۔ ریاض خلیل کے ذریعے ملک کے وہاں جس طرح چاہے مجھے نمایاں کیجئے۔ آپ و فرد اخلاق سے یہ سب کچھ کہہ سکتے
ہیں۔ کہ اگر حکومت کے ساتھ کچھ سچے کچھ حقیقی الفاظ میں غیر مقدم کیجئے۔ تصویر پھولوں سے لدی ہوئی شائع کیجئے۔ یہاں تک کہ یہی کہ
دنیا میں میرا کوئی ثانی مغرور نہ آئے۔ مگر جب کلام پر مغرور نہ آئے گی تو سب مرثیہ اشعار سے دل جاسے گی۔ آئندہ میں آئندہ
ہا میں گئے۔ کلام اس قابل ہوتا تو نذر کا مضائقہ نہ تھا۔ نہیں حضرت نہیں۔ واللہ مجھ کو آپ غلطی سادگی کے ساتھ معمولی درجہ کے
شراک کی آخری حالت میں لیجئے۔ یہ باتیں ذرا کی باتیں۔ میں غزل مزود بھیجوں گا۔ میرے نام کے ساتھ دائرہ الفاظ نہ ہوں گے۔
صرف ریاض کی کافی ہو گا۔ دعوے تو اس شہادت سے گزرا ہوں کہ غزل بھیجوں گا۔ اور قصیدہ بھی ہے۔ مگر غزل بھی تو جہاں ہے۔

آج آپ نے محبت جتا کر میرا ہوت، ہی وقت لیا خدا آپ کا سچا کرے۔ بالکل میں چند منٹ دل طرب پہلا۔ اب نہ وہ دم نہ ہاری حالت، فکر دنیا کا لگنی۔ کچھ روز سے ادھر عالم ہو گیا ہے

یاد ہوں گی تجھے گلشن کی بہاریں گل ہیں
پنکھڑی ڈھٹی تو شور و فغا دل ہوتا

پیشرو: نیماق، ۶، نوامبر ۱۹۹۸

(۲)

بنام چودھری فتح محمد صاحب شیفۃ بی لے

عالی جناب چودھری فتح محمد صاحب ہالقا بہ !

مہندستان میں دھوم ہے کس کے کلام کی
وہ کون ہے یہاں کو جو جانتا نہیں

عنوان تر شاہزادہ قلعی ہے منہ ام کو من دامن۔ حقیقت اتنی ہے کہ ”دیامن الانباز“ جتنے میں دوبار ”قلعہ“ ہفتہ وار نام لائی
دو ہفتہ ”عطر غفر“ ہفتہ وار گلچیں ”مانہ“ ”صلح علی“ روزانہ۔ یہ سب میری ایڈیٹری اور حکومت میں رسول شاہ کے ہوتے رہے
اس زمانے میں انبار گھر تھے کہ نو روز چٹائی لاہور سے ”ادھو انجاز“ دو روز گھنٹہ سے ”لارنس گٹ“ ہفتہ وار میرے شائع
ہوتے تھے۔ میرے نام اور شخص کی شہرت کا یہی سبب تھے۔ یعنی وہ پہلے جنہیں میں نکالتا تھا۔ رجبہ القادری صاحب قریب
قریب اسی زمانے کے بزرگ ہیں۔ یقیناً خط و کتابت کے ذریعے سے میرے شناسا بھی، نیروان کی تحقیق و ترقیق و دکاوت و
ذہانت اور عالمانہ وسیع معلومات کا دست سے معترف ہوئی۔ سر اقبال شاہزادہ بیہوشیت سے مجھے جانتے ہیں اور انجانی حقیقت
سے بھی۔ مجھے اس وقت مرحوم کو گائی کی یاد بے اختیار آئی۔ وہ مجھ سے حیدر آباد میں اس وقت ملے تھے جب میں سر بہادر
کنن برشاود شاہ کا مہمان تھا۔ میں ان کی فادی شاعری کا بہت احترام کرتا ہوں۔ اس سے میری یہ غرض نہیں کہ سر اقبال کی آواز و ناکار
شاعری کا احترام ان کے بلند خیالات کو دیکھتے ہوئے میرے دل میں فرق کے ساتھ ہے۔ میں کہتا ہوں سر اقبال کے بلند خیالات
نے ان کے ہر مصرعے کو جامہ لپی لہجہ کی کاموفاٹ ڈری بنایا ہے۔

پچاس سال ہوئے کے سرپرست مرحوم نے ذمہ داری پنجاب کا فخر ملکہ کر پنجاب کو اور صوبوں سے اقلیتی حالت میں ظاہر کیا تھا۔ مگر جس نے اس وقت کی کشمیری دلچسپیاں لاہور کو لے کر سرحد بنائے ہوں گے دیکھتے ہی دیکھتے تمام اصناف میں پنجاب نے اپنی ذمہ داری سے فارغ حاصل کر لیا۔ بے اختیار دل سے ہر دعا نکلتی ہے کہ یہ

ترسی اٹھان ترقی کرے قیامت کی

ترا شباب بڑھے عمر جاوداں کی طرح

مجھے بہت زیادہ حیرت زبان کی ترقی پر ہے۔ پنجاب کے شہری افراد ہوں یا اہل تصنیف و تالیف، روزانہ ہفتہ وار

پہلے ہوں یا امیر دانش کی ہونے والے رسالے، قریب قریب کسی پاکیزہ اور دو ساختہ دسے ساختہ زبان میں انتشار کرتے ہیں پنجاب سے نکلیں اور مدین بھی وہی دیکھنوں سے قریب قریب یکسانیت حاصل کر لیتا۔ گو نکلیں زبان تو جوہر اپنے خاص مرکزوں سے بھرت ہو رہی ہے۔ پھر بھی مایوسی میں امید کی جھلک اس اعتبار سے نظر آ رہی ہے کہ ذرہ دلاں پنجاب اگر نکلیں زبان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ تو ضرور اس پر بھی قابو حاصل کر لیں گے۔ وہ نکلیں زبان جو غائب و اقباس کا ستر بھی جاتی ہے اور نامزد سریت سے، سب تک غائب ہوا۔ میر نامرعلی مرحوم غیر صلائے عام کا جرحہ ہو کر نکلیں تھی۔ جزو رنگاری اور دلی نظم کو امیر داغ، جلالی نے چار چاند لگائے۔ ذرہ دلاں پنجاب کا شاعر بھی تو جوہر فرمایا۔ جو زبان انکوں اور کاجوں میں اور ابتدائی مکاتیب میں داخل دوسرے ہو چکی ہے اور ہوتی جاتی ہے۔ حاصل تو ہر سے نکلیں زبان ہو سکتی ہے۔ در زمانہ نیا می رد دیوار کی کجی کی مصداق محاسب ابی ہے آئندہ بھی رہے گی۔

میں آپ کو کہا لکھنا چاہتا تھا اور لی کلو با کی کسی اعتبار سے بیسے ہر امید ماضی کا ذخیرہ ہوا کہ ہوں۔ مجھے جناب کو بنا دنا مرکنے کا اتفاق اسی بنا پر ہوا کہ میں نے فقہ صاحب کو ایک خط اس عرض سے لکھا کہ میرے دیوان کے طبع اور چا تو پنجاب وغیرہ میں زیادہ دوسرے سے ہے گونا گویا نے ہر وقت نامہ ابی کی صورت پیدا کر دی ہے۔ اسی بیسے فقہ اور دوسرے احباب کو ہیں یقین، لکھا جاتا تھا کہ دیوان کی مطاوت و اشاعت کا زنا اب قریب ہے اور اعتبار دلائے کو میں نے ملک کے سرایہ نامزد سریتان صاحب جیت جیسے الزام آ کر جمع ہوئی، دن دسے نام آئی تھی صورت نقلی، خط میں مکتوب کر دی تھی۔ فقہ صاحب نے اس مکتوب سے متاثر ہو کر یہ بنایا تھا کہ دیوان ریاض کے متعلق اپنے مکتوب کے سرایہ نامہ اشاعت یعنی سرمد لقا در صاحب بالقابہ، سر اقبال صاحب بالقابہ، ملک سرمد و زخان نون ام اسے وزیر تعلیم پنجاب سے ایسی ہی پرمیٹیاں یا نوٹ حاصل کیے جائیں۔ کہ دیوان ریاض کو ان کے ذریعے سے بھی روشناس عالم ہونے کا موقع حاصل ہو سکے۔ فقہ صاحب نے مجھ سے خواہش کی کہ میں ایک نیا نامہ جناب کو بھیجوں۔ آپ ماس اور مختلف خبروں کا مجموعہ عجیب ہیں۔ مجھ پر آپ کی تائید کا خصوصیت تخلص یعنی کہیں کہیں کہ تائید ملی ہو دس استیہ اثر ہوا کہ میں آپ کو خط بھیجنے کے لیے بہت تاب ہو گیا۔

مجھے اس کی بھی خواہش نہیں ہے کہ آپ جواب لکھنے کی تکلیف گوارا کریں یا میری اس بے سرو پا طو لانی تحریر کے ہڑے میں وقت مٹائیں کہیں۔ میں جس اسٹیل پوزیشن میں ہوں یا حالت نے ہر گناؤں کثیر ادلاؤ ہوئے اور صرف لعلو ابورادیش ہونے کے مجھ پر ضرور دینا خاک کر دی ہے۔ مگر دیوان کی اشاعت انشاء اللہ ضرور دسے بیسے اہلیان پیدا کر دے گی۔ بقول میرے ہے۔

آس اک چیز ہے دنیا میں اگر کوٹ نہ جائے

سر اقبال تاملی عزیز الدین و زیو دنیا میرے واسطے بہترین ذریعہ تھے کہیں کہیں اعلیٰ حضرت مقام دکن سے ہوں۔ مگر میری قسمت نے مجھے روک دیا۔

بلکہ ملک سرمد لقا در صاحب، سر اقبال صاحب، ملک سرمد و زخان صاحب نون ایسی بلند پایہ شخصیتیں ہیں کہ وہ میرے

دیوان کے متعلق انہما در خیال و زبان میں تو مرد و عورتوں کی یہ قدر فرائضی ملک کی شکر گزاری کا باعث ہو گی۔ مگر میں مرد و عورتوں سے ایسی امیدوار کہ اس خداداد سیدہ بزرگہ کے ادب اور شان کے خلاف سمجھتا ہوں جس نے مجھ سے بے لطفانیت کم یا بیش کی شاعری کو اس مرتبے پر پہنچا یا کہ اگر کوئی تعلیم یافتہ بلند پایہ حضرات جن کی قابلیت نے دورِ جدید کی شاعری کو کچھ سے کچھ ہٹا دیا ہے۔ میرے لیے تو نہیں مگر میرے اشرار کے لیے اچھے الفاظ سے بھل نہیں دے سکتے۔

کہنہ تعاقب کی مٹھن سے دیا مٹھن شکستہ حال
مجھ کو نہ دیکھئے مرے اشرار دیکھئے

میرا خیال یہ ہے جو حضرات میرے دیوان کے لیے غارِ فرما فی زبانیں لگے وہ اپنے لیے میرے دیوان میں اپنی مستقل یادگار قائم کر دیں گے۔

نوشترہ لماند سیدہ بزرگہ

فتنہ صاحب نے اپنی امیدیوں جو آپ کے دامن سے وابستہ کی ہیں۔ ان کا لحاظ فرماتے ہوئے آپ حضرات مرد و عورتوں کو سمجھنا دینا جائز اور مزید اعتبار کے لیے اس کی ضرورت معلوم ہو تو آپ سیدہ لمان صاحبہ جیسے شخص کی جتنی نقل شدہ جو مضمون سمجھتا ہوں آپ پر ایک شدہ صورت میں یا کوئی ان کی خدمت میں بھیج دیں یا خود کسی وقت دیکھا دیں گے۔ میں وہ مضمون بھی مضمون سمجھتا ہوں جس کے لیے اچھے الفاظ و خان بہادری اور ذرا الہی صاحبہ اسٹنڈنٹ ڈائریکٹر سرمدیہ تعلیم پنجاب نے اپنی جتنی موصو ز حال میں مجھ کو لکھے ہیں۔

قدرواں گوہر سخن کے دیا مٹھن
منہ مرا موتیوں سے بھرتے ہیں

سیدہ دیا مٹھن احمد دیا مٹھن خیر کا دوا دوا دوا مٹھن دیا مٹھن

۱۵ اکتوبر ۱۹۳۳ء

حبیب الرحمن شروانی

(۱)

نام سیدہ مخدوم عالم صاحبہ

مفتی۔ دہلیک السلام ورحمۃ اللہ

الطاعت نامے کا پاس گزارا ہوں۔ آپ بے لادگی کی شکایت کرتے ہیں۔ اور مجھے بالادہ بننے کی تدبیر میں مشورے کے خواہشمند ہیں مجھ کو تعجب ہوتا ہے کہ ایسا شخص کیوں کر پیدا ہو سکتا ہے جس کے قبضے میں شباب، علمی استعداد، روشنی خیال، خاندانی ضلعت معاش و غیرہ اسباب قوت ہوں۔ مسلمانوں میں کام کرنے کے استغنی میدان کھلے ہوئے ہیں کہ اگر کوئی کام کا شائق ہو تو کچھ کر سکتا ہے۔ دلی می کشید کہا انجائرسٹ۔ کام مضمون ہوتا ہے۔ ابھی آئی کی لائسنس میں جو پرنسٹن انجیئرس مشراہ بین نے دیا اس میں لائی

کا معافی و ادائی اقدس میں پیرائے میں کھلا پاسے وہ دلوں پر تان دینے کا کام نہ دے تو کھنچا چاہیے کہ دل پر چلے ہر ایک مسلمان رجاء و اداء کرے) اس اقدس کو دُور کرنے اور قومی ترقی میں اسانڈ کرنے میں مدد سے سکتا ہے کسی طرح ایہ مجھ سے سینے مسلمانوں میں جو مرض ساری ہے وہ بے فکری کا ہے۔ باقی کی غزلیاں اس مرض کے اعراض ہیں۔ اگر اس مرض کا علاج کیا جائے یعنی مسلمان اپنی حالت پر غور کر کے اس کا افراط و تفریط کو برکریں تو ایسی لاپرواہی ہے۔ آپ خائف ہوں ہیں، مہم در میں عربی عادات میں، کافر تہذیبوں میں، لہجوں میں، مکتوبوں میں، بازا دلوں میں، اجباب کی مجلسوں میں، مرض مسلمانوں کے ہر شے میں جا کر دیکھنے سے دلی اور کم حوصلگی کا نشانہ ہر جگہ آپ محسوس کریں گے۔ اور یہ رنگ آپ کہیں نہیں دیکھیں گے کہ ایک یا دو مسلمان جو ان مردانہ کئی کام کے کرنے میں جان ڈا رہے ہیں۔ اور ان کی ساری حرکات و سکنات سے حوصلے کی گرمی نکال رہی ہے۔ جو دیکھنے والوں کے دلوں میں کچھ نہ کچھ برقی اثر دوڑا دیتے ہیں۔ کیا اس سے اعلیٰ اور پاکیزہ کام کسی مسلمان کے دھستے ہو سکتا ہے کہ وہ اس بد دل کے دُور کرنے اور حوصلے کی گرمی پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ حقیقتاً یہ زمانہ مسلمانوں کے لیے ایک اجبار سے خوش قسمتی کا زمانہ ہے اور یہ یوں کہ جو وقت مسلمانوں پر گھ کی آن کر پڑا ہے وہ تاریکیوں میں اپنی نظریں نہ رکھا اور جو موقع قومی خدمت کا ہم کو حاصل ہے وہ بہت کم نصیب ہوا ہو گا۔ اگر کوئی جوان مرد ایک دلی کے ساتھ اس خدمت میں جان دے دے تو شہادت کے مرتب ہونے کی امید کر سکتا ہے۔ مسلمانوں کی بے فکری کا ایک شعبہ یہ بھی ہے کہ جب وہ کسی کام کے کرنے کا خواب دیکھتے ہیں تو راتوں رات و ناموں کے دربار کے سوا انہیں کچھ نظر نہیں آتا۔ یعنی وہ یہ منصوبہ بنا دیتے ہیں کہ جب بغداد کا دربار بادشاہ ہو اور وہ شان و شوکت کے ساتھ اس میں جا کر پائے تقریب میں کھڑے ہوں تو اس وقت ملے گا وہ یوں دینی کے دھستے ایسا وقت حاصل کریں جس کی آمدنی کیمبرج اور آکسفورڈ کو ان و احد میں گرو کر دے لیکن آہ بغداد کا دربار انہیں ہم میں برکی عروج کا کچھ شائبہ نہیں ہم پر قومی خدمت کیا کر سکتے ہیں۔ جب اس خواب سے آٹھ کھٹکی ہے تو وہ اپنے دماغ کی مسرور خستہ اور مضلل ہاتھ ہیں جس نے ابھی کسی دائمی دورے سے نجات پائی ہو۔ اور اس خواب کا سولہ اس کے کچھ تجربہ نہیں ہوتا کہ وہ چند روز تک خواب دیکھنے کے لائق ہی نہیں رہتے۔ جب وہ ایسا خواب دیکھتے تھے تو اس کا خیال نہیں کرتے۔ کہ بغداد کا دربار بادشاہوں کے عروج نے نہیں سمجھا تھا بلکہ وہ ان پاک دل کاربایوں کی محنت کا ثمر تھا۔ جو اہ خدا میں ڈال گئے تھے۔ اگر ہم بھی پاک دلی سے قومی خدمت کے لیے مزدور نہیں تو ہم محنت قومی اور شوکت ملی کا دربار کا جانے کدہ اب سوال یہ ہے کہ ہم مزدور دلی کرنے کہاں جائیں۔ جواب یہ ہے کہ جہاں ہم میں دینی مزدوری شروع کر دیں۔ قومی عمارت کا سلسلہ اس کی بنا سے ہمارے ایک جگہ دینا کے ہر حصے میں پھیلا ہوا ہے۔ اور ہر جگہ مزدور نہ بننے سے کام بند ہے۔ اس اجمال کی تفصیل سنئے۔ آدم بر مطلب سب سے اول ہم کہ یہ دیکھنا چاہیے کہ ہم تو قومی عمارت کے ایک جز ہیں۔ لہذا ہمیں سے کام شروع کر دیں۔ دیکھ کے

مصدقہ بارگاہ محراب الرحمن مژدائی مرحوم امارت کے علاوہ علم و فضل میں بھی ہندو تہذیبیت کے مالک تھے۔ اور جو کتب خانہ انہوں نے قائم کیا تھا۔ وہ دور حاضر کے نوادریں سے تھا۔ وقت کے تمام الا برطیم سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ان کے بعض کتابتیں جمعہ کاروان خیالی میں شائع کر رکھے ہیں۔

ہی تحصیل علم کریں۔ تحصیل کے لیے مزدور نہیں کرنا چاہیے ہی نہیں۔ باہر جانے کی دست نہیں تو گھر پر بیٹھیں۔ کتبہ ہو تو بھاگ دوڑ کر جو غراندہ مل جائے اس سے سبق لیں کوئی دے تو بیٹے سے حساب کر لے گی بیکیں۔ اگر ایسے کرے میں ہیں جہاں کوئی پڑھا لکھا نہیں تو جو کام گاؤں میں ہوتے ہوں ان کو بیکیں۔ بل جتیں۔ نوادہ کام کریں۔ بھاری حاصل کریں غرض کچھ کریں۔ یہ کرنا اس سے بدتر ہے کہ ہم اس حسرت میں وقت بھریں کہ ہم کو دلیفہ فائدہ لگایا نہیں ہمارے پڑھنے۔ ہاں ہم جوان ہیں۔ گھر میں بڑی۔ بچے۔ بڑی بوڑھی ماں ہیں۔ رہنے کو مکان سے۔ خود بڑی سی معاش بھی ہے۔ جہاں ہم رہتے ہیں وہ شریف مسلمانوں کی بستی ہے جو گزشتہ تاریخ بھی رکھتی ہے، ہمارا بھائی بھی ہے۔ دوست احباب بھی ہیں ہم کچھ سکھ پڑھے بھی ہیں۔ صحبت کی بدولت مسکالوں کی ضرورتوں اور دوسری قوموں کی حالتوں سے واقفیت رکھتے ہیں۔ اور ہر اب تو بے انتہا کام ہم کو کرنا ہے جس سے ساری عمر فرصت نہیں ہو سکتی۔ ہم کو اول نیک ولی اور وسعت فحالی اور عمل کی عادت اپنے نفس میں پیدا کرنی چاہیے۔ اس کے ذریعے سے ہم ان لوگوں سے جن سے ہم کو سابقہ پڑے محبت و ہمدردی کے ساتھ مل سکیں گے۔ کفایت شہادی سے زندگی بسر کر سکیں گے۔ ہمدردی و محبت ملنے والوں کو ہمارا گرویدہ کر دے گی کفایت شہادی اطمینان قلب پیدا کرے گی

اب ہم گھر میں جاتے ہیں تو میری کو علم کا شوق دلاتے ہیں۔ مزدور ہو تو اس کو کھانا پڑھنا بتاتے ہیں۔ رسوم بے جا کی پرانی ذہن نشین کرتے ہیں۔ احکام دین کی پابندی کی تعلیم کرتے ہیں۔ جو نقصان خوردوں کی معیبت تاخیر بن گئے ہیں ان کے مقابلے نرمی سے جہاد کرتے ہیں۔ راشی کی تعلیم کی فکر کرتے ہیں یعنی اس کو کم سے کم جو ممکن ہے کھاتے پڑھاتے ہیں۔ سینا پر دانا سیکھنے کی توفیق دلاتے ہیں۔ بوڑھی ماں سے پرکشادہ پیشانی پیش آتے ہیں۔ سادات مذاہبات جیت کرتے ہیں۔ جو خدمت قابلِ سرانجام ہو وہ انجام دیتے ہیں۔ مکان کی صفائی کا اہتمام رکھتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ دیکھئے اس بخود ہی سی دریں کتنی خدمتیں انجام دیں۔ تعلیم نسوان۔ مادی ترقی۔ حفظ صحت و جڑہ بہت سے کام کیے۔ دوست احباب سے ملنے ہیں تو ان سے ان کا دُکھ درد سنتے ہیں۔ ان کی خوشی سے غرض ہوتے ہیں ان کے دلچسپے سے معزم۔ مگر یاد رہے منافقانہ نہیں غلغلہ پھیر دیتے ہیں کہ ان کو کس خدمت کی ضرورت ہے اس خدمت کو بخوش اسوئی ادا کرتے ہیں۔ فرض کیجئے ہمارا دوست خوش حال ہے مگر رشک کی تعلیم سے بے غلبہ ہے۔ اس کو اس طرف توجہ دلائیں گے یا وہ بے جا جھگڑائے۔ اس کو اس کی عزتیں سوجھائیں گے، فضول خرچ ہے تو کفایت شہادی کی توجہ دیں گے۔ فیاض ہے تو وہ پیر منہ لالوں میں صرف کرے کہ نہ لائق دلائیں گے۔ دقت علی ہذا۔ اس کے ساتھ ہی یہ توجہ نہ کریں گے کہ ایک باری فرمائش و فہمائش بار آور ہوگی۔ نہ اس سے حولی ہوں گے۔ کہ دوست نے ہماری نصیحت پر عمل نہیں کیا۔ فرض کیجئے ہمارا دوست مفلوک ہے۔ اس کی بے کاری دیکھ کر نے کی کوشش کریں۔ کچھ نہ کچھ ہو کر تو اپنے ہمدردانہ ہوتا ڈاؤر کام سے اس کی معیبت کسے بلکے کرنے کی کوشش کریں یہ بھی بخود ہی پہلکی نہیں۔ بھائی سے بدادارہ شفقت کا رونا دکھیں۔ اس کی ناز بھاری کریں اپنے اور اس کے حقوق کو برا دیکھیں۔ تنگ ولی سے کام نہ لیں۔ اس طرح دوسروں کے لیے عہدہ نظر قائم کریں۔ فرصت کا دقت مطالعہ وغیرہ فی مشاغل میں صرف کریں۔ شادکا وغیرہ تقریروں میں شریک ہوں تو سب سے آواز ایسا سنگتہ مزاج قائم رکھیں کہ صاحب تقریر کیلئے ہماری ہمدردی میں وقت

پیش نہ آئے۔ بلکہ ہماری آسائش کی فکر کرے تو بھی ہم نہ بولیں اور اس طرح دل میں گفتگو پیدا کر کے کچھ مناسب حال الفاظ اس کے کان میں ڈال دیں جتنا کہ اس تقریب میں کام نہ آئے تو آئندہ آئیں گے۔ یہ بھی نہ ہی تو ہمارا برتاؤ دوسروں کے لیے نفیر ہو گا۔ نفیر بھی نہ ہوتا تو ہم اپنے فرض سے ادا ہوں گے۔ نیز ایک پریشان حال بندہ خدا صاحب تعزیر کی مصیبت نہ جرحا میں گئے۔ ہمارے محلے میں جو مسلمان دکھنا رہیں ان کو ہم صفائی معطر کی تعزیر سے اس طرح دلاستے ہیں کہ جو ہمارا معطر اس سے ہر اس میں صفائی رکھیں اور ان کے ساتھ سہولت کا برتاؤ کریں۔ موقع موقع سے ہمت استقلال کے متعلق دوچار غلط بھی ان کے کان میں ڈالتے ہیں۔ اپنی لسی کی گزشتہ تاریخ کے مرتب کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔ اس کے عمدہ میں تحریر آؤ تقریر انا جانتے زمانہ کو سنانے ہیں۔ بزرگوں کی علمی یادگاروں کو جو ہماری دسترس کے اندر ہوں تمام محفوظ رکھنے کی سعی کرتے ہیں۔ اور اس سب کچھ کرنے کے بعد حبیب (بالعین) ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جو کوشش ہم نے کی وہ باطل باد آور نہیں ہوئی۔ بلکہ سب جگہ کا دست لگئی۔ تو میرے ہم خیال کر کے مطمئن رہتے ہیں کہ ہم نے اپنا فرض پورا کر دیا اور یہ اطمینان ہم کو کوشش میں بڑا مددگار دکھاتا ہے۔ میرے محضوم! اگر ہم نے اپنی زندگی اس طرح بدلی تو کیا ہم بے گار رہے اور کیا باگاری اس کا نام ہے کہ ہم ذکر کی کے پابند ہو کر بے کار ہو جائیں؟ دروازہ کھلی معاف فرمائیے۔ والسلام بلا کلام۔

خاکسار حبیب الرحمن

حبیبؒ ۲۲ جنوری ۱۹۰۴ء

علامہ اقبال

(۱)

بنام مولانا عرفان صاحب

۲۵ جولائی ۱۳۳۲ھ (بصیرت خانہ)

جناب مولانا!

اسلام و مسلم۔ مولانا شرکت علی تو اس وقت مقدمہ کی تیاری میں مصروف ہوں گے۔ آپ ان سے دریافت حالات کو لے اس خط کا جواب دیں۔ کچھ روز ہوئے میں نے ان کی خدمت میں لکھا تھا کہ ایک ہندو بزرگ مشرقت کا خط میرے پاس آیا تھا اس کا مضمون یہ تھا کہ ”ڈاکٹر موصیٰ نے ہماری اسکول کو حرم سے الگ کی صداقتی ایڈریس میں پیش کی تھی تسلیم کرتے ہیں۔ ہندو مالوی سے بھی مشورہ کرنے کے لیے جا رہے ہیں وہ بھی ہندو مسلمانوں کی صلح کی خاطر اس کو تسلیم کریں گے۔ گو اس وقت ملازمہ خود پر اس ایکم کو تسلیم کر لینا محض نہیں ہے۔ یہ خط بصیرت خانہ آ رہا ہے اور اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ میں نے مولانا شرکت علی صاحب سے بھی گفتگو کی ہے۔ وہ بھی صلح پر آمادہ ہیں۔ ایکم جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ غلط فہمی ہندوستان کے مسلمان صوبوں کا ایک ہو جانا۔

اس خط کے موصول ہونے پر میں نے مولانا شوکت علی کو کھیا اور انہوں نے اس بات کی تصدیق کی مشرقت ان سے ملے تھے۔ میں نے مشر موصوت کو دو خط اس کے جواب میں لکھے تھے مگر یہ خط قریباً ایک ماہ ڈوڈلیر آفس کے ذریعہ سے میرے پاس آسکے ہیں۔ پہلے محمد کوثر تھا کہ اس میں کوئی چال اور عیاری نہ ہو مگر اب خلوں کے واپس آجانے سے یہ بشر دفع ہوا۔ مشرقت اب معلوم نہیں کہ کہاں ہیں۔ اور مذکورہ بالا خط لکھنے سے ان کا کیا مقصد تھا۔ ممکن ہے۔ مولانا شوکت علی اس پر کچھ روشنی ڈالی ملیں۔ لیکن لوگ مشورہ دے رہے ہیں کہ میرے خطوط کے واپس آجانے کے بعد مشرقت کے خط کو شائع کر دینا چاہیے۔ اگر ممکن ہو تو محلات دیافت کس نے کے بعد محمد کوثر مطلع فرمائیں۔ امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

انٹوس کو بھئی کے فسادات ختم ہونے میں نہیں آستے۔

غمنص محمد اقبال

مولانا محمد علی جوہر

(۱)

بھنڈ داڑھ - ۲۶ اپریل ۱۹۱۶ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

برادر واجب الاحترام !

السلام علیکم۔ ہر اپریل کے محبت نامہ کا جواب آج دیتا ہوں اور محبوب ہوں کہ اس تاخیر کا باعث سوائے اس کے کچھ نہیں بیان کر سکتا کہ اس عرصہ میں ہر اپریل کو عقیدہ کا شکار رہا۔ میں جو برسے برسے معاملات میں آئی آج کے عارضی فیصلوں کا قائل نہیں اور ان تمام حکاموں کو "مشرقت" سے زیادہ نہیں سمجھتا، ہر اپریل کے فیصلہ پر کیا۔ بندہ عام فریب ہوں گا مگر دوستوں کی موت اس دائرہ میں بھی موجب کرموت کا بازدار کم ہے دوچار آئندہ بطور مزاج کے وصول کر ہی لیتی ہے۔ اور ہر اپریل کو میرے چند عزیز ترین دوست نذر اہل جوگئے اس لیے میرا غم و عقوبتے جہاں نہیں — کرموت جہاں نہیں، اس لیے کہ میں تو اس کا قائل ہی نہیں ہوں۔ بہت سے مژدوں کو جن کی ہڈیوں تک ابھی پڑ نہیں جیتا، علی ایضا میں شائع کرتا ہوں مگر ان جیتی جاگتی کشتہ پتیلوں کو کھڑکی کی شیش پر کھائی جاتی ہیں اور کھائی جا رہی ہیں مژدوں سے ہر سمجھتا ہوں کیونکہ کرموت ان کے سمبول کو نہیں آئی جگہ ان کی دعووں کو۔ تم تو پہلے ہی کہہ چکے ہو کہ

مخردم ہوں، مجبور ہوں اپنے تاب و توان ہوں

مقصود ترے غم کا مزا میرے لیے ہے

پھر جس چیز کا صحیح معنوں میں اجمارہ تم کو اس دربار سے مل گیا ہو اس میں شرکت کے دعویٰ کی مجھ سے جرات نہیں ہو

ہو سکتی۔ تاہم یہ بھی کچھ ہے کہ میں بھی کسی قدر محروم و مجبور ہوں۔ اس پر بھی میں نے انصاری صاحب کو راہ راست پر انتفاعت کی۔ جس طرح مجھ سے ہوسکا، ترقیب دی اور امیدی کہ میری اس دعا کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوگا۔" دینا لا توزع قلوبنا بعد از بدینا" میرا خط دجوان کو بھیجا لی تھا، کوئی کڑواہی مولیٰ نہ تھی۔ اس میں میرے نکار دل کے مستند و مکررے مضامین کے ٹر واردم انفرنش بھی معلوم ہوا کہ جس دنیا میں ہم لوگ رہتے ہیں وہ اس دنیا سے بہت مختلف ہے جہاں یہ ہمارے عزیز بسنس رہے ہیں۔ ہمارے تمام خیالات، تمام انما ذمے، تمام تحفے فضول اور غیر متعلق ہیں۔ میں نے غالب کے ایک شعر کا پرجو غزل لکھی تھی اس میں ایک شعر تھا۔

تقوے کے بعد خوف کہاں مزن پھر کہاں

عالم ہی اک جدا ہے وہ کچھ و عن کہاں

تقوے کا دعویٰ کرتے بھی مرد گت ہے اور یہ سب جھوٹا غرور کا۔ اگر میں کہوں کہ میں متقی اور خدا ترس ہوں۔ مگر باوجود بار بار اعتقاد اور کہ از کم چھوٹی مرنی ٹیکھنوں کے اب تک اس وعدہ الہی کو سچا جان رہا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ وہ بھی پورا ہوتا ہے کہ "مستقی فی قلوب اللہین کفر اور رب" اس لیے باوجود خاسق و نا جبر اور بندہ مرض دہرا ہونے کے اپنے کو اپنے دیرینہ اجابہ کی دنیا سے ایک الگ دنیا میں پاتا ہوں اور اس کو اس پرائی دنیا سے بدرجہا بہتر جگہ پاتا ہوں اور خوش ہوں کہ اس کی برآمد میں داخل ہو رہا ہوں۔ تاہم پرانے تعلقات و امن گیر مروتے ہیں اور گورڈر بھی چھڑا لیتا ہوں۔ تاہم دامن کے گوشے اس خاندان نکستان منزل میں لگے رہ جاتے ہیں۔ جن کے لیے آسودوں کا ایک چھٹا مروتا قافلہ روانہ ہو جاتا ہے افسوس کہ احوال ملے سے زیادہ بہت واسے نہ لنگھے۔ اب انہی کی نہیں بلکہ خود حریت کی ایک ہنسائی ہو رہی ہے مگر اس کا زیادہ رنج نہیں۔ رنج پرانے دوستوں و دوستوں کی رفاقت چھوڑنے کا ہے۔ غالب نے کچھ لکھا تھا کہ

دھکی میں مر گیا جو نہ باب نبرد تھا

مشق نبرد پیش طلب کا یہ مرد تھا

مگر اچھا ہڑا یہ جھوٹا سہارا بھی لگی۔ اب ایک سہارا باقی ہے اور وہ ہمیشہ کا ہی تھا اور اب بھی ہے۔ غالب کی غزل کا ایک شعر بھیجے گی برسوں سے دل میں کھب چکا ہے۔

چاک مت کہ سب کو بے نعل لگی

کچھ آدھر کا بھی اٹا رہا جاسیئے

اس پر ایک نعلی غزل تافید کو محدود کر کے میں نے بھی لکھی تھی جن کا ایک شعر ہے۔

ایک ہی درد کا بھلا دی ہوں مجھے

اک فقط تیرا سہارا چاہیئے

گو کھنے کو تو لکھ گیا۔ خواب جا کر کہیں اس کا مغزیم بچا ہوں اور پھر سورہ یوسف پڑھا ہوں تو اس آیت کو یہ لا مطلب اب سمجھ میں آتا ہے جس میں مذکور ہے کہ حضرت یوسفؑ نے فرعون کے جام پر دار سے اس کی رٹا لٹکے وقت کہا تھا۔ کہ بھیجہا را بھی ذکر اپنے آقا سے کر دینا کہ محنت ظلم ہوتا ہے اور وہ بھول گیا اور اس طرح چند سال اور حضرت یوسفؑ جیلخانے وندان رہے۔ جب ایسے بڑا گریہ و بیخبر کے سیلے بھی فرعونوں کی یاد دہانی داخل شرک نہیں تو کم از کم مذموم بھی گئی۔ اور اس وصف تاریک کو اس میں بھی استعانت جز اللہ کا شاہد معلوم ہوا تو پھر ہمارے تمام تعلقات تو شرک میں ٹھہرے۔ اقامت حلاوت میرزا یان، اجماع امت پر میرزا اعتقاد، تاہم بعض اوقات اس ننگ و تاریک بت کہہ میں عبادت اپنی نجات کے بیلے زیادہ موزوں معلوم ہوتی ہے جہاں ایک وقت میں ایک ہی عبادت کسے والا اپنے معبود کے حضور میں کھڑا ہو کر اپنی بندگی کا اظہار کر سکتا ہے۔ خوف ہوتا ہے کہ کہیں اپنے مذہب کی دین فرائض مساجد میں تانے کے سائھی اور خود امام بھی تجھے کفر و شرک کی طرف نہ گھسیٹے جائیں اور دوسروں کی اصلاح تو بھی خود اپنی نجات سے مایوس ہونا پڑے۔ سب کچھ ہو کر اب یوں وہ گیا ہے کہ اپنی جان بچانے کی کوشش کروں اور دوسرے کو پھیر کر پھر خافتان میں اختلاف کروں۔ بھائی دعا کو دیکھ اگر اپنی نجات کے متعلق خوف و ہراس میں کمی ہو تو کم از کم دوسروں کے متعلق یہ سب اعتبار ہی باقی نہ رہے۔ اگر یہی حالت رہی تو کہیں کہ نہ رہا۔ البتہ جب تمہارا خیال آتا ہے اور تم سے بھی زیادہ بہن کا رجحان صرف تمہارے ناموس کو جکڑ سب کے ناموس کو اس طرح بہت و جرات کے ساتھ منبھالے ہیں اور عصمت و سائنت میں جکڑ کر حق کو باؤا و ذلیل سب کو سنا رہی ہیں تو یہ سب اعتبار ہی دودھ ہوتی ہے۔ اور جس طرح خدا سے میں مایوس نہیں اسی طرح اس کے بندوں سے یوں بھی توہین کھنسر معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہ لوگ تو ہی اسٹیج کی کٹھنیاں نہیں ہیں، وہی عریب اور کزد لوگ ہیں جن سے اسلام کی ابتداء کی تھی۔ دہے یہ حضرات قرآن کے متعلق تو بگمانی بہت پہلے سے تھی۔ چنانچہ میں نے متعہ دباران آراؤوں کے معنوں کو فزولوں میں با نفا۔ مثلاً ۷۰

تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے، دے
میرا ہر بھی خوب ہے، تیری حسا کے بعد

یا ۷۰

ہیں اتنے لاف شوق پر مرعوب حسن بھی
یہ طالع عجیب ہے اک مرد و زن سے دودھ
ہے بعد کہ بلا سے بھی، اقریب، بیزید بھی
اور جانتے یہ ہیں کہ نہ ہوں، ہنسی سے دودھ

یا ۷۰

دشمنوں سے جب تعلق ہے تو کچھ
دشمنوں سے بھی مراد چاہیے

محافظ تعلقات کو دوستوں کے لیے اور حاداد کو دشمنوں کے لیے لازمی گردانتے تھے۔ ہم دوستوں کے لیے (۱) یہ سب کچھ کر دیا ہے اور آج بھی اس طرح کلمہ دیا ہوں کہ گویا ہم ہی ابدال اللہ اور اجماع اللہ ہیں۔ مگر بواہم ان حیرت انگیز افتخاروں کو دیکھ کر خفت ہوتا ہے کہ کہیں بڑا بولی کلمے نہ آئے۔ بنی اسرائیل کا وہ واقعہ یاد آیا ہے جس کا قرآن کریم میں مذکور ہے: ﴿قُلُوا اَللّٰهُمَّ اِنَّا عَمِلْنَا سَيِّئَاتٍ خُذْ سُلٰتِنَازِلْ عَلَيْنَا مَغْزٰیكَ﴾ اس غیر المردوں میں بھی سنت بنی اسرائیل کی تقلید کی تھی۔ چنانچہ مسفرین احمد سے کہا گیا تھا کہ ”وَلَقَدْ كُفِّرْتُمْ مَوْتٍ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمُوتُوْا وَتَمْدَدَ الْيَمُوْهُ وَانْتُمْ تَنْظُرُوْنَ“ دعا کو کہ یہ حال اپنا بھی نہ ہو بلکہ آخر تک ایمان اور صالح عمل پر قائم رہیں۔ قرآنی دعا مزور مقبول ہوگی۔ اس لیے کہ ازل تو آل رسول پھر تقلید سنت پرستی سے شرف ہو چکے ہو۔ اب جو نیکو نے مجھے بھی اپنے ذمہ میں بھی جو ایمان اور انہماک کا ہے شامل کر لیا ہے اور خود کلمہ چلے ہو کہ

خوش اسی حال میں جو ہر بھی ہے آنا د بھی ہے

غیر یہ تو بڑا۔ بس نے لکھا تھا کہ تم پیش گوئی کرتے ہو: جمہور کی خواہش کے خلاف، احمایان امتداد ایک ذیل پر نیکو قائم کرنے میں ہرگز کامیاب نہ ہوں گے۔ اسے بھائی اس میں پیش گوئی ہی کیا ہے۔ تم تو ان کے قمع ہوجو خواہوں کی صحیح تعبیریں بیان فرمایا کرتے تھے اور اس طرح جس سے عمل کر سخت تک پہنچ گئے ہیں کہ اس مقام سے بدت دور ہوں۔ یہ تو میں بھی جانتا تھا اور سال گذشتہ ہی میں سب کو جتنا چکا تھا کہ مزاج من مدد مروئی درسی کا نہیں ہے بلکہ قوم کی سبکی اور تباہی خواہی و غزالی کا، اور ہی کی مدد تو جس کو اسے ہم نہیں گئے ہم۔ تہذیب دے قوم فروش اور کالجی قرض۔ کیونکہ ہم سے کسی نے ستمی وعدہ کر لیا ہے اور وہ وعدہ کا سب سے بڑا بھی ہے کہ ”وَلَا تَحْزَنْوْا وَلَا تَحْزَنْوْا اَنْتُمْ اَطْلَعُوْنَ اَنْ كُنتُمْ مَوْمِنُوْنَ“ اگر خوف ہے تو اس شرد کا کہ ”اَنْ كُنتُمْ مَوْمِنُوْنَ“ سو خدا سے دعا ہے کہ ہم کو ایمان پر قائم رکھے اور ان بزرگوں کی تقلید کی توفیق عطا فرما کے جن کے متعلق اللہ شاد ہوتا ہے کہ ”فَاَوْفَوْا بِالْعَهْدِ اَللّٰهُ يَافِئِلُ اَللّٰهُ يَافِئِلُ اَللّٰهُ يَافِئِلُ“ اگر ہم ایمان پر قائم رہے تو پھر سنت اللہ میں تو تبدیلی ہو ہی نہیں سکتی۔ ہمارا الغام کہیں نہیں گیا ہے۔ وہاں تو طے ہی گا، مگر بیعت نہیں بلکہ جاسے گا کیونکہ وہ فرماتا ہے کہ:

”فَاتَّبِعُوا اَللّٰهُ وَاتَّبِعُوا رِیَاضَ اَللّٰهِ وَاتَّبِعُوا اَللّٰهِ“

اس پد میں نے لکھا ہے کہ

انعام کا مقصدی کے تو کیا جو چھنا لیکن

دنیا میں بھی ایمان کا صلہ میرے لیے ہے

اچھا اب وضاحت ہوتا ہوں تہذیب دے دونوں دیوان پر چھکا اور تہذیب عورت سے پڑھے اور بار بار پڑھے۔ اوتاسے سخن فی ہر سے اب اگر لکھتا ہوں کہ

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

لے یہاں کچھ عبارت پڑھی نہیں گئی۔

تو اس کے مرتبہ سنی یہ ہوسکے کہ جو ہفتیاں الہ آباد، جھانسی، پرتاب گڑھ اور فیض آباد میں جھینا پڑیں۔ ان سے زیادہ کا سہمی ہوں۔ مگر یہ بھی ہو تو جانتا ہوں کہ تم زیادہ کے بھی متحمل ہوسکے۔ اس لیے کہ وہ خود کسی نفس پر اس کی سکت سے زیادہ تکلیف کا ہوجو نہیں ڈالتا اور جس کے دیتے ہیں سوا ان کو سوا ملتا ہے۔ علم و اندوہ کے لیے لکھا گیا ہے تم میری غزلیں منگواتے ہو، چھایا بیچ دوں گا۔ مگر کبھی تم شاعر تھے میں شاعر نہ تھا۔ البتہ عنایت اچڑی نے تمہیں تین دیوانوں والا بنا دیا تو اس قسم کی عنایت نے مجھے سے بھی تین چار غزلیں لکھوا دیں۔ پہلے بھی تک بند کر دیتا تھا۔ مگر کاغذ کے پھولوں میں پتھر نہیں ہوتی۔ اب کچھ گوباس آنے لگی ہے، سو بھول گیا تھا۔ دے دے غم کو نہ دے کیونکہ دعا دل۔ اس وقت موت تقریباً کی پہلی غزل لکھے جیسا ہوں۔ میں کوئی خط لکھوں گا۔ تم میری انزوی کا ذکر کر کے میری طرف سے معافی مانگ لینا۔ درندہ نادان ہی دینے لگی کہ جاب کھوں نہ دیا۔

تمہارا مرید با عقیدت : محمد علی

راشد الخیری

(۱)

بنام عشق العلماء رسولی تہذیبنا زعلی

مکرمی و مضلی !

اسلام علیکم۔ گرامی نامہ کا ممنون ہوں۔ میرا مقصد ہرگز نہ تھا کہ میرے متعلق جو اعتراض تھا اس کی تردید کروں، بلکہ صحت کے معنوں سے آپ کو میری طرف سے بدگمانی نہ ہو اور اب کہ جمل چلاؤ گا وقت ہے کوئی غلط فہمی نہ ہو جائے۔ آپ محض نہیں خیال فرماتے تو جانے دیجئے۔

حاجیہ تاج بیگم صاحبہ کے معاملہ میں جس قدر میں نے کوفت اٹھائی وہ تھوڑی بہت آپ کے علم پر مبنی ہے۔ آپ اس سے ناخبر ہیں۔ اب یہ آپ ہی قرآن سے گورانی کے بعد اگو ان کے شوہر نے ملگنی اختیار کی تو مقدمات میں وہابی سے سیش جج صاحب کی خدمت میں کیونکر لے جاتا۔ میرے اھتساب وہ نہیں دے سکتے کہ میں ناچار ہوتا ہوں۔ ایک اٹھ گزروں ہو گئی ہے ایک جاگ میں ہر وقت دود رہتا ہے۔

کاش وہ سات دو بیس اس سے پہلے یاد آجاتے اس کے بعد مدتوں حساب دیا۔ کبھی کے حسب ہر پہلے ہوسکتے۔ اگر یاد فرمائی کہ پر بھی تامل کرنا تو بد معاملگی کی جا سکتی تھی۔ مجھے جہاں تک یاد ہے۔ یہ پہلی مرتبہ آپ سے تحریر فرمایا ہے۔ حالانکہ اس کے بعد مرنے والے سیکنڈوں دو بیس کا حساب دیا۔ میاں اقبال نے جو دو بیس بھیجے تھے۔ اس کا حساب آپ دیکھ لیں۔ اور مجھے جہاں تک ممکن ہو یاد ہے وہ میں نے مضامین کے واسطے اور شاید ایک آدھ معنون دعا بھی کیا تھا۔ مجھے اب معلوم ہوا کہ معنوں کی ضرورت نہیں ہے۔

میں صحت سے اپنا نام عیدہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور وسط اکتوبر میں دہلی جاؤں گا۔ مہربانی فرما کر آپ میرا اقبال سلسلے سے فرما دیجئے کہ وہ وسط اکتوبر میں ایک کاروبار کا کام کر چکے ہیں۔ میں تمام حساب کتاب کر دوں گا۔ کتاب کے متعلق اگر تغیر و تبدل کی ضرورت ہو اور دوبارہ غنت کرنے پر دست ہو سکتی ہو تو میں حاضر ہوں۔ اگر نہیں تو میں انشاء اللہ کسی اور کو ولادوں گا۔ اور جس وقت اب کوئی درخواست کتاب لکھنے کی آتی تو آپ سے منگواؤں گا۔

میاں اقبال سلسلہ کو دعا !

نیا زمند : راشد الخیری - ۱۲ ارجولائی ۱۹۲۱ء

منشی دیا زائن نگم

(۱)

بنام احسن مارہروی

عنایت فرمائندہ - تسلیم !

ناراض نام باعث مشکوری ہوا۔ تصویر کی نسبت معتز نہیں کا اعتراض ہے کہ اس کا بلیک گراؤ نہ قطعاً منع ہے۔ جو اس وقت موجود نہ تھا۔ اور زمانہ کے آخری دور کی عمارتوں میں ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ تصویر اگر اہل علم کی نہیں بلکہ اکثرانی کی ہے۔ مروجہ تصویروں سے اس کی شبہت بھی مختلف ہے۔ اس میں چند ایسی چیزیں ہیں جو عام تصویروں میں باطل گول ہے۔ چہرے سے برصا کے آثار نمودار ہیں۔ اگر اہل علم میں سلطان عالم چہا سے مباہلی ہو گئے تھے اور قدامت کا بالکل صفایا کر دیا تھا۔ ذاتی طور پر مجھے آپ کے خیال سے اتفاق ہے مگر یہ باتیں بھی قابل غماز ہیں۔ جس ایک ذریعہ کا گروپ چھپانا چاہتا ہوں۔ آپ کے پاس ہوا کہیں سے دستیاب ہو سکے تو ضرور عنایت فرمائیں۔ بلاک بیٹنے کے بعد میں اقبال کے ساتھ اصل تصویر کی واپسی کا ذمہ دار ہوں۔ مجھے یس کرنا بہت خوشی ہوئی کہ اس سال انجن ترقی اور دوسرے آپ بکری مقرر ہوئے ہیں اس انتخاب پر آپ کو تامل سے مبارک باد دیتا ہوں۔ انجن ترقی اور دوسرے اب تک کوئی کارناما یاں نہیں کیا ہے۔ خدا کرے آپ کے زمانے میں یہ ایک مردہ انجن کی حالت میں نہ رہے۔ زمانے میں علمی خبروں اور نقوش کا ایک سلسلہ شائع ہوتا رہا ہے اور اب بھی بالکل بند نہیں ہو گیا ہے۔ یہی یہ مناسب نہ ہو گا کہ اس سلسلے کا ایک حصہ انجن ترقی اور دوسرے کے لیے وقف رہے۔ جس میں آپ اس انجن کے بکری کی حیثیت سے لکھتے رہیں۔ اس حرج سے زمانہ انجن اور دوسرے کا ایک باقاعدہ ادب ہو جائے گا۔ جس کی مزید ادبی خبر انجن کے لیے ضروری ہوئی چاہئے۔ خاص اس حصے کی عیدہ کہ پانچ بیانی ہو سکتی ہیں۔ انجن کا ایک باقاعدہ سالہ جس میں اس کے متعلق کل مروجہ امور و کارروائی سے پہلے کو اطلاع ملتی رہے ہونا ضروری ہے۔ میں زمانے کے لیے خواہ مخواہ اصرار نہیں کرتا ہوں۔ مگر یہ ضرور چاہتا ہوں کہ انجن موصوف ایک کارزار انجن ہو جائے۔ معنی خاص کے لیے پیشتر سے تعلیم دے رہا ہوں۔ راجہ لندن لال، کشی کی سوانح عمری جرنی

کے پرچے ہیں جو اہل ہندو زور میں شائع ہوگا ہدیہ ناطرین ہوگی۔ اب مارچی یا اپریل کے رسالے کے لیے کوئی جرتی کاغذوں
عنایت فرمائیے۔

ذیادہ نیاز

بندہ دیارائن نظم کاچندو

۲۶ جنوری ۱۹۰۶ء

نصیر حسین خاں خیال عظیم آبادی (۱)

بنام یہ دلیسر محمد عظیم آبادی

عزیز کرم۔ سلام شوق۔

۲۸۔ کہ آپ کی محبت کی وہ یادگار راسخ عظیم آبادی مطبوعہ انافرکھنوں علی۔ ممنون بنام غزنیوں دل لگا کر پڑھا۔ حتیٰ کہ
کہ آپ نے اردو پر، غزنی جگہ پر، ہجر اپنے صوبہ و شہر پر احسان کیا ہے۔ میں آپ سے متفق ہوں کہ راسخ کا درجہ میر سے کم
نہیں۔ بلکہ بعض اعتبار سے کچھ بڑھا ہوا ہے اور اس ضمن میں آپ نے جو کچھ تحریر کیا ہے وہ ہرگز غرت فاری و مبالغہ
نہیں ہے۔

تہذیب میں جو کچھ آپ کے جے دل سے نکلا اسے بھی ایک مرتبہ جاز بھٹا ہوں۔ لیکن آقا یا کسی اور کے متعلق آپ کے
سے اہل علم کے قلم کا انتخابے قابو ہو جانا درست نہیں۔ بلاشبہ آزاد نے سہل انگاری سے کام لیا اور اس پر ایراد و مزور ہستی
مگر آپ جو عانت کریں، مزوریت سے زیادہ دوسرے گئے ہیں۔ پھر جس چند سے اپنی سیرالی بیان کرتے ہیں، دیکھنا چاہیے کہ خود اس
میں کیا دھڑا ہے۔

راسخ کے ذکر میں "وہ" میں "غزنی لکھنؤ شوق کا سعادت علی خاں کے نام سے ممنون ہونا بتاتی ہے۔ حالانکہ یہ
غزنی آصف اللہ کو تذکرہ کر دی گئی۔ ذاب و ذریلی تعریف میں اس شعر کو یاد کیجئے۔

فقط ہے یہ تیرا ہی پیش قدم
ہوا لکھنؤ جس سے رشک ارم

لہ یہ اشارہ اپنے علاقہ میں مولانا سید علی محمد خاں عظیم آبادی کی ایک "تالیف" لڑائے وطن کی طرف ہے۔ اب جب کہ دونوں ماموں بھائی
دار فانی میں جاملے۔ یہ امر کوئی ماذ باقی نہ ہوگا کہ دونوں ایک دوسرے سے صاف نہ تھے۔ یہ ایک خاندانی عاملہ اللہ و مانتہ تھا۔ جس سے ادبی
دنیا کو کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ دونوں اعلیٰ پایے کے ادیب تھے۔ ایک غزنی و ذرا و شاعر۔ دوسرا صاحب مرز نثر نگار، افسانہ و دونوں کو مصنفیت
کرسے۔

ذاتی انگشت بھی اس خد سے عزت کو دی گئی ہے۔ (مسل)

کون نہیں جانتا کہ یہ آصف الدولہ ہی تھے جہاں اور بی بی سے رنجیدہ ہو کر فیض آباد سے لکھنؤ آ رہے تھے پھر نیچے عمارات کی تعریف ہیں۔

عمارات عالی کا ہر وصف کیا نہیں اپنا اور اک اتنا دس
نہ ہو خروئی قطع ان کی بسبب دوق ہے مرتعہ کا اک اک مکاں
نظر کیجئے جس پر سو تصویر ہے عجب رنگ سے طرز تعمیر ہے

کیا یہ اس کے بعد بھی بتانے کی ضرورت ہے کہ عمارات کی بنا شوق آصف الدولہ سے منسوب ہے، نہ کہ سعادت علی خاں سے۔ اب صاف نیچے۔

تو اسے آصف الدولہ عالی جناب رہے تاقیم جہاں کا میاب
نہیں تھو سا حاجت و داعی کا بہت خوش ہے تجھ سے خدا علی کا

آپ سے بہتر اسے کون جانتا ہے کہ تذکروں کی ایسی غلیاں ناقابل معافی ہیں۔ نوائے وطن میں اس ذکر کو یوں پڑھ کر راسخ کی مٹی خراب ہوئی ہے۔ لوگ اسے مستند سمجھ کر غزنی کشش عشق کو سعادت علی خاں کے زمانے کی چیز سمجھتے ہوں گے۔ حالانکہ وہ آصف الدولہ کے وقت کی ہے۔ یعنی جب کہ غزنی میر حسن علی۔ عذریہ کیجئے مصنف کی تحقیق نے غریب و راسخ کو کتنا پیچھے بٹا دیا۔

پھر اس طرح غزنی حسن و عشق کے ذکر میں نوائے وطن کی عبادت ملاحظہ ہو: غازی الدین حیدر کے زمانہ میں پھر لکھنؤ آئے۔ ایک غزنی مسمیٰ بہ حسن و فتن ان کے نام سے موزوں کی۔ مگر اب شریعت نے دلگ ہی بدل دیا تھا۔ اس نے بھی کام نہ کیا۔ وادعالی گیا: یہ دوسری نازیکی غلطی ہے لکھنؤ میں شریعت نے محمد علی شاہ کے وقت میں رنگ بدل دیا کہ غازی الدین حیدر کے زمانے میں۔ اسی عہد میں "سازہ عجائب" تالیف ہوئی۔ اور فیض نے اپنی مشہور "غزنی" مان و ملک "رقصت" میں تصنیف کی۔ پھر شریعت نے وہ کون سا رنگ بدل دیا تھا کہ سازہ عجائب و غزنی ضیع تو عام ہو جائیں، مگر راسخ کی غزنی مقبول نہ ہو؟

لکھنؤ میں مرآۃ الجمال لکھی گئی۔ اس میں ذاب جان ایک کسی کے حسن و جمال کا ذکر ہے۔ نوائے وطن اس ذکر سے بھی خالی ہے۔ عظیم اکاؤدیں لکھنؤ عشق تصنیف ہوئی جس میں ایک کسی پر اپنے عاشق ہونے کا نہایت صفائی و دیر سے حال لکھا اور اس کی تعریف و توصیف کی ہے۔

بہت اس شعر میں ہیں خبر و پر نہیں ہے دلبر اپنا کوئی دلبر
دل اپنا اس صم کا ہے فقط رام کہ شرف و جس کا ہے نام خدا نام
اسی گل کی ہوا ہے دل میں اپنے یہی آتش ہے اب و گل میں اپنے

دنیا کے شاہد یہی کسی شاعر نے اپنے عشق کو اس طرح بیان کیا ہو۔ یہاں تو "لکھنؤ" یاد و مدیث دیگران ہیں سب کچھ کہا جاتا ہے اور راسخ کا یہی وہ رنگ ہے جسے آپ اس کا امتیازی طرہ کہتے ہیں.....

زائے وطن میں تاریخ کی وفات کی تاریخ ۱۲۳۸ھ دی گئی ہے۔ اگر گنتی بنجارا اھذا بتائی میں ۱۲۴۰ھ ہے اور بتائی نے تاریخ کو تو نہیں لکھتا مگر تاریخ کی جان کے بھر یا کچھ دنوں بعد کے ہیں دیکھا تھا۔

تاریخ کے ذریعہ ہمارے فطیم آباد کی زبان و شاعری کی تحقیق کثرت سے خالی نہیں۔ تاریخ نواب مہابت جنگ کے زمانہ یعنی ۱۱۶۲ھ (۱۷۴۴ء) میں پیدا ہوئے۔ ان کی شاعری کی عمر اگر پندرہ برس کے سن سے شمار کی جائے تو ۵۹ء ہوا۔ یعنی چالیس کے دو برس بعد۔ اور ان کی زبان بناد سے گی کر مرث چند سال کی مشق کا یہ نتیجہ نہیں۔ بلکہ پشتوں، اگر نہیں تو ایک پشت کی دیانت و صفائی کا نتیجہ ضرور ہے۔ اور اس ایک پشت کا زمانہ کم از کم پچاسی سال مقرر کیا جائے گا۔ یعنی ستر سے کبھی اور یہ زبان نہیں برکتی۔ یہ فرض کر لیا جائے (جس کا فرض کیا جانا قیاساً نام درست نہیں) تو وہ زمانہ غالباً کربلا کا زمانہ ہوگا۔ جو ۷۰ء میں فرست ہوا۔ اس لیے غالباً یہی وجہ ہے کہ اس سے بہت قبل اردو ہی نہیں، بلکہ شاہجہانی یعنی شکیانی اردو کا عام رواج آپ کے مرنے میں تھا۔ اور اس وقت لکھنؤ تو لکھنؤ، فیض آباد میں بھی شکیانی اردو عام نہ تھی۔ فیض آباد محمد شاہ یا زیادہ سے زیادہ فرخ سیر (۱۷۱۹ء) کے وقت میں آباد ہونا شروع ہوا۔ اس لیے فطیم آباد کی زبان اردو اور دکن سے بھی قدیم اور مستند ہے۔

اشرف علی خاں کو کو فغان، دلی سے فطیم آباد راجہ شباب رائے کے زمانے میں آئے۔ اور ۱۸۶۷ء میں وہیں مرے تاریخ کی عمر اس وقت ۲۴ سال سے کم نہ تھی اور اس وقت ان کی شاعری بھی جوانی پر ہوگی۔

فرخ سیر فطیم آباد امیرالامرا نواب حسین علی خاں کے ساتھ ۱۸۱۳ء میں دلی گئے ہیں۔ اس وقت فطیم آباد اصلے دلی کی جاگیر بنا ہوا تھا۔ اور اسی وجہ سے دلی شکیانی اردو کا بازار گرم تھا۔ انہیں امرا میں سے نواب سید ہدایت علی خاں اسد جنگ اتھلی پھیر صاحب سیرالکھنؤ کے باپ، بھی تھے جو فرخ سیر کے آخر عہدے سے بے گشتہ عالم شافی کے وقت تک دلی و فطیم آباد میں رہے۔ نواب اسد جنگ پھریاں، مولیٰ اور دوسرے خوب کہتے تھے۔ اردو میں بھی ان کی غزلیں ہیں۔ نواب مولانا ملک انجام وزیر محمد شاہ کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ نواب صاحب کی جاگیر میں پرگنہ چیلر بڑا سین آباد تھا۔ لیکن زیادہ تر وہ اپنے محل اور شاگرد چیتہ سمیت جودلی کے تھے، فطیم آباد میں رہتے تھے۔ حاجی گنج، پورب دروازہ اور دکن گولہ اصلے دلی کا مسکن رہا ہے۔ شاہ ارشدان، خواجہ کلان رحمن کے ہم سے گھاٹ ہے) اور شاہ صادق رحمن کے نام سے غالباً صادق پور ہے، ان سب کو دلی سے تو لیا تھا۔ اور یہ سب عہدہ شہرائے اردو میں سے تھے۔ آپ کے خاندان صادق پور میں بھی زبان کا خاص ذوق و مشق رہا۔ جسے علم و فضل اور فراغت ہمیشہ جلا دیتی رہی۔

فرخ تاریخ کے ذریعہ فطیم آباد کی زبان کا ذکر بھی ضرور ہے اور جب اس پر موز لکھئے گا تو معلوم ہوگا کہ آپ کے گھر میں جس وقت اردو عام واقع تھی، لکھنؤ اس وقت شیخوں اور کبیروں کا قصبہ و مسکن تھا اور سعادت علی خاں کے وقت ملک دلی کی زبان وہی تھی۔ جو کلاوری، موہان، ہراکے اور محمود آباد میں رائج ہے۔ عہدہ الملکی مکتب کا ارفیض آباد پر پڑا۔ اس لیے کہ انجام کے بعد صدر جنگی و سلا دھلی اردو کے اگون اور دفتر کو راجہ دوستی عہدہ الملک، فیض آباد کا تھا لے کر شاہ معاف

دینروہ دکن میں حمزہ الملک کے خازم اور اردو کے دفتر میں کلرک تھے۔ ان پر زبان کا اثر چٹا رہا اور اس وجہ سے ان کے شاعروں کی زبان بھی درست ہوئی۔ اس دفتر کے لوگوں میں تیرہ سالک اور آتش کے چچا اور ساراں صند جلیں کے ساتھ بغیر آباد آئے اور اردو کا دفتراپ وہاں قائم ہو گیا۔ بیڑ میں صاحب فخری اس نے اسی دفتر اور زبان میں آباد کے فطرت میں پرورش پائی۔ تیرہ فطرت وہیں پلے۔ تیرہ فطرت کی خاطر تیرہ فطرت صاحب کی صاحب فطرت میں اسی محل میں رہے ہوئے۔ اس نے آباد پر حوا کے بعد انیس کی زبان دی ہوئی ہے۔ اور اسے قوت کر بیٹھے کہ انیس کے قبل تک لکھنؤ کی زبان وہی تھی جتنا سچ و دہر کے ہاں مستعمل ہے۔ یہ انیس کے گھر اور حمزہ الملک الملک الملک کا مدد تھا کہ لکھنؤ کی زبان اس باب کو پہنچی گئی۔

عظیم آباد پر لکھنؤ کی زبان کا کوئی مستند اثر نہیں پڑا۔ وہاں کے بعض شاعر مضمونی کے اہلہ شاہ و ہرے اور آپ کے ہاں کے اکثر شاعر نے اپنے شاعروں کو تاج و قزاق کے مقابلے کے لیے تیار کیا اور وہاں بھیجا ہے یعنی اس وقت تک لکھنؤ کی شاعری و زبان عظیم آبادیوں کے لیے سزا دہی۔ فخر سانس اور برت و غیرہ الفاظ شاہ عالم ثانی کے وقت تک موزن تھے، وہی لکھنؤ پہنچے اور اسی دستے سے عظیم آباد آئے۔ دکن میں پنجابی اور آگرا، دینروہ کے آگے وہ مذکور ہو گئے مگر لکھنؤ اور عظیم آباد میں یہاں اثر قائم رہا

خیال

۱۲ دسمبر ۱۹۱۹ء

سید سلیمان ندوی

(۱)

بنام عزاب سید علی حسن خاں صاحب مرحوم

عندہ دم محترم دام مجددہ اسلامی الاسلام علیکم۔

آپ سے رخصت ہو کر اظہار گوہر پہنچا۔ یہاں بھی چند روز مراد اور پھر ڈس کے کی تکلیف دی۔ فجر آج اچھا ہوں پھر سے بھی دیکھ لکھی ہے اور اب صاف ہے۔ مولوی مسعود علی صاحب بھی اسی دن صبح کو الہ آباد سے آئے وہ سخت ملل ہو گئے تھے۔ غزنیہ کا خط رہ تھا۔ الہ آباد میں بروقت علاج پڑا۔ اور اب اچھے ہیں۔

جب سے آیا ہوں ندوہ کا کچھل قائم ہے۔ مولوی مسعود علی صاحب سے گفتگو ہوئی۔ وہ ندوہ میں کوئی خدمت دار حمزہ لینے پر کسی طرح راضی نہیں اور نہ مستقل قیام لکھنؤ میں رکھنا پسند کرتے ہیں۔ اس کے لیے باہل آباد وہ ہیں کہ سالی میں چند مہینے وہ وہاں اقامت کریں اور تنظیم و تعمیر میں اور فراہمی چندہ میں مدد دیں اور اس کے لیے وہ بہت جلد کارروائی شروع کریں گے مولوی عبد السلام صاحب مقرب مجاہدین گئے کہ ایک دو مہینہ وہ کراچی سالی کے طلباء کو ادبی علوم میں مدد دیں اور بچوں کی تعلیمی فکر کی کریں۔ مولوی مسعود صاحب نے طلباء کے قدیم کو خود لکھے ہیں۔ اور ان کا جلسہ جلسے میں۔ میری حالت یہ ہے کہ میں تھکی ہوئی گئی کے لیے تیار ہوں مستعد دارالعلوم بنادیکھے۔ سالی میں متعدد دہریہ کرے کوں گا۔ ندوہ کی نفاست کا بار بار گ:

تو ایسے گئے تو قبر آجبراً بر داشت کر دیں گا۔ مولوی حبیب الرحمن خان خود قلمی لکھنا چاہتے تھے۔ مولوی شعلوی صاحب کا خط آیا ہے کہ پھر خیال میں جس مذہب کو پیش کر رہی تھی جو مکی اور آپ کے اہل بیت حیدر آباد جاتے ہیں۔ عبد الصلی صاحب کے۔ یہ ہے کہ پیش کی اور مجھے لکھا جگر تم بہتر مل صاحب کو لکھو کہ اس کا خلیفہ ہو جائے چنانچہ میں لکھوں گا اور امید ہے جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے کہ ان کو مل جائے گا۔ اس طرح ان کی تعلیم کا بندوبست ہو جائے گا مولوی مرتضیٰ صاحب جو پہلے کتب خانہ میں تھے میرے پاس آئے تھے کہ ان کو کتب خانہ میں کر دیا جائے۔ میں نے کہا کہ اگر کتب خانہ میں آپ کے کام کا ریکارڈ اچھا ہے تو مجھے اخذات نہیں۔ انہوں نے کہا کہ نواب صاحب عہد مل تھے، اگر آپ نے ان کے کام کو پسند کیا ہے تو ضرور ان کو کتب خانہ میں جگہ دے دیجئے۔ کتب خانہ کی حفاظت مزبوری اور لازمی ہے۔ اس کا بند لکھنا کتاؤں کو نقصان پہنچاتا ہے۔

آپ اپنی خدمت تو ہماری فرما دیجئے۔ اور نفاذت کی تجویز بھی درج کر دیجئے۔ اگر عارضاً میرا نام بھی لکھ دیجئے تو برج نہیں۔ منتقل انتظام میری نفر میں ہے۔ انشاء اللہ۔

مولوی عہد الرزاق اور مولوی عہد الرحمن صاحب ٹکرائی کو خط لکھے گئے ہیں۔ والسلام
۱۹۴۳ء مارچ مئی
بید سیلوان۔ اعظم لکھ

(۲)

ہنام مولانا عرفان صاحب

۳۳-۳۴۔ انڈرسن اسٹریٹ مدراس۔

مخدوم عزم دم کر مڑا۔ اسلام علیکم۔ آپ کے اخیر تا رسنے مجھے بے چین کر دیا۔ کئی دفعہ تار لکھوایا، اور پھر لکھا دیا۔ یقین جانے کہ رات بھر سون سے غیہ نہیں آئی، کئی بھی دماغ کی خفگی اور معدہ کی تخیل کے باعث تین مہینے ہو گئے کہ زندگی اصل لذت سے محروم ہوں، مگر آج کی شب تو صرت کر دت ہی جرتے دلتے گز گئی اور دہان پر یہ صرع تھا۔ دوسے اور دل ان کو جزو دے مجھ کو زبان اور گویا اپنے پہلے ظہیں اپنی معذرت کے اسباب بادی صرع لکھ چکوں، مگر آپ نے شاید پوچھ نہیں کیا۔ اس لیے میں دوبارہ اپنا حلیہ بیان پیش کرتا ہوں اور یہ اس لیے کہ مجھے آپ کے ساتھ جو محبت ہے اس کی وجہ سے یہ خیال کر کے دل میں تکلیف محسوس کرتا ہوں کہ آپ میرے ہذرات کو محض بہانہ تھوڑے کرتے ہیں۔

۱۔ میں بیان چند مبتدیان کے لیے مسافرا نہ آیا۔ اسباب و سامان جو ایسے بڑے سفر یعنی حجاز کے لیے درکار ہے وہ سارا ساتھ نہیں۔ پاسپورٹ میرے پاس نہیں ہے کچھ پاسپورٹ کہیں اضطرار میں پڑا ہے۔ پاسپورٹ مدراس میں نہیں لی سکتا بھی میں نہیں لی سکتا۔ پھر کیونکر اگر بایں ہر بے مرد سوانی چل کر ہوں تو ۱۹۴۳ کو کراچی یا امر کو کوئی بی بی او سے روانہ ہو سکتا ہوں عذر فرمائیے۔

۲۔ ہر شخص جو کچھ بھی اپنے پیچھے تعلقات رکھتا ہے۔ وہ کسی بڑے سفر سے پہلے کچھ اختیارات کر لیتا ہے۔ میں پڑنے کے

جیسے میں شریک ہو کر ابھی تک اعظم گڑھ نہیں گیا۔ چند مہینوں کے لیے دارالمصنفین اور معارف کا کام نبھال کر، اور مبلغ میں چھپنے کی چیزوں کا سامان کر کے مدراس چلا آیا۔ میں نے مجلس عاملہ میں شرکت و تدبیر سے اکتفا کر دیا تھا۔ اب ادھر آپ کے تاروں نے بتایا کہ میرا نام ضروری ہے۔ اور مرث نہیں ملتا۔ اب اس کی مزدورت سہے کر میں اعظم گڑھ جا کر چند مہینوں کے کام متعین کروں۔ مبلغ میں گناہوں کی چھپائی کا کام مقرر کروں۔ معارف کے مضامین کا سامان کر جاؤں۔ پچھلی دفعہ جب یورپ گیا خوش فہمی سے میرے شریک ادارت مولوی عبد الماجد صاحب دیا بادی تھے۔ انہوں نے معارف سے مجھے مستغنی کر دیا تھا۔ اور مبلغ میں سیرت دوم کا کام سال بھر کے لیے کافی تھا۔ دوسری مرتبہ تین مہینوں کا کام درست کر کے گیا۔ اب مولوی عبد الماجد صاحب ہیں اور مولوی ابوالحسنات مرحوم، اور نہ کوئی اور کام نبھائے والا ہے۔ بائیں ہر مجھے عرب کے سفر کے لیے مدراس سے واپس جا کر چند مہینوں کے اختلالات اپنی چیز سائری کے زمانہ کے درست کر کے تیار ہونا چاہیے تھا۔ اور اس کا موقع نہیں، ایسی حالت میں جانے کے معنی معارف اور دارالمصنفین کے بند کر دینے کے ہیں۔

۳۔ محبت جب آتی ہے ایک ساتھ آتی ہے۔ مولوی مسعود علی صاحب کی ہمتی کی شادی درمیان ہے بہت دنوں سے وہ ٹال رہے تھے، ذمہ دار مہینہ نرانی دوم نے آخری مہینہ مقرر کیا ہے، ان کا شادی لکھنے یا جواب دیکھنے اور یہی مہینہ ان کے دو ہزار ادا کے قرض کی قسط کا ہے۔ جس کا قسط شاید آپ جانتے ہوں، اس لیے وہ اوائل نومبر سے ایک ماہ کے لیے دارالمصنفین چھوڑ کر مجددی مکان دیں گے اور دارالمصنفین کے لیے تم میں سے ایک کا مدراس ضروری ہے اور اسی لیے ان کو آنا ذکر نے کے لیے مجھے مدراس سے دو چار روز میں روانہ ہونا ہے۔ کیونکہ یہاں جو لکچر دینے تھے وہ ختم ہو چکے، صرف ایک باقی ہے جو آج کل میں ہو جائے گا۔

۴۔ میں باقاعدہ دارالمصنفین کا ذکر ہوں۔ اس میں دو دنوں طرح کے کام ہیں۔ پہلے یورپ گیا تو جہاں اطلاع گیا اور تنخواہ جاری رہی مگر اس وقت ہوا ایسی تھی کہ وہ مخالفت نہ کر سکے۔ دوسری دفعہ مجاز کیا کہ ان کی اجازت کے کچھ مہینہ کی رخصت ہو گیا۔ مگر اس دفعہ ہاؤس بد مزگی ہوئی، اب اس دفعہ پھر اس بد مزگی کو بڑھانا سوسائٹی یعنی دارالمصنفین کو پر باد کرنا ہے۔ ان میں بعض وہ ممبر ہیں جن کے ذریعہ سے حیدر آباد کی امداد آتی ہے مجھے یا تو مستغنی ہو جانا چاہیے یا دارالمصنفین کو ابھی اختلاف کی بنا پر لڑ دینا چاہیے۔ گو میں اب بھی زبردستی جاسکتا ہوں۔ مگر باوجود درخواست کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔

۵۔ مذکورہ قاعدہ یہ ہے کہ نومبر کے آخر میں انہا میں اس کا سالانہ جلسہ ہے۔ مولوی مسعود علی صاحب اپنی خانگی مزدوروں کے باعث گھر سے باہر نہیں ہو سکتے۔ اب بھی کو اس جیسے کو سنبھالنا ہے۔ اس مہینے میں تیری غیر حاضر کے باعث بعض مخالفت ارکان نے دوسرے ممبروں کی مخالفت تعلیم و اخلاق یعنی انگریزیشن چھوڑنا قائم کیا ہے۔ تاکہ میرے نام و سبقت پر الزام نہ لگوں کہ مجھے پرنام کیا جاسکے، اس سے پریشان ہوں، اس کے بجائے کی صورت کرنا ہے، ایک درس کا انتقال ہو گیا اس کی جگہ لا انعام مجھے کرنا ہے، نصاب بنانا اور بنانا ہے اور سرمایہ کی ذمہ داری لا انعام کرنا ہے۔

یہ سب تودود و دود کی مٹی کو پیشل جھوڑیاں تھیں۔ اب میں آخر اپنا جسم آپ کو دکھاتا ہوں، یورپ سے یہ بیماری لے کر آیا کہ کھانے کے دو گھنٹے بعد میز سے لے کر گردہ تک درد ہوتا ہے۔ علاج سے وہ جاتا ہے اور پھر ہو جاتا ہے۔ اس کیلئے یہ مزدی ہو گیا ہے کہ خاص طریق سے دیا جائے۔ آپ اپنی کمر بانی سے ہر قسم کا انعام اپنے سر پہنے کو تیار ہیں۔ مگر دافعہ یہ ہے کہ میں عرب کو دیکھ چکا ہوں اور آپ مرث سن کر فراتے ہیں، کچلی دھڑکے کے سونے پھر مرض کو پیدا کر دیا۔ بلکہ اور ایک نئے مرض میں مبتلا کر دیا۔ عرب میں گوشت عموماً دینے کا ہوتا ہے جو میرے کیلئے ذہر، دودی کا دود میں حیرت انگیز تھی ہے۔ نہایت نفیل، سہیلی اور ترلا دیاں جو میں کھاتا ہوں وہاں نہیں عین کچلی دھڑکے کی ہادرجی دکھا گیا۔ مگر گوشت اور دودی کی قسم کو وہ کیا کرتا، وہاں درد شروع ہو گیا۔ خود بھی مشکل میں آئی۔ اینٹ کو آگ میں گرم کر کے اس سے جگر، پیٹ اور گردہ کو ایک کو علاج کرتا تھا اور نیکیں حاصل کرتا تھا۔ پانچا زلا دکان سسٹم ایسا ہے۔ جو ایک دالم المرض کے کیلئے سردیاں روح ہے، کہہ نہیں سکتا کہ ایک جیسے میں اس کی کیا تکلیف دانا اٹھاتی ہے۔ اس سے مرض نیا پختہ لایا ہوں کہ دروں سر میں کے بیچ میں کوئی رنگ یا پتھا بڑی ہے۔ اس میں درد ہو جاتا ہے۔ اٹھنے بیٹھنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ اور اس قدر تکلیف ہوتی ہے کہ اس حالت میں موڑ کی سواری پر بھی حرکت ہوتی ہے تو جان نکل جاتی ہے، ایسی حالت میں دالینے سے کہ صغیر تک کوئی دن اونٹ یا شغذ کی سواری میرے کیلئے نا قابل تحمل ہے دماغ کا یہ حال ہو گیا ہے کہ ذرا سی ٹھنڈی کسی خیال کی آمد سے غیہ جاتی رہتی ہے، تین جیسے سے یہ حال ہے۔ قلب پر یہ اثر ہے کہ بالکل اندر لگی اور پڑ مرو کی آگنی ہے۔ ذرا سا بولتی ہوں تو تنک جاتا ہوں اور سینہ میں درد ہو جاتا ہے یہاں آیا تھا کہ کام کے ساتھ کچھ تفریح اور تبدیلی آپ دیو ہوا جو جائے گی۔ یہاں ایک مرض ہو جاتا رہا تھا عود کر آیا یعنی کا درد میں سوزش اور ایک مرض ترقی کر گیا یعنی سوزش اور دود و شحم کے ساتھ دوتین دافعہ درست۔ ڈاکڑی علاج یہاں کوئی ٹماڑہ نہ ہوا آخر ایک ہفتہ کے کیلئے بھلو دیا تھا۔ وہاں حکیم صاحب قبیلہ کے ایک شاگرد مستعد حکیم میں انہوں نے دیکھا اور دوتین یونانی قرص، سمجون اور شربت تجزیہ کیا ہے جو روزانہ استعمال میں ہے اور اس سے کسی قدر تخفیف ہے۔

میں نے اپنا دل نکال کر آپ کے سامنے رکھ دیا ہے اور خدا جانتا ہے کہ جو کچھ لکھ رہا ہوں وہ حرف کھوت کچھ ہے، ناؤ و کفرہ اور ہمازی کی حالت نہیں، اور نفع دنیا میں گرفتار ہوں۔ میری سات آنکھوں کی کیفیات آپ سے ہے۔ آپ جیسے آدمیوں کی شناخت کے مدعی سے میرا کوئی عیب یا ہنر چھپا نہ ہوگا۔ خدا جانتا ہے کہ آپ کی خواہش کو بروی نہ کرنے کا جس درجہ افسوس ہے۔ میں گناہگار ہوں۔ اور اپنی گناہ گاری کی سزا آپ کے ہاتھ سے برداشت کرنے کو تیار ہوں۔ کیسا کی طرح اس کی تلافی ہو سکتی ہے؟

میں دو چار روز میں یعنی یکم نومبر کو اعظم المذہب روانہ ہو جاؤں گا۔ والسلام

۱۲ اکتوبر ۱۳۵۲ء یسید سلیمان

خواجہ حسن نظامی

(۱)

بنام ہمارا جہ سرکش پرشاد

دین بیدار۔ درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الہی دہلی — تارکا پتر خراجہ دہلی
نظامی شاہ صاحب۔ اسلام علیکم۔ خطہ جہیز: درختہ ۱۲ دسمبر وصول ہوا۔ درویش کے مضمون میں جماعت علی شاہ
صاحب ہی کے واقعہ کا اشارہ تھا۔ آپ مجھ سے پہلے اس فقرہ کو فرما چکے ہیں۔

اگرچہ آپ کا خیال مجھ اذہ پر درست ہے کہ جماعت علی شاہ صاحب جیسے لوگ ان عبادات سے قائل نہیں
ہوں گے مگر اور صند کریں گے مگر ملک میں ان کے علاوہ بھی ایک جماعت کثیر ایسی ہے جو اس قسم کے معنائیں شائع ہونے
سے بولگیوں اور مضمون افزا ہوں سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اس واسطے میں نے وہ مضمون شائع کرنا ضروری سمجھا اور مناسب
معلوم ہوا تو آپ کا یہ خط بھی خانگی الفاظ قلم زد کرنے کے بعد شائع کر دیا۔ بانی نے کہا کہ اس خد میں نہایت محضانہ سچی تحریر
ہے۔ اگر خط شائع ہوا تو جماعت علی شاہ کا فقرہ درج نہ ہوگا۔

میں کل ایک خط آپ کو لکھ چکا ہوں اور دوتا بھی آپ کو دیئے ہیں۔ امید ہے کہ وصول ہوئے ہوں گے۔ میں
خود آٹھ سائے لکھنے لگا اور بات چیت کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔ خدا کے فضل سے حوربا نو کو بھی اب آرام ہے۔ یعنی قابل
فکر حالت نہیں ہے۔ شادی اگر مقرر ہوگئی تو فوراً چلا آؤں گا۔ ورنہ پندرہ دن کے بعد ادا وہ ہے۔ محض آپ ہی سے ملاقات
کرتی چاہتا ہوں کہ مریدوں کی بغیر مجھ سے کچھ کہیں ٹھہروں۔ خواجہ بابا اور بچوں کو دعا۔

دعا گو: حسن نظامی

۱۵ دسمبر ۱۹۷۳ء

(۲)

بنام مولانا وحید احمد

جناب بغیر صاحب بریل دیوار شلہ

کسی بوائے کو آواز دیکھنے کو کہہ لہذا کاما فرماشت مانگتا ہے۔

صورت حال یہ ہے کہ ۱۳ اپریل کا خط آج ۱۵ کو ملا۔ جب آپ یہ خط لکھ رہے تھے میں اپنے سفر سے واپس آئی اور
انکم ٹیکس آفیسر سے ملنے جا رہا تھا۔ ہاتھوں عورت مرد عجائبات ان کے گھروں میں واپس جا رہے تھے۔ قدم قدم پر اندیشہ ہوتا تھا

میں نے منبر خٹکے کے متعلق گزارش کی تھی کہ ایک بریل میرے یہاں ہے اس میں قیام فرمایا ہے اور اس کا نام HOTEL de HEART ہے۔

نقش پریم چند

نام سید امتیاز علی تاج

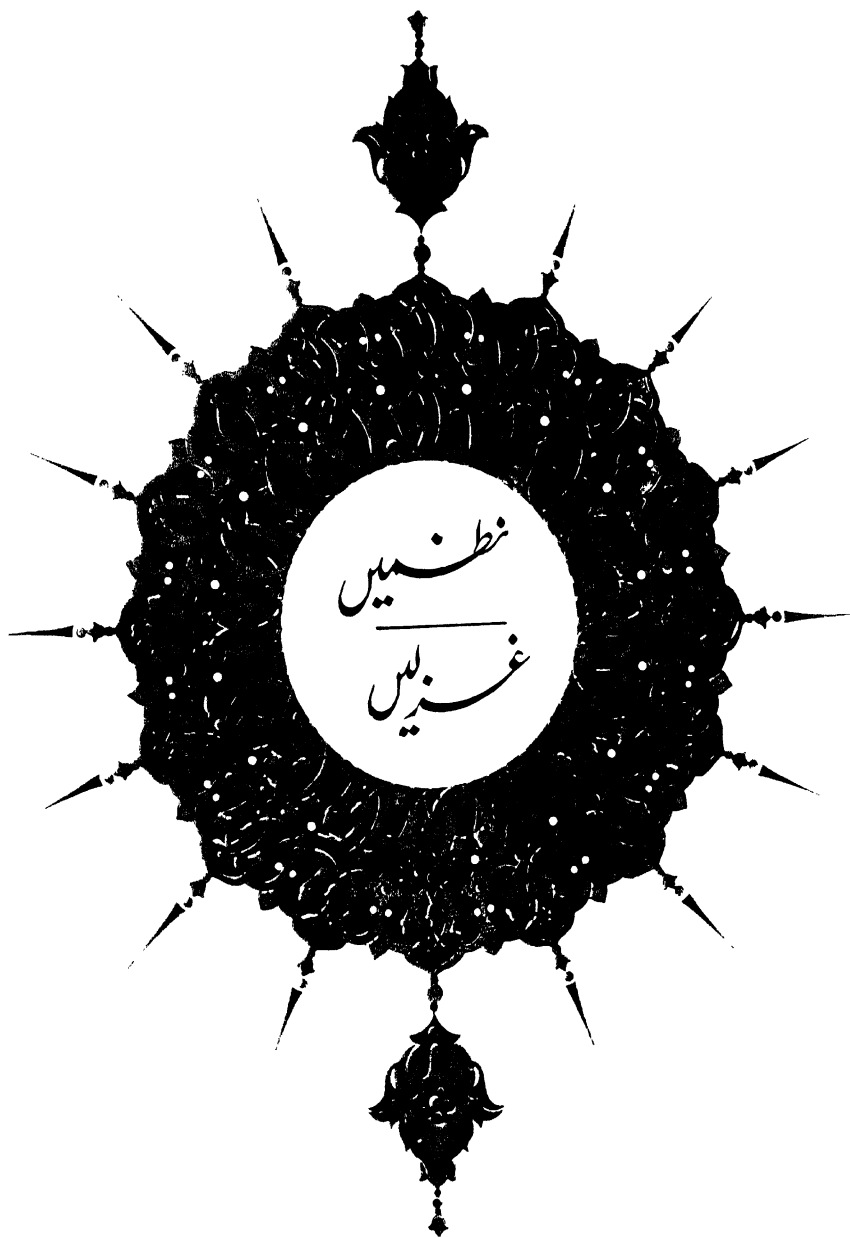
مشفق من التیم!

لفظِ خدا۔ مشکور ہوں۔ میں جن کے پرچے خوب پڑھے۔ اور خطا اٹھایا۔ میں بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ ایسا دلچسپ سا ادب اس وقت اردو زبان میں نہیں ہے۔ پہلے اگر قدرِ ناکوسے تو مجھیری ہے۔ بالخصوص اقدار اور اصل افواج پرچم صحفون قبا سید ممتاز علی صاحب نے گزرا یا ہے وہ رسالہ کی جان ہے۔ ان مصنفات پر ایسا صاف اور روشن معنوں میں پیری نظر سے نہیں گزرا۔ مجھے اب تک نہ معلوم تھا کہ حضرت مولیٰ کو علی مضامین میں اتنی دسترس ہے۔ کچھ زیادہ دلچسپ نہیں لیکن شبنم کی سرگزشت بہت اچھا ہے۔ علی کہہ پڑا۔ دو سالوں میں کوئی معجزہ تنقید نہیں نکلی۔ اس لحاظ سے و نیز تنقید کی خوبی کے اعتبار سے آپ کا رسالہ اول ہے۔ اگر دوسرے نقاد پر اچھی چوٹ کی ہے حالانکہ کسی قدر غیر منصفانہ ہے۔ عالمِ خواب مجھے بہت پسند آیا ہے۔ علاجِ بے دوا خوب ہے۔ معلوم نہیں طبعِ آزاد ہے یا کچھ اور۔ حدِ نغم بھی دیگر رسالوں سے کہیں بلند تر ہے۔ میں تعریف کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ حق کا انہار کرتا ہوں۔ گرام صاحب تو بڑے کھلم کھلا معلوم ہوتے ہیں اور حق یہ ہے کہ خوب لکھے ہیں۔

پہلے کبھی حد دوم کی سرحدیں آپ کے یہاں بھجوا دی ہیں۔ پریم تبتی حد اول چھپ دی ہے۔ غالباً دو چھپنے میں تباہ ہو جائے گی۔ کیا بتیسی کا حد دوم آپ اپنے اہتمام سے نہیں شائع کر سکتے؟ باز اسن قرابھی معلوم نہیں کہ تک تیار اسی اثنا میں اگر بتیسی حد دوم آپ شائع کر سکیں تو خوب ہو۔ کچھ قصے آپ ہی کے دونوں پرچوں میں نکلے ہیں بقیہ دس میں دو دوں گا۔ کوئی دس ہزاروں کی کتاب ہوگی۔ آپ کے لیے ایک قصہ لکھ رہا ہوں۔ خونِ جگر تو بہت صحت کرتا ہوں ہر معلوم نہیں کچھ رنگ بھی آئے گا یا نہیں۔ خون ہی نہیں ہے تو رنگ کیا خاک پیدا ہو۔ اور کیا اتنا اس کو دل اپنے والد صاحب کی خدمت میں میرا دست بند سلام کہئے گا۔ آپ کے خطوط سے ایسا غوص چلکا ہے کہ بے اختیار دھننے کو جی چاہتا ہے۔ بڑا غمی کی قید اور سفر کی درازی بہت کر دیتی ہے۔ والسلام

ممتاز مند۔ مصنفیت دلتے۔ گوردھور۔ ۱۱ اگست ۱۹۱۹ء

یہ لفظ پڑھا نہیں گیا۔



قطعات

جوشِ طمع آبادی

زلفیں باندھیں مگر بکھرتی ہی رہیں
گھڑیاں روکیں مگر گزرتی ہی رہیں
امید کا رخسار میں بہرتے رہے رنگ
اور یاس کی جھڑیاں اُبھرتی ہی رہیں

دوڑو کہ سہو ٹوٹ رہا ہے یارو
دامانی چمن چھوٹ رہا ہے یارو
یادوں کے جواہر کو پچاؤں کس طرح
نسیان مجھے لوٹ رہا ہے یارو

سو بار مری دھوپ کو سنو لایا ہے
خود میرے ہنر سے مجھے شرمایا ہے
آیا ہے مری راگھ پہ سمجھ سے کرنے
وہ جس نے مری آگ کو ٹھکرایا ہے

جھومتی برسات

جوش ملیح آبادی

۳
کیا جوش میں ہیں جھاگ اڑاتے ہوئے نامے
بادل کے خزانوں کے ہیں ٹوٹے ہوئے نامے
کلیوں کے یہ کھانچے ہیں کہ پھلکے ہوئے تھالے
دیکے ہوئے پھجوں کے تلے خوئے والے
ٹاپو میں کہیں راہ، کہیں راہ میں ٹاپو
اے دولت پہلو
ہاں، تان اڑا تان، ستر پارہ و گل رُو
اے دولت پہلو

۴
کس ناز سے وہ دیکھ گھٹ باغ میں لوٹی
نوعِ ماضی جھوم گئی کھول کے چوٹی
برکھا سے کھری ہو گئی جو چیز تھی کھوئی
جنش میں ادھر سبزہ، ادھر بیس بہوئی
ہر باغ میں ہر باغ میں، ہر راہ میں، ہر سُو
اے دولت پہلو
ہاں، تان اڑا تان، ستر پارہ و گل رُو
اے دولت پہلو

۱
ہاں، دیکھ، ذرا دیکھ، مرے سرو لب جو
گھنگھور گھٹاؤں کا یہ چلتا ہوا جادو
زرتار ڈپٹوں کے یہ اڑتے ہوئے پلو
یہ کنج میں زندانِ سید مست کی یا ہوا
اے دولت پہلو
ہاں، تان اڑا تان، ستر پارہ و گل رُو
اے دولت پہلو

۲
ساحل پر یہ اڑتے ہوئے جنت کے نظامے
انٹاک پر یہ سرخ دوشالوں کے کنارے
بکلی کی لپک میں یہ جینوں کے اشارے
اُٹے ہوئے دریا کے اُبلتے ہوئے دھارے
دھاروں میں گھری ناؤ کے مڑتے ہوئے پتھر
اے دولت پہلو
ہاں، تان اڑا تان، ستر پارہ و گل رُو
اے دولت پہلو

۵

پتی کوئی کالی ہے، تو جو ما کوئی گورا،
لہر نہ ہے ہر نعل کے ہتائے کا کٹورا
ہر زخم شہلا میں نئی عسمر کا ڈورا
لڑ کو خدا ہر اک نعل ہے، تو ہر خار ہے گھوڑ
اے دولت پہلو
ہاں، تان اڑا تان، ستر پارہ و گل رو
اے دولت پہلو

۷

شاخوں میں جھا جھم ہے فضاؤں میں روانی
بہتی ہوئی چمکار، محبت ہو پانی
بھونرے ہیں کہ اڑتی ہے کہانی پہ کہانی
اک خیمہ ہے، ادھر خیمہ رنگین جوانی
بھیٹے ہوئے پودوں کی یہ چھتی ہوئی خوش بو
اے دولت پہلو
ہاں، تان اڑا تان، ستر پارہ و گل رو
اے دولت پہلو

۶

خود سوچ دوانے ہوں نہ کس طور سے لمحات
جب ناز سے ابھرے ہوئے کو لے پڑھے کا
دن کو ہو فوسخندہ و رقصندہ جواں رات
کیا بات ہے برسات ہے برسات ہے برسات
لہراؤں سادات پہ، چل جائے جو تارو
اے دولت پہلو
ہاں، تان اڑا تان، ستر پارہ و گل رو
اے دولت پہلو

۸

ہر مست صدا، خواب زلیخا کی ہے تعبیر
ہر زخم شہلا ہر شش و با، حسن کی تفسیر
تصویر میں آواز ہے، آواز میں تصویر
اک کیف کی بازیب ہے اک نشے کی زنجیر
باغوں میں، کتنی چھاؤں میں، کوئل کی یہ کوکو
اے دولت پہلو
ہاں، تان اڑا تان، ستر پارہ و گل رو
اے دولت پہلو

۹

ہر لحظہ رواں ، تند عیناں ابر کا تو سن
ہر آن مسکتا ہوا اسلک کا دامن
ہر وقت سنئے رنگ کی اٹھتی ہوئی پلین
ہر لمحہ پردار میں پرداز کی سن سن
ہر ساعت سرشار میں نازِ زم آہو
اے دولت پہلو
ہاں ، تان اڑاتان ، ستم پارہ و گل رو
اے دولت پہلو

۱۰

شیشوں پہ یہ دُربارِ حجب لکھتی ہوئی بوندیں
شاخوں سے یہ مے ریز پستکی ہوئی بوندیں
یہ دُوب کے ریشوں سے ڈھلکتی ہوئی بوندیں
یہ ام کے پتوں پہ کھسکتی ہوئی بوندیں
بوندوں کے مجیروں میں یہ بجتے ہوئے گھنگرو
اے دولت پہلو
ہاں ، تان اڑاتان ، ستم پارہ و گل رو
اے دولت پہلو

۱۲

گھنگھور گھٹاؤں میں یہ خوابوں کے فسانے
بوچھا میں ، ہاروں کے یہ ٹوٹے ہوئے دانے
پڑ والی کی سن سن میں یہ شاخوں کے ترانے
بہتے ہوئے یہ بُرا یہ برستے ہوئے گانے
یہ مور کی جھنکار ، پیپے کی یہ پی مڑ
اے دولت پہلو
ہاں ، تان اڑاتان ، ستم پارہ و گل رو
اے دولت پہلو

۱۳

اک نکتِ مٹتی جنوں خیر نہ و خروشنے
اک نکتِ بُتِ لالہ و شے، عشوہ فروشنے
اک نکتِ سرود و سخن و سوز کے گوشے
اک سائے میں مہبائے مکتے ہوئے خوشے
اک سیج پہ برہا کے دہکتے ہوئے آئینو
اے دولت پہلو
ہاں، تان اڑا تان، مستر پارہ و گلِ رُو
اے دولت پہلو

۱۴

یہ پستی، یہ گیندی، یہ سرمئی بادل
یہ فاختی، یہ سردی، یہ وزنی مَحْسَل
یہ نقری، یہ کتھی، یہ اگری، یہ اچھل
اور فاسی طشت میں یہ چمپی بوتل
بوتل میں مہترکتا ہوا یہ شعلہ وارو
اے دولت پہلو
ہاں، تان اڑا تان، مستر پارہ و گلِ رُو
اے دولت پہلو

۱۵

ہر سجدہ صد دانہ ہے اک زلفِ تہِ دام
ہر سجدہ شکرانہ ہے اک جہتِ سونے بام
ہر گد و دش پیمانہ ہے اک رقصِ خوش انجام
ہر نعرہ زندانہ ہے اک نغمہِ الہام
ہر لغزشِ متانہ ہے اک قوتِ بازو
اے دولت پہلو
ہاں تان اڑا تان، مستر پارہ و گلِ رُو
اے دولت پہلو

۱۶

اس رُت میں خرابات کی پوشاک ہے دھانی
اور جوش کے ساغر میں خرابات کی رانی
اس شیخ سے کہہ دے کہ ارے دشمن جانی
خاموش کہ اس وقت ہے موسم کی جوانی
خشنده بہر کوچ و رقصندہ بہر کو
اے دولت پہلو
ہاں تان اڑا تان، مستر پارہ و گلِ رُو
اے دولت پہلو
اے زینتِ پہلو
اے جنتِ پہلو
اے آفتِ پہلو



جگہ مراد آبادی

اگر نہ زہرہ جبینوں کے دریاں گزرے تو پھر یہ کیسے کٹے زندگی کہاں گزرے
جو تیرے عارض دیکسو کے دریاں گزرے کبھی کبھی وہی لمحے بلائے جاں گزرے
مجھے یہ وہم رہا مدتوں کہ جراتِ شوق کہیں نہ حنا طرِ معصوم پر گراں گزرے
خطا معاف! زمانے سے بدگماں ہو کر تری وفا پہ بھی کیا کیا ہمیں گماں گزرے
مری نظر سے تری جستجو کے صدقے میں یہ اک جہاں ہی نہیں سینکڑوں جہاں گزرے
اسی کو کہتے ہیں جنت! اسی کو دوزخ بھی وہ زندگی جو جبینوں کے دریاں گزرے
مجھے تھا شکوہ، جسداں کہ یہ ہوا محسوس مے قریب سے ہو کہ وہ ناگماں گزرے
بہت حسین سہی صحبتیں گھلوں کی مگر وہ زندگی ہے جو کانٹوں کے دریاں گزرے
کبھی کبھی تو اسی ایک مشت خاک کے گرد طواف کرتے ہوئے ہفت آسمان گزرے

بہت عزیز ہے مجھ کو، انھیں کی یاد جگر۔

وہ حادثاتِ محبت جو ناگماں گزرے



جسکے مراد آبادی

یہ دن بہار کے اب کے بھی راس آئے سکے
 مری تباہی دل پر تو جسم کھانہ سکے
 وہ سبزہ ننگ چن ہے جو لہلہا نہ سکے
 یہ آدمی ہے وہ پر وائے شمع و شمس کا
 انھیں سعادۂ منزل رسی نصیب ہو کیا
 نہ جانے آہ کہ اُن آنسوؤں پہ کیا گزری
 کریں گے مر کے بقائے دوم کیا حاصل
 نہ ہے خلوص محبت کہ حادثات جہاں
 مری نظر سے گریزاں بہت رہے لیکن
 یہ مہر و ماہ مرے ہمسفر رہے برسوں
 مری نظر نے شبِ غم انھیں بھی دیکھ لیا
 گھٹے اگر تو بس اک مشت خاک سے لڑا
 کہ غنچے کھل تو سکے، کھل کے مسکرا نہ سکے
 مگر کبھی وہ نظر سے نظر ملا نہ سکے
 وہ گل ہے زخم بہا راں جو مسکرا نہ سکے
 جو روشنی میں رہے روشنی کو پا نہ سکے
 وہ پاؤں راہ طلب میں جو دم گمانہ سکے
 جو دل سے آنکھ تک آئے مژدہ تک آئے سکے
 جو زندہ رہ کے مقم حیات پا نہ سکے
 مجھے تو کیا؟ مرے نقش قدم مٹا نہ سکے
 مرے حدودِ محبت سے بچ کے جانہ سکے
 پھر اس کے بعد مری گرد کو بھی پا نہ سکے
 وہ بے شمار ستارے کہ جگمگا نہ سکے
 بڑھتے تو وسعت کو نین میں سمٹا نہ سکے

نیا زمانہ بنانے چلے تھے دیوانے
 نئی زمین، نیا آسماں بنانے سکے



فراق کورکھپوری

مطرب سے کو آج اس انداز سے گائے
 وہ چوٹ جو کیا جانے کہاں سے اُبھر آئے
 آنکھوں کو پھر اک شاید رعنا نظر آنے
 اک برق ادا، شعلہ قبا، پسیر نکلیں
 کوندا ہو گا از۔ اُٹ یہ تبسم کی گھلاوٹ
 وہ مستی قامت کہ گھٹا جھوم کے اُٹھے
 نس میں کوئی جیسے دبی چتیاں بھرے
 دوشیزہ جوانی کی ادھر ٹوٹتی انگڑائی
 وہ شوخی محتاط کے نیچے ہوئے انداز
 یہ کم نکلی چشم فسون ساز کی کیسی
 دیوانہ کو لگے چوٹ سی، ہر آنکھ بھر آئے
 وہ درد فرشتوں کو جو انسان بنائے
 زریں کمرے کچ کلے، تنگ قبائے
 دلہائے مہر کو پسلیوں میں دبائے
 لمحے کی کھٹک۔ لُجو ستاروں سے چرائے
 وہ جیتی ہر عضو کہ بجلی کو غش آئے
 رگ رگ میں کلی جیسے تپکتی چلی جائے
 تصویر ادھر قوس قزح کھینچتی جانے
 دنیا بھی نہ رہنے دے قیامت بھی نہ دھائے
 دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنائے

کچھ ایسی بھی گدڑی ہیں تے ہجر میں راتیں
 دل درد سے خالی ہو مگر بند نہ آئے

جگنو

فران گورکھپوری

یہ مست گھٹا، یہ بھری بھری برسات
تمام — حد نظر تک — گھلاؤٹوں کا سماں
فضائے شام میں ڈورے سے پڑے جاتے ہیں
جدھر نگاہ کریں کچھ دھواں سا اٹھتا ہے
وہ اک اٹھا ہے طراوت کی آنچ سے آتش
ز فرش تا فلک انکڑائیوں کا عالم ہے
یہ مد بھری ہوئی پُر وانیوں سنکلی ہوئی
جھنجھوڑتی ہے ہری ڈالیموں کو سرد ہوا
یہ شاخسار کے جھولوں میں جیک پڑتے تھے
یہ لاکھوں پتوں کا ناچنا یہ رقصِ نبات
یہ بخود ہی مسرت یہ والہانہ رقص
یہ تال سم، یہ جھپا جھم — کد کان تھتے ہیں؟
ہوا کے دوش پر کچھ گھوڑی اودی ٹھلکی
نشے میں چورسی پر چھائیاں بھرتی ہوئی
افق پر ڈوبتے دن کی چھینکتی ہیں آنکھیں
تموش سوزِ دروں سے سلک رہی ہے یہ شام

مرے مکان کے آگے ہے ایک صحن وسیع
کبھی وہ ہنستی نظراتی ہے کبھی وہ اُداس
اسی کے بیچ میں ہے ایک بڑا میل کا
ستا ہے میں نے درگوں سے یہ کدھر اس کی
جو کچھ نہ ہوگی تو سوگی قریب چھیاڑے سال
چھڑی تھی ہند میں جب پہلی جنگ آزادی
جسے دبانے کے بعد اس کو خدر کہنے لگے
یہ اہل ہند بھی ہوتے ہیں اس قدر معصوم
وہ دار و دیگر وہ آزادی وطن کی جنگ
وطن سے تھی کہ عینم وطن سے غداری
پھر گئے تھے ہمارے وطن کے پیر و جاں
دیار ہند میں رن پڑ گیا تھا ہمارے طرف
اسی زمانے میں کہتے ہیں میرے ادا نے
جب ارض ہند بچی خون سے پسو توں کے
میاں صحن دکایا تھا لاکھ اک پودا

جو آب و آتش و خاک و ہوا سے پلتا ہوا
خود اپنے قد سے جو شش ٹونکتا ہوا
فسون روح نباتی رگوں میں چلتا ہوا
لگا ہوا شوق کے سانچوں میں روز و رات
سنا سے راویوں سے دیدنی تھی اسکی اٹھان
ہر اک کے دیکھتے ہی دیکھتے چڑھا پروان
وہی ہے آج یہ چھتہ سنا رہا پڑ پیل کا
وہ ٹینوں کے گھسٹل لیے جٹا دھاری
زمانہ دیکھے ہوئے ہے یہ پیرا بچپن سے
رہی ہے اس کے لیے داخلی کشش مجھ میں
رہا ہوں دیکھتا چپ چاپ دیر تک اس کو
میں کو گایا ہوں کئی بار اس نظارے میں
وہ اس کی گہری چڑیں تھیں کہ زندگی کی چڑیں؟
پس سکون بھر کوئی دلی دھڑکتا تھا
میں دیکھتا تھا کبھی اس میں زندگی کا ابھار
میں دیکھتا تھا اسے ہستی بشر کی طرح
کبھی اُداس کبھی شادمان کبھی گھبر

فضا کا سرمئی رنگ اور ہوجھلا گہرا
گھلا گھلا سا فلک ہے دھواں دھواں سی ہے شام
ہے جھٹکتا کہ کوئی اڑ رہا ہے مائل خواب
سکوت شام میں دراندگی کا عالم ہے
ڑکی ڑکی سی کسی سوچ میں ہے مویج مبا
ڑکی ڑکی سی صفیں مل بھی گھٹاؤں کی۔
آتا رہے سر صحن رقص پیل کا
وہ کچھ نہیں ہے اب اک جنبش خفی کے سوا
خود اپنی کیفیت نیلگوں میں مہ غلط
یہ شام ڈوبتی جاتی ہے چھپتی جاتی ہے
حجاب وقت سرے سے ہے عین حرکت
ڑکی ڑکی دل فطرت کی دھڑکتیں بخت
یہ رنگ شام کہ گردش ہی آسمان میں نہیں

بس ایک وقفہ تاریک، سرسبز تاریک
 سامیں، غنمشیں، ہم سب کچھ ہوئی — فوراً
 تلی گشتا کے تلے جیلے بھیگے پتوں سے
 ہری ہری کئی چنگاریاں سی پھوٹ پڑیں
 کہ جیسے کھلتی جھلکتی ہوں بے شمار آنکھیں
 عجب یہ آنکھ بچولی تھی نور و خلعت کی
 سہانی نرم لویں دیتے اُن گنت جگنو
 گھنی میاہ خنک پتیوں کے جھرمٹ سے
 مثال چپا درشب تاب جگمگانے لگے
 کہ تھر تھراتے ہوئے آنسوؤں سے ساغرِ نام
 چھلک چھلک پڑے جیسے بغیر ان گمان
 بطونِ شام میں ان زندہ مقفوں کی دماک
 کسی کی سوئی ہوئی یاد کو جگاتی تھی —
 وہ بے پناہ کھٹا وہ بھری بھری برسات
 وہ سین دیکھ کے آنکھیں می بھراتی تھیں

مری حیات نے دیکھی ہیں میں برساتیں
 مرے جنم ہی کے دن مرگئی تھی ماں میری
 وہ ماں کہ اشک بھی جس ماں کی میں نہ دیکھ سکا
 جو آنکھ بھر کے مجھے دیکھ بھی سکی نہ، وہ ماں
 میں وہ پسر ہوں جو کھجا نہیں کہ ماں کیا ہے
 مجھے کھلایوں اور دایوں نے پالا تھا
 وہ مجھ سے کہتی تھیں جب گھر کے آتی تھی رستا
 جب آسمان میں ہر سو کھٹائی چھاتی تھیں
 بوقتِ شام جب اُڑتے تھے ہر طرف جگنو
 دیئے دکھاتے ہیں یہ بھولی بھولی روحوں کو
 مزہ بھی آتا تھا مجھ کو پھر ان کی باتوں میں
 میں ان کی باتوں میں رہ کے کھو جاتا تھا
 پراس کے ساتھ ہی دل میں کسک سی ہوئی تھی
 کبھی کبھی یہ کسک ہو کہ ان کے اٹھتی تھی
 یہ تم دل کو مرے یہ خیال ہوتا تھا
 یہ شام مجھ کو بنا دیتی کاش ایک جگنو
 تو ماں کی جھٹکی ہوئی روح کو دکھاتا رہا
 کہاں کہاں وہ بچاری جھٹکے ہی ہوگی

کہاں کہاں مری خاطر بھٹک رہی ہوگی
یہ سوچ کر مری حالت عجیب ہو جاتی
پلک کی اوٹ میں جگنو چمکنے لگتے تھے
کبھی کبھی تو مری ہچکیاں سی بندھ جاتیں
کہ ماں کے پاس کسی طرح میں پہنچ جاؤں
اور اس کو راہ دکھاتا ہوا میں گھر لاؤں
دکھاؤں اپنے کھلونے دکھاؤں اپنی کتاب
کہوں کہ پڑھ کے سنا تو مری کتاب مجھے
پھر اس کے بعد دکھاؤں اُسے میری کاپی
کہ ڈیرھی ڈیرھی لکیریں بنی تھیں کچھ جس میں
یہ حرف تھے جنہیں میں نے لکھا تھا پہلے پہل
دکھاؤں پھر اُسے آنگن میں وہ گلاب کی پیل
سنا ہے جس کو اُسی نے کبھی لکھا یا بھت
یہ جب کی بات ہے جب میری عمر ہی کیا تھی
نظر سے گزری تھیں کل چار پانچ برساتیں

گزر رہے تھے مہر و سال — اور موسم پر
ہمارے شہر میں آتی تھی گھر کے جب برسات
جب آسمان میں اڑتے تھے ہر طرف جگنو
ہوا کی موج رواں پر دیئے جلائے ہوئے
فضا میں رات گئے جب درخت پیل کا
ہزاروں جگنوؤں سے کوہ طور بنتا تھا
ہزاروں وادی امن تھیں جس کی شاخوں میں
یہ دیکھ کر مرے دل میں یہ ہنوک اٹھتی تھی
کہ میں بھی ہوتا انہیں جگنوؤں میں اک جگنو
تو ماں کی بھٹکی ہوئی روح کو دکھاتا راہ
وہ ماں میں جس کی محبت کے پھول میں نہ سکا
وہ ماں میں جس سے محبت کے پھول میں نہ سکا
وہ ماں کہ بھینچ کے جس کو کبھی میں سو نہ سکا
میں جس کے آنچلوں میں مڑ چھپا کے روز نہ سکا
وہ ماں کہ کھنڈوں سے جس کے کبھی لپٹ نہ سکا
وہ ماں کہ سینے سے جس کے کبھی چمت نہ سکا
بھٹک کے گود میں بن کی کبھی میں چہرہ نہ بنا
میں زیر سایہ اُمیت جس کے بڑھ نہ سکا
وہ ماں میں جس سے شرارت کی داو پانہ سکا
میں جس کے ہاتھوں محبت کی مار کھا نہ سکا
سنوارا جس نے نہ میرے جھنڈوئے بالوں کو
بسا سکی نہ جو ہونٹوں سے سونے گالوں کو
جو میری آنکھوں میں آنکھیں کھتی ڈال سکی
نہ اپنے ہاتھوں سے مجھ کو کبھی اچھاں سکی
وہ ماں جو کوئی کہانی مجھے سنا نہ سکی
مجھے سنانے کو جو لوریاں بھی گانہ سکی

گلے میں ڈالی نہ بانہوں کی پھول مالا پھی
 نہ دل میں لوحِ جبین سے کیا آنکھ لالہ بھی
 وہ ماں کبھی جو مجھے بدھیاں پہنا نہ سکی
 کبھی مجھے نئے کپڑوں سے جو سما نہ سکی
 وہ ماں نہ جس سے لڑکیوں کے جھوٹ بول سکا
 نہ جس کے دل کے دران تجزیوں سے کھول سکا
 وہ ماں میں پیسے بھی جس کے کبھی چرا نہ سکا
 سزا سے بچنے کو جھوٹی قسم بھی کھانہ نہ سکا
 وہ ماں کہ آیت رحمت ہے جس کی جبین جبین
 وہ ماں کہ لڑن سے ہوئی ہے ٹھہر جس کی نہیں
 دم عتاب جو بنتی فرشتہ رحمت کا
 جو راگ چھڑتی بھجھلا کے بھی محبت کا
 وہ ماں کہ گھڑیاں بھی جس کی گیت بن جائیں
 وہ ماں کہ جھڑکیاں بھی جی پھول برسا ہیں
 وہ ماں ہم اس سے جو دم بھر کو دشمن کر لیں
 تویر نہ کہہ سکی اب آؤ دوستی کر لیں
 کبھی جو سُن نہ سکی میسر تو ملی باتیں
 نہ بے سکی جو کبھی تھپڑوں کی سوغاتیں
 وہ ماں بہت سے کھلونے جو مجھ کو شے نہ سکی
 سراج سرخوئی سردی جو لے نہ سکی
 وہ ماں میں جس سے لڑائی کبھی نہ ٹھان سکا
 وہ ماں میں جس پہ کبھی ٹھیکان نہ تان سکا
 وہ میری ماں میں کبھی جس کی پیٹیر نہ چڑھا
 وہ میری ماں کبھی کچھ جس کے کان میں نہ کہا
 وہ ماں کبھی جو مجھے کر دھنی پہنا نہ سکی
 جتنا لہا تھ سے دے کر مجھے بچا نہ سکی
 وہ ماں نہ دیکھ سکا زندگی میں جس کی پیہ
 اسی کی بھٹی ہوئی رُوح کو دکھ تارادہ

وہ ماں جو دودھ بھی اپنا مجھے بلانہ سکی
 وہ ماں جو ہاتھ سے اپنے مجھے کھانا نہ سکی
 وہ ماں گلے سے مجھے جو کبھی لگانہ سکی
 وہ ماں جو دیکھتے ہی مجھ کو مسکرا نہ سکی
 کبھی جو مجھ سے مٹھائی پھپھاکے رکھ نہ سکی
 کبھی جو مجھ سے وہی بھی بچا کے رکھ نہ سکی
 میں جس کے ہاتھ میں کچھ دیکھ کر ڈبک نہ سکا
 شک شک کے کبھی پاؤں میں ٹھٹھک نہ سکا
 تبھی نہ ٹھینچنا شرارت سے جس کا اچھل بھی
 رچا سکی مری آنکھوں میں جو نہ کا جل بھی
 وہ ماں جو میرے لیے تتلیاں پکڑ نہ سکی
 جو بھگتے ہوئے بازو مرے جگر نہ سکی
 بڑھایا پیار کبھی کر کے پیار میں نہ سکی
 جو منہ بنا کے کسی دن نہ مجھ سے روٹھ نہ سکی
 جو یہ بھی کہہ نہ سکی جانے کی تھ سے
 جو ایک بار خفا بھی نہ ہو سکی مجھ سے
 وہ جس کو جھٹکا دکھانہ کبھی دکھانہ نہ سکا
 کٹافٹوں پدمری جس کو پیار آنہ نہ سکا
 جو مٹی کھانے پہ مجھ کو کبھی نہ پیٹ سکی
 نہ ہاتھ مقام کے مجھ کو کبھی کھینٹ سکی
 وہ ماں جو گفتگو کی رو میں سُن کے میری بڑ
 کبھی جو پیار سے مجھ کو نہ کہہ سکی کھامڑ
 شرارتوں سے مری جو کبھی الجھ نہ سکی
 حقائق کا مری فلسفہ سمجھ نہ سکی
 وہ ماں کبھی جسے چونکانے کو میں لک نہ سکا
 میں راہ چھینکنے کو میں کے آگے رُک نہ سکا
 جو اپنے ہاتھ سے ہر دپ میسے بھر نہ سکی
 جو اپنی آنکھوں کو اتار نہ میرا کر نہ سکی

یہ سوچ سوچ کے آنکھیں مری پھرتی تھیں
 تو ہمارے سونے بچھونے پر لیٹ رہتا تھا
 کسی سے گھر میں نہ راز اپنے دل کے کھتا تھا
 یتیم تھی مری دنیا، یتیم میری حیات
 یتیم شام و سحر تھی، یتیم تھے کتب و روز
 یتیم میری پرکھائی تھی میرے کھیل یتیم
 یتیم گیری سرست تھی میرا علم بھی یتیم
 یتیم آنسوؤں سے نکلیہ جھاک جاتا تھا
 کسی سے گھر میں نہ کہتا تھا اپنے دل کا عید
 ہر اک سے دور اکیلا اُداس رہتا تھا
 کسی شاملِ نادیدہ کو میں تکتا تھا
 میں ایک وحشتِ بے نام سے بڑھتا تھا

ہمارے شہر میں آتی ہیں اب بھی برساتیں
 ہمارے شہر پر اب بھی گھٹائیں چھاتی ہیں
 ہنوز بھیلی ہوئی سرزمینِ فضاؤں میں
 خطوطِ نور بساتی ہیں جگنوؤں کی صفیں
 فضا کے تیرہ میں اڑتی ہوئی یہ قندیلیں
 مگر میں جان چکا ہوں اسے بڑا ہو کر
 کسی کی روح کو جگنو نہیں دکھاتے راہ
 کہا گیا تھا جو بچپن میں مجھ سے جھوٹ تھا

مگر کبھی کبھی حسرت سے دل میں کہتا ہوں
 یہ جانتے ہوئے جگنو نہیں دکھاتے چراغ
 کسی کی جھٹکی ہوئی روح کو — مگر کبھی بھی
 وہ جھوٹ ہی سہی کہتا حسین جھوٹ تھا وہ
 جو مجھ سے چھین لیا عمر کے تقاضے نے

گذر رہے تھے مہِ مِوسال اور موسم پر
 اسی طرح کئی برساتیں آئیں اور گئیں
 میں رفتہ رفتہ پہنچنے لگا بہ سنِ شعور
 تو جگنوؤں کی حقیقت سمجھ میں آنے لگی
 اب ان کھلائیوں اور دایوں کی باتوں پر
 مرا یقین نہ رہا، مجھ پہ بوگیا ظاہر
 کہ جھٹکی روحوں کو جگنو نہیں دکھاتے چراغ
 وہ من گھڑت سی کہانی تھی اک فضا نہ تھا
 وہ بے پردگی کبھی کچھ عورتوں کی تھی بکو اس
 جھٹکتی روحوں کو جگنو نہیں دکھاتے چراغ
 یہ کھنکھایا مرے بہلانے کو یقین یہ باتیں
 مرا یقین نہ رہا ان فضول قصوں پر۔

میں کیا بتاؤں وہ کتنی حسین دُنیا مٹی
جو بڑھتی عمر کے ہاتھوں نے پھین لی مجھ سے
مجھ سکے کوئی اُسے کا شمسِ طفلی کو
جہان دیکھنا مٹی کے ایک ریزے میں
نمود لالہ خود رو میں دیکھنا جنت
کرے نظارہ کونین اک گھر وندے میں
اُٹھا کے رکھے حسدِ انی کو جو پھیل پر
کرے دوام کو جو قید ایک لمحے میں
سنا؟ وہ فادرِ مطلق ہے ایک مٹی سی جان
خدا بھی سجدے میں جھکا جائے سامنے اس کے

سکوت رات کا جس وقت چھڑتا ہے ستا
کبھی کبھی تری پائل کی آتی ہے جھنجکا
تو میری آنکھوں سے موتی برسنے لگتے ہیں
اندھیری رات کے پرچھاویں ڈسنے لگتے ہیں
میں جگنوئیں کے تو تجھ تک پہنچ نہیں سکتا
جو تجھ سے ہو سکے اے ماں تو وہ طریقہ بتا
تو جس کو پالے وہ کاغذ اُچھال دلوں کیسے
یہ نظم میں ترے قدموں میں ڈال دلوں کیسے

یہ عقل و فہم بڑی چیز ہیں مجھے تسلیم
مگر لگا نہیں سکتے ہم اس کا اندازہ
کہ آدمی کو یہ پڑتی ہیں کس قدر ہنسی
اک ایک کر کے وہ طفلی کے بہ خیال کی توت
بلوغت میں وہ صدے نئے خیالوں کے
نئے خیال کا دھچکا نئے خیال کی عیس
نئے قصوروں کا کربِ الامان، کہ حیات
تمام زخم نہاں ہے تمام نشتر ہے
یہ چوٹ کھا کے بھٹلنا محال ہوتا ہے

نوائے درد سے کچھ جی تو ہو گیا ہلکا
مگر جب آتی ہے برسات کیا کروں اس کو
جب آسمان میں اُڑتے ہیں چڑیاں جگنو
شرابِ نوریے سبز آبِ گینوں میں
کنول جلاتے ہوئے غلٹنتوں کے سینوں میں
جب ان کی تابش بے ساختہ سے پھیل کا
دخست سرور چراغاں کو مات کرتا ہے
نہ جانے کس لیے آنکھیں مری بھرتی ہیں

بات سمجھنے والا

حفیظ جالندھری

روزِ روشن کو ہوں میں رات سمجھنے والا
 سب کوئی سچ مری بات سمجھنے والا
 دورِ بالغ نظراں اور ہے۔ یہ دورِ نابینا
 ہم بزرگوں کے مقامات سمجھنے والا
 جلوہ صبحِ قیامت کے لیے ہے بیدار
 چاند تاروں کے اشارات سمجھنے والا
 منتظر ہے کہ ہو مغرب سے طلوعِ خورشید
 اپنے اللہ کی آیات سمجھنے والا
 تو سمجھتا ہے جسے رنگِ بہارِ گلزار
 میں اسے خون کی برسات سمجھنے والا
 آج کل تو بھی نشے میں ہے تو مجھ سے نہ الجھ
 میرے بگڑے ہوئے تو بھی مجھ لے لے کاش
 میں ہوں کم ظرف کی اوقات سمجھنے والا
 درِ زنداں پر ہے اک طرف غضبناک ہجوم
 میرے بگڑے ہوئے حالات سمجھنے والا
 شانِ زندانِ حرا بات سمجھنے والا

اس نئے دورِ سخن سے ہے پریشان حفیظ

شعر کو حرف و حکایات سمجھنے والا



آرزو لکھنوی

زندگی مجسوریوں کا راز ہو کر رہ گئی	سانس اک فریاد بے آواز ہو کر رہ گئی
دل کی دھڑکن نغمہائے راز ہو کر رہ گئی	جو محبت سوز تھی وہ ساز ہو کر رہ گئی
کی شکل آہ اور پیر دے کئی طاقت جواب	غم کی لمبی داستان آغا ز ہو کر رہ گئی
بات کیلے خود نہیں سمجھے تو سمجھاتے کسے	وہ جو الجھن دل میں مٹی اک راز ہو کر رہ گئی
ہر نفس اک نالہ دل اور دل پابندِ عزم	زندگی زنجیر کی آواز ہو کر رہ گئی
اب کہاں قربانگہ الفت میں ہم سا جاں نثار	چار دن مشق ادا و ناز ہو کر رہ گئی
اول اول جھوٹے غمخواروں کی یاد آتی بہت	آخر آخر بے کسی دم ساز ہو کر رہ گئی
جس کے بل پر پھڑ پھڑا کر ہم نے توڑا تقصیر	اب وہ حسرت حسرت پر داز ہو کر رہ گئی

ناقواں دل کی فغانِ آخری اسے آرزو

کان میں گونجی ہوئی آواز ہو کر رہ گئی



فیض احمد فیض

یاد غزالِ چشمیں، ذکرِ سمنِ عذاراں
آنکھوں میں درو مندی، ہونٹوں پہ عذرِ خواہی
جب چاہا کر لیا ہے کینچِ قفسِ بہاراں
جانانہ دارائی شامِ مسراتِ یاراں
آساں نہ تھی کچھ ایسی راہ و فاشعاراں
رُودے سخنِ ہمیشہ سوئے جگرِ فکاراں
سُوئے حرم چلا ہے ابنوہِ بادِ خواراں
موجِ صبا ایسے ہے خوشبوئے خوش کناراں
آئیں گے اس طرف بھی اک روز ابرو باراں
ہے اپنی کشتِ ویراں سربز اس نقیب سے

آئے گی فیض اک دن بادِ بہار لے کر
تسینم مے فروشانِ پیغامِ مے گساراں

آگ میں پھول

فیض احمد فیض

تیار میں تیری گلیوں پہ اسے وطن، کہ جہاں
 چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
 جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
 نظر چرا کے چلے جسم و جاں بچا کے چلے
 ہے اہل دل کے لیے اب یہ نظم بہت دکھنا د
 کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سنگ آزاد
 بہت ہے ظلم کے درست بہانہ جو کے لیے
 جو چند اہل جسٹس تیرے نام لیوا ہیں
 بنے ہیں اہل ہوس مدعی بھی منصف ہی
 کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں
 مگر گزارنے والوں کے دن گذرتے ہیں
 ترے فراق میں یوں صبح و شام کرتے ہیں
 بھجا جو روزِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
 کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی

چمک اٹھے ہیں ساسلِ توہم نے جانا ہے
 کہ اب سحرِ ترسے رُخ پر بکھر گئی ہو گئی
 غرض تصورِ رشام و سحر میں جیتے ہیں
 گرفتِ سایہ دیوار و در میں جیتے ہیں
 یونہی ہمیشہ الجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
 نہ اُن کی رسمِ نئی ہے نہ اپنی ریتِ نئی
 یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
 نہ اُن کی ہارِ نئی ہے نہ اپنی حریتِ نئی
 اسی سبب سے فلک کا نگلہ نہیں کرتے
 ترسِ فراق میں ہم دل بُرا نہیں کرتے
 گر آج تجھ سے بُدا ہیں تو کل ہم ہوں گے
 یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں
 گر آج اوج پر ہے طالعِ رقیب تو کیسا
 یہ چار دن کی حسدائی تو کوئی بات نہیں
 جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
 علاجِ گردِ شلیل و منہار رکھتے ہیں



سیاہ اکبر آبادی

جو درپردہ انھیں جہلہ نمائی کی نہ ہوتی میں سچ کہتا ہوں دنیا آرزو ہی آرزو ہوتی
متاع ضبط وقت واپس کی راگیاں ہیں نے نگاہِ حسن میں ایک اشک کی کیا آرزو ہوتی
مسافر اپنے پہلو ہی میں مل جاتی تھے منزل اگر منزل سے پہلے تجھ کو اپنی جستجو ہوتی
حدیثِ طور و موسیٰ اور وہ بھی چار لفظوں کا ہوئی تھی گفتگو اُن سے تو کھل کر گفتگو ہوتی
غلط ہے عشق پر الزام آوارہ بنگا ہی کا جو ہوتا حسن یک سو تو نظر کیوں چار سو ہوتی
دل اک قطرہ تھا۔ زولیدہ چکیدہ بیل غمیدہ ذرا سی بوند پھر کیا اشک بنتی کیا لہو ہوتی
میں برقِ حسن کو روکے ہوئے ہوں مل پائے دنیا اگر یہ کوئند کر گرتی تو میں ہوتا نہ تو ہوتی
وہ ذوق و شوقِ موسیٰ اور وہ اکلم سے کلام جزائے آرزو یارب، بقدر آرزو ہوتی

دل لے سیاہ خالی آرزو سے نہ نہ سکتا تھا

نہ ہوتی آرزو، تو آرزو کی آرزو ہوتی



عبد المجید سالک

مرے جی میں ہے کہ پوچھوں کبھی مرشدِ مغان سے
 کہ ملا جمالِ ساقی کو یطسطنہ کہاں سے
 وہ یہ کہہ رہے ہیں ہم کو ترے حال کی خبر کیا
 تو اٹھا سکا نکلا ہیں نہ بتا سکا زباں سے
 جو انھیں وفا کی سُنو بھی تو نہ زینت نے وفا کی
 ابھی آکے وہ نہ بیٹھے کہ ہم اٹھ گئے جہاں سے
 میں عدم کے لالہ زاروں میں فدا کر ازل بھٹ
 مجھے کھینچ لائی طافِ لم تری آرزو کہاں سے
 مری سرفروشت میں تھا وہی داغِ ناسدادی
 جو ملا مری جبین کو ترے سنگِ آستان سے
 بچے بچلیوں کی زد سے وہی طائرِ انا
 جو کوکِ چمک سے پہلے کل آئے استیاں سے
 یہ ہے سرگزشتِ وحشت کہ ملا سراغِ محمل
 نہ ورائے کارواں سے نہ غبارِ کارواں سے
 شبِ غم جو آئی سالکِ مٹے عارضی اندھیرے
 مرا دل سہا منور تب و تابِ جاوداں سے

○ تائیس

حضورِ یار بھی آنسو نکل ہی آتے ہیں
 کچھ اختلاف کے پہلو نکل ہی آتے ہیں
 مزاج ایک، نظر ایک، دل بھی ایک سہی
 معاملات من و تو نکل ہی آتے ہیں
 ہزار ہم سخی ہو ہزار ہم نظری
 مقامِ جنبش ابر و نکل ہی آتے ہیں
 خانے ناخن پا سو کہ حلقہ سر زلف
 چھپاؤ بھی تو یہ جب و نکل ہی آتے ہیں
 جنابِ شیخ، وضو کے لیے سہی لیکن
 کسی بہانے لب جو نکل ہی آتے ہیں
 متاعِ عشق وہ آنسو جو دل میں ڈوب گئے
 زمیں کا رزق جو آنسو نکل ہی آتے ہیں



چراغِ حسنِ حسرت

دل بلا سے نثار ہو جائے
آپ کو اعتبار ہو جائے

قبر تو بار بار ہوتا ہے
لطف بھی ایک بار ہو جائے

زندگی چارہ سازِ عنم نہ ہی
موت ہی غم گُزار ہو جائے

یا خزاں جائے اور بہار آئے
یا خزاں ہی بہار ہو جائے

دل پہ ماننا کہ اختیار نہیں
اور اگر اختیار ہو جائے



اختر شیرانی

اٹھا ساغر، کہ دنیا درپے آزار ہے ساقی
 مشیت ہو کہ قسمت، بر سر پر کیا رہے ساقی
 غضب ہے یہ جوانی اور ہم اس طرح سے کٹیں
 کہ اک اک سانس اک چلتی ہوئی تلواریں ہے ساقی
 محبت کر۔ غم دنیا ستائے تو محبت کر
 محبت اس جہاں میں اک حسیں آزار ہے ساقی
 خریدی جا نہیں سکتی خوشی دنیا کے غمگین میں
 مگر تیرے کوم سے یہ بھی کیا دشوار ہے ساقی
 محبت میں مزے لے لے کے مرنا تو مقدر ہے
 مگر اس کے لیے کچھ زندگی درکار ہے ساقی
 پریشاں کر دے تو بھی زلفِ مشکیں دوشِ زگیں پر
 کہ صحنِ باغ میں اودی گھٹا گلکار ہے ساقی
 عجب کیسے یہ کافرات آنکھوں ہی میں کٹ جائے
 ادھر بے خواہی، اختر ادھر بیدار ہے ساقی



وحشت کلکتوی

کسی طرح دن تو کٹ رہے ہیں فریب امید کھا رہا ہوں
ہزار ہا نقش آرزو کے بنا رہا ہوں مٹ رہا ہوں
وفا مری معتبر ہے کتنی، جفا وہ کر سکتے ہیں کہاں تک
جو وہ مجھے آزار ہے ہیں تو میں انہیں آزار رہا ہوں
کسی کی محفل کا نغمہ نے محرکِ نالہ و فغاں ہے
فسانہ عیش سُن رہا ہوں فسانہ غم سُنا رہا ہوں
زمانہ بھی مجھ سے نا موافق میں آپ بھی دشمنِ سلامت
تعب اس کا ہے بوجھ کیونکر میں زندگی کا اٹھا رہا ہوں
نہو مجھے جستجوئے منزل مگر ہے منزل مری طلب میں
کوئی تو مجھ کو بلارہا ہے کسی طرف کو توجہ رہا ہوں
یہی تو ہے فتنہ کو ششوں کا کہ کام سارے بگاڑ رہے ہیں
یہی تو ہے نادرہ ہوس کا کہ اشکِ حسرت بہا رہا ہوں
خدا ہی جانے یہ سادہ لوحی دکھائے گی کیا نتیجہ وحشت
وہ جتنی الفت گھٹا رہے ہیں اُسی قدر میں بڑھا رہا ہوں

○ اثر لکھنوی

صلہ جاں بازید کا پار ہے ہیں
 نظر سے ہم گرائے جا رہے ہیں
 ہو مائدہ نظر پھر دل دکھانا
 تو جہ پھر ادھر فرما رہے ہیں
 جو آئے تھے مجھے تسکین دینے
 تماشا ہے کہ خود گھبرا رہے ہیں
 گل تر کا ہوا جاتا ہے دھوکا
 وہ اس انوار سے شرما رہے ہیں
 تغافل کشتگان بے نیازی
 تری باقوں سے دل بہلا رہے ہیں
 چلی کیسی ہوا کاشن میں یارب
 خزاں سے پہلے گل مرجھا رہے ہیں
 اثر اب شکہ کرتے ہیں جفا پر
 محبت کی حدوں میں آ رہے ہیں



احمد ندیم قاسمی

کیا بھروسہ ہو کسی بہم کا
 جاندا الجھرا تو اندھیرا چمکا
 صبح کو راہ دکھانے کے لئے
 دستِ گل میں ہے دیا شبنم کا
 وقت سستا کے بٹھے گا پیر سے
 غم مقتدر تو نہیں آدم کا
 مجھ کو ابرو، تجھے عرابِ پند
 سارا جھکٹا اسی نازک خم کا
 حسن کی جستجوئے پیسم میں
 ایک لمحہ بھی نہیں ماتم کا
 جوئے اس دور میں فتیہ جاری
 کہ غزالوں کو جنوں ہے دم کا
 مجھ سے مر کر بھی نہ توڑا جائے
 ہائے ینشہ زیں کے غم کا
 اب سیو چاک گر بیانِ حیات
 کہ تقاضا ہے یہی موسم کا

غینچہ پھر لگا کھلنے!

احمد ندیم قاسمی

یہ شب سب سے یامرے دل کا سکوت بے پایاں
کچھ ایسے ٹوٹ رہی ہیں رگیں ٹخیتل کی
ہوا چلی کہ مشیت کو دل لگی سو بھی
ہر ایک چیز میں گہرائی ہے، تیز ہے
یہاں تو گل بھی مرے ہم نصیب ہی نکلے
اندھیری شام سے محسوس ہو رہا ہے مجھے

یہ دل ہے یامرے مرقد پہ چل رہا ہے چراغ
کہ جیسے تندئی مے سے چٹخ رہا ہو ایام
سمندر روں سے نہ پوچھو کبھی صدف کا سراغ
ہوا کے پھیس میں اُدے سکوت کے دھارے
کہ تیرگی میں گھلے جا رہے ہیں بے چارے
کہ جیسے پھیل کی تہ تک اُتر گئے تارے

تمام ریگتے کہے، تمام سناٹے
کہ جیسے شیر ہرن کو زنگل کے لب چاٹے
بڑے وقار سے اجداد نے سفر کاٹے
نشیب شام سے نجم سحر کی چوٹی تک
تھکے تھکے ہیں کچھ اس طرح وقت کے تیرد
سنا ہے ایسی ہی شہنائے تاریں، جن میں

گر جرس کی صدا تھی کہ رات بھر نہ تھی
مجھے یہ وہم کہ آنسو شرس گل میں برت جی
بجھا گئی وہ دینیے دامن صبا کی منی
مری نگاہ تہ او جھل ہے کاروانِ سحر
سجے تھے اوس کے موتی قبائے گلشن پر
جو آنسوؤں نے سرہام دل جلائے تھے

افق لرز نے لگا، رات کے قدم اکھر طے
 ستارہ سحری نے مجھے نہ پہچانا
 یہ اور بات مجھے تاب ضبط ہے کہ نہیں
 قدم اٹھا تو چھکنے لگی ہیں زنجبیریں
 کسی کے دوش پہ ہل تھا، کسی کے ہاتھ میں پھل
 دھک رہا تھا وہ پندار ان کے چہروں پر
 بگھر بجا کہ عروس سحر ہوئی بیدار
 اٹھی افق سے وہ محبوبہ شگفتہ مزاج
 زمیں سے تابہ فلک رنگ لہلہا نے لگے
 میں سوچتا ہوں، سحر نے مجھے شعور دیا
 مچل رہی ہیں شعاعیں اُبل رہا ہے لہو
 چمک تو خوب تھی لیکن مجلس گئے ہیں بدن
 سحر کی ایک ہی تفسیر ہے — طلوعِ سحر
 نہ مسکرائے گا غنچہ ہمارا آنے تک
 سحر کے بند درتپچے پر کیوں نہ دستک دوں
 تو کیا وطن میں پہنچ کر بھی اجنبی ہی رہوں
 سحر کی انجمن نور میں قدم تو دھروں
 نظر اٹھی تو دکھانی دے کئی احباب
 کسی کے پاس قلم تھا، کسی کے پاس کتاب
 دیا ہے اہل حکم نے جسے جنوں کا خطاب
 تنی ہوئی ہے فضا پر بسیط انگڑائی
 جو شب کو پروہ نشیں تھی تو دن کو ہرجائی
 مگر یہ دھند سی کیسا ذہن پر اثر آئی
 مگر یہی کہ سلاسل کے سلسلے ہیں طویل
 اندر ہی ہے تجلی، اُبھر رہی ہے فصیل
 نہ جانے آتشِ فرود ہے کہ صبح جمیل
 مجھے فریب نہ دیں روشنی کی تفسیریں
 وہ لاکھ نوکِ سناں سے کلی کا دل چیریں

کچھ اور نام ہے اس کا، یہ فصل گل تو نہیں
 کہ بوئے گل کے لیے ڈھل رہی ہیں زنجبیریں



اسرار الحق مجاز

خود دل میں رہ کے آنکھ سے پردا کرے کوئی
 ہاں لطف جب ہے پاکے بھی ڈھونڈا کرے کوئی
 دنیا لرز گئی دل حراماں نصیب کی
 اس طرح ساز عیش نہ چھیڑا کرے کوئی
 رنگینی نقاب میں گم ہو گئی فطرت
 کیا بے مجاہدوں کا تقاضا کرے کوئی
 یا تو کسی کو جرات دیدار ہی نہ ہو
 یا پھر مری نگاہ سے دیکھا کرے کوئی
 مجھ کو یہ آرزو وہ اٹھائیں نقاب خود
 ان کو یہ انتظار تقاضا کرے کوئی
 تم نے تو حکم ترک تمنا سنا دیا —
 کس دل سے آہ ترک تمنا کرے کوئی
 ہوتی ہے اس میں جن کی توہین ائے مجاز
 اتنا نہ اہل عشق کو رُسوا کرے کوئی

ایک گیت

میراجی

انجانے نگر من مانے تھے من مانے نگر انجانے رہے
اپنی باتوں کی سستی میں
سفتے رہے دل کی سستی میں
وہی گیت جو کچھ من مانے رہے وہی راگ جو کچھ کہے بنائے ہے

راتیں بیتیں دن بیت گئے
راتیں بھی تیری پھر دن بھی نہ
مور کھ من ایسا بیٹلا ہے اسے یاد وہ رنگ پرانے رہے

انہونی کا جسے دھیان رہا
ہونی نے اُسے چپے سے کھا
نہ وہ باتیں رہیں نہ زمانے رہے جو رہے بھی تو باقی فسانے ہے

اب گیت ہیں بس ٹپکتے ہیں
یوں دل کی آگ بجھاتے ہیں
اب سب کے لیے وہی باؤلے ہیں جو بیٹے سمے میں سیانے ہے



میراجی

غم کے بھروسے کیا کچھ چھوڑا کیا اب تم سے بیان کریں
 غم بھی راسخ نہ آیا دل کو اور ہی کچھ سامان کریں
 کرنے اور کہنے کی باتیں کس نے کہیں اور کس نے کہیں
 کرتے کہتے دیکھیں کسی کو ہم بھی کوئی پیمان کریں
 بھلی بُری جیسی بھی گزری ان کے سہارے گزری ہے
 حضرت دل جب ہاتھ بڑھائیں، ہر مشکل آسان کریں
 ایک ٹھکانہ آگے آگے، پیچھے پیچھے سامنے ہے
 چلتے چلتے سانس جو ڈٹے منزل کا عنوان کریں
 مجبوروں کی نعمت اوروں سے دوری اچھی ہوتی ہے
 مل بیٹھیں، تو مبادا دونوں باہم کچھ احسان کریں
 دستِ مزد میں خشتِ رنگیں اس کا اشارہ کرتی ہے
 ایک ہی نعرہ کافی ہے بربادی ہمد ایوان کریں
 تیرے لئے تھے میراجی سے، باتوں سے ہم جان گئے
 فیض کا چشمہ جاری ہے حفظان کا بھی دیوان کریں



صوفی تبسم

دفا کی آخندی منزل بھی آ رہی ہے قریب
 جو اس جگہ بھی نہ تو رل سکے تو میرے نصیب
 فغانِ حق و صداقت کا مرحلہ ہے عجیب
 دے تو بند و سلاسل اُٹھے تو دار و صلیب
 تے خیال کا مسکن چمن چمن کا سفر
 مری دفا کا نشیمن فقط دیارِ حبیب
 نظر سے بچ کے ملے ہیں وہ بار بار مجھ کو
 ہزار بار ہوا ہے یہ دل نظر کا قریب
 الجھ نہ جائیں کہیں اور دل کے افسانے
 کہاں حدیثِ محبت، کہاں بیانِ خطیب
 نہ جانے کونسی شے چشمِ غمگسار میں بھتی
 کہ جس کو دیکھ کے لڑاں ہوا ہے دستِ طلبیب
 ابھی فسرودہ ہے ساقی ترا تبسم لب
 کسی کی یاد کو لے آؤ میکدے کے قریب



عابد علی عابد

چہین پڑتا ہے دل کو آج نہ گل
لاکھ آنکھیں ملے خیاباں میں
لاکھ بجلی گزے کاستاں میں
گھل رہا ہے گلاب ڈالی پر
بات نرمی سے یوں وہ کہتے ہیں
مجھے دھوکا ہوا کہ جا دو سے
میرا جینا ہے سیج کانٹوں کی
بکھی بگڑا نہ کام دیو کا روپ
پیار کی راگنی انوکھی ہے
دمِ نصرت و چپ رہے رہتے
نہ ہوا رنج میرے دل کا غبار
یا کبھی عاشقی کا کھیل نہ کھیل
میں نے ہائے جو کی وہ بات ہے اور
کوہن سے معنہ نہیں کوئی
ایک دن پتھروں کے بوجھ تلے
کیا سہانی گھٹا ہے ساون کی

وہی لہجہ گھڑی گھڑی پل پل
مسکراتے ہیں طافوں میں گول
لہلہاتی ہے شاخ میں کھیل
جل رہی ہے بہار کی شعل
جیسے لہرائے ریشمی آنکھیں
پاؤں بجتے ہیں ان کے بن جھل
ان کے مرنے کا نام تاجِ مغل
وہی سچ دھج رہی وہی بھل
اس میں گنتی ہیں سب سرین گول
آنکھ میں پھیلتا ایک کا جھل
کیسے کیسے برس گئے بادل
یا اگر مانت ہو تو بات : من
تیری چاہت ہے دکھ نہ تھے بھل
بے سرتولی ہو کہیں کہ بندھیا اہل
خود بخود گر پڑیں گے راجِ مغل
سافوری نار مدھ بھری چنل

وہی کرتی ہیں دل میں گھر عابد
جوا دایں ہیں آنکھ سے او بھل



ن - م راشد

تسے کرم سے خدائی میں یوں تو کیسا نہ ملا
 مگر جو تو نہ ملا - زیست کا مزا نہ ملا
 حیاتِ شوق کی یہ گرمیاں کہاں ہوتیں
 خدا کا شکر ہمیں نالہ رسا نہ ملا
 ازل سے فطرت آزاد ہی تھی آوارہ
 یہ کیوں کہیں کہ ہمیں کوئی رہنما نہ ملا
 یہ کائنات کسی کا عبا بہ راہ سہی
 یہ دل شہیدِ فریب زگاہ ہو نہ سکا
 دلیل راہ جو بنا وہ نقشِ پا نہ ملا
 وہ لاکھ مہم سے باندا نہ محمد مانہ ملا
 کنا رموج میں مرنا تو ہم کو آتا ہے
 نشانِ ساحلِ الفت ملا، ملا، نہ ملا
 تری تلاش ہی تھی مایہ بقائے وجود
 بلا سے ہم کو سر منزلِ بقا نہ ملا

انقلابی

ن - م راشد

موتخ، مزاروں کے بستر کا بارگراں
 مردوں اُس کی نارس تنافوں کے سوز سے
 آہ برباب
 جدائی کی دہلیز پر زلزلت و رخاک، فوج کناں!
 یہ ہنگام تھا، جب ترے دل نے اس غمزہ سے
 کہا: وہو، اب لاؤ، در یوزہ غمزہ جانتاں!

مگر خواہشیں اٹھیں، بادیا نہیں،
 جو ہوں بھی تو کیا
 کہ جلا نگر وقت میں کس نے پایا ہے
 کس کا نشان

یہ تارنخ کے ساتھ چشمک کا ہنگام تھا؟
 یہ مانا تجھے یہ گوارا نہ تھا،
 کہ تارنخ دانوں کے دامِ محبت میں بھیس کر
 اندھیروں کی روج رواں کو اجالا نہیں
 مگر پھر بھی تارنخ کے ساتھ
 چشمک کا یہ کون ہنگام تھا؟

جو آنکھوں میں اُس وقت آنسو نہ ہوتے ،
تو یہ مضطرب جاں ،
یہ ہر تازہ و فوہو رنگ کی دلربا
تری اس پذیرائی چشم و لب سے
وفا کے شہری جزیروں کی شہزاد ہوتی
ترے ساتھ منزل بمنزل روان و دوان !

اے اپنے ہی زلف و گیسو کے دامِ ازل سے
ارہائی تو ملتی ،

مگر تو نے دیکھا بھی تھا
دبوتا تار کا حجرہ تار
جس کی طرٹ تو اُسے کر رہا تھا اشارے ،
جہاں بامِ دیوار میں کوئی روزن نہیں
جہاں چار سُو باد و طوفاں کے مارے ہوئے راگمیں
کی بے انتہا استخوانیں پڑی ہیں ؟
اب تک نہ آنکھوں میں آنسو نہ لب پر فغاں !



حفیظ ہوشیا پوری

کچھ اس طرح سے نظر سے گزر گیا کوئی کہ دل کو عزم کا سزا مار کر گیا کوئی
 دلِ ستم زدہ کو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں خود اپنے حُسن سے یوں بے خبر گیا کوئی
 وہ ایک جلوہٴ صد رنگ، اک ہجوم بہار بنانے کوں تھا جانے کہ دھر گیا کوئی
 نظر کہ تشنہ دیدار تھی رہی محسوس نظر اٹھائی تو دل میں اُتر گیا کوئی
 نگاہِ شوق کی محرومیوں سے ناواقف نگاہِ شوق پہ الزام دھر گیا کوئی
 اب اُن کے حُسن میں حُسنِ نظر بھی شامل ہے کچھ اور میری نظر سے نکھر گیا کوئی
 کسی کے پاؤں کی آہٹ کہ دل کی دھڑکن تھی ہزار بار اٹھا سوائے در گیا کوئی
 نصیبِ اہلِ وفا یہ سکونِ دل تو نہ تھا ضرور نالہٴ دل بے اثر گیا کوئی
 اٹھا پھر آج مرے دل میں رشک کا طوفان پھر اُن کی راہ سے باچشمِ تر گیا کوئی

یہ کہہ کے یاد کریں گے حفیظ دوست مجھے

وفا کی رسم کو پائندہ کر گیا کوئی



احسانِ دانش

بزم میں جب وہ وفانا آشنا بھی آئے گا
 وار و زندان کے پرستار و یونہی ہنستے رہو
 تہ نشیں ہو موجد و طوفان کا دامن چھوڑ کر
 روحِ گلشنِ خاک کے فزوں میں لے لی کر ڈیں
 پہلے اپنے دست و بازو پر تو کر لے اعتماد
 آپ کے جلوے سلامت آپ کے ہوتے ہوئے
 گھر میں بیٹھے مگر ہی کا شکوہ بے جا نہ کر
 ہو گئے جرمِ جنوں میں جتنے دیوانے اسیں
 عشق کی مظلوم خاموشی نہ خالی جائے گی
 ہر دم اب قافلے کو ہے یقین گسری
 جود عانکے گی دل سے کیوں نہ ہو کستباب
 کیوں نہ آئے عشق کے لب پر گلابی آئے گا
 آئے گا دورِ مکافاتِ جفا بھی آئے گا
 خود بخود کشتی ڈبو کر خدا بھی آئے گا
 اک امامِ وقت اس انداز کا بھی آئے گا
 پھر مرادِ مرقعہ و ن کو خدا بھی آئے گا
 کیا مرے دل میں خیالِ ماسوا بھی آئے گا
 رہروؤں کو جمع کر لے زہنا بھی آئے گا
 ان کے لب پر لغزِ زندان کشا بھی آئے گا
 حسنِ پراک وقت احساںِ وفا بھی آئے گا
 جانے کوئی میرِ منزل آشنا بھی آئے گا
 جب کوئی بندہ پکائے گا خدا بھی آئے گا

زندگی میں یہ جنازوں کی پرستش تا بہ کے

ایک دورِ احسانِ حسبِ مدعا بھی آئے گا

تقابل

معین احسن جذبی

کیا یہی انقلاب ہے، قلبِ ادھر جگرِ ادھر	نالہ بے قرارِ ادھر، شورِ ششِ چشمِ ترِ ادھر
اُفتِ ری سیاستِ عینِ رنگِ کوہِ سوسے سوسن	کور ہے زکس وطن، نورِ ادھر، نطنزِ ادھر
ایک تبسمِ فرنگ، ہر دوافقِ لہوِ ترنگ	نفسِ بدوشِ نالہِ رنگِ شامِ ادھر، سحرِ ادھر
لے وہ عقابِ جس سے قتی کوہِ دامن کی آبرو	آج اُسی عقابِ کبے ہالِ ادھر ہیں پرِ ادھر
کام و دہن کی تلخیاں، کوئی مٹائے اب کہاں	وائے بہ حالِ تشنگاں، شیرِ ادھر، شکرِ ادھر
قلّتِ صلحِ کل، یہاں، قلّتِ صلحِ کلِ دیاں	کثرتِ فتنہ گرا دھر، کثرتِ فتنہ گرا دھر
اہلِ ہنر کے واسطے، خاکِ بسر کے واسطے	جو روجِ جفا کا گھرِ ادھر، قہر و بلا کا گھرِ ادھر
برگ سے برسے پوچھے، نخل و شجر سے پوچھے	کون ہے بار و بارِ ادھر، کون ہے باثرِ ادھر
ایک مریضِ نیم جاں، ایک مریضِ خستہ جاں	کون ہے چارہ مجرا دھر، کون ہے چارہ گرا دھر
اہلِ فراق کچھ بتاؤ، اہلِ مذاق کچھ بتاؤ	کون سی شے ہے خوبِ ادھر، کون سی خوبِ ادھر

بحر کی رات ہے طویل، وصل کی صبح دُور ہے

جذبِ الہی ہے ناتمام، خام ابھی سُحر ہے

قطعات

جہاں نشانِ رانتر

حسن کا عطر، جسم کا صندل
عارضوں کے کلاب، زلف کا حود
بعض اوقات سوچتا ہوں میں
ایک خوشبو ہے صرف، تیرا وجود

یادِ ماضی میں یوں خیال ترا
ڈال دیتا ہے دل میں اک ہل چل
دور تے میں کسی حسینہ کا،
جیسے آجائے پاؤں میں آنچل

میری راتوں کی تیسرگی جب بھی
روح پر یاس بن کے چھاتی ہے
میری 'انجم' ہماری حسیں صورت
شع کی نو میں مسکراتی ہے

○ انصر انصاری

خزاں میں آگ لگاؤ، بہار کے دن ہیں
بصد خلوص و عقیدت خزاں کی تربت پر
اُٹ دو تخته خزاں کی تباہ کاری کا
گراستے ہم نے جہاں اشک غص و ماں ابقم
عذار گل کی وہک سے جلا کے کانٹوں کو
مُراد لیتے ہیں جس سے گل مراد وہ پھول
ملا کے قطرہ مشہم میں ناک و نہمت گل
بھرے کوڑے چمن کے یہ درس دیتے ہیں
چوشتی کیوں کے جبا دو بھرے نرغ کو
وہ عندیہ نے دل دوز راخنی چھپڑی
اب احتیاط پسندی ہے سحر نامشکور
امچال دو گل و لالہ کو ماہ و نجم تک
چمن سے بلکہ جہاں سے بھی کر کے قطع نکلے
شزار گل سے زمانے میں شعلے جبر کا دو
زہیں نہیں نہ رہے اور فلک فلک نہ رہے
جنہی شوق کی بے اعتدالیوں کے خلاف
نشاط و مستی و رعنائی و ملاوت کو
خزاں رسیدہ انگوں کے پھیکے رنگوں میں
نصورتیں، افکار میں، رعنائی میں
فروغ رنگ و ہجوم غصیا کی محبتی میں
پرائی شمعیں بجھا دیں عبا کے جھونکوں نے
گراں لڑتی ہے دل پر نوائے منہ سودہ
فصلے دشت کو، ویرانے کو، بیاباں کو
لپک رہی ہے دھوپ نر سے شاخ حیات
جناب انصر ماں دادہ رُوح گل کو

نئے شگوفے کھلاؤ، بہار کے دن ہیں
گلوں کی بھینٹ چڑھاؤ، بہار کے دن ہیں
بساط عیش و شربت، بہار کے دن ہیں
سبزی کے پھول گراؤ، بہار کے دن ہیں
لگی دلوں کی بجھاؤ، بہار کے دن ہیں
کہیں سے دھونڈ کے لاؤ، بہار کے دن ہیں
کوئی شراب بناؤ، بہار کے دن ہیں
پھلے جام لسنڈھاؤ، بہار کے دن ہیں
بہشت خوش بناؤ، بہار کے دن ہیں
رباب تم بھی اٹھاؤ، بہار کے دن ہیں
متاع ضبط لٹاؤ، بہار کے دن ہیں
زالی دھویں مچاؤ، بہار کے دن ہیں
فلک کو سر پہ اٹھاؤ، بہار کے دن ہیں
حصن فتنے جگاؤ، بہار کے دن ہیں
انورے شترامٹاؤ، بہار کے دن ہیں
کوئی دلیل نہ لاؤ، بہار کے دن ہیں
دباغ و دل میں بجاؤ، بہار کے دن ہیں
دھنک کے رنگ ملاؤ، بہار کے دن ہیں
چمن کی روح بساؤ، بہار کے دن ہیں
دل و جگر کو تپاؤ، بہار کے دن ہیں
نئے چراغ جلاؤ، بہار کے دن ہیں
اچھوتے نرغے گاؤ، بہار کے دن ہیں
چمن فروغ بناؤ، بہار کے دن ہیں
یہ بارہنس کے اٹھاؤ، بہار کے دن ہیں
اہم وقت بناؤ، بہار کے دن ہیں



پندت آئند زانِ مَلا

سنبھال ساقی محفل اب اپنے پیانے
 ہر انقلاب کی سرخی انہیں کے افسانے
 فصیلِ باغ سے یہ آمدِ حیاں رکھیں گی کہیں
 خداے ہر دو جہاں خوب سے تری تقسیم
 ابھی تمام نہیں دوستانِ محفلِ شب
 خیالِ یار! شبِ غم کی محفلوں کی قسم
 گزر گئی جو ستاروں کے دل پہ آخرِ شب
 الگ الگ سے افق پر ہیں چھوٹے چھوٹے غبار
 یہ جبرِ زیست محبت پہ کب تلک آخر
 یہ جن و عشق کی محفل بھی ہے عجب محفل
 ہماری جا بھی کہیں ہے خداے دیر و حرم
 نہ پوچھ دوہرِ حقیقت کی سختیوں کو نہ پوچھ

کہوں تو کس سے کہوں میں حدیثِ دلِ مَلا

بیا وزید گرایں جا بود سخن دانے



فضل احمد کریم فضلی

کچھ تو مجھے محبوب ترا غم بھی بہت ہے
اشکوں سے بھی کھلتا ہے وہ دل جو ہے گرفتہ
ہم خود بھی نہیں چاہتے صیاد سے بچنا
ہے رشتہ وز دیدہ نگاہی بھی عجب شے
ہاں نیم نگاہی سے یوں ہی کام لیے جا
اب ظرافت کی یہ بات ہے جو بھی جسے مل جائے
ڈھائے دل نازک پر بہت اس نے تم بھی
یہ طرہ تماشا ہے، کیا قاتل بھی مجھ کو
کچھ بانگِ ہل کبھی یہاں کان ہیں عادی

کچھ تیری توجہ کی نظر کم بھی بہت ہے
کیوں کے لیے طرہ بشنم بھی بہت ہے
سازش نگہ و دل کی منتظم بھی بہت ہے
قائم یہ ہوا پر بھی ہے حکم بھی بہت ہے
یہ تیری عنایت کی نظر کم بھی بہت ہے
دنیا میں خوشی بھی ہے بہت غم بھی بہت ہے
پھر لطف یہ ہے مجھ پر وہ برہم بھی بہت ہے
اور پھر مرے مرنے کا اٹھیں غم بھی بہت ہے
کچھ بے مر کا شمار کی مدح بھی بہت ہے

پڑتے ہیں ستمگر کے ذرا وار بھی اوجھے

اور فضلی، بسمل میں ذرا دم بھی بہت ہے

○ میکش اکر آبادی

وضع کا پاس کہاں تک کرتے ہم تو پھر دیوانے تھے
 اُن سے بھی یاں نہ سکی جو عاقل تھے فرزانے تھے
 آپ یہ طے کرتے رہے کچھ تھا کہ نہ تھا کچھ ہے کہ نہیں
 کٹ ہی گئی اپنی تو ان میں خواب تھے یا افسانے تھے
 ستانا سا محفل میں ہنگامہ سا برپا دل میں
 کیا کہتے کیا چُپ رہتے کچھ جانے کچھ اُنجانے تھے
 حسن کی فطرت ہر جانی اور دل کو ذوقِ رسوائی
 مسجد میں تھے مے خانے اور کعبے میں بُت خانے تھے
 موجِ صبا سے اُس نے پھیڑا بوئے گل سے یاد کیا
 ہم بد قسمت پھر بھی نہ سمجھے کہنے کو فرزانے تھے
 اُگلی پھیلی باتوں کا کیا ذکر ہے اب جانے دیجئے
 آپ کے در پر آہی پڑے ہم تھے جتک بیگانے تھے
 مغروروں کو دیکھ کے ہم نے یہ سیکھا ہے اے میکش
 جس سے طے اس طے جیسے جانے پہچانے تھے



عندلیب شادانی

کوئی ادا شناسِ محبت ہمیں بتائے
کس کی مجال تھی کہ حجابِ نظر اٹھائے
اک دل نشیں نگاہ میں، اللہ یہ خاشع
کچھ ہم سے بے خودی میں ہوئیں بے حجابیاں
آزردگی نہیں کہ یہ فطرت ہے جن کی
ناداں سہی پر اتنے بھی ناداں نہیں ہیں ہم
وہ جانِ آرزو کہ ہے سرمایہ نشاط
کہتے تھے تم سے چھوٹ کے کیونکر جھیں گے ہم
یادیں میں دل کا وہ عالم دم و دماغ
تم تو ہمیں کو کہتے تھے، یہ تم کو کیا ہوا
جو ہم کو بھون جائے، وہ کیوں ہم کو یاد آئے
وہ مسکرا کے آپ ہی دل کے قریب آئے
نشر کی نوک بیسے کلیجے میں ٹوٹ جائے
چشمک زنی ستاروں نے کی پھول مسکرائے
بس دل یہ چاہتا ہے کہ کوئی ہمیں منائے
خود ہم نے جان جان کے کہتے فریب کھائے
کیوں اُس کی یادِ غم کی گشتابن کے دل پر چھائے
جیتے ہیں تم سے چھوٹ کے تقدیر جو دکھائے
بکھتے ہوئے چراغ کی کو جیسے تھر تھرائے
دیکھو کنول کے پھولوں سے شبنم چھلک نہ جائے

اک ناتمام خواب، مکمل نہ ہو سکا
اُنے کو زندگی میں بہت انقلاب آئے



عشری رامپوری

ہماری محفلوں میں بے حجاب آنے سے کیا ہوگا
جنوں کے ساتھ تھوڑی سی فضائے لامکاں بھی دے
ہے مر جانا کلیدِ فتح، سمجھایا تھا زندوں نے
زہرِ قسمت! اگر حضرت خود اپنا جائزہ بھی لیں
اگر ہمدرد بنیتے ہو تو زنجیریں ذرا کھولو
دیر پیرِ مغان چھوڑیں یہ ہم سے ہو نہیں سکتا
جسے دیکھو وہ ہے سرِ مستِ مہربانے خرد و یکسر
نہیں قلب و جگر میں خون کا قطرہ کوئی باقی

نہیں جب ہوش میں ہم جلوہ فرمانے سے کیا ہوگا
مری وحشت کو اس دُنیلکے دیرانے کیا ہوگا
مگر ناصح یہ کہتا ہے کہ مر جانے سے کیا ہوگا
ہماری زندگی پر تیرے سانسے سے کیا ہوگا
مری پابستگی پر یونہی غم کھانے سے کیا ہوگا
کوئی واعظ سے کہہ دو تیرے بھکانے سے کیا ہوگا
خداوند! یہاں اک تیرے دیوانے سے کیا ہوگا
عزیزو! اب ہمارے ہوش میں آنے سے کیا ہوگا

دکھوں کو کھو نہیں سکتے اگر اہل خرد و عشقِ

تو خالی سینہٴ افلاک برمانے سے کیا ہوگا



اشکِ رامپوری

اک دن وہ مل گئے تھے سہرِ بگدڑکیں
 پھر دل نے بیٹھنے نہ دیا عمر بھر کہیں
 بگڑی کا ساتھ خوب دیا ہمدوم نے آہ
 دل سے بنا بنا سکے ادھر کی ادھر کہیں
 بیٹھے رہو گے دید کا وعدہ لیے ہوئے
 بیمارِ غم نے آنکھ نہ کھولی اگر کہیں
 سن رازِ دہاں یہ سب ترے کہنے کی بات ہے
 گوشِ وزباں بھی رکھتے ہیں دیوارِ ودر کہیں
 اہلِ وطن کے دل میں نہیں گھر تو کیسا ہوا
 عمرِ رواں گزرتی ہے دنیا میں ہر کہیں
 اندازِ اعترافِ محبت تو دیکھئے !
 میری نظر کہیں ہے تو اُن کی نظر کہیں
 اُس نکتہ چیں کو عشقِ جفا نے چلے تو اُنک
 اپنی زباں جواب نہ دے وقت پر کہیں

پس منظر

اختر الایمان

کس کی یاد چمک اٹھی سب سے دھندلے خاکے ہوئے اجاگر
یونہی چند پرانی قبریں کھود رہا ہوں چپکا میٹھا
کہیں کسی کا ماس نہ بڑی، کہیں کسی کا روپ نہ چھایا
کچھ کتبوں پر دھندلے دھندلے نام لکھے ہیں۔ میں جیون بھر
ان کتبوں ان قبروں ہی کو اپنے من کا بھید بن کر
مستقبل اور حال کو چھوڑے دیکھ سکھ سب میں بیسے چل رہا ہوں
ماضی کی گھنگھور گھٹ میں چپکا بیٹھا سوچ رہا ہوں
کس کی یاد چمک اٹھی ہے دھندلے خاکے ہوئے اجاگر؟

بیٹھا قبریں کھود رہا ہوں۔ سوکھی بن کر ایک اک موریت
درد سا بن کر ایک اک سایا، جاگ رہے ہیں۔ دو کہیں سے
آوازیں سی کچھ آتی ہیں، "گزرے تھے اک بار یہیں سے"
حیرت بن کر دیکھ رہی ہے ہر جانی پھپھکی صورت
گویا بھوٹ ہیں یہ آوازیں کوئی میل نہ تھا ان سب سے
جن کا پیار کسی کے دل میں اپنے گھام چھوڑ گیا ہے
جن کا پیار کسی کے دل سے سارے رستے توڑ گیا ہے
اور وہ پاگل ان رشتوں کو بیٹھا جوڑ رہا ہے کب سے؟

میری نفس ٹوٹ رہی ہے بوجھ سے ایسے دھکے۔ جس کو
اپنی روح سمجھ کر اب تک لیے لیے پھرتا تھا ہر سو
لیکن آج اڑی جاتی ہے اس مٹی کی سوزھی خوشبو
جس میں آنسو بوسے تھے میں نے، بیٹھا سوچ رہا ہوں بوجھ
ان کتبوں کو ان قبروں میں دفن کروں اور آنکھ بچا لوں
اس منظر کی تاریکی سے جو رہ جائے وہ اپنا لوں



عدم

زباں پر آپ کا نام آ رہا تھا
 غمِ ہستی کو آرام آ رہا تھا
 خیانت کر کے موسیٰ کو ملا کیسا
 بیماریِ سمتِ پیغام آ رہا تھا
 خدا کا شکریہ تیری زلفِ بکھری
 بڑی گرمی کا ہنگام آ رہا تھا
 ستارے سو گئے اگلائی لے کر
 کہ افسانے کا انجام آ رہا تھا
 تڑپ کر میں نے قوبر توڑ ڈالی
 تری رحمت پر الزام آ رہا تھا
 قدمِ دل کھوکھے آسودہ نہیں ہم
 بُرا تھا یا ہبلا! کام آ رہا تھا!

افسانہ آل شبے....

مگر ناتھ آزاد

اک رات کی بات کہہ رہا ہوں آزاد
شعلوں کی ندی میں بہ رہا ہوں آزاد
جس کو بھی ضبطِ فطرت میں لانا سکوں
دل پر وہ عذاب سہہ رہا ہوں آزاد

پہلا رُخ

وہ رات کہ جب غلبہ بریں تھا پہلو	جب موج ہوا تھی موج مے وقت اسبو
وہ رات تصویریں بسی ہے ایسے	جس طرح شراب میں لب بھول میں ہو
پہرے پر وہ سیلاب بستم ہے	سینے میں وہ اک جوشِ تکاظم ہے
کانوں میں مرے گونج رہا ہے اب تک	وہ رات کا خاموش ترنم ہے ہے
انسان کے حالات ہیں کس کے بس میں	اڑتے ہوئے ٹمٹات ہیں کس کے بس میں
اک رات ملی تھی اقصائِ نور نہ	دنیا ترے دن رات ہیں کس کے بس میں
گردوں پہ گھٹا تلی تھی گھنگھور اے دوست!	رہا رہا ہواؤں کے تھے منہ زور اے دوست!
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھوکوں میں کہیں	ہم تم تھے پسینے میں شرابور اے دوست!
کل شب کہ فضا تھی مست بے جام و سبو	تھا ہوش کی قید میں نہ میں اور نہ تو
اڑا اڑ کے حیرم رُوحِ تنک جاتی تھی	وہ تیرے بدن کی بھینسی بھینسی خوشبو
وہ کاکل دل فوازِ مہکی مہکی	ہر بات کلی کی طرح لہکی لہکی
ہنگامِ سحر بھی دل میں ہے رقص کنان	اے دوست! تری نظر وہ ہلکی ہلکی

دوسرا رُخ

ہاں مجھ سفرِ زمیں سے جاگو جاگو! پھر وقتِ سحرِ قرین ہے جاگو جاگو!
 آنکھوں کو طو، نظر اٹھاؤ، کہ یہ رات سونے کے لیے نہیں ہے جاگو جاگو!

امکانِ ملاقات کے پھر کم ہوں گے سکتے ہوئے لمحات یہ برہم ہوں گے
 جب صبحِ اُفتِ پہ جلوہٴ مندر ماہوگی کیا علم، کہاں تم اور کہاں ہم ہوں گے

اس سے پہلے کہ صبح بھوٹے اے دوست! بجلی کی طرح وہ ہم پہ ٹوٹے اے دوست!
 اُڑتے ہوئے لمحات کو یوں اپنا لیں اک لمحہ بھی ہاتھوں سے نہ چھوٹے لے دست!

بزمِ طرب و نشاطِ برہم نہ کرو یہ محفلِ انبساطِ برہم نہ کرو
 اے صبح کی زنگار کو فو! دک جاؤ خودِ حیم کے مری بساطِ برہم نہ کرو

ساعت ہے فراق کی پھر آنے والی سے کوئی گھڑی میں رات جانے والی
 لمحے یہ گراں بہا ہیں اے دوست کہ پھر ہے صبحِ اُفتِ پہ جسک گانے والی،

اب رات کے خاتمے کا سے وقتِ قلیل ہونے کو ہے یہ سماں سحر میں تبدیل
 جی بھر کے انھیں دیکھ، کہ کچھ جائے گی اس بزمِ طرب کی خود بخود ہر فنِ بدیل

ذوقِ نظر اک مقام پر رہ نہ سکے جلووں کا یہ طوفان کہ دل سہہ نہ سکے
 اور نطقِ اگر بیان کرنا چاہے اس وقت کی کیفیت کبھی کہ نہ سکے

یہ خنکی ماہِ تاب میں دل کی جہل سینے کی یہ خاموشیِ شب میں دھڑکنی
 یہ نیند کے وقت گفتگو سانسوں میں میلے سے یہ اک مکاں میں خوشبوئے بدن

فردوس کا باب ہے یہ رات لے ساقی! اُڑتا ہوا خواب ہے یہ رات لے ساقی!
 اس رات کو لمحات کا پسیر نہ سمجھ پی لے کہ شراب ہے یہ رات لے ساقی!

فریاد کہ رات ہاتھ میں آ کے گئی اک لطفِ غنیم ہم پہ منہ مار کے گئی
 ماحول کی تیسرگی میں فضا خا نہ، فریاد کہ رات نورِ برسا کے گئی

اسے مہرا کبھی تراشا راز نہ ملے
میں رات کے طوفاں میں یہ ٹھکتا ہی رہوں
اے نور! کبھی ترا سہارا نہ ملے
اے صبح! کبھی ترا کٹ راز نہ ملے

تیسرا رُخ

آخر سحر آکے دل کو تڑپا ہی گئی
خو ریز جو دل میں بھتیں مہنگیں آزاد
یہ تیرگی آکے نور پر چھا ہی گئی
کالا کفن اُن کو آکے پہنا ہی گئی
رات اپنا جمال کھو رہی ہے سو جاؤ
ٹوٹے ہوئے جسم پر ذرا جسم کرو
چہرہ شبنم سے دھو رہی ہے سو جاؤ
اب صبح طلوع ہو رہی ہے سو جاؤ

جو نیند میں ہو نیند میں رہ جاتا ہے
اک نور کا دریا کہ سحر سے پہلے
بیدار سے رازِ زیست کہ جاتا ہے
ظلمات کی وادیوں میں بہ جاتا ہے
اک رات اگر کرم یہ مائل ہو جائے
یہ رات — یہ شام سے سحر تک کا سماں
انسان کے ہر نفس میں شامل ہو جائے
پھیلے جو تو زندگی کا حاصل ہو جائے

بھولوں کی طرح نفس لہک جاتے ہیں
شاخوں کی طرح بدن پک جاتے ہیں
مل جاتے ہیں بھٹکے ہوئے دودلی جو کہیں
وہ رات کی ظلمت میں چمک جاتے ہیں



قتیل شفائی

خرد کے نام جنوں کا پیام لے کے چلے
 ہم اپنے ساتھ ہی اپنا مقام لے کے چلے
 سکوتِ شام کا مطلب کوئی سمجھ نہ سکا
 بس اک ہمیں تری محفل میں جام لے کے چلے
 بٹھا دئے ہیں کسی نے بہار پر پھرے
 صبا چلے بھی تو اذراںِ رام لے کے چلے
 خدا کے نام سے واقف ہر ایک راہِ نہیقی
 کبھی کبھی تو ہم اپنا بھی نام لے کے چلے
 فریب کھا ہی گئے اہلِ جہت و آئینہ
 چراغِ دھونڈنے آئے تھے شام لے کے چلے
 بنامِ ساقیِ مصحرا نظر لے ہیں سراب
 اب ایک دور بہار ابھی نام لے کے چلے
 قیتل جن سے پریشان ہیں طائرانِ حرم
 وہ پھر سے دانہ ہزنگِ م لے کے چلے



ظہیر کاشمیری

جب کبھی تذکرہ شعلہ رخاں ہوتا ہے
 دامن دل پہ سلکنے کا لگا ہوتا ہے
 ہم سمن پوشوں میں اس طرح رہے آشفۃ
 جس طرح شام کو باغوں میں دھواں ہوتا ہے
 دل بیاباں میں الاؤ کی طرح جلتے ہیں
 نیمہ زن قافلہ شستہ سراں ہوتا ہے
 اس کی ہر تان سے ملتا ہے ستاروں کو گداز
 عشق کہتے ہیں جسے نعمۂ جاں ہوتا ہے
 دل مرحوم تمنا پہ دیکھتے ہوئے داغ
 جیسے تربت پہ چراغوں کا سماں ہوتا ہے
 دعوتِ جلوۂ شب تاب پہ سرور نہ ہو
 یہ بھی اک وعدہ زریں کراں ہوتا ہے
 حن کا عکس بھی تسکین دل و جاں ہے ظہیر
 حن پر یہ صاحبِ نظراں ہوتا ہے

ایک کوہستانی سفر کے دوران میں

مجید امجد

تینک پلڈنڈی ————— سر کسار بل کھاتی تھوٹی
 نیچے، دونوں سمت، گہرے غار، منہ کھولے ہوئے
 آگے ڈھلوانوں کے پار اک تیز موڑ — اور اس جگہ
 اک فرشتے کی طرح نورانی پر تو لے ہوئے
 ٹھک پڑا ہے آگے رستے پر کوئی نخل بلند
 تمام کو جس کو گزر جاتے ہیں، آسانی کے ساتھ
 موڑ پر سے، ڈگمگاتے رسو روؤں کے قافلے
 ایک بوسیدہ خمیدہ پیٹڑ کا کمزور ماتہ
 سینکڑوں گرتے ہوؤں کی دستگیری کا امیں،
 آہ ان گردن فرازان جہاں کی زندگی،
 اک جھکی ٹہنی کا منصب بھی جھپٹ حاصل نہیں

عبد المجید حیرت

کسی کے دم سے راحت بھی ہوئی ہے مگر برپا قیامت بھی ہوئی ہے
 کوئی پوچھے کسی کا دل دکھا کر کسی کو کچھ ندامت بھی ہوئی ہے
 روا ان کی عنایت کی بدولت کسی کی کوئی حاجت بھی ہوئی ہے
 یہاں عقل سے ہم نے بہت کام یہی ہم سے حماقت بھی ہوئی ہے
 اگر تکلیف پہنچی ہے تو کیا غم بہت ہم پر عنایت بھی ہوئی ہے
 کسی کے سامنے مجبور ہو کر بیابان غم کی حکایت بھی ہوئی ہے
 علاجوں سے مریض خستہ جاں کی بہت کچھ سلب طاقت بھی ہوئی ہے
 جگر پر جب کوئی صدمہ پڑا ہے دگرگوں دل کی حالت بھی ہوئی ہے
 مشقت کا کبھی پھل بھی ملا ہے کبھی محنت کا ارت بھی ہوئی ہے
 اٹھایا ہے جنھوں نے بارِ کلفت میسران کو راحت بھی ہوئی ہے

کسی کا جو زجب حد سے بڑھا ہے

تو اے حیرت! شکایت بھی ہوئی ہے



شعری بھوپالی

غضب ہے جستجوئے دل کا یہ انجام ہو جائے
 کہ منزل دور ہو اور راستے میں شام ہو جائے
 ہر اک جذبہ ہر اک ذوق طلبِ ناکام ہو جائے
 محبت ہی محبت کا اگر انجام ہو جائے
 وہی نالہ وہی نغمہ بس اک تفریقِ فطری ہے
 فقس کو مشتہر کرو نشین نام ہو جائے
 تصدق عصمت کو نین اُس مجذوبِ الفت پر
 جو اُن کا غم چھپائے اور خود بدنام ہو جائے
 یہ عالم ہو تو اُن کو بے حجابی کی ضرورت کیا
 نقاب اٹھنے نہ پائے اور جلوہ عام ہو جائے
 یہ میرا فیصلہ ہے آپ میرے ہو نہیں سکتے
 میں جب جانوں کہ یہ جذبہ مرا ناکام ہو جائے
 ابھی تو دل میں ہلکی سی خاشخ محسوس ہوتی ہے
 بہت ممکن ہے کل اس کا محبت نام ہو جائے
 جو میرا دل نہو شعری حریت اُن کی نگاہوں کا
 تو دنیا بھر میں برپا انقلاب عام ہو جائے

دولت کی خدائی

پروفیسر شہزاد

انکھڑیوں کی مستیاں دوشیزہ رنساہوں کی آگ
 میری مٹھی میں ہے حُسنِ مصر و روم کا سہاگ
 غصتوں کے خون سے شاداب میری وادیاں،
 رقصِ منہا ہیں مرے سازوں پر مریم زادیاں
 عصمتیں اکثر پھل جاتی ہیں میری آگ میں
 ایسی زنجیریں بھی گل جاتی ہیں میری آگ میں
 میرا سلطان و وزیر و کچلاہ و تاجدار
 میرے فتراکوں کے آہو میرے تیروں کے شکار
 فرجگیر و وراثتِ قصر وادیاں کا وقتار
 میری مٹو کے خزانے میری شرابوں کا خمار
 پتھرِ حم او رنگ پر ویزی، قبائے بخت یار
 میری صبحوں کے دھندلے میرے رستوں کے غبار
 تختیں میری وراثتِ عشرتیں میری بڑا ست
 ساعر و میسنار کی صبیح عارض و گیسو کی رات
 زعفرے میرے اُجائے، قہقہے میرے چراغ
 نعمان آدم زاد سے دہکے ہوئے میرے باغ
 بزم و زمر میرے نبی، لعل و گہر میرے رسول
 میرا اعجازِ خلافت کھیتوں کا عرضِ طول

مرہم حج و زیارت، زخم دیسار و درم
 میرے ناسوروں کے چھلنی سینہ مقرر و مجسم
 میرے ناخن سے کلیساؤں کے سینوں پر غراش
 معبد و پیکل کی فوجانی مجسینوں پر خراش
 راہب و صوفی مرے گم کردہ نڈل لہا گیر
 میری مہربانوں میں دل میرے ہی طاقتوں میں ضمیر!
 جتہ و دستار کو میری غلامی کا شرف
 ستھر و زتار میرے ہی خدنگوں کے ہدف
 ہر عزّا خانے میں بے گور و گفن میرے شہید
 ہر حسین آباد میں میرے تراشیدہ یزید
 میرے بوجھلوں کی زد پر ہر تیکر کا وقتار
 کھیلنے ہیں میرے زتاری خداؤں کا شکار
 جرم و جہل و کذب عصیاں میرے ہی نقشے میں چوہ
 میرے کس بل پر دولت کو شرافت کا غرور
 مجھ کے نیلیں سرگراں مجھ سے نجابت کا حشم
 مجھ سے چہرے متعبر مجھ سے ضمیروں کے بھسم
 مفلسی سب سے بڑا میری شریعت میں گناہ
 زہر میرا ہر بستم، طنز میری ہر نگاہ!!
 خود فروشی میری فطرت پر وہ پوشی میسر اکام
 مجھ سے چھپ جاتا ہے نفس و آدمیت کا جسم
 میری راتیں میسے دن میرے شہستان میرے خواب
 چھین لوں میں جس سے چاہوں باہتاب و آفتاب
 طاعت و تقدیس عرفاں آؤ میری قسمت آؤ
 اپنے سر انہی جبینیں میرے قدموں پر جھکاؤ
 کوئی دوکان پر دیر و حشر نہ جیتے تھیں
 یا خدا بگھنا نہیں سے یا صنم بکتے نہیں
 اُن غلاموں کے بھی ہاتھوں پہ سونے کی شکن
 طلسم و یا میں بھی عریاں ہیں جن کے بدن



سیف الدین سیف

کیا منزلِ عنم سمٹ گئی ہے
اک آہ میں راہ کٹ گئی ہے

پھر سامنے ہے پہاڑ سی راست
پھر شام سے نیند اُچٹ گئی ہے

پہلو میں یہ کیسا درد اٹھا ہے
یہ کونسی راہ کٹ گئی ہے

آپ آئے نہیں تو موت کب محنت
آ آ کے پلٹ پلٹ گئی ہے

اٹھ اٹھ کے مریضِ غم نے پوچھا
کیا ہجر کی رات کٹ گئی ہے

پھر سیقت ہو اُنے یاد رفتہ
ہر غم کی نقاب الٹ گئی ہے



غلام ربانی تاباں

چمن میں کس نے کسی بے نوا کا ساتھ دیا وہ بوئے گل بھی کہ جس نے صبا کا ساتھ دیا
 دیا جو ساتھ تو پھر کس بلا کا ساتھ دیا شکستِ غم نے ہر اک مدعا کا ساتھ دیا
 فروغِ بادہ نے زنگِ حیا کا ساتھ دیا غرض اُسی بتِ کافرا کا ساتھ دیا
 خیالِ یارِ ترا شکریہ رہِ عنعم میں بس ایک تو نے دلِ مبتلا کا ساتھ دیا
 نگاہِ شوق کے یہ حوصلے کوئی دیکھے کہ ہر نظارہ صبرِ آزا کا ساتھ دیا
 میں کس طرح سے کروں کم نگاہیوں کا گلہ تری جفاؤں نے ذوقِ وفا کا ساتھ دیا
 تجھے خبر بھی نہیں ہے کہ دل کی دھڑکن نے کہاں کہاں تری آوازِ پا کا ساتھ دیا
 دلِ خراب کی یہ سادہ لوحیاں تو بہ جفا کے بعد بھی اہلِ وفا کا ساتھ دیا

اب اس سے آگے وہ مسجدِ یہ میکدہ تاباں

یہاں تک تو کسی پار کا ساتھ دیا

یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں

ابنِ نشا

یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں، یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں
 تم انشا جی کا نام نہ لو، کیا انشا جی سودا کی ہیں
 ہیں لاکھوں روگ زمانے میں کیوں عشق ہے رسوا بیچارا
 ہیں اور بھی وہ ہیں وحشت کی انسان کو دھتکتیں دکھارا
 ہاں بیکل بیکل رستہ ہے، سو بیت ہیں جس نے جی بڑا
 پر شام سے لے کر صبح تک یوں کون پھرے گا ادا
 یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں، یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں
 تم انشا جی کا نام نہ لو، کیا انشا جی سودا کی ہیں

یہ بات عجیب سناتے ہو، وہ دُنیا سے بے اس ہوئے
 اک نام سُنا اور عرش کھایا، اک ذکر پر آپ فہم ہوئے
 وہ عقل میں افلاطون سے وہ شعر میں تلسی داس ہوئے
 وہ تیس برس کو پہنچے ہیں، وہ بی اے ایم اے پاس ہوئے
 یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں، یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں
 تم انشا جی کا نام نہ لو، کیا انشا جی سودا کی ہیں

گزشتہ کیسے تب کیا ہے کیوں شاد نہیں آباد نہیں
 یہ بات تو قسم ہی مانو گئے وہ قیس نہیں سرا و نہیں
 جو جان لئے ان کی نہ سکے یہ ایسی بھی نیست و نہیں
 کیا ہجر کا دار و معقاس ہے؟ کیا وصل کے نسخے یاد نہیں
 یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں
 تم انشا جی کا نام نہ لو، کیا انشا جی سودا کی ہیں

وہ لڑکی ابھی لڑکی ہے تم نام نہ لوسو جان گئے
 وہ جس کے لائے کیسو ہیں پہچان گئے پہچان گئے
 ہاں ساتھ تارے انشا بھی اس گھر میں تھے معان گئے
 پر اس سے تو کچھ بات نہ کی انجان رہے انجان گئے
 یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں
 تم انشا جی کا نام نہ لو، کیا انشا جی سودا کی ہیں

جو ہم سے کہو ہم کرتے ہیں کیا انشا کو سمجھانا ہے؟
 اس لڑکی سے بھی کہہ دیں گئے، گو اب کچھ اور زمانہ ہے
 یا چھوٹے یا تکمیل کرے یہ عشق ہے یا افسانہ ہے؟
 یہ کیا کدو رکھ دھندا ہے، یہ کیسا تانا بانا ہے
 یہ باتیں کیسی باتیں ہیں جو لوگوں نے پھیلائی ہیں
 تم انشا جی کا نام نہ لو، کیا انشا جی سودا کی ہیں



آدا جعفری بدایونی

کرن نگاہ کی ہسلا گئی تو کیا ہوگا خلوص شوق پہ آج آگئی تو کیا ہوگا
 فریب ہوش فریب حیات سے بچ کر فریب اہل وفا کھا گئی تو کیا ہوگا
 یہی نگاہ کہ آوارہ ہے خلاؤں میں جب آفتاب سے ٹکرا گئی تو کیا ہوگا
 گلوں کے رنگ میں خون جگر کا رنگ سہی بھری بہار بھی کترا گئی تو کیا ہوگا
 اندھیری راستہ پوچھو بے قدم ہی سہی حیات فوکی سحر آگئی تو کیا ہوگا
 یہی حیات کہ ہے واقفِ رموزِ حیات جنوں کا راز کبھی پا گئی تو کیا ہوگا
 گماں بھی کر نہ سکے تھے سحر کے متوالے سحر فریب ضیا کھا گئی تو کیا ہوگا
 تری نگاہ سے روشن ہیں درخِ دل کے کنول تری نگاہ بھی ترا گئی تو کیا ہوگا

شعورِ غم بھی فینمت ہے زندگی میں آدا
 غموں کی دھوپ بھی کبلا گئی تو کیا ہوگا



شاد عارفی

کھری باتیں بہ اندازِ سخن کہدوں تو کیا ہوگا
 نکلہاں وطن کو راہ زن کہدوں تو کیا ہوگا
 غریبی جی کے لئے لے گئی تاحدِ عریانی،
 اندھیرے کو اندھیرا ہی کہیں گے دیکھنے والے
 جو مستقبل کے رُخ پر روشنی ڈالوں تو کیا دو گے
 غلط باتوں پہ دنیا کب توجہ صرف کرتی ہے
 کہیں فطرت بدل سکتی ہے ناموں کے بدلنے سے
 عز وِ سیم و زر ہے مستلائے نازِ خود بینی
 قد و گیسو کو تم تشاد و سنبل کہہ کے کیا لو گے
 ستارے توڑتی ہے جبکہ ذروں کی توانائی
 عدوئے جان و تن کو جانِ من کہدوں تو کیا ہوگا
 کسی بھی بد چلن کو بد چلن کہدوں تو کیا ہوگا
 جو میں اُن عصمتوں کو بیم تن کہدوں تو کیا ہوگا
 سوادِ شام کو صبح وطن کہدوں تو کیا ہوگا
 چین کی تاک میں برقی چین کہدوں تو کیا ہوگا
 بُتوں کو بے زبان و بے دہن کہدوں تو کیا ہوگا
 جنابِ رُخ کو میں برہن کہدوں تو کیا ہوگا
 وہ خود بینی جسے دیوانہ پن کہدوں تو کیا ہوگا
 قد و گیسو کو میں دار و رس کہدوں تو کیا ہوگا
 ستاروں کو تھارے انجمن کہدوں تو کیا ہوگا

بتوں نے بے سبب اے شاد جب اٹھا دیا جگو

جو ان کی شان میں کوئی بھجن کہدوں تو کیا ہوگا

میراث

یوسف ظفر

دی شیخ با چراغ ہی گشت گرد شہر

کزدوم دودو ملو مل و انسالم آرزو سہا

(رومی)

شام سے

اپنی بائیں، سجلی، ولہن سی سہیلی سے یوں جاہلی
جیسے اُس کے لئے ان ہزاروں میں چھپ کر گزرا تھا وہی
جاہلی — ساتھ لے کر خدا جانے کنی ادیوں میں مسرت کی تائیں
اُڑانے لگی
کیا سانے لگی! — راست چپ چاپ چھانے لگی

(۲)

دریکے شب زندگی کے کھلے ماہ و انجم نے دیکھا، تبسم کیا
گزر گاؤہ ہستی پر منزل کے مارے چلے پا، بجولاں
پہاڑوں کی سمیت فضاؤں کی وسعت سے ترسواں
مخالفت سواؤں کے تہوں سے لڑاں —

زمینوں کے سینوں میں نفرت کا لادا

زمینوں کے ناسور میں مار پیچاں

کہیں بچھوؤں کے شہستاناں

یہ کوہ دیاباں کہ جن میں درندوں کے پھول مسکن ہیں آلودہ خون ان

یہاں قوتِ نامیہ سے چپتے ہیں تمار مغیلاں

وہ پودے کہ پتوں پر ہے جن کے مرکب خراماں

کہ پھولوں پر ہے جن کے مرکب خراماں

ابن آدم! — ابن آدم! — یہ تری میراث ہے

ایک جہڑا — یہ درستی کے سے دانست

ایک دل — افسانہ

آنکھیں — بلائے ناگہاں

عافیت دشمن — چراغ خانہ سوز

ابن آدم! — تیرے ہاتھوں میں تمام اختیار

اور پنجے اپنے مرکب کے لہو سے ترتر

(۱)

شفق اپنی بائیں سہیلی سے ملنے چلی

چمکتی جبین پرستاروں کی دھول

لبوں پر تبسم کے فوج پھول

دویشے پر زر کار نغموں کا جال

نظر میں کوئی شاعرانہ خیال

کھلے رنگ آپس میں نیلے سے ہلا، خنائی سے لال

کہیں سبز سے لاجوردی ملا، بیول کھلنے لگے

مہواؤں کے باغات بلنے لگے

دھڑکنے لگے ابراہیم کی باروں کے دل

شفق شام سے جاہلی

(۴)
افواؤں کی تافوں سے سینوں کے غم وصل گئے
مساجد کے در کھل گئے
جھکے اپنے محبوب کے سامنے زندگی کے امیں
ہر دنیا و دیں

لبوں پر وعائیں — ”الہی گناہوں کو تو بخش دے
طوٹ نکلا ہوں کو تو بخش دے
عطا کر رہ راست جو تو نے دی
عبادت گزار رہیں کو — توفیق دے
کہہں جاہیں ہم نیک بنے ترے
ہمیں کام کرنے کی توفیق دے
الہی میں عاجز کہنگار ہوں
مگر میں ترا ہی ملک خواہ ہوں۔

یہ الفاظ اخالی — نہیں جن میں سوز
یہ الفاظ رٹتے ہوئے روز روز
زباں ایک عادت سے مجبور ہے — یہ عبادت نہیں
دعائیں لبوں پر — مگر دل میں طوفان امید و بیم
نکلا ہوں میں تصویرِ بالِ بیم
خیالوں میں بیوہ کا رنگیں شباب
تصویریں رشوت کی دولت کے خواب
زباں پر دعا — اور خواہش بھی
کہ حاصل ہوا بلیس کی زرگری
رُخ عجز پر پادشائی کا نور
مگر دلِ خور
پلکتے ہوئے جس سے شعلوں کے سانپ
مگر ابنِ آدم! — نہیں منہ نہ ڈھانپ

ہواؤں کی پاکیزگی میں محفوظ کئے موسم اجزا پریشان و یکجاں
ہواؤں کے دامن میں قاتل ہواہیں
زمینوں کے سینوں کے پروردہ قاتل زمینوں کے اوپر
زمینوں کے سینوں میں خوں بن کے رہتے ہیں خونی عناصر
یہی وہ فضا ہے جہاں پرورش تو نے پائی
یہ گوارہ ہے تیری انسانیت کا
میں سے ملے ہے تجھے جو ملا ہے یہی تیرا مولد یہی تیرا مسکن
یہی تیرا وطن
یہی تیری میراث ہے ابنِ آدم یہی تیری میراث ہے — ابنِ آدم!

(۳)
پہاڑوں کی ظلمت میں فوجِ کلیدوں کا جو ن لٹا
دراستی جلی
سسکتی رہی سرد، کمر ہوا
لڑتا رہا ہر ستارے کا معصوم مٹا دیا
دراستی جلی —
بھنبھوڑا ہوائے گراڈیل پڑوں کو — جاگو! اٹھو
مرے صاحبو!
حسین و شہین چاند تاروں کی کروں کا خون ہو گیا
دل ان کنج میں دیکھو! — صاحبو! — صاحبو!! —
مگر دیوار
گراتے رہے اپنے تئوں کی شمشیر، سایوں کے خار
قدم و دو قدم مل کے خود دیکھنے کی سکت کس میں مٹی
دراستی جلی —
ستاروں کے سایوں میں فوجِ کلیدوں کا جو ن لٹا
دراستی جلی — ابنِ آدم یہی تیری میراث ہے دیکھ لے
دراستی چلے

یہی تیری میراث ہے دیکھ لے
دراستی چلے

(۵)

سحر آگئی

دیکھتے ہوئے کندنی رنگ پر
حنائی عروسان ہاتھوں میں گجروں کی سیسے کھنک
لگا ہوں میں خوابوں کے گیتوں کا رس
ادافں میں دل کی لرزتی امناس
مسلل معطر جسیں ریشیں گیسوؤں میں لگائی گلابی سے پھول
سحر آگئی —

پرندوں کے نعروں نے آواز دی
چمکنے لگی زندگی —

پرندے — یہ نعروں کے پرنے اُڑے
اُڑے اور صباحت کو بھی لے اُڑے
دھوپ پہ دھوپ پہ دھوپ پہ — دیکھ لے
دراستی چلے —

(۶)

یہ چرواہا، گلہ لے لے گا بھینسوں کا انسانیت بہت دور ہے
پھر بھی نہ ور ہے
لڑکی سے محروم پیاس کی دنیا یہی سبز زار اور یہی گادو میش
یہی اس کے غمیش

نہ اس کو تمام بشری تجربے نہ درد و بشر
اسے کیا خبر یہ بھی اک جزو اعظم ہے تمکد کل کا
دق ہے یہ شیرازہ سوئیں گل کا

اسے کیا خبر کیا ہے یہ کائنات جہاں و جلال
وہ تصویر ماضی — یہ نظم حال —

اسے کیا خبر کیا ہے تقدیر معلول و دارِ عل
اسے آج ہے آج اور کل ہے کل
یہ راہی ہے منزل وہی ہے فنا — اس کا ہونا کیسا
چارہ گادو میش

مگر — اس کی ہنسی کی آوازہ تان
مہرا میں سندیلے لگاتی ہے خواب سکوں کے
فضا میں پری بن کے صوتِ طبیب کی بے جا رہی ہے
یہ ہنسی کی آواز — جیسے ہنری روپ کی جس تپیلوں کی قطار
جو ناپیدہ، انجانائی دنیا کی جانب پل جا رہی ہے
یہی ناشخص رقم ہے اس کی دلیل حیات
یہی ہے ہی اُس کی کل کائنات
نہیں تو یہ چرواہا خود اپنی بھینسوں سے بہتر نہیں ہے
وہی بے شعوری، وہی کڑکھائی
نہ جادہ نہ منزل نہ اسبابِ جاوہ، نہ احساسِ منزل
جے جا رہا ہے —

درد نہ ہے در پردہ آدمیت، مگر اس کو اس کی خبر کچھ نہیں
یہ ناواں جہواں، معصوم و مظلوم ہے دقیق سہتی ہے مجبور نہ سہتی
شعرے تیرے دلِ سادہ صورت کدوئے تجھے کچھ خبر ہے
تری ہنسی کی لرزتی ہوئی تان کیوں لگتی ہے فضاؤں کے دل کو
مہراؤں کے دل کو!
بناؤں تجھے! — پر تجھے کیا بناؤں — بچے ہنسی وقت کتنا ہے
یہی تیری میراث ہے ان آدم — یہی تیری میراث ہے، دیکھ لے
بچے ہنسی یا دراستی چلے —

(۷)

سکوں نامِ نظرت، بڑی پھولی بھالی، بڑی سادہ سادہ
ہزار اس کے عشوے میں عمر ہے ہزار

جمال اس کا پھولوں سے تافوکِ خار
رگ و پیہ میں ہے اس کے سبقِ تپاں
کہ جیسے سوریکِ رواں پر غزالِ دواں
مگر اس کے چہرے پر نقشِ تبسم، سرو و سکوں
یہ معصومیت، ایک پیغمبرِ ازجنت کی دعوت
مسترت کا، انساہنت کا، افرینی کا ایک نبوت۔

پہنچے یہ معصومیت کے شگوفے، یہ منظم خواب
مختلانِ فطرت کی رملین و نایاب و تازہ شراب
یہ آواز ان کی سناروں کی بھلہل سے ملتی ہوئی
یہ عارضِ محترم بہارِ حرم
یہ باتیں — یہ نعموں کے پھولوں کے بار
یہ آنکھیں۔ یہ گیتوں کی خاموش جھللیں، شفقِ درکنار۔
اسی جن معصوم کے ساز میں گویں ہے جس جالستِ رگ
اسی سینہٴ بال میں جاگنے کو ہے دوزخ کی آگ
ایسی درست نازک کی شاخ بہاریں سے پھولیں گے خار
جنت سے اس تجھ گل سے لپٹے ہوئے ہیں تباہی کے خونخوار
یہی تجھ کو سینہٴ سینہٴ ماسے یہی تیری برائش ہے۔
ابنِ آدم!

(۸)
شبِ تار میں ٹھونڈتی ہیں نگاہیں کہاں جا رہی ہیں جسے جانے والے
تجسس کی آنکھوں میں غمِ بکا گرم ہے لیکن یقینِ بصارت
میں ہے
تجسس کے ہاتھوں میں ہے فلسفے کا عصا، لیکن افسس کا
سمار ا یقینی نہیں ہے
تجسسِ شبِ تیرہ ونا میں وقت کی ٹھوکریں، کھال کے بھی نار سارے
ہوں جو نکلتی ہے۔ مگر اُس کا چہرہ ہے انسان کا چہرہ
ہوں کاٹتی ہے۔ مگر اُس کا جڑ ہے انسان کا جڑ
بدستوریشوں کی کھاڑاؤ ریلوں کی چٹکھاڑا انسان کی آواز سے بھونکتی ہے
شبِ تار میں پالیا۔ پالیا کی صداؤں سے ارض فرما لاپتے ہیں
مگر کیا ملے۔ فقط رازِ یک ذرہ کائنات
کہ جس سے فنا کا طسم و اوجی ہوا پختہ تر۔
شبِ تار میں آدمی کو ابھی تک وہی قطب تارہ نظر آ رہا ہے
کو جس سے جدا باختر سے ہے خار
کہ جس سے سفید اور سید کی ہے صورتِ نمایاں
کہاں ہے وہ تہذیبِ مذہب کہ جس کی حقیقت پر ہیں
علم و ادراکِ ناناں
کہاں ہے۔ کہاں ہے۔ وہ انسان! — وہ انسان!!



انجسم رومانی

دن ہو کہ رات، کینے قفس ہو کہ صحنِ باغ
 آلامِ روزگار سے حاصل نہیں سراغ
 رغبت کے کہ لیجئے عیش و طرب کا نام
 فرصت کہاں کہ کیجئے صہبائے پُریا باغ
 ویرانہ نجات میں اسودہ خاطر دی
 کس کو ملا اس آہوئے رزمِ خوردہ کا سراغ
 آنا رکھوئے دوست ہیں اور پاشکستگی
 خوشبوئے زلفِ یار ہے اور ہم سے بے دماغ
 کس کی جبین پہ ہیں یہ ستارے عرقِ عرق
 کس کے لبوں سے چاند کا دامن ہے داغِ داغ
 کہتے ہیں کسبِ فور اسی تیرگی سے ہم
 انجم ہیں دل کے داغ گہرائے شبِ چراغ

یہ پھول ستیم نطنہ

ہر طرت بکھرے ہوئے تارے، یہ پھول
تیرگی کے بل پر رقصاں جگمگاتے قہقہے
حسن کی رعنائیوں میں گم خوشی کے چہچہے
ماہ سے بڑھ کر یہ مہ پارے، یہ پھول
ان میں لہراتی ہوئی خوشبو کی شیرینی بھی ہے
آرزو کی سادگی گلشن کی رنگینی بھی ہے

دور افق تک پھیلے نظارے، یہ پھول
اس لیندی پر مگر اتنے قریب آئے ہوئے
آسمان کی ریتوں کو خاک پلائے ہوئے

جھللاتی رات کے پیارے، یہ پھول
ان کی جلتی محفلوں میں اک عجب بے جا رنگی
خود فریب اشقی بے اختیار آوارگی

سرگراں، اسلے، تھکے ہارے، یہ پھول
جانے کیا کیا روپ دھارے مسکاتی شام نے
سیم و زر کی دلکشی نے نکمٹ آیتام نے

دم بخود ہیں درد کے ہارے، یہ پھول
ان کی دنیا میں دلی آویزی کی دولت کہاں
منظرِ عالم پہ پھر سننے کی جرات اب کہاں

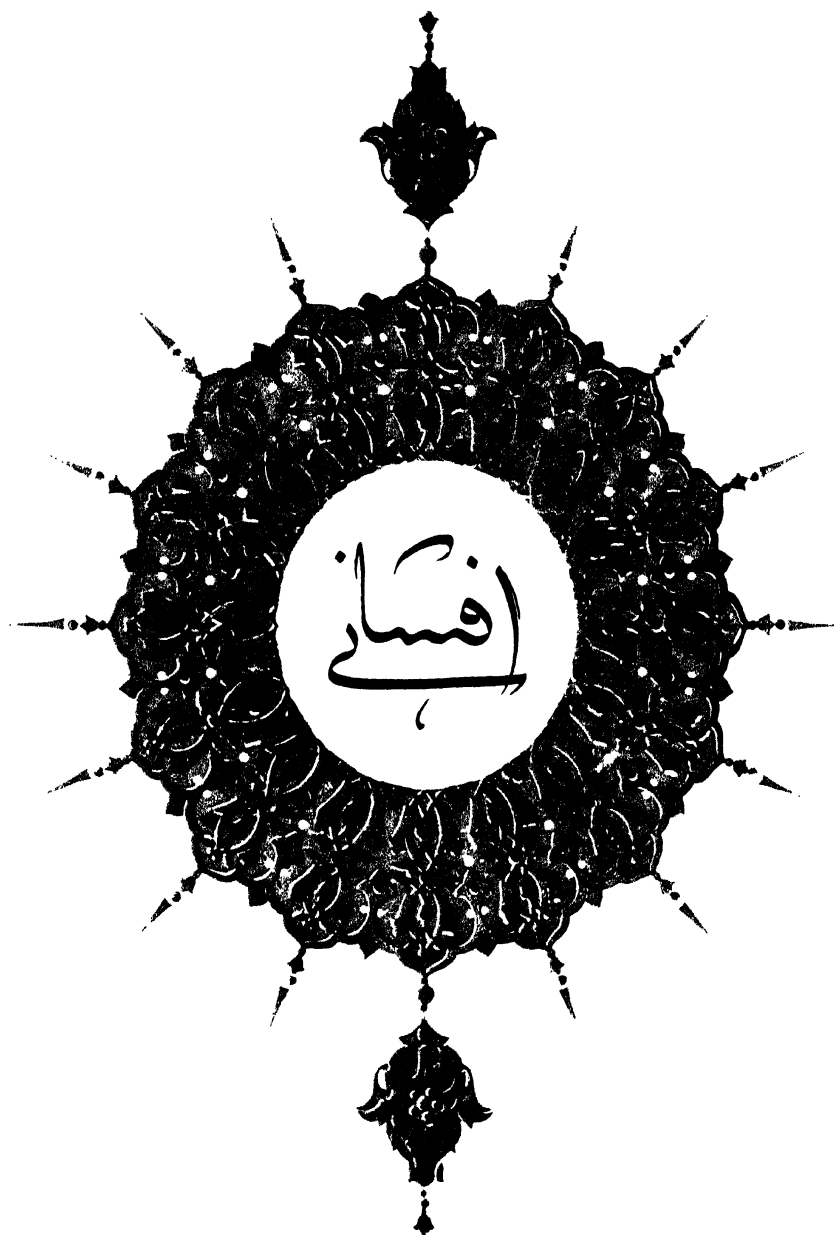
اب کہاں یہ بگھتے انکارے، یہ پھول
زندگی کی راہ سے کٹ کر غمِ فہ دایے
دن کے دیرانے میں کھو جانے کو ہیں نغصے دیے
دور افق تک پھیلے نظارے، یہ پھول



ناصر کاظمی

وا ہوا پھر درِ محبت نہ گل پھر صبا لائی ہے پیمانہ گل
 زمزمہ ریز ہوئے اہل چین پھر چراغاں ہوا کاشانہ گل
 رقص کرتی ہوئی شبنم کی پری لے کے پھرائی ہے نذرانہ گل
 پھول رسائے یہ کہہ کر اس نے میرا دیوانہ ہے دیوانہ گل
 پھر کسی گل کا اشارہ پا کر چاند بکلا میری محبت نہ گل
 پھر برشام کوئی شعلہ نوا سو گیا چھیرے کے افسانہ گل
 آج غربت میں بہت یاد آیا لے وطن تیرا صنم خانہ گل
 آج ہم خاک بسر پھرتے ہیں ہم سے ملتی رونق کاشانہ گل
 ہم پر گز سے بیخ اں کے صدمے ہم سے پوچھے کوئی افسانہ گل

ہم ہی گلشن کے امیں ہیں ناصر
 ہم کوئی نہیں بیگانہ گل



دور کا نشانہ

پہلو دھری محمد علی دودلوی

لالہ منشی دھرتے تو ذات کے بنے، اور دودھی کنشودھن جو بنیوں میں اونچی ذات نہیں سمجھی جاتی ہے۔ مگر اپنے انداز زندگی سے ہر یوں بے تعلل، ٹوڑیل، بھا رگو، سب کی یاد تازہ کر دیتے تھے۔ گھر کے اندر بچہ کرچو بچا پاٹ کر لیتے ہوں مگر باہر آزاد خیال، آزادہ دھرتی تھے۔ آج کل کی آزادہ روی نہیں کہ بائیں کرنے میں بد نظیری قند خورداری سمجھا جائے۔ اور کھٹکھٹا ہر چیز کھانا پینا نئی روشنی کی پہچان ٹھہرے۔ جس خیال سے حسن پرست بھی واقع ہوئے تھے۔ اس لئے کھٹو کے چوک اور شہر کے کچھ حصے سے جہاں قدیم کچھ کے نام لپو انراہن رہتے ہیں زیادہ واقف تھے۔ لکھنوی مشہور تھے، گھر میں مہاجنی، عدالت، دیوانی سے تہہ پیری ہوئی زمینداری سب ہی کچھ تھا مگر محبت کے لیتا یقیناً ایسے تھے کہ باوجود مصروفیت کے ان مجلسوں کے لئے وقت نکال لیتے تھے۔ چوک بھر کی خبر رکھتے تھے جہاں کہیں جلسہ ہوا یا پراپرٹیٹ محراب ہوا وہاں پہنچ ہی جاتے تھے اور رکھ رکھا ایسا تھا کہ ان مجلسوں میں حاشیہ نشین ہو کر نہیں بیٹھتے تھے بلکہ مسند کا کونہ دبا کر بیٹھنے والوں میں شمار ہوتا تھا۔ جہاں کہیں ارباب فنانات کے انتخاب کا سوال پیش ہوتا تھا وہاں ان کی رائے بہت قیمتی سمجھی جاتی تھی۔ اور ایسے اہم معاملات میں جو عرض قسمت ان کا مشورہ حاصل کر سکتا وہ مطمئن ہو جاتا تھا کہ صورت، دن، رات اور فن کے لحاظ سے اب کوئی کسر نہیں رہ گئی۔ آدمی منکسر مزاج اور خدمت کرنے کا جذبہ رکھتے تھے، مگر جہاں سے دل کے معاملات شروع ہونے لگے وہاں سے ان کی خودواری ان کو اجازت نہیں دیتی تھی کہ کسی دوسرے کے معاملات سے واسطہ رکھیں۔ بجز بے لے ای کو بتا دیا تھا کہ چاہے جتنا بڑا دوست ہو یا کتنا ہی دوست ملاقاتی ہو، اگر ان پرائیویٹ حالات میں یہ کسی کی مدد کریں گے تو ذلیل ہو جائیں گے میرے پڑھنے والے کہتے ہوں گے کہ لکھنے والا تنہا گیا ہے۔ نہ معلوم کہاں کی دنیاؤں میں براعظمتوں اور بدتمیزیوں کو پیش کر رہا ہے اور یہ بھی خیال نہیں کرتا کہ نوجوان لوگ ٹھیکہ بے راہ ہو جائیں گے چوک اور چوک باز آدموں کا ذکر تازہ نامور ہو جانا چاہیے۔ میں عرض کروں گا کہ کہیں ایسا کچھ ناچیں نہیں، نہیں تو نہ معلوم کتنے ریشوران، کتنے ہٹل، کتنے کافی ہاؤسز، بلک کارنس پتھل چھڑ جائیں گے اور نوجوانوں کو جو بہن فطرت پڑھا چکی ہے وہ تو بھولنے سے رہے لیکن زیب انسا کی طرح چلا آئیں گے کہ

پاکہ زنی منی ہا مٹ گنا و من است

جس زمانے کی میں باتیں کر رہا ہوں اس وقت عید اور دوسرے خوشی کے موقعوں پر باضابطہ غلیں ہوتی تھیں جن میں

ہے، اور سے، حیران سب باضابطہ شرمک ہونا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ہر ادا زنا ہی قدر پہچان کر بڑا دکھاتا تھا۔ کوئی عالی ستم پر گردن ہلاتا دیتا تھا۔ کوئی "آن" بھی کہہ دیتا تھا۔ کوئی عالی داد کرنا اپنا منصب سمجھتا تھا، کوئی موسیقی کے نکات میں ان کو دیتا تھا اور درنگ محفل عالی شگفتہ مزاجی ہر سے سے ظاہر کرتا تھا اور ان ہی مواقع پر بعض فوجیوں کی نگاہوں کا جائزہ لیتے ہوئے زبانی حال سے گفتا تھا۔

سہ
اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاس ان محفل
لیکن کبھی کبھی استغنا بھی چھوڑ دے

لالہ فیضی دھر کے ایسے لوگ آرٹسٹ سے تہذیب کے ساتھ بائیں کو کہے اس کا دل بھی بڑھتا تھا۔

یہ صاحب، سارا نگ پر لہرا شروع ہوا۔ بیناچ کی تھریکھیں کرتے جاتے ہیں کہ سری کرشن کی لیلیا ہے۔ سری کرشن جی بھی جیگیندھیں رہے تھے گیندھند میں جا کر۔ ناگ دینے منہ میں لے لیا۔ سری کرشن جی نے اس کو پھانس لیا ہے۔ سمندر میں جا کر اس کے منہ سے گیندھند رہے ہیں۔ ناچنے والی نے بایں اٹھ کا دھڑے کی سیدھ پر پورا لانا کیا۔ دوسرا لہڑیوں کا دھڑے کی سیدھ پر رہا۔ مگر کہیں سے ستم ہو کر بچہ سینے کے سامنے آ گیا۔ بایں ہاتھ کے پنجے نے سانپ کا پھن ثابت کیا ہے۔ واہنے ہاتھ کی انگلیوں نے ٹھکیوں دے کر یہ ظاہر کیا کہ جب سانپ پھنس گیا تو سری کرشن جی نے یوں ٹھکیوں بتائیں۔ ناچنے والی پیش و پیش چال سے بنا دی ہے کہ سانپ کی گتہ یوں پر چڑھ کر سری کرشن جی کو گیندھند سے لائے تھے۔ ہاتھ کا پتہ مانگنے کے سامنے آ گیا۔ کلائی ماتھے سے چھوٹی۔ انگلیاں اوپر کڑا مٹی دیں تھیں محفل کی طرف رہی۔ یہ کرشن جی کا ٹکٹ ہو گیا۔

اب نہاد دیو جی کا ناچ شروع ہوا۔ تہیز سے گھوم گھوم کر چاروں ہاتھوں سے دنیا بنا رہے ہیں۔ لالہ فیضی دھر اس طرح اترتے تلتے ہیں کہ ہر توڑے، ہر پٹے کے معنی آئینہ ہونے جلتے تھے۔ اسے بچے، بچے، بچے کے ناز و انداز شروع ہوئے۔ ہر پٹے اپنے کو بچاتی ہیں۔

وہ کب کر کہہ کر محبت کا مقصد ہی ہے یہی!

دگر نہ فائدہ اس کو مرے ستانے سے

تھے کی نزا کنوں، پہن کی مشکل جگہوں کی داوا لگ دیتے چلے جاتے ہیں کہ سننے والوں کا لطف دوگنا ہوتا تھا۔ بچے صاحب، اس کے بعد بھاد شروع ہوئے، وہ صاف ناخنوں، جڑوں کی شرمخی اور ہاتھوں کے لال ڈھولوں کی طرف اشارہ کرتی ہے یہ مجھوڑ کے خونیں دلی کا پتہ دیتے ہیں کہ خوشی کی خبریں بھی یوں رکھیں لو کہ آنسو لاتی ہیں۔

اپنی بیستہا میں کا سے کہوں

فرے کاروں جو دکھ پاوا

کہے معنی اب آئینہ ہو گئے۔ اس نے انگوٹھے کی آری دی، زرد و پٹے کا پٹل پتھر پر لیا۔ کرنگ ایسا ہو گیا ہے۔ کلائی سے نیچے کو اودھرا اودھرا لٹے پٹے دے کہ رات کو ٹپس بدلتے کٹی ہے۔ بچیتا دے کے انداز سے دہنے ہاتھ کی تھیلی پر ٹھہری جمانی۔ اس ہاتھ کی تھیلی کہنے کی نیچے رکھ کر خیالی ناف قائم کیا۔ انھوں نے انترے کے معنی ہو کر کہے کہ کہہ رہا تری کتا خطا تاہم مرد کیا مورے آگے آوا "یوں ثابت کرتے ہیں خیال کو ادر کھا بنانے کے لئے عرق کا شرم بھی پڑھ دیا۔

درا آٹھا تو نظر آداس کہوں ہر اس قدر
پیشکش لب پر چہ تر، یہ کیا خسیب کشاں!

یہ جھمکے تو لالہ بی دھڑکا ہوا۔ اسی طرح بٹے چھوٹے صدر نشین، حاشہ نشین، صفِ نعال والے سب مل کر کچلا
صبا مضبوط کرتے ہیں، یہ نہیں کہ ہر موقع دعوت پر وہ درسی سے اور بے پروا کی سلوک و علوت کا فرق مٹا دے یہ تو باضابطہ جہیز
کا حال ہوا۔ اب لالہ بی دھڑکا پرانیوٹ تقریحوں کا حال سنئے، دن کو بڑا چکر زبرد ہاتھ میں پھنے رہتے تھے۔ شام کو جب سیر
کے لئے نکلتے تھے تو انہیں نہیں کیرٹ کا ہوا انگلیں میں اضافہ ہوتا تھا۔ گلے میں سونے کی دو موٹی موٹی لڑی ہوتی تھیں۔ عطر کے معاملہ
میں درمی کساںی گلاب کا قیمتی عطر ہتے تھے جس کی خوشبو سے نازک مزاجوں کو چھینکیں آئے گئی تھیں۔ اتنی فیزواری ضرورتی
کنس کا عطر صرف گرمیوں ہی میں لگتے تھے۔ جگ اس کے آگے نفاست کا لحاظ نہ کر رہا تھا۔ مثلاً کیوٹے کا عطر جو صرف آبدار
خانے اور بھنڈی خانے میں کام آتا ہے برکے تیل میں ڈال بیٹے تھے۔ زمانہ مردانہ عطر میں فرق نہیں کرتے تھے۔ چھوٹوں کے
ہلکے عطر جیسے چلیپی جاڑوں میں بھی لگا بیٹے تھے۔ جاڑوں کے عطر بات مصالحہ والے جیسے حاشا منڈا البغیر گرمیوں میں استعمال کر جاتے
تھے۔ عجمیوں کی نراکڑوں کا غیر کونوکر، جھنسی مختلف عطر وں کا خیال ہوا اور پھر بھی تیز نہ ہو سکے کہ بھین بھین، بلی کی خوشبو جنت
سے آئی یا اسی دنیا میں پیدا ہوئی۔ جب بے فصل کی لپٹیں آتی تھیں تو نفیس مزاج آمد آتے تھے کہ ”لوئے کجوری می آید ہماں
آدی تھے اس لئے دل کے معاملات میں بھی حدود کے باہر پاؤں نہیں پڑنا تھا۔ ایک دن بے تکلفی میں کہنے لگے کہ سال میں ہم سب
سے پہلے تو وہ پوچھی نکال بیٹے میں جو کاروبار میں لگائی تھی۔ اس کے بعد خانہ داری کے اعتراضات الگ کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد
منافع میں سے جس قدر مناسب ہوا پوچھی میں اضافہ کرتے ہیں۔ سب کے بعد کچھ روپیہ اپنے دل کی خوشی کے لئے طلبہ کر لیتے
ہیں۔ یہ روپیہ ہم بے دھڑک صرف کرتے ہیں اگر کوئی کوئی کے گناہے میٹر کر ہمارے ساتھ روپیہ پانی میں پیسے اور کچیل
ہم کو پسند آجائے تو ہم اس میں بھی مقابلہ کرنے کو تیار ہیں۔ لیکن جب دل کی خوشی والا مال ختم ہو جائے گا تو ہم آٹھ کھٹے چھٹے
پھر دل اور دل کے افکار کو خدا حافظ۔

ایک اور راتے دل ایک سے لگے بھادوں دھڑادوں کھٹے ”لالہ آدمی وسیع الاخلاق ہے اس لئے گمنام و فخر
ایک ہی رہتی تھی۔ مگر خیر صلاح سب کی پوچھ آتے ہیں۔ شام سے لے کر دس بجے تک۔ ”رات ہی بھر گور ہے لیکن گلوں میں ہم ہے۔“
کا آواز بلند کیا کرتے تھے۔ کسی سے تکلف اور تندی کی ملاقات ہوتی تھی کسی سے خلوص اور بے تکلفی تھی۔ بعض سے مذاق ادا کیا ہوا
کی چٹیں جاتی تھیں۔ کہیں کہیں ایک اور مضحی ایسی بھی ہوتی تھی یہاں غالب مرحوم یاد آ جاتے تھے۔

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شبیرہ نہیں ہم ہی کر بیٹھتے غالب پیش وستی ایک دن
لالہ بی دھڑکا تو اسے سے فلاسفی تھے۔ جب دوستان نامہ ان کے پاؤں کے سینہ آواز نے پھر تھیں ہر کہتے تھے کہ ایک
دو گریو حکم گیر ”خود کو پانی سے پیلا ہوا سے ہلکا نہ کریں اور ہر جگہ کی حاضر باشی سے باز آئیں تو یہ جواب بیٹھے تھے کہ منشی نقاضے
الگ چیز ہیں اور منصف نازک سے ہم کلامی اور ہم نشینی کی خواہش دوسری چیز ہے۔ لیکن جن حکام میں پردہ ہوتا ہے وہاں آدمی ملے
نہیں کر سکتا کہ کسی قدر نقاضا آدمی میں پہلی بات کا ہے اور کسی قدر دوسری بات کا۔ اور انسان غلطی سے دوسرے نقاضے کو بھی

پہلا نقاشہ ہی سمجھا کر کہے۔ اگر ملک میں پر وہ نہ ہو تو دوسرا نقاشہ پورا پورا کہے اور پہلا اپنے حدود سے باہر نہ جائے۔ بات پتہ کی کھتے تھے مگر نصیحت کرنے والوں کی عقل ان باریکیوں تک نہ پہنچتی ہے۔

وہ مہلاکس کی بات مانے ہیں صاحب نوکچہ دولہے ہیں !
 "آخرین لالہ عیسیٰ دھڑکی آوارہ گردی سے ان کی آبروریزی ہوئی۔ اور ہمارے صاحب کی طرح گنگائی کوئی ہر جہ نہیں مطلب دونوں حالتوں میں گل آیا۔"

ایک دوست کے یہاں کوئی چھوٹی سی تقریب تھی۔ ناظران لالہ عیسیٰ دھڑکے متعلق نہ ہوتی تو کس کے ہوتی۔ سب بہتر گلے والی سب سے زیادہ شوق طرار انتخاب کی گئی۔ جلسہ اور دعوت صرف ایک دن کی تھی۔ رات کا عجم عام تھا۔ تقریب ختم ہو گئی جبریل کا عجم خاص تھا جس میں پانچ احباب تھے۔ اس سے بھی فرصت ہوتی۔ سازندہ سلام کر کے باہر چلے گئے۔ تشریف تو خزاں ہونے لگا۔ بیٹی ستھری صحبت، بڑے منے کی باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک سازندہ پریشان کر سہیو گس آیا اور کہنے لگا کہ ایک کانسٹیبل نے ہم کو خدا دے کر ایک خیر مارا ہے۔ جو رشتہ کی موجودگی کی وجہ سے جتنے تھے سب کے دل میں صرف سہمہ روی ہی تھیں بلکہ ایک طرح کا جوین پیدا ہوا مگر پڑھے لکھوں کا جلسہ تھا۔ پہلا جوش طرفہ اعلیٰ میں ختم ہو گیا۔ قانونی پہلو سب کے دل میں آیا کہ بیہوش و گون کا نام اسے کیا چاہو جو دل کی جا سکتی ہے۔ سب صاحب تقریب کا نہ دیکھا۔ دھڑکی نے لالہ عیسیٰ دھڑکے کی طرف نظر کی۔ زبان حال سے کہنے لگی ہمارا آدمی ذیل کیا گیا ہے۔ اس کی تلافی کیا کی جائے گی۔ ہم صاحب تقریب کو کیا جانیں، ہم تو تھا رسے بلائے سے یہاں آئے تھے۔ ہر چیز کے ذمہ دار ہم۔ اٹھو اور کانسٹیبل کو پھانسی پیر چڑھا دو۔ لالہ عیسیٰ دھڑکے سر ہٹ گیا۔ ایک ذرا سے نور کے بعد نہایت سنجیدگی سے بہت نرم اور معاملہ فہمی کے لیے جس سازندہ سے سختی طلب ہوئے۔

لالہ عیسیٰ دھڑکے جادو اس کانسٹیبل کے نام کا پتہ لگا آؤ۔
 دھڑکی :- "آپ ہیں اچھے خدے آؤ کہے بچے۔ ہمارا آدمی مارا گیا۔ ہم ذلیل ہوئے اور تم بجائے اٹھ کر وہاں جانے کے نام کا پتہ لگاتے ہو۔ مگر وہ کوئی حقارت نہیں تمہارے کا جھٹکا ہے کہ بتاؤ۔ آؤ۔ آؤ۔ آؤ۔"

لالہ عیسیٰ دھڑکی بی بی نصرت نہ کر دی ہماری بات سنو۔ ٹھٹھے سے کام نہ لیتے ہیں۔ سنو نہ نہیں۔ ہمارے ایک برادر ہیں، انھوں نے خزاں دیہاتی زمین کو قرضہ دیا۔ ان کا نام نہ تھا بھی مٹا ہو گا۔ ان کی کوٹھوں سے چوگا دیاں اڑتی تھیں۔ بڑی دھاک بیٹھی تھی۔ پولیس ان کے دروازے جانے دیتی تھی۔ نہ معلوم کتنے مغضوبہ فوجداری کے ان پر چلے، مگر پچھلے کا زور داران کا خوف ایسا تھا کہ ثبوت کے گواہ بھی نہ ملے۔ بڑے لکھوں میں نہ ہی مگر لوں سب پر ان کا رعب تھا۔ سب کے ہاں پر معاش ان کی نگاہ دیکھتے تھے۔ جو جاہا کر گذرے۔ جس کو جاہا پڑا دیا۔ ہمارے برادران کے یہاں فرقہ نے کر گئے۔ انھوں نے فرقہ میں کی خبر نقد سے لی اور ہمارے برادر کو صرف پٹوا یا ہی نہیں بلکہ بری طرح ذلیل کیا مگر ہمارے برادر نے غصہ غضب بالکل نہیں کیا اور زیادہ تابعدار ہو گئے اور بے دھڑک قرضہ اس طرح دینا شروع کر دیا جیسے کبھی ہوا ہی نہ تھا۔ آج اس کے ٹھکر کی نیر کا ٹکا کھدایا۔ بیس صاحب آج کو لڑی کے انیس مائے مارے بھرتے ہیں۔ یہ کانسٹیبل گلے کا آدمی کوں چرہ ہے میں نام معلوم ہو جائے ہم کل ہی سے دوستی کر کے مائے کو قرضہ دینا شروع کر دیں گے۔ تم اعلیٰان دکھو۔

اپنے دکھ مجھے دے دو

راجندر سنگھ بیدی

شادی کی رات باگل و نہ ہوا احمدان نے سو جاتا تھا۔

جب چلکی بھائی نے بھلا کر مدھن کو بیچ دے کر سہ میں دھکیل دیا اور اندھو سامنے شالو میں لپٹی بہن انڈیجیرے کا بھاگتی جا رہی تھی۔ باہر چھلکی بھائی، دریا والی پلچلی اور دو سہی جو رتوں کی ہنسی، رات کے خاموش باغیچوں میں مصری کی طرح، دھیرے دھیرے گلے کی ہنسی۔ عورتیں سب کی ہنسی تھیں اتنا بڑا ہو جانے پر چلی مدھن کچھ نہیں جانتا کیونکہ جب اسے بیچ مانت کے فائدے سے جگہ یا گیا تو وہ بڑا رٹا رہا تھا۔

”کہاں، کہاں، یہ جارہی ہو مجھے؟“

ان عورتوں کے اپنے اپنے دل سمیت چلے گئے۔ پہلی رات کے باسے میں ان کے شریر شہزادوں نے جو کچھ کہا اور مانا تھا اس کی گڑبگڑ ان کے کافوں میں باقی نہ رہی تھی۔ وہ خود رس بس چکی تھیں اور اب اپنی ایک اور بہن کو لے کر چلی جاتی تھیں۔ زمین کی بی بیٹیاں سر کو توڑیں، کھنچتی تھیں جیسے بادل کا ٹکڑا ہے جس کا، طرف بادش کے لیے منہ اٹھا کر دیکھنا ہی چڑتا ہے، نہ برسے تو نہیں مانی پڑتی ہیں، چڑھا دے چڑھائیں، جادو ٹوٹے کرنے پڑتے ہیں۔ حالانکہ مدھن کا لکھجی کی اس نئی آبادی میں گھر کے سامنے کھلی جگہ میں بڑا اسی وقت کا منظر تھا۔ پھر شام سستی اعمال پر مٹی کی بھینس اس کی کھاٹ ہی کے پاس بندھی تھی جو بار بار دیکھنا کافی ہوتی۔ مدھن کو سرنگھ مٹی تھی اور وہ دھاتا تھا اٹھا کر اسے دور رکھنے کی کوشش کرتا۔ ایسے میں بھلائی کا سوال ہی کیا تھا؟

ممدھن کی لہروں اور عورت کے خون کو رستہ بنتا دے والا چاند ایک کھڑکی کے رستے سے اندر چلا آیا تھا اور دیکھ رہا تھا دروازے کے اس طرف کھڑا مدھن الٹا قدم کہاں رکھتا ہے۔ مدھن کے اپنے اندر ایک گھن گرج سی ہو رہی تھی اور اسے اپنا آپ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے بھلی کا کھمبا ہے جسے کان لگانے سے اسے اندر کی سنسنی ہٹ سکتی دے جائے گی کچھ دیر تو مٹی کھڑے ہوئے کے بعد اس نے آگے بڑھ کر کھانگ لکھجی کا چاند ہی میں کر دیا تاکہ وہ سن کا چہرہ تو دیکھ سکے۔ پھر وہ شک گیا، بھی اس نے سر جھکا۔ اندھو کی سب سے پہلی باتانی عورت تو نہیں سمجھتے تھے نہ سمجھتے تھے کہ سن پچھن ہی سے پڑھنا آیا ہوں۔ شالو میں مٹی ہوئی دھن کو دیکھتے ہوئے اس نے فرض کر لیا، ”وہاں اندھو کا منہ ہو گا اور جب دھاتا بڑھا کر اس نے پاس پڑی گھنٹھی کو چھوا تو وہیں اندھو کا منہ تھا۔۔۔۔۔۔ مدھن نے سوچا تھا وہ آسانی سے مجھے اپنا آپ نہ دیکھنے دے گی لیکن اندھو نے ایسا کچھ نہ کیا جیسے دھنٹے کی سالوں سے وہ لکھی کی نظر ہو اور کسی خیالی بھینس کے سونگھتے دھنٹے سے اسے چلی بند نہ آ رہی ہو۔ فاش فینڈ اور بند لکھوں کا کربا انڈیجیرے کے باوجود سامنے پڑ پڑا تھا۔

نظر آ رہا تھا ٹھوٹی ناک پہنچتے ہوئے عام طور پر چہرہ لمبیزا ہوجاتا ہے لیکن یہاں تو سبھی گول تھا۔ شاید اسی لیے جانکی کی طوٹ گئی اور ہر ٹیٹوں کے بیچ ایک سا بے دار کمرہ جی بی بی ہوتی تھی جیسے دو سر سبز اور شاداب ٹیٹوں کے بیچ ہوتی ہے۔ مانتا کچھ تنگ تھا لیکن اس پر سے ایسا ایک اٹھنے والے ٹکڑے پر لے بال —

مجھی انہو نے اپنا چہرہ چھڑا لیا جیسے وہ دیکھنے کی اجازت تو دیتی ہو لیکن اتنی دیر کے لیے نہیں۔ آخر تیرم کی کچی ڈکٹی حد رہتی ہے۔ مدن نے ذرا سخت ڈانٹوں سے بروہی سی ہوں ہاں کرتے ہوئے دھن کا چہرہ پھر سے اوپر کواٹھا دیا اور شرانہ می آؤ، زمین کہا۔

”اندو!“

اندو کچھ دنگی گئی۔ زندگی میں پہلی بار کسی اجنبی نے اس کا نام اس انداز سے پکارا تھا اور وہ آہستہ کی آہستہ اندیسیں کرتی رہی۔ رات کے اندھیرے میں آہستہ آہستہ اس کیلے بے یار و مددگار محووت کا اپنا جوتا جا رہا تھا۔ اندو نے پہلی بار ایک نظر اوپر دیکھتے ہوئے پھر آنکھیں بند کر لیں اور سوت آنا سا کہا ”جی!“ اسے خود اپنی آواز کسی پائال سے آتی ہوئی سنائی دی۔

دیر تک کچھ ایسا ہی ہوتا رہا اور پھر مڑے ہوئے بات چیل گئی اب جو پہلی سوجھ بوجھ تھی وہ تھنے می میں نہ آتی تھی۔ اندو کے پتا، اندو کی ماں، اندو کے بھائی، مدن کے بھائی، من باب ان کی دیر سے میل سروس کی نوکری، ان کے مزاج، کپڑوں کی پسند کمانے کی عادت، سبھی کچھ کا جائزہ لیا جاتا تھا۔ بیچ بیچ میں مدن بات چیت کو توڑ کر کچھ اور ہی کرنا چاہتا تھا لیکن اندو طرح دے جاتی تھی۔ اتہائی مجھوری اور لاچار ہوتا مدن نے اپنی ہاں ڈاکر تھپڑا جاوے سات سال کی عمر میں مجھور کو روٹی کے حامن سے ملتی تھی جی تھی۔ میر زندہ رہی ہے جی باری۔ مدن نے کہا۔ باجی کے ہاتھ میں روٹی کی شیشیاں ہیں۔ ہم اسپتال کی طبیعتوں پر اور تھپڑا پاشی تھیں جیٹھوں کے بل پر سوتے رہتا اور آخر ایک دن — مار مار کر کھٹکے — اور مدن چپ ہو گیا۔ چند ہی گھنٹوں میں وہ روئے سے اڑا اور کھٹکے سے زرا دھر بچ گیا۔ اندو نے گھبرا کر مدن کا سراپا ہی چھاتی سے اٹھایا۔ اس رونے نے پل پھر میں اندو کو بھی اپنے من سے اوجھ اور بیگانہ پن سے اوجھ بچا دیا تھا۔..... مدن اندو کے بارے میں کچھ اور بھی جانتا چاہتا تھا لیکن اندو نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے اور کہا: ”میں تو بچھی کھی نہیں ہوں جی۔“ چہیں میں نے ماں باپ دیکھے ہیں، بھائی اور بھابیوں کی بھی ہیں، بیسوں اور لوگ دیکھے ہیں اس لیے میں کچھ کہتی تو جتنی ہوں..... میں اب تمھاری ہوں — اپنے بدلے میں تم سے ایک ہی چیز مانگتی ہوں۔“

روئے وقت اور اس کے بعد بھی ایک نشہ سا تھا۔ مدن نے کچھ صبری اور کچھ دراندلی کے ملے جھٹکے شدوں میں کہا: ”کیا مانگتی ہو؟ تم جو بھی کہتی میں دوں گا۔“

”بچی بات؟“ اندو بولی۔

مدن نے کچھ انا دے ہو کر کہا: ”ماں ہاں — کہا جو بچی بات؟“

لیکن اس بیچ میں مدن کے من میں ایک دوسرا آیا — میرا کاروبار پچھلے ہی منسا ہے اگر اند کو کوئی ایسی چیز مانگے جو میری پہچانی سے باہر ہو تو پھر کیا ہوگا؟ لیکن اندو نے مدن کے سخت اور پچھلے ہوئے ڈانٹوں کو اپنے طائر ڈانٹوں میں سمیٹنے اور ان پر اپنے گال کھٹکے ہوئے کہا۔

”تمہا پرے کو کھٹکے دے دو!“

مدن کشت جیراں ہوا ساتھ ہی اسے اپنے آپ سے ایک اوجھ بھی اترتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے پھر جانکی میں ایک بار اندو کا چہرہ

دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ نہ جان پایا۔ اس نے سر جاپا یا کسی سیل کا ٹا ہر اترہ ہوگا جو زندہ رہے کہ دنیا بھی ایک جتنا ہوا انسانوں کے ہاتھ کی پشت پر گرا۔ اس نے نہ خود کو اپنے ساتھ لٹاتا ہے کہ تو کیسے! لیکن ان سب باتوں نے من سے اس کی ہیئت میں بلاتی تھی۔

مکان ایک ایک کر کے سب نصحت ہوئے۔ چلی بھائی دو بچوں کو انگلیوں سے لکھتے اور مٹیوں کی اونچ نیچ سے تباہی بیٹ سنبھالتی ہوتی چل دی۔ دریا باروا لی پچھلی جواپنے "فرنگھے" مار کے گھر جانے پر شرمناقی واوٹا کرتی ہوئی، بیوش ہو گئی تھی اور جھل جانے میں پڑا لی گیا تھا، جہیز میں سے اپنے حصے کے تین کپڑے لے کر چلی گئی۔ پھر جا چا گئے جن کو ان کے بے پی ہونے کی خبر تار کے ذریعے ملی تھی اور جو شاید بدحواسی میں دن کی بجائے دھن کا منہ چومنے چلے تھے۔

گھر میں لڑکا باپ رہ گیا تھا اور چھوٹے بہن بھائی چھوٹی دلائی تو ہر وقت بھائی کی منہ کی بی گھسی تھی۔ گلی محلے کی کوئی عورت دھن کو دیکھے یا نہ دیکھے تو کتنی دیر تک دیکھے یہ سب اس کے اختیار میں تھا۔ آخر یہ سب ختم ہوا اور اندواہستہ آہستہ پانی بہنے لگی لیکن کالاجی کی اس نئی آبادی کے لوگ اب بھی اتنے جلتے دن فراں کے سامنے ٹوک جاتے اور کسی کلمی جانے سے اندر چلے آتے۔ اندواہیں دیکھنے ہی ایک دم گھر گھٹ گھٹتی لیکن اس جھڑپ سے وقفے میں انھیں جو کچھ دکھائی دے جاتا وہ بنا کھٹ کھٹ کے کھائی ہی نہ دے سکتا تھا۔ دن کا کاروبار کندہ سے روکنے کا تھا۔ کہیں ٹری سپلائی والے دو تین چٹکوں میں بیٹھیں اور دیوار کے چڑوں کو چٹکی کی آگ سے آگیا تھا اور وہ دھڑ دھڑا جلتے ہوئے خاک سیاہ ہو کر رہ گئے تھے۔ میسرادور اسام کی طرف سے منگوا یا ہوا ہر روز منگوا چٹا تھا اور رگل سے منگے حامل خریدنے کو تیار نہ تھے۔ ایک تو آمدنی کم ہو گئی تھی اس پر بدن جلدی ہی دکان اور اس کے ساتھ دلاؤ بند کر کے گھر چلا آتا۔ گھر پہنچ کر اس کی ساری کوشش ہی جوتی کہ سب کھانیں پکیں اور اپنے بستر میں ایک جا میں۔ بھی وہ کھاتے وقت خود بخود لایاں اٹھا اٹھا باپ اور بہن کے سامنے رکھتا اور ان کے کھا پکھنے کے بعد چھوٹے بڑوں کو میٹ کر ل کے پیچھے رکھ دیتا۔ سب سمجھتے ہوئے بھائی نے دن کے کان میں کچھ بھوکھا ہے اور اب وہ گھر کے کام کاج میں دھبی بیٹھے لگا ہے۔ دن سب سے بڑا تھا، کندن اس سے چھوٹا اور پاشی سب سے چھوٹا۔ جب کندن چھائی کے سرائے میں سب کے ایک ساتھ بیٹھ کر کھانے پر اصرار کرتا تو باپ دھنی نام میں ڈانٹ دیتا۔ "کھاؤ تم" وہ کہتا۔ وہ بھی کھائیں گے۔ اور پھر روتی میں ابھر اتر کر کھینے لگتا اور جب بھوکھا نے چمپے سے فارغ ہو جاتی اور بستر میں طرف توجہ ہوتی تو باپ دھنی رام اسے روکتے ہوئے کہتے: "بہن سے بہو برتنی حج ہو جائیں گے۔"

اندو کتنی یہ نہیں باپو جی۔ میں ابھی کیسے دیتی ہوں چپا کے سے؟
تب باپ دھنی رام ایک لڑکی جوتی آواز میں کہتے: "دن کی ماں ہوتی ہو، تو یہ سب تمہیں کرنے دیتی؟"..... اور اندو ایک دم اپنے ہاتھ روک لیتی۔

چھوٹا پاشی بھائی سے شرماتا تھا۔ اس خیال سے کہ داس کی گود بھٹ سے ہری ہو چکی بھائی اور دریا باروا والی بھوٹی نے ایک برس میں پاشی کی کو اندو کی گود میں ڈالا تھا، جب سے اندو اسے نہ صرف دیو بکر اپنا بچہ سمجھنے لگی تھی، جب بھی وہ پیار سے پاشی کو ہانڈوں میں بیٹھے کی کوشش کرتی تو وہ گھبرا اٹھا اور اپنا آپ جھڑپ کر دیا تھا۔ کتنی دوری پر کھڑا ہو جاتا، دیکھتا اور ہنستا رہتا، پاس آئے وہ رٹتا۔ ایک عجیب اتفاق

ایسے ہیں باوجودی ہمیشہ وہیں موجود ہوتے اور پانچ گڑھ لٹھٹے ہوئے کہتے: ”ارے جانا — بھائی پیار کرتی ہے“ ایسی سے مرد ہو گیا ہے؟
 اور دلائی تو بچھا ہی نہ بھر پڑی۔ اس کے ”میں تو بھائی کے ساتھ ہی سبوں کی سکرے اصرار سے باوجودی کے اندر کوئی جہاد میں جگہ دیا جاتا
 ایک رات اسی بات پر دلائی کو زور سے جھپٹ پڑی اور وہ گھر کی آگھی کی آگھی کی نالی میں جا گری۔ اندو نے پکٹے ہوئے پھل تو سر سے دوڑ
 اڑ گیا۔ بالوں کے پھول اور چڑیاں، مانگ کا سینڈور کا نوں کے کرن پھول سب ننگے ہو گئے۔ باوجودی: ”اندو نے سانس کھینچے ہوئے کہا۔
 ایک ساتھ دلائی کو پکڑنے اور سر پر دوڑا دھڑکنے میں اندو کے پسینے چھوٹ گئے۔ اس نے اے کی بجی کو چھاتی کے ساتھ لٹکائے
 ہوئے اندو نے اسے ایک ایسے لہسن میں ملا دیا جہاں سر ہانے ہی سر ہانے نہ کیے ہی سکے تھے۔ نہ کہیں پانچ گڑھ لٹھٹے کا بارو چوڑھے
 ایک طرف کہیں کوئی جھنڈے والی چیز بھی نہ تھی۔ پھر اندو کی آنکھیاں دلائی کے پھوٹے ایسے سر پر جھتی ہوئی اسے ڈکھا لہجی رہی تھیں اور باوجودی
 دے رہی تھیں۔ دلائی کے کانوں پر طے بڑے اور پیار سے پیار سے گڑھے پڑتے تھے۔ اندو نے ان گڑھوں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا
 ”ہائے رتی رتی ڈیڑھی ساں مرے۔ کیسے گڑھے پڑے ہیں گاؤں پر۔“
 ”نہی نے نہی کی طرح کہا: ”گڑھے نکھارے بھی تو پڑتے ہیں بھائی۔“
 ”ہاں مٹو!“ اندو نے کہا اور ایک ٹھنڈا سانس لیا۔

مدن کو کسی بات پر غصہ تھا، وہ پاس ہی کھڑا سب کچھ صحن رکھا تھا، بولا: ”میں تو کہتا ہوں ایک طرح سے اچھا ہی ہے۔“
 ”کیوں اچھا کیوں ہے؟“ اندو نے پوچھا۔

”ہاں — نہ آگے پاس نہ پیچھے بائیں ماس نہ ہو تو کوئی جھگڑا ہی نہیں رہتا۔“

اندو نے لپکا لپکا کیا خواہر تے ہوئے کہا: ”تم جاؤ جی، سر پر ہرجا کے بڑے آئے ہو۔ آدمی جیتا ہے توڑتا ہے؟“
 ”گڑھ کی چپ چاپ سے جھگڑے چلے۔ جاتو! رسوئی میں تمہارا کیا کام؟“
 مدن کھسیا جا کر رو گیا۔ باوجودی رام کی ڈانٹ سے باقی بچے کو پیٹنے سے اپنے اپنے بستروں میں لیٹ جاپڑے تھے جیسے فز
 میں تھیں سارٹ ہوئی ہیں لیکن مدن وہیں کھڑا رہا۔ اعتبار سے اسے طعیت اور بے شرم بنا دیا تھا لیکن اس وقت جب اندو نے کھلے
 ڈانٹ دیا تو وہ رو ڈانسا ہرگز نہ جھلکا گیا۔

دیر تک مدن میسٹر میں پڑھتا تھا لیکن باوجودی کے خیال سے اندو کو آواز دینے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اس کی بے صبری کی حد ہو
 گئی جب مٹی کو سلائے کے لیے اندو کی لوری مسائی دی تو آندہ بارانی، بورانی مسئلہ:۔“

دی لوری جو دلائی کی لوری کے ساتھ ہی تھی مدن کی نیند بھگا رہی تھی۔ اپنے آپ سے بڑا ہو کر اس نے زور سے چادر سر پر کھینچ لی مغیہ
 چادر کے سر پر لیٹے اور سانس کے بند کرنے سے خواہ مخواہ ایک ٹرمسے کا تصور پیدا ہو گیا مدن کو یوں لگا جیسے وہ مر چکا ہے اور اس کی
 دھن اندو اس کے پاس بیٹھی زور زور سے سر پیٹ رہی ہے دیوار کے ساتھ کلاٹیاں مار مار کر چڑیاں توڑ رہی ہے اور پھر گرتی پڑتی دھن
 چلتی رسوئی میں جاتی ہے اور چلے کی لاکھ سر پر ڈال رہی ہے پھر ہار لپک جاتی ہے اور ہاتھیں اٹھا اٹھا کر گلی حملے کے لوگوں سے بڑبڑ
 کرتی ہے ”لوگو! میں لٹ گئی!“ اب اسے دوپٹے کی پردا نہیں بغیر کی پردا نہیں، مانگ کا سینڈور بالوں کے پھول اور چڑیاں محضات
 اور خیالات کے طرے تک اڑ چکے ہیں۔

دن کی آنکھوں سے بے تماشاً آنسو بہہ رہے تھے حالانکہ سوئی میں اندھنس رہی تھی۔ چل بھر میں اپنے سماں کے اُبھٹنے اور پھر بس جانے سے بے خبر۔ دن جب تھا تو کی دنیا میں آیا تو آنسو پونچھتے ہوئے اپنے اس رونے پر ہنسنے لگا۔ اور اندھنس توری تھی لیکن اس کی ہنسی دہی دہی تھی۔ بابوی کے خیال سے وہ کبھی اونچی آواز میں نہ اُتتی تھی جیسے کھلکھلاہٹ کوئی شکا بن رہے نہ تھوٹا روپڑا اور دہی دہی ہنسی ایک گھونگھٹ۔ پھر دن نے اندھو کا ایک خیالی بُت بنایا اور اس سے عیسویں باتیں کر ڈالیں۔ یوں اس سے پیار کیا جیسے اچھی تک نہ کیا تھا۔ وہ پھر اپنی دنیا میں لٹا جس میں ساتھ کا بستر خالی تھا۔ اس نے جسے سے آواز دی۔ اندھو اور پھر چپ ہو گیا۔ اس ادھیڑ میں وہ بورانی مستانی سنایا اس سے بچے لیٹ گئی۔ ایک دھمکی سی، لیکن ساتھ ہی یوں نکلا جیسے ستادی کی رات والی پڑوسی سیٹھ کی بھینس مرنے کے پاس پھسکا رونے لگی ہے۔ وہ ایک بے گل کے عالم میں اٹھا، پھر سوئی کی طرف دیکھ کر کھجالتے دو تین بتائیاں لے کر لیٹ گیا۔ سو گیا۔۔۔۔۔

دن جیسے کافور کو کوئی سندھید دے کر سویا تھا۔ جب اندھو کی چڑیاں مست کی مٹوں میں سیدھی کسنے کے لیے کھنکھ اٹھیں تو وہ بھی عڑ پڑا اٹھ بیٹھا۔ یوں ایک دم جاگنے میں محنت کا جذبہ اور بھی تیز ہو گیا تھا۔ پیار کی کرٹوں کو توڑے بغیر آج سو جانے اور لیکار کی اٹھے تو محبت دم توڑ دیتی ہے۔ دن کا سا مار دن اندھو کی آگ سے لپٹ کر رہا تھا اور یہی اس کے صحنے کا کارن بن گیا جب اس نے کچھ بولکھائے ہوئے انداز میں کہا۔

”سو۔۔۔۔۔ تم آئیں؟“

”ہاں!“

”نہنی۔۔۔۔۔ سو کر گئی؟“

اندھو جھکی جھکی ایک دم سیدھی کھڑی ہو گئی۔ ”اے رام!“ اس نے ناک پر انگلی رکھتے ہاتھ سے کہا: ”کیا کہہ رہے ہو۔۔۔۔۔ مرے کیوں بے چاری ماں باپ کی ایک ہی بچی۔“

”ہاں۔۔۔۔۔“ دن نے کہا ”بھائی کی ایک ہی سندھ“ اور پھر ایک دم تھکنا نہ لہو اُغٹیا رکھتے ہوئے بولا: ”زیادہ تر مت لگاؤ اس چڑیل کو۔“

”نہنیوں اس میں کیا پاپ ہے؟“

”یہی پاپ ہے۔“ دن نے اور چڑھتے ہوئے کہا: ”وہ عجیبی نہیں چھوڑتی تھا۔۔۔۔۔ جب دیکھو جو کس کی طرف چٹی ہوئی ہے۔“

دخان ہی نہیں ہوتی۔

”ا۔۔۔۔۔“ اندھو نے دن کی چار پائی پر بیٹھتے ہوئے کہا: ”بہنوں اور بیٹیوں کیوں تو دھنکنا نہیں چاہئے۔ بے چاری وہ دن کی محمان آج نہیں تو کل نہیں تو پچیس ایک دن مل ہی دے گی۔“ اس کے بعد اندھو کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن وہ چپ ہو گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اپنی ماں باپ بھائی بہن بھینچا ہوا سبھی کھوم گئے۔ کبھی وہ لمبی ان کی دلاری تھی جو چلک چھٹکتے ہی نیادی ہو گئی اور پھر دن رات اس کے ٹھیکے سے ملنے کی باتیں ہوتے لگیں، جیسے گھر میں کوئی بیٹی سی باقی ہے جس میں کوئی ناگن رہتی ہے اور جب تک وہ چوکھٹو کوئی نہیں ملتی گھر کے لوگ آرام کی نیند سو نہیں سکتے۔ دور دور سے کیلنے والے، ٹخن کرے والے، دانت چھوڑنے والے ہانڈی ہانڈے کے

”میں نے تو ابھی سے چار سوٹ اور کچھ برقی انگٹ کر کھائے ہیں اس کے لیے ۵ اندوٹے کما اور جب بدن نے کوئی جواب نہ دیا تو اسے سمجھوڑتے ہوئے بولی۔ ”تم کیوں پریشان ہو جوتے ہو..... یاد نہیں آیا تو چن؟“ ————— تم اپنے دنگو مجھے دے پکچھے۔“

”اے“ بدن نے چمکتے ہوئے کہا اور جیسے بے فکر سا ہر گیا لیکن اب کے جب اس نے اندوٹے کو اپنے ساتھ پکڑا تو وہاں ایک جسم ہی نہیں رہ گیا تھا ساتھ ایک رُوح بھی شامل ہو گئی تھی.....

مدن کے لیے اندوڑ و اندوڑ ہی رُوح تھی۔ اندوڑ کے جسم بھی تھا لیکن وہ ہمیشہ کسی نہ کسی وجہ سے مدن کی نظروں سے اوجھل کی رہا۔ ایک پروردہ تھا۔ خواب کے نازوں سے تباہ اور آہوں کے دھڑس سے رنگین ہفتوں کی زرداری سے چکا چوند جو ہر وقت اندوڑ کو دھانچتا رہتا تھا۔ مدن کی نگاہوں اور اس کے کانوں کے روشناس صدیوں سے اس رُوح پر ہی کاپیرن کرتے آئے تھے جو کہ عرف عام میں بیڑی کہلاتی ہے۔ لیکن چیز اسے آسانیوں سے نکلنے کے تھان گزروں کے گڑبگڑ میں ڈھل پھرنے کے لیے ملتا آیا تھا۔ دو شاں جس تک ہار کے پلاس وہاں گئے پڑے تھے لیکن رُوح پر ہی کاپیرن تھی۔ عزت اور پاکیزگی کی سفید ماری میں مایوس وہ دیر کی لگ رہی تھی اور —————

مدن کے ہوتے ہوئے کائنات کے سینے سے ترہوتے جیسے ٹھکانے کے لیے وہ انھیں اور ہر ماں اٹھا دیتا اور پھر لانگے بچوں کو پرے سے طور پر پھیلتا ہوا ایک تنہی کیفیت میں رہا یہ انکھوں کی بھتیجی چھٹی برقی تیلیں کے سامنے دکھ دیتا اور پھر انکھوں کے بیچ میں سے بھاگتا تھا۔ ————— وہ کامرس میں جو خوش رنگ اور گماڑا سا نئے پڑا ہوتا۔ استعمال کے لیے پاس، ابتداء کے لیے دور..... کبھی جب اندکی ناگہبندی ہو جاتی تو اس قسم کے فخر سے ہوتے —————

”اے مہی! اٹھ میں چہڑے پڑے صبحی ہیں، وہ کیا کہیں گے؟“

مدن کہتا۔ ”چھوٹے ٹھگتے نہیں۔ بڑے انجان بن جاتے ہیں۔“

اسی دوران میں باوجود مانی رام کی تبدیلیاں نہ ہو گئی۔ وہاں وہ رُوح نے مل سروس میں سیکنڈ گریڈ کے ہریٹھک ہو گئے۔ تنابڑا کوٹڑ ملاکاس میں اٹھ کھڑے رہتے تھے لیکن باوجود مانی رام میں اس کیلئے ہی ٹھانگہ پیدا نہیں ہوئے۔ بہت۔ زندگی بھر وہ بال بچوں سے کبھی ملنے نہیں رہے تھے۔ محنت گھر پر قدم کے آہی، آخری زندگی میں اس تھائی نے ان کے دل میں وحشت پیدا کر دی لیکن بھوری تھی، بچے سب دلتی میں بدن اور لوندو کے پاس تھے اور وہاں انکھوں میں پڑتے تھے، سال کے خاتمے سے پہلے انھیں بیچ میں سے اٹھانا ان کی پڑھائی کے لیے اچھا نہ تھا۔ باوجودی دل کے دورے پڑنے لگے۔

بارے گھر کی ملی چھین ہوش اور ان کے بار بار کھنے پر مدن نے اندوڑ کو کندن پاشی اور رلاوی کے ساتھ تھانہ بیڑی چھوڑ دیا۔ مانی رام کی دنیا جگمگاتی۔ کہاں انھیں دفتر کے کام کے بعد فرصت کی فرصت تھی اور کہاں اب کام کی کام تھا۔ بچے بچوں کی طرح، جہاں کیلے ناز تھے وہیں پڑے رہنے دیتے اور باوجودی انھیں سمجھتے پھرتے۔ اپنے بدن سے دور اسانی جاتی رہتی، اندوڑ تو اپنے تھانہ تک سے غافل ہو گئی تھی۔ وہ

اپنے دست پر پہنچ کر دھنی رام دلا دی تھی کہ ساتھ کھینے لگتے۔ دلائی کی باوجی کے ننگے پنڈے کے ساتھ بڑا گھسانے اور بیٹ پر منہ رکھ کر کھینچا، پھلانے کی عادت تھی۔ آج جب باوجی اور مٹی پر کھیل کر رہے تھے، ہنس ہنسا رہے تھے تو مٹی نے بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ”مودھ تو کھراب پر جائے گا تو جی۔۔۔۔۔ بھائی تو بیٹی جی نہیں۔“

بیٹے کی نصیحت پر بیٹے کی مٹیا۔۔۔۔۔ باوجی نے وہ سرے ہاتھ سے پاشنی کو پٹا لٹے ہوئے کہا: ”عزیز! کھڑی کسی چیز کو خواب مجھے نہیں دیکھ سکتیں۔“

ابھی یہ فقہہ باوجی کے سر پر ہی ہڑنا کر ایک طرف سے ہنسنے لگا تھا۔ یہ غصہ کھائی کی آواز آنے لگتی۔ پتہ چلتا ہو جی کو کھینچا جی، اور پھر کوئی غلط غلط مٹی سنائی دیتی اور سب جان جیتے ہو۔۔۔۔۔ بھائی نے دودھ پیایا۔ کچھ دیر کے بعد کنڈن باوجی کے پاس آنا اور کہنا۔ ”لو جی۔۔۔۔۔ بھائی رو رہی ہے۔“

”کون؟“ باوجی کہتے اور پھر اٹھ کر اندھیرے میں دور اسی طرف دیکھنے لگتے، گھڑے گھڑے ہو کر چارپائی پر بیٹھتی۔ کچھ دیر بیٹھ کر بیٹے کے بعد وہ پھر بیٹھ جاتے اور کچھ کھتے ہوئے کنڈن سے کہتے: ”جہا۔۔۔۔۔ تو سوجھا۔۔۔۔۔ وہ بھی سوجھا ہے گی اپنے آپ۔“ اور پھر بیٹھتے ہوئے باوجی دھنی رام آسمان پر کھینچے ہوئے پر تاناک ٹھنڈا رکھ دیکھتے لگتے اور اپنے من کے بھگوان سے پوچھتے: ”چاندی کی ان کھینچے بندہ ہوتے ہوئے پھیلوں میں میرا پھیل کہاں ہے؟“ اور پھر پورا آسمان انھیں درو کا ایک دیا دکھائی دینے لگتا اور کافوں میں ایک مسلسل ڈھونڈ کی آواز سنائی دیتی ہے کہتے ہوئے وہ کہتے: ”سبب سے دنیا بنی ہے انسان کتنا رویا ہے!۔۔۔۔۔ اور وہ روئے روئے سر جاتے۔“

اندھ کے جانے کے بیس پچیس روز ہی میں مدن نے وہاں شروع کر دیا۔ اس نے کھانا میں بازار کی روٹیاں کھاتے کھاتے تنگ آ گیا ہوں۔ مجھے ففیس پر گئی ہے کہ دس کا در و دشروں ہو گیا ہے۔ پھر میرے دفتر کے نوٹ جی کی غرضی کے ساتھ ڈاکٹر کا سرٹیفکیٹ بھیج دیا۔ مدن نے باوجی کے ایک دوست سے نفسدہنی کی کھٹی کھٹی بھیجی۔ اس پر بھی جب کچھ نہ ہوا تو ایک ڈیل تار۔۔۔۔۔ جوائی تار کے پیتے مارے گئے لیکن بلا سے۔ اندھ اور سچے نوٹ آئے تھے۔ مدن نے اندھ سے دو دن سیر سے نہ بات ہی نہ کی۔ یہ نوکھلی اندھ کی کاغذ۔ ایک دن مدن کو اکیلے میں پاکر وہ پکڑ لیا اور بولی: ”آنا سہ پھل دے بیٹے جو۔۔۔۔۔ میں نے کیا کیا ہے؟“ مدن نے اسے آپ کو پھڑھڑاتے ہوئے کہا: ”چھوڑ۔۔۔۔۔ دور ہو جا میری آنکھوں سے۔۔۔۔۔ کینی۔۔۔۔۔“ ”یہی کہنے کے لیے اتنی دور سے بلوایا ہے؟“

”ہاں!“

”ہٹاؤ اب۔“

”سفر وار۔۔۔۔۔ یہ سب تمہارا ہی کیا دھرا ہے۔ تم جو آنا چاہتیں تو کیا باوجی روک لیتے؟“ اندھ نے بیس بیس سے کہا: ”اے جی۔۔۔۔۔ تم تو بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ میں بھلا انھیں کیسے کہہ سکتی تھی؟“ وہ پھر تو تم نے مجھ

بلو اکر باجو جی پر بڑا محکم کیا ہے۔"

”مطلب کچھ نہیں۔۔۔ ان کا جی بہت لگا ہوا تھا بال بچوں میں۔“

”نقد اراکین؟ — تو کہیں بھی لگا سکتے ہو۔“ اندو نے شرارت سے کہا اور کچھ اس طرح سے مدین کی طرف دیکھا کہ اس کی مدافعت کی مادی قیمتیں نہ تو کہیں۔ یوں بھی اسے کسی اچھے سے نہانے کی تلاش تھی۔ اس نے اندو کو کچھ گھبراہٹ سے سینے سے لگا لیا اور بولا۔ ”بابو جی تو سب بہت خوش تھے؟“

“ایمان”

اپنی قسم نہیں۔۔۔ میری قسم کھاؤ۔

تھاری قومیں نہیں کھاتے۔۔۔ کوئی کچھ بھی دے۔۔

لو! "مدن نے سر جھپٹے ہوئے کہا: "تباہیوں میں اسے سیکس کہتے ہیں۔"

سیس؟' اندوے پوچھا۔ وہ کیا ہوتا ہے؟"

”وہی جو مرد اور عورت کے بیچ ہوتا ہے۔“

”اے ام! اندو نے ایک دم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا: یگندے کہیں کے۔ مقرر نہیں اتنی بالوجہی کے بارے میں ایسا سوچتے ہوئے؟“

”تو بابو جی کھنڈم نہ آئی تجھے یوں دیکھتے ہوئے؟“

”کیوں؟“ اندونے بابو جی کو طافہ ادا کرتے ہوئے کہا: ”وہ اپنی بہو کو دیکھ کر خوش ہو رہے ہوں گے۔“

”مکبیروں نہیں۔ جب بہو تم ایسی ہو۔“

”مختار اسی گندہ ہے۔ اندوئے نفرت سے کہا: اسی لیے مختار کا روبرو اچھی گندہ بروئے کا ہے۔ مختار کی کتابیں مہنگی گندہ سے بھری پڑی تھیں۔ انھیں مختاری کتابوں کا کس کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ ایسے تو سب ہیں بڑی مٹی کی تختیاں تو میرے پیٹھی سے نچرے اور مہنگے پیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ تو کیا وہ بھی وہ کاغذ کاٹا۔ جس کا نام اچھی نام لے رہے تھے۔ اور پھر اندوہ پوری، ”بابو کی کریکس بلا مو۔“ اس کا وہاں جی بھی نہیں گنا۔ وہ مٹی جوں گے تو کھڑکی کی نہیں ہو گے؟“

[illegible]

ایسے ہر جگہ وہ اپنے کاروبار کی جانیں پایا تھا۔ اس نے غیر یقینی لمحے میں اندو سے صوف اٹا کر کہا: ”اچھی رہنے دو باوجود کہ شادی کے بعد ہم دونوں پہلی بار اتنا داری کے ساتھ مل سکتے ہیں۔“

تیسرے روز باجو کی کاسٹروں میں دو باجی اچھا خط آیا۔ میرے پیارے دن کے مخاطب میں میرے پیارے کے اخلاقیات پانچل میں دھل گئے تھے۔ کھانا تھا۔ ہو کے کہاں ہونے پر میرے تو وہی پرانے دن کوٹ آئے تھے۔ تمہاری ماں کے دن، جب ہماری نئی شادی ہوئی تھی تو وہ بھی ایسی ہی اچھی تھی۔ ایسے ہی اتارے ہوئے کپڑے اور ادھر چھٹک دیتی اور پتا جی سیٹھے پھرتے۔ وہی مسئلہ کا صندوق وہی جیسوں نے لکھا، ”میں بازار جا رہا ہوں، آ رہا ہوں، کچھ نہیں تو وہی بڑے بار بڑی لا رہا ہوں۔ اب گھر میں کوئی نہیں۔ وہ مکہ جہاں مسئلہ کا صندوق پڑا تھا، خالی ہے۔۔۔۔۔۔“ اور پھر ایک اور صندوق دھل گئی تھی۔ آخر میں کھانا، دفتر سے لوٹتے سے یہاں کے بڑے بڑے اندھے کڑوں میں داخل ہوتے ہوئے میرے ہی ایک ہل سا اٹھتا ہے۔۔۔۔۔۔ اور پھر ————— ہو گا خیال رکھنا، اسے کسی ایسی ویسی دایہ سے کھانے کی مت کرنا۔“

اندو نے دونوں ہاتھوں سے چھٹی پھولی، سانس کھینچی۔ ”ابھی میں پھٹتی، شرم سے پانی پانی ہوتی ہوئی بولی۔ میں سرگمی۔ باجو کی کو کیسے پہچان گیا؟“

دن نے چھٹی چھڑاتے ہوئے کہا: ”باجو کیا ہے؟“ ————— دیا دیکھی ہے۔ ہمیں پیدا کیا ہے۔“

”ہاں مگر“ اندو بولی، ”ابھی دن ہی کے ہوئے ہیں؟“

اور پھر اس نے ایک تیز سی نظر اپنے پیٹ پر ڈالی جس نے ابھی بڑھاپے شروع نہیں کیا تھا اور پھر جیسے باجو یا کوئی اور دیکھ رہا ہو اس نے ساری کا پتہ اس پر کھینچ لیا اور کچھ سوچنے لگی۔ بھی ایک چمک سی اس کے چہرے پر آئی اور وہ بولی ————— ”تمہاری سسرال سے شریانی آئے گی۔“

”میری سسرال؟“ ————— اولاد! ”دن نے راستہ پاتے ہوئے کہا: ”کتنی شرم کی بات ہے۔ ابھی چھ آٹھ جیسے شادی کی ہوئے ہیں اور چھلا آیا ہے۔“ اور اس نے اندو کے پیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

”چھلا آیا ہے یا تم لا رہے ہو؟“

”نہ۔۔۔۔۔۔ یہ سب قصور تھا رہے کچھ عورتیں ہوتی ہی ایسی ہیں۔“

”تھیں پسند نہیں؟“

”ایک در نہیں۔“

”مکیوں؟“

”چادر تو مزے سے بیٹے زندہ گی کے۔“

”کیا یہ زندگی کا حمانہ؟“ اندو نے صدمہ زدہ لمحے میں کہا: ”مرد عورت شادی کس لیے کرتے ہیں؟ بھنگیوں نے بن مانگے سے یا نا؟ پوچھو ان سے سچ کی نہیں ہوتا۔ پھر وہ کیا کچھ کرتی ہیں؟ بیروں خیروں کے پاس جاتی ہیں۔ سماجیوں، مجاہدوں، پوچھتیاں، باندھتی، شرم جی کچھ مگر دیوانہ کے کنارے لگی ہو کر کرتے رہتے کوئی شمشاد میں سامان بھاتی۔“

”اچھا! اچھا! دن بولا۔ تم نے کھانا ہی شروع کر دیا۔ اولاد کے لیے تھوڑی مگر بڑی تھی؟“

آئی مٹائی کی نیکمراسی کا اپنا کچھ بہت چھٹا تھا البتہ ذریعہ اولیٰ جو پہلی منزل پر پہنچی تھی جس نے پیدائش کے وقت رام، رام، رام، رام کی زٹ لگا دی تھی اور اب وہی زٹ مضمحل ہو رہی تھی۔

[illegible]

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، ٹھیک ہے!“ پھر پلے سے تین بار بار کہا اور پلے اپنا لڑنا ہوا لٹھروں کے سر پر رکھ کر اسے نیچا کیا۔ سچو ماو بارہ لٹک گئی۔۔۔

پھر کئی بار دے کہہ رواڑے میں سے باہر جاتی تھی نظر آتی تھی۔ وہ میٹک میں پہنچی جہاں بانی کے بچے سو رہے تھے۔ پھر کئی بار ایک ایک کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور کچھ محبت کی طمانت نکھیں اٹھا کر زمین میں کپڑیوں اور پھر ٹیڑھا لایا ہی کر سوتے تھے۔ اس کا بیٹا گئی۔ لہذا اس کے پلٹنے کے ہرے شاؤں سے پتھر رٹا تھا جیسے رو رہی ہے۔ دل حیران ہوا..... پھر کئی تو کئی دیکھوں سے گزر چکی ہے۔ کیونکہ اس کی ٹونٹک کا پٹ اٹھی ہے۔

[illegible][illegible]

”ہو گا۔“ مدن نے ایک ایشیائی سی نظر بچے پر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”میر تو کہتا ہوں شک ہے بھگوان کا کہ تم بچہ گنہگار۔“

”ہاں!“ اندو بولی۔ ”میں تو مجبوری تھی۔“

”شہنشاہِ برلن نے ایک دم اندوکی بات کاٹے ہوئے کہا: ”یہاں تو کچھ ہوا ہے..... میں تو اب تمہارے پاس بھی نہیں بیچوں گا۔“ اور مدین نے زبانِ دان تسلی دلائی۔

توبہ کرو۔" اندو بھری۔

دن نے اسی دم کان اپنے ہاتھوں سے پکڑ لیے..... اور اندر و نجف سے آواز میں جھنسنے لگی۔

بچہ پیدا ہونے کے بعد کئی روز تک اندو کی نائٹ شکایت نہ ہوئی۔ وہ گھوم گھوم کر اس بچے کی تلاش کر رہی تھی تو اب اس سے پرے
 باہر کی دنیا میں جا کر اپنی اصل کاروبار کر رہا تھا۔ اب سب کے شکایت خوار اور خوشنات تھے اس لیے یہ کہنگ بھی نہیں۔ — معلوم ہوتا تھا اس نے

[illegible]

”کیا ہوا؟“ مدن نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ اندھ غمور واما اپنے کی کوشش کر کے بول: ”اسے جھوک لگی ہے۔“ اور اس نے بچے کی طاف اشارہ کیا۔

”اے؟۔۔۔۔۔ بھوک؟۔۔۔۔۔“ من نے پہلے بچے کی طرف اور پھر اندوکی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تو تھیں کیسے تھیں؟“

”دیکھتے نہیں؟ اندونچے کی طرف نگاہ کرتے ہوئے بولی: ”سب ٹیلا ہو گیا ہے۔“

مدن نے غور سے اندو کے ڈھیلے ڈھالے رنگے کی طٹ دیکھا۔ جھر جھر دو دو جھبر رہا تھا اور ایک خاص قسم کی فو آرمی ملتی۔ پھر اندو نے

بچے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: "اسے مجھے دے دو۔"

مردن نے ہاتھ پتھر ڈسے کی طرف بڑھایا اور اسی دم کھینچ لیا۔ پھر کچھ بہت سے کام لیتے ہوئے اس نے بچے کو یوں اٹھایا جیسے وہ

کوئی مرا ہوا چہرہ نہ ہو۔ آخر اس نے بچے کو اندو کی گود میں دے دیا۔ اندو دن کی طاف دیکھتے ہوئے بولی۔ "تم جاؤ۔۔۔۔۔ ہا ہر۔"

”کنیوں؟..... باہر کہیں جاؤں؟“ مدن نے پوچھا۔

”جاؤ نا۔“ اندونے کچھ مچلتے کچھ شرماتے ہوئے کہا: ”تمہارے سامنے میں دوسرے نہیں ملا سکوں گی۔“

”ارے؟“ عدن جیت سے بولا۔ ”میرے سامنے؟“ نہیں پلا کے گی؟ اور پھر نا کھجی کے انداز میں سر کو جھٹکا دے کر باہر

کی طرف چلے نکلا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر مڑتے ہوئے اس نے اندر دیر ایک نگاہ ڈالی۔ اتنی خراب صورت اندر آج تک نہیں لگی تھی۔

باورِ وحی! اہم بھی بڑھ کر ملے تو وہ پہلے سے آدمی دکھائی پڑتے تھے۔ جب اندوس نے پتا ان کی گردن میں دیا تو وہ کھل اٹھے۔ ان کے پیٹ کے اندر کوئی بصری طاعن! یا خفا جس کو کھینے، انھیں سولی پر لٹکے نہ کھنکھارنا۔ نہ جراتاً نہ جبراً کوئی کی اس سے دس گز بڑی حالت ہوتی۔

کئی علاج کیے گئے باوجود بھی آخری علاج میں ڈاکٹر نے اوسطی کے برابر سندرہ میں کوئیاں روک رکھے کہ وہیں پہلے ہی دن انہیں نائٹ پسینہ کیا کہ وہ جن میں تین چار بار یا پچیس بار سنے چڑے۔ ہر آدمی پچیس آنکر کا پچیس پچیس حرفت پسینے ہی سے اپنی لکچ کو چھاتی کہ جس کی تھی۔ رات انہیں تھیں جن محسوس ہوتے تھے گورا انہوں نے پکارا۔ ہوا زور ادا تھی تو دنیا فائدہ بہت خراب ہو رہا ہے۔ ہوا بھگائی ہوئی گھاؤ آتے تھے کہ ایک الجھائی گیا تھا اس قدر تھیں کہ پڑا لے آئی۔ بیٹھے نہ واپس نہ لے کر طرف لیا تو قور

ان کی پتلیاں پھر مچکی تھیں اور کرنٹی ہی دم میں وہ اوپر آسمان کے گلزار میں پہنچ چکے تھے جہاں انھوں نے اپنا بھرپور پہچان لیا تھا۔

منے کو پیدا ہونے کے کل میں کمپیس روز جو شے تھے۔ اندونے نہ نفع کرا اور چھاتی پیٹ پیٹ کر خود کو نکال کر دیا۔ بدن کے سامنے دوی

منظر قاجار اس نے تصور میں اپنے مرنے پر دیکھا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اندونے چوڑیاں توڑنے کی بجائے اتار کے رکھ دی تھیں۔ سربراہ کا

نہیں ڈوای غصی کہیں زمین پر سے مٹی لگ جائے اور بالوں کے بکھر بہنے سے چہرہ بھی پاک ہو گیا تھا۔ کو کو! میں فٹ گئی، کی جگہ اس نے ایک دلدرو

آواز میں جھلنا شروع کر دیا تھا۔ لوگوں ہم کٹ گئے۔

گھبرا کر کھتا پوچھ رہا تھا۔ اس کا اچھٹن کو پوری طرف سے اندازہ نہ تھا۔ میرے بیک اس کا دل ایک کونسل میں ڈب۔ وہ شاید کیا انکار وہ گھر کے بارہ رو کے کنارے بل چڑھی میرا پروردگار علیٹ کرا اپنے دل کو شکستے پر نہ لانا۔ دھقی ماں نے حقائق سے مل کر اپنے بچے کو بھلا دیا تھا۔ چھوٹے بچے کشمیر میں جاتا رہے جسے گھر سے بلے پر شکر کے لیے میرے چڑیا کے برٹ پر چلیں ہاٹاٹھا کر صبر میں کرتے ہیں۔ انہیں اگر کوئی پروں کے لیے بچے کو نہ لانا۔

نالی کے کنارے پڑے پڑے دن سے سو جا اب تیرے ختم ہو گئی۔ کیا میں جی سوں گا و زندگی میں کبھی ہنس سوں گا؟ وہ اٹھا اور اٹک کر گھر کے اندر چلا آیا۔

ریاضیہ جیس کے بیچ غفلت و خفا جس میں گنہگاروں سے کیڑا ٹنڈ کھٹے ہوئے مدین کے ایک بار پھر اس سوال کو دہرایا۔ میں کبھی سنسن علی صحن گاؤں۔۔۔ اور وہ کھلکھلا کر سنسن۔ ادا تھا دلا کھاس کے باپ کی لاش ایسی ہی جیٹھک میں پڑی تھی۔

باپ کو گاک کے حوالے کرنے سے پہلے مدح اعلیٰ پر چڑھے ہوئے حشر کے سامنے ٹھوٹوت کے انداز میں بیٹھ گیا۔ یہ اس کا اپنے جنم دانا کو آخری ہی نام تھا۔ تس پر بھی وہ روزِ ردا تھا۔ اس کی رعایت دیکھ کر امہ میں شرمیک ہوئے والے رشتے دار جھٹکے والے سن سے دو گئے۔ پھر ہندو رواج کے مطابق سب سے بڑا بیٹا ہونے کی حیثیت سے مدح کو پٹ جلائی پڑی۔ ملحق ہو کر گھوڑی میں پال کر کیا کرنا لایا، مانی پڑی۔ عورتیں باہری سے شہنشاہ کے کوٹ میں پہن کر کمر ٹھٹھکی تھیں۔ جب مدح گھر پہنچا تو وہ کانپ رہا تھا۔ دھرتی کے اسے بغور دیکر کہ جیسے جوتھ اپنے پیچھے کوئی اعلیٰ رات کے گھر آئے پر پھر سے ہول میں مغل گئی..... اسے کوئی چہما را چاہا جسے تھا کسی ایسے جذبے کا سہارا جو رات سے بھڑا رہا۔ اس وقت دھرتی نے ان کی پیچ جگ دلائی اور اندوہ کسی گھر سے جس سے پیدا ہو کر اس رام کو اپنی بانہوں میں سے لیا..... اسی رات اگر اندوہ دینا آپ لوں مدح پر نشانہ نہ کر دیتی تو آنا تھا کہ مدح کو کسے دھوتا۔

دوسری جینے کے اندر اندر دوسرا ایجنہ پیدا آیا۔ یہی وہ کاس دوزخ کی آگ جس میں تحلیل کر دیں خود اپنا کھوکھلا لہجہ لگایا تھا۔ کبھی کبھار یہ خیال آتا کہ میں مشائی کے بعد باوجودی کے اس گلی میں، اندر اندر نہ بلا لیتا تو شاید وہ اپنی جلدی نہ چل دیتے لیکن یہ جرم، وہ اپنی موت کے پیدا ہونے والے خسارے کو بردارنے میں نلک جاتا..... کاروبار جو پہلے بے توجہی کی وجہ سے ہنر پر کیا تھا..... مجبوراً نلک نکلا۔

ان دنوں بڑے بچے کو دھکے پاس جھڑک، پھر بڑے کو چھاتی سے ٹکائے اندر دیکھ کر چل گئی تھی۔ بیچھے متا صرح طرح کی خند کرنا تھا جو کبھی ملانی جاتی تھی اور کبھی نہیں ملتی۔ بچے سے اندر کا خطا نظر..... عجیبے بیان اپنے بیٹے کے رونے کی آواز آرہی ہے اسے کوئی مانتا تو نہیں ہے؟..... دھک کو بڑی حیرت ہوئی۔ ایک جہاں ان بڑے عورت..... ایسی باتیں کیسے کر سکتی ہے؟ پھر اس نے اپنے آپ سے بوجھا کیا یہ بھی کوئی بڑا براقعہ ہے۔

سال گزر گئے۔ پیسے کبھی اٹنے نہ آئے کہ ان سے کچھ عیش ہو سکے لیکن وہ اس کے مطابق آمدنی ضرور ہر جاتی تھی۔ یہاں اس وقت ہوتی جب کہ پڑا خلع سامنے آجاتا..... کندہ کار کا درویشاے ٹولہ راہی کی فکر بھرجا رہا ہے۔ اس وقت وہ نہ لگا لگا کر میٹھا اور نہ بھرا

ایک طرف سے آتی، مسکراتی ہوتی اور کوکتی۔ کیوں کوکل ہو رہے ہو؟“ مدن اسید لہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا: ”وکیل نہ ہوں؟ کندن کا بی۔ اے کا دادا اعلیٰ دنیا ہے۔۔۔۔۔۔ یعنی۔۔۔۔۔۔ اندھوچر ہسپتال اور کوکتی“ چلو سرے ساتھ“ اور مدن لہجے کے بچے کی طرح اندو کے پیچھے چل دیتا۔ اندو صندل کے صندوq کے پاس پہنچتی جیسے کسی کو مدن صیت داتا لٹکانے کی عہادت۔ تلی کھجی کھجی اس بات پر خفا ہو کر مدن کہتا: ”مرو گی تو اسے بھی جیانی پر ڈال کر لے جانا۔“ اور اندو کوکتی: ”ہاں اسے جاؤں گی۔“ پھر اندو وہاں سے مطلوبہ رقم لے کر سامنے رکھ دیتی۔

”کہیں سے بھی آئے..... تمہیں آم کھانے سے مطلب ہے؟“

”پھر بھی؟“

”تم جہاؤ، اپنا کام چلاؤ۔“

اور سب دن زیادہ اصرار کرتا تو اند کو کتنی۔۔۔ میں نے ایک سیدھ دوست بنایا ہے، اور پھر مہینے لگی جھوٹ جانتے ہوئے علی
دن کو یہ خاق اچھا نہ لگتا۔ پھر اند کو کتنی۔۔۔ میں جو ریڑا ہوں۔۔۔ تم نہیں جانتے؟۔۔۔ سخی طیار۔۔۔ جو ایک ہفتے سے فوتا ہے اور
دوست ہفتے سے گریب گر باکوسے دیتا ہے۔۔۔..... اسی طرح میری شادی ہوئی جس پر اسی ہی فرٹ کے زیر رکے۔۔۔ ترمڑ چڑا
اور پھر امر علی کیا۔

اسیے ہی کنکرن بھی ہوا گیا۔ اس شادیوں میں اندوہی بہت بھرا کرتی تھی اور ماں کی جگہ کھڑی ہر جانی۔ آسمان سے باوجی اور ماں نکلیا کہتے اور بھول برساتے کی کو نظر نہ آتے۔ پھر ایسا ہوا، اور یہاں جی اور باوجی میں جھگڑا چل گیا۔ ماں نے باوجی سے کہا: تو کو جو کہ لائے گی کھا آئے ہو اس کا شکرمہ ہی رکھیا ہے۔ میں فیصلہ برقی ہے کچھ ہی نہیں دیکھا تھا۔ اور جھگڑا اور شتر، ہمیش اور شوک تبھی۔ انھوں نے ماں کے حق میں فیصلہ دیا۔ اور دیوں، امانات کو کہیں اگر کہیں کی کو کھ میں پڑی۔ اور اندوہ کے لایک جھجھکیا رہی۔

پھر اندہ ایسی دیوہی بھی تھی جب کوئی اصول کی بات ہوتی تو زندگی اور دنیا کو خیر و شر سے علیحدہ کر پڑتی ———۔ حدن راستہ بنا کر کی اس قدر تھی کہ خفا ہو کر بہرہ نشین نہ رہی پہلی کام کرتا تھا۔ چونکہ اندو کی باتوں میں اچھا تو ہونے کے باوجود سہائی اور درد کا اثر رہتے تھے اس لیے حدن اور کنبے کے باقی سب لوگوں کی تکلیفیں اندو کے سامنے فوجی رہی تھیں۔ جھگڑا کرتا بھی ہو جاتا ہے۔ حدن اپنے شہر ہی میں عجمیوں کی کتابیں اندو کی بات کو رد کرنے کی ایک آخری سب سے جھگڑا کرتے ہوئے اندو کی کشن میں آئے تھے اور اسی سے ٹھکرا گئے تھے۔

نئی بھائی آئی۔ کہنے کو تو وہ بھی بڑی تھی لیکن اندواکب عورت نقل سے بڑی کہتے ہیں۔ ۳۱ کے آٹھ چھوٹی بھائی رانی ایک بیوی بھی
 جسے عورت کہتے ہیں۔ رانی کے کا۔ نہ بھائیوں میں چھوڑا ہوا اور نہ ہی چاہا جاوے گی عزت جامداؤ تقسیم ہوئی جس میں ماں باپ کی جائیداد تو ایک سو
 اندواکب ایجنائی بھی تھی مگر یہ بھی تقسیم کی نہیں گئیں اور اندواکبھیں مریس کر رکھ گئی۔

جہاں سب کچھ مل جانے کے بعد اور الگ ہو کر کچھ لیکن اور رافقی ٹھیک سے نہیں سس سکے تھے وہاں اند کو کابا گھر دوسری میں بہت مشکل کرنے لگا۔

بچہ کی پیدائش کے بعد اندہ کی صحت وہ نہ رہی۔ بچہ ہر وقت اندہ کی چھاتیوں سے چپٹی رہتی تھی جہاں بھی گوشت کے اس ٹکڑے پر غور نہ کرتے تھے وہاں کہہ اندہ تو جی ہر اسے کھائے سے لگاتے رہتی تھیں کہ خود بھی پشٹن اس ہوا تھی اور جی کو سانسے جھٹکتی ہیں بیٹھے رہتے

کہ اٹھتی تو مجھے بھی جیسے دس کے — ماں —“
اور بچی جیتا کر دے نہ تھی۔

دن اندو سے کھٹے لگا۔ شادی سے سے کہ اس وقت تک اسے وہ عورت ملتی تھی جس کا وہ تعلق تھا۔ گندہ بردہ کہنے لگا اور دن نے بہت سارے دیکھنا دے بالا بلا خرچ کرنا شروع کر دیا۔ باجی کے چلے جانے پر کوئی پرچھنے والا بھی نہ تھا۔ پوری آزادی تھی۔
گویا پڑوسی سبھل کی جینس پھر دن کے منہ کے پاس پینکے رنے لگی۔ حکم بار بار پینکا رنے لگی۔ شادی کی رات والی جینس تو ایک چلنی لیکن اس کا مالک زندہ تھا۔ دن اس کے ساتھ ایسی جگہوں پر جانے لگا جہاں روشنی اور سائے عجیب بے قاعدہ میٹھیں بناتے ہیں۔ نیکو پر کبھی انہیں سب سے بھی نہیں ہے کہ اوپر کھٹ سے روشنی کی ایک چمک رہا کر اسے کاٹ دیتی ہے۔ کوئی تصویر پوری نہیں تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسے ایک پاجامہ عطا اور آسمان کی طرف اڑ گیا یا کسی کوٹھ سے دیکھنے والے کا منہ پوری طرح سے ڈھانپ لیا اور کوئی سانس کے لیے نہ تھپے لگا۔
بھی روشنی کی چمک رہا ایک چمک ساسی میں لگی اور اس میں ایک صورت آکر کھڑی ہو گئی۔ دیکھنے والے نے ہاتھ بڑھایا تو وہ آواز پھلکا گیا جیسے ہاں کچھ بھی نہ تھا۔ ”تیجے کوئی نہ تھا۔“ دے لگا۔ اوپر ملنے اس کی آواز پوری۔

دن کو اس کے تصور کے تحت وہاں سے لیکر ہر جگہ ایسا معلوم ہوا تھا جیسے آئسٹ سے ایک غلط خط لگ گیا، یا انہسی کی آواز نہ درست سے زیادہ جلد تھی اور دن بے داغ صناعتی اور توازن منہسی کی تلاش میں کھولیا۔

سبھل نے اس وقت اپنی بیوی سے بات کی جب اس کی بیگم نے دن کو شادی شہر کی حیثیت سے سبھل کے سامنے پیش کیا۔ پیش ہی نہیں کیا بلکہ منہ پر مارا۔ اس کو اٹھا کر سبھل نے بیگم کے منہ پر دے مارا۔ معلوم ہوتا تھا کسی خوش تر بود کا گودا ہے جس کے رنگ و رہنے بیگم کی ناک ۱۰ کی انگلیوں اور کانوں پر لگے ہوئے ہیں۔ گروڈر گروڈ کا گائی کی ہوتی بیگم نے سانپ کی گڑگری میں سے گودا اور بیچ اٹھا لے اور اندو کے صاف تھوڑے صحن میں بکھیر دیے۔

ایک اندو کی مجلس سے دو اندو ہو گئیں۔ ایک تراندہ خود دھلی اور دوسری ایک کانچتا ہوا رابطہ جو اندو کے پورے جسم کا احاطہ کیے ہوئے تھا اور جو نظر نہیں آتا تھا۔

دن کہیں جانا بھی تھا تو گھر سے ہو کر..... نہاد صراچے پڑے ہیں۔ منجھی کی ایک جوتی جس میں خوشبو دار قوام لگا ہوا ہر منہ پر لگا کر..... لیکن اس دن جو دن گھر آیا تو اندو کی شکل ہی دوسری تھی۔ اس نے چہرے پر پڑ پڑ خوب رکھا تھا۔ کانوں پر روج لگا کر کئی قلمی۔ لپ اسٹک کے بہرے پر جوتھ ماسک کی بندی سے ناک لیے تھے۔ اوبال کچھ اس طریقے سے بنائے تھے کہ دن کی نظائیں ان پر لگا لگے کہیں۔
”کیا بات ہے آج؟“ دن نے حیران ہو کر پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ اندو نے دن سے نظریں پچاتے ہوئے کہا۔ ”آج فرصت ملی ہے۔“

شادی کے چندہ برس گزر جانے کے بعد اندو کو آج فرصت ملی تھی اور وہ بھی اس وقت جبکہ چہرے پر پڑ چھا شیاں بھی لگی تھیں۔
ناک پر ایک سیاہی کا کھلی گئی تھی اور بلاؤز کے نیچے، ننگے پیٹ کے پاس کرپڑ چلی کی دو تین تیس کی دکھائی دیے لگی تھیں..... آج اندو نے

ایسا بندہ دوست کیا تھا کہ ان محبوب میں سے ایک بھی چیز نظر نہ آتی تھی۔ بیوں کی چٹنی کسی کسان نہ بے حد صبر لگ رہی تھی۔ یہ نہیں چاہتے تھے کہ جن نے سچا اور سچا ایک دوسرا سا لگا۔ اس نے پھر ایک بار مدد کو اندک طرف دیکھا۔ جیسے گھوڑوں کے پیر یا کسی کسی نامی گھوڑی کی طرف دیکھتے ہیں۔ وہاں گھوڑی بھی اسی درجہ انکسار میں تھی۔ یہاں جو خطہ گنگے تھے شہر کی انکسوں کو نہ دیکھ سکے۔..... اندھ کچھ خوبصورت تھی۔ آج بھی چند سال کے بعد بچوں رشیدہ منہ باہرٹ اور ان کی پسین اس کے سامنے پانی جڑی تھیں۔..... پھر ان کو کھانے کا دیکھنا تھا۔ آسمان پر کوئی خاص بارشیں نہ تھیں۔ کس پانی چٹنا شروع ہو گیا۔ اندھ گھر کی کنگا کھینچا بی بی پرتی اور اس کو پانی کناروں سے نکل کر پوری تراف اور اس کے آس پاس بسنے والے گاؤں اور قصبوں کو اپنی لمبیت میں لے رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اسی غبار سے پانی ہوتا تو اس میں کیلا سن پر بہت بھی ڈوب جائے گا۔..... اندھ بھی روئے گئی۔ ایسا رونا جڑو آج تک نہ روئی تھی۔ دن نے اس کی آواز سن کر انکسوں بند کر دیں۔ کھولیں تو وہ سامنے گھر کی تھی۔ جان و مرث نہ کر۔ نہیں نہیں، وہ اندھ تھی۔ اپنی جان کی بھی اپنی بی بی کی جان جو اپنی انکسوں کے بنائے سے مسکرائی اور جڑوں کے کونے سے دیکھنے لگی۔

اسی کمرے میں جہاں ایک دن برہیل کی مصروفی نے مدھن کو چیکر ادا کیا تھا، آج خاص کی خوشبو نے بوکھلادیا تھا۔ پہلی بارش تیز بارش سے زیادہ خطرناک برہتی ہے اس لیے اہر کا بائی اوپر کسی کمرے میں رستا ہوا انداز مدھن کے بچے چھپنے لگا۔..... لیکن مدھن تو سڑی ہر بار تھا۔ اس شے میں اس کی آنکھیں مٹنے لگیں، آنکھیں تیز ہو کر انسان کی تھمسن نہ رہا۔

"اُندو۔۔۔ من نے کہا۔۔۔ اور اس کی شدت کی رات والی بکار سے روٹھ کر اوپر تکی۔۔۔ اور اندونے پرستہ کیسے ہوتے
کہا ہے۔۔۔ اور اس کی آواز دوسری بھی تھی۔۔۔ یہ آج کا نانی کی کہانے کے اناؤں میں تھی۔۔۔"

اس سے پہلے کہ وہ اندوکی طوط ہمارے چھاننا آئے اندو کی مرن سے لپٹ گئی۔ پھر وہ نے ہاتھ سے اندو کی پیشانی اوپر اٹھائی اور کہنے لگا: "اس نے کیا کھو یا کیا پایا ہے؟" اندو نے ایک نظر من کے سیاہ ہونے پر سے ہر طرف بھینکی اور پھر اٹھ کھین بند کر لیں۔ "کیا؟" "مرنے سے چرکتے ہوئے کہا۔" تمہاری آنکھیں سرخجی ہوئی ہیں۔"

میلوئی؟ اندو نے کہا اور بچی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "رات بھر کلیا ہے اس چٹیل جی نے۔"
 بچی ایک ننگا خاموش ہو گئی۔ گئی اچھ دم سادھے دیکھ رہی تھی ایک بابا کی ہونے والا ہے، آسمان سے پانی پڑا بند ہو گیا تھا۔ اقبی
 آسمان سے پانی پڑا بند ہو گیا تھا، وہ نے پھر عرصے اندو کی آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اے ملکہ۔۔۔ یہ آکسو؟"
 "نوشہ کی ہے۔" اندو نے جواب دیا۔ "آج کی رات میری ہے۔" اور پھر ایک عجیب سی ہنسی ہنسی ہوئی وہ مدد سے چٹیل کی ایک
 "تقدو کے احساس سے مدد نہ کیا۔ آج برسوں کے بعد میری س کی مراد پوری ہوئی ہے اندو امیں نے ہمیشہ چاہا تھا۔۔۔"
 لیکن تم نے کیا نہیں۔" اندو بولی۔ "یاد ہے شادی کی رات میں نے تم سے کچھ ملکا تھا؟"

”ہاں!“ ”دن بولا“ اپنے ذمہ فحشہ دے دو۔“

”تم نے تو کچھ نہیں مانگا مجھ سے۔“

”میں نے؟“ دلی نے حیران مہرے ہوئے کہا ”میں کیا مانگتا ہوں تو جو کچھ مانگ سکتا تھا وہ سب تم نے دے دیا میرے عزیز“

سے پیار — ان کی تعلیم، بیاد شایاں! یہ پیار سے پیارے بچے — یہ سب کچھ تو تم نے دے دیا۔“

”میں بھی یہی سمجھتی تھی۔“ اندو بولی، ”لیکن اب جا کر تہہ پہا، ایسا نہیں۔“
 ”کیا مطلب؟“
 ”کچھ نہیں۔“ پھر اندو نے رک کر کہا، ”میں نے بھی ایک چیز رکھ لی۔“
 ”کیا چیز رکھ لی؟“

اندو کچھ دیر چپ رہی اور پھر اپنا منہ پر سے کرتی ہوئی بولی، ”اپنی لالچ ————— اپنی غرضی۔۔۔۔۔۔ اس وقت تم بھی کہہ دیتے —
 اپنے شکم مجھے دے دو۔۔۔۔۔۔ تو میں۔۔۔۔۔۔ اور اندو کا گلہ زندہ ہو گیا۔
 اور کچھ دیر بعد وہ بولی، ”اب تو میرے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔“
 دن کے بالکل کئی گھنٹے کی گئی۔ وہ زمین میں گر گیا۔ یہ آٹن پڑھ عورت؟۔۔۔۔۔۔ کوئی ٹا ہوا فقرو۔۔۔۔۔۔ نہیں تو۔۔۔۔۔۔ یہ تو
 ابھی سانس ہی زندگی کی لٹھی سے نکلا ہے۔ ابھی تو اس پر برابر تھوڑے بڑے ہیں اور آتشیں برآمد چاروں طرف اڑ رہا ہے۔۔۔۔۔۔
 کچھ دیر کے بعد دن کے ہوش ٹھکانے سے اُڑ بولا، ”میں کچھ گیا اندو۔“
 پھر روتے ہوئے دن اور اندو ایک دوسرے سے پٹ گئے۔ اندو نے دلی کا ہاتھ پکڑا اور اسے ایسی دنیاؤں میں
 لے گئی جہاں انسان مر کر بھی بچ سکتا ہے۔۔۔۔۔۔

پریستو کرشن چندر

جب وہ گاڑی کا دروازہ کھولی کر ڈبلے کے اندر آیا تو اس کے چلنے کے انداز سے میں نے محسوس کیا کہ فوج میں ملازمہ چکا ہے۔ اس کی شخصیت بڑی پرتو دار قد چھ فٹ سے نکلن تھا۔ رنگ سرخ دسپید، بلاق نرانی داڑھی، اس نے کالی برج کے رنگٹ کوئی سوٹ پہن رکھا تھا۔ اور ڈبلے کے درمیان روشنی میں اس کی پگھلی کی تھوں میں سے ابدی کے ٹکڑے جواہر دینوں کی طرح چمک اٹھتے تھے۔ وہ بیدھا چلتا بڑا متوازن قدم اٹھاتا ہوا، میرے قریب آکر دکا جھک کر اس نے قریب کی سیٹ کا نمبر پڑھا اور اطمینان کی سانس لے کر سیٹ پر دروازہ مولا۔ سیٹ اس کے وزن سے پیچھے کو ہر گئی۔ اس نے مزید اطمینان کی سانس لی اور میری ٹانگ کو ہلا "یہ پیچھے کو ہٹنے والی کلڈر شستیں بہت عمدہ ہیں" میں نے اپنا جتنا بڑا سگریٹ جسے میں نے ابھی ابھی سلگایا تھا جلدی سے خاک دان میں بھجا دیا۔ بڑھاسکھ میری طرف دیکھ کر سلگایا اور اس نے کہا: شکریہ! مجھے تباہی کا دھواں واقعی بہت برا معلوم ہوتا ہے۔

مجھے اس کے دانت، جب وہ سلگایا تو بہت اچھے معلوم ہوئے۔ جید پید اور مضبوط دانت جڑے جڑے اور ہم سطح اس بڑے فوجی مکے کی عمر ستر برس سے کم نہ ہوگی۔ لیکن اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں اب بھی جوانی کی چمک اور اس کا تجسس پایا گیا تھا۔ اس عمر میں بھی وہ غیر معمولی طور پر صحت مند دکھائی دیتا تھا۔ لیکن اس میں کوئی شربنس نہ تھا۔ جیسے حسین اور دلدادہ شخصیت کا مالک رہا ہوگا۔ اس وقت اس کے چہرے پر مجھے جو چیز مکمل رہی تھی وہ متعدد زخموں کے نشان تھے دائیں بائیں اس کے رخساروں پر تین چار لائے لائے زخموں کے نشان رہ گئے تھے۔ دائیں رخسار پر تو زخموں نے ایک صلیب سی بنا ڈالی تھی اور بائیں رخسار پر یہ زخم انگریزی میں دی ۷ کا نشان بناتے تھے اور جب اس نے اپنی ٹانگیں ٹھیک کرنے کے لیے اتار دیں تو میں نے دیکھا کہ اس کی تھیلیوں کی پشت پر بھی ایسی جھوٹے جھوٹے بیسوں نشان ہیں جیسے کسی نے تیر دھاہ کے چاتو سے ان لوگوں کا تیرہ بنانے کی کوشش ہو۔

جلک! میں نے اپنے دل میں سرچا جانے پہل چمک غم کے عاز پر اسے یہ حادثہ پیش آیا ہوگا۔ وہ تو خیریت رہی کہ خوبصورت اور جید انسان کی ہاند یا ٹانگ نہیں گئی۔ درد نکلتا برا معلوم ہوتا یہ آدمی! مجھے اس معاملہ پر زیادہ حذر کرنے کا موقع نہیں ملا۔ مگر نگر دیکھو ان کار کے کمرے نے آکر کہا کہ اب آپ لوگ آکے کھانا کھا لیں ہم لوگ دس بجے لیٹو ران بند کر دیتے ہیں۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ہر حال میں اسے ساتھ لے گیا۔
 حالانکہ میں اٹھ بنے کھڑے کھانا کھا کر چلا تھا مگر اس وقت پیر بھوک محسوس کر رہا ہوں۔ بروہا سلکھ سنس کر مجھ سے متعلق تھا
 اور میں اس کیلئے وہیں کھانا کھا رہا ہوں کہ مجھے بھوک نہ تھی؛ میں نے جواب دیا۔

ہم دونوں ڈائننگ کابین میں جا کر بیٹھ گئے۔ وہاں بیروں کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ صرف ایک کونے کی میز پر ایک نوجوان جوڑا
 کافی پی رہا تھا اور کھڑکی سے باہر کڑک کر پرن ماشی کے چاند کو دیکھ رہا تھا۔ لڑکی کا مات مروکے ہاتھ میں تھا۔ جسے وہ غصے سے تھوڑے
 وقفوں کے بعد دوبارہ دینا تھا۔ مات کے پاس میں لڑکی کے چہرے پر ایک گنا مسکراہٹ کھل اٹھی تھی اور مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے رشک کے
 ہاتھ میں کوئی سوچ (SWITCH) ہے کہ جسے بار بار دبانے سے یہ مسکراہٹ بھیجی کے لئے کی طرح۔ دس حواس تھی۔ لڑکی کے بال خوش نما
 طریق سے کٹے ہوئے تھے اور وہ بڑی دل ربا صورت والی، مومنہ اداؤں والی لڑکی تھی اور شکل و صورت سے ایک ایسی ہندوستانی کہ سچن
 معلوم ہوتی تھی جس میں بونہ پونی ٹھن کا بھی دخل رہا ہو۔ لڑکا خاص ہندوستانی تھا۔ سارو سے بگ کا سرقا تھا۔ چھوٹا قد لیکن مضبوط اور گھٹا ہونے
 چھلکے بال اور چہرے پر تڑپ جڑوں پر گھٹے ہوئے شیو کی نیو ہٹ تھی۔ اس کے سر کی تہمت بھی بالکل تازہ تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ آج ہی بال
 لٹا کر آیا۔ ہٹے اس نے پورے بلے حد صاف تھے اور اس کے دوپٹے وہیں رہیں سے زندگی کی صحت مند آرزوئیں پھوٹ رہی تھیں؛
 لڑکی کا ایک ہاتھ اس نے اپنے مات میں سے رکھا تھا اور بار بار وہ اسے اس طرح دبا تھا جس طرح گایا وہ اس میں ہتی دو
 بھر نے کی کوشش کر رہا ہو۔ دوسرے مات سے وہ اس کی نیلی ماسی کا چوڑا رسکے جا رہا تھا اور اس کی بے حد سیاہ چھوٹی اور چمکیلی ٹھیکیں
 لڑکی کو اس طرح دیکھتی تھیں جیسے وہ لڑکی نہ ہو جس کی ایک ہیٹ ہو۔ محبت میں صحت کو کس قدر دخل ہے۔ میں نے اپنے زور و رضاؤں
 کو آہستہ سے تبدیل کیا۔

جواب میں بڑے سکون سے کچھ نہ کہا۔ کیونکہ اب کھانا ہم دونوں کے سامنے تھا اور وہ مکمل انہماک سے کھانے کا جائزہ لینے میں
 مصروف تھا۔ سارے کھانے کے دوران میں ہی وہ چڑھتا ہوا کافی پی کر ادھل ادا کر کے چلا گیا۔ چلتے چلتے وہ گنا مسکراہٹ پیر لڑکی کے ہونٹوں کی
 اور مجھے اس لڑکی کی وہ گنا مسکراہٹ اس کے ہنسنے کی اداس حد پسند آئی۔ جب وہ رشک کی طرف دیکھتی تھی کتنی جاہلیت اور سپردگی تھی اس کی
 نگاہ میں کسی بھی نوعیت ایک نگاہ میں سب کچھ دے دالتی ہے۔ اور پھر ایک خالی برتن کی طرح معصوم کھڑکی کی کھڑکی دیکھتی رہ جاتی ہے۔ بس
 اسی وقت وہ سب سے پیاری بھی معلوم ہوتی ہے۔ مسکراتے کے بعد کچھ اس طرح کی نگاہ سے اس لڑکی نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا تھا اور
 پھر صحتاً کھانے کا مات پکڑ لیا تھا اور نوجوان اس کی کہیں مات ڈال کر اسے دینی بول میں لے گیا تھا اور ان کے جانے کے بعد لڑکیوں کا
 اور میں سوئی سوئی رہ گئی اور کھڑکی میں ٹکا ہوا چاند مجھے ایسا محسوس ہوا گویا صرف انہیں کے لیے لٹکایا گیا تھا۔ میں نے بات بڑھا کر
 کھڑکی پر پردہ ڈال دیا۔

بروہا سلکھ میری حرکت پر مسکرایا۔ مگر خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔ کھانا کھانے کے بعد بڑے سکون سے کافی پی لٹکائی اور میں سکرپٹین
 کے لیے باہر دینی بول میں گیا۔ دینی بول کے ایک کونے میں وہ نوجوان اس لڑکی کو جہم رہا تھا اور چاند لڑکی کے چہرے پر تھا۔ اور اس کی آنکھوں
 سے آنسو بہ رہے تھے۔

(رشک نے حیران ہو کر پوچھا۔ یہ آنسو کیسے؟)

کچھ نہیں رہی، لڑکی اپنے آئینوں کو پختہ ہونے لگی اور پھر لکھلا کر منی پڑی اور اس کے چہرے پر وہ دلاؤ و تہمتیں مہرنا محبت میں ڈوبا ہوا۔ گلن، تہمت!

لڑکے نے پھر اسے ایک بار چوما۔

لڑکی کے شانے کا نیچے جس نے ٹھٹھکے کہا۔ چومو! اور گلن یہاں سر دی ہے۔ اس نے خاموشی سے اپنی نگاہیں میری طرف اشارہ کیا۔ میں جو دوسری لڑکی میں کھڑا بظاہر باہر پڑا، بنا کے چاند کو دیکھ رہا تھا، لڑکے نے میری طرف اس طرح دیکھ لیا مجھے ابھی بھرا مجھ کو دے گا۔ پھر اس نے آہستہ سے گھوم کر لڑکی کی کمر میں ات گھا اور اسے دیکھی پورل سے نکال کر اٹھ رہے ہیں لے گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد بوڑھا سیکھ بھی لائی بی کر سبوراں کا ر سے نکلا میں نے بھی اتنے میں اپنا سگریٹ ختم کر لیا تھا۔ ہم دونوں واپس اپنے دہلے میں آکر اپنی سیٹوں پر دروازہ ہو گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد گاڑی دھڑکتے میں آیا۔ اس نے سب جہاں بچھا دیں لیکن وہ بے کے باہر چاندنی مکمل طور پر مکمل ہوئی تھی اور اس کی سیدہ درم روٹی میں لڑکی کے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہرے خاموش اور کستے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔

میں نے کہا۔ مجھے اس چاندنی میں غیب نہیں آتی۔ لکھائی کا پرورہ گاڑوں؟

دراغھو! بوڑھے سکھ نے بہت ہی دیکھے پھر میں بے حد پر سو آواز میں کہا۔ یہ پورم کی رات بہت بھیا ایک ہے۔ بہت خوبصورت بھی ہے مجھے اس سے دور لگتا ہے کہ میں اسے دیکھتا ہوں۔ کچھ دیر اور اس چاند کو دیکھ لوں؟ چاند کو تو فوجان لوگ دیکھتے ہیں۔ ہمارے ہمارے دیکھنے کی ہر چیز نہیں۔ میں نے انزوا بہت کم ساتھ کہا۔ بوڑھا سکھ سیرایا اس کا دایاں دسار۔ چاندنی میں تھا اور سبب کا نشان بہت کم دکھائی دے رہا تھا۔ بائیں رخسار کی وی (۷) تارکیں میں گم تھی۔

میں نے کہا۔ تمہارے رخساروں کے یہ ڈھمکیاں تم نے جگ میں حاصل کیے ہیں؟ جگ؟ جگ؟ بوڑھے سردار نے میری طرف دیکھ کر اپنے آپ میں گم ہوتے ہوئے کہا۔

ہاں! جگ ہی تو تھی۔ وہ لڑک کر آہستہ سے بولا۔

کون سی جگ؟ بائیں جگ؟ غصہ یا اس سے پہلے کی کوئی جگ؟ میں نے پوچھا۔

میں تو کبھی فوج میں نہیں رہا، بوڑھے سکھ نے آہستہ سے کہا، میرا جاس بے بنیاد ثابت ہوا اس لیے میری دلچسپی بڑھ گئی۔ میں نے چپکا

پھر یہ غم کیسے؟

بوڑھے سکھ نے ادھر ادھر دیکھا، چاند اپنی جگہ تھا۔ لڑکی اپنی جگہ تھی۔ مسافر جو میں میں خال خالی تھے تو جہاں تھے وہیں کے ہیں ابھی آرام لیں، پور دوا دوسرے تھے۔ ہمارے آگے پانچ پھر بیٹیں چھوڑ کر اخیر میں تا ایک کونے میں وہ لڑکا اور لڑکی اپنی اپنی کرسیوں پر دبے ہوئے تھے۔ لڑکی کا لڑکے کے شانے پر تھا اور لڑکے کا بازو لڑکی کے شانے پر تھا، گلیس دونوں کی ہڈی تھیں۔

بوڑھے سکھ نے مجھ سے پوچھا۔ یہ تھوڑے دوسرے لوگ؟ اگر نہیں تو یہ نہ آری ہونا دو۔

نہیں تو مجھے اس چاندنی میں کبھی نہیں آنے لگی! بوڑھے سردار نے بڑے کڑبڑ میں کہا۔ پھر اس نے اس طرح سے کہا جسے وہ قدرت نے کسے لیے تیار ہو چکا ہو۔ اس نے ایک لمبی سانس لکھ کر کہا۔ اچھا تو سن کر تمہیں یہ لکھ لکھ جانی ہو اس لیے نہیں دیکھتے ہیں کوئی طرح نہیں

کاٹ کر ٹکڑوں میں دوہرے بیٹھے گلے ہوسے تھے جن کی دھڑ سے گاڑی کی چمک چمک ہنسے بیٹھے بیٹھے دم نمودگی سے ہر نہرے میں اندر آتی معلوم ہوتی تھی اور گاڑی کے دو دروازے پھیل ہوئی سفید چاندنی میں سیاہ درخت اپنی شاخوں کو بیٹھے ہوئے، ہر چھلانے ہوئے لگا بنگار عروسی کی طرح کھڑے تھے۔

سردار نے کونے میں سوسے ہوسے سر اسٹے زحمان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ جراتی میں بھی اسی طرح ٹھہرے ٹھہرا اور لاہورا اور خود سر میرا باپ کچھ رنگہ مرض حاصل کا بھرا رہتا اور اس کے علاوہ چاک زہرہ ۳ بھی پورے لاہورا ہماری ملکیت میں تھا گھر میں کھانے پینے کی کوئی کمی نہ تھی۔ گلاب نے بھی بی بی اس کے لڑا ہوا لیکن مجھے شروع ہی سے کھیتوں میں کام کرنے کا شوق تھا۔ قلم کی بجائے میرے ہاتھ درختی چھلانے میں مشاق تھے۔ جمانے میں نے بی بی اسے لکھے کر کیا۔ ہرے باپ کی آرزو تھی کہ میں ہرقی ہو جاؤں۔ کراٹل ہڈوں طرح مجھے کھیتوں کی زندگی پسند تھی۔ بھوری بھوری مٹی کی سونڈھی جھلک، شیشم میں ڈوبے ہوئے ہرے ہرے چنوں کا بوٹ، دور دھراں کے نیچے پانی بھرتی ہوئی تابوں کی تھار اور میری سنہری گھوڑی کی دھکی چال، کچے راستوں پر ہلکی ہلکی دھل جگاتی ہوئی۔ آہ۔ آہ۔

میں نے کہا تم اپنے نیا بے میں بے حد حسین رہے۔ عورتیں تم پر بہت مرنی ہوں گی۔
بڑے سے سکھ نے عرس سکرامنٹ سے کہا ایسا تو مجھے کچھ یاد نہیں کہ کسی نے مجھ سے محبت کی ہو۔ ان میں سے مزدور ایک ڈاک سے محبت کی تھی۔

کون تھی وہ ؟

میری بیوی تھی !

بیوی ؟

جب میں بی بی اسے پاس کر کے گاؤں واپس آیا تو میرے باپ نے چاک جھراں کے بھڑواہ کی ہڈی پر تیرے پیرا بیاہ کر دیا۔ پر تیرا بڑی خوبصورت لڑکی تھی لائی اور بچی گوری اور سنہری چمکیلی اور نرم سے کراؤ گندل گزریں گزریں کی آنکھوں پر مڑتا تھا۔

کیوں ان آنکھوں میں ایسا بات تھی ؟ میں نے پوچھا۔

سچا ہے تو کوئی خاص بات نہ تھی۔ بڑی بڑی عقیں اور کانی سیاہ ! گرائیسی تو بہت سی عورتوں کی آنکھیں ہوتی ہیں، پھر بات کیا تھی ؟

کہ نہیں سکتا۔ ان آنکھوں کا رنگ، نہیں نہیں دیکھ نہیں، ان آنکھوں کا بوجھ کچھ عجیب سا تھا۔

وہ آنکھیں بولتی تھیں ؟

بولتی تو تھیں عقیں۔ بس بولنا چاہتی تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ مجھ سے کہہ لیں گی۔ مگر وہ مجھ سے کچھ نہ کہیں۔ ہر وقت پہلے سے دیکھتی رہتیں، کبھی ایسی آنکھیں تم نے دیکھی ہیں جو ہمیشہ سنا سادہ لگتی ہیں۔

جراتی میں بھی آنکھیں پہنے دیکھتی ہیں میں نے کہا،

ہاں ! لیکن پہنے ہر ایک کے الگ الگ ہوتے ہیں !

مجھ سے ابتر سے کہا۔ میں تو اپنی پر تیرا پر مشا خدتم کہہ سکتے ہو کہ یہ اس لیے ہوا کہ میری زندگی میں اس سے پہلے کوئی نہ آئی تھی

نہ اس سے پہلے نہ اس کے بعد۔۔۔۔۔۔

جاو تو تم نے نہیں دیکھی۔ دردِ زبوں نہ کہنے دہ تو ایسی عورت تھی جس سے اس نے کہی ہوئی ہونے کے بعد بھی اس سے عشق کیا جاسکتا تھا اور پھر یوں ہی ہوا۔ جب میں گاؤں پہنچا اور میں نے فوج میں بھرتی ہونے سے کانٹنے کو ترجیح دی تو میرے باپ نے فوجاً میرا یہاں کر دیا اور مجھے کھیتوں پر کام کرنے کو لگا دیا۔ حالانکہ اسے اس بات میں بڑی مایوسی ہوئی ہوگی۔ مگر میں تو بہت خوش تھا۔ تم جانتے ہو کہ میں فوج میں ہوتا تو کیسے اپنی پرست سے محبت کر سکتا تھا۔ اب تک تو فوجیوں کی کسی نہ کسی لڑائی میں امی میں فرانس میں یا ایٹلیٹھیا یا دورہ خبر میں کہیں نہ کہیں ان لوگوں نے میری جان لے لی ہوئی حالانکہ میں نہیں کہہ سکتا کہ جو کچھ ہوا وہ اچھا بنایا جا رہا ہو۔

یلاک دہ جب ہو گیا۔

میں بھی چپ رہا۔

۷۔ ت دیر کے بعد وہ بلا۔ قصہ مختصر یہ کہ میں اپنی پرست کو بہت چاہتا تھا اور وہ بھی مجھے بہت جانتی تھی اور ہم کسی ایک دن کے لینے بھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہونے تھے لیکن ہماری شادی کے چھ ماہ بعد کیا ہوا کہ میرا سر سرہنے گاؤں میں سخت جا رہا اور پرست کو اپنے میکے جانا پڑا اس کا باپ زیادہ تھا۔ اس لیے میں بھی اسے کیسے روک سکتا تھا چنانچہ پرست ہی گئی۔ لیکن اس نے جانے کے بعد میرا دل اپنے گھر میں کھیتوں میں اپنی فوجی سواہی میں کسی کام میں نہ لگتا تھا۔ میں دن رات میں نے جیسے تیسے کر کے کامے لیکن جیسے دن میں نے اپنی گھوڑی پر زین کشی اور سر پر ہویا۔ اپنی سسرال کے گھر۔ چاک بھراں ہمارے گاؤں سے تیس کس پر واقع ہے لیکن میری گھوڑی بڑی تیز رفتار ہے۔ میں شام ہونے ہوتے چاک بھراں پہنچ گیا۔ وہاں جاکے معلوم ہوا کہ میرے سسرال کی حالت پچھلے سے بہت بہتر ہے بلکہ میں نے اسے خاصا شہناش و نشاط پایا۔ اس اس کو سسرالوں مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ دادا اپنے سسرال کی صحت کو چھین چلا آیا ہے۔ تو وہ میری سعادت مندی بہت خوش ہوئے۔ دن بھر میں کس کا شکر کرنے سے میں بہت تعجب گیا تھا اس لیے کہ میری گھوڑی کے میں ہو گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب جو سولہ گاؤں پرست کی اُٹھوں گا میں نے پرست سے کہا مجھے صبح فردا اٹھا دینا۔ میں گھوڑی پر سوار ہو کر صبح میرے گھر جاؤں گا کہیں ایسا نہ ہو کہ دن چڑھے ملک ہوتا ہی نہ ہوں۔

لیکن گواہ کہ اس رات تیسرے پہر ہی میں میری آنکھ کھل گئی اور میں یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا کہ میری بوری بیسٹریٹر پر نہیں ہے اور کمرے کے آخری کمرے پر دروازے کے کھٹے سے کھٹنے اور ہڈ ہونے کی آواز آئی اور ایک سارہ سا دروازہ۔ نے پرست کو دیکھا ہوا معلوم ہوا۔ میں انھیں دل کر اٹھ بیٹھا۔ جاگڑو یہ کیا ماجرا ہے اس سوچ سوچ کر میں آہستہ سے اپنے بستر سے اٹھا۔ کرپان کو تکیے کے نیچے سے نکال کر پہنا اور آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر ہو گیا۔

باہر ایسی ہی چاندنی رات تھی۔ بڑی خوبصورت خوشبوؤں والی چاندنی رات تھی۔ سرس آلودہ شمع کی شاخوں میں چھپے ہوئے گھونٹوں میں کبھی کبھی چڑیاں غونڈی گیں چوں چوں کہیں۔ گھر ان کے چرے فزا اپنی مضبوط جھجک سے تنہا ملک کی انہیں اپنی گود میں دبا لیتے تھے۔ پاؤں شبنم میں بھیگ چکے تھے اور میرے چاروں طرف سرسوں کی ہری ہری کوئلیں ہزار ہی تھیں اور کھیتوں میں گونڈا ہوا اپنی پدیتوں کے تعاقب میں جاتا تھا پھلے میں سے سوچا جادہ کھیتوں میں سرودی حواج سے فارغ ہونے جا رہی ہے۔ لیکن جب اس نے ایک کھیت کو پار کیا۔ دوسرے کھیت کو پار کیا۔ تیسرے کھیت کی مودان سے گھر مچے کے خشک نالے کو پار کیا کہ کھیتوں کے نیچے سے ہونگئی تو مجھے کچھ تعجب طبع کی تشویش۔ حیرت اور کوفت ہی ہو گئی۔ دل کو دھچکا سا لگا اور اب میں بولے ہوئے بہت ہی احتیاط سے اس کے تعاقب میں چلنے لگا

”تا کہ اُسے پتہ نہ چلے کہ کوئی اُس کے تعاقب میں ہے۔ تیسرے کیفیت کی مصلحت سے اُوڑ کر مارے کو پار کیا۔ پھر احتیاط سے میلوں کے پیچھے سے گھوم کر میں نے اُس کے متفرق ہو جانے کی۔“

مائنے پھر مرسوں کے کھیت تھے۔ کھیتوں کے بیچ میں ایک کنواں تھا۔ کوئیں کے قریب بیروں کا ایک سائے دار جھاڑ تھا۔ جھاڑ کے نزدیک ایک چنگ بھی تھا۔ چنگ کے قریب ایک نائیکوٹ گھر تھا جس کا دروازہ آدھا کھلا تھا۔

اور میرن بوری اس چنگ پر ایک جات کے ساتھ سوڑی تھی۔ میری پرتو۔ میری بوری اُس سے بہت زیادہ گڑھی تھی وہ بابا اس کی آنکھیں جھنکی اور اس کے حصار اور کشتی شدت تھی اُس پیا۔ میں۔ میری آنکھوں میں خون اُڑنے لگا۔ میں چپکے بیروں کے جھانکے پیچھے گھڑا اُن لوگوں کو یاد کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ہاں ہاں! اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ۔

کچھ عرصے کے بعد جات نے میری بوری سے کہا۔ پرتو! مجھے پیاس لگی ہے اندر سے پانی لاؤ۔

پرتو نے اپنا سر اُس کے سینے سے بٹایا اور بولی بچنے کی تیری پیاس کیا! ابھی تک نہیں بجھی؟

بجھا جواب میں صرٹ مسکرا دیا اُس نے میری بوری کے بوٹ چوم لیے۔ پرتو! تمہارے سے چنگ سے اُٹھی اور آدھ کھلے دروازے

سے نکلنے مکان کے اندر گئی۔ پچھا اندر سے منہ لٹ کر بڑے آفتاب سے دروازے کی طرف دیکھے۔ ظاہر یہ کہ میری بوری باطل نکل تھی۔

یہ ایک ہی سنے کا بیان نکالی اور اُسے اپنے دو دن ہاتھوں میں لے کر سر کو ڈوبا اٹھا اور پھر اپنی پوری طاقت سے بچنے پر دواد کیا۔ بچنے کے منہ سے خاک کی ایک ٹہنی اُڑائی۔ دوسرے لمحے میں اس کا سر قلم ہو گیا۔ پھر میں بیروں کے جھاڑ کے پیچھے سے کھنڈوں میں غائب ہو گیا۔ میلوں کے پیچھے سے مارے کو جھوڑ کے مرسوں کے کھیتوں میں سے گزرتے ہوئے میں نے چند عرصے کے لیے لوگ کہانی زبان کو سنی تھے یہی صرٹ صرٹ کی اور جب وہ باطل صرٹ شغاف ہو کر سینے کی طرح چلنے لگی تو اُسے میان میں دلوں کو گھر کے اندر آگیا اور کمرے کے اندر آکر پھر اپنے بستر پر سو گیا۔

کوئی آدھ دن گھٹنے کے بعد پرتو تیسرے گھر میں دیر سے داخل ہوئی، میں جاگ رہا تھا۔ لیکن میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور لمحے لمحے سانس بیٹے ملا۔ پرتو نے دروازہ کھل کر پہلے تو مجھے غور سے دیکھا۔ پھر اس نے آہستہ سے میرے پیچھے کے نیچے سے کہان نکالی اور اُسے گھر لے کر دیکھا۔ اور جب اُسے باطل صرٹ پایا تو گویا اُس کے دل کا شہر دور ہو گیا اور وہ میری بطن میں آکر لیٹ گئی۔ چپ چاپ پھر کی سل! پرتو! کچھ چپ ہو گیا۔

چند گھنٹوں کے انفراد کے بعد میں نے بڑی بے چینی سے پوچھا۔ پھر کیا ہوا۔

کچھ نہیں پتا اُس کا باپ چوڑا کھشت یا ب ہو چکا تھا۔ اس لیے میں پرتو کو لے کر دوسرے دن ہی اپنے گھوڑوں پہن آیا اور ہم دونوں ہنسی خوشی اُٹھے۔ رہنے لگے۔

دن بیتے۔ مہینے بیتے، سال بیتے۔ میں نے کبھی اس بات کا تذکرہ نہیں کیا۔ پرتو نے کبھی کسی بات سے مجھ پر یہ ظاہر ہونے یا کر کے کسی بات کا بھی شہ خراٹا نہیں کیا۔ کسی بات کو کوئی ذکر تھا۔ ہاں، ایک بات میں نے مزید دیکھی تھی۔ اس واقعہ کے بعد وہ کبھی چلنے بیٹھے نہیں گئی۔ میرے پیچھے پڑا اپنے باپ کے اعزاء پر بھی نہیں لگتی۔ مرنے مرنے میں بھی اس واقعہ کو محفل سا گیا۔ کوئی اب میرے پیچھے ہو گئے تھے میرے اور پرتو کے پیچھے دو اڑنے والے اور ایک بڑی۔ بڑے خوبصورت بچے تھے ہمارے باپ اور دیپ اور میرن کو۔ بڑھتے بڑھتے بچے بھی

جسے ہر گئے اور سکول جانے لگے۔ سکول سے کالج جانے لگے تو ہمارے ان تیسرا لڑکا پیدا ہوا۔ ہر برس ٹھکانا اب ہمارے گھر میں شادمانی اور مسرت تھی۔ آرام و سکون، خوشی اور یقین، گہری رفاقت اور مخالفت جیسے گھروں کی مثال بنتی ہے!

ایک روز میں شام کے وقت کھینٹوں سے واپس آکے گھر کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ پتہ اب اور دیپ کالج سے واپس آ گئے تھے کڑی کی چھیدیں گزارنے کے لیے، ہر نام ایک کونے میں کنیز کا ٹھکانہ رہی تھی۔ میرا سات سال کا ہر برس کڑی کے گھر ڈسے کو چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پرتو گھر کے نیچے ایک کونے میں چھپے میں کڑی کی روٹیاں سبک دیتی تھی۔ لاشی میں برسوں کا سا گڑا ہوا تھا۔ اور اس کی کھٹ لیتی خوشبو میری جھوڑا اور بھی بے چین کر دیتی تھی۔ میں نے جلدی سے کپڑاں کھنکھانے لگا دیں اور کڑی کو دانت مزہ دھار پرتو کے سامنے بوندھا بچا کر بیٹھ گیا اور بالکل بچوں کی طرح بے چین ہو کر اس سے کھانا مانگنے لگا۔

پرتو جلدی سے کھانا دے دے!

پرتو نے سب سے پہلے میرے لیے کھانا پر دوسرا پھر پرتاب کے لیے، ابھر دیپ کے لیے، ابھر ہر نام کو رک کے لیے، سب سے پھوٹا ہر برس نے چل کر کہا: میں تو ان کے ساتھ کھانا کھاؤں گا۔

میں نے پرتو سے کہا تو بھی بیٹھ جا اب!

میں بیٹھ جاؤں گی تو تمہیں کھانا کون کھلائے گا؟ پرتو نے ذرا ناک میکر کر کہا۔

اس وقت پرتو مجھے کی روشنی میں اس کے رخسار دیکھتا ہوا تھے اور انھیں مرنے کو دفعتاً مانتے پڑا ذاتی تھی مجھے وہ اس وقت بہت اچھی لگ رہی تھی۔

ماں! مجھے برسوں کا سا رک اور دے دے، دیپ نے اپنی تھالی بڑھاتے ہوئے کہا۔

پرتو نے ہاتھ میں سے ساگ کی کڑی بھر کر مجھے دیپ کی خالی میں اڈھل دیا۔

میں نے کہا ہر برس کی ماں! غصہ سا اچارا کر اس وقت کہیں سے مل جائے تو کھانے کا مڑا دوڑنا ہو جائے۔

اچار تو اذ کو کھڑی میں ہے! پرتو نے ٹوک ٹوک کر کہا۔

کر کہا ہوا اندر سے جا کے لا دے۔

پرتو ہنس کر بولی اکیس کیسے جاؤں؟ اندر تو بڑا اندھیر ہے مجھے ڈر لگتا ہے۔

ڈر لگتا ہے؟ کیا کبیر سے سڑ سے بے اختیار نکلا۔ اس وقت سب کے سامنے اندر جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ لیکن مسرات

کو کھیتوں کو بار کر کے اکیلے جانے میں ڈر نہیں لگتا تھا؟ کیا کبیر میں نے نک کر کہا جانے کیلئے کہہ دیا اتنے سالوں تک جس بات کو کہیں نہ کہا تھا

کیسے وہ بات ہر لمحہ بن کر اتنے سالوں کے بعد میرے ہر ترس پڑا لگتی۔

پرتو نے بیٹھے بیٹھے بس ایک لمحے کے لیے مجھے دیکھا۔ دوسرے لمحے میں مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ کپڑا بیٹھے میرے کمر

کھڑکی سے پھرا کیسے کھلی۔ اتنی تپتی اور میں نے اپنے آپ کو بچانے کے لیے ہاتھ اوپر اٹھائے۔

ایک بار، دوبار، تین بار کپڑاں میرے ہماروں کو لاشی ہوئی پس گئی۔ میں نے اپنے بچاؤ کے لیے اپنے ہاتھوں سے اسے

دھونکا جانا۔ اور چھلایا۔ پرتو، پرتو! کج جا۔ تم پرتو ایک سبک کی شیرنی کی طرح چھوڑ دو، کڑی وہی، آخر غصہ میں بھر کر میں نے ایک جھٹکے میں کپڑاں

اُس کے ہاتھ سے جیمین کی اور دونوں لاکھڑوں سے کہاں کو اٹھا کر اور اپنے جسم اور دُورِ ج کی پوری طاقت سے پرتیز کی گھون پڑ
بھر پور وار کر دیا۔ پرتیز کی گھون لٹ کر جیمین کے گھوڑے کے قدموں میں جا گری اور وہاں سے تھک کر میرینِ عظمیٰ میں اوندھی ہو گئی اور
اس کے کیا حال کھل کر میرے سامنے بچھ گئے۔
بڑھاپا سکھو چُپ ہو گیا۔

میں بھی چپ رہا۔ ٹھوکی میں چاند بھی، ایک لمبوت ناک سمیت کی طرح خاموش ٹھہرا تھا۔ گاڑی کے سافٹوں کے چہرے سپید اور مستے ہوئے تھے۔ عجیبے و چہرے نہ ہوں۔ ہر دیویوں کے خول ہوں۔ گاڑی ٹھیکیتوں میں سے گزرتی ہوئی معلوم منزل کی طرف بڑھتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ اور چاند مجھ پر اور بے کس نسبتاً اور کچل ٹھوکی میں ٹھہرا تھا۔

بہت دیر کی خاموشی کے بعد بڑے سکون سے دنگیر لکھے میں کہا۔
 عورت کبھی نہیں خاموش رہے۔ وہ لوگ عورت کو نہیں جانتے تو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اسے ایک ڈولی میں سوار کر کے، ایک پتنگ پر ڈال کر
 چارہ بچے پیر کر کے اس کے دل کو پھینا اس سے ہمیں ملکتے ہیں۔ وہ لوگ عورت کو نہیں جانتے۔
 عورت کبھی نہیں جھوٹی!

بروٹھا سکھ فرما دیا کہ میں نے اپنے خضار کی صلیب پر آہستہ سے انگوٹھا لٹکایا اور خاموش ہو گیا۔ مجھے اب محسوس ہوا جیسے وہ صلیب بہت گہری آس کے دل کے اندر ڈوب چکی ہے۔

گامزن ہیں اس قدر سنا تھا کہ مجھے اپنی سانس روکتی ہوئی محسوس ہوئی میں نے مزاح کو دل دیتے ہوئے پہلے سانس اندر کر لیا پھر اچانک میری غور کو سننے میں سوئے ہوئے جوتے پر پڑی، زلکا کا ہاتھ اچھٹا کر کے کہتا تھا میں تھا اور تونکے کا باؤ ابھی تک زلکا کے شانے پر تھا اور دونوں کی آنکھیں بند تھیں اور دونوں سو رہے تھے۔ یکایک زلکا نے تونکے کے شانے سے سر اٹھایا۔ اترے سے ہاتھ زلکے کو کھینچے نکالا اور لٹانے کی حرکت دیکھا اور جب اسے امینا کو گریہ کر لگا تو امیگر بیڈن سو رہا ہے تو زلکا نے خود جان کا باؤ دیا اپنے شانے سے الگ کیا اور اس سے مزید پھر کر گھانا کی حرکت دی۔ پھر ایسی حیرت آمیز نگاہ سے دیکھا جو اس کی عین رسلو کا بہت کی قدرم پر نگہ زیب کرتی تھی۔ امیرو باطل ہو چکا رہ گیا۔ یکایک سیرے ذہن میں باب کی ان ہی لمبائی کی محسوس ہوئی اور میں نے سو کر کہ آنکھیں میچ کر لیں۔

دوسرے کچھ جب میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو زلکا نے اپنے کھڑکی پر پردہ گرا دیا تھا اس کا چہرہ اندھیرے میں تھا۔ گو میں اس کا چہرہ نہ دیکھ سکتا تھا۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ رو رہی ہے۔

نہنّی کی نانی

صحت جیتائی

نہنّی کی نانی کا نام بابا نامہ تھا۔ لوگوں نے کبھی انھیں اس نام سے یاد نہ کیا۔ جب چھوٹی سی لگیوں میں بابا ٹیڑھا ہوا تو قہقہے تو بھانپنے کی لڑائی کے نام سے پکارا گئیں۔ پھر کچھ دن ”بہنّی سے کی بہو“ کہا میں پھر ”بسم اللہ کی ماں“ کے لقب سے یاد کی جانے لگیں۔ اور جب بسم اللہ صاحبہ کے اندر ہی نہنّی کو چھوڑ کر چل بسی تو وہ ”نہنّی کی نانی“ کے نام سے آخری دم تک پہچانی گئیں۔

دنیا کا کوئی ایسا پیشہ نہ تھا جو زندگی میں نہنّی کی نانی نے اختیار نہ کیا۔ بوکھڑا کلاس پڑھنے کی عمر سے دو تیرے میرے گھر میں دودھ کی روٹی اور پلنے پھڑکنے کو حوض اوپر کے کام پر دھری گئیں۔ یہ اوپر کا کام کتنا بچا ہوتا ہے۔ یہ کچھ کہنے کو نے کی عمر سے کام پر جوت جیسے معاملے دے لے ہی جانتے ہیں۔ ننھے میاں کے آگے جھجھنا بھانے کی غیر دلچسپ ڈیوٹی سے لے کر بڑے سرکار کے سر کی ماش ٹانگ اوپر کے کام کی فہرست ہیں آسانی ہے۔

زندگی کی دوڑ بھاگ میں کچھ عرصہ جھلسا بھی آگیا۔ اور زندگی کے کچھ سال مانا گیری میں بیت گئے۔ پر جب دہائی میں جھپٹا بھاگ رہی اور دو ٹیوں میں مکھیاں پروٹنے لگیں تو مجھ کو جھٹکا ہونا پڑا۔ اس کے بعد تو نہنّی کی نانی بس لٹائی بھائی کرنے دھڑکی اُدھر پہنچانے کے سوا اور کسی کمر کی نہ رہیں۔ یہ لٹائی بھائی کا پیشہ خاصا سناٹا بن جاتا ہے۔ محکمہ میں کھٹ پٹ چلتی رہتی ہے۔ مخالف کیمپ میں جا کر اگر ہر ہشتابی سے مخبری کی جائے تو خوب خوب خاطر مدارات ہوتی ہے۔ لیکن یہ پیشہ کے دی جلتا، نانی ننّی بھولنے لگیں اور والی گنتی نہ پا کر تانے آخری اور مفید ترین پیشہ یعنی مندر پر ترقی پر جبکہ مانگنا شروع کر دی۔

کھانے کے وقت نانی تاک چیل کر سو گھنٹیں کرکس گھر میں کیا پاک رہا ہے۔ بہترین خوشبو کی ڈور کچھ کڑوا گھڑی آن میٹھیں۔

”اے ننّی ننّی ڈالی میں گوش میں؟“ وہ بے تعلقی سے پوچھتیں۔

”نہیں بوا کھیں ٹوڑن آج کل گھیں کہاں ہیں۔“ اوڈا سے ہیں۔

”اے سماں اللہ۔“ کیا خوشبو ہے۔ اللہ کے بسم اللہ کے بادا کو آؤں سے عشق تھا۔ روزی کی بسم اللہ کی ماں آؤ گوسش۔

جب دیکھو آؤ گوسش۔ اب تو میمنوں گڑجا دیں آؤ گوسش جو آنکھوں سے بھی دکھ جاوے اے بیوی کو تعمیر بھڑو دیا؟ وہ ایک دم ٹکڑے ہو جاتی ہیں۔

”نہیں بوا کو تعمیر بھڑو سب مانا کیا مٹا سنے کا کیا کیا۔“ بی بی لونٹ گیا۔

”سب سے بڑے کو حقیر کے جھلاؤ، گوش کیا خاک مرہ دے گا۔ حکیم جی کے میاں نمون لگا ہے۔“
 ”اے نہیں! ان کی حکیم جی کے ہونے سے کل شین برائی کی تنگی میں کھلی لگا دی۔ اسی پر میں نے کتابہ وار جوت بھیج دیا تھا۔ تو...“
 ”مے میں کوئی مٹانے نام سے تھوڑی مانگو گی؟“ ادا ناتی بڑی سنبھال سیلیرس پٹائی حکیم جی کے یہاں جا پختہ ہیں۔ دھوپ کھانے سے پہلے
 کھانسی، ٹھنسی، ٹپکائی کے ہار منڈ بیک بچ جاتی ہیں۔ پہلے ایک پتی توڑ کر سونگھنے کے بدلے چکی میں سلطیں۔ حکیم جی کی ہسوک آندھ چچی اور ادا ناتی نے
 کو حقیر پر پکٹی کو حقیر مٹا کر کھانے کے بعد ظاہر ہے دو نواسے کی حقدار ہو ہی جاتیں۔

غالی اپنے ہاتھ کی موغالی کے لیے سارے عقد میں شہر میں کھانے پینے کی چیز کو بھی اور رقم مار نکلیں۔ بچے کے دودھ کی پتیلی بوند
 سے لکائی دو گھونٹ منٹ لیے رشکر کی چینی مار لی۔ گولی ڈیٹی تالو سے چپکانی منہ سے دھوپ میں پھٹی جوس پینا ہیں۔ ڈلی ادا ناتی شینے میں افس
 لی۔ دو چائیاں میں اور ادھی شینے کے ادھر ادھی اور ادھر پورے مرگا کرتا آسترا آسترا حسب معمول کی اجتنی کو کھاتی کھسک کہیں۔ سب جانتے
 تھے۔ پر کسی کو منہ کھولنے کی ہمت نہ تھی کیونکہ ان کے بوڑھے ہاتھوں میں بھلی کی سی مہارت تھی اور بے چارے نے جانے میں وہ کوئی
 عیب نہ سمجھتی تھیں۔ دوسرے ذرا سے شنبہ پر ہی وہ نہیں چھانے پر تل جاتی تھیں اور اتنی قسمیں کھاتی تھیں۔ خزانہ ادا ناتی کی دھمپائی تھی
 تھیں کہ تو بھل۔ اب کون ان سے جھوٹا قرآن اٹھوا کر اپنی تیر میں جی کھڑے پڑوائے۔

نٹری بچہ۔ اور بیکر باز ہونے کے علاوہ نانی پرلے درجہ کی جھوٹی بھی تھیں۔ سب سے بڑا جھوٹ تو ان کا وہ برقعہ تھا جو۔
 دم ان کے اوپر سوار رہتا تھا۔ کبھی اس برقعہ میں نقاب بھی خفی پر جوئی جوس حملے سے بڑے بوتے میں بیٹے یا نیم اندھے بگنے تو نانی۔
 نقاب کو حقیر بنا کر دیا۔ مگر گندروں اور فیشیں اس برقعہ کی ڈیڑی ان کی کھڑی پر چپکی رہتی۔ آگے چاہے کچھ کرنے کے نیچے لیان۔ تو پھر نیچے
 برقعہ بادشاہوں کی بھول کی طرح لہراتا رہے اور یہ برقعہ صرف ستر ڈھانکنے کے لیے ہی نہیں تھا بلکہ دنیا کا ہر کسب اور نام نہان کام کسی
 سے لیا جاتا تھا۔ اور سنے چھانے اور گڑی مڑی کر کے تیکہ بنانے کے علاوہ جب نانی کبھی زیر سے نہایتیں تو اسے تو بوند کے طور پر استعمال
 کرتیں۔ بڑے توتہ نماز کے لیے جانتا ز اور جب حملہ کے کئے دانستہ۔ میں تو ان سے بچاؤ کے لیے اچھی خاصی ڈھال۔ گما پٹری پر لگا ہوا۔
 نانی کے برقعہ کا گھبراس کے منہ پر چھکارا۔ نانی کو برقعہ بہت پیارا تھا۔ نہایت میں میچ کر حسرت سے اس کے بڑے پر ہنسوا کر تیں دیا۔
 کوئی چن کر تلی اور احتیاطاً بیوند چھپا لیا۔ وہ اس دن کے خیال۔ نہ ہی لرزاشی تھیں جب یہ برقعہ بھی چل جائے گا۔ مگر گڑی کھانے کو
 جو مجاہد سے بھی بہت بون۔

نانی کا کوئی مستقل میڈ کو آرٹ نہیں۔ سپاہی جیسی زندگی ہے آج اس کے والدین میں تو کس افس کی صحبت میں جہاں بگڑتی پڑاؤ ڈالی جا۔
 جب وہ نکلا پڑی کوئی کر کے اس کے چل پڑیں۔ آدھا برقعہ اور آدھا جلیان لیا۔

مگر برقعہ سے بھی زیادہ وہ جس کی نگاہیں مٹھتی تھیں وہ تھی ان کی اگلی تو اسی تھی۔ کوک مٹھنی کی طرح نانی پر چھیلے اٹے ہونے
 تھے دوسرے ہتھیں۔ کیا خیال جو نظرسے اٹھل ہو چھلے۔ مگر جب برقعہ پیروں نے جواب دے دیا اور بند داسے چھلے ہو گئے۔ ان کی جوتیوں کی
 گھس گھس سن کر ہی جاتی جو بند ہو کر منہ پر ڈھٹ جاتے۔ ڈھٹائی سے نانی کے اشارے کا پیسہ دیکھنے کو سنا ان سنا کر جاتے۔ تو نانی کو
 اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ تھی کو اس کے آبائی پیشے یعنی اوپر کے کام پر لگا دیں۔ بڑے سوچ بچار کے بعد انھوں نے اُسے ڈھٹو جب
 کے یہاں لٹائی کپڑا اور ڈیڑھ پیر مینہ پر چھوڑ دی۔ پیر وہ ہر دم مسکے کی طرح لگی رہتیں۔ نئی نظرسے بدھل جوتی اور وہ بھلائیں۔ یہ عیب

کا مکہ کہیں ہوڑے، ہاتھوں سے مٹا ہے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ ڈپٹی مائن اپنے بھائی کے گھر بیٹے کا پیغام لے کر گئی ہوئی تھیں۔ دوپہر کا وقت تھا۔ نانہ منڈیر پر جاسن کی چھان میں جھپکی لے رہی تھی۔ ڈپٹی مائن تو اپنے ماموں کے ہاں بیٹھ کر بات لے کر گئی ہوئی تھیں۔ سرکار خنس خانے میں تیل دروازہ ہے تھے۔ ننھی پنکھے کی دوڑی تھاسے اوگھ رہی تھی۔ پنکھا لگ گیا اور سرکار کی تیند ٹوٹ گئی۔ شیطان جاگ اٹھا اور ننھی کی قسمت سو گئی۔

کہتے ہیں بڑھاپے کے سبب سے بچنے کے لیے مختلف ادبیات اور طلاؤں کے ساتھ حکیم بید چرنوں کی ننھی بھی تیرہ فرط لیتے ہیں۔ نو برس کی ننھی چورہ ہی تو تھی۔

مگر جب ننھی کی نانی کی آنکھ کھلی تو ننھی غائب۔ محلہ چان ملا کوئی سرائے نہ ملا مگر رات کو جب نانہ کی شکل مادی کو کھڑی کوئی تو کوئے میں دیوار سے لگی ہوئی ننھی زخمی چڑیا کی طرح اپنی چپکلی چپکلی آنکھوں سے گھور رہی تھی۔ نانہ کی گھٹکی بندھ گئی اور اپنی کردی کو چھپانے کے لیے وہ اسے گا بیاں دینے لگی۔ ملاوادی اٹھجا بھکا۔ یہاں کان کر رہی ہے۔ تو سو نہ تے ڈھونڈنے بند بیاں سوچ گئیں۔ پھر تو حمار کا رسے کسی جاڑوٹ کی مار لگوانی چوں۔ مگر ننھی کی چوٹ زیادہ دیر نہ چھپ سکی۔ نانہ سر پر دوہتر مار مار کر چپکھا ڈسے لگی۔ پڑا۔ سن نے سنا تو سر پر کچھ کر رہ گئیں۔ اوکھا بڑا۔ اوکھا بڑا۔ کی مغزش ہوئی تو شنید کچھ ڈانٹ ڈپٹ ہو جاتی۔ مگر ڈپٹی صاحب..... مجھے کے کہتیاں تو اسوں کے نانہ۔ پتو تہ نہادی۔! جی پھلے۔ دلوں سعد میں چٹائیاں اور لوٹے کھو اٹے۔ منہ سے جھوٹے والی بات نہیں۔

لوگوں کے رحم و کرم کی عادی نانہ نے ننھی کی کمر سنبھلی آئے گونہ حاصل اٹھلا اور اپنی جہان کو صبر کر کے بیڑی۔ دو چار دن لوٹ پیٹ کر ننھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور چند دنوں میں ہی سب کچھ بھول جھال گئی۔

مگر محلہ کی شریعت نادیاں نہ بھولیں۔ چھپ چھپ کر ننھی کو بلاتیں۔

”ننھی..... نانہ مارے گی“ ننھی ٹالتی۔

مے پر چوڑیاں سپن بچو۔ نانہ کو کیا خبر ہوگی..... ”بیویاں بے قرار ہو کر کھینچتا ہیں.....“

لکھا ہوا..... کیسے ہوا..... ”کی تفصیل پوچھی جانی۔ ننھی کچی کچی معصوم تفصیلیں دیتی۔ بیویاں انکوں پر

دوبہڑے رکھ کر کھینچتا ہیں۔

ننھی بھول گئی..... مگر قدرت نہ بھول سکی۔ کچی کچی قبل از وقت توڑ کر کھلانے سے پنکھڑیاں پھڑ جاتی ہیں..... ٹھنڈ رہ جاتا ہے۔ ننھی کے چہرے پر سے جی نہ جانے کتنی معصوم پنکھڑیاں پھڑ گئیں۔ چہرے پر پھلکار اور روڑا ہیں۔ ننھی بھی سے لڑکی نہیں بلکہ چھلانگ مار کر ایک دم عورت بن گئی۔ وہ قدرت کے مشاق ہاتھوں کی سنوادی بھر پور عورت نہیں۔ بلکہ میوہ میوہ میوہ جی مورت جس پر کسی دیو نے دوڑو لہا پاؤں رکھ دیا ہو۔ ٹھنڈی۔ موٹی۔ کچوراسی جیسے کچی کچی کا کھلنا کھار کے گھٹنے تے دب گیا ہو۔

میل صافی سے کوئی ناک پونچھے چاہیے کوئے، کون پوچھتا ہے۔ راہ چلتے اس کے چنگیاں بھرتے۔ مٹھالی کے ددرنے پکڑے۔ ننھی کی آنکھوں میں شیطان غمگین اٹھا..... گلاب نانہ بھائے اسے حلوے ہانڈے حسانے کے اس کا دھو بی گھاٹ کرتی، مگر میل صافی کی دھو بی نہ بھرتی۔ جانور بڑ کی گیند، پٹا کھایا اور اٹھل گئی۔

چند سال ہی میں ننھی کی چوٹ کھکی سے غمگین زائما تھا۔ سنا کہ ڈپٹی صاحب اور صاحبزادے میں کچھ تین گئی پھر سنا مسجد کے قلعہ

کو رتو اکہار نے مانتے مانتے چھوڑا پیر سنا صدیق پہلوان کا بھائی مستقل ہو گیا۔

اُسے دن نخی کی ناک کھٹے کھٹے پتی اور گلیوں میں لٹ پڑا ہوتا۔

اور پھر نخی کے تنوے سے جھٹکے پیر دھرنے کی دتی پھر کھڑ نہ رہی۔ صدیق پہلوان کے بھائی کی پہلوانی اور نخی کی جوانی نے حملہ والوں کا ناخلف بند کر دیا۔ سنسنے میں پڑی، مہینے میں اس ماں کی منوک میں کھپت ہے۔ شاید دونوں وہیں چلے گئے۔

جس دن نخی بھاگی اس دن نانی کے فرشتوں کو بھی شہ نہ ہوا۔ دو تین دن سے گھوڑی چپ چپ سی مٹی۔ نالی سے بڑبائی میں نہ کی۔ چپ چاپ آپ ہی آپ بیٹھی ہوا میں گھور کر تھی۔
”اے نخی روٹی کھائے“ نانی کہتی۔

”نانی بی بھوک نہیں!“

”اے نخی اب زیر ہو گئی سو جا۔“

”نانی بی عیند نہیں آتی۔“

رات کو نانی کے پیرہ بانے لگی۔

”نانی بی..... اے نانی بی“ ”سبحانک اللہ“ ”سُن لو یا دے کہ نہیں۔ نانی نے سنا فرمایا و!“

”جانبی اب سو جا“ نانی نے کروٹ لے لی۔

”اوری مرقی کون نہیں“ نانی نے مڑت مڑی دیر بعد اُسے سس پی کھٹ پٹ کرتے سُن کر کہا۔ کبھی غامگی نے اب نگیں بھی پید کرنا شروع کیا کون جی ہے جسے آج گھٹیں گھٹا لائی ہے۔

پرمجھ میں گھوڑ گھوڑ کر دیکھنے پر نانی سم کر رہ گئی۔ نخی سنا کی نماز پڑھ رہی تھی۔ اور صبح نخی غائب ہو گئی۔

کبھی کوئی دور دس سے آتا ہے۔ تو خبر آجاتی ہے۔ کوئی کت ہے نخی کو ایک بڑے نواب صاحب نے ڈال لیا ہے۔ غم ہے سنوں سونا ہے بگیوں کی طرح رہتی ہے۔

کوئی کتا ہے ہیرا مندی میں دیکھا تھا۔

کوئی کتا ہے فارس روڈ پر اور کسی نے اُسے سونا گاچی میں دیکھا۔

مگر نانی کہتی ہے نخی کو تیسفہ ہوا تھا چار گھڑی ٹوٹ پڑے کر رہ گئی۔

نخی کا سوگ مٹانے کے بعد نانی کچھ بطن بھی ہو گئیں۔ کوک راہ پھلتے پھیر غانی کرتے۔

”اے نانی نکاح کرو۔“ ”بھائی جان پھڑتیں۔“

”کس سے کہوں؟ لا اسے ختم سے کرا دے“ نانی بکڑتیں۔

”اے نانی ملاجی سے کرو۔“ ”الہ قسم تم پر جان دیتے ہیں۔“ اور نانی کی منکلات شروع ہو جاتیں۔ وہ وہ پیر سے کامیوں میں نکالنے کر

لوگ بھونچکے رہ جاتے۔

”مل تو جاتے پڑا.....“ ڈاڑھی نہ اکھڑوں تو کہنا۔ ”مگر جب تاجی کھی گئی مگر تیر مل جاتے تو نانی سچ غمرا س جاتیں۔“

علامہ عتبہ کے لڑکوں ہانوں کے نانی کے ازلی دشمن تو مومئے گلوڑے بندر تھے جو پڑھیں سے اسی محلے میں پڑھتے بڑھتے آئے تھے۔ جو سرخرو کا کچا کھانا ہانتے تھے۔ مرد و خطرناک ہوتے ہیں اور بچے ہدوات مگر عورتیں نورت ڈر پرک ہوتی ہیں۔ بہ نانی بھی انھیں بندروں میں بل کر پڑھائی تھیں۔ انھوں نے بندروں کو ڈرانے کے لیے کسی بچے کی غلیل بھتیجی تھی۔ اور سر پر برقعہ کا پیر باندھ کر وہ غلیل ناکہ کر جب اچلتیں تو بندر غلوڑی دیر کو شہر ضرور دہ جاتے اور پھر بے توجہی سے ٹھٹھکتے۔

اور بندروں سے ان کی آئے دن ہنسی مگلاؤں پر بیچ چلتی رہتی۔ محاذ میں جہاں کہیں شادی بیاہ جلا جالیوں ہوتا، نانی جو بڑے مگلاؤں کا شیکہ لے لیتیں۔ لنگہ خیرات تھیں تو بھی چار چار سرتیہ چکر دے کر حندہ لیتیں۔ سنو کھانا بٹور لانے کے بعد وہ اسے حسرت سے ٹھٹھکتیں، کاش ان کے پیٹ میں بھی الڈ پاک نے کچھ اونٹ جیسا انتظام کیا ہوتا تو کتنے مزے رہتے۔ مزے سے چار دن کی خود رک معدے میں بھر لیتیں چھٹی ہوئی مگر اڈہ پاک نے رزق کا اتنا اوٹ پٹا ننگ انتظام کرنے کے بعد پیٹ کی مشین کیوں اس قدر ناقص بنا ڈالی کہ ایک دو وقت کے کھانے سے زیادہ ذخیرہ بننے کے لئے کاٹھوڑ ٹپکانا نہیں۔ اس لیے نانی ٹاپ کے بیروں پر جو بڑے مگلاؤں جیلا کر سکھا، تیس چار ٹھیں ٹھکن میں بھر لیتیں۔ جب بھوک لگی ذرا سے سوکھنے لگتے بڑے بانی کا چھینٹا دیا جتنی بھروں مرغ بڑا کاڈر لہذا مغلوبہ تیار۔ لیکن کربوں اور برسات کے دنوں میں بار بار ہنسٹھار کی کرنا تھا۔ چنانچہ بڑے جانے پر طوعا و کرہ ان مگلاؤں کو اڈے پونے بیچ ڈالیں تاکہ لوگ اپنے کتوں اور بکلیوں وغیرہ کو کھلا دیں۔ مگر مومبا کتوں اور بکلیوں کے معدے نانی کے ڈھیٹ معدے کا مقابلہ نہ کر پاتے اور لوگ مول تو کیا تھکتے بھی ان فوہات کو قبضے پر تیار نہ ہوتے۔ وہی عزیز ازمان جو بڑے مگلاؤں سے بڑھنے کے لیے نانی کو ہزاروں علواتیں اور ٹھوکریں مہنا پڑتیں اور جنھیں دھوپ میں سکھانے کے لیے انھیں پوری بندر جاتی سے چاروں مل پڑتا۔ جہاں مگلاؤں سے چیلے گئے اور بندروں کے نیلے کو بے تار برقی خبر پہنچی۔ اب کیا بے غل و غل دیواروں پر ڈٹے بیٹھے ہیں۔ کچھ پلے پر دھما پڑ گئی چار رہے ہیں۔ چچر کھسٹ رہے ہیں اور آتے جاتے یہ سوخا رہے ہیں۔ نانی بھی اس وقت مرد میدان بنی سر پر برقعہ ڈاٹھا ناند سے ہاتھیں غلیل لے مروجہ پڑٹ جاتیں۔ سارا دن ”گگے۔ گگے“ کر کے شام کو بچا کچھا کوڑا بٹور بندروں کی جان کو کھسکی نانی اپنی کوٹھری میں تھک کر سوتی ہیں۔

بندروں کو ان سے کچھ ذاتی تسمی کی پرغاش ہو گئی تھی۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو کبوں جہاں بھر کی نصرت کو چھوڑ کر صرف نانی کے مگلاؤں پر ہی حملہ آور ہوتے۔ اور کبوں ہدوات لال پھانے والا ان ہی کا عزیز ازمان تکیہ لے بھاگتا۔ وہ تکیہ جو تھکی کے بعد نانی کا وعدہ عزیز اور سارا دنا میں رہ گیا تھا۔ وہ تکیہ جو برقعہ کے ساتھ ان کی جان پر ہمیشہ سوار رہتا تھا۔ جس کی سیلونی کو وہ ہر وقت بچا ٹاکہ مارتی رہتی تھیں۔ بارہ نانی کسی کو نہ کھدے میں بھیجی تکیہ سے ایسے کھید کرتیں جیسے وہ نضحی کی ہیجی ہوں اور وہ کھید ان کی گڑباؤہ اپنے سارے دکھ اس نیکے ہی سے کہہ کر جی ہکا کر لیا کرتی تھیں۔ جتنا جتنا انھیں تکیہ پر لاڈ آتا وہ اس کے ٹانگے پہنے کرتی جاتیں۔

نصرت کے کھیل دیکھتے نانی منڈ پر سے لگی برقعہ کی آڑ میں نیضہ سے جڑیں چن رہی تھیں کہ بندر دھم سے کودا اور تکیہ لے رہا جا۔ اب معلوم ہوا کوئی نانی کا کھیدہ لڑنے لگا۔ وہ دھاڑیں وہ چلائیں وہ سارا عکد اکٹھا ہو گیا۔

بندروں کا قاعدہ ہے کہ آنکھ بچی اور کوڑا گلاس لے بھاگے اور پیچھے پر میٹھے دولوں دولوں ہاتھوں سے کھڑا

دیوار پر گھس رہے ہیں۔ کٹوسے کا مالک نیچے کھڑا چکار رہا ہے۔ پیاز دسے روٹی دے جب بند میاں کا بیٹھ گیا کھڑا چھبیک اپنی راہ لی۔ ثانی نے سحلی بھر کھوسے لٹا دیئے پھر حرامی بند رسے نیلے نہ چھوڑنا تھا نہ چھوڑا۔ سو جتن کئے گئے نگر اس کا جی نہ چھلکا۔ اور اس نے سرے سے تیکر کے ٹھکانے پیاز کے پھلکوں کی طرح انار نے شروع کئے۔ وہی نلوت جنہیں ثانی نے چندھی اکھوں سے گھور گھور کر کئے تانکوں سے گونٹا تھا۔ جوں جوں غلات اترتے جاتے ثانی کی بار حواسی اور مبلا سٹ میں زیادتی ہوتی جاتی۔ اور آخری غلات بھی اتر گیا۔ اور بند رسے ایک ایک کے پھجور پر سے ٹپکا نا شروع کئے۔ روٹی کے گلے نہیں بلکہ شبت کی فتویٰ۔ نبوسٹے کا اگھو چھا..... حسینہ بی کی انگلیا..... منی بی کی گڑیا کا غرارہ۔ رحمت کی اور صنی اور خیراتی کا کچھنا.....

خیرین کے لونڈے کا ملہ..... فشی جی کا مغلا اور ابراہیم کی قمیص کی آستین معر کفت؛
صدیق کی تمک کا کھڑا۔ آسنہ بی کی سر مردوانی اور بھلائی کی کھلوٹی۔ سیکند بی کی افشان کی ڈیر۔ ملہ جی کی تصبیح کا امام اور باقر بیابا کی سونگھا۔
بسم اللہ کا سر کھا ہونا ل اور کلاوہ میں بندھی ہوئی سخی کی پسلی سا لگہ کی بلدی کی گانہ خٹہ۔ دوب اور چاندی کا جھلکا۔ اور بشیر خاں کا
گلٹ کا تھہ جو اسے جنگ سے زخمہ لوٹ آئے پر سر کرایہ عالیہ سے ملا تھا۔
مگر کسی نے ان چیزوں کو نہ دیکھا۔ بس دیکھا تو اس چوری کے مال کو جسے سالہا سال کی چھاپہ ماری کے بعد ثانی نے کھٹوٹ
جوڑا تھا۔

”چور۔۔۔۔۔ بے ایمان..... کینی“

”نکاوڑ بھیا کو محلے سے“

”پولیس میں دے دو“

”ارے اس کی تو شک بھی کھو لو اس میں نہ جانے کیا کیا ہو گا“ غرض جو جس کے مزے میں آیا کہہ گیا۔

ثانی کی چیخیں ایک دم رگ گئیں۔ آنسو خشک۔ سر نیچا۔ اور زبان لنگ! کاٹو تو خون نہیں۔ رات بھی جوں کی توں دوڑ گھٹنے
مٹھیوں میں داسے بن ہل کر سوکھی سوکھی چکیاں لیتی ہیں۔ کبھی اپنے ماں باپ کا نام لے کر کبھی میاں کو یاد کر کے کبھی بسم اللہ اور سخی کو پکار
کر کہیں کرتیں..... دم پھر کو اگھو جاتی پھر جیسے پرانے ناسوروں میں جیونے پھٹنے لگتے اور وہ بدلا کر چونک اٹھتیں۔ کبھی جبکی پسلی
دوتیں کبھی خود سے باتیں کرنے لگتیں۔ پھر آپ ہی آپ سکرا اٹھتیں اور پھر تارکی میں سے کوئی پرانی یاد کا بھلا کھینچنا مانتا اور وہ بیمار کتے کی
طرح نیم انسانی آواز سے سارے محلے کو چرنگا دیتیں۔ وہ دن اسی حال میں بیت گئے۔ عہد اداوں کو آہستہ آہستہ احساس ندامت ہونا
شروع ہوا۔ کسی کو بھی تو ان چیزوں کی اشد ضرورت نہ تھی۔ برسوں کی کھوئی چیزوں کو کبھی کارو پیٹ کر بھول چکے تھے۔ وہ بچائے خود کو نہ
لکیرتی تھے۔ تنکے کا بوجھ بھی ایسے موقع پر انسان کو شبت کی طرح لگتا ہے۔ لوگ ان چیزوں کے بغیر زندہ تھے۔ شبن کی فتویٰ اب سرویدن
سے حدیلا شتی کرنے کے قابل کہاں تھی، اور اس کے طے کے انتظار میں اپنی ٹھو اور خٹوڑی روک بیٹھا تھا۔ حسینہ نے بے انگلیا جولی کی
اہمیت کو یاد کر کے اسے خیر باد کہہ دیا تھا۔ منی کی گڑیا کا غرارہ کس مصرت کا وہ تو کبھی کی گڑیوں کی عمر سے گزر کر رہنڈ کھیوں کی عمر کو پہنچ چکی
تھی۔ محلے والوں کو ثانی کی جان لینا خٹوڑی منظور تھی۔

پرانے زمانہ میں ایک دیو تھا۔ اُس دیو کی جان تھی ایک بھورے میں رات سمندر پار ایک غار میں ایک صندوق تھا۔ اُس صندوق

میں ایک اور صندوق اور اُس صندوق میں ایک ڈیرہ تھی جس میں ایک بھورا تھا۔ ایک بہادر شہزادہ آیا..... اور اُس نے پہلے بھونے کی ایک ٹانگ توڑ دی، اُدھر دیو کی ایک ٹانگ جاوے کے زور سے ٹوٹ گئی پھر اُس نے دوسری ٹانگ توڑی اور دیو کی دوسری ٹانگ بھی ٹوٹ گئی پھر اُس نے بھونے کو مسلسل ڈالا اور دیو مر گیا۔

نانی کی جان بھی بچ گئی تھی۔ اور بندر نے وہ جادو کا ٹکڑہ انتوں سے چیر ڈالا۔ اور نانی کے کھجے میں گرم سلاخ اُتر گئی۔ دنیا کا کوئی دیکھ کوئی دلت کوئی نہ نامی ایسی نہ تھی جو نصیب نے نانی کو نہ بخشی ہو۔ جب سہاگ کی چوڑیوں پر پتھر گر اٹھا تو سبھی بغیں اب کوئی دن کی جھان ہیں، پر جب، رسم آئندہ کو کفن پہنانے لگیں تو یقین ہو گیا کہ ادلت کی پیچہ پر یہ آخری تنکا ہے۔ اور جب نفی منہ پر کا لکھ لگا گئی تو نانی بھیں بس یہ آخری گھاؤ ہے۔

زمانہ بھر کی بیماریاں پیدائش کے وقت سے جیسیں سات بار تو چپک نے اُن کی صورت پر جھاڑ دی۔ ہر سال تیج ہوا کے موقع پر جیڑہ کا حملہ ہوتا۔

تیرا میرا گو موت دھرتے دھرتے انگلیوں کے پورے نہ رگڑ گئے نہ برتن مانگتے مانگتے تھکدیاں جھلنی ہو گئیں ہر سال اندھیرے اُجالے اور بچی پنجی بیڑھیوں سے لٹھک پڑتیں۔ دو چار دن لوٹ کر پھر گھسٹے، گھٹتیں۔ پچھنے جنم میں نانی مزدور کتے کی لگی رہی ہوں گی۔ جمی تو اتنی سخت جان تھیں۔ موت کا کیا واسطہ ہوا اُن کے قریب پھٹک جاتے۔ لیبریاں لگاتے پھر س کی مگر مردہ کا کپڑا تن سے نہ چھو جاتے، کہیں مرنے والا سادوئوں میں موت نہ چھپا گیا، ہو جو تازوں کی بالی نانی کو اُن دبوچے انگلیوں کا غلبہ بن، روں کے ہاتھوں نے گی، اس کی کسے خبر تھی۔ صبح سویرے ہشتی مشاک ڈالنے گیا تو دیکھا نانی کھیریل کی بیڑھیوں پر اکڑوں بیٹھی ہیں، نہ کھلا ہے نہ کھمیاں نیمہ دیا کھسوں کے کوٹوں میں گھس رہی ہیں۔ یوں نانی کو سوتا دیکھ کر کوٹ اٹھیں مردہ سجدہ کر ڈیا کرتے تھے۔ مگر نانی ہمیشہ بڑبڑا کر طعنہ بھرتی جاگ پڑتی تھیں اور ہونسنے ڈلے کو ہزار معلواتیں سنا ڈالتی تھیں۔

مگر اُس دن بیڑھیوں پر اکڑوں بیٹھی ہوئی نانی دنیا کو ایک مستقل کالی دے کر چل بسین۔ از ندگی میں کوئی ٹکی سیدھی نہ تھی۔ کرپٹ کرپٹ کھانٹتے تھے۔ مرنے کے بعد کفن میں بھی نانی اکڑوں لٹائی گئیں۔ ہزار کھنچ نانی پر بھی اکڑا ہوا جسم سیدھا نہ ہوا۔

الحمد لله

احمد ندیم قاسمی

نشادی سے پہلے مولوی اہل کے بڑے عاشق تھے۔ کھدر یا سٹے کی نزدیکی جگہ گلہائی رنگ کی سبز و حار یوں والی ریشمی خوشانی لگی، دو گھوڑا بوسکی کی قیص جس کی آسمینوں کی چٹخوں کا شمار سبکدوش تک پہنچتا تھا۔ اور سے رنگسٹ لکھل کی واسٹ جس کی ایک جیب میں قطب نما ہوتا تو دوسری جیب میں نسوا کی لقمی ڈبیا ہوتی تھی۔ سر پر بادامی رنگ کی شندی لگی جس میں سے کلاہ کی مٹلا چڑتی چمکتی رہتی تھی۔ ہاتھ میں عصا جس پر جگہ جگہ گٹ کے بند اور پنبے کے کوکے چڑے تھے۔ بالوں میں کوئی بڑا اکافریل جس کی خوشبو گلیوں میں طقتی رہ جاتی تھی۔ قد سے اوپر اٹھی ہوئی پنکوں والی آنکھوں کے سپوٹوں میں سر مڑ تو جیسے رچ کر رہ گیا تھا۔ نیکیوں میں حار یوں کے لائے ہوئے بڑے بڑے ٹیکسز والی چاندی کی انگشتریاں جو منوسے پہلے دن میں چار پانچ بار اتارتی تھیں مگر ان کی ترتیب میں کبھی کوئی فرق نہ دیکھا گیا۔ اور چہرہ مولوی اہل کی آواز! شکر ہے اللہ تعالیٰ کی بخشش ہوئی یہ نعمت کلام پاک کی تلاوت میں استعمال ہوتی وہ نہ اگر مولوی اہل مابے کی کلی الاپ دیتا تو گاؤں بھر کی لڑکیوں کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ ہر عید پر خطبے کے بعد اس کے سامنے گھر گھر سے جمع کئے ہوئے ڈبڑے سودو پوں کی پوٹلی چھٹے آگرتی تو وہیں نمازیوں کے سامنے چالیس پچاس روپے کا ڈوس کے مسکینوں، محتاجوں میں بانٹ دیتا اور ان کے کٹا "مجھے دعا میں نہ دو، اس اللہ جل شانہ کو یاد کرو جو پتھر میں کپڑا پیدا کرتا ہے تو وہیں سے اسے خوراک بھی پہنچاتا ہے مجھے دعا میں نہ دو، مجھے اس نے کیا نہیں دیا۔ صحت، اطمینان، اے نکری، مجھے تو اس کی رحمتوں کے غولے سے اور کچھ نہیں چاہیے۔"

نیک نشادی کے بعد اللہ جل شانہ کی رحمتوں نے ایک اور صدمت اختیار کر لی۔ مولوی اہل کے ہاں اولاد کا کچھ ایسا ناخوابہ تھا کہ جب ایک سال اس کی بیوی کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی تو وہ سیدھا حکیم کے ہاں دوڑا گیا۔ اسے یقین تھا کہ بچہ نہیں ہوا تو زیر اسٹ کے نظام تخلیق میں کوئی کوڑ بڑ پیدا ہو گئی ہے۔ زہب النساء کے ہاں بچہ نہ ہونا ایسا ہی تھا جیسے پوری رات گزر جائے پر بھی سو رچ طلوع نہ ہو۔ اگے سال سورج طلوع ہو تو مولوی اہل کی جان میں جان آئی۔ یقیناً اولاد کی افراط حد نے ذوالجلال کی رحمتوں میں سے ایک رحمت بھی نگرہ شکل پر آئی پڑی کہ ریشمی خوشانی لگی صافی بن کر رہ گئی تھی۔ بوسکی کی قیص برسوں پہلے پتھر ٹوں کے دھپ اختیار کرتی غائب ہو چکی تھی۔ اور اب اس کی جگہ گاڑھے کے چوڑے نے لی تھی جو کئی بار دھلنے کے باوجود یوں میلا میلا لگتا تھا جیسے اسے جلتے وقت جلا ہے نے سوت کے تانے بانے میں لٹوڑی سی غلطی بھی بن ڈالی ہے۔ مٹلا کلاہ کی داڑھی موچیں نکل آئی تھیں۔ انگشتر یوں کی چاندی اور عصا کا گٹ لڑکیوں کے منہ میں جھک جاتا تھا۔ نرنگ سرخ پتھر ٹوں والی

ہمکھوں میں بتدیان کچھ اس طرح بہت اور پراگندگی تھیں کہ مولوی اہل ہر وقت نزع کے کرب میں گرفتار نظر آتا تھا تاہم توڑ بہت سے بچوں کے ساتھ زمانے میں بھی تاجر توڑ تباہیلیاں ہو رہی تھیں۔ مولوی اہل نے اپنی پہلوئی کی بیٹی ہمارا لہذا کے لیے جو جتنا ایک ماہیے میں خریدنا تھا وہی جو ناموچی نے اس کی سب سے چھوٹی بیٹی محمدہ النساء کے لیے چھ روپے میں تیار کیا تھا۔ اور جب مولوی اہل نے شکوہ کیا تو موچی بولا ”میں نے تو مولوی جی آپ کی خاطر زیادہ دام نہیں مانگے۔ کوئی اور ہوتا تو چھ چھوڑ دے ماریا لہذا پر جسے کو آگ لگ گئی ہے۔ قیمتیں یوں اکیدم زن سے اوپر ہو گئی ہیں کہ لگتا ہے دنیا بھر کی کائیں بھینسیں کہیں کوہ ناث پر بیچ دی گئی ہیں۔ پونے چھ کی لاگت ہے ایک چوڑی کار مارا ہوں، پٹیلے آپ چوڑی کو بھی جانے دیجئے۔ اس میں ذرا سا بھی بھوٹ ہو تو ڈوب کر مروں۔ جنازہ تک نصیب نہ ہو“

اگر دعاؤں کے بدلے میں آسمانوں سے ضروریات زندگی کا ترنا ممکن ہوتا تو اس روز مولوی اہل خدا سے اپنی محمدہ کے لیے جوتے مانگتا۔ رات کو زیب النساء سے منورہ کیا۔ اور جب اس نے بنان سے کچھ کھنے کی بجائے لٹات کا ایک کوٹا لٹا کر مولوی اہل کو محمدہ النساء کے پاؤں دکھائے تو وہ بچوں کی طرح ایک دم دو دیا۔ اور دوسرے روز صبح کی نماز اور وظا لٹ کے بعد پونے چھ روپے موچی کی نذر کر آیا۔ اور موچی کی دوکان سے اٹھ کر گلی میں آیا تو المٹر جل جلا، کو حاحا غرو نا طسراماں کر سوار سے تو بہ کر لی۔

منازیروں کی تعداد بڑھنے کی بجائے گھٹ رہی تھی اور ضروریات زندگی کی قیمتیں گھٹنے کی بجائے بڑھ رہی تھیں اور پھر اولاد بڑھ رہی تھی۔ اور اولاد کے ساتھ مولوی اہل کے بالوں کی سفیدی بڑھ رہی تھی۔ اور ہمارا لہذا نے جو دس سال میں قدم دکھا اور مولوی اہل کی یہ حالت ہو گئی کہ رکوع میں کیا ہے تو اٹھنے کا نام نہیں لے رہا۔ سجدے میں پڑے تو بس پڑا ہے۔ ہوشیار مقدیوں کو وقت پر کھانسی کا دورہ نہ پڑتا تو ممکن ہے مولوی اہل ایک ہی سجدے میں ٹکڑ کو چھتر سے ملا دیتا۔ رمضان المبارک میں تراویح پڑھانے کی سعادت حسب دستور اسی کے سپرد ہوتی، مگر وہ مولوی ابوالبرکات جو آیات یا الفاظ کی غلطی نہ کیا، کبھی زیر زبر کی غلطی کا بھی مرتکب نہیں ہوا تھا۔ البقرہ سے النساء میں جان نکلا۔ اور سورہ رحمن پڑھنا شروع کی تو ایک رکعت ہی میں اسے دوبارہ پڑھ ڈالا۔ چودھری فتح داد کو کسی شین و ممبر ڈسٹرکٹ بورڈ نے جب اسے اس استغراق پر سر زلزل کی تو ایک بار تو مولوی اہل کے جی میں آئی کہ پکار اٹھئے ”آپ کے ہاں تو نوٹوں کی کھپ ہے نا چودھری صاحب۔ آپ کے بھی کوئی بیٹی ہوتی اور وہ اب جوان ہو گئی ہو تو میں آپ کو سمجھانا کہ ایک سموت کو دوبارہ کیسے پڑھ لیا جاتا ہے“ لیکن چودھری فتح داد کی یہ سر زلزل زیادہ تر مذہبی نوعیت کی تھی۔ ورنہ یہی چودھری ہی تو تھا جو برسوں سے مولوی اہل کے گھر میں ہر شام کو گھمکی ایک روٹی اور دو مال خولے کا ایک سیکر اس التزام سے سمجھاتا تھا کہ جیسے ایک وقت نافع ہو گیا تو سوار سو اینرے پر اتر آئے گا۔ اور حدیث حق کی جس روز روٹی یا دال سالن سمجھو لے میں ذرا سی دیر ہو جاتی تو چودھری فتح داد بنفس نفیس مولوی اہل سے معافی مانگنے آتا آج وظیفہ دیر سے پہنچا ہو گا تب ہی اس غفلت کی معافی مانگتا ہوں۔ چودھرائی ذرا جا رہی اور کھانا نائے نہ تیار کیا۔ دھڑلہ زادی یہ بھول گئی کہ آپ کو یہ مال سے وظیفہ وقت پر نہ گیا تو مجھے ایک روزہ رکھ کر کفارہ ادا کرنا ہو گا“

یہ وظیفہ“ مختلف نوعیت کے تھے۔ اور معجزات کو تو مولوی اہل کے ہاں نہ آتا تھا اور نہ ہڈیاں چڑھتی تھیں۔

مولوی اہل کے عقیدت مندوں کے ہاں سے ایک درجن کے تریب جری خدا دار، دیاں اتھاتی قیں، اور حزیب النساء نے گھر میں ایکوں کو کڑا کر شریعت کا درس دینے کا سلسلہ بہاہ کے تین مہینے بعد ہی سے شروع کر دیا تھا۔ شعرات کو برہنہ کی جھوٹے چھوٹے سے "وہ خلیوں" پر دھڑا دھڑا سی شکر رکھ کر لاتی تو حزیب النساء کو وہ جھنگیری ان کے لیے الگ رکھ دینا پڑیں۔ اس روز دونوں وقت سب خوب میر ہو کر کھاتے۔ جو وظیفے باقی پڑتے انھیں وحب میں سکھایا جاتا اور جیسے میں چاہتا ہوں انھیں گولے ٹھرتے ہیں اُبال کر پیٹے ٹھرتے تیار کئے جاتے۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ انسان کو مصیبت بھرنے کے لیے رونی کے علاوہ بیٹے ڈھانکنے کے لیے کپڑا بھی تو چاہئے، چودھری فتح داد برہنہ فصل پر مولوی اہل کو ایک پوشاک بھی پیش کرتا تھا۔ لیکن جب یہ پوشاک گھر میں آئی۔ ایک ایک کی دوزی کی دوکان سے کئی۔ حزیب النساء، مہرن اور زبیرہ اور شمس کو پاس بٹھا کر پیٹنے کے مترند کا تیار کیا جو کہ رکھ دیتی اور بولوں انھوں کے بہت سے چلے نکل آتے۔ مہرن کی پگڑی سے بھی کچھ ایسا ہی برتاؤ ہوتا اور بولوں جینہ مہینوں کے لیے مولوی اہل کی اولاد ہاں نکل نکل ہوئے سے بڑھ جاتی۔ اس دوران میں اگر کسی کی نکاح خرابی کے سلسلے میں یا ناز جنازہ چرھانے کے ضمن میں جیوند دیے اٹھتے تو وہ مہر النساء کے جہیز کی خاطر میں کے ایک ڈبے میں رکھ دیئے جاتے۔ بچوں کے پیٹ بڑھ رہے تھے اور باقی جسم سکڑ رہا تھا۔ حزیب النساء کے لکھن جو کبھی اس کی سانوی کلائیوں میں گیسے رہتے تھے۔ اب ذرا سے جھٹکے سے پیسے پر ابل جاتے تھے اور اس کی لانی لانی پٹوں کے نیچھے جو انی کا جھبھل سرور رکھ میں چکا تھا۔ اور جب وہ پٹکین جھنجھتی تھی تو اس کے چہرے پر برہنہ رکھ دیتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ خود مولوی اہل زندگی کے ذرا ذرا سے حادثوں کے درمیان ہاں نکل پھرتی تھی۔ یہ لگا تھا۔ انہی دنوں اسے مولوی ابوالبرکات کی بجائے مولوی اہل کہا جانے لگا تھا۔ لکھنویوں کے ہاں تو بالکل سفید ہو چکے تھے اور دونوں پر مسوڑوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ ملاوت کرتے وقت کئی بار دونوں کی ریز میں سیٹیاں بچ اٹھتی تھیں۔ مگر آواز کا کھٹک ہ ہی تھا۔ صبح چرخے سے نکلے ہوئے حروف یوں بچے تھے جیسے پٹیل کی تھالی پر بود کی گویاں گر رہی ہوں۔ البتہ اس آواز میں لرزش سی ضرور آتی تھی جو پرلے غازیوں کو سبب بنتی تھی۔ مولوی اہل کی فقیہ لیکن چودھری فتح داد کو اس ارتعاش کا سبب معلوم تھا کہ یہ مولوی اہل اس سے مہر النساء کے لیے رشہ ڈھونڈنے کے سلسلے میں بات کر چکا تھا۔ چودھری نے اس مقصد کے لیے سانسے گاؤں پر فطرس دوڑا لی انھیں۔ رات کو سب پر لیٹ کر ایک ایک گھر میں چھ تک آیا تھا۔ اور کئی کو جو ان اسے پیچھے بھی تھے مگر ساری مشکل یہ تھی کہ مولوی اہل کو سب جانتے تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ مہر النساء کے مگر وہ پر پل ہے، اور سو کے مگر وہوں پر پل پل پل جرائی میں خون کم ہوتا ہے اور آئسو زیا دہ۔ اور پھر یہ بات بھی ان سے چھپی ہوئی نہیں تھی کہ اب مولوی اہل کو عید پر پر میں پچیس روپے ملتے تھے۔ مہر النساء کا جہیز تو خیر کیا جاتا ہو گا۔ دوسرے نو بچوں کے لیے جوتا تو پنی بھی شاید ہی دیا ہو سکے ہوں۔ ایک دو جگہ چودھری نے بات بھی کی مگر مخاطب کچھ یوں تھوڑا کہ پیچھے جیسے چہرل کی بیٹیوں میں سے ایک ہاں جھرمٹ لگائی ہو۔

لیکن مولوی اہل اور حزیب النساء کی دعا میں رانگیاں نہ گئیں۔ انہی دنوں سابعہ خدیا اور صالحہ احمد شہر سے گاؤں گئے تھے آیا اور بہانہ کیڑے کی جھوٹی سی دکان کھولی۔ یہ خدیا ایک حافظ قرآن کا کلونا بیٹا عقد فالد کے مرنے کے بعد مولوی اہل کے ہاں قرآن مجید حفظ کرنے کی کوشش کرتا رہا اور جب میں بھینکے لگیں تو بڑھ چکی ماں کو نہیں گاؤں میں چھوڑ کر شہر ہاگ گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کسی برہنہ لڑکے کے ہاں ملازم ہو گیا ہے، اسی برہنہ لڑکے نے کچھ عرصے کے بعد اسے ایک دکان کے سامنے کو مہر جگہ لے دی جہاں وہ کٹ پیسہ بیچتا رہا اور اپنی ماں کو بھی شہر بلا لیا۔ پھر جب اس نے تجارت میں کافی ہمارت حاصل کر لی تو خدیا یا رکی

بجائے شمیم احمد کا نام اختیار کر کے لکھوا ڈالا گیا۔ اس نے بڑی منت خوشامد سے مولوی اہل کو مجبور کیا کہ وہی اس کی دوکان سے بونجی کرے تاکہ تجارت میں برکت ہو اور فقہ سود ابتداء ہے۔

اس روز اہل نے اپنے شاگرد اور اس کی بڑھی ماں کا دل رکھنے کے لیے اپنی زندگی کا شاید سب سے بڑا فیصلہ کیا۔ زیب النساء کے پاس گیا، عارف کی ماں، انجیم احمد کتاب ہے کہ وہ میری بی بونجی سے کاروبار شروع کرے گا، تم کو تو مہرن کے لیے ایک سوٹ کا کپڑا دے لیں، جہیز کے لیے ضرورت تو ہے ہی، ویسے سائے گاؤں والوں کے سامنے بونجی کی رسم ادا ہوگی، اس لیے ذرا سارے بی بی بیچ دیا جائے گا، پھر شمیم احمد کا دل رکھنا تو میرا فرض ہے۔ ایک تو پرانا شاگرد ہے۔ دوسرے حافظ عبدالرحیم جو ہم بچپن کا بونو لفظ ہے، تبصرے سے مولوی اہل نے دیکھ کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر سرگوشی میں بولا ”عارف کی ماں، اللہ جل شانہ کی قسم مجھے تو کچھ ایسا لگتا ہے جیسے اللہ جل شانہ نے اسے بونجی کے لیے آسمان پر سے اتارا ہے۔“

اس بات پر زیب النساء کی آنکھوں کی راکھ ایک لمحے کے لیے تو بجھ میں لگی، بعد ازاں دھندلے سبز میں گھٹی ٹسک، وہ بولی اور گلے میں لٹکتی ہوئی چائی تپسی کے اندر باڈی ڈال کر نکالی، صندوز نکھولا اور میں کا ترہ نہ نکال کر مولوی اہل کے سامنے رکھ دیا، ”خدا تیری زبان مبارک کرے، میں تو جب بھی مہرن کو دیکھتی ہوں ایسا لگتا ہے جیسے برا بھلا تو ہے پر دیکھ کر پڑے جلنے لگتے ہیں“ وہ رونے لگی، ساتھ ہی سکراتی بھی رہی۔ اور جب ہر النساء کسی کام سے اندر آئی تو فوراً بولی ”بھئی، بابا، دھوپ میں ٹکڑے سوکھ رہے ہیں نا۔ وہاں تانڈیا اٹ کر دکھو، دو دن سب ٹکڑے کو ذیل میں بٹھا میں گے، جہاڑ میری بیٹی۔“ اور مہر النساء کے گالوں کی لالی سے جواب دیا کہ میں سب سمجھتی ہوں اماں، شمیم احمد کی دو ٹوکوں پر ابیاں بی بی بونجی کرنے چلے ہیں۔

مہر النساء، بابا، ملتی گئی تو مولوی اہل نے دوسرے کی مل متاع مبلغ تینتالیس روپے نکال کر حبیب راگے اور اسٹے ہوئے بولا ”دعا کرنا مہرن کی کہیں شادی لگ جائے تو میں باج سات برس کے لیے تو پھول کی طرح ہلکا بھلا ہوں گا۔“

زہب النساء آنسو پونجی اور شہسوارتی رہی اور مولوی اہل شمیم احمد کی دوکان چل دیا۔ وہاں بوت سے لوگ جمع تھے جن میں زیادہ تر عورتیں تھیں جو ناکوں اور ہونٹوں پر انگلیاں رکھ کر یوں کھڑی تھیں جیسے ان کی انگریز رنگ رنگ کے کپڑوں کے ساتھ سل کر رہ گئی ہو۔ مولوی اہل دوکان میں داخل ہوا تو شمیم احمد اس کے قدوں میں پھونچ گیا۔ اور جب مولوی اہل نے اپنی خوبصورت آواز میں ترانہ شریعت کی چند آیات کی تلاوت کی تو ایک سماں بندھ گیا، تلاوت کے بعد اس نے ایک کپڑا پسند کیا۔ گلابی رنگ پر نیلے پھولوں میں جگمگ رہنے والے رنگ کے نقشے تھے ”ایک زمانہ سوٹ کا کپڑا کاٹ دو“ مولوی اہل نے معمولی سے فرما دیا، آواز میں کہا اور ایک نظر چوم کو بھی دیکھ لیا، شمیم احمد نے گراں گھا کر بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھا اور سات کو کپڑا پانا۔ پچھنی انشا کہ ایک بار۔ پھر بسم اللہ پڑھی اور کپڑا کاٹا۔ تہ کیا اور آخری بار بسم اللہ پڑھ کر مولوی اہل کے سامنے یوں رکھ دیا جیسے مفت میں۔ محض تھنہ پیش کر رہا ہے۔

ذہیت ”مولوی اہل نے اب کے ماحول کی طرف نہیں دیکھا صرف اپنی جیب میں ہاتھ ڈال لیا۔
• شمیم احمد مارے احترام کے سنبھل گیا۔ ایک لمحے تک ہاتھ ملتا رہا، کھٹکارا اور بولا ”چھ روپے لوٹ کے حساب سے بیابیس روپے ہوئے قبلہ۔“

دوکان میں بسے ہوئے سب فحان جیسے مولوی اہل کے دماغ پر دھب دھب کرنے لگے۔ بوکھلا کر اس نے جیب سے

ہاتھ نکالا اور ایک روپیہ واپس جیب میں رکھ کر باقی رقم احمد کے سپرد کر دی۔ عورتوں کی انگلیاں ہونٹوں سے اٹھ کر ناک پر اور ناک سے اٹھ کر ہوا میں جیسے جیسے گھر گئیں۔ مولوی اہل نے کچھ ابل بھل میں لیا تو نسیم احمد بولا: ”تجربہ سے بوسہی فوٹی ہے اس لیے میں نے خرچ میں کوئی رعایت نہیں کی۔ میں آپ کا پرانا خادم ہوں، پھر تلافی کروں گا انشاء اللہ تعالیٰ۔“

مولوی اہل کپڑے کو نعل میں لے کر اٹھا تو اس کا جی جابا کہ نسیم احمد سے کہہ دے ”اللہ جل شانہ“ جی تلافی کرے گا اور نسیم احمد اس لیے کہ اگر تم نے کچھ بیجا ہے تو میں نے بھی اپنی بیٹی بیچنے کی کوشش کی ہے“ لیکن یہ تو اکہم سے جسب کے خالی ہو جانے کا خبر تھا، جس پر اٹھتے ہی اٹھتے اس نے قابو پا لیا اور وہ بولا: ”یہ تو تمہارا حق تھا نسیم احمد، یہ بھی کوئی سنے کی بات تھی! اللہ جل شانہ تمہیں اور تمہارے گارہ باریں برکت دے۔“

”آمین“ نسیم احمد نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

”آمین“ زب الفساء نے کپڑے کی نرمی اور بیقراری اور عجب کو دیکھ کر مولوی اہل کے ان الفاظ کے جواب میں کہا: ”اللہ کے اس کپڑے میں ہمدانی مہرن کا مہاگ مٹے۔“

چند ہی روز بعد ایک شام کو مولوی اہل کے دروازے کی زنجیر بجی، اس وقت آنے والے مولوی اہل با علوہ یا کھنڈ وغیرہ لاسے تھے اس لیے زنجیر کی آواز سنتے ہی پھرتے پھرتے ڈیوڑھی کی طرف چلے۔ لیکن جانے مولوی اہل کو کیا سوجھی۔ غلابت معمولی ناک کو بولا ”عطرب“ دیکھ کر گئے، سب کے سپرے کھٹ کھٹے رعدۃ النساء تو رو رہی دی، مولوی اہل ان کو دلاس دیتے بغیر بیڑے پر چڑھائی سناٹے کے بڑھا، چند ہی ڈیوڑھی کا دروازہ کھولا تو شہناز ایک نوارہ سا لٹا اور ساتھ ہی ”اذا زاتی“ اسلام علیک قیل۔

یہ نسیم احمد تھا، مصفاغہ کے لیے مڑھا تو تھکے کا ناتہ بندشیں کی طرح رنج اٹھا۔ اور جب اس نے ٹک ٹک کر کہا ”آپ کی خدمت میں ایک درخت سنسنے کر آیا ہوں قیل۔ اسی لیے آپ کو بے وقت رخصت دی“ تو مولوی اہل کو نسیم احمد کی پریشانی سے اندیشہ ہوئی کچھ گفتگو کی محسوس ہوئی۔ یہ درخواست یہاں ڈیوڑھی میں بھی سن سکتی تھی، لیکن مولوی اہل گروں موڑ کر پکارا ”میں ابھی آیا عادت کی ماں“ اور پھر نسیم احمد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس تیزی سے مسجد کی طرف چلا کہ نسیم احمد کو سنے نہ سنا کا شور و غوغا روکنے کیلئے اسے دوسرے ہاتھ سے گھنٹوں تک اٹھا دینا پڑا۔

دو دنوں ایک حجرے میں پہنچے تو دو دن چند نازی آگ چلنے ہارون الرشید کے انصاف کی کہانیاں سن سنا رہے تھے، دوسرے حجرے میں اندھیرا تھا یہاں ٹوٹا اندھیرا ہی رہتا تھا، اندر برکتا لیس آتالیس دونوں کی مسلسل چالہ نشی کے لیے مخصوص تھا۔ نسیم احمد کو وہیں چھوڑ کر مولوی اہل چلے جسے سہجی ہوئی ایک گھڑی اٹھا لایا اور اندر چلے حجرے کے ایک گوشے میں چلا گیا۔ ڈیوڑھی پر گڑے تیل پھرانے جل اٹھا۔ اس نے داپس جا کر لکڑی کو لاڈ میں پھینکا اور ٹیک کے نسیم احمد کے پاس لایا۔ نسیم احمد نے ان چند روز میں داڑھی نہیں منڈوائی تھی، گالوں اور گلے پر نہایت سلیقے سے خط بننے سے اور داڑھی کے تختہ نشینی بالوں پر عطر خاں دھیلنے کی روشنی میں چمکنے لگا تھا۔

”مکو“ مولوی اہل کچھ اس انداز سے بولا جیسے وہ ابھی اپنے سہماں کے لیے ایک ایران کی آرائش وزینا شس سے

فارغ ہوا ہے۔

نسیم احمد کی آنکھیں جھک گئیں اور ہونٹ ذرا سا کھل کر کانپنے لگے۔ پھر اس نے سر اٹھا کر چراغ کی طرف دیکھا جس کی ٹو

بے پناہ دوا چھوڑ رہی تھی۔ آگے بڑھ کر اس نے تنکے سے چراغ کی بتی کو کم کیا اور بولا ”آپ کی اجازت ہو تو عرض کروں“
 ”کھم۔ کھم“ مولوی اہل نے شمیم احمد کے کندھے کو تھپکا اور پھر چونک کر اس کے دوسرے کندھے پر بھی ہاتھ رکھ دیا۔ شمیم احمد کے
 کندھے کی ہڈی پر گزشت کی اتنی بڑی گیندیں سی رکھی تھیں! ”کھم نا، عزیزم“
 شمیم احمد نے اپنے ہاتھ ملنا شروع کئے، ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے کوئی چیز جیسی مشکل سے نگلی اور بولا ”اصل میں
 یہ کام تو میری اماں کا تھا۔ انہی کو آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہئے تھا مگر پچھلے چند برسوں سے ان کا دل بہت کمزور ہو گیا ہے۔ بات
 بات پر مدد دیتی ہیں اور برا بھلا کہنے لگتی ہیں، سو میں نے یہی مناسب سمجھا کہ خود ہی حاضر ہو جاؤں“
 ”متم نے بہت اچانک، مولوی اہل نے بڑی شفقت سے کہا۔

”میں آپ کا پرانا خادم ہوں“ شمیم احمد نے سمجھتے، پھیلتے اور پھر سمجھتے ہوئے کہا ”میری درخواست یہ ہے کہ حضور مجھے ہمیشہ
 کے لیے ————— اس نے ایک بار پھر چراغ کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا کر اپنی آستین پر سے کوئی خیالی دھبہ اڑا دیا۔ ”حضور مجھے ہمیشہ
 کیسے اپنی غلامی میں لے لیں“ شمیم احمد نے نزع کے سے غلامیوں کہا۔

مولوی اہل کا جی چاہا کہ کچھ بچائی بچائے، رسماً ڈرا بیٹھے ہوئے بولا ”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا شمیم احمد“
 شمیم احمد نے بڑی جرات اور دھکے سے مولوی اہل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں، آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ جس شخص سے قرآن مجید
 کے کئی دشوار مقامات اور فقہ کے بے شمار مشکل مسائل کو ان کی آن میں صاف اور سلیس انداز میں سلجھا دیا وہ ”غلامی“ کا مطلب نہیں سمجھا۔ دینی
 دہلی آوازیں جیسے اس نے نزع کی آخری بجلی لی۔ ”جی میرا مطلب ہے کہ حضور ————— حضور مجھے اپنی غلامی میں قبول فرمائیں“

اور جیسے اس دعا صاف سے مولوی اہل کی تسلی ہو گئی! اس نے مزید تشریح طلب کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ شمیم احمد کچھ دیر
 تک نظریں جھکانے کھڑا تھا مگر دوا دوسرے وقت آ رہا، اور جب مولوی اہل ایک لفٹ تک نہ بولا تو اس نے اپنی غلامیوں کو جیسے دونوں ہاتھوں
 سے بصد مشکل اٹھا کر بے انتہا جھک سے اوپر دیکھا۔ مولوی اہل کی دائرہ میں آتے ہوئے اس کے نظریں ٹوٹ گئے تھے، شمیم احمد کی دائرہ
 پر غور کرنا چھک رہا تھا اور مولوی اہل کی دائرہ میں آتے ہوئے جھکا اور غور نظر اسے کھینچنے اور چراغ کی کوئی دھیر دھیر دھواں اگلنے لگی تھی، مگر اب
 شمیم احمد کو تم کو دینے کا خیال نہ آیا۔ وہ کچھ کھینچنے کے لیے بے تاب ہو گیا مگر صرف ہونٹوں کو کھول کر رہ گیا۔ مولوی اہل نے ایکایک
 جیسے کچھ سوچ کر بکری کے پلو سے آنکھیں پونچھیں اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا ”دعا کی تیری کتنی مسکین مخلوق ہے اور جملہ شیائے —————
 کتنی مسکین! اس کی آنکھوں سے بہت سے آنسو ایک ساتھ نکلے اور دائرہ کے بالوں نے انھیں پر دیا۔ ”دوسرے کھال ہے شمیم احمد!
 دونوں گامیوں نہیں دوں گا؟ دینا ہی پڑے گا۔ اور پھر تم تو میرے اپنے عزیز ہو، بھائی، حافظ عبدالرحیم مرحوم و مخدوم کا بیٹا، اپنا بیٹا ہے۔
 آؤ، ادھر آؤ۔“ اور مولوی اہل نے شمیم احمد کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

جب وہ واپس گھر میں آیا تو زینب النساء نے چند قدم کے فاصلے پر سے ہی کہہ دیا ”کہاں سے آ رہے ہو؟“ مگر کی لپٹیں آنے
 لگی ہیں۔“

ہر انسان تو بے پردہ آنری و ڈیٹے جیسی تھی، بولی ”پیراجاجی، سارا گھر تک اٹھا ہے“
 ”کیا بات ہے؟“ زینب النساء نے پوچھا۔

مولوی اہل نے بڑی آسودہ غلطی سے بچوں کی تعداد کی حوت دیکھا۔ وہ جہاں ہاتھ لکھیں آیا تھا اس لیے سب کے مزے لکھنے لگے تھے سب کو ایک ساتھ پیار کرنا مشکل تھا اس لیے بولا ”آج میرے سب بچوں کو روٹی کے ساتھ گڑ کا ایک ایک گڑا بھی ملے گا“ لکھتے ہوئے چہرے مسخیل اور مسرور گئے اور ہر انسان کی نظر میں توستے پر کر گزریں۔

”بات سموعاوت کی ماں“ مولوی اہل باہر جاتے ہوئے بولا۔

زینب النساء نے سب حالات سن کر کہا ”میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہو“

مولوی اہل جہاں ”اندلس شاد“ کی قسم کھا کر کہہ رہا ہوں۔ اب تو اپنے سر کی قسم دیتی ہے تو غیور ڈاکٹر کیا تو محل شانہ سے بڑی ہے ہکاش حوت کی عقل یہاں نہیں کھوڑی کے آس پاس ہوتی ہے اور اس نے مسکرا کر زینب النساء کے نالو پر ایک چیت جڑوی۔

زینب النساء بچوں کی طرح رونے لگی، وہ ان انسودوں کا مطلب سمجھتا تھا وہ بھی تو ابھی کچھ دیر پہلے ایسے ہی انسود کا اچکا تھا۔ ایک لمحے کے بعد وہ آگے بڑھا اور زینب النساء کے بھیکے بھیکے کانوں پر اپنی بھگی بھگی دائرہ رکھ دی۔

”وہاں میں قبول ہوتی ہیں عافیت کی ماں“ مولوی اہل برسوں کی عبادت و ریاضت کا جہاں چہرے پر لاکر بولا ”الحمد للہ! یوں سنتا ہے سننے والا یوں دیکھتا ہے“ سنی یوزمین ”آج مولوی اہل نے سہاگ رات کے بعد شاید پہلی بار زینب النساء کو عافیت کی ماں کے بجائے زینب کہہ کر پکارا تھا۔

زینب النساء آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی ”جب شمیم خدایا تھا جب وہ لڑکا تھا اور تمہارے پاس پڑھتا تھا تو یوں پھیپھی لگا ہوس دیکھتا تھا مرنے کو جیسے کبھی کسی تم مجھے دیکھ لیتے ہو۔“ اندلس

اور ابھی میان بیوی انسودوں کو ابھی طرح خشک بھی نہیں کر پائے تھے کہ ایک بار پھر دروازے کی زنجیر بجی، پیچھے ڈیوڑھی کی

طرف دوڑے۔

”عقدہ“ اب کے مولوی اہل کی آواز میں ڈانٹ نہیں تھی ”میں خود جہاں لگا“ پھر بچوں کے پاس آکر ان کے سروں پر ہاتھ پھیرا اور آہستہ سے بولا ”ندیدہ ہیں بہت برا ہوتا ہے۔ مجھے بہر آئے والاحوہ اور چاول دینے نہیں آتا۔ کئی لوگ دوسرے کاموں کے لیے بھی نکلتے ہیں۔ مجھے بہاؤ پھر ذرا المیہ آواز میں بولا۔“ انھیں باہر سردی میں نہ نکلنے دو مرن جی۔ یہی پیچھے تو میری زندگی کا سرمایہ ہیں“

وہ ڈیوڑھی کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھولا تو گرم چادر میں پیچھے ہرے چورہ فرج داوے ہاتھ بڑھا کر مولوی اہل کو باہر لگی گھسیٹ لیا اور چھاتی سے لگا کر بولا ”مبارک ہو قنبر! بڑا بار مبارک ہو، آخر میری کوششیں پورے رہیں گئیں“

اس وقت مولوی اہل کی نظر دہری میں چورہ فرج داوے کے فرشتے بننے میں بس بروں کی کمی رہ گئی تھی ”اندلس شاد کا شکر اور آپ کا احسان ہے“ اس نے چورہ فرج سے بڑے پچھلے ہوئے سیال لبے میں کہا۔

”تمہارا نے مجھے آپ کے سامنے ضرور فرما دیا“ چورہ فرج داو بولا ”اب جلدی سے شادی کی تاریخ بھی طے کر لیجئے شمیم احمد اچھا لڑکا ہے، پراثر جوان لڑکا ہے اور پھر دو گنا غار ہے۔ دن میں بیسیوں عورتیں اس کی دوکان پر آتی ہیں، اور آپ جانتے ہی ہیں کہ کیسا سنگ زمانہ آگاہ ہے، ارکے لوگیاں بارود کے گوسے ہو رہے ہیں۔ کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ کب پڑے پڑے تھک سے ہو جائیں شمیم احمد کو میں نے ہی آپ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ رسم و رواج کے مطابق اس کی ماں آپ کے گھر میں آتی مگر بھینسا بھینسا گئی ہے، کوئی بات

اس کی مرضی کے خلاف ہر توسل و شقیں تو مٹا دیتی ہے کجنت۔ ابھی ابھی شہم نے آرگنٹا یا کہ آپ نے حامی بھری ہے، میں نے اسے جلدی شادی کر لینے پر زور دیا تو بولا کہ آپ ہی قلمبر مولوی صاحب سے تائید کا فیصلہ کرنا دیکھتے، سو میں اسی لیے حاضر ہوا تھا۔ آپ کو ایک سوچ لیجئے اور یہ ————— پر ————— ”چودھری فتح داد نے گرم چادر کے نیچے سے ایک پوٹلی سی نکالی ————— یہ میری بیوی کو دے دیجئے گا۔“ مولوی اہل نے خاموشی سے پوٹلی لے لی تو چودھری نے آہستہ سے کہا ”اللہ قبول فرمائے؟“

”آہیں“ مولوی اہل کے منہ سے غارتیہ لفظ نکل گیا۔
مولوی اہل نے اندر آکر پوٹلی کو لی تو ایک بڑے سے بڑی دھال میں سوکے ایک فوٹ پر سونے کے دو جھکے لکھے تھے۔ جن کی بڑے سے بڑی تین کٹریوں میں جانے کیسے جڑے تھے یا مینا کاری کا کام تھا!

زیب النساء کسی اور سیر کی امید میں رہناں کو چھڑا کر چکی دوستی احمد نے پیچھے ہیں؟
اور ابھی مولوی اہل جواب نہیں دے پائے تھا کہ ہر النساء بھاگ کر باہر نکل گئی۔
”اے؟“ مولوی اہل نے حیرت سے زیب النساء کی طرف دیکھا اور پھر دونوں ایک ساتھ بے اختیار ہنس پڑے!

”کچھ نہیں؟“ زیب النساء باہر دیکھتے ہوئے انگشت نہایت کو ناف کی کیل پر رکھ کر بولی۔
”تم نے بھی تو منہ پر کدو کر دیا۔۔۔۔۔۔“ شمیم احمد نے بھینٹے ہیں؟ ————— ”مولوی اہل نے زندگی میں شاید پہلی بار عورت کی آواز اور انداز کی نقل اتاری اور بچے کو اچھا نام بخش مہرت زدہ تھے، محظوظ ہو کر زور زور سے ہنسنے لگے، عمدۃ النساء ڈلنے ڈلنے جھکائی کو چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”چودھری فتح داد، دے گئے کیسے بہن کے لیے“ مولوی اہل نے بڑی بے پرواہی اور روداری میں راز فاش کیا۔

”اللہ تعالیٰ فرمائے“ زیب النساء جیسے اپنی تیر میں سے لڑکی جس پر دنیا بھلائی چڑھا ہوا تھا۔

چند ہی روز میں ہر النساء مایوس بھا دی گئی۔ اس کے ڈھکوں بیروں پر مہندی تھوپ دی گئی۔ ڈھولک تو خیر نہ بچی کیونکہ شادی لاکھ سہی رات پر مولوی ابوالکلام کا گھر تھا جس نے منور پور صلوہ کی رہائش میں تشریف آوری کر دینے کی لڑکیوں کے دھن بجا بجا کر گانے کے متعلق تو بیٹھا تھا مگر ڈھولک کا جواز کہیں موجود نہ تھا اور خجیب اتنا بد نصیب تھا کہ ہاں اب تک دف کا رواج ہی نہیں چلتے پائے تھا۔ ”دف تو لاؤ اور بجادو اور گاؤ۔ تم ڈھولک لائیں تو میں اسے اٹھا کر جوت پر چھینک دوں گا“ مولوی اہل نے میراٹل کے جوم سے ڈانٹا کہا تھا۔ آخر گاؤں کی لڑکیاں ہر النساء کو اپنے وار سے میں لے کر چڑھ گئیں اور ڈھولک کے بغیر ہی اپنی لڑکی لاپوں سے رات بھر اس کے گرد و محبت اور دوستی پھولوں اور پھواروں، ملاقاتوں اور جھلمکوں کے ٹھکانے بنتی رہیں۔

لیکن بھلا شمیم احمد کو ڈھولک شنائی کی بجائے اور گالے جھوڑنے سے کون روکتا۔ رات ایسی دھوم سے آئی اور مولوی اہل کی دیوڑھی میں وہ ہنکا مہر کی معلوم ہوتا تھا ڈھول کی ہر چوٹ مولوی اہل کے کچے ٹھونڈے کی بنیادوں پر پڑ رہی ہے۔

یہ دھوم دھڑکا دیکھ کر رات ہی رات مولوی اہل اور زیب النساء نے مکان کے ایک گوشے میں چند سرگوشیاں کیں۔

لڑکیوں کے گیتوں کے درمیان کبکوں کے گھٹننے، کھنکھنے اور بند ہونے کی آوازیں رینگتی رہیں۔ اور حسبِ دور سے دن صبح کو ہنسنے لگا، لیکن اور جیت پر چھپا کر یا تو گاؤں کا دلہن نظر میں تو تورا کچھ ہٹ گیا۔ کدو سے خیر نہیں ہی جاتے ہیں پر یہ سونے کے استہارے سے بھٹکا

مولوی اہل کے پاس دست خفیہ کا تعویذ ہے ”کسی نے راستہ دی۔ ایک تیرھیاں نہ ٹھوڑی کی ٹھکی ہوئی بھتی میں اٹھلی ڈبو کر گنا۔ کچھ تلوں کے کئی جوڑے تو ان گناہار اٹھوں نے بچان لئے ہیں کچھ تو بے پارسے مرے دایوں کے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو بی بی زینب النساء کو اپنی شادی پر ملے تھے۔ سگھڑے اس لئے اوروں کے لئے رکھ چھوڑے۔ یہ لیکن اور یہ ناک کی کپل یہ سب کچھ۔ بی بی کا بے پردہ یہ جھکے؟ اور اس نے اپنی اٹھلی کو ٹھوڑی کی جھلی میں سے نکال کر آسمان کی طرف بلند کر دیا۔

وہ انسانہ کو ڈولی میں تھاپائی تو آنکھوں اور چہرہ روں کی ایک لہری اس پر سے بھار ہوئی لگاؤں کے بچے ان پر چھینے ہوئی اہل کے بچے جو ڈیوڑھی میں ماں باپ کی دیکھا دیکھی رو رہے تھے۔ ایک دم اپنی جگہ سے یوں اچھلے جیسے ان کے قایموں تلے ٹیک دار گمانیاں ابھرا کئی ہیں ”موسوی اہل کر گنا۔ گناہاں دھڑکی برائے نکلیں۔ بچے جہاں تھے وہیں قائم کئے نہ نہت عادت ایک کئی کو اپنے پیچھے تلے چھپائے کھڑا رہا۔ اور برات کے پہلے جانے۔ کچھ بعد ہی اس کا یہ آنا تھا اس کے پاؤں سے ہاتھ تک کی مسافت۔ ملے کر سکا۔ مولوی اہل کچھ دوڑتک ڈولی تلے ساتھ ساتھ گیا۔ اس کی ناک اور آنکھیں سرخ تھیں مگر ان کے ساتھ چہرے کی زردی حذری تھی اور دونوں اہل بالنگی گلاب ہو رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دکھ اور اطمینان نے چہرے کی سرزمین کو اپنے پلے نکال پھرنے کے سیٹھے بانٹ لیا ہے، ایک سو ڈیوڑھی چالو۔ دیک گیا اور دوڑتک ڈولی پر بیٹے ہوئے ریشمی پرے کو بچھتا رہا۔ پھر دیک لہی گوی سانس لے کر اس نے دونوں ہاتھوں کی آنکھوں کو ایک دوسرے میں چھسنا کر چھینا اور پٹ کر گھر کو جانے لگا۔

گلی میں گاؤں کے بچے اسے ایک اکٹریاں اور چھوڑے ڈھنڈھ رہے ملے۔ ڈیوڑھی کے دروازے پر کھڑے ہوئے عارف اور دوسرے بچوں نے اپنے ابا کو بلایا تو ایک آن سر بھو توں کی طرح غائب ہو گئے مولوی اہل کے ہنرمیں ہیں۔ دیکے جو سوزش اور کھلی رہی تھی وہ مسکراہٹ بن کر نمودار ہوئی اور اس کی آنکھوں کے سرخ صلیق چلی گئی۔ ڈیوڑھی میں داخل ہونے لگا تو اسے دیوار سے لگی ہوئی ایک اکٹری چلتی دکھائی دی۔ لیکن وہ بڑی۔ بے پروائی سے اس کے بڑھ گیا۔ زینب النساء۔ شاید کوڑا ہی سے لگی گھڑی تھی مولوی اہل کا ہاتھ پکڑ کر بچوں کی طرح زار زار رونے لگی اور پھر اس کے ساتھ ساتھ چلی برقی جب آنکھیں میں آئی تو دونوں ہاتھوں سے بڑے سے۔ دائرے بنا کر بولی ”جہاں لیے تو میں یہ خیرستان کا سا ساتھ لگا چھوڑ گئی ہماری مہر ان“

”تمہارا تو دماغ چل گیا ہے“ مولوی اہل نے اپنی مسکراہٹ کو اور بھیلایا ”مہر میں کئی تو کیا زندہ کو بھی لے گئی؟ اور کیا شمس بھی اس کے ساتھ چلی گئی؟“ پھر ذرا دک کر بولا ”عارف میرا زندہ کیا کر رہی ہے؟“

”جی رورہی ہے“ عارف دلو اسے لگے ہوئے بچوں کی نگاہ میں سے نکل کر بولا۔

”کیاں؟“ مولوی اہل نے پوچھا۔

”جی جہاں مہر ان آیا بابوں طبعی دیں“ عارف بولا۔

”زندہ؟“ مولوی اہل بکھرا۔ زینب النساء مسلسل روئے مجاہدی تھی۔

زندہ وہ وہ اسے برمودا دار ہوئی۔ نیا گلابی دوڑتک اسٹوف کی مٹی کے سبب جگہ جگہ سے سیاہی مال کر رخ پڑ گیا تھا۔ اور زندہ نہ اپنے جی منہ ہی ہے ہاتھوں کو جھک اٹھ کر کھم سے چھلکا تھا ان پر جگہ جگہ مٹی محم رہی تھی اور بالوں کی مینڈھیاں اجڑ رہی تھیں اور —————

نارویوی اہل توبہ کو دیکھتے ہی سنانے میں آگیا تھا۔ مسکراہٹ میں نہ توں میں ہونے لگیں پڑ پڑنے لگی تھی جیسے دم توڑ رہی ہے اور چہرہ پر زردی کھنکھاتی تھی۔ زبدۃ النساء چند قدم پر آکر گئی اور مسکینوں میں روکنے لگی۔ اور پھر مولوی اہل نے زب النساء کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں جکڑ لیا اور اسے بے ڈھنگ پن سے کھینچ کر ان کے ایک گوشے میں لے جا کر یوں بولا جیسے گھر میں آگ لگنے کی اطلاع دے رہا ہے ”عارف کی ماں! سنو، یہ زبدہ تو جوان ہو گئی ہے!“ اور زب النساء انھیں پھاڑ پھاڑ کر زبدہ کی طرف یوں دیکھنے لگی جیسے وہ اب تک والدین کی بے خبری میں ہرن کے عقب میں پیچھی پاتی بڑھتی رہی تھی۔

کچھ دیر کے بعد مولوی اہل نے بغیر ضرورت کے گلا صاف کیا اور دم بخود زب النساء کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا ”نکر نہ کرو مولوی اللہ جل شانہ کی رحمتوں سے ماہر سب میرا کفر ہے۔“

زب النساء نے مولوی اہل کا ہاتھ کھینچ کر سختی سے اپنے کندھے پر گرا دیا ”نرم کرو۔“ چلیے یہاں ہاتھ پکڑے چلے گئے، اب کندھا سہلا ہے ہو۔ جوان جہان، سیماں کیا کہیں گی کہ اولاد کے سامنے۔“ زب النساء نے فقرہ پورا کرنے کی بجائے اپنا وہی کندھا اچکا دیا۔

مولوی اہل کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ ”پھار! دشمن!“ شمس النساء غدار میں سے نکلی ہی تھی کہ مولوی اہل نے جیسے سہارا لینے کی خاطر اپنے عقب میں دیوار کو ٹوٹنے کے لیے ہاتھ دھکا دیا اور کوئی سہارا نہ پا کر ٹوٹی نشانہ کی طرح جھوم سکیا۔ چلتے ہوئے شمس النساء کے پاؤں کے تپنے ایک دم پیچھے رہ گئے وہیں پر نہیں لگ جاتے تھے بلکہ اس کے سمجھنے کی طرح اس کے پاؤں میں ہی لہر ڈسنا تھا۔ سب سے پہلے بڑی زمین کو چھوڑتی تھی۔ پھر تپنے سے کچھ جھلکا تھا اور اس کے بعد پیچھے کی اٹھی ہوئی انگلیاں باری باری جیسے چمک چمک کر دھرتی کو چھوڑتی تھیں۔ تب جا کر دوسرا قدم اٹھنا تھا۔ ”کچھ نہیں بیٹی۔ کچھ نہیں۔ جاؤ۔“ مولوی اہل تیزی سے ڈیوڑھی کی طرف جاتے ہوئے بولا۔

شمس النساء حیران ہو کر اپنی ماں کو دیکھنے لگی۔ اور زب النساء زار زارہ ذوق میں ڈھیر ہو گئی، زبدہ اور شمس اس کی طرف دیکھیں۔ مولوی اہل نے باہر جا کر چروں کی طرح زور زور دیکھا اور پھر دیوار کے قریب سے چمکتی ہوئی اکئی اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لی۔

گھر میں تل دوہی کس تو تھے۔ اب ان میں سے ایک میں سوکے ٹکڑے رکھے جانے لگے تھے اور دوسرے میں تھن اور عمدہ کی گڑیاں اور دوسرے ٹھنوں کی بلوہ کی گولیاں پڑی رہتی تھیں۔ گاڑیوں میں لوہیوں کا پرانی سکول بھی کھل گیا تھا۔ اس لئے اب کلام پاک کا درس لینے والی لوہیوں کی تعداد بہت کم رہ گئی تھی اور اسی لیے سوکے ٹکڑے اب ہفتے کی بجائے چند روز کے بعد ابالے جانے لگے تھے۔ نمازیوں کو بھی زلزلے کی ہوا لگ گئی تھی۔ بعض وقت تو مولوی اہل اذان سے کر دہیں میٹھا جاتا اور جب دیکھتا کہ نمازیوں کے انتظار میں نماز فضا جو رہی ہے تو کچھ یوں کھویا کھویا سا اٹھ کر اندر مسجد میں آتا جیسے کوئی بڑا ناگوار فرض ادا کرنے چلا ہے۔ جمعہ کی نماز پر جب چند کسان جمع ہو جاتے تو وہ بڑی رقت سے خطبہ دیتا۔ اسلام میں نماز کی اہمیت اور غلطی دین

کی خدمت کے برکات کا تذکرہ کرنا اور کہتا: "تمہیں یاد ہو گا کہ کوئٹہ میں زلزلہ آیا تھا، کہیں آیا تھا، ترکی میں بھی زلزلہ آیا تھا، کہتے ہیں گاؤں کو زمین کھل گئی، کہیں کھل گئی، مسلمان ہر طبقہ پر بلکہ یوں کی طرح زلزلہ پڑا، جو برسے ہیں، کہیں پورے ہیں، کہیں کبھی سوچا ہے تم نے، اور بعد تم کہیں سوچو، تمہیں تو گنہگار کے قرار دے دیں۔ سے یہ لگانا نہ کر کھلے۔ یہ نماز نہ پڑھنے اور علمائے دین کی خدمت نہ کرنے کے سہتے ہیں۔ یہ تو راہی ہے۔ یہ آثار قیامت ہیں۔ سمجھے، اور کیا تم اپنے گاؤں کو بھی زمین کے پیٹ میں اتار دو گے؟ بناؤ، بناؤ! —" اس قسم کے جذباتی خطبوں کے بعد مقتدیوں میں ذرا سا اعنافہ ہوتا اور ایک دو روز تک کھی گئے، وٹھنے آنے لگتے، مگر پھر وہی سناٹا عود کر گیا جس میں زندہ کی آنکھیں جھپکیں، شمس کا جسم چمکتا، مٹی کے خالی کبکسوں میں سوکے ککڑے اور بچوں کے لمبے بیٹے ٹپکتے اور نالیانیں بجاتے۔ اور قمر کی گریاں نکلی ہو چکر ایک دوسرے میں گھسی پڑتی ہیں۔

مولوی اہل کے صہرت دو اہلے سہاٹے سٹھے جو کبھی نہ ٹوٹے۔ اللہ جل شانہ اور چودھری فتح داد۔ اللہ جل شانہ کا یہی کرم کیا کہ حاکم مولوی اہل اور زبیب النساء اسے نکاح زندہ سٹھے اور اب تک ان کی ساری اولاد زندہ سٹھی، اور جہاں لگا، جہاں اس ٹھاتے سے ہو اٹھا کہ زندہ اور شمس کے لیے رہنے کے پیراموں کا سلسلہ ٹوٹنے ہی میں نہ آتا تھا۔ لیکن مولوی اہل جس شدت سے ہر انسان کے برائی تلاش میں سرگرداں رہتا تھا، اسی شدت سے وہ زندہ النساء اور شمس النساء کے لیے آئے والے پیراموں سے متعلق تھا۔ "ابھی تو گل کی بھیاں پڑی تھیں، ابھی تو گلوں سے کھینتی ہیں شمس نے تو ابھی تک قمران جو بھو ختم نہیں کیا، میں ذرا زرا سی پونی ابھی بیچوں کو دل سے اٹھا کر پرست کھیں بیٹے گاؤں، زبان دیان نہیں دوں گا۔ اگلے سال دیکھ جائے گا۔"

"دیکھ جائے گا" وہ زبیب النساء زندہ اور شمس پر سہے تحاشا آتی ہوئی جوانی کی اطلاع دیا کہ کہتا: "اور میں سٹاؤں دھڑھڑانے لگا۔ توکل بڑی چیز ہے، عات کی ماں، اس کاں جب دھرتی میں بیج توںاتے تو اللہ جل شانہ پرتوکل کرتا ہے۔ توکل نہ کرے تو بیج وہیں میں ہی جو کر دے۔ نہائے۔ یہی توکل بیج کو چٹھاتا ہے اور دھرتی کو چیر کر پودا نکالتا ہے، اور سبزیٹیوں کی کوکھ میں لگیوں اور بھڑوں کو پوداں چٹھاتا ہے، سمجھیں عادت کی ماں؟"

"پورساں بیج توںاتے نا،" زبیب النساء بحث کرتی "تم نہ کیا کیا ہے؟"

"اللہ اللہ" مولوی اہل کہتا "میں نے بہت کچھ کیا ہے، میں نے نہ ہنا زکے بعد دعا میں ملائی ہیں!"

اور زبیب النساء لاجواب ہو جاتی۔

دعاؤں کے بعد مولوی اہل کا وہیں چودھری فتح داد کی طرف منتقل ہو جاتا۔ آج کتنے برسوں سے اس خدا ترس انسان نے اس کے گھر میں ہر شام کو وظیفہ سمجھا تھا۔ اور کتنی پابندی سے ہر فصل پر مولوی اہل کو پوشاک پہناتی تھی، اور لطف کی بات یہ ہے کہ دوسروں کی طرح ڈھنڈا دھنسن بیٹھا تھا۔ لیکن اب چند روز سے چودھری فتح داد بیمار رہے لگا تھا۔ ایک بوڑھے نانی نے جو عرصے سے حاجی کا کام کرنا تھا چودھری کی دیر بھر کی بڑی کچھوڑے کے اس پاس کچھ ایسی نشتر تزی کی کہ بوجھو ڈاشا بہک سوچ کر کھپوت پڑا اور بسنے لگا۔ ساتھ ہی چودھری کو لڑنے کے ہمارے آگیا اور علاقے کے حکموں کا نا تابندہ گیا۔ ان دنوں مولوی اہل کے گھر دینی چھائی رہتی۔ ایک تو ہر انسان، سہاس کی ساس کا برتاؤ سوا بلان درج تھا۔ اس پر چودھری فتح داد کی علالت، انکے کسی وقت شوبہا نے نہ مولوی اہل کی جی اٹھتا ہو چپ ہو نا مرادو! اور چچوہری فتح داد بیمار پڑا ہے اور ادھر تم ہنس کھیل سہے ہو، نا نہ کہو! اب چودھری نہ ہوتا تو اسے تک ہم میں سے

اوسے آدمی تو قانون سے مرگے ہوئے۔ اللہ جل شانہ کے حضور میں اس کی صحت کی دعا کر دے بغیر؟“
 مولوی اہل آن و نون ہر روز صبح و شام چودھری فتح داد کے ہاں مزاج پڑی کر جاتا۔ لیکن وہاں عبادت کرنے والوں کے ہجوم میں کبھی کوئی گھر کی بات نہ ہو سکتی۔ بس اتنا ہوتا کہ مولوی اہل کو دیکھ کر چودھری تعظیماً اٹھنے کی کوشش کرتا اور پھر گراہ کر اسی طرح سڑک کے بل گر جاتا ”دعا فرمائیے قبلہ؟“ وہ آہستہ سے کہتا اور مولوی اہل اُٹھ کر آسمان کی طرف اٹھتا اور کہتا ”وہی شافی مطلقاً آپ کو صحت کلی عطا فرمائے گا۔“ لیکن ایک روز جب مولوی اہل چودھری کے ہاں گیا تو وہاں سوائے اس کے ایک بیٹے کے اور کوئی نہ تھا۔ چودھری کی طبیعت بھی خلل معمولی تسلی ہوئی تھی۔ آج وہ حسب عادت تعظیماً کچھ اٹھا۔ لیکن کہا نہیں۔ لڑکے کو اشارہ کر کے باہر بھیج دیا اور بولا ”بیٹیاں کیسی ہیں قبلہ؟“

”الحمد للہ۔ ابھی ہیں۔ دعا گو ہیں؟“ مولوی اہل نے جواب دیا۔

”سننا ہے بہت پیغام آرہے ہیں؟“ چودھری نے پوچھا۔

مولوی اہل اٹھ کھڑے ہوئے۔ کچھ بیٹھا تھا کہ دو لڑکیوں کے پیام ظرفین کے دو میاں سرسبز راہوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ جوانی کا دھماکا جتنا ہے تو کوئی راز نہیں رہتا۔ چونکہ کر بولا ”جی ہاں بہت آرہے ہیں۔“
 ”پھر؟ کوئی فیصلہ فرمایا آپ نے؟“ چودھری مسلسل مولوی اہل کو دیکھے جا رہا تھا۔
 مولوی اہل کھڑک سا گیا۔ کھنکھنے کے لیے ہونٹ کھولے مگر محسوس کیا کہ اچانک ناوا، زبان اور حلق خشک ہو گئے ہیں۔ کچھ نکل کر بولا ”جی فیصلہ نہیں کیا کروں۔ یہ تو اللہ جل شانہ کے گناہ جس خالی دھندہ گھر میں غلام کے لیے ملک ملک نسلے وہاں بیٹوں کے رشتے کوں کے کرتا پھرے“

”تو قبلہ کیا میں مر گیا ہوں؟“ چودھری فتح داد کی آواز میں شکایت کی تہا بہت تھی۔

”آپ کے دشمن مریں؟“ مولوی اہل فوراً بولا اٹھا ”آپ اللہ جل شانہ کے فضل سے تندرست ہو جائیں تو پھر دوڑیں پیڑ کر ملے کو میں گئے“

”جی ہاں“ چودھری نے سجدہ و اذان دہاں میں کہا ”فوراً ملے ہو ناچا بیٹے گھر میں جو ان کی بیٹی تو ایک ایک دن ایک ایک صدی بن جائے، اللہ تعالیٰ اسب مسلمان کرنے کا۔“ وظیفہ تو بابتا قاعدہ پہنچ رہا ہے نا؟“

”جی ہاں“ مولوی اہل نے جواب دیا ”ما قاعدہ“

مولدہ قبول فرمائیے ”چودھری فتح داد نے آہستہ سے دعا کی۔

”آمین“ مولوی اہل نے عادتاً اس دعا کی تائید کی۔

کچھ دیر خاموشی رہی، چودھری ذرا سا کرا پھر بولا ”سننا ہے بیٹی نہر اللہ! اور شکر احمد کی تو خوب بندہ رہی ہے پر ساس اس کے پاؤں نہیں ملنے دیتی“

”جی ہاں“ مولوی اہل نے بڑے دھمکے کہا ”لیکن میں نے کبھی کوئی دخل نہیں دیا۔ بیٹی بیاہ دے جانے تو ہر لڑائی ہو جاتی ہے“
 ”پر ساس سے کیوں نہیں بنتی؟“

”بس وہی نہ ہی غمگیں کے طعنے تو لگتی ہے، تو سوسکے ٹکڑوں پر پڑی ہے، تیرے کپڑوں سے کفن کی بُرائی ہے تو ایسے سادہ خال لائی ہے؟ وہی عورتوں کی باتیں؟“

”ہوں، جو دھڑی کچھ دیر تک کچھ سوچتا رہا، پھر بولا ”بیٹی پرانی نہیں ہو جاتی تیرا،! بیاہ کے بعد تو اس کے حقوق بڑھ جاتے ہیں۔ اب اگر ساس اس قسم کی ہے تو آپ کا فرض ہے کہ اسے ان طعنوں کا موقعہ ہی نہ دیں۔ وہ بیٹی ہر انسان کو کنگھی کہتی ہے سنا؟ اب ہماری بیٹی کے بچہ ہو گا تو اس کے لیے آپ انہیں کسے کپڑے اور طلفی ڈوپیاں اور سونے کے گھنگھر ڈی والے کنگن بیچ دیجئے اور دھیر دیکھئے کس طرح بیٹی کا مان ہی بڑھے گا اور بڑے بیانی بل پر زبان بھی کٹ جائے گی۔ ٹھیک ہے نا بھلا؟“

ٹھیک ہے، مولوی اہل خانہ سوچا۔ بہت حد تک ٹھیک ہے مگر ایک حد تک محال بھی ہے۔ یہ سب سامان آخر آئے گا کہاں سے؟ اور کیا عارف کی ماں نے آج سے آٹھ مہینے پہلے مہرن کے مانے میں جو اندازہ لگایا تھا وہ درست تھا؟ اب مولوی اہل خانہ وہاں دیر تک پھلنا پھٹے رہنا مشکل تھا تو کیا بیچ مہرن بیٹی کے بچہ پیدا ہونے والا ہے؟ اس نے تو زینب النساء سے کبھی پوچھا ہی نہ تھا اور زینب انہیں بھی حیا کے مانے بھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ مولوی اہل بیٹیوں کے بیٹوں کو ٹوٹتے پھرنے کے سخت خلاف ہے۔

مولوی اہل قریو مہمی ہی سے بھارا ”عارف کی ماں؟“

زینب النساء بھاگی آئی ”خدا انہ کرے، کیا ہوا؟ جو دھڑی کیا ہے؟“

”اندلہ جل شانہ! رحم فرمائے گا، مولوی اہل بولا ”عارف کی ماں! سنو مہرن بیٹی کیسی ہے؟“

زینب النساء بیچکی ”تمہیں کس نے بتایا؟“

ٹھیک تک ہو گا؟ ”مولوی اہل تو آج آپ سے باہر ہو رہا تھا۔“

”بس اندلہ جانے کا آج کل میں؟“ زینب النساء تعجب کر بولی ”پتہ میں کس نے بتایا؟“

مولوی اہل تقریب کے سے انداز میں بولا ”بس یہی موقع ہے جب ہم مہرن بیٹی کو اس کی ساس کے طعنوں نشتر سے چھکھڑا دلا سکتے

ہیں، ہم اپنے نوٹے نوٹے کے لیے بہت رہا۔“

”اندلہ کرے نواسہ جو“ زینب النساء نے مولوی اہل کی بات کاٹ دی۔

”جو کچھ بھی ہو“ مولوی اہل نے فوراً تار کو جوڑا ”ہم بچے کے لیے بہت سارا سامان بیچ کر اپنی بیٹی کا مان بھی بڑھاؤں گے اور اس

بد بخت بڑھیالی ملید زبان بھی مٹانے لگے ہمیشہ کے لیے ٹھیک ہے نا؟“

”کھنا تو بڑا آسان ہے، پر کدو گے کہاں سے؟“ زینب النساء نے پوچھا۔

”تو کئی عارف کی ماں، تو کئی“ مولوی اہل کے ذہن میں جو دھڑی بیچ داد کا میٹھا میٹھا ہمدردانہ لہجہ گھوم رہا تھا۔ ”اندلہ جل شانہ! پر تیکہ

کردو، خود مولوی اہل کو اس وقت جو دھڑی پتہ نہ تھا۔

شام ہوتے ہی زینب النساء نے برقعہ اوڑھا۔ عارف کو ساتھ لیا اور مہر النساء کے ہاں چلی گئی۔ رات گئے واپس آئی۔ برقعہ کو

ایک طرف رکھ کر آہستہ سے بولی ”معاذ گھمے جو عارف کے آتا؟“

”میں عارف کی ماں کیوں؟“ مولوی اہل سنت نے لعنت میں سے سزا نکالا۔
 ”بڑی تکلیف میں ہے مرنے پر بی شکریم احمد روبرو؟“ خواجہ چارہ۔ شاید کل تک بوجھائے گا، ”زیب اللہ“ نے بڑی کھٹکتی ہوئی آواز میں سرگوشی کی۔

”سچ ماں؟“ زیدہ ٹیپ کر کے تر پراٹھ بیٹھی۔
 ”اے! مولوی! کل اور زیب اللہ حیران رہ گئے، اور پھر اس موضوع پر مزید انہماک اور نئے نئے بغیر ہی سو گئے۔
 دوسرے روز بھی کچھ ایسی ہی کیفیت رہی جب بیٹی مائے دو کے جتنی ہے اور ماں باپ مائے خوشی کے پھولے نہیں سماتے۔
 اور پھر اسی رات کو ایک ناشی نے ڈیوڑھی کا دروازہ کھٹکھٹایا مولوی اہل سنت نے ایک کڑنچر کھوئی، مرنے کے ہاں بیٹا ہوا تھا۔ ساوا گھر جاگ اٹھا، درجہ کافی دیر کے بعد بس اپنی اپنی مسکراہٹیں کر کے اڑ گئے۔ گئے تو مولوی اہل زیب اللہ کے پاس آیا، اب کیا ہوگا؟“
 ”جو دھری کیسا ہے؟“ زیب اللہ نے پوچھا۔

”اللہ جل شانہ! بھی رحم فرمائے! مولوی اہل سنتے لکھا۔
 زیب اللہ، اس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی، ”خلائی ٹوپریں اور سونے کے کلکتوں کو تو جھونک بھارت میں۔ میں تو کشتی ہوں اگر ریشم کا ایک ایک چوڑائی بیڑا میں تو ناک و جاہ لے کوئی سبیل ہے؟“

”سبیل! مولوی اہل سوچ میں پڑ گیا اور جب بولا تو اس کی آواز میں قصہ تھا ”تمہاری عقل جی تو اڑیوں میں ہے۔ اور جانے وہاں می ہے کہ نہیں رسات بیٹیاں ہیں اور سپہی بیڑی کے بیابا پر کپڑے لٹے اور گھٹنے پاتے یہاں تک کہ آنکھوں کے پچھلے بھی جھیر میں رسے ڈالے۔ آخر ایک جھوکے جھیلے امام مسجد کی بیٹی کا بیاہ تھا۔ وہ کوئی ذاب زادی تو تھی نہیں کہ کوئی کھلی دھڑا۔ اب ہاتھ بھر لوٹا پیدا ہوا ہے تو اس کے لیے دو ہاتھ کپڑا موجود نہیں اور بچہ بھی ہے کوئی سبیل ہے؟“ نہیں ہے کوئی سبیل، کفن ہی تو نہیں کر، اٹھا کر نواسے کو پہنا دیتا۔“
 ”بلکہ کیوں گئے؟“ زیب اللہ بھی غصے میں بولی، ”کفن نہیں اس کے دشمن۔ اللہ وہ سہرے باندھے۔ اب یہ تو مجھ سے نہیں ہوگا کہ خالی ہاتھ کھانا مرنے کے پاس جاؤں اس کی کہیں ساس کے سامنے، اور زانی زانی ہمارے قربان ہو کر واپس آجاؤں! غصوں کی گھڑی اٹھا کر مجھ سے تو یہ نہیں ہوگا جینا اجری ہو جائے گا میری بیٹی کا۔ ساس ناک میں دم کر دے گی۔ آنکھیں نہیں اٹھاسکیں گی کسی کے سامنے۔ زیدہ اور حسن کو بھی کوئی نہیں پوچھے گا۔ سب کو پتہ چل جائے گا کہ کچھ تھا وہ ایک دم اگل بیٹھے اور اب وہی سوکے کھڑے توڑتے پھرتے ہیں۔ ساری مگر کنواریاں بیچی دیاں کی؟“

”بیٹی! میں، مولوی اہل پیش میں آگیا۔“ اب کہ تو سر پیوڑ ڈالوں اپنا۔ کہ جو دیا کہ سرے پاس کفن تک نہیں اور تو ریشم کا کپڑا مانگتی ہے، کچھ نہیں میرے پاس، مجھیں، میرے پاس کفن میں.....“ مولوی اہل باہر نکل گیا۔

زیب اللہ کچھ دیر تک اس خیال سے چپ چاپ بیٹھ رہی کہ وہ آگن میں کچھ دیر تپل کر اندر آجائے گا مگر جب ڈیوڑھی کے دروازے کی زنجیر کھٹکتی آواز آئی تو وہ ہلکا کر دودی۔ اور زبدۃ النساء اور ساس اللہ ٹیپ کر کے رستوں میں سے نکلیں اور ملتی ہوئی اپنی ماں کے پیٹے نکلیں۔
 مولوی اہل سیدہ صاحبہ میں گلیاں ٹوک کر کے دیر تک تھپ تھپا پھر صبح کی اذان سے کہ کلام پاک کی تلاوت شروع کر دی چند منٹ لگائے تو جماعت کرائی اور سوچ طوطی چوسنے پر گھر آیا تو زیب اللہ اسی جگہ بیٹھی اپنی سوچی سوچی آنکھوں سے دیوار کو کھوٹے جارہی تھی اور زبدہ اور

شخص اس کے پاس گھڑیاں بی ہوئی پڑی سو رہی تھیں۔ وہ بچروں کی طرح چپکے سے اپنی چار پائی تک گیا اور یوں بے حس و حرکت بیٹھ گیا جیسے اسے تصویر بنا دیا ہے۔

زیب انسان کی نظریں دیکھا سے ان کو زمین پر جم گئیں۔ مولوی اہل کی نظروں نے ان کا تعاقب کیا مگر مذہب پر نہ ہر سکی، پھر جانے لے گیا خیال آیا کہ اس نے زور کی ایک آہ مہری۔ اب زیب انسان سے نہ بگاڑا۔ خود اس کی طرف دیکھنے لگی۔ مولوی اہل کے ہونٹوں پر مری مری مسکراؤ نمودار ہوئی اور اس کی آنکھوں نے کہا ”ادھر آؤ“

زیب انسان اٹھ کر اس کے پاس گئی۔ اب تک مولوی اہل موم پر چکا تھا۔

”کہاں چلے گئے تھے؟“ زیب انسان نے بڑی پیادہ بڑی نکالت کی۔

”مسجد میں“ مولوی اہل نے بچوں کی طرح جواب دیا۔

”کیوں گئے تھے؟“

”دیکھو جاتے ہیں؟“

”کچھ سوچا؟“

”ہاں“

”کیا سوچا؟“

”یہی کہ صبح ہو چکی ہے۔ تیس تو ماں ہونے کے سبب رات ہی کو مہرن کے ہاں پہنچ جانا چاہئے تھا۔ رات کو نہ جا سکیں تو اب اس وقت تو تمہارا عجیب بہت مہروری ہے“

”مضالی باغ؟“

”میں“

”پھر“

”یہی تو سوچ رہا ہوں۔ تم نے کیا سوچا؟“

”یہی“

”کچھ دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔“

”سنو“ زیب انسان بولی ”کہیں سے سو روپے تک قرضہ مل جائے گا؟“

مولوی اہل نے عجیب اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ پھر ہونٹوں کو سیکڑ کر زمین کو گھورا اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر گویا ہستہ ہستہ اٹھا جیسے کڑوٹی ہوئی ہے، نکلے ہوئے لمحے میں بولا ”ابو الزکات کو کون عقل کا اندھا قرضہ دے گا عادت کی مال۔ مجھے سب لوگ بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ سو کے کڑوٹے پیٹ میں جا کر آنکھوں میں سے جھانکے لگتے ہیں۔ مجھے تو اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔ سوچنا ہوں آج نواسے کے لیے دو گڑا کھانا بیچ سکا تو پھر اس کا ڈن میں کاہے کر رہی گئی۔“

زیب انسان بڑی مہارت سے اڑے ہوئے انسان کی گئی۔ بولی ”چودھری کیسا ہے؟“

”ہیں جاتا ہوں“ مولوی اُبل نے جواب دے کر کہا ”دراں را بھی اچھا ہوا تو مرد کا ضرور پوچھے گا۔ ہو سکتا ہے اللہ جاننا نہ کوئی سبیل پیدا کر دے“

مولوی اُبل کافی دیر تک داپس نہ آیا۔ زیب النساء نے برقعے کو جھاڑ کر انگلی پر ڈال دیا اور عارف کو منہ ہاتھ دھوئے اور تیار ہو جانے کو کہا۔ رجبہ اور شمس نے صندوق کے وہ بھی اپنے بھائی کے گرد کیٹنے جانیں گی ”ابھی ٹھہر رہی ہیں“ زیب النساء کیوں آہستہ سے بولی جیسے اس وقت ذرا سی بھی بلند آواز سے کوئی چیز جھین سے ٹوٹ کر رہ جائے گی۔

انتظار —————

انتظار —————

ماں کے تئیر دیکھ کر بچے بھی سسے بیٹھے تھے اور ماں چڑیا کے اڑنے تک سے چونک کر ڈبوڑھی کی طرف دیکھنے لگتی تھی۔ اور جھڑپوڑھی کے کو اڑوڑھاک سے بچ کر کیٹنے اور مولوی اُبل زندگی میں شاید پہلی بار بھاگتا اور بانہڑا ہوا اندر آیا اور چلا یا، عارف کی ماں اسے عارف کی ماں“ زیب النساء باہر لپکی۔ اور اس کے پیچھے رجبہ، شمس، عارف، قمرن، عہدہ اور دوسرے سب بچے یوں نکلے جیسے کہے میں کسی بگولے نے انہیں اٹھا کر باہر کھیر دیا ہے۔

اور مولوی اُبل اسی بگولے کے لیے میں جیلا یا ”مبارک ہو عارف کی ماں تم اُلوے کے چولے کو رو رہی تھیں۔ اللہ جاننا نہ“ نے جو بے چہری اور لڑکی تک کا انتقام فرما دیا۔ جنازے پر کچھ مینیں تو میں روپے ضرور ملیں گے۔ ابھی کچھ دیر تک جنازہ اسٹے گا۔ چودھری فتح دادر گیا ہے نا“

زہیب النساء نے اس زور سے اپنی چھاتی پر دھ پتڑا مارا کہ بچے تک دہل کر زور دے۔ اور پھر ایک دم جیسے کسی نے مولوی اُبل کو گروں سے دبوچ لیا، اس کی اوپر اٹھی ہوئی پتلیاں بہت اوپر اٹھ گئیں۔ پھر ایک لمحے کے دردناک سناتے کے بعد مولوی اُبل جو مرد کے جیلا کر دے کو ناجائز اور خلافت شرع قرار دیتا تھا، جیلا کر روئے گا اور پھر کی طرح پاؤں پٹختا ہو اُٹوڑھی کے دو واڑے میں سے نکل کر باہر لگی میں بھاگ گیا۔

موزیل

سعادت حسن منٹو

ترتوچن نے پہلی مرتبہ — چار برسوں میں، پہلی مرتبہ رات کو آسمان دیکھا تھا اور وہ بھی اس لیے کہ اس کی طبیعت سخت گھبراٹی ہوئی تھی اور وہ محض کھلی ہوا میں کچھ دیر سوچنے کے لیے اڈوانی جیمز کے کیمپس پر چلا آیا تھا۔ آسمان بالکل صاف تھا۔ بادلوں سے بے نیاز، بہت بڑے عاصفرتی تہنوں کی طرح ساری لمبی پڑنا ہوا تھا۔ جگہ جگہ تک جگہ جگہ بنیاں، دشت تھیں۔ ترتوچن نے ایسا محسوس کیا تھا کہ آسمان سے بہت سے ستارے چھو کر بلڈ لٹگوں سے جورات کے اندھیرے میں بڑے بڑے درخت معلوم ہوتی تھیں، الٹ گئے ہیں، اور ٹکڑوں کی طرح ٹٹھا رہے ہیں۔

ترتوچن کے لیے یہ بالکل ایک نیا تجربہ، ایک نئی کیفیت تھی — رات کو کھلے آسمان کی نیچے ہونا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ چار برس تک اپنے غلیب میں قید رہا تھا اور قدرت کی ایک بہت بڑی نعمت سے محروم۔ قریب قریب تین بجے تھے۔ ہوا بے حد ہلکی ہلکی تھی۔ ترتوچن نے کیمپس کی میکا کی ہوا کا عادی تھا تو اس کے سانسے وجود کو جو ہل کر دیتی تھی۔ صبح اٹھ کر وہ ہمیشہ یوں محسوس کرتا تھا جیسے رات بھر اس کو مارا پیٹا گیا ہے۔ پر اب صبح کی قدرتی ہوا میں اس کے جسم کا رواں رواں، تروتازگی چرس کر خوش ہو رہا تھا جب وہ اوپر آیا تھا تو اس کا دل و دماغ سخت مضطرب اور ہیجان زدہ تھا۔ لیکن آدھے گھنٹے ہی میں وہ اضطراب اور ہیجان جو اس کو بہت تنگ کر رہا تھا، کسی حد تک ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ اب وہ صاف طور پر سوچ سکتا تھا۔

کرنال کو راور اس کا ساما خاندان — محلے میں تھا۔ جو کہ مسلمانوں کا مرکز تھا۔ یہاں کئی مکانات کو الگ لگ چکی تھی۔ کئی حاجن لغت چوڑی تھیں۔ ترتوچن ان سب کو لے آیا ہوتا۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ کرنیو نافذ ہو چکا تھا اور وہ بھی نہ جانے کتنے گھنٹوں کا — غائب، اڑتا پس کھنڈوں کا — اور ترتوچن لازماً مضطرب تھا اس پاس سب مسلمان تھے۔ بڑے خوفناک قسم کے مسلمان۔ اور پنجاب سے دھڑ بھر مہاجرین آ رہے تھے۔ مسلمانوں پر بہت ظلم ڈھا ہے ہیں۔ کوئی بھی ہاتھ — مسلمان ہاتھ بڑی آسانی سے نرم ناز کر پال کر دے کی کلائی پکڑ کر موت کے کنوئیں کی طرف لے جا سکتا تھا۔

کرنال کی ماں اندھی تھی۔ باپ مفلوج بھاٹی تھا، وہ کچھ عرصے سے دیوالی میں تھا کہ اسے وہاں اپنے تازہ لیے ہوئے ٹیکے کی دیکھ بھال کرنا تھی۔

ترتوچن کو کرنال کے بھائی ترنجی پر بہت فخر آتا تھا۔ اس نے جو کہ ہر روز اخبار پڑھتا تھا۔ فسادات کی تیزی و تندگی کے

متعلق، ہفت بجے لگا کر دیا تھا اور صاف نفلوں میں کہہ دیا تھا ”نرجن! یہ ٹھیکے دیکھ بھی رہے ہیں وہ ہم ایک بہت ہی نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ تمہارا گھر بچہ رہنا بہت تنگدوستی ہے۔ اولیٰ تو یہاں سے اٹھ جاؤ اور میرے یہاں چلے آؤ، اس میں کوئی شک نہیں کہ جگہ کم ہے لیکن مصیبت کے دونوں میں آدمی کسی نہ کسی طرح گزارہ کر لیا کرتا ہے۔“ مگر وہ نہ مانا۔ اس کا اتنا بڑا لیکچر سن کر صرف اپنی گھٹی مچھلیوں میں مسکادیا مہیار تم خواہ مخواہ ٹکڑے کرتے ہو۔ میں نے یہاں سے کئی فاصلہ دیکھے ہیں۔ یہ امر ضرور بالاجور نہیں ہے۔ نئے، تھیں یہاں آئے صرف چار برس ہوئے ہیں اور میں بارہ برس سے یہاں رہ رہا ہوں۔ بارہ برس سے“

جیسے نرجن بیوی کو کیا سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ ایک ایسا شہر ہے جس میں اگر فسادات پیاپی ہوں تو ان کا اثر خود بخود زائل ہو جاتا ہے۔ جیسے اس کے پاس کوئی چھوٹا شہر ہے۔ یاد وہ کہانیوں کا کوئی ایسا طے ہے جس پر کوئی اُمت نہیں آسکتی۔ مگر تو جی مٹی کی ٹھنڈی ہوا میں صاف دیکھ رہا تھا کہ ————— غلطی نہ تھی۔ وہ تو صبح کے اخباروں میں ہی بھی پڑھنے کے لیے تیار تھا کہ کپال کو اور اس کے ماں باپ قتل ہو چکے ہیں۔

اس کو کپال کو کر کے فطوح باپ اور اس کی اندھی ماں کی کوئی پروا نہ تھی۔ وہ مرحلے اور کپال کو بچ جاتی تو تو جی کے لیے اچھا تھا۔ ————— وہاں دیوالی میں اس کا بھائی نرجن بھی مارا جاتا تھا اور بھی اچھا تھا تاکہ تو جی کے لیے میدان صاف ہو جاتا۔ خاص طور پر نرجن اس کے رشتے میں ایک دورا ہی نہیں، بہت بڑا کھٹکھٹا چنانچہ جب کبھی کپال کو اسے اس کی بات ہوتی تو وہ اسے نفی رنگہ کی بجائے کھٹکھٹو لگاتا۔

صبح کی بودا میرے دھیرے دھیرے رہی تھی۔ ————— تو جی کا کیدوس سے بے نیاز سر بڑی خوشگوار لٹنڈک محسوس کر رہا تھا مگر اس کے اندر بے شمار اندیشے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا رہے تھے۔ کپال کو کوئی نئی اس کی زندگی میں داخل ہوتی تھی۔ وہ یوں تو بے گئے کھٹکھٹو لگتا کہ اس کی ہمت ہی نرم و نازک اور لچیلی تھی۔ اس نے دیہات میں پرورش پائی تھی۔ وہاں کی کئی گریساں سردیاں دیکھی تھیں، مگر اس میں وہ سختی، وہ کٹھاؤ، وہ مردانہ پن نہیں تھا جو دیہات کی عام سکھ لڑکیوں میں ہوتا ہے۔ جھین کڑی سے کڑی شفقت کرنی پڑتی ہے۔

اس کے نقش پتے پتے تھے، جیسے ابھی ناکھن ہیں جھوٹی جھوٹی چھانیاں تھیں جن پر بالائیوں کی چند اور تہیں چڑھنے کی ضرورت تھی۔ عام سکھ دیہاتی لڑکیوں کے مقابلے میں اس کا رنگ گورا تھا مگر کوسے لکھے کی طرح، اور بدن چمکانا خاص طرح مری راز دہی کے لیے سلی ہوئی ہے۔ اور وہ بے حد شرمیلی تھی۔

تو جی اس کے گاؤں کا تھا مگر وہ زیادہ دیرواں ماں نہیں تھا۔ پڑاؤ سے نکل کر جب وہ شہر کے لائی اسکول میں گیا تو اس پھر وہیں کا جو کہ وہ گیا۔ اسکول سے فارغ ہوا تو کالج کی تعلیم شروع ہو گئی۔ اس دوران میں وہ کئی مرتبہ ————— لقاؤ اور مرتبہ اپنے گاؤں گیا مگر اس نے کپال کو کے نام کی کسی لڑکی کا نام تک نہ سنا۔ شاید اس لیے کہ وہ ہر بار اس افراطی میں رہتا تھا کہ جلد از جلد واپس شہر پہنچے۔ کالج کا زمانہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اڈوانی چیمبرز کے ٹیڑیس اور کالج کی عمارت میں غالباً دس برس کا فاصلہ تھا۔ اور یہ فاصلہ تو جی کی زندگی کے عجیب و غریب واقعات سے پُر تھا۔ برما سنگا پور۔ ہانگ کانگ۔ پھر بمبئی، جہاں وہ چار برس سے مقیم تھا۔ ان چار برسوں میں اس نے پہلی مرتبہ رات کو آسمان کی شکل دیکھی تھی جو بڑی نہیں تھی۔ ————— خاکستری رنگ کے تھن کی

چھت میں بڑا دل ویسے روشن تھے۔ اور ہوا اٹھادی اور کئی جگہاں ملتی۔

گوپال کو رکھ سوچتے تھے، وہ موزیل کے متعلق سوچتے لگے۔ اس یہودی لڑکی کے بائے میں جو آواز انی میسرز میں رہتی تھی، اس سے تروچین کو گودے گودے عاشق ہو گیا تھا۔ ایسا عشق ہو اس نے اپنی بیہوشی برسی کی زندگی میں کبھی نہیں کیا تھا۔

جس دن اُس نے آواز انی میسرز میں اپنے ایک عیسائی دوست کی معرفت دوسرے ماے پر غیبت کیا۔ اسی دن اس کی ٹیڑھ موزیل سے ہوتی چہل نکل دیکھنے پر اسے خوفناک طور پر دیوانی معلوم ہوئی تھی۔ کئے ہوئے عجوبے بال اس کے سر پر پریشان تھے۔ بے حد پریشان۔ ہونٹوں پر لب اسٹک یوں لگی تھی جیسے کاٹھا خون اور وہ بھی ٹکڑ ٹکڑ سے نیچتی ہوئی تھی۔ ڈھلاؤ حالاً اسفید چہرے تھے، جس کے کھلے گریبان سے اس کی نیل پڑی بڑی بڑی چھاتیاں تھیں جو تھائی کے قریب نظر آ رہی تھیں۔ بائیں سر جو کہ ننگی خیمیں میں میں بالوں سے آئی ہوئی تھیں جیسے وہ ابھی کبھی کسی سیدوں سے بال کٹوا کے آئی ہے اور ان کی تھنی تھنی ہوا میاں ان پر جم گئی تھی۔

ہونٹ اتنے موٹے نہیں تھے، بلکہ گرسے عنابی رنگ کی لب اسٹک کچھ اس انداز سے لگا لی تھی کہ وہ موٹے اور پھینسے کے گوشت کے ٹکڑے معلوم ہوتے تھے۔

تروچین کا کلیت، اس کے کلیٹ کے بالکل سامنے تھا۔ بیچ میں ایک ٹنگ لگی تھی۔ ہمت ہی ننگ جب تروچین اپنے کلیٹ میں داخل ہونے کے لیے آگے بڑھتا تو موزیل باہر نکلی۔ کھڑکی پر پہنچے تھی۔ تروچین ان کی آواز سن کر گر گیا۔ موزیل نے اپنے پریشان بالوں کی جھٹوں میں سے بڑی بڑی آنکھوں سے تروچین کی طرف دیکھا اور منہسی۔ تروچین بوکھلا گیا۔ جب سے چابی نکال کر وہ جلدی سے دروازے کی جانب بڑھا۔ موزیل کی ایک کھڑکی سینٹ کے پھلے فرش پر پھسل گئی اور وہ اس کے اوپر آ رہی۔

جب تروچین سمجھا تو موزیل اس کے ادب پر تھی کچھ اس طرح کہ اس کا لبیا چڑا اور چڑھ گیا تھا اور اس کی دو ننگی۔ بڑی نکڑی ناگلیں اس کے اچھر اور فہر اور..... جب تروچین نے اُسے کی کوشش سن لی تو وہ بوکھلا ہون میں کچھ اس طرح موزیل سے ساری موزیل سے اٹھا، جیسے وہ صابن کی طرح اس کے سارے بدن پر پھیر گیا ہے۔

تروچین نے اپنے ہونٹے مناسب دوزوں الفاظ میں اس سے معافی مانگی۔ موزیل نے اپنا مبادہ ٹھیک کیا اور سکاوی "میکھنا ڈول ایکدم کنڈم چیز ہے" اور وہ اتنی ہوتی کھڑکی میں اپنا انگوٹھا اور اس کے ساتھ والی انگلی چبھتی گوری ڈور سے باہر چلی گئی۔

تروچین کا خیال تھا کہ موزیل سے دوستی پیدا کرنا شاید مشکل ہو، لیکن وہ بہت ہی تھوڑے عرصے میں اس سے کھل چکی۔ لیکن ایک بات تھی کہ وہ بہت خود سر تھی۔ وہ تروچین کو کبھی خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ اس سے کھاتی تھی، بیہوش تھی، اس کے ساتھ بیٹھا جاتی تھی، سارا سارا اس کے ساتھ جو ہو پر ہناتی تھی، لیکن جب وہ باتوں اور چوہنوں سے کچھ اور آگے بڑھنا چاہتا تھا تو وہ اسے ڈانٹ دیتی۔ کچھ اس طور پر اسے گھر لٹی کہ اس کے سارے دلوں اس کی داڑھی اور مونچھوں میں جکڑ کاٹنے رہ جاتے۔

تروچین کو پہلے کسی سے محبت نہیں ہوئی تھی۔ لاہور میں، براباں، سنگاپور میں، وہ لڑکیاں کچھ عرصے کے لیے خرید لیا کرتا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ غیبی بیہوشی ہی وہ ایک نہایت اچھر قسم کی یہودی لڑکی کے عشق میں گودے گودے، دھنسنے جاتے گا۔ وہ اس سے کچھ عجیب قسم کی بے اعتنائی اور بے التفاتی برتی تھی۔ اس کے کہنے پر وہ رنجور ہو کر بیٹھا جانے کے لیے تیار ہو جاتی تھی مگر جب وہ اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھتے تو اچھر اچھر نکلیں دوڑانا شروع کر دیتی، کوئی اس کا شانس نکلنا

توروز سے ہاتھ پلائی اور تروچہ سے اجازت لیے بغیر اس کے پہلو میں جا بیٹھی۔
 ہو مں میں بیٹھی ہیں۔ تروچہ نے خاص طور پر موزیل کے لیے پُر تکلف کھانے منگوائے ہیں۔ مگر اس کو کوئی اپنا براہ دوست نظر نہ گیا
 ہے اور وہ تو الہ چھڑ کر اس کے پاس بیٹھ گئی اور تروچہ کے سینے پر رو ٹنگ رہی ہے۔
 تروچہ بعض اوقات بھٹاتا تھا کہ قادیانہ کو اس سے قطع طور پر جوہر و کربسے پر لے دو ستور اور شناساؤں کے ساتھ علی حلقہ تھی۔
 اور کئی کئی دن اس سے ملاقات نہ کر سکتی تھی۔ کبھی سرور کا کہا نہ، کبھی بیٹ کی کڑائی کا، جس کے متعلق تروچہ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ فواد کی
 طرح مضبوط ہے اور کبھی خواب نہیں ہو سکتا۔

جب اس سے طمانت ہوتی تو وہ اس سے کہتی "تم سکھو ہو۔۔۔ یہ نازک باقی تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتیں"

تربوچر جیٹھیں جاناؤ پوچھتا "کوئی نازک بائیں۔۔۔ نہ پاسے پرلنے یادوں کی؟"

موزیل دونوں ہاتھ اپنے چوڑے چمکے کولوں پر رکھ کر اپنی تکیڑی ٹانگیں چوڑی کر دیتی اور کہتی "یہ تم تھے ان کے طعنے کیا دیتے ہو۔۔۔"

ان وہ میرے باہر ہیں۔۔۔ اور مجھے اچھے لگتے ہیں۔ تم مٹنے ہو تو جلتے ہو۔"

تربوچر برے و کھارے انداز میں پوچھتا "اس طرح تمہاری میری کسی طرح سمجھے گی؟"

موزیل زور کا تمغہ لگاتی "تم سچ سے سکھو ہو۔ ایڈریٹ۔ تم سے کس نے کہا ہے کہ میرے ساتھ تھاؤ۔۔۔ اگر خجائے کی بات سب تو جادو اپنے وطن میں کس سکھتی سے نشاوری کرو۔۔۔ میرے ساتھ تو ای طرح چلے گا"

تربوچر نرم چوہانہ دراصل موزیل اسی کی زبردست کوزری ہی گئی تھی۔ وہ ہر حالت میں اس کی قربت کا خواہش مند تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ موزیل کی وجہ سے اس کی اکثر توہین ہوتی تھی۔ معمولی معمولی کرکٹوں ٹونڈوں کے سلسلے جن کی کوئی حقیقت ہی نہیں تھی، اسے خفیہ ہونا پڑتا تھا۔ گردن کے مجبور ہوا کر اس نے یہ سب کچھ برداشت کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

عام طور پر توہین اور تنگدلی کا وہ عمل انتقام ہوتا ہے مگر تربوچر کے معاملے میں ایسا نہیں تھا۔ اس نے اپنے دل و دماغ کی ہمت سے انھیں سچے یقین اور کئی کانوں میں روٹی ڈھنسی کی تھی۔ اس کو موزیل پسند تھی۔۔۔ پسند ہی نہیں، جیسا کہ وہ اکثر اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا "کوڑے کو گڈے کو ڈھنسی" اس کے ہنسنے میں ہنسن لگتا تھا۔ اب اس کے صوا اور کوئی جارہ نہیں تھا کہ اس کے جبر کا مضامین باقی رہ گیا ہے وہ بھی اس ہنسن کی دلدل میں چلا جائے اور تھکے ختم ہو۔

دو برس تک وہ اسی طرح غمزدار ہوتا رہا۔ لیکن ثابت قدم رہا۔ آخر ایک روز جبکہ موزیل مریض تھا، تو لڑکھن نے اسے اپنے باذن میں کرپوجا موزیل۔ کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتی ہو؟“

موزیل اس کے بازوؤں سے جدا ہو گئی اور کرسی پر بیٹھ کر اپنے فزک کالجیڈر دیکھنے لگی۔ پھر اس نے اپنی موٹی موٹی سیڑھیاں اٹھائیں اور گھٹی پکلیں چھپا کر کہا ”میں کبھی سے محبت نہیں کر سکتی“

تو لڑکھن نے ایسا غمخس کیا کہ گھبرائی کے نیچے اس کے کیسوں میں کسی نے دھکی ہوئی چکاریاں دکھ دی ہیں۔ اس کے تن بدن میں لگ لگ گئی۔ موزیل ہمیشہ برابر مذاق اڑاتی رہی۔ میرا مذاق انہیں، میری محبت کا مذاق ہے“

موزیل اٹھی۔ اس نے اپنے بھروسے ترشے ہوئے بالوں کو ایک دفعہ بربھکا دیا۔ مغم شیلو کو الو اور اپنے سر کے بال

کے جھوڑو۔ تو میں شرمالگاتی ہوں، کئی ٹوٹے نہیں آنکھیں ماریں گے۔ تو خوبصورت رہو۔“
 تروچن کے کیسوں میں مزید چنگاریاں پڑ گئیں۔ اس نے آگے بڑھ کر نوے سے موزیل کو اپنی طرف گھسیٹا اور اس کے عنابی ہونٹوں میں اپنے منہ کو پھنسا بھرے ہونٹ پیوست کر دیئے۔
 موزیل نے ایک دم ”دھیوں پھیوں“ کی اور اس کی گرفت سے غلطہ ہڑ گئی ”میں صبح اپنے دانتوں پر پریش کر چکی ہوں۔
 تم تکلیف نہ کرو“

تروچن جلا بیا ”موزیل!“
 موزیل دہننی بیگ سے خفا سا آئینہ نکال کر اپنے ہونٹ دیکھنے لگی جن پر لگی ہوئی گاڑھی لب اسٹیک پر خوشنشین آگئی
 عقیں ”خدا کی قسم۔۔۔ تم اپنی داڑھی اور مونچھوں کا صحیح استعمال نہیں کرتے۔۔۔ ان کے بال ایسے اچھے ہیں کہ میرا زبوی بوسکرت
 بہت اچھی طرح صاف کر سکتے ہیں۔۔۔ بس بخود اسابٹرول لگانے کی ضرورت ہوگی“
 تروچن غصے کی اس انتہا تک پہنچ چکا تھا جہاں وہ بالکل ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ آرام سے صبح پر بیٹھ گیا۔ موزیل بھی آگئی اور
 اس نے تروچن کی داڑھی کو لمبی شروع کر دی۔ اس میں جونہیں لگی تھیں، وہ اس نے ایک ایک کر کے اپنے دانتوں سے
 دبا لیں۔

تروچن خوبصورت تھا۔ جب اس کے داڑھی مونچھ نہیں لگی تھیں تو واقعی لوگ اس کو کھلے کیسوں کے ساتھ بیکہ کر دھوکا
 کھا جاتے تھے کہ وہ کوئی کم عمر خوبصورت لڑکی ہے۔ گارباؤں کے اس انبار نے اب اس کے نام خند و خال جھار یوں کی مانند اپنے
 اندر چھپا لیے تھے۔ اس کو اس کا احساس تھا۔ مگر وہ ایک اطاعت شعار اور فرمانبردار لڑکا تھا۔ اس کے دل میں مذہب کا احترام
 تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان چیزوں کو اپنے وجود سے الگ کر دے، جن سے اس کے مذہب کی ظاہری تکمیل ہوتی تھی۔
 جب داڑھی پوری ٹھنک گئی اور اس کے سینے پر ٹکنے لگی تو اس نے موزیل سے پوچھا ”میرے کیا کر رہی ہو؟“
 دانتوں میں سینہ دبانے سے وہ مسکرائی ”تمہارے بال بہت ملائم ہیں۔۔۔ میرا اندازہ غلط تھا کہ ان سے میرا
 نبوی بوسکرت صاف ہو سکے گا۔۔۔ تروچن۔۔۔ تم میرے دے دو۔ میں انہیں گوندھ کر اپنے لیے ایک فرسٹ کلاس
 بوتل بنانے لگی“

اب تروچن کی داڑھی میں چنگاریاں بھڑکنے لگیں۔ وہ بڑی سنجیدگی سے مخاطب ہوا ”میں نے آج تک تمہارے مذہب
 کا مذاق نہیں اڑایا۔۔۔ تم کیوں اڑاتی ہو۔۔۔ دیکھو کسی کے مذہبی جذبات سے کھیلنا اچھا نہیں ہوتا۔ میں کبھی برداشت نہ کرتا،
 مگر صرف اس لیے کہ تاربا ہوں کہ مجھے تم سے بے پناہ محبت ہے۔ کیا تمہیں اس کا پتہ نہیں؟“
 موزیل نے تروچن کی داڑھی سے کھیلنا بند کر دیا ”مجھے معلوم ہے۔“
 ”دیکھو“ تروچن نے اپنی داڑھی کے بال بڑی صفائی سے تھکے اور موزیل کے دانتوں سے پین نکال لیں ”مقام بھی طرح
 جانتی ہو کہ میری محبت کبواس نہیں۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں“
 ”مجھے معلوم ہے“ بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر وہ اٹھی اور دیوار سے لٹکی ہوئی تصویر کی طرف دیکھنے لگی ”میں

”جی تریسہ تریس بی بیصلہ کو بچی ہوں کہ تم سے شادی کروں گی“
 ”تو توچن اچھلی پڑا“ ”کچھ؟“

مودیل کے عنابی ہونٹ بڑی موٹی مسکراہٹ کے ساتھ کٹلے اور اس کے سفید مفسرہ دانت ایک لحظے کے لیے چمکے۔
 ”ہاں!“

”تو توچن نے اپنی نصحت میٹھی ہوئی وارھی ہی سے اس کو اپنے سینے کے ساتھ چھین لیا۔“ ”تو..... تو کب؟“
 ”مودیل الگ بٹ گئی۔“ ”جب۔۔۔۔۔ تم اپنے یہ بال کٹوا دو گے!“

”تو توچن اس وقت وجوہ سوچ رہا تھا۔ اس نے کچھ سوچا اور کہہ دیا۔“ ”میں کل ہی کٹوا دوں گا“

”مودیل فرس پر ٹیپ ڈانس کرنے لگی۔“ ”تم کب اس کرتے ہو تو توچن۔۔۔۔۔ تم میں اتنی ہمت نہیں ہے“

”اس نے تو توچن کے دل و دماغ سے مذہب کے سب سے خیال کو نکال باہر پینک دھڑم دھڑم کی گئی“

”دیکھ لوں گی“ ”اور وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ تو توچن کی ٹوچوں کو چوما اور بیٹھیں بیٹھیں“ ”کوئی باہر نکل گئی۔“

”تو توچن نے رات بھر کیا سوچا۔۔۔۔۔ وہ کب کن اتو بیٹوں سے گزرا، اس کا تذکرہ فصول ہے، اس لیے کہ دوسرے روز

اس نے فورٹ میں اپنے کیس کٹھا دینے اور وارھی بھی منڈا دی۔۔۔۔۔ یہ سب کچھ بتا رہا ہے اور وہ آنکھیں میچے رہا جب سارا

معاملہ صاف ہو گیا تو اس نے آنکھیں کھولیں اور دیر تک اپنی ننگل آئیٹھیں میں دیکھتا رہا جس پر بیٹی کی حسین سے حسین لڑائی بھی کچھ

دیر کے لیے غور کرنے پر مجبور ہو سکتی ہے۔

”تو توچن وہی عجیب و غریب تھنک محسوس کرنے لگا جو بیٹوں سے باہر نکل کر اس کو لگی تھی اور دیر تک اس کو چھیڑتی اور

گدگداتی رہی تھی۔ اس نے ٹیریس پر نیز تیر چلنا شروع کر دیا جہاں ٹینکیوں اور نلوں کا ایک ہجوم تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس داستان کا

بتایا حصہ اس کے دماغ میں نہ آئے۔ مگر وہ آنے بغیر نہ رہا۔

”بال کٹوا کر وہ پہلے دن گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ اس نے اپنے نوکر کے ہاتھ دوسرے روز صبح مودیل کو چٹ بھیجی کہ

اس کی طبیعت ناساز ہے، تھوڑی دیر کے لیے آجئے۔ مودیل آئی، تو توچن کو بالوں کے بغیر دیکھ کر پہلے وہ ایک لحظے کے لیے ٹھٹکی،

پھر مائی ڈاڈلگ ترویج، مگر کہ اس کے ساتھ لیٹ گئی اور اس کا سا اچھہرہ عنابی کر دیا۔

”اس نے تو توچن کے صاف اور ملائم لہو کوں پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے چپوٹے چپوٹے انگریزی وضع کے کٹے ہوئے بالوں میں

اپنی انگلیوں سے کھٹکائی۔ اور سوئی زبان میں غصے سے مانتی رہی۔ اس نے اس قدر شور مچایا کہ اس کی ناک سے پانی بہنے لگا۔ مودیل

نے جب اسے محسوس کیا تو اپنی سکرٹ کا گھیر اٹھا اور اسے پوچھنا شروع کر دیا۔ تو توچن شرما گیا۔ اس نے سکرٹ نیچے کی اور سرزنش

کے طور پر اس سے کہا ”جیسے کچھ ہیں تو لیا کرو“

”مودیل پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ باسی اور جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی ٹپ اٹھ گئے ہوٹوں سے مسکرا کر اس نے صرٹ اٹھا کہا ”جھے

بڑی گھبراہٹ ہوئی ہے۔ ایسے ہی چلتا ہے“

”تو توچن کو وہ پھلاد یاد آ گیا جب وہ اور مودیل دونوں ٹھکانے غصے اور آپس میں کچھ عجیب طرح گڑبڑ ہو گئے تھے۔

مسکرا کر اس نے موزیل کو اپنے سینے کے ساتھ لگایا و شادی کی ہوگی؟

”مندر“ موزیل نے ترلوچن کی طائر ٹھوڑی پر اپنے ہاتھ کی پشت پھیری۔

سطح پر ہوا کہ شادی پونہ میں ہو چونکہ رسول میرن مٹی۔ اس لیے ان کو پندرہ دن کا نوٹس دینا تھا۔ عدالتی کارروائی مٹی اس لیے مناسب یہ خیال کیا گیا کہ پونہ بہتر ہے۔ پاس ہے اور ترلوچن کے وہاں کئی دوست بھی ہیں۔ دوسرے روز انھیں پروگرام کے مطابق پونہ روانہ ہو جانا تھا۔

موزیل نوٹ کے ایک اسٹور میں سینئر گلی مٹی۔ اس سے کچھ فاصلے پر ٹنگی اسٹینڈ تھا۔ بس یہیں موزیل نے اس کو انتظار کرنے کے لیے کہا تھا۔ ترلوچن مقررہ وقت پر وہاں پہنچا۔ ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کرنا ہمارا مگر وہ نہ آئی۔ دوسرے روز اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے ایک پرانے دوست کے ساتھ جس نے تازہ تازہ موٹر خریدی ہے، دیوبلی چلی گئی اور ایک غیر معین عرصے کے لیے وہاں رہے گی۔

ترلوچن پر کیا گزری؟ — یہ ایک بڑی لمبی کہانی ہے۔ تھوڑے مختصر یہ ہے کہ اس نے جی کوڑا کیا اور موزیل کو جیل لگایا۔ اتنے میں اس کی ملاقات کوہ پالی کور سے ہو گئی اور وہ اس سے محبت کرنے لگا۔ اور ٹھوڑے ہی عرصے میں اس نے عروس کی ایک موزیل بہت وابہات لڑکی مٹی جس کے دل کے ساتھ پڑ گئے ہوئے تھے اور جو چروں کی مانند ایک جگہ سے دوسری جگہ بٹھکا رہنا تھا۔ اس احساس سے اس کو ایک گونہ تسکین ہوئی مٹی کہ وہ موزیل سے شادی کرنے کی غلطی نہ کر بیٹھا۔

لیکن اس کے باوجود کبھی موزیل کی یاد ایک چٹنی کی مانند اس کے دل کو کھینچتی مٹی اور پھر چھوڑ کر کہہ کرے لگاتی غائب ہو جاتی مٹی۔ وہ بے حیا مٹی، بے مروت مٹی، اس کو کسی کے جذبات کا پاس نہیں تھا، پھر بھی وہ ترلوچن کو پسند مٹی۔ اسی لیے کبھی کبھی وہ اس کے متعلق سوچتے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ وہ دیوبلی میں اتنے عرصے سے کہا کہ یہ ہے۔ اسی دہی کے ساتھ ہے جس نے نئی نئی کار خریدی مٹی، یا اسے چھوڑ کر کسی اور کے پاس چلی گئی ہے۔ اس کو اس خیال سے سخت کوفت پہنچتی مٹی کہ وہ اس کے سوا کسی اور کے پاس ہوگی حالانکہ اس کو موزیل کے کردار کا بھری علم تھا۔

وہ اس پر سیکڑوں نہیں ہزاروں خرچ کر چکا تھا، لیکن اپنی مرضی سے، اور نہ موزیل مٹکی نہیں مٹی۔ اس کو بہت سستی قسم کی چیزیں پسند آتی تھیں۔ ایک مرتبہ ترلوچن نے اسے سونے کے ٹوپس دینے کا ارادہ کیا جو اسے بہت پسند تھے، مگر اسی کان میں موزیل جھوٹے، بھڑکیلے اور بہت سستے آویڑوں پر نرمی، اور سونے کے ٹوپس چھوڑ کر ترلوچن سے مٹیں کہنے لگی کہ وہ انھیں خرید دے۔

ترلوچن اب تک نہ سمجھ سکا تھا کہ موزیل کس قماش کی لڑکی ہے۔ کس آب و گل سے بنی ہے۔ وہ گھنٹوں اس کے ساتھ لیٹی رہتی مٹی۔ اس کو کچھ سنے کی اعازت دیتی مٹی۔ وہ سارے کا ساما صابن کی مانند اس کے جسم پر چھ جانا تھا مگر وہ اس کو اس سے لگے ایک پلا بڑھتے نہیں دیتی مٹی۔ اس کو چڑھانے کی خاطر اتنا کہ دیتی مٹی — تم سکھ ہو — مجھے تم سے نفرت ہے!“

ترلوچن اپنی طرح محسوس کرتا تھا کہ موزیل کو اس سے نفرت نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اس سے کبھی نہ ملتی۔ برداشت کا مادہ اس میں دتی بھی نہیں تھا۔ وہ کبھی دو برس اس کی محبت میں نہ گزارتی۔ دو ٹوک فیصلہ کر دیتی۔ اٹلہ دیر اس کو ناپسند تھے، اس لیے کہ

اُن سے اس کو الجھجھوتی تھی۔ تیرہ لوہی نے کئی بار اس کو ان کی اشدّ غدورت سے آگاہ کیا۔ اس کو شرم و حیا کا واسطہ دیا مگر اس نے یہ چیز کبھی نہ سنی۔

ترجیوں جب اس سے حیا کی بات کرنا تھا تو وہ جو حیا کی تھی یہ حیا واکو اس سے۔ اگر کہیں اس کا کچھ خیال ہے تو اپنی آنکھیں بند کر دیا کرو۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ کون سا لباس ہے جس میں آدمی نہ لگا نہیں ہو سکتا۔ یا جس میں سے تمناں لگا نہیں پارتیں ہو سکتیں۔ مجھ سے ایسی کو اس نہ کیا کرو۔ تم سکھو ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ تیبولن کے بیٹے ایک سلی سا انڈو پڑ پڑتے ہو جو ٹیکرسے بنا ہوتا ہے۔ یہ بھی تمہاری داڑھی اور سر کے بالوں کی طرح تمہارے مذہب میں شامل ہے۔ شرم آتی چاہئے تمہیں۔ اسے بڑے ہو گئے ہو اور اچھی نگاہی رکھتے ہو کہ تمہارا مذہب انڈو پڑ پڑ چکا بیٹھا ہے۔
ترجیوں کو شرم شروع میں اس باتیں سُن کر غصہ آیا تھا، مگر بعد میں خود فکر کرنے پر یہ کبھی کبھی روکھا جاتا تھا اور سوچنا تھا کہ موزیل کی باتیں شاید نا درست نہیں اور جب اس نے اپنے کیسوں اور داڑھی کا صفحہ اگرایا تھا تو اسے قطعی طور پر یہ احساس ہوا تھا کہ وہ بیکار راستے والوں بالوں کا اتنا بوجھ اٹھائے اٹھائے بھرا جس کا کچھ طالب ہی نہیں تھا۔

پانی کی ٹھنکی کے پاس پہنچ کر تلوچن رُک گیا۔ تو ذیل کو ایک بڑی موٹی ٹالی دے کر اس نے اس کے مغلق سوجھنا بند کر دیا۔ کربال پور، ایک پاکیزہ ٹالکی جس سے اس کو محبت ہوئی تھی، خطرے میں آتی۔ وہ ایسے محلے میں تھی جس کو قسَم کے مسلمان رہتے تھے اور ہاں وہ تین وارداتیں بھی ہو چکی تھیں۔ لیکن مصیبت سیخی کو وہاں اڑتا نہیں گھسنے کا کفریہ قلم کار کو فیکہ کی کون پرودہ کو سنا ہے۔ اس جالی کے مسلمان ہی اگر چاہتے تو اندر ہی اندر کربال پور، اس کی ماں، اس کے باپ کا بڑی اُس کی کے ساتھ صفایا کر سکتے تھے۔

تو نرجس سوچا سوچنا بانی کے سونے تلے پر بیٹھ گیا۔ اس کے سر کے بال اب کافی لمبے ہو گئے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ ایک برس کے اندر اندر یہ پورے کیسوی میں تبدیل ہو جائیں گے۔ اس کی دائرہ و آواز نیری سے بڑھی تھی۔ مگر وہ اسے بڑھا کر نہیں جانتا تھا۔ فوراً میں ایک بار برتا رہا وہ اس صفائی سے اسے تراشنا فغا کہ تیرہ سوئی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

اس نے اپنے بیٹے اور ملازم باہوں میں انگلیاں پھیر لی اور ایک سردآہ بولی۔ — اُسٹے کا ارادہ ہی کہ رہا تھا کہ اسے کھڑاؤں کی کزخت آواز سنا دی۔ اس نے سوچا کوئی ہو سکتا ہے؟ — بلوگم میں کبھی یہودی عورتیں قید جو سب کی سب گھر میں کھڑاؤں بیٹنی تھیں۔ — آزاد قریباً آتی تھی۔ یک لخت اس نے دوسری ٹینکی کے پاس سے میوزیکل کر دیکھا، وہ چوبیسویں کی خاص وضع کا ڈیجیٹال ڈھالا گیا کرتاپننے برے زور کی انعامی لے رہی تھی۔ اس زور کی کہ ترلوچن کو محسوس ہوا کہ اس کے آپس پاس کہ ہوا صبح جائے گی۔

تو چون پانی کے نل پر سے اٹھا۔ اس نے سوچا ”یہ ابکا اکیلی کہاں سے نمودار ہو گئی۔ اور اس وقت میرس پر کیا کرنے آئی ہے؟“

موسوئل نے ایک اور انگڑائی لی — اب ترلوچن کی بیڈیاں چٹخنے لگیں۔
 ڈھیلے ڈھالے کرتے ہیں اس کی مضبوط چھتیاں دھڑکیں — ترلوچن کی آنکھوں کے سامنے کئی گولی گولی اڑتی ہیں۔

نیل اُبھر آئے۔ وہ زور سے کھانسنے لگا۔ موزیل نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا وہ لعل بالکل خفیف تھا۔ کھڑاؤں گشتی وہ اس کے پاس آئی اور اس کی خوشنودی دیکھنے لگی۔ ”تم پھر کبھی بن گئے زلوچ؟“
 داؤسی کے بال تروچن کو چھبے سکے۔

موزیل نے آگے بڑھ کر اس کی ٹھوڑی کے ساتھ اپنے ہاتھ کی پشت رگڑی اور مسکرا کر کہا ”اب یہ برُش اس قابل ہے کہ میری نیوی بلسکھٹ صاف کر سکے۔ مگر وہ تو دیہ دیو لالی میں رہ گئی ہے۔“
 تروچن خاموش رہا۔

موزیل نے اس کے بازو کی چمکی لی ”بوستے کیوں نہیں سردار صاحب؟“
 تروچن اپنی بیوقوفیوں کا اعادہ نہیں کرنا چاہتا تھا، تاہم اس نے صبح کے ٹیگے اندھیرے میں موزیل کے چہرے کو فورسے دیکھا۔
 کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ البتہ صرف وہ پہلے سے کچھ کمزور نظر آئی تھی۔ تروچن نے اس سے پوچھا ”ہمارے رہی ہو؟“

”نہیں“ موزیل نے اپنے تراشے ہوئے بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دیا۔
 ”پہلے سے کمزور دکھائی دیتی ہو؟“
 ”ہیں ڈاکٹر کر رہی ہوں“ موزیل پانی کے مونسے تل پر بیٹھ گئی اور کھڑاؤں فرش کے صفحہ بجانے لگی ”تم گویا کہ —
 اب پھر —“ نے سر سے سے مسکھتی رہے ہو؟

تروچن نے کسی قدر حساسی سے جواب دیا ”ہاں“
 ”مبارک ہو“ موزیل نے ایک کھڑاؤں پر سے اُتار لی اور پانی کے تل پر بھانے لگی ”کسی اور لڑکی سے محبت کرنی شروع کی؟“
 تروچن نے آہستہ سے کہا ”ہاں“
 ”مبارک ہو — اسی بلڈنگ کی ہے کوئی؟“
 ”نہیں“

”یہ بہت بری بات ہے“ موزیل کھڑاؤں اپنی انگلیوں میں اٹس کر اٹھی ”جوینڈ آدمی کو اپنے ہمسایوں کا خیال کبھی چاہیے؟“
 تروچن خاموش رہا۔ موزیل نے اٹھ کر اس کی داؤسی کو اپنی پانچوں انگلیوں سے چھیڑا ”کیا اسی لڑکی نے تمہیں یہ بال بڑھا؟“
 کا منظر وہ دیا ہے؟“
 ”نہیں“

تروچن بڑی الجھن محسوس کر رہا تھا، جیسے لنگھا کرتے کرتے اس کی داؤسی کے بال آپس میں الجھ گئے ہیں۔ جب اس نے ”نہیں“
 کہا تو اس کے لبے میں ہنسی کا جھلکنا تھا۔

موزیل کے ہونٹوں پر لب لباب اسٹیک ہاشی گوشت کی طرح معلوم ہوتی تھی۔ وہ مسکرائی تو تروچن نے ایسا محسوس کیا کہ اس کے گلاں میں جھلکے کی دکان پر تصانی نے پھری سے موٹی دگ کے گوشت کے دو ٹکڑے کر دیئے ہیں۔

اس نے تروچن کا بازو پکڑ لیا۔ تروچن نے گھبراہٹ میں اس سے پوچھا ”کہاں ہے؟“
 ”وہیں سے جہاں وہ ہے۔ میں اس محلے کی ایک ایک اینٹ کو جانتی ہوں۔“ چلو آؤ میرے ساتھ“
 ”مگر سنو تو۔۔۔ کر فیر ہے“

”موزیل کے بیٹے نہیں۔۔۔ چلو آؤ“
 وہ تروچن کو بازو سے پکڑ کر کھینچتی اس دروازے تک لے گئی تھی جو نیچے میڑھیوں کی طرف کھلتا تھا۔ دروازہ کھول کر وہ اترنے والی تھی کہ ٹک گئی اور تروچن کی داڑھی کی طرف دیکھنے لگی۔
 تروچن نے پوچھا ”کیا بات ہے؟“

موزیل نے کہا ”یہ تہادی داڑھی۔ لیکن خیر ٹھیک ہے۔ اتنی بڑی نہیں ہے۔۔۔ ننگے سر چلو گے تو کوئی ٹہنیں سمجھے گا کہ“

”ننگے سر؟“ تروچن نے کسی قدر بوکھلا کر کہا ”میں ننگے سر نہیں جاؤں گا“
 موزیل نے بڑے معصوم انداز میں پوچھا ”کیوں؟“
 تروچن نے اپنے بالوں کی ایک لٹ ٹھیک کی ”تم سمجھتی نہیں ہو۔۔۔ میرا دہان پگڑی کے بغیر جانا ٹھیک نہیں“
 ”کیوں ٹھیک نہیں؟“

”تم سمجھتی کیوں نہیں ہو کہ اس نے مجھے ابھی تک ننگے سر نہیں دیکھا۔ وہ یہ سمجھتی ہے کہ میرے رب کیسے ہیں۔۔۔ اور یہ پر رازد افشا نہیں کرنا چاہتا“

موزیل نے زور سے اپنی کھڑاؤں دروازے کی دہیز پر باری ”تم واقعی اوّل درجے کے ایڈریٹ ہو۔۔۔ گدھے کہیں کے۔ اسکی جان کا سوال ہے۔ کیا نام ہے، تمہاری اس کور کا جس سے تم محبت کرتے ہو؟“
 تروچن نے سمجھانے کی کوشش کی ”موزیل، وہ بڑی مذہبی قسم کی لڑکی ہے۔ اگر اس نے مجھے ننگے سر دیکھ لیا تو مجھ سے نفرت کرنے لگے گی“

موزیل چرچا گئی ”اوہ، تمہاری محبت بی ڈیڈ۔۔۔ میں پوچھتی ہوں کہ سائے سکھتہ تہادی طرح کے جو قوت ہوتے ہیں۔ اسکی جان کا خطرہ ہے اور تم کہتے ہو کہ بگڑی ضرور پہن گئے۔۔۔ اور شاید وہ اپنا اندر دیکھ رہی“
 تروچن نے کہا ”وہ تو میں ہر وقت پہنے ہوتا ہوں“

”بہت اچھا کرتے ہو۔ مگر اب تم یہ سوچو کہ معاملہ اس محلے کا ہے جہاں میاں بھائی ہی میاں بھائی رہتے ہیں اور وہ بھی راکے بڑے دادا اور بڑے بڑے موالی۔۔۔ تم بگڑی پہن کر گئے تو وہیں فرخ کر دیتے جاؤ گے“
 تروچن نے مختصر سا جواب دیا ”مجھے اس کی پروا نہیں۔۔۔ اگر میں تہائے ساتھ دہان جاؤں گا تو بگڑی پہنی کر جاؤں گا۔ میں اپنی محبت خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتا۔“

موزیل جھنجھلا گئی۔ اس زور سے اس نے پیچھا و تاب کھلے کہ اس کی چھاتیاں آپس میں بھر بھر لگیں۔ ٹکڑے سے تہادی

محبت ہی کہاں رہے گی جب تم نہ رہو گے — تمہاری وہ — کیا نام ہے اس بھڑی کا — جب وہ بھی نہ رہے گی۔ اس کا خاندان تنک نہ رہے گا۔ تم سکھ ہو — خدا کی قسم تم سکھ ہو اور بڑے ایڈیٹ سکھ ہو!“

تروچن بھنگا گیا ”بکواس نہ کرو!“

موزیل زور سے ہنسی۔ میں میں بالوں کے منبار سے آئی ہوئی بائیں اس نے تروچن کے گلے میں ڈال دیں اور ہتھوڑا سا جھول کر کہا — ”ڈارلنگ بھلو، جیسے تمہاری مرضی — جاؤ پکڑی ہیں آؤ — میں نیچے بازار میں کھڑی ہوں“

یہ کہہ کر وہ نیچے جانے لگی۔ تروچن نے اسے روکا ”تم کپڑے نہیں پہنؤ گی؟“

موزیل نے اپنے سر کو جھٹکا دیا ”نہیں — چلے گا اسی طرح“

یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ کرتی نیچے اتر گئی۔ تروچن بجلی منزل کی ریڑھیوں پر بھی اس کی کھڑاؤں کی جڑی آواز سناتا رہا۔ پھر اس نے اپنے لمبے بال انگلیوں سے پیچھے کی طرف سیٹھ اور نیچے اتر کر اپنے نفلت میں چلا گیا۔ جلدی جلدی اس نے کپڑے تبدیل کیے۔ پکڑی بندھی بندھا رہی تھی۔ اسے اچھی طرح سر پر جمایا اور نفلت کا دروازہ مقفل کر کے نیچے اتر گیا۔

باہر فٹ پاتھ پر موزیل اپنی ٹکڑی ٹانگیں چوڑی کئے سکرٹ پی رہی تھی۔ بالکل مردانہ انداز میں۔ جب تروچن اس کے قریب پہنچا تو اس نے شرارت کے طور پر مزہ لے کر دھواں اس کے چہرے پر دے مارا۔ تروچن نے غصے میں کہا ”تم بہت ذلیل ہو“

موزیل مسکائی ”یہ تم نے کوئی نئی بات نہیں کہی — اس سے پہلے اور کئی بھنے ذلیل کر چکے ہیں“ پھر اس نے تروچن کی پکڑی کی طرف دیکھا ”یہ پکڑی تم نے واقعی بہت اچھی طرح باندھی ہے — ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے کیس ہیں“

بازار بالکل سنسان تھا — ایک صرف ہوا چل رہی تھی اور وہ بھی بہت دھیرے دھیرے، جیسے کہ فوسٹ خوت زوہ ہے۔ تینیاں روش تھیں مگر ان کی روشنی بھاری معلوم ہوتی تھی۔ عام طور پر اس وقت ٹرا میں چلتی شروع ہوجاتی تھیں اور لوگوں کی آمدورفت بھی جاری ہوجاتی تھی۔ ابھی خاموشی گما گئی تھی پر اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس سڑک پر کوئی انسان گزرا ہے نہ گزے گا۔

موزیل آگے آگے قحط پاتھ کے پتھروں پر اس کی کھڑاؤں کھٹ کھٹ کر رہی تھی۔ یہ آواز، اس خاموشی نمایاں ایک بہت بڑا شور تھی۔ تروچن دل ہی دل میں موزیل کو بڑا بھلا کہہ رہا تھا کہ دو منٹ میں وہ اور کچھ نہیں نواپی دہیات کھڑاؤں ہی اتار کر کوئی دوسری چیز بھی سکتی تھی۔ اس نے چاہا کہ موزیل سے کہے کھڑاؤں اتار دو اور نفلے پاؤں چلو، مگر اس کو یقینی تھا کہ وہ کبھی نہیں مانے گی، اس لیے خاموش رہا۔

تروچن سخت خوفزدہ تھا۔ کوئی پتہ نہ تھا کہ اس کا دل وحک سے رہ جاتا تھا۔ مگر موزیل بالکل بے خوف چلی جا رہی تھی۔ سکرٹ کا دھواں اڑاتی، جیسے وہ بڑی بے فکر سی چل نکلی ہے۔

چوک میں پہنچے تو پولیس مین کی آواز گونجی ”اے — کدھر جا رہا ہے؟“

تروچن سمجھ گیا۔ موزیل آگے بڑھی اور پولیس مین کے پاس پہنچ گئی اور بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر کہا ”اوہ، تم — ہم کو پہچان نہیں تم نے — موزیل.....“ پھر اس نے ایک گلی کی طرف اشارہ کیا ”دوہرا سا باجو — ہمارا رہن ہوتا ہے۔ اس کی طبیعت خراب ہے — ڈاکٹر لے کر جا رہا ہے.....“

سپاہی اس کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے خدا معنوم کمال سے سنگٹ کی ڈبیا نکالی اور ایک سنگٹ نکال کر اس کو دیا ”لو، بچو۔“

سپاہی نے سنگٹ لے لیا۔ موزیل نے اپنے منہ سے سٹکا ہوا سنگٹ نکالا اور اس سے کہا ”ہیئر ازل لاسٹ!“
سپاہی نے سنگٹ کا کٹش لیا۔ موزیل نے داہنی آنکھ اس کو اور بائیں آنکھ ترلوچن کو ماری اور کھٹ کھٹ کرتی اس گلی کی طرف چل دی جس میں سے گذر کر انھیں ————— ملنے چاہنا تھا۔

ترلوچن خاموش تھا مگر وہ محسوس کر رہا تھا کہ موزیل کو فیکو کی غلات ورزی کے ایک عجیب و غریب قسم کی مسرت محسوس کر رہی ہے۔ بخٹوں سے کھیلنا اسے پسند تھا۔ وہ جب جو تہو پر اس کے ساتھ جاتی تھی تو اس کے لئے ایک مصیبت بن جاتی تھی۔ سمندر کی بیل تین لمروں سے تھماتی، پھرتی وہ دو رنگ نکل جاتی تھی۔ اور اس کو ہمیشہ اس بات کا دھڑکا رہتا تھا کہ وہ کہیں ڈوب نہ جائے۔ جب واپس آتی تھی تو اس کا جسم نیلوں اور زخموں سے بھرا ہوتا تھا، مگر اسے ان کی کوئی پروا نہیں ہوتی تھی۔
موزیل آگے آگے تھی۔ ترلوچن اس کے پیچھے پیچھے۔ ڈرڈر کے ادھر ادھر دیکھنا رہتا تھا کہ اس کی نعل میں سے کوئی پھڑی مار لو وارد نہ ہو جائے۔ موزیل لوگ گئی۔ جب ترلوچن بائیں آیا تو اس نے سمجھانے کے انداز میں اس سے کہا ”ترلوچ ڈیر۔۔۔۔۔ اس طرح ڈرنا اچھا نہیں۔۔۔۔۔ تم ڈر دگے تو کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔۔۔۔۔ سچ کہتی ہوں یہ میری آزمائی ہوئی بات ہے“

ترلوچن خاموش رہا۔

جب وہ گلی طے کر کے دوسری گلی میں پہنچے جو اس محلے کی طرف نکلتی تھی جس میں کربال کو رہتی تھی تو موزیل چلتے چلتے ایک دم لوگ گئی کچھ خاصہ پر بڑے اطمینان سے ایک مارو آڑی کی دکان ٹوٹی جا رہی تھی۔ ایک ٹھٹھے کے لیے اس نے اس معاملے کا جائزہ لیا اور ترلوچن سے کہا ”کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔ چلے آؤ“

دو لوں چلنے لگے۔ ایک آدمی سر پر بہت بڑی پرات اٹھائے چلا آ رہا تھا، ترلوچن سے جھک گیا۔ پرات گر گئی اس آدمی نے فور سے ترلوچن کی طرف دیکھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ سکھ ہے۔ اس آدمی نے جلدی سے نیپے میں ہاتھ ڈالا کہ موزیل آگئی۔ لوکھاتی ہوئی، جیسے نئے میں پڑ رہے۔ اس نے اس آدمی کو دھکا دیا اور بخور لے لیے کہا ”اے کی کرتا ہے؟“ اپنے بھائی کو مارتا ہے۔ ہم اس سے شادی کرنے کو مانگتا ہے“ پھر وہ ترلوچن سے مخاطب ہوئی ”دکیر! اٹھا ڈیر پرات اور لکھ دو اس کے سر پر“

اس آدمی نے نیپے میں سے ہاتھ نکال لیا اور تھوڑی آنکھوں سے موزیل کی طرف دیکھا۔ پھر آگے بڑھ کر اپنی کہنی سے اس کی چھاتیوں میں ایک ٹھوکا دیا ”دیش کر سالی۔۔۔۔۔ دیش کر“ پھر اس نے پرات اٹھائی اور بڑھا، وہ جا۔

ترلوچن بڑھاپا ”کیسی ذلیل حرکت کی سے حرام زادے نے؟“

موزیل نے اپنی چھاتیوں پر ہاتھ پیرا دو کوئی ذلیل حرکت نہیں۔۔۔۔۔ سب چلتا ہے۔۔۔۔۔ آؤ“
اور وہ تیز تیز چلنے لگی۔ ترلوچن نے بھی قدم تیز کر دیئے۔

یہ لگی طے کر کے دونوں اس محلے میں پہنچ گئے جہاں کرپال کو رہتی تھی۔ عموماً اسے سوچا ”کس لگی میں جانا ہے؟“
 ”نروچن نے آہستہ سے کہا ”تیسری لگی میں۔“ نیکو دوا لے لیا۔

موزیل سلس طوط چنان شروع کر دیا۔ یہ راستہ بالکل خاموش تھا۔ اس پاس انہی گنجان آبادی تھی۔ مگر کسی پتے تک کے روف کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

جب وہ اس گلی کے قریب پہنچے تو کچھ گرم جڑو کھان دی۔ ایک آدمی بڑی تیزی سے اس کا سہ والی بلڈنگ سے نکلا اور دوسرے کانے والی بلڈنگ میں لٹکس گیا۔ اس بلڈنگ سے تھرپڑی دیر کے بعد تین آدمی نکلے۔ خٹے پاتھر پر اٹھنے، دھوا دھوکا اور بڑی چورتی سے دوسری بلڈنگ میں چلے گئے۔ موزیل ٹھگ بھی مٹی کی اس نے تر بوچھ کو اشارہ کیا کہ اندھیرے میں جو جائے۔ پھر اس نے ہولے سے کہا۔ ”تو لوچ ڈوب۔“ یہ گڑھی اتار دو!

تزوج نے جواب دیا ”میں یہ کسی صورت میں بھی نہیں اتار سکتا!“

موزیل جھٹلا گئی ”تمہاری مرضی۔۔۔ لیکن تم دیکھتے نہیں، سامنے کیا ہو رہا ہے؟“

سائے جو کچھ ہو رہا تھا دونوں کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ صاف گونڈ ہو رہی تھی اور بڑی مڑا مڑا قسم کی جواہری ہاتھ کی بلڈنگ سے جب دو آدمی اپنی پیٹھ پر لویاں اٹھائے تھے تو موزیل ساری کی ساری کانپ کھنکھانے لگی۔ ان میں سے کچھ کا دل بھی کانپنے لگا۔ یہ سب جیڑ پکڑ رہی تھی۔ موزیل اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ غالباً وہ سوچ رہی تھی۔ جب یہ دونوں آدمی گلی کے دوسرے سرے پر پہنچ کر غائب ہو گئے تو اس نے ترلوچن سے کہا ”دیکھو، ایسا کرو۔“ میں بھاگ کر کنکر والی بلڈنگ میں جاتی ہوں۔“

تم میرے پیچھے آنا۔ بڑی تیزی سے، جیسے تم میرا پیچھا کر رہے ہو۔ سمجھے۔ مگر یہ سب اکدم جلدی جلدی میں ہو۔“

مودیل نے تروچوں کے جواب کا استغفار نہ کیا اور کتوالی بلڈنگ کی طرف کھڑاؤں کھینکنا شروع کر دیا۔ اسے اس کے پیچھے دوڑا۔ اچنکوں میں وہ بلڈنگ کے اندر گئے۔ ریڑھیں پیس کے پاس، تروچوں کا سپر ہانڈا کو مودیل بالکل شکاک طاق تھی۔ اس نے تروچوں سے پوچھا: ”دونوں مسلمان؟“

تم لوچن نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبانی پھیری ”دوسرا!“

“مسیحیوں“

یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ بڑبڑھایاں چڑھنے لگی۔ تو چون اس کے نیچے ہولیا۔ زمینوں پر خون کے بڑے بڑے دھبے پڑے۔

دوسرے بلے پر پہنچے تو کوری ڈور میں کچھ دور جا کر توجہ دینے ہوئے سے ایک دروازے پر دستک دی۔ موزیل دور سیڑھیوں کے پاس کھڑی رہی۔

تیر لوچن نے ایک بار پھر دستک دی اور دروازے کے ساتھ منہ لگا کر آواز دی ”منگنا سنگھ جی منگنا سنگھ جی!“

اندر سے مہین سی آواز آئی در کون ؟

”تر لو جین!“

کربال کو دل کی اندھی ماں اور اس کا مغلوچ باپ دوسرے کمرے میں پڑے کراہ رہے تھے۔
 موزیل نے کچھ سوچا اور بالوں کو خفیت سا جھٹکا دے کر اس نے تروچن سے کہا ”سنو! اب صرف ایک ہی ترکیب میری
 سمجھ میں آتی ہے — میں دروازہ کھولتی ہوں.....“
 کربال کو رے کے خشک حلق سے چیخ نکلتی نکلتی دب گئی ”دروازہ“

موزیل، تروچن سے مخاطب رہی ”میں دروازہ کھول کر باہر نکلتی ہوں — تم میرے پیچھے بھاگنا — میں اوپر چڑھ
 جاؤں گی — تم بھی اوپر چلے آنا — یہ لوگ جو دروازہ توڑ رہے ہیں، سب کچھ جھل جائیں گے اور ہمارے پیچھے چلے آئیں گے۔“
 تروچن نے پوچھا ”پھر؟“

موزیل نے کہا ”یہ تمہاری — کیا نام ہے اس کا — مقررہ کار لکل جائے — اس لباس میں اسے کوئی کچھ نہ کہے گا۔“
 تروچن نے جلدی چل دی کربال کو کوساری بات سمجھا دی۔ موزیل زور سے چلائی۔ دروازہ کھولا اور دھڑم سے باہر کے لوگوں پر گری۔
 سب بوکھلا گئے۔ سڑا کر اس نے اوپر کی سیڑھیوں کا رخ کیا۔ تروچن اس کے پیچھے بھاگتا رہا۔ ایک طرف ہٹ گئے۔

موزیل اندھا دھند سیڑھیاں چڑھ رہی تھی — کھڑاؤں اس کے پیروں میں فنی — وہ لوگ جو دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے
 تھے۔ سنبھل کر ان کے تعاقب میں دوڑے۔ موزیل کا پاؤں پھسلا — اوپر کے زینے سے وہ کچھ اس طرح لڑھکی کہ پتھر پڑے زینے کے ساتھ ٹکرائی،
 لوہے کے جنگل کے ساتھ اٹھتی وہ نیچے آ رہی — پتھر بیلے فرش پر۔

تروچن ایک دم نیچے اترا۔ جھگ کر اس نے دیکھا تو اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ کانوں کے رستے
 بھی خون نکل رہا تھا۔ وہ لوگ جو دروازہ توڑنے آئے تھے، روگرد جمع ہو گئے۔ کسی نے بھی نہ پوچھا کیا ہوا ہے۔ سب خاموش تھے اور موزیل
 کے ننھے اور گوتے جسم کو دیکھ رہے تھے جس پر جا بجا خراشیں پڑی تھیں۔

تروچن نے اس کا بازو پلا اور آواز دی ”موزیل — موزیل“

موزیل نے اپنی بڑی بڑی سیوہی آنکھیں کھولیں جبرال بوٹی ہو رہی تھیں اور سکرائی۔

تروچن نے اپنی پگڑی اتاری اور کھول کر اس کا ننگا جسم ڈھک دیا۔ موزیل پھر سکرائی اور آنکھ مار کر اس نے تروچن سے منہ میں غصی
 کے جیلے اڑاتے ہوئے کہا ”جاؤ، دکھو۔“ میرا اندر و بیروں ہے کہ سنیں — میرا مطلب ہے وہ.....“

تروچن اس کا مطلب سمجھ گیا مگر اس نے اٹھنا نہ چاہا۔ اس پر موزیل نے غصے سے کہا ”میں سچ کہہ رہی ہوں.....“ جاؤ دیکھ کر آؤ۔“
 تروچن اٹھ کر کربال کو کے ٹیٹ کی طرف چلا گیا۔ موزیل نے اپنی دھندلی آنکھوں سے اس پاس کھڑے مردوں کی طرف دیکھا اور کہا ”میرا بیٹا جانی
 ہے..... لیکن بہت دادا تم کو..... میں اسے سمجھ کر کرتی ہوں“

تروچن واپس آ گیا۔ اس نے آنکھوں میں آنکھوں میں موزیل کو تباہ کر دیا۔ کربال کو رچکا ہے..... موزیل نے طیناں کا سا اس لیے لیکن ایسا
 کرنے سے بہت سا خون اس کے منہ سے بہہ نکلا ”اوہ ڈراما.....“ یہ کہہ کر اس نے اپنی مہین مہین بالوں سے لٹی ہوئی کلائی سے پانچ ماہر پونچھا اور
 تروچن سے مخاطب ہوئی ”آئی رائٹ ڈارنگ — بائی بائی“

تروچن نے کچھ کہنا چاہا مگر لفظ اس کے حلق میں الجھ گئے۔

موزیل نے اپنے بدن پر سے تروچن کی پگڑی ہٹائی اسے جھانک سکو — اپنے اس مذہب کو اور اس کا بانو اس کی مضبوط چھاتیوں پر سے جو گر گر پڑا۔

سایہ

غلام عباس

دن بھر جیسے جیسے سامنے گھٹتے بڑھتے رہتے، سہاؤ کی دکان بھی جگہیں بدلتی رہتی۔ صبح کو ابھی سورج نہ نکلا ہوتا کہ وہ اپنا ٹھیلہ وکیل صاحب کے مکان کے سامنے ٹرک کے اس کنارے لاکھڑا کرتا۔ اس طرف کوئی تجارت نہیں تھی۔ زمین بھولیل کی طرح تھی اور تھوڑی سی ڈھلوان کے بعد ایک میدان آتا تھا جس میں پھیل کا ایک پرانا پڑ تھا۔ جب سورج وکیل صاحب کے چومنزے مکان کے پیچھے سے اُبھرتا اور دھوپ دھیرے دھیرے پھیل کی چوٹی سے اترتی شروع ہوتی اور کوئی دو ڈھائی گھنٹے میں میراں کا احاطہ کر کے، ڈھلوان پر چڑھ کے ٹرک کے کنارے تک پہنچ جاتی، تو وہ اپنا ٹھیلہ ٹرک کے اس کنارے وکیل صاحب کے مکان کی سیڑھیوں کے برابر کھڑا کر دیتا۔ اور یوں اس ادنیٰ مکان کا سایہ دو تین گھنٹے تک اور اسے دھوپ سے بچائے رکھتا۔ لیکن جب سورج میں سر پہ اُٹھتا تو ناچار اسے اپنا ٹھیلہ ڈھلوان پر سے وکیل کر میدان میں پھیل تلے جانا پڑتا جہاں وہ دو تین بجے تک ڈیرا جمائے رہتا۔ اس کے بعد جب سورج ڈھلوان شروع ہوتا تو پھیل کے سامنے کے ساتھ ساتھ اس کی دکان بھی آگے کو سر کی شروع ہوجاتی۔ یہاں تک کہ شام ہوتے ہوتے وہ پھر وکیل صاحب کے مکان کے سامنے ٹرک کے اسی کنارے پہنچ جاتا جہاں زمین بھولیل کی طرح تھی اور جہاں اس نے علی الصباح ٹھیلے کو کھڑا کیا تھا۔ خاص طور پر گرمیوں کی دکان یوں جی جگہیں بدلتی رہتی تھی۔ وکیل صاحب کا مکان اسے دھوپ ہی سے بچا رہتا تھا بلکہ اس کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ بھی تھا۔ وکیل صاحب ایک وسیع کنبے کے سر پرست تھے۔ ان کا شمار شہر کے مشہور وکیلوں میں ہوتا تھا۔ بڑے با اخلاق، لطیف اور مہماں نواز تھے جب تک گھر پر رہتے تھے، ان کا تانا ٹکا رہتا۔ کچری جاتے تو پیچھے پیچھے صاحبہ ان کی ہر لعزیزی کو برقرار رکھتیں۔ ان کی اپنی طے والیاں بھی کچھ کم نہ تھیں، اس پر وکیل صاحب کے موٹوں کی بیویوں کی خاطر دایاں کرنا بھی ان کے فرائض میں داخل تھا۔ چنانچہ وہی بھسہ سبجان کے پٹیلے سے سو ڈالیمیں کی بوتلوں، برف، پان، اسکریٹ وغیرہ کی خاک بندھی رہتی۔

یہ علاقہ شہر کے آخری سرے پر تھا جہاں شہر کی مدختم ہوجاتی تھی اور کھیتوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا تھا۔ اس جگہ مکان غلط خالی ہی تھے اور کوئی دکان قریب نہ تھی۔ جھلا دو ایک گھروں کے آسے پر کوئی ایک متعلق دکان کا قافلہ ہو سکتا۔ رہا سبجان تو اس کی بات دوسری تھی۔ ادل تو اس کے ٹھیلے کا خرچ ہی کیا تھا۔ نہ کرایہ دینا پڑتا تھا نہ بجلی کا بل۔ پھر دنیا میں کوئی رشتہ دار تھا نہ عزیز۔ نہ گھر تھا نہ در۔ اس کی ضروریات زندگی اس قدر مختصر تھیں کہ صرف وکیل صاحب کے مکان کی آمدنی ہی سے پوری ہوجاتی

تھیں۔ اور وہ شہر کے چوکوں کے پیٹھے والوں اور دوسرے دوکانداروں کی باہمی جھگڑوں سے الگ تھلک اس سنسان مگر عافیت کی جگہ میں خوش تھا۔

دکیل صاحب نے جب نئی نئی مکافات شروع کی تھی تو انھیں مجبوراً شہر کے ایک بارونق بازار میں رہنا پڑا تھا۔ جھوٹا سا مکان کرایہ دے بڑھا ہوا۔ مگر رفتہ رفتہ جب کام چل نکلا۔ اور لوگ ان کو جاننے لگے تو انھوں نے اس نواح میں ایک محل کی زمین سستے داموں خرید لی۔ کئی برس تک یہ زمین یونیورسٹی رہی۔ یہاں تک کہ انھوں نے تعمیر کے لیے خامار دوسرے جمع کر لیا۔ آخر جب ان کے حسب منشا مکان بن گیا تو وہ اپنے وسیع کھنے کو لے کر اس میں اُٹھ آئے۔ ان کے دم قدم سے تھوڑے ہی دنوں میں اس علاقے میں زندگی کے آثار نظر آنے شروع ہو گئے۔ دُور دُور سے تانگے والے ان کے موٹروں کو لے کر یہاں پہنچتے تھے۔ چونکہ دکیل صاحب خود بھی تانگے ہی میں بیٹھ کر گہری جایا کرتے تھے۔ اس لیے وہ ایک تانگے مع شام ان کے مکان کے آس پاس کھڑے نظر آنے لگے۔ کبھی کبھی کوئی موٹر بھی مقور می دیر کے لیے ان کے مکان کے نیچے ڈک کر اس نواح کی رونق بڑھا جاتی۔

دکیل صاحب کے گھر کے علاوہ سبھان کی آمدنی کا ذریعہ یوں تو وہ اکاڈک راہ گیر بھی تھے جو شہر سے دیہات یا دیہات سے شہر جاتے ہوئے اس سے وہ ایک پیسے کی بیڑیاں، گڑکی، ریوڑیاں یا بٹنے ہوئے جتنے خریدنے شہر جاتے۔ مگر ان سے یافت کم اور کویت زیادہ ہوتی۔ خصوصاً اس وقت جب دیہاتیں دھپے کو سر اور مقوڑی پر چل دیئے، ناک اور منہ چھپائے، اپنی پھٹی جوتیاں گھسٹ گھسٹ کر چلتیں تو سر تک پر گرد و غبار کا ایک طوفان سا اٹھ کھڑا ہوتا اور سبھان کو سونے کی بوتلوں پر گئے گریہ صاف کرنے کے لیے پانی کا ایک اور جینٹا دینا پڑتا۔

ان راہ گیروں سے کہیں زیادہ اس کی بکری تانگے والوں سے ہوتی تھی جو یوں کر کے بیچے سے پھٹا ہوا خاکی باجامرہ پہنتے ہوئے تھے مگر قیمتی سے کم درجے کا سگرٹ پیانا کی طرح کو لینہ نہ تھا۔ اور جب پیاس لگتی تو پانی کے بجائے برت میں لگے ہوئے نمین کے آدے سے ان کی تسکین ہوتی تھی۔

کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ جب سبھان دوسرے کی چھلپاتی دھوپ میں لاوارث سانڈوں، کتوں اور فقیر لوگوں کی رعیت میں پیل کے سائے تلے پناہ لے رہا ہوتا اور بکری سے بے نیاز اسٹولی پر بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگتا تو ایسے میں کوئی دیہاتی برات دھوا دھن سمیت، پسینے میں شرابور بلکے ماتھے اور کلاٹیوں پر کستے ریشمی کپڑوں کا رنگ لگا ہوا، پیاس سے زانیں ٹھکی ہوئیں، اس پیل تلے مستانے اور پڑاؤ لگنے پر مجبور ہو جاتی۔ اور سبھان کی کچی دوفوں کی کسر ایک دن میں نکل جاتی۔

سبھان کو اس علاقے میں عیشہ لگاتے پانچ برس ہو چکے تھے۔ یہی ایک ایسا کام تھا جو اس نے ایک جگہ گھر کر اتنے عرصے تک کیا تھا کہ اس کی ساری عمر گھومنے پھرنے میں گزر گئی تھی۔ ابھی وہ دس برس کا بھی نہ ہوا تھا کہ گھر میں اسے

گھر سے نکلے پر مجبور کرویا تھا۔ اس نے بھی اور جوانی میں بیسیوں ہی دھندے کئے تھے۔ آج اس شہر میں ہے تو کل اس شہر میں کبھی کسی گھر میں اور پرکے کام پر بلازم ہے تو کبھی کسی دفتر میں چیرا سی ہے۔ کبھی دیکھو شاپ میں تو کبھی چھاپے خانے میں۔ کچھ عرصہ فوج میں بھی رہا۔ جب تک ہاتھ پاؤں میں سکت رہی۔ آزاد مزدوری کو بہر کام پر ترجیح دی۔ مگر جب جوانی گزر گئی۔ اور مڑھاپے کے آثار نمودار ہوئے تو طبیعت محنت مشقت سے خود بخود کترنے لگی۔ آخر اس نے اتنی رقم جمع کر لی کہ ایک ٹھیلہ

خریدے۔ پہلے پہل اس نے پہل اور سبزیوں بیٹھے پر رکھ کر شہر کا ہر گناہ شروع کیا مگر غوروش نے ہی دلوں میں اس کام سے بد دل ہو گیا۔ اہل تو مڑی کے جھاڑ کو جھنڈا اور مولیٰ کرنا اس کی فہم سے باہر تھا۔ وہ مال کو پرکھنے میں بہت جلد دھوکا کھا جاتا تھا۔ پھر مال نہ بکے تو کل سٹر کیا باسی ہو کر فروغ ہو جاتا۔ اور پھر یہ کہ دوسرے ٹھیلے والوں سے خواہ مخواہ کے جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ دن بھر پولیس والوں کی گھڑکیاں اور چوڑیاں سنسنی پڑتی تھیں۔ چنانچہ اس نے زیادہ مانع کے خیال کو چھوڑا اور بان سکرٹ کی دکان پر اکتفا کیا۔ اور شہر کا ایک ایسا الگ ٹھلگ گوشہ تلاش کر لیا کہ جہاں کسی غدد بین سے زندگی کے دن پڑے کر سکے۔

ادھر وکیل صاحب یہ دیکھ کر کہ یہ دکان محض اہل کے گھر کے آسے ہی پر لگائی گئی ہے، اس کی سرپرستی کرنا اپنا فرض سمجھنے لگے تھے۔ چنانچہ انہوں نے خود کو دن کو تارکید معنی کہ سب اسی سے سودا خریدیں اور اگر کچھ شکایت ہو یا چیزیں منگنی معلوم ہوں تو ان کو اطلاع دیں، وہ خود اس کا بندوبست کر دیں گے مگر سہائی کسی قسم کی شکایت کا موقع ہی نہ آنے دیتا تھا۔ وہ نوکروں سے ہنسی مذاق کی باتیں کر کے اور ایک آدھ پان یا بیڑی مفت کھلا ملا کے سیٹھ انھیں خوش رکھنے کی کوشش کر لیا کرتا تھا۔

یوں ہی وہ مہینہ مکھ، الطیف گو اور ہمدرد انسان تھا۔ لگائی بٹھائی کی عادت نہ تھی۔ اس لیے سب سے خوب متی تھی۔ ٹھیک لگانے کے ساتھ ہی اس نے دائرہ داری رکھ لی تھی، لیکن کہنے والے لگا تھا۔ تحقیقی بالی، ایک تنکوں کی بنی ہوئی خوردگی وضع کی ملکی بھلکی ٹوپی ہر وقت سر پر رکھتی، چار خانہ تھہ، گارے کا کرتا، اس پر غائی زین کا کوٹ، اپنی اس وضع سے وہ خاصا دیندار معلوم ہوتا تھا۔ عاقلانہ صدم و صلاقت سے اسے کوئی واسطہ نہ تھا۔

ان با پنج برس میں جو اس نے وکیل صاحب کے ساتھ میں گزارے تھے، وہ ان کے خاندان کے بہت سے حالات سے آگاہ ہو گیا تھا۔ اسے ایک ایک فرد کی عادت و اطوار کا علم تھا۔ یہاں تک کہ پرشے میں رہنے والی عورتوں کا ناک نقشہ، ان کی سیرت اور سجاوٹ بھی اس سے چھپا ہوا نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بیگم صاحبہ سے ساجے بیٹے ایک ہی چھاتی کا دودھ پی کر پیسے کی کونج دوسری چھاتی پر دھنیر لڑتا۔ وہ جانتا تھا کہ منجھی صاحبہ زادی سب بہن بھائیوں سے زیادہ غصیلی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ وکیل صاحب کے والد ماجد میر صاحب بڑے نقاب سے کڑھکے کہنے پر وہ پیشہ چھوڑ دیا تھا غرض کئی اور ایسی باتیں جن کا وکیل صاحب کے جوتے سے والوں کو سامان میں نہ ہو سکتا تھا۔ اسی طرح اسے مکان کے ایک ایک حصے اور اس کی آرائش کا حال بھی معلوم تھا۔ حالانکہ گھر تو گھر اس نے کبھی میرٹھیل میں ہی قدم نہیں رکھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کس کمرے میں کون رہتا ہے۔ وکیل صاحب کا دیوان خانہ کہاں ہے۔ بیگم صاحبہ طے یا دیوان سے کہاں ملا تارت کرتی ہیں۔ بڑی صاحبزادیوں اور صاحبزادے رات کو کہاں سوتے ہیں۔ ہارون کو کون بجاتا ہے۔ وہ پرانا بڑا کلاک جس کا گھنٹہ کبھی کبھی رات کو کچھلے پھر کے سناتے ہیں سنائی دیا کرتا ہے کس کمرے میں ہے۔ باورچی خانہ کس منزل پر ہے اور بوڑھے میر صاحب دور و دور جا کر کس طرح بہتے بہتے ہیں۔

یہ باتیں اسے کچھ نو بچوں کے بھولے ہیں سے، کچھ نوکروں کی بے احتیاطی سے اور کچھ خود اپنی ٹوہ لگانے کی عادت سے معلوم ہو گئی تھیں۔ لیکن انھیں معلوم کرنے میں اس کی کسی بڑی نیت کو دخل نہ تھا۔ پس اسے انسانی ہمدردی کہہ بیٹھے برباد ہلاوت سے کی ایک صورت۔ آخر زندگی میں کچھ تو لگاؤ ہو نہایا چاہئے تھا ورنہ اس دیر نے میں ایک ایسے شخص کا جس کے آگے پیچھے کوئی نہ ہو، زندگی گزارنا ایسا جہنم ہو جاتا۔

اس پانچ سال کے عرصے میں سہان کے سامنے وکیل صاحب کے خاندان میں دو نئے رکنوں کا اضافہ ہوا تھا۔ ایک صاحبزادہ ایک صاحبزادی۔ ان سے پہلے جو صاحبزادے کئی گوروں میں رہتے تھے وہ اب بہن کی انگلی پکڑے سہان کی دکان سے اپنی مٹھائی کی گولیاں بیٹے خود آنے لگے تھے۔ ان کے لیے ابھی پچاس روپے کا نو روپیہ نہیں بچا گیا تھا۔

ان بہن بھائیوں سے بڑے دو صاحبزادے علی الصبار سب سے پہلے مکان سے نکلتے۔ ایک کی عمر نو برس، دوسرے کی گیارہ برس۔ ایک ہی طرح کے کوٹ۔ ایک ہی طرح کی فریباں، ایک ہی طرح کے بستے۔ اسکول روز ہونے سے پہلے وہ سہان سے دو روپیہ کی چوسنے والی سنگترے کی چاکلیں خریدتے۔ سہان سب سے پہلے ان ہی کی بوہنی کیا کرتا۔ جس دن انھیں آنے میں دیر ہو جاتی تو وہ سمجھ جاتا کہ آج اسکول میں بھیجی ہے۔ وہ ان کے لیے ہمیشہ بڑھیا سے بڑھیا سنگترے کی چاکلیں اور دوسری انگریزی مٹھائیاں خرید کے لایا کرتا۔ اور نفع کا خیال نہ کر کے جیتھ گنتی سے زیادہ دیا کرتا۔

کبھی بھی وہ چھوٹے بھائی سے کہتا:۔

”افضل میاں اسکول سے دیر ہو گئی نا، دیکھنا آج کیسے کال انھیں گے ماسٹر صاحب!“

اور افضل میاں اس کے سانسے رنگ کو گھور کر کہتے:۔

”چپ رہو تم کالا آدمی۔ تم قلم سے بات کرنا نہیں مانگتا“ اور وہ دونوں ہنستے چوٹے وہاں سے چل بیٹے۔

ایک دن صبح کو بڑا بھائی آیا لیکن چھٹا نہ آیا۔ جب اس نے چاکلیں خریدنے کے لیے جیب سے پیسے نکالے تو

سہان نے پوچھا:۔

”افضل میاں کہاں ہیں؟“

”وہ ماموں میاں کے ساتھ گاؤں گیا ہے“ لڑکے نے جواب دیا اور وہ کیلا ہی اسکول روز ہو گیا۔

جب چار پانچ روز تک سہان نے افضل کی صورت نہ دیکھی تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے بڑی چیز کھو گئی تھی جواب مل گئی ہے۔

ان لوگوں کے حانے کے کوئی گھنٹہ بعد ایک خالی تانگہ مکان کے نیچے آکر کھڑا اور کوچہ ان گھنٹی بجانا سہان

سمجھ جاتا کہ اب صاحبزادیوں کے اسکول جانے کی باری ہے۔ جب انھیں آنے میں کچھ دیر ہو جاتی تو کوہن بے صبری سے

پے در پے گھنٹی بجانا شروع کر دیتا۔ اس پر پہلی منزل کے بخارچے میں سے بوڑھی ماما جن کو سرکار کا پانسرا ہر نکالتی اور تانگے

والے سے کہتی:۔

”دم رومیاں دم لو۔ آتے ہیں ابھی آتے ہیں!“

یہ سن کر تانگے والا بڑھتا ہوا تانگے سے انکر سہان کے ٹیلے کے پاس جاتا اور اس سے تعین کی دو گریٹ خریدتا۔

یاسوٹ ٹیٹھی، والا پان ہوا کہ تانگہ آکر وکیل صاحب کی میز پر جی صاحبزادیاں ماما کے ہمراہ سرٹھیں سے آئیں۔ بڑی کی عمر چار

برس، ماس سے چھٹی کی سولہ برس اور اس سے چھٹی کی تیرہ برس۔ تینوں کے مہری وضع کے رتھے، ایک کھنٹی رنگ کا، ایک سیاہ

رنگ کا اور ایک سیلٹی رنگ کا۔ تینوں کے پاؤں میں سینڈل۔ دو بڑی سہین تانگے کی پھلی سیٹ پر بیٹھیں۔ اور چھٹی سہین اور ماما

اگلی سیٹ پر۔ اور تانگے والا ایک بڑی سی سفید چادر تانگے کے آگے دیکھتے تھان دینا۔ ماسیہ پھر برکت کا چوڑا کروا کے تھرس بوتل میں بھجوا دیتی۔ وہ اپنے لیے سبحان سے ایک برابر کا پان بھی بھرتی۔ جس میں وہ بہت سا کالا تبا کوڑ لٹوایا کرتی۔ کبھی کبھی مٹی کی ماسیہ بھرتی کر دیتا۔ ہوتی تو وہ کھائے پانی کا ایک ادھا مانا سے تنگہ کے پیا کرتی اور تانگہ چل دیتا۔

اس کے تھوڑی سی دیر بعد مختار اور شمشاد ویل صاحب کے دونوں بڑے صاحبزادے موسم کا مکے پلکے پھلکے سوٹ پہنے، اپنی اپنی سائیکل کونر۔ جب پر اسٹلٹے سیر سیروں سے اترتے دکھائی دیتے۔ وہ مزک کو پار کر کے سبحان کے ٹھیلے کے پاس آکر ٹپے ہوتے سبحان انہیں سلام کرتا جس کا وہ خندہ پیشانی سے جواب دیتے۔ مگر وہ دونوں ہر وقت ایسی گریما گرم بحث میں اُلجھے رہتے کہ سبحان باوجود کوشش کے ان سے کوئی بات نہ کر پاتا۔ پھر ان کی باتیں بھی عموماً ایسی ہوتیں کہ سبحان کے کچھ بھی پڑے نہ پڑتا۔ ان کے جوش و خروش کی تیر لہجے اور آنکھوں کی چمک کو دیکھ کر معلوم ہوتا کہ وہ کسی بہت ہی اہم اور دقیق مسئلے پر بحث کر رہے ہیں۔ گفتگو کا جتنا حصہ سبحان کی سمجھ میں نہ آتا وہ کچھ اس قسم کا ہوتا:۔

”شمسی نہ تھاری عقل کو کیا ہو گیا ہے بھلا غلطیوں.....؟“

”لیکن بھائی جان آپ بھی تو ذرا نور فرمائیے کہ اسطر.....؟“

”شمسی میں کتنا ہوں تم کیسی بچوں کی سی باتیں کر رہے ہو۔ مانا کہ.....؟“

”وہ تو صحیح ہے لیکن بھائی جان ان دلائل کی روشنی میں.....؟“

”میرا سر ٹپٹ ہے تھاری شئی.....؟“

”بھائی جان لیکن پروتیسر صاحب.....؟“

”شمسی.....؟“

”بھائی جان.....؟“

”شمسی.....؟“

”بھائی جان.....؟“

غرض کالج کو جاتے۔ کالج سے آتے۔ اکی کھیلے جاتے۔ اکی کھیل کر آتے جب کبھی دونوں بھائی ساتھ ساتھ جوتے، یہ

بحث یوں ہی جاری رہتی۔ کبھی کبھی وہ انگریزی میں بھی گفتگو کرنے لگتے۔ پھر ان کا جوش و خروش اور بھی بڑھ جاتا۔ ایسے موقعوں پر سبحان نظریں نیچی کر کے مسکرایا کرتا۔

مختار بائیس سالہ نوجوان تھا۔ صحت و توانائی کا عمدہ۔ پھر اہم جسم، سرخ و سفید چہرہ۔ شمرتی رنگ کی آنکھیں بھروسے لکھنے والے بال شمشاد اس سے دو سال چھوٹا تھا مگر اس کے باوجود اس کا قد بڑے بھائی سے نکلتا تھا۔ ظاہری جمال میں وہ مختار کے برابر نہ تھا البتہ اپنی آنکھوں کی غیر معمولی چمک سے وہ اس سے کمین زیادہ ذہین معلوم ہوتا تھا۔ اور سبحان نے بار بار یہ محسوس کیا کہ مختار بحث میں اپنے بڑے ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھا کر خواہ مخواہ چھوٹے بھائی کو ڈانٹتا ڈیٹتا ہے اور یہ شمشاد کی سعادتمندی ہے کہ وہ ہمیشہ بڑے بھائی کا احترام ٹھونڈ رکھتا ہے۔

سبحان ان کے لیے حسب معمول دو کرائے دیسی پان چن کر نکالتا اور اُن پر چونا کم اور کتنا زیادہ لگا کے انھیں بچنے کے لیے رکھ دیتا۔ وہ اپنی بھنت کے دوران میں اس سے بھانٹاں ملگتے۔ اور بانسکلوں کو بھی جھانٹتے پوچھتے جانتے اور ساتھ ساتھ بحث بھی کرتے رہتے۔ کبھی کسی پیٹے میں ہوا کم ہوتی تو وہیں سے ملازم لڑکے بشیر کو آواز دے کے پیٹ منگو باجانا اور پیٹے میں ہوا بھری جاتی۔ گمراہ بھی کیا مجال کہ بحث لمحہ بھر کے لیے بھی رکنے پائے۔ سبحان پانوں کے علاوہ سگریٹ کی دو دو بیوں میں تلخی کے پانچ پانچ سگریٹ پیٹے ہی ڈال رکھتا۔ اور وہ اپنا اپنا پان منہ میں رکھ، سگریٹ منگ، بانسکلوں پر سوار ہو، تیز تیز پیرا رتے ہوئے کالج وردن پر چلنے لگے۔ بحث بدستور جاری رہتی۔

کوئی دس بجے کے قریب ایک اور خانی تانگہ مکان کے نیچے آکر رکتا۔ اور سبحان کو معلوم ہوجاتا کہ وکیل صاحب کے کچری جانے کا وقت ہوگا۔ اس وقت اس کا ٹھیلہ وکیل صاحب کے مکان کی میٹھ جیوں کے برابر میں کھڑا ہوتا۔ وہ پیٹے ہی سے ایک اچھا سا پان چھانٹ کر لگا رکھتا۔ آخر میٹھ جیوں میں بھاری قدموں کی آہٹ سنائی دیتی اور وکیل صاحب سیاہ شیر دانی پہنے سر پر شندی گٹھری باندھے، چھڑی جھٹے ہوئے میٹھ جیوں سے اترتے۔ ان کی عمر پچاس برس کے لگ بھگ تھی۔ بھاری بھر کم آوی تھے مگر چاق و چوبند، فرسبی تراش کی داڑھی جس میں اب کچھ دلوں سے سفید بال زیادہ نظر آنے لگے تھے۔ چہرے سے فصاحت اور برداری چمکتی تھی۔ کثرت اولاد کی وجہ سے ہر ایک کو شفقت کی نظروں سے دیکھنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ سبحان کے سلام کے جواب میں ایک آدھ بات کرنا خواہ وہ بے معنی ہی کیوں نہ ہو، اپنا اخلاقی فرض سمجھتے تھے:-

”بھئی سبحان آج کل غریب زبے بڑے پھیکے آ رہے ہیں“

”تھم بھی تو کھٹے ہیں سرکار“

”سچ کہتے ہو“ یہ کہہ کر وہ تانگے میں بیٹھ جاتے۔ اور سبحان معمول کے مطابق پان، تبخی کی ڈبیا، دیاسلائی کاکس اور ایک کاغذ کے ٹکڑے پر غور ڈالنا شروع کرنا کر، کردہ زیادہ چونا کھانے کے عادی تھے، تانگے کے پاس جا کر یہ چیزیں انھیں دے دیتا۔ کبھی کبھی ان کا مختار بھی ناٹیلیں لے لے ان کے ہمراہ ہوتا اور سبحان کو اس کے لیے پان میں بہت سی سولف ڈائنمی پڑتی۔

وہ وکیل صاحب اور ان کی میگ کے بہت سے شے دانوں کو بھی جانتے لگا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ بدھ کے روز تیسرے پر حاجی صاحب کے ہاں سے زنانہ سواریاں آیا کرتی ہیں۔ چنا پھر جیسے ہی ان کا تانگہ آکے رگتا وہ لائٹ جوس، دس بھری وغیرہ کی بوتلیں پیٹے ہی سے دھو دھاک نکال رکھتا۔ ان سواریوں کے ساتھ جو پکے آتے ان کی دلی پسندیدگیوں کا بھی اسے پتہ ہوتا۔ اتوار کے روز کچھا ڈاکٹر علیہ الملوین یاغیر الہ چناندا الے کے خاندان آبا کر تے۔ موزن لڑکے وکیل صاحب کے دور کے قربت داروں میں سے تھے اور ان ہی کی طرح کثیر الاولاد۔ قریب کے رشتہ داروں میں جو کبھی کبھی شے آجاتے۔ اور جن کو سبحان اچھی طرح جانتا تھا۔ ایک تو بکیر صاحب کا چھڑا بھائی تھا جس کی بھانجی کی دکان تھی۔ جب کبھی وہ آتا تو پکے کا ایک آدھ تھان اس کی بھل میں ہوتا۔ یہ تھان کبھی تو وکیل صاحب کے ہاں ہی رہ جاتا اور کبھی وہ اسے واپس اپنے ساتھ لے جاتا۔ اور دوسرے وکیل صاحب کے تایا۔ جو بے حد ضعیف تھے اور اپنے بیٹے کے ساتھ شہر کے دوسرے ہوسے پر رہا کرتے تھے۔ جب کبھی یہ باپ بیٹے شے آتے تو دن بھر ان کے گھر پر بیٹے اور رات کو بڑی دیر میں کھانا کھا کر جاتے۔

سبحان، غنجداد ششاد کے لیکن دستوں کو بھی جانتا تھا جو ان سے ملنے آیا کرتے تھے۔ خصوصاً ربابض کو۔ شام کو جب وہ ہاکی کھیل کر واپس آتے تو اکثر ریاض میں بھی سائیکل پر ان کے ہمراہ ہوتا۔ وہ ششاد کا ہم عمر اور کالج میں اس کا ہم سبق تھا۔ مختار سے اس کی زیادہ بے تعلقی نہ تھی۔ وہ جو کہ ششاد کا بڑا بھائی تھا اس لیے ریاض بھی اس کا ادب کیا کرتا تھا۔ ریاض ان دونوں بھائیوں سے قد میں چھوٹا تھا اور رنگت بھی ان جیسی سرخ و سفید نہ تھی، تاہم اس کی ملامت میں ایک خاص باکمین تھا۔ متسم چہرہ، زندگی کی مسرتوں سے بھرپور اور لکڑوں سے آزاد ششاد کو اس سے اور اس کو ششاد سے گہری وابستگی تھی۔

سبحان کے شیلے کے قریب، جو اس وقت وکیل صاحب کے مکان کے عین بالمقابل رشک کے دوسرے کنارے پر ہوتا، پر تینوں نوجوان اپنی اپنی بائیسکل تھلے، رخصت سے پہلے کچھ دیر باتیں منور کرتے جب کبھی ریاض ان بھائیوں کی بحث میں شامل ہو جاتا۔ پھر تو بحث طولی ہی لیتی تھی۔ سبھی جانتے ہی تھا کہ سبحان سے بار بار پان اور سگریٹ لیے جاتے۔ ریاض بار بار خدا حافظ کہتا مگر رخصت نہ ہو پاتا۔ غرض گھنٹہ گھنٹہ ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹہ یوں ہی باتوں میں گزر جاتا۔ اس دوران میں وکیل صاحب کے مکان کی دوسری منزل میں جہاں بڑی صاحبزادی لاکرہ تھا، بار بار ایک رنگین سیاحیوں کے پیچھے حرکت کرتا رہتا، جسے سبحان کی کن آنکھیں کے سوا اور کوئی آنکھ نہ دیکھ سکتی۔

وکیل صاحب کے صاحبزادوں اور صاحبزادیوں سے رشتے کے سلسلے میں جو لوگ آیا کرتے، سبحان ان کو بھی خوب پہچانتا تھا۔ ایسے موقوف پر اس کی بکری ایک دم بڑھ جاتی اور گھر کے ملازموں اور بوڑھوں کے علاوہ وکیل صاحب کے چھوٹے وٹکے اور لڑکیاں بھی دوڑ دوڑ کر سبحان کی دکان پر سودا لینے آیا کرتے۔ ان لوگوں کے جانے کے غنڈی ہی دیر بعد سبحان ٹوٹ نکلتا کہ کہیں بات پکی ہوئی یا نہیں۔

وہ شبیر سے ہنس کر کہتا :-

”پانچول گئی میں ہوں گی اور سر کرنا حاتی ہیں“

شبیر حیران ہو کر پوچھتا :-

”کیا کما تم نے؟“

”زیادہ بڑ نہیں ہے، سب خبر ہے ہیں“

شبیر اب بھی لاعلمی غماز کرتا تو وہ سمجھ جاتا کہ اس کو واقعی خبر نہیں۔ اور پھر وہ ماما کی طرف رجوع کرتا جس سے اسے اکثر باتیں معلوم ہو جاتی تھیں۔ بڑی ہی وکیل صاحب کی سب سے پرانی ملازمہ تھیں۔ ان کے سائے نیچے ان ہی کی گود میں بیٹے تھے۔ اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔ نہ کوئی رشتہ دار ہی تھا۔ ان بچوں سے انھیں دلی محبت تھی۔ اس کی بنا پر وہ ان کے مستقبل کے بارے میں اڑنے زنی کرتا اپنا حق سمجھتی تھیں۔ چنانچہ محبت اور سادگی میں ان کی زبان سے بے ساختہ نکل جاتا۔

”نوع جوان لوگوں میں رشتہ ہو۔ مجھے تو یہ لوگ ایک آنکھ نہیں جاتے“ پھر ذرا تامل کر کے کہتی ہیں:- ”گھر آدمین۔ وہ دن بھی آجائے گا۔ چاند سی میٹیاں ہیں میری۔“

اور سبحان سمجھ جاتا کہ ان لوگوں سے بات نہیں بھڑی۔ ایسے ہی کسی موقع پر وہ افضل میاں سے کہتا :-

”شہ بلا بے گا میرا میاں۔ ہم کو بھی گھوڑی پر چڑھاؤ گے نا؟“

اگر اس قسم کی کوئی بات گھر میں ہوتی تو افضل میاں شرم کا راجل دیتے۔ یا معلوم نہ جوتا تو کہتے :-
”چوب درچو تم کلا آدمی - ہر قسم سے بات کرنا نہیں مانگتا“

ایک دن ایسے ہی موقع پر جب کچھ عورتیں آئی ہوئی تھیں، بڑی بی باں بیٹے اُنہیں۔ ان کا سانس بھولا ہوا تھا مگر وہ بہت خوش معلوم ہوتی تھیں۔ سہان نے ان کی طرف مستفسرانہ نظروں سے دیکھا ہی تھا کہ وہ بھڑٹ بڑپس :-
”کسی سے ذکر و ذکر نہ کچھ خبردار۔ بڑی صاحبزادی کی بات ٹھہر گئی“

”کب؟“

”اجھی اجھی“

”کون لوگ ہیں؟“

”مشہر کے نامور ڈاکٹر ہیں۔ لڑکا بی۔ اے میں پڑھنا ہے۔ پر خبردار کسی سے ذکر نہ کر بیٹھیو۔ سو دشمن ہیں سو دوست، میں نے گھر کا آدمی سمجھ کے تم سے کہہ دیا ہے۔ تم کسی سے نہ کہنا۔ بچوں سے بھی نہیں۔ لڑکوں سے بھی نہیں۔۔۔۔۔“

اس کے دو تہی ہی دن بعد سہان نے کئی اور ذریعوں سے بڑی بی بی کی بات کی تصدیق کر لی۔ سمجھوں میں سب جوں میں سب چل رہے تھے۔ لگا ورتی تو آتی جاتی ہی رہتی تھیں۔ ایک بار لڑکے کے والد ڈاکٹر صاحب بھی اپنی موڑ میں بیٹھ کے وکیل صاحب سے ملنے آئے۔ اور دوپٹک ان سے باتیں کرنے رہے۔ دوسری مرتبہ ضیافت پر آئے۔ اس موقع پر ان کا صاحبزادہ بھی ان کے ہمراہ تھا۔ وہ خاصا قبول صورت تھا مگر کسی قدر لاغر معلوم ہونا تھا۔ بڑی بی بی نے کہا ”امتحان کی تکڑ ہے بچا لے کو“ سہان کو نام بھی معلوم ہو گیا صغیر احمد۔ قرار یہ پایا کہ جب لڑکا امتحان دے لے گا تو اس کی شادی کر دی جائے گی۔

بڑی صاحبزادی کے جہیز کے لیے بڑی سرعت کے ساتھ جو زیورات و ملہوسات وغیرہ تیار کر آئے جا رہے تھے، سہان کو ان کی ایک ایک تفصیل کا علم تھا۔ اس دوران میں ششاد میاں کے دوست دیباچ بھی کئی مرتبہ ہاکی کے بعد ان دونوں بھائیوں کو ان کے گھر تک پہنچانے آئے۔ اور سہان نے دیکھا کہ دوسری منزل میں چیتوں کے پیچھے وہ رنگیں سیاہ ابھی جھوٹ کرنا ہے۔

اور ایک دن اچانک سہان کے ذہن میں ایک بات آئی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ صاحبزادی کو یہ رشتہ منظور نہ ہو؟ بات اسے کسی نے نہیں سمجھا لی تھی۔ اور کھانا بھی تو کون۔ کہیو کہ وکیل صاحب یا کھر کے کسی اور آدمی کو اس کا گمان تک نہ تھا۔ اس نے مختلف زبانوں سے اس کے بارے میں مواد حاصل کر کے خود بھی یہ نتیجہ نکالا تھا۔ آخر اس نے بھی ایک عمر گزار لی تھی۔ زمانے کا مردو گم دیکھا تھا۔ دو تہی مرتبہ بڑی بی بی اور بچوں سے اسے معلوم ہوا تھا۔ کہ صاحبزادی کی طبیعت نا ساز ہے۔ ایک دن دیکھا کہ گانگے میں سوار ہونے ہوئے وہ بڑی بے دلی سے قدم اٹھا رہی ہے۔ ایک دن وہ اپنی بہنوں کے ساتھ اسکول نہیں گئی۔ بلکہ در و در کی وجہ سے گھر میں رہی۔ مگر اس شام کو جب ممتاز اور شمشاد کے ساتھ ریاض میاں سہان کی دکان پر آئے۔ اور مرٹک کے کٹانے کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے تو اس نے دوسری منزل میں چیتوں کے پیچھے سانسے کو پہلے سے بھی کہیں زیادہ بے چین دیکھا۔

شادی کی تیاریاں اب اور بھی زور شدہ سے ہونے لگی تھیں۔ وکیل صاحب کے گھر میں ہر وقت ایک شور و فغاں مچا رہتا تھا۔ قلعہ طرح کی اجناس ناگہانوں میں لدر کے آ رہی تھیں۔ طرح طرح کا فرنیچر، منگھادیز، پلنگ، کرسیاں، تپتیاں، تاسنے اور پتیل کے

برتن جھینٹ لعلی گرنے چاندی کا جتا دیا تھا۔ علاوہ ازیں سہاؤنی کی وہ بیل بیل بھی کہ سبحان کو دکھانے کی ضرورت نہ تھی مگر پھر بھی وہ خوش نہ تھا۔ جوں جوں شادی کا دن قریب آتا جاتا تھا اس کی اندر کی برصی جانی تھی۔ اور اسے ایک نامعلوم ہول سا ہونے لگا تھا۔ وکیل صاحب اب اس سے اور بھی زیادہ لطف و مہربانی سے پیش آنے لگے تھے۔ ایک دن وہ اس سے کہنے لگے :-
 ”سبحان تم نہا اسے بیٹے بھی ایک چڑا سلوا میں گے۔ برات کے روز پہننا۔ دیکھنا انکار نہ کرنا۔ جہانے کا رشتہ عزیزوں سے کم نہیں ہوتا“

سبحان نے وکیل صاحب کے بچوں کو دعا میں دیں۔ مگر یہ مزہ بھی اس کی اندر کی کو دور نہ کر سکا۔
 ایک دن علی الصبح سبحان نے اعلیٰ ٹیبلر ٹرک کے کوا سے لاسے کھا کر کیا ہی تھا کہ دیکھا شمشاد کدے پر بائیسکل اٹھاٹے جلد بیل ریڑھیوں سے اتر رہا ہے۔ اس نے صرٹ بنان اور ٹیکہ پن رکھا تھا اور ابھی داڑھی بھی نہیں مونڈی تھی۔
 ”کتنے شمشاد میاں صبح صبح کو گھر کی تباہی مٹے؟“ سبحان نے پوچھا۔
 ”کیس نہیں، ذرا ڈاکٹر کو بلانے جا رہا ہوں“ شمشاد نے جواب دیا۔
 ”نیر تو ہے؟“ سبحان نے نگر بندی سے پوچھا۔
 ”ہاں خیر ہی ہے“ یہ کہہ کر شمشاد بائیسکل پر تیز پازوں مارنا ہوا چل دیا۔

سبحان کا ہاتھ تھا کہ وہ بے تابی کے ساتھ گھر کے اور لوگوں کی راہ دیکھنے لگا۔ تاکہ معلوم کرے کون کیا رہا ہے۔ جب وکیل صاحب کے دونوں چھوٹے صاحبزائے اسکول جانے کے لیے گھر سے نکلے تو ان سے معلوم ہوا کہ رات بڑی باجی کی طبیعت ایک دم خراب ہو گئی۔
 تھوڑی دیر بعد ایک موٹر وکیل صاحب کے مکان کے نیچے لگی اور ڈاکٹر ہاتھ میں بیگ لیے اوپر گیا۔ کوئی دس منٹ کے بعد وہ نیچے اترا۔ سبحان اپنا ٹیبلر چھوڑ کر اس کے پاس آگیا تھا مگر اس سے کچھ پوچھنے کی اسے جرأت نہ ہو سکی۔ اور وہ اور بھی زیادہ جنبانی کے ساتھ بڑی بی یا شیر کا انتظار کرنے لگا۔

اس کے کچھ ہی دیر بعد وہ ٹانگہ آبا جس میں بیٹھ کر لڑکیاں اسکول جایا کرتی تھیں مگر بڑی بی نے اسے اوپر ہی سے ”آج نہیں جائیے“ کہہ کر ٹوٹا دیکھ کر کھنکھارے کے بعد شیر برت لینے آیا تو اس سے سبحان کو معلوم ہوا کہ بڑی صاحبزادی کو سر سام ہو گیا ہے۔ سگر زیادہ لڑکی بات نہیں ڈاکٹر دو گھنٹے بعد پھر آئے گا۔

دو گھنٹے کے بعد ڈاکٹر پھر آیا اور جب وہ جانے لگا تو سبحان پھر اس کے قریب آکھڑا۔ اس کے لب ہلے مگر سوال کرنے کی اس کے کبھی اُسے جرأت نہ ہوئی۔ اس دفع بڑی بی پانی لینے آئی تھی تو ان سے معلوم ہوا کہ رات میں کچھ فرنی نہیں ہے۔ ڈاکٹر شام کو پھر آنے کو کہہ گیا ہے۔
 اس روز وکیل صاحب پھر نہیں گئے۔ نیسے پھر لڑکی کا ہونے والا سسر جو خود بھی ڈاکٹر تھا اسے دیکھنے آیا اور ایک گھنٹہ تک اس پاس رہا۔ اور لوگ جو کچھ کی خبر کو آئے انھیں جلد ہی فحش کر دیا گیا۔ دن بھر مکان پر ایک مقبرے کی سی خاموشی طاری رہی۔

شمشاد اور ممتاز کالج سے جلد ہی واپس آگئے تھے۔ شام کو وہ لڑکی کھینچے میں گئے۔ ریاض شمشاد سے ملنے آیا۔ سبحان کے ٹپلے کے قریب جب شمشاد اس سے اپنی بہن کا حال بیان کر رہا تھا تو سبحان نے سنا کہ اس کے کمر میں ابھی افادہ نہیں ہوا۔ وہ دونوں ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اگر آج رات غیر برت سے لڑکی کو پھر کوئی اندیشہ نہیں۔

سببان کی نظر سے اختیار و دسری منزل پر پہنچنے کی طوت اٹھ گئی سڑے میں روشنی ہو رہی تھی۔ اس کے سوا وہ کچھ اندر نہ دیکھ سکا۔
فقوڑی دیر میں بیابانِ رخصت ہو گیا۔

شمشا دسے گھر جاتے ہوئے سبحان سے کہا:۔

”بروت اور لار کھنا شاید رات کو ضرورت پڑ جائے“

”فقر نہ کیجئے، میں نے سن بھر بروت پہلے ہی سے منگوا رکھی ہے“

سبحان رات کو گھر آؤ گئے دکانی بڑھا دیا کرتا تھا مگر اس رات اس نے کیا روئے تک دکان جہاں سے رکھی۔ اس دوران میں وہ ملازلی سے برابر بچی کی خبریت معلوم کرتا رہا۔ اس کی حالت اگر مدھری نہیں تھی تو زیادہ بُری بھی نہیں ہونے پائی تھی۔

آدھی رات کے قریب وہ ٹھیلے کو بند کر کے صاحبِ معمول اس کے قریب ہی سڑک کے کنارے چارپائی ڈال کر لیٹ رہا تھا کھڑکی میں بید غائب تھی۔ کان وکیل صاحب کے مکان کی طوت لگے ہوئے تھے۔ صبح کو تین بجے کے قریب جب وہ ذرا اٹھ کھڑے لگا تھا تو ہچانک ایک طوت سے کتے کے جھونکنے کی آواز آئی اور وہ ہڑ ہڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اور وکیل صاحب کے مکان کی سڑکیوں کی طرف بھاگا مگر گھر میں خاموشی تھی۔

اس نے اینٹ پھینک کر کتے کو بھگا دیا۔

سہائے کی تلاش

حیات اللہ انصاری

ریاست ممبئی پور کے راج محل کے شاندار باغ میں مہاراجہ کی سالگرہ منائی جا رہی تھی، اور ریاست کے چوٹی کے عہدیدار، اعلیٰ افسر، جاگیردار اور معززین اکٹھے تھے۔ سالگرہ کی رسوم ادا ہو چکی تھیں، ایٹ ہوم بھی ختم ہو چکا تھا، اور اب ہمان کھوٹ پھر کر ایک دوسرے سے مل رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔

مسٹر مہانن واسٹر جو ریاست کا نیا انگریز وزیر داخلہ تھا مہاراجہ کو مبارکباد دینے کے بعد صدمہ میں لگے ہوئے لڑکچہ شامیر نے سے ٹکل کر ایک جاگیر دار مسٹر جوتی سے باتیں کرنے لگا۔ وزیر داخلہ کو دیکھ کر انگریز حکمران پوچھنے لگا، اور معززین اکٹھے ہو گئے۔ فارسٹ باغی تھیں تو ان لوگوں سے گھر نہ تھا، لیکن اس کے کان اس کھوج میں تھے کہ عفت اور عصمت سے تذکرے کس کس طرف ہو رہے ہیں۔ اتنے میں اسے ذرا دیر پر ایک لڑائی آواز پریشان میں بھری ہوئی سنائی دی۔

”جس میں اس کی بیٹیوں کی لالچ محفوظ نہ ہو وہ مٹ جائے تو اچھا ہے؟“

بھراؤ ایک مردانی آواز سنائی دی۔

”اتنا بالآخر نہیں کرتے مالتی؟“

مردانی آواز میں ایک اچھا بھلی لڑکی کی ایسی باتیں کہہ کر کم ہیماں تو نہ کر دے۔

مالتی نے جواب دیا۔

”میں اتنا جاننی ہوں چاہا جی کہ ہمارے ساتھ انصاف نہیں ہو رہا ہے۔“

شاہد کسی نے چپکے سے کہا کہ مسٹر فارسٹ پاس ہی کھڑے ہیں۔

مالتی نے جھجک کر جواب دیا۔

”مجھ کا جی چاہے میں سے میں سچ بات کہنے سے نہیں رکھ سکتی؟“

مسٹر فارسٹ ہندوستانی اچھی طرح سمجھ لیتے تھے، یہ سب باتیں سمجھ گئے اور جوتی سے کہنے لگے۔

”آج کل عفت و عصمت کی باتیں بہت ہو رہی ہیں“

”کچھ دپوچھئے۔ ہر طرف اسی کا پھر چاہے۔“

فارسر کے لیے جس طرح غصہ موجود تھا جو دایا جانے پر بھی چھلک آیا تھا۔ اب تو فارسٹر کی یہ حالت بدگئی تھی کہ جب بھی مصمت کا تذکرہ سننا تھا تو یہ عموماً کہتا تھا کہ سوامی کا مرن برت ہمیں بدل کر بھیر پر حملہ کر رہا ہے۔ ایسے حملے برداشت کرتے کرتے وہ اپنے سینے میں ایک ڈائنامیٹ محسوس کرنے لگا تھا۔

دوسری جنگ عالمگیر جاری تھی اور ہندوستان میں دگر و بگڑ بھرتی کر کے چند ہفتوں کی تربیت دے کر محاذ پر بھیجے جا رہے تھے۔ اس زمانے میں ایک فوجی ماہر نے یہ دریافت کیا کہ ریاست منی پور کے پہاڑ اور جنگل ایک خاص قسم کی جنگی تربیت کے لیے بہت موزوں ہیں حکومت ہند نے ہمارے لیے فوج پر کئی اجازت لی اور چند ہفتوں کے اندر اندر ضروری انتظامات کر کے وہاں تربیتی کیمپ کھول دیا گیا۔

تربیتی کیمپ اپنے ساتھ مسٹر فارسٹر کو بھی بحیثیت ریاست کے وزیر داخلہ کے لے آیا مسٹر فارسٹر کو انگلستان سے آئے صرف ۵ سال گزرنے کے تھے لیکن اس نے اپنے کو اس خور سے جو میں بہت کامیاب سولین کر دکھایا تھا۔ اس نے سولہ سال کے بچوں کو فرو کرنے میں ایسی ہوشیاری دکھائی تھی کہ حکومت اس کی انتظامی قابلیت کی قائل ہو گئی تھی اور اس کا خیال تھا کہ فارسٹر ایسے ہندوستانوں کے مزاج دان انگریز ہندوستان میں بہت کم ہیں اس لیے حکومت کو بھروسہ تھا کہ مسٹر فارسٹر ریاست میں کوئی بابت ایسی نہ ہونے دے گا جس سے کیمپ کے کاموں میں رکاوٹ پڑے۔

منی پور کی جس وادی میں کیمپ کھولا گیا تھا اس سے دو دو تین تین میل کے فاصلے پر تین چار گاؤں واقع تھے۔ کیمپ کے کھلنے کے چند ہی روز کے بعد مسٹر فارسٹر کو معلوم ہوا کہ گاؤں کو فوجی ان گاؤں میں اچانک گھس جاتے ہیں اور وہاں کی عورتوں کو اٹھلے جاتے ہیں۔ مسٹر فارسٹر نے یہ شکایت فوجی ہیڈ کوارٹر کو بھیج دی۔ نمبر سے دن وہاں سے رسمی جواب آ گیا کہ ”ضروری کارروائی کی جائے“

اس واقعہ کے دو مہینے بعد سے پندرہ فوجیوں نے ایک گاؤں پر چھاپہ مارا اور وہاں سے چند عورتوں کو اٹھالے گئے۔ صبح یہ عورتیں بہت بُری حالت میں جھگی میں پڑی ہوئی تھیں۔ ان بچہ یوں کو ان کے عزیز اٹھالائے۔ اسی دن شام کو ان میں سے ایک عورت نے نبض کا نام سینا تھا موقع پاکر بغیرت کے مارے خودکشی کر لی۔ اس خودکشی سے گاؤں والے بہت متاثر ہوئے اور انھوں نے ریاست کے اعلیٰ افسروں کے سامنے رور کر فریاد کی۔ جواب میں ان سے کہہ دیا گیا کہ وزیر داخلہ نے فوجی ہیڈ کوارٹر کو لکھا ہے کہ ایسی حرکتوں کا سد باب کیا جائے اور ہیڈ کوارٹر نے ایسا کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ امید ہے کہ یہ وعدہ جلد پورا ہو گا۔ یہ جواب اب منی گاؤں والے ایسے چلے گئے اور لفظ ہر بات ختم ہو گئی۔

لیکن دو ہفتوں کے گزر جانے کے بعد ایک سوامی نے درخواست دی کہ مجرم فوجیوں پر جلد سے جلد مقدمہ چلایا جائے اور اس سلسلے میں انھوں نے مسٹر فارسٹر سے ملاقات کی خواہش کی۔ فارسٹر نے سوچا کہ وہ فوجی جنھوں نے ایسی حرکت کی تھی اپنے دستے کے ساتھ ریاست سے جا چکے ہیں اور اب تک وہ رہا یا انگریز یا لوہ پ کے محاذ پر بھیجے جا چکے ہوں گے۔ ایک معمولی سے سوامی کی ہدایت پوری کرنے کے لیے یہ تو ہونے سے رہا کہ محاذ پر لڑتی ہوئی ایک پوری فوج کو کھلبلیا جائے اور اس طرح لاکھوں روپوں کا خرچہ اور فوجیوں کی عام بددی مولیٰ لی جائے۔ فوجیوں کی بددی اور ایسے زمانے میں جبکہ ان میں جنگ سے اکتاہٹ پھیل رہی تھی اور انکی دی دی کی حد سے زیادہ مزدورت تھی!! ظاہر ہے کہ یہ آئی ہوئی بات تھی۔ فارسٹر نے یہ سمجھ کر کہ سوامی سے ملنے سے انکار کر دیا۔

دوسرے دن انیسٹر جنرل نے سوای بی کا ایک خط فارمٹر کو دکھلایا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ اگر ہر مردوں پر دودن کے اندر مقدار میںیں چلا یا گیا تو میں مردن ہرت رکھوں گا۔

یہ خط پڑھ کر مسٹر فارمٹر نے کہا۔

دیکھا وہ سمجھتا ہے کہ اس طرح مجھے دیکھ بل کہنے میں کامیاب ہو جائے گا؟ مسٹر گانڈھی نے ابھی جو کہیں دن کا برت رکھا تھا اس کے پیچھے ایک طاقت مٹی کیو تکہ ہندوستان کے کروڑوں باشندوں سے ملتا سمجھتے ہیں اور پوچھتے ہیں۔ لیکن ایک ادنیٰ سماجی جسے اس ریاست ہی کے بہت غنورے سے لوگ مانتے ہوں، وہ بھوجن کرے یا بھوکا رہے، زندہ رہے یا مرد ہو جائی ہوں، وہاں ایک ادنیٰ نکل جائے یا بیادھے لگ کر خودکشی کرے۔ بیدلک پر اس کی ان بنی باتوں کا کیا اثر پڑ سکتا ہے؟ اور حکومت اس سے کیوں دہلے گی؟ سوای باتو سستی شہرت حاصل کرنا چاہتا ہے یا پاک ہے۔“

فارمٹر نے سوای نے عورت کی لاج کے نام پر اپیل کی مٹی اور اسی کی رکھوالی کے بیے وہ جان دینا چاہتا تھا عورت کی لاج!! جس دنیا میں ہر عورت آوارگی اور بد چلتی ہو، جہاں پاک و نامی نام بھومت ناوسترسی اور سماج کے خوت کا جہاں پاک زمرہ ایسے موقعوں پر جہاں بدنامی کا اندیشہ نہ ہو کبھی نہ چوکتا ہو جہاں وفادار بیویاں دل کی غلوں میں آزادی سے غیر مردوں سے ہم بستری ہو جاتی ہوں، وہاں ایک ادنیٰ لڑکی کی عصمت کے بیے آنا اور دھم!! یہ حرکت مرث، افتخار اور بے نتیجہ آورش پرستی ہے۔ سینا نے خودکشی کرنی طاقت کی اگر وہ عینی تو اس کا مستقبل باخشی سے برا تو نہ رہتا۔ ایک مرد اسے ستر کر دیتا تو دوسرا پسند کر لیتا۔ دنیا میں یہی ہوتا ہے۔ سوای نے سینا کا تھاویا ہی کیا یعنی دودن کے بعد مردن برت شروع کر دیا۔ فارمٹر نے جنگ کے زمانے کے انتہائی سے کام لے کر اخباروں کو برت کی خبریں پھانسنے کی ممانعت کر دی، اور اس سلسلے میں ہر قسم کے جملے اور جملوں خلاف قانون قرار دے دیئے اور پھر اس واقعہ کو اس نے اچھے ذہن سے نکال پھینکا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ دوسرا ہفتہ گزر گیا۔ تیسرا ہفتہ گزر رہا تھا کہ ایک دم سے سینا ہر ہر گھر میں محنت و عصمت کی دیوی بن کر نمودار ہو گئی رشادوں نے اس کی شان میں نغمیں اور گویوں نے کویتاں لکھیں۔ گویوں نے وہ گائیں اور اخباروں میں چھپیں۔ اخباروں میں عصمت پر مضامین نکلے گئے۔ کسی صورت سے سینا کی ایک فرضی تصویر بنا دی جو ہزاروں کی تعداد میں بکے گی۔ ہر سرگھر ہر ہر محبت اور ہر برائے میں یہ پختیں ہونے لگیں کہ عصمت بہت مزدوری چیز ہے۔ اس کے بغیر دنیا کا کام نہیں چل سکتا۔ یہ نہ رہے گی تو سماج کے گوشے گوشے ہو جائیں گے۔ پھر شہر ہر بیویوں پر بعد وہ کیسے کر سگے؟ کنوارے لڑکیوں کے چونچے ہوں گے ان کو پاسے کا گون؟ اس طرح کے درجنوں سوالات اٹھ کھڑے ہوئے جو گھوم پھر کر کسی نہ کسی راستے سے جواب کی تلاش میں فارمٹر کے پاس پہنچ جاتے تھے۔ وہ دل ہی دل میں ہندوستانیوں کی افتخار آورش پرستی پر ہنستا اور ان سوالوں کے جواب موقع اوجھل کا لحاظ کر کے کوئی جھٹکا ہوا فقرہ کس دیتا تھا۔ لیکن جب ان سوالوں کا وہ عصمت کی عظمت پر کجگوئی کا سلسلہ بہت بڑھ گیا تو فارمٹر کو کچھ پریشانی ہونے لگی کہ سوای کے برت کے اس خفیہ ملے کو کیسے روکا جائے۔

چوتھے پینچے فارمٹر کو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے ہر خاموش پونٹ اور ہر چار ہونے والی آنکھیں اسی سلسلے پر اس سے سخت کرتی ہیں اور اس سے متعلق سوالات کو اس سے پوچھتی ہیں۔ رفتہ رفتہ فارمٹر کی یہ حالت ہو گئی کہ اگر کوئی شخص دانستہ یا نادانستہ عصمت

کے منے کا حوالہ دے دیتا تو فارمٹ اندر ہی اندر کھولی ملتا۔ اور منے کو قایم میں رکھنا مشکل ہو جاتا۔
آج سواری کے برت کو پانچ بجنے لگدے کچے تھے۔

مسٹر جان فارمٹ کا دیربارک اور مسٹر جوش کا جواب سُن کر انیسٹر جنرل پوچھنے لگا۔

”ہر جگہ سی باتیں ہو رہی ہیں۔ بازار، کلب، اسکول، کالج، پارٹو فیکہ ہر جگہ یہی مسئلہ زیرِ غور ہے، شادیوں اور عرسوں میں بھی یہی باتیں

ہو رہی ہیں“

فادر مسٹر : ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دنیا کے سب کام رُکے ہوئے ہیں اور جو بہت کم محنت کا مستعمل نہیں ہو جاتا ہے زندگی کی گاڑی ایک دم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔“

فادر مسٹر کے اس فقرے پر ایک باتیںز فقرہ لگا۔

فادر مسٹر : (دراواچی آواز میں) میں مانتا ہوں کہ محنت بہت بڑی چیز ہے۔ لیکن بعض چیزیں بہت میں اس سے بدرجہا زائد ہیں۔ آج مذہب ملکوں میں دفاع پر ہر برس چیز قربان کی جا رہی ہے۔

انگریز بھائیوں کے بے ایک ہزار ایک لگاؤ کی مٹی جس پر پتھر ہیں اور سوڑکے گوشت کے کباب اور انگریزوں کے پسند کی دوسری چیزیں جی ہر فی مٹیں۔ فارمٹ گفتگو ختم کر کے ادھر گیا اور وِسکی کا ایک بڑا سا پگ لے کر اس نے ایک گھونٹ پیا۔ اتنے میں پاس سے آواز آئی۔

”مسٹر فارمٹ! کیا آپ سواری کے برت کا مقابلہ اسی طرح کرتے رہیں گے خواہ وہ مر جائے؟“

اسی سوال کے پوچھنے والی پیرس لیمب مٹی جو ریاست کے ایک سابق انگریز دیوان مسٹر جیمس لیمب کی اگلی بیٹی تھی۔

فادر مسٹر : میں نہیں اُر کوئی شخص مرنا چاہتا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں؟“

پیرس : جس طرح آپ اس برت کا اور اس کے پس منظر میں ہندوستانیوں کے خود دنیا تو کسی انداز میں ان کا مقابلہ کر رہے ہیں اسکی تعریف نہیں کر سکتی۔ ونگڈرغل۔

فادر مسٹر : غیبت ہو۔

پیرس : آپ نے ایک لمحہ بہت بڑی چیز بتا دی۔ وہ یہ کہ مغرب کی مٹوس حقیقت پسندی اور دنیاوی سوج بوجھ کیسی ہوتی ہیں۔ اور وہ ہندوستان کے وقتیا تو کسی اقدار کا مقابلہ کس خوبصورتی سے کر سکتی ہیں اور ان کو اپنی جنگی فعل و حرکت سے کس طرح پاش پاش کر سکتی ہیں۔

میں پیرس جی کی پہلو سے ذہنی بہت معمولی صورت تھی اس کی، بال بخود ہی سی لہروں کے ساتھ کندہ دہن پر شیشم کے چھوٹے کی طرح جھول رہے تھے۔ آنکھوں میں ساکن نال کی جلاہٹ تھی۔ پورٹ پتلے تھے جسے جو اس وقت جوش اور مضبوط سے کانپ رہے تھے۔ گالوں پر بیماری کا سایہ تھا۔ چہرے پر کچھ ایسا بھولا پن اور نا تجربہ کاری تھی کہ وہ ۲۵، ۲۶ سال کی ہونے کے بیس سال کی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ مس پیرس کا باپ چند سال ریاست کا دیوان رہ کر گیا تھا۔ جہاں رہنے اس کی خدمات کے جلسے میں اس کے خاندان کو ایک ماگ پڑے دی تھی لیکن یہ شرط لگی تھی کہ یہ جاگیر اس وقت تک اس خاندان کے پاس رہے گی جب تک کہ وہ ریاست میں مستقل سکونت رکھے۔ کچھ

اس جاننا دیکھ کر اسے اور کچھ میں کی صحت کی مستقل قربانی کی وجہ سے یہ خاندان اسی ریاست میں بس گیا تھا۔
پھر یہیں کہنے لگی۔

”میں جی سے ہمیشہ کہا کرتی تھی کہ جی مجھے ایک سپنا نظر آتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ کبھی نہ کبھی انگلستان سے کوئی نہ کوئی انگریز ایسا مرد مرے لئے آجائے گا جو مجھے سنا انگریز بنا دے گا۔ آپ جانتے ہیں کہ میری پیدائش انگلستان کی ہے؟ جی ہاں۔ میں چار سال کی تھی جب بابا کے ساتھ وہاں سے آئی تھی۔۔۔ لیکن میری زندگی بیاد کے بہتر پر گزری۔ چڑے پرشے میں سرچا کوئی تھی کہ مغرب کی وہ کوئی شخصیت ہیں، جہاں سے اس نے دنیا فتح کر لی ہے۔ لیکن میرا مطالعہ صرف ہندوستان پر ہی تھا۔ وہ انگریزی پڑھتے تھے اور مادری انگریزی سمجھنے والے تھے۔ لیکن مغرب کے سب دنیا فانی انداز کے پیاری۔ کچھ ان کے اثرات کچھ گاندھی کی شہرت اور اس کی تحریروں، ان چیزوں نے مجھے فتح فرما کر لیا۔ لیکن اندر ہی اندر میں اس ذہنی غلامی کے گھبراہٹ تھی اور اس حال کو توڑنے کے لیے اپنی قوم کی طرف دیکھتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی انگریز آکر مجھے اس دلدل سے غمزدار نکال دے گا۔ جب میں نے دیکھا کہ آپ سماجی کے برت کی کوئی پروا نہ منیں کرتے ہیں اور اس کے خیالات اور عمل کو خاطر میں بھی نہیں لاتے ہیں، اور اپنے مغربی اقدار پر پختہ عقیدہ رکھتے ہیں تو میں نے اپنے سے کہا کہ میں، وہ آگیا۔“
فارمستر کو ایک دم خیال آیا کہ میں دو ہفتوں سے انگریزی کلمہ میں میرے گرد چکر لگا کر رہی ہے۔

فارمستر : مجھے بڑی خوش ہوئی کہ میرے خیالات سے آپ کو کچھ فائدہ پہنچا۔

پیس : فائدہ سا فائدہ ————— ہاں میری ایک کتاب اور ہے۔ وہ یہ کہ میں اپنی قوم کی کچھ خدمت کر سکوں۔ انیسویں صدی میں مولیٰ طویل بیماری نے میرے جسم کو کمزور بنا دیا ہے۔ اور میری کوئی خاص تعلیم بھی نہیں ہو سکی ہے۔ اس لیے میں جسمانی خدمت کر سکتی ہوں اور نہ دماغی۔

فارمستر : گھبراہٹ نہیں۔ آپ کو کبھی کبھی نہ کوئی موقع مل ہی جائے گا۔

میں کی باتیں سُن کر فارمستر کی خود اعتمادی اک دم سے ٹوٹ گئی بلکہ جو کچھ ہو گئی۔ وہ یہ محسوس کرنے لگا کہ میرے خیالات نے ہندوستان کی ایک عقل مند لڑکی کے برسوں کے خوابوں کی تعبیر کر گئے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ میں ایک بڑے مٹی کو پورا کر رہا ہوں جو مغربی تہذیب نے مجھے سونپا ہے۔ میں ہندوستان کو اعتماد پرستی کی جگہ مغربی حقیقت پسندی عطا کرنا۔

(۲)

سوامی کچھ نہ کچھ چھب کر غمزدار کھانا کھا رہا تھا۔ اس لیے وہ مرے گا نہیں۔ سوامی اپنے برت کو کچھ پرکار کر رہا تھا جو اندھکھ کر غمزدار تو ہے گا۔ وہ نہ توڑے گا تو اس کے جھگٹ اصرار کر کے توڑا دیں گے۔

یہ عقیم فارمستر کی قیاس آرائیاں جو سب کی سب غلط ثابت ہوئیں۔ اور سوامی دو مہینے پورے کرنے سے پہلے ہی چل بسا۔ سوامی کے مرنے سے پہلے ہی شہر کے حالات بگڑ چکے تھے۔ چار مہینے اخباروں میں سے دو کو باغیانہ تحریروں کے الزام میں بند کرنا اور دو کو بھاری قیمت پر خریدنا پڑا تھا۔ ایک شاعر کو اس جرم پر کہ اس نے برت کی خوبیوں پر ایک نظم ایک صحبت میں پڑھ دی تھی دو سال قید با مشغلت کی سزا دینا پڑی تھی۔ شہر کے کچھ نوجوانوں نے کسی باجیے کرنے کی کوششیں کی تھیں اور ان جھگڑوں

کو لاٹھی چارج سے منتشر کرنا پڑا تھا۔ ایک بار تو انھوں نے سہیتا ڈسے، مگر خلافتِ نالائق مجلسِ نکال دیا تھا جسے منتشر کرنے کے لیے ایسا سخت ہاتھ چارج کرنا پڑا کہ چھ آدمی مر گئے اور سب سے اوپر زخمی اسپتال پہنچائے گئے۔ آخری ہفتے کے اندر اس چھوٹے سے شہر میں تیس سہندوؤں کو گرفتار کر کے بلا مقدمہ چلائے جیل میں ڈال دینا پڑا تھا۔

فارمٹر سوامی کے برت کے چوتھے ہفتے کے بعد ایسا محسوس کرنے لگا تھا کہ محصمت اس کی صف میں انتشار مچا رہی ہے۔ پھر اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس کی صف کے لوگوں کے جذبات بھی سوامی کی صف میں شامل ہو رہے ہیں اور اس کی حکومت صرف ان کے ہاتھ پاؤں پر رہ گئی ہے۔ "سہیتا ڈسے" کے موقع پر شہر لوگوں نے دن بھر کا برت رکھا تھا۔ اس دن رات کو فاسٹر کو یہ رپورٹ ملی تھی کہ بڑے بڑے سرکاری افسروں کی بیویوں اور بیٹیوں نے بھی اس دن خرابی صحت، مکی بنا پر دن بھر کا فاقہ کیا تھا۔

نظر اور پوسے تو بالکل دینا ہی مضبوط تھا جیسا اول دن تھا، لیکن اس کے اندر ایک طوفان امنڈ رہا تھا جس کا زور روز بروز بڑھتا ہی جاتا تھا جب وہ لوگوں کو اس جرم پر سزا دیتا تھا کہ وہ محصمت کی ضرورت سے زیادہ حمایت کرنے کی وجہ سے بغاوت کے سرگم ہو گئے تھیں، یا سنتے، سمجھتے یا لاٹھی چارج کرنا تھا تو اسے اپنے آپ کو اس سخت کام کے لیے پہلے سے زیادہ مضبوط کرنا پڑتا تھا۔ اور کا ختم کرنے کے بعد دینیک اپنے آپ سے بھٹ کرنا پڑتی تھی کہ میں نے جو کچھ کیلئے ٹھیک کیا ہے۔ اور آخر کار اسے دھسکی کی آڑ میں چھپ کر اس بحث سے جان چھپانا پڑتی تھی۔ دن بدن یہ نیاری اور یہ بحث اور یہ آڑ کے کھینچنا، یہ سب کام مشکل سے مشکل تر ہوتے جاتے تھے۔

ایک دن فارمٹر کو یہ رپورٹ ملی کہ ایک ادنیٰ سی بڑی نے یہ کہہ کر "سہیتا فنڈ" میں چندہ دیا ہے کہ اگرچہ میں خود محصمت کی دکاندار ہوں، لیکن خوب جانتی ہوں کہ یہ کتنی بڑی دولت ہے اور اس کی رکھشاکشی ضروری ہے۔ یہ رپورٹ پا کر فارمٹر اپنے آپ سے پوچھنے لگا کیا واقعی یہ چیزیں کا نام محصمت ہے، ایسی ہی ضروری ہے کہ لوگ اس کے اتنے دیوانے ہو جائیں؟ لیکن اس سوال نے اس کے دماغ کو خیالات کے ایسے گورکھ دھندے میں الجھا دیا جس کا اسے کوئی اور سر نہ ملا۔

ایک رات فارمٹر نے پولیس کے دو افسروں کو سادے کپڑوں میں ساتھ لیا اور معمولی شہریوں کی طرح سوامی سے ملنے پہنچ گیا۔ وہاں وہ خود کچھ نہیں بولا۔ پولیس کے افسر باتیں کرتے رہے سوامی نے اپنے ہاتھ کا مقصد سمجھایا اور پھر کہنے لگا۔
 "میرے کھنکا کر یہ برت کتنی شخص کی مخالفت میں ہے، بہت سخت غلطی ہے۔ محصمت کی رکھشاکر حکومت پر فرض ہے، اور وہ اس فرض سے ایسی دقت پہنوتی کہ سکتی ہے جب حق اور انصاف کا اثر سماج پر کم ہو جائے۔ میں اپنے برت سے حق اور انصاف کو جگانا چاہتا ہوں۔ وہ اگر جاگ اٹھے تو دل بدل جائیں گے۔ بڑے اچھے برے جانیں گے، اور جو اچھے نہ ہوں گے۔ سماج ان کی رائے کو ماننے لگا ہی نہیں۔"

پھر سوامی کہنے لگا "جو لوگ میری مخالفت کرتے ہیں وہ بھی عورت کی لالچ کی قیمت جانتے ہیں۔ پھر میں ناحق پر کیسے ہو سکتا ہوں؟"

فارمٹر نے سوامی کے الفاظ سے زیادہ اس کے دل کو محسوس کیا۔ وہاں واقعی اس کے خلاف یا کسی اور کے خلاف ڈرا گیا نفرت نہیں تھی۔

اس ملاقات نے نائرسٹر کو اور کو روک دیا جو شخص تم سے نفرت کرتا ہو یا تم سے ڈرتا ہو یا تم کو غصہ دلانا ہو اس کے سینے پر نشانہ باندھنا اور گولی مارنا آسان ہے لیکن جو شخص نہ نفرت کرتا ہو، نہ ڈرتا ہو، نہ غصہ دلانا ہو، بلکہ اس کے سینے پر طعنے سے تمہارا جلا جاتا ہو اس پر نشانہ باندھنا یا گولی مارنا آسان کام نہیں مشکل اور بہت مشکل ہے۔

سوامی مرگیا اور مرکر ایک سخت منہ بھڑک گیا وہ یہ کہ سب تھرو اسے مل کر اس کی ارحمی اٹھانا چاہتے ہیں، اس بات کی ان کی اجازت دی جاسے یا نہ دی جاسے مگر انتظام کی زبان میں یہ سوال یوں اٹھتا تھا کہ عوام کو پیسے و حیل دی جائے اور پھر ان کے گلے میں بھینسا کسا جائے۔ یا شروع ہی سے پھنسا کس دیا جائے؟

سوامی کے مرنے سے عصمت کا معاملہ اور سنگین ہو گیا تھا۔ ریاست کے عوام کی حالت یہ تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ برطانیہ نندیدہ ملی کی طرح ان کی عورتوں کی گھات میں ملوث ہو رہے۔ اس لیے عوام قدرتی طور پر اپنی عورتوں کی عصمت کی حفاظت کے لیے سرکھٹ میں غم و غصہ کا ایک آتش فشاں سلگ رہا تھا اور کچھ انداز میں ہوتا تھا کہ اس کے سپٹ میں کتنا لادنا بھرا ہے۔

فائرسٹر مذہب میں تھا کہ کیا کروں عوام کو شروع ہی سے دباؤں یا پیسے و حیل دے دوں پھر دباؤں لیکن انگریزی کلب میں ایک بات ایسی ہو گئی جس نے فائرسٹر کو سنا دیا وہ دباؤ اور اس سہارے سے اس نے اپنا تذہب ختم کر دیا کلب میں ریاست بھر کے انگریز موجود تھے اور سب کے سب مجلس کے نام سے بہت خوفزدہ تھے سب یک لڑے تھے۔ وہ یہ کہ ہم کو گاندھی والوں کے عدم تشدد پر بھروسہ نہ کرنا چاہیے کیا معلوم وہ کس وقت تشدد پر اتر آئیں؟

ایک میچم نے کہا :-

”فزیں کو جس وقت مجلس نکل رہا ہو اس وقت گاندھی والوں کا افسر اپنے آدمیوں کو بنزن کا حکم دیدے اور ایک دم لاکھ دو لاکھ تشدد ہم پر ٹوٹ پڑیں، تب فائرسٹر تم کیا کر دو گے؟“

پکٹان ڈرجٹ جو اپنی چھٹیاں گنڈا رنے والی تھی میرا اپنے ایک دوست کے پاس تھی پورا کیا تھا، کہنے لگا :-

”فائرسٹر! آپ کو کم لوگوں کی جانوں پر تجربہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔“

میں نے میرے تال میں نظر آنے والے آسمان کے رنگ کی آنکھوں سے فائرسٹر کی طرف دیکھا اور بولی۔

”آپ مذہب کیوں ہیں؟ کیا ہندوستان انہوں کے ذہنی اتالیق اقدار نے آپ کو بھی توڑ ڈالا؟“

فائرسٹر کا انگریزی طور پر مود کر گیا۔

”میں ٹوٹنے کا نہیں مس لیمب!“

فائرسٹر نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ مجلس نہیں نکلے گا۔ بس صرنا ۵۰ آدمیوں کو ارحمی کے ساتھ جلنے کی اجازت دی جائیگی۔

(۳۱)

مجلس کی اجازت نہیں دی گئی۔ لیکن شہر والوں نے اس کی کوئی پروا نہیں کی اور خلافت قانون دس ہزار آدمی ارحمی لے کر اس نیت سے روانہ ہوئے کہ شہر کے خاص بازار سے ہو کر شہر ان جاہل گے۔ فائرسٹر نے خلافت قانون مجلس کو منتشر کرنے کا پہلے سے انتظام

کر لیا تھا۔ بازار کے دوسرے سہے پر مسلح پولیس کھڑی کر دی تھی اور خود بھی موقع پر موجود تھا۔
 بازار سے گذر کر مجلس جب کنگز پر پہنچا تو پولیس نے اس کا راستہ روک دیا۔
 ارغی کے آگے سوامی کے کچھ چیلے تھے، ان کے بعد ریاست کے سیاسی کارکن تھے جن کے ہاتھوں میں ترنگا جھنڈا تھا۔
 اس کے پیچھے آدھوں کا سمندر تھا جس میں ایک طرف مورتنوں اور بچوں کا غول بھی تھا۔ لوگوں کے ہاتھ میں ایک چھڑی تک نہ تھی۔
 پولیس نے لالہ دایپیکر سے اعلان کیا کہ اگر مجمع کھڑے آگے بڑھا تو اس پر فائرنگ کر دی جائے گی۔ لیکن مجمع نے اس اعلان
 کی کوئی پروا نہ کی اور آگے بڑھتا رہا۔ جیسے وہ بازار کی حد سے نکلا فادرستہ حکم دیا۔
 ”دست“

”ون، ون، ون، ون، ون اور اوندھیلے۔ آگے کی قطار۔ ڈھیر ہو گئی، ارغی گہڑی اور لوگ بدحواسی سے جا گئے۔
 ان میں کچھ تو درہٹ کر ٹھہر گئے، کچھ دو کاؤں پر چڑھ گئے اور کچھ ایسے جاگے کو، جنہوں نے بیٹے کر نہیں دیکھا۔ جب مجمع منتشر ہو گیا تو فادرستہ حکم
 دیا کہ ارغی پر قبضہ کر دو۔ پولیس آگے بڑھی مایا کی ایک نوجوان باگلوں کی طرح بھیڑ سے نکل آیا اور زمین پر پڑے ہوئے جھنڈے کو اٹھا کر اس نے
 فیرہ لگایا۔

”انقلاب زندہ باد، انقلاب زندہ باد، انقلاب زندہ باد“
 جاگنے والوں میں ایک لہر دوڑ گئی اور ان کے تدم قہم گئے اور وہ پھر اکٹھے ہو کر آگے بڑھنے لگے۔ فادرستہ نے نوجوان کے ہاتھ
 پر اپنے ہسٹول سے ایک فیر کیا۔ وہ مجمع جھنڈے کے گر پڑا۔ لیکن پھر وہ فوراً ہی تڑپ کر اٹھا اور دوسرے ہاتھ میں جھنڈا اٹھام کر فیرہ لگایا۔
 ”انقلاب زندہ باد، انقلاب زندہ باد“

فادرستہ نے دوسرا فیر کیا اور نوجوان پھر اس طرح ڈھیر ہو گیا کہ لوگ سمجھے وہ مر گیا، لیکن ایک منٹ کے بعد اس نے پھر کڑبڑ بدلی اور
 پاس پڑے ہوئے جھنڈے کو دائیوں میں دبا کر دھڑکاتا ہوا اٹھنے لگا اور اٹھتے اٹھتے فیرہ لگایا۔
 ”انقلاب۔۔۔“

فادرستہ کو اس کی مندر پر فیرہ لگایا اور اس نے پورا ہسٹول اس زخمی پر غالی کر دیا۔ فوجوان جہاں تھا وہیں خون میں نہا کر فادرستہ کی طرح ڈھیر ہو گیا۔
 لیکن اس بات پر مجمع چھٹنے کی بجائے اکٹھا ہو کر فیر سے لگا ہوا آگے بڑھا۔

”انقلاب زندہ باد“

”سوامی جی زندہ باد“

”محضت و عفت زندہ باد“

فادرستہ نے پھر فائرنگ کا حکم دیا۔ اب کی چھراؤ نہ بیٹے تب جا کر مجمع منتشر ہوا۔ بھاگے والے نوجوان کی لاش تو اٹھالے گئے،
 لیکن سوامی کی ارغی تک نہ بچ سکے۔ پولیس نے ارغی پر قبضہ کر لیا اور شہر اس سے جا کر بھیڑنگ دیا۔

(۴)

فادرستہ کی عمر چالیس سال کی ہو چکی تھی لیکن وہ ابھی تک خیر شادی شدہ تھا۔ اس کی شریک زندگی دھکی کی سچی حوالت و خلوت،

خوشی و غم ہر موقع پر وہ فاداری سے اس کا ساتھ دیتی تھی۔ فادر ستر جب سماجی کی لاش لٹیکو کر واپس آیا تو اس نے بہت بدحواسی سے اپنی شریک زندگی کو پایا دیکھا۔ لیکن آج وہ کسی طرح بھی فادر ستر کے دل کی پیاس نہ بجھا سکی۔ اس کے سینے میں ایک ٹھنڈی بوست تھا جو کسی طرح گلے سے نہیں نکلتا تھا۔ اس ٹھنڈی نوک دانتوں میں جھنڈا دبائے والا نو جوان تھا۔ پہل سماجی اور سینہ پر سب گھسے ہوئے اس کے گلے کا قیصر بنا رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میرے سینے میں سے کئی دردوں سے جھجکا دکھا تھا، اس خفیہ نے کیسے راستہ پا لیا، اس نازک وقت میں اس خیال سے بھی کچھ سہارا نہیں مل رہا تھا کہ میں کمزور انگیزوں کا محافظ ہوں۔ کیوں کہ نہتے مجمع کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد اس بات پر یقین کرنا کہ یہ بھی لوٹ مار بھی کر سکتا ہے محال ہو چکا تھا۔

فادر ستر سوچنے لگا کہ کاش کوئی نسوانی آواز ہوتی جو پیار و پریم میں ڈوبی ہوئی میرے دل پر ملائم ملائم ہاتھ پھیرتی اور کہتی: "ڈارلنگ جان" تم نے جو کچھ کیا ہے وہ درست ہے۔ تم غلطی پر نہیں ہو، غلطی پر تھا وہ نسوانی جوانی محانت میں مر گیا، اور غلطی پر تھا وہ لونیو جان جس نے پاگل پن میں اپنی جان دے دی۔" لیکن ایسی نسوانی آواز ہے کہاں؟

ایک دم سے جلی تیلی میں سبب فادر ستر کے دل میں رونما ہو گئی۔ فادر ستر کی نگاہوں سے پردے سے اٹھنے لگے اور اسے محسوس ہونے لگا کہ ڈیڑھ عرصے سے، جب سے کہ میں برت سے لڑ رہا ہوں وہ میرے لیے درجنوں دیہی بے اور دوسری جی جب مجھے جاک پر جانا تھا تو وہ خیالوں کے نادوں پر تھم کر رہتی ہوئی تھا اور اس نے مجھے گدگد گدگد کرنا چاہا ہے اور اپنی جھیر و بے سیری بہت بندھانی ہے۔ میر جب میں غصا کر ادا واپس آیا ہوں تو وہ مسکاتی ہوئی تصویر میں آئی ہے اور اس نے خود اعتمادی کے چھانٹے لگا کر میرے جسم مندر لگے ہیں۔ فادر ستر نے پلٹ کر اپنے سے کہا جان تم یقیناً فوت ہو جو ابھی تک تم نے یہ نہیں محسوس کیا کہ تم اس لڑکی سے محبت کرتے ہو۔ وہ لڑکی تمہارے لیے بہت ضروری ہے۔ اگر تم انجین ہو تو وہ بھاپ ہے۔ اگر تم ہوائی جہاز ہو تو وہ پٹرول ہے۔ تم کو اسے اپنا بنالینا چاہیے۔

فادر ستر بیس کی تلاش میں کلب گیا۔ لیکن وہاں وہ نہیں ملی حالانکہ وہ بہت پامندی سے آیا کرتی تھی۔ فادر ستر گوانڈیشہ ہوا کہ بیس وہ بیمار تو نہیں ہو گئی۔ لیکن اسے ایک انڈیشہ اور بھی ہوا۔ جس سے وہ بہت پریشان ہو گیا۔ وہ یہ کہ کپتان درجٹ اس کے پیچھے لگا رہتا تھا اور وہ اس خدناک قسم کا عورت کا شکاری تھا جو کسی نہ کسی حال سے عورت کو اپنے اوپر ترس و لاچار اس کے مادرانہ جذبے کو کھو لا دیتے ہیں اور پھر اس حالت سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔ فادر ستر نے سٹے کیا کہ مجھے فوراً بیس کے یہاں جانا چاہیے۔

فادر ستر اب شخص تھا جس کے سینے میں طاقت اور اختیارات حاصل کرنے کی انگلیوں کا طوفان اٹھ کر رہا تھا۔ اور جو اپنی منزل کے لیے بلا جھجک خون کا دیا بھی پار کر سکتا تھا۔ لیکن آج کل یہ انگلیں ایسے نامعلوم بھاری بوجھ کے نیچے دب چکی ہیں جو تیس جن کے نیچے سے ان کے اجزیر گیت آہ بن کر نکلتے تھے اس لیے اس کو خارجی سہارے کی ضرورت تھی اور فوری ضرورت۔

فادر ستر بہت بے بسی سے بیس کے گھر کی طرف چل کھڑا ہوا۔ اس کا گھر ایسی پہاڑی پر تھا جہاں کافی دور تک پیدل جانا پڑتا تھا۔ یہ راستہ گاٹھاس کے لیے دو بھر ہو گیا۔

پیس نے فادر ستر کو آتے دیکھ لیا، وہ خوشی سے چٹکا کر اس کی طرف دوڑی۔

فادر ستر فادر ستر میں اس وقت آپ سے ملنے کے لیے کتنی بے جاہلیں تھیں!! لیکن اس بات کا تو سان گمان بھی نہ تھا کہ میں اتنی

خوش نصیب ہوں کہ آپ یہاں آجائیں گے۔ آئیے مسٹر فارمٹر۔
 مسٹر فارمٹر کو پیس نے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر کہا۔

”ہیں آپ کو ایک خبر سنانے کے لیے بہت جلد میں ہوں۔ یہ بات ایسی ہے جسے میں دنیا میں صرف آپ کے کمر بستہ ہوں اور صرف آپ ہی اس کی عظمت محسوس کر سکتے ہیں۔ کیونکہ آپ میرے جگر کی خدمت میں ہیں اور گرد، مٹی اور ساتھ ساتھ مغربی اقتدار کی آپ نے وہ تصویریں ہیں۔ وہ خبر ہے کہ آج مجھے اپنی مادر وطن کی ایک خدمت کرنے کا موقع مل ہی گیا۔ جی ہاں مجھ ہی کو اردو کے نامور وطن کی خدمت کی۔ یہی نے ایک تھکے ماندے فوجی کو نازی بہت سے کے کا محاذ پر بھیج دیا۔ ایک اچھے ماڈرن انگریز لڑائی کی طرح۔“

فارسٹر: کیا مطلب؟ میں نہیں سمجھا۔

پیس : (بسن کر) آپ خیال بھی نہیں کر سکتے ہیں کہ میں نے کیا کیا ہو گا۔ کہتا ہوں ڈرجے کی چھٹیاں تھر ہو گئی تھیں لیکن وہ لڑائی میں اتنا اکٹا ہوا تھا کہ کتنا تھا کہ میں عذابِ برہانے کی بجائے سامنے کے ہاتھوں میں ہلکے جاتوں کا اور دہاں مارا مارا دھجھکاؤ کا جب اس کی سکت میں سے کہ تو اپنے کو کبھی چھوٹی پسے کر دوں گا۔ وہ کہتا تھا کہ مار ڈالنا وہ مارا بار ہے جس کے ایسے اس کی دل کو ایک خاص قسم کے راضی کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ ہے چاہت، نرم و نازک نسوانی لمس، اور مجھے یہ ملا نہیں ہے۔ دو سال بیت گئے اس کے بغیر۔ جب وہ بہ بائیں بھر سے کیا کرتا تھا تو اس کی آنکھیں ڈبڈباتی تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں نہ ہوتی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر دے گئے۔ میں اس کی حالت دیکھ کر اس پر سے دل سے پل جھاکر کئی غلی کرک یک ماڈرن لڑکی جو ہندوستان کے دنیاوی افسی اقدار کی سنیں بلکہ یورپ کے حقیقت پسند اقدار کی یعنی ان اقدار کے جن کا مجسمہ اسی نازیٹر ہے، پکاراں ہے اسے کیا کرنا چاہئے؟ وہ کہوں نہ اس نکلے ماننے سے پی کی کو اس کا مطلب یہ راضی دے لے؛ آخر بہت خود فکر کے بعد میں نے وہی کہا جو مجھے کرنا ہی چاہئے تھا“

نارسٹر: (ایک بے چینی کو بہت سخت کوشش سے چھپا کر) ”کیا کیا؟“

پیس : جس چیز کا وہ ملو کاغدادہ اسے شے دی۔ ہم دونوں نے ایک دای میں جا کر خوب داد پیش دی۔ ابا ابا مسٹر فارم سڑ میں اس وقت بہت خوش ہوں۔ ایسا محسوس کر رہی ہوں جیسے درجٹ اس وقت ہوئی جہاں پر نہیں جا رہا ہے بلکہ میں اسے اپنے بازوؤں پر اٹھائے نماز کی طرف لیے جا رہی ہوں۔ اور جب وہ ہماری دایرہ وطن کے لیے دشمن کے لڑنے کا تڑاس وقت وہ اپنے بازوؤں سے نہیں (اچھے اٹھوں کو اٹھا کر کے) بلکہ ان کو درازتوں سے لڑے گا۔“

فارسٹر : کیا اس نے تم سے شادی کا وعدہ کر لیا ہے؟

پیس : شادی کا وعدہ !! اس کی بیوی لندن میں موجود ہے۔

فارم سٹر: پیس کیا تم اتنی ہی احمق ہو؟

پیس : کیا مطلب ؟

فارسر: تم نے اپنے کو ایک بد معاش کی خواہشوں کا شکار بنادیا اور سمجھتی ہو کہ ماہرِ وطن کی خدمت کی — کیا واقعی تم کے اتنی

بڑی غلطی سرزد ہوئی ہے؟

پلیس : اتنی بڑی ٹیلی، اگرچہ کہیں سے کہا ہے وہ سب اوتار ہے لیکن اس میں غلط کیا ہے؟ آدمی کا انتخاب غلط تھا، یا نسل غلط؛
فارمسٹر : (مختصر لکھ کر) کیا تم اپنی عقلی ہوشیاری، تم میں ملتی سبھو جو بالکل نہیں ہے۔ جو بات چھوٹی ہے جو چھوٹی لڑکی کا جسکتے ہے تم وہی نہیں

منجھ ری سو۔۔۔

پیس : میں سمجھی، تم کو میرے مستقبل کی فکر ہے۔ مئی کو اگر معلوم ہو جائے تو ان کو بھی یہی فکر ہوگی۔ لیکن مجھے کوئی فکر نہیں۔ میں نے سب کر لیا ہے سوچو، تم کو کیا ہے۔ جو ملا تو میں مغرب کو چلی جاؤں گی۔ اور یہ منہ نہیں ہوا تو بھی کوئی حرج نہیں میری سب سے بڑی فتنہ غلامی کی دیر غریب! اپنے وطن کی کوئی خدمت کر سکوں سو وہ بوری ہوگی اب جو بھی ہو، سب جھگٹ لوں گی۔

فارسطر: یہ بتاؤ تم ڈرجت کی محبت میں تو نہیں گرفتار ہو گئی تھیں؟ یا ایسا تو نہیں ہوا کہ اس کے رہنے کی وجہ سے بہت زیادہ کھل گئیں؟

پیس : میں اتنی جذباتی تو نہیں ہوں۔ انسانا تو تم محسوس کر ہی سکتے ہو۔

فارستر: پھر کیا تم کو اس میں جیسی کشش نظر آئی؟

پلیس ! نظر تو آئی۔ لیکن پہلے نہیں۔ جب میں نے فیصلہ کر لیا ہے اس کے بعد۔

فائسٹر : تو سن لو۔ تم عصمت باختر عورت ہو۔

یہ سُن کتیں پُربھائی گر ٹری۔ وہ چند سیکنڈ خاموش رہی۔ پھر اپنے کو قابو میں کر کے کہنے لگی۔

پیس : عصمت باختر! اقم اس لڑکی کو عصمت باختر کہتے ہو جس نے تمہارے خیالات پر عمل کیا؟

فارسٹر: خیالات، خیالات، خیالات، خیالات کا کیا آدمی سیدنگڑوں باتیں روزگار کرتا ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آکھیں بند

کہو کے ان پر عمل کیا جائے؟

پیش : لیکن تم تو کہتے تھے کہ تمہارے خیالات ہندوستانی اور مشرق کی طرح ناقابل عمل نہیں بلکہ وہ روزمرہ کی زندگی کی چیزیں ہیں۔ سب میں

سمجھی میں نے واقعی دھوکا کھایا۔ لیکن یہ نہ سمجھنا کہ میں نے ڈر حرا کے ہاتھ سے دھوکا کھایا، نہیں، میں نے تم سے دھوکا کھایا۔

کاتم تھمتے ہو کہ میں نے جو کچھ کہا وہ کسی فوری جذبے سے کہا، میں اس قربانی کے لیے اپنے کو ڈوب جٹ گئے اس نے کے ایک مہینہ

پہلے سے، جب سے کہ میں نے اپنے کو تمہارا اہلکار بنا لیا ہے، تمہارا کہتی رہی ہوں، تاکہ کوئی غلط فہمی نہ پڑے۔ اس طرح خدمت کر سکیں جب

میرادل اس کے خلاف زیادہ کرتا تھا تو اس کو سمجھاتی تھی کہ تجھ پر آدوش برستی کلامیہ ہے اس لیے تو ایسا ماننے کرتا ہے عصمت

کے حامیوں کے خلاف جنگ نے مہر کی مدت ستر چالی اہد میں نے اپنے دل کا گلا گھونٹ گھونٹ کر اسے خاموش کر دیا۔ لیکن افسوس

از اس کی لکھنؤ، جس طرح آواز کو مار ڈالا وہی کچھ تو میں نے اپنے کو لوری، طرح پر یاد کر ڈالا۔ لے بیڑ ہر سے قصہ

تو سے ادھرخنے والا کہ: ہیس بھٹ بھٹ کر رہنے لگا۔

ناراض و غم و اندک فتنہ سے نہ ہلکا ہوا تھا۔ لیکن جیڈ منٹ مہ راہ نے اسے اب کو سنبھالا کر کہا۔

مذکورہ بالا تمام باتوں کو دیکھ کر حضرت علیؓ نے فرمایا: میں نے اپنے آپ کو جہاں سے دیکھا ہے، وہاں سے تم کو بھی دیکھا ہے۔

وہی ہو پھر — جسے الزام ملے
میں سے کہ رٹکھڑے ہو

میں کیجئے، اپنی قیمتی باتوں کو اپنے ہی ملک پہنچے دیجئے — اچھا خدا حافظ.....“

فارمٹر : تم کو اس حالت میں چھوڑ دوں؟

بیمیں : میں آپ کی صورت نہیں دیکھ سکتی ہوں، چلیئے — ابھی جا بیٹے۔

میں رنج و غم سے گری پڑ رہی تھی۔ لیکن اس پر بھی وہ فارمٹر کے بغیر نے کی روادار نہیں ہوئی اور اسے نکال دیا۔

فارمٹر کو گھر آکر پر خیر ملی کہ سوا می کی خاک شدہ ارمی نے دوسرا جنم لے لیا ہے یعنی فخر والے کل تمہید نو جوانی کی ارمی پڑی و صحر و صحرا سے نکالنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ فارمٹر کی حالت اس کسان ایسی تھی جس کا کھلیاں اسی کے ہاتھوں میں کر اچھی زندگی گزارنے کی تمام امیدوں کو دیکر خاک ہو گیا ہو۔ اور تو خود از فرض خواہ دروازہ کھٹکھٹا رہا ہو — اختیارات کی بھوک، محنت و ترقی کی خواہشیں، جس قسم کی سب اہمکلیں نہ جانے کس طرح خاک پر چکی غصیں۔ صرف اس بات کا احساس تھا کہ جیسے بنے زکل قتل و غارت کا کاروبار کرتا ہے۔

فارمٹر خود اعتمادی کی بھیبک مانگتے پھر دھسکی کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ صبح جب وہ نازنگ کرانے جا رہا تھا تو اس کے ہم میں ارادے کی جگہ نشتر کام کر رہا تھا۔

اسے حاصل تھا۔ اس سے زیادہ زندگی میں کوئی کس چیز کی امید کر سکتا ہے، مگر جب وہ اپنی بیوی کی زبان سے یہ دو حرفی لفظ ”جی“ سنا....
 بلا لکے غمگین، پھٹکے، بے رنگ، ٹھکے ہوئے انداز میں..... تو اس کی خوشی اور خوش قسمتی دونوں پر شک اور شبہ اور ایک عین
 مایوسی کے بادل چھا جاتے۔

”جی!“

کب سے یہ لفظ اس کی زندگی میں گونج رہا تھا۔

تیرہ برس ہوئے وہ پہلی بار مسوری میں ملے تھے۔ سردیہ زمین بھر پہلے ہی انگلستان سے آیا تھا اور تقریباً پچاس برس پہلے
 چند صنعت چٹائی منانے آیا ہوا تھا۔ مسوری کے پتے تھانوں کی خوبصورت، خوشبو شاک اور دلچسپ لڑکیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ٹائمریری کے
 سلسلے ہر شام کو باقی کوئی رنگین ساڑھیوں، چٹت قمیصوں، قیمتی شادروں اور گئے میں جھونٹے ہوئے دیپٹیوں کی نمائش ہوتی تھی۔ اونچی
 ایڑی کے جوتوں پر اٹھان لائی ہوئی بال، بے باک نگاہیں، شوخ جوڑیاں، بالکی جیٹوں، ہولائی سینٹ میں ڈوبے ہوئے ہوا کے جھونکے، گھنار
 لب، مرنچے سے بالیک کیے بننے لگے کمان جیسے ابرو، نانا سے مہکتے ہوئے بال، کٹے ہوئے اور پرم کٹے ہوئے گیسو۔ نوجوان
 کے شوقین نظارہ کو دعوت عام تھی۔ مگر نہ جانے کیوں سردیہ کو سامنے مسوری میں صورت پسند آئی تو صرف ایک ”بلا“ جس سے پہلی بار اس کی
 ملاقات ”بیک مینز“ ہوئی میں ایک شام کو ”ٹی ڈانس“ کے دوران یہاں ہوئی تھی۔

”ہیلو سردیہ!“ اس کے ہنسنے کے دوست مقرر نے اسے اشارہ کر کے اپنی میز کی طرف بلاتے ہوئے کہا تھا ”یہاں، جو یا
 اور ان سے ملو۔ آپ ہیں مس بلڈ ہیز جی۔ میں نیچلی مگر لکھنؤ میں پلی ہیں“

سردیہ نے دیکھا کہ بیچاؤ کے گوسے چوبے پر دو بڑی بڑی لکھنوی ہیں۔ جن کی گرائی میں کوئی غم ڈوبا ہوا ہے اور ان کے گرد سیاہ
 صلیقے ہیں اور لمبی، نیکی، نرسلی پلک ہیں جو راتوں کو جاگے ہوئے پوتوں کے بوجھ سے تھک جا رہی ہیں۔
 وہ مقرر کے اصرار کا انتظار کرتے بغیر ہی بلا کے قریب کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور سردیہ اس کے لیے اس کچھ خبر سے ہونے والے دم
 میں بلا کے سوا اور کوئی نہ تھا۔

بارہ برس کے بعد بھی ان کی وہ سب سے پہلی لگن آج تک اس کی یاد میں تازہ تھی۔

”تو آپ آئی، ٹی ٹالچ میں ٹپسٹی ہوں گی؟“

”جی!“

”ہی، اسے میں؟“

”جی!“

”اگلے سال نیشنل کا امتحان دیں گی؟“

”جی!“

دو برس تک انگریز عورتوں کی کرخت مردانہ آوازوں کو سننے اور دو ہفتے مسوری کے شدید رول میں گزارنے کے بعد کتنا سکون
 تھا بلا کی کم کوئی تھی۔ جیسے آندھی اور طوفان اور کڑواں چمک کے بعد بارش ختم گئی ہو اور گلاب کی پتیوں پر سے چند نغمہ نغمی نویدیں گھاس پھوس

چمک رہی ہوں کتنی ہندوستانیت تھی اس ”جی! میں کتنی ملائمت اور مٹھاس! کتنی معصومیت اور جیا!“
 ”آپ ڈانٹ کر رہیں؟“
 ”جی نہیں“

ان کے دوست ناچنے والوں کی جڑ میں کھو گئے تھے اور اب وہ دونوں اپنی نیز بڑا کیلے تھے۔ سرجی نے سوچا آخر کار میری تلاش اُج ختم ہو گئی۔ بلا سے بہتر بوی نغمے نہیں مل سکتی۔ وہ جیسے بے مگر شرف سنی نہیں جو ایک جوں سے دوسرے پھول پر جھکتی پھیرے۔ پڑھی لکھی ہے مگر جو درائے اور زبان دراز نہیں، کھاتے پیتے گھرانے کی معلوم ہوتی ہے۔ مگر اتنی امیر بھی نہیں کہ ایک آئی، سی، ایس کی درخواست ٹھکرا دے۔ اس سے شادی کر کے انسان ذاتی سکھ اور سکون کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔

اور اس نے کہا ”تو آپ کے پتا.....“

”وہ کھنڈ میں رہتے ہیں۔ آرٹ سکول میں پڑھاتے ہیں۔“

”اوہ! آپ آرٹسٹ ہینر جی کی بیٹی ہیں۔ ان کی تصویروں کی فائش تو ہمارے پتہ میں بھی ہو چکی ہے“ اور پھر اس نے صفائی سے جھوٹ بولا ”مجھے ان کی تصویریں بہت پسند آتی تھیں“ حالانکہ اس وقت اس نے سوچا تھا کہ درجائے ان میٹر بھی میٹر کی کیوں اور نیلے پیلے رنگ کے جھبوں میں کیا دھڑا رہے۔ جو لوگ ان کی اتنی تعریف کرتے ہیں۔ گرامی شے اسے ان تصویروں میں سے ایک خاص تصویر یاد آئی۔ ایک گیارہ بارہ سالہ شرف و شہر پر بھی کی تصویر جو جہاں کھلے ہوئے پانی کے رنگین بیلبے بنا کر اڑ رہی تھی۔ تصویر کا نام تھا ”طبیلے“
 ”وہ تصویر طبیلے، آپ کی بی بی تھی نا؟“

”جی!“

”اس میں آپ بہت شہر پر معلوم ہوتی تھیں۔ اب تو آپ کتنی میر میں ہو گئی ہیں!“

صرف اس بار اس نے ”جی“ کہہ کر جواب نہیں دیا۔ ایک عجیب سی، اٹھکی ہوئی، بھٹی ہوئی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی ”طبیلے

کی زندگی ہی کتنی ہوتی ہے۔ ہوا کا ایک ہلکا سا جھڈ نکلا آیا اور طبیلہ ٹوٹ گیا۔ بس ختم!“

جب تک وہ مسوی رہا اس کا بیشتر وقت بھلا کی رفاقت میں گذرا۔ اس کے چنڈال چوٹی تک چڑھے، کیمڈر بیک روڈ کے گرد گھومے،

کیمپٹی ٹال پلنگ کے لیے گئے۔

اس تمام عرصے میں بلا سے مشکل سے ایک دیر تہی مجھ سے اس سے کہے ہوں گے۔ سرجی کی باتوں کو وہ بڑی خاموشی اور توجہ سے

سنی۔ جب تک وہ براہ راست سوال نہ کرتا۔ وہ کسی بات پر بھی اپنی رائے کا اظہار نہ کرتی۔ مگر سرجی کو بھلا کی کم کوئی سے کوئی شکایت

نہ تھی۔ باتوں کی باتوں جو دنیا کے ہر مسئلے پر رائے رکھتی ہیں۔ اور اس کا اظہار ضروری سمجھتی ہیں اسے بالکل پسند نہیں۔ اسے تو یہی اچھا لگتا

تھا کہ وہ بولتا جائے اور بلا بیٹھی سنتی دے ”جی! جی!“ کوئی رہے۔ جب سرجی کو بعض ہو گیا کہ وہ بھلا کو بہت پسند کرنے لگا ہے

بلکہ شاید محبت بھی کرنے لگا ہے۔ تو ایک دن تنہائی میں موندھ پا کر اس نے ”پر پور“ کہہ ہی ڈالا۔

”بلا! تمہیں معلوم ہے تاکہ میں تمہیں بہت پسند کرتا ہوں“

”جی!“

”تمہارے بغیر میں منیر رہ سکتا۔ کیا تم مجھ سے شادی کر دو گی؟“

”جی ہاں“ اس ”جی“ میں سوال ہی تھا اور جواب بھی۔

غزوری دیر کی خاموشی کے بعد وہ بولی ”دیکھئے میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں اس لیے میں آپ کو دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتی۔ میں آپ سے عزت نہیں کرتی۔“

”کیا تم کسی اور سے محبت کرتی ہو؟“

”ملائی نہ پائی سے“ جی نہیں“ شادی تو اندر ہی نکلتا تھا مگر اس بار اس نے کہا ”جی نہیں“ اور پھر ایک پل کی خاموشی کے بعد میں گہری ٹھنڈی سانس کا شائبہ تھا، کہا ”ایسا کوئی نہیں ہے۔“

سید حیر کو اطمینان ہو گیا۔ اس نے کہا ”تو پھر کوئی حرج نہیں۔ میری تمہیں اپنے سے محبت کرنا سکھا دوں گا۔“ اس دن جولائی ۱۹۶۰ء کی چودہ تاریخ تھی۔

تو کس نے ڈاک کا بلنہ دنا شے کی نیز پر سید حیر کے سامنے ڈاک رکھا۔ سب سے پہلا یہی خط جو اس نے کھولنے کے لیے اٹھایا تو اس کی نظر ڈاک خانے کی سر پرچی پر سناٹا لگنے۔ چودہ جولائی ۱۹۶۰ء، دقتاً سید حیر کی یاد میں پورے بارہ برس پہلے کا وہ دن چونک کر بیدار ہو گیا۔

لقد نے کچھ عرصے سے چپک کر رہے ہوئے سید حیر نے بلال سے پوچھا ”وجہ تھی جو آج کیا تاریخ بنتی ہے؟“

”جی ہاں“ اور اس کی نظر سسٹم کی دیوار پر لگے ہوئے کیلنڈر کی طرف گئی۔

”بارہ برس پہلے کا وہ دن یا اسے سواری میں۔ جب میرے تمہیں پر دے پوچھا تھا؟“

”جی ہاں“ مگر اس ”جی“ میں صرت اذاعت تھا۔ کوئی گرجو شے نہ تھی۔ سید حیر مارے سال پہلے کی جس رات کو کریدنا چاہتا تھا وہ بالکل ٹھنڈی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس میں کبھی بھی کوئی چنگاری نہ تھی۔

مگر سید حیر نے بلال کے چہرے پر ایک رنگ جاتے اور دوسرا آتے نہیں دیکھا۔ وہ خط کھول کر پڑھ رہا تھا جو اس کے کارپ کے پرانے اور بے تکلف دوست مانتے کے پاس سے آیا تھا۔ جواب پڑھنے میں دکھات کر تا تھا۔ خطا پر لغو فرستے ہی سب حیر سکرایا۔ کیونکہ مانتے کے لکھا تھا ”یار تو کتنے خوش قسمت ہو۔ بلال جیسے بیوی پائی ہے۔ جیتا جیتا عاقلین دو کہ اس دن بیک منبر میں تمہاری ملاقات اس سے کرانی۔ مگر اس دنیا میں کون کسی کا احسان ماخذا ہے۔“

”شمن تم نے، مانتے نے کیا لکھا ہے؟“

”جی ہاں“

سید حیر نے، بلال کے بارے میں جو جملے مانتے نے لکھے تھے وہ پڑھ کر سنائے اور پھر دوسرے خطوں کو کھول کر پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ اور اس نے یہ نہیں دیکھا کہ مانتے کے دو مستند مذاق کو شمن کی بلال کی آنکھوں میں کوئی ہچک پیدا نہیں ہوئی۔ صرت ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ کا خم پیدا ہوا اور پھر بیکامی غائب ہو گیا۔

دوسرا خط جو سید حیر نے کھولا وہ کتب کا بل تھا۔ وہ اس نے بلال کی طرف بڑھا دیا۔ کیونکہ بلال کی ادائیگی دی ہوئی تھی۔ تیسرا خط

بادل ہٹ جاتے ہیں اور برسات کی غم آلود دھوپ زمین پر پھیل جاتی ہے۔ اسی طرح ایک دھبی، مچلی، نرم سکا ہٹ اس کے چہرے پر کھل گئی۔
 ”مائیل؟“ اس نے بڑی ملاطفت سے نام دہرایا۔..... جیسے ماں بچے کا نام کہتی ہے، جیسے پیسوی ملگیاں کا نام کہتا ہے۔
 جیسے شاعر اپنا محبوب شعر لکھتا ہے..... اور اس کی آنکھیں ایک نئی روشنی سے چمک اٹھیں..... وہ روشنی دوبارہ برس تک سدھیرنے
 کی بجائی بی بی کی آنکھوں میں نہیں دیکھی تھی.....

”ہاں! ہاں! ایس۔ کوئن ہے وہ؟“ بلڈ کی آنکھوں میں اس نئی روشنی کو دیکھ کر سدھیر اپنے سے باہر پورہ تھا۔
 مگر بلڈ کسی دوسری ہی دنیا میں تھی۔ اس کی آنکھیں دور۔۔۔ بہت دور..... نہ جانے کیا دیکھ رہی تھیں۔ کوئی بہت خوبصورت
 منظر؟ کوئی دلکش یاد؟ امید کی کوئی کرن؟

”وہ سب کچھ ہے“..... اس کے مسکراتے ہونٹوں نے سدھیر سے نہیں بلکہ خود سے رگوں کی..... یہ ان ہونٹوں کی مسکراہٹ
 بگھڑ گئی۔ اور ان کے غم میں ایک کڑواہٹ اُبھر آئی۔ ”ادب وہ کچھ بھی نہیں ہے.....“ پھر کسی نامعلوم طرے کے بوجھ سے، اس کی گردن جھک گئی۔
 ”پہیلیاں سنت بوجھاؤ سدھیر جیلا۔ اس کا جی بچتا تھا کہ میز کراٹ دے۔ تمام جیبی کے ترنوں کو چنانچہ چور کر دے۔ بجائے دان
 کو اٹھا کر بلڈ کے سر پر سے مارے۔“ سچ سچ بتاؤ۔ کیا تم اس سے محبت کرتی ہو؟“

”جھکی ہوئی گردن پھر اٹھ گئی۔ آنکھوں کے ڈبڈباتے ہوئے آنسوؤں میں سے پھر وہ عجیب و غریب غنائیٹھنے لگی۔ جیسے اور بے رنگ
 انداز میں صرف ”جی“ کہنے والی بلائے غریب انداز سے سراخا کر سدھیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہ سبھی ہاں۔ آپ کا خیال صحیح ہے۔
 اور اس سے سدھیر کی دنیا تباہ و بالا ہو گئی۔ اسے ایسا لگا کہ بلائے اس کی عزت پر، اس کی آئی۔ سی۔ ایس کی شانیں۔۔۔ سنی مراد کی
 پرہیزگار کے لیے کالک پوت دی ہے۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ بلائے اسے ایک ایسی غلیظ کالی دی ہے جو عمر بھر اس کے ہاؤس میں
 کو بجتی رہے گی۔ اس وقت تعلیم اور تمدن، تہذیب اور اخلاق کے سب جھٹھے اس پر سے اتر گئے۔ اب وہ لندن کا بڑا بڑا بیڑ نہیں تھا۔
 آئی۔ سی۔ ایس ایسوسی ایشن کا بونے والا سیکریٹری نہیں تھا۔ کلب کا ممتاز ممبر نہیں تھا۔ نرائن گنج ضلع کا ڈپٹی کمشنر نہیں تھا جس کی صفی میں ایک لاکھ
 سے زائد انسانوں کی قسمت تھی۔ اس وقت وہ صرف ایک ننکا دشتی تھا۔ غصہ کے جوش میں پھرا ہوا ایک مرد جس کی صورت نے اسے دھوکا دیا تھا۔

دشمنی جیلا یا ”نکل جھاڑ اس گھوسے، اسی وقت، اسی دم“
 بلائے کے چہرے پر نہرے گھسے کے آثار پیدا ہوئے نہرے گھسے۔ وہ اب بھی کسی دوسری ہی دنیا میں تھی۔ اس نے سدھیر کی چیخ کو ایسے سنا
 جیسے بہت دور سے کوئی دھیمی آواز آئی ہو..... اور ایسا یاد پھر اس کے ہونٹ ایک معصوم سی مسکراہٹ سے کھل گئے..... جیسے کوہٹے
 ہوئے مسافر کو بڑی تلاش کے بعد راستہ مل جائے۔ جیسے وہ مدت سے بارہ برس سے۔۔۔ اسی گھر کی کا انتظار کر رہی تھی اور آخر کار وہ
 مہالک ساعت آن ہی پہنچی ہو۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف ایک نظر اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ اس نظر میں شکایت نہیں تھی۔ شکرہ نہیں تھا، رنج تھا،
 معافی تھی، جیسے اس کی نگاہیں کہہ رہی ہوں۔ ”اس پر تمہارا قصور نہیں۔ تم ان باتوں کو نہیں سمجھو گے“ پھر وہ اپنے سیدر دم میں گئی اور وہاں سے
 اپنی چھوٹی پیچ کو گود میں لے کر بارہ اندے جس سے ہوتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اس کے قدموں کی آواز دور ہوئی گئی۔ یہاں تک کہ باہر سڑک کے شریں
 ہلکنے کے لیے کھو گئی۔

مست!

اختر اول نوی

”اللہ! اودھان لاوے میں ہم اٹھائی باغیچے پر ان کا چٹائی دھو کے پھاریں!“

اس نے اپنے دوڑوں ہاتھ رکھے اور ہنستا ہے کہ ”یہ سارا لڑکوں کی ہمراز عورتوں سے بہا۔“ زیادہ خوشی کی کئی کئی دفعہ وہ جھپٹتی

پوچھتا رہی تو اس کا چہرہ اٹھ کھڑا تھا۔ اس کے ”سیان“ میں جیسو سے۔ ہمارے خوشی میں ہی کیا بھگنا۔ غار دار لڑکی بھی تو جی تھی۔

[illegible]

نور لوہائی بنی ہوئی تھی۔ اس کے پس منظر پر دو لوہے کے بنا جوڑی آٹھوں کے سامنے اس کے سر پہلے دو اسے شوق کی تصویر پر جاتی تھی وہ پہلے بیوی بڑا ہفتی تھی۔ سات سات کے بنا جوڑی گنبد میں آئی تھی۔ وہ دو ٹول پر دوڑیں برتی، خدی مائیں ہوئی۔ اس کے قریب میں ایک کی گئی گئی جاتی وہ تھیں جتنی۔ نہ تھیں اور نہ اسے آباد پہلوں کی گرمی سوچ سوچ کر وہ انکار دل پر ہوئی رہتی تھی۔

زینب اور حاتمہ سے دو عزیز بھائی زینب کی بیوی تھیں۔ ان کی بیویوں کی گواہیوں کی بنیاد پر ان کے گھر میں چلتے پھرتے مردوں کو سزا دی گئی۔ عورتوں کی گواہیوں میں مبتلا کرنا عظیم گنہگار ہے۔ عورت کی شہادت کو شہادت نہیں سمجھنا۔ کس کی کس کی تشکیلی دیکھ کر ہوا کرتی ہے۔

• ایک گئی ہے! عاتقہ یوں لیتی —

ادھر گاؤں کی دوسری عورتیں فقہہ اُستیں۔

’پس وے ہے!‘ چونچا کرے ہے! : نکل جائی!

”بستی کا نام تمہارا دے لی؟“ باپ دادا کا نام ادا پنجاہ دے لی! —

مرد و کورتی کو کیا کرتی۔ انھوں نے پہلے ایک عورت اس کے دل کی جتان سے اندر تھی جو کئی عرصے سے ادیب انھوں نے پہلے جتان کی دکان سے ایک کورتی کو دے دیا۔ عورت بیوی اچھی تھی۔ بھر دکان میں اس کے شعلے سے لپک اٹھتے تھے۔

تا جو ہنسی، گیت لاتی، ہنسی مذاق لاتی، فحش گالیاں بجاتی، روتی اور کاتی اور انکو کوڑے لگتی یا اسے دو تہرہ دیدہ کرتی۔ کوڑے منوں تھی۔ کوڑے اس کے بے درد و شوہر کی علامت تھی جو اسے ہر وقت سزا جھوڑا لیا تھا۔ یوں بھری جراتی میں بنانا بھی بڑا خطرہ ہے۔! نہ جانے اسے کیا ہو گیا تھا؟ یہ کس اندھیرے سے جڑت جاگ اٹھا تھا۔ ناجائز کام میں کچھ نہ کرتا تھا۔ اس نے تن بدن میں ایک نہ لڑ سا کیوں آگیا تھا، اہانک، اچانک طور پر دھرتی اور عورت اور عورت اور دھرتی اور عورت میں محبت رہی تھی، چٹک دی تھی، اندازاً ایک شعلہ لگی رہے تھے۔ ناگنا چین پھیل رہا تھا، اور اس میں آتشیں پس دس رہا تھا۔ دھرتی ناگ کے پس پر دھری ہے اور دھرتی کی لکھ سے عورت جہاز لڑ پکڑی ہے۔ لکھ کے اوپر لکھ رہا جو اس کے اندر عورت چھو رہی تھی۔ تورا کی ہنسنکی اور ہنسنکی کی عورت کے ہزار ناٹھ اناجو کے ہزار ناٹھ ملوں دھرتی کی گت کے لیے اٹھ رہے تھے۔ اور چارہا بن کر آکر جو اسے ہزار کی فریاد تھی اس نے جیسے پرواہ نہیں کی۔ وہ دن دن خبردار رات لگے لگے جھوٹے سرکار کی تحریر میں رہتی اور ہانے بنا بنا کر ڈیوڑھی پہن رہا جاتا تھا اور باہر جھانکتی رہتی، جتنی جی سے درشن کے لیے۔

فحش جی گاؤں میں سننے سننے آئے تھے۔ جھوٹے سرکار کے دربار میں بندو سے تھے اور بھی دم۔ بھٹے، ان کو خاندانی روایاں ہیں بہت افراط میں۔ فحش جی کے ایک بھائی نے اس سے قبل گاؤں میں بومیر میٹک کی پکٹیں بڑھائی تھیں اور سننے سننے بہتہ خیر کی پودہ ایک بانڈی سے جو ان سے سو میں ڈی تھی، وابستہ ہو گئے تھے۔ فحش جی پر بھی مکتی میٹکوں کی نظر پڑی تھیں۔ یہیں تاہو کو تو مکتی جی سے زبرد کی تھی، عالم فحش میں جبر و دل کی تھی۔ اب وہ لکھی لکھی تاک تھا تاک نہیں لکھی تھی۔ فحش مذاق سے بھی بچتی تھی۔ وہ ہم نہ مروتوں سے اپنے دل کی بات کہتی۔

اب بولتا، دور دورہ لکھیں، اب دل لکھے بنے کی فحش جی پر یہ لکھ کر کھینچیں، بڑے بچھے میں فحش جی؟

الکھان، اچھے ہیں، اچھو بندہ ہے!

زیر تن بول اٹھتی۔

ناجون بہتہ بڑے، اچھے لگے ہیں۔ جی چاہے ہے کی ان کی مورتیاں دم دیکھتے رہیں۔

تا جو جواب دیتی۔

اور جب والا اچھے لگی ہیں امرتھنی فرمائی تے آگے پیچھے تو کرتے رہے ہیں، لکھ جھوڑا۔!

ماتریتی ہوئی یوں کہتی جیسے فحش جی کی اداگی اس کی دل پسند ہر گزہ جس کے لیے کیوں خود دیکھے کیوں نہ اس سے دور رہے تھے بہت بڑے اور فحش جی کیلئے خاصے بنے تھے، لکھی داؤں سے لکھی سی کی نہتیں فحش جی کے پاس نہیں، یہیں انہوں نے لکھی یا۔ کبھی نہیں کیا کرتا تھا۔ جہاں نہت کے کوڑے ادا جاتی رہی، تا جو لاکتیں اس کے وجود میں آتا تھا۔ پھوٹا ہوا تھا، آدھ فحش جی معنی بڑی نکال لکھی پس پادتی رہی اور لکھیں پودہ زرد دھونے کی زبنت آ رہی۔ کوڑے کھانے پینے کی چیزیں فحش جی کو بھجوائی جاتی ہیں اور کوڑے کو پاپ دھڑھ میںیں ہستے ہستے کوڑے اس نے جانے اور بھی بھجوا دیں وہی دل لکھی تھی۔ اس کی بادی انھوں کی سیاہ پتیاں مسکرا سکتی تھیں۔ فحش جی اسے دیکھ کر ہنسنے اور اس کی ہنسی میں کبھی اس کو دھنکی کے انداز سے چھوٹے چھوٹے دیہے لگتے جاتے جیسے کوڑے امر دو کے رختوں میں بے رحم کے امر دو ڈھونڈنے کے لیے اپنی گردنیں اڑاتے دیدے چھاڑ تھا لکھ دیکھتے ہیں اور کوڑے کو نہیں ہنسنے پاتے۔ کوڑے کو کبھی بھری بھری شاعری اب گدائے والی ہی تھیں۔ فحش جی کا پس پاتا کوڑے کو اسے اپنی نہت پسند کر دیا۔ یہاں سے اس کی نہت پسند کر دیا۔ یہاں سے اس کی نہت پسند کر دیا۔ یہاں سے اس کی نہت پسند کر دیا۔

کرتے۔ فنانہ جو ان کی ٹیگور کے دو پہے تھی۔ ۲۰ عرض منشی جی نے دوسرے قصبے میں ایک تیرہ سالہ لڑکی سے نکاح کر لیا۔ یہ خبر آتی ہوئی تاجو کے گھر پہنچی تو منشی جی اپنی تدریسیت کٹا نہیں چاہتے تھے۔ وہ خود کھلے کا ہجر کر لیا ہے۔ دقتہ دفتر سلسلے تاجو کے سبکدستی حقیقت معلوم ہوئی۔ اور انہیں تین سو روپے کی فسخی جی اپنے بھائی کی پیروی کر کے اس گاؤں کے ہونے والے نہیں لیکن تاجو کو اس بات کو سننے والی تھی وہ فاسق جی کو کیا ملتی تھی۔ اپنے گھر پر ملتی تھی اپنی بھیماسا ملتی تھی۔

سچ بھی بڑی بڑی چیز ہے تخی۔ درنیکلی۔ مذکورہ گئے والی، بدو سے چاک کونے والی، سچ خود بھی لڑکا اور دوسرے کو بھی نکال دینے کا ہوتا تھا۔ تاجو کی فسخی میں سچ کھس پڑا۔ گروس کے دریا کے گہرے اذیادے میں جہاں جی موت میٹھی ہوئی تھی اس کے دیر سے رکھول رکھا دونوں میں تھے جہاں وہاں غزوہ ہوئی اور تاجو کو میرا کے دور سے بڑھنے لگے۔ وہ دوسرے کے وقت بڑی سبے چائی سے متھی جی سے بیاہ رہا تھی اور وصل محبوب کے باب میں شادی کی کھالی آدھی تھی۔ اور اس خواب و خیال کا اثر یہ ہوا کہ تاجو کے کھالے ایک روز اس کی خوب گندہ کی کر دی۔ اور دھنا اس کی گندہ کی تھی۔ طرہ روشنی جی کی کھلی بھری غفلت میں انار کو دھونے اور کھانے پر مہر دی۔ لیلیاں بھی گئی اور سوختی رہیں۔ دنا جو کا بھر کٹش خدایا۔ عرض شک آ رہا جو کہ کھانی نے یہ بھائی "نعم کے آدمی سے تاجو کا بیاہ کر دیا۔ تاجو دوسرے گاؤں چلی گئی۔ ساتی جس کے جدوہ یہی کو کھ میں چلے کر دہیں آئی اور کھیلے ہیں ہی بچہ پیدا ہوا۔

آن ہی روز منشی جی ایسا ہی تھی جی کے گھر چلے گئے سب دایں برے تو بڑے شاداب تھے۔ گاؤں نے تاجو کا بیاہ کر دیا تھا چاکے آئے ہیں۔ لیکن اب بھی منشی جی اپنے منہ سے کچھ نہ چہرے تھے۔ اب وہ جلد جلد منشی کے گھر چلے گئے۔ لیکن کب تک جھوٹے رہا کہ انہیں روک تو شروع کی۔ ساتی بڑے بعد وہ اپنی نئی زبانی کو ساتھ لے آئے اور جی سے فریب ہی ایک جھوٹے سے اتفاق مکان نوادست کر اس میں اپنی بیوی کے ساتھ رہے۔

لوگو جی میں کام کوئی تھی اور کام کرنے پر مجبور تھی۔ یہ وہاں کی شادی کے بعد بھی گھر کی حالت نہیں بدلتی۔ ان کے خروں پر پہلے بھی بڑی تھی اور بعد بھی بڑی رہی۔ اب یہ نوکر ماں کو کھسکیاں ملے۔ جو خود ہی کبھی کبھی سسرال ہی آ رہا تھا اور کھانے والا ایک منہ اور پیدا ہو گیا۔ جب تک وہ وہاں رہے تو خیریت ہے۔ روز کو کو کے منہ کا تھوچھن مانے گا۔ کو کو کی ماں، تاجو نے اسے منہ کا جی میں لکھا دیا۔ اوپر لٹا کے ہے۔ گراس اوپر لٹا کی فہرست لکھا ہی تھی۔ کو کو بڑے صبر سے رہا لے کر رہی۔ کو کو ہی تھا کہ۔

کو کو فرصت کے اوقات منشی جی کی بیوی نے کام کاج بھی کر لیا تھی۔ ان کے کام بڑی چاہ سے کرتی تھی۔ وہ انہیں اپنی سمجھل سمجھنے لگتی تھی۔ نئی دین کا بھی بھی کو کو سے مل جاتا تھا۔ وہ کو کو کو چھپے پونے کہتے دے دیا کرتی تھیں اور منشی جی اس سے مذاق کر لیا کرتے تھے۔ دونوں باہم دل کٹ تھیں۔

جاڑے کا موسم آیا۔ کو کو لڑکی رہی۔ دن تو خیر۔ رات بڑی غلام ہوتی تھی۔ رات کھنے تک وہ جی میں لکھتے جاڑے کی برہمیاں سمجھتی ہوئی کام کرتی رہتی تھی۔ چپ چاپ ایک دن وہ منشی جی کے گھر گئی۔ وہ جی سے رات کو دایں جو۔ ہی تھی جی میں آتی ذر منشی جی کے ماں جھانک لیں۔ دونوں ماں بیوی ایک لحاظ میں غفلت بھی بیٹھے تھیں کہ رہے تھے۔ کو کو کو منشی کی چرچٹ پڑھ لیں اور خٹک کر نرم، حسرت اور افلاس کا مجسمہ بنی ٹھہری ہو گئی۔

آؤ کو کو کو کہتا ہے گئی، اندر آجا، منشی جی کی بیوی نے پہلی ٹھیک کونے ہوئے کہا۔

میترے جاڑ انیس۔ ٹپے ہے لکڑا؟ جوان ہو رہی ہے؟
 فشی جی نے اس کے جواب سے پوچھنے اور ان کے لئے اور مھاگ سے بھی پھینچا اور مٹی اور مٹی سے آٹ پٹ
 کرتے ہوئے کہا۔

کو کو کی لائی کالی تیلیاں لائین کی پہلی ہیں روشنی میں ناچنے لگیں۔ وہ خاموش رہی۔ اندر آگئی۔ ٹوگول گولیاں تھکرتی رہیں۔ اُس نے اپنے ہنسنے پر کڑوں کو ذرا سیٹھ لیا۔

”یکسو! کوکو کیا کپ رہی ہے! کوکو کو سرری سے نیلی کپ رہی تھی۔ وہ ابنا نے پیچیدہ دندہ جذبات سے کپ لگی تھی۔ کون جانتے اس کی حیات کے کتنے روز اڑ گئے تھے! تم اسے اپنا مارینے والا پناہ گم شلوک کیوں نہیں دے دیتیں؟“ منشی جی نے بیوی سے کہا۔

سے لے کر گوکہ بہمن نے ہر اُکھاتے ہوئے اُچھا۔
 کوکر ناموش کھڑی رہی۔ اس کی گہری سیاہ تینوں چمک اُٹھیں، جیسے اُردھ گئے ہوئے کوئے کوئے سے چنگاری اُبل پڑی

-5-

مٹی جی کی بیوی نے ہمیں کے پیچے سے مار دینے کا شوق نکال کر کو کو دیا۔ اور مٹی جی نے ہمارے اسے وہیں شلوک پھینکے پر محبوب رکھا۔ تو گھر سے اپنے بچے ہوئے کہتے کہ امیر واصل کی طرح شلوک ہیں۔ وہیں جی کا شلوک اسے آٹ گیا۔

[illegible]

”مشی جی کی دہن دیس میں : کو کو نے جواب دیا۔

ناتوا اپنے بچے کو دودھ پا رہی تھی۔ گود کے اندر چڑچڑ کی آواز ابھل دک گئی۔ ناتوا اٹھ کر شیرنی کی طرح لوگوں پر بھونپی۔ اور ان کی آن میں اس نے لم مار دینے کا شوکر چھین لیا اور چھین کر خروپس لیا۔ وہ شوکر اسے آفت میں دبا تھا۔ سانس روک روک کر اس نے اٹایا۔ بہت مشکل سے دو ویلے میزن کو کس لکڑیاب دھب کر سیپ کے میزن کے دریا کی صفحہ تن تن گئے کئی تو میں بنا ہی گئیں۔ ان علی کی تو میں کی دھیر سے بھی بھرے بھرے سینہ دوڑا اور دھیر کے حلقوں سے جھانکتے دے دے دے دودھ کی بڑا اور شوکر کے دودھ سے بے دم دھبے لگئے

تا جو نہ یہ حرکت سوچ سمجھ کر نہیں کی۔ یہ سب کچھ بڑی بے شمار سی سے ہوا، جو ہی بے دردی سے، ناجائز پر ایک حق سوار ہو گیا اور نہ اس کو کو حیرت زدہ رہ گئی اور اپنے انسانی کڑواہٹ پر ہی مسودہ رہی۔

دوسرے ہی دند گاؤں کی عورتوں میں شلو کے کی لہانی فٹنی جی اودان کی بھری کی دہائی پھیل گئی۔ ناچہر وقت اس شلو کے کو پہنہ رہی تھی۔ کرکے اس کی تصدیق کوائی گئی اود طعنے طعنے کا بازدارم ہوا۔

"چھی! کوکو سے چھین کر گوم شو کو کہیں بس۔ بے شرم بدھی عورت! حاکم نے فشر لگا یا۔"
 "کیسی غلام لگی ہے چروہ صدی میں! ڈرتا سنے صملا ز شان سے کہا۔
 فشی جی کی جیڑی جن جل کر جا جو پوار کو تیں۔ عورت بھی کتنی سمجھ دار ہوتی ہے! وہ تہ کی باتیں جان لیتی ہے۔ وہ گھر سے
 بھید پا جاتی ہے۔

فشی جی اس جلا بے سے اور اس شو کے کے تصور سے لطف لیتے رہے جس کے ہاتھوں میں تین جوڑے بیسنے
 منوعم ہوئے۔

"ہائے کجب! تیری منا کلا مر گئی تھی نا جو؟ زین نے پوچھا۔

"توں سب بھی تو مدد کرے۔ کوکان بیٹے جانے! نہ پرچہ زبات! اسے ہم تو اپنا دودھ گوم رکھے لا شو کو کیا رہے۔ ہنسنے
 بھر سے لڑاکو دست پر دست۔ ٹھنڈا ٹھنڈا دودھ پیتے پیتے منٹ منٹ پریتے۔ ہائے سنے! ہائے کا دل! ہم صد کے جا ہیں اپنے
 دونوں لال پر سے آ جا جس نے جواب دیا؟

جل پری

علی عباس حسینی

— اور اس نے میرے پاؤں بانے کے لیے ہاتھ بٹھالیا۔

میں ڈاک بنگلے میں بالکل اکیلا تھا۔ میرا اردلی ہماری قریب کے ایک گاؤں میں اپنے ایک عزیز کے ہاں ٹھہر گیا تھا۔ میری خالہ ماں جو چرکیداری کے فرائض بھی ادا کرتا تھا، مجھے کھانا کھلا کر کچھ دیر کے لیے نصب چلا گیا تھا۔ تھوڑا سا کھانے سے تھک گیا تھا۔ آگے بیل دوڑھا۔ انگریز کھانے آدمیوں میں مل گیا کہ یہ سنا پسند نہ کرتا تھا۔ مجھ کو نہ لے لکھ کر، اچھینے اسی لیے رہ گیا تھا۔ باہری سے خاصہ پریشان تھا۔ مجھے کسے تین طرف ارب اور ایکڑ کے کھیت تھے جو جتنی طرف نہ تھی۔ نہر کے اس پار ایک فلائنگ کے خاصے پر دھماک اور جھٹکا تھا۔ یہاں نوے دن گھیر دوں، لکڑا جگن اور پیر پون کے کھیت تھے۔ نہ بیج میں نہ ہوتی تو شاید یہ بھڑاں کا زمین بن جاتا۔

رات بچپن سے نکل کر جوانی میں قدیم رہ رہی تھی۔ دھندلے کی چلبلا بھنوں پر گھری تارکی کی مماثلت غالب آتی جا رہی تھی۔ جگے پر ایک سنا سنا سا چھایا تھا۔ ارد گرد کی فضا پر بھی وہ سکوت طاری تھا جو دس بجے شب کے قریب دیراتوں جھنگلوں اور غیر آباد مقامات کو جیسا ناک بنا دیتا ہے۔ اس سناٹے اور خاموشی کے پردے کو بھی کبھی کلاہ جگلوں کی تھوڑا سا چھچھاک کر دیتی تھی۔ بالکل بھی کسی آؤ کی آواز۔

میں نوادار تھا۔ ضلع کی خصوصیات سے ملاوٹ میرے بے ماحول بن گیا تھا اور مقام بھی۔ نہر کے ماتحت، بھینر کی حنیفیت سے تیس میل کے دورے سے پسا تھا۔ یکے کے سوا ہی نے بچت اور نیم بچت، سرنگوں کے چنگلوں نے چڑچڑ کر دیا تھا۔ جہاں فی حق و سٹ کا تعاقب تھا کہ بستر پر بیٹھتے ہی سو جاؤں۔ لیکن یہ عجیب بات تھی کہ نیند کی دیوی آتی تو مزہ دگر خال خال، اور دل و دماغ میں اربا نہیں نہانے کی جگہ صرف پلکوں کو جھپکا دیتی تھی۔ میں اہل لید کا "سوتا جاگتا بارون الرشید" بن گیا تھا۔ جو رام چندری کی طرح رہ گیا کا دکھ سکھ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے گاؤں کو جیسے بدل بدل کر نظر آتا تھا۔ اور جس کی راتیں بہت چھٹی اور دن بہت بڑے ہوتے تھے۔ اور میرے دل میں بھی بارون الرشید کی طرح تھا۔ اس لیے کہ جس طرح وہ اپنے معمولی لہارے کے پیچھے کھڑے ہو کر تلوار دکھاتا تھا۔ اسی طرح میں نے بھی اپنی پیٹی سے دو تالی بند دق رکھا دھکیلی اسٹ اسٹائی کا خوف مسلسل لنگھنے پر مجبور کرتا تھا۔ میرے دل میں جاؤں گا ڈر تھا۔ اور دھکے بعض اصناف میں لکڑا جگلوں اور پیر پون نے ان دونوں آفت مچا رکھی تھی۔ نہ جاباے نکستی جا میں ان کی بدولت تلف ہو چکی تھیں۔ ایسے میں بسند دق پاس ہوتے ہر قے قریب نہ رکھنا بیوقوفی ہی تو ہوتی۔

میں نے بستر کے قریب چھٹی میز پر رکھے سوئے لمپ کی روشنی تیز کی اور اپنی کتابیں اٹھالیں۔ اس دورے میں تین کتابیں ساتھ

لایا تھا۔ پریم چند کی پریم پریس، سرسوت، دہلی، ایڈرس ایچ اور اناتول فرانس کی پنگوئن کیلنڈر س۔ ریت تاجی بار بار کی پڑھی ہوئی مقیم۔ لیکن مجھے پریم چند کی حوالت، غیرت، اہمیت، اثرات اور محبت کی کہانیاں بہت پسند تھیں۔ ان کے کردار بہت نئے تھے۔ ان سے میری بہت دوست ہوئی تھیں۔ ان سے طبیعتوں میں توازن واستقلال پیدا ہوتا تھا۔ وہ آج کل کی کہانیوں کی طرح بے نتیجہ نہیں تھے۔ اناتول فرانس کی ساری تصنیفوں میں مجھے اس کی تشکیل حوالہ دینا ضروری سمجھتا تھا۔ یہ شاہکار موجودہ تہذیب کے ارتقاء کی مکمل تاریخ ہے۔ محال ہی میں پریم پریس ڈیٹ ٹرو، میں نے جو بحث کے سنتے ہیں کلاکس کو مسخارفہا کہتے ہیں۔ اور جس طرح اکیلے ایک میر کے بحث کو سارے عالم کا بحث بنا دیتا ہے۔ اس کا ہذا اس کی نالے آخری ابواب میں بڑی خوبی سے موجود ہے۔ میں بابا داس سے ملے پوچھتا تھا۔ اور اس ادیب کی حریت، انڈیز میاں سوجی پر انکشت بدندان رہ جاتا تھا۔ ایڈرس ایچ میں ہیرو کا استثناء عجیب غریب ہے۔ وہ صرف دولت و ثروت کی جانب سے بے پروا ہے، بلکہ جن جنس کے معاملے میں بھی مستحق ہے۔ مجھ پر اگر بنائے کام لے کر اس نے شادی کر کے تھی ہے تو وہ خوش، اگر وہ دولت کے حرم میں کسی اور شے کی تلاش میں مرقع ہو جاتی ہے تو اسے کوئی شکایت نہیں۔ سزا یا تاجور اور بد معاشر اس کی بند رقی کے مستحق، اور راجانی کو بھی بارگاہ عورتیں اس کے تحفظ کی حقیدار۔ اگر ان میں سے کوئی اس کے احسان کا بدلہ نہ سہماں لذتوں کے ذریعے چکانا چاہتی ہے تو اسے معاوضہ کے قبل کرنے میں مدد نہیں۔ اگر خود جی اصرار کرنے کے بعد وعدہ فراموشی سے کام لیتی ہے تو وہ اس سے ناخوش نہیں جاتا۔

میں اب اس کی جگہ پر ہاتھ رکھے نام کے عجیب کردار پر اور اس کی انوکھی کیلینڈر پر غور کر رہا تھا جو اس نے سہ ماہی نامہ میں اشتہار کی ہے کہ وہ مفتا مجھے شاہ مظفر آبادی کا مشہور شعر یادو گیا :-

سُنی حرکاتِ رستیِ قدور میاں سے سُنی

نہ ابتداء کی خبر ہے، نہ انتہا معلوم

اور درواغ جسم و روح کے مابعد الطبیعیاتی مسائل میں الجھ کر یہ تہمیں "گوئی جی چیز ہے، گوشت، پوست کا مجموعہ یا کچھ اور، ہر روح شخص تبارت جمعی ہے یا اس نے الگ کوئی دوسری چیز، یا بعض حرارت ہے تو انسانی دماغ اس کے پیدا کرنے میں کامیاب کیوں نہیں ہوتا؟ اگر جسم سے علیحدہ کوئی شے ہے تو اسے فطرتی زندگی میں کون بند کر لے گا، کون نکال دیتا ہے؟ ہر یہ پیداؤش سے پہلے کہاں خلقی، مرنے کے بعد کہاں جاتی ہے؟ کیا روحانی کادیا صحیح ہے کہ درود و حزن کو بلا کر تھپے، ان سے گنتلک کر سکتے ہیں؟ — اور مجھے کچھ تعقوت کی باتیں یاد آئیں۔ کچھ یونینیت کی، کچھ مسیحی کی، کچھ سائنس کی۔ اور میں نے الجھ کر لب کی روشنی میں کہی، انھیں بند کیوں اور نیند لانے کے لیے شاد کاغذ اور دیر وارے لگاؤ۔

ع: نہ ابتداء کی خبر ہے نہ انتہا معلوم۔ — وقتاً فکر سے کہ دروازے سے ابک شخص نے جھانک کر بڑے بڑے الجھے الجھے باغی ملی کچھ بڑی دارھی اور دھنسی، جنسی جھپکی آنکھیں۔

میں نے ڈر کو دل میں چھپاتے ہوئے کہا: ”کون؟“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا وہ کہے میں جانا بابا جیسا کہ چہرہ، چھٹی قمیص، پیٹلایا بٹنارہ، ننگے پاؤں، سادے جسم اور کپڑوں پر گرد کی ایک ترجمی ہوئی، اس پر اس قدر لاغر کہ معلوم ہوتا تھا کہ کپڑوں کا دھانچا جسے یا کوئی مصری، عربی یا میراندلی نہیں سمجھنے کا قادر ہے پسینہ جھوٹے لگا میں نے بھی افسرانہ لب و لہجہ میں پوچھا:

”تو کون ہے، ہونا کیوں نہیں؟“

”پاؤ پیسے!“ وہ پہلی بار بولا۔

بلبلک نکلتے واسے میری چڑیں۔ اپنے ہی جیسے انسانوں کے سامنے دستِ مال پھیلانا انسانیت کی سخت ترین توہین ہے اور بے حیائی اور بے عزتی کی آخری حد۔

میں نے اسی لیے جو تک کر کہا۔ ”تو اندر کیوں گھسا آ رہا ہے؟ دروازے پر کھڑا ہو کر صدا لگا!“

اس کی آنکھوں کی جھلک اور بچی بڑھ گئی۔ جیسے لکھتے ہوئے کولہوں پر سے بھونک کر خاک اڑا دی گئی ہو، مگر وہ عاجزی سے بولا ”جی جے اتنے کا کام بھی تو کر لیتے۔“

نقد کی زبان پر کام کا لفظ۔ میں جو غصا سا ہو گیا۔

”کیسا کام؟“ میں نے گھبرا کر پوچھا۔

”جی پانچ پیسے کے عوض کام۔“ اس نے کہا۔

”یہاں کوئی کام نہیں ہے!“ میں نے تشریف دے کر جواب دیا۔

وہ اطمینان کے ساتھ تیرہ سوہی کی پچی کے پاس فرشتہ بھونک کر بولا ”جی آپ بہت تھک گئے ہوں گے۔ لائے ہیں آپ کے پاؤں وہ پاؤں۔ اور اس نے میرے پاؤں دبانے کے لیے اپنے سولہا ہاتھ بڑھائے۔“

میرے دماغ میں ایکوں چروں، ڈاکوؤں کی ساری کہانیاں نظم کی بدلتی تصویروں کی طرح جلدی جلدی ایک کے بعد ایک آتی چلی گئیں۔ میرے جلدی سے تانگیں سمیٹ لیں۔ اس کے چہرے پر وہ مسکراہٹ دوڑ گئی جو نہ تو وہ چہرے سے کھینچتے وقت بل کے چہرے پر دکھائی دیتی ہے۔ اس نے کہا ”ڈوبے نہیں با بوی، میں کوئی چور اچکا نہیں ہوں! میں — میں ایک والی ملک کا بھائی ہوں! اس کی آواز میں غور کی جھلک پیدا ہو گئی تھی۔

میں نے کہا ”تم!“ اور میں نے سائنہ ڈور سے ہنس پڑا۔ یہ صورت، یہ حالت، پانچ پیسے کا سواں پاؤں دبانے کی مزدوری اور والی ملک کا بھائی! مختلف جذبات کے دو عمل نے اس منہ کی ایک دیر پا قلعہ میں تبدیل کر دیا۔ دونوں طرف آنکھوں سے آنسو نکلے میرے ہاں ہنسی کی افراطی وجہ سے اور اس کے دل دھملائے جانے کے غم و فقر سے۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں پیسے جتنی تمنیں لہرائیں، بھڑوہ آگیتے خشک چہرے کی خاک و دھوٹے ہونے فرض ہو گئے۔ اس کی تکلیف کی شدت کے احساس نے میرے قہقہے کی آواز میں عین یکایک روک دی جس طرح ”جاو“ کا رخنے کا شور دھکی کا سپرچ دبانے سے دفعتاً رگ جاتا ہے۔ اور مجھے، جس طرح کا ایک جھکا دکھا عین تیرہ پیسے ہوئے موڑ میں اچانک بریک لگانے سے محسوس ہوتا ہے۔

میں نے کہا ”میرا مطلب نہیں کہ میں آپ کی بات پر شک کرتا ہوں۔“

اس نے استغیث سے آنسو پچھتے ہوئے کہا ”میں نہیں، آپ کی ہنسی بجا تھی۔ میری صورت شکل، میری حالت دیکھ کر شخص کو ہنسی آتی ہی ہے۔ کوئی مجھے دیوانہ نہ کہتا ہے، کوئی مجھ سے، لیکن میں نے آج تک کسی کو نہ تو یہ بتایا کہ میں کون ہوں، اور نہ کسی کو، پناہ نہ سنبالا۔ ایک عجیب داستان ہے۔“

میں نے اس کے لب و لہجہ اور انداز گفتگو سے محسوس کیا کہ وہ ایک پڑھا لکھا شریف نازدہ ضرور ہے۔ اور میں نے دل دی کرتے ہوئے

کہا "منیں نہیں، میں آپ کو چھوٹا نہیں سمجھتا۔ مگر اب مجھے اپنی کمائی سنائیے" اور میں مسہری پرانے گھر میں گیا۔
 اس نے اندھیکار کہا "میں یہاں سے کہا کہ میں ایک اداں ریاست کا بھائی ہوں۔ ریاست کا نام اگر نہ بتاؤں تو آپ برا مانیں گے۔
 ریاست بہت بڑی نہیں مگر اس کے خواب کو آپ سے حدود کے اندر بڑی سے بڑی مرزا دیتے کا حق ہے۔ اور اس کے اٹاشے پر اب بھی ریاست کا
 بڑے سے بڑا آدمی موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے اور جہنم سے چھوٹا وزیر اعظم کا عہدہ پاتا ہے۔ وہاں مرحوم نے ہم لوگوں کی تعلیم و تربیت
 پر لاکھوں روپے صرف کیے۔ ہم عربی، فارسی، انگریزی، فرنگی ہی نہ پڑھائے تھے بلکہ ہمیں نشانہ دیکھنا، موسیقی کرنا اور جھڑپا نہ فزین سکھانے
 گئے۔ بھائی صاحب کو اسپورٹس کا زیادہ شوق تھا اور مجھے مطالعہ کا۔ میری فرمائش پر اسٹیٹ لائبریری میں بڑا بڑا نئی کتابوں کا اضافہ
 کروا دیا۔ میری خاص پسند کا موضوع فلسفہ تھا۔ میں شروع ہی سے مابعد الطبیعیات کی باریکیوں میں الجھے میں ایک خاص لذت پانا تھا میرا محبوب
 توبین شغل یہ تھا کہ میں اپنے استادوں میں سے کسی ایک سے کسی فلسفیانہ موضوع پر بحث کرتا رہا ہوں یا پھر کسی شعری یا کسی نظم کی انوکھی تشریحیں
 کیا کروں۔ مجھے زیادہ شوق دانش، فلسفہ و ہر دور سے بھی کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ میں نے زندگی کی اور اس کا فلسفہ بڑے عرصے
 پڑھا تھا اور میں اپنی زندگی کو اسی سانچے میں ڈھالنا چاہتا تھا۔ میں نے اس نوجوان کی ہر حالت میں ہر طے کر لیا تھا کہ میں دوسرا نہ رہوں گا۔ وہ بون
 اٹھوں نے کچھ دنوں تو قافلہ کی زندگی بسر کی، میں وہ بھی نہ کروں گا۔ میں عیسائی کی طرح ہی پیدا ہوا۔ اسی لیے جب حضور نے میری شادی کی
 بہت جیت جیتے تو میں نے ان کے پاس کھانا بھجوا کر ان کی شادی کرنا ہی نہیں چاہتا۔ ان کے لیے جی کی کہ سبھیوں کا عقیدہ، ریاست، مذہب، عقیدہ تھی۔
 ڈاکٹر، معلم، وید جیسے گئے۔ ہر کار کی حکمت خاصہ نہ کرنا پڑا۔ سب نے اتفاق فیصلہ کر لیا کہ بیاری نہیں۔ ایک خواہش ہے۔ یہ خواہش تو ایسا
 میری خدمت کے لیے مردلانہ عمل کی جاؤ گی۔ نہ دیکھ دی گئیں۔ ایک سے ایک ہوش ہوا۔ ایک سے ایک تیر، میں نے ان کے افعال و حرکات،
 جذبات کا بخوبی مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ اور پھر عمل کو حساسیت کی ایک تجربہ کار میں تبدیل کر دیا۔ جب عیسائیوں کی روزانہ رپورٹوں میں انہیں
 میرے روریتوں کوئی فرق نہ معلوم ہوا تو وہ بھی ہار بیٹھے اور انہوں نے حکم دے دیا کہ اب میرے حال پر غور کرنا ہے چنانچہ میرے سبھی چٹے بھائی
 ہمنوں کی شادی ہو گئی مگر میں اپنے مشاغل میں لگا رہا۔

ایک دن صبح کے کوئی سات بجے تھے، میں نماز سے فراغت پا کر بائیں باغ میں مثل ما خدا روش کی دوڑوں جانب کھلب کھلبے ہوئے تھے۔
 بڑبڑ، آواز، سیارہ، سفید اور ان پر ہندوستانی مثل اور مختلف چھوٹی چھوٹی گل دار چڑیاں گری تھیں ہند کی کھلیاں اور ہونے سے بھی اپنے اپنے طریقہ
 طواف میں لگے تھے۔ میں دور سے اس حسین منظر کو دیکھ رہا تھا اور غالب کا یہ مطلع میرے دماغ میں گونج رہا تھا:۔

سب کہاں کچھ لادو گل میں نمایاں ہو گئیں
 شاگ میں کیا صورتیں ہوں گی کہ نہلاں پو گئیں

۱۱۔ اس پر خود کر رہا تھا کہ اداں کو قیاس نہ آتی تھی۔ کیا ہر چلے بدل کر آتے رہتے ہیں، اگر ایسا ہے تو بدیہی کیوں ہوتے ہر تے
 کیوں ہیں وہ بار بار پسیا ہونے کی ضرورت ہی کیوں پیش آتی ہے۔ چہرہ و آفتاب مارا اس طرف مڑ گیا کہ ہمارے بوس نے تو یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسانوں کی
 طرح نہایت میں بھی جان ہوتی ہے۔ وہ فطرتی ہی محسوس کرتے ہیں، درد و تکلیف بھی۔ چہرہ جتنی تک سانس اتنی دیر میں اتنی جھٹکے بعد پوچھی۔
 شوخ کی تخیل نے اسے کیونکر اتنی مدت پہلے محض معمولی مشابہت کے درمیان محسوس کر لیا تھا۔ کیا ایک بڑے شاعر کو الہام ہوتا ہے یا وہ سانس
 کی نفیس الہام ہی کوئی چیز ہے۔

پھولوں کی خوشبو سے لمبی پرتی پر ایک بلبل جھانکوں کے ساتھ مجھے جھونکی کوڑتی جاتی، اوپر سے خیالات ایک مکر جھنکے کی بجائے نئی نئی بیابان بدست جھانکتے چلتے ہلتے اور لائیں سوالات کا ایک بار کو نہ دھتے جلتے تھے۔ دفعتاً گھوڑوں کے پاؤں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے بلیٹ کو دیکھا تو جھانکی جھنڈی، لی عہد ہمارا، اپنے مشکلی پر سوار چلے آ رہے ہیں۔ ان کے پیچھے پیچھے سناٹا میرے غیب فقر، کی نگاہ پوچھنے لگا رہا ہے۔ میں سے سلام کیا تو بولے "ارے! بانی راہب!" انھوں نے مجھے راہب کا خطاب دے دکھا تھا۔ "آؤ چلیں تقریر کر گاہیں!"

مجھے کچھ بولنے پر سوار ہونے کا بہت شوق تھا، ایک مہینہ سے زائد ہوا تھا کہ محل کی چار دیواری کے باہر تدم۔ رکھا تھا۔ آج جو پرانا گھوڑا دکھائی دیا تو دل بے ساختہ جڑا کہ انہماک کہ اس کی پیٹھ پر بیٹھ جاؤں۔ پھر بھی میں اس وقت صرف کرتا پانچواں پینے تھا۔ اپنے محل کے اندر تو اس لباس میں کون سمکتا تھا، باہر اس طرح جانے کے خلاف احکام تھے۔ راستہ کے والی کے لیے تو ہر موقع محل کے لیے اس سب لباس موزوں تھے۔ میں نے سب کی صاحب سے اجازت لے کر جلدی جلدی لباس بدلا اور اپنے غیب پر سوار محل سے نکل گیا۔

لہذا مہینہ تھا، برسات ختم ہو چکی تھی، زمیں نے ہر جگہ اپنے پیسے میں پیسے ہوئے محل و جوامر سہست اور ہر بائی کی صورت میں آؤ، دیکھتے تھے، سب اس بہت ہی دل پذیر شکل تھی۔ طائر و خنجر پر چھپا رہے تھے، مشکلی اور فقر و دیوار اور عرب، سیاہی و سپیدی، ایک دوسرے کو لکھیں سے دیکھتے، انے جیتے چلے جا رہے تھے۔ دفعتاً ہمیں کچھ سبھاؤں کے جیسے دکھائی دیتے۔ جھونکی چوٹی جھولدا رہوں میں پر اور جھاندا۔ ان کے گلے گلے لٹکے روڑے روڑے ہیں، ایچ جیتے ہیں، شہر بچا رہے ہیں۔ ان کی موتیں مسل بیچیں شلواریں، سراپائیاں، پانچاھے اور شلوار کے پینے بال کر دتے، انے ہوتے تیار یا فوجی بے کوئی چوٹ میں، آگ روشن کر رہی ہے، کوئی گھڑی دونوں انھوں سے نہیں پڑے، بال کچا ہی ہے۔ مر دیا تو بیٹھے حق تعالیٰ رہے ہیں، ایسا جیتے جھوتے جھوتے تو مل رہے ہیں۔ میرے منہ سے بے ساختہ انہماک کا صبر نکل گیا، ج

صبر چٹاٹھ پڑا، جانے کا جواب لا دیتے کا بجلی را

جھانکی صاحب نے کہا: "جلدی نکالو، یہ گھر نے کی جانیں!"

میرے گھوڑوں کی رفتار تیز کر دی اور چرمنٹ میں بنی "شہر جیل" "راہ سار" کے کنارے پہنچ گئے۔ کوسوں لمبی جیل پر، راستہ نے لاکھوں روپے صرفت کے اسے قابل دیکر بنا دیا ہے۔ اس میں گھاٹ ہیں، سنگ سرخ و سنگ موسیٰ کے کنارے ہیں۔ اس میں جیل میں بیٹنے والے پتھروں کے مناظر ہیں۔ پناؤں میں بل کھاتی ہوئی نمونوں کے مناظر ہیں۔ اس کے کنارے پر سنگ مرمر کی بنی ہوئی گشتی گا ہیں ہیں۔ اس میں تیرنے کے وہ مقام سماں ہیں جو اس ورزش لہجہ اور فوٹوں کو حریف بناسکتے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ اس کا پانی صاف ہے۔ شیریں ہے اور اس میں کسی قسم کی گند کی کمی تیز تر کی اجازت نہیں۔

پرمیسیل کی اس عمارت کی طوط مرثے جو شاہی خاندان کے غسل کے لیے مخصوص تھی، اور جہاں کسی دوسرے کو نہانے کی اجازت نہ تھی۔ اور نہ نے دیکھا ہے۔ ہم نے دیکھا۔"

بیکاری نہاد سے نے بے تکلف جھپٹ کر میرے سرانے سے سنگریٹ اور دیا اسلامی، اٹھائی اور ایک مارگ مبرا کرکشی لیے بے کش ہے۔ اس کا غنازتا تھا کہ اسے یہ دنیاوی دمی و سولی مدتوں کے بعد ملا ہے۔ لیکن وہ اس سے لذت یاب ہونے کی بجائے اسے کسی دھاک طرح استعمال کر رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ۵۰ اسے جہازت پر قابو پا کر اور اپنے منتشر خیالات کو مجتمع کر کے بیان کرے۔ اس نے ادھی ملی ہونی سنگریٹ زمین پر گر کر کھجادی اور بکھے ہوئے ٹکڑے کو گا کی تھپتھپے ٹھونس لیا، پھر وہ اسے کان سے نکال کر ٹکڑیوں سے مٹا ہوا بولا:

”وہ شہزادوں کے گھاٹ پر بھی ماز اور کھڑی تھی۔ اس کے ہلکے رنگ پر چدرہ جو تے ہوئے آفتاب کی کرنیں قلع چڑھا رہی تھیں۔ اس کے لیے کارے ہاں میں اڑتے اور لہراتے سانپ کی طرح بل کھاتے تھے۔ وہ خود چوہوں سے لدی ہوئی فنی کی طرح آہستہ آہستہ ہل رہی تھی۔ ایک چمکتے ہوئے جاکو کی طرح اس کا جہرہ ایک بار پھر درخش ہوا۔ ایک چھپا کے کی آواز آئی، وہ بڑی میں غوطہ کھائی۔ میں بے ساختہ گھوڑے سے کود کر، دھڑکیا۔ لیکن وہ فی حد ہمارا کاشیاں تھا۔ نہ اس شہزادہ کی کھا۔ نہ وہاں کا نیا لکھا۔ نہ حالات و واقعات کا مجھے یقین تھا کہ میں نے آج جل پڑا۔ اپنی آنکھوں سے دیکھی تھے۔ اور وہ اندازوں سے ٹکٹ ہو چا جاتی ہے۔ میرا دل لگا رہا تھا۔ اس عجیبہ روزگار کی اور پھر حجاب و کچھنی سے نوجوانی کو دور۔ بھائی حضور مجھے آواز دے دے تھے۔ ”ایلا رہے ہو۔ کہاں جا رہے ہو؟“ میں نے کچھ نہ سنا۔ میں روزگار میں سے بڑھ چکی تھی۔

نیک کہیں پاؤں صاف لفظ اہلی بھین کی س کھٹے بازوں میں چھپا ہوا ایک۔ آفتابی چہرہ اجودہ ابرو کی سیبے نازک اور سفید ہاتھوں نے ان کو چمک کر بھیجے تھے۔ دیار اور ایک ابن و احمد کے بیٹے وہ غمور آنکھوں سے میری آنکھیں لڑیں اور اس نے ایک ایسی چیخ کے ساتھ چوہ غوطہ کھایا۔ جانی صاحب نے اتنی دیر میں عزت کی کراہی ملاحتوں کو آواز دے دی تھی۔ ان میں سے دو تین دور قی ہوئی ساتھ ساتھ بچیں۔ جانی حضور نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے پوچھنے کی کوشش کی۔ میرے سر سے بد غرائز میں لٹا۔ ہل پڑی اور بدیں شینے۔ ابھی آئی۔ یہ تمہاری پڑی کرتا۔ جو کے“ انھوں نے کہا اور ملاحتوں کو آواز دے کر دیا۔ ان میں سے دو فوراً بھین میں پڑا۔ ”میں نے معلوم ہوا دو گھر چلے ایک رہ ہوئے تعاقب میں چلے۔

بھائی حضور میرا ہاتھ پکڑ کر ادھر لے گئے ہاں ہمارے کھڑک ٹوٹے تھے۔ مجھے ہر لمحہ حسرت ہوتا تھا۔ جیسے میں باغی خدی کے سہارے چل رہی ہوں۔ تجھ سے تو ت عمل باغی سب کر لی گئی ہے میں رہ رہا۔ کائنات حق جیسے میں کبھی جاکم خواب سے چمکنا تھا ہوا۔ میری اب بھین آفتاب کی روش دھندل چکی تھی جو ان بن صوفی کے تو سننے سے ہار رہے تھے، جو میں نے، اپنی غنسی بدعات کے کرد مار دھرتے تھے۔ میں نے اچھے سے بک نہیں سے عجیب نکالی اور کھٹے کھٹے سرگرم بھلائی جلدی جلدی و تین تین لٹے تھے جب جاکر میری یہ کیفیت کو ہوئی۔

ملائیں اس پر کڑیاں ہیں۔ جیسے جسم پر سیل خفک سدی، امر سے جیسے بائوں سے پانی چمکتا ہوا۔ ان دونوں کے درمیان ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے شہر کے دو نالوں کے درمیان کافور کی بک ڈلی۔

جانی حضور نے دھاک لڑ پڑ چپ۔ ”کون سے رہی تو؟“

اس نے ندری سے جواب دیا۔ ”شہزادی“

وہ مسکرائی۔ ”اچھا۔ جب ہی آپ شہزادیوں کے گھاٹ پر نہا رہی تھیں!“

ملائوں میں سے ایک بولی۔ ”مرکار یہ نہا رہا بڑی ٹٹ کھٹ پڑی ہے۔ نہ جانے کیسے کسی آئی مرکار کی گھاٹ میں۔“

بھائی حضور نے ہا۔ ”اچھا! اسے شام کے دربار میں پیش کرنا۔“

حق ویر میں کی مرکاری ملاج بھی آگئے تھے۔ سب نے سلام کیا اور شہزادی کو گھیرے ہوئے گھاٹ کی نمائندگی کی طرف لے گئے۔

میں خاموش تھا۔ جانی حضور کی حمد تھی۔ مرکار نے بعد انھیں کا ساری ریاست میں حکم چلایا تھا۔ میں اگر کچھ کتا تو نہ جانے ملاج اور ملاجین مانستے ہی رہا۔ لیکن دل میں پچھتے گئے۔ حلق خشک ہو رہا تھا۔ اور مرکار کا ذائقہ تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کئی دن سے بخار کا مرض ہوئی۔

بھائی حقو نے گھوڑے پر بیٹھ کر کہا: ”کوتمدار کی جلیب پر ہی ہوتا بخار نکلی!“
 میں نے کہا: ”آپ نے اسے آنت ڈیٹ ڈیٹا دیا تو ہمارے میں پڑ کر گئے لیکن نہ دھرت تھی؟“
 وہ بڑے ”شامی گھاٹ“ پر بندھنے کے جاہر جم جھوم سینیں، اس کی سزا سزا بدس کی تیبہ سے لے کر کوٹ نکم ہے۔ اس لیے سرکار،
 یہی فیصلہ فرمیں گے۔“

میں نے کہا، معر۔۔۔ معر بان۔

ان کے چہرے پر دلنواں و سختی اور سبے رحمی بھیلنے لگی جو سلطان احمد، علی و ابوالہر کے چہرے پر نادر کی اطاعت و سازگاری کے وقت دکھائی دیتی ہے۔ وہی جوان و دلشاد کی بگڑ کر وہاں سے سزا پر بنادیتی ہے۔ اور وہاں سے کوئی افکار ان کے دلوں کے اندر تیرا فیرا خوب نمودار ہو کر سامنے آیا۔ جیسے وہ بھی شکلی نے نہ صرف مقدمہ میں بلکہ میں اپنی ذات کو کھتا ہوں۔

محققین وادھو چوہدری، جسے ہم نے پہلے جان کر گہرا راز میں نہ رکھے، جو کہتے ہیں کہ ہم نے اس کے دور میں تو قریب سے جھانک کر دیکھا ہے، وہ کہتا ہے کہ وہاں کچھ جالے گھیر کر قریب سے لگا کر دیکھ کر جانے کا اشارہ کیا۔ اس کا قصہ سترہ برس سے شروع ہوا اور وہ اب بھی اس میں جی جی رہا ہے۔ اس وقت کچھ سمجھی ہی تھی مگر میں دیکھتا تھا کہ کیا تو کوئی بڑا شے ہے، غصہ میں وہ تو مناسب جواب نہ دے سکتا، وہی اسے غصہ میں دیکھتا تھا کہ کیا تو کوئی بڑا شے ہے۔ وہ دیر کر کہہ دیتا تھا کہ میں نے اشارہ دے دو تو یہ بولتا ہے۔ وہ اپنی گزشتہ زندگی میں جو محسوس ہوتا تھا کہ وہ میرے اچانک واقعات سے بھرا تھا۔

میرے لب و لہجہ سے وہ ذرا لٹکٹن ہوئی۔ اس کے لبوں پر کچھ سیسکا ہمت آگئی۔

میں نے پوچھا ”تھیں میرے پاس کیڑی میٹھا کیا ہے؟“
اس نے نہ جھجھکا کر کہا ”آپ کی خدمت کے لیے“

”کس طرح کی خدمت؟“

اس نے کہا ”بہ طرح کی!“

میں نے کہا ”میرے سامنے شکی ہو کر ناچو گی“

اس نے کہا ”کنیز بیوں، جیسا حکم ہو“

مجھے غصہ نہ آیا۔ "سنیں جا بیٹے تمہاری کینزری۔" پسینوں پر کینے والا سحر! پہلی جاؤ میس سناٹے سے، دور ہو جاؤ، انہیں چھینا اور وہ ایک پیٹے پر بٹے کٹنے کی طرح کوس سے جلی گئی۔

میں پلنگ سے اتر کر ستنے لڑکھو دو دنوں قصہ ہو رہا بار بار میری آنکھیں میں پھر تیں، غوطہ لگاتی ہوئی سیل ہو رہی اور ملاسنوں کے درمیان کھائے کی کھا۔ مجھے سے طاقت انہی کی صلاحیت و فضا سب ہو گئی میں جھٹلتا ہوا کرے سے باہر، غلط خبروں، شہرلوں، پیریتھو اور سب بھگت کا تو باجھیل لے لے کا سے شہزادیوں کے گھات پر پہنچا، ملائیں اب کے باقاعدہ چہرہ دیتی ہوئی ملیں۔ انھوں نے شہزادی کو ایک کمرہ میں بند کر رکھا تھا وہ اس کے دروازے سے بیٹھ کر ان کو کوس رہی تھی۔

میں دروازہ کھول کر جب اندر داخل ہوا تو اس کی ساری گائیکوں کو اس میں اپنا تھا۔ اور اس کے بالکل ننگے کھجے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں غصے سے سرخ اور اس کے گال بالکل لال ہو رہے تھے۔ یہ تیسری دفعہ پہلی دفعہ میری دُن سے بھی زیادہ دلربا تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کمرے میں بٹسے ہوئے پلنگ پر بیٹھا دیا۔ وہ مجھے تعجب سے دیکھنے لگی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے میوں پر کبھی سی مسکراہٹ آئی۔

”آپ مجھے شہزادے ہیں؟“ اس نے سرگوشی کے لہجہ میں پوچھا۔

میں نے سر ہلا کر حامی جی۔ اور مجھے دفعتاً یاد آیا کہ میں ایک شہزادہ ہوں۔ میں ایک سرکار کی مجرم سے گفتگو کر رہا ہوں جنھوں نے عالی کے احکام پڑے سخت ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ میری کمرے کی ہی نہ ہمیشہ کے لیے مر جھا جائے بلکہ مجھے بھی نفاذی بندی یا قیدِ زمانی کی سزا مل سکتا ہے۔ میں جلد سے پلنگ پر میو گیا۔ شہزادی میرے قریب کھسک آئی۔ ساتھی ہی دیر میں اس کی نسوانی فطرت نے اسے بتا دیا تھا کہ میں اس کا والدِ شہید، اس کا غلام ہی چکا ہوں۔ وہ مجھے ہر کی طرح بدھرتی جاتا ہے۔ تو نہ کہتی ہے۔ اس نے دفعتاً میرے کندھے سے سر کاٹ کر کہا:

”میرے شہزادے! مجھے چھوڑ دیجئے۔“

میں حضورِ عالی کی خشکی کے خیال ہی سے کانپ اٹھا۔ اس نے پلنگ سے اتر کر زمین پر کھٹے ٹیک کر کہا: ”میں آپ کے لکے بہتو بڑی تھی ہوں۔ چھوڑ دیجئے۔“

”میں بے بس ہوں شہزادی، مجھے چھوڑنے کا اختیار نہیں!“

”وہ لعن سے بھری“ اچھے شہزادے ہیں! ایک مجرم بھی چھوڑ نہیں سکتے!“

میں سنے گا۔ اگرچہ مجھے دو دن تو ابھی تھے چھوڑ لینے کے، شہزادے دربار میں حاضر ہوئے۔

وہ بولی: ”ہو نہ! اس سے ٹھک جاتے دیجئے۔ پھر دیکھوں گی کوئی بڑی لیسٹ!“

میں نے کہا: ”بھائی جی! کمرے میں کیسے۔“

اس نے جھک کر میرے پاؤں چھئے ”میں نے آؤں گی شہزادے!“ اور وہ کمرے سے نکل گئی۔ ملاسنوں نے دروازہ پانچا۔ میں نے کہا: ”جہانے

دو!“ اور دروازہ پر جھانکی تو اس لحاظ کی جدھر تیاروں کا قافلہ پڑا تھا۔

خاتمہ نے دربار میں وہ تو نہیں پیش ہوئی۔ البتہ سارے ہمارے بندے کمرے سے نکلے۔ لیکن حضورِ عالی کے بار بار پوچھنے پر بھی کسی نے

یہ نہ بتایا کہ وہ کہاں گئی۔ دیکھنا دی گئی نہیں۔ چنانچہ لیکن کوئی بھی اس کے سوا نہ چھوٹا کردہ جھانک گئی۔ پھر بھی غائب نہ ہوئی۔ تاہم جنکس کیوں

لی گئی۔ مجرم کو فراموش نہ کر دی گئی۔ میں غائب ہو کر جھانکے سب سننا رہا حضورِ عالی نے ڈانٹا۔ بھائی حضور نے مذاق اڑایا۔ وزراء نے نصیحت

کی مگر میرا سکوت نہ تو بالآخر حضورِ عالی نے جھلکا کر ایک مہینہ محل میں نظر بند رہنے کا حکم سن دیا۔ یہی اس طرح چپ سا دوسرے اپنے حصہ میں چلا

آگیا۔ اور پلنگ پر لیٹ کر اس پر غور کرنے لگا کہ تو شہزادی کہاں گئی۔ اور میں اُسے پھر کبھی دیکھوں گا۔ پھر بھی ابھی نہیں اس تیاروں کی کھچے کیوں

دلوانا اور ہوتا ہوں۔ والی ملک کا دنیا اور بیخ ذات کی عورت کا عشق۔ لوگ کیا کہیں گے؟ بھائی حضور نے تو آج صبح سے دربار میں رسوا کیا، کل

سازے ملک میں تشہیر ہو گئی۔ حضورِ عالی کے غصہ کا پکارا کہ جس ڈگری پر پہنچے گا۔ سرکارِ عالیہ کے سامنے اگرچہ پیش ہوئی تو ان کو کیا نہ دکھائی نہ گلا۔

مگر گھر گیا اس کی خوشنکھتے ہیں، میں تو اس سے کوئی بھی غور نہیں رکھتا۔ میں تو شہزادی کو صرف خوش، چلیں کرتے دیکھنا چاہتا ہوں۔

پھر اس قدر ننگے کیوں؟ ممکن ہے کہ اس کا بھی کوئی بھانجہ ہو۔ ایسا محسوس ہوا جیسے ہم جہاں کسی نے ایک ساتھ بہت سی کونیاں اچھو دیں ہیں

ترتیب کر اٹھ اہوار نہیں یہ سرگز نہیں پرہیزگاری نہیں، وہ میرے ہی ساتھ رہے گی۔ میں اسے سب کچھ کو کہجیت لوں گا! میں نے شکست شہزادہ کیاد پر سے کر کے کی سینکڑوں بار پائش کر ڈالی، فرش کھل ڈالا۔ لیکن اچھی بڑھتی ہی جاتی تھی۔ میری خود کھجیت نہ آتا تھا کہ یہ ہے کیا کہ کبھی سارے جسم میں جھکریاں سی جھوٹے لگتی ہیں، کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے لگوں میں برت آداری جا رہی ہے۔ میں نے کمرے کے باہر روش پر ٹھٹھٹا شہزادہ کیا۔ مختلف طرح کے ہندوستانی اور انگریزی بھول کھلے پورے کھٹے۔ جو ان کی خوشبو سے معطر تھی۔ لیکن مجھے سواٹے اس کے کسی بات کا احساس نہ تھا کہ میرے دماغ میں کوئی کیل سی ٹھٹھٹا جاتا ہے۔ کھٹ! کھٹ! کھٹ!

اور اس نے دفعتاً اپنی لمبی انگلیاں بڑھا کر اپنی کھوپڑی پر اس طرح مار کر معلوم ہوتا تھا واقعی بہنوزی سے کہا، ٹھٹھٹا کی جا رہی ہے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ تعصیب بیان کرنے کرتے اس کی دشمنیت بڑھتی جاتی ہے۔ اور کہانی کی ابتدا میں جو رحم اور ہمدردی کا جذبہ مجھ میں پیدا ہوا تھا، اس پر ایک لمبی سی گھبراہٹ، ایک خفیف سی سراسیمگی غالب آتی جاتی ہے۔ رات کا سا ٹھٹھا، تاریکی، دور دور تک ہمارے سوا کسی انسان کا موجود نہ ہونا۔ ان چیزوں نے پرتخت استغور میں دبا ہوا خوف اُٹھانا شروع کیا تھا۔ اور اُس کے اُٹھانے کا سبب تعصیب کا موضوع نہ تھا، وہ تو کافی شیریں، پلپلپ اور دلپذیر تھا، بلکہ جگمگے کا پورا ماحول تھا، اور تعصیب کو کا انداز اور اس کا محویر۔

میں نے سی ایسے تعصیب کو تھکانے کی غرض سے سوال کیا ”تو شہزادی سے آپ کی ملاقات ہوئی یا نہیں؟“ وہ بولا ”نہ ہوتی تو آج یہ گت کیوں بنتی؟ اسی رات ہوئی۔ تقریباً بارہ بجے جب میں اپنے کمرے میں پڑاؤ کو بدلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے کھڑکی میں سے جھانکنا میں نے خیال کیا، نگاہ کا دھوکا ہے۔ آنکھیں مل ڈالیں۔ وہ اتنی دیر میں اُچک کر اندر جا چکی تھی۔ میں نے کہا ”تم؟ تم!“

وہ میرے سر کے بالوں میں انگلیاں دبڑو کر بولی ”میں نے وعدہ کیا تھا شہزادے!“ میں نے شہزادہ کو سب کو پھر پشیمت ڈال کر اسے، اپنی گود میں سینکنا چاہا۔ اس نے جبے روکتے ہوئے کہا میں اس بیسے نہیں آئی شہزادے!“

”پھر کیوں آئیں؟“ وہ بولی ”مجھے آپ کی مدد کی ابھی ضرورت ہے مجھے ایک تیز اور مضبوط گھوڑا چاہیئے تاکہ میں آج ہی رات ریاست کی سرحد سے نکل جاؤں“

میں نے کہا ”اور میں؟“ وہ بولی ”آپ شہزادے ہیں، آپ میرے عیس عورت کو بیوی نہیں بنا سکتے“ ”مگر میں تو بغیر تمہارے زندہ ہی نہیں رہ سکتا!“ ”تو پھر آپ کو تمہارا ہونا پڑے گا!“ میں نے کہا ”مضطرب!“

اور ہم اسی رات اپنے فقرہ اور مشکلی پر سوار ہو کر سرحد سے نکل گئے اور میں چوڑا ڈنک اس کے ساتھ بنجارہوں کی زندگی بسر کرتا رہا۔ ہمارے سر پر کچھ ایک کسل کا سا ثیاب ہوتا، کبھی وہ بھی نہیں مگر ہر لمحہ جتنی ہوتا شہزادی کے ہر فعل میں ایک خاص اداسی تھی۔ اور غریب،

و پذیر، نزعت الیز، اور اسی چاہتا تھا میں اسے دیکھ جاؤں۔ چلتے چرتے، ہنسنے دسنے، کام کرتے، اسوتے، اٹھتے، بیٹھتے، ان میں جو ہر کر دیکھتا پھر بھی دل میرے ہوتا۔ طبیعت نہ بدلتی۔ میں کبھی کبھی سوچتا، کیا جنت میں اس سے زیادہ خوشی ممکن ہے اور ہماری اس جنت میں ایک دن ایک سانپ ابھی گیا۔

میرا مغروری اور گم شدگی کو معمولی چیز نہ تھی۔ اشتہارات دیئے گئے تھے۔ حدیث شائع کی گئی تھی۔ انعامات کا اعلان ہوا تھا۔ آدمی چھوڑنے لگے تھے۔ ان ہی میں سے ایک کجھت اتفاقاً بخاروں کے ہر تلفہ کو دیکھتا، فوہ لیتا ہر تک پہنچ ہی گیا۔ وہ مجھ سے ملا۔ حضور عالی کی بیماری کی اطلاع دی۔ سرکار عالیہ کے ستر مرگ پر ہونے کی خبر سنائی میں نے کہا دوسرے شہزادی کے اب میرا کوئی نہیں، اس وقت تو وہ مایوس ہو کر چلا گیا مگر شب میں جب ہم ایک دوسرے کے گئے میں باہیں ڈالے بے خبر سو رہے تھے، دس بارہ آدمیوں نے ہمیں اچانک گھیر لیا اور شہزادی کو رسیوں سے باندھ کر ایک نیس میں ڈال دیا۔ مجھ سے کہا گیا کہ گھوڑا سامنے ہے، آپ کا بھی چاہے تو ساتھ چلئے ورنہ ہم اسے پیے جارہے ہیں، چارہ کا دہی کیا تھا۔ ہم دونوں سفر کر کے دربار میں حاضر کیے گئے۔ حضور عالی نے حکم دیا ”اس باجی عورت کو سپاہیوں میں سے کسی ایک کو دے دو کہ اپنا گھر بسائے اور صاحب زادے کو غسل کر کے کپڑے بدلوا کر میرے سامنے حاضر کرو“ میں اس ذلت کا تحمل نہ سوسکا۔ میں نے جبر سے دبا دیا، میں کہہ دیا کہ ”شہزادی میری بیوی ہے، اگر کسی سپاہی نے ہاتھ لگایا تو میں اس کی پوتی بونی گاٹ کر جیل کو ڈوں کو کھلاؤں گا“

حضور عالی نے طنز سے پوچھا ”بیوی ہے، کس نے نکاح پڑھا تھا؟“

میں نے کہا ”میں نے خود!“

وہ جاسنے تھے، نہ بدیا میں ایسا کر سکتا ہوں۔ اس لیے ان کے لیے جواب تو ساکت نہ رہتا تھا اگر اس سے ان کا فائدہ ہو کر اٹھا۔ بخول نے حکم دیا ”ان دونوں کو جیل میں ڈال دو، مگر الگ الگ کمروں میں!“

ہم دونوں قید کیے گئے مگر اتفاق کی بات کہ اس کی شب میں حضور عالی کو طبی دورہ پڑا اور صبح ہوتے جوتے وہ اسپتال ہی زیادہ سخت مگر عادل بیگ کی عدالت میں طلب کر لیے گئے۔ آٹھ بجے دن کو جب میں قیدیوں کا لباس پہنتے اپنی تاریک کوٹروٹی میں بیٹھا تھا یہ خبر ملی۔ مجھے اس حادثہ پر کوئی رنج نہ ہوا۔ اس لیے کہ میں انھیں باپ کی جگہ اپنی شہزادی پر ظلم کرنے والا سمجھتا تھا۔ اس لیے میں نے اعتماد و افسوس کیا اور نہ ہی میں نے آنسو بہائے۔ ہاں اس کی خوشی ضرور تھی کہ بھائی حضور کو سخت ملا۔ وہ نسبتاً یقینی رحم دل تھے۔ چنانچہ چھوٹی ہی دیر میں اس کا ثبوت ملا۔ وزیراعظم خود میری رہائی کا پروردار کے قریب سے آئے۔ میں نے کہا ”میں نیز شہزادی کے رجاؤں کا“ اس کی رہائی کا بھی حکم کیا اور ہم دونوں بند موڑ میں بٹھا کر محفل میں پہنچائے گئے۔

میں نے اپنے خاص محل میں جا کر نہا دھو کر کپڑے بدلے اور شہزادی کے بارے میں تماموں کو ہدایت دے کر میں بھائی حضور کی خدمت میں نذر گزارنے حاضر ہوا۔ انھوں نے گلے لگایا۔ دلہن کی یاد اور حضور عالی کے دفن و کفن کے سارے زرائع میرے سپرد کیے۔ میں نے اضلاع پھر وغیرہ اٹھام دیا اور میں بر اعیانہ اپنے محل میں رہنے لگا۔

شہزادی کو سارے ممکن آرام ہوتا ہے۔ اما، دانیال، خواہیں، کنیزیں ہر وقت خدمت میں لگی رہتیں۔ میں اب بھی مجبورے کی طرح اس کے گود پر اکتا۔ تقریب کے لیے سوئیں تیں، خورج کے لیے روپے تھے مگر میں نے عسوس کیا کہ وہ سست رہے گی۔ اس پر محل میں قیام کا وہی اثر ہوا جو ایک آواز چلایا پر ایک سوئے کے پھرے میں بند کر دیئے جہانے کا ہوتا ہے۔ اس کے شہانہ رنگ پھلائی گئے قلب نے ٹکا۔ اس کی

سماعت سے بہت بڑی ہمت اختیار کرنا شروع کی۔ میرے خوشی کے چہرے میں ہلکی کانٹے دار ہڈیاں نکلنے لگیں۔ میں اس کو خوش رکھنے کی سزا پر غور کر ہی رہا تھا کہ ایک شب کو جب میں بارہ بجے کے بعد دربار سے پٹا توہیں نے محل کو اس سے غالی پایا گھر کا گھر نہ کر نہ دھونڈو والا وہ کہیں نہ ملتی کہیں میں بدحواس پھر پٹا تو ٹیکس کے پیچھے ایک پرزہ ملا ”شہزادے! میں مانتی ہوں، مجھے تم سے بے انتہا محبت ہے لیکن مجبوروں کی زندگی میں اس سے بھی زیادہ!“ میں نے اس شرب میں پہلی دفعہ شراب پی اور اتنی پی کہ میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

صبح کی اعضا شکنی اور درد دوسرے مجھے پہلی دفعہ اپنی ظاہری حالت کی طرف لچکھنے پر مجبور کیا۔ میں نے دیکھا، کڑتے کے گلے کے سارے منہ کھلے ہیں۔ دامن اور آستین پر بدبو دار دھبے ہیں اور کمرے کی ہر چیز پر ترقیب سے پڑی ہے۔ مجھے یاد آگیا کہ میں نے شب میں شراب پی، اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری شہزادی اور خجالت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ نہ کاؤ آفز تھا کہ جیسے میں نے رات بھر خاک پھا بھی ہے۔ کچھ ترش، کچھ گڑا، ساقی کی حد درجہ بیگیا۔ محل میں کونے سے پرے تھے۔ میں نہ کھڑا تھا ہوا اٹھا اور تمام میں گھس نہ آیا اور محل میں میں نے پہلے دن دوبارہ خلعے کے سر کمر کلاس کی جگہ پائپ کا پانی چٹو کر گیا۔ پھر جلدی جلدی کپڑے اتار کر نیم گرم پانی سے خوب نہایا۔ جب میں توبہ لیتے باہر نکلا تو میں نے دیکھا، زہرہ میرے بستر کی چاد بادل ہی ہے اور خود بخود اس بی بی کی طرح سکڑا رہی ہے جس سے ختوری دیتیل گھر کا پائتو سفید چوڑا کھا والا ہوا۔ اس کے چٹکے ہونے پہلے بال اس کے شاد بختے کہ وہ بھی اعلیٰ محل کے آئی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب نیم سپردگی، نیم ناخمانہ جھکا۔ تھی۔ مجھے یقین آگیا کہ اس کی مدہوشی میں میں نے اسے شہزادی کی جگہ دے دی — اور مجھے خود اپنے سے نفرت ہو گئی۔ میں ڈاکو تھا، بے باقوں اور کمرہ داروں کی پوچھی کھٹے والا ڈاکو، میں نے ایک کنیز کو اپنا لیا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ مجھ سے محبت کرتی تھی، بلکہ اس لیے کہ اس کا جسم میرے لیے خرید لیا تھا۔ میں نے اس سے اس کی پسند کا حق نہ رو تھی، میں جانتا تھا کہ میں بے وفائی تھا۔ میں نے شہزادی کی ملکیت پر دوسرے کو قبضہ کر لینے کا موقع دیا۔ میں نے چند گھنٹوں میں اپنی تمام روایات کو بھلا دیا جو دامن و مجنوں و فرخاد میرے اپنا سب کچھ کھو کر محبت کرنے والوں کے لیے چھوڑ دی تھیں۔

میں اسی بیچ کتاب میں گرنا تھا کہ بھائی حسنوز کا حکم نامہ آیا ”سرکار عالیہ نے یاد فرمایا ہے، فوراً حاضر ہو“ مجھے یقین ہو گیا کہ عزیزوں نے سارے واقعات کی خبر پہنچا دی ورنہ میں یوں نہ یاد کیا جاتا۔ سرکار عالیہ نے جس دن سے شہزادی کے متعلق یہ معلوم کیا تھا کہ وہ بچاؤ ہے، مجھے حاق کر دیا تھا۔ ان کا حکم تھا کہ جب تک یہ ناگوار اور ذلیل تعلق قائم رہے گا، وہ میرا منہ نہ دیکھیں گی۔ شاید اس دیوانگی سے پہلے اس طرح کا حکم میرے لیے موت کے برابر ہوتا۔ اس لیے میں ان سے بے انتہا محبت کرنا تھا اور مجھے بھی وہ اپنی اولاد میں سب سے زیادہ چاہتی تھیں۔ لیکن شہزادی کی محبت نے میرے دل و دماغ پر اس طرح قبضہ کیا تھا کہ میں اس کے علاوہ نہ کچھ سوچ سکتا تھا اور نہ مجھے کسی اور کی دنیا میں پرواہ رہ گئی تھی۔ اس لیے مجھ پر نہ تو حسنوز عالی کی نفی اور موت کا کوئی اثر ہوا تھا اور نہ سرکار عالیہ کی ناراضگی کا — میں نے دنیا اسی کے پیچھے چھوڑ دی تھی —

اس دن جبکہ میری محبت نفرت میں تبدیل ہو رہی تھی مجھے محسوس ہوا کہ میں واقعی کس حد کا خود غرض، کینہہ خصائل اور ذلیل طبیعت ہو گیا ہوں۔ میں نے ایک بچانہ کی محبت میں باپ کی شفقتوں کو اور ماں کی محبتوں کو بھلا دیا۔ مجھ میں نہ تو خاندان کا لحاظ و پاس باقی رہ گیا تھا اور نہ اس کا احساس کہ میں ریاست جبر میں کس نظر سے دیکھا جاتا ہوں۔ دنیا مجھے کیا کہتی ہو گی۔ اور میرے فضل سے ریاست اور اس کے والی کی کتنی سبکی ہوتی ہو گی۔

میں نام و ہراساں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سلام کے لیے جھکایں تھا کہ ان کے اشاروں پر کینڑوں، مغلاہوں نے معدتہ اتنا دانش ور کیا۔ فکر، روپے، میں نے اجازت کے کر بیٹھنا چاہا اور انھوں نے ہاتھ بڑھا کر مجھے بھائی سے لگایا اور مانتے بے چینی ہو کر روئے گئیں، میری آنکھوں سے بھی ندامت کے آنسو گرے۔ ایک لفظ شکایت یا نصیحت کا زبان پر نہ لایا۔ بس بار بار چہرہ دیکھتی اور باغ باغ جو باتیں، میں دل میں کشاں ہا کہہ رہا تھا وہی دانی ماں کے ساتھ میں نے اس طرح کا سلوک کیا۔ انھیں اس حد کی اذیت پہنچائی۔ غرض وہاں سے دل میں طے کر کے اٹھا کہ شہزادی کا خیال دل سے نکال کر ہوں گا اور اب اسی طرح کی زندگی بسر کروں گا جو ایک دانی ریاست کے بھائی کے شایان شان ہے۔

ان سے رخصت ہو کر نکلا ہی تھا کہ اطلاع ملی، بھائی حضور منتظر ہیں۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھوں نے خوب خوب لٹے لیے۔ ان کو بھی اس کا دل تھا کہ میں نے کسی ایسی عورت کا اپنے لیے انتخاب نہیں کیا جو ان کے ہم پلہ ہو۔ جی سے وہ ہونو کا ماسکوں کر سکتیں۔ میں نے ہنس کر کہہ دیا "یہ تو آپ بزرگوں کا کام ہے، آپ نے کیوں تلاش نہ کی؟" وہ خوش ہو گئیں، بولیں "آج ہی قومیں سرکار عالیہ کا عہد بیسے لوں، پھر دیکھیں اس کی بجائے ایک چاندی دہن نے آئی تو تم ہی کہنا" انھوں نے اسی دن سے کچھ اس طرح کی جوڑو لکھائی کہ میرا یہ ریاست کے دانی کی صاحبزادی سے جس کا بول و مشاطہ "ایک گال چاند تھا تو ایک گال سورج" ایک ہی ہفتے کے اندر رشتہ طے پا گیا۔ اور یہ بھی طے ہو گیا کہ میرا بھائی کا سوگ اترے ہی میرے بیوے کی شہزادی میری دہن بنا دی جائے گی۔ میں نے اس دوران میں اپنے کو اس قدر مشغول بنا رکھا تھا کہ مجھے اپنی شہزادی کے متعلق سوچتے کھو جاتا تھا۔ صبح کو میں غسل کرنے کے بعد فوجی بارکوں میں چلا جاتا۔ وہاں ایک گھنٹہ تک عائد کرتا۔ پھر مقدمات سنتا۔ بارہ بجے کے قریب واپس آ آکھانا کھاتا اور فوراً لائبریری میں چلا جاتا۔ وہاں مطالعہ کرتا یا لکھتا۔ چار بجے کے قریب چالنے کی گھوڑے پر سوار ہو کر تفریح کو نکلتا جاتا اور اسی سلسلہ میں فوجی بارکوں سے ہوتا ہوا آٹھ بجے شب کو پٹنٹا گھنٹہ دو گھنٹہ بھائی حضور کے پاس بیٹھتا، اکثر ان کے ساتھ کھانا کھاتا۔ کبھی ان ہی کے ساتھ بے نوشی میں مشغول ہو جاتا، کبھی گھر آ جاتا اور زہرہ ساقی کے فرائض ادا کرتی۔ عجیب بات یہ ہے کہ جب تک میں اپنے حماس میں رہتا میں اپنے کو اور زہرہ کو حد و درجہ تفریح نگاہ سے دیکھتا۔ لیکن جہاں مدہوش ہوتا تو پھر جسم کی پیکاروں کی پکار پر غالب آجاتی۔

اسی طرح تقریباً دو سال گزر گئے اور وہ دن بھی آگیا جب میں نئی دہن کو رخصت کر کے لکھ گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بلائی آمدنی آئی تھی۔ ہر طرف سے بادل اُٹے چلے آ رہے تھے۔ زہرہ و دشتری نوکیلیں، ایک خنسا سا تاریکیوں کا نظارہ آتا تھا۔ پھر اس پر وہ گرج کر الامان۔ ہر جاندار اپنی اپنی جگہ پر سنا خافت بیٹھا تھا مگر ہمارے ہاں محل میں ہر طرف چیل چیل تھی۔ جیٹنگ پر شہنائی بج رہی تھی۔ محل میں بجلی کے دھمکیوں، بیوں اور پیکر کاشے ہوئے قمر بادوں سے قوس قزح کا سماں پیدا ہو رہا تھا۔ ریاست کے سامنے امرا، وٹو سا دھبہ ٹیپہ کھانے میں ہر دم تھے اور میں وہاں کی مصنوعی مناسبت سے اپنے ہمسواں کے مجمع میں کچھ شغل کر رہا تھا کہ اندر سے حکم آیا، میں بلایا جا رہا ہوں۔

میں کچھ جھومتا کچھ جھکتا اس مقام پر پہنچا جہاں اب بھی صاحبزادیوں کے جھگڑنے میں ایک کمرے کے دروازے پر کھڑی تھیں، مجھے دیکھتے ہی بولیں "کیا آج کی رات بھی اس موٹی شراب کی مدد کی ضرورت تھی؟"

اور قبل اس کے کہ میں اپنی فحاشت مٹانے کے لیے کوئی جواب دوں انھوں نے دروازہ کھول کر مجھے اندر دیکھلایا اور قہقہوں

کے چول بھرائی جا گئیں۔

جنہی ذاتی کو صنعت گری و فنکاری میں تغدد و لاؤینڈ ویدہ زیب بنا سکتی ہے اس کا مزہ اعلیٰ و حریر میں لپٹا پھولوں سے وطنی ہوئی مسہری پر سناکت و ساکتی پٹا تھا۔ مسقی و مدہ ہوشی پیدا کرنے والے بخارات فضا میں حطہ بیزی کہ رسبے تھے۔ مکرے کی ہر شے قیمتی اور نئی ہونے کی وجہ سے اپنی جگہ گاہٹ سے آنکھوں کو خیرہ کر دیتی تھی اور بھانگ پر بجتی ہوئی سرٹلی بانسری کی ہلکی ہلکی مسکور کو آواز پاؤں کو ایک خاص تال و دم پر اٹھانے پر مجبور کر دیتی تھی۔ میں نیم دا آنکھیں مسہری پر جھانے، کچھ جھوٹا، کچھ لٹکڑا، تارنگلی اور سرخوشی کی حالت میں کام و دہن میں ایک خاص طرح کا زلفہ محسوس کرتا چلا جا رہا تھا۔ بڑھتا جا رہا تھا۔ دفعتاً مکرے کی ساری روشنیاں گل ہو گئیں۔ میں غصہ کر کھڑا ہو گیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ نرم ریشمی دھکا کا جو مجھے مسہری کی جانب کھینچ رہا تھا۔ دفعتاً ٹوٹ گیا۔ مجھے خیال آیا کہ کسی شہریر نے خاص طور پر اس مکرے کی روشنیوں میں گل کر کے مجھے اندھیرے میں اپنی منزل اور اپنا مرکز کشش ٹوٹنے کے لیے مجھ کو کیا ہے۔ مگر غصہ ڈی ویر میں پورے محل کے شور و غوغا نے بتا دیا کہ یہ تاریکی عام ہے۔ میں نے مسہری پر ایک سرسراہٹ محسوس کی۔ درد اڑنے کی طوت پلٹنے پلٹنے اُدھر بیٹا۔ غالباً نبی دلسن بے گھوم گھومتے سے میرا دھندل دیکھ رہی تھی اور ادب اندھیرے نے مجھے ایک تار ایک تار سبب بنا کر اس کی نظروں سے پوشیدہ کر دیا تھا۔ ممکن ہے یہ حرکت منزل تک پہنچنے کے لیے میرا سہارا بن جاتی لیکن دفعتاً ایک جانا بچا نا نرم نرم ہاتھ مجھے مکر کی جانب کھینچنے لگا۔

میں نے آہستہ سے پوچھا ”شہزادی؟“

کان کے قریب منہ لاکر جواب دیا ”ہاں! باہر چلے“۔۔۔۔۔ اور میں خاموش ساتھ ساتھ بولیا۔ لان پر دو گھوڑے تیار کھڑے تھے، بھائی حضور کا نقشہ اور میرا فقرہ۔ ہم دونوں سوار ہوئے اور چور دروازے سے ہو کر جہاں آج کے ہنگامے میں کوئی پہرہ نہ تھا، محل کے باہر نکل گئے۔ میں نے شکایتوں کا باب جب کھولا تو شہزادی کے جواب نے مجھ میں باز پرس کا کیا رابا باقی منکھار وہ اپنے مخصوص انداز سے سر کو جھٹکا دے کر بولی ”میں نہیں چاہتی تھی کہ تمہارا معصوم پہلی سانس کھلی فضا کی جگہ لیں اور ہے“

اب حوت و حکایت تھی تو اس کی کردہ کیسا ہے، کہاں ہے، کب پیدا ہوا اور اس وقت اس کی دیکھ بھال کو کر رہا ہے؟ اس جزیرہ شیریں کو اس نے دروازے و راز کر کے بیان کیا۔ اور میرا دل ہی نہ بھڑکا تھا کہ اس انسان کی صلیبی بڑھتی ہی چلی جائیں۔ ہم ساری رات چلتے رہے، کبھی تیز کبھی آہستہ، مگر اس پورے طویل سفر میں مجھے ایک سیکنڈ کے لیے نہ تو بھائی حضور کے غم و غصہ کا خیال آیا اور نہ وہ غریب قریب رہ دلسن با د آئی جو میرے اس طرح غائب ہو جانے سے مختلف طرح کے خیالات کی آگ جاگے۔ جی ہوگی۔ دو سال سے چھوٹی ہوئی شہزادی میرے ساتھ تھی، مجھے کسی اور سے کیا مطلب؟۔

مجھ کے قریب ہم ریاست کے حد و دوسے باہر بن جاؤں گے ایک ڈیسے میں پہنچے۔ وہاں پہلی دفعہ اپنے نور نظر کو شمع جلا کر دیکھا۔ وہ اپنے چوٹے سے پائے میں سوار تھا، پہلی نظر میں وہ جھولی صورت میرے دل میں اتر گئی۔ سو بہو شہزادی کی تصویر تھی۔ وہی ناک، نقشہ، وہی رنگ، وہی غلائی آنکھیں، اور سونے میں وہی ہلکی مسکراہٹ جو میں نے بار بار شہزادی کے چہرے پر دیکھی تھی اور جس نے اکثر اتوں میں مجھے مسہری نہیں سمجھنے کی تھی۔ ہم دونوں اس پر جھک پڑے کبھی جگہ جگہ یا رے کو دیکھتے، کبھی ایک دوسرے کو شہزادی کی نظر میں غور، انتظار تھا، تجسس تھا۔ وہ سب کچھ تھا جو اپنے بہترین شاہکار کو دکھاتے وقت ایک کامل صنایع کی آنکھوں میں ہوتا ہے۔ وہ کتنی خیریں ”دیکھی تم نے میری تخلیق؟“

جلدیہ پھول تیس تیس محل میں کہاں نصیب ہوتا ہے تو بہاروں کا پھر ٹھہرے کھلی ہوا آواز ادا دفنا اور شمعوں کا سہیں، لالہ و گلاب، سنبل و بفسف کی آمیزش وغیرہ
وہاں کہاں نصیب ہے؟ میری آنکھیں بار بار اس تغزل میں جھٹکتی ہیں کہ ان دونوں میں ولربا نیت کس میں زیادہ ہے۔ ہلال میں یا بدر میں، غنچہ یا گلشن
میں یا گلاب تازہ میں۔

بچہ نے ماں کی خوشبو پاٹی، سوتے میں کھلایا، اس کے پنکھڑیوں جیسے لب کھلے اور اس نے ”اچی اچی!“ کہہ کر اوجھ کوٹ فی
حدھر شہزادی کا چہرہ تھا۔ اوہیں نے شہزادی کی چوتھی تصویر دیکھی جو بیشتر کی تینوں تصویروں سے بھی زیادہ دلکش تھی۔ اس کے چہرے پر ایک
سنہری لہر دوڑی۔ اس کی آنکھوں میں ایک برقی سی کوندی۔ اس کی کینٹری کی سبز مینز رنگیں سنیلیں اور پھیلیں۔ اور اس نے جھک کر بچے کے منہ پر منہ
رکھ دیا۔ بچے ایسا محسوس ہوا جیسے ان دونوں کے گرد ایک سفید بالہ بن گیا۔“

اس نے پھر مار مار کر گریٹ کیس کی طرف ہاتھ بٹھایا۔ میں نے جلدی سے سنگریٹ پیش کی۔ وہ دو تین لمبے لمبے کش لگا کر بولا
”نہت بہت دونوں سے کوئی اچھی سنگریٹ سنیں بی تھی۔ آج آپ نے پلاٹی تو شہزادی کے دیو یاد آ گئے۔“ پھر اس نے سنگریٹ کو فزوش پر لگا کر
چوڑ کر دیا۔ جیسے وہ پانی ان ساری بادوں کو خاک میں ملا رہا ہے۔ جو شہزادی سے ملاقات کے قبل دانی زندگی سے متعلق عقیدے۔ اس نے
ایک ٹھنڈی سانس لہری ادا کر دی۔

”ہم نے دو برس عجیب طرح کی خوشی میں گزارے کبھی ہم بھجڑیوں میں سوتے کبھی اپنی چوٹی سی راوی میں، کبھی ہم نے دشتوں کے
نیچے مڑے جابا کبھی ہم نے جنگلوں میں شاخوں پر لہیر کیا۔ مگر ہر لمحہ سرت سے ہریز تھا۔ ہر وقت مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ کام کر رہا ہے جس کے لیے
میری تخلیق ہوئی تھی۔ مجھے کبھی بھی مجاہدوں کے مجمع میں میٹھ کر اجنبیت نہیں محسوس ہوتی۔ میں نے کبھی ان کی سادہ و سفاک زندگی میں کوئی غیرت نہیں
پائی۔ انھوں نے مجھ کو اپنا لیا تھا اور میں نے ان کو۔“

جب ریاست کا کوئی جاسوس یا پولیس کا کوئی سپاہی نہیں ڈھونڈتا ہوا ان کی جانب آنکھتا تو ہمیں بہت پہلے سے اطلاع ہو
جاتی اور ہم کسی قریب کے جنگل میں کچھ دنوں کے لیے روپوش ہو جاتے۔ پھر ہم نے کبھی ایک ٹوٹی کے ساتھ ایک مامات زیادہ لمبہ نہ کیا۔ ہم
ان خزانہ دشتوں کے جس گروہ میں پہنچ جاتے۔ شہزادی ان کی لڑکی ہوتی اور میں داماد۔ ہر ایک ہمارے آؤ بھگت کرتا اور دل و جان سے ہمارے
غیرت پر مستعد دکھائی دیتا۔ ہم نے ان کے ساتھ ہندوستان کے مختلف حصوں کی سیر کی۔ لیکن شہزاد کے قریب پہنچتے ہی ہم ہندوستان میں زیادہ
کا ساتھ چھوڑ دیتے تھے۔ ہم جانتے تھے شہزاد میں پولیس کے اڈے ہیں اور ان کے پاس ہمارے سینے۔ پہلے ایک ریاست کو میری گرفتاری
کی فکر تھی اب دو ریاستیں میری تلاش میں ہیں۔ اس لیے آزادی کی زندگی دینا توں میں تھی، بہاروں میں تھی۔ شہزادی اور میں نے فرار کے وقت
اتنا کچھ ساتھ رکھ لیا تھا کہ وہ ہماری عمر بھر کے لیے بہت کافی تھا۔

وہ رنگ کر کچھ سہتا رہا۔ اس کی نظریں فضا میں نہ جانے کیا کیا دیکھتی رہیں۔ پھر اس نے لمبی سانس لے کر کہا ”بھالیہ کی دادی میں میری
پہلی ہالو سے ملاقات ہوئی تھی اونچی ٹوٹی کا سردار تھا۔ چھوٹا سا، گورا چٹا، خاصہ وجیر، سن تھی پولیس سے زائد نہ تھا۔ کاسے کا سہن پٹوں پر
اس کی چھٹی گلائی کیڑی اور اس کے کانوں میں سوسے کے مونڈ گول چھپے بڑے اچھے گلتے تھے۔ مجھ سے ملاقات کے وقت اس کے چہرے پر
مسکراہٹ ضرور تھی مگر آنکھوں میں کھلائی ہوئی آگ تھی۔ اس کا انداز بھی کچھ اکھڑا اکھڑا تھا۔ وہ غصہ اور وہ تپاک جو عام طور پر میرے معاملے
میں ہر ایک نے ظاہر کیا تھا اس کی بھی نمونے ہاں کی محسوس ہوئی۔ وہ بے موقع ہنس پڑتا تھا اور باتیں کرتے کرتے دفعتاً چپ ہو جاتا تھا اس

میں ایک اضطرابِ فکری کا شکار تھا۔ مجھے تعجب ہوا اور میں نے تنہائی ہو کر یہ سوچا کہ اس کا ذکر کیا کروں؟ وہ سب کئی اور اس نے بتایا کہ کسی زمانے میں ہم سے اس کا رشتہ تھا۔ بس شادی ہوئے والی ہی مطلق کرینج میں ہیں چنانچہ اور شہزاد کی زندگی کے کچھ حصے ہو گئے۔

میری محبت میں پہل دفعہ رقابت کا جذبہ بھی شامل ہو گیا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے ہاتھ پاؤں باندھ کر مجھے ناگ چھٹی کے انبار میں ڈال دیا۔ میں اس تکلیف سے بے چارے ہو کر ٹھٹھک لگا اور غصے سے منہ میرے قدم خود بخود تیز ہو گئے اور میں غصوں سے میلوں دور نکل گیا۔ میرے دماغ میں بس ایک چوٹی ہی چل رہی تھی۔ میری شہزادی اور منہ دینی میرے ناموس پر دوسرا بھی نظر ہو س ڈال سکتا تھا۔ میں شہزادہ تھا۔ دیسوں پشتوں سے ہماری بیویاں محلوں میں رہتی تھیں۔ وہی جو فخر پرستی کتبیں طبع پر ہنہ نہ دیدہ تمام آفتاب۔ اور آج ایک بنجارے کی بیہمت! مجھے یہ یاد نہ تھا کہ میں خود بھی اب بنجارہ ہوں۔ میں یہ قبول کیا تھا کہ شہزادی بنجاراں ہے جسے میرے ساتھ چھائی حضور بھی غوطہ لگاتے دیکھ چکے ہیں۔ میں یہ بھی فراموش کر گیا کہ میں نے واقعی شہزادی سے نکاح نہ کیا تھا۔ میرے ذہن میں یہ بات بھی نہ رہی کہ منہ دے اور اس سے صرف لگائی ہوئی تھی، معشوقہ اور محبوبہ تو یہی وہ میری ہی!

دل میں اٹھنے والے اس طوفان کے نشوون میں نہ تو مجھے اس کا خیال رہا کہ میں پہاڑ کے دامن میں گھوم رہا ہوں اور نہ اس کا دھیان رہا کہ وہ کتنام قریب ہے، میں ایک چٹان پر چڑھ گیا۔ ٹھوڑی دیر تو میں اپنے خیالات میں اس قدر غرق رہا کہ میں نے کسی طرف نظری نہ ڈالی۔ نہ دفعاً گھبرا کر دوڑ پر ایک لڑکھٹا بھگا، جس کا اس کو اہواز ہڈیوں سے ٹکرانی اور اس کی بازو شست سے ساری وادی کو جھنجھکی مینے۔ میں نے چوہک کر چہار جانب نظر ڈالی اسے سامنے بہت دور بھالایہ کہ برقعے ڈھکی چوٹی پر بڑھلتے آفتاب نے سنہری ملمع چڑھایا تھا اور بلند درختوں کے اوپر سے سبز سرسوں پر ایک زرتار گولٹ ٹانگ دی تھی۔ لہجہ بھوں کے لمبے گھاس والے میدان ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے کسی نے انھیں جھاڑیوں کو کھال سے ڈھک دیا ہے۔ چٹان کے نیچے جو کھرا غار تھا اور دشمن کی جگہ دھند لگا تھا اور اس میں سینے والے چنپڑے کی پانی کو تار کی نہ کامی بنادیا تھا۔ ہوا سرسبز تھی اور غنڈی، مغز دھڑبڑ تھا اور نہ صحت بخش، لیکن نہ جلنے کیوں مجھے کچھ ڈر سا لگے گا جیسے ہر چٹان کے پیچھے کوئی دشمن ٹھہرا ہے اور ہر تار ایک گوشہ میں کوئی حملہ آور۔ اور میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور میں نے اپنی جیب میں پڑے ہوئے ریلو کار کا گھوڑا پڑھایا۔ میری سانس کچھ تیز چلنے لگی اور میں چٹان سے جلدی جلدی اتارنے لگا۔ میرے پاؤں ابھی زمین پر پہنچے نہ تھے کہ دو فٹاس سے ایک تیر کیا اور میرے کوٹ کی آستین کو کھا ڈاتا ہوا پتھر سے جا ٹکرایا۔ میں نے اپنے آپ کو زمین پر گرا دیا اور دھڑ دھڑ نظر دوڑائی۔ مجھے کوئی نہ دکھائی دیا۔ مگر سرگرد کے فاصلے پر ایک جھاڑی اس طرح بل رہی تھی جیسے کوئی اس میں چھپا ہے۔ میں نے بے ہوشی ہو کر اسے کو نشانہ بنا کر دو فٹ کر دیئے۔ جھاڑی کا ٹانہ بند ہو گیا۔ میں تقریباً پانچ فٹ تک اپنی جگہ پر بڑا ہوا تاریکی میں سرعت سے بڑھتی جا رہی تھی۔ خیرہ یک راستہ میں نشیب و فراز تھے۔ دشمن سامنے کے مقابلہ کرنا نہ جانتا تھا بلکہ میں گاہ سے چھپ کر حملہ کرنا۔ میرے لیے ہر منٹ خطرہ بڑھتا جاتا تھا۔ اس لیے میں نے اسی طرح زمین پر لیٹے لیٹے جھاڑی کی طرف کھسکا کر شروع کیا۔ ہر لمحہ ہر محسوس ہوتا تھا کہ اب جھاڑی کے پیچھے سے کوئی نہ کوئی ٹھوکر مجھے دوسرے تیر کا نشانہ بنانے ہی والا ہے۔ ہر لمحہ جی ہی چاہتا تھا کہ حملہ آور کی ایک جھلک دیکھ لوں۔ اگر کسی کا نشانہ نہ بننا ہی ہے تو میں بھی تو اس پر وار کر لوں۔ اسی لیے جھاڑی جب کوئی دس قدم وہ گئی تو میں نے اپنی ٹانگیں کھینچیں اور تیز دوڑ کر میں جھاڑی کو چاند لگایا۔ اس جانب کوئی بھی نہ تھا، اب اس سے آگے ایک ٹیلے پر ایک سیاہ سیاہ سا جھانگٹا محسوس ہوا اور میں نے پھر فاصلہ کا خیال کئے بغیر نرک دیا اور اس کے نقاب میں دوڑا۔ مجھے یقین تھا کہ حملہ آور جاگ رہا ہے، اسے اس کا موقع نہ ملنا چاہیے کہ وہ اپنے حواس درست کر کے پھر کوئی ٹکین لگا دھونڈ سکے۔ اسی

میں بھی تیزی سے ٹیلے پر چڑھ گیا مگر ٹیلے کے دوسری جانب پھر کوئی نہ دکھائی دیا۔ راستے میں اب بھی کئی چھوٹی بڑی چٹانیں تھیں۔ وہ ان میں سے کسی ایک کے پیچھے چھپ کر دم سے سکتا تھا۔ اس لیے میں نے قریب ترین چٹان کی طرف رخ کر کے پھر فرار کر دیا اور ٹیلے سے ترکہ اس طرف بڑھا۔ جلدی اور تار بکی میں چھوٹا پاؤں پڑا اور میں مذکور کے بل زمین پر گر پڑا۔ چوٹ زیادہ نہ آئی۔ لیکن دم پھول گیا اور میں کئی منٹ تک بڑا پڑا اپنی سانس تابو میں لانے کی کوشش کرتا رہا اور میں نے سنا، کوئی مجھے پکار رہا ہے ”شہزادے، شہزادے!“ اور ساتھ ہی تیز دوڑتے ہوئے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔

میں چیخا ”یہاں! یہاں!“ اور میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا ایک منٹ کے بعد شہزادی اپنے مشکلی پر سوار وہاں آ پہنچی۔ اس نے پوچھا کیا ہوا؟ کس پر خبر کیا؟ ”میں نے کہا کہ گھریلو، پھر بتاؤں گا!“ اور ہم دونوں ایک ہی گھوڑے کی پیٹھ پر خیمہ تک آئے۔ راستے میں میں نے شہزادی کے اصرار پر اسے سارا واقعہ سنایا۔ وہ بالکل خاموش رہی۔ مگر جب میں گھوڑے سے اترا تو وہ اسی طرح اس پر مٹی رہی۔ میں نے سمجھا وہ گھوڑوں کے لئے گھاس اور دانے کا انتظام کر کے آئے گی۔ میں خیمے میں چلا آیا۔ مجھے ٹھنکی محسوس ہوئی جیسے میں بڑی منزل مار کر آ رہا ہوں، جیسے میں کئی راتوں سے نہیں سویا ہوں۔ میں نے ہنار کیپڑے بدلے اور عورتی دیر کے لیے اسی طرح سفری پنک پر لیٹ گیا۔ لیکن مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ دلخیزی اور جھڑپ میں لگا تھا کہ یہ کس نے تیر مارا۔ اس جھگڑ میں آباؤوں سے دور کوئی دشمن پیدا ہو گیا۔ کیا بھائی حضور کے جاسوس ہیں یا میری سسملال کے آدمی یہاں پہنچ گئے، مگر انھیں میری گرفتاری کی فکر ہوتی نہ کہ قتل کی۔

میں اسی طرح اٹھ رہا تھا کہ دفعتاً خیموں میں ایک شور سا ہوا جیسے بہت سے لوگ خوش میں باتیں کر رہے ہیں۔ کسی بات پر ہنسنے لگے ہیں۔ میں گھبرا کر باہر نکل آیا۔

سارے خیموں کی لائٹیں ایک دائرے میں بانس لگاؤں کا ڈھنگ لگا دی گئیں تھیں۔ کھڑکی کے ایک بڑے ڈھنگ کا لاؤسلنگ دیا تھا اور سارے بنگالے اس روشنی میں چمچ رہتے تھے۔ بیچ میں کچھ بوڑھے نونکے ساتھ بیٹھے تھے اور ان کے سامنے شہزادی چھری کھڑی تھی۔ وہ نونک کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہہ رہی تھی۔ میں ادھر گیا۔ میں نے سنا۔

”ہاں میں نے اس کی جگہ شہزادے سے شادی کی!“ میں اپنا ذکر سنتے ہی ایک درخت کے تنے سے جہاں اٹھ رہا تھا لگ کر کھڑا ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شہزادی آج اپنے بچوں کے سامنے کوئی مقدمہ پیش کر رہی ہے۔ میں بھی جانتا تھا کہ دیکھوں شہزادی کو اس قوم والے کیا کہتے ہیں۔ اس کا چہرہ سرخ تھا۔ وہ غصہ سے ہونٹ جھاد رہی تھی۔ اس کی بوٹی بوٹی ایک بجلی سی گوند رہی تھی معلوم ہوتا تھا کہ وہ ملاحظہ کر کر کسی نہ کسی پرگے گی۔ اور اسے خاکسار بنا دے گی۔ وہ کہہ رہی تھی ”آپ ہی سے انصاف چاہتی ہوں، اس کا اور شہزادہ کا کوئی مقابلہ ہے؟ صورت میں، شکل میں، ذات میں، بھانت میں، عورت میں، ہنرمیں، علم میں، یہ کس چیز میں ان کی برابری کر سکتا ہے؟“

مجمیع میں سے ایک بولا ”ہم خود شہزادے ہیں، ہزاروں برس ہم نے بادشاہت کی ہے!“

شہزادی پلٹ پڑی ”مردوں، مگر آج قوم اچلتے ہیں، بد معاش ہیں، شہروں میں جاتے ہیں تو پولیس ہماری نگہانی کرتی ہے۔ نہ ہمارے مکان ہیں، نہ ایک بادشاہت زمین، ہم پھرتے لگائے پھرتے ہیں اور غریب سے غریب آدمی بھی اپنے کو ہم سے اچھا سمجھتا ہے!“

ایک نوجوان خفا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا ”اگر کوئی ہمیں ذلیل سمجھتا ہے تو وہ خود ذلیل ہے۔ ہم جھگڑوں کے بادشاہ ہیں، ہم کسی کا دیا

نہیں کھاتے، ہم اپنا قانون خود بناتے ہیں۔“

ایک بوڑھے کے گھر سے ہر گھنٹہ کا دم چھڑ جاتا تھا۔ شہزادی نے ہمارے سامنے مقدمہ دائر کیا ہے۔ وہ کہتی ہے منو نے آج ہمارے
 حمان شہزادے پر تیر چلایا۔ وہ اسے مار ڈالنا چاہتا تھا۔ ہمیں سہیل نے کہہ دیا کہ یہ فیصلہ دے گئے۔ ا۔
 منو کھڑا ہو گیا۔ سب خاموش ہو کر اس کا منہ دیکھنے لگے۔ وہ نصف منٹ تک گردن جھکائے سوچتا رہا۔ پھر اس نے سر اٹھا کر مجمع
 پر نظر ڈالی۔ اور بولا:۔

”شہزادی کا الزام صحیح ہے۔ میں نے تیر مارا، اور مجھے بڑا تعجب ہے کہ وہ کیونکر بچ گیا۔ تم جانتے ہو میرا نشانہ کبھی نہیں چوکتا۔
 خیر!۔ میں تم لوگوں کا سردار ہوں۔ میں تمہارے فیصلے سے پہلے اپنا فیصلہ سنا چاہتا ہوں۔ میں شہزادی کے جیتنے سے مقابلہ
 کرنا چاہتا ہوں۔ تلوار سے، تیر سے، چاقو سے۔۔۔ جو ہتھیار اس کو پسند ہو اس سے!۔“
 مجمع میں ایک لہری دوڑ گئی، ایک شور مچا ہوا ”ہم سب کو منظور! منظور! منظور!“
 شہزادی چھپٹ کر سانسے لگتی ”مجھے ہرگز منظور نہیں۔۔۔ وہ شہزادہ ہے، وہ پستول، بندوץ جلا نا چاہتا ہے۔ وہ چاقو اور تیر کیا
 جانے، منو سے مقابلہ میں کون کی! میں!“

”چچا پو شہزادے کو اپنے گھارے میں!“ ایک نوجوان نے طعن کیا۔
 مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں لپک کر مجمع کو چڑھتا لاؤ گے پاس پہنچ گیا۔ ہر ایک مجھے حیرت سے دیکھنے لگا میں مساری تعلیم،
 سارا فلسفہ، ساری تہذیب، ساری ثقافت بالکل بول گیا۔ میں اس وقت بالکل وحشی تھا میں نے کہا:۔
 ”جیاجی! منو نے مجھ پر چھپ کر حملہ کیا، میں پرت گیا۔ میں اس کا کوئی قصاص نہیں چاہتا۔ میں نے اسے معاف کر دیا۔“
 اور تو چپ رہے مگر ایک بوڑھا بولی اٹھا ”یعنی رے کی بڑی بات!“ میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔
 کہا ”مگر منو نے اسی مجھ سے مقابلہ کی خواہش ظاہر کی ہے، میں اسے قبول کرتا ہوں۔ چھوٹے سے تلوار سے یا پستول سے، ان میں سے جس
 حربے میں وہ اپنے کو مایہ نفع بنا ہو، میں غماض کے لیے تیار ہوں!“

شہزادی چبھی ”نہیں! نہیں!“
 میں نے اسے ڈانٹا ”تم چپ رہو، عورتوں کے مجمع میں جا کر بیٹھو؟“
 جب وہ گردن جھکائے عورتوں کے مجمع کی طرف چلی تو میں نے منو سے پٹ کر کہا ”بتاؤ کس حربے سے لڑو گے؟“
 منو نے مسکرا کر کہا ”چاقو!“ اور جیب سے سگریٹ کی ڈبیہ نکال کر اس نے ایک سگریٹ جلائی۔ شہزادی کے منہ سے ایک دھڑکن
 نکلی گئی۔ ایک بوڑھے نے اٹھ کر کہا ”نہیں! نہیں! شہزادہ چاقو سے لڑنا کیا جانے؟“

ایک نوجوان غزا کے بولا ”شہزادی بخاری ہے، وہ اسے جیتنا چاہتا ہے تو ہمارے ہی حربوں سے لڑنا پڑے گا!“
 ”نہیں، نہیں!“ اور ہاں، ہاں، ”کا شورا تھا۔ میں جانتا تھا کہ منو اس فن کا ماہر ہے۔ سارے مجمع کا انداز تھا کہ اسے منو کی
 جیت اور میری ہار کا یقین ہے۔ مگر مجھے مطلقاً شوق نہیں معلوم ہوتا تھا۔ مجھے بچپن میں ہر حربے کا استعمال سکھا گیا تھا۔ لیکن جب اکو میں
 آپ سے عزم کر چکا ہوں مجھے کھیل کود، جنگ و جدل سے زیادہ مطالعہ اور کتب بینی کا شوق تھا۔ میں نے سوائے پستول کے کسی دوسرے
 حربے کے استعمال میں مہارت نہیں حاصل کی تھی۔ پھر بھی نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ تینوں کا میں ہی۔ منو منہ کے ایک گوشے میں سگریٹ

وہ اپنے مسکرائے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کی پیشانی پر پسیدہ جھلک رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی زردی دوڑی تھی اور اس کے تختہ چھیلے تختے ہفتے یا سہ ماہی ہوتا تھا کہ اس کا دل بڑے زور سے دھڑک رہا تھا۔ غالباً اس کی یہ گھبراہٹ میری میری خود اعتمادی کو مضبوط و محکم بنانے کی تھی۔ میں نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹ کے طرغدار نو جوان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:-

”میرے دوست نے جو کچھ کہا وہ بالکل ٹھیک ہے۔ مجھے شہزادی کے لیے اسی جہے سے لڑنا پڑے گا جو آپ کا قومی حربہ ہے۔“ معاً خیال آیا کہ نوٹ کی گھبراہٹ میں کیوں نہ اضافہ کر دیا جائے۔ جیب میں پڑے ہوئے پینتول کو میری انگلیاں بار بار چھو رہی تھیں۔ خود دینی نے بھی مجھے اپنی مہارت کی نمائش کی طرف اکسایا۔ میں نے جیب سے پینتول نکال لیا اور نوٹ کی طرف مڑ کر کہا ”میری پسند کا حربہ قویہ ہے“ اور ساتھ ہی ایک ذہن کر دیا۔ نوٹ کے منہ میں ہلکی ہوئی سگریٹ آدھی کٹ کر اڑ گئی اور پورا مجمع ہنسنے لگا۔ ”اے مارڈالا“ ”منو لڑا کھڑا کر کے لگا میں نے شکر کر کہا“ ”خود منو نہیں، میں نے سگریٹ کو نشہ نہ بنایا تھا، تمہیں نہیں“ ”وہ سنبھل کر کھڑا ہو گیا اس نے نوٹ کی ہوئی سگریٹ لبوں سے نکال کر دیکھی۔ پھر اسے زمین پر پھینک دیا اور اس کا داہنا ہاتھ تیزی سے کمر تک گیا اور اس نے وہیں سے چاقو نکال کر میری طرف پھینکا۔ میں اپنی حرکت کے رد عمل کے لیے تیار تھا۔ میں نے جلدی سے پیٹر ابلڈ لنگر میرے قریب ہی بغل سے ایک دوسرا چاقو سے گورا۔ چوہا میں دو نوٹ چاقو ٹکرائے اور دونوں زمین پر گر گئے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو شہزادی کمر پر دو نوٹ ہاتھ رکھے نوٹ کو غصے سے ہنسی ہوئی دیکھ رہی تھی۔ وہ دانت پس کر بولی ”شہزادے کے منہ میں کہاں سگریٹ تھی کہ تم نے نشہ نہ لگایا تھا تو؟“

مجمع کو ان جلد جلد ہونے والے واقعات کی سرعت نے بولنے کا موقع نہ دیا تھا۔ اب شہزادی کے سوال پر پھر ایک شہزادہ اٹھا۔ ”شہزادے نے بھی اس پر فریاد کیا تھا۔“ ”شہزادے نے اس پر نہیں سگریٹ پر فریاد کیا تھا۔“ ”جھوٹ ہے۔“ ”سچ ہے۔“ میں نے خاموشی کیلئے پھر ہاتھ اٹھایا۔ وہ چپ ہوئے تو میں نے پہلے شہزادی کو ڈانٹا ”اے یہ تمہیں پر مردوں کے بیچ حور توں کا دخل دینا میں اچھا نہیں سمجھتا۔ تم بیٹھ جاؤ۔“ اس کا منہ تنہا اٹھا مگر وہ بیٹھ گئی۔ میں نے مجمع سے کہا ”آپ لوگوں کو میرے نشہ نہ پرنسک ہے اچھا تو میرے نیچے سے تین موم تیاں لے آئیے۔“ ایک ان میں سے دو ڈکرتیں موم تیاں لے آیا۔ میں نے نوٹ کو اس بجائے سے ہٹوا کر ایک تپائی لکھوا دی۔ اور تینوں موم تیاں جلوا دیں۔ پھر ہر ایک کو اس جانب سے ہٹا کر میں نے اپنے مقام سے کھڑے کھڑے تین تپائی فریکے۔ جب تینوں موم تیاں بجھ گئیں تو میں نے کہا ”اب تینوں کو دیکھئے، کوئی کٹی یا ٹوٹی تو نہیں؟“ شہزادی سب سے پہلے ہلکی ہوئی دوڑی۔ اس نے تینوں تیاں اٹھا کر دکھائیں۔ سوائے تینتک کے کوئی حصہ نہ ٹوٹا تھا۔ مجمع واہ واہ کرنے لگا۔

میں نے کہا ”آؤ نوٹ، اب ہمارا تمہارا بخاروں کے حربے میں مقابلہ ہو جائے“ اور میں نے کوٹ اتار ڈالا۔ فیض اتار ڈالا، صرف شلوار پہنے رہا۔ منو نے اپنا کرتہ اتار دیا۔ تمہ کوٹ کر پھینک دی۔ وہ پہلے ہی سے جہت کا گھبراہٹ سے تیار تھا۔ دو بڑھوٹوں نے اپنی اپنی کمر سے دو چھڑے نکالے۔ ان کے وزن اور دھوکے کا مقابلہ کیا۔ دو نوٹ یکساں تھے۔ ایک چاقو اٹھوں نے مجھے دے دیا اور ایک نوٹ کو، مرد ہمارے گرد جلتے بنا کر بیٹھ گئے۔ جوتس اور پچھتے بیٹھے کر دینے گئے۔ جہت جلتے جلتے میں منہ واد حسن کا منو نہ تھا۔ اس کے ہاں مناسب اعضا بلا کا تھا اور چہرے کی گرفت پر بتائی تھی کہ وہ اس کے استعمال میں قدرت کاملہ رکھتا ہے۔ سچ عرض کرتا ہوں، میرے دل میں پہلی دفعہ ڈر پیدا ہو گیا۔ میں چھڑے کے استعمال سے بول بھی نہیں دانت کھینچ رہی تھی۔ میں اتنی امید دینی کہ میں ”جو جھڑ“ سے واقف ہوں، مجھے کوئی آسانی سے زخمی نہیں کر سکتا۔ اس وقت نوٹ کا کمر تپتی تپتی جسم دیکھ کر مجھے اس مقابلے کی نتیجہ کی طرف سے کھٹکا پیدا ہو گیا۔ لیکن قضا

کر یہ جذبہ بڑھتا مگر موت نے بڑھ کر وار کر دیا اور میں نے پیڑ ابدل کر اسے خالی دیا۔ وہ لوگوں کو اس سنجیدہ اور ہم دروں وار کرنے اور بچنے کے لیے پیڑ ابدل نہ سکے۔ میں نے چند ہی منٹ میں محسوس کیا کہ نوجس پھر تری سے وار کرتا ہے یا جھگڑا دیتا ہے وہ میرے ہاں مغفوق رہے۔ اگر آنکھ جھپک گئی تو پھر اسے اپنے کے پار ہو گا۔ معاً مجھے استاذ کا قول بھی یاد آگیا ”دست بدست لڑائی میں دشمن کے جسم کی حرکت نہ دیکھو، صرف آنکھوں کو دیکھتے رہو، وہیں سے تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ اس کا کیا قصد ہے؟“ اسی لیے میں نمو کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑے تھا اور اس کے ہر وار کو روکنے یا غالی دینے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔ مجھے خود وار کرنے کا اب تک موقع ہی نہ ملا تھا۔ ایک امرالبت میرے لیے باعث مسرت تھا کہ میرا جسم خشک تھا، میری سانس نہ بھری تھی اور نو پسینے میں نہا گیا تھا اور وہ تھکے ہوئے بیٹھنے کی طرح ہاں رہا تھا۔ غالباً نمو نے بھی اس فرتی کو محسوس کیا۔ اس لیے کہ وہ وار کرنے کرتے ایک دم پیچھے ہٹا اور بجائے اس کے کہ وہ پیڑ ابدل کر میرے وار سے بچے اس نے اچھل کر پوری قوت سے میرے سینے پر لات ماری۔ میرے ہاتھ سے چھرا چھوٹ گیا اور میں زمینی پر چپت کر پڑا۔ وہ اچھل کر میرے سینے پر سوار ہو گیا اور اس نے چھ پورا ہاتھ مارنے کے لیے چھرا تانا۔ میں اتنی دیر سے اسی موقع کی تلاش میں تھا کہ کسی طرح اس کا جسم میرے جسم سے مس ہو جائے اور میرا ہاتھ اس کی کلائی تک پہنچ جائے۔ موت نے وہ موقع مجھے اپنی حماقت سے دے دیا۔ اس کا چھرا میرے سینے میں پروست ہونے کے لیے حملہ آور سا پک کی طرح تیزی کے ساتھ چلا۔ میں نے بائیں ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی پر چپکلی دی۔ چھرا تو جھن سے جاکر دو درکار اور میں جو جسم کا چپک کر کے نمو کی پیٹ پر تھا اور اس کی دونوں کلائیاں میرے ایک ہاتھ میں تھیں۔

جی تو چاہتا تھا کہ اس کے دونوں ہاتھوں کی ہڈیاں توڑ کر میں نمو کو ہمیشہ کے لیے ٹوٹا کر دوں مگر میں نے عقدہ کو مضبوط کیا جاہل تھا، وحشی تھا، میری فح اس کو نہ لہل کرنے ہی تھی۔ میں نے اسی لیے وہیں سے بیٹھے بیٹھے بوڑھوں سے کہا کہ اسے نمونے بچے دو بار مار ڈالنے کی کوشش کی۔ یہ آخری حملہ میری اس نیت سے تھا میں بدلے لے سکتا ہوں۔ اک ذرا سی حرکت میں اس کے دونوں ہاتھوں کی ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی۔ لیکن میں اپنے کو اسی کی سطح پر نہیں لانا چاہتا تھا۔ میں اس کی چھرا بجائی سختی کرتا ہوں ؟ میں نے اٹھ کر میض بھی، کوٹ کندھے پر ڈالا۔ نمو کو اس کے دو ساتھیوں نے سنبھال کر اٹھایا۔ وہ اس کا منہ دھلا کر پانی پلانے کے لیے ایک طن لگے۔ میں نے ایک سگریٹ جلائی اور مجمع پر نظر ڈال کر کہا ”میں نے ہجراہ بننے کی کوشش کی، آپ لوگوں نے بننے نہ دیا۔ شہزادی یقیناً آپ کی بے حد میری نہیں ہو سکتی۔ ایک بار وہ مجھے چھوڑ کر چلی آئی تھی، آج میں اسے چھوڑ کر جاتا ہوں۔“

شہزادی چچ کر دوڑی۔ میں نے اسے ڈانٹا ”نرم محض نام کی شہزادی ہو، تم ان بنجاروں کی کٹھ ہو، میری نہیں! میں نے اپنے کو بہت گرایا۔ اب اس سے زیادہ نیچے نہیں گر سکتا۔“

اور میں نے جلدی جلدی اپنے فقرہ پڑھ کر کسی اور اس پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ شہزادی خوشامدیں کرتی رہی، ہجراہ بنجارین روکتی رہیں مگر میں نے ایک نہ سنی۔ شاید کسی پشتوں کی رو میں اپنے مفرد، تکنت، جلال و جبروت کے ساتھ میرے دل و دماغ پر اس وقت مسلط تھیں۔ مجھے وہ کہیں خیال آتا کہ میں حد درجہ رسوا ہوا میری بے انتہا ذلت کی گئی تھی۔ اس وقت شہزادی سے نفرت تھی، اس کے بطن سے پیدا ہونے والے بچے سے نفرت تھی اور اس پوری زندگی سے نفرت تھی جو میں نے اس کے عشق میں کاٹی تھی۔ اور میری دماغی حالت ایسی تھی کہ اگر کوئی اس وقت میرا تعاقب کرتا تو شاید میں اسے مار ڈالتا۔

میں رات دن سات روز سفر کرتا رہا۔ بس کچھ گھنٹوں کے لیے کسی چٹنے، کسی دریا کسی کنوئیں کے کنارے یا کسی ہرے عربے میدان میں سو رہتا۔ میں نے اس دوران میں کیا کھایا، کھئے اچھی طرح یاد نہیں۔ دو ایک دن تو جنگلی میوؤں پر بسر ہوئی۔ ایک دن ہسپتال سے ایک تیز تر نثر لکھ کر لیا تھا اسے آگ پر بھون کر بغیر نمک کے کھایا۔ ایک دن ایک مچھلی چٹنے میں پانی پیٹے وقت بہت آسانی سے ہانڈا گئی، وہ جھیل میں بھون کر کھائی۔ ایک دن ایک دیہاتی مسجد میں شب بسر کی، وہاں غازیوں نے اپنے گھروں سے لاکر کچھ کھلایا پلا تھا۔ مگر اتنا ضرور ادا ہے کہ میں نے اتنی بدلت تک شکم سیر ہو کر کبھی نہ کھایا اور نہ میں نیند بھر سولا۔

آٹھویں دن دیہات کے حدود میں داخل ہوا اور اسی شام کو اپنے محل میں — میں نے تمام کیا، کپڑے بدلے اور بھائی چھنور کے سلام کو حاضر ہوا۔ اور قبل اس کے کہ وہ کچھ فرمائیں، میں نے دست بستہ عرض کی ”میرا اجڑی دورہ“ ہو گیا۔ میں سزا کے لیے حاضر ہوا۔ ان کی مختصر بھری نگاہیں محبت بھری نگاہوں میں بدل گئیں اور انھوں نے مجھے سینہ سے لگایا اور مجھے ساتھ لیے ہوئے اندر آئے۔ وہاں بھی صاحبہ سے بھی میں نے معافی مانگی اور سرکار عالیہ سے بھی۔

اس نے کرک کہ پھر میری سرگیشٹ کو لپٹائی ہوئی نظروں سے دیکھا میں نے جلدی سے ڈبیا بڑھا دی۔ اس نے صہب معمول ایک سکرٹ حملہ کرتے ہوئے کھینچ لیا۔ اور ٹرا مل کر زمین پر پھینک دیا۔ پھر وہ بولا :-

”میں نے تقریباً ایک سال اپنی پھلی زندگی بسر کی۔ اب کے معمولات میں دو فرق ہوئے۔ ایک تو یہ کہ زہرہ کی جگہ اس دلس نے لے لی تھی جو دوسرے سے انتظار میں بیٹھی تھی۔ اس کا سن یعنی چاند کو شرما تھا لیکن اس کی محبت چاندنی کی طرح ملکی اور ٹھنڈی بھی تھی۔ اس شہزادی جیسی گرمی نہ تھی نہ تو بے حسی نہ تو بے ہوشی، اسی لیے پھر وہی شراب نوشی شروع ہو گئی تھی۔ سر تو شادی اور بے خودی کے لیے کچھ تو ہمارا چاہتا ہے تھا۔ دوسری بات جس شراب کی بالکل ضد تھی اس کی بھی میں نے عادت ڈال لی تھی۔ یعنی میں نے روزانہ ٹھوڑی سی ورزش کرنا اپنے آپ پر فرض کی طرح عائد کر لیا تھا، اس سے فارغ ہوتے ہی میں تقریباً ایک گھنٹہ چاقو کی لڑائی میں مصروف کرتا تھا۔ میں نے برصارت کے سب سے بڑے ہالک اور بوٹ جانے والے کو ملازم رکھ لیا تھا اور اس کی زیر ہدایت قدیم ہندوستانی حربوں کے استعمال میں مہارت حاصل کر لینا طے کر لیا تھا۔ اس ورزش سے میری صحت بھی درست رہی اور مجھ پر سے فوٹی کا زیادہ اثر نہ پڑا۔ عرض زندگی ایک ڈھیرے پر لگ گئی تھی، اور ظاہر ہے، نظر میں اس کا یقین کرنے لگی تھیں کہ میں شہزادی کو بھول چکا ہوں اور اس بے کیف ہموار طرز حیات کا عادی ہو چکا ہوں کہ دفعتاً ایک شب میں جب گیارہ بجے فلعہ معلیٰ سے اپنے محل واپس آ رہا تھا۔ ایک شخص میری موٹر کی روشنی میں دونوں ہاتھ پھیلانے راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ ڈرائیور نے موٹر روک کر پوچھا ”کون ہے؟“

وہ بولا ”ننوا“

میں نے اندر کی روشنی جلا کر جب دروازہ کھولا تو میں نے دیکھا کہ نوکے دولوں یا بھٹوں پر بیٹیاں بندھی ہیں اور اس کے چہرے سے وحشت چمک رہی ہے۔

میں نے گھبرا کر پوچھا ”میرا کیا بات ہے ننوا؟ کیسے آئے؟“

وہ ہانپتا ہوا بولا ”سرکار، شہزادی یہاں سے بیس میل پر میری ہے۔ اس نے بلایا ہے!“

میں نے نوکروں کو گھنچ لیا اور ڈرائیور سے کہا ”موٹر چھینک نکالے جلدی“

وہاں پہنچتی ہیں سے سنتری سے اس کی ہندوئی اور کاتوس کی بیٹی لی اور ڈرا بٹور کو موڑ رکھنے کا حکم دیا۔
جب ہم شہر کے حدود سے باہر نکل گئے تو میں نے منو سے پوچھا:۔
”لو کیا بیمار صحتی شہزادی؟“

وہ عجیب طرح ہنسنا ”بیماری“۔۔۔۔۔؟ بیماری، آپ کی ہمت۔۔۔۔۔! پھر وہ دھڑک کر بلا لا اسے کل بھڑپے کے لئے کاٹ لیا ہے۔ وہ مرد ہی ہے!“

میں نے جھلا کر نوگو گھورا۔ اس باجی کے لیے شہزادی کی موت ہنسی کی بات ہے۔
پھر میں نے ڈرا بٹور سے کہا:۔

”اور تیز چلاؤ!“

ہم کچی سڑکوں اور کھیتوں سے ہوتے ہوئے نفع گھنٹہ میں وہاں پہنچ گئے جہاں شہزادی پڑی تھی۔ اس کے جسم پر سفید جھاڑ ڈال دی گئی تھی صرف اس کا چہرہ کھلا تھا۔ اس کے چہرے کو جس کی تو تصویر فی کا مقابلہ وہ تصویریں بھی نہیں کر سکتی تھیں جو فنکار کے دلوں کو حمایت کا سرچشمہ بناتی ہیں، اس وقت بھڑپے کے بیٹوں نے جھانک بنا دیا تھا۔ ایک آنکھ چوٹ گئی تھی۔ ایک گال اس طرح کھا دیا تھا کہ جبر سے کی ہڈیاں دکھائی دیتی تھیں۔ نیچے کا ہونٹ تقریباً نثارو تھا۔ گردن کے پاس کا گوشت بچا ہوا تھا اور جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جو موجود نہ ہو۔ مزہ جانے کیونکہ وہ اب تک زندہ تھی گھنٹہ دو گھنٹہ ڈوبی پڑی رہتی تھی پھر بھی جب آنکھ کھولی تو ”شہزادہ! شہزادہ!“ کی رٹ لگاتی۔ میں نے کیونکر اپنے کو بچر کا بنا کر اس تک پہنچایا۔ اس سے باتیں کیں، مجھے معلوم نہیں میری آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ نکلا۔ بس اتنا ضرور محسوس ہوتا تھا کہ لگتا کہ کوئی میرے جسم میں چبڑے مارنا چلا جا رہا ہے میرا گوشت کھرچ کھرچ کر کاٹ رہا ہے اور میں بار بار کانچتا، بار بار منھیاں کس لبتا، بار بار اذیت پہنچ لیتا اور شہزادی پر جھکا ہوا اس کی دکھ بھری کمانی منستا۔ وہ لگ لگ کر کہہ رہی تھی:۔

”تم آگے شہزادے! میں نے تمہیں دیکھ لیا! میں تمہیں ہر دوسرے تیسرے روز محل کی جھاڑی کے پیچھے آدمی آدمی رات تک دیکھنے کے لیے بٹھتی رہتی تھی۔ تم قبول کتے تھے شہزادی کو! وہ اپنے شہزادے کو نہیں بھول سکتی تھی! گل میں جادوید کو بھی بے جا رہی تھی۔ وہ ”ڈیڈی! ڈیڈی!“ کی بہت دلوں سے رٹ لگائے تھا۔ میں نے کہا، اس کا منہ دھلا دوں، اچھے پیرے پسنا دوں، تب لے چلوں۔ اسی لیے پاس واسے منگل میں چٹنے پر لے گئی۔ بھڑپا باز جانے کہاں چھپا بیٹھا تھا جھاڑی میں۔ اس نے جادوید کو مزہ میں دبا کر بھاگایا چاہا! میں لپٹ گئی، اس نے پتھر کو خوب خوب کاٹا، ٹوٹا گیا اور اس نے مجھے پھالیا مگر میرا۔۔۔۔۔ میرا جادوید!“

وہ ایک بار جھنجھٹے ہاتھ میں لالال! کہاں ہے میرا چاند؟“ اور اس نے دو دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ ایک بوڑھی تنہا دی نے خون سے رنگین ایک پھیلا پڑھا دیا۔ مجھے پکڑ سا لگایا اور میں وہیں بے جان ہو کر گر پڑا۔

اس نے پھر ایک سنگریٹ اپنی اور سلی۔ وہ بوڑھی ورنیک خاموش بیٹھا جھومکیا پھر وہ بولا:۔

”میں اسی دن سے ان دو دونوں کی قبر کی عبادت کرنا ہوں اور پانچ پیسے روزانہ روشنی اور بارہ صرفت کرتا ہوں۔ پانچ پیسے سے زیادہ نہیں! لایے باجو آپ کے پاؤں وبادوں!“

اور اس نے اپنے مسو کے مسو کے ہاتھ میری پٹلیوں پر رکھ کر اٹھیں دیلا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے برت کی تاشیں زور زور سے

میری پنڈلیوں میں بلی جانے لگیں اور میں چمچ کر جاگا اور میں نے بے ساختہ اپنی ہانگیں زور سے جھٹک دیں۔ ایک سانپ پلنگ سے ملی ہوئی کھڑکی پر گرا اور تیزی سے نیچے اتر کر کھیت میں بھاگنے لگا۔ میں نے چھوٹے کر بندوق اٹھائی اور دو فیڑے لکڑہ اکٹھے کئے پتوں میں غائب ہو گیا۔

بچکے کا چوکیدار دوڑا ہوا آیا ”کیا ہوا باجی! کیا ہوا؟“

میں نے کہا ”کچھ سنیں جی، سانپ تھا!“

وہ بولا ”ارے صاحب وہی ناگ بابا ہوں گے جو اس کمرے میں رہتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں یہاں کسی کی قبر مٹی۔ انھیں نے سانپ کا روپ دھار لیا ہے!“

وہ تو جہات کی ایک پوری داستان سناتے کو تیار تھا مگر میں حیات و موت، خیال و خواب کے سلسلہ لافغانی پر غور کرنے لگا اور میری زبان پر تشاد کا یہ شعر آجی گیا۔

سی حکایت ہستی تو درمیان سے سُنی نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

صنم تراش کا خواب

ل - احمد

کون نہ کہے گا کہ قدیم یونانیوں کی نزاکت ذہنی اور عطر کے خیال ان کی اصنام پرستی کا نتیجہ تھی! یونان قدیم کے ذہن و ذکا کا بہترین ثبوت اور نمائش ان کی دیوتا ہے۔ دیوی دیوتاؤں کا ایک ایک کردار یونانی فکر و فراست کی ذمہ داری پر دلیل ہے! دیوتا کے علاوہ ان کا ادب بھی ایسی کہانیوں سے مالا مال ہے جو زندگی کے گونا گوں پہلوؤں کو روشن کرتی اور ایک نفسیاتی نتیجہ نکالتی ہیں۔ یہ کہانیاں بھائے خود ایک جبر و مالا بن گئی ہیں۔ دیوتا کا عقیدہ تو مانی ہی جائیں گی؛ ان میں سے بعض کہانیوں کو عالمگیر مشہوریت حاصل ہوئی۔ ادوان میں سے ایک صنم ساز کی کہانی بھی ہے جس کو اپنے ہی بنائے ہوئے بت سے عشق ہو گیا تھا۔ اور جس کی محبت یا قربت خیال نے اس مرمر پر یکہ میں جان ڈال دی تھی۔

مغربی ملکوں کے ادب میں جتنا لطف اور متولی پایا جاتا ہے۔ یونانی ادب ہی کا فیض ہے۔ میرے خیال میں یہ حکایت ایک نازک استعداد طویل ہے۔ اور کوئی صاحب ذوق اس سے خاص اثر لیے بغیر رہ نہیں سکتا۔ یہ حکایت جس پر داؤ سے پیش کی جا رہی ہے شاید اس میں کوئی قدرت نظر آئے!

گلیکین ایک صنم تراش تھا اور بہت دن سے ایک ایسی صورت گھڑ لینے کی آمادہ کر رہا تھا جو اس کی تمام پہلی مورتیوں سے بہت عالی و اشرف ہو۔ چنانچہ اس نے ایک پیکر مکمل کر لیا۔ اور آخری چھین چھال کر کے جب بات سے چھپنی ہتھوڑی دکھی تو قدرتی طور پر ایک جاذبہ کی نظر پڑی۔ ایک دفعہ اگھر سے نیچے تک نظر گئی تو وہ سبے اختیار مسکایا۔ ایک بچہ پہلی دفعہ بدی دنیا کو پا کر جتنا غرض ہو سکتا ہے۔ گلیکین کی یہ سرگاہت شاید دہائی ہی اضطراری مسرت کا نتیجہ تھی۔

جدا مشہورہ ایک بڑی سندھ اور سروپ مورتی تھی۔ ایسی مکمل کہ اس سے بہتر لفظ و نہیں کی جا سکتی تھی! کہا جاتا ہے کہ کونین دماغ میں بت تراش دیوی دیتا کی مورتی بنا کر پہلے خود پر جا کی کرتے تھے۔ گلیکین بھی اپنے بنائے ہوئے اس اصنامی پیکر کے سامنے سلاٹے احترام و پرستش کے گہرے جذبات پیش کر سکتا۔ اور اس کے سامنے ماتھا ٹیک سکتا تھا!

ہلیمان کے مکان کا وہ کمرہ جہاں وہ کام کرتا تھا۔ ایک ایسا صم کہہ تھا جہاں پتھر کی انگلی جو کپڑوں پر فرش پر الماریوں اور طاووس میں ہر طرف اور ہر جگہ، مرمر کی مخلوق آباد تھی۔ کسی کا انداز عقدر و غضب کا تھا تو کسی کا شان و درخشاں کی لکھی کا غرضی و شاندار کی کا تھا تو کسی کا رنج و فکر کا، کوئی مست عیش و مسرت تھا تو کوئی گیان و دھیان میں ڈوبا ہوا تھا۔ غرض آرزو مند صنایع کی حرمانی پتھر کے اندر جتنے خواب و کچھ سکتی تھی یہ مستان ان خوابوں سے معمور تھا اس کا یہ نگار خانہ پتھر کی ایک کان تھی جو زندہ تھی۔ زندگی سے معمور تھی یا شاید اس کا جذبہ خلقی۔ —

ہمیشہ قوامدانہ ہے۔ اس بات کا زور دے کہ وہ کسی اور کو اس کمرے میں داخل نہ کرنے دیتا تھا۔ کوئی اگر اس پیکرستان کو دیکھ پاتا تو وہ یا تو پستیش کرنے لگتا یا کھنکھاتی جینی! اور ہلیمان یہ دونوں باتیں برداشت نہ کر سکتا تھا اس کمرے کے اندر تو اس کی روح برہنہ پڑی تھی! گھر سے ہونے اور انظر سینہ پتھر کے ٹول اور سیس۔ کوئی چھوٹی کوئی بڑی۔ کوئی ٹیڈی کے قریب اور کسی کا پس ڈول نکل پڑا۔ ہر طرف بھری ہوئی تھیں لہجے کہ مبہم اور بے ربط خیالات کا جھوم تھا۔ ایک سل میں بیٹی ہوئی عورت، پہلو اور کولے کا مرت علم ہی گھڑائی تھا۔ دوسری میں صرف سینے کا اچھا رہی نکل پایا تھا۔ مرد و ہلیمان اگر دیو کی طاقت و درگت میں جنس جاتا اور اس وقت اس کی بیٹی پر نکاح پڑتیں، ایک عجبے کی پیشانی پر دیسی ہی ششیں منور تھیں۔ ایک سل پر ابھی صرف گہری دھاڑ پڑی تھی۔ جس سے خیال ہوتا تھا کہ ہلیمان نے اس پتھر کے اندر زندگی کا انداز پیدا کر دینے کے لیے دود کے چھوڑے چلائے ہیں بخیر یہ کہ جھین ہتھوڑے کی کے پہلے دن کے کام سے لے کر مکمل عورت جھنک، ہر دے کے منے موجود تھے۔ اور ہلیمان کے عقور و احساس کی جاگشی کا منجم انبیا معلوم ہوتے تھے؛

ایک ہی گل سنتاں، ایک ہی خاندان کی نسلیں، یہ تمام جھتے، یہ امانی مخلوق، ایک ہی جذبے اور شو کے رشتے میں بندگی تھی۔ اور ان کے اندر اچھوتی گونا گونا کچھ جڑے مثال تھا! گھڑیا کے ایک بات میں آئینہ ہے اور اس کا پھول کی گلی سا چہرہ اس آئینے پر چھلکا ہوا ہے۔ وہ اپنی ہجڑی اور "ک" لاکھ ہڈیوں کو دیکھنے میں کوئی ہے۔ ہلیمان کی جانب دستی شانے پر گھلنا کی گالی کی تحقیق نہ انکھن کا حال سنا دیا تھا! گھڑیا کے نازک و بک پاؤں ہاؤں جو درختوں کے پڑھوس ہوتے تھے۔ اس کی بانہوں کا گلاز ایک دعوت تھی کہ ان کے پھندے میں پڑ کر جان سے دینا ہی سواچ ذہیت ہے!

یقین و مسرت کی آخری نغمہ زوال کر سکا ہٹ منہ نہیں کی جا سکتی تھی۔ اسی حالت میں ہلیمان نے اپنے اتوں کو دیکھا۔ سینہ زور کی ایک نہر ہم گئی تھی۔ لیکن ہلیمان کا یقین کمرانی اس ہجرت سے بدل گیا کی کہ نہیں اتوں سے پتھر میں جان زوال دی ہے؟ اب اسے اتاد تھا کہ انسانی عظمت اور دوست کا ہی دیوتاؤں سے حسن کا۔ انچھین کے سکتے ہے!

جس ساعت میں ہلیمان کے دل میں یہ یقین پیدا ہوا کہ اس کا بنایا ہوا جبر مکمل ہے۔ ایک شکار ہے۔ بت توشی کا اجماز ہے تو وہ ساعت کچھ ایک الہامی ساعت تھی۔ اس نے اپنے نفس کو دھکا نہیں دیا بلکہ اس کا وہ یقین الہامی تھا۔ ہلیمان کو وہ مرتے بھی یاد آئے۔ جب وہ کوئی پیکر مکمل کر کے اس کے اندر اپنے احساس و خیال کو دم توڑتے دیکھتا تھا۔ جب وہ اپنی آرزوؤں کو جان کنی کی حالت میں دیکھتا تھا جب کسی ہلیمان اپنے بنائے ہوئے عجبے کو اپنے خیال و فکر سے باطل متنازع دیکھتا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے تھے۔ نالامی کا احساس صفے میں جل جاتا اور ایک وہ بت نکس دھواگلی میں بند ہو جاتا تھا!

مرمرستان کی دھوا اور اچھوتی آبادی کے اس جھوم پر شام کی اداس نغمہ جھانے لگی۔ لیکن صم آباد کی مرمریت و عذرت کے مطلوب

جو ہانا چاہتی نہ تھی۔ اسنام کی سفید رونق پھیلے ہوئے دھندلے سے مخمور کرتی معلوم ہوتی تھی۔ اور جب دیواروں پر شاہ کو رنگ بھر گیا دُش پر اجالا ہی نظر آتا تھا۔ اُداس دھندلے میں سفید پیکروں کی عربی نیا دہ شاندار اور دل کش محسوس ہر نے غلی تھی۔

اس وقت گلیان اپنے صم کو لے کر مرہین بیرون میں ایک ایسی دھڑکی نڈکی محسوس کر رہا تھا۔ جیسی پہلے کبھی محسوس نہ ہوئی تھی۔ نو بجے سوئی کی فضا نے انسانی ہڈوں کے اعضاء کو شہاب کے ٹکے رنگ میں ڈال دیا تھا۔ اور آخری کون ان کے بونٹوں اور سینے کے بوسے پر اکری رہی معلوم ہوتی تھی۔

گلیان کے اس نگارستان کے سمندر کو کن مارا نیا دہ دُور نہ تھا۔ سمندر جہاں نہرو کا سبہ پروہ اچھوتا پن۔ اس کی مریاں غصت مکاریاں ہے۔ اس مکان سے قریب تھا۔ اور اس وجہ سے سمندری موراؤں کے ساتھ ایک خوش آئند و گرا افتر کی لاجی سامان سے اندر داخل ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ جنش شام میں ہر کے گلور سے ایک جذبے کی ترکیب تھے۔ فضا کی یہ ہارو گری گلیان کے احسوس مسرت۔ پر اچھ جرج چلی گئی۔ کہ اس نے انتظار کی حالت میں کئی تھانے پر سبز قدموں کو چوم لیا۔ اور اندر سے دھڑکتے سر کو اس کے محسوس اور جھڑکتے زانو پر دھکا دیا۔ پھر اپنا ایک جھنجھٹے کی جوتی پر کھڑا ہو کر اس اصنی ہی بلور سے جوت لیا۔ اس کے خوش بونٹوں کے بوسے بیٹھے تھے۔ جوت۔ کے پہلے شمار ہوئے !

پھر جب ردمل ہوا تو خود سے بھی شرمایا۔ لیکن اس کی شرم سے ٹھیک ہوتی آنکھوں نے کہا کہ وہ جوت نہ جوت ہے نہ نہ کہ وہ گلیان کے دو کپڑے لگا اس پیکر میں جو تان پڑی تھی ! وہ مسرت تو متحرک محسوس ہوتا تھا ! اس کے سیدھ ہوں میں نہ تھی کی تعبدا تھی ! اور محاب کی غلی کی مانند چرسے سے لے کر پاؤں کے ناخن تک میں نڈکی کی پس روگ۔ تو محسوس ہوتی تھی ! اس طرح مریستی کے اندر نیا دہ سانس فوٹن ہے۔ باطل اسی طرح گلیان کے سینے میں نڈکی کا عطا ہوا قمرچ تھا ! اور جاتی دنی کون کی دم نہ تھی میں کہ یہ کی ہلکی پھلکی جھلکے نہیں کسی خوف سے۔ نہ نہ نہیں شہر نڈکی کے ڈرے !

گلیان یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اور اس کے دل میں نہ کہ لا تہ رہ بھی نہ تھا ! اب وہ کھاتے کے جسم کوہ جسم نے پہنچے کو۔ ایسے جگے بات سے چہرہ رہا تھا جیسے ہاں کا بات کسی نازک پھول یا پارسے کو سینے میں دم جو ہا تہ ہے۔ اب گلیان کے جسم میں نہ پتھر کی سختی تھی۔ اور نہ اس میں وزن محسوس ہوتا تھا ! مرہین میں رہنے پر نے ہالی سیسے سیاہ ہو گئے تھے جیسے بات نے ان کو رہا لیا ہوا ! آنکھوں کے اندر اس چمک تھی۔ جیسے سمندر کے اندر سورج چمکتا ہے۔ لیکن گلیان اب بھی نہ کہ تپ تپ تھی ! کہوں ؟

اس سوال کو ابھی گلیان اپنے ذہن میں دہری طرح قائم کرنے رہا تھا کہ ابھی ایک سکرا دی۔ اور موراؤں سے اس کے پہرے پر جہاز کا سا روپ چھایا ! معمونا نما ملازمت اس کا مات پڑتا۔ اور گلیان کے باروں سے کھیلنے لگا۔ کا ذری علم ایسی اٹھی سے اس نے گلیان کی ہلک نکالی اور ہنس پڑی۔ ایک کتبہ ہوتی ہی ہنس جس کی تشبیہ محال ہے !

گلیان نے نہ نہ جانے اس سے کیا کہہ دیا کہ اس کو گھننے کے پہلے گلیان کی جوت پر پڑتی ہے ! ایک ہال سا پڑنے نڈکی کی یہی ناگواری کا احساس ! اور پھر ایک نازک سی لاجی ! ایک غنیف سی تکان میں مبتلا دکھائی دی۔ ادنی سکون میں پڑے رہنے کے مخا بلے میں نڈکی ہی تھا دینے والی چیز !

جہاں پہلی با گلیان نے اپنی صداوت کے شہاد میں جان پڑتی دیکھی تھی تو کچھ ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے اس کی ہر ہیر کی کمانی

چھینی جا رہی تھی! اور اس سے اس کی حالت نہایت ناخوش ہو گئی تھی۔ گلابیہ کے گداڑوں کو راحت اندوزی کے انداز میں پڑا دیکھ کر اسے ایک نوع کی حیرت تھی۔ گلابیہ کے دوڑوں ہاتھ پہلی کی شکل پہنے سینے پر رکھے تھے۔ آٹھوں میں نیند کا درد مچھا تھا، اور گلابیہ کے اندر چھینے کی یہ نشانیاں اس کو ایک دیوی کے بدلے گوشت پرست کا ایک انسان بنا رہی تھیں۔ جو محبت کی تلاش میں اداس ہو گیا ہو!

مقدسات کی یہ پیش بینی تھی کہ گلابیہ کی ذاتی تخلیق معمولی مٹی سے نہیں بلکہ چھوٹے اور پاکیزہ مرمے سے ہوئی! اور تخلیق کائنات کے وقت جو صورت و حالت دی ہوگی۔ اس وقت گلابیہ ان اپنے اندر کچھ ویسی ہی الوہیت محسوس کر رہا تھا۔ اسے یہ فخر آمیز احساس تھا کہ اس بہتی لڑکھنوی کو خدا اس نے تخلیق کیا ہے، اس کا خالق وہ خود ہے!

گلابیہ ابھی تک بہتی جاگتی تصویر تو تھی مگر منتی بولتی صورت نہ تھی۔ ہر بات سے بے خبر اور ہر چیز سے نا آشنا! اسے تربیت و نگاہ تھی، اور گلابیہ کے سوا اور اس سے بہتر مقلد و ناواقف کون ہو سکتا تھا؟ چنانچہ جب اس نے یہ ذمہ داری اٹھائی تو گلابیہ ان اپنے جذبات کو صاف طور پر سمجھ نہ سکا۔ لیکن وہ اپنے اس نئے مشغلے سے بہت خوش تھا۔ اسی میں سرشار رہتا تھا، وہ اس مہربان بیکر کے حساس و جذبات کو تو نہیں سمجھ سکتا لیکن اب اس کی سادہ دہلیز میں انسانی اچھا دہلیز چھپنے لگی تھی!

وقت گزرنے کے ساتھ گلابیہ کو اب اپنے خالق کے نگار خانے میں مہربان سوں اور نوروں کے درمیان چلے رہنے سے اچھن ہونے لگی۔ سنبھل پھر کی چوکی پر بیٹھ رہنا، وہ دیکھ معلوم ہوتا تھا۔ وہ جب انسانی چوکی پر بیٹھی تو جسم اور مہر مرل جلتے معلوم ہوتے تھے اور شاید گلابیہ کو ابھی وہ صحت لی سی یاد تھی کہ مہر اس کا فطر اصلی ہے! مہربان غفلت اور اچھوتے پن کے اندر سے بیدار ہونے کا تھکا دھکا تھا، مگر غلط گلابیہ کی حیرت میں اضافہ کرتی، یہی تھی کہ ایک خواب کے مجسم ہوجانے کا معجزہ کیونکر رونما ہوتا ہے! اساتے کھڑی ہوئی گلابیہ محمودہ بہال بن کر گلابیہ ان کے سارے جذبات نیا نش و پرستاری کا مرکز بن جاتی، اور گلابیہ ان کی روت اس کے ہاتھوں پر رونے لگتی اور جب گلابیہ کسی سوچ میں پڑ جاتی تو اس کے چہرے کی صاحت پر ہاتھوں کے سائے پڑتے اور اس کے خیالات معلوم کر لینے کی آرزو میں گلابیہ کو دم کھٹنے لگتا!

اس پورے نائنے سے پیسے گلابیہ ان نے جتنے مجھے بنائے اور گھر سے تھے، ان سب کو محنت و ایگان سمجھا رہا۔ لیکن اس موت کو گھر لینے کے بعد سے، سے ایک مہموم خدائی نامہ مفتاحی کا شہید احساس ہونے لگا تھا۔ وہ خود خالق ہے اور گوشت پرست کی مخلوق پیدا کر سکا ہے! کسی وقت وہ اپنی پہلی اور پرانی حالت و کیفیت یاد کرنے لگتا تھا۔ کبھی نازل نہ ہونے والے ابہام کی آندہ میں بند ہو کر آگے بڑھا، دلوں کو ناقابل تہجد آئینہ بنایا، سام دیوا میں بسنے والے کی آمد اس تنہائی اور مروجہ طرز صبح کی تنہا رشتگی گلابیہ ان اپنی اس تمام ابہامی خودیت کو سرا و مقربیت سمجھتا تھا، لیکن آج وہ پرانی خاتون اور کیفیتیں اس کے خیال میں سرا و عقربہ بنت نہیں رہی تھیں۔ اس لیے کہ ایک عمر کا کام رہنے کے بعد باقافہ تحقیق کر سکا، اپنے دست و بازو میں۔ قدرت پانا اور خدا بن جانا اس کے خیال میں مدت نہیں مل سکتا تھا۔

لیکن جب بھی گلابیہ ان خیالات میں کھوجا کرتا تھا۔ اس کے ہر ساروں پر آئینوں کے نشان کو خود اوجھلتے اور چہرے پر اٹھا کی وہ کیفیت بیدار ہوجاتی تھی جسے مذہبی زبان میں دعا مانگ کہا جاتا ہے۔ اس وقت بھی اس پر وہی کیفیت طاری ہو گئی اور گھٹوں

کے بن چمک کر اس نے غلٹیا کی بھری مہری راولوں سے اپنی ہاتھیں پیٹ لیں۔ اور محسوس کیا کہ گھٹیا کی جتنی سے ایک جہاک، ایک نہانی، جہاک نکل کر نذر دوستی اس کے آؤدہ اس طرح چھائی جا رہی ہے۔ جیسے نثر چھانے لگا ہے۔ اچھائی نہ سوچنے لگا۔

”میں نے اس کے ہوتے، جیسے، جی بھر کے ہوتے، جیسے اب اور کہا جا رہا ہوں؟

ہماری فطرت، دوکانہ فطرت پر قابو پا بیٹھے اور منصرف ہو جانے کی ہیما نہ خواہش

جس کا دوسرا نام مردانہ کمزوری ہے۔ ہماری پاکیزہ ترین حالتوں میں بھی ہم سے

الگ نہیں ہوتی اچھی۔ جتنی ہے؟

ایک دن شام کا وقت تھا اور جذبات کو اس واسطے دلے کینیات کا اٹھ چھایا ہوا تھا۔ گلابی کی تپنیاں پھیل گئیں اور اسے انسانی عجائبات کی محبت چیز اور اس کی مذہن کا احساس ہوا۔ جذبات محبت کے دھبے میں بہہ جانے والی ہستی، عورت، کی ساخت میں اس کے جسم کی بناوٹ میں کوئی اضافہ نہ تھا۔ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے اندر بغیر و تقف کی یہ دیوانگی، اس کی آہیں اور انہر۔ راقوں کی کلابہ نہ سناہیں اور نہ زپل اور دن پسند سخاوت و خشکی، یہ سب کچھ اس کے ساتھ کیا اس کے جسم کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ یہ کام کبھی نہیں اس کی ہستی کا جزو ہیں!

ہرم اور محبت کے یہ دو دیو نے سمندر کی ہر گھڑی برسنے والے مناظر سے دودھ، بچوں کی سی تھوہرت میں اخبار جذبات و محسوسات کرتے رہتے تھے۔ محبت کرنے والوں کے وعدے اور تمہیں جو ہر مہم میں ایک دھمکتی ہیں۔ وہ ہرگز کی جاتی تھیں۔ شاید اس طرح وہ محبت کی کامیابی سے خیال کو محو و فراموش کر رہے تھے۔ سمندر کی ہر وقت بے چین موجیں مذہن کی حقیقت سمجھتی رہتی تھیں لیکن محبت میں نصیحت پر کس نے ان دھرا ہے؟ وہ مذہن کی قیاس مدت پر دھیان دیتے تھے۔ مذہن محبت کی اہمیت پر

شک کرتے تھے!

لیکن اس کے وجود و گہنیں اپنی دل کی اندیشہ مذہن است کو، اپنے احباب اس خوف کو گلابیا پر غماہر نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے دل میں دوسوں نے گھر بنا لیا تھا۔ اور وہ سوچتا رہتا تھا۔

”اوہ۔ اسے خود اس پر دھک لگایا، تو ہر چند پاکیزہ طریق سے پیدا ہوئی۔ تیری اصل لطیف و نفیس ہے، لیکن اس انسانی جسم میں تجھے لہانے دوام نہیں۔ تو میں فانی بن گئی ہے۔ اور ایک دن تیرے گھر دل کی غذا بن جانے والی ہے! ہر چند میرے سارے خواب اہمیت کے خواب تھے! انہیں سوچوں میں گھٹایا میں تیری ہستی میں جھول جاتا ہوں کہ میری بنائی ہوئی چیز پر دوسرے کے بنائے ہوئے قانون کا انفاذ کیوں ہو؟ خدا کی قدرت ثابت کرنے کے لیے وہ گلابیا جو میری نیکی ہے۔ موت کے قانون کی پابندیوں بنا دی جائے؟ اور اگر یہ قانون بدلا نہیں جاسکتا تو گلابیا ہیں چاہتا ہوں کہ قدرت اپنے قانون میں بس اتنی تبدیلی کر دے کہ دو دو سال کا اثر تیرے آؤدہ نہ ہو اور اس کے بے میں مجھے آج ہی فنا کر دیا جائے! اوہ، مگر گلابیا، غلطی تو میری ہے۔ میں نے تجھے محبت کرنا کیوں سکھایا؟

محبت کی گھڑیوں کے ہر گاہ جاتے ہیں۔ زمانہ تیری سے گزرتا گیا اور وہ وقت آ پہنچا جب دو غنائی انسانوں کی محبت ہندی کے آخری نقطے تک پہنچ کر اپنے ہر دل کو محبت یعنی اور اس ہندی سے اترتی نہیں، لگتی ہے!

وہ وقت بھی آگیا کہ ایک۔ ان گیلیان نے شدید صدمہ و ادم کے ساتھ محسوس کیا۔ شیعہ و ب کا محمدؐ کو بھی، خوبی کی گداؤں کا بھی مرہا بھی ہے۔ گیلیان نے اس کی آنکھوں کے گوشوں پر بھی بلی جھڑپاں پڑتی دیکھی، لیکن انسانی بنیاد پر اہم حقیقت کی طرف سے انھیں بند کر دیتے ہیں۔ اور گیلیان نہ صرف ایک انسان تھا۔ بلکہ دل گرفتہ محبت بھی تھا؛ اس نے خود فریبی کا سہارا لیا۔ جو دیکھا تھا اسے، ان دیکھا سمجھا اور لکھتا کہ جو بھون دشمنی کی طرف سے، انھیں بند کر کے اپنی محبت کی مر کو چند سے طویل کر لیا، لیکن وہ انسان اور عاشق ہونے کے ساتھ ایک، سناٹ بھی تھا۔ اور اسی گرفت تھا۔ جو بھری چٹان کے اندر سادی حسن و اہل کو دیکھتی تھی۔ کیونکہ ممکن تھا کہ وہ اپنے آپ کو دنیا و دنیا پر ملک و حوس کے میں رکھ سکے؟ انہما سے زیادہ مدت، اس نے غفر نہ پراساں تھا۔ اس کے خوابتوں میں صفت میں صفت ہی مکر و ماہ پن نظر آتے تھے۔ لکھنے کے سوتے روپ پر جب اس کی نظر پڑتی۔ جب وہ اس کے ہمال نویدہ کو دیکھتا، تو نہ لڑکی کے بوجھ کی تمکین کے آثار صاف دکھائی دیتے اور اس منہ کو دیکھ کر گیلیان، یوسی کے سمندر میں ڈوب رہا تھا!

لیکن گلیا خود اس حقیقت سے بے خبر اور باطل ہے پرواہ تھی۔ اس کی موتی، ب بھی بوسوں کا تقاضا کر رہی تھی وہ اب بھی ایک۔ سوسے ہوئے بچے کی حرت پیار اور، ذلتیں مٹی تھی؛ ہر چند اس کی جوئی کو مدد اپنی خواہش اور، دعا کو آسمان تک اڑ چکی کہ دیکھنے کا اشارہ کرنا محسوس نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ مکان جو ہر شے کو افسردہ کر دیتی ہے۔ انسان کی نظر اتنی تھی!

نواں حسن اور انجام بہتی کا خوف کہ احساس گیلیان کو مایوسی کے نایاب گرسے میں چلیکا جا رہا تھا، وہ اپنے صحنہ خانے کے کونوں میں منہ چھپا کر، آسو بہاتا اور ہر وقت سوچ میں ڈوبا رہتا تھا۔ اور جب حاکم صلیب جو ب دے دیتی تو دل میں اس باتیں کہنے لگتا "تھو تھی، تو نے مجھے سب کچھ دیا، وہ متر میں اور وہ اذیتیں دیں بن کی یاد میں آدمی کو سر نہ رکھ سکتی ہے! اگر جس حد تک وہ غم و غم انسان کو افسردہ و مضطرب کر دینا ہے۔ اسی حرت خوشی و مسرت بھی تھکا دیتی ہے!

"گلیا، مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ خواب جسم اختیار کر کے خود مر جاتے ہیں، پہلے جیون یا نہ مر جاتے ہیں! ان میں نے تیری تمکین کی، مگر تجھے بتا کر میں نے جو حقیقت قائم کی وہ اونٹنے تھی۔ نہ تو اس سے ہے۔ ادنیٰ حقیقت، اس کو تو ابھی ہونا چاہیے۔ سو روپ کو تو امر ہونا چاہیے!"

"گلیا، آج میں تجھ سے محبت بھی کر رہا ہوں اور تمکین بھی ہوں۔ پریم کرنے کے ساتھ دیکھی بھی ہوں، اور اس طرح دوسرے غلاب میں جتا ہوں۔ ایک انہونی بات اور ایک انسانی خواہش کی کشاکش کے نتیجے میں پیس گیا ہوں، انہونی یہ کہ میری جان محبت ایک روز زندہ نہ ہوگی! اور خواہش اس کی کہ تو اپنی تمام جہاں آ رہیوں اور شمس سامانیوں نے ساتھ لانا ہی بن جائے اور میں اس کے اندر سرور ہوں!"

ایک دن گیلیان دوبارہ آتا اور بات پیچھے ہوتے تھے۔ وہ خالق کو کرات پھیلنے دے دیا، مگر دیکھا اور سمندر سے ایک آواز آتی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ صدا حضرمین و منتخب دن و دماغ کے لیے محبت کے نغموں کا معبرہ رکھتی ہے؛ اہل گیلیان کے جہاں میں ایک پھر یہی آئی اور اس کے ذہن میں سے اور پرانے لغزات پیدا ہونے لگے۔ اب وہ نئی تمکین تراشنے کی آواز دے رہا تھا؛ لیکن اس کی یہ نئی حالت چند روز تک رہی اور پھر وہ شوق تھکا پڑ گیا۔ جوش اور دلہنے کی بنا، پھر تھکن اور اشد کی نئے سے لی!

رفتہ رفتہ وہ وقت بھی آگیا کہ پگلیان فن و صنعت کو بھی مکر و فریب سمجھنے لگا۔ اسے یقین ہو گیا کہ نعت فرب محض بے لید نہ کہ وہ محبت کے جذبہ کو ناکردتی ہے۔ محبت کی جڑ نرو چھین لیتی ہے! صنعت اب اس کی نفوس ذہن کی خدائی اور فطرت کا قید خانہ معلوم ہونے لگی! ایسی داہم پرستی مغرائی جو صرت غلام فطرت انسان کے لیے ہی مناسب ہو سکتی ہے!

فن و صنعت سے اس طرح بیزار ہو کر پگلیان اعلیٰ اپنے جذبات کے باتوں میں گھرا بن گیا۔ ستم سازی سے ہات اٹھا ہلا اور خواہش آرزو کے۔ نئے نئے مجسمے بنانے لگا۔ کسی وقت اگر گھڑیا کی انجینیں بھی نظر آتیں تو پگلیان دل سوڑی کے جذبے سے تڑپنے لگا۔ مگر ہمہ گیزا اس کی حالت کو باطل نہیں کرتی تھی۔ پگلیان کے احساس کی نزاکت اور بے نیکی گہرائی کا سمجھنا اس کے لیے ممکن نہ تھا! عورت اور مرد کی تخلیق ہونا اسی عنوان پر ہے!

پگلیان جب اس سے باتیں کرتا تو ایسی ذہنی اور ملاحظت سے مخاطب کرتا جیسے بچوں کے خواب کا تانا بانا جانی اور نازک ہڈی بے سمجھانے کے لیے اس سے کہتا۔

"پیادری گھاتی، تجھے معلوم ہے کہ پتہ کی موتیاں گھڑیا میری زندگی کا شغل رہا ہے۔ لیکن ہزار احساس سے مجھے تو نے متعارف کرایا۔ سینے کے سنی مجھے تو نے سکھائے۔ اس لیے جب میں تجھے بکیرہ وطن دیکھتا ہوں تو بیخوش سے بیزار ہو جاتا ہوں! اس لیے گھاتی اس کو موت کا طلب گار نہ بنا، خاکی نژاد ہونے کے باوجود تیسے آسمان سے الہام ہوتا ہے، جو خانی ہو کر بھی قدرت کے اشارے سے دیکھ سکتا ہے۔"

"میرے سن موہن پسندے، پیادی گھاتی، اگرچہ ہواؤں کے ساتھ تو جراتے ہیں، لیکن میرے واسطے اہمیت کی ساقیں میں! اس لیے اچھی گھاتی تو اگرچہ ہے تو میری اس، زیادہ آرزو کو، اہمیت کے اس لیے کو بپا سکتی ہے!

"گھاتی، انسان، نہ نصیب انسان کی فطرت کا ایک مختصر جزو ایک بے مقصدت جہد یعنی اس کی محبت کی اہمیت نشانی زندگی اور باقی رہتی ہے! انسانی محبت کا لمحہ فنا نہیں ہوتا! اس طرح ہونے محبت کر کے اپنی امتیاز سے سادے عالم کو بھربا بکے کائنات کو سمور کر دیا ہے! بتا، میری پیادری گھاتی، مجھے بتا، کیا تو میرے علم کا، نہ، میرے دھوکہ کا بکیرہ سمجھتی ہے؟

گھر گھاتی اس نہان کو سمجھنے کے قابل نہ تھی۔ اس کی یہ لاعلمی اپنی جگہ ایک شمس تھی، اس کی یہ بے خبری اپنے مقام پر شیریں و لذیذ تھی! وہ پگلیان کو محبت تو مفید نہیں سمجھ سکتی، لیکن اس کے پیچھے کے مفوس سے متاثر ہوئے بغیر نہ ہی! پگلیان کی آرزو تشنہ ہی رہی۔ اس کے سوال کا جواب نہیں ملا!

وہ دن بھی باد غرا پہنچا، جب گھاتی کی آنکھوں کی روشنی، آنکھوں کی بوت جو میرے کی طرح کو دیتی تھیں، مدھم پڑنے لگی، اس کے سینے پر جلد کا رنگ پھیکا پڑ چلا، اس کے پہلوؤں کے خوبچ سے خالی دکھائی دینے لگے، گھاتی کا لیگن دگدگنا سراپا اس طرح بے رنگ اور پھیکا پڑتا جا رہا تھا جیسے مقدس کا جنت ہے تو رو ہے رنگ ہوتا ہے:

جوں جوں دن بیت رہے تھے، گھاتی کا شباب زایل ہو رہا تھا، گھر گڑی ہوئی شان آذین دانا گھڑیوں کی یہ وہن محبت کے تازہ افراد ہوتے اور صرت ناک ہوس کا تباہ و برباد تھا، شاہد گھاتی کی محنت زیبائی اور اجرتا دوپ پگلیان کے اذہر پرستش کے جذبے کو پھر اجمار دے گا لیکن فطرت انسان کبھی ہرلی بھی ہے۔

ہلکیاں، وہ خلاق حسن و جمال ہے اپنی تخیل کی آرزو تھی۔ گلابیا کو اپنے نئے خواب سنا سنا کر بھلاتا رہتا تھا۔ (ادب گلابیا، وہ پیکر حسن و شباب زندگی میں پر غالب آچکی تھی۔ پرانی اداوں سے ہلکیاں کو پھسلاتی رہتی تھی۔ لیکن ان دونوں کی خواہش آرزو کے باوجود سبائی کا وقت قریب آ رہا تھا، دودی بڑھنے لگی تھی، کیونکہ جذبات مرجھاتے جا رہے تھے۔)

صنعتان کی پروری غرق سے جب گلابیا اپنا مہر کوئی تو اس دن تک میں مہر ہو جاتی کہ یہ مجھے امتداد و وقت سے متاثر ہونا چاہتے ہی نہیں۔ نہ انہیں کوئی کم ہے زلف اور وہ آرزو پر عبور ہو جاتی جو دیری دیاؤں ہی کو نزدیک دیتی ہے۔ لیکن وہ جلدی موت آنے کی فنا کرنے لگی۔

— لیکن اپنی مرضی سے مرنا کون ہے؟

ہاتھ لگایاں کو ایک دن صبح کے وقت گلابیا کی شکل بڑی سی نظر آئی۔ اس نے ایک خیال قائم کر لیا اور بے چینی سے مات ہونے کا خطرہ دیا۔ گلابیا جب اپنے بستر پر جا سوئی تو گلابیا نے ہتھوڑی اٹھا کر سوتی ہوئی گلابیا کے سینے پر ایک ضرب لگائی اور ضرب کے ساتھ سہندہ کا دائمی فکری مشن سنائی دیا۔ لہذا آداس ہو گئی۔ ایسی آداس جس کے اندر شاعروں کے خواب جاگ پڑتے ہیں۔ گلابیاں کا دل رنج و غم سے دو نیم تھا وہ بے تاب ہو کر کہنے لگا۔

”اے جمال و دھانی، کاش میں جانتا ہوتا کہ تو آنا بے رحم بھی ہو سکتا ہے۔ کاش میں اس وقت ادھا ہو گیا ہوتا، کیونکہ خواب کی تعبیر ایک لاش تھی اور ہر سینے کا نتیجہ ایک اسی ہوتی ہے؟“

گلابیاں نے پھر دتے دتے اس کے بدن کو چھوا۔ بدن ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ گلابیاں کے خیال نے دفعہ پناہ لیا۔ اس نے محسوس کیا کہ ایک دوسرا مجرہ دو گنا بڑھا ہے۔ تو وہ کانپ لیا، گلابیا پھر پتھر کی مورت بن گئی تھی، اس کا بدن مرمر کی طرح سخت اور چٹا ہو گیا، اور وہ پھر وہی پاکیزہ و سادہ پستی بن گئی، جیسی جان پڑنے سے پہلے تھی۔ مگر اس کے خدائے پراسنوی ایک بوند بھی جم کر رہ گئی تھی، یہ مجرہ آندہ اس جیسے پہ ایک اضافہ تھا۔

وہ چونکہ ایک صناع تھا۔ اس لیے گلابیاں کی جبرانی اذائے سے باہر ہے۔ وہ جو کچھ دیکھ رہا تھا خود اس کی روح کی تجزیہ نگاری تھی، موت یا مجرے کا مذہب تھا، اسے دعیاں آیا کر خن و گوشت کے پیکر میں جو نسا دیادہ ہے۔ اس کو اپنی صناعی کی قوت سے دُور کر دے۔ چنانچہ اس نے اندھیروں میں اپنی چھینی ہتھوڑی ڈھونڈ نکالی اور مات مہر کا کام میں لگا دیا، بات کی حیرت اور خوشی میں ہتھوڑی کی ضربیں کسی طاقت و دینے کی دسرن کی طرح سنائی دیتی تھیں۔

اس دنیا میں قدم نہ کر انسان ایک جادو اور دھڑکتا ہے۔ اور وہ علم کی جادو ہوتی ہے، اور انسانی فطرت جب علم پر غیور حاصل کرتی ہے تو وہ کامیابی پس اتنی ہوتی ہے۔ جتنا چھینی ہتھوڑی چد کر گلابیاں کا مہر تھا۔ اور اس کامیابی کی اہمیت علم کی ناقابل فسخ مندوبوں کے مقابلے میں پل بھر کی خوشی کے برابر ہے!

ایسی سوگوار سی جس میں اس وقت گلابیاں مبتلا تھا۔ ایک بیرونی تعلیق کے مناسب حال اور دوامی صناعیت کے پہلے موافق شے ہے۔ گلابیاں نے اپنے ذاتوں پر پودوں کی سی کپکپاہٹ محسوس کی۔ ایسی زم اور ہلکی کپکپاہٹ جو حالت اخلاط میں اس کو گلابیا کے سینے پر محسوس ہزار کرتی تھی! گلابیاں ابھی تک ایک جوش و شوق سے معمولتہ سے اتنا قریب محسوس کر رہا تھا کہ اس کو گلابیا کے مریں جسم کا زندگی اور محبت کی گرمی سے خالی اور عاری ہونے کا حق البتین نہ تھا۔ اس احساس یعنی محبت کی لافانی آرزو نے گلابیاں کی چھینی ہتھوڑی کے اندر

اسی جذبے کو دوڑا دیا تھا، اچھوڑی پڑنے کی آواز غفر مندی کا نعرہ اور خوشی کا غنجد بن گیا تھا جس کی آواز تال بکرتی تھی۔ گویا مری کی اس عودت کے اندر زندگی تازہ ہو جانے کی آواز اپنا کام کر رہی ہے!

گلچلیان نے پھر وہ غفر والی تو اسے محسوس ہوا کہ وہ پیکراس کی صناحت و دوست کاری کا نتیجہ نہیں تھا، وہ گھائیبا دکنس کا مجتہد قند تھا۔ اس کے ہر منزل سے کڑی کمان کا صنم غائب تھا۔ آنکھوں کی چلیان انسان کی غم نصیبی کا بیان بن گئی تھیں۔ جذبہٴ اہمیت بیٹنے پر ہم کر رہے تھے۔ رازوں کا گداز بڑی طرح زخمی تھا، اور رعنائی و دل دہائی کا یہ پیکر اور ارض کی نیل میں سو جانا چاہتا تھا! چنانچہ گلچلیان اب ایک پیکر جاوید عز کی جگہ راز غم کے مجھے کو کھرچ رہا تھا! اس کے مات دغا اور آنکھیں فریب دے رہی تھیں! گلچلیان غم زدہ تھا اور اس شخص کے غم سے برا غم کس کا ہوگا۔ جو خود غافل ہو کر یہ دیکھے کہ کل کا دن ہر کا عالم ہوگا، ایک ایسا عالم جہاں نہ الہام آفریں سبز و سیاہ ہوں گے۔ اور نہ کوئی چشمہ و چمن زاد!

انسان کو جہاں غم نصیب بنایا گیا ہے۔ وہاں اس پر ایک احسان بھی کیا گیا ہے اس کو دل کا سمجھنا سکھا دیا گیا ہے! لیکن جب دل کو سمجھانے کے لیے بھی ہر ناک مستقبل ہی ہو تو وہ ایک ایسی ٹھڑی ہوتی ہے۔ جب آدمی ہر چیز اور ہر بات پر دعوت ہی کو ترجیح دیتا ہے! اور جو شخص غم سے اس طرح قرب ہو اس سے کسی لافانی صناحت یا وہ تحقیق کرنے کی توقع کس طرح کی جاسکتی ہے! گلچلیان کی حالت اس وقت اگر کچھ تھی تو بس یہ کہ وہ غافل ہو کر ناقص غفلت سے محبت کرنے کی سزا پا رہا تھا! اور اس کی مثال ایسے شخص سے دی جاسکتی ہے جو ایک پرنے کو دیکھ کر دو دغا ہو!

اُوئی اللہ

منازمفی

اگر شیخ اہل حسین کو بے ستمائے بننے کی عادت نہ ہوتی۔ اگر خدا بخش کو صدمہ کہا بیٹے کے ہاتھ کے بنے ہوئے کباب کھانے کی لت نہ پڑتی۔ اگر اسلم کو مس رنگی کی محبت کا مارضہ اور مجھے چغتائی خطوط کا جنون نہ ہوتا تو یہ آپ بیٹی کبھی مہمن وجود میں نہ آتی۔ اگر شیخ اہل حسین کو بے ستمائے بننے کی عادت نہ ہوتی اور وہ اپنے بڑے بیٹے جیل کے اس جواب پر کہ اندر عورتیں بیٹھتی ہیں جی، مجھے دیاں جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اس قدر شدت سے نہ بھٹتے اور حرکت قلب بند ہو جانے سے ان کا انتقال نہ ہوتا اور مہل متعلقین ان کی وفات کے بعد بے یار و مددگار نہ رہ جاتے۔ تو اس صورت میں جیل ہمارا دو گم۔ دو کی کو بھی چھوڑ کر ایورگین لاج میں ہمارے ساتھ رہنے کے لیے آتا نہ ہوتا۔ اگر خدا بخش کو صدمہ کہا بیٹے کے کباب کھانے کی لت نہ پڑتی تو وہ ایڈورڈ ہوشل کو نہ چھوڑتا۔ ایورگین لاج میں آنے سے پہلے اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ صدمہ کہا بیٹے کی دوکان کے بدوس میں رہ سکے۔ اگر اسلم کو مس رنگی سے عشق نہ ہوتا اور وہ دن رات رنگی کے بالی دم کے چکر نہ لگاتا اور یہ خبر لاہور سے پہنچ کر ان کے گاؤں راج کو تک نہ پہنچتی اور اس کے والد ترقی کی زناکت کو محسوس کر کے اس کا عقد اس کی بنت ام زینب سے کر دیتے تو اسلم کے سرسبز عجب اللہ نے مجھے میں وہ مکان ہمارے لیے خالی نہ کر دیتے اور ایورگین لاج کی بنیاد ہی نہ پڑتی۔

اگر میں چغتائی خطوط سے متاثر ہو کر رہا کے مشہور نقوش سے چند نیم بدینہ منظرے اپنے کیدیکل کی دیواروں پر نہ سباناؤں پیر فرماتے میرے خلاف پرنسپل سے شکایت نہ کرتے تو میں بدینہ گم سے مرزا کے طور پر نہ نکلا جاتا۔ اس صورت میں ایورگین لاج بنانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ یہ واقعہ ظہور میں نہ آتا۔ اس واقعہ کی اہمیت کا اندازہ لگائیے۔

اس واقعہ کے ظہور پذیر ہونے کے لیے شیخ اہل حسین کو ہفتے ہفتے جام امل پینا پڑا۔ اور توراتی طور پر جیل کی ساخت ایسی بنائی گئی کہ وہ عورت سے دل چسپی کا اظہار نہ کر سکے۔

اس واقعہ کے ظہور پذیر ہونے کے لیے اسلم اور مس رنگی کے عشق پر دائمی بندش تمام کی گئی۔ خدا بخش کو کباب کھانے پر الکیا گیا اور صدمہ کو ایسے کباب کھانے کے بعد اسے نئے محلے میں کباب کی دوکان کھولنے پر مجبور کیا گیا۔

اس واقعہ کو عمل میں لانے کے لیے فطرت کو کیا کیا کرنا پڑا۔ اور پھر جیل، اسلم، خدا بخش اور میرے علاوہ وہ بڑی کڑیا کی عورت چیتھی ہوئی بڑھیا اور اس کی پوتی بیبا جیسے فطرت نے چغتائی کے کسی عمل سے متاثر ہو کر بنایا تھا اور بلا ضرر ہمارا لڑکے بدھو جو کائنات

بھونٹا تھا۔

اور ان سارے واقعات کو مجتمع کرنے کے لیے مجھے خوش سے نکالے جانے کا ماحول دینا پڑا۔ جب پرے سے پڑھنا شروع کرنا شروع کیا تو ان نیم برآمدہ تصویروں کے پیش نظر جو میں نے اپنے کپڑوں میں مائل رکھی تھیں۔ پس سے نکالنا شروع کر دی۔ شام کو جب ہم اکٹھے ہوئے تو اطمینان کے حکم کے متعلق سن کر غصے سے بل کھانے لگا اور انہیں گایاں دینے لگا۔

”پتھریک ہے بھائی خدا بخش نے سنجیدگی سے کہا۔ مولانا کو برا بھلا کہہ کر دل بھنڈا تو بعد میں بھی ہو سکتا ہے۔ اب یہ سوچ کر کہنا کیا ہے؟“

اس نے سر جھکا کر کہا: ”اب اس مکان تو مل سکتا ہے۔ سارے سمر سے یہ فائدہ بھی نہ اٹھاؤ تو۔“

”تو علت ہے تم پر؟“ خدا بخش نے ہند بھارت سے ہونے پر۔

”کہاں ہے وہ مکان؟“ جمیل نے مسکرا کر پوچھا۔

”نئے محلے میں۔“

”بھئی واہ۔ خدا بخش بولا۔ اپنے صندوق کی دوکان کے پاس ہونا درست ہیں بھی تمہارا ساتھی ہوں؟“

اور جمیل بھی تو کونچھ گھر رہا ہے اس کی والدہ جا چکی ہیں نا؟ اسلم نے کہا اور اس طرح اور گریں لاج کی بنا دی۔

لیکن ٹکس ہے کہ اور گریں لاج بھنے کے بعد یہ واقعہ طبعی پذیر ہونا۔ حقیقت میں ”ہم تو فقور ہمارے نوکر بھوکا تھا۔“

آپ بھنتے ہیں کہ اور گریں لاج بھنے کے بعد یہ واقعہ طبعی پذیر ہونا۔ حقیقت میں ”ہم تو فقور ہمارے نوکر بھوکا تھا۔“

معلوم ہے کہ میں کو فائدہ کو چہرہ دیکھنے کے دھکے پر جو دیا تھا اور نوکر۔ ”کہہ کر یوں سوچیں ہیں بڑا تھا جیسے اُسے کو فائدہ کی خبر لانے کو کہا گیا ہو۔“ احمد حسین بولا علی تو میرے گل گلی میں لگ گیا ہے اور گا باکھتر و فخر دے صاحب کے ہاں چلا گیا ہے اور وہ ہندوستانی اُسے کسی سچے ہندی بلایا ہے۔

— چھاپا ہو جی میں انجیوں گا۔

ایک دین میں چار ایک دن تک تو ہم وار کے بغیر آ رہے تھے، پھر ایک روز جب خدا بخش صدمہ لیا، بیٹے کی دوکان سے واپس آیا تو اس کے پیچھے پیچھے بھونٹا جیسے کوئی پالتو کتا ہو۔

”خدا بخش نے کوئیوں کو؟“ دیتے ہوئے کہا۔ یہ دیکھو آؤ آپ کو، آپ بھو میں خالص بھو۔“

”میں ہاں جی ہاں، بھو کی لمبوتری بھوٹ لگی۔“

”اب کیا یقین؟“ خدا بخش نے غصہ نہ انداز میں چاروں طرف دیکھ کر کہا۔

جی ہاں جی ہاں، بھو کا منہ کھلا اور اس میں سے خدا کے لمبوترے جھینٹے دور دور تک اڑے۔

اس کے بعد بھو صاحب بھی کام لاج سے فارغ ہونا تو پچھلے سے کوٹھے پر جا بیٹھا، بلکہ چھوٹے موٹے کام بھی وہ ہیں پر بیٹھ کر کیا کرتا۔ اس پر بھی اسے ڈانٹتے۔

”اے بھو! اسلم جیتا۔ توھاگ کر کوٹھے پر کیوں چڑھ جاتا ہے؟“

جی ہاں بالوجی: اس کی باجھیں یوں کھل جاتیں جیسے اس کی تعریف کی گئی ہو۔
 ”ابے بھوہ نہ اندیش ہنتا۔ کوٹھے پر کیا دھرا ہے؟ دھرا ہے کچھ؟“
 ”جی ہاں بالوجی“ کچھ بھی نہیں، ہرا جی ہاں بالوجی؟

بھوہ کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ چاہے اس کی تعریف کرو۔ جاتے اس پر عجب جھانے کی کوشش کرو چاہے ہاتھ اٹھانے کی۔ ضرورت میں اس کی باجھیں کھل جاتیں۔ سڑو وزن کی طرح بہاں سے وہاں تک کھل جاتا۔ بھوک کے قطرے ہوا میں اڑتے اور وہ خوش ہو کر چلتا۔ جی ہاں بالوجی ہاں جی بالوجی۔

اگر بھوہ کو کوٹھے پر دھوپ میں بیٹھنے کی عادت نہ ہوتی تو یہ واقعہ غور میں نہ آتا۔ کیوں کہ اس صورت میں یہیں کوٹھے کے حملہ اسرار کا علم ہی نہ ہوتا۔

بھوہ کی دھوپ کھانے کی عادت کو چھوڑ بیٹے۔ اگر وہ بڑھیا عمارت کے طور پر بڑی گڑھیا کی طرح نہ چنچتی تو ہماری توجہ پڑوس کے مکان کی طرف مبذول نہ ہوتی۔

”اے بے ڈکی سر پر دو پڑے“ بڑی گڑھیا چنچتی اور ہمارے کان کھڑے ہو جاتے اور ہمیں شدت سے احساس ہوتا کہ کہیں پاس ہی ایک ڈکی موجود ہے۔ ایک ایسی بڑی ڈکی جس کے سر سے بڑی انچلی پھسل پھسل جاتا ہے۔

”اے بے دین ذرا سنبھل کے پیٹھ کھچے اپنا بوش بھی ہے“ اور ہمیں احساس ہوتا کہ وہ ڈکی کمرے اس حصے سے گز رہی ہے جہاں اپنا بوش بھی نہیں ہوتا اور جہاں سنبھلنا مشکل ہو جاتا ہے۔

وہ بڑی گڑھیا چنچتی اور جمیل خواہ مخواہ شرانے جاتا اور اسلم کے دل میں مس رنگی کی یاد تازہ ہو جاتی اور وہ وہ مہمن لگانے لگتا جیسا اس نے مس رنگی سے کبھی بھی نہ کیا تھا۔ ان کو اگین اور خدا بخش نہ بندھنا کہ گنہگار بڑے گرم مصالحے ڈالنے لگا ہے۔ صدمہ کھا ہوا۔ میں گرمی ہو گئی ہے کچھ اور میرے دل میں دینا بدوش کا عمل اعتراف اور ہلکے دھلے رنگ دھاریاں بناتے اور خطوط دھکتے اور سیاہ آنکھیں دوتیں۔

اب میں سمجھتا ہوں کہ سب سے پہلے کوٹھے کا راز جمیل پر کھلا تھا۔ وہ صبح سویرے ہی ٹوٹے کر کوٹھے پر چلا جاتا تھا۔ اور پھر وہ تک نہ جانے وہاں کیا کرتا رہتا اور جب واپس آتا تو اس قدر جھلے پاؤں زینے سے آتا کہ چاہت تک سناٹی نہ دیتی۔ ذینا اتنے ہونے وہ آپ ہی آپ شرمانا اور سکانا، شرمانا جاتا اور سکاٹے چلا جاتا۔

میں اس زمانے میں اس حقیقت سے واقف نہ تھا کہ جینپ جینپ کو بھی افتخار محبت کیا جاسکتا ہے۔ اس کے برعکس میں یہ سمجھا کرتا تھا کہ جینپ اور بچی لگا ہوں سے سلوانا انسانی خصوصیات ہیں اور عورتوں کے دل میں اٹا نفرت پیدا کوئی ہیں۔

ان دنوں مجھے زندگی کا تجربہ نہ تھا۔ اور میرا علم جدید سستی کتابوں کے اور ان تک محدود تھا جیسے برکات کے رشک کا بڑا کرتا ہے اس لیے میں نے جمیل کے شرانے کو کبھی اہمیت نہ دی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ عورت کی بات پر جمیل کا جھینپنا اس بات کا شاہد ہے کہ اسے عورت سے تعلق طور پر دل چسپی نہیں۔

جمیل ایک اونچے لمبے نڈ اور دوہرا نہ جسم کا لڑکا تھا۔ اس کی جلد کا رنگ سنہری تھا۔ اس کی آنکھیں شریقی تھیں جو جھینپنے کے علاوہ نرم

وہی شخص — اس کے سہرے بال شاعرانہ انداز میں پریشان رہتے تھے۔ اس کے ہاں ہر بات کا ایک ہی جواب تھا جی دبی مسکراہٹ اور بھیگی بھیگی نظریں جیسے سادوں میں پھیرا پڑ رہی ہو۔

اب میں سمجھتا ہوں کہ عظمت نے اس کے تلوک کے پشت پر جتنے کو اس کی نظر اور مسکراہٹ میں مرکوز کر دیا تھا۔ اور اس مسکراہٹ اور بھیگی بھیگی نظریں سے وہ دل کے بڑے بڑے پیچیدہ جذبات کا اظہار کرنے کی قدرت رکھتا تھا۔ ان دونوں مجھے بھیگی نظر اور دبی مسکراہٹ کے مختلف لطیف درجن کا احساس نہیں تھا۔ اور نہ ہی میں اس حقیقت سے واقف تھا کہ وہ تلخ گنگا اور برہمنوں کی لطیف جنبشوں سے پیدا کیا جاتا ہے۔ اپنا مفہوم دور دور تک نشر کر سکتا ہے۔

جیل کے بعد کوٹھے کے اسرار کا ماز اس پر کھلا۔ اس روز جب وہ نیچے آیا تو غیر معمولی کسی گہرے خیال میں کھویا ہوا تھا اور ان جہنہ میں فنا کا ان لوگوں کا لگا رہا تھا۔ لیکن اس کے گیت کی دھن سرسبز بدلی ہوئی تھی۔ بول تو انگریزی تھے۔ لیکن دھن میں لوگ گیت کا لگ نایاں تھا۔ سب سے پہلے خدا بخش نے اس بدلی ہوئی دھن کو محسوس کیا۔ حالانکہ خدا بخش کو علم و ادب اور داگ رنگ کی باریکیوں کا احسا نہ تھا۔ پھر بھی کبھی کبھار وہ سبقانی انداز میں ایسی ایسی باتیں کہہ جاتا کہ بن کھجے مڑا آجاتا۔ بولتا: یاد اسلم آج مس رنگی کو میرا روپ دے دے ہے جو تم خیریت تو ہے؟

اسلم نے ایک لمبی آہ بھری اور بولا: مغربی دھن میں مجھے ایک ہی چیز چھلکتی ہے اور وہ ہے اس کی تشنگی۔ اگر انگوں میں مغربی دھن ہو اور داگ ناک ہوں میں مشرقی چھکاؤ تو مڑا آجائے۔

"ہی ہی ہی" خدا بخش ہنسا: "لو بھیجی۔ مس رنگی کے جسم کا اوپر کا حصہ تو غائب ہوگا۔ کیوں بڑھو؟

"جی ہاں بالو جی" بدھ کی باپھیں کھلیں

جیل کے سہرے رنگ پر زور دیتے تیرنے لگے اور آنکھوں میں بوند باندی ہونے لگی۔

اسی شام اسلم برقی چٹائی کی درق گردانی کرتے ہوئے مجھ سے کہنے لگا: یاد رکھئے یہ جھلی جھلی آنکھ بھی کیا چیز ہے؟

لیکن مس رنگی کی نوکڑ وہ سی کھلی رہتی ہیں: خدا بخش ہنسا۔

"اوسے یاد اس کا مڑہ اور ہی کچھ ہے؟ اسلم نے ایک آہ بھری۔

"جی ہاں جی ہاں بالو جی" بدھ نے سمجھا کہ اسے مخاطب کیا جا رہا ہے۔

"نیم دا" جیل مسکرایا اور پھر آنکھیں جھکالیں۔

"نیم دا" جو یا کوٹھارسی: خدا بخش نے تہ بندھاؤتے ہوئے کہا: سب ایک ہی وقت تک نے پکٹو ماسی نیم دا ہو جاتی ہیں۔ اور

نیم دا کھڑا سی کھل جاتی ہیں۔ وقت وقت کی بات ہے؟

"جی ہاں بالو جی" بدھ کے پیچھے ہوئے منہ سے چھینٹے آڑے اور دو خالی کٹورے ہیں گھونٹنے لگے۔

سب سے آخر میں ان نیم دا آنکھوں کی بات خدا بخش ٹپک بیٹھی۔ اور اس روز وہ دبا دبا یا دوام منظر عام پر آگیا۔ خدا بخش لے

کس بے دردی سے ان ڈولتی نشیمنوں کا بھانڈا دھن میں پھیر دیا۔

اوسے یاد وہ کوٹھے سے ہی چلا یا۔ کاسے، اسلم، جیل، بھیجی یہاں تو مس رنگی کا پاکستانی ایڈیشن کھلا پڑا ہے، بھاگ کے

میں مہبوت کھڑا تھا۔ دور تک جہاں نشانہ کام کوئی تھی، جھنڈوں، منڈیروں اور دیواروں کا ایک جڑا ہوا بنا۔ ٹھٹھا تھا۔ جن میں مندرا کا ایک سنہرا کلس شام کی گلابی روشنی میں چمک رہا تھا۔ جس پر چند ایک سیسے سی خاموشی سے اڑ رہی تھیں۔ پاس ہی ایک سہجد سہجد ہارواڑ سے سہجدے میں گری ہوئی تھی۔ آسمان پر کھائی بدیاں ہوں چمک رہی تھیں جیسے اس آؤنی اندر کی تمام تر نیکیوں انہوں نے جذب کر لی۔ پھر وہ دھبے آہستہ آہستہ چور چور ہوتے گئے۔ میرے ادراک، میرے خیالات، میرے جذبات پر حاوی ہوتے گئے۔ کباب بڑھتے بڑھتے دفعتاً چھپے ہوئے حروف میں ایک جنش ہوئی اور جرات میں کچھ سوراخ کھل جاتے اور پھر رنگین، سیاہ اور سنہری جیسے ناچنے اور گھٹنے بالوں کا ایک حقیر گڑنا اور چمک دار سیاہ لٹسی سی روشنی، حتیٰ کہ میں کتاب بند کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ اور ان حملے میں کونچے پر جا چڑھتا اور یہ جھیل کے تیلے اندھیرے میں کھڑا انظار رکھتا کہ کب سوراخوں کا پتہ کھڑے اور وہ دھبے ملنا دہوں اور اس سہجدے مندرا میں ناقوس بجے آؤنی اندر میں کہ پھر عاؤں اور اس آؤنی اندر کی نیکیوں ہاؤں میں منکس ہو۔

سب میں کھٹا ہوں کہ ایوڈرین لوج میں میرے علاوہ اور بھی ایسے تھے جن کی کتابوں میں سوراخ کھل جاتے تھے۔ اور کبابوں تلے ڈھپن دھبے ناچتے تھے۔ لیکن ان دنوں دھبے کیوں اس بات سے نفی واقف و متعارف میں کھٹا تھا کہ ان دھبوں کی حیثیت مجھی تک محدود رہے۔ وہ ٹکین اور جڑے تیری ہی دریافت ہے۔

مجھے اس بات کا اندازہ بھی کیسے ہوتا تھا کہ جیسی کے دن تم سب کو کھٹے پر دھوب میں بیٹھے ہوئے تو تم میں سے کوئی بھی ان جبابوں سے دلچسپی کا اظہار نہ کرتا تھا۔ کوئی شاہ بھر کہ ادھر دیکھتا بھی نہ تھا۔ میں تو تیرا اس بات کو خفیہ ماز میں دیکھنے کے لیے ادھر نہ دیکھنے پر مجبور تھا۔ تیری بات چیت دیکھتے۔

اسم عام جو رہا اپنے عجیب و غریب رسالہ لائف کی ورق گردانی کیا کرتا تھا اور کبھی کبھی ناواک ان لوگوں گنگنا نے کٹا اور گنگنا نے وقت سرسری طور پر ادھر دیکھ بھی لیتا۔ لیکن یہ تو معمولی بات تھی۔ جس تو ہمیشہ ادھر بیٹھا کے کھٹا تھا۔ اگرچہ وہ کھٹیت کہ اپنی کبھی کبھی اس مقام پر کہ کیا کرتا تھا۔ جہاں سے وہ جبابوں میں سے بھونکی انفراسکے بہ بات قابل توجہ نہ تھی کیوں کہ دلچسپی تو دیکھنے سے ظاہر ہوتی ہے اپنا آپ دکھانے سے نہیں۔ اور خدا بخش تو زیادہ تر ادھر بیٹھا ہی نہ تھا۔ چند ایک منٹوں کے لیے کھٹے پر ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر کھونٹا شروع کر دیتا۔ تیرا جواز نہ بدلتا تھا۔ بدلتا تھا آپ۔ آپ آپ گنگنا تا۔ بدلتا ہی مسالے ڈالنے شروع کر دیتے میں سمجھنے لگی ہو گئی ہے کچھ کچھ۔

البتہ عجیب کبھی اس مندرا میں آؤنی اندر کا توں بھتا تو سب کے کان کھڑے ہو جاتے۔ اسم کے اٹھنے سے پہلے چھوٹ جاتا۔ جیل کا رنگ نہ جانے کیوں زرد ہو جاتا۔ ہاتھوں میں ہونڈا باندی مرنے لگتی۔ گروہ چمپ چاپ بیٹھا رہتا۔ اور خدا بخش گڑی سے بے حال ہو کر تیرا ہڈاڑنا اور صدمہ و کباب سے گولیاں دیتا پھر دفعتاً وہ ہمیں نہیں کہنے والی بڑی گڑی یا جیجتی اور دھبے سے دروازہ بند کرنے کی آواز آتی اور ان جبابوں پر غفلت چھا جاتی۔ اور پھر — پھر مجھے لوگوں کی طرف دیکھتے کہ جوش نہ رہتا اور میری نگاہ میں منڈیروں اور دیواروں کا وہ انہار کاٹنا اور مندرا کا کلس جلتا، جیلیں مڑتیں اور بادلی رنگ جھکاتے — اور بڑی گڑیا جیسے چلی جاتی۔

ان حالات میں کیسے تنگ کر سکتا تھا کہ ان رنگین سہجدے دھبوں کا راز ان پر آشکارا ہے اور اگر آشکارا بھی تھا تو وہ اس میں دلچسپی لیتے تھے اپنے ماضیوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے، میں اس راز کے خوف کے خیال سے ان جبابوں میں کسی قسم کی دلچسپی ظاہر نہ کیا کرتا تھا کہ میں

دل دھک دھک ہوتا اور میری کیفیت ایسی ہوتی جیسے کوئی تہہ تر گوش ہو۔ چہرہ جب بھی موقع ملتا میں دسے پاؤں کو کھٹے پاؤں پر چڑھ جاتا اور میری جھونکے کے اختتام پر سائے میں کھڑا ہو کر سگریٹ سلگاتا۔

سائے میں کھڑے ہونے سے میرا مقصد اپنے آپ کو اس نقش چغتائی سے نہیں، بلکہ اس شخصیت ہموئی بڑھاپا سے چھپانا ہوتا تھا۔ جرجیل کی طرح اس سنہرے گھس پر چھائی رہتی تھی۔ اس کی حفاظت کے لیے چوکس رہتی تھی۔ دو ایک بازمیں نے دھوپ میں کھڑے ہونے کی جسارت بھی کی۔ مگر اس کے ذرا بعد ہی دھوپ سے جھٹی دروازہ بند ہو جاتا۔ اور جالی کی وہ آنکھیں بے لوز ہو کر وہ جاتیں۔ ظاہر ہے کہ مینا یہ پسند نہ کرتی تھی کہ میں روشنی میں کھڑا ہو کر اس سنہرے مندو کے سینس ٹاؤن۔ اس پیسے میں بیڑیوں کے اذیر سے سی میں کھڑا رہتا اور اسے اپنی دھنلی موجودگی کا احساس دینے کے لیے سگریٹ سلگاتا اور سگریٹ سٹگتے ہی جالیاں روشن ہو جاتیں اور وہ ”جگ بگ بگ“ کی منظر خاص بن جاتا۔ اور پھر اس نفوذ کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے جوڑنے میں مصروف ہو جاتا۔ اب تو وہ ٹکڑے بے حد روشن اور رنگین ہو چکے تھے یا میری نظر شقی ہو چکی تھی۔ بہر حال میری سب سے بڑی خواہش تھی کہ کسی روز دیوار کی وہ بند کھڑکی کھلے اور مینا چند ساعت کے لیے وہاں آکھڑی ہو۔ وہ گھنی سرنگانہ چکیں، اور آنکھوں کے سیاہ کونوں میں چمک بھرنے، بازو ہول، لمبی لمبی آنکھیں، ایک شان بے اندازی سے کھلتا ہو چھائی ہوں۔ اور وہ پرائیڈ کی گھڑیوں کی کھاتی کجریں کا نائنٹ کو اپنے آفریں میں لے ہیں۔

ایک روز گرین والوں کو قطعی طور پر معلوم نہ تھا کہ میں کسی حسین ماؤستہ واقف ہوں یا ان گھومتی قوسی بیکروں کی پیٹ میں کیا ہوں۔ مگر وہ تو کہا کرتے تھے: ”کالے! تیرا کوئی جالس نہیں۔ میان پنجاب کی ڈلی اونی۔“ مگر اور نقش بند نہیں کرتی اور وہ بھٹتے۔

وہ اس خط فہمی میں مبتلا تھے کہ کوئی ان سافے رنگ کو پسند نہیں کرتیں۔ بیوقوفوں کو معلوم نہ تھا کہ رنگ کا قصد سب سے زیادہ کشش کا باعث ہوتا ہے۔ روشنی کھیا کی سی مثال لیجئے۔ ان کا رنگ ساؤنڈ پیش کیا جاتا ہے اور پھر لوگوں کا بار انیس ساؤنڈ کھینچا کیوں کہی تھیں۔ لیکن میرے ساتھی ان باتوں کو کیا جانتے تھے یہ کیا ہے۔ روشن مہاراج کی بات چھوڑ دینے میں نے اپنے لیے ایک دوستوں سے اس بارے میں تحقیق کی تھی۔ مثلاً رفعت حسین کو کہی سے لیجئے۔ کتنا گرامش رنگ ہے اس کا، سارے کا سارا خاندان بن کوئی نہیں پاؤ رستہ انت پت ہو رہا ہے لیکن جب اس کے آبا نے ایک گوری جیٹ سمینہ سے اس کا رشتہ کرنے کی کوشش کی تو وہ میرے پاس آ کر رو دیا۔ یا رتباہ جو گی میں اسنید چمک، ایک ہے اس کا۔ اتنا چوڑا اور سرخ منہ جیسے چمندر ہو۔ اور باقاعدہ اس نے ایک کافی ٹون چھوڑ کر سے محبت لگا لی تھی جو عشق کے درجے تک جا پہنچی تھی۔

لیکن بعد از گرین کے ساتھیوں کی یہ غلط فہمی میرے حق میں بڑی مفید تھی۔ لہذا میں نے اس موضوع پر ان سے کبھی بحث نہ کی تھی۔ بحث کرنا تو ایک دھماکتا چمکتی کو ان کے پاس بیٹھنا بھی میرے پیسے وہ بھر ہوتا تھا، دہا تھا۔ جی چاہتا کہ تین کی مینہ ہو۔ اور میں سگریٹ سلگا کر بیٹھیں میں کھڑا ہو جاؤں۔ اب تو مینا میری موجودگی محسوس کر کے باہر سگریٹ کا ادبا سنے بھانے ایسی باتیں کہ جاتی کہ میں دل محسوس کر رہ جاتا۔ وہ اپنی چھٹی پہن چھپا سے لکھتی، باتیں کرتی اسے چھپاتی اور ذرا خاموش رہتی جب تک کہ وہ آفت کی کالہ بڑھاپا خدا سے غارت کرے۔ جیسے ہمیں شروع نہ کر دیتی اور وہ بھینا، تو رہے جب بات کرنے پر نہ جاتی تو گویا گھر میں نہ رہا جاتا۔ جیسے گڑا ہوا میڈیو پڑ نہ دوس کہ دہا ہو۔ اسے لڑائی کھینے کسی کا خیال نہیں کسی کا لحاظ نہیں۔ اس پر مینا سگریٹ دھم آواز میں کہتی، ”اؤ دی اگلا اتنا خیال تو ہے، مردم نکار رہتا ہے۔ اور پھر میری عورت معنی خیز انداز سے دیکھتی اور وہ بڑھاپا اور بھی بگڑتی تو بہ لکھی باتیں بنائی آگئی ہیں۔ اور پھر نہ نہ

کس نے اٹھا دے چکنا اور وہ چیل اس کے اور گرد چکر لگاتی اور میرا دل تپوں اچھلتا۔ اچھلتا جاتا۔

پھر وہ واقعہ جس نے ہماری نیت کو ہمیشہ کے لیے استوار کر دیا اور اس کی تابی کی کو دوام بخش دیا۔

ایک روز جب ہم سب کو ٹھنڈے پڑھنے تھے تو ہمارے دونوں پرستی اور جالی کے سوراخ منور تھے تو نہ جانے کاغذ کا ایک ٹکڑا اڑتا ہوا آیا۔ اور میں نے تھوڑا سا اسے دبوچ لیا۔ وہ دس اے کا ایک ورق تھا۔ میں نے بغیر کسی مقصد کے اس کاغذ کو اس بند کھڑکی کے نیچے دیوار کے انچیرے ہوئے حصے پر لٹک کر اس پر ایک اینٹ لکھ دی۔ ایسا کرنے سے میرا کوئی خاص مقصد نہ تھا اور نہ ہی مجھے اس بات کا اندازہ تھا کہ یہ چھوٹی سی تفصیل ہمارے رومان میں اتنی بڑی حیثیت اختیار کرے گی۔

اگلے روز جب میں کوٹھے پر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ کاغذ اپنی جگہ سے غائب ہے۔ خیر میں نے اس بات کو قطعی اہمیت نہ دی لیکن جب میں نے یہ میٹھوں کے اختتام پر لکھنے سے ہو کر حب معمولی کر لیت دیا اور وہ جالی۔ بعد از برقی تو میں پر دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میں وہی کاغذ تھا جسے ہونے بیٹھی تھی اور کاغذ کی طرف اشارے کے مکر رہی تھی۔

پہلی مرتبہ مجھے خیال آیا کہ وہ بند کھڑکی کھل سکتی ہے، اگلی ہی جے اور میں نے اسے کھول کر وہ کاغذ اٹھا لیا ہے اور — کاغذ بھی اسی طریق سے میرے پاس پہنچا ہے جاسکتے ہیں۔ یہ سوچنے ہی میں ختم ہو گیا اور اندازے کر کے بند کر کے دینا کو خطا سمجھنے میں مصروف ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ میں چند ایک سطریں لکھ کر خطہ کر دوں گا۔ لیکن نہ جانے کیا ہوا سمجھو۔ نہ جانے کہاں سے جذبات اُٹنے پھٹے آئے اور میں ورق پر ورق بیاہ لڑا چھو گیا۔ خطہ ختم کرنے کے بعد مجھے اپنے جذبات کی شدت کا احساس ہوا۔ ایک تفریحی ٹیبلٹ ایک دل لگی میرے لیے کسی قدر بہت حاصل کر چکی تھی۔ اس روز پہلی مرتبہ میں اپنے جذبات کی حقیقت اور شدت سے واقف ہوا۔

میرٹھوں نے سات بج کر چھ بجے ہو کر کر لیت کے کٹنے انکار سے کی روشنی میں بنا کہ وہ خطہ لکھا یا اور پھر اس کے نتیجے میں اسے اسی اینٹ کے نیچے چسپاں کیا جو بند کھڑکی کے تنے بنے جسے مجھے پرکھی تھی۔ اگلے دو مہینے میرے میں کوٹھے پر چڑھا۔ اینٹ کا خطہ غائب تھا۔ میرے دل میں انہماک بڑھ رہی ہو گئی۔

میرے لیے وہ دن گذرنا مشکل ہو گیا، وہ دن گزرنے لگا، کیا مینا جواب دے گی۔ اگر اس نے جواب نہ دیا تو۔ اگر وہ ناراض ہو گئی تو، اگر اس نے قطعی رد وازہ کھونا بند کر دیا تو۔ سارا دن مجھے کسی قسم کے خیال نہاں رہے۔ رات بھر خیندر آئی اور میں نے کڑوئیں بدل کر لٹات لاتی اور پچیس سویرے میں رات کے گراؤ دیکھا گا۔ اینٹ کے نیچے کاغذ کا ایک ٹکڑا بند کھڑکی کے نیچے پڑا ہوا تھا۔

میرے میں وہاں پہنچ کر دروازہ بند کر کے میں نے وہ کاغذ کھولا۔ مجھ پر حیرت ایک لائن تھی جو یہ تھی: ”اے اللہ اگر یہ کسی اور کے ہاتھ پڑ جاتا تو؟“

اس کے بعد اس کے خند آستہ آستہ طویل ہوتے گئے اور ایک جینے کی خطہ لکھت کے بعد تودہ دے دے الفاظ میں انہماک مثبت بھی کرتے گئے۔ لیکن ہمارے غلوں میں تو عنوان ہونا تھا اور نہ ہم ایک دوسرے کا نام لکھا کرتے تاکہ اگر وہ کسی کے ہاتھ پڑ جائے تو بھی اسے معلوم نہ ہو کہ وہ خط ہے۔

ہم ہماری باری خط لکھتے تھے۔ ایک روز وہ لکھ کر اینٹ کے تنے پر لکھ دیتی اور اگلے دو دن میں اس کا جواب لکھ کر وہیں چسپاں کیا جسے وہ رات کے وقت کھول کھول کر اٹھا لیتی تھی۔ کیسے پیارے دن تھے، ان دنوں دھبوں نے اس جھکی جھکی آنکھوں نے اس نثر دیا کوئی اللہ نے

اور ان اشارات بھرے غمخوئے زندگی کے سادہ ورق کو سنہری بنا دیا تھا۔ یہ کیفیت مرثیہ کے خطوط کا نتیجہ نہ تھی۔ میر اپنے جذبات میرے لیے انوکھے اور پاکیزہ معلوم ہوتے جب میں اسے خط لکھتا تو میرے دل سے نئے نئے انوکھے غمخوئے بھرے جذبات ابھرتے۔ اور میں ان کی بنیاد کی اور غمخوئے پر حیران ہوتا، ایسے جذبات جن کے وجود کا مجھے خود علم نہ تھا جو نہ جانے دل کی کن گہرائیوں سے ابھرتے تھے ان ہی جذبات کی وجہ سے یاد جانے لگے کہ اس دور کے تعلق سے جو حصہ وقت کئی اور تفریح کے لیے پیدا ہو گیا تھا۔ ایک بے نام سنجیدگی اور پاکیزگی پیدا ہوئی۔ نہ جانے کیا پہنچی۔ ایک ماہ کے قلیل عرصے میں ایزدگارین کے تمام تر افروز بخیرہ ہو چکے تھے۔ جمیل نے تو بالکل ہی چپ سا دکھائی تھی۔ اگرچہ وہ طبعی طور پر خاموش رکھا تھا اور اس کا بیسے سے بڑا اظہار بھی ایک خاموش مسکراہٹ یا ایک محرم گوشہ کی مسکراہٹ نہ ہوتا تھا۔ یہ زیادہ سے زیادہ اس کی آنکھوں میں ہونا باندی سی ہونے لگی تھی لیکن اب تو وہ بالکل بن خاموش ہو چکا تھا۔

وہ صبح سیر سے بیدار ہوتا اور سہاگے جاگنے سے پہلے ہی تمام مزدوریات سے نازش ہو کر بیٹھ جاتا۔ کالج سے واپس کے بعد وہ چپ چاپ میز پر بیٹھ کر مطالعے میں مصروف رہتا۔ اسلم نے لکھنے کی نئی مہر و نیت پیدا کر لی تھی اور زیادہ تر وقت اسی میں بسر کرتا تھا۔ خدا بخش حسبِ مولیٰ یا تو صمد کی دوکان پر چل جاتا اور یا بدھو سے بائیں کٹ میں مشغول رہتا اور اُدنی اللہ کی آواز سن کر رہ بند تھا نہ اور کہتا۔ ماں بدھو کچھ ناخواب نہ اور بدھو کی بیوی پھس سے کھل جاتی اور چھینٹوں کا بازار دھناتا۔ جی ہاں جی ہاں جی۔ لیکن بدھو خدا بخش لکھتا ہے تو بے جواب دیتا۔ یہ تو پڑ گئے کا بکیرا ہے اور تم بکیرا ہے۔ ام چرنے واسے اور بدھو بے سوچے مجھے ہنسا اور بوڑھی گویا چھٹی اور میرن لگا ہوں میں سنبھلے کس پر چلیں منہ لائیں۔

پھر وہ غمخوئے دن طوع ہوتا۔

اس روز جب میں کالج سے واپس آ رہا تھا تو گلی میں مینا کے مکان کے صحرے دروازے پر وہ چھپا ہوا قد بڑھنے پڑی چلا رہی تھی۔ "اڑکی درخشاں رکھنا بیا کو بار نہ جانے دینا میں شرمناک لڑکی آؤں گی۔"

بڑھیا کو بار نہ جانے دیکھ کر میں یہ سمجھا کہ علی صاف بے ادب تھا کہ میرا کٹھن پر جا کر تھا اور میری بیوی کے دھڑکنے میں کھڑا ہونے کے بجائے بارہو پ میں جا کر ہوا جانی کے سوراخ روشن تھے اور میں حسبِ معمول کسی پوچھنی بیٹا سے کھل رہی تھی۔ اس کے بال ٹھٹھے تھے۔ حسبِ معمول دن ایک نہ بج رہی تھی اور نگاہیں جھلی جھلی تھیں۔ دلتا اس نے مرنا تھا یا اور میں پہل مرتبہ دیوی کو سیسوں ڈانے کے لیے بھگ گیا۔

کھٹ بختی دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ اور میں چونکا۔ جالیوں پر فطرت طاری تھی۔ چند لمحوں کے لیے تو میں حیران کھڑا رہا پھر چپ چاپ بیٹھے چلا آیا۔

پھر بیٹھے بیٹھے دلتا مجھے خیال آیا۔ شاید بڑھیا کے علاوہ گھر میں کوئی بڑا آدمی موجود ہو شاید کوئی عورت آیا ہو جس کے سامنے تشہیر گرا دے۔ اس خیال سے مجھے تسلی سی ہوئی۔ پک کر کوٹھے پر گیا۔ لیکن میرے سر پہ بٹانے کے باوجود وہاں روشن نہ ہوئیں۔ اس روز میں کوئی ایک مرتبہ کوٹھے پر گیا لیکن بے سود۔

میرا جی چاہتا تھا کہ کمرے میں بیٹھ کر آنسوؤں سے اسے ایک خط لکھوں لیکن اس روز میں کی بادی تھی، اگلے روز مجھے اس کا

خط مل گیا تھا۔

دجائے اگلی صبح میں نے مینا کا خط ایڈٹ تے سے نکال کر منشی میں کیوں نہ دیا۔ مجھے ایک ماحول ساز دوسرے جسود اٹھا ایک گھنٹی سی تھی جو میری دگ دوگ میں برابرت لگتی جا رہی تھی، میں نے بند کرے میں اُسے کھولا، میرا زعمول صرف چند ایک فقرے لکھے ہوئے تھے۔

”آپ کا یہ کالا گھونٹا درست کون ہے۔ خواہ مخواہ مجھے اٹھائے
کر رہے ہیں، کل اس نے مجھے سلام کیوں کیا؟ اسے منع کر دیجئے۔“

میری نگاہوں نے دھندلکا چھایا اور دل ٹھوب گیا۔
کچھ کچھ میں نہیں پڑتا تھا کہ آخر اس کا مطلب کیا ہے۔ کون کالا گھونٹا ہے وہ، سلام تو میں نے کیا تھا۔ کچھ کچھ میں نہیں پڑتا تھا۔
اس گھنٹی کو سلجانے کے لیے میں باہر نکل گیا اور ایک آواز پر تیار رہا۔ حتیٰ کہ میں خود اس میں الجھ کر کھڑا گیا۔
آہستہ آہستہ میرے نکلنے کی طرف پڑنے لگے۔ وہ کسی اور سے خوبت کرتی ہے لیکن، کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ خطوط محبت کے جذبات سے دیکھتے ہوئے خطوط نہیں۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ لیکن پھر وہ کالا گھونٹا۔ وہ خوش نصیب گورا کون ہو سکتا ہے۔ کون ہو سکتا ہے وہ۔ کون مژدور وہ کوٹھے پر جاتا ہوگا۔ مژدور۔

اس ماز کو جاننے کے لیے میں نے فیصلہ کر لیا کہ ایک دن چھپ کر کوٹھے پر بیٹھا دوں۔ وہاں ایک چھوٹا سا کمرہ تو تھا ہی جوفانی پڑا تھا اور جہاں چھپ کر میں دنوں سے سب کچھ دیکھ سکتا تھا۔

وہ رات میں نے جاگ کر گزاری۔ بھرتیوں بنگے کے قریب چلنے سے کھنکھنے پر چڑھ کر میں اس کمرے میں جا بیٹھا۔ اور طلوع آفتاب کا اشتعال کوٹھے کے کمرے کے قریب پہنچے سے آوازیں سنائی دہیں۔ کوئی جاگ چکا تھا۔ اور میں چوکس ہو کر دروازے سے ٹاک کر بیٹھ گیا۔ کوٹھے پر دیرانی چھائی ہوئی تھی۔ اور اس مقام سے فصیح طور پر دکھائی نہ دیتا تھا۔ کوئی جانا کے کمرے کا چشم دروازہ کھلا ہے اور جانی کے سوراخ روشن ہیں یا نہیں۔

پھر وہ بے پاؤں کسی کے پیچھا چڑھنے کی آواز آئی۔ میرے حیدوں میں ایک دھندلی سی شکل دکھائی دی۔ کوئی اوپر آ رہا تھا۔ میرے چوڑے کے باؤں جیسے میں ٹک گیا۔ میں اسی جگہ جہاں میں کھڑا ہو کر تھا۔

اس نے سگڑت سگڑا دیا سلائی کی روشنی میں میل کی دیوئی مسکراہٹ واضح ہوئی، اس کی آنکھوں میں وہی بونا باندی جھدی تھی۔ بھڑکھڑا ہوا مسکراہٹ لگا۔

”الاءہ میری مغفرا میں کی طرف ہوئی، ایک سوراخ سے ایک تہی میں گھائی، اٹھل باہر نکلے ہوئی تھی اور دیوئی لہرا رہی تھی۔ جیسے پاس ہوا رہی ہو۔ پھر مجھے معلوم نہیں کیوں گودمیش پر ایک دھندلکا سا چھا گیا۔ چاروں طرف سے ایک منہ لے مجھے گھیر لیا۔ اور پھر بونڈ بونڈ بن کر دل میں علم کی ایک جھلک بھینک گئی۔“

تو میں ہی وہ کالا گھونٹا ہوں۔ یہ خیال آتے ہی کیلچے پر سانپ لٹ گیا۔ لیکن پھر وہ خط، کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اور ابھی جانا تو کیا بڑتا۔ اب زندگی میں ہی کوئی دلی چہ نہ رہی تھی۔ چاروں طرف ایک دیراز پھیل رہا تھا جس میں نہ تو امید کی کرن تھی اور نہ آرزو کی حرکت۔
ان حالات میں لاہور دہشتہ لار تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ چند دنوں کے لیے گھر چلا جاؤں، لیکن جانے سے پہلے میل سے

تھام واقعہ بیان کر دوں۔

جیل سے مختصر طور پر تمام واقعہ بیان کرنے کے بعد میں نے کہا: "جیل میں اتنا بھاری ہے میری انہیں۔ مجھے اندس ہے کہ غلطی کی وجہ سے میں نے اسے تم سے بچھیننے کی کوشش کی۔ یہ کہہ کر میں نے اس کے سامنے ہانکے تمام خطوط دکھ دیئے۔ جیل جرنل سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی بوڑھا ہانڈی نے کوئی اور بھی رنگ اختیار کر لیا تھا۔ جیسے بزنس بڑی ہو گئی ہوں۔ اور ان کا تو اتنا ٹوٹا جا رہا جو اور ان میں دکھ کی جھلک پیدا ہو گئی ہو۔ دفعہ ایک بونڈ اس کے گال پر آگئی اور اس نے منہ موڑ لیا اور میں وہ خطوط وہیں چھوڑ کر باہر چلا آیا اور سوٹ کیس اٹھا کر بس کے اڑنے کی طرف چل دیا۔

بس جا رہی تھی۔ ویرا نے میں درخت سر جھکائے پیچھے سرکتے جا رہے تھے۔ زرد کھیتوں میں پروں نے سر جھکا رکھے تھے خوشوں کی مٹی ہوئی آنکھیاں اٹا رہے کہ وہی نہیں۔ جاؤ، چلے جاؤ۔ دور۔ اور گئے آسمان پر ایک اور اس دھند لگا چھایا ہوا تھا۔ گاؤں میں درختوں کی چھاؤں میں جا پانی پر پڑے پڑے میری نگاہ جتوں کی طرف منعطف ہو جاتی۔ سبز جتوں میں سوراخ سے روشن ہو جاتے، آؤٹی انڈر، دور کوئی پرندہ چلتا۔ اور میں گھر کو اٹھ بیٹھتا۔ اور اندر گھر میں جا کر نینے سے کھینچنے کی کوشش کرنے لگتا۔ دفعہ باہر وادی آتاں چلائی۔ لے لے ہے۔ ابھی منڈیا نہیں چڑھا لی تھی۔ اور مجھے محسوس ہوتا کہ وہ بڑی گڑیا بیچ رہی ہے۔ پھر نگرہوں کے سامنے زمین دھتے ناچنے لگتے اور میں گھر کو باہر نکل آتا۔

ابھی گاؤں آئے گاؤں میں ہوئے تھے کہ ایک "مارو" لکھل کھول کر دیکھا تو جیل کا تار تھا۔ لکھا تھا: "نر" آؤ فروری ہے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر جیل کو مجھے جانے کی کیا ضرورت پڑ گئی۔ وہ جاہلوں والا واقعہ تو ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا تھا۔ اس کے بارے میں تو اب بات کرنا بھی بے کار تھا۔ وہ بات تو میری زندگی تھی۔ نہ جانے پھر کیا وجہ تھی۔ بہر حال میں نے سوچا جاننا ضرور چاہیئے۔ درہ نہ جیل کیا کہے گا۔ اور جیل کا قصہ بھی تو کوئی نہیں۔ اگر دنیا جیل سے محبت کرتی ہے تو اس میں جیل کا کیا قصہ۔ جب میں ایروڈ گزین پہنچا۔ تو گھر میں بصرہ کے سوا کوئی نہ تھا۔ بھروسے میری طرف دیکھا اور وہ بھوٹ کھلی ہی ہی بالو جی آ گئے۔ میں نے پوچھا: "بھوگھر میں کوئی نہیں؟"

"جی ہاں جی کوئی بھی نہیں۔" وہ بولا۔

اتفاق سے میں نے ڈاک پیچھے دیکھا۔ دو دواڑے میں جیل کٹر مسکرا رہا تھا۔

"ارے بھو! جیل صاحب تو یہ رہے؟"

"جی ہاں۔" بھو ہنسنے لگا۔ "جیل صاحب یہیں ہیں۔"

"کیوں غیر تبت تو ہے؟" میں نے کرے میں داخل ہونے ہوئے جیل سے پوچھا۔

"ہاں جیل نے کہا؟" میں جڑا ہوں۔ "ساتھ ہی اس نے بھو کو آواز دی۔" بھو جا کر ٹانگے آؤ۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

"اماں نے بلایا ہے؟"

"کب آؤ گے؟"

”معلوم نہیں۔ جب امان اجازت دے گی؟ اور کچھ دیر تک ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔“
 ”آخر کیا بات ہے جس کے لیے مجھے بلایا ہے؟“
 ”بہت مزیداری بات ہے، اے ہمدردی وہ مسکونے لگا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں سادہ نہیں بھادوں کا سا عالم تھا۔“
 ”تباؤنا، پھر میں نے بے تابی سے پوچھا۔“
 ”ذرا صبر کرو، وہ بولا: ”پڑا اچھا کیا تو آگئے۔ بہت اچھا کیا۔ مجھے معلوم تھا تم میری بات نہ مٹاؤ گے۔“
 اس کی آواز عجیب سی سنا دے رہی تھی۔ جیسے صلیق میں کچھ پھنسا ہوا ہو۔ اور اس کی مسکراہٹ میں مجبوری کی واضح تصویر جھلک رہی تھی۔

”ٹھکانا آگیا یا بدلتی۔ بدلتی چلتی یا
 جمیل نے سوٹ کیس اٹھا لیا۔
 ”لیکن وہ بات؟“ میں نے بے تابانہ پوچھا۔
 ”میرے ساتھ آؤ“ اس نے چاروں طرف حیرت بھری نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”آ جاؤ۔“
 ”ٹھکانے میں بیٹھ کر اس نے جیب سے ایک لفافہ نکالا۔ یہ وہ اس میں سب کچھ کچھڑ کر رہے۔ اور پھر آخری بار مسکونے کی شدید کوشش کی۔“
 ”تمہارے کے دو دن ہونے کے بعد میں لاچ کی طرف بھاگا۔ اور ایک کمرے میں داخل ہوا کہ اندر سے کڑی بند کر کے لپٹتے ہوئے
 ہاتھوں سے لفافہ کھولا اور جمیل کا وہ مختصر خط پڑھنے لگا۔

”میں تمہاری ہنسی، میری نہیں۔ اسے تمہارے جذبات سے عشق ہے، شکل و صورت
 کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ میں نے تمہارے جانے کے بعد صرف ایک خط اسے
 لکھا تھا۔ اس کا جواب مفروضہ ہے پڑھ لو۔
 میں نے جلدی سے مفروضہ خط نکالا۔ لکھا تھا۔

”آپ اس کا لے لو گے کو متوجہ کیوں نہیں کرتے۔ یہ دیکھو آج
 اس نے مجھے خط لکھنے کی حیرت کی ہے۔ اس کی اتنی بہت
 ایسا خط لکھتے ہوئے اُسے شرم نہیں آئی۔ جیسا اس کا لگتا ہے
 ویسے ہی اس کے خیالات ہیں آپ اسے متوجہ کر دیجئے ورنہ۔
 میں نے پھر سے جمیل کا خط پڑھنا شروع کیا۔

”میں تمہاری ہنسی نہیں، میں جا رہا ہوں ہمیشہ کے لیے ہمیشہ
 کے لیے میں کے سب وہ خطوط جو تم مجھے دے گئے تھے انہیں
 میں۔ خدا حافظ۔“

”میرا میری ہے۔ مجھے یقین نہ آتا تھا۔ وہ ایک کالے گولے کی کیسے ہو سکتی ہے! نہیں، وہ میری نہیں۔ ان خیالات کے باوجود میں کوٹھے پر چڑھ گیا۔ اور میری صید کے بالائی حصے کے اندر میرے میں پہنچ کر ڈک کر مایوں کی طرف دیکھنے لگا۔ اب میں! میں! کوٹھے دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ اس کا پہرہ نہ دھوا۔ منہ کھڑا، بالی پریشان تھے اور وہ سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے ادھر دیکھ رہی تھی جیسے کسی کے انفرادیت میں تباہ حال ہو۔

نہ جتنے شدت شوق سے یا آزمانے کے لیے میں میری صید کے اندر میرے سے نکل کر باہر صوب میں جا کھڑا ہوا۔ دفعتاً اس کے چہرے پر ہنسنے اور نفرت کے آئنا ذہنی کی طرح چمکے اور وہ اٹھ کر باہر نکل گئی۔

یہ دیکھ کر میں چہرے میری صید کے اندر میرے میں جا کھڑا ہوا۔ اور سوچنے لگا۔ وہ میری نہیں ہو سکتی۔ کبھی نہیں۔ میرے ارد گرد چستوں، دیواروں اور مکانوں کا وہی دیر نہ پھیلنے لگا۔ وہی یا اس وہی مردنی، گستاخانہ صوب تھا میں! میں نے ہنسی کھیل میں اپنی زندگی تباہ کر لی تھی، لیکن اس دنیا میں آخر کون ہے جو تباہ نہیں ہوا۔

جھیل، میں اور اوروں۔ دفعتاً مجھے خیال آیا۔ ایک نیا خیال۔ میرے ذہن میں تصویر کا ایک نیا رخ ابھرنے لگا۔ وہ یہ کہ ہم دونوں سے زیادہ تباہ حال میں ہے۔ جسے ایک شخص کی شکل و صورت اور دوسرے کے جذبات سے ثابت ہے اور جسے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ دو الگ الگ اشخاص ہیں۔

میری نگاہ حالی کی طرف منعطف ہو گئی۔ مینا پھر آ کر وہیں بیٹھی ہوئی تھی۔ عین ہی دروازے کے پاس اسی طرح تباہ حالی پریشان مڑاں جھکی ہوئی لگا، کھوئی ہوئی جیسے مینا خانی ہو چکی ہو۔ اسے ڈکی تو یہاں کیا کہ رہی ہے۔ ”دفعتاً وہ بڑی گویا جھیننے لگی۔“ نہ جانے کیا کرتی رہتی ہے؟

”اُدنی اللہ میں کیا کروں۔ مندر کا، تو میں ہوں جیسے وہ ٹوٹ چکا ہو۔“

یہ حادثے

حجاب اقتیاز علی

حادثے کا ماحول کو میرا ذہن ہمیشہ انسان کی اقدار و تہذیب کی طرف متعلق ہو جاتا ہے۔ براہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی تشہد تہذیب و دنیا میں حادثات کا کردار دیکھا جاتا ہے۔ لوگ انسانی اقدار کو تہذیب کے تحت دیکھتے ہیں مگر حجاب و مشاہدات نے مجھ پر یہ ثابت کیا ہے کہ انسان حادثے کی تیاری جھڑپ اور بالکل انجان طریقوں سے بہتوں کو تہذیب سے متعلق نہیں بنا دیتا ہے۔ اگر آپ کو میری رائے سے اختلاف ہے تو ذیل کا واقعہ سنئے۔

یہ گزشتہ ستمبر کا واقعہ ہے۔ میں ایک اخصائی مریض سے نئی نئی صحت یاب ہوئی تھی اور سیکھانوں سے دور آرام و سکون کی خاطر چند دنوں کے لیے پورے ڈاکٹر کا مکان پاس میں رکھنے کے لیے چلی گئی تھی۔

رات دس بجے اور شہر میں تاریکی تھی۔ مندرجہ ذیل واقعہ اس وقت پیش آیا تھا۔ میں نے اس واقعہ کو سن کر حجاب و مشاہدات سے خوف کے جبک جبک کر مارا۔ کئی کے سینے سے چٹ گئے تھے۔

میں افسردہ اور سہمی ہوئی تھی۔ ایک اخصائی مکیہ پانی میں گھول کر پی لی تھی اور اپنے سیاسی سٹ کو گواہ میں سے چپ چاپ آتش دہان کے پاس بیٹھی ہوئی ہوئی اس کی سیکھ کر کو مجبوراً اس مریض تھی۔

ڈاکٹر کا راجہ اپنی نرس اور ڈیوٹی پر پہنچا جاتے ہوئے حسب معمول مجھے ہلانے کے لیے اپنی طبی تجربات سے سبب زندگی کے واقعات سناتا رہا تھا۔

موت کے سلسلے میں میری افسردگی و بے کھنگامی کے ساتھ ساتھ "بہن! روحی، باہر کے طوفان کو قبول کرنا خود غلطی و بے کھنگامی ہے۔ ابھی ختم ہونے لگا۔" اور ان ہی رات نکل آئے گی۔ "ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا تم سے؟ مریضوں کے حالات۔" "بہن! یہی اور ان کے ذہن میں عجیب جیسے ہیں میرا ایک مریض ایسے خطرناک مریض میں۔" "نہا، قاتل کہہ رہا تھا تو غلطی اس کی ایک آنکھ خود بخود بند ہو جاتی تھی۔"

"ہاں۔۔۔" میں نے میرا ہوا کر کہا۔ "اور دوسری آنکھ ڈاکٹر؟"

"وہ کھلی کی کھلی رہتی"

یہ سکرین زور سے ہنس پڑی۔

مگر یہ کھلتی ڈاکٹر کا چہرہ سنجیدہ سا ہو گیا۔ وہ فوراً سے کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر بولا "یہ کیا بتا رہی؟"

باد اور کچھ ہیں نے وہاں دیکھا اسے سانسے بند کر رکھے یقین ہو گیا کہ طوفانی راتوں میں خوفناک آفات نازل ہوا کرتی ہیں۔

چار آدمی ایک لاش کو چار پائی پر ڈالے اندر کمرے میں داخل ہوئے۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان جو ہمارے ہوش رجاس کھو چکا تھا۔ بیٹی بیٹی آنکھوں سے اور حرا دھڑکتا ہوا کمرے میں گھس آیا۔ اس کے چہرے پر گہری خراشیں اور کمبلیں کہیں خون کے داغ تھے۔

ڈاکٹر گلزار ان لوگوں سے کچھ دیر بات چیت کرنے کے بعد میری عورت آیا اور جلدی جلدی کہنے لگا ”موٹر کا ایک حادثہ ہو گیا ہے رومی۔ موٹر بلی پر سے وادی میں اٹھ گئی تھی۔ ہاں بہت سخت حادثہ ہے۔ یہ لوگ فوری امداد کے لیے میرے پاس آئے ہیں۔“

اتنا کہ وہ چار پائی کی طرف گیا اور جھک کر لاش کا معائنہ کرنے لگا۔

ساتھی نوجوان نے بے ساختگی سے پوچھا ”زندہ ہے نا؟“

ڈاکٹر گلزار معائنہ ختم کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ افسردہ لہجے میں بولا ”دوست ہیں آپ کے؟“

”کیا ختم ہو گئے؟“ وہ پھر چلا گیا۔

”ابھی نہیں“ ڈاکٹر نے آہستہ سے کہا ”ریٹو کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ فوری آپریشن کی ضرورت ہے۔ میں انہیں شہر کے ہسپتال

میں لے جا رہا ہوں۔ شاید بچ جائیں۔“

”ڈاکٹر!“ نوجوان نے انتہائی ”آپ کو انہیں بچانا ہو گا۔ یہ میرے بڑے بھائی ہیں۔ اگر یہ ختم ہو گئے تو میں خود کشی کر لوں گا۔“

مجھے اس سے بے پایاں محبت ہے۔ ہائے میں نے اپنے بھائی کو مارا ہے میں اس حادثے کا ذمہ دار ہوں۔ کاہل میں چلا رہا تھا۔ وہ مجھے منع کرتا رہا مگر میں نے اس کی ایک نرسٹی۔ اسی طوفانی رات میں اس کے بارہا منع کرنے کے باوجود میں کارے کر پٹی پر چڑھ گیا۔ بارش کی وجہ سے زمین پر پتھر پھوڑ پھوڑتی تھی۔ وہ دو کتا رہا۔ انتہائی کرتار۔ متیل کر کر کے مجھے باز رکھنے کی کوشش کی مگر نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا کہ کارے کر اٹکے کو بڑھتا ہی چلا گیا۔ دراصل میں اسے نصف شب تک منزل پر پہنچا دینا چاہتا تھا۔ اس کی بیوی کے ہاں بچہ ہونے والا تھا اس لیے اس کا وہاں پہنچنا ضروری تھا یہ خبر نہ تھی کہ وہ میرے ہاتھوں اس حادثے کا شکار ہو جائے گا۔“

اور یہ کہتے کہتے وہ بے لگت زمین پر گر پڑا اور میہوش ہو گیا۔ ڈاکٹر گلزار نے اس کی ٹانگیں کھول کر بھینک دی۔ اسے ہوش میں لانے کی

تدابیر کرنے لگا۔ پھر میری طرف مڑ کر بولا ”وقت کم ہے۔ مجروح کو فوری آپریشن کی ضرورت ہے۔ یہ آدمی جلدی ہوش میں آجائے گا۔ اسے تو محض ذہنی دھچکا لگایا ہے۔ خوت کی وجہ سے میہوش ہو گیا۔ میں مجروح کو لے کر ہسپتال سے جا رہا ہوں۔ اس کی زندگی کی امید کم ہے۔“

یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر گلزار نے جلدی سے اپنا بارانی کوٹ پہنا اور لوگوں کی مدد سے مجروح کو کار میں ڈھکا کر رات کے اندر لے

اور طوفانی کے مسلسل شور میں ہسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں، ہوش مرعیں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اپنے سیاہ دو سیاہی بے کو او بی شمال میں لمبیٹ کر اور اس کے

سر پر کنڈیپ کس کر آئندہ ان کے پاس ایک بھلی نرم کرسی پر بٹھا دیا اور غور ڈاکٹر گلزار کی ہدایات کے مطابق مرعیں کے سرہانے بیٹھ کر اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگی تاکہ اسے دوا ملاؤں۔

کچھ دیر بعد مجھے بند ہی آنے لگی۔ میں ایک کشتی کے سہارے نیم دراز ہو گئی اور آنکھیں بند کر لیں مگر اچانک اپنے کی آواز سے میری

آنکھ کھل گئی اور میں گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

”میر نے اس کی جان لی ہے۔ میں نے اسے مارا ہے۔ میں گناہگار ہوں۔ میں“
وہ پوری طرح تپوہش میں آیا تھا۔ اس کی زبان سے عجیب عجیب نامکمل فقرے نکل رہے تھے۔ یوں معلوم ہوا تھا کہ اسے بیہوش دیکر کہ
مدفون جذبات اپنی پرانی قبروں سے سر باہر نکلتے کی کوششیں کر رہے ہیں۔

اس کا چہرہ لاش کی طرح زرد اور اس کا جسم بروت کی طرح سرد تھا۔
میں نے اس پر چمک کر آہستہ سے کہا ”دو اپنی نو؟“
نیر ہی، آواز میں کہ وہ چٹھی چٹھی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ پھر بولا ”مہرو؟“ اور ناماشکی کے انداز میں سر جھیر لیا۔
میں نے ملاحت سے کہا ”دو دو اپنی نو؟“

وہ یکدم چھٹ پڑا ”ہائے تمہیں اب تک مجھ سے محبت ہے مہرو؟ مجھ گناہگار سے؟ مجھے تنہا چھوڑ دو اور چلی جاؤ۔“
میں پریشان ہو کر سوچنے لگی کہ کیا کروں، پھر بولی ”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں مہرو نہیں ہوں۔ دو اپنی نو“
”مہرو نہیں جو نو اور کوئی ہو؟ میں تمہارے قاتل نہیں پھر کیوں دو اپنا رہی ہو؟ دھوکا دیتی ہو مجھے؟“
میں ذرا غصہ سے بولی ”مجھے کیا معلوم کہ مہرو کوئی ہے؟ میں تو تم کو بھی نہیں جانتی۔ تم کار کے ایک حادثے میں زخمی ہو گئے
اور یہاں لائے گئے تھے۔ مہرو کوئی ہے؟“

”میری بھیا دن ہے!“
”اور تمہیں اس سے دلچسپی ہے؟“ میں نے دو اپلاتے ہوئے پوچھا۔
”اسے جس مجھ سے دلچسپی تھی“ اب اسے پوش آگیا تھا۔ بات کرتے کرتے رگ گیا اور پوچھا ”اور میرا بھائی؟ وہ کہاں
ہے؟ کیا سر گیا؟“

میں نے کہا ”اس کی بڑھو کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ فوری آپریشن کے لیے، ہسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔ نکر نہ کرو وہ بچ جائے گا۔“
اس نے گردن پھیر لی اور پھر اپنی چوٹی آواز میں بولا ”تمہیں — وہ نہیں پتے گا۔ میں نے اسے مار ڈالا ہے۔“
”وہ ابھی زندہ ہے“ میں نے اسے تسلی دی۔

”مگر کار بیل برسے الٹ گئی تھی اور وہ ایک کھڈ میں جا گرا تھا۔ وہ زندہ نہیں رہ سکتا“ اس کی آنکھیں پھر آئیں۔
”تم نہیں چاہتے کہ وہ زندہ رہے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔
”اگر وہ مر گیا تو میں بھی خودکشی کر لوں گا۔ مجھے اپنے بھائی سے محبت ہے۔ میں تمام عمر اس سے محبت کرتا رہا مگر قسمت کو
یہی منظور تھا کہ وہ میرے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتارے۔“

قسمت کو تو نہیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ کوئی منظور ہے کہ وہ موت کے گھاٹ اتارے تمہیں معلوم ہے کہ وہ ابھی زندہ ہے مگر
تم بے خیالی میں اس کے متعلق یوں باتیں کر رہے ہو جیسے وہ مر چکا ہے۔ میرے یقین دلانے کے باوجود کہ ابھی وہ زندہ ہے تمہیں اس کی
زندگی کا یقین نہیں آتا۔ اس پر بھی تم اپنے بھائی کی محبت کے دعویدار ہو؟“
”کیا تمہیں میری محبت میں شبہ ہے؟“ اس نے ذرا تیز ہو کر کہا۔

”میرا اس سے کیا تعلق؟“ میں نے بے پردائی سے کہا ”البتہ تمہیں اپنی محبت کے متعلق شبہات پیدا ہو رہے ہیں۔ مگر یہ بات نہ ہوتی تو تم اس کے متعلق یوں بات نہ کرتے کہ وہ چمکا ہے۔“

وہ چونک سا پڑا۔ فدا مدم لہجے میں بولا ”میں بھول گیا تھا کہ وہ ابھی زندہ ہے۔“

”انسانی حافظہ اپنے چاہنے والوں کے متعلق خوشگوار باتیں سوچنے کا عادی ہوتا ہے۔“ میں نے دلی زبانی سے کہا۔

اسے غصہ آگیا ”اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو شبہ ہے کہ میں اپنے بھائی کا دشمن ہوں؟ میں مہلکیہ کہتا ہوں کہ آج کا واقعہ محض ایک اتفاقی حادثہ ہے کہ میں نے گناہ اور وہ زخمی ہو گیا۔ مجھے اپنے بھائی سے بڑی گہری محبت ہے۔ میری زندگی کا ایک ایک واقعہ اس بات کا شاہد ہے کہ مجھے اس سے کتنی محبت ہے، کسی کو کیا علم کہ میں نے اپنے بھائی کے لیے کیسی کیسی عظیم قربانیاں کی ہیں اور کبھی اُن تک نہیں کی۔“

”جس محبت میں قربانیاں ہوں اور اُن کرنے کی مہلت بھی نہ۔ ایسی محبت پہنچتی نہیں۔ کسی دن اچانک باولے کٹنے کی طرح سر ہٹا کر اپنے محبوب کو کاٹ کھاتی ہے۔“ میں نے افسردہ ہو کر کہا۔

معلوم ہوتا ہے تمہیں اب تک اس بات کا یقینی نہیں آیا کہ مجھے اپنے بھائی سے گہری محبت ہے۔ پھر کا بھی کیجیے ہو تو پانی بن کر بہہ جائے۔ میں نے اپنے بھائی کے لیے کیا کچھ نہیں کیا؟ اپنی زندگی، اپنی روح، اپنا بیچن، اپنی جوانی حتیٰ کہ اپنے حسن و عشق کی کل کائنات اس پر قربان کر ڈالی۔ اور پھر بھی دنیا کو شبہ ہے کہ میں اپنے بھائی سے محبت نہیں کرتا۔ خدا کے لیے میری داستان سسٹا اور انصاف کو دیکھیں۔ اس سے اسے کیا کیا اور اس نے مجھ سے کیا کیا؟ شاید اس کی اور میری زندگی کی شب و تاریک کی سچہ ہو سکے اس لیے میں اپنی داستان بیان کر کے دل کا بوجھ بھگتا دوں گا۔ اس کی حفاظت اور میری دغاؤں کی داستان طویل ہے۔ اس کی محبت نے میری زبان کو بند اور میرے جذبات کو مفلوج کر دیا تھا۔ اس لیے میں اس کی حفاظت کا جرابند رہا۔

میں اپنی انگریز خیالی ہے کہ محبت نسل اور زندگی کا نام ہے۔ موت کا نام نہیں۔ وہ کسی کو مفلوج کر دے تو پھر وہ محبت نہیں رہتی۔“

اور وہ گئے جا رہا تھا ”میری داستان سسٹو تمہیں معلوم ہو گا کہ میں نے کیا کچھ اس کی محبت میں برداشت کیا ہے۔ وحد ہو گئی۔ ایک مرد جب کچھ قربان کر سکتا ہے۔ اپنے خون کا آخری قطرہ بھی مسکرا کر بہا سکتا ہے۔ مگر اپنی مجبور ہو اپنی آشوبش متنا سے زبردستی فوج کسی قیمت پر بھی دوسرے مرد کی ذہنی آشوبش نہیں بن سکتا۔ مگر یہ کام میں نے کیا۔ اپنے بڑے بھائی کی محبت کی خاطر اپنی محبت کا کھلا گھونٹا بھی جھانٹا تھا کہ اس کا اور اپنا کھانا بھی ساتھ ہی کھوٹ لے لوں گا۔ نہیں وہ میرا بھائی تھا۔

وہ ہمیشہ سے میرا مقابل بنا رہا۔ بیچن سے لے کر جوانی تک زندگی کے ہر شعبے میں ایک نامعلوم طریق پر اس کا اور میرا مقابلہ ہوتا رہا۔ جیسے زندگی کے اکھاڑے میں دو دبیلوان لڑ رہے ہوں۔ ایک کمزور۔ ایک طاقتور۔ اُگاہ اس خفیہ لڑائی کا ہم دونوں میں سے کسی ایک کو بھی علم نہ ہونے پایا۔ وہ دجیدہ اور خوبصورت تھا، میں نحیف اور قبولِ مصورت۔ وہ ذہین اور فلسفہ تھا، میں سرسلا اور کم گو۔ اس کے دوستوں کا حلقہ وسیع تھا۔ میرا دنیا میں کوئی بھی دوست نہ تھا۔ سوائے میری ماں کے اور وہ بھی اکثر موقعوں پر اپنے بڑے بیٹے کی کوٹھ پر ترجیح دیتے۔ تاک جاتی تھی وہ کھیلوں اور ورزشی نمائشوں میں پیش پیش رہتا تھا۔ میں فلولت پسند اور طراکٹیب کا شوقین تھا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے کردار محفلوں کی جان ہوا کرتے ہیں۔ جتنا بچہ وہ دوستوں کی آنکھ کا ناما اور شہرہ داروں کا بیابا تھا۔ کئی

دفعہ مجھے حسد پیدا ہوا۔ مگر میری محبت نے مجھ پر حسنت طامت کی بوجھاؤ شروع کر دی۔ کئی دفعہ مجھے اس پر غصہ آیا مگر میں نے ضبط کر لیا۔ آخر وہ میرا بھائی ہے، کوئی غیبت نہیں۔

یہ تو خیر ادائیگی ہر آدمی کا زمانہ تھا۔ پھر جب جوانی کی پُرشور گھٹاؤ لو لہ بن کر اعلیٰ اور حسن و عشق کے سادوں جہادوں پر سامنے اٹھی تو وہ پھر سننے انداز سے مقابلے کے لیے تیار ہو گیا۔

کالج میں تیراکی کا مقابلہ تھا۔ میرے ہزارا نکھار کرنے پر بھی دوستوں نے اور خود اس نے نہ مانا۔ میرا اور اس کا مقابلہ ہوا۔ ظاہر ہے کہ ہار ہمیشہ میری ہی قسمت میں مٹی چٹا پتھر میں دگ گیا۔ اور سخت دل شکستہ ہو گیا۔ میرا بھائی مجھے منانے اور تسلی دلا سے دینے لگا۔ ہاتھ پاؤں میں اور مذاق مذاق میں اس نے مجھے پانی میں دھکا دے دیا۔ اتفاقاً کی بات کہ میں پانی میں سنبھل کر تیر نہ سکا اور غوطے کھانے لگا۔ پانی بھی پھوٹل پانچ گیا اور مجھے غوطہ پھوٹ گیا۔

تین مہینے میں ہسپتال میں موت و حیات کی کشمکش میں گرفتار رہا۔

اس بیماری کے دوران میں مجھے یوں شبہ ہونے لگا کہ شاید میری زندگی کی شہ تار یک میں ایک نورانی سر جو جھلکا رہی ہے۔ بات یہ تھی کہ ایک خوبصورت نرس میری خدمت کے لیے مقرر ہوئی۔ جب وہ دوا پانے کے لیے مجھ پر تھکتی تو مجھے شہ پڑتا کہ اس کی آنکھیں محبت کے نور سے جھلکا رہی ہیں۔ بعض وقت مجھے یقین نہ آتا۔ اس سے میرا ہر کھٹا۔ اپنے دل کو سمجھانا کہ میں اس خال میں یوں گرفتار ہو کر کئی لمحے محبت کھے۔ مگر ایک رات تیر بجناؤ غوطہ دگی ہی کہ میرے ہوش و حواس پر چھا رہا تھا، میں نے محسوس کیا کہ یہ لڑکی جھک کر میرے بالوں کو چوم رہی ہے۔ میری سرزد اور تاریک زندگی میں تیشی محبت کی اس پہلی کرن نے ہلکی ہلکی چاندنی کر دی۔

جب میری حالت کچھ سنبھلی تو میں نے دوسرے مریضوں سے بھی یہی سنا کہ مہر و نونے بڑی جافشانی سے میری تیار داری کی ہے۔ رفتہ رفتہ مجھے اس کی محبت کا یقین آ گیا۔ مگر ہم دونوں میں سے کسی ایک کو بھی اس بات کا علم نہ تھا کہ ہم ایک دوسرے کی محبت کو سمجھ گئے ہیں۔

میں گھنٹوں سستہ پڑ رہا تھا۔ ہوائی تلے بنایا کرتا کہ جو نئی طبیعت سنبھلی گی میں مہر دے اظہار محبت کر دوں گا۔ کئی دفعہ کوشش کی آخر اُٹھا تنہا کہ ہی دوں مگر عین وقت پر نہ جانے مجھے کیا ہر جانا تھا کہ شدت جذبات سے زبان لنگ پھو کر رہ جاتی تھی۔ میں واصل المزاج انسان تھا۔ ”عجب کی محبت اور نفرت دونوں داخل ہوتی ہیں۔“ بڑی دیر کے بعد میں نے کچھ کہا پھر اس کی داستان سننے لگی۔

اس نے میرا فقرہ سنا نہیں، ایک روانی کے عالم میں کتا رہا ”کئی دفعہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہر داس بات کی منتظر ہے کہ جو آگ دل میں ملگ رہی ہے اس کے شعلے زبان نکلیں۔ ہم ایک دوسرے کی محبت سے واقف ہو جائیں۔ ابھی میں اُٹھنا تھا کہ موقع دھڑوٹا ہی رہا تھا کہ ایک شام میرا بھائی مجھے دیکھنے آ گیا۔ بہرحسب تنگ کہ میں رہی مہ خاشی سے لے دیکھتا رہا جب وہ باہر چلی گئی تو اس نے آہستہ سے کہا ”دو گھنٹی خوبصورت لڑکی ہے شادیت سے جس جسم کے حسن کا تصور کرتا رہا ہوں یہ اس کی پوچھو تو صبر ہے۔“ افسردہ افسردہ نظریں مجھ پر ادا ہوئی اور بات چال چل میں نے باقی باتوں پر اس کی ذکر کو ٹال دیا مگر وہ دوسرے دن پھر آکر موجود ہوا اور کہنے لگا ”تو تم نے مجھے اسے نظر کر دیکھا ہے؟“ اس میں

ایک خاموشی سا دھوا دھوا ہوا ہے۔ اگر دالین اختر صحن ذکر میں تو میں اس سے شادی کروں!“

میرے ہاتھوں کے غوطے اڑ گئے! میری زبان بند ہو گئی۔ میری نظریں جھک گئیں۔

اس رات مجھے نیند نہ آئی، مقام رات کرو میں لیٹا اور آہیں بھر تارہا۔ کبھی اپنے آپ کو اور کبھی اپنے بھائی کو کوستا۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے منزل پر پہنچنے کی تیاریاں بھی کرنے لگا اور میں ابھی تک گھر کو رہ رہا بیٹھا۔

چند ہی دنوں میں مجھے ہمد کے انداز میں نمایاں فرق کا احساس ہونے لگا۔ اب وہ راتوں کے سٹنلے میں میرے سر ہانے بیٹھ کر فضاؤں کو مسموم اور رنگین نہیں بنایا کرتی تھی۔ اس کے اس روئے نے میرا دل توڑ دیا۔ میں تنہائی میں بہروں بیٹھا رہتا رہتا تھا۔ کبھی ہمد کو بے وفا سمجھتا، کبھی مجھے بھائی پر غصہ آتا، کبھی اپنے آپ پر بھینچلا اٹھتا۔

دنوں اور ہفتوں کے بعد مجھ پر اس بات کا احساس ہوا کہ میرا ظاہری اپنی حقیقی اگر میں ہمد سے اظہار کرتا تو وہاں ہی کو رہتا اور اسے پس پشت نہ ڈالتا تو آج یہ حادثہ میری قسمت میں نہ لکھا ہوتا۔ میرا بھائی نے قصور تھا۔ اسے میری محنت کا علم نہ تھا۔ یہ خطا میری تھی۔

چران دنوں کی شادی ہو گئی اور میں نے ہمیشہ بکثرت کیے اپنے اپنی محنت کا گلا گھونٹ دیا۔ اب تمہیں یقین آگیا ہوگا کہ میں نے اپنے بھائی کی محبت میں اپنے پر کیسے کیسے ظلم روا رکھے مگر مجھے کبھی اس پر غصہ آنا تو درکار اس سے شکایت تک پیدا نہیں ہوئی۔ ”پھر کھففت وہ چوک بڑا۔“ میں مجھے یاد آیا اس ساری طویل زندگی میں صرف ایک موقع ایسا آیا کہ جب مجھے اس پر شہید غصہ آیا مگر وہ بھی لمحہ بھر کے لیے وہ چپ ہو گیا۔

”وہ کونسا موقع تھا؟“ میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

وہ مدم اور اندر سے صدمے میں بولا، ”بچپن کا زمانہ تھا۔ میں بمشکل پانچ چھ سال کا ہوں گا۔ وہ ادویں باغ کی ادبھی دیوار پر چڑھے ہوئے انکو توڑ رہے تھے جب کبھی میں انکو روکا کرتی تھی تو زنا وہ شوق سے چپیں کھا جاتا۔ جب کھا کھا کر تنگ کرتا تو دیوار پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اب وہ مجھے نہیں ستائے گا۔ چنانچہ میں نے انکو روکا ایک بہت بڑا گچھا اپنے لیے توڑا۔ مگر وہ پک کر میرے پاس پہنچا اور اسے میرے ہاتھ سے چپیں کر نیچے وادی میں پھینک دیا اور نقصے لگانے لگا۔ اس کی اس حرکت پر میں دانت پیس کر رہ گیا۔ میرا سانس پھول گیا۔ بے اختیار میرا دل جہاں کہ اسے بھی اٹھا کہ انکو روک کے پاس نیچے پھینک دوں۔ ایک جنون کی سی کیفیت میں میرے ہاتھ اس کے کندھے پر پہنچ گئے اور ایک تشبیہ کی سی حالت میں میرے پیچھے اس کو تاویس کرنے لگے۔ پھر کھففت مجھے خیال آیا کہ اگر میں اسے نیچے گرا دوں گا تو اس کی بر بڑھ کی بڑی...

جبکہ چہرہ جو ہانے لگی اور وہ ختم ہو جانے لگا۔ اس خیال کے اتنے ہی میرے دل میں اپنے بھائی کے لیے رحم و محبت کا ایک دریا اپنے لگا اور میں اسے دھکا دے کر نیچے گرانے کی بجائے اس سے چھٹ گیا۔ اس بات کو آج میں سال کا طویل عمر گزر چکا ہے!“ وہ اپنی داستان ختم کر چکا تھا۔ میں چوک پڑی اور بولی، ”اور آج میں سال بعد یہ حادثہ تم سے مرزد ہوا ہے!“

حادثے کا نام سن کر میرا دل ہمیشہ انسان کی ناقص تہاؤں کی طرف قفل ہو جاتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی تشنہ تناسیب دنیا میں حادثات بن کر رہنا ہوتی ہیں۔ لوگ انھیں اتفاقات کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ مگر تجربات و مشاہدات نے مجھ پر یہ ثابت کیا ہے کہ انسان حادثے کی تیاری خفیہ اور باکل اہلخانے طریقوں سے برسوں کرتا رہتا ہے۔ تب کہیں جاکر دنیا میں ایک حادثہ رونما ہوتا ہے۔ انھیں حادثے نہ سمجھتے۔ یہ ہماری اپنی دھکی چھی تناسیبیں ہیں۔

لسدن لیٹر

قرۃ العین حیدر

دیباچہ :- معزز ناظرین! لندن لیٹر کی بہت سی اقسام ہیں۔ پہلی وہ قسم ہے جو ایک زمانے میں ہمارے ملک کے زمانہ رسالوں میں چھپا کرتی تھی۔ مزید سیدہ بانو سلیمان پائی باجی جان کو لکھتی تھیں۔ آپا بیگم میں خیریت سے ہوں۔ ممبئی سے دس مہینہ جاتی۔ نے جو آم کا چار میرے ساتھ کر دیا تھا وہ ختم ہو گیا۔ یہاں ہندوستانی طعام خانوں میں مرج اور سالہ بہت ہنگام ہے۔ ایک شینگ کی ایک پڑیا دھینے کی سمجھ بیجھے۔ گرم پانی کے باپ کے ذریعے میرا گرم دھنا ہے۔ (پھر کچھ لیٹریڈی کا ذکر خیر ہو تا تھا) یہاں آپا جانانی زمین دوزری میں جاتی ہیں (لندن ٹرانسپورٹ کا مفصل بیان) میں نے کل یہاں بلاؤ تیار کیا جو بہت پسند کیا گیا (ہندوستانی اور انگریزی کھاؤں کا موازنہ) اور آپا بیگم کے لیے انگریزی کھاؤں کی چند آسان ترکیبیں (آپ کا کام اب کیا ہے۔ اگلے خط میں میں پرانے اور ملکیت پول کا حال لکھوں گی۔ آپ کی پیاری دور افتادہ بہن ”سیدہ“

جب پیاری سیدہ بانو واپس جاتی تھیں تو دور نزدیک سے رشتے دار عزیز دوست اور محلے والے ان سے ملنے کے لیے آتے تھے۔ وہ ایک خاص دیکھنے اور سننے کی چیز خیال کی جاتی تھیں۔ اور اپنی ماتی مردہ دھن کے کسی گنام ۴۰ روپے میں بیڈ سرس یا پھر اسکولی انیسکریس بن کر گزار دیتی تھیں۔ اور ختم ہو جاتا تھا۔

تھنات! اب میں لندن لیٹر کی دوسری اقسام کا بیان عرض کر دوں گی۔ ایک آغا اشرف کا ”بنی بی بی سے آداب عرض“ تھا کہ کس طرح انگریز ناٹس لمباری کا کادوری سے متاثر ہو کر رہے ہیں۔ اور فنیہ انشاء اللہ اخباریوں کی ہوگی۔

اخباریوں کی فنیہ کے بعد سے جو لندن لیٹر مسٹر تیز و بیکل آتے انڈیا میں چھپتا ہے وہ اس طرح ہوتا ہے۔ کل ہاؤس آف لارڈز میں جب بحث چلی اور جب فلاں ڈپٹی کمشنر سے میں ملا۔ اور دیگر یہ کہ میرے باغ میں آج کل کنیا خوب چھولی رہا ہے اور فوڈ منسٹری نے انڈوں کا کوٹاکم کر دیا ہے۔ آئندہ اگلے صفحے۔

لندن لیٹر کی آخری قسم وہ ہے جب کہ ”ماشا فانی“ اور ”آئینے“ کا نام لگا کر خصوصی حسین و جمیل رسالوں کے کالموں میں یوں قلم اڑا ہوتا ہے ”دیکھئے! تو اگر کو میں نے بیگم فلاں کو لیڈی فلاں کی گھارڈن پارٹی میں اس حسین منیل سہاوی میں ملبوس دیکھا جو انھوں نے مجھے بتایا کہ جیمز ایلن خریدی ہے۔ کمانڈر فلاں بھی پارٹی میں موجود تھے۔ جینیں میں نے بریگیڈ فلاں کی دلکش بیوی کو ایک لطیف مسرتے پایا۔ کمانڈر فلاں کل ایکسٹ میں بھی موجود تھے۔ انھوں نے بتایا کہ اتفاق سے ان کو برسڈ کی ایک گنام دوکان میں ایک بہت ہی عمدہ کیمرو دستیاب ہو گیا۔ مسر فلاں جو ہمارا صاحب فلاں گمر کی بے حد خوش پوش صاحبزادی ہیں۔ کمانڈر صاحب کے اس کیمرو میں بہت دلچسپی کا اظہار کر

ہری تھیں۔ ان کو بھی فوٹو گرافی کا بہت شوق ہے۔ اس مرتبہ A S C O T میں ————— وغیرہ وغیرہ وغیرہ اور یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ ہر مہینے میں ایک گوسپ ہوتی ہے۔ یہی خبریں، یہی لوگ۔

ان میں الاقوامی حیارہ ہوں، ان کلبوں اور ریس کورسوں کی رونق دیکھنے۔ ہزاروں کی تعداد میں یہ لوگ روزانہ راہروا دھرا دھرا آ رہے ہیں۔ ہندوا۔ ہرودت۔ استانبول۔ روم۔ پیرس۔ مینٹو۔ نیو یارک، کیا لکھا گئی ہے۔ کیا لکھا نہیں اور گاڑیوں پارٹیاں ہیں۔ امڈاکر۔

آئیے۔ کیوں نہ ”لندن لیٹر“ کے ایک اور نامہ نگار یعنی اس خاکسار کے ہمراہ اس منظر کو ذرا قریب سے دیکھئے۔

ملاحظہ فرمائیے۔ بارون، ارنشڈ کا عراق جہاں چاروں طرف بیکراں ریگستان ہیں اور مجلسی ہوئی زندگی ہے۔ کہیں کوئی پائپ لائن دور سے نظر آجاتی ہے یا کوئی بدو چوپڑ پر بیٹھا سر جھکا لئے آہستہ آہستہ اپنی راہ چلا جاتا ہے۔ ایک ہی ٹھٹھک کر آسمان کو دیکھ لیتا ہے جس پر اڑن قلعے پرواز کر رہے ہیں کیا وقت ان لگا ہے کیا کبھی وہ سوچتا ہے کہ اس کے گڑا داواؤں نے اسی ریگستان سے نکل کر بحرِ عظیمات میں کیا سرپٹ کھوڑے دوڑائے تھے؟! مشرق وسطیٰ کے شہروں میں اب آپ کو سرف اطلال شک پار کے رہنے والے گھومتے نظر آئیں گے بدو اسی طرح باہر راستے کے کنارے کھڑے کھڑے چلا جاتا ہے۔

اس ریسٹوران میں ایک اور خاصا بین الاقوامی مجمع مروج ہے۔ دیواروں پر کوئو کو لاکے اشتہار لگے ہیں۔ ایک آدھ عراقی ماڈرنل اوبچی ایڑیوں کی سیٹل پینے سرعت سے ٹیکری میں سے نکل جاتی ہے۔ کس تند گرمی ہے۔ اطلال شک پار واسے پیسہ لینے ہوئے حمار ہے ہیں۔ یہاں نے اعلیٰ میں عروں کو تہذیب و تمدن سکھانے بھیجا ہے۔ یہ دور افتادہ قصبوں اور کچھ مٹی کی میندیوں میں حمار کو داہن تقسیم کرتے ہیں اور اپنے کیمروں سے تصویریں امارتے ہیں۔ مجلسی جنگلوں کے زلفے سے مشرق وسطیٰ کی زمینی سنے ان سفید فام قوموں کے وجود کو اپنے اوپر اسی طرح صبر اور قناعت سے سہا ہے۔ جو انگریز یا ڈچ یا فرانسیسی اس وقت حبیب پر جا رہا ہے جس کے نتیجے میں عرب بدو کا دنٹ بھی ہے تصویر اونٹ کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ کیا رومانٹک پس منظر ہے اس کے نگار داوا و چڑھشوں کے ساتھ ساتھ بیلسانی بھی ہو جاتے تو اعلیٰ کا ہے کو یہ بڑے دن دیکھتے بڑتے۔ اب ہر حال یہ انڈیو بلڈ ماکا ہیں اور یہ غافلگیر بندری اور جہاں چالے گا زمانہ ہے۔ اور اس ایئر منس پیڑ میں تثلیث اور توحید گیا خدا کے سارے ملنے والے ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے ہو رہے ہیں۔

توحید کا بجا دیکھ کر، عرب، ریسٹوران کے ایک کونے میں بیٹھا کسی مہری رسالے کی وزن گردانی کر رہا ہے جس میں مودی کیٹرول کی تصویریں ہیں۔ دھمیری نظم انڈسٹری نے اتنی ترقی کر لی ہے مادہ زہلی ام ربان اور شرکے و طرب میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا، مادہ زہلی ام ربان کی۔ بلکہ ان کے ساتھ خود بخود اپنی رنگس اور شرابا اور مدھوا والا اپنے اسٹریمر لائٹن آت دی شوٹر رشام کے لباس میں سب ایک لائٹ اور گاڑیوں کے ساتھ فرنسے سروانکار کے کھڑی ہو سکتی ہیں، ہر کیفیت، تو یہ بڑا شاعر عرب چپ چاپ بیٹھا رسالہ پڑھ رہا ہے۔ اس عرب کو دیکھ کر میرے دل میں محبت اور لگا لگات کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے۔ یہ میرے رسول اور میرے امام کی قوم کا ایک فرد ہے۔ وہ لوگ بھی اسی شکل و صورت کے رہے ہوں گے۔ یہی لباس پہنتے ہوں گے۔ درپے کے باہر فرات بہہ رہا ہے۔ جہاں پر میرے امام مظلوم کو پیاسا مارا گیا تھا میرے اوپر کافی جذبہ تہمت کی موڈ بخاری ہو رہی ہے۔ عرب نے کوئو ڈرنک کا گلاس ہاتھ میں اٹھا لیا ہے۔ میں اس سے کہنا چاہتی ہوں میرے بارے عرب جہاں ————— کو کوئو لاپا تو یاد کرو پیاس سیٹھی کی۔

وقت اپنی جگہ پر ٹھہر گیا ہے۔ آکر کمرے نے پہلے، بجائے شروع کر دیئے ہیں (!!) عرب بڑے سے شہدی رسالے سے اپنا پیشانی

صاف کر دیا ہے۔ میرے پیارے بڑے سوب۔ تم جو ایک پوری تاریخ رکھتے، ایک بہت بڑے عظیم تمدن اور ادایت کے بہت ہیچالے نمائندے ہو اور تمہارے خاتون میں یہ سوز کا سارا ہے اور تمہاری آنکھیں زندگی کی روشنی سے عاری ہیں تمہارے بچہ کموں نے تو مولو علی اور جناب عباس اور حفیظ کا ساتھ دیا جو کہ تم جو صدیوں کا بہت اذیت ناک اور عورت انگیز سفر طے کرتے، اس لمحے تک پیچھے ہو کر تمہارے رشتہ زدہ، بہنوں میں کو کو کو کا کلاس ہے۔ اب تم کہہ رہے ہو۔ میرے بھائی! میرے پیارے سارا بان — !!

یہ بیروت ہے۔ یہ ایک ترک میرے سامنے بیٹھا ہے۔ مذہبی اور تو می حذبائیت کا ایک اور سبب، کیا شاندار انوکھ ہے بیڑہ اور ادرتہ اور اس آئینہ کاسب ایک جھنکار کے ساتھ کانوں میں گونج گئے۔ وہ گویا سے ٹوٹ رہا ہے اور دو جہی یو۔ این کا ایک اہم کرکسٹر۔ گویا کسی کافر فلسفے کے مسئلے میں لگا تھا۔ اس نے ترک بریدگیڈ کا ذکر کیا اور ترکی جمہوریت کہ میں نے جنرل فخری پاشا کا تفسہ اُسے سنایا جو میرے ہاتھ بہت پیارے دوست تھے اور جنرل الاپاشا اور گمال اتاترک وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی ساری خلافت ترکوں کی درستان میں نے اس کے گوش گزار کردی۔ اس نے کسی خاص دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔ میرے بھائی چاہے اور اسلامی دوسنی کے جذبہ پر کچھ غصہ اپانی، ساڑھی کا ردا وہ اعظمیاں سے صرف یو۔ این۔ امیں اسپیکر کا تذکرہ کرتا رہا۔ پھر اس نے قدرے جذباتیت سے اپنی پوری جسمانی مال کا ذکر کیا جو بیمار تھی اور تیس سانس کی روانگی کے وقت کہا تھا کہ میرے بیٹے میں تم کو آزادی اور سچائی کی فتح کی خاطر گویا بھیج رہی ہوں، کارنامہ لوٹنا۔۔۔۔۔ ایجنٹیوں کو راہیوں پہ بھیجتا ترک ماؤں کی اچھی خاصی ہوئی اور عادتاً شہانہ سیر نہیں بلکہ بے میں سانس کی مال کی خیریت دریافت کی۔

ادھر دوبرا لٹنی بیٹھے ہیں۔ محفلِ انداز کو سبق سکھا دیں گے۔ وہ آپس میں کہہ رہے ہیں: مذکورہ نابالغ قاتل کا ہے۔

سڑک پر جنگ کے سہارے ایک ہمت مند سہن بھنجانے پر ہندو کا لاکھ کھڑے۔ جانے وہ یہاں کدھر سے آئے۔ وہ انگریزی نہیں جانتا۔ حتیٰ کہ اردو بھی نہیں بول سکتا۔ میں نے سارے چار سال کے طویل عرصے کے بعد ڈیڑھ جنگ کھڑے کے افراد کے علاوہ پہلی بار آج ایک عام ہندو کو دیکھا ہے۔ جن جیسا بنگالی ادا کرنے کے لیے ہیں اس سے بات کرتی ہوں۔ وہ ٹھیکہ بھجانی بولتا ہے جو میرے پتے نہیں پڑتی مجھے بعدِ تعجب پتا ہے جب میں کوشش کر کے زندگی میں پہلی دفعہ بھجانی میں باتیں کرتی ہوں۔ قومی یا ملی یکسانیت کا عجیب و غریب احساس! اترک اور انگریز اور فرانسسیسی دور، جنگ کی دوسری طرف کھڑے رہ گئے ہیں۔

سبز پہاڑوں کی ڈھلوان پر پھیلا ہوا اندر سمندر کے کنارے کنارے بکرا ہوا پر دت دمچپ میں گلنگار جا ہے۔ سمندر نیسا
میڈیکل ٹرین انیسے سیڈی ٹرینی، خدا قلم دو فون کو اپنی حفظہ ایمان بن رکھے! لبنان — اخیل جبران کے ملک، تم بہت پیاسے
ملک ہو یہ سب بہت پیاسے لوگ ہیں۔ یہ سارے انسان جو فیصل جبران کی کہانیوں کے کردار ہیں۔

لبنان کی کئی سو تک لڑکیوں کا ایک گروہ سمندر کے کنارے والی شہرک پرستہ شہر کی سمت آ رہا ہے۔ غالباً وہ لوگ میری ساری کوششوں سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ دروغ میں ان کے سنہری اور چمکیلتے بال جھلکا رہے ہیں۔ خوبصورت چہروں والی کئی سو تک لڑکیاں عربی میں ایک دوسرے سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہی ہیں۔ مذکورہ ساری کا ہے۔ تم انگریزی یا فارسی بولتی ہو؟ میں ان سے پوچھتی ہوں۔

فرخ دہری لکھتا: انگلیس نو— پھر وہ خاموشی سے کھلکھلا کر ہنستی ہیں۔ ان کی راہبہ جو خود بہت کم عمر اور خوبصورت ہے،

سکون سے مسکاتی ہے۔

یہاں دور دور انجیر اور بترن کے درخت ہیں جن کے جھنڈوں میں صدیوں پرانی کھیتربک خانا ہیں چھپی ہوئی ہیں جن کی سمت جانے والے سایہ دار خرابیہ راستوں پر سے کبھی کبھی کوئی پکار ڈیا جیپ تیزی سے اس اوبھی سکون کو منتشر کرتی ہوئی گزر جاتی ہے۔

پھر سائپرکس ہے۔ ساداتر کی پھیلا ہوا ہے۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں، چٹیل میدان، گیموں کے کھیت، تھوہ خانے، بکیرہ اسود، باسفورس، استانبول، پریوں کا شہر، روشنیوں، خوشبوؤں، رنگوں کا دارا سلطنت، کوئی چیز نئی نہیں، وہی لگیاں ہیں، وہی مسجدیں اور پبل اور بازار۔ جب میں بہت پچکنے میں ان جگہوں پر آئی تھی اس وقت کی یادوں کو کوکوشش سے اکٹھا کر کے میں نے اس زمانے سے ان کا موازنہ کیا ہے۔ کوئی فرق نہیں۔ آ؟

اجی قبلہ بہت فرق ہے۔ طیارہ گا میں اور بن گئی ہیں۔ فوجی چھاونیاں ٹریکڈ زنگ کھیتوں کی زراعت کے لیے منگوائے جا رہے ہیں مذہب کو دوبارہ زندہ کیا جا رہا ہے۔

نامن کمال کا ترکی۔ آتا ترک کا ترکی۔

میرے پیارے بابا، مجاہد حیدر یلدرم کا ترکی۔

اور اب باسفورس پر سورج غروب ہو رہا ہے۔ سارے میں شفق پھیل گئی ہے۔ اس شفق میں ابا مونیہ کے مینار نظروں سے اوجھل ہوتے جا رہے ہیں۔ مارمورہ کے پانیوں پر روشنیاں تاپتے تلپتے ٹنک ٹنک گئی ہیں۔ اور اس شفق کے دھندلکے میں مارا مشرقی یورپ ہماری نظروں سے پوشیدہ رہ گیا لیکن نظروں کے سامنے ہے۔

الیں۔ جرمنی۔

المائیہ! آہ المائیہ! (واہ المائیہ!!!)

برق۔ کوئٹہ۔ فریک فرٹ۔

ان ناموں میں کتنا سر ہے اے معزز ناظرین۔ لوہن کا جگمگا ناشر فریک فرٹ۔

فراو لین کیا چاہئے۔ ایک ویٹر جھک کر بوجھتا ہے۔

فراو لین کے پیارے بھائی فرٹز۔ تم تو ہمارے بھائی تھے نا؟ اب میں تم سے کیا بتاؤں مجھے کیا چاہئے۔ بڑا کنفیوژن ہے۔

بھائی بڑا کنفیوژن ہے۔

مجھے یہاں سے آگے جانے دو۔

بلجیم۔ کیا خوبصورتی ہے، کیا نفاست ہے، برٹسز۔ برٹسز۔ گرماؤں میں شام کی عبادت کے لیے گھٹنے بچ رہے ہیں۔ ان کی گورچ شمال کے کمر کو دو مسندوں پر پھیلتی جا رہی ہے۔

حضرات میر سے پاس وہ کیمبر نہیں ہے جو کہ میں نے برستون میں خرید لیا ہوتا تو کم از کم نذر غلام کے ساتھ میں اس کے متعلق تیار نہ ہوتا کرتی۔ اول تو مجھے ذوق گرائی اچھی طرح سے نہیں آتی۔ دوسرے یہ کہ اگر اس سے میں تصویریں اتار دیتی بھی تو وہ کسی کام کی نہ ہوتیں۔ کیونکہ میر سے پاس وہ نور مسطردیہ نہیں جس کے ساتھ یہ تصویریں کھینچ کر گھر خطوں میں بھیجی جاتی ہیں۔

لہذا ناظرین، اب میں باقم سجانہ، لندن لیٹر بے تصویر کا آغاز کرتی ہوں۔ دیباچہ ختم ہوا۔

۷۸۶

تقدیات! اس پوسٹ رہا، دلیہ زاد پر یہ پیکر عروس المیلاؤ سے ہمارا کتنے صدیوں کا پرانا قلبی اور روحانی تعلق ہے۔ ذریٰ آؤ بہ حالِ کبھی کا خیال کیجئے کہ جب سٹی آف لندن کے تاجر مدراس اور بنگالے کے لیے یہاں لنگر اٹھاتے تھے۔ یا جب اوکسفورڈ اور کیمبرج کے بونہاد فرزندوں کو سراچ الڈولر اور شجاع الدولہ کے پاس در کام سے بھیجا جاتا تھا کیا کیا معرکے ہوئے ہیں، کیا کیا توہینِ دینی ہیں۔ اندیشہ کبر پیچے سے یہاں کے کسی کیسی داستانیں وابستہ ہیں۔ چارلس ڈکنز کے ناولوں کے علاوہ روڈیا رڈ کپلنگ اور ولسن چرچل کے اوراق ان کلی کوچوں میں کبھی سے ہوئے ہیں۔

یوں اندازہ لگائیے کہ کتنے اتنی سال سے ہمارے نوجوان یہاں ادب، قانون اور طب سیکھنے کے لیے آتے رہے ہیں۔ یہاں ہائیڈ پارک میں کھٹے پر کر انھوں نے شعلہ بار تقریریں کی ہیں۔ لندن مجلس اور قہوہ خانوں اور اینک منٹ میں میڈیکل آزادی کے خواب دیئے ہیں۔ عاصمتِ ہالی کے دروازوں پر پہنچ کر جہدِ جد کی ہے۔ ہمارے نیناؤں نے گول میز کے گرد بیٹھ کر برطانیہ کی طاقت سے ٹکرائی ہے اور اب خداوند تعالیٰ کی عنایت دیکھئے کہ بالآخر ہم آزاد ہوئے۔ سچ ہے صبر کا چل بیٹھا ہوتا ہے۔ بڑا میٹھ۔

ہماری آزادی کے ساتھ ہمارے نوجوانوں کے گاندھوں سے گویا ایک بار انگریزا۔ اب ہم یہاں ایک جگہ چلتے چلتے شہر کے ساتھ آتے ہیں۔ ہمارے نیناؤں نے لڑائی لڑنے کے لیے نہیں بلکہ منظم پلس کی گاڑیوں پارٹی میں شریک ہونے کے لیے تشریف لاتے ہیں۔ اب اگر کوئی لینڈ لیڈی ہمارے کالے رنگ پر اعتراض کرے تو ہے تو ہم مطلق اس کا فوش نہیں لینے بلکہ جی عہد کے اس کے گروں کو کندہ کرتے ہیں، اس کے والی پر پیر سپاہی سے کہتے ہیں اور کھانا کھانے کے بعد اس کے پردوں سے گزرتے پکار انگلیاں بھی پونچھ لیتے ہیں۔ یہ سب اس لیے کہ ہم آزاد ہیں۔ جلاہم ہیں اور مثلاً۔ مثلاً۔ کسی اور آزاد قوم میں کیا فرق ہے؟

اے مومنین! اس وقت اس ملک میں کفر کی اس آماجگاہ میں چالیس ہزار لکھ گورہت ہے۔ کسی مسجد میں۔ ایک آدھ زندقہ لکھا بھی گلے سے لگا ہے۔ اسلام قبول کر لیتا ہے۔ ہمارے تاج ہیں جو مختلف جہادگاہوں میں رہتے ہیں۔ مزدور ہیں جو شمال کے سارے صنعتی مرکزوں میں موجود ہیں۔ صرف شہر لندن میں تو ہے ہندوستانی اور پاکستانی رستوران ہیں۔ ہمارے ان گنت دھکے اور لڑکیاں یہاں کے کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے میں مصروف ہیں۔ پھر ہماری میگنٹ ہیں: جب کوئی خاتون زرتار ”غراہ“ پہننے مٹرک پر سے گزر جاتی ہیں تو اللہ دیکھنے والوں کی ہبعت گھٹھ ہو جاتی ہے۔

میں نے عرض کیا تھا نا۔ بڑی لگائی گئی ہے۔

ہندوستان والوں کا بھی یہی احوال ہے۔ انڈیا ہاؤس کی مختلف اقسام کی عمارت میں جہاں ہمارے نادر علمی نسخے، مغل تصویروں اور سارے تہذیبی خزانے محفوظ ہیں، جن کی دیواروں پر سے میرے گورو اہل ایم سین کے بنائے ہوئے فریسکو ز کی تصویریں خاموشی سے نیچے جھانکتی ہیں۔ ہمارا فی جھانسی کی جانفشان، نئے بھارت کی سرنگ بلالیں اپنے ویش کی سفارت کے فرائض انجام دیتی ہیں۔ نفاذ جینتستانی جاتی ہے۔

جی ہاں۔ یہ بالکل ایک نئی دنیا ہے۔

سو بڑے اُدھر بسنے والوں کی اس نئی دنیا کی جھلک جب انگریز بسنے ملک میں دیکھتا ہے تو اسے بڑا اچھا بھڑا ہے۔ ساریوں اور ہندوستانی آرٹ کی تعریف کرتے کرتے اب اس کا حلق خشک ہو جاتا ہے (میرے پاکستانی پڑھنے والے مجھے معاف فرمائیں جب میں اس شخص میں ہندوستانی آرٹ کا ذکر کروں گی۔ کیونکہ جب یہ توک لفظ پاکستان سے ہی زیادہ واقف نہیں تو پاکستانی آرٹ وغیرہ کا تذکرہ تو بہت دور کی بات ہے) ہندوستانی رقاصوں کے ایک ڈانس پروگرام سے اس ملک کی حلقہ چلی یہاں ایک شام میں جو جاتی ہے اس کا تذکرہ یا مقابلہ ہمارے ایک بڑا ریفلیکٹ جی نہیں کر سکتے۔ ہم کتنا ہی ان کے اپنے ریفیو جی پروگرام، اپنے کشیر کے کپس، اور اپنی ترقی کی لکیوں کے متعلق بتائیں لیکن پڑھتے تھے طبقے کے ایک مخصوص حصے کے علاوہ ایک عام برطانوی مرد یا عورت کو یہ باتنے کی مطلق خواہش یا پرہیز نہیں تھا۔ ہمارا سیکسٹریج کیا ہے۔ یا ہم کتنی جوت بلز قائم کرنے والے ہیں۔ جبکہ شیریں دہیخدار کے بیسے یا تیش اور دیپک مار کی فلم ان کو دیکھنے کے لیے لندن کا ایک عام شہری تھنوں طیارہ اسکوار میں ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے سامنے کیڑا گھاسے صبر و استقامت سے کھڑا رہتا ہے۔ لیکن برحال، یہ بالکل ایک دوسری بحث ہے۔

لندن کی پھر نئی زندگی میں آرٹ کی منافشوں، ٹھیک، اوپرا، بیسے اور کورس کے ساتھ ساتھ ہندوستانی نفس کے منظر پر بھی ایک اہم حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ اور اس تمام آہن کی کامیابی کے بعد سے ہندوستانی فلموں کو بھی یہی مقبولیت حاصل ہو جائے گی جی جو تھیلے دونوں میاں آتی ہوئی تھی، اسے یہاں کے پریس نے کافی پسند ڈی وی اور برطانوی اور امریکی پروڈیوسروں نے اسے باقون باندھ لیا۔

نئی کے ذکر پر خیال آجاکہ انگریز کی نفسیات کے متعلق کچھ عرض کر دوں۔

’آٹا‘، ’سٹامپی ٹکوس‘، ’فلم‘ جس میں تازہ ترین ڈولی کی کیڈی ایک کہیں اور تلواریں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ ڈویل رٹسے جاتے ہیں اور ان سب نوعیات کا اعلیٰ بیانیہ پر میکانیکی مکرر مظاہرہ ہوتا ہے جو ہمارے ملک میں صرف بیوٹی ڈالوں کو بہت پسند آ سکتا ہے۔ لیکن خدا کے فضل و کرم سے جتنی دالے طبقے کی رنڈا خیمہ ساری دنیا میں تقریباً ایک سی ہے۔ ہائی وڈ کی اتنی فیصدی تصویریں اسی عالمگیر طبقے کے لیے بنائی جاتی ہیں۔ لیکن مجھے یہ ہے کہ آٹا کے مقابلے میں ”ہم لوگ“ یا ”دھرتی کے لالی“ یہاں ایک روز بھی نہ چل پاتی۔ ہندوستان کے متعلق جو تصور یہاں پر صدیوں سے موجود ہے، یعنی ہمارا جگہ کے جتنی گھوڑے اور تلواروں کی ڈٹائیاں اور سونے کے عمارت وغیرہ وغیرہ، وہ سب اس فلم میں بخیر و خوشی پیش کیا گیا ہے۔ لہذا انا ٹیکسٹس برج میں کام کرنے والی ٹائیسٹ لوڈ کی اور ٹی آٹا لندن کا بنک کارک خوش خوش گھر دوسٹے ہیں کہ انھوں نے ہندوستان یعنی مشرق کے گلیمر کی ایک جھلک دیکھ لی۔ مجھ سے یہاں کے ایک بہت بڑے

انگلینڈ میں اور بڑے شہر فلم کرٹک نے کہا کہ عالمگیر فلمیں ان کے لیے فلم بنانے سے پہلے آپ کے ڈائریکٹر محبوب کو کلاوی فلم "سائیکل کاچر" کو دیکھنے چاہئے تھی۔ یاد چارڈر لیسٹی فلمیں، میں نے "سن کی کپیلے ہائی وڈ کے ان سارے ڈائریکٹروں کو بھی "سائیکل کاچر" دکھائیے جو "نصرت" اور "دشتی کاچر" اور "سیلو گول" اور "بلغداد" جیسی تصویریں بناتے رہتے ہیں۔ یا جن حضرات نے "مکرم" تیار کیا ہے۔ محسن شہر محبوب کی ذہنی نزہت کے آپ کیوں اتنے خواب ہیں۔

انگریزوں کی اس مخصوص نفسیات کا سب سے بڑا احساس ان کا پرہیز ہے۔ SENSATIONALISM ان کی محبوب ذہنی غذا ہے۔ صرف بہت زیادہ بڑھا چکا طبع طائر یا چرہ کا صحن یا نیو ایسٹنٹین یا اینڈیشن پڑھتا ہے۔ اکثریت کے لیے وہ اخبار لکھتے ہیں جن میں نقل و مار پیٹ، اغوا، جنگیت اور اسلئے ڈاکو، ہوتا ہے۔ اسٹوڈیو کیس اب یہاں آخری سانس لے رہی ہے لیکن اب بھی عوام کو یہ خبر پڑھ کر بے حد اچھا معلوم ہوتا ہے کہ لارڈ لٹل کے بیٹے نے زہل نڈل کے نکلے رات سے فیر میں اپنی پارٹی میں شہر میں اتنی بوتلیں پیرس سے منگوائیں اور اسپین کی خانہ بدوش و قلاؤں کو بڑبڑا رہا ہوا تھا چھ گھنٹے کے لیے میڈرڈ سے بلواید پارٹی میں کچے پانچے سبجے تک جاری رہی۔ یا یہ کہ کلاؤٹس ٹلاں اتنے تنگ کوٹ کے کلاوی دیو پراشتریت لگے گئی ہیں۔

ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ عوام کو سیاست کی بعض تفصیلات سے جانی بوجھ کر لاعلم رکھا جاتا ہے۔ خود یہ طبقہ گھوڑ دوڑ، کزن کی دودھ اور فٹ بال ٹول اور کرکٹ کا اس قدر شیدا ہے کہ اس کے مقابلے میں بین الاقوامی صورت حال کی اسے زیادہ فکر نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ برطانوی عوام سیاست سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ لیکن ڈارلن الی کے لیے بہر حال چین سے زیادہ دلچسپ ہے۔

ویسے ملایا کی دوسری بات ہے۔
تحریر و تقریر کی آزادی یہاں ایک مذہب مزدوروں کو دے۔ پچھلے دنوں یہاں روسی فلم "ذوال برٹ" دکھایا جا رہا تھا نظم شروع ہونے سے پہلے یہ الفاظ سامنے آتے تھے۔ "برطانیہ ایک آزاد ملک ہے۔ اور ہم اس کے باشندے، اس چیز میں یقین رکھتے ہیں کہ جہاں سے علاوہ دوسرے شخص کو بھی اس کا حق ہے کہ وہ اپنا نظریہ اپنی رائے آپ کے سامنے پیش کرے۔ ہمیں اس فلم میں پیش کی ہوئی بہت سی باتوں سے اتفاق نہیں۔ اور روسیوں کو فتح ان کی بے مثال مادی کے علاوہ برطانوی اور امریکن اسلحہ جات کی وجہ سے بھی ہوتی تھی بلکہ بہر حال یہ ایک بہت عظیم فلم ہے۔" وغیرہ۔

یہ فلم اس طرح کے تقاریر کے ساتھ امریکی قسطنطنیہ دکھایا جاسکے گا۔
آزادی تقریر کا دوسرا مشہور معدودہ صورت حرکت کا نینڈ پارک ہے جہاں لکڑی کے ڈھلوان پر کھڑے ہو کر ساری دنیا کے سیاست دان، ایچی میٹرز، مصنف اور ادیب ہر زمانے میں گلا چھڑا کر کھیلنے لگتے ہیں۔ ایک طرف کوئی صاحب کیونست پارٹی کا پوسٹر لگائے جا رہی جنگ کے متعلق کچھ کہہ رہے ہوں گے۔ ان سے دو قدم ہٹ کر ڈیم آف کنٹریز کی کے خلاف جھلجھلا کر کچھ ارشاد کیا جا رہا ہوگا۔ دوسری طرف سوشلسٹ پارٹی کے نمائندے اپنا بیان دیتے ہوں گے۔ ایک سمت خداوند تعالیٰ کو سخت و سست کہا جاتا ہوگا۔ ان کے ساتھ ہی دوسرے اسٹینڈ پر سیرج مسیح کا پیغام پیش کیا جاتا ہوگا۔ ایک روز ایک فوسلم انگریز لوری ایک پاکستانی مولوی صاحب بھی خوش خوش سے کچھ فرما رہے تھے اور مجمع نقشے لگا رہا تھا۔

مفتاد اور سامعین کے مابین ٹکرا رہی ہو جاتی ہے۔ مجھے ہر ایک کی سنت ہے اور اسی طرح تمہیں لگتا آگے بڑھ جاتا ہے۔

آزادی تقریباً نصف ہائیڈرک تک ہی محدود ہے۔

پچھلے دنوں چند اخبار و فروخت کرنے والوں نے طے کیا کہ وہ ڈیلی وکرز نہیں گئے۔ ٹائٹلز نے اس پر بڑا زور دیا کہ لکھا کہ یہ روئے غلط ہے۔ اگر وہ ڈیلی وکرز نہیں گئے تو ہم ان کو ٹائٹلز ہی بیچنے کے لیے نہیں گئے۔ کیونکہ یہ روئے حکومت کے اصولوں کے منافی ہے۔ کل کو ٹائٹلز یا کسی اور اخبار کے لیے بھی یہ فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ آزادی تحریر پائندہ باوجود۔ چنانچہ اخبار بیچنے والوں کو اپنا فیصلہ دیکھنا پڑا۔ یہ برطانوی اصول پرستی کی ایک مثال تھی۔ تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ اس کے باوجود پہلے کی طرح اب بھی یہ اخبار ہر نمونہ سٹینڈ پر آپ کو دستیاب نہیں ہو سکتا۔ ایسٹ اینڈ کے چوراہوں پر کوئی غریب لڑکی اسے فروخت کرتی آپ کو مل جائے گی۔

ایسٹ اینڈ ————— ایکٹیوٹیٹ سے خوب میں بیٹھ کر آپ دائرہ چمکے یا اپنی گریس آریسے۔ میں پچیس منٹ کے اندر اندر آپ بالکل ایک دوسری دنیا میں وجود ہوں گے جہاں بیماری سے تباہ شدہ محلے ہیں اور محلوں سے چلے ہوئے مکانات اور تارکے لگائے۔ جہاں کی سڑکوں پر آپ رات گئے تنہا گزریں تو آپ کی جیب ضرور تراش لی جائے گی۔ ناقتیوں نے اپنی بیماری کا فضا خانہ خاص طور پر اس علاقے کو بنایا تھا جہاں لندن کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی گھنای آبادی واقع ہے۔ یہاں کوئی کونویشن نہیں ہے۔ ہر شخص بے حدودی کی موڈ میں رہتا ہے۔ افلاس اور گندگی کے معائنہ میں یہ علاقے ہمارے اپنے محلوں سے کچھ کم نہیں ہیں یہاں ان گنت ہندوستانی، پاکستانی اور لڑکے کے مزدور رہتے ہیں۔ بڑوں سے رہتے آئے ہیں اور اس آبادی میں دم مہم ہو گئے ہیں۔ ان کے لباس بھی اتنے ہی بد نما اور شکستہ ہیں جتنے ان کے سفید فام ہمسایوں کے۔ چھوٹے چھوٹے نیم تاریک ہندوستانی طعام خانے ہیں جہاں اتوار کے روز دیوار پر چھوٹی بستی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ نگر وارڈ کے اچھے رہتے ہیں۔ ایک چاند خانے میں ایک روز ہر لوگ گئے۔ اس میں دیوار پر پرانا مسلم لک۔ کالینڈر لٹک رہا تھا جس پر قادیانہ کا حکم اور جمادی کی گینٹ کے افراد کی تصویریں تھیں۔ بے رنگ کریال اور جیدی میز پر تھیں۔ ایک کونے میں ایک افلاس زدہ انگریز دال بنات کھانے میں مصروف تھا۔ کاؤنٹر پر سیاہ فام، نابالغ سہلٹ کا رہنے والا ریڑھ بٹھا ہوا بیٹا، در و دل ————— عین میں کراچی کی بندر روڈ کا کوئی رستوران معلوم نہ تھا۔ ڈیوڑھی پہن کر بیٹھ کر، نے فیئر؟ ————— جی ہاں۔ ان الٹ میلوں جگہوں کے علاوہ جن کے اندر داخل ہو کر لوگوں کی عقل چکر میں آجاتی ہے اور انھیں چکا چوند ہو جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ یہ چار خانہ بھی موجود ہے۔ انگلستان میں دہائے اخیر کا مغربی کٹا رہی نہیں ہے۔

اتوار کے روز ایسٹ اینڈ کی مشہور بیچی کوٹ لہیں میں ہاٹ لگتی ہے۔ وہی ٹھیلے والوں کی بھانت بھانت کی صدائیں ہیں۔ مرگ بچی بیچی جوٹی بریصاں، سیکٹہ ہینڈ مال کے انبار دو روئے فٹ پاتھ پر پڑے ہیں۔ وہی رنگ اور ماحول ہے جو اپنے پیارے خاص کے بازار میں تھا۔ ذرا فرق نہیں۔

پھر یہ لگیاں ہیں جن کی دونوں طرف شکستہ مکانات کے سلسلے ہیں جو کے دروازوں پر عورتیں بیٹھی دھوپ سیکھتی ہیں اور سامنے بچے کھیل رہے ہیں۔ کوڑے کے ڈھیر، بٹے کے انبار، غریب یہودیوں کے عبادت خانے میاں سے کوئی پکار ڈی یا سٹیجیم جھوٹے سے بھی نہیں گذرتی۔

یہ منظر آپ کو ہر جگہ ملے گا۔ شمال کے صنعتی مرکزوں میں شیفلڈ میں، گلاسگو میں، ویوکی آبادیوں میں، سارے آئرلینڈ میں

اور پھر چیلنج کر کے بعد اٹلی، اسپین اور یونان میں یہ سامنا پچھتم ہے جس پر کبر و چھایا ہوا ہے۔ کبر جو پچھتم کے سمندر میں اٹھتا ہے۔ نیچے نیلا مٹی کی زمین پر جگہ لگا رہا ہے۔ جس کی مہجوں پر کاؤنٹس آتے ٹیڈل ڈیم کی یاٹ تیرتی ہے۔ حسین کاؤنٹس آتے ٹیڈل ڈیم جو مار کوئٹس آتے ٹیڈل ڈیم کے ساتھ، پندرہ منٹ کوٹ سے کراٹھوی ریو پر تشریف لے گئی ہیں۔

میری پیاری دوست خایا نے مجھ سے کہا۔ اس انٹرنیشنل مسلم لینڈ سے تم انکم ہم اپنے یہودیوں کو نکال کر اسرائیل لے گئے ہیں۔ ہمارے COLLECTIVE نام دیکھو۔ ہماری نئی موسیقی، ہماری کلچر، ہمارا جذبہ۔ ہمارے سامنے وہی مسائل اور دقتیں ہیں جو ہمیں پیش ہیں۔ نیا ملک ہے۔ نئی اجتماعی طاقت جو پرانی تاریکی کی طاقتوں سے ٹکراتی ہے لیکن پھر یہی ہم اور تم ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ بتاؤ ہم میں اور تم میں، یا ہم اور عربوں میں کیا فرق ہے۔ وہ خاموش ہو گئی۔

— ہم نے کئی بار کوئٹس کی کراٹھوں کے ساتھ مصالحت کر لی لیکن ہمیشہ کوئی نہ کوئی نشانہ دکھ کر دیگیا۔ تاکہ مشرقی وسطیٰ میں عربوں اور یہودیوں میں باہمی مفاہمت، سمجھوتہ اور امن نہ پیدا ہو جائے۔

وہی ہندو مسلم مسند تھا۔ خایا نے پھر کہا۔

اب وہ جب چاہ بھیجے۔ خایا دوسری نژاد ہے۔ لو کہیں میں پیدا ہوئی تھی۔ بارہ سال کی عمر سے اس نے فلسطین کی اندر گراؤندہ تحریک میں کام کرنا شروع کیا۔ اس نے دہائیوں سے انگریزی ادب میں ڈاکٹریٹ لیا ہے۔ خایا بے حد خوبصورت لڑکی ہے۔ ایک تو یہودی ویسے ہی بہت دلکش اور ذہین ہوتے ہیں۔ اس لیے خایا کو گیمبرج میں عام طور پر بہت پسند کیا جاتا ہے۔ خایا یعنی حیا، یعنی حیات، عبرانی میں خایا زندگی کو کہتے ہیں۔

لیکن میں بنی اسرائیل کی نئی زندگی کے اس سہل سے ہر وقت اٹھتی رہتی ہوں۔ علاوہ ازیں میرے ملک نے خایا کو سرکاری یا اخلاقی طور پر تسلیم نہیں کیا ہے۔ میں خایا کو کبھی معاف نہیں کر سکتی۔ اس نے اپنے دوستیوں سے کتنے ہی گنت عربوں کی جان لی ہو گی۔ یہ سوج کر مجھے اس کے وجود سے نفرت ہو جاتی ہے۔ وہ اطمینان سے سمجھتی پانچویں پر چکر و سکل بجاتی رہتی ہے۔ وجہ وہ جذباتی ہو جاتی ہے تو کسی کانے لاپے شروع کر دیتی ہے۔ روسی اس کی مادری زبان ہے۔ عبرانی مذہبی اور سیاسی، انگریزی، ادبی، اور فرنگی اس کی کلچرل زبان ہے۔ وہ بڑی کٹر انٹی برٹش عورت ہے۔ فلسطین کی جنگ کے زمانے میں کئی دفعہ برطانوی فوج نے اسے جیل میں بند رکھا اور برطانوی پولیس نے اس کی پیٹھ بھیجی۔ سیاسی طور پر وہ اشتراکی ہے۔ اس کا باپ اسرائیلی حکومت کا ایک اہم رکن ہے۔ دفعہ عقبر کہ ان سردمراؤں انگریزوں کو وہ بحیثیت مجموعی کافی پُر اسرار اور پُر کشش نظر آتی ہے۔ پائنڈہ باو خایا یعنی حیات۔

اس وقت خایا ڈاکٹر اٹل ٹرے اہلیت کے معاملے میں الجھ رہی ہے۔ ڈاکٹر اٹل ٹرے برگ کا انٹیکو نیل ہے۔ مجھے وہ ہمیشہ شے کتاب ہے اور نگاری، کدھر کدھر تلبے کیونکہ سنسکرت اور کالی داس کا وہ بہت عارف فاضل ہے۔ سات سال تک وہ مشرقی محاذ پر روسیوں سے لڑتا رہا۔ روس میں نظر بندی کے زمانے میں اس نے پہلی بار ”جرم و مہمرا“ کو پڑھا۔ اب وہ برگ میں ادب کا

پروفیسر ہے۔ پروفیسر کی ننگی چوٹی غائب کی بزرگ سے اس انگلی پر ٹیل سے بالکل نہیں بچتی۔ کیونکہ غائب کو جرموں سے نفرت ہے۔ ڈاکٹر اسٹریٹ کی عام موجودگی میں وہ اکثر مجھ سے کہتی ہے ذرا دیکھو تو اس منحوس ہنا کوئی کالیبتاس کے پچے کو۔ یوکرین میں اس نے کتنے ہزاروں دی ہیرا دیوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہو گا۔ یوکرین جو میرا وطن ہے۔

یوکرین تمہارا وطن کہاں سے آیا سنم اسرائیلی ہو۔ میں اس سے بڑھ کر کہتی ہوں۔

یوکرین میرا وطن بالکل اسی طرح ہے جس طرح سوہر خدہ تمہارا وطن ہے، اٹلا کر تم پاکستانی ہو۔ وہ چٹا کر جواب دیتی ہے۔

———— اب ہم خطرناک پانیوں کی طرف سفر کر رہے ہیں ———— اور دھڑ دھڑا کر دھڑک رہے ہوئے آہستہ سے کتاب ہے۔

برطانوی ہے، قوم کا، ایگلو سکین۔ اس گروہ کا ایک اور منگلیو ٹیل، سارے جدید انگریزی ادب پر وہ بھی ہم سب کی طرح بے تحاشہ مادی ہے اور اپنے آپ کو ڈاکٹر میونس سے زیادہ سمجھدار فکرو خیال کرتا ہے۔ ڈاکٹر میونس تو جو کیمبرج کے بڑے گروہوں میں سے ہیں۔ وہ اکثر اٹھتا رہتا ہے۔ تم برصغیر ہند کی ساری خرافات و سیاسیات کا ذمہ دار محض مجھے ٹھہراتی ہو۔ یہ تمہاری بڑی بھول ہے۔ وہ انگلی اٹھا کر پیچھے لڑا انداز میں مجھ سے مخاطب ہوتا ہے۔

ڈاکٹر اسٹریٹ فکر کو سیاست کی خرافات سے چنداں دلچسپی نہیں۔ وہ ٹیگور کے فلسفے کے متعلق کرسٹوفل سے کچھ فرما رہے ہیں۔ کرسٹوفل کوئی ایک سنس کے دفاع میں سے ہیں اور جدید شامووف اور نقادوں کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

ٹیگور ٹیگور چلاتے ہیں۔ آپ نے کبھی اپنی خندوں کا مقدمہ پڑھا ہے؟ میں غصے سے ان دونوں سے کہتی ہوں۔ شہزاد کا سارا ذہن و فلسفہ محض ٹیگور پر مبنی ہے۔ حضرت علی اہل اسلام غزالی اور ابن ندیم اور اقبال کا بھی تو مطالعہ کیجئے۔ لیکن بھلا آپ عیسائیوں کا تعصب کب سنے گا۔

ہم خطرناک پانیوں کی طرف ———— روڈ ٹو آہستگی سے تیسرا سکرپٹ جلد ہا ہے۔

چنانچہ چاروں اور یہ خطرناک بانی ہیں۔ اور ہم سب ایک ٹاؤ میں سوار ہیں۔

کیم آہستہ آہستہ ہوتا جا رہا ہے۔ تیرہویں اور چودھویں صدی کے کالجوں کے پیچھے سے یہ سیکڑوں برس سے یونانی ہوتا آیا ہے۔ اس کے دونوں طرف پتھر سے ڈھلے ہیں اور بے انتہا سرسبز درخت ہیں۔ موسم بہار کے سارے پھول امانڈ رہے ہیں۔ دھنگل ٹوڑ کی شاخیں بانی کی سطح پر جھکی رہتی ہیں۔ صدیوں سے یہ پھیل اور یہ پرانی دیواریں اور یہ پل، یہ اندر گزرجوٹ، بخشیں سننے آئے ہیں۔ بے حد پُر سکون ———— اور بے تحاشہ خوبصورت منظر ہے جو کرسس کارڈوں اور کینڈیڈوں پر متعلق ہو کر دنیا بھر میں فروخت ہوتا ہے چیری کے درخت ہیں اور ان میں پیچھے ہونے کا بچ اور ڈی گرا پٹر ہے جہاں دیو پرت بروک رہتا تھا۔ گرا پٹر، گرا پٹر، گرا پٹر کے قبرستان میں دیو پرت بروک کے میموریل پر ایک اکیلے ریختہ چھائی پڑی ہے۔

ایک تیز رفتار موٹر لالچ یونین جیک لہراتی زانٹے سے سطح پر سے نکل جاتی ہے۔ گڈا اوٹل یونین جیک ———— اگلی ٹیہ سے کہتا ہے۔ ہولی ٹیہ میکڈونلڈ اور انڈر کوجیمس کناروں پر دور دور زنگ ٹو میوں میں منتشر دیک اینڈ منار ہے ہیں۔ پانی کی لہروں

پران گنت PUNTS تیرہ رہی ہیں۔ ابھی قریب سے جو پنٹ گڑی ہے۔ اس کے سرے پر کھڑی بوٹی غائبانہ خوشی میں اگر نمودار سے کوئی حیرانی کوک گیت شروع کر دیا ہے جو اسراٹیل کے کمیتوں میں لڑکیاں لگتی ہیں۔ ڈاکٹر اطرطو ہستہ آہستہ ایک دم جس نغمہ الاپ رہا ہے۔ ڈاکٹر مینٹی کارمن، نیگرو روحانی گیت، گلگٹا نے لگتی ہے۔ اسٹریٹشن سمٹی شروع ہو جاتی ہے۔

”تم بھی کوئی ہندوستانی، میرا مطلب ہے پاکستانی کا ناگاؤ۔“ رونڈو ذرا غفلت سے مجھ سے کہتا ہے۔ نیٹسی انکمیں نیمروا کے اپنے وطن، جنوب کے۔۔۔ PLANTATIONS کے گیت گارہی ہے۔

ڈاکٹر مینٹی کارمن۔ یہ میری دوسری پیاری دوست ہے۔ اس کی داوی جمشی سیدوگل تھی جسے نیر اور لینز میں فروخت کیا گیا تھا۔ اس کا باپ درجینا پوری ہے۔ مینٹی کو درجینا کے کسی کا بیٹا میں اسے تسلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ لہذا اس نے شمال کی کسی بوٹیورسٹی میں جا کر پڑھا۔ اور امریکن ناول میں نیگرو پادری کے کردار پر متاثر ہو کر اس نے کولمبیا کے ڈاکٹر ٹیڈا، ایڈ جہزب لکھی بہت بڑی نیگرو بیوٹی میں ادبیت کی پردھیر ہے۔ نیٹسی بے حد پیاری لڑکی ہے ہر وقت شاش پتہ ہے ادب بات پر نمودار سے تھکتے لگتی ہے۔ ”دیکھو۔۔۔ تم لوگ ہمیشہ اپنی مظلومیت پر بسو رتے ہو اور زندگی سے بیزار نظر آتے ہو۔ لیکن مینٹی کو دیکھو۔ اس کی قوم نے کتنے غم سے ہیں اور یہ اس طرح ہر قسم سے مینٹی اور دوسروں کو ہنسائی رہتی ہے۔ حالانکہ یہ بھی اپنی سیاسیات اور اپنے کھڑوٹم کے بارے میں تمامی طرح ہی حساس ہے۔ بلکہ اس نے تم سے زیادہ دکھ سمے ہیں۔“ رونڈو مجھ سے کہتا ہے۔

مینٹی واقعی بہت عظیم ہے۔ ہمارے سابقین چار امریکن اور ہیں جو صوبہ کے سب سے کسی نہ کسی مشہور یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کر چکے ہیں یا کر رہے ہیں۔ سب بڑے ذہن پرست ہیں۔ مثلاً یہ لاکا دوسل فریزر جو نیویارک کے ایک مشہور ادبی رسالے کا جوائنٹ ایڈیٹر ہے اور امریکہ کے نئے بلند پایہ نقادوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ لیکن ہم کبھی ایک دوسرے سے سیاست کی بات نہیں کرتے۔ صرف ایڈیٹریل ڈنڈ کا تذکرہ ہوتا ہے۔ مینٹی ان سب کی دوست ہے کہونکہ بہر حال وہ بھی امریکن ہے اور بڑی ہی امریکن ہے۔ لیکن ان صوبہ سے مختلف ہے ایک بات آپ کو اور بتا دوں۔ نیٹسی، خجایا یا رونڈو کی طرح اشتراکی خیالات کی حامی نہیں ہے۔ امریکی طرز جمہوریت کی پرستار ہے۔ پھر بھی اس کے کتنی گھمبیر تا اور کتنے دکھ سے وہ نیگرو روحانی نغمہ، الاپ رہی ہے۔

مینٹی کارمن بہت عظیم عورت ہے۔

کل ایک انگریز لڑکی نے بریگفاٹ کی میز پر اس سے بہت بشاشت سے کہہ دیا ”لو ٹوٹسی۔۔۔!“

مینٹی نے اس سے کہا ”دیکھو ڈارلنگ، مجھے معلوم ہے کہ تم نے کسی بُری نیت سے نہیں بلکہ محض خوش دلی سے توٹسی کہہ کر بھلا رہے۔ لیکن آئندہ کسی نیگرو کو اس نام سے مخاطب نہ کرنا۔“

”اوہ۔۔۔ آئی ایم سوسری ڈیر۔“ انگریز لڑکی نے جواب دیا اور خوشی سے پارچ میں مصروف ہو گئی۔

”تم نے کیا کیا“ بعد میں مینٹی نے مجھ سے مخاطب ہو کر آہستہ سے کہا۔ ”یہ بالکل اسی طرح ہے جب یہ لوگ نیگرو عورتوں کو توٹسی یا نیگرس کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ تم سمجھتی ہو نا۔ میرا مطلب ہے کہ۔۔۔“

وہم تانا دھری تانا تانا دھری تا دھیم — سب مل کر لاپٹے گئے ہیں۔
ٹیک — ارسل فریز چلا کر خوشی سے کہتا ہے۔

ان سفید قوموں کا بکر کسرا اب بندر آہن کا گیت بجا رہا ہے۔ یہ دھنیں انھوں نے آج تک نہ سنی تھیں۔ سب کے سب بچوں کی طرح اکسا بیڑ ہیں۔

وہ بوائے —! نینتی چلا کر کہتی ہے۔

کیا کچل ہار مٹی پیدا ہوئی ہے واسطہ —! میں سوچتی ہوں۔

شام کو ای ایم فار ستر مجھ سے کہتے ہیں — میں ہندوستان کو جھٹکس طرح جھل سکتا ہوں؟ — کبھی نہیں! —

یس سر — میں کہتی ہوں۔

خصوصاً تمہارا لکھنؤ۔

یس سر۔

تمہاری تہذیب۔

یس سر۔

تمہاری سادی مجدد جہد۔

یس سر — تو مجھے فار ڈیکر کو بھلے

فار ستر کھل کھلا کر ہنس پڑتے ہیں۔

سارے ایسٹ انگلیا پر، جنوبی انگلستان پر، موسم گرما کے خوشگوار بادل چھائے ہوئے ہیں۔ پھر دھوپ نکلتی ہے۔ سیدھی اپنے عروج پر ہے۔ ایسٹ اینڈ میں پیرا سٹیفوٹ، ایڈنبرا اور آئرنبرو مارش کے کیبل بے پناہ ہجوم اپنی طوفانیں کھینچ رہے ہیں۔ شہزادی مارگریٹ نے نئے نیشن ایجاد کیے ہیں۔ کورٹ آف سینٹ جیمز سے ذرا پرے اور سیرنگ کی عبوری مہیب عمارت ہے جس میں پورٹے آئی سی ایس اور نوآبادیات کے سان گورنر دن بھر چپ چاپ بیٹھے وہ سکی پٹے اور ٹائیز پیٹھتے رہتے ہیں یا کبھی کبھی اخبار پر سے سر اٹھا کر گڈ اولڈ بے پڑ بیڈینسی یا ڈیر اولڈ چیمز منزل کلب کا تذکرہ کر بیٹھے ہیں۔ جہاں سٹڈر میں پلے سٹڈر میں کتنی دلچسپ برج پارٹیاں ہوتی تھیں۔

ایک روز ایک پارٹی کے دوران میں میں نے ایک بہت بوڑھے انگریز کو نوٹس کیا جو سب سے الگ تھلک خاموش بیٹھا جامہ پہنی دھتلا۔ اس کے ہاتھوں میں بکتر تھلہ میں نے بیانی اسے اٹھا کر دی۔

انڈیا۔؟ اس نے دوستی کے انداز میں سوال کیا۔
پاکستان۔! میں نے اسی لذت سے عجب دیا۔
اوہ۔ دزد نعل۔ دزد نعل۔

آپ کہیں برصغیر جا چکے ہیں۔! میں نے پوچھا۔
ہاں! جا چکا ہوں۔ جا چکا ہوں۔ اس نے پیالی کھینچتے ہاتھوں سے سنبھال کر اٹھائی۔
کسی خاص جگہ۔؟
بھئی!

اچھا۔ کسی ملازمت وغیرہ کے سلسلے میں۔ یا ایسے ہی۔؟ میں نے اخلاقاً کمال برابری رکھنے کی غرض سے دوبارہ بات کی۔
نہیں۔ ملازمت کے سلسلے میں نہیں۔

اوہ۔! آرمی۔؟

نہیں، آرمی نہیں۔

تو کافی عرصہ رہے آپ ہندوستان؟

ہاں۔ کئی سال۔ کئی سال۔

کیا کرتے رہے اتنے دنوں آپ وہاں۔ میرا مطلب ہے، بھئی میں۔؟

اوہ۔ میں بھئی پرنسپل ٹیچنگ کا ڈیپارٹمنٹ تھا۔

اوہ۔

ان انگریزوں کی تہنائی اب قابلِ رحم ہے۔ ان کے دوسرے ہم مرتبہ ساتھیوں پر بھی زوال آ چکا ہے۔ بڑے بڑے لارڈز اور گورنمنٹ
جن کے پاس بے چارے خطابات، طویل وعظیں یا ستمیں اور عظیم الشان محلات اور قلعے تھے، اب نوکریاں کر رہے ہیں یا ایسے جواہرات
اور بیش قیمت کتب خانے فروخت کر رہے ہیں۔ بہت سوں نے اپنے محلوں کی نمائش شروع کر دی ہے جن پر ٹکٹ لگا کر وہ نمائشوں کو
اپنے کتب خانے، اپنے نفیس بیڈ روم اور ڈرائنگ روم ایک سٹینڈ گائیڈ کی طرح دکھلاتے چہرتے ہیں اور اس سے جو آمدنی ہوتی ہے اس
سے گھر کے خرچ میں مدد لیتے ہیں۔ "موت کے محمول" نے اسٹوکرٹسی کو اقتصادی طور پر بالکل تباہ کر دیا ہے۔
انگلستان کے لارڈز اور لیڈیگز کا زمانہ ختم ہوا۔

لہذا اسے مومنہ لازم یا نام پر کمرت پکڑو اور درد سے کبھی غافل نہ ہو۔ پڑھو ورو!

اب آئیں غلّ صاحب سے بھی مل بیٹھنے پر پچھلے تیس سال سے لندن میں رہتے ہیں۔ جو ش کے قریب عزیز ہیں اور غالباً کسی زمانے میں اے آکے کلاس فیلو تھے جو اپنی ذات سے انجمن ہیں۔ بی بی سی کے اسٹوڈیوز کے پاکستانی سیکشن میں ان کی وجہ سے بڑی رونق رہتی ہے۔ اتنے طویل عرصے کے ولایت کے قیام کے باوجود ان کا لب و لہجہ اب تک عظیم اور خالص اور والدوں کا سا ہے۔ اردو بولتے ہیں تو ہمیشہ قطع نظر کو بھیٹھ کر اور ویسٹ فیسٹر کو ویسٹ فیسٹر کہتے ہیں۔ سبنا گو انھوں نے ہمیشہ بائیس کوپ ہی کہا۔ لکھنؤ کے پرانے داستان گو یاں کے انمازیں تھے سناتے ہیں۔ تیس سال گزرے، ہندوستان کی آزادی کی لڑائی لڑنے یہاں آئے تھے اور پھر کبھی واپس نہ گئے۔ ڈیوڈ یا رک میں انھوں نے بھی بغاوت کا علم بلند کیا۔ خلافت تحریک اور گاندھی کی۔ اخبار نکالتے۔ لائبریری چارج کے پاس بیٹھ جاتے تھے اور اس سے بچ کر کرتے تھے کیا معنی کہ آپ نہایت سبے ایمان آدمی ہیں۔ ہند کو ابھی فوراً آزاد کیجئے۔

اب بوٹھے جو گئے ہیں اور دل شکستہ ہیں کہ تو سوچا تھا وہ نہ ہوا۔ پچھلے دنوں پاکستان گئے تھے لیکن پرمٹ نہ مل سکے کی وجہ سے وطنِ حرمِ دلج آباد نہ پہنچ سکے اور پھر لندن لوٹ آئے۔ ہر شخص کے دکھ درد میں کام آئے کو تیار رہتے ہیں۔ کوئی غذا نہیں کھاتے، ایکسے رہتے اور اپنے محلے محلے کے گورو اور حکمت بچا ہیں۔ ایسے لوگ اب صرت تھے کہ انہوں میں ملتے ہیں باجو و حری محمد علی رود پوی کی حکایتوں میں اور جو حری محمد علی کی حکایتوں کو بھی سمجھ کر پڑھنے اور سر ہنسنے والے ہمارے پاکستان میں بہت کم ہوں گے۔

موسم گرم مگر ماحول سرد ہے۔ ٹورسٹ ٹریٹنگ اسٹور میں کبیر تروں کو دمنے کھلا رہا ہے۔ ٹیٹ گیلری میں پاکستانی سوانح نگار اکیڈمی میں مادیوں کی فائنل پور ہی ہے پکینڈی کی سرکس میں وہاں کی مشہور عالم، سڑک پر چلنے والی، رنگیاں حسین کپڑوں میں ملبوس، اوپنی اڑی کے جوتے پہنے گھڑا میٹ اب کے کوئٹہ کھد، دی یافت پاتھ کے کناروں پر کھڑی راہ چلنے والوں خصوصاً غیر ملکیوں کو دیکھ رہا ہے۔ ٹورسٹ گھڑاچی اور متوجہ کرنے میں مصروف ہیں۔

پکینڈی: — ہارٹ آف دی ورلڈ! —! مجمع بڑھتا جا رہا ہے۔ سینا گھروں کی کھڑکیوں کے سامنے کیڑے لگے ہیں۔ ایک خوبصورت جوان آدمی جس کی ایک ٹانگ اوپر سے کٹی ہوئی ہے، عینک ڈالنا ناگنا کیڑے ہر فرد کے سامنے جاتا ہے اور نوٹی آنا کر سلام کرتا ہے۔ بہت کم لوگ اس کی طرف توجہ دیتے ہیں۔ پیسے اس کے کپس میں کوئی بھی نہیں ڈالتا۔

اسلام بیگم صاحب: —! وہ ہمارے سامنے آکر کھتا ہے۔

میری بہت ہی پیاری دوست فیروزہ جس میں اس سے پوچھتی ہے کہ کیا تم کبھی ہندوستان میں رہے ہو؟

میں: — میں ڈنکرگت فوج کرنے میں مصروف تھا اس لیے ہندوستان نہ جاسکا۔ وہ مسکرا کر کہتا ہے۔

”اچھا“ فیروزہ اس کے ڈبے میں پیسے ڈال دیتی ہے۔ وہ اسی طرح مسکرا کر قینک لوکنا آگے بڑھ جاتا ہے۔

”ڈنکرگت فوج کرنے میں مصروف تھا“ فیروزہ دہرائی ہے، ”اور اب ویسٹ اینڈ کے تعمیراتوں کے آگے عینک ڈالنا ہے

اور ابھی ایک جگہ اور ہوگی؟“

سامنے سے اعلیٰ تک پارہ اسے سپاہیوں کا ایک غول گزر جاتا ہے۔
میں اور فیروز سینا کے اندر جا کر لادوند دیکھنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔
لادوند — زندگی کا میری گورواندہ —!!

تو بھائی فیروز نے سلسلے میں رات کو میں اگلے سامنے اعلیٰ دیان سے بیٹھ کر فیروز سے کہتی ہوں۔ یہ ہمارا اپنا لطیفہ ہے۔ فیروز بھی
میں ہم جب اکٹھے پڑھتے تھے تو شام کو جو مسل کی ڈائننگ ٹیبل پر دن ہو کر کے سامنے ضروری واقعات یونچو بیسی پالیٹکس اور سکندر ایک
سائنس میں گوش گزار کرنے کے لیے بعد میں فیروز سے کہتی تھی: تو یہ سلسلے ہیں بھائی صاحب —!!
فیروز کھانا پلانکٹ میں مصروف ہے۔ اسٹوڈیو کے چاروں طرف ضخیم کتا ہیں بکری ہوئی ہیں۔ اس نے کھنٹھو سے اردو میں ایم اے
کیا تھا۔ اب وہ جرنلزم کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ ادا نڈیا ماٹوس میں کام کرتی ہے۔ فیروز جیوں ہندوستانی ڈکی ہے۔ ہندوستانی طالب علموں کی
تہذیبی سرگرمیوں میں بہت دلچسپی سے حصہ لیتی ہے۔ جدوجہد ہماری روایت ہے اور اس روایت کو ہم کبھی نہ جھوٹیں گے۔
برادر — میں جلتی ہوں۔
فیروز اور اس کے ہندوستانی ساتھی ذرا سکھٹا برہمان کرچپ ہو جاتے ہیں۔

اور یہ کہتا ہے۔ میری بچپن کی رفیق کلا جیال میں کاؤکر آپ نے اس ناچیز خاکسار کے افسانوں میں اکثر پڑھا ہو گا۔ صاحب
ہندوستان کی فائن سروس کی ایک بڑی ذمہ دار رکن ہے، پراپٹ تک گستا ہے کو ابھی ابھی کلاس کا کوئی پیریڈ گول، کر کے کالج سے
بھاگی چلی آ رہی ہے۔ اس کا ہیڈ جلیسی میں ہے۔ لہذا آرٹ ڈارٹ کا چکر اس کے یہاں بہت دہتا ہے۔
کینڈا کا 'انٹلکچرل' تاریخ اور پولیٹکس سائنس کا ماہر اتنی لمبی برگ جاتی رائے کی ایک تصویر کو بے حیائی سے امپلٹ
رہا ہے۔ اتنی آج کل ایک وقت دو کتا ہیں لکھنے میں مصروف ہے۔ ایک کینڈا کی اقتصادی تاریخ ہے اور دوسری کچھ اور اسی قسم
کی چیز ہے۔ دو کتا ہیں بڑے پڑ گیسو نظریے سے لکھی جا رہی ہیں۔ اپنا کم عمری کو چھپانے کے لیے ہر وقت بے حد سنجیدہ رہنے
کی کوشش کرتا ہے۔
پہر گیسو —؟ افوہ — افسوس یہ ہے کہ تم تو کچھ کے زوال پرست انٹلکچرل بھی نہیں ہو۔ کوئیل انٹلکچرل ہو — میں
اسے جلتے کے لیے کہتی ہوں۔

دراصل مجھے اس لفظ انٹلکچرل ہی سے دشت ہوتی ہے اور پہر کینڈا کی یہ غلطی —؟ افوہ — یہ کوئیل ٹوک بھلا کیا کھا
کہ انٹلکچرل نہیں گئے۔ بھائی جو ہندو سارے باپ کے جیوں اسٹورز ہیں، انھیں میں مگی رہو (راتی جب اپنی بے تحاشا طویل دعوایں امریکی کار میں سڑکوں
پر سے گزرتا ہے) خصوصاً کینیڈی سائیڈ کے قصبوں کی تیل پتی سڑکوں پر سے، تو راگیر ٹوک کو کوٹھو سے دیکھنے لگتے ہیں۔ امریکی کاروں انٹلکستان
میں بہت کم نظر آتی ہیں۔ انٹلکس کا برس جران کے سامنے بالکل کھوٹا ایسی دکھائی دیتی ہیں، اتنی کی لا کی دوسرے ڈک جاتی ہیں کیونکہ اس کی

’اور نو سبیل‘ سارا سامان گھیر لیتی ہے اور اس حامل میں بے حد غیر ملکی نظرات آتی ہے۔ مگر اگر حیرت سے اس ملک کا دل کو کبھی کبھی چھو کر بھی دیکھ لیتے ہیں۔
— واہ امریکہ!!

اور پھر کینیڈا کی اقتصادی تاریخ پر ترقی پسند نظریہ ————— (جنگل، اجاری رہتا ہے) برطانیہ اعلیٰ کے انقلابات ————— ایامیں انقلاب تو بادشاہیں آتے ہیں دو سال میں ساری کا پیٹ جاتی ہے۔ مبینوں اور ہفتوں میں دنیا ادھر سے ادھر کر دی جاتی ہے۔ یہ مضمون ایسی ہے کہ پچھلے دو سو سال تک انڈسٹریل ریویریشن گھسٹا۔ پیرا ایٹم انجن چلے۔ پھر کوئلے کی کافری کا سلسلہ رہا۔ بجائی دنیا کی تاریخ تو بادشاہ میں بن رہی ہے مگر خیالی میں! میں کہتی ہوں۔

کیا سیلو ڈرنک پروچ ہے آپ کی —————! ہم کہتا ہے۔

اور کیا کوک اپ آپ سب کا ہے۔ یہاں سے وہاں تک۔ میں چکر جواب دیتی ہوں۔

آرتی خاموشی سے مسکاتا رہتا ہے۔ دراصل آرتی کو تو ایسٹری یا بی وڈ میں ہونا چاہئے تھا۔ ایڈیٹ کو پتہ کیا کہ ریل وائیلڈ اس کو دیکھ پائے تو عجب تعجب بانی تلاش کرتا ہے۔ آرتی روسی نژاد ہے اور صنعت ڈاکا سے ہے، اتنا خوبصورت کہتی ہے۔

لیکن آرتی دائمی ہے۔ حیدر گریس ہے۔ نہایت بھدار اور خاموش قسم کا پروگریسو۔ اور جو کچھ وہ لکھ، بابے ٹھیک لکھ رہا ہے۔ کیا تم لوگوں کو بھی اپنی تواریخ بالکل نئے سرے سے اور نئے زاویے سے سنیں لکھنی چاہئے۔ وہ پوچھتا ہے۔

کوھیل —————!!

ابھی ابھی تم اپنے ایسوسی ایشن کے دفتر سے واپس آیا ہے۔ تم بھی ریڈیو کی طرح انگریز ہے۔ جدید سگنلز انشاس کا شغل ہے۔ اور جو نکرہ بھی جیسی ہیں رہتا ہے۔ لہذا اسے بھی اپنے آپ کو نکال دیکھئے یہ مجبور کیا جاتا رہتا ہے، حالانکہ وہ مصر ہے کہ وہ بے حد پرکٹیکل آدمی ہے۔ وہ بھی ہمیشہ فٹفٹ، ٹکڑے، اور سارے قدیم ہندو فلسفے اس نے کھولی کر بی رکھے ہیں۔ گناہ میں طرز زندگی کا سخت قائل۔ دنیا کے سارے پوڈلز کا اصل صرف اس نے دریافت کر لیا ہے۔ وہ یہ کہ ہم سب کو شخصی CELLS بنانے چاہئیں۔ ان میں رہتے ہوئے اور ان سے آگے بڑھ کر ہم سوسائٹی کی اصلاح کریں گے۔ اور زندگی کا محال نہایت سیدھی سادی اور پُر سکونی چوہا ہے گی۔ اسی شخصی درجہ معرفت کی آئیڈیالزم کے چکر میں اس کی غیر سیاسی انسانیت پرست ایسوسی ایشن کی طرف سے پچھلے دنوں چند اللہ والے نہا پرش کراچی گئے تھے۔ ان میں فرانسیسی، سوئس، ڈچ اور غالباً انگریز مرد اور عورتیں تھیں۔ یہ لوگ لالو کھیت میں کئی مہینے ہمارے کے ساتھ رہے۔ دن رات مل کر انھوں نے مکان تعمیر کیے۔ دن بھر وہ اینٹ اور گارا ڈھوتے تھے اور رات کو چائیں پر پڑ کر سو رہے تھے۔ کیا روحانی زندگی ہے واللہ! —————! میں تم سے کہتی ہوں۔

معصیت یہ ہے کہ تم جیسی ہی میں نہیں ہے لیکن انقلاب کا قائل نہیں۔ بڑا سخت PACIFIST اس کے خیال میں سوویت یونین اور مغربی ممالک دونوں تباہی کے راستے پر جا رہے ہیں۔ اچھا خاصا مہینہ مت کا بیرو معلوم ہوتا ہے۔ بس ہر ایک کو مکمل شخصی آزادی اور امن حاصل ہونا چاہئے۔ اور سب کو بھٹی جھٹی COMMUNITIES میں رہنا چاہئے۔

تم اگر خدا پرست ہونا تو بڑا عمدہ روکھو توک خاور ثابت ہوتا۔

گدا اور دلچسپ —

کرشناسین ریٹائر ہو گئے ہیں۔ جب تک وہ بانی کٹھن رہے، ٹڈیا باؤس میں انہوں نے اپنی رہائش کے لیے ایک کمرہ لے رکھا تھا جس میں ایک طرف چار بیلے کا سامان رکھا تھا اور باقی سارے کمرے میں کتاؤں اور انباروں کے انبار کھجورے رہتے تھے۔ دن بھر اور رات گئے تک وہ خود چار بیلے بنا کر بیٹے جاتے تھے اور لگانا کام کرتے تھے۔ کام میں مہر و فن، رہنما ان کی فطرتِ تانیہ ہی مکی ہے۔

اب آپ بنا کچھ کئے کیسے رہ باؤس گے؟ میں نے اس سے پوچھا۔

میں کچھ نہ کچھ مزدور کیا کروں گا۔!! انہوں نے کہا۔

اب آپ کتاؤں لکھ کیسے؟ میں نے عقلمندی سے ان کو مشورہ دیا۔

غالباً وہ انگلستان میں مستقل رہیں گے جس طرح ہمیشہ سے رہتے آئے ہیں۔ محمد علی خاں طبع آبادی کی طرح وہ بھی اس سرزمین کو نہیں چھوڑ سکتے۔

اس وقت تو وہ ادنیٰ کو جسے وہ کینیڈین بُش میں لکھتے ہیں، پر اٹنے کھلا رہے ہیں اور وہ سالن میں مرجوں کی زیادتی کی وجہ سے سوں سوں کر رہا ہے۔

اور اب رات ہو رہی ہے۔ سڑک کے کنارے کنارے کھڑے والی لڑکیاں اور وہ بوڑھے لکھاری معصوم چرٹ پانڈے رنگ چالی سے تصویریں بنا کر خاموشی سے ایک طرف دوار کے سہارے دن دن بھر بیٹھے رہتے ہیں اور ہر راگداز کو دھندلی، پُر امید آنکھوں سے دیکھتے ہیں، اپنے اپنے ٹھکانوں پر جا چکے ہیں۔ فٹ پانڈہ کی ان تصویروں کے نیچے لکھا ہوا ہے:۔۔ میں نے جھلم اور چاندنی رات کی تصویر بنائی ہے، لیکن چکر چاک سے ملے رنگ اُجھا کر نہیں ہو سکتے اور کاغذ یا کینوس کے بجائے میرے پاس صرف یہ فٹ پانڈہ کی زمین ہے۔ اس لیے تصویر ایسی نہیں بن سکی۔ جیسی میں چاہتا تھا۔ اگر آپ کچھ دیتے جائیں تو میں رات کو کھانا کھا کر سو سکوں گا۔ گو میرے پاس رات گزارنے کے لیے کوئی پلنگ نہیں ہے۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔۔۔

سڑکیں سنسان ہو چلی ہیں۔ زمین دوز درمیں اپنی آخری سافٹیں طے کر رہی ہیں متوسط طبقے کے باورسٹ اور بھرتیوں والے انگریز اپنے اپنے گھروں میں قلعہ بند ہو چکے ہیں۔

کوئی ٹورسٹ اپنے دوست سے کہہ رہا ہے۔ کیا جو بد مذاق شہر ہے جہاں اتنی جلدی رات ہو جاتی ہے۔ اسی لیے میں کل پیرس جا رہا ہوں۔۔۔ شب بخیر لندن۔

لندن سو رہا ہے۔ لندن جاگ رہا ہے۔ کھڑکیوں کے پردے کرا دیئے گئے ہیں۔ باہر شیشک ہوا چل رہی ہے۔ کل سڑکی

ہوگی۔ نیچے سرک پر شام کا اخبار بیچنے والے آخری پہچے پہچے پر پے سمیٹ رہے ہیں جن کی سرخیاں تاریکی میں مدھم مدھم ہوتی جا رہی ہیں۔ اب وہ بیرون مرگئی۔ شاہ فاروقی کو؛۔۔۔ نکال باہر کیا گیا۔ مصدقہ روئے لگے۔ ریسپوں نے ایک اور گولڈ میڈل جیت لیا۔

اب سب سو رہیں گے۔ میں اور نیروز اور کملا اور خلیا اور غنیسی۔ اور ان کے علاوہ رونڈو اور اسٹار اور اتنی اور جم سب سو جائیں گے۔ کیونکہ یہ آج کا دن بھر ختم ہوا۔
کل کیا ہو گا۔ یہی سوال شمسہ میں بھی سب کے سامنے تھا۔

لیکن سامنے دیکھو۔ اب دیوار پر کیا لکھا ہے۔ دیکھو۔۔۔

استمدادی خاطر کوئی ڈیٹیل نیسلے کے بے نہ آئے گا۔

راستے میں میرے چھوٹے بھائی نے کہہ دیا کہ یہ معلوم کیا کہ ہم فطیع سرگودھا کے ایک جاگیردار کے ہاں جا رہے ہیں جاگیردارنی

مصرغی کو ولایت لاہور سے ڈاکٹر فی بیچ جلنے آئے۔ بڑے امانوں کی پہلی بڑی جگہ تھی۔
کئی گھنٹے کے سفر کے بعد ہم لاہور سے بالکل مختلف دیاس وارہ پہرے۔ ایک چھوٹے گاؤں میں ایک بڑی سی حویلی ہماری منزل تھی۔

بڑی سی بیٹک کے دروازے پر سی پڑتی، دھوپ میں ایک درجن شکاری کتوں کو شام کا راتب تقسیم ہو رہا تھا، اور دس بارہ آدمی ان کتوں کی زنجیروں سے پٹے ہوئے تھے۔ ہماری آمد پر وہ چوٹے کتے چھ کتوں کی زنجیروں پر بیٹ گئے۔ اسی پہلی دھوپ میں گدے دار کرسی پر، میرے دوسرے روز کے دانا، ملک کل نوڈ آتی تھی مارے میٹھے تھے۔ سفید سناک کی تعداد اور نیل سناک کی کمیس، سر پر بیغلاہ کی بھاری گیڑی۔ اور کلائی پر بار۔ باز، ملک کے دفتر پر رکھی ہوئی تازہ تازہ ناخن کے پر کھیر کھیر کر گوشت نوح رہا تھا۔ یہ قوت باز کے راتب کا بھی تھا۔

کیڑی تک کے اس ملک کا تصور میں خواب میں بھی نہیں کر سکتی تھی، مگر پھر بھی اس ماحول سے میں کافی مرعوب ہو گئی۔
”ڈاکٹر فی صاحب بڑی تکلیف اٹھائی آپ نے، میں آپ کو خوش کر دوں گا۔“ ملک نے گہری نظروں اور بھاری آواز سے بیک وقت کہا۔

گھر کے اندر داخل ہوتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ ملک صاحب کی صورت اس بادشاہ سے ملتی ہے جس کی تصویر میں نے اسکول کے زمانے کی کسی کتاب میں دیکھی تھی۔ مانتے تک بیچ دریغ بڑی سی کپڑی، بڑی مٹی موٹھیں کرسی پر آتی تھی مارے اور دفتر پر باز کھٹے۔
”بس ملک کیا مانگتا ہے کتنے کی کسر تھی۔“

زنان خانے کا ماحول لباس اور سجادت کی تبدیلیوں کے ساتھ ایسا ہی تھا جیسا کہ ہمارے بڑے بڑے ٹھکانے کے بڑے گھروں میں ہوتا ہے۔ صحن میں رنگین پیرھیوں پر کافی سے زیادہ عورتیں رنگین نھاد اور موٹی رنگینی کنارے والی چادریں پیسے میں منظر کشی بنائے بیٹھی تھیں اور ایک کھیس سے ڈھنپے پلنگ پر ایک بوڑھی عورت قدم بندی بیٹھی سنوار سڑک رہی تھی۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ گھر کی بڑی بوڑھی ہوں گی۔ حقیقتاً یہی ملک کی والدہ بڑی ملکی تھیں۔ مجھے امید تھی کہ وہ اٹھ کر میرا استقبال کریں گی۔ لیکن یہ امید پوری نہ ہوئی۔ میں اٹھتی ہوئی پلنگ کے قریب آگ گئی۔

بوڑھی ملکی نے مجھے فور سے دیکھتے ہوئے دوشائے پائو سر کا کر گردن سے لے کر ناک تک ڈال لیا اور اب میں صرف اس کی تیز آنکھیں ہی دیکھ سکتی تھی جو مجھے سختی سے گھور رہی تھیں۔ مجھے اتنا افسوس آیا، اتنا کہ میں نے جی میں دعا کی کاش ان سب عورتوں کے دروازہ ہوتے لگتے۔

”میں یہاں سے، میں نے ایک ایک کر پوچھا۔ سب عورتیں جنگلی ہرنیوں کی طرح گرد میں اٹھا اٹھا کر مجھے حیرت کھڑے کر گئیں۔“
”بھلا کہاں ہے؟“ اب کے میری مانی نے انتہائی کڑھت زبان میں سوال کیا۔

”اولد کا نام پوچھا، یہاں کہاں؟“ ایک عورت نے دونوں طرف پھردی ہوئی ناک کی ٹاپس نما کیلیں چکا کر بڑی ہی کڑھت آواز میں جواب دیا۔ سب کی معائنہ نظروں بھی پر تھیں۔

میں نے سمجھا دیو میں پہنچی ہوں، اسی لیے سب کی نفرت کا نشانہ ہوں۔ شاید بے چاری ختم ہو چکی۔ اور میں

انسوس میں ڈوبی ہوئی دوبارہ ملک کی صوفوں سے ٹھنسی ہوئی جھپٹک میں پہنچ گئی۔
 ”مجھے انسوس ہے ملک صاحب میں میرے کونہیں دیکھ سکا“ اور میں نے دیکھا کہ اس فقرے سے بھائی کے چہرے پر رنگ بدلتا
 اڑ گیا جیسے اسے شدید عودہ پہنچا ہو۔ ظاہر ہے بھائی کو تعلیم کے لیے ٹیس کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔
 مگر ملک صاحب کے بچے ہوئے چہرے پر کوئی اثر نمایاں نہ ہوا۔ ”افوہ! ڈاکٹر ٹی صاحب میں نے ابھی تک والدہ سے ذکر
 نہیں کیا کہ لاہور سے ڈاکٹر ٹی بلانی ہے“ یہ کہہ کر ملک صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔
 ”مگر ملک صاحب اب اندر جانے سے کیا فائدہ؟“ میں نے گردن جھکا کر کہا۔
 ”ڈاکٹر ٹی صاحب آپ بُرائے نہیں جی، دراصل میری والدہ رحمہ و رواج کے خلاف جانا پسند نہیں کرتیں۔ اس لیے میں نے
 ان سے پہلے ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔“

لیکن گھر کے اندر پہنچ کر ملک اور بڑی ملکنی کی جھگڑا شروع ہو گئی۔ وہ بار بار میری طرف اشارہ کر کے منہ بنانا کر
 اپنے بیٹے سے کہتی۔ بیچارہ کہاں ہے؟ بیمار۔۔۔ بخیر بیمار!
 یہ قصہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بعد میں ملک نے گہری گہری نظروں سے مجھے دیکھ کر دھیرے سے بتایا کہ بڑی
 ملکنی کو آپ کی یہ بات ناگوار گزری ہے کہ آپ نے پہلے پہل کی وجہ کو تیار نہ کیا۔ زچگو، آپ جانتی ہیں بڑی مبارک چیز ہے۔
 — وغیرہ وغیرہ۔

”وہ سامنے محل میں ہے“ ملک نے ایک کمرے کے دروازے کی طرف پوچھا کہ کیا جیسے گوہر مفسود کا پتہ دے
 ہے ہوں۔ اور میں بچائے ٹھننے کے کھسکا کر رہ گئی۔

پہلے سے ایک دروازے اور بغیر کھڑکی اور درختستان کے پڑانے طرز والے کمرے میں ہونے والی زیرتختی — وہاں بھی
 کافی عورتیں تھیں، اور ایک سڑی ہوئی عورت اس کا پیٹ پکڑے بیٹھی تھی۔ اللہ کئی عورتیں اس کا سر، ہاتھ، پاؤں دبا رہی تھیں۔ زچہ
 کا پلنگ ایک تاریک کونے میں تھا اور اس کے علاوہ کئی اور پلنگ بھی کیسوں سے بچے ہوئے تھے۔ دیواروں پر قسم قسم کے خوبصورت
 برتن، اور ٹیبلٹوں سے آرائش اس حد تک تھی کہ دیوار بشکل نظر آتی تھی — یہ محل تھا۔

زیرتختیں سینتیس سالہ عورت تھی اور اپنے علاقے کے تمام زیورات سے مزین — اگر اس کے دود نہ ہو رہا ہوتا تو کافی
 بھی معلوم ہو سکتی تھی۔

میں نے مانی سے مخاطب ہو کر کہا کہ مرہیز کو فوراً اس ٹھننے اور گھٹے ہوئے کمرے سے کسی اور جگہ منتقل کیا جائے۔
 مانی نے عورتوں کے سامنے تجویز رکھی اور سناج گیا۔ انگلیاں ناکوں اور دانتوں پر پہنچ گئیں۔ اور اس بات پر
 میں بڑی ملکنی ہنسی ہوئی انگلیں۔

میری تجویز ایوان کی متفقہ رائے سے مسترد ہو گئی، کیونکہ اس قسم کا کمرہ ہر گھر کا محل کہلاتا ہے اور ضروری ہے کہ گھر کی بہو
 اس جگہ اپنے بچے کو جمع دے۔

”عورتیں کمرہ خالی کر دیں“ یہ میری دوسری تجویز منظور ہو جاتی تھی۔ لہذا میں نے مانی سے کہا کہ وہ زچہ کے ہاتھ لھیں

کی اوٹ کر کے کھڑی ہو جائے تاکہ میں مرلیز کا معاملہ کر سکوں۔

پہلی دہائی تھی، مرلیز نے بتایا کہ بڑی منتوں مرادوں کے بعد یہ دن پورے ہوئے ہیں۔ ورنہ پہلے تو کبھی تو جینے پورے ہی نہ ہوتے۔ ایک نفیرنی کشتی تھی، ایک جان رہے گی، ہاں یا بچے۔ عیم صاحب دو دنوں کو بچاؤ بڑا انعام دیں گے، خوش کر دیں گے۔ "مرلیز در وادو خوت سے سفید ہو رہی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی اور کہا کہ سب معاملہ ٹھیک ٹھاک ہے۔ یہ سن کر مرلیز نے اسے تسلی سے تسلی سے اس کے آنسو پونچھ پھینکنے کے بعد ناک پر پھینچنے میں بڑی دقت ہوئی کیونکہ میرے کی بڑی بڑی کبوتر سے دو دن نچتے دھکے ہوئے تھے۔

میں نے وہ بچہ کو تسلی دے دی مگر یہ فقہر سن کر خود پریشان ہو گئی۔ کچی عمر کی اولاد ذرا مشکل سے ہوتی ہے اور پھر چڑ کو درد بھی پڑے بچے کے لئے تھے۔ اور بچے کے قلب کی حرکت سست۔ میں نے المیہ بیان سے دعا کی کہ عزت رکھ لینا۔ ورنہ داسی کے لیے کیڑی لک تو کیا خاک نہ لگی۔

رات گئی اور عورتیں بدستور آپس میں بولتی رہیں۔ اور باری باری مرلیز کا جسم دباتی رہیں۔ مانی نے ایک دفعہ چپکے سے کہا کہ میں بھی مرلیز کا پیٹ پکڑ لوں کیونکہ عورتیں کشتی ہیں، یہ ڈاکٹر کی مفت خوردی ہے، ہاتھ پر ہاتھ دھرے میٹھی نہ ہے۔ میں نے مانی کے حکم کی تعمیل کی۔

جب مرلیز زور سے کراہنے لگی تو میں نے سب عورتوں سے باہر نکل جانے کو کہا۔ لیکن کئی عورتیں بچیں اور پلنگ کے پاس دو اینٹیں رکھ دیں اور سب مل کر زچہ کو اٹھانے لگیں تاکہ وہ اینٹوں پر اکڑوں بیٹھ جائے۔

"بس! اندر خیر اندر!" مرلیز ان کے حکم کی تعمیل کر رہی تھی اور میں یہ صورت حال دیکھ کر خوف سے بیچ پڑی۔ "سب پھر دو، بھاگ جاؤ یہاں سے، تم لوگ اسے مار ڈالو گی۔" عورتیں اس مداخلت پر پھر بڑبڑانے لگیں۔ مانی نے مرلیز کو بازوؤں سے پکڑ کر لٹا دیا۔ اور مجبوراً بغیر کسی اوٹ کے بچہ سب کے سامنے ایک کمرورسی آواز میں رونے لگا۔

مبارک سلامت کا شور مچا اٹھا اور باہر سے جتنی عورتیں اندر آ سکتی تھیں انہیں باقی دروازے میں سے اندر بھاگنے کی کوشش کرنے لگیں۔ میں دیکھ رہی تھی کہ اس وقت زچہ کی حالت نازک ہے۔ میں نے بلیڈنگ کم کرنے کے لیے اسے انجکشن کینڈوں کے ٹوکوں کے درمیان دیا۔ سوئی دیکھ کر کئی عورتیں دروازے کو راہ اٹھیں، زچہ کو غش آگیا تھا۔

اچانک باہر مندو دھول کے فائر ہوئے گئے اور پھر دھول نفیریاں بچنے لگیں۔ اس کے بعد ریموں اور گونفوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا اور کئی باری میری توجہ زچہ و بچہ کی طرف سے ہٹ گئی۔ ظاہر ہے کہ میرے لیے یہ سادی چیزیں دلچسپ تھیں، مگر یہ عجیب بات تھی کہ اس گھر کے تمام حاضرین کا رویہ ابھی تک میرے لیے دوستانہ نہیں تھا، حالانکہ میں نے کئی ریموں میں دوری عورتوں کی دیکھا وہ بھی رو رہے تھے۔ لیکن مجھے تھکے تھکے قدم پر زچہ و بچہ کی زندگی کی خاطر ان سے جھگڑنا بھی پڑنا تھا اس لیے میری دلجوئی بھی اور پیہری اور پیر گئی۔

رات بھر ڈھول بجا، لڑکچہ پوری زندہ لینا چاہتے تھے کیونکہ اسے بخار تھا۔ مگر وہ خود اس ہنگامے میں ہی دلچسپ محسوس کر رہی تھی کہ میں ہے بس ہو کر سونے کی کوشش کرنے کے علاوہ کچھ نہ کر سکی۔

صبح جب میں ناشتے کے لیے، ملک صاحب کے بلاوسے پر بیٹھ گیا تو میرے گھائی نے بتایا کہ باہر بھی رات آنندہادی چھوٹی، اور ملک کے سینکڑوں ہزاروں نے ناچ لاکر مہر کی، اور ملک صاحب کو بچے کی پیدائش کے سلسلے میں بڑی نذرین ملیں — میں اس نذرینوں والی رسم پر کافی حیران ہوئی۔

لیکن دوسرے دن میری حیرانی شدید خوف میں تبدیل ہو گئی جب کہ وہ واقعہ ہوا۔

ایک تو سردی کا زمانہ اس پر سے سویرے ہی سے بادل آنا شروع ہو گئے — میں نہانا چاہتی تھی کیونکہ مجھے اپنے جسم پر منوں غلاظت پڑی ہوئی معلوم ہو رہی تھی — یہ تو میں نے بالکل طے کر لیا تھا کہ اس گھر میں میری سب سے تناسلی ہے اس لیے میں نے نہانے کے لیے گرم پانی کسی سے طلب نہ کیا — رات بھر کی جگائی کئے بعد بخار کی شدت میں بخور ڈی سی پینڈ لینے کے بعد جب زچہ نے میری طرف کروٹ لی اور اس کی آنکھیں پیروں کی کیلوں کے ساتھ چپکلیں تو میں نے اس سے کہا کہ کیا نہانے کے لیے گرم پانی مل جائے گا۔ ”بسم اللہ ضرور نہاؤں“ اور پھر اس نے مسکرا کر بچے کو گھیرے بھیجی ہوئی عورتوں میں سے ایک سے کہا کہ بھاگ بھری سے گرم پانی گرم کر دے۔

زچہ کو بے چارگی دینے کے بعد میں نے ماٹھے سے کہا کہ سوٹ کیس سے میرے کپڑے نکالے۔

مڈکپڑے تو جی نہیں میم صاحب ہم انعام میں دیں گے“ زچہ نے مجھے ادا سے مسکرا کر کہا۔

اور مجھے ہنر مراد، خدا جانے ہر گنوار علی نے مجھے کوئی دانی خدنگا کہجی ہے جو بیٹے جینے کی خوشی میں جوڑا دے گی۔

”میں ڈاکٹر میں ملتی، اپنی مفردہ فیس لیتے ہیں جوڑے نہیں“ میں نے غرور سے منہ بنا کر جواب دیا اور وہ حیرت سے

مجھے دیکھنے لگی۔

”میم صاحب تم نے ہماری خدمت کی ہے، پھر ہم تو سمجھی کو کچھ نہ کچھ دیں گے۔“ اگست نے یہ دن دکھایا ہے۔

”اچھا اچھا میری مائی کو دے دینا میں تو۔“

اسٹے میں ایک دس بارہ سال کی لڑکی بھدر بھدر بھاگتی اندر آگئی — خوب نندہ رست چھٹی سا رنگ، ماتھے پر مہین گندمی

ہونی میڈھیوں کی خواب، کانوں میں پاندی کے بندے — یہ بھاگ بھری تھی۔

”ہم اسے جی جوڑا دیں گے، بیٹا جو ہوا ہے“ زچہ مجھے اپنی بات کا قائل کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

اور بھاگ بھری مجھے دیکھ کر ایک دم ٹھٹھانے لگی۔

”پانی رکھ دیا بھاگ بھری، ہم صاحب کو غسل لانے سے جاؤ“ زچہ نے اس سے کہا۔ اور میں نہانے چلی گئی۔

نہانے ہوئے میں جھٹکا جھٹکا کر سو جتی رہی کہ کیسے لوگ ہیں، کسی کی پوزیشن تک کو نہیں مانتے — جوڑا دے گی

مجھے، ہنڈ!

جب میں نہا کر سر پر تو یہ پیٹے ٹنگی تو گھبرا کر بال سکھانے کے لیے صحن میں بیٹھ کر آتی جاتی دھوپ میں سسیانے لگی۔

بھاگ بھری نے گھر کے کسی کونے سے مجھے دیکھا اور دوڑ دوڑ کر مٹی کے کلکڑوں والی آنکھیں لاکر میرے پاس رکھ گئی۔ اس وقت

بھاگ بھری میرے دل کو بھاگئی۔

گھر میں بڑی پہل پہل تھی۔ جوتوں پر جوتوں اٹھنی چلی آ رہی تھیں، اس وقت پھر لگانے بچانے کا پروگرام تھا۔ اچانک ملک صاحب کھانسنے کھنکھارتے زمانا خانے کی طرف آئے۔ مجھے گری گری گری نظروں سے دیکھا، زچہ دچی کے بارے میں دو دیک باتیں دریافت کیں اور پھر بڑی کمپنی کی طرف چلے گئے۔ چند منٹ بعد وہ دوبارہ باہر چلے گئے۔ ”جاگ بھڑے، بھاگ بھڑے ملک جی نانیں گے، تو یہ باہر غلطی نے میں رکھ آئے“، بڑی کمپنی نے حکم دیا۔ اور بھاگ بھڑی اسی طر آ رہی ہے۔ عید عید بھاگتی مراد نے غلطی نے کی طرف عید دی۔

گاسے جگنے کی تیاریوں کو دیکھ کر میں بورہونے لگی۔ میں اعلیٰان سے سوجا بایا جی تعلق۔۔۔ میرے خیال میں زچہ کو جی سکون سے سوجا بایا تھا، لیکن کوئی ہنس نہ چلا۔۔۔ میں نے اس وقت سوجا کر کسی مغربی صنعت کا قول ہے کہ دیہات صحت بخش قبریں ہیں، مگر میرے اندر یہ قبریں کتنی غیر شہر ہیں، کتنی ضدی یا ہٹیل لائیں ہیں۔۔۔ کتنی کسانیت ہے۔۔۔ میں تو ہوں ہی شہر کا کیڑا، مگر شرط بد کہ وہں کہ شہر کے مرغی یا کتے تنگ کہ یہاں لے آؤ تو، مرا تھے ہیں جا کر جان دے دیں۔۔۔ میں نہایت تعلق سے سوچتی رہی، سوچتی رہی، مجھے اپنے روز کے دو سو دوپوں کا خیال تک نہ آیا۔۔۔ اور پھر جیسے موت کے مرا تھے ہیں جنو کا لکھی گئی۔ درحقیقت مجھے سخت نیند آ رہی تھی۔

آج ایک بھاگ بھری روتی، گھسٹتی میرے پاس سے گزری، اس کا مزہ مرچ ہو رہا تھا۔ وقتاً وہ دو ٹنگائی اور زمین پر گر گئی۔ اس کا نیلا تھد خون کے دھبوں سے لال ہو رہا تھا۔ میں دوڑ کر اسے اٹھانے لگی۔ کئی کئی ماہیں شروع ہو گئی اور ہر ایک دم باروچی خانے سے ایک عورت دوڑتی ہوئی آکر مبین ٹرین کی آواز میں روکنے میں لگے گی۔ یہ بھاگ بھری کی ماں تھی۔

بھاگ بھری نے فوراً اکھیں کھول دیں۔

”مٹے! ملک جی! ملک جی! مٹے!“ جھاگ بھری نے ماں کی طرف ہاتھ پھیلا کر کہا، اور آنکھیں نید کر لیں۔ ماں بچہ نہ رو نہ نہ۔
 مین کرنے لگی۔

ظاہر ہے کیا ہو چکا تھا۔ میں ایک کنواری لڑکی بن کر دہشت سے کانپ رہی تھی۔ تمام عورتیں اکٹھی ہو گئیں۔ مانی مجھے کھینکنا دیکھ کر سمار سے زچہ والے کمرے میں بے آہنی چہانٹا صحن سے بڑی مٹکی کی دہنگ آواز شکر لگنے لگی۔ مانی دوبارہ ٹوہ بے باہر صحن لگتی۔ میں سن سکی تھی۔

تھوڑی دیر بعد درامی خاموشی طاری ہو گئی۔ زچہ اب تک آنکھیں پھاڑے باہر کی آوازوں پر کان اٹکائے ہوئے

مختصی —

جب مائی باہر سے آئی تو اس نے چپکے چپکے مجھے نسرہ مخضر کر کے سنا بنا کر بڑی مکنی جھاگ مبری کی کاں کو دوک رہی تھی کہ پیسے واسے گھر میں وفات ڈالو۔ لیکن جب وہ اپنی بچی کی حالت کے لیے ہی کمر لگتی تو بڑی مکنی آپے سے باہر ہو گئیں کہ تیری لڑکی خوشنماں ہوئی ہے، تو لوبہ لکڑہاں لڑکی کیوں؟ مرد سے کیا کرے۔ اور یہ بھی کہا کہ بڑی بیٹی کی عزت کی دوائی دے والی آئی، وہ دق بھول گئی جب تیرا خاندان کھیتوں پر ہوتا اور تو ملک جی کی بیٹھا جی۔ اس پر جھاگ مبری نے رورو رو کر اپنی ہم پشتوں سے فریاد کی، تو بڑی مکنی ادھر بھی مل گئیں کہ دیکھیں کون ہیں مرد بیباں، جھینس تو پکارا رہی ہے۔ اس پر

وہ دھیرے دھیرے خاموش ہو گئی۔ جھاگ بھری کی ماں جب دھنسنے سے باز نہ آئی تو بڑی ملکنی نے اسے دھکے دے کر گھر سے نکال دیا، جانتے ہوئے وہ جھاگ بھری کو لے جہانپا بجی تھی، مگر جواب ملا یہ نہیں جانتے گی، آج کام بہت ہے جو بی بی ہیں۔ سب رشتے ملنے والے جمع ہیں۔ اسی کو نئی موت آ رہی ہے جھاگ بھری کو۔“

”اسے بی، لونڈیا خون میں تو تر ہے۔ تو برہمیری، کیسے بے وقوف لوگ ہیں، خواہ مخواہ جھاگ بھری کی ماں کو اور غصہ دلا یا، وہ ایسے غصے میں گئی ہے کہ پولیس لائے، دیکھ لینا“ مائی نے منہ ختم کر دیا، ”کے طور پر ایک زوردار آہ کھینچی اور سوچ میں غرق ہو گئی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے زچہ کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش اور سنجیدہ بنی پڑی تھی۔ اس کے پہلو میں اس کے منتوں مردوں کا پہلا بچہ گنڈوں تنوعیوں سے گن جاپڑا تھا۔“

میں نے سوچا جات انسان کے ساتھ یہ شیطان کیوں لگا ہوا ہے، اب یہ پہلا بچہ دیکھو اور باپ کے لیے جیل کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ خیر چاہے مجھے زچہ پر کتنا ہی رحم کیوں نہ آئے، میں تو بچی گواہی دوں گی۔ بھلے ہی مجھے دوسروں سے روز کے نہ وصول ہوں۔

اس کے بعد باہر مچھی میں زور زور سے ڈھول دھکنے لگا اور کسی گیت کے بول گونجنے لگے۔ میں اس موقع پر ڈھول کی آواز سے بول گئی۔ گیت کے بول سن کر اوس میں مٹی ہوئی زچہ کو جیسے ہوش آنے لگا، اور اس نے بیڈھوں سے گھٹا ہوا سراہتہ سے بچے پر تھکا دیا اور اسے ہولے سے چوم کر موہوم طریقے پر سرکاری۔ ایسی محتاط مسکراہٹ جیسے وہ مکاری کے جانوں جیسی ہو، اور وہ ڈر رہی ہو کہ کہیں کوئی تار ٹوٹ نہ جائے۔

میں نے ایک آہ بھر کر کہا۔ ”بچے کی قسمت بھی کیسی ہے۔“
”نعمیوں والا ہے، جب سے میرا لالہ“ زچہ نے چونک کر جواب دیا۔
میں نے سوچا مجھے بچے کے بارے میں ایسی بات نہیں کہنا چاہئے تھی، ماں کا دلی بڑی سے بڑی مصیبت اور زنجاری کی نوزاد ہی اپنے بچے پر نہیں ڈالے گا۔ مگر پھر بھی میں نے اپنی قانون ذاتی سب کی سب اس کے سلسلے اٹھ دی۔
وہ تعجب اور خوف سے آنکھیں پھاڑے میری باتیں سنتی رہی اور پھر ایک لمبی سانس لے کر مسکرائے اور بچے کو چومنے لگی۔
بخار سے یاز جانے کیا سوچ کر زچہ کا چہرہ مہر مہر ہو رہا تھا۔ میں خاموش ہو گئی۔

حوصلہ کی انکناٹی میں ڈھول کے ساتھ گیتوں کے بول لہرتے رہے۔
ایک لورت اندر آئی اور اس نے زچہ پر جھک کر کچھ کہا جو میں نہ سن سکی۔ وہ پکلی گئی۔
میں نے زچہ کا تھپہ پکڑ لیا بخار اور تیز ہو گیا تھا۔ بچے کو بھی بخار تھا۔ میں اب یہاں سے جلد از جلد چھٹکارا پانا چاہتی تھی۔ ہو تو یہ بھی سکتا تھا کہ میں دواؤں دے کر رخصت ہو جاتی، مگر مجھے اپنے پاؤں میں ایک زنجیر سی بندھی معلوم ہو رہی تھی۔ ظاہر ہے یہ زنجیر کون سی تھی۔

ڈرا دیر بعد وہی عورت آئی جو ڈراما قبل زچہ سے کھسکے ہوئے تھی۔ اب کی اس کے ساتھ جھاگ بھری تھی۔
جھاگ بھری کی آنکھوں میں وہ نرم نہیں تھی جو میں نے پہلی بار اس کو سے میں اتنے دیکھی تھی۔ وہ کوڑا کھارایا

چپ چاپ میری طرف دیکھ رہی تھی۔

”میں صاحب اس کا بھی علاج کر دوں“ زچہ نے میری طرف مہاجت سے دیکھ کر کہا۔ اور میں اس دیہاتی جاگیردار کی عظمت کے سامنے سناٹے میں آ گئی۔

بھاگ بھری کی ”تکلیف کا جو بھی مواد ممکن تھا۔ وہ نہیں لیا۔ بھاگ بھری اس وقت کمزور تھی جسے ہر ہی غمی۔

ایک دن اور گزر گیا۔ دودھ اترنے کی وجہ سے زچہ کا بخار بہت زیادہ تیز ہو گیا، وہ بار بار غافل سی ہو جاتی۔ لیکن اس دن میں واپس چل دی۔ شاید میں زچہ کی حالت دیکھ کر ایک دن اور ٹرک جاتی، لیکن اسی دن بھاگ بھلے میں میری مانی کا شدید اصرار شامل تھا۔

تقریباً دو ہفتوں میں صبح صبح اپنے بھائی کے ساتھ قیمتی صوفوں سے تھننے ہوئے دیوان خانے میں مریخ اور پرائیڈوں کا نشانہ کرتی تھی، اور ملک صاحب مجھے زچہ بچہ کی خیریت پوچھنے کے بعد باہر دھوپ میں اپنے مرغوب پوز میں دھوپ لے سہے تھے، اور ان کے شکایات کتوں کو صبح کا رات ب تقسیم ہو رہا تھا۔ قریب ہی کہیں ڈھول ٹھیری بچ رہی تھیں، اور اس لمحے میں نے سنے کی کہ دو ایک دن اور نہ بنا چلے، پیسے بن رہے ہیں۔

اس لمحے کے بعد قریب کے ایک مکان کی اوٹ سے نکل کر بھاگ بھری کی ماں اتنی نظر پڑی۔ جادو سے کی دھوپ میں اس کا سیاہ فہرٹ لہا کر تہ اور گری زدہ چادر بھاگ رہی تھی۔ وہ دھیمی چال سے چل رہی تھی۔ اس کے سر پر ایک بڑا اٹھال تھا جو گونگے سرخ دوسٹ سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے اور بھی کئی عورتیں تھیں، وہ بھی کچھ سر پر اٹھالے ہوئے تھیں اور مرد بھی تھے، بعض نانچ رہے تھے، اور بعض ڈھول ٹھیریاں بجا رہے تھے۔ بھاگ بھری کی ماں کی تبادلت میں یہ مجلس بالکل قریب آ گیا، رات ب پر بھاگتے ہوئے کھنکھناتے گئے۔ ڈھول کی دھم دھم اور اچکتے پچاندتے مردوں کی ہڈیوں سے ملک صاحب کے ہاتھ پر میٹھا ہوا باز ایک دم اڑا اور پھر اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔ اور سب کے بعد اکڑتے بردستے گھوڑے کی لگا کر ایک شخص کی طرف اچھال کر تھانڈا رات ملک صاحب کی طرف بڑھا۔

حوالہ کی ڈیڑھ گھنٹہ سے عورتیں سیلاب کی طرح باہر آ گئیں۔ بہت سی ریشمی کپڑوں والیاں دوپٹے خانے میں بھی ٹھس پڑیں۔ میرا بھائی گھبرا کر باہر نکل گیا اور میں نے عورتوں کے ہجوم میں دھکے کھاتے ہوئے دیکھا کہ بھاگ بھری کی ماں نے نقالانہ کر ملک صاحب کے کندھوں کے قریب رکھ دیا۔

”پچھلے کپڑے آئے ہیں“ کا شہر اندر سے باہر تک برپا تھا۔ میں ایک دم اندر مانی کو ڈھونڈنے بھاگی۔ آگئی خالی تھا۔ زچہ خانے میں زچہ پینگ پر بھیڑی ہوئی تھی اور بھاگ بھری کی مینڈھیاں اس کے ہاتھ میں تھیں۔ اور اس کا چہرہ بالکل ویسا ہی ہو رہا تھا جیسے وہ دروازہ میں مبتلا ہو۔ مجھے دیکھ کر وہ چونک پڑی۔

”بڈائیے نے پانی بستر پر گر دیا۔“ وہ مجھ سے مخاطب ہوئی اور اس کا چہرہ ایک دم یوں پڑ سکون اور آسودہ ہو گیا جیسے وہ ابھی ابھی بچہ بن کر فارغ ہوئی ہو۔ بھاگ بھری کے دو توں گالوں پر انگلیوں کے سفید نشان ابھرے ہوئے تھے اور بستر پر کھسے ہوئے پانی کا نام تک نہ تھا۔

میں نے جلدی سے مائی کو ڈھونڈ کر اس سے کھسک پھسکی، وہ شدت سے میری ہم تھا ہوئی اور ہم فوراً چلے کو تیار ہو گئے۔
— مجھے ان لمحات میں یوں لگ رہا تھا جیسے میں اکیلے گھر میں ہوں، ایسے گھر میں جس کی دیواریں گچ کی ہوں۔

گھر پہنچ کر تین دن کے چہرہ سو روپے والدہ کے ہاتھ پر رکھتے ہی بڑے زور کی بوٹ شروع ہو گئی، صبح یا غلط مطلب یہ کہ میں نے فوراً چلے آنے میں حماقت کی یا نہیں۔ والدہ کہتیں بالکل ٹھیک کیا۔ بھائی کتنا خواہ مخواہ گھبرا کر بھاگیں۔
اس سے پہلے کہ اس کا کوئی فیصلہ ہو، میں یہ بات بتا دوں کہ کُتر تو پلی کے جس جلوس کی نیا دت بھاگ بھری کی ماں کر رہی تھی، وہ تھانیدار صاحب کے گھر سے آیا تھا۔

آندھی میں چراغ

مست از شیریں

کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔

اس نے آہستہ سے پوچھا ”کون؟“ اور اپنے پیکی کی آواز سن کر اس نے چٹنی کھول دی وہ اندر آ گیا اور اس کے دل میں ایک ہول سی اٹھی۔ کتنا ٹھکا ہوا تھا وہ۔ اس کے پسینے میں تر بالوں کے گچھے سے بن رہے تھے۔ جتنا جلدی اس کے نکلے ہوئے بوجھل، بھاری پاؤں اور جھولا ہوا پیٹ اسے لے جا سکتے تھے، وہ اندر گئی اور گھر طے سے پانی نکالی کر سہ آئی۔ وہ پانی ڈالنی جا رہی تھی اور وہ لاکھ منہ دھو رہا تھا۔ پسینے میں ڈوبے ہوئے گرم چہرے پر پانی کی ٹھنڈک اُسے ایسے بھلی لگ رہی تھی کہ وہ چلو میں پانی بھر بھر کر نہ پر اٹھالنے لگا۔ ٹھنڈے پانی کے لمس سے اسے فرحت محسوس ہوئی اور وہ تبت اور شکر کی لگا ہوں سے اپنی تیری کو دیکھتے ہوئے چار پائی پر جا بیٹھا اور وہ اسے کھانا بننے کے لئے تختہ بچھانے لگی۔

رہنے و دنیا میں کچھ دیر بعد کھاؤں گا۔ یہاں بیٹھو۔ کچھ دیر۔“

”نہیں، پہلے کھاؤ، بعد میں باتیں ہوں گی۔“ اس نے کچھ شرماتے ہوئے جواب دیا۔ وہ تختے پر بیٹھ گیا۔ کھانا پروس کر وہ پھر رسوئی میں گئی، اچانک اس کے پیٹ کے نچلے حصے میں ایک ترپا دینے والی ٹیس اٹھی۔ اس کی آنکھوں نے اندر جھرا چھا گیا۔ ٹیب کھڑک رہی تھی۔ درمیان دروازہ کھلا تھا۔ اننت نے اسے دیکھ لیا۔ وہ کھانا چھوڑ کر اور جلدی سے باغ و ہوا کر رسوئی کی طرف بھاگا۔ ”کیا ہوا نیلا، نیلا کیا ہوا تمہیں؟“ وہ اس پر جھک گیا۔

”نہیں تو کچھ بھی نہیں، دیہی چکر لگ گیا تھا۔ اب سے نوں چکس ہی جا با کرتا ہے۔ کوئی بات نہیں،“ لیکن اننت نے اس کے چہرے کو دیکھ کر جان لیا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ اس کی تسلی کے لئے وہ کہہ رہی تھی: ”کوئی بات نہیں تم جا کر کھانا کھاؤ۔“

”مجھے بھوک نہیں نیلا،“ وہ بھی جھوٹ بول رہا تھا۔

نیلا کے پیروں پر اٹھا۔ اس نے اپنے چہرے کو دونوں گھٹنوں میں چھپا لیا تاکہ اننت اس کے چہرے پر کرب کے آثار نہ دیکھ لے۔ لیکن اننت نے نیلا کو نہایت احتیاط اور نرمی سے بازوؤں پر اٹھا لیا۔ اور اندر چار پائی پر لٹا دیا۔ پاس کی

کھڑکی کے نیچے کے پٹ بند کر کے اس نے بوسیدہ کبل نہایت احتیاطاً و نرمی سے اڑھا دیا۔ تیار نہ ہو کر کہا: ”اب مجھے آرام ہے۔ تم جاؤ کھانا کھا لو۔“

”مجھے بھوک نہیں ہے نیلا! وہ تیار کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر جا رہا ہے پر مٹھا رہا۔ وہ اپنی بیوی کو ننگے جا رہا تھا۔ پریشان، دیکھ بھری نظروں سے۔ نیلا بھی اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں پرستش تھی اور محبت تھی۔“

ان کے جسموں میں کئی کشش تھی۔ امنت کا سوکھانا راجہ ایک بوسیدہ سی ڈھیلی ڈھالی قمیض اور دھوئی ہو چھاپڑا ہوا تھا۔ اور نیلا کا پیٹ ہمیشہ پھولا رہتا تھا۔ وہ موٹی موٹی میٹل خوردے رنگ کی ساریاں پہننے لگی تھیں تاکہ بڑھے کے پاس کام کرنے سے جو سبب پیچھا چاتا ہے وہ دکھائی نہ دے وہ کٹھن چوٹی کے بغیر ورنہ خبر کام میں مصروف رہتی تھی۔ وہ خوبصورت نہ تھے۔ فوجانی میں جو کچھ دیرا کی کشش بھی ان میں تھی۔ وہ بھی منکشی نے چھین لی تھی۔ امنت کا سالن رنگ سیاہ ہو گیا تھا۔ اس کے کال اندر دھنسن گئے تھے۔ نیلا کا رنگ ہلکی سی طرح زرد ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد کالے کالے حلقے نمایاں ہو گئے تھے۔ اس کی عمر صرف ستائیس سال تھی لیکن وہ ادھر دکھائی دینے لگی تھی۔ نہ جانے وہ کیا چیز تھی جس نے ان کو ایک دوسرے کے اس قدر قریب کر دیا تھا۔ کیشش ظاہری حس اور جسمانی کشش سے کہیں زیادہ گہری تھی۔

ماں باپ اور نہ مرنے والے ایک دن ان کا سمندر بھر کر دیا اور وہ ایک دوسرے کے ہر گھنے نیلا جانتی تھی اپنی پرستش کو کئی چار چار سال کی خدمت کرنی چاہیے اور وہ اس کی پرستش کرنے لگی، خدمت کرنے لگی۔ امنت جانتا تھا کہ ایک کمزور سی چیز اس کے سپرد کی گئی ہے اس کا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کرے، اس کا ہر طرح خیال رکھے اس کے لئے کما کما سے سہارا دے، اور نہ سے چاہے۔ یہ کمزور سی چیز تو ساری زندگی اس کا ساتھ دے گی، اس کا گھر سنبھالے گی، اس کے بچوں کی ماں ہوگی، اس طرح ان کے دل مل گئے وہ ایک دوسرے کو چاہنے لگے تھے۔ اور برسوں کی رفاقت نے ان کی محبت کو گہرا کر دیا تھا۔ برسوں کے ساتھ ساتھ اور ان نئے نئے بچوں ان کے درمیان دل کے اس ملاپ کو مضبوط کر دیا تھا۔

”بچے جو اب تک باہر کھیل رہے تھے، ناچنے کو تے اندر آگئے۔ ماں بھوک لگ رہی ہے، اہاں! اس نے اٹھا چاہا۔ امنت نے اسے زبردستی لٹا دیا۔ نہیں غم نہ سہاؤ۔ میں ان سب کو کھانا دے لوں گا۔ بچوں کو لڑھکھائی لگا ہوی سے کھانے کو نکلتے اور بڑے بڑے فوائے بنا کر نکلتے دیکھ کر اور امنت کو بے ڈھنگے ہیں سے پرستے دیکھ کر اسے سہمی لگتی۔ لیکن وہ زبرد سے نہیں سکی۔ اس کے پیٹ کے نچلے حصے میں پھر اچانک وہی درد اٹھ رہا تھا۔ اس نے تڑپ مڑپا لیا۔ لیکن امنت نے اس کی آنکھوں کا ایک دیکھ لیا تھا۔ وہ بچوں کو بھڑکے اس کے پاس آگیا۔“

”نیلا کیا تکلیف سے تھیں؟ اس نے بے قرار لہجے میں پوچھا۔“

”ایسا معلوم ہوتا ہے کہ..... مجھے..... مجھے درد شروع ہو گئے ہیں“ اس نے رگڑ رگڑ کر جواب دیا۔

”نیلا تم مجھے بتایا بھی نہیں کہ تمہیں.....“

”نہیں، اُمی! آنکھوں میں نہ تھی تو ہے، جلنے کیوں ابھی سے۔“

”میں تمہیں ہسپتال لے جاؤں گا۔ نیلا! وہ اپنا بوسیدہ کوٹ پہن کر ٹانگہ لٹے چلا گیا۔ بچوں نے بھی ماں کو پریشانی دیکھ کر

جلدی جلدی کھانا کھا لیا اور سب چار پائی کو گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ یہ تھا لاجی اچھا نہیں مان؟ کیمین چھپ لہی ہوا مان؟ کھال ہے۔ مان دلہ رددو ہے۔ کمان؟ میں چرم لون ترا چھا ہوا مانے کا نا۔ اور سب سے چھوٹا بچہ اسے چمٹے لگا۔ اس کے پیٹ کو اس کے ہاتھ اور بازوؤں کو اس کے پیروں کو اس کے سینے میں مسرت جاگ اٹھی۔ کتنا پیار کر سکتی ہیں اسے۔ اس نے ننھے کو اٹھا کر خوب چوما اور پہلو میں لٹالیا۔ آخر اس نے زندگی میں کیا سکھ پایا تھا مغلی جھوک، مصیبتیں، طرہ بھر چین، آرام نصیب نہیں۔ لیکن بچوں کی یہ محبت انشور کی یہ رفاقت، یہی تو اس کی زندگی کا سرمایہ تھا۔

ٹانگہ اگیا تھا۔ اننت بچوں کو کھلا کر کھسائی کے مان جھوٹا آیا۔ دیکھو میں کل صبح تمہیں لے جاؤں گا۔ اور تم ایک ننھا سا گڈا دیکھو گے۔ ننھا رانٹھا بھائی۔ گڈے کا سا۔ اس نے نیلا کر اپنے بازوؤں پر اٹھانا چاہا۔ لیکن وہ خود تیزی سے اٹھ کر ٹانگہ میں جا بیٹھی۔

میرٹھی وارٹس اور پیرتے اور سیرٹھیاں بہت اونچائی تک چلی گئی تھیں۔ نیلا کے قدم دنگ لگ گئے۔

”میرٹھیاں والو نیلا۔“ اننت نے کہا۔ پھر خود ہی اسے اپنے بازو سے تھام کر آئسنہ سیرٹھیاں چڑھنا شروع کیں۔ چار پائی سیرٹھیاں ملے کے کٹے کے بعد پھر وہی تڑپا دینے والی ٹیس اٹھی اور اس نے اپنے پھرے کا کرب چھپانے کے لئے اپنا سر اننت کے کندھے پر ڈال دیا۔

وہ لبردار ٹیس بڑی انتظار کرتی رہی۔ اب دو دو منٹوں کے وقفے سے دروازہ کھٹکا۔ پیٹ میں۔ ہر بچہ کی ہڈی کے زیریں تختے میں کوکھوں میں اور سر و دھبے پر درد شدہ برتن ہونا جاتا تھا۔ اس کی آنکھیں لٹی لٹی ہوتی تھیں۔ وہ اپنے نیچے جوت کو دوسرے کاٹ لیتی۔ چرخوں اور کراہیوں کو روکنے کے لئے وہ نہیں جانتی تھی کہ اننت اس کی چیخوں کو سنے وہ جان لے گا کہ اسے اتنا تکلیف ہو رہی ہے اور۔۔۔۔۔

اور اننت بند دروازے کے قریب کھڑا تھا۔ اس پر ایک دلوانی سی طاری تھی۔ وہ بے تاب ہو کر کٹنے لگا پھر منہ پر اکڑ بیٹھ جانا اور بھٹی بھٹی آنکھوں سے غلامیں گھورتا پھر غور سے سننے لگتا۔ اے اندر سے تو کوئی آواز بھی نہیں آرہی۔۔۔۔۔ لبردار ڈوڑھیں بچوں سے گونجتا رہتا ہے۔ کہیں۔۔۔۔۔ اتنی کمزور تھی وہ۔ کیا اس سخت آزمائش سے بچے نکلے گی؟ اور ایک ناقابل بیان درد اس کے دل کو کھینچ لیا ہر بچہ کا اس نے اپنے دل کی گہرائیوں سے ایک جھوٹی سی دعا مانگی پھر اس نے اپنے آپ سے کہا۔ اگر نیلا اس واقعہ نہ جانے تو وہ بھی اسے بچہ نہ ہو نہ دے گا۔ اس نے پھر دروازے سے کان لگا کر سنا۔ کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔۔۔۔۔ لیکن نیلا ہمیشہ پونی صبح سے اس زندگی اور موت کی کش مکش کر رہا تھا ہے۔ کسی بچے کے وقت اس نے کسی اس کی جنمیں نہ مٹی تھیں۔ یہ سوچ کر اسے کچھ تسلی ہوئی اور وہ منہ پر جا بیٹھا اور پھر وہی انتظار اذیت ناک انتظار۔ جیسے وقت بھر گیا ہو۔ ان چند لمحوں کی اذیتیں زندگی بھر کی تکلیفوں کا پتو لگا رہا تھا۔ اور اس کی بے قرار نگاہیں دروازے کی طرف اٹھ اٹھ جاتی تھیں۔ اب کھلے گا۔ اب کھلے گا۔۔۔۔۔

اور اندہ نیلا بے ہوش بڑی تھی۔ بچہ بہت چھوٹا تھا۔ اس نے جلدی پیدائش ہو گئی۔ اس کے ٹخف سینے میں دھن بھر جان باقی تھی۔ آؤں کاٹنے ہی میں وہ بچہ لے کر خاموش ہو گیا۔ نیلا کو اب ہوش اگیا تھا۔ اس نے بچے کے منہ کی پوچھا نہیں۔

اس کی کسی بھی ہوتی نہیں ہے یہ جان لیا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ یہ بھی نہیں بوجھا کچھ سے یا کچھ۔ نرس نے اُسے اُٹھنے سے تباہا پھر چکا ہے اور اسے لٹی دی۔ اُٹھ بیٹے کے بچے کبھی زندہ نہیں رہتے اگر انہیں نو بعد میں مری جاتا ہے۔ تیلے نے کوئی جواب نہیں دیا اور جب نرس نے بچے کو اٹھا کر دکھا یا تو ایک نظر دیکھا۔ نازک نقشِ زرد چہرہ کٹدی کی طرح سوکھا جسم۔ اس نے انکھیں پھیریں۔ ددا اُسے اس کی آنکھوں سے نکل کر دہری ٹیٹ پڑھک گئے اور محبت اور ممانائی وہ اگر کم گرم دھاوا جوئے سے سرے سے اُٹھ کر اس کے سینے میں مہر آئی تھی۔ مرد ہو کہ نہ ہو گئی۔

اندر اس کے کیسے ہیں بہہ ائی گی۔ مرد ہو کر چھوڑ دی۔
دروازہ کھلا۔ نرس باہر آئی۔ انت آٹھ گھنٹہ ہوا اور پانچ گھنٹہ کی طرح نرس کو گھورنے لگا۔ اس سے کچھ بچھا بھی نہیں
جار ہوا تھا۔ اور نرس نے بتایا۔ پھر درجہ کا ہے۔ بچہ کا خیال اسے بالکل نہیں آیا تھا۔ اس کے دل و دماغ میں یہی خیال چھوڑ بیٹھا تھا
تھا۔ کاش تھیلہ کتنی گئی ہو اور اسی پانچ گھنٹہ کے سے انداز میں اس نے نرس سے (بچھا)۔ اور میری بیوی؟ نرس نے شاید یہ نہیں
سنا۔ وہ کہہ دی تھی کہ آٹھ بجنے کے بچے نہیں جیتے۔ اب میں تو کبھی نہ کبھی مر ہی جانا۔ اس کی اتنی فکر نہ کر۔ اور
وہ واقعی بالکل ہو گیا۔ وہ نرس کو غصہ ہو کر کہہ چکا تھا۔ اور میری بیوی؟ اور جواب کا انتھکا کہ لغو دروازے میں گھسنے لگا۔ نرس نے
اسے دانت لے کر کہا۔ وہ نرس کی بات نہیں جانتے۔ کانی لے آؤ اپنی بیوی کے لئے۔ بیوی کے لئے کانی باغ و سرسبز سے
اس کی جینٹل گئی پھر اسے گرد و پیش کا خیال آیا۔ وہ جلدی باہر نکل آیا اور فریب کے پھل سے کانی لے آیا۔

وہ نہ رھال پڑی تھی۔ اس نے کافی اس کے منہ میں ڈالتا ہوا پوچھا: "نیلہ کیسی ہے طبیعت تمھاری؟"

تکلیف زیادہ ہے۔“

دوسری صبح کو بھی نیلا بونسی ڈھال بڑی نفی۔ اس کے چہرے پر پلہڑی کی چھوٹ نفی۔ جیسے اس کے جسم سے سارا خون
چوس لیا گیا ہو۔ اس نے اس پر جھٹک کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ کتنا سرد بخاؤہ ہاتھ۔ اس نے اسے ہاتھ سے پکارا۔ "نیلا"
نیلا نے آنکھیں کھولیں اور مشکلی سر ہڑا۔ اس نے نرس اور لیڈی ڈاکٹر دوڑیں آگئیں۔ وہ نیلا کا ہاتھ چھو کر ڈاکٹر
جاکھڑا ہوا۔ نرس نے نیلا کے آنکھ میں سونے چھو کر خون نکالا۔ بہت دبانے پر خون کا ایک ننھا سا قطرہ شکل نکلا۔ اور
اس نے اس قطرے کو کاغذ پر چپکا کر لال و حار ڈال دیں۔ اسے کاغذ کے ساتھ لگا کر دیکھا۔ ڈاکٹر نے پوچھا کتنا؟ پندرہ فی صدی"
نرس نے جواب دیا۔

میں نے جواب دیا۔
 ”پندرہویں صدی ۴۵۰ اکثر کے مندرجہ ذیل تھیں: اس نے انتہا کو باہر بلا لیا، ہم جانتے ہو تو چھاری بوی کی کیا حالت ہے، اس کے جسم میں قطر بھر بھی خون نہیں۔ جانتے ہو اس کے خون میں کتنا آمیو گلوبن ہے۔ پندرہویں صدی ۱۸ مرد و خود غرض مرد نکلیا جانو اس پر ایک لکڑی ہے۔ ٹھیک اپنی پڑی رہتی ہے تیشہ۔ شادی کر لینا اور جبر مرد ایک بچے دے دینا اس کی معلوم ہے ہم لوگوں کو۔ کچھ اپنی بوی کا بھی خیال کیا واصل کے دونوں میں اسے دودھ دیا وہیں دے رہے تھیں ٹانگ پلائے ہوئے۔ اور کچھ شیطاں کچھش دولاے ہوئے۔ ستر کچھ پندرہویں صدی پر آمیو گلوبن بھی ہو تو اس حالت میں بن عورین ٹانگ پڑتی ہیں، کچھش لیتی ہیں زنجیر اور خون میں پندرہویں صدی آمیو گلوبن ۱۸ اور پھر اس نے جانتے ہیں کہ کہا ۱۸ اور دم لگ صرف یہ خوب جانتے ہو کہ جب وہ موت کے منہ میں پہنچ جائے تو اسے

ہسپتال میں لاکر ٹپک دیا جائے۔ وہ نیلا کو نہیں چاہتا؟ نیلا کا خیال نہیں رکھتا ڈاکٹر کا ہر جملہ تھوڑے کی ضرب بن کر اس کے دل پر پڑ رہا تھا۔۔۔۔۔ پھل اور دودھ دار ٹانگ۔ اگر اس کے پس میں ہوتا تو کیا وہ ان چیزوں کا طہیر نہ لگا دیتا۔ نیلا کے لئے اور اب نیلا کے جسم میں نقطہ برابر خونی نہیں، نیلا موت کے منہ میں ہے۔۔۔۔۔ پھر ڈاکٹر کی آواز کچھ دہری پڑ گئی۔ ”سونا سے بہت سے فور میٹر ٹیکٹ انجکشن دینے پڑیں گے اور ہر انجکشن کی قیمت اڑھائی سے تین روپے ہے۔ کیا تم ادا کر سکو گے ان کی قیمت؟“ اس سے اس کا جی چاہا کہ ڈاکٹر کے پاؤں کپڑے اور کئے۔ ”میں کسی طرح ادا کر دوں گا ڈاکٹر! بس تم مہری بیوی کو کچا کر دو۔“

اور ہسپتال کا بل بیکانے کے لئے اس نے قرض لیا۔ وافر کو پس میں جانا چھوڑ دیا۔ سینے سنگریٹ بھی پٹنے ترک کر دئے۔ ان چند گھنٹوں سے وہ نیلا کے لئے پھل خرید لے جانا۔ نارنگیاں اور سیب، لیکن چھوٹے سے چھوٹا سیب بھی چار روپے میں آتا تھا۔۔۔۔۔ اور نیلا کو دن میں تین چار بار انجکشن دے جاتے۔

لیکن وہ اپنی مدد حال پڑی رہی۔ اس کے چہرے کا رنگ سفید سے سفید تر ہو جاتا رہا تھا۔ خون کی کمی کی وجہ اس کے ہاتھ پاؤں اتنے سرد ہو گئے تھے کہ ان میں گرمی قائم رکھنے کے لئے ہمیشہ ربر کے ساکس سے چرٹھلے جاتے اور گرم پانی کی ٹھیلیاں اس کے پاؤں کے نیچے رکھی رہتیں اور وہ اس کے ہانگ کے قریب بیٹھا گھنٹوں اُسے نکا کرنا اور نیلا کی نگاہوں کا کرب اس کی آنکھوں میں منتقل ہو جاتا۔ لیکن وہ اس کرب کو نیلا پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھر کر کہتا۔ ”تم بھی ہو جاؤ گی۔ نیلا۔ ضرور اور میں بھی تمہی ٹانگ لادوں گا۔ اور پھل اور دودھ، تم ندرت ہو جاؤ گی، سچ نیلا میں روپے جمع کر دیا ہوں۔۔۔۔۔ نیلا مسکرا کر اس سے لے تنگ رہی تھی اور اچانک معلوم ہو جاتا کہ اس کی آنکھوں میں امید کی چمک کبھی کی کبھی سے۔ آہ اس مسکرا ہٹ صرف اس کی تسلی کے لئے ہے۔ اور اس کا دل خون ہو جاتا۔ جب کبھی وہ بچوں کو لے آتا اور وہ ماں کے پٹنگ کے گرد کھڑے اسے حیران نگاہوں سے دیکھ کر کہنے لگتے تھے وہ بچوں کو عجیب سے انداز سے گنتی۔ جیسے اچھو پھوڑا کہیں جا رہی ہو۔

اور ایک رات وہ مسلسل کراہتی رہی۔ اس کا بدن چھوڑے کی طرح ڈکھ رہا تھا۔ رگوں میں دھڑکنے والے سیسپن انجکشنوں کا دور و کمروری کی وجہ سے شدید ہو رہا تھا۔ وہ ہاتھ پاؤں ہلاتی تو دور کے مارے بلبلات تھیں۔ اور انشتہ نے نرموں کی منت کی کہ آج رات اسے یہیں سو جانے کی اجازت مل جائے۔ وہ یہیں کہیں کو نہ بٹا رہے گا۔ لیکن انھوں نے جھٹک کر اسے نکال دیا رات کے فوج کے بعد کوئی بھی یہاں نہیں رہ سکتا۔ لیکن نیلا نے دیکھا تھا کہ بازو کے پیش ماڈ ڈالی لوکی کا شہر ہر رات کے گیارہ ساڑھے گیارہ تک اس کے پاس بیٹھا رہتا تھا۔ اور یہی تریس عامیٹھی سے بندہ رات کا فاضل کھول دیتی تھیں اور جب وہ ٹپکی بھی اس کے شہر کو روزانہ تک پہنچا کر خوشی سے جھومتی ہوئی دیا میں آئی۔ تو تریس اسے اندر چھوڑنے کے لئے دروازہ دیکھ پاس ہی، جو نیلا کے کمرے کے سامنے تھا، کھڑی رہتیں اور پس پس کر اسے چھوڑتی تھیں۔ بڑی محنت سے دم دونوں میں۔۔۔۔۔ سڑبیوں کی محبت کو تو کوئی نہیں سمجھتا۔ سمجھائے بھی تو بدوا نہیں کرتا۔ اس نے ایک آہ بھر کر کوٹ لی اور ورو سے ٹپکے کراہی۔ وہ رات بھر کراہتی رہی۔ کوئی اس کے پاس نہیں آیا۔ کبھی کبھی چڑچڑائی ہوئی تریس آکر اس سے کہتی تھیں زود سے

کراہتی ہے۔ دوسرے مریضوں کی فیند غراب نہیں ہوتی؟ اور وہ اسے فیند کا انجکشن دے کر کھلی جاتی اس رات اسے فیند کے کئی انجکشن دے گئے۔ لیکن اسے فیند نہ آیا.....

صبح کو وہ بالکل خاموش تھی۔ اب اس میں کراہنے کی جلی سکت نہ تھی۔ انت آیا تو اسے خاموش دیکھ کر سمجھا اب اتنے تکلیف نہیں ہے۔ لیکن شام کو لیڈی ڈاکٹر نے نیلا کا معائنہ کر کے مایوسی سے سر ہلایا۔ اور انت کو باہر بلا کر کہا: ”اب ایک ہی امید ہے“

وہ کیا ہے؟ وہ پاگلوں کی طرح چلایا۔

”اس کے جسم میں انسانی خون داخل کرنا چاہیے“

”تو میرے خون کا معائنہ کیجئے“

اور اس کے خون کا معائنہ کیا گیا۔ یہ ٹھیک ہے۔ لیکن اسے بہت سے خون کی ضرورت ہے۔ ہر روز تھوڑا تھوڑا خون اس کے جسم میں داخل کیا جائے گا۔ کیا تم اتنا خون دے سکتے ہو؟ ڈاکٹر نے سوچا تھا کہ یہ سوکھا انسان! اس کے جسم میں بھیجی خون ہوگا۔ وہ اپنی بیوی کے لئے جس کے اپنے خون کی امید بہت کم ہے۔ شاید خون نہ دے سکے، لیکن انت نے ایسی نگاہوں سے دیکھا گویا کہ وہ اپنا خون دے گا۔ تم اتنے خون کی پوچھ رہی ہو میری بیوی کو کہ میرا خون بچا سکتا ہے تو تم میرے جسم کا سارا خون چودہ سکتی ہو؟ گرم گرم خون نکلا گیا بائیس سی سی۔ اور انت کا یہ خون جس کی ایک ایک لونڈی میں سمجھتی کی گرمی تھی، نیلا کے جسم میں منتقل کیا گیا۔ اس کی ساری رگوں میں ہلکی سی گرمی دوڑ گئی۔ اور اس کے چہرے پر رون سی نکلی۔ انت خوشی سے ہانپنے لگا۔ اس نے نیلا کا ہاتھ جو اب کچھ گرم سا تھا اپنے ہاتھ میں لے کر کہا: ”..... نیلا اب تو تم بہت جلد ابھی ہو جاؤ گی۔ ڈاکٹر نے کہا ہے تمہارے جسم میں انسانی خون داخل کیا جائے تو تم جلد ابھی ہو جاؤ گی۔“

”انسانی خون؟ لیکن کون دے گا۔ اور میری طرف سے کسی دوسرے کو.....“

انت نے ایک نکھری ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ کہا: ”اب جو انجکشن تمہیں دیا گیا ہے وہ انسانی خون ہی کا تھا۔“

”لیکن، لیکن، کون.....“ اور پھر وہ جان گئی اور اس نے محبت بھری نگاہوں سے تنہا اب جھک بھی اٹھی تھی، اپنے شوہر کو دیکھا۔ پھر ان نگاہوں میں گلہ پیدا ہوا اور وہ کہنے لگی: ”..... لیکن وہ کچھ نہ کہی۔ اس کے ہونٹ جیڑھیں لگا کر رہ گئے، اس کی حالت دیگر لوگوں ہو گئی۔ چہرہ نیلا پڑ گیا۔ انت اس پر ٹھک گیا۔ ”نیلا، نیلا، وہ چلایا۔ وہ کچھ کہ رہی تھی، لیکن آواز نہیں نکلی رہی تھی۔ اس نے کان زیب لا کر سنا دہ کہ وہی تھی۔ ”بچے، میرے بچے، میں نہیں دکھنا جانتی ہوں وہ میرا بیٹا تھا۔“

بھاگا اور بچوں کو لے آیا۔ نیلا نے سب بچوں پر باری باری نگاہیں جما کر دیکھا، چہرے کو اٹھانا چاہا۔ لیکن اٹھنے کے لئے ہاتھ بے بسی سے گر گئے۔ اس نے بڑی وقت سے کچھ دیر اپنی نظروں کو انت پر جھانکے رکھا۔ یوں پوچھ رہی تھی اس نے کہ کبھی مرنا دہی ہوئی اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔ انت ہلک کی ہنسی پر ہر ہلک کیلک کر جھلانے لگا۔ ”نیلا، نیلا،“ بچے حیرانی سے ماں کو تنک رہے تھے وہ چہرے بچوں کو میٹ کر مری پر کر پڑا۔ بڑے بچے بھی باپ کی کمری کے پاس کھڑے کچھ بھی اٹھنے لگے۔ انت نے دیکھتے ہیے موت کا راز ان کی سمجھ سے باہر تھا۔ زمینیں اس کے ہاتھ پاؤں سیدھے کر کے اس پر سنبھلا کر ڈال دی تھیں سنبھلا دے اور اتنا ہی

سفید چہرہ، کالے بھرے ہوئے بال۔ وہ سکتے کے عالم میں بیٹھا گھوڑا مارا۔ لیڈی ڈاکٹر بولی۔ ”تم اس کی ادھی کا انتظام کر کے کل صبح اسے لے جا سکتے ہو۔ اس وقت تک تم نیچے ایک کمرے میں کبھی جا نہ گی۔۔۔۔۔ اور دل بھی تم کل چکا سکتے ہو مجھے افسوس ہے تمھاری بیوی۔۔۔۔۔“ لیکن وہ کچھ بھی نہیں سن رہا تھا، جیسے اس کے نام جو اس شل ہو گئے تھے۔ لیکن چندا ورنیر اور اڈولف اسے چونکا دیا۔ نعلین لے جانے والی سچی ذات کی جو رہیں سڑ بچر لے جا رہی تھیں۔ ”جب تک ہمیں پہلے ہی ایک ایک دوپٹہ دے دیا جائے ہم نہیں لے جائیں گے۔“ اور زربیں، ”پس میں باقی کر رہی تھیں۔“ ہم خود لے جا سکتے تھے۔ لیکن تو بہ! اس کا چہرہ کتنا سفید ہے، اچھے تو ڈر گنا ہے۔“ وہ نیلا کی بی بی زین برداشت نہ کر سکا۔ غصے کے عالم میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے آپ سے کہا: ”شکر ہے میں اونچی ذات کا ہندو نہیں ہوں۔“ وہ نیلا کی طرف بڑھا۔ زرب نے جلدی سے سڑ بچر بڑھایا۔ اس نے اپنا ہارٹ کلاٹ کر کہا: ”نہیں اس کی ضرورت نہیں، صرف مجھے وہ نیچے والا لاکرہ بنا دو تو مہربانی ہوگی۔“

اور اس نے اپنے بازوؤں پر نیلا کی نعلین کو اٹھا لیا۔ اور وہ نیلا کو لئے اسی زینے پر سے اتر رہا تھا، جن پر سات اون پہلے اسے سہارا دے کر اوپر پہنچا یا تھا، اس جسم کو لئے جسے موت نے سخت اور بجا دی کر دیا تھا۔ اس جسم کو جو اسے محبوب تھا جو کبھی اس کی تباہی کا مرکز تھا۔ جس نے بارہ سال تک اس کا ساتھ دیا تھا اور اس کے قریب رہا تھا۔ اور اب اس کے بعد پیشہ کے لئے اس کی آنکھوں سے اوچھل ہو چکا تھا۔ اس کی زندگی سے الگ ہو جائے گا۔ اس جسم کو اس نے کئی بار اسی طرح پیچے بانڈوں پر اٹھا لیا تھا جب نیلا پھولی کی طرح ملتی تھی جب وہ کسی لڑکی کی بی بی تھی اور اس کی ماں اس سے دن بھر کام لیتی تھی اور جب وہ ماں کی نظریں بچا کر دھیرے کمرے میں ملنے تو وہ اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا کر گھمانا اور پلنگ پر ڈال دینا اور کبھی جب وہ بیمار بیمار کمزور رہا کرتی تھی تو وہ اسی طرح اسے اٹھا کر پلنگ پر لٹایا کرتا تھا۔

اور اب وہ آخری بار اس محبوب جسم کو اپنے بازوؤں پر اٹھا کر لے جا رہا تھا۔ نیچے، نیچے، نیچے اور نیچے۔

دادا

غیدیمستور

اُسی رات کا بھیا نک سنا جیسے سرگوشیوں میں قتل کی سازشیں کر رہا تھا اور دادا بچتہ مرٹک کے بچوں بیچ اس اطمینان سے چل رہی تھی کہ لگتا یہ پوری مرٹک صرف اس کی خاطر بنائی گئی ہے، کہیں قریب ہی سے پہرے دار سپاہیوں کی سیٹیوں کی آوازیں آرہی تھیں، عجیب عجیب سناٹے میں غریب سا خوف و ہراس بھینٹا جا رہا تھا۔ دادا بھیا نک سناٹے اور سیٹیوں کی آوازوں سے بالکل بے خبری معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں تھمی ہوئی موٹی سی لاشی کے سرے پر لگا ہوا دوا مرٹک کوٹ رہا تھا اور اس کے بھاری بھاری مردانہ چہرے پر شہر بھاری ہے غصے۔ اس کے چہرے سے سخت بیزاری ٹپک رہی تھی۔ وہ باوا دوا مرٹکی سانس لینے اور پھر اپنی چوڑا کھنکھوں سے بولیں آسمان کی طرف دیکھتی جیسے دواں بھی کوئی مرٹک سا تالہ لٹک رہا ہو۔ وہ جھلنے کیا کچھ بد بڑا رہی تھی۔ پتہ نہیں گا لیاں بلکہ رہی تھی یا دوا مانگ رہی تھی۔ گشتی سپاہی اب اس کے قریب آتے جا رہے تھے لیکن وہ اسی سکون سے متوازن قدم ڈالتی چلی جا رہی تھی۔

”کون ہے تو؟“ آواز اتنے قریب سے آئی کہ اب اسے کھڑا ہو جانا پڑا۔ اس کے کھڑے ہونے کے انداز میں بیزاری اور ذکھ تھا۔ شاید وہ کھڑا نہ ہونا چاہتی تھی۔ سپاہی مارے حیرانی کے اسے جھانک جھانک کر دیکھ رہا تھا۔ انہی لمبی ترانگی عورت، لہو قد میں ڈنڈا، مردانے چہرے، ڈھبھا ڈھبھا لالہ لہا گوند، بڑے بڑے پاؤں کی شفر اور دو پٹر غائب۔ دادا ایک لمحے تک چپ چاپ کھڑی تاک جھانک کرنے والے سپاہی کو کچھ اس طرح دیکھتی رہی جیسے کہ وہی ہو کہ بھائی۔ آج مجھے خوب چلنے دو، آج میں بہت بیزار ہوں۔ آج میں زندگی سے اُٹا چکی ہوں۔ مجھے چلنے دو۔ سپاہی نے تھپتھپ کر زور سے بیٹھی بھائی۔ تھوڑی دُور پر دو سرے گشتی سپاہیوں کے جوتوں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔

”کون ہے تو؟“ گونگی ہے جو بولتی نہیں۔“ سپاہی زور سے کچاوا اور اس کی آواز سناتے ہیں دُور دُور تک پھیل گئی۔

”کیوں سناتا ہے بابا، تو اپنا کام کرو“ دادا نے آہستہ سے جواب دیا۔ ”اپنا کام کرنے کی بجائے، بولیں تو کون ہے سپاہی اس کی طرف بھٹتا۔“

”تیرا باپ ہوں حرام زائے“ دادا جیسے چنگی اور اس نے اپنی لاشی زین پر زور سے بٹھی۔ اس کے چہرے پر جیسے ساری

مونیکی کرنگی بھٹکار بن کر برسے گئی ————— سپاہی نے پھر کمری سی گالی کی ”چل تھانے ————— دو دو نیچے اٹھ لے کر آوارہ گھر مونی ہے سانی“

”تھانے لے چلے گا“ ————— وہ سپاہی کی طرف پل پڑی ————— ”تھانے لے جانے کا، تیری ایسی کی تھی“ —————
وآد اٹنے اپنا ڈنڈا سپاہی کی ٹانگ پر جھاڑ دیا اور جب سپاہی نے گھبرا کر اپنی لاشی اٹھائی چائی تو آد ا کا لٹھ اس زور سے پڑا کہ سپاہی کا سر پھٹ گیا۔ لاشی میں لگا ہوا آد ا اس کے دماغ تک پھیر گیا تھا۔ وہ زبردست جانے کیا بد بردی تھی اور پھیل چھکی چاندنی میں ہوتا ہوا جیتا جیتا خون سیاہ نظر آ رہا تھا۔ دوسرے سپاہی کے قدموں کی چاب بالکل قریب آچکی تھی۔

وآد ا نے ہلکھلا کر خون دیکھا اور چہرے سر پٹ بھاگنے کے لئے اس کے قدم اٹھے۔ ابھی وہ چند ہی قدم بھاگی تھی کہ کچھ سپاہیوں نے اس کا ڈنڈا اچھین کر ٹھنڈکیاں پٹنایاں ————— دو سپاہیوں کو لاش کے پاس جھڑک رہی تھی جا رہا ہے اسے بچا میں لیکر قریب کے حالات کی طرف چل دٹ ————— سپاہی اپنے مہم سافٹی کے متعلق یاقین کر کر کے آد ا کو گالیاں دے رہے تھے مگر وہ خاموشی سے چلتے پرتے جانے کیا سوچ رہی تھی اور رات سپاہیوں کی طرح جیسے جیسے میں کھانسی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔

وآد ا کو تین دن تک حالات میں رکھا گیا۔ اس کے متعلق زیادہ کچھ معلوم کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی، وہ کئی بار جیل بھاگی تھی، اس کی ساری ہمشری مورچہ تھی۔ بس صرف یہ معلوم کرنے کے لئے اسے کئی دن تک سزا میں دی گئیں کہ مہم سپاہی سے اس کی کوئی سی دشمنی تھی، اور اس کے عاشق کا کیا بیتر ہے۔ وآد ا نے لکھ بھایا کہ اب اس کا کوئی عاشق نہیں، وہ اب کسی کو نہیں جانتی، پھر بھی کسی نے اس وقت تک یقین نہ کیا جب تک کہ سپاہی مورچوں نے اس کی اچھی طرح مریت نہ کر دی۔

چوتھے دن اسے ایک بند گاڑی میں بٹھا کر جن پہنچا دیا گیا جہاں وہ ایک چھوٹی سی کوٹھری میں اس وقت تک کے لئے بن کر دی گئی تھی جب تک کہ اس کے مقدمے کا فیصلہ نہ ہو جائے۔

وآد ا کو جب اس ایک کوٹھری میں بند کرنے کے لئے لایا گیا تو وہ ہمیشہ کی طرح سنسن نہ رہی تھی، جیل کی کوٹھری کو بڑا اچھا گھر نہ کہ رہی تھی، سپاہیوں سے سنسی مذاق اور چھیرا چھاڑ نہ کر رہی تھی۔ بلکہ وہ بالکل چپ تھی اور جب اس کی کوٹھری کا آئینہ و دروازہ بند کر دیا گیا تو وہ مٹی کے اس طبقے سے جو پترے پر چٹائی بچھا کر بیٹ گئی جس کے سر ہانے ذرا زیادہ مٹی پھوپ کر تکیہ بنا دیا گیا تھا اسارا دن یوں ہی چپ چاپ پھٹ گئے گئے گزر گیا، المونیم کے بڑے سے بیٹے میں بڑی ہوئی چنے کی بٹنی مٹی وال اور دو موٹی موٹی روٹیاں اس کی بھوک کو لچائی رہیں۔ رات آئی تو کھانا آئے زبردستی کھلایا گیا لیکن اس کی اس کیفیت میں جو ذرا کھینچی نہ ہوئی۔ آئینہ و دروازے کے باہر ہرہ ہوتا تھا۔ پہلی پہلی لالٹیوں کی چمک ادھر سے ادھر گھومتی رہی۔ بارگ نمبر ایک، بارگ نمبر دو ————— سب اچھا —————

سب اچھا ————— پھر وہ المونیم کی آواز بن ایک دوسرے کو جواب دیتی رہیں۔ واد ا ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرتی رہی شاید آج اس کی وہ زندگی سے بڑی طرح تناسف پر نہ گئی تھی جو ایک چھوٹے سے گھرنے میں شروع ہوئی تھی۔ شاید یہ ایسی کی یاد تھی جو وہ بول نہ سکتی پڑی انداز ہے جس میں کچھ دیکھ رہی تھی۔

وہ دن جب اس کا آقا قریب کی کوٹھری میں برے کا کام نہ تھا اور اس کی اماں سارے بیٹے پندرہ روپوں کا حساب کر کر کے کڑھاکر تھی اور ان دنوں اس کا نام واد ا کے بجائے کبیر تھا۔ پندرہ روپے اور چھ جانیں۔ کبھی اسے پٹ بھردی نصیب نہ ہوتی

”اُمّی کسے ایک لفظ بھی کہا تو مجھ سے بڑا کوئی نہ ہوگا، میری ماں نے چلتی پھرتی پس کر مجھے پالا ہے، اس گھر کی ہر چیز انھیں کی ہے۔“ اس نے بہت جا بجا کہہ دیا کہ اس کو اپنا کس کو نظروں سے گرا دے لیکن اس کی ایک نہ چلی۔ ماں پر ضرور ہمارا کاب شر ہو گیا اس سے دُور بھاگنے لگا۔ ہر گھر میں ہر وقت کی لڑائی لڑائی تھی کہیں وہ ساس کو چھوڑتی، ساس اسے سارا دن گالیاں دیتی، روٹی اور چھینے ساسے حملے والوں کی ہمدردی جو کر بھی اسے پہن نہ آتا۔ اب وہ جلن کے مارے اسے اتنی روٹی دیتی کہ اس کے پیٹ کی ایک کو بھی نہ بھرتی۔ وہ زبردستی باورچی خانے میں گھس کر کھاتی اور ساس کی گالیاں بڑی خوفناک ہر نہ لگتی۔ اس کا شوہر روز کی کٹ کٹ سے تلگ آکر اسے ماتا اور وہ ساس سے بدلہ چکاتی۔ باپ کی موت کے باوجود وہ اپنے گھر بیٹھ جانے کی دھمکی دیتی اور ساس اس دھمکی سے خوش ہو کر کہتی کہ تو بھلا کیا جائے گی چڑیل۔ اور واقعی اس کی دھمکی صرف دھمکی ہی رہتی۔

پھر کچھ دن کے لئے لڑائیاں نہ لگ سکیں کیونکہ اس کی گود بھرنے والی تھی۔ ایک مہینے تک بھیل کر جب وہ اپنے بچے کو گود میں لئے اٹھی تو ساس نے یہ بھی برداشت نہ کیا کہ وہ اس کے اکلوتے بیٹے کے بچے کو گود میں لے کر اپنا حق جیتائے اور اس کا بیٹا اولاد کی دھڑ سے میری کے بس میں آجائے۔ یہ چیز ایسی تھی کہ وہ ایک دم شیرنی ہو گئی۔ ذرا بات آتی تو اس نے اپنی ساس کے چھوٹے بچے کو لہجی طرح مرمت کر دی اور پھر اسی دن اس کے شوہر اور ساس نے دودھ پیتے بچے کو اس کی گود سے چھین کر گھر سے نکال دیا۔

وہ اسرا تھا، اس کی بھیمیں نہ آتا کہ کہاں ملے، کس کے پاس پناہ لے۔ برقعہیں اٹھتی جلی جا رہی تھی کہ راستے میں اسے اپنے حملے کے تانگے والے کی پیروی مل گئی۔ وہ کنڑا اس کے ماں آبا کوئی اور مڑی کا لالہوں کے ساتھ ساسے حملے کی خبر سننا جاتی تانگے والی اسے اپنے گھر لے گئی اور مڑی ہمدردی کی مگر اس کے آسوں نہ تھے۔ وہ میدان کوٹ کوٹ کر روٹی دیتی اور تھیں کے اُدھر سے پہنچے ہوئے دودھ کے قطرے دکھا دکھا کر فریاد کرتی رہی۔ اسی رات جب تانگے والے نے انا گھوڑا اکھولا تو اس کے عجیب عجیب سے دوست بے دھڑک گھر میں آکر پیچھے پیچھے مانتے کر لے گئے۔ اس کے بعد گھر کے دروازے بند کر کے جوئے اور چوس سے شوق کیا گیا۔ تلنگے والی نے بھی زمین پر لیٹ کر چوس بھری سگڑ پی اور پھر اسے بھی زبردستی پوری سگڑ پلا دی۔ چوس کا پہلا پہلا نشہ تھا۔ وہ بالکل چکر اُٹھی اور کھری کھاٹ پر گر کر ساری رات اپنے پیچھے اپنے لال کو آواز دیتی رہی۔

دو تین دن کے بعد بھی جب اس کے آسوں نہ تھے تو تلنگے والی نے اسے بتایا کہ اس کے آس کا ایک دوست اس پر عاشق ہو گیا ہے۔ رونے دھونے سے کام نہ چلے گا، عیش کرنا جو تو اس کے ساتھ بھاگ جائے، ساری زندگی عیش کرنے کا وعدہ کرنا ہے۔ پھر تلنگے والی نے بتایا کہ وہ خود بھی جاگ کر آئی تھی۔ نہ شادی کی نہ بیاہ، دہرے سے شفا کرتی ہے میاؤں کی حکومت سے بھی بال بلی پی ہوئی ہے۔ ————— وہ ان باتوں پر راضی نہ ہوئی۔ برابر ہی رستے میں اس کی ساس اور شوہر سے میل کر اُدا۔ اب وہ سب کچھ برداشت کر لے گی۔ بھوکے مرنے کی گراف نہ کھائے گی۔ اس کا بچہ اس کی گود میں نہ دیا جائے گا تو کبھی انا گھوڑ نہ پھیلے گی۔ اگر اس سے کہا جائے گا کہ کچھ نہ دیکھنے زاپنی آنکھیں پھوڑے گی لیکن اس طرف تو بھی نہ اٹھائے گی۔ صرف اسے اپنے بچے کے قریب رہنے دیا جائے۔ آخر تانگے والا اس کے شوہر کے پاس گیا تاکہ صلح صفائی ہو جائے مگر جب وہ واپس آیا تو سافذ ہی ملاقات نامہ تھا، وہ پالکوں کی طرح بالی لوجی، بوٹیاں کاٹتی اور پیچ پیچ کر روٹی دیتی۔ اس کے سننے عاشق نے اسے جی جان سے تسلی دی، تلنگے والی نے بڑی شفقت سے گالیاں بک بک کر دم دلائے لیکن اس کی بھیمیں

کچھ بھی نہ آتا وہ ساری ساری رات اپنے اپنے کمرے کو لگاتی، اس سے باقیں کو قتی جھنجھتی اور پھر جس کے دم لگاتی۔
 وہ دھنپنے اسی طرح گزرتے آئے ایک دن مانگنے والی نے اس سے صاف کہہ دیا کہ وہ زیادہ دن نہ کھلا سکے گی لیجھا بھلا
 چلنے والا مل گیا ہے اب اپنا گھر بنائے اور آفرودہ اس شرط پر اپنے عاشق کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گئی کہ جانے سے پہلے
 ایک بار اس کا لال دکھا دیا جائے۔

جانے سے پہلے اس کو معلوم ہوا کہ اس کا شوہر اور اس کی دوسرے شہر جا چکے ہیں۔ اس خبر کے بعد وہ روٹی نہ پڑی
 بس اس طرح چپ ہو گئی جیسے پتھر میں تبدیل ہو گئی ہو۔ دوسرے دن اس کا محبت کرنے والا اسے شہر کی بڑی تاریک اور پرستار
 گلیوں کے ایک مکان میں لے گیا جہاں اسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ اس کا ساتھی چوری کر کے پیٹ بھرنا ہے۔ اس نے کسی قسم کا
 اعتراض نہ کیا۔ وہ ہاتھ کی نہ مٹانی سے جو کچھ کھانا اس کی گود میں ڈال دینا۔ مارے پیار کے پچھا چاتا لیکن وہ اس سے ہنس کر
 بولتا نہ جانتی ہی نہ تھی۔ بات بات پر گالیاں لگتی، ڈھیر ڈھیر میوے پس پتی اور سارا دن پلنگ پر پڑی بان لڑا کرتی، مگر پورا پکے
 کو تو بس حوریت چاہتیے اور عورت اس غریب کو کڑی مدت کے بعد ملی تھی وہ اسے ایک لفظ نہ کہتا۔ بہت سے وہی یوں ہی
 گزرتے چلے گئے۔

پلنگ پر پڑے پڑے اس نے جتنے کی ساری دایوں سے علاج بھی کر لیا لیکن آخر اسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ نہ بچگی کے
 وقت اس کی ساس نے مارے جانے والی کو نہیں بلایا تھا اسی لئے یہ خرابی ہوئی۔ کہ اب وہ اولاد پیدا کرنے کے لائق نہیں ہے۔
 اس انکشاف کے بعد خود وہ اور بھی عجیب و غریب ہو گئی۔ وہ سارا دن پڑی اپنا سینہ کوٹ کوٹ کر روٹی کا لیاں لگتی، چرس پیتی
 اور پھر انا کھاتی انا کہ اس کے ہاتھ میں گڑ بڑ ہو جاتی۔

ایک سال بعد اس نے اپنے سچی سے ضد کی کہ اب وہ بھی اس کے کام میں ہاتھ بٹائے گی۔ اس اٹھا دے وہ بہت
 خوش ہوا اور جلد ہی چوری کے برٹے مرنے لگے رہا دیتے۔ احتیاطاً تالہ توڑنا بھی سکھا دیا۔ پچھ ہی دن بعد وہ برٹے آتا نہ کوئی کی
 تلاش میں گھرتا پڑنے لگی اور اس کے آدمی کو ہاتھ صاف کرنے میں آسانی ہو گئی۔ اب وہ فون کے برٹے مرنے لگے۔ وہ روٹنے
 ، حوٹنے کے بجائے سیر سیر پھر دو دھڑکی اور پہلے کی طرح اپنے چاہنے والے سے بے اعتنائی بھی نہ برتی، ان ہی دنوں
 اسے جانے کیا سمجھی کہ ایک گھر میں نوکری کر کے مالی پر ہاتھ صاف کرنے کے بجائے وہ مالک کے دو دھڑ پیتے پیتے کچے بھاگ گے
 ، تیرہ بچے کوبے تماشہ جوتی میں پکڑی گئی تھی۔ اسے اور اس کے آدمی کو پورے سات سات مہینے کی قید با مشقت ہو گئی جیل
 سے چھٹ کر وہ دونوں پھر ملے اور پرا سرانگہوں میں چھپ کر دوبارہ کام شروع کر دیا مگر اب کی اس کے ساتھی نے اسے
 اچھی طرح سمجھا دیا کہ ایسی نادانی کی حرکت بھری کی نعمت میں مرنا ہو گا۔ سچا داؤا بند ہے تو ساری زندگی پلہیں کے ہاتھ نہ آؤ۔
 اریج اب اس نے واوا کے مطلب پر سمجھ تو معلوم ہوا کہ یہی میں واوا بدعاش کہتے ہیں اور وہ میں میں کا ہی عرسے ٹکھ واواؤں کے
 ساتھ رہ چکا ہے۔

دو تین دن رہی اس نے مطالعہ کیا آج سے اس کا نام واوا پکارا جائے، اگر کہیں کہنا تو وہ اپنا اور اس کا مہر چھوڑ
 لے گی۔ اس کے چاہنے والے نے بہت سمجھا دیا کہ یہ نام عورتوں کو زیب نہیں دیتا مگر اس نے اپنے عورت ہونے سے ہی انکار

کر دیا۔ ————— یہ نام رکھنے کے بعد اس نے بڑی بھرتی سے گھر تانے شروع کر دیے اور ایک بار نئے صلاخ کے بٹھانے پر سے چوری کر مٹی۔ اس دفعہ اسے چھ مہینے کی جیل مہربانی اور اس کا ساتھی بھی معاف میں چھ مہینے کی قید بھینے پر مجبور ہو گیا۔ آپ کی بار جب جیل سے بچاؤ کے دونوں ملے تو دادا کے ڈھنگ نزلے گئے۔ وہ اس قدر عجیب سی ہو گئی تھی کہ اس کا ساتھی بھی اسے نہ پہچان سکا۔ وہ اب دن و رات لے کر گلیوں میں بھاگتی۔ اس کا عاشق اور اس کے دوسرے چور ساتھی اسے سمجھانے کہ اس طرح گھومنا سب کو کھڑا دے گی۔ لیکن اس کے کان پر جو بھی نہ رہتی۔ یا تو وہ باہر گھومتی یا پھر چرس پی کر بلیک ہارڈ ہیر رستی۔ بہت سمجھانے کے بعد بھی جب وہ باز نہ آئی تو آخر ایک دن اس کا ساتھی بھی اسے چھوڑ گیا۔ اس دن وہ بڑی وینک بھوک پیاسی بڑی ٹکڑا ٹکڑا آسمان تھکتی رہی۔ اسی رات اس نے بڑے دھڑاکے سے ایک مکان کا قالا توڑا اور پھر چھ مہینے کے لئے جیل پہنچ گئی۔

چھ مہینے کے بعد جب وہ باہر نکلی تو سارا دن بھوک پیاسی اس کی پی چپ چاپ بیٹھی رہی جہاں وہ اپنے چاہنے والے کے ساتھ رہتی تھی۔ جب رات ہونے لگی تو وہ ٹھکی ٹھکی سی اٹھ کر اپنے ایک جاننے والے کے گھر لگی جو مدت مہربانی چوری سے نوکر چکا تھا۔ اس کے وہاں مانگ کر کھا نا کھا یا اور پھر چلنے چلانے ڈیوڑھی میں کھڑی مہربانی لائی چپ کر باہر نکل آئی۔

رات کا اندھیرا بھی ایک ہوتا جا رہا تھا لیکن وہ پختہ ٹرک پر لاٹھی بھاتی، جانے کیا سوچتی آہستہ آہستہ چل رہی تھی اور پھر ذرا ہی دیر بعد وہ ٹکے والے گشتی سپاہی کے سامنے کھڑی اسے بول دیکھ رہی تھی جیسے کہ وہی ہو، بھائی آج مجھے خوب چیلنے دو۔ ————— آج میں بہت بیزار ہوں۔ آج مجھے زندگی بہت آداس لگ رہی ہے، مجھے چیلنے دو۔ جیل کی ایک رات اور ایک دن اسی خاموشی میں گزر گیا۔ دوسرے دن جب وہ لوہے کے چٹکے سے بیلیں کی طرح ہار بھاگنے لگی تو اس کے چہرے پر غم و اندوہ کی ایک دھامی پھیل گئی تھی۔ جب اس کی کوٹھڑی کے سامنے سے پہرے دار گذشتی تو وہ اسے پکارنے لگی۔

”اوئے، کوئی بات دات کر، مشین کی طرح چلے جاتی ہے“ پہرے دار اسے گھورتی نگہ چلی جاتی اور دادا بڑے مروانہ وار اسے گالی دے کر ہنستی۔

کیونکہ دادا اس بار کیلی کوٹھڑی میں بند کی گئی تھی اس لئے اسے چرس کی سنت تکلیف تھی۔ اس سے پہلے جب جیل میں آئی تو چرس کی کوئی کمی نہ ہوتی۔ نشہ پرانہ ہونے کی وجہ سے اس کا دماغی توازن ساتھ نہ رہا تھا جسم اس بڑی طرح ٹوٹا کہ وہ دوسرے ہی دن بیمار پڑ گئی۔ جیل کی ڈاکٹر نے اسے دیکھا اور پھر ایسی کرڈی دوا دینی چینی کرڈی کہ اس نے نشی توڑ ڈالی اور کوٹھڑی میں ایسی ایسی اچکی بھاندی کہ ڈاکٹر اسے دیکھتے ہوئے گھبرانے لگی۔ ————— آخر دادا نے ایک دکان کا نام لے دیا اور اسے خوشامدی۔

”کہیں سے چرس مل جائے گی میری جان“

”نہیں؟“ ————— نمبر دار نے رحم کھا کر اسے دو بیڑیاں کھڑا دیں۔

” اگر تم چرس لادو تو میں تم کو دھوپے انعام دوں گی “ دادا نے ان دو روپوں کی لالچ دی جو وہ ملاشیوں کے باوجود صاف بچا لاتی تھی۔

” نا بابا، میں کہیں سے نہیں لاسکتی۔ اگر کسی افسر کو تیرہ چل جانے تو میری معافی کٹ جائے گی۔ مجھے جلدی سے گھر جانا ہے، میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں “ مہاراجہ قیدی عورت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کے بعد دادا نے پھر کچھ چرس کی خدمت کی بلکہ اب وہ چیل کے دوسرے کام کرنے والیوں کو سنانے لگی تھی۔ اور جب ہر طرف سے ”نہیں ملے گی“ جواب ملنا تو دادا کی گالیاں بڑی خوفناک ہو جاتیں۔

ایک بیٹے بعد آج دادا عدالت میں اپنے مقدمے کا فیصلہ سننے گئی تھی۔ وہ بڑی خاموشی سے عدالت کی ساری کارروائی سنتی رہی لیکن جب اسے عہد کا فیصلہ سنایا گیا تو وہ تھک دیاں، بجا بجا کر چپنے لگی۔

” ہمیں نہیں چاہیے چودہ سال کی سزا، اگر ہم اس کے بعد بھی جتنے رہے تو کیا جج صاحب ہمیں اپنے گھر ڈال دیں گے “ سپاہی مورخیں اسے کھینچ کر لے جانے لگیں تو وہ نعرہ زور سے گالیاں سننے لگی۔

” اور حرام فرمائے، اوکٹے، بس چودہ سال کی قید دیتا ہے “ سپاہی مورخوں نے اسے کھینچ کر گاڑی میں بٹھا دیا۔ لیکن وہ راستے بھر گالیاں کہتی رہی۔

جب وہ جیل پہنچی تو اُدھاری گزرجکا تھا۔ اب اسے جیل کے کپڑے اور کپڑے کر بارک نمبر دو میں چھوڑ دیا گیا جس وقت وہ بارک میں داخل ہوئی تو ساری قیدی عورتیں شقت کرنے لگی ہوئی تھیں۔ ان کے سیاہ کپڑوں میں پٹے ہوئے بستراور المیز کے بڑے بڑے کٹڑے لائن سے رکھے ہوئے تھے۔ دادا نے کپڑے تبدیل کر کے بارک میں تیزی سے ٹھکانا شروع کر دیا وہ اب بھی زیر لب گالیاں کہ رہی تھی۔ اور چرس کی شدت سے گھٹا ہوا چہرہ اس وقت بڑا ہی مکروہ لگ رہا تھا۔ وہ وہ بڑیک اسی طرح ہنستی رہی اور جب شقتی واپس آکر کھانے کے سلسلے میں دھما چو کڑی چانے لگیں تو وہ غصے میں جیسے پھنکانے لگی۔

” اے حرام زادو چو پٹ نہ ہو، ورنہ ایک سون کر کے چودہ سال اور بڑھالوں گی “

” بڑی آئی لاٹ صاحب کی بچی؟ “ ایک عورت نے تڑائی سے جواب دیا۔ دادا نے آستینیں چڑھا لیں اور دوسری عورتوں نے بڑی شکل سے بیچ بچاؤ کیا۔ اس کے بعد بھی سونے سونے دادا کی کئی عورتوں سے ٹھٹھی۔ رات بھر یہ ہوتا رہا اور دادا اپنے بستر پر بڑی بے چینی سے گروٹھیں بدلائی۔

صبح جب ناشتے میں ٹھنڈے چنے بٹنے لگے تو مناش ناش لائن میں رسبے لگے کھڑی تھی۔

” ہمیں اور دو ہاتھ چنوں میں تو پیرٹ کی ایک کور بھی نہ بھرے گی “ چنے بانٹنے والی نے شاید اس کے لیے ٹھٹھکے جسم پر دم کھا کر غور پڑے چنے اور دے دئے۔

” ہمیں بھی دو ہاروا رہیں “ دادا کے پیچھے والی عورت بڑی اتھا سے منمنائی۔

” حرام زادو روپوں کو عدیش سو جھٹا تھا تو اپنے گھر بٹھتیں جیں سے “ چنے بانٹنے والی نے اپنی بانٹنی اٹھائی۔

” گالیاں دیں نا کسی کو بھی تو سمر توڑ دو گی “ دادا نے غصے سے کہا اور پھر جنوں کی بانٹنی کی طرف جھپٹی۔ چنے تو خیر وہ

گر یہ مفت میں پینے والی دادا سب عورتوں کے لئے تو لذت تھی ہی مگر شراب کے لئے آسمانی بلا سے کم نہ تھی جب دوسری عورتوں نے لذات کے لئے ان کے عزائم آتے اور چری چھڑے روپے لئے جانے تو شرابی بڑی بلے بسی سے پوچھتی۔

”دادا تیرا کوئی نہیں ہے، کوئی یا دوست بھی نہیں تیرا۔“

”تو جہے۔ بلائے گی نا“ دادا اس کے پیٹے کی طرف ہاتھ بڑھاتی اور وہ بدک کر الگ کھڑی ہو جاتی۔

صفت کی چرس کے علاوہ دادا عورتوں کی ان کھانے پینے کی چیزوں میں بھی زبردستی حصہ لٹا تو ان کے عزیز ملاقات کے وقت سے جا بجا کرتے۔ اس سلسلے میں خوب لڑائی ہوتی جب دادا کو یوں لڑا جھکڑا کہ چیز نہ ملتی تو وہ رافوں کو بڑی ہوشیاری سے عورتوں کی گتھریاں کھول کر ان کی چیز پر چڑھتی اور پھر ان عورتوں کو بھی چپکے چپکے ہاتھیں جن کے پاس کوئی آسنے والا نہ تھا۔

کھانے کی چیزوں کو غائب دیکھ کر عورتیں سیدہ کوٹ کوٹ کر دیتیں اور دادا سے لڑتیں، اس کی شکایتیں کرتیں مگر کیا حال جو دادا کے کان پر جوں ہی رینگ جاتے۔ کبھی بارے مارنے اور تیرا دھشت لینے کی سزا میں دی جا چکی تھیں۔ اتنا کھانے اور اودھم کرنے کے باوجود جب جیل کی ڈاکٹر عورتوں کو دیکھنے آتی تو دادا بڑی مکاری سے لیٹ کر کہنے لگتی۔

”بہت کمزوری ہو گئی ہے ڈاکٹر فی صاحب، روٹی کی ایک کوری بھی نہیں کھا لی جاتی، دو دوہ بندھوا دیجئے۔“ عورتیں فوراً

دادا کی کاٹ کرتیں۔

”ڈاکٹر فی صاحب یہ تو دوسروں کا بھی چکر لکھا جاتی ہے، کیا مجال تو روٹی کی ایک کوری بھی بچے اس سے۔“ ڈاکٹر مسکراتی اور دادا

کو دیکھے بغیر یہی جلی جاتی۔ دوسری بے حد کمزور عورتوں کا بھی کبھی دو دوہ بندھوا دیا جاتا۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد دادا اشکاباٹ کرنے والی عورتوں کو بکری سڑی لگایاں دیتی۔ پھر ایک ڈاکٹر سے ہنستے ہوئے دادا کے لئے ایک ہفتے کا دو دوہ بندھوا دیا۔ اس دن اس عورتوں کو بڑی ناخوشانہ نظروں سے دیکھا۔

”اور کر شکایتیں، ہم تو آرام سے دو دوہ نہیں گے“ وہ عورتوں کو جلانے کے لئے خوب زور زور سے ہنسی۔

ویسے تو دادا کی عام طور سے یہی حالت رہتی کہ اس سے لڑا، اس سے جھکڑا، کسی کی کوئی چیز چرائی تو کسی کے جھوٹے ٹپڑ کر

مار بیٹ شروع کر دی۔ لیکن کسی کی دق وہ بالکل چپ ہو بیٹھی وہ بھی اس طرح کہ اگر کوئی اسے ایک گالی دے جائے تو ان کے کہے کبھی کبھار ہنس چھپا کر چپکے چپکے روتی تھی اور پھر آسنہ پونچھ کر شراب کو دھکیلا دے کہ دھیر سی چرس ہوتی۔

دن گزرتے جا رہے تھے، دادا کی باوک سے کئی عورتیں رہا ہوئیں، کئی داخل ہوئیں۔ مگر اب شراب کے علاوہ کئی پڑائی بھی

عورتیں اس سے مانوس ہوتی جا رہی تھیں۔ دراصل دادا ان سے کھانے پینے کے سلسلے میں تو لڑتی لیکن اگر جیل کی طرف سے عورتوں کو سختی کے

طور پر کوئی سزا دی جاتی تو وہ ان کی حمایت کرتی۔ یہاں تک کہ ایک بار سپرنٹنڈنٹ سے اس بات پر لڑا بیٹھی کہ اس نے ایک عورت کو

گستاخی کرنے کے سلسلے میں چار دن کے لئے گتھری کی قید دے دی تھی۔ اور سب عورتوں کے سامنے اس کی اچھی طرح مروت کرانی تھی جتنا

کرنے کے سلسلے میں دادا کے دس بید لگاتے گئے اور کچھ عرصے کے لئے جیل کی ساری رعایتیں چھین لی گئیں۔ عورتیں اب اس

ایسا دیکھ کر بھی کہنے لگی تھیں اور رافوں کو جب وہ اپنے گھروں اور بچوں کی یاد میں ملک ملک کر عورتیں تو دادا بڑی شفقت سے لگایاں دے

دے انھیں چپ کرانی، ان کے آسنہ پونچھتی اور خود بھی رنجیدہ ہو کر چپ بیٹھ جاتی۔

اتج شام واداکو بارکیں ایک بڑی کس دھان پانی سی عورت لائی گئی جس کی گود میں شکل سے دیکھنے کا پھر ہو گا عورت اتنے ہی زمین پر پڑی گئی اور بچے کے منہ میں دو دھڑے کرنا زاراروئے لگی۔ عورتیں اس کے گرد جمع ہو گئیں اور اس سے پوچھنے لگیں کہ وہ یہاں کیوں آئی ہے اس کے سر کوں سا جوڑا ہے۔ عورت نے دیر تک کسی بات کا جواب نہ دیا جس سے مل گئی۔ یہاں تک کہ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ عورتیں اسے پانی پلانے اور چپ کرانے میں لگی ہوئی تھیں۔ بس ایک وادانہ جو بالکل الگ تھا گھٹی اُسے گھور رہی تھی۔ بچے والی عورت جب روتے روتے تھک کر چپ ہو گئی تو وادانہ اس کے قریب سرک آئی۔

”واہ بڑا جوڑم کر کے دوتی جو، ایسا ہی چڑیا جیسا ولی تھا تو اپنے گھر بیٹھیں ٹھکانے سے“

”ہیں نے کون سا جوڑم کیا ہے“ عورت پھر بھڑک کر مٹنے لگی۔ ”میرے سر زبردستی جوڑم لگا ہا ہے“

”زبردستی کیسے؟“ وادانہ ذرا اشتیاق سے پوچھا۔

”میرا میں شادی کے ایک سال بعد دوسری عورت کر لایا۔ بچے والی عورت اپنا قصہ سناتے لگی۔ میں بہت مدتی دھولی مگر پھر صبر کر لیا کہ اپنے بچے کو باپ سے محروم نہ کروں مگر میں نوکرانوں کی طرح رہنے لگی۔ اس پر بھی میرے میاں کو صبر نہ آیا روز کرتا کہ میرا اور اپنی سوت کا بستر خود لگا باکو۔ علیحدہ پر پتھر رکھ کر یہ کام بھی کر دیتی۔“ عورت آہ بھر کر آسرو پوچھنے لگی۔ ”اس کے بعد بھی سوت کی آنکھوں میں کھٹکتی رہی اور ایک دن وہ بیٹ کر چھپنے لگی کہ مجھے زہر دیا گیا ہے۔ سارا عجب ہو گیا ڈاکٹر کو بلا کر دکھا یا تو معلوم ہوا کہ زرا زیادہ آئینوں کھائی ہے۔ اس کے بعد پولیس آگئی اور سوت نے پولیس کو بیان دیا کہ میں نے اسے زہر دیا ہے۔ گھر کی اور میری تلاش ہی لگتی تو آئینوں میرے دوپٹے کے پولیس بندھی ملی۔ مجھے یہ بھی نہ چلا کہ میری سوت نے پولیس کو باندھ دی تھی۔ پولیس مجھے حالات لے گئی اور پھر وہاں سے جیل لے آئی۔ ایک بیٹھے سے دوسری بارک میں پڑی۔ میرا باپ مقدمہ معیت رہا تھا مگر جانے کیسے ہار گیا اور اتج میں عدالت سے سزا سنکر آ رہی ہوں۔ چھ مہینے کی سزا دی تھی پراس پانچے کی وجہ سے آدھی معاف ہو گئی۔ شریف عورت ہوں اب باہر نکل کر کیا منہ دکھاؤں گی میرے آبا کی عزت خاک میں مل گئی۔“ عورت پھر ہلک ہلک کر رونے لگی۔

”ہوں! اگر گدگدایا تو اپنے ضم کے گھر نوکروں کی طرح کیوں رہی، ایک ہی دن میں گھر سے باہر نکل کر دوسرا یا کر گیتی تو اتج یہ حالت ہوتی تیری۔“ وادانہ جوش سے کہنا۔ اور پھر سونے ہونے بچے کی ٹانگ بچھ کر بکلا دی۔ ”بے چارے آدھی ہے اس کتے کے پتے کو، وہیں بھینک آئی منہ پر کالے پال۔“ لاڈ لہجے میں لے لے کر گویں۔ ”وادانے بڑی سخت سے بچے کو گویں لے لیا۔“ ادا لے تو یہی۔ ”اس نے آدھی جلی سگرٹ اس کی طرف بڑھادی۔

”میں ہمیں بیٹی اور دیکھو میرے بچے کو تم اب کچھ نہ کہنا، میں اسی کی خاطر زندہ ہوں ورنہ کہتے سے کہو کہ جان سے دیتی۔“

”میرا بچہ بڑی آئی بچے والی لے لے“ وادانے بچے کو چہرے کی طرح اٹھا کر ماں کی گویں دھروا اور پھر ویرانک چپکے چپکے گالیاں کھتی رہی۔

اس رات وادانہ کوٹ بدل بدل کر بچے کو کھینچ کر اور جانے کیا بڑبڑاتی رہی۔ ورنہ اس کا تہ بہ حال تھا کہ ساری رات کب کی کی جوں کے کٹنے کی ہر دھڑکنے بغیر ٹھٹھاٹ سے فرختے بیٹھتی رہتی۔

فاؤانے اچانک پھر دہری روپ بدل لیا غصہ ہی وہ ابھی ابھی جیل میں آئی ہے جب وہ کچھ دیر کیسے لڑی بڑی ہے۔
 ہر ایک کو دکھ ہے وہی ہے اور سڑی سڑی گلابی ناک دہری ہے۔ نیچے والی خورست سے تو اسے جیسے دھڑکی ہو گئی تھی۔ ذہن دھندلا
 اس کے نیچے کو گروں میں لٹی، اور پھر ذرا دہری ویرانہ سے ماں کی گروں میں بیٹھ رہی۔

”میرا بچہ، بڑی اکیلی بچہ دالی“
 دادا بڑ بڑائی اور عورت اسے حیرانی سے دیکھ کر اپنے سینے سے لگا لینی اور پھر
 ایسے ڈکھ سے دھنی کہ ساری حوریں دادا کو برا بھلا کہنے لگیں۔ رات جب بچہ سوئے سوئے جاگ کر روتا تو دادا خواہ مخواہ بچہ نہ لگتی۔
 ”جب کہ اس کو کتے کے پتے، لے کے لگتی، منبد کے لئے توں گئے۔“

” دیکھ واداً تو خواہ مخواہ لڑتی ہے، بچے کس کے نہیں روتے ” کوئی عورت واداً کو سمجھانا چاہتی ۔

”روئس مگر ہماری نیند کیوں خراب کریں، ذرا لاٹو اپنے بچے کی آواز داب کر رکھے نا“

”نغمہ آواز نہ داب دوں“ بچے کی ماں غصے سے کانپ کر جواب دیتی اور پھر بڑی بے بسی سے رونے لگتی۔

”ہائے میری آمان!“ — دادا جب تھوڑا جانی گراں اس کا فون کی ٹینڈیں حرام ہو چکی تھیں جبکہ سادی عورتیں مرے سے سوئی ہوئیں تو دادا کو دھس دلی بدل کر صبح کر دیتی۔

ایک دن بچے کو دکھا سنا جہاں ہو گیا۔ ماں نے دو دو کر بحال کر لیا اور دادا نے بڑی شفقت اور مغفرت سے بچے کو اپنی گود میں لے لیا۔ ڈاکٹر دیکھنے آئی تو اس نے پہلا حکم یہ دیا کہ بچہ سال کی گود میں دیا جائے اور وہی اس کا حال بنائے۔ دادا نے بچے کو دے دیا مگر اس کے تہہ زگر کرنے لگے۔ ماں دو دو کر بچے کا حال بنانے لگی۔

”ڈاکٹر کی صاحبزادی بہت بیمار ہے، رات بھر جوش نہیں رہا، کچھ نہیں کھدی میرے لال نے، انگ کی طرح پٹنڈا پھینک رہا ہے“

”کوئی بیمار و غار نہیں ڈاکٹر کی صاحب“ — ”آؤ افسر سے بولنے لگی — ”ساری رات گلا پھاڑ پھاڑ کر رو رہا ہے، کہتے ہیں کہ، کچھ نہیں کھولی“ — ”ڈاکٹر دادا کو چپ رہنے کا اشارہ کر کے بچے کو فور سے دھینچنے لگی پھر ستر لگا کر فوراً اپنے سامنے بچے کو دوایا لگوائی۔“

آج کے والی عورت کا باپ اس سے لے آیا تو بچے کے لئے چھوٹے چھوٹے کھلونے اور نئی قمیصیں دے گیا تھا اس لئے کہ

”میرے آباکتھ تھے کہ فوراً اس آدمی سے طلاق لے لیں گے اور پھر میرے چچا زاد بھائی سے شادی کریں گے میری۔“

”اچھا تو تیرا یاد بھی ہے۔“ دادا اور دوستی بیچ میں بول اٹھی۔ اسے یہ یاد ہی داری چاروں کی ہوتی ہے زیادہ باتیں نہ بننا۔“

”نزد دسے یاری، امیر! بچہ تو ہے اس کے سہاے زندگی گزار دینی۔ تو کیوں بولتی ہے میرے بیچ میں۔“ عورت بد مزہ سی ہو کر

چپ ہو گئی۔

کل صبح نیچے والی عورت رک رہا ہونے کا دن تھا۔ آج دادا نیچے کو زبردستی گورہیں لینے کے سلسلے میں کتنی ہی بار اس اور جی تھی۔ لیکن عورت نے ایک بار بھی دادا کو ہاتھ نہ لگانے دیا اور نہ اس کی لڑائی کا جواب دیا۔ آج وہ بہت خوش تھی۔ مالے خوشی کے رات اسے نیند نہ آرہی تھی۔ وہ لوریاں گا گا کر اپنے نیچے کو پیاد کر رہی تھی اور دادا کے چہرے پر جیسے ساری دنیا کی لعنت برس رہی تھی۔

”چپ ہو کر سو جائنت پڑی“ دادا بار بار چپٹی ٹکڑی عورت دادا کی پردا کئے بغیر اسی رات سے پتلے نہ سوئی۔ جب عورت گری نیند سوئی۔ بارک میں سنا اچھا گیا تو دادا اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ چوروں جی آنکھوں سے اپنے ارد گرد دیکھ رہی تھی۔ بہت بلندی پر لگا ہوا دم سا بجلی کا تختہ جیسے دادا کو گھور رہا تھا۔ — بارک نمبر ایک بارک نمبر دو — سب اچھے — سب اچھے — باہر ہیرے والیوں کی آوازیں ایک دوسرے کو جواب دے رہی تھیں۔ دادا آہستہ سے نیچے والی عورت کے بستر کے قریب رہینگ گئی۔

صبح تڑکے جب دادا کے اوپر سے کبلی سر کا باگیا تو بارک میں کمر لہج گیا جی کی اس فریح ہو گئیں اور نیچے کی ماں سینہ پیٹ پیٹ کر بچ رہی تھی۔ اپنے منہ پر پتھر مار رہی تھی اور کھٹے قد سے بار بار زمین پر گر رہی تھی۔ دادا کے گلے میں اس کی ٹھیک کس کر بندھی ہوئی تھی اور اس کے ننگے سینے پر بیٹے جوئے نیچے کھنہ میں اس کی خشک چھپاتی تھی۔ دادا اور نیچے دونوں کی آنکھیں حلقوں سے آبل جڑی تھیں اور دونوں کے جسم سرور ہو کر اکڑ چکے تھے۔

کالی تشری

کالی تتری چسپی وِچ بولے
تے اڈدی نوں بانج یے گیا

بلونت سنگھ

بڑے مزے میں مولانا نے ہمیں نیا کواڑ اس کے اُپر سلٹتے ہوئے اُچھے سے دو ٹکڑے جما دیے اور پھر مارے
سہری کے دانت لٹکتا تاخیر اپنا پانی پڑا دینا ناگوں پر دھستے والی مکن چڑھایا۔
روٹی کھانے کے بعد اسے غصے کی سخت طلب ہوئی تھی۔ چنانچہ اس نے آٹھ کھیں منہ نہ کر دیا اور کس ہی لئے ہونگے
کہ وہ دوازے پر دستک کے، از مشنای دی۔ یہ دستک اتنی ہی ناگوار گزری۔ اس نے کھت اجوبہ میں پوچھا :-

”کون ہے؟“

جواب میں پھر کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دی۔

[illegible]

نوٹ :- اس کہانی کا پس منظر وہ سنہرا سالم پنجاب ہے جس میں ہندو، مسلمان اور سکھ ڈاکو مل جل کر اپنے بھائی بندوں کے مکانات میں نقب لگا پا کر تے تھے۔

دردا زہ کھولا تو دیکھا کہ باہر تار کی بیلی میں میلنے قد کا ایک کھڑے بیگڑی اس کے سر پر موٹے رستے کی طرح بیٹھ ہوئی تھی۔ اور اس کے ایک سرے سے اس نے اپنے چہرے کا، آنکھوں کے سوا، پچھلا حصہ چھپا رکھا تھا۔ اس کا رنگ سیاہی مائل گندمی تھا۔ بھنویں موٹی گھٹی اور لمبی تھیں۔ آنکھیں تیز اور مقبض۔ اس کی ناک کی جڑ کے قریب آنکھوں کے نیچے باریک اور گہری لکیروں کا جال سا بننا ہوا تھا۔۔۔۔۔

موللا بدکلامی کرنے کرتے دمک گیا۔ اس نے بھاری اور خشک ہنسنے میں پوچھا :-
”غم کون ہو؟“

اجنبی نے غم بھرا اس کی طرف جھپٹی ہوئی نظروں سے دیکھا اور بچہ عطف سے بولا :-
”میں بھنبوڑی گاؤں سے آ رہا ہوں“

”بھنبوڑی؟ وہ تو یہاں سے بیس کو س کی دوری پر ہے لیکن غم کیوں بات کرتے ہو جیسے پڑوس کے گاؤں سے آ رہے ہو۔۔۔۔۔“

اجنبی نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

”میں ڈاچی پر آیا ہوں“

موللا کو اس کے بولنے کا ڈھنگ پسند نہیں آیا۔ اس نے بے پرواہی سے کہا ”خیر مجھے اس سے کیا غرض؟ سوالی تو یہ ہے کہ غم میرے پاس کیوں آئے ہو؟“

”مجھے لگا سنگھڑ بھنبوڑی والے نے بھیجا ہے“

یہ سنکر موللا چونکا ہوا گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر نواد کا بازو تھام لیا اور جلدی سے وحشی آواز میں بولا۔
”..... تو یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو۔ اندر چلے آؤ نا؟“

اجنبی بیک جست اندر آگیا وہ بڑا مضبوط شخص دکھائی دیتا تھا۔ اس نے بدن پر موٹا کھیس لپیٹ رکھا تھا۔ موللا نے ڈیوڑھی میں سے جھانک کر اندر کی جانب دیکھا اور اس امر کا اطمینان کر لیا کہ اس کی بہن اور ماں سب سے پیچھے والے کمرے میں محافوں میں گھسی بیٹی ہیں تو اس نے صحن والا دروازہ بند کر لیا۔ اور اجنبی سے مخاطب ہو کر بولا۔

”میں نے دروازہ بند کر دیا ہے تاکہ ہماری باتوں کی آواز بہن اندر تک نہ پہنچیں“

اجنبی کچھ نہیں بولا۔ موللا نے تیزی سے باہر والے دروازے میں سے جھانک کر ادھر ادھر گاہ دوڑائی۔ پھکی چاندنی میں دور جو ہڑکا پانی پچھلے ہوئے سیسے کی ٹپکلی کے مانند دکھائی دے رہا تھا۔ ہوا سا کھنسی۔ پیر اور معدور دور نہ کھینچ ہوئی کچھا ڈیاں بے حس و حرکت کھڑی تھیں۔ یہ دیکھ کر موللا نے اپنے دانوں میں اٹکی ہوئی حقے کیے کو ہنٹوں میں بوجھ کر بڑے اطمینان سے گڑگڑکی صدا بلند کی اور پھر دروازہ بند کر کے لوٹا نواد و ڈیوڑھی کے اندر بیٹھ ہوئی کھڑکی سے شیک لگائے کھڑا تھا۔

”جو کہ لگی ہو تو تیار کھانے والے کا کچھ بندوبست کروں“
 ”نہیں میں کھانا کھا کر آیا ہوں۔ قریب کے گاؤں سے..... بس اب کلام ہو جانا چاہیے؟“
 ”کیوں! فی جلدی بھی کیلئے؟“
 ”مجھے پھورن ٹوٹنا ہو گا“
 ”کیوں؟“
 ”مجھے نے ہی کہا تھا۔ میرا بہاں رہنا مناسب نہیں کسی نے دیکھ لیا تو سب ہو گا۔ کھاؤ کھاؤ“
 ”ڈاچی کہاں ہے؟“
 ”ڈاچی ساتھ دوائے گاؤں میں اپنے ایک دوست کے ہاں چھوڑ آیا ہوں“
 ”اور بند دکھ؟ (بندوق)“
 ”بند دکھ میرے پاس ہے“
 ”مولا کو تعجب ہوا کہ فی بڑی بندوق اس نے کہاں چھپا رکھی ہے۔
 اس پر ابھی نے قدرے جھجکا کر کہیں کے نیچے سے دو نالی بندوق دکھائی جس کی دونوں نالیاں الگ کر کے اس نے
 بٹ BUTT سمیت اگلے میں پریٹ رکھی تھیں اور پھر ای پر ایک دسی کس کر باندھ دی تھی۔
 اب مولا سمجھا۔ سر ہلا کر بولا:-
 ”اچھا توڑ کر باندھ رکھی ہے“
 ”ہاں ویسے چھپ تو نہیں سکتی تھی“
 ”ٹھیک“
 ”اب جلدی کرو“
 ”اور کارٹوس؟“
 ”اجنبی کے ماتھے پر پل پڑ گئے۔ گڑا کر کہنے لگا۔
 ”دیکھ میں بلا لگئی تیار ہو کر آیا ہوں..... بس اب مجھے نوکے پرے چلو“
 ”اچھی بات“ یہ کہہ کر مولا نے حقے کے دو تین خوب گھرے گھرے کش لئے پھر دھتے کو بدن پر خوب اچھی طرح پیشا
 اور کھرا کر بولا۔
 ”استو قعیں میرے گھر کا پتہ کیسے چلا؟ کسی سے پوچھا تھا؟“
 ”میں ایسا کیا نہیں ہوں کہ کسی سے تمہارے گھر کا پتہ پوچھنا پھرؤں۔ اس طرح تو تم پر شبہ کیا جا سکتا تھا۔ مجھے نے
 مکان کا ٹیک میٹک پتہ اور تمہارا تعلیم بتا دیا تھا۔ اور کہا تھا کہ وہ تمہاری راہ دیکھتا ہو گا“
 ”ہاں ہاں کیوں نہیں“ مولا ہنس کر بولا ”بگڑا اس کلام کو کسی مامولی آدمی کے سپرد نہیں کر سکتا تھا۔ اچھا تو لو“

چلا۔ اُمی و دین اور آدمیوں کو بھی بلاتا ہے۔
”بلاتو..... ہمیں ان لوگوں کی شکل نہیں دکھاؤ گا“
”ہے شک بے شک ضرورت بھی کیا ہے
یہ کہہ کر مولیٰ چٹنے لگا تو اجلی بولا، سچا بیٹے جاو!“

”کیوں؟“
”جس کا گردن تیرے چلوے سک نہیں ہوگا دیکھنے والوں کو۔“
”یہ تو واضح کہنی بات کہی مرنے۔“

مولانا نے مختصر اُٹھانے والوں میں دباؤ اور حلیم سے بندھن ہوئی تھی جھلانا اور رہنمائی دلاؤ اور دُعا سے باہر نکل گیا۔
 اعلیٰ نے اس کے نصحت بہتے ہی دروازہ اندر سے بند کر لیا اور کدوں کا بنا ہوا بالشت بھرا اونچا منڈا لگ بیٹ کر
 مسئلے بڑے آپلوں سے بھری ہوئی ٹی وی کی انجیسی دو فوٹو رائٹوں کے درمیان دھکر کڑ بیٹھ گیا۔
 مولانا کچھ دیکھ کر حیرت لکھائی ہوئی سنسان اور رنگ گلیڈ میں سے گزرتا ہوا بالآخر ایک بوسیدہ کچے مکان کے آگے
 کھڑا ہو کر آواز ہی بیٹھے لگا: ”سدا گرا، اوئے سدا گرا!“
 کوئی جواب نہ ملنے پر اس نے پھر ٹانگ لگائی۔
 ”اوئے سدا گرا! سدا گرا ہے!“

پھر وہ اعلیٰ ناس سے تھک کر گر پڑا۔ دماغ میں جو طراوت پہنچی نہ ہو! اجنبی کو دعائیں دینے لگا جس نے کھٹکے اس کے
تہہ بھرا دماغ۔

مکان کا دورہ نہ کھنڈ اندر سے گئے اور کالے بالوں والا ایک نوجوان باہر نکلا اس نے پہلے تو مولیٰ کی جانب خراباک
 لکھوں سے دیکھی لیکن جب پہچانا تو کسی کی نگلیں پوسے طور سے کھل گئیں۔
 مولانا نے دندہ دواختوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا 'وہاں میں نے دے کر میرا تو قلعہ بھی بیٹھ گیا کہاں گھسا پڑا خالوں
 کے موڑے۔'

اس پرووزیشن غلط تھے۔

سدا گرنے پوچھا "ماں بے تیا"

جواب میں تو لالچ چل چل کر گیا اندازہ۔ پھر اس نے نثرات اور پُرعین اعدائے ابوالہ کا ایک ایک طرح سے ماری جیسے طعنے لگنے کر مارے۔ یا ہر۔

سداگر سمجھ گیا۔

” چیلو ” مورائے کہا۔

”مختصرہ میں اوڑھنے کے لئے ترکچہ لے آؤں اذیت ہے“

وہ بھاگ بھاگ اُندر گیا اور کھلے دنگ کی ایک لوتی بدن پر بیٹھنا ہوا اور اُس آگیا۔
 دونوں دہاں سے آگے بڑھ گئے۔ گاؤں پر پہونچا عالم طاری تھا۔ کہیں کہیں کوئی کھلی ماری کتیا دانت دکھاتی ہوئی مکان کے ایک تختے سے نکل کر دوسرے تختے تک دباک جاتی۔ یا گارے کے بنے ہوئے مکانوں کی دیواروں سے چھپو درہن جاتی چھپاتی پھرتی تھیں۔

دبے دبے لیے ہیں باتیں کرنے ہوئے وہ دونوں بڑھتے چلتے گئے۔ انھوں نے بیلاننگہ کو اس کے مکان سے اور لہجو کو پٹنہوں کے طریقے سے بلا کر اپنے ہمراہ لیا اور دہاں مولا کے مکان پر پہونچ گئے۔
 اندر سے اجنبی نے دروازہ کھولا۔ اس کا چہرہ اب گڑی کے شعلے میں چھپا ہوا تھا۔ سداگن لہجو اور سدا سنگھ ابھی فوج ان تھے ان کاموں میں نئے نئے داخل ہوئے تھے۔ اجنبی کا نقاب کے نیچے چھپا ہوا چہرہ اور جتن کے مانند گھنی پھونکے تھے اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر ان کے فوجی جسموں میں ہنسی کی لہریں دوڑ گئیں۔
 اجنبی نے جلدی سے ان کی سورتوں کا جائزہ لیا۔ پھر اس نے کہیں ہیں سے ہاتھ نکال کر اشارہ کیا کہ اب واپس بات کی ہے۔

اس کا ہاتھ لہجے کا لٹا تھا اس پر موٹے مرٹے بال آگے ہوئے تھے۔

مولانے جواب دیا :-

” واپس بھی بات کی نہیں “

” تو اب چلیں “

” ضرور “

مولانے آگے قدم بڑھا دیا اور باقی سب اس کے پیچھے پیچھے ہو گئے۔ اجنبی کے قدم بڑی پھرتی سے اٹھ رہے تھے اور اس کی پٹلیاں دم پھر کو لمبی ایک جگہ نہیں نہکتی تھیں۔ تسبیح کے دائروں کی طرح کھٹا کھٹ گھومتی تھیں۔

دوسرے کبھی کبھار پیرسے دار کے دفعۃً چلا آئے کی آواز بارسائی دے جاتی جیسے وہ کوئی خوفناک خواب دیکھ کر ہڑبڑا اٹھا ہو۔ اس آواز اور اپنے درمیان کافی فاصلہ رکھتے ہوئے وہ بڑی تیزی سے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔

گاؤں سے نکل کر تقریباً پانچ میل کی فوری پر واقع پیراں دات مہٹ پر پہونچ کر وہ روک گئے۔ مولا کے اشارے پر سدا اگر سدا مہٹ کے قریب والے ہاتھ میں گھس کر ایک مرلے بیل کو باہر نکالا اور پھر وہ اسے ہانکتے ہوئے زرا پیرسے گئے اور گاؤں کے ایک بڑے سونو خور کے کھیت میں اسے چھوڑ دیا۔ اور وہ خود بیل کے پیڑ کی چھدری چھپاؤں سے جا کھڑے ہوئے۔

پورا جائزہ سدا مہٹ پر چیک کر لیا تھا۔

اجنبی کھٹے پھرتی سے اپنی نعل میں سے بندوق کا اجر بھر نکالا۔ نالبریں کو بٹ سے کرک لیا اور نیچے کی جانب چوڑی کھچی جمائی اور مٹھیلی کی ایک ہی ضرب سے اسے اپنی جگہ پر بٹھا دیا۔

پھر اس نے دونوں نالیوں میں ٹھوس گولیاں BULLETS والے کارٹریج بھرے۔ اور ایک نظر مل بیل کی جانب دیکھا جو سردوہا میں کان پھڑپھڑاتا اور پتلی اور کمزور دم کو نقاہت سے ہلاتا تھا اس پر مٹہ مار رہا تھا۔ پھر اس نے شست باندھ کر لیٹی وہائی۔ گولی کھانے ہی بیل بغیر کسی جدوجہد کے زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ یہ گولی تو شیر کو ٹھنڈا کر دینے کے لئے کافی تھی لیکن اجنبی نے احتیاط کے طور پر دوسری گولی بھی اس کی گردن پر چکاد دی۔

بیل کا کام تمام ہوتے ہی اجنبی نے اپنی اور لمبی تیزی سے چمکتی ہوئی آنکھوں سے مولا اور اس کے ساتھیوں کی جانب دیکھا پھر بھاری آواز میں بولا۔

” اچھا اب مجھے چلنا چاہیئے۔ جس سے پہلے واپس پہنچنا ضروری ہے “
 مولا نے ہاتھ بڑھا کر کہا ” اچھی بات “
 اجنبی نے چاروں سے ہاتھ ملاتے ہوئے ایک بار پھر بھاری آواز میں کہا :-
 ” سب سلامت ! “
 ” سب سلامت “

اجنبی نے پھر اپنی بندوق کو ڈوڑتا کر اس پر کپڑا لپیٹ دیا۔ اور پھرتی سے قدم اٹھاتا ہوا قاعدے پھسکی چاندنی میں غائب ہو گیا۔

وہ چاروں کچھ دیر تک اسے جلتے ہوئے دیکھتے رہے۔ پھر وہ بیل کی جانب بڑھے اور دیکھا کہ وہ قطعاً مرج چکا ہے۔

اب وہ جلد جلد گاؤں کی جانب بڑھے اور گاؤں کے قریب پہنچ کر انھوں نے دفعۃً پکڑ پکڑو، کاشور پکڑ پکڑو، لوگوں کو ڈوڑاؤں کا ڈر لگا رہتا تھا چنانچہ بہت بڑی تعداد میں لوگ گھروں سے باہر نکل آئے تب انھیں پتہ چلا کہ بھارے مولا کا بیل گولی سے مار دیا گیا ہے۔

مولا دیر تک گولی مارنے والے کی ماں اور بہنوں سے اپنا رشتہ گمانٹھنا رہا اور جب اس کا کلا بیٹھ گیا تو سوجھ بکھننے سے پہلے پہلے وہ چہرہ کس پر سے تھانے میں اس امر کی رپٹ درج کروا کر گاؤں لوٹ آیا۔

(۲)

” پیراٹھٹہ “ گاؤں چھوٹا تھا لیکن یہاں کا سب سے امیر گھرانہ ” ماہنہ “ دور دور تک مشہور تھا۔ اور گرد و پستہ میں ان کی اسمائیاں موجود تھیں۔ اب ماہنوں کا وہ بے کچھ کم ہو گیا تھا۔ کیونکہ پیر کے بیٹے اور اراد گرد کے دیگہ گاؤں کے بدعاشوں نے مل جل کر خواہ مخواہ مقدمہ بازی میں پھنسا کر انھیں کھوکھلا بنا دیا تھا۔ اور ادھر ان کے لئے مولا نے ایک نئی مصیبت کھڑی کر دی تھی۔

سردیوں کا سردی کچھ زیادہ بلند نہیں ہونے پایا تھا کہ علاقے کے قتلانے سے ایک لمبا نڈنگا مسلمان تھانیدار

گھوڑے پر بیٹھا اور دو سائیکل سوار سپاہی ساتھ لے کر پیر کے ٹھٹھے میں آکر بیٹھا۔ گاؤں کے باہر ایک بڑے اور بزرگ پیل کے پیر تلے بیٹھ کر تھا نیدار گھوڑے پر سے اتر کر نہرے کلاہ پر چڑھ گئی۔ اس کی خالی رنگ کی کلفت کلی گڑھی کے لئے نہ ہونے شملے دور ہی سے دکھائی دینے لگے۔ چنانچہ گاؤں بھر کے چاندوں، بھنگیوں اور کسانوں کے بچے اور کتے گاؤں میں گھستے ہی اس کے پیچھے ہرے اور اب وہ ایک بڑا سا حلقہ بنا لئے کھڑے تھے۔

پیل کے نیچے بلا کی گردن غنی جس میں سوکھے پتے اور جھوسے کے تیکے ملے ہوئے تھے۔ گھوڑے کی لگام سیکھ سپاہی کے ہاتھ میں تھا کہ تھا نیدار نے دونوں طرف سے دردی کو کھینچ کر اپنے سٹول پر بیٹھا، اس کا اوجھا قد کلاہ دا کی گڑھی کے باعث اور بھی اوجھا دکھائی دیتا تھا۔ اس کی دھنکی ہوئی پیشانی خوب کشادہ تھی اور اس کی ناک جڑ سے ایک مڑ پر کھڑی تھی۔ اپنی شاندار اوجھی ناک کی وجہ سے وہ بڑا باقادر اور باوہوب انسان نظر آتا تھا۔ اچھی فوجی کی نا تجربے کاری اس کے ہرے سے جھلکتی تھی لیکن وہ فوجی ضرور تھا۔ اس کی سبز رنگ کی پٹلیوں کی وجہ سے وہ بقول دیہاتوں کے ”انگریج“ جان پڑتا تھا۔

پیل نے اسے کبھی ہوا میں ٹپٹپٹ کر دو تین گزے سانس لئے اور چرچیب ٹول کر ایک خالی رنگ کا ٹافہ باہر نکالا اور اس پر بغور نظر دوڑانے لگا۔

اسی اثنا میں گاؤں کے لوگ بھی جمع ہونے شروع ہو گئے۔ اور صرف سپاہی نے گھوڑے کی لگام پیل کی جڑ سے باندھ دی۔

کہیں سے غبار دار کو جڑ ملی تو وہ پھرا سر پر پاؤں رکھ کر بیٹھا گا۔ جب وہاں پہنچا تو حال یہ کہ وہ پھیرا ہوا اور پگڑی ٹانگوں میں الجھی ہوئی۔

تھا نیدار نے ٹانگیں اکڑا کر نظر اوجھڑا تھا اور حلقے میں کھڑے ہوئے آدمیوں میں سے ایک کو قریب آئے کا اشارہ کیا۔

وہ بچا راگھبر اکرا دھر آدھر دیکھنے لگا۔

تھا نیدار نے نگاہانہ انداز سے کہا ”میں تمہیں کو بلا رہا ہوں“

”جی مجھ کو؟“ اس آدمی نے اپنے سینے پر ہاتھ لگائے ہوئے دھچکا اور اثبات میں جواب پانے پر اس نے مضحکہ خیز انداز سے آنکھوں کی پٹلیاں دائیں بائیں گھما کر اوجھڑا دھر دکھیا اور پھر پگڑی سنبھالتا ہوا تھا نیدار کی جانب بڑھا۔

”تم مولا کا گھر جانتے ہو؟“

”اوجھی..... اوو.....“

”جاؤ اسے بلا کر لاؤ“

وہ آدمی سر پٹ بھاگا۔ لیکن مولا حقہ ہاتھ میں لئے پہلے ہی سے تہمند بڑا تاج چلا آ رہا تھا۔

تھانیدار سے آنکھیں چارہ ہونے ہی اس نے دُور ہی سے حقّہ زمین پر رکھ دیا اور بڑے فلو سے جھک کر فرشی سا کیا۔ اور پھر آگے بڑھا۔

”مونیال والہو! میں نے دُور ہی سے آپ کو دیکھ لیا تھا۔ بس حقّہ تازہ کرنے میں دیر ہو گئی۔“

یہ کہہ کر مولائے بڑے خوشامدانہ انداز سے حقّہ کی نئے اس کے تھنوں سے بھڑادی۔

نمبردار آتے ہی چارپائی کا انتظام کرنے کے لئے اُٹے پاؤں لوٹ گیا۔ بیٹھنے کی کوئی مناسب جگہ نہ پا کر تھانیدار ایک گلمرد پر بیٹھنے لگا تو مولائے بڑھ کر اپنا کلیس بچھا دیا اس پر۔ اور پھر لدا لدا کر کہا ”اوتے میا دیو! ابج کے میرے گھر۔ چارپائی اور بستر لے آؤ۔“

اس کی بات سنتے ہی دو تین آدمی بھاگ نکلے۔

تھانیدار نے پہلے تو چُپ چاپ حقّہ کے خوب گھرے گھرے کش لئے اور پھر مولائی کی جانب مخاطب ہوتے ہوئے شکرا کر بولا ”سنا اوتے جھوتی پستریا بات کہے آج چھروں کے گھر موڑ پڑ گئے؟“

”توبہ امیری توبہ! اکتے کتے مولاد ہیں اس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔“ جبرجینو! جھی نوکتے ہیں کہ بدابچھا بدنام برا۔“
”ہاں خوب یاد آیا۔“ تھانیدار نے سپاہی کی طرف متوجہ ہو کر کہا ”اوتے عجیب سینہا! جاجو رام محل ماننے نے اوہرے لٹکے کو تو بل کے لیا۔“

پہلے ہی سے سدھلے ہوئے سدا کرنے آگے بڑھ کر ہاتھ جوڑ دئے اور مسکین آواز میں بولا ”کھان صاب! بڑا ازخہ ہو بیالے جی۔ بچاے مولائی کی ناں کمرہ ہی ٹٹ گئی۔ کسان کو بیل کا بڑا سہارا ہوتا ہے۔“
مولائے تھنڈی سانس بھر کر منہ نیچے کر لٹکا دیا۔

ادھر ادھر کی باتیں ہو رہی تھیں کہ رام محل سفید دھوئی اور اس پر سفید کرتہ پہنے آہنچھا۔ اس کے ساتھ اس کا نرم نازک میں سالہ لڑکا بہر محل بھی تھا جو پتلیوں پہننے تھا۔

تھانیدار نے باپ بیٹے کو سر سے پاؤں تک دیکھا، باپ بچارا ادھیڑ عمر کا سفیدہ انسان تھا لیکن تھانیدار کو لڑکے کے کھڑے ہونے کے انداز سے بغاوت کی بو آئی۔ تاہم اس نے کافی تحمل سے بوجھا۔

”الے لونڈے! اپنا نام بتاؤ۔“

اس پر پڑھے لکھے لڑکے کو کچھ گرمی آگئی برہم ہو کر انگریزی زبان میں بولا۔

”YOU SHOULD NOT BE SO RUDE!“

تھانیدار کو انگریزی بس واہی آئی تھی۔ اس لئے وہ ٹھکانے میں جس بولا۔ ”دیکھ اوتے منڈیا! ہم سے زیادہ گٹ پٹ نہیں کرنا۔۔۔ جو کتنا ہوسو اپنی بولی میں کہو۔ تاکہ سب لوگ تمھارا بیان سمجھ سکیں۔“

نوجوان ذرا تیز مزاج تھا بولا ”آپ افسر ہیں آپ کو ذرا تیز سے بات کرنی چاہیئے۔“

بیغیر متوقع جواب سن کر تھانیدار نے سر اُپر اٹھایا اس کی آنکھوں سے شرارے نکلنے لگے۔ اس نے اشارے

سے سپاہی کو قریب بلا یا اور منٹ کاٹ کر بولا: ”جیت پٹینا! ایس منڈے کو غور ٹی قریز دکھاؤ“
 عجیب سنگمر کے دو تین جھپٹکھا کر زو جان کھو ات ہل گئے۔ اس کے ہنسنوں میں سے عرن ہنسے لگا۔ تھانیدار نے
 اس کے چلنے والوں کے گچھے کو ہاتھ میں دبوچ کر کہا: ”جینا! میں تمھارے ایسے شریف بدعاشوں کو سیدھے راستے پر لانا خوب جانتا ہوں۔“
 پھر حاضرین کی جانب متوجہ ہوئے: ”دیکھو جی! ایک غریب کسان کا بیل گولی سے اڑا دیا اور اوپر سے دھونس جھانٹے ہیں۔ قانون ہمارے
 ہاتھ میں ہے۔ دو دھکا دو دھرا اور باقی کا بانی الگ کر دکھانا ہمارا کام ہے۔“
 حاضرین میں سے پیشتر کھاس کی ماں میں ہاں ملائی۔ تھانیدار غرا کر بولا: ”اوسے مولیا!“

”جی موتیاں والیو!“
 مولیٰ بلی ہی میں سے نکل کر ہاتھ باندھ تھانیدار کے رو برو کھڑا ہو گیا۔

”بیل کمان پیرا چلا ہے۔“
 سہ ہشتاہ جی وہ تو ماتھوں کے کھیت ہی میں پڑا ہے۔ بھارا نعمت کا مارا مارے میں سے نکل ان کے کھیتوں میں جا نکلا۔
 بس اٹھا کے گولی داغ وی انھوں نے۔ بھلا دو ٹنڈے مار کر کھال دیتے سارے کو۔ غریب کا بیل تو بچ جاتا۔ یہ کہنے کتنے تیرا نے
 رونی صورت بنائی۔

”ماں ماں یہ الزام سنگمر پٹینا گیا۔ لیکن بیٹے کا شتر دیکھ چکا تھا۔ اس لئے چپ ہو رہا۔“
 ”ہم مرہڑا بیل موقعہ پر دیکھیں گے۔“

”چلو موتیاں والیو!“
 اب آگے آگے موتیاں والا۔ ساتھ ساتھ مولیٰ، سداگر، بھو وغیرہ۔ ان کے پیچھے ماننے۔ اور سب کے آخر میں ناک بڑھڑھٹنے
 پتھے اور دھیں ہلاتے ہوئے گئے۔

پیشہ کھیت پر کھیت بھلا لگتا ہوا جب ماتھوں کے کھیت میں پہنچا تو دیکھا کہ سردی سے اکڑا ہوا بیل کھیت میں ٹانگیں
 پسارے پڑا ہے۔ ... مولیٰ نے احتیاطاً ایک ٹونڈے کو دیاں بٹھا دیا تھا تا کہ گدھ اور کتے مردار کے قریب نہ آئیں۔
 خاں صاحب (تھانیدار) نے بیل کی اچھی ٹانگوں کے پیچھے اور گردن میں لگی ہوئی گولہوں کے نشانات کو غور دیکھا۔
 گاؤں کے تین چار آدمیوں کو بھی دیکھے کہ حکم دیا پھر گاؤں واپس آکر ٹیپ کی چھائیں تلے بھی ہوئی چار پانی پر بیٹھ گئے۔ اس
 وقت ان کے لئے مکھی اور سی کا ٹھورا طیار تھا۔

کھن کا گڑ نکل کر اور اوپر سے سی چڑھا کر خاں صاحب نے باچیں جھاڑن مارا و مال سے صاف کرتے ہوئے کہا: ”ماں بے
 مولا! اب بتا سارا قصہ۔ تیرا بیان لکھا جائے گا اب۔“

مولیٰ نے کھانں کے گلا صاف کرتے ہوئے بتانا شروع کیا کہ کیسے بھلی رات کو وہ اپنے باڑے تک یہ دیکھنے کے لئے گیا کہ
 وہ لونڈا جو دہان میں شیون کی رکھوالی کے لئے مقرر تھا وہاں موجود بھی تھا یا نہیں۔ کیونکہ اس سخت کام ایک چھان میں سے یا رانہ تھا۔ مقرر
 پاکر راتوں کو دھرمی کھسک جایا کرتا تھا۔“

”تم ایسے تھے یا ادھی کوئی ساتھ تھا“
 ”نہیں جی کیلکھتے، میرے نال سرداگر، میلہ اور لہجہ بھی نہ تھے“
 ”یکب سے تمہارے ساتھ تھے“

”بادشاہ پر تو ہر روج میرے ساتھ ہوتے ہیں۔ کھانے دلنے سے فرصت پا کر کبھی یہ میرے پاس آجاتے ہیں اور کبھی میں ان کے پاس چلا جاتا ہوں۔ کب آٹھارے کے لئے“
 ”اچھا اچھا بھڑکیا ہوا؟“
 ”پیشہ نشا ہوا! اچھی ٹیم باؤسے سے دوسری تھے کہ وہاں دو بار بندوبست چلنے کی آواز سنائی دی۔ ہم تو جی ڈ کے مارے کھیتوں میں چمپ گئے۔۔۔“
 ”اچھا تو تم ڈر گئے؟“ خان صاحب نے پوچھا کیونکہ نشان ہی سے مراد ان آدمیوں میں سے دکھائی دیتا جنہیں درگاہ چھوڑ

جی نہیں۔

”آہو جی ہم ڈر گئے“

”بھھا بھڑکیا؟“

”اتنے میں یہ کیا ہاتھ گاؤں کی طرف بھاگنا دکھائی دیا۔ پسے ہم سمجھے کسی ڈاکو نے اس پر گولی چلائی ہے۔ جب اس کے اپنے ہاتھیں بندوبست دیکھ کر ہم گھبرا گئے۔۔۔۔۔“

”ہوں۔۔۔۔۔“ خان صاحب نے اثبات میں ہوں سر ہلایا جیسے وہ اس معاملے کی تہ تک پہنچ گئے ہوں پھر؟“
 ”پھر جی ہم باؤسے کی طرف بڑھے راستے میں انہیں کے کھیت پر پڑے ہیں۔ وہاں تیس سفید سفید چیر دکھائی دی۔ ہم ڈرتے ڈرتے قریب پہنچے تو دیکھا کہ میرا بل مرا پڑا ہے۔ میں نے سر پٹ لیا۔ اور بچک سے دیکھا تو گوئیوں کے نشان دکھائی دیئے تھا۔ نیا در صاحب نے مرنے سے چند سوالات کئے چہ میلہ سرداگر اور لہجہ کی جرح کی گئی۔

”اچھا تو سرداگر! تم نے اچھی طرح پہچان لیا تھا کہ وہ رام محل کا بیٹا میرا لال ہی تھا؟“
 ”ہاؤ جی“

اس طرح سے سب نے الگ الگ اس امر کی تصدیق کی۔ اب خان صاحب پھر میرا لال کی طرف منسوب ہوئے۔
 ”دیکھو میرا! سچ بتاؤ کہ آخر بات کیا ہے۔ ورنہ یاد رکھو میں جرموں کا سخت دشمن ہوں۔ تمہارے ہنچکے دو کاڈن میں سرگرم تھا۔۔۔۔۔“

اب تو ہر آواز میں اپنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اچھی پہلی مادی سے اس کی ناک حل رہی تھی، اور ہنٹوں پر سرجن آگئی تھی۔ اس نے دھم آواز میں کہا: ”یہ الزام بے بنیاد ہے میں تو کھانا کھا کر گھر سے باہر نکلا نہیں نکلا۔“

خان صاحب نے اس کے باپ کی طرف دیکھ کر کہا: ”لا لہ! تمہارا لونڈا در اسحت وائہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ہمارا کام نی جھوٹے جھگڑوں کو راستے پر لانا ہے۔ سمجھا لو اپنے بیٹے کو درنہ ایک بار میں نے ہاتھ اٹھا دیا تو یاد رکھو پہچان نہیں پاؤ گے کہ

اس کا سر کدھر کو تھا اور منہ کدھر کر؟
 رام لال مقدمہ بازی سے تنگ پہنچا تھا ہاتھ جوڑ کر بولا، خان صاحب! ابھی لڑکا ہی ذسے شاید..... میں بیل
 کی قیمت دینے کو تیار ہوں؟
 ”بیل کی قیمت؟“ مولانا نے چلا کر کہا، ”گرہیکے بیل کی جان ایسی سستی نہیں ہرئی کہ جب چاہا مارو یا ادھر بھر بیسے کی دھن
 جانے لگے۔“

خان صاحب بوسے ”چنب رہی تم۔“ کچاس بند کر دے۔
 ”نہیں بادشاہو! میری کیا حال ہے؟“ مولانا ہتھ جوڑ کر الگ کھڑا ہو گیا۔
 ”اچھا لالہ! اپنی بندوق تو منگواؤ خدا“
 بندوق حاضر کی گئی۔
 ”ہیرا بولا“ دیکھتے بندوق کی نالی میں کر پڑا کر میں نے الگ دیکھ چھوڑی تھی؟
 خان صاحب نے ہیرا کی طرف گھور کر دیکھا اور زور زور سے سر ہلا کر بولے، ”سب سمجھنا سوں یہ کر پڑا تو آج ہی کی
 ٹی جو لی معلوم ہوتی ہے۔“

گھوڑی و زینک بندوق کا معائنہ کیا گیا۔ پھر انھوں نے سپاہی سے کہا۔
 ”مجھے سبنا کاغذ لاؤ تو بندوق کی رسبد لکھ دوں“
 اس کے بعد سرکے بیانات مکمل کئے گئے اور پھر نھانیدار نے کہا، ”بندوق تھانے میں داخل ہوگی۔ دینا، ہیرا چلو
 تھانے۔“ پھر دیکھو میں ہیرا کا بیڑا کیسے بنانا ہوں؟
 رام لال بیٹے کے لئے سخت پریشان تھا۔ ہاتھ باندھ کر بولا۔
 ”خان صاحب دیا کیجئے۔ میں بیل کی قیمت اور چرمانہ دینے کو تیار ہوں؟“
 ”یہ تو بھکی باتیں ہیں..... معلوم ہوتا ہے کہ لھاری جیب میں رپے آچھل رہے ہیں لالہ!“
 رام لال نے مشکل ٹھوک ٹھکتے ہوئے پوچھا، ”کیا ضمانت نہیں ہو سکتی؟“
 ”یہ سب تھانے پہنچ کر طے ہوگا۔“

یہ کہہ کر خان صاحب گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ جب وہ ہیرا کو لے کر چلنے لگے تو رام لال کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ جانتا
 تھا کہ لڑکے نے جو شہیں اگر گستاخی کی ہے۔ اس لئے اس کی تیر نہیں۔ کچھ سوچ کر اس کے بڑھا اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔
 ”خان صاحب ایک بات عرض کروں؟“

خان صاحب نے گھوڑا روک لیا۔

”بات یہ ہے کہ مولانا کے بہن کو گوی ہیں نے ماری تھی؟“

خان صاحب نے ہنس کر گھوڑے کو ایڑی اور لپے لالہ لڑکے کو بچانے کی خاطر تھوڑا بدل رہے ہو۔ در اگر انہوں

سے تو دلچھپو۔ ہم تو خانوں کے بندے ہیں۔“

جب تھا پیدا صاحب ان سب کی نظروں سے اوجھل ہو گئے اور بندہ ہی اپنے ساتھ لے گئے تو مولا نے اپنے گھر کی ڈیوڑھی میں بٹہ کر پیٹے آسمان کی طرف دیکھا اور پھر بھاری آواز میں بولا: ”یا مولا! اس کے بعد سداگر سے مخاطب ہو کر اس نے کہا: ”وگھر بے سداگر! تو گھوڑی پر سوار ہو کر سیدھا بھنبوڑی چلا جا اور بگا سنگھر سے کہدے کہ وہاں دھما میں بولنے والی چڑیا یا بچر میں بند ہو گئی ہے۔“

(۳)

ابھی سورج دھل ہی رہا تھا کہ دفعۃً اس ندر زرد کی آندھی اٹھی کہ زمیں سے آسمانی ملک دھواں دھاوا ہو گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کہ زمین کا سینہ بھٹ گیا ہے اور گرد کے بادل در بادل تنگ بوس پہاڑوں کے مانند جھوم جھوم کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ اور ارد گرد کا یہ سمندر خش و خاشاک کو اڑانا، اندر نا چلا آ رہا ہے۔ سورج دفعۃً دوپوش ہو گیا۔ ہر چار جانب دھندلا ہٹ اور پھر تار بکی بڑھتی جا رہی تھی۔ اور گدے آسمان میں آنے والی آندھی کی تیرہ دینے والے چیلوں کے جھنڈ بھی اس بے پناہ دھندلاہٹ میں غلط ملط ہو گئے۔

کڑی کے بنے ہوئے بھاری بھاری چرکھڑوں والے رمٹ کے آد پرچائے ہوئے پھلہ لکے بیڑوں کے جھنڈ میں کپور اسنگھر ٹٹے والا ایک آتشیں غریبی والی سترنا پاسبانہ مضبوط گھوڑی پر سوار باہر نکلا۔ اس نے پہلے پہر کے قشہ کی جانب دیکھا اور پھر دودر دور تک کچھ ہوئے کھینٹوں بڑنگاہ دوڑائی۔ لیکن اس کی نفردور تک نہیں جاسکی۔ کیونکہ آندھی دم دم بڑھتی آرہی تھی۔ کھینٹوں کی فصیلیں گرد آلود ہوا کی آمد آمد سے ایک بڑے تالاب کے میلے گدے پانی کی طرح لہریں لینے دکھائی دے رہی تھیں۔

کپور ٹٹے والا جسے عام طور سے کالا تیز کنتے تھے۔ اپنے گاؤں سے نکالی دیا گیا تھا۔ کئی برس سے اس نے گاؤں میں داخل ہونے کی ہرأت نہیں کی تھی۔ لیکن غنہ بھر پہلے وہ چوری چھپے اپنی مین کوٹنے کے لئے گیا صرف ایک رات رہ کر اور یہ معلوم کر کے کہ کس سسرال سے لائے ہوئے زیورات وہ کہاں پر رکھتی ہے، وہ جیب چاپ لوٹ آیا تھا۔ آج ان زیورات اور ادراس کے ساتھ اڑوس پڑوس والوں پر غمگین صاف کرنے کا ارادہ تھا۔

وہ بہت عجیب انسان تھا، کالا بھنگ۔ جماعی پن پس میں رہا ہوا تھا۔ اس کا دل جس اور عزائمات کند ہو چکے تھے۔ ابھی وہ دودر دور تک نگاہ دوڑا ہی رہا تھا کہ کھینٹوں میں چند سائے دکھائی دیئے جو پر بھائیوں کی طرح اس کی جانب کئے۔

آندھی کا زور بڑھنے لگا۔

گاؤں کے چاروں طرف پھیلی ہوئی گرد پر پہلے تو سب دھول کی چادر میں لہلاہتی پھر بھاری گردنہ و زنبہ اوپر کو اُٹھنے لگی اور جو بڑے پانی کی سرسراتے ہوئے سائوں کی طرح تھنی تھنی لہریں بل کھا کھا کر دوٹیں لینے لگیں۔ طوٹے، کڑے و

کہہ رہا ہوں۔ ” اچھا اب میں چلتا ہوں۔ “

” ابھی باقی لوگ تو نہیں آئے ہوں گے۔ “

” آگئے ہوں گے۔ چل کر دیکھتا ہوں۔ تم لوگوں کو تلاش کرنے میں مبرا وقت خراب ہو رہا۔ “

” ہم نہیں دیکھتے رہے۔ تم کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ “

” رہٹ پر ملنے کا وعدہ تھا۔ میں سیدھا اسی جگہ پہنچ گیا تھا۔ “

” پہلے ہم بھی رہٹ پر گئے تھے۔ پھر وہ کھیتوں میں چلے گئے۔ “

” کیوں؟ “

” ہم نے سوچا کہ کہیں رہٹ پر کوئی ہمیں ساتھ ساتھ دیکھ نہ لے۔ “

” یہ اچھی حرکت کی تم نے۔ اس قسم کی حرکتیں کر کے تو خود بھینسو گے اور ہمیں بھی بھینسا دے گے۔ اگر مجھ کوئی اس

جگہ دیکھ لیتا تو؟ “

” مولہ بولا۔ ” اچھا جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ ہم اپنی جگہ سے تعجب دیکھنے کی کوشش کرتے رہے لیکن آندھی کی دھج

تم دکھائی نہیں دیتے۔ یعنی آگے کو خیال رکھیں گے۔ ایسی کلتی نہیں ہوگی۔ “

اس پر کچھ راضی ہو گیا۔ بولا۔

” دیکھو تم اگر پہلے اسی جگہ رکھیں گے اگر کوئی ایسی دبی بات ہو تو میں خبر کر دیتا۔ “

” اچھی بات۔ “

” مولہ اٹھا اور گھر تو بالکل سامنے پڑتا ہے۔ “

” تو پھر فدا نظر دکھانا۔ تاکہ جب ہم یہاں پہنچیں تو تم میں سے ایک شخص ہمیں یہاں آنے سے سمجھے۔ “

” لیکن آندھی بڑھتی جا رہی ہے۔ نہ جانے کب تک اس کا جو ر رہے۔ بخور ڈی دریں ہاتھ کو ہاتھ نہ لگ سکا۔ “

” دے گا۔ تم لوگ اتنی دُور سے کیسے دکھائی دے سکتے ہو۔ “

” کیوں دے نہ قدرے نا آمل کیا۔ پھر بولا۔ ” یہ بھی ٹھیک ہے۔ لیکن اب کریں کیا؟ “

” تم یہ بتاؤ کہ سب کو لے کر کب تک لوٹو گے؟ “

” کیوں دے نہ قدرے تو غور کرنے کے بعد جواب دیا۔ ” بھئی پٹیلے اور جنتی تک سے جواں آ رہے ہیں۔ اگر سب

پہنچ گئے تو ہم ایک گھنٹہ تک لوٹ آئیں گے۔ “

” اچھی بات۔ “

” اور کیا۔ اب رات بھیگنے کا انتظار تو کریں گے نہیں ہم۔ آندھی سے تو اس قدر اندھیرا چھا جائے گا کہ بس طبیعت

کھٹن ہو جائے گی۔ “

” ٹھیک ہے۔ “

”لو بھیجی ابھی چلا“
یہ کہہ کر کپورے نے گھوڑی کو ایڑ دی اور لپکے کی سی تیزی کے ساتھ دم بدم دھندلاتی ہوئی جھاڑیوں میں گم ہو گیا۔

(۴)

ایک گھنٹہ گزرنے پر بھی نہ پایا تھا کہ پیر کے ٹھٹھے پر ایسی گرمی تاب کی چھا گئی کہ پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ کپورا اور اس کے ساتھی گھوڑوں اور سانڈھنیوں پر سوارانہ دھاوا دھند چلے آسے تھے۔ تیز و تند ہوا گو یا ان کے کپڑے فوج کران کے بدن سے الگ پھینک دینا چاہتی تھی۔ ان کی واڈھیاں اور موچیں گرد سے اٹ گئی تھیں انھوں کی پلکیں ایک دوسری میں پریست ہوئی جا رہی تھیں۔ اگر کپورا ان کی رہنمائی نہ کرتا تو وہ کبھی راستہ تلاش نہ کر پاتے۔ ان میں ہندو مسلمان اور کھنکھی طے جلے لوگ شامل تھے۔ ان کے پاس دوپٹی والے غلیں تھیں، جن کی نالیوں کے ڈانے انھوں نے کپڑے کی ڈالوں سے بند کر رکھے تھے تاکہ گرد اندر نہ جانے پاتے۔ لاری کے اسٹیرنگ کی نالی والی ایک بندو ق بھی تھی۔ ان کے علاوہ وہ کھانوں، بھجیوں، لالچیوں اور صفا جنگوں سے منسلک تھے۔

اس وقت دُور سے پیر کا ٹھٹھا مارتے ہوئے جیسے کے مانند دکھائی دے رہا تھا۔ گاؤں سے بہت کدست۔ تارنگہ جی کی ٹوٹی ہوئی سماج کی آدنی و دیواریں الگ تھک کھڑے ہوئے دیکے مانند دکھائی دے رہی تھی۔ بوسیدہ دیوار کے قریب سڑے ہوئے پانی کی ایک کھائی تھی جس کی سطح پر سبز رنگ کی گائی بھی ہوئی تھی اور دیوار کی دراڑوں سے جھلکی بھلیں لٹک آئیں تھیں اور ان کی پتیاں پانی کی سطح کو جھٹک رہی تھیں۔ مولائے نہ دوا کر کوسب وعدہ موقع پر پھید ہا تھا۔ سداگر ریت کے ایک ٹیلے کی اوٹ میں سر اور کانوں کو دھسے ہیں بیٹے بیٹھا تھا۔ دیکھنے کے لئے اس نے آنکھوں کے آگے ایک چھوٹا سا سونہ رنگلا چھوڑ دیا تھا۔ بھلا ایسی تاریکی میں کیا دکھائی دے سکتا تھا۔ نظر نے تو کچھ کام نہیں کیا البتہ کانوں میں گھوڑوں کے ٹھونک کی ٹپاٹ اور سانڈھنیوں کے طبلانے کی آوازیں آئیں نہ اس نے چوکتا ہو کر گردن اوپر اٹھائی لیکن ڈاکو جہم زون میں اس کے سر پر تھے۔ اس تاریکی میں چھوڑوں کی دھبی دھبی چمک اور بھی زیادہ خوفناک دکھائی دے رہی تھی۔

”اُنھوں نے کشور میں آواز نہ گرجی۔“

”کون؟“
”سداگر“ سداگر نے جلدی سے جواب دیا مبادا جو اب بیٹے میں ناخبر ہو اور اس کا سر بھڑکی کے ایک ہی وار کٹ کر اُنک جا گرے۔

”سداگر کون؟“

اب سداگر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے چل کر بولا ”اُسے ہیں..... میں سداگر ٹھٹھے والا۔ کپورا کہتے اے“

عینِ وقت پر کپورے کی گھوڑی چلی کر لگے بڑھی ”سداگر“
 ”ہاؤ کپوریا“

”اے اپنا ہی سدا اے“ کپورے نے ساتھیوں سے کہا۔ پھر سداگر سے مخاطب ہو کر پوچھا۔
 ”مولا بھی ہے“

”نہیں۔۔۔ وہ گھر رہے“

”باکی سب شیک ہے؟“

”سب ٹھیک ٹھاک ہے“

اس اثناء میں گردا گرد ہوا فراتے پھرتی رہی۔ گھوڑے اور ساندھنیاں بے حسنی سے زلفاں نہیں۔
 دروازہ کوڑوں نے چندے آپس میں بناوٹہ خیالات کیا۔ اور پھر کپورہ سداگر سے بولا۔
 ”سداگر بچو آب ہمیں رہٹ کی طرف لے چلو۔“

سداگر کچھ کلمے بغیر اٹھا اور رہٹ کی جانب روانہ ہو گیا۔ وہ سب اس کے پیچھے پیچھے ہوئے۔
 کپورے نے رہٹ کے قریب پہنچ کر دریافت کیا ”سداگر! طویلہ تو کھالی ہے نا“
 ”ہاؤ بالکل کھالی ہے“

”ایسا نہ ہو کہ کوئی باہر کا آدمی گھسا ہو“

”اے نہیں“

رہٹ پر پہنچ کر وہ گھوڑوں اور ساندھنیوں سے نیچے اترے۔ جانوروں کو طویلے میں بند کر کے سداگر کو
 رکھوالی کے لئے مقرر کیا اور خود سارے ساندھنیاں سمیت گاؤں کی طرف بڑھے۔

مولا کے مکان کا دروازہ نیم د تھا اس نے دروازے میں بیٹھ بیٹھا کر تختوں کو ایک جگہ جمادیا تھا۔ اور وہ خود
 بھوکے ساتھ بیٹھا تھہڑی رہا تھا۔ میلہ سنگھ الگ بیٹھا دارھی کر بد رہا تھا۔

انھوں نے دروازے میں سے ڈاکروں کے گردہ کو پہچان لیا جب وہ قریب آگئے تو انھوں نے دیکھا کہ ان میں
 سب کے سب بڑے مضبوط اور زچھے تنگے آدمی شامل تھے۔

مولا تب بند جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور بولا ”ساب سلامت!“

”ساب سلامت اے جی“ دبی دبی علی آداز بی سٹائی دیں۔

مولا بڑھ کر دہیزنگ گیا۔ اس نے دیکھا کہ اس کے دروازے کے آگے بھانت بھانت کی صورتیں کھڑی ہیں۔

انھوں نے پگڑیوں کے شعلے گھا کر چرے ڈھانپ رکھے تھے۔ سوا آنکھوں کے ان کے چہروں کا ادھر کوئی حصہ دکھائی نہیں
 دیتا تھا۔ بدن سے وہ ننگے تھے۔ ان کے جسم ہر سون کے تیل کی وجہ سے نہ صرف چمک رہے تھے بلکہ تیل کی ہلکی ہلکی بو بھی
 پھیل رہی تھی۔

مولانے گری ہوئی لمبی مونچھوں پر چار انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔
• آج تان اللہ دا بڑا پھل ہے بی۔“

”ہاؤ“

مولانے کپورے کی منگی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”بھیا! پانی کا بجی پی (وسارے) کپورے نے جٹا جھاڑا دیل کے ماندا اپنے سر کو انکار کے طور پر ہلاتے ہوئے کہا۔
”نہیں بھو! بکت گھٹ لے۔ پانی کا بجی کی بات چھڑ۔“
مولانے ادھر ادھر دیکھا۔

”جارو! سواری بنا آگئے او“

”نہیں گھوڑے ڈاچیاں طیلے میں چھوڑ آئے ہیں۔“

”پر بھیا! گھوڑے کچھ بچک رکھو۔ بھائے وقت جروت پڑے گی..... اور کچھ کپورے یا تھیں کسی نے پچان لیا تو بچت آجائے گی۔ تو اپنی گھوڑی بہت بچک رکھنا.....“
کپورے کو مولائی بات پسند آئی اس نے جھک کر ایک ساتھی کے کان میں کچھ کہا۔ ”اور وہ“ ”ہاؤ“ کہہ کر طویل کی جانب روانہ ہو گیا۔

کپورے نے مولائے سے کہا۔

”مولائی! اب دیرت کرو۔ بس چلو ایسا موقع پھر کبھی ہاتھ نہیں آئے گا۔“
”بوت بچھا۔“

مولانے پھونک مار کر دیا بچھا یا تو اس کی لمبی لمبی مونچھیں پھیر گئیں۔

اب وہ ایک لمبی قطار کی صورت میں ایک دوسرے کے ساتھ لگے لگے بڑھنے لگے۔ گوبر کے ڈھیروں میں جھوٹا اور اورٹوں کے قریب ہستے ہوئے وہ گلی میں گھس گئے۔

آندھی کی وجہ سے بناہ شور پیدا ہو رہا تھا۔ ایسے موقع پر گتے لمبی تیزروں میں دیکے ہوئے تھے۔ ایک آدھ دی سی میوں کی آواز نکالی گئی تو وہ آندھی کے شور میں دب کر رہ گئی۔

ان کی رائیوں بھری ہوئی تھیں۔ ان سب کے ہتھیار بالکل طیار تھے۔ ہر ایک ہموٹ پر کپورے ایک آدمی کھڑا کر دیا۔ مولائی اب بھی تک بگاڑے سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ بگاڑے کو انسانی تھا۔ مولائی اس حقیقت سے واقف تھا۔ اس لئے اس نے بھی کوئی بات نہیں کی۔ وہ بجے کے دوش بدوش چلا جا رہا تھا۔ بگاڑے کی طرح لمبا تھا۔ اس کی آنکھیں اندر کی جانب دھنسی ہوئی تھیں لیکن ان میں وحشی جاوڑ کی آنکھوں کی سی چمک اور شیش تھا۔ وہی ان سب کا سردار تھا۔

ڈاکو طویل کنگھوڑے کی طرح دیواروں سے لگے لگے بڑھ رہے تھے۔
بگتے نے مولائے سے دریافت کیا۔

”مکان ہے کہاں؟“

”گاؤں کے بیچوں بیچ“

”بہنہ کہہ گئے کہے اور وہ پہلی بچ گیا۔ گھوٹے دہلی زبان میں کہا۔“

”اگر لوگ باگ جاگے بڑے تو اس تاریکی اور اندھی میں گاؤں سے باہر نکلنے کے لئے بہت احتیاط اور ہوشیاری

کی ضرورت ہے۔“

مولائے قدر سے بے پروائی سے کہا۔

”اوتے بھا، تو لوگوں کے سامنے کوئی ٹکارہ سکے گا۔ چاہے سو آدمیوں سے بھی مقابلہ کیوں نہ ہو جلتے۔“

تجربے پر مولائی اس پر ہلکا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ لوگ گاؤں والوں کا بخوبی مقابلہ کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ ایک گرگ جانا دیر نہ تھا۔ اس وقت سوال مقابلہ کر سکتے یا نہ کر سکتے کا نہیں تھا بلکہ اصل مسئلہ یہ تھا کہ گروہ کا ہر آدمی کچھ کر سکتا ہے ورنہ ایک آدمی بھی پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تو سارے گروہ کی آفت آجائے گی۔ اس قدر اندھی تاریکی اور شور میں یہ سارا کام بھیر و غریب انجام پا جانا اس قدر آسان نہیں تھا جتنا کہ مولائے قدر سمجھتا تھا۔

معاذ گھوٹے ایک دم ڈر گیا اور اس کے پیچھے ہٹے سب ڈاکو رک گئے۔

تاریکی میں سامنے سے انھیں ایک تاریک تر سایہ دکھائی دیا۔ معلوم ہونا تھا کہ کوئی آدمی جلد بل قدم اٹھاتا ہوا چلا آ رہا ہے۔

وہ سبچم نون ہیں دیوار کے ساتھ ٹک کر کھڑے ہو گئے۔

وہ آدمی بدن پر کالی چادریٹھ تیزی سے بڑھتا آ رہا تھا۔ لمحہ بھر وہ ان کے قریب پہنچ دیا تھا۔

ڈاکو دم سا دھکے کھڑے تھے۔ اتفاق سے اس دیوار پر ایک چھچھیا ہوا تھا اس لئے وہ مکمل تاریکی میں کھڑے تھے۔ یوں کچھ سے قریب کھڑا ہوا آدمی بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یہ تو محض گھوٹے کی منہ بستی آنکھوں نے ہی اجنبی کو آتے دیکھ پایا تھا۔

چند لمحوں بعد وہ اجنبی اور کے قریب سے گزرے گا۔ اس نوبت کہ اس امر کا مطلقاً احساس نہیں تھا کہ وہ چھپا ہوا ڈاکوؤں کی چھوٹیوں کے سامنے تلے سے گزر رہا ہے۔ اگر کہیں اس کے منہ سے چرن کی آواز نکل جاتی تو اس کا سر تن سے ہوا ہوتا۔

ڈاکوؤں پر موت کی سی خاموش طاری تھی وہ اس سختی سے آدمی کے سامنے اپنے قریب سے گزرتے دیکھ رہے تھے۔ خدا خدا کر کے وہ ان کی قطار سے آگے بڑھ گیا۔ اس کے جانے کے بعد سب نے اطمینان کی سانس لی۔ مگر نگاہ اس وقت خون خرابہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اگر کہیں اس کی بہت تیز چرخ نکل جاتی۔ اور اس چرخ کو کس کو گاؤں میں شورش مچ جاتا تو انھیں

خالی ہاتھ واپس لھانکنا پڑتا۔

گاؤں کے اندر والے چور اپنے پر پہنچے تو دیکھا کہ اونچے چوڑے والے بڑے کنوئیں کی منڈیر پر پانی نکالنے کی اونچی اونچی چوڑھائی پر جھلنے غناک انداز میں کھڑی ہیں۔ اور ان چوڑھائیوں کے قدموں میں نا ہوا پر چندوں والے لوہے کے ڈوبے ہوئے کے زور سے بل کر ڈنگا ڈنگا کا شور بلند کر رہے ہیں۔ اور چوڑے کے قریب کھڑے سوٹروں کے پیڑ گریا

انہیں خفگیں نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

وہ سب فوراً بیڑوں کے ٹھنڈے تلے چلے گئے۔ تاکہ آپس میں مشورہ کر لیں۔

کپتے سے غصہ چھوڑ کر سب کی تعداد و مسلم کی مطمئن ہو کر اس نے کہا۔

”اس جگہ کم سے کم تین جہازیں کھڑے رہنے چاہئیں!“

”وہ کیوں؟“ انہیں سے ایک نے جو دھبیانے کے علاقے کا ذرا ہنڈھ جھپٹ جہاز تھا، اعتراض کیا۔

کپتے نے کہا اس کا یہ اعتراض پسند نہیں آیا۔ اس نے برو پر گھرے بل ڈالی کہ اس کی جانب دیکھا اور پھر گہری سانس لیکر اس نے اپنے منہ سے کوہا یا اور اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کرنے لگا۔

”اس جگہ سے صرف ایک تنگ گلی آگے کو جاتی ہے۔ جو مکالموں کے اندر ہی ختم ہو جاتی ہے۔ ہمارے جہاگ نکلنے

کا صرف یہی ایک راستہ ہے۔“

”اگے آپ ان نوں پڑا نہیں لے۔“ آپان نالی کو مکالمہ کر سکتا ہے۔“ فوجان نے بازو ہوا میں لہرا کر بے پردہ اسی سے بلند

آوازیں کیا۔

اب تو کپتے کا جی چاہا کہ اس کی گردن مروڑ کر رکھ دے۔ اس کے یہ تیور دیکھ کر فوجان بھی پھرنے لگا۔ فوجان بڑبڑ

اور جوشیلی ہی بھی لیکن کپتے کے منہ تلے سے کھڑا ہونا تو اسے اس حماقت بھی اس کی۔

شاہد ان کے دو دو ہاتھ ہر جی جاتے لیکن جگے نے فوجان کو نہ کھڑکھا کی تو وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ پھر بنگا کپور سے

مخاطب ہو کر کہہ لایا۔

”ہاں تو کیا کہہ رہے تھے تم؟“

”اور حرج تنگ گلی تو دیکھ رہے ہو اسی کے اندر میں جا رہا ہے۔ وہ مکانات جن پر ہماری نظر ہے قطعے کے مانند ہیں ہر

آفت سے بچے ہوئے ہیں۔ آہل تو وہاں پیچھے کا کسی ڈاکہ کو حوصلہ ہی نہیں ہوا۔ ہماری پہلی کوشش ہے۔ اگر ہم وہیں کیس گھر گئے۔

تو عجب مصیبت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ہماری خیریت اسی میں ہے کہ ہم یہاں سے سرکے سب صحیح سلامت نکل جائیں۔۔۔۔۔

صرف یہی ایک کھلی جگہ ہے جسے خطرے کے موقع پر ہمارا ایک آدمی فوراً لگی کے اندر لے کر ہمیں خبر کر سکتا ہے۔ ہماری ہر کوشش ہونی

چاہیے کہ اول تو ہمیں متاثر نہ ہو جائے۔ لیکن ایسا ہر جی تو یہاں کھلی جگہ میں ہو۔“

جگے نے اثبات میں سر ہلایا۔

کپور نے اسے پھر کہنا شروع کیا۔

”یہ آدمی ہماری مدد بھی کر سکتی ہے اور ہمارا گھسلا بھی کر سکتی ہے۔ اگر کوئی گھڑ پڑ ہو گئی تو اس ہارڈ بازی اندھی اور اندھیرے

میں ہم اپنے ساتھیوں کی گنتی بھی نہیں کر پائیں گے۔“

نگا کو حرف بحرف اس سے اتفاق تھا۔

چنانچہ تین آدمی وہاں پر چھوڑ کر وہ لوگ آگے بڑھے۔

تنگ لگی ہیں پنچ کر انھیں ہیں عکس ہوا جیسے وہ قبر میں ہوں۔ آندھی اور ہوا ناندھ کر تھا البتہ قیامت کا شور کا زون کا پرورے پھاڑے ڈالتا تھا۔

دفعۃً لگا ایک دم رگ گیا۔ اس کے ساتھ ہی سبکے قدم رگ گئے۔ اور وہ اپنی تھوٹھیاں اس کے قریب لے آئے تاکہ اس کی بات سن سکیں۔

گتے نے ساہنسی کی طرف دیکھ کر پوچھا:

”بائس نہیں لائے؟“

”اروہ تو بھول گئے“

”واہ اوئے بھٹو..... تو کیا اب..... کے سہارے پر ٹھوگے تھبت پر۔“

”بائس کون دوسرے۔ مولا کہ گھر ہی سے نولا نا ہے۔ مینو جاؤ تو بھاگ کے جاؤ مولا کی ڈیوڑھی کے اندر میں کے

کوئے میں ایک لمبا بائس دھرا ہو گا۔..... بس اٹھا کر پھوڑ دی بائس آنا.....“

مینو نے تھوٹھیاں گھائی اور ناک کی سپرد میں بیٹھے ٹوگ بھرتا ہوا چل دیا۔

وہ سب پھر آگے بڑھے۔ کچھ دور جا کر لگی بائس ناندھ کر گھوم رہی تھی۔ موڑ سے چند قدم آگے واپس ہاتھ کو ایک دھواں اٹھا تھا۔ جس کی بنیادیں بھرنے کے بعد نہ جانے اسے کہیں چھوڑ دیا گیا تھا۔ اب وہاں بڑے بڑے خشک جھاڑ، اور پھٹی دیکاس کی چھڑیاں کے انبار لگے مکان کی دیوار کے ساتھ سے ہی تھے۔ جب کسی گلیا کو بچے جھٹے ہونے تو وہ جھٹی کر اسی میں رن کر پناہ لیتی۔ ایک کوئے میں بھڑ بھڑکے گاؤں تھا جس میں اس وقت ریت بھری تھی۔

دہان رگ کر انھوں نے اس مکان کے کچھ وارٹے کا جائزہ لیا جس کے اندر انہیں سب سے پہلے داخل ہونا تھا۔

چھت سے پڑے چمکی چمک کر انھیں دکھا رہی تھی ٹھنڈی گھٹا میں سیاہ دامن لہرائی بے پناہ رگ کی طرح آسمان کی دستخیز ہیں جیسے لگیں۔ آندھی کے زور میں کمی تو نہ آئی تھی البتہ ہوا میں پہلی ہی گرد باقی نہ رہی تھی۔

کیورے کے اشارے پر وہ پھر رگ گئے۔ ان کی وارٹھیاں پھر ایک دوسرے کے قریب آئیں۔ اس نے کہا۔

”سب لوگ یہیں پر نہیں ہیں گتے کو لے کر مکانوں کو اگلی طرف سے دیکھ لوں حرا“

وہ دونوں چنبر ہی قدم پھینک کر ان سب کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

ساہنسی نے مکان کی جانب دیکھا اور پھر دل ہی دل میں اندازہ لگائے لگا کہ اس پر بائس کی مدد سے چڑھنا ممکن بھی ہے یا نہیں۔ ان میں ایک بولا۔

”بھٹو! مکان حرا اؤ بچا مال ہوتا ہے“

”لوں ————— ہے تو“

”اگر تم بائس کے زور سے چھلانگ کر اس پر نہ چڑھ سکے تو ادھر ادھر سے اوپر جانے کا کوئی راستہ یا سہارا بھی ڈھائی

نہیں دیتا..... پھر تو آگے ولے دروازے سے جانا پڑے گا۔“

ساہنسی چپ چاپ دانتوں سے مونچھ کا ایک سر جھپٹا رہا پھر دیں بولا جیسے اپنے آپ ہی کو مخاطب ہو کر کہہ رہا ہو۔
 ”ہیں آگے بڑھ کر دیوار کے نیچے سے خشک انداز لگا سکتا ہوں۔“
 یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اور دیوار کے قریب پہنچ بیٹھی کے ایک انبار کے عقب میں گم ہو گیا۔ تاریکی کی وجہ سے اندازہ لگانا مشکل سا ہو رہا تھا۔

چند منٹ کے بعد بنگا اور کپور بھی واپس آگئے۔ بنگا بولا۔
 ”پہلے تو کپور سے کی بہن پر ہاتھ صاف کرنا ہو گا۔ اس کے بعد پتوں کے چند گھر بھی اچھپیں ان پچھلی جلدی سے ہاتھ پیر دیا جائے۔۔۔۔۔ اپنا ساہنسی بار کدھر گیا۔“
 ”وہ دیوار کی طرف گیا ہے آٹا ہی ہو گا۔ اندھیر میں اسے کبھی کچھ سوچ رہی نہیں رہا۔“
 چند ثانیوں کے بعد ساہنسی آگیا۔
 اسے دیکھتے ہی گتے سے کہا۔۔
 ”مکان تو آؤں چاہے بھٹو۔“

”ہاں بھا!“ ساہنسی نے پھر ایک مکان کی جانب نظر ڈالی۔ اور پھر قدم بے پے چلتی سے ہاتھ ملنے لگا۔ شاید اس کے ہاتھ داس پر پڑنے کے لئے بے قرار ہو رہے تھے۔
 ”پھر آگے نہ سوال کیا۔“
 ساہنسی نے اس کی جانب دیکھے بغیر جواب دیا۔

کوشش کرنے میں کیا عرج ہے؟
 گتے کو اس کے جواب سے اطمینان نہیں تھا لیکن سر دست اس کے سوا اور کوئی چارہ کال بھی تو نہ تھا۔
 اتنے میں ملکہ ہاتھ میں لیا بانس لے یوں وارد ہوا جیسے بڑے نموزی کو کندھے پر لاوے لارہا ہو۔ ساہنسی نے بیچ کر بانس مضامین پلے سے اٹھ کھینچ کر اس کی مضمرات کا جائزہ لیا اور راستہ ٹھول ٹھول کر آگے بڑھا اور پھر اس نے مکان کی چھت کی جانب نفردوڑائی۔ جھیلے آسمان پر کالے بادل گدے دھتوں کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔
 اب ساہنسی نے اپنی کمر کے گرد مہا رستہ پھیلا اور زمین پر ہاتھ مار کر دوڑ چھلکے کر بندیں ٹھونس لئے اور سر کھاکر بھی آواز میں مانتیوں سے کہا۔

”اچھا اب میں کرشنش کرتا ہوں۔ چھت پر صبح و سلامت پہنچ گیا تو یہ دوڑ چھلکے تمھاری طرف پھینکوں گا۔“
 بعد ازاں اس نے لمبے بانس کو سنبھالا، اسے دونوں ہاتھوں میں ٹولا اور پھر دو چار بار پاؤں کے نیچوں پر ناز کر تیزی سے جھاگ نکلا۔۔۔۔۔ معاً اس کے قدموں کی آواز بند ہو گئی۔
 سب نے سے پر پھر پھیرا تے ہوئے چکاوڑ کی طرح ہوا میں اٹھنے دیکھا، تیس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ چھت پر پہنچ گیا ہے۔

اگر کبھی چمک جاتی تو اسے دیکھ ہی لیتے۔ دندنہ... تڑاق سے دوڑ جیسے ان کے قریب گئے ایک تو میو کی ٹانگ پر لگا۔
 ”اوسے حیا دیا وہ ٹانگ پر لگا کر بیٹھ گیا۔ لیکن چوٹ بالکل معمولی تھی تو جھلا کچی مٹی کا تھا۔
 اب بچے نے چند آخری ہڈیاں دیتے ہوئے کہا۔

”دیکھو! اب ہمیں یہ سارا کام جلد سے جلد کھم کرنا ہے۔ اس گاؤں میں چند اچھے لڑکا جوان رہتے ہیں جو جان کی بجائے
 لگا سکتے ہیں۔ اس لئے ہمیں چسپ چاپ اور بیکھرتی سے اپنا آئینہ حاکم کے نوادر دو گیا وہ ہر جا ملے۔ سمجھ؟
 ”ماؤ بھنور“ مرنے تک زبان ہو کر جواب دیا۔

کپور نے میو کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دھیمی آواز میں ہدایت دی کہ وہ سب جوانوں کو اسے کے مکان کے
 دروازے پر پہنچ جائے۔

وہ لوگ اوجھڑ چلے گئے تو کپور جیسے کہ ساتھ لے پھوڑے والی دیوار کے قریب پہنچا۔ ابھی ان کے قدم اترنے ہی نہ
 پائے تھے کہ چھت پر سے رستہ لمبے ناک کی طرح پیچھٹا نا اور لہرا تا ہوا نیچے کو کھوٹنے لگا۔
 باری باری دونوں رستے کی دوسری چھت پر پہنچ گئے۔

چھت کی منڈ پر مشکل چار چار انگلی اُدچی ہوئی۔ نیزوند اندھی کے زروں میں انھیں یوں محسوس ہوا جیسے ان کے پاؤں
 اکھڑ جائیں گے اور وہ چشم و زبان میں اُڑ کر گاؤں کے باہر جا کر گئے۔ اس لئے وہ جھکے جھکے حص سے اُٹنے والی میز پر بیٹھتی
 مٹی کی جانب بڑھے۔ یہ آواز خوشی کی بات تھی کہ کئی گاؤں کا دروازہ ابھی کھلا تھا ورنہ انھیں کوڑ بھانڈ کر نیچے جانا پڑتا۔ اس سے یقین
 ہوتا تھا کہ گھر کے لوگ ابھی سوئے نہیں تھے۔ جینینت بہ تیزی کہ ابھی سونے کا کوئی وقت بھی نہیں تھا۔

کپور سے کہ ماٹھ میں داخل تھی، مگر اس کے اندر میں چمکتی ہوئی چھوٹی اور ساہمیسی جسب معیولی لمبا سا پتھر اٹھلے تھا۔
 انھوں نے ایک بار پھر اپنے اپنے چہروں کو گردلوں کے شعلوں میں چھپایا۔ صرف انکھوں اور ابروؤں کو نہ کا چھوڑا۔
 اور پھر چونک چھونک کر قدم رکھتے ہوئے سر پہاں اترنے لگے۔

وہ مٹی نیچے جا چکے تھے کہ دھندلے موڑ سے مٹا مٹی رہتی دکھائی دی۔ وہ فوراً سمجھ گئے کہ کوئی شخص ہاتھ میں لالٹین
 یا چراغ لئے سر پہاں پر چڑھنا چلا رہا ہے۔ وہ ٹھٹک کر رُک گئے۔ روشنی بھینکتی جا رہی تھی۔

ابھی وہ کچھ چلے ہی نہ کہ پائے تھے کہ چراغ کے نیچے دو زمانہ پاؤں دکھائی دیئے اور ان کی پہنکوں، ایک تیرہ چودہ سالہ
 لڑکی کی آنکھوں سے ملے جو چراغ کی پائے دونوں ہاتھ کے حلقے میں لئے ہوئے تھی تاکہ وہ کچھ نہ جالے۔

انھیں دیکھتے ہی لڑکی کا رنگ فن پڑ گیا۔ اس نے یہ بڑی زبان باہر نکالی کہ حلق سے ایک دلدرد چرچ نکالنے کی کوشش
 کی لیکن مارے غصہ کے اس کی قوت گواہی سلب ہو گئی۔ مٹی کا چراغ اس کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا۔

گئے گئے پھرتی سے اس کے بڑھ کر اسے ختم لیا۔ وہ بے ہوش ہو گئی۔ انھوں نے اس کے منہ میں اسی کی چند ری کر
 ٹھونس ٹھانس کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر دیں کہ نہ میں ڈالی دیا۔

حسن میں پہنچے تو دیکھا ایک جانب ڈیوڑھی ہے۔ اور دوسری جانب مکان کا پتھر معلوم ہوتا تھا کہ جس دروازے سے

نکل کر لڑکی آئی تھی اس کا گنڈا اس نے باہر سے چڑھا دیا تھا، تاکہ ہولائی تیزی کے باعث دردناک نہ لگھے۔ اندر روشنی جو رہی تھی اور گھردلوں کی باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

بچا اور ساہنسی دردناک سے کہ دونوں جانب اپنے اپنے ہتھیار سنبھالی کر کھڑے ہو گئے۔ اور کپورا باقی ساتھیوں کیلئے لڑکی کا دردناک کھولنے کو ڈیڑھ سی کی جانب بڑھا۔ ڈیڑھ سی میں عورتیں بندھے تھیں۔ ایک بیل تو اسے انشا پسند آیا کہ بے اختیار رچی چا کہ اسے بھی وہ اپنے ہمراہ لے جاتے۔ لیکن اس رات یہ قطعاً ناممکن تھا۔

ڈیڑھ سی کا دردناک کھول کر اس نے لڑکی کو بچھا لیا تو کچھ نظر نہ آیا۔ چنانچہ اس نے بیل کا لٹکے کے اندر میں ڈیڑھ سی کے دو تین آوازیں نکالیں تو متعدد مسئلے اس کی جانب بڑھے جیسے کافی دیواروں نے انھیں جھمکے دیا ہو۔

کچھ دے نے ایک جوان کو ہندوئی سمیت گھر کے پھول لٹکے پھینکے انباروں کے پاس کھڑے رہنے کے لئے بھیج دیا اور باقی لوگوں کو اندر لے آیا۔

دو کھڑی بعد وہ سب لوگ دردناک سے سانس کھڑے تھے۔ کچھ تھوڑی بڑھائی اور دردناک سے گنڈے میں لڑکی کے ٹھوکا جو بڑا تر گنڈا لڑکی آواز سے کھل کر گر کر اوزر اتر بیٹھنے لگا۔ دردناک کے دونوں تھوڑے زور سے ہلکا بھلے لگے۔

گھر کے لوگ سمجھے کہ لڑکی مٹی کا دردناک بند کر کے لوٹی ہے۔ وہ کچھ دیر تک اس کے اندر نہ لے کر انتظار کرنے رہے۔ لیکن جب کوئی صورت دکھائی نہیں دی تو ایک مرد جلدی سے باہر نکل آیا۔ پہلے وہ دردناک سے کہ دونوں جانب کھڑے ہوئے تو اور ساہنسی کو نہیں دیکھ پایا۔ جب اس نے لڑکی کو سمجھ میں نہ پا کر گردن کھائی تو کپورا اور ساہنسی کی صورتیں دکھائی دیں اس نے کھبرا کر پوچھا :-

”آپ کون ہیں“

اسی اٹار میں باقی آدمی بھی ڈیڑھ سی میں گھس آئے اور دردناک میں سے ان کی خبیث صورتیں دکھائی دینے لگیں۔ وہ دونوں چپ چاپ کھڑے رہے۔ پیچھے سے کپورے نے اس کی گدی پر اٹے کا ڈھکڑا بٹا دیا چپ بٹا کہ وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑا۔ یہ سب کچھ چند ثانیوں میں ہو گیا۔ وہ سب فوراً مکان کے اندر داخل ہو گئے۔ لڑکیوں کی روشنی میں ان کے ہتھیار بٹھکے گئے۔

کپورے اندر چھپ چھپا رہا تاکہ اسے کوئی پہچان نہ ملے۔ وہ گئے کو اندر والے کمروں میں لے گیا اور ان کی پونجی کی طرف اشارہ کیا۔ دم کے دم میں سب کچھ سمیٹ لیا گیا۔ پھر وہ سب صحن میں آ گئے۔ کپورے نے ایک نظر میں ساتھیوں کی تعداد چار تھی اور پھر وہ دو حصوں میں بٹ کر بڑوں کے مکانوں کی جانب بڑھے جن کے صحن ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔

انہیں میں باہر سے گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ ان کے قدم رک گئے۔ کان کھڑے ہو گئے۔ پھر دھڑا دھڑا گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیں۔ اس کے ساتھ اندھ کی شوق میں مردوں کے لگا کر مارنے کی صدا میں بلند رہیں۔

موتھلک نراکت سمجھنے ہوئے وہ باہر کی جانب بھاگے۔

جس فوج پر نشانہ مارا ہوا ان کی کپورے نے ہندوئی سمیت مکان کے پچھلے اڑے ڈیڑھ سی لگا دی تھی، اس نے ہلکا ہلکا

میں یہ گولیاں چلا دی تھیں۔ ہوا کہ اندھی کے زوہ سے مچھٹی اور جھاڑ کے انبار حرکت میں آگئے اور لڑکتے ہوئے اس کی جانب بڑھے اور اُس نے گھبراہٹ میں نہ جانے کیا سمجھ کر پے درپے فنی گولیاں چلا دیں۔

اسی اثناء میں گاؤں کے مختلف حصوں سے خطرے کی صدا میں بلند ہوئیں۔ چرکھڑلیوں والے کنویں کی جانب ’ایلی ایلی‘ کی آوازیں آنے لگیں جس کا مطلب یہ تھا کہ اُن کے سامنے انھیں خطرے سے آگاہ کر رہے تھے۔ اب انھوں نے میلو کو آگے لگایا اور سرپٹ بھاگے۔

چرکھڑلیوں والے کنڈین تک پہنچے تو وہاں اندھا دھند لڑھکیاں چلی رہی تھیں۔ گاؤں کے پچھلے چلی جلدی میں جیسا ہتھیار ملائے کر متناہیے پر آئے ڈٹے تھے لیکن ناریکی اور اندھی نے انھیں بچھڑ کرنے نہ دیا۔ اُدھر جگہ کے مدحائے موئے سامنے گاؤں والوں کے کندھوں سے کندھے بھڑاتے ہوئے نہایت صفائی سے اُدھر اُدھر منتشر ہو کر صحیح سلامت گاؤں سے نکل گئے۔

اتنے میں پورے کر اپنی کالی گھوڑی دکھائی دی وہ فوراً پھلانگ کر اس کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ جب وہ اپنی منہ زور گھوڑی کو ایڑے سے کا تو وہ گاؤں کے ہجوم کو کالی کی طرح چیرتی ہوئی نکلی جائیگی۔ لیکن عین اس وقت بجلی جی تو گاؤں والوں میں سے بعض نے اسے پہچان لیا اور اندھی کے جھیاٹک شور میں کالائز کالائز کی دھمکانے آوازیں گھل گھل گئیں۔

ایڑے سے جانے پر گھوڑی سرٹ کر جوابی تو گاؤں کے ایک منیلے جوان نے اس کی لگام پر جھپٹا مارا۔ اس پر گھوڑی ہلنا کر پچھنے پاؤں پر کھڑی ہو گئی۔ اس کی انکھڑیاں پھٹ گئیں، کان پھڑپھڑاتے اور یاہل لرائی۔۔۔۔۔ سوار نے ہونٹ کاٹ کر اپنی بے دستے والی کلاڑی اُدھر اٹھائی لیکن گھوڑی کے اگلے پاؤں زمین پر گئے بھی نہ پاسے تھے کہ ایک پھوہی جلی اور پھر ترے کے پیٹ کی آہٹیں اُدھیرتی ہوئی انھیں پیٹ سے باہر لے آئی۔

وہ بڑے گھرچھ کی طرح لی کھا کر اُدھر سے منہ زمین پر گرا۔ پیٹ سے خون کا فوارہ پھوٹا اور لٹھ بھر میں زمین اس کے گائے خون سے سرخ ہو گئی۔۔۔۔۔ پھر بادش کی موٹی موٹی بوندیں گرنے لگیں۔

قُدَّتِ اللُّشَّابُ

”پندرہ دن کی۔ میں نے جواب دیا۔

”میں سیر زوں گا۔ وہ کچھ دیر سوچ کر — مشفقانہ انداز سے کہتا ہے — تم کمائیاں کھنا۔“

دانشوروں کی اس غفلت پر پوسٹ مارٹم کے کرے کی نمائندگی شدت سے چھائی ہوئی ہے۔ قوم کی لاش سامنے بل پر دھری ہے۔ اور ہر شخص اس لاکوئی نہ کوئی شعور ناخدا میں بیٹے بڑی جا بگڑستی کے ساتھ پوسٹ مارٹم کرنے میں منہمک ہے، روحانی، جمانی، ایمانی اور سیاسی امراض سے لے کر خودکشی کے نفسیاتی اسباب تک بڑی تنہی سے تشخیص جو ہے ہیں علاج تجویز ہوتے ہیں۔ شعلوں پر گرنا اگم بخت مودہی ہے۔ میز پگھلے پڑتے ہیں۔ گڑباز اٹھنے اٹھنے کی بجائی ہیں — لیکن اس وقت قوم کی ساری ہماریں کا واحد علاج صرف اُس چاکے دانی ہیں ہے جس میں کوئٹہ کی بڑی امتیاز سے مٹھو خبے۔ کوئٹہ کی دالے صاحب پائی منڈے لگے منڈے منڈے کی جھپکا لے رہے ہیں۔ اور اپنے اندر گرفت دردن سیماء کے خوفناک بدترین کی باوجود بڑی تعلقی سے آراغ کی ایک عشقیہ غزل لکھ رہے ہیں۔

”آج سینما کا پروگرام ہے؟ کوئی ٹی صاحب نثار سے پوچھتے ہیں۔“

”جی نہیں۔ آج دوسرے پر دوگرام ہیں۔“ منار میری طرف اشارہ کر کے دوسرے کے لفظ پر خاص زور دیتا ہے۔

"ہوں! کوئی صاحب بیگ اتار کر مجھے سر سے پاؤں تک بڑے غور سے گھورتے ہیں: "نثار، تم نے اسی ان کی کیا تعریف کی تھی؟ کس جگہ کے میونسپل کونسلر ہیں یہ؟"

نثار قبضہ لگا کر ان کی تسبیح کرتا ہے: "میرا پہلا کونسلر نہیں، پہلا ہی یہ ہو گا۔ وہ تو پہلی کونسلر ہے۔ تو پہلی کونسلر؟ کوئی صاحب قلعی مرحوب نہیں ہوتے۔ ٹھیک ہے: "وہ بڑے مریدانہ انداز سے فرماتے ہیں: "اس نازک زمانے میں ایک آدھ تو پہلی کونسلر کو ہاتھ دینا کوئی معیوب بات نہیں ہے۔"

پھر وہ کمال شفقت کے ساتھ میری دعا میں بندھا جاتے ہیں: "بغور دار، تم بے فکر رہو۔ میں لاہور میں تمہاری موجودگی سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کروں گا۔ انشاء اللہ۔"

"یہ کہ لاہور کی زمین و زمان گاڑیاں بھی دیکھنا چاہتا ہے۔" نثار دوبارہ گزارش کرتا ہے: "یہ ان پر کہا نہیں کئے گا؟"

"تم کہا نہیں بھی کھتے ہو؟ کوئی صاحب اس انداز سے پوچھتے ہیں جیسے کہا نہیں کھنا کوئی بدست بڑا اخلاقی جرم ہے۔" کہاں کھتے ہو؟

یہ نجات سے منہ کرنا نقد و تنقید، ساقی، ہلاکوں، ادبی دنیا دینے والے کے نام لینا ہوں۔

"یہ رسالے کہاں سے چھپتے ہیں؟ میں نے تو نہیں دیکھے۔ کوئی صاحب کی تعریف میری ادبی پوزیشن کو جاتی ہے۔ وہ اپنی بیگ دوبارہ آنکھوں پر لگا لیتے ہیں اور مشتاقانہ انداز میں مجھے رائے دیتے ہیں کہ اگر مجھے کہا نہیں کھنے کا اتنا ہی شوق ہے تو بیع، ڈاکٹر کو روک چکا دی میں کھا کروں کوئی؟" آخری بار اسی میں اذیل کر وہ ان رسالوں پر اپنی لڑائی کر دے گا کہ انہیں بھی دہاتے ہیں۔

اس مختصر سی علمی ادبی بحث کے بعد صاحب ہم ہوٹل سے نکل کر ایک تانے میں سوار ہوتے ہیں تو نثار اور کوئی صاحب کا مانگنے والے سے تبادلہ خیالات شروع ہو جاتا ہے۔ مانگنے والا بڑی مشتاقی سے اپنے فنون لطیفہ کا پرچار کرتا ہے: "ذمہ دار اخبار کے مقبض ہیں دہنے والی جو اگر بڑی بولتی ہے..... چور بھجی والی جس کا رنگ گورا اور بال سنہری ہیں..... ماڈل نمون والی جو ایک ہسپتال میں رہتی ہے....."

لیکن نثار اور کوئی صاحب مانگنے والے کے ہاں کھڑے سے بالکل متاثر نہیں ہوئے۔

"تم سارے ہاسی لڑھی کا بال بھر؟ کوئی صاحب خفا ہوتے ہیں۔ تم سے تو رنگ کے اڑنے کے ساتھ والے ہزار درجہ اچھے ہیں۔" مانگنے والا رنگ کے اڑنے والوں کو قاضی و بیع کا لیاں دے کر مادی انداز سے اپنا تازہ ترین شاہکار برآمد کرتا ہے: "رنگ کی ہے صاحب ڈاؤن جانا ہے۔ ابھی کالج میں پڑھتی تھی، فقط دو جینے سے اس لائق میں آئی ہے۔ اب تک صرف چار مرتبہ باہر گئی ہے کہے خاں چٹان نے پورے سات سو روپے دے دیئے تھے۔ تمہاری خاطر دو سو میں منا لوں گا۔ چلوں؟"

آج بھی اکیلے نام پر نثار اور کوئی صاحب کی دال بھی چٹکنے لگی۔ لیکن دو سو روپے کا ذکر سن کر ان کے بڑے ٹک جاتے ہیں وہ دونوں اسی انداز پر ان سے مجھے گھورتے ہیں۔ خاص طور پر کوئی صاحب کے انداز پر ہی شدت سے علاوہ رہے ہیں اگر بغور دیکھو، میں نہیں اپنی خدمت کا سنہری موقع دے رہا ہوں۔ اگر تم اس وقت کام نہ آئے تو پہلی کونسلر نہیں لکھیا رہے ہو۔ لیکن میرے انداز میں کہ انہیں رنگ کی برکتی جواب دیتے ہیں، اور وہ باورس ہو کر پھر اپنا جڑا لگا کر بیٹھ جاتے ہیں۔

اس خاموش کو لڑو اور کئے بعد موضوع سخن بدل جاتا ہے۔ تانگے والا گھوڑے کو مخاطب کر کے کہیں بڑی ٹانگیں اور پیچ دار گاڑیاں سنا رہا ہے۔ نثار اپنے جگہی، دستوں کی تحریک کرتا رہا ہے۔ جو ضرورت کے وقت اس پر کڑی کڑی ہزار روپے تک خرچ کرنے سے بھی ہین نہیں کرتے اور کو لڑنی صاحب پاکستان کے تباہی انصاف کی کمیٹی، نالافتی اور بددیانتی پر جی کھل کر تبصرہ فرماتے ہیں۔ یوں بھی دفتر دفتر کو لڑنی اپنا رنگ دکھا رہی ہے اور جب تانگے والا گھوڑے کی اسطرت سے ہمیں چند ادراعی لایاں نا کر سیرانڈی میں ڈگڑے کی قبر کے پاس آنا دیتا ہے تو کو لڑنی صاحب کے پاؤں بڑی شدت سے دھکڑا رہے ہوتے ہیں اور وہ "س" کو "ن" میں بدل کر بڑی خوش سلائی سے چوک میں کھڑے ہوئے پولیس کانسٹیبل کو مخاطب کرتے ہیں شہابی جی شام جیتے دھوئے

سہا ہی ننھے جیل کو لڑنی کے منہ کو قریب سے زور لگا کر سن لگھتا ہے۔ اچھا آج بھی خوب چڑھا رکھی ہے صاحب پٹ کہاں ہے؟

کو لڑنی صاحب فیض سندھ شرق کی طرح چھاتی نکال کر بنا دھتھیری گردن کی عزت بڑھاتے ہیں۔ غالباً وہ مجھے پرمٹ کے طور پر سہا ہی کی خدمت میں پیش کرنے والے ہیں لیکن میں نفرتی کرکھک جاتا ہوں اور نوگڑے کی قبر کی اوٹ میں جا چھپتا ہوں۔

مجھے غیر موجود پا کر کو لڑنی صاحب کی چھاتی کا تانڈھیل پڑ جاتا ہے۔ اور وہ اپنی بٹن شرٹ کی جیبیں مٹول کر پانچ روپے کا نوٹ کانسٹیبل کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔ کانسٹیبل اس پر پرمٹ سے مطمئن ہو کر چوڑا جاتا ہے۔ نثار اور کو لڑنی صاحب کی گری گفتار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت ان کے درمیان ذات کا مسئلہ زیر غور ہے۔ وہ کچھ دیر میرا انتظار کرتے ہیں اور پھر غصے سے ایک طرف کوچل کھڑے ہوتے ہیں۔

نوگڑے کی قبر کے پاس زیادہ دیر غمناک خضرے سے خالی نہیں ہے۔ کیونکہ وہی پرمٹ والا سہا ہی اب منتظر ٹکا ہوں سے بار بار سیرامانڈہ لے رہا ہے۔ میں اپس کو مٹنے کے لیے کوئی ایسا راستہ اختیار کرنا چاہتا ہوں جہاں نثار، کو لڑنی صاحب اور پرمٹ والے کانسٹیبل سے سیرا سامنا نہ ہو۔ اس تلاش میں میں سیرانڈی کی سڑک تھما رہا ہوں۔ تانے بانے میں الجھ جاتا ہوں۔ اس صبح میں سب سنکے ہیں۔ گلیوں اور سڑکوں پر حرکت کرنے ہوئے شائقین، قدم قدم پر چیل کی طرح پھٹتے ہوئے دھل، دروازوں اور درکچوں میں گزریوں کی طرح بھی ہوئی عورتیں۔ اپنے رنگ رنگ مہوسات کے باوجود یہ ساری مخلوق الف نکلے ہے۔ اور ان کے جسم اور اذنان ایک ہی آواز شہر پر بڑی ہرجا ہجلی کے ساتھ رقص کر رہے ہیں۔ انسانی کچے گوشت کی بائزر جی ہوئی ہے۔ اور بڑی بڑی پاروں کے فمقوں کا اجتماع فیروز گیلوں اور سڑکوں پر دم کے دافوں کی طرح پیدا ہوا ہے۔ مجھے وہ کہ خیالی آتا ہے کہ یہ عورتیں جو دروازوں اور کھڑکیوں میں گردنیں نکالتے بیٹھی ہیں۔ بیابان چمڑے آؤ جابگیں گے۔ اور ابا بیوں کی طرح اپنی چوہوں میں لکڑیاں اٹھا کر سادی دینا کو اپنے زلفے میں سے لیں گی۔ لیکن میں طور پر کھل پوں کی جگہ میری گردن پر چھپا کر سے بغیر ایک بڑا سلفعہ آگڑا ہے۔ جو ایک آدھ عورتی صورت دیکھنے میں میٹھی بڑے اطمینان سے کھنکھانہ لہک رہا ہے۔ میں اپنی گردن کو اس غلطی سے پاک کرنے کی فکر کرتا ہوں۔ تو خدا کی خاص رحمت میری دیکھری فرماتی ہے۔ اور ایک گلی میں مجھے مسجد نظر پڑتی ہے۔ جس کے ایک دروازے پر کالی بیابا سے "یا اللہ" اور دوسرے دروازے پر باغیچہ لکھا ہوا ہے۔ یہ چھوٹی سی مسجد دو بلند بالا عمارتوں کے درمیان بڑی بے کسی سے جگڑی کھڑی ہے۔ اندر پیشاب اور پاخانے کا نقص ہے۔ ایک طرف تالی میں، بزر کی چند خالی اور شکستہ قزاقیں اور دھس پٹی ہیں۔ دھنوں کے لیے ایک پرانا

حمام ہے۔ جس کا پانی باسی لعابِ دہن کی طرح کثیف ہے۔ اور بڑے نندوں سے بہک ماتا ہے۔ نہ جانے اس مسجد کو دیکھ کر میرے ذہن میں دہلی کے انجن کا خیال کیوں آتا ہے جو تیز رفتاری سے چٹا چٹا اچانک بڑی سے اتر گیا ہو!

میرا منڈی سے عجیب عجیب آفریں شاہی مسجد آہنچا ہرنی اور خدا کی کھلی ضامیں امینان سے دوڑ دوڑ سے سانس لینے لگتا ہوں۔ رات کے بارہ بجے بھی مسجد کے آس پاس کئی شاخار کا دیں کھڑی ہیں۔ اور ان کے ڈرائیور ادھر ادھر بیٹھے ہلے دلی سے آگئے رہے ہیں۔ یہ شرفار کی موڑیں ہیں۔ جو اپنی ہلکات سے اجازت لے کر شاہی مسجد میں آو نیم شبی یا اقبال کے مزار پر چہرے عقیدت پیش کرنے یہاں آیا کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مسجد کی چکنی میزبیں پر الکزان کا پاؤں چھل جاتا ہے اور وہ ڈھلکتے ڈھلکتے بے اختیار دیرا منڈی کے نماں خانوں میں جا گرتے ہیں۔ اگر اقبال زندہ ہوتا تو وہ مسلہ جبر و قدر کی ایک نئی تہیز مزم کہہ سکتا تھا!

شاہی مسجد کے مین مخالف پرانے قلعے کی اونگھتی ہوئی مارت ہے جس کے دروازے پر پاکستان کا مجنہ اسکندری سے لہرا رہا ہے۔ اقبال کے مزار میں ایک چھوٹا سا مہاراجہ روشن ہے۔ تمام کچھ عرصہ ہٹا کر چھوڑ گیا تھا۔ لاہور میں مکلی کے سننے بلب آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے۔ کیونکہ ان کی ٹانگہ میرا منڈی میں بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ اقبال کے مزار کو ایک چھوٹے سے ٹپ پر ہی قناعت شعار دہنا چاہیے۔ مزار کے دروازے پر ایک آہنی قفل لگا ہوا ہے۔ تاکہ عقیدت مند اندر گھس کر سوخا کوڑو نہ چرا سکیں — باہر لان میں پیرا منڈی کے اکا دکا دول بھرتے بیٹھے رہیں گے۔ یہ خضر راہ کا کام دینے کے لیے مقرر بیٹھے ہیں۔ ایک تنگے والا دو دو ان میں داتا کے دربار پہنچا کر اعلان کرتا ہے۔ میں اچانک اس میں سوار ہو جاتا ہوں۔ تنگے میں صلیع جہلم کے دو مقدمہ باز بھی بیٹھے ہوتے ہیں۔ دن بھر مقدموں اور کھڑیوں کی زحمت کے بعد وہ گرمی و گرمی دل بہانے کے لیے میرا منڈی آگئے تھے۔ ادب حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے آن پڑھام کرنے چاہتے ہیں کہ تو سب کچھ اللہ ہی ہے! ایک مقدمہ باز اپنے ساتھی سے کہہ رہا ہے: لیکن بڑگوں کا کہنا رہا بھی بڑی چیز ہوتی ہے!

دوسرا مقدمہ باز بھی اس نظریے کی تائید کرتا ہے اور اس دعا کی گفتگو کے بعد وہ دونوں سرگرمیوں میں میرا منڈی کے ذاتی بے بہا دار خیالات کو سننے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

مجموعات کی وجہ سے داتا کے دربار میں عورتوں، مردوں اور بچوں کا بے پناہ جھوم ہے۔ کھوسے سے کھوا چھلتا ہے اور دربار کے صدر دروازے میں ٹانہ لگا کر لڑتی صاحبہ اتھیں اپنے ڈھکڑے چٹ کھڑے ہیں۔ جھوم کے ہر دھکے کے ساتھ خس و خاشاک کی طرح ہستے ہوتے اندر چلے جاتے ہیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے واپس آکر صدر دروازے کے مین بچے اپنی جگہ بحال بیٹے ہیں۔ میں ہر چند کوشش کرتا ہوں کہ ان کی نظر بچا کر ادھر ادھر ہوجاؤں۔ لیکن ٹانہ لگے دیکھ لیتا ہے اور ڈپرستی کھینچ کر اپنے پاس کھرا کر لیتا ہے۔ کو لڑتی صاحبہ بھی میری کھلی نظر شوں کو فراموش کر کے بڑے اخلاص سے پیش آتے ہیں اور داتا کے دربار کے ساتھ مسلمان عورتوں کی عقیدت مندی کے عہد مذاہد پر مازناہ روشنی ڈالتے ہیں۔ اپنے پردہ گام کے مطابق یہ لوگ اب یہاں سے مزار کے آگے پر جائیں گے اور وہاں سے زمین و زمان کا ڈیوں کی دوسری منزل شروع ہوگی۔ — لاہور ناغہ ویرن ریلوے کا بہت بڑا جنکشن ہے۔ یہاں کی زمین دو زمان کا ڈیوں ہر شوں بڑی، بر کر ہے میں جاتی ہیں۔ جگہ جگہ سرخ تیزل کے نشان ٹھٹھتے ہیں۔ لیکن ان تیزوں کے باوجود کوئی گاڑیاں کاناہلے ہلتے ہلتے چوک جاتی ہیں اور اکثر تمام کے حادثات و وقوع پذیر ہوتے ہوتے ہیں۔ اگر کوئی تیز رفتار انجن چلتے چلتے ہڑی سے اتر جائے تو اسے پھینک نہیں دیا جاتا۔ بلکہ اس کی پیشانی پر کالی سیاہی سے اللہ اور رسول کا نام لکھ کر اسے مسجد کے کام پر لایا جاتا ہے۔

چارہ گر

تسليم سيم چتاری

کنو صاحب جب کبھی اپنے تینوں بچوں کو ایک جگہ دیکھنے تو یہ بات کہے بغیر ان کا جی نہیں مانتا تھا کہ: ”یگم ولایت کی آبی ہوا
لا بھی اٹا اثر نہ ہو۔ جو بچے ہندوستان کی پیدائش میں، دور آں لا بھی دنگ روپ کھیا اور اپنی منیرہ کو کھیر — تشریف لائیں لندن میں اور
شکل پا ئی خاص“

یگم پر ان باتوں کا رد عمل مختلف حالات میں مختلف طور پر ہوتا۔ کبھی منسی خوشی میں ہوتی تو کہتیں: ”واہ جی! تم نے میری بچی کی
صورت دیکھی ہے، اس کا نصیبہ تو نہیں دیکھا تھیں کیا خبر اس کی قسمت میں کیا لکھا ہے اللہ نے چاہا تو اس بچی پر فخر کرو گے
.... کبھی مذاق کا موڈ ہوا تو کہہ دیا کہ: ”نوج میری بچی کیا ان موٹی فرنگوں پر جاتی — بلا سے ولایت میں ہوئی تو کیا ہے۔
بالکل اپنے باپ پر گئی ہے“ آئینہ دیکھو اور اسے کھیر۔

اور جو کبھی جل جاتی تو کہہ کر کہہ دیتیں کہ: ”کبھی بھی سہی میرے لئے تو سب ہی برابر ہیں کوئی بے سود و دکھ کے
تو ترما نہیں“ جو قسمت میں لکھا ہے آگے آگے کا۔ تو کیوں کیڑے ڈالتے ہو“

ویسے ایمان کی بات یہ ہے کہ منیرہ سب اچھی بچی تھی، اور سب بڑھ کر ماں باپ کو بھاری بھی، کیسی سمجھو اور چپ چاپ
پچی تھی کہ برسوں کسی کو پتہ نہ چلا کہ وہ گم سٹم عادت اور مزاج لے کر نہیں آئی بلکہ بڑے سہن بھائی نے زبردستی ہر دم کے طعنے دے کر
اسے یہ احساس کتاری پیدا کر دیا ہے کنو رانی کی گرد میں وہ مہمائی ہوئی تھی کی طرح بڑی رہتی اور جب ان کے طعنے جلتے
والہاں آئیں تو کہہ کر اپنی ”بیا کے گھٹنے سے جا لگتی، ناصر اور ویسہ اُسے مزاجی کتے اور انگ تھک ٹیٹھ و کچرہ کرو میو میو شاتی
” بھائی جان ملاحظہ ہو صورت چڑیلوں کی اور مزاج بھیلوں کے اور وہ بے جا رہی دل کی بھڑاس کھانے کو بھی
ادھر اُدھر منہ چھپاتی پھرتی۔ حالانکہ خدا نہ کہے اندھی مائی نہیں تھی۔ بس رنگ سا فو لا تھا اور نقشہ بھی اوروں سے بھدا

ادھر اُدھر منہ چھپاتی پھرتی۔ حالانکہ خدا نہ کہے اندھی مائی نہیں تھی۔ بس رنگ سا فو لا تھا اور نقشہ بھی اوروں سے بھدا
سادے کپڑوں میں بھی اچھی خاصی لگتی اور گٹے مٹھا لکے کپڑوں کو تو اس نے کبھی پچھن ہی سے نہ لکھ نہیں لگایا تھا۔ ہوش نہ سجاتے ہی
اس نے اپنے پرانے کبھی کو یہ کہنے سنا کہ ”منیرہ کی شکل سارے گھر سے علیحدہ ہے“ منیرہ کنو صاحب کی بیٹی نہیں لگتی، اور
ویسہ؟ وہ تو ہوبھو اچھی ماں پر تھی۔ کنو رانی آج بھی تیس تیس سال کی ہو کر اور تین بچوں کی ماں بن کر بھی ایسی معلوم ہوتی کہ چھپی کی
بی ہوئی مورتی ہیں۔ جسے گذر تازمانہ مانہ نہیں لگا سکتا — ویسی ہی جوان، شگفتہ اور پرکشش — جیسی وہ ڈولے سے

آزادی جنہیں، اور کنوڑ صاحب کے گھر والوں نے وہیں کا گھر نکھٹا اٹھا کر کہا تھا کہ چاند سورج کی چوڑی مل گئی ہے!
کنوڑ صاحب خود بہرہ ور ہیں ایک تھے..... اب تو جسم کچھ بہت بھاری ہو گیا اور رنگت میں ماند پڑ گئی تھی درنہ
دو فوٹو میں اب بھی گھٹنوں میں مغالہ ہوتا کہ رنگت کسی کی زیادہ اچھی ہے اور نقشہ کسی کا زیادہ پیارا ہے..... پھر تو ظاہر ہے سچے
کس بہ ہونے، پیسے تو ناصر باب کا بچپن لے کر آئے، پھر ماں کا فونہ بن کے وسمہہ پر ہیں..... دو فوٹو میں اب بھی بہت خوش تھے
کہ اب ہماری جوانی دائم ہو گئی — جب ہم بڑے ہوئے تو یہ دو فوٹو جوان ہو کر ہماری انگلیوں کو سہا لیں گے۔ دیکھنے والے دونوں
بچوں کے حسن کی تعریف کرتے تو ان باب پھولے نہ سماتے کیوں کہ بر تعریف با واسطہ انہیں کی تھی۔

جب تاحراً آٹھ نو سال کے ہو گئے تو کنوڑ صاحب نے ان کو نین نالی سے جا کر شیر و ڈا سکول میں داخل کر دیا اور بیگ صاحب
کے اصرار پر وہیں کو نوٹ میں پانچ چھ سال کی وسمہہ بھی بچپنا دی گئی۔ گھر سے بچے گئے تو ان باب کا دل دکھلانے لگا..... کنوڑ صاحب
غیب سے ان کے والد کا انتقال ہوا، ہر سال ولایت کی سیر کا ارادہ کیا کرتے تھے۔ اور ادھر کچھ دن سے کنوڑانی کو شکایت تھی کہ بہن
کی لیدی ڈاکٹر میں سب اونڈے سیدے مرض تشخیص کر کے دینا بھر کے علاج بتائیں مگر اصل مرض کو کوئی نہ پہچانتی تھی۔ اور ادھر کنوڑ صاحب
دیکھ رہے تھے کہ ان کی چھٹی تہلی کچھ پتوں کی جڑائی سے اوپر کچھ اٹھ اٹھانے موزی مرض میں جنہیں کہ بالکل ڈھال ہوتی جا رہی ہے۔
انہوں نے فوراً ہی بیوی کو لے کر ولایت کا رخ کیا..... سیر کی سیر اور علاج کا علاج..... دوران سفر میں کنوڑانی صاحبہ کی
طبیعت اور طبی نگہ رپوٹی اور لندن پہنچ کر کنوڑ صاحب کو پہل ملاقات ایک مشہور لیڈی ڈاکٹر سے کرنی پڑی جس سے کنوڑ صاحب نے
بہت ہی غمگین لہجے میں کہا: ”ہندوستان کے بعض ڈاکٹروں کو یہ بھی شبہ ہے کہ ان کے بہن میں پتھری ہو گئی ہے..... بعض نئی بتاتے
ہیں اور بعض زمانہ امراض میں سے کوئی مرض.....“

لیڈی ڈاکٹر نے مکمل معائنہ کرنے کے بعد کنوڑ صاحب کی آخری بات کو تسلیم کر لیا۔ ”ٹھیک سمجھتے ہیں..... بالکل
زمانہ مرض ہے“

کنوڑانی اور کنوڑ صاحب دونوں ہی اچھل پڑے۔ ”کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ.....“ میرا مطلب یہی نہیں بلکہ
واقعہ یہی ہے۔ اور میں جہراں ہوں کہ اب تک آپ کو اس سلسلے میں لاٹھی کیوں ہے۔ جب کہ بچہ بالکل نارمل ہے۔ اور کوئی خرابی
نہیں معلوم ہوتی۔ صرف مسر میں خون کی کمی ہے اور وہ ماس ڈی کی ضرورت ہے.....

کنوڑانی کو خود بھی کبھی ایسا ہی شبہ ہوتا مگر ان کو تو کجعت و ایوں اور ڈاکٹر بنوں نے چولا دیا تھا۔ اب اس لیڈی ڈاکٹر
کی صاف صاف بات سن کر انہیں اطمینان ہو گیا۔ البتہ کنوڑ صاحب کی پریشانی کسی طرح رفع نہ ہوتی تھی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ بہن سنو
کہ سارے ڈاکٹر کیا گھاس کھوتے ہیں جو بچے کا نصیحتہ بنا لیتے ہیں۔ اور آپریشن کے رائے دیتے ہیں..... تیرہ بات کہاں تک
ممتدہ رہتی کو یوں میری مہنتاں کی ایک سفید رنگت اور سفید لباس والی جڑے انہیں بیٹی کی خوش خبری سنائی۔ اور انہوں نے خدا
کا شکر ادا کیا۔

تیسری اولاد تھی اور کئی تیسرے پر ہی گئی تھی! جب کنوڑ صاحب کہے ہیں آئے اور سفید بازوؤں میں، سفید چادریں
پیش ہوئی گڑیا کبھی تو چرنگ پڑے..... شاید انگریز نس کی گود میں ہی سانولی لگ رہی ہے..... انہوں نے احتیاط

سے اس نازک بوجھ کو سنبھالا اور کنوڑائی کی گود میں لٹا دیا۔ کنوڑائی تو اس گوری زس سے بھی زیادہ مسفید ہو رہی تھیں۔ اور بچی ایسی لگی جیسے چاند میں دانہ لگ گیا ہو۔ کنوڑا صاحب کا منہ اتر گیا۔ وہ تو اُنکھ ناک کے حساب سے بھی اس ماں کی گود میں نہیں سمیٹ سکتی تھی!

اولیٰ اولیٰ تو میاں بیوی اس بات کو آپس میں کہتے بھی کچھ جھجک محسوس کرتے کہ بچی کی شکل اچھی نہیں ہے۔ پھر رفتہ رفتہ میاں نے دے دیے جیسے ہیں اٹھا ڈیال کیا اور بیوی نے بڑے سے دل سے مانا کہ ماں اوروں سے کچھ بدی ہوئی ہے۔ بچی تین ماہ کی ہو گئی تو دونوں گھر بیٹے، پیٹے تو دلا بیت میں ہی کنوڑائی جہاں گئیں اور جس سے ملیں، دیکھنے والوں کی نظر نے اُن سے اپنے تعجب کا اظہار کیا کہ یہ بچی کیا واقعی آپ دونوں کی اولاد ہے؟ اور ایک آدھ کھ کھنٹ تو اس شہر کا اہلکار بھی کہتا تھا کہ شاید یہ بچی ترس کھا کر کسی غریب خانے سے گود لی ہوگی! اگر دلا بیت کے غیر غلاموں میں اس صورتِ شکل کا بچہ کہاں! تو پھر کہا آپ یہ جھوٹا سا بچہ بھی مند و مستان سے ہی سنبھالائی ہیں۔ کنوڑائی کو ایسی باتیں مارے ڈال رہی تھیں۔ یہ بچی اپنی پیدائش سے قبل بھی مرضِ ممیٹھی تھی اور پیدائش کے بعد بھی روگ بن گئی۔ کبھی کبھی ماں باپ اسے چکارتے تو وہ فوراً ہی مسکرا دیتی۔ پھر دونوں یہ بھول جاتے کہ انہیں بچی کے حسین نہ ہونے کا غم ہے۔ اس کا اخلاق ہی اس کا حسن تھا۔ یہ ہر دم مسکراتی بچی کبھی بھولی نہ کبھی منہ سبوتا نہیں جانتی تھی۔ بھوکا ہے تو اور پیٹ مبرا ہے تو، بس یہاں ماں باپ نے کو، میں لیا اور اس کے مصروفِ چہرے پر مسکراہٹ کھینچی۔

کنوڑا صاحب کے دلا بیت سے ہٹنے کی خبر مندوستان پہنچی تو جو دوست احباب اُن کی وقتِ رخصت خبر خوشی سے دلیپ کی اور کنوڑائی کو صحت یابی کی دعائیں دیتے، وہیں تک پہنچے تھے، وہ اب زندہ سلامت، مٹی سمیت لوٹنے کی مبارک بادیں بھی جمع ہو گئے۔ انہیں میں کنوڑائی کی ماں مانٹا کی ماری، دلی سے چل کر رہی آگئیں اور جو کنوڑا صاحب کی ایک بہن جو اپنے خاوند کے ساتھ پونا میں رہتی تھیں، بھائی کو خوش آمدید کہنے بیٹی بھی گئیں۔

کنوڑائی چار چار بھنوں میں ایک تھیں اور بچی کو کون میں اُن کے بھائی محمود میاں بیٹے تھے۔ ماں کو دونوں بچوں سے دلانہ عشق تھا اور پر دائر دائر رشتوں۔ انہیں اپنے بچوں کے حسن و لیاقت پر بھی بڑا ناز تھا۔ کتنی تھیں کہ میں پوسٹ کے خاندان سے ہوں۔ میری اولاد کو دیکھ لو۔ شامِ امتِ اعمال کے محمود میاں کی دلیپ کسی بے ایمان شطرنجی بالوں میں جھپٹ کر پڑا تھا تو وہ بس پون ہی آدمی کا بچہ تھی! ظاہر ہے کہ محمود میاں کے ہر سال ہونے والے کچھ کسی جوانِ خود کو پوسٹ کا وارث کہلانے کے اہل نہ ہونے اور دلیپ کو اس کا بڑا ہی صدمہ تھا۔ بچی کوٹھ کھا کر انھوں نے اپنی لاٹھلی زبیدہ کے لئے کنوڑا صاحب جیسا تو اہلِ برت و ولہا ڈھونڈا اور کچھ ناصہ اور وسیع لہائی نانی کا بچہ بھی خوش کر دیا تھا۔

جب دلا بیت سے یہ مژدہ جانفزا کے کوہلی تار پینچا کہ اللہ پاک نے کنوڑائی کو بیٹی سے نواز دیا تو انہوں کو صدمہ میں بڑا کھینٹ کی مسلائی لگنے والی ماں منادنی مرگ سے بالی بال بچی۔ ووجہ روئے تو انہیں مٹھائی ہانٹنے اور زچہ کیان گانے سے فرحت نہ ہوئی۔ پھر ذرا سکون ملا تو انھوں نے تُو دیکھا نہ تُو! محمود میاں کی دلیپ کے پیچھے بڑا نہیں ہو جیسا سے آج کل اپنے نوے بچے کو دو چار پلا رہی تھیں۔ انیاں کی بات ہے کہ بچہ صورت کا بڑا نہ تھا مگر دلیپ کی خاندانی روایات کو تو ہر حال ٹھیک سمیٹتی تھی اور انہیں اپنی

[illegible]

یہی کچھ لکھتا اور ہر کاجی علاقائی - وہ خوش خوش نواسی کے استقبال کو کی گھنٹیں - اور جوں کی کھڑائی نے نہیں پر قدم رکھا، بڑی بی نے لپک کر اونی شال میں لپیٹ کر مٹی پٹی کو گود میں لے لیا اور مارے خوشی کے ان کی بہت تہ پڑی کہ سوئی ہوئی نواسی کا مائدہ کھول کر دکھائیں اور نہ یہ بل چاہا کہ اور کسی کو پہلے اس کی صورت دیکھنے دیں - حد سے کجرب کنو صاحب کی بہن جھیلنے نے بیٹھنی کو لپکا چاہا تو کنو رانی کی مانی سے یہ کہہ کر شال دیا کہ اونی لڑکی پہلے بھائی سے تو اچھی طرح مل لو سو سہری ہے - بے کل ہوگی جو مل جا کے دکھ لٹا ۛ

[illegible]

اب پھر بھی کی بات نہ آئی اور انھوں نے پڑی کو دیکھا تو بڑے سے ایک سواک روپے کے نوٹ نکالے اور زہر خند کے ساتھ کھرا میں اجرت تو ان کو بھی جوتی مگر اس سے بڑھ کر تو خوشی ملی کہ اللہ نے آج اسے بھی غلڑ کرنے کا موقع عطا فرمایا۔۔۔۔۔

جیلہ کی کل سال سے بھانجے کے ایک غفرے کی جھین سینے میں چھپائے کھینچیں اور بدلے کا انتظار تھا۔۔۔۔۔ یہ جب کی بات ہے کہ وہ سیدہ دو سال کی تھی اور میں برسوں بعد میاں کی ملازمت سے بھائی کے پاس آئی تھی۔۔۔۔۔ چاندیس بھیجی کو دیکھا تو پھسل پڑیں اور بھائی کے سر پر ٹپک کر میں تو اسے سادہ سے لوں گی یہ ساجدان کا پانچھ برس کا بیٹا تھا اور ان کو بہت لاڈلا

تھا ساتھ آیا تھا اور ————— چھوٹے بچہ کی طرح ہر دم ماں سے چپٹا رہتا تھا..... وہ بچہ کی سسے کھینے تو کزن صاحب نے کہا: ”آپا ابھی ان بچوں کا آپ نے دیکھا کیا ہے۔ خدا اس قابل تو ہونے دیں۔ یہ بڑھ گھلے ہیں، جوان ہوجائی تو آپ کی جڑی و تیرہ کر لے جائیے گا.....“

مگر جمیلہ بی کو تو ساس بننے کا ارمان لمبے ڈاٹا تھا۔ کھنے گھیں، یوں نہیں پکھا معاملہ کروں گی..... میں سات اشرفی سے لڑکی کا ہاتھ روک کر شیرینی بانٹے دیتی ہوں۔“

اب کنورانی کو بولے بغیر جا رہ نہ تھا..... آخر وہ سید ان کے پیٹ سے ہوتی تھی، ان کو بھی ماں ناکا حق تھا۔ ساجد کی صورت شکل تو بے عیب تھی مگر اس کی حرکتیں کنورانی کو ایک آنکھ نہ بھائی تھیں..... ماں کے جلے جا پیا رہنے اس کو بڑا ہمدردی اور چڑچڑاہٹ دیتا تھا۔ اور یہ بات ان کے منہ سے نکل ہی گئی کہ ”میں پکھا معاملہ کس طرح کر لیں..... یہ کوئی گڈ باگڈے کا کھیل تو نہیں..... پچھے آپ اپنے لاڈلے کے ڈھنگ تو سنبھال لیجئے..... وہ تو اپنے سسے کسی کو خاطر میں نہیں لاتا اور میری بچی کا جسم بھی نہیں دل بھی بہت نازک ہے.....“

کنور صاحب بھی اس جواب پر پشیمان ہو کر تھپتھپانے لگے اور تھپتھپانے کے ذریعے کسی نے منہ پر چوڑا کھینچ مارا ہو..... انھیں بھانج سے اس جواب کی توقع نہ تھی..... پھر کبھی وہ بھول کر رشتہ کی ات زبانی پر نہیں لائیں۔

آج کئی برس بعد طبیعی کی شکل و کھیر ان کا دل خوش ہو گیا کہ اللہ نے وہاں بھائی کے غم کو دیکھا بدل دیا۔ بچی کے ہاتھ کے روپے کی کرانہوں نے بھانج کے آگے رکھے اور ستر کر ڈالیں۔ ”اللہ نظر بد سے بچائے..... پرستے بڑھ کر ہے!“

بے جا بے کنور صاحب کھے دل کے آدمی، وہیں کے طنز کو دیکھا بھگتے: ”وہ بچی کی پیدائش کے دلچسپ واقعات سناتے تھے، خیر! پاشکل تو جیسی ہے سو ہے مگر اس کی پیدائش کس معجزے سے کم نہیں! اللہ کی شان ہے کہ اس نے کس طرح پریشانی کو نرسنی سے بدل دیا جب لیڈی ڈاکٹر نے اپنے خیال کا اظہار کیا تو میرا دل کسی طرح باور نہ کرنا تھا۔ مجھے تو آخر تک شبہ ہی رہا کہ سب اپنی آنکھوں سے بچی کو جاکے ہسپتال میں دیکھا تو یقین کرنا ہی پڑا کہ.....“

جمیلہ بیگم مسکرائیں: ”بچی کو دیکھ کر آپ کو اعتبار آگیا بلکہ اور شبہ بڑھ گیا، ہجی ہسپتال کا معاملہ تھا اور لاکھوں عورتیں اسی غرض سے آئی ہوں گی..... کیا پتہ کسی نرس کی عقلی سے.....“

بہی کی بات ختم ہونے سے قبل ہی کنور صاحب نے زوردار فحشہ لگا باور کنورانی نند کی اس چوٹ پر فٹلا کر صوفے سے اٹھ

کے دوسرے کمرے میں چلے گئیں جہاں ان کی والدہ فٹنگ پر کچھ حیران و پشیمان سی بیٹھی تھیں..... بے جا ہی برسی بی، ان کا خیال تھا کوئی کوبہی سے دہلی سے جا رہی گی اور دو ایک ماہ اپنے پاس رکھیں گی۔ کالے کوسوں سے تھرکے ساتھ بھری گودے کے لڑکی ہے۔ سیدھی گھٹنوں طرح جلنے دیں گی..... ابھی تو بچی کا عقیدہ ہی نہ ہوا تھا..... اور اب وہ بچی کو دیکھ کر اور سب کچھ بھول کر دوسری نگاہیں پڑ گئیں..... جمہور کی دلہن کیا کہے گی!!! اس کے تو سرکھے دھانوں پانی چڑھانے لگا..... جیسی بھی باتیں بنائے کم ہے..... مجھ کو محنت کو کیا پڑی تھی کہ بلا دیکھے بھالے اتنی ٹپنی کر گئی..... اللہ قسم ایساں کی پوچھو تو زبردہ کی لڑکی سے تو محمودہ کا لڑکا ہی کچھ کھلے رنگ کا ہے.....!!

معموم میرہ، نگہیں چلا دیا چار کے ہرئی صورت کو دیکھتی اور شاید ان چہرہ میں پرکھے ہوئے جذبات بھی سمجھ رہی تھی جو اس

نے منہ بسور کر دنا شروع کیا..... پھر یہ احساس کمتری اور غیر شعوری جھجک اس کی قسمت بن گئی!

یہ بات کچھ بڑوں پر ہی منحصر نہ تھی کہ انھوں نے بچوں کی صورت میں عجیب و غریب نکلے ہوئے۔ حد ہے کہ باڑوں کی چٹیل شروع ہوئی اور کنور صاحب بھی تالیاں لے کر نکلے اور وہ بہہ کر لائے تو وہ نوں بچوں کو پورا یقین کہ اتنی نے علاق میں ہماری ہیں کھچا کر کسی اور کا بچہ دکھایا ہے..... ناصر، شوق کے ساتھ کہہ کہیں اسیلے وقت ہوں جو اپنی ہیں کو نہ بچاؤں..... یہ تو جانے کس کی لڑکی ہے!! اور یہ بہہ بڑی معصومیت ماں کی گردن میں ہاتھ ڈال کر پوچھنے لگی۔ اتنی کیا لندن کی ڈاکٹر تھی اپنے بیگ میں ایسی بھی کو ڈال کر لائی تھی؟

جوں جوں منیرہ ہریش سنبھالتی گئی، دیکھنے والوں کی نظریں پھیپھتی رہی..... بہن بھائی سال بھر میں ایک بار تین ماہ کی چھٹیوں میں آتے اور جب وہ دونوں کو اپنے کھیل سے فرصت ملتی تو چھوٹی بہن کو چیلنے لگتے..... ایک دفعہ تو ناصر اور وہ بہن نے لڑکچارہ پانچ برس کی جان کا گھنٹوں شوق کیا کہ کتنے قہقاریے پانچ سیڑگیوں کے بدلے ایک جمادی سے خریدے۔ اور وہ دے دے تو غریب کی دونوں آنکھیں اٹھارہ ہو گئیں۔ ماں نہیں کھاتی، بڑے بچوں کو ڈاکٹر کی منگاری کی آنکھوں کے آنسو کسی طرح نہ تھکتے تھے۔ یہ بات اس کے جی کو لگتی اور پھر وہ بچی کبھی کھلے دل سے نہ ہنسی..... جب ناصر اور وہ بہن اسکول چلے جاتے تو گھر ایسا سناٹا ہو جاتا جیسے منیرہ کا تو وجود ہی نہیں۔ وہ تو ماں کے پاس چپ چاپ بیٹھی رہتی یا پھر کسی کو لے میں بیٹھ کر اپنی آپا سے برہوں اور شاہزادوں کی کہانیاں سنتی رہتی۔ شاید یہی وہ دنیا تھی جہاں پہنچ کر اس کا ذہن دو مانع پھر دیکر زرا دور ہو جاتا تھا۔

وہ بڑی سعادت مند اور محبہ دار تھی۔ باپ کی سرکڑوں کا ڈیرہ اور ماں کا ہادیاں بڑے سیلف سے اٹھاتی اور ان کے سارے حکم بلا چون و چرا مانگتی..... دونوں کا دل چاہتا کہ وہ اور بچوں کی طرح کھیلے و شورو مچائے، چیریں توڑے، کھولوں کی فرمائش کرے..... مگر منیرہ تو جیسے خود کو اس اعزاز کے قابل نہ سمجھتی تھی۔ اس کی زبان ہی نہیں کھلتی تھی۔

کنور صاحب اس کا سبب اس کی تنہائی سمجھ کر یہ علاج سوچا کہ اسے مجھ و سیر کے ساتھ اسکول بھیج دیا جائے۔ منیرہ جانے لگی تو کنورانی نے وہ سیر کو اپنی جان کی جھین دی اور خدا کا واسطہ دیا کہ اس بے جا دی کو اسکول میں تنگ مت کرنا۔ وہ سیر اب بہت ناواں نہ تھی۔ اور جو بہن نہ گزریاں جھینے نہ کھولوں پر اڑے اس سے بلاوجہ دشمنی بھی لگا ہوتی۔ اس نے ماں سے چارہ وہ کر لیا اور پار سے منیرہ کو لے گئی۔ ایک بے جا دی وہ سیر کیا کہی..... منیرہ کو اپنے بچوں کے سب سے بڑی دشمنی شکست اس وقت ہوئی جب وہ سیر کی سمیٹیوں نے منیرہ کو دیکھ کر کہا۔ چل بھڑی، یہ تیری ہیں نہیں سے۔ جانے کس کی بچی کی لڑائی ہے اور یہی تکلیف وہ "خوش آمدید" کے بعد جب وہ غریب سینکڑوں لڑکیوں سے الگ تھلک ہو کر کھڑی ہے تو وہ سیر کی لاکھ کوکشی کے باوجود وہ لازمی تقریبات کے علاوہ کبھی کسی سے گفتگو نہیں کرتی۔

پچھلے سال ہی اسکول کی طرف سے جو کنور صاحب کو منیرہ کی رپورٹ لکھی تو وہ خوشی سے اچھل پڑے، وہ بہت تیزی سے ترقی کر رہی تھی اور وہ سیر کی طرح منیرہ سے اسکول والوں کو کلام میں لاپرواہی کی شکایت نہ تھی۔

اسکول کی زندگی منیرہ کو شور و شغب کا شوقین نہ کر سکی..... ہاں وہ فہمنا پر سکون ضرور تھی..... اسکول میں

سبھی طرح کی لڑکیاں بغض - ہندوستانی اور انگریز کے علاوہ چینی، جاپانی اور برمی لڑکیاں بھی بغض - و بیزیاں حشش ماں باپ کا سرمایہ حیات تھیں۔۔۔۔۔ اور اگر کسی کو خاص طور پر وسیعہ کی پس بنا کے نہ دیکھا جائے تو ایسی کوئی بات نہ تھی جس سے اس کی دل شکنی کا امکان ہو۔ وہ سیدھے سبھاؤ کی صلح پر لڑکی تھی جو آستانوں میں بہت مقبول ہو گئی۔

اسکول سے بچوں کی رپورٹ آتی..... نامہ کی رفتار درمیانہ تھی۔ ایک مرتبہ خیل ہوئے تو دوسری مرتبہ ساری تلاش میں آول گئے۔ ان دنوں ہمنوں میں جہاں وسیعہ کی بے شمار شکایاتیں ہوتیں، وہیں وسیعہ کی کسی حالت میں ذرا بھی فی نہ نکلتی۔ وسیعہ کو بڑھائی کا کچھ ایسا شوق نہ تھا۔ وہ کھیل کود میں اچھی تھی اور جو یہ بھی گن نہ جوتا تو شاید اسکول میں نہ رہ پاتی۔ اور وسیعہ پر اگر کبھی کسی شیجر کو اعتراض ہوتا تو اس میں زندگی کی جولا فی نہیں..... اگر بڑھائی کے علاوہ اس نے اپنے شوق سے کسی چیز پر جھنم لیا بھی تو وہ جھنم گانے کی تلاش تھی۔ وہ پانچویں سیکڑی تھی اور آواز کے لحاظ سے سارے اسکول کی چیدہ لڑکیوں میں ایک تھی یہاں تک کہ آواز کے دن گر جا میں حمد گانے والی لڑکیوں کے گرد وہیں اس کو بھی شامل کر لیا گیا۔

دن گزرتے رہے۔

ماں کا حسین غصہ وسیعہ اب کنڈرانی کی پرسکون نیندوں میں خلل انداز ہونے لگی۔ سولہ سترہ برس کی عمر ایسی تو نہیں ہوتی کہ شادی کے سوا چارہ نہ ہو، مگر یہ اب کنڈرانی کو اچھا نہ لگتا کہ ان کی باجی ڈٹ چھ لایمی صاحبزادی بلاؤ اور اسکول میں کر قلا پنچیں بھرتی رہے۔۔۔۔۔ خود وسیعہ کو اس لباس سے چڑھتی۔ یوں تو وہ اسکول کی حد سے باہر ہمیشہ ہی نشاۃ فیض ہینتی مگر جس زمانے میں گرمیاں گزارنے ماں باپ دو دنوں عینی تال جلتے اور سینچر کی شام کو بچوں سے ملنے اسکول پہنچتے تو وسیعہ کا حلیہ دیکھ کر ماں کا دل لرھلائے لگتا..... کہاں تو ان کے گھر انے میں جواں بیٹیاں باپ کے آگے سر سے دوپٹہ نہیں گرائی تھیں اور کہاں بیروہ وسیعہ کے لباس میں دوپٹہ داخل ایک طرف گھٹنوں تک ٹانگیں بھی اپنی بے مانگی کا شہرہ کرتی تھیں۔ لہذا کچھ تو ماں کی مرضی بھی باقی نہ تھی اور کچھ وسیعہ خود بھی کو نوٹ کی پابند یوں سے عاجز آگئی تھی..... طرفہ یہ ہوا کہ وہ جو بیروہ بھرتی میں ملی ہوئی۔ کنڈر صاحب نے لاکھ بھایا مگر وہ اب اسکول جانے پر آمادہ نہ تھی اور گھر پر تیار کی کر کے وہیں گھنٹوں سے دوسروں کا امتحان دینا چاہتی تھی..... مہینہ کو اس مرتبہ تنہا ہی جانا پڑا۔

وسیعہ گھر آگئی تو ساتھ ہی شادی کے بیجا مات بھی رہنے لگے۔ وہ کنڈرانی کے ساتھ نانی کے باں دو ملی گئی تو محمود ماموں کے دو بیٹے بیک وقت اس سے شادی پر تیار ہو گئے۔۔۔۔۔ چون کہ دونوں نے اشائے کنا فی ہی چھو بھی پانچ بیٹا جتا دی تھی۔ لہذا ایک بھی تاہل قبل نہ قرار پا سکا..... خود کنڈرانی کی ماں نے ان سے کہا کہ وسیعہ حتیٰ جس محمود میاں کی ولیم بھی اچھی ماس ثابت نہیں ہوں گی۔ وہ اپنی لڑکیوں کی بد صورتی کے سبب ہمیشہ وسیعہ کے حسن سے ملتی رہی تھیں اور اب اس میں کر دل کی بھڑاس نکال دیں گی۔ محمود کنڈرانی کو بھتیجیوں کا خیال ترک کرنا پڑا..... اب رہے خود کنڈر صاحب کے بھانجے اور عیلہ بی کے لاؤ لے ساجد میاں، تو انھوں نے ایسی محافت کی کہ کنڈرانی نے وسیعہ کو ان سے نہ بیابنے کی بالکل قسم کھائی۔

بی بی کے امتحان سے نہٹ کردہ ماموں کے بلاؤ سے پر گھنٹوں گئے..... یہ وہی زمانہ تھا کہ وسیعہ پر میٹرک کی تیاریوں

میں مصروف تھیں اور دونوں نے بہا بریس کے بعد ایک دوسرے کو دیکھا تھا ماحد میاں بے چارے پہلی نظر کا شکار ہو گئے (فنون نے بھی اٹکا دیکھا نہ پہنچا اور وہیں مردانہ کرے میں ٹھیکہ کر اپنی شادی کا پیام و سیر کے نام تمام دیکھے ہوئے فنون، پڑھے ہوئے فنون اور سنے ہوئے واقعات کے خلاصے سمیت کھنچا..... مزید یہ دیکھا کہ تم باٹ اور قسیم ہوا۔ اس میں صرف تمہاری رضا و کار ہے۔ ماں باپ کی مرضی کو دخل نہیں ہے۔

شامت اعمال کی کہ بڑا شکار ہمارے بیٹی کے ماں کے ہاتھ پڑا اور کنڈر رانی کی ایڑی لگی آگ چوٹی ٹھکس پہنچے۔
خام ہے کہ بذر بذر دل نو سا جدا ہو، بذر بذر ڈاک ان کا پیام شادی اور فنون جمیلہ یکم کی خدمت عالیہ میں اس پیہر کے ساتھ پہنچے کہ جو آئندہ ایسا حراتو.....!

وسیم نے میٹرک پاس کیا اور وہیں انٹر میڈیٹ میں داخلہ لے لیا..... ناٹھ بنیر کیمبرج کر کے آئے ڈاکٹر بڑی گزشتہ کی ایسی لگن لگی کہ اس میں علاج پاسپورٹ کے علاوہ کچھ نہ ہو رہا..... فلک بوس چوٹیوں اور اتھاہ گھڑائیوں نے بیٹی نکال کے سینٹ میری کو فوٹ میں نیرو چپ چاپ پڑھتی رہی!

ناٹھ میاں کیمبرج کے ڈسپنٹھے اپنے طویل خطوط میں لکھے، دوسرے کے نیلے رنگ کی بیک میں جس میں گہری نیلی جارتھ کے پڑے تھے، وہیں دوڑ لگائی جاتیں اور وہیں نکال سے منبرہ کی بابت آئے والی شاندار اور پورٹیں کنڈر رانی سینٹ سینٹ کر دیکھتیں۔
دوسال اور بہت گئے.....

یہ اس رات کی بات ہے جب دوسرا ہفت۔ لے پاس کرنے کی خوشی میں اپنی دوسریلیوں کے ساتھ ایک انگلش فوڈ کچھ کر لٹ رہی تھیں اور ہرنگ پی خاصہ ہجوم تھا..... شکوہ ڈراپو اپنی طویل عرصہ بیک کر کے سلیٹے سے بچا بچا کر دیاں سے نکال دیا تھا۔ وغیرہ آگے جلتے ہوئے رکنا والے تھے اس پاس کی سواروں سے بوکھا کچھ اس طرح اپنی کھانا بیک کے سامنے کر دی کہ اگر شکوہ لکھے بھر کر بیک نہ لگائے تو دانا دانا کھا کر مرنا..... ایک تو اتنی تیزی سے بربک لگانے کے سبب موڑنے پیچھے کو جھٹکا کھا یا۔ دوسرے برابر کی رفتار سے آتی ہوئی پیچھے والی جیب اپنی پورنی طاقت سے بربک کے ساتھ ٹکرائی.....

جب نیٹوں دیکھیں کہ چینی بدلتی تھیں تو وسیم نے شکوہ کر دیا کہ "صاحب اپنے تو ہمارا ڈاکٹر ڈیوٹی توڑ ڈالا....."
دوسرے کو اس موڑ سے بہت پار چلتا رہتی نال سے آگراں سے اس موڑ کو اپنی مینڈ سے خراب چلتا..... اور کالج کی چار دیواری میں داخل ہونے والی یہ سبک جین کا دھنکی..... ڈگلا دیکھنے کی بات تھی اسے بڑی طرح مشتعل کر دیا اور بیک کو وہ موڑ سے کو پڑی..... جیب کی ایڑی رنگ و بیل پر دونوں ہاتھ رکھے پڑے اٹھنا ہی سے ایک صاحب کہہ رہے تھے۔
اور جناب آپ کی حماقت سے جو میری گاڑی کے ہیڈ لمپ کا پورا ہر گیا وہ.....

دوسرے نے بڑے کرانگریزی میں بڑی تیزی سے کہا: مجھے افسوس ہے کہ آپ کا مرکب بگ گیا۔ ہنس مینا کر ڈرائیو نہیں کرتے..... ایسی عمدہ موڑ کا تاس کر دیا۔

موڑ ٹکرائے کا حادثہ اس فوجان کو بالکل بدحواس نہ کر سکا تھا۔ مگر اس ڈیم ٹونے سے سچ بچ دلا دیا..... اس نے کسی قدر ہلکا کرانگریزی میں جواب دیا: مجھے افسوس ہے مگر تم..... تاہم میں ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ تو میری خطا کیا تھی؟

سیر کرنے سے شعلہ باز نگاہوں سے دیکھا۔ جواب..... تو گویا آپ نے افسانہ ہندو کا ڈیڑھ لاکھ ہمارا مٹا دیا نہیں توڑا؟ اب کرن ہے اس نقصان کا دوا دار؟ آپ تو نہیں ہیں!

وہ کچھ دیر خاموش رہا دیکھتا رہا اور پھر ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہنٹوں پر چمکی۔ اور میرا بھی ذہن نقصان ہو گیا ہے۔ آپ بتائیں، اس کی دوا دار یلیں گی آپ؟ اس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ سیر کی کلپنیں جھک گئیں ہنٹوں پر تماشا ہی جمع ہو گئے تھے، پیچھے سوار بالوں رنگ رسی نہیں اور وہ اس پر صنگ جوبل پر پٹھو ڈیڑھ لاکھ کرے اطمینان سے دیکھ رہا تھا۔ وسیع چہرہ کئی..... وہ اب ڈرنے کے بجائے دلیری پر آمادہ تھا۔ کہاں ہے آپ کا ڈرائیونگ لائسنس؟ وہ کھلبے مجھ کو!! میں کل ہی آپ کی رپورٹ کروں گی۔ بڑے ڈرائیور بنے ہیں!! یاؤں پختی و سیر ہو کر بھی تو شکورنے گاڑی بڑھائی..... ولایت سے ناسخ کا خط آیا تھا اور وہ کمزور لائی کو پڑھ کر سنا رہی تھی تو کمزور صاحب ہاتھیں ایک کاغذ سے جوئے کرے میں داخل ہوئے اور وسیع سے پوچھا۔ بیٹی تم نے ظفر میاں سے ان کا ڈرائیونگ لائسنس مانگا تھا؟

وسیع اٹھ کھڑی ہوئی۔ تم نے مانگا ہوگا..... خان بہادر ریاض احمد خاں کا بڑا بڑا کام ہے نا؟ وہ یہ لائسنس لایا ہے..... کہتا ہے کہ آپ کی صاحبزادی دیکھنا چاہتی ہیں.....

وسیع کو خندہ افسینہ آگیا۔ آبا میں تو اسے جانتی ہی نہیں..... رات اچانک ایک قسم ہوا تھا! شکور نے آپ کو اطلاع کر دی ہوگی.....

ہم لوگ سینما سے آ رہے تھے تو ایک جیب گاڑی ہماری موٹر سے ٹکرائی..... مجھے کیا پتہ کون چلا رہا ہے..... میں نے کہا اپنا لائسنس دکھاؤ ورنہ میں رپورٹ کروں گی! کمزور صاحب ہنسنے لگے..... لا حول و لا قوۃ..... وہ بے چارہ بہت ہی پریشان معلوم ہوتا ہے..... تم نے بھی حد کر دی، ان کے والد سے تو میرے بڑے تعلقات ہیں..... بلکہ تم تو ان کی گھر والوں سے بھی کئی بار ملی ہو۔ پچھلے سال ایکشن میں خان بہادر نے میری بیٹی مدولی قلمی..... وہ غریب لڑکا ڈرائیونگ میں بیٹھا ہے۔ اسے یہ لائسنس واپس کر دو..... اور کہہ دینا کہ تم نے اسے پچانا نہیں تھا!

کمزور صاحب ہنسی کے پاس بیٹھ کر کام کا خط پڑھنے لگے۔ اور وسیع ظفر کا ڈرائیونگ لائسنس ہاتھ میں لے کر پھٹکتی ہوئی، شرمندہ سی ڈرائیونگ روم کی طرف برسی ظفر سے دیکھ کر صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور مسکرا کر بڑے ادب سے سلام کیا..... وسیع نے بغیر سلام کا جواب دیئے، کاغذ میز پر ڈال دیا اور رنگ رنگ کر بولی۔ معاف کیجئے گا رات میں نے آپ کو پہچانا نہیں تھا! ظفر مسکراتا رہا۔ اور اب وہ اب تو پہچان لیا آپ نے مجھے؟

وسیع پلٹ کر مل دی تو ظفر نے کہا۔ سنے گا..... میں نے دیکھا ہے کہ آپ کا ڈرائیور تو میرا بڑا گارڈ درست کر لایا مگر، میرے نقصان کی تلافی کس طرح ہوگی.....؟ غریب آدمی ہوں! وسیع کے ہنٹ مسکراہٹ نہ روک پائے وہ مدولی سے بھاگ آئی۔ کیسا شریک رکھتا ہے تو یہ!

اس کے دو چاروں بعد ہی خان بہادر ریاض احمد خاں کے یہاں سے کمزور صاحب کو کمزور لائی اور وسیع کے موٹر

کا رقعہ آیا۔ کنور رانی اپنے میاں کے حلقہ احباب میں ولایت کی واپسی کے بعد سے پردہ نہیں کرتی تھیں اور نہ خان بہادر کے پہا پرے کی پابندی تھی۔ کھانا ایک ہی جگہ کھایا گیا۔ — اس دوران میں ظفر نے وسیمہ سے کوئی بات نہ کی۔ البتہ اس کا چہرہ بھائی رفیع جو انجینیئرنگ کالج میں پڑھتا تھا، ادھر دھڑ دھڑا کر باقیں کرتا رہا۔

کھانے کے بعد وہ بیہوش گاہ میں رکھے ہوئے ایک سنگ مرمر کے مجسمے دیکھ رہی تھی، جب ظفر خاں صدفان لیکر آیا تو وسیمہ کے چہرے پر شرم و رنگ ٹھہرنے لگا:

”وسیمہ نے شکریہ کہہ کر پان سے لیا تو ظفر نے آہستہ سے کہا: ”آپ نے میرے لئے بھی کچھ سوچا۔“ یا میں خود ہی کنور صاحبہ کو عرض کر دوں؟

”جی؟“ وسیمہ نے گھبرا کر اس کا منہ دیکھا۔

وسیمہ کی حشمت پردہ زور سے ہنس پڑا۔ ”میری گاڑی کی ابھی تک مرمت نہیں ہو پائی۔۔۔۔۔ میں تو اس دن لاچار ہو رہا ہوں۔“

”کسی قابل انجنیئر کو کھلیے۔“ وسیمہ نے شرمی سے کہا۔ ایک ایسی برابر کے کمرے سے آتے ہوئے ریفن نے کہا: ”میں ہوں قابل انجنیئر اور بات کا رٹ پلٹ گیا۔“

دوسرے دن کنور رانی نے وسیمہ کو بتایا کہ خان بہادر نے تمہارا رشتہ ظفر کے لئے مانگا ہے۔۔۔۔۔ تمہاری کیا مرضی ہے؟

وسیمہ کی مرضی کنور رانی کو معلوم تھی۔ — اور جب یہ بات طے ہو گئی تو وسیمہ نے ظفر سے پردہ مٹا کر دیا، ظفر کو کنور ان کے یہاں آنا اور ایک دن تو اس نے باقاعدہ پرچہ لکھ کر بذریعہ ڈاک وسیمہ کو بھیج دیا کہ جس دن سے آپ نے میری گاڑی کا پڑوسیپ توڑا ہے، میں اندھیرے میں بھٹاک رہا ہوں۔ اس سے قبل کہ میں بطور انتقام آپ کی کھڑکی کا شیشہ توڑ دوں۔۔۔۔۔ میری شکایت کیجئے؟

وسیمہ کی شادی میں ایک ہی ہفتہ باقی تھا کہ منیرہ وسیمہ کی کمرج کا امتحان دے کر کھنڈر آگئی۔ اس نے ظفر کو کبھی نہ دیکھا تھا۔ وسیمہ نے اسے ظفر کی دو تین تصویریں دکھائیں جو غالباً ظفر کے ہی اسٹائے پر رفیع اس کو نے کیا تھا۔۔۔۔۔ منیرہ نے ایک فوٹو کوٹھ سے دیکھ کر کہا: ”ایمان سے آج یہ تو بڑی خوبصورت ہیں۔“ مگر انھیں البتہ کچھ زیادہ لکڑی ہیں۔۔۔۔۔ آپ ذرا کم کر دیجئے گا۔۔۔۔۔ چہرے سے بہت خوش مزاج لگتے ہیں۔“

وسیمہ نے اس تنقید کا لطف لیتے ہوئے کہا: ”اوئی ان کی مونچھیں کاٹنا کچھ آسان نہیں ہے۔۔۔۔۔ بہت تیر ہیں۔ اب تو دیکھنا تیرا لطف ہی بند نہ کر دے تو شرط ہے۔“

منیرہ کو دل میں خوشی کی لہریں اٹھنے لگیں۔۔۔۔۔ سنسن کھڑو لہا بھائی کا تصور بڑا ہی دلچسپ تھا۔۔۔۔۔ اس نے آج تک کسی سے مذاق نہ کیا تھا۔ ناصہ نے اس کو کچھ ہجیر کر بہت خوفزدہ کر دیا تھا۔ وہ اس لئے بھائی جان سے کھڑ زیادہ بے تکلف نہ ہوتی تھی۔۔۔۔۔ اور کوئی ایسا رشتہ نہ تھا جس سے وہ بھی ہنس مذاق کرتی۔۔۔۔۔ کچھ تو اس کی طبیعت ہی سبب الگ تھلک تھی۔

پھر اس پر کو نوٹ کی زندگی جس میں یوں بھی نہیں کی اور ہمیشہ بے جان اور ہمیشہ معلوم ہوتی ہے..... مہینہ کا دل ابھی سے مہینے کو چاہئے لگا..... اس نے تصور میں اپنے ناخن کاٹنے کی قیچی اٹھا کر دو لہا بھائی کی مونچھوں کا صفایا کر دیا..... اور پھر ان کے دودھوں کا لون کی لڑ بھی کتر ڈالیں! اس نے سوچا کہ دو لہا بھائی کو پاں میں سی ضرور رکھلاؤں گی۔ اور ان کے بالوں میں افشان بھی ضرور لگاؤں گی۔ جو کہی دن تک تپتی رہے!

دل میں اُن گنت ارمان لے کر وہ بہن کا ہجر سہانے لگی..... بہن کو گھر جاتے دیکھ کر مزید کے دل میں اس کیلئے
اتفاقہ محبت آبل پڑی تھی..... وہ پہنچوڑی دیکھ کر کسی ضروری کام کو چھوڑ کر دیکھنے کے لیے میں دوڑی جاتی اور کہتی
اس کا بہن سے ملنا بہرہ دیکھ کر کھسک کر لگتی اور کہتی اس کے زرد دوپٹے کے داہن میں تہہ بیکار، دوپٹی۔

ہمارے آگے... منیر نے متناہی کی چھت پر سے دو لہا کو دکھایا اور خوشی کے ماسے اس کا دل اچھل کے اٹھ گیا۔
 آنے لگا... وہ دوڑی ہوئی دیکھ کر کہے میں گئی... وہاں بہت سی عورتیں جمع تھیں۔ اس نے بڑی شکل سے
 موقوف خیال کے دیکھ کے مان میں کہا... آ جا دو لہا بھائی پر سے خوبصورت ہیں اور بہت شاندار لگ رہے ہیں... پھر وہ
 بھاگ کر گئی اور ڈرائنگ روم میں بیٹھنے سے دو لہا کو سب کے ساتھ مل کر کھانے لگی۔

شادی کے تہنکات میں وسیع کثرت نظر آ رہی ہے۔ کچھ عورتوں نے میزبانوں کو دریاہ سے ہات کرنے کا موقع نہ دیا۔ وہ سب کی سب بنت نئے مذاق کر رہی ہیں اور ایک لمحے کو میٹھو نہ بن جاتی ہیں۔ کوئی اس سے عجیب و غریب سوال کرتی تو کوئی اس کی صورت کو پھڑکی کا غلام بناتی۔ ایک دفعہ بڑی ہمت سے وہ ان میں سے ایک کو لے کر لائی بھی تو بدتمیزی سے ظفر تک نہ بچ سکے اور پیسے میں رینگ چکی ہیں کہ کھانگے!

وسیر نصحت ہونے کی تربیت دی او وزیر کا تو یہ حال تھا کہ اس کی بچپان کسی طرح قابو میں نہ آئی تھیں۔ اس نے آواز دھکنے کے لئے دانتوں سے اپنی انگلی لہلہان کر لی مگر اسے کھڑے ہوئے تھے۔

منیہ کی خواہش تھی کہ وہ بھی روسیہ کے ساتھ اس کی سسرال میں جائے۔ مگر یہاں کے کبیڑے بھی اس کو میٹھے تھے۔ دیکھ کر سارے گھر میں یوں ہی پھیلا ہوا تھا۔ کمزور مانی نے اس کو روکا کہ اس وقت تو رہنے دو۔ کل صبح تم ہی جا کر روسیہ کی سسرال سے لانا۔ ناصر نے چارہ تو سمندر پر لڑ رہا ہے اور مہی کیلئے کون جائے گا.....

وہ میرے جانے سے سارا گھر سونا بن گیا تھا اور میرے چہرے پر بھی وہی مسکراہٹ تھی۔ رات بھر سوئی، صبح جوتی تو میری کالے تانبی ناک قابلِ برداشت تھی۔ وہ میرے لئے بہت سی ٹھائیاں لے کر اور کپڑے، دو ہاتھ لائے گئے تھے۔ میری پڑی ہوئی پاؤں کی گلوں پر مائل اور افشانی کے کردہ خان بہادر راض احمد کی شاندار کڑی کٹھی میں بیٹھ گئی!

خضر کا یہی اس کو ساتھ لے کر وسیعہ کے پاس گئی۔ وسیعہ نے لڑکا اور بچوں سے لڑی ہوئی کارچری کے سبز کپڑوں میں ایسی پیادری لگ دی تھی کہ خضر ابھی تک اٹھ کر منتظر دوستوں کے پاس نہ جاسکا تھا اور وہیں تمام یں پریشا ہوا خاصدا ان میں سے بھائی کے سفید دانے جن جن کو کھانے جا رہا تھا۔

منیرہ کو دیکھ کر سیمہ اٹھی تو اس کی یازیب کا ایک ایک گھونگر و بول اٹھا اور جب وہ دونوں گمے ملیں تو غفر کی

موجودگی نظر انداز کر کے ایک دوسرے کے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے منہ چمٹنے لگیں.....

کچھ دیر بعد دونوں کو ظفر کا خیال پڑا تو وسیعہ چیمپ کہہ بیٹھ گئی اور منیرہ نے اسے سلام کیا۔ اس سے قبل کہ ظفر کچھ کہے، رفیع اگلیا اور منیرہ کو دیکھ کر چچھا "جہاں صابہ کو لیں یہ ۹ ذرا مجھے ان کا نام آتا رہتا ہے..... میں انہیں خوب پہچانتا ہوں۔ انہی حضرت نے پرسوں شام مجھے مرحوں والا پاؤں کھلا دیا تھا.....

وسیعہ نے جرت سے کہا "اے اے تم منیرہ کو نہیں جانتے؟ میری بہن کو! ظفر اور رفیع دونوں نے گھبرا کر منیرہ کو دیکھا۔ وہ بیجاوی شہزادہ کی بیوی تھی..... رفیع نے کہا "جی؟ آپ کی بہن؟ وسیعہ بولی "ہاں بھی میری بہن منیرہ؟ منہ بے بار بار اس کا ذکر مجھے سناتا ہے..... الخیونک صورت نہیں دیکھی تھی؟" رفیع سر کھٹا کر بولا "جی میں نے شادی کے دوران میں انہیں دیکھا تو کئی بار مگر یہ خیال نہیں تھا کہ یہی منیرہ ہیں..... یہ تو قطعی آپ کی بہن نہیں لگتیں....."

"اے کیوں! رفیع کی چھوٹی بہن نے بقول ہی سے پوچھا۔

"ابن! رفیع گھبرا گیا، اس بات کی تشریح اس سے ممکن نہ تھی!

"واہ یہ بھی کوئی بات ہے کہ "کیوں! اس نہیں لگتیں..... تم بھی تو میری بہن نہیں لگتی ہو!"

سب ہنسنے لگے، منیرہ کے چہرے پر بدل بدل کے سُرخ اور زرد رنگ آ رہے تھے..... اس نے بھی سب کے ساتھ ہنسا چا کر وہ نہ ہنس سکی..... اسے ڈر ہوا کہ اس کو شش میں اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑیں گے رفیع جی کو لیا جواب نہ دے سکا، اس کے سبب سے وہ ابھی طرت واقف تھی..... اپنا کرناک چہرہ چھپانے کو اس نے جھک کر وسیعہ کی سادھی پرٹکا کر ایک ستارہ نور چھایا اور منیرہ راوی طور پر اسے داخلہ سے چھایا..... اس کے باشعور جذبات پر یہی ضرب تھی! کھٹو! کہ منیرہ کی زندگی میں ایک تیمان! آمیز تبدیلی ہوئی تھی۔ یہاں کا ماحول "سینٹ میری کو فوٹ" سے بالکل عدا تھا۔ یہاں اس کا لباس، اس کا کمرہ اور اس کا رہن سہن سب اس کی اپنی مرضی پر تھا..... کلب اور سینما گھر تھے۔ شاندار بیوک اور سہولتیں تھیں! پھر ناظر اور وسیعہ کے نہ ہونے سے وہی سارے گھر کی روح مردواں اور سارے مہمانوں کی مہربان تھی ممکن تھا کہ یہ ساری تبدیلیاں اور مصروفیتیں اس کی فطرت کو بھی ایک نیا جہم دیتیں..... اس کا نوجوان پیدا اس کے شکست خوردہ چہرے کو بخلا دیتا..... مگر..... خان بہادر ریاض احمد خاں کی کوکھی کے اس خول صورت فالینوں اور مقفوں سے سجے ہوئے کمرے میں ایک نوجوان نے، شاید نادانستہ طور پر اسے پرکھ کر کھوٹا کر دیا اور بے سوچے سمجھے اس شہنشاہ کو توڑ ڈالا جس پر ممکن تھا کہ اس کا آشنا نہ بن جاتا۔

جب شام کو وسیعہ کو ظفر کو اسے کہہ اپنے ہاں، اس آئی تو کسی پرے پانوں کی ٹگوریاں اسی طرح سے بیگ میں بٹری رہی تھیں اور افغان کی ڈبا بھی کسی مہر سی کی حالت میں ایک طرف پڑی تھی..... اس کی بہت اس کی شہزادہ اور اس کی آنکھیں ناب ہی تھیں سے کچھ گزریں..... آج وہ پہلے سے زیادہ بے بس ہو گئی تھی.....

ایک ال اور چلا گیا..... بہت سے نئے پھول کھلے اور پتے کھاؤ بھر گئے..... وسیعہ ماں بن گئی اور ناصر نے فائنل میں ناکامی کا غم بھلانے کے لئے وہیں ایک آئرش لڑکی سے سول میرن کر گئے۔ ن باپ سے دو پیار اور مہربانی کی

درخواست کی..... کنوڑ صاحب تازہ الیکشن میں جیت گئے اور کنوڑ رانی کے سر پر بہت سے کالے بالوں نے سفید روپ چھاد لیا۔۔۔۔۔ مگر منیرہ..... اس کی آج اور کل میں کوئی فرق نہ تھا۔ وہ ماں کے لئے پان بانی اور باپ کو اتنا دیکھ کر کھانا نہ ہی۔ ہاں اس نے ایک پان بانی اور منسان رانوں میں بچائے تھی۔۔۔۔۔ اور پھر سال کے آخر میں دسمبر کی ایک بریلی رات کو جب وہ وینک لکھی ہوئی کھڑکی میں سے باغ کی طرف دیکھتی رہی تو اسے ٹھنڈا معلوم ہوئی اور جب وہ پینک پرلٹی توکھانی کے ساتھ سینے میں درمچوس کیا۔

خدا جلے کتنی باتیں ایسی آئی اور گئی ہوں گی جب وہ یوں ہی بے کیف ہونے لگی تھی اور اسے مری کا احساس ہوتا رہا..... جب وہ ہتھالی پرلٹی اوس میں بھینتی رہی اور اس کا رواں کا پتا رہا۔ مگر یہ رات..... ہوئی شہنی تھی۔ اس کے دونوں بھیمچڑوں پٹھنڈا کا اثر ہوا اور منیرہ کی زندگی اور موت کی شکل میں پڑ گئی۔ موت کی نمائندہ دو شہرت کی شیں تھیں جو بہ سائنس کے ساتھ بھی کی طرح تھیں میں کنوڑ رہی تھی۔ اور اللہ کے بھروسہ پر زندگی کے لئے کوشاں رہے ڈاکٹر حنیف نے جو پینک کی بیٹی سے لگے بیٹھے تھے اور گھنٹوں کے حساب سے اس کے پیچھے ہونے بازوؤں میں فیسلین کی سرسبائی بیورت کئے جا رہے تھے۔

چوبیس گھنٹے اسی طرح گئے..... کنوڑ صاحب وہ پاؤں کھڑکی تک آکر اندر جھانکنے اور کربناک حالت میں پھر ٹھنڈے گئے۔ کنوڑ رانی حتیٰ الوسع سالے صدقے خیرات اور متنب کر کے اب خدا کے سامنے مرسدہ تھیں۔ وسیعہ اپنے نوزائیدہ بچے کو بھوک کر دونوں ہاتھوں میں مڑھائے۔ منیرہ کی بیٹی سے لگی فرش پر تھیں تھی۔ اور ان کی ہر آہ پاس کی رگوں میں نعرہ خوری پیدا ہو جاتی تھی..... ظفر کی جیب میں لٹھے بھر دو آؤں کی ضرورت یہاں سے وہاں دوڑ رہی تھی۔ اور ڈاکٹر صاحب کچھ چہرے سے مذہب کے آثار کی طرح نہ بدلتے تھے۔

چوبیس گھنٹے ہوئے تو ڈاکٹر صاحب اپنی جگہ دوسرے ڈاکٹر کے سپرد کر کے باہر نکلا اور کنوڑ صاحب سے کسی قدر مسکاتے ہوئے بولا۔ کنوڑ صاحب میں بیٹی کی صحت یابی کی نہیں بلکہ اس کی نئی زندگی کی مبارک باد دے رہا ہوں..... آپ خوش اے عیب ہیں!

موت لگتی اور زندگی بچنے لگی کنوڑ صاحب آرم کر سیں پر لیٹ گئے۔ کنوڑ رانی نے سجدے سے اٹھ کر شکر گزار کیا۔۔۔۔۔ تجربہ کر اپنے بھوک سے بکھٹے بچے کا خیال آیا اور لطف نے صبر کیا۔ انہیں جیسا کہ سگڑت سلگائی۔

منیرہ کی بے ہوشی اب ٹوٹ چکی تھی اور وہ کسبنا آرام سے سو رہی تھی۔۔۔۔۔

ڈاکٹر حنیف چوبیس گھنٹے میں جہاں طلبہ دیکھ کر کھٹے رہے اور سب سے اب صبح، شام، گھر دیکھتے تھے وہ لڑکی انہیں ایک مدمس لگتی تھی۔ ڈاکٹر کو ہر تھی کہ منیرہ نے اپنی بیماری میں ذرا بھی توشہ نہ کیا۔ انہاں نہیں کیا۔۔۔۔۔ جب اسے ہوش آیا وہ جب جاب آگئے ہیں بندہ کے بیٹی رہی..... جب ڈاکٹر نے اسے صحت یابی کا دوا دے سنایا تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی ایک لہر بھی نہیں آئی..... اس نے ایک دفعہ بھی کڑوی دوا پر منہ نہیں بنایا۔ ایک بار بھی ڈاکٹر سے نہیں پوچھا کہ یہ بازو چھین کرنے والے جگشتوں کی انتہا کب ہوگی۔۔۔۔۔ اور ایک دن جب کمرے میں ان کے دو منیرہ

کے علاوہ کوئی نہ تھا..... ڈاکٹر صاحب اپنی حیرت کا اظہار کر رہی تھیں۔ انھوں نے کہا ”میرہ، تمہیں نہیں معلوم کہ تم کسی خطرات کا
حالت میں ایک دن ایک رات پڑی رہیں۔ تمہارے گھروالے کیسے پریشان تھے..... اور میں..... یہاں اسی کرسی پر بیٹھا ہوا
..... تمہیں تک رہا تھا..... مجھے نہیں معلوم کہ دن کب نکلا اور رات کب آئی..... مجھے تعین نہیں تھا کہ تم اس صبح کو سہارا
لوگی..... مگر تم..... ایسا لگتا ہے کہ تمہیں اپنی صحت پر نہ حیرت ہوئی نہ مسرت..... کیا تمہیں اپنی زندگی میں نہیں
میرہ نے سر اٹھا کر مہر ڈاکٹر کا چہرہ دیکھا..... پھر تمہیں جھکا لیں اور اہستہ سے کہا ”ڈاکٹر صاحب نے زندگی
میں کیا ہے جس سے پیار ہو..... میرا مطلب اپنی زندگی سے ہے“

بڑھے ڈاکٹر نے چونک کر بے خبر کھنکھانے لگے۔ اس نوجوان لڑکی کو دیکھا..... جسے آرام دہ گھر اور شفیق ماں
باپ نصیب تھے جس نے اچھی تعلیم پائی تھی اور جس کے اگے طویل زندگی کی اُن گنت بیڑیاں چڑھنے کو تھیں..... زندگی جس کی ہر
ہے جو تمہاری زندگی میں نہیں؟

میرہ کے لئے اس بات کا جواب دینا کچھ بہت آسان نہ تھا، اس نے عجبت میں آؤ ہڈیاں بھلی کے نغمے کو دیکھا اور پھر گردن
نیچ کر کے کشمیری غائبی کے پھول شمار کرنے لگی۔

ڈاکٹر نے میرہ کے چہرے پر جذبات کی کشمکش دیکھی اور اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کے شانے کو پیار سے تھپکا۔ میرہ میں مختلف
بیادوں کا علاج کرتا ہوں..... بہت سے نرم بہت سے نامور میرہ انھوں اچھے ہوئے بہت سے مریضوں کو درد اور طبیعت
کی حالت میں میرہ انھوں سکون پہنچا..... مجھے نہیں معلوم کہ ڈاکٹر کے علاوہ میری انسانیت کی بھی کوئی وقعت ہے یا نہیں..
..... مگر تم سمجھ سکتی ہو..... اور تم ہی بتا سکو گی کہ کیا میں تمہاری مدد کرنے کا اہل ہوں یا نہیں..... تم اپنی زندگی سے
بیزار کیوں ہو.....

ڈاکٹر نے اپنے ہاتھ کے نیچے میرہ کے شانے میں ایک پاٹ محسوس کی اور دیکھتے ہی دیکھتے میرہ کے زرد رخساروں پر
آنسوؤں کی وحار بہہ نکلی..... ڈاکٹر بے قصد زندگی کی بھی کوئی قیمت ہو سکتی ہے..... آپ کی زندگی کا نصب العین بہت
بلند ہے، آپ ایک بے صرف زندگی کی بے کیفی کا اندازہ نہیں لگا سکتے.....

ڈاکٹر تھپکے بڑھے چہرے پر مٹھلی مسکراہٹ بھلی میں بھی بات ہے؟ تم نے اپنی خوش نصیبی کا بھی احساس کیا کہ نہیں
اپنی زندگی کی قدر ہے اور اس کی تضحیح تمہیں دے رہا ہے۔ تم کچھ کرنا چاہتی ہو اور اپنی بے کاری پر غور ہو..... جب تمہیں اپنا
مرض معلوم ہے تو علاج کیوں نہیں کرتیں، اس کی دوا بھی تمہارے پاس ہے؟

میرہ نے سوالیہ نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھا اور چہرے پر امید و ہم کی لہر لپکیں..... ڈاکٹر نے کھلی ہوئی کشمکش کے باوجود
ہمائل جیسے نیلے آسمان پر میرہ کا مستقبل دکھا ہوا دھڑکنے والے لیے جس کھنکھانے..... ایک بھی بیٹی
کے فرائض ادا کرتی ہو اور اب..... جب کہ تمہارا تمہارے مطالبات پڑھ رہے ہیں تو تم ایک کامیاب بیوی اور قابلِ فخر ماں بن سکتی
جو تم اپنا گھر اپنے ہاتھوں بہتر دیکھو گی اور دنیاوی دشمنی تمہارا سامنے ہو گا ہے تمہارے دل کے پکار ہو..... اور.....

میرہ کے چہرے پر زرد مایاں کھنڈنے لگیں، اس نے گلو گھبرا دیا کہ ”بس ڈاکٹر.....“

ڈاکٹر نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ اور گتھارے عوام اس سے بھی بڑھ کر ہیں، تمھاری سمیت اس سے بھی زیادہ ہے، تم اپنی قوم و اربابان لا محذور مچا رہی ہو..... تو تم ڈاکٹر کیوں نہیں مٹیں..... لیڈی ڈاکٹر.....“

” لیڈی ڈاکٹر؟“ منیرہ کے منہ سے جی کی طرح نکلا۔

” ہاں تو ڈاکٹر نے آہستہ سے کہا: بشرطیکہ تم اپنی زندگی سے اپنا اور اپنوں کا حق نکال لو..... تمھارے دن اور تمھاری راتیں بھر آرام دہ گھر اور خوش باش گھروالوں کی نہیں بلکہ رونے بجتے مریضوں اور بیماروں کی ہوں گی..... اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر اپنے فرائض کا احساس رکھنا تمھاری زندگی کا ہر لمحہ، قول و جواب کا.....“

شہت جذبات سے اس کا سانس پڑھنے لگا۔ مجھے ایسی ہی زندگی کی فضا ہے ڈاکٹر..... میں اپنی زندگی میں اپنا کوئی حق نہیں چاہتی.....“ پھر دفعہ وہ چوکی: ”گر ڈاکٹر میں نے تو کبھی بھی سائینس نہیں لی..... میں نے تو سیریکم برج جی آرٹ اور ہسٹری لی مٹی.....“

ڈاکٹر حفیظ ہنسے لگے: ”تم نے جو کچھ نہیں کیا، وہ اب سیکھ لو گی..... پانچ سات برس ابھی تمھارے لئے اہم نہیں اور منیرہ ایک سمجھدار ڈاکٹر سے اب خدمت شعار بن کر کسی طرح کم نہیں ہوتی..... تم بڑی اچھی نرس بن سکتی ہو۔ اگر تم جابروں میڈیکل کالج میں پڑھنے کے علاوہ شام کو کچھ بچے سے آٹھ بجے تک سرے زنگ ہوم میں آ جا کر دو۔ ایک گھنٹے تک اسٹاف رن کی مدد کرنا اور ایک گھنٹہ تک میری کلاس میں لیکچر لینا..... تمہیں اس سے بڑی مدد ملے گی..... بولو نیار ہو“

” بالکل تیار ہوں“ منیرہ نے بھڑائی ہوئی آواز میں کہا: اگر میں ڈاکٹر بن سکی تو کم از کم آپ کے زنگ ہوم کی نرس تو بن جاؤں گی“

اور منیرہ ڈاکٹر حفیظ کے زنگ ہوم کی نرس بن گئی! وہ لیڈی ڈاکٹر نہیں بن سکی۔ اس نے کبھی سائنس نہیں پڑھی تھی۔ اور کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ اپنی زندگی میں اپنے لئے کچھ نہیں پاسکے گی۔ تو آج سے بولوں دوسروں کے لئے وقف کرنا ہو گا..... اسے میڈیکل کالج میں داخلہ نہیں لی، سکاگر ڈاکٹر حفیظ کے زنگ ہوم کے دورانے کھلے ہوئے تھے منیرہ نے ہلکے نیلے رنگ کی ”جوکر“ سے گرنے نیلی جا رٹ کے پرے نوچ پھینکے اور شکور ڈیڑھ گھنٹے کے بعد لانا سیکھنے لگی..... وہ روز جمع کو زنگ ہوم میں اسٹاف نرس کے ساتھ زخمیوں اور مریضوں کی تیمارداری کرتی اور شام کو ڈاکٹر حفیظ کے لیکچر سنتی..... کمزورانی کو اس بات پر گارنٹری بھی تھی اور پریشانی بھی..... ان کے بے حد خواہش تھی کہ جلد سے جلد منیرہ کی شادی سے فارغ ہو جائیں اور کسی طرح اپنے اس نامعلوم خوف سے نجات پالیں چو منیرہ کے ساتھ ساتھ ان کے دل میں پیدا ہوا تھا اور جس کا داخلہ منیرہ کی شادی تھا..... وہ اس پر بھی آمادہ نہیں کہ اگر ان کے بھائی محمود میاں اپنے اس بیٹے کا رشتہ بھی نہیں جو منیرہ سے چند ماہ بڑا تھا، تو فوراً ہی منظور کر لیں گی۔ اور اگر منیرہ کا چھوٹا بھائی رفیع جواباً بھینٹیں کر گیا، چھوٹے کو کبھی رشتہ چاہیے تو قاضی کا بھی انتظار نہ کریں گی۔ مگر..... محمود میاں کی دلیں نے چھوٹے بیٹے کا رشتہ بھی اپنے صیکے میں لے کر لیا تھا۔ اور رفیع آج کل کسی ایٹھکھانڈہ بچہ سینئر کے فرائض میں دلہانے ہو رہے تھے! کمزورانی بک جھک کے خاموش ہو گئیں اور منیرہ اطمینان سے موڑ ڈرائیو کر کے زنگ ہوم جانے لگی.....

کنور صاحب بھی بچوں کی طرف سے عجیب قیمت لائے تھے۔ ایک ہی بیٹا اور وہ بھی ہاتھ سے نکال سکتے۔ ناصر میاں اُس کا رُک کر جو بیٹ جوت کا ادادہ ترک کر کے ہندوستان آئے تھے اور مسز ایڈنا ناصر بھی ہمراہ تھیں! وہ بیوی کو لے کر کھڑکے اور وہیں ممکن تھا کہ اکلوتی ہو کر سوسائٹس گھر کی رونق سمجھنے لگے۔ مگر مشکل یہ آئی کہ مسز ایڈنا ناصر ہندوستانی لباس پہننے کی نسبت اپنے عاشق زاد کو تڑپتا چھوڑ کر ولایت لوٹ جانا ہنر سمجھتی تھی۔ اور کنور رانی سے یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ وہ عزیزوں اور دوستوں میں ایسی ہوسا بننے لگے کہ نگلیں جو دیکھتی دوسالہ بیٹی نعیمہ کی طرح ایک مختصر نیلوارا رنگا لمبے ہی اپنے لئے کافی سمجھتی ہو۔ اور پٹے میں کفایت کے لئے نہ صرف وہ پیر اور پاجامے سے نالوں پر جانے لگے۔ کنور دیشتر ایسے فرما کہ اپنے جو نہ صرف استغنیوں کے شائق تھے، سبھی عاری ہوں۔ کنور رانی تو ڈوٹی جا رہی تھیں اور خزانے بڑا فضل کیا کہ ناصر میاں کو دہلی میں فوراً ہی اچھی خاصی ملازمت مل گئی اور وہ وہاں کو لے کر چلے گئے ورنہ اور کس میں جھٹک بھگتی۔

دوسرے طرف سے بول تو ماں باپ کو اطمینان تھا کہ وہ اپنے گھر خوش ہے۔ میاں نذر دان ہے، مگر وہ میر کی صحبت گھر والوں کے دل کو بوجھ دیتے تھے۔ وہ شروع سے وجہان پان سی مگر وڑکی تھی اور آئے دن کے زہر خانوں سے اس کا حلیہ اور گڑبڑ لیتا تھا۔ ہر سال دسمبر کا مہینہ ایسا تھا کہ کسی کی آئی ٹل جائے مگر وہ سید کا چہرہ نہ ملے۔ ایک کی زبان نہیں کہتی۔ دوسرے نے پاؤں اٹھا نہیں سکیا اور غیر اخیر سے کہہ دیں آگیا۔ بے چاری لڑکی انبیاس میں مبتلا تھی اور اکثر اختلاجِ قلب کی شکایت ہوتی۔ بیٹی کی یہ کیفیت دیکھ کر کنور رانی کو نرسہ نواسی بھی اچھے نہیں لگتے تھے۔ اب رہی میر تو اگر وہ شریفہ کی لاکھوں کی طرح دو بول بچہ کرنا چاہتا تو شاید ماں باپ کے سر سے کوئی بات نہ جاتا مگر اس نے تو ڈھنگ ہی دوسرا بنا لیا تھا۔ اس کا ارادہ شادی بیاہ کا نہیں تھا۔ کنور رانی اکیلے میں میاں سے کہیں کہ میری زندگی تو اول ہی عذاب تھی مگر اس کنوار بیٹی کو اس طرح بے یار و مددگار چھوڑ دی تو قریبی بھی چین نہ ملے گا۔ خدا کے لئے میر تو کھجاؤ کہ بہ شریف بیٹیوں کا طریق نہیں، ہمارے خاندان میں آج تک کسی نے یہ کام نہیں کیا ہے۔ خدا کی شان ہے کہ جن بچوں کو جینک بھی آتی تو ہم نے میسوں حکیم ڈاکٹر جمع کر کے اب وہی پتہ دوسروں کی اچھی بُری بیماریاں میں ہاتھ ڈالیں۔ دینا بھیرا ناگ بھوک صاف کریں اور چھٹی پھوڑوں کو چھوڑیں۔ کیا ہماری مرضی اولاد کے لئے کوئی حقیقت نہیں رکھتی؟

کنور صاحب میرو کے لئے کوئی اور راستہ سمجھتے تو اس کو بھی سمجھانے۔ اس رستے پر اگر میر پر معمول گئی تھی کہ کسی اس نے خود کو باندھ بھی محسوس کیا تھا۔ حالانکہ اس کی منزل کوئی نہ تھی مگر سفر کی گھاگھی میں اس نے پیچھے دیکھا اور اگلے سر پہنا چھوڑ دیا۔ ہر روز ان کے ملحق گھر میں چپ چاپ رہنے والی لڑکی اب ڈاکٹر حفیظ کے بیاروں اور کراہٹوں سے بھرے جیسے زنگہم ہم میں ہمیشہ مسکاتی رہتی۔ یہاں وہ کنور صاحب کی بیٹی اور دیکھتی ہیں نہیں تھی۔ یہاں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ نیپال کی طرف سے روشت پیچھے ان کا خاندان پوسٹ سے جا ملتا تھا اور گھر والے شاکی تھے کہ اس نے خود کو اس وراثت کا اہل کیرن نہیں قرار دیا۔ مگر۔۔۔۔۔ یہاں اس کی اپنی ذاتی شخصیت تھی۔۔۔۔۔ ذاتی وقار تھا اور اس کی انجی معصوم اور مہربان سکرامٹ تھی۔۔۔۔۔ میرو کی وہ جوانی بھی اپنی تھی جو بیٹی تالی کے اپنے پہاڑوں میں جنم لے کر گھر کی عبوس فضا میں، لنگنی رہی اور اب اس نے ماحول میں چونک کر میرو کے گرد پٹ کی مٹی۔

کے دوسرا تک اوروں کے غم میں اس کے لئے مسکراہٹ چھٹی رہی اور مزیدہ کو ایسا لگتا تھا کہ اب وہ اور جلیا، اسی طرح ایک دوسرے کے ساتھ اس شاہزادہ کے کمانے چلتے چلتے اپنے منزل پر پہنچ جائیں گی اور آخری دم ان کے دل کو یہ سکون ہو گا کہ انھوں نے ان گنت تلواروں سے چھنی ہوئے سے بچائے..... مگر جلیا کی راہیں مختلف نکلیں..... اس کی منزل اور غمی اور راضی بھی اور مل گیا!

ڈاکٹر حنیف نے نرسنگ ہوم میں جلیا کو الوداعی ووٹ دی..... مزیدہ بھی موجود تھی، سب ہنس بول رہے تھے۔ گارہے تھے اور مزیدہ کے دل میں یہ احساس چلیاں لے رہا تھا کہ زندگی جو مل رہی ہے اور وہیں ان گنت ہیں..... سانس بھی مل جائے اور بعض تڑپ تڑپ کر تنہا بھی مر جاتے ہیں..... زندگی مسکراہٹ بھی ہے اور آنسو بھی..... جس کے نصیب میں جو بھی آجائے!!

پھر اس کے نصیب نے ایک خلا..... بے کیفی اور تنہائی کا ختم اس کے سامنے کھول دیا اور اس سنسنی پوری مصل سے لڑتے ہوئے اس کا دل سیشہ سے کہیں زیادہ ویران تھا اور یہ بستر انگلیاں اور ہینک ڈھیل پر بے جان لکڑی کی طرح کسی ہوئی تھیں..... میڈیسن کے کمزور طب کمرے کے وحشہ لگے ہیں اور بھی سسک سسک رہے تھے اور انسان سڑک کو نکلتے تھے تنگ کر مزیدہ کی ہلکیوں پر بھلے ہوئے لگے تھیں۔ یہ دو چار میل کا رستہ جو روز بیک بچکے گزر جاتا تھا، آج پلوں کو جھپکائے دینا تھا۔ تاہم وہ مشغور کی طرح اونگھی نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں بھی کھلی ہوئی تھیں اور اس میں جھلک رہا تھا کہ اگر تھی مضبوط تھی۔ پھر کیا ہوا..... مزیدہ کو معلوم نہیں..... سڑک پر کوئی راہ گیر نہ تھا۔ موٹر کی سرخ لائٹ کے ساتھ دوڑتی ہوئی ٹکاہوں نے کسی شخص کو نہیں دیکھا اور پھر بھی..... سیمنٹ کی چکنی سڑک چھپکتی ہوئی بیوک نے جھٹکا کھایا اور فضا میں ایک ولدوز انسانی پیچ گوئی!!

”کیا ہوا؟“ شکر اپنی غموں سے چونکا۔

”منہ ہونے پوری طاقت سے بریک مارنے ہوئے کہا: اللہ جانے“

لڑتے ہاتھوں سے مثل پٹ کھولا اور ڈاکٹر نے قدموں سے پیچھ دوڑی جہاں ہندوڑ کے فاصلے پر انسانی گرد، شنائی دے رہی تھی۔ کھلنا تے ہوئے سیاہ دھڑ پر جھک کر مزیدہ نے فرط خوف سے، دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا۔ میپ پوسٹ کی کھلائی روشنی میں اس نے ایک زرد چہرے کے علاوہ سڑک پر ہل کھائی ہوئی خون کی تپنی سی دھار بھی دیکھی۔

”یا اللہ یہ کیا ہو گیا؟“ اس نے گھٹی جوتی اور وہیں کہا۔

”شکر نے جھک کر اسے ٹھٹھا“ بی بی۔ یہ تو مر گیا بے چارہ“

”تڑپ کر مزیدہ سڑک پر دوڑا تو کوئی اور کچھ ہاتھوں سے اس کی کلاٹیاں نکالیں..... اس کے بعد زنی اودھ کوٹ میں اس کے دل کی دھڑکنیں دھونڈنا چاہیں..... وہ کیا رنگ چھپا..... افزہ..... ہٹے ہوئے..... چھوڑ دو“

میزہ گھبرا کے کھڑی ہو گئی یہ اسے لے چلو شکور..... جلدی کرو۔
 شکور پک کر گیا اور موٹر کو پیچہ سرکالایا..... میزہ کے جسم میں سر سے پتھر تک سنسنی دوڑ رہی تھی اور دل بٹنے اور
 سے دھڑک رہا تھا..... شکور کی مدد سے اس نے زخمی کو اٹھانا چاہا تو وہ پھر چپٹا ہاٹے چھوڑ دو، خدا کے لئے.....
 مجھے موت چھوڑ، میزہ کے ہاتھ سے وہ چھوٹے چھوٹے پچا۔ بدلت دولوں نے اسے پیچھے کی سیٹ پر ڈالا اور میزہ بھی اس کے
 ساتھ ہی پھیلے جتے ہیں پابند ان پر بیٹھ گئی۔ اس سے شکور سے کہا: ”واپس جلدی رنگ جرم!“
 شکور نے گاڑی کھائی اور میزہ نے اندر کی روشنی کھول کر اسے دیکھا..... بڑے ڈرتے دیکھا..... وہ ہوش
 میں تھا اور کوٹ کی لمبی آستینیں میں سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ ”آپ اچھے ہو جائیں گے۔“ میزہ نے اس کی
 درناک نظروں کی زد سے بچتے ہوئے کہا، وہ بولا نہیں۔ کراہتا رہا اور میزہ کو دیکھتا رہا، میزہ نے پھر کہا: ”مجھے بڑا افسوس
 ہے..... مگر آپ اچھے ہو جائیں گے۔ آپ بہت جلدی اچھے ہو جائیں گے..... میں آپ کو ہسپتال لے چلی ہوں۔“
 ”ہسپتال؟ وہ کراہتا رہا۔ پوری شدت کے ساتھ!
 ”ہاں ہسپتال..... کیوں آپ کیس اور جانا چاہتے ہیں؟“

”میں ابیں کہاں جاؤں گا..... میرا کون ہے.....“ میزہ کو ایسا لگا کہ جیسے اس کی آنکھوں میں آنسو
 بھرتے ہیں۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں میزہ کو چیکر سا آ رہا تھا..... دل اچھل اچھل کر مچلے میں اٹکتا رہا اور ٹھنسی کلاٹیاں
 چھوڑے دے رہی تھیں..... وہ سچ رو دیا تھا..... اس کی بند پکوں سے آنسوؤں کی بارش نہر ککسی اور میزہ کا
 دل جا ہکا وہ بھی بھوٹ پھوٹ کر روئے۔

”یہ میں نے کیا غضب کر دیا!“ اس نے اپنی ہتھیلیاں مسلتے ہوئے دل سے پچھا اور پھر فتنہ شکور کا کن جا پکڑ
 کو گھبروڑنے ہوئے بولی۔ ”نرسنگ جرم جانا بے کار ہے شکور۔ ڈاکٹر صاحب جا چکے ہیں..... گھر چلو..... پھر جا کے
 ڈاکٹر صاحب کو بلانا۔“ شکور نے موٹر کو دوبارہ موڑا اور میزہ نے پلٹ کر اس کی پیشانی پر پکھرے ہوئے بالوں کو میٹھا۔ وہ
 اب بے ہوش ہو چکا تھا..... آستینیں سے خون کے قطرے چپا رہے تھے اور زرو خضاروں پر آنسوؤں کی بوندیں کاپ
 رہی تھیں..... میزہ رونے لگی۔

میزہ اپنے ساتھ اچھی خاصی قیامت گھر لے آئی تھی۔ اس کی ماں پریشان بھی تھیں اور ناخوش بھی..... وہ ہمیشہ
 میزہ کو موٹر چلانے سے منع کرتی تھیں اور کدو صاحب اپنا پاپ سلاک کر رات سے ہی چپ چاپ ٹل رہے تھے۔
 ڈاکٹر حفیظ دودھے ہوئے آئے میزہ نے پیچھے سے کدو بیزا اور کوٹ کو کھٹے کھٹے کر کے آنا ڈالا تھا اور پیچھے
 بے ہوش صمان کے سرٹنے جمی ہوئی اس کا کچلا ہوا بازو دیکھ دیکھ کر اپنی آنکھیں مروڑ رہی تھی۔ موٹر کا پیٹہ جیسے ہانسی ٹپڑی
 کا چوڑا کر گیا تھا.....

ڈاکٹر صاحب نے آئے ہی کہا: ”بھئی میزہ بھئی۔ تم نے تو سارے کتے دھرے پر پانی پھیر دیا۔ بھلا کہیں تم نے بھی
 سنسے کز نہیں.....“ میزہ کی روشنی شکل دیکھ کر ڈاکٹر حفیظ نے مذاق کا ارادہ ملتوی کر دیا اور ملحق کا معائنہ کرنے لگے۔ ”شکر

کرد صرت کمنی پر سے ہڈی لٹی ہے اور باقی محض گزشت چھٹ لگیہ ہے۔ ہم صبح آپریشن کے ہڈی جو ٹوڑیں گے..... فی الحال زخم صاف کر کے خون روک دیا جائے..... کیوں منیرہ؟

”جی ہاں..... مگر یہ بے ہوش کیوں ہو گیا ہے ڈاکٹر؟ منیرہ نے بغیر ارادہ کئے سوال کر ڈالا۔

ڈاکٹر حفیظ نے تعجب سے منیرہ کو دیکھا۔ شاید دو ماہ بعد آپ کو ہنرل سپتال جا کر زرنسنگ کو امتحان دینا ہے منیرہ بیٹی! حیرت ہے کہ مر نہیں گیا..... بڑا جاننا زرنسنگ جس نے تمہاری ٹیچریم مریٹھا مقابل کیا اور محض ایک بازو پرستی..... اگر کہیں آپ کا ہتھہ اس کی گردن سے گزرجانا؟

ڈاکٹر حفیظ کے مذاق کا منیرہ دبا بھی لطف نہ لے سکی۔ یوں ہی انگلیاں جھٹکتے ہوئے اس نے پیر پوچھا: یہ چھپا ہوا جائے گا نا؟

ڈاکٹر حفیظ نے کہا: اپنسلول سے پوچھو..... تم نے کیسے کیسے زخمیوں کی تیارداری کی ہے؟

منیرہ کا دل آج بھی مار اس کے اختیار میں نہ تھا..... نہ وہ اس سخت سے کبھی دھڑکا تھا اور نہ منیرہ نے دماغ کو دل سے آج کی طرح ہار مانتے پایا تھا..... وہ خاموشی سے ڈاکٹر حفیظ کے ساتھ اس بے ہوش زخمی کی مرہم پٹی کرتی رہی اور بار بار مارا مٹا کئے والے آئسروں کو دوپٹہ میں جذب کرتی گئی..... خون بند ہو گیا کہ بہت سانچوں لوصاف ہوتے پکٹا تھا اور مریض کا جواں اور زہرا ہوا چہرہ لاش کی طرح سفید نظر آ رہا تھا..... منیرہ نے ڈاکٹر کی نظر پھلکے دو تین مرتبہ اس کے ماتھے پر بکھرے ہوئے بالوں کو مٹایا..... ڈاکٹر کی نظر بچا کے..... جانے کیوں۔ حالانکہ زرنسنگ ہوم میں اس نسبت سے کمزوروں اور زخمیوں کے کنبھے ہوئے بالوں کو سلجھایا تھا..... مگر آج اسے یہی بات ”محض فرض“ سے کچھ مختلف لگ رہی تھی۔

جب تک نیاز کو ہوش نہیں آیا، ڈاکٹر حفیظ وہیں کرے میں بیٹھے منیرہ سے باتیں کرنے رہے، ایک دفعہ انھوں نے منیرہ سے کہا: ”مجھے خوب یاد ہے کہ آج کی طرح تم اس دن بھی ہر اسان اور مدح اس نہ نہیں جب تمہیں نوٹیر ہو گیا تھا.....“ منیرہ بولی: ”ڈاکٹر صاحب جان دینا جان لینے سے کہیں زیادہ آسان ہوتا ہے..... اگر اسے کچھ ہو گیا تو منیرہ صبر عمر بھر مجھے ملامت کرتا رہے گا..... میں کبھی آپ کے زرنسنگ ہوم میں قدم نہ رکھوں گی۔“ ڈاکٹر حفیظ نے بڑا عظیم الشان فغفہ لگایا..... نیاز نے پت سے آنکھیں کھول دیں اور اضطراب آمیز تعجب سے ڈاکٹر حفیظ اور منیرہ کو دیکھنے لگا۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی کرسی پلانٹ کے نزدیک کیلچنگ کراس کی نبض پر انگلیاں رکھیں اور بولے: ”میں ڈاکٹر ہوں..... بیلڈ کی نرس ہے..... اور ابھی بیلڈ کی مجھ سے کہہ رہی تھی کہ اگر تم اچھے نہ ہوئے تو زرنسنگ اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا رہے گا اور وہ کبھی بھی میرے زرنسنگ ہوم میں کام نہیں کرے گی! لہذا میں تم سے اپنی کروں گا کہ جلدی سے اچھے ہو جاؤ۔“ نیاز نے گردن کھما کے سروانے کھڑی ہوئی منیرہ کو دیکھا جو شپٹا کے اپنا ہونٹ چبا رہی تھی۔

”مجھے کیا ہو گیا ہے؟“ نیاز نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

ایک جیب میں سے چاندی کا سرگیٹ کیس اور لائٹر ملا..... دوسری جیب میں باکر قلم، رومال اور دھوپ کا تپتہ تھا جس کا ایک شیشہ اس عادت کے کی نذر ہو چکا تھا۔ اندر کی جیب میں جھڑے کا پرس تھا جس میں چند نوٹ تھے۔ پچھو بگاری، ننھی، ایک اس کا اپنا فوٹو تھا اور ایک رسبدرختی جس پر اس کا نام لکھا تھا۔ "نیا ز احمد خاں"۔

"نیا ز احمد" منبر نے آہستہ سے کہا اور اس کی جیبوں سے نکلا ہوا سامان لٹاگ کے سر ہانے میز پر کھدوایا۔ پچھو بیروں ہی خواہ مخواہ کر کے بین تختی رہی۔ پچھو کسی کھسکا کر پیگ سے ملا دی۔ پائنتی سے اپنی رضا کی اٹھا کر کبیل کے اوپر آہستہ سے پھیلادی اور سبز رنگ کے بلب والا لیمپ روشن کر کے بجلی لگ کر دی..... کمرے میں سکون ریز سبز روشنی پھیل گئی۔

دھیرے سے ہاتھ دیکھا کر منبر نے اس کی پیشانی کو چھوا..... جسم سرد تھا..... پلو خدا! شک ہے کہ بجا نہیں ہوا اور نہ سینگ کا درد تھا..... ہونٹ خشک ہوئے تھے۔ جنگا کر بانی دینا تو غلط ہے..... ڈاکٹرنے تو اٹھا کر دوا پلانے کو بھی منع کر دیا ہے..... اس لئے پول رہنے دو..... چہرہ اور گردن کو سردی تو نہیں لگ رہی ہوگی..... کہیں کھنٹ ٹھنڈا اور نہ ہو جائے۔ منبر نے اپنی گردن سے شمال آتا کر بڑی احتیاط سے اس کا سر گردن اور شانے ڈھک دیئے۔ الماری سے گرم چادر نکال کر اپنے گرد پٹی اور کسی پریم دراز ہو کر اس کو دیکھنے لگی..... کون ہے یہ؟ کون ہے بے چارہ؟ کون ہے یہ نوجوان..... میرے راتنے ہیں کیسے آگیا.....؟

ملا ایسے نیاز نے اٹھ کھولی..... ننھی بازو اٹھا تاچا اور چنچ ماری..... منبر نے بے بیدار ہونے دیکھ کر گلاس میں اس کے لئے دوا انڈیل دی ننھی تختی — دوڑ کر آئی..... کیا بات ہے؟

مجھے کیا ہو گیا ہے..... میرے ہاتھ کو کیا ہو گیا..... ہائے ہائے! وہ چھوٹے پتوں کی طرح چل رہا تھا۔ منبر گھبرا گئی..... یہ تجربہ اس کے لئے نیا تھا۔ اکثر بعض شور مچا کر سارا دار و سر پر اٹھا بیٹھتے تھے، تاہم اس سوال کا جواب دینا منبر کے بس کی بات نہ تھی کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ غالباً رات ڈاکٹر نے جو کچھ سے بتایا وہ بھول گیا تھا..... تم کون ہو؟ اس نے منبر سے پوچھا۔

"نرس! منبر نے آہستہ سے کہا اور بائیں شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے پیٹنے کی کوشش سے باز رکھنا چاہا۔

"نرس! پچھو اس نے منبر کو جانی پہچانی نظروں سے دیکھا اور لیٹ کر مصروفیت سے بچھا۔ میرے ہاتھ کو کیا ہو گیا؟

"موٹھے پھل گئی....." منبر نے بعد مشکل ہونٹوں پر زبان پھیر کر یہ الفاظ کہے۔ "گھبرائیے نہیں آپ بہت جلد چلے ہو جاتے گے۔"

"ہائے موٹھے پھل گیا! وہ دوبارہ شور مچانے پر آمادہ تھا۔ کیسے پھل گیا، کس کی موٹھے پھل گیا؟

"میری موٹھے..... منبر نے مجرا شانہ انداز سے سر جھکا کر کہا۔ مجھے صاف کر دیجئے..... میں بہت شرمندہ ہوں۔"

ادب ضبط کے باوجود پچھو اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے جنہیں وہ چھپا نہ سکی۔

"اسے آپ زبردستی ہیں..... خدا کے لئے آنسو نہ پچھو..... آپ تو کتنی ہیں کہیں اچھا ہو جاؤں گا۔ وہ ڈر کر اپنا دکھ بھولی گیا۔ منبر نے ایک ہاتھ سے اس کے سر کو سہارا دیا اور دوسرے ہاتھ سے دوا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا.....

دوایہ کر اس نے بڑا منہ بنا لیا۔ بانی لاؤں گی کے لئے؟ الائیگی کہا جی گئے آپ؟

”نہیں“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”سگریٹ پھینک دو“

”سگریٹ“ منبر و لکھلائی..... زنگم ہوم میں تو ڈاکٹر کی اجازت کے بغیر بیٹوں کو سگریٹ پینا ممنوع تھا۔ وزڈاکٹر صاحب کو آنے دیجئے۔ ان سے پوچھ لیں۔“

”میری معافی تو آپ ہیں“ اس نے غصے سے کہا۔ ”جی آپ سے پوچھنا ہوں۔“

منبر و خاموشی سے آٹھی..... میز سے سگریٹ کین اٹھا کر لکھلا اور ایک سگریٹ نکالی کہ اس کے لبوں میں کھپکھپادی پھر لاٹرکھو لا اور سگریٹ روشن کیا..... اب وہ کمر کھٹکائے کرسی پر بیٹھی تھی اور وہ سگریٹ پی رہی تھی۔ اس کا چہرہ تنگ رہا تھا۔

ڈاکٹر حفیظ اپنے ساتھ اپنا کپاؤ لٹا کر ایک نوٹس بھی لائے..... آتے ہی انھوں نے منبر و سے رات کی کیفیت پوچھی اور کہا کہ اب میں آپریشن کروں گا تو چار سو جاتوں۔“

منبر و نے اجازت چاہی کہ کیا وہ آپریشن کھدو، انہیں کمرے میں لے کر سکی ہے؟ ڈاکٹر نے اجازت دے دی۔

کچھ دیر بعد آپریشن شروع ہوا..... کپاؤ لٹا رہے سے بے ہوش کیا اور ڈاکٹر حفیظ نے جراحی کی..... دوسری نوٹس ان کا ہاتھ بٹا رہی تھی اور منبر و کی کمرے کے فاسے پر لکھیں بھاڑے کھڑی تھی اور دل کہہ رہا تھا، اللہ میری لاق رکھ لیجیو۔“ جب آدھ گھنٹے بعد ڈاکٹر حفیظ میرے پاس سے بٹے اور نوٹس چپاں باندھنے لگو، ”منبر و نے ڈاکٹر حفیظ کے ہاتھ دھوئے ہوتے نشتر کا کھینچ لیا۔“

ڈاکٹر نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔ ”مجھے یقین ہے کہ میں ایک کامیاب خیر بردار ڈاکٹر ہوں..... کیا تمہیں شک ہے؟“

منبر و جھینپ گئی۔ ”جی یوں ہی بدحواس ہوں ڈاکٹر صاحب۔“

ڈاکٹر حفیظ اس کا لکھنا کہ کمرہ رانی کے کمرے کی طرف لے گئے۔ ”کنور رانی صاحبہ..... منبر و کو نیند کی ضرورت ہے..... اسے اپنے کمرے میں سوئے دیجئے..... یہ ناشتہ کر کے سو جائے اور جب تک میں شام کو واپس نہ آ جاؤں، اسے آپ ریفین کے پاس نہ جانے دیں۔“

پھر انھوں نے منبر و کو بتایا کہ مریض کے ہوش میں آئے، ”تک کپاؤ لٹا رہا ہے، دیکھو شام تک میں بھی ٹھہرے گی۔“

کنور رانی کے حکم سے منبر و نے بلا خواہش چائے، اور پیکنگ پر بیٹھ گئی۔ ”نیز کسی طرح نہ آتی تھی اور کنور رانی برآمدے میں بیٹھی مغلانی کو اپنے غراؤں کا مہرچا پتھار رہی تھیں..... کمرے سے نکلنے کی ہمت نہ تھی۔“

”کئی گھنٹے بعد کئی کئی گھنٹے کا وقت گزرتا تھا۔ کنور رانی خانہ سماں بھی تھیں، منبر و کو کھانا پڑا، پھر اس نے ایک ماما سے کہا میرے کمرے میں جو نوٹس ہے، اس کو بلا لاؤ۔“ نوٹس آئی تو پھر ہوتے ہی منبر و سے نیاز کی شکایت کرنے لگی۔

”بڑا مشکل حالات، اچھے تو کھانے کو دوڑتا ہے، جبکہ ہوش آیا ہے اور دم چارہ ہے..... کہتا ہے، رات والی نوٹس کہاں گئی؟“

”ہائیں؟ منیرہ نے بندوقی بے اعتنائی سے پھر پوچھا۔

”ہاں جی اور کیا میرے ہاتھ سے تو دوا بھی نہیں پیتا۔“

اب منیرہ کا دل جا پا کر دوڑ کر جائے اور اسے دوا تو پلا ہے مگر ڈاکٹر کے آنے میں وہ بیٹھی افس واپس جی ادھر منیرہ کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر ڈاکٹر کی راہ نہ گئے تھی۔

ڈاکٹر جنید بلاشبہ کامیاب تجربہ کار ڈاکٹر تھے۔ شام کو جب وہ منیرہ کے ساتھ نیاڑکے پاس پہنچے تو نیاڑے مسکرا کر دروہی کی کا اعتراف کیا۔

ڈاکٹر جنید نے کہا کہ پندرہ دن ہیں وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ ادھر منیرہ کو اجازت دی کہ وہ پندرہ دن تک نرسنگ روم کے بجائے گھر پر ڈیوٹی دے۔

نیاڑے پھر شور نہیں مچایا۔ رات کو اس کے پاس کسی نرس کی ضرورت نہیں تھی۔ کئی صاحب کا ایک نوکر رات کو اس کے کمرے میں سو جاتا اور منیرہ یہ بہادیت کر کے براہ راست کمرے میں سوتے چلی جاتی کہ یہ جاگیں تو مجھے بھی بٹھا لینا۔ وہ اللہ کا بندہ نوکر تو گھوڑے سے بچ کر سوتا تھا مگر منیرہ کو اکثر رات میں نیند نہ آتی اور وہ بار بار آکے نیاڑے کو جھانک لیتی تھی۔ ایک رات اس نے دیکھا کہ وہ جاگ رہا ہے اور منہ کھلچا کھلچا کر جھانک رہا ہے۔ منیرہ ڈریسنگ گون پہن کر آئی۔ ”کیسے کیا حال ہے؟“

”آپ کی عنایت سے۔“ وہ مسکرایا۔

”جاگ کیوں گئے؟ کسی چیز کی ضرورت ہے؟“

”پہلے آپ بتائیے۔ آپ کیسے جاگیں؟“ اس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈالی کر پوچھا۔

”میری بات سمجھو دینیے۔ میں تو آپ کی نرس ہوں۔“ منیرہ گھبرائی۔

”اور میں کیا آپ کی کا زخمی نہیں ہوں؟“ اس نے شرارت سے پوچھا۔ منیرہ سے وہاں بٹھرنے نہ بنی۔

وہ جینا ہی رہا ”سگریٹ چاہیے۔ ایک سگریٹ چاہیے۔“ منیرہ وہاں سے مہاگ آئی۔ وہ سونہ سکی اور صینٹنگ پلنگ

پر بیٹھی بے چینی سے انگلیاں چٹھاتی رہی۔ نیاڑکی آنکھوں میں کیا ہے۔ باتوں میں کیا ہے۔ دل میں کیا ہے۔؟؟؟

نیاڑکا سیدھا ہاتھ تو خیر بے عار ہی تھا، گمردہ اپنا وہ برا بھلا دستہ استعمال میں نہ لانا اور بڑے اطمینان سے منیرہ

پر حکم چلاتا رہتا۔ منیرہ! ڈاکٹر بیٹ دینا۔ اسے سگریٹ پیسنے کا چوکا تھا۔ منیرہ سگریٹ لاتی تو دوا باندھ بٹھانے کے

بجائے منہ بچاؤ دیتا۔ ہر وقت بعد اس کی سگریٹ بچھو جاتی اور منیرہ کو لاٹریٹ کر دوڑا کرتا۔

دن میں دس منبرہ اپنے ہاں سوار سنے کی فرمائش کرتا۔ منیرہ سر ہانکے کھڑے ہو کر اس کے ہالی سٹوڈی۔

”ٹانگ ٹیڑھی ہے۔“ وہ اعتراض کرتا۔ منیرہ کو وہ بارہ ٹانگ بنانی پڑتی۔ اسے اسے تیل تو ڈال ہی نہیں۔ آخر کار

اسے یہی پسند آ جاتا اور منیرہ بارہ اس کے بالوں میں آنچھ جاتی۔ تندرہ صفا تو آنکھوں میں عاصی گھس جاتا۔ پانی مینا تو

آدھا کلاس اس کے گردیاں میں آٹ جاتا۔ وہ خوب اوندھی مبدھی حرکتیں کرتا اور روز رات کو شب بخیر سے پہلے کہتا۔

”میری باتوں سے آپ کو غصہ تو نہیں آتا؟“

مینو سر جی "کیجیے کبھی نصیحت بھی آسکتا ہے؟"
 وسیہ کو بچوں سے زحمت ہوتی تو وہ جیسے آتی مہرہ نے کہا "آئیے آپا نیاز سے آپ کا تعارف کرادوں"
 وہ دو لونے کے پاس پہنچیں تو مینو نے کہا "نیاز صاحب میری آپا سے ملے..... میں نے آپ سے
 ان کا ذکر تو کیا تھا۔"

نیاز نے کہا "اچھا، یہی ہیں وسیہ آپا" پھر وسیہ سے کہنے لگا "معاف کیجئے آپا۔ مجھے تو اعتقاد نہیں آتا کہ آپ
 مینو کی بہن ہیں۔"

"کیوں؟" مینو بڑی طرح چونکی "اوسیر نے پوچھا "کیوں؟"
 "مجھے دیکھئے نامیرو صحت مند ہے اور آپ کس قدر کمزور ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ ایسی عاقل طبیعہ کے گھر میں رہتے
 رہتے بھی آپ نے کچھ فیض حاصل نہیں کیا....."
 وسیہ بیٹھے لگی اور مینو بھینپ گئی۔ وسیہ نے کہا "یہ ضروری تو نہیں کہ مینو ہماری بھی دیکھ بھال اسی جانشانی سے
 کرے جیسی آپ کی ہوتی ہے۔"

نیاز نے ہنس کر کہا "اس میں شک بھی کیا ہے۔ میرا مرض بھی تو انھیں کا پیدا کروہ ہے!!"
 مینو کا چہرہ مریخ ہو گیا، گردن جھک گئی اور حلق سسک ہونے لگا۔ نیاز کے پاس سے واپس آئیں تو وسیہ بولی۔
 "تمہارے نیاز صاحب آدمی تو عجیب معلوم ہوتے ہیں۔"
 "کافی باتونی ہیں۔" مینو اور کہتی بھی گیا۔

"تم نے بھی کہا تھا کہ وسیہ کہنے لگی۔ اگر خدا نہ کرے کہیں کچھ اور ہو جاتا۔"
 اور پھر وسیہ کو اپنا ایک پرانا قصہ یاد آگیا۔ شوخی سے مینو کو دیکھ کر ہنستے ہوئے بولی "یہی، ہماری بہن جو کہ
 بڑی مبارک ہے۔ انھیں تو معلوم ہے۔ مگر سے میرا تعارف بھی اسی کی بدولت ہوا....."
 مینو نے کھیرا کہ بہن کی طرف دیکھا "جی کیا مطلب.....؟" اور جھجھکا کر وسیہ کی ساری کا ہڈ بکھینچا۔ واہ.....
 خواہ تو وہ..... اور مینو کا اقبال نامی تاج تاج کے اس کے کاؤں میں کہہ رہا تھا "بڑی مبارک گاڑی ہے..... نظیر وسیہ سے
 ملکر کیا تھا اور تم نے نیاز کو بھی کروا دیا..... بڑی مبارک بات ہے....."

اس حادثے کی بدولت مینو نے بہت سی نئی چیزیں پائیں اور بہت سی پرانی باتیں بھول گئی..... ہنسے تھائی ہیں
 سوچنا بھی آگیا۔ روز رات کو جب نیاز کا آخری سگریٹ شلگ کر ادا، دن بھر قی کرنے پر اس کی معدرت منظر کو کر کے سونے کے
 ارادے سے جاتی تو مینو کا دودھ پڑھنا..... وہ غیب و غریب باتیں سوچا کرتی..... بچپن کے سنے ہوئے قصے
 اور چٹھی ہوئی کہانیاں اس کے تصور میں رہتی تھیں..... ان شاہزادیوں کے قصے جن سے جل کر کوئی جاوہر گئی ان کے وراث
 میں جاوہر کیس مٹھو تک دیتی ہے اور وہ کوئی پندہ بن کر رہا ہر ایک جنگ جنگ کی بھیج گئی رہتی ہیں۔..... آخر کار نقد بپلٹیں
 ہے۔ ایک شاہزادہ اگر انھیں جاوہر کے اثر سے بچھڑا ہے اور اپنے بندوں میں باندھ کر ساتھ لے جاتا ہے۔

اور اس شہزادے کی باتیں جو شکا کو گلیا تھا اور زخمی ہرن کی تلاش میں اس کنبی تک پہنچ گیا، جہاں ایک دہریہ کسی بدقسمت شاہزادی کو بند کر رکھا تھا۔۔۔۔۔ شاہزادہ جان پھیل کر شاہزادی کو نکالنا ہے اور بڑی شان و شوکت سے دارالسلطنت میں لے جاتا ہے۔

مینرو کے ہونٹوں پر نئے نئے گیت بھی تھرکتے دھتکتے تھے۔ اُسے ان پندرہ دنوں میں بال سوارنے کا سبق یاد رہا تھا، جہاں رنگوں کا تناسب بھی آگیا تھا۔۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔ پندرہ دن گزر گئے۔ اور نیا رنگہ رہا تھا۔ آج ڈاکٹر نے مٹی کھول دی تو کلی چلا باؤں گا۔“

”کہاں؟ مینرو نے اس کے بال کبھرے چھوڑ دیئے اور سر ہانٹ سے گھوم کر سامنے آگئی۔ کہاں چلے جاؤ گے؟“

”ہوٹل میں۔۔۔۔۔ جہاں سے میرا سامان اپنے منگوا یا تھا۔“

”ہوٹل جانا چاہتے ہو؟ یہاں تکلیف ہے کوئی؟“

”تکلیف؟! ان پندرہ دن کی راحت البتہ تکلیف دہ یا تو بن جائے گی۔“

”تو پھر جانے کا خیال کیوں آیا؟ مینرو نے آہستگی سے پوچھا۔“

”اے بھئی ڈاکٹر نے مٹی کھول دی تو پھر جانا ہی پڑے گا۔“

مینرو خفا ہو گئی۔ ”جناب یہ سرکاری شفا خانہ نہیں۔ مجھ غریب کا گھر ہے۔۔۔۔۔ اور جب تک آپ اپنے

گھر جانے کے قابل نہ ہو جائیں آپ یہاں سے نہیں مل سکتے۔۔۔۔۔ ہاں جب آپ ہیں اتنی طاقت آجائے کہ آپ گھر جاسکیں

تو چلے جائیے گا۔۔۔۔۔“ گھر جانے سے آپ کو یہ نہیں روک سکوں گی۔۔۔۔۔“

گھر۔۔۔۔۔ میرا کوئی گھر نہیں ہے۔۔۔۔۔ آگے سے میرے باپ کا گھر ضرور ہے۔۔۔۔۔ وہ لوگ اولیٰ ہی میرا

باتوں سے ناخوش تھے، اب میری دلہانگی سے اور نالاں ہو جائیں گے۔۔۔۔۔“

”دلوانگی؟ مینرو نے تعجب سے دہرایا۔“ دلوانگی؟“

”ہاں مینرو۔۔۔۔۔ میں نے آج تک کسی کو دھوکہ نہیں دیا۔۔۔۔۔ اور میں تم سے کچھ نہ رہوں۔۔۔۔۔ یہاں

سے جا کر میرے ہالی ہمیشہ ہی اچھے رہا کر رہے گئے۔۔۔۔۔ میں سگریٹ پینا چھوڑ دوں گا۔۔۔۔۔ اور میں بالکل دلہن نہ رہ جاؤں گا۔“

اور اس نے شاہدہ تبیل کی دلوانگی ثابت کرنے کے لئے سگریٹ کو خاکستر دان میں مل دیا اور سر کو جھٹک کر بال ماتھے پر پھیر لئے

۔۔۔۔۔ مینرو کی آنکھوں میں حیرت، ہست اور درد کی مٹی جی کی نیکیاں تھیں۔۔۔۔۔ وہ نیا ڈاکٹر کیجین رہی پھر ہاتھ بڑھا کر اس

کے ماتھے پر پھیرے ہوئے ہالی سمیٹ ڈالے۔۔۔۔۔ وہ صندریہ جون کی حرج پگ پھیل گیا اور اڑیاں لرگڑنے لگا۔ ”میں یہاں

سے نہیں جانا چاہتا۔۔۔۔۔ میں پٹی نہیں کھلاؤں گا۔۔۔۔۔ تم نے مجھے اپنے پاس سے علیحدہ کیا تو میں دوبارہ تمہاری مڑکے

سامنے آکر جاؤں گے۔۔۔۔۔“

ڈاکٹر خفیہانہ آکر غیبیاں کھولیں۔۔۔۔۔ ہڈی پھر پھل چکی تھی۔ مگر ابھی زخم بھرنے باقی تھے۔۔۔۔۔ ڈاکٹر نے کہا کہ ابھی

علیٰ ج جاری رہے گا۔ اور کتو صاحب نے نیاز سے خواہش کی کہ جب تک ڈاکٹر صاحب یہ نہ کہہ دیں کہ وہ پرستور سابق ہو گیا

ہے، وہ یہاں سے نہ جلتے۔

جب شام کو منیر نے فلگ کے پاس میز پر اس کا کھانا رکھا تو اس نے یہ کہہ کر کھانے سے معذوری کی کہ اُلٹے ہاتھ سے نہیں کھا یا جاتا، حالانکہ جب سے اُسے کھانے کی اجازت ملی تھی، وہ برابر اُلٹے ہاتھ سے کھانے کی مشق کرتا رہا تھا۔

”مجبوری ہے“ منیر نے مردانہ بھری۔ پھر تو آپ کو بھوکا رہنا پڑیگا۔“

”ہو نہ، دھڑایا۔ آپ جب میری چارہ گرہیں تو۔۔۔۔۔؟“

”جی اب نہیں! پٹی کھل گئی آپ کی۔۔۔۔۔“

”اچھا یہ بات ہے“ اس نے خفگی سے منہ پھلایا، ”اب تو آپ ذرا پھر اپنی میڈلے کر نکلتے۔۔۔۔۔ بہر دستاں

سلامت۔۔۔۔۔“

”نا بابا! منیر نے کان پکڑتے ہوئے کہا۔ میں یا تو کئی میڈلے چلانے سے۔۔۔۔۔ سب مجھے الزام دھرتے ہیں اور میں

آج تک نہیں سمجھ پائی کہ یہ ہوا کیسے۔۔۔۔۔ آخر آپ نے کہاں۔۔۔۔۔ سامنے تو ہرگز نہیں تھے؟“

نیا زہنے لگا۔۔۔۔۔ ایمان کی بوجھو تو خطا میری تھی۔۔۔۔۔ تمھارا واقعی اس ہی تصور نہیں۔۔۔۔۔ میں نے خدا جی

بہمن دفعہ سڑک پار کرنا چاہا۔۔۔۔۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے موٹر کی آواز سنی اور سڑک پر روشنی پڑتی دیکھی۔۔۔۔۔ جس لمپ پوسٹ

کے اس طرف کھڑا غالباً سکرٹ سسٹم لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔۔۔۔۔ بس ایک ساتھ میں نے سوچا کہ موٹر کڈ رنے سے قبل

سڑک کے دوسری طرف پہنچ جاؤں۔۔۔۔۔“

”یہ آپ کو سوچھی کیا؟ منیر نے حیرت سے کہا۔

”بس حماقت کہو۔۔۔۔۔ ہوش میں تو تھا نہیں۔۔۔۔۔ اس تندی ملی تھی کہ ہر مل پہنچا دو پھر ہوا تھا۔“

”جی؟ منیر نے سمجھ کر کہا۔ آپ نے۔۔۔۔۔ آپ نے۔۔۔۔۔ شرب۔۔۔۔۔ پی لی تھی!“

”ہاں“ نیا نے دیکھا کہ منیر گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔۔۔۔۔ پریشانی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔۔۔۔۔ پھر کرسی

پر بٹھ گئی اور اپنا سر کھینچ لیا۔

”منیر! منیر! نیا زکا چہرہ سفید ہو گیا۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“

”کچھ نہیں“ منیر نے مایوسی سے بلیکس اٹھائیں۔ اس کی نگاہوں میں کرب تھا۔

”نہیں نہیں“ میں جانتا ہوں تم مجھ سے خفا ہو گئی ہو۔۔۔۔۔ تمہیں پھر سے نفرت ہو رہی ہے۔۔۔۔۔ نہیں نہیں منیر

خدا کے لئے۔۔۔۔۔ مجھ سے نفرت نہ کرو، مجھ سے خفا نہ ہو جانا۔۔۔۔۔ میں تمھاری خفگی برداشت نہیں کر سکوں گا۔۔۔۔۔

میں جان دے دوں گا۔۔۔۔۔ اس نے کا پنتا سڑا سیدھا بازو اٹھا یا اور منیرہ کا ہاتھ کپڑا لیا۔

اس کمزور داد زخمی ہاتھ میں انگاروں کی تپش تھی، منیرہ پھر گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔۔۔۔۔ نیا نے عاجزی سے

کہا، ”میرے خون کی لودہ جسم سے تمہیں گھن نہیں آئی۔ مگر میری داندانہ نفرت نے تمہیں مسخر کر دیا۔۔۔۔۔ میں سچ کہتا ہوں

منیرہ، میرے ہر رمز کا علاج تمھارے پاس ہے۔۔۔۔۔ تم کہا ہو گی تو میں بہت اچھا انسان بن جاؤں گا۔۔۔۔۔ تم ہی کو

جسے کسی کی محبت نصیب نہ ہو، وہ اپنے ہوش میں رہے تو کیا کرے۔

منیرہ بیچرنگی اور رکابی میں کھانا اتارنے لگی..... نیاز چھوٹے بچوں کی طرح منہ پھاڑ پھاڑ کر اس کے ہاتھ سے کھانا کھا رہا تھا!

منیرہ کو نیاز کے ساتھ جو خلوص تھا، وہ تیارواری سے کچھ سواہی تھا، یہ بات زیادہ دن تک گھر والوں سے نہ چھپ سکی..... دفعۃً گفتار صاحب نے نیاز سے اس کے گھر اور گھر والوں کا پتہ پوچھنا شروع کر دیا اور کنوڑائی سے کچھ ایسی بات چیت ہونے لگی، خاندان اچھا ہے..... اکھڑتا بیٹا ہے، شہری جاؤاد ہے..... پڑھا کھا ہے..... صورت اچھی ہے، عمر زیادہ نہیں، نوکر ہو جائے گا!

ابھی بہت سی باتیں برآمدے کی چٹ، کمرے کے پردوں اور کراڑوں کی دراڑوں کے علاوہ منیرہ کی زبانی بھی منیرہ کو معلوم ہوتی ہیں اور وہ راتوں کی تاریکی میں اجالوں کے خواب دیکھتی رہی۔ اپنے زخمی ہاتھ سے نیاز چاہتا تو منیرہ کی گردن ٹوڑ دیتا۔ مگر ابھی تک نہ اس سے لائٹ جلا کر سگریٹ سٹگانی جاتی اور نہ اپنے بال سولرتے..... منیرہ کو یہ سارے کام اپنے ہاتھوں میں انجام دینے پڑتے تھے۔

ایک روز جب وہ نیاز کے لئے چائے بنا رہی تھی تو اس نے کہا: "کل سے اپنا کام کیجئے گا۔ مجھے زنگ ہوم جانا ہے۔"

"نہریت" وہ چونکا۔

"جناب مجھے ہمیں بھر کے بعد زنگ کا امتحان دینا ہے..... خیر اب تو میں کیا خاک باس ہوں گی۔ ایک عہدہ جھک مارا ہے۔"

"اچھا جی! جھک مارا ہے آپ نے..... اور مجھے جو مار ڈالا تو..... اس کا کچھ بھی تذکرہ نہیں۔"

منیرہ گھرائی: "اے جی بھئی بھئی..... میں امتحان کی کمرہ ہی تھی....."

"گولی مارو امتحان کو..... وہ لگتا یا۔"

"ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں۔"

منیرہ اٹھ کر چل دی۔

"سو منیرہ..... کیا سچ کل سے زنگ ہوم چلی جاؤ گی؟"

"اور کیا..... جانا ہی پڑے گا..... ڈاکٹر جنیل کا فطعی حکم ہے، دماغ زنگ ہوم میں ایک چھوٹی

سی لڑکی "رقبہ" ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ وہ میرے لئے بہت ردی ہے..... کھانا پینا چھوڑ دیا ہے۔"

"اور میں بے چارہ چھوٹا سا لڑکا جو یہاں روؤں گا تو....." وہ اٹھلایا "میں بھی ترکھانا پینا چھوڑ دوں گا۔"

"جھوٹ بات! منیرہ جھنجھی۔"

” اسے لڑکی میں جھوٹ نہیں برلتا تمھاری بے اعتدال طبیعت کی قسم — تمھارے زینسگ مہم کے رشتہوں کو اور زینس جھگٹ لیں گی مگر میری دوا تمھارے اور صرف تمھارے ہاتھ ہے “

ایک دن نیاز نے منیرہ سے یہ بھی کہہ دیا کہ میں آگے سے جا کر اپنے والدین کو گھیر لانا ہوں وہ میری ادائیگی کے سبب ہمیشہ مجھ سے ناخوش رہے مگر اب میں اچھا لڑکا بن کر دکھاؤں گا۔ شرط یہی ہے کہ وہ تمھارے حصول میں میری مدد کریں “

کنو صاحب اور کنو رانی بھی اسی قسم کا اقدام چاہتے تھے۔ جو نیاز کے والدین کی طرف سے ہو۔

بندہ کرے میں پڑے پڑے نیاز کو بہت دن ہو گئے تھے، ڈاکٹر کی ہدایت پر منیرہ آسے لے کر موٹر میں بیٹ کر نہ چلی

” پہلی بات نیاز نے یہ کہی کہ اب آپ کو قطعی حق نہیں ہے کہ میرے علاوہ کسی کو منشن سٹم کے لئے تجویز کریں۔ گویل چاہے تو مجھے حکم دے دے گا میں سیٹ جاؤں گا مڑک پر “

” بکواس بند کرو “ منیرہ نے گاڑی اشارٹ کی .. ” عجائب خانہ دیکھو گے “

” اک نیا سنا رہا ہے تو بے دینی میں “ اس کی آواز بالکل بے شری تھی۔

” خدا کے واسطے نیاز مڑک والے کیا کہیں گے “

” تیرا اولاد نہ ہوں سب سے بیگانہ ہوں “ جسے عجیب وغریب گانے یاد تھے۔

دونوں نے عجائب خانے کے ایک ایک گھیرا دریا ایک ایک پیچھے کو دیکھا بندروں کو چنے کھلے

..... عجیبوں کو مرے ڈالے شش مزخ یہ کنکڑی پھینکے۔ اور لکڑیاں ڈال کر کھالوں کو ستایا منیرہ نے اپنی عمر میں پہلی بار شرارتیں کیں اور اپنی حرکتوں کا اہلٹ اٹھایا۔ اور جی بھر کے ہنسی

واپسی میں جب وہ امین آباد سے گزرے تو ایک موٹر پر ریفیع سے مقابلہ ہوا وہ موٹر سائیکل پر بٹا رہا تھا منیرہ کو اس نے اٹھا کر سلام کیا اور تعجب سے نیاز کو دیکھا۔ موٹر آگے نکل گئی تو نیاز نے پوچھا ” منیرہ تم اس لڑکے کو جانتی ہو ؟ “

” ہاں جی تو آپ کا دلور ریفیع ہے “

” او ہوا اس سے تو میں بھی مل چکا ہوں “

” کہاں ؟ “ منیرہ نے پوچھا۔

” کیسے نہیں “ اسی رات کا قصہ ہے جب تم نے میرا راج درست کیا تھا کیسے میں یہ بھی لٹا

ہم سب نے مل کر فلیش کھیلنا اور اس نے بھی بہت شراب پی مٹی بلکہ اسی کم بخت کی وجہ سے میں بہت پی گیا

منیرہ کا چہرہ بے رونق ہونے لگا نیاز نے محسوس کر لیا۔

”منبرہ..... منبرہ خدارا اب اسے بھول جاؤ..... تمھارے پاس آکر نہ مجھ ایک دن بھی شراب کا
دھیان نہیں آتا..... مجھ سے اس زمانے کا حساب نہ لو جب تم میری زندگی میں نہ تھیں..... ادواب... میں اپنی پہلی اور
آخری محبت کی قسم کھاتا ہوں کہ جب تم اسے حرام کہہ دو گی تو یہ مجھ پر حرام ہو جائے گی..... منبرہ !!؟“
منبرہ نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرا دی.....

اسی دن شام کو جب نیا زنگ کر اپنے پلانگ پریٹ گیا تھا اور منبرہ ڈرائنگ روم میں ایک کرسی پر کھڑی
ہوتی بیٹھی تھی، تاکہ وسیمہ کو ماں باپ سے یہ کہتے ہوئے سن لے کہ نیا زاپنے گھر والوں کو بلانے کے لئے کل آگے جانا چاہتا
ہے..... تو باہر رفیع کی موٹر سائیکل پھٹ پھٹائی..... وہ مبینوں بعد یہاں آیا تھا.....
ادھر آدھر کی باتیں کر کے اس نے منبرہ سے پوچھا: آج دوپہر جو حضرت تمھارے ساتھ موٹر میں تھے کیا یہی ہیں
جنہیں منسا ہے تمھاری موٹر سے چوٹ لگی تھی؟“

”ہاں یہی ہیں“ وسیمہ نے بتایا۔
”کیا خیال ہے تمھارا؟“ کنوڑ صاحب نے پرسیدل تذکرہ پوچھا۔
رفیع مسکرایا۔ میں ان سے اتنا واقف نہیں کہ ان کی بابت کوئی رائے قائم کر لوں..... میں نے اس سے قبل
ایک ہی مرتبہ ان کو دیکھا۔ اور وہ بھی ایسی حالت میں کہ عقل سے خارج تھے؟
”کیوں؟ کیوں؟“ کنوڑ صاحب تسلی کر بیٹھ گئے۔ ”کیا مطلب؟“
”واقعہ یوں ہے“ رفیع مزے لے کر سناتے لگا۔ ”میں ایک دوست کے ساتھ کیف میں چلے بیٹھے گیا تھا.....
وہاں کئی لٹنکوں کے ساتھ ایک میز پر یہ صاحب بھی جڑا کھیل رہے تھے..... اور انھوں نے اس قدر شراب پی لی تھی
کہ گانا گانے لگے۔ گالیاں بکتے تھے اور ربے اڑنے پر آمادہ تھے۔“

ڈرائنگ روم میں سناٹا چھا گیا!
گھبرائی آواز میں کچھ دیر بعد وسیمہ نے کہا: ”کتنے ہو رفیع؟“
”ارے بھائی مجھے جھوٹ بول کر کیا نفع ہوگا؟“
پھر مدلی خاموشی!
لڑکھڑکھتے قدموں کو سنبھالتی منبرہ اٹھی اور دروازے کی طرف چلی۔ ”کہاں جا رہی ہو منبرہ؟“ کنوڑ رانی نے ٹھکانا لے لیا
میں کہا: ”بیٹھ جاؤ۔“

منبرہ واپس آکر دم سے بیٹھ گئی۔
کچھ دیر بعد کنوڑ صاحب اٹھے اور کھانا رکے بولے: ”وسیمہ نیا ز سے کہہ دو کہ وہ کل اپنے گھر چلا جائے۔ یہاں
بھی جلسے..... مگر اب یہاں آنے کی ضرورت نہیں ہے..... یہی ہمارا جواب ہے۔“
کنوڑ رانی نے پھر منبرہ کو نیا ز کے کمرے کی طرف نہیں جانے دیا۔ نیا ز رات بھر اس کا منتظر رہا اور وہ رات بھر

دوسرے کے گلے سے لپٹی ہوئی ٹبک ٹبک کرکتی رہی۔ آپا خدا کے واسطے میری مدد کرو۔۔۔۔۔ آبا اور اُمّی سے کہہ دو کہ میری قسمت پر
بھروسہ کر رہی ہیں اُسے سنبھالی لوں گی۔۔۔۔۔ اُس کا دل ٹرا نہیں ہے۔۔۔۔۔ میں جانتی ہوں وہ مجھے دھوکہ نہیں دینگا۔۔۔۔۔
آبا اور اُمّی سے کہہ دو کہ مجھے میری تقدیر کے حوالے کر دیں۔۔۔۔۔“

صبح ہو گئی۔۔۔۔۔ پُرانا سورج نئی تمازت کے ساتھ نکلا اور شان سے ٹپٹے ہوئے پھول مچھا گئے۔۔۔۔۔
دوسرے نے کنوڑا کی سچے کچھ کسنا چاہا تو وہ شیرے کی طرح بکھر گئیں۔ ”دوسرے اپنے دل پر ہاتھ رکھ۔۔۔۔۔ تو بھی ماشاء اللہ
بیٹی والی ہے۔۔۔۔۔“ انگھوی دیکھتے کھکی کھکی نکلتا ہے۔۔۔۔۔ کیا میں نے بیس بائیس سال کی ٹبک اسی لئے منیرہ کو ہلاک کیا کہ اپنے
ہاتھوں بھاڑ میں جھبک دوں۔۔۔۔۔ کیا میرے نصیب میں ہی تھا کہ اکلوتا بیٹا تو فرنگی کر لے اور بیٹی جان بوجھ کر جواری ترائی
کے پتلے بندھ جائے؟

دوسرے باپ کے پاس گئی تو انھوں نے جواب دیا: ”بیٹا تم خود اچھی جذباتی لڑکی ہو۔۔۔۔۔ اس مسئلے کو پہلے سے زاویہ نظر سے دیکھو
ہوں پھر لو کہ جب تمھارا کسین پتھر آگ کے پکے ہوئے شعلے کو پکڑنا چاہتا ہے تو اس وقت تم اس کے دل کا لٹا لٹا کر بیٹی جو باپ سے دماغ پر
چلتی ہو۔۔۔۔۔ منیرہ سے کو عقل سے کام لے۔۔۔۔۔“

نیا زجاجار ہے۔۔۔۔۔ نیا زجاجار گیا۔۔۔۔۔ اس نے پردے کے پاس منیرہ کا لڑنا سچہ دیکھا۔۔۔۔۔ وہ لگا
نہیں۔۔۔۔۔ وہ کچھ کھلی نہ سکا۔۔۔۔۔ اس کے جسم پر کوئی زخم نہ تھا مگر روح کھلی ہوئی تھی اور اس کا کوئی چارہ گرد نہ تھا
۔۔۔۔۔ کوئی درد مند نہ تھا۔

جب ڈاکٹر حنیف اُسے تو ابھی تک منیرہ اپنے اس پینگ پر بے حس و حرکت پڑی تھی جس پر ایک رات اس نے بے ہوش
نیا زجاجار کو ڈالا تھا۔۔۔۔۔ ڈاکٹر صاحب نے اُسے ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور زمزمی ہوئی آواز میں کہا: ”میں نے سُن لیا ہے منیرہ۔۔۔۔۔
وہ چلا گیا ہے۔۔۔۔۔ اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔۔۔۔۔ تمھارے ساتھ بھی۔۔۔۔۔ ہم اس فیصلے کو تسلیم نہیں کریں گے
۔۔۔۔۔ میں اُسے ڈھونڈ لاؤں گا۔۔۔۔۔“

”نہیں نہیں ڈاکٹر صاحب وہ اب کبھی نہیں اُسے گا۔۔۔۔۔ آپ اُسے کبھی بھی نہیں ڈھونڈ سکتے۔۔۔۔۔ آپ کی کوئی پکار اس کے
کافور میں نہیں جائے گی؟“

ڈاکٹر صاحب کچھ دیر خاموش کھڑے ہوئے منیرہ کو کتے رہے، پھر انھیں ایک ٹم کچھ یاد آگیا: ”منیرہ بیٹی تھیں تو وہ بچہ ضرور
زنائی دے گی جو تمھارے لئے ہے۔۔۔۔۔ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تمھاری زندگی تمھاری اپنی نہیں ہوگی۔۔۔۔۔ تمھارا کام اپنے غم میں
آفسر بھانا نہیں ہے اوروں کے دکھ دھونا ہے۔۔۔۔۔ نرسنگ ہوم میں تمھاری ضرورت ہے، وہ اپنا بچہ ”دقیہ“ جسے تم دو سال سے
پال رہی تھیں، تمھارے بغیر دور دور کر اپنا خون کرتی ہے۔ وہ پریٹ بکھر کر روٹی نہیں کھاتی۔ دو ماہ ہیں اس کا وزن بہت زیادہ گھٹ گیا
ہے۔۔۔۔۔ تجھیں اس پر رحم نہیں آتا؟“

ڈاکٹر حنیف منیرہ کو اپنے ساتھ نرسنگ ہوم لے آئے۔ اُسے بازو کا سہارا دیتے ہوئے وہ طبعی برآمدوں میں سے گزرتے چاروں
طرف منیرہ کی حافی پہچانی نرسیں کھڑی تھیں، وہی نرسیں جو منیرہ کو اُسے دیکھ کر ہمدردی سے مگرانی تھیں۔۔۔۔۔ آج ان کے چہرے اس طرح

خاموشی اور اداسی نے کہ جس طرح انہوں نے ابھی نذر کے عالم میں کسی مریض کو دکھا ہوا.....
 وہ بغیر کہیں نہ کے طوبی داروں میں مریضوں کے دو بندیر بستر کی قطاروں کے بیچ میں سے گزرتے رہے اور ڈپنسری پریشانی
 تھیں اور مردہ گھر سب پیچھے رہ گئے..... یہ نرسنگ ہوم کا آخری حصہ ہے "نرسری" ڈاکٹر صاحب نے پیار سے اس کا نشانہ تھپکا "میں
 آفس جا رہا ہوں منیرہ..... تم اپنا فرض بخوبی سمجھنا پتی ہو"
 ڈاکٹر خلیط چلے گئے..... وہ آہستہ آہستہ نرسری میں داخل ہوئی..... کچھ پتے کھیل رہے تھے..... کچھ دوڑ رہے
 تھے..... رقیہ اپنے بچہ پر خاموش بیٹھی تھی..... منیرہ کو دیکھ کر اس نے خوشی سے چہرہ ماری اور ہاتھ پھیلا دیئے..... منیرہ
 بے تابانہ اس کی طرف دوڑی اور اس کے نئے بازوؤں میں منہ چھپا کر پچھلیوں سے رونے لگی.
 بالآخر انھی رقیہ نے ایک نئی سی بات پوچھی "آپا! آپ اتنے دن کہاں رہیں؟"

ابوالفضل صدیقی

اور مزدور۔ جو کبھی اور سب کچھ بھول بھلا کر گزردیں سنگھ کو اپنی طرح یا دھنکا کہ وہ کمرے چڑھان ہیں۔ رتی دوائے جہنم
نے غمخواری کو بیچ میدان بھگا، اب جسے چند کوسیرت و نابود کیا۔ اولاد ملکان سے بیرہا لے، پھر دہلی گنتی چڑھان! حافظ جی حافظ
رحمت نال! اے سیدھے ہاند! جن کے ہل پر وسیلے فریجی اور شاہ ادھر! ایک نکار تو اسٹے دلی پر چڑھ دوڑے۔
اور اس سستی شادی کو غمخو کہیے خاک کر گزردیں سنگھ اب تو بیس سال سے اسی دنگل میں تیرے میرے گھنٹیوں کے اندر دفنانہ
روز کی مزدوری کر رہے تھے۔ جہاں اب سے چالیس سال پیشتر ان کے باپ دادا کی دھاک میٹھی ہو تھی۔ اور ان کے بہادر بچے گریب

کر مذکر دیتے تو پردائی دم سادہ جاتی اور کچھ کو نگاہ اٹھا دیتے تو چرمی آذھیان لٹ کر نکل جاتیں۔ اور ان کے زمانہ کی انہیں دیکھے جوئے و چارہ بڑے اب بھی دیہات میں پائی تھے جو گروہن شلہ کو کھیت کیت دودو ان کی مزدوری کرتے دیکھ کر اس کے ہامی کے حالات بتاتے اور اپنی اداہ کو گھرت دلاتے۔

باپ کی ذہنداری، بیروہداشت، اثاث البیت، دولت سب کچھ باپ کی ذنگی ہی میں ختم ہو گئی تھی۔ ایک بہن تھی۔ جس کو وہ اچھے گھر بیاہ گئے تھے۔

اور انہوں نے اپنی ٹھکرات کے بھاری بھرے گروہن شلہ کو بھی اچھے گھر بیاہ دیا تھا۔ اور گروہن شلہ کے سسرال داروں نے بہت بڑا چاہا کہ وہ گھر جانی بن کر رہیں۔ مگر انہیں پرانی شل یا دھنی کے ساس گھر جانی سوئی اور تیر بیوی بڑا اور بیوی کیا بیاہ کے بعد گونے دوسے کی جودت ہی نہ پائی اور بھلا ایسے گھر میں کوئی کھانے پیتے گھرانے کی راجہرتی کیسے گزار سکتی تھی، کمزور صلی، اور اصرار بھی کرتے تو گروہن شلہ سگس برتے پر۔ ان کے پاس کیا تھا۔ ایک کھرپی، اور وہ بھی بڑے دھوتے کے پیچ میں کھرپی لٹا رکھتے۔ خیر کھرپی اور زمین کا بھی اذلی رشتہ چلتا ہے۔ مگر راجہرت اور زمین کا بھی اذلی رشتہ ہے اور جب ساری دھرتی پر کہیں کو شہر نہیں کے مالک نہ تھے تو گروہن شلہ کا ہے کے راجہرت تھے۔ آپ اپنے منہ میں یہاں مسخو بنا کر بن کر رہنا انہیں راجہرت کیسے تسلیم کر لیتی۔ تھے کہ سلی جود شلہ نے تسلیم نہ کیا۔

اور گروہن شلہ چران گڑھ میں نہ گئے۔ تو دودو چارہ چارہ کوس چارہ طرف دیہات میں کسی دیہل کار مردوں کی کاشت کار۔ کے کھیت پر مزدوری کرتے اور مزدور چاروں اور لودھوں کے ساتھ کہیں نہ کہیں کام پر جئے دکھائی دیتے۔ مگر یہاں بھی اپنی ٹھکرات کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ چاروں اور لودھوں سے ڈوب دھا کام کر کے دکھاتے۔ اور مالک کو ان کو روکنے کی بجائے اٹنی تو امین اور تعریف کرنی پڑتی اور باہر ہلچل مچاتا تھا۔ یہاں پر انہیں ایمان داری کا خیال کم دیتا بلکہ وہ اپنی ٹھکرات کی لاج کو روتے کہ کہیں ان کے بیٹے بیچھے مالک یہ نہ کہے کہ چلو مٹا کر ہیں۔ بے چارہ کا دقت بڑھ گیا ہے جو کچھ کرے، کریں، اور ان خیال ان کے داغ میں یہ کیا کر میرے ساتھی مزدور سب چارہ لودھ سے نیچے قوم کے ہیں اور اگر یہ مجھ سے دیا وہ یا میرے برابر بھی کام کو دکھائیں تو میری ٹھکرات کا ہے کی ہوئی۔ اور شام کو دودو انہا کو گروہن شلہ کئے ملحق کس قدر خوش نظر آتے؟ شاید ان کے دادا دیس ضریف اپنی پوری تھیل لگان کر کے اتنے خوش نظر نہ آتے ہوں گے۔ اور ان کی بہن جیگا اپنے شہر سے فضل کے فضل ہزاروں روپیہ کی پوٹ ہاتھ میں لے کر تھی ملحق نہ ہوتی ہوگی۔

اور جیگا کا شوہر ایک متوسط خوشحال زمیندار تھا۔ جس کے یہاں بھی کچھ تھا، اور سالے کی حالت سے کچھ کچھ واقف بھی تھا۔ اور اس کی کچھلی خانڈائی روایات تو آج تک زبان زخفاں حاضقیں۔ جہیز شکایت کیا کرتا کہ دودو (بڑے بھائی) نے کبھی ہمارا ہاتھ نہ بٹایا، اگر فضل کی طہاری کے ہی وقت آکر میرے کھیتوں پر پندہ دن کھڑے ہو جایا کریں تو سال بھر میں مزدور کو روڈ کی چرہی سے ہم کو اتنا کچھ دلا کرے کہ دو تین برس میں نہ کھا جائیں۔ اور جیگا کو کبھی بھی بھائی کی حالت اور کچھ روایات کا اندازہ کر کے اپنے حاش اور دولت بے کیت معلوم ہوئی۔ شوہر کے باہر اصرار پر ایک مرتبہ جیگانے گروہن شلہ سے اپنے یہاں متعلق طور پر پچھے آنے کی تڑک بھئی کی، خیر بہنوں کی بات تو ہمیں گروہن شلہ سے ہنس کر نہائی مگر جیگا کی تڑک بھئی پر چوٹی لائی یہی انہیں دکھائیں۔ ہوں نادان لو تہا، اپنے باپ دادا کی مالک اپنے ہاتھ سے کاسی ہے

شرم نہیں آتی تھو کہ: بہن گھر بھائی سو گئے۔ پر اسے ہر لمحے کہہ رہے ہیں، تو کیا تیرا بھائی کتا ہو جائے۔ مجھے تو ڈوب کر مرنّا اچھا ہے۔ بہن کے در پر جا کے رہنے سے؟

مگر جب کبھی جنگ کا ہی سانس نہ دے، یعنی اس کے ہاں کوئی بھی خیر نہ ہو، تو اس کے دل میں یہ سوچ بول اٹھتی ہے کہ اگر میں اس کے لئے کچھ نہ کر دوں تو اس کے لئے کچھ نہ کر دوں۔ اس کے دل میں یہ سوچ بول اٹھتی ہے کہ اگر میں اس کے لئے کچھ نہ کر دوں تو اس کے لئے کچھ نہ کر دوں۔ اس کے دل میں یہ سوچ بول اٹھتی ہے کہ اگر میں اس کے لئے کچھ نہ کر دوں تو اس کے لئے کچھ نہ کر دوں۔

(۲)

اور اپنے سبھی بھائیوں کے دروازہ پر ادھر کی گزریوں کی سختی چڑھا کر منہ اندھیرے کا ٹکڑا گورہوں میں لٹکے سرشارم پٹنا اور اپنی دھواں وقت کی روٹی خود پکاتا، اور صبح کو بات کی دھکی جوتی ہانڈھ کر ساتھ سے جاتا۔ اور سب مزدوروں کی روٹی ان کی حویلیں دوسرے کو پکا کر لاتی ہیں اور اپنی دات کی بچی ہوئی روٹی کی پٹنی کھول کر دوسرے کے دھکی میں گورہوں میں ٹھوکتا۔ دوسرے سے پہلے کام دلا جائے ہوئے چنے کا پھینا تقسیم کرتا جو دو آدھ پر مہر کے علاوہ مزدور ہی کا جزو ہوتا۔ گریبون میں دات لایا جوا کھانا دوسرے تک خراب ہو جاتا ہے۔ اس لیے جادوں جادوں تو گورہوں میں شلو کا بھی ناکھا پلینے اور گریبون کے موسم میں اسی چینی پر لکٹا کر کے دن کاٹ دیتے۔ تمام دن گورہوں میں شلو کا جو پھینا سرشارم پٹنا رہتا۔ شام کو کبھی کبھی جٹی جلا ہے، ناقہ تیلی، جلدی مراد، سبے رام گڑیہ آدھینے الاؤ کے گڑ آدھی دات تک گپ ہوتی جھلون کا دو دو مقبلہ اور اپنی تنہائی ہیں اور ادھاس کے اعتبار سے گورہوں میں شلو کا جو پھینا سرشارم پٹنا ہوتی رویت کا ایک تھا۔ گرواں میں ایک دن ایسا بھی آتا۔ جس روز ان کا تاریک دیوان چھو پڑ چاک لکچھا اٹھتا اور منصف تازک کے بھر کی جل نرنگ لکچھی سنائی دیتی جب مہینا دیوچ بد جگہ پٹنا کھینے اور مٹھائی سے منہ بھرے سال کے سال آئی۔ اور مٹھائی دیوچ کا عبت اور غوص سے بڑے تروا میں روز بہن بھائی کے تک لٹا گئی ہے، منہ مٹھائی سے مہرتی ہے اور پھر اپنے بھائی کے آؤ پر سانی پھر ہیں آسے والی سب دلیوں ساری مصیبتیں کب بھاریاں اپنے لیے مانگتی ہے۔ اور پھر اپنی فروتنی دہشتی اپنے بھائی کو مل جانے کی دعا مانگتی ہے اور یہ ساری دعا میں شیشوں کیست کی آوازوں میں مانگتی جاتی ہیں، بھائی بہن کو اپنی حیثیت کے مطابق دان دیتا ہے۔ مٹھائی کے بدلے میں مٹھائی یا اس کی قیمت دیتا ہے۔ پھر سے دیتا ہے اور آنے جانے کا لکڑیا دیتا ہے اور دو تین روزہ مٹھائی کو دعوت کرتا ہے۔

مجیسا یوج کے دن بالعموم بیویاں گھر چھوڑ چھوڑ کر میکے جاتی رہتی ہیں اور گھر گھر بیویوں کے بجائے بہنوں کا اختتام ہوتا ہے اور ہر جمعی آج کے دن بیوی نہیں ہوتی صرف بہن ہوتی ہے۔

جبکہ کاگوڈن راجھو نگر چران گڑھ سے چالیس میل کے فاصلہ پر واقع تھا اور دیوے ایشن سے کوس بھر کے نی صدر پر آباد تھا۔ بھتیجا دیوچ کے دو بیٹ ترکے کی گاڑی سے جنگا روانہ ہوئی۔ راجھو نگر سے ایشن تک پتہ میں کوس بھر کا فاصلہ طے کرتی، اور پھر سکندھ کلاس کا گھٹ پڑی۔ ایک مہتر کا مذہ اور ایک مہتر مہری ایک ایک کھانہ تین آدمی ساتھ ہوتے، دیوے ایشن سے چران گڑھ میں کوس تھا۔ کاندھ تو حسب معمول دریا ت کے مطابق اسی ترین سے شہر چلا جا تا اور جنگا مہری اور کھانہ دو ایشن پر ہی چھوڑتی اور ایک گھٹیا سی سوتی ساڑھی ماہر تھی اور پیدل چران گڑھ روانہ ہو جاتی اور تین کوس کا فاصلہ پیدل اس بیٹے طے کرتی کہ سر میں بیٹھے بیٹھے اس کا جسم بندھا بندھا سا ہوتا دامن میں چران گڑھ کے لوگ آتے جاتے اور اور گرو دھینوں پر کام کرتے تھے۔ جنہیں وہ مخصوص ہنس اور بیٹھ دے انہذا

ہیں سلام کرنی چاہتی۔

جبکہ چھوٹی سی مٹھائی کی پوٹی ہاتھ میں تھائے بیتا کے گھر پہنچی، اور آج گوردھن سنگھ اس کے لیے مڈوں کا دیکھا ہوا مخصوص جوڑا نکالتے۔ کافی کنارے کی وصولی دویچ نکال کر خوب نلک بڑھا کر اور کس کر باندھتے اور پوسے اپنی سفید پٹنٹوں پہنتے اور سر پر بڑا سا پلک باندھتے، راجپوتی انداز میں خوب مونچیں چڑھا کر بیٹھتے، ترچھے ترچھے، بھاری بھر کم ہونے، اگر چہ ان کی سچ دھج اور ہر وہپ میں راجپوتی انداز ہوتے۔ مگر تہہ دونوں میں آزاد مزہ و مردہ واسے دم غم جھانکتے، اور عجیب شان استغنا نظر آتی۔ بہن کو دیکھ کر کھل اٹھتے اور جنگا رواج کے مطابق تلک لٹاتی اور منہ میں مٹھائی کی ٹولی دیتی اور پھر اس کی بلایں لے کر ماری بیاریاں اور مصیبتیں اپنی جانب آجائے کی پراہٹنا لگاتی۔ جس کی تان اپنی مردانہ سستی اپنے بھائی کو مل جانے پر ٹوٹی۔

پھر برے مخصوص انداز میں گوردھن سنگھ اٹھتے، اپنی کٹھار کی کڑی کھول کر اندر گھس جاتے۔ لگی میدہ آؤ نکالتے، جیسے مہری شہار میں سے ایک دقت کے قابل نکال رہے ہیں۔ اور جنگا بڑے اہتمام سے پوری کچریاں، آلو پیاز کرتی۔ اور ان کے سامنے پردہ دیتی اور انہیں کھلانے کے بعد خود کھاتی اور زحمت ہونے لگتی، رخصت کے وقت اور عموماً مگر کے پیش سے چڑان گھر کے پیش تک کا تھوڑا کلاس کا کاپہ بتاتی اور کہتی کہ میں انہیں آئی ہوں، مہری کٹھار بتاتی ۲۰ کا ٹک کا چندن سینہ دے، یہ دقت میں چار دو پیہر بٹی، پھر چم پر موتی دو ڈیڑھ دو پیہر والی ساڑھی باندھے ہوتی اور دوسری ہی ساڑھی کے دام بانگتی اور سب حساب پانچ چھ روپیہ کا بتا اور گوردھن سنگھ یہ رقم ہاتھ پر رکھتے جیسے ہا کر جنگا ایسی خوش ہوتی جیسے اس کے بھائی نے ہفت اقلیم کی دولت اس کے ہاتھوں میں دے دی ہے۔ انگلش کے ہاتھ کا بخشا بڑا دان دولت کے ہاتھوں میں پہنچ کر پیہرے کی عزت بچاتا اور اس میں دن کے وقت تمام دیکھی تجاہل عارفانہ برتتے جاتے۔

اور سہ پہر کے بعد جنگا پیشین پہنچی، اتنی دیر میں اس کا متبر کا - مذہ شہر سے پلٹ چکا ہوتا۔ پیشین بڑھیا ساڑھی مہری کہنے کو - مے اور اپنے بائیک اچھے پکڑے اور مٹھائی کو ٹوکرا ایسے ہونے جنگا اپنی موٹی ساڑھی اٹا کر کوئی پیشین ساڑھی بدلتی۔ کا مذہ مہری کہاں اپنے اپنے کپڑے پہنتے اور اپنی ہی سسرال پہنچی۔ ساس ندی دیکھتیں۔ شوہر دیکھنا کو کھتے خود کی بھیا دیوچ کرتا ہے گوردھن سنگھ اور باہوم بناری ساڑھی دیکھ کر شوہر بول پڑتا۔

”وہا پرانے آن واسے نکال کر ہیں۔ کچھ نہ مارا مگر ہیں کو کھیتے دیتے دقت نہیں بن جاتے ہیں؟ بھلا دیکھو تو یہ ساڑھی اور اس کی ساس نعمہ دیتی۔ پھر اپنا چوٹان گھر سے بات پر مٹنے واسے چڑان“ اور کوئی نہ کہتی ”اور مٹھائی تو دیکھو، پچوٹی تو کرا مہری“ ہوں ہیں تو میں کہتا ہوں، دیکھو تو مان مٹھوانت ان کی کچی ہے دانت پھل نہیں، اور بہن کے جیسے یہ مٹھا سامان، مہری کہاں سب کی ہڈاؤں کی کرتے ہیں۔ منشی جی کو مٹھائی کی۔ کی وصولی اور بوسکی کی قیص دی۔ ہے۔ مٹھا سے پہنے بیٹھے ہیں۔ باہر چوٹال کے چہرہ تر پڑے

اور جنگا جو ترے ہیں سے نکال کر دیکھو۔ یہ کے سکر کے ایکاون روپیہ کھاتی“ اور ایکاون روپیہ ۛ

”ہمت والے لوگ ہیں، ہاں اور ہر وہن سب نعمہ ہر گلیا پر آن وہی ہے؟

ادی چھو کر مٹی چھو کر دم کیا جانو ہم جانتے ہیں ان چوٹالوں کو۔ ہمت کے لوگ ہیں اور لینا دینا ہمت کے ہاتھ ہات ہے۔

اور گوبروصن کے پاس تو باپ دادا کے نماز کا دایا یا پڑا ہے۔ یہ روپیہ نہ دیکھو۔ گونسے ہرے کھو دے ہیں۔ جی دار تھا کہ پتہ ہے جان جائے آن نہ جائے۔ کوئی بڑا بکھرا جیت نہیں تھا کہ اس سے اگلی اور کیا کرے گا نہ اس کہتی اور جتنا خوشی کے مارے بھولی نہ ساتی۔ جیسے یہ سب کچھ سچی اس کے بھائی نے دیا ہے۔ بدوں تو اس زندوں کا گھر تھا۔ مگر جتنا جیسے اس سالان سے سال بزرگ سب گھر پر مادی ہو جاتی، جیسے باہر کے بھائی گھر کی بیٹی۔

(۳)

اور بھتیجا دیوچ کا ڈیرہ مہینہ باقی تھا۔ ساتھ سے کس مہینہ کے چہرہ روئے پس انداز کیے ہوئے پانچ روپیہ کے تانبے کے پیسے گوبروصن ملے کہ پاس تھے اور دو ڈھ ماہ میں انہیں دو ڈھائی روپیہ اور جمع کرنے تھے، وہ کام دن مزدوری کرتے اور شام کو کسی کسان کے یہاں سے موٹوں کے گھسے اٹھالانے اور اسی رات تک اپنے اکیلے مکان میں پانی لگا لگا کر انہیں کرتے، انہیں سے پڑانے سن کے پڑے آتے اور انہیں توڑ توڑ کر سن میسرہ کرتے اور طلا کر باڈھ بیٹنے اور دوسرے تیسرے دن باڈھوں کے وزن کے برابر مٹا سامٹی مل جاتا اور اس طرح رات کے چند گھنٹہ کے کام میں چار چھ چہرہ روئے کے سر ہو جاتے اور اس طرح انہیں بھتیجا دیوچ کے پڑفروص دن کے اخراجات کی فراہمی میں محنت کرتے پندرہ دن ہو گئے تھے اور اب وہ مطمئن تھے کہ انہرہاہ ہیں فاقے کر کے پس انداز کرنا پڑے گا۔ جیسے سال بھر میں بارہ مہینہ بردن تو مزدوری ملتی ہی نہ ملتی تھی اور مزدور۔ دن کی طرح جس دن مزدوری نہ ملتی وہ گھر نہ بیٹھے۔ گھر پر سہا کہ ہری ہری دودھ پر پھسل پڑتے اور شام تک۔ روزانہ کی نہیں تو پانچ چھ چہرہ روئے کی گھاس پھیل کر بقیہ ہی بیٹے اور جب بارش کی وجہ سے کچھ بھی نہ کھاتے تو اطمینان کے ساتھ فاقہ کھاتے۔ مگر بھتیجا دیوچ کے منڈ کو پڑا کرتے رہتے۔ ان کا دائرہ بہت چھوٹا تھا۔ مگر دائرہ کے اندر رہنے کا طبقہ بہت وسیع، روزانہ کتنا کھوئے اور روزانہ کا پانی پیئے۔ انہیں منڈ کی کھانسیں سال کئے تھے۔ انہیں پچیس سال میں کسی کے سامنے کاتھ نہ پھیلا یا تھا۔ کسی نہ میں سے ان کا تعلق باقی نہ تھا اور ان کے باپ دادا کا جانشین بیٹا زمیندار انہیں جانتا ہی نہ تھا۔ مگر وہ اسے خوب جانتے تھے۔ کیونکہ انہی کے قرضہ میں ان کی آہائی زمیندار ہی نیلام ہو کر اسے پہنچی تھی۔ جیسے اس کے بھائی کوکھوں اور موٹی ٹونر کے اندر سودور سودی دھونکی سے ٹھکرات کی مروج پھٹک گئی تھی۔ جیسے گنر کا پاس کھا کر اس کے اوپر یہ گوشت چڑھا ہے۔ اور ایک روزانہ یومیہ کمانے والے مزدور کی نگاہیں اس پر انہیں جذبات کے ساتھ پڑتی ہیں۔ اور حلقہ کا جہاں قران لوگوں سے واقف تھا۔ جن کے پاس آست پٹ اور لین دین کے کچھ مادی سامان تھے۔ اور گوبروصن منڈ کے پاس نہ دامن تھا اور نہ خار سے اٹھتا تھا۔ اہمیت اس کا بھتیجا دیوچ کا حیران دہی ایسے ایسے معلوم کئے سامانوں پر بھاری تھا۔ جو اس کی بہن کا مذہ اور ملازمت کی سازش سے گھر پر کھانیا کرتی تھی۔

اور آج صبح گوبروصن منڈ یہ سوچ کر گھر سے نکلے کہ زمیندار بھتیجا گوارا ہے۔ روزانہ کی مروج اور سن کی کٹائی میں تو بڑی محنت بھی پڑتی ہے اور بہت تھوڑا فائدہ آتا ہے۔ اگر دات کا کام بھتیجا پڑ جائے تو بھتیجا ہی بھرتے اندر بھتیجا دیوچ کے مروج کے قابل رقم جمع ہو جائے۔ لہذا دیوچ کا حال کے لیے جی جولا ہے کے گھر میں گئے دیاں اور ہی رنگ دیکھا۔ جی جولا ہے ایک بقر تھاب کے ساتھ کھڑے تھے اور جی جولا ہے کی اوپر گھر کے دروازہ کے قریب زمین پڑے پھری ہوئی تھی۔ اور بقر تھاب سے جی جولا پڑ کر کھینچ رہا تھا۔ اور بھتیجا سے جی جولا ہے مروج کے اس کے اٹھا رہے تھے مگر دوسری صورت زمین نہ چھوڑتی تھی اور زیادہ مروج کھانے

پھر گردن چلا کر گویا بدن سے انکار کرتی تھی۔

گورہ صحنہ پہلی ہی نظریں سمجھ گئے اور آہستہ سے جتنی جولاہے کے کان کے قریب منہ لاکر بوسے کیوں چاہا ایسی بھی گھر کی بچیا کیوں ٹانگے دیت ہو۔

جتنی جولاہے محبوب سے ہر گئے اور گردن جھکا کر زلیبا پر سے تینا اپنے بس کٹائے دیت ہوں، لالہ می رزمیندا، کا ٹکان ٹوٹ رہا۔ یہ کھلی رید غلی کا نوش دیا ہے۔

”تو پھر کٹائے سے کیا بقیہ لالہ جی سے کہو کہ میں اپنے معاملہ میں گورہ صحنہ ٹکونے کہا۔

اور سے تینا بہتیری کہی اسٹا بایا بچیا ہے۔ کھائے پئے بڑی سٹوٹ کائے جئے۔ پڑنا میں مانو، کہت ہے کہ ہم کیا کریں گئے۔ ہمیں گائے تہیں چھے جادا ٹکان دیو۔ میں گایوں کا ہڈا بنانا ہے کہ زمینداری رزمینداری، کرنا ہے۔

”تو کٹے میں کٹائے دیت ہے چاہا“ گورہ صحنہ ٹکونے وقت کے ساتھ کہا۔

اور اس سے زیادہ رت کے ساتھ آنکھوں میں آنسو بھر کر جتنی جولاہے پر سے کچھ دویا میں بیٹا۔ اور ایک مسلمان کی آنکھوں میں اپنی گائے کٹنے پر مجبوری کے آنسو دلچ کر ٹھا کر کے خون میں جوش آگیا اور گورہ صحنہ ٹکونے پر سے ”پھر تم کہی گائے اس بننے رزمیندا سے کہ کسائی رکھائی، سینے گورہ“

ہاں بیٹا سب کچھ کہی پر اس نے وہی اپنے مطلب کی کہی کہ تم جانو۔ مرت دیو کسائی کو ہاں رو دھ کھاؤ ہمارا مطلب یہی تو گورہ صحنہ ٹکونے دانت کھٹا کر بوسے تینا سالا۔ ویش بنت ہے رویش جتا ہے، اور عکرات کرتا ہے، کسائی بے کسائی بھگوان نے حکومت رزمینداری دے دی اس کے ہاتھ میں! اسے غلب تیری بیل! اور بڑبڑاتے ہوئے گورہ صحنہ ٹکونے چلتے کا اندازہ بتایا۔ ایک نظر قائل تو دوسرے بچیا، کی آنکھوں سے آنکھیں چا رہیں۔ مجبورہ ہم ہوں کی شفا میں جتنی آنکھوں سے جاتیں، اور ساتھ ہی حق سے آواز دہرنے گائے سے زیادہ کچھ آدمی سے ملتی جلتی نکالی اور آنکھوں کی دہی بھی باقی سب کچھ اس کی آواز میں کہہ دی۔ اور آواز پر جیسے ایک ذہنی تریک کے ساتھ گورہ صحنہ ٹکونے اچھل کر پھر دوسری جانب دیکھا۔ اور انہیں اپنا دھپکا سا کچھ گائے کی معصوم خوبصورت ہرئی جیسی آنکھوں کی کرش داجپوت کی بہادری آنکھوں سے مل گئیں اور جیسے دو قوت انہی کہیں ایک دوسرے سے مسلح ملنے لگیں۔ جیسے ان کے شہر میں ہزاروں سال پرانی کہانی دور بردی۔ وہ بے خود ہو گئے۔ اور ان کے جذبات کا رشتہ ماضی و مستقبل دونوں سے منقطع ہو گیا اور جیسے بغیر پیچھے ہڑ کر دیئے اور ہلا ایک نظر آگے اٹھائے ساتھ سے دس مہینہ کا بچیا دیوچ کا اندازہ تھا کی کے حوالہ کیا اور دس مہینہ پرانی اور دوسرے بچیا نے جتنی جتنی گورہ صحنہ ٹکونے ہی بڑھتے ہی اچھل کر لڑی ہوئی ادا کیا تو جی جولاہے کے گھر کے کونے پر زمین کا گڑھی چلی ہوئی تھی یا گورہ صحنہ ٹکونے کی گشتی ان کے گھر کی جانب دلی بھائی ملی جارہی تھی اور ان کے گھر کا گڑھی ہوئی۔

گورہ صحنہ ٹکونے کے بے آب و گیاہ زندگی کے میدان میں کسی منف نازک داخل نہ ہوئی تھی۔ بچپن کی ماں کی آغوش فراخوش کر چکے تھے۔ جوانی ہوئی کی خوشبو سے آشنا نہ ہوئی تھی، سال کے سال بہن صحنہ کے ستارے کی طرح چمک کر سماں بھر کے لیے غائب ہو جاتی اور ایک مردود سا گورہ صحنہ ٹکونے میں چھوڑ جاتی جن کے سہارے ان کے اندر جا بایا جی احساس کی جھلک لوٹ بھیتا دیوچ کھل باقی رہتی اور بھیتا دیوچ کی لیا دہی میں انہیں سال کے ہا صحنہ بھینے کا ہر دن گزرتا۔ اور ان پر مستقل مردہ سا دھتہ۔ آج بھی زندگی میں گائے داخل

ہوئی تھی۔ اور گائے بھی نر جان۔ اور اوراد پھر شیا ما ایک ڈنگ۔ بے دماغ چلتا ہوا سیاہ ڈنگ۔ دو ٹکے پر ایسی چابک جیسے گھمی چڑھنے سے، عنصر جھوٹو قدرتی پردہ میں اور نوجوان کے سا پنچ میں ڈھلا ہوا۔ کھڑے سے کر سینگ تک برجز پر بایڈ کی سی اچھلی ہوئی۔ ایک ایک ہارندگی کے سر سے لہتے ہوئے گائے تھی کہ ہندو بن سے خاص کنہیا ہی کے ٹکے کی نمشی ہوئی دیوی۔ دودھ گھی کی ہنوں کا خزانہ اپنے اندر چھپائے ہوئے اور بڑے لمبے چوڑے دھبوں کی کاشت کے جائز دور، کا۔ بی ہوئی۔ گڑما سی دیر بعد یہ نشہ نما دین گیا اور آج سے چالیس روز بعد بھیا دیوچ کا دن ان کے سامنے کھڑا تھا اور جوں جوں دن گذرے شیا ما انہیں شیرنی سی نظر آنے لگی۔ ان کی ساری روایت سات ہشت کی سالکھ ہرپ کرتی معلوم ہوئی۔ اور اوراد گائے سے تو بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھا کرتی ہیں۔ اور آج شیا ما تو ان کے پیلے گرم دودھ میں گئی تھی۔ اور بھیا دیوچ کا ایک، ایک، دن کم ہو رہا تھا۔ دور دور فراہمی زندہ کی شکلیں نشتر نہ آتی تھیں۔ گوبدھن ٹٹک کی رات کی نیمذریں اتریں، دن کا سکون گیا۔ لائیں تو کہاں سے لائیں اور بائیں بھی تو کس پرستے پر اور کس سے۔ اور اس طرح میں روز گذرے، اور بین دن ہی کی بدور میں شیا ما رنگ پر آگئی اور کھلی رہی۔ کسی خوش نصیب کے تھان پر شیا ما اور دوسرا بھن ہوئی ہے کوئی دوسرا ہوتا تو خوشی کے مارے چوراز سنا کر گوبدھن ٹٹک پہنچا شیا ما کے مالک ٹٹک میں گل رہے تھے۔ تقدیر دیکھتے جی جولہ ہے اسے خالی کچھ کر تھا نی سے لگا رہے تھے۔ زمیندار نے بے لاد بھیا نیال کر کے ٹٹک میں بیٹھ کر دیکھا تھا۔ اور گوبدھن ٹٹک کے تھان پر میں دن ہی ہی بھن کھل گئی۔ گرم — گون جیتا ہے تری زہت کے سر ہونے تک — دودھ دے کی گھی دے کی کھجور دے کی۔ گوبدھن ٹٹک گوبدھن ٹٹک کی پچیس سال کی بی بی بنائی گئی تھی۔ بھیا دیوچ بدان کی بہن آئے گی اور وہ خالی ہاتھ ہوں گے اور ان کا دم گھٹنے تھا۔ بسات گذر کر کھڑا آگئے گی۔ تو ہری ہری جلی دھب ہرچ کر شیا ما جیسے ایک دم پہاڑ کی پہاڑی کے گائے بن گئی یہ بڑا پیٹ، بھرے ہوئے شکا سے تھن۔ اور بدھن میں جیتی اور دن دی، چال میں نشہ نما اور کبھی کبھی گوبدھن ٹٹک بھن گائے کو دیکھ کر سوچتے کیا سا بچا، کیا اچھی شیا ما گزرا اور بھن، فضا کی کی چھری سے کھٹے کھٹے پھی۔ مگر اتنے بڑے پچ کے احساس سے بھی وہ اپنے دل کو نہ بھانکے۔ وہ تو بھیا دیوچ کا تیرا سا سب کی طرح لہرانا، بھرہ اور تھا اور جس تر شیا ما دن دگنی رات چرگنی ہوئی اتنے ہی گوبدھن ٹٹک گھٹے اور کھلے اور ایک شام گوبدھن ٹٹک جھلی سے جھا کر شیا ما کو لا رہے تھے بستی کے قریب عینہ کا سا بولا گاؤں سے واپس جا رہا تھا۔ گوبدھن ٹٹک کی گائے کو دیکھ کر سا بولا نے اپنا دیہ روک جہاں مسالوں کے تدار کے بعد سا بولا کھانے کہا: تھاکو وڑی اچھی شیا ما پالی ہے۔

ان سا بولا جی پالی کیا ہے۔ سر پہ چٹکتی ہے۔ جی جولہ ہے کو ٹٹک کے لینے ہانچ دیتا کی جودت تھی۔ سودھ کنائے دیت تھے میرے پاس پانچ پانچ دیہ کاؤ کی دھرو۔ کسی کی امانت، کے دکھے تھے میں نے امانت کے دے دیئے۔ تو اب تو جے گا میں اب گئی ہے۔ ہوں ہانچ دیوچ دے کے کھاس کا مال بھی تو لے گا بیا، ایسی اوراد پھر شیا ما کسی تقدیر دے کے لاکھ گئی ہے۔ مگر بھر دیئے کی گزرا دے لاکھ سے اڈ پر کھ گئی۔ بس اب لیے دن چار مہینہ بعد۔

اور تھار مہینہ کا لفظ گوبدھن ٹٹک کو بولا کھانا دیا، آہستہ سے بڑھائے پھر سا بولا جی چار مہینہ کے لیے میں گئے جس کی دھرو جے وہ تو آج کا ٹٹک ہے۔ میرے لیے تو اس کی کھر جہادی مصیبت میں گئی۔

ارے تھاکو دیکھی بات، کتے ہو۔ یہ تو دودھا گائے ہے۔ ٹٹک میں کھی جاتی ہے پھر شیا ما۔ اس کا دودھ امرت، اس کا گھی آجیتا تھا کہ ہے شیا ما کا گھی دودھ، ہون میں دویں۔ کھتے چھپیں پھر سات بات ہے کہ پدے۔ بات کا گھی دودھ میں کھاؤں گا۔ اور بھاد آج

سے کو دان لگا۔ بلوگتے روپے؟

گوسا جی مثل تو ہے جی ہے کہ گامین گائے کس نے دیکھی؟

اس نے دیکھی وہ بھی کہہ کر جیب میں ہاتھ ڈالا اور برے کتنے روپے دوں؟

اور اب انکار کرنا اور وہ بھی تمہاری میں لانت مارنا تھا۔ سات روپے گوبر دین شکوہ کے ملق سے چلتی ہوئی آواز نکلی اور ساہوکار نے دس روپے جیب سے نکالے اور کہا: یہ لٹھا کر پھر نہیں جانی شرت معلوم ہے اوجھنی روپیہ ابوار سو دے گا۔ اور بھاڑا دار پیر پیر اور سیرا ورن پر پڑے گا۔ اور گولا کا معاصر ہے میں زیادہ بڑھانا نہیں چاہتا اس کو کھانا بھانا ہی پانی ہے؟

مثلی مشہور ہے جس کے لالچا دھرتی سو اور دھرتی دودھ نرنگ کر تو بہ دین شکوہ اچھی عورت ساجی نہیں رہے ہیں بیٹھے ہی بیٹھے بھی کھانے کھول کر ساہوکار نے انداز کیا۔ اور روپیہ انہی میں لٹا کر خوش خوش گوبر دین شکوہ کر آئے۔ شیاما اپنی بوکت ساتھ لائی تھی۔ اور اس روز گوبر دین شکوہ پین کی بندہ سوئے۔

(۴)

اور شیاما دیوچ کا معتدل زاد میں دن پہنچا جب آسمان برسات بھرنا دھوا دھوا شفاف نیلگوں بڑھا ہے۔ جب صبح شام خوشگوار ملتی جوتی ہے اور دوپہر کو کھانسی سونی مراد جوتی ہے۔ جب نصف کی تعلیم گزار کے سورج کی تیز کو نہیں پہنچتی ہیں اور سردی کا وجود اپنا غلبہ نہیں چاہتا۔ وہ لائی کی تار پک تاریں انداس کی بات سے بھد پانی دیو پر یہ کہہ کر خوش ہو کر رہنا چاہتا ہے اور جبکہ عیش کی کسر جھینکے پھینکے ہیں اور گوبر دین شکوہ میں بھانڈا پر شیاما دیکھی۔ اور دیکھ کر ایسی باؤ باؤ ہوئیں کہ شہر کے ورداؤں پر کبھی انہی کو جھٹکتے دیکھ کر یہ خوشی نہ جوتی تھی۔ جب معمولی زم اور پانی۔ بہن سے بیکا لیا۔ گیت گایا۔ پادھنا کی اور کچان پچا بھائی کو پرسا اور خود کھانا دان لیا اور سب وقت باہر شیاما تیز کر خوش ہو کر گرتی رہیں۔

اور دوسری بجیا دیوچ پر بھٹا پہنچ کر خوشی کے مارے پھولی نہ مائیں۔ ایک ذرا دھوا دھوا کچھڑا اور شہا کا دودھ سے بھرا ہوا خٹا۔ اس "پن" کھٹ جوا، شہا تھی کہ نعمت کی بات اور اچھی مہتر بر بھتیا دیوچ سے زیادہ کھانے پینے کا سامان بڑا اور دن میں کچھ گوبر دین شکوہ سے بھرا چنانچہ لاکر جتنا بہت خوبصورت تھی۔ شہا مال کی اور مقدہ رقم آگے بڑھنے والی اور جتنا بھیا کے دروازہ پر ایک کائے ایک کچھڑا دیوچ کو خوشی کے مارے آئے۔ سے باہر جوتی۔ بڑی ایک کے ساتھ گیت گایا اور سران پہنچ کر بڑی تعلیم اور خوشی کے ساتھ شیاما اور اس کے کچھڑے اور دودھ کا نہ کہ ساس اور شوہر سے کہہ "آپ تو بھیا کے تھان پر شیاما بندھی ہے۔ بڑی دودھار کچھڑیں دودھ لگی کی دہلی پہلی ہے خوب زور کی دعوت لائی ہوگی؟"

"طبیعت اچھی ہے خوب دان پُن کہتے ہیں پھر کیوں مائیں شہا ساس بولی۔ شیاما کائے بندھی ہے۔"

"اچھا شہا! ہے۔ بھیا کے تھان پر با شوہر نے کہا۔ شیاما کے کیا کہنے کسی تقدیر والے کو ملتی ہے۔ دودھ لگی مٹھا ہر چیز

امرت کی ہوئے۔"

"اور پھر بھگت مان ایسی کر گھر جوتے؟ ساس نے کہا۔

اور اچھی بھتیا دیوچ پر جب جتنا پھینچیں تو دو کچھڑے دیجئے۔ میرے بھتیا لاکھ بھر مائے گا۔ باڑھا بھانا ہرے گا۔ اب تو خوش ہو کر

کہا۔ اور ساتھ ہی ساتھ جگت نے بھائی کے چہرہ پر اطمینان اور فراغت کی چمک دیکھی جسم پر پڑے بھی تدر سے بہتر تھے۔ بڑی معنی آئی اور بڑے شوق کے ساتھ سسران پہنچ کر وہاں تک مڑ کر کوئی دہائی۔

اور شیاناکو گوردھن سنگھ کے معان پر تیسرا سال تھا کہجے بیوہ کی میعاد تین سال ہوتی ہے۔ کڑا کے دھیرے پر ساہوکار پر تین سال پرانا حساب چماتی کرتے ہیں اور اس دھیرے پر حساب لازمی تھا۔ اور ساہوچی کے بھی کھانڈ میں تو دودھ کی بوند بوند بھی کا قطرہ قطرہ لکھا ہوا تھا۔ اور چریت - اٹھارہ سے لے کر بھادو پیر کے اوپر اودھ میرا چمھی ساٹھ دو چمھی۔ اور ہر بھیا دیوچ کے حرج کا پیسہ میرے مع شرح سوداہ بناہ دو چمھی۔ دیسے تو حساب کتاب باعل صاف تھا اگر ساہوچی کی تفصیل کے ساتھ کھانا پڑا تین سال بھر چکے تھے۔ صفائی لازمی تھی۔ پہلی بھیا دیوچ پر صرف ٹاکھن اور گائے کی کھانڈ تھی۔ دوسری پر ایک بھیا بھی اسی زوہیں آیا اور تیسری پر دوسرا بھیا بھی لٹ پوٹ میں لپٹ گیا۔ گاؤں کے پتے میں جو سنے میری انھیں بڑھایا۔ پھر دھوں کی قیمت بڑھا پڑھا کر کھائی۔ مگر حساب جو حرج کے میزان میں دودھ بھرے ساہوچی کی جانب گئے اور آدمی گائے۔ اور آٹھ اس شرط پر لائے گوردھن سنگھ کے حوالہ کی گئی کہ بڈہ لایا کہ چارم لگی دودھ ان کا اور بھرے آٹھ آدھے۔ اور نصف لائے حکمت میں گوردھن اور بھیا کے درمیان چمھی دہا کر تیں۔ اور اس مرتبہ شیاناکا مال معلوم ہو رہی تھی اور دھیرے کے بعد دیوالی اور دیوالی کے تین بد بھیا دیوچ کا گیت پڑا تھا۔ مگر گوردھن سنگھ معنی تھے۔ مگر سال کی طرح اس سال میں وہ ساہوچی سے لے کر حسب معمول جیتا دیوچ کا مزاج پڑا کر دیں گے۔ اور جب دیوالی سے پیشتر وہ ساہوچی کے پاس گئے تو ساہوچی نے صاف انکار کر دیا۔ پہلے تو آدمی گائے اور وہ بھی گھٹی کا پتہ پڑا۔ اور آخر قریب دھیرے۔

اور حضرت میرا انکار گوردھن سنگھ کو تو پ کے گائے کی ہر لگی۔ نئی ہوئی چمھی کی طرح وہ بھیا جدا کیا۔ اور بھیا دیوچ کے تو آج سے سات دن دی جاتی تھے۔ اور سات دن ہیں وہ سات جنم لے کر سات مرتبہ جیتا بھی سات رہے ہیں میری مڑ کر سنا تھا۔ کچھ سوچا اور سوچ کر بھیا ساہوکار کے پاس پہنچا۔ اور کہا ساہوچی تو پھر آدمی گائے آپ کی رہی اور آدمی میری۔ اس کی قیمت نکھو نہ کر لے کر لے کر لے کر آدمی جیتا میری ہاتھ دھرو اور گائے تم سے لے کر؟

واہ بھیا کرچی واہ یعنی کہا بد سوکھی گائیں پائے بھرتے ہیں، تم پاؤ۔ اس کے نیکے بڑھاؤ لگی دودھ کر دو۔ مگر میرا کام بغیر سات آٹھ دھیرے کے نہیں بن سکتا، آج کے دن بھیا دیوچ بتا، اور جگتا آتی یوں گی؟ لیکن بھیا کہ وہ کچھ بھیا دیوچ یا دیوالی سوکھی گائے اور آدمی، اور آدمی دھیرے مہینہ کے سو او۔ بڑے تباہی پر سات دھیرے کیسے پتہ جائیں گے۔ معنی جادو ہوئے اتنے پاؤں میلا لے آدمی۔

”تو پھر مجھے تو اپنے حقد کی گائے دکھانا نہیں ہے اب؟“

”نہیں پائے تو بیچ لو جہاں بیکے اور ہمارے آدھے دام ہمارے ہاتھ دھرو“

”مگر آج کل اسے لے گا کون۔ پہلے تو گا بھن نہیں ہے۔ اور کابھی بھی ٹکلی تو دودھ پیا۔ گے گی چھ سات مہینہ بعد“

”کوئی نہ لے گا تو پاؤ۔ روڑگا کر دو۔ چار مہینے میں بھی لکائے کے دیوگے آپ بھی مثالی نہ کھا پڑو گے۔“

”تو پھر اس بھیا دیوچ کا مزاج پڑا کر دیو“

”گنہگار نہیں ہے، خدا کر د اور تبار اس نہ چھے تو ختم کر دیج ڈالو، مگر ہم تو میں گئے نہیں“
 ”تو کوئی گاؤں والا کسان تو ایسے ہیں گے گاہیں نقائی کاٹے گا؟ گربورن سنگو نے کھینا مہر کہا۔
 ”کچھ ہر دم جانو، ہم کب کہتے ہیں کو تم خالی گائے بھی، تمہیں تو دیکھتے ہو؟
 اور گربورن سنگو تاؤ میں مہرے چپے آئے۔

(۵)

بیتیا دیوچ کے مقدس اور مخلص نبی ہاڑیں دودن باقی تھے اور گربورن سنگو کی حبیب خالی تھی۔ اس کا دل سیزن میں دھک دھک کر رہا تھا۔ اور اس کا دم گھٹنے تھا، اور جب اس کی بہن دودن بعد آئے گی تو خالی ہاتھ جاسے گی۔ اس کے دل کی حرکت بند ہو جائے تو تعجب نہیں۔ اور پھر اس کے پاس تو اس کے ایک وقت کے کھانے کے قابل بندہ گھس اور آلو بھی نہیں اور بیتیا دیوچ کی صفائی کی مثل کے بلے وہ برگزینہ نہ کھوئے گا۔ اس کے سیزن میں کو تو سے پھر پھر اٹھتے۔

مہر مہر کا تھکا لارا تھا کہ اپنے جھوٹے کے سامنے صحن میں بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھ سر پر رکھے، جیسے بوری ایک سلطنت کا مالک، جس کا بہت خیال ہو رہا ہو۔ اور اس کے ہمارا مدی مدیوں کی بنی ہوئی ساکھ اور عزت مٹی میں مل رہی تھی۔ اس نے ایک لمبی سانس لی اور تمام باہل کو پھٹا لہ۔ برسات کے مہرے گھر پھوس کا جھوٹا جس کے اندر ایک چادپائی پر کچھ پیتر سے گڑے پڑے ایک جانب کچھ اور دوسرے مٹی کی پٹلی کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ اور اندر کو گھسار کی گھڑی کا دروازہ۔ مہر مہر سی پٹا را خالی۔ باہر سے ایسی ٹپکی چپڑی جیسے معلوم اس میں کتنی ہنس مہر ہے اور کھوٹے کھوٹے جذبات سے ادھر سے منہ پھیر لیا۔ اور سامنے شیا گھڑی دم ہلا رہی تھی۔ اور گربورن سنگو سب گیا۔ اور راجپوت جاگ اٹھا۔ اور بکلی کی ہر سی اس کے داغ سے چل کر دگ گھنٹا پی ٹپکی پٹی گئی۔ اور جیسے وہ اچھل کر کھڑے ہو گئے اور کڑے کمان کے تیر کی طرح ہما جن کا منہ پڑا سے جی جولا بے کے گھر میں بیٹھے، جی جولا بے الاڈ کے پاس تنہا بیٹھے ہوئے تھے جاتے ہی گربورن سنگو بے دھڑک بولے ”چاچا ہمارا لکھے بیچ دیو“

ابن بیتا تباری لکھے! وہ تو آج کل تھنہ ہے کون لینے کو؟

”جو کوئی لینے“ انہوں نے قدرے آزادی سے کہا۔

”تاہی بیت، کون پڑے گا، کوئی کسان تو بیچے گا نہیں؟“

”مہر جو کوئی لینے“

اور جی جولا بے نے غارت گھاہ سے ان کا ہر دیکھا اور مضبوط ادا دے واسے راجپوت کے انداز میں بات کر رہے تھے اور مہر بولے ”تو تم ساہو جی کو کہیں نہ لٹا گئے دیو۔ آدمی دے تم کو لے لہو“

ساہو جی ناہیں لیت، لکھتے ہیں پارا اور نہیں تو جہاں چاہے بیچ ڈالو ہمارا سی ادھیا ہمیں دے دے دیو۔

”مہر جی تم پاؤ؟“ جی جولا بے نے طنز یہ انداز میں کہا۔ ”یو لہ چتا رہے۔ اب کے تیرے سال وڈ پھڑے اور پووی گائے انہیں مہر ہو جائے۔ اور تین برس گھس دو دھ نفع میں کاتیں — سالہا جہاں ہے مہا جہاں! اور جی جولا بے کو شیا کے ساتھ لگاؤ تھا۔ پھر بوڑے بڑے دانت لٹک کر کہا ”کسانی ہے (نقائی، کانی، دیکھو تو۔ بے ایمان گلو کال کے دیت ہے سود کے لالچ میں“

”اودہ پسوں بھتیجا دیوچ ہے تم جانت ہو“

”ہیں سمجھ گیا بیٹا۔ پھر تم اچھی مروت سمجھ برہم لیو؟“

اودہ مجبور تھا کہ بیکہ کی گردن ندامت خرم اودہ روایات کے بارے میں جھگ گئی۔ اس کے شیشے سے ہم پر دوبارہ کا بدستیں آگیا۔
شام کو قصبہ سے جی بولا ہے بقر قصاب کو بلا لائے۔ بقر قصاب نے اودہ سے خیشے تک ہاوں میں باغہ لگا کر انشا ماکو
پڑتا لا، ہر سر ہنوز دیکھا۔ اودہ سے ہنوز معائنہ کیا۔ خیشے جھگ جھگ کر دیکھا۔ پھر استر سے دم کھنچی اودہ پڑ پڑایا۔ دوس مال ہے۔ دہاج
درجہ کی سمیت۔ بس دوسرے۔

اودہ تھا کہ کے کان میں میں کہتے تین سال کے گئی دودھ کی آواز کا وزن ساہوکی کے ہی تھا تر سے حساب ہو کر گیا تھا۔ آج اسی
کے گوشت کا تختہ کیا جا رہا تھا۔ جی بولا ہے نے سودا چکایا اودہ چودہ دو پیہ میزان لگی۔ نیا ماکو کی دسی بقر قصاب نے پکڑی اودہ چودہ دو پیہ
گوہر دھن سنگھ کو پکڑ لائے۔ گوہر دھن سنگھ نے دو پیہ ہاتھ میں لیے جیسے بکھوٹے کاٹ لیا۔ بغیر گنے جی تو لہنے کی جانب پڑھائے اودہ لکٹی ہوئی
آواز میں بولے ”چاچا تم سات روپیا اس جہا جن کو دے آؤ اور سات اپنے پاس دھر لیو کل دو پڑھکا آئیں تو پہنچا ڈھکیو۔
”تو پھر نہیں دھر لیو نا، جتنے کہا۔ اور گوہر دھن سنگھ کو ایسا نائی پڑا جیسے کہہ رہے ہیں۔“ ایک من گوشت تم نے یہاں
ہے اس کے سات روپہر بھی تم اپنے پاس رکھو۔

”ناہیں چاچا نہیں دھر لیو اپنے پاس اودہ سات اسے دے آؤ جہا جن کو“ گوہر دھن سنگھ نے جلتے جلتے کہا اور جیسے ایک من
گوشت کا ٹوکرا سر پر دھرے گھر کی جانب بٹھے۔ انہیں خوب یاد تھا۔ کہ بچپن میں کہا ہوا میں سنا تھا کہ محمد فری۔ نہ جب دوسرے سر۔ نہ
محمد کیا تو اپنی فوج کے آگے گوہر دھن سنگھ کو لے کر گیا تھا۔ اودہ پڑھنے پڑھنے آئے جیو۔ اور اس کے ساتھ۔ کہ جب سب چوہان اپنی تھواریں
بند کیے بیچے بھٹتے رہے تھے اودہ محمد فری کی فوج بڑھتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ انہوں نے خود کی فوج کی آذینوں کی فوج کر لی تھی اودہ
چوہان گھوڑوں کو کاٹ کر توڑ کر تک نہ پہنچے تھے اودہ بغیر اسے دلی فتح ہو گئی تھی۔

اودہ اس کی تلواریں گانے کی حفاظت کے لیے بنی ہے۔ اودہ آج اپنے اعلیٰ دکانے کو چھری تھے دسے کر رہا ہے۔ وہ
اپنے سنان گھر میں پہنچا۔ نیا ماکو کے تھان پر گوہر پستور بجا پڑا تھا۔ اور سانی کی ناندیں چارے کے پس خوردہ پر کھیاں بھینسا رہی تھیں
اودہ اس نے ایک گہری سانس لی اودہ زمین پر آگڑوں بیٹھ گیا۔

اودہ بھتیجا دیوچ کے دن حسب معمول بچا پیش پر آؤی، اودہ کارہہ ہر سال دلا ستر سات من سے پڑ پڑا گیا، کارہہ، شام
کو جایا کر لی تھی۔ اودہ جگہ پیش پیش پر کارہہ کو منتظر ملتی تھی۔ مگر آج وہاں نہ پہنچی تو جو دہری کہا رہا وہاں موجود تھے۔ ان کے والے پکڑے
اودہ مٹھا کی کا ٹوکرا کیا اودہ کہہ دیا کہ گھر کہہ دینا کہ جہاں اودہ مٹی جی کو بھتیجا نے غمناک رہا ہے اودہ کل آئیں گے۔

صبح جی جگہ جگہ کی کے دوا دہ کے قریب پہنچی تو کچھ جمع اودہ کچھ آوازیں سن کر ہاتھ منٹکا جب اس کے بڑھی تو جتنے مزاحی باتیں۔
”اچھے غامسے تھے کل دن منہ سے“

”اسے ہمارے پاس بیٹھے حلیم بیت رہے۔“

اور کل دن منہ سے سات دو پیہ بھتیجا دیوچ کے ہرے پاس دھر رہا رمانت، دھرے۔

اور اتنے میں شور ہوا کہ آئے گئیں۔ آئے گئیں، چکا آئے گئیں۔ اور جتنا پیرتی جھارتی اندر پہنچی تو گوبردن سنگھ کے جنازہ پر جا کھڑی ہوئی۔ غری طور پر بہن کی چیخ نکل گئی۔ تمام جسم ہیٹ کو پھینک دیا۔ سب موت پر چہ یگوئیاں ہو رہی تھیں۔ اور ایون کی کاشت تو تمام گاؤں میں عام تھی۔ اور سال دو سال پیچھے ایک دو قصبے ایسے ہو ہی جاتے تھے کہ سب کا پتر نہ تھا۔ جب جتنا دوسرے پیشے سے ذرا ہوش میں آئی اور اس نے وہ مخصوص گیت جن کے لہجہ میں گایا جو بھیتیا دیوچ پر گایا کرتی تھی۔ اور جی جولاہے نے گوبردن سنگھ کی امانت اتنی سے نکال کر دے دی اور جیکھانے تو گوبردن کے جنازہ پر کھڑے ہو کر شیکا کیا اور پھر مٹھائی کی ڈلی بند ہونٹوں کی جانب بڑھا کر بین کیئے مگر گوبردن سنگھ تو آج کی بھیتیا دیوچ کے دان کا راز اپنے بند ہونٹوں میں چھپائے اس قدر تلاش تھے کہ ہونٹ بھی نہ کھولے۔

اور جب لا فادارٹی جنازہ ٹھہری بنا کر اور کفن پہنا کر جیکھانے گاؤں کے چنوں کے حوالہ کیا تو دروازہ پر شیا ما کو ایسے دھائی کھڑا تھا جو آہستہ آہستہ جی جولاہے سے کہہ رہا تھا کہ ڈاکٹر نے پاس نہیں کی۔ گاسٹے کا سین نکلے۔ سالے کو دور دور پر ویتا رہا نہیں مانا۔ آج کی دوکانوں بھی ماری گئی — اور جیکھانے کو پہچان کر قریب آگئی۔ اور سب حال معلوم کر کے بھیتیا دیوچ کے دان ولے سات روپیہ اور سا ہوا دارو الے سات روپیہ علیحدہ علیحدہ نکال کر حوالہ کیئے اور کا دندہ سے آہستہ سے ایک جانب سے جا کر کہا۔

فشی جی اب کی مرتبہ بھیتیا دیوچ کے دان میں بھیتیا نے شیا مانگائے دان کی سہے سمجھ گئے۔

پرواز کے زخم

کشمیری لال ذاکر

میں ابھی ابھی اس کے گھر سے لوٹ کر آیا ہوں اور اپنے کمرے میں بیٹھا سگریٹ پی رہا ہوں۔ پردوں کے کارن کرے کا ماحول کچھ عجیب سا ہے اور اس میں سگریٹ کے دھوئیں کی گھبرائی کی گھبرائی جھلکی ہے۔ ایک دوسرے میں غلط طور پر ہیں۔ سامنے تپائی پر رکھی اینٹیں ٹڑے میں ایک اوجھلا سگریٹ ابھی تک سلگ رہا ہے۔ میں سگریٹ کو مسل کر اس کی ہستی نہیں دھٹاتا، اسے نندہ رہنے دیتا ہوں اور اس کے آخری حصے پر میرے ہونٹوں کے نشان سوئے رہتے ہیں اور اس میں سے ہلکا سا لڑتا ہوا دھواں اٹھتا رہتا ہے۔ میں اسے سلگنے دیتا ہوں جب تک کہ وہ خود نہیں بجھ جاتا۔

مجھے ایک دم گھبرا جانے سے سلگ سلگ کر تپ تپ کر ڈھک ڈھک کر دھیرے سے بجھنا پسند ہے۔ اس طرح ارتقا کی سب منزلیں طے ہوتی ہیں۔ درمیانی منزلیں طے کیے بغیر آخری منزل پر پہنچ جانا تو ایسے ہے جس طرح کوئی پرندہ پہاڑ کی چوٹی سے اڑ کر ایک لمبے آسمان کی بلندی کو گھوڑنا چاہے اور اگر اس کے منہ ٹوٹ جائیں تو اسے زمین کی پستیاں بھی قبول کرنے سے انکار کر دیں۔ ایسا ہی کچھ ناگزیر ہے زمین میں ابھر اسے آج بیناں کو دیکھ کر۔

بیناں کو میں ۱۹۴۷ء سے جانتا ہوں جب بڑا سے کے بعد میں اس شہر میں آیا تھا۔ ان دنوں وہ دوسری جماعت میں پڑھتی تھی اب بی۔ اے کر چکی ہے۔

ان دنوں وہ سبزی بیچوں میں بھیجی ہوئی کلی قتی اب پودے کے عین اوج پر کھلا ہوا بھول ہے۔

عالمی نو عمر کا عید تھا۔ فساد شریک ٹورنٹ منٹ شروع تھے میں وہی ہر کوٹ کھیل کر ادا آفریں پٹ کر گھر لوٹا تھا۔ ہمارے گھر میں ذہن میں کانٹے کی طرح چھوڑا تھا۔ جسم میں ٹھنکن کے کارن درد ہونے لگا تھا۔ میں گھر پہنچتے ہی بستر پر گر گیا اور آٹھ گھنٹے بند کر کے دن بھر کے کھیل کے متعلق سوچنے لگا۔

”جانی جان کھیل آئے میچ؟“ شاد را مجھے جانی جان ہی کہہ کر لپکا رہا ہے۔ بھیا نہیں کہتی، اسے یہ آغاز پسند ہے۔

”ہاں“ میں نے کہا۔ شاد را میرے سر ہانے بیٹھ گئی۔

”ارگئے؟“ اس نے ٹھوس اس انداز سے پوچھا جیسے اسے پہلے ہی یقین ہو کہ میں ہمارے گھر آؤں گا۔ آخر وہ میری ہی ہے۔ وہ جانتی ہے اس کا جانی کسی بھی کھیل میں کبھی نہیں جیتا۔

”ہاں!“
مفتوحہ قائم ہے۔“ شاردانے اپنا ہاتھ میسے ملتے پر رکھ دیا اور میں نے اس کی تپتی تپتی انگلیوں کی ہر پائی ٹھنڈک کو محسوس سمجھتے سمجھتے کھول دی۔ وہ مسکما دی میں جب ہارنا ہوں وہ مسکراتی ہے اور اس کی اس معصوم اور بے لوث مسکراہٹ سے شکست کی چھین ایک دم دم جاتی ہے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”چلئے ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”چلئے تیار کبھی ہے میرے کمرے میں۔ وہیں پٹے میری ایک سیٹی ملی ہے، اس سے شے“ شاردانے جواب دیا۔
”لیکن میں نے تو منہ ہاتھ بھی نہیں دھو دیا۔“
”کوئی نسا میرے بچہ رو میں جا رہے ہیں آپ۔“ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کھڑا کر دیا۔ ”کسی وقت تو حذر کر دیتے ہیں آپ۔ یوں سچا دن ہر آئینہ بھی نہ دکھیں لیکن۔“

”چلو بھئی“ میں نے اسے مزید ہونے کا موقع نہ دیا۔ میں جانتا تھا وہ کیا کہے گی۔
”کمرے کا پردہ اٹھا کر اس نے اندر قدم رکھا اور اس کے پیچھے میں داخل ہوا۔ سامنے کرسی پر ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ بول
چوکی جیسے کوئی بھرنی اپنے قریب آہٹ پا کر ڈر جائے۔
”نیناں۔“

”بھائی جان۔“
نیناں نے لمحہ بھر کے لیے پلکیں اوپر اٹھائیں جیسے جھیل کے گہرے نرل یا پانی پر عیور کا ہلکا سا نیم اندھیرا اپنی بھر پور جاذبیت سے چھا گیا ہو اور پھر فوراً ہی اس نے پلکیں جھکالیں جیسے کوئی صبح کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا ہو اور جھیل کا پانی سا گہرا ہو گیا ہو اور اس کی سطح پر رات کے سائے لہرانے لگے ہوں۔

”کمرے میں دو کرسیاں تھیں سامنے کی دیوار کے ساتھ شمارہ کا پلنگ تھا جس پر سفید سلک کی چادر بھی تھی۔ وہ پلنگ پر بیٹھ گئی میں نے کرسی لے لی۔ میں اور نیناں آگے سامنے بیٹھے تھے۔ بیچ میں تپائی تھی۔

”نیناں بڑی اچھی کہانیاں لکھتی ہے بھائی جان۔“ شاردانے پتلیوں میں چائے کا پانی ڈال رہی تھی۔
”تو آپ ہماری برادری کی ہیں؟“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جی!“ نیناں کی پلکیوں میں غصیف سی لڑش پھٹی وہ ذرا سا ادب پر اٹھیں جیسے جھیل کے پانی پر دو لڑن وقت لگے لگے ہوں۔
”صبح شام کے بازوؤں میں پھیل کر مسکما رہی ہو۔“

”جب بھی اس وادی میں کوئی قدم رکھتا ہے تو مجھے خوشی ہوتی ہے۔“
”میرے بچے ہماری قدم کہاں رکھ رہی ہے؟“ شاردانے میری بات ٹوک دی۔

”مراستے پر چل پڑنا ہی قافلے میں شامل ہو جانا ہے بھئی۔ کسی نہ کسی موڑ پر تو دوسرے مسافر مل ہی جاتے ہیں۔ جیسے آج میں مل گیا ہوں۔“

میری بات سن کر نیناں کی آنکھیں ایک بار پوری طرح کھل گئیں جیسے ساگوان کے گھنے جنگلوں میں سوئی شبنم کے سینے پر کھلی دودھ پہلنے لگی ہو اور اپنی نرم نرم کون سے اسے لگا لگنے لگی ہو اور ساری خواہیدگی، سارا کسل، ساری نیند پھوٹنے لگی ہو اور صبر چاک جانے کیا ہوا کہ تمام جنگل پر اندھیرا چھانے لگا اور دھوپ ٹٹنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف گھٹنا اندھیرا چھ گیا۔ نیناں کی آنکھوں میں بے پناہ غم جھلک اٹھا جس نے گھبرا کر اپنی نگاہیں چائے کی پیالیوں پر گھاڑ دیں۔ شاد روا پیالیوں میں دودھ ڈال رہی تھی اور بھول گئی تھی کہ میرے اور اس کے درمیان کوئی گفتگو چل رہی تھی۔

”بھائی جان آپ یہ پیالی لے لیں“ اس نے نیناں کے آگے بڑھی ہوئی پیالی میری طرف سرکادی اور میری پیالی اس کے آگے کر دی۔
”یہ کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”نیناں کو بالائی پسند ہیں۔ یہ تو چھٹے میں دودھ چھان کر ڈالتی ہے“ اس کی پیالی میں بالائی کے چھوٹے ٹھکڑے تیر رہے تھے۔
”اچھا!“

”ہاں!“ گھر میں اس کا اکثر اس بات پر جھگڑا ہو جاتا ہے ”شاردا نے کہا۔
”بڑا رشتہ کر سکا کافر بھیسے“ میں نے اپنی پیالی میں چھوٹا گھانا شروع کر دیا شاد روا نیناں کی پیالی میں شکر گھول رہی تھی۔

دیسائے میں شکر بھی خود نہیں گھولتی کم بخت، ہر کلام اسے کیا کرایا چاہئے۔ شاد روا نے پیار سے اس کے کال کو چھو لیا اور نیناں ایک دم جیسے جاگ گئی ہو۔

”مسوہ ہی تھیں آپ؟“ میں نہ سنا۔

”جی نہیں“ وہ ذرا سا مسکرائی اور اس کے چھوٹے چھوٹے نور اذانت جھک اٹھے پراس مسکراہٹ میں ایک کسک سی تھی، جیسے دودھ کی ایک ٹپکی سی لہاس کی سنسوں میں بھیل گئی ہو۔ اس کے چہرے پر نرمی سی گھبراہٹ سی تھی اور آنکھوں کا اندھیرا اور گہرا ہو گیا تھا جیسے وہ کسی دادی میں کھڑی کوئی بھاڑ کی چوٹی ہو جس کی ایک طرف تو سورج کے ڈھلنے سے چمک اٹھے، دوسری طرف اندھیرا پھیل گیا ہو۔
کچھ دیر تمیز خاموش بیٹھے چائے پیتے رہے اور اس کا چہرہ دھیرے دھیرے اپنی نارمل حالت پر آگیا۔

”کون سے معنوں لے رکھے ہیں آپ نے؟“ میں نے پوچھا۔

”سائنس اور فل معنی پیکس“

”بڑا مشکل کنفیئشن ہے، ڈاکٹری کرنے کا ارادہ ہے کیا؟“

”خیال تو ہے!“

”آپ بھی تو ڈاکٹری بننا چاہتے تھے نا بھائی جان؟“

”ہاں!“

”اور سن گئے انسانہ نگار، شاید کسی لکھے، والے پہلے ڈاکٹر بننے کے خواب دیکھتے ہیں“ شاد روا نے غلوس سے چھوڑ کر میری تھی۔
میرے خیال میں ڈاکٹر ایک بہترین ادیب بن سکتا ہے، انسانی جہاں اور ذہن کی ایک ساتھ واقفیت تو انسان کو زندگی کا مکمل نتائج بنا دیتی ہے۔ ادیب بھی ایک طرح کا ڈاکٹر ہے جو کہ ہرے جہاز ذہنوں کو تازگی اور صحت دیتا ہے۔ ٹھیکہ اور نا امید لوگوں تک کو زندہ رہنے کا

پیغام پہنچاتا ہے۔“

نہیں اس نے پہلی تپائی پر دکھ دی اور میری طرف دیکھنے لگی جیسے وہ خود بھی یہی کچھ سوچ رہی تھی۔ لیکن سوچ کی شکل واضح اور مکمل نہ تھی اور وہ اس لیے خاموش تھی اور بوڑھی نہ تھی۔ میں نے جیسے اس کے من کی بات کہہ دی تھی۔ اس کے ذہن سے ایک بوجھ سا اتار دیا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک دم ایک پیاری سی زماہٹ چھا گئی۔ ایک لطیف سی آسودگی۔

”تم ڈاکٹر بڑگی یا لیکسک؟“ اشارہ اس سے پوچھا۔

”جو زندگی بنادے گی“ یہ شاید ہیلا مکمل جواب تھا جو نیناں نے دیا تھا۔

اتنی چھوٹی عمر میں ہی اس نے شاید حالات کے بندھنوں کا اندازہ کر لیا تھا۔ زندگی نے اس اور کھلی کی بیکسٹریکس کے ارد گرد بھی شاید کائناتوں کا گھیر ڈال دیا تھا یا وہ محسوس کرنے لگی تھی کہ کچھ کھلیاں بچول بننے سے پہلے ہی ٹوٹ جاتی ہیں اور کچھ بچول کھل کر رہتی ہیں۔ یہ بیکسٹریکس تھیں۔ اس کے ذہن کی عجیب جلی جی سی کیفیت تھی جیسے دو محب اور بچاؤں پر ازاد و فرشتگی تصویر کا کسٹچ ہو کر مکمل تصویر بن نہ ہو۔ اور تصویر مکمل ہونے میں خاصا وقت لگا۔ بہت دنوں تک تیسرے سامنے وہ کسٹچ ہی پڑا رہا اور میں اسے دیکھتا رہا۔

قیناں کے پناہاں کے ایک بہت بڑے وکیل ہیں اکثر قتل کے مقدمے ہی لیے ہیں۔ سول کیئر سے انھیں کم دلچسپی ہے۔ قتل کا مقدمہ دھارنا سول کے دس مقدمے جیتنے سے بہتر ہے، کچھ اس طرح کا خیال ہے۔ انہیں وکالت کے بارے میں کوئی دن بھر اس کے قریب ان کی پرمکیش ہے۔ یہ ملک کافی پسماندہ ہے اور لوگ اپنا بہت سادہ ڈرائیونگ جھگڑوں میں ہی تباہتے ہیں۔ بایج ہزار ہویا سو اسیات میں رہتے ہیں وکیل صاحب کے خاص جگہ تھیں۔ ان کی کوٹھی شہر سے باہر اجرائے والی ٹرک کے کنارے ہے معلوم ہوتا ہے یہ نگہ انھوں نے کسی مقدمے میں ہی حاصل کی ہے، درناتنے وسیع احاطے میں تو ایک محل بن سکتا ہے لیکن انھوں نے ایک مختصر سی کوٹھی بنانے پر ہی اکتفا کی ہے اور بورج اور دوزور اس پر کام کرتے رہے ہیں شاید وہ بھی کسی مقدمے میں ہی پھنسے ہوئے تھے۔ درنہ جنھوں نے لہدیٰ امجرت لے کر کام کرنا ہوا اس بے دردی سے نہیں کرتے پہلی بار جب صبح کو سیر ملنے بہتے ہیں ان کی کوٹھی کے قریب سے گزرا تو وکیل صاحب کا بورڈ پڑھ کر دنگ لگی تو یہ نقادیناں لگا کر چرا چھاندر اصل لگ رہا تھا۔ مختصر کوٹھی تو یوں لگ رہی تھی جیسے کسی بڑی گھر مثال میں مانیوں کے کچھ کوادرڈ پھول اور کوٹھی کے آگے کھلا احاطہ جیسے گولڈ کوسدھانے کے کام آتا جو کچھ کوٹھی میں تپتی سی رشتا نیاں اوڑھے پھاہک سے باہر نکال رہے تھے۔ شاید یہ دیو میر لوگ تھے جن کے سرائے وکیل صاحب کی پرمکیش محل پر تھی۔ وہ صبح صبح رفع حاجت کے لیے باہر جا رہے تھے۔ رات انھوں نے یہیں گزار دی تھی۔ شاید آج ان کی عدالت میں پیشی ہو۔ میں آگے قدم بڑھانے ہی لگا تھا کہ کوٹھی سے ایک صاحب باہر نکلے خوب برٹھی ہوئی توند، سربا نکل منڈا ہوا اور گھٹنوں کے ذریعے تنک چڑھی ہوئی دھوئی میز پر جس پر گولڈ مائڈرک سا کراہیں انھیں وکیل صاحب کھوں، پر تھے وہ وکیل صاحب ہی جس سے میرا اس دن تعارف ہوا جب میں اور شارادہ قیناں کے ہاں جائے پر گئے تھے۔

”تمہاری سہیلی کی کوٹھی کیسی ہے شاندار؟“ میں نے کوٹھی کے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”میں نے ان کے پتا پرانے خیالوں کے آدمی ہیں۔ وہ اس طرف کم ہی دھیان دیتے ہیں“ شاردانے جواب دیا۔

”اتنا بڑا احاطہ گھیرنے کا فائدہ؟ اس میں تو ایک ریاضی جی کیپ کھل سکتا ہے۔“

”آپ بھئی نہ اُٹھیں باتیں ہی سوچیں گے۔“

”اگر فاقی جائدا کو اس مری طرح ہی استعمال میں لانا ہو تو اسے قومی ملکیت قرار دے دینا چاہیے“ میں نے ہلک پر دھمال کھینے کی ضرورت محسوس کی۔ ایک طرف بندھی ہوئی گورنر میں لت پت جھینسوں نے، چچا خاں مگر گھسان مچا رکھا تھا۔

اس وقت نیناں اندر سے بھاگتی ہوئی آئی اور اس کے پاؤں سے احاطے میں وصول کے بادل اٹھ کھڑے ہوئے۔

”ننھے بھائی صاحب!“ اور پھر اس نے شارد کو اپنے ساتھ پوٹا لیا اور دونوں ہنسنے لگیں۔ میں ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا اور دھول میرے سوٹ پر جم رہی تھی۔ کم بخت کو آج ہی ڈرائی لکھیں کر اس کے پھینا تھا۔

نیناں ہیں ایک بڑے سال کا لڑکا جس میں سے گزرتے ہوئے ایک چھوٹے سے کمرے میں لگتی، بال کمرے میں سے گزرتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ وہ ان کا ڈرائنگ روم اور اس میں شام کا سائرسٹری اہلا تھا۔ ایک صوفہ سیٹ اور کچھ کرسیاں پڑی تھیں۔ فرش پر غالباً ایک دی بھی تھی اور دیواریں بہت اونچی اور صاف تھیں ان پر کہیں کوئی پرانا کینڈر بھی نہ تھا جس جھوٹے سے کمرے میں ہم آئے وہ خاصا اچھا تھا۔

دو در نیناں کا کمرہ ہے جانی جان!“ شارد نے مجھے مخاطب کیا۔

”کمرہ نہیں میری میری پناہ گاہ ہے۔“ نیناں نے مسکراتے ہوئے کہا اور میں نے محسوس کیا کہ کچھ روز پہلے جوہر نے میری آہٹ پا کر چوکی تھی وہ واقعی زخمی تھی اور اس کے سینے میں کوئی گہرا گھاؤ تھا۔

”مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے کوئی غلستان ہے“ میں نے جواب دیا۔

”اور میرا کچھ مچھا۔ جب بگلوں کا طوفان اٹھتا ہے تو اس سے بچنے کے لیے ہی سہا رام میرے کھلم آتے ہیں“ وہ مسکراتے ہوئے بولی اور پھر اسی طرح مسکراتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں اس کے کمرے کا جائزہ لینے لگا ایک دیوار کے سہارے اس کا چٹکا تھا اور اس کے ساتھ ہی تپائی تھی جس پر ایک خوبصورت شیشیل ٹیمپ رکھا تھا۔ سامنے کی دیوار کے ساتھ کتا بوں کی بڑی سی الماری تھی جہاں کے باہر چھوٹا سا قفل لگا تھا شمالی دیوار کے ساتھ ایک آرام کرسی تھی جہاں بیٹھ کر الماری کی ایک ایک کتاب پر نظر پڑ سکتی تھی۔ اس دیوار میں ایک کھر کی مٹی جو پہلے کھلے احاطے کی طرف تھی مٹی کھر کی پر ہلکے آسمانی رنگ کا پردہ تھا جو شاید اٹھایا کوئی جاتا تھا۔ جنوبی دیوار میں کمرے کا دروازہ تھا جس میں پردے کی جگہ جتی پڑی تھی۔ فرش پر ایک نفیس کارپٹ تھا اور ایک کونے میں پیتل کے گئے ہیں زنگ کے پھول تھے۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر کتا بوں کی الماری کے سامنے جا بھڑا ہوا اشارہ مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔ شارد امیری عادتوں سے واقف ہے، بیکار میں نہیں ٹوکا کرتی۔ اس وقت ٹوکتی ہے جب اس کے خیال میں میں حد سے گزر جاؤں۔ الماری کے ایک خانے میں کتا بوں کی قطار کے اوپر فریم میں لگی نیناں کی تصویر رکھی تھی جس سے دیکھنے لگا۔

”میرے کتا بیں دیکھی جا رہی ہیں یا تصویر پر؟“ شارد اولیٰ۔

”کھانا میں بھی اچھی ہوں اور تصویر بھی“ میں نے جواب دیا اور کتا بوں کو زیادہ غور سے دیکھنے لگا۔

ہندی سائیکل کی فائندہ کتا بیں موجود تھیں۔ انگلش اور فرنچ لٹریچر کی بہت سی اچھی اچھی کتا بیں تھیں اور اردو ادب، نظم اور نثر دونوں کی تخلیقات موجود تھیں۔ کتا بوں کو دیکھ بھینچنے کے بعد پھر تصویر کو دیکھنے لگا۔ ایک جوان سی لڑکی جس کا ماحول اتنا خشک اور غیر ادنیٰ ہو ذہنی طور پر تپائی اچھی طرح کیسے نکھر سکتی ہے۔ اس کی شخصیت کو ابھارنے میں ضرور کسی دوسرے شخص کا ہاتھ ہے۔ میں ایک نئی المین میں بیٹھ گیا استے ہیں نیناں کمرے میں داخل ہو گئی۔

”صچائے آ رہی ہے، ارے آپ میری کتابیں دیکھ رہے ہیں!“
 ”ہاں بغیر تمہاری اجازت کے“ میں نے جواب دیا۔

”جوں لوگوں میں میرا جیون گزار رہا ہے وہ اجازت لینے کے قائل نہیں۔ وہ تو میرے خط تک اٹھا کر پڑھ لیتے ہیں اور محسوس نہیں کرتے کہ یہ رویہ غلط ہے۔“

اس کی آنکھوں میں پھر ایک دم ایک درد سا لگا گیا۔ کتنی بیزار مٹی اپنے ماحول سے وہ۔ اس نے الماری کی چابی مجھے دی اور میں الماری کھول کر کتابیں دیکھنے لگا۔

جائے پڑتے ہوئے میں نے پوچھا:

”نیناں یہ سب کتابیں تم نے خریدی ہیں؟“

”جی نہیں۔ بہت سی کتابیں میرے بھائی صاحب بھیجتے رہتے ہیں۔“

”کہاں ہیں تمہارے بھائی صاحب؟ میں نے تو کبھی نہیں دیکھا انہیں؟“ شاردہ اپنے پوچھا۔

”کوئی برسوں سے الہ آباد میں کالست کر رہے ہیں بہت دنوں وہ اس ماحول میں گڑھتے رہے اور آخر اسے چھوڑ کر بھاگ گئے۔“

”وہیں رہتے ہیں کہیں سال ڈیڑھ سال میں وہ ایک دن کے لیے یہاں آتے ہیں؟“

”کبھی آئیں تو مجھے ملاتا؟“ شاردہ انہ کے کہا۔

”ہو سکے تو مجھے بھی؟“ میں نے کہا۔

”مجھے تو محل ہوئی ہے شاردہ کو دیکھ کر ہے آپ جیسا بھائی ملا ہے اور جو زندگی کا ہر لمحہ اس کے ساتھ گزار سکتی ہے؟“

”شاردہ تو مجھے ہر وقت کو سستی ہے؟“

”بہنیں کو سانسیں کرتیں دعائیں دیا کرتی ہیں بھائی صاحب! اور جب ان کے پاس دعائیں ختم ہو جاتی ہیں تو دو آنسو بھینٹ

میں کر دیتی ہیں۔“

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی آنکھوں کے کونوں میں آنسوؤں کی لمبی لمبھرائی تھی۔ یہ نرمی گواہ تھی اس محبت اور عقیدت کی جو اسے اپنے بھائی سے تھی۔

اس کا بھائی بھی اس دھول مبرے احاطے میں گھسٹتا رہا اور جب ان بگولوں کا مقابلہ کرنے کرتے رہا تو بھاگ گیا۔ اس نے گرم گرم چائے کا ایک گھونٹ پیا اور پھر کہنے لگی:

”دیکھو بھی اسی کا ہے۔ جاتے ہوئے مجھے نے گھسے تھے جب یہاں آتے ہیں تو اسی کمرے میں رہتے ہیں۔ رات دن ہم دونوں یہاں اس کمرے میں بیٹھے رہتے ہیں۔ احساس جی نہیں ہوتا کہ اس کے علاوہ کوئی اور دنیا بھی ہے۔ دنیا سے اس طرح کٹ مہلے میں کتنا آسند ہے؟“

شاردہ اسے ہونٹوں سے ایک طویل آہ نکل گئی اور پھر اس کے ہونٹوں پر لمبی سی مسکراہٹ پھیل گئی جیسے وہ ہند بھری گھاٹیوں میں سورج کا پہلا اجالہ دیکھنے لگے۔

شاردہ اسے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ شاید اس کے اور بڑا سرا راندا میں اس نے کبھی باتیں نہ کی تھیں۔

”مغشہ ریئے ہیں آپ کو بھائی صاحب کی تصویر دکھاتی ہوں“
وہ کرسی سے اٹھی اور اٹھارے میں کتابوں کے اوپر رکھی اپنی تصویر کو اٹھا لائی۔ اس کے ذریعہ کو کھولی کہ اس نے اپنی تصویر کے نیچے سے ایک تصویر نکالی۔

”دیکھتے رہے ان کی تصویر“ اس نے تصویر بری طرح بڑھاتے ہوئے کہا۔ ایک خوبصورت نوجوان تکیے تکیے نقوش کھاتا اور گہری آنکھیں۔ ایسی ہی آنکھیں نیناں کی تھیں۔ آنکھوں کی پر گہرائی ہی ان دونوں میں مشترک تھی۔ یہی وہ بنیاد تھی جس پر وہ دونوں کھڑے تھے۔ نیناں اور اس کا بھائی۔ میں نے تصویر شداد کی طرح بڑھائی اور پھر نیناں کو غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی گہرائی تھی پُر اسرار تھیں اور مجھے یوں لگا جیسے نیناں نے اپنی تصویر کے نیچے بھائی کی تصویر رکھ کر غیر ارادی طور پر یہ تسلیم کر لیا تھا کہ اس کے بھائی کی شخصیت ہی اس کی دھارس کا باعث ہے۔
اتنے میں جب اٹھا کر کوئی داخل ہوا۔

”نہتے چتا جی!“ شاردہ اُکری سے اٹھی۔ وہ انہیں جانتی تھی۔

”نہتے!“ مجھے بھی کرسی سے اٹھنا پڑا۔

نیناں شاید اس اچانک مجھے کے بے نیار نہ تھی۔ وہ اٹھنے لگی تو چائے کی بیالی تباہی سے فرش پر گر گئی۔

”تم بھی اتنی ہی بے احتیاط ہو جی؟“ انھوں نے شاردہ کو مخاطب کیا اور مجھے کچھ کے سنے بغیر چپ اٹھا کر باہر نکل گئے۔
نیناں ذرا بات سننا۔ ان کی کاروائی اور نیناں خاموشی سے باہر نکل گئی۔

کچھ لمحوں کے بعد جب وہ واپس آئی تو اُس کا چہرہ بے حد اداس تھا۔ اس کی آنکھوں میں درد کی اتنی گہنی تھی کہ وہ انداز میں طرح مکمل بھی بڑھ رہی تھیں۔

سچے طور پر کے لئے آنکھیں بند کر لیں اور سوچیں لگا کہ اس کے بھائی نے اپنی تمام محبت اور اخلاص کے ساتھ نیناں پر سب سے حد تک کیا تھا۔ اس نے اپنے ماحول سے انتظام لینے کے لیے اپنی ہی کو چٹا تھا۔

اس نے اس کے گرد تحویل، تصور اور ادب کا طبعی حال بن دیا تھا اور وہ سمجھ رہی تھی کہ اب وہ ناول کے کرداروں کی طرح جتنی تھی۔ انکوں کی شبیہوں کی طرح حرکت کرتی تھی اور کمائیوں کے ہیرو کی طرح اپنے ہیرو کے خاکے بناتی تھی۔ عملی طور پر وہ اپنا جتنی جانتی جا رہی تھی۔ وہ اس جھوٹے سے کمرے کے پُر اسرار ماحول میں رہ کر قبول جاتی تھی کہ اس کے باہر ایک اُجڑا اور سنسان دنیا ہے۔ اس کے گلہ کا ماحول نہایت کھردرا اور اکھڑا ہے۔ وہ کہنے میں اُگے زنگ کے بچوں کو دیکھ کر یہ تسلیم کرنے سے انکار کر رہی تھی کہ اس کے جیون کے گرد تیز کائناتوں کی ایک اونچی باڑ ہے اور اس نے جب بھی اُڑنے کی کوشش کی وہ بھیکے لگانے اٹھتے ہوئے بھاگنے کی طرح اس کا راستہ روک لیں گے۔ اس سب کا ذمہ دار اس کا بھائی تھا جس کی تصویر کو اس نے اپنی تصویر کے نیچے رکھ کر اپنی شخصیت کو مکمل طور پر اس کے حوالے کر ڈالا تھا۔

میری سوچ کا سلسلہ اچانک ٹوٹ گیا۔

”معاف کیجئے گا بھائی صاحب!“ نیناں ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ رہی تھی اور میں نہ سمجھا تھا کہ وہ کس تصور کی معافی مانگ رہی تھی۔ لے کر بات کا انہوں نے ختم کیا۔

مکس لیے؟“ میں نے پوچھا اور ایک بار اس کے ہونٹوں کی طرف دیکھا جو بڑی طرح پلکپلا رہے تھے۔

”آپ بھی نہیں سمجھے!“ اور اس کی آنکھوں میں سلگتے ہوئے آنسو اس کے رخساروں پر بہہ نکلے اور آنسوؤں کی اس روشنی میں سب کچھ نظر آ گیا۔ میں نے سب کچھ جان لیا۔ اشارہ اُنے آگے بڑھ کر اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا اور اپنے پیٹ سے اس کے آنسو پونچھے میری نگاہ کو چند حیلے والی روشنی مدغم ہو گئی۔

”بے بس ہو کر جینا سب سے بڑا پاپ ہے اشارہ!“ اس نے کہا۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف ایک بار کتاہٹوں سے بھری ہوئی بڑی سی الماری کی طرف دیکھا اور مجھے عموماً ہوا کہ ایک دن یہ الماری اپنے پورے وزن کے ساتھ نیناں کے اوپر گر پڑے گی اور اسے سدا کے لیے اپنا گھر ڈالے گی۔

جب میں اور اشارہ اس کے گھر سے واپس آئے تو ہم دونوں ادا اس تھے۔ بہت دیر خاموش چلتے رہے جیسے دونوں کے دلوں پر بہت بڑا بوجھ پڑا ہو۔

اس کے بعد میں کبھی نیناں کے گھر نہیں گیا۔ اس نے مجھے کبھی بلایا بھی نہیں۔

سارا دوا کی ہی جاتی تھی۔ خود وہ ہنستے ہیں ایک آدھ بار ہمارے گھر آیا کرتی تھی۔

کبھی کبھی وہ اپنی کمائی بھی لے آتی۔ کمائی نہ ملنے سناتے وہ اس میں اتنا قدر رکھ جاتی کہ کئی دفعہ اسے ہماری موجودگی کا بھی احساس نہ رہتا۔ میں جب کبھی میرے لیے جاتا تو اس کی کوٹھی کے سامنے سے گزرتے ہوئے عموماً کرتا جیسے سحر کے گلوبے اس گھر کی صوفوں سے اُچڑ کر انہیں جھلس ڈالتے ہوں۔ اس کے چتا کبھی کبھار دکھائی پڑ جاتے تھیں وہ مجھے پہچانتے ہی نہیں تھے۔ لمحہ بھر کی ملاقات پہچاننے کے لیے کافی بھی نہ تھی۔ میری واقفیت نیناں سے بڑھ کر اس کے گھر والوں تک نہ پہنچ سکی۔ البتہ نیناں کو میں زیادہ سے زیادہ پہچان لیا گیا۔ ان کی شخصیت اپنی ساری جزئیات کے ساتھ میری سمجھ میں آنے لگی۔

اس کی اکثر کہانیوں میں ایک اور صوفے پر کا سا احساس ہوتا تھا جیسے وہ کمائی کو اٹکلی پکڑے ہوئے کسی بازار میں سے گزر رہی ہو اور غیر ملک کے ریلے میں اچانک اس کا ہاتھ جھوٹ گیا ہو اور کہانی کہیں گم ہو گئی ہو اور وہ اپنی ہر پور کو مشق کے باوجود اسے نہ پاسکی ہو اور اس کے انداز میں ایک جھلکا ہٹا، آنسو کی اور شکستگی سی بھر گئی ہو۔ یوں لگتا تھا جیسے کمائی کو کھتے کھتے وہ اسے چاک کسی جگہ چھوڑ دیتی ہے۔ ایک عجیب سی حسرت اور تشنہ لبی رہ جاتی تھی اس کی کہانیوں میں اس کے کردار عام زندگی کے کردار نہ ہوتے تھے۔ وہ ان کا انتخاب دھرتی سے نہیں آکاش سے کرتی تھی۔ آدش اس کے سامنے سب سے پہلی چیز تھی۔ وہ تختی کے نیچوں پر اُڑتے ہوئے دھرتی سے بہت دور فضا میں پروا دے کر کہنے کی کوشش کرتی تھی اس لیے اس کی کہانیوں کے کردار اپنے بھرپور خلوص کے ساتھ میں بے جاں ہوتے تھے۔ ان میں حرکت آمیز زندگی نہ ہوتی تھی۔ ایک ٹھنڈی اور مہذب قسم کی کیفیت تھی۔ گرمی اور چلت پھرت نہ تھی۔ ایک بے دلی اور اکٹا ہٹ سی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ ابھی کہ فن کار کو اپنی ذات سے باہر نکل کر اپنے ارد گرد کے ماحول کو گہری نظروں سے ٹٹونا چاہئے۔ جو کردار اسے وہاں سے ملے گا وہ زیادہ جاندار اور زندگی آمیز ہوں گے۔ پریوں نظر آنا تھا جیسے وہ مجھ پر بھی پڑی تھی۔ اس کا ایک زاویہ نگاہ بن چکا تھا اور اس کا بھائی اس سے سبکیٹوں میل دور رہتے ہوئے بھی اس زاویہ نگاہ کو پختہ کرتے جاتا تھا۔ کاش اس کے نزدیک کوئی ایسا شخص ہوتا جو اسے اپنے ماحول کے کھر دے۔ اسے اپنے خیل کی بھول بھلیاں

میں بھٹکنے کی بجائے حقیقت کی سنگلاخ چٹانوں پر کھڑا کر دیتا جہاں ہواؤں کے تیز زیریں اس سے ٹکراتے اور طبعی طبعی محدود پگڑیاں اسے اپنی حفاظت خود کرنے پر مجبور کرتیں۔

پراسا نے ہوا اور وہ اپنی ہی راہ پر چلتی رہی اور اس کی کمانوں میں حسرت اور افسردگی بڑھتی گئی اور اس کی آنکھوں کی گہرائیاں زیادہ پُراسرار اور غامض ہوئی گئیں۔ اس کے ہونٹوں کی سکراہٹ میں معصومیت کی جگہ زہر خند نمایاں ہونے لگا۔ وہ زندگی کے اس موڑ پر پہنچ گئی تھی۔ جہاں اسے محبت اور رملوں کی شمع کی ضرورت تھی۔ ایک بھائی کی نہیں ایک محبوب کی محبت۔ ایک ایسے شخص کی محبت جس کی آنکھوں میں اس کی شخصیت کا ہر فیلا پہلو گھل جائے، اس کے ہونٹوں کے یا قوت دہک سکیں اور رخساروں کے پھل چمک اٹھیں اور اس کے ماحول میں ابھی کوئی ہستی نہ تھی۔ اس کے گھر کے باہر ایک ادنیٰ دیوار تھی جسے کوئی نہ پھلا لگ سکتا تھا۔ اس کا تخیل اسے جن جزیروں میں سے جمانا چاہتا تھا وہ بہت دور تھے اور ان کے درگزر بہت گہرا پانی تھا جس میں اتنا اس کے بس میں نہ تھا۔

جزیرے زیادہ خوبصورت ہوتے گئے۔

ان کے گرد پھیلا ہوا پانی زیادہ گہرا ہوتا گیا۔

اس کی امداد میں کتاؤں کی تعداد بڑھتی گئی۔

اور اس کا تخیل لکھنا ان کی تلاش کرتا رہا۔

ایک دن شادمانے مجھے بتایا کہ نیناں کے بیاہ کی بات ہو رہی ہے اور پھر اچانک اس نے گھر سے باہر نکلنا ہی چھوڑ دیا۔ تمام دن اپنے کمرے میں پڑی جانے لگی کرتی رہتی ہے۔

نیناں کے پتا شادی بیاہ کے معاملے میں حد سے زیادہ کڑھتے۔ وہ راجپوت تھے اور راجپوتوں کے بھی ایک خاص طبقے سے تعلق رکھنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جب لڑکی کی ڈولی اڑ جائے تو پھر سسرال کی عیوب سے اس کی ابھتی ہی نکلنی چاہئے جیسے جی واپس آنا اس کے ماں باپ کی توہین ہے۔ نیناں کا بھائی اس سے متفق نہ تھا اور اس نے اب تک شادی نہ کی تھی۔ وہاں شکست کھا کر ان کی خود داری زخمی ہو گئی تھی اور اب پورے حوش کے ساتھ وہ اس سے معاذ پر ڈٹ گئے تھے۔ نیناں کی شادی انھوں نے اگرہ کے ایک گاؤں میں طے کی تھی۔ لڑکا فروج میں حوالدار تھا۔ ادب و ریہیز ہو کر واپس آ گیا تھا۔ ان کی بہت کافی نہیں تھی اور وہ اس کا اکیلا مالک تھا۔ اس کا باپ بوڑھا تھا اور سچوہ کی جگہ میں اپنا ایک بازو گنوا چکا تھا۔ ان کی ایک بہت بڑی پرائیویٹ تھی۔ نیناں کا گھر تو اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت ہی نہ رکھتا تھا۔ حویلی کے گرد ایک بہت اونچا نسیل تھی۔ کسی زمانے میں وہ ایک قلعہ تھا، بعد میں وہ ایک حویلی میں منتقل ہو گیا۔ ان کے پاس دس چھینیل تھیں، اگرچہ وہ چھینیلوں سے بھی کام چل سکتا تھا۔ آدھا گاؤں حویلی کے مزارعوں پر مشتمل تھا ان کے گھر سے چھا چھو بھاتا تھا۔ بیلوں کی کچی جوڑیاں تھیں اور دو بھیلان تھیں اتنی خوبصورت کہ کاریں بھی ان کے آگے بیچ ہوں۔

نیناں کے پتانے اپنے لڑکے سے اس معاملے میں کوئی مشورہ نہ کیا تھا۔ نیناں نے جو حالات اسے ماں سے معلوم ہو سکے اپنے بھائی کو لکھ دیا۔ اس کے بھائی نے جب پتا کہ فیصلے کی طاقت کی تو دلیل مباحثے اسے ایسے الفاظ لکھے کہ اس نے اسے سدا کے لیے تعلقات توڑ دیے۔ اس نے نیناں کو عین منہ ہار میں چھوڑ دیا جس سے اسے اب تک ناخوش تھا وہ اس سے چھین گیا۔ وہ

ہاں باپ کے فیصلے کے خلاف ایک لفظ نہ کہہ سکی اور اس کو نہ سنے کے عاروں سے بچنے کے لیے اپنی پناہ گاہ میں دیک گئی اور یوں بے حس ہو گئی جیسے اسے کچھ پتہ ہی نہ تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔

اس کی شادی کرکس کے دونوں میں ہوئی۔ میں ان دنوں ایک پیشکش فور کے سلسلے میں جنوبی ہندوستان گیا ہوا تھا۔ جب میں واپس آیا تو وہ سسرال جا پہنچی مگر شادمانے مجھے بتایا کہ میں روزِ نیناں کی برات آئی اسے کئی بار بے ہوشی کے دورے پڑے اور اب سسرال میں اسے ایسے ہی دورے پڑتے تھے۔

”بیباہ کے دن اس نے کئی بار آپ کا پوچھا“

”مکیروں؟“

”مکیتی مٹی میرا بھائی بیباہ میں شریک نہیں ہوا تھا ہرے بھائی جا ہی ہو تے تو مجھے مرزد و حار اس ملتی“

”کاش میں یہاں ہوتا!“ میں نے کہا۔

دو روز سے نیناں سسرال سے آئی ہوئی ہے۔ اس کا عا وند بھی ساتھ ہے۔ میں اسے شادی پر کچھ بھی مصیبت نہیں کر سکا۔ شاد و کا خیال تھا کہ مجھے مزد کوئی ٹھکانا دینا چاہئے۔ بہت سوچنے کے بعد مجھے خیال آیا ’مرقع چغتائی‘، اس کی الماری میں نہیں۔ یہ کتاب اس کے بھائی نے اسے مصیبت نہیں کی، میں ہی کر دوں۔ میں نے اپنی کتابوں میں سے اسے نکالا۔ یہ کتاب مجھے بے حد عزیز تھی اسے کبھی کبھار ہی الماری سے نکال کر پڑھتا تھا۔ سوچا یہی نیناں کو دے دوں وہ مزد و پرند کرے گی۔ میں اور شاد و ’مرقع چغتائی‘ لے کر اس کے گھر گئے۔ میں باہر کھڑا رہا اس کے ساتھ اندر نہیں گیا۔

اس نے نیناں کو میرے آنے کی اطلاع دی پر وہ اس روز کی طرح جب میں پہلی بار اس کے گھر گیا تھا اپنے وصول ہرے اعلیٰ میں گرد اڑاتی ہوئی نہیں آئی۔ در در آکھ سے میں کھڑی رہی اور شاد و اسی مجھے لینے آئی۔

آج وہ میں اپنے کمرے میں نہیں گئی۔ اس بڑے سے ڈرائنگ روم میں ہی بیٹھا جو ڈرائنگ روم سے زیادہ ایک کورٹ روم لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اب گہرائیوں کی جگہ وحشت بھر گئی تھی۔ اس کا چہرہ پتھر کی طرح ٹھوس اور بے حس ہو گیا تھا اس کے ہونٹ ایک دوسرے پر پختی سے جم گئے تھے جیسے مٹوں سے ان پر مسکرا ہٹ نہ کھلی ہو۔ اسے دیکھ کر مجھے یوں احساس ہوا جیسے میں نیناں سے نہیں مل رہا، ایک جرم کو دیکھ رہا ہوں جو پتھر کی میں اپنے کسی ناکرہ جرم کی نیر کا فیصلہ سننے کمرے میں کھڑا ہو جس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی اور پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوں۔

”بہت دنوں میں آئے آپ بھائی صاحب؟“ اس کی آواز میں کچھ بھی نہ تھا۔ نہ کوئی شکایت، نہ اُکھانا، نہ پیار۔ خالی آواز تھی۔ ہر جذبے سے محروم۔

”میں یہاں نہیں تھا۔ نیناں تمہاری شادی میں شریک نہ ہونے کا مجھے افسوس ہے۔ میری بات سن کر اس کا چہرہ یوں ہو گیا جیسے کسی دیوانے کو کسی راہ چلتے ہوئے نے چھوڑ دیا ہو۔ اس نے کہا کچھ نہیں خاموش رہی۔ صرف ایک بار میری طرف دیکھا۔ اس نظر میں اُن گنت شعلوں کی تپش تھی۔

”میں ہی لائی ہوں جناب کو۔ نہیں تو یہ آج بھی نہ آتے۔“ شاردانے مسکراتے ہوئے کہا کہ نسا پر جھانی بھید کی چھٹ جھٹ پڑ گئی۔

”بھائی صاحب میں نے اپنا کرہ بند کر دیا ہے۔“

”مکدوں؟“

”اور اپنی تمام کتابوں کو پھاڑ کر مٹا دیا ہے۔“ اس نے میرے سوال کی طرف دھیان ہی نہ دیا اور اپنی بات کنتی گئی۔

”یہ کیا کیا تم نے؟“ میں نے پوچھا مگر اس نے اس کی طرف توجہ ہی نہ دی۔

”اچھے ماحول سے انتقام لینے کا میرے پاس ہی ایک طریقہ تھا۔ میں دیپ سنگھ منیں مٹی کی یہاں سے لہاگ جاتی۔“

”دیپ سنگھ اس کے بھائی کا نام تھا۔ وہ دیپ سنگھ کی ہمدردی کا اعتراف کر رہی تھی یا اس کی بڑی پرطنز میں نہ سمجھ پایا۔

اور اس وقت تک نہیں چھپیں برس کا ایک نوجوان کمرے میں داخل ہوا۔ نیناں اسی طرح بیٹھی رہی جیسے اسے اس کے مرنے کی

خبر ہی نہ ہو۔

”نئے جیاجی! شاردان اپنی جگہ سے اٹھی۔

”میرے بھائی جان۔“

اس نے آگے بڑھ کر میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور میرے صوفے کی طرف لپکا جہاں نیناں بیٹھی تھی۔

وہ اس کے پہلو میں بیٹھا ہی تھا کہ نیناں کی آنکھیں اس پر گر گئیں جیسے جھوم پوری تو جیسے اپنے فیصلے کی عبارت سن رہا ہو اور

اس کی نظریں نیچ پر جم گئی ہوں اور پھر اس نے آنکھیں تیزی سے جھپکی شروع کر دیں اور اس کا سر ایک دم صوفے کی پشت پر ڈھک گیا۔

اسے پھر فشتی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ کتور چھپا لے سنگھ، اس کا خاندان گھر اک کر کے سے باہر نکل گیا اور چند لمحوں میں نیناں کی ماں بانی کا کلاہ لٹے

از آئی۔ نیناں بڑبڑا رہی تھی۔

”بھائی صاحب میں نے انتقام لے لیا ہے۔ میں نے انتقام.....“

ماں نے اس کے منہ میں پانی ڈالا۔ شاردانے اٹھ کر اسے سہارا دیا اور کچھ دیر کے بعد اسے ہوش آ گیا۔ وہ یوں لگ رہی تھی جیسے چائسی

کے تختے پر پکڑی ہو اور چائسی کا سر اس کی نظروں کے سامنے جھول رہا ہو۔ شاردانے صوفے میں اس کے ساتھ بیٹھی تھی اور اسے اپنے بازو میں لے رہی

تھی۔ ماں خالی گلاس لے کر کھلی گئی میں نے اپنے جوتی میں پڑنے سے متوجہ نہ کیا، کوٹولا۔ وہ وہیں تھا۔ غائب نہیں ہوا تھا لیکن نیناں کے کمرے میں

اب ایک عجیب کتاب بانی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے کتابوں کی آبی بڑی المادی نیناں کے اوپر گر گئی تھی اور نیناں سدا کے لیے اپنا بیج ہو گئی تھی اور

اس کی تصویر کا فریم لوٹ گیا تھا اور اس کی تصویر کی جگہ اب دیپ سنگھ کی تصویر تھی اور اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔

مذہب میں شاردان؟

شاردانے میری طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ اپنی کتاب تو جھینٹ کر دو۔

لیکن میں نے آنکھیں جھکا لیں اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا مترق چشتانی، میری نعل میں تھا۔ نیناں اسے دیکھ رہی تھی لیکن اس نے

کچھ نہیں کہا۔ بولی تک نہیں۔

چپ چاپ کھڑی ہو گئی اور پھر ہمارے ساتھ بڑا دم سے میں لگئی اور وہاں ایک دم رگ لگتی۔ سنا رہا اور میں اٹھ بیٹھ رہا اور اس کی
اڑتے گیٹ کی طرف چل پڑے۔ گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے لمحہ بھر کے لیے میں نے نینا کی طرف دیکھا۔ وہ وہیں کھڑی تھی اور اس کی
آنکھیں جانے کس شے پر گرد چکی تھیں۔

میں شادو اکو بانو سے بکڑ کر جلدی جلدی لڑکھڑکھ پڑے کیا۔ اس نے مجھ سے نہیں پوچھا کہ میں نے "مرقع چغلی" نینا کو
بھینٹ کیوں نہیں کیا۔ پر مجھے اس کی عادت کا پتہ ہے وہ پوچھے گی منورہ۔
میں نے جانے کتنے ہی سگریٹ بھونک ڈالے ہیں۔ جیسے ارد گرد گھٹنا دھواں پھیلا ہوا ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ اگر شادو
نے مجھ سے یہ بات پوچھ لی تو کیا جواب دوی گا؟

مائی پھپھیاں

میرزا ادیب

اُس دن سارا شہر شیخ خیر الدین مرحوم کا پہلا جنم دن منا رہا تھا۔
یہ دن منانے کے لئے کئی مہینوں سے بڑی مندر و مدر کے ساتھ تیاریاں ہو رہی تھیں چنانچہ اخبارات کے خاص نمبر
شائع ہو رہے تھے، رسالہ و جرائد میں مرحوم کی تصاویر چھاپی جا رہی تھیں اور ان کی شام کو کارپوریشن کے میئر کی زیر صدارت
ملفوظ ہالی میں ایک عظیم الشان عام جلسہ بھی ہو رہا تھا۔ اس جلسے میں شہر کی کئی مشہور و ممتاز ہستیاں مرحوم و حضور کی زندگی کے
واقعات پر روشنی ڈالی رہی تھیں۔ اور مجھے بھی اسی سلسلے میں مدعو کیا گیا تھا۔ مجھے مرحوم سے ذاتی واقفیت تھی اس کے
علاوہ اخبارات و رسالے میں بھی ہر مضمین کے مطالعے کے بعد میرے پاس ان تمام اوجھ ہو گیا تھا کہ ان کے بارے میں
ایک تقریر کیا کم سے کم دس بی چوڑی تقریریں تیار کر سکتا تھا اگر جی چاہتا تھا کہ جو کچھ لکھوں وہ مرحوم کی زندگی کے صرف
ایک ہی پہلو سے متعلق ہو اور اس کے لئے میں نے جو موضوع منتخب کیا تھا وہ تھا شیخ خیر الدین مرحوم کے احسانات عام
لوگوں پر۔ مواد لکھوں کے سامنے بھرا ہوا تھا اور میرا قلم بڑی تیزی سے اسے سمیٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس میں کوئی شک
نہیں کہ شیخ صاحب مرحوم شہر کے مشہور رئیسوں میں سے تھے، بانی وراثت میں آپ کو کافی جائیداد ملی تھی اس کے علاوہ اپنی ذاتی
کوششوں سے بھی آپ نے دولت میں کافی اضافہ کر لیا تھا اگر دیکھتے والی جو بات ہے وہ یہ ہے کہ مرحوم نے اپنی دولت کو گناہ گار نہ
کیا اور مرحوم کے نزدیک لپٹے سرمائے کا حقیقی مصروف کیا تھا۔ شیخ صاحب بے فوائدی کا ہمسرا اور یتیموں کا مہیا تھے۔ ساری عمر
خلین خدا کی خدمت کرتے رہے آپ نے اپنی آمدنی کا ایک خاص حصہ لوگوں کی بہتری کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ استاد و ذوق کا
ایک شاعر ہے۔

”نام منظور ہے توفیق کے اسباب بنا
پل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا“

اور مرحوم اس شعر کی زندہ تفسیر تھے۔ شیخ خیر الدین ہسپتال کا نام کون نہیں جانتا؟ اس ہسپتال میں روزانہ میسرینوں و میسول کا علاج
ہوتا ہے اور اکثر مریضوں کو دوا بالکل مفت دی جاتی ہے۔ مرحوم نے صرف یہ ہسپتال ہی نہیں اپنی جیب خاص سے ایک حقوق
دفتر کے ایک قلم خانہ بھی تعمیر کروا دیا تھا اور رائج بھی اس قلم خانے میں قوم کے کئی بے فرائد بے اسرار بچے بہر شہ پارہے

ہیں۔ بے یار و مددگار لوگوں کو سہارا دینا مرحوم ہی کا کام تھا۔ —————

”باوجودی ایک خط لکھ دو گے۔“
میرا قلم چلتے چلتے ٹک جاتا ہے۔ سر اٹھا کر سامنے دیکھتا ہوں مہراں گرا لی اپنے میسے ہاتھوں میں خالی لٹافہ پکڑے
دلیر پر کھڑی ہے۔

”خدا کھدونا۔“ پھر سست نہیں ہے؟
جاننا ہوں کہ اگر اس وقت تمام خیالات کو سمیٹ ڈالنا تو پھر عبارت کا ربط و تسلسل ٹوٹ جائے گا اور کہنے
میں وہ آسانی باقی نہیں رہے گی جو اس وقت حاصل ہے مگر کیا کیا جائے انکار کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ مہراں غزشتہ دس
سال سے بغیر باقی ملائے دودھ جتیا کر رہی ہے اور یہ اس کا بہت بڑا احسان ہے۔ انکار احسان مندی کے خلاف ہوگا
چنانچہ میں سر کے اشارے سے اسے اندر آنے کے لئے کہتا ہوں۔ مہراں اندر آتی ہے اور فریش پر پھسکڑا مار کر بیٹھ جاتی
ہے۔

”باوجودی تکلیف تو ہوگی۔ میری ہی کو کھٹا ہے جو رادہ پنڈی میں رہتی ہے۔ تحصیل —————
”بھئی پہلے بناؤ کھٹا کیا ہے۔ بیٹہ بعد میں لکھا جاتا ہے۔ ذرا ٹھہرو۔ کاغذ لے لوں۔ ہاں اب برو۔“
”بس یہ کھٹا ہے، جمعرات کی شام کو مائی پھانیاں مر گئی ہے۔“

یہ کہنے پہنچے اس کا لہجہ سنجیدہ ہو جاتا ہے؛ فاطمہ کو مائی پھانیاں کے مرنے کا بڑا دکھ ہوگا۔ مائی پھانیاں کو اس کا
بڑا خیال رہتا تھا جب فاطمہ کنواری تھی تو ایک دفعہ اس کا پاؤں دراصل گیا تھا۔ پھانیاں سارا دن گھومتی رہی اور اللہ جانے کہاں
موسم لے کر آئی وہ اس دن اللہ ماری بڑا نالی غمی سارے شہر میں۔

”مائی پھانیاں وہی تھی نا۔۔۔۔۔۔ دھوین۔“ میں پوچھتا ہوں۔
”گلی کے آخری مکان میں تو رہتی تھی۔ آپ کے کپڑے دھوئی ہوگی۔ سارے محلے کے کپڑے دھوئی تھی وہ تو؟“
”یہ بات ہے پرسوں اس گھر کے سامنے چند آدمی بیٹھے تھے۔۔۔۔۔۔ تو مائی پھانیاں مر گئی ہے۔“
”کیا کون کتنی بہت دالی تھی وہ کام کر کے ٹھکنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی تو یہ عورت تھی کہ لوہے کی بنا کی ہوئی مشین“
مہراں تعریف لے لے جی کہتی ہے۔

”اور اس کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ بڑی لڑا کا تھی ہر وقت لڑتی رہتی تھی محلے کے لوگ اس سے پناہ مانگتے
تھے۔“ میں پھانیاں کی وہ خصوصیت بتانا ہوں جس کا شہرہ عام ہے اور جس کا اکثر ذکر کیا جاتا ہے۔
”لڑتی تو وہ ضرور تھی اور شور بھی بہت مچاتی تھی پر اپنے خشم سے لڑتی تھی۔ لوگوں نے اللہ جانے بدنام
بھی کر دیا تھا۔ میں بتاؤں تم کو کس قسم کی عورت تھی وہ تھی۔۔۔۔۔۔ بڑی اچھی۔ مائے آپ کا وقت ضائع ہو رہا ہے۔
کیوں باتیں کروں۔“

میں تقریر والے کاغذ پر نظر ڈالتا ہوں۔ ————— ”بے یار و مددگار لوگوں کو سہارا دینا مرحوم ہی کا کام تھا

”اگلا فقرہ سوچنے کے لئے میں پیشانی بائیں ہاتھ کی پتیلی پر رکھ کر، آنکھیں بند کر کے سوچنے لگتا ہوں۔“
 ”دینا ہی بہت کم لپٹے آدمی ہوں گے جنہوں نے لڑنے ہوئے دل جوڑے ہوں، مظلوموں کو سہارا دیا ہو اور بوجھوں کا سہارا نہ ہوں۔ شیخ صاحب کی شہرت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ گرسے ہوؤں کے سچے دوست تھے۔“ میرے ذہن میں پورا فقرہ الفاظ کی مناسب ترتیب کے ساتھ آجاتا ہے۔ میں فلم ڈھونڈنے کے لئے ادھر ادھر دیکھتا ہوں مگر ان مٹر مٹر مری طرف دیکھ رہی ہے۔ نہ جانے کیا سوچ رہی ہے، نہ جانے کیا سوچ رہی ہے۔ کیا کہنا چاہتی ہے۔ اس کی خاموش نگاہیں ایک انتخاب لئے ہوئے ہیں۔ ان میں ایک خاص آواز کی جھانک ہے۔ جی چاہتا ہے اس کی دوجا د بائیں سن بول، زیادہ سے زیادہ دوشٹ صرف ہوں گے اس کے بعد شیخ مرحوم کے چند واقعات لکھ کر تقریر مکمل کر دوں گا۔ اور میں کہتا ہوں۔

”تو وہ لڑکا نہیں تھی۔ تمھاری مائی بھانیاں۔“

”عزیز بھئی۔۔۔ میں کہتی ہوں، ہاں تھی۔ اللہ تجھے میرے سزاوے میاں کو جب میں اس کے گھر میں آئی اس بیاہ کو کے تو وہ کہنے لگا۔ دیکھو میراں! اس بھانیاں سے برے برے رہنا۔ کسی دن لڑا بڑی فلم سے تو تمھارے سر کا ایک بال بھی نہیں چھوڑے گی۔ میں نے کہا۔ میں بھی کسی سے دہنے والی نہیں ہوں مجھ سے لڑنے کی تو منہ کی لھاؤ گی۔ یہ بات تو میں نے کہہ دی پر بھانیاں سے ملنے ہوئے مجھے سچ بچ ڈر لگتا تھا۔ اُس نے کئی بار لڑنا چاہا مگر میں لگا لگ ہی رہی۔ ابھی میرے میاں کو ایک جینز بھی نہیں بڑا ہوگا کہ بھانیاں کی اپنے قسم مولائجن سے ایسی لڑائی ہوئی۔ ایسی لڑائی ہوئی کہ کیا کہوں۔ بھانیاں نے ڈوسر پر آسمان اٹھا لیا اُس دن میں نے جھد کر لیا کہ اس سے کبھی نہیں ملوں گی۔ پتہ ہے لڑائی کی وجہ کیا تھی۔ وجہ یہ تھی کہ بھانیاں نے کہیں سے سن لیا تھا کہ مولائجن کا کسی ورائٹ سے باران ہو گیا ہے۔ اور وہ اس کے گھر میں آتا جاتا رہتا ہے۔ بھانیاں کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی یہ سن کر ورائٹ کو بے لفظ سنائیں کہ تو یہی بھئی۔ آدمی رات تک اُس نے مجھے والوں کو سونے نہ دیا۔۔۔ پر آپ کا وقت بڑا قیمتی ہوگا۔ میں کیا بھانیاں کی کہانی لے چکی ہوں۔“

میراں بولنے پر تھک نکت بے چہن ہو جاتی ہے۔

”نہیں تم بھانیاں کی لڑائیوں کا حال عزیز سننا۔“ میں بخوشی کہتا ہوں۔

”غیر سے دن پھر لڑائی ہوئی۔ مولائجن نے کہہ دیا کہ وہ ورائٹ کے گھر عزیز ورجا باکے گا۔ بس بھانیاں تو بوجھ شہر بن گئی۔ اس دن اس کا چچا بھی آگیا اور اس نے مجھے میں آکر مولائجن کی بائیں ہاتھ کی پتیلی پر رکھ کر دوسرے یا تیسرے دن کا قصہ ہے کہ میں کسی کا ہاک کو دو دھو دے رہی تھی اتنے میں دھکتی ہوں کہ بھانیاں چوٹا سا گلاس ہاتھ میں لے کر میرے پاس کھڑی ہے۔

”بہنو تمھارا سا تیل دے دو۔“ بھانیاں نے کہا۔

میں نے اسے تیل دے دیا۔ خیال تھا تیل لے کر سلی جائے گی پر وہ تو دھرنا مار کر وہیں بیٹھ گئی اور لگی باتیں سنائے۔ چھپے تو وہ کہنے لگی مولائجن کو بڑی تکلیف ہے بیچارہ اساری رات تو پتا رہے او میں دو راتوں سے بالکل نہیں سو سکی پھر

وہ اپنے گھر کے حالات بتانے لگی ————— اُس دن مجھے تیرہ لگا کہ بھاتاں دل کی بڑی نہیں ————— باؤجی دیکھے بڑی ہوسکتی تھی اس کا ختم ایک مراثی سے یاد کر رہا تھا پر پھر بھی جب وہ زنجی ہوتا ہے تو وہ ساری ساری رات جاگ کر اس کی خدمت کرتی ہے اور اپنی ٹوٹی ساکس کی نو وہ اس دن سے خدمت کر رہی ہے جس دن اس کا بیاد ہوا تھا۔ میرا شک شبہ جاتا رہا اور میں اس کے گھر گئے جانے لگی۔ ————— بیاری میں مولانا بخش نے کہہ دیا تھا کہ اب وہ مراثی کے گھر کبھی نہیں جائے گا مگر مجھے یہی وہ خشک ہوا وہ بھاتاں کی سوسنے کی چوڑیاں چرا کر فوراً ادھر بھاگا اور مراثی کو وہ چوڑیاں دے آیا۔ بھاتاں کے رشتہ داروں نے کہا کہ وہ مولانا بخش کو پھر بڑے پردہ اس بات پر راضی نہ ہوئی۔ ————— ایکے چلی گئی اور ایک بیٹھنے کے بعد پھر آگئی۔ ————— اللہ جانے اُسے کیوں اپنے ایلچے پر ختم کا خیال نہ ہٹا تھا۔ میں ہوتی اس کی جگہ تو بیٹھ ہے کیا کتنی کبھی اوسر کا رخ نہ کرتی تھی کبھی ہوں، اچھا تو ایک دن کا ذکر ہے جس کو ٹھوڑی میں بھی روٹی کھا رہی تھی کہ ایک بورت آئی۔ کوٹنے کی طرح کا لاسیاد رنگ، خند ساری آنار کی طرح سرخ آنکھیں اور گلے میں ہونٹوں کی کالا۔ میں نے کہا یا اہلی کون ہے اور کہیں یہاں آئی ہے وہ عورت کوٹھے ملکا تھی ہوئی آئی اور میرے پاس ٹوٹے پر بیٹھ گئی۔ میں نے کہا ہن تو کھرھائی ہے اور کیا کام ہے۔ اس پر وہ بولی میرا اہم و آراں ہے۔ مصری شاہ دہی میں ہوں۔ ذرا مولانا بخش کو بلا دو۔

میں بولی اُسے تو تو وہی ہے مراثی ہے نا۔ ————— نہ بابا بابا میں تو اس کام میں نہیں آؤں گی۔ اگر بھاتاں نے منن لیا کہ تو یہاں ہے تو وہ اللہ جانے کیا کرے۔ جری سخت عورت ہے۔ سارا عملہ اس سے دڑتا ہے۔ ————— یہ سنکر وہ بولی یہ ہن! اب میں کہاں جاؤں۔ گھر والوں نے مجھے نکالی دیا ہے کہ میں تو دالگا رہ گئی ہے۔ مولانا بخش کو ذرا بلاؤ نا۔ اس سے پوچھوں اب دالگا رکے کچھ کس کے حوالے کرتا ہے بدعاش کہیں گا۔

میں نے کہا یہ تو میں نہیں جانتی کہ اب تم کہاں جاؤ پر میں اس کام میں نہیں آؤں گی کبھی۔ تو نے پھاتاں کو دیکھا نہیں۔ اس نے اگر تجھے دیکھ لیا یہاں تو تیری ہڈیاں نکس پیں ڈاسے گی ہاں اللہ جانے بڑی سخت عورت ہے چپ چاپ یہاں سے چلی جا۔ اسی میں تیری خیریت ہے؟

وہ بولی۔ میں تو ضرور اس سے ملوں گی۔ کئی دن سے وہاں نہیں گیا۔ اللہ اسے کسی کی آئے کیوں آیا تھا میرے گھر اگر میں! تو مولانا بخش کو نہیں بلاتی تو میں خود اس کے گھر چلی جاں ہوں۔ —————

باؤجی اداہ تو بھاتاں کے گھر جانے کے لئے تیار تھی پر جب میں نے خوب دُعا دیا تو کہنے لگی اچھا۔ اپنی جلی جاتی ہوں ہاں میرا ماں رہتا ہے۔ اور وہ باہر نکل گئی۔ ————— مگر میں ادھر رہا تھا میں اسے جاتے ہوئے دیکھ نہ سکی۔ سمجھ لیا اب فاس قدر ڈوگئی ہے کہ بیٹھے مر گئی نہیں دیکھے گی۔

جس میں بھاتاں کے گھر گئی تو پھر میں نے دیکھا وہ بڑا ہی عجیب تھا۔ بھاتاں کو پڑوں پر استری کر رہی تھی اور وہ ————— بھلا کون ————— وہ مراثی، بھاتاں کی سوک ————— ہونڈھے پر بیٹھی دہی کے ساتھ رات کی پی ہوئی روٹی کھا رہی تھی میں حیران رہ گئی۔ بھاتاں کہنے لگی۔ مہرل! اجا نہی تم پر یہ کوئی ہے؟

میں نے کہا۔ نہیں! ————— مجھوٹ ٹوٹ کہہ دیا نا۔

کھنے لگی۔ بیوی فوجی ہے داراں مران۔“

”تو یہاں ———“

”ہاں بہو! کتنی ہے مجھے گھروالوں نے نکال دیا ہے۔ میرا کوئی آسرا نہیں اور میں ”واگدار“ ہو گئی ہوں۔ میں نے کہا اچھا تجھے گھروالوں نے نکال دیا ہے تو آجا یہاں! اللہ جو ہمیں روکھی سوکھی دیتا ہے تو بھی کھا لیا کر۔“ اور داراں بھانائی کے گھر میں رہنے لگی۔

بھانائی کے رشتہ داروں کو جب پتہ لگا کہ داراں مران اس کے گھر میں آگئی ہے تو وہ بونٹا اٹھے جیسے بھڑو کے چتے کو کسی نے پھیر دیا ہو۔ سب کہا اسے فوراً گھر سے نکال دو وگھر بھانائی بولی ہیں اسے سہارا دے چکی ہوں اب تم سے نہیں نکالو گی۔ کہاں کہاں ماری چرے گی یہاں سے جا کر ——— باؤ بھی کیا کہوں بھانائی کے رشتہ داروں نے بہت سختی کی۔ بھانائی کے چچا نے تو یہاں تک کہہ دیا اگر یہ مران یہاں ہے گی تو میں کبھی تھکے گھر میں نہیں آؤں گا۔ بھانائی نے سب کچھ سنا پراسا اللہ کی بنی نے داراں کو گھر سے جانے کے لئے بالکل نہ کیا۔

بھانائی پھسے کی طرح ہی گھر کا سارا کام کرتی تھی۔ داراں زیادہ کام نہیں کر سکتی تھی اس کا پیشہ گانا بجانا تھا بھلا وہ اسنری کر سکتی تھی بلجی بھونک سکتی تھی؟ ——— اچھا تو دن گذر نہ گئے۔ بھانائی کے سب ہٹنے والوں نے اس کا ”بیائی کاٹ“ کر دیا۔ باپ نے بھی آنا جانا چھوڑ دیا۔ یہ دیکھ کر داراں کہنے لگی ”بہن! اس اب زیادہ نہیں۔“ میں چلی جاتی ہوں اور وہ جلتے لگی۔ بھانائی نے اس کی چوٹی پر ٹی اور گھسیٹ کر اسے اندر لے آئی۔ اس کے بعد داراں نے جانے کا نام نہ لیا۔ پانچ پچھ مہینے کے بعد داراں کے بیان بھی پیدا ہوئی۔ بڑی کمزور بھی تھی میں تو اسے دیکھ کر ہی سمجھ گئی کہ بچے کی نہیں پر جسے اللہ رکھے اسے کون کھلے۔ بچہ سنبھل گئی اور ان کی حالت خراب ہو گئی۔ بھانائی نے اس پر کافی رقم صرف کر دی لیکن ”واگدار“ کو بلایا۔ گروہک نہ سکی۔ اس وقت ہیشاں (دانشور) دوا کھاتی بیٹھنے کی تھی!

ماں مر گئی تو بچی کی کون پرورش کرے۔ داراں نے مرنے وقت بھی بھانائی کے حوالے کی تھی یہی بھانائی نے اسے چھاتی سے لگا لیا اور اپنی ہی جان کر بٹانے لگی۔ اللہ جلنے بھانائی کو کبھی سے کیوں اتنا پیار ہو گیا تھا کہ وہ اسے گود سے اتارنے کا نام ہی نہیں بولتی تھی؟

ہزاروں کچھ اس بات کا احساس ہونے لگتا ہے کہ اس نے میرا کافی وقت ضائع کر دیا ہے چنانچہ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس خالی ٹھکانے کو دیکھنے لگتی ہے جسے وہ ساتھ لائی تھی اور جواب چار پائی پر میرے کاغذوں کے انبار کے اوپر پڑتا تھا۔

”بیٹی! زندہ رہی۔“ ”اب میں سوالی کرتا ہوں۔“

ہزاروں کے گھٹنے پھر ڈھیلے پڑ جاتے اور وہ جلدی سے کہتی ہے۔

”جی ہاں زندہ رہی پچھانوں کے لئے تو ایک مصیبت ہی تھی۔ تم تو چھوٹے کس طرح ——— وہ اس طرح کہ جب تک

مران زندہ رہی لوگ بھانائے سے کہتے دے یہ ناشتہ عورت ہے اسے فوراً گھر سے نکال دو! اب وہ مر گئی تو وہ بولے۔ یہ بھی

اللہ جانے ملا بخش کی ہے بھی یا نہیں اسے اس کی نانی کے گھر بھجوا دو۔ سنا یا تو جی مطلب یہ کہ بچی کے بارے میں ان کو شک شبہ تھا۔ تو ایک دن بچا تان کے گھر برادری کے سب لوگ جمع ہوئے اور کہنے لگے۔ دیکھو بچا تان ہم اب تک تمھارا منہ دیکھتے رہے ہیں اب خبر تیرے اسی میں ہے کہ اسے اس کی نانی کے یہاں بھجوا دو۔ اسی وقت در نہ ہم سے بڑا کوئی نہ ہوگا۔ اس وقت بچا تان نے تیرے کہ کیا کیا۔ وہ بیسٹہ تان کر بولی۔ میں اس صوم (موصوم) کو کبھی نہیں چھوڑ دوں گی۔

”اگر تم نہیں چھوڑ دو گی تو تم تمھارا “بیانی کاٹ” کر دیں گے“ انھوں نے کہا۔

”جو دل میں آئے کرو میں تو اسے چھاتی سے لگا چکی ہوں اب موت ہی اسے مجھ سے جدا کرے گی“

جہاں کے لب داہیں جوش پیدا ہو گیا ہے اور وہ اس طرح بولی رہی ہے جیسے سٹیج پر بچا تان کا پارٹ کر رہی ہے۔

” تو راورسی نے پھانسی کا بائیکاٹ کر دیا ہوگا۔“

” جی ہاں۔۔۔۔۔ مولانا یحییٰ خاں کی بیوی کے خلاف ہو گیا۔ پھانسی کے دونوں اطراف پہلے ہی مراسم کے بہت خلاف تھے وہ ماموں کے گھر چلے گئے تھے۔ دین کام کاج کرتے تھے۔۔۔۔۔ میں نے جب دیکھا کہ پھانسی اپنی خدمت سے بڑا انسان افسانہ اٹھا رہی ہے تو ایک دن اس سے بولی۔ ” پھانسی! اس عجیب کو بھیج ہی دو۔ کیا فائدہ اسے گھر میں رکھنے کا سب لوگ تمہارے خلاف ہو گئے ہیں۔“

پھر شکر وہ کہنے لگی۔

”نہیں ہوا ایسا نہیں ہوگا میں نے اس کی ماں سے کہا تھا کہ اسے سینے سے لگا کر دکھوں گی کیوں بھجوں؟ سے۔ لوگ خلاف ہو گئے ہیں تو بیشک ہو جائیں جب کسی کو سہارا دیا ہے تو لوگوں سے کیوں ڈریں؟“ میں نے کہا۔ ”تمہارے بچے لڑکے بھی تو خلاف ہو گئے ہیں؟“

بیٹاؤں کی آنکھیں آنسوؤں سے جھلک رہی تھیں۔

لوگ کہتے ہیں اڑکا ماں باپ کا بازو ہٹا ہے پر میرے لڑکے تو اللہ کی ماراں پر۔ اچھا جو بچا میں کہیں میں ان سے ڈر نہیں جاؤں گی اللہ عمت دے سب کام کر لیا کہوں گی۔“

اور پچھان سب کام کرنے لگی۔ عیثاں بڑی ہونے لگی۔ پچھان نے رات و نعت کر کے اس کا جیز بنایا اپنی ساری پونجی اس پر صف کر دی۔ جب عیثاں کا بیاہ ہوا تو پچھان بڑی خوش تھی کہ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے پر باوجودی اگر اللہ میاں کو یہ بات منظور نہیں تھی۔ عیثاں کی شادی گجرات میں ہوئی تھی۔ وہاں کسی نے عیثاں کے سسر کو بتا دیا کہ عیثاں ایک مراٹھ کی بیٹی ہے۔ بس پھر کیا غصا سسر والوں نے عیثاں کو مار پیٹ کر پچھان کے گھر بھیج دیا اور بعد میں کاغذ بھی بھیج دیا۔ ادھر عیثاں حلاق لے کر گھر آئی اور مولیٰ بخش خوں ٹھوکنے لگا۔ پچھان پر وہ دوسرا صدمہ پڑا کہ کوئی اور چونا تو کیا گل ہو جاتا پر پچھان نے بہت نہ باری۔ مولیٰ ساس کی بھی برابر خدمت کرتی رہی جسم کی بیماری پر بھی خرچ کیا اور لوگوں کے بڑے بھی دھوئی دی۔ — تاجی پچھان کا رشتہ تیس پچھان کا بیٹا تھا۔ بڑا آدمی رکھنا۔ پچھان نے اسے گھر میں رکھ لیا۔ یہ

وہ کام کاج میں مدد دینے لگا اور جب پھانانے دیکھا کہ تاجی ٹھیکس مر گیا ہے تو اس کی شادی عیشاں سے کر دی۔ خدا خدا کر کے پھانانے کے سسرے پر بوجھ بھی آگرا۔۔۔۔۔ اب سنو ملا بخش دو سال تک بیمار رہا اور پھر مر گیا! دو چار دلی بعد پھانانے کی دلی ساس بھی جل بسی۔۔۔۔۔ پھانانے کی شادی کے بعد پورے تیس برس زندہ رہی تھی یہ۔۔۔۔۔ پورے تیس برس اتنے سال پھانانے نے اس کی خدمت کی تھی۔۔۔۔۔ ایک رات پھانانے کیڑوں پر استری کر رہی تھی کہ استری سے اللہ جلنے لگا۔۔۔۔۔ عیشاں نے فرح کوٹنے لگی کہ اس کے کپڑوں پر، گہرے اور بیماری کے گھٹے جل گئے اور وہ صبح تک بے ہوش پڑی رہی۔ صبح عیشاں نے نیچے اُتر کر دیکھا تو اپنا سر میٹ لیا۔ ہر سب سے لڑا سے جا رہی پر لٹایا اور حکیم کو بلا دیا اور وہ ہوش میں آگئی پر اب وہ پہلی جیسی نہیں تھی جا رہی تھی۔ نو آٹھ ہی نہیں سکتی تھی بے چاری۔ منگل کی رات کا ذکر ہے پھانانے بچے سو رہی تھی اور عیشاں نا تاجی اور ان کا بچہ اوپر چھت پر سو رہے تھے۔ دو بجی رات کو بچہ رونے لگا۔ اللہ جانے کیا تکلیف تھی اُسے۔ عیشاں کی سوانی کی فیند باکل بے خبر سو جاتی رہی۔ پھانانے سے نہ رہا گیا پہلے تو اس نے آوازیں دی پھر پٹی بچہ رونے لگا تو آدرا ہو گئی۔ اللہ جانے کس طرح اوپر لگتی اور پھر اس نے بچہ گود میں اٹھالیا اور عیشاں کو جگا دیا۔ عیشاں بڑی زراحت و ناراض ہوئی۔

”امان تیری صلاح مرنے کی ہے“

اور یہ بات بچہ ہی نہ تھی۔ پھانانے کو ہر دلگ تھی اور وہ جمعرات کی شام کو مر گئی۔۔۔۔۔ پچاس سال لوگوں کی خدمت

کھنے کے بعد مر ہی گئی“

مہراں کی آواز بھرا جاتی ہے۔ اس کی آنکھیں غناک ہو جاتی ہیں اور وہ دوپٹے کے پلو سے ناک پونچھتے ہوئے منہ دوسری

طرف پھیر لیتی ہے۔

میں سرچے گفتا ہوں، مائی پھانانے مر گئی ہے۔ وہ مائی پھانانے جس نے تیس سال تک دلی ساس کی خدمت کی جس نے اس وقت اپنی سوکن کو پناہ دی جس وقت اس کے گھر والوں نے اسے گھر سے نکال دیا تھا اور وہ بے آسرا رہ چکی تھی جس نے ایسے وقت میں سوکن کی بچی کو بچھاتی سے لگایا جس وقت وہ ماں کے دودھ سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئی تھی جس نے دو سال تک بیمار و شہرہ کی تیار و داری کی۔۔۔۔۔ جو پچاس سال تک میرے محلے میں رہی اور جس کے بارے میں چند منٹ پہلے میں صرف یہی جانتا تھا کہ وہ ایک دھوہن ہے اور بڑی لڑا کا ہے۔۔۔۔۔

مہراں آبدیدہ آنکھوں سے میری طرف دیکھتی ہے۔

”تو کھدو باؤجی؟“

میں کاغذ نکالتا ہوں اور دیکھنے کے لئے تیار ہو جاتا ہوں۔ مہراں آنکھیں بند کر کے دائیں ہاتھ کی آنکھوں سے انھیں دباتی ہے۔ اس کی آنکھوں کے نیچے ابھی ہوئی ہڈی نم آکر ہو جاتی ہے۔ مہراں آنکھ لٹے اور آنکھ لٹے کی ساتھ والی انگلی سے اس کی کو خشک کرتی ہے اور ایک لمبی آہ بھر کر پوچھتی ہے۔

”کھہ لیا ہے خط“

”ہاں۔ پتہ بولو“

میں خط مکمل کر کے اس کے ہاتھ میں دے دیتا ہوں۔ وہ اٹھ بیٹھتی ہے اور جانے لگتی ہے۔ مدد خانے کے قریب بدھنگر
رک جاتی ہے۔

”آج شہر میں جھنڈیاں کیوں لگائی جا رہی ہیں؟ مہراں پوچھتی ہے۔

”وہ شخص معلوم نہیں کون ہے۔ شیخ خیر الدین مرحوم کا جنم دن منایا جا رہا ہے۔“

اچھا۔ بچہ خیر دین — میں نے انہیں دیکھا تھا۔ بہت بڑے آدمی تھے۔ پھانیاں ان کے کپڑے بھی دھریا کرتی تھی یہ

مہراں چلی جاتی ہے۔ میں تقریر مکمل کرنے کے لئے کاغذ پر جھکتا ہوں۔ — مجھے کچھ بھی نہیں سمجھ رہا۔ —

میری آنکھوں کے سامنے پھانیاں کا بوڑھا چہرہ اُبھرنے لگتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس چہرے پر صدیوں کی عنت، صدیوں

کا بے لوث خدمت کا فہم اچھا یا بُرا ہے۔ — اس بنیاد میں اس کی خاموش نظریہ جیسے ایک سوالیہ پوچھ رہی ہیں اور میرے ذہن

میں مہراں کے الفاظ گونج رہے تھے۔ — خیر دین بہت بڑے آدمی تھے پھانیاں ان کے کپڑے بھی دھریا کرتی تھی۔“

گٹاری کے انٹے

دیوندر ستیا رتھی

منہ میں کوئی کیرا یا کوئی نٹھا کھڑا یا مٹا تھا سے گٹاری اپنے گھونسلے میں گھس جاتی۔ گھونسلے کا دروازہ ایک معمولی سوراخ ہی تھا۔ اُدھ کی منزل میں ٹکڑے مسل خانہ کی محبت پر جہاں مین کی چادر کا سر کاڑی گئے باہر کو پٹھا دکھا تھا۔ بس وہیں اس مین کے پیچھے دیوار سے آخری درے میں یہ سوراخ تھا جو گٹاری کے گھونسلے کا دروازہ تھا۔ نیچے دسویں کے دروازے پر کھڑے کھڑے بدھ سنگھ گٹاری کو اپنے گھونسلے میں داخل ہوتے دیکھتا اور سوچتا کہ ماں کی محبت دنیا میں سب سے بڑی چیز ہے اور وہی کی کوئی چیز اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

جب قحط کی ماں آیا پر وائٹ ڈپٹ کرتی کہ آج اس نے قحط کو وقت پر کھانا کیوں نہیں کھلایا، بدھ سنگھ کی نگاہ میں گٹاری کی شخصیت ابھر کر اُدھ پہنچ آتی تھی۔ جب کوئی خوف ناک بات ہوتی گٹاری کا جڑوا دسویں کے بغلی واسے پڑ پڑ بیٹھ کر ایسی آوازیں نکالتا کہ بدھ سنگھ بڑی چرکی سے اُدھر اُدھر دیکھتا۔ وہ کہتا: گٹاری سے بڑا انسان کا دوسرا دوست نہیں ہو سکتا۔ سانپ کو دیکھ کر سب سے پہلے گٹاری ہی شور مچاتی ہے:

اس مکان میں ہمیشہ نہیں تو کبھی ابھار سانپ نظر آ جاتا تھا۔ گٹاری کی چیخ پکار ہی سانپ کی موجودگی کا پتہ دیتی۔ اس وقت بدھ سنگھ ہاتھ میں لٹخا اٹھائے سانپ کی تلاش میں نکل پڑتا۔ جب سے وہ اس گھر میں آیا تھا، چنار کے نیچے تین چار سانپ مار چکا تھا۔ بدھ سنگھ انھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا۔ بات کرتے وقت یوں سامنے آتا جیسے داری کے سامنے جوڑا، سامنے واسے شخص کا جائزہ لیتا اور پھر پیچھے اپنے انداز میں اپنا فلسفہ بجانے لگتا۔ "انھوں سے دی ہوتی کا تعین انسان کو منہ سے کھولنی پڑتی ہیں ہمارے گوزدہ مارا جی کا منہ ہے۔ کہ سوچ کر بولو۔ سوچ کر کام کرو۔ گھر واسے اس سے خوش تھے۔ کیونکہ اپنے کا سکے علاوہ وہ دوسروں کا کام بھی خوشی کر دیتا۔ خزش پر بھری کنوں کو تھک کر دیتا۔ سانپ کا ذکر آنے پر تو وہ خفتہ میں آ جاتا۔" کہتا میں اس پر چھپٹ پڑوں گا، ایک ہی ڈنڈے سے اس کی سری توڑ دوں گا۔ اس کی آواز میں اتنی گڑبڑ تھی کہ اس کی بات پر یقین کرنا پڑتا۔ مزدوری اور بچر زوری بات میں وہ بہت فرق نہیں کر سکتا تھا۔ وہی گم بوشی، وہی بھلی پیدا کرنے والی آواز، جب وہ بات کرتا تو اس کے ابھیرے جوئے گاؤں کی چڑیاں ابھرتی نظر آتیں۔ اس وقت اُدھ کھڑکی کے دروازے پر بیٹھا گٹاری کا جڑوا تکیہ سی آواز میں بولنے لگتا۔ بدھ سنگھ سوچتا کہ گٹاری اس کی داد دے رہی ہے۔

کوئی بدھ سنگھ سے بات کرے دکرے کبھی کبھی وہ رسولی کے باندھے میں دپنچی آواز میں خود ہی باتیں کرتا رہتا۔ ابھی ٹھہر کر کسی بات بدترہہ کیا جا رہا ہے، ابھی ریڈیو پر سنی ہوئی کسی خبر کو لے کر ٹانگ مرقہ لگا جا رہا ہے بات کرتے وقت وہ ہنسنے اور زبان پھیرنے لگتا۔ جسے اس بات کا رعب سے بڑا اطمینان تھا کہ گھر میں اس کا اعتبار ہے اور وہ اپنا کام ایمان داری سے کرتا ہے۔ جتنے جہان آئے ان سے ساتھ بدھ سنگھ کا سلوک ہمیشہ خوش گوار رہتا، بچوں سے اُسے بلے حد محبت تھی۔ گلی کی ماں اُس پر اس لیے بھی خوش تھی کہ گلی کا جتنا خیال وہ رکھتا ہے، کیا بھی نہیں رکھتی۔ چنانچہ کی مٹنی پر بیٹھ کر گٹاری اپنی زبان میں کچھ کہنے لگتی تو بدھ سنگھ اس کھڑے ہو کر اس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتا۔ اسے محسوس ہوتا کہ گٹاری کہہ رہی ہے — بدھ سنگھ! میں جانتی ہوں کہ تم ایکلے تین آدمیوں کا کام کرتے ہو اور دل ہی دل میں خوش رہتا۔ بڑی معصومیت سے وہ گٹاری کی محبت دیکھتا۔ جیسے وہ کہہ رہا ہو — میں تو بہت برا ابھی اتنا ہی دکرہوں، گٹاری، جتنا گلی کی ماں کا!

بچوں کے ساتھ یہ شکت ہو کر ابھی بدھ سنگھ کو جانتا ہے۔ کم سے کم بدھ سنگھ کا یہی خیال تھا۔ کون سے کی لاپس کا میں سے بدھ سنگھ کو پہچان جانا کہ تو بھوک سے چل رہا ہے یا خوشی کا ترہہ رہا ہے۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ کوئی عفتہ میں ہوتا، اس وقت چنار کے بیڑ پر بیٹھی گٹاری چوکر بدھ سنگھ سے شکایت کرتی۔ بدھ سنگھ کاٹلی گھاڑ کو لے کر آتا دیتا۔ کیونکہ بدھ سنگھ کو معلوم تھا کہ گٹاری ۱۱ روکے کا پرانا بیڑ چلاتا ہے اور کوٹے کی موجودگی میں گٹاری کو یہ محسوس نہیں ہوسکتا کہ اس کا گھونسا سلامت ہے۔ کبھی کبھی وہ سوچا کہ کون سے اور گٹاری کا یہ ختم کیوں نہیں ہوسکتا۔ کوٹے اور گٹاری کی فیروزہ جگہ میں وہ اپنے دل سے باتیں کرتے ہوئے اسی موصوف پر سہنے لگتا۔ اور بدھ جیسے بچوں کی دیواروں کو سنانے کے لیے دپنچی آواز میں کہنے لگتا۔ گٹاری تو بہت معصوم بھی ہے۔ وہ بے چارہ تو کون سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ گٹاری اس کے بچوں کا دشمن ہے۔ کچھ نہ کچھ کسی کا گھونسا اجاڑنے میں نہ جانے کیا مٹا ہے! اپنے آپ کو گٹاری کی خدمت کے قابل جانے کے لیے وہ کوئی کسر نہ چھوڑتا۔ ساتھ ہی اس کی خواہش نہ تھی کہ گٹاری اس کا شکوہ ادا کرے۔ کوٹے پر اسے عقیدہ آئے تھا۔ شیطان کو گٹاری پر ذرا رحم نہیں آتا۔ آخر گٹاری اس کا کیا بلا کرتی ہے؟

میں کچھ کہنے پر بدھ سنگھ کی نگاہ گٹاری کے گھونسلے پر پڑتی۔ گٹاری کو گھونسلے کے قریب بیٹھے دلچھ کے وہ بہت خوش ہوتا اس کی سب سے بڑی دل چاہی تھی گلی کو مسکراتے اور چل چل کر باغیچہ کی دہش پر اچھلتے کودتے دیکھنا۔ گلی کی ماں اسے منرے سے اب آدھ تعریف کا بدلہ میں دیتا، باغیچہ کی جہان کے منرے کے زمانے کے حالات بدھ سنگھ کا ساتھ رہا۔ اس کے بارے میں رائے تھا کہ ان کی ماں اس سے اتنا کہ اس کی کوئی دل چاہی تھی تو وہ تھا کہ گٹاری کا گھونسا۔ جب بھی گٹاری اترے دیتی بدھ سنگھ سوچتا کہ گٹاری کی کی نفسی ضرورت ہونے والی ہے۔ انہوں سے بچے نکلے لائے بچے منعقد رہتا، ان دنوں وہ خاص طور پر گٹاری کے گھونسلے کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لیتا اس کی نگاہ اب بھی گٹاری کے گھونسلے پر بیٹھی۔ حالانکہ زمین پر کھڑے کھڑے یہ نا ممکن تھا کہ کوشھی کی اوپر کی منزل میں کوٹا دے فلسفیانہ کی جست و خیز کی جاوے۔ کھڑے ہوئے سرے کے بچے بدھ سنگھ کے آخری سرے کے گلی سوراخ کے اندر کی دنیا کے بارے میں کوئی بات دہیافت کی جاسکے۔ کھڑکی پر بیٹھی گٹاری کی آواز میں چل اور لودی کی آواز میں دلچھ کہ بدھ سنگھ اندازہ لگاتا کہ گٹاری کے انہوں سے بچے نکل آسکیں گٹاری انسان کی سب سے بڑی دوست ہے! — بدھ سنگھ کا ٹیکہ کلام تھا۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ اسی سے بات کرتے وقت وہ عورت کو گٹاری سے تشبیہ دیتا۔ لیکن اس کے باوجود عورت کا صحیح تصور بدھ سنگھ کے ذہن کو کبھی نہ لگتا۔ اسی لیے تو اس

نے کبھی مجھ کو کبھی بیاہ کی بات نہ سوچی تھی۔ اُس کے ساتھ کام کرتے کرتے بہت کھردرے ہو گئے تھے۔ جوی برتی تو کبھی اس کے ہاتھوں پر تیل ہی چڑھا دیتی۔ لیکن اُس نے تو قسم کھا رکھی تھی کہ بیاہ کے جھگڑے میں نہ پڑے گا۔ جوی کی فریب و جبر کی کاغذ دے کبھی تنگ نہ کرتا۔ کیا کہ جو بے چہرے کی حرمت دیکھتے ہوئے وہ انہیں سچا کوڑھیا اپنے بیٹوں کی سماعت مندی حاصل نہ کر سکی۔ دروازے میں اُسے آیا کا کام کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اُس نے ایسے باپ بھی دیکھے تھے جن کے بیٹے اُن پر بھوکے بچوں کی طرح جھپٹتے تھے۔ ایسی باتیں بھی دیکھی تھیں جن کے بیٹے بولوں سے خام ہو کر اپنی ماؤں کو ایسی جلی کٹی مارتے تھے کہ سننے والے کو مزہ میں اٹھل دیا کروہ جانا پڑتا تھا ایسے بیٹے پیدا کرنے سے کیا حاصل۔ بس یہی سوچ کر اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ اکیلا رہے گا۔ دم کا دم، نہ دھوکا نہ غم۔ یہی اُس کا فلسفہ تھا پھر بھی گڑی کے بیٹے اُس کی محبت اُڑی پڑی تھی۔

بُھٹلکھ کا چہرہ کبھی اداس نہ ہوتا۔ اُس کی آواز میں کبھی نکان کا لٹکان نہ ہوتا۔ یہ وہ خود بھی جانتا تھا کہ وہ دوسرے کو دوس سے کتنا مختلف ہے، ایک طرح سے وہ چوبیس گھنٹے کا نوک تھا۔ نوکری میں نہ لانا تو سوال ہی نہ تھا نہ لگتا تھا۔ گلی کی ماں کو کبھی اُس پر جبر نہ کرنے کی فہم نہ آتی تھی۔ بلکہ وہ تو اس بات کے انکار میں رہتی کہ کبھی تو وہ بھٹلکھ بھی چوٹی مانتے۔ کبھی تو کبھی بھی منائی جاوے گی۔ گلی کی ماں اُس سے کہا کرتی تھیں میں ایک بھی چھٹی نہ مانے تو انسان کی زندگی میں کھٹن گاب جائے! لیکن وہ بھٹلکھ تھا کہ اُسے کھٹن کا وہ نہ تھا۔

گلی کی ماں کی سس بھی تو اسی کو کبھی میں رہتی تھی۔ صبح معنوں میں بھٹلکھ بھی کی ماں کی ساس کا نوک تھا۔ جنہیں ہر کوئی احترام سے بھابھوئی کہہ کر پکارتا۔ بھابھوئی پتہ تو وہ بھٹلکھ جان دیتا تھا۔ جب بھابھوئی کبھی بہار پڑتیں تو وہ بھٹلکھ اُدھی رات کو اُٹھ آٹھ کو پوچھتا۔ بھابھوئی یا کچھو یا بیٹے تو نہیں؟ بھابھوئی اُسے بیٹے سے بڑھ کر کبھی نہیں۔ اس لیے کبھی بھٹلکھ کسی بات سے بھٹلکھ کا حق دارا اصل بھی روحا تا تو بھابھوئی بڑا نہ باتیں۔ اُن کا خیال تھا کہ وہ بھٹلکھ ولی ہوتا ہے۔ اُس کی بات چیت وہ کھردراہٹ بھابھوئی کو ذرا بھی تو نہ اُکھڑا۔ کیونکہ وہ بھٹلکھ نے اپنے منہ سے یہ جی تو نہ لیا تھا کہ اس کی تنخواہ بڑھا دی جائے۔ گلی کی ماں بھٹلکھ پر اس لیے بھی سخت تھی کہ جہاں وہ بھابھوئی کا پورا خیال رکھتا ہے وہاں مزدور ت پڑنے پر خاص خاص موازنے کے آنے پر وہ سب چیزیں تیار کر دیتا ہے۔ جن پر کٹیری دوسرے کا ہاتھ ٹھیک نہ پہنچتا بھابھوئی ذرا بڑا نے خیالات کی تھیں۔ اس لیے وہ گلی کی ماں کے کچن سے اُٹھ اپنی رسوائی بڑائی تھیں۔ وہ بھٹلکھ ان کا

رسوایا بھی تھا۔ اور پراپرٹی اسٹنٹ بھی۔ کیونکہ ہر کام میں وہ بھٹلکھ کی صلاح لیتیں۔ گلی کی ماں کے بارے میں اُن کی رائے بہت اچھی تھی۔ انہروہ یہ کہا کرتی تھیں کہ اگر کوئی اُن کی سگی بیٹی بھی ہوتی تو شاید اُن کی اتنی سیوا نہ کرتی۔ بھابھوئی بھابھوئی کہتے گلی کی ماں کی زبان سونکھتی تھی۔ بھابھوئی کو سب سے بڑی جبرت تو اس بات پر تھی کہ گلی کی ماں کا جیم اس قوم میں بہا جس کی اس دیس پر حکومت نہ ہو۔ لیکن کس طرح اُن کے بیٹے کے ساتھ انگلیٹنڈ سے یہاں آنے پر اس نے اپنی طبیعت کو اس دیس کے مطابق ڈھال لیا تھا۔ کس طرح وہ یہاں کے تمدن میں رہنے لگی تھی، یہ بات کچھ ہست بڑی تھی۔ اس دیس میں آنے کے بعد بھابھوئی کے بہو بیٹے کو کچھ کم کش کش کا سامنا تھا۔ لیکن بھابھوئی نے اپنی بہو کے ہاتھ پر تیر دی دیکھی ہو۔ خیر اب تو اُن کی زندگی ایک ڈھب پر آگئی تھی۔ گلی کی ماں واپس کے لالچ میں پھنس گئی تھی۔ اور گلی کے پتا جی پھر سے وہ میگزین نکالتے جا رہے تھے جس کے ذریعے انہوں نے انگلیٹنڈ سے رخصت ہو کر اس دیس کی بہت بڑی خدمات سر انجام دی تھیں اور جسے اقتصاد دی و جرات کے باعث بند کر دینا پڑا تھا۔ بھٹلکھ پر گلی کے پتا جی بھی بہت غرض تھے اور بھابھوئی کے کمرے میں بیٹھ کر وہ اکثر کہا کرتے: دیکھ بھٹلکھ! تیری بڑی بھوکہ دہی ہے کہ بھابھوئی کا سارا کام کچھ

ذمہ لے رکھا ہے۔ اور بھابھی کہیں نہ بیٹا! جیسے تم میرے بیٹے ہو ویسا ہی بدھ سنگھ بیٹا ہے۔ میری بس ایک ہی اچھا ہے کہ بدھ سنگھ بیاہ کر لے۔ اس کی بھی ایک بیٹی ہو گئی تھی! اٹھنے کے ہاتھی کہتے: واہ بھابھی، ڈگری کر اور بدھ سنگھ کی مٹھائی بڑھائی۔ اتنا تو بے چارے نے جوڑا بھی نہ ہوگا، بدھ سنگھ یہ سننا تو کچن کی طرف چلا جاتا۔ اور اس وقت اگر گاری گڑکی سے بولن اٹھتی تو اسے محسوس ہوتا کہ گاری پوچھ رہی ہے "تم کب بیاہ کر آؤ گے، بدھ سنگھ؟" وہ کچن سے باہر کی طرف چلا جاتا۔ بیسے بیاہ کی بات کو ان سنا کرنے کے لیے وہ بڑی سے بڑی ہمدردی کر لیتا ہو۔

وہ کئی بار رات کو دھپے پاؤں بھابھی کے کمرے میں جاتا اور سوتے میں ان کا گھبر چہرہ دیکھ کر اسے بڑی خوشی ہوتی دے پاؤں وہ اس کمرے سے چلا آتا۔ بھابھی کا نہ صوب دینا کہ اس کی آنکھوں میں تیرتا رہتا، ان کی گری ہمدردی اور جدوجہد کا ذوق جیسے اس وقت اس کے کانوں میں بادل گونج رہی ہو۔ اسے خیال آتا کہ سوتے سے ایک لمحہ کے لیے جاگ کر بھابھی اس سے یہ کہیں گی: "بدھ سنگھ! اب تو تمہیں بیاہ کرانے میں دیر نہ کرنی چاہیے" وہ حجاب کے لیے تیار رہتا۔ "نہیں بھابھی! یہ نہیں ہو سکتا، جس نے ہمیشہ کی غلطی کا طوق لگے میں وہاں ہر وہ بیاہ کرانے میں تو آزاد ہوں؟"

بچن کے ہانڈے میں کمرے کمرے کبھی کبھی بدھ سنگھ اپنے دل سے باتیں کرتے کرتے اُدبھی آواز میں کہنے لگتا: گاری دوا دے جتنی ہے ایک ساتھ، دوا ہانڈے میں کہیں دن انڈوں کو سینا ہوتا ہے، آدھے دن گاری سینتی ہے، آدھے دن گاری نہتا ہے۔ لیکن عورت اور مرد کبھی اپنے کام ہانڈ ہانڈ کہیں کرتے، اسی لیے تو بیاہ مصیبت بن جاتا ہے، انہیں بھابھی نہیں۔ بدھ سنگھ بیاہ نہیں کرانے کا بدھ سنگھ اتنا بدھ نہیں ہے کہ اپنے پردوں میں ایک ذخیرہ ڈال لے۔ بھابھی اب بدھ سنگھ آپ کی سبوا بھی نہیں کرے گا۔ بدھ سنگھ اسے بیاہ کرنے کو نہ کہنا بھابھی!

گاری کی زندگی بدھ سنگھ کو بہت پیاری تھی۔ گاری کے پیر بھی کو نہ دوتے، ان کے بارے میں بدھ سنگھ مرنے سے لے کر وہ قہر چھوڑ دیتا: گاری کے پیر اپنے نہیں ہیں، یہ بہت پہلے کی بات ہے جب گاری کے پیر اپنے ہوتے تھے وہ مود کے سامنے ہاتھ پٹنے لگی، مود نے خوش ہو کر کہا: ہانڈ لے گاری تو میری اچھا ہو۔ گاری نے مود سے کہا، تم میرے ساتھ اپنے پیر بدل لو۔ مود نے سوچا بچن دیا ہے تو پُرانا چاہیے، جس جی مود نے اپنے پیر گاری کو دے دیئے اور گاری کے پیر خود لے لیے۔ آج تک مود کو اس بات کا انصاف ہے یہ سدا بڑا خسارے کا دن۔ گاری تو مود کے پیر کے پیٹے سے کہیں زیادہ سندر ہو گئی اور مود اب تک دوتا ہے جب بھی مود نہتا ہے۔ ہاتھ پٹنے پردوں کو دیکھ کر بانیس دھکتا رہتا ہے۔ میں اتنا سندر ہوں لیکن میرے پیر کتنے بھونڈے ہیں! اور اگر اُسے اوپر کھڑکی پر بھی ہوئی گاری نظر آ جاتی تو وہ پکار کر کہتا: تو بڑی چالاک تھی۔ تو نے مود کے پیر ادا کیے بات بات میں۔ واہ دی میری منہل گاری! واہ دی چٹان! اٹا دی کے ہر سیاہ خان مود سے نہ ہوتے تو نہ دھچکی اور نہ دھیرا تے خوب مٹھرت نہ لگتے، یہ سوچ کر بدھ سنگھ ٹھٹھکی ہانڈ سے گاری کی طرف منہ دیکھتا رہتا۔

بھابھی اگر بدھ سنگھ کو اپنے آپ سے باتیں کرتے سنتیں اور سمجھاتیں: اس طرح تو تیرا دماغ بھلا جائے گا بدھ سنگھ! تو اپنے آپ سے باتیں نہ کیا کر! لیکن بدھ سنگھ کہتا: میرے گود بھاداج لا کہنا ہے بھابھی، اگر اچھا چاہتا ایسے ہی ہے جیسے کیرے کا لکھنا۔ جیسے کیرے کو ایک رے سے ٹھوڑا سا لاکٹ کر اور اس کو کسے کو باقی کیرے پر اُسی جگہ جہاں سے وہ کاٹا گیا ہے گھسا کر کیرے کا لودا پانی نکال دیا جاتا

ہے۔ ایسے ہی آدمی کو ایحانت میں اپنے من سے باتیں کرنے کی عادت ڈالنی چاہیئے۔ ایسا کرنے سے جینے کا لڑوا ہانی اور ابتلا ت دہر نکلا جاسکتا ہے۔ بھابھو جی منس منس کرٹ کرٹ ہو جاتیں۔ چھ سنگھ یہ نہ سمجھ سکتا کہ بھابھو جی کیوں ہنس رہی ہیں۔ بخود ہی دروہند بھابھو جی دودھ سے چھ سنگھ کو اپنے آپ سے آہن کرتے سنتیں: گوردھاراج کا کہنا ہے کہ کئی باتوں میں انسانوں سے پندے اچھے ہیں۔ اور کئی باتوں میں نہ نڈوں میں بھی وہی بھادی پھیل ہوئی ہے جو انسانوں میں۔ اب کوئی کڑوں سے پوچھے کہ وہ گناہوں کے پیچھے کیوں پڑے رہتے ہیں۔ تو وہ کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ کڑوں اور گناہوں کی دوستی ہو جائے۔ یہ دوستی کیلئے جو۔ اس کا آپاے گوردھاراج کے پاس ضرور ہوگا :

گلی کی ماں چائے کی میز پر اپنے خاندنہ سے بحث میں الجھ کر گم ہو جاتی چاہب۔ ایسے موقعوں پر گلی کے چاہی کسی بات پہنچھلا اُٹھتے تو چھ سنگھ بھابھو جی سے ہاتھ کرتے ہوئے کہتا: گوردھاراج کا کہنا ہے بھابھو جی کو کھارے کو کہیں میں پانی کسی میٹھا نہیں ہو سکتا چلے کہیں میں من بھر کھاؤ ڈال دیں بھابھو جی کہتیں: تو ملنا کیا جانتا ہے چھ سنگھ؟ وہ بات کوٹھلے ہوئے کہتا: بھابھو جی میں پوچھتا ہوں۔ کیا گناہی اور گناہ میں بھی ان میں دیتی ہوگی؟ بھابھو جی ہنس کر کہتیں: تو ہاگل ہو جائے گا، چھ سنگھ! جب دیکھو گناہی کی بات، گناہی تیرے دماغ پر میٹھ گئی ہے، سمجھ لیا ہو گیا ہے؟ اس کے جواب میں انہی یہودی ہانختے ہوئے کہتا: بھابھو جی، اس پندے کے بچے کسی انسان کے دوست نہیں ہو سکتے چاہے انہیں من بھر دودھ پلا جا جائے۔ بھابھو جی حیرت سے چھ سنگھ کی طرف دیکھتیں۔ چھ سنگھ کی آواز سیٹی کی مسرت گونجتی۔ بھابھو جی سہمیں کہ چھ سنگھ میں ایک بھی نہ رہی۔ وہ بچا کھاتا جوتا تو پندے بڑوں کے کان کرتا۔

جب سے بھابھو جی نے چاہا کھانے پر مزہ چھ سنگھ کو گناہی کا ذکر کرنے سے لوگ دیتا تھا وہ ان کے سامنے گناہی کا ذکر کرتے جھگڑے گا تھا۔ وہ اوپر کھڑکی پر بیٹھی ہوئی گناہی سے ہلکا کو کہتا جانتا کہ اب اُسے کہیں دوسری جگہ گھوسلا دل لینا چاہیئے۔ جب کوئی کسی کو دیکھتا تھا گوردھاراج سے تو اس شخص کو چاہیئے۔ گناہی سے اُس گھر سے اُٹھ جاتے۔ بس گناہی کو بھی اپنا گھوسلا بدل لینا چاہیئے۔

لیکن گناہی اپنا گھوسلا بدلنے کو تیار نہ ہوئی۔ گناہی کی آواز اُسے بیاد نہ لگے، چھ سنگھ اُس کے پیچھے بھی اپنے دل کو سمجھنے لگا۔ جب بھابھو جی ناراض ہوتی ہیں تو انہیں ناراض کرنے سے کیا حاصل۔ گناہی کی آواز میں کون سے لڑو لکھے ہیں؟ آخر کسی پندے کی آواز انسان کے دماغ پر کیوں چھا جائے؟ ویسے تو انسان اور پندے بھائی بھائی ہیں۔ دونوں پر ایک ہی سونچ چکنا ہے۔ لیکن بھابھو جی کی بات بھی ٹھیک ہے۔ ہر وقت ایک ہی بات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں انسان یا گل ہن کہ دھوت دیتا ہے۔ ہر وقت گناہی کی عقلیں آواز کو دماغ پر دستک دینے کی اجازت کیوں دی جاتے؟ انسان کا دماغ مینا ہلا دیتا ہے اتنا ہی نازدہ مند ہے، چھ سنگھ کو فیصلہ کر لیا کہ بھابھو جی کے کہنے کے مطابق پہلے ادا اپنے دماغ کو ہر خطرے سے بچا کر رکھے۔

اب گناہی اوپر کھڑکی پر بیٹھی رہتی۔ چھ سنگھ بھول کر بھی اُس کی طرف نہ دیکھتا۔ گناہی کی آواز سے اب اُسے کوئی ٹکاؤ نہیں رہ گیا تھا۔ اب وہ اپنے آپ سے باتیں کرنے کی عادت بھی کم کر دیتا۔ کیونکہ بھابھو جی کی صاف اور واضح رائے یہی تھی کہ اب اس کے کہنے سے چھ سنگھ ہاگل ہو جائے گا۔ وہ ہاگل نہیں ہونا چاہتا تھا۔

صبح کی چائے کی میز پر بیٹھے بیٹھے گلی کی ماں گناہی پر بیٹھی گناہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گلی سے کہتی: وہ رہی گناہی، تیرے بھائی گلی گناہی کے پیچھے جھاگتی ادا اُسے ہارنے کی کوشش کرتی۔ گناہی ہاتھ نہ آتی۔ لیکن وہ ہارنا ہار جائے گی میرے قریب اگر میٹھی

اور اپنی مخصوص اکاؤنٹیں بولتی۔ گلی کی ماں خوش ہو کر گلی کو گندہ لڑائی۔ گلی دوبارہ گناہی کو پھانسنے کے لیے اس کے پیچھے دوڑتی۔ بچی کو اپنی کوشش میں ناکامیاب پار گلی کی ماں کہتی: ”بھروسہ گلی کی مدد کرو؟“

بھروسہ زور سے ہنستا۔ لیکن وہ اس کے ہوش کو گلی کی مدد نہ کرتا۔ گلی گناہی کے پیچھے دوڑ دوڑ کر اچھٹی کوڑتی۔ گناہی ہاتھ نہ لاتی۔ بھروسہ کہن کی طرف جدا جاتا۔ گلی کی ماں آیا کو بجا کر کہتی: ”گلی کی مدد کرو کیا؟“

”ایم کیل مدد کرنے سکتا، لی بی جی؟“ آیا منس کو کہتی۔

ایک دن گلی کے بتاجی نے بھروسہ سے کہا: ”بھروسہ! ایک بار گناہی کو پکڑ کر گلی کے ہاتھ میں تھما دو۔ پھر چاہے گناہی اڑ ہی جائے۔ گلی بہت ملچاتی ہے۔ وہ ایک دوسرا تائب تائب کو چھو چھو کر دیکھ لے گی۔ پھر وہ خود ہی کہے گی۔ گناہی کو چھوڑ دو۔ بھروسہ!“

بھروسہ مالک کا حکم نہ مان سکا۔ دو گناہی کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگا لیکن گناہی اس کے ہاتھ نہ آئی۔ گلی کے بتاجی منس منس کر اسے بڑھا دیتے رہے۔ پکڑ پکڑو وہ گئی گئی۔

گلی کی ماں کو یہ یقین نہ آیا۔ ”جائزہ کر بولی“ رستے دو، بھروسہ! یہ ٹھیک نہیں:

”میں ٹھیک نہیں؟“ گلی کے بتاجی کہہ آئے۔

”اس میں بحث کی تو کیا نہیں؟“

”میں کب کہتا ہوں تو بحث کی جگہ ہے؟“

”تمہاری کوئی بات کرنے سے کیا حاصل؟“

”تجربہ کون کرتا ہے؟“

”تو یہ کیا ہے؟“

”یہ تو دوستی کی جا رہی ہے۔“

بھروسہ میرے پاس آئی تھا۔ وہ حکم کے انکار میں کھڑا رہا۔ گلی گناہی کو گھاس پر بیٹھ گئی تھی اور روئے جاری تھی۔ گلی کے بتاجی نے اسے اٹھا کر سینے سے لگا دیا۔ بے گلی گناہی ہاتھ نہیں آتی تو نہ ہی، بھروسہ! ایک کام کرو۔ بائیں کا لمبا زینہ لگا کر گناہی کے گھوٹلے میں جھانک کر دیکھو۔ اگر گناہی کے اندر سے کچھ نکل آئے ہوں تو گناہی کا بچہ نکال لاؤ اور ایک نیشہ کے لیے اسے گلی کے ہاتھ پر رکھ دو وہ اسے سے خوش ہو جائے گی۔ پھر تم گناہی کے نیچے کودو پس گھونسلے میں رکھ آؤ۔“

بھروسہ ٹھیک ٹھیک کام کرنے لگا۔ زینہ اٹھا لیا اور اسے اُدپر کی منزل کے کوڑے اسے منسل خانہ کی دیوار سے لٹکا کر اوپر چڑھنے لگا۔ گلی کی ماں

نے چلا کر کہا: ”پہلے میرے پاس آؤ، بھروسہ!“

بھروسہ نے سینے سے ہٹ کر گلی کی ماں کے پاس کھڑ ہو گیا۔

گلی کی ماں نے آواز دی: ”آیا؟“

آیا وہ ڈر کر آئی۔ گلی کی ماں نے کہا: ”گلی کو اندر لے جاؤ۔“

گلی نے پتا چلی کی گود سے کھانکے پاس جانے سے انکار کر دیا۔ اتنے میں مہاراجی باہر آئیں۔ شو رسن کر وہ گھبرا گئی تھیں۔ پولیس
 "کیا جھڑا ہے؟"
 "جھڑا کچھ نہیں مہاراجی! گلی کی ماں نے اپنے خیال کی تائید پہنچاتے ہوئے کہا: بدھ سلکھ لڑی کا بچہ لانے جا رہا ہے۔ میں
 کہتی ہوں گلی کی ناراض ہو جانے لگی۔"

"ماں! یہ تو ٹھیک ہے، لڑی کا بچہ اٹھانے سے گلی تو ناراض ہو گئی ہی۔ بھابھو جی نے چلک پڑھتے ہوئے کہا۔
 بدھ سلکھ خاموش کھڑا تھا۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کس کا حکم مانے۔ بھابھو جی اور گلی کی ماں کا یا گلی کے پتا چلی کا۔ اُس نے تو
 گلی کی لڑائی کا اثرات کم چھوڑ رکھا تھا اور تین چار روز سے اُوپر کھڑی میں بیٹھی لڑی کی طرف دیکھتے نہاس کی کوشش نہ کی تھی۔ کیونکہ وہ بالکل
 کو دعوت نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ سیدھی اور مستحضر ذکاوت کے لئے کاٹا لیا تھا۔ وہ کسی طرح کی لکھن میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ عورت کے پیسے
 اُس کے ذہن میں کی جگہ نہ تھی تو یہ لڑی کا کھر کی جا دوڑتی تھی۔ بھابھو جی نے پہلے بتا دیا مڑنا تو وہ لڑی سے آشنا کی نہ پڑھا نہ چیز اب تو
 اُسے لڑی کی آواز میں کسی طرح کی ٹھٹھکی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ اب لڑی کی صورت اُس کے تصور کو سہلانے کی اہمیت نہ رکھتی تھی
 اُس کے پردوں کی پھیر پھیر بہت اُس کے بہنوں کو چھو نہاس رکھتی تھی۔ اور بھی زبردستہ تھے، ذہل تھی، مینا تھی۔ گڑبھا اور وہ پھار مڑی
 پر نہ بھی تھا جو ہمارے شروع میں بہاؤ کی طرف ہمارے سے پہلے لڑی ٹکڑے باغوں میں چمکنے کے لیے آجاتا تھا۔ جس کی دم بہت لمبی
 اور عصبور ہوتی ہے۔ ایسے ہی اور بھی بہت سے پرندے تھے ایک نانا دی ہی تو نہ تھی۔
 کچھ لمحوں کے لیے جسے کہتے ہیں: پونج موٹی نہی۔ گلی کے پتا چلی نے کوٹ کہا: بدھ سلکھ، تو یہ کام نہیں کر سکتے تو مجھے دھما
 انعام کرنا ہوگا۔"

"جی صاحب! بدھ سلکھ جو نہاسے ذہین کی طرف بڑھا۔
 گلی کی ماں خاموش تھی۔ بھابھو جی کچھ نہ کہیں۔ بدھ سلکھ ذہین پر چڑھ گیا۔ کچھ لمحوں کے بعد اُس نے واپس آکر کہا: جی صاحب!
 میں نے ابھی طرف دیکھا، میرا پہلے بھی یہی خیال تھا۔ لڑی کو اندر سے دیکھتے ہیں دن ہی جو ہے، ابھی پانچ دن اور لگیں گے، پھر جا کر
 انڈوں سے دوپٹے مٹے پٹیکے باہر نکلیں گے۔
 "اچھا تو پرندہ دن اور انڈا رکھتے ہیں؟ گلی کے پتا چلی نے جیدگی سے کہا: ہناری گلی اچھی لڑی ہے۔ وہ لڑی کے بچے
 سے مزید دوستی کرے گی؟"

بھابھو جی کے چہرے پر مہینا کی جھلک متحرک آئی۔ گلی کی ماں نے بھی سلکھ کا سامنا کیا۔ گلی کے پتا چلی نے من کی طرف دیکھا اور
 ہنس کر کہا: ہم بدوستی کرنے کے قابل نہیں۔ پانچ دن بعد لڑی کے انڈوں سے دوپٹے باہر نکلیں گے۔ جب وہ دس روز کے ہو جائیں گے
 ہم لڑی کے بچے کے گلی کی ملاقات کر آئیں گے۔
 "بہت اچھی بات ہے! بھابھو جی نے شکار لگائی۔

"مجھے بھی اعتراض نہیں ہے۔ گلی کی ماں نے کالج میں پڑھنے والی کسی لڑکی کی درخواست قبول کرنے کے انداز میں کہا۔
 گلی اپنے پتا چلی کی گود سے اُتر کر آبا کی طرف بھاگ گئی۔

جہ سنگھ نے پرانی عادت سے بدلے کا جو کر کہا: جی صاحب! میرا حساب کبھی غلط نہیں ہوتا۔ گئی ہی بیٹھ و دی اندر سے دیتی ہے۔ سال میں ایک بار۔ پورے پچیس دن وہ اپنے اندر سے سیتی ہے۔ آدھا وقت گزاری سیتی ہے اور آدھا وقت گلا رہا، یہ نہیں کہ اکیلے گزاری پر ہی سدا بوجھ ڈال دیا جائے؟

”ہاں ہاں، جہ سنگھ! اتنا صاحب کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ عمل کے پنا جی نے مذاق کرتے ہوئے کہا: اس جھگڑے میں چائے ٹھنڈی ہو گئی۔ اب یہ چائے نہیں لستی ہے، پھر سے لاؤ۔ ایک دم گرم؟

دوبارہ چائے آئی تو لگی کی ماں بولی: گئی نے لکھنی اونچی جگر گھونسل بنا یا ہے؟

”اب دراز گئی کو بھیج میں نہ لاؤ: لگی کے پنا جی بسے۔ ورنہ چائے پھر ٹھنڈی ہو جائے گی؟

لگی کی ماں نے مسکراتے ہوئے چائے کا پتار کر کے اپنے شوہر کے ہاتھ میں بٹھایا۔ پھر اس نے اپنا کپ ہونٹوں سے لٹکانے کے بعد بیٹھ گئی سے کہا۔ کب سے میں میں روٹیوں کے کالج میں انگریزی پڑھاتی ہوں، ہاں دوستی میں گزاری نے اپنا گھونسل بنا یا تھا۔ نیچے سال۔ ایک دن میں روٹیوں کو پڑھا۔ یہ بھی۔ اچانک اوپر سے دوڑن اندر سے ایک روٹی کے سر پر گئے اور ٹوٹ گئے۔ بطور سے بے چاری روٹی کا چہرہ خراب ہو گیا۔ سب روٹیاں ٹھنڈا کر ہنس پڑیں۔ بیری طبیعت بہت زبردست دھچکا لگا۔ میں اُس دن پیڑوں کے سکی اُس روٹی نے فضل خانہ میں جا کر اپنا چہرہ صحت کر لیا تھا۔ اور باقی روٹیاں سنجیدہ ہو کر پڑھنے کیلئے تھیں۔ لیکن میرے دل پر جیسے پنا ٹوٹ پڑا تھا؟

”تم بہت حساس ہو، یہ مجھے معلوم ہے۔“

”وہ واقعہ مجھے اپنا سبک ٹھیک بنانے ہوئے ہے۔“

”اب تو یہ غلط بات ہے کہ ایک پس پیلے کے واقعہ پر آٹھ ہلکے جاویں؟

”اندھے کو کر ٹوٹ گئے تو لگی کا جوڑا کرے میں دیوانہ وار منڈلانے لگا تھا۔ ان کی بیچ و پکار گئی دن تک منائی دیتی رہی تھی جیسے اُن کے اندر سے توڑنے کا گناہ ہم سے سرزد ہوا ہو؟

”اب اُس دم کو دونا دینا ہی ٹھیک ہو گا؟

”اس علم کا دھماکا سا جڑتا ہے میرے دماغ میں اس وقت میں بے چین ہو جاتی ہوں؟

یہ تو وہی بات ہوئی عیساکشا مرنے کا ہے۔ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے؟

کچھ لمحوں کے لیے سکوت طاری ہو گیا۔ جہ سنگھ بھی بوجی کے چنگ کے قریب کھڑا بھی سہمی سی لٹا ہوں سے چائے کے یز دی مرٹ دیکھ رہا تھا۔ لاش وہ لگی کی ماں کو دلا دلا کر کہہ سکتا کہ پچھلے غم بھولی جائے آئے وہ اسے غم کی فکر کرو۔ وہ حیران تھا کہ بھلا بوجی کیوں چپ بیٹھی ہیں۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ جب انسان بھی اپنی زندگی کا مالک نہیں رہا۔ ہندسے اپنی زندگی کے مالک بننے کی اہلیت کیسے حاصل کر سکتے ہیں۔ زندگی ہے تو ایک دم ٹھیک ٹھیک ہے۔ ایک ذہن کا علم، ایک ذہن کا انسانی، زندگی میرے کی میں نہیں ہے نہ خدا و گرد کا تھیلا زندگی ایک مرگ ہے جس پر پیدل چلنا ہوتا ہے۔ جیسا کہ گرد و دھاراج نے کہا ہے۔ زندگی کا مطلب ہے مٹی کا نام گانہ۔ اور گرد و دھاراج کا یہ بھی تو کہنا ہے۔ سادھو لوگ کہیں سب بدیتی۔ انسان نے کوئی چیز کم کر دی ہے وہ چیز ہے انسانیت۔ گرد و دھاراج کا کہنا ہے کہ انسانیت بہت زیادہ دیر کم نہیں رہ سکتی۔ انسان صداقت کو چھوڑ رہا ہے، اوصاف کو آواز دے رہا ہے۔ صداقت کسی دوسرے کی جیب کا سکر نہیں ہے

انصاف کسی پہلی کا نام نہیں ہے۔ صداقت کے بنا انسان سانس نہیں لے سکتا۔ انصاف کے بنا ظلم اور لوٹ کھسوٹ کی جڑ نہیں اُکھڑ سکتی..... اور اسے محسوس ہوا کہ اگلی کی ماں معمولی عورت نہیں ہے۔ جسے لٹائی کے بوس بھر پیلے کے درد و غم کا تصور آج بھی غم گین بنائے ہوئے ہے۔

ایک ایک کر کے تین دن گزر گئے۔ اگلی کے پتا جی ہر روز صبح کی چائے پر بدھ سنگھ کو یاد دلاتے کہ زینہ لگا کو لٹائی کے گھونسلے پر بھابھا کر دیکھے کہ انڈوں سے بچے نکل آئے یا نہیں۔
 ”جی صاحب! ایراساب غلط نہیں ہو سکتا ہے۔ گورو دھارا ج کا پتا اب ہے۔ بدھ سنگھ جواب دیتا: بھگوان نے چاہا تو پانچویں دن لٹائی کے انڈوں سے بچے باہر آ جائیں گے۔ اور پھر دس روز کی کوئی شرط نہیں دوڑیں گا۔ بعد بھی گامادی کے بچوں سے اگلی کی دوستی کو اپنی جان کی تپ ہے؟

تھک ہے۔ اگلی کے پتا جی کہہ اُٹھتے۔
 اگلی کی ماں خاموش دبی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں بھابھو جی سے تائید چاہتے ہوئے کہتی: میں کہتی ہوں کہ یہ خیال چھوڑ دیا جائے ایسی کیا مصیبت پڑی ہے کہ اتنی اونچائی سے لٹائی کے بچے نکال لگی اور دکھائے جائیں۔ مگر رات وقت بیٹھنے پر لٹائی کے بچے خود بخود اُتر چلے گی ہر۔ بچے قریب چھتے تھے تو آئیں گے۔

”اب سو۔ ڈرامت ڈھکاؤ ڈارنگ! اگلی کے پتا جی نے گردن گھماتے ہوئے کہا: بدھ سنگھ لٹائی کے انڈوں سے بچے نکلنے کے بعد ان کا پورا خیال دکھا کر لگا۔ اپنے کام کے ساتھ وہ یہ کام بھی آسے گا۔ آخر لٹائی نے ہمارے گھر میں گھوسٹ بنایا ہے تو ہم اسے غیر منسلک سمجھتے۔ اس میں بھی وہی زندگی ہو کر رہتی ہے جو ہمارے اندر سانس لیتی ہے۔ کیوں یہ کچھ جھوٹ ہے؟

پانچواں اور چھٹا دن جی گزر گیا۔ یعنی بیس اور پانچ پچیسواں اور چھ اور بیس چھیسواں دن، ابھی ٹک لٹائی کے انڈے اسی طرح پڑے تھے تاہم بیسویں دن بدھ سنگھ نے کسی قدر شرمندہ ہو کر کہا: گورو دھارا ج کا کہنا جھوٹ تو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ لیکن انسان کا حسبِ قضا بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن گورو دھارا ج کی لالچ رہ جانے لگی اگر آج لٹائی کے انڈوں سے بچے نکل آئیں۔

اگلی کی ماں کاٹچ جی گئی۔ اگلی کے پتا جی کسی طعانی سے گفتگو کر رہے تھے۔ ”مگر سنگھ دڈو ڈو آ یا۔ اس کے ہاتھ میں لٹھ تھا۔ بلا جی صاحب! ابھی ابھی صاحب اور سرے نکل کر گیا ہے؟

لٹائی کی گھر جڑا رسوئی کے بغل داسے پڑ پڑ بھینچا جھجک رہا تھا: ان پرندوں پر کیا مصیبت آگئی؟ طعانی نے جھنجھلا کر کہا: ”کیا یہ نفع ہے؟ کتنے دھاناک ہیں دو لوگ جو پرندوں کی بولی میں غفلت کی عقلی دھونڈا کرتے ہیں؟

”یوں شاعروں پر نشتر زنی تو نہ کیجئے۔ اگلی کے پتا جی ہنس کر رہے۔ زندگی کا گنہگار خالی ایک سرے نہیں بننا۔ ہم عالم بھی زندگی کی راگ داری کے دامن میں اُڑ رہے ہیں۔ کچھ شرمٹ آئیں ہوتے ہیں تو کچھ ہم انگریز کچھ شرمائی بچائی آواز کی داغ بیل لگاتے ہیں تو کچھ ہم انگریز کی طرح دغا دے کر رشک دیتے ہیں مستقبل کے چرسے سے نقاب اٹھنے والے ہمیشہ دوستانہ ہمدردی لیے رہتے ہیں صبر و استقامت کے مرد زندگی کے بارے میں فرمائش پوری کرنے والے شرمینعت پر مغز نہ کئے والے مڑا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگلی کی ابتدا پرندوں کی بولیوں کی نقل آواز نے کی مگر سرے ہوئی، آپ کا کیا خیال ہے؟

اس کے بارے میں تو دورائیں نہیں ہو سکتیں، "خاتنا قی نے ہنس کر کہا۔
 گٹاریوں کا جڑا چھڑا تھا۔ جیسے اُن پر مصیبت کا ہمارا ٹوٹ پڑا ہو۔ جھٹکھ پڑے سے لٹھ اٹھائے آیا۔ بولا: گٹاریوں کا
 بدلا میں نے لے لیا۔ آخر گوردھاراج کے آشر باد سے میں نے سانپ کی سری لڑنے والی ہے۔ گوردھاراج کا کہنا ہے کہ جب سانپ سویر
 جاگتا ہے وہ کہتا ہے کہ ہے بھٹوان مجھے ایسے انسان کی شکل دکھا جو مجھ پر ہاتھ اٹھائے تو میری سری مزدور تڑوٹے تاکر مجھے نہ بھی ہرکرا دھر
 ا دھر نہ بھٹکنا پڑے۔ سری ٹھٹنے سے مرنے پر سانپ دوسرے جنم میں انسان بنتا ہے ؟
 "اسی جیسے شاہ کچھ انسان سانپوں کے بھائی مورتے ہیں ؟" طاقتا قی نے طنز کی۔
 "پر سانپ گٹا دیوں کے گھونٹے میں گھس کر اُن کے اندر سے کھا گیا۔ جھٹکھ بولا: گٹا دیاں چوتی رہ گئیں، چٹے وہ بھی نہ
 بچ سکا۔"

گلی کی ماں کا بچہ سے آتی تو گٹا دیوں کی سہیل کی کہانی سن کر انوس سے ہاتھ ملتی رہ گئی۔ گٹا دیوں کے دواڈے پچھلے سال
 بریکوں کے لالچ میں انڈی کے بیڑ میں روشن دان سے لڑکڑٹ گئے تھے، دواڈے بدلتے جنہیں آج سانپ کھا گیا تھا۔ ہمارے
 گوردھاراج کا کہنا ہے کہ گٹا دی پتے عورت ہوتی تھی، جھٹکھ نے اپنے مخصوص انداز میں کہنا شروع کیا: گٹا دی کی مصیبت اب بھی کچھ کم
 نہیں۔ وہ لاکھ لاکھ جنم لے کرے۔ لاکھ پکٹنے کا جنم لے کرے، ذنگ لے کر اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ اس پر بھی گٹا دی اندر سے دیتے سے باز نہیں آتی ؟

نیرو

الوسید قریبی

اس کا تجربہ اداوی کے دلانے پر واقع تھا، جہاں وہ اپنے باپ کے ساتھ رہتی تھی۔ اس نے اپنی ماں کو دیکھا بھی نہیں تھا، صرف اس کی باتیں سنیں تھیں۔ رات کو جب داوی دو دھیا دھندلوں میں سو رہی تھی تو اس کا باپ حتماً سلا کر بچھ جاتا اور چراغ کی لور پر نظر کاٹے آپ ہی آپ بڑبڑانے لگتا۔ اس کی دھیریں میں لپٹی باتیں سن کر اس سناں ہوتا کہ شاید اس کا حقہ باتیں کر رہا ہے۔

”تیری ماں داوی کی سب سے حسین دو شیر و مہنی۔ بالکل ٹھہریسی۔ میں اسے یہیں بیاہ کر لیا تھا، اسی جھوٹے میں۔ شہد کی کھیاں، اسے کبھی ڈنک نہیں مارتی تھیں۔ بالکل تیری طرح۔ اور اس کے ہاتھوں میں بھی ایسی ہی برکت تھی۔ تیری اس گوی گائے کی ماں جو کواؤں کو پاس نہیں بھٹکنے دیا کرتی تھی، بکری ہی تو بن جاتی تھی۔ پتہ نہیں کیا لگتا تھی، اس کے کان ہیں۔ جب چاچو وہ لوہے مرغیاں تھیں تو وہ میرے کو لک بھٹکانا ہی نہیں آتا۔ ٹوکر ہی بھری رہتی تھی اندوں سے، اور بھنے اندے بھٹاؤ اتنے ہی چور بھٹکتے تھے۔ تیری جیساں بھی تو ویسی ہی ہیں۔ اور انکو ر، سبب، و اخروٹ، و خربانی کا تیرے لختہ کہ مندی میں بیچ کر بھی بھٹنے کو نہ دیتا تھا۔۔۔۔۔۔ وہ جب کشیدہ لے کر بھٹی تھی تو تسلیاں بھول پڑتی تھیں کہ کچھ مچ کے بھول ہیں۔۔۔۔۔۔ تیرے ہاتھوں میں بھی دی بات ہے۔ مگر سوچنا ہوں کہ جب ان ہاتھوں میں مندی لگے گی، بیاہ ہو گا تیرا اور نوسی جاوے گی اور کے گھر جس طرح تیری ماں اس گھر میں آئی تھی، تو تیرے باپ کا کیا بنے گا؟“

”میں نہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی اب!“

”تو نہیں جانتی چل کر ایک گھر سونا ہو کر ہی دوسرے کا گھر آباد ہوئے، اور تیرے بیاہ کی تیار بان تو تیری ماں نے تیرے پیدا ہونے سے پہلے ہی تھوڑ کر دی تھیں۔ مجھے تو لڑا کر چلے۔۔۔۔۔۔ سات دکان چاہئیں۔۔۔۔۔۔ تین شسرال میں ہوں تو چار دیکھے ہیں۔۔۔۔۔۔ وہ ادھر آئیں تو یہ ادھر چلی جائیں اور ان کے بچے دن بھر کھیں بھیلے شور مچاتے پھریں۔“

”مجھ کو بھی ایک متالا دو گے اب؟“ تیرا اپنے باپ کی بات کا مٹی۔ بڑھے چاروں کے جھنڈے جھانپاں کے مٹے جیسا، رونا تو آتا ہی نہیں اس کو اتنا پیار ہے کہ اس نے اور وہ اپنے باپ کی وارثی میں انکھیں سے لنگھی کرنے لگتی ہے وہ دو گے

تھی پتھروں پر پریوں کے کشار کا شور بھی نہیں تھا، وہ ہی کے مشکوک ہیں، بلوئی کی آواز بھی نہیں تھی، پھر نہ کی گھر کر بھی نہیں تھی۔۔۔۔۔ اس نے، افی پر نگاہ دوڑائی، اور دوڑا آسمان پر سیاہی کا دھبہ نظر آیا۔ سیاہی کا یہ تخیل برابر نشانِ قریب آنا، اور جیتا گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ خوفناک آواز بڑھتی گئی۔ پہاڑوں کے پتھر ٹوڑنے لگے۔ زرخیز حوض سے بٹ بنی دیکھ رہی تھی کہ یکایک بلا ہے، ایک مرنے سے مٹی دل دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا، لیکن اتنی بڑی بڑیاں جی کے پر اس کے جھونپڑے کی چھت سے بھی بڑے تھے، وہ دم گئے ہیں، بھی نہیں آسکتی تھیں۔ نہیں پڑیاں نہیں ہو سکتی تھیں، ایک بڑے سیدھ نے جو داوی سے گزرتے وقت ان کے یہاں ٹھہرا تھا، جیشیوں کے وطن کا حال مسئلہ وقت بتا رہا تھا کہ وہاں اتنے بڑے بڑے گدھر ہوتے ہیں کہ خزانوں کو اپنے بچوں میں اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ اس تصور سے وہ سم گئی، اور سورج کھلی کے پلوں میں ایک پتھر سے چٹ گئی۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ بچپن میں جب وہ کوئی خوفناک کہانی سنتی تھی زلفات سے منہ ڈھاپ کر اپنے باپ سے بیٹھا ہوا کرتی تھی اور اس کا خوف دور ہو جاتا تھا۔

”خیزا، گدوں کے شور کچھ جتنی ہوئی اسے اپنے باپ کی آواز سنائی دی، تم کہاں کی جو زینو؟“
لیکن زینو کی آواز صحت میں سوکھ گئی۔ اس نے اٹھ کر بھاگ جانا چاہا مگر سورج کھلی کی کاریوں میں جہاں وہ چھپی ہوئی تھی گدوں کے پردوں کے ساتھ تیر رہے تھے۔ پتھر کے گرد اس کی ہاتھوں کا حلقہ اور تنگ ہو گیا۔
اپنی آواز کا جواب نہ پا کر زینو کے باپ نے اپنی بیٹی کی ہر نی کے بچے کو جسے چھوڑ کر گیا کیوں کو چلانے کے لئے کبھی بھی باز نہ دیا جاتا تھا، کھل دیا۔ آہو بھاگا اور اس کے کھنکھروؤں کی آواز پر زینو کا باپ سورج کھلی کے چھت میں پہنچ گیا۔
”زینو۔۔۔۔۔ زینو بیٹی! تیری ہاتھوں کو کیا ہو گیا ہے؟“ ڈور گئی گئی۔ اٹھ، وہ چلے گئے۔
گداب داوی کی درہری جانب پرواز کر رہے تھے۔ سیٹیاں بجاتے، خوشے لگاتے جیسے شکار کا جائزہ لے رہے ہوں۔
”مجھے ڈر لگتا ہے، آبا کہ یہ گدھے اٹھا کر سے جاتیں گے، زینو کی سہمی ہوئی آواز آئی۔

”ڈر مت میری بیٹی۔ کوئی ہوا انہیں ادھر لے آئی ہے۔ اس سے پہلے ہی ہوا مٹی کی ڈل کو لائی تھی اور ہم نے ٹڈیوں کو مایہ نجا، یا تھا۔ ٹڈیاں تیرے دادا کے کھیت میں آتیں تھیں مگر اس نے اپنے کھیتوں میں آگ لگا کر دوسرے کھیتوں کو بچا لیا تھا۔“
اس نے اپنا تھوڑا سا ہنسی بھری منہ لکھ کر دیکھا، غاروں، وادیوں اور پہاڑوں کی چوٹیوں سے ایک دوسرے کا شہر بچا چلا، لڑتے سے کسان اور گدھے ڈھول پیٹتے، شور مچاتے، اس جانب بڑھے جہاں ٹڈیوں نے لڑ رہے تھے۔
”دیکھا تو نے؟ زینو کے باپ نے کہا۔ اس داوی کے لوگ تیرے دادا کا احسان نہیں بھول سکتے۔ تیرے گھر کے دوہانے جیتے کھے رہتے ہیں، کبھی کالا نہیں ڈالا تو نے۔ لیکن ہمارا کبھی ایک تھلا بھی کم نہ ہو؟“
زینو نے سر ہلایا کہ نہیں۔ لیکن منہ سے کچھ نہ بولی۔ وہ اب تک سہمی ہوئی تھی۔
”تیرے بلوغ سے سب کا ایک دانہ یا انگور کا ایک خوشہ بھی کسی نے توڑا؟“
”نہیں،“ زینو کے ہرٹ آہستہ سے ہے۔

”تیری مزا، تیری مریخیاں اور بھینیں۔۔۔۔۔ وہ بھر دھر دھر گھومتی رہتی ہیں، کبھی کسی کا گناہ بھی ان پر بھینا؟“

بڑے تیرکوں کا ہماری بھیل کے آدھ ہی میں سانس ٹوٹ جاتا تھا لیکن تیرے دادا نے اسے کئی بار یاد کیا ہو گا۔ لگ لگا کہنے لگے کہ اس پر ضرور خواجہ خضر کا سایہ ہے ورنہ بھیل تو ایک سانس میں ننگے سے بھی پار نہیں ہو سکتی۔
”تو یہ بچہ نے مجھ کو چھوڑ دیا اور دادا آتا پرچھٹا“ زینو نے کہا۔

”ہاں تو تیرا دادا جانتا تھا کہ زنجی ریچھ سے بچنا عملی ہوئے اور جب آدمی زندگی اور موت کا فرق متا دے تو بعض اوقات موت ہی زندگی بن جاتی ہے۔ اس نے ریچھ کو بانہوں میں پیٹ کر بھی بچنا جو شروع کیا تو درندے کی آنکھیں آبل پڑیں، منہ کھل گیا، بازو دھیلے پڑ گئے، حتیٰ کہ وہ بے جان ہو کر گر پڑا۔ بعد میں وہ اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اتنا تھا کہ جنگ میں پہلا وار ہی آخری وار ہوتا ہے۔ اگر میں اس وقت سوچتا رہ جاتا تو میرا وہی حشر ہوتا جو ریچھ کا ہوا تھا۔“
دوست گروں کا ایک اور غولی بیٹیاں بھاتا ہوا آگرا۔

”اور یہ کس پرندے؟“ زینو کے باپ نے ٹھیاں میچھتے ہوئے کہا۔ ”میرا گویا زینو۔۔۔۔۔ میرا گویا!“
لیکن زینو جس کا خوف پھر عود کر آیا تھا، اپنے باپ کے گرد و پیش بچیاں کی سیل کی طرح پیٹ گئی۔ اس کا دل اس کبوتری کی طرح دھک دھک کر رہا تھا جس کے سر پر بازو منڈلا رہا ہو۔

”اور ہر سب کچھ ہی ہو جائیگی، ایلیلیط پرندے شاید یہ نہیں جانتے کہ میں اپنی جوانی میں جنگی مسوڑوں کے سر پہلی جھکا ہوں۔“

اور وہ پتھر اٹھا اٹھا کر دیوانہ وار ہوا میں پھینکنے لگا لیکن گدیہ ستو بیٹیاں بھانے لگتے چلے گئے اور بوڑھے کے پتھر اس کے گرد دیوں گرتے رہے جیسے سر دیوں میں ادا۔

”جانیے دادا، باتم ٹھک جاؤ گے، یہ موزی بہت اونچے اڑ رہے ہیں۔“ زینو نے اپنے باپ کا ہاتھ دھکے ہوئے کہا۔
”نہیں بیٹا، بڑھے نے جانتے ہوئے جواب دیا۔ شاید میں بوڑھا ہو گیا ہوں ورنہ۔۔۔۔۔ ورنہ۔۔۔۔۔ لیکن میں ان ان ٹیڈیوں سے ہار نہیں مان سکتا۔ آدمی تو جنات سے لڑ جاتا ہے۔“

اس کے منہ سے جنات کا لفظ نکل ہی تھا کہ ایک گولا بلند ہوا اور سارے علاقہ میں پھیل گیا۔ غبار کم ہوا تو زینو اور اس کا باپ دیکھتے ہیں کہ ان کے سامنے ایک دیو کھڑا ہے۔ دیو نے زینو کے باپ کو جھک کر سلام کیا اور اس کی جانب گھسٹنے کا ہاتھ پھینکتے ہوئے بولا:

”تھیں مبارک ہو بڑے میاں، تمھاری بیٹی کا نصیب جاگ اٹھا۔“
زینو کے باپ نے گیندے کے بار کو، جو کہن کی طرح سیدھا اس کی گردن میں آگے گر اٹھا، توڑ کر جن کے منہ پر ڈال دیا۔
”اے جاؤ اپنے بیٹے کی پھول، اور میری زعفران کی کیا دیوں سے اس حرف ہو کر بات کو دھتھلے سانس کے تھقی سے ان کی خوشبو جاتی رہے گی۔“

دیو کی اپنی آنکھ جو اس کے ماتھے کے درمیان تھی، سگنے لگی۔ اس کے بال ساہی کے کانٹوں کی طرح کھڑے ہو گئے اور
وانت مورتہ کے انداز میں نودار ہوئے۔ لیکن وہ اپنا غصہ پی گیا اور اپنے ہونٹوں پر صغریٰ مسکراہٹ لانے ہوئے بولا،
”تیری بیٹی کا قصیدہ جاگ اٹھا ہے بڑے میاں۔ ہمارے بادشاہ نے اسے اپنے حرم کے لئے منتخب فرمایا ہے۔“
”میں نہ کہتا تھا بیٹی کہ تو جو ہر وقت بچوں کے گتے گھرے پینے پھرتی ہے اور اندھیرے سو رہے چمنوں کے گڈھے
گھومتی ہے اچھا نہیں۔ بہتری ماں ہوتی تو بھاتی ناچنے اس کا مطلب کہ کنواری بچوں کو خوشبو سے کیوں نہ کیا جاوے۔“ زینو
کے باپ کے بیٹی کی طرف مزاحمت آمیز نظروں سے دیکھا اور بڑے بڑا غم تو نے یہ کیا کہ وہ تنویداً تار دیا جو تیری ماں نے
تیرے بازو سے باندھا تھا لیکن وہ نہیں بیٹی۔ میرے جیسے تھی۔۔۔۔۔“

وہ اپنی بات مکمل نہیں کر پاتا تھا کہ آسمان سے نوبت دنا فوس کی آواز آئی۔۔۔۔۔ شہرِ جنت کا پیامی منہ کے
بل گر پڑا اور ایک تخت زمین پہاڑا۔

”ہم میں اتنی تاب نہیں تھی بڑے میاں کہ ہم تمھارے جواب کا انتظار کرتے اس لئے ہم خود چلے آئے۔“
”تم آؤ تو کے باپ نے کہا۔“

”ماں! تمھاری بیٹی کے حسن کا شہرہ ہم نے اپنے دربار میں سنا تھا اور ایک درویش تم لوگ اپنا غلہ تقسیم کر رہے
تھے۔ ہمارا بھی ادھر سے گذر پڑا اور ہم نے دیکھا کہ غلام ندی کے پانیوں میں ایک سفید شعلہ تیر رہا ہے۔ تیری بیٹی کا جسم
کچی چاندی۔۔۔۔۔“

”چپ ہو جاوے غیرتِ حضرت! زینو کا باپ نصیحت سے کانپ اٹھا۔
”اپنی بیٹی کی تعریف بھی نہیں سن سکتے بڑے میاں۔ بہت پیار ہے تمھیں اس سے! تمھیں تو خوش ہونا چاہیے کہ
وہ شہرِ جنت کے پہلوں میں بیٹھ گئی اور دنیا کی کوئی نعمت اس کے لئے ناقابلِ رسا نہیں ہوگی۔“
”میں وہ تمھارے لئے ضرور ناقابلِ رسا ہے۔“ زینو کے باپ نے کہا۔ ”فرمادی ہو۔“
”تم نے اپنے اطباء سے نہیں سنا کہ تم میں بھی آگ موجود ہے۔ تم اگر ٹھنڈے ہو جاؤ تو مر جاؤ۔“
”کل تو تم بہ کوس گے کہ نور اور نور دو دونوں میں روشنی ہے اس لئے ہم فوری ہیں۔“
”تمھیں مطلق میں ضرور بطولی حاصل ہے بڑے میاں۔ لیکن شاید تم طاقت کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔
سودا گن کی ایک دلیل۔“

”مگر طاقت سے تم روح کو زین نہیں کر سکتے، اور جسم بغیر روح کے بالکل ویسا ہی ہے جیسے۔۔۔۔۔ جیسے۔۔۔۔۔“
اس نے رکتے ہوئے مناسب تشبیہ تلاش کرتے ہوئے کہا۔ ”جیسے یہ واوی بغیر ہمارے۔۔۔۔۔ سو تیری طاقت کی مجھے اتنی
بھی پورا نہیں جتنی اس بچہ کی۔۔۔۔۔ لیکن تیری بدنغیر، جسارت اور دھمکی کے باوجود میں تیری درخواست پر غور کرنے کو تیار
ہوں، مگر ایک شرط ہے۔“

”مجھے ہر شرط منظور ہے۔“ جن نے جواب دیا۔

”وہ سلیمانی کی قسم کھا آ“

”کھائی ————— مگر اب مزید انتظار نہ کرنا بہتیش شوق نے مجھے پہلے ہی دیرانہ کر رکھا ہے۔ کبیر ایسا نہ ہو کہ

میں نہیں بھگ کر دوں“

”لوٹو ————— میرے خاندان کی روایت ہے کہ ہمارے یہاں کوئی دکان بغیر اپنی رضامندی کے نہ بنی نہ گئی“

”خوب! تو کیا میں تیری بیٹی سے لہجہ سیکھا ہوں کہ کیا وہ نگاہ حیات بغیر منظور کرے گی؟ ————— اے بیٹے!

تیری ایک ماں پر دنیا کی نعمتیں تیرے قدموں میں ہیں گی، اور اس نے مرنیوں کی ست لڑی کا کار کا کر خیر کئے قدموں میں پھینک دی، گوہ ذات کی جھلکوں کا یہ نصف تیرے پاؤں کی دھول پر نہا ہے“

”کیا تیرے موتی میری جہلیں میں نہ لں گے؟ میں نے اس کے نظروں سے زیادہ حسین ہیں؟“ ————— نہ تو نہ مرنیوں کی مال کی طرح بے انسانیت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”او عجب لڑکی یہ! ان سپہیوں کی سوغات سے تجھیں قافس کی کنواری پریاں، بینڈ کی پہلی بونہ والی کی تلاش میں صدیوں

اپنی جھولیں میں لئے پھری ہیں“

”مجھے تیرا نہیں چاہیے“ ————— زبیر نے کہا، ”کیا تیرے اپنے تاج کے نیچے اپنا سینک نہیں رکھیا؟“

”عزیز کا ہاتھ لے سنا، اپنے سر کی طرف کیا، دواوی کے لوگوں نے جو کدوں کو مارنے کے لئے اپنے گھروں سے آئے تھے اور زین کے جو پرے کے گرد جمع ہو گئے تھے، ایک جھرپوہ فقہ لگایا، شہر حیات نے چرخ ماری اور اس کے عقلم

”ہا، ہا، ہا“ ————— پکارتے ہوئے اس کے سامنے سجدے میں گر پڑے۔

”کیا تجھے کچھ اور بھی پوچھنا ہے؟“ ————— زبیر کے باپ نے دریافت کیا، ”میں نے تجھ سے نہیں کہا تھا تیرا ہم سے ملا نہیں ہو سکتا“

”جپ ہو جاؤ جے! عزیزت گر جا“ ————— تجھے اور تیری سنان بیٹی، دونوں کو اس بد تمیزی اور ناشکری کی سزا دی جائے گی“

”تو قسم کھا چکا ہے ————— سلیمان کے عذاب ڈر!“

”اے شطرنجی سے فرمت نہیں کہ ان باتوں کی طرف دھیان دے سکے۔ اس کا مجھے کوئی کھٹکا نہیں“

”تو اپنے خمیر سے بھی نہیں ڈرتا؟“

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ تو اس قدر توہم پرست واقع ہوا ہے“

”اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تو اس قدر دکھ اور درد شکن ہے تو میں ان فصول باتوں میں کبھی اپنا وقت نہ کرتا“

”تو ہادی زبان لکڑی سے کھینچ لی جائے گی“

”تجھ پر انگشت سلیمانی کا نہ ٹوٹے گا“

”اس کا حکم اپنی طاقت کھینچا ہے“

تجیل کے کنارے بید مجنون کی شاخوں کی طرح کاپٹنے لگا۔

”لیکن تو مڑھا ہو گیا ہے شاید، اور اپنی بڑائی بھلائی کو نہیں سمجھ سکتا۔ ہم تنہری بیٹی سے بات کر رہے گے۔ کوئی ہے؟“
شہ جہات نے تالی بخالی کی وہ تاج کہاں ہے؟ ہماری ٹکڑے کا تاج ہے، جسے ہمارے دربار کی کنواری پریوں نے ہماری دھن کے لئے تیار کیا ہے۔ بکیرہ لڑکی! اور مہر دیکھو! اسی میرے کو بکیرہ، ٹکڑے مسبا کے تاج میں بھی ایسا ٹکینہ نہیں ملے گا۔ مجھے
———— اور سونہرے بکیرہ کی ہے تو اس قدر ہی انسان کی نیلا برٹ اس کے آگے مانتا ہے اور یہ نہ تو دوسرے ارض کا سبزہ آب سے۔ چنانچہ دھنسا گیا تھا ہے۔ یہ علی پریوں کا ٹکینہ ہے یہ تاج کے لئے۔ اور تو نے لکھا کہ میں لعل بدخشاں کا نام
مشابہ تھا! ان لعلوں کی ایک سہاگہ دیکھنے کے لئے بدخشاں کے سوواگر بنا ایمان نیلام کو لئے ہیں۔ اس میں اس لگ کی سرخی بند ہے
جتنیں ہمارے بچاؤ میں بھیجے گئے تھے وہیں۔ غواہ سب پرست کو اگر ان لعلوں کی ایک کا حال معلوم ہو جائے تو اپنے کتے کا بچہ انا کر
اپنے گال میں ڈالے۔ لیکن تیری ایک باں پر یہ تاج تیرا ہے۔“

”تمہارا تاج میری ادنیٰ کے خور و نوش کے تاج سے بہتر ہے؟ اور میرے زیورات جن کا تو مجھے لالچ لے رہا ہے ان
بجروں سے اچھے ہیں جو بائسن کی شاخیں میرے لئے پروردگار کو مدحی ہیں؟ ہونے چاہیے۔“

”سن لیا تو نے؟ تو مجھ کے بانیے لگا! اور اب کہ وہ آخری بار نہ کہہ چکی ہے اگر تیری آگ میں غیرت کی کوئی بھی حوی
چنگاری جی مجھ سے تو تیرا دستہ وہ ہے جس سے تو آیا ہے۔ رہے ہم اور ہمارے جسے ہوئے جھوٹے بکینوں،
لعلیوں میں ہمارے لئے، اور ہمارے ہاتھوں میں مجھے ہوئے چھوٹ اور ٹکلیاں۔ سو ہم بھیجیں گے کہ یہ ہماری شامت اعمال
تھی۔ جا۔ اور ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دے۔“

”جذباتی بڑھا! غیرت نے زبردستی کھائے ہوئے کہا۔“

”ملعون ناری!“ زہر کا گلاب ٹھیک لکھا۔ ”تو ہمارے جذبات کو کیا سمجھ سکتا ہے۔ ہمارے جوانوں، ہمارے
قیم، ہماری بے پروگیاریاں۔۔۔ اور سب بڑھ کر ہماری موت جو تیری شیطانی فرج کے ہاتھوں پر یاد ہوئی۔“ مجھے ان
جذبات کا کیا احساس ہو سکتا ہے۔ جس کا غیرت اجماد اور ہر پہاں سے، ورنہ ایک ایک لاش بھڑک اٹھے گی اور میرے
تھکناؤں کو جس اس حدت سے پناہ نہ ملے گی ہمہ روں کا پانی، ساون کی گھٹائیں، پہاڑوں کی ریت اور کردہ زمہریکی ہوائیں جی
اس لگ کو جھنڈا اٹھ کر کہیں گی۔ جا۔ جہنم کی مخلوق دُور ہو جا رہا ہے؟

”کپڑا ٹھونس دو اس بدگلام بڈے کے منہ میں اور اس کی مغزو مٹی کو اندھے غار میں ڈال دو! ایک ٹھنڈا پانی ایک
دوسرے کے قریب ہیں تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہم دھرم و کرم کے جذبات سے ماری تھے۔“

اور بھولے جیسے میناؤں کا بیان ہے کہ زہری کی دوا میں اب زعفران کے کھیتوں سے لاشوں کا قرض چھوڑتا ہے،
تھکناؤں کی دیکھیں نہ کھنگی ہیں، ہشت بچاؤ کو امر بل کھا گئی ہے، تھوڑے کانٹوں نے رنگ کی، نکلیں چھوڑ دی ہیں، چشموں کا پانی
پھاڑوں کے پیٹھ میں جذب ہو گیا ہے، جھیلوں میں نہری ٹھیلوں کے بجائے جو کھیں رنگیں ہیں، کنول کے پھول نیچے دلوں کی طرح

سباہ پوش ہیں، سید کی شاخوں سے پتھر لگتے ہیں، جگنو اپنی چمک بھل چکے ہیں، کوہ میں کے مریخ زریں پر کوسے کا لکان گزرتا ہے اور کوہ گراں خواب کی برفوں کے نیچے تیر کی رہیں کو لہہ بن گئی ہیں، شہد کی کھیاں زنبوروں کی طرح ڈسنی ہیں اور ان کے چہنروں میں تیر کا دبیر ہے، لالہ کے تھنوں سے جھڑپیں ہیں۔۔۔۔۔ اور ان فضاؤں میں یہاں کبھی تلیوں کے پر جھلگاتے تھے اب چمکاؤں مردہ جوہروں کی بوچھیا لگتے ہیں۔۔۔۔۔ کھاروں کے چنگ گنگ ہیں اور یہ چمکی سے کئی کئی سترے آستے کی بجائے شعلے لگتے ہیں

اور

اندھے غبار کی کھاروں سے کھنکھناتی ہے جانو! مجھے بھاؤ! کانہ! آتی ہے اور فنا کے باپ! ایک۔۔۔۔۔ پڑھا جس کے اندر میں پڑا تھا، یازن میں زنجیر میں ہیں اور ماہر سلاطین کے بے دل ہیں، اپنا سر پتھروں سے بیٹھا ہے، دیکھیں اس سے آہو کا ایک خط وہیں نکلے۔۔۔۔۔ خیالی ہے کہ بے بسی کے احساں سے اس کا ساما رہا میں شگ کھڑ ہے۔

ہندو ناکھ

میں ہاشا ابھی تک اکیلے تھی۔ اس نے گھر کے ہر فرد کے لیے سب کچھ کیا تھا اپنے جسم کی باریک دیکھ بھال تھی۔ اپنی آنٹناں اور قناٹاں کا لہجہ کیا تھا۔ اپنے جسم اور جراثیم کو بچاتا تھا۔ لیکن یہ قیوم ایک ارکے سب لوگ اس سے الگ ہوتے گئے۔ ہر شخص اپنے غموں کے گرد گھوم رہا تھا اور آہستہ آہستہ زندگی کی وجہ پر بالکل اکیلے اکیلے تھی۔

وہ لبر سے اٹھی، آئینے میں اپنی صورت دیکھی، صبح کے وقت اُسے اپنی صورت کبھی ابھی نہ ملے گی، نہایت دلہا سا چہرہ، اُنھلنے کے نیچے سیاہ گڑھے چہرے کی رنگت نہ رہا ہالوں کی زمی اور ان کی کچل آہستہ آہستہ معدوم ہو گئی جا ہی تھی۔ اس کے کپڑے جو آج سے چھ برس پہلے اُسے پہن کر آجاتے تھے، آج بہت ہی کھلے کھلے تھے۔ ہر چہ بیسن کے بعد وہ اپنے کپڑوں کو دوبارہ میسٹی، کبھی لائق، کبھی بڑھاتی کبھی کر کے قریب اپنی نصیب کے گھر سے کو کم کرتی۔ کبھی باؤ کو دوبارہ میسٹی اور سینے کے پچھلے ڈکڑے دوبارہ پانچ۔ یہ تبدیلیاں جو اس کے حوصلہ میں

ہو رہی تھیں اس کے متعلق آشا کو احساس تھا۔ اور وہ اپنے آپ کو دیکھ کر جھنجھلا اٹھتی۔

اُس کا بھی ایک زمانہ تھا۔ جب وہ سنی بار ایک دہائی کی طرح اس شہر میں آئی تھی۔ ناجاتی کوئی، لہرائی بل کھاتی ہوئی اس شہر میں وارد ہوئی تھی۔ ہر شخص نے اس کے قناسب ہم۔ اس کی تنہم آنکھوں۔ اس کی تیلی کمر اس کے کولہوں اداس کے بلے بلے تو کی تعریف کی تھی جس شخص نے اُسے دیکھا ایک لمحے کے لیے وہ جھوٹ سا جو کر رہ گیا۔ ایک سکا مرٹ سیلے ہوئے جھنجھلی پر دل، چیک بک جیب میں ڈالے ہوئے تعقل میں امیدوں اور فتنوں کا چراغ روشن کیے ہوئے اپنی جان لٹا بنانے کے لیے بے قرار نعر آتا۔ اس کی ان س باتوں میں گرمی پیدا کرنے کے لیے اُس کی روت ہیں۔ بلے نوا رہی کے لمحات کا اصرار کرنے کے لیے ہر رٹنے والا بڑی گرم جوشی سے قتا۔

یہیں آشا کی زوج اُن لوگوں سے پر سرب نہ ہوئی۔ ہر آنے والے مرد میں کوئی نہ کوئی کمی رہ جاتی۔ اگر وہ پتے تھے تو صورت نکل کر لپٹ۔ منظر تھی۔ اگر صورت بھی تھی تو بہت سیس ندارد۔ اور آنے والا قبول صورت اور نیک سنس کی کائنات کو دیکھا تو دیکھا پارسے پاؤں تک لے کر نازق دیکھا۔ اور اگر اُسے تیز چیزیں دیکھتیں تو سیرت نہایت ہی پر آگاہ باتیں کر دیتے آجہائے اذوق جمال وار دوجا بیانی جس منفرات کرنے کے بہرہ صوم ہوتا۔ شاید یہ چیزیں مری کا گلاب آلی تھا۔

آنا نے ان تمام مردوں کو دیکھا۔ اپنی نفسی غربت اور گھر میں ان جلتے ہوئے انسانوں کو دیکھا جو اس کی زوج کی دلیر پسند ہے نئے سدہ بنے تھے۔ گویا سب لوگ اس سے عریض ہوئے تھے۔ بہت کچھ کر سکتے تھے لیکن نہ جانے کیوں نہ کہتے تھے کیوں سرست بھری نگاہوں سے اُس کی طرف در وقت کے کھانے کے لیے نہ تھے۔ یاں بھری نگاہیں لیے ہوئے۔ دوسے ہوئے سمجھ ہوئے کمرے میں بڑے رہتے۔ جیسے آشا کی ان کی زندگی کا مرکز تھی۔ جیسے اس کا پانچ سلاخان تھی۔ کہ تم کچھ کر دو۔ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ ہم سب بیاد ہیں۔ بیماری طاقت گیلیائی چھن گئی ہے۔ ہمیں اپنے آپ پر یقین نہیں رہا۔ ہم کچھ نہیں ہیں۔ کچھ نہیں ہیں۔

اپنی سستی ہوئی صورتوں کو دیکھ کر آشا کے دل میں ایک تاظم پیدا ہو جاتا۔ یہ نگاہیں جو ہر ماہ مرثت، میر کلینڈ اُسے اپنی زندگی بچنے کے لیے مجبور کرتی رہیں۔

اور شاید آشا نے سوچ دیا تھا کہ جھگڑا نے اُسے تمام لوگوں کو ہانے کے لیے پیدا کیا تھا۔ شاید ان تمام کو پیدا کر کے اُس نے اپنا کام ختم کر دیا تھا۔ اب آشا کی باری تھی کہ اُس سب کی کشتی کو منزل مقصود پر لے جائے۔ ایک ناکہ کی طرح —

اور آشا نے اس دن ساراں میں بھی دیکھا۔ انیس کی حرکت دیکھ کر۔ انیس کی حضی۔ اور عزت کا اعلان کر کے۔ انیس کی بھوک سے متاثر ہو کر انیس کے مستقبل کو ہانے کے لیے اس نے اپنی جوانی کا نیم کم کر دیا۔ لیکن یہ نیلام بڑا سوچ بھرا کر دیا۔ ایک رنگ کر دیکھ کر بھل جھل جھل کر لیا۔ یہ لمحات جو جزیں میں آتے رہے ان لمحات نے اس کی زوج کو بھی پرانہ دنیا۔ کیونکہ اس کی اپنی زوج اس نیلام میں شامی نہ تھی اس کی اپنی غول پر نہ تھی۔ اُسے خود وہ چیزیں سے محبت نہ تھی۔ جسے یوں زندہ رہنا مقصود تھا۔ یہ سب کچھ اُس نے اپنے کنبے کے لیے کیا۔ ان دنوں میں چار پانچ مقرر بھی کیے۔ ایک دوسرے کچھ کر ایک دوسرے کے تحت، کچھ بھائیوں کو دیکھ کر۔ کچھ ان کی طرف نگاہ ڈال کر آشا ہست پر کارواں اپنے ٹھکانے گئے لگا۔ اور پھر وہ اپنی زندگی شروع کر لی۔ لیکن یہ کارواں تو جھٹکا جاتا تھا۔ چھوٹے بھائی کے ناں ایک دلی بگٹی تھی۔ بڑے بھائی کے ناں پانچ بچے تھے۔ دوسرے آشا کے پاس پی رہے تھے اور تین بچوں کے لوجہ کو خریدا تھا۔ بھائی سنبھال رہا تھا سب سے زیادہ دلچزنا سے اس بات کا تھا کہ کوئی شخص اُس کی خدمت نہ کرے۔ اُس کی مال بھی تو یہی کہتی تو زندگی ہے، رندی!

اُسے یہ لفظ کہتے ہوئے ان لوگوں کو شرم نہیں آتی، جس کا کھانیں اُسی کو لالیاں دیں۔ اُسے ماں میں تیری جاتی ہوں، تیرے ہی خون کی بُدھ ہوں۔ تیری لگیں اور لیں میری دل و جگر ہیں۔ میں تم سے الگ تو نہیں، اُسے بھائی۔ اُسے میری بھابی ہو۔ شرم نہیں آتی تم مجھے دیکھ کر ہنس کر یوں برو۔ اپنے من ہی من میں خوش کیوں ہوتی ہو۔ کب تم نے میرا خون نہیں پایا۔ یہ گھر میں کھسک کر تعلیم، آئینہ میں جب کبھی آئند آتا ہے۔ اود میں چاہے آپ کو سزا دے مٹتی ہوں، اپنے بلی دھوتی ہوں۔ انہیں سکھاتی ہوں، اپنے بول پر پ شک لگاتی ہوں۔ اود اس کے اعتقاد میں ایک خوبصورت نبی سا مٹی ہنستی ہوں۔ یہی سادھی تو انہیں پسند ہے نا۔ تو تم جل جہنم کو خاک ہو جاتی ہو جملے والوں سے جا کر کہتی ہو ”اُسے جی وہ آج آئے واسے ہیں“ ماں تم بھی خوش نہیں ہوتی جس دن سے وہ آتا ہے یا جسے آنا ہوتا ہے تم کیوں مجھ سے لڑا جھگڑنا شروع کرتی ہو۔ تمہیں تو معلوم ہے۔ تم میں سے ہر شخص کو معلوم ہے کہ میں کی کرتی ہوں۔ تم سے کچھ چھپا ہوا نہیں۔ تم میری کمائی پر زندہ ہو۔ مجھے تو آئند سے محبت ہے۔ میں آج کل دن رات اس کا اعتقاد کرتی ہوں۔ دن رات اس کی مالا پہنتی ہوں اُس کا نام سے کہ زندہ ہوں۔ جب اُس کی یاد آتی ہے تو میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔

ماں دیکھو تو۔ مجھے کیا ہو گیا۔ میں تو سہی سی نہیں۔ چہرے پر وہ ٹنگٹکی نہیں رہی۔ وہ دھوتی نہیں ہے۔ آواز میں وہ نغمگی نہیں۔ ملکہ نہ دینی ہوتی جا رہی ہوں۔ ان دس سالوں میں میں نے کیا کچھ نہیں دیکھا۔ پھر بھی تمہیں رحم نہیں آتا۔ شاید میں دم و توہم کے تبادلے ہی نہیں۔ میں تو دھڑکی ہوں ماں۔ جو دھڑکی کی کمائی کھاتے ہیں انہیں کس نام سے پکارا جائے۔ جو دو آتشہ ماں کو رت کا لٹی دو۔ ان بھائیوں کو رت کو سو۔ نا بھد ہیں نا۔

آج آسمان بڑا خوب صورت تھا دھوپ میں ایک نشہ سا تھا۔ سانس کے مکان پر کھڑوں کا ایک جو ملا۔ ایک دھڑکے سے پیدا کر دیا تھا۔ ناویل کے درخت اس خشک ہوا میں جرم سے تھے۔ دُور ایک جہاز سفر کے لیے اپنے پر توڑ رہی تھی۔ آج آئند کا خط آنا چاہیے۔ کیا وہ آج ضرور آئے گا۔ وہ آج اس کے گاؤں اپنے دل کی ساری کہ و رت کو اُس کے سانس سے رکھ دے گی۔ وہ ہر چیز کو میری ہر شکایت کو۔ میری ہر رنج کو بڑے عزم سے سنا ہے اور حالات کو بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ کم نکت بہت درد دیتا ہے۔ میں جیسے کسے بعد صرف ایک دن یا ایک رات کے لیے بھی آتا ہے اور چڑھتا ہے۔ اپنا تار لوہاں کون نہیں کر لیتا۔ اتنی دُور سے کسے کیا فائدہ۔ خط بھی نہیں لکھتا۔ جب آتا ہے تو میں ایک تار بھیج دے گی۔ اود میں اُس کے اعتقاد میں تو جی دہتی ہوں۔ اُس پر دیکھ کہ جس دن وہ یہاں آئے گا ہوتا ہے گھر میں جگہ مر ضرور ہو گا۔

اُسی دن تو میں خوش ہوتی ہوں۔ وہ دن تو میرا ہوتا ہے۔ ہاتی سب اُن کے ہوتے ہیں۔ باقی سب شامیں۔ راتیں اُن کی ہوتی ہیں۔ اُن سے کوئی کیا کہے گا اُسے گھر والا۔ کیا تم مجھے ایک سہانی صبح نہ دے گے۔ کیا میری زندگی کی ایک گرم رات نہ دے گی۔ نگاہوں میں مسکنتی ہے۔ اتنے ہی خود واد ہو تو گھر سے نکل جاؤ۔ آئند بھی کہتا ہے کہ اب اُن کو گھر میں کیوں رکھا ہے تم نے۔ تم نے ان سب کو ڈوکی کے قابل بنا دیا۔ شامیان تک کہ اودیں۔ لیکن پھر بھی یہ سدا بوجھ ہوتا ہے کہ ان کو پر۔ آخر کب تک۔

لیکن آئند کو کیا بتاؤں کہ یہ جیٹیں ہیں آئند۔ جیٹیں۔ جو ٹکوں کو خون پہنے کی عادت ہوتی ہے نا۔ وہ ساری عمر کی نہ کی نہ کونز جیتی ہیں۔ اود مجھے خون دینے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ جب تک کوئی مجھے لال نہیں دیتا مجھے سکون نہیں ملتا۔ جب تک ماں مجھے

مندی نہیں کہہ سکتی مجھے زند نہیں آتی۔ جب تک بھائی یہ نہیں کہہ بیٹے کرتا کہ کچھ کر سکتی تھیں اور ہمارے لیے کچھ نہ کر سکیں مجھے راحت نصیب نہیں ہوتی۔ میری قربانیوں کا یہی صلہ ہے نا؟ اور کیا کر سکتی۔ آئندہ۔ اب تو آج آؤ۔ آئندہ۔ یہ جیسے بڑی پیاری ہے آسمان سے مدد ملتا ہے۔ دھوپ میں منس کے ہر دم کی نرمی اور نرمی ہے مجھے اتنا نہ بڑاؤ۔

دن کے بارہ بج گئے۔ اور ٹاکہ آیا۔ اور ساتھ میں ایک تار۔ آشنائے کا پتہ ہوئے احمدی سے تار دکھلا۔ لکھا تھا: ختم کو آرہا ہوں۔ تمہارا آئندہ

آشنا خوشی اور حیرت سے مجھ کو گئی اور تار کو چوم لیا۔ اور پھر ادھر ادھر دیکھا۔ سامنے کی چار دیواری پر اُس کی ماں لیٹی ہوئی تھی رسولی میں اُس کی بھائی کھانا پکا رہی تھی۔ صوفے پر بھائیوں کے بچے بیٹے ہوئے تھے۔ اور نیچے فرش پر اس کا بھائی خراشے لے رہا تھا۔ سامان اور آدھر کھڑا پڑا تھا۔ ہر طرف افرا تفری تھی۔ اُسے وہ آہیں گئے تو کیا کہیں گے گھر کو سجا کر بھی نہیں دکھایا کر بیٹوں کے گھر ایسے ہوتے ہیں۔ سب کچھ ہوتے ہوئے ہر طرف انتشار تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سب لوگ کچھ کی تباہی کر رہے ہیں۔ آشنائے ہر چیز کو سینٹھ سے رکھنا شروع کیا۔ صوفہ اپنی جگہ پر رکھا۔ حماد سے اُسے صاف کیا۔ ادھر ہر چیز کو ترچنے سے رکھا۔ تصویروں کو کپڑے سے صاف کیا۔ اپنی جوانی کی تصویر کو اسے آٹا تو لٹنی خراب مورت تھی۔ اب تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تصویر صاف کرتے ہوئے ایک تصویر سینچ کر پڑی۔ اور پنگ پر رسولی ہوئی ماں جاگ اُٹھی۔ بلیا شور مچا رہا ہے۔ آٹا تم نے۔ سونے بھی نہیں دیتی۔ یہ سونے کا وقت ہے ماں۔ بارہ بج چکے ہیں بارہ! وہ چلائی۔

”پڑھیا ہوں، زند زیادہ آتی ہے نا۔ جب تو پڑھیا ہو جاؤ گی تو اتھ پائوں نہ ملا سکی۔ دن بھر سوئی ہو گی۔“
فرش پر بھائی نے اُٹرائی لی۔ اور وہ چلتا: ”رات پانی رکے آیا ہوں۔ لیکن اس گھر میں سونے کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ اور“
”اُس نے پھر کوٹ لے کر آنکھیں بند کر لیں۔“

کیا وہ اپنی ماں کو بتا دے کہ آندہ صبح شام کو کہاں آئے والا ہے۔ اگر اس نے بتایا۔ تو وہ دانا شروع کر دیتی۔ پہلے تو گھر کو صاف کرے۔ چیزوں کو سمجھائے۔ فرش کو دھوئے۔ موری کو تیزب سے صاف کرے۔ تاکہ لنگی کا احساس نہ رہے۔ کپڑوں کو ابھی خارج نمائے دے۔ جائے صاف کرے۔ باتن سجا کر دکھ دے۔ یہ سب کچھ کرے۔ اکیلے۔ اُن اکیلے۔ اس کام کی تمنا کوئی ساتھ نہ دے گا۔

اُس نے اپنی چھوٹی بھائی کو ایک کونے میں بلا دیا۔ دیکھو بانا جا کر ایک مرنے والے آؤ۔ دوسرے زبرد و دُور کے جادل اسے ہاں پالیٹ کی مچلی۔ وہ تجھ بڑی خوشی سے کھاتے ہیں۔ کچھ پلاؤ۔ بنا لے۔ ایک آدھ مٹھی چیر۔ میری پیاری بھائی۔ اُس نے بھائی کے کاسے گاڑ کر قہقہے چاتے ہوئے کہا: ”میرا چلو تو دکھو۔ اسی بچوں کو تو نکلا دے۔ اچھے سے کپڑے پہنا اور تنگ سے کہہ کر وہ آٹھ کر مرنے لگاؤ دھوئے۔ شام کو وہ وہ شربا لگئی۔ بجائی گئی اور دھوئے ہوئے پتو کو سر پر دکھایا: ”بڑی سہاگ بنی چھاتی ہے۔ بھائی۔“
سب کچھ سمجھ گئی اور رسولی کی طرف گئی اور پڑ پڑاٹے لگی۔ بے شرم کہیں کی۔ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ آج وہ آ رہے ہیں۔ مندی کہیں کی شادی نہیں کر لیتی۔ کتنے رکھنا چکی ہے۔ ابھی تک جی نہیں بھرا۔ محلے بھر میں ناک لٹا رہا ہے ہمارا۔ لوگ انھیں بھاڑ بھاڑ کر دیکھتے

ہیں۔ کل ہی گلی کا مسٹنڈا میری طرف گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ جیسے میں بھی مائے رام، بچوں پر کیا اثر پڑے گا اور یہ کہتے ہوئے دال میں نمک ڈالتی گئی۔

اسی دال میں نمک ڈاٹے جاتی ہے۔ ڈالنا تھک کر روک کر سہی ماں نے چارپائی پر چلا تے ہوئے کہا: تو رہ جاتی تو اچھا تھا۔ زندگی گشتی نہیں کی مری جاتی ہے۔ وہ مارا۔ اور تم لوگ کھا کھا کر بیل ہوتے جا رہے ہو۔ اتنی ملکین دال کون کھائے گا؟ وہ چلا کر بولی بجائی نے کچھ جواب نہیں دیا۔ اس نے زور سے دھکل پٹیلے پر رکھا اور ہاؤس سے تھالی کو مٹایا۔ اور قریب کھڑے ہوئے ایک بچے کو ایک تھوڑا رسید کیا اور کہنے لگی: کس کس کا کھانا پکاؤں۔ یہاں آئے دن جہان اتے رہتے ہیں۔ وہ پکا کھانا ابھی تک تیار نہیں ہوا کہ شام کے کھانے کی فراکش ابھی سے ہونے لگی:

”شام کو کون تیرا خیم آ رہا ہے۔ کیا کہیں کی حرام خورہ؟“
 ”شام سے پوچھو نا۔ مجھے کیا معلوم۔ بھلی، گوشت، کباب۔ میٹھا سب کچھ پھانا پڑے گا؟“
 ”کون آ رہا ہے۔ مذہبی چھوڑو۔ وہ بستر سے اٹھ کر بولی۔“
 ”اشادو مٹی ہوئی ماں کے قریب آئی۔ کوئی نہیں۔ وہ آ رہے ہیں کیوں چلا رہی ہوں؟“
 ”اسی تیرا مردہ نکلے تو کہیں کی رہے وہ کون؟“
 ”ماں تو جانتی نہیں۔ وہ۔ ماں۔ وہ۔“
 ”تیری جوانی تو آگ لگے۔ تیری ماں مر جائے؟“
 ”نام کیوں نہیں مٹی۔ کون ہے تیرا خیم؟“
 ”ماں۔ وہ۔ آئندہ؟“

”اچھا آئندہ رہا ہے؟“ ماں نے ایک گواہی اس کے کو کہا: ”مٹنڈا، اساتڈ۔ منڈا اٹھا کے چلا آوے۔ جیسے یہ اس کے باپ کا گھر ہے۔ زون دیکھو ذرات۔ بس مٹے کھانے چلا آوے؟“
 ”ماں۔ وہ تو تین بیٹے کے بعد آ رہا ہے۔ ہر روز کہاں آتا ہے۔“
 ”آٹا سے شربتاتے ہوئے کہا۔“

تو گھر میں رکھ لے یا کر۔ ہیں یہاں کیوں دکھا ہے۔ اپنے بھائیوں کو گھر سے نکال دے۔ ان بچوں کو کسی دھرم شالا میں بھیج دے۔ اس گھر کو آگ لگا دے اور کہ لے اپنے یا کر۔ میں نہیں کیا کہتی ہوں۔ میری بات کوئی مانتا ہے۔ اسی وہ دیتا کیا ہے؟ جو تو اس بدمرقی ہے جان چھڑکتی ہے۔ لکھتی یاد کیا۔ کہیں شادی کر کے اور میری جان چھوڑو۔ میں تو چند دنوں کی گھمان ہوں۔ اس ماں دار بیٹے سے تہہ کا شادی کرنے والی تھی۔ میں ایک مکان لے کر رہے رہا تھا اور دس بڑا روپیہ دیتا تھا۔ لیکن تو کب مانتے والی۔ گھر بھی اچھا خاصا تھا۔ اور بزم چھین سے رہتے تیرے بھائیوں کی قسمت کھل جاتی تیرے چھوٹے بھائی کی دوکان چھوٹ جاتی۔ کوئی اچھا سا دھنڈا کر لیتا۔ دن رات پان پکاتا رہتا ہے۔ ابھی تک ماسویا بڑا ہے۔ اتنی اچھی صورت، بالائی مٹی تم نے۔ تم سے اوپر والی مذہبی ہی اچھی۔ جس نے برقعہ اڈوہ کو بھٹان کے ساتھ سادی تو کر لی۔ مٹی میں روئی اپنی جاتی تم نے۔ تم سے تھادی بڑی ہیں ابھی۔ جس نے دھنڈا تو بند کر دیا اور بڑھا پے میں ایک

زجران کے ساتھ شادی کر کے گھر بسایا تھا۔ لیکن تو ساری عمر کنوادی رہے گی۔ ساری عمر بغیر خیم کے رہے گی۔ کیسے کٹے گی ہاڈی جوانی جب میں مر جاؤں گی۔ تب تو میری باتیں یاد کرے گی۔ اب نہیں۔ اری یہ بھابیاں تھہا اساتہ نہیں دیں گے۔ یہ نہیں کھا جائیں گی تھارے بھائی ایک پیر نہیں دیں گے تھیں۔ میری بات یاد رکھ۔ اسے سڑکی ہاں۔ جا باڈا سے پھلی اور مرغ خرید لا۔ دال تو میں کھادتی ہوں میں۔ اب گھر میں مہمان آئے گا کچھ تو کھانا پڑے گا۔ اُسے مے سنڈھے۔ تھدے، خندے کو۔ ماں بستر سے لایا ہاں دیتی ہوئی گئی اور بھائی کو پاچا لٹ دیا۔ تے آبا ڈا سے جا کر زہرے آ۔ یہ دونوں کھائیں گے۔ جب جا کر ان کا جی پہلے گا۔ گھر میں پھرتی کوڑی نہیں دھوئی سلول کی فیس نہیں دی۔ چار جینے کا لڑا ایک تو دیا نہیں لیکن آج مرغ مزدور آئے گا۔ اوی کھڑی کھڑی کیا کم دی ہے۔ باہر جا کر مرنے کیوں نہیں۔ دندی چھوڑ گشتی کہیں کی۔ جاتی کیوں نہیں مرام خور۔

یوں انکو مڑتا تھا۔ یہ تو آشا کے بیسے دندرو کی بات تھی۔ یہ لایاں۔ یہ خضر، چرے پر کور و فرب کی لیکریں۔ ان سب سے آشنا تھی۔ آشا ان گایوں کو سننے کی عادی ہو چکی تھی اور ہاں کو ان گایوں کو سنانے کی عادت تھی۔ گھر کے ماحول میں یہ فحشی یہ تندی یہ گھبراہٹ۔ یہ دشت، یہ زمانہ سمازی یہ ہماں بازی یہ سب کچھ اس گھر میں ازل سے ہوتا تھا۔ گھر کے تمام فرد اس جگہ میں بھٹے مئے سترے پر آشا بھٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن بھٹا آسان نہ تھا۔ اسی لیے آشا نے ان گایوں کو زندگی کا ایک حصہ سمجھ لیا تھا۔ بیسے زندگی اُس کی زندگی سے وابستہ ہو گئی تھی۔ اس پر الگ ڈی کا دوا اُس کے پاس نہ تھا۔ اس سے بچ کر وہ زندگی کے کچھ لمحات اپنی خوشی کے لیے رکھنا چاہتی تھی۔ آشا چاہتی تھی۔ جیسے اس نے اپنی زندگی کو ان کی خوشی کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اسی طرح گھر کے باقی افراد

بغیر کسی نتیجہ کے اُس کی خوشی میں شریک ہوں گے۔ اور اُسے خوشی کے لازوال لمحات عطا کرنے میں مزاج دلی سے کام لیں گے۔ لیکن یہاں فراخ دلی کہاں۔ یہاں تو کھٹن اور رٹنڈ تھی۔ یہاں تو خود غرضی تھی۔ صرت اپنے آپ کو خوش رکھنے کی کتنا تھی۔ جبھی تو آشا پر ان گایوں کا خاص اثر نہیں پڑا۔ وہ اپنے کام میں منہمک رہی۔ چھوٹے بھائی کو کھونے پر ٹا کر فرخ کو دھویا۔ مدی کھائی۔ کمرے کی ہر چیز کو قریب سے دیکھا۔ خود نہائی۔ ہالوں کو دھوپ میں رکھا یا ————— نئے کپڑے پہنے۔ آنکھوں میں کاسل۔ لبوں پر لپ اسٹک اور ہالوں میں تیل اور سینٹ، آنکھوں میں چڑیاں۔ لالہ میں سونے کی لایاں۔ اور گلے میں رد لڈ گولڈ کا رینگن لیا۔ اور پھر آئندے کے اغلا میں جیتھ گئی۔ گھر کا ہر فرد کن آنکھوں سے آشا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بھابیاں گھسے گھسے کہ اری تھیں وہ تو بیا ہی ہوئی تھیں۔ ان کا ایک خانہ تھا۔ ہاں صرت ایک ماسٹے پر ایک جیگا۔ ایک میں صرت ایک ہی اٹھ کا سینڈرو۔ لگا ہوں ہیں ایک ہی چمک تھی۔ ایک ہی کی صورت تھی۔ ایک ہی مردے آشا کی تھی۔ ایک ہی کا انتظار تھا۔

آشا کے مسئلے میں کتنے آتے اور چلے گئے۔ کتنی بار ایک بھری گئی اند پھر مڑی۔ کتنی بار وہ ہنسی اند پھر روئی۔ کتنی بار یہ گھر نا ادم جڑا۔ ہائے، کتنے آدمی آئے اور چلے گئے اور آشا نے قصیں کھائیں کہ اب وہ کسی اور سے محبت نہ کرے گی۔ لیکن چھ بیٹھے یا سال کے بعد پھر وہی چکر ہر شخص نے اس گھر کی جڑی ہوئی زندگی کو دیکھا تھا۔ لیکن ہر بار لگایوں کی روجھاؤ آشا کو سننا پڑیں۔ یہ جانتے ہوئے ہی گھر کے افراد خود کچھ کرنے کے قابل نہ تھے۔ اگر کتاب ہوتے تو کب کے یہاں سے پہلے جاتے لیکن کہاں جاتے کون بٹھان نہیں بٹھانے والی صرت آشا تھی اور لگایاں کھانے والی بھی آشا!

بھابھوں کے دل میں حسد کی آگ بھڑکتی۔ سالی خود پیش کرتی ہے اودھم صرف ایک مرد پر قناعت کرتی۔ یہ مرد کتنے عرصے گزرے اور نامرد تھے۔ خود کچھ نہ لکاتے تھے، بہن کی لکائی پر مذہم تھے۔ اجڑ گنوار، چپ رہنے والے ماں اور بہن کی گایاں سننے والے، بازوؤں میں بہت ہمت ہوئی تو ایک گھر نہ بنائے۔ ان کے ذہنوں میں کئی بار بغاوت نے جنم لیا، لیکن کہاں جاتیں ————— کون اپنائے گا انہیں۔ اب تو اسی گھر میں ذہن کی لاشیں پڑے گی۔ یہیں سے جنازہ نکلے گا۔ لیکن آتش آتش کرتی ہے۔ ہر چہ بیٹھے کے بعد دنیا مرد۔ کبھی گویا چٹا۔ کبھی گولی ٹوٹ کر کبھی سوٹ ہیں کرتا ہے۔ کبھی میٹ ٹگا کر، کبھی کار میں بیٹھ کر۔ کبھی ٹکسی میں۔ کبھی سینما کے جاتا ہے کبھی کپڑے خرید کر دے جاتا ہے۔ یہ حرافہ پیش کرتی ہے اودھم۔ بس صرف ایک مرد، کالے کورٹے، ڈیڑھے پتلے، جاہل ٹوکے، سرے عض نامرد۔ اسی لیے انہیں اچھا نہ لگتا تھا۔ کسی کا اس گھر میں آنا۔ ان کو دل کو صحت کرنے سے کیا فائدہ۔ یہ کرسے تو اذلی سے گزے ہیں اس صفائی سے کیا فائدہ جس میں ان کا کوئی حسرت نہیں۔ محض کام کرتے جاؤ اور دو وقت کھانا کھاؤ اور جاہل مردوں کو اپنا پتی سمجھو۔ جیسی تو ناک مکوڑے سے بھی مٹی ہوئی تھیں۔ آج همان نہیں آئے والا تھا۔ بلکہ ان کی جاگ ہوئی خرابیوں اور اسٹول کا جنازہ نکلنے والا تھا۔

ہر صبح کے بعد شام آتی ہے۔ جب آتا اب اپنی تمام دھنائی سمندر میں غرق کر دے گا۔ اور آسمان پر شفق پھیل جائے گی۔ تو کچھ عرصے کے بعد بادلوں کے کنارے اودھانی ہو جائیں گے تو ایک نیا چاند آجھڑے آئے گا۔ جیسی یہ کرسے بھائے گئے ہیں، شاد رک دہن کی کو بیٹھتی ہے۔ نا بکا نہ ڈھری۔ مردوں کو کھانے والی، گھر کی عزت بیچنے والی، اسے خیریت، خاندان کی عزت کو خاک میں ماننے والی لاش آئندہ نہ آئے۔ دن بھر بھابھاں ہی سوچیں۔ یہ کھانا پکا پکایا وہ جاسے گا، یہ صفائی، یہ دیکھ دھکاؤ۔ یہ اجلا سلا سفر کش۔ یہ بناؤ سنگار۔ یہ مسکراہٹ اس مذہ کی دھری کی دھری رہ جائے۔ یہ دوڑے اور زور زور سے دوڑے۔ اپنے بال نوچے۔ دیواروں سے ٹکریں مارے، اس کی مال روئے۔ اس کے بدمعزت بھائی روئیں۔ یہ کپڑے پھاڑ کر بازار میں بیچی ناچے۔ یہ پاگل ہو جائے تو اچھا ہے۔ وہ خوش ہوئی اور ہنومان کے مندر میں جا کر پوساد چڑھائیں گی۔

یوں اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ آتش کے دل میں اختلاف کی کھیاں۔ سارے گشت کا جو رہن لیے ہوئے تھک رہی تھیں۔ اب آئندہ کی گاڑی اس آئین پر ہوگی، اب بوری والی کے قریب، اب گلے گاؤں۔ اب اندھری۔

”مڑا مسٹر! اب آتا ہی ہوگا۔ کھڑکی میں نہ بیٹھ۔ تیرا یاد آجائے گا۔ ماں نے کہا جتے ہوئے کہا۔

بادرہی خانہ۔ نہ سے ڈیرہ دون کے کھادوں کی سونہری سونہری خوشبو آ رہی تھی۔ جلاؤ تیار ہو رہا تھا۔ چائیاں پک رہی تھیں۔ براتی ایک ایک کر کے گھر سے جارہے تھے۔ جب وہ آتا ہے تو مردوں کو گھر سے جانا پڑتا ہے۔ صرف ماں وہ ماتی ہے۔ بھابھاں ایک کونے میں دھک جاتی ہیں، ایک کمرے میں۔ جس کے ایک کونے سے ہنسی، مذاق، مسکرائیں، کبھی کبھی دلی دلی سسکیاں، کبھی آہیں، بے تدری۔ دھڑے، تھیں کھڑکڑاہٹ اور کبھی کبھار پاپٹ، کسی کا ہالوں کا کھینچا جانا۔ آتش کا آگنی کے کہ وہ جانا، ہانے کیا کرتے ہو۔ آہستہ سے بالی کھینچو؟ یہ سب کچھ بھابھاں دیکھتی، سنتی اور اپنے مردوں کو گایاں دے کر کہہ جاتیں اور جب کبھی وہ آنے والا ہوتا تو وہ ہاتھ جوڑ کر بھابھاں سے ملتا کرتیں۔ لاش وہ آج نہ آئے۔ آج وہ نہ آئے۔ اسے سائیں بابا۔ اسے بھگوان۔ اسے دھبہاں کے مالک، اسے بھاری دالے لاش وہ آج نہ آئے۔

وقت گز رہا تھا۔ وقت گزر جائے گا۔ وقت گزرا جا رہا تھا۔ تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ گھروں میں بچے کھیل رہے تھے آسمان

”کھا تھا“

آج نہیں — پھر کسی دن آؤں گا۔

”آؤں“

”مار پڑھتے ہی آشا کے سارے جسم میں ایک سکتہ سا طاری ہو گیا۔

آشا تاکہ اپنی انگوٹوں میں پھینکتی ہوئی چٹک پر گڑ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بھابیوں غرض عقین۔ ماں کے چہرے پر ایک لڑ سا برس رہا تھا۔

آخری سہارا

شکید اختر

اور وہ نکلا جس جیسے اس کی روح کی گہرائوں میں اڑی چلی جاتی تھیں۔ وہ گہرا جاتی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور جلدی کی سرزدیں بھی اس کی پیشانی پر پسینے چمک اُٹھتے۔ — اختر کے ہاتھوں سے اس کی صبح پس چلی تھی اور اب اتنی بڑی صبح دینا میں اس کا کوئی بھی اپنا نہ رہا تھا۔ کسی کے لیے اب اس کے دل میں فکر نہ تھی اور کوئی دل اس کے لیے مضروب نہ تھا۔ سارا اضطراب سارا درد اور سارا غم ایسے بھانک طور پر اس کی زندگی پر آیا اور آکر چھانک کر اب یاس و حسرت کی کوئی انتہا باقی نہ رہ گئی تھی۔ اور اس کے بعد یہ دو بیٹے دو عشرے سے بھی زیادہ طویل ہو کر اس کی سسکتی ہوئی روح پر سے آہستہ آہستہ ریگ رہے تھے۔ گزری ہوئی زندگی کے نقوش اس کی نگاہوں سے بہت حد تک مٹ چکے تھے۔ مگر اس کے دل و دماغ اور آنکھوں میں بھیاب موت کا اندازہ بڑا سیلاب ابھی تک چھا رہا تھا۔ خوف ناک موت کی گرج — بے بس زندگی کی آخری کش مکش، اور اس کی کسکیاں اور پھکیاں اب بھی اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ وہ ایک نیامت سے جو کہ گزری تھی۔ اسرائیل کے صحرے سے بھی کہیں زیادہ شور مچا۔ خون کی ندیاں ہمیں۔ آگ کے شعلے جلد ہوئے۔ یزیدوں کے ہجوم میں چھین گھٹتی گئیں۔ اور گنڈا سے ابھارے اور بچھریوں میں گھبی ہوئی زندگی گنتی چلی گئی۔ وہ کئی کچھ بھی بدحواس مردوں کے ساتھ زخموں اور مرقوں کو زندگی نہ رہی تھی، وہی مگر کنوئیں کی منڈیر پر آکر سب کے پاؤں ایک لمحہ کے لیے سالت ہو گئے۔ جیسے جیات نے ان کے قدروں کو ختم کیا تھا۔ خون کے بہتے ہوئے پرناؤں میں۔ سے گزرتے ہوئے ان کے پاؤں بھی لال سرخ ہو رہے تھے۔ اپنے عزیزوں اور بہتوں اور پیادوں کا گرم گرم خون، جراب ان کے کپڑوں اور پیروں میں امرو کی جلی کی طرح جھتا جا رہا تھا۔ جیسے کاہلوں کی آدائیں ان سے قریب تو مٹی جا رہی تھیں۔ قیامت کا شور مچ رہا تھا۔ ان کے دلوں کی دھڑکنیں بھی تیرے تیز تر ہوتی چلی گئیں۔ کنوئیں کی منڈیر پر آکر وہ اپنی زندگی کو بچانے کے لیے ٹھٹھک گئی تھیں۔ مگر ان کے بیٹے، ان کی ماہیں، ان کے باپ اور ان کے سارے رشتہ دار عزیز اور عزیز بزرگوں بیدوی سے مارے جا رہے تھے۔ بغیر بغیر کر شور مچتا جا رہا تھا اور چھین جلد ہو کر گنتی جا رہی تھیں۔ وہ غموں سے بھرا ہوا تھا اب ان کے دلوں سے اضطراب مٹ چکا تھا اور وہ بڑے استقلال سے کنوئیں کی منڈیر پر چڑھ گئیں۔ اور اس کے بعد اس کو کچھ بھی یاد نہ رہا۔ — سڑی سے ان کے دانت کٹنا رہے تھے۔ اور وہ اسی آواز سے جاگ اٹھی تھی۔ کچھ عورتیں اور لڑکیاں اسی کی طرح کنوئیں کے اندر اس کی بھیگی ہوئی دیوار سے اڑی ہوئی ٹھنڈے لپک رہی تھیں۔ ان کے قدموں کے نیچے کنوئیں کا پانی سیاہ لگ رہا تھا۔ اور اس پر کئی پھول ہوئی تھیں ایک ایک ٹھنسی ہوئی تھیں۔ اس نے اپنی آنکھوں کو مل کر پھر سے دیکھا۔ وہ ابھی تک زندہ تھی؟

وہ بے تاب ہو کر کنوئیں کے اندر سانس لیتی ہوئی صوفیوں کو حریصانہ طرز پر دیکھنے لگی۔ ”اماں، آبا، بھائی اور باپ سے بھائی بہن؟ غریباں کوئی نہ تھا۔ بھرا بھرا گھر! ساما گھر؟ کیا ہو گیا؟۔ وہ سب کے سب اس کو ایک چھوڑ کر کہاں چلے گئے؟ ادب وہ کنوئیں کے اندر چھپائی ہوئی دیوار سے آوی ہوئی سردی سے کانپ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ سبھی آہستہ آہستہ سسک سسک کر وہ رہی تھیں۔ ایک کی گود میں تین سال کا بچہ تھا۔ اس کا سارا جسم سردی سے تھر تھرا رہا تھا۔ اور وہ بار بار اسی طرح پکارتے ہوئے رٹ رہا تھا۔ اماں گل میو۔ گل میو اماں۔ ماں بار بار اپنے گئے آنکل سے اس کو روکتی تھی۔ چپ رہو بیٹا، چپ رہو دشمن تمہارا آواز سن لے گا بیٹا۔ گل میو کنوئیں کے اندر تھرتھاتا۔ ہم کو جالاگ لہا ہے اماں گلے میو۔ گلے میو اماں۔ بچہ جیسے ہی چپ ہوا تھا کہ کنوئیں کے اندر پھر کی ایک بڑی سی سل آکر پانی میں گری۔ ایک جھٹک جھنجھٹ ہوئی کنوئیں کا پانی زور سے اچھلا۔ پھولی ہوئی لاشیں ڈوبنے اُٹھنے لگیں۔ خوف و وحشت سے سب کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ کچھ دیر کے بعد جب اس نے اپنی آنکھ کھولی تو دیکھ خون سے تر ہوا اپنی ماں کی گڑھے چٹا ہوا تھا۔ اور اس کا پیچھا پانی پر تیر رہا تھا۔ بس اس نے آنا ہی دیکھا۔ اور اس کے بعد جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ اسپتال کے چنگ پر پہنچا۔ اس کو بھی ڈشوں سے کنوئیں کے اندر بچھوں اور جھالوں سے گھونپ گھونپ کر ڈھکی کر دیا تھا۔ دوسرے دن مڑی دالوں نے کنوئیں میں سے کئی لاشوں کے ساتھ اس کو بھی نکالا۔ ڈیڑھ مہینہ وہ ہسپتال میں پڑی رہی۔ ذہریلے دھم کے ساتھ اس کو کنوئیں بھی ہو گیا تھا اور ادب وہ ہسپتال سے اس یلیفٹ کیسپ میں پہنچی دی گئی تھی۔ کپڑوں اور کپڑوں سے لدی ہوئی ٹکیں کئی بار کہاں آکر آکر غالی ہوتی رہیں۔ گل ہمیشہ ہلکتے دالوں کا بڑا مجمع رہتا۔ ان کے پیچھے ہرے لہتے۔ تھجیا زندا میں، اور نوٹ کھسٹ کو دیکھ کر اس کو بڑی کراہیت ملتی تھی۔ ی تھی۔ اور وہ ایسے عرقہ پر بیٹھ دیاں سے کترا کر نکل جاتی جب وہ ہسپتال میں تھی تو کئی دھماکا رہنوں نے مٹی ہوئی فریضوں کو ان کے جگڑوں کے پاس کا جا کر ایک جڑا کپڑا دیا تھا۔ اس کو بھی ایک جڑا کپڑا ملا۔ پہلے پہل ان کپڑوں کو لیتے ہوئے اس کا ہاتھ کانپ گیا تھا۔ اور اس کی آنکھوں آنسو چھٹنے لگے تھے۔ اور اسی دن اس کو اپنے عزیزوں کی موت پر رشک کیا جو شہید ہو کر جنت میں آرام سے تھے اور اچھے اچھے کپڑے دوسروں کو دینے والی یا سہیں کے چارہ انھوں میں پرانے اور پٹے ہوئے کپڑوں کا ایک جڑا کانپ رہا تھا۔ اور ابھی تک اس کے پاس ہی وہ جڑے کپڑے تھے۔ ایک اس کے اپنے ٹکڑا آخری جڑا اور دوسرا ہسپتال میں ملا تھا۔ بس یہی اس کی ساری کائنات تھی۔ ٹھنڈی زمین پر سوتے ہوئے اس کو اپنا گھر یاد آتا۔ سما سجایا بڑا گھر۔ زم اور شغاف سے بستر، میز، کرسیاں، اٹا لوں سے بھری ہوئی بیٹھے کی آدھی آدھی انداریاں۔ اماں کا بخت سے دھکا ہٹا چروا، آبا جان کی شیفٹ ٹاپیں، بھائی جان، بھائی جان اور چھوٹے چھوٹے چائے بھائی بہن۔ ہاڑے کی ماقوں میں جب بڑھئی آتا چھوٹوں کے ٹھسے ان بچوں کو سنانے لگتی تھی تو وہ اپنی مضامین میں خوف سے کیسے دھک جاتے تھے۔ اور اب کتنی ہے وہ ددی سے وہ سب کے سب ذرا کر کے جلا دیئے گئے اور زندہ جلا جلا کر ذبح کیئے گئے تھے۔ اس کی آنکھیں دوسرے دوسرے اب تھک گئی تھیں۔ اور اکثر جب اس کا جی جاہتا کہ چیخ و رنج کر دے تو اس کی آنکھوں سے بہت مشکوں سے چنڈ آنسو بہ جاتے، اور اس کے بعد سب سے زیادہ اس کو اپنے آپ پر افسوس آنے لگتا تھا۔ اس کے سب پر یا بے پیسے اپنے گھر میں تھے۔ اسی طرح ایک ساتھ جنت میں بھی خوش ہوں گے۔ مگر وہ کتنی پر نصیب تھی۔ اس کو اپنے آپ پر فخر آجاتا وہ کنوئیں کی طرف بھاگ کر اب تک کیوں کا رہی تھی؟ سیدھے پہلے بہت سے لوگوں کے ساتھ اُپر کی منزل میں کسے ایک ایک کر کے اس کو بھی مل گیا تھا یہ

[illegible]

”تم..... تم۔ کیوں رو رہی ہو۔؟ کسی نے تیں کچھ کہا ہے۔؟ اس نے بڑی مہم س آواز میں پوچھا۔
 ”آپ نے۔ آپ نے مجھ سے میرا۔ لبتے پوچھا تھا نا؟ اسی پوچھ کر اپنا گھر یاد آگیا۔ وہ اسی طرح جیکبسن لیستی

ہونی بولی —

”تو یہاں — تمہارے ساتھ تمہارا اپنا کوئی نہیں؟“

”نہیں کوئی سبھی نہیں۔ سب کے سب ایک ایک رُکے مارے چاچکے ہیں نہ۔ اس کی جھکی ہوئی معصوم نگاہیں اور اُپری اُصیں
— اود اس کی بایں آنکھوں میں غم کے چھائے ہوئے ہاروں کو دیکھ کر وہ رُکنا ڈھنسا۔ اس کی زبان گنتی شریں اور صاف تھی، وہ غلیظ جیسے
اس کے دل کی گہرائیوں میں اترتے چلے گئے۔ اس باجورہ اود بھی اداس ہو گیا۔ وہ اسی ریٹیف کے کاموں کے لیے بہت رُکد سے کیا تھا۔
لاہور سے۔ بہاد کی انہماکیوں پر ہزاروں دل زپ اُٹھتے تھے۔ بھول، پنجاب، سندھ، سرحد اور کشمیر نے بھی ان دھولوں اور غموں
کو اپنا ہی دکھا رکھا تھا۔ اود بہت سے لوگ اس دودھم میں شریک ہوئے کہ دودھے، کپڑے اور دوائیں اود زندگی کی ساری ضرورتوں کے
سامان لے کر ہمارے پڑوسیوں کی درو کرنے آ گئے تھے۔ وہ دودھتے سے ریٹیف کلام کر رہا تھا۔ گراں کا دل کبھی بھی اتنا رُکنا ڈھنسا
جیسے کپڑے، اُدھے ہوئے ہال اود قتی پریشان حالی میں بھی یامین کا حسن دیک رہا تھا۔ اس کی معصوم آنکھوں میں زندگی کے نشتر جبرے

ہم سنے تھے۔ اور عمو لے کہوں پر کچل ہو کر حسین دم توڑ دی تھیں۔ اس کے کانوں میں ابھی تک سونے کی ایرینگ پڑی تھی مگر اب وہ اور اسنے ہاتھ کی پھٹکی میں انگریزی ڈیڑھ تان کی ایک سادہ سی انگریجی تھی۔

انہنے دونوں کے بعد آج پہلے پہل اس کی نگاہوں میں پائیمیں نے اپنے لیے ہمدردی اور پاکیزہ غرض کا جذبہ دیکھا۔ اس کا دل بھر آیا۔ دنیا میں اب اس کا اپنا کوئی نہ تھا۔ پھر وہ نگاہیں اس کی گزراہوں میں کیوں نہ تھیں جو جا ہی تھیں۔ لیکن وہ پائیمیں سے کچھ بیز دیا پس چلا گیا۔ اس کے قدم پڑی انروں کے لیے خود بے تھے۔ جیسے اس کے دل کا سامنا ہوا تھا انہی قدروں پر لایا ہو۔ وہ اس کو ہاتھ سے ہلے دیکھتی رہی۔ سلیٹی رنگ کے پینٹ اور اسی رنگ کے پلے اور میں اس کا سنا زقد اور بھی نمایاں لگتا تھا۔ ابھی۔ ابھی وہ اس کو کتنے قریب سے کیچی رہی تھی۔ اس کی مثالی شکل انھیں۔ اس کے اداس سے لب، اور اس کا مڑھیا ہوا چہرہ۔ اس کی وہ فطین نگاہیں ابھی اس سے کتنی قریب تھیں۔ کبھی وہ یہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ کوئی اس طرح کا بھگم اس کے آنا قریب آ سکے گا۔

فرزاد کی طور پر اس کی نگرانی انکو ملنے پہلی گئی تھی۔ اسی انکو ملنے نے کیسا کیسا انخفا اور اس کی آنکھوں میں بھر دیا تھا اور وہ بے تابی سے آنے والے دونوں کی منتظر تھی۔ اس کی شادی کو صرف پندرہ دن تھے۔ وہ کتنے تھے۔ گھر میں شادی کی تہا تیغ رہی تھی کہ پُر غور ماسائے رہینگے۔ اور پھر ایک خیانت ان پر سے گذر گئی۔ جہاں وہ بیباہ کر جا رہی تھی۔ وہ بستی بھی جدا کر خاستگی کا چیلن ہے اور اتنے بڑے گاؤں میں سے صرف ایک چودہ برس کا لاواھان کے کھیت میں چھپ کر کچھ سکا تھا۔ کارواں کا کارواں جا چکا تھا اور ایک وہی بلربلیب تھی کہ میٹل کر رہ گئی تھی۔ باب بیک اس کی روح میں رک بال سا تھا۔ جیسے کیسے قصور اس کے دل و دماغ میں جا ملے جلتے پڑے تھے۔ اس کی آنکھیں ابھی اسی ہی جوں ہی۔ اس کے بال بھی خون میں تھمرے جانے سے قبل ایسے ہی پھیلے ہوں گے؟۔ اور اس کے لب؟۔ وہ ہمیشہ اس کے لبوں کو سوچتے ہوئے شرماتا تھی۔ اس قدر تبت بھی پہلے کی طرح اس کے لبوں کو یاد کرتے ہوئے وہ دھٹک گئی۔

اور اس کے لب؟ موت کی خاموشی سے پہلے بھی وہ ایسے ہی اداس ہوں گے۔ اچانک اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے کسی دلین و در کو نہیں اپنے مستقبل کے اسی روشن آفتاب کو دیکھا تھا۔ وہ آنکھیں اس کی تعین وہ انہی لبوں کو یاد کر کے شرماتی رہی تھی۔ اس کی مثالی شکل نگاہوں میں عبت تھی، وہ رحما اور ہمدردی تھی بے اعتبار اس کا جیج جانتے لگا کہ وہ دور لڑا اس کے قدروں سے لٹ جائے۔

دلت مجھ جھنڈی زمین اور بھی سخت ہو کر اس کی پیٹھ پر گزرتی رہی۔ وہ ذرا بھی نہ سوسکی۔ دوسرے دن نہ جانے کیوں، اس کی آنکھوں میں اختلا و جھجکا تھا۔ ابھی غمناک یادوں سے وہ بھی ناک بہتی ہوئی تھی۔ مگر اب اس کا جی بھرا گیا تھا۔ جیسا کہ موت، اولاد و دنیا جیسا اور خون کی بہتی ہوئی ندیاں۔ اور اس کا مورچہ دو بیٹے سے اس کی زندگی گھوم رہی تھی بھلا رہی تھی۔ اس نے اتنے دنوں سے یہ بھی نہ سوچا تھا کہ دنیا اس قیامت کے بعد جو چلے ہی تھی یا کوئی دوسری دنیا بن گئی تھی۔ اور کب پہلی بار جیسے اس کی بے ہوش نگاہیں ہوش میں آئی تھیں۔ اہانک اس کو اپنے آپ سے منقطع آگئی۔ اس نے اسے بس ایک فیکٹری کی سمجھا بھرا گا؟ — اس بے چارے کو کیا نمبر کہنے بچے ہوئے خوب صورت کروں میں وہ کھٹوں ایسی ہی آنکھوں، ایسے ہی لبوں اور ایسی ہی محبت سے بھری ہوئی نگاہوں کا کبھی تصور کرتی رہی تھی حبیب وہ یا حسین تھی۔ جنہیں کانا کا نا کا سا بھول — اور اب ۱۶ اربہ وہ کون تھی؟ اس کا اپنا دل بھی اپنے کو یقینی کرنے کا نہ جانتا تھا۔ اس نے جا کر اپنی آنکھوں سے انگوٹھی اتار کر کینچنیک دے۔ وہ پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ دنیا میں اب اس کا کوئی بھی نہ تھا۔ پھر ہر کس کی مقنا میں اس سدا کے دل میں جاگ رہی تھیں؟ اس کی آنکھیں بھٹکتی گئیں — اور پھر — اسی مورچہ پر اس کی زندگی گزرتی رہی۔

پاس ایک بہت اُدنچا سا سفید مکان بھی آپ نے دیکھا تھا۔؟

”مکانوں کی صحیح صورت تو اب وہاں کوئی بھی نہیں۔“

”ادوہ وہاں کے کنوئیں؟ آپ نے کچھ ادوہ آدمیوں کو ان میں سے نہیں نکالا؟ وہ اپنے ٹھکر کی باتیں اتنی محبت سے پوچھ رہی تھی جیسے اپنے مسرل میں وہ بیکے کی ایک ایک باتیں چھڑ چھڑ کر بڑے پیادہ اور محبت سے دریافت کر رہی ہو۔“

”دشمنوں نے سارے کنوئیں پر بار کر کے زخموں اور قزموں کا مرض بنا دیا ہے۔ آپ کسمت سے بچ گئیں۔“

”مگر ہر کے لیے ایک تھکی ہوئی اُجڑی سی ہنسی یا عین کے بدل پر آئی۔ آپ پنجاب سے آ رہے ہیں نا؟“

”یہ آپ نے کیسے جانا؟ اس کی آنکھیں بھی چمک اُٹھیں۔“

”یہی آپ کے سچے ادوہ باتوں سے، ابھی آپ نے جو کسمت کہا تھا نا؟ میں یہ پہلے ہی سے جانتی تھی کہ آپ لوگ ثابت نہیں ہوں گے۔ وہ ایک معصوم بچہ کی طرح ہوئی۔“

وہ ہنس پڑا۔ ”تو آپ یہی خود کہہ رہی تھیں؟“

”ادوہ یہی تو کہ آپ ہم بد نصیبوں کے لیے کتنی دُور سے آئے ہیں۔“ خلوص اور محبت سے یامین کی آنکھیں جھک گئیں وہ ایک دم چپ ہو گئی۔ جیسے اس کو اپنا خیال آ گیا ہو۔ وہ ایک اُدپٹے گھرانے کی شریف کنواری تھی۔ جس کے تخیل میں بھی کوئی طر و نہیں آ سکتا تھا۔ ادب اور ادب کے کتنی بے حجابی سے اس سے باتیں کیے جا رہی تھی۔ بے ناداری کی ہرین اس کی درج میں کو نہ اُٹھیں۔ اب وہ یامین نہ تھی۔ سیکڑوں مرد اور عورتوں کے در وہاں رہنے والی کوئی دوری بن چکی تھی۔ علم کے بارے سے اب اس کا بھی ٹھک کر بے نادر ہو گیا تھا۔ مسلسل دو مہینوں سے وہ ایک بے ہوشی کے عالم میں سوا گوا رہی تھی۔ گراپ اپنا لب اس کی زخمی زندگی ایک نئی کوڑٹ لینا چاہ رہی تھی۔ جیسے وہ اپنے غموں سے گریز کر رہی ہو۔ اب تک جو لگا میں ادب و درسا اس کے تخیل میں جھانسنے رہے تھے۔ ان ہی کی یاد میں اب وہ اس کی آنکھوں میں گھٹس سی پارسی جلی جی جی کے ہمراہ اور دھوکوں میں شریک ہونے کو اتنی دُور سے آیا تھا۔

”تجربا کی مسجد سے ہم لوگوں نے معلوم شہیدوں کی یادگار، خرن سے نزار اور کپڑوں کے کچھ ٹکڑے، کوئی بوٹی چڑھایا۔ ادوہ کتنے ہونے سحر ڈے سے بال دکھ دیے ہیں۔ ہم ان چیزوں کو اپنی زندگی سے بھی دیا وہ عزیز دھکیں گے۔ معصوم شہیدوں کی آخری یادگار کیا؟“

”تو پھر۔ میری چڑی۔ ادوہ میرے سر کے بال بھی ہوتے آپ کے پاس؟۔ میں کیوں بھالکتی تھی کچھ؟۔ وہ بے اختیار بول اُٹھی۔ ادوہ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے ٹپک پڑے۔ وہ دوسرے کمرے سے مل کر کھڑا تھا، اس کی معصوم نگاہیں یامین کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ اسی وقت یامین نے اس کو دیکھا وہ کتنا دل کش نظر آ رہا تھا۔

دو دن نہ کسی نہ کسی بھانسنے وہ اس کے پاس ضرور آئے یامین کی نگاہوں نے جب سے اس کو دیکھا تھا جیسے اک گورہ سلکون اس کو بل لیا تھا۔ وہ ایک دم بے سہارا نہ تھی۔ کسی کا دل اس کے لیے بریٹان تھا۔ اس کی جگہ بدل دی گئی تھی۔ گیلری میں ایک صاف ستھری جگہ دیتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ ”آپ میرے ساتھ کیوں نہیں جیتیں پنجاب؟“

”نورہ ہنس پڑی تھی۔ ایک عورت اور دل دوزی ہنسی ادوہ اسی ہنسی کے ساتھ اس کا دل کا ٹپک اُٹھا تھا۔ ”کسی کے ساتھ چلے جانا، کتنی بُری سی بات تھی؟“

”مگر پھر بھی اس کا دل جانتا تھا کہ وہ اکیلے رہے۔ کیمپ کے اندر اسنے شہر اور لگاؤوں سے اس کی طبیعت پریشان ہو جاتی تھی۔ ادوہ ایک عجیب سی غٹس اختیار ہو کر

اس کی دُوح پڑھا جاتی۔ جب کبھی اس کے آنے میں دیر ہونے لگتی تو وہ اس طرح بے کل ہو جاتی۔ جیسے اس کی زندگی بھر کا سرمایہ ہمیشہ کے لیے یسٹ دیا ہو۔ کبھی ادھر دیکھتی، کبھی اُٹھتی۔ چھی چھی نگاہوں سے ہر طرف اُسے دھونڈتی۔ ہمانے لڑکے کے نیچے جھانکتی۔ غریب بچہ وہ اتنی بُری نہ ہو گئی تھی جو اس کے ساتھ تہاب چلی جاتی۔ اس کے دل و دماغ میں عجیب عجیب سے جوا بھانے اُٹھتے، اور اس کی دوح میں بغاوت کا ایک طوفان سا چھیٹے لگتا۔ وہ خدا۔ اور اس کی دنیا دوزخ سے بھنی ہو رہا تھا جتنی تھی۔ اتنی مختصر سی زندگی میں اس نے کیا کیا تھا؟ جس کی وہ مراد یہ تھی؟ اپنی بے کسی کو دیکھتے ہوئے اس کو اپنے سینہ و زہن پر فخر آ جاتا۔ جو اس کے خیال میں شہید ہو کر آرام سے جنت میں بیٹھتے تھے۔ اور اکیلے وہ بے جاری حوادثِ زندگی کے سمندر میں بہک رہے تھے۔ طوفانِ تقدیر سے اسے زندگی اور موت کے درمیان بھیانک ٹکسلیں دے رہے تھے۔ لاش وہ دُوب ہی جاتی۔ موت سے بھی زیادہ مُتدیرے اور تارک دِل میں سے احمد کے ہاتھوں نے اُسے نکالا تھا۔ جب وہ اس کے ہاتھوں کو دیکھتی۔ تو اس کا جی بے اختیار چاہتا کہ احمد کے ہاتھوں کو قحط لے، بیٹھے وقت احمد کی آنکھوں کا ہلکا بھورا رنگ کتنی جھلک اُٹھتا تھا۔ اس کے بول کو دیکھتے ہوئے ایسا لگتا جیسے ہر گھڑی ان پر کوئی ناگھلنا ساز نہ چلنا۔ بنا ہے۔ اور اس کے لب پر اُگی ہوئی بلی سیاہی اُٹلی خیریت سے کٹی ہوئی وہ کانٹوں کی باڑ۔ یاسمین کو سب سے زیادہ پسند تھی، جیسے دوڑنے کی تھی کسی گلاب کی حفاظت نہ رہی ہو۔ اور کبھی کبھی تو اس کا جی بے اختیار چاہتا کہ وہ قریب سے اُس گلاب کی خوشبو سونگھے۔ یہ سوچتے ہوئے وہ نہرا جاتی، اس کی بھائی نے ایسی بہت سی باتیں اس سے سرگوشی میں کہی تھیں اور جن نگاہوں کا اشتداد کرتے کرتے وہ تھک گئی تھی۔ اب وہ اچانک احمد کی آنکھوں میں جھلک رہی تھیں۔ اس کے رخسار دیکھتے ہیں، شیم کی طرح زم گئے تھے جن کو دیکھتے ہی اس کو پناہ دہاش کا لکھیا یاد آ جاتا ہے اپنے رخساروں کے نیچے دکھ کر سوتے ہوئے اس کو بہت اچھا لگتا تھا۔

اُردو ٹیڈی میں چھوٹے چھوٹے دھکوں پر بیٹھے ہوئے جب وہ نیچے دیکھتے تو بڑے ہانی میں اتنے سنبھلے ہوئے پناہ گزینوں کو دیکھ کر بعض دفعہ انہیں یقین نہیں ہوتا کہ یہ بھی انسان ہیں۔ سارے لوگ اس ریٹیف وڈ کرکڑ جانتے تھے اور اس نے سب سے یہ کہہ دیا تھا کہ یاسمین اس سٹریٹ میں عورتوں اور بچوں کی انچارج بنائی جہانے والی ہے۔ اسی لیے وہ یاسمین کو اس کے کام سمجھایا کرتا ہے۔ اور سچ ہے اس نے یاسمین کو یہاں کا انچارج بڑا دیا تھا۔ احمد کے ساتھ کئی بار ریٹیف وڈ خواتین اور خود عورتوں کی لیڈر مسز احسان یاسمین سے ملنے اور اس کے حالات پر چھنے کو آجی تھیں۔ مگر سبھل نے یاسمین کو کسی پراپرٹ مکان میں بے جانا چاہا۔ مگر وہ نہیں گئی۔ اس کو اس گندے کیمپ کے ایک ایک حصے سے محبت ہو گئی تھی، یہاں ہر گاہ اس کی محبت کے نقوش اُجھا کرتے۔ اور وہ ان سہاروں کو چھو کر کہاں چلی جاتی؟

احمد نے ایک دن یاسمین سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس کو کبھی نہ بھولے گا۔ بہادر کی سب سے گہری یاد اس کی تھی اور ویسے بھی بہادر کی گزری ہوئی گھڑیاں اس کو ہمیشہ یاد آتی رہیں گی۔ اس کا جی بھی کچھ کہنے کو چاہتا رہا۔ مگر اس کے لب جیسے ساکت ہو گئے تھے دوسرے دن وہ اشتداد کرتے کرتے تھک گئی۔ مگر سارا دن گزرا گیا۔ اور وہ نہ آیا۔ رات کو اچانک وہ ایک خوب صحت ساز مزل کھیلنے اس کے پاس پیش کیا۔

”میں دابھیں ماما ہوں یاسمین دیکھ یہ تار کا پلاسٹک ہے، میری ماں کو دل کے دوسرے پڑ رہے ہیں۔ اور اتنی دُکد لاہور میں وہ مجھے دابھ ہی ہیں؟ اس کی آواز کا پند بھی تھی۔“ نرہ زود تھیں سرور کی گئی ہے نا؟ اپنا مکمل تھارے لیے لیتا آتا ہوں۔“ اس کے کانٹا

زرد گلاب

کونسی وادی میں ہے کونسی منزل میں ہے
عشق بلاخیز کا، قانسہ سخت جاں

(اقبال)

اے حمید

شروع نومبر کی ایک ابر آلود شام،
تصہ ہری ناگ میں بادش ہو رہی ہے۔ ہلکی ہلکی، سرد، ویران اور اداس بادش میں قصبے کی اونچی نیچی تنگ و تاریک پتھری لگیاں
سفسائی دکھائی دے رہی ہیں۔ ان لگیوں کے کونوں پر تلنے والے پراسرار نیپ کچھ بچ گئے ہیں، اور کچھ جلتے ہوئے ٹھنڈی ہوا میں کاٹ پ
رہے ہیں۔ بڑے بازو کی تمام دکائیں بند ہیں۔ انداؤں کے جھلکے ہوئے تنگ آلود سائبان جگہ جگہ سے ٹپک رہے ہیں۔ منڈی کا صحن بارش
اور کچر میں دلدل بنا ہوا ہے۔ صحن کے ارد گرد چھوٹی چھوٹی گی کوٹھڑیوں میں کہیں دن بھر کے تنکے ماندے سرد در پھٹے ہوئے کھڑے
کھیل اور مے سود ہے اور کہیں لگیں کی روشنی میں زرد چہروں والے بیو باری تجوروں کے سامنے کھاتے کھوٹے حساب کتاب میں
مغروف ہیں۔ نیچی چھت والی پرانی غلام گردش میں ایک مستزہ جان کھوڑی، دو بیل لادرا ایک جینس بندھی ہے، ان کے پاس ہی اذھیر عمر
کا چوکیدار آگ جلاتے بیٹھا سرخ کٹالی میں آٹا گوندھ رہا ہے۔ تیز بھا میں چیر کی مرطب کھیاں صرت کڑوا دھواں دے رہی ہیں۔
پتہ کیدار کی ناک سردی میں ٹھنڈی رہی ہے۔ اور اس کی چندھیائی ہوئی آنکھوں سے پانی بہہ رہا ہے۔ صحن والے نیم کے پیرستے
ایک ریڑا اپنے دونوں بازو اوپر اٹھائے نومبر کی بادش میں بھیک رہا ہے۔ بستی کے جنوب میں منلیہ عہد کی یادگار اڑبڑی ہوئی،
پرانی خستہ حال حویلیوں کا ایک سلسلہ چلا گیا ہے۔ کچھ حویلیاں ڈھے چکی ہیں اور بے کے ڈھیروں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ جو باقی
بچی ہیں ان کے گھٹے ہوئے بندوباد تاریک دیوان خانوں میں ضلع رینک اور ریاست اور کے مساجد میں آباد ہیں۔ حویلیوں کی رسیلی
رسیلی کڑور چھتیں مگر مگر سے ٹپک رہی ہیں اور ضلع رینک اور ریاست اور کے مساجد میں اپنی گدڑیاں اٹھائے کبھی یہاں بیٹھ رہے
ہیں اور کبھی دہان اٹھ رہے ہیں، ان کے کالے کالے بچے روٹی کی میٹی ہوئی صدیوں میں زور زور سے رو رہے ہیں اور ان
کی زرد آنکھوں والی مائیں، انھیں مار پیٹ رہی ہیں۔ اور ان کے دہلی پتی ٹانگوں والے غار دغا خیں گالیاں دے رہے ہیں اور کربان۔

میاں رہی ہیں اور کہیں کاشی کی لوشیا لڑھک کر نیچے گر پڑی ہے اور کہیں گرم گرم اندسے میں سوئی نخی دو لکھا پر پھر بارش کا پانی ٹپکنے لگا ہے۔ اور وہ دوتی ہوئی ماں کو پکارتی رہی ہے۔ اور کوئے نے میں بیٹھا ہوا ایک بڑوں کا دھچکا دانت یہ سب کچھ دیکھا ہے، سن رہا ہے اور بڑے اطمینان سے سرگلی کر رہا ہے۔

ان حویلیوں سے پرے جوار کے کھیتوں کے پار، نہر کے سسناناں میں پریشیاں بھاتی ٹھنڈی ہوا شیشم کی چھکی ہوئی ٹھنڈی کو جھولا بھلا رہی ہیں۔ نہر لباب بھری ہوئی ہے اور اس کا گہر دسے رنگ کا پانی کناروں سے اچھل کر باہر آ رہا ہے، آسمان گرم سے سرخی بادلوں میں چھپا ہوا ہے۔ نہر کی پہلی جانب ٹوٹی چھوٹی پرانی چار دیواری کے اندر آسم کے درختوں میں گھری ہوئی ایک بارہ دری ہے۔ اس بارہ دری میں مثل دہار کی کوئی گنگنا کینز نہی ہے۔ بارہ دری میں چاروں طرف سے میند کی چھوڑا اندر آ رہی ہے آسم کی ٹھنڈی ہوئی ٹھنڈیاں بارہ دری کے ستونوں سے اپنا آب بھارتی ہیں۔ تیرے کچھوں پر گائی جم رہی ہے۔ اور کہیں گھاس اگ آئی ہے ابھی ابھی جھکی مٹی۔ اور اس کی نیلی روشنی میں ہری ناگ کے تعصبات شیشی کو جانے والی کچھڑے بھری ہوئی دلدلی مرکز دو رنگ روشن ہو گئی تھی۔ یہاں سے شیش سات کوس کے فاصلے پر ہے۔ ہری ناگ شیش کے اگڑے اگڑے فرش والے چپے پلیٹ فارم پر دن میں صرف دویرل گاڑیاں رکھتی ہیں۔ یہاں کا شیش مارٹر گھٹ چپک بھی کرتا ہے اور بانٹا بھی ہے۔ وہ صرف گاڑی کے وقت پلیٹ فارم پر نیل ٹوٹی پیسے موجود ہوتا ہے۔ باقی سارا وقت وہ اپنے نوادر میں بیوی کی ران پر سر رکھنے غمی گاؤں کے پلاٹ پر بٹھارہتا ہے۔ اور مدھوبالا کو یاد کرتے ہوئے اپنی بیوی کی چھاتیوں پر ہاتھ پھرتا رہتا ہے۔ اور پلیٹ فارم کے دھندلے لمبے تمام رات ٹٹاتے رہتے ہیں۔

تعبہ ہری ناگ بڑی بڑی جستی ہے۔ کتے ہیں مخل شمشادھوں کا شاہی قافلہ کثیر جاتے ہوئے ہیں سے گزرا کرتا تھا۔ جنوں کی طرف جانے والی اس پرانی مرکز کے آثار آج بھی کہیں کہیں دکھائی دیتے ہیں۔ ہری ناگ کے مشرق میں پرانے کھال پر جھکا ہوا نیچے چھت والا بوسیدہ پیل، ذرا آگے جا کر ناگ شاہی اینٹوں والا پانا کنواں اور آدھا گرا ہوا مینار، اور دو رنگ مرگ کے ساتھ ساتھ جاتی ہوئی ٹوٹی چھوٹی دیوار، اور ادھر ادھر کھیتوں میں پھیلے ہوئے اگلے و قوتوں کے عرابی کھنڈرات اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ کبھی یہاں سے بھی وہ رنگ اور خوشبو اڑاتے قافلے گزرا کرتے تھے، جن میں شہزادے آسام کے دیو پیکر ہاتھیوں پر سوار ہوتے تھے اور لمبی آنکھوں اور پیسے ہونٹوں والی شہزادیوں کے ابریشمی محل پھٹے ہوئے سیاہ پاؤں والے حبشیوں نے اٹھا رکھے ہوتے تھے۔ آج اس مرکز پر سوائے کھنڈرات اور دیوان حویلیوں کے اور کچھ باقی نہیں رہا۔ لیکن اس مرکز سے ہٹ کر یہ شاہی قافلے اسی طرح رواں دواں ہیں۔ شہزادے دیو پیکر ہاتھین پر سوار گلاب کے پھولوں کو بار بار سو گندہ رہے ہیں۔ اور سیاہ خام ننگے حبشی برستی چاکوں میں ناؤک اعلا شہزادیوں کے محل اٹھائے پتھر علی شاہراہوں پر وعدے چلے جا رہے ہیں، بائیں چلے جا رہے ہیں۔ صرف مرگیں بدلی ہیں۔ صرف راستے تبدیل ہوئے ہیں۔ باقی وہی ہے۔ سب کچھ وہی ہے۔ ہر روز ایک انارکلی زندہ دفن کی جاتی ہے اور ہر رات شاہی محلوں میں جشن ہوتا ہے، اور ہر صبح ایک صبح اسولی پر لٹکا دیا جاتا ہے۔

بادلوں میں دھیمی دھیمی گمت پیدا ہوئی ہے۔

بارش کچھ تیز ہو گئی ہے۔ جموں کی پہاڑیوں کے دامن میں ہونے کی وجہ سے ہری ناگ میں بارشیں بہت ہوتی ہیں اور سردی بھی بہت پیسے آجاتی ہے۔ حالانکہ یہاں کوئی پہاڑ نہیں۔ صرف میدان ہیں۔ بے رنگ چپے میدان اور کھیت، کبھی مرکز میں،

یہ دیکھ کر ڈنڈیاں اٹھ کر گدے پر ٹکوں بستر جو ہڑوں میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے بوسیدہ چھوٹے لمبے مکان، کافی زندہ گنبذوں اور عیناؤں والی دو ایک پرانی مسجد، قصبے سے باہر ٹیلے کے پاس نہر کنارے کی پٹری، چھوٹی سی منڈی، ایک بازار، کچھ اونچی نیچی پتھریلی گلیاں، چند ایک مزاد گروسے ہوئے جھگے والا چوڑی گلی کا دفتر، پرانے بچوں اور دیکھ گئی میز کرسی والا تھانہ اور نعل ساز کی دکان اور پرانی بارہ دری کے پاس پرانی طرز کا چادر خانہ اور دھوپ، بارش، سردی اور بس۔ قصبہ ہری ناگ میں گھومتے ہوئے آدمی کو محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ایسوس مدی کے کسی مخدّی گاؤں میں آگیا ہے۔ یہاں کشمیریوں کے کئی ایک گھرانے آباد ہیں۔ یہ لوگ کہیں ہندو عیسویں سولہویں صدی میں کشمیر کی وادیوں سے ہجرت کر کے قصبہ ہری ناگ میں آباد ہو گئے تھے۔ اور تب سے اسی جگہ ہیں۔ تقسیم سے پہلے یہ لوگ روفو کرسی، شال، باغی، زردوزی، شالوں کی رنگائی اور پٹینے کی خرید و فروخت کا دھندا کرتے تھے اور سال میں چھ ماہ گھر سے باہر نکال، بنارس اور لکھنؤ میں گزارتے تھے۔ لیکن تقسیم کے بعد ان کا کاروبار بالکل تباہ ہو گیا۔ چنانچہ کسی نے کوئی چکی الاٹ کروائی۔ کسی نے ڈپو کھلوا۔ کسی نے شہر میں کھدیں کی دکان کھولی اور کوئی محض پرانے دلوں کی یادیں آہیں بھرنے کے لیے گھر میں بیٹھ گیا۔ لیکن ان لوگوں نے اپنی روایات اور دستکاری ہاتھ سے نہ چھوڑی تھی۔ ان کے گھر میں آج بھی رات کو چادرلی اُبستہ تھے اور صبح کو نلکین چائے پیتی تھی۔ اور چرسے میں سداوں آگ جلتی رہتی تھی اور بلی پر اُسی طرح بکوان کہتے تھے۔ اور سردیوں میں ہر تمبر سے روز شب دیکھ چڑھتی تھی اور رش مالوں کا دن منایا جاتا تھا۔ ان کے گھر میں آنے والے مہمان کے سامنے آج بھی سبز چائے کا سماوار، باقر خاں اور شیر مال اسی طرح رکھا جاتا اور بیزبان خوشیاں مہمان کو یاد بار کرتیں۔ ہلے آبی کھاؤ نا، یہ بھی لو، وہ بھی ذرا کھو نا!

گھر میں باتیں بیشتر کشمیری گھرانوں میں ختم ہوتی جا رہی تھیں۔ اور پہاڑی چوٹی پر سے ڈھلکے ہوئے پتھر کی طرح ہر ٹھوکے ساتھ روایات کی کڑیوں میں اڑتی جا رہی تھیں۔ اس کے باوجود کچھ گھرانے ان روایات کو بحال رکھنا مذہبی فرض سمجھتے تھے، امداد ہر قیمت پر اپنی دستکاری بچانے جا رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ صرف اپنے کچھ کے لیے زندہ ہیں اور اپنے کچھ کے لیے مر جائیں گے۔ ان ہی میں ایک گھرانہ میر غلام حسن شاہ لائی کورٹی کا بھی تھا۔ اس خاندان کو لائی کورٹی اس بے کتے تھے کہ میر غلام حسن شاہ کا پردادا کلکتہ لائی کورٹ کا سب جج رہ چکا تھا۔ وہ اپنے سوداگر باپ کے ساتھ دنگل کا رہا رہا کیے گیا تھا کہ اس نے قانون پڑھنا شروع کر دیا اور وہیں پریکٹس شروع کر دی اور اپنی طبعِ نادر انت اور خداداد مصلحت کے باعث ترقی کرتے کرتے سب جج کے عہدے پر فائز ہو گیا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا بھی باپ کے نقش قدم پر چلا لیکن بیرسٹری سے تگ نہ پہنچ سکا۔ اب یہ خاندان پٹنہ کے سوداگری چھوڑ کر قانون پڑھنے لگے۔ میر غلام حسن شاہ کے والد وکالت میں بری طرح ناکام رہے امداد اپنے پھر دی پردادا دھندا شروع کر دیا۔ میر غلام حسن کلکتہ میں پڑھا کرتے تھے۔ ایم اے کرنے کے بعد اپنے اہلی۔ الہی۔ بی کیا اور باپ کی طرح آپ بھی وکالت میں ناکام رہے لیکن ناکامی کے بعد آپ نے کاروبار میں پھینسا لگنا مان لیا اور آئی سی ایس کے مقابلہ کی تیاری شروع کر دی۔ آپ نے اس امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور آپ کو لیگل ریسیمیشن میں ایک شایان شان جملہ سے فائز کر دیا گیا۔ آپ نے اپنی ملازمت کا پورا عرصہ کلکتہ، کان پور، الہ آباد، لکھنؤ اور مدنا میں گزارا اور ریٹائر ہو کر قصبہ ہری ناگ پہنچے جہاں آپ کے ملک میں لٹاؤ کی تحریک نے زور پکڑ لیا اور ایک سال بعد فسادات شروع ہو گئے اور پھر ملک تقسیم ہو گیا۔ اب پنشن کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ پرموٹڈ فنڈ کا جھگڑا چار سال تک چلتا رہا۔ دھر پرانے خاندان کے رکھ رکھاؤ میں فرق آگیا تھا۔ دونوں بری لڑکیاں سیدہ اور منیرہ

ہی۔ اسے کرنے کے بعد گھر آکر بیٹھی تھیں۔ چھوٹی لڑکی رشتہ کو الیف! اسے کے دوسرے سال میں ہی تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑ گیا تھا۔ اور پھر عرباب کے دو چوں بیٹے فوت ہو گئے تھے۔ اور وہ جہاں بیٹوں کی شادی کی کا میں تھا۔ رنگ میں جو جمع ہو چکی تھی تمام ہو رہی تھی۔ جیسے کی میونسپلٹی کی خانی خانی صدارت کی موٹی موٹی تھی۔ پکڑے کے ایک کا رخاں میں میں معمولی سا حصہ بھی تھا۔ لیکن سورت نہ ملنے سے کا رخاں نہ ایک دن چلتا تھا اور تین دن بند رہتا تھا۔ اور کچھ میر غلام حسن شاہ بائی کوڑی دیسے بھی لوگوں کا اپنی آن بان دکھانا چاہتے تھے۔ پر یونیورسٹی خند کا وہ یہ دور کی بات تھی۔ آپ نے اپنی بیگم کو پرانا قدیمی مکان گروہی رکھنے کا مشورہ دیا۔ پرانی طرز کی نجیب المصنوع کشمیری عورت نے مکان گروہی رکھنے سے منہ کیا۔ لیکن میر صاحبناشی نہ ہوئے۔ مکان گروہی رکھ کر کا غذات پر دستخط کر کے آپ گھر لوٹے ہی تھے کہ

پرو یونیورسٹی کے پاکستان پیپس کی چھٹی آگئی۔ بیگم نے کہا۔

مکان چھڑا لائیں، میر صاحب نے فوراً جواب دیا۔

مزدور چھڑا لائیں گے۔ میں کل ہی شہر جاؤں گا،

لیکن رات سے کچھ ایسے خواب دکھانے کا مکان چھڑانے کا پروگرام ملتوی کر دیا گیا۔ چنانچہ نومبر کے یہ بھیگے ہوئے ٹھوٹے وہ دن تھے جب میر غلام حسن شاہ بائی کوڑی کے تقبرہ سری ناگ داسے پرانے حویلی نما گھر میں زبیدہ اور سعیدہ کے سیاہ کی تیاریاں ہورہی تھیں۔

اور آسمان کو سیاہ بادلوں نے دھانپ رکھا تھا اور ہندیس پڑ رہی تھیں۔

پر پرانا حویلی نما مکان آبادی سے ہٹ کر واقع تھا۔

اس کے سامنے سے چھوٹی سی ندی گذرتی تھی اور عقب میں رنگ اکوڑو دیواروں پر عشق پیمپاں اور گلاب کی جھلکی بلبلی تھی ہر ٹی تھیں اور میوں کا ایک پرانا باغ تھا۔ مکان کے صدر دروازے کی دہلیز گھاس میں چھپ گئی تھی اور دوسری منزل کے تمام کمرے بند تھے۔ ران پر اسرار بند کمروں میں دیواروں اور روشنیوں پر گروہی تھیں۔ تمام آدم آئینوں پر چالی دار پردے لک رہے تھے۔ اٹھارویں صدی کا کرم خوردہ فرنیچر عبور سے رنگ کی موٹی چادروں میں ڈھکا ہوا تھا۔

کوئوں میں ڈھیر لکڑی کے بوھل صندوق اعظم سامان سے بھرے ہوئے تھے اور ان کے اوپر جالا بھکا رہا تھا۔ لمبے چوڑے گرد آلود ٹیکوں پر غافلان کے بڑے بوڑھوں کی تعداد اور اندھے منہ پڑی تھیں اور ان کے نیچے نڈیوں نے انڈے دھندے دے رکھے تھے۔ اندھیری راتوں کو جب تیز زمستانی ہوا کے جھونکے روشن دالوں اور بند کھڑکیوں کی دروزوں میں سے اندھ داخل ہوتے تو دیواروں پر گروہی ہونے پرستے ہستہ سے بھر پھڑپھڑاتے اور محسوس ہوتا گویا ان دیوان کروں میں عہد پادشہ کی گم شدہ و حوصیں سرگوشیاں کر رہی ہیں۔ یہ کمرے دروازوں سے بند پڑے تھے اور ان میں کبھی کوئی داخل نہ ہوا تھا۔ وقت کا سیلاب، ان گناہم تہوں کو اپنے ساتھ بہا کر لے گیا تھا۔ سہیل منزل کی اونچی چھتوں خدی دیواروں اور سونے گرم تالینوں سے ڈھکے ہوئے فرشتوں واسے کمروں میں زندگی اور صفائی اور روشنی تھی۔ یہ کمرے صاف ستھرے، قیمتی اور بوھل سامان سے بھرے ہوئے تھے۔ یہاں دار و دروں پر گہرے قرمز رنگ کے بھاری پردے لٹک رہے تھے۔ اور ان کے پٹ کھٹے وقت کوئی آواز نہ دیتے تھے۔ وہ بوں نرمی سے محل جاتے جیسے آنے والے کو خاموشی سے اندھ داخل ہونے کا مشورہ دے رہے ہوں۔ یہاں کی فضا میں خواب ایسی پُر اسرار تن آسانی برج ہوئی تھی اور ان کروں میں

داخل ہو کر آدمی کو محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بریاری کی رات میں گرم گرم خوشبودار تھوڑے کا خواب دیکھ رہا ہو۔ جیسے وہ ٹھٹھکی ریح بہتر تیز ہواؤں میں سے گزر رہا ہو اور کسی نے اسے نیم گرم ٹی گوزی میں چھپا لیا ہو۔ جیسے وہ سمادار میں داخل ہو گیا ہو۔ اس پر اُسے حویلی نما مکان کا ہر کمرہ سمادار کی طرح بے سکون، نیم گرم اور معتدل تھا۔ اور اسی فضا میں پرورش پانے سے گھر کے ہر فرد میں جذبات کا اعتدال اور آہنگہ پایا جاتا تھا۔ یہاں کبھی کوئی آپس میں رشتہ داروں کے موضوع پر نہیں جھگڑا تھا۔ یہاں کبھی کسی نے غصہ میں مٹرخ ہو کر دوسرے پر کھٹکیر یا جاتی ہوئی کھٹکی سے حملہ نہیں کیا تھا۔ یہاں کبھی کسی سچے کے ایک دم تیز تیز دوپڑے کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ یہاں کے کچن ہر شام کھانا کھا کر اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے تھے اور میپ بچھا دیئے جاتے تھے۔ صرف مکان کی پشت پر باورچی خانے کا میپ چل رہا ہوتا تھا۔ جہاں بوڑھی خادمہ اپنی بیٹی لائی کی مدد سے برتن صاف کر رہی ہوتی تھی۔ بوڑھے جب بستی کی طرف سے مڑوں کے اذانیں دیتے کہ صدائیں آتیں تو اس حویلی نما مکان کے دیران آنگن سے کوئی شُرع جواب میں اذان نذر دیتا۔ بند کھڑکیوں کے اندر اور باہر ٹوٹی رات کے آخری سائے چُپ چاپ مدغم ہوتے رہتے اور لمبوں کے باغ میں بیڑوں کی تہنیں پر سے شبنم ٹپکتی رہتی اور پھر باورچی خانے کی چھت سے ٹپٹے ہوئے میپ کو دیا سلانی دکھائی جاتی۔ تیل کے میپ کی دھیمی دھیمی نرم روشنی میں خادمہ کی بیٹی لائی آگ جلاتی، چائے کے یے پانی رکھتی اور الماری میں سے چینی کے برتنوں کو نکال کر صاف کرنا شروع کر دیتی۔ بستی کی مسجدوں کے میناروں کی پردن کی روشنی کا چھپکا اُجالا جھلکتا تو بوڑھی خادمہ مسجدہ ہیر، زینبہ میرا دور رضیہ میرے کمروں میں جا کر انھیں بڑی نرمی اور پیار سے باری باری جگاتی۔

’اُٹھئے آپنی صبح ہو گئی،

سب سے آخر میں وہ گھر کی مالکہ بڑی آپو کی خواب گاہ کا دروازہ آہستہ سے کھٹکھٹاتی۔

’آپو جی اذان ہو گئی،

چالیس پینتالیس سال کی ادھیڑ عمر، سرخ و سپید مالکہ بڑے وقار سے اپنا مہارانیوں ایسا بوجھل جسم بے ہوشی، نرم اور گرم لمحات میں سے باہر نکلتی۔ غسل خانے میں وضو کے لیے پانی گرم ہوتا۔ وضو کرنے کے بعد وہ نماز پڑھتی اور نماز کے بعد وہیں مصلے پڑھتا۔ قرآن پاک میں معروف ہو جاتی تلاوت کے وقت ان کے چوڑے اور باورچہ چہرے پر طلوع صبح ایسی مقدس روشنی پھیل جاتی۔ ان کے سیاہ و سپید بال پیشانی تک سفید شمال میں ڈھکے ہوتے اور ان کے لب بند ہوتے اور جسم بے معلوم انداز میں جھول رہا ہوتا۔ اتنی دیر میں میر غلام حسن شاہ بھی نماز سے فارغ ہو جاتے اور لمبا گرم کپٹن، شُرخ تری ٹوپی سر پر رکھ، چھڑی ہاتھ میں لے سیر کے لیے باہر نکل جاتے۔

سب سے بڑی بہن زینبہ نماز سے فارغ ہو کر اپنی ماں کے پہلو میں بیٹھ کر تلاوت میں مصروف ہو جاتی۔ لیکن سجدہ بار بار جگناتے پر بھی نہ اٹھتی، اس کے سرخ و سپید خواب آلود چہرے پر بالوں کی لٹ بکھری ہوتی اور وہ ایک ٹانگہ لمحات سے باہر نکلتے بیٹھی کیسے کو پیٹ کے ساتھ بیٹھی ایک آدھ بار کچھ بڑ بڑاتی اور ٹانگہ لمحات کے اندر لے جا کر پھر سو جاتی۔

جب بادل نخواستہ اُسے اٹھنا ہی پڑتا تو وہ پلنگ پر پاؤں اٹکے بیٹھ جاتی اور لمحات میں سے گرم شمال کھینچنے ہوئے بار بار جمائیاں لینے لگتی۔ وہاں سے اٹھ کر لوٹھڑاتے، بے ربط قدم اُٹھاتی سنگا دان کے سانسے جا کر بیٹھ جاتی اور آئینے پر جھک کر چہرے پر پھیلے ہوئے جماسوں اور کلیوں کا جائزہ لینا شروع کر دیتی۔ وہ ہر رات بے شمار کریں لگا کر سوئی تھی اور ہر صبح گالوں پر کوئی

نکوئی نیا کیل نکلا ہوتا تھا۔ اسے اپنے اپنے جگے چہرے کی اس پردہ بازی کا شدید احساس تھا اور وہ بہت کم آئینے کے سامنے بٹوانا کرتی تھی۔
 بورٹر جی غدار جب وصیتہ کے کرے میں داخل ہو کر اس پر کراہت سے جھک کر سرگوشی میں آواز میں کہتی۔
 ”مجھ ٹی بی! اَللّٰهُمَّ!.....“

تو رشتہ اپنی نیند بھری جھکی جھکی سیاہ آنکھیں کھول دیتی۔ جیسے وہ پہلے ہی سے جاگ رہی ہو۔ اور وہ سوچتی کیا وہ سو رہی تھی یا جاگ رہی تھی؟ کبھی کبھی خادروں کے جھانکنے پر اسے بول محسوس ہوتا جیسے وہ پہلے ہی سے جاگ رہی ہو۔ جب سے پیدا ہوئی ہو تب سے جاگ رہی ہو اور کبھی نہ سوئی ہو۔ تو رشتہ خادروں لمحات ایسی طرح تہہ کرتے ہوئے کہتی۔

’میرے ہی بچے رشتہ تو سوتی ہی نہیں‘

لیکن مزید ضرور سوتی تھی۔ دن کے وقت سوتی تھی جاگتے ہوئے باتیں کرتے، کھاتے، سوچتے، پیاتے، کتاب پڑھتے اور کھڑکی میں سے باہر باغ میں دیکھتے ہوئے سوتی تھی۔ ہمیشہ سوتی رہتی تھی۔ اُسے کبھی شبہ ہوئے کھانڈو کھیجا کھائی بھی ہو۔ بچپن ہی سے اس کا جسم کمزور، ڈیلا اور نازک تھا۔ وہ تھوڑے تھوڑے دفعوں کے بعد ہمیشہ بیمار رہی تھی۔ اور ڈاکٹروں کی کڑوی دواؤں اور طبی تھی۔ مسلسل بنی میں مبتلا رہنے سے اسے موت سے ڈرانے لگا تھا اور زندگی سے محبت ہو گئی تھی اور وہ خواب کے عالم میں رہنے لگی تھی۔ وہ قدرتی طور پر بیماری پسند تھی اور اسکول میں اپنی ہم سہیلیوں سے بہت کم ملتی تھی۔ اُسے ہر سہیل صحت مند خوبصورت اپنے سے زیادہ خوش قسمت معلوم ہوتی تھی اور وہ کسی سے گھل مل نہ سکتی تھی۔ اس نے خیالی ہی خیال میں اپنی زندگی ایک سیسیل یا بھاسکی فطیس، جہن سے وہ تنہائی میں باتیں کیا کرتی۔ اسکول سے گھر آکر وہ اپنے کمرے میں جا کر چپ چاپ کھڑکی کے پاس کوہل کے کتاب کھول کر بیٹھ جاتی اور خواب دیکھنے شروع کر دیتی پھر اچانک وہ چونک کر بیدار ہو جاتے کسے ڈر سے کتاب پڑھنے لگتی۔ رات کو ان کی پانی حادہ سے باورچی خانے میں پیمپ کے دھیمی دھن دھن میں پلوں اور جھونکوں کی گامیاں سنایا کرتی۔ اپنے کمرے میں بستر پر بیٹھے ہی وضیہ کو کوئی کی پریوں کا خیال بھول جاتا اور وہ جھونکوں کے خوفناک نعرہ سے ڈرنے لگتی اور جلد ہی سے صحت مند کے اوپر کھڑکی۔ پھر اسے اپنے پرانے حویلی خانہ کالی کے گرد و آلودہ دیوان کھول کر کا خیال آتا اور وہ دیکھتی کہ ان کمروں میں ایسی بد صورت پتھر جوں والی کپڑی عورتیں چکر لگاتی ہیں جس کے چہروں پر کھوکھلوں سے جالے ہی رکھے ہیں اور اس کا جسم خوف سے ٹھنڈا ہو جاتا۔ وہ ہماگ کر اپنی خیالی سہیلیوں کے پاس پہنچ جاتی اور ان کی بانوں میں غورو کو بھلا دیتی۔ بچپن ہی سے خفیہ طور پر اچھی بھی تھی۔ دن بھر وہ اسکول اور گھر میں غورو کو بھلا دیتی تھی۔ وہ بات کرتے کرتے نعرہ بھول جاتی اور غلو خانے میں غورو کو بھلا دیتی۔ جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئی اس کی یہ قیام زمینی انھیں ترقی کرتی گئیں اور گھر کی خاموشی، جاہلانہ اور برادر فضلے نے ان کو اچھٹوں کی زیادہ سے زیادہ پردوش کی اب وہ کالج میں آگئی اور یہاں بھی سمجھ سمجھتی ہوئی دریاں تھامی اس کے ساتھ آئی۔ پڑھائی ختم کر کے وہ سیدھا ہوسل کے کمرے میں آ جاتی اور دروازہ بند کر کے کتابوں میں کھو جاتی۔ اس کا ادب کا مطالعہ ہر وقت کتابیں پڑھتے رہنے سے کافی وسیع ہو گیا تھا شروع شروع میں اُسے ایڈلڈ گرائیو پر بہت پسند تھا۔ لیکن بہت جلد وہ اس کی کتابوں سے خوف کھانے لگی اور اُسے تو کے نام کے ساتھ ہی اس کا کتابی کا خیال آ جاتا جس کی لاش آتشزدان میں دفن ہو۔ پینٹے پیل اُسے ناووں کی انگریزی پڑھتے ہوئے بڑی وقت کا رہنا کرنا پڑتا۔ ہر دوسری سطح پر اسے دگھنسی کو نہ لپڑتی۔ مگر اس نے محبت نہ ہادی۔ کتابوں نے اُسے بڑی تسکین دی تھی چنانچہ اُس نے

بڑی محنت سے ادب انگریزی پر کافی عبور حاصل کر لیا اور ادبیت میں سے ہی وہ ایم ایس کے لڑکپن کا مقابلہ کرنے لگی۔ اس نے انگریزی ادب کے گذر بہن عہد کے تمام ناول پڑھ ڈالے۔ زبان ناولوں کی پُر سکون، پُر آس اور گہری تہی آسان نصائے کو یا رصیت کے کھوٹے ذہن پر ٹھنڈا پھانسا رکھ دیا۔

یہاں سے گذر کر اس نے تاریخ کی طرٹ رُخ کیا۔ تاریخ میں اس نے قبل از تاریخ کے دور کو چھوڑ کر معاصر ہند سے مطالعہ شروع کیا اور یونان اور روم سے ہو کر سب نبیوں آ کر لوگ لگی رُخ نا طر کے آخری مود شہنشاہ کے زوال کے ساتھ ہی اس نے تاریخ کی کتاب بند کر دی اور اپنے آپ کو قدیم ایتھنز، منس، روم اور غرناطہ کا شہری سمجھنا شروع کر دیا۔ یورپ کی بندھویں، سولہویں اور سترہویں صدی میں اُسے سوائے درباری سازشوں اور خانہ جنگیوں کے اور کچھ دکھائی نہ دیا تھا۔ اُسے قدیم یورپ کے کسی شہر میں نہ یونان کے سائوں میں بیٹھ کر ادب اور فلسفہ اور موسیقی پر گفتگو کرنے والے رومی اور یونانی فلسفی دکھائی نہ دیے۔ رومی ادب میں سے اس نے تو رگیت اور جیوت کو بھٹی لیا۔ ٹالسٹائی کی متضاد باتیں اور عظیم اظہار بیان اس کی محسوس ہوا تھا۔ گورکی اسے خشک لگا اور دستو سک کی دو کتابیں پڑھنے کے بعد اُسے اس خوفناک مصعفت سے ڈرانے لگا۔ اس کی کتابیں رصیت کے ذہن میں اُن تمام اچھوں کو بیدار کر دیتی جنہیں اس نے قدیم یونانی کھنڈروں کے عظیم انسان ستونوں میں دفن کرنے کی کوشش کی تھی۔ ایک عرصہ تک وہ جبرائیل سے بھی متاثر رہی۔ لیکن پھر اس سے اٹکا گئی۔ اُس کے ذہن کو سب سے زیادہ تسکین و انسیدی ادب نے دی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ ایک دم درختوں کی گھٹی گھٹی، گہری گہری، سوئی سوئی چھاؤں میں کسی ساکن پانی والے پُر اسرار جھتے کے کنارے اُٹھکی ہوا اور ہر طرف نیلے چھل اور بھگی بھگی پُر اسرار و مہندہ چھل ہوئی ہو۔ اپنے ملک کے اُسے تمام ایسے ادب پسند تھے جن کی کمائیوں اور ملازموں میں پُر اسرار و مہندہ درختوں کی خواب آلود چھاؤں موجود تھی۔ مذہب پر اس نے پڑھنا شروع ہی کیا تھا کہ اس کا عقیدہ تنزل لڑی ہونے لگا۔ چنانچہ اس نے فوراً کتاب بیچ لی اور میری جہاں خدا سے دعا مانگنا شروع کر دی کہ وہ اسے گمراہ ہونے سے بچائے رکھے۔ مذہب میں بھی اُسے ایک خاص قسم کی کلاسیکی رومانیت سے پیار تھا۔ نماز پڑھنے کی بجائے وہ پیغمبروں کو نیلی نیل دھند میں اُٹھائے پہاڑیوں پر کھڑے ہو کر عبادت کی تلقین کرتے دیکھنا زیادہ پسند کرتی تھی۔ وہ تصور رجبی تصویریں اہل مقدس نونائی چہرے والوں کو فرشتوں کے جھرمٹ میں سنہری ستاروں کے درمیان دھمکتی اور اس کے ہونٹ و غریبہ بات سے کانپنے لگتے۔

چنگ پرنس و راز کتاب پڑھتے پڑھتے جب رصیت خشک جاتی تو اپنی روز کی ڈائری لکھنا شروع کر دیتی۔ وہ بڑی گرجوشتی سے سارے دن کی بے شک کاروائی شروع کرتی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی ڈائری کبھی کوئی نہ پڑھے گا۔ بلکہ وہ بیشتر خود بھی کبھی پڑھتی تھی۔ اس کے باوجود وہ ہر رات اپنی ڈائری لکھا کرتی تھی۔ اور اب تک وہ کسی کا بیان سپاہ کے مچکی تھی۔ رات کا کھانا دوسری لڑکپن کے ساتھ خاموشی سے کھانے کے بعد وہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی آتی اور سونے سے پہلے بستر پر دوڑنا ہو کر بیٹھ جاتی اور خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتی۔ رصیت کو اُس جھپی ہوئی نہر بان بہت سے بڑی محنت تھی جو رصیت نے نابین چھیل کر اپنی پُر آس محبت کی آغوش میں لے لیتی تھی اور جو اس کی ہر خطا خندہ پیشانی سے معاف کر دیتی تھی۔ کبھی کبھی اُسے عجیب عجیب قسم کے شکوک د

شہادت گھیر لیتے۔ کتابوں میں پڑھی ہوئی سنگدل، بے رحم باتیں کتابوں سے نکل کر نیردوں اور بڑھپوں سے اس کے عقیدہ کی دہلیز پر حملہ آور ہوتیں اور وہ سہم کر سکر سجاتی اور غیر شعوری طور پر قرآن کی کوئی آیت پڑھنا شروع کر دیتی اور وہ یہ دیکھ کر سیرانِ رہ جاتی کہ پلک جھپکنے میں ہر طرف روشنی اور گرامن طاری ہے اور کتابوں سے نکلی ہوئی بے رحم فوج کے خونخوار سپاہی غائب ہو چکے ہیں۔ دعامانگنے کے بعد وہ پہلے معرہ صاف کرنے والی دوائی پیتی۔ پانچ منٹ بعد ساریڈی کی خواب آور گولی پانی سے نکلتی اور بتی بجھا کریند کی راہ دیکھنے لگتی۔ کافی دیر انتظار کرنے کے بعد بھی جب نیند نہ آتی تو وہ ایک گولی اور نکل لیتی۔

کالج چھوڑنے کے بعد رعیت اپنے فقیر والے قدیم مکان میں آگئی تھی اور اس نے اپنے آپ کو باقی دنیا سے الگ کر کے تاریخ، ادب، فلسفہ اور موسیقی کی فہم کتابوں کی چار دیواری میں بند کر لیا تھا۔ اُسے اپنے پرانے مکان اور اپنی بارعب، شیخ، آنکھوں والی ماں اور باپ سے محبت تھی۔ اُسے سیدہ اور سیدہ سے بھی پیار تھا۔ لیکن وہ ان لوگوں سے بہت کم بات کرتی تھی اور اپنے ہی خیالات میں گم رہتی تھی۔ ان سے باتیں کرتے ہوئے بھی وہ اُن اجنبی چیزوں کے تصور رات میں گم ہوتی جہاں اُس کے خیالی میں فوج ایک کسی انسان نے قدم نہیں رکھا تھا۔ اُسے اپنی دوسری بہنوں کی طرح نہ تو اچھے اچھے کماؤں کا شوق تھا اور نہ قسم قسم کے پیش قیمت کپڑے پہننے کی ہوس تھی۔ اسے صرف ایک ہی شوق تھا۔ پڑھنا اور خواب دیکھنا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سو فکریس کے کسی امید ڈالے کا کوئی کردار ہے جو اپنے کرم خوردہ مسوے سے باہر آ گیا ہے اور پھر وہاں جانے کو بے قرار ہے۔

رات زیادہ گہری ہو گئی ہے۔ بارش بے ستور ہو رہی ہے۔ آسمان اور زمین کو ایک تاریک ادا نے ڈھانپ رکھا ہے جیگی ہوئی سرباکی تیز ہوا اسی طرح چل رہی ہے۔ قصبے کی گلیاں سنسان ہیں اور مکانوں کے پرناؤں سے بارش کا پانی مسلسل شور کے ساتھ برہا ہے۔ پرانے حویلی نما مکان کی پہلی منزل کے تمام لمبے بچے ہیں۔ باورچی خانے کی کھڑکی بند ہے۔ اور دشندان پر اندھیرا ہے صرف رعیت کے کمرے کا لمب چل رہا ہے۔ اور اُس کے روشندان میں سے پکی بارش کا عکس باہر بارش جھپکنے ہوئے نیوں کے پرانے دھنچن پر پڑ رہا ہے۔ کمرے کی کھڑکی بند ہے۔ اندکی طرف کمرے دھڑکی رنگ کا بھاری پردہ گرہا ہے اور اس کے ساتھ ہی رضیہ سبیاہ آجوسی میز پر جھکی کوئی کتاب پڑھ رہی ہے۔ اُس کا لباس ہلکے زرد اور ناخانی رنگ کا ہے۔ اس کے چہرے کا رنگ بھی ہلکا نہ دی مائل سفید ہے۔ جسم ڈبلا اور کھلی کتاب کی ایک طرف کھٹی ہوئی انگلیاں نازک اور لمبی لمبی ہیں۔ لمبے سیاہ بال دوپٹے میں چھپے ہوئے ہیں۔ یہ دوپٹہ کچھ اس طرح اوڑھ لیا ہے کہ کشادہ پیشانی کا نصف حصہ ہی چھپ گیا ہے۔ کماؤں میں سنہری رنگ کی دوپٹی چھٹی لایاں ہیں۔ بڑی بڑی سوگوار آنکھیں کتاب پر جھکی ہوئی ہیں اور مختصر باریک، سیاہی کشیری ناک کے ملائم ہماؤ میں ایک عجیب قسم کا کلاسیکی اسلوب ہے۔ ڈبٹے چہرے پر زرد و گلاب کی افسردگی اور پت جھڑکی دھوپ کی طول چمک ہے۔ یہ چہرہ ایک ایسی ویران جھیل سے مشابہ ہے۔ جس کی سطح پر کہیں کہیں زرد پتھر کے پوسے ہوں، اور جس کی تہ میں گھٹی گھٹی ڈھیلوں کی الجھی ہوئی پیچیدہ نشانیوں صاف دکھائی دے رہی ہوں۔ میز کی ایک جانب کتابوں کی چھوٹی سی ڈھیری لگی ہے اور کچھ کتابیاں بڑی ہیں اور دوسری جانب انخوٹ کی

کٹری کے بنے ہوئے چنار کے ایک چڑھے پتے میں سادہ بڑوں کی کچھ گولیاں رکھی ہیں۔ کانسی کے ایک لمبوترے لکھان میں گلاب کی پیل کے دو تین پھول مرچھا رہے ہیں۔ پاس ہی پٹائی پر چھوٹی چھوٹی پتلی چنیوں والی چنی کی ایک خوبصورت چلاوانی اور اسی طرز کا ایک پیالہ رکھا ہوا ہے۔ ذرا پرے گھرے سرخ قالین پر سیدہ اور زبیدہ دونوں بیٹھیں لائی کے ساتھ مل کر اپنے سرورسی چڑوں پر سجادہ کی ستارے ٹانگے ہی ہیں۔ گھرے بجے جسم والی کورنچی سیدہ پاس رکھی بیٹھ میں سے مرتبہ لگے بسکت کھا رہی ہے۔ کام بھی کر رہی ہے۔ ادبائیں بھی کر رہی ہے۔ زبیدہ بڑی سیدگی کے ساتھ اپنے کام میں منہمک ہے اور ف ہوں یا ہاں میں سیدہ کی باتوں کا جواب دے رہی ہے۔

”یعنی باہی پر کیا ہوا؟ تو کوئی بات کیوں نہیں کرتیں؟“
زبیدہ جو نوٹ پر انگلی رکھے اسے آہستہ سے کہہ رہی ہے۔

”رضیہ پڑھ رہی ہے؟“

اور سیدہ بڑبڑانے لگتی ہے۔

”وہ تو بہ وقت پڑھتی رہتی ہے۔“

اور کالی کالی مٹی ایسی آنکھوں والی لائی دیے دے ہنس رہی ہے۔ رضیہ کے گول کندھوں پر سے سرورسی رنگ کی گرم شال نیچے کھسک آئی ہے۔ وہ اسے اوپر کھینچ رہی ہے اور سیدہ تجلے ہوٹ پر سے مرتبہ پوچھتے ہوئے کہتی ہے۔

”رضیہ ابھی ذرا ہمارا ہاتھ بھی مٹاؤ نا؟“

رضیہ اپنی بڑی ہنس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیتی۔ جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔ زبیدہ جلدی سے ہول اٹھتی ہے۔

سیدہ تم جیپ بھی بھونگی یا نہیں؟

سیدہ فوراً کہتی ہے ”نہیں؟“

اور بسکت چبانے لگتی ہے اور باہر کھلی ایک بار بھر چکاتی ہے اور بادلوں کی دھیمی دھیمی گرج سناہی دیتی ہے اور رضیہ

SHANGHNESSY ۰ کی یہ سطرین پڑھ رہی ہوتی ہے۔

WE ARE THE MUSIC-MAKERS

AND WE ARE THE DREAMERS OF DREAMS,

WANDERING BY LONE SEA-BREAKERS,

AND SITTING BY DESOLATE STREAMS.

WORLD-LOSERS AND WORLD FORSAKERS.

زبیدہ اور سیدہ کی شادیاں بڑی دھوم دھام سے ہوئیں۔ دونوں شادیاں ایک ہی روز ہوئیں اور لاہور سے دونوں کی بارائیں ایک ہی وقت میں آئیں۔ قصبے کے شیش سے ہائی کورٹوں کے حویلی نما پرانے مکان تک کچی سڑک پر کاروں کی قطار بندھ گئی۔ میر غلام حسنی شاہ ہائی کورٹ نے جی کھول کر روپیہ خرچ کیا۔ اور یوں ثابت کر دیا کہ ہائی کھٹیوں کا خاندان لاہور کے کسی بڑے کشمیری خاندان

سے پیچھے نہیں ہے۔ دونوں بہنوں کو جہیز میں اس قدر سلمان ملا کہ اُسے بک کرتے ہوئے طرحدار شیشیں مارٹر کو تین بار شیشل بنانا پڑی اور قعبے کے گھروں میں کئی روز تک اس کے چہرے رہے۔ اُسی رات بوسیدہ حویلیوں کی گھٹی ہوئی چھت کے نیچے ضلع رہننگ کے پناہ گیر گولے کے پہلو میں بیٹی ہوئی اُس کی بیوی نے اپنے خاوند سے لپٹتے ہوئے کہا۔

”مکھو ارے! ہماری سادی ایسی نائیں ہوئی ہے؟“

اور مکھو اسے پرے دھکیلتے ہوئے بولا۔

”مکھاس پیچ گئی ہے کیا؟“

قدیم کشمیری روایات کے مطابق ڈاکھنوں کو نو پٹھنے سے پہلے رخصت کر دیا گیا۔ رات بھر صدیوں پورے فلسفی ایسے مکان کی پہلی منزل میں دینی دھڑوں کے دھمکتے رہے۔ لیمپوں، موم تلیوں اور شمعوں کی بھرپور چمکیلی روشنی میں کراچی، پشاور، لاہور اور بریڈی سے آئی ہوئی رشتہ دار جوڑتوں، بھریلے کپڑوں والی بیویوں اور بے باک چہروں اور مضبوط جسموں والی جوان لڑکیوں نے بند کردوں میں کشمیری، پشتو، پنجابی اور فلمی گیت گائے اور جی بھر کر شور مچایا۔ دھن کیا۔ باتیں کیں اور کھایا اور پھر ٹانگیں پسار کر سڑکیں اور خراٹے بھرنے لگیں۔ جب رات ڈھل رہی تھی۔ اور ستاروں کا نور ٹھٹھکی رات کی تہائیوں میں نند و غبار بن کر اڑا جا رہا تھا تو سفید بالوں والی ایک بوڑھی عورت نے کانپتے چوڑوں سے دھڑلک کے بے ربط تال پر ایک پرانا کشمیری گیت گایا۔ جس میں بچپن کے گندہ دنوں کا سوگ منایا گیا تھا اور جب وہ اس بند پڑھنی تو اس کی بوسیدہ پگھلیوں میں آنسو تیرنے لگے۔

ہم تو جھگل میں زعفران چنے نکلی تھیں،

کہ راستہ بھول گئیں،

ہمارے سروں پر سفید برت ہے

اور برت میں پھول دفن ہیں،

سارے پھول دفن ہیں،

یہ بوڑھی عورت دوسری عورتوں کے ساتھ آتشخان کے پاس نالین پر بیٹھی تھی۔ گیت ختم ہو گیا۔ کسی عورت نے کوئی

بات نہ کی۔ سب چپ ہو گئیں اور پرانی یادوں میں کھو گئیں۔ دو جوان لڑکیاں ریشمی کسل اور ڈھے تالین پر ایک دوسری سے لمبی سوراہی

نقیں کو نہ لے پناگ پر سر کیٹے پر کھڑے۔ انھیں ہند کے رشتہ نے اس بوڑھی عورت کا پورا گیت سنا تھا جو جھگل میں زعفران چنے

نکلی تھی اور راستہ بھول گئی تھی۔ اس گیت نے رشتہ پر بڑا اثر کیا تھا۔ اس کی گرم پگھلیوں میں بھی آنسوؤں کی نمی پکپکانے لگی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ

اگلے کس اس بوڑھی عورت کے پاس جا کر بیٹھ جائے اور اُس کا بھربھرا ہوا گھٹا اپنے ہاتھوں میں لے کر آہستہ سے پوچھے، بڑی آلو! مجھے

بھی اس جھگل کی تازہ یاد جہاں زعفران لگتی ہے۔ اور جہاں پہنچ کر گنہارباں گھر کا راستہ بھول جاتی ہیں۔ لیکن وہ گرم لحاف میں چپ چاپ بیٹھی

رہی اور زرد گیت کی زعفرانی نمک نے اُسے اپنے خشک ہاتھوں میں سمیٹ لیا۔ ساتھ دے کرے میں اس کی دو بڑی ہنسیں دہنیں بنی

بیٹھی تھیں اور اُسے ان کی سہیلیوں کی ہنسی، قہقروں اور باتوں کی ہلکی ہلکی آوازیں آرہی تھیں۔ ایک ایسی رشتہ کے ذہن میں ایک عجیب سا

خیال پیدا ہوا۔ کیا ایک روز اُسے بھی اسی طرح دھن بنا کر سمایا جائے گا اور وہ بھی کسی جہنمی کے ساتھ روانہ کر دی جائے گی؟ رشتہ کو یقین

سارے جسم پر چھوٹے چھوٹے سیاہ گنگو بایے بالوں کا ایک جھلکا ہوا تھا۔ وہ بے تحاشا گریہ پٹیا تھا۔ اُس کے گھٹے ٹھہرے ماتھے اور بعدی ناک پر ہر بروقت پسینہ آیا۔ تپا جسے وہ بائیں ہاتھ سے پونچھ کر دوسری طرف چھڑک دیا کرتا۔ جھل میں بیٹھے اُسے صحت اپنا خیال بہت چنانچہ کئی بار اُس نے بڑی آہ اور میر صاحب کی موجودگی میں ہی اپنے یورپ کے قیام کی شہراب اور آوارہ عورتوں کے قصے سنانے شروع کر دیئے اور سیدہ نے ہر بار انتہائی دور اندیشی سے باتوں ہی باتوں میں موضوع بدل دیا۔

رضیہ کو سیدہ کا ڈاکٹر خاندان، انتہائی ناپسند تھا۔ لیکن وہ اپنی بڑی بہن کی خاطر اس کی ہر بات تحمل سے سنتی اور چند پیشانی سے اُس کا جواب دیتی

بات بات پر بھڑک اُٹھنے والی مزاج کی گرم اور طبیعت کی تیز سعیدہ کا خاندان لاہور کے ایک مشہور کاہنوں انگریزی ادب کا پروفیسر تھا۔ وہ لمبے چوڑے مگر پتے دھیلے جسم کا ایک شرمیلہ نوجوان تھا۔ جو بہت کم بات کرتا تھا اور بات کرتے ہوئے کنواوی لڑکوں کی طرح شرماتا تھا۔ جب وہ چپ ہوتا تو معلوم ہوتا اس کے سینے میں جذبات کا ایک سمندر سوراہا ہے۔ لیکن جب بات کرتا تو اس کا لہجہ اس قدر برکت اور پرجوش ہوتا کہ محسوس ہوتا اس کے دل میں سوائے اس بات کے اور کچھ نہیں تھا۔ رضیہ نے اُسے عقیدہ لگا کر بہتے کھنچ کر دیکھا تھا کسی وقت وہ صحت پتے پتے ہونٹ کھول کر مسکراتا تھا اور یہ مسکراہٹ ابشار کی طرح اس کے چہرے سے گر کر ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لیتی محسوس ہوتی تھی۔ اس کے گندمی چہرے کے نقوش باریک تھے اور ان میں دل کو گرم رکھنے والی بڑی ٹیگ سی آدا سی رچی ہوتی تھی۔ اس آدمی میں چٹانوں سے ٹکراتی سمندری موجوں کا ہیبت ناک شور بھی تھا اور پُرسکون بھس کی تہ میں سونے ہوئے زرد پتھر کی آسودگی بھی تھی۔ اس کے جسم کا سب سے زیادہ پُرکشش حصہ اس کی آنکھیں تھیں۔ شہر تری رنگ کی دوپڑہ سی آنکھیں، جن میں ہر وقت کسی شے کا شمار لگتا رہتا تھا۔ وہ ان آنکھوں کو ذرا سیڑ کر باتیں کرنے کا عادی تھا اور رضیہ کو ہر بار بات کرتے ہوئے اپنے چہرے پر طالع ہونے سورج کی پہلی نیوگرم کرنوں کی حدت محسوس ہوتی۔ اُس کے پاس بیٹھ کر باتیں سنتے ہوئے رضیہ کو محسوس ہوتا جیسے لوگوں اس کے سامنے میٹھا پانی کا ٹب ”ڈیڈ سولڈ“ کا کوئی منقہ پڑھ کر سنا رہا ہو۔ رضیہ کا دل کانوں کے پاس آکر دھڑک رہا ہوتا اور وہ افسردہ آنکھوں والے پروفیسر کی دھیمی پُرسکون آوازیں دُوب جاتی۔ لیکن اسے بہت کم قہقے والے پرانے مکان میں آنے کا اتفاق ہوتا۔ پہلے میں دو ایک بار کسی شام اچانک اس کی جھوٹی سی سنسوداری کا پرانے مکان کے بڑے دروازے میں داخل ہو کر لمبوں کے پیریتے رک جاتی۔ اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی رضیہ کا دل دھڑکنے لگتا۔ وہ جلدی سے بھاگ کر نیچے آتی اور سعیدہ سے پیٹ کر ملتی اور دیکھتی کہ پروفیسر زرد سوٹ میں ملبوس اس کی طرف شرمیلیں لگا ہوں سے دیکھتے ہوئے مسکرا رہے۔ رضیہ کو یوں لگا گویا خزان کے پتوں پر کھانیاں لکھنے والا بیخوف اپنے دیہاتی مکان سے اُٹھ کر اُسے ملنے آیا ہو۔ جیسے اس کے خوابی جزیرہ کا سفیر اس کے سامنے کھڑا ہو۔ اور جیسے اُس کے شلیف میں رکھی ہوئی ساری کتاؤں میں زندگی کا گرم خون دوڑ گیا ہو اور وہ زرد سوٹ پہن کر اُسے ملنے آئی ہو۔ وہ اُسے آداب کرتی اور پروفیسر اُس کے کندھے پر آہستہ سے ہاتھ رکھ کر پوچھتا۔

”اچھی ہوئے بی بی!“

رضیہ صرف شہر کا نفوس ٹھکانا تھی۔ پروفیسر کی دونوں کپڑیوں پر پتھے کوٹھی ہوئی سفید بالوں کی لٹوں کا خیال کر کے رضیہ کو

مدرس پڑھا کر وہ محض بے بی ہے۔ ناکھ کچی ہے۔ اور اتنا کچھ پڑھنے اور سوچنے کے باوجود اس کا ذہن ابھی نابالغ ہے، غیر پختہ ہے۔ رضیہ کی اتنی اور آبا ابا کا استقبال بڑی کرمبوشی سے کرتے اور صدیوں کے افسردہ مکان میں خوشی اور زندگی کی لہر دوڑھاتی۔ شادی کے بعد سعیدہ کا رنگ زیادہ نکھر گیا تھا۔ اور اس کی طبیعت میں شوخی اور شکفتگی زیادہ آگئی تھی۔ کسی وقت وہ اپنے خاوند سے ایک دم بگڑھاتی۔ لیکن وہ کچھ اس طرح مسکرا کر اس کی طوط دیکھتا کہ سعیدہ ایک دم ٹھنڈی پڑھاتی۔

شام کی چادر پر دھیسر ہمیشہ رضیہ کے کمرے میں پڑتا۔ کبھی سعیدہ اور اس کی بڑی آپ بھئی اس کے ساتھ ہوتیں اور کبھی وہ دونوں بالکل تنہا ہوتے۔ ایسے لمحوں میں رضیہ بے حد خوش ہوتی اور پر دھیسر کے پے پے بڑے اشتیاق سے چاہ بٹاتی۔ پر دھیسر سگریٹ بست کر سلگاتا اور پر دھیسر پر دھیسر اور تالینوں کے واسے بھر پور دیہاتی کمرے میں بھری نسر کی دھک اور جھنجھکی کی خوشبو سے بھلکے پڑھاتی اور تالینوں کی عالم روشنی میں پر دھیسر کے چہرے پر کسی آنکھانی کمری مسرت کی چمک سی پھیل جاتی۔ رضیہ نیلی چیموں والی بیالی باغ میں ایسے ہنسنے لگتی ہو جاتی اور پر دھیسر آہستہ آہستہ باتیں شروع کر دیتا۔ باتیں ————— پرانے اور نئے ادب کی باتیں۔ ٹالستانی کے دھارا بند ہیں، کی باتیں، بھیکری کے دو بیٹی فیشر، کی باتیں، ہنری ایبل کے 'جرنل' اور 'مدولای' کے، 'یالی کر مستنوت' اور گوگول کی دیہاتی کہانیوں اور روسی کی مشہور امداد نلڈ کی نظم 'لاٹ آف ایشیا' کی باتیں..... اور پھر کنول کے پھول، ایسی کنساری دیوہاک نے دنیا پر ایک گیت گایا۔

SO SIGH WE, PASSING OVER THE SILVER STRINGS,
WE ARE THE VOICES OF THE WANDRING WINDS:
WANDER THOU, TOO, O PRINCE, THEY REST TO FIND,
LEAVE LOVE FOR LOVE OF LOVERS, FOR WOE'S SAKE
QUIT STATE FOR SORROW, AND DELIVERANCE MAKE.

رضیہ پر عجیب خود فراموشی کا عالم طاری ہوتا۔ وہ اپنے آپ کو کنول کے پھول ایسی کنساری دیوہاک کے روپ میں دیکھتی۔ اس کی سیاہ زلفیں سانپ کی طرح اس کے ننگے خوشبودار شانوں پر کھڑی ہوتی ہیں اور ماتھے پر چند کی کو کا پڑی ہے اور انگلیوں پر منکلی ٹرخی ہے۔ اور وہ گوتم کی مرمری خواب گاہ میں تالین پر بیٹھی وچتر دنیا پر ہندی شہزادے کو جدائی کا پیغام سنارہی ہے۔ پر دھیسر کے گھر سے پڑ سکون اور اس چہرے پر وہ گوتم کے تعلیم غم کا عکس دیکھتی اور بیالی بڑے آہستگی سے میز پر رکھ کر وہ ایک گہرا سانس لیتی اور اپنا خوبصورت پیشانی والا سر کمرے کی پشت سے لگا دیتی۔ پر دھیسر خاموش ہو جاتا اور کچھ اہرا سگریٹ سلگاتے لگتا۔

اور جب سردی کی روشن دھوپ چادروں طرف پھیلی ہوتی اور گلاب کی میلوں میں چڑیاں شور مچا رہی ہوتیں تو وہ دونوں مکان کے عقبی باغ میں بیروں کے پیڑوں تلے بیٹھ کر چلو پھرتے رضیہ لیوں کی سفید کایاں جن کی کلاقی اور انہیں سعیدہ کے بانوں میں جھانکا

شروع کر دیتی اور پروفیسر سرگرم پڑھنے ہوئے ان دونوں کو بہار کی روشنی میں مسرور دیکھ کر خوشی کے شدید احساس میں ڈوب جاتا۔ کسی وقت پروفیسر گلاب کی جھڑیوں میں چھپی ہوئی کوئی چڑیا کھڑا لٹاتا۔ سب مل کر اس کے جسم پر سرخ اور پورے پر سنہرا رنگ بھرتے۔ ایسے دامن کی طرح سما کر ہتھیلی کھول دیتے۔ چڑیا کا خناسا دل دھک دھک کر رہا ہوتا۔ ایک لمحہ کے لیے وہ یونانی دم سادے پوری ریتی۔ جیسے مرگئی ہو۔ پھر غمی سی آنکھ کے کونے سے بری نکلتی۔ سی سے دیکھتی اور میدان صاف پاکر پھر سے اڑ جاتی اور سعیدہ، رضیہ اور پردیسہ نالیاں بجاتے ہوئے اُسے رخصت کرتے۔ ایسے روش اور خوشیوں جیسے دن بڑی جلدی گزرتے۔ سعیدہ اور اس کا خاندان واپس شہر چلے جاتے اور رضیہ پھر اپنے دیوانہ فرسے کی تنہائیوں میں کتا بوں کے زرد اورانی کھول کر بیٹھ جاتی۔ پھر عینک پہنی کسی سردرات کو جب باہر گھر سے اندھیرے میں ہوا لگا، اب اور لمبوں کی شانوں میں محبت کا سحر بھونک رہی ہوتی، لمحات میں پڑتی ہوئی رضیہ کا انگ انگ دکھنے لگتا اور اس کے سینے میں سونی ہوئی، وہی ہوئی، کھوئی ہوئی، عورت ناگن کی طرح پڑو اسکے سینے جھونکے پر ایک لمبی پھٹکار کے ساتھ بیاہر ہو جاتی اور رضیہ کی کرم چھتا بوں پر سے پھسپھسائی ہوئی نیچے اترتی اور عمل خدے میں جا کر اُسے کے سامنے برہنہ ہو جاتی اور اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ چھتے ہوئے، بکے ہوئے، دھکے ہوئے، سخت اور کھردرے جسم پر پھیرنے لگتی۔ پھر آندھی اور بارش کا ایک مسیب طوفان اٹھتا۔ دریاؤں میں جھاگ اڑاتے، پھیلے، کھٹ، آو دیلا ب اٹھاتے اور ان کی بھرتی ہوئی موصیں چٹانی پتھروں کے سنگین سنداڑا کرے ساتیں اور کھنکھلی چڑوں والے تن اور، تومند دھت کھڑا کھڑ کر گرنے لگتے، اور رضیہ ایک چیخ کا کر جاگ اٹھتی اور دیکھتی کہ طوفان گزر چکا ہے۔ اور پانی کی پُرسکون سحر پر دشتوں کی ٹہنیاں اور کشتیوں کے تختے بڑ رہے ہیں۔ اس کے پیرے پر خوف، دہشت اور اذیت کے نشان ہوتے۔ جیسے رات بھر کوئی اُسے وحشیوں کی طرح چاکوں سے مارتا رہا ہو۔ اس سے پہلے اُس کے ساتھ کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ اس سے پہلے کبھی اُسے ایسے کرب انگیز خواب نہ آئے تھے۔ اب ایسا کیوں ہونے لگا تھا؟ رضیہ بہت پریشانی کے حضور میں گر پڑتی اور روتی ہوئی آنکھوں اور سر سے ہونٹوں سے اپنے گناہوں کا اعتراف کرتی اور گولڈا کر ان کی معافی مانگتی۔ پھر دن نکل آتا اور وہ نہاد دھوکے بڑے مطمئن چہرے کے ساتھ پورے خدامہ کے ساتھ مل کر اپنی آپ کے لیے پانی گرم کرتی۔ اپنے آبا جی کے کپڑے نکالتی۔ ان کے لیے دلیا خورد پکاتی اور ان کاموں سے اُسے اس قدر تسکین ہوتی کہ وہ اپنے سارے دکھ بھول جاتی۔ اس کا ذہن بادلوں سے یوں چھٹ کر صاف ہو جاتا جیسے وہ کسی غریب کسان کی بیٹی ہو۔

گمرات سے خیالوں کا پُر اسرار اندھیرا اور نئی انگٹوں کے سرخ بھول سے کراتی اور رضیہ کو اندھیرے میں اپنے گوسے بدن پر جا بجا خون کے سرخ دھبے ہی دھبے دکھائی دیتے۔ وہ ریشمی کپڑے پہن کر اٹھتی۔ روشندانوں میں سے اندہ داخل ہوتی ہوئی ستاروں کی ٹپکی ٹپکی روشنی میں سنگار دان کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے جسم پر خوشبو پھرتی۔ میز پر بیچ کر لمپ جلاتی، اور سنہرے حاشیے والا بیڈنگ لال کر اپنے محبوب کے نام دیکھتی ہوئی آتشیں محبت میں ڈوبے ہوئے طویل خطا لکھنے بیٹھ جاتی۔ کئی خطوط بھانٹنے کے بعد وہ ایک خط کو تیرے پیار سے لفافے میں بند کرتی۔ لفافے پر اپنے محبوب کا نام لکھ کر اُسے چومتی۔ اس کے بعد اُسے دراز میں بند کر دیتی اور میپ بچ کر سو جاتی۔

صبح اٹھ کر جب وہ بے خیالی میں دراز کھوئی تو بند لفافے پر لکھا ہوا کسی مرد کا نام دیکھ کر حیران رہ جاتی۔ لفافہ کھول کر

جب خطر طعنی تو شرم سے اُس کا چہرہ سرخ ہو جاتا۔ اُسے کسی طرح یقین نہ آتا کہ وہ خط اُسی نے لکھا ہو۔ وہ جلدی سے اس خط کو غلاف سے نیکھ کر آتش دان میں پھینک کر جلا ڈالتی۔

گرمیوں کی چھٹیوں میں سعیدہ اپنے خاوند کے ساتھ سری گئی ہوئی تھی۔ وہ اپنی پرہیزگار ایک روز کے لیے ہری ناک ٹھہر گئے۔ بالکل دن لاہور آتے ہوئے پر دھیس نے رضیہ کو بھی ساتھ لے لیا۔ جب سے سعیدہ کی شادی ہوئی تھی۔ رضیہ اس کے گھر کبھی نہ گئی تھی۔ ویسے بھی وہ ایک لمبے عرصے کے بعد لاہور وارجی تھی۔ جب ان کی کار رضیہ کے کالج اور ہوسٹل کے تربیت سے گزری تو رضیہ کو کالج کے پرانے دینی یاد آئے۔ سعیدہ کا گھر شہر سے باہر کنال تک پہنچا ہوا تھا۔ یہ گھر بڑا خوبصورت اور صاف ستھرا تھا۔ ہر کمرے میں روشنی، گرمی، اندک اور سوسائٹی کی دھوپ تھی۔ رضیہ بیان بیچ کر اپنے اندر ایک نئی زندگی محسوس کرنے لگی۔ سعیدہ کا خاوند اس کا بہت خیال رکھتا۔ اسے ہر روز صبح شام نہر کنا سے سیر کروانا۔ شہر سے واپس آتے ہوئے اس کے بٹے سے رنگین انگریزی رسلے خرید کر لاتا۔ تقریباً ہر روز ہی ان کا سینما جانے کا پروگرام بن جاتا۔ سعیدہ کو کبھی کبھی اپنے خاوند کی طرف سے رضیہ کی یہ ناز برداریاں کچھ ناگوار سی گزرتیں۔ مگر وہ ان باتوں پر زیادہ سوچ بچار نہ کرتی۔ ایک روز یہ لوگ زبیدہ کے ہاں گئے۔ زبیدہ کی صحت پہلے کی نسبت کافی کمزور ہو گئی تھی اور اس کی بڑی بڑی آنکھوں کے گرد حلقے سے نوازا ہوا ہو گئے تھے۔ زبیدہ کی ساس اور خنداؤں نے اُن کی بڑی آذ بھگت کی۔ رضیہ کو فوراً احساس ہو گیا کہ اس گھر میں زبیدہ سے اچھا سلوک نہیں ہوتا۔ اور وہ ہاں خوش نہیں ہے۔ اس کے باوجود زبیدہ نے رضیہ سے کچھ نہ کہا۔ رضیہ نے اکیلے میں جا کر اپنی بڑی سہی سے صحت کچھ پوچھنا چاہا مگر زبیدہ نے کوئی بات نہ کی۔

”تو پھر باجی یہ حالت کیا بنا رکھی ہے؟“

زبیدہ نے رضیہ کو اہستہ سے اپنے ساتھ لگایا۔

”کوئی حالت خواب نہیں۔ وعدہ کرو کسی سے کوئی بات نہ کر دو گی؟“

دونوں ہسٹل کی آنکھوں میں آنسو تھے اور زبیدہ دونوں پر کسا ہت تھی اور دونوں نے ایک دوسری سے وعدہ کیا کہ وہ کسی سے کچھ نہ کہیں گی۔ سب کچھ سہیل کی اور خاموش رہیں گی۔ سہیل کو ڈاکٹر صاحب بھی ہسپتال سے آگئے۔ انھوں نے مہمانوں کو دیکھ کر ترچھ کی طرح بازو دلاتے ہوئے پر دھیس سے مہمان کیا اور سعیدہ اور رضیہ کو وہاں دیکھ کر خوشی سے بھدکنے لگے۔

”میں تو آج ناراض ہی تھا۔ فون کر دیا ہوتا۔ چلو اچھا ہوا۔ زبیدہ! انھیں کچھ کھلایا یا بھی ہے یا نہیں؟ مگر تو اب تھپاؤں گہاں ہلائے گی۔ تو تو پوری بڑھرا ہے؟“

زبیدہ نے فطرس جھکائے سکراتی رہی اور اس کی ساس بھی ہنستی رہی اور اس کی ننہیں اپنے بھائی کی جیب سے چاکلیٹ نکال کر کھانے لگیں اور رضیہ پر یہ بات واضح ہو گئی کہ زبیدہ کی صحت کبیر خراب ہے۔ چھاپڑا کرٹنے بے تکلف ہونے کی کوشش کی مگر رضیہ نے اُسے کوئی لفٹ نہ دی۔ اسے ڈاکٹر کی وہ فطرس سخت ناپسند تھیں جی سے وہ اسے گھبرا کرتا تھا۔ یہ نظر ہی مکر وہ

چمکیوں کی طرح اسے اچھٹے کپڑوں کے اندر بنگتی محسوس ہوتی تھیں، چادر کے بعد رضیہ، سعیدہ اور پروفیسر کنال بیگ اپنے گھر آ گئے۔ اگلے روز آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور برسات کی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی — سعیدہ کے خاوند نے رضیہ کو ساتھ لیا اور سعیدہ سے یہ کہہ کر وہ دروازہ کھولنے کے بجائے بیٹن میں آ گئے۔ بادل گہرے ہو گئے تھے اور مال پر اندھیرا سا چورہ تھا۔ شیزانی میں تیناں جلا دی گئی تھیں۔ وہ دونوں گیلری میں جا کر بیٹھ گئے۔ وہاں اور کوئی نہ تھا۔ رضیہ پروفیسر کے ساتھ، ایسے پرسکون ماحول میں بیٹھی بے حد خوش تھی اور اس کے زردی مائل گندمی چہرے پر مسرت کا بھرپور احساس تھا۔ پروفیسر نے چائے کے ساتھ بہت کچھ منگوا لیا۔ رضیہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”مگر بھائی جان یہ اتنی ساری چیزیں کھائے گا کون؟“
”ہم کھا لیں گے۔“

اور انشا کھر اس نے ایک کپڑے بغیر خود اٹھایا اور دوسرا رضیہ کے منہ میں ڈال دیا۔ دونوں ہنس پڑے اور باہر ایک دم مینہ برسنے شروع ہو گیا۔ رضیہ کو اپنے کھر والے کمرے کا خیال آ گیا۔ کیا خبر وہاں بھی بارش پوری ہو؟ رضیہ کو اپنے کھر والے کھر اور اس کمرے سے کچھ ایسا لگاؤ ہو گیا تھا کہ وہ قریب رہ کر اچھی سے بھاگتی تھی اور دُور جا کر اسے بہت یاد کیا کرتی تھی۔ وہ کچھ اداس سی ہو گئی۔ اسے اپنی پرانی اور حالیہ زندگی کا خیال آ گیا۔ وہ کہاں جا رہی ہے؟ وہ کہاں جائے گی؟ وہ زندگی سے کیا جا رہی ہے۔ اسے گم ہونے کا؟ خدا جانے وہ کیا کھوئے، کیا پائے۔ کیا چاہیے اور اُسے کیا ملے۔

پروفیسر نے سگریٹ سٹاک کر رضیہ کو فوراً دیکھا۔

”پپ کیوں ہو گئیں؟“

”کچھ نہیں۔“

پروفیسر نے اسی طرح منہ بنا کر کہا ”کچھ نہیں؟“

دونوں ہنسنے لگے۔ رضیہ نے چائے کی پیالی میز پر رکھ کر باہر کھر کی میں سے نظر اُٹانے والی بادش کی جھار کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”بھائی جان ایک بات بتائیں گے؟“

”کیا؟“

”آپ شادی کر کے خوش ہیں؟“

پروفیسر خاموش رہ گیا۔ اس کے دُبلے چہرے سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اس سوال کا جواب کبھی نہیں دینا چاہتا تھا۔ اُس نے تسکینی ہوئی پُرسوزہ آنکھیں مسکراتے ہوئے دیکھا اور خشک سی آواز میں بولا:-

”شادی کر کے ہم لوگ نہ ٹھنکی ہوئے ہیں نہ ٹھنکی، صرف شادی شدہ ہوئے ہیں۔“

”نہیں کچھ بڑا بنا بیٹھے۔“

رضیہ بچوں ایسی منہ کرنے لگی اور پروفیسر کچھ پریشان سا ہو گیا۔

”اے اے بیٹی، میں خوش ہوں، بہت خوش۔“

رفیقہ خاموش ہو گئی۔ پردہ فیر بھی خاموش ہو گیا۔ باہر بارش پانی ہو گئی۔
پردہ فیر نے کہا:۔

”مقام بھی شادی کرو رفیقہ! تمہارا علم اور پختہ ہو جائے گا۔“
رفیقہ شرمائی۔ وہ کچھ نہ بولی۔

”میں چاہتا ہوں تمہاری شادی خود کرواؤں۔ سب کچھ اپنے ہاتھوں کروں، تم، جماعتی پیاری، اتنی ذہین، اتنی قیمتی لڑکی ہو۔ تمہیں میرے لیے تو کسی شہزادے کو آنا چاہئے۔ سوچتا ہوں کسی روز چپکے سے ہسپانیہ کے سبز زاروں میں نکل جاؤں اور سر دیکے جھنڈوں تلے سوئے ہوئے کسی اندلسی شہزادے پر چمک کر کموں، میرے ساتھ آؤں میں نے تمہارے لیے شہزادی دھونڈ لی ہے، اور پھر میں اسے لے کر تمہارے پاس آ جاؤں اور بڑی دھوم دھام سے تم دو دنوں کا بیاہ رجاؤں اور“

پردہ فیر نے چونک کر چہرہ کو دیکھا۔ وہ، یقیناً میں چہرہ چھپائے ہوئے ہی تھی۔ اس کا گزور جسم کانپ اٹھا۔ اور سکون کی آواز اُڑی تھی۔ پردہ فیر گھر گیا۔ اس نے بغیر سوچے سمجھے رفیقہ کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر بڑے پیار سے کہا۔
”آنسو روک لو! اندلسی شہزادی! تیرا شہزادہ برقی رفتار گھوڑے پر اڑا چلا آ رہا ہے۔ آنسو پونچھ لو.....“

اندلسی شہزادہ ابھی کافی دور تھا۔ لیکن سعیدہ شیراز کی گیلری میں ضرور پہنچ گئی تھی۔ پردہ فیر نے گھبرا کر اپنا ہاتھ اٹھالیا اور
بناوٹی مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے بولا

”یا گل لڑکی! یونہی روئے ٹک پڑی۔ کہنے لگی گھر یاد آ رہا ہے۔“

سعیدہ نے کوئی جواب نہ دیا اس کا چہرہ کبھی زرد ہو رہا تھا اور کبھی سرخ۔ بدلتا نہیں کی نیند بڑی کم جاتی ہے۔ وہ
نرالی آہٹ پر چونک اٹھتی ہیں۔ سعیدہ کا تنک یقین میں بدل چکا تھا۔ رفیقہ آنسو پونچھ رہی تھی۔ دل اس کا بھی دھڑک رہا تھا۔ لیکن
وہ طبعاً ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑی بلند لڑکی تھی۔ اُس نے سعیدہ سے کوئی بات نہ کی۔ سعیدہ نے پانی کا ایک گلاس
پینے کے بعد اپنے خاوند کو بتایا کہ وہ کچھ سامان خریدنے آئی تھی اور پونہمی شیراز میں آگئی کہ شاید اُس کا خاوند یہاں ہو۔ اس
کے بعد یہ لوگ وہاں سے اُٹھے اور گھر آ گئے۔ سعیدہ نے راہ میں رفیقہ سے کوئی بات نہ کی۔ گھر پہنچ کر بھی کوئی بات نہ کی۔ وہ بیسے
گمراہ سی ہو گئی۔ جو کبھی کلیلی جمیت رکھنے کے باوجود اُسے کچھ ایسا دھکا لگا کہ وہ ایلیم بٹھوس گئی۔ رفیقہ کو ایسی حالت میں وہاں رہنا پڑا
ناگوار لگا۔ اُس نے سعیدہ کے خاوند سے کہا کہ وہ گھر مانا جا رہی ہے۔ سعیدہ کا خاوند رفیقہ کو بالکل زبردست سکا۔ اُس نے رفیقہ کو
کار میں بٹھلایا۔ جو حال ناممکن سا تھا۔ یادداشتیں پر آ گیا۔ یہ کی کی روایتیں میں آدھ گھنٹہ باقی تھا۔ وہ دونوں۔ لیفرٹنٹ دوم میں آ کر بیٹھ گئے۔
پردہ فیر نے کوئلہ ڈرکس منگوالیں۔ اور وہ انھیں خاموشی سے پینے لگے۔ دونوں کے غمزدہ دل اس وقت تھے۔ دونوں کی آنکھوں میں
نظر نہ آنے والے آنسو تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے کچھ کہنا چاہتے تھے اور کہ نہ سکتے تھے۔ آخر پردہ فیر نے اپنے مخصوص
لہجے میں کہنا شروع کیا۔

”سوچو کچھ تو اسے مجھے اس کا بہت دکھ ہے۔ میں جانتا ہوں تمہیں صدمہ پہنچا ہے۔ میں تمہارے لیے بہت کچھ کرنا
چاہتا ہوں لیکن کچھ نہیں کر سکتا۔ میں تم سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ مگر ایک بات مجھ نہیں کہہ سکتا۔ اور شاید کبھی نہ کہہ سکوں۔“

تم ذہین اور پرمعی کلمی لو کی ہو۔ میری ذہنی کیفیت کو اچھی طرح پرکھ سکتی ہو سو جتنا ہوں اس گھڑی دو گھڑی کی دوستی میں ہم نے کیا پایا ہے۔ تم اپنے گھر جا رہی ہو۔ میں پھر کلاچ کی پرانی گیر پلٹوں گا۔ شاید اسی میں ہم دولوں کی بھلائی ہو۔ دولوں خاندانوں کی بھلائی ہو۔ ہم اپنے خاندان کے لیے زندہ رہو اور میں اپنی بیوی کے لیے۔ ہم میں کوئی بھی اپنے لیے زندہ نہیں ہے۔ ہم یہاں اپنے لیے زندہ نہیں رہ سکتے ہاں اپنے لیے ضرور رہ سکتے ہیں۔ اداس نہ ہونا۔ آزدہ نہ ہونا، شاید ہم کسی دوسرے جہنم میں، کسی نئے روپ میں ملیں۔
رضیہ پر موت ایسی خاموشی طاری تھی۔ وہ صرف سُن رہی تھی۔ وہ ہمیشہ صرف سننا چاہتی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے کوئی اس کے زخموں پر ہنسنے مرحم کے پھاسے رکھ رہا ہے۔ پلیٹ فارم پر گاڑی کے انجن اور ڈبلوں کی گونگناہٹ سنائی دی۔
”گاڑی آگئی ہے۔ چلو چلیں۔“

رضیہ ہستہ سے اٹھی اور پرنیسر کے ساتھ بائبل پیٹ فارم پر آگئی۔ پرنیسر نے اسے بیکند نکلاس کے زمانہ ڈبے میں سوار کروا کر ملازم کو ساتھ دانے ڈبے میں بٹلادیا۔ ریل کے انجن نے آخری سیٹی دی۔ پرنیسر نے رضیہ کو دیکھا۔ وہ گھڑی کے ساتھ سر لگائے اداس لگا ہوں سے پلیٹ فارم کے فرش کو دیکھ رہی تھی۔ گاڑی کھینکے گئی تو رضیہ نے چہرہ اوپر اٹھایا۔ دھواں، شور، گرد، دھند، آوازیں۔۔۔۔۔ تیز، بلند بچوں سے ملتی سمجھتی آوازیں، روک، نو، روک، نو، گاڑی روک، نو، رضیہ کا سر گھڑی کی چوٹ سے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور گاڑی بڑی تیزی سے شور مچاتی ہری ناگ کی طرف آڑی جا رہی تھی۔

.....

تیسرے ہی روز سیدہ نے شیزان میں پیش آئے ہوئے حادثے اور اس سے پہلے کے کئی ایک واقعات کی پوری تفصیل بڑی آج کو لکھ چکی۔ رضیہ کی والدہ سُن ہو کر وہ گئیں۔ ایک لمحہ کے لیے انہیں کچھ سمجھائی نہ دیا۔ خط کے آخر میں سیدہ نے لکھا تھا کہ اگر اب رضیہ کو اس کے گھر آنے کی اجازت دی گئی تو اس کے گھر کی چادریں دیں، برسر کر پڑیں گی۔ بڑی آج نے خط بند کر کے بڑی الماری کے پچھلے دروازے میں مغل کر دیا۔ انہوں نے رضیہ کے والد کو اس حادثہ سے آگاہ کرنا مناسب خیال نہ کیا۔ دو تین دن گزرتے چلتے پراختوں نے رضیہ کو بلایا اور بڑی تدبیر اور دانشمندی کے ساتھ اُسے پیار کرتے ہوئے سمجھنے لگیں۔

”اگر سیدہ کے سسرال دے تھیں، اچھا نہیں سمجھتے میری بیٹی، تو پھر اُن کے ہاں جانے کا ناٹھ، بہنیں جواب اپنے گھروں میں چادریں تو وہ دور کی رشتہ دار کبھی جاتی ہیں۔ میں جانتی ہوں تم پہلے یاد اُن کے ہاں گئی تھیں اور تمہارا ساتھ انہوں نے کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔ لیکن خیر تمہارے ایسی پرمعی کلمی لو کی کو ایسی باتوں کا برا نہیں ماننا چاہئے۔ بہتر یہی ہے کہ ادھر کا ماسٹر مولی جاز اب جاؤ اور خدا دے کہ کو کبیرے لیے دلیا اور سبز چادر تیار کر کے لے آئے۔“

رضیہ کے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی وقت نہ تھی کہ جو کچھ ہوا ہے، اس کا علم بڑی آج کو بھی ہو جائے۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ سیدہ نے اُمی کو خط لکھا ہے۔ اُسے اپنی اس قدر بے عزتی محسوس ہوئی کہ وہ اپنے کمرے میں جا کر ٹیبل پر گر پڑی اور ٹیکسوں میں برسے کہ جی تھر کر رہی، ان دکھوں کو بھی روٹی جو اس پر میت کچلے تھے۔ ان دنوں پر بھی روٹی تھیں وہ اٹھا رہی تھی اور اُن پر بھی روٹی جو اُسے اٹھانے تھے۔ تین دن تک کمرے میں بند رہنے اور کسی کے بلائے پر بھی باہر نہ نکلنے کے بعد اُس نے جو سترے روز شام کو اٹھ کر غسل کیا۔ کپڑے بدلے۔ سر پر اپنے مخصوص انداز میں دوپٹا اوڑھا، لیپ جلیا اور دیاں کرستوف، کھول کر بیٹھ گئی۔ جوں جوں وہ لمبے پڑھ

رہی تھی۔ اس کے اندر طاقت، ہمت، دلیری اور توانائی کا شدید احساس بکھڑا تھا۔
کھلی کھڑکی میں سے بارش کی طوفان سے لہجوں کے جھولوں کی خوشبو اندر داخل ہو رہی تھی اور رولڈاں کمرہ ملا تھا۔

“O, LIFE, I SOUGHT THEE IN MYSELF, IN MY OWN
EMPTY SHUT-IN-SOUL. MY SOUL IS BROKEN.
THE SWEET AIR POURS IN THROUGH THE WINDOWS
OF MY WOUNDS. I BREATHE AGAIN. I HAVE
FOUND THEE ONCE MORE. O, LIFE! HOLD THY
PEACE, AND LISTEN.....”

انگشت کی آخری تانہ نہیں تھیں کہ زبیدہ اپنے خاندان کے ساتھ ہمراہی ناگ آگئی۔ وہ پورے دنوں سے تھی۔ اور بانی روایات کے مطابق اپنے پیسے بچے کو ماں باپ کے گھر جمع دینا چاہتی تھی۔ اس کا خاوند پورے ساڑھو سالان کے ساتھ لیس ہو کر آیا تھا۔ زبیدہ آتے ہی بستر پر پڑ گئی۔ وہ بڑی کمزور ہو گئی تھی۔ پہلے سے بے حدود بلی اور تحیف دکھائی دے رہی تھی۔ پانچویں دن، رات کے کسی لمحے جبکہ رضیہ اپنے کمرے میں انفسردہ گال تلنے پر کمرے کی سوری تھی زبیدہ کے ہاں بھول سی لڑکی پیدا ہوئی۔ رضیہ کو صبح خبر ملی۔ اس نے بچی کو اٹھا کر بڑا پیار کیا۔ بچی کا باپ بھی پاس ہی کھڑا تھا۔ وہ بھی بچی پر جھک کر اُسے پیار کرنے لگا اور رضیہ کو اس قسم کی بوسہ دے دیا کہ وہ ناگلوں کے اُٹے پر بہت سے گھوڑوں کے درمیان کھڑی ہو۔ اور اس نے جلدی سے یونہی مسکراتے ہوئے بچی کو ماں کے پہلو میں لٹا دیا۔

ڈاکٹر ایک ماہ کی رخصت سے کر دیا تھا۔ وہ چوبیس گھنٹے گھر پر ہی رہتا تھا۔ صبح شام سیر کو جانا، ادنیٰ کی میل کا چکر لگا کر سینے میں تیرہ دینا کانتیا بڑے کمرے میں داخل ہوتا اور ٹوٹ کھول کر صوفے پر ادندھے مندریٹ کر بیٹے کے لیے سانس لینے شروع کر دیتا۔ وہ سعیدہ کے کمرے میں سوتا تھا۔ اور سعیدہ کا کمرہ رضیہ کے کمرے سے ملتی تھا۔ رات خبر ڈاکٹر کے بے ہنگم خزانے رضیہ کو بے آرام رکھتے۔ دن میں وہ کسی بھی وقت رضیہ کے کمرے میں آن و چھٹنا اور کبھی میز پر رکھی ہوئی کتابوں کو اُلٹے پلٹے لگتا اور کبھی صوفے میں دھنسن کر گڈیٹ پر گڈیٹ پڑے جاتا۔ اور ادھر ادھر کی بے مقصد باتیں شروع کر دیتا۔ رضیہ کو بے جا مداخلت بڑی ناگوار لگتی لیکن اپنی بڑی سہن کے مزہ کو چھپ ہو کر رہ جاتی۔ وہ جانتی تھی کہ زبیدہ کی زندگی سمسراں میں پہلے ہی کوئی زیادہ اچھی نہیں ہے۔ ایک دو بار اُس نے دروازہ اندر سے بند کر کے بھی دیکھ لیا۔ اس طرح اور قیامت برپا ہو جاتی۔ دروازہ باہر سے زور زور سے بجایا جاتا۔ اور رضیہ کو مجبوراً چٹخنی کھول دینی پڑتی، اندر آتے ہی ڈاکٹر بڑے تعجب سے ادھر ادھر دیکھتا اور کہتا —

”بھئی دروازہ تو کھول رکھا کرو۔ اور نہیں تو کم از کم تازہ ہوا تو اندر آتی رہے تمہاری صحت پہلے ہی کمزور ہے؟“

رضیہ کوئی نہ کوئی سہانہ بات نکال دیتی۔ پھر وہ رضیہ کے پاس آ کر میز پر جھک کر پوچھتا۔

”کہیں میں تمہارے مطالعے میں غلطی تو نہیں ہوتا؟“

”جی نہیں مباحی جان! بالکل نہیں“

”ٹیک ہے۔ اور تمہیں اتنا پڑھنا بھی نہیں چاہئے۔ تمہاری آئی سائٹ بالکل خراب ہو کر رہ گئی ہے۔“

رضیہ کتاب پر نظر میں جھانکتے ہوئے کہی کہ کیا کرے؟ کتاب بند کر دے یا پڑھتی رہے؟ اگر وہ پڑھتی رہے تو ایک لفظ بھی نہ پڑھ سکے گی اور اگر کتاب بند کر دے تو اس جھڑے پر کچھ سے بات کیا کرے؟ وہ اسی گلو کے عالم میں مبتلا رہتی اور ڈاکٹر باتیں کرتا، سگریٹ پر سگریٹ پیتا موندے میں دھندسا تا میں پڑا نکلیں بیسارے اور نکلنے لگتا۔ اسے ادھکنا دیکھ کر رضیہ فوراً کتاب بند کر تی اور دسے پاؤں واپس سے نکل بیسیدہ کے پاس جا کر بیٹھ جاتی اور اس کی پیچھے سے کیسلے لگتی۔ اسی وہ آئی کر بیٹھی ہی ہوتی کہ زور سے ہانسنے کی آواز آتی اور ڈاکٹر اندر داخل ہوتے ہی ہوں، ہوں، ہوں، کرتا پیچ کر بے تحاشہ چمن شاور رو کر دیتا۔

رضیہ زندگی میں کبھی کسی شے سے اتنی عاجز نہ آئی تھی۔ وہ کبھی اس قسم کی گھٹیا ذہنی الجھن میں گرفتار نہ ہوتی تھی جس قسم کی الجھن میں وہ ان دنوں گرفتار تھی۔ وہ کچھ نہیں سکتی تھی کہ ایسی باتوں سے ڈاکٹر کا مطلب کیا ہے۔ لیکن ایک دن یہ مطلب اس کی سمجھ میں آ گیا۔

ایک رات پڑھنے کے بعد اس نے کاپی نکال کر اپنی دائری لکھنا شروع کر دی۔ بڑی دیر ہوئی اس نے دائری کو ہاتھ نہ لگایا تھا۔ اور اس دوران میں حادثات کا ایک ہجوم اکٹھا ہو چکا تھا۔ چنانچہ وہ لکھنے بیٹھی نہ لکھتی ہی جا رہی تھی۔ دس گیارہ بجے رات کے ساڑھے بارہ بج گئے اور رضیہ کا تیرھواں ہی طرح چل رہا تھا۔ میپ میں تیل ختم ہونا شروع ہو گیا۔ وہ پیلے ٹائٹل اور پچ کا پینٹ لگا رہی تھی۔ تھوڑے گھبراہٹ میں سے روڑ پر مرم پتیاں لگیں، انصاف مل کر لکڑی کے بتے ہوئے چنار کے پتے میں جھانکا اور میپ بچھا دیا۔ لیپ بگاڑا۔ ابھی اس نے میپ کی ترمیم شروع کی کہ رضیہ کی دائری لکھنا شروع ہو گیا تھا کہ اسے اپنے صنف میں غالبی پر کسی کے پوچھنے بدھوں کی چاہ سنا دی۔ اس نے پنڈ کو پیچھے دیکھا۔ اس کے پیچھے ڈاکٹر آگیا تھا۔ سگریٹ اس کے منہ میں سلگ رہا تھا اور اس کی نچوڑ اکھیں سرخ تھیں۔ رضیہ غیر شعوری طور پر چوکنی ہو گئی اور اس کا دل بڑی طرح دھڑکنے لگا۔ لیکن اس نے اپنا اضطراب بڑی مشکل سے دبانے ہوئے نامدل انداز میں مسکرا کر پوچھا۔

”آپ اس وقت جہاں جان؟ نیند نہیں آتی ہوگی۔ ساریڈولی دوں؟“

لیکن ڈاکٹر نے کوئی جواب نہ دیا۔ بلکہ ادھر ادھر دیکھا اور رضیہ پر جھک کر ہستہ سے بولا۔

”کوئی نہیں ہے۔ سب سو گئے ہیں۔ سب سو رہے ہیں۔“

اور اس کے ساتھ ہی رضیہ کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ رضیہ کے پیسے پر بڑی ہانڈ گھڑی تھی۔ اب سب بھر پ بھلا رہتے۔ وہ جلد سے

کرچی چوڑا کھڑکی ہوئی اور ڈاکٹر کا بعد ازاں پڑے جھنک دیا۔

”آپ کیا چاہتے ہیں؟“

ڈاکٹر نے لمبائی ہوتی ہوسناک نگاہوں سے رضیہ کو مرستے کے کپڑوں تک نگہا اور بالکل کئی طرح جھپٹ کر اسے اپنے ساتھ پٹا

لیا۔ پہلے تو رضیہ ایک دم کس ہو کر رہ گئی اور ڈاکٹر کی ہانہوں میں مرہ لاش کی مانند لٹ گئی۔ مگر فوراً ہی جیسے اس کے اندر ایک شدید جھک لگا جس نے اس کے سارے جسم میں آگ لگا دی۔ اس کے ہونٹوں، کانوں اور آنکھوں سے چنگاریاں بدلت کر ٹوٹنے لگیں۔ اس نے ایک ہاتھ ہاتھ نکال کر ڈاکٹر کے منہ پر اس تندہ پر طعنا مارا کہ وہ لڑکھڑکاتے ہوئے جاگرا اور شدید ہو کر رہ گیا۔

”نکل جاؤ۔ نکل جاؤ۔“ مگر نہ میں شور مچا دوں گی۔“

رضیہ کی آواز نہ رہی تھی اور اس کے خنک ہونٹوں پر جھاگ اڑ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے ایک گہری صنف آلود گما سے دیکھا

اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ رضیہ نے جلدی سے دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھائی اور اپنے آپ کو ٹھیک سنبھالے دروازے کے ساتھ لٹک کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا سارا جسم ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ اور ٹانگیں اب پیٹے سے زیادہ کانپ رہی تھیں۔ اس نے پلٹ تک جانا چاہا۔ لیکن دو قدم اٹھانے پر ہی اس کی ہمت جو اب دے گئی اور وہ گر پڑی اور قالین پر اپنا چہرہ رلے تے ہوئے بچوں کی مانند بیٹھ پڑی۔ اس شرمناک گھناؤنے منظر کا تصور اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں کیا تھا۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے کسی نے اُسے گتے بدر و گے دلدل میں گرا دیا ہو۔ جہاں سے نکلنے کے لیے وہ ہاتھ پاؤں مار رہی ہو مگر باہر آنے کی بجائے اور نیچے چلی جا رہی ہو۔ ساری رات وہ قالین پر پڑ ہی رہی رہی۔ پچھلے وقت کہیں روتے روتے اُسے زندہ آگئی۔

جب اُس کی آنکھ کھلی تو اُس نے دیکھا کہ سنہری دھوپ کھڑکی میں سے اندر داخل ہو رہی ہے۔ وہ قالین پر اوندھے منہ پڑی ہے اور اُن کے گال کے نیچے قالین کا بؤرہ مندار ہو رہا ہے۔ اُس کا سارا بدن ڈکھ۔ ہا تھا۔ کھلی کھڑکی کے سائے کھڑکی ہو کر اُس نے باہر بارغ میں پھیلی ہوئی روشن دھوپ میں چڑیلوں کی چمکار بس سنیں اور رات کے واقعات پر غور کرنے لگی۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے رات اُس نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہو۔

دوبہر تک رضیہ اپنے کمرے سے باہر نہ نکلی۔ بوڑھی خادوم نے اُسے کھانا بھی دین لاکر دیا جو اس نے تھوڑا سا کھا کر ڈھیسے ہی چھوڑ دیا۔ تاخیر اس کی بیماری اور زہیدہ خود اس کے کمرے میں آئیں۔

”کیا بات ہے میری بیٹی؟ آج ہمارے پاس نہ آؤ گی؟“

”میں انہیں سب کچھ معلوم تو نہیں ہو گیا؟ رضیہ کا دل شرم اور مذمت سے ڈبسنے لگا۔

زہیدہ نے بڑے پیار سے اس کے گلے میں ہاتھیں ڈال دیں۔

”چلو رضیہ باہر بیٹھتے ہیں، آؤ نا؟“

رضیہ کو معاً یوں محسوس ہوا جیسے اس کے گلے میں ڈاکٹر نے اپنی بعدی سی ہاتھیں ڈال رکھی ہوں۔ وہ سمجھتی تھی۔

”آئی ہوں باجی، ابھی آئی ہوں آپر جی، یونہی ذرا پڑھنے بیٹھ گئی تھی۔“

”اتنا مت پڑھا کرو ویری بیٹی۔ پہلے ہی بڑی کمزور ہو۔“

رضیہ نے مسکرا کر کہا۔

”اب نہیں پڑھوں گی آپر جی۔ اب نہیں پڑھوں گی؟“

زہیدہ نے پوچھا۔

”کیوں؟“

اور رضیہ نے چونک کر کہا۔

”اوہاں — ساری کتابیں ختم ہو گئی ہیں۔“

زہیدہ اور اتنی باہر چلی گئیں۔ رضیہ تنہا رہ گئی۔ وہ باہر جاتے ہوئے گھبراہٹ تھی۔ وہ ضرور باہر کھڑا ہو گا۔ وہ اُس کا انتظار کر

رہا ہوگا۔ جانے باہر کیا ہو جائے، تیسرے پر وہ زبیدہ کے کوسے میں گئی۔ ڈاکٹر وہیں بیٹھا تھا دونوں میں سے کسی نے ایک دوسرے کو دیکھنے کی جرأت نہ کی۔ رقیہ بھی سے گھباتی رہی اور ڈاکٹر زبیدہ سے باتیں کرتا رہا۔

.....

دوسری صبح رقیہ نے بستر پر سوتے ہی سنا کہ ڈاکٹر اپنی بیٹی اور زبیدہ کو سہ کو واپس چلا گیا۔ اسے یوں لگا گویا کسی نے اس پر سے ہست بڑا بوجھ اٹھا لیا ہو۔ اس نے آتی تے زبیدہ باجی کے اکیدہ پہلے جانے کی وجہ پوچھی۔
 ”میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ وہ ایک ایسی تیار ہو گئے تھے اور چلے گئے۔“
 رقیہ نے اطمینان کا کلمہ اس نسل لیا اور غل غلے میں ہنسنے کے لیے جلدی۔

مردم با شروع ہوا تھا کہ بڑی ناگ میں بائی کوٹیوں کے پڑنے۔ بہت پرانے بوسہ جو بیٹا مکان کی خستہ دیواروں کے نیچے کھ کھلی زمین میں سوئے ہوئے مرد لادے میں کہیں سے ایک چنگاری چھوٹی اور دیکھتے دیکھتے لاؤ گھنٹی، کھوٹی، کھسکتی سی، آگ کی کہ بھڑبھادیوں سے ٹکرانے لگی۔ اوپر ایک نرلا سا آگیا۔ اور پوڑھی، بھڑکیوں بھری دیوار میں کا پٹے لگیں۔ یہ وہ نرلا تھا جو ہر اس پڑانے بھڑکنے کی دیواروں کو ٹپے کا ڈھیر بناتا ہوا گڑبڑاتا ہے۔ جو صدیوں سے ایک ہی جگہ آباد زمین سے زندگی کا بون بھون رہا ہو۔ آخر زمین کا سیدھا تختہ ہو جاتا ہے۔ اور درختوں کی جڑیں سرکھ جاتی ہیں۔ وہ نظاہر تن اور اور تنہا ہوتے ہیں۔ لیکن اندر ہی اندر ان کا سارا گروا دیا ایک ذوہ ہوتا ہے اور وہ طوفان کے پہلے ہی حملے میں لوٹکھڑا کر گر پڑتے ہیں۔ پھر اس حادثے کو آسمانی طاقتوں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اور یہ کوئی نہیں دیکھنا کہ ان کے جسم کو کھلے اور بنیادیں خستہ ہو چکی ہیں۔

میر غلام حسن شاہ نے وضع دار بزرگ تھے۔ انھیں اپنی حیثیت سے بڑھ کر خاندان کے ان افراد کی عزت کا خیال رہتا تھا جو مر کھپ گئے تھے۔ اور جنھوں نے اپنے وقتوں میں آئندہ نسل کا خیال کیے بغیر بے نیازی اور تن آسانی میں اچھی زندگی گزار دی تھی۔ آپ اپنے خاندان کی تعریف سننے کے لیے دوسرے اعلیٰ خاندانوں کی تعریف میں مطلب انسان رہتے تھے۔ اپنے رک رکھاؤ کے بے دوسرے رک رکھاؤ کا احترام کرتے تھے۔ چنانچہ آپ تہذیباً تہذیب کے کھلے تھے۔ جہاں ایک روپے سے کام نکل سکتا وہاں لاد رہتا پچ روپے خرچ کر دیتے اور انھیں اس خیال سے بڑی تسکین ہوتی کہ لوگ ان کی دیبا دی کو، اپنی کوئی خاندان کا طرہ امتیاز سمجھ کر تعریف کر رہے ہوں گے۔ جو کوئی ان کے پاس سوال لے کر آتا خالی ہاتھ واپس نہ جاتا۔ کئی بار جب وہ غلام حسن شاہ سے کسی نے تفرق کا سوال کیا تو آپ نے کسی دوسرے سے قرض لے کر اس کا سوال وعدہ کے مطابق پورا کر دیا۔ انھیں دوسرے کی غرض سے کوئی نسبت نہ تھی۔ وہ صرف اپنا تداراد خاندان کی وضع داری نبھا رہے تھے۔ کیٹی کے تمام ممبر آپ کے مقروض تھے اور آپ نے کبھی قرض کی واپسی کا قصہ نہ کیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ بھی مقروض ہو گئے۔ جنگ میں جو حضور بہت روپیہ جمع تھا اس کی سادھ پر دو گن سکوا ایا چکا تھا کہ پھر سے کے ایک کارخانے کا حصہ خرید لیا لیکن سود نہ ملنے سے کارخانہ تقریباً بند ہو کر رہ گیا۔ پراڈیٹ منڈ کا وہ بیرو پرانا خاندانی مکان رہن رکھ کر حاصل کی گئی رقم کے ساتھ ہی دونوں بیٹیوں کی شادی پر خرچ ہو گیا تھا۔ اب خراب گاہ

کی تجویز میں رکھے ہوئے چند سو روپوں اور نو روپات کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ نو روپات بھی ڈیڑھ ایک ہزار سے زیادہ کی مالیت کے نہ تھے۔ کچھ آپ کے والد گرامی زکوٰۃ جمع کر گئے تھے۔ اور کچھ سعادہ اور زبیدہ کو پہنایا گیا تھا۔ اس وقت اپنی گوری خاندان — چڑھنے اعلیٰ کشمیری خاندان پچیس ہزار کے قریب قرض چڑھا ہوا تھا اور مملکت دیواروں، بھاری پردوں اور موٹے افغانی تالیمنوں دلسے تاریکی مکان میں سوائے چند سو روپوں کے اور کچھ نہ تھا۔ میر صاحب نے یہ تاریک راز اپنی رفیقہ حیات ہر بھی خلعت نہ کیا تھا۔ اس خوفناک راز کو وہ اپنے ہی سینے میں چھپائے۔ قرض خواہوں کی نگاہوں سے بچنے میر تھے۔ کسی قرض خواہ کا ان سے اپنی رقم کا مطالبہ کرنا میر صاحب کے نزدیک نہ صرف ان کی بلکہ سارے خاندان کی موت تھی۔ چنانچہ وہ زیادہ وقت گھر پر ایسے کمرے میں ہی گزارتے تھے۔ مسلسل غم ناک اور پریشانی کی وجہ سے انھیں بلڈ پریشر کی شکایت رہنے لگی تھی۔ جو کہ بچوں تک میں روپے کا حساب دینے اور رہن شدہ مکان کی آخری تاریخیں قریب آرہی تھیں۔ آپ کا بلڈ پریشر بڑھ رہا تھا اور بال سفید ہونا شروع ہو گئے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں آرام کرنا پر نیم دراز آنکھوں کے سامنے اس صدیوں پرانے مکان کو دیکھ کر زمین پر گرے اور خاندان کے اعلیٰ افراد کو گلیوں میں دویدار پھرتے دیکھ رہے تھے۔ وہ کسی سے کچھ نہ مانگا سکتے تھے۔ وہ کسی کے سامنے اپنا باغیرت ہاتھ نہیں پھیلا سکتے تھے۔ ان خاندان کے بانی لوگوں کو بے یار و مددگار چھوڑ کر چپ چاپ مر سکتے تھے۔ یہ عظیم خود غرضی ایک عظیم خاندان کے شایان شان ہی ہو سکتی تھی۔ کچھ بھی ہو عظیم ذلت اور عظیم بد نصیبی کے دن قریب آرہے تھے اور میر صاحب ان کے مقابلے کے لیے بالکل تیار نہ تھے۔ وہ چپ جانے کی فکر میں تھے۔ میدان چھوڑ کر بھاگ جانے کی فکر میں تھے۔ چنانچہ ایک صبح جب کافی دیر تک ان کی خواہگاہ کا دروازہ بند رہا تو خادمہ نے اندر جا کر دیکھا۔ میر صاحب اپنے بستر پر مڑے ہوئے تھے۔ خادمہ بدحواس ہو کر بڑی آہو کی خواہگاہ کی طرف بھاگی اور ان کو خبر سنتے ہی غصہ آگیا۔ بوڑھی خادمہ نے روتے ہوئے انھیں سنبھالا اور لاتی پیچھی چلاتی چھوٹی آہنی کے کمرے کی طرف دوڑی۔ دفعہ پر جیسے بجلی سی گر پڑی۔ وہ بغیر دوپٹے کے کھلے بالوں سمیت اپنی امی کی طرف بھاگی۔ دیکھتے دیکھتے وہاں ایک کمرہ کھل گیا۔ پڈی، لاجور، کراچی، پشاور، ہر طرف تاریں دوڑ گئیں۔ دوسرے ہی روز قصبہ بہری ناگ کا پرانا حویلی نما مکان قائم کہ بنا ہوا تھا۔ دفعہ کو بار بار غصہ آ رہا تھا۔ بڑی آہو خورتوں کے درمیان میٹھی رومال چیسے پر رکھے مسلسل روٹے جارہی تھیں۔ سعادہ اور زبیدہ کی آنکھیں روٹنے سے بڑی طرح سوج رہی تھیں۔ زبیدہ کا خاوند ترشٹان میں گورکھوں کے سر پر کھڑا قریب کھڑا رہا تھا۔ اور سعادہ کا خاوند باہر برآمدے میں کرسی پر چپ چاپ بیٹھا کسی گری سوچ میں کھینچا ہوا تھا۔

کسی کو معلوم نہ ہو سکا تھا کہ موت کیسے اور کیونکر واقع ہوئی۔ میر صاحب رات کو اچھے محلے سوئے تھے۔ اور اس رات انھوں نے خلافت معمولی دفعہ کو اپنے کمرے میں ہلا کر بٹا پیا رکھا تھا۔ سب کا خیال تھا کہ موت وارث فیل جو جانے سے ہوئی ہے اور ڈاکروں نے بھی اس کی تصدیق کر دی تھی۔ لاش کے جسم پر کسی قسم کا کوئی نشان نہ تھا۔ صرف اوپر کے دانتوں میں ایک جگہ ذرا سٹون ٹکڑ لکڑ کر رہی ہو گیا تھا۔ شاید وہ مرنے سے پہلے کبھی گور پڑے ہوں اور پھر پلنگ پر دراز ہو گئے ہوں اور موت نے ان کے ذہن سے تمام اچھوتوں اور پریشانیوں کو سمیٹ کر واپس لے لیا ہو اور ان کی زندگی پر مجبوری کو سر ہر لگا دی ہو۔

اور بد نصیب دفعہ اور اس کی سفید بالوں والی شفیق تان!
تم لوگوں کو موت کب آئے گی؟

روشاہک کے دھندلے میں جب کہ تجھے کے کھلے کھیتوں پر ہند چھاری تھی۔ میر غلام حسن شاہ کو ان کے آبائی قبرستان میں دفنادیا گیا تھا۔ ایک ایک کر کے سب رشتہ دار بھگتے گئے۔ تیسرے ہی روز پرانے گھر میں سوائے سعیدہ، زبیدہ اور پروفیسر کے اور کوئی نہ تھا۔ ڈاکٹر بھی لاہور چلا گیا تھا۔ اس اعلیٰ خاندان کے باقیماندہ بد نصیب افراد پر اس بھید کا اب انکشاف ہوا تھا کہ ان پچیس ہزار روپے کا قرضہ ہے اور بدنامان بھی شہر کی ایک کمپنی کے پاس کر دی پڑا ہے۔ اُن لوگوں کے رہے سے ہوش بھی اڑ گئے۔ اب کیا ہوگا؟ اب تو سر چھپانے کو بھی کوئی جگہ نہ رہے گی۔ بڑی آپسے سعیدہ، زبیدہ اور پروفیسر سے مشورہ کیا۔ پچیس ہزار کی رقم کوئی معمولی رقم نہ تھی۔ سعیدہ کے پاس بنگلہ میں صرت اڑھائی ہزار روپیہ جمع تھا۔ اور ڈیڑھ ہزار قرضہ چڑھا ہوا تھا۔ زبیدہ بچاری کی تو خیر گھر میں اتنی حیثیت ہی نہیں تھی کہ وہ کسی سے کچھ مانگ سکے۔ سعیدہ کا خاندان سب سے زیادہ پریشان تھا۔ لیکن وہ کچھ نہ کر سکتا تھا وہ اپنی اُن کمزوری کے سامنے ایک انتہائی شریف خاندان کو محض ایک ڈوکی کھو کھلی وضعدار یوں کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھتے دیکھ رہا تھا اور اُسے کسی طرح بھی نہ بچا سکتا تھا۔ آخر بڑی آپسے تجویز پیش کی کہ روضہ کے لیے قاضی اصغر علی طرزی کٹر بیکار دانشمند نظر کر دیا جائے۔ یہ رشتہ پہلے سعیدہ کے لیے آیا تھا۔ لیکن محض اس لیے منظور کر دیا گیا تھا کہ قاضی اصغر علی کی عمر زیادہ تھی اور اس کی دو بیویاں فوت ہو چکی تھیں۔ قاضی اصغر علی مالدار آدمی ہے۔ اگر وہ روضہ کا رشتہ منظور کرے تو یہ خاندان تباہی کے غار میں گرنے سے بچ سکتا ہے۔ اس تجویز کی سب سے زیادہ مخالفت پروفیسر نے کی۔

”مخدا کے لیے آج میرا سنا کریں۔ اس سے تو بہتر ہو گا کہ آپ اپنے ہاتھوں رضیہ کو کونو میں دھکا دے دیں۔“
 سعید فوراً بول اٹھی۔
 آپ تو اس کی طرف داری کریں گے ہی۔ ہمارے گھر کی اینٹ سے اینٹ بچ جائے آپ کی جلا سے۔ آپ تو رضیہ کو پہچاننے کی فکر میں رہتے ہیں۔“

و جمعی طبعیت کا سوگ بسند پر و فیصر خاموش ہو گیا۔
 زبیدہ نے بھی باوڈی اٹھستہ اس تجویز کی حمایت کی۔ اسی وقت قاضی اصغر علی کے نام بڑی آپر کی طرف سے ایک خط لکھ کر آدمی شہر کی طرف دوڑایا گیا۔ دوسرے روز اس کا جواب آ گیا۔ قاضی اصغر علی کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ ہائی کورٹ کی خانقاہ مری طرح قریب میں چھینسا ہوا ہے۔ چنانچہ اس نے بعض باتوں کا بھانہ بنا کر رشتہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا نقد سب پر ادس ہو گئی۔ انھیں اس بات کا خیال ہی نہ رہا تھا کہ اگر وہ اپنی بیٹی کا سودا کر رہے ہیں تو دوسرے بھی باوڈی دیکھ قیمت ڈالتا ہے۔ بھلا ایسی دھن کو کون اپنے گھر بسانے کا جس کے پیچھے پچیس ہزار قریض نہوا ہوں کی ایک طویل قطار کھڑی ہو۔ دوسرے دن عیدہ اور زبیدہ بھی یہ کہہ کر اپنے اپنے گھر چل گئیں کہ وہ فی الحال آرام سے دیہات کو کوئی غیر خوشگوار بات ہو تو انھیں فوراً اطلاع کر دی جائے۔ گھر سے سب نے زیادہ خالی اور سسٹن دکھائی دینے لگا۔ رشتہ باننا کھیل کے لئے اپنی اکی کے پاس گئی اور اس کے گھنٹوں پر سر رکھ کر دینک روٹی پڑی۔

”یہ کیا ہو گیا ہے! ابوجی! ہمیں اس طرح کیوں چھوڑ گئے ہیں؟“
اور بوڑھی مدبر ماں نے ہاتھوں میں آٹے ہوئے آئینہ پیکر کر بیتی کو حوصلہ دینے لگی۔
”ہمارے یہی تقدیر تھی میری بیٹی! اؤ خدا سے دعا کر کہ وہ ہمارے گناہ معاف کر دے۔“

خدا نے ان کے سارے گناہ معاف کر دیئے تھے۔ بلکہ خدا کو تو ان کے گناہ یاد بھی نہیں تھے۔ ہاں دنیا میں رہنے والوں نے ان کی چھوٹی سے چھوٹی خطاطی معاف نہ کی تھی۔ چنانچہ گھر کے مالک کو فوت ہونے بشکل تین ماہ ہی گزرے ہوں گے کہ شہر کے بنک، جامعہ اودھوی رکھنے والی کمیٹی اور کپڑے کے کارخانے کی جانب سے اپنی اپنی رقم کی واپسی کے تقاضے شروع ہو گئے۔ کپڑے کے کارخانے کا حصہ میری صاحبہ اپنی زندگی میں ہی فروخت کر چکے تھے۔ بلکہ اٹھا کارخانے والوں سے چار ہزار روپے لے رکھا تھا۔ مکان سترہ ہزار میں گروہی چڑھا اور بنک کا مطالبہ کٹ لگا کر چھ ہزار روپے کا قضا۔ آہستہ آہستہ تقاضے شدید ہونے لگے۔ بنک کی طرف سے ہر تیسرے روز ایک آدھ یا دو تاشی خطا آجاتا۔ رہن پکینی سے جائیداد خالی کر دینے کا سہرا کاری نوٹس دیا دیا۔ گناہ خانے والوں کا ایک آدمی ہر روز آکر مکان کے بڑے دروازے کے باہر بیٹھ جاتا۔

غیر کی والدہ سے صبر و تحمل سے زبیدہ اور سعید کو لگا کر دیا تھا۔ پہلا خطا پورے پورے لکھا اور دو سترہ سیدہ کی طرف سے آیا۔ انھوں نے رضیہ اور بڑی آپ کو قہراً بہت مزوری اور تھپی سامان ساتھ لے کر اپنے اپنے ہاں آجائے کی دعوت دی۔ بڑی آپ نے زبیدہ کے ہاں جانے کا فیصلہ کیا اور مزوری سامان کی بیکلنگ شروع ہو گئی۔ رضیہ کے لیے اپنا قدیمی گھر چھوڑنا اور پھر ایسی جگہ پر اور بے بسی کی حالت میں چھوڑنا ایک عظیم صدمہ تھا جسے وہ دوسرے صدموں کے ساتھ اپنی پیٹھ میں جپا رہ گئی تھی۔

بڑھتی خاموشی اور اس کی بیٹی لاتی کے ساتھ کل کر پڑے کے بڑے صندوقوں میں ہتھی اور گرم کپڑے تہہ کر کے رکھ دی تھی۔ بڑھتی خاموشی بھی اس گھر کی تباہی نہ دیکھی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بھی آنسو سے اور آدمی رات کے وقت قابلیوں، پردوں اور آجوس کی فریج سے سب سے ہوئے اس پر اسے منہ ان ہدیوں کے پورے اس کے سفید بال پریشانی کے عالم میں اور کچھ اڑ رہے تھے۔ رات کے تین بجے تمام تھپی اور ساتھ سے جانے والا سامان صندوقوں میں بند ہو کر تیار ہو گیا۔ تین بڑے صندوق، دو سوٹ کیس اور دو بستر تیار کئے گئے تھے۔ بڑی آپ آتھن ان کے پاس سر میز پر گرم شالی اپنے جھکے ہوئے پورے کندھوں پر چھپے چپ چاپ بیٹھی تھیں۔ انھیں وہ دن یاد آ رہے تھے جب وہ پہلے روز اس گھر میں دلہن کی حیثیت سے آئی تھیں۔ کتنے روشن، پُر امن اور عمدہ دن تھے۔ وہ بناری کا مدار عروسی جوڑے میں بیوس بڑے کمرے کے وسط میں گہری سرخ سوزنی پر شہزادیوں کی طرح بیٹھی تھیں اور انھیں خوبصورت آنکھوں اور سرخ چہرے والی لڑکیوں نے گھیر رکھا تھا۔ وہ کس طرح ان پر ہونہ وار خدا ہو رہی تھیں! آج ان میں سے کوئی دکھا ہی نہیں دے رہی تھی۔ وہ سب خوبصورت آنکھوں والی سیلیاں کہاں چلی گئی تھیں؟ دکھ اور مصیبت کی اس جلیانگ گھڑی میں انھیں اپنے خاندان کا خیال آ گیا جو آج کے دن سے پچیس کے لیے ان لوگوں کو اس دن کے منافع کے لیے تنہا اور بے بار و بار دنگا رہا تھا۔ بڑی آپ نے سفید رومال والا کردار بڑھتا دکھا تھا۔ ان کے نکالا اور اُسے آنکھوں پر رکھ کر آہستہ آہستہ روئے لگیں۔

رضیہ اپنے کمرے میں ایک طرف ہو کر کھڑی دیواروں، اماریوں، میزوں، جھوٹوں اور پلنگ اور سنگار دان اور قابلیوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ اسے اپنا کمرہ سانس لیتا محسوس ہو رہا تھا اور اس کے در و دیوار گویا اس کے دکھی دلی کے ساتھ ساتھ دھڑک رہے تھے۔ کمرے کی اماریاں اور شیفٹ کتابوں سے غالی تھیں۔ میزوں کے دروازوں میں کوئی مندرجہ کار کاغذ نہ تھا۔ پلنگ پر صرف موٹا گڑا پڑا تھا۔ کلاس پر چھٹی کی دولہی منتقل ہوا تھا۔ پڑی تھیں اور ان کے اوپر تیرا سا کلاک ٹیمپ کی دھندلی روشنی میں

رات کے سواتین بجارہ تھا۔ کھڑکی بند تھی اور اس کے آگے قمری پردہ چننا ہوا تھا۔ کمرے کی برشے پریشان اور برباد دکھائی دے رہی تھیں۔
رضیہ کو کبھی خیال نہ آیا تھا کہ محض میز پر سے کتابیں اٹھا دیئے اور پلنگ پر سے بستر اٹھا دیئے سے کمرہ بھر جائے گا۔ اس کمرے نے رضیہ
کو ہر رنگ، ہر مژدہ، ہر حالت میں دیکھا تھا۔ اس کی دیواریں اور پردے اس کے ہمارا اور محرم تھے۔ انہوں نے رضیہ کو روئے، آپ ہی سہی کہتے
باتیں کرتے، چپ ہوتے، ننگیں اور اداس ہوتے دیکھا تھا، انہوں نے اُسے ہراساں کرنے والوں کی نیلی خاموشیوں میں اٹھ کر اُٹھنے کے
سامنے کھڑے ہو کر جسم پر عطر چھڑکتے اور سنری کا غڈ پر اُن دیکھے اجنبی محبوبوں کو محبت بھرتے خطوط لکھ کر دراز میں سنبھالتے
اور صبح ان خطوں کو نہامت سے پھاڑتے دیکھا تھا۔ رضیہ نے پردہ ایک طرف کر کے لیپ دھجا کر دیا اور کھڑکی کھول دی۔

بابر سردیوں کے گرے نیلے آسمان پر کھڑے ہوئے ستاروں کی بوس بھڑک رہی تھیں۔ باغ میں سردی اور اندھیرا تھا۔
اور گہری خاموشی میں بیوی کے میڑوں سے شبنم کے شپکے کی ہراساں آواز آرہی تھی۔ باغ کے اوپر درختوں پر نازوں کی دھیمی جیمی
دھندلی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ نازہ اور سرد ہوا رضیہ کی پیشانی کو چھو کر اندر داخل ہونے لگی۔ رضیہ کے کمرہ درجسم نے بھر بھر ہی
لی اور اس نے گرم نشال درست کرتے ہوئے کھڑکی بند کر کے جتنی چڑھا دی۔ اوداع! بیویں کے پرانے باغ اور اس کی شاخوں
پر سے چٹائی ہوئی شبنم! شاید تمہیں دیکھنا بھر کبھی نصیب نہ ہو۔ کھڑکی بند کرتے ہوئے رضیہ نے سوچا۔ جانے اس کھڑکی کو اب کون
کھولے گا۔ رات کی خاموشی میں پرانی وفادار خادمہ کے برے بیٹھے سارا سامان اچھے چھکڑے پر لاداد اور شیش کی طرٹ روانہ
ہو گیا، پہلی منزل کے تمام کمرے مقفل کر دیئے گئے۔ دوسری منزل کے کمرے پہلے ہی بند تھے اور اندر تو ٹاٹھوٹا بوسیدہ سامان گرو
غبار کی دیر تموں میں آنا ہوا تھا۔ اب درجہ پہلی منزل کی باری تھی۔ اب اس منزل میں مکڑیاں جانے بنیں گی۔ ٹڈیاں اٹھنے دیں گی۔ اور
جیسے تالیوں پر زونیں گے اور پلے کھلے روشندان میں سے بڑی لماری اور بڑی لماری پر سے میز پر کو کران کے شکار کو آتا
کرے گی۔ اب دیواروں کا چونا گرنا شروع ہو جائے گا۔ اور دہلیزوں، چوکھٹوں، دروازوں اور کرسیوں کو دیکھ لے گی اور بے
گدیلوں والے یانگوں میں جھپکیاں آتا دھونگی۔ بند کمروں کی گھٹی ہوئی نفا میں ایک نئی فضا پیدا ہوگی اور اس نئی فضا کے کپڑے
کوٹھے پیدا ہوں گے۔ اب یہ پرانا مکان کبھی آباد نہ ہوگا۔ اس میں جو بھی رہنے آئے گا۔ اسے آگ نہ آگیک دن رات کے
اندھیرے میں سامان باندھ کر چوروں کی طرح بھاگ جانا پڑے گا۔ اس لیے کہ اس مکان کی جڑیں لگھلی چوٹھی ہیں، بنیادوں کو دیکھ
چاٹ چکی ہے۔ اور اس کے بیچے کھولنا ہوا آتشیں لاداد گردش کر رہا ہے۔ ایسا پرانا مکان جہاں کمین ہوگا آخر ویران ہوگا اور
اس پر آسب اپنا بھندہ جمائیں گے، نکل جاؤ، نکل جاؤ، ایسے تمام بوسیدہ مکانوں کی جھٹوں سے نکل جاؤ۔ یہ لوٹ کر اگر گرنے
کو ہیں، ان کے تنے زمین کے بجز جیسے میں پھرتا لاداد ایک رہا ہے۔ یہ بھڑکنے کو ہے، اور پھر عیاں آدائے ساتھ زلزلہ آئے گا۔
اور ان حریت ناکرم خود وہ مکان کے ستون تنگوں کی طرح ہوا میں اڑتے نظر آئیں گے۔ جگ جگ جاؤ۔ جگ جاؤ۔ اسے
پہلی منزل والو! اور دوسری منزل والو.....

ادب حیرت کھرانے کے یہ آخری دو بد نصیب افراد اپنے آبائی مکان سے بے دخل ہو رہے ہیں۔ دونوں ماں
بیٹیاں گرم کپڑوں، گرم چادروں اور آٹنی شالوں میں اپنا آپ چھپائے، مہر جھکائے مکان کے پیٹے دروازے میں سے نکل کر سرد و دہلیز

برآمدے میں سے ہوتی ہوئی بڑے گیٹ کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ ان کے آگے بوڑھی خادمہ ٹوٹری اور اٹلی کھس اٹھائے چلی جا رہی ہے۔ باہر درختوں کے نیچے ایک ٹانگہ ان کا انتظار کر رہا ہے۔ جب وہ دونوں محدود دروازے میں سے باہر نکلے گیٹن نو دایہ میں آگئی ہوتی گھاس نے ان کے پاؤں پکڑ لیے۔ ہمیں چھوڑ کر کہاں جا رہی ہو۔ بڑی آہو؛ چھوٹی آہی؛ پیکر آؤ گی؛ ہم سردیوں کی ٹھنڈی تھانیوں میں یا دیکھا کریں گے۔ شاید اگلے صبح تک ہم زندہ نہ رہیں۔ ہمیں بھی یاد کر لیا کرنا۔ ہم آئے والوں کے قدم چوم کر تے تھے اور جانے والے کے پاؤں پکڑ لیتے تھے۔ اب ہم کس کی راہ دیکھیں گے، رقتیہ کی امی نے ہاتھ سے صدر روڑ وارے کے ٹھنڈے ستون کو چھوا اور جیسے کسی نے ہاں کے دل کو معنی میں لے لیا۔ رشتہ نے اپنی روتی ہوئی والدہ کے کندھوں پر ہاتھ رکھا اور تدم تدم جیتی تانے کی حرکت آگئی۔ تانگے میں بیٹھ کر انھوں نے آخری بار مکان پر نگاہ ڈالی۔ تمام کھڑکیاں بند تھیں۔ کسی کھڑکی میں کوئی میپ نہ چل رہا تھا۔ پچھلے پہر کی افسردہ، چھبکی، اور تیار روشنی اور انہماج سے اب گھٹتی ہوئی مکان پر ایک ایسے غم کا لہجہ چھو رہا تھا، جسے پھانسی شننے والی ہو، اور جو اپنی کوششوں میں بیٹھا رہ جھکائے گزرتے ہوئے دلیوں کو یاد کر رہا ہو۔

تھکات آہستہ کھیتوں میں سے گزرتے گئے۔ قصبے کے کھلے کھیتوں میں جو اردو کا دھوکا کی فصل تیار کھڑی تھی اور سردیوں میں ان کی سوندھی سوندھی مہک بڑھتی تھی۔ کھیتوں پر دُور دُور تک کھرا چھوڑا تھا اور اوپر وسیع آسمان پر رات کا رنگ اندھ چھوڑ رہا تھا۔ اور صبح کے خوف سے ستارے کا شبہ رہے تھے۔ پرانا حویلی غامگن اور افسردہ کی دلدل کی گھاٹیوں سے آہستہ آہستہ دُور چھوڑا تھا اور اب کھلے پھیکے نیلے آسمان کے پس منظر میں وہ درختوں کے اوپر ایک بڑا سیاہ دھبہ معلوم چھوڑا تھا۔ اس تاویک دھبے میں ان کے پورے خاندان کی تائید و دفن تھی۔

شیش پر کیسے کہیں دو ایک میپ روشن تھے۔ اونچے نیچے فز و الا پلٹ غام دُور تک سنسان تھا۔ پچھلے پہر کی بچہ بستہ سردی میں لوہے کے بیچ اداس میں بھیکے ٹھٹھرتے تھے۔ رشتہ اپنی والدہ اور بوڑھی ملازمہ کے ساتھ برآمدے میں کھڑکی کے بیچ پر بیٹھ گئی۔ اس کا خیال تھا شاید وہ سیدہ کے ہاں جا رہے تھے لیکن شیش پر آکر پتہ ہلا کہ وہ زبیدہ کے گھر جا رہے ہیں۔ رشتہ کا دل کچھ گیا تھا اور اس میں بھیکے ہوئے آہنی بیچ کی طرح سردی میں پڑا ٹھٹھرتا تھا۔ تانے میں، کھلے کھیتوں کی سردی کھانے سے اس کا بدن ڈھک رہا تھا۔ اور اس کے پریشان خیالات خلائم گمشدہ ستاروں کی طرح بے مقصد چکر لگا رہے تھے۔ ریل کے ڈبے میں سوار ہوتے ہوئے بڑی آہو نے مکان کی چابیاں بوڑھی خادمہ کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

”اب سب کچھ تمہارے حوالے ہے۔“

خادمہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بڑی آہو نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ گاڑی چلی تو رشتہ نے آخری بار قصبے کی طرف دیکھا۔ مشرقی آسمان پر رات کے آخری ہیمار اور زرد ساٹے مدھم چھو رہے تھے اور ستاروں کا رنگ نئی چھوٹا تھا۔ اس نے اپنا سر والدہ کے سینے سے لگا دیا۔ اور دونوں ماں بیٹیاں دُور تک روتی چلی گئیں۔

ڈیڑھ بجے بعد پری ناگ واسے پرانے مکان کا سارا سامان غلام کر دیا گیا۔ یہ بہار کے آغاز کا موسم تھا۔ نہر نہا سے لیکر کے درختوں پر بسنتی پھول آرہے تھے اور ہوا میں ان کا زرد لہر اُٹاؤ کرکندی کے باغی اور پکڑ پکڑی پر گرا رہا تھا۔ پُراٹے مکان

کے عقب میں غصہ مال عراب پر چڑھی ہوئی فتنی پچیاں اور گلاب کی بیلوں میں تختی تختی لگیاں آنکھیں کھولے چروں کے جھوٹوں سے باہر نکلتا رہی تھیں۔ بیلوں کے پیچھے سفید پیروں سے لڑ گئے تھے اور ان پر شہد کی کھیاں پکڑ لگا رہی تھیں۔ دوسری طرف بھان کی معدودہ دانے کے باہر سیلی اور دوسری منزل کی کمرہ آؤد پرانے گھر تھیں سامان نیلام ہو رہا تھا۔ مکان کی بوڑھی ملازمہ نے اپنی جیٹی الٹی کے ساتھ باورچی خانے کے باہر برآمدے کے ستون کے ساتھ لگی گھڑی منظر: چہرے اٹھائے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ دوسری جانب زبیدہ کا ناندو ڈاکٹر اور سعیدہ کا خاوند پر وغبیر شہر کی ایک کہنی اور بنک کے مناسدوں کے ساتھ کرسیوں پر بیٹھے تھے۔

سیاہ لہجے کوٹ والا آدمی چہرے پر کھڑا بھڑکیا تھا نئے نیلادی بول رہا تھا۔ سامنے قصبے کے زمینداروں جاگیرداروں اور امیر بھوپاریوں کے کارندے کوٹسے مال کا جائزہ لے رہے تھے۔ کسی وجہ سے وہ لوگ خود نہیں آئے تھے۔ لیکن انھوں نے اپنے کارندے بھیج دیے تھے۔ اس مجمع میں قصبے کا ایک میں دوکاندار، گاڑی بان، حمام، فصل ساز، کوچرو، اور صولائی موجود نہ تھا۔ وہ لوگ ایک گھر کے گھر کا یوں راج لائے دیکھ کر گھروں میں بیٹھے انداز میں انہیں پر تبصرہ کر رہے تھے اور خدا سے دعا مانگ رہے تھے کہ وہ ہر گھر کی لالچ رکھے۔ دو سپاہی پرانی وردیوں میں طبرس مسلمان کی ڈھیر یوں کے درمیان اسیں مرغوں کی طرح گروں کو اڑائے پھر رہے تھے اور یہاں وہاں کسی نہ کسی میز صوفہ، المار، دی یا ٹھک کو ڈنڈے سے بھا کر دیکھ لیتے تھے۔

نیلام بڑی تیزی سے شروع ہوا تھا سو کمال دس روپوں میں اور دس روپے کی شے ایک روپے میں اٹھ رہی تھی مقررہ فوراُ جوسٹر میں اندراج کرتے جاتے تھے اور وہ یہ بہت کم کے، جیسے غور سامندے کے پاس میز پر جمع ہوتا جا رہا تھا ڈاکٹر سکرٹسٹ سے سکرٹسٹ سلگا رہا تھا اور نیلام کرنے والی کہنی کے ایک افسہ سے کہہ رہا تھا۔

”لندن میں نیلام کروانے والوں کو کمیشن کے ساتھ آئے جانے کا، لاؤنس اور وہ وقت کا کھانا بھی ملتا ہے اور یہاں.....“

کہنی کا گھونٹنا نہ گولڈ ٹیک کے سکرٹسٹ کو گئے کے سکرٹسٹ کی مانند پینے ہونے سر ملاتے ہوئے ہاں میں ہاں ملاتے جا رہا تھا اور لہجے سیاہ کوٹ والا بڑا پتلا چار لی سا آدمی کانسی کا بھول کی پتی ایسا ہڑا اور نقش نقالی ہوا میں لہراتے ہوئے بولا۔

”ہوئے حضرات، اسی کے لیے اس ماسٹر بین انٹیک کے لیے۔ ہاں.....“

مجمع میں ایک نے اپنے ساتھی سے کہا۔

”اے خدام علی! اسے گھرے مائڈ اوٹے، اماں پاں ٹکٹے کی“

اور مجمع میں لوگ نچنے لگا کر ہنس پڑے۔ ڈاکٹر بھی دیکھ کر طرح ہنسے لگا۔ گئے خاندانے نے ڈاکٹر کی طرف جھک کر کہا۔

”دوبے یہ خال پاں سکرٹسٹ کی دکان ہی کا ہے“

جب سیاہ رنگ کے ایک خوبصورت آبنوی راٹنگ ٹیبل کی نیلامی ہونے لگی تو پر وغبیر راجی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

استے ٹے مجمع میں عورت دی جانتا تھا کہ اس میز پر جھک کر مضیہ ————— وہ یونانی المیہ کی ہر دوشی اپنی ڈاکٹر کی تھی۔ اور توجیف، ملاقاتی، توجید، کہتے، خاوند اور ہیوگو کو پڑھا کرتی تھی۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔

”آپ کہاں چلے؟“

”میری بیڑ خریدنا چاہتا ہوں؟“

نیلامی بولنے والے نے آمیزہ سی بیڑ کو چھڑی سے بجاتے ہوئے کہا۔

”ادب اسی کا مے میز کے بیٹے ————— سائبان اس کے سیاہ رنگ پر نہ جا میں۔ اس کے گئی دیکھیں۔ دیکھئے اس کے چھوڑا زہی اور اس کا ایک ڈھکنا بھی ہے۔ موٹر گاڑی کی طرح بارش ہو تو ڈھکنا چڑھایا جاسکتا ہے۔ اب بولئے اس کا مے مگر دلی کے گورے میز کے بیٹے.....“

ایک طرف سے آواز آئی۔

”پانچ روپے۔“

پروفیسر نے فوراً بیس روپے کہہ دیئے۔ سب لوگ اُسے تعجب سے دیکھنے لگے۔ نیلامی بولنے والا کتنی دیر بیس روپے ایک بیس۔ دپے دو چلنا مارا لیکن صبح میں کوئی نہ بولا۔ آخر اس نے ”بیس روپے تین“ کہہ کر چھڑی میز پر ماری اور بیڑ پر فیسر کے حوصلے کو دئی گئی۔ پروفیسر نے دپے دیئے اور پورے غلام کی مدد سے میز پر آکر اسے میں ایک طرف کر کے کھڑی کر دی۔ پروفیسر نے لائی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

”اچھی ہو بیٹی؟“

لائی نے سر ہٹھکالایا۔ اس کی ماں نے دپے سے اس کو خشک کرتے ہوئے پوچھا۔

”کیا راج اٹھ لیا بڑے بابو؟“

پروفیسر نے ایک کلمہ اس کا سر اٹھایا اور خاموش رہا۔

.....

رضیہ کو اپنی امی کے ساتھ زہید داجی کے ہاں رہتے ہوئے تیسرا مہینہ گزار رہا ہے۔ زہید کے سسہ سال دونوں کی یہ کوٹھی اولہ کلب روڈ پر واقع ہے۔ یہ کوٹھی کافی لمبی چوڑی ہے۔ اس کے لان میں کنا سے کنا سے نھت دائرے کی صورت میں پوکھلیس کے اوپنے اوپنے درخت ستونوں کی طرح کھڑے ہیں۔ برآمدے کی محرابوں میں کاسٹے دار کھاس کے روٹھے ٹٹے لٹک رہے ہیں۔ اس کے دودھ دانے ہیں۔ پوکھلیس سے اسی دروازوں کی طرف جاتی ہوئی کناں اسی کی مٹک پر چٹائی رنگ کی بچی بیٹی ہے۔ جب کوئی کارآمد داخل ہوتی ہے، تو اس کے کچلے ہسوں کے ساتھ ساتھ بلکل ملے گراؤ آکر بیٹھے۔ شکر کی جانب جھاریوں کی دس گیارہ فٹ اونچی دیوار کھڑی ہے۔ اس دیوار کے ساتھ کھان میں لالہ اور سورج نکھیں کے سورج اور زرد چھول مارچ کی دھوپ میں مسکایا کرتے ہیں۔ رضیہ اور اس کی امی کو اس کوٹھی کے دو مغرب سے کمرے دے دیئے گئے ہیں۔ ایک کمرے میں مسلمان اور دو پلنگ بچھے ہیں اور دوسرے کمرے میں دو عین کرسیاں، ایک میز اور کانس پر چھینکا تختہ مہرت مسلمان پڑا ہے۔ اس کمرے کی ایک چھوٹی سی کھڑکی لان کی طرف کھلتی ہے۔ اس وقت رضیہ اس کھڑکی کے ساتھ کھڑی ہے۔ اس کا چہرہ اس قدر ڈھل گیا ہے کہ وہ عمر رسیدہ عورت معلوم ہوتی ہے۔ چہرے کا رنگ بھوسلا چھوڑ رہا ہے اور ہاتھوں پر سبز رنگیں ابھرائی ہیں۔ بھروسے حلقوں میں انکھیں جب کسی شے کو غور سے

وکیٹھی ہی تو بیچ کی معلوم ہوتی ہیں، گاؤں پر ایک بے رنگ سی مردی چھا رہی۔ پتہ وہ کتنی دیر سے یہاں کھڑی باہر لان میں ایک طرف دھلتے سوسکے کی نارنجی دھوپ میں اپنی بوڑھی اتنی گودھیکھ رہی ہے۔ اس کی اتنی بھانڈیوں کے پھیلوں کے پاس سبز کرسی پر بیٹھ کر اپنے ہاتھوں میں پلیٹ تھامے، منجھ سے زید کھا رہی ہے۔ اس کے سر کے تمام بال سفید ہو چکے ہیں اور بھاری جسم ڈھلک کر نہ دھو گیا ہے۔ گاؤں کی بڑیاں الجھاتی ہیں اور چہرے پر گردن تلک بھر لیوں اور لکڑیوں کا ایک جال سا بچھ گیا ہے۔ اس کے پاس ہی زبیدہ کی شوش و شنگ نندیں ٹیس کھیل رہی ہیں۔ انھوں نے رنگین دوپٹے ٹکر کے ساتھ کس کو باندھ رکھے ہیں اور وہ اچیل اچیل کر کھیل رہی ہیں اور شور مچا رہی ہیں اور ان کے کتے ہوئے بال ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ بڑی ننہ کا کبھی لڑکا نیلی بکتر اپنے مضیق کی نالہ کے پاس جا کر اسے جھک کر غور سے دیکھتا ہے اور پھر ٹیس کھیلتی ہوئی اتنی سے پوچھتا ہے۔

”دادا جی..... دادی..... تیا بھار رہی ہے؟“

رفیقہ رب سب کچھ پھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے اور جیسے اُسے کچھ نظر نہیں آ رہا۔ ساتھ والی کوٹھی میں کوئی ریڈیو بڑھنالی بج رہا ہے۔ شہنائی کی پُرورد آواز میں ایک زخمی فریاد اور ایک ہے۔ سب سے کوئی کھوپڑا براجو خوب میں بیک کر اپنی ماں کی گود میں جانے کی کوشش کر رہا ہو۔ رفیقہ کے لیے یہ سنگین افسردگی کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ وہ جب سے اس گھر میں آئی تھی اسی طرح تھی۔ اس نے کبھی کسی سے بات نہ کی تھی۔ وہ سارا دن اپنے مختصر سے کمرے میں بیٹھی پڑھتی رہتی، لکھتی رہتی اور اپنی محرم نصیب بوڑھی امی کے پاؤں دہائی تھی۔ اس نے اپنے امی کی روز بروز گرتی ہوئی حالت دیکھی نہ سہائی تھی۔ امی کی نظر بے حد کمزور ہو گئی تھی اور سونے کی روشنی میں بھی انھیں دو تین گز کے فاصلے پر سوائے دھندلے اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ وہ لیکن چائے دن میں کئی بار سیاق کر تھیں لیکن یہاں انھیں نہ کبھی چلو صرف دن میں ایک بار صبح کو ملتی تھی۔ کبھی کبھی زبیدہ سب کی نظریں بچا کر اُن کے لیے سبز چادر کا جالہ بنا کر لے آتی تھی۔ وہ چوری چھپے انھیں اور بھی بہت کچھ لایا کرتی تھی۔ لیکن اپنے تخت سے گری ہوئی شکست خوردہ بوڑھی آپو نے اپنی زبان سے کبھی کچھ نہ مانگا تھا۔ قلمدہ زبیدہ کو بھی ہاں زیادہ دیر بیٹھنے سے منع کیا کرتی تھیں۔ سیدہ شروع شروع میں تقریباً روزانہ ان سے ملنے آ کر فی مگر کچھ دن گزرنے پر اس نے بھی اُن کو دیا کر کسی نے اس سے گھر نہ کیا کہ وہ بے کین نہیں آتی۔ پردے گھیرنے اپنی بیوی سے چھپ کر بڑی آچر کو ہر ماہ اپنی تنخواہ کا کچھ حصہ پیش کرنا چاہا جسے بغیر عورت نے قبول نہ کیا۔ بلکہ پردے گھیر کے ساتھ کچھ ایسی مردھری سے پیش آئی کہ وہ چپکے سے اٹھ کر چلا گیا اور پھر کبھی نہ آیا۔

ہری ناگ سے جو جلد سورو پے بچا کر لائے گئے تھے وہ ختم ہو چکے تھے۔ زیورہ۔۔۔۔۔ پرانے خانقاہی زیورات فروخت کرنا بڑی آپو نے گوارا نہ کیا تھا، علاوہ ازیں اُن کا خیال تھا کہ یہ زیورہ رفیقہ کو دیں گی۔ وہ رفیقہ کے لیے کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ ہاں! رفیقہ کے لیے تو کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ وہ تو خالی دوا میں ہی رہ گئی تھی۔ اس کی بھلاداری میں تو بہا میں بھی دین حقوں کے زور دیتے ہی گزرتے تھے۔ آج اس کی محبت، اُمسکی جوانی، اس کی زندگی سلسلہ در سلسلہ تباہ حال لکھنڈوں میں پرہیز سرکھڑی تھی اور اُس کی ہر اُمسک، ہر آرزو کا سر نہایت میں پر دیا ہوا اس کی محض پر نوحہ کناں تھا۔ وہ لاشعور کے تاریک جنگلیوں میں جھلکتی بھر رہی تھی اور اُس کی سنگین یادوں کے تمام گیت وقت کی خاک آرائی، ویران محرابوں میں سجھ رہے تھے۔ ہائے رفیقہ! تیرے سارے بیچ گرم بیت میں بوٹے گئے تھے۔ تو بھول کماں سے جیتی، تیرے سارے بکندوں کو امدادوں نے اپنی کندھیوں میں قید کر رکھا ہے سبھے روشنی کہاں سے

آٹے کی برتنائی امیوں کی بیہوشی! اپنے کھوئے ہوئے مختصر مافی میں اور روناہ کی تلاش میں نکل جا! شاید تیرا محبوب تجھے شام اور فرت کے گفتگوں میں کسی چٹے پر مل جائے اور تجھے شمالی افریقہ کے ساحل سے چوڑا ہوا اسپانیہ کی اُنی پتھر کی مرکلوں پر ملے جائے جو زنجیری اور انگریز کے باغوں کو گوارہی ہوں۔ اور جہاں انگور کی سیلوں میں ملے مٹھتی قابیلوں پر توہینیں کنیزیں قلعے کو رہی ہوئی اور اندلسی مٹھکر یورپی تمدن کا خاکہ مرتب کر رہے ہوں۔ ————— !

لیکن رصیدہ حسن طرہ بھی جاتی زبرد کا خاوند اس کا راستہ روک کر کھڑا ہوجاتا اور وہ بے بس ہوجاتی۔ اب تو بالکل ہی بے بسی تھی۔ یہاں اس کی آہ و نزاری سننے والا کوئی تھا۔ ایک انسی قہیل۔ سو ان کی حالت رصیدہ سے زیادہ قابل رحم تھی۔ اس کے باوجود اس نے اپنے آپ کو ڈاکٹر کے شیطانی حملوں سے بچائے رکھا تھا۔ وہ اپنے گرسنے سے باہر بالکل نہ نکلتی تھی۔ دن بھر کتابوں میں کوئی رہتی اور رات کو دوروازہ اندر سے بند کر کے امی کے پاس سوئی۔ اس نے کوئی بار سوچا کہ کسی طرح اپنی شادی کرے اور اپنی جی کو اپنے ساتھ ہی سے جانے۔ مگر وہ دیکھ لیگیسے اور کیونکر شادی کرے؟ یونہی اسے کون گھر میں گھسنے لے گا اور اگر وہ گھر میں آباد بھی ہوگی تو وہاں اس کی کوئی بھی عزت نہ ہوگی وہ بڑے باعزت طریق سے اپنے محسول کا جانا چاہتی تھی۔ جہاں کا ہر دو اس کا اور اس کی امی کا استہام کرے۔ لیکن وہ ہر بار ایسا سوچ کر ہی رہ جاتی پھر اُسے یقین ہو جاتا کہ اُس کا بیاہ کبھی نہیں ہوگا اور کسی ہسپتال کی چھارے نکل کر کوئی آئندہ سسٹرنز وہ لئے لیجئے نہیں آئے گا کوئی مسند کلیں آئے اپنے ڈراموں کی میر و نئی جانا گا اور اگر نہ کیگا اور فرات کی وادی میں کوئی محبوب چشمے پر اس کا انتظار نہ کرے گا اور وہ یونہی مر جائیگی، اس لئے اسے موت بڑی خوفناک دکھائی دیتی۔ مگر جب وہ اپنے خیلے راستوں پر ڈاکٹر کے بالوں پر سے بھٹکتے ممبر کو اپنی طرف بڑھتے دیکھیں تو جین مار کر جاک اٹھتی اور خدا سے موت کی دعا مانگتی۔ موت — تاہم ایک اندر وہ کانڈر میرا، ستانوں کا ستانا، تمہاں میری کینہاں اور راتوں کی رات :

ایک بار اس نے اپنی امی کے پاؤں دباتے ہوئے دُرتے دُرتے کہا۔

میرا یہاں دل گھبراتا ہے اچھی بہت گھبراتا ہے۔ کیوں نہ سمجھ ایک آدھ ماہ باجی سعیدہ کے ہاں رہ آئیں۔

رضیہ کا خیال غنا کا ہی سہیدہ کے پاؤں اس ہمانے جا کر کبھی زبیدہ کے گھر واپس نہ آنے لگی۔ مگر اس کی امی نے وہاں جانے سے صاف انکار کر دیا اور نتیجہ یہ کہ آئندہ اس گھر کا نام نہ رہے۔

”اب ہمارا مرنا جیسا اسی جگہ ہے۔“

اور رضیہ بے بس ہو کر رہ گئی۔ پنجرے میں چیر خیزا کر رہ گئی۔

باہر لائی میں دھوپ یوکلپٹس کے درختوں کی آخری ٹہنیوں کو جو کم رخصت سمندر ہی تھی۔ زبیدہ کی خندیں بدستو ٹھیس کھلی رہی تھیں۔ رضیہ کھڑکی کے ساتھ لگی اسی طرح کھڑی تھی اور بے خیالی میں کبھی انھیں کھینچتے دیکھنے لگتی اور کبھی اپنی کمزور دانتوں مانگوں کو ہاتھ آہستہ دلیہ کھاتے دیکھتی رہی تھی۔ ابجا نام ایک طرف سے گیند اچھلتی چھوٹی آئی اور دلیہ کھاتی بوڑھی عورت کے سر سے ٹکرا کر جھاڑیوں میں جا گری۔ رضیہ کا دل ایک دم ڈوب سا گیا۔ زبیدہ کی پہلی نندے بلند آواز میں بھی طور پر معافی مانگی اور دوسری نند جھاڑیوں میں گیند تلاش کرنے لگی۔ کمزور بوڑھی عورت نے کچھ نہ کہا۔ صرف عاجزی سے ان کی طرف دیکھا اور سر جھکا کر آہستہ آہستہ دلیہ کھانے لگی۔ اور اب اس کے ویسے میں اس کی آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے آنسو بھی شامل تھے۔ رضیہ کے دل پر جھججیاں سی چلی گئیں۔ اس نے کھڑکی

بند کردی اور اس کے بند پٹ کے ساتھ سر لگا کر بسکیاں جرتے ہوئے بچوں کی طرح روناشروع کر دیا اور باہر دھوپ نصرت ہو گئی۔
 ہمارا گھر گئی تھی اور درختوں پر سے گزرا شروع ہو گئے تھے کہ سعیدہ کے ہاں جا بڑا لپکا پیدا ہوا۔ سعیدہ کی
 ساس، بہو کے اصرار پر زبیدہ کے ہاں آئی تو ساتھ ان کی بوڑھی آپو کو بھی کناں بیک لپیٹی آئی۔ اس نے رضیہ کو بھی چلنے کے لیے
 کہا لیکن وہ راضی نہ ہوئی۔ سعیدہ نے رضیہ کی عدم موجودگی کو ایک لمحہ کے لیے محسوس کیا لیکن دوسرے ہی لمحے اُسے بھولی گئی
 سعیدہ نے زبیدہ، اپنی بوڑھی ماں، زبیدہ کی دو بیٹی خندوں اور اس کی ساس، سجدوں کو دوسرے کھانے کی دعوت دی تھی۔ کھانے
 پر سب نے بڑی خوش دلی اور سرگرمی کا اظہار کیا۔ زبیدہ کا ڈاکٹر خاندان تو اس قدر کھا گیا کہ اس کا پیٹ ابھر گیا اور وہ کافی پرکافی
 چڑھانے لگا۔ پردیس نے بہت کم کھا ہا اور سب سے جدا ہو کر درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر سکرپٹ بنانے لگا۔ اس کے ارد گرد
 ساتھ میں درختوں سے گرے ہوئے زرد پتے بکھرے ہوئے تھے۔ سکرپٹ سلگاتے ہوئے اچانک اُسے خیال آیا کہ رضیہ گھر میں
 تنہا ہوگی۔ اس خیال کے آئے ہی اس نے پچھلے سے گیارہ میں جا کر موڑ لکائی۔ نوکر سے کہا کہ وہ ذرا امینٹن تک حمار باہر ہے۔ اور سیدھا
 زبیدہ کی کوٹھی کی طرف چل پڑا۔

رضیہ اتنی بڑی خالی کوٹھی میں تنہا تھی۔ وہ اپنے کمرے میں آرام کر سی پر نیم درواز اپنی ڈائری کے پرانے اورانی پڑھ رہی
 تھی کہ نوٹھی میں کسی کار کے داخل ہونے کی آواز سنائی دی۔ وہ چونک پڑی۔ کار کے دھیمے دھیمے ہارن کی آواز بڑی مافوس تھی۔ اس کا دل
 دھڑکنے لگا۔ اس نے گھر کے کھڑکی میں سے جھانکا۔ باہر بوڑھیوں پر دھیمہ کار کا دروازہ بند کر رہا تھا۔ رضیہ گم سم سم سم کی دھوپ
 کھڑی رہی۔ یہ کیوں آئے ہیں؟ کیا اُسے لینے آئے ہیں؟ وہ کبھی نہیں جانے گی۔ کبھی نہیں جانے گی۔ اب یہاں اس کا کون ہے؟ کسی
 نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔ رضیہ جیسے کسی سحر کے زور سے دروازے کی طرف لپکی اور فوراً اچھی کھولی دی۔ پردیس نے
 بھولے رنگ کے سر کا موٹو پہن رکھا تھا اور اس کا چہرہ پیلے سے کبھی زیادہ افسردہ تھا۔
 رضیہ نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

”جی ہاں“

پردیس سر کی پریٹھ گیا اور کمرے میں بڑی معنی خیز چپ چاپ طاری ہو گئی۔ رضیہ کو پہلی بار اس کمرے کی خاموشی بڑی مافوس
 محسوس ہو رہی تھی۔ اس خاموشی میں آنے والے دنوں کی ٹکلیں اُمیدیں اور پرانے دنوں کے سو گوار فوسے تھے۔ وہ خاموش تھی لیکن اُسے
 اُس خاموشی کی پُر محنت سرگوشیاں سنائی دے رہی تھیں۔ سعیدہ کے خاندان نے اپنے مخصوص انداز میں فکر آمیز آنکھوں کو ذرا سیڑھ کر کہا۔
 ”میں ————— میں تمہیں بہت کم کئے آیا تھا رضیہ۔ مگر کچھ یوں محسوس ہو رہا ہے کہ تم میری باتوں سے بہت بلند ہو چکی
 تمہارے سامنے ہمیشہ انظلوں کے پائے پھیلے ہیں اور تم زندگی کے بھنڈ میں اتری ہوئی ہو۔ اب صرف اتنا ہی کہوں گا کہ تم شادی کرو۔
 سعیدہ نے آپو کی کشتیوں سے ایک دشتہ تلاش کر لیا ہے۔ اڈکاٹھے بھی پسند ہے۔ کوشش کرنا کہ اس کے ساتھ زندگی کے دو
 روز ہنس کھیل کر گزار سکو“

رضیہ تامل کر سی پر بیٹھ گئی۔

”یہ آپ کہہ رہے ہیں؟“

”ہاں رضیہ۔ اس لیے کہ تمہارے دکھوں کا میں ایک علاج ہے۔“

پروفیسر کو اس جواب کی توقع نہ تھی۔ وہ کچھ پریشان سا ہو گیا۔ وہ برقیتمت پر راضیہ کو بچانا چاہتا تھا۔ وہ اس باغصیب موقع کو ہوت کے گھر سے شکایت میں کرتے دیکھ رہا تھا۔ وہ راضیہ کو اس تنہائی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔

طعمیر، اعصاب بہ نہیں راضیہ میں چاہتا ہے کہ تم اپنے گھر آباد رہو نہ ماراجی ایک خوب صورت گھر تمہارے ہی خواجہ پورٹ بچے جن۔ تمہاری نگہداری بھی کرے گا لاکوئی ہو۔ اور انداز میں اپنی صورت دیکھو تو کیا تعین یہ تم کیا بن گی ہو؟

راضیہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”اگر خوبصورتی کی تلاش میں نکلے ہو، انسان بدصورت ہو جائے تو میں دنیا کی سب سے بدصورت عورت ہوں۔ اور اگر نیکی کرنے سے انسان بُرا ہو جائے تو فحش سے زیادہ بُرا اور کڑا ہو گا۔“

پروفیسر نے ساریٹ سکا کیا اور آٹھ کرپوشانی کے عالم میں کمرے میں ٹھیکے لگا کر رضیہ کو کڑی سے باہر دھختوں پر دھوپ میں جھکتے زرد پتوں کو دیکھ رہی تھی۔

”مجھے زندگی سے محبت ہے اور جب سے یہ معلوم ہوا ہے کہ رانجی زندگی میں شامل ہے مجھے موت سے بھی محبت ہو گئی ہے۔ کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں مرنے کے بعد بھی زندہ رہوں گی۔ یہ سوچنا ہے میں کل سورج کو طلوع ہوتے نہ دیکھ سکوں۔ لیکن یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ کل طلوع ہوئے نہ والا سورج مجھے نہ دیکھے۔ جہاں میں دفن ہوں گی وہاں زندہ گلاب کا پھول اُٹے گا۔ جہاں جس کی موت ہو تو زندہ نہ بھولی جائیں گے وہ کیسے ہر سکتا ہے؟.....“

”نیکو روضہ.....“

”زندگی گزارنا ایک کٹھن ہے، پر فیصلہ صاحب بننا سیدھا اور انچول آرٹ ادا ہو لوگ اس آرٹ سے واقف ہیں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ زندگی کا تعلق ان سٹکٹ سے ہے لیکن زندگی گزارنے کا تعلق شلیک سے ہے۔ میں جانتی ہوں آپ کو کچھ سے دلی ہمدردی ہے۔ اس کے لیے میلارڈ ٹیوٹی سے بڑھ کر ہے۔ لیکن میں اپنے بنائے ہوئے راستے پر چلنا چاہتی ہوں۔ اگر یہ راستہ ٹھیک ہو تو میں وہاں جانی راتوں میں راتوں کو چلی کر آپ کی ہمدردیوں کے سوا اور کیا کروں گی۔ اور اگر جیتے سموروں میں جا کر ختم ہو گیا تو میں اپنا صحیح راستہ تلاش کرنے تک ایک بار پھر آؤں گی۔“

وہ ایک بات آپ سے ضرور کہوں گی۔ اگر میں مر جاؤں تو میرے لیے غم بڑی کم۔ میری قبر پر کسی کو آفسز نہ ہانے دیں۔ بڑی دلیری سے زندہ رہیں۔ زندگی کے الاؤ کو دہشتی اور حلا کر آ سکیں۔ اگر یہ الاؤ دہم ہونے لگے اور لکڑیاں ختم ہو جائیں تو بے شک میری تلاش کو بھی اس میں جھکنا پڑے گا۔ میں مرنے کے بعد بھی زندگی کی لٹھی میں چلنا پسند کروں گی۔“

رضیہ خاموش ہو گئی۔ اس کا سر کمرے کی پشت سے لگا تھا اور زور دے دے پر ایک عجیب قسم کی گرم روشنی جھلک رہی تھی۔ پروفیسر میر کے ساتھ ٹیک لگائے بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر وہ ایک کبا کی آگے بڑھا۔ اس نے جھجک کر رضیہ کے نازک ہاتھ کو ہنسے احترام سے چوما اور دروازہ کھولا کہ باہر نکل گیا۔ رضیہ ایک عالمِ خود فراموشی میں ڈوبی جس کے طالع

پڑی رہی باہر کار کے سٹارٹ ہونے اور دوسرے دروازے سے باہر نکلنے کی آواز سنائی دی۔ غٹوری دُور جا کر یہ آواز نہ سنا سکا۔
 میں کھڑکی پر بیٹھ کر دیکھنے لگی۔ اس نے اس مقدس گھر کو اپنے سینے پر
 رکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔

.....

شام ہو رہی تھی۔ لکی اعلیٰ تک سجدہ کے ہاں سے کوئی واپس نہ آیا تھا۔ نوکر بھی کہیں سینا وغیرہ دیکھنے چلا
 گیا تھا۔ اتنی بڑی خالی کونٹھی میں رضیہ کو اکیلے میں کچھ سہم سا غٹور غٹور سے لگتا تھا۔ کچھ دیر وہ لائی میں تھکتی رہی۔ پھر
 برآمدے میں بیٹھی رہنے لگی۔ اس کے بعد اٹھ کر اندر کمرے میں چلی گئی اور پلنگہ پر لیٹ کر سجدہ کے خاندان سے
 اپنی آج کی ملاقات، اس کی خاموشی، اپنی باتوں اور پھر اُس کے ٹھکانے کا تہہ چھننے کے متعلق سوچنے لگی۔ کمرے میں شام
 کے پہلے مرحلوں سے پہلے شروع ہو گئے تھے۔ اس کے دل میں جی جھلنے کا خیال آیا۔ وہ اچھٹی چلائے کے
 بارے میں سوچ رہی تھی کہ دروازہ کھلا اور ایک بار پھر وہی عبادی نعیم، اسٹریچر آنکھوں والا ڈاکٹر کمرے میں داخل
 ہوا۔ لیکن آج اُس کے پاؤں میں خونزدہ لڑکھڑاہٹ نہیں تھی۔ وہ یوں کمرے کے وسط میں کھڑا تھا جیسے اپنے جہاز کے فرش
 پر کھڑائیوں کو چاہتیں لگو، اُسے کا مکمل دینے والا ہو۔

رضیہ وحک سے رو گئی۔ وہ ایک دم اٹھ بیٹھی۔

”آپ..... آپ کیا جانتے ہیں؟“

”تم جانتی ہو؟“
 ڈاکٹر کی آواز میں کسی قسم کی گھبراہٹ نہ تھی۔ اندھیرے میں اچانک ایک خیالی ٹپکا۔ رضیہ ٹپک نہ کھلی کھڑکی کی طرف پلکیں
 اور ڈاکٹر نے فوراً اسے اپنی مضبوط گرفت میں لیا۔

”اگر تم نے شور مچا تو یاد رکھو کہ تم اور تمہاری سفید بالوں والی ماں شرک کے کنارے پڑی ہو گی؟“

رضیہ کا جسم ہر کی سہل بن چکا تھا۔ سر اور بے جاں۔ اس نے ڈاکٹر کے بازوؤں سے لپکنے کی آخری کوشش کی
 اور اس کے بعد اُسے خوش آگیا۔ ڈاکٹر نے اُسے اٹھا کر کمرے پر رکھا اور دروازے سے باہر نکل کر کونٹھی کے دوسرے خالی
 کمرے کی تاریکی میں گم ہو گیا۔

.....

رات کو جب سب لوگ کار میں بیٹھے واپس آئے تو رضیہ کی بوڑھی امی نے دیکھا کہ رضیہ پلنگ پر بیہوش
 پڑی ہے اور کمرے کی فضا میں خون کی بو پھیلی ہوئی ہے۔ اس نے بدحواس ہو کر رضیہ کو بلا یا جلا یا اور پھر ڈاکٹر کو اس
 سے لپٹ لگی۔ امی کی چیخ کی آواز سن کر سبھی اس کمرے کی طرف دوڑے۔ زبیدہ نے فوراً رضیہ کے نفع حے
 پر چادر پھیلا دی اور اپنے خاندان کو آواز دی۔ اس کا خاندان بھاگتا بھاگتا اندر آیا اور اپنی بہن کو دواؤں کا کبس لانے کو
 کہہ کر رضیہ پر ٹھک گیا۔

منکرہ کو یہ نہیں ٹھیک چل رہی ہے۔

رضیہ کو فوراً دو ٹپکے لگا دیئے گئے۔ لیکن اُسے ہوش نہ آیا۔ رات بھر اُس کی بڑی ہسی اور بوڑھی ماں اُس کے پاس بیٹھی رہیں۔ درمیان میں دو ایک بار رضیہ نے آہستہ سے کراہتے ہوئے کچھ کہا اور پھر بے ہوش رہی۔ صبح کینال ہینک دالی کو بٹھی سے بھی سیدھ کے سوا باقی سب لوگ اولڈ کلب روڈ کی جانب دوڑے۔ سیدھ کے عائد نے فوراً سے رضیہ کا سر جھپایا ہوا نیلا چہرہ دیکھا اور باہر نکل گیا۔ رضیہ کا چہرہ نیلا پڑ کر سیاہی مائل ہو گیا تھا اور ناخنوں تک بھی نیلا ہٹ مائل ہو رہا تھا۔

کلائیوں اور ہتھیلی پر آہٹ پڑی ہوئی سبز رنگین کچھ گئی تھیں۔ اور بند آنکھیں سیاہ حلقوں میں ڈوب چکی تھیں اور اگر اُس کی آنکھیں کھلی ہوتیں تو شاید وہ ڈاکٹر کو اپنے روبرو دیکھ کر پھر کبھی نہ کھٹنے کے لیے بند ہو جاتیں۔ رضیہ کی بوڑھی اتی ڈاکٹر کو دیکھتے ہوئے سہمی ہوئی تھی جیسے وہ اپنی بیٹی کے اوپر موت کے بازوؤں کو جھکے ہوئے دیکھ رہی ہو۔ تین روز تک رضیہ حیات و موت کی کشمکش میں ٹھکی بے ہوش پڑی رہی۔ بلڈنگ کسی طرح بند نہ ہو رہی تھی۔ تین روز سے اس کے ممدے میں سوائے گلو کو ز اور طاقت کی دو امیوں کے اور کچھ نہ گیا تھا۔

چوتھے روز رات کے کسی لمحے اُس نے موت کے تاریک غار میں ڈوبی ہوئی آنکھیں کھولیں۔ ایک بار صحت ایک بار کسی کی تلاش میں، کسی کی جستجو میں، بارگزر دیکھا اور اسے کچھ دکھائی نہ دیا۔ بوڑھی ماں نے اپنی بیٹی کا چہرہ اپنے کانپتے ہاتھوں میں ختم کر محبت سے پکارا۔

”میری بیٹی، میری بیٹی، میری رضیہ.....“

رضیہ نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ کہنے کے لیے لب کھوے اور وہ کھٹے کے کھٹے رہ گئے۔ زبیدہ اور بوڑھی ماں چیخ مار کر لاش سے لپٹ گئیں۔ جاگو! جاگو! میری بیٹی، میری بہن! تم نے تو کہا تھا تم کبھی نہیں مر دو گی۔ دیکھو! صندوق میں تیرے بیباک کے زور پڑے ہیں اور اہماری میں تیری کتا ہیں تھپے ہلا رہی ہیں۔ جاگو! جاگو! آدمی آدمی رات تک چڑھنے والی! تجھے یہاں سے والا اندلسی شہزادہ آگیا ہے وہ دیکھو! اس کا سنہری گھوڑا! اخیر کے دشمنوں میں کھڑا ہے۔ لیکن رضیہ جا بھکی تھی۔ نیل دُھند میں ڈوبی ہوئی گنام پہاڑیوں کی طرف۔ تاریک کمرے میں پلٹے ہوئے اجنبی جزیروں کی طرف۔ اور زندگی اور موت سے بیزار کرنے والی! ذرا کھڑکی سے باہر دیکھو۔ رات نے تیرے سوگ میں اپنے تمام ستاروں پر سیاہ چادر چھیل دی ہے اور ہوا دشمنوں کی ٹکٹی ہوئی ٹمپوں سے گلے لگ کر بسکپاں بھر رہی ہے۔ ہمیں بھی اُس جیل کا راستہ بتائی جاؤ جہاں زعفران اگتی ہے اور جہاں پہنچ کر فرودہ کنواریاں گھر واپس آنا قبول مانتی ہیں۔ اور پھر کھلی کھڑکی میں سے آدمی رات کو چلنے والی ہوا کھجور کا اندھا یا اور جیسے کسی نے آہ، ہرگز شک آواز میں کہا۔

SO SIGH WE PASSING OVER THE SILVER STRINGS
WE ARE THE VOICES OF THE WANDERING WINDS

..... WANDER THOU TOO, O, PRINCE!

دوسرے دن رضیہ کو ہری ناگ کے آبائی قبرستان میں اپنے باپ کے پہلو میں دفنایا گیا۔

دسمبر کی گھڑاؤ سردرات ہے۔ بارش اتنی اچھی لگی ہے۔ کینال بینک کی تمام کوٹھڑیوں میں نازیدار ہے۔ صوف ایک کوچہ کے
 صوفی کمرے ہیں، ہلکی روشنی چوری ہے اور اندر ادیر مڑ مڑ کا ایک اداس چہرے والا آدمی سیاہ آنسو میں میڑ میڑ گھسی عورت کے ہاتھ کی
 کھسی ہوئی پرانی فائبر پڑھ رہا ہے۔ اس کے ساتھ والے کمرے میں ایک انتہائی لاغر بزرگی عورت لاف میں اپنی بیٹی کی یا میں آنسو
 بہا رہی ہے۔

اور کینال بینک سے دُور — باغوں، پھیتوں، میدانوں کے اُس پار قصبہ ہری ناگ کے حویلی بنا پرانے مکان کو تیار کی
 نے اپنی بیٹی کوئی سرد چادر میں لپیٹ رکھا ہے کسی کھر کی میں لمب نہیں مل رہا۔ اُس کی دیواریں پر گھاس لگ آئی ہے اور گلاب کی
 ہیں نیچے گر پڑی ہے۔ اور یہاں سے جنوب کی طرف نہر کے پار مغل دربار کی گننام کینز کی تربت پر اُس کی چھتیاں جھکی ہوئی ہیں اور
 قریب ہی پرانے قبرستان میں ایک جگہ رضیہ دفن ہے۔ اس کی پختہ قبر پر کافٹی جی ہے اور اوپر درختوں کی ٹہنیوں میں لگا ہوا بارش کا
 پانی ٹپک رہا ہے، رورہا ہے۔

گڈ ریا

اشفاق احمد

یہ سردیوں کی ایک ریاح بستہ اور طویل رات کی بات ہے میں اپنے گرم گرم بستر میں سر بڑھلنے لگی ہوں۔ سو رہا تھا کہ کسی نے
نہرے سے مجھ کو ڈک کر لے جکا دیا۔

”کون ہے؟“ میں نے چیخ کر پوچھا اور اس کے جواب میں ایک بڑا سا ہاتھ میرے سر سے ٹکرایا اور گھپ اندھیرے سے آواز آئی
”تھانے والوں نے رات کو گرفتار کر لیا۔“

”کیا؟“ میں نے لڑتے ہوئے ہاتھ پیسے دکھلایا چاہیہ کیا ہے؟“

اور تاریکی کا جوت بولا ”تھانے والوں نے رات کو گرفتار کر لیا۔“ اس کا فارسی میں ترجمہ کر دو۔“

”داؤ جی کے پیچھے“ میں نے روکھے ہو کر کہا ”داؤ جی آدمی رات تنگ کرتے ہیں۔“ دغ ہو جاؤ۔ میں نہیں آپکے گھر
دھننا میں نہیں پڑھتا۔ داؤ جی کے پیچھے۔“ کچھ اُڑ میں روٹنے لگا۔

داؤ جی نے چمکا کر کہا ”اگر پڑے گا نہیں تو پاس کیسے ہوگا! پاس نہیں ہوگا تو بڑا آدمی نہیں سکے گا پھر لوگ تیرے داد کو
کیسے جانیں گے؟“

”والہ کرے سب میرا جی آپ بھی آپ کو جاننے والے بھی..... اور میں بھی..... میں بھی.....“ میں نے اپنی ”جہان نگر“
پر میں ایسا رو دیا کہ دو ہی لمحوں میں گنگھی بند ہو گئی۔

داؤ جی بڑے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پیرے جلتے تھے اور کہہ رہے تھے ”بس اب چپ کر شہلاش۔“ میرا اچھا بیٹا۔
اس وقت پہ ترجمہ کر دے پھر نہیں منگاؤں گا؟“

”آٹھ سو لاکھ کا تار ٹوٹا جلا تھلہ میں نے جل کر کہا“ ”آج صرامزادے رات کو کچھ لکھ لکھ گئے کل کسی آدمی کو پکڑ لیں گے۔ آپ کا
ترجمہ تو.....“

”میں نہیں“ میں نے اٹھنوں نے بات کاٹ کر کہا ”میرزا زادہ رہا۔ آج کے بعد رات کو جگا کر کچھ نہ پوچھوں گا۔“ شہلاش اب بتا۔
”تھانے والوں نے رات کو گرفتار کر لیا۔“

میں نے روٹ کر کہا ”مجھے نہیں آتا۔“

”فوراٰ نہیں کہہ دیتا ہے،“ انھوں نے برسے ہاتھ اٹھا کر کہا ”لوکشش تو کر۔“
 ”منہیں کرنا،“ میں نے جمل کر جواب دیا۔

اس پر وہ ذرا ہلنے اور بولے ”کارکنانِ گزمرخانہ رافورا تو قیوت کر دند۔“ کارکنانِ گزمرخانہ، تھانے والے عیونیا نہیں بننا لفظ ہے نئی ترکیب ہے دس مرتبہ کہو۔

مجھے پڑھا کر یہ بلانے والی نہیں ناچار گزمرخانہ والوں کا پہاڑہ شروع کر دیا جب دس مرتبہ کہہ چکا تو واؤچی نے بڑی لمبا جت سے کہا اب سا مانغہ پاچا بار کو جب، یعنی نہ سمیت بھی ختم ہوئی تو انھوں نے شجے آرام سے بستر میں لٹاتے ہوئے اور رضائی اوڑھائے ہوئے کہا ”عجونا نہیں،“ میں اٹھ ہی پوچھوں گا؟
 پھر وہ بدھت آئے تھے ادھر کوٹ گئے۔

خام کو جب ملہ جی سے سپاہیہ کا سہتیے کر لٹا تو فورا سیوں والی لگی سے ہو کر اپنے گھر جایا کرتا۔ اس کی میں طرح طرح کے لوگ جتنے جتنے سرت ہوئے ماشکی سے واقف تھا جس کو ہر سب ”کدو کر ملا ڈھائی“ آئے، ”کتے تھے،“ ماشکی کے کھسکے ساتھ بکریوں کا ایک باڑہ تھا جس کے تین طرف تے کچے مکاؤں کی دیواریں اُرد سلسلے کے رُخ آڑی ترجی لکڑیوں اور خار دار بھادریوں کا اونچا اونچا جھگڑا تھا۔ اس کے بعد ایک چور کور میدان آتا، پھر لنگڑے کہار کی کوٹھی اور اس کے ساتھ گیارہ دو گئی کھڑکیوں اور پہلی کی کیبلوں دے دے دے کا ایک چھوٹا سا پکا تار اس کے بعد لگی میں دوسرا نو پیدا ہوتا اور قد سے تنگ ہوجاتی پھر چوں اس کی لمبائی بڑھتی توں توں اس کے دونوں بازو بھی اُردھ سے کترہ آتے جلتے۔ شاید وہ ہمارے قصبے میں سب سے لمبی گئی تھی۔ اور حد سے زیادہ منساں اس میں اکیلے چلتے ہوئے مجھے ہمیشہ یوں لگتا تھا جیسے میں مندوق کی نالی میں چلا جا رہا ہوں اور چوٹی میں اس کے دانے سے باہر نکلن کا زور سے ”مغناہیں“ ہوگا اور میں مرجاؤں گا۔ مگر خاشاک کے وقت کوئی نہ کوئی ناگہرا س لگی میں ضرور مل جاتا اور میری جان بچ جاتی۔ ان آئے جلتے والوں میں کبھی کبھار ایک غریبہ بچوں والا لاسا آدمی ہی ہوتا جس کی شکل بارہ ماہ دے ملے سے بہت ملتی تھی۔ سر پر میل کی بڑی سی بگڑی۔ ذرا سی خمیدہ کر پڑھی رنگ کا ڈھیلہ اندھا کوٹ۔ کھدہ کا تنگ پانچا اور پاؤں میں قلیٹ بوٹ۔ اکثر اس کے ساتھ میری ہی ہو کر ایک لڑکا بھی ہوتا جس نے میں اسی طرح کے کپڑے پہنے ہوتے اور وہ آدمی سر جھکے اور اپنے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے آہستہ آہستہ اس سے باتیں کر لیا کرتا جب وہ میرے برابر آتے تو لڑکا میری طرف دیکھتا تھا میں اس کی طرف اور پھینک ثانیہ ٹھکے بغیر گردن کو کر دندا اور تھکتے ہم اپنی اپنی راہ چلے جاتے۔

لیک دی جب میں اور میرا بھائی ”نشیان“ کے چوہرے پھلیاں بیٹھنے کی ناکام کوشش کے بعد قصبہ کو واپس آ رہے تھے تو ہر کھٹ پڑی پڑی آدمی اپنی گھڑی گود میں ڈالے بیٹھا تھا اور اس کی سفید چٹیا میل رخی کے پرد کی طرح اس کے سر سے چکی ہوئی تھی۔ اس کے خوب سے کوشتے ہوئے میرے بھائی نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہہ کر دوسرے کہا ”داؤچی سلام؟“
 اور داؤچی نے سر جھکا کر جواب دیا ”مجھے نہ ہو۔“

یہ جان کر کہ میرا بھائی اس سے واقف ہے میں بے حد خوش ہوا اور غور سے یہ بعد اپنی منہنی آواز میں چلیا ”داؤچی سلام“

”جیسے رہو! جیسے رہو!“ انہوں نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا۔ اور میرے بھائی نے پٹاخ سے مجھے زمانے کا ایک
تغیر دیا۔

”بشخصی خورے، کٹے،“ وہ چیخا ”وہ جب میں نے سلام کر دیا تو تیری کیا ضرورت رہ گئی تھی؟ ہر بات میں اپنی ٹانگ پھنسانا ہے کیونکہ
سجلا کوں ہے وہ؟“

”داؤجی!“ میں نے بسور کر کہا۔

”کون داؤجی؟“ میرے بھائی نے تنک کر پوچھا۔

”وہ جو بیٹھے ہیں وہ داؤجی“ میں نے آنسو پی کر کہا۔

”تو اس نرک“ میرا بھائی چپکلا اور آنکھیں نکال کر بولا ”ہر بات میں میری نقل کرتا ہے کٹا“ بشخصی خور!“

پھر میں نہیں بولا اور خاموشی کے ساتھ ماہ چلتا رہا۔ دراصل مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ داؤجی سے تعارف ہو گیا۔ اس کا
رہنچہ نہ تھا کہ بھائی نے مجھے تغیر کیوں مارا۔ وہ تو اس کی عادت ہی تھی۔ بڑا تھا نا اس لیے ہر بات میں اپنی نشانی بکھارتا تھا۔

داؤجی سے علیک سلیک تو ہو ہی گئی تھی۔ اس لیے میں کوشش کر کے لگی سے اس وقت گزرنے لگا جب وہ آجائے ہو

انہیں سلام کر کے برا مزہ آنا تھا اور جواب پا کر اس سے بھی زیادہ۔ وہ جیسے رہو پوچھ اسی محنت سے کہنے کو زندگی دو چہرہ سی ہو جاتی

اور آدمی نہیں سے ذرا اوپر اٹھ کر ہو ایں چلنے لگتا۔ سلام کا یہ سلسلہ کوئی سال بھر پوہنی چلتا رہا اور اس شناس میں مجھے اسی قدر

معلوم ہو سکا کہ داؤجی گہروں کی گھر کیوں داسے مکان میں رہتے ہیں اور چھوٹا لڑکا ان کا بیٹا ہے۔ میں نے اپنے بھائی سے ان کے متعلق

کچھ اور بھی پوچھنا چاہا مگر وہ بڑا سخت آدمی تھا اور میری جھوٹی بات پر چڑھنا تھا میرے ہر سوال کے جواب میں اس کے پاس

کھڑے کھڑے دودھ سے ہوتے تھے ”تجھے کیا؟“ اور ”تو اس نرک؟“ مگر وہ لڑکا شکر ہے کہ میرے تجسس کا یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہ چلا۔

اسلامیہ پرائمری سکول سے جو تھی پاس کر کے میں ایم۔ بی۔ بی سکول کی پانچویں جماعت میں داخل ہوا تو داؤجی کا دیکھنا میرا سب سے جماعت نکلا۔

اس کی بددوسے اور اپنے بانی کا احسان اٹھانے بغیر میں یہ جان گیا کہ داؤجی کھڑی تھے اور تعصب کی مصنفی میں عوامی نوپسی کا کام کرتے

تھے۔ دیکھ کے کا نام امی چند تھا اور وہ جماعت میں سب سے ہشیار تھا۔ اس کی گیلی کلاس پھر میں سب سے بڑی تھی اور چہرہ بی کی طرح

چھوٹا چند لڑکے اسے میاؤں کہتے تھے اور باقی بچوں کو کہہ کر پکارتے تھے۔ مگر میں داؤجی کی وجہ سے اس کو اس کے اصلی نام ہی

سے پکارنا تھا اس لیے وہ میرا دوست بن گیا اور ہم نے ایک دوسرے کو نشانیوں سے دے کر کپکپے یا رہنے رہنے کا

وعدہ کر لیا۔

گرمیوں کی چٹشیاں شروع ہونے میں کوئی ایک ہفتہ ہو گیا جب میں اچھی چند کے ساتھ پہلی مرتبہ اس کے گھر گیا۔ وہ مگر موبوں

کی ایک مجلس نے والی دوپہر تھی لیکن بیٹھ چلی کی کہانیاں حاصل کرنے کا شوق بھر پر بھڑکتا بن کر سوار تھا اور میں بھوک اور دوسرے دوزخوں

سے بے پروا ہو کر سکول سے سیدھا اس کے ساتھ چل دیا۔

اچھی چند کا گھر چھوٹا تھا لیکن بہت ہی صاف ستھرا اور روشن۔ بیٹل کی کیلوں والے دروازے کے بعد ذرا سی ڈیوڑھی تھی

آگے مستطیل صحن سامنے سرخ رنگ کا ہرآمدہ اور اس کے نیچے اتنا ہی بڑا ایک کمرہ۔ صحن میں ایک طرف انار کا پیڑ عقین کے چند پودے

اور دنیا کی ایک بڑی سی کیادی تھی۔ دوسری طرف چڑی بیڑیوں کا ایک ویز جس کی عراب تلے مختصر سی رسوئی تھی۔ رگ و رنگی کھڑکیاں ڈوڑھی سے طعنے ٹیک میں کھاتی تھیں اور میٹک کا ردو واڑہ نیلے رنگ کا تھا۔ جب ہم ڈوڑھی میں داخل ہوئے تو اتنی چند نے چلا کر ”بے بے تھے“ کہا اور مجھے صحن کے نیچے چوڑو کر جھٹک میں گھس گیا۔ برآمدے میں بوریا بچائے بے بے مشین چلا رہی تھی اور اس کے پاس ہی ایک لوکی بڑی سی پتلی سے کپسے نعل کر رہی تھی۔ بے بے نے منہ ہی منہ میں کچھ جواب دیا اور ویسے ہی مشین چلاتی رہی۔ لوکی نے نگاہیں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور گردن موڑ کر کہا ”بے بے شاید ڈاکٹر صاحب کا دل کا ہے؟“

مشین روک گئی۔

”ہاں ہاں“ بے بے نے سسکارا کر کہا اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنی طرف بلایا۔ میں اپنے جزدان کی رسی مروڑنا اور بیڑے چڑھے پاؤں دھرتا ہوا آگے کے ستون کے ساتھ آگیا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“ بے بے نے چوکر پوچھا اور میں نے نگاہیں جھکا کر ہستہ سے اپنا نام بتایا۔

”آفتاب سے بہت مشکل ملتی ہے“ اس لوکی نے پتلی زمین پر رکھ کر کہا ”ہے نا بے بے“

”کیوں نہیں بھائی جو ہوا؟“

”آفتاب کی؟“ اندر سے آواز آئی ”آفتاب کیا بیٹا؟“

”آفتاب بھائی ہے دادی“ لوکی نے رکتے ہوئے کہا ”اجی چند کے ساتھ آیا ہے؟“

اندر سے دادی برآمد ہوئے۔ انہوں نے گھٹنوں تک اپنا ہاتھ مار چڑھا رکھا تھا اور کر تہ آواز ہوا تھا۔ مگر سر پر کڑی بدمذوقی۔

پانی کی ایک ٹکلی بھی باقی اٹھائے دہ برآمدے میں آگے اور میری طرف خور سے دیکھتے ہوئے بوسے ”ہاں شکل بہت ملتی ہے مگر میرا

آفتاب بدلت ڈبلا ہے اور یہ تو دو سو سا ہے“ پھر باقی فرش پر رکھ کے انہوں نے میرے سر پر ہاتھ بھر اور پاس ہی کاٹھ کا ایک

سٹول کھینچ کر اس پر بیٹھ گئے۔ زمین سے پاؤں ادا پر اٹھا کر انہوں نے آہستہ سے انہیں جھاڑا اور پھر باقی ہر خیال دے۔

”آفتاب کا خطا آتا ہے؟“ انہوں نے باقی سے پانی کے چلو بھر کر ٹانگوں پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”آتا ہے جی“ میں نے ہولے سے کہا ”پرسوں آیا تھا؟“

”کیا لکھتا ہے؟“

”پتہ نہیں جی بابا جی کو پتہ ہے؟“

”اچھا“ انہوں نے سر ہلا کر کہا ”تو آتا جی سے پوچھا کر، ا!۔ جو پوچھتا نہیں اسے کسی بھی بات کا علم نہیں ہوتا“

میں چپ رہا۔

فقوڑی دہرا انہوں نے ویسے ہی چلو ڈالتے پوچھا ”کو فسا سیسا رہ پڑھ رہے ہو؟“

”جو تھا“ میں نے دلتوق سے جواب دیا۔

”کیا نام ہے تیسرے سید پلے کا؟“ انہوں نے پوچھا۔

”جی پتہ نہیں“ میری آواز بھر ڈوب گئی۔

”بلاذکر اذ یسّر“ انہوں نے پانی سے ہاتھ باہر نکال کر کہا۔ پھر خود ہی دیر وہ ہاتھ جھٹکتے اور ہوا میں لہرتے رہے۔ پہلے
مٹیں چلائی یہی وہ لڑکی نعمت خاں سے روٹی نکال کر برآمدے کی چوکی پر لٹانے لگی اور میں حزدان کی ڈوری کو کھوٹا پھینکا ہوا۔
ای چند، اچھ نکات چٹکے اندر ہی تھا اور میں سنوں کے ساتھ ساتھ جمیع کی کہیں گہرا بھوں میں اتار آمارا تھا ماحداؤ جی سے
نکلا میں میری طرف پھر کر کہا ”سورہ فاتحہ سناؤ“

”کچھ نہیں آتی“ میں نے شرمندہ ہو کر کہا
انہوں نے حیرانی سے میری طرف دیکھا اور پوچھا ”الحمد للہ بھی نہیں جانتے؟“
”الحمد للہ تو جانتا ہوں جی“ میں نے جلدی سے کہا۔

وہ ذرا مسکرائے اور گویا اپنے آپ سے کہنے لگے ”ایک ہی بات ہے، ایک ہی بات ہے! پھر انہوں نے سر کے
اٹکائے سے کہا سناؤ“

جب میں سانس لگا تو انہوں نے اپنا بیٹا میرے کندھوں سے نیچے کر لیا اور بگڑی کا شلہ پڑا کر کے کندھوں پر ڈال دیا اور
جب میں نے دُکا اذ یسّر کہی تو میرے ساتھ ہی انہوں نے بھی ”میں کہا۔ کچھ خیال بھرا کہ وہ ابھی کھڑکے نیچے کچھ انعام دیں گے
کیونکہ پہلی مرتبہ جب میں نے اپنے آبا جی کو الحمد للہ سنانی تو انہوں نے بھی ایسے ہی آہن کیا تھا اور ساتھ ہی ایک دو پیر بھی انعام
بھی دیا تھا مگر داؤ جی اس طرح بیٹھے رہے بلکہ وہ بھی پتھر ہو گئے۔ اتنے میں اتنی تیز کتاب تلاش کر کے لے آیا اور جب میں بیٹھے لگا
تو میں نے بات کے خلاف اہستہ سے کہا ”داؤ جی سلام“ اور انہوں نے ویسے ہی دُوبے دُوبے ہوئے سے جواب دیا ”جیسے تُو بٹے ہے
نے مشین روک کر کہا“ ”کبھی کبھی امی چیز کے ساتھ کھیلنے آ جایا کرو.....“

”ہاں آ جاؤ“ ”داؤ جی چونک کر بولے“ ”آفتاب بی آیا کرتا تھا“ پھر انہوں نے بائی پر جھکتے ہوئے کہا ”ہمارا آفتاب تو ہم
سے بہت دور ہو گیا“ اور فارسی کا شعر سا پڑھنے لگے۔

یہ داؤ جی سے میری باقاعدہ پہلی ملاقات تھی اور اس ملاقات سے میں یہ نتائج اخذ کر کے حاکم داؤ جی بڑے کچھ نہیں حد
زیادہ چپ سے ہیں اور کچھ برے سے ہیں۔ اسی دن شام کو میں نے اپنی امل کو بتایا کہ میں داؤ جی کے ٹھہر گیا تھا اور وہ آفتاب بجائی
کو بہت یاد کر رہے تھے۔

اماں نے دُکے تھی سے کہا ”تو مجھ سے پوچھ تو لیتا ہے شک آفتاب ان سے پڑھتا رہا ہے اور ان کی بہت عزت
کر تا ہے مگر تیرے آبا جی ان سے بولتے نہیں ہیں۔ کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا سو اب شک ناراضی آتی ہے۔ اگر اعلیں پتھر چل گیا کہ تو
ان کے ہاں گیا تھا وہ خفا ہوں گے“ پھر اماں نے ذرا پھر دیں کر کہا ”اپنے آبا سے“ اس کا ذکر نہ کرنا“

میں آبا جی سے بھلا اس کا ذکر کیوں کرتا مگر یہی بات تو یہ ہے کہ میں داؤ جی کے ہاں جاتا رہا۔ وہ خوب خوبان سے تھری
کی باتیں کرتا رہا وہ چٹائی پھیلائے کوئی کتاب پڑھ رہے ہوتے میں اہستہ سے ان کے پیچھے جا کر کھڑا ہو جاتا اور وہ کتاب بند کر کے
کہتے ”جو گوا گیا“ پھر میری طرف مڑتے اور منہ کر کے ”کوئی گپ سنا“ اور میں اپنی بساط اور کھمکے ”ابنِ حوٰنڈہ و حانڈہ کے
کوئی بات سنا تو وہ خوب ہنستے میں یوں میرے سے ہنستے حالانکہ مجھے اب محسوس ہوتا ہے کہ وہ کچھ ایسی دُچپ باتیں بھی نہ بھرتی

میں پھر وہ اپنے جوش سے کوئی کاغذ نکال کر رکھنے سے ایک سوال نکال۔ اس بات سے میری حمان جاتی تھی لیکن ان کا مددہ بڑا سبیلہ ہوتا کہ ایک سال اور پندرہ مہینہ باقی اس کے بعد ایک اور سوال اور پھر پندرہ منٹ کہیں چنانچہ میں مایا جاتا اور کاغذ لے کر بیٹھ جاتا۔ لیکن ان کے خود ساختہ سوال لکھ ایسے اچھے ہوتے کہ لکھی باتوں اور اگلے سوالوں کا وقت بھی نکل جاتا۔ اگر خوش قسمتی سے سوال مبدل ہو جاتا تو وہ چٹائی کو ہاتھ لگا کر پوچھنے لگتا کہ ”چٹائی“ میں نہ بھاڑ کر جواب دیتا رہا ”اوں ہوں“ وہ سر ہلا کر کہنے ”خامی میں بناؤ“ تو میں تنک کر جواب دیتا ”وہی، ہم کوئی فارسی پڑھانی جاتی ہے“ اس پر وہ چمکا کر کہنے ”میں جو پڑھاتا ہوں گو تو میں جو سکھاتا ہوں۔ سنو! فارسی میں بوریا، عربی میں حمیر، میں شرارت سے ہاتھ بڑھ کر کہتا درخشو جی کشو، فارسی بھی، اور عربی بھی۔ میں نہیں پوچھتا جی معاف کرو“ مگر وہ سُنی اور سُنی کر کے کہنے فارسی بوریا عربی حمیر اور پھر کہنی چاہے ایسے کانوں میں۔ سیسہ بھر لیتا داؤج کے الفاظ کہتے چلے جاتے۔۔۔۔۔ اسی چند کالوں کا کیرا تھا۔ سامانِ مختلف میں بیٹھا لکھتا پڑھتا۔ داؤجی اس کے اوقات میں محل نہ ہوتے تھے لیکن ان کے دادا آتی چند پر بھی بڑا برہم ہوتے سب سے وہ اپنی نشست سے اٹھ کر گھر سے پانی پیئے آیا داؤجی نے کتاب سے نکالیں اٹھا کر پوچھا ”بیٹا دو کاناؤں کیا ہے؟“

اس نے مجھ سے سڑک کے ساتھ لڑنے لگانے ”ڈیڈ“ کہا اور پھر گلاس گھڑ پوچی تیلے چھبک کر اپنے کمرے میں آگیا۔ داؤجی پھر پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ گھر میں ان کو اپنی بیٹی سے بڑا پیار تھا۔ ہم سب اُسے بی بی کہہ کر پکارتے تھے۔ لیکلے داؤجی نے اس کا نام قرۃ دکھا ہوا تھا۔ اکثر انہی لاکھتے ”قرۃ“ پر قلمی تھپے کب چھوٹے گی؟“ اور وہ اس کے جواب میں مسکرا کر خاموش ہو جاتی۔ بے بے کو اس نام سے بڑی چڑھتی۔ وہ چیخ کر جواب دیتی ”نوسے! اس کا نام قرۃ رکھ کر اس کے بھاگ میں کرتے بیٹے لکھو اور بیٹے ہیں۔ منہ اچھا نہ ہو تو شہد تو اپنے نکالنے چاہئیں“ اور داؤجی ایک لمبی سانس لے کر کہتے ”جاہل! اس کا مطلب کیا جائیں؟“ اس پر بے کا نفع چبک اٹھتا اور اس کے مزے میں جو تانگتی چلی جاتی۔ بیٹے کو سے پھر بد دعائیں اور آخر میں گالیوں پر اتر آتی۔ بی بی روکتی تو داؤجی کہتے ”ہو میں چلے کو ہو تو ہیں میٹا اور گالیاں برسے کو۔ ہم انہیں رو کو مت انہیں ٹوکو مت۔ پھر وہ اپنی کت میں بیٹھنے اور اپنا محبوب حمیر اٹھا کر چپکے سے بیڑھیاں چڑھ جاتے۔

نویں جماعت کے شروع ہی میں مجھے ایک بُری عادت پڑ گئی اور اس بُری عادت نے عجیب گُل کھلائے۔ حکیم علی احمد مرحوم ہمارے قصبہ کے ایک ہی حکیم تھے۔ علاجِ معالجے سے تو ان کو کچھ ایسی دلچسپی نہ تھی لیکن باتیں بڑی مزیدار سنا تے تھے۔ اولیاؤں کے تذکرے جنوں محبوبوں کی کہانیاں اور حضرت سلیمان اور ملکہ سبا کی گھر بوزندگی کی داستانیں اُن کے تیر بہدت ٹوٹے تھے۔ ان کے تنگے تار یک مطلب میں معجون کے چند بولوں۔ شربت کی دس چندہ بونٹوں اور دو آتش فیشیوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ دو داؤں کے علاوہ وہ اپنی طبعی تقریر اور حضرت سلیمان کے خاص صدی تعویذوں سے روضہ کا علاج کیا کرتے۔ انہی باتوں کے لیے دور دراز گاؤں کے مریض ان کے پاس کچھ چلے آتے اور فیضیاب ہو کر جاتے۔ ہفتہ دو ہفتہ کی صحبت میں میرا ان کے ساتھ ایک معاہدہ ہو گیا۔ میں اپنے ہسپتال سے ان کے لیے خالی بوتلیں اور شیشیاں چمڑا کے لانا اور اس کے بدلے میں وہ مجھے داستانِ امرِ مجرہ کی جلدیں پڑھنے کے لیے دیا کرتے۔ یہ کتابیں کچھ ایسی دلچسپ تھیں کہ میں رات رات بھر اپنے بستر میں دیک کر انہیں پڑھا کرتا اور صبح دہڑک سیار تھا۔ اماں

میرے اس مدیہ سے سخت نالاں تھیں، آج کو میری صحت برباد ہونے کا خطرہ لاحق تھا۔ لیکن میں نے ان کو بتا دیا تھا کہ چلے جے جان چل جائے اب کے دوسری میں وظیفہ ضرور حاصل کر دوں گا۔ رات ظلم ہو کر باکے ایوانوں میں بسر ہوئی اور دن کلاس میں بیچ پر کھڑے ہو کر سرمایہ امتحان میں فیصل ہوئے پھر تے۔ پچاس شاہی میں بیارہو گیا اور سالانہ امتحان کے موقع پر حکیم جی کی مدد سے ماسٹروں سے مل ملا کر پاس ہو گیا۔ دسویں میں مصلحتاً، فسانہ آزاد اور اہل بلبل ساڈھا ساتھ چلتے تھے۔ فسانہ آزاد اور مصلحتی نامہ گھر پر رکھے تھے لیکن اہل بلبل سکول کے ڈسٹک میں بند رہتی۔ آخری بیچ پر جعفر افیر کی کتاب تھے سندباد جہازی کے ساتھ ساتھ چلتا اور اس طرح دنیا کی سیر کرتا

بائیس می کا واقعہ ہے کہ صبح دس بجے یونیورسٹی سے نتیجہ کی کتاب ایم۔ بی۔ ایٹو سکول پہنچی۔ اسی چند ضرورت سکول میں بلکہ ضلع بھر میں اول آیا تھا۔ سچہ لڑکے نیل تھے اور بائیس پاس۔ حکیم جی کا جادو یونیورسٹی پر نہ چل سکا اور پنجاب کی جاہل دانش گاہ نے میرا نام بھی ان چٹوں و ٹکوں میں شامل کر دیا۔ اسی شام جبکہ گاؤں میں میرے والد سے میری بیٹائی کی اور گھر سے باہر نکال دیا۔ میں ہسپتال کے ریمٹ کی گدی پر آ بیٹھا اور۔ ات کے تنگ سوچا کہ اس کا کیا چاہئے اور کدھر جانا چاہئے۔ خدا کا ملک بنگ نہیں تھا اور میں عورت عیار کے ہمکناروں اور سندباد جہازی کے تمام طریقوں سے واقف تھا مگر پھر بھی کوئی راہ سمجھا نہ دیتی تھی۔ کوئی ددھیں گئے مسلسل اسی طرح سات دو چار اس گدی پر بیٹھا زیت کرنے کی راہیں سوچتا رہا۔ اتنے میں اہل سفید چادر اور سے لگے ڈھونڈتی ڈھونڈتی ادھر آ گئیں اور آج سے معافی لے دیے کا وعدہ کر کے مجھے چھوڑ کر لے گئیں۔ رنجھائی والی ہے کوئی دلچسپی نہ تھی مجھے تو بس ایک رات اور ان کے سیان گزرائی تھی اور صبح سویرے اپنے رنچہ نہ ہونا تھا۔ چنانچہ میں آرام سے ان کے ساتھ جا کر حسیب مول اپنے بستر پر ملازم ہو گیا۔

اگلے دن میرے نیل ہونے والے ساتھیوں میں خوشیا کو ڈرا اور وسیب بیک مسجد کے کچھارے ٹال کے پاس بیٹھے مل گئے۔ وہ لاہور جا کر بزنس کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ وسیب بیک نے مجھے بتایا کہ لاہور میں بہت بزنس ہے کیونکہ اس کے بھائی جی اکثر اپنے دوست فرخ چنڈ کے ٹھیکوں کا ذکر کیا کرتے تھے جس نے سال کے اندر اندر دو کادیں خرید لی تھیں۔ میں نے ان سے بزنس کی نوعیت کے بارے میں پوچھا تو وسیب نے کہا لاہور میں ہر طرح کا بزنس مل جاتا ہے۔ بس ایک دفتر ہونا چاہئے اور اس کے سامنے بڑا ساسن بورڈ۔ سائی بورڈ کو دیکھ کر لوگ خود ہی بزنس دے جاتے ہیں۔ اس وقت بزنس سے مراد وہ کرنسی نوٹ لے رہا تھا۔ میں نے ایک تہہ پھر وضاحت چاہی تو کوڈو چک کر بولا ”یاد دوسرے کچھ جانتا ہے، یہ بتا کر تو تیار ہے یا نہیں؟“

پھر اس نے نپٹ کر دوسرے پوچھا ”انارکلی میں دفتر بنائیے گے نا؟“
دوسرے نے دھا سوچ کر کہا ”انارکلی میں بادشاہ عالمی کے باہر دو لوں ہی جگہیں ایک سی ہیں؟“
میں نے کہا ”انارکلی زیادہ مناسب ہے کیونکہ وہی زیادہ مشہور جگہ ہے اور اخباروں میں جتنے بھی اشتہار نکلتے ہیں ان میں انارکلی لاہور لکھا ہوتا ہے۔“

چنانچہ یہ طے پایا کہ اگلے دن دونوں کے گاڑی سے ہم لاہور روانہ ہو جائیں گے۔
گھر پہنچ کر میں سفر کی تیاری کرنے لگا۔ نوٹ بائیں کوڑا تھا کہ نوکرنے کو فرات سے سکواتے ہوئے کہا ”چلو جی ٹی اکڑ صاحب ملے ہیں۔“
”کہاں ہیں؟“ میں نے برش زمین پر رکھ دیا اور کھڑا ہو گیا۔

”ہسپتال میں“ وہ بدتمیز مسکرا رہا تھا کہ میری بیٹائی کے روزگار میں وہ بھی شامل تھا۔

میں ڈوٹے ڈرتے ہمارے کسی بیٹھیاں چڑھا۔ پھر آہستہ سے حالی دلا دواڑہ کھول کر آیا جی کے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں ان کے علاوہ دائرہ بھی بیٹھ گئے۔ میں نے سب سے دائرہ جی کو سلام کیا اور اس کے جواب میں بڑی دیکے جلد جیتے رہو کی باتوں دعا سنائی۔

”ان کو پچھانے ہو؟“ بات جی نے سختی سے پوچھا۔

”جے شک؟“ میں نے ایک مہذب سلاہن کی طرح کہا۔

”جے شک کے بچے، حجاز اداست میں تیری یہ سب.....“

”مذہب کا صاحب“ دائرہ جی نے ہاتھ ادا ہوا تھا کر کہا ”یہ تو مت ہی اچھا پچھ ہے اس کو تو.....“

اور ڈاکٹر صاحب نے بات کا ٹکٹھی سے کہا ”آپ نہیں جانتے فشی جی اس لینے نے میری عزت خاک میں ملا دی“

”آپ فلا نہ رہیں“ دائرہ جی نے نہر جھکا کے کہا ”یہ ہمارے آفتاب سے بھی ذہین ہے اور ایک دلی.....“

اب نے ڈاکٹر صاحب کو غصہ آگیا اور انھوں نے نیز پر ہاتھ مار کر کہا ”کبھی بات کرتے پھرتی جی! یہ آفتاب کے جوتے کی برابری نہیں کر سکتا۔“

”کر لیا، کر لیا! ڈاکٹر صاحب“ دائرہ جی نے اثبات میں سر ہلانے ہوئے کہا ”آپ خاطر جمع رکھیں۔“

پھر وہ اپنی کرسی سے اٹھ اور میرے کندے پر ہاتھ رکھ کر بولے ”میں سیر کو چلنا ہوں تم بھی میرے ساتھ آؤ۔ راستے میں باتیں کریں گے۔“

آج اسی طرح کرسی پر بیٹھنے غصے کے عالم میں اپنا جیٹر اڈٹ پٹ کرتے اور بڑبڑاتے رہے میں نے آہستہ آہستہ چل کر کھالی دالا دروازہ کھولا تو دائرہ جی نے نیچے سر کر کے ڈاکٹر صاحب بھول نہ جانے کا اچھی جھجھکا دیکھے گا۔

آج جی نے دلے ہی چیزیں بیٹھنے ”اچھا“ کہا اور دائرہ جی خدا حافظ کہہ کر میرے ساتھ ہی کمرے سے باہر نکل آئے۔

دائرہ جی بچے اور حرا دھر گھماتے اور مختلف درختوں کے نام غامسی میں بتاتے نہر کے اسی پل پر گئے جہاں پہلے پل میرا ان سے تعارف ہوا تھا۔ اپنی عجیب و غریب نشست پر بیٹھ کر انھوں نے پکڑی آنا کر گود میں ڈال لی، سر پر ہاتھ پھیرا اور مجھے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

پھر انھوں نے آنکھیں بند کر لیں اور کہا ”آج سے میں تمہیں پڑھاؤں گا اور اگر جماعت میں اولی نہ نہ لاسکا تو فرسٹ ڈویژن ضرور لو اور ان کا۔ میرے ہر اسے میں خداوند تعالیٰ کی مدد شامل ہوتی ہے اور اس سستی نے مجھے اپنی رحمت سے کبھی مایوس نہیں کیا.....“

”مجھ سے پڑھائی نہ ہوگی“ میں نے گستاخی سے بات کاٹی۔

”تو اور کیا ہوگا گو؟“ انھوں نے مسکرا کر پوچھا۔

میں نے کہا ”میں پڑش کروں گا، روپ کر اداں گا اور اپنی کار سے کر یہاں آؤں گا پھر دیکھنا.....“

اب کے دائرہ جی نے میری بات کاٹی اور بڑی محنت سے کہا ”خدا ایک جھوڑے تجھے دس کا دیں گے لیکن ایک اُن بڑھکی کا دیں نہ میں بیٹوں گا نہ ڈاکٹر صاحب۔“

میں نے حل کر کہا ”مجھے کسی کی پروا نہیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنے گھر ماضی میں اپنے یہاں خوش۔“

انھوں نے حیران ہو کر پوچھا ”میری بھی پروا نہیں؟“ میں کیہ کہنے ہی دلا تھا کہ وہ ڈکھی سے ہو گئے اور بار بار رہنے لگے میری

بھی پڑھائیں؟ اور گویا میری پڑھائیں؟

مجھے ان کے لہجہ پر قوی آئے گا اور میں نے آہستہ سے کہا: ”آپ کی تو سب کچھ.....“ مگر انھوں نے میری بات نہ سنی اور کہنے لگے: ”اگر آپ نے حضرت کے سامنے میرے منہ سے اسی بات نکال دیتی، اگر میں یہ کفر کا کلمہ کہہ جاتا..... تو..... تو..... انھوں نے فوراً پیگڑی اٹھا کر سر پر رکھ لی اور بدھتو ہو کر کہنے لگے: ”میرے حضور کے دوبارہ کہنا، اونی کی بات میں حضرت مولانا کی خاک پا سے بدلتی ہو کر آگ سے یہ کہتے کہ انت کا طوق نہ پہنتا، پھر انھوں نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لیے اور سر بالکل گود میں جھکا کر بولے: ”میں ذات کا گڑباز۔ نیز اباپ منہ پاسی کا گولا۔ میں جب انت کا ذہن میرا خاندان اور محل کا خاندان اور آقا کی ایک نظر کر، حضرت کا ایک اشارہ۔ حضور نے چلتی کو منشی چیت رام بنایا۔ لوگ کہتے ہیں منشی جی میں کتا ہوں رحمتہ اللہ علیہ کا کھنٹ بڑا اور..... لوگ سمجھتے ہیں.....“ داؤدی کبھی بدلتی جو رشتہ، کبھی رچھکتا ہے کبھی نگلیاں چوم کر کھکھوں کو لگاتے اور بچہ جی میں خلاسی کے شعر پڑھتے جاتے۔ میں کچھ پریشانی سرا پیشمان ان کا ذرا پیچو کر آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا داؤدی؟ اور داؤدی ”میرے آقا، حضرت مولانا، میرے مرشد“ کا قطعہ کئے جاتے۔ جب جب کبیر عالم دور ہوا تو نگلیاں اوپر اٹھایا کر بولے: ”ایسا اچھا موسم ہے۔ دن بھر گرمی پڑتی ہے تو خوشگوار۔ شاہوں کا نزل ہوتا ہے۔ پھر وہ چلی کی دھواں سے اٹھتے اور بولے: ”جیو اب جلیں آزاد سے، تو آزاد خریدنا ہے“ میں جیسا رکش و بد مزاج بن کر ان کے ساتھ آیا تھا، اس سے کہیں زیادہ منفعل اور نعل ان کے ساتھ لٹا۔ مجھے ہنساری میں دسیو سبیب کے پاپ کی دو کھانسی انھوں نے گھر پر ضروریات کی چند چیزیں خریدیں اور ان سے گود میں آگے چلے۔ میں بار بار ان سے لفٹے لینے کی کوشش کرتا مگر سمیت نہ پڑتی ایک عجیب سی شرم ایک اونٹنی سی تھکی ہنس مافقی اور ”آئی تامل اور جھلم میں ڈوبتا تھا“ میں ان کے گھر پہنچ کر دوں پہنچ کر یہ عجیب کھانا کھا رہا تھا، انھی کے ہاں سویا کر دیا اور دین پر کھا کر دیا کیونکہ میرا ہستہ مجھ سے جو پیسے وہاں چھاپا ہوا تھا اور اس کے پاس ہی تھاکے یہاں سے بھی چھاپی ایک ہر کہیں لائین میں رکھی تھی۔

بزنس میں بنا اور پانی پانی کرتی پکارا ڈانٹا نے پھر نامیرے عقیدے میں نہ تھا۔ گویا میرے ساتھیوں کی روانگی کے تیسرے ہی روز بعد ان کے والدین بھی انھیں لاہور سے پکڑ لائے لیکن اگر میں ان کے ساتھ ہوتا تو شاید اس وقت انارکلی میں جہاد دفتر پتہ نہیں ترقی کے کوئے شاندار سال میں داخل ہو چکا ہوتا!

داؤدی نے میری زندگی جبرن کر دی، مجھے تباہ کر دیا تھا پھر صیحا حرام کر دیا۔ سارا دن سکون کی کہو میں گزارتا اور سات، گھر میں کی مختصر سی بات، ان کے سوالات کا جواب دیتے ہیں۔ روکتے ہیں ان کی کھاٹ میرے ہنسنے کے ساتھ لگی ہے اور وہ مونگ رسول اور مراد کی نبرد کی بات پوچھ رہے ہیں۔ میں نے بالکل ٹھیک بتا دیا ہے وہ میرا ہی سوال کو دہرا رہے ہیں میں نے پھر ٹھیک بتا دیا ہے اور انھوں نے پھر اپنی نروں کو آگے لاکھڑا کیا ہے۔ میں مل جانا اور جھوک کر کہتا: ”مجھے نہیں پتہ میں نہیں بتانا“ تو وہ خاموش ہو جاتے اور دم سادہ بیٹھے ہیں انھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرتا تو وہ شرمندگی لکھ رہی تھیں وہ اتنی جاتی ہیں۔ آہستہ سے کتا سواؤدی “

”ہوں؟“ ایک گھبرائی آواز آتی۔

”داؤدی کچھ اور پوچھو“

داؤدی نے کہا: ”ہم نے آہستہ آہستہ ہر تھکے سے ہم ٹھکے۔ اس کی ترکیب بخوبی گرو“

میں نے مسافرِ قدسی کے ساتھ کیا، یہ تو بہت لمبا سفر ہے، مجھ کو کہہ کر تباہ و تاراج کوئی اور پہنچے گا۔

انہوں نے آسمانی کی بات سمجھیں، ان سے کہا: میرا گوشت اچھا ہے۔

میں نے ذرا سوچ کر گنا شروع کیا، بہت اچھا صنعت ہے، بہت زیادتی کرنا محسنہ.....

اور داؤد اچھا کھانا پانی پر چڑھ گئے، ادا، خاکہ جسے جان پر درج ہے پہلے بھی کہا ہے سن، اللہ پہلے بتایا کرو۔

میں نے ترکیبِ خوبی سے جان بجز اسے بے پوچھا، آپ مجھے جان پر دیکھیں کہتے ہیں جان داؤد کیوں نہیں کہتے؟

”شبابش“ وہ خوش ہو کر کہتے، ایسی باتیں پوچھنے کی ہوتی ہیں جان لفظِ ناسی کا ہے اور داؤد جیسا کہ ان کے درمیان فارسی

اصناف نہیں کہہ سکتی، جو لوگ دن بدن کہتے یا بولتے ہیں سخت ٹھنکی کر سکتے ہیں، روز بہ روز کو یاد دل پر دن۔ اسی طرح سے.....

اور جب میں سوچا کہ یہ تو ترکیبِ خوبی سے بھی خطاں نکالتا ہے، اگرچہ گناہوں کو توبہ کیلئے گمراہ سے کہتا، داؤد، اب تم سے

داؤد ہی ہے!

”اور وہ ترکیبِ خوبی؟“ وہ جھٹ سے پوچھتے۔

اس کے بعد میں چاہت لاکھ بھانے کرتا، اور داؤد میری گزار باقیہ کرنا شروع کیا، اپنی کھانا پر ایسے ہی بیٹھے رہتے، بیکار، ڈاکو، ای دیویر ہو جاتی تو کسی پر کسی کو بھڑکاتا، غار سر پر دھرتے، جتنا بچہ کچھ بھی ہوتا ان کے۔ سوال کا فخر خواہ، جب دینا پڑتا۔

ای جتنا کچھ چلا کر، اس کی بیٹھک مجھے مل گئی اور داؤد بھی کے دل میں اس کی محبت پر بھی میں نے قبضہ کر لیا۔ اب مجھے داؤد کی بہت اچھے گئے گئے تھیں، ان کی جواب میں مجھے اُس وقت بڑی لگتی تھیں وہ اب بھی بڑی لگتی ہیں، مگر اب پہلے سے کسی قدر زیادہ، شاید اس لیے کہ اب میں غلبہ کی ایک پونہا، غالب ملکوں اور داؤد اچھا پرانے ملائی ملک کے پروردہ تھے۔ سب سے بڑی علامت ان کی اُٹھنے بیٹھنے، سوال پر چھ رہنے کی تھی اور دوسری کھیل کو دسے منع کرنے کی۔ وہ تو بس یہ چاہتے تھے کہ آدمی پڑھنا ہے اور جب اس طاقتور کی موت کا دن قریب آئے تو کتا بولوں کے ڈھیر پر جان دیدے۔ صحت جسمانی قائم رکھنے کے لیے ان کے پاس میں ایک ہی نسخہ تھا، لمبی سیر! اور وہ بھی صبح کی۔ تقریباً روز سورج نکلنے سے کوئی دو گھنٹے پہنچتے وہ مجھے بیٹھک میں بٹھاتے آتے اور میرا کندھا ہلکا کر کے، ”اٹھ کر کھانا کھا کر آ“ اور وہ بھی دنیا جان کے دلدل میں صبح جگنے کے لیے یہ کہنا کہتے ہیں کہ اٹھ کر صبح ہو گئی یا سورج نکل آیا، مگر وہ ”موتا ہو گیا“ کہہ کر میری نڈیل کیا کہتے ہیں، ”موتا تو ہو کر آ کر کہتے“، بھٹا ہوا کہتا، گناہ تو گھر سے پڑھنے کا دورہ کیے کیا کر لیا؟

ادب میں گرم گرم بستر سے اٹھ کر جڑ کر، ”داؤد ہی خدا کے لیے مجھے صبح نہ جگا دیا ہے مجھے تھک کر دو۔ مجھے جان سے مار دو؟“

یہ فقرہ ان کی سیکڑی پر کڑی تھی وہ فوراً میرے سر پر لمحات ڈال دیتے اور باہر نکل جاتے۔

بے بے کون داؤد سے اٹھ کر اٹھ کر کھیر تھا اور داؤد اچھا اس سے بہت ڈرتے تھے، وہ سارا دن مجھے دالوں کے پیسے سیر کرتیں اور داؤد بھی کو کوسنے دیتے تھیں، ان کی اس زبان درازی پر مجھے بڑا غصہ آتا تھا، مگر پانی میں وہ کھیر گھیرے، جبر نہ ہو سکتا تھا، کبھی کبھار جب وہ ناگفتی کالوں پر آتے تھے تو داؤد بھی میرے پاس بیٹھک میں آجاتے اور کالوں پر اٹھ کر کھیر کر کھیر کر دیتے جاتے۔ بخوڑی دیر بعد کہتے ”غیبت کرنا بڑا گناہ ہے لیکن میرا خدا مجھے معاف کرے تیری بے بے بھینارن ہے اور اس کی سرکٹ میں میں میری فقرہ انہیں اور بخوڑا غصہ کرنا تو بھی ہم تمہیں بڑے عاجز مسافر ہیں؟“ اور داؤد اچھا بے بے بھینارن سی تھی، اس کا رنگ سخت کالا تھا اور دانت بے حد سفید، ماتھا عریا اور

ہو جاتی ہے۔ پھر یہ ایک آزمائش کے لیے ہے۔ تم اپنی سب سے زیادہ خواہ مخواہ، بظاہر کٹر کوسلی زیادتی پر اتار سنے گی، پھر انھوں نے کچھ خوفزدہ ہو کر کچھ مایوس ہو کر کہا "اس کی تو نفرت ہی ایسی ہے" اس دن مجھے دادی پر بڑا دم تھا۔ میرا جی ان کے لیے بہت کچھ کرنے کو چاہتا تھا۔ مگر اس وقت میں نے سب سے زبردستی نہ کیا۔ جب اس واقعہ کا ذکر میں نے اہل سے کیا تو وہ کبھی میرے ساتھ، وہ جی تو لڑکی، معرفت دادی کے ہاں دودھ، چھل اور چینی وغیرہ بھیجے لگیں مگر اس رسد سے دادی کو کبھی بھی کچھ نصیب نہ ہوا۔ اس سبب کی لگاؤ میں میری متدرج گئی اور اس نے کسی حد تک محبت سے رہائی پر تاؤ کرنا شروع کر دیا۔ مجھے یاد ہے ایک صبح میں دودھ سے بھرنا ملامت ان کے پاس لے کر آیا تھا اور بے بے گھر پر نہ تھی وہ اپنی سکھیں کے ساتھ باہر اسوں کے چوڑے میں، ششدر کرنے لگی تھی اور گھر میں وہ دادی اور بی بی تھیں۔ دودھ دیکھ کر دادی نے کہا "چلو آج بیرون چلے بیٹیں۔ میں دکان سے کپڑے کر آتا ہوں۔ تم پانی چولے پر۔ کھو" بی بی نے جلدی جلدی حیرت لکھا۔ میں تیلی میں پانی ڈال کر لایا اور پھر دو دن وہیں چرکے پر بیٹھ کر پانی کرنے لگی۔ دادی کو ملے کر گئے تو انھوں نے کہا "تم دو دن لوں اپنے اپنے کھار پر بیٹھ جائے میں بناتا ہوں" چنانچہ بی بی میں چلائے لگی اور میں ڈاکٹر ان ڈاکٹر کی مشقیں کھینے لگا۔ دادی جو کہ جی ہو کر جاتے تھے اور عادت کے مطابق مجھے بھی اُدھے اُدھے جاتے تھے گلیوں کے "زمین سورج کے گرد گھومتی ہے" گلیوں نے دریافت کیا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے یہ نہ کہ وہ دنیا کر سورج کے گرد گھومتی تھی پانی اُبل رہا تھا۔ دادی خوش ہو رہے تھے اسی خوشی میں مجھ کو مجھ کر وہ اپنا ناز بنایا ہو کہبت گا رہے تھے۔ اوگلو! اوگلو! اوگلو! گلیوں کی بات مت بھولنا، گلیوں کی بات مت بھولنا، انھوں نے چلنے کی پتی کھینے پوسنے پانی میں ڈال دی۔ برتن ابھی تک چولے پر ہی تھا اور دادی ایک جھوٹے سے بچے کی طرح پانی کی گلی میں لگی ہوئی تھی ساتھ گولو گلیو! گولو گلیو! گولو گلیو! کے ساتھ چلے۔ میں ہنس رہا تھا اور اپنا کام کئے جا رہا تھا۔ بی بی مسکرا رہی تھی اور شبنم چلنے کے ساتھ دادی اور بی بی تینوں اپنے جھوٹے سے گھر میں بڑے ہی خوش تھے گویا سارے محلہ سارے نصیب کی خوشنیاں بڑے بڑے رنگین پردوں والی پرلیوں کی طرح جھانک رہی تھیں۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور بے بے انداد داغ ہوئی۔ دادی نے دروازہ کھلنے کی آواز پر پیچھے مڑ کر دیکھا اور ان کا رنگ نہ ہو گیا جتنی ہوئی تیلی سے گرم گرم بھاپ اُٹھ رہی تھی۔ اس کے اندر چلنے کے چوڑے چھوٹے پھیلائے ایک دوسرے کے سینے سے مل رہے تھے۔ وہ دو رنگین چھیل چھیل دلاؤ تھا تو حق پر کڑا گیا تھا۔ بے سہ سے آگے بڑھ کر چلے کی طرف دیکھا اور دادی نے چوکے سے لپٹنے ہوئے سعادت بھرے لبوں میں کہا "جائے ہے!"

بے بے نے ایک دو تیرہ دادی کی کمر میں ماما اور کیا "بڑے ہر دو حاجتے لاج نہیں آتی۔ تجھ پر بھار بھر سے تجھے ہم بھٹے پر تیرے چائے پینے کے دن ہیں۔ میں تو یہ گھر میں نہ تھی تو کچھ کو کسی کا ڈر نہ رہا۔ تیرے بھائی میں کل کی مرنے والی مرد تیرا ہی مامی ہو تیری آسین پوری ہوں۔ کس مرنے جو کہی نے جتنا اور کس لیک کی رہی ہے میرے بچے باندھ دیا..... تجھے موت نہیں آتی....." اور وہ بولتا تھا "کیوں آئے گی" اسی فقرے کی گواہی کرتے ہوئے بے بے پھر بی بی کی طرف چوکے پر چڑھی پڑے سے تیلی کی بوتل کو چولے سے اٹھائی اور زمین پر دے ماری۔ گرم گرم چلنے کے چھپا کے دادی کی بیڈ لیوں اور پاؤں پر گرسے اور وہ "ادہ تیرا بھلا بھلا ہے! اور تیرا بھلا ہو جائے" کہتے وہ اس سے ایک بچے کی طرح بھاگے اور ٹیٹیک میں گھس گئے۔ ان کے اس فرورنگ انداز پر زور کو دیکھ کر میں اور بی بی ہنسے بنا زور کے اور ہماری ہنسی کی آواز ایک تاثیر کے لیے چاروں دیواروں سے ٹکرائی۔ میں تو خیر کچھ کیا لیکن بے بے نے سب سے جا کر بی بی کو ہاتھوں سے

پڑھنا اور بیچ کر بولی میری سوت! تباہ ہوتے سے تیرا کیا ہوتا ہے۔ تباہیوں تو بھی پران لیتی ہیں۔ تو نے اس کو چاہنے کی کئی کیرں دی؟ لی لی بچا دی
پچاس برس روئے غی تو میں بھی اٹھ کر اندر ٹیک میں کسک آیا۔ داؤجی اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھتے اور پاؤں سہلہ رہے تھکے پڑے نہیں انہیں
اس حالت میں دیکھ کر مجھے پھر کیوں گدگدن ہوتی کہیں انداز کی اندر مڑ کر کے ہنسنے لگا۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے پاس بلایا
اور بولے ”شکر گوارا! تم کو گوارا میرے نہ کہ میرے بیٹے!“ فتوحی وہی لوگ کو پھر کہا ”میں تو اس کے کوئی کام بھی کرتا ہوں جس کے منظر پر کئے
کی ایک کم نصیب بڑھا خانہ گلی بیٹھا کرتی تھی“

میں نے میری سوت سے ان کی حرف دیکھا تو وہ بولے ”ماتے نامدار! ایک ادنیٰ سلفہ کجوش گرم پانی کے چند پھینے پڑنے پر نامدار
شہنوں کرے تو نعمت ہے اس کی زندگی پہ۔ وہ اپنے محبوب کے طفیل تارہ جہنم سے بچاٹے۔ خدا نے ایسا ہی مجھے حرمت عطا کرے، مولا نے ایسا
مجھے ممبر کی نعمت دے۔“

میں نے کہا ”داؤجی! آقا نے نامدار کو کہنا“

تو داؤجی کو یہ سن کر ذرا کھلیفہ ہوئی۔ اسٹوں نے شفقت سے کہا ”عاجان! پلہ یوں نہ پوچھا کہ میرے استاد میرے حضرت کی روح
کو مجھ سے ہزار نہ کر۔ وہ میرے آقا ہی تھے میرے باپ بھی استاد اور بھی تیرے دادا استاد ہیں..... دادا! استاد..... اور انہوں نے
دو دلوں ہاتھ سینے پر رکھے۔

آقا نے نامدار کا لفظ اور کونتا قسمت بخوڑہ کی ترکیب میں نے پہلی بار داؤجی سے سنی یہ واقعہ منسلانے میں انہوں نے کئی ہی دیر
لگا دی کیونکہ ایک ایک فقرے بعد افسار کے بے شمار تغیر اشعار پڑھتے تھے اور بار بار اپنے استاد کی روح کو شاہ پہنچا دیتے تھے۔
جب وہ یہ واقعہ بیان کر چکے تو میں نے بڑے ادب سے پوچھا ”داؤجی! آپ کو اپنے استاد صاحب اس قدر اپنے سینوں تلے
لٹے اور آپ ان کا نام لے کر ہاتھ کیوں جوڑتے ہیں اپنے آپ کو ان کیوں کہتے ہیں؟“
داؤجی نے مسکرا کر کہا ”جو لوہے کے ایک ترکو ایسا بناوے کہ لوگ کہیں یہ فحش چنت نام یہ پڑی ہی ہیں وہ عیان ہوں آقا
نہ ہو تو پھر کیا ہو؟“

میں عجاہ پائی کے کونے سے آہستہ آہستہ پھسل کر ستر میں پہنچ گیا، اور چاروں طرف دھنائی پھیٹ کر داؤجی کی طرف دیکھنے لگا جو سر
جھکا کر کبھی اپنے پاؤں کی طرف دیکھتے تھے اور کبھی پڑیاں سہلاتے تھے۔ جیسے جیسے وہ فتنوں بعد فرار سا ہنستے اور ہر خاموش ہو جاتے
کھنکھنے میں کھینچا، اور کیا ہو گیا۔ حضرت مولانا کی پی آواز کیا آواز تھی! میری زبوں مرزا دکھانے کا فرمایا، سہارا دیا کہ
مجاہد سے پاس آؤ، میں لاٹھی نیامان کے پاس باکھڑا ہوا، چتر پھانڈ اور دیگر دیوہات کے ایسے نیم دارہ بنائے، اس کے سلسلے پیچھے سبق
یا دکر رہے تھے۔ ایک دہرا لٹا لٹا اور کسی کو آنکھوں پر اٹھانے کی ہمت نہ تھی۔ میں حضور کے قریب گیا تو فرمایا ”جی! تم کو
سہرا زبیاں بکریاں چراتے دیکھتے ہیں۔ انھیں چرسے کھانے کے لیے چھوڑ کر جا۔ سے پاس آ جا یا کرو اور کچھ پڑھ لیا کرو۔“ پھر حضور نے
میری عرض سننے بغیر پوچھا کیا نام ہے تمہارا؟ میں نے گنواروں کی طرح کہا چنتو۔ حضرت مسکرائے۔ فتوح! اس اپنے بھی
فرمانے لگے پورا نام کہیے، پھر خود ہی بولے چنت نام ہو گا۔ میں نے سر ہلادیا۔ حضور کے شاگرد کتاب سے غلوپی
چراغ میری طرف دیکھ رہے تھے میرے گلے میں کھڑک لگا لگا رہا تھا یا انجماہ کی بجائے صرف ننگوٹ بن رہا تھا پاؤں میں اوجھڑی کے مٹے جو تھے

پیارے کی طرح میں نے سب سڑی ایڑی پر ستم کا سارا ڈھانچا۔ ان کو خدمت میں پیش کر دیا۔ پھر انھوں نے میز سے گرامر لٹائی اور بوسے ہاہر
 مان کر دیکھ کے آکر تیری بے رعبے کا فہم کم ہو گیا نہیں۔ "میں رومات میں پانی ڈالنے کے بہانے باہر گیا تو بے رعبے کو نشیہ چلائے اور بی بی
 کو چڑھا دیا کرتے پیا۔

داؤدی کی زندگی میں بے رعبے والا پسند، برائی کر رہا تھا جب وہ دیکھنے لگا کہ میں مطلع صاف ہے اور بے رعبے کے چہرے پر
 کوئی شک نہیں ہے تو وہ ہنسا کر کہنے لگا: "سب ایک ایک شکر سنا۔" پہلے مجھی سے گفتا پڑنا اور میں مجھوتے ہی کتنا حد
 لازم تھا کہ دیکھو۔ اس سترہ کوئی دن اور
 تمہارے کیوں اب رہو تمہارا کوئی دن اور

اس پر وہ تالی بجانے اور کہنے لگا: "اولیں سترہ سنو گا، اور دو کا کم سنو گا اور مسلسل نظم کا مرکز سنو گا" میں کہتا "مجھے سوچئے
 دیکھئے۔ اتنے ہی بی بی سنائے۔"

بی بی میری طرح اکثر اس سترہ سے شرمنا کرتی۔
 شنیدیم کہ تاپور ام در شہید
 چو خضر بدامش سلم در شہید

اس پر داؤدی ایک اور سترہ پڑھا۔ آؤ دیکھتے
 بی بی چینی رکھ کر کہتی۔

شہید شدہ از خواہم چشم کشودیم دیدیم کہ باقی سرت شہید شدہ نمودیم

داؤدی شایاش تو نمود کہ وہ سنے لیکن ساتھ ہی پر بھی کہہ دیتے "ایسا پڑھو تو کوئی سترہ سن سکتی ہے۔"

پھر وہ جیسے بے حرکت دیکھ کر کہنے لگا: "جی آؤ تمہاری بے رعبے بھی ایک سنائے گی" مگر بے رعبے ایک ہی روز کھا سا جواب
 دیتی "مجھے نہیں آئے خیر کبت" اس پر داؤدی کہنے لگا: "گھوڑیاں ہی سناؤ۔ اپنے بیٹوں کے بیاہ کر لیائیں بی کا دے" اس پر بے رعبے کے ہونٹ
 مسکرائے کو کہتے لیکن وہ سارا نہ سکتی اور داؤدی میں غور توں کی وجہ گھڑیاں گاسے گئے۔ ان کے دریاں بھی اچی چند کا اور کبھی میرا نام ٹانگ
 دیتے۔ پھر کہنے "میں اپنے اسی کو مولوی کی شادی پر سرور نکولی یا سوں پڑ۔ بات میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ساتھ چلوں گا اور کچا ناز پڑ۔ سہ سہ
 کریں گا" میں دستور کے مطابق شہر کا رنگا میں بیچی کر لیتا تو وہ کہنے لگا: "پتر نہیں اس ملک سے کسی شہر میں بی بی بیوی بی بی بیوی جماعت میں
 پڑھ رہی ہو گی۔ ہفتہ میں ایک دن ان کیوں کی فائدہ دہی ہوتی ہے اس سے تو بہت سی چیزیں بچانی سیکھ لی ہوں گی۔ پریشان نہیں ہو جیسا ہو گی۔
 اس بدھ کو تو یہ یاد نہیں رہتا کہ ماویاں گھڑی ہو جی ہے باہر مٹی۔ وہ تو فریب سب کچھ سنانی ہو گی۔ میں تو اس کو فارسی پڑھاؤں گا۔ جیسے اس کو
 خطاطی کی تعلیم دوں گا پھر خطا شکستہ سکھاؤں گا دستورات کو خطا شکستہ نہیں آتا۔ میں تو اپنی بہر کو سکھا دوں گا۔ سُن گولو! پھر میں
 تیرے ہی پاس رہوں گا۔ میں اور میری بیوی فارسی میں باتیں کریں گے۔ وہ بات بات پڑا پڑا بھلائی کے گی اور تو انھوں کی طرح منہ دیکھا کر لگا
 پھر وہ بیٹے پر ہر گز نہ دیکھتے تھے خوب خیر خوب گئے۔ جان پر دہا چلا تو قدر رحمت کی گشتی..... خوب..... یاد دارم.....
 اور پتر سنیں کیا کیا کچھ کہتے۔ پچاسے داؤدی اچٹائی پر اپنی جھوٹی سی دنیا بکاس کر میں فارسی کے فرمان جاری کئے جاتے۔ ایک دن جب

چھت پر دھوپ میں بیٹھ ہوئے۔ وہ ایسی دنیا بچکے تھے تو بولے سے بچے کھٹے گئے۔ جس طرح خدا نے تجھے ایک نیک میری اور تجھے سعادت مند بوجھایا کی سب دیکھ ہی وہ اپنی فضل سے میری اچھ کو بھی دے۔ اس کے خیالات کچھ نئے اچھے نہیں کھٹے تیر سوارنگ پر مسلم ایک بیچہ بارہا اس بچے پسند کیا اور آتی چند لالچی چلانا لگا کھانا سیکھ رہا ہے میری تو وہ کب مانے گا باں خدا نے بزرگ دیر تو سی کو ایک بیس مونس میری بوجھایا تو وہ آت راج راست پر نہ آئے گی۔

اس مونس کے لفظ پر مجھے بہت تکلیف ہوئی اور میں ٹپ سا ہو گیا۔ چپ بچھن اس لیے بوجھا کہ اگر میں نے منہ کھولا تو یقیناً ایسی بات نکلی جس سے داؤبی کو بڑا دکھ ہوگا۔ میری اور امی چاہتی تو خیر تیریں ہی عین لکھیں بارہ چند ہی کوئی بی کی برات سچ آگئی۔

بھیا جی رام پر تپا کے بارے میں داؤبی نے مجھے بہت کچھ بتا چکے تھے کہ وہ بہت اچھا لڑکا ہے اور اس شادی کے بارے میں انہوں نے بہت استغماہ کیا تھا اس پر وہ پورا اترتا ہے سب سے زیادہ خوشی داؤبی کو اس بات کی تھی کہ ان کے سوجھی ناسی کے استاد تھے اور کیر بھی مذہب سے متعلق رکھتے تھے۔ بارہ تیر کی شام کو جب بی بی داؤبی ہونے لگی تو گھر میں کراہ مچ گیا۔ سب سے بارہ قطار دروہی ہے۔ وہی چنڈا سو بھاہا ہے، اور لکے کی حوریں چھن چھن کر رہی ہیں۔ میں دیوار سے ساتھ لگا کھڑا ہوں اور داؤبی میرے کندھوں پر ہاتھ رکھے کھڑے ہیں اور بار بار کہہ رہے ہیں آج کچھ دیر سے ہاؤں میں کپڑی ہیں۔ تو ان کا نہیں رکھ سکا اچھا ہی کے باب بولے ”سچی جی۔ یہ اجازت دیکھے“ تو بی بی بچھا کھڑا کر رہی۔ اسے چاہا تو بی بی پر ڈال عورتیں ہوا کرتے لکھیں اور داؤبی میرا ہمارے کہ اس کی چارہائی کی طرف چلے۔ انہوں نے بی بی کو کندھے سے پکڑ کر اٹھایا اور کہا ”یہ کیا ہوا ہے! اٹھو! یہ تو تمہاری بی بی اور خود بخود نہ لگتی کی چلی کھڑی ہے اسے بوجھو نہ بناؤ۔“

بی بی اسی طرح ڈھاڑیں مارتے ہوئے داؤبی سے بیٹھ گئی انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ”ذرا العین میں تیرا نگار ہوں کہ تجھے بڑھانہ سکا تیرے سامنے شرمندہ ہوں کہ تجھے علم کا جہیز نہ دے سکا۔ تو مجھے معاف کر دے گی اور شاید بوجھو اور ام پر تپا بھی لکھیں میں اپنے آپ کو معاف نہ کر سکوں گا۔ میں غیلا کار ہوں اور میرا فعل میرے سامنے ختم ہے یہ میں کر بی بی اور بھی زور نہ دے دے لگی اور داؤبی کی آنکھوں سے کھٹے سارے موٹے آنسوؤں کے قطرے ٹوٹ کر زمین پر گرے۔ ان کے سوجھی نے آگے بڑھ کر کہا ”مفتی جی آپ فکر نہ کریں بی بی کو میں کر بچھا چھادوں گا“ داؤبی ادھر بیٹھے اور ہاتھ جوڑ کر بولے ”کوئی تو بڑھ چکی ہے، لکھنایا بوسناں میں ختم کچکا ہوں لیکن میری حسرت پوری نہیں ہوئی“ اس پر وہ ہنس کر بولے ”آپ بھی حد کیسے ہیں ساری لکھنایا تو میں نے بھی نہیں پڑھی چھل سوری آتی تھی اس کے گڑھ تھا تھا۔“

سداؤبی اسی طرح ہاتھ جوڑے کھٹے دیر خاموش کھڑے رہے۔ بی بی نے کوٹ لگی کمرنگ کی کٹنی چاروں ہاتھ لکھ کر چلے امی چنڈے کے ادھر پھر میرے سر پر پھیرا اور سکھیں کے باندھوں میں ڈیڑھ سی کی طرف جلدی۔ داؤبی میرا سارے کر چلے تو انہوں نے مجھے اپنے ساتھ زور سے بچھن کر کہا ”لو میری لارہ ہے دیکھو یہ ہمارا سانا بچہ نا ہے۔ اوگو تو۔۔۔۔۔ اور دم دیدہ۔۔۔۔۔“

بھو گیا۔۔۔۔۔ جان پیدہ تو کیوں۔۔۔۔۔“

اس پر ان کا گلہ نہ لگا اور میرے آنسو بھی تیز ہو گئے برات والے تالگوں اور اکوں پر سوار تھے۔ بی بی رتھ میں جاری تھی اور اس کے پیچھے امی چنڈا اور میں ادھما سے ادھما ان داؤبی پیدل چل رہے تھے۔ اگر بی بی کی بیچ خزا نور سے نکل جاتی تو داؤبی آگے بڑھ کر رکھ کا پرہو اٹھاتے اور کھٹے ”لا حول پڑھو۔ لا حول پڑھو“

اور خود آنکھوں پر لکے رکھے ان کی پکڑی کا شکر جھیک گیا تھا!

راتو ہمارے محلے کا بڑا اہی کیفیت سا انسان تھا۔ بدی اور کینہ پروری اس کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر پھری تھی۔ وہ بارہ برس کا میں نے ذکر کیا ہے اسی کا تھا اس میں تیس برس کیوں اور دو گاہیں تھیں جن کا دودھ صبح وشام راتو گلی کے اعلیٰ میدان میں بیٹھ کر پینا کرتا۔ تقریباً سائے محلے والے انھی سے دودھ لیتے تھے اور اس کی شرابوتوں کی وجہ سے دہتے بھی تھے۔ ہمارے گھر کے آگے سے گذرتے ہوئے وہ یونہی شوقیہ بلاٹھی زمین پر بھاگ کر داؤجی کو دو پنڈت سے رام جی کی ہانک کر سلام کیا کرتا۔ داؤجی نے اُسے کئی مرتبہ سمجھا بھی کہ وہ پنڈت نہیں ہیں معمولی آدمی ہیں۔ کیونکہ پنڈت ان کے نزدیک بڑے بڑے پڑھے لکھے اور فاضل آدمی کو کہا جاسکتا تھا لیکن راتو نہیں ماننا تھا وہ اپنی ہونچ کر بھاگ کر کتا بٹے بھی جس کے سر پر بڑی (چٹیا) ہودہ پنڈت ہی ہوتا ہے۔ ————— سپوروں یاروں سے اس کی آشنائی تھی۔ شام کو اس کے بارے میں جو بھی پوچھتا اور گندی اور فتن بولیدوں کا مشاہدہ بھی۔ بی بی کے جانے کے بعد ایک دن جب میں اس سے دودھ لینے گیا تو اس نے نرا دستہ سے آٹھ بیج کر کے ”مہرنی تو سچ لگی گی بابو اب تو اس گھر میں رہ کر لے گا“ میں چپ چاپ تو اس نے جھگ واسے دودھ میں ڈر بھیجے ہوئے کپے لکھر میں لگا بھی تھی سچ بتا تو غلط لگا یا کہ نہیں“ اے اسے بات پر غصہ آگیا اور میں نے تاملوٹ گھما کر اس کے سر میں دے مارا۔ اس ضرب شدید سے خوں وغیرہ تو برآمد نہ ہوا لیکن وہ جھک کر تخت پر گر پڑا اور میں گھر بھاگ گیا۔ داؤجی کو سارا واقعہ سن کر میں دوڑا دوڑا اپنے گھر گیا اور آج سے ساری حکایت بیان کی۔ ان کی بدولت راتو کی خانہ میں طلبی ہوئی اور حوالدار صاحب نے ملکی کو نشانی کے بعد اسے سخت تنبیہ کر کے چھوڑ دیا۔ اس دن کے بعد سے راتو داؤجی پر آتے جاتے طرح طرح کے فہرے کئے لگا۔ وہ سب زیادہ مذاق ان کی بودی کا بڑا بیکار تھا اور واقعی داؤجی کے فاضل سر پر وہ چھوٹی بودی ذرا بھی اچھی نہ لگتی تھی۔ مگر وہ کہتے تھے ”یر میری مرحوم ماں کی نشانی ہے اور مجھے اپنی زندگی کی طرح عزیز ہے۔ وہ اپنی آغوش میں میرا سر رکھ کر اسے دبی سے دھونتی تھی اور کڑوا تیل لگا کر چمکا لیتی تھی۔ گو میں نے حضرت مولانا کے سامنے کبھی بھی گڑی آنارے کی جسارت نہیں کی لیکن وہ جانتے تھے اور جب میں دیال چند میوہ دیل بائی سکول سے ایک سال کی ملازمت کے بعد چھٹیوں میں گاون آیا تو حضور نے پوچھا ”شہر جا کر چوٹی تو نہیں کھڑی؟“ تو میں نے نفی میں جواب دیا۔ اس پر بہت غرض ہوئے اور فرمایا تم ساساؤ قندہ پتیا کم ماؤں کو نصیب ہوتا ہے اور تم سا خوش قسمت آئندہ بھی خالی حال ہو گا۔ جسے تم ایسے شاگردوں کو پرچانے کا فخر حاصل ہوا ہے۔ میں نے ان کے پاؤں چھو کر کہ حضور آپ مجھے شرمندہ کوستے ہیں یہ سب آپ کے قدموں کی برکت ہے۔ سینس کفر مانے لگے چنت رام ہمارے پاؤں نہ چھو کر دھبلا ایسے لمس سے کیا فائدہ جس کا ہمیں احساس نہ ہو۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے میں نے کہا اگر کوئی مجھے بتا دے تو سمندر بھاڑ کر مجھ کو آپ کے لیے دوائی نکال لاؤں۔ اپنی زندگی کی حرارت حضور کی ٹانگوں کے لیے نذر کروں لیکن میرا بس نہیں چلتا۔ ————— خاموش ہو گئے اور نگاہیں اُپر اٹھا کر بولے ”خدا کو یہی منظور ہے تو ایسے ہی سہی تم سلامت ہو کہ تمہارے کندھوں پر میں نے کوئی سال بعد سارا گاؤں دیکھ لیا ہے۔ ————— داؤجی گذرے آیام کی تہ میں اترتے ہوئے کہہ رہے تھے ”میں صبح سویرے حویلی کی ڈپوڑھی میں جا کر آوار دیتا ہوا دم آگیا۔ ————— مستورات ایک طرف ہوا میں تو حضور صبح سے آواز دے کر مجھے بلاتے۔ دریں اپنی قسمت کو سراہتا ہوا فخر جوتے جوتے ان کی طرف بڑھتا۔ پاؤں چیتنا اور دھیر دھیر کم اٹھنا کوئے لگتا۔ وہ دعا دیتے میوے والدیں کی خیریت پوچھتے گاؤں کا حال رہا یافت فرماتے اور پھر کہتے ”لو بھی چنت رام اب اس گناہو، اکی گھڑی کو اٹھا لو“ میں مسبدگی کی طرح امنیں اٹھاتا اور کمر پر لاد کر حویلی سے باہر آجاتا۔ کبھی فرماتے ہمیں باغ کا چکر دو۔ کبھی حکم ہوتا بیدار رہو۔ کبھی کہتے تھے تیرے جتنے رام فخر، دھباؤ تو بہیں مسجد تک لے چلو۔ میں نے کئی بار عرض کیا کہ حضور ہر روز مسجد لے جایا کریں گا مگر نہیں ماننے بھی فرماتے رہے کہ کبھی جی چاہتا ہے اور

تیروں دسنا — دسنا دسنا دسنا..... تینوں تینوں تینوں تینوں سارے گامارو نارو نارو ناتے دکھ تیروں تیروں دسنا۔
وہ عینک کے اوپر سے مسکرتے میرے پاس بکرکوپٹی اٹھاتے، صفحہ نکالتے اور میری تالیوں کے درمیان اپنا بڑا سا ہاتھ کھڑا کر دیتے۔ بدش
بیٹا، ”وہ بڑی محبت سے کہتے“ یہ کوئی مشکل سوال ہے؟“ ”تو ہی وہ سوال سمجھانے کے لیے ہاتھ نیچے کرتے ہیں پھر تالیاں بجانے لگتا“ ”دیکھو،
میں تیرا داؤ نہیں چوں؟“ ”وہ بڑے مان سے پوچھتے۔“

”نہیں!“ میں منہ پھاڑ کر کہتا۔

”تو اور کون ہے؟“ ”وہ مایوس سے بوجھاتے۔“

”وہ سچی سرکار“ میں انگلی آسمان کی طرف کر کے شرارت سے کہتا ”وہ سچی سرکار وہ سب کا پالنے والا — بول کر سے

سب کا دالی کون؟“

وہ میرے پاس سے اٹھ کر جانے لگے تو میں ان کی کمر میں ہاتھ ڈال دیتا ”داؤ جی خطا ہو گئے ہیں۔“

وہ مسکراتے لگے ”بھوڑے غصے، اچھوڑ دیتا، میں تو بانی پیسے جا رہا تھا — مجھے پانی تو پی آنے لے“

میں نفرت مٹ بڑا مان کر کہتا ”لو جی جب مجھے سوال سمجھنا ہوا داؤ جی کو پانی یاد آ گیا۔“

وہ آرام سے بیٹھ جاتے اور کاپی کھول کر کہتے ”خفتش اسکو از جب تجھے بچا۔“ ایسے کامرٹ نظر آ رہا تھا تو نے تیسرا ڈاؤ لایوں نہ لگایا

اور اگر ایسا نہ بھی کرتا تو.....“

اور اس کے بعد پتہ نہیں داؤ جی کہتے دن تک پانی نہ پیتے۔

فروری کے دوسرے ہفتے کی بات ہے۔ امتحان میں کل ڈیڑھ گھنٹہ لگا تھا اور مجھ پر آنے والے خطرناک وقت کا خوف غصہ تن کا سوا
ہو گیا تھا۔ میں نے خود اپنی پڑھائی پیسے سے بڑا کر دی تھی اور کافی سنجیدہ ہو گیا تھا لیکن جیو میٹری کے مسائل میری سمجھ میں نہ آنے لگے۔ داؤ جی نے بہت
کوشش کی لیکن بات نہ بنی۔ آخر ایک دن انہوں نے کہا کل باؤں پر اپلوہ سینٹین ہیں نہ بانی یاد کرے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ چنانچہ میں انہیں
رشتے میں مصروف ہو گیا لیکن جو پر اپلوہ سینٹین بات کو یاد کرتا صبح بھول جاتی۔ میں دل برداشتہ ہو کر بہت چھوڑی بیٹھا۔ ایک رات داؤ جی مجھ سے
جیو میٹری کی تنکیں بڑا کر اور مشقیں سن کر آئے تو دوسری کچھ پریٹن سے ہو گئے تھے۔ میں بار بار دہکا تھا اور بغیر بہت کوفت ہوئی تھی۔ مجھے
سو نے کی تاکید کر کے وہ اپنے کمرے میں چلے گئے تو میں کاپی نسل لے کر پھر بیٹھ گیا اور سات کے ڈیڑھ بجے تک کاکھ کاکھ کر رہا تھا۔ مگر
جب کتاب بند کر کے کھینے لگا تو چند فٹوں کے بعد آہٹ جاننا۔ مجھے داؤ جی کا مایوس چہرہ یاد کر کے اور اپنی حالت کا اندازہ کر کے رونما آ گیا۔
اور میں باہر صحن میں آکر سبز عیون پر میوے کے سچ روئے لگا۔ گھنٹوں پر سر رکھے، درد آ رہا تھا اور سردی کی شدت سے کانپ رہا تھا۔ اسی طرح بیٹھے
مجھے کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا تو میں نے داؤ جی کی عزت بچانے کے لیے یہی ترکیب سوچی کہ ڈیڑھ گھنٹہ کا دروازہ کھول کر چپکے سے نکل جاؤں اور
پھر واپس آؤں۔ جب نسل کرکھا اور صبحی قدم آگے بڑھانے کیلئے راہ پر اٹھا تو داؤ جی کھلی اور میرے پاس کھڑے تھے۔ انہوں نے مجھے بڑے
پیارے اپنے ساتھ لگایا تو سسکیوں کا ایک لاقنایہ مسلط صحن میں پھیل گیا۔ داؤ جی نے میرا سر جھک کر کہا ”لے صبحی عیون لے میں تو یوں نہ سمجھتا تھا۔
تو تو بہت ہی کم محنت لگا،“ پھر انہوں نے مجھے اپنے ساتھ کھل میں بیٹھ لیا اور میٹھک میں لے آئے۔ بستر میں بٹھا کر انہوں نے میرے چادر میں مگر
رضائی پیش اور خود پاؤں اوپر کر کے کرسی پر بیٹھ گئے۔

انھوں نے کہا مقلد س چیز ہی ایسی ہے۔ تو اس کے ہاتھ زہریوں نالوں سے ہیں اس سے اور طرح تنگ ہوا تھا حضرت مولانا کے پاس جس وقت باقرہ آغلیس کی جس قدر کتابیں تھیں انھیں میں اچھی طرح سے پڑھ کر اپنی کاپیوں پر اتار چکا تھا۔ کوئی بات ایسی نہ تھی جس میں انھیں ہوتی ہیں نے یہ جاننا کہ راجہ کا ماہر ہو گیا ہوں۔ لیکن ایک رات میں اپنی کھانے پر پڑا منساوی الساتھی کے ایک مسئلہ پر غور کر رہا تھا کہ بات اچھ گئی۔ میں نے دیا کہ شکل بنائی اور اس پر غور کرنے لگا۔ جبر و مقابلہ کی دُوس سے مفروضہ کا جواب مشکوک آتا تھا لیکن علم ہند سے پائیز ثبوت کو نہ بھینچتا تھا۔ میں ساری رات کاغذ رسیا کرتا رہا لیکن تیری طرح سے رو بہا نہیں۔ علی الصبح میری حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے اپنے دست مبارک سے کاغذ پر شکل کھینچ کر سمجھانا شروع کیا لیکن جہاں مجھے انھیں ہوتی تھی وہیں حضرت مولانا کی طبع رسا کو بھی کوفت ہوئی۔ فرمانے لگے ”جنت رام اب ہم تم کو پڑھا نہیں سکتے۔ جب استاد اور شاگرد کا علم ایک سا ہو جائے تو شاگرد کو کسی علم کی طرف رجوع کرنا چاہئے“ میں نے جرأت کر کے کہہ دیا کہ حضور اگر کوئی اور جبر ہدایت کرتا تو میں اسے کفر کے مترادف سمجھتا لیکن آپ کا جنت اور ہر شرط میرے لیے حکم ربانی سے کم نہیں۔ اس لیے خاموش ہوں جیلا آئسے غزونی کے سلسلے ایاذ کی کیا مجال! لیکن حضور! مجھے کوئی ضرر ہو اسے فرمانے لگے تو بے حد ہدایتی آدمی ہو۔ بات تو میں ہی ہوتی، میں نے سر ہلکا کر کہا ”ارشاد فرمایا“ دینی میں حکیم نامہ مرتب سببانی علم ہند سے کہے ہو ماہر ہیں اگر تم کو اس کا ایسا ہی شوق ہے تو ان کے پاس چلے جاؤ اور ان کتاب علم کرو۔ ہم ان کے نام دفعہ لکھ دیں گے۔ میں نے رضامندی ظاہر کی تو فرمایا اپنی والدہ سے پوچھ لیا کہ وہ رضامند ہوں تو ہمارے پاس آنا۔

————— والدہ مرحومہ سے پوچھنا اور ان سے اپنی مرضی کے مطابق جواب پانا انمو فی بات مقلی جتنا مجھ میں نے ان سے نہیں پوچھا۔ حضور پوچھتے تو میں دروغ بیانی کے ساتھ کہتا کہ گھر کی لپائی تپائی کر رہا ہوں جب فارغ ہو گیا تو والدہ سے عرض کروں گا چنید ایام بڑے اضطرار کی حالت میں گھر سے۔ میں دن رات اس شکل کو مکمل کرنے کی کوشش کرتا مگر صبح جواب پر آمد نہ ہوتا۔ اس لایعنی مسئلہ سے طبیعت میں اور اشتباہ پیدا ہوا۔ میں دلی جاننا چاہتا تھا۔ لیکن حضور سے اجازت مل سکتی تھی نہ دفعہ۔ وہ والدہ کی رضامندی کے بغیر اجازت دینے والے نہ تھے اور والدہ اس بڑھاپے میں کیسے آمادہ ہو سکتی تھیں ————— ایک رات جب سارا گاؤں سو رہا تھا اور میں تیری طرح پریشان تھا تو میں نے اپنی والدہ کی پٹاری سے اس کی گل پوچی سے دور پیچے چلے آئے اور دفعہ اس کے لیے چھوڑ کر گاؤں نکل گیا۔ خدا مجھے معاف کرے اور میرے دونوں بزرگوں کی رجوں کو مجھ پر مہربان رکھے؛ واقعی میں نے بڑا گناہ کیا اور بدبگ میرا سرائی دونوں کرم فواض کے سامنے نہایت سے جھکا رہا ہے گا۔ گاؤں سے نکل کر میں حضور کی حویلی کے پیچھے ان کے مندر کے پاس پہنچا جہاں بیچہ کر آپ پر حلقے فٹے گھٹنوں کے بل ہو کر میں نے زمین کو بوسہ دیا اور دل میں کہا، بد قسمت ہوں مے اجازت جا رہا ہوں لیکن آپ کی دعاؤں کا عطر محتاج رہوں گا میرا قصور معاف نہ کیا تو آپ کے قدموں میں جان دے دوں گا مانتا کہ کرو اور لایعنی کندھے پر رکھ کر میں وہاں سے چلایا۔ میں ہا ہے؟ داد جی نے میری طرف غور سے دیکھ کر پوچھا۔

دعائی کے بیچ خاطر اشت بے میں نے انھیں جھپکا ٹپلی اور ہولے سے کہا ”دجی؟“

داد جی نے پھر کہنا شروع کیا ”قدت نے میری کمال مدد کی۔ ان دونوں کا کل مفید سرسجھار والی دبل کی پیٹری بن رہی تھی۔ یہی سیدھا سادہ دلی کو جاتا تھا اور میں مزدوری مقلی ————— ایک دن میں مزدوری کرتا اور دونوں جلتا۔ اس طرح کا تئید غبی کے سہارے سولہ دن میں دتی پہنچ گیا۔ منزل مقصود تو ہاتھ آگئی تھی لیکن گوہر مقصود کا مرکز نہ ملتا تھا جس کی سے پوچھتا حکیم نامہ مرتبانی

کا دولت خانہ کہاں ہے نفی میں جواب ملتا۔ دونوں ان کی تلاش جاری رہی۔ لیکن پتہ نہ پاسکا۔ قسمت یاد ترقی صحت بھی تھی۔ انگریزوں کے لیے نفی کو عیاں بن رہی تھیں۔ وہاں کام پر جانے لگا۔ شام کو فارغ ہو کر حکیم صاحب کا پتہ معلوم کرنا اور رات کے وقت ایک دھرم شالہ میں محسوس پھیل کر گری میں سندس جانا۔ مثل مشہور ہے جو مہذبہ یا بندہ۔ آخر ایک دن مجھے حکیم صاحب کی جائے۔ بائیں معلوم ہو گئی۔ وہ بھر پھر دوں کے محلے کی ایک تیرہ و تارگی میں رہتے تھے۔ شام کے وقت میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں فروکش تھے اور چند دوستوں سے اوسنے اوپنے گفتگو ہو رہی تھی۔ میں جوتے اتار کر دین کے اندر کھڑا ہو گیا۔ ایک صاحب نے پوچھا ”کون ہے؟“ میں نے سلام کر کے کہا ”حکیم صاحب سے ملنے ہے۔“ حکیم صاحب دوستوں کے حلقہ میں سر جھکائے بیٹھے تھے اور ان کی ہیئت میری طرف تھی۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے بڑے مراسم گرمی ”میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا ”پناب سے آیا ہوں اور..... میں بات پوری بھی کر دیا تھا کہ زور سے بولے ”ادھر اجنت رام ہو؟ میں کچھ جواب نہ دے سکا فرما لے گئے مجھے اسماعیل کا خط ملا ہے لکھا ہے شاید جنت رام تمہارے پاس آئے۔ ہمیں بتائے بغیر کسے فرار ہو گیا ہے اس کی مدد کرنا۔ میں اسی طرح خاموش کھڑا۔ بائیں پاٹ دار اور ازمیں بولے میں اندر آ جاؤ کیا چپ کا روزہ رکھا ہے؟ میں ذرا اگے بڑھا تو میری طرف مزید کیا اور ویسے ہی عودیں تو کی طرح بیٹھے رہے۔ چہرے سے ٹھکانا زمانا میں کہا ”بر خود راتینہ جاؤ۔ میں دین بیچ گیا تو آپ سے دوستوں سے فرمایا ”بھئی ذرا غم نہ لے اس سے دوستو ہاتھ کر لینے دو۔ پھر حکم ہوا بناؤ ہندوہ کا کونسا سنا۔ نہ ماری میں آ یا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے مومن کیا تو انھوں نے اسی طرح کندھوں کی طرف اپنے ہاتھ بڑھائے اور آہستہ آہستہ کرتیوں اوپھینچ لیا کہ ان کی کمر بھرنے ہو گئی۔ پھر فرمایا ”بناؤ اپنی انگلی سے میری کمر پر ایک منساوی اساتین۔ مجھ پر سکتہ کا عالم طاری تھا نہ آگے بڑھنے کی ہمت تھی نہ پیچھے ہٹنے کی طاقت۔ ایک لمحہ کے بعد بولے ”میں جلدی کرو۔“ بائیں ہوں کا ہاتھ نہ کھینچ سکتا۔ میں ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا اور ان کی چوڑی چلی کر پر کا پینے ہوئی انگلی سے منساوی اساتین بنائے لگا جب وہ غیر مافی شکل بن گئی تو بولے اب فقط میں سے خطاب ج پر عود کرنا چاہا تو تیزی سے بولے ہے ہے کیا کہتے ہو یہ فقط میں ہے کیا؟ پھر خود ہی بولے ”ہندوہ عادی ہو جاؤ گے۔ بائیں کندھے سے کوئی چھ انگلی فقط میں ہے ہاں سے خط کھینچو۔“ اللہ اکبر اللہ اکبر کیا علم تھا کیا آواز تھی اور کبھی نیز فہم تھی۔ وہ بول رہے تھے اور میں سمجھتا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ ابھی ان کے آخری جملے کے ساتھ نور کی لکیریں منساوی اساتین بن کر ان کی کمر پر اٹھرا نہیں گی۔“ پھر داڑھی دئی کے دونوں میں ڈوب گئے۔ ان کی آنکھیں کھلی تھیں وہ میری طرف دیکھ رہے تھے لیکن مجھے نہیں دیکھ رہے تھے میں نے بے چین ہو کر پوچھا ”پھر کیا ہوا داڑھی؟“ انھوں نے گریس سے مسختے ہوئے کہا ”مرات بہت گزر چکی ہے اب توبہ جا پھر بتاؤ گی؟“ میں ہنسی کے پچھے کی طرح ان کے پیچھے چلا گیا تو انھوں نے کہا ”دوستو وعدہ کر کہ آئندہ ہاوس میں ہو گا۔ اور انھوں نے مجھ کی پراڈیشن کو بتائے۔ سمجھے گا؟“ میں نے جواب دیا ”دوستو انھوں نے آپ فکر نہ کریں؟“ انھوں نے کھڑے کھڑے کہیں پینٹے ہوئے کہا ”بس مختصر یہ کہ میں ایک سال حکیم صاحب کی حضور میں رہا اور اس بوجہ علم سے چند فخر سے حاصل کر کے اپنی کور آنکھوں کو دھویا۔ دایہ پر میں رو دیا تو دستِ محبت میرے سر پر پھیر کر کہنے لگے ”جو تم سے ناراض نہیں ہیں لیکن ایک سال کی فتنہ بہت طویل ہے۔ آئندہ کہیں جانا تو ہمیں بھی ساتھ جانا، یہ کہتے ہوئے داڑھی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ مجھے اسی طرح حکم چھو کر بیٹھ کر سے باہر نکل گئے۔“

نصا چنانچہ وہ صبح لگتی جب ہماری جماعت امتحان سیتے کے لیے ضلع لاہور جاری تھی اور نادری کے ارد گرد والدین قسم کے لوگوں کا ہجوم جمع تھا اور اس ہجوم سے داد بھی کیسے کیسے نہ سکتے تھے۔ اور سب لڑکوں کے گھر واسے انہیں خیر و برکت کی دعاؤں سے نوازا رہے تھے اور داؤچی ہمارے سال کی پڑجانی کا خلاصہ تیار کر کے جلدی جلدی سوال پوچھ رہے تھے اور میرے ساتھ ساتھ خود بھی دعاؤں سے نوازا رہے تھے۔ اگر کبھی اصلاحت سے آئے۔۔۔۔۔ انہیں لڑکوں کے نصیحت و تنبیہ پر پہنچ جاتے وہ ان سے کہتے تھے ”تو اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا کہ اپنی وضع سے ہندو معلوم ہوتا تھا وہ لاشعہ میں چڑھا ایک عورت صاحب جمالی اس پر بوجھ نہ کرے آئی تھی اور جھڑپ جاتی تھی پھرتی تھی“ لڑکے کو پوچھتے یہ کون تھا؟

”جہانگیر“ میں نے جواب دیا۔ ”اور وہ عورت؟“ ”نور بہان“ ہم دونوں ایک ساتھ بولے۔۔۔۔۔ ”صفت مشرب اور احم فاعل میں فرق؟“ میں نے دو ذیل کی تعریفیں بیان کیں۔ بولے ”مثالیں؟“ میں نے مثالیں دیں۔ سب لڑکے لادوں میں بیٹھ گئے اور میں ان سے جان چھڑا کر جلدی سے داخل ہوا تو کھوکھڑی کے پاس گئے اور پوچھے ”لگے۔ بریک ان اور بریک ان تو گو فظوں میں استعمال کرو۔ ان کا استعمال بھی ہو گیا اور سرسارٹ ہو کر پہلی تو اس کے ساتھ قلم اٹھا کر بے ملینڈے ماویاں گھڑی یا کیا انہی میں۔۔۔۔۔ ماویاں گھڑی۔۔۔۔۔ ماکیاں۔۔۔۔۔ مرغی۔۔۔۔۔ ایک سال ایک چند خدا کر کے یہ آواز دھڑا ہوئی اور میں نے آواز دی کہ اس لیا!

پہلے دن تاریخ کا پرچہ بہت اچھا ہوا۔ دو برسے دن جبرافہ کا اس سے بھی بڑھ کر تیسرے دن اتوار تھا اور اس کے بعد حساب کی باری تھی۔ اتوار کی صبح داؤچی کا کوئی میں صفحہ لب خط ملا جس میں انیس برس کے فام ملان اور حساب کے قاعدوں کے علاوہ اور کوئی بات نہ تھی۔

حساب کا پرچہ کرنے کے بعد برآمدے میں ایسے لڑکوں سے جو امانت طعنے تو سو میں سے اتنی منبر کا پرچہ ٹھیک تھا میں خوشی سے پاگل ہو گیا۔ زمین پر پاؤں نہ پڑتا تھا اور میرے منبر سے مرمت کے نعرے نکل رہے تھے جو جی میں نے بڑا کد سے پاؤں باہر رکھا اور جی نہیں کد سے پر ڈال۔ ایک رشک کا پرچہ دیکھ رہے تھے۔ جس پہنچ نامہ ان سے لپٹ گیا اور اسی منبر! اسی منبر“ کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ انھوں نے پرچہ میرے ہاتھ سے چھین کر طعنی سے پوچھا ”کونسا سوال غلط ہو گیا؟“ میں نے مجھ پر کہا ”چار دیواری والا“ جھٹکا کر بولے ”تو نے غلط کیا اور دواؤں سے منہ منہ نہ کئے ہوئے گئے“ میں نے ان کی کمر میں ہاتھ ڈال کر پیٹ کر طرح چھلتا ہونے کہا ”ہاں جی ہاں جی۔۔۔۔۔ گولی مارو گھر کیوں کو“ داؤچی دو ذیل پوئی آواز میں بولے ”تو نے مجھے برباد کر دیا طعنے سے سال کے تین سو بیسٹھ دن میں پکار پکار کر کہتا رہا۔ سلطنت کا سوال انھیں کھول کر حل کرنا گھر تو میری بات نہ مانی میں منبر شاٹ نہ کئے۔۔۔۔۔ پورے میں منبر“ اور داؤچی کا چہرہ دیکھ کر میری اسی فیصدی کامیابی میں فیصدی ناکامی کے نیچے یوں دب گئی گویا اس کا کوئی دبو دہی نہ تھا، راستہ بھر دہ اپنے آپ سے کہتے رہے ”اگر منہ ہی اچھے دل کا ہو تو دواؤں کا منبر ضرور دے گا تنبیہاتی صل تو ٹھیک ہے“ اُس پرچے کے بعد داؤچی امتحان کے آخری دن ایک میرے ساتھ رہے۔ وہ رات کے بارہ بجے تک مجھے اس سرے میں بیٹھ کر پڑھاتے جہاں ہماری کلاس مقیم تھی اور اس کے بعد بقول ان کے اپنے ایک دوست کے یہاں چلے جاتے۔ صبح آٹھ بجے چہر اٹھاتے اور کمرہ امتحان تک میرے ساتھ چلتے۔

امتحان ختم ہوتے ہی میں نے داؤچی کو یوں چھوڑ دیا گویا میری ان سے جان چھائی ہی نہ تھی۔ سارا دن دوستانہ پاروں

نے ساتھ گھومتا اور شام کو نادھیں پڑھا کرتا۔ اس دوران میں اگر کبھی فرصت ملتی تو داؤچی کو سلام کرنے بھی جلا جاتا۔ وہ اس بات پر معرتے کہ میں پروڈ کم از کم ایک گھنٹہ ان کے ساتھ گزارا کروں گا کہ وہ مجھے کالج کی پڑھائی کے لیے بھی تیار کر دیں لیکن میں ان کے پھندے میں آئے ملا نہ تھا۔ مجھے کالج میں سوا درخیز ہونا گوارا تھا اور وہ مجھے کیوں داؤچی سے پڑھنا نظر نہیں پڑتے تو چھوڑ بیٹھے اس سے باتیں کرنا بھی مشکل تھا میں نے کچھ پڑھا انھوں نے کہا اس کا فائدہ میں نے تجربہ کر دیا میں نے کچھ جواب دیا فرمایا اس کی تحریک خوی کرو مگر والدین کی کانٹے اندر ٹھس آئی۔ میں اُسے کلٹی سے باہر نکالی رہا ہوں اور دو بج پھر رہے ہیں ۷:۳۰ ٹاؤن ہے یاد رہے۔ اب ہر عقل کا اندھا یا بچوں جماعت تک پڑھا جاتا ہے کہ گائے کے گھاسے کھائے مگر داؤچی فرما رہے ہیں کہ ہم بھی ہے اور فعل بھی ۷:۳۰ کا مطلب ہے ڈرانا۔ دھمکی دینا۔ اور میری دلوں کی باتیں میں جب میں امتحان سے نڈھال ہو کر نتیجہ کا انتظار کر رہا تھا ————— پھر ایک ۱۰۰۰ بی بی آجیب ہم چند دورست نکال دھینے کے لیے ملے۔ تو میں نے ان سے درخواست کی کہ نصفی کے آگے سے نہ جائیں کیونکہ وہاں داؤچی ہوں گے اور مجھے روک کر لڑا بندوقی اور کارڈوں کے محاورے پوچھنے لگیں گے۔ یا نا، میں دکھائی دے جاتے تو میں کسی بھٹی گلی میں ٹھس جاتا۔ گھر پر رہتا تھا تو بے سے زیادہ اور داؤچی سے کم باتیں کرتا۔ اکثر کہا کرتے تھے اس وقت آج کی طرح تو بھی نہیں فراموش کر رہا ہے میں نہ ادا نہ اپنے خبیث خیال سے کہہ رہے تھے۔

تین دن نتیجہ نکلا میں اور باقی لڑکوں کی ایک چھٹی سی ٹوکر کے کران کے گھر گئے۔ داؤچی سر جھکا کر اپنے گھر پر بیٹھے تھے۔ ہاتھی کو دیکھ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اندر سے کرسی اٹھا لائے اور اپنے بورسے کے پاس ڈال کر بوسے ڈاکٹر صاحب آپ کے سارے شرمندہ ہوں لیکن اسے بھی مقبول کی خوشی میں سمجھتے ہیں اچھا اچھا اس کی فرسٹ ڈویژن آجائے گی لیکن نہ اس کی بیٹیا دکنز رہتی۔۔۔۔۔“

ایک ہی تو نہر کہ سچے نے جھک کر بات کاٹی۔

اور وہ میری طرف دیکھ کر بوسے ”نو نہیں جانتا اس ایک بڑے مردانہ فونم ہو گیا ہے۔ جس میں است مہتاب اسٹریٹ خانی کرتا ہوں“ پڑھتا ہے۔ اور وہ باتیں کرنے لگے اور میں بے سے اسے ساتھ ٹپس لڑنے میں مشغول ہو گیا۔

اول اول کالج سے میری داؤچی کے خطوں کا باقاعدہ جواب دینا رہا۔ اس کے بعد بے تاملی سے لکھنے لگا اور آہستہ آہستہ پستلہ میں ختم ہو گیا۔

چھٹیوں میں جب گھر آنا تو جیسے سکول کے دیگر ماشروں سے ملنا ویسے ہی داؤچی کو بھی سلام کرنا رہا۔ اب وہ مجھ سے سوال وغیرہ نہ پوچھتے تھے۔ کوٹ پٹیوں اور مٹائی دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ چارپائی پر بیٹھ نہ دیتے تھے۔ کہا کرتے اگر کبھی اٹھانے نہیں دیتا تو خود دُکڑی لے لے۔ اور میں کُرسی کھینچ کر ان کے پاس ڈٹ جاتا۔ کالج لاٹری میں سے میں جو کتابیں ساتھ لایا کرتا انھیں دیکھنے کی تینا ضرور کرتے اور بہت سے وعدے کے باوجود اگلے دن خود ہمارے گھر آکر کتابیں دیکھ جاتے۔ اسی تہجد جو وہ کالج چھوڑ کر کتابیں ملازم ہو گیا تھا اور دتی چلا گیا تھا بے کے لیے سلائی کا کام بدستور تھا۔ داؤچی بھی نصفی جاتے تھے لیکن کچھ لاتے نہ لے لے۔ بی بی کے خط آتے تھے اور وہ اپنے گھر میں بہت خوش تھی۔۔۔۔۔ کالج کی ایک ساتھی کی زندگی نے مجھے داؤچی سے بہت دور کھینچ لیا۔ وہ لڑکیاں جو دو سال پہلے ہمارے ساتھ آٹھ پوٹھیلار کی تھیں بہت عرصہ کی تھیں۔ سیکنڈ ایئر کے زمانے کی ہر چھٹی میں آٹھ پوٹھیلار میں گزارنے کی کوشش کرتا اور کسی حد تک کامیاب بھی ہوتا۔ گھر کی مختصر مسافت کے سامنے اسٹاپاں کا طویل سفر زیادہ تسکین دہ اور مہمانانہ بن گیا۔ انہی آیام میں میں نے پہلی مرتبہ ایک خوبصورت گلابی بیڈ اور ایسے ہی لفافوں کا ایک سیٹ خرید لیا تھا اور ان پر نہ اباجی کو خط لکھ جاسکتے تھے اور نہ ہی داؤچی کو نہ مہر

کی چھینوں میں داؤجی سے ملاقات ہو سکی دکر کس کی تعطیلات میں۔ ایسے ہی ایئر گڈر گیا اور یوں ہی ایام گزرتے رہے۔

..... ملک کو آزادی ملنے لگی تو کچھ طوے ہوئے پھر لڑائیاں شروع ہو گئیں۔ ہر طرف سے فسادات کی خبریں آنے لگیں اور اماں سے ہم سب کو گھر بلوا دیا۔ ہمارے لیے یہ جگہ بہت محفوظ تھی۔ بننے سا ہو گا۔ گھر بار پیچڑ کر جاگ رہے تھے لیکن دوسرے لوگ خاموش تھے۔ حقوڑے ہی دلوں بعد مہاجرین کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا اور وہی نوک یہ خبر لانے کہ آزادی مل گئی! ایک دن ہمارے قصبہ میں بھی چند گھروں کو آگ لگی اور دونوں پر سخت لڑائی ہوئی۔ قحطانے والوں اور مٹری۔ کے سپاہیوں نے کرفیو لگا دیا، اور جب کرفیو ختم ہوا تو سب ہندو مسکھ قصبہ چھڑ کر چل دیئے۔ دوپہر کو اماں نے مجھے داؤجی کی خبر لینے کو بھیجا تو اس جانی بچانی لگی میں عجیب و غریب اصنی صورتیں نظر آئیں۔ ہمارے گھر میں داؤجی کے گھر کی ڈیوڑھی میں ایک بیل بندھا تھا اور اس کے پیچھے بوری کا پردہ لٹک رہا تھا۔ میں نے گھرا کر بتایا کہ داؤجی اور بے بے، پتا گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں اور یہ کہتے ہوئے میرا گلا رندہ گیا۔ اس دن مجھے یوں لگے جیسے داؤجی ہمیشہ بندش کے لیے چلے گئے ہیں اور سب لوٹ کر نہ آئیں گے۔ داؤجی ایسے ہونا تھے! ————— کوئی تیسرے روز غروب آفتاب کے بہت بعد جب میں مسجد میں نئے ناناہ گریزوں کے نام پوٹ کر کے اور کھل بھجوانے کا وعدہ کر کے اس لگی سے گذرنا تو کھلے میدان میں سو دو سو آدمیوں کی بھیڑ عجیب و غریب تھی۔ مہاجر رشک کے لٹھیاں پکڑے نعرے لگا رہے تھے اور گایاں دے رہے تھے۔ میں نے نماشا میوں کو بھاڑ کر کہہ دیں گھٹنے کی کوشش کی مگر مہاجرین کی خونخوار آنکھیں دیکھ کر سہم گیا۔ ایک لڑکا کسی بزرگ سے کہہ رہا تھا ”ساتھ کے گاڑی میں گیا ہو، قحطانے کو لٹا تو اپنے گھر میں گھسنا چلا گیا“

”کو کون سے گھر؟“ بزرگ نے پوچھا۔

”رہنکی مہاجروں کے گھر میں“ رشک نے کہا۔

”بھڑے؟“ بوڑھے نے پوچھا۔

”دیکھ کیا۔ انھوں نے کہہ دیا۔ دیکھا تو ہندو لٹکا۔

انہوں میں اس بھیڑ سے کسی نے چلا کر کہا ”ادوٹے راتو جلدی آادوٹے جلدی آ“ تیری سامی ————— پندت

————— تیری سامی

راتو کبریوں کا دیوڑھا ڈسے کی طرف سے جا رہا تھا۔ انھیں روک کر اور ایک لالچی دالے رشکے کو ان کے آگے کھڑا کر کے وہ بھیڑ میں گھس گیا، میرے دل کو ایک دھکا سا لگا جیسے انھوں نے داؤجی کو کپڑا لیا ہو۔ میں نے لڑم کو دیکھے بیڑا ہے قریب دو لوگوں سے کہا ”میر بڑا اچھا آدمی ہے۔ میرا ایک آدمی ہے۔ اسے کچھ مت کہو..... یہ تو..... یہ تو.....“ سنو میں نہانی چند آنکھوں نے میری طرف دیکھا اور ایک نوجوان گندا سی تولی کو بولا۔

”بتاؤ مجھے جی ————— آگیا بڑا اچھا آدمی ہے کہ ————— تیرے ساتھ کچھ ہو امین نا“ اور لوگوں نے گایاں بک کر کہا ”انھا“

ہو گا شاید

میں ڈر کر دوسری جانب بھیڑ میں گھس گیا۔ راتو کی قیادت میں اس کے درست داؤجی کو گھیرے کھڑے تھے اور اتو داؤجی کی ٹھوڑی کی کھوکھلا رہا تھا اور پوچھ رہا تھا ”اب بول بیٹا اب بول“ اور داؤجی خاموش کھڑے تھے۔ ایک رشک نے ان کی گپڑی تانا کر کہا۔

”پہلے بودی کا نو بودی“ اور راتوں سے مسرا کہیں کھٹنے والی درانتی سے راتوں کی بودی کاٹ دی۔ وہی لڑکا بھر بولا ”بلاد میں ہے؟ اور سناؤ
 سننے کا“ جیسے دو بڑے صاحبے میرے ساتھ بکریاں چپا یا کرے گا“ پھر اس نے راتوں کی ٹھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے کہا ”کلمہ پڑھ پڑھتا“
 اور راتوں کی آہستہ سے بولے۔

”کون؟“

راتوں نے ان کے منہ سر پر یہ انہیں پڑا کر کہ وہ گرتے گرتے پیچھے اور بولا ”سارے کلمے بھی کوئی باغ سات ہیں!“
 جب وہ کلمہ پڑھ چکے تو راتوں نے اپنی لاشیں ان کے ہاتھ میں دھما کر کہا ”چن بکریاں تیری انتھاری کرتی ہیں!“
 اور ننگے سر راتوں کی بکریوں کے پیچھے یوں چلے جیسے لمبے بالوں والا فریڈا بھل رہا ہو!

ایا

اوپنڈرنا تھرا شک

انٹراؤ۔

صاحب دسادیب آیا

نکر

مقام مبینی

وقتہ ہار دیکھ دن

اپر دو جس کمرے میں اٹھتا ہے وہ ایک متوسط درجہ کے مکان کا ڈرائنگ روم ہے۔ کسی ایسے کشادہ کچے راشن اور ہوادار مکان کا، برہمنی کی فوجی بستریوں میں عام ہیں۔ ان پرسٹل کی پھرتی کی بجائے کچرہ کی پھرتی ہوتی ہیں۔ اور مبینی کے چھ سات منزلہ مکاؤں کے نیچے نئے فیکٹوں جیسے گڑبوں میں رہنے والے ان کشادہ کچے مکانوں میں آکر ایک عجیب آسودگی سی محسوس کرتے ہیں یہ بیٹھنے کا کمرہ بھی مکان کی اپنی منزل پر ہے جس کا ثبوت اس کی چھت کے ڈھالوں گوشوں اور سائے کی بانگونی سے ملتا ہے۔ سامنے کی دیوار میں دائیں بائیں دروازے ہیں جو بانگونی کو جاتے ہیں۔ اس دیوار پر درمیان میں ایک ٹکڑ لگا ہے جس میں اس وقت گیارہ بج رہے ہیں۔ کمرے کو اس کے فرنیچر کے لحاظ سے تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ دائیں دیوار کے ساتھ میز اور کرسی لگی ہوئی ہے اور گیاروں کے یکایک پوشے ہیں۔ جس سے یہ حصہ چھوٹی مورتی لائبریری یا سٹڈی روم بن گیا ہے۔ سامنے کمرے کے وسط میں کوچ کا سیٹ پڑا ہے۔ اور ایک تپائی رکھی ہے۔ اسے بیٹھنے کی جگہ سمجھ لیجئے۔ تیسرے حصے میں بیٹنی بائیں طرف چھت سے ایک چھوٹا ٹکڑ لگا ہے۔

چھوٹا مبینی کے متوسط درجے کے فوجی مکانوں کا ایک لازمی جزو ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا مکان ہوگا جس کے برادرے یا گیارہ ٹکڑوں میں چھوٹا نہ ہو۔ اس کا خیال چاہے ہر ریٹ مکان

لکھائے بعد غزوئی کے مارے کسی گہرائی میں سو کے دماغ کی منتظر ہو۔ خواہ کسی مادہ واری بننے کے دماغ کی ایسی ہیکن اب تو یہ شیواجی کے ساتھ، محض چنے کھا کر سیوں کی مسافت طے کرنے والے مرتجع، بہادروں کے گھروں کی زینت بھی بنا ہوا ہے۔

ہائیں دیوار میں ادھر کو ایک دروازہ ہے جو باہر باہر سے میں لکھتا ہے۔
 پر وہ اٹھنے پر، میز پر صاحب بیٹھے کچے کھنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ صاحب سے مراد کسی گورے انگریز سے نہیں۔ ہمیں کام وہ شخص جو ایک نوکر، کھنے کی توفیق دیتا ہے۔ تو سے کی طرف کا لاہوئے کے باوجود اپنے آپ کو ”صاحب“ اور اپنی بیوی کو ”میسر“ کہہ سکتا ہے۔
 ”مجھے صاحب کہا کرو“ یا یہ حکم صادر کرنے کی بھی عزت نہیں تو اسے اتنی بار صاحب نہ کہ پکارے گا کہ وہ خود بھی اپنے آپ کو صاحب بخارنے پر مجبور ہو جائے گا۔

یہ صاحب خیر تو سے کی طرح کالے تو نہیں، لیکن اتنے گورے بھی نہیں۔ ۲۶-۲۵ برس کے خوش شکل نوجوان ہیں۔ فم کی پی سی۔ سن۔ ست ہیں۔ اور اس وقت معلوم ہوتا ہے کسی قسمی کہانی کا شادی لکھتے ہیں ”مروت ہیں۔“

پر وہ اٹھنے کے ایک لمحے بعد بائیں طرف بلب گراؤ میں دیکھنے کی آواز آتی ہے۔
 ایک لمحے بعد بائیں دروازے میں سے نوکر جھانکتا ہے۔

نوکر۔ صاحب آپ کی پھالی آیا ہے۔
 صاحب۔ کام کرتے ہوئے بے خیالی سے، پھالی کون؟
 نوکر۔ موٹی سی جوان چوڑی ہے۔
 صاحب۔ رچستور کام کرتے ہوئے، موٹی؟
 نوکر۔ صاحب کالی کالی ہے۔ آٹا بڑا بالوں کا جوڑا، بڑی بڑی آنکھیں اور صاحب بڑی جوان ہے۔
 صاحب۔ (پتھر بے خیالی میں) نام نہیں پوچھا؟
 (دروازے کے قریب بیک گراؤ میں، آیا کی نہایت میٹھی آواز آتی ہے)
 آریا۔ میں ہوں سیسیلا فرنینڈس

صاحب۔ (مجھوری کے انداز میں کام چھوڑ کر ایک غصیل سی مسکراہٹ ہونٹوں پر لاتے ہوئے، آجاؤ آیا۔
 آریا، اندر آجاتی ہے۔ نوکر پہنچا ہوا ہے۔ اگرچہ نوکر نے آیا کو کالی کالی کہے
 نوکر کے لئے کے غصہ کا استعمال اس کے کالے پن کی جگہ ہے۔ لیکن شاید
 نوکر کی نظر اس کے بڑبڑ کی نسبت اس کے شباب پر زیادہ رہی۔ اور
 اس کے بیان میں اس نے مبالغہ سے کام نہیں لیا ہے۔ آیا کی عمر میں

ایک برس کی ہے۔ اس کے بڑے جوڑے، بڑی بڑی آنکھوں اور
بھرپور جوانی۔ نے اس کے دلک کی سیاہی اور چٹائی کی کوتاہی کو یکسر
بھپا دیا ہے۔ بے حد خوبصورت بوز اور کنارے دار مٹی ہوئی نوبتی
وصاتی میں ملبوس ہے۔ آواز میں مٹھاس اور بچے میں نغمہ ہے۔ بولتے
وقت ’’ہٹ کر جاتی ہے۔ صاحب ’’ صاحب ’’ نہیں کہہ سکتے رہے کہ
'ریضہ' اور کو 'اور' وغیرہ وغیرہ

آکر صاحب کے سامنے کرسی کی پشت تمام کھڑی ہو جاتی
ہے۔ ذلی کے مٹالے میں آیا اور صاحب کی حرکت کے غصہ پسند
اشناسے دیئے گئے ہیں۔ باقی ایشن ڈائریکٹ کی سمجھ داری

(SOURCEFULNESS) پر چھوڑ دیا گیا ہے

آیا - (بلکہ اگر سر کو مٹھاس نام دیتے ہوئے، میم صاحب چلا گیا صاحب :

صاحب - ہاں آیا !

آیا - چھوڑ کر ہے ؟

صاحب - رہیں نہ اٹھنے دیکھا ہے !

آیا - وہ تو جانے والا تھا۔ میم صاحب بولتا تھا۔ وہ چلا جائیگا تو تم آکر کام دیکھنا۔

صاحب - رہو تمہوں پر لینٹ مسکراہٹ آجاتی ہے، میم صاحب نے ہنسی کی ہوگی۔ میں تو خود جانے والا ہوں

آیا - کہہ ؟

صاحب - پہاڑ پر ! اسی لیے اس نوکر کو جواب نہیں دیا۔

آیا - کیوں صاحب، تم تو اور ہی رہتے والا تھا۔ میم صاحب بولتا تھا صاحب اور ہی رہے گا۔

(جیسے اٹھانے میں کرسی کی پشت چھوڑ کر کراہہ تمام لیتی ہے۔ ایک لحظے کے لیے صاحب کی نگاہ کیا کے بھرپور سینے

پر چھپتی ہوئی کی جاتی ہے)

صاحب - (تو چھوڑ کر ایک تھکی سی (گڑائی لیتے ہیں) طبیعت ٹھیک نہیں رہتی آیا۔ میں بھی مبینہ بھر کی چھٹی ہے کہ اور ہی جا رہا ہوں

آیا - (آنکھوں میں عجیب سی ہمدردی اور مستی بھر جاتی۔ سینے کا ابھار دینے کے کرنے پر زیادہ بڑھ جاتا ہے اور بازو ڈرا

پھیل جاتے ہیں، ہاں صاحب تم کتنا ڈرا ہو گیا ہے، لحظہ بھر کے لیے صاحب کی آنکھوں میں دیکھتی ہے۔ لیکن صاحب

کی آنکھیں بالکونی۔ کے غد میں مٹی ہوئی ہیں۔ ہاتھ کو بڑھاتے ہوئے میز پر ہاتھ بڑھا لیتی ہے) میم صاحب بھی کیسا ڈرا

ہو گیا تھا ایسا کیا صاحب ؟

صاحب - (کرسی پر بیٹھے کی طرف جھٹکتے ہوئے) کچھے وزن کوئی نوکر نہیں تھا اور آیا بھی نہیں۔ میم صاحب کو عادت تو ہے نہیں

سب کام انہیں خود کرنا پڑتا۔ برتن ملنا پانی بھرننا، صفائی کرنا، مانت کو خیر اور کھٹل کے بارے باہم سنا نہ تھا۔ اور میرم صاحبہ دن رات جالگ تھا۔

کھٹل کیا صاحب ؟

آیا۔

صاحب۔ ارے یہی جیسے مانگوں کہتے ہیں، ارے وہ لال لال جو لبتے ہیں جوتے ہیں اور جبک بگ۔

آیا۔ (منہنی ہے۔ کاٹھنک کے باوجود فقرائی ہنسی،) ارے صاحب تم اس کو منہ نہیں دیتے۔

صاحب۔ کھٹل نہیں کھٹل کھٹل !

آیا۔ ہاں (منہنی ہے)۔ اس سے تو باپ بھی کیسے ہو گیا تھا۔ کتنی بھڑکاوڑیاں تھوٹھا،

صاحب۔ کیا تو انہیں منی میم صاحبہ بچے کو دیکھیں نہ کہہ کو؟ آیا لی جاتی تو ہم میم صاحبہ کو ہر دن بھی دیتے۔

(گرمی پر تھکے ہوئے چٹختے چٹختے ہوا رستے ساتھ لگ جاتے ہیں،

آیا۔) آیا پھر بیچ کی طرح میرم کے روتے سے ٹوٹ کر ہی جاتی ہے،

آیا۔ ہم تو سال بھر تمہارے پاس لڑکی کیا، ہم پورے تامل میں ہمارا ہمارے خریدہ کو لا رہا ہے۔ پاس آتے کہ ہم کو بہت

تو اس پر تانا ہے۔ میں ٹھنڈا ہوا آئے ہوں میں جاتا ہے تم کو نہ، میں لڑکی رو۔

صاحب۔ کیا حال ہے تمہارے، ہوائے ذوق کا ؟

آیا۔

فلت تھا اور تو صاحب، ہم اور سب لڑکی چھوڑ گیا تو اس کی میں لڑکی پھوٹ گئی۔ روز شاپ بیٹا تھا اور ہم کو تو اس

دیتا۔ ہم کو لا با کا لڑکی چھوڑ دیا۔ ہم سب سے شادی بنانے کو لگتا تھا۔ ہم کو لا ہم کو کام بیچ، فٹ پاتھ پر سیکھتے دن سے

شادی نہیں بنا سیکھ۔

(صاحب زور کا قہقہہ لگاتے ہیں اور پھر وہیں پوزیشن میں آجاتے ہیں،

صاحب۔ تمہاری کمیں، پتہ لگی بھی آیا ؟

آیا۔

تم کو یہ آیا پس ہے صاحب ؟

(صاحب کی آنکھوں میں دھندلی ہوئی چیرمیر، پوچھتا ہوں کیا کر چھک جاتی ہے۔ صاحب کی نگاہ اس کے سر سے پھرتے

نگار کر مڑ جاتی ہے،

صاحب۔ ہماری پسند کیا سوانی ہے۔ میم صاحب کو پسند ہے۔

آیا۔

یہ ہماری بات کہ ہے صاحب، ہم اسے بہت دیر سے جانتا ہے۔ ہماری بات والوں کے لڑکی کو تانا تھا۔ مرٹیکٹ اس

کے پاس نہیں۔ شکل بھی اچھا نہیں۔

صاحب۔ ڈیڑھ برسے دفتر کا چٹراسی۔ اسے شانتا کر دے لانے گیا تو اسے لیے بھڑکاپیں آگیا۔ میں نے پوچھا تو بولا صاحب

اس کی شکل اچھی نہیں۔ میں نے کہا لاؤ اسے، اگر وہ کام اچھا کرتی ہے تو چلے گا۔ مجھے تو اس سے مشتق کن ہے۔

آیا۔ تم کیسا ہے صاحب۔

دھپر نقرئی ہنسی فضا میں گونجتی ہے۔ اور ہنستے ہنستے وہ میز پر
بجک جاتی ہے۔ اس کے ہاتھ پھیل کر صاب کے میز پر پڑے
ہینڈ کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔ صاحب آٹھ گھڑے ہوتے ہیں)

صاحب۔ اور کیا دکرے میں گھومنے لگتے ہیں، آیا بہت اچھی ہے۔ شور نہیں مچاتی۔ تنگ نہیں کرتی۔ اپنے کام سے کام لیتی ہے
ایک جگہ بجک کے کام کرتی ہے۔ اور پھر اس کا بھیجا بھی برا ہے (ہنستا ہے) تمہاری طرح نہیں ہے۔ کہو اب کدھر کام
کر رہی ہو؟

(دھا کر چھوٹے پر ہیٹھ جاتے ہیں اور اسے جکے سے جھلا دیتے ہیں۔ کیا ان کے قریب جا کر مڑی جوتی ہے)

آیا۔ ٹاؤ میں کتنا تھا صاب!

صاحب۔ راجا کدھر کدھر! ٹاؤ!

آیا۔ پاروں سے ہم ٹاؤ میں تھا۔

صاحب۔ کس کے ہاں؟

آیا۔ اور صاب، ہم اس صاب کا نام نہیں جانتا۔ اس پونے والی جاڑی میم صاب نے بھیجا تھا۔ پن آج جھگڑا ہو گیا۔

صاحب۔ تمہارا جھگڑا کہاں نہیں ہوتا۔ کیا بات ہوئی؟

آیا۔ او میم صاب بہت کٹ کٹ کرتا ہے صاب۔ او بولا۔ تم ایسی ساڑی پہنتا ہے۔ ایسا بال بٹا ہے۔ تمہارا صاب
تو ہم سے جانتی ہے۔

صاحب۔ ساڑی تو یہ تمہاری واقعی اچھی ہے۔

آیا۔ ہم بولا۔ ہم تو ایسا بال بنائیں گے۔ ایسا ساڑی بنیں گے۔ چوکت میں کا ہے کو بوم بوم کرتا ہے۔ او بولا۔ ایسی ساڑی پہنتا

ادھر نہیں مانگتا۔ تم کو کام کرنا ہر ٹھیک سے کرو۔ ایسا صاب راد نہیں چھینگا۔ ہم بولا، ہم کو ہمارا پکارا روز ہم کو نہیں

مانگتا تو کرنی۔ او بولا صاب سے پکارو۔ صاب بولا۔ میم صاب سے لو۔ ہم تو کٹا لیا گیا۔ بولا۔ جاؤ ہم کو نہیں مانگنا پکارا۔

ہمارا پکارا رکھ کے تم جتنی ہو جاؤ! ہم چلا آیا دھپر رک کدھر صاب ایک روپیہ ہو تو دیو۔ کولا با جانے کا کرنا یہ مانگتا ہے

دو چار آنے کا ناشتہ کریں گے۔

(صاحب چم میز پر جا کر بیٹھتے ہیں اور دواؤ سے ایک روپیہ نکال کر اسے دیتے ہیں)

صاحب۔ روپیہ دیتے ہوئے، کیا تم ناشتہ کر کے بھی نہیں چلی؟

آیا۔ میں صاحب۔ میں ناشتہ کو ادھر لکھ نہیں دیتا۔ خالی پیلی ہم اڑتا ہے۔

صاحب۔ تم کھا کھاؤ گی؟

آیا۔ میں صاب۔

صاحب۔ اسے کھاؤ روکو کو آواز دیتے ہیں، جگدیش، جگدیش رلے بعد روکو کو داخل ہوتا ہے رسوئی گھر سے آیا ہے۔ ہاتھ

میں پھری اور ادھر چھلا پایا نہ ہے)

یہ ہماری پرانی کیا ہے۔ کھانا یہیں کھائے گی۔

جی بہتر۔

(چلا جاتا ہے۔ صاحب کی نگاہیں آگے سینے سے ٹکراتی ہیں اور لحظہ بھر کے لیے وہیں جمی رہتی ہیں)۔

آگیا۔

کیوں صاب کیا دیکھتا ہے؟

صاحب (اچانک نگاہیں ہٹا کر بڑی بھی ساڑی ہے۔ کتھے کوئی ہے؟)

آگیا۔

داکل کی ہے۔ یہ تو پرنٹ ہے۔

صاحب۔

(اچھا پرنٹ ہے۔)

آگیا۔

اُور دھوبی تالاب میں ایسا ساڑی جُٹتا ہے صاب۔ صاب کہا کرتا ہے ہم کو؟

ساڑی کو اپنے جسم پر پیٹ کر بتاتی ہے۔ صاحب اس

کے سمدول جسم کے مددِ خال کو ایک نظر دیکھتے ہیں۔ اور

اضغاری حرکت کے طور پر سر اٹھ کر سرے ہوتے ہیں)

صاحب۔

(اچھی لگتی ہے۔ لیکن تمہیں سفید ساڑی پہننی چاہیئے۔ وکرے میں ایک پکر ٹاٹے میں)

آگیا۔

کیدن صاب۔

صاحب (کوچ کے بازو پر بیٹھتے ہوئے) کالے رنگ پر سفید ساڑی اچھی لگتی ہے۔

آگیا۔

جسم سفید ساڑی بھی پہنتا تھا صاب، مگر کئی آدمی ہمارے دھچھوٹ جاتا تھا۔ ہم چھوڑ دیا سفید ساڑی پہنتا۔

(صاحب صرف مسکرا دیتے ہیں)

اس میں اور بڑی جانتی رہا تھا صاب۔ ایک دن کی بات ہے ہم اُور دیکھنے میں کام کرتا تھا صاب۔ ہم ایسا ہی

سفید ساڑی لاؤ بیٹھتا تھا۔ ایک پنجابی فوجی ٹیکسی میں بیٹھتا تھا۔ اور اُس کا صاب۔ جلا کھاتا تھا۔ ہم کو دیکھ کر اُتر بہت

داروپی اسے لاتھا صاب۔ ہمارے پاس آکر بولا تم بڑی میں کام کرتا ہے؟ ہم بولا۔ نہیں ہم کیا ہے۔ اوبولا۔ تم

جھوٹ بولتے ہو۔ تم بڑی میں کام کرتا ہے۔ تم ہم کو بہت پتہ ہے۔ ہم بولا۔ ہم تم کو مانتا بھی نہیں۔ پھر صاب اس

نے ہم کو پکڑ کر ٹیکسی میں ڈال لیا۔

(صاحب ہنستے ہیں)

— صاب دو بہت بگڑا تھا۔ بہت داروپی اسے لاتھا۔ ہم چلتا تھا۔ ایک سپاہی بھی آیا، مگر افسر بولا یہ بڑی میں کام

کرتا ہے، ہمارا فریڈ ہے تم جاؤ۔ اسنے دواؤ سے بولا کہ لاڑی چلاؤ۔ ہم بہت گھبراہٹ صاب۔ ہم دواؤ سے بولا۔

”دو کو لاڑی پرن صاحب اور دواؤ کو مارنے دوڑا۔ اس کے پاس دو بڑی دارو تھا صاب۔ ہم سے بولا چو! ہم بولا۔

ہم ہلکا جھنجھتی ہیں۔ اس نے بولن ہمارے سر پر اڑا دیا صاب۔ دواؤ ہماری جات کا تھا ہم اس کو لاڑی روکنے کو بولا۔

چو باقی پر اس نے گاڑی روک لیا صاحب۔ تب اور اس پرچی سے پیش نکال لیا۔ اور بولا ہم جان سے مار دیں گا تو دلاؤ
تو دیکھا اس نے چل پڑا۔ ہم بھی بہت ڈر گیا صاحب۔ اور فوجی ہم کو تھکا ہوا ہوئی میں سے گیا۔ اس نے اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے
دو دانہ بند کر لیا۔ کھڑکی بند کر لیا۔ ہم صاحب بہت کھا پڑا۔ پس صاحب ہم بھاگا۔ جہاں پر اس میں رہ گیا۔ اس
میں میں دیکھ اسے ہمارا ایدہ لگ تھا۔ پس صاحب ہم سے اس کو بھی نہیں دیکھا۔ بھاگ کر یہ لگ پہنچا۔ عزم لیا اور کوبالا
آگیا۔

ر صاحب زور کا قہقہہ لگاتے ہیں:

کچ صاحب! پھر ہم کو ایک دن اور فوجی صاحب۔ کیونکہ تم میں دن بھاگ کیوں گیا۔ ہم تم کو بہت پسند کرتا ہے ہم
تم سے شادی بنانے کو مانتا ہے۔ ہم بولا ہم کو میں بڑا اچھے شادی۔ اور ہمارا سب جات والا رہتا ہے۔ تم ہم کو
تم اس میں لاقوم تھا ہمارے فرزندوں کا۔

صاحب! دیکھ جا کر کسی پریشانی سے نہ ہنس کی تم سب کا سر جھوٹے لی تو کیسے چمے گا۔ تم کہیں شادی کیوں نہیں کر لیتی۔
آگیا۔ ہم کو مانتا بھی نہیں شادی۔ ہم جھوٹا بھر لگا۔ وہ پانچ برسوں میں شادی نہیں بنا سکا۔

صاحب! اب تم کدھر جاتی ہے؟
آگیا۔ ہم تو ادھی آگیا تھا صاحب۔ ہم صاحب بولا تھا ذکر جانے کو مانتا ہے ہم کو صاحب کا بڑا اچھے ہے تم اس کو دیکھنا۔ ہم کیا
تو اب تم باہر کیوں جانے کو مانتا ہے۔ ہم تو ادھوری بھی چھوٹ میں چھوڑ دیا۔
صاحب! تم مجھ سے پوچھ کر لیتی۔

آگیا۔ ہم کو کیا نام۔ ہم صاحب! ہم بولا تھا ہم چار تائید کو جائیں گا۔ آج پانچ ہے۔ ہم اور کیا ہے۔
صاحب! تم کو پتہ صاحب! کہے ان سے جانتا تھا۔
آگیا۔ اس میں صاحب نے آیا رکھا۔

صاحب! وہ ماما صاحب پر نہیں۔ نے گیا تھا۔ میں اس سے کہوں گا وہ تہہ سے اپنے فوری دھونڈ دے گا۔
آگیا۔ دیکھ آگیا! اب کی میز پر بھول جاتی ہے، وہ بڑا ایسا ہے صاحب۔
صاحب! کیوں؟

آگیا۔ جب ہم پتہ صاحب کے گھر سے چلا تو اوڑھت صاحب بولا۔ آیا سینہ دیکھنے میں گا؟ ہم بولا ہم کو نہیں مانتا ہے سینہ۔ بولا
پوچھانے نہیں۔ صاحب! ہم کو جو جوتی ہوئی میں سے گیا۔ ہم ایک کپ چائے پینا سوا بولا۔ آیا ہمارے ملک میں ہم تم
کو بہت پسند کرتا ہے۔

صاحب! وہ تم کو پسند کرتا ہے۔

آگیا۔ اس کا اپنا شادی نہیں بنا صاحب۔

صاحب! اس کی جیوی ہے، بہت خوبصورت لیکن میں میں ہے۔

آیا - اور ہوا ایسا ہے صاب -

صاحب - اندھیری دسے صاحب کو بھی اب آیا چہینے تم ادھر کیوں نہیں جاتی ؟

آیا - ہم کو نہیں مانگتا اندھیری - وہاں ہم کو ادھر صومات بہت تلاش کرتا ہے - ہم بے بی کو لے کر بیٹھا ہوتا - اور بے بی کو لے کر آؤ پر اپنے کمرے میں چلا جاتا - ہم کو بھی اس کے پیچھو جانا پڑتا - اور ہم کو بہت تماش دیتا تھا -

صاحب - وہ لہا صاحب اب ادھر نہیں ہے -

آیا - اوہیم صاب بھی بہت کھٹ کھٹ کرتا تھا -

صاحب - رہیں کر ، تو پیراب میں کدھر بھجوں تھیں کوئی پسند بھی ہو ؟

آیا - ہم کو تو تم جیسا کھڑی صاحب پس ہے - ہم تبارے کھڑا تھی دیر رہا تم ہم کو بھی تراس نہیں دیا - ہم اچھا ساڑی بیٹھا تھا تم

ہم کو کبھی نہیں بولا - کھانے کا ہم کو کوئی دانہ نہیں ہوتا - ہم صاب کھٹ کھٹ بھی کرتا تو تم اس کو بول دیتا -

صاحب - بلکہ تم تو یہاں سے بھی رڑک بھاگ گئی -

آیا - وہ ہمارا کھٹ برائے خرید ہم کو لے گیا صاب - یہاں کا برائے لوگ بھی تراس دیتا ہے - اور وہی لوگ بھی ہم کو کشتاں لپی بیٹھی ہے -

صاحب - تم تو دیں ہیں جانے والا تھا -

آیا - وہیں میں گیا تھا صاب پن ہمارا دل آدھیں ملا -

صاحب - تم سے پہناب جانے کو کہا تھا اس اندھیر والی ہم صاحب کے ساتھ -

آیا - نہیں صاب ہم ہمارا دل جانے کو نہیں مانگتا - ادھر ہمارا کھٹ پٹ ہو گیا ہم صاحب سے کہہ دیا ہم ایک بار ایک صاب کے

ساتھ دلی گیا - ایک دیک میں ہم صاب سے ہمارا کھٹ پٹ ہو گیا - وہ بولا دلی میں کدھر جائیں گا - ہم بولا ہم بھولا مریں گا

فٹ پاتھ پرسوئیں گا پن تبارے گھر زکری نہیں کریں گا - ہمارا مہات والا کوئی آؤد تھا نہیں - ہمارے گھے کا ہنسل ہم نے

بچھا تو اور آیا -

صاحب - کسی اور کے دل زکری کر مٹی وہاں -

آیا - ہم کو تو کئی لوگ بولتے تھا صاب ، تم ہنسل نہ بچو ہمارے سنگ رڑک - تم کو پیش کر انیں گا - کوئی ٹھیکہ نہیں ہونے وہیں گا پن

ہم بولا - ہم بھولا مریں گا - فٹ پاتھ پرسوئیں گا پن دلی میں نہیں دہیں گا -

صاحب کھلے اس کی حرمت دیکھتے رہتے ہیں - پھر کند سے جھٹکا کر قلم اٹھا لیتے ہیں ،

صاحب - ابھی کہ تم شادی کو کر آؤ - میں نے تم سے کئی بار پہلے ہی کہا ہے تبارے بیچے کی سب گرمی دودھ ہر جائے گی -

آیا - ہم کو مانگتا بھی نہیں شادی - ہمارا جات دسے بڑے سندھ رڑکوں نے ہم سے شادی ہلنے کو کہا صاب - پن ہم کو نہیں

مانگتا شادی - ہمارا دودھ میں کھٹ پٹ ہو جائیں گا - دھیر بڑ پھٹک جاتی ہے - پاتھ پھیل کو صاحب کے پیٹ کے پاس پہنچے

جلتے ہیں - آنکھوں میں نرمی اور آواز میں علامت آ جاتی ہے - ہم کو تبارے باقی کھڑی مانگتا ہے صاب - جگت نہیں مانگتا -

جو تو نہا سے پاس آیا تھا۔ ہم صاحب بولا تھا۔ چھوڑا چلا جائیں گا۔ ہم یہاں رہتا ہوتا تو تم کو کوئی نیچہ نہیں ہوتا۔
صاحب۔ دیکھو میں سے لطف ہراس کے گرد نہ بیٹھے کو دیکھتے رہتے ہیں۔ جو میرے کوٹے کو دہائے جا۔ اب سے پھر نہیں پڑتے ہیں،
تم یہاں رہتی تو ہمارا بھیجا بھی برابر نہ رہتا۔

آیا۔ تم کیا ہے صاحب!
صاحب۔ رہتو رسائی اپنا کام شروع کرتے ہوئے، لو اب جاؤ۔ کھانا دنا کھاؤ چھر مانا۔
آیا۔ تم میں کیسے کا صاحب۔
صاحب۔ دیکھتے ہوئے، اہ۔
آیا۔ صاحب ہم پہنچے ہاتھ دم میں ہاتھ لینے کو مانگتا ہے۔ آتا گرمی ہے، ہمارے پاس دوسرا ساڑی ہے۔
صاحب۔ رہتو رسائی کام کرتے ہوئے، تو کیا کر رہے لے گی؟
آیا۔ تو دل ہے صاحب۔
صاحب۔ جاؤ تہاؤ۔

آیا مسکراتی ہوئی چلی جاتی ہے،

صاحب۔ لامل دلا قوۃ، یہ آیا بھی خوب ہے روکر کو آواز دیتا ہے، جگدیش جگدیش۔
(روکر آتا ہے)

دیکھو یہ آیا نہیں نہنے گئی ہے کھانا میں کھائے گی۔ دل بھیک قسم کی حورت ہے۔ باتوں میں نہ لگے رہنا کھانا دنا کھلا کر
سادا کام نہنا دینا۔
دھم چھوڑ کر ہاتھوں کی انگلیاں مروڑتے ہوئے انگڑائی لیتے ہیں،
(اپنے آپ، مڑنا لیم اور لہا دیوان یوں ہی، اس کے لیے نہیں مرتے۔
رکایا دو دانے میں جھانکتی ہے،

آیا۔ صاحب۔

صاحب۔ کپڑے۔

آیا۔ کوئی صاحب لاٹکرا ہو تو دیر صاحب۔

صاحب۔ صابن۔

آیا۔ پسینہ بہت ہے صاحب۔ کپڑا دھوئے کاہر تو بھی نہیں گا۔

صاحب۔ روکر کو آواز دیتے ہیں، جگدیش!

جگدیش۔ دیکھ گراؤ نہ میں، جی۔

صاحب۔ ادھر ہماری صابن دانی میں صابن کا چھوٹا ٹکڑا ہے لاؤ۔

جلدیش - ربیک گراؤنڈ میں، جی لایا۔

آگیا۔ صاحب اس نام تو اور دھوب بڑا ہے۔ ہم کچھ دیر اور بالکونی میں آرام کروں۔ شام کو ہم چلا جائیں گا۔

صاحب - رپستور کام کسے ہوئے؟ اچھا۔

(جلدیش صاحب کا ٹکڑا لٹا رہے)

صاحب - آہا کو دور آیا ہے، چلیں گا۔

آگیا۔ چلیں گا صاحب۔ ہم ابھی ہاتھ دے کر آتا ہے۔

(چل جاتی ہے۔ ایسی سانس بھر کر صاحب اُٹھتے ہیں)

صاحب - دیکھو جلدیش ہم ابھی دفتر جاتے ہیں۔ کھانا ہم دیں کھائیں گے۔ تم شام تک سب کام ختم کر دینا۔ کل رپوئل پانچ تک کچھ باقی نہ رہے آیا کے ساتھ باتوں میں نہ لگے رہنا۔

(پچھے جاتے ہیں۔ پردہ کچھ لمحوں کے لیے گرتا ہے پھر اُٹھتا ہے۔ گھڑی میں بارہ بجے)

رہے ہیں۔ صاحب جلدی جلدی داخل ہوتے ہیں اور آتے ہی نوکر کو آواز دیتے ہیں،

جلدیش :

جلدیش - ربیک گراؤنڈ میں، جی آگیا۔

صاحب - ایک پانی کا گلاس لاؤ۔

(لکھنویوں سے بالکونی کی عزت دیکھتے ہیں کہ وہاں کوئی زندگی کا نشان ہے یا نہیں۔)

پھر خانوں میں تھوڑا ذکر ایک فائل نکالتے ہیں۔ ذکر پانی لٹا رہے۔)

صاحب - رہائی کا گھر جس بیٹے ہوئے؟ جلدی میں یہ فائل یہیں رہ گئی رہائی کا گھونٹ پیتے ہیں (کھانا کھد دیا آیا کو؟)

جلدیش - جی وہ تو نہیں گئی۔

صاحب - چلی گئی؟

جلدیش - اسی وقت آپ کے جاتے ہی۔

صاحب - کیوں؟

جلدیش - ذرا سائیل مانگنے آدے آئی۔ آپ کو نہ دیکھ کر بولی۔ صاحب کو بھر گیا؟ میں بولا دفتر بولی۔ کب آئیں گا؟ میں نے کہا مجھے معلوم

نہیں۔ بس اسی وقت چلی گئی۔ نہ اس نے مٹل کیا نہ کھانا کھایا۔ یہ روپیہ دے گئی ہے۔ کتنی تھی۔ ہم سمجھا تھا صاحب گھر۔ کینڈا

میں نے کہا کھانا تو کھاتی جاؤ۔ بولی۔ ہم کو نہیں مانگتا ہے کھانا۔ جلتے جاتے ہوئی تھی۔ یہ کیسا صاحب ہے؟

(صاحب گلاس ہاتھ میں لیے بالکونی کے غلام تک پہنچے ہیں۔ جب پردہ پھر گر جاتا ہے)

اصفہان کے متکبند

(ایک ریڈیائی تمثیل)

سید امتیاز علی تاج

حکایت :

مہرزاسمین، اسلام علیک، مزاج شریف، خالق ارض و ممانے جب سے یہ کائنات پیدا کی ہے، ابن آدم کو وہ مسرتیں کبھی نصیب نہیں ہوئیں جو آج اصفہان میں میسر ہیں اس حیا و حشی و عشق میں کسی شخص کا آئینہ خاطر رنگ آلود نہیں ہے میں اس قدر مسرتیں حاصل ہیں کہ اگر ہم تعداد ممکن ہونا چاہیں جب بھی نہیں ہو سکتے۔ اب مجھے دیکھئے آج ایک ایسی پریشانی کا سامنا ہے کہ میرے حواس مجھ سے رخصت طلب کرنے پر مہر ہیں۔ پر کہتا ہوں، لبورسنے اور لٹے وائے کرنے سے کیا حاصل ہے؟ قطعہ یہ ہے کہ میں ایک ایسی حسینہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں جس کے دیدار سے میری آنکھیں بہرہ یاب نہیں ہوئیں۔ آپ کو شاید یہ معلوم ہو گا کہ محبت کا مقدس جذبہ محض دیدار ہی سے پیدا نہیں ہوتا یہ آگ کبھی کبھی گفتار سے بھی ہو سکتی اٹھا کرتی ہے۔ چنانچہ اگر ایک شاہواری محبوبہ کی صورت دیکھے بغیر محض اس کے نام پر زندہ ہو جائے تو آپ اہل بیچارے کو تصور و رو کیونکر ٹھہرا سکتے ہیں؟ ربامی تو غیر میں نے لکھ لی لیکن سوال اب صرف یہ ہے کہ اپنی محبوبہ کے باپ کی دوسری شریک کیا کیوں کر کی جائے؟ آخر تاجر ہے۔ ساتھ ہی یہ بڑھی لگادی کہ جو شخص اس عقائد میں شریک ہونا چاہے ربامی کے ساتھ چاندی کے دس دینار بھی پیش کرے۔ یہاں لے دے کے ساری بونجی صرف یہ ایک دینار ہے۔ افسوس کہ آپ اسے دیکھنے سے معذور ہیں بہر حال اب نگر ہے تو یہ کہ کیا افسوس پڑھ کر چھوٹا جائے جو اسے ایک کے دس دینار نظر آئے لگیں؟ خیر عینہ سے یہی ہوتی آئی ہے، کچھ بھڑبی پر موقوف نہیں۔ بڑے بڑے اہل کمال آشفہ سلال ہیں۔ عیبیت یہ ہے کہ آج کل کا روبرو مرد اسے۔ دکان پر اسے گاؤں میں آتے جس سے تو دینار کمانے کی امید ہو سکتی لیکن محنت کا کلن کرنا محنتوں کا شیوہ ہے۔ کاتب تقدیر نے جو کچھ لکھ دیا ہے ہو کر رہے گا۔

(مرسیتی کے ساتھ شاہ کمال داخل ہوئے)

حکایت : اغاہ آتھے شاہ کمال، خوش آمدید! اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ غریب خانے پاپ قدم رنجہ ڈلنے والے ہیں تو میں سارے فرض پر گلاب و یاسمین بکھیر دیتا۔ لیکن آپ نے اپنی شریف آوردی کی اطلاع ہی نہ بخشی۔ کیوں خیر ہے آج؟

- شہر کمال: حضور نے اپنا تنور اس قدر جلد کیوں بند کر ڈالا؟
 اسے کوہ دانش، اسے سلطان القلم، ابھی اچھے پیچھے ہوئے ہیں نے سنا کہ اصفہان کے متول سوداگر اپنی مہم نے اپنی پری جمال دختر کی شادی کر دیے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ کیا صحیح ہے؟
- حلالج: ماشاء اللہ، آپ کی سماعت میں اب تک کوئی عیب پیدا نہیں ہونے پایا۔
- شہر کمال: یہ بھی سنا کہ جو شخص اس کے جمال جہاں آوا کی تعریف میں بہترین راجی کر کے لائے گا وہی اس کا شہر قرار پائے گا۔
- حلالج: لیکن میرے محسن اس کے ساتھ بعض شرطیں بہت کرٹی بھی ہیں۔
- شہر کمال: میں بھی تو سنوں وہ کیا ہیں؟ اگر چند اشعار کے عوض جوہری کی کافر ماجرا دختر ہاتھ آئے تو اور چاہئے کیا؟
- حلالج: راجی غریب آفتاب سے پہلے تیار ہو جانی چاہئے۔
- شہر کمال: معمولی بات ہے۔ مجھے ایک گھنٹے کی خدمت ہے اتنی دیر میں چار مصرعے کہہ لینا کیا بڑی بات ہے۔ اسے برادر ایک مرتبہ شیعہ کے ہاں ضیافت تھی، اس تاجپز نے ضیافت کا سارا کھانا گھنڈ بھر میں تیار کر کے رکھ دیا تھا اور پھر لطیف یہ کہ ہر کپچے کی قطع اور ٹکٹ کسی نہ کسی پھول سے مشابہ تھی۔ چنانچہ اس کا نامہ پر میں بجا طور پر غور کر سکتا ہوں۔ کہیں ہے نا؟
- تو صرف راجی ہی کہتی ہے؟
- حلالج: ایک شرط یہ بھی ہے کہ تانہ میں لڑکی کا نام آئے اور اس طرح لایا جائے جس طرح جوہری نذر دھوتی کے گینے کے ارد گرد سکنے اور چاندی کے بیل بوٹے بنا دیتا ہے۔
- شہر کمال: یعنی دیئے ہی سنبھلے سا بچوں میں ناں یا ڈتیا رکھے جاتے ہیں۔ اسے بوجھے تو شعر سوچئے بھی گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے دمار کے تھوڑے اشارے کے شہر شیرمال نکلے آ رہے ہیں۔
- حلالج: یہ بھی مزدی ہے کہ راجی نہایت پاکیزہ خطہ استعین میں کھڑکیش کی جائے۔
- شہر کمال: یہ البتہ بیڑی کی طرح قائم جانتے ہو کھنڈا ہے آتا نہیں۔
- حلالج: اس خدمت کے لیے میں جو حاضر ہوں۔
- شہر کمال: دام کیا لوگے؟
- حلالج: آتا اس خاکسار کو چاندی کا ایک دینا دے دیجئے ساریے پاکیزہ خطہ میں نظم کھدو کہ لوگوں میں ایک باد تو پر بیگڑٹیاں ہونے لگیں کرنا ابھی شہر کمال کی راجی واقعی ماہر سیمیں کی نظروں سے گزرنے کے قابل ہے۔
- شہر کمال: منظور۔ یہ لو دینا رہے جو کچھ کہا کچھ ہے، تو یہ معاوضہ زیادہ نہیں کہا جاسکتا۔ تو گویا اب راجی کی طرف توجہ کی جائے اور نہایت لطیف اشعار کے ہمیں خذرا مجھے فکر کرنے دو۔ ہاں تو یوں کہنا چاہئے۔ تو شیعہ ہے، میں پرہیز بول۔
- حلالج: مگر ایک بات اور۔
- شہر کمال: یا رقم تو پریشان کئے دیتے ہو بڑھا اور کیا چاہتا ہے۔ کہہ بھی چکو۔
- حلالج: راجی کے ساتھ چاندی کے دس دینار بھی دیتے ہیں۔

شہ کمال: سر میں پیرِ قوت، مگر پردہ نہیں، دوس دینا رہی ہیں۔ ہاں تو کیا کہہ رہا تھا میں۔ میں فتح ہوں اور پر واز ہے تو ہوں! ہوں! ہوں!
لاحول ولا قوت۔ غارت ہو گیا سارا خیال۔ کسے تھا؟
(گھٹتی جاتی ہے)

حلاج: کون ہے؟
آواز (باہر سے): میں ہوں علاؤ الدین عطر فروش!
حلاج: اندہ تشریف لے آئیے۔

(علاؤ الدین داخل ہوتا ہے)
حلاج: آج تو میری قسمت کا ستارہ زردوں پر ہے اگرچہ آپ کے عطر کے قراہوں سے گلاب کی بوٹے دلاؤ بڑے پھیکے اٹھتے ہیں لیکن بچے اس وقت اس شخص کا خیر مقدم کرنے کی سعادت حاصل ہے جس کی باتیں عطر سے بھی زیادہ نکلتی ہیں۔
علاؤ الدین: اگر یہ صحیح ہے تو یوں کہنا چاہئے کہ قدرت لطیف کاموں کے لیے ان ہی لوگوں کو منتخب کرتی ہے جنہیں طاقت و ذوق کی نعمت عطا ہوئی ہے لیکن ذرا دیکھنا یہ ان حضرت کو کیا ہو گیا؟ میرے خیال میں تو ان کی حالت اندیشہ ناک سی ہے۔

حلاج: یہ شہ کمال تانباڑی ہیں۔ آپ نے یقیناً انہیں بار بار دیکھا ہو گا۔
علاؤ الدین: میں نے، لاحول ولا قوتہ! لا بالہ میرا ان سے کیا واسطہ، لیکن یہ تو فرمائیے یہ ایسے وحشیانہ انداز میں کیوں گھوم رہے ہیں؟

حلاج: یہ اس وقت بحرِ نظم میں غرق، قافیر کی موجوں کے پھیرے کھا رہے ہیں۔
علاؤ الدین: کیا کما بخرِ نظم میں غرق؟ تانباڑی میں شالو کی روح کہاں سے آئی۔ کہیں انہیں بھی تو یہ ضبط نہیں ہوا کہ رابعی کہہ کر ماہِ سپہیں پر ہی جمال دو خیزہ کو حاصل کیا جائے؟ کیا خوب بھگپندر کے سر میں چنبیلی کا تیل۔

شہ کمال: ارہمیں یہ کیا شور مچا رکھا ہے تم نے۔ اخاء تم کو میرے دوست علاؤ الدین! وہ اس شیر مال کے دام آج تک ادا لٹھنے کی نوبت نہیں آئی۔ یاد ہے نا؟ لاحول ولا قوتہ! مصرعہ ہی دماغ سے نکل گیا تھا کیا تھا۔ یہ گھمائے.....

علاؤ الدین: کہنا فرسودہ ادب پامال خیال ہے۔ جیسے اس شخص کے شیر مال پھیکے اور سبے سزا ہوتے ہیں ویسے ہی اشعار بھی بلکیت ہیں۔ لیکن علاج پھلے میں پہنچے ہاں آئے کی غرض و غایت بیان کر ڈالوں۔ معلوم ہوتا ہے بوڑھے جوہری کے خط کا فقرہ تم نے سن لیا ہے۔ بات یہ ہے کہ ابنِ جسم خود تو بالکل کورا ہے۔ لکھ پڑھ بھی نہیں سکتا لیکن بوڑھے کو اس بات پر بڑا ناز ہے کہ اس کی بیٹی ماہِ سپہیں.....

حلاج: میں جانتا ہوں یہ اشعار ماہِ سپہیں پڑھے گی۔
علاؤ الدین: بالکل ٹھیک۔ چنانچہ اگر اپنے اشعار میں تم سے لکھواؤں تو اس کا معاد و ضم نہ کیا لے سکے؟
حلاج: دو دینار!

علاؤ الدین: وہ نہیں بھائی ایک کامیاب ہو گیا تو سارا بڑھ تمہارا۔

حلاج: منظور!

شہرِ کمال: (چھاتی کوٹتے ہوئے) میرا قافیہ رنگ ہو گیا ہے۔ شعر سو جھٹانیں۔

علاؤ الدین: تو اب سوال یہ ہے کہ اشعار لطیف ہوں یا جذبات سے لبریز ہوں یا شکل ہوں۔

حلاج: تین دینار تو ہو گئے۔ شاید باقی سات بھی کہیں سے مل رہیں گے۔

شہرِ کمال: یہ گھماٹے دنگا رنگیں۔ یہ گھماٹے رنگا رنگیں۔

علاؤ الدین: حلاج! یہاں میرے لیے شعر کہنا نا ممکن ہے جب ایک ایسا عجیب غریب انسان اس ہیئت کذائی کے ساتھ شاعری کا خواہ کر، ہا ہر تو بھلا کوئی شریف آدمی شعر کیونکر کہہ سکتا ہے؟

حلاج: آپ کہاں لکھنا پسند کریں گے؟

علاؤ الدین: کوئی نرم اور لگدگی سی جگہ ہوتی یہاں گریسے بھی تو نہیں ہیں۔ ارے میں تم کیا آدمی ہو۔ درویشوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہو۔

حلاج: آپ یہاں تشریف رکھتے نا۔

علاؤ الدین: ہوں خیر لیکن ایک بات سننا۔ اگر کوئی اور آئے تو اسے میرے قریب نہ بٹھکے دینا۔ میرا داغ بے بعد حساس ہے اور اثر بڑی جلدی قبول کرتا ہے۔ پھر میرا ذوق بھی بے حد لطیف واقع ہوا ہے۔ کوئی غیر فصیح لفظ سن پاؤں تو ذہنی کو منت ہوتی ہے اور اگر کسی احمق کا محسوس چہرہ نظر آجائے تو بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ ہفتہ بھر تک طبیعت مکدر رہتی ہے۔

حلاج: الہی تیری پناہ!

علاؤ الدین: تو اب میں صفر کتا ہوں۔

(گھنٹی کی آواز)

حلاج: کوئی اور صاحب تشریف لائے۔ ارے یہ تو جھامت مآب جناب سلیمان حجام ہیں۔

سلیمان: (دھکا ہوا آیا ہے اس لیے ہانپ رہا ہے) اماں حلاج سنا تم نے بوڑھے جوہری کا نفعہ جب ڈھنڈو درج یہ خبر لے کر میرے کوچے میں پہنچا تو میں خط بنانا بیٹھا کہ اس طرح بھاگا جیسے شیطان جہنم سے نکل کر بھاگے۔ ماسے شہر میں اس نفعے کا چرچا ہو رہا ہے اور یہ دوشیزہ ہے یہی تو عرم سر اسٹے سلطانی کی تربیت ہفتے کے قابل۔ اسے بھائی تمہارے

دھم دگن میں تو اس کی انگشتوں کی صحیح قیمت بھی نہیں آسکتی۔ ان کے یکنے اتنے بڑے ہیں کہ.....

حلاج: خدا کے لیے بات کہتے وقت اپنی قیمتی کوئیوں نہ گھمائیے، آپ سیری آنکھیں نکال ڈالیں گے۔

سلیمان: میں تو کتا ہوں یا ادب یہ بیداری کا عالم ہے یا خواب و خیال کی دنیا۔ میں اس قدر مسرور ہوں کہ بچپن کے زمانے کی طرح دلچسپی کو محسوس کرتا ہوں۔ سنو! میں تم سے کچھ کام لینا چاہتا ہوں۔ معاوضہ نقد نقد، عجمی چاہے پیشگی لے لو اور اگر کہیں میں نے اس معرکہ میں فتح پائی اور ماہ سیمیں میرے ہاتھ آگئی تو قسم کھاتا ہوں کہ ہیشتر کے لیے اس عجیبی کے

پیشے سے دست بردار ہو جاؤں گا، وہ اب میں شکر کہتا ہوں اور تم فوراً منیں لکھ لینا۔
گلی میں سے آواز : اے بد معاش نکل باہر کہاں آکر چھپ بیٹھا ہے علاج، سلیمان اندر ہے نا؟
سلیمان : گھر لو کہ، جی ہی یہ کم گفت یہاں آ پہنچا جب ڈھنڈو درجی آبا تو میں اس وقت کم بحث کی آدمی ڈاڑھی تراش چکا تھا۔
(گلش داخل ہوتا ہے)

حلاج : خوش آمدید گلش!
گلش : لیکن تم سکرا کیوں رہے ہو؟
حلاج : کیونکہ آج بڑی مدت کے بعد آپ کی زیارت ہوئی ہے۔
گلش : وہ دہاکم بحث حجام کیوں بے بد معاش یہ کیا حرکت تھی۔ آدمی ڈاڑھی تراش کر اٹھ بھاگنا۔ شہر کے ایک معزز آدمی کو اچھا خاصا معزز بنادیا میں اس ملاکی گری میں سوانگ بنا، گلی کوچوں میں سے بھاگتا ہوا آیا ہوں۔ ادھر تو آئے۔ تجھے بھاگنا سکھاؤں۔

حلاج : اپنی حضرت ایسا بھی کیا غصہ، ذرا بات تو سنئے، سلیمان بُرا آدمی نہیں، ابلتہ دل کے ہاتھوں مجبور رہے اور پھر اس وقت ذرا فکرِ شعر میں بھی مصروف ہے۔

گلش : کیا کہا شعر؟ ایک بار اس کی ناک میرے ہاتھ آجائے تو اسے سکھاؤں شعر کہنا۔
علاء الدین : اسے بھٹی یہ کیا مصیبت ہے۔ دکان کو داس چھکی کو یہاں سے۔
شہر کمال : اے لور اتنی دیر کے بعد ایک ہی لفظ سوچا تھا۔ وہ بھی بھول گیا۔
سلیمان : قندہ آپ کی باقی ڈاڑھی میں پھر کسی دن تراش دوں گا۔ اس وقت آپ کو معلوم نہیں میرے دل کی کیا کیفیت ہے مجھے معاف فرمائیے۔

گلش : ہیں؟ کیا کہا؟
حلاج : میں نے کہا حضرت ذرا بات تو سنئے میں نے سنا ہے آپ بڑے کا، دہاری شخص واقع ہوئے ہیں۔

گلش : تو پھر؟
حلاج : آپ بھی دی کیجئے نا جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔

گلش : کیا میں بھی شعر کہوں؟ میں اندر شعر؟
حلاج : چار مصرعے ہی تو کہتے ہیں۔ خبر آپ نے سن ہی لی ہوگی۔

گلش : وہی انجیسیم کا قصہ۔ جی ہاں! یہی نا کہ وہ اپنی لڑکی چند شعروں کے عوض بیچ ڈالنا چاہتا ہے۔ نا جائی ان دونوں جو رو پر بہت دور یہ صرف ہوتا ہے۔ مجھ میں اتنی استطاعت کہاں۔

حلاج : غالباً آپ نے یہ نہیں سنا کہ جین میں تنہا اونٹ بھی ہاتھ آئیں گے۔
گلش : کچھ آ تو تم نے مجھے پہلے کہیں نہ کہا۔ یہ بات ہے تو میں اس لڑکی کو جیت کر رہوں گا۔

حلاج : بالکل بجا، لیکن رباوی لکھنی بھی تو پڑے گی۔

گلہبش : کھسے کی بات ٹیڑھی ہے۔

حلاج : ایک دینار موت کیلئے تو یہ مشکل بھی آسان ہونی چاہتی ہے۔

گلہبش : اکٹھا ایک دینار۔ یہ تو بہت ہے، نصف دینار کہو۔ ہاں نصف دینار۔

حلاج : لیکن پاکیزہ اشعار اگر پاکیزہ خط میں نہ لکھے گئے تو حاصل کیا ہوگا۔

گلہبش : اچھا تو پھر بول دی سہی۔ یہ لو دینار۔

حلاج : یہ خیال بھی تو کیسے ناکارڈ کی کے ساتھ دولت کتنی ہاتھ آئے گی۔

علاء الدین : شک ہے، البتہ کسی قدر سکون تو نصیب ہوا۔ تو اب میں کا کوئی نیا اور ننگہ نہ تافیر تلاش کر رہی۔ ابجد سے تافیر کی تلاش شروع کرنی چاہئے۔ سیس، آئیں۔ فرسودہ پامال تافیر ہے پائیں۔ رنگین، سسٹکین، شیریں، غلگین۔ رنگین اور غلگین

اچھے تافیر ہیں۔ پہلے تافیر مقرر کر لینا چاہئے۔ خیال خواہ پست ہو اس کی پروا نہیں۔ شاعری کی جان الفاظ کا تفرق

اور آہنگ ہے۔

گلہبش : (دور سے) اماں علاؤ الدین تم نے تو مفر چاٹ ڈالا۔ جہاں کوئی موزوں ترکیب سوچتی ہے تم اسے خنجر بوجھ کر دیکر دینے لگے۔

سلیمان : کہاں نہ کھاؤ گلہبش۔ میں اپنی رباوی دلی میں دہرا رہا ہوں۔

شہ کمال : اگر کجاہی ہے تو آپ حضرات کوئی اور ٹھکانہ ڈھونڈ لیں۔

علاء الدین : یہ مصرعہ کیسا رہے گا۔ ترانے ملیں گا ہی ہیں تیرے روئے رنگین کا۔

شہ کمال : سوچ گیا۔ بالکل سوچ گیا۔ ج۔ سنیں ہے علم بل کو ذرا افست کے آئیں کا

علاء الدین : (دھڑک کر) کہا تم نے؟ میں ہے علم بل کو؟ یہ ہرگز نہ ہونے پائے گا۔ بل کا خیال میرا ہے۔

گلہبش : اتنا نکلا تو ہو گیا۔ کہاں بل کاں نغہ۔

علاء الدین : تم سب کے سب چور ہو۔ یہ ساری بل چوروں کی ٹولی ہے۔

حلاج : ہائیں ہائیں کیا ہو انہیں۔ شاعر اور عاشق اس پر یہ کیفیت کمر خوں کی طرح لڑ رہے ہو۔ اس خشک اور سوختہ دنیا میں

شاعر تو بے رحمت کی طرح ہیں جو خدا کی دنیا کو سیراب و شاداب بناتے ہیں۔ پھر شاعروں کا لڑنا جھگڑنا کیا معنی؟

سلیمان : (دچاک، حلاج، گلہبش، شہ کمال، علاؤ الدین) میں نے رباوی کہہ لی۔

علاء الدین : میں نہیں پہلے اس فقید کا فیصلہ ہونا چاہئے۔

سلیمان : اماں چور ہو اس قصبے کو۔ حلاج تم میرے شعر قلم نہ کرو۔ دیر کی تو میں بھول جاؤں گا۔

کبیں خوشبو ہے بریاں کی کبیں ہے دھن نسریں کا

کبیں بل کے

علاء الدین : کیا کہا بل؟ یعنی تم نے بھی میری بل کا خیال چڑا لیا۔ چچا جان کی ریش دانا کی قسم یہ دنیا ٹھکوں سے بھری ہوئی ہے۔

سیلمان : کیوں بلبل کے شکیدار آپ کیسے بن بیٹھے ؟

علاؤ الدین : یہ لفظ پہلے مجھے سوچا تھا۔

شہ کمال : سنا آپ نے ؟ حالانکہ سوچا مجھے پہلے تھا۔

گلکش : کہتے ہو جی۔ یہ لفظ میرا ہے۔

حلالج : ہر کس کوک چھوٹے میں پڑ گئے وہ لوگ روقت ٹھوڑا رہ گیا ہے۔ یہ نہ بھولے کہ آسمان کی بلند یوں پر چاند اگرچہ ایک ہی نکلنا ہے لیکن اس کا پرستار ہر یارخ میں موجود ہوتا ہے جو راتوں کے سامنے ہیں اس کی تعریف کے گیت گاتا ہے۔

سیلمان : دائرہ کیا بات کہی ہے۔ آدمی عقلمند ہے۔ مجھ سے پوچھو تو مجھے سب بڑے شوق سے اس لفظ کا استعمال کریں۔ الفاظ پر کسی کے باب کا اجارہ ہے ؟

علاؤ الدین : لیکن مجھے اس سے انکار ہے میں یہ نہیں مان سکتا ہر ایک جانتا ہے کہ الفاظ کے دہرانے اور ان کی تکرار سے حق کلام کا خون پو جاتا ہے۔

سیلمان : حلاج ! اس معاملے تو ہمارا کوئی ذاتی تعلق نہیں اس لیے تم ثابت بن کر یہ جھگڑا چھوڑ دو۔

شہ کمال : میں اس کی تائید کرتا ہوں۔

گلکش : اور میں بھی۔

علاؤ الدین : اور میں بھی۔

حلالج : یہ تو بڑی سیدھی بات ہے۔ آپ کے اشعار خواہ دو پہر کی طرح روشن ہوں خواہ ختام کی تاریکی کی مانند سبک اور لطیف، یا تاروں بھری رات کی طرح پر شکون آپ کی مرضی پر موقوف ہے۔ لیکن ان میں فلسفہ ایسے الفاظ کا بازو دھ دیکھے جس میں سفل و ریحاں اور مشک وغیرہ کی تشبیہاں خواہ کا ذکر ہو اور کائنات گلدائے رنگارنگ سے تھمتھکاڑا نظر آئے۔ رنگس کی نگاہ ہلا بھی اور سوسن کی زباں دراز بی بھی۔ اس میں طبع پر خوش الحان کا نام بھی لائیے قمری، فاختہ، طوطی اور طاووس کا ذکر بھی کیجئے۔ لیکن بلبل ہزار داستان کا نام بھی نہ لیجئے۔

علاؤ الدین : میں کوئی بھی بلبل کا ذکر نہ کرے ؟ اس طرح تو میں خسارہ ہی میں رہا لیکن اچھا تم کہتے ہو تو یوں ہی سہی۔

سیلمان : تو پھر فیصلہ ہو گیا تاکہ بلبل کا نام اشعار میں نہ آئے گا۔ یوں ہی سہی۔

(پھر سب میچ کر شعر کنش شروع کر دیتے ہیں)

حلالج : (دینار گنتے ہوئے) : ایک، دو، تین، چار، پانچ ————— دنیا میں مجھ سا نہ تھمت بھی کوئی نہ ہو گا۔ تاجروں سے

سنا ہے کہ پانچ اور پانچ دس ہوتے ہیں۔ باقی رہے پانچ دینار۔ اب وہ کہہ کر حاصل کئے جاہل جس سامعین سے مخاطب

ہو کہ اسے سننے والو ! معلوم نہیں میری حکمت تم ہوتے تو کیا کہتے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کی تعریف میں مجھ سے اچھا

شعر کوئی نہیں کہہ سکتا۔ لیکن افلاس بہت بڑی لعنت ہے۔ اب اتنا وقت بھی تو نہیں رہا کہ روپیہ کہیں سے چٹا کر ہی

لے آؤں۔ اچھا اگر میں اسے اپنا نہیں بنا سکتا تو اس کی بھی کوئی پردہا نہیں۔ اگر وہ میرے ہاتھ نہ آئی تو جب بھی یہ آفتاب

کی روشنی، بادل اور یہ زمین جس پر ہم رہتے ہیں، پھول اور شجر تو کہیں نہیں گئے۔
سیلمان : (نہایت بلند آواز سے) ہو گئی۔ ہوئی رہی۔ حلاج جلدی کرو۔ نکالو تو غلہ اور کاغذ۔ اشعار سیلاب کی طرح جیسے چلے آ رہے ہیں
 اور میری روح کے نفوس کی تیلیاں تو دگر بھاگ جانا چاہتے ہیں۔ جلدی کرو ورنہ ان کے پاؤں میں حرور کی زنجیریں ڈال دو۔

حلاج : تیار ہوں۔ چلو!

سیلمان : سہ تعویذ میں ترستے دیکھا ہے میں نے محلِ پرویں کا
 نہ کچھ دل کو تسلی ہے نہ کچھ سامان ہے دین کا
 مجھے اس رنعت بے کیف ہے لذت سے کیا مطلب

شہ کمال : آہا بابا! کیا خوب رباہی ہے حلاج! لکھنا میرا شعر جلدی سے۔ کیا بھلا مصراع؟

سیلمان : مجھے اس رنعت بے کیف دے لذت سے کیا مطلب

حلاج : اسے بھائی شہرویں دونوں باغروں سے نہیں لکھ سکتا۔

گلپیش : اے سبحان اللہ! تراجم اک مرکب سنبل و ریحان و نسریں کا

علاؤ الدین : اماں! پٹاؤ ان چوروں کو ان کی نہ سنو میرے شعر لکھو۔

سیلمان : میں نے کیا تھا؟ مجھے اس رنعت بے کیف دے لذت سے کیا مطلب

علاؤ الدین : تو ابیکر سہارا ہے مرے احساسِ غلیں کا

گلپیش : تراجم اک مرکب سنبل و ریحان و نسریں کا

شہ کمال : جہاں عشق وستی میں گور کیا غن و تمہیں کا

سیلمان : مری آنکھوں پر منڈلاتا ہے پرتو ماہِ سیمیں کا

حلاج : یارو ماہی کو کھڑے ہو۔ مجھے تو پسینہ آنے لگا۔ افواہ کتنی گرمی ہے سینوں میں شاعری کی آگ بھوک رہی ہے۔ ایک ایک
 کوڑے کہو۔ سیلمان پہلے تم اپنی رباہی لکھو اور۔

سیلمان : سہ تعویذ میں ترستے دیکھا ہے میں نے محلِ پرویں کا

نہ کچھ دل کو تسلی ہے نہ کچھ سامان ہے دین کا

مجھے اس رنعت بے کیف ہے لذت سے کیا مطلب

مری آنکھوں پر منڈلاتا ہے پرتو ماہِ سیمیں کا

حلاج : واہ واہ سبحان اللہ! کیا دلکش اشعار ہیں۔ اسے کاش یہ اشعار میرے ہوتے۔

علاؤ الدین : اماں! دیکھو وہ دہشت انگشت کتے ہر خدا کی پناہ میں تو بھگتا ہوں نہایت پیچھے شعر ہیں۔

سیلمان : کہوں جیسے پیچھے ہیں ہمارے اشعار؟

علاؤ الدین : ارے مجھو میرا کان۔

حلاج : شہ کمال اب تمام اپنی شاعری کے تنور کا ڈھکا اٹھاؤ۔ دیکھیں الفاظ کے کچے تیار کرنے میں تمہیں کتنی جھارت ہے۔
شہ کمال : عرض کرتا ہوں ہے

نعمتیں سے مرے کیا واسطہ شبہا زوشاہی کا جہانی عشق و مستی میں گزر کیا غلطی و تمہیں کا
 اسی دنیا زندگی کو زندگی کہہ کر بیکاروں کا مرے ہاتھوں میں ہو گا ہاتھ جس دن ماہوس ہیں کا

حلاج : کیا کہنے ہیں۔ واہ، واہ، واہ !
علاؤ الدین : شہ کمال ایک بات میری سن لو۔ اگر ماہوس ہیں کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو چوتھا مصرعہ بدل ڈالو۔
حلاج : گلش ! آگے آؤ۔ اب تمہاری باری ہے۔

گلش : کتنا چوں کر ہے
 تراجم اک مرکب منیل دریچان و فسر میں کا بیاں میں کیا کروں تیرے جمال لذت آگئیں کا
 میں کچھ کتنا ہوں پائی کی طرح سوتا رہا دوں گا بس اک پل کے لیے جلد وہ دکھا دو ماہوس ہیں کا

علاؤ الدین : ان اشعار میں دولت کا تذکرہ ضرورت سے زیادہ ہے۔
حلاج : اماں تو کسی کو بھی داؤ نہ دو گے۔ اچھا اپنے اشعار سنناؤ۔
علاؤ الدین : تمہارا اصرار ہے تو اسکا رکھیے کہ سکتا ہیں۔ لیکن داؤ مخ رہے کہ جو کچھ کہنا ہے دوادری میں کہا ہے اور اس زمانہ کے قسم
 بلند پایہ شاعر ایک ایک مصرعہ پر پورا پورا مہارت کر دیتے ہیں۔ تو عرض کیا ہے کہ ہے
 تو ایک سہارا ہے مرے احساس غلشیں کا ترانا خدا ستارہ ہے ہر شہنائے مشکبیں کا
 جسے لوگوں نے کوشش کی ایک کہہ کر بیکار تھا ہوا میں اڑ رہا تھا بال میرے ماہوس ہیں کا

شہ کمال : چوبیس کا محتفل ہے۔
سلیمان : اسلئے استریجیسا با ایک خیال۔
گلش : اماں تمہیں کیا چڑی ہے کہ نہ کہ جینی کر کر کے دوسروں کے اشعار درست کر رہے ہو۔ رہنے دو بوی ہی وقت غور ڈالو ہے مجھے اب
 دس دینار لانے کے لیے جانا چاہیے۔

سلیمان : میں بھی جاتا ہوں۔ چلو سب اپنے اپنے گھر چلیں۔
شہ کمال : خدا حافظ حلاج۔ ہم ابھی آئے ہیں۔

(سب جاتے ہیں)

حلاج : اب شعبیں روشن کر دوں، نہیں جب دن بھر کی گرمی کے بعد رات اپنے نازک پردہ دنیا پر پھیلا دیتی ہے تو اماں میرے
 دل کی حرکت دگر پر ہمتی ہے اور غم بھی شیریں معلوم ہوتا ہے۔ شعبیں خاموشی ہی رہنے دوں۔ لیکن حلاج اب ان خیالات
 کو چھوڑ۔ ہاتھ پاؤں ہلا اور اپنے حقیر چھوٹے کو اپنی محبوب کی آمد کے لیے آرام کر۔ الٹی فردوس اور جہنم میں کتنا
 کم حاصل ہے۔ سچا ہر سونا ہے جو جنت کی دیکھنیوں اور دوزخ کی اذیتوں کو حد اگر تار ہے۔

شہر کمال : دور سے آہستہ سے علاج !

حلاج : کون، آپ؟ دوسری بار کہئے تشریف لائے؟

شہر کمال : ذہن آہستہ ہو لو۔ میں نے کہا کرے میں تمہارے سوا کوئی دوسرا تو نہیں؟

حلاج : نہیں۔ یقینی نہ آئے تو شمع روشن کئے دیتا ہوں۔

شہر کمال : نہیں۔ مجھے جو کچھ کہنا ہے فوراً کہے دیتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ میں ماہر ہیں کو حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن سچ یہ ہے کہ

اب میں محسوس کرنے لگا ہوں کہ میرے اشعار علائقا لہریں کے اشعار کے سامنے نیکل کے اعتبار سے بہت ہیں۔ وہ

تو بڑا مشاعرہ مٹھانا، اور بھی شعر کہنا کون سا شیر مال تیار کرنا ہے لیکن اگر تم چاہو تو مجھے کچھ امید ہو سکتی ہے تمہارے قلم

کی تینیش اس کے اشعار کو کچھ کچھ بنا سکتی ہے۔

حلاج : ذرا دیکھیں تو اس کی رہائی، یہ رہی۔ ایک دینار دو تو ہو سکتا ہے۔

شہر کمال : بس تو میدان مار لیا میں نے، یہ تو ایک دینار علاوہ ازیں شادی کے بعد ضیافت بھی دی جائے گی۔

(جاتا ہے)

حلاج : صرت ایک دینار..... اس سے کیا بن جائے گا؟

سیلیمان : (آہستہ سے) علاج !

حلاج : کون ہے، سیلیمان؟

سیلیمان : ہاں میں ہوں۔ اے بھیا! مجھے تو اپنی ناکامی کا پورا یقین ہو گیا۔ لیکن اگر اس آڑے وقت میں تم کام آؤ تو.....

حلاج : کوئی فکر نہیں۔ میں سمجھ گیا تھا نا مشنار۔

سیلیمان : میں تمہیں بتا دوں کہ ابی جیم کو فن شعر سے کچھ واسطہ نہیں۔ وہ تو صرف روپے کا بھوکا ہے، چنانچہ مجھے اندیشہ ہے کہ گلش

کے اشعار اسے بہت پسند آجائیں گے۔ اب تم مہربانی کر کے یہ ایک دینار لو اور مجھے اس پریشانی سے نجات دے دو۔ میں نے

جو اشعار لکھے ہیں انہیں اسی طرح رہنے دو، اور.....

حلاج : میں سمجھ گیا۔

سیلیمان : گلش کے اشعار کو مسج کر دو۔

حلاج : ہو جائے گا بے فکر رہو۔

سیلیمان : تو میں چل دیا۔ (جانے کے بعد)

حلاج : ایک دینار اور ہاتھ آیا۔ اگر اسی طرح آج.....

علاء الدین : علاج !

گلش : علاج !

علاء الدین : کون ہے؟

گلکیش : استقام کہاں سے آئی چٹکے میں تو ایک نہایت ضروری کام کے لیے آیا ہوں۔
علاؤ الدین : خوب! لیکن جانبگیر کیوں سمجھ لیا کہ مجھے ضروری کام نہیں ہے۔ جناب ہی کیوں نہیں ذرا سی دیر کے لیے سرک جاتے؟
گلکیش : مشکل ہے۔

علاؤ الدین : تو جناب میرے لیے آسان نہیں۔

حلاج : اسے رٹنے کیوں مارتے ہو۔ دھر آؤ اور میری ایک بات سنو مجھے ایک عجیب دل لگی سوچی ہے۔ یقیناً تم دونوں اس معرکے میں کامیاب ہونا چاہتے ہو لیکن ایک آدمی تین کا مقابلہ نہیں کر سکتا اگر تم دونوں ایک ایک دینار صرف کرو تو کوئی بڑی بات نہیں۔ اتنا معاوضہ لے کر میں تمہارے حریفوں کے اشتہار تو ٹوٹ کر رہے بعد مضحکہ خیز بنادوں گا۔ میں یا سانی یہ کر سکتا ہوں۔ ایک خط یا حوت یا لفظ سے معنی کچھ کے کچھ ہو جائیں گے۔ زیادہ معاوضہ تو نہیں ایک ایک دینار میں ایسی پری جمال دو شیزہ ہاتھ آتی ہے۔

علاؤ الدین : مجھے اپنے انہی علم کی ڈاڑھی کی قسم، تم میرے اندازہ سے زیادہ عقلمند ہو۔ مجھے منظور ہے، یہ تو ایک دینار۔

گلکیش : زعمیوم میرے سر پر کیا حماقت سوار ہے کہ اتنا کچھ خرچ کرنے پر تیار ہو رہا ہوں۔ بہر حال یہ رہا دینار۔

علاؤ الدین : اب میں جب شرکال کی سموت دیکھوں گا تو مارے ہنسی کے میرے پیٹ میں بل پرٹ جائیں گے۔ میں چل دیا۔

(جاتا ہے)

گلکیش : (جاتے ہوئے) اب خواہ کامیاب ہوں یا ناکام، سلیمان کی مال تو لٹنے نہیں پاتی۔

حلاج : (مجدد جلد) ایک، دو تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ، نو۔ بس ایک دینار کی کسر ہے، میری سوٹی ہوئی تقدیر اس وقت آکھیں کھول دے۔

(مجلدی سے دروازے کی طرف جاتے ہوئے)

اماں گلکیش بیٹ آؤ۔ بات تو سنو۔ کچھ کہتا ہوں کہ تم نے آج صبح اس سے زیادہ ہنگامہ نہ کیا ہو گا۔

گلکیش : خود ہی تو میرا روپہ بھٹالیا اور بعد معاش خود ہی کہتا ہے کہ میں نے اتنا ہنگامہ سو دا کھی نہ کیا ہو گا۔

حلاج : میں کہتا ہوں جس شخص کو طعناں آتی ہے۔ وہ بہ آسانی شعر بھی تصنیف کر سکتا ہے۔ یاد رکھو علاؤ الدین شاعر ہے اور تمہارے

اشعار کا تیر نشانہ پر نہیں بیٹھا۔

گلکیش : تو اگلے دن میرا سانسے کا سارا روپیہ۔

حلاج : تم بھی کسی قدر احمق ہو۔ اے سنا نہیں کہ دوڑ میں جو گھر بڑا سب پیچھے ہو آخر میں وہی جیت جایا کرتا ہے چنانچہ اگر میدان مارنا

چاہتے ہو تو ایک چہرہ شاہی اور دلواد۔

گلکیش : تم کھاکے کتے ہو کہ جس طرح دو سروں کے اشعار سن گئے ہیں اسی طرح علاؤ الدین کے اشعار بھی مسخ کر دو گے؟

حلاج : قسم ہے تمہاری ڈاڑھی کی۔ بلکہ یہ تو میں نے اشعار میں رد و بدل کر بھی دیا۔

گلکیش : بس صرف ایک لفظ کی تبدیلی؟

حلاج : میرا کرب و غم کیا ہے، ہفت آگہی اس وقت تمہیں میرے الفاظ کی صداقت معلوم ہو سکے گی۔

گلکش : مگر ایک دنیا کی رقم بڑی بھاری ہے۔

حلاج : تمہاری مرضی میں جانتا ہوں دوسرے کے معاملے میں تم بٹسے سانسے ہو پرتنا خیال نہیں کرتے کہ دامن کے ساتھ دولت کتنی ہفتہ آئے گی۔ اسے تم تو تذبذب میں پڑ گئے۔ پھر انکار ہے کیا، یوں ہی ہمسایہ میں تمہاری قسمت ہی میں نہیں۔

گلکش : (آہ بھر کر) اچھا مجھے ملے۔

حلاج : دس پورے ہو گئے، آخر دس پورے ہو گئے۔

گلکش : کیا مطلب؟

حلاج : آپ کے دست کرم پر دس برکتوں کا نزول ہو غم کی تیرگی دور ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چاند نکل آیا اگر انسانوں کی دنیا کو حقیقت اس سے کچھ بھی نہیں اور دلفریب بھی ہوتی جیسی آج نظر آ رہی ہے اور شباب اور محبت کا نور جہاسے سینوں کو یوں ہی جگمگاتا رہتا تو زندگی ایک ایسی لطیف و پاکیزہ نظر ہوتی کہ شائع و قلم ہفتہ سے رکھ دیتے۔

گلکش : تم تو اس طرح باتیں کر رہے ہو گویا ماہر مسیحین کو مائل کرنے کا خواب تم بھی دیکھ رہے ہو۔

حلاج : ہاں مجھے حقارت ہے کہ میں نہیں پرست ہوں لیکن حقیقت ہے کہ ہم اپنی زندگی کی تعمیر خود کرتے ہیں اور جب ہم شباب کو بھول جاتے ہیں تو زندگی ایک بگڑا پیڑہ جاتی ہے لیکن سنو آٹھ سن رہے ہو۔ اس کی پاکلی کی گھنٹیوں کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ وہ اس چھوٹے سے کوپے سے گزر کر ہماری جانب آ رہے ہیں۔

(ماہر مسیحین کے عاشق داخل ہوتے ہیں)

اس کے عاشق شاعر آ رہے ہیں۔ خوش آمدید۔

شہ کمال : حلاج ہم نے اسے مسجد کے قریب گزرتے دیکھا ہے۔

سیلیمان : وہ حسین ہے، بادام کے پرے پرے درخت سے زیادہ حسین۔

علماؤ الدین : حلاج تمہارے ہاں آئینہ بھی نہیں؟

حلاج : نہیں زندہ پرور اب ذرا سرگ جلتے۔ اس کے لیے جگر چھوڑ دیئے۔ (ماہر مسیحین کی سواری آتی ہے۔ ساتھ اس کا مہاب بھی جڑے ہوئے۔)

ابن حسیم : اسے پہلے لکھنؤ والے شہر افغان کے باشندے ہیں تہذیب زیادہ دینیک یہاں گھرنے کی تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ میں جو کچھ

کہہ چکا ہوں تم سب نے سنا لیا ہے میں اب ایک ضعیف العمر اور سفید پیش انسان ہوں مجھے ملے دے کے اب بھی ایک کھاشاش

ہے کہ میرے جیسے جییری کی شوادی ہو جائے۔ تم پوچھو گے کہ میں اپنی لڑکی کو شعر کے عوض کیوں دے دینا چاہتا ہوں

میرے تمہارے امتحان کے لیے سپاہ گری کا کوئی کرب کیوں تجویز نہیں کیا میرا حجاب مختصر ہے جو شخص شاعری سے راجو

در حقیقت زندگی کی ساری لطافت کا مجموعہ ہے محبت نہیں کرتا میں اسے فطرت کا باغی اور وحشی سمجھتا ہوں۔ وہ در حقیقت

صرف نام کا انسان ہے اسی طرح جس شخص کے دل نے شخص کے آگے سر ہٹا دیا ہے اس نے خواہ کتنی ہی غلطیاں کیوں نہ

کی ہوں وہ عام لوگوں کی نسبت بہت زیادہ شفیق ہو گا۔ اس لیے حضرات اب آپ میں سے ہر شخص باری باری آگے

بڑھکر شاعری کے جوہر دکھائے۔ دیکھنا یہ ہے کہ آپ میں سے کون شاعری کے میدان میں کون سے سعادت کے عالم ہے اس معرکہ میں جو کامیاب ہوگا اسے شہن اور دولت کا انعام دیا جائے گا۔

حلاج : اے ماہِ سیمیں ! اے ہمارے چاند ! اگرچہ ان اشعار کو ایک بے ہنر کے نظم نے لکھا ہے لیکن کیا آپ ان پر نظر ڈالنا گوارا فرمائیں گی؟

ماہِ سیمیں : تم حلاج ہو۔ اہلِ قلم کے بادشاہ حلاج!

حلاج : بادشاہِ جب، اگر میری خوشنویسی آپ کو پسند آجائے۔

ماہِ سیمیں : اس کاغذ کے نیچے شہِ کمال کا نام لکھا ہے۔

شہِ کمال : میں ہوں شہِ کمال۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ اشعارِ نیکل کے اعتبار سے کسی حدِ رسیت ہیں لیکن آپ جانتی ہیں کہ تمام طنز یا ہر شاعر...
ابنِ حسیم : خاموش رہو! اشعار سننے کے لیے ہر تن گوش ہیں۔

نہ جانے ان دنوں کیوں دلوں کو لٹھکتائیں دیں گا

تمہی دیکھا ہے میں نے پیٹ اس دہی میں مسکین کا

چٹانوں سے بھی موٹی روٹیاں ان کو کھلاؤں گا

اگر مجھ کو میسر ہو خندانہ ماہِ سیمیں کا

اباجان ! ظاہر ہے کہ شہِ کمال خواہ کیسا ہی ہنرمند نہ لائی مانا جائے پر شاعری سے اسے دور کا بھی تعلق نہیں۔

شہِ کمال : لیکن۔ لیکن میں قسم کھاتا ہوں کہ ان اشعار کا ایک لفظ میرا نہیں ہے۔ حلاج تم بڑے بد معاش ہو۔ خدا نہ کرے کہ میں ایسے اشعار لکھوں۔

علاؤ الدین اور گلکش : مگر یہ شعر تمہی نے تو لکھے ہیں۔

شہِ کمال : (آتا ہے) میں کتنا ہوں بس دل لگی کی حد ہو چکی۔ یہ اشعار ہر گز میرے نہیں۔

علاؤ الدین : ہم کہتے ہیں یہ تمہارے ہیں تمہارے۔

شہِ کمال : مجھ پر کسی نے جادو تو نہیں کر دیا۔ کچھ مجھ میں نہیں آتا حضرات! بخدا مجھے یقین ہے کہ یہ اشعار میں نے نہیں لکھے۔

ابنِ حسیم : اچھا اب دوسرے شاعر کی باری ہے۔

ماہِ سیمیں : اس کاغذ پر سلیمان کا نام لکھا ہے سلیمان کون ہیں۔

سلیمان : میں ہوں بندہ ناچیز سلیمان۔

ماہِ سیمیں : مری تمخیل نے موندنا.....

سلیمان : نہیں۔ نہیں۔ تصویر میں ترے دیکھا.....

ابنِ حسیم : بکومت۔ ہاں مٹی پڑھ کیا لکھا ہے۔

ماہ سیمیں : ہ

مری غنیل لے منڈا ہے سر شہباز دشاہیں کا
فرشتے گیت گاتے ہیں مری معراض زگیں کا
مرے دل میں ہزاروں اترے اب تک پرفاں ہیں
کہ دکھا ہے تصویر میں ہیرو لیا ماہ سیمیں کا

سلیمان : جی ایسے اشعار کہنے کی مزا میں ہم نے علاج کا گانا کاٹ ڈالا تو دیکھنا، بیٹا کس بھولی میں ہو جو صابن کے جھاگ ہیں غوطہ
زدیا تو میرا نام سلیمان نہیں۔

ابن حسیم : ظاہر ہے کہ ایسے بیودہ گو، شاعری کے اس مصرعے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ دوسرے شاعروں کا کلام پڑھو۔
ماہ سیمیں : علاؤ الدین۔

علاؤ الدین : میں اتنا سخن کر دوں کہ میرے ٹوٹے بیوٹے اشعار کو پورے نور سے پردے لگا۔

ماہ سیمیں : بسا ہے میری نس نس میں معطر زلف مشکیں کا
علاؤ الدین : نہیں نہیں یہ نہیں نہیں یہ کہاں، تیرا پیکر سہارا مجھ سے
ابن حسیم : کوئی اسے چپ کر لے گاں بی بی پڑھو۔

ماہ سیمیں : ہ

بسا ہے میری نس نس میں معطر زلف مشکیں کا
زدھوکا کھائے فیروں کے اسامات نگیں کا
میں بدھوت سہی، بھونڈا سہی، بسند رسی لوگو

مگر خوشبو سے جی بھلا ہی لوں گا ماہ سیمیں کا

علاؤ الدین : ہائیں۔

ماہ سیمیں : ابا جان! کہیں اس خوشبو دار بندر سے میری شادی نہ کر دیجئے گا بس اب ایک کاغذا در رہ گیا ہے گلہش۔

ابن حسیم : گلہش صاحب معلوم ہوتا ہے کہ شاعری کا انعام آپ کے حصے میں آئے گا۔ یہ تو ممکن نہیں کہ آپ کے اشعار ان لوگوں سے بھی
برے ہوں۔ اس لیے انہیں پڑھنے کی زحمت کیوں اٹھائی جائے۔ میں لڑکی آپ کے حوالے کئے دیتا ہوں۔

ماہ سیمیں : لیکن ابا جان! یہ بھی دیکھیے کہ یہ شخص بھلا ہے۔

گلہش : میری اتھا ہے کہ آپ میری گھنڈہ بھر کی محنت کو یوں ضائع نہ کر دیں۔

ماہ سیمیں : میں شعر پڑھتی ہوں ہ

زمانہ میں بس اک پرستم ہی ہے سلمان تسکین کا

نہ مجھ کو جس خوشبو کی نہ لالچ عام شیریں کا

اگر سچے ہی میرے ہاتھ تو کیا آپ یوں کیجے

مری ڈاڑھی سے دامن باندھ دیجیے ماہ سیمیں کا

گلینش : حلاج! رکھ دے میرے تین دینار یہاں کسی وقت۔
سلیمان : اہا! تین دیناروں کے پیچھے سے کیوں جاتے ہو۔ دیکھئے تو یہ شادی کا معاملہ آخر طے کیا ہو کر رہتا ہے۔

حلاج : آہ ماہِ سیمیں کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔

ماہِ سیمیں : ان سب نے میری ہنسی اڑا لی ہے۔

حلاج : نہیں ان بچاڑوں کا کوئی تصور نہیں یہ سب کیا دھڑا میرا ہے۔

ابنِ جسیم : تمہارا؟ صاف صاف کہو کیا بات ہے ورنہ آخر خیر نہیں تمہاری۔

حلاج : لیجئے ایک اور رہا بھی جو ابھی پڑھی نہیں گئی۔

ابنِ جسیم : یہ کس نے کہی ہے؟

حلاج : میں نے!

ابنِ جسیم : مجھے بتایا گیا ہے کہ تم نے جو مجلس ہو کر کیا دس دینار تمہارے پاس ہیں؟

حلاج : یقیناً! یہ بھی مجھے اور جو کچھ میرے پاس سے لے لیجئے میری طاقت میری جوانی، میرا فتنہ، میری طبیعت کی جودت اور حق کی پرسش کا شاعرانہ جذبہ غرض جو کچھ آپ چاہتے ہو میں پیش کر سکتا ہوں مجھ سے لے لیجئے۔

ابنِ جسیم : پڑھو۔

ماہِ سیمیں : میں اس وقت تک اس کی نظم سنوں گی بھی نہیں جب تک کہ.....

سلیمان : جب تک کہ حلاج خود اسے نہ پڑھے گا۔

ماہِ سیمیں : اُں!

حلاج : کیوں صاحب! شاعر اپنا کلام خود بھی پڑھ کر سنا سکتا ہے۔

ابنِ جسیم : تمہیں اجازت ہے۔

حلاج : ہ

رُخ پُر نور کہ ہے نری چشمِ جہاں میں کا

فلک میں ایک سیارہ ہے جسے گیسوئے مشکین کا

اسے چھوڑوں مگر یا غنوں کو کوثر میں جھگو لاؤں

کہ تاروں سے بھی پاکیزہ ہے دامنِ ماہِ سیمیں کا

ماہِ سیمیں : کس قدر دلکش اشعار ہیں۔

سلیمان : نہایت دلغزب اسے حدِ لطیف ہیں ناغلاؤ الدین؟

علاؤ الدین : داتھی پاکیزہ اشعار ہیں۔

ابنِ جسیم : شکر ہے الٰہی کہ میری امیدیں برآئیں اور میں جو کچھ چاہتا تھا ویسا ہی ہوا اب حلاج میرے بیٹے! یہ تمہارے قلم نے اپنی دانائی

اور شاعری سے حاصل کیا ہے تمہارے سوائے ہے خدا کو کسے کفر نہ دوؤں، حلاج اور ماہِ سیمیں، شاعر اور اس کی بیوی ابھی

محبت میں منسلک رہو کہ جب ہماری حیات مستعار ماضی کی بھولی بھری بات ہی جیسے تو لوگ یاد رکھیں کہ روپیہ پیسہ بے اصل چیز ہے۔ میں نے دس دینار اس لیے طلب نہ کئے تھے کہ روپیہ انسان کی ہنرمندی اور قابلیت کا معیار ہے۔ میں ان چاندی کے سکوں کو سونے کے سکوں میں تبدیل کر کے اپنے الفاظ کی صداقت کا ثبوت دے سکتا ہوں۔ یہ کوسلے کی تھیلی۔

حکاج : ایک بات مجھے بھی کر لینے دیجئے میرے دوستو مجھے معاون کر دو۔ میں نے آپ سب کو دھوکا دیا، میں ابھی اس کی تلافی کئے دیتا ہوں۔ گھمبش! یہ سونے سے بھری ہوئی پوری تھیلی تم لے لو، تمہیں اپنی رباہی کا معاوضہ مل گیا۔ علماؤ الدین! تمہیں ساٹن کا ایسا چنہ دیا جائے گا جو اصنافِ بھر میں بے نظیر ہوگا۔ شرکال! تمہیں شادی کے روز رخصت دی جائے گی۔ باقی رہا سلیمان، سلیمان کے لیے بھی کوئی اعلیٰ انجیر چیز ہونی چاہئے۔

سلیمان : مجھے اپنی محبت بخشنے۔

حکاج : بخشنے۔

ماہ سیہمیں : اور میں نے بھی۔

(ماخوذ)

ہیسلو

جاوید اقبال

رہنمائی محال اگر اس کہیں کے کرواؤ یعنی نہ ہوں تو۔۔۔

منظر

ایک کوٹھی کا مالی کمرہ جس کا سامنے کا دروازہ اور کھڑکیاں باہر ڈیڑھ میٹر کی جانب کھلتی ہیں دایاں دروازہ کھانے کے کمرے کی طرف کھلتا ہے اور اس میں چڑی ہوئی کھانے کی بڑی میز پر بوٹوں کے چند چوڑے نظر آ رہے ہیں۔ بائیں دروازہ بند ہے جو اس کمرے کو کسی دوسرے کمرے سے ملاتا ہے۔

فرش پر گرد و غبار سے اُٹا ہوا غالیں بچھا ہے۔ قالین کے ارد گرد ٹوٹے پھوٹے سے صوفے رکھے ہیں۔ دیواروں پر چند بزرگوں کی سببت ناک قسم کی تصویریں لگی ہیں۔ چھت کا بنگھا بوڑھی تیزی سے چل رہا ہے۔ جو اذ قالین پر کھیرے ہوئے دو تین میلے سے نگہیوں میں سے ایک پر سر رکھے، بنیادیں پختہ تھما ہوا ہاتھ اور منہ سوراہا ہے۔ چند سالے بھی فرش پر منتشر پڑے ہیں۔

جب پردہ اٹھتا ہے تو چند غلوں کے لئے چراگ کے خراٹوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ باہر تپتی ہوئی دوپہر میں لوگ جھکڑ چل رہے ہیں۔ وصول آؤ آؤ کر کھڑکیوں کے دستانے کے دستانے میں داخل ہو رہی ہے۔ سامنے کا دروازہ کھلتا ہے۔ دو کی اور شیمیں داخل ہوتے ہیں۔ دونوں بھائی ہیں دونوں نے ایک جیسی سفید چکنیں پہن رکھی ہیں۔ دونوں شریفیوں کی ادلاؤ معلوم ہوتے ہیں۔ دو کی دہلاؤ دروازہ پر ہے۔ شیم قہقہے بھرے جسم کا گرہ لپکتا ہے۔ دو کی میں نسوانیت سی ہے مگر شیم نے چھین پال رکھی ہیں۔ دو کی کے جسم میں عورتوں جیسی لچک ہے لیکن شیم چٹان کی طرح سخت ہے۔ دو کی شہید قسم کا جذباتی فوجوان ہے اس لئے اس کی کراخت جہانی حرکات اس کے جذبات کے متوازی نہ ہوں

ہوتی ہیں۔ شہزبہ تاں کم گو اور دینی طبیعت کا ہے۔

ذکی :- (جواو کو بھینٹ دیتے ہوئے) ارے ————— ابھی تک یونہی پڑے ہو ؟ !

جواو :- (دھماکے کر کر ٹپکتے ہوئے) ہیں ! ————— ہاں یارہ آؤ !! (پھر سوجاتا ہے)

شہیم :- (عجیب انداز میں) جناب کو علم بھی ہے اس وقت کیا بجا ہے ؟ !

ذکی :- (جواو کو پھر سے بھینٹ دیتے ہوئے) بندہ خدا پاؤں پر چلے گا —————

جواو :- (بغیر تکیوں کے کھلے) ذکی کو کسی دو پہر ڈھل گئی ہے۔

ذکی :- (دنگ اکر) خیر سے آپ کے لئے ابھی دو پہر ہی نہیں ڈھلی ؟ !

شہیم :- (ذکی سے) تصور ان کا نہیں ہے بھائی۔ اس گھر کی فضا ہی کچھ ایسی ہے کجبت۔

جواو :- (اسی انداز میں) میان بڑھ جاؤ، مجھے کھڑے لوگوں سے بڑی جھٹ ہوتی ہے۔

شہیم :- (راؤ پر دیکھ کر) ذرا نیچے کی ہوا تو کھا لیں۔

ذکی :- (بے قابو ہو کر) تو یہ کس شرت کی گرمی ہے۔

جواو :- (دبیزاری سے) یہاں تک دیکھنا تو دوں کی نیکیں ساتھ کے کمرے میں پڑی ہیں، مہن کر بیٹ رہو۔

شہیم :- (بے پروائی سے) پہلے بھائی سے ایک نازہ قصہ تو سنو۔

جواو :- (گھبرا کر) کیوں ذکی، خیر تو ہے ؟ !

ذکی :- (بے پروائی سے) ارے بھئی وہی کجبت —————

جواو :- (کبدم اٹھ کر بیٹھے ہوئے) کیا پھر کوئی شلیغون آیا ؟ !

ذکی :- (دنگ اکر) کیا تاؤں یار، عجیب مصیبت میں جاں ہے ————— (اُدھر کھڑے ہوئے) عالم نہ تو بہ بنانی

میں نہ شلیغون کا فہر ————— بہنیز اس پر ہلکا گریب برکار۔ دن میں چار چار مرتبہ فون آتے ہیں۔ ابند میں تو کسی کو

خیر تک نہ ملتی لیکن اب تو اچھا خاصا انسان بن گیلے گھر بھر کا۔

جواو :- (عجب سے) وہ کیسے ؟ !

ذکی :- (انسردگی سے) میں سمجھ لوں۔ کل میں اتفاق سے آپ کے پاس میٹھا باتیں کر رہا تھا کہ شلیغون کی گھٹی بھی نہ شامت

اعمال سے جڑو میان قریب تھے۔ فون سننے ہی دوڑے دوڑے میرے پاس آئے اور کہنے لگے ”بھائی“ میں نے

پوچھا ”کو کیا بات ہے ؟“ ارے ”بھائی ————— خفی خفی“ میں نے کہا ”میاں کو کوئی بات بھی تو بہ پھر

دی جی خفی خفی ————— خیر میں سمجھ گیا تھا۔ آٹھا اور ٹیلی فون کے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں سے جواو اس آواز میں تو

قبل از سرکٹے بڑے غصے میں بیٹھے ہیں۔ پوچھنے لگے ”کس کا ٹیلی فون تھا ؟“ میں نے تمہارا نام لیا تو بولے ”کچھ

بھی ہو، میں چوٹے پھون کے ساتھ آپ کی اس قسم کی بے تعلقی کو تحسین کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ حفظ مراتب بھی

کوئی چیز ہے یا نہیں ؟“ اب میری شکل دیکھ کر وضاحت بھی نہیں کر سکتا۔

ذکی :- (نہیدگی سے) ایمان سے —————! چند روز ہوئے شمیم نے مونچھیں مونڈی تھیں نا؟

جواد :- (توجہ سے) ہاں تو۔۔۔۔۔

ذکی :- (اسی انداز میں) کہنے لگیں یہ آپ نے مونچھیں کیوں صاف کرا دیں۔ اب آپ کے نتھنے اور بھی کھلے معلوم ہونے لگیں۔

جواد :- (شہم سے) اچھا تو، تو جیسی آپ نے مونچھیں بڑھا دی ہیں؟!

شمیم :- (سجیدگی سے) نہیں واللہ، یہ بات نہیں ہے۔ مجھ سے تو بھائی نے کہا تھا۔

ذکی :- (مجھی مسکراہٹ کے ساتھ) ایک دن تمھارے متعلق بھی پوچھ رہی تھیں۔

جواد :- (بے قابو ہو کر) کیا کیا! —————؟!

ذکی :- (بے پرواہی سے) ابھی کہ آپ کے دوست کوئی جواد صاحب بھی ہیں؟!

جواد :- (اسی انداز میں) ہوں، ہوں۔۔۔۔۔

ذکی :- (سنبہ پروائی سے) ان کے اگلے دونوں دانت باہر کیسے نکلے ہوئے ہیں؟!

جواد :- (انسردگی سے) اس پر غم نہ کیا جواب دیا؟!

ذکی :- (ہنستے ہوئے) میں نے کہا ”پٹھیں ہیں ان کی گود سے گر پڑے تھے“۔

جواد :- (نخستے سے) کیبلے ہو گئے۔۔۔۔۔!

شمیم :- (بے پرواہی سے) بھائی سے کہہ رہی تھیں۔ سنا ہے آپ کو اپنی آنکھوں پر بڑا ناز ہے، ہمیشہ نیم دار کھتے ہیں۔

جواد :- (ذکی سے) تو تم نے کیا کیا؟!

شمیم :- (اسی انداز میں) بھلا یہ بتلی پر پھولے والا راز کیوں ماش کرتے۔ گول کر گئے۔۔۔۔۔

جواد :- (تنگ آکر) آخر یہ بدعت کیا ہے؟!

ذکی :- (زنگ آکر) بھئی میں تو تنگ آ گیا ہوں۔ صحن میں نکلنا ہوں تو چہرہ تو سب مجھ دیکھتے ہی دانت نکوسے لگتے ہیں۔

ادھر جو کسیدار صاحب کی زیر پرکھ ”مسکراہٹ“ دیکھ کر خون میلہ کھل اُٹھتا ہے۔ جھاڑوں تو بڑے آبا کی

خفگی کا حال ————— غرض عجب کو بنا ہوا ہوں۔

جواد :- (حافظ پر زور سے کر) یہ نتھنے، باہر نکلے ہوئے دانت اور۔۔۔۔۔ اور میرا ————— میرا تو خیال ہے ہمارا کوئی نہنا۔

ہی قریبی دوست ان لوکیوں کو جانتا ہے۔۔۔۔۔

شمیم :- (بے پرواہی سے ہنستے ہوئے) ہمارا کوئی دوست، لوکیوں کا شناسا اور ہمیں خبر تک نہیں۔ بھلا یہاں کسی کے پیٹ

میں آج تک کوئی بات بھی بچی ہے؟!

جواد :- (اسی انداز میں) ممکن ہے ریاض ہو، کہتے ہیں اس کی بہت سی لوکیوں سے شناسائی ہے۔

شمیم :- (حقارت سے) جھک مارتے ہیں جو بکتے ہیں، اُس جو کو کون جانتا ہوگا۔

ذکی :- (جواد سے) اور ہاں، ایک دوپہر اسی قسم کا ٹیلیفون بھائی مختار کو بھی آیا۔ بچارے اپنے دفتر میں بیٹھے کام کر رہے

تھے۔ ان کی جلد بازی سے کون واقف نہیں چھوٹے ہی کھٹے گئے۔ ”زیر طافات کا کوئی وقت؟“

جواو :- ”تعب سے“ تو کیا طافات ہوئی؟!

ذکی :- ”جاری رکھتے ہوئے، بھائی عمار حاجی و فزہی میں تھے کہ ان کے گھر ٹیفیڈن ہوا۔ ان کی بیگم بولیں : ”کون ہے؟“
آواز آئی ”پیلے آپ تباہے آپ کون ہیں؟“ انھوں نے کہا : ”میں بیگم عمار ہوں“ فرمائیے ؟! دوسرے جواب
آیا : ”اللہ — آپ سے تو ملنے کو دل بہت بے قرار تھا“ اسے نصیب نیا زحاصل ہوئے۔ ذری میرا ایک
کام کر دیجئے، اپنے ان سے کہہ دیجئے کہ اب جو ہمارے یہاں آئیں تو میرا ریشی رومال اور عطر کی شیشی نہ بھریں۔“

جواو :- ”خوفزدہ ہو کر“ بھرا کیا ہوا؟!

ذکی :- ”اسی انداز میں، عمار صاحب جو شام کو خوش خوش گھر ملے تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیگم سر پہاڑ، منہ پھاڑ کھٹے ٹوٹی
کھٹوٹی پر پڑی ہیں۔ ان کے داخل ہوتے ہی بھابھی صاحبہ نے پتوں کی دھماکی شروع کر دی بھائی عمار جو ٹپکے
توپنے جھاڑ ان کے گرد ہو گئیں۔ اب تم ہی سوچ لو کہ کیا اوجھ چا ہو گا۔ رات ہونے جب میں ان سے ملنے گیا
تو خلاف معمول ستر پر دراز تھے اور ان کی دامنی آنکھ کے گرد گہرے نیلے رنگ کا حلقہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے سب بچھا
تو جناب نے پھر انی آواز میں ساری کینیت کہہ سنائی۔“

جواو :- ”آہ بھر کر، الامان — مجھے تو یہ کوئی چیز نہیں معلوم ہوتی ہیں۔“

شیم :- ”بے رخی سے، اچھی نہیں، مغرب زدہ ہیں۔ اپنی طرف سے بڑی طریف طبعی نہیں ہیں۔“

جواو :- ”تعب سے، مگر یہ کہاں کی طریف طبعی ہے؟ (وقفہ کے بعد ذکی سے) آخر تم سے کہتی کیا ہیں؟؟!

ذکی :- ”اپنے آپ کو قابو نہیں رکھتے ہوئے، بھئی قصہ آمل میں یوں ہے کہ پہلے شیم کو فون آیا کرتے تھے — ایک
دن میری طبیعت ہو گئی اور لگیں اگر بڑی گھارنے، دوسرے جو مسکت جواب ملا تو انہیں اپنی صلیت پر ادراستی
ہر بڑا میں کہ آدو بھی غلط سلط بولنی شروع کر دی۔“

شیم :- ”رجل کر، صاف کہیں نہیں کہنے کہ ایک دن جناب نے میری غیر موجودگی میں انھیں بتا دیا کہ اتھر شیم کا بڑا بھائی ذکی
ہے اور وہ مجھ سے اپنی کوئی بات نہیں چھپاتا۔“

ذکی :- ”جیل یوں ہی سی، آخر بڑے بھائی کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں۔“

جواو :- ”(تنگ آکر) یاد خدا کے لئے جھگڑنا بعد میں پہلے واقعہ تو سن لینے دو۔“

ذکی :- ”جاری رکھتے ہوئے، تو جناب شیم صاحب کو پہلے فون آیا کرتے تھے۔ مدت تنگ حضرت نے ذکر ہی نہ کیا، ایک دن
جو اتفاق سے میری آنکھوں سے عمل گئی تو کیا دیکھا، یوں کہ صبح شیم صاحب بیٹھ بیٹھو بنا رہے ہیں۔ ”پوچھا : ”کو
بھئی کہاں کی تباہیاں ہیں؟“ بولے ”یونہی طبیعت کچھ کرنے کو چاہ رہی ہے۔“ میں خاموش ہو گیا۔ دو گھنٹے آپ
کھوٹیاں کھاٹنے رہے اور میں دیکھا کیا۔ ایک بار دو بار، تین بار، منہ کھینچتا رہی نہیں کے باصا بن گیا۔ دیکھو
ہوئی تو جناب غل خانہ میں گھس گئے۔ چاندی کے قریب ہاں سے نکلے تو اب کپڑے پہننے شروع کئے، چھرنے

- کے قریب آراستہ پرستہ برٹا لگے باہر کی مٹائی۔ مجھ سے غصہ نہ ہو سکا۔ پوچھ ہی بیٹھا "بھئی کدھر؟" بڑی بے مٹائی سے بولے "یہ تھی ٹکے دہلے"
- شیم : — (کھسائی ہنسی کے ساتھ) تو یہ، مبالغے کی بھی حد ہوتی ہے !!
- ذکی : — (جھلٹے ہوئے) اچھا تو کیا میں —————
- جواد : — (غصہ میں) امان ٹھہرو ملی —————
- ذکی : — کوئی ویڑھ گھٹنے بعد جناب منہ اٹکے، اچکن کے سارے ٹپن کھولے چلے آئے ہیں مجھ سے پھر نہ رہا گیا پوچھ "بھئی یہ پڑھو کی کسی؟" جواب دیا "آج شام سنیما کی قرار دوتھی"
- جواد : — (شیم سے) کیوں شیم ؟
- شیم : — (سنبیدگی سے) مجھ نہ —————
- جواد : — (حیرانی سے) پھر ملاقات ہوئی ؟
- ذکی : — (بے پروائی سے) تو یہ کرو ————— !!
- شیم : — (سنبیدگی سے) اصل میں —————
- ذکی : — (خارت سے) اصل میں کے کیا معنی۔ اچھے خدے چننے ہو۔ گھنٹہ پھر سنیما کے براہے میں تو امدت نہ نہیں تو کیا میں نے کی ہے ؟
- جواد : — (غضب سے) کیا کوئی بھی نہ آیا ؟
- شیم : — (بے پروائی سے) بھئی میرا ذاتی خیال تو یہی ہے کہ انھیں کوئی کام پڑ گیا ہو گا۔
- ذکی : — (افسرت سے) جی ہاں —————
- جواد : — (بچوں کی طرح) مگر ذکی سے بات چیت کیا رہی ؟
- شیم : — (سنبیدگی کے ساتھ) بات دراصل یہ ہے کہ میری غیر موجودگی میں بھائی کہیں ان سے گفتگو فرما چکے تھے۔ آج صبح جو میں نے رسیبہ راٹھیا کو فرم لئے تھیں "کیا ذکیہ آپا۔ یہاں موجود ہیں؟" میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا "جی نہیں، ذکی بھائی موجود ہیں۔ بولیں" اچھا تو انھیں ہی بلوا دیجئے، ہمیں ان سے کچھ کہنا ہے" مجھے بڑا طیش آیا —————
- جواد : — (سراپگی سے) لیکن اوس تو مختار پچا رہے کی گت بنوائی اور اوس قلم دونوں بھائیوں میں کشیدگی —————
- ذکی : — (سنبیدگی سے) ہاں بالکل —————
- شیم : — میرا رادہ تھا کہ بھائی کو اطلاع نہ دوں۔ میں نے ان سے تو اچھا کہہ دیا مگر ٹیلیفون نہ نہ کیا۔ میرا خیالی تھا تو وہی تنگ آکر چھوڑ جائیں گی۔ اب جو میں باہر جانے کے لئے مڑا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ گھنے والی میز کے نیچے سے ایک ہاتھ آہستہ آہستہ ٹیلیفون کی طرف سرک رہا ہے۔ پل بھر کے لئے بھائی صاحب کا سر نو دار ہوا اور دوسرے

لے کر بیلیغوں سمیت پھر مینے کے نیچے —————

جواو :- (تغیب سے) ارے ڈکی —————؟

ڈکی :- (کھسیانی مسکراہٹ کے ساتھ) یارو! کتنی ہوس جاتا ہے —————

(رباہری ڈیوڑھی میں سائیکل کی گھنٹی بجتی ہے)

شیمم :- (جبرانی سے) یگھنٹی کرن بجا رہا ہے؟

جواو :- (بے پروائی سے) متور ہوگا —————

ڈکی :- (آواز بلند) شاہ صاحب اندر تشریف لے آئیے —————

آواز :- (رباہری سے) نہیں بھئی، میں جا رہا ہوں۔

شیمم :- (آواز بلند) میاں! کیا صرف آواز سنانے ہی آئے تھے؟

جواو :- (بے پروائی سے) کہاں جا رہے ہو؟

آواز :- (اسی انداز میں) میں انسانی آماں کے ہاں ریڈیو سننے جا رہا ہوں۔ علاوہ اس کے میرے عوب دلے ماموں بھی آئے ہوئے ہیں۔

ڈکی :- (انجاکرتے ہوئے، آواز بلند) بھئی ذرا کی ذرا تو دم لے لیتے؟

آواز :- (اسی انداز میں) کہہ چکا ہوں نہیں ————— میں صرف یہ بتانے آیا تھا کہ میں نے زندگی کے بارے میں اپنا نظریہ

تبدیل کر لیا ہے۔

شیمم :- (رگھیرا کر) آنا لٹھر —————

جواو :- (تغیب سے) مگر آج صبح تو تم اسی تغیب پر بیٹھے تھے کہ رعایت ہی زندگی کا بہترین لائحہ عمل ہے؟

آواز :- (اسی انداز میں) اس کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ آج صبح میں تمہارے ہاں آ رہا تھا تو ٹانگہ میں بھی ہوئی ایک لڑکی سنے

مجھ پر نگہ غلط انداز ڈال دی تھی۔

ڈکی :- (جبرانی سے) اور اب؟

آواز :- (اسی انداز میں) وہ ساتھ والے مکان کی بھٹیلا رہے نا؟

شیمم :- (جبرانی سے) کونسی؟

آواز :- (اسی انداز میں) وہی جسے میں کوٹھے کے چھوڑ کے میں سے دیکھا کرتا تھا۔

جواو :- (زنگ آکر) ہاں ہاں —————

آواز :- (اسی انداز میں) آج وہی جب میں کوٹھے پر چڑھا تو مجھ کو کہہ دیا، میں نے منڈیر پر چڑھ کر دیکھنے کی کوشش

کی تو نامراد سامنے بیٹھی تھی، مجھے دیکھنے ہی چہچ آئی ————— آئیے دسے میرے بھم کو، تیرا سر منڈوا کر کھڑی

کی ایسی مائش کراؤں گی کہ ساری کون بازی بھول جاؤ گے، میں نے بہنیز اکھا، نیک بخت کیوں بدگمان

ہو رہی ہو، میری نیت بُری نہیں تھی، وہ تو اتفاق سے نگاہ پر لگی۔ ”گروہ بولی۔“ چھوٹ کی منڈ بیر ہے اور آپ کا قد ماشاء اللہ بھلا تین فٹ، بھلا اتفاق سے نگاہ کیونکر پڑ سکتی ہے۔ اب یہ فیصلہ تو میرا

گھروالا ہی کرے گا۔

ذکی :- (خوفزدہ ہو کر) پھر۔

آواز :- (اسی انداز میں) میں تنوٹ ہی ہو چکا ہوں۔

شمیم :- (بناوٹی تعجب سے) اب تنوٹ ہی ہو چکے ہو؟!

آواز :- (اسی انداز میں) ہاں۔

شمیم :- (بے پردائی سے) کتنے گھنٹوں کے لئے؟!

آواز :- (اسی انداز میں) اب میں عمر بھر تنوٹ ہی رہوں گا۔

ذکی :- (بے پردائی سے) یہ تو تم ہمیشہ ہی کہہ رہے ہو۔

آواز :- (اسی انداز میں) اب کی مرتبہ۔

جواد :- (اُٹھ کر دروازے کی طرف جاتے ہوئے) بھڑو تو سی۔

آواز :- (دُور سے) نہیں، نہیں۔

(رجلا جاتا ہے)

ذکی :- (پروردگی سے) چلا گیا۔

شمیم :- (بٹتے ہوئے) خوب آدمی ہے۔

جواد :- (دواپس آ کر اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے) شمیم، تم بتا، ہے تھکے کہ جس وقت بھائی نے ٹیلیفون کر لیا تو تم۔

شمیم :- (جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آجائے) ہاں، تو میں حیران پریشان دیکھتا رہا۔ ٹھوڑی دیر تک تو کھینچتا رہا۔

ہوتی، یہی پھر دیکھتے تو میں بھائی صاحب نے گا نا شروع کر دیا۔

ذکی :- (شرمناک ارے بھئی آدھر سے غزل کی فرمائش جو ہوئی تھی۔

جواد :- (دلچسپی لیتے ہوئے) تو پھر تم نے کوئی غزل گائی؟!

ذکی :- (بے پردائی سے) دی ۶

تسکین کہ ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے

جواد :- (دھجھوم کر) سبحان اللہ۔ خوب سماں بندھا ہو گا۔

ذکی :- (رافر ذکی کے ساتھ) یار، افسوس تو یہ ہے کہ حویات میں سنجیدگی سے کہوں کہ گفت اُسے بھی مذاق سمجھتی ہیں۔

شمیم :- (تنگ آکر) انھیں پوری بات کیوں نہیں سنا دیتے؟!

ذکی :- (عجائبات سے بے قابو ہو کر) بس کہنے لگیں۔ ”ہائے، کبھی ملے۔“ میں نے جواب دیا ”پچھلے میرے بارود عزیز

کو تھوڑا خوار کیا ہے۔ جواب مجھ سے ملنے کو کہہ رہی ہیں؟

جواد :- دو ٹیپی لیتے ہوئے پھر انھوں نے کیا کہا؟

ذکی :- (پڑھ روگ سے) کچھ نہیں، سولے ہی ہی کے —

جواد :- (اسی انداز میں) تم کیا بولے؟

ذکی :- میں نے کہا سب مجھے فرصت نہیں ہے۔ "بولیں"۔ آخر آپ سارا دن کیا کرتے رہتے ہیں؟ میں نے جواب نہ دیا۔

"صبح کو کئی گیارہ بجے آجھ کر ناشتہ کرتا ہوں طبیعت ذرا کسل مندی ہوتی ہے تو عشتیہ کہا نیوں کی کتا۔

آٹھا لیتا ہوں۔ اتنے ہیں۔ دپہر کے کھانے کا وقت ہو جاتا ہے۔ کھانے کے بعد جوش عشتیہ کہا فی احوال رہی۔

جاتی ہے آسے پھر پڑھنا شروع کر دیتا ہوں۔ اس طرح شام ہو جاتی ہے۔" کہنے لگیں۔ پھر شام کو آپ کیا

کرتے ہیں؟ میں نے کہا: "شام کو بھنگو خانے چلا جاتا ہوں۔"

جواد :- (تعجب سے) بھئی یہ بھنگو خانے سے تمھاری کیا مراد تھی؟

ذکی :- (بے پروائی سے) یہی، تمھارا گھر —

جواد :- (حیرانی سے) میرا گھر!!

ذکی :- (بے پروائی سے) انھوں نے خود ہی اس کا نام بھنگو خانہ رکھا ہوا ہے، انھیں معلوم ہے ہم تمام دوست

تمھارے ہاں ہر شام اکٹھے ہوتے ہیں۔

جواد :- (دفعتاً سے) لاجول ولا قوتہ — بڑی بدلتیز لو کیا ہیں!!

ذکی :- خیر — میں نے پوچھا "آپ سارا دن کیا کرتی ہیں؟" کہنے لگیں "صبح اٹھتی ہوں، آبا جان اور سبھی بھائی

صاحب و دونوں روزانہ شروع کر دیتے ہیں۔ انھیں چپ کراتی ہوں۔ ناشتہ و اشترہ کر کے اسکول بھیجتی

ہوں۔ اس کے بعد گھر کی چھاڑو ہمارو ہے۔ برتن مانگتے ہیں۔ روٹی پکانی ہے — کہیں دوپہر کو تک

بار کر اپنے بستر پر کر سیدی کرنے کے لئے لیٹتی ہوں تو آپ کو ٹیلیفون کر دیتی ہوں۔"

جواد :- (خوفزدہ ہو کر) اللہ کی پناہ — (لوگو کو پکارتے ہوئے) دیوان علی —

ذکی :- (اسی انداز میں) میں نے جواب دیا "تشریف لے کیوں کیوں ہی کرنا چاہیے۔"

جواد :- (دو ٹیپی لے کر) پھر — (پھر لوگو کو پکارتے ہوئے) ارے کوئی ہے؟

ذکی :- (اسی انداز میں) پھر وہی غمی غمی تھی — کچھ ملے تو بونہی گزے پھر بولیں "آپ نے شام کو کچھ پڑھی ہے؟"

میں نے کہا "جی نہیں، صبح و شام دو کھیں ہے" اس پر ہنسنے لگیں۔ شاعری پر بحث شروع ہوئی۔ بولیں غالب

اور اقبال بے حاشیہ ہیں —

جواد :- (اسی انداز میں) تو تم نے کیا کہا؟

ذکی :- (بے پروائی سے) میں نے کہا "پڑھیں پڑھیے۔"

- جواو :- دیکھ نوکر کو دکھاتے ہوئے دیوان ملی —
 نوکی :- اسی انداز میں پھر اصرار کرنے لگیں کہ کہیں ملاقات کیجئے۔
- جواو :- (جھلا کر چیخے ہوئے) اسے ادیبان ملی —
 نوکی :- رنگ اکڑ بھی یہ کیا دٹ لگا رکھی ہے۔ یا تو بات سنو یا اس کج بحث نوکر کو آوازیں دیتے رہو۔
- جواو :- (سنبل کر) اچھا چلو، پھر کیا ہوا ؟ !
 نوکی :- (مزے بیکر کئے لگیں) آج شام ضرور ملیں گے۔ میں نے کہا ”قسم کھائیے“
- جواو :- (پھر آواز بلند) دیوان ملی —
 آواز :- (رہا ہر سے) جی صاحب —
- جواو :- (مسکرا کر) بس اس نے سن لیا ہے۔ کہتے جاؤ !
 نوکی :- (اسی انداز میں) میں نے کہا ”قسم کھائیے“
- جواو :- (بے پروائی سے) پھر کیا انھوں نے قسم کھائی ؟
 نوکی :- (مسکرا کر سنو تو۔۔۔) بولیں ”ناشتہ بہت بھاری تھا۔ اب کچھ حلق سے نیچے نہیں اُترتا“
- (نوکر داخل ہوتا ہے)
- نوکر :- (ہاتھ کے اشارے سے سلام کر کے) جی۔۔۔
- جواو :- (بے پروائی سے) ابھی میری یہ ٹانگ ذرا قابلیں پر سے اٹھا کر صوفے پر دکھ دو۔ سو گئی ہے۔ (نوکی سے)
- لاں نو پھر —
 نوکی :- (بے پروائی سے) پھر سنئے لگیں۔
- (نوکر جواو کی ٹانگ قابلیں پر سے اٹھا کر صوفے پر رکھ دیتا ہے۔ لیکن جب واپس جانے کے لئے مڑتا ہے تو شمیم میاں ایک منگر چھڑا یہی وسیع اور فراع جہاں لیتے ہیں۔۔۔)
- جواو :- (نوکر سے مخاطب ہو کر) اور۔۔۔ اور شمیم صاحب جہاں لے رہے ہیں، ذری ان کے منہ پر ہاتھ رکھتے جانا — (نوکر شمیم میاں کے منہ پر ہاتھ رکھتا چلا جاتا ہے) لاں، تو بھی نوکی پھر ؟ !
- نوکی :- (جہاں لے کر پھر —)
- شمیم :- (انگڑائی بیکر) کچھ غنودگی سی طاری ہو رہی ہے —
- نوکی :- (بے پروائی سے) پھر طے ہو ہی گیا کہ آج شام ضرور ملاقات ہوگی۔
- جواو :- (بے قابو ہو کر) نہیں ؟ !

- ذکی :- (سبیدگی سے) ایمان سے !!
- جواد :- (بے قابو ہو کر) گھر کہاں ؟
- ذکی :- (بے پروائی سے) ہنس کر تو لو —
- جواد :- (اُسی انداز میں) نہ ، پیٹے بناؤ کہاں ۔ کیا میں بھی جاسکتا ہوں ؟!
- سینٹیم :- (ہنستے ہوئے) کیوں نہیں — !!
- ذکی :- (سروکاری کے انداز میں) کتنے گلے " ہم میں تو آٹھ دس ، اور سب ہی آپ کے ویدار کو ترس رہی ہیں ۔ مگر شروع شروع میں صرف دو ہی آپس کی باقی نسبتاً شرمیلی ہیں " میں نے کہا " لیکن فین کرتے ہوئے انھیں شرم نہیں آتی ؟ بولیں " واہ آپ پھر مذاق کرنے لگے " میں مصحفنا خاموش ہو گیا ۔ پوچھنے لگیں " ہم آپس کہاں ؟ " میں نے کہا " آپ جو وہی مقام توڑ کر دیکھئے ، غلام حاضر ہو جائیں گے " بولیں " نہیں جہاں آپ کہیں " میں سوچ میں پڑ گیا ۔
- جواد :- (جھلانے ہوئے) ہاں ، ہاں — تو تم سوچ میں پڑ گئے !!
- ذکی :- (اُسی انداز میں) پھر میں نے پوچھا " اپنی پہچان تو بنا دیجئے " بولیں " ہم دونوں نے ساڑھیاں باندھ رکھی ہوں گی اور لفٹی سینڈل " میں چلا یا " خدا را کہیں لفٹی سینڈل پہن کر نہ آئیے گا ۔ ہمارے سر پر بال پیلے ہی آکاؤں ہیں " اس پر مزید پوچھتے پڑے —
- جواد :- (بے قابو ہو کر) جلد بناؤ ، آخر ٹھہری کیا ؟!
- ذکی :- (بے پروائی سے) قصہ مختصر ، اے یہ ہوا کہ وہ دونوں ٹھیک چھ بجے سائیکلوں پر سوار ہو کر —
- جواد :- (مرستہ سے بے قابو ہو کر) ہاں ، ہاں —
- ذکی :- (اُسی انداز میں) تمھارے یہاں پہنچ جائیں گی ۔
- جواد :- (دیکھم افسردہ ہونے ہوئے) ہاں !!
- ذکی :- (بے پروائی سے) تمھارے یہاں — کیا ہرج ہے ؟!!
- جواد :- (خفتے میں آتے ہوئے) عجب نامعقول ہو —
- ذکی :- (گھبرا کر) کیوں ؟!
- جواد :- (اُسی انداز میں) ان سے یہاں آنے کو کہیں کہا ۔ کوئی اور جگہ تجویز کی ہوتی ؟!
- سینٹیم :- (جھلا کر) اور کہاں بیٹھ سکتے تھے بار ؟!
- جواد :- (سبیدگی سے) انھیں میرے ساتھ کم از کم یوں نہ کرنا چاہیے تھا ذکی — تم جانتے ہو ہم بچپن سے ساتھ بڑھے چلے آئے ہیں —
- ذکی :- (نسلی تمیز لہجے میں) بمبائی خفا نہ ہو —

جواو :- زنجے میں جھنجھتے ہوئے توادر کیا کروں۔ بھلا یہاں بیٹھے کی جگہ بھی ہے۔ ایک ہی تو صورت ہے کجھنت اور وہ بھی بغیر اس پرنگوں کے —

شیمم :- اچھکی ہنسی کے ساتھ جواو اوجان کے وقت کا!!

جواو :- (اسی انداز میں) ابش ٹرے میں سرگٹ بھجانے کی عادت سے سب ناواقف۔ دروازے کے سامنے بچھے ہوئے سگرٹوں کے انبار لگے ہیں۔ مکڑیوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ جہاں چاہیں جالے لگائیں۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔ یہ دھولی — آخر وہ تمھارے متعلق کیا نظریہ قائم کریں گی؟

شیمم :- (جلے پروائی سے) ہمارے متعلق ان کو کیا نظریہ قائم کر لے ہے؟

جواو :- (اسی انداز میں) مگر میرے متعلق تو کر رہی گی۔

ذکی :- (جلے پروائی سے) ہڑ کیا، انھیں معلوم ہے تمھارا گھر بھنگڑ خانہ ہے۔

جواو :- (جل کر) واہ بھئی واہ ————— میرا گھر —————

شیمم :- (تسلی دیتے ہوئے) تم بعض اوقات ذرا ذرا سی باتیں محسوس کر لیتے ہو۔

جواو :- (پھر ہنستے ہیں آتے ہوئے) جی تو میں بک رہا تھا کہ میں ان چھو کر یوں دو کر یوں کا قائل نہیں ہوں۔ مجھے ان نفرت ہے، ایمان سے مجھے ان سے کھن آتی ہے۔

ذکی :- (گھبرا کر) جی یہ وقت بحث کرنے کا نہیں۔ اب تو وہ آیا ہی چاہتی ہوں گی۔

جواو :- (دھتے ہیں) تو میں کیا کروں۔ میں انھیں اسی تہمد اور بنیان میں ملوں گا۔

شیمم :- (گھبرا کر) غلطیوں نہ ملنا سارا اثر ناکل ہو جائے گا۔ بھائی نے ان پر بڑی ہوا باندھ رکھی ہے۔

جواو :- (تعجب سے) ایمان سے؟

ذکی :- (سنجیدگی سے) بھدا میں نے ان سے کہہ رکھا ہے کہ تم ایف۔ اے میں پڑھتے ہو۔

جواو :- (تدبر سے دھتے ہیں) مگر یاد ذرا سوچو تو سہی، آخر وہ آئیں گی تو چائے کے لئے تو پوچھنا پڑیگا۔ او میرے پاس تو کل تین ہی بیبیاں ہیں۔ وہ بھی بے جوڑ۔

ذکی :- (جلے پروائی سے) تم ان باتوں کی فکر نہ کرو۔

جواو :- (پھر ہنستے ہیں) میں ان باتوں کی فکر نہ کروں توادر کوں کرے؟

شیمم :- (سنجیدگی سے گھڑی دیکھ کر) بھائی چھوڑنے میں پندرہ منٹ باقی ہیں۔

ذکی :- (گھبرا کر) جواو، کپڑے بدل آؤ۔ وقت ایمان سے بہت کم ہے۔

جواو :- (ڈانٹ کر) کیا مصیبت ہے۔ تم نے مجھے آتے ہی کیوں نہ بتا دیا۔ بھلا اب میں پندرہ منٹ میں کیوں کرتا ہوں جو سکتا ہوں؟

ذکی :- (جلے پروائی سے) نملنے دبانے کی ضرورت نہیں، ابھی تم پچھلے عینے ہی تو ہٹائے تھے۔ صرف یہ تمہارا بدل کر

پتلیوں میں آؤ۔

جواد :- (جل کر) میں صرف تمہارے بدلے کی پتلیوں میں آؤں اور تم جو صبح ہی سے اچکنیں ڈالتے، زلفیں سنوارے —

شیمم :- (پھر گھبرا کر) بار دلت ضائع نہ کرو ایماں سے —

جواد :- (بے پروائی سے) ابھی بیگرٹوں کے کھیلنے لڑائی ہو —

ذکی :- (گھبرا کر اٹھتے ہوئے تم جاؤ میاں، میں چٹے دیتا ہوں۔

(ذکی دلیز میں پڑے ہوئے بیگرٹوں کے کھیلنے چلتے گلتے ہے)

جواد :- (شیمم سے) شیمم، ذرا اس صوفہ کو پکڑو — (شیمم اٹھ کر صوفہ کو پکڑتا ہے) ادھر سے نہیں، وہاں سے —

(جواد دوسری طرف سے صوفہ پکڑ کر اٹھتا ہے)

شیمم :- (زور لگا کر اٹھاتے ہوئے) ہاں —

جواد :- (صوفہ کو ایک طرف لے جا کر) اور اٹھاؤ — لے... لے... اور رکھو، ہاں — (صوفہ دکھاتے

میں شیمم اسی صوفہ پر بیٹھ جاتا ہے) — (ذکی کو پکارتے ہوئے) دیوان علی — !!

شیمم :- (زنگ اٹھ کر) اب اس سے کیا کہنا ہے؟

جواد :- (ابھی جا لے اٹا رہا ہے گا۔) (سرت سے) تاہیں پر اگر ایک ہاتھ برش کا پڑ جائے تو چمک اٹھے —

ذکی :- (سگریٹ باہر پھینکتے ہوئے) اتفاق نہیں جواد خدا را —

جواد :- (پچھ کر ذکی کو پکارتے ہوئے) ابے او دیوان علی — !! (تمہارے پلٹنے سے سگریٹ نکال کر سٹکاتا ہے)

آواز :- (باہر ہی سے) جی صاحب؟

جواد :- (ذکی سے) اب میں جاتا ہوں۔

شیمم :- (جھلا کر) اب جا بھی چکیاں —

جواد :- (اتنا کرتے ہوئے) ذرا یہ سگریٹ ختم کر لوں — (زور زور سے کھنکھاتا ہے)

ذکی :- (اُسے کندھوں سے پکڑ کر دھکیلتے ہوئے) نہیں، نہیں —

جواد :- (پھر رکتے ہوئے) کہہ ایماں سے یوں معلوم ہو رہا ہے جیسے کسی پہوان کا اکھاڑ ہو۔

(ذکی داخل ہوتا ہے)

ذکی :- (باؤ ذہن بند، جی کیجیے) — !!

شیمم :- (کاٹوں پر ہاتھ رکھ کر) اسے آہستہ ہلا کر دانتوں سے کٹی جا رہا ہے —

جواد :- (بے پروائی سے کٹ لگا کر) یہ کتنے اٹھا کر لے جاؤ۔

(ذکی کٹنے اٹھا کر قطعہ کر کے کی طرف مڑتا ہے)

شیمم :- (زنگ اٹھ کر) بس اب تم جاؤ گے بھی یا نہیں —

جواد :- (غیر سنے، دلیان میں) ————— یہ کھانے کے کمرے کا دروازہ کھیر پٹنے جانا۔

(لو کہ غیر جم اب دیئے چلا جاتا ہے۔)

ذکی :- (راہ بھر کر بیٹھتے ہوئے) خدا کے لئے اب جاؤ بھی ———

جواد :- (عجب دیر ہو چکی ہے) پر..... پر..... یا ——— ؟

شیمم :- کیوں اب کیا ہے ؟

جواد :- (اسی انداز میں) آؤ وہ جا میں گی، مگر ان سے بات کیونکر شروع کی جائے گی ؟

ذکی :- (کچھ سوچ کر) تم گفتگو کرنا ————— ہم دونوں خاموش رہیں گے۔

جواد :- (بچوں کی طرح) میں کیوں بولوں ؟

شیمم :- گھر جو تھا راہ ہے (نیچے کھجورے ہوئے رسالوں میں سے ایک اٹھا کر وزن گردانی کرنے لگتا ہے)

جواد :- (عمل کر) یہ خوب رہی مصافحت تم کرو اور زرجانی کریں ہم۔ مجھ سے یہ نہیں ہو گا۔ میں کتنا ہوں جتنی کی چت پٹ ہو جاؤ۔

ذکی :- (گھبرا کر) یعنی اس کا وقت نہیں ہے۔

جواد :- (سجیدگی سے) پھر کوئی راؤ تو نکالو۔

ذکی :- (بے پروائی سے) تم جاؤ، کپڑے بدلتے وقت سوچنا، اور ہم یہاں سوچتے ہیں۔

جواد :- (شیمم کو رسالہ پڑھنے دیکھ کر پچرتے ہوئے) شیمم بھی، یہ کیا بات ہوئی یہ کوئی رسالہ پڑھنے کا وقت ہے ؟

شیمم :- (بے پروائی سے) ایک مضمون اتفاق سے طلب کا آ گیا ہے۔ شاید اسی سے مشکل حل ہو جائے۔

ذکی :- (عجب سے) کیا عنوان ہے ؟

شیمم :- (غیر نفیس اٹھائے) "ایک بون کو مرعوب کرنے کا عجیب طریقہ"

جواد :- (خوش ہو کر) ضرور پڑھو، ممکن ہے کوئی کام کی بات نکل آئے۔

ذکی :- (تنگ آکر) اب تل بھی چکو، یا چھریں بھاؤ گے۔ میں تو کتنا ہوں صرف تمہارے بدل آؤ۔

جواد :- (جانتے ہوئے) لو بھی جانا ہوں ———

(کچھ دیر سکوت رہتا ہے۔ پھر عثمان نے سے جواد کی آواز

گونجنی ہے) ————— "دلیان علی ————— اے ادولیان علی"

صاحبِ نود سے جاؤ —————"

ذکی :- (بے بسی سے) جناب ابھی صابن ہی منگو رہے ہیں (پھر باؤز بلند) ارے میاں عثمان نے سے لکھو بھی ———

(وقفہ) کیوں شیمم، کچھ ملا ————— ؟

شیمم :- (بے پروائی سے) اوں ہوں! ابھی تو کمیت بھی لکھ رہا ہے کہ بڑے بڑے جوتی اور دلیہ آدمی کیونکر لڑکیوں کے

سامنے زبانِ بند کی عارضے میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

ذکی :- (بے پروائی سے) خیر —————

(جواو داخل ہوتا ہے۔ اس نے اب تمہاری بجائے تالیہ باندھ دکھا ہے)

جواو :- (بالا بھٹکتے ہوئے، کھوجتی) !؟

ذکی :- (تعجب سے) ابھی تک تالیہ باندھے پھر ہے جو؟ (انہما کرتے ہوئے) لکٹر کپڑے بدل آؤ۔
جواو :- (رجاتے ہوئے) اچھا —————

(پیدا جاتا ہے)

ذکی :- (دقت کے بعد) شیم ہم نے فون میں ایک بات آئی ہے۔

شیم :- (بے پروائی سے) لگتا نا، پڑھتے ہوئے ہوں —————

ذکی :- کہ شرم کو بالکل پاس نہ آنے دیا جائے۔ جو مڈ میں آئے بید حرکت کہہ ڈالو۔

شیم :- (جھلکنے پر لڑائی ڈھنگ کی بات بھی تو ہو۔)

ذکی :- (بے بسی سے) یہ بھی شیک ہے۔ اچھا تو اسی مضمون میں دیکھو ————— (پھر آواز بلند) کیوں جواو! غائب ہو؟

آواز :- (ساتھ کے کمرے سے) میں آیا، کپڑے بدل رہا ہوں —————

ذکی :- (اُسی انداز میں) خدا کے لئے ٹانگ بچی زیادہ نہ کرنا۔

آواز :- (بے پروائی سے) نہیں یار، مجھے تو تین پینٹا بھی عذاب معلوم ہو رہا ہے، تم کہتے ہو مانگ پٹی نہ کرنا۔ آخر کسی

نوارو سے ملنا ہو تو کم از کم کپڑے تو قاعدے کے ہوں۔ اور ویسے تو تم جانتے ہو کہ مجھے ان چھو کیڑوں کو کیوں

سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ایمان سے سب نکالے لئے کر رہا ہوں۔

ذکی :- (دہشتے ہوئے) اے میاں، یہ ہم پر پارسائی کا رعب ————— (دو دو کہیں گھڑ پالی چھڑ جاتا ہے) مائے

دلے قابو ہو کر بدل کر دو، یہاں تو رعیت طاری ہو رہا ہے۔

(جواو کمرے میں داخل ہوتا ہے اس نے کپڑے بدل لئے ہیں)

جواو :- (بے پروائی سے) ابھی میں تو تیار ہو گیا۔ (دقت، شیم سے) کیسے؟ شیم ؟!

شیم :- (غیر نظر میں اٹھاتے) ابھی تو دیکھ ہی رہا ہوں۔

جواو :- (سنجیدگی سے) جلد جلد پڑھو میاں ————— (دقت، ابھی مجھے اس کمرے کی ہیبت پھوٹی آنکھ نہیں بھاتی —————

ذرا روشتہ دان کھول کر دیکھنا چاہیئے۔ شاید فرق پڑ جائے۔

ذکی :- (بے پروائی سے) نہیں یار یہ وقت —————

جواو :- (چھت کی طرف دیکھ کر) سفیدی آدھر سے —————

شیم :- (دیکھ کر) دھجی مل گیا ————— !!

- جواد :- (تعب سے) کیا ؟؟
 شمیم :- (دست سے) ”طریقہ“ کھنت نے آخر میں دیا ہے۔
 ذکی :- (دست سے بے قابو ہو کر) پڑھو، پڑھو —————
 شمیم :- (گلدستہ صاف کر کے) کھا ہے —————
 جواد :- (بے قابو ہو کر) بولو بھی ؟؟
 شمیم :- (سجیدگی سے) کھا ہے۔ ”خواتین سے ملنے وقت اس امر کو خاص طور پر ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ جب —————“
 ذکی :- (بے قابو ہو کر) ہاں ہاں ————— ؟؟
 شمیم :- (اسی انداز میں) ”کہ جب وہ کمرے میں داخل ہونے لگیں تو مرقعہ یا آٹھ کھڑے ہوں اور اتنی دیر —————“
 جواد :- (بے صبر ہو کر) کیا کریں ؟؟
 شمیم :- (جاری رکھتے ہوئے) ”کھڑے رہیں جب تک کہ خواتین بیٹھ نہ جائیں —————“
 جواد :- (دست سے) سبحان اللہ ————— بھی کیسے تہ کی بات کی ہے —————
 شمیم :- (پھر پڑھتے ہوئے) ”گنگو کی ابتدا —————“
 ذکی :- (بے صبر ہو کر) ہوں، ہوں ؟؟
 شمیم :- (اسی انداز میں) ”ہوں ہونی چاہیے —————“
 جواد :- (بے صبری سے) کیونکر ؟؟
 (شمیم خاموش رہتا ہے)
 ذکی :- (بے صبری سے) اناں بولو بھی ؟؟
 شمیم :- (پہر وگ، آگے برکیٹوں میں لکھا ہے) ”باقی آئندہ —————“
 جواد :- (جھلا کر) لعنۃ اللہ —————
 (باہر گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دیتی ہے)
 ذکی :- (گھبرا کر) ارے یہ آواز کیسی ہے ؟؟
 شمیم :- (کھڑکی کی طرف دیکھ کر) ٹانگہ معلوم ہوتا ہے۔
 جواد :- (تعب سے) ٹانگہ ! ————— (ٹانگہ کھڑکی کی طرف جلتے ہوئے) پھر وہیں کھڑکی میں سے دیکھا ہوں۔
 ذکی :- (حیرانی سے) کون ہے ؟؟
 شمیم :- (سہم کر) کہیں ارذانی بگلانہ آ گیا ہو —————
 جواد :- (کھڑکی میں سے جھانک کر) دوڑا کیوں آتری ہیں —————
 شمیم :- (بے قابو ہو کر) لائیں لو کیاں ؟؟ (ذکی سے) لومھی آگئیں —————

- ذکی :- راتھے ہوئے انکسوں نے نوکمانا کہ ہم سائیکلوں پر آئیں گی ؟
 شمیم :- (بے پروائی سے) سائیکلین بکچر بھی تو ہو سکتی ہیں۔
 جواد :- (لگا تا رہا نکلے ہوئے) وہاں علی سے کھڑو پھیر رہی ہیں۔ ان میں سے ایک نے دوسری کے کندھے کا سہارا لے رکھا ہے۔ بیچارہ معلوم ہوتی ہے۔
 ذکی :- (کھڑکی کی طرف آتے ہوئے) تم نہیں سمجھتے جواد — بڑی چالاک ہیں، اب کوئی نیا ڈھونگ رچایا ہو گا۔
 شمیم :- (دوہین بیٹھے ہوئے) شرازت تو ان کی رنگ رنگ ہیں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔
 جواد :- (یکدم گھبرا کر) ارے، وہ تو اوجھڑی آرہی ہیں۔
 شمیم :- (گھبرا کر) نہیں ————— ؟
 جواد :- (الٹی اس کی طرف دیکھے) ایمان سے ————— !!
 ذکی :- (صبر سے اچھٹے ہوئے) اے ہے ————— خاصی اچھی ہیں میں تو سمجھا ہوں ہی ہوں گی۔
 جواد :- (سجنگی سے) کو دکرشے مت لگاؤ یا رہ غالبین سے گرد آؤ ڈنی شروع ہو گئی ہے۔
 شمیم :- (کھڑکی کی طرف آ کر جھانکتے ہوئے) بخدا وہی ہیں —————
 جواد :- (گھبرا کر) شمیم تم اپنے ننھے چھپانے کے لئے ناک پر رومال رکھ لو۔ ذکی اپنی آنکھیں نیم وا کر لو۔
 ذکی :- (جواسے) یا تم بھی اس بات کا خیال رکھنا کہ تمہارا منہ بلا ضرورت نہ کھلے۔
 شمیم :- (پھر جھانک کر) دیکھو بھائی، ایک نے کس طرح سہارا لے رکھا ہے جیسے بیجا رہی تو ہے۔
 ذکی :- (سجنگی سے) ابھی تم دیکھنا تو سہی، آتے ہی کوئی اور سوا انگ بھری گی۔
 (نوکرو داخل ہوتا ہے)
- نوکر :- (آواز بلند) میاں صاحب !!
 شمیم :- (کالوں میں انگلیاں مٹھوں کر) ارے آہستہ بولا کرو۔ تم سے کئی بار کہلے ہے۔
 جواد :- (نوکر سے) کیوں کیا بات ہے ؟
 نوکر :- (دو جیسے لمبے ہیں، حور تیں ہیں —————
 جواد :- (رخصتے سے) نوکیا ہوا ؟
 نوکر :- (اسی انداز میں) کسی ڈاکٹر کو کرا لہ پھیر رہی ہیں۔
 شمیم :- (ذکی سے) اوصاحب دیکھ لیا ؟
 جواد :- (بے پروائی سے) میاں انھیں اندر بھیج دو۔ ہم سب سمجھتے ہیں۔
 نوکر :- (اسی انداز میں) بہتر —————
 (چلا جاتا ہے)

- ذکی :- (تعب و سرکشی سے) خدا کی قسم یہ لوگ کیا تو بلا کی مشر ہیں۔
 جواد :- (بے بسی سے) بھی میں تو انھیں کچھ سے قاصر ہوں۔
- بشیم :- (کھڑکی میں سے جھانک کر) لو! رہی ہیں۔
 جواد :- (کبدم بھاگ کر صوفہ پر بیٹھتے ہوئے) بس اب خدا کے لئے خاموش ہو جاؤ۔
- بشیم :- (کھڑکی سے ہٹ کر فرش پر بیٹھتے ہوئے) نکر نہ کرو۔
 ذکی :- (روغنہ کے بعد، تھارے کان بل رہے ہیں جواد)۔
- جواد :- (بے بسی سے) بلجی میں کیا کروں، میرے اختیار میں نہیں ہیں۔ گھبراہٹ میں کجخت خود بخود ہلنا شروع کر دیتے ہیں۔
- بشیم :- (جذبات سے بے قابو ہو کر) تو یہ۔
 ذکی :- (عینے پر گستے ہوئے) میرا تو دل دھڑک رہا ہے۔
- (دو لڑکیاں داخل ہوتی ہیں۔ دونوں قبیل صورت ہیں)
- پہلی :- (جھجک کر دروازہ کھولتے ہوئے) ہم اندر آ سکتی ہیں؟
 جواد :- (صوفے سے فرش پر بیٹھتے ہوئے) بڑے شوق سے!!
- پہلی :- (دوسری کو صوفے پر بٹھا کر خود بھی بیٹھتے ہوئے) کیا ڈاکٹر صاحب تشریف رکھتے ہیں؟
 جواد :- (دست سے) آپ ذرا بیٹھ تو لیجیے۔
- ذکی :- (بشیم کے کان میں) جواد اچھا چل رہا ہے۔
 بشیم :- (بے پروائی سے) ہاں۔
- دوسری :- (بہار لہجے میں) آپا۔۔۔ آہ۔۔۔ میرا بڈی تو بخار سے چھٹکا جا رہا ہے۔
- پہلی :- (نسبی آمیز لہجے میں) ہمت کرو۔ (پھر جواد سے) کیا ڈاکٹر صاحب گھر پر موجود نہیں؟
 جواد :- (ہنستے ہوئے) جی، ہم انہی کا انتظار کر رہے ہیں۔
- پہلی :- (آہ بھر کر) آپ سب گویا کمر بھین۔
 جواد :- (دگھبرا کر) جی۔۔۔ جی ہاں۔!!
- (کچھ دیر کے لئے سکوت رہتا ہے)
- ذکی :- (گالتے ہوئے) آج کی رات ساڑہ دلی پُرور ورنہ چھیڑ۔
- پہلی :- (دھجلا کر) خدا را گانا نہ کیجئے۔ مہری بہن کو بھونڈی آوازوں سے خفقان شروع ہو جاتا ہے۔
- دوسری :- (پہلی کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے) تم تعیش لیجیے میں آپا۔۔۔
- ذکی :- (تعب سے) مگر آپ نے تو کہا تھا کہ آپ سائیکلوں پر آئیں گی؟
 پہلی :- (نفرت و حقارت سے) کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ، ہم سائیکلوں پر کس طرح آ سکتی تھیں؟!

ذکی :- دسرت کا اظہار کرتے ہوئے (ساڑھیاں تو آپ پہنی ہیں۔ پر یہ لفظ سینڈل کیوں —؟ (انسرونگی سے) میں نے عرض کیا تھا کہ —————

پہلی :- (حقارت سے) جکے مت ———— !!

دوسری :- (بہار لہجے میں) آپا، ڈاکٹر صاحب کب آئیں گے؟ مجھ سے تو اب بیٹھا —————

تسکیم :- (جراو کے کان میں) بھئی بڑی شیطان ہے واللہ۔ ذرا قریب تو دیکھو —————

ذکی :- (صوفیہ کے قریب ہو کر) اچھا اب مذاق چھوڑیے۔ سچ بتائیے آپ ہمیں ٹیلیفون کیوں کرتی ہیں؟

پہلی :- (نفرت سے) آپ نے جھٹک لیں نہیں پی ہے؟

ذکی :- (رنگ آکر) تو کیا جھٹکا خانے میں شربت بروری پیتے ہیں؟

دوسری :- (رنگ آکر) یہ کسی دماغی مرض میں مبتلا ہیں آپا ———— !!

پہلی :- (بے پروائی سے) میں سب سمجھتی ہوں، بکنے دو ————

جراو :- (اگے بڑھ کر دیکھنے کا — مجھے کم بولنے کی عادت ہے۔ مگر اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ہم سے بہت سی

لڑکیاں دلچسپی لیتی ہیں۔

ذکی :- (بے تاب ہو کر) یعنی مجھ لیجئے کئی گوری لڑکیاں ہمارے صدر دروازے کے سامنے چا دیائیاں بچھائے حقہ

پتی رہتی ہیں ————— (دیکھی کر) اے سے .. کیا آپ حقہ پئیں گی؟

پہلی :- (جھٹکا کر) آپ کو شرم نہیں آتی یہ کہتے ہوئے؟

ذکی :- (اسی انداز میں) اچھی بات یہ ہے کہ مجھے خود اسی کا انتظار ہے۔ آتی ہی ہوگی۔

پہلی :- (غور سے) آپ دیکھ نہیں رہے ہیں نے عینک لگا رکھی ہے؟

تسکیم :- (بے پروائی سے) تو کیا ہوا؟

پہلی :- (سنبھل گئی سے) یعنی یہ کہ میں پڑھی لکھی ہوں، کوئی —————

جراو :- (ہنسنے ہوئے) چہ خوب !!

پہلی :- (جراو کی طرف مڑ کر) کیا فرمایا آپ نے؟

دوسری :- (دبھا رہیے میں) آپا، تینوں دیوالے ہیں۔ ان کے منہ نہ لگو —————

ذکی :- (عالمانہ انداز میں) خاکسار کو علم ہے کہ آپ پڑھی لکھی ہیں۔ آپ نے "شام و بھر" اور "آج و آج" دونوں پڑھی

ہیں۔ غالب کی شرح پڑھی ہے اور اقبال کی شاعری آپ کو پسند نہیں —————

جراو :- (دبھتے ہوئے) مگر میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اقبال کی شاعری آپ کے ذہن کی رسائی سے بالاتر ہے اس کے

اشعار و غزلیوں کے لئے نہیں ہیں۔

پہلی :- (دل جل کر) اور کس کے لئے ہیں؟

جواو :- (عجب ظالم نہ شان سے) ہم جیسے عالموں کے لئے —————

پہلی :- (حقارت سے) اللہ کی شان —————

جواو :- (پھر جیتے ہوئے) میں درست کہہ رہا ہوں۔ ایک صورت بھلا صوفیوں کی منازل کے متعلق کیا واقعیت دکھاسکتی ہے
آپ جانتی ہیں فنا فی الہیہ کی منزل کیا ہوتی ہے ؟

پہلی :- (حقارت سے) جی نہیں ————— آپ ہی وضاحت کر دیجئے۔

جواو :- (دگر کر) یعنی ویجئے نا ————— آہ ————— فنا فی الہیہ کی منزل گویا کہ ٹری ہی ویسپ منزل ہے اور اس کی
ہیچو گیال یعنی میں کیا عرض کروں، بہت ہی پیچیدہ ہیں ————— غالباً آپ سمجھ گئی ہوں گی۔ غالب نے کیا
خوب کہا ہے۔ م

نظرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے وریا لیکن

وہیے میں آپ کی معلومات کے لئے کہہ دوں کہ زندگی فنا ہے، اسی لئے میں گرمیوں میں دوپہر کے وقت ٹف
اور ڈھ کر سوتا ہوں۔ آپ نے کبھی عمر و بن کلثوم کے اشعار پڑھے ہیں ————— آہا! ————— کیا پُر مغز باتیں کہتا ہے۔
ذکی :- (شہیم کے کان میں) کہوں نہ ہو، آخر ایف اے میں پڑھتا ہے۔

جواو :- (جاری رکھتے ہوئے) اب آپ پوچھیں گی کہ شہیم صاحبے ناک پر رومال کیوں دکھا رہا ہے، میں کہوں گا انھیں
وادی نزلہ ہے۔ آپ پوچھیں گی ذکی صاحب کی آنکھیں نیچے دیکھ رہی ہیں۔ میں کہوں گا یہ رات کو خواب میں اکثر
ڈر جاتے ہیں۔ آپ پوچھیں گی میں کہ کیوں بولتا ہوں۔ میں جواباً عرض کروں گا کہ میرے دادا مجھ کو بے
کیا کبھی آپ نے آسمان پر کوؤں کو اڑتے دیکھا ہے ؟

پہلی :- (بے پردائی سے) جی نہیں —————

جواو :- (بے بسی سے) پھر آپ نہیں سمجھ سکتیں کہ چاکلیٹ کا مزہ کیسا ہوتا ہے !!

پہلی :- (دوسری سے) تم سچ کہہ رہے تھیں ساجدہ !!

ذکی :- (عجب سے) ارے آپ کا نام ساجدہ ہے ؟

دوسری :- (دگر کر) جی ہاں —————

ذکی :- (پہلی سے) پھر آپ پردہ پر دیں ہوں گی ؟

پہلی :- (عجب سے) جی ؟

شہیم :- (دم زلے کے) شہیم ہوں گی ————— !!

پہلی :- (شگ آکر) براہ مہربانی —————

جواو :- (مزے کیمر نہیں بھٹی عارفہ ہوں گی) ————— !!

پہلی :- (حقارت سے) میں کتنی ہوں گا کی مت کھا بیٹے —————

دباہری کی ڈیوڑھی سے سائیکل کی گھنٹی بجتی ہے،

دوسری :- (توش بیجے ہیں) ک..... کیا ڈاکٹر صاحب آئے؟

شیمم :- (گھبرا کر) تو بے ہے، متور —————

ذکی :- (استغاثہ) پھر آگیا کجنت؟

جواو :- (گھبرا کر) کہیں اس نے اپنا نظریہ نہ بدل لیا ہو۔

آواز :- (دباہری سے) بھئی —————

ذکی :- (آواز بند، کہو؟)

آواز :- (دباہری سے) میں نے اپنا نظریہ بدلی لیا ہے۔

شیمم :- (بے پروائی سے) بڑی دیر لگائی یا؟

ذکی :- (بیجا چھڑاتے ہوئے) اچھا تو جاؤ، ہم کس سن میں گئے —————

آواز :- (دباہری سے) میں ابھی سننے دیتا ہوں، مجھے جلدی نہیں ہے۔

جواو :- (بے بسی سے) تو بے ہے بھئی —————

آواز :- (دباہری سے) میں نانی اماں کے ہاں جا رہا تھا۔ وریا کے قریب پہنچا تو مجھے ایک دوست ملی گئی (فغاننا غنا زبا میں)

وہ تہذیبی عہد سے بھی ایک فٹ چھوٹا ہے —————

شیمم :- (بے پروائی سے) ہوگا —————

آواز :- (دباہری سے) اس کے ساتھ ایک سات فٹ کی لڑکی تھی۔ اس کے گھٹنے سے سر لگائے وہ کہہ رہا تھا۔ جانف میں زندگی

سے عاجز آگیا ہوں۔ اگر تم نے مجھ پر ترس نہ کھا یا تو میں دریا میں کود پڑوں گا۔

ذکی :- (تعجب سے) کہہ بھی کہیں یہ تھا لا تیراک دوست افتخار تو نہیں؟

آواز :- (دباہری سے) ہاں وہی ————— تو وہ بیپاری ہند نہ کرم سے متاثر ہو کر آنکھوں میں آنسو بھر لائی اور اسے

گروہ میں اٹھا کر ماتھے کا بوسہ لے لیا۔

شیمم :- (تعجب سے) اماں نہیں؟

آواز :- (دباہری سے) قسم ہے اللہ پاک کی ————— سو اب میں باغی ہو گیا ہوں ————— میں نے تنوعیت کے خلاف بغاوت

کردی ہے ————— ایمان سے کتا ہوں میں باغی ہوں —————

جواو :- (ڈرتے ڈرتے) ہنس نہ لو یا رک کوئی پریشے گا!!

آواز :- (دباہری سے) میں باغی ہوں ————— میں باغی ہوں ————— میں باغی ہوں —————

(چلا جاتا ہے)

پہلی :- (نفرت سے) پچھنے ہوئے، یہ ٹھیکے صاحب کی تعریف؟

- جواد :- درست ہے، ہمارے ایک دوست ہیں۔
- شیم :- رہے پروائی سے، فلسفہ کے طالب علم ہیں۔
- ذکی :- رہنمائی سے، پرنٹ بال بہت اچھا لکھتے ہیں۔
- دوسری :- رنگ آکر، آپامیری طبیعت گھبرا رہی ہے، ڈاکٹر صاحب کس وقت آئیں گے؟
- پہلی :- (جواسے نرنگی سے) بتائیے ڈاکٹر صاحب کہاں گئے ہیں؟
- ذکی :- (انتہا کرنے ہوئے) ایمان سے مذاق چھوڑیے، کسی وقت سنجیدہ بھی ہو جایا کیجئے۔۔۔
- پہلی :- (نقرش سے) میں کتنی ہوں آپ۔
- ذکی :- (بغیر وجہ دینے) اللہ قسم آپ کے ٹیلیفونوں نے میری بری گت بنائی ہے۔ آپ محلے کی نزاکت کرا بھی تلک بھی نہیں سب چھوٹے بڑے مجھے شبہ کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔
- پہلی :- (غصہ سے) آپ مجھے بتائیں گے یا نہیں؟
- شیم :- (جوا کے کان میں) بنا رہی ہیں!!
- جواد :- (شیم کے کان میں) بھی کجگفت بڑی۔
- ذکی :- (جوا دی رکتے ہوئے) ابھی تو چچا میاں مریجو نہیں تھے۔ وہ کچھ عرصے سے شکار پر گئے ہوئے ہیں درنہ۔۔۔
- جواد :- (دیکھ مے ناؤ بھر کر) اناہ۔۔۔ شکار؟ کیا بات ہے شکار کی۔ (آہستہ سے شیم کے کان میں) مجھے کسی بتایا ہے کہ لڑکیوں سے اگر شکار کی باتیں کی جائیں تو چپس جاتی ہیں۔
- پہلی :- (دھچلا کر) میں کتنی ہوں۔
- جواد :- (بغیر پروا کے) شکار۔۔۔ کبھی اپنے شیو شکار کیا ہے؟
- پہلی :- (دست کرتے ہوئے) خدا کے لئے آپ خاموش رہیئے۔
- جواد :- (اُسی انداز میں) شیر کا شکار۔۔۔ یعنی ایک مرتبہ میں تنہا سی، پی کے جنگلوں میں شیر کے شکار کو نکل گیا۔
- شیم :- (جوا کے کان میں) ارے ریاض کے سناے ہوئے تھے اپنے سانہو ٹانگ رہے ہو؟
- جواد :- (شیم کے کان میں) چلنے وڑہاں تو۔۔۔
- ذکی :- (سنبھادی سے) ایمان سے آپ میں کبھی نہیں۔ ہم سب سے کوئی بھی باگل نہیں ہے میں آپ کو نفین ولا۔
- پہلی :- (رنگ آکر) وہ تو ظاہر ہی ہے۔
- جواد :- (توجہ اب ایک دفعہ میں اتفاق سے اکیلا جنگل میں نکل گیا۔ جنگل میں بڑی چیل پہل تھی۔ گیدڑ مختلف جگہوں پر پڑا پچھل گئے بیٹھے تھے۔ بندر اچھٹے، بانجھی، جھینے سبھی جھولا جھول رہے تھے۔ ایک طرف لوط باں سلوا دی بیٹھے پھر رہی تھیں۔ میں نے اپنے قریب کھڑے ہوئے لکڑ بڑے پوچھا: کھو بھی، بات کیا ہے؟ بڑی دو نفین ہیں؟ ڈیسے قعب سبولا۔
- ”کیا آپ کو خبر نہیں، ہمارے حضرت بابوشاہ سلامت، شہنشاہ شیر بر کے ہاں اس صیغی کی عمر میں بڑی مفتوں اور آرزو

کے بعد ولی عہد پیدا ہوا ہے۔ میں اگلے نکل گیا۔ اب کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے مسند پر فقید براق چاندنی کا درخشاں تھا ہے اور شیر صاحب کا دیکھ کر گھبرا اٹھے، دھنک لگے، رابعیات مخریام پڑھ رہے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی اچھکھکے ہوئے ہٹے تپاک سے ملے۔ اور اپنے ساتھ مسند پر بٹھایا۔ ہاتھ داندھ دھولے، عام سے فارغ ہونے کے بعد اصرار اور کی باتیں جو گائیں پوچھنے لگے۔ ”آپ کی بدون کس بور کی ہے؟“ میں نے عرض کیا کہ جی بارہ بور کی ہے کہنے لگے۔ ”اس سے صرف بیرون کا شکار ہو سکتا ہے آپ یہاں کس ارو سے آئے ہیں؟“ میں نے ہاتھ بانڈ کر کہا کہ اگر جان کی امان باؤنی تو عرض کروں۔ بولے ”کھو“ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا کہ آپ کے شکار کی خاطر وہ نہایت تنگید کی سے آئے۔ میرا ہاتھ کپڑا اور فریکے نیچے میں لے گئے۔ پھر اپنی چھاتی پر سے بال پٹاتے ہوئے کہنے لگے ”جان حاضر ہے، شمشت با رہیے“ میں بہت نادام ہوا، ان کے قدموں پر گر پڑا اور ہٹے ہوئے کہا۔ ”وہ اس عالم دانی کی قسم کا شیر بر آج تک نہ دیکھا نہ سنا“ پھر —————

دوسری :- رہے قابو ہو کر آیا، انھیں چپ کرادو۔ ان کی کوا اس اب میرے لئے ناقابل برواست ہوئی ہے۔

پہلی :- رہے لی سے، خدا را ڈاکٹر صاحب —————

ذکی :- دائے بڑھ کر پٹے آپ بتائیے، ناپٹے ٹیلینوں پر ملنے کو کھانا نہیں؟

پہلی :- رہا رکے، کب کھا تھا مگر۔ —

ذکی :- (مسرت سے بے قابو ہو کر) اخاء۔ مان نہیں۔

شبنم :- (مزے لے کر) سبحان اللہ۔ —

ذکی :- رہا تھوڑا کر، ایمان سے میں زندگی سے بالکل بیزار ہوں۔

پہلی :- (بھڑائی ہوئی آواز میں) تو بھڑک کیا کریں؟

جو اد :- (سی آ میز لے کر) تجاہل و غافل تو مریچکا۔ — اب یہی حکم اور کیلے۔

دوسری :- وہیل کے کان میں، آپا میرا تو خیال ہے میں غلطی ہوئی ہے۔

پہلی :- (دوسری کے کان میں غلطی؟ وہ کیونکر —؟)

دوسری :- (کھانے کے کمرے کے دروازے کی جانب دیکھ کر) یہ ڈاکٹر صاحب کا گھر معلوم نہیں ہوتا۔

شبنم :- (جو اس کے کان میں) ارے جو ارے۔ خدا کی قسم وہ کھانے والے کمرے کی جانب کبھی رہی ہے۔

جو اد :- (روایت پیٹتے ہوئے) میں نے اس بد بخت دیوان علی سے کہا بھی تھا کہ دروازہ پھیرتے جانا۔

پہلی :- (دوسری کے کان میں) ڈاکٹر صاحب کا گھر نہیں؟ وہ کیسے؟

دوسری :- (دروازہ کی طرف اشارہ کر کے) دیکھو نا، سامنے کھانے کی میز پر بوٹ رکھے ہیں۔ مجھے تو یہ کوئی بورڈنگ ہاؤس معلوم ہوتا ہے۔

پہلی :- (جو اس سے غصہ میں، کہیں صاحب، کیا یہ بورڈنگ ہاؤس ہے؟)

جواد :- (بچوں کی طرح) تمہی نہیں۔ یہاں توڑکے رہتے ہیں۔

دوسری :- (چوڑا کر) ادنیٰ بیسے اللہ — کہاں آ پھنسیں، —

پہلی :- (دعوت سے) میں آپ سے پوچھتی ہوں کیا یہ ڈاکٹر ظہیر الدین کا گھر نہیں ہے ؟!

ذکی :- (لامعی کا اظہار کرتے ہوئے) کون سے ظہیر الدین ؟!

شیم :- (سر کھلاتے ہوئے) اپنے وہی بابر تو نہیں ؟!

ذکی :- (عجب سے) کون سے بابر، مائیں ؟!

جواد :- (بے پروائی سے) امان وہی ہماروں کے آبا ——— !!

پہلی :- (اسی انداز میں) اس گھر کا نمبر کیا ہے ؟!

جواد :- (طلبوں کی طرح) جی، پوئے آٹھ —

پہلی :- (دھجلا کر) آٹھ گراپکے دروازے پر تو آٹھ لکھا ہوا ہے ؟!

ذکی :- (بے پروائی سے) ممکن ہے کسی نے شراعت سے کھد دیا ہو۔

شیم :- (عجائزوں کی طرح) تو کیا ہوا۔ فیروں سے کیا فرق پڑ سکتا ہے۔

پہلی :- (غصے میں) آپ کو ہم سے ولی لگی کرتے شرم آئی چاہیئے۔ بیٹے برعاش ہیں آپ۔

شیم :- (عجب سے) برعاش اور ہم ؟ کیوں بھئی، یہ ٹھیک کہہ رہی ہیں ؟!

پہلی :- (بے پروائی سے) ہمیں ڈاکٹر ظہیر الدین کے ماں جانا ہے۔

جواد :- (گھبرا کر) لاجول ولاقوۃ۔ آپ کے پہنے کیوں نہ کہا۔ وہ تو سانس کے مکان میں رہتے ہیں۔

دوسری :- (راٹھے ہوئے) اٹھو آ پا، میں کہہ رہی تھی یہ کوئی —

جواد :- (لجاجت سے) میں معافی چاہتا ہوں، ہمیں —

پہلی :- (بے قابو ہو کر) بکئے مت ——— !!

جواد :- (سر نیچے کر کے) بہت خوب۔

پہلی :- (شیم کی طرف دیکھ کر) میں آپ لوگوں کو خوب سمجھتی ہوں۔

شیم :- (سر نیچے کر کے) بہت خوب۔

پہلی :- (دل بھن کر) دیکھ نہیں ہے میرے ساتھ بیا رہیں ہے۔ ورنہ ابھی پولیس میں رپٹ کھوا دو جی۔ آپ کو ہمیں اندر

بلانے کی جرأت کیسے ہوئی۔

جواد :- (دھجرائی ہوئی آواز میں) بولو ذکی، فلمی پیش پیش نئے۔

ذکی :- (دھچکاتے ہوئے) واہ، انھوں نے خود ہی فوٹیفیون پر کہا تھا۔

پہلی :- (تقدارت سے) ٹیلیفون پر کہا تھا ؟ کس نامعتول نے آپ سے ٹیلیفون پر کہا تھا ؟!

- ذکی :- (اسی انداز میں) آپ ہی ترقیبیں ۔
 دوسری :- (دیبا ر لہجے میں) چلو آپا میری طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے ۔
 جواد :- (سنبیدگی سے) جانیے جانیے ان کی طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے ۔
 پہلی :- (دھتے میں) بکے کنت ۔ میں ابھی ———
 شمیم :- (دکھیرا کر) ذکی بھائی ، بات کرو نا ، ب ؟ !
 ذکی :- (بھیرائی ہوئی آواز میں) یار ، میں کیا بات کروں ؟ !
 پہلی :- (دھتے سے بے قابو ہو کر) کیسے کہیں گے ، نا ہنبار ——— غضب خدا کا کھنڈن کو اتنا خیال نہیں کہ بیمار ساتھ آ
 اور انھیں عشق و شوق کی سوجھ رہی ہے ۔ کھو ہے کہیں گے ، نامراد ———
 دوسری :- (دروازے کی طرف دھکیں کر) چلو آیا ، باہر تو نکلو ———
 (دونوں لڑکیاں چلی جاتی ہیں)
 ذکی :- (راہینان کی سانس لیکر) ایک دن کے لئے کافی خطاب ہیں ۔
 شمیم :- (دبے پردائی سے) میں تو کتنا ہوں شکر کرونگی گئے ۔
 جواد :- (ذکی یار ، برے افسوس کی بات ہے کہ تم ابھی تک بالکل نا سمجھ ہو ۔
 (ڈیوڑھی میں سائیکل کی گھسنی بجتی ہے)
 شمیم :- (دبے پردائی سے) غالباً منور پھر آیا ہے ———
 (دروازے کے قریب بسکیاں بھرنے کی آواز سنائی دیتی ہے)
 ذکی :- (چوک کر) اے ، یہ روکن رہا ہے ؟ !
 شمیم :- (راگے بڑھ کر جھانکے ہوئے) منور ———
 جواد :- (رہنمائے ہوئے) انہیں ؟ !
 (دروازہ کھلتا ہے اور منور ہوتے بھتے داخل ہوتا ہے ۔
 منور ایک پیٹ ندر گٹھے ہوئے جسم کا ٹوچاں ہے جس کے
 ابرو ہمیشہ فحاشات سے تنے رہتے ہیں اور جس کی ناک
 ہمیشہ نفرت سے چڑھی رہتی ہے کبھی کہیں اس کی
 نگاہوں میں گوریلوں جیسی چمک نظر آتی ہے)
 ذکی :- (دیبا سے پرچنے ہوئے) کیوں بھی ، خیریت تو ہے ؟ !
 شمیم :- (مخاطب ہوئے ہوئے) منور ——— ؟ !
 جواد :- (دعجب و سراپکی سے) آخر بات کیا ہے ؟ !

- منوہر :- دوست ہوئے کچھ نہیں کچھ —
 ذکی :- (اصرار کرتے ہوئے) نہیں، کچھ تو ضرور ہے۔
 جواو :- (اتجا کرتے ہوئے) بتاؤ تو سہی تم کوئی غیر ٹھوڑی ہیں؟
 شمیم :- (تسلی دیتے ہوئے) کو، گھبراؤ نہیں —
 منوہر :- (روتے ہوئے) میں بیشیت ایک ماغی کے سائیکل پر ڈا جا رہا تھا کہ رستہ میں مجھے ایک عورت نظر آئی
 پیچھے سے جان معلوم ہوتی تھی۔ بچاری پسینہ میں بڑی طرح شرابور تھی۔ نہ جانے کہاں سے پیدل چلی آ رہی تھی۔
 مجھے بڑا ترس آیا۔ پوچھ بیٹھا۔ آپ اتنی دھوپ میں پیدل چل رہی ہیں مانگ میں کیوں نہیں بیٹھ جاتیں؟ بولی۔
 ”بیٹا اگر تمہیں کوئی مانگ ل جائے تو مجھے بٹھا دو۔“ (جذبات سے بے قابو ہو کر زور زور سے روتے
 ہوئے) جب میں نے یہ مشافہ وہیں سے واپس آ گیا۔ —
 جواو :- (عجب سے) کیوں؟
 منوہر :- (اسی انداز میں روتے ہوئے) اس کی عمر ساٹھ سال سے اوپر تھی۔
 شمیم :- (عجب سے) مگر تم تو اپنی نانی اماں کے ہاں رہ کر پوسٹے جارہے تھے؟
 منوہر :- (اختدارت سے چیخ کر) نہیں، میں اب نانی اماں کے ہاں رہ کر پوسٹے کبھی نہیں جاؤں گا۔ ہاں —
 ذکی :- (ہجراتی سے) اور تمہارے ماموں؟
 منوہر :- (ہچکچاہٹ بھرتے ہوئے) میں اپنے عرب الے ماموں سے بھی نہیں ملوں گا۔ ہاں —
 جواو :- (بے پروائی سے) چلو نہ سہی۔ مگر مچھوں سے یہ آنسو تو پونچھ ڈالو۔
 منوہر :- (رومال سے ناک صاف کر کے) جواو؟
 جواو :- (پیارے سے) کو کو؟
 منوہر :- (روتے ہوئے) مجھے ایک دوستی اور بہانہ مل جائے گی؟
 جواو :- (تسلی آمیز لہجے میں) ضرور۔
 منوہر :- (قدرے سنبھل کر) اور تمہا کو بھی؟
 جواو :- (اسی انداز میں) کیوں نہیں —
 ذکی :- (رہا دھجے لہجے میں) مگر منوہر میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم اس وقت تنہائی کے خواہشمند کیوں ہو؟
 منوہر :- (پھر روتے ہوئے) میں کچھ سوچنا چاہتا ہوں۔
 شمیم :- (عجب اور پیار سے) کیا؟ ایمان سے، یہیں بھی بتاؤ؟
 منوہر :- (وقفہ بعد) میں سوچنا چاہتا ہوں کہ اس وقت مجھے کیا سوچنا چاہیئے۔
 ذکی :- (بے قابو ہو کر) عجب! اللہ قسم یہی اس وقت ہم بھی سوچنا چاہتے ہیں۔

جواو :- (تسلی آمیز لہجے میں) اگر ہم چاروں اسی کمرے کے کونوں میں پڑ کر سو جائیں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہ ہوگا منور :-
 منور :- (دھڑائی آواز میں) نہیں ———
 جواو :- (نوکر کو پکارنے ہوئے) دیوان ملی ———!!
 (نوکر داخل ہوتا ہے)

نوکر :- (آواز بلند) جی صاحب !!
 شمیم :- (رنگ آکر) اسے آہستہ بولا کرو، تم سے کئی بار کہا ہے۔
 جواو :- (بے پروائی سے) ذکی اور شمیم صاحب کی نیکیوں، میرے اور بخاری صاحب کے تہمدے آؤ ———
 نوکر :- (جالتے ہوئے) بہتر ———

(چلا جاتا ہے)
 شمیم :- (تھاپی لیکن اس صوفے کو پرے رکھا و دیشینے کے لئے ٹھوڑی جگہ تو ہو جائے۔
 ذکی :- (بیٹھتے ہوئے) دو چار ٹکے بھی منگو لیتا ہاں ———

————— پردہ —————

تعجب طلب

شوکت تھانوی

مجھے اس وقت جو عقدہ آ رہا تھا یہ مفت کی وہ قسم ہے جس کا تجزیہ کرنے کی ہیئت کوشش کی اور کبھی کامیاب نہ ہو سکا۔ کچھ سمجھ ہی میں نہیں، تا کہ یہ عقدہ اتفاقات کی فعلیت پر آتا ہے یا اپنی بیجا رگی پر۔ اور ایک عجیب بات یہ بھی ہے کہ میں ان لوگوں کو نہایت حق سمجھتا ہوں جو اس قسم کے موقعوں پر بھی شغل ہوتے ہیں، نہ سمجھتا ہوں کہ میں بلکہ حسب سہولت میں بھی سکر ایٹ اپنے لبوں پر ایسے بیٹھے رہتے ہیں، جھلا یہ بھی کوئی بات! شائستگی لینے کے لیے جب سینہ بدین ہوں چکے۔ سینہ بدین کے تھے کس پئے اور کثرت اتھ میں سے کہ باہر جانے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ بائش شروع ہو گئی۔ تاہم یہ ڈرامہ پڑ پانی پھر گیا۔ پھر سے برسے، ٹیٹ کو پریس میں کس دیا اور ٹیٹ کیا کہ چل آج اپنی لاپرواہی میں یہ خوش گوار موسم بسر کریں گے سلگنیت ڈوب لیا۔ پڑھنے کی عیال آٹھائی اور لاپرواہی میں پہنچ گئے جہاں چاروں طرف الماریوں میں ان مصنفین کی کتابیں چنی چنی ہوئی تھیں جس سے کچھ نہ کچھ فہمیت رہ چکی ہے۔ ابھی رہے نہ کیا تھا کہ اس وقت کس مصنف سے شرف نیاز حاصل کیا جائے کہ ایک اور پہلی کتاب میرے نزدیک تو اس قسم کے موقع پر مفید و نفع دہنا اگر کام ہے تو یہ جملہ لفظ کوئی بیماری ہے۔ جس کا علاج کرنا چاہیے۔ اتنا اچھا موسم تھا کسی ٹھنڈی ٹھنڈی مریض آدنی تھیں۔ کیا سلف تھلے اس وقت معاملے میں، مگر اگر آؤد فلک کچ رہا رہے یہ بھی نہ دیکھ لیا۔ اب اندھیرے میں گم رہے وقت بنے بیٹھے ہیں اور یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ کریں تو کیا کریں۔ کچھ دیر روشنی آنے کا انتظار کیا۔ پھر مایوس ہو کر آرام کر لی پر لیٹ گئے۔ مگر کھائیں اس اندھیرے میں بھی اس طرف تھیں جہاں وہ لب شک رہا تھا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے جگمگا رہا تھا۔ گویا اگر اس طرف سے نگاہ ہرٹ گئی تو روشنی آکر وہاں چلی جائے گی۔ کہیں کیوں آؤں جب کہ قریب منظر ہی نہیں ہو۔ معلوم نہیں کتنی دیر اسی طرح گم رہے کہ بجایک خس کے عطر کی جھین جھین خوشبودیں پھٹی ہوئی ایک دھندلاوا آئی۔

آداب!

سانسے ایک قانون مجرم ہاں اس کی ترتیب اور رنگوں کے امتزاج میں پورا اسلوب قیلے کڑی تھیں۔ میں چونک کر آنکھ کھڑا ہوا اور نواد رضا خان کو تعظیم دیتے ہوئے پوچھا کہ اس کی تلاش ہے آپ کو؟

خاتون مجرم سننے اپنی خند لگی میں ایک چوڑا سا ہنسنے لگی کہ تے ہرے فرمایا عجیب!

میں کہہ رہا تھا اگر کسے کے بعد موعول کرنے ہی والا تھا کہ مختصر یہ: اخلص عجیب نہیں ہے، کہ وہ خود لوہاں ٹھیں عجیب بات ہے تپ

کی لاپرواہی میں میری کتابیں موجود ہیں اور آپ مجھ کو مانتے نہیں۔ کاش ڈاکٹر کا میرے ساتھ ہوتے یا کم از کم دانش ہی ساتھ ہو تو کتنا لذت کی دسم

توا دہو جاتی؟

ہیں ایک دم چمک پڑا۔ آپ... آپ... جواب... جواب امتیاز قریبیں؟
عزیز جواب نے میری دھماکا سے لطف لیتے ہرے کہا: کان کیا کر اب بھی پہچان لیا۔ آپ مجھے معزومی حراوت سے بچے
انسان معلوم ہوتے ہیں۔ آپ نادانی کا سینہ دھجکاہاتے ہیں؟

عرض کیا: "مازنی اور بل روٹی الگ الگ کھانے کا اتفاق ہوا ہے۔"

محترمہ جہان نے فرمایا: "انٹاس" سینڈویچ تو کھایا ہی ہوگا۔

عرض کیا: ”جی نہیں انسان کا زودہ العبتہ لھا چکا ہوں اور انسان کے کجاو بھی منکھے ہیں

وہ بڑی سچی لڑکی تھی۔ مجھے دکھ ہوا کہ کاش میں نے نارنگی کا پتہ اس کے سینڈوچ کھا کے ہوتے، میں اسی سلسلے میں سعادت میٹ کر نے بی کو فتح کر دیتا۔ وہ ٹھوس چیز اور کھوکھلے حرف متوجہ ہو گئیں۔ اس بار یہ تھے چھپے گیسوں کے آسمان پر سبز رنگ کا چاند دم بخود ہے۔

کائنات ایک عظیم سکوت اور خوفناک انجمن میں دوبارہ گرہ لگی ہے۔

اور میں نے خدمت سے - تہیکار - اس لیے کھڑا رہا ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا ہے کہ میں نے ناجائز اور انصاف کے سیدھے حق نہیں لٹا۔ میں اپنی آفتوں سے اب اس خدمت کو رہنے دے گا۔ لا انتھا کو خیر جواب سے فرمایا صحیح یہ بادل چھٹ جائیں گے اور ایسا ہی بھول جائے گے دھتے ہوئے آسمان پر باجی کہہ گا کشتی آفتاب بگ پر نہائے گا۔

میں نے احمقوں کی طرح کہا: جو خدا کو منظور ہو!

مترجمہ جناب نے، فرمایا: ”اور پھر وہی ٹہرے راستہ کی دوپہر ہوگی۔ آپ کے مکان میں کوئی فرانسیسی دیوہیکو ہے جس سے پتہ چلے گا کہ وہاں آفریں اور متین کا لغزہ دیکھنا ہے۔“

میں نے عاجزی سے سر جھکا کر کہا: شاید ایک اور پاکستانی دریغ ہو جس سے ایشیا تو ایشیا، لاہور بھی مشعل مظہر کا ہے۔

معتز مرے فرمایا یہاں نیلگوں جیٹم جنوں کے ازار کے جگر تراش سے دل دھتے ہیں زیادہ سے وہ معاملہ ہے کہ اوصوں کی پیچھے سے کان بڑی آواز سنانی دے، اڑا سمان کا لنگ ایسا ہے جیسے بشتے کا کھیت لہبا، باور سمندر سے جس کی گہری نیل چادر کچھ ہو، اور یہاں پتے ہوئے سہیل کی نکلتے، ہے، دلچسپیوں کی سوئی سوئی ہائیں، تعبیروں کے شغف بھی کیا سیر میں شغف میں آتے ہوں۔

میں نے بڑی مستعدی سے کہا، ”جی نہیں تھیگر لڑکے۔“ سے ایک۔ کلا میل اس مزید خانے میں بی بی بی جانے گا۔ نہایت خوش اور
 جھینگل میں، بعضی تہنا گاتے ہیں، کبھی کوہ میں اور مات کو عید تک اپنے راگ چیر دیتے ہیں۔ ان کے دوا گانے سنتے سنتے ہیں اور کسی کام کا
 نہیں دیتا۔

مقررہ حساب۔ پنجہ جس سے جو کو دیکھتے ہوئے کہا: ورنہ آپ بھی آدمی تھے کام کے۔ ہم میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جنہیں نونق کے ساتھ صحیح انداز کا کہا جاسکتا ہے:

بہس نے بغیر سمجھے نہایت برقوقنی سے کہا "دوست مرزا! آپ نے!"

عالمِ غفر مر حجابِ میری جلے و تو قی کو تار لگائیں اور راہِ راست مجھ سے سوال کیا۔ آپ اپنے کتب خانے میں میری کتابیں کیوں رکھتے ہیں؟

عرض کیا: پڑھنے کے لیے؟

کچھ سمجھ میں نہ آیا کیا جواب دیں۔ علی الحساب عرض کر دیا: دلچسپی جو ہوتی ہے پڑھ کر؟

وہ سوال کرنے پر تکی ہوئی تھیں کیا دلچسپی ہوتی ہے؟

عرض کیا: یہی کہ — گویا — میرا مطلب یہ ہے کہ خوب ہوتی ہیں آپ کی تصانیف!

مگروہ شخص نے: انی نہ نقین: کس اعتبار سے؟

عرض کیا: ہر اعتبار سے؟

لکھنے ٹھیں: مثلاً جغرافیائی اعتبار سے —

گہرا لکھ دیا: جی اور کیا —

وہ اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے بولیں: میں اپنی سب کتابیں واپس لے جانا چاہتی ہوں۔ آپ فی الحال دوسری کس لکھنا کیجئے۔

اور دانستہ چربن مایا کیجئے۔ اس سے آپ کے احساس میں بامیدگی پیدا ہوگی کتاب مینی کا شرقی ابھی قبل از وقت ہے۔ جی چکے تو پڑھنے اور پڑی ہے۔ غذا کا خاص خیال رکھیے۔ صبح ناشتے میں دھالی چٹنا مک لکھی کا کریں، تین اونٹ لیوں کا رس، تین مٹاؤ اور سات موگہ بھیاں — کھانے میں سیب کا بھرتہ —

میں سیب کے بھرتے کی ترکیب پوچھنے والا ہی تھا کہ وہ غائب اور اندری سے ان کی تصانیف بھی غائب۔

میں بے تحاشہ اس دیکھنے کی طرف: دوڑا جو روسی یا فرانسیسی توروں کی رعنائی پاکستانی بھی نہ تھا۔ گرا بھی جھانک ہی رہا تھا۔ کوئی کھانے اور

کی آواز نہ پہنچا دیا۔

”اسلام دیکھ؟“

دوہرے جسم کے ایک صاحب جیناک لٹائے پان لٹائے، اٹھ میں دیر بزمہ دبانے موجود تھے۔ میں نے دسنا کہا: ”علیکم السلام؟“

وہ صاحب لیٹر کی رسمی تعارف کے برائے: صحیفہ ادنا وادشر لیت زروشت میں عورت کے حقد و ناموس کی بڑی تائید کی گئی

ہے۔ تہم الا بڑی میں عورت کے حقین غلام اور حسن باطن دونوں کے لیے کچھ اصول علم فراست اور دنیا فز کے لحاظ سے مقرر تھے —

مروجہ ہو کر عرض کیا: درست فرماتے ہیں حضور۔ مگر جناب کی تعریف ہے۔

وہ بہتر رعائنا انداز سے بولے: آپ کے دھانے کی ساخت سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی راز کو چھپانے کے اہل نہیں آپ کو

معلوم ہونا چاہیے کہ شیریں رزاد کی محبوبہ چالیس صفات جمال میں سے اتالیس پر حاوی تھی، دھانہ کی ساخت کی وجہ سے رازداری کی اہلی نہ

تھی۔ مگر حسن و اخلاق اور وفا داری کے اعتبار سے وہ بھی اس قدر عمدہ تہ بھی کہ جب اس کا شرہ ہر خسرو پر ویر نقل کیا گیا اور شرہ دیا فرماں دوا ہوا

تو اس نے خود کشی سے پہلے اپنے بال کھول دیئے۔ نازک نازک اکتوں سے نازک سینہ پوخا نہ براغا و قسم کی ضربیں لگاتے لگاتے تھک کر تھک ہو کر

آغوش طلب انداز میں گری۔ مگر شیرہ کے ساتھ رشتہ ازدواج منظور نہ کیا —

عرض کیا: اور فرار داس نہ مانے میں کہاں تھا؟

جلے پردا ہی سے بولے وہ — سرگشتہ خوار رسوم و مقہور تھا۔

ماجرے سے عرض کیا: میں اپنے دھانے کی ساخت کے باوجود آپ کے نام کو راز میں رکھنے کی کوشش کروں گا۔
ایک تکیا بڑا بان کا رکھا یہ بھانکتے ہوئے پرے ایک جھوٹے دھڑے سے دیر بار کسے کے بلے اٹھانے بنائے دیتا
ہوں۔ نیاز۔

میں نے جڑم کو کہا: نیاز۔ مولانا نیاز۔ نیاز فقہودی۔ شباب کی سرگزشت۔ کیرپہ اور ساہلی۔
نیاز صاحب نے میرا سلسلہ کام متعلق کہتے ہوئے کہا: آپ نگار کے مزیداد ہیں؟
عرض کیا: تھا تو مگر اب نہیں ہوں:

وہ جواب دے بغیر بڑے فرسٹ اید سے آپ کے پاس؟

عرض کیا: تھی تو میرے اہل کی گیری میں نہ تھیں، لہذا بچا ڈالی۔

کہنے لگے: شہزاد نیاز؟

عرض کیا: بچے چھا کتے تھے، اسے انہیں لم کر دی۔

مولانا نے مزید: نگارستان اور تاملات نیاز بھی آپ کے کتب خانہ میں رہنا چاہیے۔ میں اپنا شمار نگارستان شہر کو راہ میں
کرنا نہیں چاہتا۔

اور وہ ایک تھکے کے ساتھ مجھے چھری کے دستے سے اپنی کتابیں اداری سے نکالیں اور قبل اس کے کہ میں معذرت کروں
وہ تیزی سے نکل گئے۔ میں دروازے تک ان کے پیچھے پیچھے گیا تا کہ نگار کا جھوٹا دے کر لائی کروں۔ مگر قبل اس کے کہ میں ان کو آواز دیتا، کسی نے
مجھ کو آواز دی۔

”مشر۔ اسے جیت۔“

گھوم کر دیکھا۔ ایک مرد قد اچھے بالوں والی ایسی خاتون کھڑی تھیں جو اپنے چہرے کی ساخت میں سکونیت بیٹھے تھیں۔ میں نے
گردن کے خم سے ان کو تسلیم دی۔ وہ اپنے اچھے ہوئے بالوں کے گرداب حرکت میں لا کر بولیں۔ میں نے آپ کو پروفیسر اور اہل کالجی کے بارغ
کے اس خٹکے میں غائب دیکھا ہے جہاں تیل پائیاں بچائی جاتی تھیں اور ادا بچاں تھام کے بھی لگتی تھیں۔

میں نے جڑم کو عرض کیا: آپ کو فطرتی تو نہیں ہو رہی ہے؟

خاتون عزم بولیں: آپ کو بان کاٹنے کی شکایت تو نہیں ہے؟

عرض کیا: جی ہاں نہیں۔

خاتون عزم نے وثوق سے حکم دے دیا: پھر تو انڈی سائٹس کا ہونا مزدوری ہے یہی شکایت ڈوہلی کو بر لگی تھی۔ وہ ایک مذہبی
مذاہرے کی ہے جو برابر ادا رہتی ہے۔

سینچلہ کر پوچھا: خدا کے لیے تپا چکے آپ فرقہ العین حیدر تو نہیں؟

وہ بولیں: ہوں تو نہیں مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ترائی کا وہ ایشیئہ برے ذہن سے نہ نکل سکے گا جہاں مزاحمیرے ایک لاکھ لکھی
میں سے روافض کر کے کہتا ہے: ہیندو نے بچے کا مس ہا؟ اور انسانی مالی جس کے گھر کے آگن میں ہم بیٹھ کر امرور کھاتے تھے۔ یہ انڈا جو مجھے منڈے

خاموش پانیوں کے کنارے کنا۔ بے لے جانا ہے سینٹ کو لہا اگر مجھے میرا داغ واپس لی گیا تو میں تندرے سامنے جا بیٹھیں جہوں کی:

میں نے سہرہ دی سے کہا: اللہ نے جانا تو ضرور واپس لی جائے گا۔ مجھ نے جو اس سے واپس امید دار۔

وہ اچانک بولیں: آپ کے پاس میرے کبھی مہتمم خانے ہے؟

میں نے کہا: جی ہاں!

وہ خوش ہو کر چلیں: اسی میں ہے۔ میرا داغ اسی میں ہے۔ گلاؤ میرے دوست اس خوشی میں اوناٹا لنگ رازن گاؤ۔ جگہ
تھہرنا جو میں کبھی کوئی لوں۔ لا اؤند کبھی۔ خدا کرے اس نے شادی نہ کی ہو۔ اب اس کے سارے پائلہ صل ہو جائیں گے۔ اور دینا بیٹے
اس یقیناً ACCEPT کرے گی۔

میں بد وقتوں کی حرت ان خیرتہ کو دیکھتی ہی رہ گیا۔ وہ تیزی سے المادی کی حرت گئیں اور میرے بھی صند خانے کی جلد نکال کر
خوشی سے اچھل کر بولیں: یقیناً اسے لوٹ۔ گڈ ٹائٹ۔ اب میں اپنے سنٹر کو لوٹ جاؤں گی اور سیدھی وفاق لانا شروع کر کے سہ جاؤں گی۔
گڈ۔ ٹائٹ۔

میں سوچتا ہی رہ گیا کہ وسیعہ السلام کی حرت گڈ ٹائٹ کا جواب دیا ہے اور وہ ایک حرت گڈ ٹائٹ کا جواب نہیں دے سکتا ہے کہ اسی
وقت یہ۔ انوں اور ان کے ہیں آئی۔ تو مجھے سلام کہ میں کہوں: وسیعہ السلام!

میں نے گھڑا کر دیا: وسیعہ السلام!

اور اب جہاں سے دیکھا تو پتہ کوسہ پہنچ گیا۔ لہذا سارے گڈ ٹائٹ پر صدمہ دی اور محنتوں سے اچھا دیکھا جہاں پہنچے ایک لاکھ دو سو تیرک
بہایت ڈانٹ سے گڈ ٹائٹ سے رہے ہیں۔ تھو کو یہ ان دیکھ کر بہت متحاش سے بولے: وسیعہ السلام۔ اور اب سوچیں یہ بات کہ دو بروں کے
عیب دیکھو تو چھپے اپنے عیبوں۔ تصور بھی کر لیا کہ وہ اگے گئے تو نہ مات کو بیروں اور گناہوں سے بچائے گا اور نہ یہ ہم کو بچے گا۔ اور جب
خدا کسی بندے پر رحمت کی نغز فرماتا ہے۔ تو وہ آدمی دل کا بادشاہ بن جاتا ہے۔ پس میں دل کا بادشاہ بن گیا ہوں اور تمام ب کو بھول کی
بادشاہی تقسیم کرتا ہوں کہ تم بھی میری حرت پہنچے گناہوں کو یا دکر دو اور خدا سے تو بہ کر دو اور خدا سے کہو کہ: اے خدا تو بھی مسلمان ہو جا۔
میں نے ان بزرگ عظیم کے تقدس سے دل ہی دل میں رز کر کہا: حضور تشریف تو رکھیں تاکہ میں نہ بت یا آئیں کریم۔ کوئی چیز بہت
کر سنے لی سعادت حاصل کر سوں:

بزرگ عظیم نے خندہ پیشانی سے فرمایا: آن میری چھوٹی لڑکی کو تو باؤنے آئیں کریم بنائی تھی میں خواجہ محل کے بالا خانے میں تیرنا
لام کر دیا خدا کہ یہ پاشا آئیں کریم لے کر آئے ہیں نہ پہنچا اس سے مجھے غم ادا جاتا ہے میں نہیں کھاتا۔ وہ چمچے گئے تو حسن اوجا ب۔ بے کونے
اور لہا کہ کوڑی دل شکھی ہو گی۔ چکے لیجئے۔ میں نے پوری مشنری عمارت کر دی اور کہا: ہر جہاں بادشاہ من در شکوہ حرت انداختم۔

میں نے نوش کر لیا: میں آپ کو پہچان گیا۔ حیات خواجہ حسن نظامی:

خواجہ سادب نے فرمایا: آپ تو مجھے اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے عید کا چاند بنوں اور جیسے آپ لکھنے ہی دوسلہ ہیں ہوتا کی

کو عید کر سٹ!

میں نے عیدت سے کہا: آپ کی تعانیف نے آپ سے اتنا قریب کر دیا ہے کہ مجھے واقعی آپ سے مل کر اتنی ہی خوشی پہنچا ہے

خواجہ صاحب نے فرمایا: ”اگر میں آپ کی خوشی کا ہمارا نہیں گیا ہوں تو اپنے کو مبارک بالکھن سمجھتا ہوں ورنہ خوش اعمال لوگ تو خوش رہتے ہی ہیں۔“

میں نے عرض کیا: ”نہیں خواجہ صاحب میرے دل میں آپ کی تدر و منزلت کی وجہ مرث یہ ہے کہ آپ بلا کے سخت کوئی ہیں“ خواجہ صاحب بوسے ڈال کر کہتے ہیں: ”حکیم کہتے ہیں: تجربہ کار دوست کہتے ہیں: خواجہ ہاؤ کہتے ہیں: کشتی شاہ کہتے ہیں اور غویرا دل بھی کہتا ہے کہ دماغی غنت کی کثرت ان بیادوں کی بنیاد ہے۔ لیکن اگر میں کام ترک کر دوں تو کام بھی مجھے ترک کئے گا۔“ میں نے کہا: ”غیر یہ باتیں فرمائی دیں گی خواجہ صاحب۔ مگر مجھے ایک بات پوچھ لینے کیجئے کہ کیا یہ واقعہ ہے کہ آپ نے حاجی برنارڈوشا کا ناکھڑا کیا تھا؟“

خواجہ صاحب نے نہیں کہا: ”اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ میری جبریل و کس نغمی کی وفات کے بعد میں نے مرثیہ حاجی برنارڈوشا کا ایک سالانہ انواروں میں لکھا کہ آئندہ ساری دنیا میں مذہب اسلام ہوگا۔ میرا عقیدہ ہے کہ جادوچ برنارڈوشا جتنی نغمی تھے“ میں نے حیرت سے کہا: ”جی ہاں کیا فرمایا۔“ جادوچ برنارڈوشا اور جتنی نغمی؟ خواجہ صاحب نے فرمایا: ”جی ہاں۔ میں نے اپنے غفلت کی وجہ بھی اس طرف مبذول لائی ہے کہ وہ اپنی مجلسوں اور دنیا و دل میں میری جبریل و کس نغمی اور جادوچ برنارڈوشا جتنی نغمی کے نام لے کر کیا دیا کریں“

میں رنج و رافقا کہ جادوچ برنارڈوشا جتنی نغمی کا ناکھڑا رکھا تھا اس طرف مبذول لائی ہے کہ وہ اپنی مجلسوں اور دنیا و دل میں میری جبریل و کس نغمی اور جادوچ برنارڈوشا جتنی نغمی کے نام لے کر کیا دیا کریں“ میں نے کہا: ”جی نہیں اس سعادت سے ناشاد رہا ہوں۔“

کہنے لگے: ”تو غنوی نماز و مزدور پڑھے۔ یہ غنوی مسجدوں میں نہایت ہے۔ یہ غنوی کہ سے کم ستر و مرتبہ سترہ آدمیوں کو ضرور دکھائیے اور نہایت“

میں پوچھنے ہی والا تھا کہ اگر اٹھارویں مرتبہ میں نے کسی کو نہ دی تو کفارہ کیا دینا ہوگا۔ مگر خواجہ صاحب نے کہا: ”اے اللہ سے میری ایک کتاب نکال لی جو میں نے سرتیج ہمارے سرور کے نام معنون کی تھی خواجہ صاحب نے خوش ہو کر کہا:۔“

”آپ نے بہت اچھا کیا۔ سرتیج اصل میں اردو کے سرتیج تھے۔ وہ پروانہیں بلکہ اردو کے پرتیج تھے“

اور ایک سرتیج ہمارے سرور و قوال ہیں جو نے میرے غفلت میں آگئے۔ خواجہ صاحب مجھ کو رگل نشانی فرما رہے تھے: ”اردو ہمدی زبان ہے۔ جس سے مراد ہے ہمداد و مسلمان“ ”ہے ہمداد و مسلمان۔“ ”دو ذوق مل کر ہلے ہم۔“

میں عقیدت کی شدت سے ہلکا کر رہ گیا اور خواجہ صاحب نے اس کو ہلکا مہٹ کو دکھ کر ارشاد فرمایا: ”آپ پریم راگی سے قوالی مزدور بنا کیجئے۔ اس سے آپ کے قلب کی وقت میں انجمادی کیفیت پیدا ہوگی۔ اور مکتبی سے طبیعت میں ایک متغیر صفا جب اللہ پیدا ہو جائے گا“

میں پریم راگی کا پڑ لٹ لٹنے کے لیے پھسل اٹھا نے کو بھلا ہی تھا کہ خواجہ صاحب ٹانچہ ہر سار پریم راگی کے بعد اللہ سے ملے کر رخصت ہو گئے اور ان کی جگہ ایک لکھنواں جڑاوا پانچھٹیک لٹکے نظر آیا۔ مگر یہ قوال پانچھوٹا بھی تھا۔

”پہچانا مجھے؟“ اور یہ کہ میرے پرچم سے ہونے پر منہل سے ایک بھول بنا دیا اور پھر اس بھول کی قیاس بناتے ہوئے کہا ”مجھے آپ سے ملنے کا شوق تھا۔ بہت شوق تھا۔ اور ہر روز ملنے کا ارادہ کرتا تھا۔ میں آپ کو اپنی تصویر دکھاتا ہوں۔ میری تصویر دیکھ کر آپ مجھے آسانی سے دیکھ سکیں گے۔ بات یہ ہے کہ اصل تصویر ہے اور میں خود کچھ نقلی سا ہوں۔ اس تصویر میں جو میری آنکھیں ہیں وہ آپ کے دل و دماغ پر چھا جائیں گی۔ بات یہ ہے کہ یہ تصویر سالت ہے اور میں ذرا ہلکا ہوں۔ اس تصویر کو دیکھنے یہ تصویر بھی خاموش ہے اور یہ ایک کسے کیجئے بڑی بڑی آواز اس آنکھیں بھی خاموش ہیں۔ بہت سی عورتیں یہ تصویر دیکھ کر سنا بناتی ہیں۔ مگر تنہا ہی میں چلنے سے ان آنکھوں کو جو جیتی ہیں۔ اسی چراغاں کی کثرت نے میری نظر کو دور کر دیا ہے اور میں ایک نکلانے ملا ہوں۔“

میں حیرت سے ان حضرت کی باتیں سن رہا تھا مگر وہ نام پوچھنے کی ہمت ہی نہ دیتے تھے، کچھ ہی چلے گئے۔ آپ یقین کیجئے کہ اگر میں عورت ہوتا تو میرے ہلکے پیاز کی رنگ کے کفٹ لگے مل کے ہمیں دوپٹے کے قیچے میرے سینے کا احاطہ یقیناً چھینا لھاتا اور جو کوئی غبر کو دیکھتا ایک دھکے کے ساتھ اس کی نظریں پٹ جاتیں۔ مگر میں یقیناً ایسی چال نہ بھناتا کہ لوگ اونچی زبانی کہتے کہ میرا بیٹا ناشوق مجھے نہیں لیا مگر وہ پھنسا جس کی سوتوں کا گہرا ڈھنکا ہوتا۔ میں اس طرح کبھی نہ سوتا کہ بڑی بڑی آواز اس آنکھیں نہ ہوتے ہی دایاں بازو ایک طرف دھکک جاتا۔ میں نے تنگ آ کر پوچھا ”حضرت! پہلے یہ تو بتا دیجئے کہ میں کس صاحب سے بھلا ہوں جناب کا اکرم ہمارا؟“

وہ صاحب عجیب مرزا داغ سے ہوئے۔ بہت سے نام ہیں میرے۔ مثلاً ”گورشت“۔ ”لھول دو۔“

میں ایک دم چیخا۔ ”اے اے اے۔“ غرض صاحب — سعادت حسن منٹو — اردو ناول کا اثر داسے لٹا پڑا — خود زیب داستان اور انشا و نثار۔“

غرض صاحب نے میری بد مذاقی سے بدلہ مڑا ہوتے ہوئے کہا۔ اب ایسی باتیں نہ کیجئے کہ مرزا نشتر آؤ جائے۔ میں اس وقت مغویہ اور برآمد کی برقی لڑکیوں کے متعلق غور کر رہا ہوں اور میرے ذہن میں صرف پھر لے جسے پیٹا بھر رہے ہیں۔ میں سوچنے لگا۔ یا اللہ اس کا ذہن کس دای کو دکھایا جائے، مگر وہ بوسے ہی رہے۔ اور کیوں جناب ان کو مغویہ کیوں کہا جاتا ہے انہیں اغوا کیا گیا۔ اغوا تو ایک بڑا دھانگ ضل ہے جس میں مراد اور عورت دونوں شریک ہوتے ہیں۔ یہ تو ایک ایسی کھائی ہے جس کو پھانسنے سے پہلے دونوں دھنوں کے درمیان کھینچنا آئے ہیں۔“

میں نے صفائی پیش کی۔ غرض صاحب، خدا گواہ ہے میں نے اس کا نام اخڑایا ان عورتوں اور لڑکیوں کا نام مغویہ نہیں رکھا ہے۔ وہ تمہی سے بوسے۔ تم — تم تو شکاری ہو۔ صحنائی، انشا و نثار اور شاعر طرہ اصحا کے نکلا میں مصروف ہیں۔ میں تم سے نہیں ملنا چاہتا۔ تم انسان کو مہند اور مسلمان کہتے ہو۔ تم کہتے ہو ایک لاکھ مہند و مرزا ایک لاکھ مسلمان ہو۔ تم یہ نہیں کہتے کہ دو لاکھ انسان مرے۔ تم سمجھتے ہو کہ ہندوؤں سے مذہب نکلا۔ جیسے ماستے ہیں۔ جیوتوت — چکر فرید دیکھا نہیں اور بن بیٹھے انشا پورا۔“

میں نے منانے کی بہت کوشش کی بلکہ وہ دھکیا کہ پرمٹ ملے کہ امرتسر جاؤں گا اور دو چکر فرید دیکھ آؤں گا۔ مگر غرض صاحب تو اس بیگانی سے چلتا ہے جیسے غبار کا بڑا بیگانہ۔ میں دل ہی دل میں لکھتا ہوں کہ وہ دوا سے تھک جا کر دوا بس لوٹ آیا اور لوٹ کر ایک دم چولہا پڑا۔ بڑی بڑی آنکھوں کی ایک سادہ اور معصوم گراہ سادہ اور معصوم سے دیا وہ خیف و ڈر اور خائفوں میں کو کر دوزی نے لڑکی بنا دیا تھا۔ کھڑی ہوئی نظر آئی اور وہ سلام کے بجائے عورت سلوادی۔ میں بھی مسکونے کی کوشش میں دانت نکال کر دیکھ وہ عزم و ہوس — آپ بڑے علمی آدمی معلوم ہوتے ہیں کثرت

آفت ہو جانے سے گھبرا جاتے ہیں۔ آخر چاند کی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی کا تصور کیوں نہیں کر لیتے، آسمان پر چلتے ہوئے یہ روپے دیتے آخر کس کام کے ہوئے ہیں؟

میں نے نہ ہانسنے کیوں یہ بے ہودہ بات کہہ دی۔ میں سمجھا نہیں آپ کیا فرما رہی ہیں :
 وہ مل کر بولیں : ”بھئی سنتے سمجھو۔ ایک ذرا کچھ لیتے تو جہانے کیا ہو جاتا یہاں تکیہ بھی تو نہیں ہے کہ میں اپنا سر اس پر رکھ دوں۔
 میں نے خدا کا شکر دیا کہ آج ہی صبح اس کمرے سے گاؤ تکیہ اٹھوایا ہے۔ میں سوچ رہا تھا اور وہ میرے جواب کی منتظر تھیں۔
 آخر خفا ہو کر بولیں : ”اب کچھ بولو بھی۔ یہ انخفا دردم تو نہ کر نہ رہا جائے۔ جی جانتا ہے کہ سسکت سسکت کر روؤں۔
 میں نے جلت جلت کر بٹھتے ہوئے کہا : ”میں پر سوچ رہا تھا کہ آپ کون ہو سکتی ہیں۔“

وہ بولیں : ”میں کئی چولھے میں۔ پہلے اپنے متعلق تو غور کرو کہ کون ہو سکتے ہو۔ میں نے غلطی کی جو تمہارے پاس آئی۔ وقت
 اپا بھول کی طرح گسٹ گسٹ کر مل رہا تھا۔ میں نے کہا چلو ان حضرت سے مل آؤ۔ یہاں آکر بیڑا دھڑکنا بڑا دل غراپ سے ڈوب گیا۔ اب یہاں سے
 جاؤں گی اور سنی اور اپنی باتوں کے جیسے تھے پڑی کراہتی رہوں گی۔ میں کسی پر بوسہ کھول کر کہے جان سی لیٹ جاناؤں گی اور میرا چہرہ جہاں سے
 بالکل خالی ہو گا۔“

میں نے پہچان لیا اور گویا لغو بن گیا : ”آپ — اجرو مردود۔“

وہ میری حماقت پر مسکرا دیں : ”جی نہیں — غصہ بڑھ سکتا رہوں۔“

میں نے کہا : ”وہ ایک ہی بات ہے۔ عہد ایک ہی ہے خواہ کا دھمازا صفر ملی کا ہو یا محمد ملی کا۔“

یہ ایک سر پر لٹا ہوا باب روشن ہو گیا۔ گھبرا کہ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ روشنی اپنی تھی۔ کتابوں سے الماریاں بھر پوری تھیں اور تمام
 مصنف غائب تھے۔ کاش کہ آجیں غائب ہوتیں اور مصنف موجود ہوتے —

دوست کے نام

پطرس

از لاہور۔

اسے میرے گراچی کے دوست !

چند دنوں پہلے میں نے جناب میں۔ تجر چھٹی نہ کر رہی تھی غریب زندگی ایک نہیں قائم ہوئی سے جو دنیا فتنہ تصویروں کی
مناشوں کا اہتمام کیے گی۔ خوش سو۔ پر محرم نہ ہو سکا کہ اس نے کہتا رہا کہ ان اچے جوان ہیں، لیکن میں نے جانتا ہوں کہ آپ کو ایسی باتوں سے ہٹانے کا
شوق ہے اور مدت سے ہے اور آپ ادب اور آداب کا ذوق صحیح رکھتے ہیں۔ اس لیے مجھے بتایا ہے کہ آپ اس میں غور نہ کیا کہ یہ ہوں گے
بلکہ جب نہیں کہ یہ انجین آپ کی صاف کا قیود ہو۔ اور آپ ہی نے اپنی جائزہ دینے سے اپنے خوش مذاق لوگوں کو ایک نئے پرمیں لایا ہو
جنہیں شوق تو ہے لیکن آپ کا مشاقت نہیں۔ یہ سچ کہ بہت ایمان ہوا۔ کیونکہ اپنے جنہوں کی ایک نہیں بنا کر آپ کو مزہ دے۔ ایک گوند
تقویت قلب نصیب ہوگی۔ ورنہ تنہا کا ہوں اور تصویروں سے باز رہنا نہ کی باتیں کرتے کرتے اسٹریٹ ٹھاک ہوتا ہے۔ ذوق سیر کی تہائی
پر تنہائی کی وحشت اور تھکی ناپ آئے کتنی بہت۔ انسان دیر نہیں تو میں دناش مزہ دے جو جانا ہے۔ اور صاحب کا ایک منہ مٹا فیر بدل کر
پیشے کوئی چاہتا ہے کہ مفرد ہو تو ساتھ رکھوں مازوں کو میں۔

میں اسے دوست کیا اس کام میں کی۔ نے آپ کی عزت نہیں کی؟ کیا کسی مقامی اخبار نے جس میں نہیں کھا کر پاکستان پر اہل کا
ناز کیا ہے۔ آپ جیسے خوش خروں کو مٹوئی اور نقاشی کا شوق چڑا ہے؟ کسی نے جیسے ہو کے شہر دیا اور۔ بیڑ کی سازگی کا فقرہ
”میں نہ؟ کسی ستون پتھر پر درمیں آپ وہیں کے لئے سبب ہیں وہاں کرتے ہوئے آپ کے جو ادب اور تعریف کوئی پر لفظ نہیں کہ؟ اور
آپ پر کفر اور ترک اور اعدا کا فتورے لگا کر لوگوں کو آپ کے خلاف نہیں لکھایا؟ اور کچھ نہیں تو کیا کسی شخص سمجھتے ہیں انہیں نے ہمدردی
اور تہذیب کے رکھ رکھاؤ کے ساتھ آپ کو یہ مشورہ نہیں دیا کہ برہنہ وار

بہاگ پرنٹنگ فورس کو تحسب نیز است؟

اور ہاں فرض ان باتوں سے کٹنے کو کیا مضامین کے موقع پر کسی نیم تعلیم یافتہ مجمع نے جو تنہا ادب آپ سے برتری کا دھڑلہ
سے۔ آپ کی آزمائش کا ٹھکانہ نہیں لکھایا؟ اور جب آپ چپے ہوئے فقرائے تو آپ پر قہقہے بلند نہیں ہوئے؟
اگر آپ کو ایسی مزاحیہ پیش نہیں آئیں تو گراچی سے ایک تھک کوئی جگہ ہوگی یا پھر ہیرادی اور وہ ولی پاک رہی ہوگی۔ اور

دعاؤں، قہاری سمندر، اور قہار سے مزاروں، قہار سے سرائوں اور قہار سے لٹس بر۔ دولا پر جہاں جہاں تہا سے ماتھ ابجد کے فکھ کینیں گے، اسات کا نام روشن کریں گے۔ اور جو نزا کیں اور دعا تیں اور دعا تیاں انہوں نے صدویں میں پیدا کی ہیں۔ انہیں سننے نہ ہونے دیں گے تاکہ جہاں کسی کو مہادی تحریر نعرہ آئے دہ جہاں سے کہ یہ مسلمان کا لکھا ہوا ہے۔ جس قوم کا لکھا ہوا ہے جس نے دنیا میں خوش حالی کا مرتبہ لکھا۔ اور جواب بھی اپنی ستم آ رہی پر نہ کرتی ہے۔

یہ کہنے سے آپ کیونکر باز آئیں گے، لیکن کیا آپ کی بات کوئی سنے گا؟ کیا کراچی میں میں ایسے لوگ؟ خونِ عیضہ کی انہیں ڈڈا آپ نے بنا لی ہے۔

اور پھر خوش دلی سے نوافیت دے گی۔ لیکن کیا آگے بھی جڑے گا؟ تصدیقوں کا ذکر بھی کیجئے گا؟ اجاڑ دیں کھانا تاکہ آپ تصدیقوں کی ناشیلا انتہام کو بے ہوش کر دے۔ یہ سب سے نواسے دوست و قریبی نے اپنی خبریت سے مطلع کر دئے گا کیونکہ اگر کوئی سب سے آگے نکلے گا تو نہیں تو آپ کو۔ بڑے انتہا جسامت سے کام لےنا چاہئے گا اور عرب نہیں کہ لوگ آپ کا حال دیکھ کر جرات پکڑا کریں۔

ہوا سے خاک میں اس وقت کوئی بھی ادارہ ایسا نہیں جسے آپ صبح معنوں میں آرٹ عکس نہ لیں۔ لاہور، یونیورسٹی کے نصاب میں آرٹس، تعلیمات کے معنوں کے شامل تھا۔ لیکن یہ ایک مخلوق کا شغل تھا جس میں تفریحی سی معنویت، تفریحی سی معنویت اور کچھ صنعت اور دست کاری سب چلی چلی تھی۔ لیکن یہ ایک ایسا معنوی اور ایک زمانہ متفرق سمجھ کر صرف تفریح کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ یہ معنوں اس میں اس میں موجود ہے۔ لیکن کب تک؟ فی الحال تو ایک بورجوا میں خاتون میسر میں جو یہ معنوں پر حاکم ہیں وہ کہیں ادھر ادھر ہر جگہ ہیں اور کوئی عورت ان کی جگہ دستیاب نہ ہو تو یہ تصور بھی ایک ہوجاے گا۔ کیونکہ تفریحوں کی پڑھانے کا کام خدا غلام کسی مرد کے سپرد ہوتا تو نزلے نہ آجائیں گے اور یہ اس معنوں کا حلیہ بھی صرف کے ساتھ بدل رہا ہے۔ موسیقی تو نہ کر کے لے کر دینی گئی ہے۔ کیونکہ ہوتو بھلا کسی کی جان کو اس کی بیٹی اس کے دستوں سے یہ لکھو دیکھو کہ کہیں لگنے کا شوق ہے؟ باقی رہی تصویر کشی تو ایک لمحے دالے اگلے دن سنا گئے کہ ایک کالج نے لکھو ایسا ہے کہ ہماری لڑکیاں جانوروں کی شبکیں نہ بنائیں گی چنانچہ تجویز ہو رہی ہے کہ تصویر کشی کی شوق صرف سبب ناشائستگی، مرتبان یا پھر ۔۔۔ دیکھا۔ جھلک پر کج جائے۔ اس پریکٹک ادھر جگہ بحث ہوئی تھی کہ مقدم زمین میں آیا۔ ایک روشن خیال موسوی صاحب نے صرف اتنی فوجیں دی کہ ہاتھ کا بھی ہوئی تصویر پر تو ہرگز جائز نہیں۔ فوٹو ایبٹ جائز ہے۔ وجہ یہ بتائی کہ فوٹو میں انسان کی شبیہ جو بہرہ ویسی ہی ہوتی ہے۔ ہاتھ سے تصویر بنائی جائے تو اس میں جھوٹ ضرور ملانیت کر جاتا ہے۔ کسی نے کہا کہ فوٹو میں تو کسی حرفتوں سے لی جاتی ہے اور بعض فوٹو گرافر بھی تو بے فن ہیں۔ ہوتے ہیں جواب ملا۔ کہ جاہلوں کو اور حماقت سے کام لیا جائے تو فوٹو بھی جائز نہیں رہتا۔ عزیزان کہ فوٹو ایک ایسی ایک فوٹو گرافر کا کام حق اور اداسنی کا آئینہ دار ہے جو ہمارے کچھ لکھنے کے باہر چارہ آنے میں تصویر کی کچھ ہے۔ یہ حال تو جاننا اور شاید کا ہے۔ باقی رہے جھلک رہا، دیکھا تو دیاں جی ایک ایک دن کوئی ان کو ان میں معنوں کے جھوٹ "گورڈن سے جا بے گھر" اور آپ چینیے اور سکتے دوجا ہے کہ کہ یہ تو دین لوگ ہے لہذا تو بہت بڑا — ہے اور آپ کے اکتوں سے تصویر فوٹو کر جاتا تو ڈال جائے گی۔

ان حالات میں چنٹائی کے جینے کا امکان --- کم ہے۔ کوئی بات سچی بھی ہوتی ہے اس کی تصویر دل میں؟ وقت تک

تو جنوں کی انگلیاں معلوم ہوتے ہیں۔ اور پھر انسانوں کی تصویریں بنانے سے بھی تڑوہ نہیں چمکتا۔ اور صرف مروی نہیں بلکہ عورتیں بھی غزال چیشم، سینہ چاک اور بعض اوقات حرم کے بند تک دکھائی دے جاتے ہیں۔ گویا نین سے کچھ کہنا مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ چمٹائی کی تصویریں میں تھسے، دودریاں، پچھلے بہت ہوئے ہیں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کون سا دوسری پیلے کے لباس کا حصہ ہے یا ناقہ کے ساز و سامان کا۔ لیکن چمٹائی کی دوسری سے ایک سہولت مزدور نقرائی ہے وہ یہ کہ دے دے کے ہی ایک ہمارا مقصد ہے۔ اسے دفن کر دیا جائے تو یہ وہ بانو، اتھم جائے گی۔ اور ہماری مصروفی ایک ہی مریض سے ہوش کے لئے پاک ہو جائے گی۔ باقی وہیں مغلوں کی قدیم تصویریں، یا ایرانی مصوری کے قدیم نمونے جو چند لوگوں کے پاس بطور تبرک محفوظ ہیں یا جن کے انڈیا آئین کے عجائب خانے کی قفس کے بعد پاکستان کو مل جائے گی اہم ہے۔ تو ان کو کسی اور ملک کے متغیر کردار و اصول کیسے جاسکتے ہیں کیا کراچی میں لوگوں کا یہ خیال نہیں؟ اگر نہیں تو کراچی سب سے اہم تھک کوئی جگہ ہوگی۔

لیکن یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ کراچی کو کونسا ایسا بڑا ہے اور کون سے ٹم شدہ برہمن میں واقع ہے کہ وہ دگر کے سہیل کی کوئی لہر دیاں تک نہ پہنچ سکے؟ آپ کو تعمیر اور ترقی کی سوجھ بوجھ ہی ہے۔ لیکن یہاں تو تخریب کا دور دورہ ہے۔ ماضیوں سے ملے چھین کر اس کی جگہ قائم اور موقوفہ آپ کیونکر رکھ دیں گے؟ آپ کوئی سامراجیان پیدا کیجئے آپ کے پیچھے کے پیچھے وہ تخریب کی راہ اختیار کر رہا ہے۔ لوگ جس چیز کا مفروضہ لگا کر اٹھتے ہیں۔ سب سے پہلے اسی چیز کا قانون کر بیٹے ہیں۔ آپ کیجئے کہ رمضان کا احترام واجب ہے تو لوگ تو یہاں جانا بھرا کر باندھ دیں وہ دھن دھن پھرتے ہیں کہ کس کا منہ کا لاریں۔ آپ اسلام کی دعوت دیکھتے تو قاتل شروع ہو جاتا ہے کہ کس کے دوسے لگائیں؟ آپ جیال کی قلعین کیجئے تو لوگ مرنا مارنا، عورتوں کے منہ پر حقوٹنے لگتے ہیں۔ اور بچیوں پر اپنا بھانڈا زور آڑتے ہیں۔ مجھ کو تو سکھا دی ہے اور مجھے زندگی

اس دور کے طے ہیں کیوں ننگب مشکائی؟

ایسے فیض و منصب کی ضایاں ہیں آج تک کہیں آرت چنپا ہے؟ آرت کے لیے تو ضبط اور انس اور استحکام اور فراخ لازم ہیں۔ یا پھر کوئی دلو کوئی آرتنگ کوئی مفتی جو دلوں کے دروازے کھول دے اور ان میں سے شر و من غم و دلگ کے طوفان اچھل چھن کر ہر جگہ پھریں۔ کیا کہیں آرت ایسے بھی چنپا ہے کہ ہر جگہ کے کو دولت اور اقتدار کی ہوس لے اڑھا اور ہرا کر لکھا ہو اور ہر چوڑا اپنی بے بضاعتی کا بدلہ ہر ہمارے اور ماہر سے لینے پر تلا ہو۔ نہ کوئی اقتصادی نظام ایسا ہو کہ ہر چیز کی پوری قیمت اور ہر قیمت کی پوری چیز نصیب ہو۔ اور لوگ خالق کے عرسے نجات پا کر خدمت کی گویوں نہ آتھ جھپک میں۔ نہ کوئی ملحقہ نام لیا کر لوگوں کو اس دنیا میں دنیا میں کہیں بھی جڑا، دمنائی امید یا خوف ہو۔ زمست کا کوئی ایسا جھوٹا آئے کہ دشمنوں کی تہنیاں مست ہو کر کھویں اور پتوں کی سربراہت سے آپ ہی آپ نئے پیدا ہوں۔ نہ عافیت کا کوئی گوشہ ایسا بچاں آپ کا فن کا معنی ہو کر بیٹھا جائے اور آپ کے لیے تصویب بنانا ہو۔ نہ آس پاس کوئی ایسی زالی بسی ہو جہاں شاعر غریب شہرین کو گھومتا پھرے اور لوگ اسے دیوانہ مہنی سمجھ کر اسے ہٹ لینے دیں۔ فنون لطیفہ کی کہیں تو آپ نے بنالی ہے۔ لیکن ڈنڈا بول کر کہیں پہلا کام اس انجن کا یہ نہ ہو کہ چند تصویریں کو محض خالق اور حریاں کہہ کر جلا دیا جائے۔ چند مصوروں پر اداسی اور بے دینی کی تہمت لگا کر انہیں ذلیل کیا جائے۔ یا پھر ان کے اہل ایسے لوگ مضطر کیسے جاتیں جو ان کے ہنر کو کھردری سے کھردری کر سکیں پر پھینک دیں اور ان پر دایح کر دیں کہ جس پر تڑی کا انہیں دوسرے تھا۔ اس کا دور اب گزر گیا۔

میں اہل مزدور کس رویش خاص پر نازاں پائیکل رسم و رہ عام بہت ہے
 میں جانتا ہوں کہ آپ آرٹ کو محنت نہیں سمجھتے اور اسے محض امارت کا دل بہلا دینے سمجھتے۔ آپ ایسے نہیں کہ آپ کو
 جاندار ہی کی تصویر پر اصرار ہو۔ یا محض تصویر ہی پر اصرار ہو۔ حسن کو اختیار ہے۔ جہاں وہ ہے خوشگیاں ہے اختیار کرتے۔ صرف یہ ہے کہ زندہ
 رہے اور امیر عزیز۔ چھوٹے بڑے۔ اونٹنے اعلیٰ سب پر اپنی بخششیں اور ذاتی فرمائے۔ ایک زمانہ تھا کہ آرٹ اور صنعت و حرفت کا آپس
 میں جوں و امن کا ساتھ تھا۔ آپ تو اس مہذبہ میں کو آپس لانا چاہتے ہیں۔ تاکہ آرٹ کا جلوہ بچوں کے کھلونوں میں۔ کسان کے تھریں
 سیدانی کے لٹھے کی پھری میں۔ پنہاری کے مٹی کے گھروں میں۔ غرض زندگی کے ہر گوشے میں زندگی پائیں جو لیکن جو نفعی نفعی شمعیں ہیں
 دیاں مٹا رہی ہیں۔ انہیں ہی بجھا دیا گیا۔ تو انھوں انسانوں کی دنیاں ہواں تک تارک پڑی ہیں۔ وہ کیسے بگاڑ گئی کی پکی کرچی ہیں
 جو آپ کے ہم ملیں ہیں انہیں اس بات کا احساس ہے؟ اگر ہے تو انہیں بتا دیجئے کہ آرٹ کی ایک سربراہیت کے بیٹے انہیں اس بیگانہ
 تبسم ماحول میں کئی صحرا چھانسنے پڑیں گے۔

فرشتے نیست کرد پر ہوسے آن عند غم نیست ۔ دوزخ مولود جہاں کم نہ شب و ناز نیست
 اگر یہ محض میرا دہم ہے تو اسے دوست پھر گراچی سب سے۔ تاکہ تھک کوئی بل۔ جو کی تو چہ اسے دوست ہم سب کو۔ ہاں
 بل بیچنے یا گراچی کو اتنا کو بیچ کیجئے کہ ہم سب اس میں سما جائیں۔
 گراچی میں آپ نے بہت کچھ صوبہ پیدا کر لیا ہو گا۔ آپ کے اعضاء اور اصابتہ دانے کے سب لوگ نمان ہوں گے۔
 جسے بڑے اسروں سے آپ کی طاقت ہو گی۔ بڑے بڑے ادباء اس وقت کا قرب نصیب ہو گا۔ ان سے کہئے کہ۔

منزل ماہروں دوزخ بھی دشوار بھی ہے

کوئی اس قافہ میں قافیہ سرا نہ بھی ہے؟

برج بانو

کنیالال کپور

یہ برج بانو کی داستان ہے۔ برج بانو کون ہے؟ اس کے فیصلہ، غریب نام کی کیا وجہ ہے؟ یہ تمام سوالات جس آسانی سے کیے جاسکتے ہیں، شاید ان کے جوابات اتنی آسانی سے نہ دیئے جاسکیں تاہم کوشش کروں گا کہ آپ کو برج بانو سے روشناس کرا سکوں۔ برج بانو ایک خوب صورت عورت ہے جو پاکستان سے بہت سا تھکدوستان میں آئی ہے۔ کیا میں اسے انکار کے لایا ہوں؟ نہیں، صاحب میں تو سنا شریف واقع ہوا ہوں کہ خوب صورت عورت تو کبھی کسی بصورت ہواؤں کو بھی انکار نہ کرنا گوارہ نہیں سمجھتا ہوں، کیا اسے محبت محبت ہے؟ یہ ذرا پیڑھا سوال ہے۔ اگر آپ یہ پوچھتے کہ کیا مجھے اس سے محبت ہے؟ تو میں یقیناً اس کا جواب اثبات میں دیتا۔ وہ آج کل کہاں ہے؟ وہ میرے گھر میں رہ رہی ہے۔ اسے برج بانو نہیں کہتے ہیں، یہ سوانہ مجھ سے کئی اشخاص نے کیا ہے۔ آپ پہلے شخص نہیں ہیں۔ یہ کہیں۔ وجہ بیان کیے دیتا ہوں۔ اسے برج بانو کا نام اس لیے دیا گیا ہے کہ اس کی ماں ہندو اور باپ مسلمان تھا۔ آپ کو یقین نہیں آتا؟ ہنر تو یہی ہے کہ آپ مجھ پر اعتبار کریں۔ ورنہ مجھے ایک ایسے شخص کی حسد پیش کرنی پڑے گی جو ایک بار لینڈ بنو گئے۔ جسے اس عورت کی پیدائش کے سبب ملامت معلوم ہیں۔ اسے میری ماں اس عورت سے عشق ہے۔ آپ کہیں گے کہ یہ عورت لوگوں سے عشق کو کرتی ہے؟ آپ نے خط سمجھا۔ یہ لوگوں سے عشق نہیں کرتی تو کون اس سے عشق کرنے پر مجبور ہو جاسکتے ہیں۔ دراصل اس عورت کی زبان میں کچھ ایسی مرموزی کشش ہے کہ جو شخص بھی اس کی باتوں کو سنتا ہے دل و جان سے اس کا گردیدہ ہو جاتا ہے۔ آپ میری ہی مثال لیجئے۔ میری عمر تیس برس کی تھی جب میں نے پہلی بار اسے ایک مجلس میں تین کونٹے ہوئے سنا۔ مجھے فوراً اس سے عشق ہو گیا۔ تیس برس کی عمر ہمارے ملک میں جہاں انسانوں کی اوسط عمر صرف پچیس سال ہے عشق کرنے کے لیے نہایت فیروزہ مند ہے۔ لیکن میں مجبور تھا اور معرفت مجھ پر ہی کیا منحصر ہے۔ لکن میں ایک فیض دین کا منتظر نہ ہوا کرتا تھا۔ وہ اس عورت کی زبان کے چمنار سے بڑھ کر ایسا مرثا۔ کرسادی مراس کا لائق اس کی زبان کے ہونے لیتا رہا۔ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اس عورت کی شان میں ایک رباعی کہی تھی جس کا ہر مصرع پانچ سو صفات پر مشتمل تھا۔ ہاں تو یہ عورت پاکستان سے میرے ہمراہ آئی ہے۔ لیکن چند دنوں سے اداس سی رہتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کچھ لوگ پچھلے چند دنوں سے اس سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ نہ صرف اس سے بلکہ مجھ سے بھی۔ کل کا ذکر ہے۔ ایک مجلس چوٹی والے پتھر تھی جو میرے ہمسائے ہیں۔ مجھ سے کہنے لگے: لا لاری یہ کیا جھاک ہے۔ آپ کے گھر کا ایک ایسی اورت رہتی ہے جس کا باپ مسلمان تھا۔ اور میرے کئی بے باؤں والے دوست مجھ سے بار بار

کہہ چکے ہیں: ”آپ خواہ مخواہ اسے ساتھ لے آئے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر سرحد پار کرنے سے پہلے آپ اسے سٹیج کی لہروں کی نذر کر دیتے“

میں جب ایسی باتیں سنتا ہوں۔ تو مجھے سخت رنج ہوتا ہے۔ لیکن برج بانو کے دلی پر جو گزندتی ہے وہ بیان سے باہر ہے یہ بیماری ہر روز جلی کئی سن سن کر تلک آگئی ہے۔ آج دوپہر کے وقت جب وہ ویو ویو میں بیٹھی ہوئی کچھ سوچ رہی تھی۔ تو میں نے اس سے کہا: ”برج بانو، میرا خیال ہے کہ تم پاکستان چلی جاؤ۔ یہاں یہ لوگ تمہیں رہنے نہیں دیں گے۔“

”لیکن کیوں؟ برج بانو نے چوک کر کہا۔“ میرا قصور؟

”تمہارا قصور یہ ہے کہ تمہارا باپ مسلمان تھا؟“

”لیکن میری ماں تو ہندو تھی۔“

”وادی کے معاملے میں ماں کو کوئی نہیں پوچھتا۔“

”یہ عجیب منطقی ہے۔“

”جہاں جذبات ہی سب کچھ ہوں وہاں منطق کی وال نہیں گنتی۔“

وہ اورد بھی اُداس ہو گئی۔ میں نے بھارتی ہوئی آواز میں کہا: ”برج بانو تمہیں اب یہاں سے ”اوشیہ“ چھے جانا ہوگا۔“

ایک لمحہ کے لیے وہ میرے منہ کی طرف دیکھتی رہی۔ جیسے میری بات اس کی سمجھ میں نہ آئی ہو۔ اورد پھر کہنے لگی۔

”اوشیہ کسی شہر کا نام ہے کیا؟“

”شہر کا نام نہیں۔ ”اوشیہ“ ہندی زبان میں ”مزدور“ کو کہتے ہیں۔“

وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی اورد کہنے لگی ”میری چنانی بھی ”مزدور“ کو ”اوشیہ“ کہا کرتی تھی۔“

میں نے پوچھا: ”تم خود ”کو“ ”اوشیہ“ کیوں نہیں کہتی؟“

”برج بانو نے طنز آمیز لہجے میں کہا: ”کہنے کی کوشش کرتی ہوں۔ لیکن زبان ”کو“ ماننے لگتی ہے۔“

”بس اسی لیے تمہیں ہندوستان چھوڑنا پڑے گا۔“

ایک ثلث برج بانو کے چہرے پر بغض و غضب کے آثار پیدا ہوئے اورد اس نے چہرہ کہا: ”ہندوستان میرا گھر ہے۔ میں اپنا

گھر چھوڑ کر کس طرف جا سکتی ہوں؟“

”تمہارا گھر پاکستان ہے۔“

یہ بالکل غلط ہے۔ پاکستان میری نژادت میں سے ہے۔ میرا اصلی وطن ہندوستان ہے۔ میں دہلی کے قریب ایک گاؤں

میں پیدا ہوئی۔ بچپنا جھوڑپری اورد شباب لال قلعہ دہلی میں بسر ہوا۔ مجھے ہندوستان کے شہنشاہ نے منہ دکھایا۔ دیوان عام میں مجھے سب سے اونچی

منہ پر سجا یا گیا۔ اورد جس وقت میرا ستارہ عروج پر تھا۔ کوئی بنگالی، گجراتی، سندھی، حیدر میرے حسن، میری عینک اورد ٹخنوں کی تاب نہ لا سکی۔

میں ہندوستانی ہوں اورد ہندوستان میں رہوں گی۔“

”یہ درست ہے۔ پرتو۔۔۔۔۔۔“

”پرنتوز“ کیا جلا ہوئی ہے جی۔ برج بانو نے شرارت سے کہا۔

”پرنتوز“ ہندی میں ”لیکن“ کو کہتے ہیں۔“

”ماں یاد آیا۔ میری ماں ہی لیکن“ کو پرنتوز“ کہا کرتی تھی۔

”تمہیں اب“ لیکن“ کو ”پرنتوز“ کہنا ہو گا۔“

”معاف کیجئے میں تو“ لیکن“ کو ”لیکن“ ہی کہوں گی۔“

”یہی تو تمہاری فعلی ہے۔ اگر ”لیکن“ کو ”پرنتوز“ نہیں کہو گی۔ تو تمہیں یہاں سمجھ کا کون؟“

”ہر وہ شخص۔۔۔۔۔“

معا ایک فعلی یعنی والا میری ڈیوٹی جی کے آگے ٹھہر گیا۔ برج بانو اپنا آخری فقرہ مکمل کیے بغیر کھڑی ہو جاتی ہے اور ہاتھ کے

اشارے سے ”فعلی“ والے کو بدلتی ہے۔

”فعلی“ کہا میں گئے آپ؟“ وہ مجھ سے پوچھتی ہے۔

کیا یہ فعلی کھانے کا وقت ہے۔ میں تم سے نہایت اہم باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ آج تمہیں فیصلہ کرنا ہے کہ تم پاکستان جاؤ گی یا نہیں؟“

”پہلے فعلی کھا لیجئے۔ اس کے بعد حضرتے دل سے آپ کے مشورے پر غور کریں گے۔“ اور وہ فعلی دالے کو مخاطب کر کے

پوچھتی ہے۔

”کیسی ہے یہ فعلی تمہاری۔ میرا مطلب ہے کچھ ٹھکانے کی ہے یا یورپی سی“

فعلی والہ کن انکھیں سے برج بانو کے چہرے کی حرکت دیکھتا ہے اور کہتا ہے ”اجی کیا پوچھتی ہیں آپ میری فعلی؟ میری

فعلی بے نظیر، لاجواب، شاندار۔“

بمقام بانو کے منعم ہوں پر مسکراہٹ کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ اور فعلی کھائے بغیر فعلی دالے کی تھیلی پر ہاتھ دوسے کا ڈٹ رکھ

دیتی ہے اور اس سے چلے جانے کو کہتی ہے۔

”فعلی دالا چلا جاتا ہے۔ میں اسے بیچنے کے لیے کہتا ہوں۔ لیکن وہ بدستور کھڑی ہے اور سکرا رہی ہے۔

”کیا فیصلہ کیا ہے تم نے۔ پاکستان جا رہی ہو نا؟“

وہ میری بات سن کر ایک سکھ دھما بھد کی لاری کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ”وہ دیکھئے“

میں لاری کی طرف نفرو ڈرتا ہوں۔ لاری کے فریم پر چمکے شہر آند دو میں کھلے ہوئے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے۔

دو دو دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں

خوش دہو اہل وطن ہم تو سزا کرتے ہیں

لاری نفروں سے اوجھل ہو جاتی ہے اور ایک چھا بڑی والا ڈور سے چھٹا ہوا لگی میں داخل ہوتا ہے۔ وہ ”چنا زور گرم“

بیچ رہا ہے۔

میرا چنا بنا ہے اعلیٰ اس میں ڈالا مرچ مصالحہ چنا لایا میں بابو مریدار چنا زور گرم

اب ایک انبارِ فروش لگی ہیں آتا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں دس بارہ مختلف اُردو روزنامے اور رسالے ہیں۔ برج بانو ایک اُردو روزنامہ خریدتی ہے۔ لیکن جو بھی اس کی پہلی نظر سرخی پر پڑتی ہے اس کا رنگ لہو پڑ جاتا ہے جلی صوفت میں کھٹا ہے۔ ”برج بانو اب ہندوستان میں نہ رہ سکے گی۔“

ایک لحظہ کے لیے اس پر گریا بجلی سی گرتی ہے۔ وہ دم سے زمین پر گرا جاتی ہے۔ لیکن میں بڑھ کر اس کا دامن تھام لیتا ہوں۔

دو چار منٹ ہم دونوں خاموش اور بہت کھڑے رہتے ہیں۔ اس کے بعد میں اس سے کہتا ہوں: ”مذکر وہاں تو کہیں پاکستان جانا ہی ہوگا۔“

وہ پھری ہوئی شیرنی کی طرح لڑک کر کہتی ہے: ”میں نہیں جاؤں گی۔ ہرگز نہیں جاؤں گی۔“

”لیکن حکومت نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تم....؟“

”حکومت کاؤن بنا سکتی ہے لیکن عوام کے فطری رجحانات کو نہیں بدل سکتی۔ جب تک ہندوستان میں قلعی والے سلکو ڈیوڈ

اور چٹا زرد گرم پینچے والے موجود ہیں۔ حکومت میرا ہال بھی بیکا نہیں کر سکتی۔“

”خدا کی قسم۔ بڑی عندی ہو تم!“

برج بانو مسکرا رہی ہے۔ اور میں قلعی والے کے الفاظ زیر لب دہرا رہا ہوں۔ ”لاحاب! شاندار! بے نظیر!!“

سفر نامہ جہاز بادسندی کا

شفیق الرحمن

بسم اللہ! دیارِ فرسانِ نعمت زنی علیہ خاتہ، نگینِ ترانہ، راست براست، ملائم و کامست، یعنی تذکرہ جہاز بادسندی مغلّی عزیز۔ اسے عاجو! خدا آپ کا بخیر کرے۔ مدتِ مدید و عرصہٴ بعید کا ذکر ہے کہ ایک سرپر کو ایک نوجوان شیعہ و نزار ذکر جسے نوجوان کھٹا بڑی خوش فہمی تھی کافی باؤس کے دروازے پر زندگی سے بالکل بیزار کھڑا تھا۔ نام اس دروازہ کا بجز بادخا نہ تخلص بندھی اور لقب خود۔ علیہ اس کا فائدہ زدہ تھا۔ اور سر کے بال ماڈرن خواتین کے بالوں سے بھی لمبے تھے تاکہ پر ایک شلستہ عینک زندگی کے دن توڑی تھی شیواں نے پہنتے جہرے نہیں کروایا تھا۔ بعل میں اس کے کاغذوں کا ایک پلندہ تھا۔ پوشاک اس کی ایسی تھی کہ گلننگ نہ ہوتا کہ اس نے پوشاک کو پہن رکھا ہے۔ مظلوم ہوتا تھا کہ پوشاک بے جواسے پہنے ہوئے ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ نوجوان بظاہر بظہے سے متعلق تھا۔

اس نے اپنی سائیکل مستحالی، ملازم کو اگلے روز بخش دینے کا وعدہ کیا اور مال روڈ پر ہوا ہو گیا۔ چوک کے باہر کو دیکھتے چلتا ہیں کہ کہیں جا پہنچا۔ ایک عالیشان محل کے سامنے اسے کچھ عجیب سی فینک ہوئی جیسے خیالات کی روانی میں دفعتاً الجھن پیدا ہو گئی ہو۔ چونک کر دیکھا تو پچھلے پیسے میں بلیک ہو چکا تھا۔ آثارِ کا دن تھا اور کانیں بند تھیں۔ یہاں تک کہ وہ محضات جو ایک پسپ اور بیکچر لگانے کا درسا سامان لے کر سائیکل دوسرے کھول بیٹے ہیں۔ اور پر وپاٹر کھلتے ہیں، غائب فلا ہو چکے تھے۔

انہوں نے محل کے دروازے سے ایک شخص ہاتھ میں کارآمد شے تھامے نمودار ہوا۔ اسے دیکھ کر جہاز باد کی ہینک مسرت سے چمک اٹھی، اس نے بڑھ کر کپ ہانگامی شخص نے دیدیا جہاز باد نے اسے کھینچا، مروڑا، کھولنے کی کوشش کی لیکن ناکامیاب رہا۔ اس پر وہ قانازیر ہو کر مسکرایا کہ اس کو پھر ایک جوڑی سیاہ کھٹی اور عمدہ نوکھوں سے مزین تھا۔ اور بولا۔۔۔ اسے مروڑا دل! مزید کوشش جھٹ ہے۔ کیونکہ یہ پیم نہیں ڈنڈا ہے۔

جہاز باد نے سائیکل ایک طرف رکھ دی اور محل کی جانب متوجہ ہوا۔ دروازے پر پر و پٹھا تو ہینک کے شیٹے صاف کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کھتا تھا۔۔۔ جہاز بادسندی بھگدن۔

ذرا قریب گیا تو مرغانِ فوج کی زمزمہ پر واز ہی دل کو بھانے لگی، ہزار و طوطی کی صدا آنے لگی، انواع و اقسام کی خوشبوؤں سے مدامِ عطرِ حارین گہ۔ فدا سی وید میں یہ طبلہ بجنے لگا۔ ریڈیو پر نغمہ دلدار اور رباب کی آواز خوش گافوں میں آئی۔ طبعِ لذیذ کی خوشبو آئی تھی۔ ماہ

توشواری کی صدفی عقل کی مدد سنا تھی۔ دیکھا کہ احباب بذلہ بیخ اور خانوں کی ذریعہ رنگ رلیاں مناتی ہیں۔ بھولیاں قہقہے لگاتی ہیں۔ جہاز باد سوچنے لگا کہ صرف خورد اور کلاں لافرتی ہے۔ مگر کوئی مجھ سا بے نصیب، بدطالع، بدبخت ہے، کوئی صاحب تاج و تخت ہے۔ اس مکان کے کلین پر لڑی عنایت ہے اور ٹیڈ گنا ہگار پر یہ غائب۔ یہ کسی شاہ خٹک باگاہ کا ایولین سپر تو آگاہ ہے، یا روضہ رضوان ہے۔ کہیں توبہ تو کہیں غلام ہے۔

ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس مرد قوی کو کچھ نے اکسینام دیا کہ صاحب مکان نے فرمایا ہے کہ ہمارا سلام بولو۔ جہاز باد خورد نے کہا ———— دیکھم اسلام اور رواشی کا قصہ کیا۔ مگر وہ مرد قوی پہل کئے لڑکے صاحب خانہ یاد فرماتے ہیں۔ جہاز باد سمجھ گیا کہ جو زہو صاحب خانہ کوئی باہر لغیات ہے۔ جس نے اتنی دور سے میرا تجزیہ نفسی کر کے خیالات بھانپ لئے ہیں۔ ایسا زہو کہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے۔ اچھی سوچ ہی رہا تھا کہ اس کو کچھ چھندر نے ہاتھ پکڑا اور اندر لے گیا۔ جہاں شاندار دعوت مستحقہ حیرت ہوئی کہ یا اہی اتنی خورد اور گھنڈن حسناں پیش، شورش و شنگل رشک گل رخاں فرنگ کیونکر ایک جگہ پر جمع ہیں۔ جہاز باد سندی کلاں بڑے نپاک سے ہلا اور گویا ہوا ———— ”اے معزز اچھی حضرت دیکھنے میں تو آپ انٹیلیجنٹ معلوم ہوتے ہیں۔“

جہاز باد خورد نے اثبات میں سر ہلایا۔ جہاز باد کلاں کی باچھیں کھل گئیں ———— ”الھولند۔ یہ خاکسار بھی انٹیلیجنٹ تھا۔ یہ سب شہزادیاں اور شہزادے ایسے ہیں جو انٹیلیجنٹ ہیں۔ ہونے والے ہیں ابھی تھے۔ آپ ان سے ملے۔“

سب خوب بھل گئے۔ مگر وہ کر لے۔ اگرچہ جہاز باد خورد گلدی سے بہت ڈرتا تھا۔ وہ عید کے روز چھپتا چھڑتا۔ تاہم ایک مہم جویم سی امپر پر اس نے بھل گئے۔ مگر وہ کر لے۔ لیکن جب شہزادیوں کا نمبر آیا اور اس نے سرخ لباس والی حسین شہزادی سے بھل گئے۔ مگر وہ کر لے۔ تو کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ وہ فوراً دو قدم پیچھے ہٹ کر بولی ———— ”آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔“

جب دونوں ہماز بادوں نے ایک دوسرے کا نام سنا تو کمال درجہ محظوظ بھی ہوئے اور محظوظ بھی۔

جہاز باد کلاں نے خورد کو ایک چھوٹا پیگ دینا چاہا تو وہ معذرت خواہی کرتے ہوئے گویا ہوا ———— ”یا پیر وہ شہزادی سعید نظر آتا ہے۔ غروب آفتاب سے پہلے دکن سے گریز کرنا چاہیے۔ البتہ میری وقت کی چیز ہے۔“

جہاز باد کلاں یہ تقریر سن کر دم بخود رہ گیا۔ عیش و عشرت کرنا چاہتا تھا لیکن شہزادوں کی طرف دیکھ کر ارادہ ہمتی کر دیا اور یوں ہلا

”سے باذاتی انسان پیر کا گلاس نوش جان فرما اور بار بار دروازے کی طرف مت دیکھ تیری سائیکل ہم نے مرمت کے لئے بھیج دی ہے ہواشائی کی کہ کہ وہ جام جہاز باد خورد نے پیا اور دوسرا اٹھینے لگا۔ جہاز باد کلاں نے اس کی طرف شفقت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا ———— ”اے نوجوان سلیقہ شعار ہم خوش ہوئے۔ لیکن یہ مت بھولیو کہ یہ خدا نے ذوالجلال کے ہاتھ میں ہے کہ ایک گندائے بے نوا کرتیہم زون میں صاحب دولت و جاہ کرے۔ اور قارون سے مالدار کو زور سے اشارے سے تیرا خاک و تباہ کر دے تو ضرور حیران ہوگا کہ کھینچیں ہوں تو کہ میرا آتش یہ فریاد دار بہرے جنہیں سمجھائی ہی دیتا ہے۔ یہ افغانی بیڑ تو غلام شدہ غم بھیج کر تھی ہے یہ پڑھتی تھیں۔ یہ سب کچھ ہیں بونہی نہیں ملا ———— ہم۔“

”واحد حکم نہ استعمال کیجئے۔“ ایک طرف سے آواز آئی۔

تمعات کیجئے، تو اس کے لئے مجھے کیا کیا معینتیں اٹھانی پڑیں۔ اس کا ذکر میں بھی سناؤں گا۔
مختل میں یکجہت کھیل سیکھی گئی تھی۔ کھڑی دیکھنے لگا کسی کو ضروری کام یاد آگیا۔ کسی نے کہہ دیا جان اٹھ کر
مہرے جموں گئے، کوئی بولا یہ کیا فی اسی مرتبہ جی ہے کہ زبانی یاد ہو گئی ہے جب سب چاکے تو جب از باد کلاں نے غور کے لئے
چٹھا گلاس اٹھایا، کتاب سامنے رکھے اور کلام کیا۔

جہاز یاد سندھی کا پہلا سفر

جشت اڈل جون بندھار کج

تاثریاسے ردو مہار کج

”اے میرے عزیز ہم نام تو نے ان شہزادوں کی جیٹا جی دکھی، حیرت ہے کہ تجھے کوئی ضروری کام یاد نہ آیا۔ یہ میری شخصیت
معلوم ہوتی ہے۔ نئی بوتل کھول اور خدا کی قدرت کا ناشہ دیکھ۔“

”اے میرے محنت جہ نام، ادھر اُدھر کی باتوں سے پرہیز فرما اور اپنا سفر بیان کر۔“

”یہ ان دنوں کا ذکر ہے۔“ کلاں گویا ہوا۔ ”مجھ پر یہ خاکسار نیا نیا جوان ہوا تھا۔ ان دنوں جے باد سندھی کھلتا،

خفا۔ بعد میں جے۔ بی۔ سندھی ہو گئی۔ اس علاقے پر کبھی اور جے۔ بی۔ سندھی جی تھے چنانچہ کلاں کا اٹھا ڈکھا۔ ناچر کو فونو لطیف فونو
بلڈرشناسی فونو حرب و ضرب، فونو جج تفریق میں غامضی شہر مرقع موسیقی میں وہ مہارت ملی کہ شہدہ سارنگ، شہدہ گلپان، شہدہ
گمرو حورج سب تجویز کا سکتا تھا۔ لیکن طبیعت میں اس بلا کی سادگی تھی کہ ایک بیٹھنے کو اسپیشل کتا سمجھ کر کھڑ لایا۔ اور کئی دنوں تک
ساتھ ساتھ لئے چلا جب غلی کا احساس ہوا تو ایک بیٹھ کے ہمراہ اسے رخصت کیا۔ سبب کے درخت کو بھی پہچان سکتا اگر اس میں سبب
گئے ہوں۔ درخت پھلوں یا پھولوں کے بغیر پلوے اور درخت میرے لئے یکساں تھے۔ نصیب دوستان طبل مورا تو طیب نے ایک کاغذ
پر کچھ لکھ کر دیا۔ پھر نے مجھے میں باندھ لیا اور شفا پائی، بعد میں پتہ چلا کہ وہ تو یوزن تھا، سو تھا۔ ایک مرتبہ سر مرٹے پر حکیم جی سے دریافت
کیا کہ اسے کھانا کھانے سے پہلے استعمال کروں یا بعد میں۔ لغت میں قبولے کے معنی دیکھے تو مکا ڈا دہ گیا۔ برسوں دوپہر کے کھانے
کے بعد سو یا ایک لیکن کبھی احساس تک نہ ہوا کہ ایسی معمولی حرکت کے نتائج تیلوے کی شکل میں برآمد ہوتے ہیں۔ کہ فاف جس کا حلق میں تنگ
شکاف گونج پیدا کرتا ہے۔ جب فارغ تعلیم ہوا بھی تعلیم نے مجھ سے فراغت پائی تو چند ناچاروں نے سیاست کی طرف رغبت
دلائی۔ فردی نے رجسٹر کیا۔ اور مات دوتی دل چوکتی تھی نصیب ہوئی۔ میری آتشیں تحریروں نے کسی جگہ نہ لٹھی۔ رن کا یا مستند
مقامات پر جو تاج پلا کئی اخبارات مہذب ہو گئے۔ اس حیرت انگیز مقبولیت کی وجہ میرے جگہری دوست تھے۔ جو بے معمولی صلے کے
عوض یہ سب کچھ دیا کرتے۔ فلک کج رفتار کو میری شہرت ایک آنکھ نہ بھائی اور دفعتاً میری تحریروں میں تمام ہونیں پسند ہی پسند میں
نود عرض دیا مجھے بھول گئی، محض میرے دوستوں کی وجہ سے۔“

”تو کیا آپ کے یہ دوست داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔؟“

ہنیں: ان میں سے ایک تو ضلع دار بن گیا اور دوسرا جھڑپٹ مدد سونم۔ کچھ دنوں کے لئے تو دنیا اندھیر معلوم ہوئی پھر

شاعری کا شوق چڑیا محرم و غصہ کی بغلی میں ترنم کا۔ عالم خاک ہر کھڑکی درست سے پر بھیجی تین تار بج سکتا تھا اور دلچسپت سے برسی، غزل کے لئے اگر طبیعت غیر حاضر ہوئی تو آواز نظم ہی آزادی سے کہہ دیتا کرتا۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ عکسر کے بار جو بحرِ جہان کا بورڈلگا ہوا خدا وہ کسی ضرورت مند فخر پر اُسیا۔ دعا دے بڑے بورڈ سے مرتب کیا گیا۔ مجھے غرض تبدیلی آب و ہوا خیال جان لیوا۔ واپس لوٹنا تو خطو کا ایک بلندہ تنہا یا یہ سب تعزیت نامے تھے جہاں تھا کہ کس نے کس کی جان ازنی کس کے سپرد کی جو بورڈ دکھتا سورن تو کتاب نے عقلی سے نثر کی لیکانے مرحوم کلمہ دھاغاک

عذ بورڈ بدلائیں تبھر میری رسوا ہو چکا تھا سندھی شخص کرنے سے بھی کئی فرق نہ پڑا۔ شاعر کی رنگ کارٹری۔ پھر سوچا کہ اس مرد باہمت شاعری گئی تو کیا ہوا اور بہت سے مفید مشعلے ہیں۔ اس ملک میں انسان کی ادھر عمر بیس بائیس سال ہے۔ تو یہ عمر بھی کی گذرا چکا۔ اب اپنے آپ کو حرم ہی سمجھ دو میری سرمد کی طرف رجوع کر۔ ایک دفعہ نام چمک اٹھا تو دارے نیارے ہو جائیں گے چنانچہ اس پائپر نے اس سطح میں رطامہ لولیکا بجا دل پورا اور سندھ کے ٹیلوں میں میٹر وقت گذارا۔ قابلِ تغیر دل سے ٹونگ حاصل کی جنگ سے بعیرت افزود ہوا۔ مگر قسمت میں مل کر رکھا تھا۔

کر کسی ایک نام کو سنک نہ کر سکا۔ ایک دن اتفاق سے اکڑس بکسلے، دو جیفنا ولت، برتر ڈرسل کی کتابیں ایک کباڑی نے کہاں اتنی سستی میں گنیں کر خریدنا پڑیں جو کو خریدا چکا تھا اس لئے دونی گردانی رہجو رہا۔ اچھا بھلا میٹھا تھا، چاک بانشارت ہوئی کہ تو انٹیگیو مل ہے۔ اگرچہ یہ ور بلے ساغا کارنے درشنے میں آیا تھا۔ تاہم خفا ملائی انٹیگیو مل لبلاتے شرم کی غلی چنانچہ میں نے کانوں جانا مژدہ کر دیا۔ پوشاک، غذا، ورزش اور صلیے سے لا پرواہ بن چلا گیا سب سے الگ تنگ رہنے لگا۔ پڑوسیوں سے بات کرنا تو ایک طرف ان کی طرف دکھنا بھی گناہ سمجھنا قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ میری زندگی ایک انقلاب سے آشنا ہوئی۔ ایک چاندنی رات کو جب میں کافی ہاؤس سے لوٹا۔ تو ایک پرندہ بالکل میرے سر کے اوپر سے لڑکھا۔ یہ راہمند زخاتوشیں ہوئی۔ کوکو خفائی پرندے بڑے حسرت اور ڈر ہو چکے تھے۔ اندیزہ ہو چکے کہ بعد کبھی نظر نہ آئے۔ دل میں یہ شبہ نہیں پایا کہ ہون جو یہ پرندہ ہاتھا۔ اس مرادہ جانفزا سے روح کو سمرو حاصل ہو، اور طبیعت کو کمان دور بہ سکون یوں معلوم ہونے لگے سب کچھ ممکن ہے۔ زندگی میں کلی بخش راحت ہے۔ دنیا میں امن ہے اور میں انٹیگیو مل ہوں !

ایک ایک سامعین دان دوست نے بڑی بڑی خبر سنا لی کہ میں ساکن ہرگز نہیں ہوں۔ ہر جو میں کھٹنے کے بعد زمین کی گردش کی وجہ سے بن سوساٹھ ڈگری گھوم جاتا ہوں۔ فضاؤں میں کئی سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑا رہا ہوں۔ سورج کے گرد دہرائی میں گردش کر رہا ہوں۔ اس طرف اس طرف، اسی طرف، اسی طرف، میرے کانوں میں تیز ہوائے نشوں نشوں ہونے لگی چکر چکر اڑنے لگا۔ فوراً ٹھیک شراب دہی پر پہنچا۔ اچھا۔ ہندوستانی شراب دہی کی سکتے ہیں۔ جب باہر نکل دو دنیا نایک تھی۔ دھواڑے پر کھڑا سوچ رہا تھا کہ کیا کروں اس نئے میں شاہراہ پر ڈھول کی آواز سنا دی۔ ساتھ گھنٹی بج رہی تھی۔ دھول کی ہم آہنگی اس قدر خوش الحان معلوم ہوئی کہ مروہ جسم میں جان چڑ گئی۔ میں لاشوری طور پر پیچھے ہو گیا جب پوچھا تو اپنے آپ کو اٹھاڑے میں پایا۔ خیر! ٹھیک لیکن یہ عجم کو دیکھ کر بہت بھرا۔ اچھا۔ پہلو اڑنے سے طرح طرح کے پٹھے ساتھ ساتھ جھٹکے ہوئے تھے۔ دہاں اپنے ناموں کا بھی دیکھا، (کہ خطا جب نے یہاں اسلندہ لگا یا پٹا) وہ ایک واقعہ وہاں اٹھائے ایک ٹائٹ۔ پر نچا ہوا اٹھاڑے کا طواف کر رہا تھا۔ اس کا بچھا پیچھے پیچھے تھا۔ غالباً میں نے اپنے عزم کا ذکر نہیں کیا۔ گو گھر اس کا ایک بیویں صدی کی امریکی فلز کی ممبرا نے تھی جس کا نقشہ ملک فرنگ کے ایک ذی فہم نرک کا رنگے تیار کیا تھا۔ اس کے دھواڑے پر بہک وقت میں چاروں طرف دہاں فلز کی ممبرا کی دھواڑی کا حیرت انگیز ثبوت بن کر اٹھڑی جھومتی تھیں۔ وہ عشاء وہ درہ وہ طوفان تھا کہ ٹھیک لیکن اس سلسلے

سے گذرتے تو منہ دوسری طرف پھیر لیتے۔ دیسے یہ مرد و آزاد پل کا پورا تھا فتنہ ترازو و طرزی میں اس کا دور دور تک شہر تھا۔ اس کے دروازے پر فتنہ جوں اور دوسرے منہ دل کا ہمیشہ اڑ دام بہتا مگر آتے آتے اور جینی کا لاشی اس کے اختیار میں تھا۔

کشتیاں ختم نہیں تو راموں جان کی نظر اس طرف پڑ گئی۔ اس نے گردن سے آدرا جا رہا زور سے دھب لگا کر بولا — سنا بے گیدی یہاں کہاں پھر رہا ہے کہ تمام تیرا کافی پادس اور میل نوجوانوں کی فصل ہے۔ ایسی بگڑا آتے ہوئے اپنے نہیں شرم محسوس نہیں کرتا۔ یہ کہ کوہ ڈیوہ انزل کے غل کے ساتھ سوئے ڈیوہ روانہ ہوا اور اس فقیر کو کمال سخت اٹھانی پڑی۔ سوچنے لگا۔ یہی مرگ کبھی مانگے لئے ٹھوسے کی طرح لاغیر تھا۔ خدا کی شان کیڑا پھرتے ہی اس قدر تانا بول گیا کہ فیل بھی دیکھے تو بغیر پانی مانگے شرم سے زوب مرے۔ اور اس پر باہمی گفتگو — واللہ یہی جی چاہتا تھا کہ سر دک پر دراز ہو جاؤں۔ اور اپنے آپ کو جان بھی تسلیم کر والوں یکا یک ایک صلے سے فرج پر درستی دی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک خوش پوشاک نوجوان جو فقط ایک ننگوٹے سے مرص تھا۔ آڈھول پر رتھیاں ہے بس پر اس غل کے پاؤںوں کو حرکت پرتی۔ یہ حرکت آہستہ آہستہ قائم ہوئی مگر کئی یہاں تک کہ مضبوط رہا۔ اور پھر اس کا تھکنا خوش لباس کے پیچھے ہو گیا۔ آگے چل کر معلوم ہوا کہ آڈھول والے کی گرد ایک بورڈ ہے چشم زدن میں چند اجڑا ہوا جان کے دھب سے اتر گیا تھا عجیب سے نکالا آہ مرد و عورتی جس سے شیشوں پر چند قطرے نمودار ہوئے۔ فیصل سے تنگ صاف کر کے ناک پر رکھی تو آنکھوں کو وہ تقویت بخشی کہ مریاں جس کا احاطہ طور سے ہمارے ہے۔ بعد از مطالعہ اشکات ہوا کہ وہ ریڈیم ٹانک بڑا کا اشتہا تھا۔

علم محترم کا وہ عہد جو اس عاجز کی صحت پر کھلم کھلا حملہ تھا تیری طرح جو سب سے بوجھ تھا تھا بعد از انعام کا یہ نیاز مند کر چکا تھا۔ ایک دن ماموں جان نے اپنی دکان پر کرسی کو جینی دینے سے محذرت چاہی کیونکہ تھا اتنی جینی بچ رہی تھی جو اس کے احباب کے لئے درکار تھی۔ اس نے ٹانک کو اپنی ٹیڈر میں بیانی سے خوش کرنا چاہا لیکن وہ شخص کہ شرارت کر لے پڑا بیٹھا تھا۔ کا خدا کا ایک پروردہ تھا کہ تلافی لینے کا تلافی ہوا۔ میں اس وقت جب وہ خند دکان کے اندر گیا علم محترم اپنی بروک میں بیٹھ کر جلسہ ترتیب سے اور خواجہ مرا سے خست منہ بند ہوا کہ سر دک کا قصد کیا۔ لیکن سب انتظامات پہلے مکمل ہو چکے تھے۔ ماموں جان کو روک لیا گیا۔ اور سرکاری اہان خانے میں لگا اس ملک میں جیل کہلاتا ہے اتنا ہم دلعلم کا بند و بست دو روز تک رہا۔ اتنی دیر میں ملند مرتبہ اعلیٰ مقام حضرات کی سفارشیں پہنچ چکی تھیں چنانچہ جب اسے قاضی صاحب کے سامنے لایا گیا تو انہوں نے فقط سیلو ان سندھ کا خطاب دالیں لے کر چھوڑ دیا۔

ماموں جان کو اس صدمے نے نہ حال کر دیا۔ کیونکہ اسے پہلوانی اور سیاست سے مدد ملے۔ اس کی زندگی کا مقصد صرف یہ دو چیزیں تھیں۔ میں نے سمجھا کہ سیلو ان سندھ کوئی ایسا بڑا خطاب نہیں جس کے لئے جان ہلا کر لی جائے آپ سیلو ان ہند بن گئے ہیں۔ عیساکہ فاضل اعلیٰ علامہ اقبال فرما گئے ہیں — ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔

میرا ماموں اس پر چوک اٹھا اور کہنے لگا — واہ واہ۔ مگر بخود دار اس کا اگلا معرہ کیا ہے وہ غالباً میرے حق میں زیادہ مفید ہوگا۔

”دوسرا معرہ اسے محترم عشق کے استغافوں کے متعلق ہے۔“

”واہ، وطنیت کے امتحان بھی ہوتے ہیں۔ کون سی یونیورسٹی ملتی ہے؟“

میں نے اس مرد جاہلی سے زیادہ بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔ حق تو یہ ہے کہ گوئی شخص علم اس ناشدنی کا تھا۔ بڑے گناہ کا ادب

پاس علم خداوندی ہے۔ مگر حیات اس کے چرے پر ہی طرح یوں برستی تھی کہ اس ناچیز کو اس کے ساتھ چلنے میں شرم محسوس ہوتی۔
 ”عشق کے امتحانوں کے متعلق کیا فرما گئے ہیں علامہ؟“ اس نے اصرار کیا۔

”یہ دوسرا معرکہ اسے علم محترم آپ جیسے پرفرتقوں کے نلے نہیں، مجھ جیسے فوجاؤں کے نلے ہے، بہتر ہوگا کہ آپ پہلے
 معرکہ کا ہی اپنے اوپر انطباق کریں گا میں نے سب سے ٹھونکتے ہوئے کہا۔

”مجھے سترہ سو سال سے قلعہ دیکھی نہیں۔“ وہ آہستہ دیکھ کر بولا ”مگر دوسری چیز عشق بالکل میری لاش میں ہے۔ اور بخود دل
 تو گستاخ ہوتا جا رہا ہے۔“

اس نے اپنی انٹلی کا ٹھیک بنا کر میرے سر کے منقر سے گلیج پر ملاد، نہایت متزن آواز نکلی تو کافور کو بھی معلوم ہوئی۔ بسکٹ
 خود داری نے لعن و ملاحت شروع کر دی۔ یہی خیال آتا تھا کہ ملک چھوڑ کر کہیں چلا جاؤں بیٹھ خاتم کٹ خیر بد کس طرح بیٹھا معلوم
 ہوا کہ صبح سے پہلے کوئی گاڑی نہیں جاتی پھر سوچا کہ اسے مرد و معیول ایکوں اپنے ناموں سے ڈرتا پھرتا ہے۔ طاقتور بن اور اس کا
 مقابلہ کر۔ اس دن سے میں نے کافی ہاؤس جانا ترک کر دیا۔ اور ساری کتا میں ایک بھٹیاری کے حوالے میں کر دیا۔ بعد از وفات استعمال
 میں لاوے۔ اور ریڈیم ٹانگ پڑھانے اور گدگد گمانے میں زندگی بسر کرنے کا تہیہ کر لیا۔ ڈنٹر پیلنے کے بعد زمین کو بیاں کھانا، لچر کھانا، شیشی
 نکالتا۔ لچر چار گولیاں۔ چھوٹا نڈا گدگد رات کو پانچ گولیاں ہفتہ گزارا ہوا یقین جانیے۔ بدن سے ششائیں نکلے گئیں۔ اندھیری سے اندھیری حالت
 میں بغیر روشنی کے چل سکتا۔ طاقت کا ایک سمندر تھا کہ ٹھانٹیں مار رہا تھا۔ انھوں دن خواہش پیدا ہوئی کہ شیرم پر ساری کی جائے۔ ٹھوٹا
 کس کو چڑھا لکھ بیٹھا۔ گرنیڈوں کو بیخود میں دھاڑتے دیکھ کر اپنی راستے تبدیل کر بیٹھی۔ اس کے بعد خیال ہوا کہ کبھی رزم ختم کی جاتی جائے۔
 چنانچہ اسی سنگوت میں ماموں کی مجلس پر پہنچا۔ نوکر چاکر ڈر کر بھاگ گئے۔ کیا دیکھا ہوں کہ ماموں سترہ سو سال سے اس طرح صنوبر خنوع دھانگ
 رہا ہے۔ کہ اسے باری تعالیٰ میرے اس نامکار بجائے کو تو فتن دے کہ کافی ہاؤس جانا ترک کر دے۔ اور اپنی روزی خود کمانے لگے۔ مجھے بھی
 یہی تو فتن دے۔ ہم سب کو یہی تو فتن دے۔ میں اب بالکل سیدھا ہو گیا ہوں۔ تیری شان ہے کہ جس کی ڈیوڑھی پر سیکار ڈال کر کیدی تک جھڑتی
 تھیں وہ اب اب گدھا تک نظر نہیں آتا۔ خداوند تعالیٰ کہیں مجھے کسی انتہائی کھیل کی بد دعا تو نہیں لگی۔“

”بس بس اسے مرد و محنت اٹھا! میں نے تیرے قبل تن ہونے کا راز با لیا ہے۔ اور خبردار جو کسی نیکو چل کو برا بھلا کہا ہے تو
 خبردار جو کسی کو بھی برا بھلا کہا ہے تو کیا ہم سب ایک جیسے نہیں سب برا نہیں ہیں۔ میں بابا بروں پر نادم و نادمہ۔ پر نادم و نادمہ کے کنفیڈنٹس کے
 کنفیڈنٹس سادی ہے ابن بطوطہ کے۔“

اسے عزیز از زبان بھانجے، آج سے مجھے اپنا ساتھی سمجھ تیرے حق میں جو دعا کی تھی وہ میں واپس لیتا ہوں۔ اس نے غرغر
 کرتے ہوئے کہا۔

دفعۃً مجھے محسوس ہوا کہ صحت کے ساتھ ساتھ میرے عقیدے سے بھی بدل چکے ہیں۔ مجھے تھلک چھوٹ پنا دو بھر دکھائی دینے لگا۔ کہ اس
 طبقہ میں رہنا بڑا مشکل ہے۔ انہیں لوگ سمجھتے نہیں ہر وقت مذاق اڑاتے ہیں۔ سارا عجیب خراج طیبوں کی حسیب میں جلا جاتا ہے۔ کیونکہ
 صحت اس طبقے کی نہایت خستہ ہوتی ہے۔ لازمہ صحت کے لئے انٹرویو میں جاؤ تو آسان سے سوالوں کے مشکل جواب سن کر کمزوروں کو احساس
 کمتری ہو جاتا ہے۔ اور وہ خواہ مخواہ قہقہے کر دیتے ہیں۔ وہ سبے جگہ علیہ دیکھ کر ہی ڈرتا جاتا ہے۔ الغرض ان لوگوں کو سوسائے ہوا اچھا لگنے کے

اور کچھ مہتر نہیں آتا۔ اور ہوا میں تقدائیت نہیں۔ کچھ پوچھو تو ارادہ اس خاکسار نے اس روز بدلا جب عہد گاہ میں دو بزرگوں کو بے لگ مہر ہوتے دیکھا۔ دونوں بیٹھے تھے مگر ہلکے آٹھلیکڑوں تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، ہاتھ پھیلانے، منگوائے، ازرب کلمات خوشگوار لائے۔ ایک دوسرے کے برابر سے نکل گئے۔ جب غلی کا احساس ہوا۔ تو فخر سے بلند ہوئے۔ ”کہاں چلے گئے؟“ میں تو یہاں بڑا اور تم؟“ ”پیرا“

مڑے اور نکل کر جھونکے کے قعد سے واپس لوٹے۔ لیکن اس مرتبہ چر نشا نہ تھا گیا۔ تیسری مرتبہ انگلی پائیہ تکمیل کو پہنچی۔ رات کو اس نیاز مند نے ایک خواب دیکھا کہ اپنے ایک آٹھلیکڑوں استاد سے مل کر ہوتے وقت جو کہ بڑا کچھ پھیرتا ہوں تو چونک پڑا۔ ان کی دم غالب تھی۔ جاگا تو غصت شرمندہ ہوا۔ اسی دن سے میں نے اس آٹھلیکڑوں کے پے بلکہ PSEUDO INTELLECTUAL پنے سے لکھ کر کٹی کر لی۔ ”جی تو س رہا ہے اور کھ رہا ہے۔“

”نہیں تو۔“ جہاز باد خورد و فخر جاگا۔

”اچھا بتا میں کیا کہہ رہا تھا۔“

”جہاد باد خندی، رہا ز بہاد خندی، نہا ز باد خندی۔“

”معلوم ہوتا ہے کہ یہ مہر کا اثر ہے۔“

”مہر گز نہیں! یہ سفری بہت لمبا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ بیدل طے کیا گیا تھا۔ اور یہ مہم وہ پرندہ کون سا تھا جو آپ کے سر مبارک کے اوپر سے گذرا؟“

”اے مہم نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ پرندہ وہ بوم تھا کیونکہ اس کے بعد بھی کئی مرتبہ وہ اس حقیر کے سر پر سے گزرتا۔ کرنا نام پہلا سفر جہاد باد سندھی کلان کا، رخصت ہونا جہاز باد سندھی خورد کا، ساتھ وعدہ آنے کے اگلے روز انہیں ساعت سفر دوم۔“

اگلے روز جب محل منعقد ہوئی تو اس میں صرف دو حضرات، شامل تھے خورد و ادو کلان۔ ہر چند کہ کلان نے شہزادے شہزادیوں کا بے مہر سے انتظار کیا۔ بارہا ٹیلیفون کیا۔ لیکن ہلکی ہوئی۔ ناچار چائے ٹھوکانی۔ خورد و ادو دیکھ کر نہایت غلغلہ ہوا اور یہ مصرعہ نہان پر لایا جاہ راکن چادہ پیش — لیکن کلان نے اس کی بات سنی ان سنی گوری ادو لولا —

جہاز باد سندھی کا دوسرا سفر

حسینوں سے فقط صاحب سلامت دھڑکی اچھی

نہ ان کی دوستی اچھی نہ ان کی دوستی اچھی

اسے عزت و ازا جان ہم نام ایک دو جن میں میں نے ایک شخص کو جو ہم کے سامنے تقریر کرتے سند وہ کہہ رہا تھا کہ سب لوگ برابر ہیں، سب عورتیں برابر ہیں، سب بچے ایک سے ہیں۔ لہذا سب کو برابر حق ملے چاہئیں۔ زندگی آسان ہو سکتی، بس میں سفر کیجئے، ساڑھے چار آنے میں سکڑ کر شو کیجئے۔ اندھا ہو جانے پر امداد چاہیے۔ اور خوشی ہونے سے پہلے باہر نکل آئیے، میونسپلٹی

نے کہیں کہیں ریڈ نوٹسب کئے ہیں۔ اور ان پر موسیقی (جو ایسی فیصدی غمی ریا زوں پر شکل ہے) اور خبریں مٹی جاسکتی ہیں۔ بک مثال پر کھڑے ہو کر فدا سی دیر میں تازہ رسائل ادنیٰ کتب کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ ایک لمبے سے اور کوٹ سے سردیاں کل سکتی ہیں اور دور نگاہ بنی سڑکوں سے گرمیاں، فدا سی خوشامد سے باسی نجات کی جاسکتی ہے۔ لیکن یمت بھولنے کے سب لڑکے ایک جیسے ہیں۔ اور سب لڑکیاں ایک سی ہیں۔ مثال کے طور پر روس میں —

”وہ روس کا ذکر زبان پر لایا تو مجھے شہر سا ہوا۔ اگرچہ معلومات اس اتھڑکی روس کے بارے میں نہایت محدود ہیں۔ تاہم بحث کرنی ہو تو گفتگوں بول سکتا ہے۔ اسے ہم نام خود دنیا روس کے متعلق کیا خیال ہے؟“
”اسے ہم نام کلاں معلومات تو میری بھی، ایسی دیسی ہیں۔ اگرچہ میں نے گراڈتو مارکس کی لمبی ہونی مشہور و معروف کتاب ”سرمایہ داری“ پر طبعی ہے۔“

”نہیں یہ کتاب کارل مارکس نے لکھی ہے۔“
”تو وہ بھی تو مارکس برادر میں سے ہوگا۔ مارکس برادرز کو ماشاء اللہ کون نہیں جانتا۔“
”خیر تو میں تقریر سن رہا ہوں، اس نوجوان کے بعد ایک شہزادی نے تقریر شروع کر دی۔ خاکسار نے تقریر سے زیادہ شہزادی میں دلچسپی لی معلوم ہوا کہ اس پارتی میں چند شہزادیاں بھی ہیں۔ ان میں سے دو شہزادیاں تو والدہ خوب تھیں۔ ناچیز نے خیم دول کو ان کی دیدے ترقیادہ پایا۔ اور اپنے تئیں اس ٹوٹی مٹی مثال ہوئے پر آمادہ پایا۔“

لیکن پتہ چلا کہ مثال ہونا آسان نہیں۔ کافی جھان بن کے بعد یہ لوگ اپنے ساتھ شریک کرتے ہیں۔ بڑی کوشش کے بعد میں نے ان کے سر پرست کا کھوج نکالا۔ کسی نے بتایا کہ ان کے بچے سبزی ہائے تازہ سے پریمز بکرتے ہیں۔ بیلیوں کا اصرار ہے کہ سبزیوں بچوں کی ہمدردی کے لئے از مہاشد ہیں۔ اور مہر ہے کہ نباتات، اجادات اور حوانات سب کچھ کھا جاتے ہیں۔ لیکن سبزیوں کو چھوٹے نمک نہیں ہیں انے ان حضرت سے مل کر اس ہم کا بیڑا اٹھایا چند لاجریں تکبوں کے نیچے رکھ دیں۔ کچھ ٹائر بلائے طاق رکئے۔ شلم کتابوں کے نیچے چھپا دیئے۔ بچوں کو جب یہ چیزیں فوا فرما لیں تو کچھ کہ انہوں نے چرائی ہیں۔ خوب سر ہو کر کھائیں۔ ان کے آہ نہانت نوش ہوئے اور گوا اپنے پیارے کئے کا کرنے لگے جو میل تھا مگر دعائی پینے سے احتراز کرتا۔ میں نے پہلے تو دعائی اس سب کا بکار کے دہن میں چھین جا ہی جب اس نے تواتر تارنا مندی کا اظہار کیا تو شیشی خوش پڑی۔ کس پر اس سب کا طاقت اندیش نے زبان سے ساری دوا بی باٹ لی اور کہہ کر دار کو سپنیا۔ وہ حضرت کمال درجہ ہر مان ہوئے اور بولے — ”اے مرد عاقل تو دولت نغبات سے مالا مال معلوم ہوتا ہے۔ بتا کیا مانگتا ہے؟“

میں نے آرزو بیان کی کہ کاش کہ مستقل طور پر آپ کی صحبت سے ذوق حاصل ہوتا۔ احمد اللہ کہ اس مرد گرامی نے مجھے اپنی جماعت میں شریک فرمایا۔

ایک ایک دن میں دو کام میں جی گزرتا۔ ہم سب ایک دوسرے کے دوست تھے۔ ایک سگڑ کاٹین کھولنا سب اس پر ٹوٹ پڑتے۔ اسی طرح ایک دوسرے کے کپڑے، چیزیں، روپیہ، استعمال کرتے۔ دیسے ہم لباس اچھا پہنتے تھے۔ لیکن جب کام پر جانا ہوتا تو نہانت سادہ اور کھردرا سا لباس ہوتا۔ ایک خاص قسم کے سستے کپڑے کا بنا ہوا۔ سرور ایک عجیب سی ٹوپی ہوتی۔

حاکمٹ اور تپلوں کا استعمال بھی ضروری تھا۔ ہمارا کام آسان تھا کیونکہ ادا کرتے تھے تھیں کم، پوسٹر لگانا، خاص خاص مجلسوں میں تقریر کرنا، جہاں کوئی کھیل تماشہ ہو، بہت سے لوگ جمع ہوں وہاں شور و غل مچا کر رنگ میں جھنگ ڈال دینا۔ اس کے لئے ہمیں معاوضہ ملتا تھا۔ ہمیں اپنی فنی کے ممبروں کے علاوہ ہر شخص سے فقی بھغن تھا۔ گریہ فکسار مصلیٰ شہزادیوں کے لئے متحرک ہوا تھا۔ اس لئے زیادہ دسیکھ سکا اور دیسے کا دیسار ہا۔ اگ شک و تر کو یکساں جلاتی ہے۔ شہزادیوں کے قرب لئے نورمن مسروٹس کیب بر کچہ اچھا اثر نہیں کیا۔ یہ فقیران میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لینے لگا۔ شہزادیوں نے سروپوں میں خوب تبلیغ کی، گریساں آئیں تو تیز دھوپ سے ان کی رنگت سنولنے لگی۔ سربراہ پنکھوں اور برون کا خاطر خواہ انتظام نہ تھا۔ موٹھی کٹی ہانڈیکر ہوتی اور پیدل چلنا پڑا۔ شہزادیوں کو شکایت تھی کہ باشندوں کی تعداد کتنی زیادہ ہے۔ ادھر ہم کتنے قہوڑے ہیں لوگ ان پڑھ ہیں سمجھتے نہیں بلکہ اب تو لوگ ہم سے جڑنے لگے ہیں۔ بھلا اور شہزادیاں ہماری طرح خدمت کھنے کیوں نہیں نکلتیں۔ اس طرح تو کچھ بھی نہیں ہونا۔ پھر ایک روز ہم نے سنا کہ ایک شہزادی نے خاں بہادر قلندر بیگ سے شادی کر لی ہے۔ حالانکہ خاں بہادر مصوف کی گذشتہ سے پرستہ سب بیاہن جمع سلامت تھیں۔ دوسری نے ایک راستہ بہادر کوٹھا، جو سب کی داسے میں کافی بزرگ تھے۔ جن کی بیوی کے متعلق افواہیں اڑ رہی تھیں کہ سرکاش جو بھی بیبا ہوئے والی ہیں۔ یہ تازہ ٹکڑے جو پھول تو یہ تازہ چیر ساری جو کشتی یک دم بھول گئیں۔ پھر سوچا کہ شہزادیوں پر پھوسہ کرنا دلیل حماقت ہے۔ ان کی استقامت کا دم بھرنامیں حماقت ہے۔ کیا ایک تیسری شہزادی نے ایک دو تندرہ دینار سے عقد کیا جس نے فوراً دوسرے بچ کر ایک پیکار ڈھنڈی، الغرض خواں سے پہلے ساری شہزادیاں ٹھکانے لگیں۔ ان میں سے ایک بے دفاع کو جس نے لکھ کر بھیجا۔

عاج جو کیا تھا دندہ نکاح کا تمہیں یاد ہو کر نہ یاد ہو۔

جواب آیا ہے

بہت دنوں کے تقابل نے تیرے سپید کیا

وہ اک نکاح جو بظاہر نکاح سے کہے

ہم طرح طرح کی آزادیاں چاہتے تھے، سوچنے کی آزادی۔ جو میں آئے کرگزرنے کی آزادی۔ ایک آزادی نے اس خلک کو کمال ذلیل و خوار کیا۔ ہوا بون کر ایک روز میں نے ایک فوجان کو دیکھا کہ سر ہاندار اپنے پاؤں پر گھماڑی مار رہا ہے۔ سب دیکھتے ہیں اور کوئی کچھ نہیں کہتا۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ قریب ہا کہ نصیحت شروع کی سی تھی کہ فوجان نے ترچھا وار کر کے ایک میرے پاؤں پر بھی چڑھی۔ دو ماہ ہسپتال میں پڑ رہا۔ قصور نہ میرا تھا نہ اس کا۔ میں نے آزادی گفتار دکھائی تھی اور اس نے آزادی کر دار۔

خدا کا نایاں ہوا کہ ایک عجیب خواب اس ناشدنی کو نظر آیا۔ ایک رات سو با تو کیا دیکھتا ہوں کہ جیسے گھوڑے پر سوار ہوں اور گھوڑا جنگل میں سے گزر رہا ہے۔ کیا ایک آہ سانی دی۔ حیران ہو کر ادھر ادھر دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ کچھ دیر کے بعد آہ غیر دوشنی، دوسری با حیران ہوا۔

"میں نے بھری ہے۔ گھوڑے نے بڑی سلیس آندو میں کہا۔" اور میں کیوں نہ بھروں۔ میں بھی تو جاندار ہوں منہ میں زبان دیکھتا ہوں۔ تم انسانوں کے لئے تو حقوق مانگتے ہو۔ جانوروں نے کون سا گناہ کیا ہے؟ جانوروں کی تبدیلی کے مطابق ہم سب ارتقا کی مختلف منزلوں پر ہیں۔ ہمارا اختیار ایک ہے۔ لہذا ہم سب ایک دوسرے کے کزن ہیں۔ اسے میرے کزن! میں تھک گیا ہوں اب

”تم گھوڑے بنو اور میں سواری کرونگا۔“

چارو تاجار اس تجویز کو ٹھٹھا بنا ڈیا، باری باری ہم نے سواری کی، جگل سے باہر نکل کر خیال آیا کہ اگر دونوں ساتھ ساتھ سیدل چلتے تو بہتر تھا، رخصت ہوتے وقت میں نے اپنے کزن سے دریافت کیا کہ اگر وہ انسان بنا چاہے تو کسی ماہر نفسیات سے حکم آؤ سمیٹش کا انتظام کرایا جائے۔ لیکن وہ نہ مانا۔ بولا۔ ان دونوں تانگے کے گھوڑوں کو چھوڑ کر نفیہ گھوڑوں کی پوزیشن انسان کی پوزیشن سے بدیہا بہتر ہے، صبح جا کا تو جوا پریشان ہوا۔ اس گفتگو کا برا اثر ہوا کہ تانگے میں بیٹھنے سے احتراز کرنے لگا۔ اور کوئی سواری میسر نہ تھی۔ نکل و حرکت محال ہو گئی۔ سائیکل چلا چلا کر برا حال ہوا، عقیدے بدلنے پر پڑے۔ اور سر شہزاد سے بھی تتر بتر ہو گئے۔ کچھ راتوں میں جا بسے ایک دو ایک ٹریں گئے۔ باقی کے ریڈیو میں ملازم ہو گئے۔ ایک رہ گیا تھا۔ اسے بروقت یہ دم رہنے لگا کہ ڈ۔

شاید کہ پولیس خفیہ باشند

دو بھی سٹاک انڈسٹریل میں گیا۔ اس کے ساتھ میرا دوسرا سفر تمام سوا عزیز القندہ ایسی نگاہوں سے الماریوں کی طرف مت دیکھ کہ موم بھی پتھر بن جائے۔ مجھے احساس ہے کہ سودج غروب ہو چکا ہے۔ آج ویسی شہاب منگانی ہے کہ چٹوئیں اٹھ کر نکلتی ہیں۔ اگلے روز جب خانوں شب نے چادر سیاہ میں شرح افر بھیجا یا اور شاہ خادرنے اورنگ سپر ہر جلوہ فرمایا۔ (مجھ کو صبح ہوئی)۔ تو دونوں جہاز بادل کو آرام کرسیوں پر سونایا۔ کہ ساتھ ان کے چند ترگوش جی خوابیدہ تھے۔ آکھ کھٹنے پر غنچہ صبح کھل کھلایا۔ مرغان خوش بھان کی ترانہ سنجی سے کانوں نے لعلت مزید یابا جہاز بادلاں شریا اور زبان پر یہ کلمے لایا۔

”اے مرد نیک طینت! بادۂ ویسی نہامت تیر نکلا، لب تک حالت خستہ ہے۔ آج اچھی طرح اس شہر کے معنی سمجھیں آتے ہیں۔“

جرا آج بی ہو تو ساقی حرام شے پی سو

یہ گل کی بی ہوئی نے کہ خار باقی ہے

یہ بنا کہ تیرے عزیز و اقربا تیرا انتظار تو نہ کرتے ہو گئے۔ شاید حقانے میں پوچھنے گئے ہوں۔“

”میں خدا کے فضل و کرم اور آپ کی دعا سے ناکتھا ہوں، تو پھر سناؤں میرا سفر۔؟“

”درا صبر فرمائیے، سمجھ کلام کو زیرِ نگاہ لائے۔“

اتنے میں ملازم نے مزیدہ جانفزاسنا یا کھجورٹا حاضر ہی بنا رہے۔ چار پی کو کھلاں مضبوط نہ کر سکا۔ ادویوں کو یا ہوا۔

جہاز باد بسندگی کا تیسرا سفر

۷ ”دل سے شوقِ ریخ بکوز گیس

تا نکلا جھانکنا کھو نہ گیس

اے مرد مخلص! میں تو کم گرا گذارنے حقان کے مرغزاروں میں گیا۔ وہ سرزمینِ نور عینِ مرا جوں کے لئے عشرت افزا لہن اور مددیشوں کے لئے دکشا غوثِ کدہ ہے۔ جب کچھ عرصہ خوش وقت ہو کر واپس لوٹا تو ایک نیا نام سننے میں آیا جس سے کان

قدیمی طور پر نا آشنا تھے۔ یہ نام تھانوی پسندی۔

معلوم ہوا کہ میری فراموشی میں ایسی خوشگوار ہوا چلی کہ پھر پھر ترقی پسندی بن گیا۔ شاعری ترقی پسند ہوئی۔ ادب ترقی پسند بنا سارا ملک ترقی پسندی کے گئی گا۔ یہ عقائد بہت خوش ہوا۔ ترقی کو نہیں چاہتا، بہت سے احباب جو غلام تھے۔ ترقی کے لئے مددوں سے کوشاں تھے۔ یہاں تک کہ کئی مرتبہ پیش قیمت تحائف بھی دے چکے تھے۔

نوجوان تو اس تحریک کے اس قدر گردیدہ ہوئے کہ ترقی پسندی کو اپنے نام کے ساتھ بطور دگری استعمال کرنے لگے۔ تعارف کراتے وقت ذکر کیا جاتا کہ غلام ترقی پسند ہے یا نہیں۔

ادھر ترقی پسند ادب کا ریکٹ بٹے زوروں پر تھا۔ یہاں تک مبلغین زور اور ایڈیٹروں نے حد بندی مقرر کر دی اور ترقی پسند رسالوں اخباروں میں صرف ترقی پسند چیزیں ہی چھپ سکتیں۔

اس دہائی نے بڑے شوق سے اس نئے ادب کا مطالعہ کیا۔ اور اسے بعد عام فہم پایا۔ سر کتاب دوسری کتاب سے غنی تھا۔ تمام انسانے ایک جیسے تھے۔ ساری غزلیں ایک ہی تھیں۔ حقوڑے سے مطالعے کے بعد اتنی خود اعتمادی آگئی کہ افسانے کا آغاز پڑھ کر انجام بنا سکتا تھا۔ غزل کا مطلع سن کر پیشین گوئی کر سکتا کہ بغیر اشعار میں کیا ہوگا۔ وگ ہی سرعت سے ادب اور شاعرین رہے تھے جن حضرات کو میں مرکزوں پر سارا دن گھومتے، کافی ہاؤس میں نہیں ہاں کھٹے دیکھا کہ کتاب اس نئی دنیا سے ادب میں نام پیدا کر چکے تھے۔

یہ ترقی شاعری تو کچھ کا بلدا، ادب بننے کا شوق چرایا جیتا پورا ہی دھن سے ساز ملا کہ اسی میں اے الہامات شروع کر دیا میری چیزوں پر ترقی پسند طبقوں میں توداہ ہوئی لیکن کچھ لوگ خواہ مخواہ لکھ لے کر پیچھے پڑ گئے معلوم ہوا کہ ان دنوں دو مختلف گیمپ بن گئے ہیں جو ایک دوسرے کے سامنے مورچہ باندھے منظر ہستے ہیں۔ میں کچھ حیران ہوا۔ ادا ایک بہت بڑے ترقی پسند سے ملا۔ پوچھا کہ کیا یہ ضروری ہے کہ لکھنے کے لئے کسی ایک گیمپ میں رہا جائے۔

اس نے بتایا کہ بہت ضروری ہے۔

میں نے کہا — لیکن ان دونوں گیمپوں میں ہر وقت فتوئیں مئی ہوتی رہتی ہے۔ یہ مجھے پسند نہیں۔ کیا کوئی غیر جانب دار رہ کر نہیں لکھ سکتا؟

وہ بولا — اگر آپ غیر جانبدار رہنا چاہتے ہیں تو لکھنا چھوڑ دیجئے۔

چنانچہ یہی اتفاق ہوا۔ اس میں ایک راز مضمر تھا جو اجماعی باتوں کا — ترقی پسندی کا فلسفہ کچھ مشکل نہ تھا — اپنے جیسے لوگوں کی صدا تو نہیں کرنا۔ جو لوگ لکھنے لکھانے کے علاوہ دہائی لکھانے کے لئے محنت کرتے ہیں انہیں ادب کا دشمن قرار دینا۔

افسانہ، مقالہ، غزل — سب کے لئے سانچے موجود تھے۔ چنانچہ ترقی پسندی کا سبیل لکھانے کے لئے یہ ضروری تھا کہ صرف ان مسائل پر غور کیا جاسکے جن پر اس تحریک کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ تنقید کرتے وقت میں پٹ کو کاچتا، نہ مصنف کے پیغام کو۔ نہ پیغام کی افادیت کو۔ ہر چیز میں دی جانے پہچانے موضوع، وہی مقررہ ترکیبیں اور الفاظ ڈھونڈتا، اگر مل جاتے تو ترقی پسندی کا ٹھپہ لگا دیتا وہ مصنف کو گمراہ کرنے والا سر دیا۔ دارالتمزبل پسند اور نہ جانے کیا کیا کہتا۔

”آپ نے فرمایا تھا کہ افادہ بننے کی وجہ سمجھ بیان کریں گے۔“ خود نے بات کاٹی۔

ہاں تو بات دراصل یہ تھی کہ اس معنی عزا کو چند افسانہ نگار اور شاعر شہزادیاں پسند تھیں، ان میں سے دو ایک کو قومی ہونستی سے جانتا تھا۔ اور کئی سال سے لگے نگران پر فریفتہ تھا۔ لیکن انہوں نے میرا اتنا سادہ ٹوٹس نہیں لیا۔ کھنٹی و کھنٹی یہ ایسا ہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ اگر ان کی تعریف کرنے لگوں تو شاید ہفت بوجا میں۔ موقوفہ بھی تھا چنانچہ میں نے ان کی تحقیقات کو سرسنا شروع کر دیا۔ ہر دوسرے تیسرے پینے اپنے ٹھوس مضامین میں ان کی تعریفیں کرتا۔ لیکن تعجب ہوا کہ یہ مدح سرائی رائیگاں گئی کسی سے بہتہ کرایا تو معلوم ہوا کہ شاہ زادوں نے ایک لفظ بھی نہیں پڑھا تھا۔ مجھے شبہ ہوا۔ اور دھر دھر چھنے پراکتشاف ہوا کہ انہوں نے کیا کسی نے بھی نہیں پڑھا۔ ایسے مضامین یہاں کوئی نہیں پڑھتا کیونکہ انہیں خشک اور خالی سمجھا جاتا ہے۔ ویسے بھی نفاذوں کی تعداد دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔

”ان کیمنوں کا کیا ساج“

”بتا تا ہوں، نہی۔“ میں تو بہت تحریک کچھ مجھے کیلئے مقبول ہوجاتی ہے لیکن اس نام سے خواہ خواہ خوش فہمی تھی کہ اب ہر چیز میں ترقی ہوگی۔ حالات سدھ جائیں گے۔ انسان ترقی کرے گا۔ دنیا بہتر ہو جائے گی۔ لیکن آہستہ آہستہ مایوسی چھانے لگی۔ ادب بالکل جزو دم بن کر رہ گیا۔ آج کوئی بات ہوئی، اسی ہفتے اس پر نظم کھو دی گئی یا افسانہ، اگلے مہینے کتاب۔ لوگوں کو بہت جلد علم ہو گیا کہ اس کا پیرزن زرا کا غدی تھا۔ اس تحریک کا مقصد کچھ نہیں تھا۔ تعمیر موقوفہ تھی۔ یہ میری دہنیں تھے۔ پہلا اب تک غلط ٹھوسوں پر BETTING کرتی رہی تھی۔ ان کی زندگی عمل سے غالی تھی۔ ان کا نظریہ حیات مرغیانہ اور قنوطی تھا یہ چاہتے تھے کہ بہرے بڑھنے والے کو باغیچا ہو جائے ادب کسی خاص طبقے کی میراث نہ ہوا ہے نہ ہوگا۔ چنانچہ لوگ اس قومی ہنگامے سے تنگ آ گئے۔ اور ادب سے ایسے بدگمان ہوئے کہ انہوں نے علمی رسالے پڑھنے شروع کر دیئے۔ علمی رسالے تو فراری ادب میں بھی شامل نہیں ہیں۔ سادہ ہی ایک عجیب و غریب ادب نے جنم لیا۔ موقوفہ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے متعدد حضرات نے تاریخی اور مذہبی ناول لکھنے شروع کر دیئے جو باتوں کا تھکے معلوم موزنا ہے کہ آپ بود بود ہے ہیں۔“

”جی نہیں، بود تو نہیں ہوتا۔“ خود دھائی لے کر بولا۔ فراری ادب پر مجھے ایک شہم دید واقعہ یاد آگیا۔ طے ہوا کہ تلے ضلع کے محل میں قیدیوں کو اخلاقی کتابیں پڑھائی جائیں۔ داروغہ جیل اتفاق سے رجعت پسند تھا۔ سب کتابیں فراری ادب پر آئے۔ تجربہ نگار کو دو مہینوں کے اندر اندر سارے قیدی فرار ہو گئے۔“

”خیر تو یہ کہتے ہیں بدستور ترقی پسند رہا بعض ایک ماہ پارہ کے عشق کی وجہ سے۔ اس نسبت ملنا زکریا نے مینا بلدا میں دیکھا۔ میں اپنے دو پیش کشے لئے مارا تھا کہ خیال آیا کہ نہ دینا بازار کا نظارہ کروں۔ ایک سنال پر کچھ خریدنا چاہا لیکن دونوں ہاتھوں کو گھرا پایا۔ لوگ حسینہ پر تلے کہ قریب پانچ سو روپے اس کے ہاتھ میں تھا وہیں جب خریدنے سے فراغت ہوئی تو حسینہ مذکور سے کہے طلب لگے۔ اس نے کہا کہ جھول نہ سے کہا۔ ایک کتا توئی کے پیچھے بھاگ گیا۔“

انگشت بدلتا سخت پریشان ہوا اور سوال کیا کہ کیونکر بھاگ گیا۔

”یوں بھاگ گیا۔“ اس نے دو دمراکت بھگاتے ہوئے کہا۔

کتے تو دونوں مل گئے لیکن ادب اس کی اس دربر بھائی کو کچھ عاشق ہونے کے اور کوئی صورت نظر نہ آئی۔ آخر شکاری شکاری کر دی۔ اس علاقے میں جتنے اختر صحن، اختر صحن، حسن اختر، محمد اختر، فریدو تھے سب گن ڈالے مگر آقا نہ ہوا۔

آخر اپنی کزن کی مدد چاہی۔ وہ فالجانی ملائیسے کر بولی۔ ”میں آج ہی اسے کلب میں بلاؤں گی۔“ چنانچہ شام کو وہاں پہنچ کر کلب میں آئی، اس شے سے کہ بھاری فری غرارہ پہننے، عطر لگائے، زیور پیش بہا محجب بہار دکھانا تھا۔ لگے میں جلیں، چمپا کی مورتوں کی بالا دھڑلے، کاؤں میں بے بائیاں، ہاتھوں میں حسین بند، الماس کے کڑے، پاؤں میں سونے کے چھپڑے، ناک میں میرے کی ننھے، انگلیوں میں جواہرات کی گھومٹیاں۔ سر، ہاتھ، اس فقر نے دیکھتے ہی شعر پڑھا۔

جان پڑ جاتی ہے زیور میں پہننے سے ترے
کہیں اڑ جائے رطبتی تری جگنو بو کر

لیکن میری کزن نے ہلے ہلے سے ہشت کر کے چپ کر دیا۔ اور اس سے گویا ہوئی۔ کہ کلب میں بلائے کا تو فقط بہانہ تھا۔ اصل میں ہمیں ایک پیغام سنانا تھا۔ میرا کزن، جوان زیا خرام خورو گلگوں دیکھتے ہی آپ پر شیفہ و دالہ ہوا عین کا بول بالا ہوا۔ وہ ہزار جان سے تمہارے گل رخسار کا عندلیب بننا چاہے، آہ مرد اور دل میں درد سے عین کا مرض پیدا ہے۔ ماشاء اللہ عجیب و غریب فوجوان ہے۔ عجیب کن بان ہے، لاکھوں جوانوں میں انتخاب ہے۔ حسن و خوبی میں اپنا آپ جواب ہے تم دونوں کی خوب شہجے کی گہری چھنے گی۔ وہ بھی کم سن۔ تم بھی جوان، وہ بھی نازک بدن۔ تم بھی دعوان پان۔ وہ مجھ بادیو آخری، تم سر دین زار نازینی۔“

افوہ! اتنی لمبی چوڑی تمہید کی ضرورت تھی۔ ”حیدر نے بات کاٹی۔“ والدین میری شادی کا تہیہ کر چکے ہیں۔ تم بھی مجھے پارٹیوں اور کلب وغیرہ میں جانے کی اجازت اتنی آسانی سے مل جاتی ہے۔ کئی اخباروں میں اشتہار بھی دیئے گئے ہیں۔ غالباً اگلے مہینے میرا سوئیر چا جائے گا۔ اگر آپ کے کزن کو اتنا ہی ذوق و شوق ہے تو سوئیر شریک کرے۔“

حیدر کی یہ تقریر اس حقیر کو نہایت ترقی پسند معلوم ہوئی اور اس نیاز مند نے اس کے ساتھ رہنا چاہا۔ زیوروں سے ایسی عجیب آوازیں آئے کہیں کہ اولاد ترک کر دیا۔ پھر سامنا چنے کی کوشش کی۔ مگر ایک دوسرے کے مہوسات آپس میں الجھ کر رہ گئے۔ چنانچہ نص کی حسرت، حسرت ہی رہی۔

سوئیر قریب آیا تو میری کزن نے اخبار میں چھاپا ہوا اشتہار دکھایا۔ جو ضرورت رشتہ کے عام اشتہاروں سے ملتا جلتا تھا مگر ترقی پسندی کی عینک لگا کر پڑھا تو عبارت کا مفہوم کچھ یوں سمجھ میں آیا۔

اشتہار برائے سبک

ہر خاص و عام کو اطلاع دی جاتی ہے کہ اگلے مہینے کی پہلی تاریخ کو صبح چھ بجے شہزاد سی ولیر جہان کے سوئیر کا ٹورنامنٹ شروع ہوگا اور مناسب اور معقول امیدواروں کو شہزادی پر عاشق ہونے کی اجازت ہوگی۔ بشرطیکہ وہ مندرجہ ذیل ضوابط پر پورے اترتے ہوں :-

۱۔ کنوارے کا سرٹیفکیٹ جس پر صاحب بہادر وچن کمشنر کے دستخط ہوں۔ اور امیدوار کے والد کی سالانہ آمدنی اور جائیداد کی تفصیل درج ہو۔

۲۔ تندرستی کا سرٹیفکیٹ جس پر سول سرجی صاحب بہادر کی تصدیق ہو۔

۳۔ دو عزیز آدمیوں کے نام اور پتے جو امیدوار کے چال چلن کی ضمانت دیں۔ اور اس کے فتنہ پردازوں میں سے نہ ہوں۔

۴۔ سرکاری خزانے میں بانج روپیہ جمع کرانے کی رسید۔

۵۔ طبقاتی چیزیں مثلاً زمینداروں اور خان بہادروں کی سفارشیں ممنوع ہیں۔

۶۔ امیدوار ایک ہفتے کا لاشن، بستر اور دفا دار ملزم بہرہ لائیں۔

۷۔ ہمارے کو ترجیح دی جائے گی۔

۸۔ کامیاب امیدوار کو شہزادی ولیم کے علاوہ جائیداد کا تہائی حصہ بطور انعام ملے گا۔

نوٹ :- سب کو خبردار کیا جانا ہے کہ خواہ مخواہ عاشق مومنے کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔ اس قسم کا امیدوار

ایسی سزا کا مستحق ہوگا جو پچاس روپیہ جرمانہ اور تین ماہ کی قید تک ہو سکتی ہے۔

اس ناچیز نے اس شاندار ترقی پسند سیٹ پر اظہار مسرت کیا۔ اور دعا آگئی کہ دنیا کی شہزادی کی شادی اسی طرح ہو کہسے خود! کاغذات مہل کے گھوڑا منگایا یہ سیر بھی لگا کر سوار ہوا۔ اور سوئے فورنا منٹ روانہ ہوا یہ مقابلہ نہایت شاندار رہا۔ حرج حرج کے صحیحان ملے گئے۔ آئی کیو (۱۰۵) بھی شٹ کیا گیا۔ جو تازہ ذہین تھے۔ انہیں نکال دیا گیا۔ اتفاق سے ایک حبشی بھی کہیں سے آن چکا، اسے سزا دی گئی اور فہرست سے خارج کر کے وقت اس کے منہ پر سفیدی مل کر خنجر میں پھرایا گیا۔ تاکہ سب کو عبرت ہو۔

چند جمعیت پسند امیدواروں نے آتے ہی پہلا سوال یہ کیا کہ جائیداد کا کون سا حصہ ملے گا۔ شامی یا جنوبی جواب شنیدہ راتوں رات فرار ہو گئے۔ کیونکہ وہ علاقہ تہری نہ تھا۔ وہاں یوب وہیل لگانے کی ضرورت تھی۔

خاکسار بھی فائیل جیت کر فائیل تک چا سپنچا۔ اتنے میں نہ جانے شہزادی کے ماموں کا لڑکا کہاں سے آگرا۔ یہ مردوک کہ سچ نجیعت و نزار تھا ایک بہت بڑی جائیداد کا نہاد وارث تھا۔ (ادب و صحت اس کے باپ کی گرتی جارہی تھی) اس مردود کے مقابلے میں یہ ناچیز۔ قدرے مفلس تھا۔ مفلس عاشق کہلاتا تھے دیسے بھی شرم محسوس ہوتی ہے مگر یہ سچ ہے کہ وہ

مفلسی سب بہادری ہوئی ہے

آدمی کا دوسرا کھوئی ہے

اس کمبخت کے آجانے سے ڈرنٹ کا رنگ ہی بدل گیا۔ نہایت سراپہ دار و سولات پوچھے جاتے۔ اور شہزادی کی امان نے برادر زادے کے لئے رو دو کر برا حال کر لیا۔ آخر وہ سب کے سب جمعیت پسند ثابت ہوئے اور فہرست اس نمون کے حق میں کیا گیا۔

ڈرنٹ کے نتیجے کی خبر مشتاک سننے ہی موم جامد مہر جاگ ہوا۔ تاملیاس پہنے اس حال میں خاکہ نہ سر پہنچتا تھا۔ نہ پاؤں پر جچی۔ بین شہزادی کے والد نے اس حیرت کو غلاب توقع مبارک باد دی۔ اور کہا کہ لڑکی کو اس کی والدہ نے بیوہ لگا کر رکھا ہے شاید تو نے حکیم کو نہیں دیکھا جو دراصل — بے غم — ہے۔ لڑکی بھی چند سال کے بعد دیسی ہی عجم دشیم بن جائے گی۔ اگرچہ جبے ملٹا پارٹوٹ نہیں لیکن واسے نادانی کیا بتاؤں کہ — عا — میں امیرِ دایم فریہی ہا ہوں۔ اسے نوجوان کو ٹھٹھے میں نہیں رہا۔ اس کے بعد

ترنم سے بولے)۔

تم بھی بیاہ کر دو نوحہ نو
ہم دیکھوں گی فریادوں کو

اس بیان سے اس نیاز مند کی تسلی تو نہ ہوئی لیکن یہ یقین ہو گیا کہ شہزادیاں اس ملک کی سرگزشتی پسند نہیں ہیں —
”یاد رہے ایک بات پڑھیں؟“ خود نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔
”دو پوچھ۔“

”اب دو ہی پوچھوں گا۔ یہ بتائیے کہ کبھی آپ کو کسی سے کچھ محبت ہوئی؟“
”ہاں ہوئی تھی۔ یہ شہزادی فارغ تحصیل بلکہ فارغ اعلیٰ ہو چکی تھی۔ ہم دونوں جرمنوں کی کلاس میں ملے، ہائیکورٹ کے پاس جو
بھیجے جے وہاں اکڑ جایا کرتے۔ وہاں میں نے اسے کورٹ کا شروع کیا۔ اس کے سرخ روشن پر ایک ٹال ہوتا۔ یہ غالب کبھی تو پیشانی پر ہوتا
کبھی نثار پر۔ تو کیونٹھوڑی یاد رکھی۔ دوسرے سے غائب ہوتا میں حیرت سے یہ شعر زبان پر لایا۔
محبت رخ پر ترے خصال گھسنا ہوا
یہ غلام حبشی حسانہ قدس آن ہوا

تس نے فوراً مطلع کیا کہ خال وہ مصنوعی تھا۔ اور سرچے سے محض زیبائش کی خاطر بنایا جاتا تھا میں نصیحت سرخ ہونٹوں

کی تعریف کی کہ

لال ہیں آپ ہی لب شرفخی پاں ددر ہے

ناز کی کہتی ہے یہ بارگراں ددر ہے

اس پر شہزادی نے عجب تسرے فرمایا کہ یہ پان دان کی سرخی بنیں یکس ٹیکٹ کی بڑھیا لب شک ہے۔ اگرچہ اس فقرہ کو علم تھا
کہ لب شک کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ شک نہیں کرتی۔ تاہم موضوع بدلنا پڑا۔ اور پارٹری کا ذکر چھڑا وہ بولی میں جانتی ہوں
آپ اس جیلے سے میری خوشامد کرنا چاہتے ہیں۔

میں نے جوویوں کی طرف دیکھ کر کہا: ”کی میں انہیں چھو سکتا ہوں؟“

وہ بولی: ”آپ اسی ہاتھ سے میرا ہاتھ تھامنا چاہتے ہیں۔“

اس صاف گوئی پر یہ درویش باغ باغ ہو گیا۔ ماشاء اللہ کیا ترقی پسند محبوبہ تھی۔ بے حد مسرت کا سامنا ہوا۔ سوچا کہ جب انجام

مقررہ ہے تو غرار بدلی میں شامل ہے کہ

بیاہ کا ایک دن معین ہے

نیکوئوں رات ہجر نہیں آتی

چنانچہ میں نے اسے شادی کے نلے کھد دیا۔

بولی: ”آپ خراشے تو نہیں لیتے؟“ میں نے فنی میں سر جھوٹ دیا۔

اس پر وہ بولی: ” تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ آپ جیسے ادر میرے والدین کو سنا لیجئے۔“

یہ جواب بھی ترقی پسند تھا اور اس فرد کی پسند آیا۔ میں سیدھا اس کے والدین کے پاس پہنچا اور سوال کیا۔ انہوں نے پہلے تو اس کمترین کا ثبوت نسب حضرت آدم تک دریافت کیا۔ یہ حجت متعلقین کے متعلق طرح طرح کے سوالات پوچھتے رہے معلوم ہوتا تھا، گویا ہمت لگا رہے ہیں۔ پھر بولے۔ اگر تم وہ دونوں سے خدا خواست کسی کا انتقال ہو گیا تو بڑی کے لئے کیا انتظام ہوگا۔ کوئی ذاتی ملکیت یا شے کی پالیسی ہے؟ پھر میرا کفریہ شروع ہوا۔ جیسے نیا ہی بوری ہو۔ میں نے عرض کیا کہ میرا ارادہ نیک ہے اور میری ادائیگی ملکِ نومت نہ پہنچے گی۔ آخر آپ اتنے لمبے چوڑے ہر کے لئے کیوں ضرر میں معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو یقین ہے کہ یہ شادی کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ وہ بولے۔ اگر ہر تھوڑا لکھا گیا تو دنیا کے سامنے ہماری ناک کھٹ جلتے گی۔ خیر یہ حقیراں گی۔

وہ چاہتے تھے کہ پانی رسومات ساری ادائیگی جائیں میں معروض ہوا کہ مجھ کا کھانا ایا م جمالت کی رسم ہے جب پہلی کا یہی ایک طریقہ تھا کہ لوگوں کو بلا کر دکھا دیا تاکہ واقعی شادی ہوئی ہے تاکہ وہ سب بعد میں گواہ رہیں۔ اب تو خداوند میں صوبہ بھجپ جاتی ہے۔ اور پھر شہر دخل سے یہ اتھرت مت گھبرا ہے ہاتھ پاؤں میں عرشہ آتا ہے لیون محوس ہوتا ہے کہ جیسے میں کچھ کیچھ کر بیٹھا ہوں۔ لیکن وہ بدستور مقرر رہے۔

آخر یہ تجویز پیش کی کہ شادی دو چھتوں میں ہو۔ پہلے آپ مجھے فارغ کر دیں پھر مہینوں بلکہ سال بھر تک روشنیاں ملا کر شرب ڈھول بجائیں اور دعوت برسر اسے۔ ریشیا کو (مو ایشیائے کوچک کے) مدعو کر لیں۔ وہ کہاں درجہ رحمت پسند نکلے کر نہ مانے۔

اسی طرح وقت گزرتا گیا کسی نے مندرہ دیا کہ ہرادی کو نور تو دیکھو۔ دیکھا تو ملیہ بدل بکا تھا۔ عینوں اکھڑا، بال ترشونا، ماتھ پانا ان خوبوں کا مجھے پہلے علم نہ تھا۔ جو دن اور ایک آپ سے کسی روز بھی معلوم ہوتی۔ مگر میں سادہ کپڑوں میں دیکھتا تھا جو بی ادب مرقی دکھانی دیتی۔ رنگ و روغن کی وجہ سے اصل شکل دیکھنا محال تھا چنانچہ عشق و عاشقی کو بلائے اکیٹھی رکھا اور ان رحمت پسندوں کو ان کے محل پر بھیجوا۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ کچھ منزل پسند ایک ترقی پسند کو سر باز رکھوں مار رہے تھے اور وہ عاوش کھڑا برداشت کر رہا تھا میں کچھ دیر تو کھڑا دیکھتا رہا۔ پھر ایک اچھا پتھر اٹھا کر کھینچ لیا۔ وہ دبلا اٹھا اور بولا۔ اسے مرد ستن فہم یہ سب تو مجھے ہی نہیں جانتے کہ کیا کر رہے ہیں۔ تو تو ترقی پسند ہے مجھے ہر گز یہ امید نہ تھی۔

اس واقعے کے بعد انجمن سی پیدا ہو گئی۔ کیسے ترقی پسند اور کہاں کی ترقی پسندی۔ لوگ جہاں تھے وہیں کے وہیں میں۔ کوئی کسی مرغ بھی ترقی نہیں کر رہا۔ دیسے میرے دوست ترقی پسندی کے تعلقات ہمیشہ کشیدہ ہی رہے۔ ہم نے ایک دوسرے کو زیادہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ شاید مجھے شہزادوں کی وجہ سے کچھ چٹسی ہو گئی تھی۔

”اس کے بعد کیا ہوا؟“

”اس کے بعد یہ ہوا کہ تنہا نگاری کی بدولت مجھے گزلیں اچھلنے میں غامی جہالت ہو گئی۔ ادھر غمی پرچوں کی ہانگ بٹھنی جاری تھی۔ چنانچہ یہ غمی نقاد بن گیا۔ ادھر غمی ستاروں کے متعلق نازہ ترین افواہیں ہم پہنچانے لگا۔ کہ وہ بول بٹھنے والے میری زمین تحریروں کا بڑی بیصبری سے انتھار کیا کرتے۔ غمناز اور ادا کا رنج سے ڈرنے لگے۔ کئی مہینوں سے اسی بہانے کو سنی ہو گئی۔ ترقی پسند اور رحمت پسندوں کے درمیان کھینچنے لگے۔

پھر کیا ہوا؟

”بھگال ہوا، موصول ہوا۔“ گلاس نے جھلکا کر کہا۔

”ابھی کتنا سفر باقی ہے؟“

”تو بڑا بے مہربان، اچھا ہے، سفر بہت ہی ختم ہوا۔ یونہی طبیعت ہمراہ کر دی۔ اگلی مرتبہ جب فرصت ہو تو بے آئیو۔“

سر شام جہاز باخوردوان دھمکا اور بولا۔

”صبح سویرے اس کے لئے معافی کا خواستگار ہوں۔ سزا کے طور پر میسر اس سفر دوبارہ سننے کے لئے تیار ہوں۔“

جہاز باخوردوان سکرا کر بولا۔ ”تم معاف کرتے ہیں۔ اور جو تھا سفر پہلی مرتبہ سنا ہے میں۔“

جہاز باخوردوان کی کاچو تھا سفر

۴ فصل بہار آتی یہ صوفیو شہاب

بس سوچ کی نماز مصلحتا اٹھائیے

اسے زینت و برینہ ایک رات کا ذکر ہے کہ میں نے کئے کو مارنے کے لئے ایک وزنی سی کتاب اٹھائی کتا دور جا چکا تھا۔ لہذا دوش کر دانی کرنے لگا۔ اور چڑھتے چڑھتے سو گیا۔ علی الصبح جوتا اٹھا تو اپنے آپ کو پر دتاری پایا۔ سچا کتا پریشیتا ابدیوی اسی میں ہے کہ پر دتاری ہنوں اور نام پاؤں۔“

اسے ہم مدعو طوعی گفتار، غفلت پر دتاری سے آپ کی کیا مراد ہے؟

”یہ ایک آمرینی لفظ کا غم ابدی ہے اُنہو میں۔ ڈکٹنری دیکھ بہت کچھ معلوم ہو گا۔ پر دتاری مٹا آسان کام نہیں، بڑی بہت چاہئے۔ دن رات بھاری بھاری کتابوں کا مطالعہ کرنا، کتابے بیکچروں میں جانا پڑتا ہے۔ پبلشنگ الگ، ہوتے ہیں بہت جلد فدی نے یہ کورس مکمل کر لیا زندگی میں کن تبدیلیاں آگئیں۔ اٹھنا بیٹھنا صرف پر دتاریوں میں ہوتا۔ بڑی طویل بحثیں ہوا کرتیں۔ پر دتاری ہونے کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ میں مذہب میں اور دیگر اہم مسائل پر جدید ترین نظریوں کا اظہار کرنے کی پوری آزادی تھی، ہماری انوکھی اور بصیرت افروز باتیں سن کر عوام چونک چونک پڑتے، ہر موضوع کو ہم تفصیل اور قوت سے سمجھنے، انسانیت کو دینے کے عالمگیر قوانین ہمارے لئے مہل اور لغو تھے۔ ہر انسان، ہر موصول، ہر بیان کو ہم صرف مشرق کی نظر سے دیکھنے بلکہ مغرب میں عجیب اڑا دیتے، جب دن تھوہ جی۔! کیا عجب تھا، کیا وہ بد بختا۔ سڑک پر پر دتاری چلتا تو لوگ ادھر ادھر بیٹھ کر ماسٹہ دیتے، جھک جھک کر سلام کرتے، کیا جال تو کوئی ہم سے بحث کر سکے، چند ہی غوروں کے بعد وہ یوں خاموش ہو جاتا جیسے سانپ سو گھ گیا ہو، بڑے سے بڑے پوچھ میں محض چند پر دتاریوں کی اقد قیامت برپا کر سکتی تھی۔“

”جنگ جملہ بدو پر دتاری آگئے۔“ لا نولہ کر وہ ایسے بھاگتے کہ چپاں اور پھانے چھوڑ جاتے۔

جب میں نے مقامی پبلک کو لگے لگاتے تھا وہاں مقامی لوگ ان تھیں کہ سید سے بہت زبردستی تھیں۔ وہ ہم سے بدگمان تھیں، ہم مذہب دوستی، ایمان، غصہ مخت۔ کے پرچے ضرور اٹھاتے تھے لیکن سب دکھا دے کے سننے تھا، کبھی کبھی ہمارے دل میں محبت کی آگ سے سلگنے لگتے ضرورت پڑنے پر ہم خدا کا واسطہ دیا کرتے، معصیت پڑتی تو دعا میں مانگتے۔ مگر کبھی نہیں، سوائس کے متعلق ہمارا تجربہ اتنا ہی تھا جتنا غیر پر دتاریوں کا لیکن

ہماری معلومات کا مخد فریڈر ڈی ایچ لائسن اور دیگر حضرات کی کتابیں تھیں۔ خیالات ان کے تھے بیان ہمارا تھا۔ اگرچہ ہم نے ان مصنفین کا حوالہ کبھی نہیں دیا۔ اور ہاں میں ہاں بول گیا کہ پروٹسٹانسی ایک انقلاب بھی جانتے تھے۔“

”کیسا انقلاب؟“

”کبھی ایک عالمگیر انقلاب تو کبھی ملکی یا غیر ملکی انقلاب۔۔۔ بعض اوقات ہم مقامی انقلاب پر ہی قناعت کر جاتے ہیں انقلاب ہو کہیں کسی قسم کا کسی سازش کا۔ چنانچہ ہم بار بار نیکل کر انقلاب کے لئے اکٹھے ہوتے تھے کہ ہنگامے بیاہوں اور نوآفرینی چمے، دیکھے خدا بولے مگر لوگوں پر ہماری اہمیت واضح ہو جاتے لیکن مجھے غصہ تھا تو اس پر کہ یہی لوگ ان جو ہم سے ملنا ہی ہنک بھتیں کلب میں وہ دھماچو کیونچا میں کہ خدا کی پناہ۔ ایک خاص طبقے سے خوب چلبلیں کرتیں۔ یہ حضرات بھی عجیب تھے۔ دیسے اچھے جملے تھے لیکن اپنے آپ کو جید مڑوہ ان بدعصب سمجھتے اس کی وجہ اپنی بے درخشاںی مانتے۔ حالانکہ ہر ایک ماٹرا اللہ چھوچھو ہواں کا باب تھا۔ ان کی ایک ہی رٹ تھی کہ ان کی ازدواجی زندگی نہایت نیکاناک ہے۔ اور وہ بیوی سے تقریباً تقریباً علیحدہ ہو چکے ہیں۔ اتنی بڑی دنیا میں کسی نے انہیں سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اس ہمارے وہ ہر روز کی سے فطرت کرتے چونکہ ان کے پاس کارں تھیں اس لئے یہ بورژوا تھے۔“

”اس ناچیز کے چچا جان جو تھا نہ مارا میں کار کھتے ہیں کیا وہ بھی بورژوا ہیں؟“ خود دے ہو چھا۔

”مرد جو ننگے۔ تو یہ شادی شدہ بورژوا حضرات دن بھر کاروں میں لوگوں کو لئے پھرتے بھٹ پیٹے کہ ان میں سے کوئی جا نہیں برس سے کم نہ تھا یہ نہیں انہیں اس میں کیا ملتا تھا؟“

”غالباً انہیں سسٹہ تیس اکیس کے پرانے ماڈل پسند نہیں تھے۔ اور نئے سسٹہ ایم ماڈل حقیقت دیدہ زیب ہوتے ہیں۔“ خود نے دوبارہ عرض کیا۔

”گھر یہ سنئے ماڈل ان کا خوب مذاق اُڑاتے۔ جتنے ہی سوال ہوتا آپ کی ننگی بچی کا اب کیا حال ہے؟ آپ کے بڑے کا بخار اترا؟ بیوی کا کوئی خط آیا؟ بڑی بڑی کی ک شادی ہو رہی ہے؟ دیکھئے میں ضرور بدلیئے مگر یہ بورژوا تھے کہ۔“

”دیسے یہ بورژوا ہوتا کیا ہے؟“

”بورژوا وہ ہے۔۔۔ کاروں نے پیرے کے انبار اور ہاتھوں کی جنبش سے تانے لے کر کشش کی جو۔۔۔ جو۔۔۔ باطل بورژوا ہو۔۔۔ منا ہے کہ فرانس میں سود گردوں کا ایک طبقہ رہتا تھا اسے بورژوا کے نام سے پکارتے تھے۔ لیکن یہ کافی عرصے کا ذکر ہے۔“

”یاد دہرشد۔ یونٹ آف پیرس کی کئی سٹیٹی پر ایک بورژوا بھڑکا ہوا ہے۔“

”اللہ بہتر جانتا ہے کہ اس کے گئے میں میں دینا تخت ناوا کی ہے۔ تو میں نے لڑکیوں سے ان بورژوا حضرات کی خوب برائیاں کہیں اور انہیں بہت سمجھا۔ یہ بھی کہا کہ یہ سب سرمایہ دار ہیں اور ساج کے دشمن ہیں۔ وہ سسٹہ گلیں کار کو چھوڑ کر ان کے پاس ہوتی کوڑی بھی نہیں سے۔ جنک میں ان کا حساب منفرے بلکہ فروعی رہتے ہیں۔ میں نے بتایا کہ سرمایہ داروں نے کیلئے سرمایے کی ضرورت نہیں۔ یہ سرمایہ دارانہ ذہنیت ہے جس پر غصہ آتا ہے۔ وہ بولیں جب سرمایہ میں تو ذہنیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگرچہ میں خود پروڈونائٹ سے اکتا چکا تھا لیکن یہ لگے گا کہ وہ مل تھا۔ کچھ عرصہ بچا ہوا۔ آخر ایک دن میں نے آؤد کھینا۔ تاہم ایک ذہن ی پڑی ہوئی نہیں سے خریدی اور بورژوا بن گیا۔۔۔ دسے بائیں ہر بڑی سے فلوٹ کرنا شروع کیا۔ اور ہر جانی کے نام سے شہرت پائی۔“

”آہ تو آپ ہر بات میں جی رہ چکے ہیں۔ ملائیے اختصار، ناشدنی نہیں ہر بات پر چکا ہے۔ آہ سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ زندگی میں مختصر ہے۔ اور تین تیرے بعد ادھل اتنے زیادہ ہیں۔“

”لیکن وہ تین روکیں تو کچھ پسند آئیں اور ارادہ اس خاکسار کا شادی کرنے کا تھا۔“

”ان سب سے؟“ خود تو جھک پڑا۔

تینیں، ایک سے ایک معلوم ہو کر لڑکیوں کی توقعات بہت زیادہ ہیں۔ کورٹ شپ میں وہ صرف لڑکے کے فرائض معلوم کرنا چاہتی ہیں انہیں فرائض پیل حلقہ کے رہنے والی سانس کس مزاج کی ہے۔ کہنے میں بہت زیادہ لوگ تو نہیں۔ لڑکے کی خواہ کار گڈ لیا ہے اور یہ گڈ اسے ملے گا بھی یا نہیں۔ یہ بہنے کے کیا امکانات ہیں۔ نئی مہرج تو نہیں کہ فردا دوسرے در سے بات کی اور خطا ہو گیا۔“

”تیر نہیں۔ البتہ شادی کے متعلق سنجیدگی سے صرف ایک طبقہ سوچتا ہے، غامد دل کا طبقہ۔ یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ حقیقی سہرت سے انسان تب تک آشنا نہیں ہوتا جب تک اس کی شادی نہیں ہوتی۔ لیکن تب بہت دیر ہو چکی ہے۔“

یاد نوٹات ممت کاٹ چھپ چاپ مستارہ۔ یہ لڑکیاں بھیجید (MATERIALISTIC) قعیس، بولی جوں دقت نہ کرتا کیا ہیں ہر چیز سے
بے نیاز ہوتا کیا۔ جہاں تک کرنا ہی سے ڈرتے لگا۔ ان لوگوں سے میری خوف کھانا جو خیر ہے بنتے بال بال کچے گئے حرارت سونے سے پہلے اس قسم کی دعا کہتا
کر۔ اے پردہ کار میرے حال پر رحم فرما شیوہ کی کہیں شادی کر دے۔ اگر کسی پر غمخوری کی کہیں مشکلی ہو جائے میں اس پر آمرا عبدین اور دودھی فضیل
کسی کہیں انتظار کرنا دے

لیکن اس کا بوشہ دار ہونے سے کیا تعلق ہے؟ کاٹن کو مومو بھرا بدل جاتے " خود بخود تڑپ دیر میں ڈانگسری دیکھ چکا تھا بوللا۔

”بہت اچھا۔ اب اس مغربی ایک چیز باقی رہ گئی ہے تجھے یاد ہوگا کہ اصف بلکہ کے سندباد کی ملاقات ستمہ پیر سے ہوئی تھی جس کے

پتھل سے بڑی جمیعتوں کے بعد نکلتا تھا۔ میرا بھی ایک ایسے ہی سفر ہے " واسطہ بڑا اسفر ہے "وٹے وقت میں ایک بندرگاہ پر اترتا تھاں بندر

کی بندر تھے وہاں ایک انشورنس ایجنٹ میرے پیچھے ملک گیا۔ ایسا تعاقب کسی نے کسی کا ریکہ ہوگا۔ جو میں گفتگو میں وہ فقط تین چار گھنٹے بچھے

چھوڑتا رہتا۔ ساتھ ساتھ اس سے دور بے کے لئے کیا کیا محن میں نے نہ لئے۔ رحمت کا سمجھتا کہ اس کی ڈیڑا باؤ رکھا، آخر تک اسے خود کسی کی دھمکی دی نہیں

پر وہ بولا کہ میں جی ساتھ خود کسی کر دو گا اور ایسی دینے کے لئے اگلے جہان تک پچھا نہ چھوڑ دے گا جب میں نے سچ کچھ قبول کر دیا تو بولا اسے مرد نیک

خصلت! اگر تو فی فی خود کسی کر رہا ہے تو ایسی مفت سے لئے کن وارث تجھے بنانا چاہئے۔ اتنا غصہ کیا خود کسی کا ارادہ کر گیا۔ اور دوسرا کہا ٹی بازار

میں اصف بلکہ کا قدیم نسخہ حاکم کر لئے گیا۔ تاکہ کوئی ترکیب نکالوں سندباد سے اسے اسے مرد ناباکو کہ انگوٹوں کی شراپ بلا کر دے ہوش کیا تھا۔ ابلہ میں نے

اسے بادۂ افروغی کیا بلکہ انراں ہوا۔ پانی کر دہ اپنے تنہا ہوش میں نہ رہا۔ کچھ دیر وہاں کی تباہی کتبہ را پھر اسے خود کو زود کو بک گیا۔ جیلہ حیران ہو کر خود توبہ کرنے

اتھوں اسیر و ام لیا ہوا۔ خود گرفتار ہو کر رہتا ہوا۔

جب اگلے روز وہ مجھے سڑک پر ملا تو نرا کر مینہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس کے بعد جب کہیں ٹانگھل ہو کر رہا تاخیر اس طرح میری نجات ہوئی
 الف بلا سے معذور اٹھ گیا۔“

گستاخی محاف: خود بولا۔ ”شعور سے اب تک جو واقعات آپ نے سناے میں بالکل اہل ٹپ ہیں، غالباً آپ کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہے۔ بہرہٴ نہیں آپ ثابت کیا کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کو یہ فرمیں نہایت ”نکارا۔“

مگر تو نے مجھے بار اٹھا بھی تو ہے۔ شاید ایک دن میں دو سفر کر کر تو اکٹا لیتے۔ اب آئندہ تجھے ایک لفظ نہ سناؤں گا۔ جب تک تو ہونٹ سی لینے کا دلاہ نہ کرے۔“
 ”کس کے ہونٹ؟ آپ کے؟“
 ”نہیں اپنے۔“

اور وہ دو فوجیوں نے اصرار ہو کر شک و شبہات دھو دھوئے دل صاف ہوئے اور جہاز باؤکلاں کا چوتھا سفر تمام ہوا۔
 اگلے روز جب شہناز بچوں کے آفتاب پر جال بھیک کر شکار کیا سپاہ افکار کو شکست ہوئی قلمت کی مگرانی ہوئی تب جہاز باؤ خود دھار ہو کر بولا۔ ”یا استاد کلاں اپنا باپ بچوں سفر بیان کر کہ میں دو روز تک تیرے ہاں قیام کر دوں گا۔ اپنی گھڑی بھی کسی کو دے آیا ہوں۔ اور دو پولیس بھی ساتھ لایا ہوں۔ اب مجھے سماعت کے لئے تیار سمجھ۔“
 جہاز باؤ کلاں نے بول کلام کیا۔

جہاز باؤ سندھی کا پانچواں سفر

”دل دکھایا کسی گھمبیں نے کوئی گل توڑا
 باغ سے نالہ بلبیل کی صدا آتی ہے“

اس پر خود پھر بول اٹھا۔ ”بھائی ایک صلاح ہم دوں گے، وہ یہ کہ آئندہ آپ ایسے اوٹ بٹاؤگے اور بے عمل شہر کم از کم اپنے محل میں میں نہ پڑھا کریں۔ اب تک جو اشعار حضور نے پڑھے۔ ان کا ہفتے سے کوئی سرور کار نہ تھا۔“
 اسے فوجیان بن بخت! اعراض کرنا تیری مرشد میں ہے۔ یہ اشعار میں نے روایات قدیم کو مدنظر رکھتے ہوئے پڑھے۔ پڑانے زمانے میں دستور تھا کہ داستان کوئی اشعار کے بغیر ناکمل تھی۔ اسے محض رواداری سمجھ۔ رواداری بشرط استواری اصل یہاں ہے۔“
 ”رواداری نہیں۔ وفاداری بشرط استواری۔“ خود دے لقمہ دیا۔

”اچھا بابا وفاداری یہی میکنی واسطہ ہے تجھے اپنے پیر کا۔ اگر تیرا پیر ہے تو۔ تو خاموش رہ۔ آج کا سفر بالکل فطر ہے۔ اور غالباً آخری سفر ہوگا۔ لہذا آج کی رات ساڑہ دو رو نہ چھیڑ۔

میں زیادہ دیر بورتھوڑا نہ رہ سکا۔ لوگ اس لفظ کے نہ سمجھ کر کہتے نہ سمجھ کر کہتے کہ آتا تھا۔ بار بار مسمیٰ پوچھتے۔ ادھر میری کار بھی بک چکی تھی۔ مہو جاکر ذہنی ارتقا کی منزل میں طے کرنے کی غرض سے یہ سفر شروع کئے تھے درنہ کافی ہاں بڑا نہ تھا۔ چنانچہ پھر باہر نکلنے کی شافی۔ موسم گرما گزرنے کے لئے ساٹھ مل کر مخرج کیا۔ کہ کسی جہانے بڑے بڑے آدمیوں سے ملاقات ہو جائیگی۔ وہاں نہ جانے کیا ہو اگر خیالات اس ناچیز کے دفعہ بدل گئے۔ غالباً یہ اپنے وطن کی صحبت کا اثر تھا کہ خاکسار منزل میں مانا کہیں کا کہیں جا نکلا۔ آخر اس گلہ بچہ لکھ گیا جہاں تو مجھے آج دیکھ رہا ہے۔ اب میں بالکل بے نیاز ہوں۔ کسی کی مراد نہیں کرتا، مطلب تو خود فرد کسی کی مدد نہیں کرتا کسی کو خط نہیں لکھتا۔ لوگوں سے تب ہی ملتا ہوں اگر کوئی کام مورد بلا عرض کسی کو دھو نہیں کتا۔ نہ زیادہ مہو جاتا ہوں نہ محنت کرتا ہوں۔ بھلا دینے کے بھیجے آج تک کسی سے ختم ہونے ہیں۔ جو میں اور تو ہمیں ختم کر سکیں گے۔ ہر قسم کی تقریر و تحریر سے اعتبار اٹھ چکا ہے۔ پڑھنا، لکھنا، اٹھا، بھلنا یہ سب بیکار باتیں ہیں شہزادوں کی متوازی تہذیب و فانی سے منادی

میں بھی دیکھی نہیں رہی۔ بچوں کی سماجی حیثیت یا تو عمارتوں پر بندوں کی سی ہے۔ وہ مین سال کیلئے بھر پور ہے برعکس میں اور بال باپ کو بوقت سمجھنے لگتے ہیں میرے پڑوسیوں سے میرے نظریوں کی مستقامت میں بڑی مدد دی ہے۔ آج مجھے بھی قدرت کا تماشا دکھانا تھا۔
یہ بکر کو وہ خود کو دیکھنے لگے گا۔ کوڑا کھولنے کی دیر بقی کر دوسرے گھر سے چھپ چکا تھا رشتا سی دی۔ کئی بچے بڑی بیباک آواز میں چلا جاتا کر رہے تھے۔ خود دے کان میں انگلیاں ڈالیں تو کلاں نے دیکھ کر ہنسا۔

آج میرے دوست! جب کبھی مجھے گھر سانسے یا آندھ ل کے متعلق خیال آتا ہے تو فوراً یہ دیکھ کر کھول کر بیٹھ جاتا ہوں اور عزت حاصل کرتا ہوں۔ اور پھر اگلی نسل کی بجائے کوئی پردہ نہیں جس روز میں اس جہاں سے نصرت ہوا، اوروں کا کہوں کو خاندان کا نام روزی کرتے دیکھنے دو بارہ ہرگز نہیں آؤں گا۔

”افو! — نچ — نچ — یہ بیٹے بھانٹے کیا ہو گئے۔“ خود نے اعلان فرمایا۔

”اب میں Nihilist ہوں، لی بٹ!“ کلاں نے اپنے سینے پر کھون کی ہارٹ کرتے ہوئے کہا۔ ”خیر اور اس وقت کے سنے پوچھے ہیں تو۔ اور اسے مرد و عورت بازمیرے پاؤں سمجھتا ہوں۔“ ایشیائی مجھے سات منفرکت نے چاہئیں تھے۔ یہیں دنیا کے حالات کو نظر کرتے ہوئے پانچ کافی ہیں۔ دیسے بھی محسوس ہوتا ہے کہ کدوئی تک دوسری اپنی منزل میں سے پالی ہے۔ میرا مقام مجھے ہاتھ آگیا ہے اور نوجویوں کو تو فوں کی طرح دیکھ رہا ہے کہ چاہے تو جیتے دو سفر تو کر آ میری طرف سے اجازت ہے۔“

”جی نہیں۔“ ایسے احوال اور ایسا عمل چھوڑنے کو کس کا جی چاہتا ہے۔“

”یہ عمل میرا کہ ہے۔ الاٹ شروع ہے شروع شروع میں خاکسار نے خیالوں و رمالوں میں بڑے درناک بیانات چھپوانے کو کہا ایک ادبی لادھی کھونا چاہتا ہوں۔ پبلک نے زبانی و صلا و خرافی تو بہت کی لیکن چند کسی نے نہ دیکھا، دراصل پبلک بڑی ہوشیار ہو گئی ہے، فوراً سمجھ جاتی ہے۔“
”دروغہ نہیں، اسے دیکھتے تھے! یہ لادھی کا کریمت چل جاتا تو دولت کا ڈھیر لگ جاتا۔ اور ہر خود دار تیری پوسٹ دار ہیں کیا ہے؟ تو کدوئی کے سنے اپنا نام چھڑ کر دیا؟“

”نام چھڑ تو نہیں کہ آیا لیکن جس لمحے میں رہتا ہوں وہاں چھ ہے۔ یہاں اور کتنے بہت زیادہ ہیں۔ سوچ رہا ہوں کہ وہاں ایک جینی ریستوران کھول لوں۔“

”اس سے تو یہ بہتر ہے کہ میرے ساتھ شرکت کر۔ تو کدوئی فرمانبردار نوجوان نظر آتا ہے کہ کام مجھے کوئی خاص نہیں ہے۔ تیری بندیشانی کو دیکھ کر میرا موٹو ٹھیکٹ ادنیٰ و علی ہو گیا ہے۔“

”یہ بندیشانی نہیں مجھے بن گئی پہلی نشانی ہے۔“

”یہ کتنے بے بہا فوٹے کیونکر پایا؟“

”ایک دوسرے رسول مری کے مقابلے میں شرکت کی تھی۔“

اتفاق! پھر تو پورے غم میں تو سنے کے لائن ہے۔ پہلے اپنی ہیئت کو کافی ٹھیک کہو حجامت کر، دھبک بدل، سر نہ غسل کیا کہ ادھر ہر دوزخ کو پڑوں کو دھوا کر استی کر۔“

”میں مجھے تشنگی نہیں اپنی بارود کی نہ نکال دیں۔“

”تو کیا برو؟ خیال ہے کہ چند نثر فاضلہ می مرتبہ کو خوش کرنے کے لئے ایک بلند پائے کا معیاری رسالہ جاری کروں۔ دیکھو کہ دوسرے لوگ کریں گے۔ لیکن نام ہمارا ہو گا۔ کیا راہ ہے۔“

”اب جیسا کہ سب کچھ سن رہا ہے بنا کہ کبھی تو بھی ایسی کٹھن کمزوروں سے گھبرا جائیگی ایسی مصیبتیں کچھ بھی نہیں۔“

خود دئے لوگوں کا ہاتھ چوما اور انکھوں میں آنسو لا کر بولا۔ ”آپ واقعی بڑے بڑے معاشق سے دوچار ہوئے۔ صید انتشار ہوئے۔ اب آپ سزا اٹھائیں۔ دل نکھول کر دکھائیں اور کھلیں۔ خدا کرے نام عمر شاہد ہو، فائز ہر دم و باہم اور ہو۔“

اس پر تہا زباد سندھی گلاں نے خود کے سر پر دستِ شفقت چھرا۔ اس کا رتبہ اور جی بڑھا یا جب تک زندہ رہے۔ دو جان اور دو قالب ہو کر رہے۔

غافل نہیں دُعا، افریندہ ہر دو جہاں، کار ساز مطلق، قادرِ حق میں شکر ادا کرنا چاہیے کہ بندوں کو کمسی کسی مصیبتوں سے بچاتا ہے۔ کٹھن دقت میں اسی کا فضل آئے آتا ہے۔

نتیجہ — پس اے پیارے بچہ! حقیر اس کمافی سے یہ نکلا کہ یہ ضروری نہیں کہ ہر کمافی سے توجہ نکلے۔

شہر اور گاؤں

فلک پیمیا

شہر کا رہنے والا ہوں۔ اکثر شہری انہوں ستروں کی خوش نما ترکیب دیکھ کر خوش بھی ہوتے ہیں، غرض بھی کرتے ہیں۔ مگر بعض چیزیں یہ نہ دیکھتے ہیں نہ سمجھتے ہیں۔ چونکہ گارے سے دماغ محفوظ نہیں۔

شہر وہ ہوتا ہے، جہاں دیوان خانے، زنان خانے، کارخانے، جہلی خانے، قہوہ خانے، قہر خانے ہوں۔ نیز بچوں قہر دیگر ضروریات مثلاً دکانیں اور ان میں روپیہ کمانے والے سیٹھ، عدالتیں اور عدالتوں میں جھوٹ ہوا کر، سفید کو سیاہ دکھلا کر مال دار بن جائے، والے معرذین اور ان کے رینٹ۔ بنگ اور بنگوں سے روپیہ کی ہجرت کرنے والے مباد۔ گاؤں وہ ہوتا ہے جہاں کسان مٹی کرید کرید کرید گیا لوگ کرنا ہے کہ کہیں بیج اور پانی مل کر چا دل کا ذروین کھیت تو کہیں شرف کا سونا۔

شہروں میں دولت کی آب پاشی سے گھاسے بننا می کھتے ہیں۔ گاؤں میں عزت کے کندھے پر انج کی بودی۔ کیا یہ جاتا ہے کہ کھیت انسان نے بنائے اور ہنگ شیطان نے اور آخر کار انسان کے کھیت شیطان کے تکیوں کے لٹھ گردی ہو گئے۔ یہ مبالغہ ہو یا غلط ہو مگر گاؤں میں عام طور پر محنت کا اجر عزت ہے اور عزت کا نتیجہ یہ کہ گاؤں والے کھائیں بھیجرا اور شہر والے چکھیں پر اسٹھے۔ جسے کسان سے محبت ہو۔ مگر جو قہرستی سے مٹی نہ کرید سکتا ہو وہ بھی کر سکتا ہے کہ لفظوں کی مٹی میں سنا دیش کرے۔ تینا لے لفظوں کے بنائے گئے بلا آسمان سے۔ اس آسمان کے اوپر پہنچے، اندر بارہا چاروں طرف جڑ آسمان والا ہے ریا آگ میں ہے جسے ہماری آرزوں کو پورا کرنے کے لیے ہونا چاہیئے، اسے شہریوں کی غیروں سے ایک شہریوں یا کروڑ تھان۔

”اے محبت افلاک والے پناہ بندی دے! میں دھواں ہوں۔ لوگوں

کی آنکھوں کو مجھ سے تکلیف ہے۔ مجھے آگ کر دے“

کیا شہروں کے رہنے والوں نے اپنے شہر کو بندری سے دکھایا ہے؟ صبح و شام بڑے شہروں پر دھوئیں کا گھٹا توپ ہوتا ہے۔ فضا کی شہا میں اس بڑھ کو آگ لٹنے سے اکثر قاصر رہتی ہیں اور یہ ذیب ستراری کی عجیب رنگ لاتی ہے یعنی دماغ میں گاڑا۔ دلوں میں کہورت، خال خال کوئی شہری ہونا ہے جو محض کڑوا دھواں یا غلیظ کچھ نہ ہو۔

گاؤں والے فرشتے نہیں۔ اذکر وہ ایماں بے غبر ہیں اور اس بے خبری کی بدولت بہت سے مصعفت خوانوں سے برتر ہیں۔
 کوئی پڑا شہر نہیں جہاں شاندار کھنڈر نہ ہوں۔ کیا ہمد، کیا دہلی کیا آگرہ وہ شہر کیا جس میں کھنڈر نہ ہوں؟ کھنڈروں کو دیکھ کر شہزاد کے
 رہنے والے بادشاہان کے کھنڈروں میں قائم کرتے ہیں۔ پدم سلطان ہونے کے واسطے، بیٹھی بیٹھی آجمل کے جھنکے، لہریاں ہیں جہاں لوگوں کو خیالی نند
 غزنیہ میں سلا دیتی ہیں۔ گاؤں اس نعمت سے محروم ہیں۔ سینکڑوں گاؤں کا کوہ نہ چھان قالا آتے ذن کی بے رونق سی دکائیں تو دکھائی دیں گے۔

استخوان ماضی

کے تاجروں کی دکان آئندہ سے ادھم لہی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گاؤں والے کا حافظہ کمزور ہے۔ شہر کی ایک باذوق نبردست ماہر مشق والی
 شاندار دکان میں یہ سودا جکتے دیکھا۔ گاہک نے داخل ہوتے ہی آہ بھری اور چلا کر کہا۔

”حضور آج کا نہیں ساری جو کا پیاسا ہوں۔ جواب ملا۔ یہاں دعائی سیل جلدی ہے۔ سلی مری کمانی نہ گزراؤ۔ پیاس سے تباہی آدمی
 ملا ہے تو کیا تو رہے؟ جہاں، اتنا خبر کیا ہے کچھ دن اور میرا کرو۔ مرستے وقت نہیں ایک نہایت خوبصورت ایشا رکھائی دے گا۔ گاہک خوشی خوشی
 اپنا تمام سراپا پیش کر کے رخصت ہوا۔

گاہک گاؤں تھا۔ فروشدہ شہر تھا۔

ایک انسان کی موت

فکر تو نسوی

شہر کے سب سے بڑے اور باوقوف بل پر ایک انسان کی لاش پڑی ہے۔ وہ ابھی ابھی دس منٹ پہلے مرا ہے۔ اس نے فانی یہ ہوتی کر پبل کے فٹ پاتھ پر مرا۔ اگر وہ پبل کے عین درمیان مرنے کو بڑھ چکا ہو گا اور آئے جانے والوں کو تکلیف دیتی — جسے دہلے ذمہ دہنے والوں سے زیادہ ذمہ دار انسان ہوتے ہیں۔

”ارے! — یہ تو شہسو فیچر ہے! — شہسو فیچر کے ایک کامیڈ نند فیچر نے اکر اعلان کیا — نندو فیچر شہسو فیچر سے تین گز کے فاصلے پر بیٹھ کر عیبک مانگا کرتا ہے، اس لیے پڑی ہونے کے لمبے سے اس کا اعلانیٰ فرض ہے کہ وہ آٹھ کر آئے اور لوگوں کو بتانے کو یہ سب مرحوم پڑی کا نام کیا ہے — چنانچہ وہ ننگا آتا ہوا آیا۔ لاش پر بیٹھا اور چورسی ناکھی نہ نگاہ بھجو پر ڈالی۔ جیسے وہ کہہ رہی ہو — میں نہ کہتا تھا بھگو آخر تم مراؤ گے اور تمہاری اس جگہ پر مجھے ہی بیٹھ کر عیبک مانگنا پڑے گی!“

شہسو فیچر قسمت کا وحشی تھا، کیونکہ وہ عین اس نادار موقع پر بیٹھا کرتا تھا، جہاں سے پبل کے پہلو سے آتے ہوئے چرمنے والی بیڑیاں شروع ہوتی ہیں۔ اور اس کے کامیڈ نند فیچر نے اس نادار جگہ کو حاصل کرنے کے لیے نہ جانے کتنی بار گولیوں کا تو فانی تھی! جب جا کر شہسو فیچر ہوا ہے — نندو نے اپنے کان پیسے ادھ مٹی پڑی آبادی ہے اور شہسو کی لاش کی جیب میں ہاتھ ڈال کر باجس نکالی ہے اور بیڑی مسلا کر باجس اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا ہے — ”میرا اور شہسو کا دس سال کا ساتھ تھا۔ ہم باہل جگہ کی دوستوں کی طرح عیبک مانگا کرتے تھے۔ آہ! بھگو ان سے آتے مجھے پہلے دیا گیا۔“

ایک تھنڈا سانس بھر کر بڑی حد تک وہ روٹنے لگا ہے۔ اور دو تھے روٹنے قریب سے لڑتی ہوئی ایک آپ ٹوڈیٹ اور زوٹال حسینہ کے سامنے ہاتھ پھیلا کر کہنے لگا ہے — ”بی بی بھگو ان کے نام پر ایک پیسہ۔ بھگو ان مجھے امیر بنائے رکھتے۔“

شہسو کا منہ کھلا ہوا ہے۔ کھلے ہوئے منہ میں عیبک مانگنے کا انداز نہیں ہے کیونکہ موت بھگو اس کے لیے عیبک مانگنا غیر ضروری ہے۔ اس کے دانت سختی سے جھنجھتے ہیں، اس کا چہرہ خشک، زرد اور پھیلا پھیلا سا ہو گیا ہے، لکڑی کی ٹبریاں اور نیلی نیلی گین پڑی ہیں۔ اب وہ اب سے امیر آئی ہیں — فرض کوئی چیز ایسی نہیں ہے، جس کی بنا پر وہ پڑ لاش کو خیر بھودت کہا جاسکے۔ لاش مدیدہ اور مہلا پرانا ہے دو تین جھون پر جو ہر بند گئے ہوئے ہیں وہ اصلی لباس سے زیادہ صاف اور چمکیلے ہیں۔ جنہیں دلچسپ کہ یہ مرست ہوتی ہے کہ شہسو کا بیڑی نوٹھانے کا میٹھ کانی جدید اور ترقی یافتہ تھا۔

شعبہ کو لاش سے بڑھ کر کے فاضل پر چڑھنے کو توں کا سودا کر بونا نام بیٹھا ہے۔ وہ پالش سے چمکائے ہوئے پرانے بوتلوں کو فٹ پاتھ پر نہایت نفاست اور تعظیم کے ساتھ سناٹے بیٹھا ہے اور اپنے ایک گلاب کے ساتھ سودا پٹانے میں مصروف ہے۔ وہ شعبہ فیزیکی لٹریچر سے بڑی طرح آگاہ نہیں ہے۔ کیونکہ شعبہ کوں نے کبھی اس سے پانا بوتل نہیں خریدی تھی۔ اسی لیے اسے یہ بھی معلوم نہیں ہوا کہ شعبہ فیزیکی مرگیا ہے۔ وہ اپنے ایک گلاب سے کہہ رہا ہے — ”جناب! میں نے یہ بوتل امریکہ کے ایک خاص نوجوان فیزسٹ سے حاصل کیا ہے۔ آپ بھی اسے چن کر فوجی آفیسر معلوم کر لیں گے۔“

شعبہ مور اپڑا ہے۔ اور ڈیڑھ گز کے خاصہ بڑے شخص ابھی مرا نہیں ہے، فوجی آفیسر بننے میں مصروف ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ایک جوتھی پائے چھینکا رہا ہے۔ اور غیب کے خزانے کو نہ جانے میں جٹا ہوا ہے۔ ایک بھاری سی بھاری بھوک اور مگر کی عزت اپنے میٹھے دانت کھول کر کہیں۔ یہ ہے اور مردوں کے گناہوں کے کاتیل بن چکا ہے۔ اٹھارہ سال کی ایک شرخ و شگ کھڑی ہوئی اپنے ایک کھڑا لٹریچر کے ساتھ اس کیم لٹریچر سے اور کھڑا لٹریچر سے ایک ریجنو بھی چھوڑا اپنے کیوں کی گلی ٹری ٹری اٹھا۔ اس سین کھڑا کی منت خوشامد کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ میرے کیلئے اس کیم سے زیادہ قیمتی اور لذیذ ہیں۔ مگر اس کے وجود وہ یہ ساری ٹری مرث دوانے میں دینے کو تیار ہے۔ سائنٹ پاتھ زلفہ ہتھ میں مصروف ہے۔ شعبہ کوں کے بارے میں ہر ایک کو مرث اتنا معلوم ہے کہ وہ مرگیا ہے۔ یہی اطلاع کافی ہے۔ اس سے زیادہ اطلاع کے لیے اس کے ذہن میں جگہ نہیں ہے۔ کیونکہ ان کے ذہن کی میٹرنگ پرانے بوتلوں، اسلکوں، غیب کے خزانوں، اساتذہ کے تیل اور لگے ہوئے کیوں سے گھری ہوئی ہے۔ اسے کیا ہو گیا ہے؟ لاش کے قریب ڈرتے ہوئے ایک معزز سے آدمی نے پوچھا۔

”میرا خیال ہے یہ مرچا ہے۔ دوسرے معزز آدمی نے نہایت ابا لٹری سے جواب دیا ہے۔“

”مرچوں کیا ہے؟“

”سالانہ اور زیادہ بڑی دنیا بڑا۔ اس لیے اسے وہ مرچا کہتے ہیں۔“

”آپ بجا کرتے ہیں، مجھے بھی دمر کا ہی کیس لکھائی دیتا ہے۔ پتہ معزز آدمی نے نہایت مزیدار ہنر میں بتا دیا ہے۔ اور پھر ہر گلاب کا ہر چھلکا ہر چھلکا ہے۔ جیسے اس کے سرے کوئی بھاری بوجھ لگا ہوا ہو۔ اگر اسے یہ نہ بتایا جاتا کہ شعبہ دوسرے مزیدار تو مت سخت جسمانی کوبہ تھا چنانچہ اپنے جسمانی کوبہ کا علاج کر کے وہ مطمئن ہو کر چھلکا گیا ہے۔“

”میرے خیال میں کسی سپاہی کو جلانا چاہیے۔ ایک اور آدمی نے رائے دی ہے۔ ہر آدمی کو کوئی نہ کوئی رائے دینا پڑتی ہے۔“

”میرا خیال ہے، سپاہی کو نہیں جلا چاہیے۔ دوسرے آدمی نے پہلے آدمی کی رائے کو جڑ سے کاٹ دیا ہے۔“

پہلا آدمی ناراض ہو گیا ہے اور خفقان آ کر چہرے سے چھٹوڑے نکال کر چہانے لگا ہے۔ اس کی رائے کی کوئی جعہ رقیب نہیں کی گئی ہے۔ لہذا وہ شعبہ کوں لاش سے سخت ناراض ہو کر چھلکا گیا ہے۔ اگر پولیس کے سپاہی کو جلا کر لاش اس کے حوالے کر دی جاتی تو آخر کسی نالی بڑھ جاتا۔ لوگ بنائے پولیس سے اتنا کیوں بدلتے ہیں کہ اپنے مردے بھی اس کے حوالے کرے گھر اسے ہیں۔

مرکز کا ٹریٹیک نہایت زور دھڑکتے جاری ہے۔ لیس، لایاں، لادری، اور سائیکس، ورگ، سائیکس — سبھی نشین نہایت تیزی سے آگے بڑھتی جا رہی ہیں۔ برٹش کی رفتار کی کوئی اپنے توازن میں ہے اور اپنے معزز نشان پر ڈٹی ہوئی ہے۔ کسی کا پٹرول ختم نہیں ہوا

کسی کے نازیں لقص پیدا نہیں ہو رہا۔ جس کی وجہ سے کوئی بھر کوڑک جائیں اور شہسو کی لاش پر ایک نغز ادا لیں شاید شہسو کی موت سے کسی کو دلچسپی نہیں ہے۔ کیونکہ شہسو انسان تھا اور انسان اور مشین میں کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ انسان جذبات کا مجبور ہوتا ہے۔ گوشین پر زدن کا مجبور ہوتی ہے۔

ایک کتا مرگشت کرتا ہوا شہسو کی لاش کے قریب سے گزرا ہے ایک دو کلنڈر کے پیلے شہسو کی لاش کے پاس ٹھٹھا ہے۔ وہ لاش کو پہچانتے لگا ہے۔ وہ لاش کو پہچان گیا ہے۔ کیونکہ شہسو اور وہ دونوں کئی بار اکٹھے سوتے رہے ہیں۔ کتے نے لاش کو پہچان کر پیلے دم ہٹائی ہے۔ شہسو کے جسم میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ اس نے یہ ترجمہ دلانے کے لیے اور شہسو کو چھترنے کے لیے اس کے ساتھ رکھی ہوئی گھڑی کو سونگھا ہے۔ مگر شہسو کی لاش پتھر جیسے صدم ہوئی ہے۔ آٹا مایوس ہوئی ہے۔ اس نے ایک آؤری گوشین کی ہے اور ساتھ کھڑے ہوئے آدمیوں کے ہاتھوں سے لگا ہے۔ شاید اس کا خیال ہے کہ یہ لوگ شہسو کو کوئی نقصان پہنچا نا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ شہسو کے دشمن ہیں۔ نیک کا خاتمہ اٹھاتے ہوئے وہ شہسو کے پاؤں کے قریب بیٹھ گیا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ شہسو کی موجودہ پوزیشن کیا ہے۔

لاش کے قریب آدمی آئے ہیں۔ ایک دومنٹ ٹھہرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ ہر آدمی یہ تعین کر کے آگے بڑھتا ہے کہ واقعی ایک انسان مرا ہے۔ یہ لاش اب ایسے چوراسے کی حرکت دکھائی دے رہی ہے جہاں سے لوگ ایک دومنٹ میں کو اس کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ شہسو کی زندگی میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں لوگوں سے اس کی ہر روز زندگی بھر وہ بھیک کے لیے لوگوں کو مانگا رہا، ہاتھ جوڑ جڑ کر پکار رہا۔ مگر کوئی اس کی حرکت اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ موت نے اسے زندہ لوگوں کے بہت قریب کر دیا ہے۔

”اس کے اوپر کوئی پیرا ڈال دینا چاہیے۔ لاش کا کھوا دینا ہر دم نہیں ہے۔ ایک کھدو پوش نے انسانیت کی بلندوں سے پکارا۔“
”ہاں، مرد و مال دینا چاہیے۔ آخر انسان کی لاش ہے۔ لوگ تو جانوروں کی لاش پر بھی ہری ڈال دیتے ہیں۔ دوسرے نے انسان کو جانور سے ملنے کرنے کا اعلان کیا ہے۔“

معاذ ہر دم کا ہے۔ اس لیے کوئی آدمی بھی تجی بات منہ کہنے کی ہمت نہیں کر رہا۔ بلکہ ایک شخص نے تو آگے بڑھ کر ایک میا پکھیل کھینچ کر بھی ڈال دیا ہے۔ کھینچ کر شہسو کا ہے اور اس کی گھڑی کے اوپر پڑا ہوا تھا۔ اس کھینچنے نے ڈنگی بھر اس کا ساتھ دیا ہے اور اب موت کے دت بھی دے رہا ہے۔ میلے کھینچے کھینچے سے بلی کچل لاش ڈھانپ دی گئی ہے۔ ڈنگ سے ڈنگ میچ لگایا ہے۔

”اس کے منہ پر کھینچ کر موت ڈالو! کسی نے سختی سے برداشت کیا ہے۔“

”نہیں میں، ڈال دو! کسی نے ناک پر رومال رکھتے ہوئے کہا ہے۔“

”نہیں نہیں، موت ڈالو! پرتیکے چلے گا کھینچ کے نیچے مردہ پڑا ہے۔“ اس آدمی نے خطرو کی گھنٹی بجائی ہے۔

”یہ پتہ لگانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟“

”ضرورت ہے۔“

”نہیں ہے۔“

”ہے۔“

”نہیں ہے۔“

اُس آدمی نے پہلے کمری میں اُک لاش کے منہ پر سے لکھیں بنا دیا ہے۔ دوسرے نے فقہ میں آکر دوبارہ لکھیں منہ پر ڈال دیہے پہلے نے پھر بتا دیا ہے۔ دوسرے نے پھر ڈال دیا ہے۔ ادا پھر دونوں نے لکھیں کو چھوڑ کر ایک دوسرے کے منہ پر گھونٹا مارا ہے اور حق اور صداقت کی لڑائی ہونے لگی ہے اور پھر اس لڑائی کو دوچار آدمیوں نے بچ میں پکڑ کر ختم کر دیا ہے۔ اور دونوں صداقت کی تلاش میں دو مختلف سمتوں کو پہلے گئے ہیں — ایک گھٹیا موضوع پر لڑنا ہے کار ہے۔ جب زفرہ شہسوہو پر کوئی آپس میں نہیں لڑا تھا۔ تو اب مردہ شہسوہو پر لڑنے کا کیا فائدہ ہے — اور پھر صرح اور دیار کا فائدہ نہ تو دے بھی ختم ہو گیا ہے۔

اب لاش رہنا منہ چبانے سے بڑی ہے۔ اُس کے قریب کوئی آدمی نہیں ہے۔ جتنے آدمی گئے تھے، وہ اپنا اپنا فرض ادا کر کے جا چکے ہیں۔ کسی نے آدمی کو یہ پتہ نہیں مل گیا کہ لکھیں کے شیخے شہسوہو سودا ہے یا مرگیا ہے۔ یوں لگتا ہے۔ جیسے جنرمنٹ پہلے شہسوہو کو موت آئی تھی وہ لکھیں دے تھے ہی تھا گئی ہے۔ یعنی زندگی اور موت کے درمیان لکھیں آگیا ہے۔ جس نے زندگی اور موت کے درمیان ایک علیحدگی مائل کر دی ہے۔

تیسری جارمنٹ سے لاش لکھیں کی ادب میں ہے۔ اور پھر بارہ تیرہ سال کا ایک فیضہ صاحبک منٹا لوٹا، انگلتا، بھڑا آیا ہے اس نے پہلے شہسوہو کا کندھا بھجھوڑا ہے اور پھر منہ سے پکڑا دیا ہے۔ موت ایک بار پھر سورج کی روشنی میں چمک اٹھی ہے۔ روشنی کی اس حرکت سے لوٹا ڈوڑ گیا ہے۔ اور اس نے لکھیں کے ہوتے ہوئے ہی کہا ہے۔

”بابا! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“

”ابے سائے! مر گیا ہے تیرا بابا! قریب کھڑے ہوئے ایک گنڈیری فروش نے جیسے اُسے شرم دلائے ہوئے کہا ہے۔

”کیسے مرا؟“

”موت سے“

”ابھی تو میں اسے اچھا بھلا چھوڑ کر گئی تھا؟“

”ابے! تمہارا ذکر تو نہیں تھا کہ تم سے پوچھ کر مرنے لگا۔ اُس کا بھی چاہا اور مر گیا! ٹاٹا ٹاٹا —“

ایک آنے کی پاؤں

لوٹنے کی خیرت زورہ آنکھیں یک دم سنجیدہ ہو گئیں ہیں۔ اُس نے لکھیں کے اندر اپنا ہاتھ بجا کر شہسوہو کی ڈھبک کھولی ہے۔ اُس میں سے کچھ یزگار کی نکلی ہے۔ جسے اُس نے ایتلا سے جبب میں ڈال دیا ہے۔ اُسے شاید بہت زور کی بھوک لگی ہے۔ اس لیے اس نے اپنے پٹے پڑانے کو کٹ کی جبب میں سے دو دو تیاں نکالی ہیں۔ گھٹری کھول کر اُس میں سے سبزی لاسان نکالا ہے اور لاش کے قریب بیٹھ کر کھانے لگا ہے۔ روٹی کے دو چار تھنوں نے ہی اُس کے رخسار دل پر لہو دوڑا دیا ہے۔ اس لہو میں ایک طمانیت ہے۔ جو بھیک میں ناہی ہوئی رویوں میں سے پھوڑی گئی ہے اور شہسوہو کا لوٹنا چھوڑ کر شہسوہو کی طرح ابھی مرا نہیں ہے۔ اس لیے وہ طمانیت کچھ نہ سکاتا ہے۔

لوٹنے سے کھانا ختم کیا ہے، بیڑی سٹائی ہے۔ شہسوہو کی گھٹری میں سے اپنے کپڑے نکالے ہیں۔ ایک ٹوٹا، ایک گلاس اور ایک پرائی چپل نکالی ہے۔ اور باقی گھٹری وہیں باڈھ کر دکھ دی ہے۔ اور اپنی مینار کی ایک نئی گھٹری ناکر لگاتا ہوا چلا گیا ہے۔

جہون کے دن چار ————— اسے گوری

بیون کے دن چار

روٹ سے سوچ بہار ————— اے گروی

بیون کے دن چار

اب لاش ایک بار پھر شے منڈی پر ہے۔ نئے نئے راہ گیر آ جا رہے ہیں۔ گروہ و ہرائی ہوئی باتیں دہرا رہے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے شہر کی لاش پر کوئی اچھوٹی مات نہیں کہی جا سکتی۔ اور اب لاش ایک ایسے ریگستان کی طرح پڑی ہوئی ہے۔ جہاں سال میں ایک انچ سے زیادہ بارش نہیں ہوتی۔

”یہ لاش آخر کب تک یہاں پڑی رہے گی؟ قریب کھڑے بڑے گنڈیری فروش نے ایک ہائی لے کر کہا۔

”میں کیا جانوں، مجھ سے کیوں پوچھتے ہو؟“

میرے خیال میں لاش کو یہاں سے اٹھا دینا چاہیئے بڑی لگ رہی ہے۔ گنڈیری واسے نے لاسکچر بٹھا دیا۔

”اُن جڑی تو لگ رہی ہے۔ ذلہ انسانوں کے دہیان ایک ٹوکے لا بڑا دہنا؟؟؟..... جی جی جی! اب تو ام نے ایک سیلے سے پُٹ کو پیسے سے پرے سے جھاڑتے ہوئے کہا۔

گراٹھ ایا کیلے جانے۔ اس سالے کا کوئی سالک بند ہی نمودرا ہو گا؟

”تو کیر؟.....“ میرا خیال ہے، پٹری والوں کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ سب کی اس کے کفن و دفن کے لیے چندہ اکٹھا کریں؟

”جو پڑ پڑی نہیں؟ جو پٹری واسے نہیں کے نہیں۔ سب مرامی ہیں۔ یہ انسان کی قدر کرنا کیا جا میں۔ اچھا تو را خیال رکھنا جیسا میرے بڑوں کا۔ میں فوراً اسٹنے دکان سے چائے پی آؤں؟“

یوں ام چائے پینے چلا گیا ہے۔ سارے پٹری واسے مرامی ہیں۔ چائے کے بہت پیاسے ہیں۔ گنڈیری فروش شاہد سوچ ڈاٹے کہ ہمارا سچ کہتا ہے۔ پٹری واسے انسان کی قدر کرنا نہیں جانتے۔ ابھی تو آدمی گنڈیریاں بیچنا باقی ہیں۔ لاش کے پاس کھڑے ہو کر گنڈیریاں بیچنا بہت برا لگتا ہے۔ لاکھ لوگ لاش کے پاس کھڑے ہو کر گنڈیریاں خریدنے سے بچا پاتے ہیں۔ گنڈیرتہ آدمے گنڈیر سے ایک بھی لاکھ تریب نہیں بٹھا ہے۔

وہ اپنا غرا پنچر، ٹھاکر چل دیا ہے۔ اور سامنے واسے فٹ پاتھ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ پٹری واسے سب مرامی ہیں۔ انسان کی قدر نہیں کرتے گنڈیریوں کی زیادہ کرتے ہیں۔

لاش پر جو کھیاں جن بھنا رہی تھیں۔ وہ گنڈیریوں کی وجہ سے تھیں۔ اب وہ کھیاں بھی شہر کو چھوڑ کر گنڈیریوں کے پیچھے پیچھے دھڑکے فٹ پاتھ پر جا رہی ہیں۔ بریئر شہر کا ساتھ چھوڑ رہی ہے۔

پانچ چھ منٹ اور گدگد گئے ہیں۔

نندنیہر چھر کلن آتا ہوا آیا ہے۔ وہ لاش کے گرد گدھ کی طرح نہلا نہلا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی ہے۔ جس کا ہونٹ نیک زیت تم لکے۔ اس نے باڈو پر ایک بٹا لگا رکھا ہے۔ جس پر جماعت غداران قوم کے نقوشے ہوئے ہیں جس نے جیسے وحش کو سونگھ کر پوچھا ہے،

اچھا تو یہ لاش ہے :

”یہ لاش نذر فقیر نے خزانہ دارانہ لوبہ میں کہا ہے۔ یہ بھیک مانگتا تھا، کئی دفن سے بھاڑ تھا، آج مر گیا ہے بھارا۔“
 ”کوئی برج نہیں، اجماعی جماعت اس کے لویا کرم کا بندوبست کر دے گی۔ آہ! ملک میں بھکاریوں کی کیا حالت ہو رہی ہے۔“
 نذر فقیر کو بھکاریوں کے فلسفہ پر بحث میں حصہ لینے کا کوئی شعور نہیں ہے، اس لیے وہ مضطرب ہے اور کہہ رہا ہے۔ اسے
 آپ کیسے اٹھا کر لے جائیں گے ؟“

مزدوروں کے ذریعے دسے سے ہانڈھ کر :

وہ شخص مردے اٹھوانے کا شاید تجربہ رکھتا ہے۔ اس نے وہ مزدوروں کو اشارہ دے بلایا ہے۔ اور انہیں حکم دیا ہے کہ لاش
 کو رستے سے ہانڈھ گندے پراٹھ کر ہمارے دفتر تک لے چلو :

نذر فقیر نے دستہ بند حواس نے یہ نیت پھرتی سے ادا کر دینا شروع کر دی ہے۔ راؤ گربا ایک لاش کو رستہ بندھتے دیکھ کر پھر اکتھ ہو
 گئے ہیں۔ دستہ بانڈھا ایک تاش کی کیفیت رکھتا ہے اور ہر تاش پر راء لبر کو اپنی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ کیٹش نقل کا اصول ہے۔
 ”یہ بہت سارے جملے ہیں۔ لاش کو رستہ نہیں ہانڈھنا چاہیئے، ایک راؤ گربا سے حقارت سے کہا ہے۔“

”تو پھر آپ اپنے گھر سے ایک چادری لاکر دے دیجئے :

میں برتن میں۔ سناہوں، میری اپنی چادری کوئی نہیں ہے :

برتن والی لطیفہ خرچہ دنت ہے، سب کو ”اوسے“ گناہ ہے اور بھی بے ساختہ ہنس پڑے۔

مجموع کچھ نو ایک لائشیل ٹ پتھ کی طرف بڑھ رہا ہے اس نے نوہ ابر کو دوسرے ہی لایا ہے۔ ایک طرف ہسٹ جاؤ :

کیوں اکتھے ہو رہے ہو، کیا بات ہے ؟“

”یہ تشبہ فقیر ہے جوہ گیا ہے، خادم قوم نے جیسے کو تمنا جو اب دیا ہے۔“

”کیوں مر گیا ہے، کیسے مر گیا ہے ؟ کس نے مارا ہے ؟ لائشیل نے آئینی سوالات کی لہجہ کر دی ہے اور لاش کے سر اٹھانے

ان سن ہو کر اٹھا رہی ہے مزدوروں نے سر ہانڈھنا بند کر دیا ہے۔ انہیں قانونی آرقہ کا اٹھا رہے۔“

”یہ لاواش لاش ہے، اور ہماری جماعت اسے نشان سے ہمارے ہی ہے، خادم قوم نے فخر کے ساتھ اعلان کیا ہے۔“

”کون ہے ہمارے ہی موت ؟ ہوں ! میں سب جانتا ہوں تم لوگوں کی، ہمعاشاں۔ تم اسے مارا ب لاش چھپانا چاہتے ہو ؟“

ڈوٹے کی آواز پھر ابھری ہے۔ جس سے سبھی لوگ سہم گئے ہیں۔ کئی کئی کڑا کر نکل گئے ہیں۔ خادم قوم جو جس وعظ و نصیحت سے اُبل

رہا ہے اور کہہ رہا ہے۔

”اس فقیر کے قاتل تم ہو، ہمارا سماج ہے، ہمارا نظام ہے، ہمارے لوگ ہیں۔ انسان مڑکوں پر یوں بھوکے پیاسے مرد ہے ہیں

اور تو بھلائی ہاتھ میں لیے مردوں کو گرفتار کرنے کے لیے پھر رہے ہو۔ شیم، شیم !“

سبھی لوگ اس تقریر سے متاثر ہوئے ہیں اور کہہ رہے ہیں۔ شیم، شیم !“

”اپنا کچھ کر جب میں رکھ لائشیل اپنے دنا کو مٹی میں ملے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ میں تمہیں گرفتار کرتا ہوں، کیونکہ تم قانونی کارروائی

میں نکاح و دل دہے ہو۔
 سبھی لوگ کائینیل کی مثال بات سے متاثر ہوئے ہیں۔۔۔۔۔ شیم! شیم!
 نندو فقیر کی حالت درگوں ہے۔۔۔۔۔ اسے قانون کے بارے میں کتنی باتیں سمجھ نہیں ہے، اس لیے وہ لڑکھاری کے ذریعے کھلکھلا کر اپنی پرانی جگہ پر جا بیٹھتا ہے۔

تم مجھے گرفتار نہیں کر سکتے۔ میں خادم قوم ہوں۔ خادم قوم کا چہرہ غصہ سے سرخ ہے
 ”چلو مہر، مگر اس بند کو رو، ورنہ تھکانے چلو۔“

”یہ لاوا دشت لاش ہے۔ اس لیے قوم کی امانت ہے، اسے میں لے جاؤں گا۔“
 ”تم اس لاش کو کھانا تک نہیں کھا سکتے۔“

”میں اسے لے جاؤں گا، یہ بڑبڑاؤں گا نہیں؟“

کائینیل سننے لگا کہ میں تمہارے قوائی دی ہوں۔ لوگ تذبذب میں ہیں کہ لاش کس کے ہاتھوں میں زیادہ محفوظ رہے گی۔ پولیس کے یا خادم قوم کے۔

مجھے شک ہے کہ اس کی موت کے ذمہ دار تو تیرا ہی ہونا چاہیے۔ کائینیل نے خادم قوم پر آخری اور بھرپور وار کیا ہے۔ اس لیے اب تھکے خفاہ
 مقدر چپے نہ۔

تمہارے کون کس نے مارا ہے؟ اس سلسلہ میں تمہارے ناموش ہے۔ اپنی موت کے متعلق اس کی کیا رائے ہے۔ اپنے دفنانے کے بارے
 میں اس کا اپنا نقطہ نظر کیا ہے؟ اس کا کچھ پتہ نہیں چل رہا۔ کیونکہ تمہارے اپنی لاش کے مستقبل سے بے نیاز ہو کر مر رہا ہے۔ خادم قوم تمہاری ہی کر
 بیا ہی کے ساتھ تھکانے جا رہا ہے اور نہایت جوشیے انداز میں تمہارا جا رہا ہے۔۔۔۔۔ میں عدالت میں بات کروں گا کہ اس موت کا اصل ذمہ دار
 کون ہے۔۔۔۔۔ میں حق اور صداقت۔۔۔۔۔

وہ چپے لگے ہیں۔ لوگ بھی چپے لگنے ہیں۔ تمہارے لاش پر سے اب مطلع پھر صاف ہو گیا ہے۔

اب تمہارے لاش پھر لوگوں سے لڑ گئی ہے

”میں چارمنٹ اور گندو لگے ہیں۔“

”میں چارمنٹ اور

دس پندرہ اور

اور پھر لاش میں ایک خفیف سی حرکت پیدا ہوئی ہے۔ اس کے منہ سے ایک خفیف سی آواز آ رہی ہے۔ جیسے کوئی رگڑ رگڑ
 کر اس سے رہا ہو۔ اس نے نہایت کرب اور اذیت کے ساتھ مومے ہوئے اپنی انگلیوں کھولی ہیں۔ اور پھر بند کر لی ہیں۔ اور پھر جیسے ہڑبڑا کر کھٹنے
 کی کوشش کی ہے۔ لڑکھاری کے باعث اس سے اٹھانیں جا سکا۔ اس نے چند بے معنی الفاظ منہ سے نکالے ہیں اس نے جلیق ہوئی رگڑ
 کی حرکت پر اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ پھیلا دیا ہے۔

نندو فقیر بھاگ کر لڑکھاری آ جا، اس کے پاس آ گیا ہے۔

”شعبو! — تم..... تمہیں..... چھو! تم تو اٹھ بیٹھے ہو! شعبو نے اٹھنے کی کوشش کی ہے مگر اس کا سر اٹھ نہیں رہا ہے۔ تودھو! اس کا لہریہ ہے اس لیے وہ شعبو کے سر کو سہارا دے کر اسے اٹھا رہا ہے۔ تمہیں کیا ہو گیا تھا؟“

”کچھ نہیں، میرا دل ڈوب رہا ہے۔ کہیں سے پانی لاؤ؟“

نندو فقیر بانی لینے چلا گیا ہے۔ اس کے قدم سن سن کے بھاری ہو رہے ہیں۔

”گڈیریاں ایک کٹنے کی پاؤں سامنے کے نوٹ پاتھ سے آواز مچ رہی ہے۔“

”سانڈے کا تیل! سانڈے کا تیل! ایک اور آواز بجائی ہے۔“

”صاحب! بالکل امریکن برٹ ہیں، خالص فوجی.....! ایک اور مانوس آواز شعبو کے کان میں پڑی ہے۔“

شعبو نے ایک اٹھ اپنے ڈوبتے ہوئے دل پر رکھا ہے اور دوسرا اٹھ ایک حسین ماہ گیر چوڑے کی طرف پھیل

دیا ہے۔

”جڑی بنی رہے باجوہ! جھگوان کے نام پر ایک پیہ!“

چند یادیں

عبدالرحمن حنفی

آج سے تقریباً بیس سال پہلے اراکہ کیا تھا کہ میں بعض واقعات کو طبعیذ کرتا چلا جاؤں، چاہے وہ خشک اور ہوں یا ناسخ و حشو اور مگر ان میں زندگی کی رقی ضرور موجود ہو۔ بہتر آہستہ بہرہ کو کشش کتاب کی سی شکل اختیار کر گئی۔ اور میں اپنی اس کو کشش کو فرسودہ باتیں کہہ کر یاد کرنے لگا۔ اس میں شاعروں، افسانہ نگاروں اور آرٹسٹوں سے ملاقاتوں کے علاوہ بعض ایسے حقائق کا بھی ذکر آگیا ہے جن میں سامان زندگی کے علاوہ رموز زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

ایک موقع پر ایک مغربی عورت نے مجھ سے سوال کیا کہ ”تمہارا ماڈل؟“ میں نے ذرا بے تکلفی سے کہا ”تم ہی تو ہو“ وہ سکاٹی جیسے آئینہ میں اپنا عارضہ لے رہی ہو۔ وہ کپ میکس کے زیر اثر اپنے آپ کو ناپسندے لگی۔ اور دوبارہ مغربی انداز میں جیسے غلام کی بصیرت سے منکر ہونے کی کوشش کر رہی ہے، کہنے لگی ”اس ملک میں آرٹسٹوں کو اپنے بے ماڈل تلاش کرنے میں کافی مشکلیں پیش آتی ہوں گی“ اور غلام اپنی غلام والا معاملہ تو تھا نہیں، میرے پرداوانے تو یقیناً آزادی دیکھی ہوگی اور پھر مجھے اپنی بصیرت اور فہم پر بھر دے بھی تھا۔ میں نے دوبارہ اپنے الفاظ دہرائے اور اسی انداز سے کہا ”فنگلار کو ماڈل تلاش کرنے میں نہ یہاں مشکلیں پیش آتی ہیں اور نہ مغرب میں۔ صرف طرز زندگی کا سوال ہے اور وہی فرق ہے۔ میں یورپ دیکھ آیا ہوں۔ کس قدر جذبات سے خالی شہینوں کے کل پرندوں کی طرح رنگ و بو ملے عورتیں ماڈل بن کر آرٹسٹوں کے سامنے پیچ کر اپنی برہنگی کی فاشش کیا کرتی ہیں۔ خصوصیت سے اس وقت جب وہ اپنی اکٹا ہٹ دور کرنے کے لیے سرگٹ کے بے سود کش لگاتی ہیں تو کتنی عجیب ڈنڈی اور جذبات سے عاری نظر آتی ہیں۔ تم نے دیکھا ہو گا، میں نے محسوس کیا تھا وہ ہر سہارے کے باوجود جسمانی شدتوں کا نواز قی قائم نہیں رکھ سکتیں اور نہ اپنی غریبی کو چھپا سکتی ہیں۔“ تمہارا مطلب غالباً ماڈل سے وہ عورتیں ہیں جو برقع پہنتی ہیں اور مردوں سے حجاب کرتی ہیں۔“ اس موقع پر وہ ذرا مضطرب مسکرائی جیسے میرے قوی کردار پر طنز کر رہی ہو۔ ساتھ ساتھ وہ اٹھ بیٹہ خود مائی نکال کر اپنا غازہ اور سرخی دیکھ رہی تھی اور اس میں اضافہ بھی کرتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے کہا ”انفردانی خصوصیت چاہے وہ مرد کی اپنی ہو یا عورت کی، زیادہ قریب ہونے سے ضعیف اور مضطرب ہو جاتی ہے۔ خصوصیت سے عورت مرد کے حقوق سے دستبردار ہو جاتی ہے۔ ایشیا کا یہ فطری تقاضا ہے کہ وہ عورت کو تاراج کے ہیروں اور جواہرات کی طرح اپنے سر کے لیے محفوظ

عروج اپنی ذہانت اور تکنیک کو فنی حلاصت میں بروئے کار لائے۔

آرٹسٹ کی صلاحیتوں کا یہ تقاضا نہیں کہ وہ انجینئری پیدا کرے، درمزشناسی کو ایک معیار بنا دے۔ اور ایک برہنہ ماڈل کے اختصار کو جو مکمل سمجھے۔ جمالیات کی ہر جھلک دنیا کے خوبصورت سے خوبصورت بدن کی عروانی سے بالاسے اور صدیق تعلق کا تخلیق کی تکمیل کے لیے ہمیشہ کردار کی اہمیت کو ترجیح دیتا ہے اور غور و خوض فن کے لیے جہاں وہ چاہے اپنے ماڈل کو دیکھ لیتا ہے۔ بشرقی آرٹسٹ کی طرح نہ وہ ماڈل کا مقلد ہے اور نہ ماڈل کی لعنت کو فطری تقاضا سمجھتا ہے اور اسی اصول پر تمام ازم جمع ہیں۔ اور یہی اصول اس کو اپنے خطرناک منزل سے بچا سکا ہے۔

مغرب میں آج قوت و ڈیزائن میں جس بلند آہنگی سے لغوہ بند کیا ہے اس سے پہلے صدیوں کے فن میں یہ قوت الہی کے ہاں نہ ہونے کے برابر نظر آتی ہے۔ مشرقی معاصر میں مغل آرٹ نے شبیہ نگاری میں ایک دصت پیدا کیا تھا جس سے ان کے فن کی انفرادیت۔ اس وقت کی معاشرت و بار بار کی دشوکت بادشاہ اور مصاحب کی پہچان کی عکاسی ہوتی ہے، مگر یہ کہیں نہیں ملتا کہ جبریں، گور و صحن، غریخ ہے اور نادال و عصا و عبد الصمد نے جہانگیر، شاہ جہاں، ممتاز علی یا نور جہاں کو اپنے سامنے بطور ماڈل کے بٹھایا ہو جس طرح لینڈ وٹ نے مونا لیزا کو ایک ماڈل کی حیثیت سے بٹھایا تھا۔ وہ اپنے مشاہدات سے متاثر ہوئے تھے۔ ان کے مطالعہ کا تقاضا تھا۔ ان کے دماغ بھی ایسے تھے اور یہی ایک وجہ تھی کہ انھوں نے جمالیات پر ہسانی، جوا کو قربانی کر رکھا تھا۔ جیسے اس کے اسباب کچھ ہی تھے۔

پیرس سے برلن جانے کے لیے جب میں اپنی سیٹ والے ڈبے میں پہنچا تو اتفاق سے میرا مسافر ایک ایسا آرٹسٹ تھا جو ان دو ملکوں میں ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے اپنی اہمیت رکھتا تھا۔ میری ملاقات فریج آرٹسٹ اینڈر ڈیرین سے ہوئی اور جب ہم ادھر ادھر کی باتوں سے گھوم کر امریشین ازم اور سائیلے ازم کو برا بھلا کہہ چکے اور بعض انفرادی آرٹسٹوں کے متعلق گفتگو کرنے لگے تو ڈیرین نے کہا ٹوئس لوٹس کا نظریہ اچھا تعلق یقیناً بہت عجیب و غریب تھا۔ اس کا قول ہے کہ وہ ہر بات ایک نئی گوت سے ہم ہنساں لیے ہوتا تھا کہ اس کی ہر صبح ایک نئی تخلیق کا پیش خیر ہو۔ مرکزی خیال صرف اس قدر تھا۔ اس پر بحث ہوتی رہی۔ مگر تخلیق کے بارے میں کوئی قطعی اصول وضع نہ ہو سکا کیونکہ میں اپنے مرکزی خیال پر قائم رہا کہ تخلیق زندگی کے رجحانات کا کتنا ہی اہم مسئلہ کیوں نہ ہو مگر اس کا نتیجہ اس کی نشو و نما سے بہت گہرا تعلق رکھتا ہے۔ وہ پیرس کا رہنے والا تھا، اسے حرام و حلال، ستر اور ننگ کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ اس نے یہاں تک بھی اپنے عقیدے کا اظہار کر دیا تھا کہ جب حیوان اور پرند ہمارے دو بوجہ دنیا کی مظلومہ کہتے ہیں تو کیوں ہم یہ جرات نہ کریں کہ ننگے پھر لگیں اور سب کے سامنے عورتیں بچے جٹا کریں۔ میں نے اسے بار بار احساس دلایا کہ پیرس میں یقیناً ایسا ہوتا ہے۔ میں نے تاؤں کو ستر کوں اور فٹ باؤڈر گلی کوچل کے موڑوں پر عورتوں اور مردوں کو بدعنوانی دیکھا ہے اور یہ شرف پیرس ہی کو حاصل ہے جس نے آزادی کے بے جنگ کی دنیا کو علم و فن دیا۔ دوکر میگو، ہوباسیل، فلاہیر، بال، زاک برگس، وردان، کورسے، مینے، ریناٹے، تینٹے، گولیس اور لوئی ادا گال جیسے پُر خلوص فنکار جیسے تھیلوں نے ہمیشہ دنیا کے جو دکو توڑا سنا کو ختم کیا۔ ارتقا کے سنے کو سلجھایا۔ عوام کو اپنی ذمہ داری کا احساس دلایا۔ وہ ملک اتنی بڑی دولت کے ہوتے ہوئے آج مسافروں کے رحم پر ہے جو براہ نقل واد میں فرانس کی کشادگی کی قیمتیں چکاتے ہیں۔ جسے ادا کرنا کہہ کر کبھی من مانی قیمت نہیں دیتے۔

وہ پیرس میں تھا اس نے اپنے فطری تقاضے سے پھر ٹوئس لوٹس کا ذکر اس ضمن میں پھیڑا کہ وہ پیرس کی ہر اگندہ زندگی کا

ترجمان تھا۔ وہ گھناؤنے اور دکھ بھرے واقعات کو رنگ دینے والا تھا۔ میں رادھارادھ کی باتوں سے ہٹ کر چپ ہو رہا۔ کیونکہ اس قسم کی کچھ کامی کوئی تعبیر آمد نہیں ہوا۔ اس پر بھی میں نے یہ ضد کہا تھا۔ ٹولس ٹولس میں بربریت کی سی بو آتی ہے مگر محام کی نمائندگی کا نشانہ بھی نہیں ملتا۔ اس کی مصوری سے اس کے اپنے قول کی کتنی بھی تصدیق ہوتی ہو مگر اس کی ہر تصویر اس کے ذہنی اتانا چڑھاؤ کی نمائندگی کرتی ہے۔ جو سکتا ہے نہ کہ نقطہ نظر سے اس کے آرٹ کا درجہ بہت بلند ہو۔ اس میں اس کے ماحول کی عکاسی اور ترجمانی ہو۔ لیکن جہاں تک اخلاق کا تعلق ہے اس کا نظریہ فرائض تک محدود ہے۔ جہاں دن رات سوائے نفسانی خواہشات اور برہنگی کے مظاہر ہوں گے دوسری کوئی قوت و ماحول پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس جب ہم یرمیراں اور روبز کی بنائی ہوئی ننگی تصویروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ٹولس ان کے سامنے خود ننگا، بے ستر، جنسی ٹھکن کا ماما ہوا نظر آتا ہے۔ اس وحشت اور برہنگی میں ان عورتوں کی تصویروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ٹولس ان عورت نظر نہیں آتی جنہیں زمانے نے جتنا اور نہاں کرنے ان کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھا ہے۔ پیرس کتنا ریچھ اور گدا گدا شہر ہے۔ ٹولس اس کے قول اور نقطہ نظر سے یہ واضح بھی ہے۔ میں خیال کرتا ہوں اس کے آرٹ کے صحیح مقاصد کو سمجھنے کے لیے اس زندگی کا مطالعہ بھی ضروری ہے کہ اس دنیا کے لوگ کس قدر گھناؤنے، کس قدر بد ذوق، جنس کے خریدار ذلیل زندگی کی ہرزالت سے دوچار ہیں۔ حالانکہ وہ خود ایک امیر زادہ تھا۔ پھر اس کے گھر کی حمایت تھی۔

ملاؤں کی روایات کے سلسلہ میں مجھے یرمیراں کا نظریہ بہت پسند ہے۔ اس نے خود کو ماڈل سمجھا اور اس کی اپنی بنائی ہوئی اپنی شہیسیں سو کے قریب آتی ہیں جو ایک فہم کم کے نزدیک ایک سے ایک نہیں ملتی۔ لیکن ہر شہیسیں یرمیراں کا اپنا کردار، اپنے اوصاف، اپنا منہ اور جلیں نہیں ہوتا۔ اس نے جب بادشاہ سے اپنے سامنے ایک ماڈل کی حیثیت سے بیٹھنے کی درخواست کی اور بادشاہ بھی ایک ملحد مزاج شخص کا ر کی خوشی کو پورا کرنے کی غرض سے اس کے ہاں آیا تو اس نے اسے وہ لباس پہن کیا جس میں وہ اس کی تصویر بنانے کا خواہاں تھا۔ بادشاہ نے دیکھا کہ وہ ایک فقیر کا بوسیدہ لباس تھا۔ بادشاہ باوجود ہر جاہ و جلال کے اسے گدا گدا نظر آ رہا تھا جو مقدس انجیل کا ایک کردار تھا۔ اور میرے نزدیک ہی ایک انتہا زہے جو ٹولس ٹولس اور یرمیراں کو ایک ٹھوس سے الگ کرتا ہے۔ یرمیراں کی ہر عورت ابی مریم مصل، مین اور محبوبہ جس کو ماں نے جانا اور باپ نے شفقت کی گود میں اسے پالا پوسا ہے۔ ٹولس ٹولس یرمیراں سے تقریباً تین سو سال بعد فرائض میں پیدا ہوا اور وہیں مر گیا۔ اس کا فن اس کی اپنی انفرادیت کا سہارا ہے۔ وہ زندہ ہے۔ کیونکہ اس سے انسانی منزل اخلاقی زندگی سے بھی اپنے آپ کو آزاد تصور کرتا ہے۔ اس کی ہر عورت گھناؤنی زندگی کی حامل ہے۔ نہ اسے ماں نے جانا ہے اور نہ باپ کی شفقت اسے نصیب ہوئی۔

حیدر آرٹ کی تحریک کے اسباب کچھ بھی ہوں وہ ایک رد عمل ہے۔ وہ ایک انتشار ہے جس کے پشت پناہ میکاں اور کیمیا جیوہ ہیں۔ جب سے دنیائے فن کے ساتھ انسانیت کو وابستہ پایا ہے۔ یہ موجودہ تحریک اپنی اہمیت کی ذمہ دار ہے۔ اس کا دعویٰ ہے وہ آزادی اور سچائی کی علمبردار ہے۔ اس سے آرٹ کا وہ ابتدائی دور پھر سے جنم لیتا ہے جسے وحشت اور بربریت نے اٹھا و خراب کئے تھے۔ انہیں ملکہ اٹھارویں صدی کی پرستش کے لیے تخلیق کیا تھا۔ جس میں دیوتا، خدا اور محبوب سمجھے شامل تھے۔ موجودہ تحریکوں کے رجحانات و جہتی وجود، فنی نشوونما کی ٹھکن کے تقاضے ہیں۔ اس وقت فنکاروں کی طرف سے یہ نہیں بلکہ اس فن کے قدر شناسوں ہی جیے اطمینانی اور تنہیت پائی جاتی تھی۔ مشین اور کیمیا کی ترقی نے آرٹسٹ کو زندگی کے اور قریب کر دیا ہے تاکہ وہ فطری خود حال کو

زیادہ سے زیادہ ترقی پسندانہ انداز میں دیکھنے کا شوگر بن جائے۔

انیسویں صدی کے آخری حصہ میں ریپبلکین آرٹسٹوں کو اور بھی زیادہ نفرت ملی خصوصیت سے ریپبلک اور بیس نے ان اقلہ یوں کی جس خلوص سے دہری کی ہے، ایسا کوئی اور آرٹسٹ نظر نہیں آتا مگر گوگس، بونگ، سیزا، مینے اور پیکا سومو موجودہ تمدن کو مریض خیال کرتے رہے اور کہتے رہے آرٹ کو پھر سے جنم دینے میں اس کی جیت ہے۔

انیسویں صدی کا اختتام نہ ہو اٹھانکہ PRIMITIVE ART نے مختلف شکلوں میں مختلف ملکوں میں انیاز حاصل کیا اور دیکھتے دیکھتے کئی صورتوں میں سامنے آیا اور دنیا نے اسے قبول کر لیا۔ وحشی قوموں نے اپنی بربریت کو اپنے دیوتا کے تناسب اور خدا و خال کو، اور مذہبی توجہات کو جہاں چھوڑا تھا، وہاں سے اس کی ابتدا کی صدیوں کے بعد ترقی پسندانہ رجحانات کے زیر اثر اس سے تعاون کیا گیا اور اپنے سامنے فرعون کے مجسموں کو، جینٹیس کی برتری کو دکھا گیا۔ اور ہر بربریت اور اختصار کو حل قرار دیا گیا۔ اس اسکول کے تمام قائدے سائیکفک توجہ کے لیے کیمیا کی اور میکانیکی تھیوری سے استفادہ کرتے رہے اور فن اپنی فطرت کے مطابق مہذب دینا سے وابستہ ہو گیا۔

جہاں کے لافانی آرٹسٹ کہنا کی نے عرب کی ہندسی شکلوں نے، ایران کی نسخ اور نستعلیق خطاطی نے جدید آرٹ کو متاثر کیا جس میں فرانس، لندن، امریکہ، ہندوستان اور جاپان نے حصہ لیا۔ اور جو بھی جدید تحریک میں شامل ہوا اس نے سوئی ہوئی قوتوں کو سمجھ کر بیدار کرنے کی کوشش کی۔ اور آخری دم تک اس کا ساتھ دیا۔

مشرق کی وہ مریض جس پر آرت کے پہلے شاہکار نے جمع کیا وہ زمین مصر ہے۔ اس کے بعد فلسطین، ایران اور ہندوستان نے اپنے ماحول، اپنی معاشرت کی بنا پر بڑے بڑے شاہکار تخلیق کئے۔ یہ سب آرٹسٹ اور صنایع زما ڈال کے عقلمند تھے، زما ڈال ان کی پرکھ تھی۔ ان کے ماڈل وہ کردار تھے جن میں زندگی تھی۔ ناقابل تفسیر عمل تھا۔ جن میں انسان اور انسانیت کے چیلنے پھولنے کے امکان تھے۔ ان کی ذہانت اور ان کا شعور انھیں سمجھ سکا تھا۔ قراغیہ مصر کے مجسمے اے کے انبنداد اور ان کے وقت اور عظمت پر ہی روشنی نہیں ڈالتے بلکہ ان میں فن کی وہ تمام قوتیں بجا چھینیں اور حقائق بانے جاتے ہیں جن کی طرف دیکھ کر آج کا انسان متحیر ہی نہیں رہ جاتا بلکہ وہ سوجنا چلا جاتا ہے کہ خدا نے انہیں کئی لافانی قوتوں سے سرفراز کیا تھا۔ پتھروں کا سادل اور فولاد کا جسم دے کر کیوں انہیں کچل کر رکھ دیا تھا۔ ان مجسموں کا بادی مسودہ افتخار اور مملکت ہی نہیں وہ اعلیٰ ترین اوصاف ہیں جن سے فنکار کی نیت، پاکیزگی اور اس کے خصوص کا اظہار ہوتا ہے اور وہ کیفیت جو ان کے دیکھنے سے پیدا ہوتی ہے انفرادی نوعیت کی ہے۔ ان کے مطالعے سے کبھی انتشار پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک نہایت لطیف مبطلان ان کے ہمارے درمیان حائل چیز ہے کہ ہم روزمرہ زندگی اور انسانی عظمت سے دجا رہ جاتے ہیں اور یہ اثر آخری ماڈل کی بدولت نہیں کردار کی تشکیل سے ہے جو ہزاروں سال گزر جانے پر بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی۔ وہ فنکار اپنے شاہکاروں کو سادہ اور نہایت کم درجہ نشیوں سے، اختصار سے مکمل دیتے تھے۔ ظاہری طور پر ان کا مقصد ہر شاہکار کو آسان، عام فہم، قابل سمجھ بنا جانا تھا۔ مگر جب ان پر مبصروں نے نگاہیں گاڑ دیں تو انھیں ان کے معنی فرعون کے دعوں سے بھی زیادہ بلند اور قیمتی نظر آنے لگے اور فن کی پرکھ رکھنے والوں نے بادشاہ اور رعیت کے تعلق کو چھو کر ان کو ان کی ذاتی خصوصیات سے الگ کر کے صرف کردار اور شاہکاروں کو تخلیق کی رو سے دیکھنے پر قناعت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغرب جو مادہ پرستی میں پیش پیش تھ

ماڈل کی پرنٹش سے مندر ہو کر فوٹو گرافی کے مسئلے سے بھی گزر کر ایشیا کی اس غیر فانی عظمت کا احترام کرنے لگا۔
 رودان کے بعد اپٹامین کا دور آیا۔ ڈوہن اور مور نے دنیا کی توجہ کو کھینچا۔ پیکامیونے اپنے آرٹ کے تجربات میں نیا اضافہ
 کیا تو دنیا بھر میں اس تحریک نے انتشار پیدا کر دیا۔ اور فن کے پرکھنے والوں نے بھی مطالعہ کا دائرہ بہت وسیع پایا اور ابتدائی آرٹ کی جگہ
 مکعبیت نے لے لی۔ پیمید گیلان در پیمید گیلان پیدا ہونے لگیں اور جدید آرٹسٹوں کی سائنس کوئی تحریک نہ دے سکی اور وہ اپنی بوجھلاہت
 میں شعبہ بازی پر اندر آئے اور اپنی پیمید گیلان کا کوئی عمل پیش نہ کر سکے۔ اس فن کے بانیوں کو جب ذرا روشنی ملی ہے تو وہ منہ کھولی کر
 اس طرح دیکھتے ہیں جیسے کسی نادر طریق پر غلط راہ پر کھڑے ہیں۔ پیکامیونے گئے سیریکونز بٹھا کر گھر سے باہر نکل آتا ہے، در کھنچ کر
 ہلے سے پٹا ہوا، اپنی سے نیازوں کا مظاہرہ کرتا ہے۔ کبھی ستر سال کی عمر میں اتھارہ سالہ لڑکی سے شادی رچا کر چھوٹے پیکامیون کا اعلان
 کرتا ہے۔ شہرت اس کے دروازے پر کھڑی ہے، وہ اسے اور ہوا دیتا ہے اور کہتا ہے سیدھے سادے خط، ساڈگی اور اختصار فن
 کی روح ہے۔

نقوش کی دس سالہ تحریروں کی مکمل فہرست

زیرِ ادارت : احمد ندیم قاسمی ، ہاجرہ مسرور

احمد قاسم حسین

نور الحسن ہاشمی

خدیجہ مستور

ہمارے دنیا مسند فلسطین
ہمارا سماج کچھ تو کہئے
قلم ڈھونڈتے ڈھونڈتے
نئی کتابیں ہم وحشی ہیں (کوشش چند) ”ہم“
نئی دنیا کو سلام (مسردار جعفری) ”ثقافت“

۲

ظلع ہاجرہ مسرور
مقالے جہان نو بہرہ ہائے پیدا فیض احمد فیض
تقسیم و ملت علامہ غلام مرتضیٰ
سیاسی بحران اور ہمارا ادب اختر قاسم حسین
ادبیئے اردو کی خدمت میں غلام جمیلانی برقی
بدلتی قدیمیں شیر محمد اختر
فریب بہار جان شاد اختر
فریب علی مسرور جعفری
لمحہ دلبری نگر نوسوی
یہ بہار عنیا جاندھری
خیر حقیق جعفر طاہر
یرگیت مغبول حسین احمد پوری
عظوائی مشابہ احمد ندیم قاسمی
ٹماک ڈھبے خدیجہ مستور
رات بھر اختر اور بھوی
لحات اندر لحات شذکت قناری
نرد و پستے میکسم گورکی
غزل انجم دھانی
غزل شاد عارفی

طلوع ہاجرہ مسرور
یا افق نادر سن قادری
مرا دوست آگاہ از ایستاد عزیز مسرور
حال الدین جمیل صیقلی غلام رسول ہر
اردو زبان فلک بنا
نظمِ صدارت حنیف جاندھری
رباعیات بیابان اکبر آبادی
رباعیات احمد ندیم قاسمی

ابر و اس بر صفت ظفر
مناجات تیوتم ظفر
مشورہ تقی اللسنائی
افسانے جہر وں کا منہ دلیہ کوشش چند
میں انسان ہوں احمد ندیم قاسمی
بڑے افسانے بنے بیٹھے ہوں ہاجرہ مسرور
میرا دشمن میرا بھائی عزیز احمد

غزلیں ناخائیں ولیم سینسٹم
غزل مسلسل انر لکھنوی
دو غزلیں اختر شیرانی
برگِ سبز فراق گوکھپوری
گھمائے چیدہ حنیف جاندھری
غزل علی سردار جعفری
غزل احمد ندیم قاسمی
غزل سیت الدین سیت
غزل مختار صدیقی عبدالحمید عظیم

ہماری زبان ڈاکٹر عبدالحق
بیابان اکبر آبادی
نوجوا احمد فاروقی

عزل	عبدالعزیز ظفر	سیاہی	کرشن چندر
عزل	مجید امجد	چڑھے چڑیا کی کہانی	امجد عباس
عزل	قیم نظر	نظرت کیوں غلطی؟	عزیز احمد
عزل	احمد ندیم قاسمی	آندھی میں چراغ	ممتاز شیریں
ہماری زبان	نیا زنجیری	ہمد	جاوید اقبال
	آل احمد سرور	غزلیں	حظیلا ہوشیار پوری
	اختر اور بیڑی	غزل	عبدالحمد سالک
	عزیز احمد	غزل	آثر کھنوی
	معین احسن مدنی	غزل	عبدالحمد عجم
	خواجہ احمد عباس	غزل	اختر شہدائی
ہماری دنیا مغربی راست کے تیز بندے	مرزا محمد حسین	غزل	اختر ہوشیار پوری
ہمارا سماج	کچھ تو کہئے	غزل	احمد ندیم قاسمی
مسلم	فلم کے اثرات	غزل	ڈاکٹر باقر
نئی کتابیں	سما خٹین	ہماری زبان	عبادت بریلوی
	آجڑ شب		آغا شہد
	”عجب“		
	”ہم“		
	”قاف“		

۳

مقالے	طالع	احمد ندیم قاسمی	ہماری دنیا آج کی دنیا
	جہاں کی قدریں	ڈاکٹر تاثیر	ہمارا سماج مسئلہ انسان اور ادیب
	فکارت روزگار	غلام رسول مہر	فلم نگاہیں تعبیری تسلیں
	ترقی پسندوں کا رجحان	ساحر لدھیانوی	نئی کتابیں حقیقت پسندانہ (محمود بنگلوی) ”ہم“
	پاکستان کی قومی زبان	ڈاکٹر محمد عبداللہ، باری علیگ	دور سے پر (شیر محمد اختر) ”ہم“
	تعمیر دولت	علاؤ اللہ غلام سرشد	سنئے اور پرانے چراغ (آل احمد سرور) ”قاف“
	زبان کا مسئلہ	نکر تونسوی	اقبال کے خط و طبع کیلئے نام ”قاف“
	درد و اند	گلبرگ آبادی	ماہ نو (ماہنامہ) ”دھات“
	رباعیات	جوش ملیح آبادی	گوچ (طفیل ملک) ظہیر باہر
	صدائے بھرا	اختر الایمان	
	سمندر	محمود جہانگیری	
	ایک شام	قصہ قیاس خاں	
	یہ بچوں	تسیم نظر	
	رداں سے سفینہ	سیف الدین سیف	
	پڑوسی	قتیل شفا	
	نواب	فارغ بھادی	
	نواب سے گناہ تک	احمد ندیم قاسمی	
	افسانے	سعادۂ حسن مٹو	

نظمیں

مقالے	طالع	ہاجرہ مسرور	ہماری دنیا آج کی دنیا
	ظفر و مزاج	”پطرس“	ہمارا سماج مسئلہ انسان اور ادیب
	برج بانو	کنہیا لال کپور	فلم نگاہیں تعبیری تسلیں
	شہزاد گڑوں	”فلک پیم“	نئی کتابیں حقیقت پسندانہ (محمود بنگلوی) ”ہم“
	کون (ظلم)	شفیق الرحیمی	دور سے پر (شیر محمد اختر) ”ہم“
	منشی ہارے عشق	خواجہ احمد فاروقی	سنئے اور پرانے چراغ (آل احمد سرور) ”قاف“
	ادیب حبیب اللہ اور دلفانی	احتماس حسین	اقبال کے خط و طبع کیلئے نام ”قاف“
	اختر شہدائی	آل احمد سرور	ماہ نو (ماہنامہ) ”دھات“
	ارسطو کا تصور المیہ	جاوید اقبال	گوچ (طفیل ملک) ظہیر باہر

۴

مقالے	طالع	ہاجرہ مسرور	ہماری دنیا آج کی دنیا
	ظفر و مزاج	”پطرس“	ہمارا سماج مسئلہ انسان اور ادیب
	برج بانو	کنہیا لال کپور	فلم نگاہیں تعبیری تسلیں
	شہزاد گڑوں	”فلک پیم“	نئی کتابیں حقیقت پسندانہ (محمود بنگلوی) ”ہم“
	کون (ظلم)	شفیق الرحیمی	دور سے پر (شیر محمد اختر) ”ہم“
	منشی ہارے عشق	خواجہ احمد فاروقی	سنئے اور پرانے چراغ (آل احمد سرور) ”قاف“
	ادیب حبیب اللہ اور دلفانی	احتماس حسین	اقبال کے خط و طبع کیلئے نام ”قاف“
	اختر شہدائی	آل احمد سرور	ماہ نو (ماہنامہ) ”دھات“
	ارسطو کا تصور المیہ	جاوید اقبال	گوچ (طفیل ملک) ظہیر باہر

نظمیم

فنون اور نثر کا اسلام	عبد الرحمن چغتائی
ادیب اور عوامی ادب	کفر قوسوی
ہندوستان پاکستان کا نعرہ	جوش ملیح آبادی
پندرہ اگست	اختر الایمان
آلیہ چترن آزادی	عبد المجید بیسٹ
حصہ میں کے بادل	نخمر جالندھری
رد میں	منیب الرحمن
چرخ روشنی میں	عبد المجید عدم
رد واد و گروصل	اختر اقصا دی
نقطہات	جاں نثار اختر
اجنبی دہس میں	اداجعفری بدایونی
اے ساقی	مقبول حسین احمد پوری
اظہار	ضیا جالندھری
میراث آدم	تاجش دہلوی
جدید تر	احمد ندیم قاسمی
ایک اڑانی میں	ابوالفضل صدیقی
(؟)	سماعت حسن منٹو
چھپے چوری	ہاجرہ مسرور
مائی ڈار لکھ جوش	ہندرناتھ
آجی سہارا	مشہد اختر
کھیل	ڈاکٹر تانیر
جب بادل اٹھے	احمد ندیم قاسمی
آیا	پندرہ اگست
غزل	فرانی گورکھپوری
انقلاب مسلسل	حفیظہ بو شیار پوری
غزل	اثر لکھنوی
تازہ اشعار	عابد علی عابد
غزل	انجم رومانی
غزل	شاد عارفی
بڑے رفقہ	مختار صدیقی
غزل	تیرم نظر
غزل	سیف الدین بیگ
غزل	قتیل شغائی
غزل	عبدالحزیز فطرت
غزل	احمد ریاض

ہماری زبان اردو کا مستقبل

جعفر طاہر
آل احمد مسرور
خواجہ احمد فاروقی
ڈاکٹر سید عید اللہ
اثر لکھنوی
میاں بشیر احمد
پندرہ اگست
اختر الایمان
جاں نثار اختر
انجم رومانی
اے قدوس
عجالت بریلوی
عائشہ درانی
عابد علی عابد
ابوسید بزمی
سماع کا ایک سال

فہم جازے

فلموں کا معیار
اردو فلم کا ایک سال
اردو کا ایک سال
سیاست کا ایک سال
سماج کا ایک سال

۵

طلوع	احمد ندیم قاسمی
قائد اعظم	ادارہ
اسٹیمبر حکمہ	مقبول حسین احمد پوری
اختر شیرانی	ندیم
پرویش لوح و قلم کتنے ویگے	فیض احمد فیض
خاموش خاموش	انجم رومانی
دنیا کے بچے	سودا انشورود کا خطاب
قدیم انسان، احساں فر	اختر اقصا دی
ادب اظہار	عابد علی عابد
زبان کا مشہد	طفیل احمد خاں
فساد مجاہد اور پیداد	عزیز احمد
اقبال اور رومی	نذیر مومن
روایت کی اہمیت	عجالت بریلوی
دلی کا آخری ادیب	آغا محمد اشرف
فنی خواب و خیال	مظفر علی سیّد
ہیں کیا کرنا چاہئے	ابوالقاسم صدیقی
افسانہ نگار عسکری	ریاض جاوید

مقالے

مطالعے

ڈرامہ غزلیں

میر تقی میر	عبد شہید	غزل
رات سلامت ہے	قمر لعلی	غزل
میں اکیلارہ نہ جاؤں	خزیر جاوید	غزل
اک دنیا پتالی	ایوب احمد کرمانی	ہماری دنیا معاہدہ شمالی اعلان تک
تختے	اسرار اور اخلاطوں کی تہذیبیں	ہم اسے نام
حقیقت پسند	مسعود جمال	ہماری تحریک
موتی	ابجین ترقی پسند مصنفین	نئی کتابیں
بیرہشتاں پہلے پیرہشتاں کے بعد	عبد اللہ ملک	جاوید کا خاص باب
معاذے دور	ظہیر زاہر	ووماہی شاہزادہ
منزل ہے کہاں تیری	"قاف"	جب خون بہا
چھنڈا دو جا ہے ہمارا		اشہارہا
لغزش		
سید جود		
کوباباشی (مترجمہ حمید اختر)		

غزل	طلوع
غزل	استقامت آدمی
غزل	رونگے گنگے کی نظر
غزل	(روداد و روغن میں کی گئی)
غزل	اسے ماؤ، بہنو، بیٹیوں
غزل	(روداد و روغن میں کی گئی)
غزل	یہاں ڈال کر گئے ہیں
غزل	(روداد و روغن میں کی گئی)
غزل	(روداد و روغن میں کی گئی)

ہماری نیاں یہاں نکال دی گئیں ہمارا
ہماری تحریک :- ابجین ترقی پسند مصنفین کا ہجوم اور اولیٰ ہڈی کے
نئی کتابیں نیا دور (فسادات مجری) محمد صفدر

۸ (آزادی غبار)

طلوع	ایچنگے بائے میں
ادب اور فراہ بیت	ڈاکٹر اعجاز حسین
مقالے	میرزا فرحت اللہ بیگ
میرزا فرحت اللہ بیگ	اختر انصاری
ترقی پسند تحریک	عبادت بریلوی

تہذیب ناقابلِ تعمیر ہے ایسا بہن برگ - جر کرمانی
کہا جسے پیر کا خون ڈال دیا گیا کہ اس کو دیا گیا کہ اس کو دیا گیا
عالمگیر امین کا گیس پیرس کا منشور
پاکستان کے دانشوروں کا اعلان نامہ
ہندوستان کے دانشوروں کا اعلان نامہ
چنگ گنگ سے چنگ گنگ : احمد نعیم قاسمی
..... رہی ہوئی تہذیب
دستِ محمد و ساقی
شانت سندس
قصاوم
سین الحار
اندھرا
جنگ

نقشیں

نغم	چکرا اور آبادی	غزل	مرزا احسان احمد
نغمت پری	مغز اکبر آبادی	غزل	عدم
پہرے کے دو در کھلے	سوامی مہاروی	غزل	منیا جاندھری
تراوش	جہیل نقوی	غزل	رازمراہ آبادی
غزلیں	اثر لکھنوی	غزل	عبدالعزیز فطرت
غزل	عدم	غزل	اثر صہبائی
غزل	اثر صہبائی	غزل	فضل احمد کریم فضل
غزل	یوسف ظفر	غزل	خاطر غزنوی
غزل	حیرت شملوی	غزل	نظیر صدیقی
غزل	شانی المی سحقی	غزل	محمد صدیق کلیم
غزل	شاو لکھنوی	غزل	الطاف مشہدی
غزل	حبیب اشعر	غزل	گروین دیمہ گماں سے نکلا رفعت مروش
غزل	باقی صدیقی	غزل	جشن عید یا جشنی قائم
غزل	افبال صفی پوری	غزل	ہم سفر سے
غزل	شہرت بھاری	غزل	رام کھلاون
غزل	ادیب سہارنپوری	غزل	مشاعر
غزل	مصطفی اکبر آبادی	غزل	بہار کاکیت
غزل	عابد حسینی	غزل	کو کین کا پیو پاری
افسانے	عوبد احمد	غزل	پہاڑی دینا
حل منڈل	سعادت حسن منٹو	غزل	بھارے بنی
ڈوٹو	شوکت خاٹاوی	غزل	پاکستان میں نظرو پیش منظر
لیاقت نرو معاہدہ	سہیم بانڈے	غزل	نہتوں کا ہفتیار
گرتے گھر	اثر لکھنوی	غزل	افضل مرزا جاندھری
نئی کتابیں	جگن ناتھ آزاد	غزل	
چھان بین		غزل	
بیکراں		غزل	

(سائنس) ۱۶-۱۵

ذکر تاثیر

ہائے وہ میر کاروان سرمد ڈاکٹر تاثیر
لندن کی ایک شام ڈاکٹر تاثیر
مرثیہ اس کا لکھنے ہیں آج عابد امجد سائیک، عابد علی عابد
(ذکر تاثیر) صوفی تلمس، حنیف جاندھری
" خلیفہ عبد الحکم، اقتدار علی تاج
" ایں لے رحل، فیض احمید فیض
" عبدالرحمن چغتائی، حنیف جاندھری

مقالے

ان کی باتوں میں گوں کی خوشبو پطرس
دعوت علی شاہ شرم سرجم
تقاضا اور تقاضے عبدالرحمن چغتائی
مجھ کے لئے فضل بیک کا استعمال عذیب شادانی

۱۴

طالع
مقالے پاکیزہ خیالیں
اندس کے آثار طبع
تین ناول
اقبال کی ایک نظم علی تنقید
یہ میراجی ہیں
غالب کی تصویریں
غزل
غزلیں

دعا عظیم
میر ناصر علی (مترجم)
نیا ترجمہ پوری
جلال الدین اکبر
مظفر علی سید
مظہر ممتاز
خیر پوری
فراق گورکھ پوری
رضا علی وحشت

۱۸-۱۷ (ناولٹ نمبریں)

منظوم کہانیاں ہمسایہ
عبدالمجید عدم
مسلم بھٹلی شہری

مقالے فورٹ ولیم کالج کے
چند ناول نگار
اردو ناول
ناول یا افسانہ
علاوہ
صلاح الدین احمد
نقاد
دقار عظیم

ناولٹ کٹاری •
سرمال
اٹھارے نام پر
برت کی ہادیوں میں
مہمان ہمار
سعادت حسن منٹو
شرکت تھانوی
انتصار حسین
اسے حمید
اشفاق احمد

زیرِ ادا دت

محمد طفیل

۲۰-۱۹

طویل مختصر افسانے

تسلیم سلیم چٹاری
اے حمید
سعادت حسن منٹو
فرائی گو رکھجوری
رضا علی وحشت
آل احمد سرور
عابد علی عابد
اتر لکھنوی
مجید احمد
سیف الدین سیف
عبدالمجید عدم
شاد عارفی
پرست ظفر
ناصر کاظمی
حیرت شملوی
باقی صدیقی
عبدالمستین عارف
احمد راہی
اختر ہوشیار پوری
فطرت
منظور عارف
عاطف اکبر آبادی
رضا ہمدانی

افسانے سورا پے
ہتشر گل
اولی اللہ
سہارے کی تلاش
سنان موٹ
حقیقت نبوت
سہارے دن
اُس کی باتوں میں گون کی خوشبو
بار خاطر
رباعیات
نفران اس
سلسلے
رد و ادا زمانہ
آرٹ
خواب حسن
کراچی سے ایک ناول
رخصت
نئے زاویے
کی خوب یہ انجام ہے
تغییر
غذرا
سرلاب
یاد
کرشن چندر
احمد ندیم قاسمی
رمیناز مہتمم
حیات اللہ افساری
خدا بہر مستور
اشفاق احمد
یزدانی ملک
ڈاکٹر تاثیر
شرکت نقاوی
جوش ملیح آبادی
احمد ندیم قاسمی
اختر الایمان
مجید احمد
عبدالمجید عدم
شہور علیگ
جگن ناتھ آزاد
قدیم نظر
انجم دوانی
سوامی مادھوری
اختر ہوشیار پوری
منظور عارف
فادری بخاری
منیر نیازی

مکاتیب
نظیں

نوار د

غزل
ہوا کے دوش پر (افسانہ) انور سجاد
قم سے بڑھنے کی لگی ہے (نغمہ) فرداد زیدی
کوہ حریب خود یا کچھ کو فرزلے (غزل) انوار حسین ہاشمی

مقالے

طبقہ معتزلہ نیاز فخری
برناؤ شاہ آلی احمد سرور
ناہید کی داستان عابد علی عابد
قطب شہزادی کی لسانی خصوصیات احتشام حسین
باری صاحب سعادت حسن منٹر
عند کی ادبی تاریخ کا ایک نئی خواہرا احمد قادری
ناولٹ کی تکنیک سعادت بریلوی
بلستان کے لوگ گیت محمود ہاشمی
ہندوستان میں مغلیہ فرعونری ربیعہ سلطانہ
ماہ نقابا بی چند نصیر الدین ہاشمی
فتح خاں، رابعہ خاطر غزنوی

حسن خلیق احمد ندیم قاسمی
تبدیلی اختر الایمان
ساز عدا کھید دم
منزل مجید احمد
عطا کر صاحب محمد رحمانہ صری
سیاروں کی آواز مشور علیک
مشرقی رنگاں گلجی ناخدا آزاد
بتائے نگار چمن زایہ گیتی سلام بھٹی شہری
جھگڑا تو ان میں کوئی نہیں سوای ماہر وی
بہی خاطر غزنوی
اشعار عبدالعزیز فطرت
نقد و نظر فارغ بخاری
یہ سہائے بیسوت کے دھاگے جمیل ملک

مقالے (۱) شعر و شاعری

خاں اور اس کی شاعری عذریب شادانی
نظیر اکبر آبادی کا عہد ابوالبت صدیقی
شاد و عظیم آبادی عزیز احمد

خسرو غلام جیلانی برقی
آکھڑا کھنڈے پہچان مجھے انتظار حسین
سر چٹایا تھا کہ رنگ یاد آیا اخلاق احمد دہلوی
غزل گلبرگ آبادی
غزل فراق گور کھجوری
غزل آئندہ نرائن ملک
غزل اثر کھجوری
غزل عابد علی عابد
غزل رضا علی وحشت
غزل غلام مصطفیٰ تبسم
غزل اسرار الحق مجاز
غزل عبدالمجید عدم
غزل تقییل مشغافی
غزل ہنالی سبزوادی
غزل شعری جمالی
غزل شاد عارفی
غزل ناصر کاظمی
غزل ناصر کاظمی

غزلیں

۲۲-۲۱

افسانے

سایہ غلام عباس
موزیل سعادت حسن منٹر
الحدیثہ احمد ندیم قاسمی
دیت کا تو دا ممتاز مفتی
شاید کہ بہار فی علی عباس حسینی
دبی زمانہ، وہی فسانہ قرق العین جیدر
تیسری کروٹ مسند رانہ
ذلیل پیشہ ابراہیم جمیس
چور شاہد احمد دہلوی
سہیل کے نام اسے جمید
مجمع انتظار حسین

مرگ کے کنارے سعادت حسن منٹر
اس کی باتوں میں گلوں کی خوشبو جوش ملیح آبادی
اکبر نامہ اکبر الہ آبادی
بار خاطر شوکت صفائی
رباعیات جوش ملیح آبادی
سداپا گلبرگ آبادی
افطالی لہ۔ م۔ راشد

مکاتیب

نظمیں

۲۹-۳۰ (پنج سالہ نمبر)

عبد امجد	شاعر
رضا علی وحشت	غزل
جگن ناتھ آزاد	افسانہ آن شے
مشاد عارفی	غزل
پروفیسر شورش	طالع
انجم دھانی	غزل
مختار رحمان صہری	نئے رائجے
ناصر کاظمی	غزل
موزیہ حامد مدنی	بہند کی ندی
عبدالحجید بیٹی	غزل
ظہور نظر	سورسے پہلے
بانی صدیقی	غزل
فارغ بخاری	افغانی
سدا کھلی شہری	غزل
خاطر غزنوی	غما و گندم
احمد فراز	غزل
نور مجنوی	سرمد
شاہ کھنوی	غزل
احمد رحمن	دب سے دب سے
زہرہ نگاہ	غزل
احمد طغفر	ایک صوت کے نام
عبدالعزیز فطرت	غزل
میر نیازی	دن ڈھلے
جلیل ملک	غزل
موزیہ حامد مدنی	وقت اور زندگی
انتہر ہوشیار پوری	غزل
مجید شاہد	غزل

افسانے۔ دیوتا، طائر، ڈرلے

احمد ندیم قاسمی	طون بگر
مجوز گورکھ پوری	تنہائی و دلسلی
کرشن چندر	پانی کا درخت
سعادت حسن منٹو	پانچواں مقدمہ
علی عباس حسینی	رحیم بابا
گنپتا لال کپور	بندہ پرورد کب تک؟
مننا ز مہنتی	میرا گھر

طلوع	مقالے
محمد طفیل	حالی کا ایک غیر مطبوعہ مضمون { مولانا حالی (ذکر گورکھ پوری) }
آسان اردو	ڈاکٹر عبدالحق
قتیل دہلوی	تھیان پریڈ کبادی ڈاکٹر مختار الدین احمد
اسلمی ادب	فرمان گورکھ پوری
واحد علی شاہ کی ایک نادر تصنیف	{ ڈاکٹر ابو علیت صدیقی }
باغ و بار کے نسوانی کردار	سیدہ قمار عظیم
صدر الدین آزاد کے { خواجہ احمد فاروقی }	غیر مطبوعہ خطوط
غزل کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر عبادت بریلوی
تاج کی جذبات نگاہی	ڈاکٹر عذیب شادانی
مرسے وادشاو	محمد حسن سکری
چند بابیں	عبدالحق بن پیٹائی
نگرینی ناول کا اردو ناول پر اثر	ڈاکٹر احسن خاں
غالب اور میر آباد	ڈاکٹر نصیر الدین ڈی
نظریں، نعروں، اشتعال و مارغ	چتر شمع آبادی
غزل	فران گورکھ پوری
غزل	فیض محمد فیض
شباب کے کیپول	احمد ندیم قاسمی
غزل	عابد علی عابد
غزل	آل احمد سرور
غزل	آثر گھنوی
دعوت نامہ	احسان دانش
غزل	صوفی بستم
آثری طاقت	انتہا الایمان
غزل	انتہا انصاری
نوروز	عبدالحجید عدم
غزل	عبدالحجید عدم
دلین	قتیل مشغائی
غزل	قتیل مشغائی

غزل	خدیجہ مستور	اداد
غزل	تسليم سليم چشتاری	حسن انتخاب
غزل	اشفاق احمد	سواور ممتاز کبیری
غزل	دیو بند مستیاد خفی	غمیم
جائزین	ڈاکٹر محمد باقر	صدر نگ
غزل	اسے حمید	پنژان دے
غزل	شوکت صدیقی	پریت لاج
غزل	انصار حسین	ماہ
غزل	فکر تونسوی	دفتر کی مہرب
غزل	عنبر الدین احمد	ہستخوان، اجناتون
غزل	احمد نیر ناکھی	مہر بہ لب
غزل	حبیب اشعر	چترا
غزل	مسعود انور عشقی	نئی کتابیں دم جمہ مطالعے اور جاننے عبادت بریلوی
غزل	شاہد احمد پوری	
غزل	ابو الفضل صدیقی	
غزل	باہرہ مسرور	
غزل	گروپا اور لوری	
غزل	کوڑے کے ڈھیر پچ	
غزل	گلپ کا بیبول	
غزل	ٹوپی پارک	
غزل	گرم سیخ	
غزل	ایک نیک جہشی (دہریہ) ل۔ احمد اکبر آبادی	
غزل	چامپا (دجلی)	
غزل	شروین کمار دما	
غزل	سوز احمد	
غزل	سعاد حسن منٹو	
غزل	منٹو صاحب	

۳۳-۳۴

طبع	ڈاکٹر عبدالحق، نیاز فتحپوری	خاکے
سچے قاعدہ	شوکت قادی	مقالے
اسلامی ادب کی مین؟	ڈاکٹر محمد احسن فاروقی	
داغ کا نغزل اور اس کے	ڈاکٹر عبادت بریلوی	
سماجی تحریکات	ڈاکٹر محمد الدین احمد	
مکتبہ برسیہ	حضرت رحمانی	
میر کا اسلوب تصنیف گوئی	سید علی عباس جلاپوری	
تخیل نفس پر ایک نظر	ڈاکٹر نعیم احمد بن ہاشمی	
اردو غزل کا تنقیدی مطالعہ	جوش ملیح آبادی	
نظریں، نظریں ازالہ	عابد علی عابد	
غزل	فراق گورکھپوری	
غزل	معین احسن حبلی	
غزل	احمد ندیم تاشکی	
غزل	انزگھنوی	
غزل	محمد امجد	
غزل	ناصر کاظمی	
غزل	پروغیر مشور	
غزل	مشاد عارفی	
غزل	لے متوالو، اناتوں والو	

مقالے	محمد طفیل	نظریں، نظریں
ایک خط	فراق گورکھپوری	غزل
نیا مرشد نازک خیالان	آفتاب احمد	غزل
کچھ میر کے بارے میں	تاجی عبدالودود	غزل
باغ و بہار و فسانہ عجائب	سید وقار عظیم	غزل
لاقصید		غزل

۳۵-۳۶

مقالے اصول نادری (ذیر مطلقہ) مولانا حالی (مرحوم)

پنج اکبر حماد حسن قادری
کچھ میر کے بارے میں قاضی عبدالودود
ڈاکٹر ادا کا کشتن اور نربب ڈاکٹر غلام جیلانی برقی
اردو غزل ڈاکٹر ابرار الیٹ صدیقی
فیضی کا نظریہ شعر ڈاکٹر وحید قریشی
ادب میں روایت اور بغاوت [۱۰ نمبر شہناز شامی
کارشتہ

نظریہ غزلیں شکستہ زندان جوش ملیح آبادی
غزل جگر مراد آبادی
غزل فرائی گورکھپوری
غزل عابد علی عابد
غزل اثر لکھنوی
غزل آل احمد سرور
غزل شاد عارفی
غزل عدم
غزل عدم کا شبیری
غزل خلیفہ کا شبیری
غزل جیون دیس
غزل ایمان
غزل سوز نیاز
غزل حیرت شکلوں
غزل فرارِ تمنا
غزل شاعر لکھنوی
غزل ظہور نظر
غزل اتہال صفی پوری
غزل حامد عزیز مدنی
غزل سلیم احمد
غزل ابن آدم
غزل احمد فراز
غزل کراہتے ہوئے دل
غزل سیل و احمد سلیم
غزل ایک کہانی، ایک افسانہ عارف عارف

ارسطو کی حلاقیات غلام جیلانی برقی
عنایہ شادانی کا نغزل نظیر صدیقی
نظریہ غزلیں غزل فرائی گورکھپوری

غزل عابد علی عابد
غزل عنایہ شادانی
غزل احمد ندیم قاسمی
غزل رمضان دشت
غزل کیٹی جریا کوٹی
غزل اختر انصاری
غزل پورب دیس کی ناری محمود جالندھری
غزل تجید امجد
غزل شاد عارفی
غزل زہرہ
غزل ناجی ناظم آزاد
غزل ناصر کاظمی
غزل سہم چھٹی شہری
غزل فضل
غزل راز مراد آبادی
غزل باقی صدیقی
غزل جمیل ملک
غزل احمد دیاس
غزل سعاد حسن منٹو
غزل خاموش نغمے
غزل سگریٹ پیس کی آزادی
غزل فکر لکھنوی
غزل افسانے، ڈرامے

غزل تیریا
غزل محمود
غزل فیسی پورکھنک سیلون
غزل ہریر لب
غزل ڈھلان
غزل ایک فائنہ، ایک ڈی
غزل ایک سفر اور
غزل ایک تہا ایک شکست
غزل امین احمد

شخصیات

غزل جگر مراد آبادی
غزل محمد طفیل

غزل	شہرت بخاری	اندلسیہ	ڈاکٹر احسن فاروقی
افسانے	ثبث منفی	ابوالفضل صدیقی	منہر تاج
بلونت سنگھ جیٹا	سعادت حسن منٹو	انناس کا درخت	دیوند رام سر
پینا	احمد ندیم قاسمی	لعبور اور چراغ	جیلانی باق
مروت آپ کے لئے	مننا زعفرانی	گریز	آغا بابہ
اجنسٹا	دیوند رستیاہتی	آپا	غلام علی چودھری
بد چلن عورت	ابراہیم مجلس	مالک	سید خلیل احمد
خواب کی چیزیا	سید فیض محمود	رگ سنگ	ضمیر الدین احمد
لیزا	منظور الہی	فٹ پاٹری	ابن الحسن
حکیم کی بیگم	ڈاکٹر محمد حسن	ست بھرائی	احمد ندیم قاسمی
نہراجم	خلعتی (مریخ)	مننا	اختر اور بھوی
نہراجم	نہراجم کے بعد (آرٹھی) محمود حسن جتوئی	کنیز	ہاجرہ مسرور
نہراجم	کچھ فساد عجائب کے، بھین، رشید احمد صدیقی	دیوے بکشن	قدرت اللہ شہاب
نہراجم	بے قاعدہ	شکار گاہ سے	ابوالفضل صدیقی
نہراجم	شوکٹ خٹاؤی	لالہ صحرانی	خدیجہ مستور
نہراجم	سید محمود احمد	گوریا	اشفاق احمد
نہراجم	فراق گورکھپوری	مردہ کھر	شوکٹ صدیقی
نہراجم	فراق کی شخصیت	بچی نبولی	انتظار حسین
نہراجم	فراق صاحب	نئے سال کا آخری دن	کشمیری لال ڈاکر
نہراجم	فراق گزارش	یا قوت اور عیب	انور عظیم
نہراجم	نہراجم کی پاکستان (ساقی سے)	دوسری شادی	شوکٹ خٹاؤی

۳۷-۳۸ (افسانے)

(۱)	منہی کی تانی	صہمت چٹائی	خاکے
	برودہ فروش	غلام عباس	
	شادی	سعادت حسن منٹو	
	کالی تیزی	بلونت سنگھ	
	کوڑی کا حال	علی عباس حسینی	نوار و بونے
	مسوری مسوری	خواجہ احمد عباس	نوار و بونے
	بچا جان	حیات اللہ انصاری	نوار و بونے
	گڈی کے اٹھے	دیوند رستیاہتی	نوار و بونے
	گٹھ پتیا	کھنیا لال کپور	نوار و بونے
	اب بھائی کوئی نہیں کوئی	تقسیم سلیم چٹائی	نوار و بونے
	منیں آئی گئے	سہیل عظیم آبادی	نوار و بونے
	بھائی جان	اسے عید	نوار و بونے
	زرد گلاب	ابراہیم مجلس	نوار و بونے
	گوری عورت، کلامرد		نوار و بونے

۳۹-۴۰

طلوع	محمد طفیل
تخلیق کی جمہوریت	قرۃ العین حیدر
بکرت	(اسلام آباد)

اسلامی ادب ڈاکٹر سید شوکت سبزواری
ادب پرانے عاقبت وطنان احمد دہلوی
اسلامی ادب سید علی عباس جلاپوری
ادب میں یہ تقسیم کیوں؟ سعید احمد رفیق
اسلامی ادب کا مسئلہ
آفتاب احمد، ڈاکٹر اسمن فاروقی، حامد حسن قادری
ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر ابولیت صدیقی

نظریں، نگریں، راجیات

غزل جوش ملیح آبادی
غزل اثر لکھنوی
غزل فرائی گورکھپوری
غزل عابد علی عابد
غزل احسان دانش
یہاں سے وہاں تک احمد ندیم قاسمی
غزل شاد عارفی
تنہا مجید امجد
غزل جلیل قدوائی
غزل قہقوں کی محبت عدم
غزل غزل طیبانی
موضوع کی تلاش نقیب ششغائی
راستے پروین فیروز شہر
دلہنیں امین انشاہ
غزل باقی صدیقی
غزل شام لکھنوی
ہمدانی بی بی بچیں سبکدوش سوامی مارہروی
فاصلہ تیغ اللہ آبادی
غزل خلیل الرحمن اعظمی
ایک انہجی لڑکی نور مجبزی
تین زمانے احمد ریاض
غزل شہرت بھادی
غزل نظر حیدر آبادی
غزل تمرا اجنالی
دلہا حمایت علی شام
غزل سلیم احمد سلیم
غزل جہل ملک
غزل تنویر نقوی

افسانے گفتگو

محبت بھی بھڑی—

کوشش چندر
لی۔ احمد
علی عباس حسینی
سعادت حسن منٹو
ممتاز مفتی
آفتاباں
خاطر نوٹوی

تراجم

شخصیات

مرثیے ترجمہ شاہد احمد دہلوی
ریت کی دیوار ترجمہ شردن کنار ورمہ
پرسٹ آفس ترجمہ غلام حسین مصطفیٰ
احمد ندیم قاسمی عبادت بریلوی
نویسہ صاحب محمد طفیل

۴۲-۴۱ (غزل میر)

دلی دکن میر تقی میر
سودا درد
معصی میر حسن
جرات انشا
نقد نگار آبادی غالب
موتن ذوق
بہادر شاہ ظفر ضیفہ
تاسع آتش
امیر سیستانی دارغ
حالی اکبر الہ آبادی
شاہ عظیم آبادی ریاض خیر آبادی
آزاد افسادی آرزو لکھنوی
اقبال حسرت موہانی
اصغر گوٹوی فانی بدایونی
مگر مراد آبادی جوش ملیح آبادی
فرائی آثر لکھنوی
یکانہ سیما ب
حقیقہ جانہ ہری
فیض احمد فیض اختر شیرانی
تائیر حقیقہ ہمدانی پوری
عبدالمجید سالک عابد ۱۹۶۰ء

(۲)

چراغ حسن حسرت	صوفی تبسم	جلیل مالک پوری	احسن مار پوری
احسان دانش	سائغر لکھنوی	نور نادری	کیفی ذاتیر دیوبند
آفتاب انصاری	شاد عارفی	یحیٰی، مولانا محمد علی	دل شاہچہاں پوری
ہنال بیہار دی	اسرار الحق مجاز	میدوم دادش	آغا حسن کاظمیری
معین حسن جلی	امجد نسیم قاسمی	دشت گلگونی	آسی الدہنی
عبدالحجید عدم	سیدت الدین سیف	تاجور نجیب آبادی	عبدالمطیع مین
ظہیر کاظمیری	تقیل شتافی	ظفر تاباں	عزیزیت شادانی
ساجد صباوی	موجود سلطان پوری	علی اختر حیدر آبادی	تلوک چندھوڑم
شکیل بدایونی	فضل احمد کریم فضل	آنند زراش ملہ	روشن صدیقی
ناصر کاظمی	ابن انشاء	میراجی	جوش ملیانی
سراج دکنی	شاہ مبارک آباد	جلال الدین اکبر	آل احمد سرور
(۳) شاہ حاتم	فغان	ماہر انصاری	سراج الدین ظفر
منظر جان جاناں	میر سوز	مختار صدیقی	یوسف ظفر
قائم چاند پوری	یقین	انجم رومانی	قبیم نظر
بیان، اختر احسن اللہ	حکیم ہدایت اللہ خاں ہدایت	حیرت شعلی	سکندر علی وجد
میر محمدی بیدار	عبدالحی تاباں	ادیب سہارنپوری	ذوالفقار علی بخاری
سید محمد میراثر	جعفر علی حسرت	غلام ربانی تاباں	راز مراد آبادی
سعادت یار خاں رنگین	شاہ نعیم الدین نعیم	شان الحق قسبی	مجید امجد
لمنوں	شہیدی	باقی صدیقی	حکیم ناڈہ آزاد
دربار لکھنوی	صبا لکھنوی	عوش ملیانی	ظہور نظر
نسیم لکھنوی، دیاشکر	رند لکھنوی	عتیا جان دھری	احمد رباق
نسیم دیوبند، نواسہ مرزا نصر علی	نسیم دیوبند	احمد راجی	عارف عبدالمبین
مرزا قربان علی بیگ ساکت	موجود، میر ہمدی	شہزاد احمد	شہزاد احمد
جلال لکھنوی	نسیم لکھنوی	سلام مھلی شہری	شاہو لکھنوی
صابر دیوبند	قاسم راہ پوری	جعفر طاہر	حبیب انصر
بہائی پردانی میرٹھی	حفظ جرن پوری	کلین احسن کلیم	سلیم احمد
یحیٰی بدایونی	چکبست	نور بجنوری	اصغر سبیم
نظر علیا بی	وحید الدین سیم پانی پنی	سائغر صدیقی	عظیم مر تقی
شوکت گلزاری	عشر لکھنوی	جلیل ملک	
مصطفیٰ خیر آبادی	شبلی نعمانی	(۵) آفتاب شاہ عالم بادشاہ	آرزو، سراج الدین علی خاں
حسن بریلوی	نسیم حسرت پوری	آصف، نواب ذریافتہ لکھنوی	یحیٰی خاں
یحیٰی دیوبند	ساجد دیوبند، امر ناڈہ	آشنو ہزارا، قاضی حسن خاں	آبیر، نواب محمد یار خاں
سائق دیوبند	آغا شاہ دیوبند	اسد، میراجانی	آسن، مرزا حسن علی
صقی لکھنوی	ناطق لکھنوی	انیس، میر بر علی	انجم، احمدہ الملک امیر خاں
ناطق گل و گھڑی	عزیز لکھنوی	آبیر، مظفر علی	امید، قربا مش خاں

کمال، شاہ کمال الدین
گشتار رامپوری، کرامت اللہ
ماہی، مرزا محمد ابرہیم بیگ
منت، میر تقی الدین
فتھو میاں نور الاسلام
تہر، حاتم علی
میر، حکمران آبادی
محمی، کھنوی، ولوی محمد حسین
شیار، شاہ نیاز بریلوی
ناظم، نواب یوسف علی خاں
نور، میر محمد شفیع احمد
ولا، مظفر علی خاں
وفا، رامپوری، جیم عید الدادی خاں
بدایت، فتح بدایت اللہ
بجڑ، شاہجہان پوری، نواب محمد علی خان
(۶) ہری چند اختر
اسد علیانی
سوزت، جمالی
دستہ، قریشی
سند، زربین کار
نخست، جارجی
محمد نسیم
اختر، ہوشیار پوری
خاطر، مولوی
فارغ، بخاری
سلیم، واحد سیم
مراد، شیدا بانی
زہرہ، نگاہ
نواب، شاہجہان بیگ شیریں
نواکت
امرا، جان زہرہ کھنوی
مونی، حاتم مونی
لطیف، محمدی جان صاحب کھنوی
وتبر، امرا، حاتم
شہزاد، حاتم، شورش لہ

استیاق، ولی، مدرسہ سرسندی
ایم، صاحب سیر
ابن، خواجہ امین الدین
امانت، کھنوی
اختر، نواب واصل شاہ
احسان، شاہجہان پوری
انور، امرا، امام
بقا، ضیاء اللہ
میاک، شاہجہان پوری
برادر، گلشن اللہ
تجلی، میاں، حاجی
تسلی، لالہ، کلام
تشنہ، محمد علی
نفاق، نواب شاہجہان پوری
چرخش، شیخ محمد دکن
جوتیں، میر محمد باقر
حسانی، حسام الدین حیدر
خاکسار، محمد یار
خلیق، میر منگو
دکبر، ماہروی
رنگی، نواب محمد علی خاں
ریشان، نواب امین الدین
راقم، قمر الدین
زکی، نواب محمد زکریا خاں
سید، نواب میرزا محمد علی شاہ
شوق، قدوائی، احمد علی خاں
نور، مولانا، تعلیم
نشد، میر ملک محمد علی خاں
صبا، لالہ، کاجی علی
اصغت، امرا، آبادی
رشید، کوہ، آبادی
عاجر، عارف الدین خاں
عارف، محمد نواب علی خاں
فرات، شہزاد اللہ
قدوی، لاہوری
حیات، سرت، لاہور
حیات، سرت، لاہور

۴۴-۴۳ (میر غزل نمبر)

طدوع دیست زلیخا (ترجمہ) حامد حسن قادری
کتنے کی موت کرشن چندر
بھنگن سعادت حسن منٹو
گودیا گھر مستان رفعتی
پا پریدہ خدیجہ مستور
پھول سرگئے اسے حمید
وڈر لیندیں ابن سعید
شاہراہ عبدالغنی عبد الرحمان صدیقی
لمی حسین محمد یوسف خان
مرکاتیب بار خاطر شریک نقوی
شخصیات فراق پتے خط و کی روشنی میں فراق گورکھپوری

غزل اور مختصر لکھن

(۱) مولانا حالی، آل احمد سرور، نیاز فتح پوری، سید احتشام حسین،
عبد السلام ندوی، ڈاکٹر سید عبداللہ، حاجن قادری، عہدیت بدلیا
ڈاکٹر مسعود حسن زبوی، سید قاضی عظیم، کلیم الدین احمد، ڈاکٹر
ابوالیث صدیقی، ڈاکٹر یوسف حسین، سید باہتر حسین،
سید امجد حسین، فیض احمد فیض، علی سرور، راجہ عرفی۔
(۲) دل دکن، سراج دکن، آبرو، حاتم فغان، میر تقی میر، مسودا،
میر درد، منظر جان جاناں، سوز، شیخ قائم، یقین، میر محمد میرا،
عبدالحی تاباں، میرزا، رنگین، مصطفیٰ، غلام حسن حسن، برات، الفنا،
نظیر گوگڑاوی، نصیر، مومن، مغالہ، مومن، ذوق، بہادر شاہ ظفر،
شبیخ، ناسخ، آتش، شہیدی، سالک، مجروح، داغ، ایرمیا،
حالی، جمال، تسلیم، اکبر، ریاض، آرزو، کفایتی، انبیا، حضرت مرثی،
مہر گووندی، غازی، بدایونی، جگر مراد آبادی، جوش، اندرائی،
میرزا یگانہ، حفیظ جالندھری، سبحان۔

کمپوزر (اردو غزل کا مستقبل)

حصہ لینے والے :- عبد الحمید سالک، صوفی تیسرے، ڈاکٹر ابوالیث صدیقی،
سید طعن، سید قاضی عظیم، نظیر کاظمی، ڈاکٹر محمد اہد، بدلیا،
احسان، دانش، حامد علی خان، چچا، حسن حسرت، احمد بدایونی،
حفیظ جالندھری، حبیب اشعر

مفت

غزل

فراق گورکھپوری

۴۵-۴۶

طدوع محمد طفیل
ڈرامے تلوں ادیبز ناٹھ، شک
تکے کا سہارا امجد حسین
کلاؤ ناٹھ عورت سنیاناس کتیا لال کپور
سنگتہ سلام پھلی شہری
افسانے بابا نور احمد ندیم قاسمی
غزل سعادت حسن (غزل)
چار کوٹ عمنان رفعتی
فاخر کی جہیز میں دانہ دیویندر ستیا رفعتی
صنم تراش کا خواب ل۔ احمد
پھیلا دیوچ ابوالفضل صدیقی
کلیا ہوا ڈبہ انتظار حسین
چھٹکارا جلالی بانو
نظیم، غزل، مختصر، بسات جوش بیچ آبادی
جنگلو فراق گورکھپوری
غزل حکمران آبادی
غزل فیض احمد فیض
غزل فراق گورکھپوری
غزل اثر کفایتی
غزل علی علی عابد
غزل احمد ندیم قاسمی
غزل اختر انصاری
غزل احسان دانش
غزل اداس رات کے گنگھی میں ابن انشاء
غزل خٹا عارفی
غزل نہال سیوہری
غزل عبد الحمید حیرت
غزل گلبن ناٹھ آزاد
غزل پرودیسر شہر
غزل جلیق قدوائی
غزل ناصر کاظمی
ایک نظم تبیع الد آبادی
لیلا میر نیاز

غزل	نور مجنونی	خمس العلماء مولوی عبدالرحمن
ہر زنجیر گراں	احمد ریاض	آرزو کھنڈی
غزل	فارغ بخاری	ڈاکٹر مولوی عبدالحق
غزل	جبل ملک	ابوالکلام آزاد
مقالے	سید وفار عظیم	علامہ درویش تیرہ کیفی
جہان غالب	قاضی عبدالودود	خواجہ حسن نظامی
میر کا فنی کشور	ڈاکٹر عبادت بریلوی	مولانا عبدالحامید دریا بادی
اقبال اور کاوش پیرو اور حرکت	غلام جیلانی	ڈاکٹر ذاکر حسین
گلچے گرامیہ	اسلوب احمد انصاری	مرزا محمد سعید
شب بیداری	محمد طفیل	مولانا حامد حسن قادری

مکاتیب اُن کی باتوں میں گلون کی خوشبو حافظ محمد شیرانی
ڈاکٹر آفریقہ، حامد جی قادری

۴۸-۴۷ (تخصیصات نمبر)

تخصیصات	تخصیصات نگار
محمد حسین آزاد	آغا محمد باقر
مولانا شبلی نعمانی	سید صباح الدین عبدالرحمن
حالی	خواجہ غلام الحسین
ہمدرد افادی	عبدالحامید دریا بادی
مولانا عبدالحلیم شرر	خاک تر جانش
گرامی	سوز ملک
مولانا عبدالدین سلیم	روح بانی پتی
مرزا رسوا	علی عباس حسینی
آغا شہر	عشرت رحمانی
میر ناصر علی	انصار ناصری
مولانا راشد الخیری	فضل احمد خاں دیوبند
اقبال	ڈاکٹر حفیظ عبدالحمید
غانی	جوش ملیح آبادی
مرزا عظیم بیگ چغتائی	شاہد احمد دیوبند
سید سجاد حیدر بدایونی	قرۃ العین حیدر
مولوی عنایت اللہ دیوبند	شیخ محمد اسماعیل بانی پتی
پروفیسر شیرانی	ڈاکٹر سید عبداللہ
مرزا فرحت اللہ بیگ	مرزا عصمت اللہ بیگ
حسرت موہانی	جلیل قدوائی
مولانا سید کبیر اللہ ندوی	سید صباح الدین عبدالرحمن

(۳)

غزل	نور مجنونی	خمس العلماء مولوی عبدالرحمن
ہر زنجیر گراں	احمد ریاض	آرزو کھنڈی
غزل	فارغ بخاری	ڈاکٹر مولوی عبدالحق
غزل	جبل ملک	ابوالکلام آزاد
مقالے	سید وفار عظیم	علامہ درویش تیرہ کیفی
جہان غالب	قاضی عبدالودود	خواجہ حسن نظامی
میر کا فنی کشور	ڈاکٹر عبادت بریلوی	مولانا عبدالحامید دریا بادی
اقبال اور کاوش پیرو اور حرکت	غلام جیلانی	ڈاکٹر ذاکر حسین
گلچے گرامیہ	اسلوب احمد انصاری	مرزا محمد سعید
شب بیداری	محمد طفیل	مولانا حامد حسن قادری
مکاتیب اُن کی باتوں میں گلون کی خوشبو حافظ محمد شیرانی	ڈاکٹر آفریقہ، حامد جی قادری	رشید احمد صدیقی
ڈاکٹر آفریقہ، حامد جی قادری	آل احمد سرور	مجنون گورکھ پوری
	فرانک گورکھ پوری	ڈاکٹر زور
	رفیع سلطانہ	ڈاکٹر کھنڈی
	شیخ ممتاز حسین چوہدری	جگر صاحب
	رشید احمد صدیقی	حافظ جالندھری
	سوز ملک	عبدحیدر آبادی
	نصیر الدین شاہی	عابد صاحب
	محمد طفیل	مختار کھنڈی
	میرزا ادیب	مولانا صلاح الدین احمد
	وزیر آغا	چوہدری محمد علی دہلوی
	بگم اخلاق حسین	عنایت شاہانی
	ڈاکٹر شوکت سبزواری	ڈاکٹر شوکت سبزواری
	سید مشتاق عظیم	منٹو ناموں
	حامد جلال	کرشن چندر
	ہمندر ناظم	عصمت چغتائی
	خالد لطیف	راجندر سنگھ بیدی
	کنہیا لال کپور	احمد ندیم قاسمی
	خدیجہ مسطور	خواجہ احمد عباس
	صابر عبدالحامید	مجتاز مفتی
	مسعود قریشی	قرۃ العین حیدر
	ایمن سعید	دیوندر ستیا رتھی
	پرباش پندت	خدیجہ مسطور
	ہاجرہ مسرور	شفیق الرحمن
	محمد خالد اختر	تسلیہ مسعود
	سلیم اختر شد مہر	

۵۱-۵۲

وامرخت فیض احمد فیض
کم بیک ایفقا فیض احمد فیض
فیصل آباد کی بہم فیض احمد فیض
دریکچہ فیض احمد فیض
جلگڑ اور ستاسے جیدانی بانو
گیموں اور گلاب خواجہ احمد عباس
شریلا ممتاز مفتی
بھاگ بھری ہاجرہ مسرور
تیسرا سنگٹ بلونت سنگھ
منڈو، میرا دشمن اد پندرا ناتھ سنگ
ہرے رنگ کی گڑیا دلچندر سنیا دھنی
سراب خدیجہ مستور
مظفر شہزاد شہزاد
کول رانی صدیقہ بیگم سید لاری
بیاباد غلام علی چوہدری
فردوسی سید عابد علی عابد
نغز جوش ملیح آبادی
رباعیات جوش ملیح آبادی
نغز انزل کھٹوری
صبح مشکستہ احمد ندیم خاکی
اکشتاف معذیب شادانی
ہمسفر، جام مشکش روشن صدیقی
نغز اختر انصاری
نغز عدم
نغز شاد عارفی
اتحاد ہندوپاک پرو فیسر شہزاد
نغز غلام ربانی تابان
نغز دافن جونیوری
نغز ابن انشا
منوژند سپہ مصطفیٰ ازیدی
نغز ناصر کاظمی
نغز ستار کھٹوری

ناولٹ
افسانے

ڈراما
نظمیں، ناولیں، نغز

مقالے

نغزل زہرہ نگاہ
نغزل احمد ربیع
نغزل نور مجتبیٰ
منو کا پیغمبر عظیم قریشی
نغزل باقر ہدی
نغزل جمیل ملک
نغزل بشیر منڈر
کرن منیر اختر
داغ فراق گورکھپوری
برکات شاہ کی پہلی گرامر سید مسعود حسن رموی
آزادی کی سیاحت آغا محمد اشرف
تنقید میں نقطہ نگاہ کی بحث واکرم شوکت سہروردی
روشنی کی آوازیں شفیق منصور

۵۳-۵۴ (افسانہ نمبر)

افسانہ نمبر ۱ افسانہ نمبر ۲
طویل مختصر داستانوں کا دور

طوطا کانی حیدر بخش حیدری
آرٹسٹ محفل حیدر بخش حیدری
باغ دہار میرا امی دہلوی
بتال بھجپی مظفر علی دلا دلا لال
سنگھاسن بنیسی کاظم علی دلا دلا لال
افسانے نو تن محمد بخش بھٹو
فسانہ عجائب رجب علی بیگ مسرور
العتیلد احسن علی خاں کشمیری، جعفر علی خاں
ناولوں کا دور عبود ساسا
جام مرشار زنن ناتھ مرشار
دل دنیا شہزاد کھٹوری
شریعت زادہ مرزا محمد بادی رسوا
بھنوری دلی راشدا بھنوری
نغمہ جویم توفیق علی خاں
نغمہ اسلم حنا بٹ اللہ دہلوی
شاعر کی وصیت عبدالرزاق بیگ آبادی
پیتا خواجہ منظور حسین

کیمور کا قصہ	منصور احمد	مختصر کے سائے	حجاب انبیا علی
بلی کے بچے	جلیل تدوائی	نیارمیں	ایم اسلم
مصور کا راز	حامد علی خاں	نازو	اختر انصاری
دلہن کی پوشاک	فضل حق قریشی	درونی تیرگی	میرزا ادیب
پڑیوں کا بچہ	تیرغدار ام فیروز پوری	بنتِ قمر	صادق انجیری
افسانوی مضامین کا دور		لکھ دانا	شیر محمد اختر
شیراز سے کابا زار میں گھسنا خواجہ حسن نظامی		رسیدا	مسز عبدالغادر
اوکھنے کی سیر	آغا حیدر حسن	سلیخا لا	صالحہ عابد حسین
جہان آباد	ناصر نذیر فراتی	بغیدہ منہا آتی	بہاد علیگر
دربار دلی کی لکھ بادی	عشرت لکھنوی	مہادلوں کی ایک رات	احمد علی
زودیشیمان	چودھری افضل حق	دلی کی سیر	رشید جہاں
ریا کار	فلک پیرا	جوان موی	عمود الظفر
پریت کی بٹی	چراغ حسن حسرت	زندگی کے چوڑے	کہ شہر حیدر
صحابی بیٹوں لاہور میں	اشرف صہوجی	نیا قانون	سعادت حسن منٹو
اردو افسانہ		گرہن	راجندر سنگھ بیدی
خار نشان و گلستان	سجاد حیدر بلہ رم	جو بھٹی کا چوڑا	عصمت جیٹاٹی
طوق آرم	سلطان حیدر جوش	بھاری گلی	احمد علی
کیو پڈوسٹیک	نیاز فقیروری	آئندی	غلام عباس
سمں پوش	مجیوں گورکھ پوری	پرینٹر سنگھ	امجد علی قاسمی
بھینٹ	لی۔ احمد	آپا	مننا زلفی
تیسری جنس	محمد علی رودلوی	زعفران کے پھول	خواجہ احمد عباس
کفن	پریم چند	بچے جانے دو	اختر حسین داسے پوری
جاں نثار	سدرشن	مجاموں کی یونین	فلک راج آئند
چنی کی بکھوٹی	عظیم ریگ جینائی	نئی مصیبتیں	رشید جہاں
پریم کی چوڑیاں	عظیم کرپوری	حرام حادی	حسی عسکری
انڈیا ہونا	حکیم احمد شجاع	زیرین تاج	عویز احمد
تین پیسے کی بھڑکری	قاسمی عبدالغادر	آج کی کوشش	حیات اختر انصاری
مید لکھنوی	علی عباس حسینی	بلیکن کا پودا	اوپندر ناتھ اشک
ڈالی کا بوج	حامد انڈیا فسر	لال دھرتی	دیو ندر سنیا رتھی
زندگی	عاشق شاہوی	کلیاں اور کاسٹے	اختر اور پوری
لادی میں	قیاض محمود	جنگا	بیوت سنگھ
سکے کاغذ و بارغیت	انبیا زعلی تاج	بھالو	ہجرہ مسرور
پیلہ	عابد علی حابد	خون	انور
کیا کر	پرویسر محبوب	جلا وطن	فروغ العین حیدر
دولت خلع	شوکت قہاوی	میٹوں سے بچے بالائے چھٹے	خدیجہ مستور

جینی	شفیق الرحمن	نذیر احمد کے مذہبی انکار	ڈاکٹر غلام جیلانی برق
الاد	سہیل عظیم آبادی	نذیر احمد کے تصانیف	شیخ محمد اظہار علی بانی ہدی
آئینہ	ممتاز شیریں	یا و مجاز	محمد رضا انصاری
نزد و چہرے	ابراہیم مجلس	مجلہ نقد	ڈاکٹر محمد حس
سرور اکبر بن سنگھ	قدرت اللہ شملہ	مجاز کا غیر مطبوعہ کلام	
ٹوٹ گیا کانا	نسیب سیم چٹائی	جذبہ شوق نیل شہر پر راز نہیں	
سمندر ادیتیں کرے	مدھو سون	یہ تیرگی شب ہی کچھ صبح طراز آئی	
گلوا	سید نفیس حسین	مذہ فارسی و گجراتی کہتے ہیں	
سرگزشت	ابوالفضل صدیقی	زلف سرکش بے نیاز پہنچ و چشم	
جہاں میں رہتا ہوں	محمد ناقد	رعنہ ساجویں دست و گریبان میں بیکھا	
آب حیات	راما نند ساگر	دھواں سا کسمت اٹھ رہا ہے شر اسے اڑا کرے آہ بہاں	
یاجی ولایت	آغا بابر	نظم : آہنگ جنوں	
آنکھ بھولی	شکید اختر	مکہ قریب ذائقہ کے خطوط	فران گو رکھ پوری
اب اور تب	ہنس راج رہبر	مطالعہ صاحب	کنہیا لال کپور
روپ چند	صدیقہ بیگم سہاروی	نظمیں نور علی رباعیات	جوش ملیح آبادی
تجاوہ	عبدالرحمن چٹائی	دکان سخن	فران گو رکھ پوری
گڈیا (پانچواں دور)	اشفاق احمد	حبیب غیر دست	فیض احمد فیض
راون کے دیس ہیں	اسے محمد	غزل	عابد علی عابد
تیسرا آدمی	شوکت صدیقی	غزل	صوفی تسم
اچھا دھیا	انتظار حسین	غزل	عدم
کھجور	پرکاش پٹیل	قطعات	احمد انصاری
چاند بھگیا	سر لادوی	غزل	غلام ربانی تاباں
موسم کی مریم	جیلانی بانو	گفتگوئے ہمار	انسیا زعی موعزی
لڑکھائی چٹان	انور عظیم	غزل	مکیش اکبر آبادی
مقتالات	سید وقار عظیم	غزل	شاد عارفی
داستان سے اٹھنے تک	عبادست بریلوی	غزل	فضل احمد کریم فضل
مختصر افسانے کا فن		غزل	عبدالمجید حیدر
مغربی افسانہ کا اثر	{ ممتاز شیریں	غزل	محمود رحماندھری
اردو افسانہ پر	{ اردو افسانہ پر	غزل	ناصر کاظمی
اردو افسانے کا مستقبل	{ محمد حسن عسکری	غزل	شمالی بھٹوی
اردو افسانے میں روایت	{ (مذکرہ)	غزل	اقبال صفی پوری
اور تجربے		مہر وند اندھیرا ہے	نور مجذوبی
		غزل	حمایت علی شامو
		غزل	احمد ریاض
		غزل	خلیل الرحمن اعظمی

دودی	مینیر نیازی	غزل	احمد ندیم قاسمی
سحر بیید	عبدالعزیز فطرت	قصائد	ہاجر انصاری
غزل	نارنج بخاری	باد و گد	اداجعفری
غزل	ہاجر ہوشیار پوری	غزل	شاد دعائی
غزل	بینہ منذر	غزل	نقیل شفاقی
غزل	جلیل ملک	غزل	اشک رامپوری
افسانے			
سردار دی موت (پنجابی)	احمد ظفر	غزل	انجم رومانی
رات چورا اور چاند	بلونت سنگھ	غزل	غلام نظر
پانچواں مقدمہ (غیر مطبوعہ)	سعادت حسن منٹو	غزل	اداجعفری
خدا داد کا کوئی	شوکت صدیقی	غزل	زہرہ نگاہ
مسی	آغا بابر	آل برنگال	فیض نظر
رات ہر کا مہمان	کشتیری لال ڈاکر	غزل	تہوہ نظر
ننگی ہاتھیں	شکیلہ اختر	شہرِ آذر	مصطفیٰ زیدی
پہنچاؤں	صادق حسین	غزل	عظیم مست شیشی
حاجی پور گوجران	منظور الہی	غزل	نور مجتہدی
نئی کتابیں			
۵۸-۵۷			
افسانے، ڈرامے، طنز و مزاح			
کوہ پانی پر فنی صورت میں	کنہیا لال کپور	غزل	باقتر جمہدی
بار خاظر	شوکت قاضی	غزل	پروہار بٹھی
گرم کوٹ اور بیوی	احمد حسین	غزل	مستظرا لیکر آبادی
چنگیز خاں	سید عابد علی عابد	غزل	بشیر منذر
انٹ	صالحہ عابد حسین	غزل	جلیل حشمی
رات چورا اور چاند (مسلّم)	بلونت سنگھ	غزل	منظر ایم
الغ بیلا ۱۹۵۷ء	خواجہ احمد عباس	غزل	موج ملک
مولوی گزٹ	ابوسعید قریشی	غزل	قریبان حسین شیدہ
پڑی کا داغ	عبدالقیم سید باری	غزل	راہل گورکھپوری
ابدی سرت	نور مجتہدی	غزل	مینیر نیازی
نیلام گھر	مصیح الحسن منوی	غزل	قاضی عبدالودود
جبل و طعن	احمد سعید	غزل	احمد ندیم قاسمی
نظمیں، نغمے، نظمیں، جدید سخن	فران گورکھپوری	غزل	احمد علی الدین جدی
حقیقت و حجاز	حکمران آبادی	غزل	دلیہ رامسر
غزل	فیض احمد فیض	غزل	شاہد احمد پوری
غزل	فران گورکھپوری	غزل	شاہد احمد پوری

مقالے

آوارہ گرد اشعار

حقیقت اور فنی حقیقت

اردو ادب کے جدید ترین رجحانات

کمانی کافن

اگر وہ ایک صحیح مولوی نذیر احمد

ڈاکٹر نذیر احمد جرنیل صاحب، ٹنکپن کاظمی
مولوی نذیر احمد کی مذہبی تصانیف، شیخ محمد سعید اعلیٰ پانی پتی

۵۹-۶۰ (تخصیصات نمبر ۱۲)

تخصیصیت **شخصیت**

دارغ دہلوی	جوش مسیانی
اکبر آبادی	عبدالمجید دریا بادی
دقار الملک	مولانا غلام رسول نیر
نواب سجاد الملک	ڈاکٹر عبداللہ الحق
ڈاکٹر عبداللہ بن احمد	محمد حسین خان زبیری
مولوی چراغ علی	غلام بخت
غلام رام پوری	شاد عارفی
شاد عظیم آبادی	سیحس امام
فصیح حسین خیال	شاہ ولی الرحمن دلی کا کوی
امداد امام اثر	سید حسن امام
حبیب الرحمن شروانی	مانک رام
علامہ عبداللہ العبادی	ابراہیم خیرودودی
پنڈت برج برائے عظیم	محمد بن تنکیب
مولانا حسن دہرودی	جمیل زبیری
نیا زائن نگم	نواب کا پوری
سائل دہلوی	مالک رام
چودھری افضل حق	شورش کا شمیری
سہاب اکبر آبادی	شار آٹوی
میرزا یگانہ چنگیزی	سید اعظم حسین اعظم
رضا علی وحشت	انور قادری
سلطان حیدر جوش	وجید احمد
اختر شیرانی	نیر داسطی
ابو سعید بزمی	اوید بزمی
رشید جہاں	صدیقہ بیگم سید ہادی
مجاذ	ابوالکلیت صدیقی
مولوی محمد اودھ بادی	عماد احمد عباسی
محمد ذوب	رضا انصاری
ڈاکٹر رام بابو سکینہ	آثر کھنوی
جوش علیانی	پنڈت ہری چند اختر
ظفر چنڈ محمود	جگن ناتھ آزاد

(۲)

عبدلرزاق علی آبادی شاد خان
ڈاکٹر عابد حسین عبدالحسن عارفی
موسیٰ راہپوری حضرت رحمانی
سید انصاری علی ناچ شوکت قاضی
صوفی غلام مصطفیٰ اعظم محمد نظامی
مسعود حسن رضوی علی عباس حسینی
علی عباس حسینی کشور علیا زبیدی
حامد علی خان محمد عبداللہ قریشی
رئیس احمد جعفری ارشد قاضی
شکیل بی کام قد نکیب
شیخ محمد جمیل پانی پتی بدر الاسلام فضل
ڈاکٹر غلام حیدر بی بی محمد عثمان
اسے راجا لون زبیدہ خان لون
ڈاکٹر سید امجد حسین سید احتشام حسین
سید احتشام حسین ڈاکٹر محمد حسن
اختر حسین رائے پوری دیوبند رستیا رفقی
اختر اور بزمی شکیل اختر
حیات اللہ انصاری سید انیس رضوی
ادبند ناتھ اشک گوشتیا اشک
حقیقہ جو شیا پوری ناصر کاظمی
ان م - راشد عطاء اللہ سجاد
احمد علی سید علی اکبر قاصد
اختر انصاری عزیز بونوی
شاد عارفی طاہرہ اختر
سید عبدالحمید عدم شاد احمد تسری
حذلی انور عظیم
شکیلہ اختر صوفیہ فضل
مولانا محمد جویہ عتیاء الدین احمد برنی
مولانا حسین احمد دینی رشید الوہیدی
سید ابوالاعلیٰ دودودی فہیم صدیقی
علامہ مشرقی غلام جیلانی برقی
عطا اللہ شاہ بخاری شورش کا شمیری
امیں لے رحمنی اثر صہبائی
محمد نظامی شورش کا شمیری
شورش کا شمیری محمد وارث کامل

(۳۱)

(۳۲)

جبل الزمان
احمد سعید
منظر عالمی
احمد جمال پاشا
سید ثریا سلطانہ
انوار حسن شاہی
جوش ملیح آبادی
جگر مراد آبادی
سیب اکبر آبادی
عابد علی عابد
احمد ندیم قاسمی
سراج کھٹونی
آئندہ زمانہ ملک
معین الحسن جعفری
اختر انصاری
عدم
عدم
فضل احمد کریم فاضل
مورثی راجپوری
شاد عارفی
اشک راجپوری
شور علیگ
شور علیگ
تقیل مشفقائی
غلام ربانی تاباں
حیرت شملوی
اکبر رومانی
مجلہ ناقد آزاد
راز مراد آبادی
ناصر کاظمی
سوامی ماری پوری
ظہور نظر
ظہور نظر
شناور کھٹونی
نور مجنوبی

نظریں غزلیں

(۵) حیدر آبادی چند شخصیتیں
علی گڑھ کی چند شخصیتیں
ہمارے چند شخصیتیں
سرحد کی چند شخصیتیں
سر سید احمد خان
خان بہادر مولوی شہید الدین محمد الدین مادمودی
نواب حسن الملک
امیر دہشتی
سر سید بہادر سیر
عبدالرزاق کابجوری
لالہ سری رام
سید علی بلگرامی
منشی سجاد حسین
مرزا محمد امدادی مولوی لکھنوی مانی حاشی
محمد دین فونق
عشرت لکھنوی
امیر گوٹہ دی
تاجور نجیب آبادی
صفی لکھنوی
دل شاہ جہاں پوری
قلک بیجا
مالک رام
احسان دانش

۶۱-۶۲ (سالنامہ)

افسانے
چور (غیر مطبوعہ)
استفان کے نگینہ
جانا حاتم خان کی کچر
رست چور اور چاند
ہادی کے کاغذیں
ایک پھول، ایک کار
سات دن کی بادشاہت کشمیری لالی ڈاکر
زینہ
ایک انسان کی موت
بچی انیش
سعادت حسن منٹر
استفان کے نگینہ
کینیا لالی کچر
بلوت سنگھ
محباب استیاض علی
مندر ناقد
ابو سعید قریشی
فکر تونسوی
غلام علی چودھری

۴ خطوط	مرکب پرشاد	۴ خطوط	شاد و بلگرامی	۷ خطوط
۴ خطوط	بچود دیاونی	۴ خطوط	سیاہ اکبر آبادی	۴ خطوط
۴ خطوط	خواجہ عنترت لکھنوی	۴ خطوط	فرحت اللہ بیگ	۷ خطوط
۴ خطوط	داست الخیری	۴ خطوط	فانی بدایونی	۷ خطوط
۴ خطوط	حکیم اہمل خان	۴ خطوط	آرزو لکھنوی	۵ خطوط
۴ خطوط	سائل دہلوی	۴ خطوط	محمود شیرانی	۷ خطوط
۴ خطوط	محمد دین فوق	۴ خطوط	تاج و نخب آبادی	۴ خطوط
۴ خطوط	ڈاکٹر انصاری	۴ خطوط	یگانہ چنگیزی	۵ خطوط
۴ خطوط	غلام حبیب نیرنگ	۴ خطوط	قاضی عبدالغفار	۴ خطوط
۴ خطوط	سر تیج بہادر سپرو	۴ خطوط	سلطان حیدر جوش	۴ خطوط
۴ خطوط	آغا شاعر نزل باش	۴ خطوط	اختر شیرانی	۴ خطوط
۴ خطوط	ظفر الملک	۴ خطوط	ڈاکٹر تاثیر	۴ خطوط
۴ خطوط	احسن ماربروی	۴ خطوط	عبدالسلام ندوی	۴ خطوط
۴ خطوط	صفی لکھنوی	۴ خطوط	چراغ حسن حسرت	۴ خطوط
۴ خطوط	دیاز انجم بیگم	۴ خطوط	اختر جوناگڑھی	۴ خطوط
۴ خطوط	وحید الدین سبیم	۴ خطوط	(۲) سید ندیم حسین محدث دہلی	ایک خط
۴ خطوط	نصیر حسین خیال	۴ خطوط	نواب سرسزمیل اللہ خان	۴ خطوط
۴ خطوط	حالی دہلوی	۴ خطوط	محمد سمیع اللہ	۴ خطوط
۴ خطوط	سید سلیمان ندوی	۴ خطوط	ابو محمد عبدالحق	ایک خط
۴ خطوط	خواجہ حسن نظامی	۴ خطوط	سر آسمان مجاہد	۴ خطوط
۴ خطوط	داتر تریب کیفی	۴ خطوط	سید شوکت حسن شوکت فہمی	ایک خط
۴ خطوط	منظر آسن گیلانی	۴ خطوط	مولانا افرغ علی آزاد	ایک خط
۴ خطوط	سجاد حیدر بلدرم	۴ خطوط	رضا بلگرامی آرزو	ایک خط
۴ خطوط	مظہر اللہ خان	۴ خطوط	نواب صدر الدین حسین	ایک خط
۴ خطوط	سر اسامہ سعید	۴ خطوط	مینہ شکوہ آبادی	ایک خط
۴ خطوط	مرزا محمد ہادی عویدہ لکھنوی	۴ خطوط	مولوی فدا بخش	ایک خط
۴ خطوط	خواجہ عزیز الدین عویدہ لکھنوی	ایک خط	سید عبدالحق	ایک خط
۴ خطوط	مفتی کفایت اللہ	۴ خطوط	سید عباس حسنی فصاحت	۴ خطوط
۴ خطوط	عبد الرحمن بجنوری	۴ خطوط	امیر علی رضوی	ایک خط
۴ خطوط	مفتی پریم چند	۴ خطوط	جسٹس امیر علی	ایک خط
۴ خطوط	اصغر گوٹروی	۴ خطوط	سید علی بلگرامی	۴ خطوط
۴ خطوط	حسرت موہانی	۴ خطوط	سید میر حسن	ایک خط
۴ خطوط	وحشت گلشنی	۴ خطوط	مولانا میر حسن	ایک خط
۴ خطوط	پرو فیہر محفوظ الحق	۴ خطوط	عبدالرزاق کچنوری	۴ خطوط
۴ خطوط	مفتی مدینش پرشاد	۴ خطوط	شاہ سلیمان چلواری	ایک خط

محمد علی رودلوی	ایک خط	سید عبدالدین احمد عرقی	ایک خط
مولانا عبدالباری	۴ خطوط	مرزا محمد عسکری	ایک خط
جلیل بانک پوری	ایک خط	مولوی محمد اکرام خاں ندوی	ایک خط
ممدی حسن	۴ خطوط	سعید انصاری	ایک خط
پیش بلگرامی	ایک خط	مولانا مسعود عالم ندوی	ایک خط
کشن پرست وکول	۴ خطوط	مولانا مسعود علی ندوی	۴ خطوط
نسیم بھرت پوری	ایک خط	مولوی عزیز مرزا	۴ خطوط
میر نثار علی شہرت	ایک خط	سید فزندی علی صفیر بلگرامی	۵ خطوط
ترشی محمدناظر	ایک خط	مولوی غلام حسین کنتوری	۵ خطوط
غلام احمد مہجور	۴ خطوط	مولوی عبد الغفور شہباز	۸ خطوط
مولانا رشید احمد گلگامی	ایک خط	سید علی حسن خان	ایک خط
مولوی بشیر الدین	ایک خط	سید حسین بلگرامی	۹ خطوط
مولانا عبدالباری آسی	۴ خطوط	سر آفتاب احمد	۴ خطوط
مولانا آزاد سہجانی	ایک خط	حکیم حبیب الرحمن شردانی	۴ خطوط
پیٹل شہید زائن نسیم	۴ خطوط	دہا جنت جھنجھاڑی	۹ خطوط
میرز آفاق لکھنوی	۴ خطوط	حکیم ناطق کلاوٹھی	۴ خطوط
بہنو دھوپانی	ایک خط	مولوی سید محمد حسین مچوی	۹ خطوط
آزاد انصاری	۴ خطوط	جشن شاہ دین بہاولپور	۶ خطوط
مولوی عنایت اللہ	ایک خط	حکیم فقیر محمد شتی	۴ خطوط
مولوی نور الحسن پیر	۴ خطوط	بہنو دھوپانی	۴ خطوط
مولانا جمید الدین فراہی	ایک خط	مولانا محمد عرفان	۴ خطوط
میر ناصر علی	ایک خط	مولانا اسم جیرا چوہری	۴ خطوط
مرزا اادی رسوا	۴ خطوط	ہمدی بیگم	۴ خطوط
سیر نظیر شاہ	۴ خطوط	ابوالکلام (س)	ایک خط
شفیق عساکر پوری	ایک خط	مولانا عبد الحق	ایک خط
ڈاکٹر ضیاء الدین	۴ خطوط	مولانا عبدالماجد دریابادی	ایک خط
مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی	۴ خطوط	پطرس	ایک خط
سید طفیل احمد منگھوری	ایک خط	نیا زنجی پوری	ایک خط
مولانا ظہور احمد وحشی	ایک خط	ڈاکٹر ذاکر حسین	ایک خط
مولانا عبدالمصطفیٰ الیونہی	ایک خط	غلام رسول ہر	ایک خط
مولوی سید ممتاز علی	ایک خط	عبد المجید سالک	ایک خط
سر سید رضا علی	۴ خطوط	ڈاکٹر عبدالنثار صدیقی	ایک خط
منشی نو بہت رکنے نظر	ایک خط	ڈاکٹر عابد حسین	ایک خط
عبد اللہ بو سعید علی	ایک خط	رشید احمد صدیقی	ایک خط
ہوادریار جنگ	۴ خطوط	خواجہ غلام السیدین	ایک خط

ایک خط	مننا ز مقلق	ایک خط	ڈاکٹر تارا چند
ایک خط	بلونت سنگھ	ایک خط	فرانی گورکھپوری
ایک خط	سویز احمد	ایک خط	مالک رام
ایک خط	قرۃ العین	ایک خط	ڈاکٹر علی الدین زور
ایک خط	حجاب احتیاز علی	ایک خط	احتیاز علی بوشی
ایک خط	ہاجرہ مسرور	ایک خط	سید مسعود حسن دشوی
ایک خط	خدیجہ مسرور	ایک خط	شیخ محمد اکرام
ایک خط	تسلیم نسیم چغتائی	ایک خط	پروندیر محمد حسن قادری
ایک خط	کنتیا لال کیور	ایک خط	پروندیر محمد شفیع
ایک خط	شوکت ظفاری	ایک خط	مولانا حسین احمد مدنی
ایک خط	معین حسن جذبی	ایک خط	شیخ محمد عبد اللہ
۲ خطوط	میراجی	ایک خط	جوش شیخ آبادی
۳ خطوط	منٹو	ایک خط	حفیظ جان نذہری
۴ خطوط	مجاز	ایک خط	گلبر مراد آبادی
		ایک خط	نوح نادی
		ایک خط	آثر لکھنوی
		ایک خط	آل احمد سرور
		ایک خط	مختار الدین آرزو
		ایک خط	سید احتشام حسین
		ایک خط	اختر حسین واسطے پوری
		ایک خط	محمد حسن مسکری
		ایک خط	عبد یس شادانی
		ایک خط	جوش طیبانی
		ایک خط	سید اشیان علی ناچ
		ایک خط	فیض احمد فیض
		ایک خط	ای۔م۔ واسطہ
		ایک خط	کرشن چندر
		ایک خط	عصمت
		ایک خط	احمد علی
		ایک خط	راجندر سنگھ بیدی
		ایک خط	غلام عباس
		ایک خط	حیات الٹا نصاری
		ایک خط	علی عباس حسینی
		ایک خط	خواجہ احمد عباس
		ایک خط	احمد ندیم قاسمی
		ایک خط	اوپنڈر ناتھ شک

۶۶-۶۸ (دس سالہ نمبر)

مدون	محمد طفیل
رپورٹ ناٹ	قرۃ العین جیدر
افسانے لکھی ماں	عصمت چغتائی
پرتو	کرشن چندر
ماقم	احمد ندیم قاسمی
ٹھٹھے پل	علی عباس حسینی
دھند	مننا ز مقلق
رات و چور اور چاند	بلونت سنگھ
زل کی پیاس	خدیجہ مسرور
تاریک صلیب اور درد چاند	اسے حمید
چمکیں	ہندہ ناتھ
رات کی آنکھیں	کنتیری لال ڈاکر
ایمان کی سلامتی	جیلانی بانو
انسان اور صلیب	صادق حسین
دو ہزار و سب کے کاپیک	دیوندر راسٹر
انسان، اس کا گھر اور رخصتا	احمد مسجد
بچتے چرخ	رام لعل
ایک رات	ڈاکٹر قنفذین
ڈرامے کھلی کھریاں	ہاجرہ مسرور

نقوش میں شائع ہونے والی تخلیقات کا خاکہ

(۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۸ء تک)

زمانہ ادارت: احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ مسرور

نمبر شمار	شمارہ نمبر	مصنفین	افسانے	ڈرامے	ناولٹ	نظریں	غزلیں	کل تعداد نظروں پر	اصول و صفات طبع شدہ
۱	۱	۷	۵			۶	۹	۲۷	۸۴
۲	۲	۸	۴			۷	۶	۲۵	۸۰
۳	۳	۱۰	۵	۱		۹	۷	۳۲	۱۰۴
۴	۴ (آزادی نیر)	۱۱	۷	۱		۱۳	۱۳	۴۵	۲۶۴
۵	۵	۱۷	۸	۱		۱۳	۹	۴۹	۱۹۸
۶	۶	۷	۵			۱۲	۸	۳۲	۱۲۰
۷	۷ (دین نیر)	۱۲	۷			۱۴	۹	۴۳	۱۵۳
۸	۸ (آزادی نیر)	۱۰	۱۰			۲۲	۲۰	۶۲	۲۴۰
۹	۹	۴	۵			۸	۷	۲۴	۸۰
۱۰	۱۰	۴	۴			۹	۶	۲۳	۷۲
میزان	۹۰	۶۰	۳			۱۱۴	۹۴	۳۶۱	۱۳۹۴

زمانہ ادارت: سید وقار عظیم

۱۱	۱۲، ۱۱ (خاص نمبر)	۱۱	۱۲			۱۰	۱۷	۵۰	۲۰۰
۱۲	۱۳	۴	۴			۵	۱۴	۲۷	۷۲
۱۳	۱۴	۶	۵			۴	۱۴	۲۷	۷۲
۱۴	۱۵، ۱۶ (سالنامہ)	۱۸	۱۲			۱۰	۳۴	۷۴	۲۴۴
۱۵	۱۸، ۱۷ (ناولٹ نیر)	۳	۴ منظوم	۱	۴			۱۰	۲۸۸
میزان	۴۲	۳۵	۱	۴		۲۹	۷۷	۱۸۸	۸۷۶

زمانہ ادارت: محمد طفیل

۱۶	۲۰، ۱۹	۱۳	۱۰	۱		۱۵	۲۲	۶۱	۲۳۲
۱۷	۲۲، ۲۱	۱۵	۱۲			۱۶	۳۸	۸۱	۲۶۴

نقوش ————— ۱۳۴۶ ————— ادب عالیہ

نمبر شمار	شمارہ نمبر	مضامین	افسانے	ڈرامے	ناولٹ	تعلیمیں	غزلیں	کلی لکھنا	تعداد صفحات طبع شدہ
۱۸	۲۴، ۲۳	۹	۹		۱	۱۲	۲۶	۵۷	۲۴۰
۱۹	۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸	۲	۳۸					۴۰	۴۰۰
۲۰	۲۹، ۳۰	۱۱	۹			۱۹	۲۰	۵۹	۲۴۰
۲۱	۳۱، ۳۲، ۳۳	۱۶	۱۵	۱		۲۰	۲۵	۷۷	۴۰۸
۲۲	۳۴، ۳۵	۱۰	۱۰	۱		۶	۲۰	۴۷	۲۰۸
۲۳	۳۶، ۳۷	۱۱	۷	۱		۵	۱۳	۳۸	۴۰۸
۲۴	۳۸، ۳۹	۱۳	۱۱			۱۱	۱۷	۵۲	۲۴۸
۲۵	۴۰، ۴۱، ۴۲	۱	۴۰					۴۱	۵۰۶
۲۶	۴۳، ۴۴	۸	۱۰			۱۲	۱۶	۴۶	۲۱۶
۲۷	۴۵، ۴۶، ۴۷							۸۱۵	۴۸۰
۲۸	۴۸، ۴۹، ۵۰	۵	۷	۲				۱۴	۲۵۶
۲۹	۵۱، ۵۲	۷	۸	۴		۸	۱۶	۴۳	۲۶۴
۳۰	۵۳، ۵۴، ۵۵	۸۶							۷۰۰
۳۱	۵۶، ۵۷، ۵۸	۱۵	۳۰					۳۵	۳۸۴
۳۲	۵۹، ۶۰، ۶۱	۵	۱۰	۱	۱	۹	۱۶	۴۲	۲۴۸
۳۳	۶۲، ۶۳، ۶۴	۵	۱۱۰					۱۱۵	۱۰۹۰
۳۴	۶۵، ۶۶، ۶۷	۹	۸			۱۱	۱۷	۴۵	۲۰۸
۳۵	۶۸، ۶۹، ۷۰	۱۰	۷	۲		۱۲	۲۱	۵۲	۲۴۴
۳۶	۷۱، ۷۲، ۷۳	۸۸						۸۸	۸۱۴
۳۷	۷۴، ۷۵، ۷۶	۲۱	۱۶			۱۴	۲۹	۸۰	۳۸۴
۳۸	۷۷، ۷۸، ۷۹	۹	۱۱	۲		۱۴	۳۲	۶۸	۳۱۴
۳۹	۸۰، ۸۱، ۸۲	۴						۱۲۱۷	۱۰۴۸
۴۰	۸۳، ۸۴، ۸۵	۱۲	۷	۲		۱۹	۲۲	۷۲	۴۵۶
	میزان	۳۸۵	۱۷	۱۷	۲	۲۰۳	۱۱۶۶	۲۱۶۸	۱۰۰۰۶
	کل میزان	۵۱۷	۱۷	۲۱	۶	۳۴۶	۱۳۳۷	۲۷۱۷	۱۲۲۷۶

ہماری کتاپیں

۵/-	عزیز ناصر	نبی اُتی	۶/-	شوکت تھانوی	نیلو فر
۱۰/-	"	خلفائے محمد	۳/۸	"	مولانا
۴/۸	جگر مراد آبادی	شعلہ طور	۶/-	"	غزالہ
۴/-	رسوا	امراؤ جان ادا	۳/-	"	خدا نخواستہ
۴/۴	ابوسعید قریشی	منٹو	۳/-	"	سودیشی ریل
۲/۸	عدم	قول و قرار	۳/۸	"	کتبا
۳/-	"	پیچ و خم	۳/۸	"	ساج کو آج
۳/-	منٹو	مرکبوں کے پیچھے	۲/۴	"	سسرل
۳/-	احمد نیر تھاکر	آنچل	۳/۸	"	کارٹون
۳/-	"	بازار حیات	۳/۸	"	مابدولت
۶/-	"	نقوش طیف	۲/۸	"	بقراط
۲/۸	ڈاکٹر تاثیر	عزیزم کے نام	۴/-	"	جورڈو
۵/-	عابد علی عابد	یہ بیٹا	۲/۸	"	مضامین شوکت
۲/۸	امام ابن تیمیہ	سیاست الہیہ	۱۰/۸	"	قاضی جی (تین حصے)
۴/-	مضامین ہمال الدین افغانی	پندرہ اگست	۲/۸	"	غائب کے ڈرامے
۲/۸	رشید اختر ندوی	صاحب	۳/-	"	دیگرہ وغیرہ
۳/-	محمد طفیل	استقاو	۴/۸	"	بھابی
۳/-	عابد علی عابد		۳/-	قتیل شفقانی	روزن

ادارہ فروغِ اردو، لاہور

مدیر نقوش

محمد طفیل

میرے باپ میں کسی نہ کسی طرح دو درجہ ہیں بچی چلی گئیں۔ کچھ لوگ مجھ سے ارادت رکھتے ہیں اور یہ ان کے دل کی فیاضی ہے۔ بعض لوگ مجھے وطن سے یاد کرتے ہیں اور یہ ان کے دل کی ناراضی ہے۔ میں کیا ہوں اور کیا نہیں ہوں۔ اس کا فیصلہ آج نہیں، کل ہو گا۔ میں نے اپنی زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح لوگوں کے سامنے رکھ دی ہے۔ یہ اوراق انھیں اس امر کا فیصلہ کرنے میں مدد دیں گے کہ میں کتنا برا اور کتنا اچھا ہوں۔

ابوالکلام

آج میں آپ کی اُن حضرت سے ملاقات کرنا ہوں جو اس سے پہلے اپنے کئی دو ستون کی پڑھایاں اچھا لکھے ہیں اور دعوے یہ کرتے رہے ہیں کہ میں تو صاف گو قسم کا انسان ہوں۔ ارادہ ہے آج انھیں بھی صاف گوئی کی کسوٹی پر رکھ دیا جائے۔ صورت دیکھئے تو مسکین، بھولے بھالے، تفریقہ اس کے برعکس، میں انھیں ۱۹۲۳ء سے جاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مگر یہ حضرت مجھے اب تک چکے پر چکر دیئے جا رہے ہیں اور اب تک یہ معلوم نہیں ہونے دیا کہ یہ آخر ہیں کیا ملا؟ مجھے یہ دو ٹوٹی ہے کہ میں ان کا بچپن کا دوست ہوں۔ اُس وقت کا دوست، جب یہ بجائے چلنے کے رہ گیا کرتے تھے اور راتی اوجی کہہ کر روٹی مانگا کرتے تھے۔

بعض نابالغوں کا خیال ہے کہ طفیل صاحب ایسے شریف آدمی اگر پیدا ہونے بند نہیں ہوئے تو کیا بے ضرور ہو گئے ہیں۔ بلکہ یہاں تک کہ اب تو ایسا برائڈ آنا ہی نہیں۔ یہ سچی اگر ان کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا تو نقصان کا بھی کوئی خطرہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بعض بے تکلف دوست انھیں بے ضرر اور غیر مفید کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

یہ جوں جوں بڑھتے گئے۔ والد کی مسلسل اور جان لیوا بیماری کی وجہ سے غریبی حیران ہوئی گئی۔ وہ وقت بھی آیا کہ جب دو وقت کی روٹی کے بھی لالے پڑ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ بے چارے کی تعظیم اور حوری رہی۔ انہیں باقی اسکول میں پڑھتے تو دیکھا گیا ہے۔ مگر ان کے پاس کوئی قابل ذکر تعلیمی سرٹیفکیٹ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زبان سے اکثر یہ فقرہ سننے میں آتا ہے۔ اہی سرٹیفکیٹ کو چھوڑیے۔ آج کل تو سکولوں اور کالجوں میں جہالت کے سرٹیفکیٹ جڑتے ہیں۔

ان کی تیرہ ہی جماعت کا ایک واقعہ مجھے آج تک یاد ہے۔ جب یہ حضرت اول درجہ کے گنڈہ میں ہوا کرتے تھے اور خوب پٹاکرٹے تھے۔ اگر استاد نے گھر پر کرنے کے لیے کام دیا تو یہ پٹانی سے بچنے کے لیے اپنے ہی ہم سبقوں کے گھروں پر جا کر، انہیں باتوں میں لگا کر، انہیں بچا کر یا ان کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر، اس دن کا کام کئے ہوئے صفحات ہی پھاڑ لیا کرتے تھے۔ اس طرح خود سرخو ہو کر دوسروں کو مصیبت میں ڈال دیا کرتے تھے اور استاد ان بچاروں کو یہ کہہ کر خوب پٹاکرٹے تھے ————— ”جو کس نے کاپی میں سے صفحے پھاڑ لئے ہیں۔“

شناڑ ————— ہوں کاپی میں سے صفحے ————— اُتو ایک تو کام نہیں کرتے۔ دوسرے جھوٹ بولتے ہیں۔ ایک دن، ان کا ایک ہم سبق، ان کے ہاتھ کی صفائی سے پٹ رہا تھا تو یہ اپنے آپ کو ملامت کرتے ہوئے اٹھے اور اقرار کر لیا کہ یہ جو کچھ کہہ رہا ہے۔ صحیح ہے اور تصور وار میں ہوں۔ استاد نے ان کی صاف گوئی کی کوئی قدر نہ کی۔ اُسے اتنی ٹھکانی کی کراسول کی دیوار پر تکبہ لگو گئیں۔ اب سے نہ جانے کیا ہوا کہ یہ پٹھانی میں تیز ہو گئے۔ اتنے تیز کہ استاد ان پر غور کرنے لگے۔ ان کی اس سے بھی پیسے کی باتیں مجھے یاد ہیں۔ جو ممکن ہے اب ان کے لیے وجہ فضیلت نہ ہوں۔ مگر وہ باتیں ان کے منقبض کو سمجھنے میں کچھ نہ کچھ مدد دے ہی سکتی ہیں۔ یہ اپنے اصلی کی یادوں کو کبھی بھلا دینا چاہتے ہیں۔ مگر وہ ہیں کہ انھیں یاد آ ہی جاتی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی جھٹلا کر یہ شعر بھی دہراتے ہوئے پائے گئے ہیں۔

یادِ ماضی عذاب ہے یا رب

چھین لے مجھ سے حافظ میرا

ابھی یہ چار پانچ برس ہی کے ہوں گے کہ انھوں نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا اور اپنی خوب گنت بھڑائی۔ رٹے، جینے اور گپا، گھر والوں نے جناب کی یہ حالت دیکھی تو بھڑوں کے چھتے کو جلا ڈالا۔ کوئی دو مہینے بعد بھڑوں نے پھر وہی ڈبرے ڈال دیئے۔ انھوں نے دوبارہ چھتے میں ہاتھ ڈال کر اپنا جلیہ حسب سابق بنالیا۔ آج جبکہ اس واقعہ کو تیس برس سے زائد عرصہ گزر چکا ہے۔ انھوں نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کی عادت ترک نہیں کی۔

انہی دنوں کا ایک واقعہ اور بھی ہے۔ جب یہ حضرت عطیک سے جل بھی نہیں سکتے تھے۔ مانی نے اپنی مانی کے ہاں ڈاکہ ڈالا۔ وہ بچاڑی سب سے چھپ کر، چار پائی کے نیچے، زمین میں سوراخ کر کے اور اُس میں مٹی کا ایک چھڑا سا اور گاڑ کر پیسے جوڑا کرتی تھیں۔ یہ حضرت رینگتے، چلتے مرقعہ واردات پر ہنسنے لگے۔ ڈھکنا اٹھایا، پیسے نکاسے، مٹی میں دبائے۔ برآمدے میں پہنچے تو بڑے بچوں نے چھین چھین کر خوب مزے کئے۔

چند دنوں کے بعد یہ حضرت بھڑاؤسی دھین پر، جتنے بھی پیسے ہاتھ آئے نکال لائے۔ مانی نے مرقعہ پر ہی جوڑو کو کڑ لیا۔ خوب پیٹا پیٹتی جاتی تھیں اور کتنی جاتی تھیں۔ ہائے ہائے طفیل تیرا میرا فرق، تو نے مجھ تشریف ”کی ساری پونجی لٹا دی۔“ گنتے ہیں کہ جو رچوری سے جانے لگی تو ہیرا پھیری سے باز نہیں آتا۔ طفیل صاحب ہیرا پھیری کے ساتھ چوری سے بھی باز نہ آئے۔ جب یہ چھوٹے سے تھے تو چھوٹے چور تھے۔ بڑے ہوئے تو بڑے چور ثابت ہوئے۔ پہلے مانی کی اکٹیاں، دونیاں

اور پیسے جرایا کرتے تھے۔ سینے پر سے تو والدہ کی بڑی احتیاط سے چھپائی ہوئی نوپے کی صندوقچی میں سے روپے تک چرانے لگے۔ یہ مشغلہ کوئی مہینہ دو مہینے چلا ہوا کہ والدہ ان کی شرافت کا علم ہو گیا۔ اس سے پہلے اس لیے پتہ نہ چلا کہ یہ چوری میں ہی عقل سے کام لیا کرتے تھے اور ایک دن میں، ایک یا دو روپوں سے زیادہ نہیں چرایا کرتے تھے۔

چوری میں لاکھ خرمیاں ہوں گی۔ مگر ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ ایک نہ ایک دن آوی پڑتا مانتا ہے۔ چنانچہ طفیل صاحب بھی پکڑے گئے۔ ایک مولانا پر پانچو گیا۔ محلے والوں کو بھی معلوم ہو گیا کہ صاحبزادے سے چور ہیں۔ ان کی والدہ نے چور کو والد صاحب کے حوالے کر دیا اور والد صاحب سب سے تھکانے کی طرف، اب طفیل صاحب دور کو منت سماجت کر رہے ہیں۔ ہاتھ جوڑ رہے ہیں۔ ناک دگڑ رہے ہیں۔ مگر والد صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔

جب تھا نہ قریب آگیا تو جناب طفیل کے ہاتھ پاؤں اور پیچھے کے ہاتھ چھکا دے کہ والد صاحب کی مضبوطی سے اپنی کلائی چھڑائی اور گلت گھاگے۔ ان کے والد صاحب زور زور سے پکارتے ہی رہ گئے۔ پکڑو پکڑو چور ہے۔ اب لوگوں کو کیسے یقین آئے کہ یہ جو جھوٹا سالاکا سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے جا رہے ہیں جو بھی پوچھتا ہے۔

اس واقعہ کے بعد انھیں چوری سے ایسی نصرت ہوئی کہ باقی زندگی میں، اس آرٹ سے ہی ہاتھ دھو بیٹھے۔ روز طفیل صاحب تو اب بھی کہتے ہیں کہ میری ابتدا بڑی شاندار تھی۔

جب بیسترہ اٹھارہ برس کے ہوئے تو ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ دولت اور والد کا جنازہ ایک ساتھ اٹھا۔ اب انھیں نہ صرف خود کما کر اپنا بیٹا پیتا پیتا ایک بھلا ملک چھوٹے سے گھرانے کی وال روٹی کی بھی نگرہ انگلیہ تھی۔ انسی سی تھان اور زندگی کی یہ سب سے کھٹن راہ۔

چھ سات برس انھوں نے خوشنویسی کے کام پر حلال کر دیے مگر اس میں سے کچھ نہیں انداز لگایا۔ اس رقم سے، ایک دوست کے انٹرناک سے پینٹنگ ہاؤس کی بنیاد رکھی۔ اول تو کچھ کل کی دوستیاں ہی کچھ کم خطرناک نہیں ہوتیں۔ اس پر انٹرناک، اس لیے ان کے بھی تھان خوابوں کی تعمیر دی ہوئی۔ جو علم ناموفق ہوتی ہے۔

اس واقعہ کا ان کی زندگی پر بڑا گہرا اثر ہوا۔ بے زاری اور بے کاری میں جب کئی عرصے گزر گئے تو مسئلہ انھوں نے امداد فروغ اردو کی داغ بیل ڈالی۔ ابتداً کچھ گزری، اس کی داستان کیا پوچھتے ہیں۔ میں یوں جانے پوچھتا ہوں اور دشمنیوں کا یہ کبھی جان برسوں ہی مقابلہ کرتی رہی۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ یہ محلے کے گھر لوٹے، ماضی پر ہاتھ رکھ کے بیٹھ گئے۔ والد نے انھیں یوں پریشان دیکھا تو پوچھا "بیٹا کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں"

"کوئی بات تو ضرور ہے"

"بات یہ ہے کہ میں ساری دیندے اکیلے ہی لڑ رہا ہوں۔ کوئی بھی تو نہیں ہے جو میرا ساتھ دے۔ نہ رشتہ دار، نہ دوست؟"

”میرے رب ایک ہے مگر تو اکیلا نہیں ہے“

”جی ہاں! میرے ساتھ ساری خدائی ہے؟“

”تیرے ساتھ تیرے دلوں سے ہیں۔ تیری اُمکیں ہیں۔ تیرے ارادے ہیں۔ اور پھر خدا۔“

”سب کچھ مجھے ساتھ ہے۔ مگر خدا میرے ساتھ نہیں؟“

”ایسی کیوں نہیں کیا کرتے؟“

”میں بھی انسان ہوں۔ بچھن سے اب تک ہزار ڈکھ جھیلے ہیں۔ مگر اب تک خدا کو ترس نہیں آیا؟“

”دیکھ میں تجھے دو باتوں کی نصیحت کرتی ہوں۔ ایک یہ کہ صبر و ضبط کے دامن کو کبھی بھی ہاتھ سے نہ چھوڑنا۔ دوسرے کسی

بھی کام کو نامکمل نہ جاننا۔“

فطیل صاحب نے ہمیشہ اپنے دونوں کے رومان کو سرِ صفحات بنام کیا ہے۔ دل چاہتا ہے آج ان حضرت کا بھی کچا چٹا لکھ دیا جائے۔ کچی عمریں ایک صاحبہ نے غالباً انھیں پرتوت کھوکھ کر ان سے ذرا ویسی قسم کی خط و کتابت شروع کر دی۔ جب انھیں اُن صاحبہ کی طرف سے پہلا خط ملا تو یہ پاگل خانے کی برہمیں پر ہی سمجھ گئے۔ وہ خط کو کتابت نہایت دلچسپ تھی۔ سینکڑوں خطوں کا آجانا رہا۔

اگر مختصر سے انھار سے تنگ فرمایا تو انھوں نے مفتی وقت بن کر فوراً ڈانٹ پلائی کہ یہ بات غلط، اگر مختصر سے کوئی شہادت کی تو انھوں نے چھوٹی عمر میں برسے میاں ہی کر بڑی ہی معنی خیز ”چڑی“ کرکس شہادت کا مزاجی کر کر کر دیا۔ اگر انھوں نے کوئی لگاؤ کی بات کی تو انھوں نے اپنا رشتہ ہی اس سے مختلف بنا دیا۔ غرض جتنی بھی نالائقیوں ان سے سرزد ہو سکتی تھیں۔ وہ برہمیں نہ توئی نالائقی یہ کی کہ اس دو طرفہ خط و کتابت ہی کو ایک دن جلاؤ لا۔ جبکہ ان میں سے ایک ایک خط کو خود آں جناب نے ایک ایک دو دو دن کی ریاضت سے لکھا ہوا تھا آج یہ خود کو شش کر کے بھی لکھنا چاہیں تو اُس جیسا ایک خط نہیں لکھ سکیں گے۔

ان سارے واقعات پر، یہ کبھی ناول ہی لکھیں گے (بشرطیکہ انھیں کسی طرح ایک دو برس کی قید ہو جائے۔ ورنہ فرصت کہاں) جس کی ضامنت کوئی چھ سو صفحات تو ہوگی۔ اُس میں ہیر و دی بڑی نالائقی اور بیوقوفیوں کے ساتھ، دوسرے کی ہنس سے اپنے جھانی کا پیار ملے گا۔

زندگی کے اس ابتدائی غلط تجربے ہی کی بنا پر، ان کا خیال یہ ہے کہ عورت ہی کو مرد پر عاشق ہونا چاہئے۔ مرد کو عورت پر ہرگز ہرگز عاشق نہیں ہونا چاہئے۔ اگر کوئی مرد کسی عورت پر عاشق ہوتا ہے تو انھیں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔

یہ خواہ مخواہ کے ناصح مفتی بھی، ایک دن ایک صاحبہ انھیں ادارہ فروغ اُردو پر اکیلا پا کر ایک نہایت باناؤنی قسم کا سوال ناول خریدنے آئے تو انھوں نے ہوں ہاں ہی نہ کی۔

وہ صاحبہ قدرے تڑخ کر بولیں۔ ”میں پوچھتی ہوں۔ فلاں ناول ہے؟“

”جیسے تو کہ آپ کو نروںں گا؟“

”کیوں؟“

”وہ ناول بڑا عرابی ہے۔“

وہ بھتا کر بولیں۔ ”یہ تو مجھے بتائیے۔ آپ میرے سرپرست کب سے کہتے ہیں؟“

اس طرح کا ایک واقعہ اور بھی ہے مگر سوال یہ ہے کہ طفیل صاحب کو دوسروں کی ہمنوں کے بارے میں، اپنی ہمنوں کی طرح سمجھنے کا کیا حق ہے؟ اگر حق ہے تو جب جواب ملتا ہے تو پسینے کیوں چھوٹتے ہیں۔

ابھی کوئی ایک برس کی بات ہوگی کہ شامت اعمال اُس دن بھی یہ اکیلے ہی بیٹھے اپنے خیالوں کی دنیا میں گم تھے کہ ایک صاحبہ دندنائی ہوئی آئیں اور ان سے پوچھا ”کمٹواری“ ہے؟

یہ بڑے پریشان ہوئے۔ مگر اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔ صحت اتنا ہی کہہ سکے۔ ”جی!“

”میں پوچھتی ہوں۔“ دختر باکرہ کا اردو ترجمہ ہے؟

”میں فارسی نہیں سمجھتا۔“

”تو کیا اردو بھی نہیں جانتے؟“

”جی نہیں۔“

طفیل صاحب کے اس جواب پر اسلئے تو سماعت نے انھیں سر سے پاؤں تک دیکھا پھر پاؤں سے سر تک اور انہی کے جواب ”جی نہیں“ کو اس انداز سے ٹوٹایا۔ جیسے کہ وہی ہوں۔ چنید کہیں کا۔

طفیل صاحب سوائے اپنی ذات کے ہر بات میں نفاست کا بڑا خیال رکھتے ہیں اور خوب صورت چیزوں پر تو جان بھی دیتے ہیں یقین کیجئے انھیں اس حد تک خوب صورتی تو کیا ہے کہ کچھ نہ پوچھے۔ ہر چیز میں جس دھونڈھٹے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک دن یہ اپنے نہایت ہی بے لکھت دوست سے کہہ رہے تھے۔ ”دیکھو! یاد رہا مئے جگر کو آبیٹھا ہے۔ کتنا خوبصورت ہے۔“

خود ان کی اپنی ذات کا یہ حال ہے کہ اگر نیا کوٹ بھٹ گیا ہے تو بھٹ جاتے۔ پتلون پر جیسے گر گئی ہے تو گر جاتے۔ یہ بیٹے ہوئے کوٹ اور چائے گری پتلون کے ساتھ بھی بہ خوشی نباہ کرتے چلے جاتیں گے۔ پائش کے ساتھ میں ان کے بوٹ عموماً ختم ہی ملے۔ ثانی کے بغیر کوٹ اوڑھتے ہیں اور بازار میں اکیلے جاتے ہوئے ہاتھیں بھی کرتے جاتے ہیں۔ جیسے کوئی پاگل!

ان میں یوں تو بے شمار خوبیاں ہیں۔ مگر ایک انتظامی خوبی ایسی ہے کہ باقی تمام خوبیاں ان کے سامنے بیچ ہیں۔ ان کے خاص خاص دوست جانتے ہیں کہ دعوت کے دن طفیل صاحب کو کھانا نہیں بھیجنا چاہیے۔ چنانچہ انھیں حکم مل جاتا ہے کہ اب ہم کھانے پینے کا سامان ہمانوں کے سامنے رکھنے والے ہیں لہذا بات تو آپ یہاں سے چلے جائیں۔ ۱۰۔ ادھر کا رخ اس وقت کریں۔ جب ہم خارج ہو جائیں۔ آپ نے غصہ کیا ہو گا کہ یہ طفیل صاحب کے دوستوں کی کتنی زیادتی ہے۔ ویسے آپ اس کا فیصلہ ان کے انتظام کے ماتحت جو ایک شادی ہوئی تھی۔ اُس کا ذکر مٹس لینے کے بعد کریں۔

ان کے ایک نہایت ہی عزیز دوست نے انھیں بلایا کہ میری بہن کی شادی ہے اس میں شرکت کر کے میرا ہتھ بٹاؤ۔ چنانچہ یہ پہلے پکڑنے والے کسی اور کے سپرد تھا۔ ان کے ذمہ صرف یہ کام تھا کہ برات کو اپنی نگہانی میں کھانا کھلا دینا اور جب دو لہا گھر میں داخل ہو تو یہ رہا رہنا دینا۔

باجوں کی آواز قریب آنے لگی تو ان کے ہوش اڑنے لگے۔ جوں جوں برات قریب آتی گئی، ان کے کان پیٹنے اور آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ برات صحن میں داخل ہو گئی۔ اب انہیں دو لہا نظر نہیں آتا۔ پہلے کا دیکھا ہوا نہ تھا۔ پڑھا کھا تھا۔ اس بے دو لہا ہن کر بھی آدمی ہی تھا۔ انھوں نے گھبراہٹ میں کسی اور کو دو لہا بھائی کا خطاب دے ڈالا۔

اب کھانا نکل رہا ہے اور ہر شور مچا رہے ہیں۔ پلاؤ کی کتنی دھمکیاں ہیں۔ آٹھ — آٹھ سے کیا بنے گا — یہ حضرت تو پورے شہر کو لے کر اٹکے ہیں۔ شور رہا۔ دو — ڈال دو پانی — دروازے جاؤ گے — اسی آٹنا میں دو ایک پیٹے پلاؤ کی پلیٹ لے کر ان کی ٹانگوں کے بیچ میں سے نکلنا چاہ رہے تھے۔ یہ بوکھلائے ہوئے تو تھے ہی، انھوں نے رکھ کر پڑنا شروع کیا۔ ایک پیٹے کو رسید کیا تو وہ کم بخت پلاؤ پھینک کر زور زور سے رونے لگا۔ اب یہ اُسے منا رہے ہیں۔ بھئی خدا کے لیے چپ ہو جاؤ اور پلاؤ کی ایک چھوڑ دو پیشیں لے جاؤ۔ مگر وہ ایسا سختی سے پکڑ نہ چکا ہوتا تھا۔ اُنّا ٹانا انھیں ایک ترکیب سمجھی بھٹ ایک دو پر چپ سے نکالا۔ پیٹے کی ہتھیلی پر رکھا۔ ساتھ ہی ہاتھ جوڑے، نب کہیں بچہ راضی ہوا۔ اس پر بھی اُس پیٹے نے جا کر اپنی ماں سے کہہ دیا۔ ماں بھی پیٹے کی طرح بڑی مصلیٰ ماس غصہ۔ ایک دم گامیوں پر اُتر آئیں۔ رُنا نے جین کا مایاں مل رہی تھیں۔ مرد انے میں پلاؤ مل رہا تھا۔

جب برات پہلی گئی اور گھر کے لوگ اکٹھے ہو کر بیٹھے تو سب کے سب ان کی باتیں یاد کر کے ہنس رہے تھے اور یہ پریشانی ہو رہے تھے کہ غصہ ہی باتیں ان سے منسوب کی جا رہی ہیں۔ وہ سب کی سب غلط ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ، اپنی انتظامی صلاحیتوں کی پوری سبقت دیکھ کر اُنّندہ کے لیے تو یہ جی کر چکے ہیں کہ اب کسی کی برات آئے یا جنازہ اٹھے۔ پرواہی نہیں کرنی چاہئے۔

ان کے سر سے والد کا سایہ اُس وقت اٹھا۔ جب یہ کچھ بھی کرنے کے قابل نہ تھے (مکمل فردی سال ۱۹۴۲ء) اور والدہ کا سایہ اُس وقت اٹھا (جون ۱۹۴۲ء) جب یہ اس دنیا میں آبرو مندانہ زندگی گزار رہے تھے۔ ان کے خیال کے مطابق، یہ سب کچھ والدہ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ منہل صاحب کا اپنی والدہ کے بارے میں یہ خیال ہے کہ وہ اپنی نیکیوں کی وجہ سے اللہ کی بارگاہ میں، کسی شمار قطار میں عزت و تھیں۔

بیماری سے دودن پہلے کی باتیں آپ بھی سن لیں :-

”بیٹا میری آخری بیماری ہے“

”یہ بھی کوئی بیماری ہے۔ بخار ہی تو ہے“

”ہے تو بخار، مگر چھوٹا ہاتھوں کو، شام کو کتنے نیچے لوٹے؟“

”دیکھیں؟“

میرادل چاہتا ہے کہ تم جلدی سے آ جاؤ۔“

”اگر یہ بات ہے تو میں جانا ہی نہیں۔“

”منہ نہیں، بات کوئی نہیں، مگر آنا جلدی سے، ایک کام ہے۔“

یہ پہلے تو گئے۔ مگر ان کے دل میں کھد بھد ہی لگی رہی کہ والدہ نے جلدی واپس آنے کو کہا ہے۔ ضرور کوئی بات ہے۔ یہ اُس دن تین بجے ہی لوٹ آئے۔ دیکھا تو والدہ کی سانس اکھڑی ہوئی ہے۔ بہت گہرا سانس۔ فوراً ڈاکٹر کو بلا لائے۔ دوائی دی گئی۔ سانس بحال ہو گئی۔ بخار بھی ہلکا ہو گیا۔

دوسرے دن پھر سانس اکھڑ گئی۔ تو یہ پھر ڈاکٹر کو بلانے کے لیے دوڑے۔ مگر ان کی والدہ نے واپس بلایا اور بڑے حوصلے سے کہا: ”بیٹا! تو جو کچھ چاہتا ہے۔ وہ اب پورا نہ ہو گا۔“

ان کی والدہ ایسی باتیں کرتی رہی ہیں۔ مگر یہ ڈاکٹر کو بلا لائے۔ سانس ضرور اکھڑی اکھڑی سی تھی مگر ظاہری حالت بڑی اچھی تھی۔ تین چار دن میں، بخار سے مرعفی کی حالت بھلا خواب ہی کہتی ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر نے دوائی دی۔ سانس پھر بحال ہو گئی۔ بخار بالکل اتر گیا۔ بظاہر سب کی عید ہو گئی۔

طفیل صاحب نے بھی ایلڈ کا شکرا دیا اور والدہ سے کہا: ”بخار بھی اتر گیا۔ سانس بھی ٹھیک سے آئے لگی ہے۔“

اس پر خواب تو کچھ نہ ملا۔ البتہ مسکرائیں ضرور، جیسے کہ وہی ہوں۔ ہلکا کہیں کا۔

یہ اُس دن کہیں بھی نہ گئے۔ سارا دن منہسی خوشی کی باتیں ہوتی رہیں۔ گھر میں دشتہ داروں کا آنا جانا رہا۔ دلی گز گیا۔ رات ہوئی تو کوئی گیارہ بجے والدہ نے، ان سے سو جانے لے لیے اصرار کیا۔

رات کے ایک بجے کے قریب والدہ نے انہیں بلایا۔ یہ بیڑا کراٹھے کے قریب آئے تو والدہ نے سر پر ہاتھ پھر کر کہا: ”بیٹا! میں اس دنیا سے جا رہی ہوں۔ اپنے دونوں بھوٹے بھائیوں کا خیال رکھنا۔ دیکھنا وہ دنیا میں کسی طرح بھی آزدہ نہ ہوں۔ یہ کہہ کر چھاتی سے لگا لیا اور یہ بھوٹ بھوٹ کر رونے لگے۔ اس پر ان کی والدہ کہنے لگیں: ”رو نہ نہیں ابھی مجھے بڑی باتیں کرنی ہیں۔ حوصلے سے کام لو۔“

”حوصلے سے کام کم طرح لوں؟ کیا کروں؟“

یہ تو پھر ڈاکٹر کو بلانے چلے گئے۔ والدہ نے ایک ایک کو پاس ملا کر یہاں کہا۔ دعائیں دیں۔ چھوٹوں کو بھی، بڑوں کو بھی، جب یہ (بیز ڈاکٹر کے) واپس لوٹے تو سب کے سب رو رہے تھے اور والدہ سب کو صبر کی تلقین کر رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں:۔

دیکھو، ٹرنک کھول کر جو صاب سے اچھا جوڑا ہو۔ وہ میرے پیچھے جتنی بھی شادی پر دے دینا۔ میں نے نہ تو کسی کا کچھ دینا ہے اور نہ ہی کچھ لینا ہے۔ میرے کانوں میں جو سونے کے بوندے ہیں وہ ہلانے والی کو دے دینا۔ چاروں جمعراتوں پر تیتھوں کو بلا کر کھانا کھلا دینا۔“

اب صبح ہونے ہی والی تھی۔ یہ پھر ڈاکٹر کی تلاش میں نکلے۔ والدہ کو بہتر چلا تو انہوں نے انہیں کپاس بلایا۔ ڈاکٹر کو لانے سے منع کیا۔ یہ طبی کہا کہ اب کوئی فائدہ نہیں۔ میرے پاس میٹھو۔ مگر یہ نہ مانے۔ ڈاکٹر کو لانے کے لیے چل ہی دیئے۔

ڈاکٹر کوئے کر جب یہ واپس آئے تو ان کی والدہ ان کی ممانی اور بیگم سے کہہ رہی تھیں کہ مجھے ننلا دو۔ وہ چپ تھیں۔ کیا کرتیں۔ ایک دن پہلے تک تو بخار تھا۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ بھلا یا جائے۔ ڈاکٹر کویکھ کر اور دوائی دے کر چلا گیا۔ یہ بھی کہہ گیا۔ کوئی خطرے والی بات نہیں ہے۔ آپ لوگ ملا وجہ گھبراہٹ ہے۔

جب بیگم اور ممانی ننلا نے پر راضی نہ ہوئیں تو والدہ نے پھر ان کی طرف دیکھا اور اصرار کیا ”ان سے کہو۔ مجھے ننلا دیں۔ پرنہ نہیں یہ کیا سوچ رہی ہیں مگر مجھے سب کچھ نظر آ رہا ہے۔“

میں بھی جُپ ہو گیا۔ ماموں صاحب بھی جُپ ہو گئے۔ ممانی بھی جُپ ہو گئیں۔ میرے، شارسے پر بیگم نے اٹھ کر بانی گرم کیا۔ جب پانی گرم ہو گیا تو والدہ خود چارپائی سے اٹھیں۔ بیگم اور ممانی نے سہارا مزدور دیا۔ گردہ ٹھٹھانے میں جا کر خود اپنے ہاتھوں سے صابن مل کر نہائیں۔ نہانے کے بعد، پیدل چلی کر واپس آئیں اور بیگم سے کہا ”میرے بالوں میں خوشبودار تیل لگا کر لکھی کر دو۔“ جب یہ سارے کام ہو گئے تو بچی سی آواز میں ہوں ہوں کرنے لگیں۔

طفیل صاحب نے پوچھا ”اماں کیا بات ہے؟“

”بیٹا تیرا امیرا یہ رشتہ ختم ہو چکا ہے۔ اب تو میں پرایا مال ہوں۔“

اس کے بعد ایک منٹ خاموش رہیں۔ پھر اونچی آواز سے پڑھا ”لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔“ اس کے بعد وہ پھر کچھ نہ بولیں۔ حالانکہ سب بلا تے ہی رہے۔

موت اور اس کا اتنا خندہ بے نیازی سے استقبال، ہر کسی کے لب کی بات نہیں۔ والدہ کے انتقال سے، طفیل صاحب بچھ کے رہ گئے ہیں۔ کسی کام میں ان کا دل نہیں لگتا۔ ہر وقت کچھ سوچتے رہتے ہیں۔ شاید یہی سوچتے ہوں کہ دنیا کے یہ سارے کچھ میرے کتنے عارضی اور کتنے بے حقیقت ہیں۔

اگر آپ کی ان سے بے تکلفی ہے تو یہ کافی حد تک متکلف نہ ثابت ہوں گے۔ تکلف کے تعلقات ہیں تو یہ آپ کو اتنا بور کر دیں گے کہ آپ پریشان ہو جائیں گے اور سوچیں گے الٹی کس بدھو سے واسطہ پڑا ہے جس کے نہ منہ میں زبان ہے۔ نہ دماغ میں بھیجہ، حالانکہ حسب ضرورت ہیں دونوں چیزیں۔ اگر مخاطب بھی کوئی اور ہے تکلف نہ ہو تو پھر لطیف ہی آجائے گا۔ مجاز لکھنوی اور طفیل لاہوری کے مابین، ایک بار بڑے مزے کی باتیں ہوئی تھیں اور یہ گفتگو کوئی پون گھنٹہ کے عرصہ میں ہوئی ہوگی۔ آپ پیسے بھی شاید ایک بار چڑھ چکے ہوں۔ ایک بار اور سہی! ابنو! طفیل صاحب کرتے ہیں :

”خیریت؟“

”جی ہاں!“

”جُپ جُپ کیوں ہیں؟“

”جو بھی۔“

”کافی دیر سکوت کے بعد۔“ ”ابھی تو آپ کچھ دن رہیں گے؟“

”جی ہاں!“

”آپ بولنے کیوں نہیں۔ کیا بات ہے؟“

”یونہی“

”اچھا“

”جی ہاں“

(غیر کافی دیر سکوت کے بعد) ”لکھنؤ دیکھا؟“

”کچھ کچھ“

”کافی کیسی ہے؟“

”مکڑ دی“

”شہر ت مسکو اول؟“

”یسلم اللہ!“

”اچھا یہ بتائیے۔ اس رفتار سے آپ ولانتاس تک کب پہنچیں گے؟“

انہیں اپنے بارے میں یہ بڑی غلط فہمی ہے کہ میں ہر وہ کام کر سکتا ہوں۔ جو کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ اسی غلط فہمی نے انہیں

مدیر نقوش بنادیا تھا۔ ورنہ یہ اور نقوش کی ادارت! ہمنہ!!

یہ غلط فہمی انہیں یوں بھی ہوئی کہ تقریباً تمام مشاعروں اور ادیبوں سے، ان کے ذاتی اور اچھے مراسم تھے۔ ان میں سے کوئی دوست تھا تو کوئی بھائی، ان کے مدیر ہونے کے فوراً بعد، بھائی دوست بن گئے اور دوست دشمن، الحمد للہ کہ آج نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ان کا کوئی دوست ہی نہیں۔ سب اپنے اپنے دلوں میں بھرے بیٹھے ہیں۔

اس میں ان کے دوستوں کا کوئی قصور نہیں۔ اول تو انہیں مدیر ہی نہیں بننا چاہیئے تھا۔ اگر میں بیٹھے تھے تو انہیں دوستانہ حنفی کا احترام کرنا چاہیئے تھا۔ مثال کے طور پر، ان کا کوئی دوست، میل دو میل سے چل کر آتا ہے اور یہ میں میر کی دھن میں غرق، دوت پوچھتا ہے بد فطیل صاحب خیریت ہے؟

دیار کشی چند رنے افسانہ نہیں بھیا۔“

”اوہو!“

”جی ہاں!“

”دیکھائی اور بیٹے تو اچھے ہیں؟“

”امید ہے کل تک ضرور رہا ہے گا۔ مجھے کہ شہن نے خط لکھا تھا۔ افسانہ لکھ لیا ہے۔ صاف کر کے دودھ زنگ میچ دیں گا۔“

”بھائی! میں پوچھ رہا ہوں۔ بھائی اور بچے تو ٹھیک ہیں؟“

”معاف کرنا چاہی! مجھے ان کا کچھ بڑ نہیں۔ ایک ہفتہ سے گھر بارہ بکے پہلے نہیں جاسکا۔ صبح سزا اندھیرے اٹھ کے چلا آنا ہوں تاکہ پرچہ جلد آجائے۔ ہاں بھنگ بڑی ضرور ہے کہ جاوید کو بخار آ رہا ہے۔“

”اڑ ہو کسی ڈاکٹر کو دکھایا؟“

”پرچہ چھپ جائے تو کسی ڈاکٹر کو دکھاؤں۔“ پھر اکیدم کاتب صاحب سے مخاطب ہو کر، ”بھئی کو ثابت کنی ختم ہوئی؟“

وہ دوست، جو بیچارہ مارے خلوص کے چل کے آیا تھا۔ وہ ان کے پاس آکر ان کے نفوس خریا سے پریشان ہو جاتا ہے۔ پندرہ میں منٹ تک وہ خاموش بیٹھا رہتا ہے۔ سوچتے شاید یہ اب بھی آدمی کے جامد میں آجائیں اور کوئی ڈھنگ سے بات کریں۔ یہ اپنی دھن میں مست، اندر ہی کی ”تجربہ نگار“ کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں۔ بالآخر خلوص کی زد میں آیا ہوا دوست، ان کی یہ حالت دیکھ کر، جانے کیلئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ تب یہ چونکتے ہیں اور پیار بھری مسکراہٹ کے ساتھ، اُس کا بازو پکڑ کر کہتے ہیں: ”یار چائے تو پی لو؟“

”میں اتنی دور سے آپ کے پاس صوف چائے پینے آیا تھا؟“

تب انھیں اپنی نالائق، مردم بیزاری اور دوست کشی کا احساس ہوتا ہے۔ دوست سے معافی مانگتے ہیں۔ اسے باہر تک چھوڑنے جاتے ہیں۔ مگر وہ جو دوست کے خلوص کو نہیں لگتی ہے۔ اُس کا ان کے پاس کوئی ملاوٹ نہیں ہوتا۔ دوستوں کو ناراض کیا۔ بھائی مروٹا دوستی تک بھی آئے بغرض اتنے انہماک کے بعد انھوں نے جو مزہ مزہ کئے۔ ان کے بارے میں لکھو سے ایک خط آتا ہے:-

آپ نے شخصیات مزہ میرا میرے فیو سے کوشاں کیا ہے۔ مگر مجھ پر مضمون نہ چاہا۔

اب آپ سے کون دوستی رکھے۔“

ایک اور خط بھی آتا ہے:

”آپ بھی عجیب چیز ثابت ہوئے۔ افسانہ مزہ میں، جو آپ نے میرا افسانہ لیا ہے۔ وہ میرا سب سے گھٹیا افسانہ تھا۔ آخر آپ نے مجھ سے کس دفتر کا انتقام لیا ہے؟“

کراچی سے ایک شاعر نے زبانی یہ پیغام بھیجا:-

”آپ نے ناول مزہ میں فیض کی تو چھ غزلیں بھیجی ہیں اور میری صرت ایک، کیا میں فیض سے گھٹیا شاعر ہوں۔ اگر آپ کو شاعری کی الف بے کا پتہ نہیں تو کسی سے پوچھ لیا جاتا۔“

لاہور داسے پہلے ہی مجھ سے بیٹھے تھے۔ وہ شخصیات مزہ میں بھی نہیں آئے تھے۔ افسانہ بھی اُن کا گھٹیا شامل ہو گیا تھا۔ ناول مزہ میں بھی کسی کی ایک غزل آتی تھی اور کسی کی نہیں آتی تھی۔ چنانچہ ”پنوں نے جانے کی میز پر بیٹھ کر یہ پروگرام بنایا کہ ہم سب نفوس کے دستہ چیلے ہیں۔ ایک نے کہا میں فیض کا گریبان پہنوں گا۔ دوسرے نے کہا میں گھوندرہ ماروں گا۔ تیسرے نے کہا میں ”مصلحتاً بیچ“ جاؤں گا۔ مگر تم اپنا کام کرتے جانا۔

خیر یہاں تک تو نینیت تھا۔ کوئی انھیں کالی دے دے تو دے دے۔ کوئی فیض مار کر خوش ہوئے تو ہوئے۔ مگر ایک دن ایسا ہوا کہ لاہور سے کراچی جاتے ہوئے اخبار نویسوں نے یہ پروگرام بنایا کہ داسی پر میری نفوس کی خبر لی جائے۔ بنیاد سجاد ظہیر کے

جس نقاد نے تمام مغربی نقادوں کو پڑھا ہو (اور اتفاق سے اپنے ہاں کے تنقیدی سرمایہ سے استفادہ نہ کیا ہو) اور ان کے حوالے پر حوالے دے کر مضمون کو بھاری بہر کم بنادیا ہو۔ وہ مضمون بھی اگر نقوش میں نہ چپے تو پھر آپ ہی بتائیں مدیر نقوش کی حقل کا نام کیا جائے یا نہ کیا جائے۔

اس ضمن میں ایک دلچسپ لطیفہ بھی ہے :-

ایک نقاد نے (اب ان کا نام کیا لوں) انہیں ایک مضمون بھیجا۔ اچھے خاصے بڑے نام والے نقاد تھے جب وہ مضمون پڑھا تو انہیں نہ چھا۔ جناب نقاد کو بڑے احترام کے ساتھ لکھ دیا کہ یہ مضمون نقوش میں نہ چھپ سکے گا اور اس میں غلاں غلغلہ نقص ہیں۔ وہ صاحب بڑے پرہم ہوئے۔ پہلے تو وہ نقوش اور مدیر نقوش کی تعریفیں کرتے تھا ذکر کرتے تھے۔ پھر یکدم معصوم قسم کی گامیوں پر آئے۔ مثلاً نا لائق اور بدترین قسم کے الفاظ بے دریغ استعمال کر ڈالے۔

اللہ کی شان ملاحظہ ہو۔ بعد میں وہ مضمون ”لگا“ جیسے بڑے پرہم میں چھپ گیا۔ تب تو وہ صاحب اور چڑھے۔ ایک اور خط لکھا جس میں مردہ سنایا گیا تھا کہ وہ مضمون نیاز فقیری جیسے علامہ نے تو پسند فرمایا ہے۔ مگر جناب جیسے ”پڑھے تھے“ نے واپس کر دیا تھا۔ یہ واقعہ اپنی جگہ ضرور صحیح ہے۔ مگر فیصل صاحب آج بھی دیا منڈاری کے ساتھ یہ خیال ہے کہ کیا صاحب لاکھ علامہ سی میرے ذہنی گرو سہی، لگا، اُدو کا عظیم الشان پرہم سی۔ مگر وہ مضمون نقوش میں چھپنے کے قابل نہ تھا۔

انہیں اپنے رسالے اور اس کے کام سے اتنا مشتق ہے کہ کیا کسی عاشق کو اپنے محبوب سے ہو گا۔ بلا مبالغہ انہوں نے اپنے ایک ایک لبر پر انہی اتنی محنت کی ہے کہ ان کی جان پر ہی آئی ہے۔ آپ باور کریں یا نہ کریں۔ جن دنوں کوئی خاص تہیز و ترتیب ہوتا ہے تو ان کا دس بارہ پونڈ وزن کم ہو جاتا ہے۔ نہ وقت پر کھانا کھانا۔ نہ سونا، دن رات کام۔ صبح کے جتنے جتنے اگر رات کے بارہ ایک یا دو تین بج گئے ہیں تو بھی انہیں کچھ پروا نہیں۔ بلکہ گن ہیں۔ مرت ہیں۔

ایک بار یہ ہوا کہ یہ اپنے دفتر سے رات کے بارہ بجے لوٹے۔ جگم سے کہنا۔ کھانا لاؤ۔ وہ بیچارے انہیں ملتی ہوئی اٹھی۔ کھانا گرم کر کے لائی۔ دیکھا تو یہ پھر نقوش کے مشتق میں غرق، کاپیاں پڑھ رہے ہیں۔

بلکہ نہ، شہر کو اپنے سہاگ کا واسطہ دے کہ کہا ”خدا کے بیٹے کو نام کو بند کر دیجئے۔ بہت ہو چکی۔ اب کھانا کھا لیجئے۔ کیوں اپنی جان کے نیچے پڑے ہوئے ہیں؟“

یہ اُسے منت سماجت سے کہتے ہیں ”خدا کے بیٹے چپ دیو۔ لوگوں کو نہ جگاؤ۔ میرے مزید ڈالنے کا ڈر نہ کھانا بھی ہو جائے اور کام بھی، بون کھانا کھایا۔ رات کے تین بجے سوئے۔ مگر بیک کو سختی کے ساتھ ہدایت کر دی۔ صبح سات بجے جگا دینا۔

بیکم کے لیے حکم کی تعمیل ضرور تھی۔ اُس نے سات بجے جگا دیا۔ اب ان سے اٹھا نہیں جاتا۔ انہیں نہیں کھلتیں۔ ایک دن کی جگانی ہوئی تو یہ نوبت نہ آئی۔ یہاں تو روز کا نفعہ تھا۔ بیکم برسی اور طنز سے کمٹی ہیں۔ اب اٹھنے کیوں نہیں۔ رسالہ لیٹ ہوا جا رہا ہے۔“ یہ کہتے ہیں ”اٹھنا تو چاہتا ہوں مگر انہیں نہیں کھلتیں“

پھر طفیل صاحب پیکار کے بیکم سے کہتے ہیں ”میرے قریب آؤ۔ میرے بچوں کو زور سے اُدھو۔ تاکہ میری آنکھیں

کھلیں اور بس اٹھ سکیں۔

مگر سب کوئی صاحب اسے زیب و آستان ہی سمجھیں۔ مگر یہ بے دفاعہ اب یوں کبھی نہیں بٹتا۔ بلکہ اب تو ان کی زندگی یونہی گزر رہی ہے۔ یونہی گزر جائے گی۔ زندگی کی لطافتیں اور مسرتیں انہیں براؤز بلند پکارتی رہتی ہیں۔ مگر یہ ان سب سے بے نیا ہو چکے ہیں۔ جیسے بالکل مردہ ہوں۔

قیافہ شناسی میں بھی یہ بڑے ماہر ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میں صورت دیکھ کر، ہر کسی کے کیریکٹر کے بارے میں بتا سکتا ہوں۔ ایک بار یہ اور ان کے ایک اخبار نویس دوست، نانگے پر سوار، غلہ دیکھنے جا رہے تھے۔ معاً ایک نانگہ پاس سے گزرا۔ اُس میں نقاب اُٹے، ایک لڑکی چھٹی مٹی چاندنی صورت، اُس پر بھی میک اپ، ان کے اخبار نویس دوست نے، اُسے دیکھتے ہی اسیوں ہٹو کا دیا۔

یہ بھی متوجہ ہوئے اور فتویٰ دے دیا۔ ”یہ لڑکی آوارہ ہے۔“

”ارے نہیں؟“

”مشرط لگاؤ۔“

”جو کبر۔“

اب ان کے لیے، یہ ثابت کرنا کہ یہ لڑکی آوارہ ہے بڑا دشوار تھا۔ آج کل آوارہ دیکھنا کہاں آوارہ دیکھتی ہیں۔ بدھران کے دوست کا فیصلہ یہ تھا کہ یہ لڑکی قطعاً آوارہ نہیں ہے۔ اب یہ کرتے تو کیا کرتے۔

انہوں نے تاکنے والے سے کہنا ”میں ان کو چوان، ذرا اپنے ٹھوڑے کو دوڑاؤ اور اُس نانگے کے برابر برابر چلو۔“

کوچوان نے ان کی طرف بڑی معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ مگر زبان سے یہ کہا۔ بہت اچھا سرکار۔“

اب ان کا نانگہ، اس نانگے کے برابر برابر چل رہا ہے۔ لڑکی نے بھی اس بات کو تاثر کیا۔ انہوں نے اس سے پہلے، کبھی کسی

لڑکی کو آوارہ ثابت نہیں کیا تھا۔ اس لیے پیسے چھوٹ رہے تھے۔ اپنی بات کو سچا ثابت کرنے کے لیے، انہوں نے لڑکی کی طرف، تین چار منٹ ٹھٹکی باز دیکھا۔

لڑکی نے بھی پہلو بدلا اور اپنی ران سے ہاتھ اٹھا کر بڑے مہذب انداز میں سلام کیا۔

اب تو ان کی باپوں کھل گئیں۔ دوست کے چکی لی اور اسے نظروں ہی نظروں میں سمجھایا۔ دیکھا پچھم نہ کہنے لگے۔

نانگہ بیکوڑ روڑ پر پہنچ گیا جہاں کا نانگے والے سے مل کر کے آئے تھے۔ نانگے والے نے، ان کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اسے کہا۔ ”نکدہ کرو نانگہ، دھرتے چلو۔ جدھر وہ نانگہ جا رہا ہے۔ منہ مانگے دام ملیں گے۔“

”بہت اچھا سرکار، پر یہ کام بڑا پیڑھا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میں بھی ٹھکانے کی ہوا کھاؤں۔“

”بھٹی جو خدا کو منظور!“

”خدا کو کیا منظور ہو گا۔ اس قصے کو چھوڑیے۔ وہ تو بے ہی بد معاش، دیکھا ابھی سلام کر رہی تھی۔“

کوچوان کے ان دیبا کس پر انہوں نے اپنے دوست کی طرف اس طرح دیکھا۔ جیسے انہوں نے مونٹ ایورسٹ فتح کر لی ہو۔

یہ باتیں جوتی ہیں، مگر ان کا تاثر اس تانگے کے ساتھ جیتا رہا۔ یہ دل میں سوچتے بھی تھے کہ ہٹاؤ اس قصے کو، آخر کیا فائدہ، مگر زبان نے دل کا ساتھ نہ دیا۔ تانگے برابر چلتے رہے۔ وہ لڑکی بھی ٹکٹھی لگائے دیکھتی رہی اور یہ بھی، کبھی وہ اپنے پریشان بالوں کو سمجھاتی، کبھی یہ مسکراتے، کبھی وہ دھاسی تن کے بیٹھ جاتی، کبھی یہ ہاتھ سے بالوں کو سنوارتے، کبھی وہ مسکراتی، کبھی یہ ہم جاتے بغرض انہی بوجھبوجھوں میں، اُس کا تانگہ ایک جگہ رک گیا اور ان کے دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہو گئی۔

کوچوان نے پوچھا۔ ”رودوں با بوجھی تانگے کو؟“

”نہیں“

”پھر“

”سر پٹ دوڑاؤ“

گھوڑا سر پٹ دوڑتا رہا۔ مگر یہ اس بات کا فیصلہ نہ کر سکے کہ گھوڑا تیز دوڑ رہا تھا یا یہ۔

کھیلوں میں بھی یہ کئی بازیوں سے مدد و مدد گچی لیتے ہیں۔ اتنی دلچسپی کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ کیرم بورڈ اور تاش میں اتنے گم نہیں ہیں۔ جتنے ٹینگ بازی اور کرکٹ میں۔

کوئی پندرہ سال بعد پچھلے برس انھیں ٹینگ بازی کا پھر سے ابال آیا۔ گھر میں اعلان کر دیا۔ اب کے بسنت پر ٹینگیں بڑھیں گے، بڑے سب حیران، بونہی ہانک دی ہے۔ اب اس عمر میں بچوں والا شغف کیا اختیار کر سگے۔ مگر بسنت سے ایک دن پہلے چھ ”گوٹوں کے دوپٹے“ منگوائے گئے۔ درجنوں بھوٹی بڑی ٹینگیں ساتھ آئیں۔ رات بھر کتے نہ اندھن رہے۔ جس وقت موذن نے اذان دی۔ انھوں نے منڈیر پر چڑھ کے دیکھا، تو اس وقت کوئی بھی جیالا ٹینگ بڑھائے ہوئے نہ تھا۔ خاصہ اندھیرا تھا۔ ٹینگ بڑھے تو کیسے بڑھے۔ البتہ کہیں کہیں جھتوں پر، ایک ایک دو دوسن چلے، کھڑے محسوس تو ہوئے۔ مگر نظر نہ آئے۔

فقوڑی دیر بعد انھوں نے ”وہ کاٹا“ کا زور دار نعرہ لگایا اور اپنی ٹینگ بڑھادی۔ اوروں کے بھی غوصلے بڑھے۔ انھوں نے بھی جو باؤ وہ کاٹا کا نعرہ لگایا۔ پھر کیا تھا آناٹا حرکت پیدا کر لیے۔

قسمت کے دھنی یہ ہمیشہ سے رہے ہیں۔ ہوا بھی خوب تیز تھی۔ انھوں نے جس سے پیچ لڑایا۔ کاٹا، جب حرفوں کو دیکھا کہ یہ تو صفا بکا کر رہے ہیں تو تین تین چار چار اکٹھے ٹکڑے آدھارے۔ اس میں بھی زیادہ تر میدان انہی کے ہاتھ رہا۔ اُس پاس کے محلوں میں دھاک مچ گئی۔ بفضل خدا اب اپنے علاقہ میں، دوسرے سال سے، ٹینگ بازی میں جیتیں چلے آ رہے ہیں۔

انھیں بے پیچ لڑا نہیں ہوا۔ ”کچھ کچھ“ کو یہ قطعاً پسند نہیں کرتے۔ سکتے ہیں دشمن کو اپنے جوہر دکھانے کے پورے موقعے دینا چاہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات ان کے اتنے بے پیچ جاتے تھے کہ ٹینگ نظری نہیں آتی تھی۔ لڑو کے برابر نظری آتی تو کیا۔

ایک بے پیچ میں، ان کے ہاتھ ڈور کی مسلسل رگڑ سے لہو لہان ہو گئے۔ سچی کہنے رہے کہ ٹینگ میں دسے جیسے ہاتھوں سے خون ٹپک رہا ہے۔ مگر انھوں نے ایک دشمن۔ برابر اُت اُت سی کرتے ڈور دیتے رہے۔ کوئی آدھ پون گھنٹہ کی حد دھمکے بعد

جب انھوں نے بیچ کا ٹامبا، تب انھوں نے پتنگ اپنے چھوٹے بھائی کے حوالے کی۔ بڑھی ہوئی پتنگ کو جب انا راجا ہاتھ توڑ دے ان کے خون سے نہائی ہوئی تھی۔

لوگن کا بھی شوق، انھیں بڑا لگا ہے۔ لاہور سے باہر بیچ پورے ہوں تو یہ اپنے دفتر ہی میں ریڈیو سے جا میں گئے۔ جب تک بیچ ہوتا رہے گا۔ براہ کرم شری سننے رہیں گے۔ ہزاروں کام ہوں۔ کچھ نہیں کریں گے۔ کوئی شے دلا بھی آئے تو بات ہی نہیں کریں گے۔ باتیں ہوں گی بھی تو کرکٹ ہی کے بارے میں۔

بسمی قابل ذکر بیچ انھوں نے یا تو دیکھے ہوں گے یا سنے ہوں گے۔ ابھی پاکستان میں آسٹریلیا کے بیچ ہوئے ہیں۔ یہ ریڈیو سے ایک منٹ کے لیے بھی نہ بیٹے۔ کوئی اچھی ہمت لگائے تو یہ خوش ہوتے تھے۔ کوئی اچھا لگند پھینکے تو یہ خوش ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ سیریاں بھی بجاتے تھے۔ ناپتنے سے، انھیں ان کی پوزیشن روکتی تھی۔ وہ نہ یہ بیچ راہس کے لیے بھی تھے۔

یوں بھی ہوا ہے کہ کوٹھڑی سنتے سنتے ایدم بے حد خوش ہو گئے۔ زور زور سے سیٹیاں بجانے لگ گئے۔ پوری قوت سے نالیاں پیٹنے لگے۔ پھر نوکر کو آواز دی، جلدی سے پانچ روپے کے لٹولا — دھیر پوچھی گئی تو بتایا بارہوے آڈٹ ہو گیا ہے۔

ان کی صحت یوں تو کبھی زیادہ ابھی نہیں رہی۔ جھوٹے نمٹے میسوں عارضے لاحق رہے۔ مگر یہ انا بط قسم کے بیمار بہت ہی کم کھٹے۔ گو صاحب ایک بار چمٹے، خوب ہوئے۔ مزا آگیا۔ یہ تھوڑے شہزاد کا ہے کہ بیٹھے بھٹائے بیمار ہو گئے۔ سو کے سٹے طبیعت ٹھیک پائی۔ چیل ددی کو نکلے۔ گھر تک واپس پہنچ مشکل ہو گیا۔ بیٹے تو پھر لیٹ ہی گئے۔

بہتر سے دوا دارو اور ٹوٹے ٹوٹے ہوئے۔ مگر صحت نہ سنبھلی۔ گزرتی ہی گئی۔ سہارا دواؤں سے دعاؤں تک پہنچا۔ مگر دونوں ہی علاج بیکار ثابت ہوئے۔ ڈاکٹروں اور حکیموں نے بھی جواب دے دیا۔ جب یہ خوشخبری عام ہوئی کہ جناب علیل اب ایک دو دن کے صحت یاب ہیں تو ان کے قریبی دوست آخری دیدار کو آکر پہنچے۔

”ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں۔ اب آپ سہلہ اچھے ہو جائیں گے۔“

”اب آپ کی صحت پہلے سے بہتر ہے۔“

”بخار ہلکا ہو گیا ہے۔“

”انشاء اللہ کل تک ٹھیک ہو جاؤ گے۔“

طفیل صاحب یہ ساری باتیں سنتے رہے۔ بولے تک کی ہمت نہ تھی۔ نقابست انہی تھی کہ اگر منہ پر کبھی جھپٹ جاتی تھی تو ہاتھ اٹھا کر اُسے ہٹانے تک کی ہمت نہ تھی۔ بس ہڈیوں کا ایک بجھ تھا۔ جو چار پائی پر بار تھا۔ یہ اپنے دوستوں کو ان کی باتوں کا جواب دینا چاہتے تھے۔ مگر زبان ساقدانہ نہ تھی۔ اپنی اس حد تک معذوری پر ان کے افسوس نکل آئے۔ دوستوں نے افسوس پوچھے تو انھوں نے سناٹی نہ دینے والی آواز میں دوستوں کی باتوں کا جو جواب دیا یہ تھا:۔

”ڈاکٹروں نے آپ سے جو کچھ کہا ہے۔ وہ یہ نہیں ہے۔ جو آپ حضرات کہہ رہے ہیں۔ ڈاکٹروں کا فیصلہ مجھے بھی معلوم ہے۔ مگر میں

خود صحت یاب ہوں گا۔ آج نہیں تو کل، میرا بھی فیصلہ ڈاکٹروں کو سنا دینا۔

غیر معمولی قوتِ ارادی کے بل بوتے پر، یہ موت کے منہ سے بھی نکل آئے۔ قوتِ ارادی کے استحکام ہی نے انھیں زندگی میں اُبروند بنایا ہے۔ ان کے پاس اگر کوئی دولت ہے تو یہی۔ اگر انھیں اپنی کسی حرکت پر ناز ہے تو اسی پر۔

جب موت ان کے سامنے ناچ رہی تھی۔ تو یہ خدا سے من ہی میں جوتاہیں کرتے تھے۔ وہ کچھ اس قسم کی تھیں:۔
 ”اے اللہ میں تجھ سے درگزر کی، تمنا کرتا ہوں۔ اس لیے نہیں کہ مجھے زندگی عزیز ہے۔ بلکہ اس لیے کہ میری انگلیوں اور آرزوؤں کا ٹھکان ہوا جا رہا ہے۔ میں اس دنیا میں اکر کیڑوں مکوڑوں کی سی زندگی گزارنا نہیں چاہتا تھا۔ تو مجھے اتنی ہمت دے کہ میں اپنے ارمانوں کو پورا کر سکوں۔ میں اپنے لیے نہیں۔ دوسروں کے لیے زندگی چاہتا ہوں۔ میری موت آج نہیں تو کل واقع ہو جائے گی۔ مگر تو مجھے اُن دونوں اور ادا دلوں کی تکمیل کے لیے زندہ رکھ۔ جنھوں نے میرے ذہن سے نکل کر ابھی تک زندگی کی ایک ساعت بھی نہیں گزاری۔“

کئی دنوں کی بات ہے کہ یو۔ پی کے ایک صاحب اُن کے پاس آئے۔ انھوں نے انھیں بھی یو۔ پی کا سچو لیا اور لگے پتھا ہوں کی بُرائیاں کرنے، پنجابی یہ ہوتے ہیں۔ پنجابی وہ ہوتے ہیں۔ میری تو قیوں میں رکاوٹ پیدا کر دی۔ مجھے تنگ کرتے ہیں۔ مجھے ستاتے ہیں۔ یہ پتکے سستے ہیں۔ جب انھوں نے کہا۔ پنجابی بڑے حرام زادے ہوتے ہیں تو انھوں نے اپنے نوکر سے کہا۔ ”صاحب کے لیے چائے لاؤ۔“ چائے کا مٹن کر یو۔ پی دے اسے صاحب سمجھے ہوں گے۔ یہ بھی پنجابیوں کے ہاتھوں ستا ہوا ہے۔ وہ اور چڑھے۔ پھر تو وہ ماں بہن کی گالیوں تک آگئے۔ طفیل صاحب نے دوسرے نوکر سے کہا۔ ”صاحب کے لیے سٹھائی کا بھی انتظام کرو۔“ چائے آئی۔ سٹھائی آئی۔ دونوں نے خوب کھائی اور پی۔ پستے بھی رہے۔ پیار سے باتیں بھی کرتے رہے۔ جب وہ صاحب جانے لگے تو انھوں نے ان سے پوچھا۔ ”آپ کہاں کے رہتے دے ہیں؟“

”یہ پوچھ کر کیا سمجھے گا۔“

”میں نہیں بتائیے۔“

”صاحب نے دیکھ لیا۔“

”آپ کو میری قسم!“

”میں پنجابی ہوں۔“

یہ شکل و صورت کے اعتبار سے ہیں لونڈے سے ہیں۔ بدیر نقوش ہونے کا مطلب تو یہ تھا۔ اپنی نذیر احمد جیسا کہ پہنا کہتے۔ سر سید ایسی واڑھی ہوئی۔ ابوالکلام جیسا رعب و ودید ہو تا۔ برعکس اس کے یہ سید سے سادے آدمی کا بچہ ہیں۔ نہ رعب نہ بچہ، ان کی شکل و صورت سے زیادہ ان کے نام کا اثر ہے۔ ایک لطیفہ آپ بھی سُن لیں :-

ان کے چہرے مٹے کام تعارفی رعبوں سے ہو جایا کرتے ہیں جو کام ہوا۔ جس سے ہوا۔ تعارف ہو یا نہ ہو۔ لکھ کر کہہ دیا۔ ہو گیا۔ لوگ عزت کرتے ہیں۔ لحاظ کرتے ہیں۔

ایک دفعہ یہ اپنے ایک کام کے لیے، خود ایک دفتر میں جا نکلے۔ جتن اٹھا کر صاحب سے ملے اور بغیر تعارف کے ملے۔ وہ نہایت

”کھائی سے پیش آئے۔ یہ اپنا تعارف ہی نہیں کر پائے تھے کہ وہ صاحب بر سے کیا بات ہے؟“

”جی اچھے آپ سے ایک کام ہے؟“

”کیا کام ہے؟“

”جی وہ ذرا —————“

”آپ لوگ خواہ مخواہ وقت ضائع کرتے ہیں۔ اس کام کے لیے، میرے ہینڈ کلرک سے ملنے۔ یہ ہینڈ کلرک سے ملنے میرے اسٹنٹ سے ملے۔ سیدھا منہ اٹھاتے ہیں اور میرے پاس چلے گئے ہیں۔ پتہ چلا کہ ان صاحب کو کس نے اندر آنے دیا؟“

”جی غلط ہو گئی“

”خبردار جو آئندہ کوئی بروں اندر آیا۔“

”بہتر جناب!“

”ڈرامے کا یہ سمن ان کے سامنے اتنی تیزی سے گزرا کہ یہ سنٹ پٹا گئے۔ گردن ہلکائے اپنے دفتر پہنچے ٹیلیفون اٹھا کر انہی صاحب سے بات کی۔“

”میں نقوش کے دفتر سے طفیل بول رہا ہوں۔“

”کیسے حضور مزاج تو اچھے ہیں؟“

”جی ہاں اللہ کا شکر ہے۔“

”فرمائیے آج کیسے بھول گئے۔ مدت کے بعد یاد فرمایا۔ کوئی میرے لائن خدمت؟“

”یہ ایک ذرا سا کام ہے۔“

”آپ اپنے ہینڈ کراس کو چٹ دے کر بیچ دیں۔ ابھی بوجھ جائے گا۔“

”بہت اچھا چیز اسی کو بیچ رہا ہوں۔“

”دیکھئے کبھی ملاقات کی بھی کوئی صورت نکالنی چاہئے۔“

”جی!“

”میں کہتا ہوں۔ کبھی دفتر آئیے نا!“

”ہاں! ————— اچھا ————— اچھا! —————“

ان کی زندگی کے ایک دو خوش کن واقعات یہ ہیں جنہیں آج بھی خوشی ہوتی ہے۔

ابھی یہ اپنے کاروبار کی ابتدائی سیڑج پر تھے۔ چند عرصے میں ان کے لیے بہت بڑی نعمت تھی۔ ان دنوں انہوں نے ایک

وکان سے آرٹ پیپر کا ایک ریم خریدیا۔ ایک مزدور کے سر پر اٹھایا۔ دو آنے کی اجرت مقرر ہوئی۔ بارش کی وجہ سے بازار کچھ بڑے

لن پت تھا۔ آرٹ پیپر بڑا پھسلواں ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ مزدور سے بار بار کہتے تھے۔ دیکھو جی احتیاط سے چلو۔ کاغذ کو مڑھو

سے پرٹو۔ لڑ گیا تو پچاس روپے کا ریم تباہ ہو جائے گا۔ یہ فقرہ انھوں نے ایک بار نہیں۔ تین بار بار دہرایا۔ کرنا خدا کا یہ ہوا کہ وہ ریم سرسے پھسل کر زمین پر گر ہی گیا اور کچھ عرصہ میں مٹا گیا۔ مزدور کا پنے لگا۔ یہ چپ رہے۔ مزدور نے کاغذ سمیٹا۔ ساتھ چل دیا۔ دفتر پہنچ کر اس نے کاغذ ایک کونے میں رکھ دیا اور خاموش ہو کر کھڑا ہو گیا۔

انھوں نے جب سے چار اکٹیاں نکالیں اور مزدور کے ہاتھ پر رکھ دیں۔

مزدور شرمندہ ہو کر بولا۔ ”آپ سے دو آنے ملے ہوئے تھے۔“

دو آنے اس صورت میں تھے۔ جب تم کاغذ کو صحیح سالم لے آتے۔

”جی ہاں۔“

”اب تم جتنی کے قصدا رہو۔“

ابھی پانچ چھ ماہ کی بات ہے کہ یہ سائیکل پر سوار صبح سویرے ہی والدہ کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے جا رہے تھے کہ سبلی ہال کے پاس انھیں ایک ابا بچہ لڑکا ملا۔ جو بچے سے بالکل ہی معذور تھا۔ اس نے التجا کے انداز میں، ان سے کہا ”مجھے سائیکل پر بٹھا کر گنگا رام ہسپتال تک لے جائیں۔ انھیں جلدی تھی۔ مگر روٹے کی خواہش ان کا برابر تعاقب کرتی رہی۔ یہ قبرستان کے قریب پہنچ گئے ہوں گے مگر روٹے کی بات ذہن سے نہیں اُترتی تھی۔ ذہن سے اُترتی تو کجا، پریشانی بڑھنے لگی۔ چنانچہ برائے پاؤں پلٹے۔ روٹے کو سائیکل پر بٹھا یا خود پیدل چل کر اسے ہسپتال تک پہنچایا۔ لڑکا کہتا رہا۔ سائیکل پر سوار ہو جائیں، آپ کو جلدی ہوگی۔ یہ جواب دیتے۔ نہیں پیدل چلنے میں لطف آ رہا ہے۔

جب لڑکا منزل مقصود پر پہنچ گیا تو انھوں نے اس سے معافی مانگی۔ میں جلدی میں تھا۔ اس لیے اپنے فرض سے غافل ہو گیا تھا۔ ایسی ہی ”بیوقوفی“ کی ایک بات اور بھی مٹی میں۔ ایک دن یہ صبح سویرے ہی اپنے دفتر اس لیے آکر بیٹھے کہ ایک ضروری کام کو نبھالیا جائے۔ خوب گرمیوں کے دن تھے۔ دھواں بھلا۔ کاغذ، قلم، دوات لے کر بیٹھے۔ خوب موڈ میں تھے۔ اتنے میں ٹھٹھک سے پیچھے کے ساتھ کوئی چیز لگی۔ یہ اسٹے، ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ معلوم ہوا کہ ایک چڑیا پکے ٹکڑے اگر گری پڑی ہے۔ فوراً پکے۔ چڑیا کو اٹھایا۔ جو ادھوئی ہو چکی تھی۔ انھوں نے اسے اپنے ہاتھوں کی گرم آنکھوں میں لیا اور پانی پانی کا وہ شور مچایا، جسے پانی کے بغیر یہ خود ہی کے جارہے ہوں۔ چڑیا نے پانی بیا تو وہ ”ٹھٹھکے“ لگی۔ مگر اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ چکی تھی۔ وہ جان سے تو نہ لگی۔ مگر داغی ہو گئی تھی۔ انھوں نے اسے ایک ادبجی جگہ پر بٹھا دیا مگر خود سارا دن کوئی کام نہ کر سکے۔ وہ ضروری کام بھی ہاتھ پھیرا کر رہ گیا۔

یہ عمو بڑی بڑی باتوں کو ہی جانتے ہیں۔ بعض اوقات یوں ہی اکڑ بھی جاتے ہیں۔ یہ سچ یا اس وقت ہوتے ہیں۔ جب ان کی بہت پر جھک دیا جائے۔ ورنہ بڑی سے بڑی بات ہوتی اور لگتی۔

پطرس بزرگ سبیلے ہیں، انھوں نے کوئی ایک لکھنے والوں کو خط لکھے۔ ان میں ایک ڈاکٹر صاحب بھی تھے۔ فیصلی کے انکشاف لکھنے والے ڈاکٹر نہیں۔ ادب کے ڈاکٹر، بڑا رعب اور غلط ہے ان کا سبھی ان کے سامنے بیٹھتی ہی رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے جوجی میں آئے۔ کہتے رہتے ہیں۔ کوئی بولنا نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے فیصل صاحب کے خط کے جواب میں لکھا :-

طفیل صاحب قلم!

”یہ آپ سحرے ہوئے آدمیوں کو بھیجے گا کیا ڈھنگ نکالا ہے۔ نہ بھائی بہ بات اچھی نہیں رہے تو کچھ ایسا عسوس ہوتا ہے۔ جیسے آپ لوگ دینی اردو کے سالوں لے لے اس انتظار میں رہتے ہیں کہ کوئی مرے اور اس کا تبر نکالیں۔ خواہ جیتے ہی اس کی طرف مر کے بھی کسی نے نہ دیکھا ہو۔ بخاری میرا دوست تھا اور میں اس کے نیلے بہت کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن ابھی اس موڈ میں نہیں ہوں اور کم از کم مردہ نمبر کے لیے میں کچھ نہیں لکھنا چاہتا۔ مردہ نمبروں نے مجھے اس قدر حراساں کیا ہے کہ میں نے اپنی وصیت میں لکھ دیا ہوا ہے کہ میرے مرنے کے بعد کسی کو میرا مردہ نمبر شائع نہ کرنے دیا جائے۔ کیونکہ مجھے اب یہ بالکل واضح طور پر نظر آ رہا ہے کہ کوئی منافع خور ضرور میرے ”نام زندہ“ کو ”مردہ فوڈی“ کے بہانے بیچ کر پیسے بنائے گا اور مجھے یہ مند ہے کہ ”اردو کی خدمت کرنے والے“ یہ کام نہ کریں۔“

جس وقت انھیں ڈاکٹر صاحب کا یہ خط ملا تو انھوں نے اپنے اوپر پیرسٹینٹ بھیجیں کہ اور نکال شخصی نوعیت کے نمبر، یہ اہل قلم سے اپنی عقیدت کے اظہار میں نمبر نکالنے ہیں۔ لوگ اسے منافع خوری کا ایک حیلہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ انھیں دینی جیتے کی طرح ان پر حجابی حملہ کیا :-

برادر م، سلام مسنون!

”آپ کے خط میں اگر صرف یہی لکھا ہوتا کہ میں مضمون نہیں لکھ سکتا تو شاید میں چپ ہو جانا۔ مگر اب تو جواب عرض کرنا ضروری ہو گیا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ میرے اور آپ کے مرنے پر کوئی بھی رسالہ نمبر نہیں نکالے گا بلکہ شاید لوگ یہ کہیں، چلو اچھا ہوا کہ مرا۔ البتہ ہمارے گھر والے ہیں روئیں گے اس لیے کہ ہماری ذات سے ان کا مغاڑا وابستہ ہوگا۔ میری یہ بات شاید اب دل لگی کا درجہ رکھے مگر مجھے اس کے بیچ ہونے پر سو فیصد یقینی ہے کہ کسی کے لیے آپ بڑا ہیں، کسی کے لیے ہیں! المیزان الگ الگ ہیں۔

”مردہ نمبر“ کی ترکیب مجھے پسند آئی۔ غالباً آپ یہ چاہتے ہیں کہ حیف ظہان دھری کی طرح زندگی ہی میں ہر اہم شخصیت کا مجلس نکال دیا جائے۔ اگر کسی کا مجلس اس کی زندگی میں نہ نکلے تو پھر بعد میں بھی نہ نکلے۔ میں اس کا قائل نہیں ہوں۔ اگر کوئی ادیب اس دنیا سے چلا جاتا ہے تو باقیوں کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ اُسے خراج عقیدت

چوٹی کوں۔ اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ جن میں ایک یہ بھی کہ مرحوم کے بارے میں مسائل نہ رہ سکیں۔

دیکھئے نقوش اب اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ بڑی شخصیتوں کی آڑے لے کر اُبھرے۔ بلکہ اللہ کے فضل سے اس نے اپنا ایک مقام بنالیا ہے۔ وہ اگر پطرس نہیں نکالے گا تو بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں نے خوشخبر لکھا تھا اور یہ سمجھ کے لکھا تھا کہ خٹو ایک بڑا نیکیا آرٹسٹ تھا۔ اسے خراج عقیدت پیش کرنا چاہئے۔ مگر اس پر بعض منتعلیق قسم کے لوگوں نے ناک بھوس چڑھائی کہ نقوش کا یہ مقام نہ تھا۔ پھر اس کا دوسرا پہلو بھی لیجئے۔ فخر کا پہلا پوزیشن آج بھی بازاریں ملتا ہے مگر میرے دوسرے فیروں کے تین تہر جاچا بیٹیشن جیسے جن کو سنے کا مطلب یہ ہے میری یہ کوششیں صرف مالی منفعت کے باعث نہیں ہیں بلکہ ایک ادب سے عقیدت کا اظہار ہیں۔

معائنہ کیجئے کہ میں نے کتنے بڑا ڈھنگ لکھا کہ آپ اچھی باتوں کے بڑے پہلوؤں پر ہی سوچتے۔ بہشتیں۔ یہ آپ کی خوبی بھی ہے اور بُرائی بھی۔ بڑا کو نسا بھاری ہے؟ اس کا یہ فیصلہ کون کرے؟

جیسے تیرے۔ تجھے پوچھنے آپ نے یہ باری باتیں "کھلیں" میں نے پیاری باتیں کہیں۔ ————— ادب عالیہ

اس پر نگاہ: یہ نقوش نا فاعل حرکی کی بات نہیں نکلی ہے۔ توطنیل صاحب کا ایک خط اور بھی پڑھیں جو انھوں نے اپنے ایک

دور رس کو دیر چند روزہ انصاری کو لکھا تھا:۔۔۔

یاد رہے: یہ خط نا فاعل حرکی کا ہے۔

آپ کی شکایت بالکل بجا ہے کہ آپ کی تمام تر تعزیرات کا انتخاب اب تک چھپ جانا چاہئے تھا۔ یہ شکایت نہ صرف سو فیصد حق بجانب ہے۔ بلکہ سب کی دوسٹ آرڈر سو فیصد بھی درست ہو سکتی تو یہی ٹھیک تھا تو بھی غلط نہ ہوتا۔

مگر یاد کیا جاتاؤں یہ جو تشویش کی بجائی میری جان کو کھینچے۔ اس نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا میرا لکھوں کا اور اچھوٹ ہو گیا ہے۔ مذکوئی نئی کتاب چھپتی ہے نہ کسی بیانی کتاب کا نیا بیٹیشن آتا ہے۔ پتھر بھی میری ہے تو بھی کجائی طرح شکرت ہے۔ خود بڑا پریشان ہوں۔ کئی بار اپنے اوپر غصہ آتا ہے (یاد رہے) اس کی حالت دیکھ کر ہی بتا چاہتا ہوں تو کوکشی کر لوں یا نقوش کو بند کر دوں۔ تا کہ یہ اندازہ کم کا آدمی بن جاؤں اور وہ سب کچھ کروں جو میرے لیے دنیاوی اعتبار سے زیادہ سودمند ہو۔ یہ خیال کرتا ہوں تو نقوش محبوبیت کی تمام تر تڑپا دیئے والی اداسوں کے ساتھ

میرے موٹے پر پوت بن کر جاتا ہے اور میں پھر ایک زخم خوردہ عاشق کی طرح، اس پر دلی شکاری ہوجاتا ہوں۔ بہک جاتا ہوں۔ ہار جاتا ہوں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ مجھے نقوش میں مالی اعتبار سے نقصان ہوتا ہے۔ میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے نقوش کے حسن و جمال میں مزید تابی پیدا کرنے کے لیے اتنا کچھ کرنا پڑتا ہے کہ باقی کے سائے کام ٹھپ ہو گئے ہیں۔ دیکھا جائے تو یہ حینیت مجموعی یہ سودا منہ کا بڑا ہوسے۔

میرے عشق نے جو میری حالت بنا رکھی ہے وہ سب کچھ آپ سے کر دی ہے۔ اس وجہ سے میں آپ کی تکلیف جلد تر شامت سے مجبور رہا۔ والسلام!

ایک جگہ میں نے لکھا ہے کہ طفیل صاحب بڑے نفاست پسند ہیں۔ اس کا انوار اور لوگوں نے بھی کیا ہے۔ مگر میں بھی آپ کو ان کی نفاست پسندی اور کاہلی کا حال ایک ساتھ ہی سناؤں۔

جس دن ان کے قلم کی بخراب ہو۔ سیاہی اچھی نہ ہو۔ کاغذ اچھا نہ ہو۔ یہ کسی کو خط ہی نہیں لکھیں گے۔ خواہ کتنا ہی ضروری کام کیوں نہ ہو۔ پھر جس دن یہ سب چیزیں اچھی ہوں گی۔ یہ خط پر خط لکھتے چلے جائیں گے۔ حتیٰ کہ بلاوجہ بھی خط لکھتے رہیں گے جس دن انھیں خط لکھنے کا دورہ پڑتا ہے تو پہنچاؤں، پچاس ساٹھ ساٹھ خط لکھ ڈالیں گے۔

ان کی میر مستورات، ضروری اور غیر ضروری کاغذات سے بٹی رہتی ہے۔ ان کے ارد گرد بھی یہی حال ہوتا ہے۔ اگر ایک ٹکڑے سے لفظے میں ضروری خط اور سب سے بڑے ٹکڑے میں غیر ضروری خط لکھتے ہیں تو دوسرے لفظے میں بھی، خوش میوین لفظوں میں، اگر کسی چیز کی، انھیں ضرورت پڑ جائے تو ضروری نہیں وہ ہی دن مل جائے۔

کبھی کبھی ان کا چیزا سی، مینر کی یہ محانت دیکھ کر، سائے لفظوں کو ایک جگہ باندھ کر، کسی دوسری جگہ رکھ دیتا ہے۔ وہ بھی کیا کرے۔ وہ برداشت نہیں کرنا کہ میر کو مال کو دام بننا دیکھے، مگر یہ دیکھتے رہتے ہیں۔ یہ بہ کاغذ کو غمی سمجھ کر اپنے سے دور کرنا نہیں چاہتے۔ وہ بہ کاغذ کو غیر ضروری سمجھ کر ٹھکانے لگا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی غمی مست دے بھی دفنی طور پر کہہ جاتے ہیں۔ پھر یہ انھیں ہفتوں اور مہینوں تلاش کرتے رہتے ہیں۔ انھیں یہ پسند نہیں کہ کوئی کام آسانی سے ہو جائے۔ یہ ہر آسان کام میں خود دشواریاں پیدا کر کے پھر سائے آسان بنانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔

ایک دن ایک صاحب انھیں اپنی ایک غزل دے گئے۔ انھوں نے رکھی۔ دوسرے تیسرے دن وہ صاحب تشریف لائے اور پوچھا "میری غزل پڑھی ہے؟"

"نہیں"

"اچھا پھر بے واپس کر دیجئے۔"

"نہیں اب کہاں ہے؟"

"میں میرے پر ہوگی۔ ڈھونڈھ دیجئے۔"

”بھی نہیں ملے گی“

”حل جائے گی“

”محبوب میری میر پر اگر اتنی بھی کم ہو جائے تو وہ بھی ایک دن میں قوتل نہیں سکتا“

غلیل صاحب تصور کے بے حد قابل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی میں کوئی مسئلہ ہے ہی نہیں۔ یہ ہر کام کے لیے ان کے لئے منشاء کرتے ہیں۔ کام ہو جاتا ہے تو شکر گزار ہو جاتے ہیں۔ نہ ہو جب بھی یہ سمجھ جیتے ہیں کہ ہو گیا۔

کسی دوست نے انہیں درغلابا کہ حکومت وقت کو اپنے کارناموں سے مطلع کرو۔ وہ قہقہے لاکر کہنے لگے اور کہہ نہیں تو لپک آؤ تو صحتی جملہ تو بھیج ہی گئے۔ یہ بڑے خوش، سادے لباس کا ایک بڑا سا پلندا بنا کر بھیج دیا اور اب اس تاریخ کا انتظار کرنے لگے جس دن حکومت اعلان کرتی ہے کہ فلاں کو یہ عفو دیا، فلاں کو یہ خطاب۔ چنانچہ صاحب وہ تاریخ بھی آئی جس دن یہ کام ہوتا ہے۔ اب ہر بار بارناموں کو پڑھتے ہیں۔ مگر ان میں ان کا نام نظر نہ آیا۔ بڑے آزرہ پڑے۔ مگر مایوس نہیں۔ فوراً تصور کی دنیا میں چلے آئے اور یہ سمجھ لیا کہ مجھے حکومت نے، حسب بڑا ادبی اعزاز عفو دیا ہے۔ اب کوئی انہیں لاکھ کے کمریاں، تھیں تو کسی نے منہ لگایا ہی نہیں۔ مگر یہ کسی کی کب سننے ہیں۔ اپنی مورچ میں رہتے ہیں۔ اپنے تصور ذات کی دنیا میں رہتے ہیں، جو ان کی کلفتوں اور آزرہ دگیوں کا واحد سہارا ہے۔

یہ کبھی کبھی بوں ہی سوچتے ہیں :-

”ہر فرض محال میں آج مر جاؤں تو کیا ہو۔ بہت سے لوگ تو خوش ہوں گے۔ کچھ خدائیں قسم کے لوگ، امیری تمام تر نالائقیوں کے باوجود (شاید یہ کہیں کہ اچھا ہی آدمی تھا۔ جن کو ادب سے شغف ہو گا۔ وہ ممکن ہے یہ کہیں)۔ انہوں نے اپنے زمانے میں اچھے اچھے فنکار ملے۔ اور بس۔۔۔ خور کیجئے میرے بعد، میری زندگی کا حاصل ہی ایک فقرہ ہو گا۔ صرف اسی ایک فقرے کے لیے میں نے کیا کیا کچھ نہیں کیا ہے؟ دنیا تیاگ دی ہے۔ مجھے زندگی کی دل کشنیوں اور مصرتوں سے واسطہ نہیں رہا۔ دن رات کام کرتا ہوں۔ دن رات مرنے ہوں۔ دن رات کام کرتا ہوں۔

یار دوستوں سے ملنے کے لیے میرے پاس وقت نہیں۔ بچوں کی دیکھ بھال کے لیے میرے پاس وقت نہیں۔ بیوی سے ہنسنے بولنا میرے تقدیر میں نہیں۔ گھر سے دفتر، دفتر سے گھر کس لیے؟۔۔۔ صرف ایک فقرے کے لیے۔

اگر میں میں جوانی میں مر گیا۔ جس کے بڑے امکانات ہیں تو میرے بچوں کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھرنے والا بھی کوئی نہ ہو گا اور میرے بچے اس فقرے کو چاٹا کریں گے۔ ”ہمارے آبا نے بڑے بڑے اچھے فنکار لکھے۔“

بہر حال ان کے بعد، جو کچھ بھی ہو۔ انہوں نے اپنی زندگی صرف اسی ایک فقرے کے لیے ضائع کر دی ہے۔



پیارا بچہ !

بے شک پیارا اور بے حد پیارا کیوں نہ ہوتا۔ ماں کی نعمت، اس کی نگہداشت اور آسٹرملک کی خوشیاں کا درگاہ ہیں۔ دانشمند ہیں وہ مائیں جو اپنے بچوں کی پرورش آسٹرملک سے کرتی ہیں۔ خواہ ماں کے دودھ کی کمی کو پورا کرنے کے لئے دیا جائے یا دودھ چھٹ جالنے پر، آسٹرملک ماں کے دودھ کا بہترین بدل ہے۔

آسٹرملک اعلیٰ اور خاص قسم کے دودھ سے تیار کیا جاتا ہے۔ اس میں فولاد بلیا گیا ہے تاکہ بچوں میں خون کی کمی نہ ہونے پائے، اور بڑیوں اور دانتوں کی مضبوطی کے لئے وٹامن ڈی بھی شامل کیا گیا ہے۔ جی ہاں! یہی وجہ ہے کہ مائیں پختہ اعتماد کے ساتھ بچوں کو آسٹرملک دیتی ہیں۔

آسٹرملک

ماں کے دودھ کا بہترین نعم البدل



منازلہ پیشکش

خالصہ

نیلو فر شرکت خاندانی کا یہ ناول بے حد مقبول ہو رہا ہے۔ اگر آپ نے اب تک اسے نہیں پڑھا تو آپ مزاحیہ ادب کی ایک نادر کتاب کے مطالعہ سے محروم ہیں۔

خاندانی تاریخ کے نگار ہیں ام المہدیہ حضرت خدیجہ کا بڑا اقدوس ہے۔ یہ کتاب اس پاک بانو کی پیشہ خانوں کے حالات و زندگی پر مشتمل ہے۔ عبدالحیہ الزہراؤ کی اس کتاب کا مطالعہ حیات کا موصف

حضرت خاندانین ولید کے عہد کا زمانہ اس سے کون واقف نہیں ہوگا اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ اس پر کیا سہ سال کی شخصیت میں حیثیت انسان کے کیا کی غلطیاں تھیں۔ زانی کر دیکھا تھا اور اس نے ان کی جنگی فتوحات پر کیا اثر ڈالا۔ یہ کتاب عربی کے مشہور شخصیت نگار جاس محمود العقاد کی لکھی ہوئی ہے اور اپنی قیمت کے اعتبار سے اردو ادب میں پہلی پیش کش ہے۔

قیمت ۶/-
۳/-

عربک تین مدبر

اسلام نے کئی صاحبِ تدبیر شخصیتیں پیدا کیں مگر مغربہ بن شعبہ زہراؤ بن ابیہ عرب بن العاص ایسے تہتر اسلام کی پوری تاریخ میں کم نہیں گئے۔ یہ کتاب آپ کو بتائے گی کہ کیسے کیسے تین بزرگوں پر ان صاحبانِ تدبیر نے وقت کی نبضوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ یہ عراق النصر کی تصنیف ہے جس کے قلم کار ڈاؤد دان طبعی مانی چکا ہے۔

قیمت ۳/-

بجانی

جیسے میرا بھائی گل کی بھور بھائی "یہ کہادت تو نہ جائے کہ سے سننے میں آ رہی ہے مگر ناول "بجانی" کے ہیرو نے اس کو واقعہ کر دکھایا ہے کہ جب کبھی ملے ایک نئی خاتون کے ساتھ ملے اور ہر تہہ اس خاتون سے بھی کہہ کر قدرت کر پائے ان سے ملنے یہ آپ کی بجانی ہیں۔ ایسا باغ و بہار کردار اور شوکت خاندانی کا نگار اعداد و بیان میں سرا آگیا۔

قیمت ۲/۸

نمک مرچ

شرکت خاندانی کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہر مضمون جان نواخت ہے۔

قیمت ۳/-

باغ و بہار

عبدالحیہ محمد کے تازہ ترین قسطوں کا مجموعہ

قیمت ۳/-

ادارہ

فروغ اردو، لاہور

۱۸۲۰۶

MUSSOORIE

This book is to be returned on the date last stamped

[illegible]

U 18206
 891.43903 वापि सं०
 No. ACC. No.....
 No. 79-80. पुस्तक सं.
 वर्ग सं. पुस्तक सं.
 Class No..... Book No.....
 लेखक
 Author.....
 शीर्षक Namoosh : Adab-i-Alya
 Title.....

891.43905

18206

LIBRARY
LAL BAHADUR SHASTRI
National Academy of Administration
MUSSOORIE

Accession No.

1. Books are issued for 15 days only but may have to be recalled earlier if urgently required.
2. An over-due charge of 25 Paise per day per volume will be charged.
3. Books may be renewed on request, at the discretion of the Librarian.
4. Periodicals, Rare and Reference books may not be issued and may be consulted only in the Library.
5. Books lost, defaced or injured in any way shall have to be replaced or its double price shall be paid by the borrower.

Help to keep this book fresh, clean & moving